ماہی ماہی کوکدی میں



1

ہما کوکب بخاری

انتساب

اپنے پیارے ابو جان کے نام
جنہوں نے میرے ہاتھ میں قلم تھمایا

ہما کوکب بخاری

پیش لفظ

''ماہی ماہی کوکدی میں'' میرا پہلا ناول ہے۔ آپ میں سے بہت سے قارئین اسے قسط وارصورت میں ماہنامہ ''خواتین ڈائجسٹ'' میں پڑھ ہی چکے ہیں۔ بہت سی وجوہات کی بناء پر میرا اسے کتابی شکل میں لانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن علی میاں پبلیکیشنز کے عبدالغفار صاحب کی مشکور ہوں جن کی کاوشوں کے باعث یہ ناول آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اس ناول کو لکھتے ہوئے میں نے کوشش کی تھی کہ اس میں ممکنہ حد تک زندگی کے حقیقی رنگ بھروں۔ اس کے کردار وہی ہوں جنہیں آپ اپنے اردگرد چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہوں، وہی رویئے ہوں جنہیں آپ محسوس کر سکتے ہوں اور وہی کہانی ہو جو آپ کے گرد کہیں موجود ہو لیکن زندگی کی ہماہمی میں شاید آپ نے اسے نظرانداز کر دیا ہو۔ اس ناول میں یہ سبھی کچھ ہے لیکن اس حقیقت کے ساتھ ساتھ زیبِ داستاں کے لئے کچھ افسانہ بھی ہے۔

یہ ناول پچھلی صدی یا یوں کہہ لیں کہ پچھلے ہزاریئے کی آخری دہائی کے شروع میں لکھا گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب آج کی بہت سی ضروریات صرف آسائشات سمجھی جاتی تھیں۔ سو نئے پڑھنے والوں کو بتا دوں کہ ناول میں بہت ضرورت کے وقت بھی سیلولر فون اور انٹرنیٹ کا استعمال اگر آپ کو دکھائی نہ دے تو سمجھ جائیں کہ یہ بیتے وقت کی داستان ہے۔

یہ ان لوگوں کی کہانی ہے جو ہمارے معاشرے میں ایک بلند مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان سے عقیدت اور محبت کو لوگ ایمان کا حصہ تصور کرتے ہیں۔ وہ صدیوں پرانی خود ساختہ روایات کو محض اس وجہ سے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں کہ یہ ان کے بزرگوں کی روایات ہیں۔ انہوں نے ان روایتوں کو پاؤں کی زنجیر بنا رکھا ہے۔

اسی خاندان کا ایک سرپھرا نوجوان ان روایتوں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو ایک بھونچال آجاتا ہے۔ نفرت اور دشمنی کی ایک نہ بجھنے والی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ جھوٹی اَنا کی

جنگ چھڑ جاتی ہے۔خون کے رشتے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔

نفرتوں کے آکٹوپس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا...... ایسے نازک وقت میں ایک نازک سی لڑکی نفرت اور دشمنی کی آگ کو بجھانے کا عزم کرتی ہے اور اتنی بڑی قربانی دیتی ہے جس کا کوئی عورت تصور بھی نہیں کر سکتی۔یہی اس کہانی کا کلائمکس ہے۔

یہ ناول تقریباً تین سال تک ''خواتین ڈائجسٹ'' میں چھپتا رہا۔ان تین سالوں میں زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے۔ایسے میں اگر میرے گھر والوں،خصوصاً میری امی جان،آپی،ارم اور وجاہت کا سہارا نہ ہوتا تو یہ ناول کبھی بھی مکمل نہ ہو پاتا۔ابو جان کی وفات کے بعد قلم تو کیا اپنی زندگی سے بھی اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔اس وقت انہی پیارے لوگوں کے سہارے میں نے قلم سے دوبارہ ناتا جوڑا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے جناب محمود ریاض صاحب (مرحوم) اور محترمہ امت الصبور کے تعاون اور محبت کے باعث ہی یہ ناول مکمل ہو پایا تھا۔میں ان سبھی افراد کی تہہِ دل سے مشکور ہوں۔

ہما کوکب بخاری

زندگی کی راہیں کبھی کبھار بہت پُر پیچ اور پُر خار ہوتی ہیں۔نہ جانے حقیقت کہاں افسانے میں اور افسانہ کب حقیقت میں مدغم ہو جاتا ہے' جو کسی کو یہ کتھا سنانے بیٹھو تو شاید کوئی یقین ہی نہ کرے لیکن یہی حقیقت ہے' یہی سچ ہے کہ شاہراہ حیات پر یوں بھی ہوتا ہے' جب چلتے چلتے تھک کر ہم کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نگاہ دوڑاتے ہیں تو دور کہیں ٹمٹماتی روشنی دکھائی دیتی ہے لیکن اس تک بڑھتے بڑھتے پتا چلتا ہے کہ یہ تو ممنوعہ علاقہ ہے۔یہ ہماری نہیں کسی اور کی پناہ گاہ ہے۔تب یہ احساس شدت اختیار کر جاتا ہے کہ ان راہوں پر چلنے والے کے لیے گناہ وثواب محض ضمنی باتیں ہوتی ہیں اور اس گناہ وثواب کے درمیان جو حدِ فاصل شیخ و برہمن نے کھینچ رکھی ہے' وہ کتنی بے معنی ہے۔

☆======☆======☆

کالج میں فیئر ویل کے انتظامات زور وشور سے جاری تھے۔زیادہ تر کام فرسٹ ایئر کے طلباء کو سونپا گیا تھا۔ماہ بانو صبح سے اور ساتھیوں کے ساتھ میورل بنانے میں مصروف تھی۔رنگ' رونق اور خوشبو سے اسے عشق تھا اور کالج ان تینوں چیزوں میں خود کفیل تھا۔پھر یکایک اسے نہ جانے کیا ہوا کہ سب رنگ پھیکے لگنے لگے۔رونق بے معنی ہو گئی اور خوشبو ہوا میں تحلیل ہو گئی۔اس نے سرسری نظر سے سب کا جائزہ لیا۔رنگوں کی شیشیاں فرش پر کھلی پڑی تھیں' گتے بکھرے ہوئے تھے' لڑکوں کے منہ میں جلے ہوئے سگریٹ تھے اور لڑکیاں ایک ہاتھ سے بال ماتھے سے ہٹاتی' دوسرے ہاتھ میں برش پکڑے کام میں مصروف تھیں۔ایپرن تو پہلے ہی رنگوں اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔جنہوں نے ایپرن پہننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی' ان کی قمیصوں پر نیلے' پیلے' سرخ اور نہ جانے کن کن رنگوں سے تجریدی آرٹ کے نمونے بنے ہوئے تھے۔سب ہی بہت پُر جوش لگ رہے تھے۔پتا نہیں ماہ بانو کو اچانک کیا ہوا تھا کہ وہ بیزار ہو گئی تھی۔

وہ سب کو اپنے اپنے کام میں مصروف چھوڑ کر وہاں سے اٹھ آئی اور آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں رکھے کالج کا نظارا کرنے لگی۔چہرے...... چہرے......

چہرے۔ کتنے چہرے تھے' یہاں بے فکرے' ہنستے بولتے...... رنگوں میں ڈوبے چہرے' لیکن جس چہرے کا اسے شدت سے انتظار تھا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ عبداللہ کا چہرہ...... ریشماں کے عبداللہ کا چہرہ۔

وہ اِس خوش قسمت چہرے کی منتظر تھی' جسے ایک بے حد حسین اور نرم و نازک لڑکی بنا دیکھے ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی۔ ایسے لوگ خوش قسمت ہی تو ہوتے ہیں' جنہیں محبتیں بے مانگے مل جاتی ہیں لیکن عبداللہ کالج سے ایک سال کی چھٹی پر تھا۔ اسے اس کے بابا نے ورلڈ ٹور پر بھیجا ہوا تھا اور یہاں ماہ بانو اس کا انتظار کر رہی تھی اور اس انتظار کو تقریباً ایک سال ہونے والا تھا۔

اس ایک سال میں اس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ بہت کچھ پایا تھا اور بہت کچھ کھویا تھا۔ اسی سال میں اسے اُما ملی تھی۔ اُما واقعی روشنی اور نور کی مانند تھی۔ وہ ہندو تھی لیکن ماہ بانو اور اس کے بیچ یہ اَن دیکھا' اَن کہا معاہدہ تھا کہ مذہب ان دونوں کی دوستی کے درمیان حائل نہیں ہوگا۔ پھر عرفان تھا بے حد باتونی' جسے باتوں اور پینٹنگ کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا اور سب سے بڑھ کر سعد تھا۔ دیکھنے میں سعد عام سا لڑکا تھا' جیسے بہت سے لڑکے ہوتے ہیں' جن میں کوئی بھی خاص بات نہیں ہوتی لیکن ماہ بانو کے لیے وہ ان بہت سے عام لڑکوں سے بالکل جدا تھا کیونکہ اتنے سارے لڑکوں کے درمیان سعد وہ واحد لڑکا تھا' جس کے نام پر ماہ بانو کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔

اب سے پہلے ماہ بانو نے صرف انارکلی آتے جاتے میوزیم کے پہلو میں ایستادہ اس عمارت کو دور دور سے ہی دیکھا تھا۔ سرخ رنگ کی یہ عمارت اسے ہمیشہ بہت پُراسرار' بہت گہری لگتی تھی اور لوہے کی سیاہ گرل کے پیچھے واقع اس کی پارکنگ میں چلنے پھرنے والے سب لوگ اسے کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی دیتے تھے' جن تک اس کی رسائی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ سب اسے بہت اعلیٰ بہت منفرد لگتے تھے' جن کے ہاتھ کورے کاغذ پر رنگوں کی مدد سے جان ڈال دیتے تھے' جو زمین پر بکھری ہوئی بے جان مٹی کو پل بھر میں شکل عطا کر دیتے تھے۔

پھر ایف۔ اے کا رزلٹ نکلنے کے بعد ابا جی نے اسے اپنے پاس بلایا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اسی جادو کی نگری میں داخل ہو جائے۔ اماں کو اعتراض تھا کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے' نہ جانے وہاں کا ماحول کیسا ہوگا کچھ اِدھر اُدھر سے بھی انہوں نے سن لیا تھا کہ لڑکیوں کے لیے ایسے ماحول میں پڑھنا ٹھیک نہیں ہے لیکن ابا جی کے اصرار کے سامنے انہیں ہار ماننا پڑی اور یوں ماہ بانو اس جادو نگری میں چلی آئی۔

وہ ہولے سے ہنس پڑی۔ ''یہ جگہ میرے تخیل سے کتنی مختلف ہے۔ نہ تو یہاں جادوگر رہتے ہیں' نہ ہی بہت اعلیٰ اور منفرد لوگ۔ کتنے عام انسان بستے ہیں یہاں میرے جیسے عام سے لوگ۔''

اسے یاد تھا' اب سے بہت سال پہلے وہ اماں اور ابا جی کے ساتھ گھر کے کچے آنگن میں پیڑھی پر بیٹھی رات کا کھانا کھا رہی تھی۔ آنگن کی دیوار کے ساتھ ایک ترتیب میں بہت سی مٹکیاں'

گھڑے' صراحیاں اور مٹی کی ہانڈیاں رکھی تھیں۔ ہولے ہولے چلنے والی نرم ہوا ان کی کچی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چاروں طرف پھیلا رہی تھی۔

''ابا جی!'' ماہ بانو نے مسحور ہو کر کہا۔

ابا جی نے چنگیر سے روٹی اٹھاتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''ابا جی! یہ خوشبو کتنی اچھی ہے۔ شاید دنیا کی سب خوشبوؤں سے بڑھ کر مٹی کی خوشبو ہے' کوئی اور خوشبو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

''ہوں۔'' وہ مسکرائے۔

''ابا جی آپ کتنے خوش قسمت ہیں۔'' وہ پھر بولی۔ ''آپ کے ہاتھ میں آ کر تو مٹی کو زبان مل جاتی ہے۔''

''کاش ایسا ہو سکتا۔'' انہوں نے چنگیر ایک طرف سرکا دی اور پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

''کیوں؟ کیا آپ ایسا نہیں سمجھتے؟''

''میرے سمجھنے نہ سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک کمہار کی اُڑان بہت محدود ہوتی ہے۔ اس کی سوچ اور اس کا ہنر دونوں ہی بہت روایتی ہوتے ہیں۔ اتنے ہی محدود اور روایتی جتنا محدود اور روایتی یہ چاک کا چکر ہے' جتنا محدود اور روایتی یہ کچا مکان اور اس کا ماحول ہے اور جتنے محدود اور روایتی اب میرے خواب ہیں۔''

''کیوں ابا جی' آپ زندگی سے کیا چاہتے تھے؟ بہت شاندار بنگلا' لمبی سی چمکتی ہوئی کار' اچھا کھانا اور پہننا' دو چار شوگر اور ٹیکسٹائل ملیں؟'' وہ ہنسی۔ ''نہیں ابا جی اگر یہ سب ہمارے پاس ہوتا تو ہم کتنے محروم ہوتے' پھر مٹی کی یہ خوشبو ہمیں کیسے نصیب ہوتی۔''

ابا جی نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اپنے چھوٹے سے کمرے کی طرح اپنی سوچ کو کبھی محدود نہ ہونے دینا ماہ بانو! میں نے زندگی کے لیے بہت سے خواب بُنے تھے' لیکن نہ تو میرے خوابوں میں کوئی شوگر مل تھی اور نہ ٹیکسٹائل مل...... میرے سب خواب مٹی سے گندھے ہوئے تھے۔''

''کیوں ناشکری کرتے ہیں۔'' اماں جواب تک خاموش بیٹھی باپ بیٹی کی باتیں سن رہی تھیں' ان سے نہ رہا گیا۔ ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں لاکھوں سے بہتر بنایا ہے' دو وقت کا کھانا آرام سے نصیب ہو جاتا ہے۔ ہماری کتنی جانیں ہیں' تین فرد ہیں گھر میں' ہمیں کس چیز کا لالچ؟ ہمیں اتنا ہی بہت ہے' انسان کو قناعت پسند ہونا چاہیے۔''

''زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کو ناشکری نہیں کہتے۔'' ابا جی بولے۔ ''اور عقل و ہنر میں قناعت پسندی کا مطلب یہ ہوا کہ ہمالیہ کے پانی کو نیچے اتر کر زمین سیراب کرنے کے بجائے وہیں چوٹی پر قید کر کے جوہڑ بنا دیا جائے۔''

“ویری گڈ ابا جی!” ماہ بانو نے تالی بجائی۔ “آپ کا ایک پوائنٹ ہوا۔”

پھر وہ اماں سے مخاطب ہوئی۔ “اگر آپ نے جلد ہی ابا کو اس بات کا جواب نہ دیا تو آپ ہار جائیں گی۔”

اماں نے برتن سمیٹے۔ “میں ہمیشہ تمہارے ابا جی سے ہار جاتی ہوں‘ یہ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ مجھے کوئی جواب ہی نہیں سوجھتا۔”

اماں کی سادگی پر ابا جی اور ماہ بانو دل کھول کر ہنسے۔

“ہنس لیں جتنا ہنسنا ہے۔” اماں باورچی خانے میں جاتے جاتے پلٹ آئیں۔ “میں تو اس لیے کہتی ہوں کہ ایسی باتیں سن کر شیطان آجاتا ہے اور بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔”

“ہوناں مولوی کی بیٹی۔” ابا جی بدستور ہنس رہے تھے۔ “اب میری عمر نہیں رہی کہ شیطان آکر بہکائے۔”

“آپ سے کیا بحث! آپ تو ہر بات کو گھما پھرا کر نہ جانے کہاں لے جاتے ہیں۔” وہ پھر باورچی خانے کی طرف پلٹ گئیں۔

“بانو کی ماں! جب مزاج کچھ بہتر ہو جائے تو ایک پیالی چائے لا دینا۔ اپنے سسر بزرگوار کو کہتے سنا ہے کہ جو عورت شوہر کی خدمت کرتی ہے‘ وہ سیدھی جنت میں جاتی ہے۔ بڑا مقام و مرتبہ ہے ایسی بیویوں کا۔”

جواب میں باورچی خانے سے سوائے برتنوں کی کھنک کے کوئی آواز نہ آئی۔ ابا جی نے ماہ بانو کی طرف دیکھا جو دلچسپی سے انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

“چلو اب چل کر سو جاؤ‘ صبح جلدی اٹھنے کے لیے ضروری ہے کہ رات کو وقت پر سویا جائے۔”

“ابا جی! مجھے نیند نہیں آرہی۔” اس نے کہا۔ “میرا دل چاہ رہا ہے‘ آپ سے باتیں کرنے کو۔”

“ضرور کرو باتیں لیکن یہاں نہیں‘ پہلے چارپائیاں بچھا دو‘ میں تھک گیا ہوں‘ لیٹ کر باتیں کروں گا۔”

ماہ بانو نے فٹافٹ آنگن میں چارپائیاں بچھا کر بستر لگا دیے۔

“ابا جی آجائیں۔”

ابا جی لیٹے ہی تھے کہ اماں چائے کی پیالی لے کر آ گئیں۔ “سو گئے کیا؟”

“نہیں سویا نہیں تھا‘ چائے کا انتظار کر رہا تھا۔” وہ اٹھ بیٹھے اور پیالی تھام لی۔ “ہاں تو بانو تمہارا کیا باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا؟” انہوں نے چائے کا گھونٹ بھر کر پوچھا۔

وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ “ابا جی! اگر آپ کے خواب اتنے اونچے تھے تو پھر

انہیں پانے کے لیے آپ نے جدوجہد کیوں نہیں کی؟ آپ تو کہتے ہیں کہ کوشش کرنے سے انسان سب کچھ پالیتا ہے۔”

“جو کچھ میں اب کہتا ہوں‘ وہ عمر کے تین چار عشروں کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ جانتی ہو بانو بیٹا! میں کتنی کٹھالیوں سے گزرا ہوں؟ لیکن افسوس کہ کندن بننا میرے نصیب میں نہیں تھا۔” پھر وہ ایک لمحے کے توقف سے بولے۔ “میں گاؤں کا ایک سیدھا سادا‘ جاہل دیہاتی لڑکا تھا۔ میرے، باپ دادا‘ پردادا اور ان کے پردادا تک سب کمہار تھے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی مٹی اور چاک کا چکر دیکھا تھا...... مٹکیاں اور صراحیاں دیکھی تھیں۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ کب مٹی کا پیڑا چاک پر رکھا تھا۔ میں تو بس سارا دن مٹی اور چاک سے کھیلتا تھا اور رات کو تھک کر سو جاتا تھا۔ میری دنیا بہت محدود تھی لیکن میں خوش تھا۔ تمہاری طرح‘ مجھے بھی مٹی کی خوشبو مسحور کر دیتی تھی۔ میری زندگی میں پہلی مرتبہ اس وقت تبدیلی واقع ہوئی جب گھر میں میری شادی کی بات چلی۔ کیوں بانو کی ماں‘ یاد ہے تمہیں وہ وقت۔”

“ہٹیں‘ بچی کے سامنے کیا باتیں کرنے لگے‘ چلو بانو اپنے بستر پر۔” اماں نے کہا۔

“تم ہم دونوں کے درمیان مت آؤ‘ ہم دونوں دوست ہیں‘ کیوں بانو؟”

“جی ابا جی۔” وہ چہکی۔

“بس اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟” ابا جی اماں کی طرف مڑے۔

“میں اعتراض کروں بھی تو آپ کو کیا پروا؟” اماں احتجاجاً کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔

“کیوں بانو! تمہاری ماں ہم سے ناراض ہو گئی ہے کیا؟”

“ابا جی! آپ اماں کو چھوڑیں‘ سونے کے لیے کروٹ لی ہے انہوں نے۔” ماہ بانو جلدی سے بولی۔ مبادا ابا جی‘ اماں کی ناراضگی کی وجہ سے اس سے بات چیت بند کر کے خود بھی سونے کی تیاری شروع کر دیں۔

“ہوں‘ تو میں غالباً شادی کی بات کر رہا تھا۔”

“جی ابا جی۔”

“تو میری زندگی میں تبدیلی اس وقت رُونما ہوئی جب میری شادی کی بات چلی۔ ہمارے وقت میں یہ رواج نہیں تھا کہ شادی سے پہلے لڑکا‘ لڑکی ایک دوسرے کو دیکھیں‘ نہ ہی ہمارے اماں ابا نے ہم سے پوچھا کہ ہم شادی کہاں کرنا چاہتے ہیں‘ سب کچھ بالا ہی بالا طے کر دیا۔”

“تو ابا جی! آپ کہیں اور شادی کرنا چاہتے تھے؟” ماہ بانو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

“ارے توبہ کرو‘ ہماری یہ مجال کہاں تھی۔” وہ ہنسے۔ “میں نے مٹی اور چاک کے چکر کے علاوہ کبھی کسی چیز کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم نے میری بات کا غلط مطلب

نکال لیا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے رشتہ طے ہو جانے کے بعد بھی کتنے دن تک خبر ہی نہیں تھی کہ میری زندگی میں تمہاری اماں رضیہ بیگم تشریف لانے والی ہیں اور جب یہ آئیں تو لگا کہ زندگی میں بہار آ گئی ہے اور مٹی صرف چاک پر دھر کر برتن بنانے کے لیے نہیں ہوتی۔ اسی مٹی میں پھول بھی کھلتے ہیں' لیکن بانو گڑیا! جہاں پھول ہوتے ہیں' وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔

گاؤں میں ہم سب مل کر ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ میری بھاوج بیگم کو یہ اچھا نہیں لگا کہ ان کی تین کمروں کی راجدھانی دولتِ مشترکہ بن جائے۔ بس روز روز کی کھٹ پٹ شروع ہو گئی۔ تمہاری اماں کے منہ میں تو زبان ہی نہیں تھی۔ ہاں آنکھوں میں جل تھل رہتا تھا۔"

"آپ کیا خاندان کے سارے بکھیڑے سنا ڈالیں گے؟" اماں نے کروٹ بدلے بغیر ابا کی بات کاٹی۔

"تو تم جاگ رہی ہو؟"

"آپ لوگوں کی باتیں سونے دیں گی بھلا۔"

"ابا جی! آپ اماں کی باتیں چھوڑیں۔" ماہ بانو نے جلدی سے مداخلت کی۔ "یہ بتائیں پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ کہیں اور قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ پہلے تو تمہاری اماں کو گاؤں میں ہی چھوڑ کر آیا' جب حالات بہتر ہوئے تو تم دونوں کو یہیں لے آیا۔ اس وقت تم بہت ننھی منی سی تھیں۔ یہ جو کونے میں چنبیلی کا چھوٹا سا پودا لگا ہوا ہے ناں بالکل اتنی سی تھیں۔"

ماہ بانو ہنس پڑی۔

"لیکن اصل بات میں نے تمہیں اب تک نہیں بتائی۔ تم نے پوچھا تھا ناں کہ میرے خواب اتنے اونچے تھے تو پھر میں نے انہیں پانے کے لیے جدوجہد کیوں نہ کی؟" ابا جی بولے۔

ماہ بانو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ان دنوں میں کام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا' جب دینو کمہار سے میری ملاقات ہوئی۔ اس بے چارے نے ساری زندگی شادی نہیں کی تھی اور بہت بوڑھا بھی تھا۔ بس سمجھو جیسے آج کل کا مہمان ہو۔ اپنا سب کچھ اس غریب نے کسے دے کر جانا تھا۔ مجھے اپنے ہمراہ رکھ لیا۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ ایسے خدا ترس انسان کی خوب جی جان سے خدمت کرنی ہے' اسی لیے سارا کام سنبھال لیا۔ دن بھر کی مزدوری میں دینو چاچا کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا' وہ آدھا خود رکھ لیتا اور آدھا مجھے دے دیتا تھا۔ یہ تو دینو چاچا کی وفات کے وقت مجھے پتا چلا کہ جو پیسے وہ رکھتا تھا' اس میں سے سوائے کفن دفن کے چند سو روپے کے۔ اس نے ساری رقم میرے لیے ہی محفوظ کی ہوئی تھی۔"

"اللہ تعالیٰ جنت بخشے' بہت ہی نیک انسان تھا۔" اماں بولیں۔

"پھر ابا جی؟"

"جب میں نے پہلے پہل برتن بنانا شروع کیے تو دینو چاچا انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پتا ہے کیا کہنے لگا؟ کہنے لگا کہ لگتا ہے تم نے برتن بنانا کالج میں سیکھا ہے۔ میں ان پڑھ دیہاتی تھا' مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تعریف کا ایک انداز ہے۔ دینو چاچا کی بات نے مجھے بہت حیران کر دیا۔ میں نے کہا کہ بھلا کالج میں یہ کام کب سکھاتے ہیں۔ کالج میں تو بابو لوگ پڑھتے ہیں جو کتابیں کاپیاں اٹھائے صاف ستھرے کپڑے پہن کر سائیکل دوڑاتے پھرتے ہیں اور میں ان پڑھ دیہاتی ہوں' میرا ان کا کیا مقابلہ۔

لیکن میری بات سن کر دینو چاچا ہنس پڑا بولا کہ ٹھنڈی سڑک پر کونے میں ایک ایسا کالج ہے جہاں مٹی کی مورتیں بنائی جاتی ہیں اور مٹی کی یہ مورتیں بنانے والے ہماری طرح غریب غربا نہیں' بڑی کوٹھیوں اور گاڑیوں کے مالک ہیں۔ پھر چاچا بولا کہ میں بھی انہی کی طرح بن سکتا ہوں۔ جیسا اچھا کام میرا ہے' ویسا تو وہاں بھی کسی کا نہیں ہوگا۔

اس رات بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کیں تو نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا' جس کام کو میں جاہل اور ان پڑھ دیہاتیوں سے منسوب سمجھا کرتا تھا' وہ تو یہ بابو لوگ بھی کیا کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے نیند آئی تو خواب میں مَیں نے خود کو بابو بنے دیکھا' جو پتلون قمیص پہنے مٹی کا پیڑا چاک چکر کے اوپر رکھ رہا تھا۔

میری آنکھ کھل گئی اور میں سوچنے لگا کہ میں کوئی عام انسان نہیں ہوں۔ پل بھر میں مَیں نے کالج' کار' کوٹھی...... ہر جگہ کا سفر کیا۔

اگلے دن تمام کام جلدی سے نپٹا کر میں ٹھنڈی سڑک کے کونے پر یہ کالج ڈھونڈنے چل دیا۔ مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ ایک ہی دکاندار سے پوچھنا پڑا۔ اس نے تفصیل سے تمام پتا سمجھا دیا۔ کالج کے پھاٹک سے داخل ہوتے ہوئے مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ایک مرتبہ تو دل چاہا کہ بھاگ جاؤں لیکن رات سوتی جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھے تھے' انہوں نے میرا راستہ روک لیا۔ اپنا دل مضبوط کر کے میں آگے چل پڑا۔

لیکن وہ تو کوئی اور ہی دنیا تھی۔ اپنی تہہ بند اور لمبی سی قمیص میں مَیں وہاں موجود سب لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان کوئی عجوبہ دکھائی دے رہا تھا' جو باتیں وہ کر رہے تھے' وہ بھی میرے لیے بالکل نئی تھیں۔ میں ہونق بنا ان سب کے درمیان سے گزرتا رہا۔ کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ وہ سب اپنے آپ میں مگن تھے' مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس سے کیا بات کروں' پھر ایک بابو قسم کا لڑکا الگ تھلگ کھڑا رنگوں سے تصویر بناتا نظر آیا۔ میں خدا کا نام لے کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

''بابو جی!'' میں نے اسے مخاطب کیا تو اس نے تصویر سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھا۔

''ہوں۔'' وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''یہ وہ کالج ہے ناں، جہاں مٹی کی مورتیاں بنانا سکھایا جاتا ہے۔'' میں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

اس بابو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں۔'' وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کی مسکراہٹ سے مجھے حوصلہ ہوا۔

''میں کمہار ہوں۔'' میں نے اپنی خودی بلند کرنے کی کوشش کی۔ میں چاہتا تھا کہ ہم دونوں برابری کی سطح پر چاہے نہ بات کریں لیکن وہ میری بات کو اہمیت ضرور دے۔

''اچھا۔'' اس کے انداز میں اب بھی دلچسپی تھی۔ ''میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔''

''بابو جی! میں چاہتا ہوں کہ میں اور کام بھی سیکھوں۔ ابھی میں صرف برتن بنانا جانتا ہوں، مجھے مٹی کی مورتیں بنانی نہیں آتیں۔ دینو چاچا نے کہا تھا کہ کوشش کروں تو میں بھی مورتیں بنا سکتا ہوں، آپ مجھے یہاں داخل کرلیں گے۔''

بابو کے چہرے پر مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ ''کتنا پڑھے ہو؟''

''پڑھا لکھا تو نہیں ہوں، لیکن مجھے کام بہت اچھا آتا ہے۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو لا کر دکھا سکتا ہوں۔''

''ہوں۔'' وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی یہاں پڑھتا ہوں۔ داخل کرنا یا نہ کرنا میرا کام نہیں ہے لیکن تمہارے سلسلے میں مجھے ایک مسئلہ نظر آرہا ہے۔''

''کون سا مسئلہ ہے جی؟'' میں اب بھی ناامید نہیں تھا۔

''تمہاری تعلیم کچھ کم ہے۔''

یہ اس بابو کا مہذب انداز تھا، ورنہ میں تو تعلیم کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔

''یہاں یہ مسئلہ ہے۔'' بابو نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کہ ہنر بعد میں سکھایا جاتا ہے، تعلیم پہلے دیکھی جاتی ہے، لیکن ایک بات ہے۔''

''کیا؟''

''کہ اگر تمہارا کام بہت اچھا ہے تو تمہارے لیے ترقی کے دروازے ضرور کھلیں گے۔ آج نہ سہی، کل سہی۔ اس کالج کے نہ سہی، کسی اور درس گاہ کے سہی۔ نہ تو آج تک خوشبو کے راستے میں کوئی دیوار کھڑی کرسکا ہے اور نہ ہی روشنی کو بیڑیاں پہنائی جاسکی ہیں۔ اچھا کام کسی کالج کی سند کا محتاج نہیں ہوتا، وہ تو دیکھنے میں ہی اچھا نظر آتا ہے۔''

وہ ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ ''یقین کرو، تمہارا یہ ہنر کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گا

کیونکہ اس کی جڑیں تمہارے وجود سے پھوٹتی ہیں۔ ہر چیز ہم سے جدا ہوسکتی ہے، پر مٹی کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی، لیکن ہنر کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی ضروری ہے۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' میں اتنی جلدی اپنے خواب چکنا چور ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم پڑھنا لکھنا شروع کردو لیکن اس کے ساتھ ساتھ مٹی کے برتن بنانا مت بھولنا۔''

میں مایوس ہوگیا۔ اس قدر شدید مایوسی تو مجھے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بابو نے شاید مایوسی کی یہ تحریر میرے چہرے پر پڑھ لی۔

''دیکھو مایوس مت ہو۔'' اس نے برش اسٹول پر رکھ کر میرے کندھے تھام لیے۔ ''یہاں اس سے بہتر ہرگز نہیں سکھایا جاتا، جتنا کہ تمہیں آتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ تم کمہار کہلاتے ہو اور یہاں ڈپلومہ پر سرامکس لکھا جاتا ہے۔ یہ تو سوچو کہ تم بھی مارکیٹ میں ہو اور یہاں سے پڑھ کر نکلنے والے بھی اس مارکیٹ میں جائیں گے۔ ان کا کام بھی سامنے ہوگا اور تمہارا کام بھی سامنے ہوگا۔ نہ تو تمہارے بنائے ہوئے برتنوں پر یہ لکھا ہوگا کہ تم نے یہ ہنر اپنے باپ دادا سے سیکھا ہے اور نہ ہی یہاں سے پڑھ کر نکلنے والے اپنے بنائے ہوئے برتنوں کے ساتھ اپنا ڈپلومہ رکھیں گے۔ مارکیٹ میں تم سب برابری کی سطح پر کھڑے ہوگے۔''

اس بابو کی بہت سی باتیں اس وقت میرے سر پر سے گزر گئی تھیں لیکن ان باتوں سے مجھے کسی قدر حوصلہ ضرور ہوا تھا۔

''بابو جی! مجھے پڑھائے گا کون؟ ہماری تو پچھلی سات پشتوں میں بھی کوئی پڑھا لکھا نہیں گزرا۔''

''یہ تمہارے حوصلے کی بات ہے، کوشش سے انسان خدا کو بھی پا لیتا ہے۔'' وہ ایک شیشی سے رنگ نکالنے لگا۔ ''اپنے لیے خود راہیں تلاش کرو۔ زندگی کی دوڑ میں اپنے لیے اپنی قوتِ بازو سے جگہ بناؤ۔ یاد رکھو، یہاں ہر کوئی آگے بڑھنے کی دھن میں سرپٹ دوڑ رہا ہے اور کوئی بھی یہ زحمت نہیں کرتا کہ پیچھے رہ جانے والے لوگوں پر رحم اور ہمدردی کی ایک نظر ہی ڈال لے کیونکہ اتنی دیر میں کارواں آگے نکل جائے گا۔''

میں چپ چاپ واپس چلا آیا۔ میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ کتنے دن میں بے دلی سے کام کرتا رہا اور جیسے ہی کام ختم کرتا تھا۔ کھاٹ پر پڑ جاتا تھا۔

پھر ایک دن خبر ملی کہ ہمارے گھر سے تین گھروں کے فاصلے پر جو نائی رہتا تھا، اس کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا ہے، تب میں نے سوچا کہ یہ نائی کون سا سات پشتوں کا پڑھا لکھا ہے۔ بات باپ دادا کی دولت و ثروت اور تعلیم کی نہیں ہوتی، اصل چیز محنت اور ہمت ہے جو انسان کے کام آتی ہے۔

میں نے اس نائی کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ وہیں میری ملاقات اس کے بیٹے ڈاکٹر غلام حسین سے ہوئی۔ وہ پڑھ لکھ کر بابو بن گیا تھا' لیکن اس میں غرور نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ بہت محبت سے ملتا تھا وہ مجھ سے' میں نے اسے اپنا رازدار بنا لیا۔ اپنے سب خواب اسے بتا دیئے اور پھر اپنی مایوسیوں کی کہانی بھی اسے سنا دی۔ میری باتیں سن کر وہ ہنس پڑا' کہنے لگا۔

''یہ کیا مشکل ہے' میں تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔''

''سچ!'' میں خوشی سے گنگ ہو کر رہ گیا۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''لیکن ایک شرط ہے۔''

''بتائیں ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔'' میں جلدی سے بولا۔

''بعد میں مکرمت جانا۔''

''آپ کہیں تو نہ مانوں تو جو چور کی سزا وہ میری۔''

''میری شرط صرف یہی ہے کہ تم اپنی اولاد کو بہترین تعلیم دلواؤ گے۔''

''منظور ہے۔'' میں جھٹ بولا پھر اچانک مجھے خیال آیا۔ ''لیکن میری تو صرف ایک بیٹی ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اس کے بعد ہماری کوئی اولاد نہیں ہوگی۔''

''تو؟''

''تو میں اسے کیسے تعلیم دلوا سکتا ہوں؟'' میں شش و پنج میں پڑ گیا۔

''اولاد تو اولاد ہوتی ہے خواہ بیٹا ہو یا بیٹی۔'' وہ بولا۔ ''تعلیم ہی انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔ میں تمہیں عورت کی تعلیم کے بہت سے فائدے بتا سکتا ہوں' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ابھی تمہارا ذہن انہیں قبول نہیں کرے گا۔ جب تم علم حاصل کرو گے تو تمہارے ذہن میں وسعت پیدا ہوگی۔ اس وقت تم خود سمجھ جاؤ گے کہ تمہاری بیٹی کو علم کیوں حاصل کرنا چاہیے۔ بس پڑھنے لکھنے سے پہلے میری یہ تین باتیں یاد رکھنا۔''

''کون سی باتیں؟''

''کبھی کسی مسئلے پر بغیر سوچے سمجھے رائے مت دینا' اگر کوئی تم سے اختلاف کرے تو فوری طور پر اس کی نفی مت کرنا۔ بلکہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر اسے جواب دینا۔ اگر یہ سمجھو کہ تمہاری بات غلط اور کسی اور کی بات درست ہے تو اپنی رائے پر اڑے مت رہنا بلکہ اچھائی کو اپنانے کی کوشش کرنا۔ اپنا تعلق روایت سے قائم رکھنا لیکن روایتوں کو پاؤں کی زنجیر مت بننے دینا۔ دنیا بہت آگے بڑھ رہی ہے اس کے ساتھ آگے بڑھنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی سوچ کو کبھی محدود نہ ہونے دینا۔''

میں نے ڈاکٹر غلام حسین کی یہ سب باتیں خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور اس سے پڑھنا شروع کر دیا۔ پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ علم انسان کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس کام میں اتنی تاخیر کیوں کی۔ میں نے نہ صرف ان باتوں اور مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش کی جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے بلکہ میں ان مسئلوں پر بھی سوچتا تھا جو کتابوں میں نہیں ہوتے تھے۔

میری پڑھائی عام لوگوں سے بہت مختلف تھی کیونکہ میں ڈگریوں کے حصول کے لیے نہیں پڑھتا تھا۔ میرے نزدیک علم' ذہن کی وسعت کا نام تھا۔ پھر میں نے تمہیں بھی سکول میں داخل کروا دیا۔ شکر ہے مجھ سے تمہارے سلسلے میں تاخیر نہیں ہوئی' تم سن رہی ہو نا ماہ بانو۔'' ابا جی نے اچانک پوچھا۔

''جی ابا جی۔'' وہ جیسے اس دنیا میں واپس آ گئی۔

''بانو گڑیا! میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں تمہیں اس کالج میں پڑھاؤں گا جس میں پڑھنے کا مجھے ارمان تھا اور جس کے باہر سے گزرتے ہوئے آج بھی میری آنکھوں میں وہی پرانے خواب جاگ جاتے ہیں۔''

''ابا جی! آپ نے پڑھنا شروع کر دیا اور پھر بھی آپ کے خواب ادھورے ہیں۔''

''ہاں' میرے خواب اس لیے ادھورے رہ گئے ہیں کہ میں نے بہت دیر کر دی تھی۔ خواب دیکھنے میں بھی اور ان کے حصول کی جدوجہد کرنے میں بھی لیکن بانو تم ابھی صرف آٹھویں میں ہو' بہت وقت ہے تمہارے پاس' میں تمہیں شہر کے بہترین انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم دلوا رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میرے یہ خواب اب تم پورے کرو۔ میری سب امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔''

''ابا جی! آپ بالکل فکر نہ کریں' میں آپ کے خوابوں کو تعبیر دوں گی۔'' اس کے لہجے میں عزم تھا پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔ ''آپ کے وہ استاد ڈاکٹر غلام حسین کہاں گئے؟''

''میں نے اس سے صرف چھ سال پڑھا تھا پھر وہ اپنے ماں باپ اور بیوی کو لے کر کراچی چلا گیا تھا۔ اس نے بنیاد فراہم کر دی تھی اور میں بھی رکا نہیں' آگے بڑھتا گیا۔''

وہ اور ابا جی کتنی دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔

''اب سوئیں گے بھی یا یونہی صبح کر دیں گے؟'' اماں بالآخر تنگ آ کر بولیں۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا' جب ایف۔ اے کے رزلٹ کے بعد ابا جی نے اپنی خواہش پھر دہرائی۔ وہ چاہتے تھے کہ ماہ بانو ٹھنڈی سڑک کے کونے میں واقع اس جادونگری میں داخل ہو جائے' جس سے بہت سال پہلے وہ خود بے نیل و مرام باہر نکلے تھے۔ خود ماہ بانو بھی اپنے خوابوں میں اسی پُراسرار اور گہری عمارت کو دیکھا کرتی تھی۔ جب وہ بھی وہاں کورے کاغذ اور سپاٹ کینوس پر رنگ بکھیرے گی اور بے جان و بے رنگ مٹی کو خوبصورت شکلیں دے گی۔

یہ سب تو اپنی جگہ تھا ہی لیکن ماہ بانو کے وہاں داخلہ لینے کی وجہ یہ بھی تھی کہ سرخ اینٹوں کی

وہ عمارت اس کی روح کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ عمارت اور اس کے مکین اس کی زندگی میں کوئی اہم اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کریں گے۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی زندگی کی ڈور اس جگہ سے بندھی ہوئی ہے‘ جیسے...... وہ بے جان عمارت اس کے دیکھتے ہی سانسیں لینے لگتی ہے‘ اسے کچھ کہنا چاہتی ہے‘ کوئی خاص بات‘ کوئی اشارہ یا نہ جانے کیا۔

داخلہ فارم ابا جی ہی لائے تھے اور پھر انہیں جمع بھی کروا آئے تھے۔ چند دن بعد ٹیسٹ تھے۔ انگریزی...... اور ڈرائنگ کا پرچا تھا اور اسے دونوں کی ہی فکر نہیں تھی۔ اس کی انگریزی پر ابا جی نے خاص توجہ دی تھی اور ڈرائنگ تو یوں بھی اس کی بہت اچھی تھی۔ ایف۔ اے تک اس نے فائن آرٹس پڑھ رکھی تھی لیکن درحقیقت اس میں آرٹ کی پیدائشی صلاحیت تھی۔ اب اس نے اتنا کیا تھا کہ اماں کو بطور ماڈل بٹھا کر لائف ڈرائنگ کی پریکٹس شروع کر دی تھی۔

مقررہ تاریخ کو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ سیکرٹریٹ کے اسٹاپ پر ویگن سے اتری۔ یہ تھوڑا سا فاصلہ وہ پیدل ہی طے کر سکتی تھی۔ جناح ہال کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے وہ بالکل خالی الذہنی کی کیفیت میں تھی۔ گیٹ سے اندر پارکنگ میں داخل ہوتے ہوئے اس کا دل بھر آیا۔

’’ابا جی کتنی امیدوں سے یہاں آئے ہوں گے۔‘‘ اس نے سوچا۔ ’’اور کتنے دُکھے دل سے یہاں سے باہر نکلے ہوں گے۔‘‘

وہ کالج کی عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔

’’پتا نہیں وہ لڑکا ابا جی کو کہاں ملا ہوگا۔‘‘ وہ چلتے چلتے سوچ رہی تھی۔ ’’شاید اس درخت کے نیچے یا پھر اس کونے کی طرف یا شاید کہیں اور...... خدا جانے خود اب کہاں ہوگا۔ زندگی کی بھیڑ بھاڑ میں کہیں گم ہو چکا ہوگا یا اتنے بڑے ہجوم آبادی میں اپنے لیے کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔‘‘

چلتے چلتے وہ مین گیٹ تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر عمارت کی پیشانی کی جانب دیکھا۔

’’کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔‘‘

ہاں وہ سچ مچ پاکستان کے بہترین آرٹس کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ مسکرائی اور بسم اللہ پڑھ کر اس نے قدم اندر رکھ دیا۔ اس کی توقعات کے برعکس اندر سنسانی کا راج تھا۔ اکا دکا طالب علم‘ کچھ ملازمین‘ چند پرندے اور پھدکتی ہوئی گلہریاں‘ وہ ہولے سے ہنس پڑی۔

’’ہم تو یہ سوچ کے آئے تھے تیری گلیوں میں
کہ یہاں تیشۂ فرہاد کی قیمت ہو گی

بھائی کیوپڈ سے ملیں گے کسی دو راہے پر
کسی بے نام سے اک موڑ پہ جنت ہو گی
ہم اولمپس پہ خداؤں کی زبان بولیں گے
اپنی تقدیر میں وینس کی رفاقت ہو گی۔‘‘

وہ چلتے چلتے گنگنائی پھر خود سے بولی۔

’’اونہوں‘ وینس کی رفاقت کی ضرورت مصطفیٰ زیدی کو ہی ہوگی۔ یہاں وینس کی جگہ کچھ اور لگنا چاہیے۔ مثلاً زوئیس ہاں زوئیس ٹھیک رہے گا یعنی۔

’’اپنی تقدیر میں زوئیس کی رفاقت ہوگی۔‘‘

’’ویسے ناشکری نہیں کرتی‘ اگر زوئیس نہ ملا تو پیرس بھی چل جائے گا۔ چلو گولی مارو پیرس کو‘ مینی لوئس بھی چل جائے گا لیکن بس اس سے نیچے نہیں۔‘‘

وہ خود سے بولتی جا رہی تھی لیکن اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر وہ خاموش ہو گئی۔

اور آج آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے اسے یہ سب کچھ کتنا نارمل لگ رہا تھا۔ نہ تو اب اس عمارت میں اس کے لیے کوئی اسرار رہا تھا اور نہ ہی یہ جھک کر ماہ بانو کے کان میں سرگوشی کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اب تو بس تیزی سے کام نپٹانے کی فکر تھی۔ آج پینٹنگ ہے‘ کل مجسمہ سازی‘ پرسوں ڈرافٹنگ اور اس کے بعد ڈیزائننگ اور پھر ڈرائنگ اور ان سب کے بعد بس کام‘ کام‘ کام اور صرف کام۔

’’سارے کالج میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی اور محترمہ یہاں تشریف فرما ہیں۔‘‘

وہ اُما کی آواز سن کر چونک گئی۔

’’تم کب آئیں؟‘‘

’’بہت بے خبر بیٹھی ہوئی ہو‘ میں پچھلے ایک منٹ سے تمہیں دیکھ رہی تھی‘ کسی مراقبے میں گم تھیں تم؟‘‘ اُما اس کے ساتھ ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

’’بس یونہی سوچ رہی تھی کچھ۔‘‘

’’سعد کے بارے میں؟‘‘ اُما نے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ وہ بولی۔ ’’میں ان لمحوں کے متعلق سوچ رہی تھی‘ جو بیت گئے ہیں‘ ان کے متعلق نہیں جو ابھی میری مٹھی میں قید ہیں۔‘‘

’’بڑی ثقیل باتیں کرنے لگی ہو۔‘‘ اُما ہنسی۔ ’’میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ وہ مرغابی کے شوربے کا شوربا ہے ناں‘ سنا ہے‘ وہ فیئر ویل پر آ رہا ہے۔‘‘

’’مرغابی کے شوربے کا شوربا؟‘‘ ماہ بانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

’’مرغابی کے شوربے کا شوربا ہی ہوا ناں‘ تمہاری کزن یعنی ریشماں کا کزن عبداللہ۔‘‘

''عبداللہ آ رہا ہے؟'' ماہ بانو نے خوشگوار حیرت کے ساتھ بہت جوش سے پوچھا۔

''ہاں' لیکن یاد رکھنا سعد کے سامنے اتنے جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کرنا' ورنہ وہ برا مان جائے گا۔''

''بے وقوفی کرے گا ایسا کر کے وہ' میں نے تو آج تک عبداللہ کو دیکھا بھی نہیں ہے۔''

''صرف اپنی کزن کی خاطر تم اتنی بے چین ہو عبداللہ سے ملنے کے لیے' مجھے بعض اوقات تم پر حیرت ہوتی ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گی اُما'' ماہ بانو نے کہا۔''ریشماں اس پر جان دیتی ہے حالانکہ اس نے بھی کبھی عبداللہ کو نہیں دیکھا۔ اس کے پاس میرے ساتھ بات کرنے کے لیے اور کوئی موضوع ہی نہیں ہے کیونکہ میں اس کی واحد رازداں ہوں اور عبداللہ سے محبت اس کا واحد اور اکلوتا راز ہے' وہ صرف مجھ سے شیئر کرتی ہے۔ شروع میں تو میں عبداللہ' عبداللہ کی گردان سن کر چڑ ہی گئی تھی لیکن پھر میں نے اس کے وجود کو قبول کر لیا اور اس کے بعد تو یوں ہونے لگا کہ عبداللہ میرا بھی پسندیدہ موضوع بن گیا۔ ہم دونوں گھنٹوں بیٹھ کر اس موضوع پر بات کیا کرتے تھے۔ تھکے بغیر۔''

''وری انٹرسٹنگ۔'' اُما دلچسپی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔''اسے بھی خبر ہے کہ ریشماں اسے اس قدر چاہتی ہے۔''

''شاید نہیں' وہ تو شروع سے ہی برطانیہ میں تھا' اس کے بابا حیدر علی شاہ کو اپنے بڑے بھائی اور ریشماں کے باپ پیر صاحب رجب علی شاہ کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ ان کے اکلوتے بیٹے عبداللہ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں' اس لیے انہوں نے شروع ہی سے اسے باہر بھیج دیا تھا۔ پھر جب پیر صاحب اور حیدر علی شاہ کے درمیان زمینوں کا جھگڑا عدالت میں چلا گیا تو اسے پاکستان بلا لیا گیا' ورنہ وہ وہیں اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آتا۔ یہاں بھی گاؤں میں اس کے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہے' وہ بہت کم گاؤں جاتا ہے' صرف اپنی اماں' بابا اور بہنوں سے ملنے کے لیے۔''

''تو تم اسے ریشماں کی بے قراری بتا دو گی؟'' اُما نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے سیڑھیوں پر پڑا ہوا گھاس کا تنکا اٹھا لیا۔''تم ان مسئلوں کو نہیں سمجھ سکتیں اُما۔ ان کے خاندان میں بہت گہری نفرتیں ہیں۔ ان کا آغاز کہاں سے ہوا' یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن اتنا معلوم ہے کہ اب نفرت کا یہ زہر پوری طرح پھیل چکا ہے۔ ریشماں تو عذاب میں ہے ہی' عبداللہ پر یہ عذاب کیوں مسلط کیا جائے۔''

''ضروری تو نہیں کہ وہ بھی ایک اَن دیکھی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے' جیسے ریشماں بے وقوفوں کی طرح اس کی محبت میں گرفتار ہے۔''

''ہاں ظاہر ہے' وہ باہر سے پڑھ کر آیا ہے' اس کے خیالات اور سوچنے کا انداز یقیناً یہاں کی روایتی سوچوں سے مطابقت نہیں رکھتا ہوگا۔ محض چچازاد ہونے یا بچپن کے منگیتر ہونے کا یہ

مطلب تو نہیں کہ وہ اس کی محبت میں بھی گرفتار ہو جائے۔ پتا نہیں بچپن کی منگنی کی اس کی نظر میں اب کیا اہمیت ہوگی جبکہ اب تو نفرتوں نے آکٹوپس کی طرح سب کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے' اسی لیے میں ابھی یہ بات عبداللہ کو نہیں بتاؤں گی۔ مجھے نہ تو ان کے خاندان کی نفرتوں سے کوئی غرض ہے اور نہ مصلحتوں سے' ریشماں میری خالہ زاد بہن ہے' میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ عبداللہ نے ریشماں کی محبت کو اہمیت نہ دی اور ریشماں کو یہ بات معلوم ہو گئی تو اسے بہت دکھ ہوگا۔''

''مجھے بہت حیرت ہے۔ ایسی دیوانگی تو صرف کتابوں اور کہانیوں میں ملتی ہے یا پھر فلموں میں۔''

''تم ریشماں کے حالات نہیں جانتیں' ورنہ ایسی بات کبھی نہ کرتیں۔ وہ ایک بہت عام سے خیالات رکھنے والی لڑکی ہے۔ اس کے لیے بچپن کی منگنی کی وہی اہمیت ہے جو میرے تمہارے لیے شادی کی ہو سکتی ہے۔ ان کے خاندان میں بس مانگ لینا کافی ہوتا ہے۔ یہ تو عزت کا معاملہ ہوتا ہے اور اس پر خون تک ہو جاتا ہے۔''

اُما نے جھرجھری لی۔''اتنی خوفناک باتیں نہ کرو پلیز' چلو اٹھو فیئر ویل کی تیاریاں دیکھتے ہیں۔''

وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں اور بلا مقصد کالج میں گھومنے لگیں۔ سارا کالج مصروف تھا۔ آڈیٹوریم میں موسیقی کے پروگرام کی تیاری ہو رہی تھی۔ گرافک اسٹوڈیوز میں سمیر اور سہیل زور و شور سے اپنے تھیسز ڈسکس کر رہے تھے...... پینٹنگ اسٹوڈیو میں ردا' آمنہ اور ظہیر فن فیئر کے لیے سٹال کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ دونوں چلتے پھرتے یونہی بے مقصد کالج کی رونق دیکھ رہی تھیں کہ Scupture اسٹوڈیو سے عدنان برآمد ہوا۔

''کہاں غائب ہو تم دونوں؟'' اس کی ان پر نظریں پڑیں تو ان کی طرف بڑھ آیا۔''کتنی دیر سے تلاش کر رہا تھا تمہیں۔''

''ہم یونہی گھوم رہے تھے۔'' اُما بولی۔

''چلو جلدی کرو' ریہرسل کے لیے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ واپس اسٹوڈیو میں مڑ گیا۔

''ابھی ریہرسل کا وقت تو نہیں ہوا۔'' ماہ بانو نے گھڑی دیکھی۔

''یہ کسی کو بخشتا بھی ہے' اسی طرح اکٹھا کر لیا ہوگا سب کو۔'' اُما بولی۔''ویسے تم اس سے عبداللہ کے متعلق پوچھ سکتی ہو' اس کے متعلق سب سے زیادہ انفارمیشن ایڈی کے پاس ہی ہوتا ہے۔''

''اونہوں' یہ بات کالج میں صرف مجھ اور تم تک رہنی چاہیے کوئی تیسرا بندہ اس راز میں شریک نہیں ہوگا۔ یہ راز میرے پاس ریشماں کی امانت ہے۔''

عدنان عرف ایڈی کالج کے مائم کلب کا کرتا دھرتا تھا اور بہترین ہدایت کار تھا۔ اس وقت

بھی وہ مائم (چپ سوانگ) میں حصہ لینے والوں کو ان کا رول اور جسم کی حرکات و سکنات کے متعلق بتا رہا تھا۔ ماہ بانو ایک طرف بیٹھی بغور اسے دیکھ رہی تھی

اسے یاد تھا کہ ایڈی نے اس دفعہ کے پروگرام کے لیے کتنی محنت کی تھی۔ پہلے تو پورا ایک مہینہ یہ سوچنے میں گزر گیا کہ مائم کا موضوع اور موسیقی کیا ہو گی۔

''ہندو دیو مالائی کتھا کو سب بہت دلچسپی سے دیکھیں گے۔'' یہ ماہ بانو کا خیال تھا۔

''اور اس کے ساتھ کوئی موسیقی بھی ہے ذہن میں؟'' ایڈی نے پنسل انگلیوں میں گھماتے ہوئے پوچھا تھا۔

''Mea Culpa کیسی رہے گی؟''

''ہوں۔'' ایڈی پُر خیال انداز میں بولا۔

''ویسے میرے ذہن میں بھی موضوع ہے' لیکن موسیقی کوئی نہیں ہے۔'' اُما نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''کیا؟''

''انسان کی مشینوں کے خلاف جنگ۔'' اُما نے کہا۔ ''ہم مائم Fall of Man سے شروع کر سکتے ہیں' جب آدمؑ و حوا کو جنت سے نکالا گیا اور انسان زمین پر آباد ہو گیا۔ تب ضرورت ایجاد کی ماں قرار دی گئی اور انسان نے پہیہ بنا کر اپنی زندگی کی سہولت کو رائج کیا' لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ یہ سہولت رفتہ رفتہ انسان کے لیے بلائے جان بنتی گئی اور اب یہ حال ہے کہ انسان مشینوں کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔''

''ہوں۔'' ایڈی نے پُر خیال انداز میں اسے دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم ان مشینوں سے چھٹکارا حاصل کریں' جن کی وجہ سے انسان' انسان سے دور ہوتا جا رہا ہے۔'' اُما بولی۔

''آئیڈیا اچھا ہے' لیکن اس کی نوک پلک سنوارنے کی شدت سے ضرورت ہے۔'' ایڈی نے کہا۔

''اُما! میں تم سے بالکل متفق نہیں ہوں۔'' ماہ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تمہارا جمہوری حق ہے۔'' اُما مسکرائی۔ ''ویسے تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''مشینوں کو اپنی زندگی سے نکال کر ہمارے پاس کیا بچے گا؟'' ماہ بانو بولی۔ ''میرا نہیں خیال کہ میں پتھر کے زمانے میں جا کر خوش رہ سکتی ہوں کیونکہ وہ Survival of Fittest کا دور تھا' اس دور میں صرف وہی زندہ رہ سکتا تھا' جو زندہ رہنا جانتا تھا' جس کے بازو میں اتنی جان تھی کہ وہ زندہ رہ سکے اور فرینکلی اسپیکنگ مجھے تو سوئی گیس پر کھانا پکانے سے وحشت ہوتی ہے اور تم ہمیں چقماق کے دور میں پھینک رہی ہو۔ بہت مشکل بات کر رہی ہو تم۔''

''تمہیں سوئی گیس پر کھانا پکانے سے اس لیے وحشت ہوتی ہے کیونکہ تمہیں کھانا پکانے سے ہی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اُما ہنسی۔

''تم اُما کی بات کا مطلب نہیں سمجھیں۔'' ایڈی نے مداخلت کی۔ ''مشینوں کو انسان کا غلام رہنا چاہیے' انہیں دیوتا نہیں بننا چاہیے کہ انسان ان کی پوجا شروع کر دے۔ سہولت کو سہولت رہنا چاہیے' بلائے جان نہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم مشینوں کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم انہیں اپنے تابع رکھیں۔ مشینوں نے ہمیں اپنا مطیع بنا لیا ہے۔ تم دیکھ سکتی ہو کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں انسان اور اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے۔ مشینوں کو رفتہ رفتہ انسان کی صورت ملتی جا رہی ہے اور انسان آہستہ آہستہ روبوٹ بن رہا ہے۔''

''میں تمہیں چھوٹی سی مثال دیتی ہوں۔'' اُما بولی۔ ''یہ ٹی وی اور وی سی آر دیکھ لو۔ ان کے دیکھنے میں نہ کوئی برائی ہے اور نہ کوئی پریشانی' جب تک ان کا استعمال ٹھیک اور ایک حد کے اندر رہے جبکہ یہاں یہ حال ہے کہ جس دن ٹی۔ وی پر کوئی خاص پروگرام ہو تو لوگ ملنے ملانے کے لیے ایک دوسرے کے گھر جانے تک سے گریز کرتے ہیں۔ میں اندرون سندھ کے ایک عام سے گاؤں سے تعلق رکھتی ہوں ٹھیک ہے ہم وہاں کبھی کبھار ہی جاتے ہیں لیکن وہاں کی چند باتیں ایسی ہیں' جو جاننے کے لیے وہاں زیادہ دیر تک رہنا ضروری نہیں ہے۔

جب تک وہاں ٹی۔ وی کی وبا نہیں آئی تھی تو سارا گاؤں مل جل کر شام کو کہیں اکٹھا ہوتا تھا۔ دن بھر کی باتیں اور گوسپ ہوا کرتی تھیں۔ مغرب کے وقت رات کا کھانا کھا لیا جاتا تھا اور عشاء کی نماز پڑھ کر سب سو جاتے تھے کیونکہ انہیں سویرے بیدار ہونا ہوتا تھا۔ اب جب سے گاؤں میں چار ٹی۔ وی آئے ہیں' تب سے حالات ہی بدل گئے ہیں۔ پہلے پہل تو ان گھروں میں سارا گاؤں جمع ہو کر ٹی۔ وی دیکھ لیا کرتا تھا پھر بچوں کے شور شرابے سے بیزار ہو کر انہوں نے گاؤں والوں کو اپنے گھر آنے سے منع کیا۔ اس کے بعد لڑائیاں ہوئیں' پرانی مضبوط دوستیاں ٹوٹیں' نئے اور مصنوعی رشتے قائم ہوئے' جن کی بنیاد اخلاص نہیں' مادیت پرستی تھی اور بالآخر پیسے کی دوڑ شروع ہو گئی۔''

''یہ تو ایک قدرتی ردِ عمل تھا۔ قصور ٹی۔ وی کا نہیں' ٹی وی دیکھنے والوں کا تھا۔'' ماہ بانو نے اعتراض کیا۔

''ظاہر ہے قصور وار کبھی بھی ایک بے جان چیز کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ قصور وار اسے استعمال کرنے والے ہی ہوتے ہیں۔'' اُما بولی۔ ''لیکن تلخی کی بنیادی وجہ بہرحال وہی ایکس انچ کا بے جان ڈبا ہے۔''

''فرض کرو کہ پورے گاؤں میں ٹی۔ وی آ جائے تو یہ مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔'' ماہ بانو اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ ''جبکہ تمہاری تھیوری اس کے برعکس ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ

سائنس جتنی زیادہ ترقی کرے گی اور پھیلے گی' اتنے ہی مسائل بڑھیں گے۔''

''بنیادی مسئلہ انسان کی انسان سے دوری کا ہے۔ سب گاؤں کو ٹی۔ وی مل جائیں گے تو اور قسم کے مسائل جنم لیں گے۔ جس وقت کوئی خاص پروگرام ہو گا تو کوئی کسی سے ملنے ملانے کا روادار نہیں ہو گا۔ جیسے یہاں شہروں میں بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ٹی۔ وی دیکھنے کے اتنے شوقین ہوتے ہیں کہ باہر نکلنا تو کجا وہ گھر والوں کے ساتھ بھی بات چیت کرنے کے بجائے گپ چپ ہو کر ٹی۔ وی اسکرین کو گھورتے رہتے ہیں۔ خود سوچو اس میں فائدہ کتنا ہو گا اور نقصان کتنا؟''

''تم لوگ اپنی بحث میں ٹی۔ وی بے چارے کو کیوں دھنک رہے ہو؟'' ایڈی بولا۔ ''تم دونوں ہی غلط ٹریک پر نکل گئے ہو۔ بانو بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہمارے یہاں ہے تو سہی لیکن اس کی بہت شدت بھی محسوس نہیں کی گئی۔ موجودہ دور کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس مسئلے کا آغاز دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہوا ہے' جب تعمیرِ نو کے لیے ہر شخص کو میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ زندگی اس قدر تیز ہو گئی کہ انسان روبوٹ بن کر رہ گیا۔ فیکٹ اور فگرز کی اہمیت انسانوں کے جذبات اور خود انسان سے بھی بڑھ گئی تھی اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش' خواہش کے بجائے عفریت بن گئی۔ یعنی وہ حالات پیدا ہو گئے' جنہیں ڈکنسز نے ہارڈ ٹائمنز کہا ہے۔''

وہ خاموشی سے ایڈی کی بات سن رہی تھیں۔

''تمہیں معلوم ہے کہ ایتھوپیا کی آبادی کے متعلق کیا کہا گیا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''کہ وہاں ایک عورت اوسطاً چھ اعشاریہ تین بچے پیدا کرتی ہے۔ کتنی آسانی سے انسان کو فیکٹس اور فگرز میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایسے انسانوں کو جن میں سے ہر ایک سانس لیتا ہے۔ بھوک' پیاس محسوس کرتا ہے' تکلیف محسوس کرتا ہے' جن میں سے ہر ایک نے مقررہ وقت تک زندہ رہنا ہے اور اس وقت کے اختتام پر مر جانا ہے۔ ایک ایسے شخص کو ہم فیکٹس اور فگرز بنا کر Almanics میں کیسے بند کر سکتے ہیں' جس نے اپنی زندگی کی بہت سی خوشیوں پر اپنی ذات کے حوالے سے خوش ہونا اور بہت سے غموں کو اکیلے جھیلنا ہے۔ ایک ایسے شخص کا چھ اعشاریہ تین ہونے سے کیا تعلق؟ اور بانو تم غالباً مشینوں سے مراد فریج' ٹی وی' ٹیپ ریکارڈر قسم کی چیزیں لے رہی ہو جبکہ یہ درحقیقت رویوں کی بات ہے۔''

''گو کہ میں اب بھی تم سے بحث کر سکتی ہوں' لیکن صرف اس لیے چھوڑ رہی ہوں کہ ڈرامیٹک آرٹ نہ پڑھے ہونے کے باوجود بھی تم اس موضوع پر بہترین مائم پیش کر سکتے ہو۔'' ماہ بانو ہنسی۔

''بانو! آئیڈیا تمہارا زیادہ اچھا ہے' لیکن میں اسے اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔'' ایڈی نے کہا۔ ''جب تک میں اسے بہت اچھی طرح تمام زاویوں سے پڑھ نہیں لیتا' تب تک اس پر ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔''

''اس سلسلے میں اُما تمہاری مدد کر سکتی ہے' کیوں اُما؟'' ماہ بانو اس کی طرف مڑی۔

''نہ بابا نہ۔'' وہ ہنسی۔ ''میں نے یہ سب کچھ نہیں پڑھا ہوا' مجھ سے زیادہ تو اس وقت بھی ایڈی ہی جانتا ہے۔''

''کمال ہے۔'' ماہ بانو نے سر ہلایا۔

''اس موضوع کو میں اسٹاک میں رکھ رہا ہوں' اس پر اگلی دفعہ مائم کریں گے۔'' ایڈی بولا۔

''تو پھر طے کہ اس مرتبہ مائم Fall of Man اور پھر انسان کی مشینوں سے جنگ کے متعلق ہو گا۔'' اُما نے کہا۔

''ہاں۔'' ایڈی بولا۔ ''لیکن پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا' کہ انسان کی پیدائش کو مختلف مذاہب اور دیو مالاؤں میں کس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔''

''ایک مقبولِ عام نظریہ تو یہی آدم علیہ السلام وحوا کی پیدائش اور پھر ان کا جنت سے نکالا جانا ہے جو آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں درج ہے۔'' اُما بولی۔ ''اور جس پر مسلمان' یہودی اور عیسائی کم وبیش متفق ہی ہیں۔ میرے خیال میں ایڈی تم اسی نظریئے کو Follow کرو۔''

''مشورے کا شکریہ' لیکن یہ میرا فیلڈ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اسے کیسے ہینڈل کیا جانا چاہیے' اگر مجھے اسٹیج پر بیس فیصد پیش کرنا ہے تو میری معلومات پچھتر فیصد ہونی چاہئیں۔''

''آل رائٹ۔'' ماہ بانو جلدی سے بولی۔ ''میری معلومات کے مطابق چینی کہاوت یہ کہتی ہے کہ پہلے یہ کائنات ایک خلا تھی' جس کی شکل انڈے جیسی تھی۔ اس کے پھٹنے سے آسمان اور زمین بنے اور اسی کے ذریعے پہلا مرد اور پہلی عورت یعنی یانگ اور ین پیدا ہوئے۔''

''اور مصری کہتے ہیں کہ گہرے پانیوں کے اندر سے آتم پیدا ہوا تھا۔ اسے کسی نے تخلیق نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود ایک بڑی طاقت تھا۔ اسی آتم کو ''گریٹ ہی سی'' کہا جاتا ہے اور تمام کائنات بھی اسی آتم نے تخلیق کی۔'' ایڈی نے بتایا۔

''مصریوں کا یہ نظریہ ہم سے ملتا جلتا ہے۔'' اُما بولی۔ ''ہم کہتے ہیں کہ سب سے پہلے برہما پیدا ہوا۔ برہما کی تخلیق کسی نے نہیں کی بلکہ وہ پانیوں کے اوپر تیرتے ہوئے آگ کے گولے سے پیدا ہوا۔ اس وقت اس کے پانچ سر تھے۔ بعد میں صرف چار رہ گئے۔ چار سر رہ جانے کی بہت سی مختلف کہانیاں بتائی جاتی ہیں۔ بہرحال اس وقت تو برہما کی پیدائش کی بات ہو رہی ہے۔ اس نے خود کو درمیان سے کاٹ کر سرسوتی دیوی کو پیدا کیا اور اس طرح دنیا کو مرد اور عورت کا وجود ملا۔ ویسے شیو جی اور وشنو جی کی پیدائش بھی تقریباً اسی طرح بیان کی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تخلیق وشنو جی کے کنول کے پھول سے ہوئی۔ خیر کچھ بھی کہا جائے' تخلیق کار برہما کو ہی مانا جاتا ہے جبکہ کائنات کو بچانے کی ذمہ داری وشنو جی اور تباہ کرنے کا کام شیو جی کے ذمے ہے۔''

''اور غالباً سب سے رومانٹک روایت جاپان سے متعلق ہے۔ جاپانیوں کا کہنا ہے کہ ایک

آسمانی مرد اور ایک آسمانی عورت آسمان کی قوس قزح کا پُل بنا کر اس پُل کے راستے زمین پر اترے۔ اس وقت زمین پر پانی کے سوا کچھ نہیں تھا' لیکن ان آسمانی مرد اور عورت کے اترنے کے بعد اس میں سے ایک جڑا ابھری جو رفتہ رفتہ جزیرے کی شکل اختیار کر گئی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''ہوں۔'' ایڈی نے اپنے اسکربل پیڈ پر تیزی سے پوائنٹ نوٹ کیے اور پھر اسے بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''اتنی روایتیں کافی ہیں یا اور بھی بتانا ہوں گی؟'' اُما نے پوچھا۔

''کافی ہیں کیونکہ ہم آدم علیہ السلام وحوا کے حوالے سے کام کریں گے۔'' ایڈی آرام سے بولا۔

''اپنا جبڑا خواہ مخواہ تھکایا ہم نے۔'' اُما بیزاری سے بولی۔

''نالج' نالج ہی رہتا ہے' خواہ اسے فوری طور پر استعمال کیا جائے یا نہیں۔'' ایڈی نے کہا۔ ''یہ معلومات مجھے پھر کبھی کام آ سکتی ہیں۔''

ماہ بانو کو ایڈی کی یہ بات بہت پسند تھی۔ وہ ہر خاص بات نوٹ کر لیا کرتا تھا۔ وہ باتیں بھی جو بظاہر نہایت غیر اہم لگتی تھیں' لیکن درحقیقت غیر اہم ہوتی نہیں تھیں۔ وہ ایسی سب معلومات کو مناسب وقت پر استعمال کرنے کا فن جانتا تھا۔

مائم کا آئیڈیا منتخب کرنے کے بعد وہ ساؤنڈ ایفکٹ' لائٹ ایفکٹ' سیٹ ڈیزائننگ' ڈائریکشن اور نہ جانے کن کن چیزوں میں الجھ گیا تھا۔ بیک گراؤنڈ موسیقی کی تلاش میں اس نے آف بیٹ مرکن الیکٹرونکس اور ورجن ایرے سے لے کر اچھرہ' رحمٰن پورہ اور دھرم پورہ قسم کی جگہوں کی چھوٹی چھوٹی آڈیو کیسٹ کی دکانوں تک کو کھنگال ڈالا تھا اور پھر ایک دن وہ بہت خوش خوش کالج پہنچا تھا۔

''خیریت تو ہے؟'' اُما نے پوچھا۔ ''آج وہ تمہارے چہرے پر مستقل چپکی ہوئی بیزاری کہاں غائب ہو گئی؟''

''کیوں ایسے زیادہ بہتر نہیں ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''بہتری تو بعد کی بات ہے' ابھی تو تمہارے چہرے کے ان نئے خدوخال میں سے ہم پرانا ایڈی تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''میں اتنا ہی بیزار دکھائی دیتا ہوں؟''

''کم از کم جب سے یہ مائم والا چکر شروع ہے' تب سے تو ایسا ہی ہے۔'' ماہ بانو بولی۔

''یعنی تم لوگوں کو میرا یوں سنجیدگی سے کام کرنا پسند نہیں ہے؟''

''کام کرنا پسند ہے' سنجیدگی البتہ بالکل اچھی نہیں لگتی۔'' یہ اُما کا خیال تھا۔ ''ویسے مائم ابھی تک جاری ہے پھر یہ مسکراہٹ تمہارے چہرے پر آنے میں کیسے کامیاب ہو گئی؟''

''اسے کہتے ہیں کہ بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔'' وہ بولا۔ ''سارے لاہور میں مارا ماری کرنے کے بعد کل جب تھک ہار کر میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا تو میری چھوٹی بہن کے کمرے سے Passion کی آواز آئی۔ تب میں نے سر پیٹ لیا کہ مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔ موسیقی ہو پیٹر گبرائیل کی اور آواز ہو نصرت فتح علی خان کی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مائم ضرور ہٹ ہو گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن Passion خاصی پرانی بات نہیں ہو گئی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''آرٹ میں کوئی خوبصورت چیز کبھی پرانی نہیں ہوتی' ورنہ بی تھون کی موسیقی سن کر لوگ آج بھی سر نہ دُھنتے۔'' ایڈی بولا۔

اور اب وہ ریہرسل روم میں سب کو ان کا رول سمجھا رہا تھا۔ شام تک اس نے سب کو ریہرسل میں جوتے رکھا۔

''اُف ایڈی! اب ہمارے حال پر رحم کرو پلیز۔'' اُما تھک کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اتنی جلدی۔'' ایڈی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ''ابھی تو صرف چھ بجے ہیں۔''

''کچھ خدا کا خوف کرو' ساڑھے دس بجے سے اٹھک بیٹھک کرتے کرتے یہ وقت آ گیا ہے۔ ایک نہ دو پورے ساڑھے سات گھنٹوں سے تم ہمارے سروں پر مسلط ہو۔ ہم سے اب اور کچھ نہیں کیا جائے گا۔'' ماہ بانو بھی اُما کی تقلید میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آج ریہرسل کا آخری دن ہے اور پھر میں نے تم لوگوں سے مسلسل کام لیا بھی نہیں ہے۔ وقفے وقفے سے کام کیا ہے تم لوگوں نے۔''

''ہماری ہمتیں بھی جواب دے گئی ہیں۔'' باقی سب نے بھی شور مچا دیا۔

''ہوں۔'' ایڈی نے کندھے اچکائے۔ ''جاؤ پھر' غالباً ایک میں ہی ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے تھکن پروف بنایا ہے۔''

وہ دونوں شکر کا کلمہ پڑھتی باہر نکلیں۔ سعد سامنے سے چلتا ہوا انہی کی جانب آ رہا تھا۔

''ہو گئی سزا ختم۔'' ان کے تھکن سے بے حال چہرے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''اُف نہ پوچھو' آج تو ریہرسل کروا کروا کے اس نے مار ہی دیا ہے۔'' ماہ بانو نے اپنے سانولے چہرے پر بہتے ہوئے پسینے کے قطروں کو گلابی کھدر کے بڑے سے چادر نما دوپٹے سے پونچھا۔

''اُما! تمہیں بھی ہوسٹل جانا ہے؟'' سعد نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اور بانو تمہیں گھر جانا ہے؟''

''ظاہر ہے۔''

''چلو میں تم دونوں کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' سعد نے انگلی میں کار کی چابی گھمائی۔

''شکریہ' میں چلی جاؤں گی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''پلیز بانو' کیا ہماری دوستی کا ایک دوسرے پر اتنا حق بھی نہیں ہے؟''

''جس دن ہماری دوستی کے درمیان تمہاری اکارڈ آ گئی۔ وہ شاید ہماری دوستی کا آخری دن ہوگا۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو' کالج بس تمہیں اس وقت گھر چھوڑ نہیں سکتی' کیسے جاؤ گی پھر؟'' سعد جھنجلا گیا۔

''جیسے چالیس لاکھ کے اس شہر میں کم از کم تیس لاکھ لوگ سفر کرتے ہیں' یعنی پبلک ٹرانسپورٹ۔'' ماہ بانو نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

''کیوں ضد کرتی ہو بانو؟'' اُما نے اسے ڈپٹا پھر اس کے کان کے پاس منہ لا کر بولی۔

''اور ہو سکتا ہے' اس دوران تمہارے کان وہ بات سننے میں کامیاب ہو جائیں جسے سننے کے لیے تم عرصے سے بے چین ہو۔ یعنی آئی لو یو۔''

ماہ بانو ہنس کر پیچھے ہٹ گئی اور ان دونوں کو خدا حافظ کر کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

''بانو اچھی خاصی بے وقوف ہو تم۔ اب اوپر والا ہی تمہارے حال پر رحم کرے۔'' پیچھے سے اُما چیخی۔

ماہ بانو ہنستے ہوئے گیٹ سے نکل آئی۔

☆======☆======☆

سیکرٹریٹ سے تین نمبر ویگن میں بیٹھ کر بھاٹی گیٹ جاتے ہوئے اُما کی بات اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''اُما مشکل یہ ہے کہ تم سب مجھے جو سمجھتے ہو' میں وہ نہیں ہوں۔'' ماہ بانو نے سوچا۔ ''میں کھدر اس لیے نہیں پہنتی کہ اپنی بے تحاشا بھری ہوئی وارڈ روب دیکھ کر خوش ہونے کے بعد رفاہِ عامہ کا ڈراما رچاؤں۔ میں کھدر اس لیے پہنتی ہوں کہ مجھے یہ میسر ہے۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ یہی سب بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔

اور پھر سعد کی اکارڈ میرے علاقے کی تنگ اور پُر پیچ گلیوں میں کیسے داخل ہو سکتی ہے۔ پتا نہیں اس کا کیا ردِعمل ہوگا' جب اسے معلوم ہوگا کہ میں ایک عام سے کمہار کی بیٹی ہوں' جس کا سوشل اسٹیٹس' وہ نہیں ہے جو سعد غلط فہمی کی وجہ سے سمجھتا آ رہا ہے۔ ابھی تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں بھی اس کی کلاس کی طرح کھدر پوشی کے فیشن میں مبتلا ہوں۔ سعد اچھا ہے لیکن اس کی اچھائی کی

بھی کچھ حدود ہیں اور بھاٹی گیٹ اس کی ان حدود سے کچھ پرے ہی واقع ہے۔''

ویگن ایک جھٹکے سے داتا دربار کے سامنے رکی تو وہ بھی حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ تنگ اور پُر پیچ گلیوں کا طویل راستہ پیدل طے کر کے جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اماں اور ابا پیڈسٹل فین کھولے صحن میں چار پائیاں ڈالے بیٹھے تھے۔

''بہت دیر کر دی بانو تم نے؟'' اماں نے اسے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

''آج ریہرسل کا آخری دن تھا ناں اماں۔'' اس نے دوپٹا اور شولڈر بیگ ان کی چار پائی پر پھینکے اور گھڑے سے پانی نکال کر پینے لگی۔ ''ایڈی کے ساتھ کام کرنا اپنی مصیبت کو خود ہی آواز دینا ہے۔'' وہ چار پائی پر پنکھے کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

''مجھے تمہارا لڑکوں کے ساتھ پڑھنا ہی پسند نہیں ہے لیکن تمہارے ابا کس کی سنتے ہیں۔ غضب خدا کا اب لڑکوں کے ساتھ ڈراما کرنے کی بھی اجازت دے دی اور بی بی پہنچ رہی ہیں گھر شام کے سات بجے' یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا؟''

''اماں ابھی تو فرسٹ ایئر ہے' اس لیے جلدی واپسی ہو جاتی ہے۔ اگلے سال سے تو جب گرافکس کی کلاسیں شروع ہوں گی تو تب کالج میں ہی رات کے آٹھ دس بج جایا کریں گے؟''

''استغفار۔'' اماں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''کچھ سنتے ہو بانو کے ابا؟''

''بانو کی اماں! تم دنیا کو اپنے ابا کی نظر سے مت دیکھو' وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ بانو میری بیٹی ہے اور مجھے اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے۔''

ماہ بانو ہنستے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''میرے ابا بے وقوف نہیں ہیں' میں کہتی ہوں بانو کے ابا! اب کچھ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی بھی فکر کریں۔'' اماں بولیں۔ ''خاندان میں اس کی عمر کی لڑکیاں شادی کر کے دو دو بچوں کی مائیں بھی بن گئی ہیں۔ ایک یہی رہ گئی ہے کنواری کی کنواری' جب کوئی ملنے ملانے کے لیے گاؤں سے آتا ہے تو یہی پوچھتا ہے کہ کب کرنی ہے اس کی شادی' چار رشتے تو یوں سامنے پڑے ہیں خاندان میں' اور جو کسی کو کہہ دیا کہ ہم بانو کی شادی کرنا چاہتے ہیں تو لائن لگ جائے گی رشتوں کی۔''

''اب یہاں تم زیادتی کر رہی ہو بانو کی اماں۔'' ابا جی بولے۔ ''خاندان میں کون سے اچھے رشتے ہیں' کیا میں گلو مستری سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا یا پھر اس شیدے کمہار سے؟''

''تو کیا حرج ہے' آپ بھی تو کمہار ہی ہیں۔ خاندان کے دیکھے بھالے رشتوں میں جو بات ہوتی ہے' وہ باہر کے رشتوں میں نہیں ہوتی۔''

''مجھے ان کے کمہار یا مستری ہونے پر اعتراض نہیں ہے۔ اعتراض ان کی جہالت پر ہے' اگر وہ صرف ان پڑھ ہوتے تب بھی میں کچھ سوچ سکتا تھا لیکن وہ تو بڑے جاہل ہیں۔''

''ہائے' اپنے بھتیجوں کو جاہل کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں' یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں ان جاہلوں کا چچا ہوں۔''

''تو پھر گھر میں بٹھائے رکھنا اپنی لاڈلی کو یا کسی کھوسٹ پروفیسر کے حوالے کر دینا۔ میری بلا سے' اپنی بیٹی ہے چاہے چولہے میں جھونکیں' چاہے جہنم میں' میرا کیا جاتا ہے۔'' اماں بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھیں۔

''اُف شکر ہے میرے ابا جی اچھے ہیں' ورنہ اماں تو مجھے گلّو شیدے یا بالے کے پلے باندھ کر ہی رہتیں۔'' ماہ بانو نے شکر کا سانس لیا۔

''بانو!'' رات کے کھانے پر اماں بولیں۔ ''صبح تیار رہنا ہمیں گاؤں جانا ہے۔''

''گاؤں؟'' اس کے ذہن میں عبداللہ کا دھندلا سا سایہ آ گیا۔

''ہاں۔''

''ریشماں کی طرف جائیں گی آپ؟''

''ارے ہاں کیوں نہیں' ایک ہی ایک تو میری بہن تھی' ظالموں نے بہت برا سلوک کیا اس کے ساتھ۔'' اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''اب اس کی پھول سی بچی کو قید کر کے رکھا ہوا ہے' نہ بے چاری کہیں جانے کی' نہ کہیں آنے کی' میں بھی نہ جاؤں اس کے پاس تو وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے وہاں۔''

''اچھا ہے' اسی بہانے اسے عبداللہ کی آمد کے بارے میں بھی بتا دوں گی۔'' ماہ بانو نے سوچا۔

رات کو سونے سے پہلے اس نے اپنے اور اماں کے چند جوڑے بیگ میں ڈالے اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

''پتا نہیں سعد بھی میرے بارے میں ویسے ہی سوچتا ہے یا نہیں۔'' اس نے سونے سے پہلے ہمیشہ کی طرح سوچا۔ ''یا شاید میں ہی پاگل ہوں' کیوں اس کی طرف کھنچی چلی جاتی ہوں میں۔ اُما کہتی تو ٹھیک ہی ہے اور یہ بھی کہ اتنا پوزیسو تو انسان صرف محبت ہی میں ہوتا ہے لیکن پھر وہ بتاتا کیوں نہیں ہے؟ کیوں نہیں صاف صاف کہہ دیتا کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔

شاید وہ اس انتظار میں ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ اب اس میں اتنا وقت بھی نہیں رہ گیا' ابھی تھرڈ ایئر میں ہے۔ ایک دو مہینوں کی بات ہے پھر فورتھ ایئر میں چلا جائے گا اور پھر اس ایک سال کے بعد وہ عملی دنیا میں قدم رکھ لے گا۔

ابا جی میری اس خواہش کو رد نہیں کریں گے۔ اماں بھی خوش ہوں گی لیکن اصل مسئلہ میرے اماں' ابا نہیں' سعد اور اس کے گھر والے ہیں۔ کلاس کا یہ فرق اگر فلموں کی اسکرین سے نکل کر ہماری حقیقی زندگیوں میں آ گیا تو پھر کیا ہو گا؟ پتا نہیں کیا ہو گا پھر؟ میں تو شاید پاگل ہی ہو جاؤں یا

شاید نہ ہوں' عجیب سی بات لگتی ہے' کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو گا۔''

صبح حسبِ معمول اماں نے اسے سویرے سویرے ہی جگا دیا۔

''جلدی کرو بانو' کبھی کالج کے بجائے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے لیے بھی جاگ جایا کرو۔'' اماں نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ ''ابھی سویرے سویرے نکلیں گے تو شام تک گاؤں پہنچیں گے' میں چاہتی ہوں' اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔''

نیند سے اس کی آنکھیں پہلے ہی بند ہو رہی تھیں...... جی ٹی ایس کی پھٹیچر سی بس کی گھوں گھوں میں وہ جلد ہی سو گئی۔

قریبی بڑے شہر سے ان کا گاؤں نیاز پور کوئی پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہو گا' لیکن کوئی پکی سڑک نہ ہونے کی وجہ سے تانگے کے مدھم سُروں کی ٹک ٹک اور گرد و غبار کے طوفان میں نہاتے ہوئے یہ راستہ کافی طویل لگتا تھا۔

تنگ سی کچی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک لہلہاتے ہوئے کھیت پھیلے تھے۔ اس سڑک پر صرف تانگے ہی نہیں' موٹر گاڑیاں بھی چلتی تھیں۔ پیر صاحب رجب علی شاہ کی پجیرو اور نسان پٹرول۔

تانگے کا مریل سا گھوڑا جب ٹخوں ٹوں' ٹخوں ٹوں کرتا ہوا کماد کے کھیت کے پاس پہنچا تو ایک جیپ تیزی سے ان کے پاس سے گرد اڑاتے ہوئے گزرتی چلی گئی۔ سفید چادر میں سر سے پیر تک لپٹی ہوئی ماہ بانو پہلے ہی گرمی' پسینے اور سفر کی تھکن سے بے حال تھی اوپر سے گرد کا یہ طوفان۔

''اُلو کا پٹھا' ایسے گیا ہے جیسے باپ کی جاگیر ہو۔'' وہ بڑبڑائی۔

''چپ۔'' اماں نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ''بکواس کیے جائے گی' موقع دیکھتی ہے نہ محل' ٹرٹر کیے جاتی ہے۔''

''ٹھیک تو کہتی ہے چھوٹی بی بی۔'' بڈھا کوچوان ہنسا۔ ''اس کے باپ کی جاگیر ہی تو ہے' پیر صاحب رجب علی شاہ کا گدی نشین ہے یہ خادم علی شاہ۔''

''بھائی یہ بچی ہے ناں' اسے نہیں پتا۔'' اماں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''کبھی کبھار تو آتی ہے یہاں' وہ بھی ایک دو روز کے لیے۔''

''بی بی آپ کو جانا کہاں ہے گاؤں میں؟''

''مولوی نعمت اللہ صاحب کے یہاں۔''

''مولوی صاحب کے گھر؟ بہت اچھے ہیں مولوی صاحب' بہت عزت کرتا ہے سارا گاؤں ان کی۔ انہی کے دم سے کچھ نہ کچھ مسلمانی باقی ہے اس گاؤں میں ورنہ جاہلوں کو تو دین دنیا کی خبر ہی نہیں اور پڑھے لکھوں کے لیے دین کی اہمیت ہی نہیں رہی۔ ہائے وہ وقت کہاں سے آئے گا۔

جب پیر صاحب جلال الدین مرحوم اس گاؤں کے والی تھے' جیسے ہی انہوں نے آنکھیں بند کیں' رجب علی شاہ پتا نہیں' کس گناہ کی سزا کے طور پر ہمارے سروں پر مسلط ہو گیا۔''

بڈھے کوچوان نے تانگہ گاؤں کی اکلوتی مسجد کی سفید دیوار کے پاس روکا۔ اماں نے بٹوا کھول کر پیسے نکالے۔

''نہ بی بی نہ۔'' کوچوان نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''آپ تو یہاں آتی رہتی ہوں گی۔ ہم مولوی صاحب کے گھر کی سواریوں سے پیسے نہیں لیتے۔''

بڑی اماں اور نانا سے ملنے کے بعد وہ جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی اور دیر تک نہاتی رہی۔ ٹیوب ویل کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بہت فرحت بخش تھا۔ ماہ بانو کی ساری تھکن اتر گئی۔ لان کا ہلکا سا پرنٹڈ سوٹ پہن کر باہر نکلتے ہوئے اس نے اماں سے ریشماں کی طرف جانے کی اجازت مانگی۔

''اس وقت اندھیرا اچھل گیا ہے' کل چلی جانا۔''

''اماں پلیز' دومنٹ کا تو راستہ ہے۔'' وہ ریشماں کو عبداللہ کی آمد کے بارے میں بتانے کے لیے بے چین تھی۔

''پاگل ہوئی ہے۔'' اماں نے اسے ڈپٹا۔ ''پتا بھی ہے کہ اس کے بھائی کیسے ہیں۔''

''اماں میں چادر لے کر وہاں جاتی ہوں۔ اس پر نقاب بھی ہے۔ پھر میں کون سا مردانے میں جا رہی ہوں۔''

''چپ کر کے سو جاؤ بچی۔'' بڑی اماں بولیں۔ ''اس وقت وہ کسی کو ریشماں سے ملنے نہیں دیتے۔ کل میں خود تجھے چھوڑ آؤں گی۔''

''ایسے ماحول میں پاگل نہیں ہو جاتی وہ' میں تو ایک دن بھی نہ رہ سکوں ایسی جگہ پر۔'' ماہ بانو نے جھرجھری لی۔

''بس بیٹا قسمت کی بات ہے سب۔'' اماں نے آہ بھری۔

''ماں بیٹی دونوں ایک سا خراب مقدر لے کر آئی تھیں۔ زرینہ بے چاری کی جان تو اس چخ چخ سے چھوٹ گئی لیکن ریشماں پتا نہیں کب تک پستی رہے گی' اس چکی میں۔'' بڑی اماں افسردگی سے بولیں۔

''اماں! جب آپ لوگوں کو معلوم تھا کہ رجب علی شاہ کی حرکات ایسی ہیں تو کیوں کی زرینہ خالہ کی شادی وہاں؟ کیوں پھینکا انہیں اس جہنم میں؟ دھن' دولت بڑی چیز ہوتی ہے لیکن اتنی بڑی بھی نہیں کہ ایک معصوم عورت کو دولت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ میں یہاں کم کم آتی ہوں پھر بھی مجھے معلوم ہے کہ رجب علی شاہ اور اس کے بیٹے...... انسانیت کی سطح سے کس قدر گرے ہوئے لوگ ہیں' آپ تو یہیں رہتے تھے' کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دو

بیویاں سالم ہضم کر چکا تھا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی آپ لوگوں نے خالہ کی شادی اس سے کر دی تو ان کے اور ریشماں کے مقدر کی خرابی کے ذمہ دار آپ لوگ ہیں۔ قسمت کو کیوں برا بھلا کہتے ہیں جبکہ فیصلہ آپ لوگوں کا تھا۔''

''بہت بکنے لگی ہے۔'' اماں نے زمین پر پڑا ہوا چمٹا اٹھا لیا۔ ''تعلیم نے یہی سکھایا ہے کہ بڑوں کے سامنے یوں بولتے ہیں۔''

''نہ نہ پتر!'' بڑی اماں نے ان کے ہاتھ سے چمٹا کھینچ لیا۔ ''جوان بیٹی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔''

''اماں میں گستاخی نہیں کر رہی' صرف حیرت کا اظہار کر رہی ہوں کہ آخر وجہ کیا تھی زرینہ خالہ کی وہاں شادی کرنے کی۔''

''تجھ سے مطلب؟'' اماں چلائیں۔ ''چل اندر' نماز کا وقت ہونے والا ہے' ابھی دس منٹ میں نمازی آتے ہوں گے۔''

''میں چلی تو جاتی ہوں لیکن پلیز آئندہ اپنے اور اپنے بڑوں کے کیے کا مردہ قسمت کے سر نہ منڈھنا۔'' وہ پیچھے مڑ کر کمرے میں چلی گئی۔

''بک بک کیے جائے گی۔'' اماں نے ڈراوے کے لیے جوتا اٹھا لیا لیکن تب تک ماہ بانو اندر جا چکی تھی۔

تھوڑی دیر تک اماں اور بڑی اماں چولہے کے پاس خاموش بیٹھی رہیں پھر اماں نے سر اٹھایا۔

''اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں میری راتوں کی نیندیں اچاٹ ہو گئی ہیں' لیکن بانو کے ابا کی نظر میں کوئی لڑکا جچتا ہی نہیں ہے۔''

''بانو کا باپ سمجھدار ہے' تم جلد بازی مت کرو' سوچ سمجھ کر رشتہ کرو۔ ایک ہی تو بیٹی ہے تمہاری' میں نہیں چاہتی کہ اس کا حال بھی زرینہ والا ہو۔'' بڑی اماں بولیں۔

''اماں اتنے اچھے رشتے ہیں' آخر کب تک کوئی انتظار کرے گا۔ وہ گلو ہے' اچھا بھلا مستری ہے' شہر آ جائے تو روزانہ سو ڈیڑھ سو نہ سہی' پچاس ساٹھ روپے تو کما ہی لے گا۔ پھر وہ شیدا ہے' میں بانو کے ابا سے کہہ رہی تھی کہ ہمیں یہ گھر بار قبر میں تو لے جانا نہیں ہے' وہاں تو بس ایک اللہ کا نام جائے گا ہمارے ساتھ۔ شیدے کے ساتھ شادی ہو جائے بانو کی تو جما جمایا کاروبار اس کے حوالے کر دیں گے۔''

''پھر اسے پسند نہیں آئے یہ رشتے؟''

''نہیں اماں' یہ راج ہٹ' بالک ہٹ اور تریا ہٹ تو سنی تھی پر جو ضد بانو کے ابا کی ہے' وہ دیکھی نہ سنی۔'' اماں نے کہا۔ ''چلو گلو اور شیدا تو ان پڑھ جاہل ہیں لیکن بالا تو پانچ جماعت پاس

ہے۔اتنی اچھی ڈرائیوری کرتا ہے‘ اس پر بھی وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔‘‘

’’دیکھو رضیہ! بانو نے بارہ جماعتیں انگریزی میں پاس کی ہیں اور اب ماشاء اللہ کالج میں ہے۔شرع میں بھی حکم ہے لڑکی کی مرضی پوچھنے کا۔وہ پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہے۔ان گنواروں کے پلے بندھ گئی تو ہیرا سی بچی کی ناقدری کریں گے یہ لوگ۔‘‘

’’اسی غم میں تو گھلی جاتی ہوں میں‘ اتنا پڑھ لکھ جائے گی تو کہاں سے بر ملے گا۔خاندان میں تو کوئی لڑکا اتنا پڑھا ہوا نہیں ہے‘ کہیں کنواری نہ رہ جائے میری بچی۔‘‘

’’اُف!‘‘ ماہ بانو کا دل چاہا کہ وہ اپنے بال نوچ لے۔’’اماں کا بس چلے تو گلو‘ بالے اور شیدے تینوں سے ہی میری شادی کروادیں۔کیونکہ اماں کو تینوں میں ہی ایک سے بڑھ کر ایک خوبی نظر آتی ہے۔مجھے یقین ہے کہ اگر انتخاب کا حق مکمل طور پر اماں کے ہاتھ میں ہو‘ تب بھی اماں ان تینوں میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کر سکیں گی۔‘‘

وہ سلاخوں والی کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر چار پائی پر بیٹھ گئی۔

’’کبھی سعد کو دیکھ لیں اماں تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔جو شیدے‘ گلو اور بالے کو بیک وقت اپنا ملازم رکھ سکتا ہے۔جس کی کار ہمارے دو کمروں کے گھر سے زیادہ لمبی ہے۔‘‘

’’جس کی کار اتنی لمبی ہے‘ وہ بھلا تمہیں کہاں گھاس ڈالنے لگا۔‘‘ ماہ بانو کے اندر کہیں سے آواز آئی۔

’’ممکن ہے تمام مادی آسائشیں اس کی محبت کے سامنے ہیچ ثابت ہوں۔‘‘ اس نے خود کو تسلی دی۔

’’ہاں اور وہ تمام مادی آسائشیں چھوڑ کر بالآخر بھاٹی گیٹ کے اس دو کمروں کے مکان میں مٹی کے برتن بنانے کے لیے چلا آئے گا‘ ہے نا دلچسپ بات۔‘‘ اس کے اندر کوئی مضحکہ اُڑانے والے انداز میں ہنسا۔

اس نے جلدی سے ان باتوں کی طرف سے اپنا ذہن ہٹانے کی کوشش کی اور اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگی ہوئی الماری کے پٹ کھول کر اس میں سے زرینہ خالہ کی چھوٹی سی صندوقچی باہر نکال کر چار پائی پر رکھ لی۔

باہر نانا کے حجرے کے پرے سے اذان کی آواز آنے لگی۔وہ چپ چاپ چار پائی پر بیٹھی رہی۔اذان ختم ہونے کے بعد اس نے آہستگی سے صندوقچی کا ڈھکنا اٹھایا۔اس سے قبل اس نے اس چھوٹی سی صندوقچی کو بس باہر سے دیکھا ہی تھا‘ کبھی کھولا نہیں تھا۔اسے یقین تھا کہ اماں کبھی اس بات کو پسند نہ کرتیں۔اسے ہمیشہ اس میں ایک انوکھا‘ رومانوی سا اسرار نظر آتا تھا لیکن آج اس نے بلاوجہ ہی اس کا ڈھکنا کھول دیا تھا۔

اس میں بہت کچھ تھا۔چھوٹی چھوٹی بے شمار بظاہر فالتو چیزیں تھیں لیکن انہیں ایک نظر

دیکھتے ہی ماہ بانو کو احساس ہو گیا تھا کہ درحقیقت ان میں ایک چیز بھی فالتو نہیں تھی۔وہ سب کسی کے دیئے ہوئے تحفے تھے‘ سوکھے پھول‘ پرفیوم کی خالی شیشیاں‘ ایک لفافے میں بند کچھ کاغذوں کی راکھ‘ کانچ کی بے شمار ٹوٹی ہوئی چوڑیاں‘ نیلے رنگ کا مردانہ قمیص کا ایک بٹن‘ ہار پنوں کے چند ٹوٹے ہوئے سنہری گھنگھرو‘ گلے میں پہننے والی سونے کی زنجیر کی چند کڑیاں اور ان سب کے نیچے بچھی ہوئی سرخ رنگ کی اوڑھنی جو اب اُڑی اُڑی گلابی رنگت اختیار کر چکی تھی۔

اس نے صندوقچی کو چار پائی پر الٹ دیا۔ان سب چیزوں کے بعد اوڑھنی کے نیچے سے نکل کر ایک ریشمی کپڑا چار پائی پر گرا۔ماہ بانو نے اسے اٹھا لیا۔شاید کبھی وہ سفید رنگ کا کپڑا رہا ہو لیکن اب اس میں پیلاہٹ نمایاں تھی۔اس کے ایک کونے میں اُڑی ہوئی رنگت والے سرخ دھاگے سے انگریزی کے دو حروف بھی کڑھے ہوئے تھے۔

’’زیڈ اینڈ ایچ (Z and H)‘‘ ماہ بانو زیر لب بولی۔’’زیڈ سے تو زرینہ خالہ کا نام بن گیا‘ یہ ایچ کون ہے؟‘‘

اسے یوں لگا جیسے وہ کسی کی زندگی میں جھانک رہی ہے‘ جیسے کچھ چوری کر رہی ہے لیکن ان کیفیات سے زیادہ سنسنی خیز محسوسات دوسرے تھے۔اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی کہانی چپکے چپکے اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہے‘ جیسے کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس میں اسے‘ ماہ بانو کو مرکزی کردار ادا کرنا ہے۔اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہ میں اپنے کالج کی سرخ اینٹوں سے بنی عمارت گھومنے لگی۔سفید روشن مسجد کے مینارا سے کچھ اشارہ دے رہے تھے۔رجب علی شاہ کی حویلی اسے آواز دے کر بلا رہی تھی۔

وہ جو بھی کہانی تھی اس کا تعلق انہی جگہوں سے تھا۔کالج کی سرخ اینٹوں‘ مسجد کے سفید میناروں اور رجب علی شاہ کی قلعہ نما حویلی کی اونچی اونچی دیواروں سے۔

’’زرینہ خالہ کی کہانی میں میرا کردار کہاں فٹ ہوتا ہے؟‘‘ ماہ بانو سوچ رہی تھی۔

’’بانو!‘‘ کمرے کے باہر سے اماں کی آواز آئی۔

ماہ بانو نے جلدی جلدی سب چیزیں صندوقچی میں رکھنا شروع کیں۔

’’بانو!‘‘ اماں دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی تھیں۔

ماہ بانو کے صندوقچی میں چیزیں واپس رکھتے ہوئے ہاتھ خود بخود رک گئے۔

اماں کی نگاہ کھلی ہوئی صندوقچی پر پڑی تو ایک لمحہ کے لیے ان کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا پھر وہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

’’میرے منع کرنے کے باوجود تم نے صندوقچی کیوں کھولی؟‘‘ وہ چند قدم آگے بڑھ آئیں۔

’’یونہی بلاوجہ۔‘‘ اس نے باقی چیزیں بھی جلدی سے واپس رکھ کر ڈھکنا بند کر دیا۔

"کسی انسان کا ماضی کھنگالنے سے صرف دکھ اور غم ملتا ہے۔" اماں نے صندوقچی اٹھا کر واپس الماری میں رکھ دی۔ "خاص کر ایسے شخص کا جسے مرے ہوئے بھی کئی سال بیت گئے ہوں۔"

"اماں! زرینہ خالہ کو انگریزی آتی تھی؟"

اماں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ پھر انہوں نے خود پر بہت قابو پا کر کہا۔

"نہیں۔"

"تو پھر اس رومال پر......"

"ہمیں کسی کا ماضی کھولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" اماں نے اس کی بات کاٹی۔

"لیکن میں اس کہانی کا ایک کردار ہوں۔" اس کے اندر کوئی چلایا۔ "مجھے یہ سب کچھ جاننے کا حق حاصل ہے۔"

"اماں۔" اس نے انہیں پکارا۔

"کیا بات ہے؟"

"اگر اس کے پیچھے کوئی کہانی ہے تو بتا دینے میں کیا حرج ہے اور پھر میں آپ کی بیٹی ہوں۔"

"تم تھکی ہوئی ہو سو جاؤ۔" اماں کمرے سے باہر نکلنے لگیں۔

"پلیز اماں۔" اس نے لپک کر ان کا بازو پکڑ لیا۔

"تم کیوں جاننا چاہتی ہو یہ سب کچھ؟ اس میں دکھ اور تکلیف کے سوا کچھ نہیں ہے اور تم تو شاید یہ دکھ محسوس بھی نہ کر سکو کیونکہ تم نے زرینہ کو دیکھا نہیں تھا' اس وقت جب اس کی آنکھیں ہر وقت ہنستی رہتی تھیں اور نہ اس وقت جب تقدیر نے آنسو اس کا مقدر بنا دیئے تھے۔"

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کہانی کو سننے کو میری آرزو کہیں بہت اندر سے پھوٹ رہی ہو۔" ماہ بانو نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "جیسے یہ کہانی آپ کی نہیں میری زندگی کا حصہ ہو اور اسے جاننے کا مجھے پورا پورا حق حاصل ہو۔"

اماں نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں اور وقت کا پہیہ چوبیس سال پیچھے چلنے لگا۔

☆======☆======☆

یہ کہانی چوبیس برس پیشتر تب شروع ہوئی تھی' جب پیر صاحب جلال الدین کے بڑے بیٹے اور گدی نشین رجب علی شاہ اپنے چھوٹے بھائی حیدر علی شاہ کے ساتھ برطانیہ سے پاکستان لوٹے تھے اور ان کی واپسی کی خوشی میں ان کی والدہ نذری بیگم نے حویلی میں ختم قرآن پاک کا

اہتمام کر رکھا تھا۔ گاؤں میں کوئی دینی یا سماجی تقریب مولوی نعمت اللہ اور ان کے گھرانے کی شمولیت کے بغیر انجام پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سو اس دن بھی حویلی میں ان کا جانا ضروری تھا۔

"جلدی کرو' حویلی سے تانگہ کب کا آیا کھڑا ہے اور کتنی دیر لگاؤ گی؟" مولوی صاحب نے حجرے میں داخل ہو کر دریافت کیا۔

"اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" رضیہ بولی۔ "اب تو بخار بھی بڑھ گیا ہے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا ابا جی کہ ہم پیر صاحب سے معذرت کر لیں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے' ان کے ہم پر اور ہمارے گھر پر بے شمار احسانات ہیں۔"

"لیکن ابا جی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میری فکر نہ کرو۔ یونہی موسم کی تبدیلی سے بخار ہو گیا ہے۔ شام تک بھلی چنگی ہو جاؤں گی۔" اماں نے کہا۔ "تم دونوں اپنے ابا کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"آپ کو ایسے چھوڑ کر جانے کے لیے دل نہیں مانتا۔" رضیہ بولی۔

اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "زرینہ ایسا کرو کہ تم میرے ساتھ آ جاؤ اور رضیہ تم اپنی ماں کی دیکھ بھال کرو۔"

حویلی کے زنانہ میں بے شمار عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور قرآن پاک پڑھنے کے ساتھ ساتھ گاؤں کے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی کر رہی تھیں۔

"سنا ہے بخشو موچی کی بیٹی ریاضے کے ساتھ بھاگتے ہوئے پکڑی گئی۔ باپ نے بہت مارا بیٹی کو لیکن پھر عزت کے ڈر سے بات چھپا دی گئی۔"

"ہاں' پرسوں رات لڑکی کے رونے چیخنے کی آوازیں میرے گھر بھی آ رہی تھیں۔ ارے میرا گھر کون سا دور ہے کہ یہ باتیں چھپی رہیں۔ ایک دیوار نہ سہی' پر سب سے قریب تو میرا ہی گھر ہے ناں' اچھی بھلی لڑکی پر اس لفنگے نے نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے۔"

"تعلیم تو بی بی خراب ہی کرتی ہے' اب اس ریاضے کو ہی دیکھ لو' پوری پانچ جماعتیں پڑھی ہوئی ہیں' بس پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سارا وقت فیشن میں برباد' بالوں میں تیل لگائے' آنکھوں میں سرمہ ڈالے کرمو پان والے کی دکان کے سامنے کھڑا ہر آئی گئی عورت کو تاکتا پھرتا ہے۔ میری توبہ جو میں اپنے بیٹے کو پڑھانے کا سوچوں بھی۔"

"ہاں بہن' اچھی بھلی اولاد ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔" ایک اور نے آہ بھری۔

"یہ سب قسمت کی بات ہے۔ ہماری تو قسمت ہی خراب ہے کہ پڑھ لکھ کر اولاد ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اب پیر صاحب کو ہی دیکھ لو۔ دونوں بیٹے ولایت سے پڑھ کر آئے ہیں۔ جب ولایت جانے لگے تھے تو ڈھکے چھپے سب نے کہا تھا کہ اپنے ساتھ میمیں لے کر ہی لوٹیں

گئے' پھر پیر صاحب کے بڑے بیٹے کے متعلق لوگوں نے کیا کیا نہ کہا کہ وہاں میموں میں گھرا رہتا ہے۔ یہ بھی کہا کہ ایک چٹی چمڑی والی سے شادی بھی کر لی ہے لیکن دیکھ لوایسا کچھ نہیں ہوا۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی خالی لوٹ آئے۔ حالانکہ ساری عمر ولایت ہی میں گزاری ہے دونوں نے۔''

''اب تم ہماری اولاد کو پیر صاحب کی اولاد سے تو نہ ملاؤ۔'' ایک بولی۔ ''پیر صاحب کی اولاد ہم عام لوگوں کی اولاد جیسی تو نہیں ہے۔ ہم اُمتی بھلا کب مقابلہ کر سکتے ہیں ان کا۔''

''اے ہے' حلق کیسا سوکھا پڑ رہا ہے۔ زرینہ بیٹا ذرا دو گھونٹ پانی تو لا دے کہیں سے۔'' چاچی نوراں نے گلے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''بہت پیاس لگتی ہے چاچی کو۔'' زرینہ سوچتی ہوئی اٹھی۔ ''ابھی روح افزا کا پورا جگ حلق میں انڈیل بیٹھی ہے پھر بھی پیاس لگ رہی ہے۔''

وہ چپ چاپ بڑے کمرے سے باہر نکل گئی۔ مختلف چھوٹے بڑے کمرے عبور کر کے وہ لان میں پہنچی جہاں گاؤں کی عورتیں ٹب اور حماموں میں روح افزا بنا رہی تھیں۔ ساتھ ہی زمین پر برف کی سلیں رکھی ہوئی تھیں' جن کا پانی دالان میں ہر طرف پھیل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے مٹی سے اٹے' ننگے پاؤں سے وہیں اچھل کود کر رہے تھے۔ ہر طرف کیچڑ کیچڑ ہو رہی تھی۔

زرینہ نے ایک جگ اور گلاس اٹھایا اور واپس پلٹی۔ کمرے کے دروازے سے گزرتے ہوئے اسے ہلکا سا جھٹکا لگا اور سنبھلنے کی کوشش میں شربت سے بھرا ہوا جگ اور شیشے کا گلاس زمین پر گر گئے۔ زرینہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو اس کا بڑا سا ریشمی دوپٹا لکڑی کے بھاری دروازے کی کنڈی میں بری طرح اٹکا ہوا تھا اور دروازے کے بیچوں بیچ ایک اجنبی کھڑا دلچسپی سے اس کی بوکھلاہٹ دیکھ رہا تھا۔ زنان خانے میں ایک مرد کو دیکھ کر اس کی بوکھلاہٹ میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے ایک نظر قالین میں جذب ہوتے شربت اور بکھرے ہوئے شیشوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اٹکے ہوئے دوپٹے کی جانب۔ وہ اس شش و پنج میں مبتلا تھی کہ پہلے کیا کرے۔ دوپٹے کو کنڈی سے نکالے یا فرش پر بکھرے ہوئے شیشے جمع کرنا شروع کر دے۔ اچھی بھلی عقل اس وقت پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی۔

''میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟'' اجنبی نے مہذب انداز میں پوچھا۔

''نہیں' ہاں۔'' وہ مزید بوکھلا گئی۔ ''میرا مطلب ہے کہ......''

اجنبی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔''

وہ آگے بڑھا اور اس کے دوپٹے کا کنڈی میں اٹکا ہوا سرا تھام لیا۔ زرینہ کو اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے جلدی سے دوپٹے کو کھینچ لیا۔ چرر کی آواز کے ساتھ دوپٹا پھٹا اور کنڈی کی قید سے آزاد ہو گیا۔

''یہ کیا' کیا آپ نے؟'' اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔

لیکن زرینہ اس کی بات کو سنی اَن سنی کر کے وہاں سے بھاگ آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی جوان اجنبی مرد سے یوں براہِ راست بات کی تھی۔

گاؤں میں دو چار ہی تو گھر تھے' جہاں سختی سے پردے کی پابندی کی جاتی تھی اور مولوی نعمت اللہ کا گھرانہ انہی میں سے ایک تھا۔ ان کے ہاں بے پردگی سخت معیوب سمجھی جاتی تھی۔ کجا یہ کہ کوئی اجنبی' مولوی صاحب کی کسی بیٹی کا دوپٹا پکڑ لے۔

گھر آ کر بھی وہ گم صُم ہی رہی۔ اس کے لیے یہ سب بہت حیران کن اور بہت انوکھا تجربہ تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والی ایک خوش باش لڑکی تھی۔ اماں' ابا' رضیہ اور چند سہیلیاں اس کی زندگی اسی محور کے گرد گھومتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔

پھر آج یہ کیا ہوا تھا؟ وہ اجنبی اس کی آنکھوں سے جھانکتی دلچسپی' اس کی مسکراہٹ' وہ اس کا زرینہ کو مدد کی پیشکش کرنا اور دوپٹا کنڈی سے نکالنے کے لیے اس کا سرا تھامنا اور پھر زرینہ کا جلدی سے دوپٹا کھینچ لینا۔

وہ دوپٹے کا پھٹا ہوا سرا ہاتھ میں پکڑے بیٹھی یہی کچھ سوچ رہی تھی' جب رضیہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''کہاں گم ہو؟''

''کہیں نہیں۔'' وہ بوکھلا گئی۔ یوں لگا جیسے رضیہ نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کے پھٹے ہوئے سرے کو مٹھی میں بند کر لیا۔

''یہ دوپٹا کیسے پھٹ گیا؟'' رضیہ نے اسے پھٹے ہوئے دوپٹے کو مٹھی میں بند کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''پتا نہیں' میرا مطلب یہ کہ ایسے ہی مجھے نہیں پتا۔'' وہ گھبراہٹ میں بے ربطی سے بولی۔

''یعنی دوپٹا پھٹ گیا اور تمہیں خبر نہیں ہوئی۔'' رضیہ نے حیرت سے کہا۔ ''جانتی ہو کتنا مہنگا دوپٹا ہے۔''

''ہاں نہیں مجھے نہیں پتا چلا' معلوم نہیں کیسے پھٹ گیا۔'' زرینہ نے نگاہیں چرائیں۔

''کیا بات ہے؟ لگتا ہے تم کچھ چھپا رہی ہو۔'' رضیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نہیں تو۔'' اس نے اضطراب سے انگلیاں چٹخائیں۔

''تو پھر اتنی گم صُم کیوں ہو۔ جب سے آئی ہو خاموش بیٹھی ہوئی ہو۔ نہ وہاں کے قصے' نہ کوئی کہانی' نہ یہ بتایا...... کہ کس نے کیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے' نہ یہ کہ کس کس نے اماں کا احوال پوچھا۔''

''سب پوچھ رہے تھے اماں کو۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''ہاں سب ہی۔''

"کوئی بات تو ہے۔ چلو تم نہ بتانا چاہو تو میں پوچھ کر کیا کروں گی۔" رضیہ اٹھ کھڑی ہوئی تو زرینہ نے سکون کا سانس لیا۔

☆======☆======☆

وہ کوئی عام سی لڑکی تھی یا بادِ صبا کا جھونکا' وہ حُسن تھی' خوشبو تھی' چٹکی ہوئی' بلوریں چاندنی میں مسکراتی ہوئی موتیے کی کلی تھی۔ وہ مہرِ تاباں' وہ ماہِ کامل' وہ بہار شمائل' وہ پری وِش مجسم غزل تھی۔
جب سے حیدر علی شاہ نے اسے دیکھا تھا۔ تب سے وہ اس کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔ وہ حیدر علی شاہ جو برسوں ولایت میں گزار کر آیا تھا' جس نے سورج کی کرنوں سی بالوں والیوں کے ساتھ بہت سے غیر سنجیدہ معاشقے بھی کیے تھے' جو کیمبرج کا تعلیم یافتہ تھا اور پہلی نظر کی محبت کو سچ ماننے والوں کا خوب مذاق اڑایا کرتا تھا اور جسے اپنی وجاہت پر اس قدر ناز تھا کہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے آج تک کسی لڑکی کی طرف خود پیش قدمی نہیں کی' اس کے باوجود اس کا کوئی بھی ویک اینڈ تنہا نہیں گزرتا۔

آج وہی حیدر علی شاہ گاؤں کی ایک عام سی لڑکی کو دیکھ کر سب کچھ بھول بیٹھا تھا۔ وہ بار بار خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ محض وقتی جذبہ ہے جو آپ ہی آپ' آج نہیں تو کل ختم ہو جائے گا لیکن اس کی ہر دلیل کے جواب میں اس کے کہیں بہت اندر سے تمسخر آمیز ہنسی کی صدا آنے لگتی تھی۔

"ٹھیک ہے وہ حسین ہے۔" وہ اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹا ہوا خود کو سمجھا رہا تھا۔ "ہاں اس کی رنگت بھی شہد سے گندھی ہوئی لگتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اس کے بال لانبے اور سیاہ ہیں' یہ بھی غلط نہیں ہے کہ اس کی شربتی آنکھیں ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد اور کچھ بھی دیکھنے کی آرزو نہیں رہتی' لیکن اس کے علاوہ کیا ہے اس میں؟ کچھ بھی نہیں۔
وہ یقیناً تعلیم یافتہ نہیں ہوگی۔ ایک نمبر کٹ گیا۔ وہ مہذب بھی نہیں ہے ورنہ میری پیشکش کے بعد یوں اپنا دوپٹا نہ پھاڑتی۔ ایک اور نمبر کٹ گیا۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہیں ہے' جیسا کہ مجھے یقین ہے تو پھر اس سے سنجیدہ قسم کے عشق کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ تو وہ میرے ساتھ شیکسپیئر پر بحث کر سکتی ہے اور نہ ہی شیلے کے Ode To The West Wind پر۔ اسے تو کیٹس کے نام کا بھی علم نہیں ہوگا اور اگر اسے بائرن کے حالاتِ زندگی کا علم ہو گیا تو مجھے یقین ہے کہ وہیں پٹ سے گرے گی اور مر جائے گی۔ یعنی بقیہ سب نمبر بھی کٹ گئے۔
بھلا ایسی لڑکی سے کوئی سنجیدہ یا غیر سنجیدہ عشق کرنے سے بڑھ کر بھی کوئی Waste Of Time ہو سکتا ہے؟ اس کے متعلق تھوڑا بہت سوچنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انگلینڈ میں شرم و حیا کے یہ نظارے کم یاب ہی نہیں نایاب ہیں۔ اس کی جگہ یہاں کی کوئی بھی لڑکی ہوتی تو اس کا ردِعمل بھی یقیناً یہی ہوتا اور نہ جانے ایسی ہی اور کتنی لڑکیوں سے میری ملاقات بھی ہو جائے۔

ظاہر ہے' میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تو عشق کر نہیں سکتا اور پھر حقیقت تو یہ ہے کہ جتنی محنت یہاں کی لڑکیوں سے عشق کرنے کے لیے درکار ہو گی۔ کم از کم میں تو اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں فارغ وقت میں ایما' جوڈی اور کٹی کی تصویریں دیکھ کر خوش ہو جایا کروں۔"

دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ اپنے خیالات سے چونک اٹھا۔ آنے والا اس کا بڑا بھائی رجب علی شاہ تھا۔ دونوں بھائیوں کی عمر میں بارہ سال کا فرق تھا۔ رجب علی شاہ پیر صاحب کا بڑا بیٹا اور گدی نشین تھا۔ اس کے بعد دو بہنیں زیب النساء اور مہر النساء تھیں۔ پھر حیدر علی شاہ اور اس سے دس برس چھوٹا سخاوت علی شاہ تھا۔ عمر کے اس تفاوت کی وجہ سے حیدر علی شاہ بڑے بھائی کے سامنے ہمیشہ مؤدب رہتا تھا۔
"آئیے۔" حیدر علی نے مسہری سے اٹھ کر بڑے بھائی کا استقبال کیا۔
"کہو' دل لگ گیا یہاں؟"
"آہستہ آہستہ لگ ہی جائے گا۔" حیدر علی نے کہا۔
"دل لگانے کے سامان کی رئیس زادوں کو کوئی کمی نہیں ہوتی۔ خواہ وہ ولایت ہو یا پاکستان۔" رجب علی بولا۔ "بس ایک بات یاد رہے کہ دل لگاؤ دل کو نہ لگاؤ۔ میں اسی لیے بور نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں بھی ہر چیز دستیاب ہے۔"
"نہیں' مجھے ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" حیدر علی نے قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔
گو کہ اس کا کوئی ویک اینڈ تنہا نہیں گزرتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی تنہائی کی ساتھی ہفتے کے روز ڈنر کرنے کے بعد "بائے" کہہ کر چلتی بنتی تھی اور اگر وہ جانے کے موڈ میں نہیں ہوتی تھی تو حیدر علی کسی نہ کسی ترکیب سے اس سے جان چھڑا لیتا تھا۔ اس لیے اس کا کوئی بھی عشق زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھا تھا۔
ولایت میں رجب علی شاہ کی اپنی ایک دنیا تھی۔ اسے اس بات کی خبر نہیں تھی اور نہ ہی وہ جاننا چاہتا تھا کہ حیدر علی شاہ کیا کر رہا ہے۔ کہنے کو تو وہ پیر صاحب جلال الدین شاہ سے یہ کہہ کر ولایت میں رہ رہا تھا کہ اس طرح حیدر علی کی دیکھ بھال ہو سکے گی لیکن درحقیقت اسے نہ تو بھائی کی دیکھ بھال سے کوئی سروکار تھا اور نہ اس کی تعلیم سے۔
"اس طرح یہاں کیسے رہ سکو گے تم؟" رجب علی شاہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔
"رہ لوں گا۔" وہ بولا۔ "بس ایک بات کی اجازت درکار ہے؟"
"کہو۔"

''کیا میں یہاں فوٹو گرافی کر سکتا ہوں؟''

رجب علی شاہ کا قہقہہ بلند ہوا۔

''بس اتنی بے ضرر سی خواہش؟'' اس نے کہا۔ ''اگر کسی اچھی سی لڑکی کی تصویر کھینچو تو مجھے ضرور دکھانا۔''

☆======☆======☆

زرینہ اور رضیہ، خالہ کبریٰ کے گھر جانے کے لیے تیار بیٹھی اچھو کوچوان کا انتظار کر رہی تھیں۔

''اب تک اچھو کو آ جانا چاہیے تھا۔'' رضیہ نے کہا۔ ''اسی لیے اسے رات کو کہلا دیا تھا' اس طرح تو دیر ہو جائے گی۔''

''تھوڑی دیر دیکھتے ہیں' نہ آیا تو پھر مسجد سے کسی بچے کو بھیج کر پتا کروا لیں گے۔'' زرینہ نے مشورہ دیا۔

ابھی اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ ایک بچے نے حجرے کے دروازے پر آ کر آواز لگائی۔

''باجی! اچھو آ گیا ہے۔''

''اچھا!''

ان دونوں نے برقعے پہنے اور اماں کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئیں۔

''سلام بی بی!'' انہیں آتا دیکھ کر اچھو نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا پھر اپنے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''آج راجہ کی طبیعت کچھ گری گری سی تھی' میں نے کہا کہ مولوی صاحب سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ صبح ضرور آؤں گا' اس لیے سوچا کہ آپ لوگوں کو شہر میں چھوڑ کر ڈنگر ڈاکٹر کو دکھانے لے جاؤں گا اپنے راجہ کو۔''

''بھائی اگر راجہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اطلاع بھجوا دی ہوتی' کوئی ضروری تو نہیں تھا آج خالہ کبریٰ کے گھر جانا' کل چلے جاتے۔'' رضیہ نے کہا۔

''نہ بی بی نہ۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''مولوی صاحب سے وعدہ خلافی نہیں کر سکتے اور پھر خالہ جی بھی تو آپ کا انتظار کرتی ہیں ناں آج کے دن۔''

وہ دونوں تانگے کی پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئیں اور گھوڑا ہولے ہولے چلنے لگا۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرف سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ خالہ کبریٰ ساتھ والے گاؤں میں رہتی تھیں۔ بے چاری بیوہ تھیں۔ دو بیٹیوں کی شادی کر دی تھی اور دونوں اپنے اپنے میاں کے ساتھ شہر میں رہ رہی تھیں۔ ایک بیٹا تھا سو وہ کمائی کی غرض سے کراچی چلا گیا تھا اور خالہ کبریٰ بالکل اکیلی ہو گئی تھیں۔ رضیہ اور زرینہ ہفتے میں ایک بار ان کی طرف چکر لگا لیا کرتی تھیں۔ صبح جاتی تھیں اور ان کا ہفتے بھر کا بکھرا ہوا کام نمٹا کر شام کو چلی آتی تھیں۔

ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان تانگہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جب اچھو نے ایک دم لگام کھینچ کر گھوڑا روکا اور تانگے سے نیچے اتر آیا۔

''کیا ہوا اچھو؟'' رضیہ نے پیچھے دیکھا۔

''بس بی بی! ایک منٹ۔'' وہ بولا۔ ''چھوٹے شاہ صاحب آ رہے ہیں انہیں ذرا سلام کر لوں تو پھر چلتے ہیں۔''

''یہ وہی شاہ صاحب تو نہیں جو ولایت سے آئے ہیں؟'' رضیہ نے منہ قدرے موڑ کر تنگ راستے کی طرف دیکھا۔

''مجھے کیا خبر؟'' زرینہ بے پروائی سے بولی۔

''لگتے تو وہی ہیں...... دیکھو گلے میں ولایتی کیمرا لٹکایا ہوا ہے اور پتلون قمیص پہن رکھی ہے۔'' رضیہ نے متجسس نظروں سے اسے دیکھا پھر زرینہ کو بے پروا پا کر اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر متوجہ کیا۔ ''دیکھو ناں۔''

زرینہ نے بھی منہ موڑا۔ سامنے وہی حویلی والا چلا آ رہا تھا۔ رضیہ کے ہاتھ پر زرینہ کی گرفت خواہ مخواہ مضبوط ہو گئی۔

''کیا بات ہے؟'' رضیہ نے اس کے ہاتھ کی گرفت محسوس کر کے کہا۔

لیکن زرینہ نے اس کی بات سنی اَن سنی کر دی۔ وہ اس کو دیکھ رہی تھی جو دو رویہ کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر پیدل چلا آ رہا تھا اور جسے سلام کرنے کے لیے اچھو نے تانگہ روکا تھا۔ اسے قریب آتا دیکھ کر اچھو دوڑ کر اس کی جانب بڑھا۔ زرینہ کو چند دن قبل کی اپنی بوکھلاہٹ یاد آ گئی۔ گاؤں کے عام گنوار سے غیر مہذب لڑکے اسے بالکل پسند نہیں تھے' جو بالوں میں تیل لگائے آنکھوں سے بھی باہر سرمے کی دھار نکالے' گردن کے گرد رنگین مفلر لپیٹے' کرمو پان والے کی دکان پر کھڑے ہو کر آئی گئی لڑکی کو تاکتے پھرتے تھے۔ دوسری جانب یہ حویلی والا تھا۔ اچھو کہہ رہا تھا کہ یہ چھوٹے شاہ صاحب ہیں۔ کتنا بانکا سجیلا تھا وہ اور کس قدر مہذب۔ پتا نہیں وہ اس دن زنان خانے میں کیا کر رہا تھا۔ زرینہ کو اس کی آنکھوں میں موجود دلچسپی یاد آئی۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

رضیہ نے اسے یوں گم صم بیٹھا دیکھا تو ٹہوکا دیا۔ ''تمہیں ہوا کیا ہے؟''

''آں...... ہاں۔'' وہ جیسے واپس اس دنیا میں لوٹ آئی۔ ''نہیں تو کچھ نہیں ہوا۔''

''مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟'' رضیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کچھ ہو بھی تو بتانے کو۔'' اس نے نگاہیں چرا لیں۔

''ہے تو سہی کچھ' لیکن تم بتانا نہیں چاہ رہیں۔''

''ہے تو نہیں' کاش کچھ ہو جائے۔'' زرینہ نے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف دیکھ کر

سوچا۔

اچھو واپس تانگے میں آ بیٹھا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر آہستہ آہستہ اسی راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ چھوٹے شاہ صاحب دور ہوتے گئے حتیٰ کہ موڑ مڑنے کے بعد وہ زرینہ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

خالہ کبریٰ حسب معمول گھر میں اکیلی تھیں اور دو دن سے بخار میں پھنک رہی تھیں۔

''ہائے خالہ جی آپ نے اطلاع بھجوا دی ہوتی۔'' رضیہ انہیں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ''کیا حال ہو گیا ہے آپ کا۔''

''بیٹا کس سے کہتی۔ ایک تو یہ گھر بھی گاؤں کے باقی گھروں سے دور ہے۔ دو چار دن میں ایک مرتبہ کوئی نہ کوئی پوچھنے آ جاتا ہے' لیکن روز روز تو کوئی مجھ بڈھی کے لیے اپنے کام کا حرج نہیں کر سکتا ناں۔''

''خالہ! اسی لیے کہتی ہوں صفدر بھائی کی شادی کر دیں۔'' زرینہ بھی برقع اتار کر ان کے قریب آ بیٹھی۔ ''بہو آ جائے گی تو کچھ خیال تو رکھا کرے گی آپ کا۔''

''لے پگلی' بہو آ گئی تو کیا میرے ساتھ رہے گی؟ ظاہر ہے اسے صفدر کے ساتھ رہنا ہو گا۔''

''تو خالہ آپ بھی ساتھ چلی جانا ان دونوں کے۔''

''اس جگہ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ ہزار بار کہا ہے صفدر سے کہ واپس آ جائے۔ اچھا بھلا نوکر تھا یہاں پیر صاحب کے پاس پتا نہیں کیا آئی جی میں کہ کراچی چلا گیا۔ اچھی بھلی آمدنی ہو جاتی تھی یہاں۔ گندم بھی فصل کے فصل مل جاتی تھی لیکن بیٹی جس جوان لڑکے کے سر پر باپ کا سایہ نہ ہو اسے من مانی کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ میں مر گئی تو کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی۔ پتا نہیں کتنے دن لاش پڑی سڑتی رہے گی۔''

''اللہ نہ کرے خالہ جی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔'' رضیہ نے جھرجھری لی۔ ''چلیں میں آپ کو حکیم صاحب کے پاس لے چلتی ہوں۔''

''نہ بیٹی' زرینہ اکیلی رہ جائے گی گھر پر۔''

''خالہ جی آپ فکر نہ کریں۔ یہاں کس نے آنا ہے پھر اپنا ہی گاؤں ہے یہ' سب جانتے ہیں ہمیں۔''

''بچیوں کی فکر تو ہر وقت رہتی ہے چاہے کتنی بھی اپنی جگہ کیوں نہ ہو۔'' خالہ کبریٰ نے کہا۔

''ارے خالہ رہنے بھی دیں' میں نہیں جانتی کیا' سب علاج نہ کرانے کے بہانے ہیں۔''

رضیہ بولی۔ ''چلیں اٹھیں۔''

پھر وہ تقریباً زبردستی انہیں اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئی۔ زرینہ گھر کے کام کاج میں لگ

گئی۔ گھر میں کام تھا ہی کتنا۔ ایک جان تھی خالہ کی' اس نے جلدی جلدی صفائی کی۔ کپڑے دھوئے' مرغیوں کو دانا ڈالا اور ہنڈیا پکا کر فارغ ہو گئی۔

''اب تک آ جانا چاہیے تھا خالہ کو۔'' زرینہ نے سوچا۔ ''خدا جانے اتنی دیر کیوں کر دی۔''

انہیں گئے کافی وقت گزر چکا تھا۔ دھوپ میں تیزی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہی۔ اچانک بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ تیزی سے لپک کر گئی اور کنڈی اتار کر دروازہ کھول دیا۔

''کتنی دیر کر دی تم نے۔'' لیکن جب سامنے رضیہ اور خالہ کے بجائے اس نے اسی حویلی والے چھوٹے شاہ جی کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت ہو کر رہ گئی۔

وہ بھی اسے دیکھتا رہ گیا۔ گلابی رنگ کے کرتا شلوار پر دوپٹے سے بے نیاز' اپنے لانبے سیاہ بالوں کی چوٹی آگے ڈالے ہوئے گم صم کھڑی وہ لڑکی۔

اور پھر اچانک یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ زرینہ نے پیچھے ہٹ کر جھپاک سے دروازہ بند کر دیا اور اس سے کمر ٹکا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ چند لمحوں کے بعد دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی۔

''بی بی! میں مسافر ہوں' کیا تھوڑا سا پانی مل سکتا ہے؟''

وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دے۔ چند منٹ بعد ایک بار پھر دستک ہوئی۔

''وہ بے چارا خدا جانے کتنا پیاسا ہو گا۔'' زرینہ نے سوچا۔ ''کیا میں اسے ایک گلاس پانی بھی نہیں دے سکتی۔'' پھر وہ جلدی سے بولی۔ ''ایک منٹ ٹھہریں۔'' اور پانی لینے چلی گئی۔

جالی کی الماری سے اس نے المونیم کا گلاس نکالا اور پانی سے بھری صراحی اٹھا کر ڈیوڑھی کی طرف چل پڑی۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر سیاہ ریشمی چادر اوڑھتے ہوئے اسے خیال آیا۔

''حویلی میں کھانے پینے کے اتنے عمدہ برتن ہیں' پتا نہیں وہ اس گلاس میں پانی پینا پسند بھی کریں یا نہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ برا مان جائیں اور پانی پیے بغیر ہی چلے جائیں۔''

اور حیدر علی شاہ کا پانی پیے بغیر چلے جانا زرینہ کے لیے خاصی تکلیف دہ بات ہوتی۔

''پھر کیا کروں؟'' یہ سوچ کر وہ پریشان ہو گئی۔ خالہ کبریٰ کے گھر شیشے کا ایک برتن بھی نہیں تھا اور چاندی کے جو چند برتن تھے' وہ صفدر نے کراچی جانے سے قبل اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے بیچ دیئے تھے۔

دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی۔ وہ اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ اس نے المونیم کا گلاس وہیں ایک کونے میں پھینک دیا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر صراحی والا ہاتھ باہر

بڑھا دیا۔

''کیا کوئی گلاس بھی مل سکتا ہے؟''

''نہیں ہے جی۔'' زرینہ نے دروازے کی جھری سے باہر جھانکا۔

''تو پھر اس صراحی سے پانی پینے کا طریقہ بھی بتا دیں۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''مجھے پتا نہیں۔'' وہ گھبرا گئی کہ کہیں وہ پانی پیے بغیر ہی نہ چلا جائے۔

''ایک طریقہ ہے لیکن وہ آپ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔''

وہ خاموش کھڑی رہی۔

''میں اوک بنا لیتا ہوں' آپ اوپر سے پانی گراتی جائیں۔'' پھر اس کی خاموشی محسوس کر کے چند لمحے کے توقف سے بولا۔ ''ایک مسافر پر اتنا احسان بھی نہیں کریں گی؟''

اس نے جلدی سے سیاہ ریشمی چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لی اور پھر اسی چادر سے آنکھوں کے سوا پورا چہرہ بھی ڈھانپ لیا اور دروازے کی اوٹ سے باہر نکل آئی۔

''یہ لیں۔'' حیدر علی نے صراحی اس کی طرف بڑھائی۔ اس کی نظریں زرینہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اس نے چپ چاپ صراحی تھام کر پانی ٹپکانا شروع کیا۔ وہ اوک بنا کر پیتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی پی کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''شکریہ۔'' اس نے کہا۔

زرینہ چپ چاپ واپس مڑنے لگی۔

''سنیے۔''

حیدر علی شاہ کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''اپنا نام تو بتاتی جائیں۔''

زرینہ کی شربتی' حیرت سے بھرپور آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔

''کیا کریں گے جان کر؟''

''کسی کی ذات کے اندر اترنے کے لیے سب سے پہلے تعارف کی سیڑھی پر قدم رکھنا پڑتا ہے اور تعارف کی ابتدا نام سے ہوتی ہے۔''

زرینہ ہولے سے ہنس پڑی۔

حیدر علی شاہ کو یوں لگا گویا کائنات ہنسی کی جلترنگ سے گونج اٹھی ہو۔ وہ ہنستی تو سیاہ ریشمی چادر کے حصار میں موجود اس کی دونوں آنکھیں بھی مسکرانے لگیں۔

''روشنی' ہوا' خوشبو اگر ان کے یہ نام نہ ہوتے تب بھی ان کا وجود مکمل تھا' تب بھی انہیں محسوس کیا جا سکتا تھا۔'' وہ بولی۔ ''پھر نام میں کیا رکھا ہے؟''

''کیا آپ نے شیکسپیئر کو پڑھ رکھا ہے؟'' حیدر علی کے انداز میں تحیر تھا۔

''وہ کون ہے؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''وہ ایک بہت بڑا انسان تھا۔ بہت سی اچھی باتیں کہی تھیں اس نے۔''

''اچھی بات کہنے کے لیے بڑا ہونا ضروری نہیں' فقط انسان ہونا شرط ہے۔'' وہ پھر واپس مڑنے لگی۔

''سنو۔''

''کہیے۔''

''میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟''

''جو آپ کو اچھا لگے۔''

''گوری! کیا پھر ملو گی۔''

''اگر تقدیر نے ملایا تو۔'' اس نے مڑ کر اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

حیدر علی شاہ رہٹ کے جھر جھر کرتے پانی اور کنوئیں کے گرد گھومتے بیلوں کی ٹن ٹن بجتی گھنٹیوں کے درمیان کھڑا رہ گیا۔ گوری اندر جا چکی تھی۔ متکلم دروازہ گونگا ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے اوپر لگی ہوئی کنڈی بھی ساکت تھی۔ وہ گلابی مخروطی ہاتھ جو کچھ دیر پہلے تک کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ شربتی' مسکراتی آنکھیں جنہوں نے زمین و آسمان کو یک دم روشن کر دیا تھا۔ اس سپاٹ دروازے کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں۔ کائنات پھیکی پھیکی لگنے لگی تھی۔ روشنی کے رو پہلے رنگ اچانک ہی بجھ گئے تھے اور تیز دھوپ جسم کو جھلسانے لگی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر مڑا اور آہستہ آہستہ کچے راستے پر رواں دواں ہو گیا۔

دروازے کی جھری سے باہر جھانکتی ہوئی زرینہ اسے تب تک دیکھتی رہی۔ جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ غیر محرم تھا اور اس کے متعلق کسی سوچ کو اپنے ذہن میں جگہ دینا گناہ تھا۔ یہی تو اماں نے شروع سے اسے سکھایا تھا' لیکن اس کے متعلق نہ سوچنا کس قدر مشکل کام تھا۔ وہ جو اس کے دل کے دریچے پر دستک دے رہا تھا۔

کتنا مختلف تھا وہ گاؤں کے عام سے لڑکوں سے۔ نہ ان کی طرح تیل سے چمکتے ہوئے بال' نہ آنکھوں میں سرمے کی دھار' نہ گلے میں رنگین مفلر' نہ منہ میں پان اور نہ ہی انگلیوں میں لوفروں کی طرح پکڑا ہوا بگلا برانڈ سگریٹ۔

ہلکے رنگ کی قمیص اور نسبتاً گہرے رنگ کی پتلون پہنے' گلے میں کیمرا لٹکائے پریشان بال' جنہیں بوقتِ ضرورت وہ انگلیوں سے ہی سنوار لیا کرتا تھا۔ اس میں واقعی کوئی سحر تھا' یا شاید اس کی انفرادیت تھی جو زرینہ کو اس کی جانب کھینچ رہی تھی۔

باہر دروازے پر دستک ہوئی۔

''ہو نہ ہو یہ رضیہ اور کبریٰ خالہ ہوں گی۔'' اس نے سوچا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی لیکن پھر حفظِ ماتقدم کے لیے اس نے پوچھ ہی لیا' کون ہے؟

''میں ہوں۔'' رضیہ کی آواز آئی۔ ''جلدی کھولو' دھوپ نے ستیاناس کر دیا ہمارا۔''

زرینہ نے کنڈی کھول دی۔

''اُف' اُف! ایک تو دھوپ اور گرمی پھر یہ کالا برقع۔ آج اگر ہم سیخ پر لگے ہوتے ناں تو تم تھوڑی دیر میں روٹی کے ساتھ ہمارے سیخ کباب کھا سکتی تھیں۔'' رضیہ نے آتے ہی برقع اتار کر چارپائی پر پھینکا۔ ''ایک گلاس ٹھنڈا پانی تو پلانا۔''

زرینہ نے کبریٰ خالہ کو سہارا دے کر چارپائی پر بٹھایا اور خود پانی لینے باورچی خانے میں چلی گئی۔ جب وہ صراحی اور گلاس لے کر کمرے میں آئی تو رضیہ زور زور سے خود کو اور خالہ کو پنکھا جھل رہی تھی۔

گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے حیدر علی شاہ کی شبیہہ اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔ اسے لگا کہ وہ صراحی سے اوک میں پانی ڈالتی جا رہی ہے اور وہ پیتا جا رہا ہے' وقت کی نبض تھم گئی ہے' زمین نے سورج کے گرد گھومنا بند کر دیا ہے اور چاند اپنی جگہ ساکت ہو گیا ہے۔

''گوری کیا پھر ملو گی؟''

اسے محسوس ہوا گویا ہر چیز اس سے یہ سوال پوچھ رہی ہے' گنگنا رہی ہے۔

''گوری کیا پھر ملو گی؟''

صراحی سے جھر جھر گرتا پانی اس سے پوچھ رہا ہے' رہٹ کے بیلوں کے گلے میں ٹن ٹن بجتی ہوئی گھنٹیاں یہ سوال کر رہی ہیں۔ دھان کی لہلہاتی فصل آہستہ خرام ہوائیں' فضا میں اُڑتی ہوئی چڑیاں اور صحن میں دانا چگتی مرغیاں سب ایک ہی سوال دہرا رہے ہیں' گنگنا رہے ہیں۔

''گوری کیا پھر ملو گی؟''

''ارے...... اے...... اے...... کیا کر رہی ہو؟'' رضیہ کی آواز اسے ہوش و حواس کی دنیا میں کھینچ لائی۔ وہ کھڑے ہو کر اپنے کپڑوں سے پانی کی بوندیں جھاڑ رہی تھی۔

''اوہ! یہ کیا ہوا ہے؟'' زرینہ گھبرا گئی۔

''یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ کیا ہوا' کہاں گم ہو تم؟'' رضیہ جھلا کر بولی۔ ''سارے کپڑے بھیگ گئے ہیں میرے۔''

''نہ...... نہ یوں نہیں ڈانٹتے۔'' خالہ کبریٰ نے لیٹے لیٹے کہا۔

زرینہ نے جلدی جلدی گلاس پانی سے بھر کر خالہ اور رضیہ کو دیا پھر بات پلٹنے کی غرض سے بولی۔ ''اتنی دیر کر دی آپ لوگوں نے میں تو پریشان ہو گئی تھی۔''

''شہر سے ڈاکٹر آیا ہوا تھا۔'' خالہ نے بتایا۔ ''رضیہ نے زور لگایا کہ حکیم صاحب کو دکھانے کے بجائے ڈاکٹر کو دکھاؤں' بس وہیں دیر ہو گئی۔ سارا گاؤں امڈ پڑا تھا۔ اتنی لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔''

''تو پھر کیا بتایا ڈاکٹر نے؟''

''یہ دوائیں دی ہیں۔'' انہوں نے پاس پڑے ایک خاکی لفافے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دو قسم کی گولیاں ہیں۔ صبح و شام لینی ہیں اور شربت دیا ہے' تین وقت پینے کے لیے۔''

اس نے کن اکھیوں سے رضیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے تیور بگڑے ہوئے لگ رہے تھے۔ واضح طور پر اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں جلدی سے روٹیاں ڈال دوں۔''

روٹیاں پکاتے ہوئے وہ سوچتی رہی کہ رضیہ کو اس راز میں شامل کرے یا نہیں۔ خدا معلوم یہ جان کر اس کا ردِعمل کیا ہو۔ ظاہر ہے' وہ اس کی حوصلہ افزائی تو نہیں کرے گی بلکہ وہ تمام نصیحتیں اس کے سامنے اکٹھا دہرانے لگے گی جو اماں وقتاً فوقتاً نہیں کیا کرتی تھیں۔ خود زرینہ بھی یہ جانتی تھی کہ اس بات کو زیادہ آگے بڑھانا خطرناک ہو گا لیکن پھر بھی اس کے دل کی خواہش تھی کہ یہ بات آگے بڑھ جائے۔ اتنا تو اسے یقین تھا کہ رضیہ یہ بات اماں کو نہیں بتائے گی۔ اماں کیا کسی کو بھی نہیں بتائے گی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اسے روکنے کی بھرپور کوشش کرے گی۔

باقی سارا دن رضیہ نے اس سے بالکل بات چیت نہیں کی۔ شام کو جب وہ تانگے پر واپس گھر کی طرف رواں دواں تھیں تو زرینہ سے رہا نہ گیا۔

''کیا ہوا رضیہ' تم مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہیں۔''

''کیا ضروری ہے کہ تم سے بات کی جائے؟''

''ناراض ہو کیا؟''

''مجھے ناراض ہونے کا بھلا کیا حق ہے۔''

''تو واقعی ناراض ہو؟'' زرینہ بولی۔

رضیہ بغیر کچھ کہے شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں دھان کے کھیتوں کی طرف دیکھتی رہی۔

''وجہ تو بتا دو ناراضگی کی۔'' زرینہ نے ہمت نہیں ہاری۔

''جس طرح تمہارے گم صم رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے' اسی طرح میری ناراضگی کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔''

کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہیں' صرف گھوڑے کے ٹاپوں کی ٹک ٹک سنائی دیتی رہی پھر

بالآخر زرینہ بولی۔

''گھر چل کر میں تمہیں کچھ بتاؤں گی۔''

اماں ابا کو خالہ کی بیماری اور پھر ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا بتا کر جب وہ اپنے کمرے میں پہنچیں تو رضیہ...... متوقع نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''میں تمہیں سب کچھ بتا رہی ہوں لیکن پہلے مجھ سے وعدہ کرو۔''

''کیا؟''

''کہ اماں ابا سے کچھ نہیں کہو گی۔''

''وعدہ۔'' رضیہ نے بلا تامل کہا۔

''اور یہ بھی کہ جو کچھ میں کروں' مجھے اس سے روکو گی نہیں۔''

''یہ عجیب سی بات ہے' ظاہر ہے تم کنوئیں میں چھلانگ لگانے لگو گی تو میں تمہیں کیسے نہیں روکوں گی۔''

''لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے' میں بھلا کیوں کنوئیں میں چھلانگ لگانے لگی۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میرا مطلب ہے کہ ہے تو سہی' کنواں نہ سہی کھائی سہی لیکن پھر بھی تم مجھے روکنا مت۔''

''کنواں ہے یا کھائی' تم کچھ بتاؤ تو سہی۔''

زرینہ چند لمحے سوچ میں گم رہی پھر بولی۔ ''آج چھوٹے شاہ جی ملے تھے ناں راستے میں۔''

''ہاں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ مجھے ان سے محبت ہو گئی ہے۔''

''کیا؟'' رضیہ چلائی۔

''ششش! آہستہ۔'' زرینہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اماں! ابا آ گئے تو؟''

''کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔'' رضیہ نے اس کا ہاتھ ہٹا کر تعجب سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔'' اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

''تم جانتی ہو' تم کیا کہہ رہی ہو؟'' اسے اب تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

''ایسی کیا انہونی بات کہہ دی ہے میں نے۔ کیوں نہیں کر سکتی' میں چھوٹے شاہ جی سے محبت؟''

''کہاں ہم غریب لوگ اور کہاں پیر صاحب کا گھرانہ۔ ان کے گھر سے دو وقت کی روٹی نہ آ جائے تو ہمیں ہفتے میں سات دن فاقے کرنے پڑیں۔ یہ ان کی مہربانی ہے کہ وہ ہم سے

عزت سے پیش آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان سے برابری شروع کر دیں۔''

''عشق نے یہ سب کب دیکھا ہے۔''

''تم پاگل ہو رہی ہو۔ جانتی ہو اماں' ابا کو خبر ہوئی تو کیا ہوگا؟ چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں گی اماں تمہاری اور گاؤں میں جو ناک کٹے گی سو الگ' کتنی عزت ہے ابا جی کی یہاں۔ آج تک کوئی انگلی نہیں اٹھا سکا ان کی جانب' مثالیں دی جاتی ہیں پورے گاؤں میں ہمارے گھرانے کی' اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو کتنا تھو تھو کریں گے سب ہم پر۔'' رضیہ نے کہا۔ ''اور پھر تم چھوٹے شاہ جی کے عشق میں گرفتار ہو۔ تمہیں کیا معلوم وہ کہیں اور شادی کرنا چاہتے ہوں؟''

''وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں رضیہ۔'' پھر اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی پرچھائیں دیکھ کر بولی۔ ''قسم سے سچ کہہ رہی ہوں۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''مجھے؟'' زرینہ نے کہا۔ ''کچھ باتیں کہنے کے لیے نہیں ہوتیں' صرف محسوس کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ کیا تم روشنی کو قید کر سکتی ہو' خوشبو کو مٹھی میں بند کر سکتی ہو؟ ہوا کو چھو سکتی ہو؟ نہیں' تم صرف ان کا وجود محسوس کرتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ یہ چیزیں ہیں' بغیر کسی سے کچھ کہے سنے' لیکن تم ان کے گرد حصار قائم نہیں کر سکتیں۔ محبت بھی روشنی' خوشبو اور ہوا کی طرح ہے' یہ محسوس کرنے کے لیے ہوتی ہے' زبان جھوٹ بول سکتی ہے لیکن جذبہ جھوٹ نہیں بولتا۔''

''اُف خدایا۔'' رضیہ نے سر پیٹ لیا۔ ''کہیں تم نے کوئی فلم تو نہیں دیکھ لی؟ ایک تو یہ فلم والے سب کے اخلاق برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''فلم؟ ہوش کی...... بات کرو' کبھی سینما جا سکتی ہوں؟'' زرینہ ہنسی۔

''پھر کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''عشق۔''

''پاگل پن۔''

''عشق پاگل پن کا دوسرا نام ہی تو ہے۔'' وہ پھر ہنسی۔

''اور پھر بھی تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں نہ روکوں۔''

''ہاں' گو کہ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے ضرور روکو گی۔''

''تم چھوٹے شاہ صاحب سے ملی ہو یا بس صرف انہیں آج صبح ہی دیکھا ہے؟''

''میں ان سے ملی ہوں۔''

''کب؟'' رضیہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''کہاں؟''

''پہلے حویلی میں اور دوسری مرتبہ آج ہی خالہ کبریٰ کے گھر۔'' اور پھر زرینہ نے اسے ہر بات بتا دی۔

''میں نہیں مانتی کہ وہ تم پر مرمٹے ہیں۔'' رضیہ نے تبصرے کا آغاز کیا۔''وہ ولایت سے پڑھ کر آئے ہیں۔ایک سے ایک اچھی خوبصورت لڑکی بھری پڑی ہے وہاں اور پھر انہیں ادائیں بھی خوب آتی ہیں۔وہاں کی عورتوں کا بھلا ہم کہاں مقابلہ کر سکتے ہیں۔وہ تم سے صرف مذاق کر رہے ہوں گے۔تمہاری حیثیت وقت گزاری کے لیے استعمال ہونے والے کھلونے سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

''رضیہ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔کیونکہ تم اس جذبے سے آشنا نہیں ہو۔تم اپنی زندگی کو چند لگے بندھے اصولوں کے تحت گزار رہی ہو۔تمہارے لیے گناہ وثواب کے قاعدے بہت واضح اور غیر مبہم ہیں۔میں بھی جانتی ہوں کہ عافیت اسی میں ہے کہ ہم سب اپنی زندگی رہٹ کے بیلوں کی طرح گزار دیں جو آنکھوں پر بندھی پٹی کے ساتھ ایک ہی محور ایک ہی مرکز کے گرد صبح سے شام تک گھومتے رہتے ہیں لیکن رضیہ میں عافیت کی طلب گار نہیں ہوں۔بہت مشکل لگنے لگا ہے یوں جینا۔''

''تو تم نے چھوٹے شاہ صاحب سے ملنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟''

''نہیں......لیکن تقدیر نے ملا دیا تو میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گی۔''

''تم احمق اور بے وقوف ہو۔زندگی لفظوں کے سہارے نہیں گزر سکتی۔ذرا سوچو زرینہ پیر صاحب کے گھرانے کی عورتوں کے درمیان تمہاری کیا وقعت' کیا حیثیت ہوگی۔تمہیں کبھی وہ رتبہ' وہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکے گا جو ان سید زادوں کو حاصل ہے۔ہم کون ہیں ان کے سامنے؟ انہی کے ٹکڑوں پر پلنے والے عام سے لوگ۔یاد رکھو جب تک تم مولوی نعمت اللہ کی بیٹی کی حیثیت سے وہاں آتی جاتی رہو گی تب تک تمہاری قدر بھی ہوگی اور تمہیں عزت بھی ملے گی لیکن جس دن انہیں معلوم ہوا کہ اب تم چھوٹے شاہ صاحب کی محبت میں گرفتار ہو اور ان کی محبوبہ ہو اسی دن تمہاری حیثیت دو کوڑی کی ہو جائے گی ان لوگوں کے سامنے۔ابھی تم مہرالنساء اور زیب النساء بی بی کے برابر بیٹھتی ہو تب تمہیں ان کے پیروں کے پاس بھی جگہ نہیں ملے گی۔''

''کتنی بے معنی لگنے لگی ہیں یہ باتیں۔'' زرینہ نے ہولے سے کہا۔''ایک اگر صرف چھوٹے شاہ جی ساتھ دے دیں تو۔''

''ان کی مت نہیں ماری گئی۔'' رضیہ چڑ کر بولی۔

''اچھا اس وقت تو سو جاؤ۔بہت نیند آرہی ہے۔'' زرینہ نے بحث سے بچنے کے لیے کروٹ لے لی۔

اور آنکھیں موندتے ہی حیدر علی شاہ زرینہ کے خوابوں میں چلا آیا۔

''سنیے' اپنا نام تو بتاتی جائیں۔'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟''

سارا کمرا حیدر علی شاہ کی آوازوں سے بھر گیا۔ہر طرف سوال جھنجنانے لگے۔ہر دیوار پوچھنے لگی۔جھینگر گنگنانے لگے۔

''گوری' کیا پھر ملوگی؟''

وہ مسکرادی۔''کاش مل سکوں۔''

حیدر علی کے چہرے پر امید وبیم کی کیفیت منجمد ہو کر رہ گئی لیکن پھر دروازہ بند ہو گیا اور امید کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی۔اس کی نگاہ گونگے دروازے پر تھی۔اگر وہ غور سے دیکھتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اس دروازے کی ایک درز اب بھی متکلم تھی اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ واپس پلٹ گیا۔اور زرینہ یہ سب سوچتے سوچتے نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

پھر دن بہت ہولے ہولے گزرنے لگے۔اس کے دل میں ایک موہوم امید نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

''خالہ کبریٰ کے گھر جاتے ہوئے شاید وہ پھر دکھائی دے جائیں۔''

اور پھر اسی امید پر وہ دن انگلیوں پر گن گن کر گزار رہی تھی۔سب کے درمیان بیٹھ کر باتیں کرتے کرتے وہ اچانک کسی سوچ میں کھو جاتی۔ہوا کی سرسراہٹ تک پر چونک اٹھتی لیکن اس دن تو انتہا ہو گئی۔جب وہ توے پر روٹی ڈال کر انہی سوچوں میں گم ہو گئی۔

''اُف کیا جلنے کی بو آرہی ہے۔'' اماں نے ناک سکیڑی۔

''اماں اپنے ہی گھر سے آرہی ہے۔'' رضیہ پیڑھی سے اٹھی۔''میں دیکھتی ہوں۔''

اور توے پر سیاہ روٹی دیکھ کر وہ جھلا اٹھی۔

''یہی حد رہتی تھی۔'' اس نے جلی ہوئی روٹی اٹھا کر پھینک دی۔

''کیا ہوا؟'' زرینہ اسے غصے میں دیکھ کر گھبرا گئی۔''اچھا روٹی جل گئی۔ہاں جل گئی۔شاید لکڑیاں زیادہ ہیں۔آنچ تیز ہے اس لیے۔''

''آنچ بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے غصہ دبانے کی کوشش کی۔''اٹھو مجھے پکانے دو روٹیاں۔''

''نہیں نہیں' میں پکا لیتی ہوں۔''

''کیا ابا اماں کو ایسی جلی ہوئی روٹیاں کھلاؤ گی؟ اٹھو مجھے پکانے دو۔'' اس نے زرینہ کو بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

''غلطی ہو گئی۔اب نہیں کروں گی ایسا۔'' زرینہ نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔

رضیہ کا دل پسیج گیا۔اسے یوں بھی زرینہ سے بے حد محبت تھی۔

''اگر اب روٹی جلی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ اسے دھکا کر اماں کے پاس چلی آئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ واپس پیڑھی پر بیٹھی تو اماں نے پوچھا۔''کیا جلا دیا؟''

''کچھ نہیں اماں آنچ تیز تھی۔ ایک روٹی ذرا سی جل گئی ہے۔''

''ذرا سی جلنے کی اتنی بو پھیلی ہے۔'' اماں بولیں پھر قدرے آگے جھک کر آہستہ سے بولیں۔''تم نے کچھ محسوس کیا ہے؟''

''کیا اماں؟ اماں کے رازدارانہ انداز کو دیکھ کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

''زرینہ کو کچھ ہوتا نہیں جا رہا۔''

''کچھ نہیں ہوا' اسے کیا ہونا ہے۔'' رضیہ نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''بہت چپ چپ رہنے لگی ہے۔ کھوئی کھوئی سی۔''

''مجھے تو نہیں محسوس ہوا۔'' وہ جلدی سے بولی۔''ہاں کچھ کم گو ہو گئی ہے۔ آپ ہی تو ہر وقت ٹوکتی تھیں کہ لڑکیوں کو اتنا زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔''

''لیکن اس پر اثر کب ہوتا تھا۔''

''اب تو ہو گیا ناں' اب خوش ہو جائیں۔''

''اب میں یہ بھی نہیں کہتی کہ بالکل ہی گم صم ہو جائے وہ۔ مجھے تو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے اسے یوں چپ چاپ دیکھ کر۔''

رضیہ کو اس پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ اس نے رضیہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اماں ابا کو کچھ نہ بتائے گی اور خود ہی اپنی حرکتوں سے وہ اپنے راز کا اعلان کرتی پھر رہی تھی۔ اگر اس کی ایسی حرکتیں جاری رہتیں تو کیا اماں کو علم نہ ہو جاتا اصل بات کا۔ یہ تو اچھا تھا کہ ابا جی کا زیادہ وقت مسجد میں گزرتا تھا لیکن آج اگر اماں نے یہ بات محسوس کر لی تھی تو کل کو اور لوگ بھی بھانپ جاتے۔ ڈھنڈورا تو وہ خود پیٹتی جا رہی تھی۔

''پتا ہے آج اماں مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں؟'' رات کو جب سب کام نمٹا کر وہ اپنے کمرے میں آئیں تو رضیہ بولی۔

''کیا؟'' رضیہ نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ رہی تھیں کہ تم روز بروز تبدیل ہوتی جا رہی ہو۔ چپ چپ رہنے لگی ہو۔ گم صم ہو گئی ہو۔''

''کیا؟ سچی اماں یہ کہہ رہی تھیں؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔

''جی ہاں اور اگر تمہاری یہی حرکتیں جاری رہیں تو کسی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ تمہارا اصل مسئلہ کیا ہے۔''

''لیکن باتیں تو میں اب بھی کرتی ہوں۔''

''ہاں' ادھوری ادھوری باتیں۔'' رضیہ بولی۔''اور بعض اوقات تمہیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا

کہ تم کیا بات کر رہی ہو۔''

''میں کیا کروں رضیہ ایسا میں جان بوجھ کر تو نہیں کرتی۔ بس خود بخود ہی ہو جاتا ہے۔ مجھے تو خود بھی خبر نہیں ہوتی۔''

''اسی لیے کہتی ہوں کہ آگ سے کھیلنا بند کرو' اس کھیل میں تمہارا اپنا دامن بھی جل سکتا ہے۔ کسی اور کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ آج اماں نے محسوس کیا ہے کل اور لوگ محسوس کریں گے۔ مجھے منع کرتی ہو اور خود ڈھنڈورا پیٹ رہی ہو۔''

''سچی رضیہ سب کو پتا چل جائے گا اس طرح؟''

''اپنے ہاتھوں سے جو اشتہار لگا رہی ہو۔''

''کیا کروں میں۔ یہ اضطراب تب تک ختم نہیں ہوگا جب تک میں ان سے مل نہیں لوں گی۔''

''پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ پہلے تم نے کہا تھا کہ تم ان سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گی۔''

''تبھی تو مضطرب ہوں۔'' زرینہ نے کہا۔''پتا نہیں تقدیر کب ملاتی ہے اور ملاتی بھی ہے یا نہیں۔''

''مجھے تم نے پریشان کر دیا ہے۔''

''تم نے خواہ مخواہ پریشانی خود پر مسلط کر رکھی ہے۔'' زرینہ بولی۔

''پتا نہیں تم کیا چاہتی ہو......اور درحقیقت ہوگا کیا۔'' رضیہ نے ہاتھ ملے۔

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ صبح صبح کیمرا لٹکا کر ساتھ والے گاؤں کی طرف چل دیا۔

''شاید گوری سے ملاقات کی کوئی صورت نکل آئے۔'' اس نے سوچا۔''ہو سکتا ہے دستک کی آواز پر آج بھی وہی دروازہ کھولے اور کل کی طرح کہے۔

''اتنی دیر کر دی تم نے۔''

اور اس ایک فقرے سے کائنات جھوم اٹھے۔ ہاں دیر تو میں نے کر دی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جسے میں لندن کے کلبوں اور ہوٹلوں میں ڈھونڈتا رہا۔ وہ وہاں نہیں پاکستان کے اس دور افتادہ چھوٹے سے گاؤں نیاز پور میں رہتی ہے۔ کتنی سادہ اور معصوم ہے وہ اور ذہین بھی۔ لگتا ہے کچھ پڑھی لکھی بھی ہے۔ بالکل ہی جاہل گنوار نہیں ہے جیسے کہ یہاں کی بہت سی عورتیں حتیٰ کہ مرد بھی ہیں۔ یہاں کی عام عورتوں کے برعکس اس میں رکھ رکھاؤ بھی ہے۔ گفتگو سے اس کی حسِ جمال کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

وہ چلتا ہوا رہٹ تک پہنچ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر سامنے وہ چھوٹا سا مکان تھا جہاں کل اچانک اس کی گوری سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر بوڑھا برگد سوچوں میں گم

کھڑا تھا۔ اس کی جٹائیں شاخوں سے بل کھا کر زمین پر گر رہی تھیں۔ حیدر علی شاہ اس برگد کے نیچے بیٹھ کر مکان کا جائزہ لینے لگا۔

اس مختصر سے آدھے کچے آدھے پکے مکان پر بلا کا سکوت طاری تھا یوں جیسے وہاں کوئی بھی نہ ہو۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ سورج آہستہ آہستہ سر پر آ رہا تھا لیکن درخت کی چھاؤں کے نیچے حیدر علی شاہ سورج کی تمازت سے بالکل محفوظ تھا۔ مکان میں زندگی کی پہلی علامت مرغیوں کی صورت میں نمودار ہوئی جو کٹ کٹ کرتی نہ جانے کہاں سے نکلی تھیں اور مکان کے گرد دانہ چگنے لگی تھیں۔

''یہ مرغیاں شاید عقبی دروازے سے نکلی ہیں۔'' حیدر علی نے سوچا۔

وہ برگد کے نیچے بازو کا سرہانہ بنا کر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ کافی دیر بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کی تیزی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر مکان کی طرف چل دیا۔

''ٹھک ٹھک۔'' اس نے دروازے پر دستک دی۔

کچھ دیر کے بعد توقف سے دروازہ کھلا لیکن اس پری جمال نازنین کے بجائے دروازہ ایک بوڑھی عورت نے کھولا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟''

''خالہ جی' پانی مل سکتا ہے؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اندر آ جاؤ باہر بہت گرمی ہے۔'' انہوں نے دروازہ چھوڑ کر حیدر علی کو راستہ دیا۔

اس کی تو دل کی مراد پوری ہو گئی۔

''کتنی آسانی سے یہ مرحلہ طے ہو گیا۔'' اس نے ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔

''یہاں آ جاؤ بیٹا' یہ کمرا ٹھنڈا ہے۔'' وہ اسے اندر کمرے میں لے گئیں۔

کمرے تک جاتے جاتے اس نے مختصر سے گھر کا جائزہ لیا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا سوائے اس مہربان بوڑھی کے۔

''ادھر بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کیا اور ہتھ پنکھی اسے پکڑا کر خود باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ المونیم کا گلاس لے کر نمودار ہوئیں۔

''لو۔'' انہوں نے گلاس اسے تھمایا جو لسی سے بھرا ہوا تھا۔

' پ نے خواہ مخواہ اتنا تکلف کیا۔'' وہ شرمندہ ہو گیا۔

''اس میں تکلف کی بھلا کیا بات؟ یہ شہر نہیں ہے بیٹا جہاں کوئی کسی کو پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ جب خدا بخشے صفدر کے ابا زندہ تھے تب تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی مہمان ہمارے گھر سے ہنسی خوشی رخصت نہ ہو اور پھر آج کل گرمی بھی تو بہت ہے۔ لسی سے جسم میں گرمی نہیں ہوتی۔''

وہ نمکین لسی پیتے ہوئے بھی گھر کا جائزہ لیتا رہا۔

''خالہ جی آپ یہاں تنہا رہتی ہیں؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔'' انہوں نے سرد آہ بھری۔ ''دو بیٹیاں ہیں ان کی شادی کر دی ہے۔ وہ اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ شہر میں رہتی ہیں اور صفدر ہے وہ روزگار کی تلاش میں کراچی چلا گیا ہے۔ اچھا بھلا پیر صاحب کے گھر نوکر تھا وہ' پتا نہیں کس نے پٹی پڑھائی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ گیا۔''

''شادی شدہ بیٹیاں۔'' حیدر علی سوچ میں پڑ گیا۔ ''وہ کسی صورت شادی شدہ نہیں ہو سکتی۔ پھر اگر وہ ان کی بیٹی نہیں ہے تو کون ہے؟''

''تم شہر سے آئے ہو نا۔ بیٹا؟''

''جی۔'' وہ بولا۔

''کسی کام سے آئے ہو یا یونہی گھومنے پھرنے؟''

''یہاں تو بس تفریحاً آ گیا تھا۔ مجھے فوٹوگرافی کا شوق ہے۔''

خالہ نے بغیر کچھ سمجھے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یعنی تصویریں کھینچنے کا۔'' اس نے کیمرا تھپتھپایا۔

''اچھا اچھا۔ میں سمجھتی ہوں۔'' ایک دم اس کی بات سمجھ میں آ گئی۔ ''میرے صفدر نے بھی کراچی میں تصویر کھنچوائی تھی۔ دکھاؤں تمہیں؟''

''جی ضرور۔'' اس نے ان کا دل رکھنے کے لیے کہا حالانکہ اسے ان کے بیٹے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

خالہ کبریٰ دوسرے کمرے سے ایک فریم شدہ تصویر اٹھا لائیں۔

''یہ دیکھو۔'' انہوں نے دوپٹے کے پلو سے تصویر پر لگا شیشہ اچھی طرح صاف کر کے تصویر اسے تھما دی۔

وہ تصویر ایک نوجوان کی تھی۔ اس جیسے بے شمار نوجوان اس سے قبل حیدر علی اپنے گاؤں میں کرمو پان والے کی دکان پر کھڑے تاک جھانک کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ اس نے تصویر خالہ کو واپس کر دی۔

''بہت خوبصورت ہے آپ کا بیٹا۔'' اس نے ان کا دل رکھنے کے لیے تبصرہ کیا۔

خالہ کھل اٹھیں۔ ''ہے نا؟'' پھر چند لمحے تصویر کو بغور دیکھنے کے بعد بولیں۔ ''بالکل اپنے ابا مرحوم پر گیا ہے۔''

''خالہ جی آپ یہاں تنہا کیسے رہ لیتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''آپ کو تنہائی سے گھبراہٹ نہیں ہوتی۔''

''بس قسمت کا لکھا پورا کر رہی ہوں ورنہ اکیلے کون رہنا چاہتا ہے۔'' وہ افسردہ ہوگئیں۔

''گاؤں کے گھر بھی یہاں سے فاصلے پر ہیں۔ صفدر کے ابا شور شرابے سے گھبراتے تھے اس لیے یہاں مکان بنوالیا ہم نے۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ مجھ بڈھی کو یہاں زندگی کے باقی دن یوں اکیلے ہی کاٹنے ہوں گے۔''

''آپ کے کوئی رشتے دار' ملنے ملانے والے نہیں ہیں؟ میں نے تو سنا تھا کہ گاؤں میں سب لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔''

''رشتہ دار بھی ہیں اور ملنے ملانے والے بھی لیکن بیٹا اب کون مل جل کر رہتا ہے۔ وہ زمانے گزر گئے۔ ہاں دو چار دن میں کوئی نہ کوئی چکر لگا جاتا ہے پھر میں ان سے خوب باتیں کرتی ہوں۔ کچھ منگوالوں تو وہ بھی لا دیتے ہیں۔ پھر رضیہ اور زرینہ آجاتی ہیں ہفتے میں ایک مرتبہ اور کافی کام نمٹا جاتی ہیں۔''

''رضیہ اور زرینہ۔'' اس نے سوچا۔ ''ہوسکتا ہے وہ انہی میں سے کوئی ایک ہو۔ ان سے براہِ راست سوال بھی تو نہیں پوچھا جاسکتا نا۔''

''تم تصویریں کھینچنے شہر سے یہاں آئے ہو؟''

''خالہ جی میں بھی آپ کی طرح گاؤں کا ہی ہوں۔''

''لگتے تو نہیں ہو۔'' خالہ نے بغور اس کا جائزہ لیا۔

''یہ دراصل کچھ عرصہ انگلینڈ یعنی ولایت رہنے کا اثر ہے۔ ورنہ میرا مرنا جینا تو اسی مٹی کے ساتھ وابستہ ہے۔''

''تم ولایت سے آئے ہو؟'' خالہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے عجائب گھر میں رکھے ہوئے کسی عجوبے کو دیکھا جاتا ہے۔

''جی ہاں۔''

''مجھے بھی لگ رہا تھا' ولایت تو انسان کو بالکل بدل کر ہی رکھ دیتا ہے۔'' پھر انہوں نے آگے جھک کر رازداری سے پوچھا۔ ''کوئی میم تو نہیں اٹھا لائے اپنے ساتھ؟''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''خالہ پاکستان میں کوئی کمی ہے لڑکیوں کی۔ اتنی اچھی تو لڑکیاں ہیں یہاں۔''

''جیتا رہ بیٹا۔'' انہوں نے خوش ہوکر کہا۔ ''اللہ سلامت رکھے۔ ہر کوئی تمہاری طرح نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں کے معصوم معصوم لڑکے جاتے ہیں وہاں اور وہاں کی چلتا پرزہ لڑکیاں پھنسا لیتی ہیں انہیں۔ نہ شرم نہ حیا۔ نہ ماں باپ کی عزت و آبرو کی پروا۔ اللہ بچائے ایسی لڑکیوں سے۔''

خالہ کی بات سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ ''اتنے معصوم بھی نہیں ہوتے یہاں سے جانے والے لڑکے۔''

خالہ کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انہیں اس کی بات سے ذرا بھی اتفاق نہیں تھا لیکن انہوں نے بحث نہیں کی۔

''پیر صاحب کے دو بیٹے بھی تو پڑھ رہے تھے۔ ولایت میں۔'' وہ بولیں۔ ''وہ کہیں ملے تمہیں؟''

حیدر علی شاہ نے اپنی مسکراہٹ دبالی۔ اگر وہ انہیں بتا دیتا کہ وہ پیر صاحب کا منجھلا بیٹا ہے تو یقیناً ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔

''ان سے تو بہت پرانی واقفیت ہے میری۔'' وہ بولا۔ ''وہ بھی بچپن سے وہیں تھے اور میں بھی۔ ہم اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔''

''اچھا؟'' خالہ کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت اچانک ہی مزید بڑھ گئی۔

''تو اور کیا خالہ۔''

''بیٹا تم اس چارپائی پر بے آرام ہو رہے ہوگے۔'' انہیں اچانک خیال آیا۔

''بے آرامی کیسی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ بے آرام نہیں ہوتیں تو میں کیوں ہونے لگا۔''

''ولایت میں تو لوگ چائے پیتے ہیں۔'' انہیں ایک دم خیال آیا۔ ''لیکن میرے پاس چائے کی پتی نہیں ہے۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولیں۔

''چھوڑیں خالہ چائے بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''میں تو وہاں بھی لسی ہی پیتا تھا۔''

''بہت اچھا کرتے تھے بیٹا۔'' وہ خوش ہوگئیں۔ ''انسان کو اندر تک ساڑ کر رکھ دیتی ہے چائے۔ اب تو یہاں بھی چائے کا فیشن ہوگیا ہے۔ میں کہتی ہوں رکھا کیا ہے اس میں۔ یہ تو صاف صحت تباہ کرنے والی بات ہوئی ناں۔''

''جی بالکل۔'' اس نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''تو تم پیر صاحب کے بیٹوں کو جانتے ہو۔'' وہ واپس اپنے پسندیدہ موضوع کی طرف پلٹ آئیں پھر انہوں نے آگے جھک کر رازداری سے پوچھا۔ ''کیسے ہیں وہ؟''

''بہت اچھے ہیں خالہ جی اور بہت لائق بھی۔''

''ہاں ہوں گے ہی۔'' خالہ بولیں۔ ''وہ بھی اپنے ساتھ کوئی گوری چمڑی والی میم نہیں لائے۔'' پھر وہ قدرے توقف سے گویا ہوئیں۔ ''لیکن کچھ نہ کچھ بات ہے ضرور۔''

''کیسی بات؟'' حیدر علی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''رہنے دو بیٹا۔ ہم کچھ بولے تو خواہ مخواہ گناہ گار بنیں گے۔'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے جبکہ اندر سے دل ان کا بھی چاہ رہا تھا کہ وہ حیدر علی سے تصدیق کروائیں۔

''کیوں خالہ اس میں گناہگار ہونے والی کون سی بات ہے۔ وہ بھی میری اور آپ کی طرح کے عام انسان ہیں۔'' اس نے اس موضوع میں ان کی دلچسپی بھانپتے ہوئے انہیں اکسایا۔ موضوع خود اس کے لیے بھی باعث دلچسپی تھا۔

''کسی سے کہو گے تو نہیں؟''

''میں کیوں کسی سے کہنے لگا کچھ؟''

''تمہارے دوست ہیں ناوہ۔''

''تو میں نے آپ کو بھی تو خالہ کہا ہے۔ کبھی خالہ کی بھی چغلی لگائی جاتی ہے۔'' اس نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹا۔'' وہ بولیں۔

''آپ کوئی بات بتانے لگی تھیں۔'' اس نے انہیں یاد دلایا۔

خالہ نے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا پھر آہستہ آواز میں بولیں۔ ''میں نے رجب علی شاہ کے متعلق عجیب وغریب باتیں سنی ہیں۔''

''کیسی باتیں؟'' اس نے بھی ویسے ہی رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

''اللہ جھوٹ نہ بلوائے بیٹا! پتا نہیں سچ ہے یا جھوٹ۔ وہ سائیں سردار علی ہے ناگاؤں کا۔ بھئی وہی جو لام پر گیا تھا فرنگی فوج میں بھرتی ہو کر اور تمغہ بھی لایا تھا۔''

حیدر علی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس کا بیٹا لاہور شہر چلا گیا ہے پر وہ یہیں رہتا ہے۔ اچھی بڑی سی کوٹھی ہے وہاں اس کی۔ اللہ کا بڑا فضل ہے اس کے ہاں۔ اس کا بیٹا سرور گیا تھا ولایت۔ اس نے واپسی پر باپ اور دادا کو بتایا تھا کہ رجب علی شاہ سارا وقت میموں میں گھرا رہتا ہے۔ خوب لٹا رہا ہے وہاں پیسے۔''

حیدر علی نے ذہن پر زور دیا لیکن سرور نامی کسی لڑکے سے ملاقات اسے یاد نہ آئی لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ اس کی دی ہوئی یہ اطلاع بالکل درست تھی۔

''یہ بھی کہہ رہا تھا۔'' خالہ بتا رہی تھیں۔ ''کہ وہاں اس نے کسی میم کے ساتھ شادی بھی کی تھی لیکن چھ مہینے بھی نہیں چل سکی وہ شادی۔''

یہ بات بھی سو فیصد درست تھی۔ رجب علی نے کرسٹی سے شادی کی تھی۔ کرسٹی بہت اچھی بہت سویٹ لڑکی تھی لیکن رجب علی کے مزاج میں جو تندی و تیزی تھی اس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکی۔ اور پھر اگر وہ لندن کے نائٹ کلب میں ملنے والی لڑکی سے یہ توقع کر رہے تھے کہ شادی کے بعد وہ برقع اوڑھ لے اور گھر میں ان کے انتظار میں راتیں جاگ کر گزارے گی۔ تو یہ رجب علی شاہ کی نہ صرف بھول تھی؛ بلکہ زیادتی بھی تھی۔

''اور کچھ بھی بتایا؟'' اس نے پوچھا۔

''بس ایسی ہی باتیں بتا رہا تھا۔ تم تو اس کے دوست ہو تمہیں کچھ معلوم ہے؟''

''میری زیادہ دوستی حیدر علی شاہ کے ساتھ تھی۔'' وہ بولا۔ ''اس کے متعلق کچھ بتایا سرور نے؟''

''اس سے سرور کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ ویسے یہ باتیں بتائیں تو سرور نے اپنے باپ اور دادا کو تھیں لیکن کانوں ہی کانوں میں یہ سب گاؤں والوں تک پہنچ گئی تھیں۔ اب کچھ سمجھ نہیں آتی۔ دیکھو ناں رجب علی شاہ اور اس کا بھائی بغیر میموں کے واپس آگئے ہیں پھر بھی زبانیں نہیں بند ہوئیں کسی کی۔'' پھر وہ قدرے توقف سے بولیں۔ ''اب دیکھو نا۔ یاسمین اس کی منگ ہے۔ اتنی خوبصورت ہے وہ سلیقہ شعار بھی ہے اور پھر ہے بھی خاندان کی۔ چچا کی بیٹی ہے۔ پر بے چاری یونہی بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ کی لڑکیوں کے بچے ہو چکے ہیں اور وہ اب تک ڈولی اٹھنے کا انتظار کر رہی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب رجب علی کو گھر بسانے کی فکر کرنی چاہیے۔''

''جی بالکل۔'' وہ بولا۔

اس نے یاسمین کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کے خاندان میں پردے کی بہت سختی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ رجب علی کے عجیب وغریب مطالبات اور ناروا سلوک یہاں کی کوئی لڑکی ہی برداشت کر سکتی ہے۔

''آئے ہائے۔'' خالہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''میں بھی باتوں میں ایسی لگی کہ تمہیں کھانے کا بھی نہیں پوچھا۔ ٹھہرو میں ابھی کھانا لاتی ہوں۔''

وہ باہر والے چولہے میں لکڑیاں جلانے لگیں تو حیدر علی بھی پاس پڑی پیڑھی پر آکر بیٹھ گیا۔

''تم یوں گرمی میں آگئے باہر؟''

''آپ بھی تو باہر گرمی میں ہی بیٹھی ہیں۔''

''میں تو روٹیاں پکانے آئی ہوں ناں۔'' وہ ہنسیں۔ ''تم کیوں گرمی کھانے آگئے۔''

''وہاں اکیلا بیٹھ کر کیا کرتا خالہ۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اور وہ پیڑے بنانے لگیں۔

''آج میں آپ کی مدد کروں گا روٹیاں پکانے میں۔''

''کیا؟'' خالہ نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ''یہ بھی بھلا مردوں کے کرنے والے کام ہوتے ہیں؟''

''اس سے میری مردانگی پر کوئی حرف نہیں آتا خالہ۔ ولایت میں ہمیں اپنے ہاتھ سے کام کرنا پڑتا تھا۔'' حالانکہ حیدر علی نے وہاں بھی کبھی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہاں بھی تمام کام ان

کے پاکستانی ملازم کرتے تھے۔''

''وہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ ہر کام نرالا ہوتا ہے وہاں کا۔'' انہوں نے ناک بھوں چڑھائی۔

''خالہ کو قائل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔'' حیدر علی نے سوچا پھر بولا۔ ''دیکھیں خالہ جی اپنے ہاتھ سے کام کرنا تو بہت اچھی بات ہوتی ہے۔ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنا سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ ہم تو ان کی اُمت کے ادنیٰ سے لوگ ہیں۔''

''جیتے رہو، خوش رہو۔'' وہ اس کی بات سن کر نہال ہوگئیں۔ ''شکر ہے موئے فرنگیوں نے تمہیں بالکل ہی فرنگی نہیں بنا دیا۔''

خالہ روٹیاں توے پر ڈالتی گئیں اور وہ سینکتا گیا۔ لکڑیوں کے جلنے سے نکلنے والے شعلوں کی حدت سے بار بار اس کے ہاتھ اور بازو جھلس رہے تھے لیکن وہ ساری تکلیف برداشت کرتا گیا۔ خالہ کی تمام تر ہدایات کے باوجود تین روٹیاں اس نے کہیں کہیں سے جلا دیں اور چوتھی روٹی آدھی کچی رہ گئی۔

تمام وقت خالہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں اور وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ اسے اس زندگی میں مزہ آ رہا تھا۔ عام لوگوں کے درمیان اس سے قبل بھی اس نے زندگی گزاری تھی لیکن وہ پاکستان کے اس دور افتادہ گاؤں کے عام لوگ نہیں تھے۔ برطانیہ کے عام شہروں میں رہنے والے باشندے تھے۔ شام کو جب وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو خالہ اداس ہوگئیں۔

''کتنا اچھا وقت گزرا تمہارے ساتھ۔'' وہ بولیں۔ ''تم نے آ کر صفدر کی کمی پوری کر دی۔ کل سے پھر میں اس گھر میں اکیلی ہو جاؤں گی۔''

''آپ فکر کیوں کرتی ہیں خالہ جی۔ جب تک میں یہاں ہوں آپ کے پاس آتا جاتا رہوں گا۔''

اور پھر اگلے دن اس نے سویرے ہی خالہ کبریٰ کے گھر کے دروازے پر دستک دی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''میں سوچ رہی تھی کہ تم نے صرف میرا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا ہے کہ یہاں آتے جاتے رہو گے۔'' وہ بہت خوش تھیں۔

''آپ کے گھر آ کر اتنا مزہ آیا کہ کل بھی یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' وہ اندر چلا آیا۔ ''آپ کیا کر رہی تھیں؟''

''صفائی کر رہی تھی گھر کی۔'' وہ بولیں۔ ''اب تو خیر سمجھو ہو ہی گئی ہے۔''

''آپ اکیلی اتنے کام کرتی ہیں۔''

''میری اکیلی جان کا کام ہی کتنا ہوتا ہے۔''

پھر وہ مختلف کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ مرغیوں کو دانہ ڈھونڈنے کے لیے ڈربہ کھول دیا۔ کنویں سے پانی لا کر مٹکا بھر دیا۔ گھر میں بھی پانی کا چھڑکاؤ کر دیا۔ پھر خالہ کبریٰ ہنڈیا پکانے بیٹھیں تو وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔ دوپہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اٹھنے لگا لیکن خالہ نے اسے بازو سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

''تم بیٹھو بیٹا میں دیکھتی ہوں۔ یہاں کے لوگ تمہیں کب پہچانیں گے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''پتا نہیں اس وقت کون آ گیا۔ یہاں تو سب کے آنے کے لگے بندھے اوقات ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ متحیر سی اندر آئیں۔

''پیر صاحب کی حویلی سے گندم کی بوری آئی ہے۔'' انہوں نے جوش سے حیدر علی کو بتایا۔ ''اللہ تعالیٰ پیر صاحب جلال الدین کو اور بڑا مرتبہ دے اور زیادہ خوشحالی دے۔ یہ تو ان کا احسان ہے ورنہ ہم غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔'' انہوں نے دوپٹے کا پلو اٹھا کر دعا دی پھر اس سے مخاطب ہوئیں۔ ''میں نے بوری ڈیوڑھی میں رکھوا دی ہے۔''

حیدر علی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ خالہ کبریٰ جیسی مہربان عورت کے لیے گندم کی بوری بھجوا کر اس نے احسان نہیں کیا تھا۔ الٹا وہ ان کا احسان مند تھا جن کے پُرسکون گھر میں آ کر وہ اپنی حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر پرورش پانے والی تکلیف دہ روایتوں اور سازشوں کو کچھ دیر کے لیے بھول جاتا تھا۔

☆======☆======☆

جمعہ کا سارا دن زرینہ نے یہ سوچنے کی نذر کر دیا کہ وہ اگلے روز کیا پہن کر خالہ کبریٰ کے گھر جائے۔

''نیلا پھولدار سوٹ۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''نہیں اس کا رنگ اب کہیں کہیں سے اُڑتا جا رہا ہے۔ ہاں جب نیا تھا تب بہت شاندار لگتا تھا۔ وہ ہرے رنگ والا ٹھیک رہے گا لیکن نہیں۔ اس کی قمیص دروازے کی کیل میں اٹک کر پھٹ گئی تھی۔ ٹھیک ہے کہ میں نے اسے رفو کر لیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کل پہننے کے لیے ٹھیک نہیں رہے گا۔ ویسے وہ پیلا اور سفید پھولدار سوٹ بھی اچھا ہے لیکن اس کے دوپٹے میں ٹک پڑے ہوئے ہیں۔ ایک تو ہر طرف ٹڈیاں پھدکتی پھرتی ہیں۔ مجال ہے ایک دوپٹا بھی محفوظ رہ جائے۔ ویسے رضیہ کے پیلے سوٹ والا دوپٹا چل سکتا ہے۔ اگر وہ دینے پر آمادہ ہو جائے تو۔ ویسے انکار تو اس نے کبھی نہیں کیا لیکن کل کہیں اس کا وہی کپڑے پہننے کا ارادہ نہ ہو۔''

''اب تو یہ پوچھنا بھی بے کار ہے کہ کس سوچ میں گم ہو۔'' رضیہ ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''میں سوچ رہی تھی کہ کل کون سے کپڑے پہنوں۔''

''ابھی سے کل کی فکر کرنے کی کیا بات ہے۔''

''شاید کل وہ کہیں راستے میں نظر آجائیں۔''

''اُف خدایا۔'' رضیہ جھلا اٹھی۔ ''اور وہ اسی لمبے سے سیاہ برقعے میں تمہارے لباس کا جائزہ لیں گے۔''

''ہا...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اوپر تو برقع ہوگا۔''

''اب پتا چل گیا ناں اس لیے کپڑوں کے مسئلے پر اپنا دماغ مت خرچ کرو۔''

''تم نے تو سوچنے کا بھی سارا مزہ کرکرا کر دیا۔''

''مزہ تو اس وقت کرکرا ہوگا جب سب کو تمہاری حماقت کی خبر ہوگی۔''

''ایسے تو نہ کہو۔''

''کیوں نہ کہوں۔ جب مجھے معلوم ہے کہ آگے یہ سب کچھ ہوگا۔ تم ہو دسویں پاس اور می ٹھہری بالکل اَن پڑھ۔ پھر بھی جو کچھ مجھے سمجھ آرہی ہے وہ پتا نہیں کیوں تمہیں سمجھ نہیں آرہی۔''

''تم بھی تھوڑا سا پڑھ لکھ جاتیں تو میری بات سمجھ میں آجاتی۔'' زرینہ نے منہ بنایا۔

''معاف کر مجھے۔ ایک تم ہی پڑھی لکھی کافی ہو۔'' رضیہ چڑ گئی۔

''طعنہ دینا ہے تو مجھے دو' تعلیم کو نہیں۔ میری کسی کتاب میں نہیں لکھا تھا کہ چھوٹے شاہ سے عشق کرنا ضروری ہے۔ یہ تو خود بخود ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کیسے۔''

''پتا نہیں کیسے۔'' رضیہ نے اس کی نقل اتاری۔ ''سب پتا لگ جائے گا کہ کیسے ہوا عش جب یہ نشہ اترنے لگے گا۔''

''ابھی تو نشہ چڑھا بھی نہیں کہ تم اترنے کی بات کر رہی ہو۔'' زرینہ ہنسی۔ ''ویسے رضیہ نے تو انہیں دیکھا ہے نا۔ تم بتاؤ تمہیں کیسے لگے وہ؟''

''بہت اعلیٰ' بہت ارفع۔ جنہیں دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن چھوا نہیں جا سکتا۔''

''مانتی ہوں ناں؟'' وہ ہنسی۔

''لیکن تم نہیں مانتیں۔''

''مانتی ہوں لیکن ہار مان کر آہیں بھرنا مجھے پسند نہیں ہے۔ مجھ میں حاصل کرنے کی لگن ا شوق ہے۔''

''ہر چکوری چاند کو دیکھ کر یہی کہتی ہے لیکن نہ تو چکوری کی پرواز اتنی بلند ہوتی ہے اور نہ چاند اپنی سطح سے نیچے اتر سکتا ہے۔''

''انہونی تو ہے لیکن ہو جائے تو کتنا اچھا ہے۔''

''اور نہ ہو تو؟''

''کم از کم محبت کے جذبے سے محروم تو نہیں رہوں گی۔'' زرینہ نے آنکھیں موند لیں۔

''سنا ہے شہروں میں پاگلوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کچھ عرصے بعد تمہیں بھی پاگل پن کے علاج کی خاطر شہر لے جانا پڑے گا ہمیں۔'' رضیہ جل کر بولی۔

''تو لے جاؤ ناں' انتظار کیوں کر رہی ہو۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اللہ کرے اماں ابا آج کل میں کہیں تمہارا رشتہ پکا کر کے شادی کر دیں۔ خود ہی دماغ ٹھکانے آجائے گا۔''

''دعا نہیں دے سکتی ہو تو بد دعا بھی نہ دو۔''

''کرو بابا۔ جو کچھ کرنا ہے کرو۔ ہمیں کیا۔'' رضیہ اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

''شکریہ شکریہ۔'' زرینہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''اب مجھے مزید مشکور ہونے کا موقع نہیں دو گی کیا؟''

''سیدھی سیدھی بات کیا کرو۔'' وہ تو پہلے ہی جھلائی ہوئی تھی۔

''ایک احسان اس بندی پر اور کرو۔''

''بکو۔''

''دیکھ لیں چھوٹے شاہ جی' آپ کے لیے ہمیں کیا کیا سہنا پڑ رہا ہے۔'' اس نے یونہی ہوا کو مخاطب کیا۔

''یہ تو کچھ نہیں ہے۔ یہ تو صرف ابتدا ہے تاکہ تمہیں آگے سب کچھ سہنے میں آسانی ہو۔'' وہ جل گئی۔

زرینہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''تاریخ بتاتی ہے کہ عاشقوں پر ہمیشہ بہت ظلم توڑے جاتے رہے ہیں۔ کتنا ظلم ہوا ہیر پر جسے کھیڑے بیاہ کر لے گئے۔ سسی تھلوں میں دفن ہو گئی۔ سوہنی چناب میں غرق ہو گئی۔ مجنوں کو پتھر مارے گئے۔ فرہاد کو دودھ کی نہر کھودنے پر مجبور کیا گیا اور مرزا کو صاحباں کے بھائیوں نے مار دیا لیکن رضیہ تم چاہو تو تاریخ کا دھارا بدل سکتی ہو۔''

''اس وقت سے الٹی الٹی باتیں کر رہی ہو۔ اب کہہ بھی دو کہ تم چاہتی کیا ہو؟''

''صرف تمہارا پیلا دوپٹا۔''

''پیلا دوپٹا کیوں؟''

''کل میں نے اپنا پیلا اور سفید پھولدار سوٹ پہننا ہے اور اس کے دوپٹے میں جگہ جگہ ٹک لگے ہوئے ہیں اس لیے۔''

''کہا تو ہے تمہیں کہ تمہارے چھوٹے شاہ جی کے لیے تمہارے کپڑوں کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ تم برقعے میں ہو گی۔''

''ہائے پھر کہو۔'' زرینہ شرارت آمیز انداز سے ہنسی۔

''کیا؟''

''وہی یعنی میرے چھوٹے شاہ جی۔''

زرینہ کی شرارت سے چمکتی آنکھیں دیکھ کر رضیہ کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

''ایک دوپٹے کی تو بات ہے۔'' اس نے بہت معصومیت سے کہا۔ ''اتنی تو باہر میں نے کسی سے بھیک مانگی ہوتی تو وہ بھی مل جاتی۔''

''بکومت' کبھی تو سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔'' رضیہ نے اسے جھڑکا پھر اٹھ کر ٹرنک سے پیلا دوپٹا نکال کر اسے تھما دیا۔

اگلے دن وہ وقت سے کتنی دیر پہلے تیار ہو کر اچھو کا انتظار کرنے لگی۔ پھر تانگے پر بیٹھ کر ہمیشہ کی طرح دھان کے لہلہاتے کھیت دیکھنے کے بجائے اس تنگ سی پکی سڑک پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

''شاید وہ اس موڑ پر اچانک سامنے آجائیں یا پھر اس درخت کے پیچھے سے نکل آئیں۔ یہ دھان کی فصل اتنی اونچی نہیں ہے کہ اس میں کھڑے ہو کر وہ دکھائی نہ دے سکیں لیکن پھر بھی ہو سکتا ہے۔ امید تو اچھی ہی رکھنی چاہیے۔ شاید کبھی چکوری کے پروں میں اتنی طاقت آجائے کہ وہ اُڑ کر چاند کو پالے یا شاید چاند ہی چکوری کے لیے سب کچھ قربان کر کے زمین پر اتر آئے۔ ہو سکتا ہے ناں۔ امید تو اچھی ہی رکھنی چاہیے۔''

لیکن تمام راستہ طے کر لینے کے باوجود بھی جب وہ کہیں دکھائی نہیں دیا تو زرینہ مایوس ہو گئی اور جب تانگہ خالہ کبریٰ کے گھر کے دروازے پر رکا تو زرینہ بالکل بجھ چکی تھی۔ رضیہ نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ زرینہ چپ چاپ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ زرینہ نے کھلے دروازے کی سمت دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں دروازے میں چھوٹے شاہ جی کھڑے ہوئے تھے۔

''شاہ جی۔'' وہ مسرت آمیز انداز میں بولی۔

حیدر علی چونک گیا۔ خالہ کبریٰ کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ گوری ہفتے کے روز آتی تھی۔ خدا معلوم اس کی گوری کا نام رضیہ تھا یا زرینہ' بس اس کے لیے تو وہ صرف گوری تھی۔ پورا ایک ہفتہ اس نے اس دن کی آمد کے انتظار میں کاٹا تھا۔ اس امید کے ساتھ کہ اس کی گوری بھی اس کی خاطر بے چین ہوگی' اس کے لیے بھی یہ تمام عرصہ گزارنا مشکل ہوگا۔

اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا گوری کے لیے' پورے ایک ہفتہ تک خالہ کبریٰ کے وہ سب کام کرتا رہا تھا' جو تمام زندگی اس نے کبھی نہیں کیے تھے۔ شروع میں خالہ کی خدمت کی وجہ صرف گوری تھی لیکن بعد میں خالہ کی مہربانیوں نے اس کے قدم باندھ لیے تھے۔

اور آج اس کی ہفتہ بھر کی بے چینی اور تھکن گوری کے صرف دو لفظوں نے ایک لمحے میں ... کر دی تھی۔

''شاہ جی!''

کہنے کو صرف دو لفظ تھے لیکن حیدر علی کے لیے یہ کسی امرت سے کم نہیں تھے۔ گوری کے لہجے میں چھپی مسرت آمیز حیرت نے وہ سب جذبے عیاں کر دیئے تھے' جو صرف محسوس کیے جاتے ہیں' جنہیں کہا نہیں جاتا۔

گویا وہ بھی اس کے لیے سوچتی رہی تھی۔ راتوں کو تاروں کی چھاؤں میں اپنے اور اس کے نام کے ستارے ڈھونڈتی رہی تھی۔ اس نے بھی حیدر علی کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا تھا۔ جاگتی آنکھوں سے اس کے...... خواب دیکھے تھے اور یہ سب کچھ حیدر علی کو فقط ان دو لفظوں سے معلوم ہو گیا تھا۔

''شاہ جی۔''

کائنات جھوم اٹھی تھی' کلیاں چٹک گئی تھیں' پھول مہکنے لگے تھے' رہٹ کا پانی جھر جھر بہہ رہا تھا۔ بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سحر زدہ کر دینے والی موسیقی میں بدل گئی تھی' مرغیاں کٹ کٹ کرتے ہوئے حیدر علی کو مبارکباد دینے لگی تھیں۔

آج اس نے اس لڑکی کو پا لیا تھا جسے اس نے برسوں تلاش کیا تھا۔ کبھی لندن کے مضافات میں واقع محل نما کوٹھیوں میں' کبھی نائٹ کلبوں میں' کبھی پکاڈلی اسٹریٹ پر' کبھی سڑکوں پر بے مقصد سائیکلنگ کرتے ہوئے۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اپنی من پسند لڑکی پھولی پھولی سفید اسکرٹ پہنے ہوئے کہیں پیانو بجاتی ملے گی یا ندی کے کنارے گھاس پر بیٹھ کر پانی میں خود ہی پتھر پھینکنے کے بعد لہریں گنتے ہوئے یا پھر کسی مضافاتی محل کے بے ترتیب سے باغ میں کینوس ایزل پر لٹکائے کلر پلیٹ تھامے لینڈ اسکیپ پینٹ کرتے ہوئے۔

حیدر علی جدیدیت کا قائل تھا۔ نہ اسے خود گھر میں رہنا پسند تھا اور نہ ہی وہ لڑکیوں کو گھروں میں بند رکھنے کا قائل تھا۔ اس نے ہمیشہ ایک تعلیم یافتہ' خوبصورت اور ماڈرن لڑکی کے خواب دیکھے تھے جو اس کے ساتھ ادب' فلسفہ' نفسیات اور سیاسیات پر بحث کر سکے' جو اس کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے بلکہ وہ دونوں بحث کے دوران ایک دوسرے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرتے رہیں اور پھر بالآخر ہنس کر بانہوں میں بانہیں ڈال کر ساری بحث کو چائے یا کافی کی ایک پیالی کے ساتھ اُڑا دیں۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے اس کی من پسند لڑکی کہاں ملے گی' لیکن اسے یقین تھا کہ وہ جب بھی اور جہاں کہیں بھی دکھائی دی' وہ اسے فوراً پہچان لے گا اور اس کے دل سے صدا آئے گی۔

''یہی ہے وہ۔''

اب وہی حیدر علی حیران تھا کہ اس کا دل یہ صدا ایک ایسی لڑکی کے لیے کیوں دے رہا ہے جو برقعے میں لپٹی ہوئی ہے' جس کی باتیں تو خوبصورت ہیں لیکن اسے شیکسپیئر' کرسٹوفر مارلو' کیٹس

اور شیلے کی کچھ خبر ہی نہیں' جس کے ساتھ وہ......فرائڈ کے نظریات پر بحث نہیں کر سکتا' جسے نہ افلاطون کے مکالموں کی خبر ہے اور نہ ہی سارت کی وجودیت کی تھیوری کی' جس کی مسکراہٹ مونا لیزا سے زیادہ خوبصورت ہونے کے باوجود اسے مونا لیزا کا بھی علم نہیں' جسے یہ تک معلوم نہیں کہ مائیکل اینجلو نے اسٹائن چیپل کے میورلز میں آرٹ کا سب سے خوبصورت عہد قید کر دیا تھا اور رافیل نے School of Athenes پینٹ کر کے خود کو دنیا کا سب سے بڑا آرٹسٹ ثابت کر دیا تھا' جس کی موسیقی کی حد بی تھون کی سمفنی نہیں' بیل کے گلے میں منمناتی گھنٹیاں تھیں۔

نہ وہ اسے سفید پھولی پھولی سکرٹ پہن کر پیانو بجاتے ہوئے ملی تھی' نہ ہی ندی کے کنارے بیٹھ کر پانی میں کنکر پھینک کر لہریں گنتے ہوئے اور نہ ہی کسی درخت کی چھاؤں کے نیچے پھولوں کے بے ترتیب تختوں کے پاس ایزل کینوس پر ٹکائے لینڈ اسکیپ پینٹ کرتے ہوئے۔

ان کی پہلی ملاقات کتنے غیر رومانوی انداز میں' کتنے غیر رومانی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ اس کے خیالوں سے کتنی مختلف تھی پھر بھی کتنی اپنی اپنی سی تھی۔ اس نے حیدر علی کے ذہن کے کینوس پر چھائے ہوئے رنگوں کو بالکل ہی بدل دیا تھا اور نئے رنگوں سے ایک بالکل نئی اور انوکھی تصویر بنائی تھی۔ ان میں سے ہر رنگ خوشبو سے بھیگا ہوا تھا۔ ہر رنگ روشن اور معطر تھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ گوری نے اپنی مخروطی گلابی انگلیوں سے دروازے کو ہولے سے بجایا تھا۔ اس آہستہ رَوی دستک کو سن کر حیدر علی جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا اسے تکے جا رہا تھا اور گوری اور اس کی بہن کے لیے اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

''سوری!'' وہ ایک دم پیچھے ہٹا۔ ''اندر آ جائیں' خالہ کبریٰ گھر پر ہی ہیں۔''

رضیہ نے نقاب کی اوٹ سے زرینہ کی طرف دیکھا۔ زرینہ نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ وہ ڈیوڑھی میں کھڑا رہ گیا۔ اور وہ دونوں کمرے میں چلی آئیں۔ سلام دعا کے بعد رضیہ بولی۔

''خالہ جی! یہ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' حالانکہ زرینہ کے حوالے سے وہ جانتی تھی کہ حیدر علی کون تھا۔

''تم برقع اتار دو' سمجھو بالکل اپنے صفدر جیسا ہی ہے۔'' وہ بولیں۔ ''اللہ اسے خوش رکھے بہت نیک لڑکا ہے' میری تنہائی دور کر دی اس نے۔''

''پھر بھی خالہ ہیں کون؟''

''علی نام ہے اس کا۔'' انہوں نے بتایا۔ ''روز آ جاتا ہے میرے ساتھ کاموں میں ہاتھ بھی بٹا دیتا ہے اور باتیں بھی کرتا رہتا ہے۔ جس دن سے یہ گھر میں آنا شروع ہوا ہے اس دن سے سمجھو اس گھر کے بھاگ ہی جاگ اٹھے ہیں۔ شاہ صاحب کے گھر سے کبھی گندم کی بوری آ جاتی ہے اور کبھی ذبح کیا ہوا جانور۔ سب اس کے قدموں کی برکت سے ہے اور اب یہ فکر بھی نہیں ہے

کہ کسی دن مر گئی تو لاش دنوں کے حساب سے پڑی سڑتی رہے گی۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا کہ آپ کو معلوم نہیں ہو گا۔'' رضیہ نقاب اٹھا کر بولی۔

''کیا معلوم نہیں ہو گا؟''

زرینہ نے ملتجی نظروں سے رضیہ کی جانب دیکھا اگر وہ خالہ کبریٰ کو شاہ جی کی حقیقت بتا دیتی تو وہ شاید بے ہوش ہی ہو جاتیں۔ ایک پیرزادہ ان کے گھر کا کام کرتا رہا تھا' کنویں سے پانی بھر کر لاتا رہا تھا' ان کے ساتھ روٹیاں سینکتا رہا تھا اور مرغیوں کو دانا کھلاتا رہا تھا اور وہ اُمتی ہو کر ایک سیّد زادے سے یہ کام لیتی رہی تھیں۔ ان کے نزدیک یہی ایک بات ان کی ساری زندگی کی عبادت اور ریاضت پر پانی پھیرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔

خالہ جی کو یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد شاہ جی کا وہاں آنا یقیناً ناممکن ہو جاتا اور شاہ جی سے یہاں ملاقات نہ ہوتی تو پھر کہاں ہوتی؟ مانا کہ اس پر کہیں آنے جانے کی کوئی خاص پابندی نہیں تھی لیکن پردے کی سختی ضرور تھی۔ وہ گاؤں کے کسی بھی گھر چلی جاتیں تو گھر کے مکین ان کی خاطر جوان لڑکوں کو کچھ دیر کے لیے باہر بھیج دیتے۔ حویلی میں یوں تو اس کا خاصا آنا جانا تھا لیکن وہاں تو پردے کی پابندی اس کے اپنے گھر سے بھی زیادہ تھی۔

پھر کہاں ملتی وہ شاہ جی سے؟ تقدیر بھی تو ملانے کے لیے راستے تلاش کرتی ہے لیکن اگر سب راستے ہی مسدود ہو جائیں تو؟ نہیں وہ اپنی نظروں کے سامنے یہ راستے مسدود ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتی تھی۔

رضیہ اس کی ملتجی نظریں دیکھ کر شش و پنج میں مبتلا ہو گئی۔ اسے متذبذب دیکھ کر زرینہ فوراً بولی۔

''خالہ جی یہی کہ ابا جی کو علم ہو گیا کہ ہم نے کسی غیر کے ہوتے ہوئے نقاب اٹھا دیا تھا تو ہماری خیر نہیں۔''

''تمہارے ابا کی طبیعت کو میں نہیں جانتی کیا۔'' خالہ پوپلے منہ سے مسکرائیں۔ ''لیکن علی کی بات اور ہے۔ تم صفدر سے پردہ نہیں کرتیں اور علی بھی میرے لیے ویسا ہی ہے۔ بہت ہی شریف ہے۔ اب دیکھو کمرے میں بھی نہیں آیا۔ غریب باہر ہی کہیں کھڑا ہو گا۔''

''ابا جی تو یہ سب باتیں اتنی آسانی سے قبول نہیں کریں گے ناں۔ خالہ ایسا کریں کہ آپ انہیں کہیں باہر بھجوا دیں۔''

''باہر بھجوانے کی کیا ضرورت ہے؟'' زرینہ نے اسے گھورا۔ ''اتنی گرمی ہو رہی ہے باہر۔ تھوڑی دیر میں سورج آگ برسانے لگے گا۔''

''تو اُن کا کوئی ٹھور ٹھکانا بھی تو ہو گا۔ وہیں چلے جائیں ہم شام تک یہاں ہیں' اس کے بعد جی چاہے تو واپس آ جائیں۔'' رضیہ اس کے گھورنے کی پروا کیے بغیر بولی۔

''خالہ جی! میں باہر جا رہا ہوں کوئی کام ہو تو آواز دے لینا' میں برگد کے پیڑ کے نیچے ہی بیٹھا ہوں گا۔'' کمرے کے باہر سے حیدر علی کی آواز آئی۔

''بس ہو گیا تمہارا دل خوش۔'' زرینہ کی آنکھیں رضیہ سے کہہ رہی تھیں لیکن منہ سے وہ یہی بولی۔ ''اب تم آرام سے برقع اتار سکتی ہو۔''

دونوں بہنیں خاموشی سے کام میں لگ گئیں۔

''زرینہ بیٹا! آج روٹی کے بجائے چاول پکا لینا۔ پیر صاحب کی طرف سے پورے ایک من کی بوری آئی ہے کل۔'' خالہ کبریٰ نے آواز دی۔

''جی اچھا خالہ۔''

''کتنی صفائی رہتی ہے؟'' رضیہ نے اس سے بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔ اسے احساس تھا کہ زرینہ اس سے ناراض تھی۔

''ختم ہو گئی ہے۔'' اس نے جھاڑو کونے میں دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے بے رخی سے کہا۔

''میں نے بھی کپڑے دھو لیے ہیں' ہنڈیا بھی پکا لی ہے۔'' رضیہ نے کہا لیکن زرینہ کوئی بات کہے بغیر باورچی خانے میں گھس گئی۔

''مجھے پتا ہے' تم مجھ سے ناراض ہو۔'' رضیہ اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

''لیکن تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' زرینہ چاولوں کی بوری سے چاول نکالتے ہوئے پلٹی۔

''تم میری چھوٹی بہن ہو میں تمہیں کسی دلدل میں گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''خود بتاؤ' تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔''

''تمہیں صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ پھر بوری سے چاول نکالنے لگی۔

''ہماری آپس میں کبھی ناراضگی نہیں ہوئی تھی۔ ایک تیسرے فرد کی آمد نے ہمارے درمیان اتنی دیواریں کھڑی کر دی ہیں کہ تم مجھ سے بات بھی کرنا نہیں چاہتیں۔''

''جو لوگ ہمارے دل کے پاس رہتے ہیں ان میں سے کوئی بھی دوسرا یا تیسرا فرد نہیں ہوتا' وہ سب پہلے ہوتے ہیں۔'' وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''پتا نہیں بے چارا علی کتنی گرمی میں بیٹھا ہوا ہوگا۔'' خالہ بولیں۔

زرینہ کے چاول چنتے ہوئے ہاتھ ایک لمحے کو رکے پھر اسی تسلسل سے مصروف ہو گئے۔

''خالہ جی! یہ رہتے کہاں ہیں؟'' رضیہ نے پوچھا تو زرینہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

''پرلے گاؤں کی سرائے میں رہ رہا ہے اور پتا ہے' پیر صاحب کے بیٹوں کا بہت اچھا

دوست ہے۔''

''یقیناً ہوں گے۔'' رضیہ بولی۔

وہ اس شش و پنج میں مبتلا تھی کہ انہیں شاہ جی کی حقیقت بتا دے یا نہیں۔ اس کے نزدیک شاہ جی کا مرتبہ بہت بلند تھا اور ان کی دعا اور بددعا دونوں میں بہت اثر تھا۔ اتنے بڑے مرتبے والے شخص کو اس کے لیے ناراض کرنا ناممکن تھا لیکن زرینہ کو کنویں میں گرتے دیکھنا بھی تو اسے گوارا نہیں تھا' پھر کیا کرے وہ؟ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔

اس کے دل میں یہ بات بھی مسلسل کھٹک رہی تھی کہ شاہ جی' زرینہ کی خاطر باہر گرمی اور دھوپ برداشت کر رہے ہیں۔ وہ پیر صاحب کے گدی نشین نہ سہی لیکن برگد کے پیڑ تلے اُگی ہوئی گھاس ان کے مرتبے اور شان کے مطابق تو نہیں تھی۔ ان کی اپنی حویلی' اتنی بڑی اور شاندار تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں کھلی رہ جائیں اور پھر وہ تو ولایت بھی رہ کر آئے تھے' جس کے ساتھ عیش اور آرام کا ہر تصور وابستہ تھا اور اس وقت وہ نیلے آسمان تلے' آگ برساتے سورج کی حدت کا مقابلہ کر رہے تھے۔

''پتا نہیں علی کو بھوک پیاس نہ لگی ہو۔'' خالہ کو پھر اس کا خیال آ گیا۔

''خالہ سرائے میں سبھی کچھ ملتا ہے' یہیں باہر تو نہیں بیٹھے رہیں گے وہ۔'' زرینہ نے اپنے دل کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔ ''اور اگر بھوک پیاس محسوس ہوئی تو دروازہ کھٹکھٹا کر مانگ لیں گے۔''

''اللہ سب کو ایسی اولاد دے۔ میرے دل سے تو اس کے لیے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔'' انہوں نے آہ بھری۔ ''سگی اولاد اپنی ہوتے ہوئے بھی اپنی نہ بنی اور یہ پرائی اولاد خبر نہیں کس کا بیٹا' کس کی آنکھ کا تارا ہوگا' ایسے لگنے لگا ہے جیسے اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہو۔''

زرینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ باورچی خانے میں آ گئی اور کھڑکی کی چق اٹھا کر باہر جھانکنے لگی۔ وہ برگد کے پیڑ تلے ایک بازو سر کے نیچے رکھے لیٹا ہوا تھا۔ وہ واپس خالہ کے کمرے میں چلی آئی۔

''خالہ! یہ کب سے یہاں آ رہے ہیں؟'' وہ کمرے میں داخل ہوئی تو رضیہ پوچھ رہی تھی۔

''بس پچھلے ہفتے' جب تم لوگ آئے تھے' اس سے اگلے ہی دن آیا تھا۔ اسے تصویریں کھینچنے کا بہت شوق ہے ناں' بس کیمرے سے تصویریں اتار رہا تھا کہ گرمی لگی اور پانی پینے یہاں آ گیا۔'' خالہ وہی کہانی بتا رہی تھیں جو اس نے انہیں سنا رکھی تھی۔ ''پھر تو ایسے گھل مل گیا جیسے برسوں سے یہاں رہتا آ رہا ہے۔'' پھر خالہ ان کاموں کی تفصیل بتاتی رہیں' جو وہ ان کی مدد کے لیے کرتا رہتا تھا۔

''اگلے دن جب وہ پانی پینے آئے ہوں گے اور میں ان کو نہیں ملی ہوں گی تو انہیں کتنا

افسوس ہوا ہوگا۔ اسی لیے تو ہفتہ بھر خالہ کے ساتھ ہی نتھی رہے۔'' وہ سوچتے سوچتے ہنس پڑی۔ ''اگر کوئی ہمیں چاہنے لگے اور ہم بھی اسے چاہنے لگیں تو کتنا اچھا اور خوشگوار احساس ہوتا ہے۔''

''تم بیٹھے بٹھائے کیوں ہنسنے لگیں؟'' خالہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں خالہ جی' اپنی سہیلی کی ایک بات یاد آ گئی تھی۔''

''رضیہ! فٹافٹ چاول ابال لو بے چارا علی بھوکا بیٹھا ہوگا۔ میں تو روز بروز اس کی شرافت کی قائل ہوتی جا رہی ہوں۔ اب یہی دیکھ لو اتنی گرمی میں باہر پڑا ہوگا لیکن پانی مانگنے تک نہیں آیا۔ مجھ سے تو اب چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا ہے۔ بڈھی ہڈیوں میں جان ہی نہیں رہی ورنہ میں ہی اسے پانی کا پوچھ آتی۔''

رضیہ باورچی خانے میں چاول ابالنے چلی گئی۔ کافی دیر تک زرینہ وہیں کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہی پھر وہ بھی باہر نکل کر دوسرے کمرے میں چلی آئی اور کھڑکی کی چق کا سرا تھام کر باہر جھانکنے لگی۔

اب وہ برگد کے درخت سے کمر ٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ آج وہ سفید کرتا شلوار میں ملبوس تھا۔ سامنے کے بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے اور وہ کسی سوچ میں گم تھا۔ کتنی دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا پھر اٹھ کر رہٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''شاید انہیں پیاس لگی ہو۔'' زرینہ نے سوچا۔ ''اگر ہم یہاں نہ آتے یا پھر رضیہ ہی بیکار کی ضد نہ کرتی تو انہیں اتنے گرم موسم میں یوں باہر نہ بیٹھنا پڑتا۔''

اپنی سوچ سے وہ تب چونکی جب اس نے رضیہ کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس کیا۔

''کب تک یوں کھڑی رہو گی؟''

''شاید انہیں پیاس لگی ہے۔'' اس نے رضیہ کی بات نظر انداز کر دی۔

''تمہیں میری باتیں بری تو لگتی ہیں لیکن میں جو کہتی ہوں تمہارے بھلے کو مدِنظر رکھ کر کہتی ہوں۔'' رضیہ بولی۔ ''واپس آ جاؤ' ابھی یہ درد برداشت ہو سکتا ہے لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جب تم یہ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہو گی۔''

لیکن وہ رضیہ کی بات سن ہی کب رہی تھی' اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ رضیہ نے شاہ جی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ اسی کی باتیں سن کر باہر گئے تھے۔

''شاہ جی!'' بے اختیار اس نے حیدر علی کو آواز دی۔

حیدر علی کے رہٹ کے جانب بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے مڑ کر آواز کی سمت دیکھا۔

گوری کھڑکی میں کھڑی بے تابی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کھڑی اس کی بہن گھبرا کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔

اس کے قدم کھڑکی کی جانب اٹھنا شروع ہوئے۔

''یہ کیا حماقت ہے؟'' رضیہ نے گھبرا کر کہا۔ ''کیوں دی تم نے شاہ جی کو آواز؟''

''کیوں دی آواز؟'' زرینہ نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''تمہاری آواز خالہ جی نے بھی سن لی ہو گی۔''

''میں کیا کروں رضیہ' میرا دل میرے بس میں نہیں ہے۔'' اس نے کھڑکی کی چوکھٹ سے کمر ٹکا لی۔

''اب یہ حماقت کر ہی لی ہے تو ضروری نہیں کہ اسے کھینچ کر لمبا بھی کر لو۔ ہٹو' کھڑکی بند کرو' نہ تم نے چہرہ ڈھانپا ہوا ہے اور نہ سر۔''

دوسرے کمرے سے چارپائی کی چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔ یوں جیسے کوئی چارپائی سے اتر رہا ہو۔ رضیہ نے ایک نظر قدم قدم آگے بڑھتے شاہ جی کی طرف دیکھا اور پھر دروازے کی سمت۔

''تمہیں سمجھانا بے کار ہے لیکن میں خالہ جی کو تو وہاں روک سکتی ہوں ناں۔'' وہ بولی۔ ''تمہارے لیے نہیں' ابا جی اور اپنے گھرانے کی عزت کے لیے۔''

وہ تیزی سے پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

''گوری!'' اس نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر زرینہ کو پکارا۔

''شاہ جی! آپ کو پیاس لگ رہی ہے؟'' اس نے دوپٹے سے سر ڈھانپتے ہوئے کہا۔

''دید کی پیاس تو مٹ گئی۔'' اس نے زرینہ کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن دل کی تشنگی نہیں مٹی۔''

''آپ اندر آ جائیں۔''

''زرینہ!'' رضیہ کمرے کے اندر چلی آئی۔ اس نے سر اور چہرہ چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ زرینہ نے پلٹ کر دیکھا۔

''کھڑکی بند کرو اور کمرے سے باہر نکلو۔''

لیکن جب زرینہ اس کی بات سن کر بھی ساکت کھڑی رہی تو وہ تیزی سے اس کے قریب چلی آئی۔ کھڑکی کے دوسری جانب حیدر علی بھی موجود تھا۔ اس نے زرینہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ ''بند کرو کھڑکی۔''

''پلیز بہن جی!'' حیدر علی بولا۔ ''اس کا کوئی قصور نہیں ہے اسے کچھ مت کہیں۔''

''شاہ جی! میں اس کی بڑی بہن ہوں۔'' رضیہ نے کہا۔ ''میں ہاتھ جوڑ کر آپ کی منت کرتی ہوں کہ آپ اپنے قدم یہیں روک لیں۔ ہم اُمتی لوگ آپ کے پاؤں کی خاک ہیں' آپ کی برابری کے مستحق نہیں' جیسے تنکا تنکا جوڑ کر چڑیا گھونسلا بناتی ہے' ویسے ہی صدیوں کی محنت سے

ہم نے یہ عزت اور مقام بنایا ہے' اس عزت کو ہم سے نہ چھینیں۔''

''میرے لیے بھی آپ کی بہن قابلِ عزت ہے۔'' حیدر علی بولا۔ ''آپ یہ گمان نہ کریں کہ......''

''قابلِ عزت ہے تو سیدھے راستے سے آئیں اور آ کر لے جائیں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''لیکن آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ بات ناممکن ہے۔''

''محبت میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا' لیکن ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ابھی تو بھائی جان کی بھی شادی نہیں ہوئی' بڑی آپا اور زیبی آپا کی نسبت تک طے نہیں ہوئی۔ کچھ وقت تو لگے گا۔''

''شاہ جی! میری بہن بہت بھولی بھالی ہے لیکن آپ تو سمجھ دار ہیں' آپ کے گھرانے کی سیّد زادیوں میں اسے نہ عزت ملے گی' نہ وہ مقام جس کی یہ مستحق ہے۔''

''اسے عزت اور مقام دلانا میرا کام ہے' آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔''

''میں فکر نہیں کروں گی تو کون کرے گا' یہ مجھے کتنی پیاری ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ میں خود جاہل رہ گئی لیکن اماں ابا سے لڑ جھگڑ کر اسے دس جماعتوں تک پڑھوایا' اس کے منہ سے بات نکلی اور میں نے کسی نہ کسی طرح پوری کی لیکن اب یہ جس اندھے کنویں میں چھلانگ لگا رہی ہے میں اسے کیسے اس میں چھلانگ لگانے دوں گی۔''

''رضیہ! خدا کے لیے ایسا تو نہ کہو۔'' زرینہ نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔

''مجھے کہنے دو زرینہ' میں نے بہت مشکل سے اپنے اندر یہ سب کہنے کی ہمت جمع کی ہے۔'' وہ پھر حیدر علی سے مخاطب ہوئی۔ ''ہم آپ کے ٹکڑوں پر پلنے والے لوگ ہیں۔ ہم آپ کی برابری نہیں کر سکتے' نہ ہی آپ کے خاندان کے مخمل میں ٹاٹ کا یہ پیوند کوئی بھی برداشت کرے گا۔ باتیں ہوں گی' بدنامی ہوگی' جگ ہنسائی ہوگی' برسوں اور نسلوں کی کمائی ہوئی عزت پل بھر میں خاک میں مل جائے گی۔''

''آپ کیوں سوچ رہی ہیں ایسا۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں کسی بھی صورت کسی سے اعلیٰ وار[illegible] ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ خاندانی عزت بہت بڑی چیز ہوتی ہے لیکن یہی واحد چیز نہیں ہے۔ انسان کی ذاتی صفات اسے اچھا یا برا بناتی ہیں۔ میں اس بات کو نہیں مانتا کہ محض خاندانی عزت ہی بڑائی ناپنے کا پیمانہ بنا لیا جائے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی بہن کو اپنی بیوی کی عزت بناؤں گا' اسے وہ مقام دلاؤں گا' جو میری بیوی کو میرے گھرانے میں ملنا چاہیے۔ ا[illegible] یوں راستے میں تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''آپ نے وعدہ کیا ہے میں یقین کر رہی ہوں کیونکہ آپ کے گھرانے میں کبھی کو[illegible] وعدے سے پھرا نہیں ہے۔'' بالآخر رضیہ نے کہا۔ ''بس اتنی گزارش ہے آپ سے کہ اسے اپنی عزت سمجھنا۔''

''رضیہ۔'' خالہ کبریٰ کی آواز آئی۔

''آئی خالہ۔'' رضیہ جلدی سے چلائی پھر اس نے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ ''چلو زرینہ۔'' اس نے بازو سے پکڑ کر اسے گھسیٹا۔

''چھوڑو مجھے۔'' زرینہ نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

''چلو میرے ساتھ۔'' وہ اسے کمرے سے باہر لے آئی۔

''جی خالہ۔''

''بیٹا کھانا پک گیا ہو تو مجھے کسی برتن میں ڈال دو' میں علی کو دے آؤں۔''

''خالہ جی! یہ برا لگتا ہے کہ ہماری وجہ سے وہ باہر کھانا کھائیں۔'' زرینہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا کروں؟ کہاں کھانا کھائے گا وہ؟''

''انہیں اندر بلا لیں۔'' رضیہ نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔ ''ہمیں ان کی شرافت کا یقین آ گیا ہے۔ ہماری وجہ سے وہ باہر گرمی میں کھانا کھائیں' یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔''

''ڈیوڑھی میں کھانا دے دوں؟''

''ڈیوڑھی ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔'' زرینہ مضطرب ہو گئی۔

''کیا نہیں ہے؟''

''کچھ نہیں خالہ۔'' رضیہ جلدی سے بولی۔ ''چاہیں تو کمرے میں بلا لیں۔ آپ نے انہیں [illegible] کہا ہے' میں انہیں بھائی کہتی ہوں۔''

''اللہ تمہیں خوش رکھے' وہ واقعی بہت شریف اور نیک ہے۔ بہت خاندانی لڑکا ہے۔ ٹھہرو' میں اسے اندر بلا لاؤں۔'' وہ باہر نکل گئیں۔

''رضیہ!'' زرینہ بولی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''بہت بہت شکریہ۔''

''پرے ہٹو۔'' اس نے خود کو چھڑایا۔

''کیسے ہٹوں' شکر ہے تمہیں اُن پر اور ہماری محبت پر یقین آ گیا۔''

''مجھے ان کے وعدے پر یقین آیا ہے کیونکہ ان کے گھرانے میں وعدہ خلافی کی ریت نہیں ہے۔ اگر تم بیاہ کر سیّد خاندان میں چلی جاؤ اور تمہیں وہاں عزت اور مرتبہ مل جائے تو میں تو خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔''

''اب خوشی سے پاگل ہو جاؤ گی اور جب میں کہتی تھی تو چاند اور چکوری اور نہ جانے کیا کیا مثالیں دے کر سمجھاتی تھیں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' زرینہ ہنسی۔

''اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ تمہیں کھلی چھٹی مل جائے۔''

''جب چھٹی چاہیے ہوگی تو تمہیں درخواست دوں گی باقاعدہ اور تم سے دستخط لے کر ہی ہٹوں گی۔'' وہ مسلسل ہنس رہی تھی۔

''اب کھی کھی، کھی ہی کیے جاؤ گی یا برتن بھی لگاؤ گی۔'' رضیہ نے اسے ڈپٹا۔

''آج تو میرا دل چاہ رہا ہے کہ خوب ہنسوں اور میرے ساتھ ساتھ آسمان اور زمین پر رہنے والے سب پرندے، سب پھول، سب جگنو، تتلیاں اور ستارے ہنسیں۔'' وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''آج تو ساری دنیا کے رنگ ہی بدل گئے ہیں۔ یوں نکھر آئے ہیں جیسے بوندیں پڑنے کے بعد ہر شے نکھر جاتی ہے۔ آسمان دُھل جاتا ہے، پتے شفاف ہو جاتے ہیں، پھولوں کے رنگ شوخ ہو جاتے ہیں، خوشبو کے بوجھ سے ہوا کی کمر جھکی جاتی ہے۔''

''اُف...... اُف...... اُف......'' رضیہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''یہ شاعری چھوڑو اور برتن لگاؤ۔''

''یہ شاعری کہاں ہے میری اَن پڑھ بہن، یہ سو فیصد نثر ہے۔''

''برتن لگاتی ہو یا تمہاری پٹائی کروں؟'' رضیہ نے اسے دھمکایا۔

''اتنا شوق ہے برتن لگانے کا تو خود لگا لو۔'' وہ بے تعلقی سے بولی۔

''عشق و عاشقی تم کرو اور خدمت گزاری میں کروں، یہ بھی خوب رہی۔''

''محترمہ! آپ نے ہی کچھ دیر قبل اعلانِ نیاز پور جاری کیا تھا کہ وہ آپ کے بھائی ہیں اپنے بھائی کی خدمت کرنا آپ کا فرض ہے ہمارا تو کوئی بھائی ہے نہیں اس لیے ہم یہاں بیٹھ کر آرام فرمائیں گے اور آپ اپنے بھائی کی خاطر داری کرنے کے لیے برتن لگائیں گی۔''

''تم سے اللہ پوچھے۔'' وہ چڑ کر اٹھ گئی۔

بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو زرینہ بھی رضیہ کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں بھاگ آئی۔

''اب کیا ہوا؟''

''وہ آ رہے ہیں؟''

''ظاہر ہے اندر بلایا ہے تو آئیں گے ہی۔''

''مجھے شرم آ رہی ہے۔''

''تھوڑی دیر پہلے جب کھڑکی میں ننگے سر ننگے منہ کھڑی تھیں۔ تب تو شرم نہیں آ رہی تھی۔ یہ اچانک ہی کہاں سے ٹپک پڑی۔''

''اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں تھی، اب آگئی ہوں۔''

''تو پھر یہیں باورچی خانے میں ٹھہر جاؤ، کمرے میں مت جاؤ۔'' رضیہ نے کہا۔

''کتنی ظالم ہو تم۔'' پھر وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔ ''تم میرے ساتھ کمرے میں چلو

ناں۔''

''مجھے کیوں درمیان میں گھسیٹتی ہو، خالہ آ کر کھانے لے جائیں گی، میں یہیں رہوں گی۔''

''تم سچ مچ بہت ظالم ہو، آ جاؤ گی تو تمہارا کیا جائے گا، ہاں میرا بھلا ہو جائے گا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات میں تمہارا بھلا ہے اور کس میں برا، میں تو بس تمہیں اس راستے پر چلتے ہوئے دیکھ رہی ہوں جو سامنے دکھائی دے رہا ہے، کہاں روڑے آئیں گے اور کہاں رکاوٹ، یہ مجھے اب بھی نظر آ رہا ہے اور یہ بھی کہ ان رکاوٹوں کو عبور کرنے کے لیے تمہارے پاس صرف چھوٹے شاہ جی کے کیے ہوئے وعدے کی لاٹھی ہے، وہ اپنے وعدے پر قائم رہے تو تم سر بلند رہو گی اگر وعدے سے پھر گئے تو پھر کبھی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہو گی۔''

''کیا تمہیں شک ہے اُن کے وعدے پر؟'' زرینہ نے اضطراب سے کہا۔

''مجھے وعدے پر نہیں تقدیر پر شک ہے۔'' رضیہ بولی۔ ''پتا نہیں کیوں زرینہ مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ کہیں کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ کسی کے لیے بھی اچھا نہیں ہوگا...... نہ تمہارے لیے اور نہ چھوٹے شاہ جی کے لیے۔''

''تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتیں۔''

''میں خود سمجھ نہیں پا رہی کہ یہ اشارہ کس بات کا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں گی، بس یہ سب محسوسات کی بات ہے۔''

''رضیہ بیٹا!'' خالہ نے باورچی خانے میں جھانکا۔ ''کھانا نہیں تیار؟''

''بس لا رہی ہوں۔'' اس نے جلدی سے ڈونگے میں سالن نکالا۔

رضیہ ٹرے اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی تو زرینہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اس کے دوپٹے کا کونا پکڑے اندر چلی آئی۔ کھانے کے دوران تقریباً خاموشی ہی رہی۔ بس خالہ اور حیدر علی کے درمیان اکا دکا باتوں کا سلسلہ کبھی چلتا اور کبھی رک جاتا۔ کھانا کھا کر خالہ تو آرام کرنے لیٹ گئیں۔ رضیہ ان کی ٹانگیں دبانے لگی اور زرینہ برتن دھونے لگی برتن تھے ہی کتنے۔ چند منٹوں میں فارغ ہو کر ہاتھ پونچھتے ہوئے وہ مڑی۔ دروازے میں حیدر علی کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹھٹک گئی۔

''مجھے اندر بلا کر خود غائب ہو گئیں۔'' اس نے کہا۔ ''پھر میرے آنے کا کیا فائدہ؟''

''میں نے تو آپ کو اس لیے اندر بلایا تھا کہ باہر گرمی پڑ رہی ہے۔''

''اپنے لیے نہیں بلایا تھا؟''

''اپنے لیے؟'' اس نے حیدر علی کی جانب دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''اپنے لیے کیوں بلاتی میں آپ کو؟''

''تو میں چلا جاؤں؟''

''بے شک! لیکن پانی پی کر جائیں، کہیں پھر واپس نہ آنا پڑے۔'' اس نے نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ روکنے کی کوشش کی لیکن حیدر علی کے ہونٹوں پر ابھرتی مسکراہٹ دیکھ کر اس سے اپنی ہنسی ضبط نہ ہوسکی اور پھر وہ دونوں ہی ہنس پڑے۔

''شی۔'' اچانک زرینہ کو خیال آیا کہ صحن کے کونے میں ہونے کے باوجود ان کی آوازیں خالہ کبریٰ تک پہنچ سکتی ہیں۔ ''آہستہ۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' حیدر علی نے بھی ویسے ہی رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''خالہ نے سن لیا تو؟''

''تو کیا ہوگا؟''

''غضب ہو جائے گا اور تو کچھ نہیں ہوگا۔''

''یہ تو تمہیں محبت کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔'' وہ مزے سے بولا۔ ''محبت تو یوں بھی آگ کا دریا ہوتی ہے اور اس آگ میں صرف اسی کو کودنا چاہیے، جو اس سے گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔''

''صلاحیت تو بہت ہے، کبھی آزما کر دیکھ لینا بے شک۔'' وہ بولی۔ ''مجھے تو بس ایک ہی خوف ہے۔''

''کیا خوف؟''

''عزت۔ سادات نہ سہی لیکن تھوڑی بہت عزت ہمارے پاس بھی ہے۔ کبھی حالات بگڑے تو آپ کا تو کچھ نہیں جائے گا۔ مردوں کا تو کبھی کچھ نہیں جاتا۔ ہاں عورت اپنا سب کچھ کھو دیتی ہے۔ اعتماد، عزت اور بعض اوقات زندگی بھی۔ مجھے زندگی کھو دینے سے ڈر نہیں لگتا لیکن اعتماد اور عزت کا جانا مجھے گوارا نہیں۔''

''وہ مرد، مرد نہیں ہوتا جو اپنی محبت کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟''

''مجھے تو آپ پر اعتماد ہے لیکن کیا کروں، رضیہ خود بھی ڈرتی ہے اور مجھے بھی ڈراتی رہتی ہے۔''

''بہن ہے ناں تمہاری، اس کی فکر بھی بجا ہے لیکن کچھ عرصے میں جب وہ مجھے جاننے لگی تو وہ بھی فکر مند ہونا چھوڑ دے گی۔'' پھر وہ قدرے توقف سے بولا۔ ''کیا خیال ہے باہر برگد تلے نہ بیٹھیں، بہت ٹھنڈا میٹھا سایا ہے۔''

''کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''صبح سے میں وہاں بیٹھا ہوا تھا...... ایک بلی، دو کتوں، تین گلہریوں اور خالہ کبریٰ کی مرغیوں کے علاوہ جو جاندار مجھے وہاں دکھائی دیئے ہیں وہ رہٹ کے دو بیل ہیں، لیکن میرے خیال میں یہ کسی سے تمہاری وہاں موجودگی کا ذکر نہیں کریں گے۔''

خالہ اس وقت سو رہی تھیں اس لیے زرینہ کو کوئی خاص پریشانی نہیں تھی۔ رضیہ کو وہ منا سکتی تھی۔ ہاں باہر دیکھ لیے جانے کا خدشہ تھا لیکن حیدر علی کی موجودگی میں اسے یہ خدشہ بھی کچھ زیادہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''فصل کھڑی ہوئی ہے، کھیتوں کے ان آخری سروں پر اس وقت کون آئے گا۔'' اس نے اپنے دل کو تسلی دی اور حیدر علی کے ساتھ باہر چلی آئی۔

وہ دونوں برگد کی چھاؤں تلے بیٹھ گئے۔

''تمہارا حویلی آنا جانا ہے؟''

''جی۔'' وہ بولی۔ ''آپ کی بہنوں سے اکثر ملنے جاتی ہوں۔''

''لیکن وہاں ملنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔''

''میں آپ کے ساتھ آپ کے بھروسے پر آ تو گئی ہوں شاہ جی لیکن یوں ملنا اچھی بات تو نہیں ہے۔'' وہ گھاس کے تنکے توڑتے ہوئے بولی۔

''جب تک شادی نہیں ہوتی تب تک تو ایسے ہی مل سکتے ہیں۔''

''اور......'' وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی۔

''اور کیا؟''

''میرا مطلب ہے کہ کب تک ہم یونہی ملتے رہیں گے؟''

''یعنی شادی کب ہوگی؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ ''ابھی تو بھائی جان کی شادی ہونی ہے، بڑی آپا اور زیبی آپا کی شادی ہونی ہے۔ میرا نمبر بہت بعد میں آئے گا۔''

''تو پھر محبت اتنی جلدی کیوں کی؟'' وہ شکایت آمیز انداز میں بولی۔

''اتنی جلدی؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''میں تو حیران تھا کہ اب تک تم سے الگ کیسے تھا؟ اب سے پہلے تم کہاں تھیں، مجھے ملی کیوں نہیں؟''

وہ ہنس پڑی۔ ''مجھے بنائیں مت۔'' پھر بولی۔ ''آپ کے بھائی جان تو اتنے بڑے ہیں پھر انہوں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''انہوں نے شادی کیوں نہیں کی؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا بتائے۔

رجب علی کی حرکتیں ابھی تک یہاں کے لوگوں کے سامنے نہیں آئی تھیں اور وہ اسے پیر صاحب کے گدی نشین کی حیثیت سے بہت عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کے ولایت میں رہنے کے دنوں میں یہاں اس کی حرکتوں کی کچھ نہ کچھ بازگشت سنائی تو ضرور دی لیکن کانوں، کانوں میں ہونے والی باتوں نے اس وقت دم توڑ دیا تھا۔ جب وہ دونوں بغیر میموں کے ائیر پورٹ پر اترے تھے۔ رجب علی بگڑے ہوئے رئیس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اسے شادی کی ضرورت صرف نسل چلانے کے لیے تھی، گھر بنانے کے لیے نہیں۔ ''گھر'' کا تصور اس کے لیے

بالکل بے معنی تھا۔ اسے تو گھر کی اتنی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی جتنی ایک مسافر کو رات بسر کرنے کے لیے کسی سرائے کی ہوتی ہے۔ سو ایسے شخص کو شادی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

''ان کی منگیتر بھی تو ہے۔'' زرینہ کی بات اسے سوچ کے سمندر سے باہر کھینچ لائی۔ ''کتنا انتظار ہے اسے شادی کا' پھر بھی وہ شادی نہیں کرتے۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ ان کی منگیتر کو شادی کا انتظار ہے۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''یہ بھی بھلا بتانے کی بات ہوتی ہے۔ یہ سب تو سمجھنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ویسے مجھے یہ بات بڑی بی بی نے بتائی تھی۔''

''بڑی بی بی کون ہے؟''

''آپ کی بڑی آپا مہرالنساء۔''

''ہوں۔'' پھر وہ ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ ''اصل میں بھائی جان کو شادی کا شوق نہیں ہے لیکن آج کل بابا جان اور اماں جان ان پر دباؤ ڈال رہے ہیں' بس کچھ ہی دنوں میں ان کی شادی ہو جائے گی۔''

''اور بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی کی شادی کب ہوگی؟''

''جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ ملا فوراً شادی کر دیں گے۔''

''ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے۔''

''ایک نہیں سو باتیں کہو' تمہاری کسی بات کے برا ماننے کا کیا سوال۔''

''سب کہتے ہیں کہ آپ کی بہنوں کی شادی نہیں ہوگی۔''

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے زرینہ کی طرف دیکھا۔

''کہتے ہیں کہ اس طرح جائیداد تقسیم ہو جائے گی۔''

''ایسے ہی کہتے ہیں لوگ' بھلا ایسے بھی ہو سکتا ہے۔''

''پتا نہیں۔'' زرینہ نے ایک دم دفاعی انداز اختیار کیا۔ ''یہ تو لوگ کہتے ہیں۔''

☆======☆======☆

''زبانِ خلق نقارۂ خدا ہوتی ہے۔'' مہرالنساء کی ذاتی ملازمہ پندرہ سالہ حمیدہ اس کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھی۔ ''میرے بھائی کو یہ بات اس کے ماسٹر نے بتائی تھی۔''

''ہاں۔'' مہرالنساء سوچ میں ڈوب گئی۔

''کیا سوچنے لگی ہیں بڑی بی بی؟'' اس نے پوچھا۔

''سوچ رہی ہوں کہ اتنی بڑی حویلی میں اگر تمہارا ساتھ بھی نہ ہوتا تو میں کہاں جاتی؟ کس سے بات کرتی' کس سے اپنے غم کہتی۔''

''آپ پورا بھروسہ رکھیں مجھ پر۔'' وہ اس کے پاؤں دباتے ہوئے بولی۔ ''ان شاء اللہ

آپ کی باتیں اپنے اندر دفن کر دوں گی میں۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ آپ اپنے دکھ سکھ مجھ سے کہتی ہیں۔''

''مجھے بتاؤ حمیدہ اور کیا کہتے ہیں لوگ؟''

''کیا ہوا جو خاندان میں آپ کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں ہے۔ آخر خاندان کے باہر بھی تو سیّدزادوں کی کمی نہیں ہے' لیکن بی بی جائیداد کے بٹوارے کا خوف ہے جو آڑے جاتا ہے۔''

''لیکن مجھے زمین' جائیداد کسی چیز میں سے حصہ نہیں چاہیے۔ میں نے کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا' کچھ نہیں مانگا مجھے اس حویلی کی نہیں' ایک چھوٹے سے گھر کی ضرورت ہے۔ زندہ رہنے کے لیے تازہ ہوا اور روشنی کی ضرورت۔''

☆======☆======☆

زیب النساء مسہری پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ زندگی کتنی اداس کتنی بوجھل ہے کب تک یوں تنہائی برداشت کی جا سکتی ہے۔ ہر چیز ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ کٹورے میں بھی ایک حد تک پانی بھرا جاتا ہے۔ زیادہ ڈالنے کی کوشش کی جائے تو وہ چھلک جاتا ہے۔ کٹورا تو چھلک کر بھی محفوظ رہتا ہے لیکن انسان کی چھلکن سارے سماج اور اخلاق کے سب قاعدوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یا خدا مجھے اس وقت سے محفوظ رکھنا۔ میں نے اب تک اپنے اوپر جو بند باندھ رکھے ہیں انہیں قائم رکھنا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ''ٹھک ٹھک''

''کون ہے؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔

''زیبی آپی میں ہوں۔'' حیدر علی کی آواز آئی۔

زیب النساء نے جلدی سے اپنی بڑی سی چادر ٹھیک طرح سے سر پر جمائی اور مسہری سے اتر آئی۔

''آ جاؤ۔''

حیدر علی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

''تم سارا دن کہاں ہوتے ہو علی؟'' وہ اندر آ کر بیٹھ گیا تو زیب النساء نے پوچھا۔

''میں۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''میں ایک بہت خوبصورت' بہت اچھی جگہ جاتا ہوں۔''

''ہاں تم تو جا سکتے ہو۔'' زیب النساء نے دکھ سے سوچا' لیکن منہ سے صرف اتنا بولی۔ ''ہریالی میں؟''

''جی آپی' وہاں ہریالی بھی ہے۔ رہٹ بھی' بہت سی مرغیاں بھی ہیں اور ایک بہت بوڑھا برگد بھی' یہ دیکھیں۔'' اس نے ایک خاکی لفافہ زیب النساء کی جانب بڑھایا۔ ''یہ تصویریں ہیں

اس جگہ کی۔''

زیب النساء نے لفافہ کھول کر تصویریں نکالیں اور پھر ایک ایک کر کے سب تصویریں دیکھ لیں۔ ''اس میں ہریالی تو نظر نہیں آرہی۔''

''آپی یہ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں ہیں ناں' اچھی ہیں؟''

''ہاں بہت اچھی۔'' اس نے تصویریں واپس لفافے میں ڈالیں۔

''آپی مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔''

''کہو۔''

''آپ میرے لیے بالکل ماں جی کی طرح ہیں' آپ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا میں نے۔'' اس نے ایک نظر بہن کی طرف دیکھا جو اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ''بلکہ آپی آپ ہی میری واحد راز دار ہیں۔''

''ایسی کون سی راز کی بات ہے۔''

''ابھی کسی سے کہنا مت۔''

''پگلے! میں نے کبھی بھی کسی کو تمہاری کوئی بات بتائی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''آپی! مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی ہے۔''

''وہ تو ولایت میں بھی تمہیں کتنی لڑکیوں سے ہوئی تھی۔''

''نہیں آپی! یہ ویسی محبت نہیں ہے۔'' وہ اس کے سامنے ہی قالین پر بیٹھ گیا۔

''ارے تم اوپر بیٹھو ناں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بولا۔ ''آپ جلدی سے میری بات سنیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں سب سے یہ بات شیئر کروں' ہر کسی کو اپنے اس راز میں شریک کروں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ فوری طور پر کسی کو یہ بات نہیں بتا سکتا۔ صرف آپ ہیں جن سے میں ہر بات کہہ سکتا ہوں۔''

''اب کہہ بھی دو کہ اب تمہیں کس سے محبت ہوئی ہے؟''

''یہ اب اور تب والی محبت نہیں ہے آپی۔ یہ سچ مچ کی محبت ہے' جو ہمیشہ رہنے والی ہوتی ہے۔''

''ہمیشہ رہنے والی محبت تو بہت پریشان کن بات ہے۔'' زیب النساء نے تبصرہ کیا۔ ''وہ محبت نہیں رہتی روگ بن جاتا ہے۔''

''چھوڑیں بھی آپی! میں محبت کو روگ بنانے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے خستہ حال قسم کے عاشقوں سے وحشت ہی نہیں ہوتی بلکہ نفرت محسوس ہوتی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو معاشرے کی چند فرسودہ سی روایات میں خود کو جکڑ کر اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو درحقیقت محبت کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے' وہ بزدل ہوتے ہیں اور بزدلوں کو میں بھی

پسند نہیں کرتا۔''

''یہ تقریر بند کرو اور بتاؤ کہ تمہاری ہمیشہ رہنے والی محبت کس سے ہوئی ہے؟'' وہ اب بھی حیدر علی کے عشق کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی تھی۔ ''کیا گاؤں کی ہی کوئی لڑکی ہے؟''

''ہاں! وہ گاؤں کی ہی گوری ہے۔''

''تم گوری سے نیچے نہیں آسکتے؟ وہاں ولایت میں تو گوریاں یوں بھی تھوک کے بھاؤ ملتی ہیں لیکن تمہاری محبت کو داد دینے کو جی چاہتا ہے' جس نے یہاں بھی گوری ڈھونڈ لی۔''

''نہیں آپی! یہ ویسی گوری بھی نہیں ہے' اس کی رنگت تو شہد آگیں ہے۔ وہ ولایت کی گوریاں تو اس رنگت کے لیے مرتی ہیں کتنے کتنے پونڈ اور ڈالروں کی کریمیں اور لوشن لے کر اپنی رنگت ٹین میرا مطلب ہے شہد آگیں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسے تو یوں لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی خاص سانچے میں ڈھال کر نکالا ہو۔ اتنے لمبے سیاہ بال ہیں اس کے۔'' اس نے گھٹنوں تک اشارہ کیا۔ ''اور ہر وقت ہنستی ہوئی بڑی بڑی شربتی آنکھیں' یوں لگتا ہے کہ بہت فرصت کے وقت تخلیق کیا گیا ہے اسے۔''

''ایسی کون سی لڑکی ہے گاؤں کی؟'' زیب النساء نے اپنے ذہن پر زور دیا۔

''اور پتا ہے آپی' وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''کیا؟'' وہ حیران رہ گئی۔ ''تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔''

''خبر کیوں نہ ہوتی۔ ایک تو میں ہوں ہی اتنا اسمارٹ' پھر آپی دل کو بھی تو دل سے راہ ہوتی ہے ناں۔''

''اسے معلوم ہے کہ تم حیدر علی شاہ ہو۔ اس حویلی اور ان زمینوں کے مالک۔ پیر صاحب جلال الدین شاہ کے منجھلے بیٹے؟''

''ہاں۔''

''پھر بھی وہ تمہارے قریب آگئی؟''

''کیوں نہ آتی۔'' وہ بولا۔ ''آپی کبھی زمینیں اور جائیدادیں بھی انسانوں اور رشتوں کا نعم البدل ہوئی ہیں؟ اصل چیز تو انسان اور یہ محبتیں ہیں' باقی سب کچھ تو جھوٹ ہے۔''

''اسے نہیں پتا کہ اس کشادہ حویلی میں......'' زیب النساء گہرا سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

''اس کشادہ حویلی میں کیا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بولی۔ ''تم بتاؤ اپنی گوری کے بارے میں۔''

''یہ بہت مصیبت ہے کہ وہ پردہ کرتی ہے' پھر بھی آج کتنی دیر تک ہم بوڑھے برگد کی چھاؤں تلے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آپی! وہ اتنی سادہ ہے اور اس کی باتوں میں اتنی معصومیت

ہے کہ بعض اوقات مجھے ہنسی آجاتی ہے پتا ہے آج کیا کہنے لگی۔"

"کیا؟"

"کہ میں اتنی اونچی حویلی میں رہنے کے باوجود وہاں ایک چھوٹے سے گھر میں سارا دن کیسے گزارا کر لیتا ہوں اور کانچ اور چاندی کے بجائے المونیم کے گلاس میں پانی کیسے پی لیتا ہوں۔" وہ ہنسا۔ "ہے ناں دلچسپ بات۔ پیاسا اس بات کی پروا کب کرتا ہے کہ وہ اوک سے پانی پی رہا ہے یا سونے چاندی کے کٹورے میں۔"

"وہ پردہ کرتی ہے؟" زیب النساء پُر خیال میں بولی پھر کچھ سوچ کر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن وہ نہیں ہوسکتی۔"

"اتنا سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے' میں اس کا نام بتا دیتا ہوں۔"

"تو بتاؤ۔"

"لیکن اس نے منع کیا تھا' وہ ڈرتی ہے۔ اصل میں اس کی بڑی بہن نے اسے ڈرا دیا ہے۔"

"تم کہیں......؟" وہ چپ ہوگئی۔

"آپ اسے جانتی ہیں!" وہ بولا۔ "یہیں کی مسجد کے امام کی بیٹی ہے۔"

"زرینہ؟"

"جی آپی! مجھے اس کا نام کچھ اچھا نہیں لگا' لیکن وہ خود بہت اچھی ہے۔"

"تم سنجیدہ ہو علی؟" زیب النساء نے دھڑکتے ہوئے دل سے اس سے پوچھا۔

"تو آپ کیا سمجھ رہی ہیں' اس وقت سے میں مذاق کر رہا ہوں؟ نہیں آپی! آپ سے تو مذاق نہیں کروں گا ناں؟"

"تم مجھ سے نہیں زرینہ سے مذاق کر رہے ہو۔ تمہاری باتوں سے مجھے شک تو محسوس ہوا تھا لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زرینہ جیسی لڑکی عشق و عاشقی کے معاملوں میں پڑ سکتی ہے' وہ تو خاصی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔"

"سلجھی ہوئی ہے تبھی تو اسے آپ کے بھائی نے پسند کیا ہے آپی! میری پسند کوئی معمولی تو ہو نہیں سکتی اور پھر یہ آپ کو کس نے بتا دیا ہے کہ سلجھی ہوئی لڑکیاں محبت نہیں کر سکتیں۔ آپ یہ بھی غلط سمجھ رہی ہیں کہ میں اس سے مذاق کر رہا ہوں۔ قسم لے لیں میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"

"اف خدایا۔" وہ پریشان ہوگئی۔

"کیوں آپی؟" وہ تشویش سے بولا۔ "آپ پریشان کیوں ہوگئیں؟"

"تم جانتے ہو کہ بابا جان تمہاری نسبت طے کر چکے ہیں؟"

"کیا؟" ایک لمحے کو تو اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ "کب کر چکے ہیں' کس سے

کر چکے ہیں؟"

"ماموں جان کی بیٹی فوزیہ سے۔"

"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے آپی! مجھ سے پوچھے بغیر میری زندگی کا فیصلہ' نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ایسا کرنے کے لیے تم سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔ بابا جان سارے گاؤں کے فیصلے خود کرتے ہیں۔ سب کی شادیاں بابا جان کی مرضی سے طے ہوتی ہیں پھر ان سے ان کی اولاد کے لیے یہ حق کوئی کیسے چھین سکتا ہے؟"

"مجھے نہ سارے گاؤں کی پروا ہے اور نہ میں نے سب کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ مجھے صرف اپنی اور گوری کی پروا ہے۔ آپی میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس سے شادی کروں گا اور یہاں بغیر مجھ سے کوئی بات کیے بغیر میری مرضی معلوم کیے' میری منگنی بھی کر دی گئی۔" وہ غصہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "کب ہوئی میری یہ منگنی جس کی مجھے بھی خبر نہیں ہے۔"

"برسوں پہلے جب تم ولایت میں تھے۔"

"کمال ہے' یہ بھی خوب رہی مجھے پڑھایا لکھایا۔ اس قابل بنایا کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی بھی راستے کا تعین کر سکوں۔ مجھے قوتِ فیصلہ ملی لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ملا۔ ہونہہ لیکن آپی! میں بتا رہا ہوں کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا' کبھی نہیں۔" وہ غصے سے بولا۔

"دھیرج علی...... دھیرج۔" زیب النساء نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھایا۔

"غصے اور زور زبردستی سے کوئی معاملہ سلجھتا نہیں ہے۔ اب تم کیا بابا جان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گے؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا کرو کہ کچھ دن خاموشی سے انتظار کرو' جب تک بھائی جان کی شادی نہیں ہو جاتی تب تک تمہاری شادی کا ذکر نہیں آئے گا۔ اس وقت تک کوئی نہ کوئی راہ شاید نکل آئے۔"

"اور ماں جی اور بابا جان ان کی شادی میں تاخیر پر کسی صورت رضامند نہیں ہیں۔" وہ بولا۔ "خیر مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ ان کی شادی کب اور کہاں ہوتی ہے۔ مجھے صرف اس بات کی پروا ہے کہ مجھے کہاں شادی کرنی ہے۔"

"اس بارے میں کچھ نہ کچھ سوچیں گے' تم ابھی سے جلدی میں کوئی قدم نہ اٹھا بیٹھنا۔"

"آپی! بھائی جان کی منگنی کے متعلق سب کو معلوم تھا' خود بھائی جان کو بھی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میری منگنی کی مجھ سمیت کسی کو خبر بھی نہ ہو۔"

"بس تمہاری واپسی کا انتظار تھا۔ اب بھائی جان کی شادی کے ساتھ ساتھ اس کا بھی اعلان ہو جائے گا۔"

"آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے آپی۔"

''میں تمہیں کسی بھی بڑی پریشانی سے بچانا چاہتی ہوں۔'' زیب النساء نے پیار سے کہا۔ ''کیا تم زرینہ کو مجھ سے ملوا سکتے ہو؟''

''آپ کیوں ملنا چاہتی ہیں اس سے؟''

''میں اسے فوزیہ کے متعلق نہیں بتاؤں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''آل رائٹ! میں اس سے کہوں گا کہ وہ آپ سے مل لے۔''

''اب تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو اور اپنے ذہن کو اس مسئلے میں مت الجھاؤ۔''

''اب آرام کیسا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں گوری کے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ زمینیں، جائیداد، یہ حویلی سب کچھ......''

''علی!'' وہ آزردگی سے بولی۔ ''مجھے تمہاری آمد کا کتنا انتظار تھا۔ جب تم ولایت میں ہوتے تھے تو میں دنوں تمہاری چٹھی کا انتظار کرتی تھی۔ میں کتنی اکیلی ہوتی تھی لیکن تمہاری چٹھی کے آجانے سے مجھے لگتا تھا جیسے میری تنہائی ختم ہوگئی ہو، جیسے تم میرے پاس ہو۔ تمہارے آنے کی کتنی شدت سے دعائیں مانگی تھیں میں نے۔ اب تم آگئے ہو تو پھر چھوڑ کر جانے کی باتیں کرتے ہو۔''

''زیبی آپی!'' حیدر علی نے اس کی آنکھ سے ڈھلکتا ہوا آنسو اپنی انگلی سے پونچھا۔ ''پلیز روئیں مت، میں آپ کو یوں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ آپ کی شادی ہوگی۔ پیار کرنے والا شوہر ہوگا۔ پیارے پیارے بچے ہوں گے۔ آپ تنہا کب ہوں گی۔''

زیب النساء نے آنکھیں موند لیں۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوگا علی۔'' اس نے اپنے دل میں کہا۔

''زیبی آپی! یہ تنہائی آپ نے خود پر کیوں مسلط کی ہوئی ہے۔ آپ نے بھی اور بڑی آپا نے بھی۔ آپی پردہ یہ تو نہیں کہتا کہ آپ گھر سے باہر بھی نہ نکلیں لوگوں سے بھی نہ ملیں جلیں ٹھنڈی ہوا میں چند سانس بھی نہ لیں۔''

''یہ گھر کب ہے علی، یہ تو حویلی ہے حویلی۔ پیر صاحب کی حویلی اور ہم عام پردہ دار لڑکیاں نہیں۔ پیر صاحب جلال الدین کی سیّد زادی بیٹیاں ہیں۔ ہمارا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی حویلی سے نکل کر کسی کے گھر ملنے جائیں۔ یہ ہم سے کمتر لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ہمیں سلام کرنے آئیں۔

علی آسمان سے بھی زمین کا منظر دکھائی تو دیتا ہے لیکن ہمیں عظمت کے ایسے آسمان پر بٹھا دیا گیا ہے، جہاں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا سوائے دیواروں کے۔ ان دیواروں میں سانس لینے تک کے لیے کوئی روزن نہیں ہے۔ یہاں کی دیواریں اتنی بلند ہیں کہ باہر سے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اتنی موٹی ہیں کہ دم گھٹنے سے نکلنے والی چیخیں بھی کسی کو سنائی نہیں دیتیں اور اتنی مضبوط ہیں کہ آج تک ان میں نقب نہیں لگ سکا۔''

حیدر علی دم بخود اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بہن نے پہلی مرتبہ اس کے سامنے اپنے لیے زبان کھولی تھی، ورنہ وہ اس کے سامنے صرف اسی کے متعلق باتیں کرتی تھی۔ وہ کتنی تنہا تھی، اس کشادہ سجے سجائے کمرے میں کتنی گھٹن تھی۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر چلا آیا۔

☆======☆======☆

''شاہ جی! بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔'' گھر آکر سونے سے پہلے زرینہ نے رضیہ کو مخاطب کیا۔

''اور کوئی وہاں تم دونوں کو دیکھ لیتا تو؟''

''وہاں آتا ہی کون ہے، وہ بھی تپتی ہوئی دوپہر میں، کھیتوں میں کام کرنے والے مزارعے بھی اس وقت پیڑوں تلے آرام کرتے ہیں اور پھر اب تو فصل بھی کھڑی ہوئی ہے۔ اس دور افتادہ آخری سرے پر آکر کسی نے کیا کرنا ہے۔''

''فرض کرو کہ کوئی آجائے تو؟''

''تم کیوں الٹی الٹی باتیں فرض کروانے پر تلی ہوئی ہو..... بد فال منہ سے نہیں نکالنی چاہیے۔ کیا پتا کون سی گھڑی قبولیت کی ہو۔''

''یہ تمہیں الٹی بات لگتی ہے؟ اس دور افتادہ آخری سرے پر آکر کسی نے کیا کرنا ہے۔ مان لیا لیکن اگر کسی کو کچھ کرنا ہوا تو کیا وہ تم سے پوچھ کر کرے گا کہ زرینہ بی بی! مجھے فلاں کام ہے آپ ہٹ جائیں تاکہ میں آپ کو نہ دیکھ سکوں۔''

زرینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''اگر کسی نے مجھے دیکھ بھی لیا تو وہ پہچانے گا کیسے؟ میں تو پہچان لوں گی کیونکہ برقعے کے اندر سے میں نے سب کو دیکھا ہوا ہے لیکن کسی نے مجھے نہیں دیکھا ہوا۔ پھر بھلا کسی کو کیا خبر ہوگی کہ یہ طوطا مینا کون ہیں۔''

''یہ میں نے کب کہا ہے کہ گزرنے والا کوئی مرد ہی ہوگا، وہ کوئی عورت بھی تو ہو سکتی ہے، جو تمہیں پہچانتی ہو۔'' رضیہ چڑ گئی۔ ''اور ایک ان چند گاؤں والوں پر کیا موقوف، شہر تک کے لوگ چھوٹے شاہ جی کو پہچانتے ہیں۔ کم از کم مرد تو سب ہی پہچانتے ہیں ناں انہیں۔''

''اس سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے۔''

''کیا؟''

''کہ تم مجھے پکڑوانے پر تلی ہوئی ہو۔''

''اب تم مجھ سے مار کھاؤ گی زرینہ، میرا دل ہول رہا ہے اور تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ تم آگ میں کود رہی ہو۔''

''کود رہی کہاں ہوں، کود چکی ہوں، اب تو یا جلنا ہے یا پھر کندن بننا ہے۔''

''میرے خدا۔'' رضیہ کا دل سر پیٹنے کو چاہا۔

''اور ہاں یہ دوپٹا رکھ لو اپنے پاس۔'' اس نے رضیہ کا پیلا دوپٹا اسے پکڑایا۔ ''ہمیں نہیں چاہیے۔''

''ہمیں نہیں چاہیے۔'' اس نے چڑ کر زرینہ کی نقل اتاری۔ ''یاد ہے کتنی منتیں کر کے لیا تھا۔ دیکھ لینا جواب میں نے تمہیں اپنا ایک بھی جوڑا یا دوپٹا دیا۔''

''نہ دو' اگلی دفعہ کے لیے تو میں نے سوچ بھی لیا ہے کہ میں نے کیا پہننا ہے۔''

''یعنی اگلی دفعہ بھی یہ بے وقوفی دہرانے کا ارادہ ہے؟''

''اب میں' شاہ جی سے کیا ہوا وعدہ تو نہیں توڑ سکتی۔ ویسے آج تم نے دیکھ لیا ناں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ کل رات دوپٹا دیتے ہوئے کس طرح بار بار کہہ رہی تھیں کہ اتنے بڑے برقعے کے اندر وہ میرے کپڑے کیسے دیکھ سکیں گے۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ اکٹھے ایک نہیں دو پاگلوں سے میرا واسطہ پڑے گا۔'' رضیہ بستر پر لیٹ گئی۔ ''اور اب چپکے سے سو جاؤ' ورنہ صبح نہیں اٹھ سکو گی۔''

☆======☆======☆

''پورا ایک ہفتہ گزارنا ہوگا گوری کے بغیر۔ ایک ہفتہ یعنی پورے سات دن۔'' حیدر علی مسہری پر نیم دراز سوچ رہا تھا۔ کیسے گزرے گا یہ ایک ہفتہ۔ اس کے بغیر تو ایک پل رہنا بھی مشکل ہے۔ کائنات کا تمام حسن' ساری کشش گویا اس میں اتر آئی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی ہوتی لیکن خیر یہ زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے پڑھا لکھا تو میں بھی سکتا ہوں۔ اصل مسئلہ تو اس منگنی کا ہے جو مجھ سے پوچھے بغیر ہی نہ جانے کب طے کر دی گئی اور اب زیبی آپی بھی گوری سے ملنا چاہتی ہیں۔''

زرینہ کے متعلق سوچتے ہوئے اس کے خیال کی رو زیب النساء کی جانب چلی گئی۔

بڑی آپا اور زیبی آپا کتنی اداس اور کتنی تنہا ہیں۔ یہ کس نوع کا انصاف ہے کہ ایک جیتے جاگتے' سانس لیتے ہوئے انسان کو بغیر کسی جرم کے دیواروں کے درمیان قید کر دیا جائے۔ ان سے روشنی' ہوا اور کائنات کے سب رنگ چھین لیے جائیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔''

''صاحب آپ کو بڑی بیگم یاد کر رہی ہیں۔''

''میں آ رہا ہوں۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ماں جی دن میں ایک مرتبہ اسے اور رجب علی کو ضرور بلاتی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ماں جی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''بیٹا تھوڑا سا وقت اپنی ماں کے ساتھ بھی گزار لیا کرو۔''

''ماں جی!'' اس نے ان کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ''میں آپ کے بلاوے کا ہی منتظر تھا۔''

''کہاں رہتے ہو سارا دن۔ تمہارے بابا جان بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔''

''بس یونہی گھومنے پھرنے نکل جاتا ہوں زمینوں پر' کچھ فوٹوگرافی بھی کرتا ہوں۔''

''رجب علی کا گھر بس جائے تو کچھ تمہاری بھی فکر کروں۔''

''ماں جی!'' وہ بولا۔ ''میری فکر چھوڑیں۔ مجھ سے پہلے بڑی آپا اور زیبی آپی...... ہیں۔ ان کی شادی سے پہلے میری شادی ممکن نہیں ہے۔''

''ان دونوں کی طرف سے میرا دل بھی بہت کٹتا ہے لیکن کیا کروں' خاندان میں ان کا جوڑ موجود ہی نہیں ہے۔''

''ماں جی' خاندان ہی تو حرف آخر نہیں ہے۔''

''خاندان ہی حرف آخر ہے۔'' رجب علی' بابا جان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

حیدر علی نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔

''تمہاری ولایت کی تعلیم یہاں نہیں چلے گی ہمارے اپنے رسم و رواج اور طور طریقے ہیں۔'' رجب علی نے کہا۔

''آئیے بابا جان!'' حیدر علی تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔

پیر صاحب بیٹھ گئے لیکن رجب علی کھڑا ہی رہا۔

''بابا جان! میں بہت ادب سے آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' حیدر علی نے انہیں مخاطب کیا۔

''کہو۔''

''میں ماں جی سے کہہ رہا تھا کہ بھائی جان کے بعد جلد ہی بڑی آپا اور زیبی آپی کی بھی شادی کر دیں۔''

''جب ان کی شادی کا مرحلہ آیا وہ بھی ہو جائے گی۔''

''لیکن کب بابا جان۔''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے علی۔'' رجب علی نے کہا۔ ''تم اپنے کام سے کام رکھو' یہ بابا جان اور ان کے بعد میرا مسئلہ ہے۔''

''بھائی جان! یہ مسئلہ نہیں ذمے داری ہے۔''

''تم کیا چاہتے ہو کہاں کریں ان کی شادی؟'' رجب علی فوراً ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''ہے کوئی لڑکا خاندان میں؟ اگر ہے بھی تو ہمارے برابر کا نہیں ہے۔ کس کے پاس اتنی زمینیں اور جائیداد ہے؟''

’’یہ کس صحیفے میں اترا ہے کہ ان کی شادیاں خاندان سے باہر نہیں ہوسکتیں۔‘‘ حیدر علی ضبط سے بولا۔’’اور یہ برابری والی بات نئی منطق ہے جو میری سمجھ سے باہر ہے۔ آپ کے نزدیک برابری کا کیا معیار ہے؟ حویلیاں، زمینیں، جائیداد؟ نہیں بھائی جان، کاغذ کے چند کرنسی نوٹ اور اینٹ گارے سے کھڑی ہوئی دیواریں بڑائی یا برابری کا معیار نہیں ہوتیں۔‘‘

’’سن لیا بابا جان آپ نے۔‘‘ رجب علی، پیر صاحب کی جانب مڑا۔’’اب برابر کا جوڑ ڈھونڈنا نرالی منطق ہوگئی ہے۔‘‘ پھر وہ حیدر علی کی جانب مڑا اور سختی سے بولا۔

’’ایک بات سن لو علی۔ بہنوں کی شادیاں خاندان میں ہوں گی، کسی ہم پلہ گھرانے میں ہوں گی، ورنہ نہیں ہوں گی۔ اس بات کو دوبارہ کبھی موضوع گفتگو نہ بنانا۔‘‘

’’بابا جان! آپ بھی اس ناانصافی پر خاموش ہیں؟ آپ تو کچھ کہیے بھائی جان سے۔‘‘

’’رجب علی جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔‘‘ پیر صاحب بولے۔

’’کیا، بابا جان آپ بھی؟‘‘

’’ہاں، خداندان کی جائیداد تقسیم نہیں ہوسکتی اسے خاندان میں رہنا ہوگا۔‘‘

’’صرف جائیداد کی خاطر آپ لوگ میری بہنوں کی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔ یہ جائیداد انہیں کون سا سکھ دے گی۔‘‘

’’حیدر علی! وہ صرف تمہاری بہنیں ہی نہیں میری بیٹیاں بھی ہیں۔‘‘ پیر صاحب جلال سے بولے۔’’اور میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ انہیں کیا چیز دینی ہے اور کیا نہیں۔‘‘

’’تم کیا چاہتے ہو کہ ہم اپنی بہنیں اور زمینیں غیروں کے حوالے کردیں، یہ بے غیرتی تم برداشت کرسکتے ہو ہم نہیں۔‘‘

’’او مائی گاڈ!‘‘ حیدر علی کا دل سر پیٹنے کو چاہا۔’’اس میں بے غیرتی کی کیا بات ہے۔ ہم شادی کریں گے ان کی، رخصت کریں گے انہیں، اپنے ہاتھ سے اس میں بے عزتی اور بے غیرتی کہاں سے آگئی؟‘‘

’’یہ بے غیرتی نہیں تو اور کیا ہے۔ بیٹی دے کر ناک نیچی ہوجاتی ہے۔ ہرایرے غیرے کی اچھی بری چپ چاپ سننی پڑتی ہے۔ سر جھکا کر چلنا پڑتا ہے اور ہم ہمیشہ سے سر اٹھا کر چلنے کے عادی رہے ہیں۔ کسی لڑکی کی خاطر ہم سر نہیں جھکا سکتے۔‘‘ رجب علی رعونت سے بولا۔

’’حیدر علی! میں نے تمہیں ولایت اس لیے بھجوایا تھا کہ ملکوں نے اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا تھا ورنہ مجھے تمہاری پڑھائی سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی میں تمہیں اس بات کی اجازت دے سکتا ہوں کہ تم ولایت کی تعلیم کو تلوار بنا کر بزرگوں کی قائم کی ہوئی روایات سے لڑو۔‘‘ پیر صاحب کہہ رہے تھے۔’’اور یہ ہماری روایت ہے کہ ہم اپنے گھر کی زمین اور عورت دوسرے کے حوالے نہیں کرتے۔ بے غیرتی کی اس انتہا سے پہلے مرجانا بہتر ہے۔‘‘

’’بابا جان! آپ جیتی جاگتی، سانس لیتی ہوئی لڑکیوں اور زمین کو ایک ہی مقام دے رہے ہیں؟ وہ زمین، جائیداد اور بینک بیلنس کی طرح نہیں ہیں، وہ محسوس کرسکتی ہیں، ہر دکھ اور ہر تنہائی کو۔ بابا جان! آپ ان کے لیے صدر دروازہ نہیں کھولیں گے تو چور راستے اپنے آپ ہی کھل جائیں گے۔ کٹورے میں گنجائش سے زیادہ پانی ڈالا جائے تو وہ بھی چھلک جاتا ہے۔ ان کے صبر اور ضبط کو ان کے لیے آزمائش مت بنائیں۔ اس دن کو آنے سے روک دیں بابا جان، جس دن چور دروازے کھل جائیں گے اور کٹورے سے پانی چھلک جائے گا۔‘‘

’’حیدر علی شاہ!‘‘ پیر صاحب جلال سے کانپنے لگے۔’’نکل جاؤ اسی وقت دور ہوجاؤ میری نظروں سے۔‘‘

’’میرے چلے جانے سے کیا ہوگا۔ صرف آپ کا جلال اور غصہ ختم ہوجائے گا، لیکن آپ کے کندھوں پر ذمہ داری کی جو گٹھڑی پڑی ہے اس کا بوجھ کم نہیں ہوگا۔‘‘

’’نذری بیگم!‘‘ وہ دھاڑے۔’’اپنے بیٹے سے کہہ دو کہ میری نظروں سے دور ہوجائے، کہیں میرا ہاتھ اس پر نہ اٹھ جائے۔‘‘

ماں جی نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔

’’علی! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔‘‘

وہ چپ چاپ سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

’’یہ کیسی نرالی منطق ہے بابا جان اور بھائی جان کی۔‘‘ وہ اپنے کمرے میں آکر سوچنے لگا۔

’’میں انہیں کیا سمجھاؤں۔ ایک تو ادب مانع آتا ہے اور پھر ان میں سے کوئی بھی میری بات سمجھنا نہیں چاہتا اور جب کوئی کچھ بات نہ سمجھنے کی قسم کھالے تو آپ تمام تر کوششیں کرلیں تب بھی وہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ انہوں نے اپنے ذہن اور اپنے کان دونوں بند کیے ہوئے ہیں، ایسے میں کوئی انہیں کیا سمجھا سکتا ہے۔‘‘

☆======☆======☆

حیدر علی خلاف معمول بہت سنجیدہ تھا اور زرینہ اسے سنجیدہ دیکھ کر پریشان ہورہی تھی۔

’’کچھ تو کہیں، بات کیا ہے؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ وہ برگد کی جٹاؤں کو ہاتھ سے جھلاتا ہوا بولا۔

’’کچھ تو ہے، کیا مجھ سے کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ میں نے کوئی غلطی کی ہے، جو مجھ سے ناراض ہیں؟‘‘

’’تم تو اتنی اچھی ہو گوری کہ تم سے میں کبھی ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔‘‘ وہ بولا۔

’’تو پھر اس قدر چپ چاپ کیوں ہیں؟‘‘

’’میں چاہتا ہوں کہ تم باتیں کرو اور میں سنتا رہوں۔‘‘

''میرا تو تجربہ نہیں ہے لیکن میری ایک سہیلی اس معاملے میں خاصی تجربہ کار ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مردوں نے جب کوئی بات نہ بتانی ہو تو وہ بہت اطمینان سے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور عورت کی توجہ خود اس کی اپنی جانب مبذول کروا دیتے ہیں۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''وہی ہوتا ہے جو نرگس کے ساتھ اس وقت ہوا تھا جب اس نے پانی میں اپنا عکس دیکھا تھا۔'' وہ بولی۔ ''ہر انسان اپنی ذات سے عشق کرتا ہے۔ عورت بھی پھر خود میں اپنے اور اپنے محبوب میں گم ہو جاتی ہے اور اصل بات وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے۔''

''تمہاری یہ سہیلی واقعی تجربہ کار لگتی ہے۔'' حیدر علی ہنسا۔

''یعنی یہ بات درست ہے۔''

''ہاں۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ضرور کسی الجھن میں ہیں۔''

''ہوں' الجھن بھی ہے۔'' اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

''پھر مجھے بھی اپنی الجھن میں شریک کرلیں۔''

''گوری! اب تک تمہیں کوئی تحفہ تو دیا نہیں ہے۔ اپنی الجھنیں کیوں دوں۔''

''میرا تحفہ تو آپ کا پیار اور آپ کی محبت ہے شاہ جی! اور اسی پیار اور محبت کی وجہ سے آپ کی سب خوشیاں اور آپ کے سب غم میرے ہیں۔ میں آپ کے حصے کے غموں کو اپنے کندھے پر لاد تو نہیں سکتی لیکن آپ کو حوصلہ تو دے سکتی ہوں ناں۔''

''تم کتنی اچھی ہو گوری۔ تمہیں میری الجھنیں اور میرے غم بانٹنے ہیں تو پتا ہے کیا کرو؟''

''کیا؟'' زرینہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''مجھ سے اچھی اچھی باتیں کرو۔ تم سے مل کر میں سب الجھنیں بھول جانا چاہتا ہوں۔''

زرینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یوں لگا جیسے ویران جنگل کے کسی معبد میں گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ حیدر علی اسے تکنے لگا۔

''یہ بتائیں شاہ جی! کہ آپ کی زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی اور لڑکی بھی آئی تھی؟''

''تم سے پہلے؟ یہ کیوں پوچھا تم نے؟''

''ولایت میں تو بہت خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ مجھ سے زیادہ گوری' سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں' کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں تو ان لڑکیوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں پھر آپ کی نگاہِ انتخاب مجھ پر کیسے ٹھہری؟''

حیدر علی چند لمحے اسے تکتا رہا پھر بولا۔ ''یہ شاعر کہتا ہے کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ وہاں واقعی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں' لیکن ان میں سے کسی سے بھی ملتے

ہوئے میرے دل سے یہ صدا نہیں آئی تھی کہ وہ لڑکی میری ہے۔ تمہیں دیکھا تو میرے دل نے صدا دی کہ میں تمہاری ہی تلاش میں تھا۔ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں تلاش کیا۔ لندن کے کلبوں میں سڑکوں پر' لائبریری میں کتابوں کے ریک کے پیچھے' خاموش ندیوں کے ویران اور بے آباد کناروں پر' کینوس لگے ایزل کے گرد اور پیانو بجاتی لڑکیوں کے درمیان۔ میرے وہم میں بھی نہیں تھا کہ تم مجھے یہاں ملوگی۔''

''پھر میں آپ سے زیادہ خوش قسمت رہی۔'' وہ ہنسی۔ ''مجھے آپ کو ڈھونڈنے کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ آپ مجھے خود بخود مل گئے۔ بغیر کسی تگ و دو بغیر کسی تردد کے۔ ہاں ایک ہفتے تک میں بہت تڑپی تھی آپ کے لیے۔ جس دن آپ نے خالہ کبریٰ کے گھر پانی پیا تھا۔ اس دن ہی میں نے اپنا دل آپ کو دے دیا تھا۔ پھر میں نے خدا تعالیٰ سے کتنی دعائیں کی تھیں کہ آپ مجھے مل جائیں۔ نیاز پور سے یہاں تک کے راستے کے درمیان آپ کو کتنا ڈھونڈا تھا اور اس وقت کتنی حیران ہوئی تھی جب خالہ کبریٰ کے گھر کا دروازہ آپ نے کھولا تھا۔ میری ایک ہفتے کی تڑپ میں اتنی سچائی تھی کہ آپ مجھے فوراً ہی مل گئے۔''

''اب نہیں تڑپتیں مجھ سے ملنے کے لیے؟''

''اب تڑپ نہیں بے قراری ہوتی ہے۔ یہ پورا ہفتہ بھی آپ کے متعلق سوچتے ہوئے ہی بیت گیا۔''

''گوری میری ایک خواہش پوری کروگی؟''

''آپ حکم دیں شاہ جی۔''

''حکم نہیں' بس خواہش ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''تم اچھی اچھی کتابیں پڑھا کرو۔''

''میری دسویں کی کتابیں تو اماں نے بیچ دیں ردی میں۔ ہمارے پاس گھر میں زیادہ جگہ نہیں ہے ناں چیزیں رکھنے کی۔''

''میں ان کتابوں کی بات نہیں کر رہا۔''

''پھر کن کتابوں کی بات کر رہے ہیں؟''

''تم نے شاعری پڑھی ہے؟''

''ہمارے کورس میں حالی اور علامہ اقبال کی شاعری تھی۔''

حیدر علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''میں اس شاعری کی بات نہیں کر رہا۔''

''اور تو میں نے کوئی شاعری نہیں پڑھی۔''

''اچھا میں تمہیں کتابیں لاکر دوں گا۔''

''ایک ایک کر کے لانا اور پھر لے جانا۔''

''کیوں؟ تمہیں چاہیے کہ تم کتابیں جمع کرو' چھوٹی سی ہی سہی اپنی لائبریری بناؤ۔''

''رہنے دیں' اماں سب کتابیں ردی میں بیچ دیں گی۔'' وہ بولی۔ ''اور پھر اماں جیسا تفتیشی افسر تو کوئی بھی نہیں ہوگا۔ انہیں تو کسی تھانے کا تھانے دار ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے مجھ سے اگلوا کر ہی دم لینا ہے کہ روز روز میں کہاں سے کتابیں لاتی ہوں۔''

''ایک تو یہ بھی بہت مسئلہ ہے۔'' وہ بولا۔ ''خیر یہ بھی دیکھ لیں گے۔ میں تمہیں کوئی بہت اچھا سا تحفہ دینا چاہتا ہوں...... بتاؤ کیا لاؤں تمہارے لیے؟''

''تحفہ بھی کبھی پوچھ کر دیا جاتا ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح ہنسی۔ ''تحفہ دینے والے کی پسند پر ہوتا ہے اور اس کا ذوق ظاہر کرتا ہے۔ لینے والا تو بس لے لیتا ہے۔''

''پھر بھی کسی چیز کی خواہش تو ہوگی۔''

''شاہ جی صرف آپ کے ساتھ کی خواہش ہے' آپ کا ساتھ مل جائے تو پھر کوئی آرزو باقی نہیں رہے گی۔''

حیدر علی کے ذہن میں زیب النساء کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''تم جانتے ہو کہ بابا جان تمہاری نسبت طے کر چکے ہیں؟''

اور پھر وہ چلایا تھا۔ ''کیا؟ کب کر چکے ہیں؟ کس سے کر چکے ہیں؟''

''ماموں جان کی بیٹی فوزیہ سے۔'' تب زیب النساء نے اسے بتایا تھا۔

''کہاں گم ہو گئے آپ؟'' زرینہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

وہ چونک اٹھا تو زرینہ ہنس پڑی۔ ''اتنے گم کہاں تھے میں تو یہاں آپ کے سامنے ہوں۔''

''ہمیشہ میری نظروں کے سامنے ہی رہنا گوری۔'' وہ ہولے سے بولا۔

''آپ نے مجھ سے میری خواہش پوچھی تھی۔ میں نے آپ کو بتا دی لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔''

''تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی۔'' اس نے زرینہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اس جنم میں بھی اور اگلے جنم میں بھی۔''

''بس شاہ جی! یہی میرا تحفہ ہے۔ اس کے بعد کوئی حاجت' کوئی تمنا نہیں ہے۔'' اس نے آنکھیں موند لیں۔

''گوری!'' تھوڑی دیر بعد حیدر علی نے اسے پکارا۔

''ہوں۔''

''میں نے تمہارے متعلق بات کی تھی۔''

''کس سے؟'' وہ گھبرا گئی۔

''اپنی زیبی آپی سے' ان سے میں کچھ نہیں چھپاتا۔''

''میں نے آپ کو منع بھی کیا تھا۔'' وہ گھبراہٹ سے بولی۔ ''کسی کو خبر ہو گئی تو اچھا نہیں ہو گا۔''

''ظاہر ہے آج نہیں تو کل مجھے گھر والوں کو بتانا ہی تھا۔ زیبی آپی سے میں کچھ نہیں چھپا سکتا۔''

''پھر کیا کہا انہوں نے؟'' زرینہ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''مجھ سے؟'' وہ پریشان ہو گئی۔ اس کے ذہن میں رضیہ کی آواز گونجنے لگی۔

''تم احمق اور بے وقوف ہو۔ زندگی لفظوں کے سہارے نہیں گزر سکتی۔ ذرا سوچو زرینہ پیر صاحب کے گھرانے کی عورتوں کے درمیان تمہاری کیا وقعت' کیا حیثیت ہو گی؟ تمہیں کبھی وہ مرتبہ وہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکے گا جو ان سیّد زادوں کو حاصل ہے۔ ہم کون ہیں ان کے سامنے؟ انہی کے ٹکڑوں پر پلنے والے عام سے لوگ۔ یاد رکھو' جب تک تم مولوی نعمت اللہ کی بیٹی کی حیثیت سے وہاں آتی جا[illegible] رہو گی تب تک تمہاری قدر بھی رہے گی اور تمہیں عزت بھی ملے گی لیکن جس دن انہیں معلوم [illegible]ا کہ اب تم چھوٹے شاہ جی کے عشق میں گرفتار ہو اور ان کی محبوبہ ہو۔ اس دن تمہاری حیثیت دو کوڑی کی ہو جائے گی ان لوگوں کے سامنے۔ ابھی تم مہر النساء اور زیب النساء کے برابر بیٹھتی ہو۔ تب تمہیں ان کے پیروں کے پاس بھی جگہ نہیں ملے گی۔''

لیکن اس وقت اس نے رضیہ کی بات کو بالکل اہمیت نہیں دی تھی۔ آج جب حیدر علی نے اس سے زیب النساء سے ملنے کے لیے کہا تو اس کے ذہن میں کتنے ہی خدشات جاگ اٹھے۔

''اب تم کہاں گم ہو؟'' حیدر علی نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''نہیں' کہیں نہیں۔'' وہ واپس آ گئی۔

''تم گھبراؤ نہیں۔ زیبی آپی بہت اچھی ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے شاہ جی! میں انہیں جانتی ہوں' وہ واقعی بہت اچھی ہیں لیکن اگر انہیں میری یہ جرأت بری لگی تو؟''

''وہ میری خوشیوں کو اپنی خوشیاں سمجھتی ہیں' تم فکر مت کرو۔''

☆======☆======☆

حویلی میں قدم رکھتے ہوئے پہلی مرتبہ وہ ڈگمگا رہی تھی۔ ساری رات وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ کل کیا ہو گا اور ساری رات اسی پریشانی میں گزر گئی تھی۔

''خیر کچھ بھی ہو' میں چھوٹے شاہ جی کو نہیں چھوڑ سکتی۔'' اس نے تہیہ کیا ہوا تھا۔

قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے اس نے حیدر علی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ وہاں کہیں نہیں تھا۔

"خدا کرے کہ میری وکالت کے لیے وہ وہیں زیب النساء کے کمرے میں ہوں۔" اس نے سوچا۔

لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کشادہ کمرے میں لکڑی کے بھاری فرنیچر اور زیب النساء کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ جھجک کر دروازے میں ہی رک گئی تھی۔

"اندر آجاؤ باہر کیوں کھڑی ہو؟" زیب النساء کے ہونٹ ہلے۔

زرینہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر چلی آئی۔ زیب النساء مسہری سے اٹھ کر دروازے تک گئی پھر دروازہ بند کر کے اس کی طرف پلٹی۔

"تم حیدر علی سے محبت کرتی ہو؟" اس نے بند دروازے کے سامنے کھڑے کھڑے پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے تو زرینہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ اسے اتنے واضح اور غیر مبہم سوال کی توقع نہیں تھی۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔"

"جی۔" اس نے ہمت کر کے جواب دیا۔

زیب النساء ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی زرینہ کو عام ہنسی سے بہت مختلف لگی۔ اس ہنسی میں عجیب سی وحشت اور جنون تھا۔

"بہت بھولی ہو تم۔" زیب النساء کی ہنسی تھمی تو وہ بولی۔ "یہ حویلی کتنی بڑی ہو گی؟"

زرینہ کو اس کی بات کا مطلب بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ "جی۔"

"میں نے پوچھا ہے کہ یہ حویلی کتنی بڑی ہو گی؟"

"بہت بڑی۔" اس نے جی کڑا کر کے جواب دیا۔

"اور اس میں رہنے والے کتنے بلند مرتبہ لوگ ہیں؟"

"بہت بلند جیسے آسمان پر ٹکے ہوئے چاند اور تارے۔"

"ہاں چاند اور تارے بہت خوشنما ہوتے ہیں' لیکن بس دور دور سے' کہنے والے کہتے ہیں کہ چاند میں داغ ہے' ہو گا' مجھے نہیں معلوم کیونکہ اس حویلی کی عورتیں اتنی بلند مرتبہ ہیں کہ چاند کی چاندنی کو بھی انہیں چھو کر آلودہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

تم بہت خوش قسمت ہو زرینہ' جو چاند اور ستاروں کو دیکھ سکتی ہو۔ بادلوں اور فضا میں اُڑتے پنچھیوں کو گننے کی کوشش کر سکتی ہو۔ اپنا بھائی مجھے جان سے بھی پیارا ہے اور تم میرے بھائی کی پسند ہو اس لیے زرینہ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ بھاگ جاؤ یہاں سے' یہاں انسان نہیں تقدس اور تکریم کے سائے بستے ہیں اور تقدس و تکریم کی اس فضا میں دم گھٹنے لگتا ہے۔

"یہ دیوار دیکھ رہی ہو؟" اس نے زور سے ایک دیوار پر ہاتھ مارا۔ "یہ اتنی مضبوط ہے کہ اس

میں آج تک نقب نہیں لگ سکا۔ یہ اتنی موٹی ہے کہ تمہاری چیخوں کی آواز بھی باہر نہیں جا سکتی اور اتنی اونچی کہ یہاں تازہ ہوا کا گزر بھی ممکن نہیں ہے۔

یہ بستر دیکھ رہی ہو؟" اس نے مسہری کی جانب اشارہ کیا۔ "یہاں میری پھوپھو نے اٹھارہ سال کی عمر میں دم توڑا تھا اور اب ان کی روح اس کمرے میں بھٹکتی رہتی ہے۔ پوری حویلی میں بھٹکتی رہتی ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی ہیں۔ مجھے حویلی سے نکل بھاگنے کو کہتی ہیں۔

زرینہ! بھول جاؤ کہ تم نے حیدر علی شاہ سے محبت کی تھی۔ اول تو تم اس بلند و بالا حویلی میں داخل نہیں ہو سکتیں اور اگر تم اس میں آ گئیں تو یہاں تمہارا دم گھٹ جائے گا' جیسے میرا دم یہاں گھٹتا ہے۔ کوئی تمہاری چیخیں سننے والا نہیں ہو گا' جیسے میری چیخیں اس کمرے میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چلی جاؤ' بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ سب راستے بند ہو جائیں گے اور تم ان دیواروں سے سر ٹکرانے کے لیے تنہا رہ جاؤ گی۔ جیسے میرے لیے سب دروازے بند ہیں۔ جیسے میں دیواروں سے سر ٹکراتی ہوں۔ چلی جاؤ یہاں انسانوں کا نہیں سایوں اور روحوں کا بسیرا ہے۔"

"بھاگ جاؤ چلی جاؤ یہاں انسانوں کا نہیں سایوں اور روحوں کا بسیرا ہے۔" کمرے میں زیب النساء کی آواز بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔

زرینہ کے منہ سے خوف کے مارے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ اس نے بند دروازے کے سامنے کھڑی زیب النساء کو دھکا دیا اور پاگلوں کی طرح باہر بھاگ کھڑی ہوئی۔

☆======☆======☆

حویلی میں رجب علی شاہ کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو چکی تھیں۔ یوں تو شادی مہینہ بھر بعد ہونا طے پائی تھی لیکن ابھی سے حویلی کے در و دیوار کو سجایا جا رہا تھا۔

سجاوٹ کا تمام تر سامان لاہور سے منگوایا گیا تھا۔ گاؤں کی کئی عورتیں اور مرد کام میں جتے ہوئے تھے' فرش چمکائے جا رہے تھے۔ چھت اور دیواروں کو بجلی کے قمقموں سے روشن کیا جا رہا تھا۔ پرانا سامان کام کرنے والوں کو عنایت کر کے کمروں کو نئے سامان سے آراستہ کیا جا رہا تھا۔ نئے قالین' نئے پردے' نئے صوفے اور نئے برتن غرضیکہ ہر چیز نئی اور چمکدار تھی۔

غریبوں کے لیے لنگر کھول دیا گیا تھا۔ شام کو مردانے میں بھانڈوں اور ہیجڑوں کی محفل جم جاتی تھی اور گاؤں کے تقریباً سبھی مرد تماشا دیکھنے کے شوق میں وہیں جمع ہو جاتے تھے۔ ہر طرف میلے کا سا سماں تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ آخر پیر صاحب جلال الدین شاہ کے سب سے بڑے فرزند اور گدی نشین رجب علی شاہ کی شادی ہونے والی تھی۔

کتنے برسوں بعد اس گھر میں ایسی کوئی خوشی آئی تھی۔ کتنا ارمان تھا نذری بیگم کو اپنے فرزند اکبر کی شادی کا' کتنا چاؤ تھا بہو کا اور کتنی خواہش تھی پوتوں کو اپنے ہاتھ میں کھلانے کی۔ یاسمین میں وہ سب خوبیاں موجود تھیں جن کی وہ آرزو مند تھیں۔ خوبصورت' سلیقہ مند' پردے کی پابند'

خاموش طبع اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پانچ سو مربع راضی کی واحد وارث۔

پیر صاحب یوں بھی خوش تھے کہ وہ ان کے چھوٹے بھائی کی اکلوتی اولاد تھی۔ انہوں نے رجب علی اور یاسمین کا رشتہ یاسمین کی پیدائش سے پہلے ہی طے کر دیا تھا۔ چھوٹے بھائی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے حکم سے سرتابی کرے۔ اس کے لیے ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ حرفِ آخر کا درجہ رکھتے تھے۔ خاندان سے باہر تو یوں بھی رشتہ دینے کا سوال ہی نہیں تھا' پھر رجب علی شاہ تو ان کا بھتیجا تھا اور پیر صاحب کا گدی نشین بھی۔ ان کی بیٹی کے لیے اس سے اعلیٰ گھرانہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔

یاسمین کے والد اور پیر صاحب کے چھوٹے بھائی نے اپنی سی تمام کوشش کر ڈالی تھی لیکن ان کی قسمت میں اولادِ نرینہ نہیں تھی۔

یاسمین ان کی اکلوتی اولاد تھی' اس لیے تمام زمین اور جائیداد اسی کے نام تھی۔

رجب علی شاہ کی گردن مزید اکڑ گئی تھی۔ اسے یاسمین یا اپنی شادی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپی اس جائیداد میں تھی جو وہ جہیز کی صورت میں اپنے ساتھ لا رہی تھی۔

دادا کی وفات کے بعد جو جائیداد دو بھائیوں میں تقسیم ہو گئی تھی' وہ پھر واپس اسی گھرانے میں آ رہی تھی۔ حویلیاں دگنی ہونے والی تھیں' زمینیں اور موٹریں دگنی ہونے والی تھیں اور اس کی رعیت بھی دگنی ہونے والی تھی۔ یہ سب باتیں اس کی دستار میں نئے چمکتے ہوئے ستاروں کا اضافہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔ کچھ عرصہ قبل تک اس کی گردن میں جو ہلکا سا خم باقی تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی وہ بھی نکل گیا تھا اور اب اس کی گردن میں مزید کلف لگ گیا تھا۔

حیدر علی شاہ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ لاہور سے کپڑے لتے کی خریداری' کمروں کی سجاوٹ کے لیے نئے ساز و سامان کی پسند ناپسند' حویلی کی آرائش کے لیے بجلی کا سامان ان سب چیزوں کی ذمہ داری اسی کے سر تھی۔ اس کی ایک ٹانگ نیاز پور میں ہوتی تو دوسری لاہور میں' اسے اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ خالہ کبریٰ کو اپنی مسلسل غیر حاضری کی کوئی معقول سی وجہ بتا کر ان سے معذرت کر لے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے زرینہ کا خیال بھی ستا رہا تھا۔ اسے بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ بھائی کی شادی کی وجہ سے وہ مصروف ہے اور فی الحال اس سے ملنے نہیں آ سکتا۔

''کیا سوچتی ہو گی گوری۔'' اپنی کار کے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے لاہور کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ ''میں اس قدر غیر ذمہ دار ہوں کہ اسے اپنے نہ آنے کی اطلاع بھی نہ دے سکا۔ پتا نہیں کیا کچھ سوچا ہو گا اس نے میرے بارے میں۔ سنگدل' بے وفا' وعدہ خلاف اور نہ جانے کیا کیا۔''

اس کے ہونٹوں پر خود ہی مسکراہٹ آ گئی لیکن اسے منانا مشکل نہیں ہو گا بس پیار کی ایک

نظر ہی کافی ہو گی' اسے راضی کرنے کے لیے..... اس کے سب گلے شکوے ساری شکایات پل بھر میں ختم ہو جائیں گی اور پھر اس کی محبت بھری نگاہ سے میری تمام تھکن بھی اتر جائے گی۔

اس کے لبوں سے بے تابی سے نکلنے والے لفظ ''شاہ جی'' سے کائنات کے تمام رنگ بدل جائیں گے۔ پھول کھل اٹھیں گے' سورج کی چمک بڑھ جائے گی' پرندے چہچہا اٹھیں گے' صبح کا دیوتا ساری دنیا پر رنگوں کی بارش کرے گا۔ تتلیوں کے رنگ روپہلے ہو جائیں گے' ساری کائنات مہک اٹھے گی۔ فقط ان دو چھوٹے سے الفاظ سے۔

''شاہ جی!''

اس کے لبوں سے محبت کی شیرینی میں رچے ان لفظوں سے بڑھ کر بھی بھلا کائنات میں کوئی اور چہکار ہو گی۔

حیدر علی نے تیزی سے ایک بس کو اوورٹیک کیا اور ونڈ اسکرین سے پار نظر آنے والی لمبی سیدھی سڑک پر نظریں گاڑ کر پھر زرینہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

''پتا نہیں وہ زیبی آپی سے ملی یا نہیں۔ شاید نہ ہی ملی ہو' وہ تو اس تصور سے ہی گھبرا رہی تھی۔ سامنا کرنے کا تو اس میں حوصلہ ہی نہیں ہو گا۔ بے کار کی جھجک اور شرم و حیا' لیکن خیر میرے ساتھ رہے گی تو خود ہی حوصلہ اور جرأت بھی آ جائے گی اور جھجک بھی ختم ہو جائے گی۔ ہاں شرم و حیا ایک حد تک ہونی چاہیے لیکن اتنی بھی نہیں کہ وبال جان بن جائے۔

اگر گوری' زیبی آپی سے ملی ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتیں کہ وہ آئی تھی۔ کس طرح گھبرائی اور جھجکی تھی اور بالآخر یہ جان کر کہ زیبی آپی کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے وہ کس طرح ہنسی تھی۔

زیبی آپی جس طرح مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہیں' اسی طرح مجھ سے منسلک ہر چیز سے بھی ویسی ہی محبت کرتی ہیں۔ میری ہر خوشی کو اپنی خوشی سمجھتی ہیں اور میری ہر پسند کو اپنی پسند۔ مجھے یقین ہے کہ اب جب گوری ان سے نئے رشتے کے حوالے سے ملے گی تو زیبی آپی وہ سب محبتیں اس پر نچھاور کر دیں گی جو ان کے پاس پہلے صرف میرے لیے تھیں۔ وہ اسے میری پسند ناپسند کے متعلق بتائیں گی' میری بے قراریوں کی داستان اسے سنائیں گی اور ہو سکتا ہے کہ میرے وہ سب غیر سنجیدہ معاشقے بھی اسے سنا ڈالیں جو انگلینڈ میں میں نے بہت شوق سے کیے تھے۔ وہ اس کا تصور کر کے ہی ہنس دیا تھا۔

اور جب گوری کو خبر ہو گی کہ اس سے پہلے بھی کم از کم تین گوریاں میری زندگی میں آ چکی ہیں تو وہ غصے سے منہ پھلائے گی اور جب میں اسے منانے کی کوشش کروں گا تو وہ رخ بدل لے گی' پھر جب میں اسے یہ بتاؤں گا کہ ایماء کٹی اور جوڈی تو صرف مسافر تھیں جو تمہاری تلاش کے سفر میں چند لمحوں کے لیے میرے قدموں سے قدم ملا کر چلی تھیں' میری منزل تو صرف تم ہو

گوری...... تو وہ ایک دم سے کھل اٹھے گی' ہنس پڑے گی اور کائنات میں تمام زندگی ایک مرتبہ پھر رواں دواں ہو جائے گی جیسے Sleeping Beauty (سلیپنگ بیوٹی) کے جاگتے ہی سو ہوا سارا محل جاگ اٹھا تھا۔ پھر وہ میرے بازوؤں میں آ کر کہے گی۔

''شاہ جی اب آپ کی تلاش تمام ہو گئی ہے' اب آپ کی زندگی میں ہمسفر کی گنجائش ہے کہ مسافر کی نہیں۔''

☆======☆======☆

جس دن سے رجب علی شاہ ولایت سے واپس آیا تھا تب سے زمینوں اور جائیداد کے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ وہ تمام معاملات جو اس سے قبل پیر صاحب یا ان کے خاص آدمیوں کے ہاتھ میں تھے۔ اب رجب علی شاہ نے پیر صاحب کی مرضی سے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ یوں بھی وہ اسے اپنی گدی پر بیٹھنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے اس لیے اب اس کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ انہیں اس سے بہت سی توقعات تھیں۔

''ہمیں یقین ہے کہ کچھ ہی عرصے میں رجب علی سب انتظام بہ حسن و خوبی سنبھال لے گا۔'' وہ نذری بیگم سے کہہ رہے تھے۔

''ماشاءاللہ آخر ولایت کا تعلیم یافتہ ہے۔'' نذری بیگم صدقے قربان ہو جانے والے لہجے میں بولیں۔

''تعلیم تو حیدر نے بھی وہیں سے حاصل کی ہے لیکن وہ اپنی تہذیب اور روایتیں ہی بھول گیا ہے' ہر بات میں جرح کرنے کی عادت ہو گئی ہے اسے۔''

''ابھی بچہ ہے' شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا' خود ہی۔'' وہ جلدی سے بولیں۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو' لیکن ہمیں اس کے کچھ زیادہ آثار نظر نہیں آتے۔'' پیر صاحب بولے۔ ''اس دن اس نے ہم سے گستاخی کی۔ نہ صرف گستاخی کی بلکہ وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ بھی نہیں ہوا۔''

''آپ اپنا دل برا نہ کریں' اندر سے وہ یقیناً شرمندہ ہو گا۔'' انہوں نے جلدی سے بیٹے کا دفاع کیا۔

''ایسی شرمندگی کا کیا فائدہ کہ اس نے ہم سے معافی مانگنے کی زحمت بھی نہیں کی۔'' پیر صاحب نے کہا۔ ''وہی بات جو اس نے کہی' اگر کسی اور نے کہی ہوتی تو ہم اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتے۔ حیف کہ ایسی بے ہودہ بات ہمارے اپنے بیٹے نے اپنے منہ سے نکالی اور ہماری بے بسی کہ ہم غصے سے کھول کر رہ گئے۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکے اسے۔ اولاد انسان کی بہت بڑی کمزوری اور آزمائش ہوتی ہے۔''

''میں اسے سمجھا دوں گی' اتنا سا بچہ تو تھا جب یہاں سے گیا تھا۔ اسے کیا خبر کہ یہاں کے

طور طریقے اور رسم و رواج کیا ہیں۔ یہاں رہے گا تو سمجھ آتی جائے گی اور جب اس کی اپنی اولاد ہو گی تو پھر کسی کے کچھ کہنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔ وہ خود ہی اس رنگ میں رنگ جائے گا۔ جس کے پاؤں میں جوتا ہوتا ہے اسی کو خبر ہوتی ہے کہ وہ کہاں سے اور کتنے زور سے کاٹ رہا ہے۔ ابھی اس کے پاؤں میں وہ جوتا ہی نہیں ہے لیکن آپ فکر نہ کریں' ایک نہ ایک دن یہ جوتا وہ بھی پہنے گا۔''

''کاش حیدر علی بھی رجب علی کی طرح فرمانبردار اور روایتوں کو قائم رکھنے والا ہوتا۔'' انہوں نے آہ بھری۔

''اللہ کے واسطے آپ علی کی طرف سے اپنا دل میلا نہ کریں' وہ بھولپن کی وجہ سے ایسا سوچتا ہے' آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''رجب علی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس گدی کا بالکل درست جانشین ہے۔'' وہ بولے۔ ''آتے ہی اس نے زمین اور جائیداد کے سب انتظام سنبھال لیے ہیں اور اب تو شادی کے بعد اس کی ذمہ داری بڑھ جائے گی۔''

''وہ سب ذمہ داریاں نبھانے کا اہل ہے۔''

''ہاں۔'' پیر صاحب کے انداز میں طمانیت تھی۔ ''بس اس کی شادی ہو جائے تو علی کے پاؤں میں بھی شادی کی بیڑیاں ڈال دینی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نظروں کے سامنے ہی ہماری اولاد کے گھر بس جائیں اور ہم انہیں اپنے اپنے گھروں میں شاد اور آباد دیکھ سکیں۔''

''آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ہے پیر صاحب! میں تو چاہتی ہوں کہ علی کے بعد سخاوت کی نسبت بھی طے کر دی جائے۔''

''صرف نسبت ہی طے نہیں کرنی اس کی بھی شادی کر دینی ہے۔ ہم نے رجب علی کو ڈھیل دے رکھی تھی کہ کچھ عرصہ آزادی کے ساتھ رہ لے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس عمر میں شادی کر رہا ہے وہ۔ حیدر علی کو تعلیم کے لیے باہر بھجوایا کہ پڑھائی کے بعد اس کی شادی ہوتی رہے گی لیکن وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اب ہم سخاوت کو یہ ڈھیل دینے پر بالکل تیار نہیں ہیں۔''

''درست فرمایا آپ نے۔''

''ہم سوچ رہے ہیں کہ سخاوت کے لیے کون سا گھرانہ مناسب رہے گا۔''

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو بڑے بھائی جان......''

ابھی نذری بیگم کی دبے دبے لہجے میں کی جانے والی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیر صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔

''وہاں سے حیدر علی کی دلہن فوزیہ آ رہی ہے' ہم نہیں چاہتے کہ ایک ہی گھر کی دو بہنیں ہماری بہوئیں بنیں۔''

’’جیسے آپ کی مرضی۔‘‘ سدا کی اطاعت گزار نذری بیگم نے اب بھی ان سے کوئی بحث کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان کی بات رد کرنے کے لیے کوئی دلائل دیے لیکن انہیں اس بات کا قلق ضرور تھا کہ ان کے بھائی کی دوسری بیٹی اور ان کی بہت پیاری بھتیجی اس حویلی میں دلہن بن کر نہیں آسکتی۔

’’سخاوت کے لیے میں کچھ سوچوں گا۔‘‘ یہ کہہ کر انہوں نے بات ختم کر دی۔

☆======☆======☆

منشی فضل دین، رجب علی شاہ کے سامنے کھڑا گھگھیا رہا تھا۔

’’شاہ صاحب! حساب کتاب میں ایک پیسے کی گڑبڑ بھی نہیں ہے، آپ بے شک سب کاغذوں کی پڑتال کر لیں۔‘‘

’’کاغذات چیک کر لیے ہیں، میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔‘‘ رجب علی شاہ نے اسے ڈپٹا۔ ’’کیا نام ہے تمہارے اس بیٹے کا جو تانگہ چلاتا ہے؟‘‘

’’سرکار نام تو اس کا محمد اسلم ہے لیکن سب اسے اچھو ہی کہتے ہیں۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ اس نے ایک فائل میں لگے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ’’وہ تانگہ کہاں سے آیا اس کے پاس؟‘‘

’’سرکار! پیر صاحب نے خوش ہو کر اچھو کو عنایت کیا تھا۔‘‘

’’ایسی کیا خوشی تھی کہ انہوں نے اس کمی کمین کو سالم تانگہ بخش دیا؟‘‘ اس نے میٹھی نظروں سے منشی کی طرف دیکھا۔

’’حضور پشتوں سے آپ کے گھرانے کی خدمت کرتے چلے آرہے ہیں، اچھو نے پوری آٹھ جماعتیں پاس کی ہوئی ہیں۔ وہ کمانے کے لیے شہر جانا چاہتا تھا۔ پیر صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے اسے رک جانے کا حکم دے دیا اور گاؤں میں ہی اسے روزگار فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا۔‘‘

’’اور پھر اسے تانگہ بخش دیا۔‘‘ رجب علی نے تمسخر سے کہا۔

’’پیر صاحب کی عنایت ہے سرکار۔‘‘

’’ان کاغذات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے تمہارے بیٹے کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں پر ایسی ہی عنایت کی ہے۔‘‘ رجب علی صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

’’پیر صاحب کو اللہ تعالیٰ لمبی زندگی دے، وہ بہت دریا دل اور فیاض ہیں۔‘‘

’’ہونہہ۔‘‘ اس کے ہونٹ تمسخر سے سکڑ گئے۔ ’’تم لوگ چکنی چپڑی باتیں کر کے ان سے مختلف چیزیں ہتھیاتے رہے اور خوشامد کے لیے انہیں دریا دل اور فیاض ہونے کا خطاب دے دیا۔‘‘

’’سرکار ایسی بات ہرگز نہیں ہے، یہ سب کچھ انہوں نے اپنی خوشی سے ہمیں بخشا ہے۔‘‘ منشی جلدی سے بولا۔

’’بکواس بند کرو، میری بات کاٹتے ہو۔‘‘ اس نے منشی کو ڈپٹا۔ ’’آئندہ کسی نے میری بات کاٹی تو کھال میں بھس بھر دوں گا اس کی۔‘‘

’’غلطی ہوگئی سرکار۔‘‘ اس نے گھبرا کر رجب علی کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

’’جس، جس نے ہماری یا ہمارے خاندان کی خدمت کی ہے اسے حق محنت ملتا رہا ہے، تم بھی یہاں کے تنخواہ دار ملازم ہو۔ جتنی خدمت کی اس کا معاوضہ لیا۔ اور چاول کی جو بوریاں تم لوگ ہتھیا چکے ہو، چاہیں تو ہم تمہاری ناک کے راستے وہ سب باہر نکال سکتے ہیں، لیکن پھر بھی اس کے لیے ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ پر یاد رہے کہ آئندہ یہ سلسلہ نہیں چلے گا۔‘‘

’’جی حضور!‘‘

’’اور جو تانگہ تمہارے بیٹے کو ملا ہے آئندہ سے وہ ہمارے استعمال میں رہے گا۔ ہاں تم پر اتنا کرم کیا جاسکتا ہے کہ ہم تمہارے بیٹے کو اپنا ملازم رکھ لیں اور وہ تانگہ بدستور وہی چلاتا رہے۔‘‘

☆======☆======☆

''یہ کہاں کا انصاف ہے ابا کہ پہلے چیز دی اور اب واپس لے رہے ہیں۔'' اچھو غصے سے بل کھا رہا تھا۔ ''مجھے ساری دنیا سے بڑھ کر عزیز ہے اپنا تانگہ اور گھوڑا۔ دیکھ لیں اس گاؤں میں کیا ارد گرد کے بیس گاؤں میں آپ کو میرے راجا جیسا گھوڑا اور میرے تانگے جیسا تانگہ نہیں ملے گا۔ پیر صاحب کے اصطبل میں بھی میرے راجا جیسا کوئی گھوڑا نہیں ہے۔ مجھے محبت ہے اپنی اس چھوٹی سی دنیا سے' میں یہ تانگہ ہرگز ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔''

''بکواس کیے جائے گا۔'' منشی فضل دین نے حقہ کونے میں رکھا اور خود بان کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ''اچھو کی ماں! اسے سمجھاؤ' یہ شاہ صاحب کا حکم ہے۔''

''شاہ صاحب کا حکم ہے کوئی قرآن کا حکم نہیں ہے کہ اس پر ضرور عمل کیا جائے۔ آخر ہمیں بھی جینے کا حق ہے۔''

''ہائے بیٹا! ایسی بات نہیں کرتے۔'' اچھو کی ماں دہل کر رہ گئی۔ ''منہ سے بھی نہیں نکالتے ایسی بات' فرشتے سن لیں تو آگ کے گرز تپانے لگتے ہیں۔''

''فرشتوں کو اس کے علاوہ بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ وہ سارا دن اس انتظار میں نہیں رہتے کہ ہم شاہ جی یا پیر صاحب کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالیں اور وہ گرز آگ پر تپانے لگیں۔''

''ہائے میرے مولا۔'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''ماں' اب وہ وقت نہیں رہا جب ہماری حیثیت محض ہاتھ باندھے غلام کی سی تھی۔ یہ کوئی اندھیر نگری نہیں ہے' ہمارے منہ میں بھی زبان اور بازوؤں میں طاقت ہے۔ دیکھتا ہوں کون میرے راجا کو لے جاتا ہے۔''

''دیکھ لیا۔'' منشی فضل دین چلایا۔ ''دیکھ لیا اپنے بیٹے کو اچھو کی ماں' یہی دن دیکھنا رہ گیا تھا کہ یہ شاہ صاحب کی حکم عدولی کرے۔''

''نہ بیٹا ایسا نہیں کہتے' کیوں اپنی عاقبت خراب کرنے پر تلا ہوا ہے۔''

''کیوں' کیا قیامت کے دن لوگوں کو جنت جہنم میں بھیجنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے رجب علی شاہ نے؟''

''کفر کی باتیں نہ نکالا کر منہ سے۔'' اماں اس سے بھی زیادہ اونچی آواز میں بولیں اور پھر اچھو سے مخاطب ہوئیں۔ ''اور تُو کیوں خدا رسولؐ کی ناراضگی لینے پر تلا ہوا ہے؟''

''خدا' رسولؐ نے کہیں نہیں کہا کہ کوئی تمہارے جھکے ہوئے سر پر جوتے لگائے تو وہ چپ چاپ کھا لو۔''

''تیرے سر پر تو میں لگاؤں گا سو جوتے اور گنوں گا ایک' جا دفع ہو جا یہاں سے' جہنمی۔'' منشی نے ڈراوے کے لیے پاس ہی فرش پر پڑا ہوا جوتا اٹھا لیا۔

''ہونہہ!'' اچھو غصے سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''آٹھ جماعتیں کیا پڑھ لیں' خوفِ خدا ہی نہیں رہا دل میں' اہل بیت پر چڑھ دوڑنے لگا۔'' منشی بڑبڑائے جا رہا تھا۔ ''تعلیم نے مت ماردی ہے اس کی' ابھی کل ہی خط لکھتا ہوں سلیم کو کہ کالج چھوڑ کر گھر واپس آ جائے۔ اس کے آٹھ جماعتیں پڑھ کر یہ لچھن ہیں تو وہ چودہ پڑھ کر کیا گل کھلائے گا۔ باپ دادا کا نام یہی بھائی مٹی میں ملائیں گے۔''

''ہونہہ! باپ دادا کا نام۔'' اچھو صحن سے ابھرتی باپ کی بڑبڑاہٹ سن کر مزید جھلا گیا۔ ''نام کیا ہیں باپ' دادا اور پردادا کے فجو' مجو اور دینو کہنے کو ہیں فضل دین...... عبدالمجید اور دین محمد لیکن گاؤں بھر میں کسی کو یہ نام یاد بھی ہیں ان کے؟ کسی سے پوچھو کہ دین محمد کا آبائی محل کہاں ہے تو ٹکر ٹکر منہ دیکھنے لگا اور پوچھو کہ دینو کی بارگاہِ عالیہ کون سی ہے تو لا کر اس ٹاٹ کے پردے والے عالیشان محل پر چھوڑ جائے گا۔

اور میں محمد اسلم عرف اچھو' باپ دادا اور پردادا کے عظیم ناموں کا محافظ ہوں واہ واہ دینو' مجو' فجو اور اب اچھو! اور پھر میرے آدھ درجن بچے آ جائیں گے یہ آبائی نام سنبھالنے اور حویلی کے کام نمٹانے کے لیے۔''

وہ دھپ سے بستر پر بیٹھ گیا' جس کی چولیں پہلے ہی ہلی ہوئی تھیں۔ ''میرے راجا کو لے جانے آئے تو سہی کوئی ٹانگیں توڑ کر ہاتھ میں پکڑا دوں گا اس کی۔ ایک ہی محبت کی ہے' میں نے پوری زندگی میں کسی قیمت پر کسی کو اپنی یہ محبت چھیننے نہیں دوں گا۔''

اس کی نظروں کے سامنے تقریباً سال بھر پہلے کا وہ منظر گھوم گیا جب وہ منشی فضل دین سے شہر جانے کے لیے لڑ رہا تھا۔

''کیا رکھا ہے اس گاؤں میں ابا' سارا دن کولہو کے بیل کی طرح جتے رہتے ہیں آپ اور ملتا کیا ہے؟ دو وقت کی سوکھی روٹی۔ کبھی پیر صاحب کو ترس آ جائے تو ڈھائی سو مربعوں پر اُگی گندم کی پوری فصل میں سے ایک بوری بخش دیتے ہیں۔ دنیا میں بھی کما رہے ہیں اور آخرت کا انتظام

بھی پورا ہے۔ ہم تو وہ بد بخت ہیں جنہیں نہ دنیا میں کچھ مل رہا ہے اور نہ ہی آخرت میں کچھ ملنے کی امید ہے۔''

''تجھے تو سچ مچ کچھ نہیں ملے گا آخرت میں۔ دنیا بھی اپنے ہاتھوں برباد کر رہا ہے اور عقبیٰ بھی۔'' منشی جو پیر صاحب کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا گھر میں شیر کی طرح دھاڑتا تھا۔

''میں نے نہیں درخواست دی تھی اللہ میاں کو اس پھٹے پرانے گھر میں پیدا کرنے کے لیے جہاں دو وقت کی روٹی بھی باتیں سن کر ہی کھانے کو ملتی ہے اور نہ ہی رجب علی' حیدر علی اور سخاوت علی نے ایسا کوئی کارنامہ کیا تھا کہ ان کے حصے میں اتنی اونچی حویلی آ جاتی۔''

''اسی لیے تیری دنیا نہیں سنورتی کہ اہل بیت پر بات کرنے سے باز نہیں آتا۔''

''آپ تو بات نہیں کرتے ان پر پھر آپ کی دنیا کیوں خراب ہے؟'' وہ جل کر بولا۔

''میری دنیا بہت اچھی ہے' بہت خوش ہوں میں یہاں۔ اللہ پاک دو وقت کی روٹی عزت سے دے رہا ہے' اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''تو آپ اپنے اس دیمک زدہ گھر میں خوش رہیں' میں جا رہا ہوں شہر دنیا اور آخرت میں سے کوئی ایک تو ہاتھ آئے۔''

''ہر پھر کر شہر جانے کی بات کرتا ہے' تو ہلا بھی یہاں سے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

''شکر ہے ابا کہ باہر کسی نے یہ بات نہیں کی' خواہ مخواہ میرے اوپر قتل کا کیس بن جاتا۔ آپ کو پتا ہے ناں کہ آپ کی مار میں سر جھکا کر کھا لوں گا' ورنہ ابھی میری ٹانگیں توڑنے والا پیدا ہی کوئی نہیں ہوا۔''

''بڑا آیا پہلوان کی اولاد۔'' منشی بڑبڑایا۔

''شیخی نہیں بگھارتا' لیکن گاؤں کا کوئی جوان بھی پیٹھ نہیں لگا سکتا میری' جو ہاتھ میری طرف بڑھے گا اس کی ہڈیاں نہ چُرمرا کر رکھ دوں موم کی طرح۔''

''تب دیکھوں جو اپنے باپ کی ہڈیاں موم کی طرح چُرمرا دے۔'' منشی کو بھی تاؤ آ گیا تھا۔

''ایک آپ سے ہی تو نہیں لڑ سکتا۔'' وہ ہار کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''اب ہلنا نہیں ہے یہاں سے رات تک۔'' منشی نے حکمیہ انداز میں کہا۔

''ابا مجھے کسرت کرنے جانا ہے شام کو۔'' اس نے گویا فریاد کی۔

''میں نے کہا ناں ہلنا نہیں ہے۔'' منشی ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر باہر گلی میں نکل گیا۔

پیر صاحب کے پاس جا کر اس نے اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔

''دو ہی تو بیٹے ہیں میرے پیر صاحب! دل پر پتھر رکھ کر سلیم کو پڑھنے کے لیے بھجوایا ہے۔ اب اچھو بھی جانا چاہتا ہے شہر میں۔ جوان اولاد پر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے کیسے روکوں گاؤں میں۔''

''اس کا دل کیوں نہیں لگتا گاؤں میں؟'' پیر صاحب نے پوچھا۔

''حضور کمانے کی دھن میں شہر جانا چاہتا ہے۔''

''کما تو یہاں بھی سکتا ہے وہ۔'' پیر صاحب بولے۔

''اسے جنون ہو گیا ہے تانگہ چلانے کا۔ کہتا ہے شہر جا کر محنت مزدوری کروں گا پھر پیسے جمع کر کے ایک شاندار سا تانگہ خریدوں گا۔ سوچتا ہوں' اس کی جلدی سے شادی کر دوں شاید اس طرح ٹک جائے یہیں۔''

''کہاں شادی کرنا چاہتا ہے تمہارا بیٹا؟''

''سرکار مسئلہ تو یہی ہے کہ شادی پر بھی راضی نہیں ہوتا۔'' پھر خوشامدانہ انداز میں ان کے گھٹنے پکڑ کر بولا۔ ''حضور آپ اسے فوری شادی کا حکم دے دیں۔ میں دو دن میں اس کی بات پکی کر کے بارات بھی لے جاؤں گا۔''

''اپنے بیٹے کو ہمارے پاس بھیجنا۔'' یہ کہہ کر پیر صاحب اٹھ گئے۔

شام کو منشی خوشی سے سرشار گھر پہنچا تو اچھو اسی چارپائی پر بیزاری کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔

''یہ کہیں باہر تو نہیں گیا تھا؟'' اس نے آتے ہی اچھو کی ماں سے سوال کیا۔

''بیڑیاں پہنا کر جایا کریں ابا تاکہ یہ سوال کرنے کی زحمت نہ ہو۔'' وہ جل کر بولا۔

''بیڑیاں تو میں ایسی ڈالوں گا تیرے پاؤں میں کہ ساری زندگی ہلنے جلنے کے قابل نہیں رہے گا۔''

اچھو کے کان کھڑے ہو گئے۔

''پیر صاحب سے بات کی؟'' ماں بھی لپک جھپک باہر صحن میں نکل آئیں۔

''ہاں' انہوں نے طلب کیا ہے اسے۔''

''کیوں؟'' اچھو کا تحمل جواب دینے لگا۔

''تیرے لیے گوند کا انتظام کر رہے ہیں تاکہ چپکا رہ اس گاؤں سے۔''

''ابا! یہ اچھا نہیں کیا آپ نے۔'' وہ پاؤں پٹختا کمرے میں گھس گیا۔

ماں کی نظریں اس وقت تک اس کا تعاقب کرتی رہیں جب تک کمرے میں داخل ہو کر اس نے زوردار آواز کے ساتھ لکڑی کا بوسیدہ سا دروازہ بند نہیں کر دیا۔

''بھلئے لوکے! جلدی سے سوچ کوئی لڑکی تاکہ پیر صاحب کو بتا کر اس کی بات پکی کروں۔''

''اللہ جانے شادی کے نام سے اتنا بدکتا کیوں ہے' ورنہ لڑکیاں تو کتنی ہی ہیں۔ گاؤں کے سارے لڑکے ٹیڈی بن کر کرمو پان والے کی دکان پر کھڑے رہتے ہیں لیکن اسے اکھاڑے میں کشتیاں لڑنے اور ڈنڈ پیلنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔''

"کسرت کرنے والوں کے دماغ ذرا موٹے ہوتے ہیں لیکن کوئی حرج نہیں ہے۔ بہو آ کر سب کچھ سنبھال لے گی۔ ابھی تو لڑکیوں کو دیکھ کر بدکتا ہے جب دولہا بن کر کمرے میں جائے گا تو اپنی دلہن کو دیکھ کر ساری کسرت اور پہلوانی بھول جائے گا۔ بس کچھ دن کی بات ہے۔"

اور پھر منشی اس کے تمام تر احتجاج کو نظرانداز کر کے کان سے پکڑ کر اسے حویلی میں لے آیا۔

"ابا میری یہ بے عزتی کسی اور نے کی ہوتی تو مزہ چکھا دیتا اسے۔" اچھو غصے سے زیرلب بولا۔ "سارا گاؤں دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا کہ جس جوان کی پیٹھ دور نزدیک کے کسی گاؤں کا کوئی فرد نہیں لگا سکتا اسے اس کا باپ کان سے پکڑ کر چوہے کی طرح گھسیٹ رہا ہے۔"

"بچو! ابھی تو وہ آئے گی جو تجھے کان سے بھی پکڑے گی اور مزہ بھی چکھائے گی۔"

اچھو دانت پیس کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر میں پیر صاحب تشریف لے آئے۔ دونوں باپ بیٹا ان کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"یہ ہے تمہارا بیٹا؟" انہوں نے منشی کو مخاطب کیا۔

"جی سرکار۔" منشی نے ہاتھ باندھے۔

"کیوں برخوردار شہر کیوں جانا چاہتے ہو؟"

"جناب بہتر روزگار کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں۔" اس نے ادب سے کہا۔

"روزگار یہاں بھی بہت ہے، تم کھیتوں میں کام کر سکتے ہو۔ حویلی میں بہت سے کام ایسے ہیں جن کے لیے تم جیسے نوجوان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، پھر کیوں بھاگنا چاہتے ہو یہاں سے؟"

"ان کاموں میں میرا دل نہیں لگتا۔" وہ دبے دبے انداز میں بولا۔

"کیوں، کہاں دل لگایا ہوا ہے تم نے؟ اگر کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو نام بتاؤ۔ تمہارے باپ کی برسوں کی خدمت کے عوض ہم تمہاری شادی اس جگہ کروا دیں گے۔" پیر صاحب کی آواز میں رعب اور دبدبا تھا۔

"شادی صرف ابا کی ضد ہے سرکار......" وہ جلدی سے اپنی صفائی میں بولا۔ "میں نے تو آج تک گاؤں کی کسی لڑکی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ چاہے سارے گاؤں سے پوچھ لیں آپ۔"

"حضور یہ ٹھیک کہتا ہے، اس کم ذات کو شادی کا شوق بھی نہیں ہے۔"

"تم چپ رہو منشی، ہمیں لڑکے سے بات کرنے دو۔" پھر وہ اچھو سے مخاطب ہوئے۔

"مجھے بتاؤ کہ تمہارا کس کام میں دل لگتا ہے۔ شہر جا کر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

"جناب تانگہ چلانا چاہتا ہوں۔" اس کے خواب اس کی جاگتی آنکھوں میں اتر آئے۔ تانگہ چلانے کا اسے جنون کی حد تک شوق تھا۔ دن رات اس کے خوابوں میں ایک تانگے کا بسیرا رہتا تھا، جس کا گھوڑا خود اس کی طرح جاندار اور طاقتور ہوتا تھا۔ لمبی ایال اور خوبصورت دُم والا مشکی گھوڑا، جس کی لگامیں اچھو کے ہاتھ میں ہوتی تھیں اور وہ بانکی چال چل رہا ہوتا تھا۔

"ہوں، تانگہ!" پیر صاحب چند لمحوں کے لیے سوچ میں گم ہو گئے پھر منشی سے کہہ کر اپنے اصطبل کے سائیس کو بلوایا۔

"اس لڑکے کو اصطبل میں لے جاؤ اور جو گھوڑا اسے پسند آئے، وہ اس کے حوالے کر دو۔"

"جی!" سائیس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔"

اچھو کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں بیٹھے بٹھائے ایک دن اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔ وہ تو خوشی کے مارے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ابھی وہ سائیس کے پیچھے بے تابی سے کمرے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ پیر صاحب کی آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔

"اچھو!"

"جی حضور!" وہ پیچھے مڑا۔

"یہ گھوڑا اور تانگہ ہم تمہیں ایک شرط پر دیں گے۔"

اچھو کے چہرے پر مایوسی کے سائے لرزنے لگے۔

"شرط بہت آسان ہے۔" انہوں نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔

"جی حضور۔" اس نے اپنے لہجے میں جھلکتی مایوسی چھپانے کی کوشش کی۔

"تم شہر تانگہ چلانے جانا چاہتے تھے ناں؟"

"جی۔"

"اب جب تمہیں یہاں تانگہ مل رہا ہے تو تم یہیں گاؤں میں رہو گے کمائی کی غرض سے شہر نہیں جاؤ گے۔"

وہ کھل اٹھا۔ شہر تو وہ اس لیے جانا چاہتا تھا کہ محنت مزدوری کر کے پیسے جمع کرے اور ایک بڑھیا سا تانگہ خریدے اب جب اس کی یہ خواہش یہیں رہتے ہوئے پوری ہو رہی تھی تو اسے کیا ضرورت تھی شہر جانے کی۔

"حضور، مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔" وہ خوشی خوشی بولا تھا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔"

اچھو نے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے۔

''آپ پر میری اور میری اولاد کی جان قربان' آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے' وہ میری آنے والی نسلیں بھی نہیں اتار سکیں گی۔'' منشی پیر صاحب کے قدموں میں گر گیا۔

''تم ہمارے جدی پشتی نوکر ہو اس لیے ہم نے تمہاری اور تمہارے خاندان کی خدمت سے خوش ہو کر تمہارے بیٹے کو یہ سب کچھ عطا کیا ہے۔''

''اللہ پاک آپ کو اور آپ کی اولاد کو لمبی زندگی دے میری اور میرے بیٹے کی بھی عمر آپ کو لگ جائے۔''

''فی الحال تمہارا بیٹا گاؤں میں ٹک گیا ہے' جب گھوڑے اور تانگے سے اس کا دل بھر جائے گا۔ اس وقت ہمیں بتا دینا تب ہم اس کی شادی طے کر دیں گے۔''

''اللہ پاک آپ کو دنیا اور آخرت میں ہیروں کے محل دے۔''

پیر صاحب اٹھ کر اندر چلے گئے۔

اصطبل میں پہنچ کر اچھو نے کتنے ہی گھوڑے دیکھے اور رد کیے تھے۔

''تمہارے لیے کیا آسمان سے کوئی خاص گھوڑا اترے گا؟'' سائیں چاچا نے تنگ آ کر کہا تھا۔

''مجھے آسمانی گھوڑے کی نہیں اپنے خوابوں کے گھوڑے کی تلاش ہے۔'' اچھو بولا۔

''لو جی' جوان آدمی گھوڑوں کے خواب دیکھتا ہے۔'' سائیں نے اس کا مذاق اڑایا۔

''تو کیا ان ٹیڈی لڑکوں کی طرح سرخ مفلروں کے خواب دیکھوں؟'' وہ تنک کر بولا۔ ''میرا ایک ہاتھ برداشت نہ کر سکیں یہ ٹیڈی۔''

''اچھا' اچھا جلدی سے ان میں سے کوئی ایک گھوڑا پسند کر لو اور اپنا راستہ ناپو۔''

''چاچا! ان کے علاوہ بھی تو گھوڑے ہیں اصطبل میں۔''

''کن گھوڑوں کی بات کر رہے ہو تم؟'' سائیں نے اسے گھورا۔

''یہ تو یہاں کے گھوڑے ہیں' مجھے عربی نسل کے گھوڑے دکھاؤ جو قد آور اور مضبوط ہوں۔''

''واہ' واہ! کبھی شکل دیکھی ہے اپنی شیشے میں۔'' سائیں چمک کر بولا۔ ''وہ گھوڑے تم جیسے کم ذاتوں کے لیے نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں تانگے میں جوتا جاتا ہے۔''

''مجھے تو ویسا ہی گھوڑا چاہیے۔'' اچھو بھی اڑ گیا۔ ''پیر صاحب نے کہا تھا کہ مجھے جو گھوڑا بھی پسند آ جائے' وہ میں لے سکتا ہوں۔''

''اتنا عمدہ گھوڑا میں تمہیں دیکھنے تک نہ دوں گا۔ کجا یہ کہ تم اسے گھٹیا سے تانگے میں جوتو۔''

''لیکن میں تو عربی نسل کا گھوڑا ہی لوں گا۔''

دونوں میں تکرار اس حد تک بڑھی کہ معاملہ ایک مرتبہ پھر پیر صاحب کے سامنے پیش ہوا۔

''ہم نے حکم دیا تھا کہ یہ لڑکا اپنی پسند کا گھوڑا لے گا تمہیں حکم عدولی کی جرأت کیسے

ہوئی؟''

اور سائیں پورے پندرہ منٹ تک جھاڑ کھانے کے بعد کان دبا کر واپس آیا اور اچھو کو عربی نسل کے گھوڑوں کے پاس لے گیا۔

ان گھوڑوں کو دیکھ کر اچھو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ابلق' چمکتے دار اور مشکی' خوبصورت' طاقت ور اور قد آور گھوڑے اپنے اپنے تھان پر ہنہنا رہے تھے۔ ان کے تھان صاف ستھرے تھے اور وہ ان پر کسی فوج کے سپہ سالاروں کی طرح گردن تانے کھڑے تھے۔

''اب دیکھتے ہی رہو گے یا گھوڑا بھی لو گے۔'' سائیں نے بیزاری سے کہا۔

''آں...... ہاں ہاں۔'' وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

پھر قدم قدم آگے بڑھ کر اس نے لمبی ایال اور خوبصورت دُم والے چمک دار مشکی گھوڑے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا؟'' یوں لگا جیسے سائیں کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہو۔ ''یہ پورے اصطبل کا بہترین گھوڑا ہے۔ تم اتنی اعلیٰ نسل کا اور ایسا بہترین گھوڑا تانگے میں جوتو گے؟ احمق یہ سواری کا گھوڑا ہے۔''

''تمہیں کیا پتا چاچا' یہ تو میرے خوابوں کا راجا ہے۔'' اس نے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ ''آج سے اس کا نام راجا ہے۔''

اچھو اپنے خیالات کی دنیا سے واپس پلٹ آیا۔ کتنا خیال رکھا تھا اس نے اپنے راجا کا اپنے اہم کاموں کو چھوڑ کر وہ راجا کی خاطر مدارت میں لگا رہتا تھا اور راجا بھی تو یوں چلتا تھا جیسے اس کے قدم زمین پر نہ پڑتے ہوں بلکہ وہ ہوا میں تیرتا ہو' ارد گرد کے سبھی گاؤں میں اس کا گھوڑا اور تانگہ سب سے شاندار سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی۔ راجا اس کا دوست اور اس کا غمگسار تھا۔ اچھو کے یار دوست راجا کو 'بھابی بیگم' کہہ کر پکارتے تھے اور وہ ہنس پڑتا۔

''بے وقوفو! یہ تمہاری بھابی نہیں' تم لوگوں کا بھتیجا ہے۔ میری اولاد کی طرح ہے یہ۔''

''اتنے نخرے بیویوں کے اٹھاتے ہیں میری جان' اولاد کے نہیں۔'' وہ بھی ہنستے۔

اور اب رجب علی شاہ اس کی متاعِ عزیز' اس کی پہلی محبت اس کا دوست' محبوب اور اولاد' اس کا راجا' اس سے چھیننا چاہتا تھا۔

''میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ چلایا۔ چاہے وہ میرے جسم سے روح کھینچ لیں' لیکن اپنی زندگی میں میں راجا کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔''

☆======☆======☆

کتنے دنوں تک زمین' جائیداد کے کاموں میں الجھے الجھے رجب علی شاہ کے اعصاب پر تھکن سوار ہو گئی تھی۔ شہر کی رونقوں سے دور ایک عام سے گاؤں میں رہتے ہوئے جہاں نہ کسی

نائٹ کلب کا شور ہنگامہ تھا اور نہ ہی کسی حسینہ کی سنہری زلفوں کا سایہ۔

پینے کا شغل تو جاری تھا لیکن اپنے کمرے میں رہتا...... پینے میں نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ کشش۔ بس روز کی ایک روٹین تھی جسے وہ پورا کرتا رہتا تھا۔

گھر میں ہونے والی تیاریوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ سارا کام حیدر علی نے بخوبی سنبھال رکھا تھا' اس لیے زمینوں کے مسئلے سلجھا کر اب وہ فارغ تھا اور اس فراغت کے ساتھ ہی اس کے اندر وہ تمام خواہشات انگڑائی لے کر بیدار ہوگئیں جو اب تک کام کے بوجھ کی وجہ سے اونگھ رہی تھیں۔ ایسے ہی میں اس نے اپنے معتمد خاص شکورے کو طلب کیا۔

''جی حضور!'' شکورا اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

رجب علی نے بغور اس کی جانب دیکھا۔ شکورا وہ تنومند اور قدآور جوان تھا جسے آتے ہی رجب علی شاہ نے اپنے ذاتی نوکر کی حیثیت سے پسند کیا تھا' اس میں وہ سب کچھ تھا جو رجب علی اپنے ذاتی خدمت گار میں دیکھنا چاہتا تھا...... طاقت' جرأت' راز داری اور وفاداری۔ تب سے اب تک وہ رجب علی کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔

''جلدی سے کار تیار کرو۔'' اس نے شکورے سے کہا۔

''جی سرکار۔'' وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ کار میں بیٹھ کر لاہور کی طرف رواں دواں تھے۔

''میں جب سے آیا ہوں' تب سے اب تک لاہور جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔'' وہ بولا۔ ''تم تو جاتے رہتے ہوگے وہاں؟''

''بس سرکار' دو مرتبہ اتفاق ہوا ہے جانے کا۔'' شکورے نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' اس نے ہنکارا بھرا پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''اس خاص کوچے کا تو پتا ہوگا ناں تمہیں۔''

''اس کا کسے نہیں معلوم سرکار' لاہور کے تمام سینما اور سب کوٹھوں کو جانتا ہوں میں۔'' اس نے فخر سے بتایا۔

''آج کل نمبر ایک کون جا رہی ہے؟''

''چندا بائی۔'' وہ بلا تامل بولا۔ ''بڑی قیامت خیز چیز ہے وہ۔ جیسا نام ہے اس سے کہیں بڑھ کر حسین ہے وہ۔ اب تو سنا ہے کہ اس نے فلموں میں کام کرنے کی ہامی بھی بھر لی ہے۔ بڑا چلتا پرزہ ہے حضور! کتنے رئیس زادے اس کی بیٹھک میں گھنٹوں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بیٹھے رہتے ہیں۔ عام لوگوں کی طرف تو دیکھتی بھی نہیں ہے وہ' اپنی قیمت اچھی طرح جانتی ہے ناں' اس لیے بڑے بڑوں کو تڑپاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے' ہمیں چندا بائی کے کوٹھے پر ہی چلنا ہے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

اتنے دنوں کی تھکن کے بعد چندا بائی کی اتنی ذرا سی تعریف نے ہی اس کے دل میں ہلچل مچا دی تھی۔ کار کے ایکسیلریٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ لاہور' لندن کی طرح ایڈوانس...... نہ سہی لیکن نیاز پور سے کہیں بہتر تھا۔ وہاں برطانیہ کی طرح چندے آفتاب' چندے مہتاب نہ سہی لیکن چندا بائی تو موجود تھی۔

چند گھنٹوں بعد ہی رجب علی شاہ' چندا بائی کے کوٹھے میں داخل ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ بھائی اور بھائی کی نئی زندگی کی شروعات کے لیے ہر بہترین چیز ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکٹھی کر رہا تھا۔ (بہنوں کے لیے بھی اس نے ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی) لیکن ایسے میں بھی وہ گوری کو نہیں بھولا تھا۔ گوری جو اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت اور دل کش باب تھی۔

جیولر کی دکان میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ بہت خوبصورت' نازک اور نفیس سونے کی چین پر پڑی۔ اس کے تصور میں گوری کا سراپا اترتا چلا آیا۔

اس کی شہد رنگ' صراحی دار گردن میں یہ چین کتنی اچھی لگے گی۔ اس نے سوچا۔

تصور ہی تصور میں اس نے یہ سنہری چین گوری کی گردن میں پڑی دیکھی اور اگلے ہی لمحے بلا تامل اس نے وہ چین گوری کے لیے خرید لی۔

یہ جدائی کے ان لمحوں کا مداوا تو نہیں کر سکتی لیکن اس سے گوری کو یہ احساس ضرور ہوگا کہ تمام تر مصروفیات کے باوجود بھی میں اسے بھولا نہیں ہوں۔ میں کہیں بھی جاؤں' میری گوری میرے ساتھ ہے۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

اب تک اس نے گوری کے لیے تین چیزیں لی تھیں۔ خوبصورت سرخ اوڑھنی' پرفیوم اور گلے کی زنجیر۔

کتنی سندر' کتنی دلکش لگتی وہ جب خوشبو میں بھیگی اوڑھنی لیے' سنہری زنجیر گردن کی زینت بنائے حیدر علی کے سامنے آتی۔ رنگ' خوشبو اور حسن یکجا ہو جاتے۔ وقت سہج سہج' تھم تھم کر چلنے لگتا۔ زندگی اپنے مدھم سُروں کے ساتھ ہوا کے دوش پر وصل کی وہ گھڑیاں لاتی جو زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہوتیں۔ ہمیشہ رہنے والی لافانی ساعتیں۔

گاؤں کی کچی سڑک پر اترتے ہی حیدر علی کو اپنی کار کی رفتار آہستہ کرنا پڑی۔ دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر اندھیرا پوری طرح پر پھیلا چکا تھا۔ سڑک کچی اور ناہموار تھی۔ یہی نہیں اس اکلوتی' ویران سڑک پر اس وقت کتوں کا راج تھا۔ دن میں جس جگہ کی بادشاہت اس کے گھرانے کے پاس تھی' رات میں اسی جگہ کی حکومت ان آوارہ کتوں کے ہاتھ آ گئی تھی۔

ہچکولے کھاتی' آہستہ روی سے آگے بڑھتی کار گاؤں کے قریب پہنچی تو ہوا کے دوش پر تیرتی ایک پُرسوز مردانہ آواز حیدر علی کی سماعت سے ٹکرائی۔ کوئی شخص درد میں ڈوبی آواز میں ہیر وارث شاہ گا رہا تھا۔

''ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وِچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک باز توں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

(ہیر نے جوگی سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو' روٹھے ہوئے سجن کو کوئی راضی نہیں کرسکتا۔ میں تو ایسے شخص کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی جو دور گئے سجن کو واپس لے آئے۔ جو میرے دل کا درد مٹا دے' وہ چاہے میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہن لے۔ تم خود ہی بتاؤ کہ مدتوں کے بچھڑے ہوئے محبوب کو سچا رب کب واپس بھیجتا ہے۔ لوگ یونہی دل رکھنے والی باتیں کرتے ہیں' ورنہ مرے ہوئے اور بچھڑے ہوئے کو کوئی نہیں ملا سکتا۔ اگر باز سے کوا کونج چھین لے تو تم دیکھنا کہ وہ باز خاموش ہو کر اپنی چونچ پروں میں دبا لیتا ہے یا چلاتا ہے۔)

حیدر علی نے کار حویلی کی سمت موڑنے کے بجائے آواز کی جانب سفر جاری رکھا۔ درد میں بھیگی اس آواز کا اثر وہ اپنے جسم کی تہوں تک محسوس کر رہا تھا۔

دور کھیتوں کے پاس ایک ہیولا سا تھا۔ آسمان پر پھیلے تاروں کی ٹمٹماتی مدھم روشنی اسے دیکھنے کے لیے ناکافی تھی۔ پھر کار کی ہیڈ لائٹس اس ہیولے پر پڑیں۔

پیلاہٹ مائل سفید تہبند اور قمیص میں ملبوس جھکی ہوئی کمر والا شخص جس کی پشت کار کی جانب تھی' کار کی روشنی میں خود کو محصور دیکھ کر اس نے مڑ کے دیکھا اور پھر تیز روشنی کے باعث آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے منہ موڑ لیا اور تیزی سے کھیتوں کے درمیان غائب ہو گیا۔

حیدر علی گہرا سانس لے کر رہ گیا اور کار حویلی کی جانب موڑ لی۔ روشنی میں وہ صرف اتنا قدر دیکھ سکا تھا کہ اس شخص کے چہرے پر بے ہنگم انداز میں پھیلی ہوئی گھنی داڑھی تھی اور چال میں قدرے لنگراہٹ تھی۔

نہ جانے کون شخص ہے۔ حیدر علی سوچ رہا تھا۔

آج سے قبل اس نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن یہ بھی تو تھا کہ رات کے اس پہر وہ کبھی باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی باہر نکلنے کی اور حویلی کی بلند و بالا اور موٹی

دیواروں سے گزر کر اس کی آواز کا اس تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔

گاؤں میں تو یوں بھی رات بہت جلدی ہو جاتی تھی۔ پورے گاؤں میں صرف حویلی میں بجلی کا انتظام تھا۔ باقی گھروں میں لالٹینیں جلتی تھیں اور وہ بھی مغرب کی اذان کے ساتھ رات کا کھانا کھا کر بجھا دی جاتی تھیں۔

حیدر علی نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف ساڑھے گیارہ بجے تھے لیکن گلیوں میں پھیلا سناٹا دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آدھی رات کا سماں ہو۔

حیدر علی اپنی سوچ پر خود ہی ہنس پڑا۔ آدھی رات ہونے میں وقت ہی کتنا رہ گیا تھا' صرف آدھ گھنٹہ' لیکن اس کی رات کی تو ابتداء بھی بارہ بجے سے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوئی تھی' جب باقی گاؤں والے اپنی تین چوتھائی نیند پوری کر چکے تھے۔

گاؤں کی اکلوتی سفید مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دایاں پاؤں خود بخود بریک پر جا ٹھہرا۔ مسجد اور اس کے ساتھ بنے ہوئے حجروں پر بھی تاریکی کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ یہیں اس کی گوری تھی جسے دیکھنے کے لیے وہ بے قرار تھا جس سے ملنے کے لیے اس کا دل مچل رہا تھا۔

''شاید ابھی کوئی دریچہ' کوئی روزن اس کے حُسن سے روشن ہو جائے۔'' اس نے سوچا۔

''شاید اسے بھی یہ بے قراری باہر کھینچ لائے۔''

حیدر علی نے سگریٹ سلگا لیا اور کار میں بیٹھے بیٹھے حجروں میں کوئی روزن' کوئی دریچہ کھوجنے لگا لیکن مدھم مدھم چاندنی میں وہ عمارت کے نقوش الگ الگ کرنے سے قاصر تھا۔

ہاں دیوار سے ایک بلی کودی تھی اور کودنے سے پہلے اس نے رات کے اندھیرے میں چمکنے والی اپنی روشن آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا تھا اور بس۔ اس کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

اور اس دوران جو آوازیں اس کی سماعت سے ٹکراتی رہی تھیں' ان میں نہ تو گوری کی رس بھری آواز تھی اور نہ اس جھکی ہوئی کمر والے بوڑھے کی پُرسوز' درد میں ڈوبی ہوا کے دوش پر تیرتی آواز...... اب یہاں ہر طرف جھینگروں کی مسلسل ابھرتی ہوئی کوکو تھی اور گلیوں میں راج کرنے والے کتوں کی بھوں بھوں۔

پھر لمحہ لمحہ سرکتا گیا۔ سگریٹ ختم ہو گیا اور حیدر علی نے اس کا بقیہ حصہ کار کے شیشے سے باہر اچھال دیا' لیکن کوئی روزن' کوئی دریچہ گوری کے حُسن سے منور نہ ہوا۔ کوئی رس بھری آواز اس کی سماعت سے نہ ٹکرائی۔ کسی نے پیار سے اس کے کان کے پاس سرگوشی نہ کی۔

''شاہ جی۔''

اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور کار آگے بڑھا دی۔ یہاں آکر یہاں ٹھہر کر' یہاں انتظار کر کے اس کی بے قراری میں کمی نہیں' اضافہ ہوا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے دل پہلے سے کہیں

زیادہ مچل رہا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ کم از کم ہفتے کے دن تک وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا' سوائے اپنی اس بے قراری کے ساتھ انتظار کرنے کے۔

صبح ناشتے کے دوران حیدر علی کو کل والے بوڑھے کا خیال آیا۔ اس کا ذاتی خدمت گار نواز دین وہیں اس کے کمرے میں کھڑا تھا۔

''کل رات جب میں یہاں پہنچا تو کوئی شخص ہیر گا رہا تھا۔'' حیدر علی نے اس سے کہا۔ ''جانتے ہو وہ کون شخص ہے؟''

''سرکار بہت پہنچا ہوا بابا ہے۔'' وہ بولا۔ ''پتا نہیں کہاں سے آیا ہے' اب تو برسوں بیت گئے اسے یہاں رہتے ہوئے۔''

''پہنچا ہوا کیا مطلب؟''

''سرکار۔'' نواز دین ایک دم گھبرا گیا۔ ''میں کسی برابری کی بات نہیں کر رہا۔ اس قدر پہنچا ہوا نہیں ہے' بس چپ چاپ رہتا ہے' بولتا نہیں ہے۔ ہاں رات ہوتی ہے تو ہیر گانے لگتا ہے۔ اللہ لوک ہے سرکار' سب گاؤں والے اسے سائیں بابا کہتے ہیں۔ نذر نیاز لے لیتا ہے لیکن صدقہ خیرات نہیں لیتا۔ پیر صاحب نے اس کا حصہ مقرر کیا ہوا ہے' ان کی وجہ سے اب تک جی رہا ہے۔''

''کوئی شخص کسی کی وجہ سے نہیں جیتا۔ زندگی اور موت کا اختیار کسی انسان کے پاس نہیں' صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔'' حیدر علی بولا۔

''آپ سے سائیں بابا نے کچھ کہا؟'' نواز دین نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

''نہیں' تم ہی تو کہہ رہے تھے کہ وہ بولتا نہیں ہے۔''

''زیادہ نہیں بولتا' پر جب بھی بات کرتا ہے تو وہ سچ ثابت ہوتی ہے۔''

حیدر علی کو اس کی بات پر کچھ زیادہ یقین نہیں آیا۔

''آپ کے اور بڑے شاہ صاحب کے آنے سے پہلے بھی سائیں بابا نے کہا تھا کہ حویلی میں رونق آنے والی ہے۔'' اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''میں حیران تھا کہ یہ کون شخص ہے' اب سے پہلے نہ کبھی دیکھا نہ ذکر سنا۔''

''حضور! آپ کے لیے پیر صاحب نے پیغام بھجوایا تھا۔''

''کیسا پیغام؟''

''فرما رہے تھے کہ ناشتہ کر کے آپ ان سے مل لیں۔''

''اچھا!'' حیدر علی نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

پیر صاحب اس وقت مزارعوں کی فریاد سن رہے تھے جب حیدر علی ان کے پاس پہنچا۔

''سرکار ہم تو تھک ٹوٹ کر خوب گہری نیند سو جاتے ہیں ہمیں پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ

ہماری بھینس لے گئے۔'' ایک بوڑھا مزارع گڑگڑا رہا تھا۔

''جی حضور! رات کو کھیتوں میں پانی بھی وہی لگا رہے تھے۔'' ایک اور نے جلدی سے کہا۔

''منشی۔'' پیر صاحب نے رعب سے پکارا۔

''جی سرکار'' وہ جلدی سے آگے بڑھا۔

''بندے بھیج کر پتا کرو کہ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں یا نہیں یہاں یہ رسہ گیری نہیں چلے گی۔''

وہ مزارعے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے تو پیر صاحب' حیدر علی کی جانب مڑے۔

''بابا جان! آپ نے یاد فرمایا تھا؟''

چند لمحے وہ اس کی طرف دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے۔ ''واقعی اولاد انسان کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑا امتحان ہوتی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں بابا جان!''

''ہمارا خیال تھا کہ تم ہم سے اپنے کیے کی معافی مانگو گے' اس پر اظہارِ ندامت کرو گے لیکن اظہار تو دور کی بات ہے تمہارے چہرے سے لگتا ہے کہ تم اپنی بات پر شرمندہ تک نہیں ہو۔''

''میں سمجھا نہیں کہ آپ کس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟'' حیدر علی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم نے تمہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت بھیجا۔ اولاد جب جوان ہوتی ہے تو باپ کا بازو بنتی ہے مگر تمہیں تمہاری تعلیم نے باپ کے بازو کاٹ دینے کی تربیت دی ہے۔''

''کیسی بات کر رہے ہیں آپ بابا جان! میں آپ پر اور اس گھر پر اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں' آپ حکم تو کریں۔''

''ہمیں تمہاری جان لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ایک شیر دل اور جری بیٹے کی ضرورت ہے جو ہماری زندگی میں اور اس کے بعد بھی اس خاندان اور اس کی روایات کی حفاظت کر سکے۔''

ایک دم ساری بات حیدر علی کی سمجھ میں آ گئی۔ بابا جان اب تک اس گفتگو کے حوالے سے بات کر رہے تھے جو بہت دن قبل ان کے درمیان مہر النساء اور زیب النساء کی شادیوں کے متعلق ہوئی تھی۔

''میں نے آپ سے بہت ادب کے ساتھ بات کی تھی۔ میرا مقصد آپ کو دکھ دینا یا تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ میں تو آپ میں سے کسی کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا' اسی لیے بہنوں کی تکلیف دہ تنہائی محسوس کر کے میں نے آپ سے بات کی تھی۔''

''قسم ہے اس ذات پاک کی کہ اگر یہ بات تمہارے علاوہ کسی اور نے کی ہوتی تو ہم اپنے

ہاتھ سے اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتے۔''

''اپنی عقل کے مطابق میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کو اس میں سے کیا بات بری لگی تھی۔''

''تمہاری عقل' روایتوں کو کاٹنے والی دو دھاری تلوار بننے لگی ہے علی۔ ہماری بات غور سے سنو بیٹا۔ ہر بات عقل کی کسوٹی پر رکھ کر نہیں جانچی جاتی ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے ہاتھ سے بیٹے کے گلے پر چھری نہ رکھ دیتے اور نہ ہی آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلوں میں بلا تامل کود پڑتے۔ عقل کی لگامیں تھام کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں تو کوئی آگ گل و گلزار نہیں بنتی۔''

''درست کہا آپ نے۔ میں ارشاد خداوندی کو عقل کی کسوٹی پر نہیں پرکھ رہا' لیکن بابا جان بڑی آپا اور زیبی آپی کی شادی کے بارے میں بھی کیا ایسا ہی کوئی ارشاد ہے؟''

حیدر علی کو اپنے سوال کی ساخت سے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بات پیر صاحب کو گراں گزرے گی' لیکن کلاس روم اور لیکچر تھیٹرز میں اپنے پروفیسرز سے کھل کر بحث کرنے والے حیدر علی کے لیے یہ مرحلہ بہت دشوار ہوتا تھا۔ جب وہ بابا جان سے اختلاف کرنا چاہتا تھا' ان سے اپنے ہر ''کیوں'' کا جواب حاصل کرنا چاہتا تھا' لیکن کھل کر سیدھے لفظوں میں سوال نہیں پوچھ سکتا تھا اور اپنے ہر سوال پر ''کیوں'' کو ادب کے دبیز پردوں میں لپیٹ دیتا تھا ایسے میں اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جو کچھ وہ جاننا چاہتا ہے' اس کا پانچ فیصد بھی وہ ان سے نہیں پوچھ پا رہا۔ تب غیر شعوری طور پر آہستہ آہستہ ادب میں ملفوف سوالوں کے اوپر سے وہ احترام کی تہہ بہ تہہ جمی ہوئی پٹیاں کھولتا جاتا تھا اور اس کا ہر ''کیوں'' واضح ہوتا جاتا تھا۔

پیر صاحب کو اس کے سوال پر غصہ تو آیا لیکن انہوں نے نہایت تحمل سے اسے مخاطب کیا۔

''اپنے سے کمتر لوگوں میں شادی کرنا ہمارے منصب اور روایتوں کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اونچا مرتبہ عطا کیا ہے۔ ہم نے کبھی بھی اپنے اس مرتبے سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہمیشہ اپنے سے کمتر لوگوں کی بھلائی کے بارے میں ہی سوچا ہے۔ صدقہ خیرات میں کمی نہیں کی۔ غریبوں کی خاطر حویلی کا جو چولہا ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے میں جلا تھا وہ آج تک سرد نہیں ہوا' لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے اس منصب اور مرتبے کی حفاظت کریں' اپنے خاندان کے خون کو خالص رکھیں اور یہ گدی بچا کر رکھیں۔''

''اور ایسا ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ آپ بڑی آپا اور زیبی آپی کی شادی کبھی نہ کریں۔'' حیدر علی بولا۔ ''یہی کہنا چاہتے ہیں ناں آپ؟''

''بیٹی بیاہی جاتی ہے تو جائیداد تقسیم ہوتی ہے' رعیت تقسیم ہوتی ہے اور یہ بیٹیاں جہیز میں صرف زمینیں' مزارعے اور خدمت گار ہی نہیں باپ اور بھائیوں کی عزت بھی ساتھ لے جاتی ہیں'

پھر یہ ان کے سسرال والوں کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ اس عزت کو ماتھے پر سجا کر رکھیں یا اپنے قدموں میں رول دیں اور علی! بیٹیاں جو عزت اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں انہیں ماتھے پر سجانا کم ہی نصیب ہوتا ہے' اس لیے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر عزت اور سکون کی زندگی گزار دیں۔'' پیر صاحب کہہ رہے تھے۔ ''اس گدی پر بیٹھنے والے ہمارے آباؤ اجداد میں سے کسی کی بیٹی کبھی نہیں بیاہی گئی۔ کیونکہ یہ اس گدی کے منصب اور شان کے خلاف ہے۔ صدیوں کی عزت کو محض اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی خاطر کسی نے خاک میں آلودہ کرنا گوارا نہیں کیا' ہم بھی یہ نہیں کر سکتے۔''

حیدر علی چند لمحے تک حیرت کے ساتھ باپ کی جانب دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''بابا جان! ان بیٹیوں نے کبھی بغاوت نہیں کی؟''

یہ سوال درحقیقت بیسویں صدی کے ایک متجسس طالب علم کا سوال تھا' لیکن پیر صاحب کو اس بات پر طیش آنا لازمی تھا۔

''ہماری بیٹیوں اور ولایت کی بے حیا عورتوں کے درمیان اتنا ہی فرق ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان۔ یہ جراثیم اور گندگی ہماری بیٹیوں میں کبھی نہیں آ سکتی۔ زمین سے جتنی بھی خاک اُڑتی رہے وہ آسمان کو آلودہ نہیں کر سکتی۔''

''بابا جان! زندہ انسانوں کے رہنے کی جگہ یہ زمین ہے' آسمان نہیں ہے۔ آپ نے میری بہنوں کو مُردہ کیوں تصور کر لیا؟ وہ زندہ ہیں بابا جان' سانس لیتی ہیں' غم اور خوشی کی کیفیت کو محسوس کر سکتی ہیں۔ تنہائی کے عفریت کو جبڑے پھیلا کر اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ سکتی ہیں۔ سکون کی زندگی وہ نہیں ہوتی جو ماں باپ کے گھر تنہا رہ کر گزار دی جائے۔ سکون کی زندگی وہ ہوتی ہے' جس میں ماں اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں کھلاتی ہے اسے لوری دیتی ہے۔ اسے اپنے سامنے جوان ہوتے ہوئے دیکھتی ہے۔ آپ بڑی آپا اور زیبی آپی کو اس حویلی میں بند کر کے یہ سکون دے سکتے ہیں؟ آراستہ کمرے اور بہترین ملبوسات شوہر کی محبت اور اولاد کی خوشیوں کا نعم البدل نہیں ہوتے۔''

''بس علی! اتنا کافی ہے۔'' پیر صاحب نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا۔ ''جن عورتوں کی بات تم کر رہے ہو' وہ عام کی کمین عورتیں ہوتی ہیں' جو ماں باپ سے بغاوت کرتی ہیں' جو باپ کی دستار پر سیاہ دھبے لگاتی ہیں جو باپ اور بھائیوں کی عزت سسرال والوں کے قدموں میں ڈالنے کے لیے شادی کا انتظار کرتی ہیں۔

لیکن اس حویلی میں ہماری بیٹیاں ہیں' پیر جلال الدین شاہ کی بیٹیاں' رجب علی شاہ کی بہنیں' وہ لڑکیاں جن کے کمرے کا رخ باہر چلنے والی ہوائیں بھی نہیں کرتیں کہ کہیں ان ہواؤں کے دوش پر ان کے نام کسی غیر مرد کے کانوں میں نہ پڑیں۔ وہ کوئی عام لڑکیاں نہیں' سیّد زادیاں

ہیں' جن کی آواز بھی کسی نامحرم کان میں نہیں پڑی' جن کی شرافت اور پاکیزگی کی قسم کھائی جا سکتی ہے اور ہماری یہ قابلِ فخر بیٹیاں کسی غلط سوچ کو بھی اپنے ذہن میں جگہ نہیں دے سکتیں۔''

''وہ سیّد زادیاں ہیں۔ آپ کی یعنی پیر جلال الدین شاہ کی بیٹیاں' رجب علی' حیدر علی اور سخاوت علی کی بہنیں لیکن آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان سب سے پہلے وہ انسان بھی ہیں' جنہیں ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے۔ ہاں ہوا بھی ان کے کمرے کا رخ نہیں کرتی۔ تب ہی تو ان کمروں کی فضا اتنی بوجھل اور کثیف ہے' انہیں اتنی بڑی آزمائش میں مبتلا مت کریں۔ پلیز بابا جان! کوئی کھڑکی کھول دیں' ان کے لیے تاکہ وہ بھی تازہ ہوا میں سانس لے سکیں۔ اس طرح ان کے وجود کی نفی کرنے اور انہیں ان قبر نما کمروں میں زندہ درگور کرنے سے بہتر تھا کہ آپ انہیں پیدا ہوتے ہی ختم کر دیتے۔''

''علی! تم ہماری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔'' پیر صاحب مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

''نہیں' بابا جان! میں آپ کو اس حقیقت سے آشنا کر رہا ہوں جو کسی بھی وقت رونما ہو سکتی ہے لیکن آپ نے اس جانب سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اگر بڑی آپا اور زیبی آپی کسی کھائی میں گر گئیں تو اس کے ذمہ دار آپ اور بھائی جان ہوں گے' اگر ایک مرتبہ باہر نکلنے کا خیال دل میں آ جائے تو دروازے اپنے آپ کھلنے لگتے ہیں۔ ایسے میں صدر دروازہ مقفل ہو تو چھوٹا سا روزن بڑھتے بڑھتے چور دروازے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر طوفان کی آمد کو کوئی نہیں روک سکتا۔''

''حیدر علی!'' پیر صاحب کے لیے غصے پر قابو پانا اب ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ ''ہم نے تمہیں اس لیے طلب کیا تھا کہ تمہارے چہرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر تمہیں اپنے گلے سے لگائیں گے لیکن تم نے ہمیں بہت مایوس کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اپنی بہنوں کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تمہاری زبان نہیں لڑکھڑائی۔ بھائی ہو کر تم ان کی شرافت اور پاکیزگی پر شک کر کے ان کی تذلیل کر رہے ہو۔ جاؤ دور ہو جاؤ ہماری نظروں سے' چلے جاؤ یہاں سے۔''

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کا ذہن بری طرح منتشر تھا۔ بابا جان کو وہ کیا سمجھا سکتا تھا' جبکہ انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا تھا کہ ان کی بیٹیوں کے کمروں کا رخ تو باہر چلنے والی ہوائیں بھی نہیں کرتیں۔ وہ اپنے اس فخر سے بھلا کیسے دستبردار ہو سکتے تھے۔ وہ تو خیر ابھی روایتوں کے درمیان پلے بڑھے تھے' حیرت تو اسے رجب علی پر تھی جو ولایت سے آیا تھا۔

مانا کہ اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ برسوں اس ماحول میں رہا تو تھا۔ رجب علی جو مردانہ وجاہت میں حیدر علی سے کسی طور کم نہ تھا اور مائل بہ کرم بھی رہتا تھا اس لیے اس کے گرد ہمیشہ پری جمالوں کا ہجوم اکٹھا رہتا تھا۔ سچ مچ دل ہار جانے والی' کچھ وقت گزاری کی خواہش مند اور کچھ دولت بٹورنے کی شائق۔ رجب علی ان میں سے ہر ایک کی خصلت سے واقف تھا پھر بھی پیسہ لٹانے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔

پھر پتا نہیں کیوں اس نے کرسٹی سے شادی کر لی تھی اور تب پہلی مرتبہ حیدر علی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

کرسٹی' حیدر علی کی کلاس فیلو اور بہت اچھی دوست تھی۔ بس صرف دوست اور یہ دوستی بھی اتنی ہی تھی جتنی ایک کلاس فیلو کی دوسرے کلاس فیلو سے ہو سکتی ہے۔ وہ دونوں ہی کلاس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ خوب زور و شور سے ایک دوسرے کی بات کی تردید کرنے کے لیے پوائنٹ پہ پوائنٹ نکالتے تھے۔ لائبریری کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چلا چلا کر بحث کرتے تھے اور لائبریری میں بھی پاس پاس بیٹھ کر مدھم آوازوں میں بحث جاری رکھتے تھے پھر جب یہ آوازیں بلند ہونے لگتیں اور ارد گرد بیٹھے طلباء انہیں گھورتے تو وہ لائبریری سے کھسک لیتے تھے۔

آتی سردیوں کی ایسی ہی شام کو وہ دونوں جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لندن کی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے برٹرینڈ رسل کی Conqust of Happiness پر بحث کرنے میں مصروف تھے' جب اچانک کرسٹی کو خیال آیا۔

''سردی بڑھتی جا رہی ہے' کیا خیال ہے کسی نائٹ کلب میں نہ چلا جائے؟''

''ویسے تو وہاں گرمی کا زور کچھ زیادہ ہی ہو گا لیکن چلو چلتے ہیں۔'' حیدر علی نے کہا۔

''اچھے خاصے بونگے ہیں ہم دونوں۔ ساری دنیا ویک اینڈ پر عیش کر رہی ہے اور ہم لارڈ برٹرینڈ رسل سے مغز ماری میں مصروف ہیں۔'' وہ ہنسی۔ ''اور اگر ہماری یہ بحث وہاں نائٹ کلب میں بھی جاری رہی تو لوگوں نے ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دینا ہے۔''

''یہ طے ہے کہ ہم دونوں کا ساتھ صرف نائٹ کلب کے دروازے تک ہو گا۔ اندر داخل ہوتے ہی تمہارا راستہ الگ اور میرا الگ ہو جائے گا۔''

''منظور ہے۔'' وہ ہنستی گئی۔ ''یوں بھی میرا بور ہونے کا ارادہ نہیں ہے۔ ہم دونوں اکٹھے رہے تو بال روم میں بھی لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔''

اور پھر دروازے سے داخل ہوتے ہی حیدر علی دائیں جانب مڑ گیا اور کرسٹی اسے بائے کہہ کر بائیں جانب۔

ایک میز پر بیٹھ کر اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی رجب علی بھی اکثر اسی کلب میں آیا کرتا تھا اور پھر یہ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ وہ اور کرسٹی محوِ گفتگو ہیں۔

یہ رجب علی کی کرسٹی سے پہلی ملاقات تھی۔

ویک اینڈ کے بعد حیدر علی نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس دن اس کی ملاقات حیدر علی کے بھائی سے ہوئی تھی اور پھر جلد ہی ان دونوں کی ایک اور ملاقات ہو گئی۔

اس دن سائیکلنگ کرتے ہوئے وہ دونوں پولیٹیکل فلاسفی پر بحث کر رہے تھے۔ یہ بحث

اس قدر بڑھی کہ دونوں نے اپنی سائیکلیں سڑک کے کنارے ایستادہ درختوں سے ٹکرا کر ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ابھی وہ اسی کوشش میں مصروف تھے کہ رجب علی شاہ اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں چلا آیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے حیدر علی کو مخاطب کیا۔

''ابھی میں لندن سے یہاں پہنچا تھا' پتا چلا کہ تم اس طرف آئے ہو تو تمہیں ڈھونڈنے چلا آیا۔''

رجب علی بات تو اس سے کر رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں کرسٹی کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔

اور پھر پتا نہیں دو ہی دن میں کیا ہوا کہ رجب علی اور کرسٹی نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے ان کے اس فیصلے پر بہت حیرت ہوئی تھی۔ کرسٹی کی تعلیم ابھی نامکمل تھی اور پھر یاسمین بھابی بھی تو تھیں۔

''یاسمین بھابی کا کیا ہو گا؟'' اس نے حیرت سے رجب علی سے پوچھا۔

''کیوں کرسٹی بطور بھابی اچھی نہیں ہے؟'' وہ ہنسا۔

''میں یہ کب کہہ رہا ہوں۔ کرسٹی بہت اچھی ہے لیکن یاسمین بھابی کا کیا ہو گا؟''

''فی الحال تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر اطمینان سے بیٹھی ہے۔ یوں بھی مجھے گدی کے وارث کی پیدائش کے سلسلے میں کوئی اتنی جلدی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہ سمجھا۔ ''کیا آپ کی نظروں میں یاسمین بھابی کی اپنی کوئی حیثیت نہیں؟ ان کی وقعت صرف اتنی ہے کہ وہ گدی کا وارث پیدا کر دیں؟''

''یہ کم وقعت اور اہمیت ہے۔'' رجب علی ہنس پڑا۔ ''اور ہاں تم شادی پر ضرور آنا' کوئی بہانا نہیں چلے گا۔''

''کیا بابا جان کو اس شادی کی خبر ہے؟'' اس نے دبے دبے انداز میں پوچھا۔

''فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

اور پھر تمام تر کوشش کے باوجود بھی وہ شادی والے دن نہ پہنچ سکا۔ اگلے دن جب اس نے رجب علی کے اپارٹمنٹ کی بیل بجائی تو دروازہ کسی ملازم کے بجائے خود رجب علی نے ہی کھولا۔ وہ اس سے بہت گرمجوشی سے ملا۔ شادی کا تحفہ قبول کیا اور بہت تپاک سے اسے اندر لایا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد حیدر علی نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

''کرسٹی کہاں ہے؟ مجھے افسوس ہے کہ میں اسے دلہن بنے نہیں دیکھ سکا اور مجھے حیرت بھی ہے کہ وہ بحث کیے بغیر دلہن کیسے بن گئی۔''

''اب کرسٹی تمہاری کلاس فیلو نہیں بھابی ہے۔'' رجب علی کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ''تمہاری بھابی اس وقت اپنے کمرے میں ہے۔''

''اسے معلوم نہیں کہ میں آیا ہوا ہوں؟ اس قدر بے مروتی کہ ملنے کے لیے بھی نہیں نکلی۔''

''تم غالباً بھول رہے ہو۔ ہمارے ہاں کی عورتیں غیر محرم مردوں کے سامنے نہیں آتیں' جانتے ہو نا یہ ہمارا دستور نہیں ہے کہ بھابیاں دیوروں یا بیٹوں کے سامنے آئیں۔'' رجب علی نے کہا۔

چند لمحوں کے لیے تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کرسٹی پردہ کرنے لگی ہے۔'' رجب علی نے مطمئن انداز سے کہا۔

''کرسٹی' پردہ!'' وہ زیر لب بولا۔

سنہرے خوبصورت بالوں اور نیلی آنکھوں والی کرسٹی جو ہر وقت کلاس میں آگے بڑھنے کی کوشش میں اس کے ساتھ بحث کرتے کرتے جھگڑنے لگتی تھی۔ اس کرسٹی کے ساتھ پردے کا تصور بہت عجیب اور حیران کن بات محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ مذاق کر رہے ہیں؟''

''فی الحال نہیں کر رہا۔'' اس کے اطمینان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ ''اب اتنی تکلیف کرو کہ ملازم کچن میں ہے۔ اسے چائے کا کہہ آؤ اور بھوک لگی ہو تو فریج کھول کر دیکھ لو کافی کچھ مل جائے گا۔''

''مجھے نہ تو اس وقت بھوک محسوس ہو رہی ہے اور نہ چائے کی طلب ہے۔'' وہ بولا۔ ''بھائی جان! میں حیران ہوں کیا یہ فیصلہ کرسٹی نے خود کیا ہے یا آپ نے اس کے لیے کیا ہے؟''

''ہمارے گھرانے میں عورتیں فیصلے نہیں کیا کرتیں۔'' اس نے پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔

''یعنی یہ فیصلہ آپ نے اس پر مسلط کیا ہے؟''

''لفظ مسلط کرنا کے معنی منفی انداز میں لیے جاتے ہیں بھئی یہ ہماری خاندانی روایت ہے' اس میں مسلط کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔''

''کیا شادی سے پہلے اسے ان روایات کا علم تھا؟''

''یہ بات تم یہاں لندن میں بیٹھ کر پوچھ سکتے ہو۔'' اس نے پائپ سے کش لگایا۔ ''کبھی یہ بات وہاں نیاز پور میں نہ پوچھنا۔''

حیدر علی نے گہرا سانس لے کر صوفے کی بیک سے پشت ٹکا لی۔

''مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ پہلے کیا تھی اور کیسے رہتی تھی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اب وہ میری بیوی ہے اور اسے ویسے ہی رہنا ہے جیسے میں پسند کروں گا۔''

''یہ زیادتی والی بات ہو گی۔ آپ اسے پردے میں لے کر تو نہیں آئے تھے اور نہ ہی وہ آپ کو برقعے میں ملی تھی۔ اگر آپ نے اپنی بیوی کو ایسی ہی پابندیوں میں رکھنا تھا تو ایسے ہی

ماحول کی کسی لڑکی سے شادی کرتے جو اس بات کو اس رویے کو قبول تو کر سکتی۔ کرسٹی کوئی چابی والا کھلونا نہیں ہے' جس میں آپ اپنی مرضی سے چابی بھریں اور اس کے لیے اپنی مرضی سے راستے کا تعین کریں۔ بیوی' شوہر کی ملازمہ اس کی باندی تو نہیں ہوتی' اس کی نصف بہتر ہوتی ہے۔''

رجب علی تمسخر سے ہنس پڑا۔ ''برٹرینڈ رسل کی زبان میں باتیں مت کرو۔ رسل' کرسٹی اور تمہاری تکون اس نائٹ کلب کے باہر والی اسٹریٹ پر ختم ہو چکی ہے' جہاں تم دونوں ملے تھے۔ اب کرسٹی صرف اور صرف میری ملکیت ہے۔''

''کوئی جیتا جاگتا باشعور انسان کبھی کسی کی ملکیت نہیں ہوا کرتا۔ آپ کی باتوں نے مجھے بہت اپ سیٹ کیا ہے اور اب تک میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ جب آپ نے اپنی بیوی کے ساتھ یہ سلوک کرنا تھا تو پھر شادی کے لیے کرسٹی کا انتخاب کیوں کیا؟ آپ جانتے ہیں کہ وہ ان پابندیوں کو قبول نہیں کر سکتی۔ ہاں یاسمین بھابی ایسا کر سکتی ہیں کیونکہ وہ شروع سے ایسے ہی ماحول میں رہی ہیں۔ ان کے لیے یہ پابندیاں اور روایات نئی نہیں ہیں۔ اچھا نہ ہوتا کہ اس بے جوڑ شادی کے بجائے آپ اپنی بچپن کی منگیتر کا ہاتھ تھام لیتے۔''

''اصل مزہ اڑیل گھوڑے کو رام کرنے میں ہے۔ سیدھے سدھائے جانور پر سواری کرنے میں کوئی چیلنج نہیں ہے۔ غربت انسان کو دولت کی طرف دھکیلتی ہے اور دولت طاقت کی جانب اور میں وقتاً فوقتاً اپنی طاقت آزما کر اس بات کا یقین کر لینا چاہتا ہوں کہ یہ ابھی میرے قبضے میں ہے۔''

وہ رجب علی کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرسٹی نے اتنی جلد بازی میں اتنا بڑا اور احمقانہ فیصلہ کیوں اور کیسے کر لیا تھا؟ آخر اسے رجب علی میں کیا دکھائی دیا تھا۔

لیکن ان سوالوں کا جواب باوجود کوشش کے بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

اس کے بعد جب بھی اسے ویک اینڈ پر یا کسی اور دن لندن آنے کا اتفاق ہوتا تو اپنے اپارٹمنٹ کے بجائے وہ کسی دوست کے پاس ہوٹل میں رہنے کو ترجیح دیتا۔ رجب علی کو پسند نہیں تھا کہ اس کی بیوی کسی کے سامنے آئے اور خود وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اب اس کی کرسٹی سے ملاقات ہو جبکہ تین کمروں کے اس لگژری اپارٹمنٹ میں ایک دوسرے سے سامنا ناگزیر تھا سوائے اس صورت کے کہ کرسٹی اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ جائے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کھلی فضاؤں میں چہکنے والی اس پیاری سی لڑکی کی بقیہ دو کمروں اور کچن میں گھومتے پھرنے کی آزادی بھی سلب کر لے۔

لندن کے نائٹ کلب اور ایسی ہی دوسری جگہوں پر اکثر اس کی ملاقات رجب علی شاہ سے ہو جاتی تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح نازنینوں میں گھرا رہتا تھا اور ساری ساری رات باہر گزار دیتا تھا۔ اسے یوں آزادی سے آوارہ گردی کرتے دیکھ کر وہ اندر ہی اندر بہت کڑھتا تھا لیکن کچھ

کر نہیں سکتا تھا۔

پھر ایک دن اسے کرسٹی کا خط ملا۔ بے حد مختصر سا۔ اس نے حیدر علی سے فوری طور پر ملنے کی درخواست کی تھی۔ اگلے دن جمعہ تھا' اس لیے اس نے سوچا کہ کلاسز کے فوراً بعد لندن چلا جائے گا۔ اس تمام عرصے میں وہ یہی سوچتا رہا کہ اسے کرسٹی سے ملنا چاہیے یا نہیں۔ ایک طرف مدت کی دوستی تھی اور دوسری طرف یہ نیا رشتہ جو روایتوں اور پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اسے کرسٹی سے مل لینا چاہیے۔ اس کی شادی کو چھ ماہ گزر چکے تھے اور اس دوران یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے حیدر علی کو یاد کیا تھا۔

اگلے دن شام کے وقت وہ رجب علی کے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجا رہا تھا۔ دروازہ ملازم نے کھولا۔ رجب علی گھر پر نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ویک اینڈ کی دلچسپ شام گھر میں گزار کر بور ہونا اسے گوارا نہیں تھا۔ حیدر علی بھی اس وجہ سے ایسے وقت آیا تھا تاکہ کرسٹی سے بات کرنے کے لیے اسے رجب علی کو دلیلوں سے قائل نہ کرنا پڑے اور خود کرسٹی بھی کھل کر اس سے بات کر سکے۔

''بی بی کہاں ہیں؟'' اس نے لونگ روم کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنے پاکستانی ملازم سے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہیں۔''

''اور بڑے شاہ صاحب؟''

''باہر گئے ہیں۔''

''بی بی کو اطلاع کرو کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔''

''بڑے شاہ صاحب کا حکم نہیں ہے سرکار۔''

''کیا؟'' حیدر علی کو اس کا یوں انکار کرنا اچھا نہیں لگا۔ ''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ انہیں اطلاع کرو' تمہیں انکار کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

''میں بلا دیتا ہوں سرکار لیکن بڑے شاہ صاحب بہت ناراض ہوں گے۔'' اس نے دبے دبے انداز میں کہا۔

''ان سے پہلے میں تم سے ناراض ہوں گا۔'' وہ قدرے سختی سے بولا۔

ملازم الٹے قدموں پلٹ کر خواب گاہ کے دروازے کی جانب بڑھا اور مدھم سی دستک دے کر کچن میں چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کرسٹی اسی دروازے سے برآمد ہوئی۔ حیدر علی چند لمحے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کتنی مرجھا گئی تھی۔ اس کے سنہری بال نئے سرے سے تراشے جانے کے قابل ہو رہے تھے۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ذہانت کی جگہ دکھ' غصے اور بغاوت کے سائے تیر رہے تھے اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر جو شگفتگی' شادابی

اور نکھار ہوا کرتا تھا' وہ ماند پڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کی رسمی گفتگو کے بعد کرسٹی خاموش ہو گئی۔

''تم نے مجھے بلایا تھا۔'' وہ جلد از جلد اصل موضوع پر بات کر کے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ یہاں آ کر اسے رجب علی کی عدم موجودگی کا احساس شدت کے ساتھ ستانے لگا تھا' جس کی اجازت کے بغیر وہ اس کی بیوی سے ہمکلام تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ ان حالات میں وہ کرسٹی کا سامنا کرنے سے بھی کترا رہا تھا۔ وہ اگر اس سے رجب علی کے متعلق کوئی شکوہ شکایت کرتی تو بھلا کیا جواب دیتا اسے۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے نیلی آنکھوں سے حیدر علی کی جانب دیکھا۔

''کیسی مدد؟''

''میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں لیکن ہر راستہ بند ہے۔ تمہیں خط لکھنے کے بعد مجھے یقین بھی نہیں تھا کہ وہ تم تک پہنچ جائے گا لیکن اتنا یقین ضرور تھا کہ خط تمہیں مل گیا تو تم آؤ گے اور میری مدد بھی کرو گے۔''

''میں آج تک یہ بات نہیں سمجھ پایا کہ تم نے اتنا بڑا اور اہم فیصلہ اتنی جلدی کیوں کیا؟ اب تم مجھ سے مدد چاہتی ہو۔ کیا شادی سے پہلے اتنی سی زحمت بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ مجھ سے شادی کے بارے میں مشورہ کر لیتیں۔''

''اب ایک غلطی ہو گئی ہے' میں ماضی کو واپس نہیں لا سکتی' حال تباہ کر چکی ہوں' لیکن اپنے مستقبل کی تباہی قطعاً گوارا نہیں ہے۔ جو ہو گیا' وہ بہت تلخ تھا' میں اسے دہرانا نہیں چاہتی میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ اپنے اگلے سانس آزادی کی کھلی فضا میں لوں۔''

''مجھے تم نے عجیب پریشانی میں گرفتار کر دیا ہے۔'' حیدر علی نے سگریٹ سلگا لیا۔ ''تم نے بڑی امید وابستہ کر لی ہے تم نے مجھ سے۔''

''تم علی...... تم میری مدد کر سکتے ہو' اپنے بھائی کو قائل کر سکتے ہو کہ وہ مجھے طلاق دے دے۔'' وہ جلدی سے اسے قائل کرنے والے انداز میں بولی۔

''تم نہیں جانتیں کرسٹی' ہمارا سیٹ اپ بہت مختلف ہے میں آخری بندہ ہوں گا جو تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا سکے۔''

''گویا تم میری مدد نہیں کرو گے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا لیکن کیسے' یہ مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔''

''میں نے بہت کوشش کی اس کے خیالات بدلنے کی۔'' وہ آزردگی سے بولی۔ ''میرا خیال تھا کہ دلیل سے ہر ایک کو قائل کیا جا سکتا ہے لیکن نہیں' جس نے نہ ماننے کی قسم کھائی ہوا سے بھی قائل نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات اس کا رویہ اتنا نامعقول ہو جاتا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

وہ اچھے طریقے سے تصور کر سکتا تھا کہ رجب علی نامعقول ہونے پر آئے تو کن حدوں کو چھو سکتا ہے' لیکن وہ خاموش رہا۔

''اس کے نزدیک بیوی کسی جیتے جاگتے وجود کا نام نہیں کسی کھلونے کا نام ہے جو آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات تسلیم کرے' اس کی آنکھوں کے اشارے کے ساتھ اٹھے اور آنکھوں کے اشارے کے ساتھ بیٹھ جائے۔ اسے طلب ہو تو بن کے اس کے پاس آ جائے ورنہ کونے میں کسی بت کی طرح ٹکی رہے لیکن علی! میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔

یہ میری ذات کی نفی ہی نہیں تذلیل بھی ہے۔ میں کوئی ضرورت کی شے تو نہیں ہوں' میں سوچ سکتی ہوں' محسوس کر سکتی ہوں' میری بھی کوئی مرضی ہے لیکن اس کے نزدیک میں کچھ نہیں ہوں۔ بس جو کچھ ہے' وہ ہی وہ ہے۔ وہ موجود ہو یا نہ ہو' اس سارے گھر میں ہر طرف اس کی شخصیت بکھری ہوئی ہے۔ اس کے وجود سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ یہ اپارٹمنٹ! مجھے وحشت ہونے لگی ہے اس سے' اس کے وجود سے' تنگ آ گئی ہوں میں ان تین کمروں کی دیواریں دیکھ دیکھ کر۔

کچھ عرصہ اور مجھے اس جگہ رہنا پڑا تو میں یقیناً پاگل ہو جاؤں گی۔ تم یقین کرو گے کہ پچھلے چار مہینے سے میں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا' اخبار تک نہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ختم ہوئی جا رہی ہوں' میرے ذہن کو زنگ لگ رہا ہے' میں تو ہر وقت خوش رہنے والی لڑکی تھی' لیکن اب میں اس قدر چڑچڑی ہو گئی ہوں کہ مجھے خود ہی اپنی اس حالت سے خوف آنے لگا ہے۔''

حیدر علی چپ چاپ اس کی تمام گفتگو سن رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کرسٹی اپنے دل کا سارا غبار نکال کر ذہنی طور پر ہلکی ہو جائے' اس لیے اس کی باتیں سنتا رہا۔

''ہر انسان کی زندگی کے دو حصے ہوتے ہیں علی' ایک دوسرے کا اور ایک اپنا لیکن رجب علی شاہ یہ نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے گرد بسنے والے تمام افراد کی زندگی سمیٹ کر اپنے نام کرنا چاہتا ہے۔ ان کی زندگی بھی خود بسر کرنا چاہتا ہے۔'' وہ خاموش ہو گئی۔

''کاش! تم نے شادی سے پہلے مجھ سے کوئی بات کی ہوتی۔'' حیدر علی نے افسوس سے کہا۔ ''مجھے اس قدر پابندیوں کا اندازہ تو نہیں تھا پھر بھی رجب علی میرا بھائی ہے اور جس حد تک میں اسے جانتا ہوں اس کے بعد میں تمہیں کبھی اس شادی کا مشورہ نہ دیتا۔''

''میں پاگل ہو گئی تھی' اس کی باتوں میں آ گئی تھی' پتا نہیں کیوں' شاید اس لیے کہ وہ صرف اسمارٹ اور ہینڈسم ہی نہیں ہے بلکہ اس میں شاہی غرور بھی ہے۔ اس کی ذات کا یہی غرور اسے تم سے اور باقی لڑکوں سے جدا کرتا ہے۔ ہاں یہی بات تھی۔ وہ اپنی طرف مائل کر کے بے نیاز ہونے کا فن جانتا ہے اور میں اس کی اسی بے نیازی اور اسی غرور سے ہاری تھی۔'' وہ افسردگی سے بولی۔ ''حالانکہ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ صرف اور صرف اپنی ذات کی محبت میں گرفتار ہے

اور میں یہ سمجھتی رہی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ محبت ایسے تو نہیں کی جاتی علی، ہیں ناں؟" اس نے حیدر علی کی طرف دیکھا۔ وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

"محبت تو ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا سکھاتی ہے، ایک دوسرے کی تکلیف پر اکٹھے رونا اور خوشی پر اکٹھے ہنسنا سکھاتی ہے۔ On Jesus میں نے چھوٹی سی بے وقوفی کی بہت لمبی سزا کاٹی ہے۔"

"تم نے ان سے طلاق مانگی ہے کیا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے کرسٹی کی جانب دیکھا۔

"ہاں لیکن شاید وہ بہت اذیت پسند ہے۔ وہ مجھے ایسے ہی رکھنا چاہتا ہے۔ طلاق دینے پر بالکل آمادہ نہیں ہے۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں بلایا ہے کہ میری مدد کرنا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ جسے تم دلائل سے قائل نہیں کر سکیں، اسے میں قائل کرلوں گا۔" حیدر علی نے جھلاہٹ سے کہا۔ "تم تو ہر بات چلا کر بھی کہہ سکتی ہو، لیکن مجھے جو بھی بات کرنی ہو گی، اسے ادب و احترام کی کتنی ہی تہوں میں لپیٹنا پڑے گا اور اتنی تہوں میں لپیٹ کر اصل بات اندر ہی کہیں گم ہو جائے گی۔ بات کا مفہوم ہی بدل جائے گا۔"

"مجھے اتنا پتا ہے علی کہ مجھے اس قید سے رہائی نہ ملی تو میں خود کو ختم کرلوں گی، یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہے۔" اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

"تمہارے بھائی نے اپنی بیوی کو ایسے ہی رکھنا تھا تو اسے چاہیے تھا کہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرتا جو اسی قسم کے ماحول میں پلی بڑھی ہوتی۔ چڑیا گھر کے جانور کو ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے میں لے جایا جا سکتا ہے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آزاد فضاؤں میں تیرتے پنچھی کو ہم رنگ زمین دام میں گرفتار کر کے باقی ساری زندگی کے لیے پنجرے میں قید کر دیا جائے۔ مجھے یہاں سب کچھ میسر ہے...... وہ سب کچھ کہے بغیر لا کر میرے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے لیکن پنجرا سونے کا بھی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، رہتا تو وہ پنجرا ہی ہے۔ مجھے اتنی بے شمار اور قیمتی چیزوں کا کیا کرنا جب وہ مسلسل میری ذات کو رد کرتا رہتا ہے، مجھے وہ شکل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے جس میں مَیں ڈھل ہی نہیں سکتی۔ اسے تو درحقیقت ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جس کی ذات مائع کی طرح ہو، جس میں اس کا اپنا کچھ بھی نہ ہو۔ میری طرح کی کوئی لڑکی اس کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ جو عقل و شعور رکھتی ہو، جو اس کے نظریات کو دلیل کی تلوار کی دھار پر پرکھنا جانتی ہو۔ اس بے جوڑ شادی کو کبھی نہ کبھی ختم ہونا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اس کا اختتام میری خودکشی پر ہو۔"

"تم مجھے کچھ سوچنے کا موقع تو دو۔" اس نے صوفے کی پشت سے کمر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ دونوں چپ چاپ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ بیرونی دروازہ کھول کر رجب علی

اندر داخل ہوا۔ انہیں اکٹھا بیٹھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا پھر آگے بڑھ آیا۔ حیدر علی ایک دم سے گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ......؟" اس کے منہ سے اسی قدر نکل سکا۔

"ہاں۔" وہ اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ "بیٹھو۔"

حیدر علی بھی اپنے صوفے پر ٹک گیا۔

رجب علی نے کرسٹی کو مخاطب کیا لیکن اس انداز میں جیسے حیدر علی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

"تم نے طلاق مانگی تھی؟"

"ہاں۔" وہ مضطرب انداز میں بولی۔

"آل رائٹ! میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں، تمہیں جلد ہی کاغذات مل جائیں گے۔"

حیدر علی اور کرسٹی اچنبھے میں رہ گئے۔

وہ بات جو بظاہر اتنا بڑا مسئلہ نظر آ رہی تھی، یوں اچانک پل بھر میں طے ہو گئی تھی۔

لیکن حیدر علی اس کا بھائی تھا اور بہت زیادہ نہ سہی پھر بھی کسی قدر اپنے بھائی کو جانتا تھا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ کہیں رجب علی اس پر اور کرسٹی پر کسی شک کے باعث تو طلاق نہیں دے رہا۔

یہ خیال ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ رجب علی جیسا بھی تھا اس کا بھائی تھا اور کرسٹی بہرحال اس کی بھابی تھی۔ کم سے کم اس وقت تک تو بھابی ہی تھی جب تک رجب علی اسے طلاق نہ دے دیتا۔ اس نے تو اس سے پہلے کبھی کرسٹی کے متعلق ایسا نہ سوچا تھا۔ اب بھائی سے اس کی شادی کے بعد ایسا کیسے سوچ سکتا تھا۔

وہاں سے جاتے وقت کرسٹی بہت خوش تھی لیکن حیدر علی کے سینے میں پھانس اٹکی ہوئی تھی۔ کتنی دیر تک لونگ روم میں بیٹھ کر وہ سگریٹ پھونکتا رہا۔ رجب علی اپنی خواب گاہ میں تھا۔ کافی دیر کے بعد تمام تر ہمت مجتمع کر کے وہ اٹھا اور خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی۔

"یس!" اندر سے رجب علی کی آواز آئی۔

حیدر علی اندر داخل ہو گیا۔

"تم......! آؤ آؤ۔" رجب علی نے مسکرا کر کہا تو اسے کچھ ہمت ہوئی اور وہ اندر داخل ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" بہت ہمت کر کے وہ بولا۔

"کہو۔" اس نے پائپ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں اور کرسٹی صرف دوست تھے۔" اس نے بہت محتاط انداز میں کہا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ آپ کو میرا اور اس کا ملنا اچھا نہیں لگا۔ خاص طور پر اس لیے کہ آپ مجھے شادی کے فوراً بعد اس

بات سے منع کر چکے تھے اور شاید آپ نے اسے طلاق بھی اسی لیے دی ہے لیکن پلیز آپ یقین کریں کہ میں اس سے محض ایک دوست اور دیور ہونے کی حیثیت سے ملا تھا' اس سے ہم دونوں کا ہی کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔"

"میں جانتا ہوں تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" رجب علی نے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے ایک فیصد بھی یہ شک گزرتا تو میں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر تم دونوں کو شوٹ کر دیتا۔ اسے جھوٹ یا مذاق نہ سمجھنا۔ تمہارے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے ولایتی لوگ میری یہ بات سن کر یقیناً مجھے سفاک ہونے کا خطاب دیں گے لیکن مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے۔ میری رگوں میں دوڑنے والے خون کو اس معاشرے نے ابھی سفید نہیں کیا۔ غیرت کے پیچھے میں کسی کو بھی رعایت نہیں دے سکتا۔"

حیدر علی کا دل تو بہت چاہا کہ اس سے پوچھے کہ وہ کس غیرت کی بات کر رہا ہے۔ جو غیرت اپنی بیوی اور بھائی کے لیے کسی بھی وقت پھوٹ سکتی ہے' اس غیرت پر خود اپنے لیے اس نے کیوں بند باندھ رکھے ہیں۔ غیرت صرف بیوی یا بہنوں کو غیر محرم کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کیوں ابلنے لگتی ہے۔ وہ اس وقت کیوں نہیں ابلتی' جب خود رجب علی غیر عورتوں کے ساتھ ساری ساری رات گھر سے باہر گزار دیتا ہے اور اس کی بیوی تنہا بیٹھ کر رات کو اس کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ غیرت اور بے غیرتی کے یہ دہرے معیار کیوں؟ لیکن کہنے کی باری آئی تو...... صرف اسی قدر پوچھا۔

"پھر آپ نے اسے طلاق دینے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟"

"وہ قابلِ اعتبار نہیں تھی اور کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں نے اسے غیر محرم مردوں سے ملنے جلنے سے منع کیا ہوا تھا پھر بھی وہ تمہارے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ میں تمہیں جانتا ہوں علی' یہ بھی جانتا ہوں کہ تم محض پرانی دوستی کا پاس کر کے یہاں آئے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم دونوں کے درمیان کوئی غلط بات نہیں ہوئی' لیکن یہ بے اعتباری کی پہلی سیڑھی تھی' قصور تمہارا نہیں اس کا تھا۔ میری نظروں میں دوبارہ کبھی اسے پرانا مقام نہیں مل سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے اسے فوری طور پر طلاق دے دی۔"

عجیب منطق تھی رجب علی کی۔ اور عجیب تر معیارِ اخلاق تھا۔ حیدر علی کے ذہن میں بیک وقت بہت سے سوال کلبلا رہے تھے۔ وہ اس نرالی منطق اور عجیب و غریب معیارِ اخلاق کے فلسفے کی دھجیاں بکھیرنا چاہتا تھا' لیکن پاسِ ادب آڑے آ رہا تھا اور اس صورتِ حال میں خود اس کی اپنی پوزیشن بھی کمزور تھی۔

"آپ کا دل میری طرف سے میلا تو نہیں ہے۔" بالآخر اس نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" رجب علی نے پائپ کا کش لگا کر دھواں باہر چھوڑا تھا۔ "میں نے کہا نا

کہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو تم اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے یہاں موجود نہ ہوتے۔"

حیدر علی ماتھے کو ہاتھ سے رگڑ کر مسہری پر لیٹ گیا' اصولاً حیرت کے اس پہلے جھٹکے کے بعد اسے سنبھل جانا چاہیے تھا لیکن ہوتا یہ تھا کہ رجب علی کی باتیں اور اطوار ہر مرتبہ نئے سرے سے اسے حیرت زدہ کر دیتے تھے۔ بعض اوقات وہ الجھ بھی پڑتا تھا اور بعض مرتبہ جھلا کر اس جگہ سے دور چلا جاتا تھا' جہاں رجب علی اپنے نادر خیالات کا اظہار کر رہا ہوتا تھا۔

اور اب اس کے سامنے بہنوں اور ان کے مستقبل کا مسئلہ تھا۔ بابا جان تو اس سلسلے میں کچھ سننے پر آمادہ ہی نہیں تھے۔ تکلیف دہ بات تو یہ تھی کہ رجب علی بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اگر ایک رجب علی اس کا ساتھ دیتا تو وہ بابا جان پر دباؤ ڈال بھی سکتا تھا۔ انہیں قائل کرنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا' لیکن افسوس تو اس بات کا تھا کہ وہ اس معاملے میں ان سے کہیں زیادہ سخت تھا۔

ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ اٹھ کر باہر نکل گیا اور پیدل چلتا رہا۔

گاؤں کی گلیوں میں چہل پہل تھی۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر کچھ لوگ خریداری میں مصروف تھے۔ یہ بازار گاؤں کی سب سے پُر رونق اور دلچسپ جگہ تھی۔ یہاں وہاں بچے کھیلتے پھر رہے تھے۔ کچھ بالکل ننگ دھڑنگ اور کچھ صرف لمبی سی قمیص میں ملبوس مٹی سے اٹے یہ بچے ہر طرف کود رہے تھے۔ عورتیں اِدھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔ سر ڈھانپے اور بقیہ چادر کو گلے میں لٹکائے ہوئے' ان کے اطوار میں گنوار پن نمایاں تھا۔ کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ آنکھوں اور چال میں جوانی کی شوخی لیے جب وہ ان دکانوں کے پاس سے گزرتیں تو وہاں وقت گزاری اور نظر بازی کے شوق میں کھڑے لڑکوں کی نگاہیں دور تک ان کا پیچھا کرتیں۔ ان کے تعاقب میں جاتیں۔ رنگین فقرے اچھلتے' سینے پر ہاتھ رکھ کے دردِ دل کے واسطے دیئے جاتے' کہیں سے ہائے ہائے اور کہیں سے وائے وائے کی صدائیں آتیں اور پھر دور جاتی مہ جبینوں کی دبی دبی ہنسی ابھرتی۔ کبھی کبھار بظاہر بے نیازی میں ہوا کے دوش پر کاغذ بھی اُڑتے جاتے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ کاغذ کس ہاتھ سے نکلے ہیں اور انہیں کس تک پہنچنا ہے۔

حیدر علی کے وہاں پہنچنے پر بازار کی رونق نصف سے بھی کم ہو گئی۔ وہاں سے گزرنے والے سبھی لوگ مؤدب ہو گئے۔ دکانوں پر کھڑے نوجوان کھسکنے لگے۔ لڑکیوں کی مستانی چال میں تیزی آ گئی۔ ہاں کن اکھیوں سے وہ حیدر علی کا جائزہ لینے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ کاغذوں' فقروں اور شوخ نگاہوں کا کھیل بند ہو چکا تھا۔ بچے البتہ ویسے ہی اچھل کود میں مصروف تھے۔

وہ چلتا ہوا وہاں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ مسجد کے سفید مینار اسے آوازیں دے رہے تھے۔ اس کی گوری اسے بلا رہی تھی' پکار رہی تھی اس سے ملنے کی بے قراری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مسجد کے اطراف میں بہت سکون اور بہت خاموشی تھی۔ یہاں مکان بھی بہت کم اور قدرے فاصلے پر تھے۔

حیدر علی، مسجد کے مقابل ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور سگریٹ سلگا کر رات والے روزنوں اور دریچوں کی ڈھونڈ کے کھیل میں مصروف ہو گیا۔ شاید یہ روزن منور ہو جائیں یا وہ دریچہ کھل جائے۔ ایک بے معنی آنکھ مچولی...... بھوسے کے ڈھیر میں سوئی کی تلاش کی بے کار کوشش لیکن وقت گزرنے کے باوجود بھی تبدیل نہ ہوا۔ مسجد بالکل خالی تھی۔ یہاں تک کہ سپارہ پڑھنے والے بچے بھی وہاں موجود نہیں تھے۔

تھک ہار کر اس نے خالہ کبریٰ کے گھر کا راستہ لیا۔ فصل تیار کھڑی تھی اور وہ دونوں طرف لہلہاتے کھیتوں کے بیچ چلتا جا رہا تھا۔

گوری کی خالہ کبریٰ کے گھر موجودگی کی کوئی امید نہیں تھی اور اسی لیے اس کی چال میں بھی کوئی تیزی نہیں تھی۔ خالہ کبریٰ کا گھر بھی ویسے ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہی کسی فلسفی کی طرح سر جھکائے غور و خوض کرتا برگد کا بوڑھا درخت، وہی رہٹ کے پانی کی جھر جھر، وہی خاکستری کچا پکا مکان اور وہی کٹ کٹ کر کے دانہ چگتی مرغیاں اس نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ خالہ کبریٰ دروازے کا کنڈا تھامے کھڑی تھیں۔

''تم!'' اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ تم شہر چلے گئے ہو گے۔''

''گیا تھا، پر اب لوٹ آیا ہوں۔''

''آؤ، اندر آ جاؤ۔'' انہوں نے اس کے لیے راستہ چھوڑا۔

وہ دونوں اندر کمرے میں چلے آئے۔ گو کہ اسے...... وہاں گوری کی موجودگی کی توقع نہیں تھی پھر بھی اس نے امید بھری نظروں سے اِدھر اُدھر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ گھر میں صرف خالہ تھیں۔ اپنی تنہائی کے ساتھ۔

''آپ کیسی ہیں خالہ؟'' اس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بس بیٹا! دن پورے کر رہی ہوں۔'' وہ افسردگی سے بولیں۔ ''اب تو یہی خواہش ہے کہ اللہ پاک عزت سے بلا لے۔''

''خدا خیر کرے، ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی زندگی دے اور آپ اولاد کی ڈھیروں خوشیاں دیکھیں۔''

''اولاد کی خوشی میرے مقدر میں کہاں۔ بڑی بیٹی ہے سدا سے بیماری اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ چھوٹی ہے تو وہ اپنے گھر میں خوش نہیں۔ پتا نہیں کب یہاں واپس آ جائے۔ کچھ جو امید تھی تو وہ صفدر سے تھی لیکن اس نے بھی اپنی مرضی چلا لی۔ ماں کو پوچھا تک نہیں۔'' ان کا لہجہ دکھی ہو گیا۔ ''بس تقدیر کی بات ہے'' پھر انہوں نے بات پلٹی۔ ''میں بھی کیا دکھڑے سنانے بیٹھ گئی۔ تم اپنا حال چال سناؤ، گھر والوں سے مل کر آئے ہو کیا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں، بس شہر میں بھی، یہی افسوس رہا کہ آپ کو بتائے بغیر چلا گیا۔''

''پہلے تو میں فکر مند ہو گئی تھی پھر خیال آیا کہ تم شہر چلے گئے ہو گے، مجھے تمہاری واپسی کی امید نہیں تھی۔ یوں بھی یہاں دھرا ہی کیا ہے تم جیسے جوان کے لیے۔''

وہ سوچنے لگا کہ خالہ سے گوری کے متعلق کیسے دریافت کرے۔ ابھی وہ موزوں الفاظ کی تلاش ہی میں تھا کہ خالہ نے صفدر کا ذکر چھیڑ دیا۔

''کتنی محبت سے کتنی جان مار کر پالا تھا میں نے صفدر کو، بیٹیاں بے شک اللہ کی رحمت ہوتی ہیں لیکن ارمان تو بیٹے کا ہی ہوتا ہے ناں، پہلے اولاد بچتی ہی نہیں تھی پھر صفدر کے ابا نے شہر کی ڈاکٹرنی سے علاج کروایا اور اللہ تعالیٰ نے شفا دی تو سیدھے دو لڑکیاں پلے پڑ گئیں۔ میں تو رو رو کے بے حال ہو گئی۔ تب صفدر کے ابا پیر صاحب کے والد صاحب کے پاس لے گئے۔ ان کی دعا سے میرا صفدر پیدا ہوا۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''باپ کا سایہ تھا تو یہ بھی ٹھیک تھا جیسے ہی انہوں نے آنکھیں بند کیں بس یہ میرے ہاتھ سے نکل گیا کتنے جتن کیے میں نے تعویذ بھی کرائے لیکن بے فائدہ۔''

وہ ان کی بات بے توجہی سے سن رہا تھا۔ اس کے حواسوں پر اس وقت گوری کا قبضہ تھا اور وہ صرف اور صرف اس کے متعلق دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت ہر چیز اسے بے حد بے کار اور بور لگ رہی تھی۔

''اس سے تو اچھا تھا کہ میں زیبی آپی کے پاس چلا جاتا۔ ان سے کم از کم میں گوری کے متعلق کھل کر بات تو کر سکتا ہوں۔'' اس نے سوچا۔

لیکن خالہ کبریٰ اس کی سوچوں سے بے خبر بولے گئیں۔ ان کا پسندیدہ موضوع صفدر کے ابا اور صفدر تھا۔ سارے دن کی تنہائی میں اگر چند لمحے کے لیے کوئی آ جاتا تھا تو وہ اس سے سب باتیں کہہ دینے کی کوشش کرتی تھیں۔

''اسے چھینک بھی آتی تھی تو میں حکیم صاحب کے پاس دوڑی جاتی تھی۔ ٹھنڈ لگ جاتی تھی تو اپنی رضائی بھی اس کے اوپر ڈال دیتی تھی، تاپ چڑھتی تھی تو اس کے سرہانے سے ہلتی نہیں تھی، لیکن اسے ماں کا خیال نہ آیا۔ غیروں کو بلا لیا، اپنی شادی پر اور مجھے شادی کے بھی کتنے دن بعد اطلاع دی۔''

''کیا صفدر نے شادی کر لی؟'' اس نے ان کی دلچسپی کے پیشِ نظر پوچھا۔

''ہاں بیٹا! اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔ کیا کیا ارمان تھے میرے۔ اس کے پیدا ہوتے ہی میں نے اس کی شادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ خاندان کیا گاؤں کی بھی کوئی لڑکی میری نظروں میں نہیں جچتی تھی۔ پھر ایک دن اللہ نے میری سن لی اور بھانجی کی پیدائش کے ساتھ ہی میں نے سوچ لیا کہ اسی کو صفدر کی دلہن بناؤں گی لیکن......''

انہوں نے آہ بھر کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کب کی اس نے شادی؟''

''مہینہ بھر ہوگیا ہے۔''

''یہاں گاؤں کی کسی لڑکی سے تو نہیں کی ہوگی۔''

''یہاں کی کوئی لڑکی پسند کر لیتا تو بات ہی کیا تھی' چلو میری پسند کی ہوئی لڑکی کو دلہن نہ بناتا میں دل پر پتھر رکھ لیتی' لیکن جو بھی دلہن لاتا کم از کم اپنی تو ہوتی۔ اس نے تو وہاں کراچی میں کسی شہری لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ جو تھوڑی بہت امید اس کے واپس آنے کی تھی' اب تو وہ بھی نہیں رہی۔ لڑکی یہاں کی ہوتی تو آج نہیں کل وہ ضرور واپس پلٹتا' میرے لیے نہ سہی بیوی کی خواہش پر ہی سہی لیکن اب وہ وہیں کا ہو کر رہ جائے گا۔ پتا نہیں میرے جنازے کو کندھا دینے بھی آئے گا یا نہیں۔''

''اللہ تعالیٰ خیر کرے گا خالہ۔''

''تم ہی بتاؤ بیٹا! کیا خرابی تھی زرینہ میں۔ تم نے تو اسے دیکھا ہوا ہے' کس چیز کی کمی تھی اس میں' لیکن صفدر کے سر پر تو شہری لڑکی سوار تھی۔''

حیدر علی سناٹے میں رہ گیا۔

گویا خالہ کا انتخاب زرینہ تھی۔ اس نے سوچا۔

''اس کے ماں باپ سے بھی کر لی تھی' میں نے بات لیکن اس کے ابا نے کہا کہ صفدر کے آنے پر دیکھا جائے گا۔ شکر ہے کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی' ورنہ میری ناک تو کٹوا ہی دی تھی اس نے۔''

''جی۔'' اس نے اسی قدر کہا۔

''سب سے زیادہ دکھ تو مجھے زرینہ کا ہے۔ میں نے مارے شرمندگی کے ان کے گھر اطلاع بھی نہیں بھجوائی لیکن بیٹا! یہ خبر بھی بھلا چھپ سکتی ہے۔ سنا ہے کہ جس دن سے زرینہ کو اس بات کا علم ہوا ہے اس دن سے وہ ایسی بیمار پڑی ہے کہ چارپائی سے اٹھ بھی نہیں سکی۔''

''کیا؟'' اس کی بات پوری طرح سمجھ میں نہ آنے کے باوجود وہ چلایا۔

اس کی زرینہ' اس کی گوری بیمار تھی' اتنی زیادہ کہ چارپائی سے لگ کر رہ گئی تھی لیکن آخر کیوں؟ اس کی بیماری کی وجہ صفدر تو نہیں ہو سکتا تھا پھر کیا ہوا تھا اسے؟ وہ تو گوری کو ہنستے ہوئے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر بہت رسان سے الوداع کیا تھا پھر اچانک یہ کیا ہو گیا تھا اسے؟ وہ کچھ نہ سمجھ پایا۔

''آپ کو کس نے بتایا کہ وہ بیمار ہے؟'' حیدر علی نے اضطراب سے پوچھا۔

چند لمحے تک خالہ اسے تکے گئیں۔ اس کا اضطراب ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

''جس طرح صفدر کی شادی کی بات نہیں چھپی' اسی طرح یہ بات کیسے چھپ سکتی تھی۔''

''ہوا کیا ہے اسے؟'' حیدر علی کو اب اس بات کی پروا نہیں تھی کہ خالہ اس بارے میں کیا سوچیں گی۔ اس کی گوری اتنے دن سے بیمار تھی اور وہ اس قدر بے خبر تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہو سکا۔

''معلوم نہیں۔'' خالہ نے سرد مہری سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''خالہ پلیز مجھے بتائیں کہ اسے کیا ہوا ہے؟'' وہ ان کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ وہ ان سے نرمی سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے اصرار میں خود بخود معمولی سی سختی آ گئی تھی۔

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' انہوں نے پلٹ کر کہیں زیادہ سختی سے پوچھا۔

''کیونکہ۔'' اس نے تیزی سے کہنا چاہا کہ وہ گوری سے محبت کرتا ہے لیکن پھر بمشکل زبان پر قابو پایا۔ اسے اپنی نہیں گوری کی فکر تھی۔ جس طرح صفدر کی شادی کی بات نکل سکتی تھی ویسے ہی یہ بات بھی تو باہر نکل سکتی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہر خاص و عام کی زبان پر ان کا قصہ ہو اور ہر فرد اس قصے میں اپنی پسند کی کلیاں ٹانک کر اس سے چسکا لے۔ اس بات سے اس کا تو کچھ نہ بگڑتا ہاں گوری اپنا سب کچھ کھو دیتی۔

خالہ کی نظروں میں اب تک یہ سوال تھا۔ اسے چپ دیکھ کر وہ گویا ہوئیں۔

''تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں کہ آئندہ اپنی زبان پر زرینہ کا نام بھی نہ لانا۔ اس کے باپ کی بہت عزت ہے گاؤں میں۔ بہت بے داغ پگڑی ہے مولوی صاحب کی۔ وہ ہزار نرم دل سہی لیکن یہ بات کبھی برداشت نہیں کریں گے' اپنی سفید پگڑی پر داغ لگنے سے پہلے ہی پیر صاحب سے کہہ کر وہ تمہیں اور زرینہ کو ذبح کروا کے رکھ دیں گے چاہے قصور کسی ایک ہی کا ہو۔''

کرسٹی کے بقول اس میں رجب علی کی طرح کا شاہی غرور تو نہیں تھا لیکن اس کی رگوں میں خون تو وہی دوڑ رہا تھا۔ گرم گرم تیزی سے گردش کرنے والا لہو جسے اپنی توہین گوارا نہیں تھی۔

''کس کی جرأت ہے کہ پیر صاحب کی اولاد کی گردن پر چھری چلا سکے؟''

''اللہ پیر صاحب کی اولاد کو سلامت رکھے انہیں ہزاروں خوشیاں دکھائے۔ میں اس کی نہیں تمہاری بات کر رہی ہوں۔'' خالہ کبریٰ نے سمجھے بغیر تیزی سے کہا۔

''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ ابھی کسی کے ہاتھوں میں اتنی جان نہیں ہے کہ میری گردن پر چھری چلا سکے اور نہ ہی کسی میں اتنی ہمت ہے کہ میری پسند کو مجھ سے الگ کر سکے۔''

''کک' کیا کہہ رہے ہو؟'' خالہ گھبرا گئیں۔ ''تم کون ہو؟''

خالہ کو گھبراتے دیکھ کر وہ اپنے الفاظ اور لہجے پر پریشان ہو گیا۔

''گھبرائیں نہیں خالہ' میں اب بھی آپ کا بیٹا ہوں۔'' اس نے انہیں تسلی دی۔

''مجھے بتاؤ تم کون ہو اور پیر صاحب سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' ان کے ہاتھ پاؤں پھول

رہے تھے۔

''اس گھر میں' میں صرف آپ کا بیٹا ہوں۔''

''میرا دم نکلنے کو ہے' جلدی بتاؤ تم کون ہو؟'' ان کی سوئی ایک ہی سوال پر اٹکی ہوئی تھی۔

''میں حیدر علی ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

چند ثانیے تک خالہ بے یقینی سے اس کی جانب دیکھتی رہیں پھر ''ہائے'' کہہ کر انہوں نے دوہتڑ اپنے سینے پر مارا۔

''یہ کیا غضب ہو گیا۔ کیا گناہ کر بیٹھی میں انجانے میں۔''

''کیا ہو گیا ہے خالہ آپ کو۔'' حیدر علی انہیں سہارا دے کر کمرے میں لایا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔ ''ٹھہریں میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔''

''شاہ صاحب! مجھے اور گناہگار نہ کریں۔ ہم اُمتی تو آپ کے پاؤں کی خاک ہیں۔ ہماری جگہ آپ کے قدموں میں ہے آپ کے برابر نہیں۔''

''خالہ میں آپ کو ماں جی کی طرح سمجھتا ہوں اور ماں کی جگہ پاؤں میں نہیں ہوتی۔'' وہ انہیں تسلی دیتا رہا۔

☆======☆======☆

اس دن زرینہ صبح سے ہی کچھ گم صم تھی۔ اماں نے بھی اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ حویلی جاتے ہوئے اس کے چہرے پر ہمیشہ والی شادابی نہیں تھی لیکن انہوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔

''ہو جاتا ہے ناں ایسا کبھی کبھار۔'' انہوں نے سوچا تھا۔ ''کبھی نیند پوری نہیں ہوتی اور کبھی یونہی گھر بیٹھے بندہ اکتا جاتا ہے۔ پھر موسم بھی تو اچھا نہیں ہے۔''

یہی سوچ کر انہوں نے اسے حویلی جانے کی اجازت دے دی تھی کہ اس کا دل بہل جائے گا۔ یوں بھی انہوں نے اس پر زیادہ روک ٹوک نہیں رکھی تھی۔ وہ تھی بھی تو ایسی کہ اس کے چہرے کی معصومیت دیکھ کر بے اختیار پیار آ جاتا تھا اور یہ بھی تھا کہ وہ بہت سلجھی ہوئی تھی۔ گلی سے گزرتی تو ناک کی سیدھ میں چلتی جاتی تھی۔ گاؤں کی اور لڑکیوں کی طرح اِدھر اُدھر مسکراہٹیں تو نہیں اچھالتی تھی۔ حالانکہ حُسن وخوبصورتی میں اس گاؤں کی کیا ارد گرد کے کسی بھی گاؤں کی کوئی لڑکی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں بھی اس پر بہت اعتماد تھا۔

لیکن اس دن جب وہ گھر واپس آئی تھی' تو آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر تھا۔ گلابی رنگت ایسی زرد ہو رہی تھی جیسے پیلا ریشم' ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ پتا نہیں گھر تک کیسے پہنچی تھی وہ کیونکہ گھر کی دہلیز عبور کر کے دو قدم بھی نہیں چلی ہو گی کہ چکرا کر زمین پر گر پڑی۔ اسے گرتے دیکھ کر وہ اور رضیہ بھاگ کر اس تک پہنچے تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی ان دونوں نے اٹھا کر

اسے اندر بستر پر ڈالا۔ رضیہ پانی لے آئی۔ کچھ منہ پر ٹپکایا اور کچھ ہونٹ کھول کر پلانے کی کوشش کی۔ مولوی صاحب کام سے چند دن کے لیے شہر گئے ہوئے تھے اس لیے اماں کو ہی برقع سر پر ڈال کر حکیم صاحب کی طرف دوڑنا پڑا۔ ان کی کوشش سے اس نے آنکھیں تو کھول دیں لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

''وہاں روح تھی۔ ہاں' میں نے خود دیکھا تھا۔ زیب النساء انسان نہیں روح ہے۔'' ہوش میں آنے کے بعد وہ چلانے لگی تھی۔ ''میں نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں نے۔''

اماں مزید گھبرا گئیں اس کی یہ بہکی بہکی باتیں سن کر۔ رضیہ جانتی تھی کہ وہ کس وجہ سے زیب النساء کے پاس جا رہی تھی۔ وہ ہر وہ بات جانتی تھی جو شاہ صاحب اور زرینہ کے درمیان ہوتی تھی۔ زرینہ اس سے کچھ نہیں چھپاتی تھی۔

اس کے حویلی جانے سے پہلے رضیہ کے ذہن میں کتنے ہی خدشات نے سر ابھارا تھا۔ اس نے منع بھی کیا تھا زرینہ کو بہت روکا بھی تھا اسے حویلی جانے سے لیکن وہ رکی نہیں تھی۔

''شاہ جی نے کہا تھا میں ان سے ضرور ملوں اور شاہ جی کا کہا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔'' زرینہ نے کہا تھا۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو زرینہ' اگر بات باہر نکل گئی تو غضب ہو جائے گا۔'' وہ زچ ہو گئی تھی۔

''آج نہیں تو کل اس بات کو نکلنا ہی ہے اور یاد رکھو میری ڈھال بہت مضبوط ہے۔ سارے وار اپنے اوپر سہہ لیں گے شاہ جی' مجھ پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔'' اس کے لہجے میں مان تھا' فخر تھا۔

اور اب رضیہ' زرینہ کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اماں کو ابھی تک اس کی باتوں سے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ زیب النساء سے ملنے کیوں گئی تھی لیکن زرینہ اپنے حواسوں میں کب تھی۔ اگر وہ زیب النساء کا ذکر چھوڑ کر چھوٹے شاہ صاحب کا ذکر شروع کر دیتی تو اماں کو خبر ہونی یقینی تھی۔ رضیہ اسی پریشانی کے عالم میں اس کے سرہانے بیٹھ کر مسلسل اسے تسلی دے رہی تھی۔

''میں نے خود دیکھا ہے رضیہ۔'' وہ اس کے سینے پر سر ٹکائے بے آواز روتے ہوئے اسے اپنی بات کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''زیب النساء بھاگ جائے گی۔ تم دیکھ لینا' پھر تمہیں میری بات کا یقین آئے گا۔ وہ پاگل بدروح ہے۔ نہیں۔ اس کے کمرے میں پاگل بدروح ہے۔ اس کی پھوپھو اس بستر پر مری تھیں ناں۔ لاش چلی گئی' روح وہیں رہ گئی۔''

''کچھ نہیں ہے' سب تمہارا وہم ہے۔'' رضیہ نے اس کے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''تم سو جاؤ۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں تم مانتی کیوں نہیں ہو۔'' وہ بار بار اپنی بات کی نفی ہوتے دیکھ کر زچ

ہو چکی تھی۔

"اچھا اچھا وہاں بدروح ہے لیکن یہاں تو نہیں ہے۔ مسجد پاک صاف جگہ ہوتی ہے۔ بدروحیں ایسی جگہ کا رخ نہیں کرتیں۔ تم آرام سے سو جاؤ' وہ یہاں نہیں آئیں گی۔" وہ اسے بچوں کی طرح تھپک کر سلانے لگی۔

"میں اب وہاں نہیں جاؤں گی' کبھی نہیں۔" وہ بڑبڑائی۔

گویا عشق کا بھوت اتر گیا لیکن آخر زیب النساء نے ایسا کیا کہہ دیا کہ چند منٹ میں ہی اس کی کایا پلٹ گئی۔ رضیہ اسے تھپکتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

روتے روتے رضیہ اور اماں کو اپنی بات کا یقین دلاتے ہوئے وہ سو گئی تھی۔ اسے سوتا دیکھ کر اماں نے رضیہ کو ہاتھ کے اشارے سے باہر آنے کے لیے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے اچانک میری بچی کو۔" ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ "شکر ہے تمہارے ابا گھر پر نہیں ہیں ورنہ میں ان کو کیا جواب دیتی۔"

"پتا نہیں کیا ہوا ہے۔" رضیہ ہولے سے بولی۔

"یہاں سے جاتے ہوئے بھی مجھے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی لیکن پتا نہیں وہاں کیا ہوا کہ اس کی حالت اتنی بگڑ گئی۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" اس نے نظریں چرالیں۔

"وہ تو گھرانہ بھی ایسا نہیں ہے کہ ان پر شک کیا جا سکے۔ پتا نہیں کیا کیا دیکھ سن آئی ہے کہ بدروح بدروح لگی ہوئی ہے۔" وہ فکرمندی سے بولیں۔

"کچھ نہیں اماں جان ٹھیک ہو جائے گی۔ آپ زیادہ فکر نہ کریں۔"

"اللہ کرے۔" انہوں نے کہا۔ "مجھے لگتا کہ کچھ دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ طبیعت پہلے بھی ٹھیک نہیں تھی اس لیے زیادہ اثر ہوا ہے۔ سو کر اٹھے گی تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔"

یہ مفروضہ قائم کر کے وہ کام کاج میں مصروف ہو گئیں لیکن ہوا یہ کہ اس کی طبیعت مزید خراب ہو گئی اور وہ تیز بخار میں پھنکنے لگی۔ اکثر سوتے میں چیخ مار کر جاگ پڑتی اور جاگتے میں ڈر کر رضیہ کو تھام لیتی۔

مولوی صاحب گاؤں واپس آئے تو اماں کو بحالت مجبوری انہیں ساری بات بتانا پڑی۔ اگر وہ ٹھیک ہو گئی ہوتی تو شاید وہ سرسری سا تذکرہ کر کے یہ بات مولوی صاحب کے کانوں میں ڈال بھی دیتیں اور اس باب کو بند بھی کر دیتیں لیکن اب تفصیل بتانا ناگزیر تھی۔

"ڈر اور خوف سے اس قدر بخار۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "رضیہ کی ماں سچ کہہ رہی ہو کہ یہی بات ہوئی ہے؟"

"قسم سے میں سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ جلدی سے بولیں۔

"تم نے اسے صفدر کی شادی کا تو نہیں بتایا؟ کہیں اس صدمے سے۔"

انہوں نے سوالیہ انداز میں اماں کی جانب دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"لیں بھلا اسے صفدر سے کیا دلچسپی کہ وہ اس بات کو اپنے دل سے لگا لے۔" اماں نے جلدی سے اس کی وکالت کی۔ "کہہ تو رہی ہوں میں آپ کو کہ وہ چھوٹی بی بی اور اس کی پھوپھو کی بدروح کا ذکر کر رہی تھی۔ ان کا صفدر سے کیا تعلق؟"

"پیر صاحب کی ایک ہی ہمشیرہ تھیں اور ان کی وفات بہت برس پہلے عالم جوانی میں ہوئی تھی لیکن کسی بدروح کا کیا کام؟" اماں کی بات مولوی صاحب کے حلق سے اتر نہیں رہی تھی۔

"یہ مجھے کیا پتا لیکن جب وہ گھر آئی تھی تو پیلی ہلدی ہو رہی تھی۔ اسے یوں دیکھ کر میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ پہلے تو اللہ معاف کرے شیطان کے کان بہرے' میرے ذہن میں کوئی اور خدشہ آیا تھا لیکن پھر اس کا خوف دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر کم از کم یہ خدشہ ڈھل گیا۔"

"نہیں نہیں۔ پیر صاحب کی حویلی میں ایسی بات کے رونما ہونے کے متعلق سوچنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔" مولوی صاحب بولے۔ "زرینہ کہیں اور بھی تو نہیں گئی تھی؟"

"نہیں۔ وہ تو حویلی میں بھی زیادہ دیر نہیں رکی۔ جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گئی تھی۔ میں حیران ہوں کہ واپس بھی کیسے آئی' گھر میں داخل ہوتے ہی گر گئی تھی۔ شکر ہے کہیں راستے میں بے ہوش نہیں ہو گئی۔"

"میری تو عقل حیران ہے۔" مولوی صاحب بولے۔ "آخر اتنا کیا ڈر خوف۔"

"چڑیا جتنا تو دل ہے میری بیٹی کا۔ اتنی معصوم اور اتنی بھولی ہے۔" اماں بولیں۔ "یہ ٹھیک ہو جائے تو میں پیر صاحب کے والد اور حضرت صاحب کے مزار پر گھی کے چراغ جلاؤں گی۔ سورۃ یٰسین کا ختم کراؤں گی۔ بس یہ ٹھیک ہو جائے۔"

بیماری نے زرینہ کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ اس کی رنگت سنولانے لگی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑنے لگے تھے اور اب چیخنے چلانے کے بجائے وہ کھوئی کھوئی نظروں سے خلا میں نہ جانے کیا تکتی رہتی تھی۔

"یہ دودھ پی لو۔" رضیہ نے اس کی چارپائی پر بیٹھ کر پیار سے اسے کہا۔

اس نے ایک نظر رضیہ کو دیکھا اور پھر ہوا میں تکنے لگی۔

"پی لو ناں۔" اس نے پیار بھرے لہجے میں اصرار کیا۔ "چلو میں خود ہی پلا دیتی ہوں۔"

رضیہ نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا لیکن اس نے ہاتھ سے گلاس پرے کر دیا۔

"میری بات بھی نہیں مانو گی؟ بس صرف دو گھونٹ ہی لے لو۔"

"رضیہ' شاہ جی کو بلا دو۔ کہیں سے انہیں ڈھونڈ لاؤ۔" کتنے دن بعد اس نے لب کھولے تھے۔ آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

رضیہ نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا پھر آہستہ سے اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگالی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس دن زیب النساء سے ملنے کے بعد زرینہ پر کیا بیتی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ چھوٹے شاہ صاحب کے عشق کا بھوت یقیناً اتر چکا تھا۔ وہ جو بار بار کہہ رہی تھی کہ اب کبھی حویلی میں قدم نہیں رکھے گی۔ ظاہر ہے اس بات سے رضیہ اور کیا مطلب اخذ کر سکتی تھی لیکن اب اس کے لہجے اور آنسوؤں سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اب تک شاہ صاحب کو بھولی نہیں تھی۔

''میں نے تمہیں کتنا سمجھایا ہے زرینہ۔'' وہ دکھ سے بولی۔ ''ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھو۔ تم اپنے آپ کو پہچان نہیں پاؤ گی اور تمہارا یہ حال صرف اور صرف چھوٹے شاہ صاحب کے سبب ہوا ہے۔ خدا کے لیے زرینہ' اب بھی وقت ہے واپس پلٹ آؤ۔''

''تم مجھے زندہ سلامت دیکھنا چاہتی ہو؟ تمہیں مجھ سے محبت ہے؟ تو خدا کے لیے شاہ جی کو ڈھونڈ لاؤ۔'' وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر بری طرح سے رو پڑی۔

رضیہ حیران پریشان تھی کہ کیا کرے۔ کیا کہہ کر زرینہ کو تسلی دے۔ اسے حویلی میں پیش آنے والے واقعے کا بھی تو علم نہیں تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ زرینہ کا یہ حال کیسے ہوا؟ وہ کیسے شاہ صاحب کو ڈھونڈے انہیں کیسے یہاں لائے؟ یہ تو ناممکنات میں سے تھا۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔

کتنی محبت تھی اسے زرینہ سے' کتنی خواہش تھی اسے کہ وہ خوش رہے لیکن زرینہ تو اسے ان حدود میں قدم رکھنے کو کہہ رہی تھی جہاں داخل ہوتے ہی رضیہ کے پَر جل جاتے۔ اس کی اڑان ختم ہو جاتی۔

بات صرف رضیہ کی ذات کی ہوتی تب بھی وہ پرواز کرتی لیکن جو کچھ زرینہ چاہتی تھی اس کی لپیٹ میں تنہا اس کی ذات نہیں آتی تھی۔ اس میں اماں' ابا اور پیر صاحب کے گھرانے سمیت ان دونوں گھرانوں کی عزت بھی آتی تھی۔

اس نے ایک نظر گھٹنوں پر سر رکھے روتی ہوئی زرینہ کی جانب بے بسی سے دیکھا پھر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے چپ کرانے لگی۔

جیسے جیسے رات بھیگتی جا رہی تھی ویسے ویسے زرینہ کا تکیہ بھی بھیگتا جا رہا تھا۔ پھر دور سے سائیں بابا کی پُرسوز اور درد میں ڈوبی آواز آنے لگی۔

''ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندا ای
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندا ای
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندا ای

بھلا دس کھاں چریں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندا ای
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے ایویں جیوڑا لوک ولاوندا ای
اِک باز توں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندا ای''

(ہیر نے جوگی سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو' روٹھے ہوئے سجن کو کوئی راضی نہیں کر سکتا۔ میں تو ایسے شخص کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی جو دور گئے سجن کو واپس لے آئے۔ جو میرے دل کا درد مٹا دے' وہ چاہے میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہن لے۔ تم خود ہی بتاؤ کہ مدتوں کے بچھڑے ہوئے محبوب کو سچا رب کب واپس بھیجتا ہے۔ لوگ یونہی دل رکھنے والی باتیں کرتے ہیں' ورنہ مرے ہوئے اور بچھڑے ہوئے کو کوئی نہیں ملا سکتا۔ اگر باز سے کوے نے کونج چھین لی ہے۔ دیکھو اس باز نے خاموش ہو کر اپنی چونچ پروں تلے چھپالی ہے یا وہ کوک رہا ہے۔)

درد میں بھیگی یہ آواز سیدھی زرینہ کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ ایسا لگا جیسے سبزے میں چھپے جھینگروں سمیت ساری کائنات یہ راگ الاپنے لگی ہے۔

''ایہا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیا نوں موڑ لیاوندا ای
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے ایویں جیوڑا لوک ولاوندا ای''

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر وہی منظر گھوم گیا زیب النساء کا جذبات سے عاری چہرہ اور سب ساکت چیزوں کے درمیان اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ۔ اسے جھرجھری آ گئی۔

کمرے میں پھیلی مدھم سی چاندنی میں اس نے قریب کی چارپائی کی جانب دیکھا۔ رضیہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے بھی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی لیکن آنکھیں بند کرتے ہی شاہ جی کا تصور اسے بے چین کر دیتا تھا۔

''کہاں ہیں آپ؟'' اس نے دُکھے دل کے ساتھ سوچا...... ''آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کی زینی آپی آپ کی خوشیوں میں خوش ہوتی ہیں لیکن یہ کیا کیا انہوں نے میرے ساتھ؟ اور آپ کہاں چلے گئے؟ میری پرواز محدود ہے لیکن آپ پر تو کوئی پابندی نہیں لیکن نہیں۔ آپ تو آئے ہوں گے خالہ کبریٰ کے گھر۔ میرا انتظار بھی کیا ہوگا' کھیتوں کے درمیان بنے کچے راستے پر کسی تانگے کے پہیوں اور گھوڑے کے سموں کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہوگی لیکن آپ کو دھول اڑاتے راستے پر کچھ نہیں ملا ہوگا۔'' اس نے آہ بھری۔ ''میں وہاں نہیں ملی تھی تو مجھے تلاشتے ہوئے کھوجتے ہوئے یہاں آجاتے۔ خدا کی قسم' آپ کی خاطر میں اس آگ میں بھی کود جاتی۔ سب کو بھلا کر' سب کی پروا کیے بغیر آپ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتی۔ کہیں سے آجائیں شاہ جی خدا کے لیے۔''

رات کے سناٹے میں موٹر کی مدھم سی آواز ابھری۔ وہ اپنے بستر پر اٹھ بیٹھی۔ پورے گاؤں میں موٹر صرف حویلی ہی میں تھی۔ آواز آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ زرینہ کا دل دھڑک اٹھا۔ اندر ہی اندر کوئی اس سے کہہ رہا تھا۔

''یہ شاہ جی ہیں جو تمہاری خاطر آئے ہیں۔ صرف اور صرف تمہاری خاطر۔ اپنی گوری، خاطر۔ وہ بھی ویسے ہی بے چین ہیں جیسے تم۔''

موٹر کی آواز مسجد کے سامنے یک لخت ختم ہو گئی تھی۔ وہ تیزی سے بستر سے اتر کر کھڑکی کی جانب لپکی لیکن دو قدم بھی نہ چلی کہ نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے چکرا کر زمین پر گر پڑی۔

گرنے کی آواز سن کر رضیہ کی آنکھ کھل گئی، پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا لیکن پھر کمرے میں پھیلی مدھم سی چاندنی میں اسے زرینہ کا بستر خالی نظر آیا تو وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''زرینہ کہاں ہو تم؟'' اس نے کمرے میں ہر طرف نگاہ دوڑائی۔

بستر اور کھڑکی کے درمیان زرینہ گری پڑی تھی اور شاید بے ہوش تھی۔

''اوہ خدایا۔'' رضیہ اس کی طرف لپکی۔

گھبراہٹ میں اسے لالٹین جلانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے اس نے زرینہ کو اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ وہ واقعی بے ہوش تھی۔ رضیہ اسے ہلا جلا کر ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگی لیکن جب اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا تو وہ صحن میں پڑے گھڑے سے پانی کا کٹورا بھر لائی۔

''زرینہ میری جان آنکھیں کھولو۔'' اس کے منہ پر پانی چھڑکتے ہوئے وہ گھبراہٹ میں اسے پکار بھی رہی تھی۔

زرینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی لمحے باہر موٹر کی آواز ایک مرتبہ پھر بلند ہوئی۔

''رضیہ مجھے کھڑکی تک لے چلو۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ''باہر شاہ جی آئے ہیں۔''

''شاہ جی آئے ہیں۔'' وہ تعجب سے بولی۔ ''تمہیں کس نے بتایا کہ وہ آئے ہیں؟''

''دیر مت کرو مجھے پتا ہے وہ آئے ہیں۔ میرے لیے آئے ہیں۔ کہیں وہ چلے نہ جائیں۔'' اس نے ملتجی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

رضیہ تذبذب کے عالم میں تھی۔

''وہ جا رہے ہیں۔'' زرینہ نے بستر سے اترنا چاہا۔

موٹر کی آواز ایک مرتبہ پھر دور ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اترتا دیکھ کر رضیہ نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے کھڑکی تک لے آئی۔

زرینہ نے بے تابی سے باہر جھانکا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ سوائے دور جاتی موٹر کی بتیوں اور جھینگروں کی آوازوں کے۔ مایوسی اس کے رگ و پے میں اترتی چلی گئی۔

☆======☆======☆

پیر صاحب مزارعوں کے تصفیہ طلب امور نمٹا رہے تھے۔ رسہ گیری، نہری پانی کی چوری، لڑکیوں کے والدین کی گاؤں کے لڑکوں کے خلاف شکایات اور نہ جانے کیا کیا۔

''حضور! کھوجی نے کھرا نکالا ہے، انہی کے گھر کی طرف جاتا ہے نشان۔'' ایک فریاد کرتا۔

''سرکار! رحمٰن نگر والے مسلسل ہمارا پانی چوری کر رہے ہیں۔'' دوسرا رپورٹ پیش کرتا۔

''پیر صاحب! آپ ہمارے مائی باپ ہیں، بہت پریشانی میں آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں۔ یہ نور محمد کا لڑکا سارا دن گاؤں کی لڑکیوں کو تاکتا رہتا ہے۔ میں نے سمجھایا تو میری بیٹی کے پیچھے پڑ گیا۔'' کوئی اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر روتا۔

ان سب کی تسلی تشفی کر کے ان کے مسائل نمٹا کر وہ منشی فضل دین سے مخاطب ہوئے۔

''رجب علی واپس آیا؟''

''نہیں حضور ابھی تک تو نہیں آئے۔''

''کچھ خیر خبر آئی، بتایا کہ کب تک آنے کا ارادہ ہے؟''

''لاہور سے ٹیلی فون آیا تھا سرکار، شکورے نے بتایا ہے کہ آج رات تک پہنچ جائیں گے۔'' منشی نے بتایا۔

''رجب علی نے سب کچھ اتنی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد ہمیں کافی دقت محسوس ہو رہی ہے۔''

''حضور چھوٹے شاہ صاحب یہیں موجود ہیں کہیں تو انہیں بلا بھیجوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولے۔ ''یہ کام اس کے بس کا نہیں ہے۔''

''حضور! ایک درخواست کرنی تھی۔'' منشی دبے دبے انداز میں بولا۔

''کہو۔''

''بڑے شاہ صاحب نے کچھ حکم دیئے ہیں، میں نے سوچا آپ سے تصدیق کروا لوں۔'' اس نے پہلے والے انداز سے کہا۔

''رجب علی کا ہر حکم ہمارا حکم ہے، جو کچھ اس نے کہا ہے بالکل ویسے ہی ہونا چاہیے۔ تم لوگوں پر اس کی اطاعت ویسے ہی فرض ہے جیسے ہماری اطاعت۔''

''جی سرکار۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اگر رات کے وقت وہ لاہور سے یہاں پہنچا تو اسے بتا دینا کہ اگلی صبح کو ہم سے ملاقات کر لے۔''

☆======☆======☆

عورتوں کو اسیر کرنے کا فن رجب علی سے بہتر کسی کو نہ آتا تھا۔ تبھی بھری بیٹھک میں

بیسیوں رئیس زادوں کے درمیان چندا بائی رجب علی کی اسیر ہوگئی تھی۔ پھر وہی شاہی غرور و تمکنت' وہی سر اٹھا کر چلنے کا انداز اور لٹانے کو بے تحاشہ دولت۔ شیرا اتنا گاڑھا ہو تو بھلا مکھی کی کیا مجال کہ ایک مرتبہ بیٹھ کر پھر اٹھ بھی سکے۔ مردانگی کی ظاہری خصوصیات تو یہی تھیں اور پھر مائل بہ کرم ہونے کے بعد یک لخت بے نیاز ہو جانا۔

عورت تو عورت ہوتی ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ جانے والی اور چندا بائی تو ان عورتوں میں سے تھی جو جھوٹ کو سچ سمجھنے کی شعوری کوشش میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہیں۔ ہر ایک آ کر کہتا ہے چندا بائی سے محبت ہوگئی ہے اور وہ ہر ایک کی بات کو سچ سمجھنے لگتی۔ شروع میں تو اس بات سے نگینہ بائی کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا لیکن پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔

چندا بائی محبت کے الفاظ کو سچ سمجھنے کی کوشش تو اب بھی کرتی تھی لیکن اب اس کے نزدیک محبت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اس سے محبت کرنے والا اپنی محبت کے حساب سے بٹوے سے نوٹ نکال نکال کر اسے دیتا جائے' جو جتنے نوٹ نکالتا تھا وہ اس کے الفاظ کو اسی درجے کے میزان پر تولتی تھی۔

الفاظ اب بھی اسے خوش کرتے تھے' لیکن صرف وقتی طور پر' اسے احساس ہو چکا تھا کہ اگر وہ ان الفاظ سے صرف خوشی نچوڑتی رہی تو بھوکی رہ جائے گی۔ روٹی کھانے کے لیے چند روپے بھی نہیں ہوں گے اس کے پاس اور جس ہار سنگھار کے سہارے وہ اپنے گرد بھیڑ لگائے رکھتی ہے یہ ہار سنگھار ختم ہو کر رہ جائے گا۔ ایک مرتبہ یہ حقیقت ذہن نشین کر لینے کے بعد اس نے ہر الفاظ کے درجے متعین کر دیئے تھے۔ اس کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ بیٹھک بھی بھری رہتی تھی' کاروبار بھی چلتا رہتا تھا اور جھوٹ اور سچ کے اس کھیل میں مگن ہو کر وہ خوش بھی رہتی تھی۔

لیکن رجب علی نے چندا بائی کو عجیب مصیبت میں گرفتار کر دیا تھا۔ اس کی میزان کے مطابق تو وہ اس کا سب سے سچا عاشق تھا ہی لیکن صرف سچ نے اس سے پہلے اس پر یہ اثر تو نہیں کیا تھا۔ شروع میں یہ سچ اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتا تھا۔ ایک انوکھی لذت پیدا ہو جاتی تھی یہ ایک فقرہ سن کر۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔''

لیکن آہستہ آہستہ اس سچ کا اثر صرف اتنا رہ گیا کہ یہ سنتے ہی اس کے دل کی کلی کھلنے لگتی ہونٹ مسکانے لگتے' گردن پُر غرور انداز میں تن گئی۔ آنکھوں میں بے نیازی کی چمک اتر آئی کمر میں لچک پیدا ہوگئی اور چال میں شوخی آ گئی۔

اس دفعہ پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ رجب علی شاہ سے مل کر اس کی باتیں' اس کی سرگوشیاں تن من وہ پگھلنے لگی تھی' چھنچنے لگی تھی' اس کے وجود کی ساری بے نیازی بہہ رہی تھی۔ وہ اسے سمیٹ کر پھر سے چندا بائی کی شکل دینا چاہتی تھی لیکن بہتے ہوئے خیال کو کہاں تک قابو کرتی۔ اپنا جسم تو اس

نے بہت سے لوگوں کے حوالے کیا تھا لیکن اپنی شخصیت اور روح تک کسی کو بھی نہیں پہنچنے دیا' اپنے اندر دفن کیا ہوا تھا اسے۔

لیکن رجب علی شاہ نے صرف اس کا جسم نہیں لیا تھا' اس کے اندر سے اس کی شخصیت اور روح تک کو باہر کھینچ لایا تھا۔ وہ اس سے بچ نکلنا چاہتی تھی' بھاگ جانا چاہتی تھی' لیکن اس کی اُڑان کی صلاحیت تو وہ سلب کر چکا تھا۔

دولت لٹانے کے لیے تو اس کے پاس آنے والا ہر شخص بے قرار ہوتا تھا اور سب ہی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے لیکن ان کے پاس بھی صرف دولت ہی تھی۔ ان میں سے کسی میں بھی وہ عجیب سی مقناطیسی کشش نہیں تھی جو رجب علی شاہ کی شخصیت کا حصہ تھی۔

وہ اسے اپنے گلبرگ والے محل نما بنگلے میں لے آیا تھا۔ جس چیز پر اس نے ہاتھ رکھا تھا' جس چیز کی طرف اشارہ کیا تھا اس نے چندا بائی کے آگے ڈھیر کر دی تھی۔

خود چندا بائی کو بھی مدت بعد سجنے سنورنے میں مزہ آیا تھا۔ اس نے بہت اہتمام کیا تھا۔ نیوی بلیو ساڑھی زیب تن کر کے' کانوں میں بالی پتا ڈالے' بانہوں میں ایک قطار میں درجنوں کھنکتی ہوئی چوڑیاں اور کنگن اور پاؤں میں پائل ڈال کر اس نے اپنا سراپا آئینے میں دیکھا۔ وہ حسین تھی لیکن آج حسین تر لگ رہی تھی۔ آئینے کے سامنے سے ہٹنے سے پہلے اس نے ماتھے پر چمکتی ہوئی بندیا لگائی اور خوبصورت سی مسکان خود بخود ہی اس کے رنگین ہونٹوں پر پھیل گئی۔ رجب علی شاہ کو دیوانہ بنانے کے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو چکی تھی وہ...... تصور ہی تصور میں وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔

''مجھے دیکھ کر وہ ہوش و خرد سے دیوانہ نہ ہوا تو میں بھی چندا بائی نہیں۔'' اس نے سوچا۔

''جب وہ دیوانہ وار میری جانب بڑھے گا تو میں اٹھلا کر شکوہ کروں گی کہ آپ نے ہمیں پھول تو دلوائے ہی نہیں اور وہ ہر رنگ اور ہر خوشبو کا پھول میرے سامنے ڈھیر کر دے گا۔''

ایک مرتبہ پھر اس نے اپنا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر ڈرائینگ روم کی جانب چلی آئی' جہاں رجب علی شاہ موجود تھا۔ چندا بائی نے دروازے میں کھڑے ہو کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ پائپ کے کش لیتے ہوئے کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔

چندا بائی نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور نزاکت سے چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے ملبوس کی خوشبو کی لپٹیں اور اس کے وجود کی مہک رجب علی شاہ تک پہنچی تو ضرور ہو گی پھر بھی اس کی نگاہیں رسالے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ چندا بائی کو تعجب ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی اس کی موجودگی سے یوں بے خبر رہے۔ اس نے کھنکھار کر رجب علی کو اپنی طرف متوجہ کیا لیکن اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

"شاید سنا نہیں ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

اور پھر وہ اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب کے رجب علی نے اپنی نگاہیں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ اس کے رنگین ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی' لیکن ایک لمحے سے بھی کم عرصے میں اس مسکراہٹ نے دم توڑ دیا کیونکہ رجب علی اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر سے پائپ کے کش لینے اور رسالے کے مطالعے میں مصروف ہو گیا تھا۔

تعجب تو چندا بائی کے تاثرات کو بیان کرنے کے لیے بہت چھوٹا سا لفظ تھا۔ چند لمحے تو وہ یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ اس کے دل میں کیا تھا جو ٹوٹ گیا۔ اس کی انا اور اس کا غرور یا کچھ اور' اتنی بے نیازی اور اتنی بے مروتی تو اس کے تصور سے بھی باہر تھی۔ اس کی دو گھنٹے کی تیاری اور صرف ایک اچٹتی نگاہ۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا اس کے ساتھ۔ اس کا واسطہ تو ہمیشہ جنبشِ ابرو کے غلاموں سے پڑا تھا پھر یہ آج کیا ہوا تھا؟ اس کی روح تک بلبلا اٹھی تھی۔ کیا اس کی خوبصورتی اور اس کا نکھار اس بات کا مستحق بھی نہیں تھا کہ وہ اسے غور سے دیکھ تو لیتا۔ صرف ایک نظر' ایک ستائش بھری نظر۔ وہ اچٹتی سی نگاہ اسے اندر تک کاٹ دینے کے لیے کافی تھی۔

اس نے رجب علی کی جانب دیکھا۔ ان دونوں کے درمیان دھوئیں کی ایک باریک سی تہہ موجود تھی اور اس دھوئیں کے پیچھے وہ مطمئن انداز میں دائیں ہاتھ میں پائپ تھامے کسی انگریزی رسالے پر نظریں جمائے ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھا تھا۔

چندا بائی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہوں۔" وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولا۔

"کہاں گم ہیں آپ؟" اس نے ایک ادا کے ساتھ شکایتی لہجے میں کہا۔

اس نے چندا بائی کی طرف دیکھا' لیکن وہ ایسی سپاٹ نظروں کی متمنی تو نہیں تھی۔

"کاغذوں کے اس ڈھیر میں کیا رکھا ہے۔" وہ آنکھوں میں چمک بھر کر بولی۔ "چلیے کہیں باہر چلتے ہیں' یہاں کمرے میں ہمارا دل گھبرا رہا ہے۔"

"ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔" وہ پھر پائپ اور رسالے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

یہ انتہا تھی' پھر بھی چندا بائی نے ہار نہ مانی اور ایک کے بعد ایک کتنے ہی جتن کر ڈالے لیکن رجب علی کی بے نیازی کا خول نہ چٹخا۔ اس نے اپنا سب کچھ سونپ کر رجب علی کو پانے کی کوشش کی' لیکن وہ اسے نہ پا سکی۔ وہ پیسہ لٹانے کو تیار تھا پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ چندا بائی کی میزان کے مطابق وہی اس کا سچا عاشق تھا' لیکن اس نے تو چندا بائی کی میزان بھی الٹا دی تھی۔ اچانک ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ پیسے کے ساتھ ساتھ اسے رجب علی کے لفظوں کی بھی ضرورت ہے' لیکن رجب علی جتنی بے دردی سے اور جس قدر بے دریغ دولت لٹا رہا تھا' محبت کے الفاظ کے بارے

میں اتنا ہی کنجوس تھا وہ ہر روز پہلے سے بڑھ کر اس کی اسیر ہو رہی تھی۔

وہ خود کو ایسے سیارے کی مانند محسوس کر رہی تھی جو انجانے میں سورج کی کشش کے تابع ہو گیا تھا اور اب اس کے گرد تیزی کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ اس کے قریب جانے کی خواہش تھی لیکن اس کی حدت کی وجہ سے پاس جانے کی جرأت نہ تھی اور اس سے دور ہٹنا ممکن نہیں تھا۔ بس ایک محور تھا جس کے گرد چکر کاٹنے پر مجبور تھی۔ وہ اس کی ذات کے پنجرے میں محبوس ہوتی جا رہی تھی اور جانتی تھی کہ رجب علی شاہ کی شخصیت اسے اپنے اندر قید کرتی جا رہی ہے اسی لیے وہ اس کے پاس سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ کہیں دور نکل کر اس طلسم سے رہائی پانا چاہتی تھی لیکن ہر مرتبہ صرف پھڑ پھڑا کر رہ جاتی' بے بس ہو جاتی تھی وہ۔ اس کے سامنے اسے لگتا تھا جیسے اس کی روح رجب علی نے اپنے پاس رکھ لی ہے' کبھی نہ لوٹانے کے لیے۔

اس کا دل شدت سے چاہتا تھا کہ وہ نہیں تو رجب علی جلد یہاں سے چلا جائے' کہیں بھی' بس یہاں نہ رہے۔ اس طرح شاید وہ اس قید سے رہا ہو جائے' لیکن جس دن رجب علی نے اسے اس کی رہائی کا مژدہ سنایا اس دن اس کی بے کلی اور بڑھ گئی۔ اس نے کتنی منتیں کی تھیں اس سے رک جانے کے لیے' اس کا فیصلہ تبدیل نہیں ہوا تھا اور وہ اسے واپس وہیں چھوڑ آیا تھا' جہاں سے اسے لایا تھا۔ جسم اسے لوٹا گیا تھا' روح اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

☆======☆======☆

رجب علی نے شکورے اور دوسرے ملازمین کو پہلے ہی گاؤں بھیج دیا تھا اور اب خود بھی اپنی شوامپالا میں نیاز پور کی طرف رواں دواں تھا۔ اسے گاؤں پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے کار کی رفتار درمیانی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک پر پڑے زیت کے ذرات چمک رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی بس قریب سے گزرتے ہوئے ہارن بجاتی تو سڑک پر زندگی کے آثار دکھائی دیتے ورنہ بس وہ تھا کار کے انجن کی آواز تھی یا اس کی لامتناہی سوچیں۔

"اچھی تھی چندا۔" اس نے سوچا۔ "بس صرف اچھی' حُسن اور خوبصورتی تو موجود تھی' جادوگری نہیں تھی اس میں' پاؤں زمین کے ساتھ جکڑنے کا منتر نہیں آتا تھا اسے۔ ہاں کرشتی تھی' ان بے شمار لڑکیوں سے بہتر جو میری زندگی میں آئیں لیکن بہترین نہیں تھی۔ بہترین کوئی بھی نہیں تھی۔ دیکھتے رہنے اور لوٹ آنے پر مجبور کرنے والی کوئی نہیں تھی۔ ایک دلچسپ دن اور ایک رنگین رات کے بعد اپنی دلکشی کھو دینے والی کھلی کتاب کی طرح کی عورتیں جنہیں پڑھ لینے کے بعد ان کے اندر کچھ بچتا ہی نہیں ہے۔ عورت میں تو اسرار ہونا چاہیے' بھول بھلیاں ہونی چاہئیں' کسی ایسی کتاب کی طرح جسے بار بار پڑھنے کو دل چاہے۔ جس میں روز ایک نئے اور انوکھے باب کا اضافہ ہو' جس کا روز ایک نیا مفہوم سامنے آئے۔ چندا جیسی عورتیں وقت گزاری کے لیے ٹھیک ہیں' منزل بنا کے ڈیرے ڈالنے کے لیے نہیں۔"

پتا نہیں وہ بھی کبھی ملے گی جسے دیکھتے ہی منزل مل جانے کا احساس دل میں کروٹیں لے گا۔ ڈھونڈ ختم ہو جائے گی۔ تلاش کا سفر تمام ہوگا' زندگی میں ٹھہراؤ آ جائے گا' جس کے لیے دل خود یہ صدا دے گا کہ یہی ہے وہ جس کی تلاش میں برسوں میں نے مارا ماری کی ہے۔ ہزاروں لڑکیوں کو آزمایا ہے اتنی لڑکیوں' اتنی بہت سی لڑکیوں میں کوئی ایک تو ایسی ملتی جو اسیر ہو جانے کے بجائے اسیر کر لینے کا فن جانتی' منتر پڑھ کر پتھر بنا لینے کا فن جانتی اور پھر ہمیشہ کے لیے وہیں بسیرا کر لیتی۔''

اس نے کار جی ٹی روڈ سے نیاز پور کے کچے راستے پر اتار دی۔ ہچکولے کھاتی جہازی سائز شوامپالا آہستہ روی سے حویلی کی سمت بڑھ رہی تھی۔

جب سائیں بابا کی درد میں ڈوبی آواز رجب علی شاہ کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وِچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک باز توں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

ادھیڑ عمر سائیں بابا کھیتوں کے قریب بنے ہوئے کچے راستے پر لنگڑا کر چلتے ہوئے گا رہا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی اپنے اوپر پڑتے ہی وہ کچے راستے سے اتر کر کھڑی فصل میں غائب ہو گیا۔

رجب علی اسے نظر انداز کر کے آہستہ روی سے گاڑی چلاتے ہوئے حویلی میں پہنچ گیا۔

☆======☆======☆

مہر النساء اور زیب النساء ماں جی کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

''درزن بٹھا کر اب شادی کے کپڑے سلوا لو۔'' ماں جی ان سے کہہ رہی تھیں۔ ''دن کتنے رہ گئے ہیں شادی میں' سستی سے کام مت لو۔''

''جی اچھا۔''

''میں دیکھ رہی تھی علی بہت اچھے کپڑے لایا ہے' جو تم لوگوں کو پسند آئیں وہ تم رکھ لو۔''

''ہمارے لیے جو کپڑے لایا ہے علی' وہ ہم لے چکے ہیں۔'' زیب النساء نے کہا۔

''اُن میں سے بھی کوئی اچھا لگے تو رکھ لو' یاسمین کے لیے اور آتے رہیں گے۔'' ماں جی نے پیار سے کہا۔

پھر مہر النساء سے مخاطب ہوئیں۔ ''حمیدہ کہاں ہے؟ اس سے کہو کپڑوں کا صندوق یہاں

لے آئے۔''

''ماں جی! اس کی کیا ضرورت ہے' اتنے بہت سے کپڑے تو علی لایا ہے ہمارے لیے اور کی کیا ضرورت ہے؟'' مہر النساء نے کہا۔

''بات ضرورت کی نہیں میری اور تمہارے بابا جان کی خوشی کی ہے۔ اولاد کو خوش دیکھ کر ماں باپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔''

پھر انہوں نے صندوق کھلوا کر ڈھیر سارے رنگ برنگے جھلملاتے ملبوسات ملازماؤں کے ہاتھوں کمرے میں ہر طرف رکھوا دیئے۔ بڑی بہو کو ملنے والے خاندانی زیورات ہٹا کر باقی سب زیور بھی ان کے سامنے رکھ دیئے۔

''یہ سب تمہارے سامنے ہے۔'' ماں جی نے کہا۔ ''جو اچھا لگے بلا تکلف اٹھا لو۔''

اُن کی بات منہ ہی میں تھی کہ دروازے کے باہر سے پیر صاحب کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہونے والے ہیں۔ مہر النساء اور زیب النساء نے جلدی سے چادروں کے پلو سر پر ڈالے اور احترام کی خاطر کھڑی ہو گئیں۔

''ٹھیک ہیں آپ دونوں؟'' انہوں نے شفقت سے باری باری دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ بیٹیوں کو انہوں نے کبھی بھی 'تم' کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔

''جی بابا جان۔''

''کھڑی کیوں ہیں' بیٹھ جائیں۔'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بھی بیٹھ گئیں۔

''گویا شادی کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔'' انہوں نے چاروں طرف جگمگاتے ملبوسات اور زیورات کی جانب دیکھا۔

''جی بابا جان!''

''میں ان سے کہہ رہی تھی کہ انہیں جو چیز اچھی لگے' اپنے لیے منتخب کر لیں۔'' ماں جی نے بتایا۔

''بالکل' بالکل' اس گھر کی ہر چیز پر پہلا حق آپ دونوں کا ہے۔'' وہ بولے۔

''ہم دونوں کا؟'' مہر النساء یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس پڑی۔ ''اس سے بڑا مذاق بھی ہو سکتا ہے کوئی۔ گدی بھائی کی' جائیداد بھائی کی' زمینیں اُن کی' حویلیاں اُن کی' سب دولت اُن کی' گھر کے چراغ اُن کے اور بالآخر یہ سب کچھ اُن کی اولاد کا۔ ہمارا کیا ہے یہاں؟ زندگی میں دو کمرے اور مرنے کے بعد اپنے آبائی قبرستان میں دو دو گز زمین' پھر ہمارے یہی کمرے بھائی جان کی بیٹیوں کے حصے میں آ جائیں گے جیسے ہم سے پہلے اس خاندان میں گزرنے والی عورتوں کے کمرے ہمارے حصے میں آئے ہیں۔ ہاں قبر کے لیے سب کا حصہ اپنا اپنا ہے۔''

"چپ کیوں ہیں بیٹا! اپنی پسند کی چیز اٹھالیں۔" انہوں نے پاس بیٹھی زیب النساء کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "یہ پسند نہیں تو بتائیں ہم کل ہی علی کو لاہور بھیج کر آپ کی پسند کی چیز منگوا دیں گے۔ بس ہماری ایک ہی خواہش ہے بیٹا کہ آپ دونوں خوش رہیں اور اپنی پسند اور خواہش کا اظہار کرتے وقت جھجکیں بالکل مت' ہمیں کھل کر بتا دیں' جس چیز کی خواہش یا ضرورت ہو بس ایک اشارہ کر دیں۔"

"کھل کر بتا دیں' اشارہ کر دیں۔" کوئی بہت تلخ اور کڑوی سی چیز اس کے حلق میں اتر چلی گئی۔ "ہونہہ! زبانی جمع خرچ' کیا سب کچھ کہہ دینا ضروری ہوتا ہے۔" اس نے سوچا۔ "ہمارے اظہار کی طاقت سلب کر کے اب کہتے ہیں کہ ہم سب کچھ کہہ دیں' کس منہ سے کہیں بابا جان' آپ نے تو ہمیں پاکیزگی کی سفید چادروں میں لپیٹ کر فرشتوں کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ اچھائی اور نیکی کو ہمارے اوپر اس قدر مسلط کر دیا ہے کہ ہم چاہیں بھی تو کچھ نہیں بول سکتے اور اگر بول ہی پڑیں بابا جان تو بھی کیا ہوگا۔ تاروں کے ٹوٹنے سے بھی کبھی سکوتِ شب میں دراڑ پڑ سکتی ہے؟

یا میں کہہ دوں کہ مجھے ایک گھر کی ضرورت ہے' شوہر کے پیار محبت کی ضرورت ہے' اس اولاد کی ضرورت ہے جسے میں اپنے ہاتھوں میں کھلا سکوں' جسے اپنی آنکھوں کے سامنے جوان ہوتے دیکھ سکوں۔

لیکن یہ کہنے سے کیا ہوگا؟ کیا آپ یہ سب کچھ مجھے دے دیں گے؟ نہیں ناں' تو پھر کہنے کا فائدہ؟ کہ یہ مقام بھی نہ رہے جو آج ملا ہوا ہے اور خلش ساری زندگی کے لیے رہ جائے۔"

لیکن یہ سب باتیں وہ کہہ نہیں سکتی تھی' ہاں سوچ سکتی تھی کیونکہ اس کی سوچ پر کوئی پہرے نہیں تھے۔ بابا جان' ماں جی' بھائی اور مہرالنساء کسی کی رسائی بھی تو نہیں تھی اس کی سوچ تک۔

تھوڑی دیر بعد وہ بابا جان اور ماں جی سے معذرت کر کے اپنے اپنے کمرے میں آ گئیں۔

مہرالنساء اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو حمیدہ اس کے جھلملاتے ملبوسات پھیلا کر بیٹھی ہوئی تھی' اسے اندر داخل ہوتے دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو حمیدہ' بیٹھو۔" مہرالنساء پیڑھے پر بیٹھ گئی۔

"بڑی بی بی! کتنے اچھے کپڑے ہیں آپ کے' ایمان سے آپ کے مقابلے میں کوئی لڑکی نہیں ٹھہر سکے گی جب آپ یہ پہنیں گی۔" وہ جوش سے بولی۔ "بس اب جلدی سے یہ سب سلوا لیں۔"

"تمہیں اچھے لگ رہے ہیں یہ کپڑے؟"

"اچھے نہیں بہت اچھے لگ رہے ہیں' یہ دیکھیں نیلے رنگ کا جوڑا۔" حمیدہ نے نقرئی ڈبا اٹھا کر اس کے سامنے رکھا۔ "اور یہ ہرا اور اس پیلے جوڑے کا دوپٹا کتنا اچھا ہے ایک سے بڑھ کر

ایک ہے۔ اتنے بڑھیا کپڑے میں نے نہیں دیکھے۔" وہ جوش سے بولے جا رہی تھی۔ "اور یہ سونے کے زیور تو لگتا ہے' خاص طور پر آپ کے لیے بنے ہیں۔"

"تمہیں جو جوڑا' جو کپڑا اچھا لگے' وہ لے لو۔"

"جی!" اس نے تعجب سے مہرالنساء کی جانب دیکھا۔

اس سے قبل بھی وہ اسے کپڑے دیتی رہی تھی۔ عمدہ عمدہ بڑھیا کپڑے جنہیں پہن کر وہ اپنی سہیلیوں اور رشتہ دار لڑکیوں کے سامنے خوب شو مارتی تھی' لیکن ان میں سے کوئی بھی اتنا عمدہ کپڑا نہیں تھا۔ زیادہ تر تو اسے اترن ہی ملتی تھی اور جب کبھی مہرالنساء خوش ہو کر اسے نیا کپڑا دے دیتی تھی تو اماں فوراً ہی اسے جہیز کے نام پر بڑے صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیتی تھی۔ پر ایسے کپڑے' وہ بھی بالکل نئے' اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟" مہرالنساء بولی۔

"بی بی! اللہ تعالیٰ یہ کپڑے آپ کو مبارک کرے' میری تعریف کا یہ مطلب نہیں تھا۔" حمیدہ گڑبڑا کر بولی۔

"لے لو حمیدہ! میں جو تم سے کہہ رہی ہوں۔ میں ان کپڑوں کا کیا کروں گی؟" اس کے لہجے میں دکھ کی پرچھائیاں اتر آئیں۔ "تم پہنو گی تو کوئی دیکھے گا' سراہے گا۔ تمہاری تعریف کرے گا۔ میرے لیے تو ہر کپڑا کفن جیسا ہے' جس کی طرف کوئی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتا' جسے کوئی نہیں سراہتا' کوئی تعریف نہیں کرتا۔"

"بی بی! اللہ پاک سے دعا کریں' وہ ہر ایک کی سنتا ہے۔"

"میری دعا میں تاثیر نہیں ہے حمیدہ' میں تو دعا کر کے ہار گئی لیکن شاید اوپر کے دروازے میرے لیے بند ہیں۔ یہاں کے سب لوگ بابا جان سے دعا کرواتے ہیں اور سب کی دعائیں وہ اوپر والا سنتا ہے' لیکن میں ایسی بدقسمت ہوں کہ ان کی اولاد ہوتے ہوئے بھی ان سے دعا کرنے کو نہیں کہہ سکتی۔

لوگوں نے اولاد مانگی' ترقی مانگی' اچھی فصل مانگی' بیٹیوں کے بر مانگے اور بابا جان نے سب کے لیے اس اوپر والے کے سامنے ہاتھ پھیلائے' سب کی دعائیں باریاب ہوئیں۔ اولاد بھی ملی' ترقی بھی ملی' اچھی فصل بھی ملی اور بیٹیوں کے بر بھی' لیکن ہمیں کیا ملا اپنے بابا جان سے؟ صرف ان کے نام کے طفیل آئندہ کے لیے آبائی قبرستان میں چند گز زمین سیّدہ مہرالنساء کے نام کی۔"

حمیدہ چپ چاپ وہ سب جھلملاتے ہوئے رنگین کپڑے تہہ کر کے واپس صندوق میں رکھنے لگی۔

☆======☆======☆

اپنے کمرے میں بیٹھی رضیہ منتیں کر رہی تھی زرینہ کی کہ وہ کچھ کھا پی لے لیکن وہ مان کر ہی نہیں دے رہی تھی۔

"میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا' قسم سے۔" زرینہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

اس کے آنسو رضیہ کے اندر تک دکھ کی لہریں اتار دیتے تھے۔

"تھوڑا سا میرے ہاتھ سے' بس صرف دو نوالے۔" رضیہ نے روٹی' سالن میں ڈبو کر اس کے ہونٹوں کے قریب کی۔

اس سے قبل کہ وہ ہونٹ وا کرتی مسجد سے متصل دروازہ کھول کر مولوی نعمت اللہ صحن میں داخل ہوئے۔

"رضیہ کی ماں' رضیہ کی ماں؟" انہوں نے اونچی آواز میں اماں کو پکارا۔ حالانکہ باآواز بلند بولنا' ان کی عادت نہیں تھی۔

"ابا جی! اونچا کیوں بول رہے ہیں؟" وہ کھانا بھول کر اُن کی جانب متوجہ ہوگئی۔ اب تو ذرا سا کھٹکا بھی اسے ڈرا دیتا تھا۔

"اماں کو آواز دے رہے ہیں' تم جلدی سے کھانا کھاؤ۔"

"تم باہر نکل کر دیکھو ناں رضیہ۔"

اس سے پیشتر کہ رضیہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلتی ابا جی نے دروازے کے قریب آ کر آواز دی۔

"رضیہ! تمہاری اماں کہاں ہیں؟"

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ روٹی کی چنگیر اور سالن کی پلیٹ وہیں چارپائی پر چھوڑ کر باہر کی طرف لپکی۔ "تھوڑی دیر پہلے تو نماز پڑھ رہی تھیں کمرے میں' شاید ابھی تک فارغ نہیں ہوئیں۔"

"کیا ہوا؟" اماں جاء نماز لپیٹتی گھبرا کر کمرے سے باہر نکلیں۔ "خیریت تو ہے' چلا کیوں رہے تھے۔"

"زرینہ کی طبیعت کیسی ہے اب؟" وہ برآمدے میں بچھے لکڑی کے تخت پر بیٹھ گئے۔

"ویسی ہی ہے' بخار تو ختم ہو گیا لیکن کمزوری نہیں جا رہی' کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں ہے' جسم میں جان کیسے آئے۔" اماں نے تہہ کی ہوئی جاء نماز تخت پر رکھی۔ "لیکن آپ کیوں اتنی اونچی آوازیں دے رہے تھے؟"

"میں بہت پریشان ہوں رضیہ کی ماں۔" وہ بولے۔

"اللہ خیر کرے۔" وہ پاس ہی بیٹھ گئیں۔ "کیا ہوا؟"

"نہ جانے کس نے خاندان بھر میں مشہور کر دیا ہے کہ زرینہ' صفدر کی شادی کے متعلق سن

کر اتنی دلبرداشتہ ہوئی ہے کہ چارپائی سے لگ گئی ہے۔"

"کیا؟" اماں نے تعجب سے کہا۔ "کیسی کیسی باتیں مشہور کر دیتے ہیں لوگ' اللہ ان سے پوچھے۔"

"بددعا نہیں دیا کرتے۔" وہ بولے۔ "سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ آج تک کسی کو میری بیٹیوں کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت بھی نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں کس نے یہ سب کچھ مشہور کر دیا۔"

"ارے وہ بے چاری تو حویلی سے آنے کے بعد بیمار ہوئی ہے۔ بیمار بھی کیا ہوئی' خوفزدہ ہوگئی۔ پتا نہیں کس نے کیا کہہ دیا۔ میری پھول جیسی بچی بالکل ہی مرجھا کر رہ گئی لیکن لوگ تو موقع ڈھونڈتے ہیں' بات کو بتنگڑ بنانے کا۔ ناس پٹے ایسے لوگوں کا۔"

"سوچتا ہوں کہ بات کے مزید پھیلنے سے پہلے ہی جلد از جلد اس کی شادی کر دوں۔"

کمرے میں بیٹھی زرینہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر زور سے بھینچ دیا ہو۔

"شادی! جلد از جلد۔" وہ زیرلب بولی۔

"میں تو کب سے کہہ رہی ہوں کہ اب دونوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کریں۔" اماں نے کہا۔ "پر بڑی سے پہلے چھوٹی کی بات چلائی تو نہ جانے اور کیا کیا باتیں سننا پڑیں پہلے رضیہ کے متعلق سوچیں۔"

لیکن اماں کی بات بھی زرینہ کی تشفی نہ کر سکی۔

"نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" وہ بڑبڑائی۔

شادی کا ذکر سن کر رضیہ اندر کمرے میں چلی آئی۔ روٹی کی چنگیر اور سالن ویسے ہی دھرا ہوا تھا اور زرینہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔

"تم نے کچھ کھایا نہیں۔" وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"ابا کی بات سنی رضیہ؟" اس نے بڑی بڑی شربتی آنکھوں کو مزید پھیلایا۔

"کچھ نہیں ہوگا' جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ہوگا' تم آرام سے کھانا کھاؤ۔"

"وہ یہ کر گزریں گے رضیہ' خدا کے لیے کہیں سے شاہ جی کو بلا لاؤ۔" اس کی آنکھیں پھر آنسو بہانے لگیں۔

"آہستہ بولو۔" رضیہ نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر گھبرا کے دروازے سے باہر دیکھا لیکن تخت پر بیٹھے اماں اور ابا اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

"میں کیا کروں' میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"سب سے پہلے تو تم کھانا کھاؤ تاکہ یہ کمزوری دور ہو اور اس ہفتے کے روز بہم ذالہ کبریٰ

کے گھر جا سکیں، وہاں چھوٹے شاہ صاحب سے بھی تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ اتنی آسان سی بات ہے۔'' رضیہ نے کہا۔ ''تم کھانا نہیں کھاؤ گی تو یہیں چارپائی پر پڑی رہو گی۔ وہاں پر صاحب چھوٹے شاہ صاحب کا رشتہ کہیں طے کر دیں گے اور یہاں اماں ابا تمہاری بات پکی کر دیں گے۔''

''ایسی بات تو نہ کرو رضیہ۔''

''اور کیا بات کروں۔ ظاہر ہے چھوٹے شاہ صاحب کو میں یہاں لانے سے تو رہی اور ایسی بے ہمتی کا مظاہرہ کرو گی تو اس کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا؟''

رضیہ کی اس بات نے کام کر دکھایا اور وہ کھانا کھانے پر تیار ہو گئی۔

''اب ذرا اپنے چہرے کے زاویئے بھی ٹھیک کر لو اور کمرے سے باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لو تا کہ تم پر اُداسی کا جو دورہ پڑا ہوا ہے، اس سے تمہیں نجات مل سکے۔'' رضیہ نے چنگیر اور سالن کی پلیٹ اٹھا لی۔ ''اس کا اضافی فائدہ یہ ہو گا کہ ابا جی کی تسلی ہو جائے گی اور تمہاری شادی کے سلسلے میں وہ جلد بازی نہیں کریں گے۔''

''سچ کہہ رہی ہو ناں؟'' اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''میں اَن پڑھ ہو کر یہ بات سمجھ سکتی ہوں اور تم پڑھی لکھی لڑکی یہ بات نہیں سمجھتی۔''

''میری تو عقل ہی کام نہیں کر رہی، پتا نہیں کیا ہو گا۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا جب تم اپنی طبیعت بہتر کر لو گی۔''

رضیہ کے دلائے ہوئے خیال نے اس میں نئی روح پھونک دی تھی اور کتنے ہی دن بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اماں تو اسے باہر نکلتے دیکھ کر نہال ہو گئی تھیں۔

''آ جا میری بیٹی۔'' انہوں نے اپنے قریب ہی اسے تخت پر بٹھا لیا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''ٹھیک ہوں اماں۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''بالکل ٹھیک ہو جائے گی میری بچی۔'' انہوں نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''بس اب خوب پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ تا کہ نقاہت دور ہو جائے۔''

''جی اماں؟''

''اور بال دیکھو کیسے روکھے ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے دو دن سے کنگھی بھی نہیں کی۔'' انہوں نے رضیہ کو آواز دی۔

''رضیہ! کنگھا اور تیل تو لانا۔''

''ابھی لائی۔'' رضیہ نے کہا۔

وہ کنگھا اور تیل کی بوتل اٹھا لائی اور پھر خود بھی وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔

''ادھر دو میں اپنی بیٹی کے سر میں خود مالش کروں گی۔'' انہوں نے اس کے الجھے بالوں والی لمبی سی چوٹی کھول کر اس میں کنگھی شروع کی۔

''دیکھو کتنے بال ٹوٹ رہے ہیں، بال تو گریں گے ہی کھاتی پیتی جو کچھ نہیں ہو۔ اب رات کو دودھ پی کر سونا ہے۔''

''میں تو روز لاتی ہوں اماں، پر یہ پیتی ہی نہیں ہے۔'' رضیہ نے شکایت کی۔

''کیسے نہیں پئے گی۔ اب نہ پئے تو مجھے بتانا، زبردستی پلاؤں گی۔ حالت دیکھی ہے اس کی کتنی مرجھا گئی ہے چند دن میں۔'' اماں نے ڈھیر سارا تیل بالوں میں ڈال کر سر کی مالش کرنا شروع کی۔ ''اب ٹھیک ہو جاؤ جلدی سے، بڑے شاہ صاحب کی شادی قریب آ رہی ہے، وہاں یہ سرسوں جیسی پیلی شکل لے کر نہ جانا۔''

''بڑے شاہ صاحب کی شادی ہے؟'' اس نے سننے کے باوجود تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

''ہاں حمیدہ بتا رہی تھیں کہ ایک سے ایک عمدہ چیز اکٹھی کی ہے شادی کے لیے، کیا حویلی کا سامان کیا کپڑے لتے۔ ایسا بڑھیا سامان ہے کہ آنکھیں کھل جائیں۔'' اماں مالش کرنے کے ساتھ ساتھ بتا رہی تھیں۔ ''یہ تو تم بیمار ہو گئی تھیں، میرا دل اِدھر اٹکا ہوا تھا، نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا ورنہ بڑی بیگم کو مبارکباد دینے بھی جانا تھا۔ آخر بڑے شاہ صاحب کی شادی ہے برسوں بعد تو ایسی رونق آئی ہے۔''

''اماں! آپ حویلی مت جانا۔'' وہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

اماں نے ایک نظر رضیہ کی جانب دیکھا لیکن اس نے نظریں چرا لیں۔

''آخر بات کیا ہے زرینہ!'' بالآخر اماں نے پوچھا۔ ''ہوا کیا ہے تجھے؟''

''مجھے.....؟ مجھے تو کچھ نہیں ہوا؟'' وہ جلدی سے بولی۔

''اپنی اماں سے بھی اپنا آپ چھپائے گی؟'' وہ بولیں۔ ''کہہ دے بیٹا! سب کچھ کہہ دے کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔''

''اماں!'' اس نے ان کے گھٹنوں پر سر ٹکا دیا۔ ''کتنی بڑی ہے ناں حویلی۔''

''ہاں بڑی تو ہے۔''

''اور اماں! اندر کو باہر کی خبر نہیں ہوتی، باہر کو اندر کی نہیں۔''

''پیر صاحب بہت پہنچے ہوئے ہیں، انہیں اندر باہر کی سب خبر ہوتی ہے، یہ ہم جیسے عام لوگ ہیں جو بے خبر ہیں۔''

''انہیں پتا ہے اماں کہ زیب النساء بی بی کے کمرے میں روح رہتی ہے؟''

''پگلی! اس کے کمرے میں کہاں سے روح آ گئی؟'' اماں ہنس دیں۔

''نہیں اماں' وہاں سچ مچ روح ہے انہوں نے خود بتایا تھا مجھے۔'' اس نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''اس کی پھوپھو کی روح ہے وہاں اور پتا ہے وہ کیا کہتی ہے اس سے؟''

''کیا کہتی ہے؟'' اماں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر پوچھا۔

''وہ زیب النساء کو حویلی سے بھاگ جانے کو کہتی ہے۔''

''استغفار!'' اماں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ایسی بہکی بہکی باتیں نہیں کرتے۔''

''اماں یہ میں تو نہیں کہہ رہی۔ مجھے خود بتایا ہے اس نے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ روح پوری حویلی میں پھرتی ہے' پر رہتی اس کے کمرے میں ہے۔ بس اماں آپ وہاں نہ جانا۔'' اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''وہموں کو دل میں جگہ نہیں دیتے چندا' وہ پاک روح تھی' جنتی تھی۔ یہ جو ویرانوں' کھنڈروں اور جنگلوں میں پھرتی ہیں' یہ بد روحیں ہوتی ہیں' جن کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔

''وہ اتنی جلدی مری کیسے تھیں؟''

''بس بیٹا' بے چاری کی زندگی اللہ پاک نے اتنی ہی مختصر لکھی تھی۔'' انہوں نے گہرا سانس لیا۔ ''حویلی کی بیبیاں بہت ضرورت کے علاوہ حویلی سے باہر نہیں نکلتیں۔ اونچی شان والی بی بی زادیاں ہیں ناں اس لیے' ہماری تمہاری طرح یوں گلیوں میں پھرنا انہیں زیب نہیں دیتا لیکن پیر صاحب کی شادی کی بات ہے۔

سکینہ بی بی ان کی بہت لاڈلی بہن تھیں اور بارات کے ساتھ ہی گئی تھیں۔ جاتے ہوئے ہلکا ہلکا بخار تھا' لیکن بھائی کی شادی کی خوشی میں پروا نہیں کی اور چلی گئیں۔ سفر اتنا لمبا تو نہیں تھا لیکن وہ اور بیمار ہو گئیں تو انہیں بڑی بیگم کے والد کی حویلی میں ٹھہرنا پڑا۔

چند دن بعد بخار اتر گیا اور وہ بھلی چنگی ہو گئیں' لیکن پتا نہیں کیا ہوا' واپس آئیں تو بالکل صُم تھیں۔ بظاہر کچھ نہیں تھا لیکن اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھیں اور بس ایک دن چپ چاپ ختم ہو گئیں۔''

''انہوں نے چپ چاپ جان نہیں دی ہوگی' وہ روئی ہوں گی' چلائی ہوں گی' لیکن حویلی کی دیواریں بہت موٹی اور بہت بلند ہیں ناں' ان سے کسی کی آواز باہر نہیں جاتی۔ زیب النساء بی بی کے رونے اور چلانے کی آواز بھی باہر نہیں جاتی۔''

''پگلی کہیں کی' وہ بھلا کیوں رونے لگیں رونا ان کی قسمت میں ہوتا ہے' جن کو کسی چیز کی کمی ہو' انہیں بھلا کس چیز کی کمی ہے؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''اماں ٹھیک کہتی ہیں رونا تو میرے مقدر میں ہے جسے نہ معلوم اپنی محبت ملے نہ ملے' لیکن انہوں نے خود ہی تو کہا تھا کہ وہاں ان کا دم گھٹتا ہے؟

کی چیخیں کوئی نہیں سنتا اور وہ دیواروں سے سر ٹکراتی ہیں پتا نہیں کیوں؟''

''کس سوچ میں گم ہو گئی؟'' اماں نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔

''پھر بھی اماں! آپ وہاں نہ جانا' وہ بہت اونچی حویلی ہے ناں' کہیں آپ کا دم نہ گھٹنے لگے۔''

اماں ہنس پڑیں۔ ''میرا دم کیوں گھٹنے لگا' ایسی جگہ میں کسی پاگل کا ہی دم گھٹے گا۔''

''لیکن میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کبھی بھی نہیں۔''

''اچھا نہ جانا' لیکن بال تو بندھوا لو۔'' انہوں نے پراندہ اٹھا کر اس کے بال اکٹھے کیے۔

اسے کمرے سے باہر نکل کر صحن میں رکھے گملوں میں لگے موتیے کے پودوں کو پانی دیتے دیکھ کر ابا جی بہت خوش ہوئے۔

''رضیہ کی ماں' اب تو زرینہ ٹھیک ہے۔'' انہوں نے اماں کو مخاطب کیا۔

''ٹھیک کہاں ہے' بس چل رہی ہے' ذرا حالت تو دیکھیں اس کی' سوکھ کر لکڑی ہوئی جا رہی ہے۔''

''چلو چار پائی تو چھوٹی' کمزوری آہستہ آہستہ ہی جائے گی۔''

رضیہ اس کے کھانے پینے پر خوب توجہ دے رہی تھی اور وہ بھی اس لیے سب کچھ چپ چاپ کھا لیتی تھی کہ شاہ جی سے ملنے کا موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ ایک خالہ کبریٰ کا گھر ہی تو تھا جو اس کی امیدوں کا مرکز تھا۔

گھر کے کاموں میں بھی اسی لیے اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا تاکہ ابا جی کو یہ تسلی ہو جائے کہ اسے صفدر کی شادی سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور اماں کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ تندرست ہو چکی ہے اور وہ اسے گھر سے باہر نکلنے سے نہ روکیں۔

رضیہ چولہے کے پاس بیٹھتی تو وہ بھی وہیں آ جاتی۔ جلدی جلدی پیاز کاٹ دیتی' لہسن صاف کر کے پیس دیتی اور لکڑیاں بھی جلا دیتی۔ رضیہ چیختی رہ جاتی' اسے بار بار آرام کرنے کو کہتی لیکن وہ ان کاموں میں مگن رہتی شعوری کوشش سے بات بات پر ہنسنے لگتی۔

لیکن جمعہ والے دن سچ مچ وہ بہت خوش تھی ہفتے کے روز اسے شاہ جی سے جو ملنا تھا۔ اتنے دن کے بعد ملاقات کا تصور ہی اسے خوشی سے پاگل کر رہا تھا۔ مسرت کی کرنیں اس کی آنکھوں سے پھوٹ رہی تھیں' ہونٹ بے وجہ مسکرا رہے تھے۔ کتنے دن بعد اسے خوش دیکھ کر اماں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

رات کو ہمیشہ کی طرح وہ کپڑوں کا ٹرنک کھول کر بیٹھ گئی اور ایک ایک سوٹ نکال کر اور رد کر کے دوسری طرف رکھتی گئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' رات کے برتن دھو کر ہاتھ پونچھتی ہوئی رضیہ کمرے میں داخل ہوئی تو

اسے کپڑوں کو الٹ پلٹ کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں دیکھ رہی تھی کہ کل کون سے کپڑے پہنوں لیکن عین وقت پر ایک بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں ملتا۔'' اس نے سب کپڑے واپس ٹرنک میں ٹھونس دیئے۔

''کیسا جوڑا چاہیے تمہیں؟'' رضیہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''ایسا جسے پہن کر جب میں شاہ جی کے سامنے جاؤں تو وہ پلکیں جھپکنا ہی بھول جائیں۔''

''تم پیوند لگے کپڑے پہن کر بھی ان کے سامنے چلی جاؤ تب بھی وہ پلکیں جھپکنا بھول جائیں گے۔''

''اب میں اتنی بھی خوبصورت نہیں ہوں۔''

''تم تو چاند کا ٹکڑا ہو زرینہ' زمین پر ہی جنت کی حور ہو۔ کیا کبھی شاہ صاحب نے تمہیں نہیں بتایا کہ تم کتنی حسین ہو؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''کہتے تو وہ بھی یہی ہیں۔''

''پھر یقین کیوں نہیں آتا تمہیں؟''

''اپنی چیز تو ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے ناں۔ میں کتنی بھی بدصورت اور بدشکل ہوتی تم مجھ سے اتنا ہی پیار کرتیں ناں جتنا اب کرتی ہو' اس لیے کہ میں تمہاری بہن ہوں۔''

''لیکن پھر شاید شاہ صاحب تم سے اتنا پیار نہ کرتے۔''

''سچ!'' اس نے اپنی شربتی آنکھیں پھیلائیں۔ ''وہ مجھ سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ میں خوبصورت ہوں۔''

''پتا نہیں' لیکن تم بدصورت ہوتیں تو شاید نہ کرتے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' رضیہ نے ٹانگیں بستر کے اوپر کر لیں۔

''سوچ رہی ہوں کہ اگر انہیں خوبصورتی ہی چاہیے تھی تو ولایت میں اس کی کیا کمی تھی؟ کہتے ہیں کہ اصل میں مجھے دیکھتے ہی ان کے دل نے صدا دی تھی۔ ان سے کہا تھا کہ انہیں اب تک میری تلاش تھی اس لیے انہیں مجھ سے محبت ہوئی۔''

''بہت بھولی ہو تم زرینہ۔''

''اچھا اب ان سے ملوں گی تو پوچھوں گی۔'' وہ بولی۔ ''اور تمہاری بات آزمانے کے لیے کل میں اپنا وہ ہلکے دھانی رنگ والا جوڑا پہن کر جاؤں گی۔''

''وہ تو اتنا پرانا سا ہے اور دھو دھو کر اس کی رنگت بھی اُڑ چکی ہے۔''

''تب ہی تو کہہ رہی ہوں۔ دیکھو گی کہ میں سچ مچ چاند کا ٹکڑا اور زمین پر جنت کی حور ہوں یا تم میرا دل بہلا رہی تھیں؟'' وہ ہنسی۔

''آج تمہارا سونے کا ارادہ نہیں ہے؟'' رضیہ بولی۔ ''مجھے تو نیند آ رہی ہے۔''

''مجھے تو بالکل نہیں آ رہی نیند! لیکن تم لالٹین بجھا دو۔''

رضیہ بتی نیچے کر کے لیٹ گئی۔

''رضیہ!'' ساتھ والے بستر سے زرینہ نے اسے پکارا۔

''ہوں۔''

''سو تو نہیں گئیں۔''

''نہیں' بولو۔''

''مجھے ایک مشورہ دو۔''

''کیا مشورہ دوں' پہلے کون سے مشورے مانے ہیں تم نے میرے جو ایک اور مشورہ دوں۔''

''نہیں قسم سے رضیہ' یہ والا مانوں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''پوچھو! کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

''میں ملنے پر شاہ جی کو حویلی والا واقعہ بتا دوں یا نہیں؟''

رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔

''بتاؤ ناں۔'' زرینہ بولی۔

''سوچنے تو دو' اپنے اردگرد مصیبتیں تم خود کھڑی کرتی ہو اور دُکھڑے میرے سامنے روتی ہو۔''

''ناراض تو مت ہو۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''میں ناراض نہیں ہو رہی۔ یہی تو مسئلہ ہے کہ تم سے کوئی ناراض نہیں ہو سکتا۔'' رضیہ ٹھنڈی پڑ گئی پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''میرا خیال ہے نہ ہی بتاؤ۔''

''وجہ بتاؤ گی؟''

''جیسے مجھے اور اماں کو تمہاری بات کا یقین نہیں آیا تھا' ویسے ہی وہ بھی یقین نہیں کریں گے۔ سمجھیں گے کہ تمہارے دماغ کی کوئی چول ڈھیلی ہو گئی ہے۔ پھر کیا فائدہ بتانے کا؟''

''تمہیں یقین کیوں نہیں ہے' میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ جھلا اٹھی۔

''مجھے یقین ہے بابا صرف اس لیے کہ تم یہ بات کہہ رہی ہو' ورنہ یہ بات میری عقل سے باہر ہے کہ حویلی میں اتنی پاک بی بی کی روح کیوں منڈلاتی پھر رہی ہے کیوں کہتی ہے زیب النساء سے بھاگ جانے کے لیے؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''یوں بھی تم کس منہ سے ان سے کہو گی کہ ان کی پھوپھو کی روح زیب النساء کو حویلی سے

بھاگ جانے کے لیے کہتی ہے کیا اپنی بہن کے متعلق وہ ایسی بات برداشت کر سکیں گے؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''اور یہ بھی سوچو کہ شاہ صاحب ولایت سے انگریزی تعلیم لے کر آئے ہیں' جو لوگ انگریزی تعلیم لیتے ہیں' وہ جن بھوت اور روح' بدروح والی باتوں کو نہیں مانتے۔ وہ سمجھیں گے کہ تم پاگل ہو گئی ہو' جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔''

''پھر کیا کہوں ان سے کہ حویلی میں کیا ہوا تھا؟''

''کسی ترکیب سے ٹال دینا انہیں۔''

''بہت مشکل ہوگا یہ کرنا۔''

''خود کو پاگل کہلوانے سے بہتر ہے کہ بات ٹال دو۔'' رضیہ بولی۔

زرینہ چند ثانیے خاموش رہی پھر بولی۔ ''لیکن میں اُن سے کہہ دوں گی کہ میں حویلی کبھی نہیں جاؤں گی۔''

''اچھا کہہ دینا' لیکن اب سونے دو' اتنی سخت نیند آ رہی ہے۔'' رضیہ نے کروٹ بدل لی۔

زرینہ' شاہ جی کے خیالوں میں گم ہو گئی۔ کل کی متوقع ملاقات کا اسے اتنی بے چینی سے انتظار تھا۔ کہ وہ لمحہ لمحہ گن گن کر گزار رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وقت پَر لگا کر اُڑ جائے اور وہ شاہ جی کے روبرو پہنچ جائے۔ پھر وہ ہو' شاہ جی ہوں اور گنگناتا ہوا رہٹ ہو۔

ساری رات اس نے سوتے جاگتے میں گزاری تھی۔

صبح کو ابھی ابا جی مسجد جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ وہ بستر سے اتر آئی' ورنہ ہمیشہ وہ اذان کے ساتھ جاگا کرتی تھی۔

''بہت جلدی آنکھ کھل گئی آج۔'' ابا جی نے اسے دیکھا تو بولے۔

''بس نیند نہیں آ رہی تھی' سوچا کیا ایسے ہی بستر پر پڑی رہوں گی' اس لیے اٹھ گئی۔'' وہ حمام کھول کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔

''کچھ دن اور آرام کرو اچھی طرح' اس طرح تھک کر پھر بیمار نہ پڑ جانا۔''

''نہیں ابا جی! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ انہیں تسلی اور یقین دلانے کی غرض سے ہنس کر بولی۔ ''بالکل پہلے کی طرح اچھل کود سکتی ہوں۔''

ابا جی مسکرا کر مسجد میں چلے گئے۔ وہ جلدی سے اندر آئی اور ٹرنک کھول کر دھانی رنگ کا جوڑا نکال لیا۔ ٹرنک کے گھسٹنے' کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز پر رضیہ کسمسا گئی۔

''کیا صبح صبح کھڑ کھڑ لگائی ہوئی ہے۔'' وہ غنودگی کے عالم میں بولی۔

''اب اٹھ جاؤ' اذان ہونے ہی والی ہے۔'' زرینہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

رضیہ نے سنی اَن سنی کر کے کروٹ بدل لی۔

زرینہ کو جانے کی اتنی جلدی تھی کہ جلدی جلدی کوئلے دہکا کر بڑی سی بھاری استری میں ڈالے اور کپڑے استری کرنے لگی۔

''یہ اتنی صبح صبح کہاں کی تیاری ہے؟'' اماں نے اسے کپڑے استری کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''آج ہفتہ ہے ناں' خالہ کبریٰ کے گھر نہیں جانا کیا؟''

''کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔ تمہارے ابا جی منع کر گئے ہیں۔'' اماں نے کہا۔

''منع کر گئے ہیں' لیکن کیوں؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''آگے ہی خاندان والے کمبخت طرح طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں خود تمہاری خالہ بھی ہر آئے گئے کے سامنے رونا رو رہی ہیں کہ صفدر کی وجہ سے تم بیمار پڑی ہو۔''

''لیکن اماں میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا تو ان باتوں کو اور ہوا ملے گی' سب یہی سمجھیں گے کہ جو بات پھیلی ہے وہ درست ہے۔'' اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''تمہارے ابا تم سے بہتر سمجھتے ہیں' ہم چپ رہیں گے تو کوئی کب تک بولے گا۔ خود ہی سب خاموش ہو جائیں گے لیکن تم وہاں گئیں تو سب کے ہاتھ پھر سے یہ نیا موضوع آ جائے گا۔ ہم تمہیں...... کہیں اور جانے سے نہیں روکتے بس وہاں مت جاؤ۔''

''اماں ایک مرتبہ' آخری مرتبہ بھی نہیں؟'' اس نے پُر امید لہجے میں پوچھا۔

''کرنا کیا ہے تمہیں وہاں جا کر؟ تمہیں بھی تمہاری خالہ یہی دکھڑا سنانے بیٹھ جائیں گی۔ بس ہم سے جس قدر ہو سکتا تھا ہم نے ان کے ساتھ کیا۔ تمہاری شادی ہو جائے' بات پکی ہو جائے تو شوق سے جانا وہاں پر۔ اس سے پہلے میں ان کی خیر خیریت پتا کر کے آتی رہوں گی۔ تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اماں نے حتمی لہجے میں بحث ختم کر دی۔

وہ کپڑے اور استری چھوڑ کر وہیں چھوڑ کر بیٹھ گئی۔ اسے بہت رونا آ رہا تھا۔ شاہ جی کی خاطر انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی خاطر ہی تو اس نے اپنا آپ سنبھالا تھا۔ انہی سے ملاقات نہ ہو پائی تو کیا فائدہ؟

''اب کیا ہوگا؟'' یہ وہ سوال تھا جو اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

☆======☆======☆

کتنی دیر گزر گئی تھی اسے برگد تلے بیٹھ کر گوری کا انتظار کرتے ہوئے لیکن دھول سے اٹا وہ کچا راستہ پہلے کی طرح ویران تھا۔ حیدر علی شاہ نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کے بارہ بجنے ہی والے تھے۔

''وہ بیمار ہے کیسے آ سکتی ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ''پتا نہیں کیا ہوا اسے اور کتنی بیمار ہے وہ۔ کوئی راستہ بھی تو نہیں مل رہا اس سے ملنے کا۔ نہ معلوم میری غیر حاضری میں یہ سب کیا ہوا۔ اتنا غیر متوقع ملاپ اور اس قدر اچانک جدائی۔''

ایک مرتبہ پھر وہ اس کچے راستے کی طرف بڑھا جس پر صبح سے وہ کتنے ہی چکر لگا چکا تھا لیکن بے سود۔ اس مرتبہ کے چکر میں صرف اتنا ہوا کہ ایک گلہری پھدک کر اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک سے دوسری سمت کے پودوں میں گم ہوگئی۔

کوئی پریشانی سی پریشانی تھی۔ ایک ہی تو راہ تھی گوری سے ملنے کی' وہ بھی بند ہوئی جا رہی تھی۔ سب سے زیادہ فکر تو اسے گوری کی بیماری کی تھی۔ ایسا کیا ہوگیا تھا اسے کہ وہ چارپائی سے ہی لگ کر رہ گئی تھی۔ خدا معلوم کتنا یاد کرتی ہوگی وہ اسے۔

اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ تو ہفتے کے روز صبح صبح وہاں آ جاتی تھی اور اس کے بعد وہاں آنا بھی مشکل تھا۔ خالہ کبریٰ کی طرف وہ جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے واپس نیاز پور کی طرف چل پڑا۔

خالہ کبریٰ کے لیے یہ انکشاف بم دھماکا ثابت ہوا تھا کہ وہ پیر صاحب کا منجھلا بیٹا ہے۔ اسے بعد میں خود پر غصہ بھی آیا تھا اور افسوس بھی ہوا تھا کہ وقتی جذبے اور غصے کے زیرِ اثر اس نے انہیں اپنا اصل روپ اور اپنی محبت بتا دی تھی۔ پھر انہیں تسلی دینے اور سمجھانے میں کتنا وقت لگ گیا تھا۔ انہوں نے تو اعلان کر دیا تھا کہ وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گی۔ اور اللہ میاں جو سزا دے گا سو الگ۔

کتنی مشکل سے اس نے انہیں سمجھایا تھا کہ اللہ میاں انہیں کچھ نہیں کہے گا اور ساتھ ہی ساتھ منتیں بھی کی تھیں کہ وہ اس راز کو راز ہی رکھیں۔ گوری سے محبت کی تشہیر اسے گوارا نہیں تھی۔ خالہ کبریٰ نے اپنے گناہوں کا درجہ کم کرنے کی خاطر اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ یہ بات کسی کو نہیں بتائیں گی لیکن حیدر علی شاہ نے ان کے اس وعدے سے زیادہ امید باندھنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ کر بھی کیسے سکتا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی خالہ کے اندر اس وقت تک کلبلاتی رہتی ہے جب تک وہ اسے کسی کے گوش گزار نہ کر دیں۔ صرف یہ بات اسے حوصلہ دے رہی تھی کہ خالہ کبریٰ اس کے ساتھ شایانِ شان سلوک نہ کرنے پر بہت پشیمان تھیں اور اب ہر طرح سے اسے خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف تھیں' پھر کچھ بھی تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب ان کے منہ سے بات نکل جائے۔

حویلی پہنچ کر اس نے زیب النساء کے کمرے کا رخ کیا۔

''ان سے کم از کم دل کا حال تو کہا جا سکتا ہے۔'' اس نے سوچا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ زیب النساء کے کمرے میں اس کے مقابل بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا علی؟ بہت چپ چپ لگ رہے ہو؟'' زیب النساء نے اس کا جائزہ لیا۔

''بہت دن ہو گئے گوری سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' وہ بولا۔ ''سنا ہے وہ سخت بیمار ہے۔''

''اوہو...... کیا ہوا اسے؟''

''پتا نہیں۔ میں تو یہاں تھا نہیں' بس مجھے اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ بہت شدید بیمار ہے۔ سمجھ نہیں آتا آپی کہ اسے ہو کیا گیا ہے۔ بالکل ٹھیک تو تھی وہ جب میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔''

''فکر کیوں کرتے ہو' بیماری تندرستی سبھی کچھ انسان کی جان کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی وہ۔''

''میں فکر نہیں کروں گا تو کون کرے گا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں' اسے ذرہ بھر بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔''

''اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تو اس سے محبت کیوں کی تھی؟'' زیب النساء نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہیں سمجھا۔

''تمہاری محبت سے اسے تکلیف کے سوا کیا ملے گا علی؟'' وہ بولی۔ ''تمہاری منگنی طے ہو چکی ہے۔''

''میں اس منگنی کو نہیں مانتا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''اور میں باقی سب سے بھی یہ بات منوا کر رہوں گا۔''

''فرض کرو سب نے تمہاری بات مان لی تب بھی کیا ہوگا؟'' وہ بھی تیزی سے بولی۔ ''یہی ناں کہ تم اس سے شادی کر کے اسے اس عالیشان پنجرے میں قید کر دو گے۔ یہ محبت ہوتی ہے علی کہ اپنے پیاروں کے پر کاٹ دیئے جائیں؟ انہیں جیتے جی ان قبر جیسے کمروں میں بند کر دیا جائے؟ نہیں علی محبت اسے نہیں کہتے۔ یہ زیادتی ہے جو تم زرینہ کے ساتھ کر رہے ہو۔''

''نہیں زیبی آپی! میری بیوی ویسے نہیں رہے گی۔ جیسے اس خاندان کی اور بہوئیں رہتی ہیں۔ اگر میں نے بھی یہی حرکتیں شروع کر دیں تو میری اس اعلیٰ تعلیم کا کیا فائدہ؟ میں اس پر روشنی' ہوا رنگ اور زندگی کے دروازے بند نہیں کروں گا۔ مجھے نہیں پتا کہ میں کس حد تک درست ہوں اور بابا جان اور ان کی روایتیں کس حد تک لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ میری عقل اور میری تعلیم مجھے کون سا راستہ دکھا رہی ہے اور میں اسی راستے پر چلوں گا۔''

''چل سکو گے؟'' زیب النساء کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

''اتنا کم ہمت نہیں ہوں۔''

''تو پھر علی تم زرینہ کو کہیں دور لے جاؤ۔ بہت دور۔ اتنی دور کہ اس پر اور تمہاری آنے والی اولاد پر اس حویلی اور اس کے مکینوں کا سایہ بھی نہ پڑے۔ یہ حویلی ان لوگوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے جن کے دل میں جینے کی امنگ ہو۔ جو ہنسی خوشی زندگی گزارنا چاہتے ہوں۔'' وہ ہولے سے بولی۔ ''بس اتنا ذہن نشین کر لو علی کہ یہاں رہتے ہوئے نہ تم گوری تک پہنچ پاؤ گے اور نہ وہ تم تک۔ ان دیواروں میں راستہ نہیں بن سکتا یہ بہت مضبوط ہیں۔ ہاں اگر ہمت ہو تو انہیں پھلانگ جاؤ۔''

"کبھی میں سوچتا ہوں آپی۔" وہ قدرے توقف سے بولا۔ "کہ ہم سب کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں اور بسر بھی کر رہے ہیں یا نہیں۔ لگتا ہے درحقیقت یہ ہماری زندگی نہیں ہے' اسے ہم نے بابا جان سے ادھار لے رکھا ہے اور وہ ہم سے اس زندگی کے لمحے لمحے کا سود وصول کر رہے ہیں۔ ہر حکم' ہر فیصلہ ان کا ہے۔ جیسے ہم انسان نہ ہوں کوئی کٹھ پتلی یا کسی مداری کے بندر ہوں۔"

زیب النساء اس کی بات سن کر ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔

"یہ تم کہہ رہے ہو علی۔" وہ بولی۔ "تم جو اپنی من مانی کر سکتے ہو۔ اپنے حقوق کے لیے لڑ سکتے ہو۔ اونچی آواز میں ہی سہی بابا جان کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ سکتے ہو۔ تم جو بلا روک ٹوک اس حویلی سے اندر باہر جا سکتے ہو۔ کہیں بھی جا سکتے ہو۔ تمہیں تو یہ بات نہیں کہنی چاہیے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہیں بہت کچھ میسر ہے۔"

چند ثانیے تک وہ زیب النساء کی جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ "آپی میں نے اپنے لیے تو لڑنا شروع بھی نہیں کیا میں تو آپ کے اور بڑی آپا کے لیے لڑ رہا ہوں۔ آواز بلند کر رہا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی۔" اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "تمہارے چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ نہ تو ان دروازوں میں کوئی درز نمودار ہو گی اور نہ ہی ان دیواروں میں دراڑیں پڑیں گی۔ ہاں تم اپنا مرتبہ کھو دو گے۔ اس لیے علی مت کرو ایسا۔"

زیب النساء کے پاس بیٹھ کر دل کا بوجھ کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا تھا۔ اتنی ساری الجھنیں' اتنی ساری پریشانیاں اکٹھی ہو گئی تھیں اور ان پریشانیوں کی ڈوری اتنی الجھی ہوئی تھی کہ کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ تھا' گوری تھی' زیبی آپی اور بڑی آپا تھیں اور وہ فوزیہ بھی تھی جو نہ جانے کب اور کیسے اس کی منگیتر بن گئی تھی۔ پھر ماں جی بھی تھیں جو یقیناً بھائی کی بیٹی کو بہو کی صورت میں اس حویلی کی دہلیز پر لانا چاہتی ہوں گی۔ نہ وہ گوری کو دکھ میں مبتلا کر سکتا تھا اور نہ ہی ماں جی اور دونوں بہنوں کو......

یہی سب سوچتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پلٹ کر دیکھنے سے قبل ہی وہ جان چکا تھا۔ اس طرح اس کے کندھے پر صرف رجب علی ہی ہاتھ رکھ سکتا تھا۔

"بھائی جان آپ؟"

"بھئی کہاں گم ہو تم۔" وہ بولا۔ بھائیوں سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں حاکمانہ پن کی سختی نہیں رہتی تھی۔ "صبح سے ڈھونڈ رہا تھا تمہیں۔" وہ اسے لے کر بڑے کمرے میں آ گیا۔

"میں زیبی آپی کے پاس تھا۔ اس سے پہلے باہر گیا ہوا تھا۔ کہیے آپ کو کوئی کام ہے؟"

وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔

"کیا اب بہر ملاقات کسی تقریب کا اہتمام کرنا پڑے گا۔" رجب علی نے ٹانگ پر ٹانگ

رکھ لی۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی کام ہو تو آپ حکم کریں۔"

"کوئی کام نہیں۔ بس ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔" اس نے پائپ میں ایمفورا کا تمباکو بھر کر اسے سلگایا۔ "اس ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے ہماری اتنی ملاقات نہیں ہوتی جتنی پہلے الگ الگ شہروں میں رہنے کے باوجود ہو جاتی تھی۔"

"مصروفیت ہی کچھ اس نوعیت کی تھی۔ جب میں لاہور گیا تھا تو آپ یہاں تھے اور جب آپ وہاں گئے تو میں یہاں آ گیا۔"

"بابا جان سے آج صبح میری ملاقات ہوئی تھی۔ انہیں تم سے بہت شکوے ہیں آج کل۔"

"میں جانتا ہوں لیکن ان کے شکوے اور شکایتیں دور کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔"

"ینگ مین۔ ایسی چھوٹی چھوٹی سی باتوں کو اپنے دل پر مت لیا کرو۔ بابا جان زیادہ دن تک تم سے ناراض نہیں رہ سکتے۔" اس نے پائپ کا کش لے کر دھواں ہوا میں چھوڑا۔ "تم بھی اپنی اور ان کی گفتگو میں غور طلب نکتے مت شامل کیا کرو۔"

"میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بات انہوں نے شروع کی تھی۔"

"بات یہ ہے علی کہ ہر جگہ رہنے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ زندگی گزارنے کا کوئی ایک کلیہ نہیں ہوتا جسے ہر جگہ استعمال کیا جا سکے۔ زندگی گزارنے کا طریقہ جگہ اور ماحول کے ساتھ تبدیل ہوتا جاتا ہے۔"

"تو میں نے کب کہا ہے کہ یہاں نائٹ کلب کھول دیں۔" وہ جھلا گیا۔ "میں نے تو ان کی ایک ایسی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا وجود ہر جگہ ہے۔"

"میں نے پہلے ہی کلیئر کر دیا تھا علی کہ آئندہ اپنی گفتگو میں یہ نکتہ مت لانا۔" رجب علی کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

"آپ کے ساتھ بھی یہ بات میں نے نہیں شروع کی لیکن اب اگر گفتگو کا یہ رخ آ ہی گیا ہے تو صرف ایک مرتبہ میری بات سن لیں۔ بابا جان کے گدی نشین کی حیثیت سے نہیں' میرے بڑے بھائی بن کر۔"

رجب علی مسکرایا۔ "کہو لیکن مجھے قائل کرنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ میں قائل نہیں ہوں گا۔"

"تو پھر کہنے کا فائدہ؟" وہ لحظہ بہ لحظہ مزید جھنجھلا رہا تھا۔

"کہہ دو۔ اس طرح کتھارسس ہو جائے گا۔" رجب علی ویسے ہی اطمینان سے پائپ سے کش لگاتے ہوئے بولا۔

"میرا کتھارسس تو ہو جائے گا کیونکہ آپ لوگ میرا چیخنا اور چلانا برداشت کر لیں گے لیکن

مجھ سے زیادہ فرسٹریشن تو بہنوں کو ہو گی جو کسی صورت کتھارسس بھی نہیں کر سکتیں۔ جو نہ چیخ سکتی ہیں اور نہ چلا سکتی ہیں۔ بس اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہیں۔ آپ لوگ ان کے لیے زندگی کو اتنا بوجھل کیوں بنا رہے ہیں۔ نہیں اٹھا سکیں گی وہ اس زندگی کا بوجھ اور کسی دن اچانک ہی تھک کر گر جائیں گی۔'' اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ''آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ جس چیز کی ضرورت ہمیں ہے' اس کی ضرورت انہیں نہیں ہے' جن خوشیوں سے ہم اپنے گھروں کو آباد دیکھنا چاہتے ہیں کیا ان خوشیوں کی خواہش انہیں نہیں ہو گی؟ اوہ گاڈ! میں سمجھ نہیں پا رہا کہ کس زبان میں گفتگو کر کے آپ لوگوں تک اپنے دل کی بات پہنچا سکتا ہوں۔''

''دینے کو تو میں بھی بہت سی دلیلیں دے سکتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ ہم تو بریڈنگ سے قبل گھوڑے کا بھی شجرہ دیکھتے ہیں کہ وہ اعلیٰ نسل کا بھی ہے یا نہیں۔

اگر وہ نسل دار ہے تو Byerly Arabian اور Darley Arabian میں سے کس گھوڑے کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر ہم اپنے اصطبل کا اتنا خیال رکھتے ہیں تو یہ تو پھر ہماری حویلی ہے اور اس کا تعلق ہماری نسل کے خالص رہنے سے ہے۔ اس کا خیال تو ہمیں اپنی جان پر کھیل کر رکھنا پڑے تو یہ بھی کر گزرنا چاہیے۔ لیکن علی' میں اس وقت تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ آج میں تم سے خوشگوار موڈ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''جانتا ہوں میں آپ کی دلیلیں' لیکن پلیز انسانوں اور گھوڑوں کو ایک صف میں شامل مت کریں۔ بہت سی دلیلیں تو میں بابا جان سے بھی سن چکا ہوں۔ انہوں نے بھی بہت سی بے جان دلیلوں کا سہارا لیا تھا مجھے قائل کرنے کے لیے۔ وہ تو یہاں تک بھی کہہ چکے ہیں کہ اس گدی کے کسی بھی وارث کی کوئی بھی بیٹی کبھی بیاہی نہیں گئی کیونکہ یہ اس گدی کی شان کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ پیر گھرانے کی بے عزتی سمجھی جاتی ہے کہ ان کی بیٹی کسی کمتر گھرانے میں جائے۔''

''کہتے تو ٹھیک ہیں بابا جان!''

''تو میرے متعلق کیا حکم ہے؟ میں جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا' جسے بچپن میں آپ نے گود میں اٹھایا' کھلایا۔ جس کی ذرا سی تکلیف کو آپ نے اپنی تکلیف سمجھا۔ کیا کل میں اتنا کمتر ہو جاؤں گا کہ آپ کی بیٹی کی میرے گھر میں شادی آپ کی سبکی بن جائے؟ میں اتنا غیر ہو جاؤں گا کہ آپ کی بیٹی کو اپنی بہو نہ بنا سکوں؟ میرے بیٹے سے آپ کی بیٹی کی شادی آپ کے گھرانے کی انسلٹ ہو گی کیا؟''

پوری گفتگو میں پہلی مرتبہ رجب علی کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت نظر آئی۔

''اپنے خون کے رشتے کے حوالے سے میں یہ حق رکھتا ہوں کہ آپ سے اپنے ان سوالوں کا جواب طلب کر سکوں۔''

''تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ تم کمتر ہو جاؤ گے۔'' اس نے حیدر علی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ

رکھ کر محبت سے کہا۔ ''بھائی تو بھائیوں کی طاقت ہوتے ہیں۔ ان کا وجود ایک دوسرے سے ہی مستحکم رہتا ہے۔ پھر کبھی یہ بات مت کرنا۔ بھتیجے اور بھتیجیاں سگی اولاد سے کم نہیں ہوتے لیکن مہر النساء اور زیب النساء کے لیے چچا جان کے گھر میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ رہ گئی تمہاری بات تو یقین کرو کہ اگر میری کوئی بیٹی ہوئی اور تمہارا کوئی بیٹا ہوا تو میں کسی قسم کی تاخیر کے بغیر اپنی بیٹی کو تمہاری بہو بنا دوں گا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسا ہی رشتہ سخاوت کے ساتھ جوڑا جا سکا تو اس کے ساتھ بھی جوڑ دوں گا۔ اب خوش ہو؟''

''میرا دل مت رکھیں۔ جو وعدہ انسان پورا نہ کر سکے اسے شروع میں ہی نہیں کرنا چاہیے۔''

''تمہارا یہ بھائی آج تک کبھی اپنی کہی ہوئی بات سے پھرا ہے؟'' رجب علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''میں آپ کو جھٹلا نہیں رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ابھی آپ بابا جان کی گدی پر نہیں بیٹھے۔ یہ بات اگر آپ نے اس دن دہرا دی جس دن آپ بیٹھے' تب میں اس کا یقین کروں گا۔''

''اوہ' تم تو بہت شاکی لگ رہے ہو۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''لیکن میں اپنے الفاظ نبھانا جانتا ہوں۔ بھئی میں تو کہتا ہوں کہ جس دن میری بیٹی پیدا ہوئی اسی دن تم اسے اپنے گھر لے جانا۔ میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔''

حیدر علی بھی مسکرا دیا۔ ''گویا میرے ہونے والے بیٹے کی آپ کی ہونے والی بیٹی سے منگنی ہو گئی۔''

''بالکل ہو گئی۔ کہو تو سب کا منہ بھی میٹھا کروا دوں؟''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے کہہ دیا' یہی کافی ہے۔''

''اپنے ساتھ ساتھ تمہاری بھی شادی نہ کروا دوں؟'' رجب علی بولا۔

حیدر علی پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ ''فی الحال میری شادی کو رہنے دیں۔''

''خیریت تو ہے۔ ایسی شکل انسان کی تب بنتی ہے جب اسے عشق کا بخار ہوا ہو۔'' رجب علی نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

حیدر علی سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کو بتا دوں یا نہیں۔'' اس نے سچ سچ کہہ دیا۔

''کہہ دو۔ مجھے بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ آپ کو بتانے سے کچھ فائدہ بھی ہو گا یا نہیں۔''

''اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔'' رجب علی نے کہا۔ ''لیکن پھر وہی بات۔

تمہارا کتھارسس ہو جائے گا۔"

"مجھے واقعی محبت ہو گئی ہے۔" وہ بولا۔ "بلکہ محبت بھی نہیں جنوں خیز عشق کہیں۔"

"آں۔" وہ مسکرایا۔ "کس سے؟"

"گوری سے۔" حیدر علی نے کہا۔

"ہوں۔ سچ مچ کا عشق ہے یا محض وقت گزاری؟"

"میں نے کہا ناں کہ جنوں خیز عشق ہے۔ محض وقت گزاری نہیں ہے۔"

"بہت خوبصورت ہے کیا وہ؟"

"خوبصورت لفظ اس کے حُسن کو بیان کرنے کے لیے بہت چھوٹا ہے لیکن میں نے محض حسین ہونے کی وجہ سے اسے پسند نہیں کیا۔ اس میں ایک عجیب سی کشش ہے میں بیان نہیں کر سکتا اس کشش کو۔"

"پھر مسئلہ کیا ہے؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اب جب میں گوری کے عشق میں گھٹنوں گھٹنوں غرق ہو چکا ہوں تو پتا چلا ہے کہ بابا جان میرا رشتہ کہیں اور طے کر چکے ہیں۔"

"ہاں مجھے بتایا تھا بابا جان نے صرف رشتہ طے نہیں ہوا باقاعدہ منگنی ہوئی ہے۔" اس نے پائپ منہ میں ڈال لیا۔

"آپ کو بتایا تھا؟ کب؟ اور مجھے کیوں نہیں بتایا جس کی منگنی ہوئی ہے۔"

"ایزی۔ ایزی۔" رجب علی بولا۔ "تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"آپ تو بتا سکتے تھے؟ سب کو پتا تھا اس بات کا سوائے میرے۔"

"کیا ہو جاتا بتانے سے؟ پتا تو تمہیں اب بھی چل ہی گیا ہے۔"

"بہت کچھ ہوتا۔ کم از کم گوری تو اس کا شکار نہ ہوتی اور تب میں بھی اس کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھتا۔"

"نہیں علی! تم پھر بھی اسے دیکھتے۔ جن میں کشش ہوتی ہے وہ لوگ دیکھنے اور پھر دیکھتے رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تم تب بھی کچھ نہ کر سکتے۔ محبت پلاننگ کے ساتھ نہیں کی جاتی۔"

"اب تو میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ ہولے سے بولا۔ "ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

"یعنی وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟"

"اس کی محبت تو سمندر سے زیادہ گہری اور آسمان کی وسعتوں سے بھی زیادہ بیکراں ہے۔ اس کے مقابلے میں میری محبت شاید کچھ کم ہی ہو۔"

"دیکھو علی' یوں بھی ہوتا ہے کہ لڑکیاں دولت کے پیچھے آنے کے لیے محبتوں کو سیڑھی بناتی ہیں۔"

"ہاں ایسی بھی ہوتی ہیں لڑکیاں لیکن وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ تو اتنی معصوم اور بھولی ہے کہ آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔" پھر قدرے توقف سے وہ بولا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ آپ میری مدد نہیں کر سکتے۔"

"تم کیسی مدد چاہتے ہو؟"

"ظاہر ہے' میں گوری کو پانا چاہتا ہوں۔"

"بہت آسان بات ہے۔ دوسری شادی کر لو اس سے۔" رجب علی نے اطمینان سے کہا۔

"دوسری شادی؟ میرا دو شادیاں کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ایسا مجھے ہی گوارا نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی میں گوری کے علاوہ کسی کو بھی شامل نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری بات یہ کہ میں جانتا ہوں کہ گوری کی موجودگی میں' میں کسی اور سے انصاف نہیں کر سکوں گا۔"

"اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔ فوزیہ تمہاری منگ ہے تمہارے ساتھ منسوب ہو چکی ہے وہ۔ تمہارا نام اس کے نام کا حصہ بن چکا ہے۔ تمہارے لیے کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ تم جانتے ہو اس معاملے پر تو خون بہہ جاتے ہیں یہاں۔"

"بھائی جان میں کسی کا خون نہیں بہانا چاہتا۔ میں نے آپ کو یہ بات بتائی ہی اس لیے ہے کہ آپ میری مدد کریں۔"

"کچھ چیزیں ایسی ہیں علی جو میرے اختیار میں نہیں ہیں جس طرح بیوی عزت ہوتی ہے اسی طرح منگیتر بھی عزت ہوتی ہے۔ تمہاری محبت اپنی جگہ لیکن اب فوزیہ اس گھر اور اس حویلی کی عزت ہے۔ بہو ہے وہ' بھابی ہے۔ اسے عزت سے اس حویلی میں لانا ہی ہوگا۔ منگنی کے دن سے ہی اس کا تعلق اپنے ماں باپ کے گھر سے ختم ہو کر اس گھر سے جڑ گیا ہے۔ جس دن سے تم دونوں کی منگنی ہوئی ہے اس دن سے اس نے اپنے ماں باپ کے گھر کا سوت کا ایک تار بھی نہیں پہنا۔ اس گھر کے اناج کا ایک دانہ نہیں کھایا۔ وہ اب ان کی نہیں ہماری عزت ہے اور اس حویلی کی عزت مٹی میں ملنے سے پہلے ہمیں خود مٹی میں مل جانا چاہیے۔ اسے اس گھر میں لے آؤ۔ اس کے بعد تم آزاد ہو۔ چاہو تو اگلے ہی دن گوری سے شادی کر لو۔ عدل انصاف کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہاری بیوی ہوگی۔ اسے ویسے ہی رہنا ہوگا جیسے تم چاہو گے۔ اس کا اس حویلی میں آ جانا ضروری ہے اور بس۔ اس سے زیادہ تم اسے نہیں دو گے تو بھی تم سے پُرسش کی جرأت کوئی نہیں کر سکے گا۔ بعد میں چاہے تم اپنا تمام پیار' ساری محبت گوری کو دے دو لیکن پہلے فوزیہ کو یہاں لے آؤ۔"

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کسی عورت پر ظلم کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس نے

نفی میں سر ہلایا۔

''اس میں ظلم کی کیا بات ہے۔ فوزیہ کو محبت دینے کی ضرورت نہیں ہے اور گوری کو اولاد، حساب خود ہی برابر ہے۔''

''کیا؟'' اس نے حیرت سے رجب علی شاہ کی جانب دیکھا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ......''

''میرا مطلب بہت سادہ ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''اولاد صرف خاندان کی عورت سے اور جائیداد خاندان میں۔''

''یعنی مجھ سے شادی کی صورت میں گوری کو اولاد کی پیدائش کے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوا کرتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہاری گوری واقعی تم سے محبت کرتی ہے تو اسے اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔ باقی جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے تو اسے یہاں ہر طرح کی آسائش ملے گی۔ جو منہ سے مانگے گی وہ اس کے سامنے ڈھیر کر دیا جائے گا۔ سونا، چاندی، زیور، کپڑے، ہر چیز۔''

''بھائی جان! مجھے شادی کرنی ہے سودا نہیں۔''

''تم نے مجھ سے مدد مانگی تھی۔ اور میں نے تمہیں اس صورتِ حال سے نمٹنے کا واحد حل بتا دیا۔ بابا جان تو یہ بھی پسند نہیں کریں گے کہ تم اپنی مرضی سے دوسری شادی کرلو لیکن اس مسئلے کو میں سنبھال لوں گا۔ مجھے پتا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں کیسے قائل کرنا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکوں گا تمہارے لیے۔''

''مشورہ اور اس حد تک مدد دینے کا شکریہ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

مسہری پر نیم دراز سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک دے کر سخاوت اندر داخل ہوا۔

''علی بھائی! آپ تو ملتے ہی نہیں ہیں۔'' اس نے اندر آتے ہی شکوہ کیا۔

''گویا سب کو مجھ سے یہ شکایت ہے۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''کوئی ایسی ویسی۔ مجھے تو بہت سخت شکایت ہے آپ سے۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آل رائٹ۔ تم شکایت کرو، میں سن رہا ہوں۔'' وہ بھی سیدھا ہو گیا۔

''آپ کا وقت یقیناً بہت قیمتی ہے لیکن میرے لیے اس کی قیمت تھوڑی سی کم کر دیں۔''

''ارے یار! میرا تمام تر وقت تم لے لو لیکن اس طرح مجھ سے ناراض مت ہو۔'' وہ مسکرا کر سخاوت کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' سخاوت خوش ہو گیا۔ ''میں آپ کو دعوت دینے آیا ہوں۔''

''کس چیز کی؟''

''گھڑ سواری کی۔ سنا ہے آپ بڑے زبردست قسم کے شہسوار ہیں۔ میں بھی دیکھوں کہ اس تعریف میں کس قدر سچ ہے۔''

''شہسوار نہیں صرف گھڑ سوار ہوں۔ وہ بھی بس عام سا اتنا زبردست بالکل نہیں ہوں جتنا تم نے کہا ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔

''یہ میں نے نہیں کہا۔ بھائی جان سمیت سب ہی کہتے ہیں۔''

''بھائی تو بھائیوں کی تعریف یوں بھی بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں۔ تم بھائی جان کی تعریف کو سنجیدگی سے مت لو۔''

''خیر! یہ تو کل پتا چل ہی جائے گا۔ اگر آپ کل صبح سویرے جاگ گئے۔''

''تمہارا شکوہ دور کرنے کے لیے جاگنا تو پڑے گا ہی۔''

''میں نے بھائی جان کو بھی دعوت دی ہے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔'' سخاوت نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔''

''آپ کون کون سے کھیل کھیلتے ہیں گھوڑوں سے متعلق؟ مجھے تو صرف سادہ گھڑ سواری ہی آتی ہے۔ جس قدر تیز ممکن ہو سکے گھوڑا دوڑا سکتا ہوں لیکن باقی کھیلوں کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی۔ بابا جان چاہتے ہیں کہ میں اور کھیل بھی کھیلوں لیکن یہاں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس سے میں سیکھنا پسند کروں۔''

''کیا سیکھنا ہے؟ میں سکھا دوں گا۔''

''جو کچھ آپ کو آتا ہے، وہ سب سکھا دیں۔'' سخاوت جلدی سے بولا۔

''میں پولو کھیل لیتا ہوں۔ Tent Pegging بھی مجھے بہت پسند ہے۔ ایک جنوبی امریکہ کا کھیل ہے Pats وہ بھی کھیل لیتا ہوں۔ Steeple Chase یعنی رکاوٹوں والی ریس بھی میری پسندیدہ ہے۔ وہاں انگلینڈ میں تو میں نے Hunt Club (شکاری کلب) بھی جوائن کر رکھا تھا۔''

''بس علی بھائی یہ سب باری باری سکھا دیں۔'' وہ جوش سے بولا۔

''تیار رہو لیکن ایک بات ہے کہ میں بہت سخت ٹریننگ دیتا ہوں۔'' حیدر علی مسکرایا۔

''کوئی پروا نہیں ہے۔ میں بھی سخت تربیت ہی لینا چاہتا ہوں۔'' سخاوت اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں اب چلتا ہوں لیکن کل صبح کا پروگرام یاد رکھنا۔''

☆======☆======☆

صبح سویرے حسبِ معمول کسرت سے فارغ ہوتے ہی اچھو راجہ کے پاس چلا آیا۔

''کیسا ہے میرا یار؟'' اس نے راجہ کی گردن تھپتھپائی۔

راجہ نے ہنہنا کر اسے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔

''بھوک تو تمہیں لگی ہوگی لیکن کھانا کھانے سے پہلے نہانا دھونا بہت ضروری ہوتا ہے۔'' اچھو نے اپنی شلوار کے پائنچے چڑھا لیے اور راجہ کو کھریرا کرنے لگا۔ ''اب مستی بالکل نہیں ہو گی۔ آرام سے صاف ستھرا ہو کر پھر ناشتہ کرنا۔'' وہ حسبِ معمول اس سے باتیں کرنے لگا۔

''گھوڑا صاف ستھرا ہو تو شو زیادہ پڑتی ہے۔ کبھی دیکھے ہیں فضلو اور رشیدے کے گھوڑے۔ قریب سے ناک بند کر کے گزرنا پڑتا ہے۔ ایسے گھوڑے کی طرف کوئی نظر بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ ساری شوشا ماری جاتی ہے۔ گھوڑے کو تو کسی جرنیل کی طرح ہونا چاہیے۔ قدم زمین پر پڑیں تو دشمن کا کلیجہ بھی ہل جائے۔ گردن یوں تنی ہوئی جیسے ابھی ابھی دشمن کی فوج کو کاٹ کر آ رہا ہو۔ کاٹھ ایسا کہ دیکھنے والے کی نظر نہ ٹکے اور نرمی ایسی کہ ہر ایک سے محبت سے پیش آئے۔ سوار کو اپنی پیٹھ پر ایسے بٹھائے جیسے پھول اپنے اوپر تتلی کو جگہ دیتا ہے چلے تو یوں لگے جیسے ہوا میں تیر رہا ہو۔''

راجہ یوں ہنہنایا جیسے اس کی تمام بات سمجھ گیا ہو۔

''شاباش میرے شیر۔ اب ذرا منہ کھولو تاکہ میں تمہارے دانت بھی صاف کر دوں۔ مجھے پتا ہے کہ گندے بچوں کی طرح تمہیں بھی دانت صاف کرانا پسند نہیں ہے لیکن دانت تو تمہیں صاف کرانے ہی ہوں گے۔'' باتوں کے ساتھ ساتھ وہ بڑے سے برش کی مدد سے اس کے دانت بھی صاف کرتا جا رہا تھا۔ ''بدتمیز بچوں اور جنگلی گھوڑوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ ان کے والدین سے تربیت کے سلسلے میں کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے اور انہوں نے اپنی اولاد پر توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے تمہارے میلے دانت دیکھ لیے تو لوگ کیا کہیں گے۔ یہی نا کہ میں تم پر توجہ نہیں دیتا۔ تم سے محبت نہیں کرتا۔ بری بھلی تو سب مجھے سننا پڑے گی ناں۔ تمہیں اچھا لگے گا جب سب مجھ سے ایسی باتیں کریں گے؟ نہیں ناں؟ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ضد کیے بغیر دانت صاف کروا لیا کرو۔''

''اچھو۔'' اندر سے ماں کی آواز آئی۔

''کیا بات ہے؟'' وہ وہیں باہر سے چلایا۔

''کب تک اس کی ناز برداری کرے گا۔ اب آ جا اندر۔''

''بس آتا ہوں۔ اسے دانہ تو دے دوں۔''

''مت کر اب اس پر زیادہ خرچا۔'' منشی نے بھی اندر سے چلا کر کہا۔ ''واپس تو جانا ہی ہے اسے پھر اس پر پیسہ خرچ کرنے کا فائدہ؟''

''کوئی مائی کا لال ہاتھ تو لگائے میرے راجہ کو۔ ہاتھ توڑ کر بھجوا دوں گا واپس۔'' اسے غصہ آ گیا۔ ''اور ابا آپ جیسی بے مروتی دیکھی نہ سنی۔ کتنا ساتھ دیا ہے راجہ نے ہمارا۔ سلیم کی پڑھائی کا خرچا اسی نے اٹھا رکھا ہے ورنہ میں پوچھتا کیسے اسے شہر بھیجتے۔ اب اور کچھ نہیں تو اس بے چارے کے دانے پر تو نظر نہ رکھیں۔ کتنا کھا جائے گا یہ غریب۔''

اس نے پیار سے راجہ کے سر پر ہاتھ پھیرا جو ناند میں منہ گھسائے ان کی باتوں سے بے خبر دانہ کھانے میں مصروف تھا۔

''میں بتا رہا ہوں تجھے آج خود ہی اسے حویلی واپس لے جانا۔'' منشی اپنا تہبند سنبھالتا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر باہر نکلا۔ ''بڑے شاہ صاحب کو دوبارہ نہ کہنا پڑے۔''

اچھو نے ایک نظر باپ کی طرف دیکھا اور پھر راجہ کو دانہ کھلاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''کچھ سنا ہے یا نہیں؟''

''آپ کی طرف والے کان سے سن بھی لیا ہے اور دوسری طرف والے کان سے نکال بھی دیا ہے۔''

''ایسا جھانپڑ دوں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔''

''مجھے جتنا چاہیں مار لیں لیکن میرے راجہ کو کچھ نہ کہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔''

''اب تم دونوں چونچ ہی لڑاتے رہو گے یا اندر بھی آؤ گے۔'' ماں بھی باہر نکل آئیں۔

''چلو اندر چلو دونوں۔''

''ابا کو اندر لے جائیں ماں۔ ورنہ بول بول کر میرے راجہ کا بھی سکون برباد کریں گے۔ مجال ہے ایک دن بھی اسے ڈھنگ سے دانہ کھانے دیا ہو۔''

''بڑا آیا راجہ کا باپ۔'' منشی کو تاؤ آ گیا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے اس دو کوڑی کے جانور کے دانے پر نظر رکھنے کی۔''

''دیکھیں ابا۔ اسے دو کوڑی کا جانور نہ کہیں۔''

''تھا تو نہیں یہ دو کوڑی کا جانور پر جب سے تیرے پاس آیا ہے ناں تب سے دو کوڑی کا ہی ہو گیا ہے۔ آج سورج چڑھتے ہی یہ حویلی میں واپس کر کے آنا ہے۔''

''اماں! ابا کو منع کریں۔ بار بار ایک ہی بات دہرائے جا رہے ہیں۔ کسی مائی کے لال میں ہمت ہو تو آ کر لے جائے۔ جو آگے بڑھے گا اسے ایسا دھوبی پٹڑا دوں گا کہ اٹھنے کے قابل نہیں رہے گا۔''

''تو کسی کو کیا دھوبی پٹڑا دے گا۔ اس سے پہلے ہی تیری چمڑی الگ نہ کر لی تو کہنا۔''

''اب بس بھی کرو گے یا نہیں۔'' ماں کو غصہ آ گیا۔ ''صبح صبح انسان اللہ رسول کا نام لیتا ہے لیکن یہاں تم دونوں کی چخ چخ شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے تو سوکنیں بھی نہیں لڑتیں۔ جیسے تم باپ

بیٹا آپس میں لڑتے ہو۔''

''میں کب لڑتا ہوں' یہ ابا کی زبان میں ہی کھجلی ہوتی رہتی ہے۔''

''میری زبان میں ہی نہیں ہاتھ میں بھی کھجلی ہوتی ہے۔'' منشی نے اس کے سیاہ بالوں سے بھرے ہوئے سر پر اپنے ہڈیوں بھرے ہاتھ سے چپت رسید کی۔

''دیکھ لیا ماں۔'' وہ چلایا۔ ''قسم سے ابا یہ ہاتھ کسی اور نے اٹھایا ہوتا تو توڑ کر رکھ ابھی۔''

''تم باز نہیں آؤ گے۔'' ماں جھلا گئی۔ پھر پہلے اچھو کو گھر کے اندر دھکیلا اور پھر منشی کو اندر گھسیٹ لائی۔

''اب کوئی بولا تو میں جھانپڑ لگاؤں گی۔ سمجھے تم دونوں۔'' ماں نے انہیں گھورا۔

''ایسی عورت پورے گاؤں میں نہیں ہوگی جو شوہر سے یہ بات کہے۔'' منشی بڑبڑایا۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے ماں کیونکہ میں فالتو بولنا پسند ہی نہیں کرتا۔ ذرا ابا کی طرف دھیان رکھنا۔ یہ جنگ بندی کی پروا نہیں کرتے۔'' اچھو چارپائی پر بیٹھ گیا۔

منشی بھی اسی چارپائی پر اس کی پشت کی جانب پشت کر کے بیٹھ گیا۔ ''مجھے باؤلے نے نہیں کاٹا کہ خواہ مخواہ میں اس سے لڑتا پھروں۔ اچھا ہے اس کی بھیڑی شکل نظر ہی نہیں آ گی تو دل بھی نہیں جلے گا۔''

''بس ماں دیکھ لیا۔'' وہ چلایا اور پھر منشی کی جانب مڑا۔ ''سارا گاؤں کہتا ہے کہ میری شکل......آپ پر گئی ہے۔''

''اپنے کرتوت چہرے پر آ جاتے ہیں کمبخت۔ تیری بھیڑی شکل تیرے اپنے کرموں کا صلہ ہے۔ شکل ملنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

''میں نے کیا برائی کی ہے ابا؟''

''تو چپ نہیں رہ سکتا اچھو۔'' ماں پراٹھا توے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

''یہ کیا چپ ہوگا اس نے تو قبر میں بھی فرشتوں کے ساتھ جھگڑا کرنا ہے۔'' منشی کب چپ ہونے والا تھا۔

اچھو غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''کہاں جا رہا ہے اچھو؟'' ماں چلائی۔

''میرا میٹر پھرنے لگا ہے ماں۔ میں یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔'' وہ ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر باہر گیا۔

''پراٹھا تو کھاتا جا۔''

''ابا کو کھلا دیں تا کہ زیادہ طاقت سے مجھ پر حملہ آور ہوسکیں۔'' وہ راجہ کی طرف بڑھ

ہوئے چلایا۔

اسے آتا دیکھ کر راجہ ہنہنانے لگا۔

''چل میرے یار سیر کو چلتے ہیں۔'' اس نے راجہ پر زین کسی۔ ''یہاں تو مجھے کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ ایک تُو ہی ہے جس سے میں دل کی ہر بات کہہ سکتا ہوں۔ یہ ابا ہیں ناں' میری صورت کے ہی بیری ہیں۔ کہتے ہیں میری شکل بھیڑی ہے۔ تُو بتا میری شکل بھیڑی ہے کیا؟''

راجہ نے پھر ہنہنا کر اچھو سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اچھو نے پیار سے اس کی گردن سہلائی اور ''بسم اللہ'' کہہ کر اس کے اوپر بیٹھ گیا۔

صبح کی سپیدی ہر طرف پھیلنے لگی تھی۔ نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ اس نے راجہ کو ہلکی سی ایڑھ دی اور وہ خوبصورت دُلکی چال چلنے لگا۔ صبح کا یہ وقت اچھو کا پسندیدہ وقت ہوتا تھا جب وہ راجہ پر سوار ہو کر سیر کے لیے نکلتا تھا۔ سیر کی سیر ہو جاتی تھی اور سب کام پر جانے والوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔

☆======☆======☆

رجب علی' حیدر علی اور سخاوت علی صبح صبح گھڑ سواری کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ تینوں بھائی Breeches میں ملبوس رائیڈنگ بوٹس پہنے اپنے اپنے گھوڑے کو کینٹر کراتے ہوئے باہر میدان میں آ گئے۔ میدان میں ان کے اصطبل کے اور گھوڑے بھی موجود تھے۔ سخاوت علی کی بات اپنی جگہ' رجب علی کا اپنا بھی خیال تھا کہ زمینوں اور جائیداد کے کاموں سے فراغت پاتے ہی اس طرف اپنی توجہ مبذول کر لے گا۔ اچھی گاڑی' اعلیٰ نسل کا کتا اور گھوڑا۔ جدید اسلحہ' پرانی شراب اور نیا شباب اس کی کمزوری تھی۔ یہ سب گھوڑے بھی اسی لیے کھیتوں سے باہر بڑے میدان میں جمع تھے کیونکہ اب اس کا ارادہ اپنے اصطبل کو بہترین بنانے کا تھا۔

میدان میں پہنچ کر وہ تینوں اپنے اپنے گھوڑے سے اتر آئے۔ وہاں کھڑے ملازمین نے گھوڑوں کی باگیں ان کے ہاتھ سے لے لیں۔

''مجھے معلوم نہیں تھا سخاوت کہ تم اتنی اچھی رائیڈنگ کرتے ہو۔'' حیدر علی نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھا۔

''ابھی آپ کو پتا کیا ہے جناب! کچھ ہی عرصے میں آپ کو پیچھے چھوڑ دوں گا۔''

''مجھے شدت سے اس دن کا انتظار رہے گا جس دن میرا چھوٹا بھائی مجھے اپنے سے پیچھے چھوڑ دے۔'' حیدر علی ہنس پڑا۔

''ویسے علی بھائی گھڑ سواری میں واقعی آپ کا جواب نہیں۔ میں نے تو کبھی آپ کو پریکٹس کرتے بھی نہیں دیکھا۔ یہاں تو آپ صبح کو سوئے رہتے ہیں یا پھر باہر نکل جاتے ہیں۔''

''یہ تو میں یہاں آ کر کچھ سست ہو گیا ہوں اور کچھ اور چکروں میں پڑ گیا ہوں۔ وہاں

انگلینڈ میں، میں بہت باقاعدگی سے رائیڈنگ کیا کرتا تھا۔"

"ابھی تو تم نے اس کی رائیڈنگ دیکھی ہے، کبھی اس کی شو جمپنگ اور Tent Pegging دیکھنا۔" رجب علی نے کہا۔ "گھوڑے کو نو فٹ تک تو آسانی سے جمپ کرا لیتا ہے اور Tent Pegging کرتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا کہ اس کے نیزے نے میخ نہ اکھاڑی ہو۔"

"میری کتنی خواہش ہے کہ Tent Pegging میں میرے مقابلے کا کوئی شخص نہ ہو۔" سخاوت بولا۔

"تو آج سے ہی علی کی شاگردی میں چلے آؤ۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ تینوں میدان کے وسط میں کھڑے گھوڑوں کے پاس پہنچ گئے۔

"مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے یہ گھوڑے دیکھتے ہوئے۔" رجب علی نے کہا۔ "ان میں سے کتنے گھوڑے تو ایسے ہیں جو میرے معیار سے بہت کم ہیں اور تربیت کسی کی بھی اچھی نہیں ہے۔"

"بابا جان کو تو گھوڑوں سے بس واجبی سی دلچسپی ہے انہیں جنون نہیں ہے گھوڑوں کا۔ یہ تھوڑا بہت اصطبل ہے یہ بھی میری وجہ سے ہی قائم ہے۔" سخاوت بولا۔ "سائیس بڈھا ہو گیا ہے۔ ٹھیک سے دیکھتا بھی نہیں ہے لیکن بابا جان اس لیے الگ نہیں کر رہے کہ وہ بہت پرانا ملازم ہے۔ باقی نوکر چاکر دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن اتنی نہیں جتنی کرنی چاہیے۔"

"سائیس۔" رجب علی نے اسے آواز دی۔

تھوڑے فاصلے پر کھڑا بڈھا سائیس ہاتھ باندھ کر اس کی جانب چلا آیا۔ اس کی نگاہیں اس چابک پر ٹکی ہوئی تھیں جو رجب علی نے دائیں ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا۔ اخروٹ کی منقش لکڑی کے ہینڈل اور اس سے منسلک چمڑے کا کوڑا جو تہہ بہ تہہ جما کر اس نے پکڑا ہوا تھا۔ سائیس کی روح فنا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس سے قبل وہ اس بات کا عادی نہیں تھا۔ پیر صاحب نے سجاوٹ کے لیے پرانے ہتھیار اور کوڑے ضرور رکھے ہوئے تھے لیکن وہ انہیں ہاتھ میں پکڑ کر بات کرنے کے عادی نہیں تھے، پھر اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ رجب علی شاہ بہت سخت گیر ہے۔ اور کسی شخص کو رعایت دینے پر آمادہ نہیں ہے اس لیے اس کے سامنے پہنچ کر وہ کچھ زیادہ ہی مؤدب اور فرض شناس دکھائی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

"جی حضور۔" اس کے ہاتھ بدستور بندھے ہوئے تھے۔

"یہ کون ہیں؟" اس نے ہاتھ میں پکڑے چابک سے گھوڑوں کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔

"حضور یہ گھوڑے ہیں۔"

"گدھے۔" وہ دھاڑا۔ "تم نے انہیں اپنے سے بڑا گدھا بنا دیا ہے۔"

"جج......جی حضور۔" وہ گھگھیایا۔

"ہمیں اپنے اصطبل میں گدھے نہیں گھوڑے چاہئیں۔ سمجھے تم؟ ایسے گھوڑے جن کا خون ابل رہا ہو۔ جو نیزہ بازی کرتے ہوئے میخ کی طرف اسی طرح دوڑیں جیسے چیتا اپنے شکار کی طرف بڑھتا ہے۔ ہمیں یہ جھکے ہوئے سر والے گھوڑے نہیں چاہئیں۔"

"جی حضور۔ ایسے گھوڑے بھی ہیں جو اپنی کمر پر زین نہیں کسنے دیتے۔"

"ایڈیٹ۔ ہم گرم لہو والے گھوڑوں کی بات کر رہے ہیں جنگلی اور غیر مہذب گھوڑوں کی نہیں۔"

"جی سرکار۔" وہ مزید بوکھلا گیا۔

"ابھی ہم تم سے کہیں کہ ان میں سے رائیڈنگ اور پولو کے گھوڑے الگ کرو تو تم وہ بھی نہیں کر سکو گے۔ تمہیں تو مہذب اور غیر مہذب گھوڑے کے درمیان فرق کا بھی نہیں پتا۔ احمق بڈھے، کسی اصطبل میں جنگلی گھوڑے کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہاں کا سائیس تم جیسا گدھا ہے۔"

"حضور عربی گھوڑوں کو سدھانا آسان کام نہیں ہے لیکن میں پوری کوشش کرتا ہوں۔" اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"ایڈیٹ۔ عربی گھوڑے سب سے زیادہ آسانی سے سدھائے جا سکتے ہیں۔" پھر وہ حیدر علی کی جانب مڑا۔ "ذرا اس احمق کی طرف دیکھو۔ یہ کہتا ہے کہ عربی گھوڑے نہیں سدھا سکتا۔" وہ دوبارہ سائیس کی جانب متوجہ ہوا۔ "عربی گھوڑا سدھائے جانے کے لیے سب سے زیادہ آمادہ جانور ہوتا ہے اور سب سے زیادہ عقلمند بھی ہوتا ہے۔ جو سائیس ایسے گھوڑے کو نہ سدھا سکے اسے گھر چلے جانا چاہیے۔ شکورے!" اس نے ملازموں کے درمیان کھڑے شکورے کو آواز دی۔ "اس بڈھے کو اس کے گھر کا راستہ دکھا دو۔ اور تم۔" اس نے ایک اور ملازم کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

"جی سرکار۔" فرض شناسی کے اظہار کے لیے وہ دوڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔

"یہ جو ریوڑ اس ایڈیٹ نے جمع کر رکھا ہے، اس میں سب سے بدمعاش گھوڑے پر زین کسو۔"

اس کا یہ حکم سنتے ہی تمام ملازمین میں ہلچل مچ گئی۔ سخاوت نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"انہیں ایسے ہی کسی ڈنڈے کی ضرورت تھی۔ یہ قوم ڈنڈے کے بل پر ہی کام کر سکتی ہے۔ ہمارے بابا جان کی نرم خوئی سے انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔" وہ ان کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ "ویسے بھائی جان کیا آپ کا ارادہ واقعی کسی سرکش گھوڑے پر سواری کرنے کا ہے؟"

''کسی سرکش کو سدھانا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ میں اپنے سامنے کسی کی اکڑ اور سرکشی برداشت نہیں کرسکتا۔ خواہ یہ اکڑ اور سرکشی کسی جانور کی ہو یا انسان کی۔''

''یہ جو ہمارا ایورگریٹ ہے ناں۔'' سخاوت نے گھوڑے کی جانب اشارہ کیا جسے تین ملازمین نے سنبھالا ہوا تھا اور چوتھا اس پر زین ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''یہ یہاں کا سب سے سرکش گھوڑا ہے۔''

حیدر علی نے ایک نظر سفید رنگ کے قد آور گھوڑے کی سمت دیکھا جو خود پر زین کسوانے کے لیے کسی طور آمادہ نہیں تھا۔ پھر سخاوت کو مخاطب کیا۔

''جانتے ہو یہ کس نسل کا گھوڑا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے کسی قدر شرمندہ ہو کر کہا۔

''یہ Through Bred ہے اس نسل کے گھوڑے باقی ہر نسل سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ نسل عربی اور برطانوی گھوڑوں کے ملاپ سے وجود میں آئی ہے۔ یورپ میں جو گھوڑے جنگوں میں استعمال ہوتے تھے' وہ بھاری بھرکم ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ یورپی جنگجو سر سے پیر تک زرہ بکتر اور بھاری ہتھیاروں سے لیس ہوتے تھے اور اتنا بوجھ بھاری بھرکم گھوڑے ہی اٹھا سکتے تھے۔ دوسری طرف عرب میں زرہ بکتر وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔ عرب لوگ تو لڑائی کے دوران بعض اوقات گھوڑے پر زین بھی نہیں کسا کرتے تھے اس لیے ان کے گھوڑے قد میں چھوٹے اور بے حد پھرتیلے ہوا کرتے تھے۔ عرب میں گھوڑے کو گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا تھا اور گھر کے فرد کی طرح ہی برتاؤ بھی کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کے گھوڑے حساس اور عقلمند ہوتے تھے۔

یورپ کے لوگوں نے عربی اور یورپی گھوڑوں کی خصوصیات اکٹھا کرنے کے لیے یہ مخلوط نسل پیدا کروائی۔ اس نسل کے گھوڑے یورپی گھوڑے کی طرح قد آور اور عربی گھوڑوں کی طرح پھرتیلے' حساس اور عقلمند ہوتے ہیں۔ یہ تمام تر نسل تین گھوڑوں سے وجود میں آئی ہے جو سولہویں صدی میں عرب سے برطانیہ برآمد کیے گئے تھے اور ان گھوڑوں کے نام ہیں۔

Godophin arab, Byerly arabian, Daley arab.

''علی بھائی آپ کو تو بہت معلومات ہیں گھوڑوں کے بارے میں۔'' سخاوت نے رشک سے اس کی جانب دیکھا۔

''جو چیز انسان استعمال کرتا ہے اس کے بارے میں اسے اتنی معلومات ضرور ہونی چاہئیں۔'' پھر وہ رجب علی سے مخاطب ہوا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اس گھوڑے ایور گریٹ پر سواری کرنا چاہوں گا۔''

رجب علی کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ حیدر علی اس سے کہیں بہتر گھڑ سوار تھا لیکن گھوڑا سرکشی پر آمادہ تھا اور حیدر علی کو نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔

''نہیں علی۔''

''پلیز بھائی جان یہ آپ کے مرتبے اور شان کے خلاف ہے یہ مجھ سے بے قابو ہو گیا تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر آپ اسے سنبھال نہ سکے تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔''

رجب علی مسکرا دیا۔ ''مانا کہ میں تم سے بہتر گھڑ سوار نہیں ہوں لیکن اتنا کمزور بھی نہیں ہوں۔''

''چھوڑیں بھائی جان! علی بھائی کو شوق پورا کر لینے دیں۔ میں بھی دیکھوں ان کی تعریفوں میں کس حد تک صداقت ہے۔'' سخاوت نے جلدی سے کہا۔

''بس بھائی جان فیصلہ ہو گیا کہ سواری میں کروں گا۔'' حیدر علی بولا۔ پھر وہ سخاوت سے مخاطب ہوا۔ ''تم وہاں جا کر زین ڈالنے کا منظر دیکھو۔''

سخاوت سمجھ گیا کہ وہ اسے وہاں سے تھوڑی دور بھیجنا چاہتا ہے۔ تاکہ رجب علی سے علیحدگی میں بات کر سکے اس لیے ایورگریٹ کی طرف چلا آیا۔

''آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔'' سخاوت کے دور جانے کے بعد اس نے رجب علی کو مخاطب کیا۔

''کہو۔''

''آپ کو سائیس کو یوں نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔'' وہ بولا۔ ''یوں اچھا نہیں لگتا۔ مانا کہ وہ رائج الوقت معیار کے حساب سے ہم سے کمتر ہے لیکن بہرحال بوڑھا ہے۔ ہمیں اس کے سفید بالوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔''

''تم تو ابا جان سے بھی زیادہ نرم خو ہو۔ ایک بہت پتے کی بات آج ذہن نشین کر لو۔ حکمرانی کا پہلا اصول سخت گیری ہے۔ یہ سائیس جو تمہارے سامنے گھگھیا رہا تھا' اس کی وجہ کوئی رائج الوقت معیار نہیں' یہ چابک تھا۔'' اس نے اپنا داہنا ہاتھ بلند کیا جس میں اس نے چابک تھام رکھا تھا۔ ''کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ان کا سدِ باب کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر کہ کوئی تمہارے سامنے سینہ تان کہ کھڑا ہو سکے' اس شخص کی ٹانگیں ہی کاٹ دو۔''

''علی بھائی۔'' سخاوت نے اسے پکارا۔ ''گھوڑا تیار ہے۔''

حیدر علی گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔

ایورگریٹ' سفید رنگ کا وہ قد آور گھوڑا واقعی بہت سرکش تھا۔ پہلے تو اس نے حیدر علی کی اپنی کمر پر بیٹھنے کی کوشش ناکام بنانے کی جدوجہد کی لیکن جب وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور علی اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا تو اس نے اپنی پچھلی دونوں ٹانگیں اٹھا کر کک ماری اور پھر وقفے وقفے سے مارتا ہی چلا گیا۔ حیدر علی بھی اس کی پشت کے ساتھ جما ہوا تھا۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر ایور

گریٹ الف ہو گیا پھر بھی حیدر علی کو اپنی پشت سے نہ گرا سکا۔

اس کے بعد حیدر علی نے اسے بھگانا شروع کیا اور کچھ دیر اس کی سواری کرنے کے بعد اتر آیا۔

''مان گئے آپ کو علی بھائی۔'' سخاوت کی خوشی دیدنی تھی۔

ابھی وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ رجب علی کی نگاہ کچے راستے پر پڑی جہاں دُلکی چال چلتے ہوئے ایک قد آور مشکی گھوڑا نمودار ہوا تھا جس کی پشت پر گاؤں کا ایک جوان سوار تھا۔

''واؤ'' اس کے منہ سے سیٹی بجانے والے انداز میں نکلا۔ ''بلیک بیوٹی۔''

ابھی وہ اس کی جانب دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکی گھڑونچی اٹھائے موڑ سے سامنے اس کچے راستے پر نکل آئی۔ اس کے خدوخال بہت بہت واضح تو نہیں تھے لیکن اس کی چال میں جوانی کی شوخی اور بانکپن تھا۔

لڑکی کے قریب پہنچ کر گھڑ سوار رک گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ بات چیت کے دوران لڑکی قہقہہ مار کر ہنسی بھی۔ اس کے ہنسنے کی مدھم سی آواز رجب علی کے کانوں میں بھی پڑی۔ پھر لڑکی اپنی راہ پر چل دی اور گھڑ سوار اپنی۔

''شکورے۔'' رجب علی نے آواز دی۔

''جی سرکار'' وہ دوڑا آیا۔

رجب علی نے مڑ کر باقی سب کا جائزہ لیا۔ حیدر علی اور سخاوت مختلف گھوڑوں اور ان کی تربیت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ جبکہ باقی ملازمین ان کے گرد مستعد کھڑے تھے۔

وہ مطمئن ہو کر شکورے سے مخاطب ہوا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟''

''حضور۔ یہاں کے نائی کی بیٹی ہے۔ ہے تو نائی کی بیٹی لیکن بہت مغرور ہے۔ نسیم نام ہے اس کا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ حالانکہ گاؤں میں اس سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکیاں موجود ہیں۔ پھر بھی سب سے زیادہ آہیں اسی کے پیچھے بھری جاتی ہیں۔ اچھا بھلا ڈانٹ کر رکھ دیتی ہے سب کو اس لیے بہت سے لڑکے تو اسے دیکھ کر ہی گھبرا جاتے ہیں۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔ وہ جانتا تھا کہ رجب علی کو ایسی باتوں میں تمام تر تفصیل درکار ہوتی ہے۔ ''بس ایک اچھو ہی ہے جس سے اچھی طرح ملتی ہے۔''

''اس سے اچھی طرح سے کیوں ملتی ہے؟''

''وہ پہلوان آدمی ہے' لڑکیوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سارا گاؤں اسے شریف سمجھتا ہے اس لیے اس سے اچھی طرح مل لیتی ہے۔''

''اور وہ گھوڑا کس کا ہے؟''

''یہ اچھو کا ہی ہے سرکار۔ وہی منشی مغل دین کا بیٹا...... اسے یہ گھوڑا پیر صاحب کی سرکار

سے عنایت ہوا تھا۔''

''بابا جان نے ایسا عمدہ گھوڑا اسے دے دیا۔ اس کے پائے کا کوئی گھوڑا تو ہمارے پورے اصطبل میں نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''بہرحال آج دوپہر تک یہ گھوڑا اصطبل میں اور رات تک یہ لڑکی ڈیرے پر ہونی چاہیے۔'' وہ بھائیوں کی جانب مڑ گیا۔

☆======☆======☆

جی ٹی (GT) روڈ سے نور محمد کے مہمانوں کو اس کے گھر چھوڑ کر اچھو دوپہر کے کھانے کے لیے گھر کی جانب تانگہ بڑھا رہا تھا۔ جب شکورا رجب علی کے ایک اور ملازم کے ساتھ راستے کے درمیان آ گیا اور اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

''کیا بات ہے؟'' اچھو نے باگیں کھینچ لیں۔ ''خیر تو ہے؟''

''خیر ہی ہے۔'' شکورا چند قدم آگے بڑھ آیا۔

''گھر چلنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''ویسے تو ماں کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہو گی لیکن چلو میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیتا ہوں۔''

''تانگے سے اترو۔'' اس نے اچھو کی فراخدلانہ پیش کش یکسر نظر انداز کر دی۔

''خیر تو ہے شکورے۔'' وہ نیچے اتر آیا۔ ''گھر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔''

''کہاناں سب خیر ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں راجہ کو لینے آیا ہوں۔''

''راجہ کو لینے آیا ہے؟'' اچھو کے کان کھڑے ہو گئے۔

''ہاں بڑے شاہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ دوپہر تک راجہ کو ان کے اصطبل میں ہونا چاہیے۔''

''اچھا آ آ۔'' اس نے اچھا کو کافی لمبا کھینچا' پھر ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ ''تو شاہ صاحب نے راجہ کو منگوایا ہے۔''

''ہاں۔'' اس کے جارحانہ انداز کو دیکھ کر شکورے نے بھی سینہ پھلا لیا۔

''تو ان سے کہنا کہ اس کام کے لیے تجھ جیسے مریل چوہے کے بجائے کسی جوان مرد کو بھیجیں جو مجھ سے راجہ کو چھین کر لے جا سکے' کیونکہ میں اپنا راجہ کسی کو نہیں دینے کا۔''

وہ دوبارہ تانگے پر جا بیٹھا۔

''چل اتر نیچے۔'' شکورا غصے سے چلایا۔ ''شاہ صاحب کی حکم عدولی کرتا ہے؟''

''ہمت ہے تو لے جا۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔''

شکورے نے اپنے ساتھ آئے ہوئے ملازم کی طرف غصے سے دیکھا۔ جو چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا' اور اپنی خودی بلند کرنے کی کوشش کی۔

''گھوڑا کھول دو۔''

''نہ نہ مت کھولنا' ورنہ بہت پٹے گا میرے ہاتھوں۔'' اچھو نے اسے تنبیہہ کی۔

گاؤں کا بچہ بچہ اچھو کی شہ روزی کو جانتا تھا' ملازم تذبذب میں مبتلا تھا کہ کیا کرے' اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر شکورا خود ہی آگے بڑھا' لیکن جونہی اس نے راجہ کی گردن پر ہاتھ رکھا' اچھو نے نیچے چھلانگ لگا کر اسے گردن سے دبوچ کر پیچھے کھینچا اور پھر ان دونوں پر پل پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں سوجے چہروں کے ساتھ رجب علی شاہ کے سامنے کھڑے تھے۔

''گویا تم دونوں جوانمردی دکھا کر آ گئے۔'' وہ اندر سے غصے سے کھول رہا تھا لیکن بظاہر پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ ''لیکن ہمیں حیرت ہے کہ اسے ہمارے حکم سے سرتابی کی مجال کیسے ہوئی۔''

''سرکار گھوڑے کو تو اس نے اپنی اولاد کی طرح رکھا ہوا ہے۔'' شکورا دبے دبے انداز میں بولا۔

''ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' وہ دھاڑا۔ ''ہمیں صرف اس بات سے غرض ہے کہ وہ گھوڑا حویلی کے اصطبل میں ہونا چاہیے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ملازموں کا وہ ریوڑ جو ہم نے اس کام کے لیے بھرتی کیا ہوا ہے' وہ بھیڑیے کی کھال میں بھیڑیں ہیں۔ جو ایک گھوڑا نہیں لا سکے' وہ بھی ایک کمی کمین منشی کے بیٹے سے۔ دفع ہو جاؤ اور منشی کو میرے پاس بھیجو۔''

''جی سرکار۔'' وہ الٹے پاؤں پیچھے مڑے۔

منشی فضل دین رجب علی کے سامنے جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا' گو کہ ابھی تک اسے اچھو والے واقعے کی خبر نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اس ملاقات سے خائف تھا۔ رجب علی ملازمین سے خاصا سختی کا برتاؤ کرتا تھا اور ملازمین کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ حتیٰ المقدور اس کی نظروں سے بچے رہیں۔

''جی حضور۔'' اس کے سامنے پہنچ کر منشی نے عاجزانہ انداز میں ہاتھ باندھے۔

''تمہارے بیٹے نے اب تک گھوڑا کیوں نہیں لوٹایا؟'' اس نے پائپ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

''حضور! میں اسے کہہ آیا تھا۔ آج نور محمد کے مہمانوں کو اس کے گھر چھوڑ کر وہ گھوڑا حویلی میں دیتا جائے گا۔'' منشی نے جلدی سے جھوٹ گھڑا۔

''بہت بدمعاش ہے تمہارا بیٹا؟'' رجب علی دھاڑا۔

''جی نہیں' جی ہاں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''ہم اس کی ساری اکڑ نکال دیں گے' سمجھے؟''

''جی حضور!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''شکورے۔'' رجب علی نے پکارا۔

''جی سرکار۔'' دروازے کے ساتھ کھڑا شکورا جلدی سے آگے بڑھا۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے منشی کو شکورے کے سوجے ہوئے چہرے کی طرف متوجہ کیا۔ ''اس کا یہ حال تمہارے بیٹے نے کیا ہے۔''

''حضور غلطی ہو گئی' معاف کر دیں۔'' منشی نے جھک کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''آئندہ کبھی ایسا نہیں ہو گا۔''

''یہ اس کی پہلی بے وقوفی ہے' اس لیے معاف کر رہے ہیں' لیکن اسے بتا دو کہ تیسری بے وقوفی کرنے کے لیے وہ زندہ نہیں رہے گا' اس کے بعد کسی بے وقوفی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس کا دل زیادہ مچلے تو ایک کوشش کر دیکھے۔''

''نہیں حضور ایسا نہیں ہو گا۔'' منشی گڑگڑایا۔

''آئندہ ہمارے خاص آدمیوں پر ہاتھ اٹھانا تو درکنار اس نے آنکھ بھی اٹھائی تو ہم اس کی آنکھیں نکلوا دیں گے' اور چمڑی ادھیڑ کر اس میں بھس بھر دیں گے سمجھے؟'' اس کی آواز بتدریج اونچی ہوتے ہوئے کافی بلند ہو گئی تھی۔

''جی حضور!'' وہ اب بھی اس کے پاؤں پکڑے ہوئے تھا۔

رجب علی نے پاؤں جھٹک کر اسے پرے کیا اور بولا۔ ''ابھی اور اسی وقت جاؤ اور اپنے بیٹے کو ہمارے سامنے پیش کرو۔''

''جی حضور!'' وہ الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

''اور تم شکورے!'' اس نے غصے سے اسے گھورا۔ ''یہ تمہاری بھی پہلی حماقت ہے کہ تم چہرے پر ناکامی سجائے ہمارے سامنے آ گئے ہو' دوبارہ ایسی حماقت نہ ہو' ورنہ تم بھی تیسری حماقت کی حسرت لیے مٹی تلے چلے جاؤ گے' ہم ناکام ہو جانے والے کو پہلے سزا دیتے ہیں' حکم عدولی کرنے والے کو بعد میں۔''

''حضور آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔'' وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

''ہمارا دوسرا حکم یاد رکھنا۔ اس پر عملدرآمد میں ذرا سی کوتاہی ہوئی تو ہم تمہاری کھال میں بھس بھروا دیں گے۔''

''حضور آپ فکر نہ کریں' لڑکی آپ کے آنے سے قبل ہی ڈیرے پر ہو گی۔''

☆======☆======☆

جس وقت منشی تیزی سے چلتے ہوئے گھر پہنچا اچھو راجہ کو دانا کھلا رہا تھا اور ساتھ ہی اس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

''بڑے آئے تھے میرے راجہ کو لے جانے' ہاتھ نہیں لگانے دیا میں نے انہیں اور وہ شکورا خواہ مخواہ زیادہ اچھل کود کر رہا تھا۔ اس کی ناک تو پسے ہوئے آلو جیسی کر دی ہے' ہفتہ بھر منہ چھپاتا

پھرے گا۔''

منشی کچھ دور کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔

یہ ایسے گھوڑا دینے پر راضی نہیں ہوگا۔اس نے سوچا۔سختی کرنے سے کہیں شہر ہی نہ بھاگ جائے۔کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ یہ گھوڑا بھی دے دے اور اسے زیادہ بک بک کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔

جلد ہی منشی کے ذہن میں ترکیب آگئی اور وہ اچھو کے قریب چلا آیا۔

''تُو اب تک واپس کام پر نہیں گیا؟''

''ابا آپ؟'' اس نے حیرت سے باپ کی طرف دیکھا۔''میں تو سمجھا تھا کہ آپ حویلی میں ہوں گے۔''

''کام سے آیا تھا' ابھی واپس بھی جانا ہے۔اچھا ہوا تُو اب تک گھر پر ہے۔اب میری بوڑھی ہڈیوں میں جان نہیں رہی مجھے واپس حویلی چھوڑ دینا۔پیدل چلنا مشکل لگتا ہے۔''

''ابا میں تو کہتا ہوں' اب آرام کریں۔میں جو ہوں گھر کا خرچ چلانے کے لیے۔''

''کیا بات ہے آج تیرے منہ سے بہت پھول جھڑ رہے ہیں۔''

''میرے منہ سے تو پھول ہی جھڑتے ہیں۔پتا نہیں آپ کو کیوں کانٹے لگتے ہیں۔''

''اچھا اب جلدی کر' مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''بس پانچ منٹ۔'' وہ گھوڑے کو تانگے میں جوتنے لگا۔

منشی اپنے خوبرو جوان بیٹے کی طرف دیکھے گیا' جس نے شکورے کا حشر برا کر دیا تھا۔کوئی اور وقت ہوتا تو وہ شکورے کی اس پٹائی پر اس کی پیٹھ ٹھونکتا لیکن ابھی تو اس کے کانوں میں رجب علی شاہ کی آواز گونج رہی تھی۔

''اسے بتا دو کہ تیسری بے وقوفی کرنے کے لیے وہ زندہ نہیں رہے گا۔اس کے بعد کسی اور بے وقوفی کی گنجائش نہیں ہے۔اگر اس کا دل زیادہ مچلے تو ایک کوشش کر دیکھے' آئندہ ہمارے خاص آدمیوں پر ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات اس نے آنکھ بھی اٹھائی تو ہم اس کی آنکھیں نکلوا دیں گے اور چمڑی ادھیڑ کر اس میں بھس بھر دیں گے۔''

''ابا جی تانگہ تیار ہے۔''

اچھو کی بات سن کر منشی چونک گیا۔اور جلدی سے تانگے میں اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

گھوڑا گردن اٹھائے آہستہ آہستہ حویلی کی جانب رواں دواں تھا اور اچھو ہیر وارث شاہ گا رہا تھا۔

منشی اس کے چہرے پر نظریں جمائے اسے تکے گیا۔اچھو سے اسے بے تحاشا محبت تھی لیکن بہت انوکھی قسم کی۔اس نے کبھی اس محبت کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔منشی ہونے کے

ناتے پیر صاحب کے مزارعوں پر رعب جمانے کی ایسی عادت پڑی تھی کہ اب رعب جمائے بغیر اس کا کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا تھا۔اور اس کے اس رعب داب کا شکار اچھو بھی ہوتا رہتا تھا۔

کیسا گھبرو جوان تھا اس کا بیٹا۔اونچا لمبا' کسرتی جسم والا اس کے سیاہ گھنگھریالے بال ماتھے پر پڑے ہوئے تھے اور اپنے فولاد کی طرح مضبوط ہاتھوں میں گھوڑے کی لگامیں تھامے وہ ہر چیز سے بے خبر تھا۔

منشی نے اپنی ہی نظر لگ جانے کے خوف سے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

''کیا ہی اچھا ہو اب یہ شادی کے لیے راضی ہو جائے۔پیر صاحب سے کہہ کر چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو جائے اس کا۔'' اس نے دل میں سوچا۔''چاندی بہو گھر میں آ جائے تو کیسا اجالا ہو جائے ہر طرف۔گھر میں بچوں کی ہنسی گونجے اور یہ بھی کچھ ذمہ دار ہو جائے۔کتنے ہی لوگ اس کے رشتے پر نظر جمائے بیٹھے ہیں۔شادی کرے تو اس کی ضدی طبیعت میں بھی کچھ ٹھہراؤ آ جائے' ابھی تو دل دھڑکتا ہی رہتا ہے کہ کچھ کر نہ گزرے۔''

''ابا حویلی آ گئی۔''

اچھو اسے خیالوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لایا۔

''چل تُو بھی اتر۔'' منشی نیچے اترتے ہوئے بولا۔

''مجھے بڑی سڑک پر جانا ہے' گاڑی آنے والی ہوگی۔نور محمد کے کچھ اور مہمانوں کو اس گاڑی سے آنا ہے۔اس نے سختی سے تاکید کی تھی' کہ میں ٹھیک وقت پر سڑک تک پہنچ جاؤں۔''

''کم بخت یہاں تک آ گیا ہے تو کیا پیر صاحب کو سلام کیے بغیر چلا جائے گا۔''

''ابا! سلام اگلی دفعہ ہو جائے گا۔'' وہ اترنا نہیں چاہتا تھا۔

''اب بک بک نہ کر جلدی سے اتر' ورنہ کان سے پکڑ کر لے جاؤں گا۔''

وہ بادل نخواستہ اتر آیا۔

رجب علی برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھی اور سامنے میز پر چابک رکھا ہوا تھا۔

''سلام شاہ صاحب!'' رجب علی کو دیکھ کر وہ خائف ہو گیا تھا۔پھر بھی اس نے نظریں جھکا کر ماتھے تک ہاتھ لے جا کر اسے آہستہ سے سلام کیا۔

''ہوں۔'' رجب علی نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتار کر سر تا پا اس کا جائزہ لیا۔

''منشی یہ...... یہ ہے تمہارا بیٹا؟''

''جی حضور! آپ سے معافی مانگنے آیا۔''

''ابا!'' اچھو اس بات کے لیے تیار نہیں تھا' اس لیے باپ کے اچانک اس جھوٹ پر حیران رہ گیا۔

''قریب آجاؤ۔'' رجب علی نے رعب دار آواز میں اسے حکم دیا۔

اچھو کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

''بہت غرور ہے اپنی اس جان پر؟'' اس نے اچھو کے چہرے پر نظریں جمائی ہوئی تھیں اور اچھو کو یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے وہ نظریں پتھر کی طرح اس کے چہرے میں پیوست ہوئی رہی ہیں۔

اس نے رجب علی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

''بدمعاشی کرتے ہو گاؤں میں؟''

''نہیں سرکار میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ میں تو بس سارا دن اپنا گھوڑا تانگہ چلاتا ہوں' اکھاڑے میں چلا جاتا ہوں' میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''

''تم نے ہماری حکم عدولی کی ہے۔ ہمارے خاص آدمی کو مارا پیٹا ہے' پھر بھی کہتے ہو کہ کچھ نہیں کیا۔''

''میں نے شکورے کو اس لیے مارا ہے کہ یہ میرے عزیز ترین راجہ کو لے جانے آیا تھا۔ راجہ میرا دوست' میرا بھائی' میرا بیٹا' میرا سب کچھ ہے۔ میں اپنا راجہ کسی کو نہیں دے سکتا۔''

''کسی کو نہیں دے سکتے۔'' رجب علی کے لہجے میں ٹھہراؤ اور آنکھوں میں غضب تھا۔

پھر پلک جھپکتے میں اس نے میز پر پڑا ہوا کوڑا اٹھایا اور اچھو کو رسید کر دیا۔

وہ اس ناگہانی افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا' جیسے کوئی سانپ لہراتا' بل کھاتا ہوا اس کی جانب بڑھا چلا آیا ہے' جس کے جسم کو چھوتے ہی تیز آگ اس کے وجود میں بھرتی چلی گئی' اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ بلند ہوئی۔ اور پھر جسم پر پڑنے والے ہر کوڑے کے ساتھ اس کی چیخیں مزید بلند ہوتی گئیں۔ ہر بار کوڑا سانپ کی طرح لہراتا لہلہاتا اس کی جانب بڑھتا اور اس کی ہر ضرب اچھو کے بدن پر گہرے زخم کا نشان چھوڑ جاتی۔

برآمدے میں موجود تمام لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کسی کو بھی توقع نہ تھی' کہ رجب علی اس قسم کا اقدام کر گزرے گا۔ منشی فضل دین آنکھیں پھاڑے اسے اور اچھو پر مسلسل برسنے کوڑوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اچھو کے حلق سے نکلنے والی چیخیں اس کا کلیجہ چیر رہی تھیں۔ صورتِ حال اس کے لیے اتنی اچانک تھی کہ کتنی دیر تک وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ جب کچھ حواس بحال ہوئے تو دوڑ کر رجب علی کے قدموں میں گر گیا۔

''حضور! اسے معاف کر دیں' خدا کے واسطے بخش دیں اسے۔ آئندہ یہ ایسی گستاخی نہیں کرے گا۔'' وہ رجب علی کے پاؤں پر سر رکھ کے چلا رہا تھا۔ ''اس دفعہ معافی دے دیں سرکار' بوڑھے پر رحم کریں۔''

رجب علی نے ہاتھ روک دیا لیکن منشی اس کے قدموں پر سر ٹکائے ویسے ہی دہائی دے

رہا تھا۔ ''گھوڑا باہر کھڑا ہے سرکار ہم واپس کرنے ہی لائے تھے' ہمیں نہیں چاہیے' ہم کمی کمین کے پاس اس کا کیا کام۔ حضور اسے بخش دیں۔ یہ آئندہ آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔''

رجب علی نے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر سے منشی کو پرے کیا۔

''اپنے اس بیٹے کو لے کر دفع ہو جاؤ۔ ہمیں اس طرح کے سو گھوڑوں کی بھی پروا نہیں ہے لیکن حکم عدولی ہم کسی بھی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔''

اچھو زخمی حالت میں زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے لیکن جسم سے زیادہ اس کی روح پر تازیانے لگے تھے۔ آج تک گاؤں کا کوئی پہلوان اس کی پشت زمین سے نہیں لگا سکا تھا۔ وہ ہمیشہ سر اٹھا کر اور سینہ تان کر چلا کرتا تھا۔ جن لوگوں کو دو ہاتھ لگا کر وہ زمین چاٹنے پر مجبور کرتا تھا' آج انہی لوگوں کے سامنے بری طرح سے پٹ کر لاچاری اور بے بسی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

اسے نہ اپنے جسم سے مسلسل رستے ہوئے خون کی پروا تھی اور نہ ہی ان سے اٹھتی ہوئی درد کی لہروں کی' گھاؤ تو درحقیقت اس کی روح کو لگے تھے۔ جسمانی زخم تو بھر سکتے تھے' لیکن رجب علی نے اس کی روح پر جو تازیانے لگائے تھے' وہ کسی صورت بھر نہیں سکتے تھے۔ وہ بے بس تھا' لاچار تھا' غریب تھا۔ اس لیے اپنے زخموں کو دل میں دبائے ماتم کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے جسم پر پڑنے والے زخموں کا نہیں۔ بلکہ اپنی بے بسی' لاچاری اور غربت کا ماتم۔

اس کے دل میں رجب علی شاہ کے لیے نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر رجب علی کی ہڈیاں سرمہ کر دے' اس کے جسم کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالے۔ اس کی صورت مسخ کر دے' سب کو یہ باور کرا دے کہ پانسہ پلٹنے والا رجب علی کا زورِ بازو نہیں بلکہ اس کا کوڑا تھا۔ اگر رجب علی اپنے بازوؤں کی طاقت کے بل پر اس کے مقابل آیا ہوتا تو وہ کبھی بھی اس کی پشت زمین پر نہیں لگا سکتا تھا۔

لیکن اس کی روح اتنی گھائل ہو چکی تھی کہ اس کے اندر کے لاوے کو باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ مل سکا۔ اپنے اوپر اس کا مان ختم ہو چکا تھا۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اب چاہے وہ رجب علی کی ہڈیوں کا سرمہ بنا ڈالتا' اس کی بوٹیاں نوچ لیتا یا اس کا سر کسی بھاری پتھر سے کچل دیتا۔ اپنی بے عزتی کے لمحات کو اپنی کتابِ زندگی سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ ان لمحوں کو اس کے ساتھ رہنا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے دل و دماغ کے لیے ناسور بن کر۔ اس نے سر جھکا کر آنکھیں موند لیں' دو آنسو لڑھک کر اس کے گالوں پر آ گئے۔

''رجب علی شاہ یاد رکھنا' تُو نے میری روح کو گھائل کیا ہے۔ میں بھی تیری روح کو ہی گھاؤ لگاؤں گا۔ ایسا گھاؤ جو تیرے لیے ناسور بن جائے گا۔ تُو ہر کروٹ پر تڑپے گا' لیکن تجھے چین نہیں ملے گا۔ تُو نے مجھے میرے مان سے محروم کیا ہے خدا تعالیٰ تجھے تیرے مان سے محروم کر دے۔

ان شاء اللہ۔'' اچھو کے دل کی ہر ایک دھڑکن سے رجب علی شاہ کے لیے بددعا نکلی تھی۔

''حضور! آئندہ کبھی حکم عدولی نہیں ہوگی' یہ نادان ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ سکھی ر آپ نے اسے معاف کر دیا۔'' منشی' رجب علی کے پاؤں سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے ا مسلسل دعائیں دے رہا تھا۔

پھر وہ تیزی سے اچھو کی طرف بڑھا اور اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اس کے کرتی ج اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ برآمدے میں ملازمین کی کافی بڑی تعداد موجود تھی لیکن ان میں کسی نے بھی منشی کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اچھو نے سر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا' جس کی موٹی سی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر اور جو اپنے ناتواں ہاتھوں سے اسے سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ یہ عمر تو اولاد باپ کا سہارا بنتی ہے' یہاں باپ اپنے بیٹے کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ خود ہی آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ منشی نے سہارا دینے کی غرض سے اس کی کمر میں ڈال دیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ دونوں باہر کی جانب بڑھ گئے۔

بڑے پھاٹک سے نکلنے سے پہلے اچھو نے مڑ کر دیکھا۔ برآمدے میں ڈھیر سارے ملازمین کے درمیان رجب علی اور حیدر علی کھڑے تھے۔ رجب علی کی اس کی جانب پشت جبکہ حیدر علی اسی کی سمت دیکھ رہا تھا۔

''رجب علی میں خود سے کیے ہوئے وعدے کو نبھانے کے لیے زندہ رہوں گا۔'' اس عزم کے ساتھ سوچا۔

☆======☆======☆

اماں نے خالہ کبریٰ کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا' اور ملاقات کی جو رہی سہی امید تھی بھی دم توڑ گئی تھی۔ زرینہ بہت افسردہ تھی۔ رضیہ نے اسے یوں چپ چاپ تخت پر بیٹھے د تو لیے سے منہ ہاتھ پونچھتی اس کے پاس چلی آئی۔

''خیر تو ہے منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟''

رضیہ کی ہمدردی پا کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر آپ پر قابو پانے کی کوشش کی اور وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ رضیہ بھی اس پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔

''اب کیا ہوا؟ کچھ تو کہو؟''

''جانتی تو ہو تم...... میں کیا بتاؤں۔'' اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر رضیہ کی جانب دیکھا

''ہوں۔'' رضیہ نے گہرا سانس لیا۔

''میں مرجاؤں گی ان کے بغیر اتنے دن تک میں نے کل کا انتظار کیا تھا' لیکن کل

گزر گیا' میری جھولی میں یہ چھوٹی سی خوشی ڈالے بغیر۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے نکلنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔

''خدا کے لیے زرینہ رو ؤمت۔'' رضیہ نے اس کے پاس بیٹھ کر دوپٹے کے پلو سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔ ''اس طرح رونے سے کبھی مسئلے حل نہیں ہوتے۔ مجھے سوچنے دو کہ اب کیا کیا جائے۔''

''مجھے پتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا' میری تو قسمت ہی خراب ہے۔''

''کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔ مجھ جیسی جاہل لڑکی یہ بات کرے تو کوئی حرج نہیں' لیکن کسی پڑھی لکھی لڑکی کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔'' وہ بولی۔

''ایسا کرو رضیہ تم وہاں چلی جاؤ اور شاہ جی ملیں تو انہیں میرا پیغام دے دینا۔'' زرینہ کو اچانک خیال آیا۔

''اماں نے تمہیں وہاں جانے سے منع کیا ہے تو کیا مجھے جانے دیں گی؟ نہیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔''

''مجھے نہیں پتا۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اگر مجھے شاہ جی نہ ملے تو میں اپنی جان دے دوں گی۔'' وہ رو پڑی۔

''میں نے کہا ہے ناں کہ میں کچھ سوچتی ہوں۔'' رضیہ گھبرا گئی۔ زرینہ جیسی جذباتی لڑکی سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ یہ حماقت کر بھی گزرتی۔

کچھ دیر تک وہ اس مسئلے کا حل سوچتی رہی لیکن زرینہ کی سسکیاں بار بار اسے پریشان کر رہی تھیں۔

''اُف خدایا' تم خاموش ہوگی تو میں کچھ سوچ سکوں گی ناں۔'' وہ جھنجھلا گئی۔

زرینہ نے شاکی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''دیکھو تم یونہی روتی رہیں تو میں کچھ نہیں سوچ سکوں گی۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

زرینہ بستر سے اٹھ کر کمرے کے دوسرے کونے میں زمین پر جا بیٹھی اور چہرہ گھٹنوں پر رکھ دیا۔ اس کی اس حرکت نے رضیہ کو مزید جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس نے اس کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ فائدہ بھی کیا تھا اس بات کا زرینہ نے مزید دھواں دھار رونا شروع کر دینا تھا۔

وہ اپنا ذہن اس طرف سے ہٹا کر یہ سوچنے لگی' کہ زرینہ کی چھوٹے شاہ صاحب سے ملاقات کی کیا صورت ہو سکتی ہے' کافی دیر تک سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا۔

''زرینہ!'' اس نے آواز دی۔

زرینہ نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

"ایک ترکیب ذہن میں آئی تو ہے لیکن پھر ہمیں اس راز میں کسی اور کو بھی شریک کرنا ہو گا۔"

"ترکیب کیا ہے؟" وہ جلدی سے رضیہ کے قریب آ بیٹھی۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ کہیں اس سے کوئی نقصان نہ ہو۔" وہ متذبذب تھی۔

"تم بتاؤ تو۔" زرینہ کے لہجے میں بے تابی تھی۔ "کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"نقصان ہو سکتا ہے۔" رضیہ نے زور دے کر کہا۔

"رضیہ میں ہر نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بس مجھے شاہ جی مل جائیں۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس کی آنکھوں میں پھر ڈھیر سارے آنسو اتر آئے۔

رضیہ کچھ دیر خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی' پھر اس نے اٹھ کر دروازے کے باہر کا جائزہ لیا۔ ابا جی مسجد ہی میں تھے اور اماں اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ واپس پلٹ آئی۔

"کہو ناں' کیا ترکیب ہے؟" زرینہ نے اضطراب سے انگلیاں چٹخائیں۔

"حمیدہ کے متعلق کیا خیال ہے؟" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"حمیدہ؟ وہ کیا مدد کر سکتی ہے؟"

"کر تو سکتی ہے۔" رضیہ بولی۔ "اگر تم اسے اس راز میں شامل کر لو تو۔"

زرینہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اس سے تمہاری خاصی دوستی ہے۔" رضیہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور اس میں راز رکھنے کی صلاحیت بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے' اسے راز میں شامل کر لیا ہے پھر؟"

"پھر یہ کہ اسے مناسب ترامیم کے ساتھ ساری بات بتا دو اور اپنا موجودہ مسئلہ بھی۔ اس سے کہو کہ وہ شاہ جی سے کہے کہ اب دیر مت کریں اور جلد از جلد رشتے کی بات کریں۔" رضیہ بولی۔ "آخر روز ہی تو حمیدہ حویلی جاتی ہے اور پردہ بھی نہیں کرتی' دن میں سو موقعے جاتے ہیں ایسے کام کے لیے بس گھر کا بھیدی ہونا چاہیے۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔" زرینہ سوچتے ہوئے بولی۔ "میں حمیدہ کو کہہ دوں کہ وہ کسی کو نہ بتائے تو وہ مرتے دم تک کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دے گی لیکن رضیہ' شاہ جی کو میری کی خبر ہو بھی گئی تو کیا ہوا؟ ابھی رشتہ بھیجنا کسی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں اس رشتے کے لیے انہیں کتنا لڑنا پڑے سب سے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ہم دونوں کہیں مل سکیں' میری آنکھیں ترس گئی ہیں ان کی صورت دیکھنے کے لیے۔"

"چاہے سب سے انہیں لڑنا پڑے یا جھگڑنا لیکن وہ تم سے شادی کا وعدہ کر چکے ہیں۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ انہوں نے یہ وعدہ نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے کبھی اس بات سے انکار کیا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ فوری طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں اور میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ اتنے عرصے تک ان سے نہ ملوں۔"

"تم ایسا کرو کہ....." رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔

"میری سمجھ میں آ گیا۔" زرینہ چہکی۔

"کیا؟"

"ایسا کرتی ہوں کہ میں حمیدہ کے ہاتھ شاہ جی کے نام خط بھجوا دیتی ہوں اور انہیں کہیں باہر ملنے کو کہتی ہوں۔"

"کہاں ملو گی؟"

"یہ سوچنا پڑے گا۔" پھر قدرے توقف سے بولی۔ "پرانا کنواں ٹھیک رہے گا۔"

"کیا؟ پرانا کنواں؟ اُف توہ وہ آسیب زدہ ہے اور پھر اس کے قریب کے کھیتوں میں تو دن بھر میلے کا سماں رہتا ہے۔"

"لیکن میں دن میں کب ملوں گی؟"

"تت.....تو کیا رات کو؟" رضیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

زرینہ نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو۔ جانتی نہیں ہو' وہ بھوت پریت کا مسکن ہے۔"

"پاگل تو تم ہو..... بھلا شاہ جی کی موجودگی میں کسی بھوت پریت کی کیا مجال ہے کہ وہ میرے قریب بھی آئے۔"

"زرینہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ رات کے وقت یوں گھر سے چوری چھپے نکلنا حماقت ہے۔" رضیہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم کس طرح اکیلی وہاں تک جاؤ گی اور یہ تو سوچو کہ کسی کو خبر ہو گئی تو کیا ہوگا؟ قیامت آ جائے گی۔"

"شاہ جی کی جدائی سے بڑھ کر کیا قیامت ہوگی۔ میں تو قیامت سے گزر رہی ہوں۔ اب تو اس قیامت کو عبور کرنا ہی ہوگا۔ میں ساری زندگی جدائی کی آگ میں نہیں جل سکتی۔ شاہ جی کی جدائی میں' میں اندر سے راکھ ہو جاتی ہوں۔ میرا اپنا آپ میرے اختیار میں نہیں ہے رضیہ۔"

"جانتی ہو کہ تمہاری ان حماقتوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔"

"جسے جلنے کا خوف ہو' وہ اس آگ میں کودتا ہی نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "تم بے کار میں مجھے سمجھا رہی ہو رضیہ۔ میرے اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ نہ دل' نہ دماغ' نہ اپنا آپ۔"

رضیہ مضطرب ہو گئی۔ "جانتی ہو پورے گھر کی عزت خاک میں مل سکتی ہے۔"

"میں شاہ جی کی محبت ہوں اور محبت کی بنیاد عزت ہوتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ شاہ جی

میری عزت خاک میں مل جانے دیں گے؟''

''افوہ......'' رضیہ کی عقل میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ کون سی دلیل اسے قائل کر سکتی ہے۔

''ہوسکتا ہے تمہارے بلانے کے باوجود شاہ صاحب نہ آئیں۔''

''میں یہ تو مان سکتی ہوں کہ آج سورج مشرق سے نہیں نکلا' لیکن یہ نہیں مان سکتی کہ پیغام ملنے کے باوجود شاہ جی نہ آئیں۔''

''تم جاؤ گی کیسے؟''

''اس کھڑکی کے راستے۔'' اس نے کمرے کی واحد کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس پر بوسیدہ سے کپڑے کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ اس کھڑکی میں سلاخیں بھی نہیں تھیں۔

''اماں ابا کو خبر ہوگئی تو؟ وہ تمہیں زندہ گاڑ دیں گے۔''

''پروانہیں۔ میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ میں مر جاؤں گی لیکن میرے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔ اُف تک نہیں۔''

''کہنا آسان ہوتا ہے کرنا بہت مشکل...... زبانی کلامی تو میں بھی بہت سے دعوے کر سکتی ہوں' لیکن مجھے معلوم ہے کہ حقیقتاً میں کچھ نہیں کر سکتی۔''

''تب ہی تو میں آگ کے دریا میں کود گئی ہوں' لیکن تم کنارے پر ہونے کے باوجود اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔ مجھے صرف ایک ڈر رہتا ہے اب۔ وہ ہے جدائی کا ڈر۔ اس کے علاوہ کوئی خوف نہیں میرے دل میں۔''

وہ طاقچے میں رکھی گلابی کاغذوں والی رف کاپی اور پنسل اٹھا لائی۔

''دیکھو زرینہ یہ خط کسی اور کے ہاتھ بھی لگ سکتا ہے۔'' رضیہ خوف زدہ تھی۔

''لگ بھی گیا تو کوئی حرج نہیں۔ میں اس طرح لکھوں گی کہ کسی کو اصل بات کا پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''دیکھو زرینہ! دھیان سے۔'' وہ بولی۔ ''بلکہ میرا مشورہ مانو تو اپنی اس اضافی ترکیب پر نظرِ ثانی کر لو۔ اپنی محبت کو درمیان سے ہٹا کر۔''

وہ ہولے سے ہنس پڑی۔ ''یہ محبت تو مرنے پر ہی درمیان سے ہٹے گی۔''

رضیہ اسے دیکھتی رہی۔ اس نے کاپی کا درمیانی صفحہ کھول کر لکھنا شروع کیا۔

''پرانے کنویں کے پاس۔ جب سب سو جائیں۔''

اور صفحہ پھاڑ کر اسے تہہ کر دیا۔

''بس اتنا سا؟''

''ہاں وہ سمجھ جائیں گے۔''

''لکھا کیا ہے؟'' رضیہ آگے ہو کر بیٹھ گئی۔

''رضیہ......'' زرینہ کے کچھ بتانے سے قبل ہی باہر سے اماں کی آواز آئی۔

زرینہ نے ایک لمحے کے اندر ہی تہہ شدہ کاغذ تکیہ کے غلاف کے اندر ڈال دیا۔

''جی اماں۔'' رضیہ جلدی سے بولی۔

''نماز پڑھ لی ہے تو ناشتہ تیار کر دو۔ تمہارے ابا آتے ہی ہوں گے۔''

''جی اماں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ اور جاء نماز اٹھا کر باہر نکلی۔ ''بس اماں...... ابھی نماز پڑھ لوں تو بناتی ہوں۔''

''اس وقت سے نماز بھی نہیں پڑھی تم نے۔'' انہوں نے اسے گھورا۔

''بس اماں! فجر کی نماز چھوٹی سی تو ہوتی ہے۔ ابھی پڑھ کر فارغ ہو جاؤں گی۔'' اس نے جاء نماز بچھا کر جلدی سے نیت باندھ لی۔

اماں تسبیح لے کر تخت پر بیٹھ گئیں۔

زرینہ اپنے کمرے میں بے کل بیٹھی تھی۔ جب رضیہ ناشتہ لیے کمرے میں آئی تو اس کی بے چینی فوراً محسوس کر لی۔

''خیریت ہے ناں؟''

''ہاں...... بالکل خیریت ہے۔'' زرینہ نے کہا۔ ''میں سوچ رہی ہوں کہ حمیدہ کو حویلی جانے سے پہلے یہ خط کیسے پہنچایا جائے۔''

''آج شام کو اسے دے دینا۔ کل صبح حویلی جاتے ہوئے وہ لے جائے گی۔''

''نہیں۔ میں اور انتظار نہیں کر سکوں گی۔'' پھر اس کے ذہن میں خیال آیا۔ ''مسجد میں اس کا چھوٹا بھائی سپارہ پڑھنے آتا ہے۔ کیوں نہ اسے کہہ دوں کہ حمیدہ حویلی جانے سے پہلے یہاں سے ہو جائے۔''

''زرینہ خدا کے لیے اب بھی پلٹ آؤ۔''

''تم ایسی بات کرتی ہو تو میرا دل بہت دُکھتا ہے لیکن میں کیا کروں۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں مان سکتی۔'' پھر قدرے توقف سے وہ بولی۔ ''اس کا بھائی ابھی یہیں ہو گا ناں؟''

''ہاں......'' رضیہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

زرینہ نے چارپائی سے اتر کر چپل میں پاؤں ڈالے اور باہر کی طرف لپکی۔

''ابا جی!'' وہ ان کے پاس آ گئی۔

''ہوں۔'' انہوں نے ناشتہ کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

''ابا جی! حمیدہ کا بھائی پڑھنے آیا ہے؟''

''ہاں آیا ہوا ہے لیکن بہت نکما ہے وہ لڑکا۔ اب تک قاعدے پر ہی اٹکا ہوا ہے۔''

''اس سے کام تھا۔''

"کچھ منگوانا ہے بازار سے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "حمیدہ کو پیغام بھجوانا تھا کہ حویلی جانے سے تھوڑی دیر کے لیے یہاں آجائے۔" ایسا اکثر ہوجاتا تھا کہ وہ اپنی سہیلیوں کو یوں پیغام دے کر بلا لیتی تھی اس لیے مولوی صاحب کو اس پیغام پر حیرت نہ ہوئی۔

"اچھا کہہ دوں گا۔"

"ابا جی! یاد سے۔"

"کہہ دوں گا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"شکریہ!" وہ کھل اٹھی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد حمیدہ اس کے سامنے تھی۔

"ہمیشہ مجھے بلواتی ہو کبھی خود بھی ہمارے گھر آجایا کرو۔" اس نے آتے ہی شکوہ کیا۔

"ہاں آؤں گی، ابھی تو تمہیں کام سے بلوایا ہے۔"

"ہاں ہاں کہو کوئی کام تھا تو چھوٹے سے کہہ دیا ہوتا۔"

"نہیں، یہ کام تو تمہیں ہی کرنا ہے۔" وہ مدھم آواز میں بولی۔

"خیر تو ہے ناں؟"

"ہاں بالکل خیر ہے۔" زرینہ چپ ہوگئی۔

"کیا بات ہے؟" وہ رضیہ کی جانب مڑی۔ "تم لوگوں نے تو تجسس میں مبتلا کردیا ہے۔"

"بتاتی ہوں۔" زرینہ نے رضیہ کی جانب دیکھا جس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"چھوٹے شاہ صاحب کو جانتی ہوناں۔"

"انہیں کون نہیں جانتا۔ بہت اچھے ہیں وہ جبکہ بڑے شاہ صاحب۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "توبہ توبہ...... انہیں دیکھ کر ہی سب کی جان نکل جاتی ہے۔" پھر اسے اچانک خیال آیا۔ "لیکن تم اتنے پُراسرار انداز میں ان کے متعلق کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"وہ۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ "تم وعدہ کرو میری بات کو راز ہی رکھو گی۔"

"وعدہ۔" اس نے بلا تامل ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "کتنے ہی لوگوں کے کتنے راز ہیں میرے پاس لیکن میں نے آج تک کسی کو ان میں شریک نہیں کیا میں ہر ایک کے راز کو اس کی امانت ہوں جس میں خیانت کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔" وہ ہنسی۔ "کہتے ہیں کہ عورت میں بات چھپانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ ابھی تک مجھ سے نہیں ملے ورنہ یہ کبھی نہ کہتے۔"

"مجھے تم پر اعتماد ہے...... حمیدہ اسی لیے تو اس وقت تم سے مدد طلب کر رہی ہوں۔"

"تم بلا جھجک مجھ سے سب کچھ کہہ دو۔"

"اب میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گی وہ خاموشی سے سننا حیران ہوکر چیخ مت مارنا۔"

"تم کہنا تو شروع کرو۔"

"میں اور چھوٹے شاہ جی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

"کیا؟" وہ زور سے چلا پڑتی اگر رضیہ نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیا ہوتا۔

"میں نے کہا تھا ناکہ چلانا مت۔"

"تم نے بات ہی ایسی کی تھی کہ میں حیران رہ گئی۔" حمیدہ کے انداز میں اب بھی حیرت تھی۔ "لیکن یہ سب ہوا کب؟ گاؤں میں تو ہر بات اتنی تیزی سے پھیلتی ہے پھر اتنی بڑی بات ہو گئی اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوئی۔"

"خیر اس لیے نہیں ہوئی کہ یہ راز اب تک کسی غیر ذمہ دار شخص کو نہیں معلوم۔"

پھر زرینہ نے مناسب ترامیم کے ساتھ ساری بات اسے بتا دی۔

"ہوں۔" وہ بولی۔ "رقعہ تو میں انہیں دے سکتی ہوں۔ دن میں دو تین مرتبہ وہ بہنوں یا بڑی بیگم سے ملنے وہاں ضرور آتے ہیں۔ نہ آئیں تب بھی رقعہ تو میں دے ہی دوں گی لیکن اگر وہ کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تو؟"

"تم احتیاط رکھنا اور ان کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں نہ دینا۔ یوں بھی میں نے ایک سطر لکھی ہے کسی نے پڑھ لی تب بھی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

"مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے لیکن میں تمہارا یہ کام ضرور کروں گی۔"

"بہت شکریہ حمیدہ۔" وہ واقعی ممنون تھی۔ "بس تم ایک مرتبہ رابطہ بحال کردو پھر میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گی۔"

"دوستی میں تکلیف کیسی۔ میں تو صرف اس لیے ڈر رہی ہوں کہ یہ کھیل خاصا خوفناک ہے۔ کسی کو خبر ہوگئی تو تمہاری خیر نہیں۔"

"میری فکر چھوڑو، صرف یہ کام کردو میرا میں ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی۔" اس نے رقعہ حمیدہ کو تھما دیا۔

"ایسی بات مت کرو، میری دوستی تمہارے کسی کام آگئی تو اس میں احسان کیسا۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"حویلی سے واپس آنے کے بعد مجھے اطلاع کردینا۔"

"اچھا؟"

وہ چلی گئی۔

☆=====☆=====☆

حیدرعلی شاہ پیرصاحب اور ماں جی کے پاس بیٹھا رجب علی کی شادی کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔

''کچھ زیورات ابھی ہفتہ بھر میں جیولر خود ہی بھجوا دے گا۔'' اس نے انہیں بتایا۔

''چلو شکر ہے' یہ مرحلہ تو طے ہوا۔ اس کے بعد بری کا سامان مکمل ہو جائے گا۔'' ماں جی بولیں۔

''بچیوں کے جوڑے سل گئے؟'' بابا جان نے ماں جی سے پوچھا۔

''جی درزن کو بٹھا دیا ہے۔ میں تو کہتی رہی لیکن مہرو اور زیبی نے سستی دکھائی۔ اب بھی میں زبردستی نہ کرتی تو شادی کے دن تک ان کے جوڑے نہ سلتے۔''

''بچیاں ہیں ناں کبھی کبھار کوتاہی بھی کر سکتی ہیں لیکن ان سے سختی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تو باپ اور بھائیوں کے گھروں کے پھول ہوتی ہوں۔'' پیر صاحب کے لہجے میں شفقت ہی شفقت تھی۔

حیدرعلی شاہ انہیں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا کتنی متضاد شخصیت تھی ان کی۔ بیٹیوں کے لیے پیار اور محبت کا سمندر موجزن تھا ان کے اندر لیکن وہ ان کی نفسیات اور ضروریات سے بے خبر تھے۔ ان کی محبت کا طریقہ بالکل مختلف تھا۔ وہ دنیا کی ہر مادی آسائش ان کے سامنے ڈھیر کر دیتے تھے لیکن ان کی روحانی ضروریات کو تسلیم کرنے سے قاصر تھے۔

یہ کیسا عجیب امتزاج تھا ان کی شخصیت کا۔ انہوں نے بیٹوں کو اپنے کلف لگے اونچے شملے کی طرح رکھا ہوا تھا سب کی نظروں کے سامنے پوری شان کے ساتھ اور بیٹیوں کو دل کے بہت اندر سب سے چھپا کر۔

اس نے مزارعوں کے ساتھ ان کا سلوک دیکھا' جن کے ساتھ وہ ایک باپ کی طرح مہربانی سے پیش آتے تھے' ان کے مسئلے سنتے تھے اور جب تک انہیں حل نہیں کر لیتے تھے تب تک آرام سے نہیں بیٹھتے تھے۔ گاؤں بھر کے رشتے ان کی مرضی سے طے ہوتے تھے لیکن انہوں نے کبھی کوئی بے جوڑ شادی نہیں کروائی تھی۔ ماں باپ کے علاوہ اولاد کی رضا بھی حاصل کر کے رشتے طے کرتے تھے۔

لیکن اپنے گھر میں وہ ہر معاملے سے بے خبر تھے۔ یہاں انہوں نے اپنی اولاد سے یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ بذاتِ خود کیا چاہتے تھے۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ خیالات کی دنیا سے واپس حقیقت میں چلا آیا۔ ایک ملازمہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی وہ خاصی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''حضور مردان خانے میں بڑے شاہ صاحب غصے میں اچھو کوچوان کو کوڑے سے پیٹ رہے ہیں۔'' اس نے گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیا؟ رجب علی اچھو کو پیٹ رہا ہے؟'' پیر صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی سرکار' انہوں نے مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دی ہے۔ منشی دہائیاں دے رہا ہے لیکن بڑے شاہ صاحب بہت غصے میں ہیں۔''

''کیا کیا ہے اچھو نے؟'' پیر صاحب نے اپنے مخصوص دبدبے کے ساتھ پوچھا۔

''یہ تو سرکار مجھے نہیں معلوم۔'' وہ اپنی معلومات کی کمی پر قدرے نادم ہو گئی۔ ''میں گئی تو وہ اچھو پر کوڑے برسا رہے تھے۔ مجھے اتنا ڈر لگا کہ میں بھاگ آئی۔''

''حیدرعلی۔'' پیر صاحب اس کی جانب مڑے۔

''جی بابا جان۔''

''تم جا کر پتا کرو یہ کیا معاملہ ہے اور مجھے اطلاع کرو۔''

''جی بابا جان۔'' وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

مردان خانے کی طرف بڑھتے ہوئے جب وہ مہر النساء کے کمرے کے پاس سے گزرنے لگا تو دروازے سے باہر جھانکتی ہوئی حمیدہ اسے دیکھتے ہی کوریڈور میں نکل آئی۔

وہاں عورتوں کی آمد و رفت جاری تھی پہلے تو وہ جھجکی لیکن پھر ہمت کر کے پاس سے گزرتے حیدرعلی شاہ کو آہستہ سے آواز دی۔

''چھوٹے شاہ صاحب۔''

''ہوں۔'' وہ رک گیا۔

اس نے کن اکھیوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ عورتیں بظاہر اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ ان کے کان اور آنکھیں کتنی تیز ہیں۔

''کہو۔'' وہ اسے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر بولا۔ ''گھبراؤ نہیں جو کہنا ہے کہہ دو۔''

''جی وہ۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اوڑھنی کے پلو میں بندھا ہوا رقعہ نکالنے لگی۔

اسے ہر طرف سے عورتوں کی نگاہیں اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''یہ آپ کے لیے۔'' اس نے مدھم آواز میں کہہ کر رقعہ اس کی جانب بڑھایا۔ ''زرینہ نے دیا ہے۔''

''کیا؟'' اس نے کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اتنے لوگوں کی موجودگی محسوس کر کے خود پر قابو پا لیا۔

''اچھا!'' حیدرعلی نے رقعہ پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔

''بڑی بی بی کہہ رہی تھیں کہ ان رنگوں کے جوڑے ضرور منگوانے ہیں لاہور شہر سے۔'' اس نے اونچی آواز میں عورتوں کو سنانے کے لیے کہا۔

"ٹھیک ہے میں منگوادوں گا۔"

حیدرعلی نے بھی اس کا مقصد سمجھ کر اونچی ہی آواز میں جواب دیا اور آگے کی طرف چل دیا۔ حمیدہ کمرے میں مڑنے کے بجائے ان عورتوں کی طرف بڑھ گئی جو اس کے خیال میں کن سوئیاں لے رہی تھیں تاکہ انہیں تسلی دلا سکے کہ کاغذ کا جو ٹکڑا اس نے حیدرعلی کے حوالے کیا تھا اس پر لاہور سے منگوانے والے کپڑوں کے رنگوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔

حیدرعلی تیز تیز چلتا ہوا مردانے میں پہنچا۔ وہ چاہتا تھا کہ رجب علی اور اچھو کی خبر بابا جان کو دے دے۔ پھر اطمینان سے گوری کا رقعہ پڑھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر رقعہ کھول لے لیکن اچھو والا معاملہ بھی اہم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رجب علی معاف کرنے یا رعایت دینے کا قائل نہیں ہے چاہے بات کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو پھر پتا نہیں اچھو سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوا تھا جس کی پاداش میں وہ کوڑے سے پٹ رہا تھا۔

جس وقت وہ برآمدے میں پہنچا تب تک رجب علی کارروائی مکمل کر چکا تھا اور منشی اپنے بیٹے کو سہارا دیئے باہر لے جا رہا تھا۔

"آؤ آؤ علی کہاں سے آ رہے ہو؟" اسے دیکھ کر رجب علی کے چہرے پر خوشگواری پھیل گئی۔ حیدرعلی نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی نگاہیں اچھو پر ٹکی ہوئی تھیں جس کے سفید کپڑوں پر تازہ خون کے بے شمار چھینٹے تھے۔ وہ قد آور جاندار مرد تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کے سیاہ بال چمک رہے تھے۔

اس نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔ ان آنکھوں میں زہر تھا۔ پھر وہ پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

"کہاں گم ہو؟" رجب علی کی آواز اسے سوچ کے سمندر سے باہر نکال لائی۔

"کہیں نہیں۔" وہ بولا۔ "آپ سے ضروری بات کرنی تھی۔ اگر ممکن ہو تو اندر چلتے ہیں۔"

"اندر۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "یہیں بات کر لیتے ہیں کیا خیال ہے؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

رجب علی نے ملازمین کو ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "بیٹھو۔"

وہ دونوں آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"تمہاری ضروری بات یقیناً تمہاری گوری کے متعلق ہوگی۔" اس نے شگفتگی سے کہا۔

"مجھے بابا جان نے بھیجا ہے۔" وہ بولا۔ "کچھ دیر پہلے انہیں اطلاع ملی تھی کہ آپ منشی کے بیٹے کو بری طرح پیٹ رہے ہیں۔"

"انہیں کس نے بتایا؟"

واضح طور پر اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ کوئی پیر صاحب سے اس کی شکایت کرتا۔

"پتا نہیں۔" علی جان بوجھ کر اسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔ "مجھے انہوں نے خود حکم دیا ہے کہ میں جا کر اصل بات کا پتا کروں۔"

"میں خود انہیں بتادوں گا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"آل رائٹ۔"

"تم سناؤ تمہاری گوری کا کیا حال ہے؟"

"وہ بیمار تھی اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی۔ شاید اب ہو جائے۔"

"چلو اچھا ہوا' تمہیں ایسی لڑکی مل گئی جس نے منتر پڑھ کر تمہیں جکڑ لیا تمہارے پاؤں زمین سے باندھ دیئے۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں ایک دوسرے سے محبت ہوتی ہے۔"

"پتا نہیں میرے خیال میں تو وہ خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں محبت مل جاتی ہے۔"

"تم اتنے ناامید کیوں ہو؟"

"میں ناامید کبھی نہیں ہوتا۔ صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ کون سا طریقہ ہو سکتا ہے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"تم خواہ مخواہ فکرمند ہو۔ فوزیہ اگر تمہارے راستے کا پتھر ہی ہے تو اسے ٹھوکر مار کر اپنی گوری کی طرف بڑھ جاؤ۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ تم سے اس سلسلے میں سوال جواب کر سکے۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

وہ چند ثانیے رجب علی شاہ کی صورت دیکھتا رہا۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔" بالآخر اس نے کہا۔ "جن سے انسان محبت کرتا ہے انہیں سب کچھ دے دینا چاہتا ہے۔ میں ماں جی کی محبت میں بندھا ہوا ہوں۔ فوزیہ کو انکار کر کے انہیں دکھ نہیں دے سکتا۔ پھر گوری ہے جو میرے لیے سب کچھ ہے۔ اسے بٹی ہوئی تنہا زندگی دینا مجھے کسی صورت گوارا نہیں۔"

"تمہاری اپنی سوچ تمہارے لیے پریشانی پیدا کر رہی ہے ورنہ یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے حل نہ کیا جا سکے۔ مرد بنو مرد بن کر سوچو۔ تم سختی سے فیصلہ کرلو تب بھی کسی کو مجال نہیں ہونی چاہیے۔"

حیدرعلی ہنس پڑا۔ "میری مردانگی کا ہدف عورتیں نہیں ہوتیں کیونکہ میں مردوں کے ساتھ مقابلہ کرنا جانتا ہوں۔ عورتوں پر مردانگی ثابت کرنے کی کوشش صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو مردوں سے مقابلے میں صفر ہوتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ بابا جان سے ضرور مل لیں' مجھے کچھ ضروری کام ہے اس لیے باہر جا رہا ہوں۔"

گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ بہت خوش تھا۔ گوری کا خط اس کی جیب میں تھا۔

اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے خود گوری اس کے ساتھ ہے۔

چلتے چلتے وہ مولسری کے ورخت کے پاس رک گیا اور اس کے تنے سے ٹیک لگا کر زرینہ کا رقعہ نکال لیا۔

ہولے ہولے چلنے والی ہوا...... مولسری کے پھولوں کی خوشبو چار سُو پھیلا رہی تھی۔ حیدر علی نے گہرا سانس لے کر خوشبو کو اپنے اندر اتارا اور رقعہ کھول لیا اس پر صرف ایک سطر لکھی ہوئی تھی۔

''پرانے کنویں کے پاس جب سب سو جائیں۔''

وہ کھل اٹھا اور بے اختیار گوری کی تحریر کو چوم لیا۔ درخت کے اوپر ایک پپیہا بولا اور پھڑ پھڑاتا ہوا نیلے آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔

''مغموم پپیہا ہے کہ بھٹکا ہوا شاعر۔

جو پوچھتا پھرتا ہے کہاں ہے تُو؟ کہاں ہے؟'' حیدر علی آسمان کی وسعتوں میں پپیہے کو کھوجتا ہوا گنگنایا۔

گوری سے ملنے کے خیال نے ہی اس میں ایک نئی تازگی بھر دی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ملائم گلابی کاغذ پر لکھی وہ ایک سطر پڑھی' کاغذ کو اسی طرح تہہ کیا اور گنگناتا ہوا واپس چل دیا۔

کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی پگڈنڈیوں اور گاؤں کی تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے خوشدلی سے گنگنا رہا تھا۔ آج ساری دنیا اچھی لگ رہی تھی یہاں تک کہ سورج کی حدت بھی ناگوار محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پرانے کنویں کے قریب پہنچ کر وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور خوشدلی سے ہنس دیا۔

یہ کنواں کب کا متروک ہو چکا تھا۔ بہت بوڑھے سے برگد کی جٹاؤں نے کنویں پر سایہ پھیلایا ہوا تھا۔ کنویں کے اردگرد میلے کا سا سماں تھا۔ کھیتوں میں کام ہو رہا تھا۔ کچھ لڑکے بیکار...... اِدھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ بچے سائیکل کے پہیے میں لکڑی پھنسا کر اسے بھگا رہے تھے' کچھ بنٹے کھیلنے میں مصروف تھے اور کچھ یونہی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں سر کھجاتی' بڑی بڑی چادریں سنبھالتی گیٹیوں سے سٹاپو کھیلنے میں مگن تھیں۔

لیکن بوڑھے برگد کے نیچے کوئی نہیں تھا۔ اس کے گرد جتنی بھیڑ تھی' سائے تلے اتنی ہی تنہائی اور ویرانی۔

حیدر علی نے آگے بڑھ کر کنویں میں جھانکا لیکن اسے اندھیرے کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ برگد نے پہلے ہی اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ پتوں سے چھن کر آتی سورج کی روشنی کنویں کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی تھی۔

وہ پلٹ آیا۔

☆======☆======☆

وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ حیدر علی گوری سے ملنے کے لیے جتنا بے چین تھا گھڑی کی سوئیاں اسی قدر سُست رفتاری سے چل رہی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔''

اس کا ذاتی خدمت گزار اندر چلا آیا۔

''شاہ صاحب آپ کو اندر زنان خانے میں بلایا گیا ہے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بلاوا مہر النساء نے بھیجا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔ زیب النساء بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم زیبی اور ماں جی سے مل کر چلے جاتے ہو' میرے پاس نہیں آتے۔'' مہر النساء نے شکوہ کیا۔

''آپ مجھے بلا لیا کریں ناں جیسے آج بلایا ہے۔'' وہ خوش دلی سے ہنس پڑا۔

''یعنی میرے بلانے سے آؤ گے خود سے نہیں آؤ گے۔''

''آپا آپ سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ یاد ہے بچپن میں کیسے ڈانٹتی تھیں آپ اور ایک مرتبہ تو کان بھی کھینچا تھا دو دن تک دُکھتا رہا تھا۔'' وہ مسکرا کر بولا تو مہر النساء بھی ہنس پڑی۔

''اب نہیں ڈانٹوں گی تم یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔''

''پہلے پکا وعدہ کریں۔'' وہ دور کھڑے کھڑے بولا۔

''پکا وعدہ ہے اب آ بھی جاؤ۔''

وہ منقش صوفے پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''کہیں' آج آپ کو میرا خیال کیسے آ گیا؟''

''تمہارے کان کھینچنے کا ارادہ ہے۔''

''میرے کان؟ تب ہی اتنے پاس بٹھایا ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''لیکن یاد ہے ابھی آپ نے وعدہ کیا تھا۔''

''وہ وعدہ تھا' نہ ڈانٹنے کا' کان کھینچنے سے متعلق کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔''

''خطا جان سکتا ہوں اپی؟''

''یہ تم آج کل کن چکروں میں ہو؟''

''میں؟ کسی بھی چکر میں نہیں۔''

مہر النساء نے مسہری پر بیٹھی زیب النساء کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اوڑھنی کے پلو سے کھیل رہی تھی۔ مہر النساء کی نظروں کے تعاقب میں حیدر علی نے بھی اسی کی طرف دیکھا۔ ایک

لمحے سے بھی کم وقت میں وہ سمجھ چکا تھا کہ زیب النساء نے گوری کے متعلق سب کچھ مہرالنساء کو بتا دیا تھا۔اب اس سے کچھ چھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔

''کیا میری خطا اتنی ہی ناقابلِ معافی ہے؟'' اس نے بات کو مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کی۔''اتنی سی غلطی پر کان کھینچنا کچھ زیادہ بڑی سزا نہیں ہوگی؟''

''یہ اتنی سی غلطی ہے؟''

''اتنی سی ہی ہے ناں۔ میرا اور گوری کا اچانک آمنا سامنا ہوا' یقین کریں اس طرح آمنے سامنے آنے میں ہماری کسی کوشش کو کوئی دخل نہیں تھا اور یہ ٹکراؤ واقعی اچانک تھا۔ غلطی یہ ہوئی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ بیٹھے...... اب اتنی چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا دینا بہت ظلم کی بات ہے۔''

''واقعی یہ تو بہت ننھی منی اور معصوم سی غلطی ہے لیکن وہ جو ملاقاتیں ہوئیں ان کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا پسند کرو گے؟''

''وہ۔'' اس نے سر کھجایا۔''ہاں وہ ایسا ہے کہ ہم نے باہمی تعاون کو فروغ دینا چاہا تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کام ایک دوسرے سے بالمشافہ ملاقات کیے بغیر سرانجام دینا ممکن نہیں۔''

''تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے علی! جانتے ہو تم کتنی مشکل میں پڑ سکتے ہو۔''

''پڑ سکتا نہیں پڑ چکا ہوں لیکن مشکلوں کو عبور کرنا ہی تو زندگی ہے۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

''تم کرنا کیا چاہتے ہو اب؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ میں بھی حل ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔''

''تم فضول کے مشغلوں میں پڑ گئے ہو علی' محبت وغیرہ سب فارغ وقت کے بے کار مشاغل ہیں۔کوئی کام کرو گے تو خود بخود ہی تمہارے ذہن سے یہ خیال نکل جائیں گے۔''

''بڑی آپا۔'' حیدر علی نے اس کی طرف دیکھا۔''محبت فضول چیز نہیں ہوتی لیکن آپ نہیں سمجھیں گی۔ کہتے ہیں دل کی اپنی منطق ہوتی ہے جسے عقل کی منطق کبھی نہیں سمجھا سکتی۔ یہ سب صرف محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ محبت کیا ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔''مجھے کچھ کام ہے میں چلتا ہوں۔''

وہ دونوں چپ چاپ اسے باہر جاتا دیکھتی رہیں۔اس کا کہا ہوا فقرہ کسی ہتھوڑے کی طرح ان کے دل و دماغ پر برسا تھا۔

''آپ نہیں سمجھیں گی' یہ صرف محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ محبت کیا ہے۔''

''آپ نہیں سمجھیں گی۔''

کہنے کو تو یہ محض چار لفظ تھے لیکن ان الفاظ میں درحقیقت پشتوں سے آباد اس حویلی کی بیٹیوں کی آہوں کی ایک طویل داستان چھپی ہوئی تھی۔ یہ الفاظ ان کے لیے اعتراف بھی تھے طعنہ بھی اور احساسِ محرومی بھی۔

وہ یہ بات سمجھ بھی کیسے سکتی تھیں۔ محبت کہانی کی صورت میں سامنے آئے تو سننے دیکھنے والا محض تماشائی ہوتا ہے' واقعہ بن کر بیتنے لگے تو اس سمندر میں آنے والے کا بال بال بھیگ جاتا ہے۔

وہ محض تماشائی تھیں پھر کیسے جان سکتی تھیں کہ محبت کے سمندر کے اندر اترنے والے کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔

دیر تک وہ دونوں گم صم بیٹھی سوچتی رہیں۔ پھر مہرالنساء نے سر اٹھا کر زیب النساء کی جانب دیکھا۔

''مجھے مردوں سے نفرت ہے شدید ترین۔''

زیب النساء نے چونک کر اسے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

''انہوں نے کائنات پر قبضہ کر رکھا ہے۔'' مہرالنساء نے ہولے سے کہا۔''غاصبانہ قبضہ۔ پتا نہیں ہمارے پھیپھڑوں میں اترنے والی ہوا ان کے تابع کیوں نہیں ہے۔اگر یہ ان کے قبضے میں ہوتی تو ہم اسے بھی حاصل نہ کر سکتے۔''

''پتا نہیں مرد کیسے ہوتے ہیں۔'' زیب النساء نے بھی مدھم آواز میں کہا۔''شاید سب بھائیوں اور بابا جان جیسے ہوتے ہیں۔''

''اور کیسے ہوں گے ان جیسے ہی ہوں گے۔''

''میں سوچتی ہوں کہ ہم کیوں پیدا ہوئے؟ نہ ہوتے تب بھی کوئی فرق تو نہ پڑتا۔'' وہ دونوں پھر خاموش ہو گئیں۔

''آپا اگر مرد علی جیسے ہوتے ہوں تو بہت اچھے ہوں گے لیکن اگر بھائی جان جیسے ہوتے ہوں تو پھر یقیناً......'' زیب النساء چپ ہو گئی۔''کتنا اچھا ہو اگر سب علی جیسے ہوتے ہوں۔''

''کیا علی' کیا بڑے بھائی جان یا بابا جان تھوڑے سے فرق سے سب ایک جیسے ہیں۔ جیسے علی زرینہ سے ملاقاتیں کر رہا ہے اور تمہیں سب قصے بھی سنا دیتا ہے اگر ویسے ہی ہم کریں۔ تو اس کی غیرت جاگ جائے گی شرم سے اس کا سر جھک جائے گا۔اس سے محبت کرنے والی زرینہ چھپ چھپ کر اس سے ملنے کے باوجود بھی شرافت کا مجسمہ ہے لیکن کیا ہم صرف رنگ ہوا اور روشنی کی خاطر بھی قدم حویلی سے باہر نکال سکتے ہیں؟'' مہرالنساء نے کہا۔''سب ایک سے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''ایسا ہی ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔''پہلے میں بھی تمہاری طرح سوچتی تھی لیکن اب

نہیں۔ مجھے شدید نفرت محسوس ہوتی ہے سب مردوں سے۔''

زیب النساء نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں کسی خاص شخص کی شبیہہ نہیں تھی لیکن مردوں کے لیے نفرت بھی نہیں تھی بھائیوں اور بابا جان کے متعلق سوچتے ہوئے نفرت جیسے لفظ کو خیالوں میں لانے کی بھی اس میں ہمت نہیں تھی۔

''مرد'' لفظ میں اسے ہمیشہ ایک انوکھا اسرار محسوس ہوا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں پہلے تو دونوں بھائی مسلسل ولایت ہی میں رہے۔ بابا جان سال میں ایک مرتبہ ان سے مل آتے تھے۔ اب جب وہ واپس آئے تھے تب بھی ان کی اپنی الگ دنیا تھی۔ بابا اور بھائیوں سے بعض اوقات دن میں صرف ایک مرتبہ اور کبھی کبھار دن بھر ایک بھی ملاقات نہ ہوتی تھی۔ ایسے میں وہ کیا جان سکتی تھی کہ مرد کیسے ہوتے ہیں؟

کبھی تو یوں بھی ہوتا تھا کہ وہ اس موضوع پر سوچنے لگتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سوچ اس کی نظروں کے سامنے کوئی شبیہہ ڈھال دیتی تھی۔ اس شبیہہ کا کوئی نام نہیں ہوتا تھا' بس وہ مرد تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے وہ خود بخود نمودار ہوتی تھی اور بے اختیار اس شبیہہ کی جانب بڑھنے لگتی تھی۔

اور ابھی اس سمت میں وہ چند ہی قدم بڑھ پاتی تھی کہ احساسِ گناہ جاگ جاتا تھا۔ خوابوں اور خیالوں کی دھند چھٹ جاتی تھی اور اس کے سامنے اس کا اداس ویران کمرا آ کھڑا ہوتا تھا ایک طرف کمرے کی تنہائی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی اور دوسری جانب خوابوں کا احساسِ گناہ کچوکے لگانے لگتا تھا۔ کمرے کی تنہائی اسے خواب بُننے پر مجبور کرتی تھی اور احساسِ گناہ خوابوں میں بھی چین نہیں لینے دیتا تھا۔ تب وہ جلدی سے مصلیٰ بچھا کر نوافل پڑھنے لگتی تھی یا کلام پاک اٹھا کر تلاوت شروع کر دیتی تھی۔ شروع میں تو کچھ دیر اسے سکون ملتا تھا لیکن پھر غائب دماغی اس پر مسلط ہونے لگتی تھی۔ اس کی نظریں کلامِ پاک پر ہوتی تھیں ہونٹ ہل رہے ہوتے تھے مگر دماغ کہیں اور گم ہوتا تھا۔

بابا جان اس کی عبادت گزاری سے بہت خوش تھے اور اکثر کہا کرتے تھے۔

''زیب النساء ہماری قابلِ فخر بیٹی ہے۔ اپنے پانچوں بچوں میں سے یہ مجھے سب سے پیاری ہے۔''

وہ انہیں کیا بتاتی کہ اس کی عبادت اطاعت کے لیے کم' فرار کے لیے زیادہ ہے۔ بس سر جھکائے تعریف سنتی رہتی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' مہر النساء اسے خیالات کی دنیا سے باہر نکال لائی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ چور سی بن گئی۔ کبھی کبھار تو اسے یوں لگتا تھا جیسے سب اس کی سوچ پڑھ سکتے ہیں اور اگر وہ نہیں پڑھ سکتے تو بھی اس کی سوچ کے تمام رنگ اس کے چہرے پر ضرور آ

ہیں۔

''مجھے نماز پڑھنی ہے۔'' وہ جلدی سے اٹھ گئی۔

اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد حمیدہ کمرے میں آ گئی۔ مہر النساء کو گم صم بیٹھے دیکھا تو اس کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہیں بڑی بی بی؟''

''حمیدہ!'' وہ بولی۔ ''مرد بہت برے ہوتے ہیں ناں؟''

سوال کا انداز بتا رہا تھا کہ مہر النساء اس سے اثبات میں جواب چاہتی ہے۔ اس لیے اس نے زور و شور سے گردن ہاں میں ہلا دی۔

''کوئی ایسے ویسے بالکل فٹے منہ ہوتے ہیں۔''

''تم تو ملتی ہو گی ان سے۔''

''ہاں جی کیوں نہیں۔ ہمیں تو صبح سے شام تک کام ہی ایسے ہوتے ہیں کہ سارا وقت کوئی نہ کوئی سر پر سوار رہتا ہے۔''

''اچھے نہیں ہوتے ناں؟ بس ساری چیزوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے زیادہ عورتوں پر۔ دنیا کی ہر چیز کو غلام بنا لینا چاہتے ہیں۔''

''سولہ آنے ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ میرا ابا ہے اسے ہر وقت یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ کہیں میں کھڑکی میں تو نہیں کھڑی' راستے میں چلتے ہنس تو نہیں پڑی' آج روٹی چھوٹی کیوں پکی ہے کہیں پکاتے ہوئے میرا دماغ کسی اور طرف تو نہیں تھا۔

چھوٹی سی بات ہو جائے تو اماں کو دُھن کر رکھ دیتا ہے۔ بس سارا دن یہی تماشہ چلتا رہتا ہے۔ میں تو یہاں آ جاتی ہوں اس لیے میری بچت ہو جاتی ہے ورنہ ابا بہت سخت ہے۔''

''ہوں وہ تمہاری اماں کو کیوں مارتا ہے؟''

''کہتا ہے بیوی کو مارنا شوہر کا حق ہے۔ اس سے بیوی تیر کی طرح سیدھی رہتی ہے۔'' وہ خود ہی ہنس پڑی۔ ''پر اماں نے کیا سیدھا ہونا ہوا۔ ابا گھر سے نکلتا ہے تو یہ موٹی موٹی گالیاں پڑتی ہیں اسے اماں سے۔ سامنے کم بولتی ہے اور بولے تو مار کھاتی ہے لیکن پیچھے خوب صلواتیں سناتی ہے۔''

''پتا نہیں سب عورت کو ہی کیوں تیر کی طرح سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔'' مہر النساء بولی۔ ''میرے خیال میں سیدھا ہونے کی مردوں کو زیادہ ضرورت ہے۔''

''بس جی' سب ایسے ہی چلتا ہے۔''

''پتا نہیں یہ دنیا کب ان کے قبضے سے بچ کر نکلے گی۔ کون اسے مردوں کے چنگل سے آزاد کرائے گا۔''

''ایسا کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ مخلوق تو کیڑے مکوڑوں کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی ہے
دھاڑتی شیر کی طرح ہے۔ میں تو ابا کی آواز سن کر ہی سہم جاتی ہوں۔''

''حمیدہ! تم شادی مت کرنا۔'' مہرالنساء نے کہا۔

''جی؟'' وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گئی۔

''ایک مرد کے چنگل سے نکل کر دوسرے کے چنگل میں پھنس جانا کہاں کی عقلمندی ہے
پہلے میں سوچتی تھی کہ میری شادی ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اب سوچتی ہوں کہ اس سے کیا
پڑے گا۔ اب بھی میرا کچھ نہیں ہے تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔

ہماری ماں کو شادی کر کے کیا ملا؟ بابا جان کے سامنے زبان کھولنا تو درکنار نظریں بھی نہ
اٹھا سکتیں۔ چاہتی تھیں کہ سخاوت کے لیے بھی بھائی کی بیٹی ہی لائیں لیکن بابا جان نے
ایک 'نہیں' کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ اپنی اولاد کا نام خود رکھیں۔ تکلیف
انہوں نے جھیل کر ہمیں پیدا کیا' پرورش پر انہوں نے جان ہلکان کی لیکن انہیں اپنے ہی بچوں کے
نام رکھنے کا اختیار نہیں تھا۔ ہم تین بڑوں کے نام دادا جان نے رکھے علی اور سخاوت کے بابا جان
نے۔

ہونہہ۔ کتنی بے بس ہیں ماں جی۔ چھوٹی سی بات کرنے کے لیے بھی پہلے بابا جان کے
ماتھے کی طرف دیکھتی ہیں۔ اس پر شکنیں پڑی ہوں تو خاموش ہو جاتی ہیں اور اگر مزاج بہتر ہو
دبے دبے انداز میں بات کرتی ہیں۔'' وہ گویا یہ سب باتیں خود سے کہہ رہی تھی۔

''بی بی یہی ہوتا ہے۔ عورت تو قسمت پھوڑنے کے لیے ہی اس دنیا میں آئی ہے۔ جب
اچھی طرح پھوٹ جاتی ہے قسمت تو واپس آسمانوں میں بلالی جاتی ہے۔''

''یہ سارا قصور مردوں کا ہے میرے دل میں اب مردوں سے نفرت کے سوا کچھ نہیں
ہے۔''

☆======☆======☆

زرینہ کو وقت گزارنے کی جتنی جلدی تھی وقت اسی قدر تھم تھم کر گزر رہا تھا۔ دل کسی کام
میں نہیں لگ رہا تھا حالانکہ کرنے کو کتنے ہی کام تھے اس نے تو دوپہر کا کھانا بھی ٹھیک سے نہیں
کھایا تھا۔ عصر کے کچھ بعد بالآخر حمیدہ چلی آئی۔ زرینہ اس وقت دالان میں لگے گملوں میں پانی
ڈال رہی تھی۔ حمیدہ کو آتے دیکھا تو لوٹا چھوڑ' اس کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے اپنے کمرے میں آ
گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے دروازہ بند کر کے جلدی سے پوچھا۔ ''کیا میرا خط دے دیا؟ کچھ کہا
انہوں نے؟ پہنچ جائیں گے ناں وقت پر۔''

''آرام سے ایک ایک کر کے سوال پوچھو۔'' وہ چارپائی پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔

''بتاؤ ناں ہوا کیا؟''

''ہوا یہ کہ مجھے کافی دیر بعد انہیں رقعہ دینے کا موقع ملا۔ میں یہ چاہتی تھی کہ کسی ایسے وقت
انہیں تمہارا خط دوں جب ارد گرد کوئی نہ ہو۔'' وہ بولی۔ ''لیکن تمہیں تو پتا ہے ناں کہ وہاں ہر وقت
میلہ لگا رہتا ہے۔ ایک آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔''

''تم یہ بتاؤ کہ ہوا کیا؟'' وہ بولی۔ ''مجھے اتنی لمبی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''سنو تو۔'' حمیدہ نے آرام سے کہا۔ ''وہ پیر صاحب اور بڑی بیگم کے پاس بیٹھے تھے۔
جب باہر نکلنے لگے تو مجھے یقین ہو گیا...... کہ اب کم از کم رات تک وہ دوبارہ یہاں کا رخ نہیں
کریں گے۔ تب اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان ہی انہیں خط دینا پڑا۔''

''پھر؟'' زرینہ کی بے تابی عروج پر تھی۔

''پھر یہ کہ وہاں موجود سب عورتوں نے کان لگا لیے وہ تو اچھا ہوا کہ سب کو معلوم ہے کہ
مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا ورنہ جانے کون کون سی باتیں پھیلاتی پھرتیں۔''

''تم نے شاہ جی سے کیا کہا؟''

''پہلے تو میں نے آہستہ سے انہیں بتا دیا کہ یہ تمہاری طرف سے ہے۔ پھر سب کو سنانے
کے لیے اونچی آواز میں ان سے کہا کہ کاغذ پر رنگوں کے نام لکھے ہیں۔ بڑی بی بی نے کہا ہے کہ
ان رنگوں کے جوڑے چاہئیں۔ ظاہر ہے وہ عورتیں بڑی بی بی سے پوچھنے سے تو رہیں کہ انہوں
نے واقعی کوئی جوڑے منگوائے ہیں یا نہیں۔''

''اور وہ عورتیں مان گئیں؟''

''آج میرا ان پڑھ ہونا کام آ گیا۔ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ بی بی نے کون سے رنگوں کے
جوڑے مانگے ہیں۔ میں نے کندھے اچکا کر کہہ دیا کہ کیا خبر مجھے پڑھنا کب آتا ہے۔ ویسے
گلابی اور ہرے رنگ کی بات کر رہی تھیں مجھ سے۔ اس بات پر سب مطمئن ہوئیں۔''

''ان کا ردعمل کیا تھا؟''

''جب میں نے انہیں آہستہ سے بتایا کہ یہ تمہاری طرف سے ہے تو یکدم کچھ کہنے لگے۔
لیکن انہوں نے بیچ میں ہی خود کو روک دیا۔ پھر خط جیب میں ڈال کر باہر چلے گئے۔''

''بتایا نہیں آنے کا؟''

اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

''پڑھا ہی نہیں انہوں نے۔ اتنے لوگوں کے سامنے پڑھ بھی کیسے سکتے تھے۔''

''ایک سطر تو لکھی تھی میں نے پڑھ لینے میں کیا ہرج تھا۔'' اس کے انداز میں مایوسی تھی۔

''پاگل کہیں کی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ کاغذ پر ایک سطر لکھی ہے یا زیادہ۔'' حمیدہ ہنسی۔

''ہاں یہ تو ہے۔''

''آج بے چارے اچھو کے ساتھ بہت برا ہوا'' حمیدہ نے کتھا کی تمہید باندھی۔

''کیا ہوا اس کے ساتھ؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔ ''حادثہ تو نہیں ہو گیا۔ یہ بڑی سڑک یوں بھی بہت بری ہے۔ اندھوں کی طرح بسیں اور لاریاں چلاتے ہیں لوگ۔''

''یہ میں نے کب کہا ہے کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔''

''تو پھر؟''

''اسے تو بڑے شاہ صاحب نے چابک سے پیٹا ہے۔'' وہ آگے ہو کر راز داری سے بولی۔

''کیا؟ لیکن کیوں؟ کیسے؟''

حمیدہ مزید راز داری کی خاطر اس کے زیادہ قریب ہو بیٹھی اور مدہم آواز میں اسے پوری بات بتا دی۔

☆======☆======☆

نسیم کچھ ہی دیر پہلے لسی کی گڑوی لے کر خالہ جی کے گھر سے نکلی تھی۔ خالہ جی اس کی سگی خالہ نہیں تھیں۔ وہ پورے گاؤں کی ہی خالہ جی تھیں۔ نسیم کو لسی بہت پسند تھی۔ خالہ رات کو پینے سے منع بھی کرتی تھیں لیکن اسے لسی کے بغیر کھانا ادھورا لگتا تھا۔ خالہ کے گھر کی لسی تو یوں بھی اس کی پسندیدہ تھی۔ گڑوی میں لسی تو لاتی ہی تھی۔ چاٹی کا مکھن بھی کتنا سارا لے آتی تھی۔

وہ جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھی۔ کیونکہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اور اماں نے گھر واپس آنے کی سختی سے تاکید کی تھی۔ ابا کو تو اس کے خالہ جی کے گھر رہ جانے پر کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا لیکن اماں کو یہ پسند نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ورنہ اماں کا پارا اونچا ہونے لگتا۔ یوں بھی اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ تنور کی گرم گرم روٹی پر مکھن چپڑ کر لسی کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کا تصور اسے تیز چلنے پر مزید اکسا رہا تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلی جا رہی تھی۔ جب سامنے سے چار ہیولے نمودار ہوئے۔ ان کا آنا اتنا اچانک تھا کہ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔

''کک کون ہو تم؟'' اس نے ہمت مجتمع کر کے پوچھا۔

''واہ، ہمیں نہیں جانتی۔ اتنے گمنام بھی نہیں ہیں ہم۔'' اس نے شکورے کی آواز پہچان لی۔

''کبھی نظر کرم ڈالی ہو تو پتا چلے ناں۔'' ایک اور بولا۔

''دفع ہو جاؤ' راستہ چھوڑو میرا۔''

''اب تو ہم راستے میں آ گئے ہیں۔ یوں بے مراد کیسے جا سکتے ہیں۔''

''نہیں جاتے؟'' وہ غصہ سے چلائی۔ ''چیخ چیخ کر سارے گاؤں کو اکٹھا نہ کر لیا تو میرا نام بھی نسیم نہیں۔''

''تو چل تبدیل کرا اپنا نام۔''

شکورا سرعت سے اس کی جانب بڑھا اور اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ کر اسے اپنی کمر پہ لاد لیا۔ نسیم نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن سب کوششیں بے کار گئیں۔ طاقت میں وہ اس

سے کہیں بڑھ کے تھے۔

☆======☆======☆

لالٹین کی مدھم روشنی میں زرینہ نے صحن کی طرف کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگادی او
واپس مڑی۔

''خدا کے لیے زرینہ یہ حرکت مت کرو۔ میرا دل دہل رہا ہے۔'' رضیہ کے ہاتھ پاؤ
ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

''اور تم خدا کے لیے ''نہ'' مت لگاؤ۔ جس کام میں ''نہ'' لگ جائے وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو
سکتا۔''

''اگر ابا' اماں میں سے کوئی جاگ گیا پھر؟''

''تم شور نہیں کروگی تو نہیں جاگیں گے۔'' وہ چڑ گئی۔ ''پہلے کبھی جاگے ہیں جو آج جاگیں
گے۔''

''ابا جی تہجد کے لیے اٹھتے ہیں۔ اگر انہوں نے کمرے میں جھانک لیا تو؟''

''تب تک میں آجاؤں گی۔'' اس نے ہلکے دھانی جوڑے پر سیاہ چادر لپیٹ لی۔

''زرینہ اللہ کے واسطے رک جاؤ۔ ایک مرتبہ قدم اس نیت کے ساتھ گھر سے نکل جائیں
واپسی کا ہر راستہ بند ہو جاتا ہے۔''

زرینہ نے ایک لمحے کے لیے مڑ کے اسے دیکھا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ کھڑکی کے چھج
ہاتھ رکھ کر باہر کود گئی۔ رضیہ بے اختیار کھڑکی کی جانب بڑھی۔ زرینہ کچھ فاصلے پر صرف ای
ہیولے کی صورت میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ چلا کر اسے واپس آنے کے
کہے لیکن پھر بات پھیل جانے کے خیال سے رک گئی۔ زرینہ نے اس کے دل کو بہت ٹھیس پہنچ
تھی۔ وہ عجیب...... دوراہے پر کھڑی تھی۔ جب زرینہ روتی تھی تو وہ اس کے آنسو پونچھنے
لیے بے چین ہو جاتی تھی۔ اور جب زرینہ کو راہ سجھائی دے جاتی تھی تو وہ معاشرے اور زما
کے خیال سے پریشان ہو جاتی تھی۔ اس کی حالت عجیب سی تھی۔ پریشانی کے عالم میں وہ کھڑ
کے سامنے کھڑی اندھیرے میں زرینہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

کتنی دیر گزر چکی تھی۔ حیدر علی شاہ کو وہاں انتظار کرتے ہوئے لیکن وہ مایوس نہیں ہوا
یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کی گوری وعدہ کر کے اسے بلا کر وہاں نہ آئے۔ باتوں باتوں میں اس
سخاوت سے تصدیق کروالی تھی کہ یہاں زیادہ تر لوگ سرِ شام ہی سو جانے کے عادی ہ
مغرب کے بعد بہت کم لوگ جاگا کرتے تھے۔ عشاء کی نماز کے اختتام کے ساتھ ہی ہر طر
سناٹا چھا جاتا تھا اور گلیوں میں آوارہ کتوں کی حکومت قائم ہو جاتی تھی۔

مغرب کے فوری بعد گوری کا آنا مشکل تھا۔ کیونکہ مولوی صاحب عشاء کی نماز کی امامت کے بعد ہی اپنے حجرے میں جاتے تھے۔ یقیناً گوری ان کے سونے کے بعد ہی نکلتی اور اس میں کچھ وقت لگنا لازمی تھا۔

بوڑھے برگد سے کمر ٹکائے وہ مسلسل اس راستے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے گوری کو آنا تھا۔ وہ اس کے لیے خریدے ہوئے تمام تحفے بھی ساتھ لایا تھا۔ سونے کی زنجیر' سرخ خوبصورت چنری' پرفیوم کی بوتل اور میراجی کی نظموں کی کتاب۔

دور سے ایک ہیولا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خدوخال واضح نہیں تھے لیکن چال کسی لڑکی کی تھی۔

''ہو نہ ہو' یہ گوری ہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔'' حیدر علی نے سوچا اور اس کی جانب بڑھا۔

وہ گوری ہی تھی۔ حیدر علی کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکی اور پھر دیوانہ وار اس کی جانب بھاگی۔

''شاہ جی۔'' وہ اس کے ہاتھوں کے ساتھ سر ٹکا کر رو دی۔ ''کہاں چلے گئے تھے آپ؟ میری یاد نہیں آئی آپ کو؟ مجھے پوچھا تک نہیں' کھوجا تک نہیں۔ کیا میں اتنی جلدی بھول جانے والی چیز تھی؟''

''کیسی باتیں کر رہی ہو گوری' تم تو میری جان ہو' میری زندگی ہو' تمہیں بھول سکتا ہوں میں؟'' اس نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''پھر مجھے یوں اکیلا کیوں چھوڑ دیا؟ میں نے کتنی آوازیں دیں آپ کو۔ کتنا یاد کیا۔''

''یاد تو میں نے بھی تمہیں بہت کیا تھا۔ ایک ایک لمحے ایک ایک پل۔'' اس نے زرینہ کی آنکھوں سے بہتے آنسو اپنی انگلی کی پور سے صاف کیے۔

''تو پھر آئے کیوں نہیں؟''

''کیا سب شکوے یہیں کروگی؟'' وہ رسان سے بولا۔ ''وہاں کنویں کے پاس آجاؤ پھر دونوں مل کر باتیں کریں گے۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کنویں کے پاس ٹوٹے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے۔

''پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہیں ہوا کیا تھا؟ خالہ کبریٰ نے بتایا تھا کہ تم بیمار تھیں۔''

''خالہ نے اور بھی کچھ کہا ہوگا۔ کہیں آپ نے ان کی بات کو سچ تو نہیں سمجھ لیا تھا؟''

''میں تمہیں اتنا ہی احمق لگتا ہوں؟''

''میں نے سوچا شاید آپ یہ سن کر ناراض ہو گئے ہوں۔ میں دل میں ڈر گئی تھی۔''

''اگر مجھے تمہاری وفا کا یقین نہ ہوتا گوری تو میں کبھی تمہاری سمت نہ بڑھتا۔ تم تو میرے

دل میں رہتی ہو اور میرا دل میرے ساتھ بے وفائی کیسے کر سکتا ہے؟''

زرینہ نے سکون کے ساتھ کمر پیچھے برگد کے درخت کے تنے کے ساتھ ٹکالی۔

''میں تو تمہیں بالکل ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ مجھے اچانک لاہور جانا پڑ گیا اور میں تمہیں اطلاع بھی نہیں دے سکا۔ اگر مجھے ذرا سی بھی خبر ہوتی کہ ہجر کے یہ لمحے اتنے طویل ہو جائیں گے تو یقین کرو کہ میں کبھی بھی لاہور نہ جاتا۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''وہاں بھی یہ خیال مسلسل مجھے ستاتا رہا کہ گاؤں میں میری گوری میرا انتظار کر رہی ہو گی۔''

''اب مجھ میں جدائی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے شاہ جی۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''محبت کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اپنے لیے تو انسان کی صرف ایک زندگی اور ایک موت ہوتی ہے لیکن اپنے پیاروں کے لیے اسے کتنی مرتبہ مرنا جینا پڑتا ہے۔''

''اچھا یا برا' ہر وقت بالآخر کٹ ہی جاتا ہے۔'' اس نے زرینہ کا سر اپنے کندھے کے ساتھ ٹکا لیا۔ ''اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ جدائی کا یہ وقت بھی ختم ہوا۔''

''ابھی کہاں ختم ہوا ہے۔'' وہ ہولے سے بولی۔ ''یہ سب صرف دل کو تسلی دینے کی باتیں ہیں۔''

''تم کیوں فکر کرتی ہو۔ مجھ پر اعتماد نہیں ہے تمہیں؟''

''آپ پر تو اپنے آپ سے بڑھ کر اعتماد ہے۔ بس تقدیر پر اعتماد نہیں ہے۔ کہیں جیسے کوئی میرے اندر ہی اندر کہتا ہے کہ میرا مقدر کہیں اور جڑا ہوا ہے۔''

''یہ سب تمہارے ماحول اور ذہن کا خوف ہے' جو تمہیں دہلاتا رہتا ہے۔ تم اپنے قدم یقین کے ساتھ زمین پر رکھو گی تو راستہ خود بخود بنتا چلا جائے گا۔ پھر میں ہوں تمہارے ساتھ خوف کس بات کا ہے؟''

''ہوں!'' پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''یہ خوف تو تب ہی ختم ہو گا جس دن ہمارے راستے میں کوئی دیوار نہیں رہے گی' جس دن قانون' اخلاق اور شریعت کی نظر میں ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔''

''وہ دن بھی ضرور آئے گا۔ حویلی میں اس سے پہلے کسی بھی دلہن کا اتنا شاندار استقبال نہیں ہوا ہو گا۔ جتنا تمہارا ہو گا۔'' حیدر علی نے اسے تسلی دینی چاہی۔

''حویلی؟'' زرینہ نے سر حیدر علی کے کندھے سے اٹھا لیا۔ یوں لگا جیسے اس کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہو۔

''کیا ہوا؟ تم پریشان کیوں ہو گئیں؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''شاہ جی میں حویلی میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی بھی نہیں۔'' خوف ایک مرتبہ پھر اس کی رگوں میں منجمد ہو گیا تھا۔

''کیوں؟''

حیرت زدہ انداز میں پوچھے گئے اس سوال کا جواب وہ سچائی میں نہیں دینا چاہتی تھی۔ مبادا وہ اسے پاگل سمجھ بیٹھتا یا زیب النساء کے متعلق بھاگ جانے والی بات کہہ دینے پر غصے میں ناراض ہو جاتا۔ اس کی ناراضگی زرینہ کو کسی صورت گوارا نہیں تھی۔

''مجھے حویلی کو دیکھ کر وحشت ہونے لگتی ہے۔ دم گھٹنے لگتا ہے میرا۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہاں کمرے نہیں۔'' تیزی سے بولتے بولتے وہ اچانک چپ ہو گئی اور برگد کے پتوں کے درمیان سے آسمان پر بکھرے ہوئے ستارے کھوجنے لگی۔

''کمرے نہیں تو کیا ہیں؟''

''رہنے دیں۔''

''کہو گوری۔ مجھ سے سب کچھ کہہ دیا کرو' ہمیں تو زندگی کی سب سانسیں اکٹھی گزارنی ہیں پھر چھپانا کیا مطلب؟''

چند ثانیے تک وہ ملگجے اندھیرے میں حیدر علی کے چہرے کے خدوخال دیکھتی رہی' پھر ہولے سے بولی۔ ''آپ کو برا لگے گا۔''

''تمہاری کوئی بات مجھے بری نہیں لگ سکتی۔ تم مجھ سے وہ سب کہہ دیا کرو جو تم کہنا چاہتی ہو۔ اپنی ساری مشکلیں سب تکلیفیں اور غم میرے حوالے کر دو' میں ان سب کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔''

''مجھے وہ کمرے نہیں قبریں لگتی ہیں۔ زندہ انسانوں کی قبریں۔ جہاں لاشیں چلتی پھرتی ہیں۔ لگتا ہے یہ قبریں اتنی گہری ہیں کہ ان میں ہوا روشنی اور آزادی کا گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ لگتا ہے کہ ہر کمرے میں روحیں پر پھڑپھڑا کر اپنی موجودگی کا اعلان کرتی ہیں۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے وہاں۔ خدا کے لیے شاہ جی' مجھے وہاں کبھی مت لے جانا۔''

''میری ہر خوشی تمہاری خوشی کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہم الگ اپنا گھر بنائیں گے گوری۔ جہاں سب اکٹھے ہوں گے۔ میں بڑی آپا اور زیبی آپی کو بھی لے آؤں گا۔ وہ حویلی میں اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان بھی کتنی تنہا رہتی ہیں۔''

''بس شاہ جی آپ کو پا لینے کے بعد یہی ایک خواہش ہے میری' میں حویلی نہیں جانا چاہتی۔ اس کے علاوہ میری کوئی تمنا نہیں ہے۔''

''اب بتاؤ اگر تمہارے شکوے ختم ہو گئے ہوں تو میں تمہیں کچھ دکھاؤں؟''

''آپ مل گئے تو سب شکوے خود ہی ختم ہو گئے۔''

''لاہور جانا بہت مجبوری تھی لیکن وہاں میں تمہیں بھولا نہیں تھا۔ تم ایک ایک پل میرے ساتھ تھیں۔'' اس نے گلے کی زنجیر کی گہرے [illegible] دیا' اس کے نرم و نازک گورے ہاتھ

پر رکھ دی۔ ''یہ جدائی کے لمحوں کا مداوا تو نہیں کر سکتی لیکن تمہیں یہ ضرور بتائے گی کہ تم بھولنے والی چیز نہیں ہو' تم تو گوری خوشبو کی طرح ہر وقت میرے وجود کا احاطہ کیے رکھتی ہو۔''

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

''یہ کیا ہے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے لیے ہے' کھول کر دیکھ لو۔''

''دیکھ لوں؟ اچھا۔'' اس نے ڈبیا کھولی اور سنہری چمکتی ہوئی زنجیر ڈبیا سے باہر نکال لی۔

''یہ کیا؟'' اس نے اپنی خوبصوت شربتی آنکھیں حیرت سے پھیلائیں۔

''یہ تمہارے لیے ہے۔''

''میرے لیے؟ لیکن اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو یہ سونے کی زنجیر ہے۔'' اس کے انداز میں جھجک تھی۔

''اس سے تمہیں کیا؟''

''لیکن شاہ جی یہ بہت قیمتی ہے۔ آج تک میں نے اتنی قیمتی چیز نہیں پہنی۔'' وہ متذبذب تھی۔

''یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں گوری۔'' وہ رسان سے بولا۔ ''ادھر مجھے دو۔''

زرینہ نے زنجیر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی۔ حیدر علی نے اپنے ہاتھوں سے وہ چین اسے گلے میں پہنا دی۔

''شکریہ شاہ جی۔'' وہ ممنونیت سے بولی۔ ''مجھے پوری زندگی کبھی اتنا اچھا اور خوبصورت تحفہ نہیں ملا۔''

''ایک چیز اور بھی ہے۔''

''کیا؟'' اس نے شوق سے پوچھا۔

''یہ۔'' حیدر علی نے کھلتے ہوئے سرخ رنگ کی چنری اس کے سر پر رکھ دی۔

''کتنی خوبصورت ہے یہ؟'' اس نے خوشی سے چنری کو ہاتھ لگایا۔

''اونہوں۔ ابھی ایک کمی ہے۔''

''کس چیز کی؟'' اس نے خوابناک آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

''اس کی۔'' حیدر علی نے پرفیوم کی شیشی کے اسپرے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ مسحور کن خوشبو چاروں طرف بکھر گئی۔ زرینہ نے خوشی سے قہقہہ لگایا اور پرفیوم کے مسلسل اسپرے سے خود کو بچانے کے لیے ہاتھ اپنے سامنے کر لیے۔

''بس کریں شاہ جی۔'' وہ ہنسنے لگی۔

بجائے بس کرنے کے حیدر علی نے اور شدت سے بٹن دبانا شروع کر دیا۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے اس کھیل میں تب تک مگن رہے۔ جب تک پوری بوتل خالی نہیں ہو گئی۔

''بس کریں اب۔'' وہ ہنستے ہوئے چلائی۔

''اب تو بس کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ بھی ہنس رہا تھا۔ ''پرفیوم ختم ہو گیا ہے۔''

''اُف خدایا۔'' زرینہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''ہر طرف کتنی خوشبو پھیل گئی ہے۔''

''یہ ہماری محبت کی خوشبو ہے۔'' اس نے بوتل پر ڈھکن لگایا۔

''خاصی تیز ہے۔'' وہ گلے میں پڑی زنجیر سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''ویسے شاہ جی چار پانچ ماہ تک یہاں سے گزرنے والے ہر شخص کے کپڑوں سے یہ خوشبو ضرور آئے گی اور پتا نہیں ہوا کے دوش پر کتنے گھروں تک بھی پھیل جائے۔''

''ہوا ہر گھر میں جاتی ہے' لیکن اسے بھید بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ کسی سے کچھ نہیں کہتی ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''ویسے اردو کے شاعروں اور محاوروں کو میری اس بات سے اختلاف ضرور ہو گا لیکن سائنس دان میری بات کی تائید کریں گے۔''

''اب تو آپ کو کوئی کمی نہیں لگ رہی ناں؟''

''ہوں۔'' وہ چند ثانیے اسے بغور دیکھتا رہا۔ ''ہاں ایک اور بھی ہے۔''

''اب کیا ہے؟''

''کتاب۔'' وہ بولا۔ ''بلکہ ایک اچھی کتاب۔'' اس نے میرا جی کی نظموں کا مجموعہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''آپ کو بہت شوق ہے کہ میں پڑھوں؟''

''بہت نہیں' بہت زیادہ۔''

''پھر میں ضرور پڑھوں گی۔'' وہ کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی' پھر سر اٹھا کر بولی۔ ''بڑے شاہ صاحب کی شادی ہو رہی ہے؟''

''ہاں۔''

''پیر صاحب نے آپ کے متعلق تو کوئی بات نہیں کی۔''

تھوڑی دیر تک وہ چپ رہا پھر فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ باقی سب کیا کہتے ہیں۔ اپنی زندگی کا فیصلہ میں خود کر سکتا ہوں۔''

''پیر صاحب کی اجازت کے بغیر کیسے کر سکتے ہیں؟''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ جو میرے کام ہیں وہ مجھ پر چھوڑ دو۔ اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔''

"سنا ہے بڑے شاہ صاحب بہت سخت ہیں۔" اس نے جھجک کر پوچھا۔

"اپنوں کے ساتھ وہ بہت اچھے ہیں۔ بہت محبت کرنے والے، بہت خیال رکھنے والے۔"

"اب تو سنا ہے کہ ہر فیصلہ انہی کا چلتا ہے۔ اگر وہ نہ مانے تو؟"

"تم کیوں اپنا ذہن پریشان کرتی ہو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا ہوا ہوں؟ ان سے بات کر چکا ہوں میں۔"

زرینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آپ نے کہہ دیا ان سے؟"

"تم خود بھی تو جانتی ہو کہ ان کے فیصلے کی کتنی اہمیت ہے۔ ظاہر ہے انہیں بتانا تو تھا ہی۔"

"انہیں غصہ تو نہیں آیا؟"

"نہیں۔ غصہ کیوں آتا؟"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ انہوں نے کچھ شرائط رکھ دیں۔"

زرینہ کا دل ڈوبنے لگا۔ "کیسی شرائط؟"

"تم نہیں سمجھو گی۔ بس اتنا جان لو کہ مجھے تمہیں غیر مشروط طور پر اپنانا ہے اور ایسا میں ضرور کروں گا۔ اول تو میں چاہتا ہوں کہ میرے اس فیصلے کو سب دل سے تسلیم کر لیں اور میری خوشی میں سب خوش ہوں لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو پھر میں خود کو آزاد سمجھوں گا۔"

"پتا نہیں کیا ہوگا۔" وہ اٹھ کر کنویں کے پاس کھڑی ہو گئی۔

حیدر علی بھی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"مجھے بتاؤ۔ تمہیں میری بات کا یقین کیسے آئے گا؟"

"پتا نہیں یقین کیا ہوتا ہے۔ میرے گرد تو خوف نے گھیرے ڈال رکھے ہیں۔ جدائی کے خوف نے۔ تقدیر نے کیا لکھا ہے۔ میں اس بات کو کیا جانوں۔" پھر اس نے فوراً بات پلٹی۔ وہ ماحول کو خوشگوار رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے شگفتگی سے بولی۔ "کچھ اندازہ ہے شاہ جی کہ یہ کنواں کتنا گہرا ہوگا۔"

"اندازہ ہے تو نہیں لیکن ابھی لگا لیتے ہیں۔" اس نے جھک کر ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور اسے کنویں میں پھینک دیا۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟" زرینہ خوفزدہ ہو گئی۔

کنویں کی تہہ میں پتھر گرنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"کیوں؟ کرنا کیا ہے۔ پتھر پھینکا ہے۔ اس طرح گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

"آپ کو نہیں پتا۔ پرانے کنوؤں میں پتھر نہیں پھینکتے ان میں بلائیں رہتی ہیں۔"

"کم آن گوری، ان میں بلائیں نہیں انسان کے وہم رہتے ہیں۔"

"یہ جگہ یوں بھی آسیب زدہ ہے۔" اس کا خوف بدستور موجود تھا۔ "بڑے بوڑھے منع کرتے ہیں، یہاں پتھر پھینکنے سے کہتے ہیں۔ بلائیں جاگ جاتی ہیں۔"

"کچھ نہیں کہیں گی تمہیں یہ بلائیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں تو ڈرتی کیوں ہو۔" حیدر علی نے زرینہ کا ہاتھ تھام کر اسے ٹوٹے ہوئے بنچ پر بٹھا دیا۔ "بلائیں جاگ گئیں تو میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

اس کی بات بمشکل ختم ہوئی تھی کہ فضا میں ایک نسوانی چیخ گونجی۔ خوف کے مارے زرینہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"یہ کیسی چیخ تھی۔" حیدر علی نے گویا خود سے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا ناں شاہ جی۔" وہ خوف کے مارے اس کے قریب آ گئی۔

"پاگلوں والی باتیں مت کرو، تم پڑھی لکھی لڑکی ہو، یہ کسی بلا کی نہیں عورت کی چیخ تھی۔"

"بلائیں آوازیں بدل بدل کر چیختی ہیں۔" چیخ ایک مرتبہ پھر گونجی۔

"لیکن یہ بلا کنویں کی نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" حیدر علی نے اسے تسلی دی۔ "آواز ڈیرے کی سمت سے آ رہی ہے۔" وہ جو کوئی بھی تھی۔ اب اس کی چیخوں میں تسلسل آ گیا تھا۔

"گوری کوئی عورت مصیبت میں ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔" اس نے زرینہ کو سمجھایا۔ "یہ کنویں کی کوئی بلا نہیں ہے۔ تم آرام سے بغیر کسی خوف کے یہاں بیٹھو میں دیکھتا ہوں کہ یہ عورت کون ہے۔ اور اس پر کیا افتاد ٹوٹی ہے۔"

"نہیں۔" وہ چلائی۔ "آپ کہیں نہیں جائیں گے، کہیں نہیں۔"

زرینہ نے اس کا بازو سختی سے تھام لیا۔

"گوری سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"میں کچھ سننا کچھ سمجھنا نہیں چاہتی۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ اگر آپ گئے تو میں اس کنویں میں کود کر جان دے دوں گی۔"

"او گاڈ۔ گوری پلیز، صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ کسی جن بھوت یا بلا کی آوازیں نہیں ہیں۔ تمہاری جیسی کسی لڑکی یا عورت کی چیخیں ہیں جو کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے پیچھے کتے لگ گئے ہوں یا کوئی اور پریشانی ہوا سے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ رو پڑی۔ "آپ نہیں جائیں گے۔ ہم دونوں بھی اس کنویں کے پاس نہیں بیٹھیں گے۔"

یک لخت چیخوں کی آوازیں تھم گئیں اور فضا میں صرف جھینگروں کے بولنے کی آوازیں رہ گئیں۔

☆======☆======☆

ڈیرے کے قریب واقع گھر بھی اس سے کافی فاصلے پر تھے' پھر بھی چیخوں کی مدھم مدھم آوازیں ان گھروں تک پہنچ گئی تھیں۔ دن کا وقت ہوتا تو شاید ان گھروں کو خبر بھی نہ ہوتی لیکن رات کے سناٹے میں یہ آوازیں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ دن بھر کے تھکے ہارے لوگوں کی نیندیں اتنی گہری تھیں کہ زیادہ تر لوگوں کو کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ چند ایک جاگ گئے' لیکن کچھ کو ان کی ضعیف الاعتقادی اور کچھ کو بیویوں نے باہر نکلنے سے روکا۔ یا کسی نے تجسس کے مارے دروازے کی درز سے باہر دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ مگر سامنے پھیلی تاریکی میں ان کی آنکھیں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر رہی ہیں۔ کنڈی کسی بھی گھر کی نہ کھلی۔

☆======☆======☆

چلو' میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔'' حیدر علی نے زرینہ سے کہا۔

'' مجھے گھر چھوڑنے کے بعد آپ وہاں تو نہیں جائیں گے؟'' اس نے اس سمت اشارہ کیا جہاں سے چیخوں کی آواز آئی تھی۔

'' اب جانے کا کیا فائدہ۔ بھلی یا بری مصیبت بہر حال گزر چکی ہے۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔

'' کل یہیں مل سکتی ہو؟'' چلتے چلتے حیدر علی نے پوچھا۔

'' جی ضرور۔''

'' زیادہ تردد کی ضرورت نہیں ہے اگر نہ آسکو تو پریشان مت ہونا۔ میں سمجھ جاؤں گا کہ تمہیں موقع نہیں مل سکا۔''

''ہوں۔''

چلتے چلتے مسجد کے سفید میناروں کے دھندلے ہیولے دکھائی دینے لگے' زرینہ رک گئی۔

'' کیا ہوا؟''

'' میں زنجیر اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔'' اس نے گلے میں پڑی سونے کی زنجیر اتار دی۔

'' کیوں؟''

'' اس چنری کو تو میں اپنے کپڑوں میں چھپا لوں گی لیکن۔''

'' اس زنجیر کو چھپانا تو زیادہ آسان ہے۔''

'' اماں کی نظروں سے کچھ بچنا ممکن نہیں۔ چنری اور خوشبو کی خالی بوتل کے لیے تو کوئی سا بہانہ کیا جا سکتا ہے لیکن سونے کی اتنی قیمتی زنجیر کے لیے میں کوئی بہانہ نہیں کرسکوں گی۔ ہمارے گھر سونے کا صرف ایک زیور ہے۔ اماں کی بالیاں' چند ماشوں کی ہوں گی۔ انہوں نے یہ زنجیر

دیکھ لی تو بہت برا ہوگا۔''

'' یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔ تاکہ سدا تمہاری مرمریں گردن میں چمکتی رہے۔''

زرینہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی' پھر زنجیر اس کی جانب بڑھا دی۔

'' اس کی چند کڑیاں الگ کر کے مجھے دے دیں۔ باقی اپنے پاس رکھ لیں۔''

'' وہ کس لیے؟''

'' تاکہ آپ کی نشانی میرے پاس رہے۔ پھر جب ہم دونوں مل جائیں گے تو ان کڑیوں کو جوڑ کر دوبارہ زنجیر مکمل کر لیں گے۔ اس کے بعد میں اسے کبھی اپنے سے الگ نہیں کروں گی۔''

وہ مسکرا دیا۔ '' ایسا ہی سہی۔''

حیدر علی نے ذرا سا زور لگا کر زنجیر دو حصوں میں تقسیم کر دی۔ چھوٹا حصہ زرینہ کو تھما دیا اور بڑا حصہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

'' شکریہ۔'' زرینہ بھی مسکرا دی۔

'' یہ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔ شادی کی رات تمہیں تمہاری یہ امانت مل جائے گی۔''

وہ ہولے سے ہنس پڑی اور وہ دونوں ایک بار پھر چل پڑے۔

'' تم گھر میں کیسے داخل ہوگی؟''

'' میرے کمرے میں کھڑکی ہے۔ زمین سے زیادہ بلند بھی نہیں ہے اور اس میں سلاخیں بھی نہیں لگی ہوئیں۔ اسی سے جاؤں گی۔''

کھڑکی میں رضیہ بے چینی سے کھڑی ہوئی تھی۔ زرینہ کو واپس آتے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ چھوٹے شاہ صاحب اسے چھوڑنے کے لیے خود آئے تھے' یہ دیکھ کر اسے مزید تسلی ہوگئی۔ اب تک وہ شدید پریشانی اور اعصابی کشیدگی کا شکار تھی۔ ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزارا تھا۔

کھڑکی سے قدرے فاصلے پر زرینہ نے رک کر شاہ صاحب سے بات کی اور آگے بڑھ کر کھڑکی پھلانگ لی۔ وہ وہیں کھڑے اسے اندر جاتے دیکھتے رہے۔ جب زرینہ نے ہاتھ ہلا خدا حافظ کا اشارہ کیا تو وہ واپس چل پڑے۔

زرینہ کے کمرے میں آتے ہی خوشبو کا جھونکا بھی اندر آ گیا۔

'' شکر ہے تم آ گئیں۔'' رضیہ نے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر اس کا ماتھا چوما۔ '' تم تھوڑی دیر تک اور نہ آتیں تو میں خوف سے مر ہی گئی ہوتی۔''

'' پاگل ہو۔'' وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ '' پتا ہے رضیہ آج میں بہت خوش ہوں یہ دیکھو۔''

اس نے بند مٹھی کھولی۔ لالٹین کی زرد مدھم روشنی میں اس کی نرم ہتھیلی پر گلے کی زنجیر کی چند

کڑیاں جگمگا اٹھیں۔

''یہ کیا؟''

''یہ شاہ جی نے دی ہے اور یہ بھی۔''اس نے چنری دکھائی۔

''تمہارا تو پورا وجود خوشبو میں ڈوبا ہوا ہے۔''

''یہ مہک بھی شاہ جی کی بدولت ہی ہے۔''اس نے پرفیوم کی خالی شیشی اسے دکھائی۔

''اماں اور ابا کو کیا جواب دو گی؟ یہ خوشبو صبح تک بھی تمہارے وجود سے الگ نہیں ہوگی۔''

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا لیکن خیر میں کچھ بھی بہانا کر دوں گی۔''

''میں تمہاری جلدی واپسی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ دیکھ میرے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔''زرینہ نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''تم مت گھبرایا کرو۔ آج تو اتنا مزہ آیا۔ پتا ہے کیا ہوا۔''اس نے جوش کے ساتھ سب باتیں رضیہ کو بتانی شروع کیں۔

☆======☆======☆

''نسیم کے ابا! اتنا دن چڑھ آیا ہے۔ ذرا جا کر خالہ جی سے پتا تو کرو کہ وہ اب تک کیوں نہیں آئی۔''نسیم کی ماں نے کہا۔

''آ جائے گی تُو کیوں گھبراتی ہے۔ خالہ جی کی طبیعت خراب ہوگی اس لیے رک گئی ہو گی۔''

''تم نے ہی اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ رات کو وہاں نہ رکے' لیکن تم باز نہ آئے۔ کہہ ہی دیا کہ بے شک رات وہیں رہ جائے۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ جوان جہان لڑکی ہے۔ کل کلاں کچھ ہو گیا تو کتنی بدنامی ہوگی۔''

''تم بھی حد کرتی ہو۔ سارا گاؤں دیکھا بھالا ہے۔ کیا ہوگا اسے۔''وہ استرا تیز کرتے ہوئے بولا۔

''میری بات یاد رکھو۔ سیانے کہتے ہیں کہ درانتی کے ایک طرف دندانے ہوتے ہیں لیکن دنیا کے دونوں طرف۔''

''یہ سیانا ضرور تمہارا باپ ہی ہوگا۔ کرنے کو اس کے پاس کچھ تھا نہیں۔ سارا دن حقہ گڑگڑاتا تھا اور فرمان جاری کرتا تھا۔ یا پھر سیانی تمہاری ماں تھی۔ جب نصیحتوں کی پٹاری کھول لیتی تھی تو نئی سے نئی نصیحتیں مسلسل برآمد ہوتی تھیں۔''

''خبردار جو میرے ماں باپ کو برا بھلا کہا۔ تمہارے ماں باپ کیا تھے؟ جاہل مطلق۔ مرتے مر گئے پر کبھی عقل کی کوئی بات نہ کی۔''

دروازہ زوردار آواز میں بجا۔

''اس وقت کون سی مصیبت نازل ہو گئی۔''نسیم کا باپ استرا چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا اور کنڈی کھول دی۔ سامنے گاؤں کے بہت سے لوگ کھڑے تھے۔

''کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟ تم سب بہت پریشان لگ رہے ہو؟''

''کوئی پریشانی سی پریشانی ہے۔ کل رات چیخوں سے گاؤں کے در و دیوار لرزتے رہے۔ کوئی بلا بری طرح چیخ رہی تھی۔ تمہیں نہیں پتا چلا کیا؟''

''نہیں۔''وہ ہونقوں کی طرح ان کی جانب دیکھنے لگا۔

گاؤں والوں نے چیخوں کا قصہ خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ کتنی کلیاں لگائی گئیں۔ کوڑوں کے برسنے کی آوازیں۔ کتوں کے رونے' یہاں تک کہ زمین کے ہلنے کی شہادتیں بھی سامنے آئیں۔

''اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پرانے کنویں کے اندر سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔''

''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔ محسوس تو مجھے بھی ہوا تھا کہ کچھ ہو رہا ہے۔''نسیم کا باپ جوش سے بولا۔''چارپائی ہلنے کا تو صرف پتا چلا تھا پر اس نیک بخت نے کہا کہ زلزلہ آیا ہوگا۔''

''نسیم کے ابا تماشا دیکھنے مت کھڑے ہو جانا۔ جلدی آنا بلکہ جاتے جاتے خالہ کے گھر نسیم کا پتا کرتے جانا۔''اس کی ماں اندر سے چلائی۔''سارا کام بکھرا ہوا ہے' کہنا جلدی آئے۔''

''اچھا۔ اچھا۔''

''نسیم خالہ کے گھر کب ہے۔ ابھی میں انہی کے گھر سے آ رہا ہوں۔''ہجوم میں سے ایک نے کہا۔

''وہیں اندر ہوگی' تمہیں خبر نہیں ہوئی ہوگی۔''اس کا باپ بولا۔''کل شام گئی تھی ماں نے منع کیا کہ رات وہاں نہ ٹھہرے پر میں نے کہا کیا حرج ہے۔''

''مگر چاچا! وہ تو شام کو ہی وہاں سے چل پڑی تھی۔ میں نے کہا بھی آپا نسیم میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں پر وہ نہیں مانی۔ کہنے لگی کہ خود ہی چلی جائیں گی۔''

''کیا؟''نسیم کے باپ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔''لیکن وہ تو رات کو گھر نہیں پہنچی۔''

ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا۔ پھر سب اپنی اپنی بولی بولنے لگے۔ نسیم کی ماں بھی گھبرا کر باہر نکل آئی۔

''ہاں چاچا! لسی اور مکھن لیتے لیتے اسے دیر ہو گئی تھی لیکن خالہ جی کے اصرار کے باوجود بھی وہ رکی نہیں۔ کہنے لگی کہ اماں ڈانٹے گی۔''

''ہائے میری بچی کہاں گئی۔''اس کی ماں نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارا۔

''تم میں دیکھ کر آتا ہوں۔''اس کا باپ بوکھلا گیا۔ پھر نسیم کا بتانے والے لڑکے کے سر پر

چپت رسید کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کم بخت کون سا سچ کہہ رہا ہوگا۔ تُو اندر جا میں ابھی خالہ جی کا گھر دیکھ کر آتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ساتھ سب ہی خالہ کے گھر کی طرف بڑھے۔ جس راستے سے گزرے، ہر شخص سے ملے سب کو خبر ہوگئی۔ ہجوم بڑھتا گیا۔

خالہ جی نے بھی وہی بتایا جو اس لڑکے نے بتایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پورے گاؤں میں ڈھنڈیا پٹ گئی۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا تھا کہ گاؤں کی کوئی لڑکی گھر سے اچانک غائب ہو جاتی لیکن ایسی صورت میں کسی اور گھر سے کوئی لڑکا بھی ضرور غائب ہوتا تھا۔ اور لوگوں کے لیے معاملے کی تہہ تک پہنچنا مشکل نہیں ہوتا تھا لیکن ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ لڑکی اکیلی غائب ہوئی تھی۔ گاؤں بھر کے لیے یہ ایک معمہ تھا۔

ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد نسیم کی لاش پرانے کنویں کے قریب کھیتوں میں مل گئی۔

☆======☆======☆

''میں نے تم سے کہا تھا کہ لاش کنویں میں پھینکنا اور تم باہر کھیتوں میں پھینک آئے۔'' شکورا اپنے ماتحتوں پر برس رہا تھا۔ ''جانتے ہو لاش مل گئی ہے۔''

''ہم تو وہیں لے جا رہے تھے لیکن کنویں کے قریب سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور وہ جگہ آسیب زدہ۔ ہمیں کچھ ہو جاتا تو بال بچوں کا کیا ہوتا۔ انہیں کون سنبھالتا۔''

''مجھے تو لگتا ہے۔'' ان میں سے ایک رازداری سے بولا۔ ''کل کنویں سے کوئی بلا نکل آئی ہوگی۔ بہت دن تک سوتی ہیں بلائیں۔ اب ان کے جاگنے کا وقت ہوگیا ہے۔''

''نہیں۔'' ایک اور نے اسے گھورا۔ ''نسیم بے گناہ تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر فرشتوں نے اس کی بے گناہی کا اشارہ دیا ہوگا۔ وہ کوئی عام خوشبو نہیں تھی۔ بالکل جنت کی خوشبو لگتی تھی۔ شاید ہو فرشتے اس کی روح لے جانے آئے ہوں گے۔''

''کیا ایسا ہوسکتا ہے؟'' شکورے نے خوفزدگی کے عالم میں کہا۔

''کیوں نہیں۔'' اس کے لہجے میں ویسا ہی یقین تھا۔ ''تم میں سے کسی نے پہلے ایسی خوشبو سونگھی ہے۔''

''نہیں۔'' ان سب نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہ عطر گلاب کی ایسی خوشبو ہے نہ چنبیلی کی۔''

ان کی باتوں نے شکورے کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔ وہ بھاگا بھاگا رجب علی شاہ کے پاس پہنچا اور اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

''لاش مل جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' رجب علی نے بے نیازی سے کہا۔ ''

باتیں نہیں کرتی۔''

''وہاں دور دور تک اب بھی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی خوشبو تو پہلے کبھی کسی نے نہیں سونگھی۔''

''سب تمہارا وہم ہے۔''

''معافی چاہتا ہوں شاہ صاحب' لیکن یہ وہم نہیں ہے۔ خوشبو اب ہلکی ضرور ہوگئی ہے۔ لیکن موجود ہے۔ دوسری طرف گاؤں والوں نے عجب تماشا مچا رکھا ہے۔''

''کیوں وہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''کہہ رہے ہیں رات بھر گاؤں چیخوں اور سسکیوں کی آوازوں سے لرزتا رہا ہے۔ کوڑوں کی شائیں شائیں کی آوازیں آ رہی تھیں اور کوئی عورت چلا رہی تھی۔ گاؤں کے کتے بھی رو رہے تھے۔ اور بھی کچھ کہہ رہے تھے۔'' اس نے دماغ پر زور ڈالا۔ ''ہاں کہہ رہے تھے کہ رات کو زلزلہ آیا تھا اور چارپائیاں بھی ہلی تھیں۔''

''سٹوپڈ' ایڈیٹ احمق لوگ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

پرانے کنویں کے پاس لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ نسیم کا باپ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ہجوم سے کچھ فاصلے پر رجب علی شاہ کی اوپن ٹاپ جیپ رکی۔ اسے آتا دیکھ کر سب نے سلام کر کے راستہ چھوڑ دیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے رعب سے پوچھا۔

گاؤں کا ایک بزرگ سب کے نمائندہ کی حیثیت سے سامنے آیا اور بہت سے الٹے سیدھے واقعات جوڑ کر اور مفروضے قائم کر کے اپنی طرف سے ایک کہانی سنا دی۔

وہ شکورے کی طرف مڑا۔ ''لڑکی کی میت گھر پہنچانے کا انتظام کرو۔''

پھر آگے بڑھ کر نسیم کے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔''

بڑے شاہ صاحب کو اپنے ساتھ ہمدردی کرتے دیکھ کر وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''میری بچی کو ظالموں نے مار دیا۔ شاہ صاحب میری بچی۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

''یوں اپنی بچی کی لاش کو تماشہ مت بناؤ۔ ہم نے میت گھر پہنچانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ کفن دفن کا انتظام بھی ہماری طرف سے ہوگا۔ باقی مرنا جینا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ رونے کے بجائے اس کی مغفرت کی دعا کرو۔''

اسے تسلی دلاسہ دے کر وہ کنویں کے قریب پہنچا۔ خوشبو اب بھی تھی لیکن کافی ہلکی ہو چکی تھی۔ اس نے چند گہرے سانس لیے خوشبو مانوس سی تھی۔ وہ ذہن پر زور ڈالنے لگا۔

''یہ کسی پرفیوم کی خوشبو ہے۔''

کچھ اور گہرے سانس لینے پر اس کے ذہن میں جھکا سا ہوا۔

''Intimate (انٹی میٹ)''

کچھ دن قبل Intimate (انٹی میٹ) کی بھری ہوئی شیشی اس نے حیدر علی شاہ کے ڈریسنگ ٹیبل پر دیکھی تھی۔

☆======☆======☆

زرینہ کے لیے اماں کے سامنے خوشبو کی وضاحت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

''کل رات سونے سے پہلے تو نہیں تھی' ہمیں کیا پتا کہاں سے آئی؟''

''سونے سے پہلے تو واقعی نہیں تھی۔'' وہ بولیں۔ ''جب میں آیت الکرسی پڑھ کر پھونک آئی تھی' تب بھی نہیں تھی۔'' وہ کھڑکی کی طرف بڑھیں اور باہر جھانکا۔

''کک..... کیا دیکھ رہی ہیں اماں؟'' زرینہ کو اپنا دم حلق سے اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔

باہر کچے میں اس کے اور حیدر علی کے قدموں کے نشان ہو سکتے تھے۔

''دیکھ رہی ہوں کہ کہیں کوئی بچہ عطر کی شیشی تو نہیں پھینک گیا۔'' وہ مڑیں۔

''یہی ہوا ہوگا اماں۔'' زرینہ نے ان کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی' لیکن وہاں کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

''گویا' انہیں قدموں کے نشان دکھائی نہیں دیئے' ہو سکتا ہے بہت مدھم ہو گئے ہوں۔'' اس نے سوچا۔

''مگر یہاں کوئی شیشی نہیں ہے۔'' وہ اس کی سوچوں سے بے خبر بولیں۔ ''اور خوشبو کمرے کے اندر پھیلی ہوئی ہے' باہر نہیں۔''

رضیہ نے زرینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں چرالیں۔

''ہمیں کیا پتا اماں۔'' وہ اپنے آپ میں چور سی بن گئی۔ ''اور پھر خوشبو تو اتنی زیادہ ہے کہ سمت کا اندازہ ہی نہیں ہو رہا۔ ہم نے کتاب میں پڑھا تھا کہ بعض اوقات ہوا خوشبو یا بدبو کی سمت ہی بدل دیتی ہے۔''

اماں بولیں تو کچھ نہیں' لیکن ان کی تشفی بھی نہیں ہوئی تھی۔

زرینہ چور نظروں سے اپنی چارپائی کے نیچے پڑے ہوئے جست کے بکس کی طرف دیکھ رہی تھی' جس میں سرخ چنری آدھی سے زیادہ باہر لٹک رہی تھی۔ رات کو لالٹین کی روشنی میں اپنے کپڑے ٹھیک طرح سے اندر نہیں رکھ سکی تھی۔

اماں کمرے سے باہر نکلیں تو رضیہ لپک کر زرینہ کے پاس آ گئی۔

''اب کیا ہوگا؟''

''شش!'' زرینہ نے انگلی ہونٹوں پر رکھی۔

''اماں کو پتا چل گیا تو غضب ہو جائے گا۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''میں کپڑے بکس کے اندر کر دوں' آدھے باہر لٹک رہے ہیں۔''

''رہنے دو' بکس گھسیٹنے کی آواز اماں تک ضرور پہنچے گی۔''

''رات کو بھی تو رکھے تھے' بکس نہیں گھسیٹنا پڑا تھا..... چارپائی اٹھالی تھی۔''

''پگلی' وہ رات کا وقت تھا' ابھی ہم چارپائی اٹھا رہے ہوں اوپر سے اماں پہنچ جائیں تو؟''

''ہاں یہ تو ہے' اب کیا کروں؟ کسی بھی وقت اماں کی نظر اس پر پڑ سکتی ہے۔''

''اوں!'' رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''ایسا کرو چارپائی پر کروشیے والی بڑی چادر ڈال دو۔ وہ سامنے آ جائے گی تو بکس پر کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' زرینہ جلدی سے باہر والی الماری سے چادر نکال لائی۔

''لڑکیو! اپنے ابا کے لیے پراٹھا بنا دو' آتے ہی ہوں گے مسجد سے۔'' اماں نے آواز دی۔

''اچھا ماں۔'' رضیہ جلدی سے بولی۔

مولوی صاحب مسجد سے آئے تو رضیہ نے جلدی سے ناشتہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

''ابا جی' ناشتہ!''

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

''کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اماں نے پوچھا۔

''ہاں طبیعت ٹھیک ہے۔''

''پھر ناشتہ کیوں نہیں کر رہے؟''

''دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ بولے۔ ''آج مسجد میں عجیب وغریب افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔''

''اللہ خیر کرے۔'' اماں بولیں۔

زرینہ ان کے برابر تخت پر آ بیٹھی۔ رضیہ نے بھی پیڑھی گھسیٹ لی۔

''جو بھی مسجد میں داخل ہوا اس کے ہونٹوں پر یہی قصہ تھا۔ میں نے تو کچھ نہیں سنا' لیکن سب مُصر تھے کہ رات بھر گاؤں میں چیخ و پکار مچی رہی۔''

زرینہ کے اعصاب ایک دم سے کشیدہ ہو گئے۔ رضیہ سر جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن کھرچنے لگی۔

''آوارہ کتے روتے رہے۔'' ان کی بات جاری تھی۔ ''کوڑوں کی شائیں شائیں کی آوازیں سنائی دیں اور زمین بھی ہلی۔''

''کیا ہم اتنے بے ہوش پڑے ہوئے تھے کہ ہمیں خبر نہ ہوئی؟'' اماں بولیں۔

''پتا نہیں' مجھ تک نہ تو کوئی آواز پہنچی' نہ زمین کے ہلنے کا پتا چلا۔ سب کا خیال ہے کہ یہ پرانے کنوئیں کی بلاؤں کی کارستانی ہے۔''

''اللہ خیر کرے۔'' اماں بول اٹھیں۔

''مجھے تحقیقات کی خاطر گاؤں والوں کے ساتھ جانا ہے۔''

''ابا جی! ناشتہ تو کرتے جائیں۔'' رضیہ نے کہا۔

''گاؤں بھر پریشان ہے' میرے حلق سے نوالہ بھی نہیں اترے گا۔''

''احتیاط رکھنا رضیہ کے ابا۔'' ان کے جاتے جاتے اماں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

زرینہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی' اس کے پیچھے پیچھے رضیہ بھی چلی آئی۔

''ایسا سب تو نہیں ہوا تھا۔'' زرینہ نے ہولے سے کہا۔

''تم آ گئی تھیں کیا پتا ہوا بھی ہو۔''

''یہ سب کسی نے یونہی اُڑائی ہے۔ بلائیں نہیں چیخیں' صرف ایک بلا تھی وہ بھی تب جب شاہ جی نے کنویں میں پتھر پھینکا تھا۔ مجھے ذرا بھی خیال ہوتا کہ وہ یہ کر گزریں گے تو میں کبھی کنویں کی گہرائی کے متعلق استفسار نہ کرتی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ پرانے کنویں میں پتھر نہیں پھینکتے۔''

''اگر تمہاری اور چھوٹے شاہ صاحب کی بات کھل گئی تو؟'' رضیہ بھی ہول رہی تھی۔

''کیسے کھلے گی' خود سے کھل جائے گی کیا؟ ہمیں کسی نے دیکھا ہے وہاں؟'' زرینہ گئی۔

وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں اور صحن میں ایک ایک کر کے گاؤں کی کتنی ہی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ہر کوئی اپنے ساتھ نئی باتیں اور انوکھے قصے لا رہی تھی۔ جب اماں تک عجیب و غریب خوشبو اور نسیم کے مرنے کی اطلاع پہنچی تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔

''رضیہ' زرینہ!'' وہ وہیں سے چلائیں۔

''کیا ہوا اماں؟'' وہ دونوں جلدی سے کمرے سے باہر نکلیں۔

''اندر چلو۔'' اماں خود بھی پاؤں چپلوں میں گھسیڑ کر اندر کی طرف لپکیں۔

''ہوا کیا اماں؟''

''شش!'' انہوں نے دونوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ''اللہ خیر کرے۔ گاؤں پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ کل رات کنویں کی بلائیں جاگ گئی ہیں۔ انہوں نے نسیم کو بھی مار دیا ہے۔ پرانے کنویں کے پاس سے ایسی خوشبو آ رہی ہے جو اس دنیا کی لگتی ہی نہیں ہے۔''

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''یہ سب بلاؤں کی کارستانی ہے۔ میرا دل ہولا جا رہا ہے۔ تم لوگوں کے کمرے سے بھی عجیب و غریب خوشبو آ رہی ہے۔ کہیں بلاؤں نے تم لوگوں کو تاک تو نہیں لیا؟'' اماں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

''اماں! انسان کو وہم نہیں پالنے چاہئیں اچھی اور بری تقدیر تو اللہ کی طرف سے

ہے۔'' زرینہ نے جلدی سے کہا۔

''اماں! آپ خواہ مخواہ فکر کرتی ہیں۔'' رضیہ نے بھی فوراً اس کی تائید کی۔ ''مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہوتی ہے' یہاں انسان' شیطان کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔''

انہوں نے اماں کو تسلی دینے کی حتی الامکان کوشش کی۔ انہیں خوشبو کی حقیقت کا علم تھا' لیکن وہ اماں کو یہ بتا نہیں سکتی تھیں۔

''تم دونوں غور سے میری بات سنو۔'' اماں نے کہا۔ ''کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے کہ تم لوگوں کے کمرے سے بھی خوشبو آ رہی ہے' سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟''

''جی اماں۔'' انہوں نے اقرار میں گردن ہلائی۔

''اب کہیں سہیلیوں کو بتاتی نہ پھرنا۔''

''نہیں اماں۔''

''ملانی جی۔'' باہر سے ایک عورت نے آواز دی۔ ''آپ کو مولوی صاحب بلا رہے ہیں' کہہ رہے ہیں نسیم کے گھر پُرسا دے آئیں۔''

''میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔'' وہ باہر نکلتے ہوئے بولیں۔ ''تم دونوں اپنے کمرے میں قرآن پاک کی تلاوت کرتی رہنا اور ہاں پانی پر دم کر کے کمرے میں چھڑک بھی لینا۔''

اماں کے ساتھ عورتوں کا ہجوم بھی نسیم کے گھر کی طرف چل پڑا اور وہ دونوں گھر میں تنہا رہ گئیں۔

''اُف خدایا! یہ کیا ہو گیا ہے' کیا کیا کہانیاں بن گئی ہیں ایک چھوٹی سی بات کی۔'' زرینہ دھم سے تخت پر بیٹھ گئی۔

''لیکن نسیم کو کیا ہوا؟''

''پتا نہیں' سب کہہ رہے ہیں کہ اسے بلاؤں نے مارا ہے۔''

''مگر وہ اتنی رات گئے باہر کیا کر رہی تھی؟''

''تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو؟''

''تم ڈر رہی ہو؟'' رضیہ نے الٹا سوال کیا۔

''پتا نہیں' مجھے لگتا ہے رضیہ! کہ یہ کچھ اور گڑ بڑ ہے۔''

''کیسی گڑ بڑ؟''

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔ شاہ جی بھی کہہ رہے تھے کہ بلائیں ولائیں کچھ نہیں ہوتیں۔''

''بلائیں ہوتی ہیں یا نہیں' لیکن زرینہ تم آج باہر مت نکلنا۔''

''میری فکر چھوڑو۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''افوہ! ابھی تک گھر کی صفائی بھی نہیں ہوئی' میں

جلدی سے جھاڑو لگادوں۔''

☆======☆======☆

نسیم کی موت پر گاؤں بھر میں چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔ کسی کا خیال تھا کہ اس کی موت میں پرانے کنویں کی بلاؤں کا ہاتھ ہے اور کوئی اس بات پر مصر تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے آنے کا اشارہ ہے' تب ہی تو وہاں عجیب اور انوکھی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ گاؤں بھر کے بچے بوڑھے' جوان اور عورتیں نسیم کے گھر جمع تھے سوائے ایک شخص کے۔ اچھو۔

جو اپنے کمرے میں چارپائی پر چت لیٹا چھت پر لگے شہتیروں کو گھور رہا تھا۔ ہتک' سبکی' توہین اور ذلت کا احساس اس کے وجود کے ایک ایک ریشے میں سرایت کر چکا تھا۔ اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود بے لباس ہو گیا ہو اور سارا گاؤں' یہ زمین آسمان' درخت اور سبزہ زمین پر رینگتے کیڑے مکوڑے' پھدکتی چڑیاں' دم ٹانگوں میں دبا کر دوڑتے ہوئے کتے' رہٹ کے گرد گھومتے بیل' سب کے سب اس پر ہنس رہے ہوں۔ اس کا مذاق اُڑا رہے ہوں' انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کر رہے ہوں۔

اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دماغ پھٹ جائے گا' اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔

''اچھو۔'' ماں نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر پکارا۔

وہ ویسے ہی چھت پر نظریں جمائے رہا۔

''اچھو بیٹا! کچھ تو کھا پی لے۔'' اس نے اندر آ کر منت بھرے انداز میں کہا۔

اس کے وجود میں پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔

''کچھ تو بول اچھو؟'' انہوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ''کچھ تو بول......؟''

اچھو کے دماغ میں ایک ساتھ بہت سے دھماکے ہوئے۔ زمین آسمان اور اس کے درمیان کی سب چیزیں تلپٹ ہو گئیں۔ بے شمار سیاہ کوڑے لپلپاتے ہوئے اس کی طرف بڑھے' لیکن اس کے قریب پہنچ کر وہ سانپوں میں بدل گئے۔ دوشاخہ زبانوں والے سانپ۔

''کچھ تو بول اچھو...... کچھ تو بول......'' ماں اسے جھنجھوڑ کر تھک گئی تو بے اختیار رو پڑی۔

اس نے نظریں گھما کر آنسو بہاتی ماں کی طرف دیکھا۔ رجب علی شاہ کے لیے اس کے دل میں نفرت کی شدید لہر اٹھی۔

''کیا بولوں ماں؟'' اس کے ہونٹ ہلے۔ ''کیا بولوں؟ میرا جسم زخمی نہیں ہوا' روح گھائل ہوئی ہے۔ میرا مان ٹوٹ گیا ہے۔''

''اچھو کے ابا!'' ماں چلائی۔ ''جلدی آ' اچھو بولنے لگا ہے۔''

منشی بھاگا بھاگا آیا۔

''اچھو بولنے لگا ہے تُو نے یہی کہا ہے ناں؟''

''ہاں...... ہاں! اچھو اپنے ابا سے بات کرناں۔'' وہ منت بھرے انداز میں بولی۔

اچھو اٹھ بیٹھا۔

''میں ختم کر دوں گا سب کچھ' زندہ نہیں چھوڑوں گا...... رجب علی شاہ کو۔'' اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

اس کی بات سن کر منشی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

''نہ بیٹا نہ ایسا نہیں کہتے۔'' پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تو نے میری بات مان لی ہوتی تو کاہے کو یہ دن دیکھنا پڑتا۔ کتنا کہا تھا کہ وہ دو کوڑی کا جانور واپس کر دے' تجھ سے زیادہ قیمتی تو نہیں تھا وہ' ہوا کچھ فائدہ تیرے اڑنے کا؟''

''کیوں دیتا میں اپنا راجہ اسے؟'' اچھو چلایا۔ ''وہ کون ہوتا ہے میرے راجہ کو مجھ سے جدا کرنے والا۔ آپ اپنی اولاد کسی کے حوالے کر سکتے ہیں؟ مجھے یا سلیم کو مالکوں کے کہنے پر کہیں پھینک سکتے ہیں۔

راجہ میرا بیٹا ہے' میری اولاد ہے' میرا دوست' ساتھی' غمگسار سبھی کچھ تو راجہ ہے میں کیوں اپنے سب رشتے کھو دیتا۔

اور وہ سانپ جیسی زبانیں رکھنے والے لوگ' یہ گاؤں والے' کیا میں مر گیا تھا کہ ساری شام آنگن میں بیٹھے آپ دونوں کو دلاسا دیتے رہے۔ ان کی زبانیں اور بات کر رہی تھیں' آنکھیں اور...... وہ تسلی دینے نہیں تماشا دیکھنے آئے تھے۔ یہ دیکھنے آئے تھے کہ گاؤں کا سب سے بڑا شہ زور کس طرح اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔ اس کی پیٹھ جو مکر اور فریب سے زمین کے ساتھ لگی تھی' اس کا نظارہ کرنے آئے تھے وہ سب' مجھے نفرت ہے ان سب سے آخ تھو۔''

''مجھ پر رحم کر وا اچھو' میرے بڑھاپے پر رحم کر' میرے بازوؤں میں اور بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں ہے۔ اتنا بار نہ ڈال میرے اوپر۔'' منشی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ''اولاد ماں باپ کے بے روح جسم دیکھ سکتی ہے' لیکن ماں باپ کے وجود کو اسی دن دیمک لگ جاتی ہے جس دن انہیں اولاد کے بے روح جسم دیکھنے پڑتے ہیں۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں ہمارے بڑھاپے پر رحم کرو۔''

رجب علی شاہ کے لیے اس کے دل میں نفرت کی ایک اور لہر اٹھی پہلے سے زیادہ شدید۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر اپنے جذبات اعتدال پر لانے کی کوشش کی اور بمشکل بولا۔

''تو پھر ابا! کبھی مجھے بولنے کے لیے نہ کہنا۔ میری نفرت مجھے کچھ اور بولنے نہیں دیتی۔''

☆======☆======☆

"یہ سب کیا ہو رہا ہے رجب علی؟" پیر صاحب غصے اور پریشانی میں مبتلا تھے۔

"کیا بابا جان؟" اس نے یوں کہا جیسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔

"رجب علی! تم وارث ہو اس گدی کے‘ تمہیں خبر ہونی چاہیے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ گاؤں والے جاہل ہیں اور نہ جانے کیا کیا بک رہے ہیں۔ ان کی باتوں پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیسے کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نسیم اس گاؤں کی بیٹی تھی اور گاؤں کی ہر بیٹی کی عزت اور جان کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے‘ ہمارا فرض ہے۔"

"بابا جان! یہ عورتیں گاؤں کی گلیوں میں بے پردہ دندناتی پھرتی ہیں۔ ایسی صورتِ حال کا نتیجہ اس سے کیا مختلف ہوگا۔"

"یہ اس لیے بے پردہ رہتی ہیں کہ برقعے اوڑھ کر کھیتوں میں کام نہیں کیا جا سکتا اور ان کا کھیتوں میں کام کرنا ہماری معاشی مجبوری ہے۔"

"مجبوری ہے یا نہیں‘ مجھے اس سے بحث نہیں ہے بابا جان! جس ماحول میں یہ لڑکیاں رہ رہی ہیں‘ اس ماحول میں یہی سب کچھ ان کے ساتھ ہوگا۔" وہ بولا۔ "باقی رہا اس گھرانے کی تسلی تشفی کا کام تو وہ میں نے کر دیا ہے۔ چالیس دن تک کھانا انہیں حویلی سے ہی جائے گا۔ کفن دفن کے خرچ کی ذمہ داری بھی میں نے لے لی ہے‘ اس کے علاوہ کیا کیا جا سکتا ہے؟ خود سوچیں وہ لڑکی اتنی رات گئے باہر کیا کر رہی تھی۔ اس سارے معاملے میں وہ بھی یقیناً قصوروار تھی۔"

"ہوں‘ اتنی رات گئے اسے گھر سے باہر نہیں ہونا چاہیے تھا۔" پیر صاحب بھی سوچ میں پڑ گئے۔

"میں نے پتا کروایا تھا‘ اپنے گھر سے وہ یہ کہہ کر گئی تھی کہ رات گاؤں کی خالہ جی کے گھر گزارے گی۔ حالانکہ اس کی ماں نے اسے منع بھی کیا تھا‘ جبکہ خالہ جی کے گھر وہ بمشکل آدھا گھنٹہ رکی تھی اور یہ کہہ کر چلی گئی تھی کہ وہ اپنے گھر جا رہی ہے۔" رجب علی نے کہا۔ "آپ چاہیں تو میں مزید تحقیقات کر لیتا ہوں۔ میں اس لیے خاموش ہو گیا تھا کہ خواہ مخواہ مری ہوئی لڑکی کی بدنامی ہوگی۔"

"کسی بچی کی بدنامی نہیں ہونی چاہیے‘ نہ اس کی زندگی میں نہ زندگی کے بعد۔"

"جی بابا جان! اسی لیے میں نے گاؤں والوں کی ان فضول کہانیوں کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"ایسی بچیوں کے متعلق سوچ کر ہمارا دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ ابھی تمہاری شادی کے بعد گاؤں کے جن بچوں اور بچیوں کے رشتے ہمیں طے کرنے تھے‘ یہ بچی بھی انہی میں شامل تھی۔" انہوں نے افسردگی سے کہا پھر قدرے توقف سے بولے۔ "اور یہ اچھو والا معاملہ کیا ہے؟ ہم

نے علی کو تاکید کی تھی کہ تم سے پوچھ کر ہمیں بتائے‘ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ دن بدن پہلے سے زیادہ غیر ذمے دار ہوتا جا رہا ہے۔"

"آئی ایم سوری بابا جان! اس غیر ذمے داری کا مظاہرہ علی نے نہیں میں نے کیا ہے۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "علی نے مجھ تک آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر میں نے کہا کہ میں خود ہی آپ کو بتا دوں گا؟"

"اس بات سے ہمیں بہت دھچکا لگا ہے۔ یہ گاؤں والے پشتوں سے ہمارے خاندان کی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے کبھی ان سے سختی کا برتاؤ نہیں کیا۔"

"بابا جان! میں آپ کے رویوں پر تنقید نہیں کرنا چاہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقت تبدیل ہو گیا ہے۔ اس نئے دور کو اسی کے تقاضوں کے مطابق ہینڈل کرنا پڑے گا۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان لوگوں کی آنکھوں میں شرم باقی تھی‘ مگر اب یہ لوگ بے دیدے ہو گئے ہیں‘ اپنی مرضی چلانے لگے ہیں‘ کسی کو اس کے ظرف سے زیادہ مل جائے تو وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ آپ کی نرم خوئی کی وجہ سے یہ لوگ سر پر چڑھ گئے ہیں‘ یہاں کی ہر چیز تلپٹ ہو چکی ہے‘ سارا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ کوئی کام وقت پر نہیں ہوتا‘ کوئی شخص حویلی کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ سب اپنا اپنا اُلو سیدھا کر رہے ہیں۔"

"نہیں بیٹا‘ ایسا نہیں ہے اب بھی سب ہمارے اشارے پر گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے بابا جان کہ آپ نے ان لوگوں سے غلط توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ میں نے سب کاغذات کا جائزہ لیا ہے۔ ہر فصل سے ان لوگوں نے اپنے حصے سے زائد حصہ وصول کیا ہے‘ کسی کو دو چار بوری گندم زیادہ چلی جانے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا‘ غصہ مجھے اس بات پر آتا ہے کہ آپ کے مزارعوں نے ہمیں احمق سمجھتے ہوئے یہ دھاندلی کی ہے‘ وہ مانگ کر‘ بتا کر لے جائیں‘ مجھے کوئی اعتراض نہیں‘ مگر جب وہ ہمیں بے وقوف سمجھتے ہوئے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ حرکت کریں گے تو ہمیں بتانا پڑے گا کہ ہم احمق نہیں ہیں۔

سب سے برا حال تو اصطبل کا ہے‘ آپ کہتے ہیں بابا جان کہ یہ لوگ ہمارے اشارے پر جان تک قربان کر سکتے ہیں‘ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہے آپ کی نرم مزاجی نے ان کے اندر اتنا حوصلہ پیدا کر دیا ہے کہ ہماری بات ان کے لیے بے وُقعت ہو کر رہ گئی ہے۔"

"کیسی بات کر رہے ہو رجب علی؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بابا جان۔" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔ "اچھو کے پاس اتنا

بہترین گھوڑا تھا جتنا ہمارے پورے اصطبل میں نہیں ہے۔ اس احمق نے رائیڈنگ کے لیے بہترین گھوڑے کو تانگے میں جوت رکھا تھا۔"

"یہ گھوڑا ہم نے اسے عنایت کیا تھا۔" پیر صاحب نے کہا۔

"درست بابا جان لیکن اس کے ساتھ وہی ہوا' اس کا ظرف اتنا نہیں تھا کہ آپ کی عنایت کو سنبھال سکتا۔ بجائے اس کے کہ وہ کوئی عام سا گھوڑا منتخب کرتا' ایسا گھوڑا جو ایک واہیات تانگے کے قابل ہوتا' اس نے آپ کی نرم خوئی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بہترین گھوڑے کا انتخاب کیا' یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کی چیز حویلی کی چیز سے کمتر ہونی چاہیے' الٹا وہ ہمارا مقابلہ کرنے لگا۔"

"نہیں رجب علی! وہ بہت اچھا اور بہت پیارا جوان ہے' اس کا گھوڑا اس کا خواب تھا اور کے خوابوں کو چکنا چور نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"اس نے میری حکم عدولی کی جرأت کی۔ اس حویلی کی عزت قائم رکھنا میرا فرض ہے' میں کسی بھی جگہ کسی کو اس سے آگے نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ گھوڑا اس شخص کے قابل نہیں تھا' اس پر اس کا ردعمل جو میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا' آئندہ گاؤں میں کسی کو حکم عدولی کی جرأت نہیں ہوگی۔"

پیر صاحب گہرا سانس لے کر رہ گئے۔

"بیٹا! کسی کو ایسا حکم نہیں دینا چاہیے' جسے پورا کرتے ہوئے اسے تکلیف ہو۔"

"یہ تو چھوٹا سا امتحان تھا' جس میں اچھو ناکام رہا' وہ سر کیا کٹواتا' اس کے لیے تو ایک گھوڑا واپس کرنا مشکل تھا۔"

"تم اس سے سر طلب کرتے' وہ دے دیتا لیکن تم نے اس سے اس کے خواب طلب کیے تھے' جن پر ہمارا کوئی حق نہیں تھا۔ انسانوں کی نفسیات سمجھو رجب علی۔"

"آپ کا منصب بہت بلند ہے بابا جان اور میں آپ سے بحث کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر وہ گھوڑا اس کا خواب تھا تو میری بھی عزت تھی۔"

"ہمیں تمہاری عزت بہت پیاری ہے۔" بالآخر انہوں نے کہا۔ "لیکن بیٹا کوشش کرو' اس گاؤں میں پیار محبت بانٹو۔ ہم اچھو کی دلجوئی کرنا چاہتے ہیں مگر اس طرح کہ اس سے تمہاری عزت اور وقار پر کوئی حرف نہ آئے۔"

"آپ حکم دیں بابا جان۔"

"اچھو بہت کام کا جوان ہے' منشی کو اپنی طرف سے بلاؤ اور اسے کہہ کر اچھو کو اصطبل میں لگوا دو۔ گھوڑے اسے بہت پسند ہیں پھر وہاں اس کا اپنا گھوڑا بھی ہوگا' نہ تمہاری آبرو پر حرف آئے گا اور اس کی خلش بھی جاتی رہے گی۔"

"جو آپ کا حکم۔"

☆======☆======☆

حیدر علی اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس۔" اس نے اخبار منہ کے آگے سے ہٹایا۔

دروازہ کھلا اور رجب علی اندر داخل ہوا۔

"بھائی جان آپ؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ نے کیوں زحمت کی' مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"غرض میری تھی' اس لیے خود ہی چلا آیا۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ نے صرف حکم دیا ہوتا۔"

رجب علی نے پائپ میں تمباکو بھر کر اسے سلگایا پھر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"چند دن پہلے میں نے تمہاری ڈریسنگ ٹیبل پر انٹی میٹ کی بوتل دیکھی تھی۔ کیا وہ اب بھی تمہارے پاس ہے؟"

"وہ تو نہیں ہے' لیکن اور بہت سے پرفیومز ہیں' آپ چاہیں تو میں حاضر کروں؟"

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ "یہ بتاؤ کہ انٹی میٹ کی بوتل کہاں ہے؟"

حیدر علی چند ثانیے خاموش رہا پھر بولا۔

"وہ میں نے گوری کے لیے خریدی تھی۔"

"ہوں۔" وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر پائپ کا کش لے کر بولا۔ "پرانے کنویں کے پاس اسی پرفیوم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔"

"آں۔" حیدر علی نے مناسب الفاظ سوچنے کی کوشش کی۔ "کل رات ہم وہاں ملے تھے۔"

"چلو ایک الجھن تو رفع ہوئی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن علی! اگر تمہیں وہاں گوری سے ملنا تھا تو مجھے بتا تو دیا ہوتا۔ تمہیں کوئی ناخوشگوار صورتِ حال بھی پیش آ سکتی تھی۔"

وہ خاموش رہا۔

"یہ زیادہ بہتر نہ ہوتا کہ تم اس فضول جگہ کے بجائے کسی بہتر جگہ کا انتخاب کرتے' مثلاً ڈیرے پر بلا لیتے۔"

"ہمارے لیے وہی جگہ بہتر ہے۔" وہ قدرے تامل سے بولا۔

"اگر تم راز داری کے خیال سے انکار کر رہے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ڈیرے پر موجود کوئی ملازم زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"درست کہہ رہے ہیں آپ' لیکن یہ گوری کا اصرار ہے۔"

"ٹھیک ہے جیسا تم چاہو' آئندہ رات کے وقت کوئی بھی وہاں کا رخ نہیں کرے گا۔"

"شکریہ۔" وہ مسکرایا۔

"تم باہر بھی نکلا کرو' کچھ زمینوں کی دیکھ بھال اور دوسرے مسائل پر نظر رکھا کرو۔"

"مجھے ان چیزوں سے ایک فیصد بھی دلچسپی نہیں ہے انہیں آپ ہی سنبھالیں۔"

"ابھی تو میں سنبھال لوں گا' لیکن کچھ عرصہ بعد ذمہ داریاں تمہارے کاندھوں پر بھی آئیں گی' اس وقت کے لیے تیاری تو کرلو۔"

"ہوجائے گی تیاری بھی۔ ابھی کچھ عرصہ میں ان جھمیلوں سے آزاد رہنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا ہے آزاد رہو۔" رجب علی نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں ہوں ہر چیز کی دیکھ بھال کرنے کے لیے۔"

"آج یہ کیا عجیب وغریب باتیں پھیلی ہوئی ہیں؟" اس نے قدرے توقف سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا' وہ ایک لڑکی اٹھوالی تھی' اس نے حماقت میں اپنی جان گنوائی' اس پر یہ فضول کہانیاں مشہور ہوگئی ہیں۔" رجب علی نے بیزاری سے کہا۔

"کس نے اٹھوائی تھی لڑکی؟" حیدر علی ایک لمحے کے لیے تو کچھ بھی نہ سمجھا۔

"میرے حکم پر اٹھائی گئی تھی اور کون اٹھواتا۔"

"کیا؟" اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تم اس قدر حیران کیوں ہو؟"

"یہ نہیں کرنا چاہیے تھا آپ کو۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"تمہاری اخلاقیات کے دائرے خاصے تنگ ہیں علی' تمہارا دم نہیں گھٹتا ان میں؟"

"میں اخلاقیات کا علمبردار نہیں ہوں' لیکن کچھ چیزیں میرے لیے تکلیف دہ ضرور ہیں اور پھر میری...... میرا مطلب ہے' گوری بھی اسی گاؤں کی ہے۔"

"تم اس لیے پریشان ہوگئے ہو۔" رجب علی مسکرایا۔ "تمہاری گوری کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو میں اس کی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ اس طرف سے تم بالکل پریشان مت ہو۔"

"میں صرف اسی لیے پریشان نہیں ہوں' گاؤں کی سب لڑکیوں کی عزت کی حفاظت کی ذمہ داری اس حویلی پر عائد ہوتی ہے۔"

"حویلی کی ذمہ داری انہیں برقعہ اوڑھانا نہیں ہے۔ بے پردہ عورتوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ہی کرتا ہے۔" رجب علی نے اطمینان سے کہا۔

"درست فرمایا آپ نے لیکن کیا بحیثیت مرد آپ یا مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم بے پردہ عورتوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب بن کر ضرور نازل ہوں؟" حیدر علی نے اپنا غصہ دبانے کی کوشش کی۔

رجب علی کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں۔

"یہ تمہارے معاملات نہیں ہیں علی' تمہاری گوری کو کچھ نہیں ہوگا' باقی سب کی فکر کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔"

"انسان اپنی تسلی کے لیے سو بہانے گھڑ لیتا ہے' سو دلیلیں دے دیتا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

رجب علی بدمزگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں ہے۔"

"اوہ گاڈ!" اس کے جانے کے بعد حیدر علی نے سر پکڑ لیا۔ "یہ میں کس جگہ پھنس گیا ہوں؟ بے تکے اور نامعقول رویوں کے بیچ' کتنے سکون سے انگلینڈ میں رہ رہا تھا۔ نہ کوئی فکر تھی نہ پریشانی۔ دن رات اپنے تھے' پتا نہیں کیوں یہ جگہ میرے لیے دلدل بنتی جارہی ہے۔ اور معلوم نہیں رات کو گوری آئے گی بھی یا نہیں۔ گاؤں کی اور لڑکیوں سے زیادہ پڑھی لکھی ہے پھر بھی انہی فضول سے وہموں کو خود سے چمٹائے ہوئے ہے۔ مگر میں اس پر غصہ بھی تو نہیں ہوسکتا۔ وہ ہے ہی اتنی پیاری' اتنی اچھی کہ اسے دیکھ کر بے ساختہ دل میں محبت ابھر آتی ہے۔ غصے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اب تو اس کے بغیر ایک پل رہنا بھی محال ہے۔"

☆======☆======☆

"خدا کے لیے زرینہ آج رات رک جاؤ۔" رضیہ نے اس کی منت کی۔ "میرا دل ڈوب رہا ہے' مجھے لگتا ہے کہ آج رات پھر کچھ ہوگا۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔"

"کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" رضیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نسیم کے ساتھ کیا ہوا۔ ایک دن میں ہی بھول گئیں۔"

"اس کے ساتھ کچھ اور ہوا ہے رضیہ' وہ نہیں ہوا جو سب سمجھ رہے ہیں۔"

"یہ یا وہ کچھ تو ہوا ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوگا تم چپ کرکے سو جاؤ۔" زرینہ جلدی سے کھڑکی پھلانگ گئی۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی جب وہ پرانے کنویں کے قریب پہنچی تو حیدر علی پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔

"شکر ہے تم آگئیں۔"

"آپ کو توقع نہیں تھی؟"

"تھی بھی اور نہیں بھی۔" وہ کنویں کے قریب ٹوٹے بیچ کی طرف بڑھے۔

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ تم بہت وہمی ہو۔ میں سوچتا رہا کہ آج کی کہانیاں تم پر نہ جانے کیا اثر ڈالیں گی۔"

"میں سوچ رہی ہوں۔" وہ حیدر علی کے برابر بیٹھ گئی۔ "کل رات آپ نے ٹھیک کہا تھا نسیم کی موت کی وجہ بلائیں نہیں ہیں۔ بلائیں کنویں سے نکلتیں تو پہلے ہم پر جھپٹتیں۔ نسیم چلانے کی آواز تو بہت دور سے آ رہی تھی جبکہ اس کی لاش کنویں کے قریب سے ملی ہے۔ گاؤں اسی لیے غلط فہمی کا شکار ہو رہا ہے' کیونکہ اس کی لاش ان کھیتوں سے ملی ہے۔" اس نے قریبی کھیتوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اور اس لیے بھی کہ یہاں خوشبو پھیلی ہوئی تھی' لیکن ہم جانتے ہیں کہ خوشبو کی وجہ کیا تھی اور یہ بھی کہ نسیم کی آواز بہت دور سے آ رہی تھی ڈیرے کی سمت سے۔"

"تھینک گاڈ! کہ تم نے اپنے وہموں سے چھٹکارا پا کر اپنی عقل کو بھی استعمال کیا۔"

"مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ایک مرتبہ پھر کنویں میں پتھر پھینکیں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "نہیں اب نہیں پھینکوں گا۔"

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ نسیم کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ اتنی رات گئے تک گھر سے باہر رہتی۔"

"نسیم کے ساتھ کیا ہوا کو چھوڑو' یہ پوچھو کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟" وہ اس کا ذہن اس واقعے کی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا۔

"کیا ہوا آپ کے ساتھ؟"

وہ ہنسی تو اس کے موتیوں کی لڑیوں سے سفید دانت چمک اٹھے۔ حیدر علی چند ثانیے تک اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔" وہ شرما گئی۔

"دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی حسین' کتنی سندر ہو۔ ایک مرتبہ مجھے یونان جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں میں نے ایفروڈائنا کا مجسمہ دیکھا تھا۔"

"کس کا؟"

"قدیم یونانیوں کی حُسن' محبت اور جنگ کی دیوی ایفروڈائنا کا۔" وہ بولا۔ "اسے دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ اس سے بڑھ کر کوئی حسین نہیں ہو سکتا' لیکن تمہیں دیکھنے کے بعد میں نے اپنا یہ خیال بدل دیا۔"

"میں بہت خوبصورت ہوں شاہ جی؟"

"نہیں' تم بے حد حسین اور دلکش ہو گوری۔"

"اگر میں پیوند لگے کپڑے پہن لوں' تب بھی بہت حسین لگوں گی؟"

"چاند تو چاند کہلاتا ہے' اپنے داغ کے ساتھ بھی۔"

"اگر میں ایسی نہ ہوتی تو؟" اس نے اپنی شربتی آنکھیں حیدر علی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں بہت حسین نہ ہوتی تب؟"

"تب بھی کیا فرق پڑتا؟"

"پھر بھی آپ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے' اسی طرح میرا انتظار کرتے۔"

"تمہیں کیوں شک ہے؟"

"رضیہ کہتی ہے کہ میں بدصورت اور بدشکل ہوتی تو پھر شاید آپ مجھ سے اتنا پیار نہ کرتے۔" اس نے کہا۔ "شاہ جی! آپ مجھ سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ میں خوبصورت ہوں۔"

وہ چند ثانیے خاموش رہا۔

"بتائیں گے نہیں۔"

"سچ سچ بتا دوں؟" اس نے کہا۔

"جی۔"

"شروع میں تو یہ تمہارا حُسن ہی تھا جس نے مجھے تمہاری طرف بڑھنے پر مجبور کیا تھا۔ تمہیں دیکھ کر خیال آیا تھا کہ تم ہی وہ منزل ہو جس پر مجھے ڈیرے ڈالنے ہیں۔ پھر دوسری ملاقات پر تمہاری باتیں سنیں تو تمہارا حُسن ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ یاد ہے تمہیں وہ ملاقات؟"

زرینہ نے آنکھیں موند لیں اور وہ سارا منظر جزئیات سمیت اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

"اب میں تم سے اس لیے محبت کرتا ہوں کہ تم محبت کیے جانے کے قابل ہو' کیونکہ میرا دل یہ صدا دیتا ہے کہ تم میری ہو بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہیں۔"

"اگر بدصورت ہو جاؤں پھر بھی آپ مجھ سے اسی طرح پیار کرتے رہیں گے۔"

حیدر علی کو اس کی معصومیت پر بے اختیار پیار آ گیا۔

"خوبصورتی اور بدصورتی انسان کے اندر ہوتی ہے گوری۔ خوبصورت شکل وصورت تو اضافی خوبی ہوئی ناں تم اندر باہر حُسن سے رنگی ہوئی ہو۔ اگر تمہاری شکل خوبصورت نہ رہی' تب بھی تمہارے اندر کی خوبصورتی تمہارے چہرے پر حُسن بن کر چھا جائے گی۔ تم تب بھی میری ہی رہو گی۔"

"سچ؟" وہ کھل اٹھی۔ "آج میں بہت خوش ہوں۔"

"تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔"

"بڑے شاہ صاحب سے پھر کوئی بات ہوئی؟"

"ہوں' ذرا ان کی شادی کا ہنگامہ سرد پڑ جائے تب کچھ کروں گا۔"

''ابا جی چاہتے ہیں کہ بڑے شاہ صاحب کی شادی کے بعد پیر صاحب سے کہہ کر دونوں بہنوں کی شادی بھی کروادیں۔''

''یہ کس نے کہا تم سے؟''

''اُڑتے اُڑتے سنا ہے۔''

''تم فکر مت کرنا' میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔''

''اب میں کوئی فکر نہیں کرتی۔''

''وہ کتاب پڑھی تم نے جو میں نے دی تھی؟''

''تھوڑی سی۔''

''کیسی لگی؟''

''بہت اچھی۔''

''کچھ یاد ہے کیا پڑھا تھا؟''

''ایک نظم بہت اچھی تھی لیکن وہ جدائی کی نظم تھی۔''

''میرا جی کی زندگی میں وصل کے لمحے آئے ہی نہیں تھے انہوں نے جو کچھ لکھا' وہ سب جدائی اور دوری کے متعلق ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''مجھے جدائی اور دوری کے ذکر سے وحشت ہوتی ہے پر وہ نظم بہت خوبصورت ہے۔''

''سناؤ گی؟''

چند لمحے زرینہ نے اپنے ذہن میں نظم کو دہرایا پھر بولی۔

''کلیاں چٹکیں' غنچے مہکے
رنگ برنگے پنچھی چہکے
اپنی اپنی باتیں کہہ کے
کون بتائے کہاں گئے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے
چھڑی ہوئی ہے کتھا سہانی
ایک کہانی سب کی زبانی
کچھ انجانی' کچھ من مانی
پل پل' چھن چھن رنگ نئے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے
دکھ کے دن اور سکھ کی راتیں
ہونی یا انہونی باتیں

کس کی جیتیں کس کی ماتیں
آنکھ سے اب تک بھید چھپے ہیں۔
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے۔''

''گڈ۔'' حیدر علی نے اسے داد دی۔ ''تمہیں تو یہ زبانی یاد ہے۔''

''شکریہ۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''آپ کو اچھا لگتا ہے ناں کہ میں پڑھوں' اس لیے اب میں ضرور پڑھوں گی۔''

''تم زیبی آپی سے ملی نہیں۔'' حیدر علی نے موضوع پلٹا۔ ''انہوں نے تمہیں بلایا بھی تھا۔''

زرینہ مضطرب ہوگئی۔

''گویا زیب النساء نے انہیں اپنی اور میری ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' اس نے سوچا پھر حیدر علی کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں پہلو بدل کر بولی۔

''شاہ جی' میں وہاں جانا نہیں چاہتی' کچھ اس لیے کہ وہاں قدم رکھتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے' میری ہمت جواب دے جاتی ہے اور کچھ اس لیے کہ وہاں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

''چند دن رہ گئے ہیں بھائی جان کی شادی میں۔ ایسا کرو' اس شادی میں ان سے مل لینا۔''

''میں شاہ جی؟'' پل کے پل میں اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔''

''اوہو! ٹھیک ہے مت جاؤ۔ روتی کیوں ہو؟'' اس نے اپنا رومال اس کی طرف بڑھایا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے' تھوڑی دیر میں ابا جی تہجد کے لیے جاگ جائیں گے۔'' اس نے رومال سے آنکھیں صاف کیں۔

''چلو میں چھوڑ آتا ہوں۔''

وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر واپسی کے راستے پر چل پڑے۔

☆======☆======☆

حویلی ویسے تو ہمیشہ ہی پُر رونق رہتی تھی' مگر ان دنوں اس کی رونق دیکھنے والی تھی۔ عرصے بعد حویلی کے در و دیوار ایسی خوشیاں دیکھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ مسرت نذری بیگم کو تھی۔ کتنی خواہش تھی انہیں اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی۔ اتنی دفعہ پیر صاحب سے دبے دبے انداز میں کہا بھی کہ اب رجب علی کی شادی کر دینی چاہیے' لیکن ان کی طرف سے ہر دفعہ یہی سننے کو ملتا تھا کہ کچھ دن آزادی سے گزار لینے دو اسے۔ نذری بیگم کو تو یوں لگنے لگا تھا' جیسے ان کی زندگی میں یہ مراد پوری ہی نہیں ہوگی۔

مگر اب یہ دن آنے والا تھا' جس دن کی خواہش میں انہوں نے برسوں ایک ایک دن گن گن کر کاٹا تھا۔ بہو بھی انہیں پسند تھی۔ رجب علی کی شادی ہوتی تو حیدر علی کے لیے بھی راستہ

کھلتا۔

یاسمین بہت اچھی تھی، لیکن ان کی بھانجی نہیں تھی۔ جو محبت انہیں فوزیہ سے تھی، وہ یاسمین سے نہیں تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ سگی بھانجی اور پیر صاحب کی بھتیجی میں اتنا فرق ہونا تو لازمی تھا۔

ان کا بس چلتا تو وہ فوراً ہی سخاوت کی بھی شادی کر ڈالتیں۔ وہ چھوٹی عمر میں شادی کر دینے کی قائل تھیں۔ ان کے خیال میں رجب علی اور حیدر علی دونوں کی شادی اب سے پہلے ہو جانا چاہیے تھی۔

خیر اب وہ خوش تھیں۔ دیر سے ہی سہی ان کی زندگی میں یہ خوشی آ رہی تھی۔ وہ خوش ہو کر حویلی کے در و دیوار دیکھتیں جو جگمگا رہے تھے، زیور کپڑے دیکھتیں، مہندی کے تھال سجتے دیکھتیں اور ان کا دل خوشی سے معمور ہو جاتا۔

☆======☆======☆

چند دن کے شور شرابے کے بعد حالات ایک مرتبہ پھر معمول پر آ چکے تھے۔ نسیم اور بلاؤں کا تذکرہ اب بھی ہوا کرتا تھا، لیکن گاؤں کی فضا میں جو انجانا سا خوف تیرتا رہتا تھا وہ کافی حد تک تحلیل ہو چکا تھا۔ اچھو والے واقعے کی اہمیت تو نسیم کے قصے کے ساتھ ہی دم توڑ گئی تھی مگر خود اچھو ابھی تک دکھ اور اذیت کے خول توڑنے میں ناکام رہا تھا۔

جو تھوڑی بہت گفتگو اس کے متعلق ہوتی تھی اس کا مرکز گاؤں کا واحد اکھاڑا تھا، جہاں نوجوان کسرت کرتے وقت اکثر اس کا ذکر کرتے تھے جبکہ باقی لوگ اس قصے کو تقریباً بھلا چکے تھے۔

پھر بھی اچھو گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں والوں کی یادداشت اتنی بری بھی نہیں ہے کہ اسے دیکھنے کے باوجود بھی انہیں یہ قصہ یاد ہی نہ آ سکے۔

وہ تصور میں دیکھ سکتا تھا کہ گھر سے نکلتے ہی سب اس کی جانب انگلیاں اٹھا کر ہنسنے لگیں گے، جو نہیں ہنسیں گے ان کے ہونٹ بھی تمسخر سے سکڑ جائیں گے۔ آنکھوں کے گوشے اس کی ذلت کو یاد کر کے چمک اٹھیں گے۔ اور شاید کوئی مذاق اڑاتا فقرہ اس کا کلیجہ بھی چھلنی کر دے، اس لیے وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔

''اچھو۔'' منشی فضل دین ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر گھر میں داخل ہوا۔

''کیوں چلاتے ہو، جبکہ جانتے بھی ہو کہ وہ سارا دن اور ساری رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا ہے، بالکل چپ چاپ، گم صم۔'' ماں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور آٹا گوندھنے میں مصروف ہو گئی۔

منشی تھک ہار کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔

''پیر صاحب سے کہہ کر اب اس کی شادی کروا دیتے ہیں، بیوی آ جائے گی تو اسے غمگسار

مل جائے گا۔ دل کے دکھ کہہ دینے سے بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اچھو نے تو ہر بات دل پر لے لی ہے، کسی سے کہہ سن کر بوجھ ہلکا بھی تو نہیں کرتا۔''

''اب اس پر شادی یا کسی اور بات کے لیے زور مت ڈالنا۔ کیا خبر غصے میں آ کر کیا کر بیٹھے۔'' ماں نے آٹے کی پرات سے سر اٹھایا۔ ''اسے کچھ ہو گیا تو ہم ختم ہو جائیں گے۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟'' منشی نے سر ہلایا۔ ''روز ایک نئی افتاد ٹوٹ پڑتی ہے۔''

''پھر کچھ کہا شاہ صاحب نے؟''

''ہاں۔'' منشی تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کہہ رہے ہیں کہ اچھو آئندہ سے حویلی کے اصطبل میں سائیس کا ہاتھ بٹائے۔''

''کیا؟'' وہ دہل گئی۔ ''اچھو نہیں مانے گا اور ایک نئی مصیبت نازل ہو گی۔ یا اللہ ہم کس عذاب میں گرفتار ہو گئے ہیں۔''

اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ اچھو کے کمرے میں چار پائی چرچرائی۔

وہ دونوں دم سادھ کر وہیں دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد کمرے کے دروازے میں اچھو نمودار ہوا اور چلتا ہوا ان کے قریب آ بیٹھا۔ اتنے دن بعد اپنی مرضی سے اسے کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر ماں جھٹ پٹ آگے بڑھی اور اس کا ماتھا چوم لیا۔

''میرا لعل، تُو بیٹھ میں کھانا نکالتی ہوں۔''

''پہلے روٹیاں تو پکا لے۔'' منشی بولا۔

''لو یہ کتنی دیر کا کام ہے۔ ایک منٹ میں پک جائیں گی۔'' اس نے فٹافٹ لکڑیاں جلائیں اور توا رکھ کر روٹیاں پکانے لگی۔

''آج میں نے اپنے بیٹے کی پسند کی مونگ کی ثابت دال پکائی ہے؟'' اس نے روٹی توے پر ڈالی۔

وہ چپکا بیٹھا رہا۔ ماں باپ کے لیے یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ کمرے سے باہر نکلا ہے۔

''اس دن بول پڑا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ پھر بولنے لگے گا۔'' انہوں نے سوچا۔

صبح جب منشی حویلی جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگا تو چار پائی پر بیٹھا اچھو بھی بڑے بڑے قدم اٹھاتا اس کے پاس چلا آیا۔ منشی کا دل خوش ہو گیا۔

''باہر چلنا ہے؟ میں تو حویلی جا رہا ہوں تُو بھی اپنے یار بیلیوں کو مل آ۔''

وہ دونوں گھر سے باہر نکلے تو گلی میں بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔

''اچھو باہر نکلا ہے، اچھو کو دیکھو۔''

احساس شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''کتنا کمزور ہو گیا ہے۔''

''ہاں' غریب کو شاہ صاحب نے بہت بری طرح مارا تھا۔''

''چچ' چچ...... بے چارا۔''

''رجب علی شاہ......سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔'' اچھو کے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔

لوگوں کو بھولا بسرا واقعہ یاد آ گیا تھا اور ان کی یہ یادداشت اس کے دل پر برچھیاں برسا رہی تھی۔ گاؤں کے بڑے بازار سے اسے گزرتے دیکھ کر کتنے نوجوان اس کی جانب بڑھے۔

''اچھو! تم کہاں چھپے ہوئے تھے اتنے دن سے؟ اکھاڑے کیوں نہیں آئے' ہم آئے تھے تمہارے گھر پر چاچی نے کہا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' ہوا کیا تھا؟''

نوجوانوں کو پاس آتے دیکھ کر منشی رک گیا تھا' اس لیے اچھو بھی رک گیا۔ وہ سب کی باتیں سن رہا تھا۔ سر جھکائے' لیکن اس نے کسی کو جواب نہیں دیا۔

''اچھو!'' ایک نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ ''تم بول کیوں نہیں رہے۔''

منشی سے رہا نہ گیا۔ ''یہ سب اس کمبخت گھوڑے کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ منحوس جانور ہمارے گھر آتا نہ یہ دن دیکھنا پڑتا۔''

''اس بے چارے گھوڑے کو کیوں کوستے ہو چاچا' اس نے واپس کر دیا ہوتا تو بڑے شاہ صاحب اس پر ہاتھ کیوں اٹھاتے۔''

''ہاں چاچا! اچھو کو بڑے شاہ صاحب کی حکم عدولی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ تو اپنے گلے خود ہی مصیبت ڈالنے والی بات ہوئی ناں۔''

''مانا کہ راجہ بہت اچھا گھوڑا تھا' لیکن تھا تو بہرحال جانور...... ایک جانور کی خاطر شاہ صاحب کا حکم ٹالنا......توبہ توبہ!''

اچھو اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ اس کے گرد لگے چھوٹے سے مجمع کا موضوع گفتگو اس کی ذات تھی' لیکن اس پر ہونے والی تمام تر بحث میں سب نے اسی کے وجود کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ سب اس کے متعلق باتیں کر رہے تھے' اسے گھیرے میں لے کر' اسے نظر انداز کر کے۔

''بس اپنی تو قسمت ہی خراب ہے' جس دن سے یہ واقعہ ہوا ہے' اس دن سے بات کرنا چھوڑ رکھی ہے اس نے۔ زبان ہوتے ہوئے گونگا ہو گیا ہے۔'' منشی نے آہ بھری۔

''چاچا سنا ہے بڑے شاہ صاحب نے اچھو کو اصطبل میں کام کرنے کے لیے بلوایا ہے۔''

منشی نے ایک نظر اچھو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جو بالکل سپاٹ تھا پھر اقرار میں گردن ہلا دی۔

''تو پھر کیا اچھو کام پر جائے گا؟''

منشی نے ٹھنڈی آہ بھر کر اچھو کی طرف دیکھا۔ اس کی توقعات کے برعکس اچھو نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اچھو! تو واقعی کام پر جائے گا؟'' منشی نے اس کا بازو ہلا کر پوچھا۔

اچھو نے ایک مرتبہ پھر اقرار میں گردن ہلائی اور سر جھکا کر حویلی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ منشی بھی اپنا تہہ بند سنبھالتا اس کے پیچھے لپکا۔

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ' زیب النساء کے کمرے میں بیٹھا اسے اور مہر النساء کو لندن کے قصے سنا رہا تھا۔

''اور آپی! میں نے آپ کو موم کے عجائب گھر کی تصویریں تو دکھائی تھیں ناں۔''

''ہاں' موم کے بنے ہوئے مجسمے یوں لگتے تھے' جیسے جیتے جاگتے انسان کھڑے ہوں۔''

''وہاں سچ مچ انسانوں اور مجسموں میں پہچان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن لندن خوبصورت شہر نہیں ہے۔ جب ہنگامے اور شور شرابے سے میرا دل بھر جاتا تھا تو میں سیدھا کینٹ کاؤنٹی چلا جاتا تھا بہت خوبصورت' بے حد پُرسکون جگہ ہے کینٹ۔ تا حدِ نگاہ گہرا سبزہ یوں لگتا ہے' جیسے سبز ریشم بکھرا ہوا ہو۔''

''مجھے ہریالی بہت پسند ہے۔'' زیب النساء بولی۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ چاہے چھوٹی سی کٹیا ہو' لیکن ہر طرف سبزے سے گھری ہو' اونچے اونچے درخت ہوں' ہولے ہولے بہنے والی ندی ہو اور آسمان پر بہت سے پنچھی ہوں۔''

''جیسا منظر آپ نے بتایا ہے' ایسا تو کوئی پکنک اسپاٹ ہی ہو سکتا ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''ایسا نہ کریں آپی کہ کسی دن پکنک پر چلیں' بہت مزہ آئے گا۔''

''پکنک! وہ کیا ہوتا ہے؟''

''پکنک کہتے ہیں۔'' وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ''کسی خوبصورت مقام پر گھومنے پھرنے اور سیر کرنے کو جب سیر کر کے انسان تھک جاتا ہے تو پھر سب مل کر وہاں کھانا کھاتے ہیں۔''

''سنا بڑی آپا! علی کیا کہہ رہا ہے؟'' زیب النساء مسکرائی۔ ''کبھی ہم ایسا کر سکتے ہیں؟''

''اسے کچھ نہ کہو زیبی' یہ سانس تو یہاں نیاز پور کی فضا میں لے رہا ہے لیکن اس کا دل اور دماغ ابھی تک ولایت میں ہیں۔'' مہر النساء بولی۔

''کیوں؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟'' حیدر علی چڑ گیا۔ ''بات پردے کی ہے ناں تو ہم جہاں بھی گئے سب سے پہلے وہاں پردے کا انتظام کریں گے۔''

مہر النساء ایسے ہنسی جیسے کسی ننھے سے بچے کی ضد دیکھ کر ہنس رہی ہو۔

''آپ یوں کیوں ہنس رہی ہیں آپا! ایسا ہونا ممکن ہے اگر آپ دونوں اس بات کو ممکن بنانا چاہیں تو۔''

''کیوں بابا جان کی نگاہوں سے خود کو گرانا چاہتے ہو علی؟'' مہر النساء یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

"ہم نے خود پر بہت سے بند باندھ رکھے ہیں۔" زیب النساء نے ہولے سے کہا۔ "ان میں ایک بھی دراڑ پڑ گئی ناں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ پتا نہیں کیا کیا بہہ جائے گا اس سیلاب میں۔

پہلی خواہش کی طرف قدم بڑھنے سے روک لینا مشکل ہوتا ہے ناممکن نہیں' لیکن ایک دفعہ قدم بڑھ جائے تو پھر خواہشوں کا ایسا دلفریب اور لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا' قدموں کو روک لینا ممکن نہیں رہتا۔ اس راستے پر ایک مرتبہ قدم بڑھ جائیں تو واپسی کے سب در خود ہی بند ہو جاتے ہیں۔

میں نہیں چاہتی کہ میں اپنے صبر وضبط کو کسی امتحان میں ڈالوں۔ بہت کمزور ہوں میں۔ ایسے کسی امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکوں گی۔ مجھے پتا ہے کہ پہلا قدم روکنا بے حد مشکل ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ یہ قدم یہیں رکا رہے۔ یہ چھوٹی سی خواہش پوری نہ ہوئی تو کچھ نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس یہ پوری ہو گئی تو پتا نہیں کون کون سی خواہشیں بے لگام ہو جائیں گی۔"

چند لمحے حیدر علی اسے تکتے گیا۔

"آپی آپ کی خواہشیں جائز ہیں تو پھر کیوں بند باندھتی ہیں ان پر؟ کیوں نہیں حق مانگتیں اپنا۔"

"کن سے اپنا حق مانگوں؟ ان سپاٹ دیواروں سے؟ یا پھر ان ساکت و جامد کرسیوں اور مسہری سے؟ جس دن میری صدا ان دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آئی اس دن حویلی میں قیامت آ جائے گی۔ اس حویلی کی بنیاد اینٹ گارا نہیں وہ نام نہاد معیارِ عزت ہے جس کی اَن دیکھی زنجیروں میں ہم سب بندھے ہوئے ہیں۔ تم چاہتے ہو کہ یہ حویلی زمین بوس ہو جائے۔"

"ہو جانے دیں آپی۔ اسے زمین بوس ہو جانے دیں۔" وہ بولا۔ "کوئی بھی مادی چیز انسان سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ اس جہاں کی سب سے قیمتی چیز انسان ہے۔ اسے ختم نہیں ہونا چاہیے۔ گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہیے۔ اس حویلی کی برجیوں کو آپ کے ناتواں کندھے بہت عرصے تک سہارا نہیں دے سکیں گے۔"

"خدا کے لیے علی ہمیں بغاوت پر مجبور مت کرو۔" مہر النساء نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ "ہم خوش نہیں ہیں لیکن اسی طرح رہنا چاہتے ہیں۔"

"آپی میں آپ کو بغاوت کرنے کو نہیں حق مانگنے کو کہہ رہا ہوں۔"

زیب النساء اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ کہاں چل دیں؟"

"مجھے نماز پڑھنی ہے۔"

"ابھی بہت وقت ہے۔ آپ کی نماز قضا نہیں ہوگی۔ پلیز ابھی بیٹھیں۔" حیدر علی نے اس

کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس بٹھا دیا۔

"زرینہ سے ملاقات ہوئی؟" زیب النساء نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔

"ہاں۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اب تو روزانہ ملاقات ہوتی ہے۔"

"تم میں بابا جان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کا حوصلہ ہے؟" زیب النساء کے انداز میں چیلنج تھا۔

"آپی' میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھ میں حوصلے کی کمی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ باپ کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔ جو بات میں نگاہیں نیچی رکھ کر منوا سکتا ہوں' اس کے لیے ان کے سامنے تن کر کھڑا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ بات حوصلے کی نہیں محبت کی ہے اور میری محبت نے میرے حوصلے کو سلایا ہوا ہے۔ میں گوری کے لیے سب سے ٹکر لوں گا۔ ضرورت پڑی تو ابا جان سے بھی' لیکن اس سے میری ان کے ساتھ محبت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ نہ ہی میں ان کے مرتبہ کو نقصان پہنچا کر اپنی کوئی خواہش پوری کروں گا۔"

"تمہیں اپنی بات میں دوغلا پن محسوس نہیں ہو رہا؟" مہر النساء نے کہا۔

"آپ کو ہو رہا ہے؟" حیدر علی نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔

"ہاں...... جب تک تمہاری نگاہیں نیچی رہیں گی تب تک تم کچھ بھی نہیں منوا سکو گے۔"

"نہیں آپا! منوانے کے لیے آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا ضروری نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کے لیے گریبان نوچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔" وہ بولا۔ "پتا ہے آپا...... جدوجہد اور حصول مسلسل اور متواتر عمل ہوتے ہیں۔ مجھے بابا جان سے اختلافات ہیں۔ شدید اختلافات۔ بڑے بھائی جان سے بھی ہیں۔ شدید نہیں' شدید ترین۔ بعض اوقات میں مایوس بھی ہو جاتا ہوں لیکن یہ مایوسی وقتی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار ان سے بات چیت کرتے ہوئے جذباتی بھی ہو جاتا ہوں لیکن پھر سوچتا ہوں کہ صدیوں سے قائم یہ طرز زندگی' یہ ماحول' رِیت رواج اور اندازِ فکر اتنی جلدی تو نہیں بدل سکتا۔ آہستہ آہستہ ہی بدلے گا ناں۔"

"علی جب تم اتنی ساری مصلحتوں کا شکار ہو تو ہم سے کیوں کہتے ہو کہ ہم اپنا حق چھینیں؟" زیب النساء نے تلخی سے کہا۔ "تمہارے حوصلے کو محبت نے باندھ رکھا ہے لیکن ہمارے پاس تو حوصلہ ہی نہیں ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ ہم بھی جدوجہد اور حصول کو متواتر اور مسلسل عمل سمجھتے ہوئے روز بابا جان کے سامنے نگاہیں جھکا کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کریں؟ تم نظریں نیچی رکھ کر ان سے گوری کا مطالبہ کرو تو ہم بھی ایسا ہی کوئی مطالبہ کرنے ان کے سامنے پہنچ جائیں۔ کر سکتے ہیں ہم ایسا؟

ہم پاکیزگی کے لیے آسمان پر بیٹھے ہوئے ہیں جہاں سے باقی سب لوگ کیڑے مکوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں انسان نہیں رہنے دیا' دیویاں بنا دیا گیا ہے۔ انسانی صفات ہمارے لیے

ممنوع ہو چکی ہیں۔ ہم ایک قدم نیچے اتر آئے تو نہ ہماری جگہ آسمان پر رہے گی نہ زمین پر۔"

کچھ دیر تک حیدر علی سوچ میں گم سگریٹ کے کش لیتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا۔

"ہم سب کا سوچنے اور عمل کرنے کا انداز اس لیے مختلف ہے کیونکہ ہم نے زندگی کو مختلف طریقوں سے گزارا ہے اور اس لیے بھی کہ بدقسمتی سے میرے اور آپ کے لیے معاشرے اور اخلاق نے مختلف دائرے کھینچ رکھے ہیں۔ ہم دہرے معیاروں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان معیاروں کو فخر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بابا جان کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کے بیٹے ولایت سے تعلیم حاصل کر کے لوٹے ہیں۔ اور اس بات پر بھی کہ ان کی بیٹیوں کے کمرے کا رخ تو ہوا بھی نہیں کرتی۔

ایسے معاشرے میں نہ وہ غلط ہے جو میں سوچتا ہوں نہ ہی وہ جو آپ سوچتی ہیں۔ مجھے آگے بڑھنے کا اختیار اسی معاشرے نے دیا ہے اور اسی نے آپ کے قدم زمین سے جکڑ دیے ہیں۔"

"نہیں۔" زیب النساء نے سر ہلایا۔ "کتنی عجیب بات ہے کہ ہم دونوں بیک وقت غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ پکنک پر جانا بالکل غلط بات نہیں ہے۔" حیدر علی نے ماحول کو خوشگوار بنانا چاہا۔ "ذرا بھائی جان کی شادی ہو جائے پھر ہم پکنک منائیں گے، یہیں اپنی زمینوں پر۔"

"علی ہمیں ان دیواروں سے نکلنے کی بات مت کرو۔"

"بس آپی میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گا۔"

"کسی اور کو بھی لے جانا ہے کیا؟"

مہر النساء نے پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

"اگر گوری بھی چلی جائے تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"ہم نے اب تک تمہاری گوری پر کوئی اعتراض کیا ہے جو اب کریں گے۔" مہر النساء بولی۔ "میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ پکنک ہمارے نہیں کسی اور کے لیے ہے۔"

"بڑی آپا۔" اس نے مہر النساء کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "یہ پروگرام صرف آپ دونوں کے لیے ہے، گوری پھر کبھی سہی۔"

"علی! تم کتنے خوش فہم ہو۔" وہ ہنسی۔ "تم تو غالباً خیالوں ہی خیالوں میں پکنک منا بھی چکے ہو۔"

"جہاں ہر طرف دیواریں ہی دیواریں ہوں کوئی بھی روزن، کوئی دریچہ نہ ہو وہاں خوش فہمی ہوا کے کسی معطر اور لطیف جھونکے کی طرح ہوتی ہے۔ انسان کو خیالوں کی الگ دنیا تو نہیں

بسانی چاہیے لیکن کبھی کبھار اچھے خواب دیکھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

☆======☆======☆

اصطبل میں داخل ہوتے ہی اچھو نے نگاہیں گھما کر راجہ کو تلاش کرنا چاہا۔ دائیں طرف سے سب سے آخری کونے میں راجہ اپنے تھان پر کھڑا اسے دیکھ کر ہنہنا رہا تھا۔ اچھو تیزی سے اسی طرف لپکا۔ وہ اسی کا راجہ تھا۔ چمکدار سیاہ جلد والا راجہ، اسے دیکھتے ہی اچھو کے دل میں محبت کا سمندر موجیں مارنے لگا۔ وہ گاؤں کا سب سے بڑا شہ زور تھا۔ بہادری کا کوئی تمغہ ہوتا تو گاؤں بھر میں صرف اسی کو ملتا۔ اس کا خیال تھا کہ بہادر شخص کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آتے لیکن اپنے راجہ کو دیکھ کر نہ جانے کیسے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

اور یہاں اس کا راجہ کتنا بے رنگ لگ رہا تھا۔ نہ سر پر سرخ تاج تھا، نہ کانوں کے قریب رنگ برنگے پھندنے تھے اور نہ گلے میں گھنٹی تھی جو اس کے سر کی جنبش کے ساتھ ساتھ میٹھے سُروں میں گنگنانے لگتی تھی۔ وہ تو ہر روز صبح کو موتیے کے تازہ پھولوں کا ہار راجہ کی گردن میں ڈالا کرتا تھا۔ اسے سجا سنوار کر رکھا کرتا تھا۔

اس نے بے اختیار راجہ کو چوم لیا اور پھر کتنی دیر تک اس سے لپٹ کر بے آواز روتا رہا۔

"اچھو، بڑے شاہ جی آ رہے ہیں۔" بوڑھے سائیس کی گھبرائی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پونچھے اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد رجب علی شاہ اور سخاوت اصطبل میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے بڈھا سائیس چھوٹے چھوٹے قدموں سے تقریباً دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ اچھو کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ برجیز میں ملبوس دونوں بھائی بہت اسمارٹ لگ رہے تھے۔ دونوں کے دائیں ہاتھ میں چابک تھا۔ اچھو کی نیچی نگاہیں صرف ان کے لانگ شوز اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے چابک دیکھ سکتی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر نفرت اس کے جسم کی سب رگوں میں لہو کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ اس نے بہت مشکل سے خود پر قابو پا رکھا تھا۔

"ہوں۔" رجب علی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "شاید تمہیں معلوم ہو کہ یہاں پر تم پیر صاحب کی سفارش کی وجہ سے کھڑے ہو۔ ایک حماقت تم کر چکے ہو۔ کرنا چاہو تو دوسری بھی کر گزرو لیکن تیسری حماقت کی صرف حسرت ہی رہ جائے گی اور اپنی اس حسرت کے ساتھ تمہارا یہ جسم زمین کے نیچے اور روح آسمان کے اوپر پہنچ جائے گی۔ پیر صاحب کی مزید کوئی سفارش تمہارے کام نہیں آئے گی۔"

ضبط کرنا بہت مشکل تھا مگر اچھو پھر بھی ضبط کر رہا تھا۔

"یہاں تمہیں مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے نہیں رکھا گیا۔ یہاں کام کرنا ہوگا۔ سمجھے؟"

رجب علی کو ہر بات میں "جی حضور" سننے کی اس قدر عادت پڑ چکی تھی کہ اپنی بات کے جواب میں "جی حضور" سننے کی خاطر وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اچھو کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے پر اس کے ماتھے پر ڈھیروں شکنیں پڑ گئیں۔

"تم نے ہماری بات نہیں سنی؟"

اچھو نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھایا اور پھر جھکا لیا۔

"حضور یہ بول نہیں سکتا۔" بڈھے سائیں نے جلدی سے مداخلت کی۔

"بول نہیں سکتا؟" رجب علی کے انداز میں تعجب تھا۔ "کیوں بکتے ہو۔ ہم نے خود اسے بولتے سنا ہے۔"

"سرکار پہلے بولتا تھا پر اب صدمے سے گونگا ہو گیا ہے۔" سائیں نے وضاحت کی۔

"کیا صدمہ ہوا ہے تمہیں؟ باپ مر گیا ہے یا ماں کو کفن پہنا کر آ رہے ہو؟" رجب علی نے اسے گھورا۔

اچھو نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"حضور اسے معاف کر دیں۔ مولوی صاحب کا دم کیا پانی پیے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔" سائیں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"ہوں۔ جوان آدمی ہے اسے کسی سخت کام پر لگاؤ۔" رجب علی شاہ نے کہا اور اسے ایک ہاتھ سے دھکیل کر آگے بڑھ گیا۔

اچھو کے دل و دماغ میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ رجب علی کے جانے کے بعد اس نے مشقت سے بھرپور دن گزارا تھا۔ اسے سخت سے سخت کام سے بھی گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی لیکن رجب علی کی باتوں نے سب کاموں کو بہت بوجھل بنا دیا تھا۔

دوپہر کو مکھن لگی روٹی اور لسی کے گلاس سے پیٹ کی آگ بجھا کر وہ درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔

"رجب علی شاہ! میں چاہتا تو آج بہت آسانی کے ساتھ تیرا گلا گھونٹ کر تجھے ہلاک کر سکتا تھا۔ میرے بازوؤں میں اتنی جان ہے کہ چند منٹ میں تجھے ٹھنڈا کر دیں۔ مجھے یہ بھی پروا نہیں کہ اس کے بعد میرا کیا حشر ہو گا۔ میری بوٹیاں کتے نوچیں گے پڑے نوچتے رہیں۔

پھر بھی میں نے تجھے نہیں مارا۔ اس لیے نہیں کہ میں اپنی بے عزتی بھول گیا ہوں۔ اس لیے بھی نہیں کہ مجھے تجھ پر ترس آ گیا ہے اور اس لیے بھی نہیں کہ میں کسی انسان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ صرف اور صرف اس لیے رجب علی شاہ کہ میں تیرے جسم کو نہیں تیری روح کو موت دینا چاہتا ہوں۔

تیرے جسم اور تیرے قد بُت سے مجھے کوئی سروکار نہیں مجھے بدلہ لینا ہے تیری عزت اور

تیرے مان سے۔ یہی اصول ہے ناں۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ کان کے بدلے کان اور جسم کے بدلے جسم۔ میں نے اپنے جسم کے گھاؤ تجھے معاف کر دیئے مگر اپنی عزت اور اپنے مان کے بدلے تجھ سے بھی تیری عزت اور تیسرا مان ہی چھینوں گا۔

میں اسی لیے یہاں آیا ہوں' اسی لیے تیری باتیں برداشت کی ہیں اور اسی لیے تیری جان بخشی ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جو میرا ہو گا۔ صرف اور صرف میرا۔"

☆======☆======☆

ہر رات کی طرح اس رات بھی زرینہ سیاہ چادر اوڑھے پرانے کنویں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گو کہ یہ چاند کی تیرہ تاریخ تھی پھر بھی گاؤں کی گلیاں' مکان' دکانیں' سنسان راستے اور سبز کھیت سب نقرئی چاندنی میں نہائے ہوئے تھے۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ سائیں بابا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وِچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک بازتوں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی"

زرینہ مسکرا دی۔

"سائیں بابا بچھڑے لوگ کہیں نہ کہیں مل ضرور جاتے ہیں ہاں مرے ہوئے کبھی نہیں ملتے۔ کبھی واپس نہیں آتے۔" اس نے دل میں سوچا۔ "بچھڑنا وقتی بات ہوتی ہے۔ ملنے کے لیے جدا ہونا تو یوں بھی شرط ہے۔ شاہ جی بھی مجھ سے بچھڑے تھے۔ مجھے لگا تھا جیسے میں زندہ ہی نہیں رہی' لیکن ہم دونوں کے قدم اسی زمین پر تھے۔ ہم اسی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ تو بالآخر مل بھی گئے۔"

انہی سوچوں میں گم وہ کنویں کے قریب پہنچی۔ حیدر علی شاہ پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔

"آج دیر ہو گئی تمہیں۔"

"اماں بابا جاگے ہوئے تھے۔" وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔ "ان کے سونے کا انتظار کرتی رہی۔"

"میں نے سوچا کوئی مسئلہ ہو گیا ہو گا اس لیے شاید تم نہ آؤ۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یہاں انتظار کرتے رہیں اور میں نہ آؤں۔" وہ ہولے سے ہنسی۔

‘‘کیا باتیں کر رہے تھے تمہارے اماں ابا؟’’

‘‘باتیں بہت خوفناک تھیں۔ آہستہ آہستہ بول رہے تھے اس لیے زیادہ تو نہیں پتا چلا بس وہی بات کہ اب میری اور رضیہ کی شادی ہو جانی چاہیے۔’’

‘‘ہوں۔’’ حیدر علی نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ‘‘انہوں نے کسی کو پسند کیا ہے تمہارے لیے؟’’

‘‘ایسے تو نہ پوچھیں۔ مجھے رونا آ جائے گا۔’’

اس نے اس قدر معصومیت سے کہا کہ حیدر علی ہنس پڑا۔

‘‘پھر کیسے پوچھوں؟’’

‘‘آپ کو ہنسی سوجھ رہی ہے اور میری جان پر بنی ہوئی ہے۔’’ اس نے بسورا۔

‘‘مجھے ہنسی کب سوجھ رہی ہے۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہارے اماں ابا کس خوش قسمت کو اس کارِ خیر کے لیے نامزد کرنا چاہتے ہیں۔’’

‘‘شاہ جی! میں آپ سے بالکل بات نہیں کروں گی۔’’ اس نے منہ پھیر لیا۔

حیدر علی نے سگریٹ سلگا لیا۔ تھوڑی دیر تک زرینہ منہ پھیرے بیٹھی رہی پھر اس کی طرف مڑی۔

‘‘آپ کو تو مجھ سے ذرہ برابر بھی محبت نہیں ہے۔’’

‘‘یہ انکشاف کب ہوا تم پر؟’’

‘‘ابھی ابھی۔’’

‘‘وہ کیسے؟’’

‘‘آپ کو میری پروا ہوتی اور مجھ سے محبت ہوتی تو مجھے مناتے۔’’

‘‘اوہو۔ میں الفاظ ڈھونڈ رہا تھا تمہیں منانے کے لیے۔’’

‘‘کہاں ڈھونڈ رہے تھے آپ تو سگریٹ پی رہے تھے۔’’

‘‘اچھا یہ لو سگریٹ بجھا دیا۔’’ اس نے سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا۔

‘‘پتا نہیں کیسے چن رہے تھے اماں ابا۔’’ وہ خود ہی سے بتانے لگی۔ ‘‘لیکن مجھے کسی اور سے شادی نہیں کرنی۔ شاہ جی، آپ بڑے شاہ صاحب سے کہیں ناں کہ وہ پیر صاحب سے ہماری شادی کی اجازت لے دیں۔’’

‘‘وہ کیوں لیں اجازت۔ میں خود بات کروں گا۔’’

‘‘میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کیونکہ سب کہتے ہیں کہ پیر صاحب بڑے شاہ صاحب کی کوئی بات نہیں ٹالتے جبکہ آپ سے وہ......’’ زرینہ کہتے کہتے رک گئی۔

‘‘مجھ سے کیا؟’’

‘‘کہہ دوں؟’’

‘‘کہہ دو۔’’

‘‘کہ آپ سے وہ۔’’ زرینہ نے کہا۔ ‘‘کچھ ناراض رہتے ہیں۔’’

‘‘یہ کس نے کہا تم سے؟’’

‘‘یہاں چھوٹی سے چھوٹی بات پھیل جاتی ہے۔ یہ تو پھر بہت بڑی بات ہے۔’’ وہ بولی۔ ‘‘ویسے سب گاؤں والے بڑے شاہ صاحب کی نسبت آپ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔’’

‘‘وہ کیوں؟’’

‘‘کیونکہ بڑے شاہ صاحب بہت سخت ہیں۔ آپ ویسے نہیں ہیں۔ سب بڑے شاہ صاحب سے بہت ڈرتے ہیں مگر آپ ویسے نہ بننا۔ یہ اچھی بات تو نہیں ہے کہ کسی سے سب ڈرتے ہی رہیں۔’’

‘‘بڑے شاہ صاحب بہت محبت کرنے والے انسان ہیں۔ وہ اتنے سخت نہیں ہیں جتنے بظاہر دکھائی دیتے ہیں۔’’

‘‘وہ جیسے بھی ہیں آپ کے تو بھائی ہیں۔ آپ سے بہت محبت کرتے ہوں گے۔ ان سے کہیں ناں؟’’

‘‘میں خود بابا جان سے بات کروں گا۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔’’

‘‘اگر وہ آپ سے اور زیادہ ناراض ہو گئے اور آپ کی بات نہ مانی تو۔’’

‘‘گاؤں والوں نے فضول میں یہ سب مشہور کر رکھا ہے۔ بابا جان مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔ ہاں ہمارے اختلافات ہیں۔ دعا کرو وہ اختلافات دور ہو جائیں۔’’

‘‘میں ضرور دعا کروں گی۔ پھر آپ بات کریں گے تو وہ نہیں ٹالیں گے۔’’

‘‘امید تو یہی ہے۔’’

‘‘شاہ جی۔’’

‘‘ہوں۔’’

‘‘کبھی کبھار مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اب ہم جتنے قریب ہیں کچھ عرصے بعد اتنے ہی دور ہو جائیں گے۔’’

‘‘وہم ہے تمہارا۔’’ حیدر علی نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

‘‘خدا کرے وہم ہی ہو۔’’

‘‘اچھا تم شادی پر تو آؤ گی ناں۔’’

‘‘حویلی؟’’

‘‘تم حویلی نہیں آنا چاہتیں ناں۔ ٹھیک ہے کل رات حویلی سے یاسین بھائی کی طرف

مہندی لے جائی جائے گی۔ وہاں تو آسکتی ہوناں تم؟''

''وہ کون سی مختلف جگہ ہے۔ وہ بھی تو حویلی ہی ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''گویا تم شادی کی کسی تقریب میں بھی نہیں آؤ گی۔''

''میں آنا نہیں چاہتی مگر آپ حکم دیں تو آجاؤں گی۔''

''حکم؟ تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں حکم دوں گا۔ اسٹوپڈ۔ میں اس طرح کے فضول حکم نہیں دیا کرتا۔''

''پھر چند دنوں تک آپ سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔'' اس کے لہجے میں افسردگی اتر آئی۔

''دو دن تو مہندی کی تقریب ہے۔ پھر بارات اور ولیمہ۔ مہندی والے دن آنا تو ناممکن ہے۔ بارات والے دن کا بھی وعدہ نہیں ہے لیکن ولیمے والی رات میں ضرور آؤں گا۔''

''یہ تین دن کیسے گزریں گے۔''

''گزر جائیں گے۔ آرام سے گزر جائیں گے۔ تم کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر فکر مند ہو جاتی ہو۔''

''فکر تو کرنی پڑتی ہے۔ یاد ہے پچھلی مرتبہ ہم بچھڑے تھے تو کیا ہوا تھا؟ مجھے تو ملنے کی امید ہی نہیں رہی تھی۔''

''اس مرتبہ کچھ نہیں ہوگا۔'' حیدر علی نے اسے تسلی دی۔ ''یہ بتاؤ کہ باقی گھر والے تو شادی میں جائیں گے ناں؟''

''ہاں۔ اماں تو چاہتی ہیں کہ میں بھی جاؤں۔ مجھے پتا ہے وہ زبردستی بھی کریں گی۔''

''پھر؟''

''پھر میں کچھ نہ کچھ بہانا بنالوں گی۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ میرے سر میں درد ہے۔ میری صحت کی ویسے بھی اماں کو بہت فکر رہتی ہے۔ آرام کرنے کا کہہ کر چھوڑ جائیں گی گھر پر ہی۔''

حیدر علی ہنس پڑا۔ ''بہانا بھی بناؤ گی تو اس قدر نکما۔''

''اوہو۔'' زرینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اتنی دیر ہوگئی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ اگر ابا جاگ گئے تو مصیبت آجائے گی۔''

''چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔''

☆======☆======☆

حویلی میں رات کو ہونے والی مہندی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔

حیدر علی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ رجب علی اس کے قریب چلا آیا۔

''اس شور شرابے سے تنگ آگیا ہوں میں۔ دل چاہ رہا تھا تھوڑی دیر کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھوں۔''

''میرے کمرے میں آجائیں۔''

حیدر علی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ دونوں اندر آگئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔

''بابا جان اور اماں جان کی خوشیاں ہیں ورنہ مجھے اس پینڈو ہنگامے سے دحشت ہونے لگتی ہے۔''

''تین دن کی بات ہے پھر سکون ہو جائے گا۔''

وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ رجب علی نے اپنا پائپ نکال لیا۔

''ایک بہت کام کا بندہ ہے ہمارے پاس۔'' اس نے پائپ میں تمباکو بھرا۔ ''میں سوچ رہا ہوں اسے کس کام پر لگایا جائے۔''

''کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''اچھو کی۔'' وہ بولا۔ ''کچھ دن قبل اس نے شکورے کو بری طرح پیٹ ڈالا تھا۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ شکورے کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے تو وہ اس کی آنکھ نکال لے گا۔''

''آج کل کیا کر رہا ہے اچھو۔''

''بابا جان کے کہنے پر اصطبل میں کام کر رہا ہے۔'' اس نے پائپ کا کش لیا۔ ''یہ شکورا بہت بزدل نکلا۔ چھ فٹ قد' اتنی جان اور خوفناک مونچھیں۔ صرف ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں۔ ایڈیٹ مار کھا کر آگیا۔''

''اب جبکہ وہ اصطبل میں کام کر رہا ہے اسے وہاں کام کرنے دیں۔''

''شکورے کو مفت کی روٹیوں کی چاٹ لگنے لگی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اصطبل کا کام کچھ عرصے کے لیے اس کے حوالے کر دوں تاکہ اس کے دماغ میں جو افسری گھس رہی ہے وہ نکل جائے اور اچھو کو شکورے کی جگہ لے آؤں۔ بس ایک پرابلم ہے۔''

''وہ کیا؟''

''جس دن وہ واقعہ پیش آیا تھا اس دن سے وہ خاموش ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی سے بات نہیں کرتا۔''

''چچ' چچ۔'' حیدر علی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''بہت برا ہوا ہے۔ نفسیاتی اثر ہوگا۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسا کوئی بھی پرابلم پیش آسکتا ہے۔''

''مجھے اس کی نفسیاتی گرہوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک گونگے کے ساتھ میرا گزارا مشکل ہوگا۔'' رجب علی بولا۔ ''اچھو کو گاؤں کا سب سے بڑا شہہ زور مانا جاتا

ہے۔ اگر اس نے شکورے کو میرے ذاتی ملازم کی حیثیت سے نہ مارا ہوتا تو میں یقیناً اسے شہ
دیتا۔ بہر حال اب وہ حماقت کی سزا بھگت چکا ہے۔ ایسے شخص کو میرے ذاتی خدمت گاروں میں
شامل ہونا چاہیے۔ بس اگر وہ بول پڑے تو میں اسے شکورے کی جگہ دے دوں۔"

"میرا خیال ہے وہ بول پڑے گا۔" حیدر علی نے کہا۔ "وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے نفسیاتی اثرات زائل ہوتے جاتے ہیں لیکن شاید بول پڑنے کے باوجود بھی وہ آپ کے کسی کام نہ آئے۔"

"یہ اندازہ کیسے لگایا تم نے؟"

"میرا نہیں خیال کہ وہ زیادہ قابلِ بھروسہ ثابت ہوگا۔ جسم پر لگنے والے زخم بالآخر بھر جاتے ہیں لیکن ایک حساس انسان اپنی انا پر لگنے والے زخم نہیں بھول سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاک کے باعث بول بھی نہیں پا رہا۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" رجب علی نے مطمئن انداز میں کہا۔ "یہ عام سے جاہل لوگ تم جیسے پڑھے لکھے انسان کی طرح نہیں سوچتے۔ نہ ہی ان کے دماغوں میں انسانی حقوق کا کیڑا کلبلاتا ہے۔ اب تو وہ پہلے سے زیادہ قابلِ بھروسہ ہوگیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی کسی بھی دوسری حماقت کی سزا کیا ہوگی تم جن لوگوں کی نفسیات کی بات کرتے ہو وہ یہ لوگ نہیں ہیں۔ ان کی نفسیات بالکل مختلف ہے۔"

"آپ بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ آپ کا ان سے رابطہ بھی بہت زیادہ ہے۔ میرا ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اس قدر رابطہ نہیں ہے۔"

"میں تم سے کیا بور باتیں کرنے لگا۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری گوری کیسی ہے؟"

"گوری بالکل ٹھیک ہے۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "بس کچھ افسردہ ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ حویلی نہیں آنا چاہتی اور شادی کی تقریبات کی وجہ سے کچھ دن تک ہمارا ملنا ممکن نہیں۔"

"اوہو۔ ایسا کرو کہ تم وقت نکال کر کسی نہ کسی طرح اس سے ضرور مل لو۔ زندگی میں ایسا شخص صرف ایک مرتبہ ملتا ہے جو صرف ہمارے لیے جیتا ہے اور ہم اس کے لیے' ایسے شخص کو مایوس نہیں کرنا چاہتے۔"

"گوری سے تو روز ملاقات ہو جاتی ہے لیکن آپ کی شادی صرف ایک مرتبہ ہوگی۔"

"ہوپ فلی۔"

رجب علی نے کہا تو دونوں بھائیوں کا قہقہہ ایک ساتھ بلند ہوا۔

"گوری نے آپ کے لیے پیغام بھجوایا ہے۔"

"میرے لیے؟" رجب علی نے تعجب سے کہا۔ "کیسا پیغام! کوئی فرمائش ہے کیا؟"

"فرمائش ہی ہے۔"

"کسی زیور یا کپڑے کی؟"

حیدر علی ہنس پڑا۔ "نہیں وہ ایسی فرمائش کرتی ہی نہیں ہے اور اگر کرے تو میں خود ہی پوری کر دوں گا۔"

"تمہارا بڑا بھائی ہونے کے ناتے وہ مجھ سے ایسی کوئی بھی فرمائش کر سکتی ہے بلکہ اسے کرنی چاہیے۔"

"نہیں یہ فرمائش ذرا مختلف ہے جو فرمائش اس کی ہے اس کے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ پوری کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر اسے سچ مچ کی تسلی نہیں ہوئی۔"

"کہو۔" رجب علی نے دلچسپی سے کہا۔

"اس کے والدین آپ کی شادی کے بعد بابا جان سے اس کی شادی کی اجازت لینے آنے والے ہیں۔ وہ ظاہر تو نہیں کر رہی تھی لیکن درحقیقت بہت پریشان تھی۔ کہہ رہی تھی کہ آپ بابا جان سے ہماری شادی کی سفارش کریں۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میں بابا جان سے بات کروں گا۔"

"پتا ہے' اس نے یہ فرمائش آپ سے کیوں کی ہے؟"

"کیوں؟"

"کیونکہ اس کا خیال ہے کہ بابا جان آپ کی کوئی بات نہیں ٹالتے جبکہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔"

رجب علی نے قہقہہ لگایا۔ "اس کا خیال اسّی فیصد تو درست ہی ہے۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ میری منگنی کی اطلاع اس کے لیے بہت بڑا شاک ثابت ہوگی۔"

"اتنا زیادہ مت سوچا کرو علی۔ وہ تم سے سچ مچ محبت کرتی ہے تو تم سے گلہ ضرور کرے گی' دور نہیں ہوگی۔" پھر گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا خیال ہے میں اچھو کو اصطبل سے چھٹی کروا کر اپنے پاس ہی لے آؤں۔ اتنی دیر کمپنی دینے کا شکریہ۔"

☆======☆======☆

شکورا اچھو کو عمومی کام سمجھا رہا تھا۔ بڑے شاہ صاحب کو کیا پسند ہے کیا نہیں۔ کس وقت وہ کیا چاہتے ہیں۔ کن تیوروں کا کیا مطلب ہے وغیرہ۔ اچھو ہر بات ذہن نشین کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ قدرت اسی وجہ سے اسے رجب علی کے قریب ہونے کا موقع دے رہی تھی تاکہ وہ اس سے اپنا بدلہ لے سکے۔

آزمائش کے طور پر رجب علی نے اس سے کچھ کام بھی لیے تھے اور مطمئن ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

دوپہر سے ہی حویلی میں مہندی کے سلسلے میں ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ مہر النساء اور زیب النساء نے ایک جیسے پیلے رنگ کے جوڑے پہن رکھے تھے۔ آج انہیں بھی حویلی کی چاردیواری سے باہر نکلنا تھا۔

سب ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔ زیب النساء کے لیے بھی بہت مرتبہ بلاوا آ چکا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپے کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی لیکن آج بے حد حسین لگ رہی تھی۔

''میں کس قدر خوبصورت ہوں۔'' اس نے سوچا۔ ''لیکن کیا فائدہ اس خوبصورتی کا جب کوئی سراہنے والا ہی نہیں۔ کوئی تو ہو جو میری بھی اس طرح تعریف کرے جیسے علی' زرینہ کی کرتا ہے۔

یہ کتنا اہم دن ہے اس حویلی اور اس خاندان کے لیے۔ بڑے بھائی کی شادی ہو رہی ہے جو بابا جان کی گدی کے وارث بھی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میری زندگی میں میرے لیے بھی کوئی اہم دن آتا۔''

اسے یوں لگا جیسے مسہری پر کوئی ہنسا ہو۔ نہیں شاید کوئی رویا ہو۔ یا پھر نہ ہنسا تھا نہ رویا تھا۔ وہ تو شاید نزع کی آخری ہچکی تھی۔ یا پھر یہ سبھی کچھ تھا۔

زیب النساء اس آواز کو پہچانتی تھی۔ یہ پھوپھو کی آواز تھی جنہیں فوت ہوئے بھی برسوں گزر چکے تھے۔ اس نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں دیکھا لیکن اب آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ انہیں اپنے مقابل دیکھ سکتی ہو۔

اس کے کمرے کی واحد مسہری جس سے یہ آواز آئی تھی' اس سے اکثر یہ آواز آیا کرتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ شاید صرف گمان تھا۔ کسی کو وہ آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بس صرف اسے آتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ہنسی یا شاید کراہ اسے کیا بتا رہی تھی۔ وہ بغیر لفظوں کے پھوپھو کی ہر بات سمجھ جاتی تھی۔

وہ اس سے کہہ رہی تھیں کہ ایک اہم دن ان کی زندگی میں بھی آیا تھا۔ جس دن بابا جان کی شادی تھی۔ تب انہیں کوئی ملا تھا۔ ان کے پاس بھی زیب النساء کی طرح حوصلہ نہیں تھا۔ ہاں خوف بہت تھے۔ تب ہی تو وہ گھٹ گھٹ کر ختم ہو گئی تھیں۔

وہ ہنسی' وہ کراہ اس سے کہہ رہی تھی کہ اگر اس کی زندگی میں کوئی اہم دن آئے' فیصلے کی کوئی گھڑی آئے تو اسے حوصلہ اکٹھا کرنا ہوگا۔ ڈر اور خوف جو اس کی روح سے جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں' انہیں اتار پھینکنا ہوگا۔ اپنا قدم آگے بڑھانا ہوگا تا کہ وہ گھٹ گھٹ کر دیواروں سے

ٹکرا ٹکرا کر اسی مسہری پر جان نہ دے۔

''آپی کا آپ کی خواہشیں جائز ہیں تو پھر کیوں بند باندھتی ہیں ان پر؟ کیوں نہیں حق مانگتیں اپنا؟''

حیدر علی کے سوال کی بازگشت اتنی دیر بعد سنائی دی تھی۔

یہ دیواریں بھی عجیب تھیں۔ سب کچھ سن کر محفوظ کر لیتی تھیں۔ ہر بات خود میں جذب کر لیتی تھیں اور جب وہ اکیلی ہوتی تھی تو ہر لفظ' ہر لہجے کی بازگشت کتنی دیر تک گونجتی رہتی تھی۔

''آپی! آپ کی خواہشیں جائز ہیں تو پھر کیوں بند باندھتی ہیں ان پر؟ کیوں نہیں حق مانگتیں اپنا؟''

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

''میں نہیں مانگوں گی اپنا حق۔ میں خوش نہیں ہوں پھر بھی اپنا حق نہیں مانگوں گی۔'' وہ چلائی۔ ''میں قدم اٹھانا چاہتی ہوں پھر بھی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ میں اپنی آرزوؤں کی پرواز بابا جان کے شملے سے بلند نہیں ہونے دوں گی۔''

ہر دیوار تمسخر سے ہنسنے لگی۔

''خود فریبی' خود فریبی' خود فریبی۔'' آئینہ چلانے لگا۔

''نہیں۔ میں خود کو فریب نہیں دے رہی۔ کوئی تسلی دلاسا بھی نہیں دے رہی خود کو۔ مجھ میں حوصلہ ہے اپنے اوپر بند باندھنے کا۔''

لیکن اس کی بات کس نے نہیں سنی۔ دیواریں ہنستی رہیں۔ آئینہ چلاتا رہا۔ وہ پاگل ہونے کو تھی۔ جب دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک سن کر ہر شے ساکت ہو گئی۔ یوں جیسے کبھی اس پر ہنسی ہی نہ ہو۔ کبھی اس کا مذاق ہی نہ اڑایا ہو کبھی چلائی ہی نہ ہو۔

لکڑی کی مسہری' آئینہ' دیواریں۔

اور کوئی نہیں جانتا تھا مگر وہ ان کی مکاریوں سے واقف تھی۔ یہ سب چیزیں ایسے ہی کرتی تھیں۔ اس کی موجودگی میں شور برپا کیے رکھتیں اور ہلکا سا کھٹکا بھی ہو جاتا تو ایسے بن جاتیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ انہیں کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔

دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''آ جاؤ۔''

اندر آنے والا حیدر علی تھا۔

''آپی آپ تیار ہیں؟''

''ہاں۔''

''تو پھر جلدی چلیں۔ سب جا چکے ہیں۔ آپ نے دیر کر دی۔''

''مم...... میں تیار ہو رہی تھی۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

''چلیں جلدی کریں۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ وہاں آپ کی موجودگی کتنی ضروری ہے۔''

زیب النساء نے مسہری پر پڑی بڑی سی سیاہ چادر سے خود کو سر سے پاؤں تک چھپا دیا۔

''سانس لینے کی جگہ تو رہنے دیں۔'' حیدر علی بولا۔

''یوں سانس لینے کی عادت ہے۔''

''جس جگہ سے آپ کو گزرنا ہے وہاں کوئی مرد نہیں ہے ہو بھی تو اس کی نظریں نہیں اٹھیں گی۔ آپ چاہیں تو چہرے سے چادر ہٹا دیں۔''

''نہیں۔ ٹھیک ہے۔''

''لیکن آپ کو دکھائی کیا دے رہا ہے؟''

''مجھے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہمیشہ بابا جان کی آنکھوں سے راستہ دیکھا ہے۔''

''اچھا میرا ہاتھ پکڑ لیں اور آرام سے چلیں۔ کہیں ٹھوکر نہ لگے۔''

وہ احتیاط سے اسے چلاتا ہوا کار تک لایا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

''بیٹھیں آپی۔''

اسے بٹھا کر وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

''سب گاڑیاں چلی گئی ہیں اور ہمارے لیے یہ چھوڑ گئے ہیں۔ ایک دم چھکڑا۔'' اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں کہاں جواب دے جائے۔ خیر آج کا دن نکل جائے تو کل ٹھیک کرا لیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ صرف دو چار لوگوں کو ڈرائیونگ آتی ہے۔''

حویلی سے باہر نکلے تو حیدر علی اردگرد اسے مختلف جگہوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ زیب النساء خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

مسجد کے قریب پہنچ کر کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ زیب النساء نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' حیدر علی نے کہا اور اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

''کیا ہوا؟'' زیب النساء بولی۔ ''خراب ہو گئی ہے؟''

''دیکھتا ہوں۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ ''آپ بیٹھی رہیں۔''

گو کہ چودھویں کے چاند کی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں تھی کہ انجن کا جائزہ لیا جا سکتا۔

بونٹ بند کر کے وہ پلٹا تو اس کی نگاہ زرینہ کی کھڑکی پر پڑی جو پردے کا ایک کونہ تھامے وہیں کھڑی تھی۔ چاندنی میں نہائی ہوئی وہ کوئی یونانی دیوی لگ رہی تھی۔ غالباً کار کی آواز سن

ہی وہ کھڑکی میں آئی تھی۔

''آپی اس وقت تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔ اب کیا کریں؟''

''تم کیا چاہتے ہو کیا کریں؟'' اس کے انداز میں طنز کی کاٹ تھی۔ ''کچھ تو سوچا ہو گا تم نے پہلے ہی۔ یوں بھی کار بہت اچھی جگہ خراب ہوئی ہے۔''

وہ شرمندہ ہو گیا۔

''یقین کریں آپی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کار پہلے سے خراب تھی۔ باقی تینوں کاریں جا چکی تھیں۔ مجھے بابا جان نے کہا تھا کہ آپ کو لے آؤں۔''

''مجھے بناؤ مت علی۔ میں بچی نہیں ہوں۔ اس کی ماں بہن اور باپ تو مہندی میں آئے ہیں۔ یہ تمہارا انتظار کرنے کے لیے ٹھہر گئی۔ تمہیں اسی کے پاس آنا تھا تو مجھے اپنے ساتھ کیوں گھسیٹ لائے۔''

''آپی میرا یقین کریں۔ میں ابھی کسی نہ کسی صورت آپ کو لے جاتا ہوں۔ شاید کوئی ہمارا پتا کرنے آ رہا ہو۔ تب تک آپ وہاں گھر میرا مطلب ہے زرینہ کے پاس چلی جائیں۔ جیسے ہی دوسری کار آئی ہم چلے جائیں گے۔ یوں راستے کے عین درمیان میں ٹھہرے رہنا مناسب نہیں ہے۔''

''اس کے گھر جانے سے بہتر ہے کہ میں عین سڑک کے درمیان کسی دوسری کار کا انتظار کر لوں۔ تم جانا چاہو تو تمہاری مرضی ہے۔''

حیدر علی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ ایک دو مرتبہ پھر کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ وہ دونوں خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ زرینہ الجھے بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی سامنے ڈالے کھڑکی میں کھڑے ہو کر انہیں دیکھتی رہی۔

''آپی آپ کا یوں یہاں بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔'' اس نے زیب النساء کو دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی۔

''میرا وہاں جانا بھی مناسب نہیں ہے۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

اچانک رات کے سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی۔ حیدر علی کار سے باہر نکلا۔ سامنے سے اچھو حویلی کا ایک تانگہ لیے چلا آ رہا تھا۔ حیدر علی کو دیکھ کر اس نے لگامیں کھینچیں اور نیچے اتر آیا۔ تانگہ غالباً خواتین کو لے کر گیا تھا۔ تب ہی اس کے گرد پردے کا انتظام تھا۔

''اچھو تم حویلی واپس جا رہے تھے؟''

حیدر علی کے سوال پر اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔

''ایسا کرو۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میرے ساتھ چھوٹی بی بی ہیں اور کار خراب ہو گئی ہے۔ تم واپس جا کر دوسری کار بھجواؤ اور کچھ بندے بھی لاؤ تا کہ یہ کار کنارے کی جا سکے۔ پہلے ہی

جگہ تنگ ہے اوپر سے کار عین درمیان میں کھڑی ہے۔"

اچھو نے اقرار میں سر ہلایا اور مڑنے لگا۔

"یا ٹھہرو اچھو۔ ایسا کرو کہ بی بی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں یہاں انتظار کر سکتا ہوں لیکن ان کے لیے اتنی دیر تک سڑک پر کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے۔ تانگے کے حساب سے یوں بھی راستہ لمبا ہے۔ کسی کے آنے تک بہت دیر ہو جائے گی۔"

اچھو نے پھر ہاں میں گردن ہلائی۔

"آپی! اگر آپ برا نہ مانیں تو تانگے پر چلی جائیں۔ اچھو آپ کو بحفاظت پہنچا دے گا۔ اگر ہم کسی کا انتظار کرتے رہے تو بہت دیر ہو جائے گی۔"

زیب النساء نے ایک نظر کھڑکی میں کھڑی زرینہ کی طرف دیکھا اور پھر کار سے نکل آئی۔

"میں سمجھتی ہوں۔" وہ بولی۔ "تمہیں اتنی تفصیل سے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپی آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے؟ یہ محض اتفاق ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

وہ زیب النساء کا ہاتھ پکڑ کر تانگے تک لایا اور پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔

"گھبرانا مت آپی۔ اچھو بھروسے کا آدمی ہے۔ منشی فضل دین کا بیٹا ہے۔ بس ایک مسئلہ ہے کہ بول نہیں سکتا اس لیے جب تانگہ رو کے تو آپ خود ہی اتر آنا۔"

تانگہ چلتا گیا اور حیدر علی اسے تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ اندھیرے میں تحلیل نہیں ہو گیا۔

☆======☆======☆

اچھو کے دل میں اطمینان کی لہریں اترتی جا رہی تھیں اس کے دل کے درد میں کمی ہو رہی تھی۔ خلش مٹتی جا رہی تھی۔

"اچھو قدرت نے تجھے بنا بنایا موقع فراہم کر دیا ہے۔ خود شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے اپنے گھرانے کی عزت تیرے سپرد کی ہے۔

کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ، عزت کے بدلے عزت اور مان کے بدلے مان۔ کتنا سیدھا سادا اور سچا اصول ہے۔" اس نے سوچا۔

گھوڑے کے سموں کی ٹک ٹک اور تانگے کے پہیوں کی مسلسل چوں چوں نے مل کر نقرئی رات میں موسیقی کا رچاؤ پیدا کر دیا تھا۔ تانگے میں بیٹھنے سے قبل اس کے اعصاب کشیدہ تھے۔ زرینہ کو دیکھتے ہی نہ جانے اتنا غصہ کہاں سے اس کے اندر بھر گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے علی کے نزدیک بہنوں کی اہمیت ختم ہو گئی ہو۔ ہر وقت اس کے لبوں پر گوری کا نام ہوتا تھا۔ وہ چڑ جاتی تھی اور آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ علی نے گاڑی جان بوجھ کر خراب کی تھی

تاکہ زرینہ سے مل سکے۔ زیب النساء کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔

"وہ ہے کیا چیز جس کی خاطر علی دیوانہ ہو رہا ہے۔" وہ سوچ رہی تھی۔ "مانا کہ وہ خوبصورت ہے لیکن خوبصورت تو بہت سی عورتیں، بہت سی لڑکیاں ہیں۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے علی کو کہ اس کے خیالوں میں کوئی اور آتا ہی نہیں ہے۔ ہم بھی اس کی بہنیں ہیں۔ خوبصورت بھی ہیں۔ ہماری تعریف تو کبھی نہیں کی اس نے۔ پر کیا کیا جائے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں ناں جو ساری عمر محروم ہی رہتے ہیں۔"

لیکن تانگے میں بیٹھ کر وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔ اس کے کانوں کو ٹک ٹک اور چوں چوں کی یہ آوازیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ سُر تال کا ایسا خوبصورت ملاپ اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کے گرد تو صرف کراہیں اور تمسخر آمیز ہنسی بستی تھی۔ لفظوں اور لہجوں کی بازگشت رہتی تھی۔ ان آوازوں کے دائرے بنتے بگڑتے رہتے تھے اور وہ ان سے بچنے کی خاطر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی تھی۔ آنکھیں میچ لیا کرتی تھی۔ یہ سب آوازیں تکلیف دہ تھیں، اس کی روح کو دھنک کر فضا میں بکھیر دینے والی۔

مگر جو آواز ابھی اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی وہ بہت خوبصورت تھی۔ روح میں اندر تک سکون کی لہریں اتار دینے والی۔ اسے یوں لگا جیسے اس آواز کو سننے کے لیے اس کے کان کب سے ترس رہے تھے۔

"صرف کان ہی کیا، میرا جسم، مری روح دونوں ہی پیاسے ہیں۔ میں کب جانتی تھی کہ تانگے کی آواز اتنی میٹھی اتنی سریلی ہوتی ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو۔" اس نے سوچا اور پھر تلخی سے مسکرا دی۔ "معلوم ہوتا تب بھی میں کیا کر لیتی؟"

"تو پھر تم کبھی تانگے میں نہ بیٹھتیں۔" گھوڑے کے سموں کی ٹک ٹک اور پہیوں کی چوں چوں نے اسے جواب دیا۔ "مگر اب تم اسیر ہو گئی ہو۔ خواہشوں کی اسیر۔ نہ چاہتے ہوئے اور انجانے میں ہی سہی تمہاری پہلی خواہش پوری ہو گئی ہے اور یاد ہے تم ہی تو کہتی ہو کہ پہلی خواہش کو روک لینا آسان ہوتا ہے اگر ایک دفعہ قدم بڑھ جائے تو پھر دوسرے قدم کو روک لینا ممکن نہیں رہتا۔"

چند ثانیوں کے لیے وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا لیکن اس سے بھی بڑھ کر حیرت کی بات یہ تھی کہ گھوڑے کے سموں کی ٹک ٹک اور پہیوں کی چوں چوں کو اس کے بھید کی خبر کیسے ہوئی تھی؟ اس کا دل چاہا کہ وہ پردے کا کونا سرکا کر ان بھیدی پہیوں کو ایک نظر ضرور دیکھے جو اس کے راز کی تشہیر کر کے اب مزے سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔ اس نے تانگے کے گرد تنی چادر کو ایک سمت سے اٹھانے کی کوشش کی۔ چادر کہیں اٹکائی گئی تھی لیکن تھوڑا سا زور لگانے سے ہی اس کا سرا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

اس نے باہر جھانکا۔ تانگہ کچی سڑک پر چل رہا تھا۔ جس کے دونوں جانب کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ دودھیا چاندنی ہرطرف بکھری ہوئی تھی۔ کتنا خوبصورت منظر تھا یہ۔ کتنی نرم ہوا چل رہی تھی۔ اس نے چند گہرے سانس لے کر اس ماحول میں خود کو جذب کرنا چاہا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ تو پہیے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے ذرا سا جھک کر نیچے جھانکا۔ چوں چوں کی آواز اس کے قریب آ گئی۔ پہیے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''حیرت سے کیوں دیکھتی ہو۔'' اب کے انہوں نے سرگوشی میں کہا۔ ''ذرا آسمان کی سمت دیکھو، چاند کتنا حیران ہے اور یہ جو ننھے منے تارے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں، دیکھو تو وہ اپنا کھیل چھوڑ کر تمہیں دیکھنے لگے ہیں۔''

''کیوں؟'' زیب النساء نے بھی ہولے سے پوچھا۔

''یہ سوچ رہے ہیں کہ اتنی حسین صورت انہوں نے آج تک دیکھی کیوں نہیں۔ یہ اب تمہیں جی بھر کے دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ کہیں تم پھر گم نہ ہو جاؤ۔''

''ہاں گم تو مجھے ہونا ہے۔'' اس نے آہ بھر کر مدھم آواز میں کہا۔

''ارے نہیں۔ اب تم گم نہیں ہو سکتیں۔ جس زنداں میں تم قید تھیں اس میں روزن پیدا ہو چکا ہے۔ تم پرانی قید سے آزاد ہو گئی ہو۔ اگر آزاد نہ ہوتیں تو یوں کبھی باہر نہ جھانک سکتیں۔ البتہ اس قید سے نکل کر تم ایک اور بھنور میں پھنس چکی ہو، خواہشوں کے بھنور میں۔''

''نہیں۔'' اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''نہ مانو ہمارا کہا۔''

دونوں پہیے اور سموں کی ٹک ٹک سب اس سے لاتعلق ہو گئے۔ یوں جیسے اسے جانتے ہی نہ ہوں۔ جیسے اس سے کبھی بات ہی نہ کی ہو۔

''سنو۔'' اس نے پکارا۔

لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جھنجھلا گئی۔ پھر اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ سچ مچ سب چاند ستارے گم صم ہو کر اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ اتنی دور تھے کہ نہ اس سے بات کر سکتے تھے، نہ اس کی بات سن سکتے تھے اس نے سر پیچھے کر کے پردہ برابر کر دیا۔

☆======☆======☆

زیب النساء کا تانگہ اندھیرے میں گم ہو گیا تو حیدر علی واپس پلٹا اور زرینہ کی طرف سے منہ موڑ کر کار سے کمر ٹکا کر سگریٹ سلگا لیا۔ اسے اس بات کا بہت افسوس تھا کہ زیب النساء نے اسے غلط سمجھا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس وقت ان حالات میں زیب النساء کو قائل کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کی باتیں سن کر ہی اس کا زرینہ کے پاس جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ زرینہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑکی میں کھڑی تھی۔

وہ اسی لیے اس کی سمت پشت کر کے کھڑا تھا تاکہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے۔

اسے معلوم تھا کہ خواہ مخواہ خود کو اذیت دینے والی بات ہے لیکن وہ ذہنی طور پر اس قدر تھکا ہوا تھا کہ زیب النساء کی باتیں اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھیں۔ یہ ذہنی تھکن کئی دن سے اس پر طاری تھی لیکن اب زیب النساء کی باتوں نے اس احساس کو شدید کر دیا تھا۔

وہ اپنی گوری کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ماں جی کا مان توڑنا بھی اس کے بس سے باہر تھا اور رجب علی نے جو درمیانی راستہ تجویز کیا تھا اسے قبول کرنا بھی حیدر علی کو گوارا نہیں تھا۔ دوسری طرف اس کی بہنیں تھیں جن کے متعلق وہ ہر وقت سوچتا رہتا تھا۔ ان کی شخصیت کتنی بری طرح مسخ ہو رہی تھی۔ جب زیب النساء نے اس سے کہا تھا۔

''مجھے پتا ہے کہ پہلا قدم روکنا بے حد مشکل ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ یہیں رکا رہے۔''

تو اس کا دل چاہا تھا کہ اپنی اتنی اچھی بہنوں کے سب دکھ اپنے دل میں سمیٹ کر انہیں پرسکون کر دے۔ ان کے دامن میں دنیا کی سب خوشیاں لا ڈالے لیکن وہ بے بس تھا جب وہ کہتی تھیں کہ وہ اپنے صبر وضبط کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتیں، وہ خوش نہیں ہیں لیکن اسی طرح رہنا چاہتی ہیں تو اس کا دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔

خواہ مخواہ ہی چلا آیا تھا وہ یہاں اور اتنی ساری محبتوں کے روگ پال لیے تھے۔ کتنی تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھی زندگی اور کتنا مشکل ہو گیا تھا سب حقیقتوں کا سامنا کرنا۔

اس نے سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسل دی۔

''شاہ جی۔''

اپنے پیچھے مدھم سی آواز سن کر وہ مڑا۔ سامنے شربتی آنکھوں میں پھیلا کاجل لیے گوری کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر گوری نے سکون کی گہری سانس لی۔

''میں سمجھی آپ ناراض ہیں مجھ سے۔''

''نہیں، میں بالکل ناراض نہیں ہوں۔ بلاوجہ ہی ناراض ہو جاؤں گا۔''

''میں وہاں کھڑکی میں کھڑی تھی۔'' وہ بولی۔ ''موٹر کی آواز سن کر آئی تھی۔ آپ نے مجھے دیکھا پھر بھی میرے پاس نہیں آئے۔''

''میرے ساتھ زیبی آپی جو تھیں۔''

''اب تو نہیں ہیں۔''

''دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' حیدر علی کے لہجے میں تھکن تھی۔

زرینہ چند لمحے خاموشی سے اسے تکتی رہی پھر اس کے برابر ہی کار سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

"دل نہیں چاہ رہا تھا یا آپ کی آپی نے آپ کو منع کر دیا ہے۔"

"وہ کیوں منع کرنے لگیں۔" اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"وہی تو منع کریں گی۔ مجھے پتا ہے۔" اس کے انداز میں تلخی آگئی۔

حیدر علی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "میری طرف دیکھو گوری۔"

"چھوڑیں...... کیا دیکھیں گے میرے چہرے پر۔ آپ کی آپی کو خبر ہوگئی تو انہیں یہ بھی بہت برا لگے گا۔" وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔

"گوری۔" حیدر علی نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اس کے سامنے چلا آیا۔ "کیا کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو۔"

"کیا ہر بات زبان سے کہہ دینا ضروری ہوتی ہے۔"

"اگر سننے والا میرے جیسا کم عقل ہو تو ہاں' ہر بات زبان سے کہنا ضروری ہو جاتی ہے۔"

حیدر علی کی بات سن کر اس نے نظریں چرالیں۔

"کہو' کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ جاننے پر مُصر تھا۔

"جو کچھ رشتوں کے حوالے سے ایک عورت سمجھ سکتی ہے وہ آپ مرد کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ ہمارے درمیان کوئی آئے' خواہ وہ آپ کی بہن ہی کیوں نہ ہو۔" وہ بدستور دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

اس نے زرینہ کا بازو چھوڑ دیا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے' زیبی آپی ہمارے درمیان نہیں آرہیں۔"

"مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اور آپ ان کی طرف داری اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ آپ کی بہن ہیں۔" وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"کس فضول بات پر اڑ رہی ہو گوری۔" وہ تنگ آگیا۔

"یہ فضول بات لگتی ہے آپ کو؟ ہاں آپ کے لیے تو فضول ہی ہوگی کیونکہ میں آپ کی کچھ نہیں لگتی اور وہ آپ کی بہن ہیں لیکن کبھی میری طرف دیکھا ہے آپ نے؟ میں آپ کی خاطر سب رشتے بھول چکی ہوں۔ سب رشتے توڑ بھی سکتی ہوں۔ میری بہن مجھے منع کرتی رہی لیکن میں نہیں مانی۔ سیاہ اندھیری راتوں میں آپ باہر دیکھ لیے گئے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن کسی نے مجھے باہر دیکھ لیا تو پتا ہے کیا ہوگا۔" اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔ "مگر میں نے کبھی نتیجے کی پروا نہیں کی۔ کسی شخص یا کسی ڈر اور خوف کو اپنے اور آپ کے درمیان نہیں آنے دیا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں آج کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے ان وہموں کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔"

"آپ کے پاس تو حقیقتوں کا بھی کوئی علاج نہیں ہے۔"

"میں کسی فضول بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔" اس نے خواہ مخواہ ابھر آنے والے غصے کو دبانے کی کوشش کی۔ "تم گھر جاؤ۔"

"میں ایسے گھر نہیں جاؤں گی کہ آپ یہیں کھڑے رہیں اور میں اندر چلی جاؤں۔ آپ کو بھی میرے ساتھ آنا ہوگا۔"

"میں یہیں کھڑا ہوں۔ تم جاؤ۔"

"پھر بھی کہتے ہیں کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس کے انداز میں دوبارہ تلخی اتر آئی۔

"تم کیوں زیبی آپی کے پیچھے پڑ گئی ہو۔" اس نے اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ "ان کے اپنے دکھ ہی کم نہیں ہیں۔"

"تب ہی تو وہ کسی کو بھی خوش نہیں دیکھ سکتیں۔" وہ حیدر علی کی بات کاٹ کر چلائی۔ "ان سے کوئی محبت نہیں کرتا تب ہی تو وہ کسی اور کو محبت کرتے نہیں دیکھ سکتیں۔"

"شٹ اپ۔" وہ دھاڑا۔ "میں مزید ایسی کوئی بکواس برداشت نہیں کر سکتا۔"

زرینہ سکتے کی سی کیفیت میں چند لمحے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ حیدر علی اسے ڈانٹ دے گا۔ وہ بھی اس بری طرح سے۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا۔ پلکیں جھپک جھپک کر اس نے آنسو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن جب وہ سب بند توڑ کر بہہ نکلنے کو بے چین ہوگئے تو وہ گھر کی طرف پلٹ گئی۔

☆======☆======☆

دور یہ کھیتوں کو چھوڑ کر تانگہ دوراہے پر پہنچا تو اچھو نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بغیر وہ راستہ چن لیا جو جنگل کی طرف جاتا تھا۔ یہ جنگل حویلی والوں کا پسندیدہ مقام تھا۔ جب بھی شکار کا پروگرام بنتا تھا وہ یہیں آتے تھے۔

"قدرت کے کام نرالے ہیں۔" اس نے سوچا۔ "آج میں شکاری ہوں۔ اب سے پہلے کب سوچا تھا کہ اس جنگل میں اس نیت سے داخل ہوں گا۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں خود سب کو یہ داستان سناؤں گا تاکہ رجب علی دوبارہ کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ اس کا سر اتنا جھک جائے کہ اس کے قدموں میں جا گرے۔ پھر چاہے یہ تینوں بھائی مل کر میرے گلے میں رسی ڈال کر مجھے گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹیں۔ مجھے پروا نہیں۔ بس ایک مرتبہ میرے اندر کی آگ ٹھنڈی ہو جائے۔ ایک مرتبہ رجب علی کا سر جھک جائے' بس ایک مرتبہ۔"

تانگہ انجانی راہوں پر رواں دواں تھا اور زیب النساء کا دل چاہ رہا تھا کہ راستہ لمبا ہوتا جائے کتنا دلچسپ اور سنسنی خیز سفر تھا یہ۔ راستہ انجانا تھا' نقرئی چاندنی تھی' فضا میں موسیقی کی کھنک تھی اور وہ تھی' بالکل اکیلی' مکمل طور پر آزاد شاید کسی اور کو یہ آزادی مکمل نہ لگے لیکن اس کے لیے یہ آزادی بھی بہت بڑی نعمت تھی۔

یہاں اس کے گرد حویلی کی موٹی موٹی دیواریں نہیں تھیں اس کے اور آزاد دنیا کے درمیان ایک باریک سا پردہ حائل تھا اور بس۔ یہاں سے اس نے بھیدی پہیوں کو بھی دیکھا تھا اور آنکھ مچولی چھوڑ کر گم صم اسے تکے جانے والے تاروں کو بھی۔ بغیر کسی ڈر اور خوف کے لیکن سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ انہوں نے بھی اسے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر کتنا حیران ہوئے تھے وہ۔

زیب النساء خوشی سے سرشار تھی اور خوشی کا یہ تاثر اتنا بھرپور تھا کہ وہ ہنس پڑی اور ہنستی چلی گئی۔

اچھو نے حیرت سے پیچھے دیکھا جہاں سے ہنسی کی آواز ابھری تھی۔

"یہ کون ہنسا ہے؟" اس نے سوچا۔ "چھوٹی بی بی! نہیں۔ وہ کیسے اتنا اونچا ہنس سکتی ہیں۔ مگر ان کے علاوہ کوئی ہے بھی تو نہیں۔ وہ اکیلی ہی تو بیٹھیں ہیں۔"

اس نے پھر اچنبھے سے پیچھے کی سمت دیکھا جہاں سے ہنسی کی مسلسل آواز آ رہی تھی اور تانگہ روک لیا لیکن ہنسی کی آواز اسی طرح جاری تھی۔ یہ سوچنا تو بعد کی بات تھی کہ وہ ہنسی کس کی تھی۔ ابھی تو وہ اس سُریلی ہنسی میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ کتنی خوبصورت' کھنک دار آواز تھی کہ وہ خود بخود مسحور ہوتا جا رہا تھا۔

ہاں' وہ اچھو مسحور ہو رہا تھا جس نے آج تک لڑکیوں کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔ جس کے نزدیک عورت کے نرم و نازک وجود سے زیادہ کشش اس پہلوان میں ہوا کرتی تھی جو آنکھوں میں اسے چت کرنے کی خواہش لیے اس کی طرف بڑھتا تھا۔ اس کے پاس تو اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اپنی ماں کے علاوہ کسی عورت' کسی لڑکی کو غور سے نظر بھر کر دیکھے۔ وہی اچھو آج صرف ایک ہنسی سن کر مسحور ہو گیا تھا۔

ہنستے ہنستے زیب النساء کو احساس ہوا کہ تانگہ رک چکا ہے۔ اس کی ہنسی ایکا ایکی تھم گئی۔ اس کا دل بے کل ہو گیا۔

"کیا وہ دلچسپ سفر تمام ہو گیا۔ کیا میری آزادی کی حد یہیں تک تھی؟ اتنی سی آزادی پر خوش ہو رہی تھی میں؟" اس نے سوچا پھر اچانک اسے خیال آیا۔ "مگر یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے؟ نہ ڈھول' نہ باجے' اتنی خاموشی۔"

اس نے چادر کا نقاب چہرے پر ڈالا اور تانگے کے گرد تنا ہوا پردہ اٹھا کر باہر دیکھنا چاہا کہ اسی وقت باہر سے کسی نے پردہ اٹھا دیا۔ پردہ اٹھانے والا وہی کوچوان تھا جسے علی نے اچھو کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ زیب النساء نے متجسس نظروں سے باہر کی طرف دیکھا لیکن وہ بہت اجنبی اور اندھیری جگہ تھی۔ نہ کوئی حویلی تھی' نہ شادی کا ہنگامہ۔ بس درخت ہی درخت تھے اور ان سے چھن کر آنے والی چاندنی۔

ابھی وہ صورتِ حال کو سمجھ ہی نہیں سکی تھی کہ اچھو نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو مضبوطی سے

پکڑ لیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

"چھ...... چھ...... چھوڑو۔" وہ ہکلائی لیکن الفاظ ٹھیک طور سے ادا بھی نہیں ہو سکے۔

چھوڑنے کے بجائے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی اور اچھو نے ایک جھٹکے کے ساتھ یوں کھینچ کر اسے باہر کھڑا کر دیا جیسے وہ جاندار لڑکی نہیں کوئی ہلکی پھلکی سی گڑیا ہو۔

خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کا حلق بند ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سانس کی آمد و رفت بھی ختم ہوتی جا رہی ہو۔ اچھو کی انگلیاں اس کے بازو کی نرم و نازک کھال میں کھبتی جا رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔

اگلے ہی پل ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ نقاب الٹا جا چکا تھا۔

☆======☆======☆

کمرے کی کھڑکی کے عین نیچے دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر دیئے زرینہ رو رہی تھی۔ حیدر علی کے الفاظ نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اس کی خاطر اپنی عزیز از جان بہن سے بھی لڑ پڑتی تھی اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی تھی اور حیدر علی نے اپنی بہن کی خاطر اسے اس بری طرح ڈانٹ دیا تھا اور جب وہ پلٹ کر جا رہی تھی تو اسے ایک مرتبہ رسماً ہی سہی رکنے کو بھی نہیں کہا تھا۔

"یہی فرق ہوتا ہے مرد اور عورت میں۔" وہ سوچ رہی تھی۔ "وہ چاہتا ہے کہ عورت سب بندھن توڑ کر صرف اور صرف ایک بندھن باندھ لے۔ صرف اور صرف ایک شخص کی ہو جائے لیکن عورت مرد کو اس کے سب رشتوں' سب بندھنوں سمیت قبول کرتی ہے اور ساری زندگی انہی رشتوں اور بندھنوں کو پانی دے کر سیراب کرنے میں گزار دیتی ہے۔"

"گوری۔"

کھڑکی کے قریب سے آواز آئی۔ اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔

"گوری۔" حیدر علی نے دوبارہ پکارا۔

زرینہ نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے کھڑکی کے باہر کی جانب حیدر علی کھڑا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ میرا مطلب تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔"

آنسو پھر بہہ نکلے۔ اس نے انگلی کے پور سے زرینہ کے آنسو پونچھے۔

"پلیز اب مت رونا۔" اس نے رسان سے کہا۔ "تمہارے آنسو میرے دل پر گرتے ہیں۔"

"آپ باہر کیوں کھڑے ہیں' اندر آ جائیں۔" اس نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔ "لیکن یہاں سے نہیں۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔"

وہ مڑ گئی۔ دروازے کی کنڈی کھولی' حیدر علی سامنے ہی کھڑا تھا۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ دونوں زرینہ کے کمرے میں آ گئے۔

''بیٹھیں۔'' اس نے چار پائی کی طرف اشارہ کیا۔

حیدر علی نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہاں دو چار پائیوں کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ دونوں چار پائیوں پر صاف ستھری چادریں بچھی ہوئی تھیں جن پر ہاتھ کی کڑھائی کی گئی تھی۔ ان میں سے ایک چار پائی پر بیٹھ گیا۔ زرینہ اپنے لیے برآمدے سے پیڑھی لے آئی۔

''اوپر بیٹھو ناں۔''

''نہیں شاہ جی' میں ٹھیک ہوں۔''

وہ دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے۔ حیدر علی نے اس خاموشی کو توڑا۔

''ناراض ہو مجھ سے؟''

''جھوٹ نہیں بولوں گی۔'' وہ بولی۔ ''ہاں میں ناراض ہوں۔''

''مجھے احساس ہے غلطی میری تھی۔ مجھے اس طرح نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا تمہیں لیکن میں پریشان تھا اس لیے تمہاری باتیں برداشت نہیں کر سکا۔''

''آپ مجھے میری وجہ سے ڈانٹ دیتے' مجھے پروا نہ ہوتی لیکن آپ نے کسی اور کی محبت کو میری محبت پر ترجیح دے کر مجھے ڈانٹا۔'' اس نے ہونٹ کاٹے۔

''میں نے کسی کی محبت کو تمہاری محبت پر ترجیح نہیں دی۔ تمہاری محبت اپنی جگہ ہے باقی سب کی اپنی جگہ اور زیبی آپی کوئی اور نہیں میری بہن ہیں گوری۔'' اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ کہتے تھے کہ آپ کو میری کوئی بات بری نہیں لگتی۔'' ''بری لگ ہی نہیں سکتی لیکن مجھے یقین ہے کہ اب میں کچھ بولی تو آپ پھر مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ شاید میرے پاس واپس بھی نہ آئیں اس لیے چھوڑیں اس بات کو۔'' وہ بولی۔ ''یہ بتائیں موٹر کیسے خراب ہو گئی اور اب آپ کیسے جائیں گے؟''

حیدر علی نے گہرا سانس لیا اور بولا۔

''یہ محض اتفاق ہے کہ گاڑی یہاں خراب ہو گئی ہے۔ باقی کاریں جا چکی تھیں۔ سب گھر والے بھی چلے گئے تھے صرف میں اور زیبی آپی رہ گئے تھے۔ یہ کار ویسے بھی کچھ خراب ہو رہی تھی یہاں آ کر بالکل ہی رک گئی۔ پھر تم بھی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اس لیے زیبی آپی نے سوچا کہ میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں۔''

''میں تو مجبور تھی۔ موٹر کی آواز سنتی ہوں تو آپ کے آنے کا گمان ہوتا ہے اور لپک کر کھڑکی میں آ جاتی ہوں' مجھے تو میری محبت نے مجبور کر رکھا ہے۔''

حیدر علی اسے تکنے گیا۔

''اگر اسے میری اور فوزیہ کی منگنی کا علم ہو جائے تو شاید یہ اپنی جان ہی دے دے۔'' اس نے سوچا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ کی آپی نے کچھ کہا ہے' ورنہ آپ مجھے دیکھ کر بھی میرے پاس نہ آتے' یہ کیسے ہو سکتا تھا؟''

''آپی بہت دکھی ہیں گوری' آپی بھی اور بڑی آپا بھی۔''

''دکھی تو میں بھی ہوں شاہ جی۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''تمہیں کیا دکھ ہے؟''

''محبت سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ بہت تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے بس اسی کے لیے جیتا ہے اور اس کی محبت میں کتنی ہی مرتبہ مرتا ہے لیکن چھوڑیں ان باتوں کو ان میں کیا رکھا ہے؟''

''باقی سب گھر والے مہندی پر ہی گئے ہیں؟'' حیدر علی نے موضوع بدلنا چاہا۔

''ہوں۔'' وہ بولی۔ ''اماں مجھے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھیں لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ اس سے پہلے بس ختم قرآن پاک پر گئی تھیں۔ کیونکہ وہ صبح کے وقت تھا۔ ڈھولکی پر ایک دن بھی نہیں گئیں۔ بے چاری رضیہ بھی میری وجہ سے نہیں جاتی تھی حالانکہ اس کا دل بہت چاہتا تھا جانے کو۔ آج بھی رکنے کو کہہ رہی تھی مگر میں نے زبردستی بھیج دیا اسے۔''

''مجھے آپی کی بھی فکر ہے۔ انہوں نے کبھی ضد نہیں کی' پتا نہیں کیوں انہوں نے اتنی ضد کر ڈالی۔''

''کیسی ضد؟''

''میں چاہتا تھا کہ وہ یہاں تمہارے پاس ٹھہر جائیں اور میں کار کا بندوبست کر لوں لیکن وہ نہیں مانیں۔''

''وہ کیسے مانتیں۔'' زرینہ نے دل میں سوچا۔ ''یوں سامنا کرنا اتنا آسان تو نہیں ہے۔''

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ چونکی۔ ''سوچ رہی تھی کہ تھوڑی دیر میں آپ چلے جائیں گے اور یہ جگہ کتنی سونی سونی لگنے لگے گی۔''

''اپنے آپ کو میری اتنی زیادہ عادت مت ڈالو گوری۔''

''جب عادت پڑ گئی تب کہتے ہیں عادت نہ ڈالو۔''

''وہ خیال آیا۔''

''کیا؟''

حیدر علی نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''ابھی کسی کو بھی آنے میں کم از کم سوا گھنٹہ لگے

گا۔"

"پھر؟"

"تب کچھ فوٹو گرافی نہ ہو جائے۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کیمرا کار میں رکھا ہوا ہے کیوں نہ تمہاری کچھ تصویریں ہو جائیں۔"

"میری تصویریں؟ میں تو ساری کی ساری آپ کے سامنے ہوں۔"

"تصویریں تو یادیں ہوتی ہیں اور پتا ہے یہ یادیں انسان کے لیے سرمایہ کب بنتی ہیں؟"

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"جب جوانی ڈھل جاتی ہے اور انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تب سردیوں کی کسی ٹھٹھرتی ہوئی شام کو راکنگ چیئر پر بیٹھ کر آتش دان کے سامنے کافی پیتے ہوئے اسے وہ دن بہت یاد آتے ہیں جو اس کے اپنے تھے‘ جب وہ زندگی کی حرارت اپنے جسم کے ایک ایک ریشے میں محسوس کر سکتا تھا اور جب کسی پری وش کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ کائنات کی سب وسعتوں کو ایک جست میں پھلانگنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ان خوبصورت دنوں کی کوئی یادگار تو ہونی چاہیے ناں؟"

"ہاں۔" وہ مسکرا دی۔ "جب ہم دونوں بوڑھے ہو جائیں گے تب یہ تصویریں دیکھیں گے اور ان دنوں کو یاد کریں گے۔ یہ تصویریں بھی میری امانت ہوں گی آپ کے پاس۔ یاد ہے ناں آپ کو پہلے بھی میں نے ایک امانت دے رکھی ہے۔"

"ہاں۔ تمہاری چین تمہیں اس دن مل جائے گی جس دن تم میری ہو جاؤ گی۔"

"شکریہ۔" وہ ہنس پڑی۔

"شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے جو اتنی دیر بعد ہنسی ہو۔" وہ بھی مسکرا دیا۔ "میں باہر سے کیمرا لے آؤں۔"

☆======☆======☆

سیاہ چادر کے حلقے میں چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے چہرے پر اچھو کی نظریں ایسی تھمیں کہ وہ پلکیں جھپکنا ہی بھول گیا۔ وہ تو پرستان کی کوئی پری لگ رہی تھی۔ لگتا تھا زمین پر جنت سے کوئی حور اتر آئی ہو۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ زیب النساء کے بازو پر اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی ہے وہ تو اسے تکنے میں کھویا ہوا تھا جب مدھم سی سسکی کی آواز سن کر وہ واپس پلٹ آیا۔ زیب النساء کے چہرے پر خوف اور تکلیف کے آثار منجمد ہو چکے تھے۔ اچھو کے دل پر بھاری بوجھ آ گرا۔ اس نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ زیب النساء نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ اچھو اس کے بالکل مقابل کھڑا تھا۔ اس نے ایک نظر اس کے چوڑے چکلے وجود کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے خوفزدہ ہو کر آنکھیں دوبارہ میچ لیں۔

"کیا میں اتنی حسین‘ اتنی معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کر دوں؟" اس نے سوچا۔ "ایک ایسی لڑکی کی زندگی جس پر آج سے قبل کسی نامحرم کی نگاہ بھی نہیں پڑی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

اگلے ہی لمحے اس کے دماغ نے صدائے احتجاج بلند کی۔

"لیکن تم اسے ایک لڑکی کی حیثیت سے یہاں نہیں لائے۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس وقت یہ صرف اور صرف رجب علی شاہ کی بہن ہے۔ اس رجب علی شاہ کی جس نے تم سے تمہارا مان‘ تمہاری عزت اور تمہارا غرور چھینا ہے۔ اپنی عزت کا بدلہ لینا تمہارا فرض ہے۔ اس لڑکی کی حیثیت ثانوی ہے۔ اسے تم بطور انسان نہیں لائے۔ یہ تو ایک چیز ہے‘ ایک کھلونا ہے اور بس۔ کھیلو اور توڑ دو۔ نہ توڑنا چاہو تو واپس کر دو۔ اس کے بغیر رجب علی شاہ کا سر کبھی نہیں جھکے گا۔"

اچھو نے ہاتھ بڑھایا لیکن زیب النساء کی معصومیت نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ وہ عجیب شش و پنج میں گرفتار ہو گیا تھا۔ زیب النساء کو یہاں لاتے ہوئے اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ رجب علی شاہ کی بہن‘ اس کی عزت کو اپنے ساتھ لا رہا ہے اور رجب علی کی عزت کو مٹی میں ملانا اس کا واحد مقصد تھا‘ لیکن یہاں پہنچ کر احساس ہوا تھا کہ وہ رجب علی کی بہن ہی نہیں اپنے آپ میں ایک مکمل شخصیت بھی ہے۔

"کیا کروں؟"

یہ سوال مسلسل اس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ غصے میں کچھ دور درخت کے ایک کٹے ہوئے تنے پر جا بیٹھا۔ زیب النساء کو احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے تو اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اچھو اس کے سامنے نہیں تھا۔ اس کا دماغ اس تمام تر صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ خوفزدہ تو وہ پہلے بھی تھی۔ اب خود کو اکیلا پا کر اسے لگا کہ وہیں گر کر بے ہوش ہو جائے گی۔ بہت مشکلوں سے قریبی درخت کے تنے کا سہارا لے کر وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہو گا؟" آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے سوچا۔ "خدا جانے یہ کون سی جگہ ہے۔ میں کہاں ہوں اور وہ کہاں گیا۔ یہ کیا ہو گیا اچانک۔"

بازو میں ٹیس اٹھی تو اس کے منہ سے سسکی نکل گئی اور دائیں ہاتھ سے بایاں بازو سہلانے لگی۔

"لیکن وہ لمس کتنا عجیب تھا۔" اس نے بازو سہلاتے ہوئے سوچا۔ "اس وقت تکلیف دہ محسوس ہوا تھا۔ پر اب سنسنی خیز لگ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی تک اس نے پکڑ رکھا ہے۔ اور اس کے ہاتھ کتنے مضبوط تھے یوں جیسے فولاد کے بنے ہوں۔ مگر وہ گیا کہاں۔"

اس نے کن اکھیوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا لیکن اسے اچھو کہیں بھی نظر نہ آیا۔ چادر اس کے سر سے سرک گئی۔ بائیں بازو سے چادر ہٹا کر اس نے قمیص کی آستین اٹھا کر چاندنی میں اپنے

بازو کا جائزہ لیا۔ گورے بازو پر سرخ نشان بہت واضح تھے۔ اس نے ان نشانوں پر ہاتھ پھیرا یوں لگتا تھا جیسے پکڑنے والا اپنے ہاتھ کا لمس وہیں چھوڑ گیا ہو۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا۔ اس مرتبہ اس نے خوب غور سے اچھو کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچھو کے نظر نہ آنے پر خوش ہو یا اس ویرانے میں تنہا رہ جانے کے بعد اس کے مل جانے کی دعا کرے۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اچھو کا وہاں رہنا زیادہ خطرناک تھا یا وہاں سے چلے جانا۔

غور سے دیکھنے پر سامنے درختوں کے جھنڈ میں ایک کٹے ہوئے تنے پر اس کا ہیولہ سا دکھائی دیا۔

اچھو تنے پر بیٹھا بغور اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ خوفزدہ تھی۔ پھر بازو سہلانے لگی۔ یقیناً اس نے اسے بہت سختی سے پکڑا تھا۔ اپنی اس وحشیانہ حرکت پر اسے خود ہی غصہ آگیا۔ پھر چھوٹی بی بی نے چادر ہٹا دی۔ اس کے لمبے بالوں کی چٹیا بل کھا کر سامنے اس کی گود میں پڑی ہوئی تھی۔ جب اس نے آستین اٹھا کر اپنے گورے بازو کو سہلانا شروع کیا تو اچھو کا دل چاہا اپنا ہاتھ کاٹ کر پھینک دے۔ اس کے یہ مضبوط ہاتھ بھی اپنے جیسے کسی طاقتور مرد پر اٹھے تھے۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اس نے کسی کمزور لڑکی پر طاقت استعمال کی تھی۔ اس کا سر شرم سے جھک گیا۔

وہ کتنی معصوم، کتنی پیاری لڑکی تھی۔ فرشتوں کے سے تقدس والی، وہ کیا کرنے چلا تھا اس کے ساتھ اسے اپنی مردانگی پر ہی تو مان تھا لیکن اپنے اس مان کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کیا بھونڈا طریقہ ڈھونڈا تھا اس نے۔

''یہ موقع پھر نہیں ملے گا۔'' اس کا دماغ بار بار اصرار کر رہا تھا۔

لیکن دل ہر مرتبہ لعنت ملامت کر کے اسے روک دیتا تھا۔

''میں ایک بے قصور لڑکی کو اس کے بھائی کے کیے کی سزا نہیں دے سکتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بے قصور تو تم بھی تھے۔ تم سے کیا خطا سرزد ہوئی تھی جس کی اتنی کڑی سزا دی رجب علی شاہ نے۔'' دماغ نے اسے اکسایا۔

''لیکن انصاف کے تقاضوں کے مطابق اس کی غلطی کی سزا اسی کو ملنی چاہیے۔'' اس نے دل ہی دل میں دماغ سے جرح کی۔

''یہ سزا بھی تو اسی کو ملے گی، اسی کا سر جھکے گا۔ شادی کے لیے اس سے شاندار تحفہ کیا ملے گا اسے۔''

''اس سزا میں تو اس کا پورا گھرانہ شامل ہو جائے گا۔ وہ بھی جنہوں نے جرم نہیں کیا۔''

''جرم سب نے کیا ہے۔'' دماغ نے زور دیا۔ ''اس جرم میں وہ بھی شریک ہیں جو اس کا ہاتھ روک سکتے تھے لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ نہیں روکا۔''

''مگر اس کی بہن تو اس کا ہاتھ نہیں روک سکتی تھی۔'' اس نے دماغ کو سمجھایا۔ ''خطا اس کی تو نہیں تھی پھر سزا میں وہ کیوں شریک ہو؟ اور پھر عورت کو انتقام کا نشانہ بنانا کہاں کی مردانگی ہے؟ بے چاری تو یوں بھی خوفزدہ ہے۔ نہ جانے میں نے اسے کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔ وہ اب بھی بازو سہلا رہی ہے۔ افسوس میں نے بہت برا کیا۔''

اس نے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ تنے پر مارا۔ ''کاش میں نے یہ نہ کیا ہوتا۔''

زیب النساء اپنا بازو چھوڑ کر اسے تکنے لگی۔ وہ اپنا ہاتھ تنے پر مار رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ اب اسے اچھو سے بالکل خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا لمس اسے اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ وہ پہلا غیر مرد تھا جو اس کی زندگی میں آیا تھا۔ جس نے اسے چھوا اور اسے دیکھا تھا۔ خوابوں میں اس کی سمت بڑھنے والے ہیولے سے لپٹی دھند چھٹ گئی تھی۔ خدوخال واضح ہو گئے تھے اور جو شبیہہ ابھری تھی وہ ہو بہو اچھو کی تھی۔

اس جگہ اچھو کی موجودگی اسے دلاسا دے رہی تھی۔ اس کا تنومند وجود، اس کے فولاد جیسے ہاتھ اسے کسی بھی مصیبت سے بچا سکتے تھے۔ اس کا تحفظ کر سکتے تھے۔ اس کا خوف ختم ہوتا جا رہا تھا۔

لیکن وہ اسے یہاں کیوں لایا تھا؟ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''پتا نہیں کیوں۔'' اس نے سوچا۔ ''یا شاید وہ میرے خوابوں کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے مجھے یہاں لایا ہے یہ بتانے کے لیے لایا ہے کہ اسی طرح وہ مجھے ان اونچی اونچی دیواروں سے بھی نکال سکتا ہے۔ کیا میری دعائیں قبول ہو گئی ہیں؟ یا عہد نبھانے کے لیے کوئی مسیحا میری زندگی میں چلا آیا ہے؟ ہاں تب ہی تو وہ لمس اتنا اپنا اپنا سا لگا ہے۔ تب ہی تو اب تک میں وہ مضبوط انگلیاں اپنے بازو پر محسوس کر رہی ہوں۔ ہاں تب ہی تو......

لیکن اگر یہ میرے لیے آیا ہے تو کہتا کیوں نہیں ہے بتاتا کیوں نہیں ہے۔ امید کیوں نہیں دلاتا کہ مجھے سب سے بچالے گا۔ سزا دینے والا کوئی ہاتھ، غصہ بھری کوئی نظر مجھ تک نہیں پہنچ سکے گی۔ کیوں نہیں کہتا کہ یہ مجھے زمانے کے تمام دکھوں سے چھپا کر رکھے گا۔ ایسی جگہ لے جائے گا جہاں پھوپھو کی روح نہیں ہوگی۔ کراہتی مسہری اور مذاق اڑاتا آئینہ نہیں ہوگا۔ جہاں کی دیواریں لہجوں کی بازگشت بن کر میرے اعصاب نہیں چٹخائیں گی۔ کیوں نہیں کہتا آخر۔'' اس نے امید بھری نگاہوں سے اچھو کی جانب دیکھا۔ ''میں بھی کتنی بے عقل ہوں۔ علی نے خود ہی تو بتایا تھا کہ یہ بول نہیں سکتا۔ تب ہی تو اس نے کچھ نہیں کہا۔ چاہتا ہوگا کہ میں خود ہی سب کچھ سمجھ جاؤں لیکن میں کچھ نہیں سمجھی۔ ہاں اسی لیے اس نے تاسف سے اپنے ہاتھ کو تنے پر مارا

تھا۔ کتنا افسوس ہوا ہوگا اسے کہ میں کچھ نہیں سمجھی۔ پر اب میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں۔ مگر اسے کیسے بتلاؤں کہ میں نے سب اَن کہی باتیں سمجھ لی ہیں۔"

☆======☆======☆

"تصویریں تو میں کھینچ رہا ہوں لیکن روشنی کم ہے۔" حیدر علی نے کیمرے میں ریل ڈالتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں کیسی آئیں گی؟"

"دو لالٹین جل رہی ہیں پھر بھی روشنی کم ہے؟"

حیدر علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "دو چھوڑ کر چار لالٹین جلا لو تب بھی روشنی کم ہوگی۔ ویسے فلیش تو ہے میرے پاس۔ خیر دیکھتے ہیں۔ ویسے کبھی دن میں کھینچنا ممکن ہو تو بہترین تصویریں کھینچیں۔"

"دن میں تو ناممکن ہی سمجھیں۔" وہ بولی۔ "کوئی ایسی جگہ ہی نہیں ہے جہاں ہم مل سکیں۔ اماں ابا...... کو کیا پورے گاؤں کو خبر ہو جائے گی کہ ہم ملتے رہتے ہیں۔"

"خالہ کبریٰ کے بیٹے نے مصیبت ڈال دی ورنہ اچھی بھلی ملاقات ہو جاتی تھی۔" وہ بولا۔

"خیر چھوڑو۔ کوئی اچھا سا پوز دو۔"

"کیا مطلب؟"

"اب اس کا کیا مطلب سمجھائیں تمہیں۔ پہلے ایسا کرو کہ گھر میں جتنی لالٹین یا موم بتیاں ہوں وہ لے آؤ۔"

"آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔"

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے جسے غالباً سٹور روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا لیکن عام گھروں کے اسٹور کے برعکس یہ بہت صاف ستھرا اور تمام فالتو سامان بھی قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ زرینہ نے لالٹین اونچی کی۔ شیلف پر چار لالٹین اور بہت سے دیئے پڑے ہوئے تھے۔ وہ یہ سب سامان کمرے میں اٹھا لائے۔

"اگر ہم ان سب کو جلا دیں تو روشنی زیادہ ہو جائے گی؟"

زرینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"مجھے صرف اتنی لائٹ چاہیے جس میں فوکس کیا جا سکے...... گزارا ہو جائے گا۔"

"تو چلیں دیئے جلاتے ہیں۔" اس نے کہا۔

وہ دونوں ترتیب سے رکھے ہوئے دیئے جلانے لگے۔

"مجھے نہیں معلوم تھا دیئے جلانا اتنا دلچسپ کام بھی ہو سکتا ہے۔" حیدر علی بولا۔

"پہلے کبھی نہیں جلائے؟"

"تمہارے ساتھ پہلے کبھی نہیں جلائے اس لیے۔"

زرینہ نے پلکیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔ حیدر علی اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ دیئے کی مدھم لو کے سب رنگ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ حیدر علی کو مسلسل اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ جھینپ کے پھر دیوں پر جھک گئی۔

☆======☆======☆

"کتنی دیر ہو گئی ہے، زیبی اب تک نہیں پہنچی۔" مہر النساء نے اماں جان کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں خود فکر مند ہوں کہ اب تک آئی کیوں نہیں۔"

"شاید اس نے آنے کا ارادہ بدل دیا ہو۔" مہر النساء نے خیال ظاہر کیا۔

"ارادہ کیوں بدل دیا ہو۔ میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ تیار ہو کر جلد از جلد علی کے ساتھ یہاں پہنچے۔"

"پھر کیوں نہیں آئی؟"

"باہر پتا کراؤ کہ علی آیا ہے یا نہیں۔ اگر وہ آ گیا ہے تو اس کا مطلب ہے زیبی نے آنے کا ارادہ بدل دیا ہے اور اگر وہ اب تک نہیں آیا تو زیبی نے اسے بھی اپنے ساتھ دیر کروا دی ہوگی۔"

"میں پتا کرواتی ہوں۔" مہر النساء نے کہا اور حمیدہ کو علی کا پتا کرنے باہر بھیج دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد حمیدہ نے اطلاع دی کہ حیدر علی بھی اب تک نہیں پہنچا۔

"بس دونوں آتے ہی ہوں گے۔" مہر النساء مطمئن ہو کر اس کونے کی طرف دیکھنے لگی جہاں رضیہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ کافی دیر سے اسے زرینہ کی غیر موجودگی کھٹک رہی تھی۔

"رضیہ آ گئی ہے، زرینہ کیوں نہیں آئی۔" وہ یہی سوچ رہی تھی۔ اچانک ایک خدشے نے سر اٹھایا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ علی کو زرینہ نے کسی طور روک لیا ہو؟ لیکن کیسے؟ اور پھر علی اکیلا تو نہیں اس کے ساتھ زیبی بھی ہے۔"

رضیہ اور دوسری لڑکیاں باتیں بھی کر رہی تھیں اور مسلسل ہنس بھی رہی تھیں۔

"دیکھا جائے تو رضیہ اور زرینہ کی شکلیں بہت ملتی ہیں۔" وہ سوچ رہی تھی۔ "لیکن زرینہ پھر بھی زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ بہت گوری ہے جبکہ رضیہ سانولی ہے بالکل ویسے ہی جیسے زیبی گوری اور میں سانولی ہوں۔ میرے اور زیبی کے درمیان بھی وہی فرق ہوگا جو رضیہ اور زرینہ کے درمیان ہے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لینے والی اولاد میں بھی اس قدر فرق ہوتا ہے۔

حُسن کتنا اہم ہوتا ہے عورت کے لیے۔ اگر مردوں کو موقع دیا جائے تو وہ کبھی کم صورت لڑکی کو نہیں چنیں گے۔ علی کو ہی دیکھ لو، گاؤں کی سب سے حسین لڑکی پسند کی ہے اپنے لیے۔ وہ

فوزیہ بے چاری تو کچھ نہیں ہے زرینہ کے مقابلے میں۔ اس کی نگاہیں خود بخود فوزیہ کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس میں علی کو متوجہ کرنے کی کوئی صفت بھی تو نہیں ہے۔ رنگ صاف ہے لیکن ناک نقشہ بس گزارے لائق ہے۔ علی کی ولایتی سوچ کے سامنے یہ اپنی دیسی سوچ لیے کبھی بھی سر نہیں اُٹھا سکے گی۔ جس جہان کی باتیں علی کرتا ہے اس تک تو اس کی سوچ کی پرواز بھی ممکن نہیں۔ یہ تو اس کے سامنے اپنی شخصیت لیے سرنگوں ہوتی جائے گی دبتی جائے گی۔ جیسے ہر عام عورت کے ساتھ ہوتا ہے' جیسے اماں جان کے ساتھ ہوا۔"

فوزیہ چلتے ہوئے اس کے قریب آ گئی۔

"زیبی آپی نہیں آئیں؟" اس نے آہستہ آواز میں پوچھا۔ وہ یونہی مدھم آواز میں باتیں کرنے کی عادی تھی۔

"آتی ہو گی اسے اور علی کو اکٹھے آنا ہے۔"

علی کا نام سن کر فوزیہ کے چہرے پر شرم کے کئی رنگ پھیل گئے۔

"جی۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"کھڑی کیوں ہو۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔" مہر النساء نے اپنے ساتھ صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی۔" وہ بیٹھ گئی۔" اس کے چہرے پر اب تک رنگ ہی رنگ پھیلے ہوئے تھے۔

مہر النساء کو اس پر ترس آنے لگا۔

"اسے کیا معلوم کہ جس کے ذکر پر اس کے چہرے پر اتنے رنگ پھیل گئے ہیں' وہ اسے نہیں کسی اور کو چاہتا ہے۔ کتنی تکلیف دہ حقیقت ہے۔ یہ زرینہ کا کسی صورت مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن چپ چاپ بغیر دیکھے علی سے محبت کیے جا رہی ہے۔ خود علی کو بھی اس محبت کی خبر نہیں۔ اسے خبر ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ وہ تو زرینہ کے علاوہ کسی اور کی جانب دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔

افسوس' جس نے بڑھ کر اظہارِ محبت کر دیا' یہ مرد اس کی جانب قدم بڑھا دیتے ہیں اور جو اتنی محبت دل میں چھپائے رکھے اسے درخورِ اعتنا ہی نہیں جانتے۔"

"کیا سوچ رہی ہیں آپا؟"

فوزیہ کی بات نے اسے چونکا دیا۔

"سوچ رہی ہوں کہ اب علی کی شادی بھی ہو جانی چاہیے۔"

فوزیہ کا چہرہ شرم سے بالکل سرخ ہو گیا۔

"چچ...... چچ۔" مہر النساء نے دل ہی دل میں افسوس کیا۔ "اگر اسے علم ہو جائے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔"

☆======☆======☆

اچھو نے اپنے داہنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس ہاتھ سے اس نے چھوٹی بی بی کو پکڑ کر کھینچا تھا۔ اس کی انگلیاں اس کی نرم و نازک جلد میں کھبتی چلی گئیں اور اس نے پروا تک نہیں کی۔ کتنا بے رحم ہو گیا تھا وہ۔

اس نے تو یہ بھی پروا نہیں کی کہ وہ پیر صاحب کی بیٹی تھی۔ سیّدزادی تھی۔ ان پیر صاحب کی اولاد تھی جنہوں نے اس کے خاندان پر بے شمار احسان کیے تھے۔

اور یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ عورت نزاکت اور لطافت کا دوسرا نام ہے۔ جو اندھیری راہوں میں چاند کی طرح اپنے وجود کی روشنی بکھیرتی ہے۔

اس نے گاؤں میں بہت سی لڑکیاں دیکھی تھیں...... تین مرتبہ وہ شہر بھی گیا۔ وہاں بھی بے شمار لڑکیاں نظر آئی تھیں اسے' لیکن کسی میں بھی ایسی کشش' اتنی معصومیت نہیں تھی۔ اس نے بات نہیں کی تھی۔ اچھو کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ تو شاید کوئی شکوہ کرنا جانتی ہی نہیں تھی۔

"کاش یہ سیّدزادی نہ ہوتی' کاش یہ عام سے کسی کسان کی بیٹی ہوتی اور میں ابا سے کہلوا کر اسے اپنا لیتا۔" اس نے سوچا۔ "ماں کہتی تھیں کہ آج نہیں تو کل مجھے ضرور کوئی نہ کوئی لڑکی پسند آ جائے گی اور میں کہا کرتا تھا کہ میری زندگی میں وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ کتنا زعم تھا مجھے اپنے آپ پر۔ کیا معلوم تھا کہ ایک لڑکی کی معصومیت میرے دل میں اس طرح بس جائے گی کہ کائنات کا رخ ہی بدل جائے گا۔"

اور پسند بھی آئی تو کون سی لڑکی' جو چاند کی طرح روشن اور پُرکشش ہے تو اتنی دور بھی ہے۔ جسے چھونا تو کیا دیکھنا بھی منع ہے۔ جو میرے ہی نہیں کسی کے بھی نصیب میں نہیں ہے۔ آہ میری قسمت۔"

اچھو کے اندر خلا سا سرایت کرتا جا رہا تھا۔ سناٹا پھیلتا جا رہا تھا' لفظ گم ہو رہے تھے۔ صرف چھن جانے کا احساس تھا جو دل میں جڑ پکڑ رہا تھا۔

"کیا زندگی کے سب المیے میرے اوپر بیتیں گے؟ اندھیری راتوں کی ساری بے کلی صرف میرا ہی مقدر رہے گی؟ جو جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام بن کر آیا ہے' کیا میرے لیے سزا بن جائے گا؟ کیسے بھولوں گا اس لڑکی کو جس کے متعلق سوچنا بھی گناہ ہے؟ رجب علی شاہ تجھے سزا دیتے دیتے میں نے خود کو ہی عمر قید کی سزا دے ڈالی۔ مجھے کیا معلوم تھا ایسا ہو جائے گا۔ اچانک محبت مجھے اپنا قیدی بنا لے گی۔"

اس نے اپنے داہنے ہاتھ کو غور سے دیکھا جس کی انگلیوں کی پوروں پر زیب النساء کے لمس کی تازگی وہ اب تک محسوس کر رہا تھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ کل میری زبان پر لگے قفل خود بخود کھل جائیں گے مگر ان پر تو ایک اور قفل لگ گیا ہے۔ کبھی نہ کھلنے کے لیے۔ چاند کو بڑھ کر چھو لینے کی آرزو کو دل کے بہت اندر دفن

کر دینا چاہیے۔

دل پر بوجھ لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور شکستہ قدموں سے زیب النساء کی جانب بڑھا۔ زیب النساء بڑی بڑی آنکھیں کھولے قدم بہ قدم اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھتی رہی۔

''وہ آرہا ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''میرے لیے' مجھے امید دلانے کے لیے۔ یہ باور کرانے کے لیے کہ حویلی کی دیواریں خواہ کتنی اونچی اور موٹی کیوں نہ ہوں' اس کا راستہ کبھی نہیں روک سکتیں۔ مگر اس کے قدموں میں شکست کی چاپ کیوں ہے؟ شاید اس کا خیال ہے کہ میں اس کی بات نہیں سمجھی۔ پاگل' بھلا ہر بات کہہ دینے کے لیے لفظ ضروری ہوتے ہیں۔ میں تو بغیر لفظوں کے بھی سب کچھ سمجھ جاتی ہوں۔ ہر وہ شور سن لیتی ہوں جسے اور کوئی بھی نہیں سن سکتا۔

میں تو پھوپھو کی بھی ہر بات سمجھ لیتی ہوں جنہیں مرے ہوئے بھی ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ مجھے یاد ہے' جب میں حویلی سے نکلنے لگی تھی تب بھی انہوں نے کہا تھا کہ اگر میری زندگی میں کوئی اہم دن آئے۔ فیصلے کی کوئی گھڑی آئے تو مجھے حوصلہ اکٹھا کرنا ہوگا' ڈر اور خوف جو میری روح سے جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں انہیں اتار پھینکنا ہوگا۔ اپنا قدم آگے بڑھانا ہوگا تاکہ میں بھی ان کی طرح گھٹ گھٹ کر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اسی مسہری پر جان نہ دے دوں۔

اور میں بھی یہی سمجھتی رہی کہ میں اپنا قدم آگے نہیں بڑھا سکوں گی۔ ڈر کے بچھو ہمیشہ مجھے ڈنک مارتے رہے' خوف کے سانپ مجھے ڈستے رہے' کبھی عزت کے نام پر۔ کبھی مذہب کے نام پر۔ میرا جسم ان کے زہر سے نیل و نیل ہو گیا۔ سارے کا سارا۔ ڈر اور خوف کا زہر ایک ایک رگ و ریشے میں سرایت کرتا گیا۔ میں نے اس ساری زندگی کے لیے مقدر جان کر اس سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

مگر آج جسم کا ایک ایک ریشہ احتجاج کر رہا ہے' مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ ''آخر کیوں؟'' میرا اپنا وجود باغی ہو رہا ہے۔ خوف کی جونکیں خود ہی مر مر کے گرتی جا رہی ہیں۔ صرف اس ایک شخص کی وجہ سے' جو مجھے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لے تو دنیا کا کوئی تیر مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ میں تو بہت کمزور تھی۔ بہت ڈرپوک تھی۔ یہ اس ایک شخص کا اعجاز ہے کہ میری کمزوری نے خود ہی دم توڑ دیا ہے۔ ڈر اور خوف نہ جانے کہاں گم ہو گئے ہیں اور میں ٹھنڈی شفاف فضا میں سانس لینے لگی ہوں۔

ہاں' میں نے ڈر اور خوف کے بندھن سے خود کو چھڑا لیا ہے۔ مجھے مسہری پر گھٹ گھٹ کر جان دینا منظور نہیں ہے۔ مجھے دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان نہیں دینی۔ مجھے زندہ رہنا ہے۔ زندگی پر میرا بھی حق ہے اور یہ حق میں پوری طرح وصول کروں گی۔ جب ساتھ دینے والا اس قدر مضبوط ہو تو کسی کا ڈر کیسا؟''

اور پھر وہ انوکھا لمس۔ اس نے سوچتے سوچتے اپنے بازو پر وہیں ہاتھ رکھ دیا۔ جہاں اچھو کی انگلیوں کے نشان اب بھی موجود تھے۔

اچھو قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے مقابل پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکا۔ زیب النساء اسی کو تک رہی تھی۔ اچھو نے نظریں جھکا دیں۔ وہ چاہتا تھا کہ معذرت کے چند الفاظ بول کر دل کو تسلی دے لیکن لفظ کھو گئے تھے اور ذات کے اندر بننے والا خلا بڑھ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر چادر زیب النساء کے سر پر رکھ دی اور اس کی طرف دیکھے بغیر تانگے کی سمت بڑھ گیا۔ زیب النساء بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی جا رہی تھیں۔

''کیا یہ کوئی اشارہ تھا؟'' وہ سوچ رہی تھی۔

تانگے پر چڑھنے سے قبل ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے اچھو کی سمت دیکھا اور پھر اندر بیٹھ گئی۔ اچھو نے تانگے کے گرد پردہ برابر کیا اور تھوڑی ہی دیر میں تانگہ چل پڑا۔

اچھو ہر سزا کے لیے تیار تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اب اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ حویلی کی سیّد زادی کو اس کی مرضی کے بغیر جنگل میں لے جانا' اس کا چہرہ دیکھ لینا' اسے چھونے کی جسارت کرنا۔ یہ کوئی چھوٹے جرائم تو نہیں تھے۔ یوں بھی رجب علی اسے بتا چکا تھا کہ اس کی دوسری حماقت کی سزا کیا ہوگی۔ وہ بھی موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ اسے صرف اس بات کا رنج تھا کہ جس لڑکی کو محبت کی نظر سے دیکھا تھا اسی کو تکلیف پہنچانے کا الزام مرنے سے پہلے اس کی روح کو چھید ڈالے گا۔

☆======☆======☆

اتنے سارے دِیوں اور لالٹینوں کی وجہ سے کمرا اچھا خاصا روشن ہو گیا تھا۔

''اب کافی ہے روشنی؟'' زرینہ نے سوالیہ نگاہوں سے حیدر علی کی جانب دیکھا۔

''ہاں بہتر ہے۔'' وہ بولا۔ ''اب تم تصویریں اتھوانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''میں بالکل تیار ہوں۔''

''یونہی کھنچواؤ گی؟''

''کیوں ٹھیک نہیں لگ رہی؟'' اس نے ہاتھ سے قمیص کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کی۔

''تم تو کیسے بھی رہو' دنیا کی حسین ترین لڑکی رہو گی۔''

وہ ہنس پڑی۔

''بیک گراؤنڈ دھندلا کرنا پڑے گا۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ کمرے میں بیک گراؤنڈ کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں ہے۔''

زرینہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اچھا یوں کرو۔'' اس نے پُرخیال نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ''کوئی اور جگہ تو ہے نہیں۔ چار پائی پر بیٹھ جاؤ اور سمائل دو یعنی مسکراؤ۔ ہاں گڈ۔''

کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ فلیش چمکی اور تصویر بن گئی۔ ایک ایک کر کے اس نے کئی ہی تصویریں کھینچ لیں۔

''تم بہت اچھی ماڈل ثابت ہو رہی ہو۔'' حیدر علی نے کہا۔

''شکریہ۔'' وہ مسکرائی۔

''اب ایسا کرو بال کھول دو۔''

''اچھا۔'' اس نے بال کھول کر انہیں اچھی طرح کنگھی کر لیا۔ حیدر علی سگریٹ ہونٹوں میں دبائے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ریشمی بال گھٹنوں تک لمبے تھے۔

''ٹھیک ہے۔''

''ہوں۔'' حیدر علی نے کیمرا اٹھا لیا۔ ''اب اپنا بایاں ہاتھ بالوں میں پھیرو۔ جہاں میں کہوں' سٹاپ وہاں رک جانا۔''

زرینہ نے اقرار میں سر ہلایا اور اپنا بایاں ہاتھ بالوں تک لے گئی۔ ایسے میں کُرتے کی کھلی سی آستین کہنی تک سرک گئی۔

''یہ تمہارے بازو کو کیا ہوا ہے؟'' حیدر علی نے پوچھا۔

''کہاں؟ کچھ نہیں ہوا۔''

وہ چلتا ہوا قریب آ گیا اور اس کا بازو تھام لیا جو کہنی کے پاس سے جھلسا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہوا ہے؟''

''اچھا آپ اس کی بات کر رہے ہیں۔ روٹیاں پکاتے ہوئے کبھی کبھار جل جاتا ہے۔''

''کیسے جل جاتا ہے؟ تم دھیان سے نہیں پکاتیں دیکھو کیا حال کر لیا ہے اپنے بازو کا۔''

''کتنا بھی دھیان سے پکایا جائے پھر بھی جل جاتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''لکڑیوں پر پکاتے ہوئے ایسے ہی ہوتا ہے۔ کہیں آنچ بہت زیادہ ہوتی ہے اور کہیں بہت کم۔ ابا کو جلی ہوئی روٹی بہت بری لگتی ہے۔ روٹی بچاتے ہوئے بازو جل جاتے ہیں۔''

حیدر علی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''یوں تو بازو پر نشان پڑ جائیں گے۔ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا جس سے بازو نہ جلے۔''

''ہے تو سہی۔ تیل کا چولہا آ جائے تو بہت فائدہ ہو لیکن تیل کا چولہا بہت مہنگا ہے۔ اماں ہر دفعہ پیسے جمع کرتی ہیں اور ہر مرتبہ وہ پیسے کہیں اور لگ جاتے ہیں۔''

''آئندہ سے تم روٹیاں نہیں پکاؤ گی۔''

''میں نہیں پکاؤں گی تو اور کون پکائے گا؟'' وہ ہنسی۔

''مجھے نہیں معلوم۔ بس تم نہیں پکاؤ گی۔ رضیہ سے کہہ دو وہ پکا لیا کرے۔''

زرینہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''وہ نہیں جلے گی کیا؟''

''اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ تم میری ہو' تمہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ باقی سب سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔''

''اتنی خود غرضی۔ چچ۔ چچ۔''

''تم اسے خود غرضی کہو یا کچھ اور۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔''

☆======☆======☆

حویلی کے احاطے میں پہنچ کر تانگہ رک گیا۔ یہاں بھی پردے کا پورا انتظام تھا اور باپردہ خواتین کو یہیں اتارا جاتا تھا۔ تانگے کے رکتے ساتھ زیب النساء نیچے اتر آئی۔ اچھو بھی تمام تر حوصلہ جمع کر کے اس کے قریب چلا آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کر لے۔ اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ دنیا اس کے بارے میں کیا سوچتی ہے اور اس پر کتنے پتھر پھینکتی ہے۔ اسے غرض تھی تو صرف اس بات سے کہ جس لڑکی کو انجانے میں اس نے اپنا دل دے دیا تھا۔ وہ اسے برا نہ سمجھے۔

اچھو کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر زیب النساء کے دل کی دھڑکنیں پھر بے ترتیب ہونے لگیں۔

''شاید کوئی اشارہ' کوئی یقین دہانی۔'' اس نے پُر امید نظروں سے اچھو کی جانب دیکھا۔

لیکن دوسری سمت گہری خاموشی طاری تھی۔

اچانک کہیں سے کراہیں ابھریں' پھوپھو کی کراہیں جو اس سے کہہ رہی تھیں کہ زندگی میں کوئی اہم دن آئے فیصلے کی گھڑی آئے تو اسے حوصلہ اکٹھا کرنا ہوگا۔ اپنا قدم بڑھانا ہوگا تاکہ وہ گھٹ گھٹ کر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنے کمرے کی مسہری پر جان نہ دے۔

اس نے کھوجتی نظروں سے اچھو کی جانب دیکھا۔ وہاں تاسف تھا' پشیمانی تھی۔

''جو تم کہنا چاہتے تھے اور تم نے نہیں کہا' وہ سب مجھے معلوم ہے۔ تم بول نہیں سکتے مگر میں بول سکتی ہوں' یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے سب معلوم ہے۔ کوئی اپنے دل کی دھڑکنوں سے کب تک بےخبر رہ سکتا ہے۔'' زیب النساء کے ہونٹ ہلے۔

اچھو حیرت اور تعجب سے اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا اور وہ مڑ کر تیزی سے حویلی کے اندر چلی گئی۔

''اتنی دیر سے کیوں آئیں؟''

وہ بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو مہر النساء نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''میں سخت پریشان ہو رہی تھی۔''

''آں' ہاں۔'' زیب النساء جیسے خواب کی سی کیفیت سے باہر نکل آئی۔ ''میں کہیں نہیں

تھی۔ یہیں آ رہی تھی۔''

مہرالنساء نے چند ثانیے حیرت سے اسے دیکھا پھر اپنی حیرت کو زبان دیتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا زیبی! تم اپنے آپ میں نہیں لگ رہیں۔''

اس نے جلدی سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یوں جیسے کوئی چوری پکڑے جانے کا خوف ہو۔

''نہیں تو۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جا رہی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''نہ بتاؤ۔ ویسے تمہارا چہرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' مہرالنساء بولی۔ ''صرف یہ بتا دو کہ علی کہاں ہے؟ ہم سب تم دونوں کے لیے فکر مند تھے۔ فوزیہ کا تو برا حال تھا۔ وہ منہ سے تو کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن میں جانتی ہوں کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ وہ تو یوں بھی گاڑی کے سفر سے خوفزدہ رہتی ہے۔''

''گاڑی راستے میں خراب ہو گئی تھی یا شاید علی نے جان بوجھ کر خراب کر دی تھی اس لیے دیر ہو گئی۔''

''زرینہ سے ملنے کے لیے؟''

''لگ تو یہی رہا تھا۔''

''یہاں بہت شور ہے۔ چلو چل کر کسی پُرسکون کمرے میں بیٹھتے ہیں۔'' مہرالنساء نے کہا۔

ملازمہ انہیں ایک آراستہ کمرے میں چھوڑ گئی۔

''اماں جان کہاں ہیں؟''

''بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھیں تو چچی جان انہیں آرام کرنے کی غرض سے کمرے میں لے گئی ہیں۔ وہیں اماں جان بھی ہیں اور چچی جان بھی۔''

''اچھا۔''

''اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟'' مہرالنساء گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔

''ہم آ رہے تھے اور مسجد کے پاس پہنچ کر گاڑی خراب ہو گئی۔ وہیں کمرے کی کھڑکی میں زرینہ بھی کھڑی تھی اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ علی کے ساتھ میں' اس کی بہن بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ویسے ہی کھڑکی میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔''

''پھر تم کیسے آئی ہو؟''

''میں؟'' زیب النساء کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ ''میں تانگے پر آئی ہوں۔''

''کس کے ساتھ؟''

مہرالنساء کی کھوجتی ہوئی نظریں اسے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے گھبرا کر نظریں چرا لیں۔

''مجھے نہیں معلوم زیبی کہ تم کس کے ساتھ یہاں تک آئی ہو اور علی نے تمہیں یوں اکیلے ہی کیوں بھیج دیا۔ میں تو صرف اس قدر جانتی ہوں کہ مرد اس دنیا کی سب سے قابلِ نفرت اور سب سے بے اعتبار شے ہے۔''

''نہیں آپا'' وہ جلدی سے بولی۔ پھر نگاہیں جھکا لیں۔ ''ایسا نہیں ہے۔''

''تم نے دنیا نہیں دیکھی زیبی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ یہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔ علی کو ہی دیکھ لو تمہیں نظرانداز کر کے زرینہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔''

''وہ میرے لیے بے اعتبار نہیں ہے۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''اس نے کہا اور تم نے یقین کر لیا۔'' مہرالنساء بولی۔ ''اس سے بڑھ کر حماقت کیا ہو گی۔''

''یہی تو اعتبار ہے۔ اس نے کچھ نہیں کہا پھر بھی میں سب کچھ سمجھ گئی۔''

''اس نے کچھ نہیں کہا؟'' مہرالنساء کے انداز میں بے یقینی تھی۔

''ہاں۔''

''اور تمہارا خیال ہے کہ وہ بے اعتبار نہیں ہے۔ وہ تمہیں چاہنے لگا ہے۔ تم جانتی ہو کہ تم کس بھنور کی طرف بڑھ رہی ہو؟''

''بڑھ نہیں رہی ہوں۔ بڑھ چکی ہوں لیکن آپا وہ مجھے ہر بھنور سے بچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ تمام پتھر اپنے جسم پر روک لے گا' سب تیروں کے سامنے ڈھال بن جائے گا۔ وہ مجھے بچا لے گا سب سے۔''

''علی سے میں نے کہا تھا کہ اسے اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے پر تم سے کیا کہوں۔ تم جانتی ہو کہ تم کیا کر رہی ہو اور اس کا انجام کیا ہو گا۔ پھر کیوں کر رہی ہو ایسا' مت کرو یہ۔''

''آپا میں ڈرتی تھی۔ بہت زیادہ اتنے سارے خوف جونک کی طرح میری ذات سے چمٹے ہوئے تھے۔ میں اپنی مرضی' اپنی پسند کی بات سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مبادا میری ضبط کی فصیل میں میرے ہی ہاتھوں نقب لگ جائے لیکن آج عجیب بات ہوئی۔

گھوڑے کی ٹاپوں اور تانگے کے پہیوں نے اچانک میرے بھید کھول دیے۔ میں تو حیران ہی رہ گئی۔ پھر اس سریلی موسیقی نے مجھ سے کہا کہ میں اب خواہشوں کی اسیر ہو گئی ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے انجانے میں ہی سہی' میری پہلی خواہش پوری ہو گئی ہے۔''

''اور آپا۔'' زیب النساء بولی۔ ''پہلی خواہش انجانے میں کیا پوری ہوئی' میں کسی اور خواہش پر بند ہی نہ باندھ سکی۔ تنکے کی طرح آرزوؤں کے ریلے میں بہتی چلی گئی میں۔ آپ نہیں جانتیں وہ لمس کتنا انوکھا' کتنا مختلف تھا۔ یوں لگا جیسے تپتے صحرا پر بوندیں برس گئی ہوں۔ آپا میں چاہتی بھی تو خود پر بند نہیں باندھ سکتی تھی۔

جب تک حصول کا کوئی ذریعہ ہی نہ ہو تب تک بہت سے دعوے کیے جا سکتے ہیں لیکن ایک

مرتبہ امید کی کرن چمک جائے تو سب دعوے ریت کی دیوار کی طرح ایکا ایکی بیٹھ جاتے ہیں۔"

"ہونہہ۔ عورت کتنے ہی خواب دیکھ ڈالتی ہے صرف ایک ثانیے میں۔ تم نے بھی حویلی کی دیوار میں اندر سے نقب لگانا شروع کر دی۔"

"آپا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے اسے نقب لگانا مت کہیں۔"

"تم یہ نہ سوچو کہ مجھے حویلی یا اس کے اونچے برجوں سے کوئی ہمدردی ہے۔ قطعاً نہیں۔ انہیں تو کب کا زمین بوس ہو جانا چاہیے تھا۔ اور میں تو دور بیٹھے ان کے گرنے کا انتظار ہی کر رہی ہوں۔ مجھے تو تم سے ہمدردی ہے۔ ہر اس عورت سے ہمدردی ہے جو ان دیوہیکل مردوں کے ساتھ پہنچ کر اپنا آپ کھو دیتی ہے اور ان کے مقابل محض بونی بن کر رہ جاتی ہے۔ مجھے اماں جان سے ہمدردی ہے۔ یاسمین سے ہمدردی ہے، فوزیہ سے ہمدردی ہے اور نہ جانے کس کس سے ہمدردی ہے۔ یہ سب اپنے پورے وجود سمیت ننھی منی بونیاں ہیں۔ یہ کتنی تگ و دو کر لیں، کیسے جتن کر لیں اتنی بلند نہیں ہو سکتیں کہ دیوہیکل مردوں کے سامنے اپنا آپ نمایاں کر سکیں۔"

"آپا وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ مجھے وارفتگی سے تکتا ہے۔ اور میں اسے۔ مجھے کوئی جتن نہیں کرنا پڑا۔"

"ابھی تو جتن زرینہ کو بھی نہیں کرنا پڑا۔ ہاں فوزیہ کے مقدر میں اس جتن کے علاوہ کچھ اور شاید ہے ہی نہیں۔ پتا نہیں کیوں آخر کار سب تقسیم الٹ جاتی ہے۔ زرینہ بھی جتن کرے گی اور تمہیں بھی تگ و دو کرنا ہو گی۔ قدرت کا اصول ہے کہ بالآخر تقسیم ویسی نہیں رہتی جیسی نظر آتی ہے اور ہر عورت کو اپنے حصے کی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔"

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اس کے بغیر میری زندگی کتنی ویران، کتنی بنجر تھی۔ اس کے ایک لمس نے میری روح تک شاداب کر دی ہے۔ اس نے یہ بازو پکڑا تھا۔" زیب النساء نے اپنا بازو آگے بڑھایا۔ "اور میں اب تک تازگی محسوس کر رہی ہوں۔ نہ جانے اتنی ساری زندگی اس کے بغیر کیسے گزار دی میں نے۔"

"باقی زندگی بھی اس کے بغیر گزارنی ہو گی۔"

"نہیں۔" زیب النساء کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ "ایسا نہیں ہو گا۔"

"تو کیا کرو گی؟"

"وہ مجھے لے جائے گا۔ یہاں سے بہت دور۔ اتنی دور کہ دکھ کی کوئی پرچھائیں بھی وہاں نہیں پہنچیں گی۔ پچھتاوے کا کوئی بچھو مجھے ڈنک نہیں مارے گا۔"

"اس خوش فہمی سے نکل آؤ۔ پہرے بہت کڑے ہیں۔ آج کے بعد پھر کتنے ہی عرصے کے لیے ہم انہی دیواروں میں قید ہو جائیں گی۔"

"پہرے تو اب بھی کڑے تھے۔ بس میری قسمت میں محبت کے پھول کا کھلنا لکھا ہوا تھا۔

سو وہ کھل گیا۔ اگر قسمت میں اس کا پھلنا پھولنا لکھا ہے تو وہ تمام تر پہروں کے بیچ سے بھی اس پھول کو پانی دینے چلا آئے گا۔ میں بے چین ہوں تو وہ بھی ضرور بے آرام ہو گا۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"کون ہے؟ آجاؤ۔" مہر النساء نے کہا۔

دروازہ تھوڑا سا کھول کر فوزیہ نے جھانکا۔

"آؤ فوزیہ! باہر کیوں رک گئیں۔"

فوزیہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر آ گئی۔

"میں زیبی آپی سے نہیں ملی تھی۔" وہ نظریں جھکا کر اوڑھنی کے پلو سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ دونوں یہاں ہیں۔"

"میں تھک گئی تھی اس لیے زیبی کو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئی۔ تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

وہ چپ چاپ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم کہاں تھیں، مجھے وہاں بڑے کمرے میں تو نظر نہیں آئیں۔" زیب النساء نے پوچھا۔

"پھوپھو بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھیں۔ انہیں کمرے میں لے گئی تھی اور ٹانگیں دبانے لگی تھی۔"

"کوئی عورت نہیں تھی یہ کام کرنے کے لیے جو تم ٹانگیں دبانے لگیں۔"

"مجھے اچھا لگتا ہے۔ یوں بھی یہ تو میرا فرض ہے۔" وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ بولی۔

"تم فرض نبھاتی رہ جاؤ گی۔ خبر نہیں باقی سب بھی تمہاری طرف نکلنے والے فرض پورے کریں گے یا نہیں۔"

"جی؟" وہ کچھ نہیں سمجھی تھی۔

"کچھ نہیں۔"

"آپ کو دیر کیوں ہو گئی؟" اس کے انداز میں جھجک تھی۔

"گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ پھر میں تانگے میں آ گئی اور علی گاڑی کے پاس ٹھہر گیا۔"

فوزیہ کے انداز میں بے کلی واضح تھی۔ کتنی دیر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی پھر سر اٹھا کر بولی۔

"باہر اندھیرا تو بہت ہو گا۔"

"نہیں اتنا زیادہ نہیں تھا۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"ویسے ہی۔" اس نے یوں نظریں چرائیں جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ "اصل میں مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔"

''تم گھبراؤ مت علی اندھیرے سے نہیں ڈرتا۔'' مہرالنساء مسکرائی۔

فوزیہ نے شرما کر اپنا چہرہ گھٹنوں میں دے لیا۔ مہرالنساء اور زیب النساء نے ایک دوسرے کی جانب افسوس سے دیکھا۔

''زیبی' بابا جان فوزیہ اور علی کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کب کریں گے؟''

''کہہ تو رہے تھے کہ بھائی جان کی شادی کے فوراً بعد کر دیں گے۔''

''اچھا نہ رہے اگر آج ہم یہ اعلان کر دیں؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ بہت چھپا لیا۔ اب گاؤں کی چند لڑکیوں کو ضرور خبر ہونی چاہیے۔ ہوسکتا ہے اس سے بھلے کی کوئی صورت نکل آئے۔''

''آپ کا مطلب ہے رضیہ وغیرہ؟'' زیب النساء نے جھجک کر پوچھا۔

''ہاں۔'' پھر وہ فوزیہ سے مخاطب ہوئی۔ ''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

لیکن فوزیہ بدستور چہرہ چھپائے بیٹھی رہی۔

''دیکھ لیں کہیں علی کو برا نہ لگے۔'' زیب النساء متذبذب تھی۔

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم لڑکیوں کو بلواؤ۔''

باقی لڑکیوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اصل اہمیت رضیہ کی تھی جس کے ذریعے یہ خبر زرینہ تک پہنچ سکتی تھی لیکن اسے الگ بلا کر بتانا غیر مناسب بات لگتی اس لیے کافی ساری لڑکیوں کو بلا لیا گیا تھا۔

''جی بی بی۔'' وہ اندر آ گئیں۔

''بیٹھو...... ہم نے تم لوگوں کو ایک خوش خبری سنانی تھی۔''

لڑکیوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر وہیں قالین پر بیٹھ گئیں۔

''اب تو کافی سارے سال گزر گئے ہیں اس بات کو' مگر بابا جان کا ارادہ تھا کہ بڑے شاہ صاحب کی شادی کے بعد یہ خوش خبری گاؤں والوں تک پہنچائیں مگر ہم بہنوں کے لیے بہت مشکل ہے کہ اتنی اچھی خبر کو خود تک محدود رکھیں اس لیے سوچا کہ اب آپ لوگوں کو اس میں شریک کر ہی لینا چاہیے۔'' مہرالنساء کا رُوئے سخن خصوصاً رضیہ کی جانب تھا جو بہت دلچسپی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

''جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں صرف برابر کے خاندان میں رشتہ جوڑا جاتا ہے۔'' مہرالنساء نے رضیہ پر چوٹ کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت رضیہ اس بات کو بالکل نہ سمجھ سکی۔

''اس لیے بابا جان نے چھوٹے شاہ صاحب کا رشتہ اماں جان کے بھائی کی سب سے

پیاری بیٹی فوزیہ سے طے کر دیا ہے۔''

رضیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ سب لڑکیاں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مبارکباد دے رہی تھیں اور وہ منہ کھولے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک نظر گٹھڑی سی بنی فوزیہ کی جانب دیکھا اور پھر مہرالنساء کی طرف جو آنکھوں میں تنبیہہ لیے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ تمام بات ناقابلِ یقین تھی۔ چھوٹے شاہ صاحب نے زرینہ سے وعدہ کیا تھا شادی کا۔ خود اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زرینہ سے شادی کریں گے پھر یہ فوزیہ درمیان میں کہاں سے آ گئی تھی۔ اس کی بہن کی جگہ لینے۔ یکبارگی اسے فوزیہ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی بہن کے حق پر ڈاکا ڈال رہی ہو۔

شاہ صاحب نے زرینہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ ایک بار نہیں کئی بار۔

تو کیا وہ جھوٹ تھا۔ فریب تھا؟ محض وقت گزاری۔ اسے چھوٹے شاہ صاحب سے بھی نفرت محسوس ہونے لگی۔ یہ جال انہی کا بچھایا ہوا تو تھا۔ جس میں زرینہ جیسی معصوم لڑکی پھنس گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے اور زرینہ کو ساری بات بتا کر اسے جھنجھوڑ ڈالے۔ اس سے پوچھے کہ کیا اسی محبت پر اسے ناز تھا۔ اسی کی خاطر وہ راتوں کو سارے زمانے سے چھپ کر شاہ صاحب سے ملنے جاتی تھی۔

''اوہ خدا! زرینہ کو علم ہوگا تو اس پر کیا گزرے گی؟ اس پر تو قیامت بیت جائے گی۔'' رضیہ نے سوچا۔

☆======☆======☆

''بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب تک کسی نہ کسی کو آ جانا چاہیے تھا۔'' حیدر علی نے گھڑی دیکھی۔

''آپ کو بہت جلدی ہے جانے کی؟'' زرینہ نے دبے دبے انداز میں شکوہ کیا۔

''تمہارے پاس آ کر واپس جانے کو کس کا دل چاہتا ہے۔ میں زیبی آپی کے لیے پریشان ہوں۔''

''آپ دوسروں کے لیے ہی پریشان ہوتے ہیں کبھی میرے لیے بھی پریشان ہوئے؟''

''زیبی آپی دوسروں میں سے تو نہیں ہیں۔'' اس کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔ ''اور جہاں تک تمہاری بات ہے گوری تو تم مجھ سے الگ کب ہو۔ تم تو ہر جگہ میرے ساتھ رہتی ہو۔ میرے دل میں جو رہتی ہو۔''

''یہ بتائیں دل میں تو صرف میں ہی ہوں ناں یا کچھ اور آپ کے اپنے بھی ہیں آپ کے دل میں۔''

''یہاں صرف تمہارا بسیرا ہے۔''

وہ مسکرادی۔ وہی دلکش مسکراہٹ جسے حیدر علی وارفتگی سے تکے جاتا تھا۔

''میں یقین کرلوں کہ یہاں صرف میرا بسیرا رہے گا؟''

''امید تو یہی ہے۔''

''یقین نہیں ہے۔''

''یقین کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔''

زرینہ اسے تکتے گئی پھر مسکرادی۔ ''میرا دل خوش کرنے کو ہی اثبات میں جواب دے دیتے۔''

''اس بات سے تمہارا دل خوش ہوجاتا؟''

''پہلے میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوجاتی تھی پر اب صرف اور صرف آپ کا ساتھ ہی خوشی دیتا ہے اور آپ کی محبت بھری باتیں توانائی دیتی ہیں۔''

''اگر کبھی یہ ساتھ چھن جائے گوری؟''

''خدانہ کرے۔'' وہ تڑپ اٹھی۔

''واقعی خدانہ کرے لیکن اگر ایسا ہوجائے تو؟''

''میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔ کبھی نہیں سوچ سکتی۔ مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے جس میں آپ کا ساتھ نہ ہو۔ خدا کے لیے پھر ایسی بات کبھی نہ کہنا۔''

حیدر علی دیئے کی روشنی کا عکس اس کے چہرے پر دیکھتا رہا۔

''یہ کس خوف میں مبتلا کردیا ہے آپ نے مجھے۔'' چند ثانیے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

''کہیں ایسا تو نہیں۔'' وہ رک گئی۔ اس کے لہجے میں خدشے تھے۔

''میں اتنی آسانی سے نہیں ہاروں گا گوری۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''تم اپنے سب خدشے سب غم میرے حوالے کردو اور بے فکر ہوجاؤ۔ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔''

زرینہ کھل اٹھی۔

''میرا تو خوف کے مارے دم نکلنے کو تھا۔'' وہ ہنسی۔ ''پر اب میں مطمئن ہوں۔''

حیدر علی نے ایک بار پھر کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

''میری دعائیں اثر کررہی ہیں۔'' زرینہ بولی۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے دعا کی ہے کہ دیر تک کوئی نہ آئے اور آپ دیر تک میرے ساتھ رہیں۔''

''اچھا تو یہ تمہاری دعاؤں کا اثر ہے۔ اب پلیز یہ دعا بھی کردو کہ کوئی جلد از جلد آجائے کیونکہ بابا جان اور بھائی شدت سے میرا انتظار کررہے ہوں گے۔''

زرینہ زور سے ہنس پڑی۔

''تمہیں دیکھ کر دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جب بھی مجھے بیٹی دے' بالکل تمہاری طرح کی دے۔''

''جی؟'' اس نے پلکیں جھپکا کر حیدر علی کی طرف دیکھا اور پھر جھینپ کر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

''اتنا شرماتی کیوں ہو۔ بھئی تمہاری بیٹی کو تمہاری طرح کا ہی ہونا چاہیے ناں۔'' اس نے زرینہ کے چہرے سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔ ''اور معلوم ہے میں اس کا نام کیا رکھوں گا۔''

''کیا؟'' زرینہ نے شرمیلے لہجے میں پوچھا۔

''ریشماں۔'' وہ بولا۔ ''وہ ہوگی بھی تو بالکل ریشم جیسی۔''

''آپ کو بیٹے اچھے نہیں لگتے؟''

''لگتے ہیں لیکن بیٹیاں زیادہ پیاری ہوتی ہیں۔''

''حیرت ہے۔''

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟''

''ہے ناں۔ سب کو بیٹے ہی اچھے لگتے ہیں۔''

''تم اپنی بات کرو۔ تمہیں بیٹے اچھے لگتے ہیں یا بیٹیاں؟''

''مجھے؟'' وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ ''مجھے بیٹے اچھے لگتے ہیں' وہ باپ کا بازو بنتے ہیں۔''

''اور تم اپنے بیٹے کا کیا نام رکھوگی؟''

''آپ رکھنا۔'' وہ جھینپ گئی۔

''میں نے بیٹی کا نام رکھ دیا ہے۔ بیٹے کا تمہیں رکھنا ہوگا۔''

''سوچنے دیں۔'' چند لمحے بعد زرینہ نے سر اٹھایا...... ''عبداللہ...... کیسا نام ہے؟''

''بہت خوبصورت۔ تو پھر طے ہے۔ بیٹی کا نام ریشماں اور بیٹے کا نام عبداللہ۔''

حیدر علی کی بات سن کر زرینہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی کو بریک تب لگے جب دور سے کسی گاڑی کی مدھم سی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''کوئی موٹر آرہی ہے شاید آپ کو لینے۔''

''ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔''

''وہاں مسجد سے چلے جائیں۔ کسی نے دیکھا تو یہی سمجھے گا کہ آپ مسجد سے نکلے ہیں۔''

''خدا حافظ۔'' کہہ کر وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

زیب النساء کی بات سن کر اچھو گنگ ہی تو رہ گیا تھا۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ اس

سے ایسی بات کہہ سکتی ہے۔ اسے تو یقین تھا کہ گھر جا کر وہ رو رو کے ساری بات پیر صاحب اور اپنے بھائیوں کو بتائے گی اور اگلا لمحہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ثابت ہوگا۔

لیکن اس نے تو ناممکن بات کہہ دی تھی۔

''جو تم کہنا چاہتے تھے اور تم نے نہیں کہا وہ سب مجھے معلوم ہے۔ تم بول نہیں سکتے مگر میں بول سکتی ہوں۔ یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے سب معلوم ہے۔ کوئی اپنے دل کی دھڑکنوں سے کب تک بے خبر رہ سکتا ہے۔''

اور وہ اب تک بے خبر تھا۔ یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ جو کچھ اس کے دل پر بیت رہی ہے وہی کچھ زیب النساء کے دل پر بھی گزر رہی ہے۔

مگر زیب النساء تو شجرِ ممنوعہ تھی۔ ہاتھ بڑھا کر چھونا تو درکنار اس کی طرف تو نگاہ اٹھانا بھی ناقابلِ معافی جرم تھا۔ اور وہی زیب النساء اس سے کہہ رہی تھی کہ کوئی اپنے دل کی دھڑکنوں سے کب تک بے خبر رہ سکتا ہے۔

رات اپنے بستر پر چت لیٹ کر دیئے کی مدھم لو میں وہ زیب النساء کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اپنے ذہن سے یہ خیال جھٹکنے کے لیے بار بار وہ نیم تاریک چھت کی کڑیاں گننے لگتا لیکن زیب النساء اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی ستاروں کی طرح چمکتی آنکھیں اس کا روشن چہرہ بالوں کی بل کھاتی چوٹی کچھ بھی تو اس کے ذہن سے محو نہیں ہو رہا تھا۔

''یا خدا! یہ کس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے مجھے۔'' اس نے سوچا۔ ''مجھے کیا خبر تھی کہ صرف ایک لمحہ میری زندگی کا رخ بدل کر رکھ دے گا۔ پتا نہیں تقدیر انسان کو اس راہ پر چلانے کی کوشش کیوں کرتی ہے جس پر چلتے ہوئے پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں اور اتنی دھول اٹھتی ہے کہ ایک دوسرے کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔

ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں پھر بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ایک دوسرے کو بچا نہیں سکتے۔ مذہب اخلاق اور سماج کبھی یہ بات برداشت نہیں کریں گے۔ مجھے اپنی پروا نہیں میں تو آگ میں بھی کود سکتا ہوں لیکن ایسا کرتے ہوئے چھوٹی بی بی کی عزت داغدار ہو جائے یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ جا چکا تھا اور اماں وغیرہ کے آنے سے پہلے زرینہ کو بہت سے کام نمٹانے تھے۔ کمرے کے فرش پر کتنے ادھ جلے سگریٹ بکھرے ہوئے تھے۔ اتنے سارے دیئے اور لالٹینیں پڑی تھیں۔ حیدر علی کے کپڑوں سے اٹھنے والی مہک ابھی تک فضا میں موجود تھی۔ اسے یہ سب آثار مٹانے تھے ورنہ اماں بغیر کوئی سوال پوچھے سب کچھ سمجھ جاتیں۔

اس نے جلدی سے بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چٹیا بنائی طاقچے میں پڑی اگربتیاں لگا کر

کمرے میں رکھ دیں اور جھاڑو اٹھا لائی۔

''جھاڑو بعد میں لگاؤں گی پہلے سگریٹ کے ٹکڑے چن کر باہر پھینک دوں۔'' بستر کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

فرش پر سگریٹ کے ٹکڑوں کے ساتھ نیلے رنگ کا ایک بٹن بھی پڑا ہوا تھا جس میں نیلا دھاگا پھنسا ہوا تھا۔

''یہ تو شاہ جی کی قمیص کا بٹن ہے۔'' اس نے ہتھیلی پر رکھے بٹن کا بغور جائزہ لیا اور مسکرا دی۔ ''یعنی میرے خزانے میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔''

ایک ادھ جلا سگریٹ اور بٹن اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر اس نے بقیہ ٹکڑے کھڑکی سے پھینک دیئے اور جلدی جلدی کمرے کی صفائی کرنے لگی پھر دیئے اور لالٹین پرانی ترتیب سے واپس رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''شاہ جی نے اب تک مجھے اتنا کچھ دیا ہے لیکن میں نے آج تک انہیں کوئی تحفہ نہیں دیا۔'' چارپائی پر لیٹ کر وہ سوچنے لگی۔ ''میں انہیں کیا تحفہ دوں؟''

وہ سوچے گئی لیکن کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔

''ایک سے ایک اعلیٰ چیز تو پہلے ہی موجود ہے ان کے پاس میں انہیں کیا دے سکتی ہوں۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ دینا تو چاہیے کیا دوں؟''

سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔ کتنی دیر بعد جھنجھوڑنے پر اس کی آنکھ کھلی۔ سامنے رضیہ کھڑی تھی۔

''تم لوگ آ گئے؟'' وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ ''مجھے پتا ہی نہیں چلا۔''

''نیند اتنی گہری ہو تو واقعی کسی چیز کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔''

''حالانکہ میں اتنی گہری نیند نہیں سوتی۔ پتا نہیں آج کیا ہوا۔'' پھر جیسے کچھ یاد آنے پر قدرے جوش سے بولی۔ ''ہائے رضیہ میں نے تمہیں کچھ بتانا ہے۔'' پھر اس کے لہجے میں قدرے رازداری اتر آئی۔ ''اماں ابا کہاں ہیں۔''

''مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ہے۔'' وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

''پہلے میری بات سنو آج اتنا مزہ آیا کہ کیا بتاؤں۔''

رضیہ چند لمحے تک اس کے خوشی اور جوش سے تمتماتے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھوٹے شاہ صاحب کی منگنی کی خبر اسے کیسے سنائے۔

''کیا ہوا تم کیوں اتنے مشکوک انداز میں مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں گھر خالی چھوڑ کر کہیں نہیں گئی تھی۔ شاہ جی خود یہاں آئے تھے۔''

''اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر تمہیں سبز باغ دکھائے ہوں گے اور تم بھی ان کے جال میں

پھنس گئی ہوگی۔''

''رضیہ! شاہ جی کے متعلق میں ایسی کوئی بات برداشت نہیں کرسکتی۔'' زرینہ کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

''یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے' شاید تمہیں اس سے بڑی اور کہیں زیادہ تکلیف دہ باتیں برداشت کرنا پڑیں۔''

''تم نے میری ساری خوشی پر پانی پھیر دیا۔'' اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ ''تم ہمیشہ یونہی کرتی ہو۔''

''جاننا چاہتی ہو' میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟''

''کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے جاننے کی۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''اور تم کچھ بھی کہہ لو' میں جس راستے پر چل رہی ہوں اس سے واپس نہیں پلٹوں گی۔''

''میں جانتی ہوں کہ تم اسی قدر احمق ہو۔'' رضیہ کو بھی غصہ آ گیا۔ ''اور یہ بتاؤ کہ چھوٹے شاہ صاحب یہاں کیوں آئے تھے' کیا ضرورت تھی انہیں یہاں آنے کی؟''

''اتنے غصے میں کیوں پوچھ رہی ہو۔'' اس نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔ ''یہ سوال آرام سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔''

''پہلے آرام سے پوچھا جا سکتا تھا' اب نہیں۔''

''تم تو کبھی آرام سے نہیں پوچھتیں۔'' زرینہ نے شکایتی لہجے میں کہا' لیکن اگلے ہی لمحے ساری شکایت ختم کر کے وہ بستر پر آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''اصل میں شاہ جی کی موٹر یہاں خراب ہوگئی تھی۔ افوہ! اتنی مشکوک کیوں ہو رہی ہو۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کی موٹر یہاں خراب ہوئی۔ زیب النساء بھی تمہاری طرح ہی شکوک و شبہات میں گرفتار ہوئی تھی۔ ویسے آج سے مجھے زیب النساء بہت بری لگنے لگی ہے۔''

رضیہ خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

''مجھے الجھن ہونے لگی ہے تمہیں ایسے بیٹھے دیکھ کر۔''

''یہ احساس دوطرفہ ہے' مجھے بھی تمہاری حرکتوں سے ایسے ہی الجھن ہوتی ہے۔''

''تم کچھ چھپا رہی ہو مجھ سے۔'' زرینہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نہیں میں نے تو آتے ہی کہا تھا کہ مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ہے۔'' رضیہ بولی۔ ''لیکن پہلے تم اپنی بات مکمل کر لو تاکہ یہ طلسم ایک ہی مرتبہ ٹوٹے۔''

زرینہ چند لمحے کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر ایک دم بے نیازی اس پر غالب آ گئی۔

''یہ طلسم تو میرے مرنے پر ہی ٹوٹے گا۔''

رضیہ کا دل بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ زرینہ کو یہ سب کچھ بتا دینا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

''رضیہ! تم ہی تو ہو جس سے میں سب کچھ کہہ دیتی ہوں۔'' وہ ہولے سے بولی۔ ''تم بھی میری بات نہیں سنو گی تو کس سے بات کروں گی میں۔ شاہ جی سے محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اور پھر رضیہ میں کسی ایک طرفہ عشق میں تو مبتلا نہیں ہوں' وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ میرا ہاتھ تھام لیں۔''

''تو تھامتے کیوں نہیں ہیں؟'' رضیہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔ ''اس لیے کہ ان کی......''

اسے اچانک احساس ہوا کہ فوری طور پر زرینہ کو فوزیہ کے متعلق بتانا ٹھیک نہیں ہے نہ جانے اس کا ردِعمل کتنا شدید ہو اور پھر اس وقت تو گھر میں ابا اور اماں بھی موجود تھے۔ زرینہ چلا پڑتی یا صدمے کے مارے اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ نکل جاتا تو ساری بات ہی بگڑ جاتی۔

اور دوسری جانب زرینہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''تم نے بات ادھوری کیوں چھوڑ دی؟'' اس کے ہونٹ ہلے۔

''کچھ نہیں' پریشانی میں خدا جانے میں کیا کچھ بک دیتی ہوں۔ میری باتوں کی پرواہ مت کیا کرو۔'' رضیہ نے جلدی سے بات بنائی۔ ''یہ بتاؤ آج چھوٹے شاہ صاحب سے کیا بات چیت ہوئی؟''

''تم اپنی بات کرو' تم کیا کہتے کہتے رک گئی تھیں؟''

''کہاں ناں کہ یونہی فضول سی بات کرنے لگی تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔''

''تو وہ بات بتا دو جس کا تم نے آتے ہی ذکر کیا تھا۔'' زرینہ بھی اڑی ہوئی تھی۔

''میرا تو دماغ ہی چاٹ لیا ہے تم نے۔'' رضیہ چڑ گئی۔

اسے چڑتے دیکھ کر زرینہ ہنس پڑی۔ پھر اس نے تکیے کے نیچے پڑا بٹن اور ادھ جلا سگریٹ اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

''دیکھو رضیہ! بھلا یہ کیا ہے؟'' اس کے لہجے میں خوشی اور جوش لوٹ آئے تھے۔

رضیہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کی چارپائی پر آ بیٹھی۔

''یہ چیزیں دی ہیں شاہ صاحب نے؟'' اس نے زرینہ کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر دھرے سگریٹ کے ٹکڑے اور نیلے بٹن کو دیکھا۔

''یہ انہوں نے دیئے کب ہیں' وہ ایسی چیزیں نہیں دیتے۔ جب ان کے جانے کے بعد میں کمرے کی صفائی کرنے لگی ناں تو یہ بٹن مجھے ملا۔ سگریٹ کے ٹکڑے تو اور بھی تھے' لیکن وہ میں نے پھینک دیئے تھے۔ اتنے زیادہ ٹکڑے نہیں رکھ سکتی تھی ناں۔ بس یہ ایک رکھ لیا۔ آج پہلی

مرتبہ وہ ہمارے گھر میں آئے تھے۔ کوئی نشانی تو ہونی چاہیے تھی ناں آج کے یادگار دن کی۔"

"ہوں۔" رضیہ نے غائب دماغی سے کہا۔

"پتا ہے کیا ہوا آج؟" اور پھر رضیہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے تمام روداد سنا شروع کر دی۔

☆======☆======☆

فجر کی نماز پڑھ چکنے کے بعد اچھو، مولوی صاحب کے پاس چلا آیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

اچھو نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نمازی ایک ایک کر کے واپس جا رہے تھے اور سپارہ پڑھنے والے بچوں کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ اس نے سب کے چلے جانے کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔ جو بات وہ کہنا چاہتا تھا وہ سب کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے انداز نے مولوی صاحب کو بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اکیلے میں کہنا چاہتا ہے، اس لیے وہ بھی خاموشی سے سب کے باہر جانے کا انتظار کرتے رہے۔

اچھو کے اوپر جو کچھ گزر چکا تھا، اس سے وہ بھی واقف تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ صدمے کے مارے اچھو بات چیت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔

"ہاں بیٹا، اب کہو کیا بات ہے؟ کوشش کرو تو تم پہلے کی طرح سب کچھ بول سکتے ہو۔" سب کے چلے جانے کے بعد انہوں نے بے حد شفقت سے کہا۔ کچھ تو یوں بھی وہ ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتے تھے اور کچھ انہیں اچھو کی محرومی کا احساس بھی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ محبت کا برتاؤ اس کی زبان پر پڑے قفل کھول دیتا۔

کچھ دیر تک اچھو سر جھکائے بیٹھے رہا پھر اس نے سر اٹھایا۔

"میں سمجھتا تھا کہ میری زبان پر پڑے محرومی کے قفل کو صرف اور صرف شدید نفرت اور انتقام کی چابی ہی کھول سکتی ہے، لیکن اب احساس ہوا کہ محبت میں نفرت سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔" اس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ مولوی صاحب بمشکل اس کی آواز سن سکے۔

"الحمدللہ۔" انہوں نے ہاتھ بلند کیے۔ "تمہاری آواز دوبارہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔"

"اور مجھے اتنا بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ خوشی کی بات ہے یا غم کی۔"

"اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے اور شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو مثبت طریقے سے استعمال کیا جائے۔"

"مولوی صاحب! میں کچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

"پوچھو بیٹا!"

"جو کچھ رجب علی شاہ نے میرے ساتھ کیا تھا وہ غلط تھا یا درست؟" اس نے مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

اس کا سوال سن کر مولوی صاحب ایک دم دفاعی پوزیشن پر آ گئے۔ "انسان کو درگزر سے کام لینا چاہیے۔"

"میں نے یہ نہیں پوچھا۔ میں نے تو یہ پوچھا ہے کہ رجب علی شاہ کا فعل درست تھا یا غلط؟" وہ ایک لفظ میں جواب لینے پر مُصر تھا۔

"کسی چیز پر یک دم مہرِ تصدیق ثبت کر دینا یا کسی بات کو ایک لمحے میں غلط قرار دے دینا درست نہیں ہوتا۔" مولوی صاحب تامل سے بولے۔ "اللہ تعالیٰ نے بھی اس شخص کو افضل قرار دیا ہے جو ایثار سے کام لیتا ہے اچھا تو یہ ہوتا کہ تم پہلے ہی گھوڑا واپس کر دیتے۔

مجھے علم ہوا ہے کہ بڑے شاہ صاحب نے بہت مرتبہ تمہیں پیغام بھجوایا تھا لیکن تم نے ان کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ غور سے دیکھو تو تمہیں اس ساری بات میں اپنی ہی غلطی نظر آئے گی۔ وہ گھوڑا تمہیں انہی کے سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ انہوں نے شریف لوگوں کی طرح پہلے تقاضا کیا، حالانکہ وہ زور آور اور طاقتور تھے۔ تم نے انکار کیا۔ انہوں نے بار بار تقاضا کیا اور تم نے بار بار انکار کیا۔ تب انہوں نے یہ قدم اٹھایا جو سب کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوا۔

غور سے دیکھا جائے تو اس عمل پر انہیں تم نے مجبور کیا تھا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں نے بڑے شاہ صاحب کے طرزِ عمل کو کلی طور پر درست قرار دیا ہے۔ نہیں...... انہیں بھی تحمل اور برداشت کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔"

اچھو مولوی صاحب کی طرف دیکھے گیا۔

"تم نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنا حق چھین لیں۔ اسلام کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمان ہمیشہ تحمل و برداشت سے کام لیتے ہیں، لیکن اپنے حق پر ڈاکہ ڈالنے والے کو بخشتے بھی نہیں ہیں۔"

مولوی صاحب کی باتیں سن کر اچھو کا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ چند لمحے وہ سر جھکائے بیٹھا رہا پھر مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"یہ بتائیں مولوی صاحب! کہ اسلام مساوات کے بارے میں کیا کہتا ہے؟"

مولوی صاحب نے اپنی دانست میں ایک مشکل موضوع کو بخیر و خوبی نمٹا دیا تھا، اس لیے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

"ہمارا مذہب دینِ فطرت ہے اور اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم تو ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ بہترین منصف بھی ہے۔ دنیا کا نظام چلانے کے لیے اس نے انسانوں کے مختلف طبقے بنائے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ انسانوں کے درمیان فرق نہ ہو۔ معاشی لحاظ سے سب برابر ہو جائیں تو دنیا کا

نظام کیسے چلے؟

لیکن یہ جو مختلف طبقے بنائے گئے ہیں یہ صرف دنیاوی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہیں اور دنیا کی زندگی عارضی اور چند روزہ ہے۔ یہ صرف ایک امتحان گاہ ہے۔ اصل میں یہ ہمیشہ رہنے والی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اس زندگی میں بھی طبقات ہیں' لیکن رنگ ونسل' خاندانی جاہ وحشم......اور معاشی نکتہ نگاہ سے جنم لینے والے نہیں بلکہ یہ طبقے انسان کے اچھے برے اعمال سے وجود میں آئیں گے۔ برتر در حقیقت وہ ہوگا جو زیادہ متقی اور پرہیز گار ہوگا۔

قیامت کے دن کسی سے یہ پُرسش نہیں ہوگی کہ اس کا خاندان کون سا ہے یا یہ کہ جنت میں جانے کے لیے وہ کتنا مال و دولت صرف کرسکتا ہے۔ قیامت کے دن جنت کا حق دار صرف وہی ہوگا جس کے اعمال اچھے ہوں گے' جس نے اپنے جیسے انسانوں کو تکلیف نہیں پہنچائی ہوگی' جس نے بڑے بڑے مرتبے پر رہتے ہوئے بھی صلہ رحمی کا ثبوت دیا ہوگا اور جس نے حقوق اللہ پورے کیے ہوں گے۔

مساوات کا مطلب بھی یہی ہے کہ دنیاوی لحاظ سے چاہے کوئی بھی برتر ہو' فیصلے کے وقت سب انسان برابر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی شخص بڑا ہوگا جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھتا ہے۔''

''ہوں۔'' اچھو نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''یعنی اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھتا کہ کون حویلی والا ہے اور کون جھونپڑی والا۔''

''بالکل۔'' مولوی صاحب نے تائید میں سر ہلایا۔

''اور مولوی صاحب یہ بتائیں کہ لڑکیوں کی شادی کس عمر تک کر دینی چاہیے۔''

''جیسے ہی کوئی اچھا اور مناسب رشتہ ملے اس نیک کام کو سرانجام دے دینا چاہیے۔''

''اس لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے والدین اس فرض سے غافل ہوں۔''

''ایسے میں ان کے قریب رہنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں' لیکن یاد رہے کہ صرف اس صورت میں جب یہ مکمل یقین ہو کہ والدین اس فرض کی طرف سے غفلت برت رہے ہوں۔ دوسری صورت میں اس طرح ان کی دلآزاری ہوگی۔''

''ایک اور سوال ذہن میں کھٹک رہا ہے۔''

''بلا جھجک پوچھ لو بیٹا!''

''سیّد لڑکی کی شادی غیر سیّدوں میں ہوسکتی ہے؟''

مولوی صاحب ایک مرتبہ پھر متذبذب ہوگئے۔ ''میں اتنا عالم فاضل نہیں ہوں کہ کوئی مستند رائے دے سکوں۔ اتنا ضرور ہے کہ رشتہ اپنی ذات برادری میں طے ہو تو انسان بہت سی الجھنوں سے بچ جاتا ہے۔''

''مولوی صاحب! میں ایک لڑکی سے ملا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی لڑکی کی طرف بری نظر سے نہیں دیکھا۔ بہرحال وہ مجھے اچھی لگی' اب میں کیا کروں؟''

''میں تمہیں جانتا ہوں اور مجھے احساس ہے کہ تم کبھی کسی لڑکی پر بری نظر نہیں ڈالو گے' اگر تمہیں اچھی لگی ہے تو اپنے باپ سے کہو' پیر صاحب اس کی بات نہیں ٹالیں گے اور تمہارا رشتہ وہاں طے کر دیا جائے گا۔''

''لیکن مسئلہ یہ ہے مولوی صاحب کہ وہ سیّد لڑکی ہے۔''

''ہوں۔'' مولوی صاحب سوچنے لگے۔

''کس سوچ میں پڑ گئے مولوی صاحب! کیا اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان مساوات قائم نہیں کی؟ کیا برتری کا معیار خاندانی بڑائی ہے یا تقویٰ؟ مانا کہ میں بہت اعلیٰ درجے کا مسلمان نہیں ہوں' لیکن ہوں تو کلمہ گو۔ پھر میں ایک کلمہ گو لڑکی سے کیوں نہیں شادی کر سکتا؟ کیا یہ میرا قصور ہے کہ میں کسی بڑے گھرانے میں پیدا نہیں ہوا؟ خود آپ نے ہی تو کہا تھا کہ طبقات صرف دنیاوی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہیں' پھر جب اس بات پر اللہ تعالیٰ میری پکڑ نہیں کرتا کہ میرا تعلق کسی اعلیٰ خاندان سے نہیں ہے تو دنیا والوں کو کیا حق ہے کہ اس بات پر وہ میری پکڑ کریں' مجھے گھٹیا جانیں؟''

''غصہ نہیں کرتے بیٹے! غصہ حرام ہے۔'' مولوی صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تمہارے باپ کو بہت خواہش ہے تمہاری شادی کی مجھے بھی تم بالکل بیٹوں کی طرح ہی عزیز ہو۔ تمہاری خوشیاں مجھے بھی پیاری ہیں۔ میں خود پیر صاحب سے بات کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں اجازت دے دیں گے' لڑکی کے والد کا کیا نام ہے؟''

''سیّد جلال الدین شاہ۔'' اچھو نے اطمینان سے کہا۔

''جلال الدین شاہ!'' مولوی صاحب نے ذہن پر زور دیا۔ ''کیا آس پاس کے کسی گاؤں کے ہیں؟''

''یہ اور آس پاس کے بیسیوں گاؤں انہی کے ہیں۔''

''انہی کے ہیں۔'' مولوی صاحب ایک لمحے کے لیے کچھ بھی نہ سمجھے پھر جیسے اچانک ہی ان پر انکشاف ہوا کہ اچھو کا اشارہ کس طرف تھا۔

''لاحول ولاقوۃ' کیا بکواس کر رہے ہو' تمہیں شرم نہیں آئی یہ بات کہتے ہوئے۔ اس سے پہلے ڈوب کیوں نہ مرے تم...... استغفار...... استغفار...... پیر صاحب کی صاحبزادی کے متعلق ایسی نازیبا بات۔ میرے سامنے تو تم نے یہ کہہ دیا لیکن کسی اور کے سامنے مت کہنا۔ ماں باپ روتے رہ جائیں گے' لیکن انہیں تمہاری قبر کا نشان بھی نہیں ملے گا۔''

''بس بس مولوی صاحب بہت ہوگیا۔ زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اچھو بھی بگڑ

گیا۔ ''کبھی آپ کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آپ تحمل اور برداشت کا پرچار کر رہے تھے' اب آپ کا وہ تحمل اور برداشت کہاں گیا؟ آپ نے کہا کہ کسی کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈالنا چاہیے پھر پیر صاحب کہلانے والے جلال الدین شاہ کو یہ کیوں نہیں سمجھاتے آپ کہ وہ اپنی حویلی میں بند بیٹیوں کو ان کا حق دے؟ آپ جانتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر اپنی بیٹیوں کی شادی نہیں کر رہا' پھر آپ نے اسے اس غفلت پر کیوں نہیں ٹوکا؟

میں نے حویلی کی سیّد زادی سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو کیا برا کیا؟ جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھتا کہ کون کس رنگ اور نسل کا ہے' کس حویلی یا جھونپڑی کا ہے تو آپ کے سب فیصلے حویلی کے حق میں کیوں ہیں؟ جب تک آپ کو میری بتائی ہوئی لڑکی کے باپ کے نام کا علم نہیں تھا' تب تک آپ اس بات پر راضی تھے کہ آپ پیر صاحب سے بات کریں گے پھر اب کیا ہوا کہ آپ میری قبر تک جا پہنچے۔

بتائیں آپ کا مذہب کیا کہتا ہے۔ جب کوئی لڑکا کسی لڑکی کے گھر رشتہ لے کر جائے اور لڑکی والوں کو وہ رشتہ نامنظور ہو تو کیا وہ لڑکے کو قتل کر دیں؟ اس کی قبر کا نام و نشان بھی مٹا دیں؟ بولیں کیا کہتا ہے آپ کا مذہب اس بارے میں؟''

''اچھو! اس وقت تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو تمہاری باتوں سے بغاوت کی بُو آرہی ہے۔''

''ہاں میں باغی ہوں اور کیوں نہ بغاوت کروں؟ رجب علی شاہ نے مجھ سے میری اولاد جیسا گھوڑا چھین لیا' آپ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھا۔ کیوں؟ کیا تحفہ یا ہدیہ واپس لیا جاتا ہے؟ پیروں کی حویلی میں یہ روایت کب سے چلی آرہی ہے کہ چیز دے کر اس کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے' پھر اس نے مجھے کوڑوں سے پیٹا۔ آپ کے نزدیک یہ بھی درست ہے کیونکہ میں نے حکم عدولی کی تھی۔ نہیں مولوی صاحب' وہ مجھے کسی صورت یہ حکم نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ مجھ سے میری چیز چھین لے اور مجھے پیٹ بھی ڈالے۔

اس نے مجھے اس لیے پیٹا کیونکہ وہ پیروں کی اولاد ہے' گدی نشین ہے اور میں ان کی حویلی میں کام کرنے والے ایک معمولی سے منشی کا بیٹا اور یہی فرق دیکھتے ہوئے آپ نے اس کی حرکتوں کو درست قرار دیا۔

جب میں نے اتنا کہا کہ میں کسی سیّد لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو قدرے تامل کے بعد آپ راضی ہو گئے کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ میں اپنے جیسے کسی مفلوک الحال گھرانے کی کسی سیّد زادی کے متعلق بات کر رہا ہوں' لیکن جیسے ہی میں نے حویلی والوں کا نام لیا آپ نے مجھے موت کی دہلیز تک پہنچا دیا۔

واہ مولوی صاحب واہ! ان گنبدوں کے نیچے بیٹھ کر بھی آپ کو سود و زیاں کا خیال ہے؟

آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تو بعد میں حساب دینا ہو گا' پہلے حویلی والے حساب چکتا کرنے آئیں گے۔''

''کیا بکے جا رہا ہے؟'' مولوی صاحب بپھر گئے۔

''کچھ خدا کا خوف کریں مولوی صاحب' یہ چھت بے شک پیروں کے پیسے سے بنی ہے' لیکن گھر خدا تعالیٰ کا ہے۔ صرف ایک چھت کے نفع کی خاطر جو سودا آپ کر رہے ہیں وہ بہت مہنگا ہے۔ افسوس' اس چھت کو آپ نے خدا کے گھر کی چھت نہیں سمجھا' بلکہ ان پر لگے شہتیروں کو دیکھ کر آپ کو ان روپوں کا خیال آیا ہے جو حویلی والوں نے اسے بنانے پر خرچ کیے ہیں۔

مولوی صاحب حویلیاں کتنی بھی مضبوط کیوں نہ ہوں ان میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں' ان کی چھتیں بھی گر جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا گھر بظاہر کتنا ہی کمزور نظر آئے درحقیقت بہت مضبوط ہوا کرتا ہے۔ آپ نے ان در و دیوار کو اللہ تعالیٰ کا گھر سمجھنے کے بجائے حویلی کی جاگیر سمجھا' کوئی عجب نہیں کہ اس کی جس چھت کی خاطر آپ دوغلے پن کا شکار ہو رہے ہیں کل وہ ڈھے جائے۔''

مولوی صاحب کے لیے یہ انتہا تھی۔ انہوں نے کوئی بات کیے بغیر ہاتھ فضا میں بلند کیا مگر اس سے قبل کہ وہ اچھو تک پہنچتا' اس نے درمیان میں ہی مولوی صاحب کی کلائی پکڑ لی۔

''میں نے آپ کی بہت عزت کی ہے مولوی صاحب! آپ کو ہمیشہ باپ کا درجہ دیا ہے اور اسی لیے اب تک آپ کو 'آپ' کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپ اس عزت کے مستحق نہیں ہیں۔''

اس نے ایک جھٹکے سے ان کی کلائی چھوڑی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مسجد سے باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

مولوی نعمت اللہ سے کھانا پینا دوبھر ہو گیا تھا۔ ان کا ایک پرانا شاگرد عین مسجد کے بیچ میں ان کی تذلیل کر کے چلا گیا تھا۔ مانا کہ یہ سب دیکھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن احساسِ توہین بہت شدید تھا۔ رضیہ اور زرینہ کھانے کا پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھیں۔ اماں نے کتنی منتیں کر ڈالیں' لیکن وہ گم صم ہی رہے۔ اصرار بڑھا تو پگڑی سر پر ڈال کر باہر نکل گئے۔

ان کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ فوری طور پر منشی فضل دین سے ملنا چاہتے تھے۔

حویلی پہنچ کر انہوں نے منشی کو اپنے آنے کی اطلاع دی' لیکن منشی سے پہلے ان کی آمد کی خبر حیدر علی شاہ کو مل گئی۔ وہ فوراً برآمدے میں چلا آیا۔

''السلام علیکم چھوٹے شاہ صاحب!'' مولوی صاحب نے قدرے جھک کر کہا۔

''یہ کیا کرتے ہیں مولوی صاحب! کیوں مجھے گناہ گار کرتے ہیں۔'' انہیں جھکتے دیکھ کر حیدر علی نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے آپ اس گاؤں میں دین کی روشنی پھیلا

رہے ہیں' آیئے اندر آیئے۔''

وہ مولوی صاحب کو گول کمرے میں لے آیا۔

''کہیے کیسے آنا ہوا؟''

''منشی سے کچھ ذاتی نوعیت کا کام تھا' اس لیے چلا آیا۔''

''آپ کا یہاں آنا میرے لیے بہت خوشی کی بات ہے لیکن آپ نے حکم بھجوا دیا ہوتا' منشی خود حاضر ہو جاتا آپ کے سامنے۔''

''اللہ تعالیٰ آپ کو بہت رتبے دے اور بہت نیک بنائے شاہ صاحب' آپ نے مجھے بہت عزت دی ہے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں' یہ عزت کا مقام آپ نے خود کمایا ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہ بتایئے مسجد میں کسی چیز کی کمی تو نہیں؟''

''نہیں شاہ صاحب! اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ہے۔ پیر صاحب ہر طرح سے ہمارا خیال رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور زیادہ بلند مرتبہ دے۔''

''گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہو؟''

''اللہ کا بہت فضل ہے شاہ صاحب۔''

ان کی باتیں جاری تھیں کہ منشی چلا آیا۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیدر علی نے اسے مخاطب کیا۔

''منشی! مولوی صاحب کے گھر گندم اور چاول کی دو بوریاں اور ایک اچھا سا تیل کا چولہا پہنچا دینا۔''

''شاہ صاحب آپ کی عنایت ہے پر یقین کیجیے اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔''

''مجھے یقین ہے آپ کی بات کا' لیکن آپ خود چل کر ہماری حویلی میں آئیں اور ہم آپ کی خاطر داری نہ کریں' یہ ممکن نہیں ہے۔''

''شاہ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' منشی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اب آپ منشی سے بات کیجیے' میں چلتا ہوں۔'' حیدر علی اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے کمرے سے باہر نکلنے تک مولوی صاحب اسے دعائیں دیتے رہے۔

''کہیے مولوی صاحب کیسے آنا ہوا؟''

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''مجھ سے ضروری بات؟'' وہ قدرے حیران ہوا۔ ''کریں۔''

''یہاں نہیں کہیں اور چلو۔''

''کہیں اور کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔

''مطلب یہ کہ حویلی سے کہیں باہر' اپنے گھر چلو یا پھر میرے ساتھ مسجد میں آ جاؤ۔''

''ایسا ہے۔'' منشی کچھ سوچ کر بولا۔ ''یہ تین دن تو بے حد مصروفیت کے ہیں' اس کے بعد جیسے ہی وقت ملا میں خود چلا آؤں گا۔''

''تب تک شاید بہت دیر ہو چکی ہو۔''

''اس سے پہلے تو ناممکن سمجھیں۔'' منشی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شادی کے دن ہیں' سارا کام میرے سر پڑا ہوا ہے۔ ویسے تو بعد میں بھی مصروفیت ہے' لیکن خیر میں کسی نہ کسی ترکیب سے وقت نکال ہی لوں گا۔''

''تم میری بات کو سنجیدگی سے اس لیے نہیں لے رہے کیونکہ تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ تمہارے بیٹے کی جان کو زبردست خطرہ ہے۔''

''کک...... کیا؟'' منشی کا رنگ اڑ گیا۔ ''مولوی صاحب! آپ اچھو کے متعلق کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں اور اگر تم نے اسے نہ روکا تو شاید تمہیں اس کی قبر کا نشان بھی نہ ملے۔ میں تمہارا اور اس کا خیر خواہ ہوں اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں کہ جو کچھ بھی کرو جلدی کرو۔''

منشی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

''بس مولوی صاحب! ایک منٹ مہلت دیں' میں ابھی آیا۔'' منشی تہبند سنبھالتا ہوا تقریباً دوڑتے ہوئے حویلی کے اندرونی کمروں کی طرف بڑھ گیا۔

انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچ منٹ بعد ہی منشی تیزی سے چلتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔

''آئیں' مسجد ہی چلتے ہیں۔''

وہ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے مسجد میں آ بیٹھے۔

سپارہ پڑھنے والے بچوں کو مولوی صاحب آج کے دن کے لیے چھٹی دے چکے تھے۔

''جلدی بتائیں مولوی صاحب! میرے اچھو کو کیا خطرہ ہے۔ میرا دم نکلنے کو ہے۔'' منشی نے بیٹھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

''آج فجر کی نماز کے بعد اچھو میرے پاس آیا تھا۔ جب وہ بولنے لگا تو میں بہت خوش بھی ہوا تھا' لیکن منشی اس نے دوبارہ زبان مل جانے کے بعد جو باتیں کیں' ان کے کرنے سے بہتر تھا کہ اسے دوبارہ زبان ملتی ہی ناں۔''

''یہ لڑکا میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے مولوی صاحب' مجھے اندازہ ہے کہ اس نے پھر سے شاہ صاحب کی شان میں گستاخی کی ہو گی۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ اس بات کو اپنے تک رہنے دیں۔ میں کسی طرح اسے سمجھا دوں گا پر خدا کے واسطے یہ بات کسی سے نہ

کہنا۔'' منشی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''نہیں منشی! تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اچھو نے کیا کہا ہے۔''

''کیا کہا ہے اس نے؟'' منشی نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

''یہ پوچھو' کیا نہیں کہا۔ پہلے مجھ سے اسلام کے متعلق سوال کر کے پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا' اگر تب مجھے اصل بات کا علم ہو جاتا تو میں کوئی مصلحت آمیز جھوٹ بول دیتا۔ شریعت میں اس کی اجازت ہے' ایسے سچ سے جو شر پھیلانے کا باعث بنے' مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہوتا ہے لیکن تب مجھے خبر نہیں ہو سکی۔'' مولوی صاحب سانس لینے کو رکے پھر بے حد دھیمی آواز میں بولے۔'' وہ پیر صاحب کی کسی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا؟'' منشی اچھل پڑا۔'' جھوٹ نہ کہیں مولوی صاحب آپ کو میرے بیٹے پر اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی۔''

''آرام سے بولو منشی' تمہاری اونچی آواز کسی نے سن لی تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا' تمہارا گھرانہ البتہ تباہ ہو جائے گا۔''

''میں کہہ دوں گا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''افسوس منشی! میں نے تمہارے بیٹے کو سمجھایا مگر اس نے ناسمجھی کا ثبوت دیا۔ تمہیں بھی مطلع کیا مگر بجائے اس کے کہ تم عقل مندی کا مظاہرہ کرتے' تم بھی حماقت پر اتر آئے میرا جو فرض تھا میں نے پورا کر دیا۔ باقی تمہارے بیٹے کے مقدر میں ذلت و رسوائی کی موت لکھی ہوئی ہے تو اسے کون بچا سکتا ہے۔'' مولوی صاحب اٹھنے لگے۔

''مولوی صاحب' مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔'' منشی نے ان کے ہاتھ پکڑ کر انہیں واپس بٹھانے کی کوشش کی۔'' میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا۔ آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اچھو ایسی حرکت کر بیٹھے گا۔''

''یہ تو تمہیں سوچنا ہو گا کہ تم کیا کرو۔ تمہارے بیٹے نے میری بھی سخت توہین کی ہے۔ میں اسے سمجھاتا' لیکن میری بات وہ بالکل نہیں سنے گا۔ تب بھی میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی' لیکن اس نے میری بات سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ سید لڑکی کی شادی کے مسئلے کے متعلق کون سے علماء کیا کہتے ہیں۔ کون حمایت کرتے ہیں اور کون مخالفت کرتے ہیں۔ حمایت کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں اور مخالفت کرتے ہیں تو کیوں لیکن تمہارے جاہل مطلق بیٹے کو میں کچھ بتا بھی دیتا تو اس کی عقل میں میری بات کہاں سماتی کہ ... کا کفو کون ہو سکتا ہے' اسے تو کفو کا مطلب بھی معلوم نہیں ہو گا چلا تھا دینی مسئلے پر میرے ساتھ بحث کرنے۔

اب اسے جو کچھ کہنا سمجھانا ہے منشی وہ تم ہی کہو سمجھاؤ۔ یوں بھی اپنی اولاد کے اعمال کے

ذمہ داران کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ تم کر سکتے ہو' وہ میں یا کوئی اور نہیں کر سکتا۔''

''مولوی صاحب! میں برباد ہو جاؤں گا' تباہ ہو جاؤں گا' میرے حال پر رحم کریں۔ میرے اچھو کے لیے کچھ کریں۔'' وہ بچوں کی طرح زور زور سے رونے لگا۔

''مجھے تمہارے بڑھاپے اور تمہارے بیٹے کی منہ زور جوانی پر ترس آ رہا ہے منشی۔'' بالآخر مولوی صاحب پسیج گئے۔'' مجھ سے تعویذ لے جاؤ لگتا ہے کوئی تمہارے بیٹے پر شیطانی عمل کر رہا ہے' جس کی وجہ سے وہ باغی ہوتا جا رہا ہے۔ ایک تعویذ جلا دینا۔ یہ بدروحوں اور شیطان کو جلا کر بھسم کر دے گا یا تمہارے بیٹے کے پاس سے بھگا دے گا۔ ایک تعویذ پانی میں گھول کر پلا دینا۔ بیٹا تمہارا کہا ماننے لگے گا۔ جو تم کہو گے۔ اسی پر عمل کرے گا اور ایک تعویذ اس کے تکیے میں سی دینا۔ اس کے دل کو قرار آ جائے گا اور تمام برے خیالات دماغ سے نکل جائیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔''

''مولوی صاحب! آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔ مجھ سے آپ کی شان میں گستاخی ہوئی ہے اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔ مرتے دم تک آپ کو دعائیں دیتا رہوں گا۔''

وہ یونہی گڑگڑاتا رہا اور مولوی صاحب تعویذ لکھتے رہے۔

☆======☆======☆

مولوی صاحب کو انہوں نے اس سے قبل کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا نہ جانے کس فکر میں گم بیٹھے تھے۔

"اماں پوچھیں تو ابا کو کیا پریشانی ہے۔" زرینہ انہیں پریشان دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

"ذرا صبر کرو' مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔ خود ہی بتا دیں گے۔ میں نے بار بار اصرار کیا تو مزید پریشان ہوں گے۔"

اماں کا کہنا درست تھا' تھوڑی دیر بعد انہوں نے آواز دے کر اماں کو کمرے میں بلا لیا۔

"کہیں ابا کو کوئی سن گن تو نہیں مل گئی۔" رضیہ نے ہولے سے زرینہ سے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے میرے اور شاہ جی کے بارے میں؟" زرینہ گھبرا گئی۔

"ظاہر ہے اور کس بارے میں؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"لیکن یہ بات کون باہر نکالے گا؟" زرینہ بولی۔

"حماقت کا ثبوت مت دو' میں یا حمیدہ باہر کسی کو یہ بات نہیں بتائیں گے' لیکن زیب النساء کو تو کوئی فکر نہیں ہے ناں۔ وہ کسی بھی ذریعے سے یہ بات پھیلا سکتی ہے۔"

"لیکن کیسے؟"

"تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا؟ وہ کسی خادمہ سے سرسری سا ذکر کر دے یا [illegible] دے کر اس کام کے لیے کہے تو جانتی ہو بات کہاں تک پھیلے گی اور میری مانو تو یہ دونوں بہنیں قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔"

"مہرالنساء بھی؟"

"ہاں' مہرالنساء بھی۔"

"بات تو دل کو لگتی ہے' لیکن ایسا ہو گیا تو کیا ہو گا؟"

"چھوٹے شاہ صاحب کو تو کچھ نہیں ہو گا البتہ تمہاری فاتحہ پڑھی جائے گی۔"

"رضیہ میری اچھی بہن' ذرا سننا تو ابا' اماں سے کیا کہہ رہے ہیں؟" اس نے خوشامد کی۔

رضیہ کمرے کے دروازے کے قریب پیڑھی رکھ کر بظاہر پیاز کترنے لگی' لیکن اس کی تمام توجہ اندر ہونے والی گفتگو کی جانب مبذول تھی۔

جیسے جیسے وہ سنتی جا رہی تھی' ویسے ویسے اس کا خوف ختم ہوتا جا رہا تھا کہ ابا کو زرینہ کے متعلق کچھ خبر ہوئی ہے۔ البتہ اچھو کا معاملہ اس کے لیے حیرت انگیز ضرور تھا۔

جونہی مولوی صاحب نے بات ختم کی اور اماں نے تبصرہ شروع کیا' وہ وہاں سے کھسک آئی۔

"کیا رہا؟" زرینہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔" رضیہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میرے ساتھ آ جاؤ۔ ہنڈیا بھی پکاتی جاؤں گی اور تمہیں بات بھی بتاتی جاؤں گی۔"

☆======☆======☆

اچھو بظاہر پُرسکون تھا' لیکن اس کے اندر کتنے ہی طوفان اٹھ رہے تھے۔ مولوی صاحب کی دوغلی پالیسی نے اس کے اندر آگ لگا دی تھی۔

"اب میں وہی کروں گا جو میں چاہوں گا۔" اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ "میں ان دیواروں کو نہیں مانتا جو سماج نے مختلف ناموں سے ہمارے درمیان اٹھا رکھی ہیں اور مجھے سماج کے ان ٹھیکیداروں کی پروا بھی نہیں ہے۔ مجھے پروا ہے تو صرف چھوٹی بی بی اور ان کی عزت کی۔"

ماں سے سونے کے لیے کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا' لیکن نیند تھی کہ آ ہی نہیں رہی تھی۔ مولوی صاحب کی باتیں یاد آتی تھیں تو غصہ کسی طوفان کی مانند اس کی ذات کے اندر ہی اندر توڑ پھوڑ شروع کر دیتا تھا۔

وہ بستر پر لیٹا انہی واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب اسے محسوس ہوا کہ کوئی گھبراہٹ کے عالم میں گھر میں داخل ہوا ہے۔ یوں کسی کی آمد یقیناً کسی اچھی خبر کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی' اس لیے وہ چارپائی سے اٹھنے لگا' لیکن پھر منشی کی آواز سن کر رک گیا۔

"اچھوں کی ماں! اچھو کہاں ہے؟" اس کی بدحواس سی آواز سنائی دی۔

"اندر کمرے میں سو رہا ہے' لیکن تم کیوں اتنے گھبرائے ہوئے ہو؟"

"اپنی قسمت میں اب سوائے گھبرانے اور پریشان ہونے کے رہ کیا گیا ہے۔" چارپائی چرچرائی جس سے اچھو کو اندازہ ہوا کہ منشی چارپائی پر بیٹھ گیا ہے۔

"اب کیا ہو گیا؟"

"یہ پوچھو کیا نہیں ہوا' اس بڑھاپے میں یہ دن دیکھنا پڑیں گے' یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں

تھا۔"

"میں پوچھتی ہوں کہ ایسا کیا ہو گیا جو میرے بیٹے پر غصے ہو رہے ہو۔"

"تمہارے بیٹے پر غصے نہیں ہو رہا' اپنی تقدیر کو رو رہا ہوں۔"

"تو بیٹھے روتے رہو' میرا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟"

"بڑی آئی وقت کو آباد کرنے والی۔" منشی چلایا۔

"شی! اچھو سو رہا ہے۔ اتنا کام کر کے غریب تھک جاتا ہے۔"

"اب نہیں اٹھے گا تیرا اچھو! ایک دم قصہ پاک ہو جائے گا اس کا۔" منشی چڑچڑے انداز میں بولا۔

"تمہارے منہ میں خاک' شیطان کے کان بہرے...... جب بھی بولو گے الٹا ہی بولو گے۔"

"جب بڑے شاہ صاحب یہ سب کر گزریں گے' تب پوچھوں گا۔"

"کیا ہوا اب؟" ماں واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ "میرے بھولے بھالے بیٹے سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی ہے کہ سب اس کی جان کے دشمن بنے جا رہے ہیں۔ اے کچھ کہو تو سہی' بتاؤ تو کچھ کہ ہوا کیا ہے؟"

"اب آئی ناں عقل ٹھکانے۔" منشی بولا۔ "یہ پکڑ تین تعویذ یہ جلانا ہے' یہ اسے گھول کر پلانا ہے اور یہ والا اس کے تکیے میں سی دینا تاکہ اب جو خناس اس کے دماغ میں بھرا ہے وہ نکل جائے۔"

"یہ تو میں کر دوں گی' پر بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟"

"عورت ذات کی زبان کا کیا بھروسہ اور تیری زبان کا تو بالکل بھی نہیں ہے۔ ہمدردیاں سمیٹنے کے چکر میں پورے گاؤں میں بات پھیلا دے گی' اس لیے چپ چاپ وہ کام کرو جو میں کہتا ہوں۔ مولوی صاحب نے یقین دلایا ہے کہ ان تعویذوں کے اثر سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مجھ پر اعتبار نہیں تمہیں؟"

"تجھ پر تو اعتبار ہے نیک بخت' پر تیری زبان پر اعتبار نہیں ہے۔"

"یا اللہ' ہمیں اس مشکل سے نکال۔"

"یہ تو شکر ہوا کہ مولوی صاحب نے ساری بات مجھے بتا دی' ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔" منشی نے کہا "اور ہاں اچھو کو خبر نہ ہونے پائے ان تعویذوں کی تیرے لاڈلے کو پتا چل گیا تو سارا اثر جاتا رہے گا۔"

چارپائی پھر چرچرائی۔ منشی غالباً لیٹ چکا تھا۔

"ہوں تو یہ بات ہے' دل تو چاہتا ہے کہ تعویذ گھلا پانی مولوی کو ہی جا کر پلا دوں۔" اچھو کا مزاج بگڑنے لگا تھا۔ "دوغلے لوگ۔"

☆======☆======☆

"ساری بات واضح ہے۔" زرینہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھو نے کہا کہ وہ ایک لڑکی سے ملا تھا اور وہ اسے اچھی لگی۔ اس پر ابا جی نے اسے مشورہ دیا کہ اسے اس لڑکی سے شادی کر لینا چاہیے اور جواب میں اس نے پیر صاحب کی بیٹیوں کا حوالہ دے دیا۔"

"ہاں۔" رضیہ نے تائید میں سر ہلایا۔

"وہ یقیناً زیب النساء کی بات کر رہا ہو گا' وہی اس کے ساتھ گئی تھی' لیکن غور کرو ملنے کا مطلب کیا ہے۔ اچھو نے کہا تھا کہ وہ لڑکی سے ملا تھا۔"

"زیب النساء نے میرے سامنے وہاں کسی کو نہیں بتایا کہ وہ اچھو کے ساتھ آئی ہے۔ ہو سکتا ہے اس مختصر سے سفر کو اچھو ملنا کہہ رہا ہو۔"

"نہیں۔" زرینہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ملنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ لڑکا تانگہ چلاتا جائے اور پیچھے بیٹھی لڑکی پردے میں گم صم بیٹھی رہے۔ بھلا یہ بھی ملنا ہوتا ہے اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ اچھو نے کہا تھا کہ لڑکی اسے اچھی لگی۔ جب تک وہ اچھو سے بات نہ کرے یا اسے اپنا چہرہ نہ دکھائے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اچھو خواہ مخواہ ہی اسے پسند کر بیٹھے۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" رضیہ بولی۔ "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ صرف بڑے شاہ صاحب کی دشمنی میں ایسا کہہ رہا ہو۔ آج ابا جی سے اس نے جو باتیں کی ہیں' ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بڑے شاہ صاحب کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔"

"اتنا احمق بھی نہیں ہے کہ وہ ایک بلاوجہ کی بات میں اپنی زندگی داؤ پر لگائے۔"

"وہ صرف اس لیے بھی یہ بات پھیلا سکتا ہے کہ اس سے پیر گھرانے کی عزت میں فرق آ جائے گا۔"

"رشتہ بھیجنے کی جو بات اس نے کی ہے اس سے پیر گھرانے کی نہیں خود اچھو کی عزت میں فرق آئے گا۔ نہیں رضیہ اگر اسے اپنی جان دے کر ہی انہیں بے عزت کروانا ہوتا تو وہ صرف باتوں پر اکتفا نہ کرتا۔ کل بہت اچھا موقع تھا' اس کے پاس حویلی کی عزت خاک میں ملانے کا۔" زرینہ نے کہا۔ "بات کچھ اور ہے۔"

"شاید۔"

"تم ایسا کرنا رضیہ کہ آج جب حویلی جاؤ تو ذرا سن گن لینا' شاید کچھ اور اندازہ ہو جائے اس بات کا۔"

"آج میں حویلی نہیں جا رہی۔"

''کیوں؟'' زرینہ نے تعجب سے اس کی جانب دیکھا۔

''بس نہیں جا رہی' دل نہیں چاہ رہا۔''

یہ حقیقت تھی کہ حویلی جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا' لیکن گھر رکنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اماں' ابا کی غیر موجودگی میں وہ اسے شاہ صاحب کی منگنی کی اطلاع دینا چاہتی تھی۔

''کل ان لوگوں نے میرے متعلق پوچھا تو نہیں تھا؟''

''باقی سب نے تو پوچھا تھا' لیکن انہوں نے نہیں پوچھا۔ ویسے ان کی نظروں میں میرے لیے کچھ اچھے جذبات نہیں تھے۔''

''مجھے پروا نہیں ہے اس بات کی۔ میرا ساتھ تو شاہ جی کے ساتھ ہے۔ جب تک وہ اچھے ہیں تب تک سب کچھ ٹھیک ہے' لیکن ایک بات ہے رضیہ' انہیں اپنی بہنوں سے بہت محبت ہے۔''

''ان کی بہنیں بہت رکاوٹیں ڈالیں گی۔''

''یہی خدشہ مجھے بھی ہے۔'' زرینہ نے کہا۔ ''پر کیا کروں ان کی بہنوں کی وجہ سے ان سے محبت کرنا چھوڑ تو نہیں سکتی ناں۔''

''زرینہ! اپنے ابا جی کے لیے کھانا لے آؤ۔'' اماں کی آواز آئی۔

''اچھا اماں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ہم بھی ساتھ ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔'' رضیہ بولی۔

''تم سالن نکالو' میں برتن لگاتی ہوں۔''

زرینہ نے برآمدے میں پڑے تخت پر کھانا چن دیا۔

''آج کے دن کا آغاز تو بہت برا تھا' لیکن چھوٹے شاہ صاحب کی مہربانی کی وجہ سے طبیعت کی بے زاری قدرے کم ہو گئی۔'' مولوی صاحب نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

زرینہ اور رضیہ نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''میں نے سنا ہے چھوٹے شاہ صاحب بہت اچھے ہیں۔'' اماں بولیں۔

''انہیں جتنا اچھا کہو اتنا کم ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''انہوں نے اتنی عزت دی مجھے' ایسے بات کی مجھ سے کہ اب تک میرا جی خوش ہے' اللہ تعالیٰ ان کے مرتبے میں اضافہ کرے۔''

''آمین۔'' زرینہ نے دل ہی دل میں کہا۔

''انہوں نے یہاں دو بوری گندم اور چاول بھیجنے کا بھی حکم دیا ہے اور معلوم ہے اس کے علاوہ کیا عنایت کر رہے ہیں؟''

''کیا؟'' زرینہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ تم دونوں بچیوں کے کام کی چیز ہے۔'' مولوی صاحب بولے۔ ''فرمائش تم لوگوں نے

ہے کی' لیکن بغیر جانے بوجھے اسے پورا وہ کر رہے ہیں۔''

''تیل کا چولہا۔'' زرینہ نے جوش اور خوشی کے ساتھ فوراً کہا۔

''میری یہ بیٹی پڑھی لکھی ہے ناں' اس لیے فوراً بوجھ لیا۔'' مولوی صاحب نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

زرینہ ہنستی چلی گئی۔ ساتھ بیٹھی رضیہ نے اسے ٹہوکا دیا۔

''یہ ایسے ہی پاگلوں کی طرح ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔'' اماں نے منہ بنایا۔ ''بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے' ہنسے جاتی ہے۔ چپ کر واب آواز باہر جاتی ہے۔ کوئی اچھا لگتا ہے کہ اس چار دیواری سے ہنسی ٹھٹھے کی آواز باہر جائے۔''

ان کے جھڑکنے پر وہ بمشکل ہنسی روکنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

''میں شاہ جی کا شکریہ ضرور ادا کروں گی' انہیں کتنا خیال ہے میرا۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''اتنی چھوٹی سی بات بھی ان کے ذہن میں رہ گئی۔''

شام کو اماں ابا حویلی چلے گئے تو وہ دونوں صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ گئیں۔

''شاہ جی کتنے اچھے ہیں۔'' زرینہ نے کہا۔ ''انہیں کتنا خیال ہے میرا۔ ابا جی بھی ان سے خوش ہیں۔ اب اگر پیر صاحب راضی ہو جائیں تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہے۔''

''پیر صاحب کیوں راضی ہونے لگے۔ آج سے پہلے کبھی انہوں نے نچلی سطح پر کوئی رشتہ جوڑا ہے جو اب جوڑیں گے۔'' رضیہ بولی۔

''شاہ جی کی بات کا خیال تو کریں گے۔''

''اور اگر انہوں نے پہلے فیصلہ کر لیا ہو تو؟''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔ ''نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔ شاہ جی کو تو خبر ہوتی ناں اس بات کی۔''

''یقیناً۔'' رضیہ اسے اصل بات بتانے کے لیے راہ ہموار کر رہی تھی۔

''تو پھر ٹھیک ہے' شاہ جی کو خبر ہوتی تو مجھے بھی خبر ہوتی۔ اس کا مطلب ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''کیا یہ ممکن نہیں کہ شاہ صاحب کو تو معلوم ہو' لیکن انہوں نے تمہیں نہ بتایا ہو؟''

''نہیں' ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ ہی کیوں کرتے؟''

''تو زرینہ! خود کو کسی بری خبر کے لیے تیار رکھو کیونکہ کم از کم یہ بات انہوں نے تم سے چھپائی ہے۔''

چند لمحے تک وہ رضیہ کو کھوجتی نظروں سے دیکھتی رہی پھر سر جھٹک دیا۔

''یہ اچھی بات نہیں ہے کہ مجھے باز رکھنے کے لیے تم شاہ جی پر کوئی الزام لگا دو۔''

''میں کوئی الزام نہیں لگا رہی۔ اگر مہرالنساء اور زیب النساء نے جھوٹ نہیں بولا جو کہ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے نہیں بولا تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ چھوٹے شاہ صاحب کی منگنی ہو چکی ہے۔''

''نہیں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں یہ بات کسی صورت نہیں مان سکتی۔''

''تمہیں ماننا پڑے گی۔''

''میں سوچتی تھی رضیہ کہ تمہیں مجھ سے بہت محبت ہے لیکن آج پتا چلا کہ تمہیں مجھ سے ذرہ بھر بھی محبت نہیں ہے ورنہ تم شاہ جی پر ایسا الزام نہ لگاتیں۔'' زرینہ کے لہجے میں دکھ تھا۔

''مجھے تم کو اپنی محبت کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رضیہ کو ایک دم اس پر غصہ آ گیا۔ ''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ گاؤں کی آدھی لڑکیوں کو میرے سامنے مہرالنساء نے یہ بتایا تھا اور اب تک ان لڑکیوں نے پورے گاؤں میں یہ بات پھیلا دی ہوگی۔ شک ہو تو کسی سے بھی پوچھ لو۔''

زرینہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں تمہیں ان کی منگیتر کا نام نہیں بتا رہی۔ تمہیں مجھ پر شک ہے ناں' اس لیے چاہو تو گاؤں کی کسی بھی لڑکی سے معلوم کر لو۔''

''رضیہ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا' لیکن اس کے لہجے میں وہ پہلے والا اعتماد نہیں تھا۔

''تمہارا اپنا بھلا اس میں ہے کہ تم مان جاؤ۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' زرینہ کی آواز بھیگ رہی تھی۔ ''میں تو جیتے جی مر جاؤں گی رضیہ۔ میں شاہ جی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''خدا کے لیے زرینہ! واپس پلٹ آؤ۔ انہوں نے تم سے بے وفائی کی ہے' اس لیے تم بھی ان کی خاطر اپنی زندگی برباد مت کرو۔''

''میں تو اس جگہ پہنچ گئی ہوں' جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا۔'' چند لمحے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتی رہی پھر سر اٹھا کر بولی۔ ''وہ کون ہے؟''

''ان کی ماموں زاد فوزیہ۔'' رضیہ نے بتایا۔ ''جس وقت مہرالنساء اس منگنی کے متعلق بتا رہی تھی' اس وقت وہ بھی وہیں تھی شرم سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ مہرالنساء کے چہرے کے تاثرات مجھے یہ بتا دینے کے لیے کافی تھے کہ اس اعلان کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ یہ سب تمہارے کانوں تک پہنچ جائے۔''

''میں کیا کروں رضیہ؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''ابھی کچھ نہیں بگڑا۔'' رضیہ نے اسے تسلی دینا چاہی۔ ''اتنا وقت نہیں گزرا کہ تم انہیں بھول نہ سکو۔ بس جو ہوا اس پر مٹی ڈالو اور ختم کرو اس قصے کو۔''

''یہ قصہ تو اب میرے مرنے پر ہی ختم ہوگا اور پھر مجھے شاہ جی نہ ملے تو زندہ رہنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔''

''وہ آرام کے ساتھ فوزیہ سے شادی رچا کر خوش خوش بیٹھ جائیں اور تم ان کے لیے جان دے دو۔ ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی مجھے تم سے۔''

''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے ناں کہ شاہ جی کو اس رشتے کی خبر ہی نہ ہو۔'' زرینہ کے لہجے میں امید تھی۔

''ناممکن انہیں یقیناً خبر ہوگی۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کل رات ہی تو انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اپنی شکست تسلیم نہیں کریں گے وہ۔ سچ مچ مجھ سے محبت کرتے ہیں' بہت زیادہ۔''

''یہ یقین تم مجھے دلا رہی ہو یا خود کو؟''

''میں پوچھوں گی شاہ صاحب سے' ضرور پوچھوں گی۔ تم دیکھ لینا رضیہ' انہیں اس بات کی خبر نہیں ہوگی۔'' اس نے رضیہ کی بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

''مجھے ڈر ہے' کہیں خوش فہمیوں کے جنگل میں بھٹکنے کے لیے تم تنہا نہ رہ جاؤ۔''

''شاہ جی کو یقیناً یہ بات معلوم نہیں ہوگی۔'' زرینہ نے ہولے سے کہا۔ اس کے لہجے میں بھرپور یقین تھا۔

☆======☆======☆

شادی کے یہ تین دن زرینہ پر تین صدیوں کی طرح بھاری تھے۔ اماں بھی حویلی سے واپسی پر حیدر علی شاہ کی منگنی کی خبر لائی تھیں۔ گاؤں بھر میں یہ بات پھیلی ہوئی تھی' لیکن زرینہ کو یقین تھا کہ اس پورے قصے میں حیدر علی بے قصور ہے۔

مولوی صاحب کے ذکر کرنے کے اگلے ہی روز گندم اور چاول کی بوریاں اور تیل کا بالکل نیا چولہا ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس بات سے بھی زرینہ کو بہت تسلی ہوئی تھی یوں بھی اسے تنکے کا سہارا ہی بہت تھا۔

بارات اور ولیمے پر چلنے کے لیے اماں نے اسے کتنا کہا تھا' لیکن وہ حویلی میں قدم رکھنے پر تیار نہیں تھی۔ زیب النساء اور مہرالنساء ایک دم ہی بری لگنے لگی تھیں اب تو یہ بات بھی واضح ہو چکی تھی کہ وہ دونوں اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسے بھی اس بات کی خواہش نہیں تھی۔ اسے تو صرف حیدر علی شاہ کی طرف داری درکار تھی۔ اس نے ہی تو کہا تھا کہ وہ کوئی غم اور

فکر نہ کرے اور سب کچھ اس پر چھوڑ دے۔

وہ بہت بے چینی سے حیدر علی سے ملنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک ایک پل اتنا طویل ہو رہا تھا' وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا' لیکن طویل سے طویل وقت بھی بالآخر گزر ہی جاتا ہے۔ سو یہ تین صدیوں جتنے طویل دن بھی بالآخر تمام ہوئے۔

رات کو اماں' ابا کے سو جانے کے انتظار میں وہ اپنی چارپائی پر آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی جب رضیہ گربہ قدم چلتے ہوئے اس کے پاس آ گئی۔ زرینہ کو اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ہوا؟'' رضیہ کو اپنے قریب پا کر اس نے پوچھا۔

''تم سوئی نہیں؟''

''آج کیسے سو سکتی ہوں' مجھے تو تین راتوں سے نیند نہیں آئی۔ بھول گئیں؟ آج مجھے شاہ جی سے ملنے جانا ہے۔''

''مت جاؤ۔''

''یہ نہ کہو' کوئی ایسی بات نہ کہو جو میں نہ مانوں۔''

''اگر شاہ صاحب نہ آئے تو؟'' قدرے توقف کے بعد رضیہ نے پوچھا۔

''یہ ناممکن ہے۔''

''بہت سے ناممکن تمہارے سامنے ہی ممکن ہوئے ہیں۔''

''شاہ جی کی منگنی کی اس وقت تک کوئی وقعت نہیں ہے' جب تک وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ پیر صاحب کی حکم عدولی کریں گے۔ تمہاری خاطر اپنی ماں اور بہنوں کو ناراض کریں گے؟ انہوں نے اپنی بہن کی خاطر تمہیں بری طرح ڈانٹ دیا تھا' پھر بھی تمہیں ان سے توقع ہے کہ وہ سب کو چھوڑ کر تمہیں اپنا لیں گے۔''

''خدا کے لیے رضیہ مجھے تنہا چھوڑ دو' میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔'' اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو آنسو گرے۔

''تمہاری یہی پریشانی تو مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔''

چند لمحے وہ دونوں خاموش بیٹھی رہیں' پھر رضیہ بولی۔

''ابا جی' اماں سے ہمارے رشتوں کی بات کر رہے تھے۔''

زرینہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا' لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔ چپ چاپ رضیہ کو تکتی رہی۔

''میرا رشتہ وہ کمہاروں کی برادری میں طے کرنا چاہتے ہیں' معلوم نہیں کس کا ذکر کر رہے تھے۔''

''میرے متعلق تو کچھ نہیں کہا ناں؟'' زرینہ کے لہجے میں امید تھی۔

''نہیں' کسی کا نام نہیں لیا۔ تمہارا رشتہ وہ کسی بہت اچھی جگہ طے کرنا چاہتے ہیں۔''

''اچھی؟ اچھی تو ایک ہی جگہ ہے' پر وہ ان کے اختیار میں نہیں ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے زرینہ پر رشک آ رہا تھا۔ سب کو اس کا خیال تھا۔ اماں' ابا اور شاہ صاحب کو۔ اماں بھی ابھی کہہ رہی تھیں۔

''رضیہ کا تو وہیں کمہاروں میں رشتہ طے کروا دیں پیر صاحب سے کہہ کر۔ زرینہ کا البتہ میں خوب دیکھ بھال کر رشتہ طے کرواؤں گی۔ میری پھولوں جیسی نازک سی بیٹی ہے۔ ذرا دکھ پہنچے تو مرجھا کر رہ جاتی ہے۔ بڑی بیگم سے خود جا کر سفارش کرنے کو کہوں گی۔''

اور ابا نے کہا تھا۔ ''ہاں زرینہ مجھے بھی بہت پیاری لگتی ہے' اس کا رشتہ جلد بازی میں طے نہیں کرنا۔ یوں بھی پیر صاحب بہت عزت دیتے ہیں مجھے' جہاں کہوں گا وہیں رشتہ طے کر دیں گے۔''

اور رضیہ کے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی تو اس نے خوب برتی سے سب کا دل جیتنا چاہا تھا۔ اسے زرینہ سے حسد محسوس نہیں ہو رہا تھا بس ایک خلش تھی کہ وہ ہر معاملے میں پیچھے ہی تھی۔ آج تک اس نے ہر وہ قدم اٹھایا تھا' جس پر چلنے کی اسے اماں' ابا نے تاکید کی تھی اور اس راہ پر بھولے سے بھی قدم نہیں بڑھایا تھا' جہاں چلنے سے انہوں نے منع کیا تھا۔

اس نے کبھی اماں ابا سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی فرمائش تو دور کی بات اس نے کبھی اپنی ضرورت کے لیے بھی نہیں کہا تھا جو کچھ اسے ملتا تھا وہ پہلے زرینہ کی طرف دیکھتی تھی کہ کہیں اسے تو اس چیز کی ضرورت نہیں۔ پتا نہیں کہاں کمی کی تھی اس نے۔

''مجھے تم پر رشک محسوس ہوتا ہے رضیہ۔'' زرینہ نے کہا تو وہ چونک پڑی۔

''مجھ پر؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ حیرت کی بات ہی تو تھی ناں۔ ابھی وہ زرینہ پر رشک کر رہی تھی۔

''ہاں تم پر۔'' وہ بولی۔ ''کتنی بے فکر ہو تم۔ اماں' ابا جہاں کہیں گے شادی کرنے کو وہیں شادی کر لو گی۔ سکون سے گھر کو سنبھال لو گی' میاں کا خیال رکھو گی اور بچے پالو گی۔'' اس کے لہجے میں افسردگی اتر آئی۔ ''اور مجھے دیکھو یوں لگتا ہے جیسے ایک ایک لمحہ سولی پر بسر ہو رہا ہو۔ نہ جانے کس لمحے تختہ دار کھینچ لیا جائے۔''

اور اس لمحے رضیہ نے سوچا کہ انسان کتنا غیر مطمئن ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے آپ کی تکلیف دیکھتا ہے یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ دوسرا کس تکلیف میں مبتلا ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" زرینہ کی آواز اسے واپس کھینچ لائی۔

"سوچ رہی ہوں کہ محبت کی تھوڑ زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے یا ڈھیر ساری محبت کا ایک دم چھن جانا۔"

"محبت کا چھن جانا تو بہت بڑی بات ہے میرے لیے تو یہ تصور ہی جانکاہ ہے۔"

"محبت کی تھوڑ بھی بہت سوہانِ روح ہوتی ہے زرینہ۔" رضیہ بولی۔ "ترس ترس کر جینا بھی کوئی جینا ہے گلستان نہ سہی' سراب ہی سہی صرف چند لمحوں کا احساس ہی سہی کہ کہیں ڈھیر ساری محبت ہماری بھی منتظر ہے۔"

"اماں' ابا سو گئے کیا؟" زرینہ نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی' وہ تو شاہ صاحب کے پاس جانے کے لیے بے چین تھی۔ ڈھیر ساری محبت کا ایک دم چھن جانا واقعی اس کے لیے جانکاہ تھا۔

"باتوں کی آواز نہیں آ رہی سو ہی گئے ہوں گے۔" رضیہ نے جواب نہ دیا تو زرینہ خود ہی بول پڑی۔

چارپائی سے اتر کر وہ دبے قدموں برآمدے کی طرف بڑھی اور سن گن لینے کی کوشش کی پھر رضیہ کے قریب آ کر ہولے سے بولی۔

"سو گئے ہیں' میں چلتی ہوں' میرے لیے دعا کرنا۔"

رضیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

زرینہ سیاہ چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر حیدر علی شاہ نے اسے دھوکا دیا تو وہ دوبارہ اپنے گھر نہیں جائے گی' وہیں کنویں میں کود کر جان دے دے گی۔

اونچے نیچے راستوں پر تیزی سے چلتی وہ کنویں کے قریب پہنچی تو اسے کوئی ہیولا دکھائی نہ دیا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔

"اس درخت تک جب میں پہنچتی ہوں تو شاہ جی آگے بڑھ آتے ہیں اور پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ کنویں تک جاتے ہیں۔ پر آج شاہ جی کیوں نہیں ہیں۔"

وہ مزید تیزی سے چلتے ہوئے کنویں کے پاس والی بینچ پر جا پہنچی۔

"شاہ جی کیوں نہیں آئے۔ وہ تو ہمیشہ مجھ سے پہلے یہاں موجود ہوتے تھے پھر آج کیا ہوا۔ کہیں رضیہ کے خدشات درست تو نہیں ہیں؟ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ شاہ جی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔" اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔

دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ بری طرح سے رو پڑی۔

☆======☆======☆

حسبِ معمول رات پونے آٹھ بجے حیدر علی شاہ حویلی سے نکلنے کو تھا کہ ملازم نے پیر

صاحب کا بلاوا دیا۔

"ابھی ابھی بلایا ہے؟" حیدر علی نے گھڑی دیکھی جس کے ڈائل پر سوئیاں تیزی سے بھاگ رہی تھیں۔

"جی' شاہ صاحب! فوراً طلب کیا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ واپس پلٹا۔

خواب گاہ میں پیر صاحب کے علاوہ اماں جان بھی موجود تھیں۔

"آپ نے مجھے یاد کیا ہے بابا جان۔"

"ہاں۔"

"فرمایئے۔"

"ادھر میرے پاس آؤ ناں۔" اماں جان نے پیار سے کہا۔

اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اماں جان کے قریب جا بیٹھا۔ جنہوں نے اپنے پاس ہی مٹھائی کا ڈبا رکھا ہوا تھا۔

"اب جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم رجب علی کے فرض سے فارغ ہو گئے ہیں تو چاہتے ہیں کہ اب تمہارے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔"

"اس طرح نہیں پہلے میرے بیٹے کا منہ میٹھا کروائیں۔"

اماں جان نے مٹھائی کے ڈبے سے ایک بڑا سا لڈو نکالا۔ اس سے ان کے چہرے پر خوشی کے کتنے ہی رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ حیدر علی کو پہلی مرتبہ شدت سے احساس ہوا کہ اس کی کشتی بری طرح سے بھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسے اماں جان کے پیار اور ان کی محرومیوں کا بھی احساس تھا اور اپنی گوری کی بے انتہا محبت کا بھی۔

کہنے کو تو اس نے ہمیشہ کہا تھا کہ اس کے لیے فیصلہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا' لیکن حقیقت یہ تھی کہ فیصلے کی گھڑی سخت کڑی تھی۔

اماں جان کے بلند ہوتے ہاتھ میں لڈو دبا ہوا تھا۔

"تھینک یو۔" اس نے لڈو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔

"اونہوں' ماں کے ہاتھ سے۔"

اس نے چپ چاپ ان کے ہاتھ سے تھوڑا سا لڈو کھا لیا۔

"لیکن بابا جان مجھے اس سلسلے میں کوئی جلدی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"ہمیں تو جلدی ہے ناں بیٹا۔" پیر صاحب نے کہا۔

"گستاخی معاف بابا جان لیکن ابھی میرا نمبر نہیں آیا۔ مجھ سے پہلے کسی اور کا حق ہے اور آپ کا فرض کسی اور کی طرف نکلتا ہے۔"

"بیٹا اپنے بابا سے ایسی بات نہیں کرتے۔" اماں یک دم گھبرا گئیں۔ "اور پھر تمہارے بابا نے بہت اچھی...... بہت پیاری لڑکی کا انتخاب کیا ہے تمہارے لیے۔ کوئی اور لڑکی تمہارے لیے اتنی اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی۔"

"ہمیں بات کرنے دیں۔" پیر صاحب نے مداخلت کی پھر وہ حیدر علی شاہ سے مخاطب ہوئے۔

"ہمیں معلوم ہے کہ ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فوری طور پر ہم نے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ نسبت ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں اور لڑکی والوں کو اتنی دیر تک انتظار میں مبتلا رکھنا اچھی بات نہیں۔"

"کیسی نسبت بابا جان؟ مجھ سے پوچھے بغیر میری شادی یا منگنی کا فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ یعنی تمہاری نسبت طے کرنے کے لیے ہمیں تمہاری اجازت درکار ہوگی۔"

"اجازت نہ سہی اقرار کی ضرورت تو ہوتی ہے۔"

"علی میرے لعل! باپ کے سامنے کوئی ایسے بولتا ہے۔" اماں جان نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ اس معاملے میں نہ آئیں نذری بیگم ہم نے اسے تعلیم دلوا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ کاش یہ بھی رجب علی کی طرح اطاعت گزار اور فرمانبردار ہوتا۔ تمہیں اندازہ ہے علی کہ تمہاری باتوں نے ہمیں کتنا صدمہ پہنچایا ہے؟"

"بابا جان! آپ کو یا اماں جان کو دکھ پہنچانے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تو صرف اپنا حق مانگ رہا ہوں۔"

"غور کرو تو ہم نے تمہیں تمہارے حق سے کہیں زیادہ دیا ہے۔ آج جو تم ہمارے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو۔ کیا یہی حق لینا چاہتے ہو؟"

"میں آپ کے سامنے سینہ تان کر کیسے کھڑا ہو سکتا ہوں بابا جان۔ اولاد اپنے والدین کے قدموں میں بیٹھے تب بھی ان کی مہربانیوں کا قرض نہیں چکا سکتی۔"

"تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟"

"صرف یہ حق کہ اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا فیصلہ مجھے خود کرنے دیا جائے۔"

"فیصلہ تو ہو چکا اور یہ فیصلہ آج نہیں' برسوں پہلے اس وقت ہوا تھا جب تم ولایت میں تھے۔ یوں بھی یہ فیصلہ اولاد کے ہاتھ میں نہیں دیا جا سکتا۔ آج کل کے کچے ذہنوں کے نوجوان یہ سوچتے ہیں کہ زندگی انہیں گزارنی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ دو افراد کی زندگی کا معاملہ نہیں ہوتا' ایک نئے گھر کی بنیاد ہوتی ہے' ایک نئی نسل کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ ایک پورے خاندان

ا انداز ہوتا ہے۔"

"اگر آپ کا خیال ہے کہ میں کچے ذہن کا ہوں تو گستاخی معاف بابا جان آپ غلطی پر ہیں۔ میں بھی اپنے اور اس گھر کے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کروں گا۔"

"سنا نذری بیگم! آپ کا فرمانبردار بیٹا کیا کہہ رہا ہے؟" پیر صاحب نے بہت مشکل سے خود پر قابو پا رکھا تھا۔ "یہ اپنی شادی خود کرے گا' خود لڑکی ڈھونڈے گا اور ہمیں بتائے گا کہ فلاں لڑکی اس حویلی میں بہو بن کر آنے والی ہے۔ یہ عزت ہے اس کی نظر میں اپنے والدین کی۔ خوب نام روشن کرے گا۔ آپ کا بیٹا۔ اس حویلی اور اپنے باپ' دادا کا۔"

"نہ بیٹا ایسا نہیں کہتے۔" اماں جان آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔ "آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا' وہ تمہارا بڑا بھائی رجب علی بھی تو ہے' تمہارے ساتھ ولایت سے آیا ہے' پر اس نے تو ایسا نہیں کیا۔" پھر وہ پیر صاحب کی طرف مڑیں۔

"بچہ ہے ناں' ابھی نا سمجھ ہے۔ آپ اس کی باتیں دل پر مت لیں۔ میرا بیٹا ہے' میں سمجھاؤں گی تو مان جائے گا۔"

"اسے بتا دیں کہ اس کی شادی فوزیہ بیٹی سے ہی ہوگی' چاہے یہ کچھ بھی کر لے اور اب یہ اسی وقت ہمیں اپنا منہ دکھائے جب اپنے کہے پر پشیمان ہو اور جب دل سے ہماری عزت کرنے لگے۔" پیر صاحب کہتے ہوئے خواب گاہ سے نکل گئے۔

"اماں جان! آخر بابا جان میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟" ان کے جاتے ہی وہ پھٹ پڑا۔ "کیا میں اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا کوئی حق نہیں رکھتا؟ میری منگنی میری مرضی کے بغیر طے کر دی گئی اور کسی نے مجھے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی۔

اماں جان میں کوئی کھلونا تو نہیں ہوں' جس میں چابی بھر کر اسے چلا لیا جائے یا جہاں دل چاہے اس کا رخ موڑ دیا جائے۔ میں ایک جیتا جاگتا انسان ہوں' میری بھی کچھ خواہشیں ہیں' کچھ خوشیاں ہیں' میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہوگا۔"

اپنے جذبات کے بہاؤ میں وہ یہ بھی نہیں دیکھ سکا تھا کہ اماں جان کی آنکھوں میں برسات اتر آئی تھی۔ جب سانس لینے کو رکا تو اسے احساس ہوا کہ ان کے بوڑھے گالوں کی جھریوں میں آنسو راستہ بنائے چلے آ رہے ہیں۔

"اماں جان!" وہ اپنی باتوں پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ "پلیز روئیں مت۔"

وہ ان کے آنسو پونچھنے لگا۔

"کیسے نہ روؤں۔ ایک امید یہی تو رہ گئی ہے اپنے میکے سے کوئی تعلق جوڑنے کی۔ جس دن سے اس حویلی میں آئی ہوں سوائے خوشی غمی کے سب ناتے ٹوٹ گئے اپنے بھائیوں سے۔ سوچا تھا اپنی بھانجی کو اس حویلی میں پھلتا پھولتا دیکھوں گی تو دل میں ٹھنڈ پڑ جائے گی' لیکن تم تو

چاہتے ہو کہ میرا مرنا جینا بھی ختم ہو جائے اپنے میکے کے ساتھ۔''

''پلیز اماں جان! میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن آپ کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔''

''تو کیوں کرتے ہو اپنے بابا جان کو ناراض' کیوں ماں کا دل دکھاتے ہو' جانتے ہو کہ ہمارے ہاں منگنی کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتی۔ خون کی ندیاں بہہ جایا کرتی ہیں اس بات پر۔ اس لیے تم کچھ بھی کر لو شادی تو تمہیں وہیں کرنی ہے' پھر معاملہ الجھاتے کیوں ہو' علی بیٹا بات جو طے پا گئی' وہ ہو کر ہی رہے گی' چاہے غصے میں کر دو چاہے پیار سے' پھر پیار محبت سے کیوں نہ مان جاتے۔''

''اماں جان! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں' بات یہ ہے کہ......''

''بات کچھ نہیں ہے۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹی۔ ''صرف اتنا ہے کہ پڑھ لکھ کر تم اپنے بزرگوں کو بے وقوف سمجھنے لگے ہو۔ میرے لعل سوچو تو' جو لڑکی برسوں سے تمہارے نام پر بیٹھی ہوئی ہے' اس کا کیا ہوگا۔ کیا اپنی مانگ کسی اور کے حوالے کر دو گے؟ غیرت سے ڈوب نہ مرے گی کیا؟''

''ایک تو آپ لوگوں کی غیرت کا مفہوم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لڑکی کو زبردستی میرے سر پر مسلط کر دیا اور اب مجھ سے یہ توقع کی جا رہی ہے کہ میں اس علاقے کی نام نہاد غیرت کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر لا دلوں۔ اماں! میں ایک عام سا انسان ہوں' مجھ میں اتنی خوبیاں نہیں ہیں جتنی آپ لوگ مجھ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری پرواز کی بھی ایک حد ہے۔ مجھ سے اتنی اڑان کی توقع کیوں رکھتے ہیں آپ لوگ جہاں تک میرا جانا ممکن نہیں ہے۔''

''کیسی اولاد ہو علی! میں نے برسوں گزار دیے ان دیواروں میں خاموشی سے رہتے ہوئے' اس خوش فہمی میں مبتلا رہ کر کہ میرے بچے میری محرومیاں اور میرے آنسو چن لیں گے لیکن تم نے تو یہ امید بھی توڑ دی مجھے کتنا مان تھا تم پر' وہ مان بھی نہ رکھا۔ میری تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہاری ضد کی صورت میں' میں اپنے بھائی اور اس کے بیٹوں کو روؤں گی یا تمہیں۔

جاؤ میری طرف سے تم آزاد ہو۔ اپنی پرواز کے لیے سمت کا تعین تم خود کرو۔ تمہارے بابا کیا کہتے یا کرتے ہیں اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں لیکن میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔''

''اماں' اماں یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''جاؤ بیٹا مجھے آرام کرنے دو۔'' وہ مسہری پر لیٹ گئیں۔

''اماں' میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔''

''میں ناراض نہیں ہوں' تم جاؤ۔''

لیکن ان کی آواز میں موجود آنسوؤں کی نمی نے اسے بے چین کر دیا۔

''اماں پلیز روئیں مت' پلیز اماں؟''

''میرا تمہارا رشتہ ایسا ہے بیٹا کہ نہ چاہتے ہوئے ہی سہی' ہمیں ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ ضرور دینا ہے۔ خوشیاں دینے کے روادار نہ ہوں تو غم ہی سہی۔'' اماں نے کروٹ بدل لی۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنی زیادہ محبتیں عذاب لگنے لگی تھیں۔ محبت کے ان دیکھے جال اتنے مضبوط تھے کہ ان سے نکلنے کی ساری جدوجہد بیکار تھی۔ وہ جتنے ہاتھ پاؤں مارتا تھا' یہ جال اتنی ہی سختی سے اس کے گرد تنتے جا رہے تھے۔ وہ اٹھ کر پائنتی کی طرف چلا آیا اور اماں کے پاؤں پکڑ لیے۔ کتنی دیر وہ یونہی بیٹھا رہا۔

''پاؤں ہی پکڑنے ہیں تو اپنے بابا جان کے پکڑو۔ آج تم جو کچھ بھی ہو' ان ہی کی وجہ سے ہو۔ جاؤ علی۔'' بالآخر ماں نے کہا۔

حیدر علی شاہ شکستہ قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ کتنی الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا وہ۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی خواب گاہ میں جا کر گہری نیند سو جائے۔ ایسی نیند جو کم از کم چند گھنٹوں کے لیے اسے ان پریشانیوں سے نجات دلا دے لیکن گوری کا خیال بھی ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ خدا جانے وہ اب تک اس کا انتظار کر رہی ہوگی یا گھر واپس جا چکی ہوگی۔

اس نے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے دس سے کچھ اوپر ہو رہے تھے۔ گہری نیند لینے کی خواہش کو وہ دبا کر حویلی سے باہر نکل آیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتے جب وہ کنوئیں کے پاس پہنچا تو نقرئی چاندنی میں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ یقیناً وہ اس کی گوری تھی جو برگد کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر بھی وہ وہیں بیٹھی رہی۔

وہ اس کے قریب چلا آیا۔

چاندنی' رات کی تاریکی میں اس کا چہرہ روشن کر رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں' ہونٹ نیم وا' سیاہ چادر ایک کندھے سے ڈھلکی ہوئی' بال کچھ کچھ الجھے ہوئے۔ کتنی دیر تک وہ یونہی اسے دیکھتا رہا۔

نہ جانے اس لڑکی میں کیا تھا کہ جس کی خاطر اس نے اپنی ماں کی آنکھیں نم کر دی تھیں۔ اماں جان کے آنسوؤں نے اسے اندر تک کاٹ کر رکھ دیا تھا' لیکن ان سب باتوں کے باوجود ایک لمحے کے لیے بھی اسے گوری کو چھوڑنے کا خیال نہیں آیا تھا اور چھوڑنے کا خیال آ بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ تو اسے اپنے وجود کا ہی ایک حصہ لگتی تھی اور اپنے آپ کو کاٹ کر پھینک دینے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کیسے پلٹا کھایا تھا زندگی نے اور کیسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا اسے۔

لیکن یہ لڑکی نہیں تھی ساحرہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب بھی اسے قدم بڑھانے پڑے' وہ گوری کی طرف ہی بڑھیں گے۔

''گوری!'' بالآخر اس نے اسے پکارا۔

وہ کسمسائی۔

"گوری!"

اب کے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے سامنے حیدر علی شاہ کو کھڑے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں غیر یقینی کی کیفیت ابھری۔

"شاہ جی آپ؟"

"آئی ایم سوری، مجھے دیر ہوگئی، کب سے یہاں انتظار کر رہی ہو؟"

"پتا نہیں، اب تو لگتا ہے جیسے صدیاں گزر گئی ہیں۔" اس نے ہونٹ کاٹ کر خود پر آنکھوں میں اتر آنے والے پانی کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

"اوہو، دیر تو ہوسکتی ہے، روتی کیوں ہو؟ چلو آنسو پونچھو۔"

اس نے چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کیں، کچھ دیر تک حیدر علی اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر بولا۔

"کیا ہوا؟ اتنی چپ چاپ کیوں ہو؟"

"کیا بات کروں؟"

"کوئی بھی اچھی سی بات۔"

"اچھی باتیں تو ہیں ہی نہیں میرے پاس۔"

"تو بری بات ہی کہہ دو۔"

"اب کیا رہ گیا ہے کہنے کے لیے۔" وہ تلخی سے ہنسی۔

"کیا مطلب؟ جو کچھ کہنا چاہتی ہو، کھل کر کہا کرو۔"

"جب میں نے کہا تھا کہ یہ چند دن کی جدائی کسی لمبی جدائی کا پیش خیمہ نہ ہو تو آپ نے مجھے تسلی دی تھی۔"

"پھر؟"

"آج بھی تسلی دیں گے؟"

"آج ہم جدا کب ہیں؟"

"کل تو ہو جائیں گے ناں۔" وہ بولی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو گوری۔" اس نے زرینہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔" اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ "میں نے سوچا تھا کہ یہ درد و کرب کی آخری رات ہوگی۔ غم زیست سے نجات مل جائے تو ہر درد ہر کرب سے نجات مل جائے گی، لیکن آپ تو یہ بھی نہیں ہونے دیتے۔"

"میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں گوری، پلیز مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔" حیدر علی

لہجے میں تھکن تھی۔

"پریشان مت ہوں۔ کوئی ایک فیصلہ کر لیں، ایسا فیصلہ جس پر آپ کو بعد میں کوئی پشیمانی نہ ہو، جس کی ذمہ داری صرف اور صرف آپ کے کندھوں پر ہو اور جو......"

"میں رات کے اس پہر یہ لایعنی گفتگو سننے یہاں نہیں آیا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"میں جانتی ہوں۔" پھر قدرے توقف سے اس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ کو نہیں معلوم۔"

"کیا؟"

"آپ کی اپنی منگنی کے بارے میں۔" اس نے کھوجتی نظروں سے حیدر علی کی جانب دیکھا۔

اس لمحے حیدر علی نے غور کیا کہ زرینہ کی آنکھیں روئی روئی سی تھیں، لیکن یہ غور کرنے کی اسے زیادہ مہلت نہ مل سکی۔ وہ اس سے اس کی منگنی کے بارے میں پوچھ رہی تھی، لیکن اسے یہ بات معلوم کیسے ہوئی تھی؟

"آپ کو نہیں پتا ناں؟" اس کے لہجے میں امید تھی۔

ایک لمحے کو حیدر علی کا دل چاہا کہ وہ جھوٹ بول دے، لیکن جھوٹ بولنا ناممکن تھا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے گویا اعتراف جرم کیا۔

"آپ مذاق کر رہے ہیں...... ہیں ناں۔" اس نے اسے جھنجوڑ دیا۔ "آپ کو نہیں پتا ناں۔"

حیدر علی نے آہستگی سے خود کو چھڑا کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "مجھے بہت بعد میں علم ہوا جب میرے لیے پلٹنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا تھا، اس لیے کچھ نہیں بتایا۔ فائدہ مجھے کیا تھا بتانے کا جو کچھ یہ بات جان کر مجھے ہوا تھا۔ وہ تمہیں بھی ہوتا اور میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"مجھے بتا تو دیا ہوتا شاہ جی۔" وہ رو پڑی۔

"کیا فرق پڑتا۔ حالات تو یہی ہوتے ناں جو اب ہیں۔"

"بہت فرق پڑتا۔ کسی اور کے منہ سے یہ بات سننے کے بجائے میں آپ کے منہ سے سنتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کوئی اور بتائے تو سچا انسان بھی جھوٹا لگنے لگتا ہے۔" وہ بولی۔ "پتا نہیں محبت اتنی تکلیف دہ کیوں ہوتی ہے۔ میرے لیے تو پلٹنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا۔"

"رونے سے مسئلے حل نہیں ہوا کرتے۔ مجھے سوچنے دو کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ تم پلٹ نہیں سکتیں تو میں بھی کب پلٹ سکتا ہوں۔ آنسو پونچھو، ورنہ میں کچھ بھی سوچ نہیں سکوں گا۔"

لیکن آنسو خود بخود آنکھوں میں اترتے چلے آ رہے تھے۔

''اب تو آپ کے گھر والوں کے ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' قدرے خاموشی کے بعد وہ بولی۔

''ہوں۔''

''پھر؟ خدا کے لیے مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ شاہ جی۔''

''آج بابا جان نے مجھے بلایا تھا۔ میں یہاں کے لیے نکلنے ہی لگا تھا کہ ان کا بلاوا آ گیا۔ یہ بات زیبی آپی پہلے ہی مجھے بتا چکی تھیں لیکن بابا جان نے آج پہلی مرتبہ یہ ذکر کیا تھا۔''

''پھر؟''

''میں نے انکار کر دیا۔''

''کیا؟ انکار کر دیا؟'' اس کے انداز میں خوشی سے زیادہ حیرت تھی۔ ''پیر صاحب سے انکار کر دیا۔''

''یہ تو کرنا ہی تھا۔''

''پھر؟'' اس کی حیرت اب بھی برقرار تھی۔

''وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں' لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ مجھے ہر حال میں ان کی پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کرنی ہے۔''

''آپ نے انہیں میرے متعلق بھی بتا دیا؟''

''نہیں۔''

''اور بڑے شاہ صاحب!''

''انہوں نے مجھے ایک درمیانی راستہ بتایا تھا' جو مجھے منظور نہیں تھا۔''

''اور آپ کی اماں جان اور بہنیں؟''

''بہنیں مجھے سمجھاتی ہیں' روکتی اس لیے نہیں ہیں کیونکہ یہ ان کے بس میں نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''اور اماں جان آج مجھ سے سخت خفا ہیں۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں ان کی آنکھوں میں آنسو برداشت کر سکوں گا' مجھے اماں جان بہت پیاری ہیں گوری۔ ہر بیٹے کو اپنی ماں سے محبت ہوتی ہے' لیکن میری محبت کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں پھر بھی میں ان کے آنسو دیکھتا رہا۔'' اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔ ''انہوں نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ کچھ طلب نہیں کیا تھا۔ آج پہلی مرتبہ انہوں نے مجھ سے جو چیز طلب کی' وہ انہیں دے دینا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ میں انہیں روتے چھوڑ کر چلا آیا۔''

کتنی دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

''میں آپ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گی شاہ جی۔'' بالآخر اس نے کہا۔ ''آپ جو فیصلہ کریں سوچ سمجھ کر کریں۔''

''نہیں میں اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ تمہاری ذات میری طاقت ہے گوری۔ تمہارے بارے میں' میں اکیلے ہی کوئی فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں۔''

''نہیں شاہ جی' مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں اس فیصلے میں شامل ہو سکوں۔ ساری زندگی کا یہ بوجھ میں نہیں اٹھا سکوں گی۔'' وہ بولی۔ ''ہاں آپ جو فیصلہ کریں گے وہ مجھے قبول ہوگا' بس ایک بات ہے شاہ جی۔''

''وہ کیا؟''

''جب آپ دونوں فریقوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کریں تو آپ کے چہرے پر شرمندگی یا پشیمانی کی کوئی تحریر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بوجھ ہم میں سے کوئی بھی نہیں اٹھا سکے گا۔''

وہ اسے دیکھے گیا۔ گوری سے اتنی حوصلہ مندی کی توقع نہیں تھی اسے۔

''ابا جی جاگنے والے ہیں' میں چلتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو۔'' وہ ہمیشہ کی طرح زرینہ کے ساتھ چل پڑا۔

راستہ خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ جب مسجد کی سمت سے سائیں بابا کی پُرسوز آواز خاموشی کا پردہ چیرتے ہوئے ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وِچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک باز توں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

''یہ سائیں بابا کی آواز ہے۔'' زرینہ بولی۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ یہ فقیر ہیں' لیکن میں نے آج تک انہیں کسی سے کچھ مانگتے نہیں دیکھا۔''

حیدر علی خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا گیا۔

''یہ کبھی کسی سے بات نہیں کرتے لیکن جب بھی کرتے ہیں وہ سچ نکلتی ہے۔ پتا نہیں انہیں آنے والے وقت کی خبر کیسے ہو جاتی ہے۔''

''وہم ہے تمہارا' آنے والے وقت کی بھی بھلا کسی کو خبر ہوتی ہے۔''

''اللہ والوں کو ہر اس بات کی خبر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ بندے تک پہنچانا چاہتا ہے۔''

چلتے چلتے جیسے ہی انہوں نے موڑ مڑا کھچڑی بالوں والے سائیں بابا لنگڑاتے ہوئے ان کے سامنے آ گئے۔ زرینہ نے گھبراہٹ کے عالم میں چادر کے ایک سرے سے منہ ڈھانپنا چاہا۔

''کس سے چھپ رہی ہے بچی۔'' سائیں بابا بولے۔ ''روشنی کو سو پردوں میں چھپا لیں

تب بھی وہ نظر آ کر رہتی ہے۔''

زرینہ دم بخود کھڑی ہوگئی۔

''راستہ چھوڑ دو۔'' حیدر علی نے زرینہ کو گھبرا کر رکتے دیکھا تو سائیں بابا کو قدرے جھڑک دیا۔

''کہہ سکتے ہیں شاہ جی آپ اس زمین کے بادشاہ جو ہیں' لو میں نے راستہ چھوڑ دیا۔'' وہ ایک طرف ہٹ گئے تھے۔

''کیا کرتے ہیں شاہ جی! یہ اللہ والے ہیں' خدا کے لیے انہیں کچھ مت کہیں۔'' زرینہ نے اور زیادہ گھبرا کر حیدر علی کا ہاتھ تھام لیا۔

''حویلی کی بہو بننا چاہتی ہے بچی؟'' سائیں بابا نے پوچھا۔

زرینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں تجھے حویلی کی بہو بنے دیکھ رہا ہوں' لیکن ایسے کہ تیرے تن پر نہ سرخ جوڑا ہے اور نہ گلے میں زیور' نہ ڈھول تاشے ہیں' نہ باجے گانے۔ بہت سی آہیں' بہت سی سسکیاں ہیں۔''

''مم...... میں حویلی کی بہو بن جاؤں گی ناں؟'' زرینہ کو اگلی باتوں کی پروا نہیں تھی۔

''ہاں بہت جلد۔''

''سنا شاہ جی آپ نے؟ سائیں بابا جو کچھ کہتے ہیں [illegible] درست ہوتا ہے۔'' خوشی اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ''اب چاہے کوئی کچھ کر لے ایسا ہی ہوگا۔''

''اچھا اب گھر چلو۔'' حیدر علی اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا' اس لیے بولا' ورنہ وہ سائیں بابا کو بہت بڑا فراڈ سمجھ رہا تھا۔

''نادان لڑکی! دکھ پر خوش ہو رہی ہے۔ رونے کے بجائے ہنستی ہے۔'' سائیں بابا بڑبڑاتے ہوئے آگے چلے گئے اور وہ آنکھیں پھاڑے انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

''فضول باتیں ہیں۔ ان پر یقین کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''ایسے بہت سے فراڈ دیکھ چکا ہوں میں۔''

''نہیں شاہ جی! ایسی بات مت کہیں' سائیں بابا کی شان میں گستاخی مت کریں۔''

''کیا ہو گیا ہے گوری' اس نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو بات بنا لی۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور ظاہر ہے' رات کے اس پہر میرے ساتھ جو لڑکی ہوگی وہ حویلی کی بہو ہی بننا چاہتی ہوگی۔ اتنی سی بات ہے باقی سب اس نے ڈراما ڈالا ہے۔''

''ایسے مت کہیں ناں۔'' وہ حیدر علی سے الجھ پڑی۔ ''وہ بہت پہنچے ہوئے ہیں اور اگر یہ باتیں آپ اس لیے کر رہے ہیں کہ میرا دھیان ان کی آخری بات سے ہٹ جائے تو مت کریں ایسا۔ آپ کا ساتھ مل جائے پھر دکھ آئیں یا سکھ میں برداشت کر لوں گی۔ آپ کو کبھی میری

آنکھوں میں آنسو نظر نہیں آئیں گے' کبھی میرے ماتھے پر بل نہیں دیکھیں گے آپ' بس آپ مل جائیں۔''

یوں تو اس نے حیدر علی سے کہا تھا کہ وہ اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالے گی' لیکن جذباتی کمزوری کے اس لمحے نے اس سے سب کچھ کہلوا دیا تھا۔

وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر مسجد تک پہنچے۔ اس کے بعد زرینہ نے کوئی بات نہیں کی تھی' لیکن حیدر علی کو اندازہ تھا کہ اس نے سائیں بابا کی ہر بات کو سچ تسلیم کر لیا تھا۔ وہ خوش تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ اسے حویلی کی بہو بننے کی خوش خبری مل گئی تھی۔

کمرے کی کھڑکی میں کھڑی رضیہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ زرینہ اندر داخل ہوئی تو اس کی جان میں جان آئی۔

''خیریت رہی ناں؟'' چھوٹتے ہی اس نے سوال کیا۔ ''کیا کہا چھوٹے شاہ صاحب نے؟''

☆======☆======☆

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر حیدر علی نے پہلا کام یہ کیا کہ نوکروں کے ذریعے سائیں بابا کو بلوا بھیجا۔ حویلی کے بڑے پھاٹک سے جیسے ہی وہ نمودار ہوئے برآمدے میں بیٹھا حیدر علی اٹھ کر ان کے قریب چلا آیا۔ نوکروں کو اس نے بھجوا دیا تھا تاکہ کھل کر بات کر سکے۔

''کون ہو تم؟''

''اس اوپر والے کی ایک ادنیٰ مخلوق ہوں۔'' انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

''زیادہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے' صحیح صحیح بتاؤ تم کون ہو؟'' اس نے سائیں بابا کو ڈپٹ دیا۔

''کیوں فقیر کو تنگ کرتے ہو۔ میں تمہاری طرح اس زمین کا بادشاہ نہیں ہوں تو پھر کیا ہوا؟ ایک ادنیٰ مخلوق۔''

حیدر علی انہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا حالانکہ ان کی باتوں نے اسے زچ کر دیا تھا۔

''تم درحقیقت اس گاؤں کے نہیں ہو' کہاں سے آئے ہو؟''

''اب تو یہیں کا ہوں' پہلے خبر نہیں کہاں رہتا تھا؟''

''کوئی کام بھی کرتے ہو یا بیکار کے ڈرامے دکھا کر لوگوں کو الو بناتے ہو۔''

''فقیر تو تلاش میں ہے' اس کی سب سے قیمتی چیز کھو گئی ہے۔'' انہوں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا کھویا ہے تمہارا؟''

''میری محبت کھو گئی ہے۔''

''محبت؟'' حیدر علی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں میری محبت کھوگئی ہے۔''

''تو محبت کی بھیک مانگ رہے ہو۔ محبت بھی کوئی کشکول میں ڈالنے کی چیز ہوتی ہے؟''

''ابھی تو تلاش ہے' کشکول پہلے دن کی طرح خالی ہے۔''

''تمہاری محبت کہاں کھوئی ہے؟''

''سب کہتے ہیں کہ یہاں کھوئی ہے' بہت سی باتوں کی خبر اوپر والا دے دیتا ہے۔ بس یہ نہیں بتاتا کہ میری محبت کہاں گئی۔ میں بھی لوگوں کو محبت کی خبر دیتا ہوں پر سنو۔'' سائیں بابا نے رازدارانہ انداز میں آواز دھیمی کرلی۔ ''کل جو لڑکی تمہارے ساتھ تھی ناں' اسے اس کی محبت نہیں مل سکتی' لیکن یہ بات اسے کہنا مت۔ ہمیں خوشیاں بانٹنی چاہئیں' غم نہیں۔''

حیدر علی کو ان کے بوڑھے وجود سے الجھن ہونے لگی تھی۔

''اپنی محبت کی تلاش میں مَیں نے کونا کونا چھان مارا۔'' سائیں بابا نے آہ بھری۔ ''بس اس چار دیواری کے اندر نہیں جھانکا' تم اجازت دو تو ایک نظر دیکھ لوں؟ شاید یہیں سے مل جائے۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اب حیدر علی میں مزید برداشت کا حوصلہ نہیں تھا۔ ''اور میں آئندہ اس گاؤں میں تمہیں ڈرامے کرتے نہ دیکھوں۔''

☆======☆======☆

یاسمین میں کوئی بھی ایسی خاص بات نہیں تھی جو رجب علی کو اس کی جانب متوجہ کر کے اپنا اسیر بنا لیتی۔ اس کی عام سی شکل وصورت' حد درجہ لجانا شرمانا اور ہر لمحے کی تابعداری سے رجب علی جلد ہی اکتا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جی جان سے خدمت کر کے شوہر کا دل جیت لے گی لیکن درحقیقت یہ اس کی خدمت اور تابعداری ہی تھی جس کی وجہ سے رجب علی اسے بیوی کے بجائے ملازمہ سمجھنے لگا تھا۔ یوں بھی رجب علی کو اس شادی سے کوئی دلچسپی تھی تو محض اتنی کہ اسے گدی کے وارث کی ضرورت تھی ورنہ یاسمین تو ایک لمحے کے لیے بھی اسے متاثر نہیں کرسکی تھی۔ اس کے پاس متاثر کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ خیر اسے اس بات کی زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ جو کچھ اسے گھر میں دستیاب نہیں تھا' وہ باہر سے مل جاتا تھا۔ قیمتاً نہ مل سکے تو طاقت سے حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے اس کے معمولات میں شادی کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

اس دن بھی وہ سخاوت علی کو پولو کے کھیل کے بنیادی اصول سمجھا رہا تھا جب چکی پر گندم کے دانے پسوانے کے لیے لے جانے والی لڑکیوں کا ایک گروہ کچھ فاصلے سے ہنستا ہوا گزرا۔ ان کی بے فکر ہنسی اور لہراتے آنچلوں کے رنگ آپس میں گڈمڈ ہوگئے۔ کتنے دن ہوگئے تھے رجب علی شاہ نے ایسی ہنسی نہیں سنی تھی۔ یاسمین بہت کڑے اصولوں کے درمیان پل کر جوان ہوئی تھی۔ اسے صرف زیر لب مسکرانے کی عادت تھی۔ وہ بھی سر جھکا کر۔ اب جو فضا میں منتشر

بکھرے تو آوازوں کے تعاقب میں اس کا سر داہنی طرف گھوم گیا۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر لڑکیوں نے شرما کر منہ چھپانے کی نیم دلانہ کوشش کی اور کن انکھیوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ رجب علی نے فوراً شکورے کو طلب کیا۔

''یہ لڑکی کون ہے جس نے سرخ اور پیلے پھولوں والی اوڑھنی لے رکھی ہے؟''

''یہ جنت بی بی ہے شاہ صاحب۔'' وہ بولا۔ ''اپنے ہی مزارعے الٰہی بخش عرف بخشو کی چھوٹی بیٹی۔ چند ہی دنوں میں اس کی شادی ہونے والی ہے۔ جیرے پہلوان کے بیٹے کے ساتھ۔''

''اچھو کہاں ہے؟'' رجب علی نے دور ہوتی ہوئی جنت بی بی کی جانب دیکھا۔

''ابھی گندم کے کھیتوں کی طرف جارہا تھا شاید آپ نے ہی کوئی حکم دیا تھا۔''

''تم اور اچھو شام کو اس لڑکی کو ڈیرے پر پہنچا دینا۔''

''جو حکم شاہ صاحب۔''

شکورا' اچھو کی تلاش میں گندم کے کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ اچھو گھنے درخت کی چھاؤں میں چارپائی ڈالے بیٹھا مزارعوں کی نگرانی کررہا تھا۔

''میرے ساتھ چلو ایک ضروری کام ہے۔'' شکورے نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔

اچھو بغیر کچھ پوچھے اس کے ساتھ چل پڑا۔ کچھ دور اکیلے میں پہنچ کر شکورا رک گیا۔

''بڑے شاہ صاحب نے ایک کام دیا ہے۔''

اچھو منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اور میرے خیال میں شاہ صاحب نے یہ کام اس لیے تمہارے سپرد کیا ہے تاکہ انہیں تمہاری وفاداری کا اندازہ ہوسکے۔''

وہ ہمیشہ کی طرح خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

''ایک لڑکی اٹھانی ہے۔''

''کیا؟'' اچھو چلایا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''اچھو تم بولنے لگے ہو؟'' شکورے کے انداز میں مسرت آمیز حیرت اتر آئی۔ ''مجھے اس بات کی کتنی خوشی ہورہی ہے۔ میں بتا نہیں سکتا۔ ہم دونوں ہمیشہ سے دوست تھے۔ میں تمہیں کبھی کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا لیکن روزی روزگار کا چکر انسان سے شرافت کی وقعت چھین لیتا ہے۔''

''ہر انسان سے نہیں چھینا کرتا شکورے۔ جس شخص کے اندر شرافت کا بیج پھوٹتا ہے وہ ہمیشہ شریف رہتا ہے۔'' اچھو بولا۔ ''خیر مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ تمہارے اندر یہ بیج یا تو تھا ہی نہیں یا پھر اگ نہیں سکا۔''

''تم یہ سب کچھ کہہ سکتے ہو۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے اس کے بعد تم یہ سب کہنے کے حقدار ہو لیکن میری جگہ آ کر سوچو تو شاید میں تمہیں اتنا برا دکھائی نہ دوں۔

میری چھ بہنیں ہیں جن میں سے صرف ایک کی شادی ہوئی ہے۔ باپ معذور ہے۔ اپنے گھر کے لیے جو کچھ کرنا ہے وہ مجھے کرنا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میری کیا مجبوریاں ہیں۔ اور پھر کیا ایک آرام دہ اور پُرسکون زندگی گزارنے کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے؟ اور ایسی زندگی گزارنے کے لیے میں ایمانداری، دیانتداری اور اصول کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔'' شکورے نے پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدتے ہوئے کہا۔ ''بہت سے لوگ بڑے شاہ صاحب کے احکامات بجالانے کے لیے صرف اس وجہ سے ہر وقت تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ پیر صاحب کی اولاد اور گدی کے وارث ہیں لیکن میں اس لیے ان کے احکامات بجالاتا ہوں کیونکہ ان کی تعمیل میری آسودہ زندگی کی ضمانت ہے۔''

''لعنت ہو ایسی آسودہ حالی پر جو لوگوں کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر کے حاصل ہو۔'' اچھو نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

''نہ اچھو نہ۔ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کرنا۔'' شکورا بولا۔ ''میرے اندر شرافت کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، کسی وقت میں تمہاری یہ باتیں بڑے شاہ صاحب کو بتا کر اپنے لیے کچھ اور آسودہ حالی خرید لوں۔''

اچھو نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔

''بہت خوب۔ ضرور کروانا۔ صرف یہ بتا دو کہ اب سے پہلے کتنی مرتبہ رجب علی کی یہ خدمت کر چکے ہو۔''

''بہت مرتبہ۔ مگر اس گاؤں میں یہ دوسری مرتبہ ہوگی۔''

''یہ بتاؤ کہ جو لڑکی اٹھانے لگے ہو وہ تمہارے گھر سے کتنی دور رہتی ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' شکورا چلایا۔ ''میرے گھر کی بات زبان پر لائے تو زبان کو گدی سے باہر کھینچ لوں گا۔''

''چلاتے کیوں ہو دوست۔ میرا تمہارے گھر کا رخ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ رجب علی شاہ کو وہاں تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔''

''میں کہتا ہوں بکواس بند کرو ورنہ۔'' شکورے نے اچھو کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی اچھو نے اس کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ لی۔

''ابھی دنیا میں کوئی ایسا ہاتھ نہیں ہے جو اچھو کے گریبان تک پہنچ سکے۔'' اس نے ایک جھٹکے سے شکورے کی کلائی چھوڑ دی۔

شکورے نے جھک کر درخت کے تنے سے پشت ٹکالی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''مجھے تم پر ترس آرہا ہے۔'' اچھو نے رحم بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''تم سا بدقسمت بھی کون ہوگا۔''

شکورا تنے سے ٹیک لگائے لگائے ہی نیچے بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں کہ میری مثال اس کتے کی سی ہے جو مالک کے حکم پر صرف اس لیے دوڑا بھاگا پھرتا ہے کہ انعام میں اسے راتب ملے گا لیکن یہ بات میں خود سے بھی نہیں کہنا چاہتا۔'' وہ بہت مدھم آواز میں بولا۔

''تم خود سے یہ بات کہو یا نہ کہو لیکن تم یہ بات جانتے ہو۔'' اچھو بولا۔

''میں اس دلدل سے صرف اس لیے نہیں نکلنا چاہتا کہ میری بہنیں محفوظ ہیں۔ پہلے وہ آزاد فضاؤں میں تتلیوں کی طرح اُڑتی پھرتی تھیں لیکن رجب علی شاہ کی نیت کا بھید جاننے کے بعد میں نے انہیں گھر میں قید کر دیا ہے نہ وہ کہیں آتی ہیں اور نہ کہیں جاتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ خوب سارا پیسہ جمع کر کے انہیں یہاں سے کہیں دور لے جاؤں جہاں ایک مرتبہ پھر وہ تتلیوں کی طرح اُڑنے لگیں۔ اگر میں رجب علی شاہ کے ساتھ نہ ہوتا تو بے خبری میں یہ قیامت کسی دن میرے گھر بھی ٹوٹ سکتی تھی۔''

''تم نے سمجھ لیا کہ اب وہ محفوظ ہو گئی ہیں؟ نہیں شکورے آزادی امتحان ہے تو قید آزمائش۔ اپنی بہنوں کو اس طرح قید مت کرو کہ وہ جال لے کر ہی اُڑ جائیں۔''

شکورا چند لمحے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''نہیں وہ اپنے گھر کی محبت کی ڈور میں ایسی بندھی ہوئی ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرسکتیں۔''

''ہر بھائی کو اپنی بہن پر ایسا ہی مان ہوتا ہے۔ کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ قید کی اذیت کے رنگ کیسے ہوتے ہیں۔''

''مجھے خود خبر نہیں ہوتی کہ میں کب انسان سے شیطان بن جاتا ہوں۔ برائی کب اچھائی پر اس طرح غالب آجاتی ہے کہ انسانیت کی کوئی رمق میرے اندر باقی نہیں رہتی۔''

''تم میں انسانیت باقی ہے تب ہی تو تم یہ سب باتیں سوچ رہے ہو۔''

''نہیں اچھو۔'' اس کی آنکھوں سے بوجھل بوجھل سا خالی پن غائب ہوگیا اور اس کی جگہ بیگانگی اور لاتعلقی نے لے لی۔ ''میں نے زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے مجھے اپنے لیے نہیں اپنی بہنوں کے لیے زندہ رہنا ہے اور رجب علی شاہ غلطیوں کی معافی دے سکتا ہے، حکم عدولی کی ہرگز نہیں۔''

''اپنی بزدلی کو مجبوری کے کپڑوں سے مت ڈھانپو۔'' اچھو نے اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کی۔

''تم یہ بات نہیں سمجھو گے کیونکہ تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ نہ بہن، نہ بیوی، نہ

محبوبہ، جذباتی رشتوں کی ڈور میں بندھ کر انسان بہت کمزور ہو جاتا ہے۔''

اچھو ایک لمحے کے لیے زیب النساء کے تصور میں گم ہو گیا۔ وہ روشن چہرہ اور چند الفاظ جو اس کی زندگی کا سرمایہ تھے۔ شکورا مسلسل کچھ کہہ رہا تھا لیکن اچھو کا ذہن جنگل میں گزرے ان لمحات میں اٹکا ہوا تھا۔ جب پہلی مرتبہ محبت کی کلی اس کے دل میں چٹکی تھی۔

''اور مجھے بہر حال زندہ رہنا ہے۔'' اچھو اپنے خیالات سے باہر نکلا تو شکورے کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔ ''تمہیں زندہ رہنے کا شوق ہو تو شام کو آ جانا ورنہ بڑی سڑک پر سہ پہر تین بجے لاری رکتی ہے۔ اس میں بیٹھ کر گاؤں سے بہت دور چلے جانا۔''

''ہوں۔'' اچھو نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''لڑکی کون سی اٹھانی ہے؟''

''اس کا علم تمہیں شام کے وقت ہو جائے گا۔''

''ابھی کیوں نہیں؟''

''میں تم پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتا۔ تم تو اپنی جان سے جاؤ گے، میں خواہ مخواہ ہی مارا جاؤں گا۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ زندہ رہنے کا مجھے بھی شوق ہے اور بھاگ کر میں کہاں جاؤں گا۔ میرے ماں باپ یہاں ہیں۔ انہیں چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں۔'' اچھو نے اس سے لڑکی کا نام اگلوانے کے لیے بات بنائی۔

''بہر حال یہ تفصیلات تمہیں شام کو ہی ملیں گی۔'' شکورا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ پہلی لڑکی کون تھی؟'' اچھو نے جلدی سے پوچھا۔

''پہلی لڑکی نسیم تھی۔'' وہ بولا۔ ''اور یہ میں تمہیں محض اس لیے بتا رہا ہوں تا کہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ تم پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔''

اپنی بات مکمل کر کے وہ مڑا اور بغیر کوئی بات کیے ایک سمت چل پڑا۔

''بہت برا ہوا۔'' اچھو نے دل میں سوچا۔ ''میں نے ایسی بات شروع کر دی کہ وہ لڑکی کا نام بتانے سے ہی مکر گیا۔ اگر میں تدبیر سے کام لیتا تو اس لڑکی کی مدد کر سکتا تھا پر اب کیا کروں۔'' وہ سوچ گیا پھر اٹھ کر مسجد کی سمت چل پڑا۔

اچھو کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھ کر مولوی صاحب کو خیال آیا کہ شاید تعویذوں کے اثر کی وجہ سے وہ راہِ راست آ گیا ہے اس لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوئے۔

''مجھے یقین تھا کہ تم میرے پاس ضرور آؤ گے۔'' انہوں نے شفقت سے کہا۔

''مولوی صاحب حقیقت تو یہ ہے کہ میں آپ کے پاس اس لیے نہیں آیا کہ مجھے پچھلی باتوں پر کوئی شرمندگی ہے یا میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔'' وہ بولا۔ ''میں صرف

آپ کے پاس آیا ہوں کہ گاؤں کی ہر بیٹی کی عزت کی حفاظت ہم پر فرض ہے اور کم از کم کسی بیٹی کی عزت پر حرف آنے والا ہے۔ اس سلسلے میں صرف آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔''

مولوی صاحب پہلے تو اس کی بات سن کر سٹپٹائے پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''پتا نہیں آپ میری بات پر کس حد تک یقین کریں گے لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ حرف بحرف سچ ہے۔''

''اب کچھ بتاؤ بھی کہ بات کیا ہے۔''

''مجھے بہت باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ آج شام گاؤں کی کوئی لڑکی اغوا ہونے والی ہے۔''

''کیا؟ اغوا ہونے والی ہے؟ تم اپنے حواسوں میں تو ہو؟''

''میں بالکل اپنے حواسوں میں ہوں اور اپنی معلومات کی حد تک بالکل درست اطلاع پہنچا رہا ہوں۔''

''کون ہے وہ لڑکی اور کون اغوا کرنا چاہتا ہے؟'' انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

''افسوس کہ مجھے لڑکی کا نام معلوم نہیں ہو سکا لیکن اغوا کرنے والے کا نام میں جانتا ہوں۔''

''تب کیا فائدہ۔'' مولوی صاحب کی آواز میں مایوسی اتر آئی۔ ''اس طرح تو شاید ہم بروقت اس لڑکی کی مدد نہ کر سکیں۔''

''لیکن ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ اغوا کرانے والا اور کرنے والا کون ہے۔ ان کی نگرانی کر کے یہ جرم کرنے والوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکتا ہے۔'' اچھو نے جلدی سے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' مولوی صاحب نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا۔ ''اغوا کرنے والا کون ہے؟''

''اس کام کے لیے مجھے اور شکورے کو کہا گیا ہے۔''

''کیا؟ تم لڑکی کو اغوا کرو گے؟''

''مولوی صاحب میری بات تو سن لیں۔'' اچھو نے ان کی بات کاٹی۔ ''یہ اغوا ہم اپنے لیے نہیں کر رہے بلکہ کسی اور نے اس کام کے لیے ہم سے کہا ہے۔''

''کون ہے وہ بدبخت؟'' مولوی صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''پتا نہیں آپ میری بات کا یقین کریں گے یا نہیں لیکن مولوی صاحب یہ حکم ہمیں رجب شاہ نے دیا ہے۔ اس سے پہلے اس نے نسیم کو بھی اغوا کرایا تھا۔''

''کیا؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟ بڑے شاہ صاحب پر ایسا گھٹیا الزام لگاتے ہوئے تمہیں

شرم بھی نہیں آئی۔ وہ بھی اس مسجد کے اندر بیٹھ کر۔ انسان کو اپنی کمینگی میں اس حد تک نہیں جانا چاہیے کہ وہ کسی کے اجلے دامن پر بغیر سوچے سمجھے کیچڑ ملنے لگے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے گھر میں نہ ہوتے تو میں دھکے دلوا کر باہر نکال دیتا۔''

''میری بات تو سنیں مولوی صاحب۔''

''مجھے کچھ نہیں سننا۔ تمہارے وجود سے گھن آنے لگی ہے مجھے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اچھو اپنا غصہ دباتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں جا رہا ہوں لیکن یہ یاد رکھئے کہ اگر یہ واقعہ پیش آ گیا تو اس کا ذمہ دار صرف رجب علی شاہ ہی نہیں آپ بھی ہوں گے۔''

اچھو لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ شام کا انتظار کرے اور اس وقت براہِ راست مقابلہ کر کے لڑکی کو بچانے کی کوشش کرتا۔

☆======☆======☆

اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹ کر چھت کی طرف تکتے ہوئے زیب النساء کی آنکھوں میں بیتے لمحے اتر آئے۔ ہلکی سی چٹکی ہوئی چاندنی میں درختوں کے سیاہ سائے اور ایک بے حد مضبوط ہاتھ کا لمس۔ اس کا ہاتھ خود بخود اپنے بازو پر جا ٹھہرا۔ ہولے ہولے اپنے بازو کو سہلاتے ہوئے وہ اچھو کے متعلق ہی سوچے گئی۔

''کیا ہمارے مقدر میں ملن کے وہ چند ہی لمحات تھے جو ایک دم ہتھیلی سے پھسل گئے۔'' اس نے سوچا۔ ''کیا اب ہم کبھی بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکیں گے؟''

کتنی دیر تک وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی چھت کی کڑیاں گنتی رہی پھر اچانک ایک خیال سے چونک اٹھی۔

علی نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا۔ اگر ہم پکنک کے لیے چلے جائیں تو ممکن ہے' ملنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

اس خیال نے ہی اس کے اندر توانائی بھر دی۔ تیزی سے وہ مہر النساء کے کمرے کی طرف بڑھی۔

مہر النساء' حمیدہ کو اپنی قمیص پر شیشوں کے کام والا گلا کاڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی جب زیب النساء اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''آپا' مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔''

مہر النساء نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر جوش و خروش کی علامات بہت واضح تھیں۔

''آؤ بیٹھو۔'' مہر النساء نے کہا۔

''حمیدہ تم باہر جاؤ۔'' وہ وہیں پیڑھے پر بیٹھ گئی۔

''حمیدہ کو باہر بھجوانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر بات سے باخبر ہے۔''

''یعنی آپ نے اسے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''یقین کرو' حمیدہ کوئی بات باہر نہیں نکالے گی۔'' مہر النساء نے اسے یقین دلایا۔ ''اسے راز کو راز رکھنا آتا ہے۔''

''بی بی میں تو آپ کے پاؤں کی خاک ہوں۔'' حمیدہ سوئی دھاگا چھوڑ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ''آپ یوں سمجھیں کہ بڑی بی بی نے آپ کی بات کنوئیں میں ڈال دی ہے۔ انہوں نے اس لیے مجھے بتایا ہے کہ شاید میں آپ کے کام ہی آ جاؤں۔''

زیب النساء نے اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھا لیکن اس کے چہرے پر سچائی ہی سچائی پھیلی ہوئی تھی۔

''تم میری کیا مدد کرو گی۔'' زیب النساء نے کریدا۔

''میری تو چھوٹی سی عقل ہے بی بی۔ مجھے خود سے کچھ نہیں سوجھتا۔ ہاں جیسے آپ کہیں گی ایسے ہی کر گزروں گی۔''

''میں سوچ رہی تھی آپا'' اس نے حمیدہ کو نظر انداز کر دیا۔ ''کہ علی نے پکنک پر چلنے کو کہا تھا۔ میں گھر سے باہر نکلوں گی تو شاید کوئی صورت نکل ہی آئے۔''

''چند ہی دنوں میں تم اچھی خاصی احمق ہو گئی ہو۔'' مہر النساء جھلائی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ ادھر تم پکنک پر چلنے کے لیے کہو گی اور اُدھر علی تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں لے جائے گا۔''

''علی اپنی بات ضرور منوا لے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ وقت لگ جائے لیکن اتنا زیادہ بہرحال نہیں لگے گا کہ سب کچھ ہی ختم ہو جائے۔'' وہ اپنی بات پر ہی مُصر تھی۔

''خدایا۔ خدایا۔'' مہر النساء نے جھلا کر کہا۔ ''جانتی ہو علی خود بابا جان کے عتاب کا شکار ہو رہا ہے۔ اس وقت تو وہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا تو تمہارے لیے کیا کرے گا۔ جانتی ہو' بابا جان اس سے کس قدر ناراض ہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس گھر کے مکینوں کا کیا بنے گا'' زیب النساء نے ہونٹ کاٹے۔

''اس گھر؟ یہ گھر لگتا ہے تمہیں؟ یہ گھر نہیں حویلی ہے۔ پیر صاحب جلال الدین شاہ کی حویلی جس کے دروازوں پر لگے تالے آہ و فغاں کی چابی سے نہیں کھلتے۔'' مہر النساء کے لہجے میں تلخی در آئی۔

''مجھے نہیں پتا کہ پاگل ہونے یا خودکشی کرنے میں مجھے کتنا عرصہ لگے گا۔'' زیب النساء کی آواز میں غصہ تھا جسے چھپانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

''کیا پھوپھو کے ساتھ بھی یہی بیتا ہو گا؟'' مہر النساء نے یوں ہولے سے کہا جیسے اسے

دیواروں کے سن لینے کا خدشہ ہو۔

زیب النساء نے آنکھیں موند کر پیڑھے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

حمیدہ کو ایک دم ان دونوں پر ڈھیر سارا ترس آ گیا۔

''بی بی کسی خدمت کا مجھے بھی موقع دیں۔'' اس نے دبے دبے انداز میں کہا۔

''تم کچھ نہیں کر سکتیں حمیدہ۔'' زیب النساء نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''کرنے کو تو میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ بس آپ کے حکم کی دیر ہے۔''

''مثلاً؟'' اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

''مثلاً؟'' حمیدہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب گئی۔ ''میں اچھو بھائی تک آپ کا پیغام پہنچا سکتی ہوں اور......'' وہ جھجک کر رک گئی۔

''اور کیا؟'' زیب النساء نے اپنی بے تابی چھپانے کی کوشش کی۔

''اور۔'' حمیدہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور جھجکتے ہوئے بہت آہستگی سے بولی۔ ''اور رات کو حویلی کا دروازہ بھی کھول سکتی ہوں۔''

زیب النساء کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ایک ٹک حمیدہ کو دیکھے گئی۔

''بی بی اگر میں نے کچھ غلط کہا ہے تو مجھے معاف کر دیں۔'' اس کی خاموشی سے گھبرا کر حمیدہ نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''میری چھوٹی سی عقل ہے۔ مجھے بات کرنی ہی نہیں آتی۔ لیکن بی بی میری نیت بالکل صاف ہے۔''

''ہوں۔'' زیب النساء سوچ میں ڈوب گئی۔

''نہیں حمیدہ! اتنا آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' مہر النساء نے اس کی تجویز رد کر دی۔ ''یہ زندگی ہے' کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس کے حویلی میں داخل ہونے یا زیب النساء کے حویلی سے باہر نکلنے کا مطلب جانتی ہو؟ بڑے بھائی جان یا بابا جان کو خبر ہوئی تو سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی بی بی! میں تو حکم کی غلام ہوں۔ اس بات کی گناہ گار ضرور ہوں کہ مجھ سے بی بی کے اتنے پیارے چہرے کے اوپر چھائی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔ آپ لوگوں سے پیار ہے میرے دل کے اندر کہ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے لیکن آپ لوگوں کو کچھ ہو جائے یہ حمیدہ کو گوارا نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے حمیدہ تم میرا پیغام اس تک پہنچا دینا۔'' زیب النساء کی آنکھوں میں اب سوچ کے دائرے موجود تھے۔

''تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟'' مہر النساء نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ ''اگر وہ ہمارے برابر کی

ذات برادری کا ہوتا تب بھی تمہیں معافی ملنا مشکل تھی اور ایک ایسے شخص کے ساتھ تمہارے تعلقات کا انکشاف ہونے کے بعد کیا ہوگا' تم اس سے ناواقف تو نہیں ہو۔''

''ہاں میں جانتی ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ ذات برادری کے ایک ہونے یا نہ ہونے سے فرق تو اس جگہ پڑتا ہے جہاں شادی ہو جانے کی کوئی صورت ہو۔ یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں' اس لیے ہر صورت میں انجام ایک سا ہی ہوگا اور اس انجام کے لیے میں خود کو تیار کر چکی ہوں۔

مرنا تو ہے ہی' پھر اس منحوس چار دیواری میں اپنی حسرتوں کی چادر اوڑھ کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بہتر نہیں ہے کہ ان بے معنی اور لغو روایتوں کے خلاف علم بلند کر کے مرا جائے۔ یہاں سے باہر نکل کر خوشیاں پا لینے کی کم از کم ایک موہوم سی امید تو ہے لیکن کرب و اذیت کے غبار میں لپٹی ان اینٹوں کے حصار میں تو خوشیاں حاصل کرنے کی کوئی امید ہی نہیں ہے۔ پھر کیوں نہ میں ایک ایسی جگہ کی طرف جاؤں جہاں حاصل چاہے کچھ نہ ہو' حصول کی امید تو ہے۔''

''خیالی پلاؤ پکانا اور لفظوں کی کھیر میں چمچ مارتے رہنا بہت آسان ہوتا ہے زیبی۔'' مہر النساء بولی۔ ''دعوے تو بہت لوگ کر سکتے ہیں لیکن آگے بڑھ کر ان پر عمل کرنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔''

''تم مجھے ہر کسی کی فہرست میں شامل کر رہی ہو؟''

''تمہیں نہ کروں تو بھی وہ شخص تو اس فہرست میں شامل ہو سکتا ہے ناں۔''

''آپا ایک بات بتائیں۔ آپ مردوں کو اتنا ناقابلِ اعتبار کیوں سمجھتی ہیں۔'' زیب النساء کے انداز میں کاٹ تھی۔ واضح طور پر اسے اچھو کے متعلق مہر النساء کے خیالات سن کر دکھ ہوا تھا۔

''تم ناقابلِ اعتبار ہونے کی بات کرتی ہو۔ مجھے مردوں سے نفرت ہے۔'' مہر النساء کے چہرے پر بھی نفرت کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔

''اس لیے کہ آج تک کسی مرد نے آپ کو پسند نہیں کیا؟'' وہ شاید مہر النساء کے وجود کو اندر تک کاٹ دینے پر تلی ہوئی تھی۔

''شاید۔'' اس نے بہت صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ ''لیکن وجہ صرف یہ بھی نہیں ہے۔''

''اور کیا وجوہات ہیں؟''

''اور۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''مرد میں دوغلا پن ہوتا ہے۔ اس کے ایک نہیں دو روپ ہوتے ہیں۔ چاندی کے سکے کی طرح دنیا اور معاشرے کے تھپیڑے اسے اچھالتے ہیں تو پتا نہیں چلتا کہ ہتھیلی پر کون سا سرا اوپر آئے گا اور مجھے دوغلے پن سے نفرت ہے۔ اس کے روپ بدلتے ہیں۔ دنیا کے سامنے اور گھر کی چار دیواری کے اندر اور اپنے لیے اور دوسروں کے

لیے اور۔

وہ باقی ساری مخلوق کو غلام بنا کر اپنے قدموں تلے رکھنا چاہتا ہے۔ چاہے غصہ کر کے اور آنکھیں نکال کر غلام بنا لے چاہے محبت سے رام کرے لیکن بناتا وہ غلام ہی ہے دوست نہیں۔"

"اب ایسا بھی نہیں۔ ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔" زیب النساء نے اس کی بات کاٹنے کی کوشش کی۔

"ہر مرد کی خصلت ایک ہی ہوتی ہے۔ نشانہ ایک ہی ہوتا ہے۔ منزل ایک ہی ہوتی ہے۔ صرف وہاں تک پہنچنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔" مہر النساء نے اسے زیادہ بات نہیں کرنے دی اور فوراً ہی بولی۔ "کیا ہماری اماں جان کو اتنا حق بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی اولاد کا نام اپنی پسند سے رکھ سکتیں؟ وہ میرا نام نرگس رکھنا چاہتی تھیں لیکن بابا جان بھڑک اٹھے تھے۔ کہنے لگے یہ کیسا نام ہے۔ یہ تو ایک فلمی اداکارہ کا نام ہے۔ ہماری بیٹی کا ایسا نام ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اماں بے چاری چپکی رہ گئیں۔

اور پھر یاسمین کو دیکھ لو کتنا آگے پیچھے پھرتی ہے بڑے بھائی جان کے۔ ان کی آنکھ کے اشارے کی منتظر رہتی ہے۔ ان کے ماتھے کی شکنیں دیکھ کر اس کا رنگ اتر جاتا ہے۔ ہونہہ ایسے ملاپ کی تمنا میں انسان پاگل ہو جائے۔ اس کے لیے برسوں انتظار کرے؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ ہماری یہ بے رونق اور بے رنگ زندگی زیادہ بہتر ہے۔ کیا ضرورت ہے دنیا میں مزید آقا اور غلام زادیاں پھیلانے کی۔"

"مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے آپا کہ آپ مایوسی کی آخری حدوں کو چھونے لگی ہیں لیکن میں اس حد تک نا امید نہیں ہوئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ایک ایسے سہارے کے لیے تڑپ رہی ہوں جو مجھے نہ تو بابا جان دے سکتے ہیں اور نہ تین جوان بھائی۔ میں اس اولاد کے لیے تڑپ رہی ہوں جسے میری کوکھ سے جنم لینا ہے اور آپا میں مایوس نہیں ہوں۔"

"زیبی تم حماقت پر اتر آئی ہو۔"

"لیکن مجھے اس پر افسوس نہیں ہے۔"

حمیدہ ٹکر ٹکر دونوں کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"حمیدہ۔" زیب النساء نے اسے مخاطب کیا۔ "تم میرا زبانی پیغام ان تک پہنچا دو گی۔"

"آپ حکم دیں بی بی۔"

"تم ان سے کہنا کہ۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ "میں نے ان کے دل کی دھڑکن سنی تھی۔ کیا انہوں نے میرے دل کی دھڑکن نہیں سنی؟ اگر سن لی ہے تو انہوں نے دیواریں کیوں نہیں دیں۔ کوئی روزن کوئی دریچہ کیوں نہیں تلاش کر لیا؟"

☆======☆======☆

اچھو صحن میں چارپائی ڈالے آسمان کو تک رہا تھا جب حمیدہ گھر میں داخل ہوئی۔

"سلام چاچی۔" اس نے بآواز بلند چاول چنتی اچھو کی اماں کو سلام کیا۔

"جیتی رہ۔" اس نے اپنی جانب بڑھتی ہوئی حمیدہ کی طرف دیکھا۔ "آج حویلی نہیں گئی کیا؟"

"نہیں۔" اس کا انداز سرسری سا تھا۔ "گئی تو تھی پر چھوٹی بی بی نے کام سے بھجوایا ہے۔"

اچھو کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کی نظریں اب تک نیلے آسمان پر جمی ہوئی تھیں لیکن کان حمیدہ اور اماں کی باتوں پر لگ گئے تھے۔

"اچھا۔" اماں بولیں۔ "کیا کام دیا چھوٹی بی بی نے؟"

"ایک پیغام بھجوایا ہے۔" اس نے کن اکھیوں سے اچھو کی طرف دیکھا۔

"پیغام؟ کس کے لیے؟"

"ہے ایک لڑکی۔ وہی اپنی شمشاد وہ کچھ کپڑے اپنے گھر لے گئی تھی کڑھائی کے لیے۔ بی بی بار بار تاکید کرواتی ہیں کہ کسی کے سامنے کپڑے لے کر نہ بیٹھ جائے۔ ذرا احتیاط کرے۔ کسی اور کی نظر نہ پڑے کپڑوں پر۔"

"تو گھر کیوں لے گئی کپڑے۔ اسے پتا نہیں ہے کہ بی بیوں کے کپڑوں پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنی چاہیے۔"

"تمہیں تو پتا ہی ہے چاچی کہ شمشاد کتنی محتاط ہے اور پھر کسی کی اتنی جرأت کہاں کہ اس کمرے میں داخل ہو جہاں ان کے کپڑوں کی سلائی کڑھائی ہو رہی ہو۔"

"اچھا جانے دے' یہ بتا یہاں کیسے آنا ہوا؟"

"بس چاچی' چلتے چلتے تھک گئی تھی' سوچا ذرا دم لینے کو رک جاؤں۔" اس نے پھر کن اکھیوں سے اچھو کی طرف دیکھا۔ اتفاق سے اسی لمحے اچھو بھی کن اکھیوں سے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے میں وہ سمجھ گیا کہ حمیدہ دراصل اس کے لیے پیغام لائی ہے۔

"کسی ترکیب سے اماں کو یہاں سے اٹھانا چاہیے۔" اچھو نے سوچا۔ "اگر میں درست سوچ رہا ہوں تو ماں کے جاتے ہی حمیدہ اصل بات بتا دے گی۔"

"لائیں چاچی! میں چاول چن دوں۔"

"اللہ عمر دراز کرے۔" انہوں نے چاولوں کا چھابہ اسے تھما دیا۔ "یہ صاف کر دے میری بچی۔ میں بس ابھی پانچ منٹ میں فقیر دین کی طرف سے ہو کر آئی۔ اس کی بیٹی کے گھر بیٹا ہوا ہے۔ کیا کروں میرا تو بس کہیں نکلنا بھی مشکل ہے۔ اس گھر میں مجھ اکیلی جان کے اوپر اتنے کام ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ کوئی بہو آ کر گھر سنبھال لے۔ سارا کام اکیلے کرنا پڑتا ہے۔ کہیں جانا اور آنا بھی نہیں ہو سکتا۔"

اگلے دس منٹ تک اماں بہو نہ ہونے کے نقصانات گنواتی رہیں اور حمیدہ سر جھکا کر ہولے ہولے چاول چنتی رہی اچھو کے دل کی کلی بھی کھل اٹھی تھی۔ ابھی اس نے دعا مانگی بھی نہیں تھی کہ پوری ہوگئی۔ پھر بھی اماں کے شک وشبہے سے بچنے کے لیے اس نے ان کے پیچھے زور سے آواز لگائی۔

"اماں جلدی آنا۔"

"تم باپ بیٹے کا بس چلے تو میرے پاؤں میں زنجیر باندھ کر ہانڈی چولہے اور جھاڑو پوچے کے لیے رکھ لو مجھے۔ میرے چچازاد بھائی کے سالے کی بیٹی کے گھر بیٹا ہوا ہے وہ بھی آٹھ بیٹیوں کے بعد۔ پورے دس دن ہو گئے ہیں کاکے کو پیدا ہوئے۔ تم لوگوں کی وجہ سے میں جا کر مبارکباد بھی نہیں دے سکی۔

ابھی نکلی بھی نہیں کہ پیچھے سے آوازیں پڑنے لگیں۔ تم لوگ تو برادری میں میری ناک کٹوانے پر تل گئے ہو۔ سب کہتے ہوں گے کہ نور بھری دینے دلانے سے ڈرتی ہے۔ میں کس کے آگے رونا رووؤں کہ نور بھری کا دل بہت بڑا ہے لیکن یہ جو دو جونکیں میری جان کو چمٹی ہیں ان سے نجات ملے گی تو کہیں آجا سکوں گی۔

بہو ہوتی تو سو کام سنبھال لیتی لیکن اپنی قسمت میں بہو کا سکھ نہیں لکھا ہوا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ملک الموت آئے گا تو اس سے بھی اجازت لینی پڑے گی کہ ان دونوں لاڈلوں کے لیے ہفتہ دس دن کی روٹی پکا کر رکھ جاؤں پھر جان لے لینا میری۔"

ماں جانے کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اپنے دل کا غبار بھی نکال رہی تھی۔

اچھو اور حمیدہ نے اسے دوبارہ چھیڑنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس کا انجام خاصہ پریشان کن بھی ہوسکتا ہے۔

ماں کے جانے کے بعد اچھو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور ہتھیلیوں پر سنسنی محسوس ہونے لگی۔ حمیدہ چپ چاپ اپنے کام میں مگن تھی۔ جب اچھو کے لیے خاموشی ناقابلِ برداشت ہونے لگی تو حمیدہ نے سر اٹھا کر پہلے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر قدرے مطمئن ہوکر اسے پکارا۔

"کیا ہے؟" وہ بظاہر بے نیاز بنا پڑا رہا۔

"بڑے شاہ صاحب کی مہندی پر چھوٹی بی بی کو آپ لے کر گئے تھے۔"

"گویا میرا خیال درست تھا۔" اس نے سوچا پھر باآواز بلند کہا۔ "ہاں تو؟"

"وہ۔" وہ جھجک گئی۔ "بہت اچھی ہیں چھوٹی بی بی۔"

"پھر؟" اس کی ظاہری بے نیازی ویسے ہی قائم تھی۔

"ایک کے علاوہ کبھی کسی غیر محرم مرد نے ان کی شکل نہیں دیکھی۔" وہ ویسے ہی آہستگی سے بولی۔

"تُو کہنا کیا چاہتی ہے؟" اچھو نے مدافعانہ انداز اختیار کیا۔

"پتا نہیں وہ ٹھیک سمجھ رہی ہیں یا غلط۔" وہ تذبذب میں تھی۔ "آپ جو اتنا غصے میں بول رہے ہیں اس سے شک پڑتا ہے کہ ان کا خیال غلط ہی ہوگا۔"

"ارے میں غصے میں کب ہوں۔" اس نے جلدی سے دانت نکالے۔ "میں تو بہت خوش ہوں۔ یہ دیکھو ہی ہی ہی۔" اس نے ہنس کر دکھانے کی بھونڈی سی کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حمیدہ گھبرا کر پیغام دیے بغیر چلی جائے اور حمیدہ اس انتظار میں تھی کہ پہلے اچھو کوئی ایسی بات کرے جس سے اسے یہ تسلی ہو جائے کہ وہ بھی زیب النساء کو پسند کرتا ہے۔ مہر النساء نے اس بات کو خاص طور پر تاکید کی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ اچھو بھی زیب النساء کے لیے اسی انداز میں سوچ رہا ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ زیب النساء کو وہم ہوا تھا اور ایسا پیغام اس کی شرمندگی اور شاید موت کا باعث بھی بن سکتا تھا۔

"اچھا چاچی کتنی دیر میں واپس آجائیں گی۔"

اس کی بات سن کر اچھو کو شدت سے احساس ہوا کہ وقت پر لگا کر اُڑ رہا ہے۔ ماں کسی بھی لمحے پہنچنے والی ہوں گی۔

"مجھے بھلا کس بات کا خوف۔" اس نے خود سے کہا۔ "میں براہِ راست پوچھ لیتا ہوں۔"

وہ اٹھ بیٹھا۔

"تمہاری چھوٹی بی بی نے کیا صرف شمشاد کے لیے ہی پیغام بھجوایا ہے یا میرے لیے بھی کچھ کہا ہے۔"

حمیدہ کے ہاتھ رک گئے۔

"شی آہستہ۔" اس کا ہاتھ بے اختیار ہونٹوں پر جم گیا۔

اچھو کو یقین ہوگیا کہ اس کے نام بھی یقیناً کوئی پیغام دیا گیا ہے۔

"جلدی بولو۔ ماں آنے والی ہیں۔"

حمیدہ نے جلدی جلدی تمام بات اسے بتادی۔

"ہوں۔" وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

"چھوٹی بی بی سے کہنا۔" بالآخر اس نے کہا۔ "کہ جذبے اپنا آپ منوا ہی لیتے ہیں اور سچے جذبے تو پہاڑ کو ریزہ ریزہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ حویلی کیا چیز ہے۔ میں جو خاموش تھا تو صرف اس لیے کہ میرے آگے بڑھنے سے ان کی عزت پر حرف آسکتا ہے اور یہ مجھے گوارا نہیں۔"

☆======☆======☆

"اس سے کہنا کہ عزت دور رکھ کر پوجنے میں نہیں ہوتی اپنا بنا لینے یا کسی کا ہو جانے میں

اصل عزت ہوتی ہے یوں بھی یہ لفظ ''عزت'' تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ وجود کو اندر ہی اندر کاٹتا چلا جاتا ہے۔

حالانکہ عزت کو بھی محبت کی طرح خودرو پھول ہونا چاہیے تھا لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ اسے ہمارے اندر سے پھوٹنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ پہلے ہی ایک خول بنا کر ہمیں اس کے اندر بند کر دیا گیا ہے اور جو چیز وجود کے اندر سے توانائی حاصل نہ کرے اُسے مصنوعی طریقے سے قائم رکھتے ہاتھ تھک جاتے ہیں اور جی چاہنے لگتا ہے کہ اسے تہس نہس کر دیا جائے۔

اس سے کہنا کہ میں یہ بیرونی سانچہ توڑ کر عزت اور محبت دونوں کو اپنے وجود کے اندر اُگانا چاہتی ہوں۔''

☆======☆======☆

شام ہو چلی تھی لیکن اچھو کا ذہن صبح کے واقعے سے ہٹ کر زیب النساء کی طرف چلا آیا تھا۔ ایک عجیب سرشاری کی کیفیت طاری تھی اس پر۔ صبح سے حمیدہ دو پیغام لا چکی تھی۔ اس نے یہ پیغام بھی بہت واضح طور پر دیا تھا کہ وہ ان کی ملاقات کا بندوبست کروا سکتی ہے۔

''کیا آج رات ممکن ہے؟'' اس نے امید سے پوچھا تھا۔

''میں پوری کوشش کروں گی۔ اب یہ نہیں کہہ سکتی کہ بی بی بھی آج رات ملاقات کے لیے راضی ہوں گی یا نہیں؟''

''تم کوشش کرو' بی بی راضی ہو جائیں گی۔''

اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

''کاش اس وقت راجہ ہوتا' میں سب سے پہلے یہ خوش خبری اسے سناتا۔'' اس نے کہا۔

''ایک وہی تو ہے جو میری خوشیوں میں خوش ہوتا ہے۔ خیر اب بھی وہ زیادہ دور تو نہیں ہے۔''

وہ حویلی کی سمت چل پڑا۔

☆======☆======☆

''بی بی مجھے تو یہ آپ کی محبت کا معجزہ لگتا ہے کہ اچھو بھائی کو زبان واپس مل گئی ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ ان سے اشاروں کی زبان میں بات کرنی پڑے گی۔'' حمیدہ' زیب النساء کی ٹانگیں دباتے ہوئے تبصرہ کر رہی تھی۔

''کیا وہ ہمیشہ سے بات چیت نہیں کر سکتے تھے؟''

''نہیں بی بی۔ ایسا اب سے کچھ عرصہ قبل ہوا تھا لیکن چھوڑیں اس بات کو۔ اس میں کیا رکھا ہے۔''

''میں سوچ رہی ہوں کہ رات کو کون سا راستہ استعمال کیا جائے۔'' زیب النساء نے سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''میں نے تو سب کچھ تم پر چھوڑ دیا لیکن انہیں کیسے خبر ہوگی میری موجودگی کی۔''

''یہ بھی آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ انہیں میں نے پہلے ہی بتا دیا ہوتا لیکن یہ سوچ کر چپ رہی کہ آپ کی مرضی کے بغیر کیسے بتاؤں؟''

''اب سب کام چھوڑ کر پہلے انہیں جگہ بتا آؤ۔''

''جی اچھا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

زیب النساء کے کمرے سے نکلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ اچھو کے گھر گئی تو اس کی ماں کو شک ہونا یقینی ہے لیکن یہ کام ایسا نہیں تھا کہ کسی اور کے سپرد کیا جا سکتا۔ دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے وہ اس کے گھر کی سمت بڑھ رہی تھی کہ سامنے سے اچھو آتا دکھائی دیا۔

''واہ یہ تو اللہ تعالیٰ نے میری سن لی۔'' اچھو کو آتے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔

کھیتوں کے درمیان ان کے دیکھ لیے جانے کا امکان بھی نہیں تھا۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟'' اچھو نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''آپ کی طرف ہی آ رہی تھی۔'' وہ بولی۔

''کیا بی بی نے کوئی پیغام دیا ہے؟'' اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔

''ہوں۔'' حمیدہ کو اچھو کی آنکھوں کی چمک بہت بھلی لگی تھی۔

''ملنے کو کہا ہے؟'' آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی۔

''ہوں۔'' وہ بولی۔ ''آپ جلدی میں نہ ہوں تو میں آپ کو جگہ بتا دوں۔''

چند لمحوں کے لیے اچھو سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر پہلے ہی شکورے نے اسے حویلی کے بڑے پھاٹک کے باہر بلایا تھا۔ اس کا پیغام ملتے ہی اسے صبح کا واقعہ یاد آ گیا تھا اور وہ سب کام چھوڑ کر حویلی کی طرف چل پڑا تھا۔

اب حمیدہ کی بات نے اسے تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک طرف اخلاقی فرض تھا اور دوسری طرف اس کی محبت کی پہلی بہار۔ یہ طے تھا کہ اگر وہ اغوا ہونے والی لڑکی کو بچانے کی کوشش کرتا تو شاید وہ لڑکی تو بچ جاتی لیکن خود اس کا بچنا ناممکن تھا۔ دوسری طرف زیب النساء اس کے حواسوں پر چھائی جا رہی تھی۔

''کس سوچ میں پڑ گئے؟'' حمیدہ بولی۔ ''ڈر رہے ہیں کیا؟ آپ مرد ہو کر ڈر رہے ہیں اور ہم عورت ہو کر بھی نہیں ڈرتیں۔''

''میں نہ تو ڈر رہا ہوں اور نہ خوفزدہ ہوں۔ قدرت نے ایک عجیب معمے میں پھنسا دیا ہے۔ سوچ رہا ہوں اس سے کیسے نکلوں؟''

ڈھیر ساری باتیں اپنے آپ ہی اس کے ذہن پر یلغار کر رہی تھیں۔ ایک طرف شکورے کے الفاظ اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ دوسری جانب زیب النساء کے لب ہل رہے تھے۔ پھر سب صورتیں، سارے الفاظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے بہت دور کسی ویرانے کی طرف بھاگ جائے۔ جہاں نہ محبت کے رنگ ہوں نہ نفرت کے۔ رنگوں سے ایک دم اسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ غبار بہت بڑھ گیا تھا۔

''ایک لڑکی اٹھانی ہے۔'' شکورا چلایا۔

''میں نے آپ کے دل کی دھڑکن سن لی تھی کیا آپ نے نہیں سنی؟ اگر سن لی ہے تو یہ دیواریں ڈھا کیوں نہیں دیں۔ کوئی روزن کوئی دریچہ کیوں نہیں تلاش کر لیا؟'' زیب النساء کے یاقوت سے ترشے ہونٹ ہلے۔

اور اس سے وہ ہار گیا۔ ان ہونٹوں اور لفظوں کا سحر بہت زیادہ تھا۔ اسے موت کا خوف نہیں تھا لیکن وہ زیب النساء کو حاصل کیے بغیر مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اور پھر جواز تو بے شمار تھے۔

''میں نے اس لڑکی کو بچانے کی پوری کوشش کر لی۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ یوں بھی اپنی جان داؤ پر لگا کر اسے بچانا پاگل پن ہی ہوگا۔ ویسے بھی اولاد خصوصاً بیٹیوں کی حفاظت ماں باپ اور بھائیوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ نسیم تو اس لیے اغوا ہوئی کہ وہ گھر سے باہر تھی۔ وہ لڑکی گھر سے نہ نکلے تو محفوظ رہ سکتی ہے۔''

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔ بی بی سے کہہ دوں گی کہ آپ نہیں آنا چاہتے۔'' حمیدہ اکتا گئی تھی۔

''میں آؤں گا' ضرور آؤں گا۔ تم مجھے جگہ بتا دو۔''

''حویلی کا جو بڑا باورچی خانہ ہے ناں' اس کے پہلو میں ایک دروازہ ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس سے نکلیں تو حویلی کی بڑی دیوار اور باورچی خانے کی دیوار کے درمیان ایک چھوٹی سی گلی بن جاتی ہے اس گلی میں باہر کی جانب ایک چھوٹا سا دروازہ کھلتا ہے۔ اس جگہ سے مرد سودا سلف پکڑانے کے لیے آتے ہیں اس کے علاوہ وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند رہتا ہے۔ آپ اس کے پاس ہی ٹھہرنا۔''

''لیکن اس کے پاس تو قبرستان ہے۔ تمہاری بی بی خوفزدہ تو نہیں ہو جائیں گی؟''

''نہیں' وہ کسی سے بھی خوفزدہ نہیں ہوتیں۔ جو زندہ لوگوں سے خوفزدہ نہ ہو وہ ان سے خوفزدہ ہوگا جن کا وجود مٹی میں مل گیا۔''

''اچھا میں انتظار کروں گا۔''

''عشاء کی نماز کے بعد جب سب نمازی اپنے گھروں کو چلے جائیں گے تب آنا۔''

''اچھا۔''

''میں یہی بتانے آئی تھی اب چلتی ہوں۔'' وہ واپس مڑ گئی۔

اچھو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا شکورے کی طرف چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس بہانے اس کام سے چھٹکارا حاصل کرے۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ اگر لڑکی کو اغوا کرنے کے لیے اسے بھی جانا پڑا تو تھوڑی دیر قبل کیا ہوا فیصلہ بغیر سوچے سمجھے خود ہی بدل جائے گا اور سارے جواز دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ سو بہتری اسی میں تھی کہ وہ کسی بہانے اس کام سے جان چھڑا لے۔

لیکن اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ شکورا اس کا انتظار کر کے جا چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اچھو نے سوچا کہ اسے بھی واپس پلٹ جانا چاہیے لیکن پھر یہ سوچ کر وہیں بیٹھ گیا کہ وہاں اس کی موجودگی سے شکورے کو کم از کم اتنا اطمینان تو ہوگا کہ وہ یہ کام کرنے آیا تھا۔

☆======☆======☆

گاؤں میں حیدر علی کا رشتہ طے ہو جانے کی خوشی میں پیر صاحب نے باقاعدہ مٹھائی تقسیم کر دی تھی۔ اپنی دانست میں وہ اس کے تمام راستے بند کر رہے تھے۔ مٹھائی سے بھرا ہوا سب سے پہلا ٹوکرا مولوی نعمت اللہ کے گھر پہنچا تھا۔ زرینہ اس وقت کپڑے دھو کر الگنی پر ڈال رہی تھی جب مولوی صاحب ٹوکرا اٹھائے صحن میں داخل ہوئے۔

''یہ کیا ہے ابا جی۔'' اس نے اشتیاق سے ٹوکرے کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے مٹھائی ہے۔''

''ہاں اور اس کے ساتھ ایسی خبر ہے کہ سناؤں تو روح تک شاداب ہو جائے۔''

''اچھا؟'' وہ قریب آ گئی۔ ''کیا خبر ہے؟''

''اتنا شوق ہے اس لڑکی کو مٹھائی کا۔'' اماں تخت پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''ارے پہلے اپنے ابا کو بیٹھنے کے لیے تو پوچھو۔ گرمی سے آئے ہیں پانی پلاؤ جلدی سے۔''

''ابھی لائی۔'' وہ گھڑوں کی طرف بڑھ گئی۔

''مبارک ہو۔ پیر صاحب نے چھوٹے شاہ صاحب کا رشتہ طے کر دینے کی باقاعدہ تصدیق کر دی ہے۔ بلکہ یہ بھی کہلوایا ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر کوئی تاریخ بھی جلد ہی طے ہو جائے گی۔'' مولوی صاحب اماں کو بتا رہے تھے۔ ''اور پتا ہے یہ مٹھائی انہوں نے لاہور سے منگوائی ہے۔''

ان سے کچھ دور گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیلتی زرینہ کا ہاتھ کانپا۔ گلاس نیچے گرا اور سارا پانی مٹی میں جذب ہو گیا۔

''ایک تو میں اس لڑکی سے بہت تنگ ہوں۔ پتا نہیں برتن کیوں اتنے پھسلتے ہیں اس کے ہاتھوں سے۔''

لیکن زرینہ نے شاید ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا

گیا تھا۔ کسی چیز کا سہارا لینے کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ زمین پر گر پڑی۔

"ارے کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" مولوی صاحب اور اماں اس کی طرف دوڑے۔ رضیہ بھی سوئی دھاگا چھوڑ کر اس کی جانب لپکی۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ بہت مدھم آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔ "وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ہائے کچھ کریں۔ کیا ہو گیا میری بچی کو اچانک۔" اماں چلائیں۔ پھر رضیہ کو ہونقوں کی طرح کھڑے دیکھ کر جھنجھوڑ دیا۔ "یہاں کھڑی کیا تک رہی ہو۔ پانی کے چھینٹے ڈالو اس کے منہ پر۔ ارے آپ بھی یونہی کھڑے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے پتا نہیں کیا ہو گیا میری بچی کو اور آپ کچھ کر ہی نہیں رہے۔"

"اماں آپ تو بندے کو بوکھلا دیتی ہیں۔" رضیہ نے زرینہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ "دھوپ میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی گرمی سے چکر آ گیا۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

پانی کے چھینٹوں سے زرینہ کے حواس بجا ہوئے تو چند لمحوں کے لیے وہ خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھتی رہی پھر رضیہ کے گلے لگ کر رونے لگی۔

"ارے کیا ہو گیا ہے؟"

"اماں کچھ نہیں ہوا۔" رضیہ جھنجھلا گئی۔

"رضیہ اسے کمرے میں چارپائی پر لٹا دو اور پنکھا جھلتی رہو۔" مولوی صاحب بولے۔

"جی ابا جی۔" اسے تو زرینہ کو وہاں سے ہٹانے کے لیے بہانہ درکار تھا۔ "اٹھو زرینہ کمرے میں چلو۔"

رضیہ کے سہارے وہ کمرے میں آ گئی۔

"خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔ جتنی بے وقوفیاں کر چکی ہو وہی کافی ہیں۔ مزید حماقتوں سے اب تو باز آ جاؤ۔" رضیہ نے مدھم آواز لیکن سخت انداز میں اسے ڈانٹ دیا۔

"میں جانتی ہوں ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ بولی۔ "رضیہ ایسا نہیں ہو سکتا ناں؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ابا جی کو بھی خبر ہو سکتی ہے سمجھیں تم؟ تم نے مذاق بنا لیا ہے اپنی زندگی کو...... اب روتی کس بات پر ہو۔ جو بویا ہے اس کی فصل اُگے گی اور اسی کو تمہیں کاٹنا ہوگا۔

کیا تم بے خبر تھیں' اس بات سے؟ نہیں' تمہیں معلوم تھا بالآخر تمہاری حماقتوں کا یہی انجام ہوگا پھر بھی تم جان بوجھ کر ایک ایک قدم اٹھا کر اپنی تباہی کی سمت بڑھی ہو تو پھر جب اب تباہ ہونے لگی ہو تو کس سے شکوہ کر رہی ہو؟ آنسو کیوں بہا رہی ہو؟"

"مجھے سائیں بابا نے بتایا تھا کہ میں۔"

"گولی مارو سائیں بابا کو۔" رضیہ نے غصے میں اس کی بات کاٹی۔

"بس مجھے پتا چل گیا ہے۔ میرا کوئی نہیں ہے۔" وہ اوندھے منہ بستر پر گر کر رونے لگی۔ "ی کو مجھ سے محبت نہیں ہے' تمہیں بھی نہیں ہے' کسی کو محبت نہیں ہے۔"

"ہیں...... ہیں۔" اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ "میری چندا ہم سب تجھ سے محبت رتے ہیں۔" وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔ "ایسے نہیں کہا کرتے۔ مجھے پتا ہے ے کپڑے دھوتے ہوئے دھوپ بہت ستاتی ہے۔ پر میں کیا کروں چندا۔ رضیہ بھی گھر کے کام گی رہتی ہے۔ اسے نہیں کہہ سکتی۔ میری ٹانگ پر ایسا کم بخت پھوڑا نکلا ہے کہ نیچے بیٹھنا مشکل گیا ہے ورنہ میں خود ہی کپڑے دھو لیتی۔ اب تمہارے ابا سے کہوں گی کہ اس طرف چھت ڈلوا ۔ وہ پیر صاحب سے کہہ دیں تو ہفتہ بھر بھی نہ لگے اس کام میں۔ اللہ تعالیٰ پیر صاحب کے جات بلند کرے ہمارے کام میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرتے۔"

ان کی بات سن کر وہ اور زور سے رو دی۔

"اماں اس کی تو عادت ہے خواہ مخواہ رونے کی۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ رو دھو کے ابھی یک ہو جائے گی۔" رضیہ نے انہیں تسلی دی۔

اماں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگیں۔ تھوڑی یر میں زرینہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

"اس طرح روتی ہو تو تمہارے ابا جی پریشان ہو جاتے ہیں۔" اماں نے اس کے بالوں ں ہاتھ پھیرا۔ "چلو باہر آؤ۔ تمہاری پسند کی مٹھائی آئی ہے۔ وہ بھی کھاؤ اور اپنے ابا جی کو بھی تسلی و۔"

"مجھے مٹھائی نہیں کھانی۔" وہ بے رخی سے بولی۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر میں سو جاؤں گی۔"

"اچھا ہے سو جاؤ۔" اماں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆======☆======☆

حیدر علی اپنے کمرے میں بند سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اب تک اسے اس مسئلے کا کوئی ایسا حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' جس سے دونوں فریق اور وہ خود بھی مطمئن ہو جاتا۔ اماں جان کا چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا تھا۔ ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو یاد کر کے اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا تھا۔ ان کے الفاظ کی بازگشت چاروں طرف سے اس پر یلغار کیے ہوئے تھی۔

اور پھر گوری تھی جو اس کی روح تھی' اس کا عشق' اس کی کائنات تھی۔

وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا' جب دروازے پر دستک سنائی دی۔

"یس!" اس نے بےزاری سے کہا اور بچا ہوا آدھا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔
دروازہ کھلا اور رجب علی گھڑ سواری کے لباس میں ہاتھ میں اپنا مخصوص چابک اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔
"ہوں' گوری کو یاد کیا جا رہا ہے۔" اس نے حیدر علی کی جانب بغور دیکھا۔
حیدر علی اٹھ بیٹھا۔ "آئیں بیٹھیں۔"
"میری مانو تو آرام کے ساتھ فوزیہ سے شادی کر لو۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یوں بھی شادی اور محبت کو اکٹھا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بالآخر صرف شادی باقی رہ جاتی ہے اور چند بچے۔"
"آپ کو اس لیے مذاق سوجھ رہا ہے کیونکہ آپ نے محبت نہیں کی۔" اس نے سگریٹ کیس سے نیا سگریٹ نکال لیا۔ "میں نے سنا ہے بابا جان نے گاؤں میں مٹھائی بھی تقسیم کر دی ہے۔"
"نہ صرف مٹھائی تقسیم ہوگئی ہے بلکہ شاید ہفتہ بھر میں شادی کی تاریخ بھی طے ہو جائے۔"
"کیوں کر رہے ہیں بابا جان ایسا۔" اس کی جھلاہٹ بہت واضح تھی۔ "آپ کو معلوم ہے وہ ابھی کہاں ہیں؟"
"کیوں؟ اب تم ان سے جھگڑو گے؟" رجب علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
"نہیں' اپنے باپ سے کون جھگڑ سکتا ہے۔ میں تو صرف یہ پوچھوں گا کہ ان کے اس تم کے رویے کی وجہ کیا ہے؟ اور انہیں یہ بتاؤں گا کہ میں کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے کوئی اور لڑکی پسند ہے۔"
"انتہائی حماقت کا ثبوت دو گے یہ بات کر کے۔" وہ نہایت آرام سے بولا۔ "بابا جان اولاد سے بے حد محبت کرتے ہیں' لیکن اپنی عزت آن اور زبان سے زیادہ نہیں۔"
"اینی وے...... میں نے گوری کو زبان دے رکھی ہے اور میں بھی اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتا۔"
"تم چند دن ٹھہر جاؤ' میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔"
"آپ کا بندوبست کیا ہوگا' یہ میں جانتا ہوں۔ میں آپ کو پہلے سے بتا رہا ہوں کہ مجھے شادیاں نہیں کرنی۔"
"نہ کرو' اس میں اتنے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" رجب علی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "اٹھو میں تمہارا بگڑا ہوا موڈ درست کرتا ہوں۔"
"میرا موڈ نہیں ہے کہیں جانے کا۔"
"بالکل کسی چھوٹے بچے کی طرح روٹھے ہوئے لگ رہے ہو۔ کم آن یار...... یور آر

...اؤ...... اس طرح مسائل کا سامنا نہیں کیا جاتا' اٹھو۔"
"چلنا کہاں ہے؟" وہ بادل نخواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"بہت زبردست پروگرام ہے ڈیرے پر۔" رجب علی ایک آنکھ دبا کر بولا۔ "ہے تو گاؤں کی لیکن ہے بہت زبردست چیز۔"
حیدر علی کی جھنجھلاہٹ میں غصہ بھی شامل ہو گیا۔
"کیا نام ہے اس کا؟" اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔
"تم کیوں فکر کرتے ہو۔ میں دھیان رکھتا ہوں اس بات کا کہ تمہاری گوری محفوظ رہے۔ اینی وے...... اس کا نام ہے جنت بی بی! ہے تو ذرا دقیانوسی سا نام' لیکن خیر یہاں کرسٹین' سوزن اور بھی کہاں' پھر بھی چل جاتا ہے۔"
"میں کچھ مصروف ہوں' اس لیے میرا آپ کے ساتھ جانا ممکن نہیں۔"
"کیسی مصروفیت؟ سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے کی؟"
"مجھے گوری سے ملنے بھی جانا ہے۔"
"آل رائٹ...... جیسے تمہاری مرضی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"میری آفر بہر حال برقرار ہے' موڈ ہو تو آ جانا' صبح تک لڑکی وہیں ہوگی۔"

☆======☆======☆

اچھو حویلی کے عقبی پھاٹک کی جانب درخت سے ٹیک لگائے زیب النساء کا انتظار کر رہا تھا۔ بتائے ہوئے وقت سے بھی کتنی دیر قبل وہ یہاں آ گیا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ پہلی محبت کی بے تابی ہی بہت تھی اور کچھ اس خدشے کے پیش نظر بھی کہ رجب علی اچانک کسی کام سے اسے بلوا نہ بھیجے۔ گھر میں رہتا تو پیغام دینے والا با آسانی اس تک پہنچ سکتا تھا' لیکن اب کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا۔
یہ تو اچھا ہوا تھا کہ شام کو شکورے نے اس سے زیادہ بحث نہیں کی تھی اور رجب علی کو بھی نہ بتایا تھا کہ اغوا کے وقت اچھو اس کے ساتھ تھا' ورنہ بہت گڑبڑ ہو جاتی۔
پھر شام کے واقعات سے ہٹ کر اچھو کا ذہن آنے والے لمحات کی طرف چلا گیا۔
"پتا نہیں آج وہ کیسی لگے گی' کیسے کپڑے پہنے ہوں گے۔ خیر وہ جیسے کپڑے بھی پہن لے اس پر جچ جائیں گے لیکن ہم بات کیا کریں گے؟ پتا نہیں ہماری باتیں کیا ہوں گی؟"
ایسی ہی باتیں وہ تب تک سوچتا رہا' جب تک چھوٹا پھاٹک چراؤں کی ہلکی سی آواز کے ساتھ نیم وا نہیں ہو گیا۔ گو کہ دروازہ کھلنے کی آواز مدھم تھی' لیکن سناٹے میں بہت واضح سنائی دی تھی۔
اچھو ایک دم درخت کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ نیم وا دروازے سے کوئی جھانک رہا تھا'

لیکن اندھیرے کی وجہ سے چہرے کے خدوخال واضح نہیں تھے پھر وہ چہرہ دروازہ کی اوٹ میں غائب ہوگیا۔

چند لمحوں بعد وہ دروازہ تھوڑا سا اور کھلا اور کوئی لڑکی محتاط انداز میں چلتے ہوئے اچھو کی طرف بڑھی۔

''یہ زیب النساء نہیں ہوسکتی۔ اس کی چال بتا رہی ہے کہ یہ زیب النساء نہیں ہے۔ پھر کون ہوسکتی ہے۔ ہاں حمیدہ ہوگی۔''

وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔ اس کا اندازہ درست تھا آنے والی حمیدہ ہی تھی۔

''مجھے بی بی نے بھیجا ہے کہ آپ کا پتا کر آؤں۔'' وہ قریب آکر بولی۔ ''میں ابھی انہیں آپ کا بتاتی ہوں۔''

''اچھا۔''

حمیدہ پلٹ گئی۔

اور وہ پھر انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسی دروازے سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے زیب النساء باہر نکلی اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اچھو کی طرف بڑھ گئی۔ اسے آتے دیکھ کر اچھو بھی آگے بڑھ آیا اور پھر بغیر کوئی بات کیے اچھو نے زیب النساء کا ہاتھ تھام لیا اور وہ دونوں قبرستان کی چار دیواری سے اندر داخل ہوگئے۔

ایک کافی پرانی قبر کے پاس پہنچ کر زیب النساء رک گئی۔

''میں یہاں کبھی نہیں آئی' لیکن مجھے یقین ہے کہ یہی میری پھوپھو کی آرام گاہ ہے۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''میں یہاں فاتحہ پڑھ لوں۔''

ان دونوں نے ہاتھ بلند کر دیئے۔

فاتحہ خوانی سے فارغ ہو کر وہ وہیں ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گئے۔

وہ دونوں گم صم بیٹھے رہے پھر زیب النساء نے ہی خاموشی توڑی۔

''پتا نہیں میں یہاں کب آؤں گی اور میری جگہ کون سی ہوگی۔''

''اونہوں' ابھی تو ہماری زندگی شروع ہوئی ہے۔ ابھی سے یہ باتیں مت کرو۔''

''ہوسکتا ہے' مجھے یہ جگہ نہ ملے۔'' وہ بولی۔ ''اگر ہم ایک ہوگئے تو یقیناً مجھے یہ جگہ نہیں ملے گی لیکن تب مجھے اس بات کا ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔''

''انسان رشتوں کی ڈور میں الجھا ہوا ہو تو کوئی بات بھی یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔'' وہ بولا۔ ''ہر فقرے میں جواز پیدا ہو جاتے ہیں' اگر کے دائرے بنتے جاتے ہیں۔''

''تو کیا میرے نصیب میں یہی قبرستان ہے؟'' اس کے لہجے میں مایوسی اتر آئی۔

''میری دعا اور خواہش ہے کہ نہ ہو۔''

''تو پھر؟''

اچھو تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہا پھر بولا۔

''تم کسی جھونپڑی میں رہ لو گی؟''

''آپ کے ساتھ ہر جگہ رہ سکتی ہوں۔''

''یہ ریشمی کپڑے اور یہ آرام و آسائش جو تمہیں ملی ہوئی ہیں' یہ بھی شاید تمہیں میسر نہ آ سکے۔''

''پروا نہیں۔''

''تمہیں گھر کے کام بھی خود ہی کرنے ہوں گے' کیونکہ ماں سے اب کام نہیں ہوتے۔''

''یہ بھی کروں گی۔''

''میں بہت محنت کروں گا تاکہ تمہیں آرام ملے' آسائش ملے' لیکن اس میں تھوڑا وقت تو لگے گا ناں۔''

''ہوں۔''

''پتا نہیں ماں کا سلوک تمہارے ساتھ کیسا ہوگا' مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے۔ ایک طرف تمہارا خاندان ہے اور خود تم' جن کی میری ماں اس قدر عزت کرتی ہیں کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں اور دوسری طرف ساس بہو کا رشتہ...... پتا نہیں وہ اس رشتے کو کس طرح قبول کریں گی؟''

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔''

''میں بہت سے زاویوں سے سوچ رہا ہوں۔''

''اتنا سوچنے سے ہمارے درمیان دوری تو نہیں آ جائے گی۔'' اس کی آواز میں اندیشے تھے۔

''میں دعوے کرنے کا قائل نہیں ہوں' بس کر گزرتا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''اب یہی دیکھ لو کہ کم از کم اس گاؤں میں ہم اکٹھے زندگی کبھی نہیں گزار سکیں گے۔ ہمیں یہاں سے بہت دور جانا ہوگا' لیکن میں اپنے ماں باپ کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں جہاں بھی جاؤں گا' وہ میرے ساتھ ہی رہیں گے۔''

''لیکن کیا وہ یہاں سے جانے پر تیار ہو جائیں گے؟''

''انہیں تیار ہونا پڑے گا۔'' اس نے کہا۔ ''یوں بھی تمہارے بھائی کے حکم ماننا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ آج نہیں تو کل اس کے یہ احکامات مجھے کسی بڑی مصیبت میں بھی مبتلا کر سکتے ہیں۔''

'' کیسے احکامات؟'' وہ گھبرا گئی۔

'' انہیں چھوڑو' خواہ مخواہ تمہیں دکھ ہوگا' بس اتنا ہے کہ انہی کی بنیاد پر میں ماں جی اور ابا کو یہاں سے شہر جانے پر آمادہ کروں گا۔''

'' پھر؟''

'' پھر شہر میں کوئی مکان دیکھ کر انہیں وہاں چھوڑوں گا اور یہاں آ کر تمہیں لے جاؤں گا مجھے اس طرح ملنا اچھا نہیں لگتا۔''

'' اور آپ شہر کب تک جائیں گے؟''

'' جس قدر جلد ممکن ہو سکا۔ شاید اگلے ایک یا دو دن کے اندر۔''

'' ہوں۔''

زیب النساء نے آنکھیں موند لیں۔ وہ بھی ایسے کب ملنا چاہتی تھی' اسے بھی ایک گھر ایک خاندان چاہیے تھا۔ اچھو کی باتوں نے سکون کی ٹھنڈی لہریں اس کے وجود میں اتار دی تھیں۔

☆======☆======☆

رات کی چادر نے جیسے ہی زمین کو ڈھانپا' زرینہ' حیدر علی سے ملنے کے لیے بے قرار ہو گئی لیکن اماں ابا ابھی سوئے نہیں تھے۔ پتا نہیں آج اتنی دیر تک وہ کیوں جاگ رہے تھے۔

'' اماں' ابا سو کیوں نہیں رہے؟'' اس نے بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑیں۔

رضیہ نے بغیر کچھ کہے کروٹ لے کر منہ دوسری دیوار کی جانب پھیر لیا۔

'' تم بھی ناراض ہو گئی ہو؟'' وہ رضیہ کی چارپائی پر آ بیٹھی۔

'' میری مجال ہے کہ تم سے ناراض ہو سکوں۔ میرا دماغ مت چاٹو' نیند آ رہی ہے مجھے سونے دو۔''

'' میں نے کب سونے سے منع کیا ہے۔ بس ذرا دیر کی بات ہے۔ جھانک کر پتا لگانے کی کوشش کرو کہ اماں ابا کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' اس نے منت کی۔

'' کیوں؟ کس لیے؟'' رضیہ نے تھوڑا سا اٹھ کر پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

'' لڑو تو مت۔'' زرینہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

'' میں احمق نہیں ہوں کہ تم سے لڑوں۔ بھینس کے آگے بین بجانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔'' وہ پھر لیٹنے لگی۔

'' تو پھر نہیں دیکھو گی کہ اماں ابا کیا بات کر رہے ہیں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ '' مجھے جانا بھی ہے' پتا نہیں وہ سو کیوں نہیں رہے؟''

'' تمہیں جانا ہے تو چلی جاؤ۔''

'' خدا کے لیے ناراض مت ہو۔'' زرینہ نے منت کی۔ '' بس آج شاید آخری مرتبہ ہے''

…نے آنکھیں موند کر جذبات اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔

'' لیکن دعا کرو آخری مرتبہ نہ ہو' دعا کرو ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں' دعا میں اثر ہوتا ہے ناں؟''

رضیہ نے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھا' وہ آنسو پیچھے دھکیلنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

پتا نہیں زرینہ کے چہرے میں کیا سحر تھا کہ اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انتہاؤں کو چھوتا ہوا غصہ بھی خود بخود ختم ہو جاتا تھا اور اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو کلیجے کو چیر کر رکھ دیتے تھے۔

رضیہ نے گہری سانس لی۔

'' تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور ان سے ٹکرا کر بعض اوقات دعائیں بھی پلٹ جاتی ہیں کیونکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ [چاہتا] ہے' وہ ہم نہیں جانتے۔''

'' ہاں۔'' زرینہ کے [ا]نداز میں بے بسی تھی۔ '' لیکن یہ جانتے ہوئے بھی ہم دعائیں مانگنا چھوڑ تو نہیں سکتے۔''

'' تم خود کو کسی بھی برے فیصلے کے لیے تیار رکھو۔'' رضیہ نے کہا۔

'' ہوں۔'' وہ دوپٹے کے پلو سے کھیلنے لگی۔

'' اماں' ابا شاید سو گئے ہیں' آوازیں نہیں آ رہیں۔''

'' ہاں' لگتا تو ایسا ہی ہے۔''

زرینہ چارپائی سے اٹھ کر دبے قدموں ان کے قدموں کی طرف بڑھی اور پھر اسی خاموشی کے ساتھ واپس پلٹ آئی تھی۔

'' سو گئے ہیں۔'' وہ بولی۔

'' میں چلتی ہوں۔''

'' کیوں جا رہی ہو؟ رہنے دو' جو کچھ ہو رہا ہے' اسے تمہارے آنسو اور تمہاری آہیں بدل نہیں سکیں گی۔''

'' آج میں انہیں صرف یہ کہنے جا رہی ہوں کہ اب میں ان سے صرف اسی صورت میں ملوں گی' جب ان کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ میں کسی اور لڑکی کی آہ برداشت نہیں کر سکوں گی۔''

'' نہیں' تم یہ سب اتنی آسانی سے نہیں کہہ سکو گی اور جب کہنا مشکل ہوگا تو بلا وجہ الجھ پڑو گی۔''

'' ہاں' لیکن بزرگ کہتے ہیں کہ لڑائی کی رات بے شک آئے' جدائی کی رات کبھی نہ آئے۔ پتا نہیں میرے مقدر میں تنہائی اور جدائی کی کتنی سیاہی ہو' اس لیے رضیہ آج مجھے مت

روکو۔‘‘

وہ اسی پگڈنڈی پر ہولی اور آہستہ روی سے چلتے ہوئے کنویں تک پہنچ گئی۔

حیدر علی حسبِ معمول اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

کتنی دیر تک صرف جھینگروں کے بولنے کی آواز آتی رہی پھر حیدر علی نے خاموشی کو توڑا۔

’’کچھ تو بولو گوری۔‘‘

’’مجھے جو کچھ کہنا تھا‘ میں تو کبھی کی کہہ چکی‘ اب آپ کو بولنا ہے۔‘‘

’’میں آج بابا جان کے پاس جا رہا تھا لیکن بڑے بھائی جان نے روک دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں وہی کچھ کریں گے۔‘‘

’’آپ کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی؟‘‘

’’نہیں‘ اور میں چاہتا ہوں کہ اس سے قبل ہی بابا جان سے بات ہو جائے۔‘‘

’’ہوں۔‘‘

پھر قدرے توقف سے بولی۔

’’آج جو مٹھائی آئی تھی‘ وہ سچ مچ اسی خوشی میں تھی کہ آپ کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کیا گیا ہے؟‘‘

’’ہاں‘ اگر یہ کوئی خوشی تھی تو......‘‘

’’کہیں ایسا تو نہیں کہ......‘‘ وہ بات پوری کیے بغیر خاموش ہو گئی۔

’’کیا؟‘‘

’’کہ وہ آپ کے نکاح کی......‘‘ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

’’نہیں‘ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘

’’شاہ جی میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ......‘‘ وہ پھر خاموش ہو گئی۔

’’بولو......رک کیوں گئیں؟‘‘

’’کہ اب میں اس دن آپ سے ملوں گی‘ جس دن آپ میرے حق میں فیصلہ کریں گے۔ میں خود کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ کسی کے ہاتھ میرے لیے دعا کے لیے اٹھنے کے بجائے مجھے بددعا دینے کے لیے اٹھیں۔ مجھے بددعا سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ کے لیے کسی پچھتاوے کا سبب بنوں اور آپ کو پا لینے کے بعد بھی ساری زندگی آپ کو کھوجتی رہوں۔‘‘

حیدر علی نے اس کی طرف دیکھا جو بہت مشکلوں سے اپنے آنسو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر تمام تر کوشش کے باوجود بھی ایک قطرہ اس کے گال پر پھسل پڑا۔ اس نے سر

’’ایک چیز مانگوں گوری......دو گی؟‘‘

’’آپ جان مانگیں شاہ جی‘ وہ بھی دوں گی۔‘‘ اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

’’اپنے یہ آنسو مجھے دے دو۔‘‘

’’مانگی بھی تو اتنی بے قیمت چیز۔‘‘

’’تمہیں کیا معلوم کہ ان کی قدر و قیمت کیا ہے؟‘‘

اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر آنکھیں موند لیں۔

حیدر علی نے انگلی کی پور سے اس کا آنسو اٹھا لیا اور پھر ایک کے بعد ایک کتنے ہی قطرے اس کے گال پر موتیوں کی لڑی بناتے گئے۔

’’تھینک یو۔‘‘ حیدر علی نے کہا۔

’’تم نے مجھے اپنا زادِ راہ دے دیا ہے‘ اب ساری زندگی کانٹوں پر چلنا پڑے تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔‘‘

’’مجھے بھی آپ نے بہت کچھ دیا ہے۔ شاہ جی......اتنا کچھ کہ اتنے زیادہ کی تو میں نے کبھی تمنا بھی نہیں کی تھی‘ لیکن میں آپ کی طرح بے غرض نہیں ہوں۔ آپ کی ہر عنایت کے ساتھ میرے لالچ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک کے بعد ایک خواہشوں کی ایسی ڈور کھل گئی ہے کہ دوسرا سرا ہاتھ ہی نہیں آتا۔‘‘

’’مجھے تمہاری خواہشیں بہت عزیز ہیں گوری۔‘‘

’’میں چلتی ہوں۔‘‘ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ’’قسمت میں ہوا تو پھر ملیں گے۔‘‘

’’میں قسمت سے جنگ کرنا جانتا ہوں۔ اگر مجھے آخری لمحے تک لڑنا پڑا تو بھی میں لڑوں گا۔‘‘

چند ثانیے تک زرینہ اس کے چہرے کو تکتی رہی پھر اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

☆======☆======☆

زیب النساء کے لیے وہ رات اس کی تمام زندگی سے بڑھ کر تھی۔ نہ اظہار کی ضرورت پڑی تھی نہ اقرار کی۔ وہ یوں ملے تھے جیسے ہمیشہ سے ساتھ ہوں۔ زندگی میں ایسے حُسن اور ایسی رنگینی کا احساس اسے پہلی مرتبہ ہوا تھا...... یوں لگا تھا جیسے کاغذ پر بنی بے رنگ اور بے رونق تصویر ایک دم سے بدل گئی ہو‘ جیسے وہ ایک انگڑائی لے کر کاغذ کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں سانس لینے لگی ہو‘ جیسے اس میں قوسِ قزح کے ساتوں رنگ بھر گئے ہوں۔ وہ سر سے پاؤں تک محبت میں ڈوب چکی تھی‘ جیسے رنگوں میں نہا گئی تھی۔

حویلی کی ٹھوس اور بلند دیوار میں سانس لینے کے لیے ایک روزن پیدا ہوا تھا اور اس نے

زندگی کی بازی لگا کر اس روزن کو دریچہ بنا دیا تھا' جہاں سے روشنی ہو' خوشبو اور محبت کے سب رنگوں تک اس کی رسائی ممکن ہو گئی تھی۔ خیالوں میں دھند کی دبیز تہہ میں لپٹے جس پیکر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھی اس میں احساس گناہ جاگ اٹھا تھا۔ آج اسی پیکر کو حقیقت کی دنیا میں چھو کر اس نے بار بار یہ یقین کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ خواب و خیال کا قصہ نہیں ہے۔

اس نے زیب النساء کو یقین دلایا تھا کہ وہ اسے یہاں سے بہت دور لے جائے گا۔ اتنی دور جہاں تک نیاز پور کی ہوا بھی نہ پہنچ سکے۔ وہاں وہ دونوں مل کر ایک نئے گھر کی بنیاد ڈالیں گے۔ ایک ایسے گھر کی بنیاد جس کی دیواریں محبت کے گارے کو گوندھ کر بنی ہوں گی' جس کی اینٹیں پیار کی مدھم آنچ پر پکی ہوں گی۔

اسے اس کے علاوہ کچھ چاہیے بھی نہیں تھا۔ اس حویلی کی سربلند دیواروں نے اس سے مساوات کا صرف ایک ہی وعدہ کیا تھا کہ بالآخر اس میں رہنے اور گاؤں پر حکومت کرنے والے اس کے مکین ایک ہی جگہ کی مٹی اوڑھ کے سوئیں گے۔

لیکن یہ ایک وعدہ اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ مٹی کا پکا تھا یہاں کی نہ سہی' کہیں اور کی سہی۔

☆======☆======☆

''اپنے اس بیٹے کو کوئی عقل دے نیک بخت' ابھی تو میں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا کہ اس کی واہی تباہی سننا پڑ رہی ہے۔'' منشی فضل دین چلایا۔

''کیا تکلیف ہو گئی تم دونوں کو سویرے سویرے ارے کبھی صبح کو اللہ اور اس کے رسول کا نام بھی لے لیا کرو۔ اٹھتے ہی ایک دوسرے کو کاٹ کھانے لگتے ہو۔''

''اماں' ابا سے کہیں ناں کہ سکون سے میری بات سن لیں۔''

''کیا بات سنوں' نواب صاحب حکم جاری کر رہے ہیں کہ باپ دادا کی زمین اور گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں' کسی نئی جگہ پر گھر بنا لیں۔ واہ واہ کیا شاہی فرمان جاری کیا ہے۔ تیری اولاد نے۔''

''ہائے بیٹا۔'' ماں بھی حیران ہو کر پاس چلی آئی۔ ''گھر چھوڑ دیں اپنا' یہاں سے چلے جائیں۔ رشتے ناتے ختم کر دیں؟ نہ...... نہ...... ایسی بات بھول کر بھی نہیں سوچتے۔ چل میرا بیٹا' جلدی سے یہ دودھ پی لے پھر میں تیرے لیے پراٹھا ڈالتی ہوں۔''

ماں نے دودھ کا بڑا سا گلاس اس کی جانب بڑھایا۔

''ماں آپ کو کیا چاہیے؟ یہ گھر بار' زمین رشتے ناتے یا اچھو آپ کو جو چننا ہو چن لیں۔''

''کیا بکتا ہے؟''

ماں تو حیران سی کھڑی رہ گئی تھی' لیکن منشی سے رہا نہ جا سکا۔

''تُو سمجھتا ہے کہ اس قسم کی دھمکیوں سے ہمیں مجبور کر دے گا۔ نہیں بیٹا۔ پھر میں بھی تیرا باپ ہوں...... زنجیر ڈال کر گھر میں بند نہ کر دیا تو فضل دین نام نہیں ہے میرا۔''

''ارے پوچھو تو کہ صبح صبح کیا آفت آئی ہے جو یہاں سے جانے کو کہہ رہا ہے۔ رات تک تو ٹھیک تھا۔''

''خاک ٹھیک تھا۔ شام کا گیا آدھی رات کو گھر لوٹا تھا۔ یہ حرکتیں ہوتی ہیں شریفوں کی۔''

''آپ لوگ سکون سے میری بات سن لیں تو آپ کو اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔'' اچھو نے تحمل سے کہا۔

''ہم سے زیادہ تجھے سکون کی ضرورت ہے۔ جا اور ٹھنڈا پانی سر پر ڈال تا کہ تیری عقل ٹھکانے آئے۔''

''ماں میں آج سہ پہر کی لاری سے شہر جا رہا ہوں۔''

''ارے کیوں جا رہا ہے میرے لال؟'' ماں نے دودھ کا گلاس چھوڑ کر لپک کے اسے پکڑ لیا۔

''میں کہیں نہیں جانے دوں گی تجھے۔''

پھر منشی کی طرف مڑی۔

''اور تم بھی اپنے غصے کو قابو میں رکھا کرو جی' کیا بیٹے کو گنوانے کا ارادہ ہے۔ تم سے تو آرام سے بات ہی نہیں ہوتی۔ ساری زندگی حویلی میں منشایت کر کے سمجھنے لگے ہو کہ گھر میں بھی سب تمہارے غلام ہیں۔ ہونہہ! ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے تم میرے بیٹے کو اس گھر میں......''

''تبھی دو آنکھوں سے دیکھتا ہوں اسے' اندر باہر سے پتا ہے مجھے اس کا۔''

''اب چپ بھی کرو جی۔'' ماں نے کہا اور اچھو کو وہیں چارپائی پر بٹھا کر بولی۔

''میرے بچے! تھوڑی سی سمجھ بوجھ سے کام لے ناں میرے چندا۔ جس مٹی سے ہمارا صدیوں کا ناتا ہے' اسے کیسے چھوڑ دیں۔ سارے رشتے ناتے ہیں یہاں' اپنا گھر بار ہے' تیرا باپ منشی ہے۔ تُو محنت کرے تو یہ جگہ تجھے بھی مل سکتی ہے۔ دانے اناج کی کوئی کمی نہیں ہے سارا گاؤں عزت کرتا ہے۔ تیرے باپ کی اتنی دھاک ہے کہ سب سر جھکا کر سلام کرتے ہیں۔ ہمارے دکھ اور ہماری خوشیاں تو اس مٹی کے ساتھ ہیں' اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ پیر صاحب کے سائے کی برکت چھوڑ کر کسی بے برکتی جگہ کیسے ڈیرا ڈال سکتے ہیں۔ پرندے بادلوں سے بھی اوپر نکل جائیں' لیکن شام پڑتے ہی اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹ آتے ہیں۔''

''ماں اگر گھر کو آگ لگ رہی ہو تو ہم کیا کریں' خود بھی ساتھ جل جائیں؟ یا پچھتاوؤں کی راکھ کریدتے رہیں' نہیں ماں یہ عقل مندی نہیں ہے' تب ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہمارا دانا پانی اس جگہ سے اٹھ گیا ہے۔ اس نیلی چھتری والے نے کہیں اور کے دانوں پر ہمارے نام کی مہر لگا دی

ہے۔"

"لیکن بیٹا! ہمارا گھر تو نہیں جلا۔" ماں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ "جس دن زور کی ہوا چل رہی ہو اس دن تو میں چولہا بھی نہیں جلاتی۔ ماسی بیداں کے تنور سے پکا پکایا کھانا لے آتی ہوں۔"

"ماں! اس آگ کو آپ نہیں سمجھیں گی۔ یہ تو اچانک ہی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور مجھے پتا ہے کہ مجھ تک پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"کیسی باتیں کر رہا ہے اچھو؟" ماں گھبرا گئی۔

"کیوں پھر کوئی بد دماغی دکھا آیا ہے شاہ صاحب کو؟" منشی نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "دیکھ' پہلے تو میں نے تجھے بچا لیا تھا لیکن تیری کھوپڑی یونہی الٹی رہی تو اب کے تجھے کوئی نہیں بچا سکے گا' سمجھا کہ نہیں۔"

"ارے تم دونوں کیا باتیں کرنے لگے کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔" ماں مزید پریشان ہوگئی۔

"اچھو! پھر تو کوئی گڑبڑ نہیں کی بیٹا۔"

"ماں' میں تو گڑبڑوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتا ہوں' لیکن یہ ہی میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔"

"مجھے یقین تھا کہ پھر کوئی نیا گل کھلا آیا ہے تمہارا بیٹا۔ لکھوا لو مجھ سے کہ یہ اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے روز کوڑے کھائے گا۔"

"بس بہت ہوگئی ابا؟" وہ بگڑ گیا۔ "مت کیا کریں اس شیطان کی وکالت۔"

"کیا...... کیا...... کیا؟ بڑے شاہ کو شیطان کہتا ہے؟ زبان گدی سے باہر کھینچ لوں گا۔ استغفار' استغفار...... یا مولا' اپنی اولاد کے منہ سے یہ سننے سے پہلے میں بہرا کیوں نہیں ہوگیا۔ کاش کہ یہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ ایسی بدبخت اولاد سے تو بہتر تھا کہ میں بے اولاد ہی رہتا۔"

"ہاں میں بدبخت ہوں لیکن وہ آپ کا پیرزادہ بہت اونچے بختوں والا ہے' جس نے کل مجھے حکم بھجوایا تھا کہ اس کے لیے لڑکی اغوا کروں۔"

"کیا بک رہا ہے' میں تجھے جان سے مار دوں گا۔" منشی نے اپنے سینک سلائی سے وجود کی پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے اسے ایک تھپڑ جڑ دیا۔

"مار لیں جتنا چاہے مارنا ہے' لیکن ذرا سورج چڑھ آئے تو آپ کو خود یقین آ جائے گا کیونکہ یا تو اس لڑکی کی لاش بھی نسیم کی طرح کسی کھیت میں مل جائے گی اور یا پھر وہ لڑکی اپنی داستان غم خود ہی سب کو سنا دے گی۔" اچھو بولا۔ "آپ یہاں سے نہیں جانا چاہتے نہ جائیں میں بھی آپ دونوں کو چھوڑ نہیں سکتا' یہ میری مجبوری ہے' لیکن پھر تیار رہیں میرے کفن دفن کے لیے کیونکہ کل لڑکی کے اغوا سے انکار کر کے بھی میں رجب علی کے ہاتھوں بچ نکلا تھا' پر ہر مرتبہ اب

نہیں ہوگا۔"

منشی اور ماں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جو کچھ اچھو بتا رہا تھا' وہ ان کے تصور سے بھی بعید تھا' لیکن اپنے بیٹے کو بھی وہ جانتے تھے۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ ایسا الزام بلا سوچے سمجھے ہی کسی پر لگا دے۔

تو کیا سچ مچ ایسا تھا؟ نہیں یہ سب کچھ سچ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ "ہوسکتا ہے اور نہیں ہوسکتا" کے درمیان معلق ہوگئے تھے۔

پھر منشی کمزور سے لہجے میں بولا۔ "کسی شیطان نے میرے بیٹے پر تعویذ کر دیا ہے' تب ہی اسے الٹے سیدھے خیالات آ رہے ہیں۔ ذرا دن چڑھے تو میں مولوی صاحب سے اس کے توڑ کا تعویذ لاتا ہوں۔"

☆======☆======☆

جنت بی بی کو سرِ شام ہی ماسی بیداں کا چھوٹا لڑکا گلا بلا کر لے گیا تھا۔ وہ بھی ابا' اماں کی اجازت سے اس کے ساتھ چل پڑی تھی لیکن کچھ دور ہی اچانک کسی نے اس کے اوپر کھیس ڈال دیا تھا۔ اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں بھی مارے تھے' لیکن بے سود۔

اور پھر بڑے شاہ صاحب کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر جیسے اس کی آنکھیں ہی پتھرا گئی تھیں۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی تھی' لیکن حیرانی اور صدمہ اتنا زیادہ تھا کہ اس کی چیخیں حلق میں ہی دم توڑ گئیں۔

پھر جب صبح صادق وہ لٹی پٹی گھر کے دروازے تک پہنچی تو اس کے اندر دہلیز عبور کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ وہیں دروازے پر ڈھیر ہوگئی تھی۔

گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور صحن میں گھر کے افراد روزمرہ کاموں میں مصروف تھے۔ مُنی حمام تلے رات کے برتن دھو رہی تھی' اماں چارپائیاں دیوار کے ساتھ لگا رہی تھی' ننھی جھاڑو لگا رہی تھی اور باقی بچے اِدھر اُدھر کدکڑے لگاتے پھر رہے تھے' اسے گرتے دیکھ کر سب ہی اس کی طرف بھاگے۔

"کیا ہوا' کیا ہوا؟" کے ساتھ بے شمار سوالوں کی مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔

اماں کچھ ہی دیر میں سب سمجھ گئی تھیں اور یہ سب سمجھتے ہی اس نے جنت بی بی کو دُھن کر رکھ دیا تھا۔

"اماں! میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ چلاتی رہی۔

لیکن اماں نے بس نہیں کیا۔

پاس پڑوس کی عورتیں دیواروں سے جھانک رہی تھیں' کچھ ان کے گھر بھی چلی آئی تھیں۔

"میں پوچھتی ہوں کون تھا وہ کمبخت؟" اماں پر جیسے جنون سوار تھا۔

اور ایک اماں ہی کیا سب بڑی بوڑھیاں بولے جا رہی تھیں۔ ابا ادھر نہیں تھا۔ رات کھیتوں میں پانی لگانے کی اس کی باری تھی' ورنہ وہ صرف کپڑے دھونے والے ڈنڈے پر اکتفا نہ کرتا۔ چولہے کے پاس پڑی لمبی سی چھری لا کر ایک ہی دفعہ کام تمام کر دیتا۔

''میں تجھے آج زندہ نہیں چھوڑوں گی' بتا وہ کون تھا؟''

''بتاتی ہوں اماں...... بتاتی ہوں۔'' وہ چلائی۔

کچھ ہمسائیوں نے بھی اماں کا چلتا ہاتھ روکا' اس وقت تک وہ نیل و نیل ہو چکی تھی۔

''انہوں نے کہا تھا نہ بتانا ورنہ......'' وہ نڈھال سی ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

''جلدی بتا نہیں تو میں تیرا خون پی جاؤں گی۔''

''ورنہ وہ مُنی اور ننھی کو بھی اٹھا لیں گے۔'' اس نے اٹک اٹک کر فقرہ مکمل کیا۔

عورتوں نے انگلی دانتوں تلے دبالی۔ ایک مرتبہ پھر بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔

''اور پھر وہ سب کو مار دیں گے۔'' قدرے توقف سے وہ بولی۔

درد کی ٹیسوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی۔

''ارے کمبخت! وہ تھا کون' اسے بھی نہیں چھوڑوں گی۔'' اماں نے ایک مرتبہ پھر اس پر حملہ کرنا چاہا' لیکن عورتوں نے پیچھے ہٹا دیا۔

''بڑے شاہ صاحب۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

☆======☆======☆

اس کی بات کا یقین کرنا سب کے لیے تقریباً ناممکن تھا' لیکن ماسی بیداں کے چھوٹے لڑکے گلو نے خوفزدہ ہو کر سب کو بتا دیا کہ جنت بی بی کو بلوانے کے لیے اس سے شکورے نے کہا تھا اور بدلے میں لاہور شہر کی سیر کرانے کا وعدہ کیا تھا اور یہی نہیں بلکہ اس پر کھیس ڈال کر اسے لے بھی گیا تھا تو تب سب ہی کا یقین ڈانواڈول ہونے لگا۔

''تُو نے اس وقت کیوں نہیں بتا دیا تھا کمبخت۔'' ابا اس پر جھپٹا۔

''مجھے شکورے چاچا نے کہا تھا کہ یہ کھیل ہے۔'' وہ بھاں بھاں روتے ہوئے بولا۔

''انہوں نے کہا تھا کہ جب وہ آپا پر کھیس ڈالیں گے تو وہ چیخے چلائے گی بھی' لیکن یہ بھی کھیل ہو گا اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں نے اس کھیل کے بارے میں کسی کو بھی کچھ بتایا تو چاچا مجھے سیر نہیں کرائے گا۔''

''جب جنت کو اٹھایا شکورے نے تھا تو وہ بڑے شاہ صاحب کا نام کیوں لے رہی ہے؟''

یہ وہ سوال تھا جو سب کے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

جنت بی بی کے چچا زاد بھائی غصے میں پاگل ہو کر شکورے کو اس کے گھر سے گھسیٹ

لائے۔

''میں ادھر ہی تجھے ذبح کر دوں گا۔'' ایک چلایا۔

''خون پی جاؤں گا تیرا تجھے جرأت کیسے ہوئی ہماری بہن کی طرف میلی نظر سے دیکھنے کی۔''

''اتنی اکڑ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شکورے نے بھی آنکھیں دکھائیں۔ ''لڑکی نے میرا نام نہیں لیا' اس چھوکرے کے کہنے پر تم لوگ مجھے پکڑ لائے۔ ابے اولڑکے۔''

وہ گلے کی طرف متوجہ ہوا۔ ''بول' میں نے اٹھایا تھا تیری آپا کو؟''

گلے نے سر اٹھا کر شکورے کی طرف دیکھا جو خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر خوفزدہ ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''ہاں...... ہاں...... ہاں۔'' وہ آنکھیں بند رکھے رکھے ہی چلایا۔

''اوئے جھوٹ بکتا ہے۔'' شکورے نے اسے ڈپٹا۔

پھر گھر کے صحن میں جمع ہونے والے لوگوں سے مخاطب ہوا۔

''اس بچے کی بات پر یقین کرنے سے بہتر ہے کہ لڑکی سے پوچھو کہ اس پر کیا بیتی...... اس نے میرا نام لیا تو یہ میرا سر ہے اور یہ......؟''

اس نے پاؤں سے چپل اتار کر سامنے کھڑے بزرگ کو پکڑا دی۔

''یہ جوتا ہے' اتنے جوتے لگاؤ کہ نہ سر باقی رہے نہ جوتا' لیکن اگر وہ میرا نام نہیں لیتی تو یہی جوتا اتنی دفعہ تم لوگ اپنے سر میں مارو کہ نہ تم لوگوں کا سر باقی رہے اور نہ ہی یہ جوتا۔''

''ارے بھئی جس نے یہ حرکت کی ہے اسے پکڑو' جس کا نام لڑکی لیتی ہے' اسے گریبان سے گھسیٹ کر لاؤ اور یہاں ذبح کر کے خون پیو۔ شکورا بے چارا تو ایسے ہی پھنس رہا ہے۔''

بات تو اس کی منطقی تھی اور مسئلہ یہ تھا کہ جنت اس کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ بڑے شاہ صاحب کے نام پر ہی مُصر تھی۔

چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اتنا تو سب کو یقین آ گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی بلکہ اسے لے جایا گیا تھا۔ اس بات کا بھی انہیں یقین تھا کہ اسے لے جانے والا شکورا ہی تھا کیونکہ کتنے ہی لوگوں نے اسے اس کھیس کے ساتھ ماسی بیداں کے تنور کی طرف بڑھتے دیکھا تھا' لیکن مسئلہ وہاں سے شروع ہوتا تھا جہاں جنت' شکورے کے بجائے بڑے شاہ صاحب کا نام لے رہی تھی۔

''لو جی تمہاری لڑکی نے تو بڑے شاہ صاحب کو بھی نہیں بخشا۔'' شکورا اطمینان سے بولا۔ ''کل کو کوئی لڑکی اٹھ کر پیر صاحب پر الزام لگا دے تو وہ بھی مان لینا۔ ہونہہ...... میرا تو یہ مشورہ ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کر دو۔ اگر حویلی میں یہ خبر پیر صاحب یا بڑے شاہ صاحب تک

پہنچ گئی تو تم میں سے کسی کی خیر نہیں۔ پیر صاحب کا تو تم سب کو علم ہی ہے کہ عزت اور آن کی خاطر مرمٹیں گے یا ماردیں گے' لیکن اپنی اجلی پگڑی کو داغدار نہیں ہونے دیں گے اور جہاں تک بڑے شاہ صاحب کا تعلق ہے تو اب وہ یہاں نئے نہیں آئے کہ تم لوگوں کو خبر ہی نہ ہو ان کے غصے کی۔ زمین میں آدھا گڑوا کر اوپر کتے نہ چھوڑے تو میرا نام شکورا نہیں۔ لگالو یہیں دس دس روپے کی شرط۔''

سب کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ جنت نے جسے اماں نے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ لوگوں کو یوں چپ ہوتے دیکھا تو اس سے رہا نہیں گیا۔ کھڑکی کی سلاخیں پکڑ کر اس نے چلانا شروع کیا۔

''یہ سب چپ ہو سکتے ہیں لیکن تم میرا منہ بند نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھ یہ ظلم بڑے شاہ صاحب نے کیا ہے بڑے شاہ صاحب نے کیا ہے' بڑے شاہ صاحب نے کیا ہے اور مجھے اٹھایا تم نے تھا...... تم نے تھا۔ تم نے تھا۔''

کچھ عورتوں نے اسے زبردستی پیچھے دھکیلا' لیکن وہ مسلسل چلائے گئی۔

''لو جی! اس سے پوچھو کہ جس کے منہ پر پیچھے سے کھیس ڈال دیا جائے اسے کیا پتا کہ اسے اٹھایا کس نے ہے؟ جھوٹے کا جھوٹ ساتھ کے ساتھ کھلتا جاتا ہے۔ یہ لڑکی تو پاگل پن کی اداکاری کر رہی ہے' اس کی باتوں میں آکر کہیں خود کو حویلی کے کتوں کی خوراک بنوانے کی کوشش مت کرنا۔'' شکورا بہت مطمئن تھا۔

''اور ہاں پہلے اس شخص کو تلاش کرو جس نے یہ کام کیا ہے پھر یہ بھی کھل جائے گا کہ لڑکی کو کوئی زبردستی لے کر گیا تھا یا وہ خود اپنے پاؤں پر چل کر گئی تھی۔

اچھا جی! اب میں چلتا ہوں' ابھی تو نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ تم لوگوں نے اٹھا دیا۔''

اس نے منہ پھاڑ کر جمائی لی اور بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔

شکورے کی دھمکی اس قدر واضح تھی کہ کسی میں بھی اونچی آواز میں بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن سرگوشی میں رجب علی شاہ کا نام پھیلتا گیا۔

☆======☆======☆

''کچھ سنا آپ نے مولوی صاحب!'' اماں کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ''کیسا گندا الزام لگایا ہے اس لڑکی نے بڑے شاہ صاحب پر۔''

''اوہ خدایا! کل میں نے اچھو کی بات پر بالکل توجہ نہیں دی تھی۔'' مولوی صاحب نے سر پکڑ لیا۔ ''مجھے یقین آگیا ہے کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔''

''کل اچھو آیا تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟'' اماں نے پنکھا جھلتے ہوئے پوچھا۔

اپنے اپنے کام کاج میں مصروف رضیہ اور زرینہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

''اچھو نے مجھے پہلے ہی اس حادثے سے آگاہ کر دیا تھا' لیکن اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ کس لڑکی کو اغوا کیا جانا ہے۔''

''ہائے اللہ! کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب؟'' اماں کا پنکھا جھلتا ہاتھ رک گیا۔

''اچھو کو پہلے سے کیسے پتا چل گیا؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔'' انہوں نے کہا اور پوری بات اماں کو بتا دی۔

''بڑے شاہ صاحب ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔'' اماں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ہو نہ ہو اس میں بھی اچھو کا ہاتھ ہے۔ یہ کوئی بہت بڑی سازش ہے بڑے صاحب کے خلاف۔''

''بڑے شاہ صاحب کے متعلق تب بھی بہت باتیں پھیلی تھیں' جب وہ ولایت میں تھے لیکن اچھو کے متعلق سب جانتے ہیں کہ اس کا کردار کیسا ہے؟''

''جانے دیں مولوی صاحب! وہ بغیر میم کے گاؤں واپس آگئے تو بے کار کی پھیلائی ہوئی باتیں بھی ختم ہو گئیں۔ کل کو یہاں بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' اماں بولیں۔

''اور پھر وہ سب آپ بھول گئے جو اچھو نے مسجد جیسی جگہ میں بیٹھ کر کہا تھا۔ توبہ توبہ! اس نے بیبیوں پر بھی تہمت لگانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''سچ کیا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔'' وہ بولے۔ ''مجھے تو یہ پتا ہے کہ میں نے جنت کی آنکھوں میں سچائی دیکھی ہے اور اس سے اچھو کی باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔''

''آپ ان لوگوں کی باتوں میں آکر کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ ایسا ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے اور پھر یہ بھی تو سوچیں کہ انہیں یہی کرنا ہوتا تو ولایت میں اس کے مواقع کم تھے' وہاں نہ شادی کر آتے وہ؟ لیکن نہیں' نہیں گاؤں اور خاندان کی عزت کا اتنا پاس تھا کہ وہاں کی وہ بے حیا عورتیں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ اتنا خیال تھا انہیں اپنی دی ہوئی زبان کا کہ بغیر کسی رد و کد کے چھوٹی بیگم سے عقد کر لیا۔ نہ مولوی صاحب' معافی چاہتی ہوں لیکن آپ کی باتوں سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔''

''بس ایک مرتبہ جنت کے گھر جا کر اس کی باتیں سننے کے بجائے اس کی آنکھیں پڑھ آئیں۔ یقین خود ہی آجائے گا۔'' مولوی صاحب بولے۔

''ویسے بھی سب گھر والوں نے اس کی زبان بند کرا دی ہے' خوف کے مارے سب نے بے غیرتی کی چادر اوڑھ لی ہے اور چپکے سے بیٹھ گئے ہیں۔ اب تو صرف جنت کی آنکھیں بات کر رہی ہیں اور فریاد بھی۔''

مولوی صاحب کے انداز میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اماں چپ ہو کر رہ گئیں۔

''میں ابھی اچھو سے بات کرتا ہوں۔''

''کیوں پرائے فساد میں پڑتے ہیں' رہنے دیں' اگر لڑکی والے چپ ہیں تو ہمارے بیچ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اماں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اسی مزاج نے تو مسلمانوں کو خراب کیا ہے' برائی کو روکنا ہر ایک کا فرض ہے۔ کل نسیم تھی آج جنت ہے' کل کو خدانخواستہ ہماری کوئی بیٹی بھی اس کا شکار ہو سکتی ہے۔ راہ میں لگی کانٹوں کی جھاڑی کو ہٹایا نہ جائے تو وہ پھل پھول کر تناور درخت بن جایا کرتی ہے اور پھر تمام تر کوشش کے باوجود اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں رہتا۔"

مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میرا اچھو سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

☆======☆======☆

"اب کیا ہوگا؟"

منشی فضل دین اور اماں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ اچھو برآمدے میں بیٹھا انہیں تک رہا تھا۔ جب باہر سے اچانک آواز آئی۔

"اچھو"

منشی اچھل پڑا۔ "یہ کون ہے؟"

"کہیں کوئی حویلی سے اچھو کو بلانے تو نہیں آیا؟" اماں کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"میں اب اپنے اچھو کو حویلی میں نہیں جانے دوں گی۔"

"ماں خدا کے لیے مولوی صاحب کی آواز کو بھی نہیں پہچانتے آپ لوگ' مولوی صاحب آواز دے رہے ہیں۔" وہ باہر کی جانب بڑھا۔

"میری بات سن اچھو!" منشی نے پاس سے گزرتے ہوئے اچھو کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"یہ مولوی ہے تو اچھا' لیکن پیر صاحب پر جان نثار کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہے' کہیں جاسوسی کرنے نہ آیا ہو' تو اس کے سامنے عادت کے مطابق اول فول نہ بکنے لگنا بڑے شاہ کے متعلق۔"

"ابا! مجھے میرے انداز میں زندہ رہنے دیں۔ مجھ سے گیدڑوں کی طرح نہیں رہا جاتا۔ سوچتا ہوں اور کر گزرتا ہوں' کسی کے سامنے منمنانا یا گھگیانا مجھے پسند نہیں ہے۔"

"کچھ سمجھایئے اپنے اس لاڈلے کو۔" منشی نے ماں سے کہا۔ "کیوں خودکشی کرنے پر تلا ہوا ہے؟"

لیکن منشی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اچھو باہر جا چکا تھا۔

"جی مولوی صاحب! آپ ہمارے غریب خانے پر کیسے آ گئے؟"

"مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"میں کچھ مصروف ہوں' لیکن خیر آپ کو یہیں کھڑے کھڑے چند منٹ دے سکتا ہوں۔" وہ بے رخی سے بولا۔

"میں جنت بی بی کے متعلق تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"اب کیا فائدہ' اب تو جو ہونا تھا سو ہو چکا' سارے گاؤں میں وہ بات پھیل چکی ہے' جس کا آپ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔"

"مجھے سچ سچ بتاؤ کہ یہ بڑے شاہ صاحب کو...... پھنسانے کا طریقہ تو نہیں ہے؟"

"واہ مولوی صاحب واہ!" وہ تلخی سے بولا۔ "حویلی والوں کے نمک کا ذائقہ اب تک آپ کی زبان پر ہے۔ یہ بتائیں کتنی بوریاں گندم اور چاول نے آپ کا منہ بند کیا ہوا ہے۔ میری بات کا یقین اس لیے نہیں کہ میں اچھو ہوں منشی فضل دین کا بیٹا اور رجب علی کی شرافت کا یقین اس لیے ہے کہ وہ پیر صاحب جلال الدین شاہ کا سب سے بڑا بیٹا اور گدی کا وارث ہے؟"

"بہت ہو گئی مولوی صاحب! آپ کی انہی حرکتوں کی وجہ سے میرا دل اس جگہ سے اچاٹ ہو گیا ہے اور میں یہ گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہوں' کسی ایسی جگہ کی تلاش میں جہاں صرف پیروں کی اولاد کو ہی قبول نہیں کیا جاتا ہو گا بلکہ مجھ جیسے ادنیٰ انسان کی بھی بحیثیت انسان کوئی وقعت ہو گی۔"

"تم نے میرے متعلق بہت غلط انداز ے لگائے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں ایک سیدھا سادہ انسان ہوں' اللہ اللہ کرنے والا۔ میرے اندر لوگوں کو پہچاننے کا شعور نہیں ہے اور پھر جو کچھ آج کل ہو رہا ہے' ایسا اس سے پہلے ہمارے گاؤں میں کبھی ہوا بھی نہیں ہے۔ میری عقل حیران ہے کہ کس کی بات کا یقین کروں اور کس کی بات رد کروں۔"

"مولوی صاحب آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا بہت برا کیا لیکن......"

اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اب آپ کی باتیں سن کر یہ قلق نہیں رہا کہ آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا' اس میں آپ کی نیت شامل تھی۔"

"بس ایک بات یاد رکھیں مولوی صاحب کہ جو بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہو اس کے متعلق چپ سادھ لیں۔ وقت ہر انسان کے رویے اور نیتیں خودبخود ظاہر کرتا جاتا ہے۔ کل تک آپ کو میری بات کا یقین نہیں تھا آج آپ کو شک ہے' لیکن آنے والا کل ہر سچائی کو از خود ظاہر کر دے گا۔"

"اللہ تعالیٰ کرے ایسا ہی ہو۔" پھر وہ قدرے توقف سے بولے۔ "میں پیر صاحب کے پاس جا رہا ہوں' تم اس واقعے کے اہم کردار ہو' میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں' اب بہت دیر ہو گئی ہے مولوی صاحب! میں کسی کو اپنے ساتھ کا یقین دلا چکا ہوں اپنا وعدہ پورا ہونے سے پہلے مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آئندہ بھی مجھے ایسے حکم ملتے رہیں گے' جنہیں پورا کرنا مجھے گوارا نہیں ہو گا' اس لیے میں یہ گاؤں' یہ مٹی اور اس سے جڑے سارے رشتے ناتے توڑ کر یہاں سے جا رہا ہوں۔"

""نہیں اچھو! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے' اگر تم جیسے نوجوان بھی میدان چھوڑ گئے تو یہاں فصل کی آبیاری ہوگی' جسے اس مٹی میں نہیں اُگنا چاہیے۔""

""میں نے کہا ناں کہ اب میرے لیے مزید یہاں رکنا ممکن نہیں رہا۔"" وہ بولا۔ ""کل تک میں آزاد تھا' میرے گرد کسی جذباتی رشتے کا حصار نہیں تھا' کسی وعدے کی زنجیر میرے پاؤں میں نہیں تھی' لیکن آج میں اَن دیکھی ڈوریوں میں بندھ گیا ہوں اور اسی لیے میں نے اگر کل ہونے والے گناہ میں حصہ نہیں لیا تو اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی' آپ پیر صاحب کے پاس جانا چاہیں تو چلے جائیں' لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا' پورے گاؤں میں کوئی ایک شخص بھی آپ کی حمایت نہیں کرے گا' ایک انگلی بھی رجب علی کی جانب نہیں اٹھے گی' کسی کی زبان اس کے خلاف الزام لگانے کے لیے نہیں ہلے گی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ گناہ گار ہے۔ کوئی اسے گناہ گار نہیں کہے گا' آپ جائیں' میں آپ کے لیے صرف دعا ہی کرسکتا ہوں۔""

مولوی صاحب مایوس ہوکر حویلی کی طرف چل پڑے اور اچھو ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر گھر کے اندر چلا آیا۔

""میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔"" ماں نے اچھو کا بازو تھام کر کہا۔ ""میرے بچے کو کچھ ہوگیا تو اس زمین اور مٹی نے ہمیں کیا دینا ہے۔""

""نیک بخت کبھی سوچ سمجھ کر بھی بات کرلیا کر۔"" منشی بولا۔ ""کچھ نہیں ہوگا تیرے بیٹے کو۔ اچھو تُو اِدھر آ میرے پاس بیٹھ۔""

اچھو خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

""مجھے تیری آدھی باتیں اچھی لگی ہیں' لیکن آدھی باتیں بالکل اچھی نہیں لگیں۔""

""کون سی ابا؟""

""جو ابھی تُو مولوی کے ساتھ کررہا تھا۔"" منشی بولا۔ ""مولوی کا تو ہوگیا ہے دماغ خراب جو پیر صاحب کے پاس چل پڑا ہے۔ شکورا پہلے ہی سب کو دھمکا گیا ہے کہ ایسی کسی بھی شکایت کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا اور پھر ہمیں کسی کے پھڈے میں پڑ کر کیا لینا دینا۔ بہت اچھا کیا جو تُو مولوی کی باتوں میں آکر اس کے ساتھ نہیں چلا گیا۔

لیکن یہاں سے جانے والی بات ٹھیک نہیں ہے۔ تجھے کیا' وہ شکورا بھی تو ... صاحب نے کہا سو وہ اس نے کردیا۔ تُو بھی کرتا جا جو وہ کہتے ہیں۔""

""چاہے وہ کسی کی بہو بیٹی اٹھانے کو کہہ دیں؟""

""تو تجھے کیا۔ تیری ایک بڈھی ماں ہی تو ہے' اس کا بوجھ میرے علاوہ ... کون سی کوئی بہن ہے تیری کہ تجھے فکر ہو۔ ارے جب اتنی بہنوں کی موجودگی میں شکورے ... نہیں آئی تو تجھے کیا ضرورت ہے فرشتہ بننے کی۔""

""واہ ابا! بہت اچھا سبق دے رہے ہیں آپ۔""

""میں کب کہتا ہوں بیٹا کہ تُو اس سے زیادہ کچھ کر۔ دیکھ میری بات سن......"" منشی کا انداز سمجھانے والا تھا۔

""اللہ تعالیٰ نے بھی شدید بھوک کی حالت میں جہاں جان جانے کا خطرہ ہو حرام کو حلال قرار دیا ہے۔""

""ابا جی! اپنے مطلب کے لیے ہم فوراً ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کو لے آتے ہیں' چاہے غلط ہی کیوں نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ مسلسل حرام کھاتے رہو۔ انہوں نے برے حالات سے بچنے کے لیے ہجرت کا حکم بھی دیا ہے۔ جب ہجرت کرنے کے بعد ہمیں کھانے کو حلال مل سکتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ہم یہیں بیٹھے بیٹھے حرام کی زندگی میں منہ مارتے رہیں۔""

""یہ لڑکا نہیں سمجھے گا' میں بتا رہا ہوں۔"" منشی نے سر پیٹ لیا۔

""کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا اچھو۔"" ماں نے اس کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ ""ہمیں اس مٹی اور رشتے ناتوں سے چمٹے رہنے کا کیا فائدہ جو ہمارا بیٹا ہی نہ رہا۔""

""یہ عورت تو موقع ملتے ہی ٹانگ اڑا دیتی ہے ناقص العقل مخلوق۔"" منشی چلایا۔

""ہمارے بیٹے کو کیوں کچھ ہونے لگا؟ جو یہ اکڑفوں چھوڑ کر پیر صاحب کا حکم ماننے لگے تو کچھ نہیں ہوگا اسے۔""

""ابا جی! مجھے افسوس ہونے لگا ہے کہ جن ہاتھوں نے میری شخصیت کی تعمیر کی' وہ ایک ایسے شخص کے ہاتھ ہیں' جس کی اپنی کوئی شخصیت ہی نہیں۔ میں تو خواہ مخواہ ہی فخر کرتا رہا آپ پر۔ آپ کو یہ گاؤں' یہ مٹی' اس سے بندھے سب رشتے اور حویلی سے ملنے والے سب جائز و ناجائز انعام مبارک ہوں۔ میں بھی کوئی نیک اور پرہیزگار شخص نہیں ہوں' بلکہ میرے گناہ شاید میری نیکیوں سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ یہ بھی بہت بڑا گناہ ہے کہ میں برائی کا راستہ نہیں روک سکا۔ میں انسان ہوں اور میری مٹی میں گناہ اور ثواب دونوں گندھے ہوئے ہیں' لیکن مجھے بہرحال فرشتوں نے سجدہ کیا تھا اور ایک سجدے کا حق نبھانے کے لیے میں اس گندگی میں مزید نہیں رہ سکتا۔

اور اسی لیے اگر آپ یہاں سے نہیں جائیں گے تو بھی میں یہاں سے ضرور جاؤں گا' یہ میرا فیصلہ ہے۔""

☆======☆======☆

""کیسے مولوی صاحب! آپ کیسے تشریف لائے؟"" پیر صاحب گول کمرے میں داخل ہوئے۔

""پیر صاحب! آج یہاں آنے کی دو وجوہات ہیں۔""

''کہیے۔''

''میں تنہائی میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے کن انکھیوں سے دست بستہ کھڑے ملازمین کی جانب دیکھا۔

''یہ اپنے ہی لوگ ہیں آپ بالکل فکر نہ کریں۔''

''پیر صاحب! میں آپ سے بہت عاجزانہ درخواست کر رہا ہوں کہ آج ہونے والی گفتگو میں کسی کے سامنے نہیں کر سکتا۔''

''ہوں۔''

چند لمحے سوچنے کے بعد انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ملازمین کو باہر نکل جانے کا حکم دیا۔

''اب کہیے۔''

''سب سے پہلے تو چھوٹے شاہ صاحب کی نسبت طے ہو جانے کی مبارکباد قبول کیجیے۔''

''بہت شکریہ' جلد ہی آپ تاریخ طے ہو جانے کی خوش خبری بھی سنیں گے۔''

''مجھے اس مبارک گھڑی کا شدت سے انتظار ہے ویسے تو میری چھوٹے شاہ صاحب سے زیادہ ملاقات نہیں ہوئی' لیکن جب بھی ہم ملے ہیں' ان سے مل کر بہت خوشی محسوس ہوئی ہے۔ سارا گاؤں ان کی تعریف کے قصیدے پڑھتا ہے۔''

''شاید اس لیے کہ ابھی وہ زمینوں کے معاملے سے دور ہے۔'' پیر صاحب مسکرائے۔''ہم جانتے ہیں کہ گاؤں والے رجب علی کی سختی سے کچھ خوفزدہ رہتے ہیں' لیکن زمینوں کے سب معاملات ہم نے اس کے سپرد کر دیئے ہیں۔ اب وہ انہیں جیسے چلانا چاہے ہم نہیں پوچھتے ہیں۔ یوں بھی یہ سب کچھ اسی نے سنبھالنا ہے' جبکہ حیدر علی نہ کسی کے لینے میں ہے نہ دینے میں۔''

''جی درست فرما رہے ہیں آپ۔''

''ویسے ہم چاہتے ہیں کہ حیدر علی بھی زمینوں کے معاملات میں دلچسپی لے' لیکن وہ تو بس اپنے آپ میں مگن رہتا ہے اور پھر رجب علی بھی اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ساری ذمہ داریاں اس نے اپنے کندھوں پر لے رکھی ہیں۔ جب انسان پر اتنی ذمہ داریاں ہوں تو مزاج میں سختی آ جاتی ہے۔''

''بجا فرمایا آپ نے...... شادی کے بعد جب ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی تو چھوٹے شاہ صاحب خود ہی اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔''

''اور کہیے گھر میں سب خیریت ہے ناں' کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''اللہ تعالیٰ کا بہت احسان ہے اور پھر آپ کی بھی بہت عنایت ہے' مجھے تو کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی اور ہر چیز گھر میں آ جاتی ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا پھر قدرے توقف سے بولے۔

''آج میں بہت مشکل بات آپ سے کہنے آیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے بیان کروں؟''

''مشکل؟ کیسی مشکل درپیش ہے آپ کو؟ دیکھیں مولوی صاحب' یہاں کی کوئی بات باہر نہیں نکل سکتی' اس لیے آپ بلا جھجک سب کچھ کہہ دیں۔ کیا کسی بچی کا مسئلہ ہے؟''

''جی مسئلہ تو بچی کا ہے۔'' وہ رک رک کر بولے۔''لیکن میری نہیں گاؤں کی ایک بچی کا مسئلہ ہے۔''

''کہیے کیا مسئلہ ہے؟''

''پیر صاحب! میں حویلی کی عزت و آبرو کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں' لیکن آج میرے کان میں ایک ایسی بات پڑی ہے کہ میں دہل کر رہ گیا ہوں۔ میری دعا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہو' لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر دعا قبول نہیں ہوا کرتی۔''

پیر صاحب کے چہرے پر تناؤ کے آثار پیدا ہو گئے۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں' کھل کر کہہ دیں۔''

''میری زبان لڑکھڑا رہی ہے۔''

''ہم آپ کو حکم دیتے ہیں مولوی صاحب کہ جو کچھ کہنے کے لیے آپ آئے ہیں' وہ کہہ دیں۔'' پیر صاحب نے اپنے مخصوص حکمیہ انداز میں کہا' جس کا مطلب تھا کہ اب مزید انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

مولوی صاحب نے گہری سانس لی اور سر جھکا کر بولے۔

''کل رات گاؤں کی ایک بچی اغوا ہوئی تھی۔ تقریباً اسی طرح جیسے پچھلے دنوں نسیم اغوا ہوئی تھی۔''

''گاؤں کی بچی اغوا ہوئی تھی؟ کون سی بچی۔ ہم تک تو کوئی اطلاع نہیں پہنچی۔'' پیر صاحب بولے۔''اور نسیم کا تو سب کو علم ہے کہ وہ اغوا نہیں ہوئی تھی اور اگر ہوئی بھی تھی تو اس میں کچھ اس کی اپنی مرضی بھی شامل تھی۔''

''میرے پاس مصدقہ اطلاع ہے کہ نسیم کو بھی اس کی مرضی کے بغیر اغوا کیا گیا تھا اور کل جنت بی بی کو بھی اس کی مرضی کے بغیر ہی اغوا کیا گیا تھا۔''

''ہوں۔'' پیر صاحب نے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا۔

''اور اس اغوا کے سلسلے میں بہت اونچا نام لیا جا رہا ہے۔''

پیر صاحب کچھ بولے بغیر منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''لوگ اونچی آواز میں وہ نام لینے سے کترا رہے ہیں کیونکہ انہیں بہت دھمکیاں ملی ہیں۔

سارا گاؤں خوفزدہ ہے اور کچھ کہنے پر تیار نہیں' یہاں تک کہ جنت بی بی کے گھر والوں نے بھی چپ سادھ لی ہے' لیکن کسی کو تو آگے بڑھنا ہے تاکہ آئندہ کے لیے یہ سلسلہ منقطع ہو سکے۔

پیر صاحب! میں بھی بیٹیوں والا ہوں اور اس قدر طاقتور نہیں ہوں کہ ان کی حفاظت کا دعویٰ کر سکوں جو آج جنت پر بیتی ہے' کل کو اس آگ کی تپش سے میرا گھر بھی جل سکتا ہے' گاؤں کا کوئی بھی گھر جل سکتا ہے کیونکہ ہمارے جھونپڑوں کی دیواریں حویلی کی دیواروں کی طرح نہ تو اونچی ہیں اور نہ ہی مضبوط۔''

''اپنی گفتگو میں حویلی کا تذکرہ مت کریں مولوی صاحب ہم کسی کی گفتگو میں بھی یہ بات برداشت نہیں کر سکتے۔'' پیر صاحب نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے تحمل سے کہا۔

''اور اپنی بات جاری رکھیے۔''

''معاف کیجیے' لیکن اب کیا بات جاری رکھی جا سکتی ہے پیر صاحب! کیونکہ جو اونچا نام سارے گاؤں میں سرگوشیوں کی صورت میں لیا جا رہا ہے وہ اسی حویلی کے ایک فرد کا نام ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' پیر صاحب اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکے۔

''کس میں اتنی جرأت ہے کہ وہ اس قبیح فعل کو اس حویلی کے ساتھ منسلک کرے؟ ہم نے آپ کو بہت عزت دی ہے' لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم آپ کو حویلی پر کیچڑ اچھالنے کی اجازت بھی دے دیں۔''

''آپ مجھے غلط سمجھے ہیں پیر صاحب! میں خدانخواستہ حویلی پر کیچڑ اچھالنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو صرف آپ کو وہ وقت یاد دلانے آیا تھا' جب ایک عام مسلمان خلیفۂ وقت کو بھی عدالت میں کھینچ کر لا سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ایک یہودی نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام لگایا تھا تو قاضی نے انہیں بھی کٹہرے میں طلب کیا تھا اور انہوں نے بھی اپنا دفاع ایک عام مسلمان کی طرح کیا تھا لیکن ایسا وہی عظیم انسان کر سکتا ہے جس کے ہاتھ صاف ہوں۔

پیر صاحب! ہم تو ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہیں۔ آپ اہل بیت میں سے ہیں' میں تو اتنا چاہتا ہوں کہ آپ اس سنت پر عمل کریں۔ غیر جانبدارانہ تحقیق کرائیں۔ یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ اصل مجرم چھپ سکے۔''

''کیا گاؤں والے حیدر علی کا نام لے رہے ہیں؟''

''نہیں' بڑے شاہ صاحب کا!''

پیر صاحب کے چہرے پر بے یقینی کی سی کیفیت پیدا ہوئی پھر قدرے توقف سے بولے۔

''جو کچھ آپ نے ہمیں پڑھانے کی کوشش کی ہے یہ سبق ہمارے ہی اجداد کا ہے اور اسے بہت پہلے پڑھ چکے ہیں' آپ جا سکتے ہیں۔''

''ایک آخری درخواست کروں گا پیر صاحب۔'' مولوی صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

''کیجیے۔''

''میں بہت کمزور آدمی ہوں اور کسی طرف سے پڑنے والا دباؤ بھی برداشت نہیں کر سکوں گا۔''

''آپ بے فکر رہیں' اب یہ معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے' آپ اسے بھول جائیں۔ اب اس سلسلے میں ہونے والی تحقیق میں ہم آپ کو زحمت نہیں دیں گے۔''

''بہت بہت شکریہ پیر صاحب۔''

☆======☆======☆

''جاؤ جاؤ دونوں ماں بیٹے چلے جاؤ۔ میری زندگی میں کچھ تو سکھ چین کے دن آئیں گے۔'' منشی ان دونوں کو سامان باندھتے دیکھ کر چلا رہا تھا۔

''سارا مغز تو یہ دونوں چٹ کر گئے میرا۔ جب دیکھو چخ چخ جب دیکھو بک بک۔ کچھ تو زندگی اچھی گزرے گی میری۔''

لیکن منشی کے تمام تر گولہ بارود کے جواب میں وہ دونوں خاموشی اختیار کیے سامان باندھتے گئے۔

''جب کما کما کر کھلانا پڑے گا تو نانی یاد آ جائے گی۔'' وہ پھر چلایا۔

''پر بتا دوں' نانی کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جس عورت نے زندگی میں کسی کو کوئی فائدہ نہ دیا ہو اب مرنے کے بعد کسی کو کیا فائدہ دے گی۔''

''بیٹا! نانی کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو نقصان بھی نہیں ہوگا۔'' اب ماں بھی میدان میں اتر آئی۔

''کہیں غلطی سے کسی دن گھبرا کر دادی کو نہ یاد کرنے لگنا۔ بھوت بن کر چمٹ جائے گی تم سے اس کی بدروح۔''

''خبردار جو میری ماں کے متعلق ایک بھی الٹی سیدھی بات کی تو...... زبان کھینچ لوں گا۔''

ماں کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ اچھو نے منہ پر ہاتھ رکھ کر چپ کرا دیا۔

''میری ماں کے ساتھ تو اس عورت کو خدا واسطے کا بیر تھا۔'' منشی کے ہاتھ نیا موضوع لگ گیا۔

''کبھی جو سکھ کا سانس لینے دیا ہو اس غریب کو بالآخر مار ہی چھوڑا اسے' پر چین پھر بھی نہیں آیا۔

روٹی پکا کر دی تو کبھی کچی کبھی جلی ہوئی۔ سالن میں نمک ہمیشہ تیز کر دیا۔ کپڑے دھونے کی باری آئی تو اپنے دھو کر الگ ہو گئی۔ جھاڑو لگائی تو صرف اپنے کمرے میں' گھلا گھلا کر مار دیا اس بے چاری عورت کو۔''

"میرا منہ نہ کھلواؤ اچھو کے ابا' کبھی جو میں گننے بیٹھ گئی تمہاری ماں کے کرتوت تو گاؤں بھر میں منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی ہاں۔"

اچھو نے پھر ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اماں! ابا ہمیں لڑ بھڑ کر الجھانا چاہتے ہیں تاکہ ہم یہیں رک جائیں اور شہر نہ جا سکیں۔ آپ خواہ مخواہ ان کی باتوں میں آتی ہیں' چلیں اب جلدی سے تیار ہو جائیں۔"

"ہونہہ......" اچھو کے منہ پر سے ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی کہ اماں نے بغیر کوئی بات کیے صرف صوتی اثرات دے کر منشی کی ساری باتوں کو ملیا میٹ کر دیا اور مڑ کر کپڑے بدلنے کمرے میں چلی گئی۔

"میں کہتا ہوں رک جا...... ورنہ پچھتائے گی۔ بیٹا سونے کا تاج بھی تیرے سر پر رکھ دے پر میں جو تیرا اصلی سرتاج یہیں رہ گیا تو سونا چاندی بھی تجھے کچھ نہیں دے گا۔" منشی چلایا۔

"ایسے بوسیدہ اور مغز چاٹنے والے تاج کو سر پر سجا کر کیا کروں گی میں' تم اس گھر میں سکھ چین سے رہو۔ نہ میری اور نہ میرے بیٹے کی بک بک' جھک جھک' چخ چخ...... اب تو مزے میں رہو گے۔" ماں نے کمرے سے نکلتے ہوئے تیر واپس پھینکا۔

"چلیں ماں؟" وہ نکل آئی تو اچھو نے سامان اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"چل بیٹا۔"

ابھی وہ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر باہر نکلنے لگے تھے کہ منشی تہبند سنبھالتے ہوئے بھاگا آیا۔

"جب تم دونوں ہی جا رہے ہو تو میں یہاں کس کے لیے رہوں گا؟"

☆======☆======☆

مولوی صاحب کی باتوں نے پیر صاحب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی ان کے کسی بیٹے پر ایسا الزام بھی لگا سکتا تھا۔ اضطراب کی کیفیت میں وہ کمرے کے اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگے۔

"ہمارا بیٹا' وہ بھی رجب علی' ایسی حرکت نہیں کر سکتا' کسی صورت نہیں۔"

انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ان کی نگاہ دروازے سے جھانکتے ہوئے سخاوت علی پر پڑی۔

"باہر کیوں کھڑے ہو بیٹا' اندر آ جاؤ۔"

سخاوت مسکراتے ہوئے اندر آ گیا' لیکن پیر صاحب کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی دیکھ کر اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔

"کچھ ڈھونڈ رہے تھے بیٹا؟"

"بڑے بھائی جان کو تلاش کر رہا تھا۔"

"ہوں۔" انہوں نے پُرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹھو بیٹا! اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ ہمیں تم سے کچھ کام تھا۔"

"حکم دیجیے بابا جان۔"

پیر صاحب کے بیٹھنے کے باوجود بھی وہ مؤدبانہ انداز میں کھڑا رہا۔

"بیٹھ جاؤ سخاوت۔" انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

سخاوت منتظر نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

"ایک بات کا بالکل سچ سچ جواب دینا۔"

"جی۔" وہ کچھ نہ سمجھا۔

"تمہیں رجب علی سے زیادہ پیار ہے یا حیدر علی سے؟"

سخاوت کے لیے یہ سوال بہت عجیب سا تھا۔

"یہ تو بہت مشکل سوال ہے بابا جان! مجھے تو دونوں سے ہی بے حد پیار ہے۔"

"خوب سوچو' یقیناً کوئی ایک تمہیں سب سے زیادہ پیارا ہے۔"

سخاوت کتنی دیر تک سوچ میں گم رہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا بابا جان! مجھے تو دونوں سے یکساں پیار ہے' لیکن میرا خیال ہے کہ بڑے بھائی جان مجھے علی بھائی کی نسبت زیادہ چاہتے ہیں۔"

"یہ کیسے اندازہ لگایا تم نے؟"

"وہ مجھے اپنے ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔ ہر قسم کا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے بتاتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ میری ہر بات میں دلچسپی لیتے ہیں جبکہ علی بھائی ایسا نہیں کرتے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ علی ایسا کیوں نہیں کرتا؟"

"وہ کہتے ہیں کہ اس طرح میری اپنی شخصیت کبھی نہیں بن سکے گی بلکہ میں اس شخص کی عادات میں ڈھلتا جاؤں گا' جو ہر وقت مجھے خود سے نتھی رکھے گا۔"

لیکن بابا جان مجھے علی بھائی سے اتفاق نہیں ہے۔ یوں بھی بڑے بھائی جان اتنے اچھے ہیں کہ اگر میں ان کی عادات میں ڈھلتا جاؤں تب بھی یہ کوئی برائی کی بات نہیں ہو گی۔ ویسے بھی ایک جیسی عادات والے افراد زیادہ دور تک ایک ساتھ چل سکتے ہیں اور ہمیں تو مرتے دم تک اکٹھے رہنا ہے۔"

"بہت خوب۔" پیر صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ہمارا سیروں خون بڑھ گیا ہے تمہاری باتیں سن کر۔"

"شکریہ!" وہ مسکرایا۔

"یہ بتاؤ کہ کل شام بھی تم رجب علی کے ساتھ تھے؟"

"جی، شام کو وہ مجھے شطرنج کھیلنا سکھا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ جس طرح شطرنج کی بساط سجائی جاتی ہے' ہوبہو ویسے ہی میدان جنگ کو بھی ترتیب دیا جاتا ہے۔"

"تم کتنی دیر تک رجب علی کے ساتھ تھے؟"

"پوری شام ہم اکٹھے ہی تھے۔ بھائی جان نے بہت سی بازیاں مجھے ہرائی تھیں اور برابر سمجھاتے گئے تھے کہ میں نے کہاں کیا غلطی کی تھی۔"

"ہوں......اور وہ کب تمہارے پاس سے اٹھا تھا؟"

"خیر تو ہے ناں بابا جان؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"بالکل خیر ہے بیٹا! ہم نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟"

"تقریباً ساڑھے سات بجے کا وقت تھا جب وہ میرے پاس سے یہ کہہ کر اٹھے تھے کہ علی بھائی کے پاس جا رہے ہیں۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں کچھ دیر تک خود ہی شطرنج کھیلتا رہا پھر کھانا کھا کر سو گیا۔"

"اچھا بیٹا! اب تم جاؤ' لیکن کسی ملازم سے کہہ کر علی کو میرے پاس بھجوا دو۔"

"جی بہتر بابا جان۔"

تھوڑی دیر میں حیدر علی ان کے روبرو تھا۔ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ شاید رجب علی نے ان سے گوری کے سلسلے میں بات کی تھی' اس لیے ذہنی طور پر وہ اس موضوع پر گفتگو کے لیے تیار تھا۔

"آپ نے یاد فرمایا بابا جان؟"

"ہوں' بیٹھو۔"

"شکریہ۔" وہ بیٹھ گیا۔

"آج ہم بہت پریشان ہیں۔"

وہ بولے' لیکن حیدر علی خاموش رہا۔ اس کا خیال تھا کہ پریشانی کا سلسلہ شاید اس کی شادی کے مسئلے تک جا پہنچے گا۔

"اپنے ایسے بیٹے کے خلاف تحقیق کرنا جو جان سے بھی پیارا ہو' بہت مشکل کام ہے۔"

"کیسی تحقیق بابا جان؟" اس نے بات کو آگے بڑھانا چاہا۔

"ہم اس وقت تمہیں زحمت نہ دیتے' اگر مسئلہ اہم نہ ہوتا۔ یوں بھی تمہیں ہماری پریشانیوں سے کچھ سروکار نہیں ہے' لیکن مجبوری کے تحت ہمیں تمہیں یہ زحمت دینا پڑی۔"

"مجھے بہت افسوس ہے بابا جان!" حیدر علی شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا۔

"میں نے آپ کو دکھ دیئے ہیں' لیکن میں بھی مجبور ہوں مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔"

"بس' بس ہم ان باتوں کو دوبارہ چھیڑنا نہیں چاہتے۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہمیں یہ بتاؤ کہ کل رجب علی رات کے وقت تمہارے پاس آیا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"کس وقت اور کتنی دیر تک بیٹھا رہا؟"

"شاید ساڑھے سات بجے یا اس سے کچھ اوپر کا وقت ہو گا اور وہ زیادہ دیر تک رکے بھی نہیں تھے۔"

"ہوں۔" انہوں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اب ہم تم سے جو کچھ پوچھیں گے اس کا جواب سوچ سمجھ کر سچ سچ جواب دینا۔"

حیدر علی کو کچھ اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ اس قسم کے سوالات کا مقصد کیا ہے۔

"کیا رجب علی کسی لڑکی کو اغوا کر سکتا ہے؟"

حیدر علی چند ثانیے کے لیے سناٹے میں رہ گیا۔

"تم اس کے بھائی ہو اور اس کی ذات کے ان پہلوؤں سے بھی واقف ہو گے جن سے ہم واقف نہیں ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا بابا جان؟"

"صرف اس سوال کا جواب دو جو ہم نے تم سے پوچھا ہے۔"

حیدر علی سوچ میں گم ہو گیا۔ 'ہاں اور نہیں' دونوں الفاظ کہہ دینے بہت مشکل تھے۔ 'ہاں' اس لیے کہ بابا جان کی نظر میں اسے اپنے بھائی کی تذلیل گوارا نہیں تھی اور یہ ایک لفظ اتنا فتنہ فساد برپا کر سکتا تھا' کہ حویلی کے در و دیوار ہل کر رہ جاتے اور 'نہیں' اس لیے کہنا مشکل تھا کہ جھوٹ بولتے وقت اس کی آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔

"کیا رجب علی کسی لڑکی کو اغوا کر سکتا ہے؟" پیر صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔

اور اسی سوال میں حیدر علی کو جائے پناہ مل گئی۔

"نہیں۔" اس نے بلا تامل کہا۔

صرف اس لیے کہ رجب علی نے کبھی کوئی لڑکی خود اغوا نہیں کی تھی اور نہ ہی وہ کر سکتا تھا۔ جب اتنے ملازمین موجود تھے تو اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ خود یہ کام کرتا جبکہ بابا جان نے پوچھا تھا کہ "کیا رجب علی کسی لڑکی کو اغوا کر سکتا ہے؟" اگر وہ "کر سکتا ہے" کے بجائے "کروا سکتا ہے" پوچھتے تو شاید حیدر علی کے لبوں کی خاموشی نہ ٹوٹتی۔

حیدر علی کے "نہیں" کہتے ہی پیر صاحب نے سکون کی ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔ کسی ملازم سے کہہ کر رجب علی کو ہمارے پاس بھیجو۔"

"جی بہتر۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیر صاحب کی باتوں سے اسے یہ احساس تو ہو گیا تھا کہ کل رجب علی جس لڑکی کا حوالہ دے رہا تھا' اس کی کوئی خبر بابا جان تک پہنچ گئی ہے' لیکن اس سے زیادہ کا اسے کچھ علم نہیں تھا۔ کسی ملازم کو کہنے کے بجائے وہ خود ہی رجب علی کی تلاش میں نکل گیا۔ ایک ملازم سے دریافت کرنے پر پتا چلا کہ وہ اس وقت اپنے پورشن میں ہے۔ یاسمین بھابی کی ملازمہ کو پیغام دے کر اس نے اندر بھیجا اور خود رجب علی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں رجب علی باہر آ گیا۔

''تم نے مجھے بلایا؟''

''میں نے نہیں بابا جان نے آپ کو یاد کیا ہے۔'' وہ بولا۔

''کہاں ہیں بابا جان؟''

''وہ گول کمرے میں ہیں' لیکن ان کے پاس جانے سے قبل آپ میری بات سن لیں۔''

''کہو۔''

حیدر علی نے اردگرد دیکھا' لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ یوں بھی جس جگہ رجب علی موجود ہوتا تھا۔ خاص ملازمین کے علاوہ اس جگہ کے قریب جانے سے سب ہی کتراتے تھے۔

''کیا کل ڈیرے پر واقعی کوئی لڑکی تھی؟''

''تمہیں شک ہے؟'' وہ مسکرایا۔ ''لیکن میری آفر آج صبح تک تھی اور اب دوپہر ہونے والی ہے' اس لیے اب وہ آفر ختم ہو چکی ہے۔ ہاں تم چاہو تو آج نیا انتظام کر دیتے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' اس نے خود پر ضبط کیا۔

''میرا خیال ہے بابا جان تک اس بات کی اطلاع پہنچ چکی ہے اور وہ تفتیش کر رہے ہیں۔''

''ہوں۔'' اس نے پُر خیال انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے تم بے فکر رہو...... میرے خلاف کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔''

''وہ لڑکی آپ کے خلاف بیان دے سکتی ہے۔''

''تو میری بیوی میرے حق میں بیان دے دے گی۔'' رجب علی نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

''بیوی کا یہ فائدہ تو ہوتا ہے ناں بلکہ میرے خیال میں بیوی کا یہ ایک ہی فائدہ ہوتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ' مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

☆======☆======☆

پیر صاحب نے مولوی صاحب کے علاوہ گاؤں کے معززین کو طلب کر لیا تھا۔ رجب علی بھی ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''آج ہم نے ایک بہت سنجیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔'' پیر صاحب کہنے لگے۔

''گاؤں کے ایک بہت معزز فرد نے سیّد رجب علی شاہ کے خلاف ایک انتہائی سنگین الزام لگایا ہے۔ یہ الزام ایک بچی کے اغوا کے بارے میں ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ وہ بچی یہاں آ کر تماشہ بنے' اس لیے ہم نے اس کے بجائے اِس کے گھر کے مرد حضرات کو بھی یہاں بلا لیا ہے۔ اس وقت دونوں فریقین یہاں موجود ہیں ہم چاہیں گے کہ اس واقعے کے متعلق آپ لوگوں کو جو بھی بات معلوم ہو جائے' وہ بلا جھجک اور بلا کم و کاست بتا دیں۔''

ان کی بات کے جواب میں سب خاموش رہے' کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ رجب علی کی موجودگی میں اس کا نام لے سکتا۔ اس کی آنکھیں وہاں موجود لوگوں کو یہ بتا دینے کے لیے کافی تھیں کہ اپنے خلاف کھلنے والی ہر زبان کو وہ بآسانی بند کر سکتا تھا۔ سو عافیت اسی میں تھی کہ چشم پوشی اختیار کر لی جاتی اور سب نے یہی کیا۔

پیر صاحب نے ایک ایک سے پوچھا' لیکن سب نے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ جنت بی بی کے گھر والوں نے بھی اس واقعے کی تردید کر دی۔

صرف ایک شخص ایسا تھا' جس نے اپنی کہانی پہلے کی طرح دہرائی تھی اور وہ تھا ماسی بیداں کا لڑکا گلا۔ وہ اب بھی مُصر تھا کہ آپا جنت پر چاچا شکورے نے کھیس ڈالا تھا اور آپا جنت چیخی چلائی بھی تھی۔

''حضور بچہ ہے پتا نہیں کیا خواب دیکھ لیا ہوگا۔'' لوگوں نے کہا۔ ''ورنہ ہم جانتے ہیں کہ شکورے نے یہ نہیں کیا۔''

''رجب علی۔'' پیر صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کل شام سے صبح تک تم کہاں تھے؟''

''کل شام پہلے ہم سخاوت کے ساتھ تھے پھر حیدر علی کے پاس چلے گئے' اس کے بعد صبح تک ہم یہیں حویلی میں تھے۔'' وہ بولا۔ ''اور آپ کسی سے بھی اس کی تفتیش کروا سکتے ہیں۔''

''سخاوت اور حیدر اس بات کی تصدیق کریں گے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی بابا جان۔'' ان دونوں نے تصدیق کی۔

''اب ایک آخری گواہی رہتی ہے۔ ویسے تو آپ سب زبان سے مان چکے ہیں کہ رجب علی بے قصور ہے' لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے دل اس کے بے قصور ہونے کی گواہی دیں' ورنہ یہ شک ساری زندگی کانٹے کی طرح ہمارے دل میں پیوست رہے گی۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''اگر تو ہماری بہو بیگم نے کہہ دیا کہ رجب علی بے قصور ہے تو اعتراض اور شک کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ گو کہ ہمارے گھرانے کی بہو بیٹیوں کا پردہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ان کی آواز بھی کوئی غیر محرم شخص سنے' لیکن چونکہ آپ میں سے ہی ایک شخص نے ہمیں اہل بیت کی نسبت کا حوالہ دے کر ہم سے انصاف طلب کیا تھا' اس لیے اپنے جذبات کو دبا کر ہم اپنی بہو بیگم

نے اس بات کی تصدیق یا تردید آپ لوگوں کی موجودگی میں کرائیں گے' وہ پردے کے پیچھے رہ کر اپنا بیان دیں گی۔"

"بابا جان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" رجب علی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"آپ وہاں کمرے میں جا کر خود ان سے پوچھ لیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے' لیکن پردے کے پیچھے ہی سہی' ان کا یہاں آنا انتہائی غیر مناسب بات ہے۔"

"یہ ہمارا حکم ہے رجب علی' ہماری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے' آج ہیں' کل نہیں ہوں گے' لیکن جاتے جاتے ہم اپنا اجلا دامن میلا نہیں کر سکتے۔ کیا جواب دیں گے ہم اپنے ان بزرگوں کو جنہوں نے عدل و انصاف کی اعلیٰ روایات قائم کی تھیں۔ تم تو اس وقت مجرموں کے کٹہرے میں ہو اور تمہیں اس قسم کی بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"گستاخی معاف بابا جان! جب بڑے بھائی جان پر کسی نے کوئی الزام لگایا ہی نہیں ہے' یہاں تک کہ جنت بی بی کے والدین کے مطابق یہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا تو پھر اتنا آگے بڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟" حیدر علی نے مداخلت کی۔

"اس تصدیق یا تردید کی ضرورت تو تب پڑتی جب اس بات کی افواہ سے زیادہ کوئی حیثیت ہوتی۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ جرم ہوا ہی نہیں ہے تو پھر تفتیش کس چیز کی ہو رہی ہے؟ ایک شخص نے اپنے آپ کچھ گھڑ کے یا اڑتی اڑتی کوئی بات سن کر ان پر الزام لگا دیا' لیکن ثابت کیا ہوا؟ کچھ نہیں۔ یہ تک تو ثابت نہیں ہو سکا کہ کل کوئی لڑکی اغوا ہوئی تھی۔"

"درست فرما رہے ہیں چھوٹے شاہ صاحب۔" بہت سے لوگوں نے بآواز بلند حیدر علی کی بات سے اتفاق کیا۔

"پیر صاحب! یہ بات ہمارے لیے بھی تکلیف دہ ہے کہ بہو بیگم یہاں تشریف لائیں۔" ایک بزرگ نے کہا۔

"گویا آپ لوگ مطمئن ہیں کہ ایسی کوئی بات سرے سے وقوع پذیر ہی نہیں ہوئی؟" پیر صاحب نے سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی ہاں۔" تقریباً سب نے کہا۔

"اور اب اس الزام پر مزید تحقیق کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

"جی بالکل۔"

"اور یہ کہ رجب علی بے قصور ہے۔"

"جی بالکل۔"

"یا اللہ تیرا شکر ہے کہ تُو نے ہماری عزت رکھی۔" پیر صاحب کلمہ شکر پڑھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بابا جان گستاخی معاف' پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔" رجب علی نے پوچھا۔

"ہم شکرانے کے نوافل پڑھنے جا رہے ہیں۔"

"لیکن بابا جان معاملہ ابھی ختم تو نہیں ہوا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں ہمارا حق دیا جائے۔"

"کیسا حق؟"

"جس شخص پر غلط الزام لگایا جاتا ہے اسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ الزام کے جھوٹے ثابت ہونے پر وہ الزام لگانے والے پر قذف کا مقدمہ پیش کر دے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح آپ ہمیں بطور ملزم اپنے اور اتنے لوگوں کے روبرو لائے ہیں اسی طرح ہم پر الزام لگانے والے کو بھی بلائیں۔"

پیر صاحب چند ثانیے تک خاموش رہے پھر گویا ہوئے۔ "رجب علی' بات یہ ہے کہ تمہارا یہ حق طلب کرنا غلط نہیں ہے' لیکن ہمارا گھرانہ اتنے اونچے مقام پر کھڑا ہے کہ ہمیں درگزر کرنے کی روایت اپنا لینی چاہیے۔ طاقت رکھتے ہوئے معاف کر دینے والے کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست بنا لیتا ہے۔"

"سبحان اللہ...... سبحان اللہ۔" چاروں طرف سے صدائیں آنے لگیں۔

پیر صاحب کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے گاؤں کے افراد بھی انہیں سلام کر کے باہر چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف رجب اور حیدر علی ہی موجود تھے۔

"یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔" حیدر علی نے سگریٹ سلگا لیا۔

"کیا اچھا نہیں ہوا؟" رجب علی نے یوں کہا جیسے اسے کچھ علم ہی نہ ہو۔

"آپ جانتے ہیں کہ میرا اشارہ کس بات کی طرف ہے۔"

"تمہارے نزدیک اچھا ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یعنی یہ کہ یہاں موجود سب لوگ میرے خلاف گواہی دیتے۔"

"نہیں میرے نزدیک اچھا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہی نہ ہوتی۔"

"یہ تو ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ بابا جان کی نگاہوں میں میری قدر و منزلت میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں آئی اور یہ بھی اچھا ہوا کہ گاؤں والے میری آنکھوں کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ آئندہ وہ چوں کرنے کی حماقت بھی نہیں کریں گے۔ ویسے حقیقت تو تم بھی جانتے تھے اور جانتے بوجھتے ہوئے بھی تم نے میرا ساتھ دیا تو کیا یہ بہت اچھا تھا۔"

"نہیں اچھا تو یہ بھی نہیں تھا' لیکن ساتھ میں نے آپ کا نہیں' بھابی کا دیا ہے۔ جانتا

ہوں کہ ان کے لیے حویلی کے اندرونی حصے سے یہاں تک آنا پل صراط سے گزرنے کے برابر ہو گا اور پھر باآواز بلند جھوٹ بولنا' نہیں وہ یہ سب نہیں کر سکتیں اور میں انہیں اس تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار کرنا نہیں چاہتا اس لیے میں نے جو کچھ کہا' وہ آپ کی نہیں اپنی بھابی کی وجہ سے تھا۔''

رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''اپنی بھابی کا خیال رکھنے کا شکریہ۔''

☆======☆======☆

گول کمرے سے نکل کر حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھتے ہوئے بھی پیر صاحب کے ذہن میں رہ رہ کے گُلّے کے الفاظ کانٹوں کی صورت میں چبھ رہے تھے۔ گاؤں کے سارے لوگوں کی گواہی کے بعد محض ایک چھوٹے سے بچے کی بات کو سب کی بات پر فوقیت دینا کسی طرح مناسب نہیں تھا' لیکن وہ بچہ اتنی سختی سے اپنے مؤقف پر قائم تھا کہ اس کی بات کو یک دم رد کر دینا بھی ممکن نہیں تھا۔

شکرانے کے نوافل ادا کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ حویلی کے اس پورشن کی طرف بڑھے جو رجب علی اور یاسمین کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اندر اطلاع بھجوانے کے تھوڑی ہی دیر بعد یاسمین خود دروازے پر نمودار ہوئی۔

''بابا جان آپ! آپ نے کیوں زحمت کی' مجھے بلوا لیا ہوتا۔''

''بیٹیوں کو بلایا نہیں جاتا' ان کے پاس خود چل کر جایا جاتا ہے۔'' وہ بولے۔

''آئیں اندر تشریف لائیں۔'' وہ انہیں اندر لے آئی۔

''یہاں ہماری بیٹی کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''نہیں بابا جان!'' وہ سر جھکا کر بولی۔ ''میں بہت خوش ہوں۔''

''رجب علی سے کوئی شکایت؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''ہم آپ سے ایک سوال کا جواب لینے آئے ہیں۔''

''مجھ سے؟'' یاسمین نے حیرت سے پلکیں اٹھائیں۔

''ہاں آپ سے' لیکن ہمیں اپنے سوال کا بالکل سچا جواب چاہیے۔''

''پوچھیے بابا جان! میں اپنے علم کی حد تک آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔''

''کیا کل رات رجب علی گھر پر تھا۔''

یاسمین کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ پیر صاحب کو بغور اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے گھبراہٹ میں اپنی نظریں جھکا لیں۔

''جی۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''ہمیں سچ جواب چاہیے۔''

''جی بابا جان! یہی سچ ہے۔'' اس نے بے چینی سے انگلیاں مروڑیں۔

''لیکن ہمیں ملازمین نے کہا تھا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔'' انہوں نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

یاسمین کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا' لیکن بولی کچھ نہیں۔

''رات کو ہم نے اسے طلب کیا تھا' اس وقت وہ کہاں تھے؟''

ان کا سوال پوچھنے کا انداز اتنا قطعی تھا کہ یاسمین کے لیے خاموش رہنا ممکن نہیں رہا۔

''یہ ضروری تو نہیں بابا جان کہ کوئی گھر پر نہ ہو تو وہ کسی غلط جگہ پر ہی گیا ہو گا۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔ ''ویسے وہ زیادہ دیر کہیں باہر نہیں رہے تھے۔ ہم نے کھانا بھی اکٹھے کھایا تھا۔''

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی' اس کا لہجہ اس بات کی تائید نہیں کر رہا تھا۔

''ہوں' شوہر کی پردہ پوشی اچھی بات ہوتی ہے لیکن اس حد تک پردہ پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ اپنے گھر کی بنیادیں ہی کمزور ہونے لگیں۔'' پیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہم صرف آپ کے تایا یا سسر ہی نہیں ہیں' آپ کے والد کو بھی ہم نے اپنے ہاتھوں میں پالا ہے۔ اس گھر پر سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف ہو تو اپنے والد کے پاس جانے سے قبل آپ ہمارے پاس آئیں۔''

پیر صاحب کی بات سن کر یاسمین کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ واضح طور پر انہوں نے یاسمین کا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔

''اب ہم چلتے ہیں' جیتی رہو۔''

ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ چلے گئے لیکن دکھ کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆======☆======☆

شکورا' رجب علی کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔

''گڑبڑ یہ ہوئی کہ لڑکی نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور بات سارے گاؤں میں پھیل گئی۔''

''اس سے تو ہم بعد میں نمٹیں گے۔'' رجب علی بولا۔

''لیکن پہلے اس شخص سے نمٹیں گے جس نے یہ بات حویلی کے اندر پہنچائی۔ وہ صرف ... ہے۔ ہمیں کل شام تک اس شخص کا نام معلوم ہو جانا چاہیے' جس نے یہ بات بابا جان کو ... ہے۔''

''حضور! یہ حرکت تو گاؤں کا کوئی بھی فرد کر سکتا ہے کیونکہ جنت نے چلا چلا کر سب کے آپ کا نام لیا تھا اور سارے گاؤں کو پتا چل گیا تھا۔''

"ہمیں لایعنی قسم کی تاویلیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" رجب علی نے سختی سے کہا۔

"گاؤں میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ یہ بات بابا جان تک پہنچائے۔ ادھر کمرے میں سب نے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ کس میں اتنا جگرا تھا کہ وہ آگے بڑھا۔"

"باقی سب لوگ تو واقعی ڈرتے ہیں۔ ہاں ایک بندہ ہے جس میں بہت اکڑ ہے۔"

"اور وہ کون ہے؟"

"اچھو! ہو نہ ہو یہ کام اسی نے کیا ہے۔ اس پر زیادہ شک کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ منشی اور اپنی ماں کے ساتھ گاؤں چھوڑ گیا ہے۔ منشی میں تو اتنا دم خم ہے نہیں' البتہ اچھو خود کو بہت پھنے خان سمجھتا ہے۔"

"اچھو گاؤں چھوڑ گیا ہے اور منشی بھی چلا گیا ہے؟"

"جی سرکار! آپ کو شاید جلد خبر ہو جاتی منشی کی غیر حاضری کی' اگر صبح صبح یہ فساد نہ ہو جاتے۔"

"اور تم ہمیں اب اطلاع دے رہے ہو۔"

"سرکار میرا قصور نہیں ہے' مجھے خود بھی پانچ منٹ پہلے پتا چلا ہے۔ میں بھی اسی مسئلے میں مصروف تھا۔ اس لیے ان کی غیر موجودگی کا احساس دیر سے ہوا۔" شکورے نے اپنی صفائی پیش کی۔

"ہو نہ ہو یہ اسی کی شرارت ہے اور اب وہ ڈر کر گھر سے بھاگ گیا ہے۔ جاتے ہوئے سرکار کسی سے مل کر بھی نہیں گیا۔"

"لیکن کل تو وہ تمہارے ساتھ تھا جنت کو تم دونوں نے مل کر اٹھایا تھا ناں!"

"جی' جی بالکل۔" وہ جلدی سے بولا۔

اب وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کل اس نے رجب علی کو یہی بتایا تھا۔

"پر سرکار! ساتھ تو وہ تھا ہی میرے' لیکن بہت بکواس کر رہا تھا' بہت سبق پڑھا رہا تھا مجھے۔"

"سبق تو اسے ہم دیں گے اور ایسا دیں گے کہ لوگ کانپ اٹھیں گے۔ بابا جان کے سامنے اس نے ہماری حیثیت کم کرنے کی جو سازش کی تھی' اس کا اسے ایسا نتیجہ بھگتنا پڑے گا کہ گاؤں کی آنے والی سات نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔" رجب علی نے کہا۔

"اس وقت ہمارے سامنے چند اور ایسے مسائل ہیں جنہیں حل کرنا بہت ضروری ہے' ان کے بعد اچھو کو بھی دیکھیں گے۔"

"شکر ہے۔" شکورے نے سوچا۔ "کل تک میں بندہ کہاں سے تلاش کرتا۔ یہ تو اچھا ہوا اچھو گاؤں چھوڑ کر گیا تو پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا ورنہ یہی پھندا میری اپنی گردن پر ہوتا۔"

☆======☆======☆

"بی بی! اچھو بھائی آپ کے لیے پیغام دے گئے ہیں۔" حمیدہ نے زیب النساء سے کہا۔ آئینے کے سامنے بیٹھی اپنا جائزہ لیتے ہوئے زیب النساء اٹھ کر مسہری پر آ بیٹھی۔

"کیا کہا ہے؟" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"وہ آج شہر چلے گئے ہیں۔ منشی اور اس کی ماں بھی اس کے ساتھ ہی ہیں اور وہ کہہ گئے ہیں کہ وہاں کوئی چھوٹا موٹا مکان ڈھونڈ کر وہ جلد ہی واپس آئیں گے۔ تب تک آپ تیار رہنا۔ شاید وہ آئیں بھی اطلاع دیئے بغیر' بس وہ صرف آپ کو لینے آئیں گے اور آپ کو لے کر فوراً ہی واپس چلے جائیں گے۔"

☆======☆======☆

رجب علی کو پیر صاحب نے فوری طور پر لاہور بھجوا دیا تھا۔ حکم یہ تھا کہ وہ حیدر علی کی شادی کی خریداری کر سکے' لیکن حقیقت یہ تھی کہ کچھ عرصے کے لیے وہ اسے گاؤں سے دور رکھنا چاہتے تھے تاکہ جنت بی بی والا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے۔

رجب علی نے انہیں بہت دکھ پہنچایا تھا' لیکن اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے انہوں نے اس لیے گریز کیا تھا کیونکہ ایک تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ وہ ان کا سب سے پیارا بیٹا اور ان کی گدی کا وارث بھی تھا' لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انہیں اپنے گھرانے کی عزت بہت عزیز تھی۔ جس واقعے سے گاؤں والوں نے لاعلمی ظاہر کی تھی اسے کرید کرید کر اپنے گھرانے کو رسوا کرنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ تو تحقیق اور تفتیش پر بھی اس لیے راضی ہوئے تھے کیونکہ انہیں رجب علی کی بے گناہی کا سو فیصد یقین تھا' لیکن اس نے ان کے اعتماد کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

مولوی صاحب شرمندگی کے مارے منہ سر لپیٹے پڑے تھے۔ ان کی خطا اتنی تھی کہ جو بات کسی کی اور میں ہمت نہیں تھی۔ وہ انہوں نے کہہ دی تھی۔ سب پیچھے ہٹ گئے تھے اور وہ اگلی صف میں تنہا رہ گئے تھے۔

سب سے زیادہ دکھ تو انہیں اس بات کا تھا کہ ان کی بات جھوٹ ثابت ہو جانے کے بعد لوگوں کے خیال میں وہ پیر صاحب کے سامنے اپنی عزت کھو چکے تھے۔

"میں نے تو پہلے ہی منع کیا تھا مولوی صاحب کو۔" اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"کیا ملا سچ بول کر۔ خود جنت کے گھر والوں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ لڑائی میں پڑ کر کیا فائدہ ملا' جوان لوگوں کو اپنی عزت کا احساس نہیں ہے' ہمیں کیا پڑی ہے خیال کرنے کی۔ یہ تو وہی ہوا نا، مدعی سُست' گواہ چست۔"

"لیکن اماں بڑے شاہ صاحب یہ کیسے کر سکتے ہیں؟" زرینہ نے دبے دبے لہجے میں اعتراض کیا۔

"میں بھی یہی سمجھ رہی تھی' لیکن جنت کے گھر جانے کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہو گیا۔ اس کے ماں باپ نے اسے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی تھی' لیکن کھڑکی کی سلاخوں سے جھانک کر میں نے اس کی حالت دیکھی تھی اور تب مجھے یقین آ گیا تھا۔ اس نے خود بھی مجھے بتایا تھا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"لیکن اماں۔"

زرینہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ حقیقتاً پریشان تھی۔ ہر آنے والا دن اس کے اور حیدر علی کے بیچ پھر فاصلے بڑھا رہا تھا' لیکن سب پریشانیوں کے درمیان بھی دور بہت دور امید کی کرن چمک رہی تھی۔ سائیں بابا کے الفاظ اس کے ڈوبتے وجود کے لیے محض تنکے کا سہارا ہی سہی لیکن یہ تنکے کا سہارا بھی بہت تھا۔

☆======☆======☆

زیب النساء اسی وقت بال سکھا کر مسہری پر لیٹی تھی۔

رات بھیگ رہی تھی۔ آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے اچھو سے ملے ہوئے۔

"نہ جانے وہ کب آئیں گے اور مجھے اس قید سے رہائی نصیب ہو گی۔ نہ جانے کب میں کھلی ہوا میں سانس لے سکوں گی۔ زندگی ایک دم بدل جائے گی' رنگ ہی رنگ' خوشبو ہی خوشبو ہر طرف بکھر جائے گی۔ ایک ہفتہ کتنا لمبا ہوتا ہے۔ سات طویل دنوں سے مل کر بنتا ہے اتنے طویل دن جیسے صدیاں ہوں۔"

اچھو سے ہونے والی دو ملاقاتیں اس کی زندگی کا سرمایہ تھیں۔ ان کا ایک ایک لمحہ کسی فلم کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے چلتا رہتا تھا۔ کوئی ایک لمحہ ایک پل بھی ایسا نہیں تھا جب اس کا خیال زیب النساء کے ذہن سے محو ہوا ہو۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ۔" وہ اٹھ بیٹھی۔

اندر داخل ہونے والی حمیدہ تھی۔

"حمیدہ تم؟ اس وقت خیر تو ہے؟"

"بی بی!" وہ اپنے پیچھے دروازے بند کر کے جلدی سے اس کے پاس آئی اور سرگوشی میں

بولی۔ "اچھو بھائی نے آپ کے پاس بھیجا ہے' وہ باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو چلی آئیں۔"

"وہ باہر ہیں؟ مجھے لے جانے آئے ہیں؟" زیب النساء کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ "لیکن اس قدر اچانک۔"

"انہوں نے کہا تو تھا کہ وہ کسی بھی وقت آ جائیں گے بغیر اطلاع دیئے۔ وہ کہہ رہے ہیں جلدی کریں۔ بڑی سڑک تک آپ کو پیدل جانا ہو گا' آگے البتہ سواری کا انتظام ہے۔"

"مم...... میں تیار ہوں۔" اس نے سفید باریک ریشمی دوپٹا اٹھایا۔

"لیکن میں سب سے مل کر جاؤں گی۔"

"اتنا وقت نہیں ہے بی بی! اچھو بھائی بہت جان جوکھوں میں ڈال کر یہاں آئے ہیں۔ بڑے صاحب کے ملازموں نے انہیں دیکھ لیا تو چھوڑیں گے نہیں۔" حمیدہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن میں بابا جان سے تو مل لوں۔"

"جو کچھ کرنا ہے جلدی کریں۔"

وہ جلدی سے پیر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے میں ان کے علاوہ اماں جان' یاسمین بھابی...... اور مہر النساء بھی تھیں۔

"آئیں بٹیا! ابھی آپ کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر پیر صاحب مسکرائے۔

"میرا بابا جان!"

"ہاں آپ کا۔" یاسمین بولی۔

"بیٹھو بٹیا!" اور اماں جان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"میں یونہی آ گئی تھی' بیٹھوں گی نہیں۔"

"کیوں بٹیا!"

"بس بابا جان نیند آ رہی ہے۔" وہ بولی۔

"آپ سب کو خدا حافظ کہنے آئی تھی۔"

"شب بخیر میری چندا۔" اماں جان نے کہا۔

"دیکھیں نذری بیگم سفید لباس میں ہماری بیٹی کتنی پیاری لگ رہی ہے' فرشتوں کی طرح پاکیزہ' معصوم۔"

اس کے دل پر خنجر سا چل گیا' آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی' اس لیے نہیں کہ اسے کسی سے نفرت تھی۔ نہیں وہ تو سب کے لیے صرف اور صرف محبت کے جذبات رکھتی

تھی۔ اس کے جانے کی وجہ افراد نہیں، روایتیں تھیں۔ بابا جان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانے کا خیال دل پر آرے چلا رہا تھا، لیکن اسے بہر حال جانا تھا۔

"کیا ہوا؟ آپ کی آنکھیں کیوں بھیگ گئیں؟" پیر صاحب بے چین ہو گئے۔

"کچھ نہیں بابا جان! سوچ رہی ہوں کہ یہ محبت نہ ملے تو کیا ہوگا۔" وہ چند قدم آگے بڑھ کر پیر صاحب کے قریب آ گئی۔

"بابا جان! میرے ماتھے پر پیار کریں۔"

فرطِ محبت سے پیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ زیب النساء کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھے پر بوسہ دیا۔

"شکریہ بابا جان!" اس نے آنکھیں موند کر آنسو پیچھے دھکیلے اور واپس مڑ گئی۔

"اسے کیا ہوا پیر صاحب؟" اماں جان کی آواز اندیشوں سے کانپ رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا اماں جان۔" مہر النساء ایک لمحے میں سب کچھ سمجھ گئی تھی پھر بھی تسلی دینے کی غرض سے بولی۔

"جب میں یہاں آ رہی تھی تو یہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ شاید کوئی برا خواب دیکھ کر ڈر گئی ہے۔"

☆======☆======☆

حویلی کے عقبی پھاٹک سے باہر نکلتے ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ واپس لوٹ جائے۔ محبتوں کی زنجیر پاؤں جکڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بچپن سے جوانی تک کتنے لمحات ایک پل میں آنکھوں کے سامنے گزر گئے۔

وہ بچپن کے خوبصورت دن بابا جان اور رجب علی بطورِ خاص اس کے لیے چن چن کر خوبصورت گڑیاں لایا کرتے تھے۔ جب حیدر علی پیچھے سے آ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا، جب مہر النساء اپنی گڑیوں کے لیے اس کی گڑیوں کے کپڑے چرا لیا کرتی تھی اور پھر دونوں میں خوب لڑائی ہوتی تھی، تب رجب علی ان دونوں میں صلح کرایا کرتا تھا۔

اور ایک دن جب وہ حویلی کے دالان میں بنے تالاب میں پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے گر گئی تھی تو کیسے رجب علی اور حیدر علی دونوں نے اسے بچانے کے لیے اکٹھے پانی میں چھلانگیں لگا دی تھیں۔ باہر نکلنے کے بعد بھی وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ کتنی دیر تک رجب علی سے لپٹ کر روتی رہی اور وہ پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے چپ کراتا رہا تھا۔

اور پھر جوانی آئی۔ بے رنگ اور بے رونق، لیکن ماں باپ کی محبتوں سے بھرپور۔ اس کے بعد اچانک ہی ایک روز وہ محبت کے بالکل نئے مفہوم سے آشنا ہوئی تھی۔

"زیبی!" اپنے قریب اچھو کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

"آں...... آپ؟"

"بہت دیر کر دی تم نے میں خاص طور سے موٹر لایا تھا تمہارے لیے...... ایسا نہ ہو کہ ڈرائیور انتظار سے بے زار ہو کر واپس چلا جائے۔"

اس نے باہر نکل کر اپنے پیچھے پھاٹک بند کر دیا۔

"میں پھوپھو جانی کی آرامگاہ پر فاتحہ پڑھ آؤں۔"

"اس کا وقت نہیں ہے۔"

"خدا کے لیے اس کام سے مجھے نہ روکیں۔ پھر زندگی میں تو کیا شدید موت کے بعد بھی مجھے یہاں آنا نصیب نہ ہو۔"

"اچھا جلدی کرو۔" زیب النساء نے اتنے منت بھرے انداز میں کہا کہ اچھو کو اجازت دینا ہی پڑی۔

"شکریہ۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ قبرستان میں داخل ہو گئے۔

"اندھیرے میں تمہارے سفید کپڑے بہت نمایاں ہو جائیں گے۔"

"رات کے اس پہر کون ہوگا، جو ہمیں دیکھ لے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر اب جلدی کرو۔"

☆======☆======☆

حیدر علی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ رجب علی کو بابا جان نے شادی کے سامان کی خریداری کے لیے لاہور بھیج دیا تھا اور وہ جب بھی لاہور جاتا تھا، اس کے آنے کے بارے میں کوئی حتمی دن یا وقت نہیں بتایا جا سکتا تھا۔ کبھی ہفتہ بھر میں لوٹ آتا تھا اور کبھی مہینے تک بھی واپس نہیں آتا تھا۔

"میرا خیال ہے اس سلسلے میں مجھے خود ہی بابا جان سے فائنل بات کرنا ہوگی۔" اس نے خود سے کہا۔ "بس بہت ہوگئی، اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ پیر صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرے میں صرف اماں جان اور وہ بیٹھے ہوئے تھے۔

"میرا بیٹا آیا ہے۔" اماں جان کھل اٹھیں۔

پیر صاحب نے صرف ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔ حیدر علی نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا پھر اماں جان کی طرف بڑھ گیا۔ ان سے مل کر اور چند باتیں کر کے وہ پیر صاحب کے قریب چلا آیا۔

"اگر آپ فارغ ہوں بابا جان تو مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"ہمیں بھی تم سے کچھ کہنا ہے۔" انہوں نے کتاب بند کی اور عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔

''جی فرمائیے۔''

''ہم نے تمہاری شادی کی تاریخ طے کر دی ہے آج صبح ہی تمہارے ماموں اور ان کے بڑے فرزند آئے تھے۔ ہم چاہتے تو ایک ہفتے کے اندر اندر تمہاری شادی کر دیتے' لیکن اس جلد بازی پر لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل سکتا تھا۔ تمہیں تو شاید کوئی فرق نہ پڑتا لیکن ہم نوزیہ بڑ پر کوئی انگلی اٹھتے نہیں دیکھ سکتے' اس لیے آج سے ٹھیک ڈیڑھ مہینے کے بعد یعنی اگلے مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو ہم تمہاری شادی کر دیں گے' تم تیار رہنا۔''

☆======☆======☆

''موسم کتنا سہانا ہو رہا ہے...... ہے ناں؟'' زیب النساء نے کہا۔

''ہاں۔''

وہ دونوں اونچی نیچی پگڈنڈی پر چلتے جا رہے تھے۔

''ہوا کتنی اچھی لگ رہی ہے نرم نرم سی' لگتا ہے بارش ہو گی۔ بارش میں بھیگنا کتنا اچھا لگتا ہو گا۔''

''بہت اچھا لگتا ہے۔ آئندہ جب کبھی بارش ہو تو تم ضرور اس میں بھیگنا۔ میں زکام کی دوائیں ہر وقت گھر میں رکھوں گا۔''

اس کی بات سن کر زیب النساء کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''نہیں' ابھی میرا بیمار پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''تمہارے بال ہوا میں اُڑتے ہوئے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔''

''میں نہا کر نکلی تھی' اس وقت گیلے تھے' اس لیے نہیں باندھے۔ بعد میں اتنی جلدی میں نکلنا پڑا کہ باندھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ٹھہریں میں باندھ لوں۔''

''نہیں کھلا رہنے دو' یوں بہت اچھے لگ رہے ہیں اور تم تو کھلے بالوں میں قیامت ڈھا رہی ہو۔''

زیب النساء ہنس دی۔

''مجھے تو جلدی میں کوئی موٹی چادر لینے کا بھی خیال نہیں آیا۔''

''کوئی بات نہیں۔''

وہ باتیں کرتے چلے جا رہے تھے کہ موڑ مڑ کے ایک کار ان کے بالکل سامنے آ گئی۔ کار کی ہیڈ لائٹس جگمگا رہی تھیں۔

خوف کے مارے زیب النساء کو خون اپنی رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

☆======☆======☆

اس مرتبہ رجب علی کا ارادہ زیادہ دن تک لاہور میں رکنے کا نہیں تھا۔ اس نے حیدر علی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ گوری کے سلسلے میں بابا جان سے بات کرے گا' اس لیے ایک ہفتے میں ضروری خریداری سے فارغ ہو کر اور باقی سامان کا آرڈر دے کر اس نے رختِ سفر باندھ لیا۔ اسے گاؤں پہنچنے کی اس قدر جلدی تھی کہ دھوپ کی پروا کیے بغیر اس نے اسی وقت سفر شروع کر دیا تاکہ رات تک حویلی پہنچ سکے۔ زیورات کا آرڈر دیتے ہی وہ گاؤں کی طرف چل پڑا تھا۔ یوں بھی اسے کون سا سامان ساتھ لانا تھا۔ جو کچھ خریداری کی تھی وہ ملازمین کو اپنے ساتھ لانی تھی اور اس کا اپنا تو کچھ سامان تھا نہیں۔

لاہور میں گلبرگ والے مکان میں سب کچھ پہلے سے موجود تھا۔ بس ایک ریوالور تھا' جو وہ ہر وقت اپنے پاس رکھنے کا عادی تھا۔ اس کے علاوہ سفر پر نکلتے ہوئے وہ کوئی سامان پاس نہیں رکھتا تھا۔

وہ گاڑی چلاتا رہا اور پچھلی سیٹ پر شکورا اونگھتا رہا' راستے بھر وہ حیدر علی اور گوری کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ شاید وہ پہلے ہی بابا جان سے اس سلسلے میں بات کر لیتا' لیکن انہوں نے بالکل اچانک ہی اسے لاہور جانے کا حکم دے دیا اور ان کا حکم ٹالنا اسے کسی صورت پسند نہیں تھا۔ پھر یہ سوچ کر بھی وہ شہر چلا آیا کہ شادی تو بہر حال حیدر علی کی ہونی ہی ہے اس لیے خریداری کر ہی لینی چاہیے لگے ہاتھوں کچھ دن روز کی اکتائی ہوئی زندگی سے باہر نکلنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ رہ گئی گوری والی بات تو وہ آ کر بھی کی جا سکتی ہے۔

انہی سوچوں میں گم اس نے جی ٹی روڈ سے گاڑی گاؤں کی طرف جانے والی کچی سڑک پر اتار لی۔ یہاں ہر طرف اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا۔ چاند بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی جھانکتا اور پھر وہیں چھپ جاتا۔ لگتا تھا کہ کسی وقت بھی بارش شروع ہو جائے گی۔ جبکہ وہ بارش سے پہلے پہلے حویلی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ گاؤں کے کچے راستوں پر اپنی کار کو لت پت کرنا اسے بالکل گوارا نہیں تھا ایسے میں جیسے ہی اس نے موڑ موڑا' دو ہیولے اس کے سامنے آ گئے۔

''حضور! یہ تو اچھو ہے۔'' شکورا ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اسے دیکھ کر جلدی سے بولا۔

''ہوں۔'' رجب علی نے کار روک دی۔

''اور اس کے ساتھ کون ہے۔''

''پتا نہیں سرکار' پہلی مرتبہ اس کے ساتھ کوئی لڑکی دیکھ رہے ہیں۔''

اچھو اور اس کے ساتھ والی لڑکی دونوں رک چکے تھے۔ لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے اس کا باریک سفید ریشمی دوپٹا اتر کر لہرا رہا تھا' لیکن سب سے خوبصورت اس کے بے حد لمبے بال تھے' جو ہوا کے دوش پر ایسے اُڑ رہے تھے جیسے کسی نے فضا میں ریشم بکھیر دیا ہو۔ چہرے کو چھپانے والے اس کے گورے گورے ہاتھ کسی کو بھی دیوانہ بنا لینے

کے لیے کافی تھے۔ سفید پیراہن میں لپٹی وہ لڑکی بالکل آسمان سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔

''یہ سرسوتی ہے' لکشمی ہے کہ اُما۔'' رجب علی نے سوچا۔ ''یا پھر ایفروڈائٹ مجسم ہوگئی ہے۔''

لیکن عجیب بات تھی' ایسی مکمل خوبصورتی بہت کم دیکھی تھی اس نے' پھر بھی اتنا حُسن دیکھ کر پہلی مرتبہ اس کے جذبات میں ہلچل نہیں مچی تھی۔ بس وہ اس قدر حُسن دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ آسمان سے اتری اس پری کو دیکھنے کے بعد وہ اچھو کو بھی فراموش کر چکا تھا۔ اس لڑکی کو قریب سے دیکھنے کی خواہش لے کر وہ کار سے اتر آیا۔

اچھو کی نگاہیں کار پر ہی مرکوز تھیں۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی کے باعث وہ یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ کار میں کون ہے' لیکن اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ کار سوار رجب علی یا حیدر علی میں سے ہی کوئی تھا۔ ذہنی طور پر وہ ہر خطرے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

اور پھر رجب علی کو اترتے دیکھ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور زیب النساء کو خود سے قریب کر لیا۔ رجب علی بھی بغور انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کار کے دوسرے دروازے سے شکورا بھی اتر آیا۔

''نمک حرام! تیرا خیال تھا کہ تُو بڑے شاہ صاحب سے بچ جائے گا۔'' شکورا اترتے ہی بولا۔ ''لیکن دیکھ تیری موت خود تجھے کھینچ کر انہی کے روبرو لے آئی ہے۔''

''بڑے بھائی جان!'' زیب النساء نے زیر لب کہا۔

سردی کی ایک لہر اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں محسوس ہوئی اور وہ بے ساختہ چیخ پڑی۔

''اچھو! مجھے بچالو۔''

چلاتے ہوئے اس نے اچھو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔

رجب علی جیسے کسی خواب سے بیدار ہو گیا۔ اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

''زیبی۔''

گو کہ وہ زیب النساء کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا' لیکن اس کی آواز تو وہ کروڑوں کی آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ غصے اور نفرت کا زہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ اس کے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ عمل کا وقت تھا' لیکن اس جوش میں بھی اس کے حواس برقرار تھے۔ اس قدر بے عزتی کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اور بے عزتی بھی اپنی ہی بہن کے ہاتھوں۔ سر موڑے بغیر وہ شکورے سے مخاطب ہوا۔

''شکورے! تم گاؤں چلے جاؤ' ہم تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔''

''لیکن شاہ صاحب آپ کو اس طرح چھوڑ کر......'' کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اسے احساس ہو گیا تھا کہ صورتِ حال اس سے کہیں زیادہ سنگین تھی' جتنا کہ اسے نظر آ رہی تھی۔

''ہم کہہ رہے ہیں تم گاؤں جاؤ۔'' رجب علی نے سختی سے حکم دیا۔

''جی بہتر۔'' وہ مڑ گیا۔

رجب علی تب تک خاموشی سے وہیں کھڑا رہا' جب تک شکورا اندھیرے میں گم نہیں ہو گیا۔ اچھو بھی اسی طرح خاموش کھڑا رجب علی کو گھورتا رہا تھا۔ جبکہ زیب النساء اسے مضبوطی سے تھامے اس کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔

''زیبی! میرے پاس آؤ۔'' رجب علی کی آواز ابھری۔

''نہیں' نہیں' نہیں۔'' وہ ہسٹیریائی انداز میں چلائی۔

''زیبی! میں دوسری اور آخری بار کہہ رہا ہوں' یہاں میرے پاس آ جاؤ۔''

اس کے انداز میں جانے کیا تھا کہ زیب النساء کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ کچھ کہنے کے بجائے اس نے اچھو کے بازو پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر دی۔

چند ثانیے رجب علی انتظار کرتا رہا' پھر اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

''رک جاؤ رجب علی! مزید ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا۔'' اچھو نے تنبیہہ کی۔

''اس وقت میں وہ اچھو نہیں ہوں' جسے تم نے بے خبری میں پیٹ ڈالا تھا۔ ویسے تو تم سے وہ حساب بھی بے باق کرنا تھا لیکن صرف اور صرف زیبی کی خاطر میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔''

''اب اگر میری بہن کا نام اپنی غلیظ زبان پر لائے تو تمہاری زبان گدی سے کھینچ نکالوں گا۔'' رجب علی نے سفاک لہجے میں کہا۔

''لیکن ہر مرتبہ زیبی بھی تمہیں نہیں بچا سکے گی۔'' اچھو نے اس کی بات نظر انداز کر کے اپنی بات پوری کی۔

''ذلیل انسان! دل تو چاہتا ہے کہ تجھے کتے کی موت ماروں لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہ دھرتی تیرا غلیظ بوجھ زیادہ دیر تک اپنے اوپر اٹھائے' اس لیے......'' اس نے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

''اس کھلونے سے مارو گے مجھے؟'' اچھو ہنسا۔ ''کم از کم مجھے یہ تسلی رہے گی کہ تمہارے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ ان کے زور پر میری کمر زمین سے لگا سکو اور یہ بھی کہ مجھے مار دینے کے باوجود بھی تمہاری بہن میری ہی رہے گی۔ یہ محبت کے رشتے ہیں' مرنے یا مار دینے سے انہیں توڑا نہیں جا سکتا۔''

''بس اتنا کافی ہے۔'' رجب علی نے ریوالور سیدھا کر لیا۔

اچھو کے پیچھے چھپی ہوئی زیبی کو ان مکالموں سے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ آنے والے لمحات اس پر کیا قیامت ڈھانے والے ہیں' بس ایک دم سے مسلسل دھماکے ہوئے اور اچھو دوہرا

ہو کر اپنے خون میں لت پت زمین پر گر گیا۔

چند ثانیے تو زیب النساء کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کیا ہو گیا ہے اور جب' اندازہ ہوا تو اچھو اس سے بہت دور جا چکا تھا۔ اتنی دور جہاں سے جا کر کوئی لوٹا نہیں کرتا۔

''نہیں۔'' وہ چلا کر اچھو پر جھک گئی۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا...... اٹھو...... اٹھو تم نے مجھے سب سے بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ تم ہر رکاوٹ عبور کر کے مجھے لے جاؤ گے' پھر اب کہاں چلے گئے؟''

اس نے اچھو کے بے جان جسم کو جھنجوڑ دیا۔ اس کا سفید لباس خون سے تر ہو گیا تھا۔ وہ اسے جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہی تھی' چلا رہی تھی' جب رجب علی نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور اسی طرح گھسیٹتا ہوا کار کی طرف بڑھ گیا۔

''چھوڑو مجھے ظالم انسان نفرت ہے مجھے تم سے' تم نے میرے اچھو کو مار دیا۔ میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔''

''بکواس بند کرو۔'' اس نے کار کا دروازہ کھول کر زیبی کو اندر دھکیلا۔

''ہلنا مت اس جگہ سے' سمجھیں؟''

رجب علی کے بیٹھنے تک زیب النساء نے کتنی ہی کوشش کی کہ دروازہ کھول کر نیچے اتر جائے لیکن لاک کھولنے میں ناکام رہی۔

رجب علی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور راستے کے درمیان پڑے اچھو کے اوپر سے گزرتا ہوا حویلی کی طرف چل پڑا۔ زیب النساء چیختی چلاتی رہی' لیکن وہ بغیر ایک لفظ بولے گاڑی چلا رہا تھا۔

''ہوں' تو یہ بات تھی۔'' درخت کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے شکورے نے گہرا سانس لیا۔

کچھ تجسس اور کچھ رجب علی کی مدد کے خیال سے وہ وہیں درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا تھا۔

اس پورے واقعے کا دورانیہ بمشکل دو منٹ تھا۔

☆======☆======☆

پیر صاحب کے منہ سے شادی کی تاریخ طے ہو جانے کا سن کر حیدر علی چند ثانیے کے لیے تو گنگ ہی رہ گیا۔

''لیکن بابا جان! ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ غصے سے جھلا کر بولا۔ ''کیا میری اتنی حیثیت' اتنی وقعت بھی نہیں ہے کہ میرے کسی معاملے پر مجھ سے مشورہ کر لیا جائے۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ ''تم چاہتے ہو کہ تمہاری شادی کی تاریخ تم سے طے کروائی جاتی۔''

''میں یہ چاہتا ہوں بابا جان کہ میری شادی مجھ سے پوچھ کر طے کی جاتی۔''

''کیا برائی ہے فوزیہ میں؟''

''میں نے یہ کب کہا ہے کہ اس میں کوئی برائی ہے۔'' پہلی مرتبہ اس نے اس موضوع پر کھل کر گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

اس نے ایک نظر اماں جان کی طرف دیکھا' جو بالکل بے نیاز ہو کر سپاٹ دیوار کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''میں کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہوں۔''

لیکن ابھی اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور رجب علی' زیب النساء کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے کمرے میں کھینچ لایا۔

چند لمحے تو کمرے میں موجود کوئی بھی شخص صورتِ حال کو نہ سمجھ سکا۔

''یہ ہے آپ کی قابلِ فخر بیٹی! جو ایک انتہائی گھٹیا اور کمینے شخص کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔''

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ زیب النساء کو قالین پر پھینک دیا۔

''اس گھٹیا انسان کے ساتھ میں نے اسے بھی مار کر گاڑ دیا ہوتا لیکن غصے اور نفرت کے ان لمحات میں بھی مجھے خاندان کی عزت اور وقار کا خیال تھا۔ اوہ خدایا!''

رجب علی نے جذبات اعتدال پر لانے کے لیے مٹھیاں بھینچ لیں۔

وہ سب گنگ کھڑے کبھی رجب علی کی جانب دیکھ رہے تھے اور کبھی خون میں بھیگے کپڑوں میں ملبوس سسکتی ہوئی زیب النساء کو۔

یہ کیا سن لیا تھا انہوں نے۔ دکھ اور تکلیف کے کانٹے پورے وجود میں چبھنے لگے' جو کچھ آج رات ہوا تھا' ایسا تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

سب سے پہلے حیدر علی آگے بڑھا اور نرمی سے اس کا بازو تھام لیا۔

''اٹھیں آپی!'' اس نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔

اتنی ہمدردی پا کر زیب النساء اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''انہوں نے اچھو کو مار دیا' میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔

اماں جان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں جبکہ پیر صاحب کے چہرے پر دکھ کے ساتھ ساتھ شدید تناؤ کے آثار بھی تھے۔

''میرے ساتھ آئیں۔'' اس نے پیار سے کہا اور اسے کمرے سے باہر لے گیا۔

''یہ سب کیا تھا رجب علی؟'' اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بھی انہیں اس بات پر

یقین نہیں آیا تھا۔

رجب علی گہرا سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

"میری بیٹی ایسا نہیں کر سکتی، میری زیبی ایسا نہیں کر سکتی۔" اماں جان جیسے خواب کی سی کیفیت میں بولیں۔

"کاش ایسا نہ ہوا ہوتا، لیکن افسوس ایسا ہی ہوا ہے۔" رجب علی نے کہا۔

"نذری بیگم! آپ آرام کریں اور اس مسئلے پر زیادہ نہ سوچیں۔" پیر صاحب نے ان سے آنکھیں ملائے بغیر کہا، پھر رجب علی سے مخاطب ہوئے۔

"مہر النساء اور یاسمین بیٹی کو اپنی اماں جان کے پاس چھوڑ کر ہمارے گول کمرے میں آؤ۔"

"جی بابا جان!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

حیدر علی کے لیے زیب النساء کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اسے اس کے کمرے میں لے تو آیا تھا، لیکن زیب النساء اپنے حواسوں میں نہیں تھی اور بار بار کمرے سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"مجھے نفرت ہے اس حویلی کی اینٹوں سے، ان دیواروں سے، اس میں رہنے والے ایک ایک مکین سے۔" وہ چلانے لگی۔

"تم لوگوں نے اسے بے دردی سے مار ڈالا۔ اب میرے لیے کیا رہ گیا ہے یہاں، مجھے بھی مار دو، مجھے زندہ نہیں رہنا، ختم کر دو سب کچھ، تہس نہس کر ڈالو ہر اس چیز کو جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔"

"ریلیکس آپی!" حیدر علی اسے اپنے بازوؤں میں تھام کر مسہری کے قریب لے آیا۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں، مجھے یقین ہے کہ اسے کچھ نہیں ہوا ہوگا، وہ زندہ ہوگا۔ میں ابھی کسی کو بھجواتا ہوں، آپ یہاں لیٹ جائیں۔"

"نہیں، وہ مر چکا ہے۔ یہ سارا خون، یہ دیکھو۔" اس نے اپنے کپڑوں پر لگے تازہ خون کے دھبوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب اس کا خون ہے، وہ زندہ نہیں ہے، میں نے خود اسے دیکھا تھا۔ تمہیں نہیں پتا، اگر وہ زندہ ہوتا تو مجھے بچا لیتا، وہ مجھے سب سے بچا سکتا تھا۔"

"اچھا!" اس نے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "آپ یہاں لیٹ جائیں۔"

"کانٹوں کے اس بستر پر کیسے لیٹوں، تمہیں نظر آ رہے ہیں کانٹے؟ نہیں...... تم لوگوں کو کبھی نظر نہیں آئے، یہ تو صرف ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔"

"اچھا پھر آپ یہاں بیٹھ جائیں۔" اس نے زیب النساء کو پیڑھے پر بٹھا دیا۔

چند لمحے وہ سپاٹ دیوار کو گھورتی رہی پھر حیدر علی سے مخاطب ہوئی۔

"علی! وہاں الماری میں میری گڑیاں رکھی ہوئی ہیں، وہ مجھے لا دو۔"

"اچھا!" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور الماری میں پڑی ڈھیر ساری گڑیاں نکال لایا۔ یہ وہ گڑیاں تھیں جو بچپن میں وقتاً فوقتاً پیر صاحب اور رجب علی اسے بطور تحفہ دیتے رہے تھے۔ حیدر علی نے وہ سب گڑیاں اس کے سامنے میز پر ڈھیر کر دیں۔

"یہ گڑیاں ہیں نا علی! ان میں اور ہم میں کچھ زیادہ فرق تو نہیں ہے، جہاں رکھ دیا، وہیں پڑی رہیں اور پھر بھول گئے۔" وہ جیسے خود سے بولی۔

"بس ان کے قالب میں روح نہیں ہے اور ہم میں روح ہے۔ یہ فرق کم تو نہیں ہے پھر بھی کسی نے اسے سمجھا ہی نہیں۔ سب ہمیں بے زبان، بے روح گڑیاں ہی سمجھتے رہے، بس ایک جگہ رکھ کر بھول گئے۔

علی کوئی ایسا قالب جس میں روح ہو کیا وہ بے شناخت رہ سکتا ہے۔ محض کسی کی ملکیت بن کر؟ یہ بے روح گڑیاں میری ملکیت تھیں۔ میں انہیں رکھ کر بھول گئی تھی، میں کس کی ملکیت ہوں؟

نہیں علی! کوئی انسان کسی کی ملکیت کیسے ہو سکتا ہے۔ جو شخص سانس لیتا ہو، سوچتا ہو، وہ کسی کی ملکیت کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے کبھی لفظ "کیوں" نہیں پوچھا تھا، لیکن کیا یہ کبھی میرے ذہن میں آیا بھی نہیں ہوگا؟ نہیں۔ یہ لفظ ہر وقت میرے ذہن میں گردش کرتا ہے، لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے ہر کیوں کے جواب میں ایک خاندانی روایت کی مثال موجود ہے۔ میرے ہر سوال کا جواب یہی ہے کہ اس حویلی میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

حیدر علی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے زیب النساء کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

"تم نے آئینہ دیکھا ہے علی؟" وہ جیسے خود سے ہی مخاطب تھی۔

"بہت دفعہ دیکھا ہوگا، لیکن اس کے اندر کبھی نہیں جھانکا ہوگا۔ جاننے اور سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تم لوگ بہت سی باتیں جانتے ہو، لیکن سمجھتے نہیں ہو۔

تم نے کبھی میرے کمرے کے اس آئینے میں پھپھو کو نہیں دیکھا ہوگا، نہیں دیکھا نا؟ میں دیکھ سکتی ہوں۔ حالانکہ وہ میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے فوت ہو گئی تھیں، پھر بھی میں انہیں دیکھ سکتی ہوں۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی ہیں، میں اپنے کانوں سے ان کی سسکیاں سن سکتی ہوں، ان کی ہنسی کی آواز اس کمرے میں گونجتی ہے ان کی آہ و زاری سے کمرا بھر جاتا ہے، لیکن یہ دیواریں ایسے ہی سپاٹ رہی ہیں۔ ان میں کوئی روزن، کوئی دریچہ نہیں کھلتا، کوئی آواز باہر نہیں جاتی۔ ان دیواروں سے سر ٹکرا کر ان کی ہنسی، سسکیوں میں تبدیلی ہو جاتی ہے ہر طرف چیخیں پھیل جاتی ہیں،

لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں ہے ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکتی۔ بس کچھ ہوتا ہے تو فقط اتنا کہ میں بار بار مرتی ہوں۔ دم گھٹنے لگتا ہے۔

ایسے ہی ایک دن خود کو گھٹن سے بچانے کے لیے میں نے اپنے ہاتھ لہولہان کر کے تازہ ہوا کے لیے جگہ بنالی۔ پر تازہ ہوا کا وہ جھونکا اتنا معطر تھا کہ میرے لیے پلٹنا ہی ناممکن ہو گیا۔ آہ......'' اس نے آنکھیں موند لیں۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر زیب النساء کے لب ہلے۔

''وہ بہت اچھا تھا۔ تم لوگوں کے لیے قابلِ نفرت ہے' لیکن میں جانتی ہوں کہ کتنا اچھا تھا۔ مجھے پتا ہے علی کہ میری باتیں تمہاری غیرت پر تازیانہ بن کر لگیں گی' لیکن اب میں ہر حد عبور کر چکی ہوں۔ جب وہ ہی نہ رہا تو مجھے اپنے انجام کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس نے میری خاطر ہر رکاوٹ عبور کی۔ یہ حویلی کتنی بڑی' کتنی مضبوط اور کتنی شاندار ہے' لیکن اس نے اس کی عظمت کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ کوئی چیز بھی تو اس کا راستہ نہیں روک سکی مگر قسمت۔'' اس نے آہ بھر کر کہا۔ ''ہماری قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔''

چند ثانیے وہ پھر خاموش رہی۔

''علی!'' بالآخر اس نے آنکھیں کھولیں۔

''ہوں۔''

''اسے یوں نہ پڑے رہنے دینا' اگر اب بھی تمہارے لیے میری ذرا سی بھی اہمیت ہے' مجھ سے تھوڑا سا بھی پیار ہے تو خدا کے لیے اسے وہاں سے اٹھا کر کسی اچھی جگہ دفن کر دینا۔ وہاں باہر تو......!''

اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور مزید بات کرنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں' میں خود جاؤں گا اور انتظام کروں گا۔'' وہ بولا۔

''یہ خون دیکھ رہے ہو؟'' اس نے اپنے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

''جس وقت گولی چلی' اتنا خون بہا' اتنا خون بہا......'' اس نے ہونٹ کاٹ کر آنسو روکنے کی کوشش کی۔

''پھر بھی اس ظالم درندے نے بس نہیں کیا۔ اس نے گاڑی اس کے اوپر سے گزار دی۔ ایسا ظلم تو کبھی کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ وہ میرا بھائی نہیں ہے' میری رگ رگ میں اس کے لیے نفرت بھر چکی ہے۔''

وہ پھر بے تحاشا رو پڑی۔

☆======☆======☆

پیر صاحب کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اندر سے وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے ہوں'

وہ اس قدر پیار کرتے تھے' اس کے ساتھ ایسے واقعے کا منسوب ہو جانا انہیں مار ڈال رہا تھا۔ کمرے میں رکھے ہوئے صوفے پر وہ تقریباً ڈھے گئے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت خود کو ختم کر دیں' لیکن دماغ روکے ہوئے تھا۔

پہلے انہیں اپنے خاندان کی عزت بچانا تھی۔ اس حویلی کو سلامت رکھنا تھا' اسے دوبارہ ... کے ساتھ تعمیر کرنا تھا۔ یہ وقت حالات سے فرار کا نہیں بلکہ ان کا سامنا کر کے انہیں اپنے ... میں موڑ لینے کا تھا۔

رجب علی آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھی بہت تھکا ہوا لگ رہا

''بیٹھو۔'' پیر صاحب نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بغیر کوئی بات کیے بیٹھ گیا۔

''ہمیں بتاؤ کیا ہوا تھا؟'' پیر صاحب نے پوچھا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''بابا جان! یہ نہ پوچھیں میں اس وقت سے اپنے ذہن سے ان لمحات کی یاد مٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

چند ثانیے کی خاموشی کے بعد اس نے پیر صاحب کو پورا واقعہ سنا دیا۔

''ہوں۔'' انہوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی اور کسی سوچ میں گم ہو گئے۔ کتنی دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی صرف ایک وال کلاک کی مدھم سی ٹک ٹک وقت گزرنے کا احساس دلا رہی تھی۔

''اپنے کسی ذاتی ملازم سے کہہ کر وہ لاش بڑی سڑک سے پرے پھنکوا دو' لیکن اسے قابلِ شناخت نہیں رہنا چاہیے۔'' بالآخر پیر صاحب نے کہا۔

''بہتر بابا جان!'' وہ بولا۔ ''لیکن اگر میرے جذبات تک رہنے دیا جائے تو میں اس کی لاش یہاں گاؤں میں برگد کے ساتھ لٹکوا کر......''

''بس......'' پیر صاحب نے ہاتھ اٹھائے۔ ''اس وقت اپنے جذبات کو خود پر حاوی مت ...۔ یاد رکھو گدی سنبھالنے کے بعد تمہیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا' لیکن ان ... کسی مسئلے کو بھی جذبات سے سلجھانے کی کوشش مت کرنا' ورنہ وہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھ جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حویلی کی عزت پر کبھی حرف مت آنے دینا۔ کسی کو بھی انگلی اٹھانے کا موقع مت دینا۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔''

رجب علی نے سر جھکا لیا۔

''ہمیں تم سے بھی بہت شکوے ہیں' لیکن ان پر بعد میں بات کریں گے۔ تمہیں بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا ہے۔ صرف پیر صاحب کہلایا جانا کافی نہیں ہوتا' اسے نبھانا پڑتا ہے۔ یہ

محض ایک لفظ نہیں ہے بلکہ ہماری صدیوں کی کمائی ہوئی عزت ہے۔"

وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

"اب جاؤ اور لاش اٹھوانے کا بندوبست کراؤ۔ اس کے بعد ہماری خواب گاہ کی الماری سے سیاہ رنگ کی شیشے کی بوتل لے آؤ۔" پیر صاحب نے حکم دیا۔

"چابیاں اپنی اماں جان سے لے لینا۔ بوتل تلاش کرنے میں تمہیں مشکل پیش نہیں آئے گی' کیونکہ وہاں صرف ایک ہی بوتل ہے۔"

"بہتر بابا جان!" وہ باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ زیب النساء نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

"پتا ہے علی کون آیا ہے؟" پھر وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔

"موت کے ہرکارے آئے ہیں' سن رہے ہو' ان کے قدموں کی چاپ؟ میں انہی کی منتظر تھی۔ وہ جان کی بازی لگا کر بھی مجھے آزاد کرانے کا بندوبست کر گیا ہے۔"

"نہیں آپی!" اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر اس نے باآواز بلند "یس" کہا۔

دروازہ کھلا اور پیر صاحب اور رجب علی شاہ اندر داخل ہوئے۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

پیر صاحب نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا اور آگے بڑھ آئے۔

"علی! ہمیں اپنی بیٹی سے کچھ بات کرنی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"بابا جان! اس وقت میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں' تم اپنی اماں جان کے پاس جاؤ' اس وقت انہیں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔" اس نے ایک نظر زیب النساء کی طرف دیکھا' جس کی نظریں رجب علی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ان نظروں میں صرف اور صرف ایک جذبہ تھا' شدید نفرت کا جذبہ...... اس نے تو شاید پیر صاحب اور حیدر علی کی گفتگو بھی نہیں سنی تھی۔

حیدر علی یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ پیر صاحب اس سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔

"تم نے سنا نہیں علی؟" اس مرتبہ ان کا لہجہ سخت تھا۔

"بابا جان! آپ میری ایک بات سن لیں گے؟"

"ابھی خواب گاہ میں پہنچ کر ہم تمہاری بات سن لیں گے۔"

"میں اس سے پہلے آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" وہ ان کے قریب چلا آیا اور آہستہ سے بولا۔

"بابا جان! آپی کی ذہنی حالت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے پلیز انہیں کوئی سخت بات نہ کہیے گا۔ وہ اس وقت شدید ترین ڈپریشن میں ہیں۔ پلیز بابا جان وہ جو بھی کہیں اسے برداشت کر لیں۔ مجھے پتا ہے' یہ آپ کے لیے بہت مشکل مرحلہ ہوگا' لیکن بات آپ برداشت کر لیں' بعد میں ہم دیکھ لیں گے کہ اس سلسلے میں کیا جا سکتا ہے' لیکن..."

"تم جاؤ' ہم جانتے ہیں کہ ایسے موقع پر حالات پر کیسے قابو پایا جاتا ہے۔" پیر صاحب نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

ان کے الفاظ اور لہجے سے وہ کچھ بھی اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کمرے سے نکلنے سے قبل وہ ایک مرتبہ پھر زیب النساء کے پاس آیا اور اس کے ہاتھ پر پیار کیا۔

"آپی میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔"

زیب النساء خاموش رہی۔

وہ کمرے سے نکل گیا۔

"بیٹا! کیا وہ سب درست ہے جو رجب علی نے ہمیں بتایا ہے؟" حیدر علی کے جانے کے بعد وہ اس کے قریب والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"انہوں نے کم بتایا ہوگا' میں بتاتی ہوں کہ کیا ہوا تھا؟" اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ انجام سے بے پروا ہو چکی ہے۔

"جس طرح یہ گڑیاں میری ملکیت تھیں' اسی طرح میں آپ کی ملکیت میں تھی' جس طرح میں انہیں الماری میں بند کر کے بھول گئی تھی' اسی طرح آپ مجھے اس کمرے میں بند کر کے بھول گئے تھے۔

لیکن مجھ میں اور ان گڑیوں میں ایک بنیادی فرق تھا۔ ان میں روح نہیں تھی' مجھ میں تھی' ان میں دل نہیں تھا' مجھ میں تھا۔ یہ سوچ نہیں سکتی تھیں' میں سوچ سکتی تھی۔ سو میں بہت کچھ سوچتی تھی۔ بہت سے "کیوں" میرے گرد چکراتے رہے' لیکن ادب آداب کی تہوں میں ملفوف لہجہ سے مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں اپنے "کیوں" کا جواب آپ سے طلب کر سکتی۔ اس لیے میں نے نظریں چرانا شروع کر دیں۔ اپنی سوچوں سے بھی اور اپنے سوالوں سے بھی۔ اور ان پر دھول بیٹھتی گئی۔ اتنی زیادہ کہ سب کچھ اس میں دفن ہو گیا۔

جب کبھی یہ سوچیں سر اٹھانے کی کوشش کرتی تھیں تو میں خوفزدہ ہو کر مذہب میں پناہ ڈھونڈنے لگتی تھی۔ جب دھند کی دبیز تہہ سے کوئی ہیولا میری طرف بڑھتا تھا تو میں سجدے میں گر جاتی۔ آپ کو نہیں معلوم کہ اس آنکھ مچولی کے ساتھ دن کیسے گزرتے ہیں' لیکن مجھے معلوم ہے' اذیت ناک لمحوں کی چبھن میں اب بھی محسوس کر سکتی ہوں۔

جب یہ چبھن بڑھنے لگی' اتنی بڑھی' اتنی زیادہ کہ میری روح گھائل ہوگئی تو میں نے یہ دروازہ کھول دیا۔ اپنے دل کا بھی اور اس حویلی کا بھی۔"

پیر صاحب کے چہرے پر ابھرنے والے تناؤ اور کرب کے آثار دیکھنے کے باوجود وہ کہتی چلی گئی۔

"میرے لیے بڑا پھاٹک کھولنا ممکن نہیں تھا' اس لیے میں نے عقبی پھاٹک استعمال کیا آپ اسے چور دروازہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہاں دنیا کا سب سے اچھا انسان میرا منتظر تھا اور جب میں زندگی کی حقیقی خوشیوں کی تلاش میں اس کے ساتھ نکلی تو ایک درندے نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس نے میری عزیز از جان ہستی کو......"

"بس ٹھیک ہے۔" پیر صاحب نے ہاتھ بلند کیے۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے' آپ کو یہ سب سننا ہوگا۔" وہ چلائی۔ "سنتے ہوئے آپ کا دل دکھ رہا ہے ناں؟ اس لیے نہیں کہ آپ کو اپنی بیٹی کے' میرے حال پر افسوس ہے بلکہ اس سے آپ کی پگڑی داغدار ہوئی ہے بس چند لمحوں کی اذیت بھی برداشت نہیں کر سکے آپ' مجھے دیکھیں میں نے برسوں ان کانٹوں پر لمحہ لمحہ گزارا ہے۔"

"زیب النساء۔" پیر صاحب دھاڑے۔

"اونچا بولنے یا چلانے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوگی۔ وہ جو مجھے آپ سے بھی زیادہ عزیز تھا' اس کا خون اس درندے کی گردن پر ہے۔"

اس نے کارنس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے رجب علی کی جانب اشارہ کیا' جس کا پیمانہ صبر لبریز ہونے کو تھا۔

پیر صاحب کے لیے بھی یہ انتہا تھی۔ ان کا طمانچہ زیب النساء کے گال پر انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔ چند لمحے تک تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں انہیں دیکھتی رہی۔ جس باپ نے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا' آج پہلی مرتبہ اس نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

"بس اتنا حوصلہ تھا بابا جان؟" بالآخر وہ بولی۔ "میرا حوصلہ دیکھیں' جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے گولیاں لگتے دیکھا ہے' اسے خاک اور خون میں نہاتے دیکھا ہے' پھر بھی میں نے قاتل پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں نے اس کے بے جان وجود کو گاڑی کے ٹائروں کے نیچے کچلے ہوئے دیکھا۔ ظلم تو مجھ پر ہوا ہے لیکن میرا ساتھ کس نے دیا' سوائے میرے آنسوؤں کے۔ جانتی ہوں کہ آپ میرے لیے موت کا تحفہ لائے ہیں' میں بھی اسی کی منتظر تھی۔

میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس اپنی بیٹیوں کو زندگی اور موت دینے کے علاوہ کچھ نہیں مجھے میرا تحفہ دے دیں' مجھے اس کے پاس جانا ہے' اپنی پھوپھو کے پاس جانا ہے۔"

پیر صاحب نے جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی' ڈھکنا کھول کر پانی سے بھرے گلاس

میں اس کے چند قطرے ٹپکائے اور گلاس زیب النساء کی طرف بڑھا دیا۔

گلاس تھام کر چند لمحے وہ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک ہی سانس میں پورا پانی پی گئی۔

پیر صاحب نے گہرا سانس لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مسہری کے قریب لے آئے۔

"لیٹ جائیں۔"

"بس ایک بات بتا دیں بابا جان کہ یہ شیشی آج پہلی مرتبہ کھلی ہے یا اس سے پہلے بھی کھل چکی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جب یہ لی تھی تب اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ آج پہلی مرتبہ اس کا ڈھکن کھلا ہے۔"

"گویا پھوپھو......!" اس نے سوچنے کی کوشش کی' لیکن اس کی سوچیں منتشر ہو رہی تھیں۔

وہ لیٹ گئی اور اس کے لمبے بال بستر پر بکھر گئے۔

پیر صاحب اس کے سرہانے کی طرف بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر ایک بار پھر وہی شفقت اتر آئی تھی جو کسی بیٹی پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں نظر آنے لگتی تھی۔ ایک مرتبہ پھر وہ سراپا محبت تھے۔

"بیٹا! آپ کی کوئی خواہش ہے؟"

"ہوں!" اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

"آپ بتائیں ہم ضرور پوری کریں گے۔"

"آئندہ جو شخص بھی آپ کی گدی پر بیٹھے گا' اگر اس کی کوئی بیٹی ہوئی تو اسے یہی والا کمرا دینا اسی مسہری اور اسی آئینے کے ساتھ۔" اس نے بمشکل کہا۔

اس کا دم گھٹ رہا تھا اور زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

پیر صاحب وہیں بیٹھے رہے اور رجب علی اسی جگہ کھڑا رہا۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد پیر صاحب نے زیب النساء کے ٹھنڈے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"کاش آپ نے ایسا نہ کیا ہوتا۔" وہ بولے تو ان کی آواز میں دکھ تھا' پچھتاوا نہیں تھا۔

کمرے کے آئینے میں ایک اور شبیہہ اتر آئی تھی۔

☆======☆======☆

رانجھا رانجھا کر دی ہن میں آپے رانجھا ہوئی
سدو مینوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی
رانجھا میں وچ' میں رانجھے وچ غیر خیال نہ کوئی
میں نئیں اوہ آپ ہے' اپنی آپ کرے دلجوئی
جو کجھ ساڈے اندر دِسّے ذات اساڈی ہوئی
جس دے نال میں نیون لگایا' اوہو جیسی ہوئی

چٹی چادر لاہ سٹ کڑیئے ' پہن فقیراں لوئی
چٹی چادر داغ لگیسی ' لوئی داغ نہ کوئی

حیدر علی ٹارچ ہاتھ میں لیے حویلی سے باہر نکل آیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ حادثہ کہاں پیش آیا تھا' لیکن اسے یقین تھا کہ جگہ ڈھونڈنے میں اسے زیادہ تردد کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

وہ جی ٹی روڈ کی طرف جانے والی اس ممکنہ پگڈنڈی پر ہولیا' جس پر اس کے خیال میں حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ زیب النساء کی باتیں اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ اس کے کہے ہوئے فقرے بار بار حیدر علی کے ذہن میں گونج رہے تھے۔

''اسے یوں نہ پڑے رہنے دینا' اگر اب بھی تمہارے لیے میری ذرا سی بھی اہمیت ہے' مجھ سے تھوڑا سا بھی پیار ہے تو اسے وہاں سے اٹھا کر کسی اچھی جگہ دفن کر دینا۔''

وہ جانتا تھا کہ جس قسم کے حالات سے اس کی بہنیں گزر رہی تھیں' ان میں یہ سب کچھ رونما ہوسکتا تھا۔ پھر بھی یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ اس کا ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔

صحیح کہا تھا زیب النساء نے جاننے اور سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے' محسوس تب ہی کیا جا سکتا ہے' جب بیتتی ہے' اس سے پہلے تو بس زبانی باتیں ہوتی ہیں۔

کہیں دور سے ابھرنے والی سائیں بابا کی پُرسوز آواز اسے خیالات کی دنیا سے نکال لائی۔

''ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وِچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک باز توں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

(ہیر نے جوگی سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو' روٹھے ہوئے سجن کو کوئی راضی نہیں کرسکتا۔ میں تو ایسے شخص کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی جو دور گئے سجن کو واپس لے آئے۔ جو میرے دل کا درد مٹا دے' وہ چاہے میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہن لے۔ تم خود ہی بتاؤ کہ مدتوں کے بچھڑے ہوئے محبوب کو سچا رب کب واپس بھیجتا ہے۔ لوگ یونہی دل رکھنے والی باتیں کرتے ہیں' ورنہ مرے ہوئے اور بچھڑے ہوئے کو کوئی نہیں ملا سکتا۔ اگر باز سے کوا کونج چھین لے تو تم دیکھنا کہ وہ باز خاموش ہوکر اپنی چونچ پروں میں دبا لیتا ہے یا چلاتا ہے۔)

ایک دم حیدر علی کا دل چاہا کہ وہ سائیں بابا سے ملے' کیوں؟ اس کی اسے خبر نہیں تھی۔ بس

وہ چاہتا تھا کہ ان سے ملے۔ اس کے قدم خود بخود آواز کی سمت اٹھ گئے۔

سائیں بابا کھیتوں کے درمیان لنگڑاتے ہوئے چلتے جا رہے تھے۔

''سائیں بابا!'' اس نے بے اختیار انہیں آواز دی۔

سائیں بابا نے سر گھما کر اس کی جانب دیکھا۔

''سائیں بابا!'' وہ ان کے قریب چلا آیا' لیکن اسے خود خبر نہیں تھی کہ وہ ان سے کیا بات کرنا چاہتا تھا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم میرے پاس آؤ گے۔'' وہ بولے۔ ''تم نے آج رات تارا ٹوٹتے دیکھا ہے؟ نہیں' مجھے خبر ہے کہ تم نے نہیں دیکھا۔''

حیدر علی الجھ گیا۔

''سائیں بابا آپ کون ہیں؟'' وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''اس اوپر والے کی ایک ادنیٰ مخلوق' جو اپنی کھوئی ہوئی چیز تلاش کرتے کرتے فقیر بن گیا ہے۔''

''آپ نے کوئی تارا ٹوٹتے دیکھا ہے؟''

''ہاں' تم بھی دیکھ سکتے تھے' لیکن وہ ان دو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے لیے انسان کے اندر آنکھ ہونی چاہیے اور یہ آنکھ بہت مشکل سے ملتی ہے۔'' سائیں بابا نے آہ بھری۔

''جب سب کچھ کھو جاتا ہے تب اندر کی آنکھ بیدار ہوتی ہے لیکن تم یہ آنکھ بھی نہیں پا سکتے۔ تمہیں قدرت نے فقیر پیدا نہیں کیا نہ ہی کبھی تمہارے دل میں فقیر بننے کی آرزو پیدا ہوئی کیونکہ دنیاوی آسائشوں کے سانپ تمہارے پورے وجود سے لپٹے ہوئے ہیں...... دولت کے بچھوؤں سے تمہاری تجوری بھری پڑی ہے نفس کا ناگ پھن اٹھائے کھڑا ہے۔''

ایک دم حیدر علی نے اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا احمق محسوس کیا۔ وہ آکسفورڈ کا پڑھا لکھا کن توہمات میں خود کو جکڑ رہا تھا۔

''نفس' دولت' آرام و آسائش' بچھو یا سانپ نہیں ہوتے' انسان کس لیے محنت کرتا اور مقام بناتا ہے۔ اس احمق بڈھے کی طرح سب لوگ گھر بار چھوڑ کر فقیر بن جائیں تو دنیا کتنی صدیاں پیچھے چلی جائے۔ تہذیب انسانی ایک مرتبہ پھر پتھر کے دور میں پہنچ جائے۔ انسان کو کنوئیں کا مینڈک بنا دینے کے لیے یہ دنیا نہیں بنی۔'' اس نے سوچا۔

''وقت تو مسلسل آگے بڑھنے کے عمل کا نام ہے' حرکت میں زندگی ہے۔ ٹھہراؤ اور جمود موت ہے پھر انسان جانتے بوجھتے کیسے موت کو گلے لگا سکتا ہے؟''

سائیں بابا جو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے تھے' ایک دم ہنس پڑے اور ایک سمت چل دیئے۔

"ہونہہ!" اس نے سر جھٹکا۔

"جن لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا' وہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو بہلانے کا کوئی ذریعہ بھی تو ہونا چاہیے ناں۔ دربدر پھرنے کے لیے بھی تو کسی جواز کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ خود کو مطمئن کیا جا سکے۔"

وہ پھر اسی پگڈنڈی پر ہولیا۔

"جس کے لیے دولت اور آسائش کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ وہ اسی طرح دولت کو برا بھلا کہتا ہے۔ میں نے بہت کم لوگوں کو باہوش و حواس دولت کو ٹھکراتے دیکھا ہے اور ان میں سے بیشتر کو بھی بعد میں پچھتاتے ہی دیکھا ہے۔"

وہ چلتا جا رہا تھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔

موسم اچھا ہو رہا تھا' لیکن اس کا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ سائیں بابا کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر وہ زیب النساء کے بارے میں سوچنے لگا۔

"یہ ہونا تھا۔ میں پہلے ہی بابا جان کو اس تکلیف دہ صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ کاش انہوں نے میری بات پر توجہ دی ہوتی۔ پتا نہیں اب وہ زیبی آپی سے کیا بات کر آئے تھے۔ کہیں وہ ان سے کوئی سخت بات نہ کہہ دیں جبکہ اس وقت انہیں تسلی اور دلجوئی کی ضرورت ہے۔"

چلتے چلتے اس کی ٹارچ کی روشنی خون آلود مٹی پر پڑی۔ وہ پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ خون بارش کے پانی کے ساتھ مٹی میں جذب ہو رہا تھا' لیکن اب بھی واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے شہادت کی انگلی سے اس جگہ زمین کو چھوا اور پھر انگلی سونگھنے لگا۔ خون کی ہلکی سی بو نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔

وہ واقعہ یہیں رُونما ہوا تھا۔ حیدر علی نے اردگرد ٹارچ کی روشنی ڈالی' لیکن وہاں کوئی انسانی جسم موجود نہیں تھا۔ ہاں کسی کے گھسیٹے جانے کے واضح آثار موجود تھے۔ اس نے ان نشانوں پر روشنی ڈالی۔ کچھ دور جا کر وہ نشان ختم ہو گئے تھے۔ ابھی بارش بہت ہلکی تھی' ورنہ شاید یہ نشان مٹ چکے ہوتے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ دیر ہوگئی ہے۔" اس نے سوچا۔ "اسے بڑے بھائی جان نے اٹھوا دیا ہے۔"

بوجھل قدموں کے ساتھ وہ واپس چل پڑا۔

"زیبی آپی کو کیا جواب دوں گا اب...... انہوں نے پوچھ لیا تو کیا بتاؤں گا کہ ان کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہ کر سکا۔"

پتا نہیں اماں جان کا کیا حال ہوگا۔ یہ صدمہ ان کے لیے بہت بڑا ہے' لیکن کڑوی سہی' یہ گولی ہم سب کو نگلنی ہے' کیونکہ ان حالات تک پہنچنے کے ذمہ دار ہم سب خود ہیں۔ زیبی آپی کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا قصوروار ہم ہیں۔"

چلتے چلتے پرانے کنویں کے نزدیک لگے برگد کے درخت کو دیکھ کر وہ رک گیا۔ بہت سی یادوں کی کسک ایک دم جاگ اٹھی تھی۔ گوری شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ آج اس جگہ کوئی نہ تھا' نہ ہنسی کی کھنک تھی' نہ وہ سسکیاں' صرف ویرانی تھی' جس نے اس جگہ ڈیرا جما رکھا تھا۔ مایوسی کی لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

"کیا دیا میری محبت نے اسے آنسو' دکھ' اذیت اور مستقبل کا خوف' وہ اب بھی تڑپتی ہوگی میرے لیے' سمجھ رہی ہوگی کہ میں اسے بھول گیا ہوں۔ اسے کیسے بتاؤں کہ اس کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت' ہر پل میرے ساتھ ہوتی ہے۔ میرے خیالوں میں' میری یادوں میں۔"

سر جھٹک کر وہ حویلی کی طرف چل دیا۔

☆======☆======☆

پیر صاحب، رجب علی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئے، جہاں یاسمین، اماں جان کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ مہر النساء بھی ان کے قریب ہی مسہری پر گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔

انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اماں جان نے تڑپ کر ان کی جانب دیکھا، لیکن منہ سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔

رجب علی ان سے نظریں چرا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

پیر صاحب کی آنکھوں میں دکھ اور کرب کی پرچھائیاں پھیلی ہوئی تھیں، وہ بھی وہیں بیٹھ گئے۔

''آپ کی بیٹی سکون کی نیند سو گئی ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئے تو ان کی آواز میں کوئی لرزش، کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ بس یوں جیسے وہ کوئی عام سی بات بتا کر اپنا فرض پورا کر رہے تھے۔

اماں جان نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ پتا نہیں ان میں کتنا صبر، کتنا حوصلہ تھا کہ ان کے منہ سے سسکی بھی نہیں نکلی۔

یاسمین نے پیر صاحب کی بات سن کر چونک کر رجب علی کی طرف دیکھا، لیکن وہ صوفے سے پشت ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

اور مہر النساء نے شاید کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ اس کی سوچیں اتنی ہی گہری تھیں جتنا اماں جان کا صبر۔ کمرے میں موت کا سا سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ یاسمین اب بھی اماں جان کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ ان کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا، لیکن منہ سے ایک بھی سسکی نہیں نکلی تھی۔

کتنے ہی لمحے دبے پاؤں سرکتے گئے۔ کمرے کی جامد خاموشی دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز سے ٹوٹی۔ آنے والا حیدر علی تھا۔ ایک نظر اس نے وہیں کھڑے کھڑے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر اندر چلا آیا۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر یاسمین نے گھبرا کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔

یہ ان کے خاندان کی روایت تھی کہ بھابی دیوروں کے سامنے بھی نہیں آتی تھیں۔ رشتہ کتنا

بھی قریبی سہی لیکن نامحرم بہرحال نامحرم ہی تھا۔

چادر کی اوٹ سے اس نے رجب علی کی جانب دیکھا، لیکن وہ اس کے بجائے حیدر علی کی طرف متوجہ تھا، جو اماں جان کے پاس آ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دبے قدموں کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اماں جان۔'' اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لیکن وہ اسی طرح گھٹنوں پر سر رکھے بے آواز روتی رہیں۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس آپ حوصلہ رکھیں۔'' اس نے انہیں تسلی دی۔

''دیکھیں، ہم سب موجود ہیں یہاں آپ کے پاس۔ ابھی میں آپی کے پاس بھی گیا تھا، وہ آرام سے سو رہی تھیں اس لیے میں واپس چلا آیا۔''

کچھ دیر تک وہ انہیں تسلی دیتا رہا، لیکن اس کی باتوں کے جواب میں انہوں نے سر تک نہیں اٹھایا۔

پھر وہ پیر صاحب کی طرف مڑا۔ ''بابا جان میں جان سکتا ہوں کہ آپ نے زیبی آپی سے کیا بات کہی تھی؟''

''کیا تم نے اسے سکون سے سوتے نہیں دیکھا؟'' انہوں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''اسی بات پر تو مجھے حیرت ہے کہ وہ اتنے آرام و سکون سے سو کیسے گئیں۔ ان کی ذہنی حالت اچھی نہیں تھی۔''

''ہمارا خیال ہے کہ یہ بہتر ہی ہوا ہے۔''

''ہاں خیر بہتر تو ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں ابھی اس جگہ گیا تھا، لیکن وہاں کوئی لاش نہیں تھی۔''

پیر صاحب یا رجب علی نے اس کی بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چند لمحے وہ ان کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر انہیں خاموش پا کر بولا۔

''اسے گھسیٹ کر اور شاید اٹھا کر کسی اور جگہ لے جایا گیا ہے کیا یہ آپ نے کیا ہے؟''

''یہ تمہارے سوچنے یا حل کرنے کے مسئلے نہیں ہیں۔'' بالآخر رجب علی نے کہا۔

''نہیں، کوئی بھی معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔'' اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

''سب سے پہلے تو مجھے اچھو کے بارے میں بتائیں کہ اسے کہاں دفن کیا گیا ہے؟''

''کیا تمہارے خیال میں اسے دفن کیا جانا چاہیے تھا؟'' رجب علی نے تلخ انداز میں کہا۔

''کاش میرے لیے ممکن ہوتا کہ سارا گاؤں اس کی روندی ہوئی لاش دیکھ سکتا۔ یہ دیکھ پاتا کہ اس قسم کی حرکت کرنے والے کی لاش کتے کس طرح گھسیٹتے پھرتے ہیں، کیسے چیل اور کوے اسے نوچ کر کھاتے ہیں۔''

''بس بھائی جان بہت ہو گیا۔'' حیدر علی کا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔

"میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اچھو کی لاش نماز جنازہ کے ساتھ دفن ہوگی۔"

"کیوں؟ تم اپنی غیرت اتار کے ایک طرف رکھنے کے بعد اسے کندھا دینا چاہتے ہو؟" رجب علی طنزیہ انداز میں بولا۔

"آپ کس غیرت کی بات کر رہے ہیں میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اعمال نامہ اس جگہ سب کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کتنے غیرت مند ہیں۔"

"شٹ اپ۔" رجب علی دھاڑا۔

"ڈونٹ شاؤٹ (چلاؤ نہیں) زبان سب کے منہ میں ہوتی ہے اور اسے استعمال کرنا بھی سب جانتے ہیں۔ آواز کا والیوم اونچا کر کے اگر آپ اپنی غیرت مندی ثابت کرنا چاہتے ہیں تو جان لیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"حیدر علی! تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔" پیر صاحب نے کہا۔

"حدود کا تعین ہمیں نئے سرے سے کرنا ہوگا بابا جان! جو کچھ ہو چکا اسے کوئی بھی واپس نہیں لوٹا سکتا' لیکن اس واقعے سے سبق حاصل کر کے ہمیں پرانی روایتوں کے شکنجے سے اپنا آپ چھڑانا ہوگا۔"

"اس سے پہلے کہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تم یہاں سے چلے جاؤ علی۔"

"نہیں بابا جان! آپ کو مجھے برداشت کرنا ہوگا...... آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ میں اپنی بہنوں کو مزید ایک لمحے کے لیے بھی اس سولی پر لٹکتا نہیں دیکھ سکتا۔ جس پر صدیوں سے اس خاندان کی لڑکیوں کو روایت کے نام پر لٹکایا جا رہا ہے۔"

"ہمیں مجبور مت کرو کہ ہم تم پر ہاتھ اٹھالیں' چلے جاؤ یہاں سے۔"

"آج آپ مجھ پر ہاتھ اٹھائیں یا گولی چلائیں' لیکن آپ کو وہ سب سننا ہوگا جو حقیقت ہے۔" اس کا انداز اٹل تھا۔

"آج جو کچھ ہوا اس کے ذمہ دار آپ ہیں بابا جان اور بھائی جان آپ بھی۔ آپ زیبی آپی کو بالوں سے گھسیٹ کر یہاں لائے کیوں؟ اس لیے کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ یہ چار دیواری چھوڑ کر ایک نئی دنیا بسانے جا رہی تھیں' لیکن کیا ایک لمحے کے لیے بھی آپ نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ ایسا کیوں ہوا؟"

"تم اس وقت آکسفورڈ میں اپنے کلاس روم میں نہیں ہو علی' یہاں تمہارا فلسفہ نہیں چل سکتا۔ یہ غیرت کے معاملے ہوتے ہیں۔ اس حویلی کی عورتوں کو ویسے رہنا ہوگا جس سے یہاں کی عزت پر حرف نہ آئے۔ تمہارے فلسفے نے تمہاری غیرت اتار پھینکی ہے' لیکن مجھ میں اب تک غیرت موجود ہے۔"

"مت نام لیں میرے سامنے غیرت کا۔" حیدر علی غصے سے پھٹ پڑا۔

"کس غیرت کی بات کر رہے ہیں' کیا غیرت اس کا نام ہے کہ آپ روپے پیسے سے زبان خریدیں اور جہاں طاقت سے کام چل سکتا ہو وہاں اپنے بندوں سے کہہ کر لڑکیاں اٹھوا لیں لیکن جب آپ کی بہن کسی غیر مرد کے ساتھ نظر آئے تو آپ اسے بالوں سے گھسیٹ کر گھر لے آئیں۔ اگر آپ کی غیرت کا یہی معیار ہے تو آئی ایم سوری مجھے بے غیرت رہنا ہی پسند ہے۔"

"بس علی! آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔" پیر صاحب کا غصہ بھی آسمان پر پہنچ چکا تھا۔

"تمہیں یہ لحاظ بھی نہیں ہے کہ تم کس سے بات کر رہے ہو' یہ خیال بھی نہیں ہے کہ یہاں تمہاری بہن اور ماں بھی موجود ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں کیا وہ سوال کبھی اماں جان یا بڑی آپا کے ذہن میں گردان نہیں کرتے ہوں گے؟ آپ نے ان سے عمل کرنے کی آزادی چھین رکھی ہے لیکن آپ ان کی سوچ پر پہرے نہیں بٹھا سکتے۔ کاش آپ جان سکتے کہ آج زیبی آپی نے مجھ سے کیا کہا ہے۔

میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ اگر آپ ان کے لیے صدر دروازہ نہیں کھولیں گے تو چور دروازے خود بخود کھل جائیں گے۔ ان کے صبر و ضبط کو ان کے لیے امتحان نہ بنائیں ورنہ یہ پیالہ چھلک جائے گا' لیکن آپ کو اپنی روایتیں عزیز تھیں' اس لیے میری ان باتوں نے مجھے آپ کی نظر سے گرا دیا۔ اگر اس لمحے آپ نے میری بات سن کر سمجھ لی ہوتی تو آپ کو یہ رات آنکھوں میں نہ کاٹنی پڑتی۔ زیبی آپی کے مجرم آپ ہیں بابا جان آپ......"

"علی' علی!" رجب علی غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے حیدر علی کا گریبان پکڑ لیا۔ "تمہاری یہ جرأت کہ تم بابا جان سے اس قسم کی بات کرو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میرے مرنے سے بھی آپ کے مسئلے حل نہیں ہوں گے' اس لیے میرا گریبان چھوڑ دیں۔"

رجب علی کے لیے یہ انتہا تھی۔ اس نے حیدر علی کے منہ پر گھونسہ لگانے کی کوشش کی' لیکن اس نے ایک طرف جھک کر خود کو بچا لیا اور ایک جھٹکے سے اپنا گریبان بھی چھڑا لیا۔

اماں جان گھٹنوں سے سر اٹھائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ مہر النساء بھی ایک ٹک انہی کی جانب دیکھتی جا رہی تھی۔

"مجھے مجبور نہ کریں بھائی جان کہ میں بھی آپ کو اسی زبان میں جواب دوں۔ اس سے زیادہ برداشت کا حوصلہ میرے اندر بھی نہیں ہے۔"

"تم مجھے کیا بتاؤ گے۔" رجب علی اس پر جھپٹا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔ اماں جان کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ

نکل گئی۔

"انہیں الگ کرائیں اللہ کے واسطے انہیں الگ کرائیں۔" وہ پیر صاحب کی طرف دیکھ کر منت بھرے انداز میں چلائیں۔

"آج فیصلہ ہو جانے دیں نذری بیگم۔"

ان دونوں کی لڑائی سے کمرے کی چیزیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔

جب پیر صاحب نے بھی مداخلت سے انکار کر دیا تو اماں جان بستر سے اتر آئیں۔

"بند کرو یہ لڑائی۔" وہ دونوں بھائیوں کے بیچ میں آ گئیں۔ "تم دونوں کیا سب ادب آداب بھول گئے ہو؟"

اماں جان کو اپنے بیچ آتے دیکھ کر دونوں نے ہاتھ روک لیے اور ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔

"اس گھر کے ہر مکین کی محبت میں، میں نے اپنا آپ مٹا دیا۔ اس کا یہ صلہ دے رہے ہو مجھے؟ اپنی کس کس اولاد کے لیے رونا پڑے گا مجھے؟"

حیدر علی نے سر جھکا لیا۔

"دور ہو جاؤ تم دونوں میری نظروں کے سامنے سے۔"

"اماں جان!" حیدر علی نے کچھ کہنا چاہا۔

"مت بات کرو مجھ سے آج میری اولاد نے میرا ایسا دل دکھایا ہے کہ تم میں سے کسی کے ساتھ بات کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ چلے جاؤ دونوں یہاں سے۔"

حیدر علی بوجھل قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔

☆======☆======☆

"میں سوچ رہی ہوں رضیہ کہ شاہ جی کو تحفہ دوں۔" زرینہ نے کہا۔

"اوہ خدایا!" رضیہ کا دل چاہا کہ اس کا سر پھاڑ ڈالے۔

"تم میں ذرا بھی مستقل مزاجی نہیں ہے۔ ابھی چند دن پہلے تو تم کہہ کر آئی تھیں کہ آئندہ ان سے نہیں ملو گی۔"

"ابھی کم از کم ایک ملاقات تو رہتی ہے ناں۔" وہ بولی۔ "جس میں وہ مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کریں گے اور اگر فیصلہ میرے حق میں ہو گیا تو پھر سب غم ہی ختم ہو جائیں گے اور پھر یہ بھی دیکھو ناں کہ انہوں نے مجھے کتنے ہی تحفے دیئے ہیں، مجھے انہیں کچھ تو دینا چاہیے۔"

پتا ہے رضیہ! میں ہر نماز کے بعد صدق دل سے دعا کرتی ہوں کہ سائیں بابا نے جو کچھ کہا وہ پورا ہو جائے اور شاہ جی مجھے وہ خوش خبری سنائیں، جو اس سے پہلے میں سائیں بابا کے منہ سے سن چکی ہوں۔"

"وہ خوش خبری کب تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ تم ایسے دلہن بنو گی کہ نہ تن پر سرخ جوڑا ہو گا نہ گلے میں زیور نہ ڈھول تاشے نہ باجے گاجے۔ ہاں بہت سی آہیں اور سسکیاں ہوں گی۔"

"شاہ جی مل جائیں تو نہ مجھے سرخ جوڑے کی ضرورت ہے نہ زیور کی اور گھر سے بیٹی کو رخصت کرتے وقت وہ کون سا گھر ہوتا ہے، جہاں ماں باپ روتے نہیں ہیں۔"

"وہ خوشی کا رونا ہوتا ہے، آہیں اور سسکیاں نہیں ہوتیں۔ آہیں اور سسکیاں تو تب نکلتی ہیں جب دل زخمی ہو کر خون خون ہو جاتا ہے۔"

"تو کیا وہ فوزیہ کی سسکیاں ہوں گی؟" وہ سوچ میں ڈوب گئی۔

"رضیہ! میں نے تو کبھی کسی کو دکھ دینے کا سوچا بھی نہیں تھا، لیکن ہم میں سے کسی ایک کو تو بوجھ اٹھانا ہی ہو گا۔ مجھ میں کسی کو بھی دکھ پہنچانے کا حوصلہ نہیں ہے، اس لیے فیصلے کا تمام تر اختیار میں نے شاہ جی کو دے دیا ہے۔ میں آنکھیں بند کر لینا چاہتی ہوں، کوئی منظر نہیں دیکھنا چاہتی نہ خوشی کا نہ غم کا، میں تو بس شاہ جی کا ساتھ چاہتی ہوں عمر بھر کا۔"

"آنکھیں بند کرنے سے کیا ہوتا ہے، جس کا دل دکھتا ہے، اس کی آہیں اور سسکیاں دل سے دیکھی اور سنی جاتی ہیں۔"

"میں اس مسئلے پر سوچنا نہیں چاہتی۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"انسان موت سے پہلے اس کے خوف سے کیوں مر جائے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں انہیں تحفے میں کیا دوں؟"

"مجھ سے کیوں پوچھتی ہو، پہلے بھی تم نے میری کس بات پر عمل کیا ہے؟"

"میں انہیں اپنے ہاتھ کا کاڑھا ہوا رومال دے دوں؟" اس نے رضیہ کی بات نظر انداز کر دی۔

"تمہاری مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

زرینہ اسے کمرے سے باہر جاتے دیکھتی رہی پھر خود بھی باہر چلی آئی۔

مولوی صاحب برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ ان کے پاس چلی آئی۔

"ابا جی! آپ سے کچھ کہنا تھا۔" وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کہو۔" انہوں نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے ریشمی کپڑا اور رنگین دھاگے چاہئیں۔"

"کیا کرو گی؟"

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ ایک خوبصورت سا رومال کاڑھوں۔"

"اتنے بچے پڑھنے کے لیے آتے ہیں کسی سے کہہ کر منگوا لو یا چاہو تو خود جا کر خرید لاؤ۔"

"اس گاؤں میں تو کوئی بھی چیز نہیں ملتی آپ مجھے شہر سے منگوا دیں ناں۔" اس نے لاڈ

سے کہا۔

''جب کوئی شہر جائے گا تو منگوا دوں گا۔''

''آپ بھول جاتے ہیں ابا جی لیکن یہ بہت ضروری ہے آپ کو یاد رکھنا ہوگا۔''

''میں تو واقعی بھول جاتا ہوں' لیکن اس کا کیا علاج ہے۔''

''علاج بالکل ہے۔'' وہ فوراً بولی۔

''تو اجازت ہے لو کر دو۔''

''علاج یہ ہے ابا جان کہ میں صبح شام ہر وقت آپ کو یاد دلاتی رہوں گی' پھر آپ نہیں بھولیں گے۔''

''ابا جی یاد نہیں دلاتی رہے گی' آپ کے کان کھاتی رہے گی۔'' رضیہ نے جل کر کہا۔

''یہ تو بتا دو کہ کس رنگ کا کپڑا اور دھاگا چاہیے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اوں۔'' وہ سوچنے لگی۔ ''ہاں سفید رنگ کا کپڑا اور سرخ دھاگا ٹھیک رہے گا۔''

''اُف گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔'' ماں کمرے سے نکلیں۔ ''زرینہ آج سے صحن میں چارپائیاں بچھانی شروع کر دو۔ سارا گاؤں صحن میں سوتا ہے۔ ہمارے گھر میں سب کو گرمی کھانے کا زیادہ ہی شوق ہے۔''

''اماں باہر سونا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔'' زرینہ نے تائید طلب نگاہوں سے رضیہ کو دیکھا لیکن وہ جگ ہاتھ میں لیے موتیے کے پھولوں کو پانی دیتی رہی۔

''اندر کمرے میں بھن جائے گی یہ لڑکی۔'' اماں تخت پر جا بیٹھیں۔

''میں بالکل نہیں بھنوں گی۔ میری فکر نہ کیا کریں۔'' وہ بولی۔

''اور آج تو آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیاں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ ذرا بارش ہوئی تو چارپائیاں برآمدے میں رکھنے کے لیے دوڑو۔ نہیں اماں مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ چند دن کمرے میں ہی گزار لیں۔''

''نمک کی بنی ہوئی نہیں ہو کہ بارش میں گھل جاؤ گی۔''

''اماں! میں مکئی کا دانہ بھی نہیں ہوں' جو بھن جاؤں گی۔'' اس نے منہ بنایا۔

''بس جو میں کہہ رہی ہوں' وہ کرو۔'' اماں نے اسے ڈپٹا۔ ''ہر گھر میں لڑکیاں یہ کام کرتی ہیں۔ تمہارے نخرے بڑھتے جا رہے ہیں۔''

پھر وہ مولوی صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

''کچھ خیر خبر ملی اچھو کی؟ پتا نہیں گاؤں چھوڑ کر کہاں چلے گئے سب گھر والے۔''

''جانا کہاں ہے' ملتان یا لاہور چلا گیا ہوگا۔'' وہ بولے۔

''ابا جی! ہو سکتا ہے کراچی چلا گیا ہو۔'' زرینہ نے بھی خیال ظاہر کیا۔

''ملتان اتنا قریب ہے اور لاہور کوئی نہ کوئی حویلی سے جاتا ہی رہتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کراچی ہی گیا ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں مزدوری بھی آسانی سے مل جاتی ہے اور لوگ تو اتنے زیادہ ہیں کہ بندہ چھپ جائے تو کوئی ڈھونڈ بھی نہیں سکتا۔''

''اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے' واپس یہیں آنا ہوگا۔''

''واپس آ گئے تو خیر نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ بڑے شاہ صاحب بہت سخت ہیں' وہ کسی کو معاف نہیں کرتے۔''

''دنیا کا ظلم زیادہ دن نہیں چلتا بالآخر سب نے اوپر والے کے سامنے جمع ہونا ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ سب کے ہاتھوں میں اس کا اعمال نامہ تھما دے گا اور ہم انسان حیران ہوں گے کہ اعمال نامے میں رائی برابر نیکی اور بدی تک بھی موجود ہوگی' لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے' جو بہر حال میں پورا ہوگا اور اس اگلی دنیا میں ہر کوئی اپنے اعمال کے مطابق جگہ پائے گا۔ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے ہاں وہ ابدی دنیا ہے اور یہ زندگی درحقیقت ہمیں اس دنیا کے لیے دی گئی ہے تاکہ ہم اپنی اگلی زندگی کی خاطر زادِ راہ اکٹھا کر سکیں۔''

''لیکن ابا جی! پیر صاحب تو ایسے نہیں ہیں' وہ تو بہت اچھے ہیں پھر وہ بڑے شاہ صاحب کو روکتے کیوں نہیں ہیں؟''

''جو بات ان کے علم میں ہی نہ آئے' اسے کیسے روک سکتے ہیں وہ؟''

''ہوں۔'' پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بظاہر بہت سرسری انداز میں بولی۔

''ابا جی! باہر کی تعلیم کچھ نہ کچھ اثر تو دکھاتی ہی ہے۔ ابھی ایک بیٹے کی حرکتیں سامنے آئی ہیں' پتا نہیں دوسرا کیسا ہوگا؟''

''شاید۔'' مولوی صاحب بولے۔ ''انسان کسی کے بارے میں کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔''

زرینہ بجھ کر رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ مولوی صاحب حیدر علی کی تعریف کریں گے یا اس کے متعلق کوئی اور بات بتائیں گے' لیکن انہوں نے تو گفتگو ہی ختم کر دی تھی۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر صحن میں چارپائیاں بچھانے لگی۔

رات کو کھلے آسمان تلے سیدھی لیٹ کر وہ تارے گننے کی کوشش کرتی رہی لیکن تھوڑی ہی دیر میں تاروں اور بادلوں کی آنکھ مچولی میں الجھ گئی۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پھر سائیں بابا کی پُرسوز آواز ہوا کے دوش پر چار دیواری پھلانگ کر اندر داخل ہوئی۔

''ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی

بھلا دس کھاں چڑیں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک بازتوں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

وہ اٹھ بیٹھی۔ حیدر علی کی یاد شدت سے ابھر آئی تھی۔ وہ اس کا خیال ذہن سے جھٹک دینا چاہتی تھی لیکن وہ ہر رکاوٹ عبور کر کے دندناتا چلا آرہا تھا۔

بارش کا ایک قطرہ اس کے بالوں میں جذب ہوا تو وہ چونکی اور جلدی جلدی بستر سمیٹنے لگی۔ ذرا سی دیر میں سب کی آنکھ کھل گئی۔ اماں ابا تو کمرے میں چلے گئے۔ وہ دونوں بستر سمیٹنے اور چارپائیاں اٹھانے لگیں۔

''اچھی بھلی نیند برباد ہو گئی۔'' رضیہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔

لیکن وہ وہیں برآمدے میں تخت پر لیٹ گئی۔

''پتا نہیں شاہ جی کیا فیصلہ کرتے ہیں۔'' وہ سوچنے لگی۔

''اور ایک ان کے فیصلے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل میں تو پیر صاحب کو فیصلہ کرنا ہے۔ اور ان کی ہر بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے جبکہ وہ پہلے ہی فوزیہ کے حق میں فیصلہ کر چکے ہیں' پھر بھی پتا نہیں کیوں سائیں بابا کی بات یاد آجاتی ہے تو دل کو قدرے سکون ہو جاتا ہے۔ پھر وہ آہیں اور سسکیاں۔''

☆======☆======☆

سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

حیدر علی رات بھر سو نہیں سکا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے قدموں تلے انگارے بچھا دئیے ہوں۔ اگر رجب علی کو اپنے کئے پر ذرا بھی ندامت ہوتی تو وہ چپ کر جاتا لیکن جب وہ بار بار اپنے فعل کو غیرت مندی پر محمول کرنے لگا تو حیدر علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ ایک واقعے نے ان کے درمیان وسیع خلیج حائل کر دی تھی۔ ساری رات وہ راکنگ چیئر پر بیٹھ کر جھولتا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ غصہ اور دکھ اس کے وجود کے ایک ایک بند میں جیسے موجیں مار رہا تھا۔

صبح کا وقت اس نے بمشکل کاٹا تھا۔ جیسے ہی سپیدۂ سحر نمودار ہوا' وہ زیب النساء کے کمرے کی طرف بڑھا' دو تین مرتبہ دستک کے جواب میں جب کسی نے اندر سے آنے کو نہیں کہا تو اس نے ہلکا سا دباؤ ڈال کر دروازہ کھول لیا۔

کمرے میں نائیٹ بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی' اور زیب النساء مسہری پر دراز بے خبر سو رہی تھی۔ وہ دروازے سے ہی واپس پلٹ آیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اب بھی صورتِ حال

ہی تھی' وہ پلٹنے لگا پھر رک گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس صورتِ حال میں آپی اتنی بے فکری کی نیند سو جائیں۔''
اس نے سوچا۔

اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ کہیں کوئی گرہ تھی جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کچھ دیر وہ اسی شش و پنج میں مبتلا رہا کہ آگے بڑھ کر زیب النساء کو جگا دے یا سویا رہنے دے پھر یہ سوچ کر پلٹ گیا کہ اگر وہ سچ مچ اتنی بے فکری سے سو رہی ہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہی ہے۔ ہاں اگر مزید کچھ دیر تک نہ جاگی تو وہ اسے جگا دے گا۔

وہ واپس اپنے کمرے میں تو آ گیا تھا' لیکن اس کا ذہن مسلسل زیب النساء کی طرف تھا۔ اس کا یوں سو جانا ایک غیر معمولی بات تھی' جو بار بار حیدر علی کو پریشان کر رہی تھی۔

جب بے چینی حد سے بڑھ گئی تو پھر وہ زیب النساء کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ اب مرتبہ پھر ہلکے سے دباؤ سے کھل گیا۔ اس نے اندر جھانکا تو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں وقت تھم گیا ہو' جیسے اتنے سامان سے بھرے ہونے کے باوجود وہ کمرا بالکل خالی ہو اسے اپنی گزشتہ رات کی سوچ یاد آئی۔

''وقت تو مسلسل آگے بڑھنے کا نام ہے' حرکت میں زندگی ہے' ٹھہراؤ اور جمود ہے۔''

اور اس وقت کمرے کی ہر چیز ساکت ہو چکی تھی۔ زندہ انسان بے جان چیزوں میں بھی ہلچل پیدا کر دیتے ہیں' پر جب زندگی فنا کے گھاٹ اترتی ہے تو لمحے رک جاتے ہیں۔ بے جان چیزیں قائم رہتے ہوئے بھی فنا ہو جاتی ہیں۔ بالکل یوں جیسے چاند اپنی چمک دمک کے لئے سورج کا محتاج ہوتا ہے۔ جس دن سورج کو فنا نے آدبوچا' اسی دن چاند کا وجود بھی بے معنی ہو جائے گا۔

کمرے میں لمحوں کے ساکت ہو جانے کا احساس ہوتے ہی حیدر علی کا دل بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن بالکل خالی الذہنی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ چند قدموں کا فاصلہ کوسوں پر محیط ہو گیا تھا' اس لئے ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی۔

اور پھر اجل کے ہاتھوں نے زندگی کو شکست دے دی۔ نائیٹ بلب کی زرد روشنی میں بھی اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ کبھی کی اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔ چہرے پر پھیلی ہلکی سی زردی یہ بتانے کے لئے بھی کافی تھی کہ اس پر کیا بیت چکی ہے۔

چند ثانیے حیدر علی سن ہو کر رہ گیا' اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ وہ ایک ٹک زیب النساء کی طرف دیکھے گیا۔ اس کے سفید کپڑوں پر لگے خون کے دھبوں سے ہلکی سی بو اٹھ رہی تھی اور سفید ہی چادر پر اس کے سیاہ لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر ابدی سکون پھیلا ہوا تھا۔

''پتا ہے علی کون آیا ہے؟'' دیواریں چلانے لگیں۔

"موت کے ہرکارے آئے ہیں۔ سن رہے ہو ان کے قدموں کی چاپ۔ میں ان کی منتظر تھی' وہ جان کی بازی لگا کر بھی مجھے آزاد کروانے کا بندوبست کر گیا ہے۔"

"تم نے آج رات کو تارا ٹوٹتے دیکھا ہے؟" آئینہ بولا۔

"نہیں، تم نہیں دیکھ سکتے' مجھے خبر ہے تم نے نہیں دیکھا۔"

☆======☆======☆

حویلی کے در و دیوار کے بیچ معمول کے مطابق کام شروع ہو چکا تھا۔ پیر صاحب ابھی ابھی قرآن پاک بند کر کے اپنی خواب گاہ سے باہر نکلے تھے' رجب علی اور سخاوت علی گھڑسواری پر جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ جب حیدر علی وہاں پہنچا۔

"علی بھائی۔" سخاوت اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ "آج آپ جلدی جاگ ہی گئے ہیں تو ہمارے ساتھ رائیڈنگ پر ہی چلے چلیں۔ آپ ہوتے ہیں تو رائیڈنگ کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔"

حیدر علی نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا اور رجب علی کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں تولتے رہے پھر حیدر علی گویا ہوا۔

"آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ جیت گئے ہیں؟ نہیں' زیبی آپی کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ نا قابلِ معافی ہے؟"

"اگر تم میرے بھائی نہ ہوتے علی تو اس وقت زمین کے اوپر یوں تن کر کھڑے نہ ہوتے۔"

"آپ کو ان رشتوں کا احساس ہے؟" وہ تلخی سے بولا۔ "نہیں' موت کے ہرکارے کو کسی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا کام تو صرف موت بانٹنا ہوتا ہے' جو آپ اس گھر میں بانٹ رہے ہیں۔ آپی کے قتل پر میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"اوہ!" رجب علی نے گہرا سانس لیا۔

"کیا ہوا زیبی آپی کو؟" سخاوت کے لئے یہ بات نا قابلِ یقین تھی۔

"وہ بالکل ٹھیک تھیں' کل رات کتنی دیر تک میں ان کے پاس بیٹھا رہا تھا۔"

"رجب علی' زیب النساء کی وفات کا باقاعدہ اعلان کر دو اور یہ بھی کہ اس بات کا علم کے وقت سب سے پہلے حیدر علی کو ہوا ہے۔" پیر صاحب نے حکم دیا۔

"کتنے سنگ دل' کس قدر بے حس لوگ ہیں آپ۔" حیدر علی چلایا۔ "اپنے ہاتھ کا کتا مر جائے تو انسان اس پر بھی افسردہ ہو جاتا ہے' لیکن آپی کو قتل کر دینے کے بعد بھی آپ کی پشیمانیوں پر شرمندگی کی ایک لکیر' دکھ کا ذرا سا سایہ بھی نہیں ہے۔"

"قتل۔" سخاوت زیرِ لب بولا۔ وہ کوئی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"حیدر علی۔ اسے نہ تو قتل کیا گیا ہے اور نہ سزا دی گئی ہے۔" پیر صاحب نے قطعی انداز میں کہا۔ "وہ اس در و دیوار سے آزادی چاہتی تھی' سو ہم نے اس کے لئے نیا گھر تعمیر کر دیا۔ ہمارے بس میں اس قدر آزادی دینا تھا' اس لئے آئندہ ہم تمہارے منہ سے یہ الفاظ کبھی نہ سنیں۔ اپنی اولاد اور خود اپنے سے بھی زیادہ' ہمیں اپنی اور اس حویلی کی عزت عزیز ہے اور ہم کسی کو بھی یہ عزت خاک میں ملانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

"بابا جان اس حویلی کی عزت مجھے بھی بہت پیاری ہے' لیکن انسانی جذبات و احساسات سے زیادہ نہیں۔ آج تو میں خاموش ہو رہا ہوں کیوں کہ اب وقت پلٹ نہیں سکتا' لیکن آئندہ ہم بھائی شاید اکٹھے نہ ہو سکیں۔ آج سے میری ان رسموں رواجوں اور ان کے علمبرداروں سے کھلی جنگ ہے۔"

☆======☆======☆

صبح زرینہ کی آنکھ افراتفری اور غیر معمولی چہل پہل کی وجہ سے کھلی۔ ایک آنکھ کھول کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ صحن میں کچھ عورتیں جمع تھیں اور اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں۔

"افوہ! اب اٹھ کر اندر کمرے میں جانا پڑے گا۔" اسے الجھن محسوس ہونے لگی۔ ان عورتوں کو بھی اور کوئی وقت نہیں ملا تھا آنے کو۔"

اٹھنے کا ارادہ کرنے کے باوجود وہ کسلمندی سے وہیں پڑی رہی۔ نیند ایک مرتبہ پھر حملہ آور ہو رہی تھی' لیکن ان عورتوں کی اونچی آوازیں اس کے کانوں میں جیسے چبھ رہی تھیں۔

"ملانی جی! پتا نہیں اس گاؤں کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔" ماسی برکتے کہہ رہی تھی۔

"کیا یہی گھڑی رہ گئی تھی دیکھنے کو' یا مولا رحم فرما۔"

"ماسی! تم آہستہ آواز میں رحم طلب کرو گی تو بھی آواز اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائے گی۔" وہ جھنجھلا کر بند آنکھوں کے ساتھ ہی بولی۔

"ضرور تم نے میرا سر کھانا ہے۔"

"اٹھو اب۔" اماں نے اسے ڈپٹا۔ "کیا نحوست پھیلا رہی ہو صبح کے وقت سو کر۔"

اس نے سنی اَن سنی کر کے کروٹ بدل لی۔

"اٹھو زرینہ۔" رضیہ نے اسے جھنجھوڑا۔

"کیا مصیبت ہے۔" اس نے رضیہ کا ہاتھ جھٹکا۔ "ایک تو صبح صبح سارا گاؤں سر پر سوار ہو گیا ہے' اوپر سے تم ہڈیاں چرمرا رہی ہو۔"

"اٹھو جلدی کرو' چھوٹی بی بی کا انتقال ہو گیا ہے۔" اس نے زرینہ کو بری طرح جھنجھوڑ دیا۔

"تو میں کیا کروں؟" وہ جھلائی پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔

"کیا زیب النساء کا انتقال ہو گیا؟"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ ساری نیند غائب ہو چکی تھی۔

کب ہوا؟ تمہیں کس نے بتایا ہے؟''

''یہ جو اتنی عورتیں جمع ہیں' اسی لئے تو آئی ہیں۔''

''میں پوچھ رہی ہوں کب انتقال ہوا کیسے ہوا؟''

''رات کو ٹھیک ٹھاک سوئی تھیں' پتا نہیں کیا ہوا صبح پتا چلا وفات پا گئی ہیں۔''

''اوہ خدایا!'' اس نے سر پکڑ لیا۔

''اماں اور میں حویلی جا رہے ہیں تم چلو گی؟''

زرینہ کا ذہن مفلوج ہو رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر اسے کیا کرنا چاہیے۔

''تم نہیں جانا چاہتیں۔''

''نہیں' میں جاؤں گی۔'' وہ ہولے سے بولی۔ ''پتا نہیں شاہ جی کی کیا حالت ہو گی انہیں بہت محبت تھی اپنی بہن سے۔''

''شی۔'' رضیہ گھبرا گئی۔ ''تم نے ضرور ڈھنڈورا پیٹنا ہے سارے محلے کو سنا دو یہ بات۔''

''میرا ذہن کام نہیں کر رہا۔''

''تو پھر بہتر یہی ہے گھر پر رہ جاؤ' وہاں کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دی تو اپنے ساتھ باقی سب کو بھی مصیبت میں مبتلا کرو گی۔''

''نہیں رضیہ' ایسی باتیں میں صرف تم سے ہی کہتی ہوں اور تو کسی کے سامنے نہیں کہتی۔''

اس کے انداز میں اتنی معصومیت تھی کہ رضیہ کو اس پر بے اختیار پیار آ گیا۔

''اچھا پھر اٹھو جلدی کرو۔''

وہ اچھل کر تخت سے اتری اور جلدی سے تیار ہونے لگی۔

''اماں چلنا نہیں ہے۔'' چند منٹ میں وہ ان کے سامنے تھی۔

''چلو۔'' اماں نے پاؤں چپلوں میں ڈالے۔

''اچانک کیا ہو گیا زیب النساء کو؟'' رضیہ کے ساتھ حویلی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے زرینہ مدھم آواز میں بولی کیوں کہ عورتوں کا خاصہ بڑا ہجوم ان کے ارد گرد ہی موجود حویلی کی طرف چلا جا رہا تھا۔

''پتا نہیں میں خود حیران ہوں جب چھوٹے شاہ صاحب تم سے ملے تھے تو انہوں نے اس سلسلے میں کوئی ذکر کیا تھا؟''

''نہیں' اگر وہ بیمار ہوتیں تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتاتے۔ ویسے اس دن ہم دونوں ہی پریشان تھے اور ہماری ملاقات بھی ہمیشہ کی نسبت مختصر تھی۔''

''مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے' لیکن شاید آج فوزیہ بھی وہاں موجود ہو۔''

رضیہ نے خیال ظاہر کیا۔

زرینہ کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ ''میرا اس سے کیا تعلق ہے' اس کا ذکر کیوں کرتی ہو؟''

''دشمنی کا بندھن تو سب سے زیادہ مضبوط بندھن ہوتا ہے۔''

''ہوتا تو ہو گا' لیکن میری اس سے دوستی ہے نہ دشمنی' میرے لئے اس کے وجود یا اس کے ہونے نہ ہونے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''یہ رویہ بہت اچھا ہے۔'' رضیہ نے تبصرہ کیا۔

''اس طرح نہ تمہیں دکھ کا سامنا کرنا پڑے گا اور نہ پچھتاووں کا' لیکن اسے اپنانا بہت مشکل ہے۔''

''میرے لئے مشکل نہیں ہے۔'' وہ خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی' مگر اس کا لہجہ اس کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا۔

حویلی کے پھاٹک پر پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لئے رک گئی۔

''چلو جلدی کرو۔'' رضیہ نے اسے گھسیٹا۔

زرینہ نے متجسس نظروں سے حیدر علی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی' جس میں اسے کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔

بائیں ہاتھ اپنے رشتہ داروں کے درمیان وہ بھی موجود تھا۔ سفید شلوار کرتے میں وہ ہمیشہ سے بہت مختلف دکھائی دے رہا تھا۔

اسے دیکھ کر زرینہ بے اختیار رک گئی۔ اس کے ماموں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے تسلی دے رہے تھے۔

''زرینہ! تم پاگل تو نہیں ہو گئی۔'' رضیہ نے پھر اسے آگے کی طرف گھسیٹا۔ ''جلدی چلو۔''

وہ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے ہی اندر لے آئی۔ اندر کہرام مچا ہوا تھا۔ گاؤں کی عورتیں بین کر رہی تھیں' لیکن سب سے بری حالت حمیدہ کی تھی۔ وہ دونوں برقعے اتار کر وہیں ایک طرف بیٹھ گئیں۔ زرینہ اتنی عورتوں کے درمیان فوزیہ کو تلاش کرنے لگی۔

ایک طرف مہرالنساء گھٹنوں پر سر ٹکائے رو رہی تھی' اس کے قریب ہی بڑی بیگم تھیں۔ ان کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے لیکن ہونٹ بالکل سلے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر یاسمین اور نگین' جو بری طرح رو رہی تھیں۔

زرینہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

لمحے دبے پاؤں سرکتے جا رہے تھے۔ ایک ملازمہ انہیں سپارے پکڑا گئی اور وہ دیگر عورتوں کے ساتھ کلام پاک پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ پھر اچانک ہل چل بڑھ گئی۔ رونے اور بین

کرنے کی آواز میں شدت آ گئی۔ زرینہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پیر صاحب، رجب علی، حیدر علی اور سخاوت کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ جنازہ اٹھانے کا وقت ہو گیا تھا۔

زرینہ ایک ٹک حیدر علی کی سمت دیکھے گئی، جس کے چہرے پر حزن و ملال بکھرا ہوا تھا اور ضبطِ گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا تھا۔ اس نے بہت دفعہ حیدر علی کو پریشان ہوتے دیکھا تھا لیکن اسے کبھی اس طرح دکھی نہیں دیکھا تھا۔

کتنے پل گزر گئے، وہ سفید کفن میں لپٹی زیب النساء کی طرف دیکھے گیا پھر کلمہ شہادت کا ورد بلند ہوتے ہی جیسے وہ ہوش میں آ گیا اور جنازے کو کندھا دے کر باقی سب کے ساتھ باہر لے گیا۔

☆======☆======☆

"تم نے فوزیہ کو دیکھا تھا؟" گھر کے کچے صحن میں دیوار سے ٹیک لگائے رضیہ نے زرینہ سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا۔ "لیکن تم نے اس وقت اسے نہیں دیکھا تھا، جب چھوٹے شاہ صاحب باقی سب کے ساتھ اندر آئے تھے۔"

"ہاں، لیکن اس وقت تمہیں ہوش کب تھا۔" رضیہ بولی۔

"اور ان چند لمحوں میں وہ بھی تمہاری طرح ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔"

زرینہ مضطرب ہو گئی۔ "لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ اسے نہیں مجھے چاہتے ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یک طرفہ محبت کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔" اس کی یہ دلیل رضیہ کی تسلی کے لئے کم اپنی تسلی کے لئے زیادہ تھی۔

"اور پھر انہوں نے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ وہاں آئی ہوئی ہے۔"

"دیکھا تو خیر انہوں نے تمہیں بھی نہیں تھا۔" رضیہ زمین پر پڑے تنکے سے کھیلتے ہوئے بولی۔

زرینہ زچ ہو گئی۔ "ان کی جوان بہن فوت ہو گئی تھی، وہ اس کا جنازہ اٹھانے آئے تھے، بھرے مجمعے میں وہ مجھے تلاش کرتے پھرتے۔"

"یہی تو میں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ اسے نہ دیکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اسے نہیں چاہتے تھے۔"

"میں تم سے یہ فضول بحث نہیں کرنا چاہتی۔" وہ جھلا گئی۔

اسے صبح کا وہ منظر یاد آ گیا جب حیدر علی کے ماموں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے

دلاسا دے رہے تھے اور وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

"ایک بات محسوس کی تھی تم نے؟"

"کیا؟" زرینہ نے بے زاری سے پوچھا۔

"زیب النساء کا چہرہ کیسے نیلا ہو رہا تھا۔"

"ہاں پتا نہیں کیا ہوا تھا بے چاری کو۔" وہ بولی۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کی عمر اتنی مختصر ہے تو میں شاہ جی سے اس کے متعلق کبھی نہ لڑتی، پر مجھے کیا پتا تھا۔"

"یہ سب کچھ تو زندگی کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے۔" رضیہ نے اسے تسلی دی۔

"ہاں مجھے پتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی۔

"مثلاً آج تمہیں پتا چلے کہ کچھ عرصے بعد مجھے مر جانا ہے تب بھی تم مجھ سے لڑو گی ضرور اور شاہ جی سے ملنے سے روکو گی۔ جب تک میں زندہ ہوں تب تک تو یہ سب چلتا ہی رہے گا۔"

اس کی بات سن کر رضیہ ہنس پڑی۔ "پاگل کہیں کی۔"

"خیر، میں بھی اتنی جلدی نہیں مرنے کی۔ ابھی تو شاہ جی کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹنے ہیں اور تم سے بھی تو جی بھر کر لڑنا ہے۔ جب تک اچھی طرح تم سے لڑ نہیں لوں گی، تب تک سوچنا بھی مت کہ میں مر سکتی ہوں۔"

زرینہ نے کہا اور دونوں زور سے ہنس پڑیں۔

"لڑکیو! کچھ ادھر کا بھی ہوش ہے حمیدہ آئی کھڑی ہے۔" اماں نے دوسرے کونے میں بیٹھی رضیہ اور زرینہ کو کھسر پھسر کرتے دیکھ کر پکارا۔

"حمیدہ۔" زرینہ زیر لب بولی اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کہاں ہے؟"

پھر اماں کے ساتھ کھڑی حمیدہ پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔

"تم کب آئیں؟" اس نے حمیدہ کے دھواں دھواں چہرے کا بغور جائزہ لیا۔

"ابھی آئی ہوں۔" وہ بولی۔

"میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

"کہاں گرمی میں مارتی ہو بے چاری کو۔" اماں بولیں۔ "کمرا تو تندور بنا ہوا ہے، باہر ہی بٹھاؤ۔"

"اماں ہمیں گرمی نہیں لگتی۔"

وہ حمیدہ کو اندر گھسیٹ لائی۔ رضیہ بھی ان کے پیچھے اندر لپک آئی۔

"خیریت تو ہے نا حمیدہ۔" اس نے ہاتھ کا پنکھا اسے تھماتے ہوئے پوچھا۔

"میں سخت پریشان ہوں۔" اس نے سوجی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ "مجھ سے یہ

دباؤ برداشت نہیں ہو رہا' لیکن کوئی ایسا بندہ نہیں ہے' جس سے دل کی بات کر کے میں اپنے اندر کا غبار باہر نکال سکوں۔''

زرینہ اور رضیہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''تم ہم سے کہہ دو۔'' بالآخر رضیہ نے کہا۔

''کہہ دینے سے انسان کا دل ہلکا ہو جاتا ہے یقین کرو تم جو کچھ مجھ سے کہو گی' وہ ہم اپنے تک محدود رکھیں گے۔''

''میں تو اپنے سانس کی آواز سے بھی خوف زدہ ہوں کہ کہیں وہ ہی میرا راز فاش نہ کر دے' مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟''

''اگر ایسی بات ہے تو تم تسلی سے کچھ وقت یہاں گزار دو۔ انسان افسردگی والے ماحول سے نکلے تو ہی ٹھیک سے کچھ سوچ سکتا ہے۔'' زرینہ نے کہا۔

''ہم بھی یہاں ہیں' ہم سے جس قدر ہو سکا' تمہاری مدد کریں گے۔ ویسے بھی تم نے جو مجھ پر احسان کیا تھا میں اسے بھولی نہیں ہوں۔''

''احسان کیا تھا' میں تو دوستی نباہ رہی تھی۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا

''مجھ سے کسی کو دکھی اور افسردہ نہیں دیکھا جاتا۔ سب کے لئے جان کی بازی لگا دیتی ہوں' ہر ایک کے راز کو اپنے اندر دفن کر لیتی ہوں' لیکن آج اندر گھٹن بہت بڑھ گئی ہے۔''

''گرمی سے آئی ہو' میں تمہارے لئے لسی لے کر آتی ہوں۔'' رضیہ اٹھی۔

''تمہیں پتا ہے زیب النسا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔'' وہ لسی کے ٹھنڈے گلاس سے کھیلتے ہوئے بولی۔

زرینہ کچھ بولنے لگی تھی' لیکن رضیہ نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

حمیدہ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور پھر گہرا سانس لے کر بولی۔ ''اب بھی میں نے کسی کو شریک نہ کیا تو شاید میں اندر ہی اندر گھٹ جاؤں گی۔ تمہیں نہیں پتا چھوٹی بی بی یوں ہی نہیں مریں' انہیں قتل کیا گیا ہے۔''

''کیا؟'' ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''کس نے قتل کیا ہے؟ کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کچھ باتیں مجھے معلوم تھیں اور کچھ بڑی بی بی نے بتا دیں اور میں بڑی بی بی کی بات پر یقین کرنے کے لئے اس وجہ سے مجبور ہوں کیوں کہ اصولاً آج صبح انہیں اپنے کمرے میں نہیں ہونا چاہیے تھا کیوں کہ کل رات ان کے فرار کے لئے حویلی کا چھوٹا پھاٹک میں نے خود کھولا تھا۔''

☆======☆======☆

اچھو کی مسخ شدہ لاش بڑی سڑک کے دوسرے کنارے ذرا پرے کر کے پڑی ہوئی تھی۔

سب سے پہلے اس پر ایک گوالے کی نظر پڑی جو کندھے پر دودھ کے ڈرم رکھے اپنی دھن میں سیٹی بجائے چلا جا رہا تھا۔

صبح صادق کا وقت تھا اور اندھیرا ابھی نہیں چھٹا تھا۔ راستے میں گٹھڑی سی پڑی دیکھ کر اسے تجسس ہوا۔

''یہ کیا پڑا ہے؟'' اس نے سوچا۔ ''لگتا ہے کوئی گٹھڑی ہے۔ شاید کوئی چور چوری کا سامان باندھ کر لے جا رہا تھا اور کسی وجہ سے سارا سامان چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا۔'' اس نے خود سے ہی اندازے لگانے شروع کیے۔

''ضرور اس چور کے پیچھے کچھ لوگ پڑے ہوں گے اس لئے ڈر کے مارے گٹھڑی یہیں پھینک گیا۔ واہ بھئی رحیمے تیری قسمت آج تو صبح ہی صبح مہربان ہو گئی۔ محنت کسی نے کی' پھل میرے لئے چھوڑ گیا' کوئی کام کی چیز نکلی تو چور کو دعائیں دے کر میں رکھ لوں گا' اور اگر میرے مطلب کی چیز نہ ہوئی تو گٹھڑی کسی معتبر شخص کے حوالے کر کے کوئی چٹ پٹی سی کہانی سنا کر سارے گاؤں پر اپنی دھاک جما دوں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ میں نے چور کو کیسے للکارا' وہ بڑھک ماری کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلا۔

پر نہیں' جب تک یہ نہ بتایا کہ میں نے چور کو دھوبی پٹڑا دے کر گرایا تھا' تب تک دھاک کیسے بیٹھے گی۔ ہاں میں نے چور کو للکارا' وہ گٹھڑی چھوڑ کر میرے سامنے آ گیا۔ یہ جان تھی اس کی' مکھن ملائی پر پلا ہوا تھا' پر میں نے بھی پروا نہیں کی' اپنی جان بھی آخر کسی سے کم تو نہیں ہے پھر تو ایسی لڑائی ہوئی کہ گاؤں والے دیکھتے تو دانتوں تلے انگلی دبا لیتے۔ پہلے وہ مجھے گھسیٹ کر دس فٹ تک لے گیا۔ دس نہیں پندرہ فٹ تک۔ ہاں تو پندرہ فٹ تک گھسیٹ کر لے گیا۔ پھر میں نے کہا رحیمے آج غیرت کا امتحان ہے یہ خیال آتے ہی جیسے جسم میں بجلی بھر گئی۔ پھر میں اسے گھسیٹتے ہوئے بیس فٹ تک لے گیا۔ اس نے اڑنگا دینے کی کوشش کی' لیکن میں نے اٹھا کر اسے ایسا دھوبی پٹڑا مارا کہ کیا کبھی کسی دھوبی نے بھی مارا ہو گا' یاد کرے گا ساری زندگی' بس پھر کیا تھا میں نے اسے اتنا پیٹا' اتنا پیٹا کہ سب کھایا پیا بھول گیا۔ جب تک ناک سے لکیریں نہیں نکالیں تب تک میں نے بھی نہیں بخشا۔

پھر ہاتھ باندھ کر منت کرنے لگا کہ اگر میں اسے گاؤں والوں کے سامنے لے گیا تو اس کی بڑی بے عزتی ہو گی۔ جب آنسوؤں سے رونے لگا تو مجھے ترس آ گیا۔ میں نے کہا رحیمے! جانے دے بال بچوں والا ہے' ایسے ہی ان کے سامنے شرمندہ ہو گا اس لیے یہ وعدہ لے کر چھوڑ دیا کہ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ میرے معافی دیتے ہی منہ پر کپڑا رکھ کر ایسے بھاگا کہ مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔

بھائیو! اصل میں یہ میری طاقت نہیں تھی' ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا' یہ تو دراصل سچائی اور ایمانداری کی طاقت تھی' جس نے اس کی کمر زمین سے لگائی۔ بس یہ باتیں کروں گا تو خوب واہ واہ ہوگی۔''

سوچتے سوچتے وہ آگے بڑھا اور قدرے ڈرتے ہوئے جھک کر گٹھڑی کو سیدھا کیا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ گٹھڑی نہیں بے جان انسانی وجود تھا۔ چیخیں مارتے ہوئے وہ گاؤں کی طرف دوڑا اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزارعوں کو بلا لایا۔

اچھو کی نعش ناقابلِ شناخت ہو چکی تھی' ورنہ اس گاؤں کے تقریباً سبھی کوچوان اور پہلوان اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ سب سے پہلے ورثا کی تلاش میں گاؤں کی مسجد سے اعلان کروایا گیا' لیکن جب کافی دیر گزرنے پر بھی کوئی وارث سامنے نہ آیا تو گاؤں والوں نے اسے لاوارث قرار دے کر دفنا دیا۔

☆======☆======☆

گاؤں چھوڑ کر اچھو لاہور چلا آیا تھا۔ خیال تھا کہ کچھ عرصے میں کراچی چلا جائے گا۔ اتنے بڑے شہر میں سر چھپانے کا ٹھکانہ اور مزدوری ملنا کچھ مشکل نہیں تھا اور پھر اچھو کے خیال میں کراچی پیر صاحب کی دسترس سے بھی دور تھا لیکن اتنی دور جا کر فوری طور پر واپس آنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا جب کہ وہ زیب النسا سے ایک ہفتے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔ سو کچھ عرصہ اس نے لاہور میں رہنے کا فیصلہ کیا اور لوہاری گیٹ میں دو کمرے کرائے پر لینے کے بعد گاؤں چلا آیا۔

اس کا چھوٹا بھائی سلیم بھی وہیں کے سول لائنز کے اسلامیہ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ یوں اچانک گاؤں چھوڑ کر چلے آنے کی وجہ تفصیل کے ساتھ اس نے صرف سلیم کو بتائی تھی۔ جب وہ زیب النسا کو لینے گاؤں جانے لگا تو سلیم نے بھی اس کے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی' لیکن اچھو نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ایک دن کی تو بات ہے پھر وہ لاہور چلا آئے گا۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا کہ زیب النسا کو لانے میں کوئی مسئلہ پیش آ سکتا تھا تو اچھو کے خیال میں وہ مسائل سے نمٹنا بخوبی جانتا تھا۔

لیکن دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور اچھو کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ماں اور منشی تو پریشان تھے ہی' سب سے زیادہ پریشانی سلیم کو تھی۔

''میرا خیال ہے' مجھے ان کی تلاش میں جانا ہی پڑے گا۔'' اس نے خود سے کہا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ اچھو آخر کہاں رہ گیا؟'' منشی بولا۔ ''یہ کوئی بات تو نہ ہوئی ناں' ہمیں یہاں بند کر کے خود بتائے بغیر چلا گیا۔''

''کام سے گیا ہے' نوکری ڈھونڈ رہا ہو گا بے چارا!'' اماں بولیں۔ ''تم ہر وقت آسمان سر پر اٹھائے رکھتے ہو۔''

''اتنے دن ہو گئے پر تیرے بیٹے کو نوکری نہیں ملی ہمیں اس ڈربے میں بند کر گیا۔'' منشی چڑ کر بولا۔ ''کہاں ایسا کھلا گھر تھا گاؤں میں' کہاں یہ دو کمروں کا ڈربہ جیسے انسان نہ ہوں مرغیاں بند کی ہوں' نہ روشن کمرے نہ صحن ہونہہ!''

''مجھے پتا ہے کس چیز کا غم لگا ہے تمہیں۔'' ماں بھی میدان میں اتر آئی۔ ''تمہاری منشائیت ختم ہو گئی ہے۔ جھک جھک کر سلام کرنے والے نہیں رہے۔ لو حد ہو گئی بیٹے کی پروا نہیں کہ اس نے کوئی خیر خبر کیوں نہیں بھیجی' لگے ناشکری کرنے' ہر وقت اپنی ہی پڑی رہتی ہے تمہیں۔''

''آپ لوگوں کی لڑنے کی عادت نہیں گئی۔'' سلیم جھلا اٹھا۔ ''جس دن سے آئے ہیں میں تو آپ لوگوں کو لڑتے ہی دیکھ رہا ہوں۔''

''چپ کر۔'' ماں نے ڈپٹا۔ ''تیرے خیال میں ہم لڑ رہے ہیں؟ تو ٹھیک ہے ہم چاہے لڑیں مریں تجھے کیا۔''

''اچھو نے تو کبھی ایسے نہیں کہا تھا' پر یہ شہری بن گیا ہے ناں' اس لئے ذرا منہ کھولیں تو اس کے کان میں درد ہو جاتا ہے۔'' منشی نے بھی منہ پھلا لیا۔

''اف!'' سلیم نے سر پکڑ لیا۔

''ہونہہ!'' ماں سر جھٹک کر جھاڑو دینے لگی۔

''میں جا رہا ہوں اچھو بھیا کو ڈھونڈنے۔'' بالآخر سلیم نے کہا۔

''ہاں اور تُو بھی اس کے ساتھ گم ہو جانا۔'' منشی چلایا۔ ''چپ کر کے بیٹھا رہ' وہ بچہ نہیں ہے کہ گھر کا راستہ بھول جائے گا' جیسے ہی موقع ملا یہیں پر آئے گا۔''

''انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔'' سلیم بولا۔ ''اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ انہیں تلاش کیا جائے۔''

''کیا تُو پولیس میں ہے کہ اسے ڈھونڈے گا'' منشی نے حسب عادت اختلاف کیا۔ ''کبھی عقل سے بھی کام لیا کرو۔''

''ابا خدا کے لئے بس کریں۔'' سلیم نے تنگ آ کر ہاتھ جوڑے۔ ''پتا نہیں اچھو بھیا آپ کو کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔''

منشی کو آگ لگ گئی اور جو منہ میں آیا بولنے لگا۔

''بولیں جتنا بولنا ہے بولیں۔'' وہ جھلا گیا تھا۔ ''میں بھی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا رہا ہوں۔'' پھر وہ ماں سے مخاطب ہوا۔

''ماں! مجھے شاید چند دن لگ جائیں' پر آپ فکر مت کرنا۔''

''ایک وہ چلا گیا ہے' اب اس کی باری ہے۔'' ماں جھاڑو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں نہیں جانے دوں گی تجھے۔''

''ماں کیا بچوں والی باتیں کر رہی ہیں۔ میں کون سالام پر جا رہا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ اچھو بھیا کہاں ہوں گے۔ جیسے ہی ملے نوکری پر لات مار کے کان سے پکڑ کر آپ کے سامنے لے آؤں گا۔''

''اس نواب زادے کو دیکھو' یہ اچھو کو لانے نہیں اس کی نوکری پر لات مارنے جا رہا ہے۔'' منشی تنک کر بولا۔'' جیسے اللہ تعالیٰ چھپر پھاڑ کر دینے والا ہے' کہتا ہے شہر میں پڑھ رہا ہے' خاک پڑھ رہا ہے' کبھی تو عقل والی بات کر لیا کر نالائق۔''

''اچھا اماں خدا حافظ۔ خدا حافظ ابا!'' سلیم انہیں سلام کر کے تیزی سے باہر نکل گیا۔

منشی پیچھے آوازیں دیتا رہ گیا۔ سلیم کو یقین تھا کہ اگر اس نے اب بھی منشی کی بات نظر انداز نہ کی تو پھر شاید اگلے ایک ہفتے تک وہ اسے اپنی جگہ سے ملنے بھی نہ دے۔

☆======☆======☆

گاؤں میں سلیم جس سے بھی ملا اس نے اچھو کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا جس دن سے وہ گاؤں چھوڑ کر گیا ہے اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

''ہمارا خیال تھا کہ شہر گیا ہے۔'' ماسی بیداں بولی۔'' اور وہاں گیا ہے تو تم سے تو ضرور ملے گا۔ یہاں بھی تینوں کسی سے ملے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ گھر ویسے ہی پڑا ہے بالکل تھوڑا سا سامان ساتھ لے کر گئے ہیں۔ انتظار کرو' ممکن ہے چند دنوں میں آ جائیں۔''

پورے گاؤں میں چٹ پٹی اور دلچسپ باتوں کے دو ہی مرکز تھے۔ ایک نائی کی دوکان اور ایک ماسی بیداں کا تنور۔ نسیم کی وفات کے بعد سے نائی کی دوکان کی سرگرمیاں کچھ ماند پڑ گئی تھیں اور اب روزانہ اجتماع ماسی بیداں کے تنور پر ہی منعقد ہوا کرتا تھا۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' نور محمد مزارع سالن میں ڈوبی انگلیاں چاٹتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔'' بڑے شاہ صاحب ذرا ناراض رہا کرتے تھے اچھو سے' پر جب سے اچھو حویلی میں ملازم ہوا تھا' تب سے سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔''

''ہوں۔'' سلیم پُر خیال انداز میں بولا۔'' گاؤں میں کوئی خاص بات ہوئی ان دنوں؟ مجھے تو شہر میں کچھ خبر ہی نہیں رہی گاؤں کی۔ ابا بھی سارے جہاں کو چٹھی لکھ کر دیتے ہیں' پر مجھے لکھنے کی باری آتی ہے تو انہیں تھکن یاد آ جاتی ہے۔ میرے پیچھے تو لگتا ہے خاصی تبدیلیاں آ گئی ہیں۔''

''کوئی ایسی ویسی تبدیلیاں۔'' حیدر علی کے ملازم نواز دین نے کہا۔'' جس دن سے پرانے کنوئیں کی بلائیں جاگی ہیں گاؤں پر آفتیں نازل ہوتی جا رہی ہیں اور عجیب عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔''

''آپ کو ان کے جاگنے کی خبر کیسے ہوئی؟'' سلیم نے دلچسپی سے پوچھا۔'' اور کیسی عجیب

باتیں اور آفتیں آ رہی ہیں؟''

''لو یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ چیخ چیخ کر انہوں نے پورا گاؤں سر پر اٹھا لیا تھا' کوڑے چلنے کی آوازیں شائیں شائیں کرتی سنائی دے رہی تھیں۔ زمین ایسے ہلی تھی جیسے زلزلہ آ گیا ہو' توبہ توبہ۔'' نواز دین نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''اور پھر کنوئیں کے پاس ایسی پُر اسرار خوشبو پھیلی ہوئی تھی کہ بندہ سونگھ کر مدہوش ہو جائے۔''

سلیم کا تعلیم یافتہ ذہن ان باتوں کو قبول نہیں کر رہا تھا' لیکن اس نے اس لئے مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ انہی باتوں کے دوران اسے کسی کام کی بات کے انکشاف کی توقع تھی۔

''پھر؟'' اس نے پوچھا۔

''نہ پوچھو پھر کیا ہوا صبح صبح نسیم کی لاش وہیں کنوئیں کے قریب سے ملی۔''

''اچھا!'' سلیم نے حیرانی ظاہر کی حالانکہ اچھو پہلے ہی سے اس واقعے کی حقیقت سے آگاہ کر چکا تھا۔

''تو اور کیا۔'' نواز دین کھانا چھوڑ کر مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

''یہ تو بہت پُر اسرار بات ہے اس کے علاوہ بھی کچھ ہوا؟''

''یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا۔'' وہ سلیم کے قریب کھسک آیا اور دھیمی آواز سے بولا۔

''پھر ایک مرتبہ جنت بی بی تمام رات گھر سے غائب رہی صبح واپس آئی تو اس نے بڑے شاہ صاحب پر الزام لگا دیا۔ پیر صاحب نے تفتیش کی لیکن کچھ ثابت نہیں ہوا معاملہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن ابھی ایک اور آفت نازل ہونی باقی تھی۔ ایک صبح اچانک بلا وجہ چھوٹی بی بی فوت ہو گئیں۔''

''کیا؟'' سلیم کے اعصاب تن گئے۔

''لو تمہیں نہیں پتا؟ سب کہتے ہیں کہ رات تک ٹھیک تھیں پتا نہیں کیا ہوا انہیں اپنے بستر پر سوئیں تھیں لیکن جب صبح چھوٹے شاہ صاحب نے دیکھا تو فوت ہو چکی تھیں بس اللہ تعالیٰ کا کرنا ہوتا ہے۔ بندہ کیا دخل دے سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے جو کم عمر میں فوت ہو جائے وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے کیوں کہ اس کے گناہ کم ہوتے ہیں اور جہاں تک چھوٹی بی بی کا تعلق ہے وہ تو سیدھی جنت میں ہی جائیں گی اتنی نیک پاک تھیں۔''

''حویلی کی بیبیاں ہمیشہ کم عمری میں وفات پاتی ہیں آج تک کبھی کسی نے بھی لمبی عمر نہیں پائی۔'' نور محمد مزارع بھی اپنی معلومات سمیت گفتگو میں داخل ہوا۔

''اس کے علاوہ بھی کوئی عجیب بات ہوئی؟''

''کسی کو کہنا مت۔'' نواز دین مدھم آواز میں بولا۔

"نہیں' میں کسی سے نہیں کہوں گا' تم کہو۔" سلیم کے انداز میں بے تابی تھی۔

"حویلی کے اپنے حالات ٹھیک نہیں ہیں سب ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ بڑے شاہ صاحب اور چھوٹے شاہ صاحب تو ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے پیر صاحب نے سب کچھ بڑے شاہ صاحب کے سپرد کر دیا ہے اور خود صرف بہت اہم معاملات نمٹاتے ہیں۔"

"چھوٹی بی بی کس دن فوت ہوئی تھیں؟" سلیم نے دریافت کیا۔

"جس اتوار کی رات کو بارش ہوئی تھی ناں بس اس سے اگلی صبح کو۔"

سلیم کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ پچھلے اتوار کو اچھو' زیب النسا کو لینے کے لئے گاؤں آیا تھا۔ پھر سلیم نے سب کو کریدا لیکن کوئی کام کی بات معلوم کرنے میں ناکام رہا زیب النسا کی موت نے اس کا ایک خیال غلط ثابت کر دیا تھا۔ اب تک وہ خود کو یہ تسلی دیتا رہا تھا کہ معاملہ بگڑنے کے خوف سے اچھو' زیب النسا کو سیدھا کراچی لے گیا ہوگا اور مہینے ڈیڑھ مہینے میں انہیں خیریت کی اطلاع بھجوا دے گا۔

لیکن زیب النسا کا انتقال ہو گیا تھا اور اچھو کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

☆======☆======☆

"پتا بھی نہیں چلا اور اتنے ڈھیر سارے دن گزر گئے۔" زیب النسا کے چالیسویں سے واپسی پر زرینہ نے برقع اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں یوں لگتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔"

"اس بات کو تو چھوڑو شکر کرو کہ حمیدہ پکڑی نہیں گئی۔" وہ خود کو پنکھا جھلنے لگی۔

"پیر صاحب کا خیال تھا کہ زیب النسا کسی مددگار کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اندر ہی اندر سب کو کھنگالا جا رہا تھا' اس طرح کہ کسی کو شک بھی نہ گزرے۔"

"ہاں شکر ہے کہ اس کی بچت ہو گئی۔" رضیہ لیٹ گئی۔

"آج بھی شاہ جی بہت اچھے لگ رہے تھے ہے نا؟" رضیہ نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"میرا خیال تھا کہ پتلون قمیض میں ہی اچھے لگتے ہیں لیکن وہ تو شلوار کرتے میں بھی سب سے الگ سب سے منفرد لگتے ہیں۔"

"دیکھنے میں تو بڑے شاہ صاحب بھی کم نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی ٹکر کے ہیں۔" رضیہ نے تبصرہ کیا۔

"لیکن کرتوت تو کالے ہیں ناں' ایسا بندہ تو مجھے سو دفعہ مرنے کے بعد زندہ ہونے پر بھی اچھا نہ لگے۔"

"ہونے والے جیٹھ کو ایسے کہہ رہی ہو۔" رضیہ ہنسی۔

"مجھے انہیں جیٹھ بنانے کا کوئی شوق نہیں ہے یہ تو بہت بدقسمتی ہے شاہ جی کی کہ وہ ان کے ... ہیں وہ بھی بڑے۔ اگر شاہ جی بڑے ہوتے تو ہمیں اس قدر مسئلہ بھی نہ ہوتا۔ تب تو سارے ... حل ہو جاتے۔ سارے نہ ہوتے تو آدھے ضرور حل ہو جاتے۔"

"یہ تو دو بدقسمتیاں ہوئیں ناں۔" رضیہ ہنسی۔ "سنا ہے اچھو کا بھائی گاؤں آیا ہوا ہے۔"

"ہاں سنا تو میں نے بھی ہے کہ بھائی کے متعلق پوچھتا پھر رہا ہے۔"

"ہمیں اب تک صحیح طریقے سے پتا تو نہیں چلا' لیکن بات واضح ہے' اگر وہ زیب النسا کو ... سکتے ہیں تو پھر انہوں نے اچھو کو کب بخشا ہوگا۔"

"ہاں۔" زرینہ نے اتفاق کیا۔ "لیکن ایک بات کی مجھے خوشی ہے کہ شاہ جی اس حرکت ... نہیں ہیں یہ سب کام بھی بڑے شاہ صاحب نے کیا ہے۔"

"یہ تو حمیدہ کہہ رہی ہے' ہوسکتا ہے ایسا نہ ہو۔" رضیہ نے خیال ظاہر کیا۔

"جب وہ باقی بات غلط نہیں بتا رہی تو یہ کیوں جھوٹ بتانے لگی۔" زرینہ نے فوراً اختلاف

"یہ بھی باقی باتوں کی طرح مہرالنسا نے بتایا ہے اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ ہم جب بھی حویلی ... کلام پاک پڑھنے کے لئے گئے ہیں تو تقریباً ہر مرتبہ ہی دونوں پر ہماری نظر پڑی ہے۔ شاہ ... افسردہ اور دکھی دکھائی دیتے تھے جبکہ بڑے شاہ صاحب کے چہرے سے کچھ پتا ہی نہیں ... اگر وہ خوش نہیں تھے تو دکھی بھی نہیں تھے۔

اور پھر اباجی بتا رہے تھے کہ بظاہر دونوں بھائی ایک دوسرے سے ناراض نظر آتے ہیں اسی ... تو بڑے شاہ صاحب مجھے زیادہ برے لگنے لگے ہیں کہ وہ شاہ جی سے لڑے تھے۔ ضروری ... کہ ہر بات ہماری آنکھ کے سامنے وقوع پذیر ہو تو ہمیں یقین آئے۔ کچھ باتیں حالات بھی ... ہیں۔"

"لیکن یہ بات تمہارے لئے نقصان دہ ہے بڑے شاہ صاحب نے پیر صاحب سے ... متعلق بات بھی کرنی تھی۔"

"ہاں۔" وہ بجھ سی گئی۔ "مجھ تک آتے آتے سب کچھ غلط ہو جاتا ہے۔"

☆======☆======☆

ماموں نے اور لوگوں کو بھی تسلی دی تھی لیکن حیدر علی کے ساتھ ان کا رویہ واضح طور پر زیادہ ... تھا۔ اس وقت حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ انہیں کچھ کہہ سکتا۔ اس نے اپنے وجود کی ساری ... کے ساتھ خون کے ساتھ گردش کرتے غصے کو قابو کیا ہوا تھا۔ ماموں کیا کر رہے ہیں اور کیا ... پر اس نے توجہ تک نہیں دے تھی۔

ہاں چند دن بعد اسے علم ہوا تھا کہ اماں جان نے فوزیہ کو چالیسویں تک رکھنے کے لئے کہا تھا جسے ماموں جان نے قبول کرلیا تھا۔ یہ خاصی حیران کن بات تھی لیکن ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے کبھی بھی اسے نہیں دیکھا تھا لیکن چند دنوں میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کون سی لڑکی فوزیہ تھی۔

پہلی مرتبہ جب وہ مہر النسا کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پیڑھے پر ٹانگیں اوپر کئے بیٹھی حمیدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ حیدر علی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے کندھے سے سرکی اپنی اوڑھنی ٹھیک کرنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو ایک ٹک حیدر علی کو دیکھے جا رہی تھی اور تب وہ پلٹ گیا تھا۔

پھر جب وہ اماں کی خواب گاہ میں داخل ہوا تھا تو فوزیہ ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے بڑا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ اماں کی ٹانگیں دباتے دباتے اس کے ہاتھوں میں واضح لرزش اتر آئی تھی۔ تب بھی وہ واپس چلا آیا تھا۔

اور پھر بہت سے مواقع پر اسی طرح لمحوں کے لئے ان کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ فوزیہ بری لڑکی نہیں تھی لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ گوری بہت اچھی تھی اور اس کے دماغ پر اس بری طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے آگے حیدر علی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اس لئے اس نے فوزیہ کو دیکھنے یا اس پر توجہ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

پھر یہ حادثہ بھی ایسا تھا جس نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گوری بھی حویلی آتی رہی ہو گی لیکن اس کا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ حیدر علی نے اسے بھی دیکھنے یا ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اپنے کمرے میں سگریٹ پیتے ہوئے حیدر علی انہی گزشتہ دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اس کا ملازم نواز دیں ایک لفافہ اٹھائے چلا آیا۔

"یہ پیر صاحب نے بھجوایا ہے۔" اس نے لفافہ آگے بڑھایا۔

حیدر علی نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن کچھ اندازہ نہ ہوا کہ اس میں کس قسم کی تحریر ہو سکتی ہے۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اس نے لفافہ چاک کر کے اندر سے طے شدہ کاغذ نکال لیا۔

وہ پیر صاحب کا خط تھا اس کے نام۔ اس نے نظریں تحریر پر جما دیں۔

"پیارے بیٹے حیدر علی!

سدا خوش رہو!

یہ بات ہمیں بھی پسند نہیں ہے کہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے خطوط کے ذریعے گفتگو کی جائے لیکن بدقسمتی سے حالات ایسے ہیں کہ بات کرتے ہوئے ہم دونوں صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں گے اور

یوں بدمزگی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا اس سے شاید آپ کا تو کچھ نہ بگڑے لیکن ہماری نظر میں ہمارے منصب کی اور خود ہماری وقعت ختم ہو جائے گی۔

آپ کے علم میں ہے کہ ہم نے شادی کی تاریخ طے کر دی تھی اور آپ کے ماموں جان نے اپنی صاحب زادی کی رخصتی کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں۔ بدقسمتی سے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ جس دھوم دھام سے آپ کی شادی کرنا چاہتے تھے فوری طور پر وہ ممکن نہیں رہا لیکن چونکہ زبان سے پھر جانا ہماری روایت کے خلاف اور منصب کے شایانِ شان نہیں ہے اس لئے آپ کی شادی پہلے سے طے شدہ تاریخ پر سادگی سے انجام پائے گی۔ اس تقریب سعید میں تقریباً ایک ہفتہ ابھی باقی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اپنے وعدے اور اپنے الفاظ کا پاس رکھنے کی خاطر ہم اپنی جان سے بھی گزر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ بھی ہمارے وعدے کو حکم سمجھتے ہوئے اس پر عمل کر کے ہمارا مان بڑھائیں گے۔

بہت دعاؤں کے ساتھ

آپ کے والد گرامی

پیر سیّد جلال الدین شاہ

خط کی تحریر پڑھ کر علی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"اوہ خدایا!" وہ کراہا۔

کچھ دیر تک خود سے الجھنے کے بعد اس نے گوری سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆======☆======☆

اب تک یہ بات ثابت تو نہیں ہوئی تھی لیکن سلیم کا شک پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اچھو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ چار دن سے وہ مسلسل اچھو کو کھوج رہا تھا لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ زیب النسا کی موت میں بھی اسے حویلی والوں کا ہاتھ نظر آ رہا تھا اور اگر ایسا ہی تھا تو اچھو کی زندگی کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

لیکن حویلی والوں سے براہِ راست ٹکر لینے کی اس میں ہمت نہیں تھی پھر کیا کیا جائے؟ یہ بات اسے مسلسل پریشان کر رہی تھی۔

اس کا معمول تھا کہ دن چڑھے تک سویا کرتا تھا اور پھر مختلف لوگوں سے مل کر ان کی باتوں سے اچھو کے متعلق معلومات اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا اور رات کو ڈیرے کے قریب سن گن لینے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن اب تک اسے کوئی کامیابی نہیں ملی تھی۔

☆======☆======☆

یہی احوال درد کا کہیو
گر صبا کوئے یار سے گزرے
کون سی رات ملنے گا!
دن بہت انتظار میں گزرے

زرینہ کے ہاتھ میں دبے کاغذ پر صرف یہ دو شعر تحریر تھے اور انہیں پڑھ کر اس کی بے قراری میں اضافہ ہو گیا تھا۔

حمیدہ اسے کاغذ تھما کے جا چکی تھی۔ اس مرتبہ وہ بھی سخت خوف زدہ تھی لیکن چھوٹے شاہ صاحب سے انکار کرنے کی اس میں جرأت نہیں تھی سو چپ چاپ خط پکڑا گئی تھی۔

''لیکن اس کا مطلب کیا ہوا؟'' رضیہ نے تجسس آمیز لہجے سے پوچھا۔

''وہ ملنا چاہتے ہیں۔'' زرینہ نے مختصراً کہا۔

''تو کیا تم جاؤ گی؟''

''یہ پوچھنے والی بات ہے؟''

''دیکھو کسی مصیبت میں مت گرفتار ہو جانا۔ زیب النسا کی وفات کے بعد سے میں تو ڈر گئی ہوں۔''

''پتا نہیں رضیہ! لیکن اب مجھے ڈر نہیں لگتا شاید لگتا ہو لیکن میرے اندر جو آگ لگی ہوئی ہے اس سے بڑی کوئی آگ باہر نہیں ہو سکتی اس لئے محسوس نہیں ہوتا۔''

''آج کل تمہارا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔'' رضیہ نے اسے دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''اماں ابا اپنے کمرے میں نہیں صحن میں سونے لگے ہیں اور ہمیں بھی وہیں سونا پڑتا ہے۔''

''میں بہانا کر کے کمرے میں پڑ رہوں گی۔''

''صحن سے کمرے کی کھڑکی صاف دکھائی دیتی ہے۔'' رضیہ اڑی ہوئی تھی۔

''جانا تو مجھے ہے چاہے کوئی بھی صورت اختیار کرنی پڑے۔'' وہ حتمی لہجہ میں بولی۔

رضیہ کی باتیں کچھ غلط نہیں تھیں۔ گھر کے کام کاج کے دوران بھی زرینہ سوچتی رہی کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

شام کو جب آسمان پر بدلیاں تیرنے لگیں تو وہ اماں کے پاس پہنچ گئی۔

''اماں! آج تو اندر سوئیں گے ناں؟'' اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''اندر کیوں سوئیں گے اتنا ٹھنڈا میٹھا موسم ہو رہا ہے۔''

''رات کو بارش ہو جائے گی۔'' وہ جھلا اٹھی۔ ''آپ نے ضرور ہماری دوڑ لگوانی ہے۔''

''تم نہ لگانا دوڑ۔'' اماں کو غصہ آ گیا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں تم بگڑتی جا رہی ہو۔ پہلے سب کام رضیہ نے سنبھالے ہوئے ہیں یہ بھی کر لے گی۔''

''بس میں باہر نہیں سوؤں گی۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''میری بلا سے تم بیداں کے تنور میں جا کے سوؤ۔'' وہ اندر چلی آئی۔

''اللہ کرے چارپائیاں لگانے سے پہلے اتنی بارش ہو کہ کوئی باہر سو ہی نہ سکے۔'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔

''پھر تو تم ضرور شاہ صاحب سے مل سکو گی۔'' رضیہ اس کی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہو رہی تھی۔

''چاہے آندھی آئے چاہے طوفان یا سیلاب' مجھے تو جانا ہے۔'' وہ تنک کر بولی۔

''ارے بابا! بے شک چلی جاؤ تمہیں کون روک رہا ہے اور اگر روکے تو تم کون سا رکنے والی ہو۔''

لیکن زرینہ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔ موسم خوشگوار ہو گیا تھا لیکن تیز بارش تو کیا بوندا باندی تک نہیں ہوئی تھی۔ مغرب کے بعد جب وہ کھانا کھا چکے تھے رضیہ چارپائیاں بچھانے صحن میں چلی گئی۔

''میری چارپائی بچھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

''جو حکم سرکار۔'' رضیہ نے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' زرینہ چڑ گئی۔

''تم سے کس نے کہا ہے کہ میں تمہاری کسی بات سے ہنسی ہوں۔'' اس نے بھی جوابی حملہ کیا۔

''ہونہہ!'' زرینہ نے منہ پھیر لیا۔

''اس کا خیال تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد اماں ابا حسب معمول جلد ہی سو جائیں گے لیکن وہ سونے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہے تھے۔

''میں کہتی ہوں مولوی صاحب کچھ بچیوں کی فکر کریں۔'' اماں نے کہا تو برآمدے میں تخت پر بیٹھی زرینہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

''میں نے کیا کرنا ہے اللہ تعالیٰ نے کرنا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ بھی تو کوئی سبب بناتا ہے ناں خود تو نیچے نہیں اترے گا۔'' اماں بولی۔

''بات کرنے سے پہلے سوچ تو لیا کرو کہ کیا کہہ رہی ہو۔'' مولوی صاحب کو ان کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ ''تمہیں اللہ پر بھروسہ نہیں مگر مجھے بہت ہے۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ مجھے بھروسہ نہیں ہے میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ پیر صاحب سے بات کریں انہوں نے کہا تھا کہ بڑے شاہ صاحب کی شادی کے بعد رشتہ طے کر دیں گے اب یہ دن آ گیا ہے کہ چھوٹے صاحب کی شادی تیار ہے لیکن اور کسی کا بھی رشتہ طے نہیں ہوا۔''

"ہر کام کے لئے اوپر والے نے وقت مقرر کر رکھا ہے اور اس کے لئے سبب بھی وہ خود بناتا ہے۔"

"یہ آپ کے لئے بس اتنی چھوٹی سی بات ہے اور میری راتوں کی نیندیں اُڑ چکی ہیں۔ رضیہ کی تو مجھے اتنی فکر نہیں ہے لیکن زرینہ کو دیکھ کر میرا دل ہول جاتا ہے۔"

"کیوں؟" مولوی صاحب نے بھی وہی سوال پوچھا جو زرینہ کے ذہن میں گردش کرنے لگا تھا۔

"رضیہ کا رشتہ تو تقریباً طے سمجھیں زرینہ کی تو اب تک کہیں بات بھی نہیں چلی وہ صفدر تھا تو وہ بھی نکما نکلا۔" اماں بولی۔

"رشتے اتنے زیادہ موجود ہیں لیکن لوگ بھیجتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ کچھ اس لئے کہ ہمارا گھرانا بہت معزز اور اونچا ہے اور کچھ اس لئے کہ زرینہ بے حد خوبصورت ہے۔"

"اور صحیح پوچھیں تو مولوی صاحب مجھے اس کی خوبصورتی سے بھی خوف آتا ہے۔ نسیم اور جنت اس سے زیادہ خوبصورت تو نہیں تھیں کون نہیں جانتا کہ بڑے شاہ صاحب گاؤں میں کیا کرتے پھر رہے ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔" انہوں نے گویا اپنی طرف سے بات ختم کر دی۔

"مولوی صاحب اس سے پہلے میں نے آپ سے کبھی بحث نہیں کی۔" اماں بولیں۔

"لیکن یہ ایسی بات ہے جس پر میں چپ نہیں رہ سکتی۔"

"تم کیا چاہتی ہو کہ میں رات کے اس پہر جا کر پیر صاحب سے بات کروں؟"

"ناراض کیوں ہوتے ہیں' یہ میں نے کب کہا ہے میں تو فقط یہ چاہتی ہوں کہ ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں یا زرینہ کی شادی گاؤں سے کہیں باہر کی جائے۔"

"زرینہ کی شادی کہاں ہوگی اس کا فیصلہ ہم نے نہیں اوپر والے نے کرنا ہے۔ جہاں تک ہمارے کہیں جانے کی بات ہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اتنی آسانی سے میدان چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔ جب سب لوگ ڈر اور خوف کی وجہ سے چلے جائیں گے تو ظلم کے پودے کو تناور درخت بننے سے کون روکے گا؟"

"تو کیا یہ کام آپ کریں گے؟" اماں ہول اٹھیں۔ "ایک مرتبہ کر کے دیکھ لیا بہت کافی ہے۔ بس اب اپنے کام سے کام رکھیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے دوسروں کے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کی۔ آپ اکیلے رہ جائیں گے اور کوئی نہیں ہوگا آپ کے ساتھ۔"

"اللہ مالک ہے۔" وہ بولے۔ "لوگ اپنے دماغ سے سوچتے ہیں' میں اپنے ذہن سے۔"

"آ بیل مجھے مار' اسی کو کہتے ہیں۔" اماں نے جل کر کہا اور لیٹ گئیں۔

"پرانے وقتوں کی حکایتوں کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ دنیا تبدیل ہو چکی

ہے وقت بدل گیا ہے۔ لوگ اور ان کے مزاج بدل گئے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ ان کے آواز اٹھانے سے سب کچھ بدل جائے گا حالانکہ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوگا۔ سب کچھ ویسا ہی رہے گا۔"

مولوی صاحب بھی لیٹ گئے۔ اماں کی باتیں ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں' لیکن انہوں نے چپ سادھ رکھی تھی۔

زرینہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسے سب کے سونے کا انتظار تھا تھوڑی ہی دیر میں مولوی صاحب خراٹے لینے لگے۔ اماں کے نیند کے انداز سے بھی ان کی گہری نیند کا پتا چل رہا تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر تکیے کے نیچے رکھی سیاہ چادر نکال کر اوڑھ لی۔

"زرینہ!"

اپنے پیچھے رضیہ کی مدھم آواز سن کر وہ پلٹی۔

"آج مت جاؤ میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج تمہارا جانا اچھا نہیں ہے۔"

"وہ بات مت کہو رضیہ' جو میں نہ مانوں۔"

"خدا کے لئے زرینہ آج رک جاؤ۔" رضیہ نے اسے بازو سے پکڑ کر منت بھرے انداز میں کہا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا' آج سے پہلے بھی کچھ ہوا ہے جو آج ہوگا۔" زرینہ کے انداز میں لاپروائی تھی۔

"اور آج تو میں نے سیاہ کپڑے پہن رکھے ہیں' چاندنی بھی نہیں ہے۔ تاریک رات میں کسی کو میرا ہیولا بھی دکھائی نہیں دے گا۔"

"دیکھو بارش کا بھی امکان ہے بالکل بھیگ جاؤ گی۔"

"یہ دلیلیں مجھے نہیں روک سکتیں خدا حافظ۔" وہ کھڑکی کے راستے باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

رات بے حد تاریک تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ اپنے خیالوں میں گم وہ چلتی گئی۔

کنوئیں پر حسب معمول حیدر علی اس کا منتظر تھا۔ اتنے دن بعد اسے یوں اپنا انتظار کرتے پا کر زرینہ کا دل بھر آیا۔ اسے آتے دیکھ کر وہ بھی آگے بڑھا۔

"آج بہت دیر کر دی' میں پریشان ہو رہا تھا۔"

"اماں ابا دیر سے سوئے تھے۔" وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

چند لمحے خاموشی سے بیت گئے پھر وہ بولی۔ "بہت افسوس ہوا چھوٹی بی بی کا۔ میں تقریباً روزانہ ہی حویلی آیا کرتی تھی' آپ کو بہت مرتبہ دیکھا بھی تھا۔"

"ہوں۔" اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ "یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دوران

بہت کم مجھے تمہارا خیال آیا تھا۔ میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔''

''وہ تو دکھائی دے رہا تھا' لیکن حیرت ہے کہ بڑے شاہ صاحب آپ کی طرح دکھی نہیں لگ رہے تھے۔''

''گویا تم نے محسوس کرلیا۔''

''شاہ جی! آپ کی حویلی اتنی بڑی ہے کہ مجھے اس سے خوف آنے لگتا ہے۔ یہ عمر بلاوجہ وفات پانے کی تو نہیں ہوتی۔''

حیدر علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے اس حوالے سے بہت کچھ سنا اور محسوس کیا ہے۔''

''کیا سنا اور کیا محسوس کیا؟''

''پتا نہیں مجھے آپ سے کہنا چاہیے یا نہیں' لیکن مجھے بہت سی باتوں کا علم ہے اور کچھ باتوں کا انسان اندازہ بھی لگا سکتا ہے۔''

''مثلاً؟ تم جھجکے بغیر کہہ دو۔''

''آپ کو میں نے نہیں بتایا تھا' لیکن میں چھوٹی بی بی سے ملی تھی۔ مجھے آپ کی حویلی ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی' عالی شان مضبوط اور سب سے بلند' لیکن اس دن آپ کی حویلی سے میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا' مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ کوئی گھر نہیں بلکہ حویلی کی بیبیوں کے لئے بہت بڑا قید خانہ ہے اور پھر اب وہ سب کچھ سچ ہو گیا۔

چھوٹی بی بی نے کہا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہیں کیوں کہ اتنی مضبوط اور بلند دیواروں کے ہوتے ہوئے ان کی آہیں' ان کی سسکیاں اور کراہیں یہاں تک کہ ان کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ میں آپ کا خیال دل سے نکال دوں پر یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ سو میں نے آپ سے کسی بات کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔ یوں بھی میرا خیال تھا کہ آپ میری باتوں پر یقین نہیں کریں گے بلکہ شاید ناراض ہی ہو جائیں۔'' اس نے حیدر علی کی طرف دیکھا۔

''پھر ایک دن اچھو بھائی ابا سے ملے۔ ان کی گفتگو کے بعد معمہ حل کرنا مشکل نہیں رہا۔''

''تم واقعی ذہین ہو گوری' لیکن ان باتوں کا ذکر کبھی کسی اور کے سامنے مت کرنا۔''

اس نے سگریٹ کی راکھ کو جھاڑتے ہوئے کہا۔

''میں تو آپ سے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی شاہ جی' لیکن میرے دل میں ایک پھانس سی اٹکی ہوئی تھی۔''

''کیا؟''

''کیا اس رات حویلی میں چھوٹی بی بی کے ساتھ جو کچھ ہوا' اس میں آپ بھی شامل تھے؟''

''یہاں تمہارے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اگر مجھے ایک فیصد بھی گمان ہوتا تو میں اپنی جان دے کر بھی اپنی بہن کو بچا لیتا' لیکن مجھ سے بھی اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔''

زرینہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اسے حیدر علی کی بے گناہی کا یقین تھا پھر بھی صرف تسلی کے لئے یہ سوال پوچھ لیا تھا۔

''پتا نہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے سگریٹ زمین پر پھینکا اور جوتے سے مسل دیا۔

''خیر ان باتوں کو چھوڑو' آج میں نے تمہیں اپنا فیصلہ سنانے کے لئے بلایا ہے۔''

زرینہ کے لئے جیسے زمین کی گردش تھم گئی۔ وقت رک گیا۔ وہ سانس روکے حیدر علی کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

''مجھے صرف اور صرف تمہارے ساتھ رہنا ہے گوری' چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔''

وہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔

''کیا کہا ہے آپ نے؟'' وہ جیسے سرگوشی میں بولی۔

''جو تم نے سنا ہے ٹھیک سنا ہے۔''

''شاہ جی!'' خوشی اور مسرت کی وجہ سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''مجھے یقین تھا پھر بھی میں خوف زدہ تھی۔ اوہ خدایا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اتنی بڑی خوشی ملنے کا اظہار کیسے کیا جاتا ہے۔'' وہ ہنسنے لگی اور ہنستی چلی گئی۔

ہوا کے دوش پر اس کی کھنکتی ہوئی مترنم ہنسی پھیل رہی تھی۔

اچانک بوندا باندی شروع ہو گئی' لیکن اسے بھیگ جانے کی بھی پروا نہیں تھی۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے گوری۔''

''کیا؟'' اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ابا جان کو راضی کروں۔'' وہ بولا۔ ''اب تک میری یہ کوشش تھی کہ میری خوشی میں سب شریک ہوں' ورنہ یہ فیصلہ تو میں بہت پہلے بھی کر سکتا تھا' لیکن میری خواہش تھی کہ اماں اور ابا جان تمہیں بہو تسلیم کر لیں اور تمہیں تمہارا جائز مقام ملے' لیکن یہ محض میری خوش خیالی تھی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم میری بیوی تو بن سکتی ہو لیکن وہ تمہیں بہو کا درجہ نہیں دیں گے۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ ہمیں ان کی مرضی کے بغیر یہ قدم اٹھانا پڑے گا۔''

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ بجھ گئی۔ ''اماں' ابا تو کبھی راضی نہیں ہوں گے۔''

''تم صرف چند پہلوؤں پر سوچ رہی ہو جبکہ میرا ذہن مختلف باتوں کے متعلق سوچ رہا

ہے۔ بابا جان اپنی حکم عدولی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔ بات اگر صرف حکم کی ہوتی تو بھی شاید وہ اپنے رویے میں لچک پیدا کر لیں' لیکن یہاں یہ بات وعدے کی ہے جو انہوں نے ماموں جان سے کیا ہوا ہے۔ زبان دے کر پھر جانا ہمارے خاندان کی روایت نہیں ہے' اس سے ہمارے اور ماموں جان کے گھرانے کے درمیان نہ مٹنے والی دشمنی کا آغاز تو ہو ہی جائے گا' خود بابا جان بھی ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے اور اس معاملے میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔''

''تو اب کیا کریں؟''

''میں اپنی خاندانی روایتوں سے ٹکر لے کر انہیں تبدیل کرنا چاہتا تھا' لیکن یہ بہت صبر آزما کام ہے اور اس میں جتنا وقت لگے گا وہ ہم دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں ہے' اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم یہاں سے بہت دور جا کر ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھیں گے' جس کی روایتیں کسی کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنیں گی اور اس مضبوط گھرانے کے ساتھ میں واپس آؤں گا۔ ان روایت سے ٹکرانے اور انہیں ختم کرنے کے لئے۔''

''لیکن جب اماں' ابا نہیں مانیں گے تو ہماری شادی کیسے ہو گی؟ اگر تو آپ لوگوں کی طرف سے پیغام آتا یا پیر صاحب حکم ہی دے دیتے تو ابا جی نے دوسری بات سوچے بغیر ہماری شادی کر دینی تھی لیکن اب جبکہ آپ کی شادی میں بمشکل ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ وہ اس بات کو ہرگز نہیں مانیں گے۔''

''نہ مانیں' میرے والدین بھی تو نہیں مانے پھر بھی میں نے فیصلہ تمہارے حق میں کیا ہے۔''

''آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔'' وہ اسے سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔

''آپ کی بات اور ہے' مرد کی بات ہمیشہ اور ہوتی ہے' لیکن عورت ایسا کیسے کر سکتی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ عورت کیا کر سکتی ہے اور کیا نہیں' تم نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تم بتاؤ کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو گی یا نہیں؟''

''شاہ جی میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' وہ تذبذب کے عالم میں بولی۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے گوری۔''

''ایسے تو نہ کہیں شاہ جی!'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''آپ نے فیصلہ کرنے میں اتنے دن لگا دیئے اور مجھے سوچنے کے لئے چند منٹ بھی نہیں مل سکتے؟''

حیدر علی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ''آئی ایم سوری لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں۔''

''مجھے فیصلہ کرنا ہے' میرے قدم تو کسی اور سمت اٹھ ہی نہیں سکتے' پھر بھی مجھے کچھ وقت تو دے دیں' میں تو آپ کے ساتھ نئی دنیا بسانے چلی جاؤں گی لیکن رضیہ کا کیا ہو گا اور پھر کیا آپ

کے گھر والے میرے گھر والوں کو معاف کر دیں گے یا آپ کے ماموں کا گھرانہ میرے گھر والوں کو بخش دے گا؟

میں تو صرف اتنی مہلت مانگ رہی ہوں' جتنے میں یہ اندازہ لگا سکوں کہ اپنی خوشیوں کی ہمیں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی اور کیا میرے لئے وہ قیمت ادا کرنا ممکن بھی ہو گا یا نہیں۔''

حیدر علی اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔

''آپ کے گھر والے طاقت ور ہیں اور آپ کے ماموں بھی' ان دونوں کے درمیان میرے گھر والوں کا کیا انجام ہو گا۔''

''آل رائٹ! تم سوچ لو' لیکن مجھے کل رات تک جواب چاہیے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ میں کہاں کھڑا ہوں اور ایسی صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''اس کے علاوہ میری کوئی مدد نہیں کریں گے آپ؟''

''تم کیسی مدد چاہتی ہو؟''

''کچھ تو۔'' اس کے لئے اپنی بات سمجھانا مشکل ہو رہی تھی۔ ''اماں' ابا اور رضیہ کو کوئی تحفظ۔''

''کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا' کیوں کہ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔'' وہ بولا۔

''اصل میں' میں اپنے ساتھ صرف اپنی ڈگریاں اور ضرورت کے چند سو روپے لے کر جانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اپنی خوشیوں کی خاطر میں کس حد تک خود غرض ہو سکتی ہوں۔''

''بارش تیز ہو گئی ہے۔'' حیدر علی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔''

وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی' لیکن اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

''ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔'' وہ چلتے چلتے بولا۔

''کیا؟''

''تمہارے گھر والوں کو تحفظ دینے کا یہ واحد طریقہ ہے کہ کل صبح تمہارے گھر آ کر میں براہِ راست تمہارے ابا سے بات کروں۔''

''نہیں خدا کے لئے ایسا مت کرنا۔'' وہ رک گئی۔

''جلدی کرو ورنہ بارش میں بالکل ہی بھیگ جاؤ گی۔'' وہ بولا۔

''اور میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ انہیں کسی اور شہر میں سیٹل کروا دوں۔ اس طرح تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ میرے اکاؤنٹ میں خاصے پیسے ہیں اور میرا خیال ہے کہ انہیں استعمال کر لینے سے کوئی ایسا فرق بھی نہیں پڑے گا۔''

آپ کو نہیں پتا ابا جی نہیں مانیں گے‘ پتا نہیں ان کا ردِعمل کیا ہو گا۔‘‘

’’انہیں محفوظ رکھنے کا یہ واحد طریقہ ہے کہ انہیں کسی دوسرے شہر منتقل کر دیا جائے اور اس کے لئے ان سے بات کرنا ضروری ہے۔ میں گفتگو ایسے طریقے سے کروں گا کہ تم پر آنچ نہیں آئے گی۔‘‘

’’آپ کو اندازہ نہیں ہے ابا جی آپ کو ٹال کر یہ اطلاع حویلی بھجوا دیں گے۔‘‘

بحث کرتے اور بارش میں بھیگتے وہ دونوں مسجد کے قریب آ چکے تھے۔

اردگرد دور تک پھیلے گھپ اندھیرے کے درمیان اس کے کمرے میں پھیلی زرد روشنی بہت واضح دکھائی دے رہی تھی۔ زرینہ چلتے چلتے رک گئی۔

’’تم کمرے میں روشنی کر کے آئی تھیں؟‘‘ حیدر علی نے دریافت کیا۔

’’نہیں تو۔‘‘ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ہاتھوں میں جیسے سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔

’’اوہ خدایا!‘‘ اس نے آنکھیں موند لیں۔

حیدر علی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور چند قدم آگے بڑھ آیا۔

کھڑکی سے اندر کمرے میں تین لوگ واضح دکھائی دے رہے تھے۔ مولوی صاحب جو شدید غصے کے عالم میں لگ رہے تھے‘ اماں جن کی رنگت اُڑی ہوئی تھی اور مسلسل روتی ہوئی رضیہ‘ ان میں سے کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی‘ لیکن انداز یہ بتا دینے کے لئے کافی تھا کہ اندر کی صورتِ حال بے حد سنگین تھی۔

’’آج ہمیں باتوں میں دیر ضرور ہوئی ہے‘ لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ مولوی صاحب تہجد کے لئے اٹھ جائیں۔‘‘ وہ بولا۔

’’غلطی میری ہے مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ اماں‘ ابا اور رضیہ تینوں صحن میں سو رہے تھے۔ بارش ہوئی تو اٹھ گئے ہوں گے اور تب ہی مجھے نہ پا کر......‘‘ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

حیدر علی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہا تھا

’’تم فکر مت کرو میرے ساتھ چلو‘ جو بات صبح کرنی تھی وہ میں ابھی کر لیتا ہوں۔‘‘

’’خدا کے لئے شاہ جی یہ غضب مت کرنا۔‘‘ وہ رو دینے کو تھی۔

’’اب میں کسی صورت ابا جی کے سامنے نہیں جا سکتی۔ ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی اور وہ بھی مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے‘ وہ بہت پیار کرتے ہیں مجھ سے لیکن اصولوں کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔‘‘

’’تمہیں کچھ نہیں ہو گا آؤ میرے ساتھ۔‘‘

’’میں نہیں جاؤں گی۔‘‘ اس کی آواز بھرا گئی۔ ’’مجھ میں ہمت نہیں ہے ان کا سامنا کرنے

کی میں ان کی نظروں سے گر چکی ہوں۔‘‘

’’میں جو ہوں تمہارے ساتھ گوری۔‘‘

’’اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا‘ میری شرمندگی تو کم نہیں ہو گی‘ الٹا انہیں میری دیدہ دلیری پر زیادہ غصہ آئے گا۔ ابا جی پیر صاحب جتنے طاقت ور نہ سہی لیکن اتنی ہمت ہے ان میں کہ اپنی اجازت کے بغیر رات کے اس پہر اور اس غرض سے نکلنے والی بیٹی کے ساتھ وہی سلوک کریں جو آپ کی بہن کے ساتھ آپ کے بابا جان نے کیا تھا۔‘‘

’’میرے بابا جان کے علاوہ کوئی بھی باپ اس قدر سنگدل نہیں ہو سکتا۔‘‘

’’یہ آپ کی غلط فہمی ہے‘ اگر ابا جی نے آپ کے سامنے کچھ نہ کہا تو وہ حویلی میں ضرور اطلاع بھجوائیں گے اور پھر صورت حال کیا ہو گی اس کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔‘‘ وہ بولی۔ ’’آپ اس وقت چلے جائیں‘ جو ہو گا میں خود بھگت لوں گی۔‘‘

’’پاگل ہوئی ہو۔‘‘ وہ بولا۔ ’’تمہارا کیا خیال ہے کہ ایسے حالات میں‘ میں تمہیں تنہا چھوڑ دوں گا۔‘‘

’’میں جانتی تھی کہ کسی روز ایسا بھی ہو سکتا ہے‘ لیکن میں نے نتیجے کی پروا کبھی نہیں کی تھی۔ میری آنکھیں بند نہیں تھیں‘ مجھے اچھی طرح سے پتا تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں اس لئے اب جو کچھ بھی ہو گا‘ میں سہہ لوں گی آپ جائیں۔‘‘

’’پاگل پن کی باتیں مت کرو‘ جو کچھ بھگتنا ہو گا ہم اکٹھے بھگتیں گے۔‘‘

’’لیکن میں آپ کے ساتھ گھر نہیں جاؤں گی۔‘‘ اس کے انداز میں ضد تھی۔

حیدر علی نے محسوس کیا کہ جو کچھ بھی کرنا ہوا سے جلدی کرنا ہو گا‘ ورنہ معاملہ مزید الجھ سکتا ہے۔ جبکہ زرینہ کسی دلیل سے قائل ہونے پر تیار نہیں تھی۔ اس نے اچانک فیصلہ کیا

’’چلو گوری میرے ساتھ ہم ابھی شادی کریں گے۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’ہاں‘ ہم ابھی شادی کریں گے اور یہاں تمہاری کوئی ضد نہیں چلے گی۔ میں تمہیں نہ موت کے منہ میں دھکیل سکتا ہوں اور نہ اپنے سے دور کر سکتا ہوں۔ مذہبی اور قانونی طور پر تمہیں اپنا لینے کے بعد کوئی بھی شخص تم پر حق نہیں جما سکے گا اور میرے پاس اسٹینڈ لینے کی ٹھوس بنیاد ہو گی‘ اپنی بیوی کو کوئی بھی کسی دباؤ کے تحت نہیں چھوڑتا۔‘‘

’’شاہ جی میری بات تو سنیں۔‘‘ اس نے کہنا چاہا۔

’’میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ہوں‘ چلو میرے ساتھ۔‘‘ وہ اسے اپنے ساتھ لے چلا۔

’’آپ کو پتا ہے اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔‘‘

’’مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں سب سے لڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں۔ میں جو

اتنے عرصے خاموش تھا تو اس کی وجہ میری کوئی کمزوری یا بزدلی نہیں تھی۔ میں صرف خاندان میں دراڑ نہیں ڈالنا چاہتا تھا' لیکن اب یہ دراڑ ڈالی جا چکی ہے اور خود بابا جان اور بڑے بھائی جان نے ڈالی ہے' اب ہم کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے یوں بھی مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں کشمکش سے نکال کر محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ فیصلہ آپ عجلت میں کر رہے ہیں۔'' اس نے احتجاج جاری رکھا۔

''میں یہ فیصلہ تو کر چکا تھا' صرف وقت طے کرنا باقی تھا سو وہ قدرت نے خود ہی طے کر دیا۔''

زرینہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت وہ حیدر علی کو اس فیصلے سے نہیں ہٹا سکتی' جو وہ کر چکا تھا اور پھر اس صورتِ حال کا کوئی حل خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس لئے تن بہ تقدیر ہو کر اس کے ساتھ چلی گئی۔

جب وہ ڈیرے پر پہنچے تو دونوں بری طرح بھیگ چکے تھے۔ زرینہ کو کچھ فاصلے پر چھوڑ کر اس نے ڈیرے میں موجود تین ملازمین کو سوتے سے جگا کر ان کے گھر روانہ کر دیا اور ان کے جانے کے بعد زرینہ کو اندر لے آیا۔

''یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔'' وہ بولا۔ ''چادر اتار کر نچوڑ لو' آرام کرنا چاہو تو وہ کمرا ہے' یہاں تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔''

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' وہ اس کے قریب آ گئی۔ ''میں اکیلے نہیں رہوں گی۔''

''تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ذرا سی ہمت اور بہادری کا ثبوت دینا ہو گا تمہیں' مجھے کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔''

''کیسے کام کرنے ہیں؟''

''ایک تو یہ کہ اس وقت میری جیب میں بمشکل ہی پانچ سو روپے ہیں' جو شاید بھیگ کر ردی کاغذ کے ٹکڑے بن چکے ہوں۔ میری ڈگری حویلی میں پڑی ہے مجھے اور تمہیں کپڑوں کی بھی ضرورت ہے اور ان سب سے بھی بڑھ کر ایک نکاح خواں کی ضرورت ہے۔''

''لیکن نکاح تو ابا جی پڑھاتے ہیں۔''

''یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔''

''مجھے یہاں نکاح نہیں کرنا' ہم شہر جا کر نکاح کر لیں گے' اگر آپ کا فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا تو اس میں کم از کم اتنی ترمیم کر لیں کہ جلد سے جلد واپس آ کر شہر چلنے کی تیاری کریں' نکاح وہاں ہو جائے گا۔''

''جو کام میرے ہیں وہ مجھ پر چھوڑ دو' میں بحث میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے' نکاح خواں ساتھ والے گاؤں سے بھی آ سکتا ہے' لیکن یہ ضروری ہے کہ نکاح آج ہی

رات ہو' ورنہ بعد میں ہم بہت سی قانونی الجھنوں میں پھنس سکتے ہیں۔ جس رات تمہارے ابا نے یہ دیکھا ہے کہ تم گھر میں موجود نہیں ہو اسی رات نکاح ہونا ضروری ہے۔''

بات زرینہ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

''پھر آپ کتنی دیر میں آئیں گے؟'' وہ پریشان تھی۔

''جس قدر جلد ممکن ہو سکا شاید میں حویلی سے کار بھی لے جاؤں تا کہ نکاح خواں کو جلدی لایا جا سکے۔ تم اتنی دیر آرام کرو۔'' وہ باہر نکل گیا۔

زرینہ چند لمحے اس دروازے کی طرف دیکھتی رہی جس سے نکل کر ابھی حیدر علی گیا تھا۔ ایک دم تنہائی نے اسے آ دبوچا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ حیدر علی سے بہت دور ہو گئی ہو۔ بوجھل قدموں سے وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جس میں آرام کرنے کا حیدر علی نے کہا تھا۔

☆======☆======☆

سلیم کافی دن سے ڈیرے کے پاس سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب تک کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی تھی۔ اس دن جب بوندا باندی شروع ہوئی تو اس نے گھر جانے کا ارادہ کر لیا لیکن پھر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

''شاید آج ہی کے دن کوئی خاص بات ہو جائے اور میں محض اپنی آرام طلبی کے باعث بعد میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔''

یہی سوچ کر وہ برستی بارش میں بھی ڈیرے کے قریب ہی موجود تھا۔ بارش کی وجہ سے نیند تو آنکھوں سے دور تھی لیکن بوریت نے اسے گھیر رکھا تھا۔ پھر اچانک اس کی تمام حسیں بیدار ہو گئیں۔

دور سے ایک لڑکا اور لڑکی ڈیرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ رجب علی اور حیدر علی کو پہچانتا تو نہیں تھا لیکن آنے والے کا لباس دیکھ کر اسے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً دشواری نہیں ہوئی کہ وہ رجب علی یا حیدر علی میں سے ہی کوئی تھا۔ ساتھ ایک لڑکی کی موجودگی سے اس نے اپنے تئیں پر اندازہ لگایا کہ وہ رجب علی ہی ہے۔ وہ بغور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا ملازمین کو سوتے سے جگا کر ڈیرے سے ہٹا دینے لڑکی کو اندر لے جانے اور حیدر علی کے باہر آنے کے تمام مناظر اس نے دیکھے تھے۔

''ہوں۔'' اس نے پُرخیال انداز میں ہنکارہ بھرا۔

☆======☆======☆

کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ باقی کمروں کی طرح جنریٹر نے اس کمرے کو بھی روشن کر رکھا تھا اور اس روشن کمرے کو دیکھ کر اسے یوں محسوس

ہوا جیسے وہ پریوں کے دیس میں آ گئی ہو۔ کمرے تو اس نے حویلی میں بھی دیکھے تھے خوبصورت اور کشادہ لیکن وہ بھی اس قدر شاندار نہیں تھے۔ دبیز قالین' جھالروں والے پردے جدید ترین فرنیچر اور خوبصورت ڈبل بیڈ جس کی ریشمی گلابی چادر کے اوپر ریشمی دھاگے سے بنا سفید کروشیے کا خوبصورت بیڈ کور بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں رات کی رانی کے تازہ پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی وہ مسحور ہو کر آگے بڑھ آئی۔

''یہ سب کچھ کتنا حسین اور کتنا مختلف ہے۔'' اس نے سوچا۔ اس کے بالوں اور کپڑوں سے قطرہ قطرہ پانی قالین پر ٹپک رہا تھا لیکن وہ کمرا دیکھنے میں محو تھی کافی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ قالین ہلکا ہلکا نم ہو چکا ہے تو وہ چونک اٹھی اور کمرے سے متصل ڈریسنگ روم میں چلی آئی قد آدم آئینے نے اس کے قدم روک لئے اور وہ اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ سیاہ لباس میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی گوری رنگت اور شفاف جلد بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ آنکھوں کا کاجل پھیل رہا تھا اور لمبے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

''اوہو!'' اسے پھر بال سکھانے کا خیال آیا۔ تولئے کی تلاش میں اس نے الماری کھولی لیکن سامنے سجی ڈھیر ساری بوتلیں دیکھ کر بنا سوچے سمجھے بند کر دی دوسری الماری کھولنے کی کوشش کی لیکن اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ تیسرا دروازہ آسانی سے کھل گیا۔ یہ باتھ روم تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ پلکیں جھپک کر رہ گئی۔ خوبصورت نیلگوں ٹائلز والے لمبے چوڑے باتھ روم میں بھی ایئر فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ہر چیز آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔

ایک دم سے اسے احساسِ کمتری نے آن گھیرا۔

''یہ اتنی ساری چیزیں جو اس کمرے اور غسل خانے میں ہیں مجھے تو ان میں سے اکثر چیزوں کو استعمال کرنا بھی نہیں آتا۔'' اس نے سوچا۔ ''شاہ جی نے مجھ جیسی دیہاتی اور گنوار لڑکی میں کیا دیکھا کہ میری خاطر سب رشتے توڑنے پر آمادہ ہو گئے؟ یہاں تو ہر چیز غیر ملکی ہے وہاں ولائیت کی لڑکیوں کو ان سب چیزوں کا علم ہو گا پھر شاہ جی ان سب لڑکیوں کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوئے مجھ میں کیا ہے؟'' اس نے مایوسی سے سوچا۔

اس کے ذہن میں اچانک بہت پرانے دنوں کے نقوش تازہ ہو گئے۔

''ولائیت میں تو بہت خوبصورت لڑکیاں ہیں مجھ سے زیادہ گوری' سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں۔ کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں پھر آپ کی نگاہِ انتخاب مجھ پر کیسے ٹھہری؟'' اس نے پوچھا تھا۔

اور جواب میں حیدر علی چند لمحے اسے تکتا رہا تھا پھر بولا۔ ''شاعر کہتا ہے کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے وہاں واقعی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں لیکن ان میں سے کسی سے ملتے ہوئے میرے دل سے یہ صدا نہیں آئی تھی کہ وہ لڑکی میری ہے۔

تمہیں دیکھا تو میرے دل نے صدا دی کہ میں تمہاری ہی تلاش میں تھا۔ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں تلاش کیا' لندن کے کلبوں میں' سڑکوں پر' لائبریری میں کتابوں کے ریک کے پیچھے خاموش ندیوں کے ویران اور بے آباد کناروں پر' کینوس لگے ایزل کے گرد اور پیانو بجاتی لڑکیوں کے درمیان۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم مجھے یہاں ملو گی۔''

زرینہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ باتھ روم میں داخل ہو گئی۔

ٹاول اسٹینڈ پر صاف ستھرا نیلا تولیا لٹکا ہوا تھا۔ وہ تولیا اٹھا کر بال سکھانے لگی۔

☆======☆======☆

زیب النسا کی وفات کے بعد سے رجب علی پُرسکون نہیں تھا۔ ایک خول اس نے خود پر چڑھا رکھا تھا جو اس لئے ضروری تھا کہ وہ گدی کا وارث تھا اور اسے جذباتی اور اعصابی طور پر مضبوط نظر آنا چاہئے تھا۔ اسے اپنے کئے پر افسوس نہیں تھا اس حرکت پر افسوس تھا جو زیب النساء نے کی تھی اور مسلسل یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ ایسی صورتِ حال آئندہ بھی پیش آ سکتی ہے۔

پھر یہ بھی تھا کہ اس واقعے کے بعد سے بھائیوں کے درمیان خلیج حائل ہو گئی تھی۔ اسے اپنے دونوں بھائی بہت پیارے تھے۔ سخاوت کو تو وہ یوں بھی ہر اہم جگہ اپنے ساتھ رکھتا تھا لیکن حیدر علی اس سے بہت دور چلا گیا تھا وہ چاہتا تھا کہ پرانی باتیں بھول کر علی اس کے گلے لگ جائے لیکن بظاہر یہ ہونا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا منصب اور انا اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ خود چھوٹے بھائی کے پاس چلا جائے۔ یوں بھی علی کے پاس جانے کا مطلب یہ تھا کہ اسے اپنے کئے پر کوئی افسوس ہے جبکہ ایسا نہیں تھا اور نہ ہی وہ اسے کوئی ایسا تاثر دینا چاہتا تھا۔

بس ایک موہوم سی امید تھی کہ گوری کے سلسلے میں علی کو اس کی مدد کی ضرورت تھی جب کہ شادی میں بھی بمشکل ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس موقع پر وہ اس سے مدد کی درخواست کرتا۔ ایسی صورت میں رجب علی کا خیال تھا کہ وہ بلا تامل علی کی مدد پر تیار ہو جائے گا اور جیسے بھی اسے پڑا فوزیہ سے اس کی شادی رکوانے کی کوشش کرے گا۔

''اور یہ کوئی مسئلہ بھی نہیں ہو گا۔'' یہ موضوع ذہن میں آتے ہی وہ سوچتا۔ ''اگر اپنی سگی بہن کو ختم کیا جا سکتا ہے تو یہ سلوک کسی اور کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ حویلی اور رشتے قائم رکھنے کے لئے میں ہر انتہا پر جا سکتا ہوں بس میرا بھائی میرے پاس واپس آ جائے۔

فوزیہ کی اہمیت ہی کیا ہے۔ وہ نہیں رہے گی تو بابا جان کے الفاظ کا پاس بھی رہ جائے گا اور علی بھی زبردستی کے اس بندھن سے آزاد ہو جائے گا۔''

سگار کے کش لیتے ہوئے وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا۔

''اگر انا آڑے نہ آئے تو میں اب بھی بغیر ایک لمحے کی تاخیر کے حیدر علی کو اپنے گلے لگا لوں۔ بھائی ہی تو بھائیوں کی اصل طاقت ہوتے ہیں۔ حویلی کی دیواروں میں یوں بھی تو رخنے پڑ

جائیں گے اور میں اسے کمزور ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

کمرے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری۔ رجب علی نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ حیدر علی اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کمرے کے باہر سے گزر رہا تھا۔ اس وقت حویلی ویران تھی۔ وہ علی کو آواز دیتا تو کوئی بھی اس کی شکست کا یہ منظر دیکھنے کے لئے موجود نہ ہوتا' لیکن علی کی نظروں میں تو اس کی سبکی ہو جاتی ناں۔ سو اس نے آواز دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ فائیل اٹھائے انگلی پر گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزرا۔

''علی!'' رجب علی نے بے اختیار آواز دی۔ حیدر علی رک گیا۔

''کہیے۔'' رجب علی کو شرمندگی نے آ گھیرا آخر شکست تو اسی کی ہوئی تھی لیکن ایسی بے اختیاری میں کہ وہ بے بس ہو گیا تھا۔

''مجھے جلدی ہے۔'' اسے خاموش دیکھ کر حیدر علی نے کہا۔

''میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' اس نے شرمندگی سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے اپنے اوپر متانت طاری کر لی تھی۔

حیدر علی نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

''تمہیں شادی کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں اسے بہ آسانی رکوا دوں گا۔''

''پیش کش پُرکشش ضرور ہے لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' حیدر علی کے انداز میں بلا کی سرمہری اتر آئی۔

رجب علی دم بخود رہ گیا۔ اتنی بے اعتنائی اور سرد مہری کی اسے بالکل توقع نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ پیشکش اس کے اور علی کے درمیان روز بہ روز بڑھتی ہوئی خلیج پاٹ دے گی لیکن حاصل کیا ہوا تھا؟ اس کی انا بھی چُور چُور ہو گئی تھی۔ جھک جانے کی ذلت بھی اٹھانی پڑی تھی شکست بھی ہوئی تھی اور تعلقات کی خلیج کبھی نہ ختم ہونے کی حد تک جا پہنچی تھی۔

رجب علی دکھ غصے اور احساسِ توہین سے پاگل ہو رہا تھا اگر حیدر علی اس کا بھائی نہ ہوتا تو ایک سیکنڈ سے کم وقت میں وہ اسے شوٹ کر دیتا۔

اندر کا ابال بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت اس کے اعصاب پُرسکون نہ ہوئے تو وہ یقیناً حیدر علی کو معاف نہیں کر سکے گا۔ اسے اپنے اشتعال پر قابو پانے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی اور ایک ہی صورت میں ممکن تھا صرف ایک اچھی ڈرنک ہی اسے سکون پہنچا سکتی تھی۔

کار کی چابی میز پر ہی رکھی ہوئی تھی وہ ڈیرے پر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا

☆======☆======☆

زیب النسا کی موت کے بعد سے اماں جان بالکل گم صم ہو کر رہ گئی تھیں کم گو تو وہ پہلے ہی تھیں لیکن اب تو بالکل ہی بجھ گئیں تھیں۔ کچھ تو بیٹوں کے درمیان سرد مہری دیکھ کر بھی دل کڑھتا تھا اور کچھ مستقبل کے اندیشے پریشان رکھتے تھے۔

اگر حیدر علی نے عین وقت پر فوزیہ سے شادی سے انکار کر دیا تو؟ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اسے اس گھر' اس کے مکینوں اور ان کے منہ سے نکلے الفاظ سے قطعاً دلچسپی نہیں رہی تھی اور کوئی عجب نہیں تھا کہ عین وقت پر وہ نکاح خواں کے سامنے انکار کر دے ایسی صورت میں جو بات آتی' اس میں سراسر نقصان ان کا اپنا تھا۔ ایک طرف اپنا بیٹا تھا اور دوسری طرف شوہر اور دوسری طرف اپنا سگا بھائی۔ ان کے لئے کسی ایک کا انتخاب کرنا یا کسی ایک کی سلامتی کی دعا مانگنا ممکن ہی نہیں تھا۔

ہر نماز کے بعد سورہ یٰسین پڑھ کر اپنے گھرانے کی سلامتی کے لئے دعا مانگا کرتی تھیں اس بات انکار کا مطلب تھا ان کے بھائی اور اس کے گھرانے اور خصوصاً فوزیہ کی توہین جو ان کے بھائی کے گھرانے کے لئے برداشت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی دشمنی کی ابتدا ہوتی جو کسی ایک یا دونوں گھرانوں کے مردوں کے خون سے بھی ٹھنڈی نہیں پڑ سکتی تھی۔

ان کے بھائی کے خلاف ہتھیار نکالنا پیر صاحب کی مجبوری ہوتی لیکن بیٹے کے خلاف ہتھیار نکالتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ ہچکچاتے۔

اور ان میں یہ کشت و خون دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' پیر صاحب کتاب بند کر کے عینک اتارتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کچھ نہیں۔'' وہ عادتاً مدھم آواز میں بولیں۔ ''میری سوچ آپ سے اور اولاد سے متعلق ہوتی ہے اس کے علاوہ کیا سوچنا ہے۔''

''جب تک ہم موجود ہیں' تب تک آپ کو ان سوچوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ہیں نا حالات سلجھانے کے لیے۔''

اماں جان نے آہ بھری۔ ''جب کشتی بھنور میں پھنس جائے تو خوف تو دامن گیر ہو ہی جاتا ہے۔''

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔'' پیر صاحب نے کہا۔

ایک ملازمہ دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔

''سرکار! منشی فضل دین کا بیٹا سلیم آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

پیر صاحب چونک گئے اماں جان کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ اس وقت ہم کسی سے نہیں ملتے!''

''حضور! میں نے تو بہت کہا لیکن اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ ابھی اور اسی وقت آپ سے ملنا بے حد ضروری ہے میرے مسلسل انکار کرنے پر کہنے لگا کہ بات اتنی اہم نہ ہوتی تو میں اس وقت مخل نہ ہوتا۔''

''ہوں۔'' وہ پُر خیال انداز میں بولے۔ ''اسے بٹھاؤ ہم آتے ہیں۔''

''جو حکم سرکار۔'' وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔

''سلیم اس وقت کیوں آیا ہے؟'' اماں مضطرب ہو گئیں۔ ''کہیں اسے خبر تو نہیں ہو گئی؟''

''اگر معاملہ ہماری بیٹی کا نہ ہوتا تو اسے یا کسی اور کو بھی خبر ہو جاتی تو ہمیں پروا نہیں تھی لیکن اب بات اور ہے۔'' وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ''اور اس لئے ہمارا اس سے ملنا ضروری ہے۔''

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔

''آپ فکر مت کریں ہمیں معاملات سنبھالنا آتے ہیں۔''

گول کمرے میں سلیم پیر صاحب کے انتظار میں بیٹھا تھا ان کے آنے پر اٹھ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام۔'' وہ اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''بیٹھو!'' سلیم کچھ کہے بغیر بیٹھ گیا

''اس وقت ہم کسی سے نہیں ملا کرتے لیکن صرف یہ سوچ کر چلے آئے کہ شاید تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہے تب ہی تم رات کے اس پہر اتنی بارش میں یہاں چلے آئے۔''

''جی ہاں۔'' اس نے اپنی بات کے لئے ذہن میں موزوں اور الفاظ اکٹھے کئے۔

''میں کافی دن سے اپنے بھائی کو تلاش کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گاؤں جا رہا ہے لیکن پھر واپس نہیں آیا میں بہت پریشان ہوں۔''

پیر صاحب نے چند لمحے اس کے الفاظ پر غور کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیا اسے اچھو کے گاؤں آنے کی غرض کا بھی علم ہے یا فقط اتنا ہی علم تھا کہ وہ یہاں آیا تھا لیکن سلیم کے لہجے میں کوئی دھمکی آمیز بات نہیں تھی۔

''جب اتنے دن تک تم نے ہماری مدد کے بغیر اپنے بھائی کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو کیا ایک رات اور صبر نہیں کر سکتے تھے؟'' وہ بولے تو ان کے انداز میں قدرے ناگواری تھی۔

''وہ میرا بھائی ہے اور اس کے لئے میرے دل میں کیا درد اٹھ رہا ہے یہ صرف کوئی بھائی ہی جان سکتا ہے۔'' سلیم نے دبے دبے انداز میں کہا حقیقتاً اسے پیر صاحب کے انداز پر خاصا غصہ آیا تھا۔

''اتنی رات گئے اور بارش میں تمہارے بھائی کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہے یہ کام تو صبح ہی ہو سکتا ہے۔'' پیر صاحب بولے۔

''ویسے ہماری اطلاعات کے مطابق تو تمہارا بھائی اور ماں باپ بغیر کسی سے ملے یا کسی کو کچھ بتائے کہیں چلے گئے ہیں۔ کہاں؟ یہ جاننے کی ہم نے کوشش نہیں کی کچھ اس لئے کہ ان کا گھر اور بیشتر سامان ویسے ہی کھلا پڑا ہے اور کچھ اس لئے بھی کہ ہماری اس کوشش کے باوجود کہ سب لوگ یہیں ہنسی خوشی سے رہیں ہم کسی کو باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔''

اب سلیم کی باری تھی کہ وہ ان کی بات میں حقیقت ڈھونڈے لیکن وہ کوئی اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔

''تم کل صبح آ جانا ہم ان تینوں کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔'' پیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے

''سرکار ایک گزارش اور ہے۔''

سلیم کی بات نے ان کے اٹھتے قدم روک دیئے۔

''غالباً بڑے شاہ صاحب آپ کو حویلی میں نہیں ملیں گے۔''

پیر صاحب کو محسوس ہوا جیسے سلیم کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا ہو۔

''ابا جی بتاتے تھے کہ آپ بہت انصاف پرور ہیں۔ وہاں ڈیرے پر ایک لڑکی اور بڑے شاہ صاحب آپ کے انصاف کے منتظر ہیں۔''

پیر صاحب کے چہرے پر سرد مہری چھا گئی۔

''تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''جی بالکل! کیوں کہ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بڑے شاہ صاحب اور ایک لڑکی.....'' وہ چپ ہو گیا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ رجب علی کے ذکر پر اس کے لہجے میں زہر سا اترنے لگا تھا جبکہ پیر صاحب کو یہ تاثر ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا کہ ان کے سامنے اس واقعے کا ذکر کرنے کا مقصد درحقیقت رجب علی سے انتقام لینا ہے۔

''کیا دیکھا تم نے؟''

''بس ایک لڑکی کو روتے چلاتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے ڈیرے کے ملازمین کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا اور پھر بڑے شاہ صاحب کہیں باہر چلے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب تک یہیں پہنچ چکے ہوں گے۔'' اس نے اتنے اطمینان سے جھوٹ اور سچ کی آمیزش کی تھی کہ پیر صاحب انہیں ایک دوسرے سے الگ نہ کر سکے۔

''ہوں۔'' پیر صاحب کے انداز میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ''جانتے ہو قذف' یعنی کسی پر جھوٹا الزام لگانے کی کیا سزا ہے؟''

"جی یہ بھی جانتا ہوں بلکہ حدود کے تمام قوانین پڑھ رکھے ہیں میں نے' دیگر سزاؤں بشمول اغوا وغیرہ سے متعلق بھی مجھے واقفیت ہے۔" آخری بات اس نے آہستہ سے کہی تھی' لیکن دانستہ آواز اس قدر ضرور رکھی تھی کہ پیر صاحب کے کانوں تک پہنچ جائے۔

پیر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ رجب علی اس حرکت میں ملوث ہوگا اور یہی یقین تھا جس کی وجہ سے اس کل کے بچے کی توہین آمیز بات انہیں برداشت کرنا پڑی تھی۔

اس نے ان کی انصاف پروری کو چیلنج کیا تھا۔ دبے دبے انداز میں ہی سہی' ان کے گھرانے کا مذاق اڑایا تھا' انہیں یہ باور کرایا تھا کہ اغوا قابلِ معافی جرم نہیں ہے' ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ منہ موڑ کر چلتے بنتے۔ معاملہ ابھی بگڑا نہیں تھا' وہ اسے سنبھال سکتے تھے۔ خاندان کی عزت و آبرو بچانا بہت اہم تھا۔ گدی کے وارث پر سے یہ داغ دھونا نہایت ضروری تھا۔

سلیم منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"چلو' ہم ابھی ڈیرے پر چلیں گے۔"

☆======☆======☆

حیدر علی کی گاڑی کچے راستے پر ہچکولے کھانے کے بعد جی ٹی روڈ پر چڑھ گئی۔ ہموار سڑک پر چڑھتے ہی اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

رات کے اس پہر شدید بارش کے درمیان ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اکا دکا ٹرک تیزی سے اس کے پاس سے گزرتے رہے' لیکن اس کی منزل ابھی تین میل دور تھی۔ وہ کسی ایسے گاؤں سے نکاح خواں لانا چاہتا تھا' جو ان کی جاگیر میں نہ آتا ہو' کیوں کہ اپنی جاگیر کے اندر سب لوگوں پر پیر صاحب کا دباؤ تھا اور وہ مزید کسی الجھن اور پریشانی میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

اکیلے ہوتے ہی بہت سے خیالات نے اس کے ذہن پر دھاوا بول دیا تھا' لیکن وہ ہر خیال سے پیچھا چھڑا لینا چاہتا تھا۔ اماں جان کی منت بھری نظروں' بابا جان کے حکم اور رجب علی کی پیشکش کو ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ اب اس کے قدم اتنے آگے بڑھ چکے تھے کہ واپسی ناممکن تھی۔ وہ کسی بھی کمزور لمحے کو خود پر غالب نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

بابا جان اور رجب علی کی اسے کچھ زیادہ پروا نہیں رہی تھی' لیکن اماں جان کی خواہش۔

اس نے شعوری طور پر ہر خیال کو دماغ سے نکال کر تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔

☆======☆======☆

ڈیرے کے باہر گاڑی رکنے کی آواز سن کر زرینہ چونک گئی۔ منہ دھوتے ہوئے پانی کے چھینٹے ڈالتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

"شاہ جی آ گئے۔" اس کا دل کھل اٹھا' لیکن اگلے ہی لمحے وہ الجھن میں مبتلا ہو گئی۔ "اتنی

جلدی شاہ جی کیسے واپس آ سکتے ہیں۔" اس نے خود ہی اپنے پہلے خیال کی تردید کر دی۔ "تو پھر یہاں کون آ گیا؟"

نلکا بند کر کے وہ دبے قدموں غسل خانے کے دروازے پر گئی اور نہایت آہستگی سے اسے بند کر کے کنڈی لگا دی۔

"جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ آنے والے شاہ جی ہیں تب تک میں بھی دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

وہ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔

☆======☆======☆

گاڑی سے اتر کر رجب علی اندر آیا۔ دو کمروں کی بتیاں روشن تھیں' جب کہ باقی ہر چیز پر تاریکی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ جنریٹر صرف اس وقت چلایا جاتا تھا' جب حویلی کا کوئی فرد وہاں آتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ملازمین لالٹین سے ہی کام چلا لیتے تھے' لیکن خلافِ معمول آج وہاں کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔

اس نے تمام حسیات مجتمع کر کے کسی کی موجودگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"جو کوئی بھی ہے میرے کمرے میں ہی ہے۔" اس نے سوچا اور چند قدم آگے بڑھ کر کمرے کے بند دروازے کے سامنے رک گیا۔

سب سے پہلا خیال اسے یہ آیا کہ شاید کوئی ملازم اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہینڈل گھما کر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول لیا' لیکن وہ روشن کمرا بھی خالی تھا۔ ایک قدم بڑھا کر وہ اندر چلا آیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

سامنے ہی کروشیے کے سفید بیڈ کور پر ایک سیاہ باریک ریشمی چادر بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھی۔

"کوئی لڑکی۔" اس نے سوچا۔ "لیکن کون اور کیسے۔"

اس نے آگے بڑھ کر چادر اٹھا لی۔ ہلکی سی نمی والی وہ چادر نہ جانے کب سے وہاں پڑی تھی' لیکن اس میں کسی لڑکی کے وجود کی مہک ابھی تک موجود تھی۔

چادر دوبارہ پھینک کر وہ ڈریسنگ روم کی جانب بڑھا۔ ایک دم اس کی بے زاری اور کوفت دور ہو گئی تھی۔ یہاں پہنچتے پر اتنا دلچسپ سرپرائز ملے گا' اس کا اسے گمان بھی نہیں تھا۔ اسے اس کی پروا نہیں تھی کہ وہ کون تھی' کہاں سے اور کیوں آئی تھی' بس اتنا کافی تھا کہ وہ اس کی خواب گاہ میں تھی اور مفت کی شراب تو قاضی کو بھی حلال ہوتی ہے۔

ڈریسنگ روم کے آدھے پردے تنے ہوئے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا' لیکن وہاں بھی اس اجنبی لڑکی کی خوشبو کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گویا وہ باتھ روم میں تھی۔ اس نے دروازے پر دستک

دی۔ ایک مرتبہ' دو مرتبہ' تین مرتبہ' لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھولنا چاہا' لیکن وہ بند تھا۔

''ہوں۔'' اس نے پُرخیال انداز میں دروازے کی طرف دیکھا۔

☆======☆======☆

وقت اتنا زیادہ نہیں گزرا تھا' لیکن زرینہ کو ایک لمحہ ایک صدیوں کے برابر لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ کتنی دیر گزر گئی تھی' لیکن کسی کی آہٹ نہیں ابھری تھی۔ پھر اچانک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو خوف کے مارے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے۔

''شاہ جی ہوتے تو اس انداز میں نہ آتے۔'' اس نے سوچا تھا۔

پھر یوں لگا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں' لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ کسی کے اپنے تک پہنچنے یا واپس چلے جانے کا۔ جب انتظار ناقابلِ برداشت ہو گیا تو قدموں کی آہٹ سنائی دی جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ واضح ہو رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ وہ دم سادھے ویسے ہی کھڑی رہی۔

پھر اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ خوف کے مارے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ دروازے کی کنڈی پر گئی۔ وہ مضبوطی سے بند تھی۔

دروازے پر دوسری دستک ہوئی۔ اس نے پہلی مرتبہ غسل خانے کا جائزہ لیا کہ شاید کوئی کھڑکی باہر کھلتی ہو' لیکن وہاں ایک بالکل ننھی منی سی کھڑکی تھی جو خاصی اونچائی پر ہونے کے علاوہ اس قدر تنگ اور چھوٹی تھی کہ اس کے لئے وہاں سے نکل بھاگنا ممکن ہی نہیں تھا۔

تیسری مرتبہ دستک ہوئی تو اس کی آنکھوں میں اپنی بے بسی کے خیال سے آنسو آ گئے۔

''اگر شاہ جی ہوتے تو مجھے پکارتے۔ اوہ خدایا' یہ کون آ گیا؟''

''لڑکی دروازہ کھولو۔'' باہر سے تحکمانہ انداز میں اسے مخاطب کیا گیا۔

اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ یہ انداز حویلی کے مکینوں کے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ وہ حیدر علی نہیں تھا۔ سخاوت بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پیر صاحب کی آواز اور لہجے کو وہ پہچانتی تھی۔

اور ان سب کے بعد صرف ایک شخص باقی بچتا تھا۔۔ رجب علی شاہ۔

زرینہ کی جو تھوڑی بہت امید تھی' وہ بھی اسی پل ختم ہو گئی۔ رجب علی سے اسے کسی رعایت کسی رحم کی توقع نہیں تھی۔ جو شخص اپنی سگی بہن کا قاتل تھا اسے زرینہ سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے؟

''اگر میں شاہ جی کا حوالہ دے دوں تو؟ انہوں نے شاہ جی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کریں گے۔'' امید کی ایک کرن نمودار ہوئی۔

لیکن پھر یہ کرن بھی بجھ گئی۔

''ان دونوں بھائیوں کی راہیں تو بالکل ہی جدا ہو گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے' انہیں ہمارے گاؤں چھوڑنے کے منصوبے کا علم ہو تو' وہ ہمارے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کریں' جیسا زیب النسا اور پھوکے ساتھ کیا تھا۔'' اسے جھرجھری آ گئی۔ ''مجھے اپنی پروا نہیں ہے' لیکن شاہ جی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

''لڑکی! دروازہ کھولو ورنہ یہ دروازہ توڑنا بھی مشکل نہیں ہے۔''

ایک مرتبہ پھر وہی تحکمانہ لہجہ تھا۔

زرینہ کو خون اپنی رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہونے لگا۔ اس نے ایک نظر اپنے سراپے پر ڈالی۔ اس کے کپڑے اب تک بھیگے ہوئے تھے۔ چادر وہ وہیں کمرے میں رکھ آئی تھی' کہ باہر نکل کر اوڑھ لے گی اور دوپٹا لانے کی اس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ایسی صورتِ حال میں اسے کیا کرنا چاہیے۔

اچانک دروازے پر ٹکر لگی۔ خوف کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور گھبراہٹ کے عالم میں وہ دروازے سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔

☆======☆======☆

پہلی ٹکر کے ساتھ ہی اندر موجود لڑکی نے پہلی مرتبہ اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ خوف زدہ چیخ' قدموں کی آہٹ اور چوڑیوں کی کھنک۔ رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ابھی کافی رات پڑی تھی اور اسے کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔

ہولے ہولے سیٹی بجاتے ہوئے اس نے الماری کھول کر ایک بوتل اور فرنچ گلاس نکالا اور کمرے میں آ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ دروازے کی کنڈی توڑنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کنڈی تو بھی وہ ایک دو سے زیادہ جھٹکے برداشت نہیں کر سکے گی اور آرام سے اکھڑ جائے گی' لیکن اتنے تردد کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کیوں کہ وہ اندر بند لڑکی کے ردعمل کا اندازہ کر سکتا تھا۔ کسی کی جگہ بند ہو کر اپنے اوپر ٹوٹ پڑنے والی افتاد کا انتظار کرنا اعصابی طور پر بہت مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد ہی لڑکی کے اعصاب جواب دے جائیں گے اور پھر کچھ بھی مشکل نہیں ہو گا۔

اس نے تھرماس سے برف کے ٹکڑے نکال کر گلاس میں ڈالے' بوتل انڈیلی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔

☆======☆======☆

زرینہ کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ ایک ہی ٹکر کے بعد کنڈی میں لگی کیلیں نمایاں طور پر اکھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ چند لمحوں بعد دروازے پر دوسری ٹکر

پڑے گی' لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

ہولے ہولے سیٹی بجنے اور الماری کھلنے بند ہونے کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ رجب علی اس وقت کمرے میں ہی ہے۔

"یا اللہ! کہیں سے شاہ جی کو بھیج دے۔" اس نے بے آواز روتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

"یا اللہ مجھے اس مصیبت سے رسوائی کا داغ لگے بغیر نکال دے۔ اتنی دیر ہوگئی شاہ جی نہیں آئے۔ یوں لگتا ہے' صدیاں گزر گئی ہیں انہیں جدا ہوئے۔ وہ ہوتے تو کسی کی جرأت نہیں تھی میرے ساتھ ایسا کرنے کی۔ رجب علی کو بھی نہیں۔

شاہ جی کدھر رہ گئے آپ؟ آپ نے تو کہا تھا میں یہاں بالکل محفوظ ہوں۔ آپ کو نہیں پتا تھا کیا کہ یہاں درندہ بھی آ سکتا ہے؟" وہ گھٹنوں میں سر دیے زار و قطار رو پڑی۔

وہ روتی جا رہی تھی' لمحے گزرتے جا رہے تھے' لیکن اتنی آہستگی کے ساتھ جیسے صدیاں بیتی ہیں۔ اتنا وقت گزر گیا تھا لیکن حیدر علی نہیں آیا تھا۔ وہ تھک گئی تھی' اس کا ذہن پاگل کر دینے والی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اندیشوں کے سانپ بار بار ڈس رہے تھے' خوف کے بچھو ڈنک مار رہے تھے۔

اسے لگا جیسے وہ پاگل ہوگئی ہے۔ رجب علی اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل' کھیل رہا تھا۔ حیدر علی کا کچھ پتا نہیں تھا اور اپنی قسمت کا اسے کچھ بھروسہ نہیں تھا۔

اس کے اعصاب چیخ رہے تھے۔ اسے خود اندازہ نہیں ہوا کہ بے آواز روتے روتے کب وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

رجب علی اس کے چیخنے اور رونے کی پروا کیے بغیر پیتا رہا۔ کافی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے خیال میں صحیح وقت اب آیا تھا۔ غسل خانے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں کہا۔

"تمہاری ضد پوری ہوگئی ہے تو دروازہ کھول دو' ورنہ ہم خود کھول دیں گے۔"

جواب میں رونے کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔

"دروازہ کھول دو۔"

"نہیں۔" زرینہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ "کبھی نہیں۔"

دروازے پر ایک اور ٹکر پڑی اور کنڈی اکھڑ گئی۔

☆======☆======☆

پیر صاحب ڈرائیور کے ساتھ ڈیرے پر پہنچے تو رجب علی کی گاڑی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔

بجلی بھی روشن تھی۔

اس حد تک سلیم کی بات درست ثابت ہوگئی تھی' کہ رجب علی وہیں موجود ہے۔ برآمدے میں پہنچتے پہنچتے اس کی دوسری بات کی بھی تصدیق ہوگئی کہ وہاں کوئی لڑکی بھی موجود تھی' کیوں کہ اس کی چیخ و پکار وہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ پیر صاحب کے اعصاب تن گئے اور غصہ پورے وجود میں کروٹ لینے لگا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔" انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

"جی حضور۔" ڈرائیور بھیگی بلی بن کر جلدی سے کافی دور چلا گیا۔ سلیم کو وہ پہلے ہی اس کے گھر پر اتار آئے تھے۔

پیر صاحب اکیلے اندر بڑھے۔ کمرے کے دروازے کا ہینڈل آسانی سے گھوم گیا

"رجب علی شاہ!" انہوں نے ہلکی سی جھری کی اوٹ سے اسے پکارا۔ ان کی اس پکار میں حکم بھی تھا' دکھ بھی اور جلال بھی۔

☆======☆======☆

دروازے کی کنڈی اکھڑتے ہی رجب علی نے دروازہ کھول دیا۔

سیاہ کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی گھٹنوں میں منہ دیے بری طرح سے رو رہی تھی۔ ابھی وہ قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ خواب گاہ کا دروازہ نیم وا ہوا اور پیر صاحب کی آواز سنائی دی۔

"رجب علی شاہ!"

اس کے اٹھتے قدم رک گئے۔

"بابا جان!" اس نے زیر لب کہا۔

ان کی آمد کے لئے وہ کسی طور تیار نہیں تھا۔ وہ تو خاص طور پر رات کو' کہیں بھی نہیں نکلتے تھے۔

"رجب علی!" اس مرتبہ آواز میں اتنی سختی تھی' کہ وہ سٹپٹا گیا۔

ایک نظر اس لڑکی پر ڈال کر اس نے غسل خانے کا دروازہ بند کیا اور کمرے میں آ گیا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ انہوں نے لڑکی کی چیخ و پکار نہ سنی ہو' اس لئے اس کی چادر چھپانا بے کار تھا۔ البتہ بوتل اور گلاس اس نے جلدی سے ڈبل بیڈ کے نیچے کھسکا دیے۔

"جی بابا جان۔" وہ ان کے سامنے مجرموں کی طرح جا کھڑا ہوا۔

"مت کہو اپنی گندی زبان سے ہمیں بابا جان!" غصے کی شدت سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ "تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے ہمیں شرم آتی ہے۔"

"پلیز میری بات سنیں بابا جان۔" اس نے کہنے کی کوشش کی۔

"بند کرو بکواس' ہم تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتے۔ تم نے ہمیں اور حویلی دونوں کو رسوا

کیا ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے تمہیں شوٹ کر دیں۔"

"میرا سر حاضر ہے بابا جان۔" وہ بولا۔ "لیکن اس معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں یہاں آیا تو ایک لڑکی پہلے سے غسل خانے میں بند تھی۔ میرے کہنے پر بھی اس نے دروازہ نہیں کھولا' الٹا شور مچانے لگی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ جب میں یہاں آیا تو ملازمین بھی نہیں تھے۔"

"جھوٹ بولنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے رجب علی! عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ لڑکی پہلے سے موجود تھی' ملازمین بھی نہیں تھے' کیا کوئی شخص تمہاری اس بات پر یقین کر سکتا ہے؟ ہمیں صرف اس بات کا جواب چاہیے کہ تمہاری خواب گاہ میں کوئی غیر لڑکی کیوں موجود ہے اور وہ کہاں سے آئی ہے؟"

"اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے بابا جان!" وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے رہا۔

"کہاں ہے وہ بچی؟"

"جی اندر۔" وہ بولا۔ "بابا جان آپ اس سے تصدیق کروا سکتے ہیں۔ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"تصدیق تو ہم جنت بی بی سے بھی کروا سکتے تھے۔"

"بابا جان!" اس نے ہونٹ کاٹے۔

"یہاں اس کمرے میں خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے حکم دیا۔

وہ چپ چاپ صوفے پر جا بیٹھا۔

پیر صاحب نے نیم وا دروازے پر دستک دی اور گویا ہوئے۔

"بچی! آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں۔ ہم تھوڑی دیر بعد آپ سے بات کریں گے۔" انہوں نے خواب گاہ کے دروازے کے باہر سے ہی کہا۔

زرینہ کو لگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی سن لی ہے۔ کم از کم اس افتاد سے تو نجات مل گئی تھی۔

"لیکن میں' پیر صاحب کو کیا بتاؤں گی اور اگر اس دوران شاہ جی آ گئے تو؟" یہ سوچ کر ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "یہ تو وہی آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہوئی ناں۔" غسل خانے سے بوجھل قدموں اور بھیگی آنکھوں سے نکل کر وہ خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ جس کا بیرونی دروازہ اب مکمل طور پر بند تھا۔ اندر اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

سب سے پہلے اس نے بستر پر پڑی چادر اٹھائی اور جلدی سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ پیر صاحب کچھ پوچھیں تو کیا بتائے۔

بستر کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ قالین پر ہی بیٹھ گئی اور گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ آنسو خود بخود ہی

بہتے چلے آ رہے تھے۔

"چاہے یہ میری جان لے لیں' لیکن میں شاہ جی کا نام بھی نہیں لوں گی۔" اس نے تہیہ کیا۔

"شاہ جی کو کچھ ہو جائے یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور پیر صاحب کی آواز آئی۔

"بچی! ہم اندر آ سکتے ہیں؟"

اس کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھول کر پیر صاحب اندر داخل ہوئے۔

"ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو ہمارے بیٹے کی وجہ سے دکھ پہنچا ہے۔ ہم چاہیں بھی تو کسی صورت اس کی تلافی نہیں کر سکتے' لیکن جس حد تک ہمارے بس میں ہے ہم آپ کی مدد کریں گے۔" ان کا لہجہ بہت میٹھا' بہت مشفقانہ تھا۔

"آپ اپنے والد کا نام بتا دیں اور سب کچھ ہم پر چھوڑ دیں' آپ پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔"

اس نے بے اختیار گھٹنوں سے سر اٹھایا۔

"نہیں۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ہم نے آپ سے کہا ہے ناں کہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر قالین پر ہی بیٹھ گئے۔ "آپ کو ہماری بات کا اعتبار نہیں ہے' ہم سب سنبھال لیں گے' کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی آپ کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے۔"

"نہیں میں نہیں بتاؤں گی۔" وہ چلائی۔

"آپ کو نہیں پتا۔ ہمیں بیٹیاں بہت پیاری ہیں۔ اس میں کسی اپنے پرائے کی بات نہیں' کیوں کہ بیٹیاں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہم آپ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔ آج سے آپ ہماری بیٹی ہیں اور کسی میں اتنی جرأت ہرگز نہیں ہے کہ ہماری بیٹی کی طرف دیکھ بھی سکے۔"

اس نے ان کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ وہاں اس کے لئے پیار و محبت کی وہ مٹھاس تھی جو صرف ایک باپ کے چہرے پر ہی نظر آتی ہے۔

"ہاں بیٹا۔" انہوں نے تسلی دی۔

"میرے ابا جی مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

"ہماری زندگی میں کوئی آپ کو کچھ کہے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔"

"آپ کو نہیں پتا ناں' آپ نہیں جانتے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

وہ انہیں کیا بتاتی کہ اصل بات کیا تھی' اگر انہیں اصل بات کا علم ہو جاتا تو اسے یقین تھا کہ ان کی محبت اور حفاظت کے عہد باطل ہو جاتے۔ وہ اپنے الفاظ سے نہیں پھرتے تھے۔ وہ اس کی حفاظت ضرور کرتے' لیکن حیدر علی کو وہ کسی صورت معاف نہ کرتے۔

اتنی دیر تک وہ اسے دلاسے دیتے ہوئے اس کے والد کا نام معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے' لیکن اس نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔

☆======☆======☆

''تو یہ کھیل اس گھر میں اتنے عرصے سے کھیلا جا رہا تھا۔'' مولوی صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا غصہ کس پر اور کیسے نکالیں۔

''اور تم اس میں برابر کی شریک تھیں۔''

''ابا جی! میں نے تو اسے سمجھایا تھا پر......'' رضیہ منمنائی۔

''بکواس بند کرو۔'' وہ چلائے۔ ''میرے لئے وہ لڑکی مر گئی ہے' چاہے وہ کسی شاہ کے ساتھ بھاگتی یا فقیر کے ساتھ' داغ تو ایک سا ہے ناں۔ کاش میرے پاس زہر ہوتا میں یہ بھی نہ سوچتا کہ خودکشی حرام موت ہوتی ہے۔ ذلت کی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے' خواہ وہ حرام موت ہی ہو۔''

''کس چیز کی کمی تھی تم لوگوں کو؟'' اماں دکھ سے بولیں۔ ''جس چیز کی فرمائش کی دیر سے سویرے سے وہ تمہارے ابا نے پوری کی۔ اپنی بساط سے بڑھ کر دیا تم لوگوں کو۔ اس کا یہ صلہ دیا ہے۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ تم دونوں کو اکٹھے دفن کر دوں۔ کاش پیدا ہوتے ہی مار دیا ہوتا۔ میں نے تم لوگوں کو۔

ہم نے کبھی بیٹے کی محرومی کا ذکر نہیں کیا تم دونوں کے سامنے کہ کہیں تمہارا دل نہ دُکھے۔ تم یہ نہ سوچو کہ ہمیں تم سے محبت نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھا ہم نے اور اس کا یہ صلہ ہے کہ ماں باپ کے منہ پر کالک مل دی۔ بس ایک مرتبہ وہ اس گھر میں آ جائے۔'' انہوں نے مٹھیاں بھینچیں۔

''اوہ خدایا! یہ تو وہ دنیا ہے' جہاں پیروں کی حویلی پر لگے داغ بھی لوگوں کو نظر آ جاتے ہیں تو ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔ صبح کی روشنی پھیلتے ہی صدیوں کی کمائی ہوئی عزت پل میں تار تار ہو جائے گی۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے' آوازیں کسیں گے' کہ اس مولوی کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے' جس کی اپنی بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔

اور جو کچھ پیر صاحب ہمارے ساتھ کریں گے یا ان کے برادر نسبتی وہ الگ بات ہے' کتنی ذلت ہو گی ان کے سامنے۔ کیا کہیں گے کہ میں انہیں سبق پڑھا رہا تھا اور خود میرے اپنے گھر میں کیا ہو رہا تھا۔

بولو کیا کروں میں' کہاں جا کر منہ چھپاؤں' اب تو صرف مٹی ہی مجھے پناہ دے سکتی ہے۔ بے غیرتی کے ساتھ تم اور تمہاری بہن زندہ رہ سکتے ہیں' میں نہیں۔''

''ابا جی!'' رضیہ ان کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ''مجھے معاف کر دیں' میں بہت بری ہوں' نیچ ہوں' لیکن پھر بھی مجھے معاف کر دیں۔ میں نے اسے بہت سمجھایا تھا' لیکن مجھ میں آپ سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی مجھے پتا تھا کہ آپ کو علم ہوا تو آپ اسے کبھی معاف نہیں کریں گے اور مجھے اس سے بہت محبت ہے۔''

مسجد میں داخل ہو کر کسی نے آواز دی۔

''مولوی صاحب؟''

ان سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

''مولوی صاحب؟ آواز دوبارہ آئی۔

''کہیں حویلی سے تو بلاوا نہیں آ گیا؟'' اماں کی خوف زدہ آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

''اچھا ہے' اگر وہیں سے بلاوا آیا ہے۔ میں پیر صاحب سے خود درخواست کروں گا کہ ایک ایک گولی وہ مجھے اور میری بیٹی کو مار کر اس رسوائی سے نجات دلا دیں۔'' انہوں نے پاؤں کے قریب بیٹھی رضیہ کو پیچھے ہٹایا اور مسجد کی طرف بڑھ گئے۔

رضیہ ان کے پیچھے لپکی' لیکن اماں نے واپس کھینچ لیا۔

''اپنے غیرت مند باپ کو اور ذلیل مت کراؤ۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔

مولوی صاحب مسجد پہنچے تو پیر صاحب کا ڈرائیور رشید اان کا انتظار کر رہا تھا۔

''مولوی صاحب! پیر صاحب نے آپ کو فوراً طلب کیا ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ اس وقت تکلیف دینے پر معذرت چاہتے ہیں' اگر آپ کی فوری ضرورت نہ ہوتی تو زحمت نہیں دیتے' انہوں نے گاڑی بھی بھجوائی ہے۔''

''چلو میں تیار ہوں۔'' وہ بوجھل قدموں سے اس کے ساتھ چلنے لگے۔

☆======☆======☆

اپنی تمام تر کوشش کے باوجود حیدر علی اتنی جلدی نکاح خواں کے گاؤں تک نہ پہنچ سکا جتنی اسے توقع تھی۔ بارش بہت تیز ہو چکی تھی اور ونڈ سکرین کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خاص طور پر مین روڈ سے اتر کر گاؤں کے کچے راستے پر گاڑی ڈالتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ جگہ جگہ کیچڑ اتنا زیادہ تھا کہ گاڑی کسی بھی جگہ پھنس سکتی تھی۔ پھر اسے اس گاؤں کے راستے بھی معلوم نہیں تھے' پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔

''یہاں اتنی دیر ہو گئی ہے' پھر نہ جانے نکاح خواں تیاری میں کتنی دیر لگائے اور گوری وہاں

پریشان ہو رہی ہوگی۔'' اس نے سوچا۔

لیکن اس مسئلے کا اس کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔

☆======☆======☆

''اس وقت تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہیں مولوی صاحب!'' پیر صاحب نے انہیں اپنے نزدیک بٹھالیا۔

''آپ حکم کریں پیر صاحب۔'' ان کے چہرے پر اعصابی کشیدگی ظاہر تھی۔

''خیریت تو ہے مولوی صاحب! آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں۔ سب اہلِ خانہ تو ٹھیک ہیں ناں؟''

''جی!'' انہوں نے نظریں چرائیں۔

''جب پیر صاحب کو بھی اصل بات کا علم ہے اور مجھے بھی تو پھر یہ اس طرح انجان بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔'' مولوی صاحب نے الجھن سے سوچا۔ ''اب تو آر ہو یا پار' لیکن جو ہو جلد سے جلد ہو۔ ہوسکتا ہے پیر صاحب محض تنبیہہ کر کے زرینہ کو میرے سپرد کر دیں۔'' ایک موہوم سی امید نے سر اٹھایا۔

''یہاں ہمیں ایک مسئلہ پیش آ گیا ہے۔'' پیر صاحب ان کی کیفیت جانے بغیر بولے۔ ''ہمارے بیٹے رجب علی سے ایک غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ ہمیں رنج ہے کہ اس نے ایسی حرکت کی۔ چاہتے تو ہم یہ تھے کہ اسے سخت سے سخت سزا دیتے' لیکن معاملہ صرف اس کا نہیں ہے ایک بچی کا بھی ہے اور ہر بچی کی عزت ہمیں جان سے بھی پیاری ہے۔''

مولوی صاحب کا دل چاہا کہ چلا اٹھیں۔ ''ایک بیٹا میری بیٹی کو بھگا لے گیا' دوسرا ہمیشہ کی طرح کسی اور کی لڑکی کو اغوا کر لایا۔ کیا اب حویلی کی یہی اقدار رہ گئی ہیں۔ غریب کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے' جسے آپ کے بیٹے دوکوڑی کی کر رہے ہیں۔ ایک محبت کے نام پر جال ڈالتا ہے اور دوسرا طاقت دکھاتا ہے۔''

لیکن تمام تر خواہش کے باوجود بھی ان کے ہونٹ سلے رہے۔ بات صرف ہمت کی کمی کی نہیں تھی بلکہ اس کی بھی تھی' جس کا داغ ان کے دامن پر لگا تھا' اور وہ چلا چلا کر اپنے دامن پر لگے داغ کی تو طرف لوگوں کو متوجہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کم از کم تب تک نہیں جب تک خود ہی کسی کی نظر اس داغ پر نہ پڑ جاتی۔

''آپ حکم کریں پیر صاحب۔'' انہوں نے خود پر قابو پا کر کہا۔

''ہم نہیں چاہتے کہ کوئی بچی یوں رسوا ہو' اس لئے آپ ابھی اور اسی وقت ان دونوں کا نکاح پڑھا دیں۔ باقی سب کچھ ہم خود سنبھال لیں گے۔'' انہوں نے کہا۔

''اس طرح بچی بھی محفوظ ہو جائے گی اور رجب علی کو بھی خود ہی سزا مل جائے گی' کہ جس

لڑکی کو وہ اغوا کی نیت سے لایا تھا' وہی اس کی بیوی بنے گی تو پھر آئندہ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔''

''جی!'' مولوی صاحب بولے۔

''آپ یہیں ٹھہریں' ہم ابھی رجب علی کو لاتے ہیں۔'' وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں پہنچے جہاں رجب علی ٹانگ پر ٹانگ دھرے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''اٹھو۔'' پیر صاحب بولے۔

''جی بابا جان!'' وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔

''ہم اسی لڑکی سے تمہارا عقد کروا رہے ہیں۔''

ایک لمحے کے لئے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

''جی بابا جان؟''

''ہم تمہارا عقدِ ثانی کروا رہے ہیں فوراً آؤ۔''

''بابا جان ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

''تم ہمارے حکم سے انکار کر رہے ہو؟''

''آپ کے حکم سے انکار میرے لئے ممکن نہیں ہے' لیکن بابا جان آپ کا یہ فیصلہ عجلت میں کیا گیا ہے۔ میں کسی ایسی لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں' جو نہ جانے کس طرح میری خواب گاہ میں آ گئی۔ کسی کے ساتھ بھاگ کر آئی یا کسی کے انتظار میں یہاں رک گئی اور۔'' اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کسی ملازم کے ساتھ یہاں آئی ہو۔ کیا ایسی لڑکی کی یہ اوقات ہو سکتی ہے کہ وہ حویلی کی بہو بنے۔''

''جب تم اپنی اوقات سے نیچے گر سکتے ہو تو تمہیں سر بھی جھکانا ہی ہوگا۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ تمہیں ہمارا حکم پورا کرنا ہوگا۔''

''آپ کی حکم عدولی کو میں گناہ سمجھتا ہوں' لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے' یاسمین بھی تو ہے' وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گی۔'' اس نے دوسرا سہارا ڈھونڈا۔

''جب تم نے جرم کیا ہے تو تمہیں سزا بھی کاٹنی ہوگی۔ اپنی بیوی کو بتانا ہوگا کہ تمہاری دوسری شادی کن حالات میں ہوئی اور اس کے بعد یاسمین بیٹی جو کچھ کہے' وہ بھی برداشت کرنا ہوگا۔ ہم نے پہلے بھی تمہیں تنبیہہ کی تھی' لیکن تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔'' انہوں نے قطعیت سے کہا۔

''اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہمیں اپنی ساری اولاد میں زیب النساء سے زیادہ کوئی عزیز نہیں تھا اور اس سے بھی زیادہ ہمیں اپنی عزت عزیز ہے۔ ایک مرتبہ معاملہ ہم نے دبا دیا' لیکن

ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا، غلطی کی معافی ایک مرتبہ مل سکتی ہے، بار بار نہیں۔"

"بابا جان!"

"ہم کچھ نہیں سننا چاہتے، ابھی معاملہ بگڑا نہیں ہے لیکن صبح کی روشنی پھیلتے ہی سب گاؤں والے ایک مرتبہ پھر فریاد لے کر ہمارے در پر آئیں گے۔ کتنی مرتبہ ہم کہیں گے کہ تم اس گھٹیا حرکت میں ملوث نہیں ہو۔ کتنے لوگوں کی زبانیں بند کریں گے؟ کس کس کو روکیں گے کہ ہمارا مذاق نہ اڑائے؟ پچھلی مرتبہ بھی ایک شخص نے ہمیں انصاف کا طعنہ دیا تھا اور آج بھی ایک شخص نے یہی طعنہ دیا ہے۔ ہم اپنی رعایا کے سامنے گردن نہیں جھکا سکتے۔ اب لمحے کی تاخیر کے بغیر ہمارے ساتھ آؤ۔"

رجب علی بادل نخواستہ ان کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے وجود میں غصے کے آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ اپنی عزت خاک میں ملتی نظر آ رہی تھی۔

"اگر وہ کسی ملازم کی محبوبہ ہوئی تو؟" یہ خیال ہی سوہانِ روح تھا۔

اپنے مقام سے اتنا نیچے اتر آنا اسے گوارہ نہیں تھا۔ خوش وقتی کی بات اور تھی، لیکن کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا جو گھر سے بھاگ کر یا اپنے محبوب سے ملنے یہاں آئی ہو، اس کے لئے دنیا کا سب سے تکلیف دہ اور مشکل کام تھا۔

"بابا جان! یہ بہت بے عزتی کی بات ہے۔" وہ راستے میں رک گیا۔

"اپنی عزت تم نے خود مٹی میں ملائی ہے۔" پیر صاحب کا غصہ بھی آسمان سے باتیں کرنے لگا تھا۔ "پچھلی مرتبہ بھی سب سچ تھا، لیکن مصلحت کی وجہ سے ہم خاموش ہو گئے تھے۔ خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ ہمیں فیصلہ لوگوں کے بیان پر کرنا تھا اور ان میں سے کس کا بیان تمہارے خلاف نہیں ہے، لیکن جب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں تو کسی طرح چشم پوشی کر سکتے ہیں۔ یاد رکھو ہمیں ہر بچی کی عزت پیاری ہے اور وہ منصب بھی بہت عزیز ہے، جس کے لئے تم نے خود کو نااہل ثابت کر دیا ہے، لیکن جس پر ہمارے بعد بہرحال تم نے ہی فائز ہونا ہے۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے، ہم اس منصب کی عزت بچا سکتے ہیں۔ اب بھی تمہیں بے گناہ ثابت کر سکتے ہیں، لیکن صبح کی سفیدی نمودار ہونے کے بعد ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں رہے گا۔ ہمیں تمہاری نہیں اس گدی کی عزت بچانی ہے، جس پر آئندہ تم بیٹھو گے۔"

رجب علی ان کے پیچھے اس کمرے میں چلا آیا، جہاں مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔

"بچی سے اجازت لینا ضروری ہے پیر صاحب۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "اور اس کے والد کو بھی یہاں ہونا چاہیے۔"

"ہوں۔" وہ بولے۔ "آپ آئیں میرے ساتھ، میں تو اسے نہیں پہچانتا اس کے والد کے متعلق بھی میں نے اس سے بہت پوچھا ہے، لیکن وہ کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں ہے، شاید آپ

کو کچھ بتا دے۔"

"یہ بات تو شاہ صاحب ہی بتا سکیں گے۔" مولوی صاحب نے سوچا، لیکن کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خود ان کا ذہن بھی بری طرح الجھا ہوا تھا۔

پیر صاحب خواب گاہ کے دروازے پر دستک دے کر انہیں پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہو گئے۔

"اگر میں چھوٹے شاہ صاحب پر زرینہ کے اغوا کا الزام لگا دوں تو یقیناً پیر صاحب ان کی بھی شادی کر دیں گے اور یوں بے عزتی کا کوئی دھبا مجھ پر نہیں آئے گا۔" مولوی صاحب اپنی سوچ میں گم اندر داخل ہوئے۔

"اس وقت میں اللہ تعالیٰ سے کچھ اور نہیں مانگتا، بس خدایا مجھے بے عزتی کی اس دلدل میں اترنے سے بچا لے۔"

دستک کی آواز پر زرینہ نے سر اٹھا دیا تھا۔

پیر صاحب کے پیچھے مولوی صاحب کو داخل ہوتے دیکھ کر اس کے اعصاب بالکل ہی جواب دے گئے۔

"ابا جی!" اس کے ہونٹوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

پیر صاحب کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ انہوں نے مڑ کر مولوی صاحب کی طرف دیکھا، جو نہ جانے کس سوچ میں گم اندر داخل ہو رہے تھے۔

☆======☆======☆

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ حیدر علی کی کار کے دونوں پچھلے پہیے کچے راستے سے نیچے اتر کر کیچڑ میں دھنس گئے تھے اس نے ریس دے کر انہیں نکالنا چاہا، لیکن بے سود۔

اس کا دل چاہا کہ کار کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے، لیکن یہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کا وقت تھا۔ کار وہیں چھوڑ کر برستی بارش میں وہ پیدل چل پڑا

"آج ہی اتنی بارش ہونی تھی۔" دل ہی دل میں وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ "یوں لگتا ہے جیسے آج کے بعد کبھی بارش ہو گی ہی نہیں۔"

ناہموار راستے پر چلنے میں اسے کافی دشواری ہو رہی تھی، پھر یہ بھی تھا کہ اسے اس علاقے سے زیادہ واقفیت بھی نہیں تھی۔ اٹکل سے وہ اس امید پر چلتا جا رہا تھا کہ اتنے اندھیرے میں بھی وہ یقیناً گاؤں کی مسجد کے مینار تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی جائے گا۔ اس کے بعد کا سارا کام پیسہ آسان کر دے گا۔

"دو بندے بھی دھکا لگائیں تو گاڑی وہاں سے نکل سکتی ہے۔" اس نے سوچا۔ "اس کا انتظام بھی گاؤں کے مولوی صاحب سے کہہ کر کروالوں گا۔"

☆======☆======☆

خواب گاہ میں اس وقت صرف مولوی صاحب اور زرینہ تھے۔ جونہی پیر صاحب کو احساس ہوا تھا کہ وہاں موجود لڑکی مولوی صاحب کی بیٹی ہے' وہ انہیں خواب گاہ سے باہر لے گئے تھے اور پھر کتنی دیر تک سمجھاتے رہے۔

''مولوی صاحب! ہم آپ سے بے حد شرمندہ ہیں'' انہوں نے کہا تھا۔ ''ہمیں علم نہیں تھا کہ یہ قیامت آپ کے گھر پر ٹوٹی ہے' اپنی پریشانی کے درمیان ہم آپ کی پریشانی سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔''

مولوی صاحب کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ اپنی عزت بچانے کا یہ موقع قدرت نے انہیں فراہم کیا تھا اور وہ کسی بھی صورت اسے ہاتھ سے نکلنے نہیں دے سکتے تھے

''یاد ہے پیر صاحب! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ میں بھی بیٹیوں والا ہوں اور اس قدر طاقت ور نہیں ہوں کہ ان کی حفاظت کا دعویٰ کرسکوں کیوں کہ ہمارے جھونپڑوں کی دیواریں حویلی کی دیواروں کی طرح نہ تو اونچی ہیں اور نہ ہی مضبوط۔'' مولوی صاحب سر جھکائے کہہ رہے تھے۔ ''لیکن آپ کو میری یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔''

''مولوی صاحب! ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم شرمندہ ہیں۔ اور آپ کی عزت ہمیں اپنی عزت کی طرح ہی عزیز ہے۔ اسی لئے ہم چاہتے ہیں کہ سپیدہ سحر نمودار ہونے سے قبل دونوں کا عقد کر دیا جائے۔ صرف یہی صورت ایسی ہے' جس سے بگڑی بات بن سکتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''ہمیں تو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ آپ بیٹی کے اغوا کے وقت ہمارے پاس کیوں نہیں آئے۔''

مولوی صاحب ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ کیا بتاتے کہ بیٹی اغوا تو ہوئی ہی نہیں تھی' لیکن پیر صاحب سے کچھ کہنا بھی تھا' سو دل پر جبر کر کے لڑکھڑاتی زبان میں بولے۔

''مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ بات بھی ثابت ہو سکے گی۔ میں تو اتنا چاہتا تھا کہ صبح اپنی بیٹی کے ساتھ ہی خودکشی کرلوں گا۔''

انہوں نے براہ راست یہ تو نہیں کہا تھا کہ زرینہ کو اغوا کیا گیا تھا' لیکن وہ پیر صاحب کو یہ تاثر دینے میں ضرور کامیاب ہو گئے تھے۔

''اب آپ بیٹی کے پاس جا کر اسے بھی تسلی دیں۔ وہ بہت خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی ہے' اسے بتائیں ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ان پر آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔ اب ہم اپنا وعدہ پورا کر رہے ہیں۔''

اور اب مولوی صاحب' زرینہ کے پاس تھے۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری اپنی بیٹی میرا دامن داغدار کرے گی' میں خودکشی کرلیتا

ہتا تھا' لیکن شاید قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا اور میری عزت بچ گئی۔'' وہ بولے۔ ''پیر صاحب ہم سے میں تمہارا اور بڑے شاہ صاحب کا نکاح پڑھوانے لگا ہوں۔''

''نہیں۔'' وہ چیخی۔ ''میں یہ شادی نہیں کروں گی۔''

اب تک وہ جس وقت سے خوف زدہ تھی' وہ وقت آیا تو وہ ہر خوف سے گزر گئی حیدر علی کے ساتھ کی جو موہوم سی امید تھی' وہ ختم ہو گئی تو اس کے لیے جیسے سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔ نہ خوف نہ ید۔ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو چکی تھی۔

''کیسے نہیں کرو گی۔'' مولوی صاحب طیش میں آ گئے۔ ''تمہیں ہر حال میں یہ شادی کرنی ہوگی۔''

''میں شاہ جی سے بے وفائی......'' اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ مولوی صاحب نے سختی ے ساتھ اس کا منہ بند کر دیا۔

''اب کبھی ان کا نام مت لینا' ورنہ تم مجھے زندہ نہیں دیکھو گی۔'' انہوں نے ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا دیا۔

''ابا جی! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں آپ مجھے مار دیں' قصہ ہی ختم ہو جائے۔''

''میں تمہیں نہیں اپنے آپ کو ختم کروں گا' میری لاش پر تم چاہے کسی کے ساتھ شادی کر نا لیکن میری زندگی میں یہ ممکن نہیں ہوگا۔'' وہ بولے۔

''پتا نہیں قدرت کو مجھ پر کس وجہ سے ترس آیا ہے' لیکن میں اپنی عزت بچانے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا۔

میں' پیر صاحب سے کہہ چکا ہوں کہ تمہیں بڑے شاہ صاحب نے اغوا کرایا تھا۔ گو یہ جھوٹ ہے لیکن جیسے زندگی بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حرام کو بھی وقتی طور پر حلال قرار دے دیا ہے اسی طرح میں نے جھوٹ مصلحت کے تحت بولا ہے۔ ٹھیک ہے میں تم پر دباؤ نہیں ڈال رہا۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔

''تم اپنی مرضی سے کسی کا بھی انتخاب کرلو' اپنے باپ کو عزت دے دو یا ذلیل کر دو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ مجھے ذلت کی زندگی قبول نہیں ہے اور چھوٹے شاہ صاحب تک جانے کے لئے تم جس راستے سے گزرو گی وہاں تمہیں اپنا باپ زندہ نہیں' مردہ حالت میں ملے گا۔''

زرینہ کو لگا جیسے اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا ہو' جیسے اس کی ہر خواہش دم توڑتی جا رہی ہو' نکھ کے سارے خواب چکنا چور ہو رہے ہوں۔

ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ حیدر علی کے ساتھ تھی۔ مطمئن نہیں تھی' لیکن تنہا بھی نہیں تھی۔ اب چانک سے جیسے ساری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ لق و دق صحرا کے بیچ۔

"مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اپنی خواہشوں کی خاطر میں کس حد تک خودغرض ہو سکتی ہوں۔"

اس کے ذہن میں اپنے ہی الفاظ گونجے جو کچھ ہی دیر پہلے اس نے حیدر علی سے کہے تھے' لیکن اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کچھ دیر پہلے کی بات نہ ہو بلکہ صدیاں گزر چکی ہوں۔ اسے یہ بات کہے ہوئے۔

"نہیں' میں اتنی خودغرض نہیں ہوں۔" اس کے دل نے کہا اور اس نے گردن جھکا دی۔

☆======☆======☆

ندی کی لہریں ہولے ہولے ایک دوسرے سے اٹھکھیلیاں کرتی ایک سمت سے دوسری سمت بہتی چلی جا رہی تھیں اور حیدر علی خالی الذہنی کی کیفیت میں ننھے ننھے کنکر پھینک کر بھنور بنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی زندگی جاگ اٹھی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اور ہوا کی سرسراہٹ نے گویا منظر میں جان ڈال دی تھی۔

صبح صادق کے وقت جیسے ہی بارش ختم ہوئی تھی ہر چیز پر نکھار آ گیا تھا۔ نیلا شفاف آسمان' دھلے ہوئے سبز پتے' رواں ندی ہر چیز چمک اٹھی تھی۔

لیکن حیدر علی کے لئے کسی چیز میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ اس کے لئے تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کی تمنائیں' اس کے خواب سب کچھ۔ وہ جو رگِ جاں سے بھی قریب تھی' اب ایک ایسے رشتے کی ڈور میں بندھ گئی تھی کہ اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ بن گیا تھا۔ وہ اس مقام پر بے بس ہو گیا تھا جسے تقدیر کہتے ہیں' ورنہ اس نے تو پوری کوشش کی تھی۔ جس حد تک اس سے ممکن تھا' اس نے جلدی کی تھی' لیکن تقدیر کے نام پر بہت سی دیواریں اس کے راستے میں آ کر اسے گوری سے دور ہی دور کرتی گئیں۔

کہنے کو اس کا راستہ بارش نے روکا تھا۔ کیچڑ میں گاڑی پھنسی تھی۔ نکاح خواں نے دیر کی تھی۔ پیسے لینے کے باوجود ان دو افراد نے بے دلی سے گاڑی کو دھکا دیا تھا۔

لیکن حقیقت کیا تھی؟

حقیقت صرف اور صرف یہ تھی کہ ان کے راستے الگ تھے' جو کسی صورت ایک نہیں ہو سکتے تھے اور یہ بات کاتبِ تقدیر نے بہت پہلے آسمان پر لکھ دی تھی' جو اس کی قسمت میں نہیں تھا' وہ اسے کیسے مل سکتا تھا۔

اس کے پہنچنے تک تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا' سوائے رجب علی کے جو بستر پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس نے پاگلوں کی طرح گوری کو' ہر طرف گوری کو تلاش کیا تھا' لیکن وہاں اس کی مہک کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے رجب علی کو جگانے کی کوشش کی تھی لیکن چار خواب آور گولیاں کھانے کے بعد وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ اس نے آنکھیں بھی نہیں کھولیں۔

اسی وقت باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔ بابا جان کی گاڑی تھی۔ ان کا ڈرائیور شیدا نکل رہا تھا۔

"بڑے سرکار نے بڑے شاہ صاحب کو طلب کیا ہے۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

وہ حویلی کا پرانا نمک خوار تھا اور اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی طوفان گزر چکا ہے۔

"شیدے! تم جانتے ہو یہاں کیا ہوا ہے؟" اس نے مضطرب انداز میں پوچھا

"یہاں ایک لڑکی تھی' وہ کہاں گئی؟"

پہلے تو شیدا چند ثانیے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر اس نے سر جھکا لیا۔

"سرکار! وہ بی بی بالکل محفوظ ہیں اور حویلی کی بہو بن چکی ہیں۔ بڑے سرکار نے بڑے شاہ صاحب کی شادی کروا دی ہے ان سے۔"

اور اسی لمحے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اتنا تکلیف دہ' اتنا غیر متوقع انجام ہوا ان کی محبت کا۔

"لہر سے لہر ٹکرائے کیسے' کہو؟
اور ساحل سے چھو جائے کیسے' کہو؟
لہر کو لہر سے دور کرتی ہوئی بیچ میں سینکڑوں اور لہریں بھی ہیں اور کچھ بھی نہیں
چاہے دھرتی کے سینے میں جنگل نہ ہوں
چاہے پربت نہ ہوں' چاہے دریا نہ ہوں' چاہے ساگر نہ ہوں۔
نیلے آکاش میں چاند' تارے نہ ہوں' کوئی سورج نہ ہو۔
رات دن ہوں نہ دنیا میں شام وسحر
کوئی پروا نہیں
ایک ہی دھیان ہے
دور ہی دور جیون گزر جائے گا اور کچھ بھی نہیں۔"

☆======☆======☆

صبح ہوتے ہی حویلی سے رجب علی کی دوسری شادی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ لوگ حیران تھے' دبے دبے انداز میں حیرت کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ یہ جاننے کو وہ بے چین تھے کہ حویلی کی نئی بہو کس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی' لیکن تمام تر تجسس اور حیرت کے باوجود پیر صاحب کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مبارک باد دے رہے تھے اور ایک دن کے وقفے کے بعد ہونے والا ولیمہ کھانے کو بھی بے قرار تھے۔

"بہو بیگم کے گھر والوں کی درخواست تھی کہ عقد سے قبل اس کی تشہیر نہ کی جائے۔ چھوٹی بی بی کی وفات کا غم بھی ابھی تک تازہ ہے' ورنہ یہ شادی بھی اسی طرح شاندار طریقہ سے انجام

پاتی جیسے پہلی ہوئی تھی۔'' پیر صاحب کہہ رہے تھے۔

'' بہو بیگم اسی گاؤں کے ایک نہایت ہی معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور اس گھرانے سے تعلق جوڑنا ہمارے لئے باعثِ مسرت ہے۔''

'' گاؤں کا معزز گھرانہ۔'' سب اپنے اپنے ذہن دوڑانے لگے کہ ایسا کون سا گھرانہ ہو سکتا ہے جسے پیر صاحب نے یہ عزت بخشی ہے لیکن منہ سے کچھ کہے بغیر وہ اس بات کے منتظر رہے کہ ابھی پیر صاحب ان کا تعارف کروائیں گے۔

'' مولوی نعمت اللہ اور ان کے گھرانے کی شرافت و نجابت کو آپ سب جانتے ہیں۔ بڑے شاہ صاحب' رجب علی شاہ کا عقدِ ثانی ان کی چھوٹی صاحب زادی کے ساتھ ہوا ہے۔''

لوگ حیران تھے کہ ایسا کیسے ہو گیا۔ ضرورتاً دوسری کیا بعض اوقات تیسری شادی بھی کی گئی تھی' لیکن اس سے پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ بظاہر بلا وجہ ہی اور اس قدر اچانک دوسری شادی کر لی جائے۔

اور اس سے بڑھ کر حیران کن بات یہ تھی کہ یہ رشتہ کسی سیّد زادی سے کرنے کی بجائے ایک عام سے گھرانے میں جوڑا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مولوی نعمت اللہ گاؤں کے معززین میں سے تھے اور ان کے گھرانے کی بابت سب جانتے تھے لیکن وہ سیّد نہیں تھے۔

کہیں کوئی گرہ تھی جس کا سرا گاؤں والوں کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔

یہاں سے مبارک باد دے کر وہ جلدی سے مولوی صاحب کے گھر پہنچے۔

'' یہ کیا بات ہوئی مولوی صاحب کہ آپ نے اس خوشی میں ہمیں شامل ہی نہیں کیا؟'' سب کو شکوہ تھا۔

'' مجھے خود یقین نہیں تھا کہ یہ سب بہ حسن و خوبی انجام پا جائے گا دل میں انجانا سا خوف تھا۔ کہاں میں' کہاں پیر صاحب کا گھرانہ اس سے پہلے کب ایسا ہوا تھا' دل دھڑک رہا تھا پھر میں اہتمام کرتا تو بھی کتنا کر لیتا' پیر صاحب کے گھرانے کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا اس لئے پیر صاحب سے درخواست کی تھی کہ پہلے سے کسی کو نہ بتایا جائے۔'' انہوں نے نظریں چرا لیں۔ کتنے جھوٹ بولنے پڑ رہے تھے انہیں۔

عورتیں گھر میں مبارک باد دے رہی تھیں رضیہ کمرے میں بند رو رہی تھی اس میں کسی کے سامنے جھوٹی خوشی کی نمائش کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اسے اس بات کی ذرا سی بھی خوشی نہیں تھی تو پھر وہ سب کے سامنے منافقت کیسے کر سکتی تھی۔

رہ رہ کر اسے زرینہ سے ہونے والی اپنی گفتگو یاد آ رہی تھی جب وہ چھوٹے شاہ صاحب کی تعریف کر رہی تھی تو رضیہ نے اس سے کہا تھا۔

'' دیکھنے میں تو بڑے شاہ صاحب بھی کم نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی ٹکر ہیں۔''

'' لیکن کرتوت تو کالے ہیں ناں۔'' زرینہ فوراً بولی تھی۔ '' ایسا بندہ تو مجھے سو دفعہ مرنے کے بعد زندہ ہونے پر بھی اچھا نہ لگے۔''

اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ بازی کہاں کیوں اور کیسے پلٹ گئی تھی اور وہ جو اپنا مقدر حیدر علی کے ساتھ جوڑنے جا رہی تھی۔ اچانک رجب علی کی زندگی میں کیسے داخل ہو گئی تھی۔

☆======☆======☆

یاسمین کی ازدواجی زندگی کو لگنے والا گو کہ یہ پہلا جھٹکا نہیں تھا' لیکن سب سے شدید ضرور تھا اس نے ہمیشہ صبر کیا تھا لیکن اس لئے کہ شاید اس طرح وہ رجب علی کو پا لے ناں کہ اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے اسے کھو دے۔ اتنے دن کے ساتھ کے بعد وہ صرف یہ اندازہ لگا سکی تھی کہ رجب علی کو اس کی ضرورت تھی ہی نہیں' اس نے تو بس فرض نبھایا تھا شاید اپنے بابا جان کے الفاظ کا احترام کیا تھا اور کچھ نہیں

اور اب اچانک یہ افتاد ٹوٹ پڑی تھی' جس کے لئے وہ کسی طور تیار نہیں تھی۔ اس کا وجود جیسے کسی نے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ جس وقت پیر صاحب اس کے پاس آئے' اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر بند باندھے تھے' مگر آنکھوں کی سرخی سب کچھ خود ہی بتا رہی تھی۔

'' آپ کو اب تک تو علم ہو ہی گیا ہوگا۔'' وہ بولے۔ ''ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں ایسا فیصلہ کرنا پڑا' لیکن یہ فیصلہ کرنے کے لئے ہم مجبور تھے۔''

اس کی آنکھیں پھر برس پڑیں۔

'' ہم نے آپ سے کہا تھا ناں کہ شوہر کی پردہ پوشی اچھی بات ہوتی ہے' لیکن اس حد تک پردہ پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ اپنے گھر کی بنیادیں ہی کمزور ہونے لگیں۔''

'' میں تو سوچتی رہی کہ میری خاموشی میرا گھر بچانے کی ضمانت ہے۔ میں کیا کروں بابا جان؟'' اس کے انداز میں بے بسی اتر آئی۔

ان کا دل کٹ گیا۔ یاسمین انہیں بہت پیاری تھی۔

'' خاموشی وہاں اچھی ہوتی ہے جہاں اسے سمجھنے والا کوئی ہو۔'' وہ بولے۔

'' اتنا ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری زندگی تک آپ سے محض اس وجہ سے بے انصافی نہیں ہوگی کہ رجب علی کی دوسری شادی ہو گئی ہے۔ اور آپ کو یہ تو علم ہے ناں کہ ہم اپنے الفاظ سے کبھی نہیں پھرتے۔''

'' گاؤں سے پیغام آیا ہے' میرے بابا جان بھی آج آئیں گے۔'' اس نے نظریں جھکا لیں۔

'' ہمارا ہی بھائی ہے ناں' آنے دو اسے۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ہم اب چلتے ہیں۔''

☆======☆======☆

ایک ایک کر کے حیدر علی کو نہ جانے کون کون سی بات یاد آ رہی تھی۔ جب وہ دونوں پہلی مرتبہ ملے تھے تو وہ کتنی بوکھلائی ہوئی تھی۔ دوپٹا دروازے کی کنڈی میں اٹکنے کی وجہ سے شربت کا جگ اور گلاس زمین پر گر کر چور چور ہو گئے تھے۔ یہی افتاد کم نہیں تھی کہ اس کی نظر حیدر علی پر پڑ گئی تھی اور اس کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

''میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''نہیں۔ ہاں۔ میرا مطلب ہے کہ۔'' وہ اس قدر گڑبڑا گئی تھی کہ فقرے میں ربط بھی نہیں تھا۔

اور اس نے آگے بڑھ کر گوری کا دوپٹا کنڈی سے نکالنا چاہا تھا کہ اس نے گھبراہٹ میں دوپٹا ہی کھینچ لیا جو چر کی آواز کے ساتھ پھٹا اور کنڈی کی قید سے آزاد ہونے کے بعد اس کے ہاتھوں سے بھی پھسل گیا۔

لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر ہی بھاگ گئی۔

اور وہ دن جب پیاس کی وجہ سے اس نے خالہ کبریٰ کے دروازے پر دستک دی تھی اور جواب میں گوری نے دروازہ کھولا تھا۔

''کتنی دیر کر دی تم نے۔'' دروازہ کھولتے ہی اس نے کہا تھا اور پھر اسے دیکھ کر جیسے ساکت ہی رہ گئی۔

وہ بھی اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ گلابی رنگ کے شلوار کرتے پر دوپٹے سے بے نیاز، بالوں کی چوٹی آگے ڈالے، وہ اتنی حسین اور معصوم لگ رہی تھی کہ وہ صدا جس کا انتظار، اس کا دل نہ جانے کب سے کر رہا تھا، اچانک ابھری۔

''دیر تو واقعی تم نے کر دی ہے حیدر علی، کیوں کہ یہی وہ لڑکی ہے، جس کی تمہیں تلاش تھی، جسے تم نے ہر جگہ ڈھونڈا۔ لندن کے کلبوں میں، سڑکوں پر، لائبریری میں، کتابوں کے ریک کے پیچھے، خاموش ندیوں کے بے آباد اور ویران کناروں پر، کینوس لگے ایزل کے گرد اور پیانو بجاتی لڑکیوں کے درمیان، لیکن وہ تو یہاں تھی، تمہارے اتنے قریب تم سے اس قدر دور۔''

اسے اتنے غور سے اپنی طرف دیکھتا پا کر زرینہ نے پیچھے ہٹ کر ایک دم سے دروازہ بند کر دیا تھا اور پھر کتنی مشکل سے اس نے اپنا خوبصورت ہاتھ باہر نکالا تھا جس کی مخروطی انگلیوں میں صراحی دبی ہوئی تھی۔ اور جب وہ باہر نکلی تو چاند سیاہ بدلیوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ صرف شربتی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بڑی بڑی خواب ناک آنکھیں۔ پھر جب وہ اسے پانی پلا کر پلٹنے لگی تھی تو اس نے بے اختیار پکارا تھا۔

''سنیے!''

وہ کچھ کہے بغیر رک گئی تھی۔

''اپنا نام تو بتاتی جائیں۔''

''کیا کریں گے جان کر؟'' وہ دونوں خوبصورت آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں نہیں۔

''کسی کی ذات کے اندر اترنے کے لئے سب سے پہلے تعارف کی سیڑھی پر قدم رکھنا پڑتا ہے اور تعارف کی ابتدا نام سے ہوتی ہے۔''

وہ ہولے سے ہنس پڑی تھی۔ ''روشنی، ہوا، خوشبو! اگر ان کے یہ نام نہ ہوتے، تب بھی ان کا وجود مکمل تھا۔ انہیں محسوس کیا جا سکتا تھا۔ پھر نام میں کیا رکھا ہے۔''

''آپ نے شیکسپیئر کو پڑھ رکھا ہے؟'' حیدر علی کو ہرگز اس سے اتنی گہری بات کی توقع نہیں تھی۔

''وہ کون ہے؟'' انداز میں سادگی تھی۔

''وہ ایک بہت بڑا انسان تھا۔ بہت اچھی باتیں کہی ہیں اس نے۔''

''اچھی بات کہنے کے لئے بڑا ہونا ضروری نہیں وہ تو فقط انسان ہونا شرط ہے۔'' وہ واپس مڑنے لگی۔

''سنو!'' حیدر علی نے بے ساختہ پکارا تھا۔

''کہیے۔''

''میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟''

''جو آپ کو اچھا لگے۔''

''گوری! کیا پھر ملو گی؟''

''اگر تقدیر نے ملایا تو۔'' اس نے مڑ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

اور اب اس کے لئے تقدیر نے ہر راہ بند کر دی تھی۔ بھنور گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ سب کچھ غرق ہوتا لگ رہا تھا، لیکن حیدر علی کو بچ جانے یا بچا لینے کی خواہش نہیں تھی۔

''وہ میری بھابی بن گئی ہے، کیسی ستم ظریفی ہے قدرت کی، وہ جو میرے لئے ہنستی تھی، میری خاطر روتی تھی، جس کے دل میں، خوابوں میں، سانسوں میں صرف میں تھا، آج وہ میری بھابی ہے، میرے بھائی کی عزت، اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ بن گیا ہے۔''

اس کے سر میں جیسے دھماکے سے ہو رہے تھے۔

اب تو جیسے ایک زمانہ گزر گیا تھا، اس وقت کو جب وہ اور کرسٹی لندن کے اپارٹمنٹ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور اچانک رجب علی چلا آیا تھا۔ کرسٹی اس سے طلاق چاہتی تھی اور وہ اس بات پر آمادہ نہیں تھا، لیکن انہیں ساتھ بیٹھے دیکھ کر رجب علی نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے کرسٹی کو طلاق دے دی تھی۔ پھر جب حیدر علی اس کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے گیا تھا تو اس نے

پائپ صاف کرتے ہوئے نہایت اطمنان سے کہا تھا

''تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ایک فی صد بھی شک گزرتا تو میں ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر تم دونوں کو شوٹ کر دیتا۔''

اب نہ جانے وہ گوری کے ساتھ کیا سلوک کریں۔نہیں گوری نہیں زرینہ بھابی کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں۔

☆======☆======☆

زرینہ کے لئے ایک دم سب کچھ بدل گیا تھا' سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔اسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں مرچکی ہے' جسم باقی ہے روح نہیں رہی۔تمنائیں' خواہشیں اور خواب سب کچھ لمحوں کی دھول میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا' کھو چکا تھا۔وہ پلٹنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔حیدر علی کو آواز دینا چاہتی تھی لیکن ہونٹوں پر قفل لگے ہوئے تھے۔ہر طرف گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پیچھے ماضی کے ٹمٹماتے چراغ تھے لیکن اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی اور سامنے ایسا گہرا اندھیرا کہ راستہ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

اس کا کمرا بے حد خوبصورت اور شاندار تھا' اتنا زیادہ کہ اس نے کبھی خواب میں بھی ایسا آراستہ اور آرام دہ کمرا نہیں دیکھا تھا۔اس کے لئے زیور پہنچ چکے تھے۔ساتھ والے کمرے میں عورتیں ملبوسات تیار کرنے میں مصروف تھیں۔دو خادمائیں اس کے احکامات کی منتظر تھیں' لیکن اسے یہ سب کچھ بہت بے معنی لگ رہا تھا۔اسے ان میں سے کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔وہ تو سوکھی روٹی اور چٹنی کھا کر بھی گزارا کر لیتی اگر اس کے ساتھ حیدر علی ہوتا۔

رجب علی سے اسے نفرت تھی' پہلے بھی وہ اسے پسند نہیں تھا' اس نفرت کا آغاز جنت بی بی والے واقعے سے ہوا تھا اور پھر زیب النسا کی موت کے بعد۔حیدر علی کا بھائی ہونے کے ناتے جو تھوڑی بہت عزت رہ گئی تھی' وہ بھی جاتی رہی تھی لیکن یہ ناپسندیدگی اتنی شدت کے ساتھ بھی محسوس نہیں ہوئی تھی' جتنی کل رات' وہ ان لمحوں کو کبھی نہیں بھلا سکتی تھی۔جب خوف کا عفریت اسے پوری طرح جکڑ رہا تھا اور رجب علی اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔

اور آج اسی رجب علی کے ساتھ وہ ایک ایسے رشتے میں باندھ دی گئی تھی' جو لمحوں کا نہیں جنموں کا رشتہ ہوتا ہے۔اس شخص کے ساتھ جس سے اسے شدید نفرت تھی۔

''آپ کو بڑی بیگم نے یاد کیا ہے۔''ایک خادمہ نے کہا تو وہ اپنے خیالوں سے چونک گئی۔

وہ اس حویلی میں بارہا آئی تھی اور یہاں کے در و دیوار کو جانتی تھی' لیکن آج اماں جان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے یہ سب کچھ بہت اجنبی ہو۔وہی ملازمائیں اور اِدھر اُدھر پھرتی عورتیں جن کے پاس رک کر وہ کتنی ہی دیر باتیں کر لیتی تھی' جو ہاتھ

پکڑ کر اسے روک لیتی تھیں' جن کے ساتھ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی آنکھوں میں حیرت دلچسپی اور تجسس کے تاثرات رکھنے کے باوجود وہ اس سے کچھ پوچھ نہیں سکتی تھیں۔

خواب گاہ میں اماں جان اکیلی نہیں تھیں' ان کے ساتھ یاسمین اور مہرالنسا بھی تھیں' اس لئے ان دونوں کا سامنا کرنا مشکل تھا' دل چاہا الٹے قدموں واپس بھاگ جائے۔صرف ایک رات نے اس کی زندگی میں کیسا انقلاب برپا کر دیا تھا۔وہ اپنی ایک دن پرانی دنیا میں لوٹ جانا چاہتی تھی' لیکن اب ہر راستہ بند ہو چکا تھا۔

''اندر آجاؤ' وہاں کیوں کھڑی ہو؟''اماں جان نے کہا۔

اس کے قدم من من کے ہو رہے تھے۔آہستہ آہستہ چلتی وہ ان کے قریب آ گئی

''وہاں بیٹھ جاؤ۔''انہوں نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

یاسمین اور مہرالنسا ان کے قریب ہی بیٹھے ہوئی تھیں اور ابھی وہاں اتنی جگہ ضرور تھی کہ وہ بھی بیٹھ سکتی' لیکن انہوں نے اسے اپنے قریب بٹھانا پسند نہیں کیا تھا۔

کچھ دیر تک اماں جان تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہیں' پھر گویا ہوئیں۔

''آج سے تم اس گھر کی بہو بن گئی ہو' لیکن یہ رشتہ مجبوری میں باندھا گیا ہے' ورنہ تم جانتی ہو کہ ہمارے خاندان میں ایسے بے جوڑ رشتے کبھی نہیں اپنائے گئے۔

یاسمین رجب علی کی پہلی بیوی ہے اور جو حیثیت اس کی ہے' اسے تمہیں تسلیم کرنا ہوگا۔یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ یاسمین رجب علی کے بابا جان کے بھائی کی بیٹی ہے ہمارا خاندان ایک ہی ہے' یہ خون کا رشتہ بھی ہے' اسے حویلی میں سب کی خوشی اور دھوم دھام سے لایا گیا ہے نہ کہ تمہاری طرح تاریکی میں اس طور سے کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔

تمہیں حویلی میں آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں ہے۔خاص طور پر تم یاسمین کے رہائشی حصے کی طرف کبھی نہیں جاؤ گی' اس کے علاوہ کسی کے کمرے میں آنے جانے کے لئے پہلے اپنے شوہر اور اس شخص سے اجازت لو گی۔

تمہارے میکے سے تم سے کوئی ملنے آئے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے' لیکن تم میکے نہیں جاؤ گی۔

حویلی کی روایات تمہیں بھی معلوم ہیں اور تمہیں ان کی پاس داری کرنا ہوگی۔''

زرینہ کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنے آپ میں بار بار مر رہی ہو۔احساسِ ذلت نے اسے چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''اب تم جا سکتی ہو۔''

اماں جان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔واپس مڑتے ہوئے ایک نظر اس نے یاسمین اور مہرالنسا کی آنکھوں میں دیکھا۔یاسمین کی آنکھوں میں اس کے لئے

نفرت ہی نفرت تھی۔

اور مہرالنسا۔

اس کی آنکھوں میں تو پوری کہانی تھی۔ اس کے لئے نفرت' الزام' تمسخر اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ لمحہ بھر سے زیادہ وہ ان کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکی اور باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

رجب علی کے لئے وہ رات بہت بھاری تھی احساس ذلت مسلسل کچوکے لگ رہا تھا۔ یہ احساس کہ اس کی نئی بیوی کسی اور کی محبوبہ تھی۔ اس کی رجب علی کے کمرے میں موجودگی بلا جواز تو نہیں تھی' وہ خود وہاں نہیں آ سکتی تھی کوئی اسے اس کی اپنی مرضی سے وہاں لایا تھا' تب ہی تو اس نے اتنی لاپروائی سے ڈبل بیڈ پر اپنی چادر پھینکی ہوئی تھی۔

اب ایسی لڑکی اس کی بیوی تھی جو نہ جانے کس کے ساتھ تنہائی میں' نہ جانے کتنے پل گزار چکی تھی' جسے نہ جانے کس کے ہاتھوں نے چھوا تھا' جس سے نہ جانے کس نے محبت کا دعویٰ کیا تھا اور وہ نہ جانے کس سے محبت کرتی تھی' کس کے متعلق سوچتی تھی' جس کی تنہائیوں پر نہ جانے کون قابض رہ چکا تھا اور گاؤں میں نہ جانے کتنے لوگ محبت کے اس افسانے سے واقف تھے۔

اور آج وہ لڑکی اس کی بیوی بنادی گئی تھی۔ اس کی عزت بنادی گئی تھی۔

وہ بابا جان کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا' ورنہ اس کے ساتھ نکاح پڑھوانے کے بجائے اسے شوٹ کر چکا ہوتا۔

''لیکن شوٹ تو اسے کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے دل کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔ ''بس چند دن کی بات ہے تاکہ تب تک یہ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو اس کے ساتھ شادی کرنے کے خیال کا سن کر ہی اسے شوٹ کر دیتا۔''

لیکن یہ تسلی خود اسے بے معنی لگ رہی تھی۔ پیر صاحب کو اس کی ذہنی حالت کا اندازہ تھا' اس لئے نکاح کے ساتھ وہ زرینہ کو اپنے ساتھ حویلی لے گئے تھے۔

ہر گزرتے پل کے ساتھ رجب علی کی رگوں میں دوڑنے والا خون نفرت سے ابلتا جا رہا تھا۔ تسلی کے الفاظ بے معنی ہوتے جا رہے تھے۔ اسے خیال تھا کہ ایسے وقت میں اسے خود پر قابو پانا ہوگا' ورنہ معاملہ بالکل ہی بگڑ جائے گا لیکن جب تک اس کا شعور اس کے ساتھ تھا' وہ خود پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر بیڈ سائیڈ ٹیبل سے خواب آور گولیوں کی شیشی سے اس نے چار گولیاں نکال کر پانی کے ساتھ نگل لی تھیں اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

لیکن صبح اٹھ کر ذلت کے ناگ نے پھر پھن پھیلا لیا تھا۔ بس اتنا تھا کہ اب ایک اچھی نیند لے لینے کے بعد وہ زیادہ بہتر طور پر سوچ سکتا اور اپنے اعصاب پر کافی حد تک قابو پا سکتا تھا۔

اب تک اس نے ایک نظر بھی زرینہ کو نہیں دیکھا تھا۔ اسے دیکھنے کی اب کوئی ضرورت بھی

نہیں تھی۔

صبح وہ حویلی میں داخل ہوا تو ہر کوئی مبارک باد دینے میں پیش پیش تھا۔ وہ بے نیازی اور لاتعلقی کے تاثرات کے ساتھ گردن کی جنبش سے سب کو جواب دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

زرینہ اپنے رہائشی حصے میں داخل ہونے ہی لگی تھی کہ حمیدہ اس کے پاس آ گئی۔

''یہ سب کیا ہے زرینہ؟'' وہ بدحواس سی لگ رہی تھی۔

''یہ......؟'' وہ ہولے سے بولی۔ ''پتا نہیں۔'' پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''شاید بدنصیبی۔''

''زرینہ بڑے شاہ صاحب۔'' حمیدہ دبے دبے انداز میں گھبراہٹ کے ساتھ بولی۔

چوکھٹ پر زرینہ کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوگئی' لیکن صرف ایک لمحے کے لئے پھر وہ کسی بھی جانب دیکھے بغیر کمرے کے اندر چلی گئی۔ رجب علی نے مختصر سی یہ گفتگو پوری طرح سنی تھی اور نفرت کی چنگاری پھر آگ بننے لگی تھی۔ اس ان دیکھی لڑکی نے ایک عام سی تیسرے درجے کی ملازمہ کے سامنے اس کی بے عزتی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

''شاید بدقسمتی۔''

زرینہ کے یہ الفاظ سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اتر گئے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت زرینہ کو ختم کر دے۔ ان دونوں کی گفتگو سے واضح تھا کہ یہ عام سی خادمہ اس کی بیوی کے ماضی کے راز سے واقف ہے۔ وہ اسے نام سے پکار رہی تھی' اس سے پوچھ رہی تھی کہ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔

اپنے غصے پر بمشکل قابو پا کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ دانش مندی اسی میں تھی کہ ان کی گفتگو وقتی طور پر نظر انداز کر دی جائے۔

جب وہ اماں جان کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو یاسمین رو رہی تھی اور اماں جان اسے تسلی دے رہی تھیں۔ مہرالنسا بھی وہیں تھی' اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر یاسمین نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے۔ رجب علی نے اسے نظر انداز کر دیا۔

''آؤ بیٹا۔'' اماں جان نے اس کے لئے اپنے قریب جگہ بنائی۔

''بیٹھوں گا نہیں' بس آپ کو سلام کرنے آیا تھا۔''

''کچھ دیر تو ماں کے پاس بیٹھ جایا کرو۔''

وہ وہیں بیٹھ گیا۔

''اماں جان! علی کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ اس کی گاڑی تو یہیں کھڑی ہے؟''

''اس کا کیا پتا چلتا ہے کہ کب کہاں گیا۔'' اماں جان بولیں۔ ''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''جی کہیے۔''

یاسمین اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

''جو کچھ ہوا میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کروں گی' جو بیت گیا اس پہ رونے کا کیا فائدہ۔'' اماں جان نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

''تمہاری دوسری بیوی بہت خوبصورت ہے کہیں تم یاسمین سے کوئی زیادتی کوئی برا سلوک تو نہیں شروع کر دو گے؟''

اس کی نگاہوں کے سامنے چوکھٹ پر جمے دو گلابی مخروطی ہاتھ آ گئے' جن کی خوبصورتی کو اپنے غصے میں اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ واقعی ان ہاتھوں کی مالکہ بہت خوبصورت ہوگی۔

''رجب علی۔''

وہ جیسے ہوش میں آ گیا اور ہوش میں آتے ہی وہ گلابی ہاتھ تحلیل ہو گئے۔ اب پھر وہی نفرت تھی' وہی غصہ تھا۔

''اماں جان!'' اس کے انداز اور لہجے سے اس کے جذبات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

''بس چند دن بعد آپ کو آپ کے سوال کا جواب مل جائے گا۔ میں بابا جان کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا' لیکن انہوں نے یہ فیصلہ عجلت میں کیا ہے۔ میں نے اب تک اس لڑکی کو نہیں دیکھا اور نہ دیکھنے کی خواہش ہے۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر گلابی مخروطی ہاتھوں کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

''وہ خوبصورت ہے یا بدصورت' اس بات سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔

میں نے بہت مرتبہ بابا جان کو یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی کہ میرے آنے سے قبل وہ لڑکی وہاں موجود تھی کیوں' کیسے اس کی مجھے خبر نہیں' لیکن انہوں نے میری بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔''

''مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ تم اس کے ساتھ کیسا رویہ رکھتے ہو' میں صرف اس قدر چاہتی ہوں' کہ یاسمین کا جو وقار اور مقام جو پہلے تھا' وہی اب بھی رہنا چاہیے۔ اس لڑکی کو میں نے یہاں رہنے کے آداب سمجھا دیئے ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ میں اسے یاسمین کی جگہ لینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے اجازت ہے؟''

''ہوں۔''

اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر یاسمین کے ساتھ اس کے والد' رجب علی کے چچا بھی موجود تھے۔ یاسمین غالباً رو رہی تھی اور وہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھے اسے تسلی دے رہے تھے۔ رجب علی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر یاسمین نے آنسو صاف کر لیے۔

''آؤ' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' وہ بولے۔

رجب علی کو خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہاں کیوں چلا آیا تھا۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ بلا مقصد ادھر اُدھر کیوں گھوم رہا تھا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' رجب علی کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

''مجھے معلوم ہے یہ بھی معلوم ہے' کہ تمہارے پاس اپنی بیوی کے لئے بھی وقت نہیں ہے۔ پہلے بھی نہیں تھا اور اب تو بالکل نہیں ہوگا۔''

''اگر آپ کو اس بات پر اعتراض ہے تو آپ اپنی بیٹی کو یہاں سے لے جا سکتے ہیں۔'' اس کا انداز سفاکانہ تھا۔

''رجب علی!'' وہ غصے میں بھر گئے۔

''اس طرح بات کرنے کی اجازت میں نے بابا جان کے علاوہ کسی کو نہیں دی' آپ بھی یہ بات یاد رکھنا۔''

''بابا جان!'' یاسمین نے اضطراب کے عالم میں باپ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ان کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ رجب علی ایک نظر دونوں باپ بیٹی پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

''اماں میں حویلی جا کر ایک نظر اسے دیکھ آؤں۔'' رضیہ منت کر رہی تھی۔

''خبردار! جو وہاں جانے کا نام بھی لیا تم نے۔'' اماں نے دبی آواز میں اسے ڈانٹا۔

''وہ وہاں اس شخص کے ساتھ نہیں رہ سکے گی' وہ مر جائے گی۔'' وہ رونے لگی۔

''مر جانے دو۔'' اماں کو مزید غصہ آ گیا۔ ''جو کچھ بھی اس پر بیتے گا وہ اس کے اپنے کیئے کی سزا ہے۔''

''وہ حویلی سے بہت ڈرتی تھی' اس کی دیواروں اور اس کی بلندی سے۔ اماں! میں سچ کہہ رہی ہوں وہاں اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اس نے چھوٹے شاہ صاحب......!''

''بکواس بند کرو۔'' وہ طیش میں آ گئیں۔ ''اب نام لیا چھوٹے شاہ صاحب کا تو زبان کاٹ کر رکھ دوں گی۔ وہ بڑے شاہ صاحب کی بیوی ہے اور بس۔ اب ہر پرانی بات ختم ہو گئی ہے۔ وہ بڑے شاہ صاحب کی عزت ہے اور اسے حویلی میں اسی طرح رہنا ہوگا جیسے بیبیاں رہتی ہیں۔''

☆======☆======☆

''اسے حویلی سے وحشت ہوتی تھی اور اب وہ ہمیشہ کے لئے اس حویلی میں دفنا دی گئی ہے۔'' حیدر علی سوچ رہا تھا کتنے خوف زدہ ہو کر اس نے کہا تھا۔

''شاہ جی میں حویلی نہیں جاؤں گی۔''

"کیوں؟"

"مجھے حویلی دیکھ کر وحشت ہونے لگتی ہے دم گھٹنے لگتا ہے میرا۔ مجھے لگتا ہے وہاں کمرے نہیں۔" اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ برگد کے پتوں کے درمیان سے آسمان پر بکھرے ستارے کھوجنے لگی تھی۔

اور پھر کتنی مشکل سے اس نے بتایا تھا۔

"مجھے وہ کمرے نہیں، قبریں لگتی ہیں۔ زندہ انسانوں کی قبریں، جہاں لاشیں چلتی پھرتی ہیں لگتا ہے یہ قبریں اتنی گہری ہیں کہ ان میں روشنی ہوا اور آزادی کا گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ لگتا ہے کہ ہر کمرے میں روحیں پھڑ پھڑا کر اپنی موجودگی کا اعلان کر رہی ہیں۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے وہاں۔ خدا کے لئے شاہ جی مجھے وہاں مت لے جانا۔ آپ کو پا لینے کے بعد یہی ایک خواہش ہے میری میں حویلی میں نہیں جانا چاہتی، اس کے علاوہ میری کوئی تمنا نہیں ہے۔"

اور اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اپنا الگ گھر بنائے گا، اسے حویلی کے دم گھونٹ دینے والے ماحول سے دور رکھے گا۔ وہ تو رجب علی کی شادی میں بھی اسی لئے شریک نہیں ہوئی تھی کیونکہ حویلی کے ذکر سے ہی اسے وحشت ہونے لگتی تھی۔ وہاں چند لمحے گزارنے بھی اسے گوارا نہیں تھے۔

اور اب جیتے جی وہ کبھی بھی حویلی سے باہر نہیں آ سکتی تھی۔

میں جانتا ہوں کہ ایسے ماحول میں وہ زیادہ عرصے تک نہیں جی سکے گی، لیکن اب اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا، سوائے چند یادوں کے جو ہر لمحہ، ہر پل اس کے ساتھ تھیں۔

وہ وقت جب اس نے گوری کی سنہری جلد والی حسین گردن میں سونے کی زنجیر ڈالی، سرخ رنگ کی چنری اس کے سر پر رکھی تھی اور پرفیوم کی پوری بوتل اس کے اوپر انڈیل دی تھی۔

اور پھر جاتے ہوئے گوری نے وہ زنجیر اسے تھما دی تھی۔

"یہ میں تمہارے لئے لایا تھا تاکہ سدا تمہاری مرمریں گردن میں چمکتی رہے۔"

"اس کی چند کڑیاں الگ کر کے مجھے دے دیں باقی اپنے پاس رکھ لیں۔" گوری نے کہا تھا۔

"وہ کس لئے؟"

"تاکہ آپ کی نشانی میرے پاس رہے پھر جب ہم دونوں مل جائیں گے تو ان کڑیوں کو جوڑ کر دوبارہ زنجیر مکمل کر لیں گے۔ اس کے بعد میں اسے کبھی اپنے گلے سے الگ نہیں کروں گی۔"

"ایسا ہی سہی۔"

اور اس نے تھوڑا سا زور لگا کر زنجیر دو حصوں میں تقسیم کر دی تھی۔ چھوٹا حصہ گوری کو تھما دیا

اور بڑا اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

"یہ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔ شادی کے بعد تمہیں تمہاری یہ امانت مل جائے گی۔"

اور یہ بات سن کر گوری ہنس پڑی۔ اس کے ہنسنے سے فضا میں چاروں طرف دھنک رنگ بکھر گئے تھے۔

اور وہ ہر وقت خوف زدہ بھی تو رہتی تھی۔ شاید اس کی چھٹی حس نے بہت پہلے اسے آنے والے وقت سے خبردار کر دیا تھا وہ جب بھی اسے یقین دلاتا تھا تو وہ پہلے سے بڑھ کر خوف زدہ ہو جاتی تھی۔

"پتا نہیں یقین کیا ہوتا ہے۔" اس نے کہا تھا۔ "میرے گرد تو خوف نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، جدائی کے خوف نے تقدیر میں کیا لکھا ہے، میں اس بات کو کیا جانوں۔"

اور ایک مرتبہ اس نے یہ بھی تو کہا تھا۔ "مجھے لگتا ہے جیسے میرا مقدر کہیں اور جڑا ہوا ہے۔"

ایسے میں اس کی ہر یقین دہانی بے کار ہو جاتی تھی، ساری تسلیاں یونہی رہ جاتی تھیں۔

لیکن اس وقت وہ خوش ہوئی تھی جب سائیں بابا نے کہا تھا۔

"میں تجھے حویلی کی بہو بنے دیکھ رہا ہوں، لیکن ایسے کہ تیرے تن پہ نہ سرخ جوڑا ہے نہ گلے میں زیور، نہ ڈھول تاشے ہیں نہ باجے گاجے۔ بہت سی آہیں، بہت سی سسکیاں ہیں۔"

اور اس پر بھی وہ خوش ہو گئی تھی۔ گوری کو اس کا ساتھ چاہیے تھا اور کچھ بھی نہیں۔ نہ سرخ جوڑا، نہ زیور، نہ دھوم دھام نہ حویلی۔

دن ڈھل رہا تھا، اندھیرا ہر طرف سے یلغار کر رہا تھا۔ جب ندی میں بننے والی لہروں کو اندھیرے نے نگل لیا تو وہ چونک گیا۔ وقت کیسے گزرا تھا، اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ ویسے ہی ے گوری کی موجودگی میں پر لگا کر اڑا کرتا تھا۔

اسی طرح آج اس کی یادوں کے درمیان بھی لمحے بیتنے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

اٹھ کھڑا ہوا اور بوجھل قدموں سے حویلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ چلتے چلتے پرانے کنوئیں کے قریب پہنچ کر اس کے قدم اپنے آپ ہی رک گئے۔ یادوں کی کسک ایک مرتبہ پھر جاگ اٹھی تھی۔ برگد کی جٹائیں جھولتے ہوئے گنگنا رہی تھیں۔

کلیاں چٹکیں، غنچے مہکے
رنگ برنگے پنچھی چہکے
اپنی اپنی باتیں کہہ کے
کون بتائے کہاں گئے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے
بھری ہوئی ہے کتھا سہانی

ایک کہانی سب کی زبانی
کچھ انجانی، کچھ من مانی
پَل پَل چھِن چھِن رنگ نئے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے
دُکھ کے دن اور سکھ کی راتیں
ہونی یا اَن ہونی باتیں!
آنکھ سے اب تک بھید چھپے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے

اس میں یادوں کی کسک سہارنے کی مزید ہمت نہیں تھی، اس لئے وہاں سے چل پڑا۔ حویلی جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ڈیرے میں بھی پاگل کر دینے والی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔

''کہاں جاؤں؟'' وہ سوچ رہا تھا۔

لیکن کوئی اور پناہ گاہ بھی تو نہیں تھی، اس لئے تھکے ہوئے قدموں سے حویلی کی طرف ہی چل دیا۔

حویلی کے وہی در و بام جو کبھی اپنے اپنے لگتے تھے آج بہت اجنبی لگ رہے تھے، یوں جیسے پل بھر کی شناسائی بھی نہ ہو۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ مسہری پر لیٹ گیا اور سگریٹ سلگا لیا۔

''اسی چھت کے نیچے ایک کمرے میں گوری بھی ہو گی۔'' اس نے سوچا۔ ''پتا نہیں کیا کر رہی ہو گی؟ کیا وہ بھی مجھے اس شدت سے یاد کر رہی ہو گی؟ جس شدت سے میں اسے یاد کر رہا ہوں، ہاں یقیناً۔ لیکن نہیں اسے مجھے یاد نہیں کرنا چاہیے، کہیں اپنے پاگل پن میں وہ بھائی جان سے کوئی ایسی بات نہ کہہ دے۔ اوہ نو!'' وہ اٹھ بیٹھا۔ ''مجھے اپنی پروا ہے، لیکن میں اسے زیبی آپی کی طرح مرتے نہیں دیکھ سکتا۔''

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا اور مہر النسا کی خواب گاہ کی طرف بڑھا۔ وہ ابھی جاگی ہوئی تھی اور اپنی ملازمہ حمیدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر دونوں خاموش ہو گئیں۔ حمیدہ اٹھ کر باہر نکلنے لگی۔

''تم یہاں قریب ہی رہنا۔'' مہر النسا نے اس سے کہا۔

حیدر علی اس کے قریب بیٹھ کر کتنی دیر تک مناسب الفاظ تلاش کرتا رہا۔

''زرینہ کے متعلق کچھ کہنے آئے ہو؟'' مہر النسا نے خاموشی توڑتے ہوئے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''ہوں!''

''تو پھر کہو چپ کیوں ہو؟''

''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں؟'' پھر چند لمحے کے توقف کے بعد ہولے سے بولا۔ ''آپا میں چاہتا ہوں کہ وہ بھائی جان کے سامنے ہمارے آپس کے تعلقات کا ذکر نہ کرے۔''

''ڈرتے ہو؟'' اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔

''میں کسی سے نہیں ڈرتا۔'' اس نے اپنے اندر ابلتے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ''لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ گوری کو کوئی نقصان پہنچے۔''

''گوری؟ لیکن اب تو وہ زرینہ بن چکی ہے، زرینہ بھابی۔''

''آپا! آپ میرا یہ کام کر سکتی ہیں یا نہیں؟'' اس نے حتمی انداز میں پوچھا۔

''ذاتی طور پر نہیں، ہاں کروا سکتی ہوں کیونکہ مجھے اس کی نہیں تمہاری پروا ہے۔''

وہ بولی۔ اور پھر حمیدہ کو طلب کیا۔ ''چھوٹے شاہ صاحب جو کام بتائیں وہ کر دو۔''

حمیدہ ایک طرف نظریں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ حیدر علی نے گہرا سانس لیا۔ پھر کاغذ قلم لے کر سوچنے لگا۔

''کیا لکھوں؟''

الفاظ نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ ذہن بالکل خالی لگ رہا تھا۔ پھر بالآخر وہ قلم کو کاغذ پر گھسیٹنے لگا۔

''گوری!

ہمیشہ خوش رہو!

آج بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں، لیکن کہہ نہیں پا رہا۔ اس وقت تو فقط یہ خیال باقی ہے کہ ہمارے درمیان جو بھی رشتہ تھا، وہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا ہے۔ میں نے پوری کوشش کی تھی، لیکن تم نے ٹھیک کہا تھا کہ تمہارا مقدر کہیں اور جڑا ہوا تھا۔ یہ تو ہم دونوں تھے جو اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے کسی صورت تیار نہیں تھے۔

کل تک مجھ میں جذبے تھے، حوصلہ تھا، تمہیں اپنا لینے کا جذبہ اور سب سے ٹکرا جانے کا حوصلہ۔ آج میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، سوائے پچھتاوے کے۔ یہ پچھتاوا کہ کاش میں تمہیں یوں چھوڑ کر نہ جاتا۔ کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی اور ہم فوراً شہر چلے گئے ہوتے۔ کاش پرانا وقت، صرف ایک پچھلی رات لوٹ آئے۔

لیکن وقت کا پہیہ الٹا چلانا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ ہم دونوں ہی کے اختیار میں نہیں ہے اور یہ احساس کتنا تکلیف دہ ہے۔

مگر گوری میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ وقت گزرتا ہے، تو اس کی دھول

میں بہت کچھ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور جو چیز نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے' آہستہ آہستہ ذہن سے بھی محو ہو جاتی ہے۔ یہ شاید اچھا ہی ہے' ورنہ زندہ رہنا صرف ایک سزا بن جائے۔

تم سے اتنی درخواست ہے گوری کہ وہ سب کچھ جو بیت چکا ہے اسے شعوری طور پر بھلانے کی کوشش کرو۔ حقیقت کو تسلیم کرنا بہت مشکل ہے' لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ میرے لئے کیا تم اتنا کر سکتی ہو کہ خوش رہو اور بھائی جان کے سامنے اپنی گزشتہ زندگی کے متعلق کچھ مت کہو؟

میری سب دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے راستے میں خوشیاں ہی خوشیاں بکھیر دے۔

تمہارا حیدر علی شاہ''

کاغذ تہہ کرنے سے پہلے اس نے ایک اچٹتی سی نظر اپنی تحریر پر ڈالی۔

''تمہارا حیدر علی شاہ!'' پر اس کی نظریں ٹک گئیں۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے ''تمہارا'' کاٹ دیا اور کاغذ حمیدہ کی طرف بڑھا دیا۔

حمیدہ بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''آپ گوری سے ملیں؟'' حیدر علی نے پوچھا۔

''علی! اسے اپنے اعصاب پر اس طرح سوار مت کرو۔ تم نے آئینے میں اپنا آپ دیکھا ہے؟ یوں لگتا ہے جیسے نہ جانے کتنے میلوں کی مسافت کی دھول تمہارے چہرے پر ہو۔''

''میں اسے نہیں بھلا سکتا آپا۔''

''مت بھولو' کہ اب وہ تمہاری بھابی ہے' تمہارے بھائی کی عزت ہے اور بھائی کے حوالے سے تمہاری بھی عزت ہے۔ بھابی کا مقام بہت جدا ہوتا ہے۔''

''میں سب جانتا ہوں آپا! لیکن اسے یاد رکھنا یا بھول جانا کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں ہے۔''

''یاد ہے بہت پہلے ایک مرتبہ تم نے زیبی سے کہا تھا۔'' مہرالنسا کہتے کہتے چند ثانیے کے لئے خاموش ہو گئی۔ زیبی کے ذکر سے وہ ایک دم ہی افسردہ ہو گئی تھی۔

''اس نے کہا تھا' کہ ہمیشہ رہنے والی محبت تو بہت پریشان کن بات ہے۔ یہ محبت نہیں رہتی روگ بن جاتی ہے۔''

''اور علی! تم نے اس سے کہا تھا' کہ تم محبت کو روگ بنانے کے قائل نہیں ہو۔ تمہیں خستہ حال قسم کے عاشقوں سے وحشت ہی نہیں بلکہ نفرت محسوس ہوتی ہے۔ تم نے کہا تھا' کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو' جو معاشرے کی چند فرسودہ روایات میں خود کو جکڑ کر اپنی محبت کا گلا گھونٹ

یتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو درحقیقت محبت کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ وہ بزدل ہوتے ہیں اور م بزدلوں کو پسند نہیں کرتے۔

بزدلی علی صرف یہ نہیں ہوتی بلکہ اپنی شکست تسلیم نہ کرنا بھی بزدلی ہی ہوتی ہے۔ اب ب تقدیر کا فیصلہ تمہارے خلاف ہو گیا ہے' تو تم نے کیوں روگ بنا لیا محبت کو؟ زندگی صرف یک زرینہ کے نہ ملنے سے ختم تو نہیں ہو سکتی' اپنی شکست پر رونے کی بجائے اسے حوصلے سے بول کر لو علی' اسی میں تمہاری بہتری ہے۔''

''جب میں نے زیبی آپی سے بات کی تھی' اس وقت تک میں کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوا تھا مجھے پتا ہی نہیں تھا' کہ تدبیر محض تدبیر ہوتی ہے' لیکن تقدیر حرفِ آخر ہوتی ہے۔ کل رات ک میرا بھی یہی خیال تھا' لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مقدر تھا جسے تبدیل کرنا میرے اختیار یں نہیں ہے۔''

''تب ہی تو' کہتی ہوں کہ جب یہ جانتے ہو کہ مقدر بدل نہیں سکتے تو اپنی شکست کو بھی تسلیم کر لو۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''وہ خوش نہیں رہ سکے گی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے علی کہ بھائی جان نے یہ شادی دل سے قبول کر لی ہے؟'' مہرالنسا نے پوچھا۔

اگر میں' گوری کو نہ جانتا تو ضرور کہتا کہ نہیں' لیکن آپا گوری میں پتا نہیں کیا سحر ہے کہ اسے کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہاں انہوں نے یقیناً یہ شادی دل سے قبول کر لی ہے۔ گوری شاید ایسا نہ کر سکے' لیکن بھائی جان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ ایسا ہے۔ آج جب بھائی جان اماں جان کے پاس آئے' تو میں وہیں تھی۔''

''کچھ کہا انہوں نے گوری کے متعلق؟'' اس کی بے تابی واضح تھی۔

وہ قدرے سوچ کر بولی۔ ''انہوں نے کہا تھا کہ اب تک انہوں نے زرینہ کو دیکھا بھی نہیں ہے۔ وہ شادی کسی صورت نہیں کرنا چاہتے تھے' کیوں؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ شادی تو بابا جان نے زبردستی کروائی ہے۔''

''وہ زرینہ کو ایک مرتبہ دیکھیں گے تو ہر بات بھول جائیں گے۔'' اس نے بہت آہستگی سے جیسے خود سے کہا پھر' اچانک اسے خیال آیا۔

''حمیدہ نہیں آئی' بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''آتی ہی ہو گی۔'' مہرالنسا نے کہا۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ لمحے دبے پاؤں سرکتے گئے۔ بالآخر حمیدہ آ گئی۔

اس کی مٹھی میں ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔ حیدر علی متوقع نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا

"جی یہ!" اس نے نظریں چراتے ہوئے مٹھی کھول دی' جس میں حیدر علی کا دیا ہوا خط تھا۔

"بی بی کہہ رہی تھیں کہ یہ شاید کسی اور کی چٹھی ہے' جو میں غلطی سے انہیں دے رہی ہوں کیوں کہ نہ وہ کسی گوری کو جانتی ہیں اور نہ ہی کسی......!" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

حیدر علی کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اس نے خاموشی سے وہ خط اٹھالیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

"میں کس بات پر دکھی ہو رہا ہوں۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔ "یہ تو اچھا ہے کہ وہ مجھے بھولنا چاہ رہی ہے' یہی تو میں بھی چاہتا ہوں' یہی تو میں نے اسے کہا تھا کہ جو کچھ بیت گیا' اسے شعوری طور پر بھلانے کی کوشش کرے' پھر اب اس کے الفاظ نے مجھے اندر تک کیوں کاٹ کر رکھ دیا ہے۔" وہ سوچتا رہا۔ "اس وقت اسی چھت کے نیچے کسی کمرے میں وہ بھی ہوگی' اپنے شوہر کے ساتھ۔"

یہ احساس اتنا تکلیف دہ تھا کہ رات کاٹنی اس کے لئے مشکل ہو چکی تھی۔

☆======☆======☆

حمیدہ کا ذہن بری طرح منتشر تھا۔ پہلے زیب النسا کا صدمہ تھا اور اب زرینہ کا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے وہ منظر نہیں ہٹ رہا تھا' جب اس نے حیدر علی کا خط اسے تھمایا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

اس کے انداز میں اتنی بے نیازی اور لاتعلقی تھی کہ حمیدہ سمجھ ہی نہ سکی کہ اس کا ذہن کس ڈگر پر چل رہا ہے؟

"یہ تمہارے لئے۔ میرا مطلب ہے آپ کے لئے ہے۔" اس نے جلدی سے تصحیح کی۔

"چھوٹے شاہ صاحب نے بھیجا ہے۔" اس کے چہرے پر سرد مہری اور لاتعلقی کی دھند اور گہری ہوگئی تھی۔

"ان سے میرا کیا تعلق ہے؟"

وہ بولی تو اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں تمام بناوٹی بے نیازی اور سرد مہری پل بھر میں غائب کر دی تھی۔

"میں تو حکم کی غلام ہوں' انہوں نے کہا اور میں یہاں چلی آئی۔"

"میں انہیں نہیں جانتی۔ ان کا کوئی پیغام لانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا تھا۔

"اچھا!" وہ جانے کے لئے مڑ گئی۔

"رکو حمیدہ۔"

وہ دروازے تک پہنچی تھی کہ زرینہ کے الفاظ نے اس کے قدم روک دیے۔

"خط دے دو۔" اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے صرف اسی قدر کہا۔

اس کا لہجہ خود سے ہونے والی جنگ میں شکست کھا جانے کی چغلی کھا رہا تھا۔ خود پر جو بند باندھنے کی کوشش میں وہ مسلسل مصروف تھی۔ وہ جذبوں کی شدت سے ٹوٹ گیا تھا اپنے اندر ہونے والی جنگ میں اس نے خود اپنے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

حمیدہ نے خاموشی سے خط اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ وہ جذبات اعتدال پر لانا چاہ رہی تھی۔ کتنی دیر تک خط تھامے وہ ہاتھ کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہت دل مضبوط کر کے اس نے کاغذ کی تہیں کھولی تھیں' لیکن تحریر پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنے آپ میں نہیں رہی تھی اور بری طرح سے رو پڑی تھی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی' لیکن حمیدہ سمجھ سکتی تھی کہ اس وقت اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ اس نے زرینہ کو تسلی دینے کی بہت کوشش کی لیکن آنسو پونچھ لینا اس کے بس میں کہاں تھا۔ کتنی مشکل سے خود پر قابو پا کر اس نے خط پڑھا تھا۔

"سنو حمیدہ! اس وقت جو کچھ ہوا' وہ شاہ جی کو مت بتانا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے دل میں ان کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے' وہ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے' لیکن میں کیا کروں' خوش رہنا میرے بس میں نہیں ہے' لیکن۔" وہ چند ثانئے کے لئے خاموش ہوگئی۔ "لیکن انہیں کچھ نہ بتاؤں' یہ میرے بس میں ہے۔

حمیدہ! تم ان سے صرف اتنا کہنا کہ شاید یہ خط غلطی سے میرے پاس آگیا ہے کیوں کہ نہ میں کسی گوری کو جانتی ہوں اور نہ حیدر علی شاہ کو۔"

"تم نے ان کی حالت نہیں دیکھی زرینہ!"

"انہیں دیکھنے کی لئے مجھے ان دو آنکھوں کی ضرورت نہیں ہے حمیدہ۔" اس نے بات کاٹ دی تھی۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے جیتے تھے' جیتے ہیں' انہیں دیکھے بغیر میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تم ان سے وہی کہو' جو میں نے کہا ہے۔ میں انہیں کسی خلش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔ ان تمام دوریوں کے باوجود ہم ایک دوسرے سے دور نہیں ہو سکتے' لیکن ہمیں ایک دوسرے سے دور ہونا چاہیے' میں اپنے لئے نہیں خود ان کے لئے' ان سے دور ہونا چاہتی ہوں۔ خدا کے لئے میری مدد کرو حمیدہ اور ان سے صرف وہ کچھ کہو' جس کے لئے میں نے تمہیں کہا ہے۔"

اور حمیدہ کے دل میں کانٹا سا چبھ گیا تھا' لیکن اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔

☆======☆======☆

ولیمے میں بھی وہ دھوم دھام نہیں تھی جیسا کہ حویلی کا خاصہ تھا۔ زیب النسا کے چالیسویں کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ تقریب بے حد سادہ تھی۔ زرینہ دلہن بنی ہوئی تھی' اس کے گرد ہجوم تھا' لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ اس ہجوم میں بھی وہ بے حد تنہا تھی۔ تب ہی اس کی نگاہ اماں اور

رضیہ پر پڑی۔ اس کا دل چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اماں کے گلے لگ جائے آنکھیں بند کر لے تا کہ یہ سارا منظر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے' پھر اس منظر کے تحلیل ہوتے ہی وہ ایک نیا منظر تخلیق کر لے۔

بہت مشکل سے اس نے اپنی اس شدید خواہش پر قابو پایا۔ اماں وہیں دوسری عورتوں کے درمیان ٹھہر گئیں۔ مجبوراً رضیہ کو بھی وہیں رکنا پڑا۔ عورتیں انہیں مبارک باد دے رہی تھیں' وہ مسکرا کر قبول کرتی جا رہی تھیں۔

لیکن یہ زرینہ ہی جانتی تھی کہ وہ مسکراہٹ درحقیقت کتنی مصنوعی تھی اور اس میں کتنے تفکرات چھپے ہوئے تھے اور وہ زبردستی وہاں آئی تھیں کیوں کہ آئے بنا چارہ نہیں تھا لیکن احساسِ جرم اور احساسِ کمتری کے مارے وہ حویلی کی عورتوں سے آنکھیں بھی نہیں ملا رہی تھیں۔

یاسمین تو وہاں موجود نہیں تھی' لیکن اماں اور مہرالنسا کا انداز یہ بتا دینے کے لئے کافی تھا کہ وہ انہیں گرم جوشی سے خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ زرینہ نے اپنی توجہ اس طرف سے ہٹالی تھی' اسے معلوم تھا کہ وہ اس مسئلے پر زیادہ دیر تک سوچتی رہی تو پاگل ہو جائے گی۔ شاید چیخنے چلانے اور در و دیوار سے سر ٹکرانے لگے۔ اس لئے عافیت اسی میں تھی' کہ سب کچھ ذہن سے نکال دے' پھر وہیں رہتے ہوئے وہ سب سے بے تعلق ہو گئی۔ یوں جیسے اس کے گرد اتنا بڑا ہجوم نہ ہو بلکہ وہ بالکل تنہا ہے۔ کتنی دیر گزر گئی' اس کی اسے خبر نہیں تھی۔ وہ تو اس وقت چونکی جب اسے وہاں سے اٹھایا جانے لگا۔

اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر اس نے گہرا سانس لیا اور سنہری دوپٹا اتار کر بستر پر پھینک دیا۔

''زرینہ!''

اپنے پیچھے رضیہ کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

''میں اندر آ جاؤں؟''

''تمہیں اجازت لینے کی ضرورت ہے کیا؟''

''پتا نہیں' اصل میں بہت کچھ بدل گیا ہے ناں۔''

''کیا بدلا ہے؟'' اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔

''تم۔ تم نہیں رہی اور وہ بھی۔'' رضیہ خادماؤں کی موجودگی کا احساس کر کے خاموش ہو گئی۔

''تم لوگ جاؤ۔'' زرینہ نے ان سے کہا۔

''بی بی! آپ کا کھانا رکھا ہوا ہے۔'' ایک نے کہا اور پھر وہ دونوں باہر نکل گئیں۔ زرینہ چند ثانیے رضیہ کو دیکھتی رہی اور پھر بے اختیار اس کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کتنا وقت بیت گیا ان دونوں کو ہی خبر نہیں ہوئی۔

''وہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکے ناں' بیچ منجدھار میں چھوڑ گئے۔''

''نہیں رضیہ ایسا مت کہو' ان سے جو ہو سکا انہوں نے کیا' لیکن قسمت پر کس کا زور ہے۔''

وہ دونوں مسہری پر بیٹھ گئیں۔

''اب مجھے پتا چلا ہے کہ سائیں بابا کا کہنے کا مطلب کیا تھا۔ ٹھیک کہا تھا انہوں نے' میں دکھ پر خوش ہوتی رہی' رونے والی بات پر ہنستی رہی' وہی ہوا ناں جو انہوں نے کہا تھا۔ حویلی کی بہو تو بن گئی' سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہو کر' آہوں اور سسکیوں کے درمیان' ایک لمحے کے لئے بھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ خوشی حویلی کی بہو بننے پر نہیں شاہ جی کی بیوی بننے پر منانا چاہیے تھی اور اب تو ساری زندگی کی آہیں اور سسکیاں ہیں۔''

''بڑے شاہ صاحب تمہارے پاس آئے؟''

''نہیں' میں نے بہت دعائیں مانگی تھیں کہ نہ آئیں اب تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا دعا مانگنی چاہیے اور کیا نہیں۔'' آنسوؤں نے پھر اس کی آنکھیں دھندلا دیں۔

''کیا وہ سب باتیں جانتے ہیں؟''

''پتا نہیں' میں نے بہت مرتبہ شاہ جی سے کہا تھا کہ ان سے کہیں' وہ پیر صاحب سے ہماری سفارش کریں۔ شاہ جی نے انہیں میرے اور اپنے متعلق بتایا بھی تھا۔''

''پھر تو وہ جانتے ہوں گے؟'' رضیہ فکر مند ہو گئی۔

''مجھے اپنی پروا نہیں ہے' شاہ جی کی فکر ہے' انہیں کسی صورت یہ گوارا نہیں ہو گا کہ ان کی بیوی کبھی ان کے بھائی کی محبوبہ رہی ہو۔ ٹھیک ہے یہ شادی ان کے لئے بھی زبردستی کا بندھن ہے مگر اب تو بندھ گیا ہے۔ وہ یہ بات برداشت نہیں کر سکیں گے۔''

''میرا دل کانپ رہا ہے زرینہ۔'' وہ بولی۔ ''وہ ضرور جانتے ہوں گے۔''

''پتا نہیں' لیکن کل شاہ جی نے مجھے پھر رقعہ بھجوایا تھا۔''

''کیا؟'' رضیہ گھبرا گئی۔ ''کیوں؟''

''یہ کہنے کے لئے کہ میں گزرے ہوئے کل کو بھول جاؤں اور خوش رہنے کی کوشش کروں۔''

''ہونہہ! کتنی آسانی سے یہ مشورہ دے دیا انہوں نے تمہیں۔''

''نہیں رضیہ! تم انہیں نہیں جانتیں' میں جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ انہوں نے دل پر کیسے پتھر رکھا ہو گا۔ وہ کس عذاب کس اذیت سے گزرے ہوں گے۔''

''کیا انہیں خیال نہیں ہے کہ بڑے شاہ صاحب کو خود ہی ہر بات کا اندازہ ہو جائے گا۔''

''میں نے سوچا تھا۔'' وہ بولی۔ ''مجھے خیال آیا کہ شاہ جی مجھے ہمیشہ گوری کہتے ہیں' ممکن ہے' انہوں نے ان کے سامنے کبھی میرا نام نہ لیا ہو' گوری ہی کہتے ہوں۔''

''اگر ایسا ہوا تو یہ اچھا ہی ہے۔''

پتا نہیں کہ اتنے برے کے بیچ کچھ اچھا بھی ہوسکتا ہے یا نہیں۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''اور تم نے اس رقعے کا کیا جواب دیا؟''

''میں نے خود پر بہت بند باندھے تھے۔ سوچا تھا کہ قسمت میں جتنا رونا تھا' وہ تو میں شادی والی رات ہی رو چکی ہوں' اب یوں بھی آنسو بچے ہی کہاں ہوں گے لیکن ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذ کا وہ ٹکڑا تھامتے ہی میرا ضبط جواب دے گیا۔ اتنی شدت سے احساس ہوا کہ اب ہر چیز بدل گئی ہے۔ ہر خواب' ہر تمنا' ہر خواہش فنا ہوگئی ہے' ہر رشتہ ہر تعلق بدل گیا ہے' پہلے آنکھیں بند کرتے ہی ان کی صورت سامنے آجاتی تھی' اب اس خوف کے مارے میں آنکھیں ہی بند نہیں کرتی کہ اب کسی اور کے متعلق سوچنا بھی گناہ ہے اور جس کے متعلق مجھے سوچنا چاہیے' اس کے لئے میرے دل میں مزید نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ پہلے میں ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو لیتی تھی' ان کے لئے ہنستی تھی ان کے لئے روتی تھی۔

لیکن اب دوریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ایک چھت تلے رہنے کے باوجود میں انہیں دیکھ بھی نہیں سکتی اور دیکھ لوں تو احساسِ گناہ کب پیچھا چھوڑے گا۔

یہ سب خیال آتے ہی میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہی' بے بسی کا احساس مجھے مار رہا تھا۔ میں اپنے آپ میں مر رہی تھی۔'' وہ خاموش ہوگئی۔

''پھر؟''

''ان کی شادی ہونے والی ہے ناں؟ انہیں یہ شادی کر لینی چاہیے۔'' وہ بولی۔ ''اس لئے میں نے ان سے کہہ دیا کہ شاید یہ کسی اور کا رقعہ ہے' جو شاید غلطی سے مجھ تک پہنچ گیا ہے' ورنہ میں نہ کسی گوری کو جانتی ہوں اور نہ حیدر علی شاہ کو۔

مجھے رجب علی شاہ سے اتنی شدید نفرت ہے کہ یہ بات کہنے کی وجہ اس کی عزت کا پاس کرنا نہیں تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں خود حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہتی تھی اور یہی شاہ جی کے لئے بھی چاہتی تھی۔ نہ ان دوریوں کو بانٹنا ہمارے اختیار میں ہے اور نہ وقت کا پہیا الٹا چلانا ہمارے بس میں ہے' اس لئے ہمیں سب کچھ بھول جانا چاہیے۔

میں شاہ جی کو کچھ نہیں دے سکتی تو ان کی زندگی کو لاحاصل کے بیابان میں بھٹکنے کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتی۔'' رضیہ نے محسوس کیا کہ اپنی صاف گوئی میں وہ خود کو بھی اذیت دے رہی تھی' اپنے جسم میں آپ ہی نشتر چبھو رہی تھی اور اس تکلیف کو پورے شعور کے ساتھ محسوس کرنا چاہتی تھی۔

''بڑے شاہ صاحب تمہارے پاس آئیں گے تو کیا تم انہیں کچھ بتاؤ گی۔'' رضیہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''شاید شاہ جی کا نام لئے بغیر سب کچھ بتا دیتی' لیکن اب ان کا حکم کیسے ٹال سکتی ہوں۔ میرا اور رجب علی کا رشتہ ایسا ہے کہ میں اسے اپنا جسم دینے سے انکار نہیں کرسکتی' لیکن میرے دل اور میری روح تک وہ کبھی نہیں پہنچ سکتا۔''

''تم خود کو اذیت دے رہی ہو زرینہ۔''

اس نے کچھ نہیں کہا اور اپنے زیور اتارنے لگی۔

''آج شاید چھوٹے شاہ صاحب نے ولیمے میں شرکت نہیں کی۔''

رضیہ نے کہا تو بالوں میں اٹکے ہوئے جھومر کو اتارتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے۔

''جب ہم یہاں آرہے تھے تو وہ دوسری سمت میں جا رہے تھے۔''

''ہوں۔'' اس نے اور کچھ نہیں کہا۔

''یاسمین کو دیکھا تھا تم نے؟'' رضیہ نے پوچھا۔

''نہیں تو' وہ وہاں کب آئی تھی؟''

''آئی تو تھی' لیکن تم اپنے آپ میں نہیں تھیں۔'' وہ بولی۔

''بس تھوڑی دیر کے لئے آئی تھی تاکہ سب کو یہ باور کرا سکے کہ بڑے شاہ صاحب کی دوسری شادی نے حویلی کے رشتوں میں دراڑیں نہیں ڈالیں' لیکن اس کا اترا ہوا چہرا اور سوجی ہوئی آنکھیں' وہ سب باتیں کہہ رہے تھے' جو وہ زبان سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔

''مجھے اس سے ہمدردی ہے' لیکن اس سے زیادہ اس کے لئے میں کچھ نہیں کرسکتی۔'' اس نے خود کو لاتعلق ظاہر کرنا چاہا تھا۔

''اس سے زیادہ تو تمہیں ہمدردی کی ضرورت ہے۔''

''تم تو آتی رہو گی ناں ملنے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں کل بھی اماں کی منتیں کرتی رہی' لیکن انہوں نے آنے کی اجازت نہیں دی پتا نہیں اب بھی اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ حویلی کی باقی عورتوں سے کوئی تفصیلی ملاقات ہوئی؟''

''تفصیلی تو نہیں' البتہ جو مختصر سی ملاقات تھی' وہی کافی تھی۔''

''مجھے اندازہ ہے کہ اس دوران کیا بات چیت ہوئی ہوگی۔'' رضیہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا تم سے کہ یہ سب تمہیں اپنے برابر مقام دینے پر تیار نہیں ہوں گی۔''

''مقام دلوانا اس شخص تک ہوتا ہے' جس سے بندھن بندھتا ہے۔ شاہ جی کی بات اور تھی۔'' وہ ایک لمحے کے لئے رکی۔

''اور میں تو یوں بھی دوسری بیوی ہوں' ایسی بیوی جو مسلط ہوگئی ہے خواہ مخواہ۔''

وہ پھر اپنے آپ کو اذیت دینے پر تل گئی تھی۔

''تم خود پر ظلم کر رہی ہو ایسی باتیں کر کے۔''

''تو کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟'' اس نے رضیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''تمہارے انداز میں سفاکی ہے۔''

''حقیقت ہی کہی ہے۔'' وہ بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔'' زرینہ نے کہا۔

ایک خادمہ اندر داخل ہوئی۔

''رضیہ بی بی کو آپ کی اماں بلا رہی ہیں۔''

رضیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں کوشش کروں گی آنے کی' پر وعدہ نہیں کرتی۔''

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''مجھے پتا ہے میں' اماں ابا کے لئے پرائی ہو گئی ہوں۔''

اسے پیار کر کے رضیہ باہر چلی گئی۔

''بی بی! کھانا تو ٹھنڈا ہو گیا ہے۔'' خادمہ نے کہا۔ ''دوسرا لے آؤں؟''

''نہیں' کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''اب میں آرام کروں گی' کوئی خاص بات نہ ہو تو مجھے تنگ مت کرنا۔''

''جی بہتر۔'' خادمہ باہر نکل گئی۔

''چند دن پہلے تک یہ میرا نام لیتی تھی' مجھ سے ہنستی بولتی تھی۔'' اس نے سوچا۔ ''قدرت کی ستم ظریفی ہے۔''

وہ جان بوجھ کر اپنی سوچوں کو ایسی باتوں میں اٹکانے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

چوکھٹ پر جمے وہ دو گلابی ہاتھ مسلسل رجب علی کا پیچھا کر رہے تھے اور اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔

''میں اس قدر کمزور تو نہیں ہوں کہ انہیں اپنے ذہن سے جھٹک ہی نہ سکوں۔ نہیں وہ ایک ایسی لڑکی کے ہاتھ ہیں' جو میری نہیں ہے' جو نہ جانے کس کے ساتھ کون سا تعلق جوڑنے جا رہی تھی کہ قدرت اسے میرے راستے پر لے آئی۔

اگر مجھے اپنی عزت کا پاس نہ ہوتا تو ڈیرے کے ملازمین سے یہ بات با آسانی معلوم کی جا سکتی ہے کہ یہ لڑکی کس کے ساتھ آئی تھی' لیکن اپنے آپ کو اس حد تک گرانا مجھے گوارا نہیں ہے۔ وہ کچھ بھی ہو' میری بیوی بنا دی گئی ہے اور اپنی بیوی کے متعلق ملازمین سے چھان بین کرنے کو میری غیرت کیسے گوارا کر سکتی ہے۔

پتا نہیں گاؤں میں کس کس کو اس کے معاشقے کا علم ہو گا اور لوگ کیا کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔ اس کا جرم نا قابلِ معافی ہے۔ وہ اپنی راہ پر چلتی جاتی تو کوئی حرج نہیں تھا یا پھر باقی لڑکیوں کی طرح میرے راستے میں آ کر دبے قدموں گزر جاتی۔ یہ اس کی غلطی نہیں جرم ہے اور اس حرکت کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔''

لیکن اس کے تصور میں پھر وہ گلابی ہاتھ ابھر آئے۔ وہ جھلا اٹھا۔

''شکورے۔'' اس نے آواز دی۔

''جی سرکار۔'' وہ دوڑا آیا۔

''گاڑی تیار کرو' ہمیں ڈیرے پر جانا ہے۔''

☆======☆======☆

''تم نے اچھا نہیں کیا علی۔'' مہر النسا کہہ رہی تھی۔

''کیا اچھا نہیں کیا؟''

''آج ولیمے میں تم نہیں تھے۔ یہ بات سب نے محسوس کی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے بابا جان اماں جان کو بتا رہے تھے کہ وہاں سب تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے۔''

''آپ جانتی ہیں میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ میں اتنے اعلیٰ ظرف کا مالک نہیں ہوں نہ ہی کوئی فلمی کردار ہوں۔ بہتر یہی تھا کہ میں وہاں نہ رہتا۔ میری غیر موجودگی سے باقی سب بھی پریشانی سے بچ گئے ہیں۔''

''اب جب ایسا ہو چکا علی تو تم بھی پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ تمہیں دیکھ کر میرا دل کٹنے لگتا ہے' اس طرح سوچتے رہے تو تم خود کو ختم کر لو گے۔'' مہر النسا کی آنکھیں بھر آئیں

''مجھے زندہ رہنے سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔''

''علی' علی۔'' وہ دوڑ کر آئی اور اسے خود سے لپٹا لیا۔ ''تم ایسا نہ کہو۔ ابھی تو زیبی کا غم بھی کم نہیں ہوا اور تم ایسی باتیں کرنے لگے۔ کیا ہے وہ لڑکی جس کی خاطر تم خود کو روگ لگا رہے ہو۔'' وہ رونے لگی۔

''میں نے دیکھا ہے اسے۔ وہ بالکل مطمئن ہے تمہاری پروا بھی نہیں ہے اسے' بھول چکی ہے وہ تمہیں' خود اس نے تم سے کہا تھا کہ وہ تمہیں نہیں جانتی' پھر ایسی لڑکی کے لئے جان دے دو گے؟ تمہارے لئے کیا صرف اسی کی اہمیت ہے' میری کوئی اہمیت نہیں ہے؟ میں جو تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں' خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ محبتیں تو علی زندگی دیتی ہیں' یہ کیسی محبت ہے' تمہاری کہ زندگی لینے لگی ہے۔''

''آپا۔'' اس نے مہر النساء کو چپ کرانا چاہا۔

''نہیں ہوں میں تمہاری آپا۔'' وہ پیچھے ہٹ کر چلائی۔

"میں نے زیبی کو منع کیا لیکن اس نے اپنی مرضی چلائی۔ تمہیں منع کرنے کی کوشش کی، لیکن تم نے میری ایک نہ مانی پھر کس منہ سے مجھے آپا کہتے ہو۔"

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"مان لو کہ اب اس کی شادی ہوگئی ہے' مان لو کہ تم دونوں کے درمیان جو بھی تعلق تھا' وہ ختم ہو چکا ہے' مان لو کہ اب وہ تمہارے بھائی کی عزت ہے اور تم اپنے بھائی کی عزت سے نہیں کھیل سکتے۔ کیا تمہیں اتنا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اسے بار بار گوری کہہ کر' اس انداز سے اسے یاد کر کے تم اپنے بھائی کی عزت تار تار کر رہے ہو۔

اس کی یاد اتنا ستاتی ہے تو جاؤ اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لاؤ' مگر تم یہ نہیں کر سکتے' کر سکتے ہو؟"

"آپا! میری بات سنیں۔"

"تم لوگ ہر وقت اپنی سنانے کے عادی ہو' لیکن آج میری بات سنو!" اس نے حیدر علی کو ڈپٹ دیا۔

"وہ تمہاری بھابی بن چکی ہے اور بھابی' دیور کا رشتہ وہ نہیں ہوتا' جس کے لئے تم اتنے افسردہ ہو۔ اپنے دیوروں کے لئے وہ ماں اور بہن کی جگہ لے لیتی ہے۔ سمجھے تم؟ اپنی ماں یا بہن کے لئے اس انداز میں سوچ سکتے ہو تم؟"

حیدر علی کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ اٹھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

مہرالنساء کی باتیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کی سماعت سے ٹکرا کر پورے وجود میں پھیل گئی تھیں۔

"اس کی یاد اتنا ستاتی ہے تو جاؤ اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لاؤ' مگر تم یہ نہیں کر سکتے' کر سکتے ہو؟" در و دیوار چیخنے لگے تھے۔

"وہ تمہاری بھابی بن چکی ہے اور بھابی دیور کا رشتہ وہ نہیں ہوتا' جس کے لئے تم اتنے افسردہ ہو' اپنے دیوروں کے لئے وہ ماں اور بہن کی جگہ لے لیتی ہے سمجھے تم' اپنی ماں یا بہن کے لئے اس انداز میں سوچ سکتے ہو تم؟"

اس کے کمرے کی دیواریں مسلسل یہی بات دہرا رہی تھیں۔ گھوں گھوں چلتا پنکھا طنز سے مسکرا رہا تھا' ایک ایک اینٹ اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ پاگل ہوا جا رہا تھا اور پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

نا معلوم رات کا کون سا پہر تھا' لیکن حویلی کے مکین گہری نیند میں تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک ایک کو جھنجھوڑ کر جگائے اور بتائے کہ گوری اس کی ہے۔ صرف اور صرف اس کی۔ اس پر کسی کا حق نہیں ہے سوائے اس کے' وہ جو اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے' جس کی گوری سے محبت

دوری کا بندھن نہیں ہے' اب بھی وہ ایک دوسرے کو اسی طرح چاہتے ہیں۔ محض دو دن کی دوری کے درمیان قائم محبت کے اٹوٹ بندھن کو کیسے ختم کر سکتی ہے۔

اسے ہوش آیا تو وہ زرینہ کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

☆======☆======☆

رات پل پل بیتی جا رہی تھی' لیکن رجب علی کی آنکھوں میں نیند کا نشان نہیں تھا اس نے پہلو میں لیٹی یاسمین کی طرف دیکھا جو کافی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد اب سو چکی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سونے کی کوشش کی۔ آنکھیں موندتے ہی کمرے کے دروازے کی چوکھٹ تھامے دو گلابی ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے آ گئے۔

ان ہاتھوں نے پورا دن اسے پریشان کیے رکھا تھا۔ وہ تنہائی چاہتا تھا' لیکن تنہا ہوتے ہی ہاتھ اس کے سامنے آ جاتے تھے۔ سختی سے بھینچے' نفرت کا اظہار کرتے وہ ہاتھ' ہاں آنکھیں ہی نہیں' ہاتھ بھی پوری کہانی سنا دیتے ہیں اور وہ ہاتھ اسے نفرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان سنا رہے تھے۔

رجب علی کے اندر جنگ جاری تھی' وہ خود اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ وہ گلابی ہاتھ اس سے بغاوت کر رہے تھے اور اپنے خلاف ہونے والی ہر بغاوت کو کچل دینا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ روندنا' شکست دینا چاہتا تھا' لیکن وہاں تو بات ہی مختلف تھی۔ وہ ہاتھ اسے اپنی طرف بلا رہے تھے' اس سے شکست کھانے کے لئے نہیں' بلکہ اسے شکست دے دینے کے لیے۔ وہ انہیں ذہن سے جھٹکنے کی جتنی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اسی قدر اس پر مسلط ہوئے جا رہے تھے۔ تھک ہار کر اس نے انہیں روند دینے' ختم کر دینے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

"وہ لڑکی اس قابل ہرگز نہیں ہے کہ پیرزادہ رجب علی شاہ کی بیوی بنے۔" اس نے شعوری کوشش سے سوچا۔

"اسے میری ہر ذہنی اذیت کی سزا بھگتنا ہوگی۔ ان ہاتھوں کو سزا کاٹنی ہوگی' جن کی ایک ایک لکیر میں نفرت کا آتش فشاں ابل رہا تھا۔ اس زبان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہوگا جس نے "شاید قسمت۔" کہہ کر ایک تیسرے درجے کی خادمہ کے سامنے میری تذلیل کی تھی۔"

لیکن ہر دلیل بے کار تھی' جو بات وہ اپنے ذہن میں بٹھانا چاہ رہا تھا' اس پر اسے خود بھی زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ نائیٹ بلب کی مدھم نیلگوں روشنی میں اس نے ایک نظر یاسمین کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"مجھے اس لڑکی سے اپنی تذلیل کا حساب لینا ہے۔" اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

☆======☆======☆

زرینہ کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر حیدر علی کو احساس ہوا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ اس

نے بے بسی سے بند دروازے کی سمت دیکھا۔ لکڑی کا بھاری منقش دروازہ اتنا مضبوط' اتنا موٹا تھا کہ اگر اس کی گوری اندر رو رہی تھی' سسک رہی تھی' تو بھی اس کی آہیں باہر تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔

وہ باہر کھڑا اس دروازے کو تکتا رہا۔ دوری محض دو دن یا ایک دروازے کی نہیں تھی' اخلاق اور مذہب کی تھی' بھائی کی عزت کی تھی' وہ دو دن تو کیا' دو صدیوں کی دوری بھی پاٹ سکتا تھا' لیکن مذہب' اخلاق اور عزت کی بیڑیاں نہیں توڑ سکتا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر دروازے سے پلٹ آیا۔

نیند زرینہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ قالین پر پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی وہ سپاٹ دیوار کو تک رہی تھی۔

پچھلے دنوں کے واقعات آپس میں گڈمڈ ہوئے جا رہے تھے۔ کتنے ہی چہرے' کتنے ہی رویے کتنی ہی باتیں اور کتنے ہی واقعے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ تھے۔ اتنی مضبوطی کے ساتھ کہ انہیں الگ کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلنے والے کمرے کے دروازے سے رجب علی کو اندر داخل ہوتے بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔

کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں وہ پریوں کے دیس کی کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ رجب علی اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس' لمبے بال پشت پر بکھیرے' دوپٹے سے بے نیاز۔ اسے تو احساس بھی نہیں تھا کہ کمرے میں کوئی داخل ہوا ہے۔

رجب علی نے شعوری طور پر خود کو غصہ دلانے کی کوشش کی۔ ایک مسلط کی گئی عورت اس قابل ہرگز نہیں تھی کہ اس کی' پیرزادہ رجب علی شاہ کی آمد کو نظرانداز کر دے۔ رجب علی شاہ جو اب اس کا شوہر بھی ہے۔

لیکن نہ جانے اس میں کیا سحر تھا کہ تمام تر کوشش کے باوجود بھی وہ اس پر غصہ نہ کر سکا۔ کتنے لمحے دبے پاؤں سرکتے گئے۔

وہ دیوار کو تک رہی تھی' پلک جھپکائے بغیر اور رجب علی اسے تک رہا تھا۔ وہ اس کی توقعات سے بڑھ کر حسین تھی اور بے حد معصوم بھی۔

اسے زندگی سے ہمیشہ یہ شکوہ رہا تھا کہ اسے کبھی محبت نہیں ہوئی' بہت سی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں اور نکل گئیں' لیکن کوئی اس کے قدم نہیں جکڑ سکی۔

مگر آج زرینہ کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ منتر پڑھ کر اس کے قدم جکڑ دینے والی ہستی اس کی زندگی میں اب آئی ہے۔

☆======☆======☆

حیدر علی اپنے کمرے میں بیٹھا سگرٹ پھونک رہا تھا۔ گوری کے کمرے کے دروازے سے ہی قدموں کی چاپ ابھری تھی۔ اور رجب علی اس کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد حیدر علی اپنے کمرے میں پلٹ آیا تھا۔

''مجھے اس کے بارے میں ایسے نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ میرے بھائی کی عزت ہے۔'' بار بار وہ خود کو سمجھا رہا تھا' لیکن لفظوں کے اس کھیل سے اسے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ باتیں کہہ دینا بہت آسان ہوتی ہیں' سمجھنی بہت مشکل۔

''اس دن وہ کتنی اچھی لگ رہی تھی' جب میں نے خوشبو کی ساری شیشی اس پر انڈیل دی تھی۔'' اس کی سوچیں پھر بھٹکنے لگیں۔

''ہنستے ہوئے وہ بہت پیاری لگتی ہے' پتا نہیں اب وہ ہنستی ہو گی یا نہیں؟''

''لیکن اب مجھے اس کے بارے نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ میری بھابی ہے۔ یہ بات چاہے روح تک کو گھائل کر دے' لیکن یہ حقیقت ہے۔''

ساری رات یونہی بیت گئی' خود کو سمجھاتے اور یادوں میں بھٹکتے ہوئے' بار ہا وہ اس کے کمرے کے دروازے تک جا کر پلٹ آیا۔ مہرالنسا کے الفاظ سیسہ بن کر سماعت میں اترتے رہے۔

صبح فجر کے وقت حویلی میں چہل پہل شروع ہوئی تو وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

سخاوت اور رجب علی کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔

''بھائی جان! آج آپ کا گھڑ سواری کا پروگرام نہیں ہے؟'' سخاوت رجب علی سے پوچھ رہا تھا' جو ہمیشہ کی طرح گھڑ سواری کے مخصوص لباس میں ملبوس نہیں تھا۔

''آج نہیں' پھر کسی دن۔'' رجب علی نے کہا۔ ''آج کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے۔''

سخاوت کی نظر حیدر علی پر پڑی۔

''آپ علی بھائی سے سفارش کر دیں۔'' اس نے رجب علی سے کہا۔

''تمہارے علی بھائی کو اب میری ضرورت نہیں رہی' تم خود کہہ کر دیکھ لو۔''

حیدر علی ان کی گفتگو کو نظرانداز کر کے آگے بڑھنے لگا' لیکن سخاوت جلدی سے اس کے پاس چلا آیا۔

''علی بھائی!''

''ہوں۔'' وہ رجب علی کو نظرانداز کر کے رک گیا۔

''آج آپ اتفاق سے جلدی جاگ گئے ہیں تو پلیز رائیڈنگ کے لئے چلے چلیں۔''

''میں بابا جان کے پاس جا رہا ہوں' اس کے بعد چلیں گے۔''

"ٹھیک ہے، میں باہر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر پیر صاحب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

آج اس کی چال میں ہمیشہ والی خود اعتمادی کے بجائے ایک عجیب طرح کی شکست تھی۔ چہرہ تھکا ہوا تھا۔ یوں جیسے میلوں پیدل چل کر آیا ہو۔ ذہانت سے چمکتی آنکھیں نیند کی کمی کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔

اماں جان کو سلام کر کے وہ پیر صاحب کے پاس چلا آیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے بابا جان۔"

"آرام سے یہاں بیٹھ کر بات کرو۔ آج انہیں حیدر علی کی طرف سے کسی انکار کا خدشہ نہیں تھا۔ آج وہ ہمیشہ والا حیدر علی نہیں تھا۔

"میں یہ کہنے آیا ہوں بابا جان! کہ آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے۔" وہ ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔

انہوں نے اسے بغور دیکھا۔ سر جھکائے انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے اپنی بات کر کے کتنی دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

"بابا جان آپ اس حویلی کو بچانا چاہتے ہیں ناں تو پلیز فوری طور پر میرا نکاح کر دیں۔" اس نے اچانک سر اٹھا کر کہا۔

"میں اور اذیت برداشت نہیں کر سکتا۔"

اور اس لمحے پیر صاحب کے سامنے ہر گرہ خود بخود کھل گئی۔

☆======☆======☆

رضیہ بے دلی سے گھر کے کاموں میں مصروف تھی۔ اماں باہر تخت پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اباجی مسجد میں تھے۔ فضا پر عجیب سی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں حمیدہ گھر میں داخل ہوئی۔

"سلام چاچی!"

"وعلیکم اسلام!" اماں نے کروٹ بدل لی، کسی سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ رضیہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی۔

"حمیدہ خیر ہے ناں، زرینہ تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں، زرینہ بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے تسلی دی۔ "میں یونہی ملنے چلی آئی تھی۔"

"آؤ بیٹھو۔" وہ دونوں صحن میں پیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔

"سب سے پہلے مجھے زرینہ کا بتاؤ وہ کیسی ہے؟"

"ابھی میں اسی کے پاس سے آ رہی ہوں۔ وہ ٹھیک ہے، بس تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔" رضیہ نے ایک نظر تخت پر لیٹی اماں کی طرف دیکھا۔ "اماں نہیں جانے دیتیں۔"

"پتا ہے، آج پیر صاحب چھوٹے شاہ صاحب کے سسرال گئے تھے۔" اس نے انتہائی رازداری سے کہا۔

"ہونہہ! اب ان کی شادی ہو یا نہ ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" رضیہ نے تلخی سے کہا۔

"میری بہن کی زندگی برباد کرنی تھی، سو وہ کر دی انہوں نے۔"

"تم نے ان کی حالت دیکھی نہیں ہے، ورنہ یوں نہ کہتیں۔ کل رات بھی وہ بڑی بی بی کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے تو پوری کوشش کی تھی، لیکن تقدیر پر بھی کسی کا بس چلا ہے؟"

"ہر چیز اپنی جگہ، انہوں نے پوری کوشش کی تھی، میں نے مان لیا، وہ اب بھی اسے یاد کرتے ہیں، یہ بھی مان لیا، لیکن اس پورے قصے میں زرینہ کے ہاتھ کیا آیا وہ اپنی دنیا میں آج نہیں تو کل مگن ہو جائیں گے، لیکن میری بہن اس ماحول میں نہیں رہ سکے گی، گھٹ گھٹ کر مر جائے گی وہ؟" اس نے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی۔

"وہ واقعی بہت افسردہ لگ رہی تھی آج۔" حمیدہ نے کہا۔

"کچھ غیر حاضر دماغ بھی لگی مجھے وہ۔ پتا ہے رضیہ، حویلی کا ماحول بہت عجیب سا ہو رہا ہے آج کل، ہر طرف کھنچاؤ کی سی کیفیت ہے۔"

"کک، کیا بڑے شاہ صاحب کو کچھ خبر ہو گئی؟" رضیہ نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

"نہیں، اتنا تو یقین ہے مجھے کہ انہیں کچھ خبر نہیں ہے۔ بڑی بی بی مجھے ہر بات بتا دیتی ہیں۔ پہلے میں ہر بات اپنے اندر رکھ لیتی تھی، لیکن جب سے چھوٹی بی بی پر وہ سب کچھ بیتا ہے۔ میرے اندر بہت گھٹن ہو گئی ہے۔ میں ہر بات کسی سے کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لینا چاہتی ہوں، تب ہی تو تمہارے پاس آ جاتی ہوں۔"

"دل کا یہ بوجھ تم مہر النساء بی بی کے سامنے بھی ہلکا کرتی ہو گی؟"

"نہیں، وہ تو اپنے دکھوں اور غموں کی گٹھڑی اٹھانے کے لئے بھی میری مدد لیتی ہیں۔ میں اپنے اندر کے غبار کا بوجھ ان پر کیسے لاد سکتی ہوں۔ میں تو بس تم سے کہہ دیتی ہوں۔" وہ بولی۔

"زرینہ چھوٹے شاہ صاحب کو یاد کرتی ہے؟"

"ہاں، لیکن زبان سے نہیں، چھوٹے شاہ صاحب کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی ہے۔ دعا کرو ان کی شادی وقت پر ہو جائے۔ شاید یوں وہ ہونی ٹل جائے، جو نہیں ہونی چاہیے۔" حمیدہ تنکے سے مٹی میں لکیریں کھینچنے لگی۔

"پیر صاحب آج ان کے سسرال گئے ہیں۔ بی بی بتا رہی تھیں کہ آج چھوٹے شاہ صاحب کا نکاح ہو جائے گا، لیکن رخصتی وقت پر ہو گی یوں بھی اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ ان کی شادی میں، اور ہاں پیر صاحب خانقاہ حضرت صاحب والی حویلی ان کے لئے ٹھیک کروا رہے ہیں۔"

خانقاہ حضرت صاحب پیر صاحب کی جاگیر کا قریبی گاؤں تھا۔

"لیکن اتنی عجلت میں نکاح؟" رضیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"مجھے بی بی نے بتایا ہے' بات دراصل یہ ہے۔"

☆======☆======☆

رجب علی خود کو مختلف کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال' فصل کا حساب' مزارعوں کی کھچ کھچ۔ کتنے کاموں میں خود کو الجھا رکھا تھا اس نے' لیکن دوپہر کی دھوپ میں شدت آتے ہی جب سب اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے تو وہ حویلی کی بیٹھک میں اکیلا رہ گیا اور تب اسے وہ سب کچھ یاد آیا جسے نظرانداز کرنے کی وہ صبح سے کوشش کر رہا تھا۔

وہ واقعی ساحرہ تھی۔ منتر پڑھ کر قدم جکڑنے والی نہیں' صرف دیکھ کر پتھر کا بنا دینے والی' اسے دیکھ کر رجب علی کو قدیم یونانی گورگن بہنوں کا خیال آ گیا تھا۔ کیٹس کی لا بیلا دام یاد آ گئی تھی۔ بس فرق تھا تو اتنا کہ وہ طاقت ور تھیں یہ کمزور۔

جیسے ہی زرینہ کی نگاہ اس پر پڑی تھی' کمرا سونے کی چوڑیوں کی کھنک سے بھر گیا تھا اس کے ہاتھ ہی نہیں' آنکھیں' ہونٹ' چہرے پر ابھرتے والی لکیریں' سب ہی کچھ نفرت کی داستان سنا رہا تھا اور رجب علی کی بدقسمتی کہ وہ چاہنے کے باوجود اس سے نفرت نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے زرینہ سے بہت کچھ کہا تھا۔ نہ جانے کیا کیا لیکن اس کی یادداشت میں صرف اس کی جامد خاموشی باقی رہ گئی تھی۔ زرینہ نے صرف سنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی کچھ بولے' لیکن وہاں صرف ایک چپ تھی۔

رجب علی کو اس چپ سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ تو کہتی' محبت کا نہیں تو نفرت کا ہی اظہار کر دیتی۔ اپنی اس محبت کا اعتراف ہی کر لیتی' جس کی اذیت پل پل رجب علی کے اندر اترتی جا رہی تھی۔ اس کے قرب سے وحشت ہونے لگی تھی تو دور ہٹ جانے کو ہی کہہ دیتی' ہنسنا نہیں چاہتی تھی تو رو ہی پڑتی۔

لیکن اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ تو کسی پتھر سے بنے مجسمے کی طرح لاتعلق اور خاموش تھی۔ وہ خاموشی اتنی دبیز تھی کہ رجب علی خود بخود ہی احساسِ جرم میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ یوں جیسے سب کچھ غلط ہو گیا ہو اور اس سارے کا ذمہ دار وہ ہو صرف اور صرف رجب علی۔

اسے زرینہ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس نے اس کا وجود' اس کی ذات' اس کے ہر رویے کو پل بھر میں رد کر دیا تھا۔ اپنی خاموشی کے ساتھ۔ اس سے پہلے وہ کبھی رد نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ جیتتا آیا تھا ہارنا اسے آتا ہی نہیں تھا اور زرینہ اسے ہرا رہی تھی' وہ زرینہ جو خود بھی ہاری ہوئی تھی۔ ایک ہاری ہوئی عورت سے مات کھانا رجب علی کو گوارا نہیں تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدم خود بخود زرینہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر دونوں خادمائیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

سادہ نیلے پرنٹڈ سوٹ میں' بندھے بالوں کو دوپٹے سے چھپائے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ رجب علی کو اندر آتے دیکھ کر وہ وہیں صوفے پر ساکت ہو گئی۔

رجب علی کمرے کے وسط میں رک گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس زرینہ سے کہنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں' وہ اس کی محبت کو نہیں سمجھ سکتی اور سمجھ جائے تو بھی اس کی نہیں بن سکتی وہ محبت کے بس ان دیکھے حصار میں قید تھی' وہاں سے اسے باہر نکالنا رجب علی کے بس میں نہیں تھا۔

"تم نے کھانا کھا لیا؟" اسے اپنے وہاں آنے کا جواز گھڑنا پڑا۔ زرینہ کو مطمئن کرنے کے لئے نہیں' خود کو مطمئن کرنے کے لئے کہ وہ تو صرف اس سے کھانے کا پوچھنے آیا تھا۔

لیکن دوسری طرف خاموشی تھی۔

"یوں خاموش رہ کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟" اس کے وجود میں چنگاریاں سی دہکنے لگیں۔

"تم دو کوڑی کی عورت جو اپنے جیسے دو کوڑی کے نہ جانے کس شخص کے ساتھ وقت گزارتی رہی ہو' تم ہم سے مقابلہ کر رہی ہو۔ اس گدی کے وارث سیّد رجب علی شاہ سے۔"

وہ سانس لینے کو رکا' لیکن وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ یوں جیسے وہ یہ سب کچھ اس سے نہیں کسی اور سے کہہ رہا ہو۔

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟" وہ طیش میں اس کی طرف بڑھا' لیکن زرینہ نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

"تم میری پیشانی پر لگا وہ داغ ہو جسے مٹ جانا چاہیے ابھی اسی وقت۔"

اس کے ہاتھ زرینہ کی مرمریں گردن کی طرف بڑھے اور اسے چھوتے ہی جیسے سب کچھ بدل گیا۔

"میری بدقسمتی ہے کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار بھی نہیں سکتا۔" رجب علی نے شکستگی سے سوچا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

پیر صاحب نے حیدر علی کو خانقاہ حضرت صاحب والی حویلی میں بھجوا دیا تھا تاکہ اپنی نگرانی میں اسے ٹھیک ٹھاک کروا سکے' لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اسے حویلی سے دور بھجوانا چاہتے تھے۔ اس جگہ سے دور بھجوانا چاہتے تھے جہاں زرینہ تھی۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا تو وہ اس کی شکستگی دیکھ کر خوش نہیں ہوئے تھے' لیکن مطمئن

ہو گئے تھے۔ پر جب انہیں گرہیں کھلنے پر حقیقت کا ادراک ہوا تھا تو وہ بجھ کر رہ گئے تھے۔ایک لڑکی کی خاطر انہیں اس کا ٹوٹنا گوارا نہیں تھا اور لڑکی بھی ایسی جس کی حیثیت بالکل تبدیل ہو چکی تھی۔حویلی کی بہتری اسی میں تھی کہ وہ وہاں سے دور چلا جائے' اس لئے انہوں نے اسے دوسری حویلی میں بھجوا دیا تھا اور خود اپنے برادرِ نسبتی کے پاس چلے گئے تھے انہیں اور ان کے گھرانے کو جلد نکاح پر کوئی اعتراض نہیں تھا یوں بھی اب تو بمشکل تین دن رہ گئے تھے رخصتی میں۔

☆======☆======☆

حیدر علی ایک کرسی پر بیٹھا حویلی کی تزئین و آرائش دیکھ رہا تھا۔اس نے شادی کرنے کا فیصلہ عجلت میں ضرور کیا تھا' لیکن اسے اس پر افسوس نہیں تھا۔وہ اپنے پاؤں کی بیڑیاں مضبوط کرنا چاہتا تھا' تا کہ کسی دن دیوانگی کے عالم میں کہیں وہ منقش دروازہ کھول نہ بیٹھے' جس کے قریب جانے کا اب اسے کوئی حق نہیں تھا۔

وہ زرینہ کی ہر یاد کو مٹا دینا چاہتا تھا۔تمام تر شعور کے ساتھ' کیوں کہ اب وہ اس کی گوری نہیں بلکہ اس کی بھابی تھی۔ بھابی جو ماں اور بہن کے برابر ہوتی ہے جس کی محبت ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں کی طرح ہوتی ہے۔دہکتی آگ کی طرح نہیں' جو پل بھر میں سب کچھ راکھ بنا دے۔وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ دونوں ایک چھت تلے رہیں گے' تب تک وہ بے اختیار رہے گا' خود پر کبھی قابو نہیں پا سکے گا بلکہ شاید اپنے بھائی کی عزت کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور وہ اس حد تک گرنا نہیں چاہتا تھا' وہ یہ فیصلہ کر کے دکھی تھا' لیکن نادم نہیں تھا۔

☆======☆======☆

ہولے ہولے سہی' لیکن دن گزر رہے تھے۔حیدر علی اور فوزیہ کی شادی نہایت سادگی کے ساتھ انجام پائی تھی اور وہ دونوں خانقاہ حضرت صاحب والی حویلی میں منتقل ہو گئے تھے۔

فوزیہ بہت خوش تھی۔حیدر علی نے اسے صرف اپنی نئی زندگی کی ساتھی بنایا تھا۔اس لڑکی کا اپنی زندگی کے فیصلوں پر کوئی اختیار نہیں تھا۔اس بے چاری کو تو جس کھونٹے سے باندھ دیا جاتا' وہ ہنسی خوشی وہیں بندھ جاتی' پھر اسے کسی بات کا قصور وار ٹھہرانا حماقت ہوتی۔اس کا کوئی قصور نہیں تھا' پھر سزا کیوں کاٹتی وہ۔

☆======☆======☆

یاسمین ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔رجب علی کے بعد گدی کا وارث وہی تھا' لیکن یاسمین کو اپنی حیثیت روز بروز کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

''خاندان اور عزت کچھ نہیں ہوتی۔'' وہ مہر النساء سے کہتی۔''یہ حقیقت ہے کہ وہ خوبصورت ہے' میں خوبصورت نہیں ہوں۔وہ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی میرے نہیں ہوتے۔ان کی زندگی میں میری کوئی حیثیت' کوئی وقعت نہیں ہے۔''

''مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' مہر النسا کا ایک ہی جواب ہوتا۔

''لیکن وہ خوش نہیں ہیں' پتا نہیں کیوں' حالانکہ میں نے ان سے کبھی شکوہ بھی نہیں کیا' کبھی ان کی بے اعتنائی کا گلہ نہیں کیا پھر بھی وہ خوش نہیں رہتے۔''

رجب علی خوش نہیں تھا۔وہ عجیب مصیبت میں گرفتار تھا۔دور جا کر اس کے دل میں زرینہ کی محبت انگڑائیاں لینے لگتی۔اس کے قرب کی خواہش اتنی شدید ہوتی کہ وہ اس کے پاس چلا آتا' لیکن اس کے پاس آ کر اسے دیکھ کر یہ خیال کچوکے لگانے لگتا کہ اس کا جسم تو رجب علی کی ملکیت ہے' لیکن اس کا دل کسی اور کے پاس ہے' اس سے پہلے کوئی اور اسے چھو چکا ہے' اس سے اظہار محبت کر چکا ہے' اسے اپنی آغوش میں پناہ دے چکا ہے۔

تب نفرت کا لاوا اس کے اندر پھوٹنے لگتا۔اس کا دل چاہتا کہ اپنی دو نالی بندوق اٹھا کر

دونوں گولیاں اس کے جسم میں اتار دے‘ اس کے جسم سے ابلتا ہوا سرخ لہو دیکھے۔ اسے زمین پر گر کر تڑپتے ہوئے دیکھے‘ اور محبت اور نفرت کا یہ کھیل ختم ہو جائے۔ اس کی زندگی کا یہ باب بند ہو جائے۔ یہ تکلیف دہ آنکھ مچولی اس کی برداشت سے باہر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

لیکن ہر مرتبہ وہ بے بس ہو جاتا تھا۔ محبت ہر نفرت پر غالب آجاتی تھی اور اس دن جب اسے یہ خبر ملی تھی کہ زرینہ ماں بننے والی ہے تو وہ کھل اٹھا تھا۔

’’شاید اب وہ میرے قریب آجائے۔‘‘ اس نے سوچا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ خاندان کے باہر کی کسی عورت کو ان کے خاندان میں آنے کے بعد ماں بننے کا حق نہیں دیا جاتا۔ یہ جائیداد اور زمینوں کا ہی نہیں نسلوں کی حفاظت کا بھی مسئلہ تھا‘ لیکن زرینہ کی خاطر وہ ہر اصول توڑ دینے پر تیار تھا۔

پھر چند دنوں کے وقفے سے فوزیہ اور زرینہ دونوں مائیں بن گئیں۔ فوزیہ بیٹے کی اور زرینہ بیٹی کی ماں۔

’’اس کا نام تو تم رکھو گی زرینہ۔‘‘ رجب علی نے پیار سے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھا لیا۔

اسے بیٹے سے زیادہ اپنی یہ بیٹی عزیز تھی۔

’’ریشماں!‘‘ اس کے ذہن میں بہت پرانی یادوں کے در وا ہو گئے۔

’’ریشم جیسی نرم و نازک‘‘

’’ہماری یہ بیٹی ہمارے لئے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ شاید یہ بچھڑے ہوؤں کو پھر ملا دے۔‘‘ اسے حیدر علی کا خیال آگیا‘ جو اس کے بیٹے کی پیدائش پر مبارک باد دینے بھی نہیں آیا تھا۔ فوزیہ آئی تھی لیکن وہ نہیں آیا تھا۔

’’ہم بھائیوں نے بہت پہلے یہ فیصلہ کیا تھا‘ میں نے اور علی نے کہ اگر میری کبھی کوئی بیٹی ہوئی اور اس کا بیٹا ہوا تو میری بیٹی اس کی بہو بنے گی۔ میرا بھائی مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے‘ شاید یہ ہمیں آپس میں ملا دے۔‘‘

زرینہ نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

اسی روز مٹھائی کے ڈھیر سارے ٹوکروں اور کتنے ہی تحائف کے ساتھ رجب علی خانقاہ حضرت صاحب پہنچا۔

بھائی کی آمد کی خبر سن کر حیدر علی باہر آیا۔

’’اتنے خفا ہو کہ ایک بار بھی ملنے تک نہیں آئے۔‘‘ رجب علی نے بیٹھتے ہوئے گلہ کیا۔

’’ایسی بات نہیں ہے۔‘‘ وہ بولا۔ ’’ذمہ داریاں سر پر آپڑیں تو مصروفیت بڑھ جاتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میں کتنا لاابالی تھا۔ ذمہ داریوں سے کوسوں دور بھاگنے والا۔‘‘

’’لیکن کوئی مصروفیت اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ خوشی کے موقع پر بھی بھائی اکٹھے نہ ہو سکیں۔‘‘

’’آپ خود آگئے‘ ورنہ میں آپ کے پاس آنا چاہتا تھا۔‘‘ حیدر علی نے کہا۔

’’آپ کو مبارک باد دینے کے لئے بھی اور آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانے کے لئے بھی۔‘‘

’’تم سمجھتے ہو کہ میں بھول گیا ہوں؟ نہیں میں اپنا وعدہ نہیں بھولا۔‘‘

’’تھینک یو۔‘‘

’’تم چاہو تو کوئی رسم کر لو‘ چاہو تو میری زبان پر اعتبار کر لو۔‘‘

’’مجھے آپ کی زبان پر اعتبار ہے۔‘‘ حیدر علی نے کہا۔

’’بیٹے کا نام کیا ہے؟‘‘

’’عبداللہ!‘‘

’’بہت خوبصورت نام ہے۔‘‘

رات کو عبداللہ کو گود میں اٹھائے وہ سوچ رہا تھا کہ زرینہ کو وہ حویلی کی بلند و بالا دیواروں کی قید سے نہیں چھڑا سکا تھا‘ لیکن اس کی بیٹی کو وہ وہاں قید نہیں رہنے دے گا۔

ریشماں کو وہاں سے نکالنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

☆======☆======☆

بیٹی کی پیدائش کے بعد بھی رجب علی کا اضطراب ختم نہیں ہوا تھا۔ زرینہ اب بھی اس سے اتنی ہی دور تھی۔ بس فرق پڑا تھا تو اس قدر کہ بیٹی کی آمد نے خاموشی کی گہری جھیل میں کنکر پھینک کر کچھ تلاطم پیدا کر دیا تھا۔

وہ ریشماں میں مگن رہنے لگی تھی۔ اسے ہمیشہ کی طرح اب بھی رجب علی کی آمد کی خبر نہیں ہوتی تھی اور وہ دروازے میں کھڑا اسے تکتا رہتا تھا۔ جب وہ مدھم مدھم آواز میں اپنی بیٹی کے ساتھ نہ جانے کیا باتیں کرتی تھی اور کبھی اچانک ہی ہنس پڑتی تھی‘ تو یوں لگتا تھا‘ جیسے مندر میں کسی داسی کے گھنگھرو بج اٹھے ہوں۔

اس کی کائنات کا تمام تر محور اس کی بیٹی تھی۔

اس سے رجب علی یہ بھول جاتا تھا کہ زرینہ کسی اور کی چاہت اور محبت ہے اس کی محبت کی ڈور کہیں اور الجھی ہوئی ہے۔ یہ بات اسے اس وقت یاد آتی تھی جب ریشماں سو جاتی تھی اور کمرے میں صرف وہی دونوں ہوتے تھے۔ تب ہر بات اتنی ہی شدت سے اس کے شعور پر حملہ آور ہو جاتی تھی۔ محبت اور نفرت کی آنکھ مچولی دوبارہ شروع ہو جاتی تھی

رجب علی نے بہت مرتبہ چاہا تھا کہ اس شخص کے متعلق معلوم کرے‘ جو کبھی زرینہ کی تنہائیوں میں آیا تھا‘ لیکن اس کی انا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی کے منہ سے اپنی بیوی کے ماضی کے متعلق معلوم کرے۔ اپنی اس قدر تذلیل اسے گوارا نہیں تھی‘ ورنہ یہ پردہ ہٹا کر پرانے منظر دکھانے والے بہت سے لوگ موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر حمیدہ تھی‘ جو شاید اس کی بیتی زندگی

کے بہت سے رازوں سے واقف تھی' لیکن اپنی بیوی کے محبوب کا نام معلوم کرنے کی ذلت اور توہین سے وہ گزرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس دن بھی وہ دروازے میں آکھڑا ہوا تھا اور حمیدہ سے بالوں میں تیل لگواتی زرینہ کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ وہاں کھڑا ہے۔

ریشماں اپنے جھولے میں سو رہی تھی۔

''رضیہ تم سے ملنے کے لئے تڑپتی رہتی ہے' لیکن چاچی جی اور مولوی صاحب نے اسے یہاں آنے سے منع کیا ہوا ہے۔'' حمیدہ اس سے کہہ رہی تھی۔

''تڑپتی تو میں بھی ہوں اس سے ملنے کے لئے' اماں اور ابا جی سے ملنے کے لئے' لیکن اس مقبرے سے نکل نہیں سکتی۔'' وہ تلخی سے ہنس پڑی۔

''مگر اس سب کی قصور وار بھی تو میں ہی ہوں۔''

''میں نے تمہیں بتانا تھا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔''

''مگر میں تب بھی نہیں جا سکوں گی۔'' وہ ایک بار پھر ہولے سے جیسے خود پر ہنس پڑی۔

''سنا ہے بڑے شاہ صاحب' ریشماں کی نسبت چھوٹے شاہ صاحب کے صاحب زادے سے طے کر رہے ہیں؟''

''ایسا ہو جائے حمیدہ تو میں سکون سے مر سکوں گی میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے لئے بھی یہ حویلی مقبرہ بن جائے' مجھ پر تو جو گزرنی تھی گزر گئی' لیکن میری پھولوں کی طرح نازک بیٹی پر یہ سب نہیں گزرنا چاہیے۔'' وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

''یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔''

''اس اوپر والے نے میری بیٹی کو سب کچھ میرے جیسا دیا ہے' وہی رنگ روپ وہی چہرہ۔ میری دعا ہے کہ اسے میری قسمت نہ ملے۔ شاہ جی میرے لئے کچھ نہ کر سکے مجھے اس کا شکوہ نہیں ہے' لیکن انہوں نے میری بیٹی کو اس درو دیوار سے نہ بچایا تو میں سمجھوں گی کہ انہوں نے کبھی مجھ سے محبت ہی نہیں کی تھی' وہ سب جھوٹ تھا' فریب تھا۔''

دروازے پر کھڑے رجب علی پر جیسے کسی نے بجلی گرا دی۔

''گوری۔''

سارے قصے کی گرہیں اپنے آپ ہی ان کے سامنے کھل گئیں۔

☆======☆======☆

''اماں کو خاموش ہوئے کافی دیر گزر چکی تھی' وہ کروٹ بدلے آنسو بہائے جا رہی تھیں۔ صبح صادق کا وقت ہو چکا تھا مولوی صاحب اذان دینے کی تیاریوں میں تھے۔ اماں کی خاموشی سے اکتا کر ماہ بانو بولی۔

''پھر کیا ہوا اماں؟''

''بہت دیر ہو گئی ہے گھنٹہ ڈیڑھ آرام کر لے پھر نماز پڑھنی ہو گی۔'' وہ آنسوؤں کے درمیان بولیں۔

''اماں پلیز' بتائیں ناں پھر کیا ہوا؟'' اس نے زبردستی ان کا رخ اپنی جانب موڑا۔'' کیا پھر رجب علی نے انہیں مار دیا؟''

''کتنی بے حسی سے پوچھ رہی ہو؟'' اماں کو اس کے انداز سے دکھ پہنچا تھا۔'' وہ میری ایک ہی بہن تھی۔''

''اماں! ظاہر ہے مجھے اتنا دکھ تو نہیں ہو سکتا ناں' جتنا آپ کو ہوا ہوگا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''ویسے زیادہ امکان تو یہی ہے کہ رجب علی نے انہیں قتل کیا ہوگا۔ کیوں اماں! میرا اندازہ ٹھیک ہے ناں؟''

اماں گہری سانس لے کر بولیں۔'' پتا نہیں حمیدہ بتاتی تھی۔'' انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

☆======☆======☆

زرینہ کے بالوں میں تیل لگا کر حمیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے بڑی بی بی کے پاس جانا ہے' وہ انتظار کر رہی ہوں گی میرا۔''

''ہوں!'' زرینہ نے سر کی جنبش سے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

''ارے ہاں۔'' حمیدہ کو جیسے خیال آیا۔

''تم نے رضیہ کو کوئی خط دینا ہو تو مجھے دے دو۔ اب تو وہ خط پڑھ لیتی ہے۔''

''ہاں!'' زرینہ ہولے سے ہنسی۔

''اس نے ابا جان سے قرآن پاک حفظ کیا تھا۔ بالکل زبردستی' پڑھنے کی بہت چور تھی وہ اور اب میری خاطر' میرے خط پڑھنے کے لئے اس نے دو چار لفظ سیکھ لئے ہیں۔ پتا ہے حمیدہ' بہت مسئلہ ہوتا ہے اسے خط لکھنے میں۔ ایسے لفظ لکھنے پڑتے ہیں' جنہیں وہ آسانی سے پڑھ سکے۔ بس اسی لئے ابھی تک خط ادھورا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کن لفظوں میں لکھوں۔''

''جب لکھ لو تب دے دینا۔''

ریشماں کے رونے کی آواز سن کر زرینہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور حمیدہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی' لیکن وہاں رجب علی شاہ کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئی۔

اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ شدید وحشت۔ حمیدہ کو اپنا دم رکتا ہوا محسوس ہوا لیکن رجب علی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ ریشماں کو گود میں اٹھا کر چپ کراتی زرینہ کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ موقع غنیمت جان کر حمیدہ وہاں سے باہر نکل آئی۔

وہ جلد از جلد مہر النسا کے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔ رجب علی کا غصہ کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ زرینہ کی دوست تھی' لیکن رجب علی کے سامنے زرینہ کی کوئی بلا اپنے سر نہیں لینا چاہتی تھی۔ یوں بھی گندم میں گھن پستے کیا دیر لگتی ہے۔

مگر پھر تجسس اور دوستی نے اسے روک لیا۔ وہ دبے قدموں ایک مرتبہ پھر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی' جو آدھا کھلا ہوا تھا۔

رجب علی چند قدم آگے بڑھ چکا تھا۔ زرینہ ابھی تک ریشماں کی طرف متوجہ تھی شاید دبیز قالین پر چلنے کی وجہ سے وہ رجب علی کے قدموں کی چاپ نہیں سن سکی تھی۔

''گوری!'' رجب علی نے اسے پکارا۔

یوں لگا جیسے زرینہ کو کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

''شاہ جی!'' وہ آنکھوں میں حیرت لئے تیزی سے مڑی لیکن رجب علی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے پھر رجب علی تیزی سے پلٹ گیا۔

جو تصدیق وہ کرنا چاہتا تھا' ہو چکی تھی۔ رجب علی کو پلٹتے دیکھ کر حمیدہ بھی وہاں سے تیزی سے کھسک گئی۔

☆======☆======☆

''پھر اماں! ماہ بانو نے دلچسپی سے پوچھا۔

''پھر؟'' وہ نیم تاریکی میں چھت کی کڑیوں کو گھورتے ہوئے بولیں۔ ''پھر ہم پر اچانک ہی قیامت ٹوٹ پڑی۔ حویلی سے زرینہ کی موت کی اطلاع آئی۔''

''تو کیا انہیں رجب علی نے زہر دیا تھا؟''

''زہر تو وہ دونوں بھائی خود تھے' جو قطرہ قطرہ اس کے جذبات میں اتر کر اسے موت کی نیند سلا گئے۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ موت حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوئی ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اسے رجب علی نے زہر دیا ہوگا' لیکن نہ تو اس کا چہرہ زیب النسا کی طرح نیلا پڑا تھا اور نہ ہی اس پر اذیت کا کوئی نشان تھا۔ وہ بالکل پُرسکون تھی۔ غموں سے آزاد ہو چکی تھی۔

حمیدہ کا کہنا تھا کہ رجب علی دوبارہ اس کے کمرے کی طرف نہیں گیا تھا' کوئی بھی وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ نہ جانے اس ایک لفظ ''گوری'' نے اس کے دل پر کیا اثر کیا تھا۔ پتا نہیں کس گھڑی وہ چپکے سے ختم ہو گئی' بنا کچھ کہے' بنا کوئی شکوہ کئے۔''

''اوہ!'' ماہ بانو گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''اور اماں وہ مہر النساء؟''

''تجھے کیا' چپ کر کے سو جا۔'' اماں جان نے چڑچڑے انداز میں کہا اور منہ پھیر لیا۔''

اب بھی مسلسل رو رہی تھیں۔

ماہ بانو نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ مزید کچھ بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ زرینہ کی موت کا زخم ایک بار پھر ہرا ہو گیا تھا۔

مسجد سے فجر کی اذان سنائی دی۔ ماہ بانو بھی کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

''ہوں' یہ تھی ساری رام کہانی۔'' اس نے سوچا۔

''دلچسپ ہے' اُما کو ضرور بتاؤں گی۔ وہ یقیناً اسے انجوائے کرے گی' پھر مل کر تبصرہ کرنے میں مزہ آئے گا۔ آج ریشماں سے ملوں گی اور وہ چھوٹتے ہی عبداللہ کا ذکر چھیڑ دے گی' لیکن وہ کیا ہے؟ میرا یہ احساس کہ جیسے کوئی کہانی چپکے چپکے میرے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہے' جیسے کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کا مرکزی کردار میں ہوں' جیسے میں کالج کی سرخ اینٹوں سے بنی عمارت' مسجد کے سفید روشن مینار اور پیر صاحب رجب علی شاہ کی حویلی کے مثلث میں گھر گئی ہوں۔ جیسے یہ تینوں عمارتیں مجھے پکار رہی ہوں' آواز دے رہی ہوں۔

کیا زرینہ خالہ کی کہانی کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے؟

اور ہے تو اس میں میرا کیا کردار ہے' میں کہاں ہوں؟ مجھے کیوں لگ رہا تھا' جیسے یہ کہانی زرینہ خالہ کی نہیں' میری زندگی کا حصہ ہے' جسے جاننے کا مجھے پورا حق ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ صندوقچی بھی کسی پنڈورا کا پٹارا ثابت ہو' جس کے کھلتے ہی تمام بلائیں باہر آ گئی ہوں' پھر کبھی واپس نہ جانے کے لئے۔''

سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر بہت مرتبہ اماں نے جگانے کی کوشش کی' لیکن سفر کی تھکن اور پوری رات جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھ دوپہر بارہ بجے ہی کھلی' وہ بھی بہت مشکل سے۔

''تم سونے کے لئے آئی تھی یہاں؟'' اماں کو اس پر غصہ تھا۔

''کل تڑپ رہی تھی ریشماں سے ملنے کے لئے کہ ابھی شام کے وقت ہی ملنا ہے اور اب ایسی پڑی ہو کہ جاگنے کا نام نہیں لے رہیں۔''

''بس اماں! اب تو اٹھ گئی ہوں۔'' اس نے بدمزگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

''جلدی سے نہا دھو لو' اب ناشتے کا وقت تو گیا' کھانا کھا کر ریشماں سے ملنے چلی جانا۔''

وہ بغیر کوئی بات کہے' چپل گھسیٹتی صحن کے ایک کونے میں بنے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوئی' اور ایک مرتبہ پھر اسے ریشماں کا خیال ستانے لگا۔

''اماں کچھ کھانے کو دیں' بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ ان کے قریب پیڑھی پر آ بیٹھی۔ ''پھر مجھے ریشماں کی طرف بھی جانا ہے۔''

''ابھی آنکھ نہیں کھل رہی تھی اور ابھی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔'' اماں نے اسے گھورا اور

چنگیر اس کے سامنے کھسکا دی۔

دستر خوان میں پراٹھے اور فرائی انڈے نے اس کی بھوک چمکا دی۔

"اماں! چائے نہیں ملے گی؟"

"یہ لو۔" انہوں نے مٹی کا پیالہ اس کے سامنے کر دیا۔

"تھینک یو۔"

"بیٹا! دودھ میں دیسی گھی ڈال کر پیا کرو۔" بڑی اماں نے اسے لیکچر دینا شروع کیا۔

"اف! بڑی اماں کچھ خدا کا خوف کریں۔" اس نے منہ بنایا۔

"اماں! اسے رہنے دیں، یہ اپنی چلاتی ہے، کچھ کہنے کا فائدہ نہیں ہے اسے۔" اماں بے زاری سے بولیں۔

"ذرا صحت دیکھو اپنی۔ پتا نہیں کیسی مریل مریل لڑکیاں ہوتی ہیں آج کل کی۔ بیٹا جنت میں بھی یہی کچھ ملے گا۔" بڑی اماں نے اپنی دانست میں سب سے بڑی دلیل دی۔

"لیکن بڑی اماں! مجھے جنت میں جانے کی کچھ ایسی جلدی نہیں ہے۔"

"سن لیا۔" اماں کو غصہ آ گیا۔ "میں نے تو اسی لئے اسے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ہر بات کا گھڑا گھڑایا جواب ہے اس کے پاس۔"

پھر بڑی اماں اور اماں اپنے زمانے اور آج کل کی لڑکیوں کا موازنہ کرتی رہیں اور وہ کان بند کر کے کھانا کھانے میں مصروف رہی۔ انڈے، پراٹھے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بھی وہ ریشماں اور عبداللہ کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

"ابھی کل کالج میں عبداللہ سے ملاقات ہوگی۔ پتا نہیں وہ کیسا ہوگا۔ شاید اس کی کوئی گرل فرینڈ بھی ہو۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی ضرور ہوگی۔ وہ باہر سے پڑھ کر آیا ہوا ہے، تو یقیناً اتنا سیدھا تو نہیں ہوگا۔ میں اُما سے ایک مرتبہ پھر ڈسکس کروں گی کہ مجھے اسے ریشماں کے اضطراب اور اس کی محبت کے بارے میں بتا دینا چاہیے یا نہیں۔

شاید عبداللہ کو خبر ہو اور وہ اس بات کو ہنسی میں اڑا دے۔ اسے بھلا کیا دلچسپی ہوگی۔ ریشماں کی۔ بے قراریوں میں ظاہر ہے۔ وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح یہ تو کرنے سے رہا کہ گھوڑے پر بیٹھ کر گنڈاسا اٹھائے اپنی منگ کو حاصل کرنے یہاں پہنچ جائے، سب رسموں کو توڑ کر سب رواجوں کو تہس نہس کر کے۔" اپنی سوچ پر اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔

"دیکھتی ہیں اماں آپ اس کی حرکتیں۔" اماں نے بڑی اماں کو مخاطب کیا۔ "کوئی بات ہوئی ہے ابھی بھلا ہنسی مذاق کی؟ اور یہ بی بی لگی ہے ہنسنے۔ اماں میرا دل تو ہولنے لگتا ہے۔ یہی حال زرینہ کا تھا۔ پڑھ لکھ کر اپنے میں گم ہوگئی تھی۔ میں نے سمجھانا چاہا پر سمجھ نہ سکی۔ اب یہ پڑھ لکھ گئی ہے، اوپر سے پڑھ بھی لڑکوں کے کالج میں رہی ہے۔ اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں

…بس بڑی اماں! ہماری اماں کو تو کوئی موقع دے تعلیم کے خلاف بولنے کا۔ ایک سے …ل گھڑلاتی ہیں۔ کیا کبھی کسی فلسفی نے ایسی دلیلیں گھڑی ہوں گی۔"

"زیادہ بک بک نہ کر۔" اماں نے بے زاری سے کہا۔

"زرینہ کی نظر میں بھی میں جاہل تھی اور تیری نظر میں بھی ماں جاہل، فائدہ کیا ہوا اسے اتنی …پوری دس جماعت تک پڑھا تھا اس نے۔ تجھے بھی کچھ نہیں ملے گا اتنا زیادہ پڑھ کر۔

…یکھ میری جان! لڑکی کا کام دفتروں میں جوتیاں چٹخانا نہیں ہوتا، گھر بسانا ہوتا ہے۔ لڑکیا… میں اچھی لگتی ہے۔ شوہر اور بچوں کے ساتھ۔ یہ گھر سے باہر کی فکریں مردوں کے کرنے …ہیں۔ عورت کی راج دھانی اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔"

"بڑی اماں! میں اماں کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی ہوں۔ اس …فائدے ہیں۔ کان صاف ہو جاتے ہیں اور دماغ بھی روشن ہو جاتا ہے۔ ہاں بڑی اماں …ل شرط ہے۔ آپ بھی کر کے دیکھیں، بہت فائدے میں رہیں گی۔"

"دیکھا اماں آپ نے!" اماں نے بڑی اماں کو مخاطب کیا۔ "ان باپ بیٹی کی نظر میں …وئی حیثیت ہی نہیں ہے۔"

"اچھا اماں! اب شکوے شکایتوں کا پروگرام تھوڑی دیر بند۔" اس نے چنگیر اور مٹی کا پیالہ …طرف سرکا دیا۔

"میں تیار ہوں، آپ کو ریشماں کی طرف چلنا ہے یا نہیں۔"

"یا تو اٹھ نہیں رہی تھی یا پھر اب ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے۔" اماں بڑبڑاتی ہوئی اٹھ …ئی ہوئیں۔

"ذرا دم لے لے میں تیار ہو جاؤں۔"

☆======☆======☆

…ں ان دونوں کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ اماں دیر تک اس کی بلائیں لیتی رہیں۔ اِدھر اُدھر کی کتنی …ہاری باتیں کیں انہوں نے۔ پھر اماں نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا

"ریشماں! کچھ تم ہی سمجھاؤ اسے۔ ایسے اچھے رشتے موجود ہیں خاندان میں، لیکن اسے …ا کے ابا کو کوئی اچھا ہی نہیں لگتا۔ پتا نہیں کس پھونس پروفیسر کے پلے بندھنا ہے اسے۔"

"سعد پھونس پروفیسر بن کر کیسا لگے گا۔ ناک پر موٹی سی عینک، بال سفید، لاٹھی ٹیک کر …ہوا۔" ماہ بانو نے سوچا اور خود ہی ہنس پڑی۔

"لڑکی تمہیں کوئی لڑکا پسند تو نہیں آ گیا؟" اماں اس کی بلاوجہ کی ہنسی سے بار بار مشکوک ہو …ہیں۔"

''اماں! ابھی تو پڑھنا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''چار سال تک تو بالکل بھول جائیں۔''

''اس لڑکی کا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اس مرتبہ جاکر تمہارے ابا سے آخری بات کروں گی، ہاں۔''

ماہ بانو نے مسکراہٹ دبالی۔ اسے ڈر تھا کہ اسے یوں مسکراتے دیکھ کر اماں کا پھر پارہ چڑھ جائے گا۔

''میں چلتی ہوں اب، بانو تو کب آئے گی۔'' اماں نے برقع سنبھال لیا۔

''میری فکر نہ کریں اماں میں آجاؤں گی۔'' وہ ریشماں کی مسہری پر آرام سے لیٹ گئی۔

''فکر نہ کریں۔'' اماں کو غصہ آگیا۔

''تیری فکر ہی تو میری جان کو چمٹی ہوئی ہے۔ کیا کہیں گے تیرے تائے چاچے کہ یہاں تو آگئی ہے ملنے اور انہیں پوچھا بھی نہیں، باتیں بنیں گی۔''

''بننے دیں باتیں، وہ تو یوں بھی بنیں گی۔ نہ گئی تو یہی کہیں گے ناں کہ ماہ بانو پتا نہیں خود کو کیا سمجھنے لگی ہے۔ کسی سے ملتی جلتی نہیں ہے اور ملنے چلی گئی تو ارشاد ہوگا، کہ اسے شہر کی ہوا لگ گئی ہے، ماڈرن ہوگئی ہے۔ بن بن کر بولتی ہے۔ ہمارے گلاس میں پانی پینا تک گوارہ نہیں ہے۔ اب ریشماں تم خود بتاؤ، ان گندے میلے گلاسوں میں بھلا کوئی پانی پی سکتا ہے؟ ہمارے گھر میں بھی سونے چاندی کے برتن نہیں ہیں، لیکن صاف تو ہیں ناں اور اماں جب باتیں ہی سننی ہیں تو نہ جاکر سننا زیادہ بہتر ہے۔''

''عاجز آگئی ہوں اس لڑکی کی منطق سے۔ اب ماں کو سبق پڑھائے گی کیونکہ بہت پڑھ لکھ گئی ہے ناں۔'' اماں باہر نکلنے کو مڑیں۔

''دو گھنٹے بعد تمہارے نانا جی آکر لے جائیں گے، اکیلی مت آنا۔''

''خالہ جی صرف دو گھنٹے کے لئے۔'' ریشماں نے کہا۔ ''دو گھنٹے میں تو ہم ٹھیک سے کوئی بات بھی نہیں کرسکیں گے۔''

''بیٹا! میں زیادہ دیر تک چھوڑ دیتی، اسے تو پروا نہیں ہے، لیکن اور رشتے داروں کے گھر بھی تو جانا ہے۔ یہ تو کان بند کرکے مزے سے الگ بیٹھ جاتی ہے۔ باتیں مجھے سننا پڑتی ہیں۔ ہاتھ گناہ نہ پاؤں گناہ لیکن بات ہوتی ہے، تو یہی کہ بھابی جی نے بھائی اور بھتیجی کو ہم سے جدا کردیا ہے۔

کوئی پوچھے کہ ان کے بھائی اور بھتیجی کو میں نے باندھ رکھا ہے کیا؟ میرے کہنے پر بھی نہیں ملتے تو میں کیا زبردستی کرسکتی ہوں۔'' پھر اماں، ماہ بانو کی طرف مڑیں۔

''لڑکی! تم بھی تیار رہنا دو گھنٹے بعد۔''

''اماں یہ سوچ کر جلدی بلوا رہی ہیں کہ میں تائے چاچے سے ملنے جاؤں گی تو یہ ان کی ...ے۔'' اماں کے جانے کے بعد وہ بولی۔

''لوگوں کے رشتے دار اتنے اچھے ہوتے ہیں، ایک ہم ہیں رشتے داروں کا ذکر آتے ہی بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔''

ریشماں ہنس پڑی۔ ''تمہارے رشتے دار تو پھر اچھے ہیں، میرے والے دیکھو۔''

''خیر تمہارے تو اسپیشل رشتے دار ہیں اللہ تعالیٰ نے سب کے ایک ایک سانچے بنائے تھے پھر بنا کر توڑ دیئے۔''

پھر ماہ بانو کو جیسے بالکل اچانک یاد آیا۔ ''اوئے ریشماں! یاد آیا۔''

''کیا؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''عبداللہ!'' ماہ بانو سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

''عبداللہ پاکستان آگیا ہے۔ کل کالج میں فیئرویل فنکشن ہے اور سنا ہے کہ وہ اس میں ...ا ہوگا۔''

''سچ؟'' ریشماں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میرا دوست ہے ایڈی اور عبداللہ کا بھی، وہ بہت گہرا دوست ہے، اس کے توسط سے پتا ...ا ہے مجھے۔''

''ہائے بانو، تم کیسے دوستی کرلیتی ہو لڑکوں سے؟ تمہیں خالو بھی کچھ نہیں کہتے؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ لڑکے کوئی ایسی مخلوق نہیں ہوتے کہ انہیں الگ سے اتنی اہمیت دی ...ئے۔ بھئی عام انسان ہوتے ہیں وہ بھی میری اور تمہاری طرح کوئی ایسی خاص چیز نہیں ہوتی ...یں کہ انہیں اس طرح حیرت سے دیکھا جائے۔ جیسے بچے چڑیا گھر کے جانوروں کو دیکھتے ...رہ گئے ابا جی، تو انہوں بھلا کیا کہنا ہے۔''

''اف! میرے ابا جان سن لیں تو جان سے ہی ماردیں۔'' ریشماں نے جھرجھری لی۔

''خیر، یہ تو ان کا پرانا مشغلہ ہے۔'' ماہ بانو نے اطمنان سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب کو چھوڑو، میری بات اور ہے، تمہاری اور۔''

ریشماں گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

''اوہو، معاف کرنا، مجھے خود پتا نہیں چلتا کہ کیا بول گئی۔ دفع کرو اس بات کو، میں تو تمہیں بتا ...تھی کہ کل عبداللہ کالج آئے گا۔''

''کاش! تم اس وقت آتیں جب وہ آچکے ہوتے تم ان سے مل چکی ہوتیں اور مجھے بتاتی

کہ وہ کیسے ہیں' دیکھنے میں بھی اور ویسے بھی۔ پتا نہیں' وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ سوچتے بھی ہوں گے یا نہیں۔''

''یعنی میں ابھی نہیں آئی ہوتی ' بڑی بے مروت ہو۔'' ماہ بانو نے اسے آنکھیں دکھائیں۔''میں مری جارہی تھی تم سے ملنے کے لئے اور جنابہ فرمارہی ہیں کہ کاش' تب آئی ہوتی' جب ان کے محترم آچکے ہوتے۔''

''میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ پتا نہیں پھر کب آؤ گی تم' کب ان کے متعلق پتا چلے گا' تمہیں اندازہ نہیں ہے میری بے چینی کا۔''

''مجھے خوب اندازہ ہے تمہاری بے چینی کا۔'' وہ پھر ٹانگیں پسار کر لیٹ گئی۔

''اگلی مرتبہ نہ جانے کب آنا ہو لیکن جب بھی آؤں گی یقین کرو تمام تر معلومات سے لیس ہو کر آؤں گی۔''

''تم ایسا کرنا بانو۔'' ریشماں بولی۔''کہ ان کی ایک ایک بات خوب غور سے سننا انہیں اچھی طرح دیکھنا بالکل یوں جیسے تم نہیں انہیں میں دیکھ رہی ہوں اور پھر ان کی ہر بات مجھے اس طرح بتانا کہ میری نظروں میں ان کی تصویر بنتی چلی جائے۔ مجھے محسوس ہو کہ میں خود ان سے مل کر آئی ہوں جیسے لمحہ لمحہ ان کے ساتھ رہی ہوں میں۔''

''ایسا کروں گی۔'' ماہ بانو نے چٹکی بجائی۔''ان کی تصویر لا دوں گی تمہیں دن رات دیکھتی رہنا مزے سے۔''

ریشماں ہنسی۔''ہاں یوں بھی ان بلند و بالا دیواروں کے درمیان میں اس امید پر آسانی سے وقت کاٹ رہی ہوں کہ آنے والا وقت میری جھولی میں بہت سی خوشیاں ڈالے گا اتنی زیادہ کہ میں سمیٹتے سمیٹتے تھک جاؤں گی اور خوشیاں ختم نہیں ہوں گی۔''

''ویسے ایک بات ہے ریشماں۔''

''کیا؟''

''ہوسکتا ہے تمہاری امیدیں پوری نہ ہوں۔'' ماہ بانو نے محتاط انداز میں کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ کچھ بھی ہوسکتا ہے ناں یہ بھی کہ جیسا تم چاہو ویسا ہو جائے یہ ضروری تو نہیں ناں کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ سب کچھ ہمیں مل جائے۔''

چند لمحے تک ریشماں اسے تکتی رہی۔

''ہوں' ہوسکتا ہے لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ دیکھو بانو! میں تمہاری طرح پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ میری سوچ بھی انہی دیواروں تک محدود ہے پتا نہیں میں اپنی بات سمجھا پاؤں گی یا نہیں۔ تپتے صحرا میں کچھ نہ ہو تو بھی سراب کے پیچھے بھاگنا ہی پڑتا ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں' میں خالی ہاتھ ہوں' میرے پاس امید کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔ جینے اور جیے جانے کے لئے کوئی منزل تو

ہونی ہی چاہیے ناں۔ صحرا میں پانی کی تلاش میں بھٹکنے والوں کو سراب حوصلہ تو دیتا ہے ناں۔ منزل پر پہنچنے کے لئے اسی حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جینے کے لئے امید کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پاس بھی صرف یہی زادِ راہ ہے یہی میرا سہارا ہے اور یہی سرمایا۔''

ماہ بانو اسے دیکھے گئی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''دیکھ رہی ہوں کہ ان دیواروں میں قید لڑکی میں کتنا حوصلہ ہے کتنا عزم ہے۔ جو زادِ راہ تمہارے پاس ہے ناں ریشماں در حقیقت یہی سب کچھ ہے جینے اور جیے جانے کی امید کہ آج نہیں تو کل منزل ضرور ملے گی۔ سرابوں کو دیکھ کر حوصلہ ہارنا نہیں ہے بلکہ اور تیزی کے ساتھ اپنے سفر پر رواں دواں رہنا ہے۔''

ریشماں ہنس پڑی ہنستے ہوئے وہ بہت اچھی لگتی تھی۔

''قسم سے تم سے [illegible] سی خوبصورتی بھی میرے پاس ہوتی ناں ریشماں تو اب تک سعد پاگل ہو چکا ہوتا۔''

''تم میں کیا کمی ہے بھلا وہ سعد تو پاگل ہے جو اب تک تم سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا اس نے۔''

''مجھ میں کیا کمی ہے؟ اتنی کالی ہوں میں یہ جو نانی جی کے گھر سے پرے بھینس بندھی کھڑی ہے ناں اس سے رنگت کا مقابلہ رہتا ہے میرا اور میں ہمیشہ جیت جاتی ہوں۔''

''کچھ خدا کا خوف کرو بانو اب تم اس قدر بھی کالی نہیں ہو سانولی رنگت ہے تمہاری یہ تو اتنی پیاری لگتی ہے مجھے تو بہت پسند ہے۔''

''تمہاری پسند کا کیا کرنا ہے میں نے۔'' ماہ بانو ہنس پڑی۔

''اماں جان کہتی ہیں کہ ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے اللہ تعالیٰ کا جس نے ہمیں ہر نعمت دی ہے۔ ایک رنگت سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''تم اپنی اماں جان کے اقوالِ زریں اپنے تک رکھا کرو اور شکر بھی تم ہی ادا کرو کیوں کہ تمہیں تو واقعی ہر نعمت ملی ہے مجھے جس دن ہر نعمت ملی میں بھی شکر ادا کیا کروں گی۔''

''بانو! جب تمہیں وہ ملیں گے تو تم کیا کہو گی ان سے؟''

''مجھے کیا کہنا ہے تم چاہو تو رقعہ لکھ کر دے دو محبت کی ایک لازوال داستان کے عنوان سے ذرا جذبات کا مرچ مسالہ تیز رکھنا تا کہ کچے دھاگے سے سرکار بندھے آئیں۔''

ماہ بانو نے شرارت سے اسے دیکھا۔

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''مذاق مت کرو ٹھیک بتاؤ۔''

"ارے بھئی مجھے کیا کہنا ہے وہ تمہارا عبداللہ ایڈی کا فرینڈ ہے میں اور اُما بھی ایڈی کے دوست ہیں پہلے رسمی بات چیت ہوگی پھر میں اور اُما دیکھیں گے کہ وہ ہماری دوستی کے قابل بھی ہے یا نہیں اگر ہوا تو اسے اپنے گروپ میں شامل کرلیں گے نہ ہوا تو میں اپنے رستے پے اور تم اپنی راہ چلو کہہ کر خدا حافظ کر دیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی‘ میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں اس سے دوستی کرنا ہوگی اور اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک عادت مجھ کو بتانا ہوگی یوں جیسے میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔"

"اچھا بابا! دماغ نہ کھاؤ۔" ماہ بانو نے کہا۔ "پہلے ہی میرا موڈ خراب ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"کل فیئر ویل ہے اور میرے پاس پہننے کو کپڑے اور جیولری کچھ نہیں ہے۔ میں ابا جی کو کہتی تو وہ کہیں سے بھی پیسوں کا بندوبست کر دیتے لیکن میں ان پر کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی۔ مائم کا ڈریس تو ہے میرے پاس وہ تو ہم سب مائم کرنے والوں کا ایک جیسا ہے لیکن صبح فن فیئر کے لئے کوئی پرانا سوٹ نکالنا ہوگا۔"

"افوہ! میں نے سوچا کہ پتا نہیں کیا غضب ہوگیا کہ تمہارا موڈ خراب ہے۔" ریشماں بولی پھر اس نے ملازمہ کو آواز دی۔

"کریمن!"

کریمن دوڑی آئی۔

"جی بی بی!"

ریشماں نے آہستہ سے اس سے کچھ کہا اور وہ سر ہلا کر چلی گئی۔

"اور تمہاری پڑھائی کہاں تک پہنچی؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"بس چل رہی ہے۔" وہ بولی۔

"سبط حسن جو کچھ پڑھتا ہے مجھے بھی زبردستی پڑھانے بیٹھ جاتا ہے‘ کہتا ہے اس طرح اسے سب کچھ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔"

"بہت پیار ہے تمہیں سبط حسن سے؟"

"ظاہر ہے میرا بھائی ہے پیار تو ہوگا۔" ریشماں بولی۔ "وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتا ہے بہت زیادہ۔"

"خیر یہ ضروری تو نہیں کہ بہنوں کو بھائیوں سے اور بھائیوں کو بہنوں سے پیار ہو یہاں تو سگے بہن بھائی ایک دوسرے کو نہیں پوچھتے یہ تو پھر سوتیلا بھائی ہے۔"

"بانو! ایسے کبھی مت کہنا‘ مجھے نہیں پتا کہ میری سگی ماں مجھ سے کتنی محبت کرتی‘ میرے سگے

بہن بھائی ہوتے تو وہ مجھے کتنا چاہتے لیکن اماں جان نے مجھے کبھی سوتیلا نہیں سمجھا‘ بھائیوں نے بھی سوتیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا۔ سب مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ مجھے اپنی سگی ماں کا خیال بھی نہیں آتا اور پھر سب سے بڑھ کر بابا جان ہیں تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کتنے اچھے ہیں۔"

"بابا جان!" ماہ بانو ہنسی۔ "میں جانتی ہوں کہ وہ کتنے اچھے ہیں پیر صاحب رجب علی شاہ۔"

"اس طرح کیوں ہنسیں تم؟"

"کچھ یاد آ گیا تھا ویسے پورے گاؤں میں بہت شہرت ہے تمہارے بابا جان اور بھائیوں کی اچھائی کی۔"

ریشماں نے نگاہیں چرالیں۔

"گاؤں والوں سے میرا کیا واسطہ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ وہ سب مجھ سے محبت کرتے ہیں اور بس۔"

کریمن کے آنے سے دونوں کی گفتگو میں وقفہ آ گیا۔

"یہ گٹھڑی کیا اٹھا لائیں؟" ماہ بانو نے کریمن کے ہاتھ میں چادر میں لپٹے کپڑوں کی طرف دیکھا۔

ریشماں کے اشارہ کرنے پر کریمن گٹھڑی بستر پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"یہ تمہارے لئے!" ریشماں نے کپڑے اس کے سامنے پھیلا دیے۔

"میرے لئے کیوں؟"

"تم نے بتایا تھا ناں کہ کالج کے فنکشن کے لئے تمہارے پاس کپڑے نہیں ہیں۔"

"اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تم اپنے کپڑے اٹھا کر مجھے پہننے کے لئے دے دو۔" ماہ بانو نے ملال کر کہا۔

"یہ بالکل نئے ہیں۔ سبط ابھی چند دن پہلے لایا تھا قسم سے میں نے ابھی تک نہیں پہنے۔ میں تمہیں اترے ہوئے کپڑے تو نہیں دے رہی۔"

"تم نے بہت غلط سمجھا ہے ریشماں! میں نے باتوں باتوں میں تم سے یونہی ایک مسئلہ کہہ دیا تھا‘ جس طرح تم اپنے مسئلے کہہ دیتی ہو۔ میرے پاس بہت سے ایسے کپڑے ہیں‘ جو میں کل پہن سکتی ہوں۔"

"لیکن وہ پرانے ہیں ناں۔"

"پرانے ہیں تو کیا ہوا‘ کالج والے نکال تو نہیں دیں گے ناں مجھے کہ تم پرانے کپڑے پہن کر آئی ہو لہٰذا کالج میں نہیں جاسکتیں۔"

"دیکھو ماہ بانو! اس میں میری بھی ایک غرض ہے۔" ریشماں نے جیسے اعتراف جرم کیا۔

"تمہاری غرض۔ تمہاری کیا غرض ہے؟"

"میں ان سے مل نہیں سکتی' انہیں دیکھ نہیں سکتی' میں چاہتی ہوں......" وہ لمحہ بھر کے لئے رکی۔

"اُف! میں تمہیں سمجھا بھی تو نہیں سکتی۔ دیکھو بانو! میں چاہتی ہوں کہ تم ان سے ویسے ہی ملو' جیسے میں ان سے ملتی۔"

ماہ بانو نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔ "تمہیں معلوم ہے' تم بار بار مجھ سے کیا فرمائش کر رہی ہو۔ میری اکلوتی محبت کا گلا گھونٹنے پر کیوں مُصر ہو۔ سعد کچا چبا جائے گا مجھے ویسے بھی میرے معاملے میں بہت حساس ہے وہ۔"

ریشماں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں واقعی تمہیں سمجھا نہیں سکی۔"

"میں تو وہی سمجھی ہوں جو تم نے کہا ہے اور بار بار کہا ہے۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی' کہ اتنے اچھے کپڑے میرے کس کام کے ہیں۔ یہ کریمن ہے ناں' کتنی بدصورت ہے اور کتنی میلی میلی رہتی ہے پھر بھی یہ مجھے اپنے سے بہتر لگتی ہے۔ کیونکہ اسے ایک چاہنے والا' سراہنے والا میسر ہے۔ پتا ہے اس کا چکر چل رہا ہے رجو کے ساتھ۔" ریشماں نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"چکر چل رہا ہے اس کا۔" ماہ بانو نے قہقہہ لگایا۔ "اس کریمن کا؟"

"ہاں' رجو سے۔"

"رجو سے؟" ماہ بانو نے دلچسپی سے کہا۔ "لیکن یہ رجو ہے کون؟"

"اس کا عاشق۔"

"وہ تو ہے' لیکن ہے کون وہ؟"

"بھئی' مجھے کیا پتا' میں یہاں ہوتی ہوں' مجھے کیا خبر کہ رجو کون ہے؟"

"کہہ تو تم ایسے ہی رہی تھیں جیسے وہ کوئی خاص چیز ہو۔" ماہ بانو ہنس پڑی۔

"تو کوئی عام چیز ہے بھلا۔" وہ ہنس پڑی۔

"میری خاص الخاص ملازمہ کا محبوب ہے' بہت آہیں بھرتے ہیں دونوں۔"

"یہ ظاہر ہے تمہیں کریمن نے بتایا ہوگا۔"

"تو اور کیا؟"

"چھوڑو یار' جیسے اسے رجو کی آہوں کی بہت خبر ہوگی۔ بھئی زمانہ بہت فاسٹ ہے' آہیں بھرنے کی فرصت کسے ہوتی ہے آج کل۔"

"دفع کرواسے' میں تمہیں بتا رہی تھی کہ اس کریمن کی باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھے بھی چاہے' میری بھی تعریف کرے۔ اس خوبصورتی کا کیا فائدہ اگر اسے دن کے چوبیس گھنٹے یہ دیواریں ہی تکتی رہیں۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔"

"میں یہ چاہتی ہوں کہ مجھے نہ سہی' وہ میرے کپڑوں کو ہی دیکھ لیں۔ ان کے دیکھنے سے ان میں ان کی خوشبو رچ جائے گی۔ شاید وہ ان کی تعریف کردیں' پھر میں یہ کپڑے پہنوں گی۔"

"اوہ خدایا!" ماہ بانو نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"تم بھی کریمن اور رجو کی طرح بہت فالتو ہو' ایک ہم ہیں ہر روز Submission کی فکر۔ روز کے سونمبر اور ایورج کی پریشانی۔ ہمیں تو سر کھجانے کا بھی وقت نہیں ملتا۔"

"بھئی' فالتو تو میں ہوں۔" وہ ہنسی۔ "لیکن تم میری جگہ ہوتیں بانو تو تم بھی یہی کرتیں۔ وسیلہ نہ ہو تو پیدا کرلیا جاتا ہے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو جاؤں گی' تو تمہارا کیا جائے گا۔"

"میرا تو خیر کچھ نہیں جائے گا' اسی خوشی میں کہیں تمہارا کچھ نہ چلا جائے۔"

"میری پروا مت کرو' بس تم یہ کپڑے لے جاؤ۔"

"پھر سیّدانی جی! آپ میرے اترے ہوئے کپڑے پہنیں گی؟"

"طنز کر رہی ہو مجھ پر۔"

"نہیں یار! طنز کیا کرنا ہے' لیکن تم لوگوں کی روایتیں مختلف ہیں۔"

"میں اس بات کو نہیں مانتی' سبط بھی یہی کہتا ہے کہ یہ سب فضول باتیں ہوتی ہیں۔ بس مجھے تو اتنا ہی پتا ہے کہ وہ ان کپڑوں کو دیکھیں گے اور میرے لئے یہی بہت ہوگا۔"

"بہت سامان ڈھونا پڑے گا۔ کپڑے کافی زیادہ ہیں۔" اس نے ایک اور بہانا کیا۔

"تم فکر مت کرو' کریمن پہنچا دے گی۔"

"تم نے انکار کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"یہاں گاؤں میں وقت کتنا تھم تھم کر چلتا ہے۔ بندہ بور ہی ہو جائے۔"

"مجھے تو ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔ یہ کیا بندہ چوبیس گھنٹے لٹو کی طرح گھومتا رہے۔" ریشماں بولی۔

"تم بور بھی نہیں ہوتیں؟ کچھ تو تیزی ہو وقت میں۔" وہ باتیں کر رہی تھی کہ کریمن اندر داخل ہوئی۔ "بی بی کو مولوی صاحب لینے آئے ہیں۔"

"میں چلوں' نانا جی باہر انتظار کر رہے ہوں گے۔" ماہ بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اماں جان سے نہیں ملو گی؟"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے ملنے کا۔" ماہ بانو نے منہ بنایا۔ "میرے جانے کے بعد تم ہی مل

لینا۔"

"ایسے کیوں کہتی ہو‘ وہ تمہاری کچھ نہیں‘ لیکن میری تو ماں ہیں۔"

"ماں اپنی ہی ہوتی ہے۔" اس نے چادر اٹھائی۔

"میں بحث نہیں کروں گی تم سے‘ کیوں کہ تم بہت تھوڑی دیر کے لئے آئی ہو۔"

مولوی صاحب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس بڑھاپے میں عمر کا کم غموں کا ہاتھ زیادہ تھا۔ سفید داڑھی اور سر کے سفید بالوں میں گھرا ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر خود ہی دل ان کا احترام کرنے کو چاہنے لگتا تھا۔

ان کے ساتھ جاتے ہوئے ماہ بانو کا دل چاہا کہ ان کے بیتے برسوں کو کریدے ان سے پوچھے کہ زرینہ خالہ کے سلسلے میں وہ کس احساسِ جرم میں مبتلا ہوئے؟ ریشماں سے بھی وہ بس عید‘ شبرات وغیرہ پر مل آتے تھے۔ کیا کبھی ان کا دل نہیں چاہا‘ کہ ریشماں بھی ان کے پاس آئے یا وہ اپنی نواسی کو جی بھر کر پیار کریں؟

لیکن وہ لاٹھی پکڑے‘ سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ پتا نہیں وہ سوچتے رہتے تھے یا واقعی کم گو تھے۔

"پتا نہیں ان کا کتنا قصور تھا اس سارے قصے میں۔" ماہ بانو نے سوچا۔ "اگر بیچ میں انا اور عزت کے یہ بے ہودہ فلسفے نہ ہوتے تو کتنی آسانی سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا‘ لیکن ہمارے یہاں لوگوں کی عادت ہے دوسروں پر مسلط ہو جانے کی‘ دوسروں کی زندگیاں بھی خود ہی گزارنے کی۔ کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں سمجھتا‘ یا پھر شاید سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ آسان سی بات کو بھی پتا نہیں کیوں اس قدر پیچیدہ کر دیتے ہیں۔"

گھر میں صرف بڑی اماں تھیں۔

"بڑی اماں! اماں کہاں ہیں؟" اس نے صحن سے ہی کمروں کا جائزہ لیا۔

"وہ رشتے داروں سے ملنے گئی ہے۔ کہہ کر گئی ہے کہ تم اپنے تایا کی طرف آ جانا۔"

"اماں تو حد کر دیتی ہیں۔" وہ بان کی کھری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"باتیں بھی سنتی ہیں اور پھر ان ہی میں گھستی ہیں۔"

"تم نے اور تمہارے باپ نے چھوڑ رکھا ہے رشتے داروں کو‘ اب کیا وہ بھی چھوڑ دے؟" بڑی اماں نے اسے گھورا۔

"تم دونوں پھر بھی رشتے داروں کے پیارے بن جاؤ گے‘ میری بیٹی! بیچاری خواہ مخواہ ماری جائے گی‘ سب یہی کہیں گے کہ اس نے ہمارے بھائی اور بھتیجی کو ہم سے الگ کر دیا ہے۔"

"آپ لوگوں کی نرالی منطق ہے۔ ویسے میں بھی تایا چاچوں کی کوئی اتنی پیاری نہیں ہوں۔ خیر جانے دیں میں جا رہی ہوں۔"

"وہاں سب کو سلام کہنا میرا بھی۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں بھی اماں کی طرح رشتے داروں میں گھسنے جا رہی ہوں‘ ہرگز نہیں۔ اتنی فالتو نہیں ہوں میں۔ موسم اتنا اچھا ہو رہا ہے‘ میرا دل چاہ رہا ہے‘ ندی کنارے جا کر کچھ پینٹ کرنے کو۔ پینٹنگ کا سامان تو ہے نہیں میرے پاس‘ اب ندی میں کنکر پھینکوں گی‘ لہریں گنوں گی اور اسکیچ بک میں کچھ اسکیچ کروں گی۔"

"تجھے اللہ نیک ہدایت دے‘ کبھی کسی کی سن بھی لیا کر۔"

وہ بڑی اماں کو نظر انداز کر کے کمرے میں چلی آئی اور جلدی سے بیگ کندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی۔

"میں گھنٹا بھر میں آ جاؤں گی بڑی اماں۔"

"دیر نہ لگانا۔" پیچھے سے حسبِ معمول ہدایت نامہ جاری ہوا۔

ندیا کنارے بیٹھ کر گھٹنوں پر رکھی اسکیچ بک کے صفحے پر اسکیچ بناتے ہوئے وہ گزرے دنوں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ ان دنوں کے متعلق‘ جب وہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ بے خیالی میں وہ وینس کی تصویر کے کتنے ہی اسکیچ بنا چکی تھی۔ چونکی تو وہ اس وقت جب ایک مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"وینس!"

اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا اور ایک لمحے میں ہی آنے والے کا بغور جائزہ لے لیا۔

وہ حیدر علی شاہ جیسا تھا۔ مشابہت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے سراپے میں حیدر علی کے خدو خال ڈھونڈنے کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑی تھی۔

"عبداللہ!" ماہ بانو نے ایک لمحے میں اسے پہچان لیا۔ دھندلا خاکہ واضح ہو گیا وہ اچھا تھا۔ بے حد ہینڈسم‘ دل ہی دل میں وہ اس کا اور ریشماں کا موازنہ کرنے لگی اور اسے یہ فیصلہ کرنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ یہ کپل بہت جچتا ہے۔

عبداللہ دلچسپی سے اپنا تنقیدی جائزہ لیتے دیکھ رہا تھا۔ ماہ بانو کو جیسے ہی احساس ہوا‘ اس نے نگاہیں اسکیچ بک پر جما دیں۔

"جی وینس!" وہ بولی۔

"ویسے مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ آپ کے ادا کئے ہوئے اس ایک لفظ کا مطلب کیا تھا۔ تعریف‘ تنقید یا محض شناخت اور پہچان۔"

"شناخت اور پہچان کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی تنقید۔" وہ بولا۔

"اصل میں غلط ہوتی ڈرائینگ میرے لئے کافی تکلیف دہ ہوتی ہے۔"

ماہ بانو نے اسے گھورا۔ "غلط ہوتی ڈرائینگ۔"

''ہوں۔'' پھر اس نے اردگرد کسی موزوں جگہ کی تلاش میں دیکھا۔

''میں بیٹھ سکتا ہوں۔''

''آپ کی اپنی جاگیر ہے' میں کیسے منع کر سکتی ہوں۔'' عبداللہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''یہ تنقید ہے' طعنہ ہے یا محض شناخت اور پہچان۔''

ماہ بانو کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''سب کچھ ہے۔ شاید یہ ہماری پوری قوم کی نفسیات ہے' اعتراف کر رہی ہوں۔'' وہ ہنسی۔

''جو چیز ہمارے پاس نہیں ہوتی' کسی اور کے پاس دیکھ کر ہم میں تلخی گھل جاتی ہے اور محنت کرنے کی بجائے ہم خواہ مخواہ فرسٹریٹ ہو جاتے ہیں۔''

''فرسٹریٹ تو اس لئے ہوتے ہیں کہ آج کل یہ اِن ہے۔ تازہ تازہ امپورٹڈ آئیٹم ہے' جسے ہر کوئی بغیر کرنسی کے حاصل کر سکتا ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔

''جیسے پہلے کوئی بور نہیں ہوتا تھا' پھر ہم نے مغرب سے بوریت کو امپورٹ کیا اور اب بور ہونا آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے' اس لئے پوری قوم کے لئے ایک جدید اور نئے رومینٹک آئٹم کی ضرورت تھی۔''

ماہ بانو اس کی بات سن کر ہنس دی۔

''میری شناخت اور پہچان تو ہو گئی بلکہ مجھ پر تنقید بھی ہو گئی اور میں نے طعنہ بھی برداشت کر لیا لیکن اب تک آپ نے اپنے بارے میں نہیں بتایا' اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ وینس بے چاری سے کیا قصور سرزد ہو گیا تھا کہ آپ اس پر یہ ستم ڈھا رہی ہیں۔''

''میں ماہ بانو ہوں۔ یہاں مستقلاً نہیں رہتی' اپنے نانا جان اور بڑی اماں سے ملنے آئی تھی اور اپنی کزن سے بھی۔''

''وہ لگ ہی رہا تھا کہ آپ یہاں مستقلاً نہیں رہتیں ویسے آپ کے نانا کون ہیں؟

''مولوی نعمت اللہ۔'' ماہ بانو نے اس کا ردِعمل دیکھنے کے لئے نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں لیکن وہاں کوئی خاص ردِعمل نہیں تھا۔

''اچھا!'' اس نے بغیر تاثرات کے کہا۔ ''میں سگریٹ پی لوں' آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟''

''نہیں' یہاں میں کوئی اعتراض نہیں کر سکتی۔'' وہ مسکرائی۔

''چلیں اپنی جاگیر کا کچھ تو فائدہ ہوا۔''

اس نے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لی۔

''اور وہ بات تو رہ گئی۔''

''کون سی؟''

''یہ جو وینس کے ساتھ سلوک ہو رہا ہے یہ کیوں؟''

''اب میری ڈرائینگ اتنی بری بھی نہیں ہے۔'' اس نے اسکیچ بک پر بنی وینس کے اسکیچ کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ''ٹھیک ہے ابھی آرٹ کالج جوائن کیے مجھے بمشکل چند مہینے ہوئے ہیں' لیکن کچھ نہ کچھ تو سیکھ ہی لیا ہے۔''

''آرٹ کالج۔'' وہ یقیناً چونکا ہو گا' لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا۔

''تو آپ آرٹ کالج میں ہیں۔''

''جی۔''

''اتفاق سے میں بھی وہیں زیرِ تعلیم ہوں۔''

''جی مجھے علم ہے۔''

''ایڈی کو جانتی ہیں آپ؟''

''ہوں' میرا فرینڈ ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔'' وہ دلچسپی سے بولا۔ ''وہ میرا بھی فرینڈ ہے بہت اچھا فرینڈ۔''

''وہ بھی معلوم ہے' لیکن اس وینس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے اس میں کیا غلطی ہے؟''

''یہ دیکھو' کتنی فلیٹ سی لگ دے رہی ہے۔ تصویر کو جاندار ہونا چاہیے۔ ادھر دو میں بتاؤں۔'' اس نے سگریٹ ہونٹوں تلے دبایا اور اس کی اسکیچ بک اور پنسل لے کر اسے سمجھانے لگا۔

لیکن وہ اس کی باتیں سننے کی بجائے کچھ اور سوچ رہی تھی۔

''واقعی اگر زرینہ خالہ حیدر علی شاہ کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھیں تو یہ کچھ غلط نہیں تھا۔ کالج میں کم ہی اتنے ہینڈسم بندے ہوں گے۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا ہے' کہ اس کی گرل فرینڈ ضرور ہو گی۔''

وہ کالج کی گوسپ ذہن میں دہرانے لگی۔ کس کا افیئر کس کے ساتھ ہے اور کس کے متعلق کیا مشہور ہے' لیکن عبداللہ کے متعلق اس کا ذہن خالی رہا۔

''شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ سال بھر کی چھٹی پر ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''ساری گوسپ تو انہی لوگوں کے متعلق سننے کو ملتی ہے' جو کالج میں نظر آتے رہتے ہیں۔

ویسے ایڈی اور سعد دونوں ہی بتا سکتے ہیں اس کے متعلق۔ ویسے تو کالج آنے پر اس کا ریکارڈ بھی سامنے آجائے گا خود بخود ہی۔''

''کہاں گم ہو؟''

عبداللہ نے کہا تو وہ چونکی۔

''کچھ نہیں' تصویر دیکھ رہی تھی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ کل تم کالج آ رہے ہو؟''

اس نے عبداللہ کی بے تکلفی کے بعد اس سے بے تکلف ہونے میں دیر نہیں لگائی یوں بھی کالج میں آپ آپ کب چلتا تھا۔

''ہاں' اور تم؟ کیا ابھی یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں' یہاں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کل کالج جانا تو بہت ضروری ہے' ورنہ ایڈی جان سے مار دے گا' میں مائم کلب میں ہوں ناں۔'' عبداللہ ہنس پڑا۔

''ایڈی کا خبط اب تک ویسا ہی ہے۔''

''ویسے کبھی کبھار اس سے چڑ بھی جاتی ہوں' لیکن یہ حقیقت ہے' میں اس سے بہت امپریس ہوں۔ وہ اتنا کام کرتا ہے اور تھکتا بھی نہیں ہے۔ یہی نہیں وہ اتنا Creative ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے اتنے آئیڈیاز ہیں اس کے پاس اور ہر ایک پہلے سے زیادہ دلچسپ اور منفرد۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اس کا بقیہ حصہ دور اچھال دیا۔

''مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو!''

''تم وہی ماہ بانو ہو ناں' جس کی اُما سے بہت دوستی ہے۔''

ماہ بانو چونک گئی۔ ''تم اُما کو کیسے جانتے ہو؟''

''میں تم دونوں کو جانتا ہوں' جیسے تم مجھے جانتی تھیں۔ ہاں پہچاننے میں کچھ دیر ہوگئی۔''

''پھر بھی؟'' اس نے کریدنا چاہا۔

''بھئی ایڈی کی اور میری دوستی بہت گہری ہے۔ میں دور تھا' لیکن کالج کی خبریں اور ایڈی کے دوستوں کا تعارف سب مجھ تک پہنچتا رہا تھا۔''

''اچھا!'' وہ مسکرائی پھر اچانک اسے خیال آیا۔

''اوہو! میں نے دیر کردی۔ اماں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔'' وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں تھینک یو' میں چلی جاؤں گی' ویسے بھی اس سے آگے پیر صاحب کی جاگیر شروع ہو جاتی ہے اور وہاں تم نے قدم رکھا تو تمہارا قلع قمع ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔''

''اتنی آسانی سے کوئی نہیں کرسکتا میرا قلع قمع۔''

''مان لیا' لیکن ضروری ہے کہ تم آگ میں کود پڑو۔'' اس نے بیگ کندھے پر ڈالا۔

''اور میرے ابا جی ہوتے تو کوئی حرج نہ ہوتا' لیکن میری اماں جان نے مجھے کسی لڑکے کے ساتھ دیکھ لیا تو ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا اور لڑکا بھی وہ جو سیّد حیدر علی شاہ کا بیٹا ہو۔''

''تمہیں دیر ہو رہی ہے اس لئے یہ بعد میں پوچھوں گا کہ خصوصی طور پر سیّد حیدر علی شاہ کا ذکر کیوں۔''

''ابھی تو یہ بتاؤ کہ تم لوگ اپنی کار پر جاؤ گے۔''

ماہ بانو ہنس پڑی۔ ''ہم بے کار ہیں۔''

''اوہ! آئی ایم سوری۔'' وہ بولا۔

''مجھے بھی رات کو لاہور کے لئے نکلنا ہے' تم چاہو تو تم لوگ میرے ساتھ ہی چلے چلو۔''

''تھینک یو تم نے کہہ دیا یہی بہت ہے' لیکن فی الحال میں آفر قبول نہیں کرسکتی۔'' وہ مڑ گئی۔

''گڈ بائے۔'' پیچھے سے عبداللہ نے کہا۔

''گڈ بائے۔''

اور وہ کچے ناہموار راستے پر احتیاط سے چلتے ہوئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

اماں غصے میں بھری اس کا انتظار کر رہی تھیں' اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی برس پڑیں۔

''کہاں گم ہوگئی تھی؟ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ رشتے داروں کی طرف نہ گئی۔ چلو خیر ہے۔ لیکن بندہ اپنا اتا پتا بتا کر جاتا ہے۔''

''سوری اماں! ویسے میں بڑی اماں کو بتا کر گئی تھی کہ میں ندیا کنارے جا رہی ہوں کچھ پینٹ کرنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن ظاہر ہے یہاں نہ ایزل ہے نہ کینوس بورڈ میں نے سوچا اسکیچ بک سے ہی کام چل جائے گا۔''

''ہٹ پرے' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا الا بلا ہے۔ بڑی اماں کو جیسے سمجھ آتی ہوگی تیری باتوں کی۔ تانگہ منگوایا ہے میں نے' چلنے کی تیاری کر۔''

''جی اماں!'' وہ کمرے میں گھس گئی۔

بس کی گھوں گھوں میں نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ چونکی تو اس وقت جب اماں نے اس کا کندھا ہلایا۔

''اللہ جانے اس لڑکی کو اتنی نیند کیوں آتی ہے۔'' وہ بے زار تھیں۔

''لاہور آ گیا؟'' اس نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا لیکن اردگرد کے ماحول نے خود ہی اسے بتا دیا کہ گاڑی رکنے کی وجہ لاہور آنا نہیں بلکہ غالباً گاڑی خراب ہونا ہے۔

''یہ گاڑی کم بخت خراب ہوگئی ہے۔'' اماں نے بتایا۔ ''پندرہ منٹ تو گزر گئے ہیں۔ ٹھیک ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔''

''ہو جائے گی ٹھیک۔'' اس نے کھڑکی سے باہر اندھیرے میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

''میرا خیال ہے کہ انجن میں کچھ خرابی ہوگئی ہے۔''

''ابھی وہ سامنے سیٹ والا بڈھا آیا تھا' کہہ رہا تھا کہ بہت دیر لگ جائے گی۔'' اماں نے کہا۔

''ابھی ہم پہنچے کہاں ہیں؟''

''پہنچنا کہاں ہے۔ ابھی شروع ہوا ہے سفر۔'' اماں بولیں۔

''پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''ہر مصیبت ایسے ہی وقت ٹوٹتی ہے' اب پتا نہیں کب گھر پہنچیں گے یہ بھی نہیں پتا کہ آرام کا وقت بھی ملے گا یا نہیں۔''

''تمہیں اپنے آرام اور سونے کے علاوہ بھی کسی چیز کی فکر ہوتی ہے۔'' اماں کا پارا چڑھ گیا تھا۔

''یہ نہیں سوچتی کہ دو عورتیں اکیلی اس ویرانے میں خوار ہو رہی ہیں۔''

''اماں' دو عورتیں اکیلی نہیں ہوتیں اور یہ ویرانہ بھی نہیں ہے۔ سڑک پر دونوں طرف دکانیں وغیرہ ہیں۔ ابھی دیکھتے ہیں گاڑی ٹھیک ہوگئی تو خیر ہے' دیر کی صورت میں اتر کر کوئی اور گاڑی دیکھیں گے۔''

پون گھنٹہ گزر جانے پر بھی جب گاڑی ٹھیک ہونے کے آثار نظر نہ آئے تو ماہ بانو مزید بےزار ہوگئی۔

''اماں اتریں' یہاں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کوئی دوسری بس دیکھتے ہیں۔ ساری رات یہاں تو نہیں بیٹھ سکتے ناں۔''

''بانو ایسا کرو کہ سامنے سیٹ والے بڈھے سے کہو کہ کوئی گاڑی رکوا دے' یوں سڑک پر کیسے کھڑے ہوں گے ہم۔''

''اماں یہ بڈھا بےچارہ تو کسی تیزی سے گزرتی بس کی ہوا کے ساتھ ہی فنا ہو جائے گا۔ یوں بھی انسان کو اپنا کام خود کرنا چاہیے۔'' اس نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا۔ ''چلیں اٹھیں' ہم کوئی بچے نہیں ہیں کہ اتنا سا کام بھی نہ کر سکیں۔''

وہ دونوں بس سے اتر کے سڑک کے کنارے کھڑی ہوگئیں۔ ہلکی ہلکی نرم ہوا نے ماہ بانو کی ساری سستی دور کر دی۔ بسیں آتی' قدرے رفتار دھیمی کرتیں اور زن سے گزر جاتیں۔ یوں بھی سب ہی پہلے سے اوورلوڈ تھیں۔ مزید مسافر بٹھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ اسے تو خیر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا' لیکن اماں کا تھکن سے برا حال تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اماں کو کہاں بیٹھائے کہ ایک کار تیزی سے ان کے سامنے سے گزری تھوڑی دور تک گئی اور پھر ریورس گیئر میں پیچھے پلٹ

کر ان کے نزدیک آ کر رک گئی۔

''پتا نہیں کون لوفر ہوگا؟'' ماہ بانو نے سوچا اور منہ پھیر لیا۔

''خیر تو ہے ماہ بانو؟''

انگریزی میں پوچھے گئے سوال اور اپنا نام سن کر وہ چونک گئی۔

''عبداللہ!'' اس کے ذہن میں خیال آیا۔

''یہ کون ہے؟'' اماں چونک گئیں۔

''اماں! یہ کالج میں میرے ساتھ پڑھتا ہے۔'' اس نے فوری طور پر یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ نووارد عبداللہ ہے۔

''کیا کہہ رہا ہے؟''

''ایک منٹ!'' وہ کار کی کھڑکی پر جھک گئی۔

''ہماری بس خراب ہوگئی ہے نہ یہ ٹھیک ہوتی لگ رہی ہے اور نہ کسی اور بس کے رکنے کے آثار ہیں۔''

''آؤ میں چھوڑ دوں گا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''میرے ساتھ میری اماں جان بھی ہیں۔''

''کار میں بھی بہت جگہ ہے۔''

''ایسا ہے عبداللہ۔'' اس نے انگریزی میں کہا تا کہ اماں نہ سمجھ سکیں۔

''میرے ابا جی کے سامنے تو کوئی حرج نہیں' لیکن میری اماں ذرا پرانے خیالات کی ہیں انہیں اچھا نہیں لگے گا اگر تم مجھ سے فالتو بات کرو گے تو۔''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ٹھیک ہے نہیں کروں گا۔''

''اور پلیز اماں کو اپنے شجرہ نسب سے بھی آگاہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

''اور کوئی حکم؟''

''یہ حکم نہیں درخواست ہے شاہ صاحب!'' وہ ہنس کر پیچھے ہٹ گئی۔

اماں اس کے نزدیک آ چکی تھیں اور خاصی مشکوک لگ رہی تھیں۔

''یہ ہے کون جس کے ساتھ تم ہنس رہی ہو؟'' انہوں نے دبی آواز لیکن سختی سے پوچھا۔

''اماں کالج میں ساتھ پڑھتا ہے' بتایا تو تھا آپ کو۔'' وہ بولی۔ ''یہ بھی لاہور جا رہا ہے' ہمیں گھر پر اتار دے گا۔''

''رہنے دو کوئی بس وغیرہ آتی ہی ہوگی۔''

''اماں پلیز! وہ شریف انسان ہماری مدد کر رہا ہے اور ہم انکار کر دیں' یہ کتنا برا لگے گا۔''

چند لمحے اماں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئیں۔

"چلو ٹھیک ہے۔"

ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ اماں اتنی آسانی سے کیوں مان گئی تھیں۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ وہ کس قسم کے لڑکوں کے ساتھ پڑھ رہی ہے تاکہ آئندہ اباجی کے سامنے اپنے تجربے کو بطور دلیل پیش کر سکیں۔

"اماں! آپ آگے بیٹھیں۔" اس نے کہا۔

"اے ہائے غیر مرد کے ساتھ آگے بیٹھ جاؤں' دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا؟"

"ایٹی کیٹس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" اس نے دبے انداز میں اماں کو سمجھانا چاہا

"وہ ہمارا ڈرائیور تو نہیں ہے۔ کس قدر بدتمیزی کی بات ہے کہ وہ مشکل وقت میں ہمارے کام آ رہا ہے اور ہم اسے ڈرائیور بنا دیں۔ آپ آگے نہیں بیٹھیں گی تو مجھے بیٹھنا پڑے گا۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اماں نے کہا۔

"پلیز اماں! وہ آپ کی اولاد کے برابر ہے۔ مجھ سے بمشکل دو تین سال بڑا ہوگا' کچھ نہیں کہے گا آپ کو۔"

بادل نخواستہ اماں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

ماہ بانو نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر پہلے اپنا سامان اندر رکھا پھر خود بھی بیٹھ گئی۔

"میں ڈکی میں سامان رکھ دیتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا۔ "اس طرح تمہیں تکلیف ہوگی۔"

"نہیں شکریہ' میں ٹھیک ہوں۔" ماہ بانو کے انداز میں تنبیہ تھی' جیسے کہہ رہی ہو کہ میں نے تم سے کہا تھا۔ اماں کے سامنے مجھ سے کوئی فالتو بات نہ کرنا۔

کار چل پڑی۔ اندھیرے کی وجہ سے عبداللہ اور حیدر علی شاہ کی مشابہت کا اندازہ نہ ہوا تھا۔

"صبح کی روشنی کے ساتھ جیسے ہی اماں کو یہ احساس ہوگا تو کیا ہوگا۔" ماہ بانو نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔ "پتا نہیں اماں کا ردعمل کیا ہو؟ نہ جانے وہ اس سے ریشماں کے منگیتر کی حیثیت سے محبت اور پیار سے ملیں گی یا اس میں حیدر علی شاہ کا پرتو دیکھ کر اس کی ذات کو رد کر دیں گی۔

اتنا بہرحال طے ہے کہ دونوں صورت حال میں میری شامت ضرور آئے گی لمبی چوڑی انکوائری سے گزرنا پڑے گا مجھے۔ مثلاً یہ کہ میں عبداللہ کو کب سے جانتی ہوں؟ اور اس سے پہلے اماں کو اس کے متعلق سب کچھ بتایا کیوں نہیں' عبداللہ کیسا ہے؟"

اندھیری سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

اور کار خاصی تیز رفتاری سے چلتی جا رہی تھی۔ ماہ بانو کے تنبیہی لہجے کے بعد عبداللہ نے اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اماں بھی اس کی طرف سے پوری طرح نہ سہی' لیکن

ذرے مطمئن ہو گئی تھیں۔ ماہ بانو نے اطمنان سے آرام دہ سیٹ میں دھنس کر آنکھیں موند لیں۔

اسے اچھی نیند تو نہیں کہا جا سکتا' لیکن بہرحال وہ اونگھنے لگی تھی۔ لیٹے میں اسے صرف اس قدر اندازہ ہو رہا تھا کہ اماں اور عبداللہ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ کہیں کہیں کچھ باتیں اس کے کان میں بھی پڑ رہی تھیں لیکن وہ ان پر دھیان دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔

ابھی اندھیرا ہی تھا' جب وہ لاہور میں داخل ہوئے۔ ماہ بانو آنکھیں ملتی ہوئی سیدھی ہو گئی۔

"اب کہاں چلنا ہے خالہ جی؟" اس نے ماہ بانو کی بجائے اماں جان کو ہی مخاطب کیا۔

"ہمیں یہیں اتار دو' آگے ہم چلے جائیں گے۔ خود ہی۔" اماں سے پہلے وہ بول پڑی۔

"ایسے ہی تمہیں زحمت ہوگی۔"

"زحمت!" اس نے بیک ویو مرر سے ماہ بانو کی طرف دیکھا۔ "اگر یہاں تک آنے میں زحمت نہیں ہے تو مزید چند کلو میٹرز چلنے میں بھی نہیں ہوگی۔"

"یہاں تک تو تمہیں... یوں بھی آنا ہی تھا۔" اس نے اپنی ہدایات خود ہی بالائے طاق رکھ دیں۔

"آگے تمہیں جانا ہوگا گلبرگ وہاں ہمیں نہیں جانا۔"

"بانو!" اماں نے اسے گھورا۔ "میں کر لیتی ہوں بات۔"

پھر عبداللہ کی طرف مڑیں۔ "بیٹا بھاٹی چلنا ہے وہیں ہے ہمارا گھر۔"

"افوہ!" ماہ بانو کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے جو بات اس نے اُما کو نہیں بتائی تھی وہ اماں نے اتنی سہولت سے عبداللہ کو بتا دی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو یہ خبر ہو کہ اس کا تعلق غریب گھرانے سے ہے۔ کالج میں تقریباً سبھی طلبہ اور طالبات بہت امیر کبیر یا اپر مڈل کلاس گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اسے اپنے اباجی پر فخر تھا کہ وہ مٹی کو زبان عطا کر دیتے ہیں لیکن کہیں یہ چبھن بہرحال موجود تھی کہ وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کی طرح دولت مند نہیں ہے۔

اور پھر سعد تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سعد اس سے بددل ہو یا اسے چھوڑ دے۔ اسے اس لمحے سے خوف محسوس ہوتا تھا جس لمحے سعد اسے صرف اس کے سوشل اسٹیٹس کی وجہ سے رد کر دیتا کبھی کبھار وہ دل کو مضبوط کرتی تھی۔

"اگر اسے میری نہیں بلکہ دولت کی ضرورت ہے تو اچھا ہے وہ ابھی الگ ہو جائے ایسے شخص کا ساتھ چھوٹ جانا ہی بہتر ہے۔"

لیکن اندر ہی اندر وہ چاہتی تھی کہ سعد اس آزمائش میں مبتلا نہ ہو۔

"آخر کسی کو آزمانے کا فائدہ بھی کیا ہے۔" وہ سوچتی۔

"اگر کوئی آزمائش میں پورا نہ اتر سکے تو سارا بھرم بھی جاتا رہتا ہے۔ آزما لینے سے صرف

دکھ ملتے ہیں اذیت اور تکلیف ملتی ہے۔ اچھا ہے کہ ہم کسی کو ایسی آزمائش میں ڈالیں ہی نہ جس سے بھرم بھی چلا جائے۔''

اماں عبداللہ کو گھر کا پتا سمجھا رہی تھیں اور وہ دل ہی دل میں چڑتی جا رہی تھی۔ ریشماں اور عبداللہ سے ملنے کا سارا لطف غارت ہو گیا تھا۔

''اتنی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بالآخر اس سے رہا نہ گیا تو چڑ چڑے انداز میں بولی۔ ''ہمارے گھر تک ان کی کار نہیں جا سکتی۔''

''جہاں چار پہیے نہ جا سکیں' وہاں یہ دو ٹانگیں چلی جاتی ہیں۔'' عبداللہ خوشدلی سے کہنے لگا۔

کار کچھ فاصلے پر کھڑی کر کے وہ تینوں بھاٹی گیٹ کی تنگ اور پُر پیچ گلیوں میں چل پڑے۔ سامان ماہ بانو اور عبداللہ نے اٹھا رکھا تھا' جو کچھ زیادہ نہیں تھا دستک کے جواب میں ابا جی نے دروازہ کھولا اور ان کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''ابا جی! السلام علیکم!'' وہ آتے ہی ان سے لپٹ گئی۔

''اندر آ جاؤ بیٹا!'' ابا جی نے ماہ بانو کو پیار کر کے الگ کیا۔

''ابا جی! یہ میرا کالج فیلو ہے۔'' اس نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہماری گاڑی راستے میں خراب ہو گئی تھی' پھر ہم اسی کے ساتھ آئے ہیں۔''

''اندر آ جاؤ برخوردار باہر کیوں کھڑے ہو۔'' ابا جی نے شفقت سے کہا۔

میں اب چلتا ہوں' کچھ تھکن بھی محسوس ہو رہی ہے اس نے معذرت کر لی۔

''چائے پی کر چلے جانا چائے سے تھکن اتر جاتی ہے۔''

''رہنے دیں ابا جی یہ ایسی جگہ پر چائے پینے کے عادی نہیں ہیں۔'' ماہ بانو بلاوجہ تلخ ہو رہی تھی۔

''ویسے ایک کپ چائے پینے کو دل بہت چاہ رہا ہے۔'' عبداللہ نے ماہ بانو کی بات نظر انداز کر دی ابا جی اسے اندر لے آئے۔ ماہ بانو اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''بانو! چائے تو بنا دینا۔'' اماں نے باہر سے آواز دی۔

''اماں! میں تھکی ہوئی ہوں۔'' اس نے بیگ بستر پر پٹختے ہوئے کہا۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

اس کی بات کے جواب میں صرف کچن سے برتن کھڑکنے کی آوازیں سنائی دیں

''اس وقت سو جانے میں ہی عافیت ہے۔'' اس نے کمرے کی بتی بجھا کر بستر کا رخ کیا۔

''ابھی جب اماں جان کو اندازہ ہو گا کہ عبداللہ حیدر علی شاہ کا بیٹا ہے تو بہت شامت آئے گی میری۔ کالج میں آج نہیں تو کل سعد کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں ان تنگ و تاریک گلیوں

میں رہنے والے ایک کمہار کی بیٹی ہوں تو پتا نہیں اس کا کیا ردعمل ہو گا۔ سب کام اکٹھے ہی غلط ہوتے ہیں' اور ایسا ہوتا بھی صرف میرے ساتھ ہی ہے۔''

نرم سنبل کا تکیہ سر تلے رکھنے کی بجائے اس نے سر کے اوپر اس طرح رکھ لیا کہ باہر کی آوازیں کم سے کم اس تک پہنچ پائیں۔ یہی سب باتیں سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔ صبح نو بجے اماں جان کے جھنجوڑنے پر اس کی آنکھ کھلی۔

''پاگل کر دیا ہے مجھے اس لڑکی نے' اٹھو اب کیا نحوست پھیلا رکھی ہے۔''

نیند سے بوجھل آنکھیں لئے جب وہ غسل خانے کی طرف بڑھ رہی تھی تو اماں نے اسے روک لیا۔ ''پہلے میری بات سنو۔''

''جی۔'' اس نے رسی پر لٹکا تولیہ اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

''یہ عبداللہ تمہارے کالج میں پڑھتا ہے اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''جب سے میں کالج میں آئی ہوں تب سے چھٹی پر ہے۔ ہاں ایڈی کا دوست ہے' اس لئے مجھے پتا تھا لیکن میں اس سے ملی نہیں تھی۔''

''ملی نہیں تھی تو اسے جانتی کیسے تھی؟'' اماں نے ایک اور سوال داغ دیا۔ ''اسے پہچانا کیسے تم نے؟''

''عقل سے' کل ندیا کنارے اس سے ملاقات ہوئی تھی وہیں میں نے اسے پہچان لیا۔ ظاہر ہے ہمارا کالج ایک ہی ہے' ایڈی دونوں کا مشترکہ دوست ہے' اس لئے ہماری بھی ہیلو ہائے ہو گئی' اتنی سی بات ہے اور آپ کو بتایا اس لئے نہیں کہ اس کا موقع نہیں ملا تھا۔''

تو ابھی بتا دیتی تم!''

''اماں' ابھی تو میں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا' آنکھیں بھی نہیں کھلیں میری' ذرا حواس تو ٹھکانے آتے پھر بتاتی ناں۔'' وہ غسل خانے کی طرف مڑ گئی۔

''یاد رکھنا' وہ ریشماں کا منگیتر ہے۔'' پیچھے سے اماں کی آواز آئی' لہجے میں تنبیہہ تھی اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ''مجھے معلوم ہے۔'' اور غسل خانے میں گھس گئی۔

جب تک وہ نہا کر باہر نکلی' اماں جان کی کہی ہوئی آخری بات اور ان کا لہجہ اسے چبھتا رہا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ صبح سے اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا' جب اماں نے نہایت اطمینان سے عبداللہ کو گھر کا پتا بتا دیا تھا اور اس کے بعد جاگتے ہی اماں کی تفتیش اور بالآخر تنبیہہ۔ یہ سب اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

ناشتے کے دوران اس سے رہا نہ گیا۔

''اماں جان! آپ نے عبداللہ سے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہہ دی۔'' اس نے پوچھا۔

''ایسی ویسی سے کیا مطلب؟''

"مطلب اس کے بابا جان یا زرینہ خالہ کے متعلق کوئی بات؟"

"مجھے پاگل سمجھا ہوا ہے تم نے۔"

"اور ریشماں سے متعلق کوئی بات؟"

نہیں بابا!" وہ بولی۔ "اتنا ضرور پوچھا تھا کہ وہ حیدر علی کا بیٹا ہی ہے ناں اور اس نے اثبات میں جواب دیا۔"

"ہوں!" وہ سوچ میں گم ہوگئی۔

"میری بات سننا بانو!" اماں کے انداز میں رازداری آگئی۔

"جی!" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آج کل کے لڑکے بہت خراب ہو گئے ہیں۔" اماں نے تمہید باندھی۔ "آوارہ گردی میں وقت برباد کرتے ہیں۔ یہ عبداللہ تمہارے ساتھ کالج میں ہے' ذرا اس پر نظر رکھنا۔"

"نظر رکھنے کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دیکھتی رہنا کہ یہ کسی لڑکی کے چکر میں تو نہیں ہے یا یہ بھی آج کل کے لڑکوں کی طرح آوارہ گردیوں میں وقت تو برباد نہیں کرتا۔"

"اگر ایسا ہو تو پھر؟"

"پھر مجھے ضرور بتانا کہیں میری بھانجی کی زندگی خوار ہی نہ ہو جائے۔"

"اماں! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کے مجرم بہنوئی آپ سے پوچھ کر اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ نہیں کریں گے اور دوسرے یہ بھی بھول جائیں کہ وہ ریشماں کی شادی اب بھی وہاں کرنے پر راضی ہوں گے۔"

"ہائے ہائے! یہ رشتہ تو بچپن میں طے ہو گیا تھا' اب اس سے کوئی کیسے پھر سکتا ہے۔"

"یہ تو آپ بھی مانتی ہیں ناں کہ بچپن کے رشتے ضروری نہیں کہ بڑے ہو کر بھی قبول کر لئے جائیں اور یہ بھی آپ کو پتا ہے کہ جس دشمنی کی ابتدا زرینہ خالہ کے وقت سے ہوئی تھی' وہ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ پیر صاحب ایسی جگہ بیٹی دے دیں گے؟ ایسے میں بیٹی دے دینے کا کیا مطلب ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے سامنے جھک گئے اور جھکنا کیسے گوارا کر سکتے ہیں وہ۔"

"اس گھر سے ہمیں دکھ ہی دکھ ملے ہیں خوشی ایک بھی نہیں ملی۔" اماں نے آہ بھری۔ "بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے۔ جس دن سے رجب علی شاہ کو علم ہوا کہ اس کی بیوی زرینہ اور حیدر علی کی گوری ایک ہی ہے' تب سے وہ خود پر قابو ہی نہیں رکھ سکا۔ حالانکہ بات ختم ہو چکی تھی' لیکن اس کے دل سے اذیت کا یہ کانٹا نہیں نکل سکا اور اس نے حیدر علی کو ہر جگہ زک دینے کی کوشش کی۔

حیدر علی آخر اس کا بھائی تھا۔ کچھ زیب النسا کے قتل کو وہ معاف نہیں کر سکا تھا۔ کچھ گوری کے بچھڑنے کا صدمہ تھا۔ رہی سہی کسر اس کی بے وقت موت نے پوری کر دی۔ حیدر علی کو اب تک یقین ہے کہ زرینہ کو قتل کیا گیا تھا اور یوں دونوں بھائیوں کے درمیان ایسی دشمنی کی ابتدا ہوئی' جو آج ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔"

"تب ہی تو کہہ رہی ہوں کہ ریشماں کی وہاں شادی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہاں حیدر علی شاہ اور عبداللہ وغیرہ اڑ جائیں تو اور بات ہے۔" ماہ بانو نے کہا۔

"پتا نہیں اس غریب کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ کچھ ماں نے بھگتا اور کچھ اب بیٹی بھگتے گی۔"

"یوں بھی عبداللہ کے بابا نے اسے اسی دشمنی کی وجہ سے باہر بھجوا دیا تھا' اگر رجب علی اور اس کے بیٹے اس رشتے کے سلسلے میں مخلص ہوتے تو کبھی عبداللہ کو نقصان پہنچانے کا سوچتے بھی نہ۔"

"اب تو دو ہی صورتیں ہیں کہ ریشماں بیچاری وہیں زیب النسا کے کمرے کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہے یا پھر عبداللہ سے اس کی شادی ہو جائے' لیکن پتا نہیں عبداللہ کیسا ہے۔"

"دیکھنے میں تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔" ماہ بانو نے تبصرہ کیا۔

"دیکھنے میں تو اس کا باپ بھی ٹھیک ہی لگتا تھا لیکن کیا دیا اس نے زرینہ کو؟ اگر وہ زرینہ کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو وہ اتنی جلدی نہ مرتی۔ بھلے اس کے پاس کپڑا' لتا اور اتنا زیور نہ ہوتا' روکھی سوکھی کھاتی' لیکن آزاد فضا میں سانس تو لیتی۔ ہماری تو زندگی کو گھن لگا دیا' ان بھائیوں نے۔"

"اماں! کچھ قصور زرینہ خالہ کا بھی تھا۔ پتا نہیں اُس دور کی لڑکیاں اتنی احمق کیوں ہوتی تھیں کہ محبت کو روگ ہی بنا لیتی تھیں۔"

"میں اسے سمجھاتی بھی تھی' لیکن وہ سمجھنے کی حد سے گزر چکی تھی۔ پتا نہیں کیا جادو کیا تھا حیدر علی نے اس پر۔" اماں کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"بیٹا میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ یہ مرد بہت بے اعتبارے ہوتے ہیں۔ وقت گزاری کے لئے محبت کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور پھر ایک طرف کو چلتے بنتے ہیں۔ اب حیدر علی کو دیکھ لو۔ زرینہ کی خاطر دیوانوں کی طرح پھرا کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا لیکن ہوا کیا؟ جب وہ اسے نہیں ملی تو چند دن کے اندر اس نے شادی کر لی اور اب خوش اور مطمئن ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے درمیان اسے یہ یاد بھی نہیں ہوگا کہ کوئی گوری کبھی اس کی زندگی میں آئی تھی۔"

"خیر اماں یہ تو نہیں کہہ سکتے' اس لئے کہ یہ جو اتنی طویل دشمنی ان کے درمیان چلی آ رہی ہے' یہ زرینہ خالہ کی یادگار ہی تو ہے۔"

"یہ دشمنی زرینہ کے لئے نہیں نبھائی جا رہی' یہ تو جھوٹی انا کی جنگ ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی زرینہ سے سچی محبت ہوتی تو اس کی بیٹی کی خاطر ریشماں کے لئے یہ دشمنی ترک کر دیتے' لیکن یہ تو اس کی اکلوتی بیٹی' اس کی آخری نشانی کو بھی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"اوہو' باتوں میں خیال ہی نہیں رہا' میں اتنی لیٹ ہوگئی' اُما صلواتیں سنا رہی ہوگی مجھے۔" وہ جلدی سے اٹھ کر تیار ہونے لگی۔

جب وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو اماں نے بے اختیار اسے چوم لیا۔ خوبصورت بلوچی فراک اور شلوار میں کھلے بالوں کے ساتھ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"کہیں نظر نہ لگ جائے میری بیٹی کو۔"

"چھوڑیں اماں' کالے رنگ کو نظر نہیں لگتی۔" اس نے بیگ کندھے پر ڈالا۔

"بہت ناشکری لڑکی ہے تُو۔"

"اچھا اماں! اب میں چلوں۔ درمیان میں گھر نہیں آؤں گی میں' وہیں ہوسٹل میں تیار ہو جاؤں گی۔ رات کو شاید دیر ہو جائے۔" اس نے اپنا پروگرام بتایا۔

"کتنی دیر؟"

"اوں!" اس نے حساب لگایا۔ "دس ساڑھے دس تو آرام سے بج جائیں گے۔ ہوسکتا ہے ذرا اور دیر بھی ہو جائے۔"

"دس ساڑھے دس!" اماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے اتنی دیر کالج میں رہنے کی۔"

"اماں پلیز! میرا ٹائم تو یوں بھی شام کو ہی ہے۔ پھر پروگرام بمشکل آدھا ہوا ہوگا' پھر بھی میں اٹھ جاؤں گی۔"

"آج آجائیں تمہارے ابا تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔"

وہ کان لپیٹ کر باہر نکلنے لگی۔

"سنو! میں تمہارے ابا کو بھیج دوں گی۔ اکیلی مت آنا۔" اماں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"اچھا!" وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

کالج کی رونقیں عروج پر تھیں۔ رنگ اور خوشبو کا جیسے سیلاب آیا ہوا تھا۔ فن فیئر کی وجہ سے ہر طرف اسٹال لگے ہوئے تھے۔ کچھ طلبہ فینسی پیپر ڈریسز پہنے اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔ ایک طرف پھانسی گھر اور جیل خانہ تھا۔ دوسری طرف کھانے پینے کے اسٹال تھے۔ اس کونے میں مہندی' راکھی' پھولوں اور سہروں کے اسٹال تھے۔

وہ اُما کو ڈھونڈتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس سے مل کر وہ تسلی کر لینا چاہتی تھی کہ آج وہ واقعی

اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد ہی اس کا ارادہ سعد سے ملنے کا تھا۔

اُما اور نیہاں دہی بڑے کھاتے ہوئے مسلسل بولے جا رہی تھیں۔ اُما کو غصہ تھا کہ اب تک ماہ بانو نہیں آئی۔ آدھا دن تو گزر چکا ہے۔ ماہ بانو کو آتے دیکھ کر وہ دہی بڑے کی پلیٹ چھوڑ کر اس کی طرف بڑھی۔

"اگر آج تم اتنی اچھی نہ لگ رہی ہوتیں تو یقین کرو' اتنی دیر سے آنے پر میں نے تمہیں قتل کر دیا ہوتا۔" اُما اس کے گلے لگ کر بولی۔

"تھینک گاڈ!" اس نے سکون کا سانس لیا۔

"میں نے آئینے کی بات کا یقین نہیں کیا' اماں کی تعریف پر کان نہیں دھرے' لیکن اب تم نے کہا ہے تو مجھے یقین آگیا ہے کہ میں واقعی اچھی لگ رہی ہوں۔"

پھر وہ اُما کے کان کے پاس منہ لے گئی۔

"سعد کہاں ہے؟"

"ابھی تو اِدھر ہی تھا۔" اُما نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"مووی بنا رہا تھا۔"

"چلو اسے دیکھتے ہیں۔" ماہ بانو نے اسے کھینچا۔

"میرے دہی بڑے۔" اُما چلائی۔

"چھوڑو بھی میرے ساتھ آؤ۔"

"ارے یاد آیا۔" اُما کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "اِدھر میرے ساتھ آؤ۔" وہ ماہ بانو کو مخالف سمت میں گھسیٹنے لگی۔

"اُف! کیا کر رہی ہو' پہلے میرے ساتھ چلو۔"

"تم میرے ساتھ چلو۔"

ماہ بانو نے اُما کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اُما اسے بھیڑ سے ہٹ کر الگ گوشے کی طرف لے گئی اور دونوں سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔

"ہاں' کیا بات ہے؟"

"وہ عبداللہ آگیا ہے۔" اُما نے اپنی طرف سے دھماکہ کرنا چاہا۔

"پتا ہے اور میں مل بھی چکی ہوں۔"

"کیا؟"

"جی ہاں۔"

"پھر تو میں فضول میں تمہیں کھینچ لائی۔ اس تو اچھا تھا کہ تم سعد سے مل کر اپنی تعریفیں کروا لیتیں۔"

ماہ بانو ہنس پڑی۔

''ویسے یار! یہ عبداللہ ہے کتنا ہینڈسم' اگر تمہاری کزن کا فیانسی نہ ہوتا تو میں ابھی اس پر عاشق ہونے کو تیار تھی۔''

''ہائے' میں نے تمہیں بتانا تھا۔'' ماہ بانو کو جیسے ایک دم یاد آیا۔

''کیا؟''

''میں گاؤں گئی تھی' ریشماں سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔''

''ہائے سچ؟'' اُما نے دلچسپی سے کہا۔

''اور سب سے مزے کی بات' میں نے عبداللہ اور ریشماں کے خاندان کی دشمنی کا سراغ بھی لگالیا ہے۔''

''اگر تمہیں سعد سے ملنے کی جلدی نہیں ہے تو پلیز' جلدی سے بتادو۔ تمہارے لہجے سے اندازہ ہورہا ہے۔ کہ کوئی بہت خاص بات پتا چلی ہے تمہیں۔''

''بات تو خاص ہی ہے' میں تمہیں سب کچھ سنانے کو بے چین ہورہی تھی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''سعد سے بھی ملاقات ہوجائے گی لیکن یہ بہت مزے کی بات ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آئندہ عبداللہ سے ملتے ہوئے تمہیں بھی ان سب باتوں کا علم ہو۔''

ماہ بانو نے شروع سے آخر تک تمام کتھا اُما کو سنا ڈالی۔ بس اس قدر خیال رکھا کہ تمام تر روداد سنانے کے باوجود اس کی موجودہ مالی پوزیشن کا اندازہ اُما کو نہ ہوسکے۔

''یہ تو واقعی بہت دلچسپ اور بہت خطرناک ہے۔'' اس کی بات کے اختتام پر اُما نے کہا۔

''ہاں تب ہی تو میں یہ سب کچھ تمہیں سنانے کے لئے بے چین تھی۔''

''اور عبداللہ کے ساتھ تمہاری ملاقات کالج میں ہی ہوئی؟ تم نے اسے پہچانا کیسے؟ ایڈی نے تعارف کرایا تھا؟'' اُما نے پوچھا۔

''نہیں اس سے ملاقات کل ہوئی ندیا کنارے۔'' اور ماہ بانو نے عبداللہ سے ملاقات کی تفصیل بھی اسے سنادی اور ذرا سی احتیاط کے ساتھ۔

''ایک بات تو بتاؤ بانو! تمہاری اماں کو ان سب باتوں کا اتنی تفصیل کے ساتھ کیسے علم ہوا؟''

''کسی نہ کسی ذریعے سے سب کچھ اماں جان تک پہنچتا رہا تھا سب سے زیادہ معلومات انہیں حمیدہ سے حاصل ہوئی تھیں پھر زرینہ خالہ کے خطوط سے۔ ان دنوں زرینہ خالہ اور اماں جان کے درمیان بات چیت کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا۔ اماں جان کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن صرف زرینہ خالہ کے خطوط کی خاطر انہوں نے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا شروع کیا۔

اچھو کی موت کے طریقے کی تصدیق شکورے نے کی جو چھپ کر رجب علی شاہ کو دیکھ رہا تھا یہ سب اس نے میرے نانا جی کو بتایا تھا۔ اس وقت جب اس کا ضمیر اسے تنگ کرنے لگا تھا۔ کچھ خالی جگہیں اماں جان اور حمیدہ نے مل کر اپنی عقل سے پُر کرلیں۔

پھر یہ بھی تھا کہ حیدر علی عبداللہ کے بابا اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے مہرالنسا کے پاس آجاتے تھے اور مہرالنسا ہر بات حمیدہ سے کہہ دیتی تھی۔ زرینہ خالہ بھی اماں جان سے کچھ نہیں چھپاتی تھیں اس لئے اس تمام چکر سے باہر کھڑے ہونے کے باوجود بھی اماں جان اس سے بے خبر نہیں تھیں۔''

''میں اور نظریے سے پوچھ رہی تھی۔'' اُما نے کہا۔

''میرا مطلب تھا کہ ریشماں کے حوالے سے تم نے اس سے کوئی بات نہیں کی اگر تم یہ بات کرو تو تمہارے خیال میں اس کا کیا ردعمل ہوگا؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتی مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کی کوئی گرل فرینڈ بھی ہے یا نہیں۔''

''میں ایسا نہیں چاہتی خیر چند دن میں یہ سب معلوم ہو ہی جائے گا۔''

''ایسا نہیں ہونا چاہیے وہ اس قید خانے کی اذیت صرف اس وجہ سے برداشت کررہی ہے کہ ایک دن عبداللہ اسے وہاں سے لے جائے گا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''لیکن یہ سب بہت مشکل ہے پتا نہیں' ہمیں کس چیز کی دعا کرنی چاہیے اور کس چیز کی نہیں۔ میں تو کہتی ہوں وہ ہو جس میں سب کی بہتری ہے۔''

''پتا نہیں لوگ اتنے گہرے گہرے عشق کیسے کرلیتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ حقیقی زندگی میں ایسا ممکن ہے۔'' اُما نے تبصرہ کیا۔

''دیکھو ایک شخص انگلینڈ سے پڑھ کر آتا ہے اور یہاں گاؤں کی میٹرک پاس لڑکی کے عشق میں گھٹنے گھٹنے گرفتار ہوجاتا ہے۔ مجھے تو یہ عجیب سی بات لگتی ہے۔ اور پھر یہیں پر بس نہیں ہے وہ دونوں چھپ چھپ کر ملتے بھی ہیں۔ مجھے بتاؤ بانو تم پہلی نظر کی محبت میں گرفتار ہوسکتی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''اور نہ میں ایسا عشق کرسکتی ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے جدائی کی تکلیف ضرور ہوگی لیکن بس کچھ عرصے' میں نہیں سمجھتی کہ یہ جدائی روگ بن کر میری جان ہی لے لے گی۔''

''ویسے یہ معلوم نہیں کہ تمہاری خالہ کی جان کس نے لی تھی۔ جدائی نے یا رجب علی شاہ پر ہونے والے انکشاف نے۔''

''اینی وے' میں ایسے فلسفے کو نہیں سمجھ سکتی شاید اس لئے کہ ہم لوگ بہت مادہ پرست ہیں۔ ہم محبت کرنے سے پہلے سکیورٹیز دیکھتے ہیں' یہ دیکھتے ہیں کہ جس سے ہم محبت کرنے لگے ہیں وہ ہمیں کیا دے سکتا ہے پوری پلاننگ کرتے ہیں' محبت کرنے کے لئے بھی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

"یوں بھی پہلی نظر کے عشق میں ہم کیا دیکھ سکتے ہیں' صرف شکل وصورت اور بس۔" اُما نے تبصرہ کیا۔ "اور شکل صورت میں کیا رکھا ہے اگر ذہنی ہم آہنگی نہ ہو ایک دوسرے کے لئے عزت اور احترام کا جذبہ نہ ہو تو محبت کیسے ہو سکتی ہے؟ میرے خیال میں تو محبت بھڑک کر اپنی لپیٹ میں لے لینے والا جذبہ ہی نہیں ہے یہ تو آہستگی سے قطرہ قطرہ جسم اور روح میں سرایت کر جانے والا جذبہ ہے۔"

اپنے نزدیک کھنکار کی آواز سن کر وہ چونکیں سامنے ردا کھڑی تھی۔ ردا کا پھولوں کا اسٹال تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک خوبصورت کلی تھی سرخ گلاب کی۔

"رداتم!" اُما چونکی۔ "ہمیں پتا ہی نہیں چلا تمہارے آنے کا۔"

"ہم دیکھ رہے تھے کتنی دیر سے تم دونوں ایک دوسرے کے کان کے قریب کھسر پھسر کرنے میں مگن تھیں۔" ردا بولی۔ "بہر حال اس وقت میں تم دونوں کے لئے یہ پھول لائی ہوں۔"

"ہاؤ نائس۔" ماہ بانو کھل اٹھی۔ "کس نے بھیجے ہیں؟"

"اُما کے کارڈ پر نام موجود ہے اور تمہیں!" اس نے ماہ بانو کی طرف اشارہ کیا

"پھول بھیجنے والے نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کو کہا تھا اور ہمارے اسٹال پر راز داری کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ تم چاہو تو تم بھی پھول بھیجنے والے کو اپنی طرف سے پھول بھجوا سکتی ہو صرف چالیس روپے میں' آگے تمہاری مرضی کہ کارڈ پر نام لکھوایا نہیں۔"

"جلدی دو ہم بھی دیکھیں کہ اتنے خوبصورت پھول کس نے بھجوائے ہیں۔" اُما نے بے تابی سے کہا۔ "ویسے ماہ بانو کے متعلق میں بالکل ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکتی ہوں' کیوں بانو ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟" ماہ بانو ہنس پڑی۔

ردا انہیں پھول اور کارڈ دے کر چلی گئی۔ اُما کو پھول ایڈی نے بھجوایا تھا اور ماہ بانو کو؟ ماہ بانو نے تجسس سے اردگرد دیکھا اسے یقین تھا کہ پھول بھیجنے والا اس وقت اس کی بے چینی اور حیرانی سے محظوظ ہونے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوگا۔

اور وہ واقعی اس کی طرف متوجہ تھا۔ تین کی ٹولی میں ایڈی' سعد اور عبداللہ کھڑے تھے اور سب ان ہی کی طرف متوجہ تھے۔

"ایڈی!" اُما نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "اور بانو میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں کہ تمہیں پھول سعد نے بھجوائے ہیں۔ اب یقین کر لو کہ تم واقعی آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔"

ماہ بانو نے ایک نظر ان تینوں کی طرف دیکھا پھر کارڈ پر نگاہ ڈالی۔ پھول سعد نے نہیں بھجوایا تھا' کیوں کہ یہ رائٹنگ سعد کی نہیں تھی۔

"عبداللہ!" ماہ بانو نے آہستہ سے اُما سے سرگوشی کی۔

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں' تو یہ پھول عبداللہ نے بھجوایا ہے۔"

"بہت بدذوق ہے سعد۔" اُما ہنسی۔

"تھینکس عبداللہ۔" ماہ بانو وہیں سے چلائی۔

اس نے ہاتھ ہلا کر شکریہ کا جواب دیا۔ "تم ایڈی کو شکریہ بھی نہیں کہو گی؟" ماہ بانو اُما کی طرف مڑی۔

"آئیڈیا!" وہ چٹکی بجا کر بولی۔

"میں شکریہ اس طرح ادا نہیں کروں گی' آؤ میرے ساتھ۔" اس نے ماہ بانو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ان تینوں کے قریب سے وہ اطمینان سے گزرتی چلی گئیں۔

"بہت بے مروت ہو اُما!" ایڈی بولا۔

لیکن وہ سنی اَن سنی کر کے بھیڑ میں داخل ہو گئیں۔ ظہیر اور طاہرہ کے اسٹال پر پہنچ کر اُما بولی۔

"ایک سہرا چاہیے۔" اُما بولی

"کس کے لیئے؟"

"ایڈی کے لیے۔"

پیسے دے کر وہ کچھ دور جا کھڑی ہوئیں' اور آئس کریم کھاتے ہوئے انہی تینوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

کالج کی یہ دلچسپیاں سب کے لیے تھیں۔ ایک ایک فرد کتنے ہی لوگوں کو پھول بھجواتا تھا۔ اس کا مطلب محض دوستی ہوتا تھا۔ کوئی وعدہ یا اظہار نہیں.........ویلنٹائن ڈے پر بھی سب دوست ایک دوسرے کو پھول دیا کرتے تھے اور پھولوں کے ختم ہو جانے پر صرف پتے بھی پکڑا دیا کرتے تھے۔ کالج کا ماحول دوسرے تعلیمی اداروں سے بہت مختلف تھا۔

اور پھر ظہیر اور طاہرہ نے ایڈی کو سہرا پہنا کر ہی دم لیا۔ اردگرد موجود بیشتر طلبہ نے تالیاں بجا کر باآوازِ بلند' یوں مبارک باد دینی شروع کی جیسے واقعی وہ ابھی نکاح پڑھوانے جانے لگا ہو۔ وہ دونوں بھی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑیں۔

"ویسے ایڈی! پھول اور سہرے پر بس کرتا نظر نہیں آ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ پھیرے لگانے پر بھی تیار ہو جائے گا۔" ماہ بانو محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

اُما بھی ہنس پڑی۔ "بھئی اتنا آسان نہیں ہے' میرے ساتھ پھیرے لگانا۔ میرا سوئمبر بہت مشکل ہوگا۔ اور پھر ایک بات اور بھی ہے۔" اُما اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟"

''مجھے ساری زندگی رونے دھونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔اس کے ساتھ تو جولڑکی بھی شادی کرے گی ساری زندگی اپنی قسمت کو روتی رہے گی۔''

''اونہوں' ایڈی کی کمپنی تو بہت دلچسپ ہوتی ہے۔میرا نہیں خیال کہ وہ اتنا برا لائف پارٹنر ثابت ہوگا۔'' ماہ بانو نے تبصرہ کیا۔

''اتنا برا نہیں' بہت برا۔دیکھا نہیں تھا مائم کے دنوں میں' مصیبت میں مبتلا کیا ہوا تھا ہمیں' ذرا سے کام کو سر پر سوار کر لیتا ہے۔ یوں سمجھتا ہے' کہ اس کے علاوہ تو سب نکمّے ہیں' اور کوئی یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔''

''کر تو سب سکتے ہیں' لیکن اس کی طرح نہیں کر سکتے جیسے ایڈی کرتا ہے۔'' ماہ بانو نے حتمی انداز میں کہا۔

''وہ تینوں یہیں آ رہے ہیں۔'' اُما نے کہا۔

''سہرا اچھا ہے' اپنی شادی کیلئے سنبھال کر رکھ رہا ہوں۔'' ان کے قریب آ کر ایڈی نے سہرا احتیاط سے لفافے میں ڈال دیا۔

''چلو کم از کم تمہیں یہ احساس تو ہو گیا ہوگا کہ میں بے مروّت بالکل نہیں ہوں۔ایک پھول کے بدلے میں ایسا خوبصورت سہرا کبھی کسی نے کسی کو نہیں دیا ہوگا۔''

''ایک پھول کہہ کر اس کی توہین مت کرو' اس میں' وہ کیا ہوتا ہے یار۔''

وہ عبداللہ کی طرف مُڑا پھر بولا۔''ہاں وہ جذبِ دل کی شدتیں وغیرہ اور نہ جانے کیا کچھ ہے' اور یہ سب کچھ اس چالیس روپوں کے علاوہ ہے' جو میں نے اپنی سگریٹوں کا کوٹہ کم کر کے یہاں خرچ کیے ہیں۔''

ایڈی نے جس انداز میں کہا' وہ سب ہنس پڑے۔

''اور وہ جو میری جذب دل کی شدتیں وغیرہ ہیں' انہیں ابھی تک اظہار کا مناسب طریقہ بھی نہیں سُوجھ رہا۔'' سعد نے مصنوعی آہ بھری۔

''تمہیں یہ طریقہ ٹرین چھوٹنے کے بعد ہی سمجھ میں آئے گا۔'' ماہ بانو نے جل کر کہا' پھر عبداللہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''پلیز! میری بات سننا عبداللہ۔''

''سناؤ۔''

ماہ بانو نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔اتنی بھیڑ بھاڑ میں صرف ایک گوشہ ہی ایسا تھا' جہاں کوئی بھی نہیں تھا۔اسے بھی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی' جو کچھ وہ عبداللہ سے کہنا چاہتی تھی' وہ سب کے سامنے نہیں کہہ سکتی تھی۔

''مجھے صرف تم سے بات کرنی ہے۔'' وہ بولی۔

''تو ہم چلے جاتے ہیں' ایڈی نے کہا۔

''نہیں ہم چلتے ہیں۔'' ماہ بانو نے جلدی سے کہا۔عبداللہ کندھے اُچکا کر اس کے ساتھ ہو لیا۔اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے' ماہ بانو کی نگاہ سعد پر پڑی' جس کی آنکھوں میں واضح طور پر ناپسندیدگی تھی۔اسے ماہ بانو کا اس طرح عبداللہ کے ساتھ چلا جانا یقیناً برا لگا تھا۔

ماہ بانو کو اُلجھن ہونے لگی' اسے اس قسم کے شکوک وشبہات بہت برے لگتے تھے۔

صبح ہی اماں جان نے تنبیہ کی تھی کہ عبداللہ ریشماں کا منگیتر ہے۔یوں جیسے ماہ بانو کو اس بات کا علم نہیں تھا۔اور اب سعد نے مُنہ بگاڑ لیا تھا۔

''ہاں کہو کیا کہنا ہے؟'' بالآخر اُس کے روکنے پر عبداللہ نے کہا۔

ماہ بانو نے ساری اُلجھنیں ذہن سے جھٹک دیں' اور سوچنے لگی کہ بات شروع کرنے کے لئے کون سے الفاظ مناسب رہیں گے؟

''دیکھو عبداللہ! تم سعد کو یہ مت بتانا کہ میں بھاٹی میں رہتی ہوں۔'' اُس نے سوچا' لیکن پھر خود ہی اس فقرے کو رد کر دیا۔''یہ مناسب نہیں ہے' جب سعد نے کبھی اظہار نہیں کیا تو میں اس کا نام کیوں لوں' ہاں یہ ٹھیک رہے گا کہ عبداللہ! تم میرے بہت اچھے دوست ہو' اس لیے......''

''اونہوں' وہ میرا اچھا دوست کیسے ہو گیا' کل ہی تو اس سے ملاقات ہوئی تھی' لیکن پھر کہوں تو کیسے۔خواہ مخواہ ہی اسے یہاں تک گھسیٹ لائی۔''

عبداللہ اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔

''کیا اتنی مشکل بات کہنی ہے کہ جس کے لئے الفاظ نہیں مل رہے۔''

ماہ بانو چونک گئی۔''تم اچھی فیس ریڈنگ کر لیتے ہو۔''

وہ کیاری کے ساتھ لگی اینٹوں پر بیٹھ گئی۔عبداللہ بھی اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

''اتنا سوچو گی تو بات نہیں کر سکو گی۔'' اس نے سگریٹ نکال کر سُلگا لیا۔

''جو بات مجھے کرنی ہے' وہ سوچے سمجھے بغیر کر بھی نہیں سکتی۔'' پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔''میں نے تم سے کہا تھا نہ کہ جب ہم کسی چیز کو حاصل نہیں کر سکتے تو احساسِ کمتری ہمیں فرسٹریشن میں مبتلا کر دیتی ہے۔''

''اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا ہی سب سے زیادہ خطرناک بات ہے۔یا تو یہ احساس انسان کو سب سے آگے لے جاتا ہے۔یا پھر پیچھے چھوڑ دیتا ہے کہ انسان قافلے سے بچھڑ جاتا ہے۔'' وہ بولا۔

''میرا شمار تم ان لوگوں میں کر سکتے ہو جنھیں ہر وقت قافلے سے بچھڑ جانے کا خوف رہتا ہے۔میرے احساسِ کمتری کو کبھی کوئی مثبت راہ نہیں ملی۔''

''اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکا بانو تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''میں اسی لئے تمہیں یہاں لائی تھی۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

عبداللہ بغیر کچھ کہے اُس کی بات کا منتظر رہا۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ غلط ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن مجھے مسلسل یہ کانٹا چبھتا رہتا ہے ٬کہ یہاں جواتنے لوگ ہیں٬ میں ان سے کم٬ بہت پیچھے ہوں۔''

''پاگل ہو٬ تم کس اعتبار سے اُن سے کم ہو سکتی ہو٬ تم میں کس چیز کی کمی ہے؟ شکل صورت٬ تعلیم٬ مینرز٬ تم ہر لحاظ سے مکمل ہو۔'' عبداللہ نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تھینک یو عبداللہ٬ لیکن تم اس بات سے تو انکار نہیں کر سکتے ناں٬ کہ مکمل تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔''

''آل رائٹ٬ مکمل کوئی بھی نہیں ہوتا٬ تو پھر تم احساسِ کمتری میں کیوں مبتلا ہو٬ اگر تم میں کسی بات٬ کسی چیز کی کمی ہے٬ تو ہر ایک میں کسی نہ کسی بات٬ یا کسی چیز کی کمی ہوگی۔''

ماہ بانو ہنس پڑی۔ ''تم بہت اچھے دوست ہو٬ عبداللہ میں صبح سے قنوطیت میں مبتلا تھی٬ لیکن اب تم سے بات کر کے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔''

''ہنسنا اچھا ہوتا ہے٬ ہنستی رہو گی تو بہت سی بے معنی باتوں پر قنوطیت میں مبتلا ہونا چھوڑ دو گی۔'' اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر باقی حصہ جوتے تلے مسل دیا۔

''بات یہ ہے عبداللہ! کہ یہاں کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا کے میرا تعلق کس قسم کی فیملی سے ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے ہی کبھی کسی کو نہیں بتایا٬ یہاں تک کہ اُما کو بھی نہیں۔''

''کیوں؟ اچھی بھلی فیملی تو ہے۔ تمہاری اماں ذرا پرانے خیالات کی ہیں٬ لیکن ایسا تو میری اماں جان کے ساتھ بھی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے۔ اور تمہارے ابا جی میرے بابا جان کی طرح بہت خوش مزاج اور روشن خیال ہیں۔ میری اور تمہاری فیملی میں صرف اتنا فرق ہے کہ میں اکلوتا نہیں ہوں٬ تم اکلوتی ہو٬ ویسے بیٹوں کی حد تک میں بھی اکلوتا ہی ہوں۔''

''اس کے علاوہ جو سب سے بڑا فرق ہے وہ ہے اسٹیٹس٬ بینک بیلنس اور جائیداد کا۔''

''بانو۔'' عبداللہ کے انداز میں حیرت تھی۔ ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ تمہاری سوچ اتنی گھٹی ہو گی۔''

''تم یہ اس لئے کہہ رہے ہو کیوں کہ تم میرے مقام پر نہیں ہو میں نہیں کہتی کہ مجھے اپنے ابا جی اور اُن کے ہاتھ کے بنائے ہوئے مٹی کے برتنوں پر فخر نہیں ہے۔ میں آج اس مقام پر ہوں تو صرف اپنے ابا جی کی وجہ سے ہوں٬ تم اندازہ نہیں کر سکتے عبداللہ کہ مجھے ان سے کتنا پیار ہے لیکن......'' وہ پل بھر کو چپ ہوئی پھر بولی۔

''لیکن یہ کانٹا چبھتا رہتا ہے کہ ہم لوگ اتنے دولت مند نہیں ہیں جتنے یہ سب ہیں۔

اس نے کالج میں چلتے پھرتے٬ ہنستے بولتے چہروں کی طرف دیکھا۔

''تمہاری محبت اور تمہارے فخر پر مجھے شک ہونے لگا ہے۔''

''تم نہیں سمجھ سکتے ہو۔'' وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔ ''کیوں کہ تم میری جگہ پر نہیں ہو۔ جیب میں آٹھ دس ہزار روپے روز ڈال لینے کے بعد میں بھی یہ بات کر سکتی ہوں۔ اتنی ہی آسانی سے جتنی آسانی سے تم نے یہ بات کہی ہے۔''

''تم زندگی سے اپنے لیے کیا چاہتی ہو٬ جائیداد٬ بینک بیلنس٬ کپڑے٬ جیولری اور بس۔''

''میں یہ سب نہیں چاہتی۔'' اُس نے عبداللہ کی بات کاٹی۔

''میں صرف تھوڑا سا سکون چاہتی ہوں۔ اور یہ چاہتی ہوں کہ تم کالج میں کسی کو میری مالی حیثیت کے بارے میں نہ بتاؤ اور بس٬ میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔''

''تمہارا کیا خیال تھا کہ میں یہاں آ کر یہ سب باتیں نشر کر دوں گا٬ بہت امیچور ہو۔''

''میرا یہ خیال نہیں تھا٬ باتوں باتوں میں بھی تو ذکر نکل آتا ہے۔''

''ویسے مجھے جاننے کا حق تو نہیں ہے٬ لیکن اگر تم جواب دینا چاہو تو اتنا بتا دو کہ یہ راز داری کیوں؟ میں مانتا ہوں کہ یہاں بہت سے لوگ اسٹیٹس کانشس ہیں٬ لیکن زیادہ تر لوگ ابھی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے٬ کیا ایسا کسی خاص فرد کے لیے چاہتی ہو؟''

ماہ بانو کو پھر اُلجھن ہونے لگی۔ وہ بہت جلد اصل بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

''اگر ایسا ہو تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔'' اُس نے خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''اب تم نے دوست کہا ہے٬ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس سے فرق پڑتا ہے۔ جو شخص اتنی سی بات پر تم سے متنفر ہو سکتا ہے٬ وہ کبھی تمہارا اچھا دوست ثابت نہیں ہو سکتا۔''

وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا٬ لیکن اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

''یہ میرا مسئلہ ہے۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تم سے بس اتنی توقع ہے کہ تم کسی سے کچھ نہیں کہو گے۔''

وہ دونوں اُما اور ایڈی کے پاس چلے آئے جو وہیں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ سعد اُن کے پاس سے جا چکا تھا۔

''چلو اُما! اب ہاسٹل چلتے ہیں٬ شام کے پروگرام کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

اُما٬ ایڈی اور عبداللہ کو گڈ بائے کر کے چلی آئی۔

''خیریت ہے اُلجھی اُلجھی سی لگ رہی ہو۔'' ہاسٹل میں اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے ماہ بانو سے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہے۔''

''عبداللہ کو ریشماں کے متعلق بتایا تم نے؟''

وہ سمجھ رہی تھی کہ اتنی دیر تک ماہ بانو عبداللہ سے ریشماں متعلق بات کرتی رہی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''پھر اتنی دیر کیا گپیں لگتی رہیں' سعد کو بھی ناراض کر دیا۔'' اس نے دوپٹا اور بیگ بستر پر پھینک دیے اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔

''سعد ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے' میرا اس سے کیا تعلق ہے۔ خواہ مخواہ رعب برداشت نہیں کر سکتی میں۔'' چڑ چڑی تو وہ پہلے ہی ہو رہی تھی۔ اُما کی بات سن کر اس کا پارہ اور چڑھ گیا۔

''اوپر سے اس عبداللہ نے نصیحتوں کی پٹاری کھول لی۔ جس کو دیکھو' وہ مجھے احمق سمجھتا ہے۔ سعد کا خیال ہے کہ میں اتنی بے وقوف ہوں کہ اس کا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر اسے راضی کرنے دوڑی چلی آؤں گی۔ ہونہہ! اور عبداللہ' اس کے خیال میں' میں امیچور ہوں۔ یوں بھی نصیحت کرنے پر خرچ ہی کیا آتا ہے۔ نہ ایکسائز ڈیوٹی نہ محصول چنگی' لہٰذا جب دل چاہا پٹاری کھول کر نکالی اور دوسرے کو تھما دی۔''

اُما اس کی بات سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکی۔ سعد کی حد تک تو وہ سمجھ گئی تھی' لیکن عبداللہ اس کے عتاب کا نشانہ کیوں بن رہا تھا اس کی اسے خبر نہیں تھی۔ بالآخر بہت سوچ کر اسے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی۔

''وہ نصیحتیں کیوں کرنے لگا؟ کہیں تم نے اُس سے اُس کی گرل فرینڈز کے متعلق تو نہیں پوچھ لیا؟''

اُما نے کچھ اتنے بھول پن سے پوچھا تھا کہ ماہ بانو کا سارا غصہ پل بھر میں اتر گیا۔

''واہ! کیا دور کی کوڑی لائی ہو۔'' وہ ہنس پڑی۔

''تو پھر؟''

''کچھ نہیں' بس اب میرا غصہ اُتر گیا ہے' کوئی اور بات کرو۔''

''کرتی ہوں' لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم نے عبداللہ سے ریشماں کے متعلق بات کی؟''

''ارے نہیں بابا مجھے کچھ اور بات کرنی تھی۔''

''میں نے باتوں باتوں میں ایڈی سے پوچھا تھا۔'' وہ بستر پر ماہ بانو کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔

''کیا پوچھا تھا؟''

''یہی کہ عبداللہ کا کوئی افیئر چل رہا ہے؟''

''پھر؟'' ماہ بانو کے انداز میں بھی دلچسپی اتر آئی۔

''اس نے اتنا بتایا ہے کہ وہ کبھی کسی کے ساتھ سنجیدگی سے انوالو نہیں ہوا۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں رہی لیکن بات بس دوستی تک ہی رہی۔ اس کی چوائس کی لڑکی اب ہی نہیں ملی۔''

''ایڈی نے اس کی منگنی کا ذکر اب تک نہیں کیا؟''

''نہیں۔ شاید وہ عبداللہ کی مارکیٹ ویلیو خراب نہیں کرنا چاہتا۔'' ماہ بانو ہنس پڑی۔

''لیکن تم نے عبداللہ سے کیا بات کی؟'' اُما اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے پر راضی نہیں تھی۔

''بتاتی ہوں' لیکن پہلے تم بتاؤ کہ ایڈی کی جذب دل کی شدتیں وغیرہ کہاں تک پہنچیں؟''

''وہ خواہ مخواہ کی حماقت پر اُتر آیا ہے۔'' اُما نے کہا' پھر آگے بڑھ کر رازداری سے بولی۔

''آج تو حد ہی کر دی اس نے' پتا ہے کیا کہا مجھ سے؟''

''کیا؟''

''کہنے لگا کہ مجھے لگتا ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

''کیا؟'' ماہ بانو چلائی۔ ''سچ کہہ رہی ہو؟''

''تو اور کیا۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں نے کہا کہ مجھ پر اب تک ایسا کوئی انکشاف نہیں ہوا' تو پتا ہے اُس نے کیا کہا۔ وہ کہنے لگا کہ وہ اس وقت تک انتظار کر سکتا ہے۔ جب تک مجھ پر یہ انکشاف نہیں ہو جاتا۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ وہ ایک پھول پر بس کرتا نظر نہیں لگ رہا' کاش میں نے تم سے اس وقت شرط لگائی ہوتی۔'' ماہ بانو ہنس پڑی۔

''تمہارا کیا خیال ہے ایڈی سیریس ہے اس معاملے میں؟''

''مجھے تو سو فیصد یقین ہے۔ کیوں تمہیں کوئی شک ہے' اس بارے میں؟''

''شک کی بات نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''پر ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ دیکھو ناں یہ تو خواہ مخواہ خود کو مصیبت میں مبتلا کرنے والی بات ہوئی۔ ہماری دوستی میں آج تک مذہب حائل نہیں ہوا' لیکن ایڈی جس طرف بڑھ رہا ہے' وہاں ہر قدم پر مذہب درمیان میں آئے گا اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی اپنے اپنے مذہب کو رد نہیں کر سکتا۔''

''یہ تو ہے' ایڈی کو بھی یہ سمجھنا چاہیے۔''

''وہ تو پاگل ہے' لیکن مجھے پاگل نہیں بننا۔'' اُما نے کہا۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے بانو' کہ میں نے یہاں کتنی مشکلوں سے داخلہ لیا ہے۔ ڈیڈی اور ممی کا کہنا تھا کہ میں' وہیں داخلہ لے لوں' وہاں نہیں لیتی تو انڈیا چلی جاؤں' لیکن یہاں نہ آؤں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ یہ شہر اس ملک کا حصہ ہے' جس سے میں جنون کی حد تک محبت کرتی ہوں' لیکن ممی' ڈیڈی مجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ہمارے ہاں سے کوئی بھی یہاں آنا پسند نہیں کرتا' لیکن میں یہیں آنا چاہتی تھی۔ ممی ڈیڈی کا دل تو میرے رونے دھونے اور بھوک ہڑتال سے پسیج گیا' لیکن وجے' میرا بھائی' وہ کسی بھی صورت مجھے یہاں بھجوانے پر راضی نہیں تھا۔ پھر انہی دنوں اسے امریکہ جانا پڑا' اور اس کی غیر موجودگی میں' میں یہاں پر آگئی۔ وہ اب تک مجھ سے ناراض ہے' بات نہیں کرتا مجھ سے۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہارے گھر والوں کو اندازہ نہیں ہے کہ یہاں کے لوگ کتنے کھلے دل کے ہیں۔ تم چار سال اس کالج میں رہوگی' شہر کی سڑکوں پر نکلوگی' ملو ملاؤ گی اور اس تمام عرصے میں کوئی بھولے سے بھی یہ نہیں پوچھے گا کہ تم کہاں کی رہنے والی ہو' یا تمہارا مذہب کیا ہے؟''

''لیکن یہ بات وہاں کوئی نہیں جانتا۔ جب میں ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے دوران سب کو بتاتی ہوں کہ ہمارا کالج چھوٹا سا پاکستان ہے۔ جس میں پاکستان کے ہر علاقے کے' ہر زبان بولنے والے طالب علم موجود ہیں اور ہر ایک کی ہر ایک سے دوستی ہے تو سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں درحقیقت اپنی صفائی پیش کر رہی ہوں۔''

''ایسا کرو کہ کسی دن اپنے گھر والوں کو یہاں لے آؤ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔''

''میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک اور اس کے لوگوں سے محبت کرتی ہوں۔ بھارت میں بابری مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے تو میرا دل دکھتا ہے اور اس کے جواب میں مندر گرائے جاتے ہیں' تو بھی میرا دل دُکھتا ہے۔ ہمارے گھرانے کے مسلمانوں کے گھرانوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ ہم ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں' کھاتے پیتے ہیں' بلکہ اپنے روز مرۃ معمولات میں ہم مذہب کو اتنی اہمیت بھی نہیں دیتے' لیکن شادی بیاہ وغیرہ ایسے معاملات ہیں' جن میں کوئی بھی مذہب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

''ہم مسلمان لوگوں کا حال بھی مختلف تو نہیں ہے' ہم بھی رمضان اور محرم کے علاوہ صرف شادی بیاہ پر ہی اسلام کا نام لیتے ہیں۔ ایڈی کے گھر والے خواہ کتنے ہی آزاد خیال سہی' لیکن وہ اسے کسی ہندو فیملی میں شادی کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔''

''نہ میرے لئے وہ اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہے اور نہ میں اس کے لیے' اسی لئے میں نہیں چاہتی کہ یہ بات آگے بڑھے۔''

''پتا نہیں کیوپڈ کے سب تیر غلط ہی کیوں لگتے ہیں۔''

''اندھا ہے ناں' لیکن کام دیوتا اندھا نہیں ہے۔''

''کام دیوتا' وہ کون ہے؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''ہم ہندوؤں کا کیوپڈ اندھا نہیں ہے' پر شرارتی بہت ہے' جب شیو جی آنکھیں بند کئے تپسیا میں مصروف تھے اور ان کی اُما انہیں حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی' تو اس وقت سب دیوتاؤں کے کہنے پر کام دیوتا نے ہی محبت کا تیر چلانے کے لئے اپنی کمان سیدھی کی تھی۔'' اُما بولی۔

''کیوپڈ ہو یا کام دیوتا' تیر ہمیشہ غلط ہی چلتا ہے۔'' ماہ بانو کے ذہن میں زرینہ خالہ کا خیال آگیا۔ اُما صرف ہنس کر رہ گئی۔

''پتا نہیں اُما! کیا بات ہے' لیکن ایک احساس میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔''

''کیسا احساس؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے ماہ بانو کی طرف دیکھا۔

''زرینہ خالہ کی کہانی ختم ہوئے برسوں بیت چکے ہیں۔ ایک زمانہ ہوگیا ہے' اُن کا وجود مٹی میں ملے ہوئے۔ حالات کی جھیل میں کنکر گرنے سے اگر کوئی ہلچل ہوئی تھی' تب بھی اب سطح پرسکون ہوگئی ہے' لیکن مجھے لگتا ہے اُما! کہ جیسے اس سکون کی تہہ میں بہت سے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔''

''وہ تو ہے' جس دشمنی کا بیج بویا جا چکا ہے اس کا پھل تو کاٹنا ہی پڑے گا۔''

''نہیں اُما! تم میری بات نہیں سمجھیں' پتا نہیں کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے' جیسے یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی' جیسے یہ کہانی نئے کرداروں کے ساتھ دوہرائی جانے والی ہے اور ان نئے کرداروں میں سے ایک کردار میں بھی ہوں۔''

اُما خاموشی سے اسے تکتی رہی۔

''زرینہ خالہ کی صندوقچی کھولتے ہوئے یہ احساس بہت شدید تھا۔ پھر میں نے ان کی کہانی سنی تو سوچا کہ اس میں تو کچھ نہیں بچا۔ یہ باب تو مدت ہوئی بند ہو چکا ہے' لیکن میرا یہ احساس میری سوچ پر حاوی ہوگیا۔''

''تم میری بات سے اتفاق تو نہیں کروگی لیکن.....'' اُما کے انداز میں تذبذب تھا۔

''لیکن کیا؟''

''دیکھو میرا مذاق نہ اڑانا' خود مجھے بھی اپنی بات کی حماقت کا احساس ہے' لیکن میں صرف ایک توجیہہ پیش کر رہی ہوں۔'' وہ اب بھی متذبذب تھی۔

''تم کہو تو۔''

''تم دو جنموں کو بھی نہیں مانتیں' میں بھی اسے تسلیم کرنے پر تیار نہیں' لیکن یونہی ایک خیال سا آیا تھا۔''

ماہ بانو کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ آگئی۔ وہ اُما کا مذاق اُڑانا نہیں چاہتی تھی' اس لئے ٹشو پیپر منہ کے آگے رکھ کر کھانسنے لگی۔ اُما کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ماہ بانو کیا سوچ رہی تھی۔ ابھی وہ کچھ کہنا

ہی چاہتی تھی کہ دروازہ کھول کر نیہاں اندر داخل ہوگئی۔

اُما اور نیہاں روم میٹ تھیں۔

''میں نے تم لوگوں کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' اُس نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔

''بالکل نہیں۔'' اُما نے خوش دلی سے کہا۔

نیہاں بہت ترنگ میں لگ رہی تھی۔ کندھے پر رکھا بیگ اُس نے بستر پر پھینکا' ہاتھ میں تھامے ڈھیروں پھول بھی کمرے میں اُچھال دیے۔

سوائے ایک پھول کے۔

ماہ بانو اور اُما نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ نیہاں گنگنانے لگی۔

''موسم گنگنا رہا ہے' دل دیوانہ گا رہا ہے
رستہ مجھ سے کہہ رہا ہے لگ جائے نہ ٹھوکر
دھیرے چل' دھیرے دھیرے چل۔''

پھر وہ اُن دونوں کی طرف مُڑی۔

''شاعر بہت بدذوق لگتا ہے اتنے خوبصورت موسم میں ٹھوکر کا ذِکر کرتا ہے' اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ کمبخت نے تھوڑی دیر تو اتنے حسین موسم کا لُطف لے لینے دیا ہوتا۔''

اُما ہنس پڑی۔ ''ایسے موسم میں ہی تو ٹھوکر لگنے کا خدشہ زیادہ ہوتا ہے۔''

''شاعر نے حل بھی تو بتا دیا ہے یعنی دھیرے دھیرے چل' دھیرے چلو گی تو ٹھوکر سے محفوظ رہو گی۔'' ماہ بانو بولی۔

''جیسے تم نے یہ گُلاب پکڑ رکھا ہے' احتیاط سے پکڑو گی تو کانٹے نہیں چبھیں گے۔'' اُما نے کہا۔

نیہاں دھم سے بستر پر بیٹھ گئی۔

''اس گُلاب کے کانٹوں سے مجھے چبھنے کا خوف محسوس نہیں ہو رہا' نہ ہی اس موسم میں ٹھوکر لگنے کا ڈر ہے۔''

''یہ بھی گئی کام سے۔'' اُما بولی۔ ''زور کس پر ہوا ''بھی'' پر۔''

''اور کون کون شکار ہوا ہے؟'' اُس نے اپنی سُرمئی آنکھیں اُن کے چہروں پر گاڑ کر کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

''ہم دونوں میں سے کوئی شکار نہیں ہوا' یونہی کالج کے بارے میں عمومی بات کی تھی۔'' ماہ بانو نے جلدی سے کہا۔

''اچھا میں کچھ اور سمجھی تھی۔''

''لیکن ہم کچھ نہیں سمجھے' تم بتاؤ کہ یہ پھول تمہیں کس نے دیا ہے؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''چھوڑو بھی' اُس نے تو صرف دوستی کی غرض سے دیا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی لڑکیوں اور لڑکوں کو دیا ہے' لیکن خوش ہو جانے میں کیا حرج ہے۔'' وہ ہنسی۔

''کیا حماقت ہے ہم لڑکیوں کی' اتنی بے معنی باتوں پر بھی خوش ہو جاتی ہیں۔'' اُما نے کہا۔

☆======☆======☆

''زرینہ کی موت حیدر علی شاہ کے لئے ایک ایسا صدمہ تھی' جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ فوزیہ اُس کی پسند نہیں تھی' لیکن اپنی ناکامی کا بدلہ اپنی بیوی سے لینا' حیدر علی کو کسی طور گوارہ نہیں تھا۔ اُس نے فوزیہ کو وہ سب کچھ دیا تھا۔ جس کی کوئی بھی عورت خواہش کر سکتی تھی۔ اُسے ایک لمحے کو بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ حیدر علی کی زندگی میں زبردستی داخل ہوئی تھی۔

اُس نے فوزیہ کو گھر پر پڑھایا لکھایا تھا اور ہر اہم اور غیر اہم بات فوزیہ سے ڈسکس کرنے کے بعد فیصلہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے فوزیہ کو اس کے ذہین ہونے کا احساس دلایا تھا۔ خود فوزیہ بھی بہت ذہین تھی۔ ایک مرتبہ جھجک دور ہو جانے کے بعد اس نے پڑھنے لکھنے میں بہت محنت کی تھی۔ گو کہ اس کے پاس کسی قسم کی ڈگری نہیں تھی' لیکن وہ ہر موضوع پر بحث کر سکتی تھی۔ نوکروں اور نوکرانیوں کی پوری فوج ہونے کے باوجود ہر قسم کے ملکی اور غیر ملکی کھانے پکانے میں مہارت رکھتی تھی۔ جس حویلی میں وہ رہتے تھے' اس کی سجاوٹ بھی بے مثال تھی۔ حیدر علی کے لئے وہ ایک بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔

رجب علی کے ساتھ اُن کے گھرانے کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہو گئے تھے۔ زرینہ کی موت نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بہت دور کر دیا تھا۔ فوزیہ بڑی حویلی چلی جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھار یاسمین بھی اُن کی طرف آتی تھی' لیکن دونوں بھائی پھر کبھی ایک دوسرے کی حویلی نہیں گئے۔ رجب علی نے ریشماں اور عبداللہ کے رشتے کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کی مگر اس میں شک نہیں کہ دونوں بھائیوں کے دل میں بہت زیادہ غم وغصہ تھا' جسے قطعاً وہ دونوں چھپائے ہوئے تھے۔

غم وغصے کے اس طوفان کو باہر نکلنے کا بہانہ اس وقت ملا جب حیدر علی شاہ نے عبداللہ سے چھوٹی زہرہ اور زینب کو اسکول میں داخل کروایا۔ یہ خاندانی روایات کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ اُن کے گھرانے کی لڑکیوں کو تو چاند اور سورج کی کرنیں بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں' اور حیدر علی نے اُنہیں اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ آج معاملہ اسکول کی حد تک تھا۔ وہ دونوں بچیاں تھیں' لیکن کل کو جوان ہونے پر یہ بات کالج تک بھی پہنچ سکتی تھی' جس جس نے یہ بات سُنی دانتوں تلے اُنگلیاں دبا لیں۔

پیر صاحب جلال الدین شاہ کو فوت ہوئے دو سال ہو چکے تھے اور رجب علی اُن کی گدی

سنبھال چکا تھا۔ سو اب یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ خاندان کی روایات کی پاسداری کرے۔ اور خاندان کی روایات کہتی تھیں کہ بھائی کی بیٹیاں صرف بھائی کے گھر میں ہی بیاہی جاسکتی ہیں۔ زینب اور زہرا کی پیدائش پر رجب علی کے گھرانے میں خود ہی یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ دونوں اُن کے گھر کی بہو بنیں گیں۔ یہ بات تو رسمی طور پر طے کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

حیدر علی شاہ اس معاملہ پر خاموش تھا اور تب تک خاموش رہنا چاہتا تھا' جب تک رجب علی کے گھرانے کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہو۔ یاسمین باتوں باتوں میں کبھی ذکر کردیتی تو فوزیہ بات ٹال دیا کرتی تھی۔ وہ کسی صورت نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹیاں اپنی زندگی بڑی حویلی کے قید خانے میں گزاریں۔ جب تک اس نے حیدر علی کے ساتھ زندگی کا یہ نیا رُخ نہیں دیکھا تھا' تب تک اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی' لیکن ایک روشن اور بہتر ماحول دیکھنے کے بعد اب اس کا ذہن کسی تنگ اور گھٹے ہوئے ماحول کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ رجب علی کو زینب اور زہرا کے اسکول میں داخل ہونے کی خبر ملی تو اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا' لیکن یہ اطلاع غلط نہیں ہوسکتی تھی ایک تو اطلاع لانے والا اس کا قابلِ اعتماد ملازم تھا اور دوسرے اسے حیدر علی کی روشن خیالی کا اندازہ بھی تھا۔ یہ سننے کے بعد لحہ بھر بھی اس کے لئے گھر میں ٹکنا دوبھر ہوگیا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں علی؟'' وہ حیدر علی کی حویلی میں لال انگارہ بن کر داخل ہوا تھا۔

''کیا؟'' حیدر علی نے تحمل سے پوچھا۔

وہ جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا اور اس سارے طوفان کے لئے تیار بھی تھا۔

رجب علی دانت پیس کر رہ گیا۔ اسے حیدر علی کے مزاج کا بھی اندازہ تھا۔

''تم نے اپنی دونوں بیٹیوں کو اسکول میں پڑھانا شروع کردیا ہے؟'' اُس نے بھی تحمل سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''جی ہاں' ویسے پڑھ تو وہ بہت پہلے سے رہی ہیں۔ میں اور فوزیہ گھر میں اُنھیں پڑھاتے رہے ہیں' اب آج ہی اُنہیں اسکول میں داخل کروایا ہے۔''

''تم ایسا نہیں کروگے علی۔''

''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں' اس لئے کہ مجھے آپ کا جواب معلوم ہے' مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔''

رجب علی کچھ دیر تک سگار انگلیوں میں گھماتا رہا۔ حیدر علی کو دیکھتے ہی برسوں پرانی کئی یادیں ذہن میں تازہ ہوگئی تھیں۔ بہت مشکل سے اس نے ان یادوں کو ذہن سے جھٹکا تھا۔

حیدر علی اس کا بھائی تھا۔ جس سے وہ بہ یک وقت شدید محبت اور اتنی ہی شدید نفرت بھی کرتا تھا۔ اس وقت وہ چاہتا تھا کہ اس کی محبت غالب رہے' لیکن نہ جانے کیوں بار بار نفرت سر

اُبھار رہی تھی۔ اس سے کچھ کہنے سے قبل' رجب علی اپنی اسی نفرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آل رائٹ' مجھے اعتراض نہیں ہے اور یہ رعایت اس لئے ہے کہ مجھے تم سے بہت محبت ہے' تم بچیوں کو پڑھانا چاہتے ہو تو ضرور پڑھاؤ لیکن اس طرح جیسے تم نے فوزیہ بھابی کو گھر میں پڑھایا ہے' دونوں بچیاں اسکول نہیں جائیں گی۔''

''زہرا اور زینب میری بیٹیاں ہیں اور ان کے متعلق اس قسم کا کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار صرف مجھے اور فوزیہ کو ہے' مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی بات رد کررہا ہوں۔''

''بہت غلط کررہے ہو علی۔ آج کے دن تم انہیں اسکول لے گئے' یہ کوئی چھوٹی خطا نہیں ہے' لیکن تمہاری محبت سے مجبور ہوکر میں اسے نظر انداز کررہا ہوں۔ کل وہ گھر سے نہیں نکلیں گی۔''

''میں نے کبھی آپ کے گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کی اور مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی ایسا نہیں کریں گے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''تم مداخلت کر بھی نہیں سکتے کیونکہ میں نے خاندان کی کسی روایت سے انحراف نہیں کیا اور میں تمہارے معاملات میں مداخلت اس لئے کرسکتا ہوں کیونکہ میں تمہارا بڑا بھائی اور پیر ہوں۔'' رجب علی نے کہا۔ ''تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ گاؤں میں کیسی کیسی باتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کتنی تھو تھو ہو رہی ہے۔ کیا اب سیّدوں کے' پیروں کے' خاندان کی بیٹیاں غیروں میں جاکر پڑھیں گی؟ گھر سے نکلیں گی؟ نہ تو ہمیں ان سے نوکریاں کروانی ہیں اور نہ اُن کی کمائی کھانی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کو خود بھی اپنی بات کے بے معنی ہونے کا احساس ہے۔ پڑھنے لکھنے کا مطلب نوکری کروانا یا کمائی کھانا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوسکیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹیاں بھیڑ بکریوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ اولاد کو اُن کا جائز حق دینا والدین کا فرض ہے۔''

رجب علی نفرت کے جذبے کو خود سے دور رکھنے کی جتنی بھی کوشش کررہا تھا' حیدر علی اتنا ہی اسے ہوا دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم اپنا فرض پورا کرو میں اپنا فرض پورا کروں گا۔ میرا فیصلہ ہے کہ کل سے بچیاں گھر سے باہر نہیں جائیں گی۔''

''پھر جب ہم دونوں کا فیصلہ اٹل ہے تو کل کا سورج بھی کوئی دور نہیں ہے' نتیجہ کل پر چھوڑ دیں۔''

''اب بھی وقت ہے علی' زینب اور زہرا تمہاری بیٹیاں ہی نہیں' میری ہونے والی بہویں بھی ہیں۔ یہ بات مت بھولنا۔'' رجب علی کا انداز دھمکی دینے والا تھا۔

"لیکن یہ بات کب طے ہوئی ہے؟"

"یہ بھی اُسی طرح اٹل رشتہ ہے، جس طرح عبداللہ اور ریشماں کا رشتہ ہونا اٹل ہے۔"

رجب علی کو غالباً اندازہ تھا کہ یہ حیدر علی کی دُکھتی رگ تھی۔

"وہ بات آپ خود طے کر گئے تھے، لیکن زینب اور زہرا کے سلسلے میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ان کی قسمت کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا اور وہ ابھی اتنی چھوٹی ہیں کہ اپنی رائے نہیں دے سکتیں، پھر یہ مناسب وقت بھی نہیں ہے۔ ہاں اگر دس بارہ سال بعد آپ یہ پیشکش کریں گے تو میں ضرور غور کروں گا اس پر۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" رجب علی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

"عبداللہ اور ریشماں کا رشتہ اُن کی مرضی کے بغیر طے ہوا ہے۔ پیر گھرانے کی کسی بیٹی کی شادی نہیں ہوتی اور یہ تم بھی جانتے ہو، اس لئے یہ رشتہ رسمی طور پر طے کرنا ضروری تھا، لیکن چھوٹے بھائی کی بیٹیاں ہمیشہ بڑے بھائی کے گھر بیاہی گئی ہیں۔ یہ ایسی روایت ہے، جس کے بعد رسمی طور پر کچھ طے کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم دونوں بچیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھتے رہو اور میں دونوں کو اپنی بہویں سمجھتا رہوں گا اور اس کے بعد جو تم سے ہو سکے، وہ تم کرو، اور جو مجھ سے ہو سکے گا، وہ میں کروں گا۔ بہو گھر کی عزت ہوتی ہے اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا میں جانتا ہوں۔"

رجب علی دھمکی دے کر جا چکا تھا۔

فوزیہ کو علم ہوا تو وہ فکر مند ہو گئی۔

"اب کیا ہوگا؟"

"ہونا کیا ہے، میرے فیصلے پر عمل کرنے سے مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں روک سکتا۔"

"لیکن وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں، میں اپنی بیٹیوں کو کسی تکلیف میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"دونوں بچیاں مجھے اتنی پیاری ہیں کہ اُنہیں نظروں سے اوجھل کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ورنہ میں انہیں کسی دوسرے شہر میں بورڈنگ میں داخل کروا دیتا۔" حیدر علی نے کہا۔

"یہ تو بالکل مت کریں۔ وہ پتا لگاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور بچیوں کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو کیا ہوگا۔ یہاں ہم دونوں ہیں، وہ لوگ جو قدم بھی اٹھائیں گے سوچ سمجھ کر ہی اُٹھائیں گے۔"

زینب اور زہرا قریبی شہر کے اسکول میں پڑھ رہی تھیں، جبکہ عبداللہ ان دِنوں لاہور میں بورڈنگ میں داخل تھا۔

اگلی صبح حیدر علی بچیوں کو لے کر اسکول جا رہا تھا۔ اُن کی کار کے پیچھے ایک جیپ میں گن مین اور محافظ سوار تھے۔ خود اُن کی کار میں بھی ایک گن مین موجود تھا۔ کافی راستہ خیریت سے طے

ہو چکا تھا۔ بڑی سڑک تھوڑی ہی دور تھی، اردگرد پھیلے ہوئے وسیع کھیتوں سے اُن کی گاڑیوں پر فائرنگ کی گئی۔ دوسری طرف سے بھی جوابی کارروائی کی گئی۔ دونوں فریقین کا خاصا نقصان ہوا، لیکن حیدر علی اور دونوں بچیوں کو معمولی چوٹیں آئیں۔

اس واقعے کے بعد دونوں فریقین کے درمیان کھلی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ حیدر علی نے عبداللہ کو بیرونِ ملک بھجوا دیا۔ دونوں بیٹیاں مری کانونٹ میں داخل کروائیں اور کسی کو اس بات کی خبر نہ لگنے دی کہ ان کے بچے کہاں ہیں۔

تمام تر غصے کے باوجود حیدر علی نے کبھی رجب علی کی اولاد کو نقصان پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ رجب علی اُن کی حویلی سے ایسا نکلا تھا کہ اب وہاں صرف فاتح کی حیثیت سے ہی داخل ہونا چاہتا تھا۔ اُس نے حیدر علی کو تنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جب یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تینوں بچے کہاں ہیں، تو جائیداد اور زمین کے بارے میں فساد ہوئے۔ کتنے مربعے کس بھائی کو ملنے چاہئیں، کون سی زمین کی کتنی پیداوار ہے، کسے زیادہ پیداوار والی زمین مل رہی ہے، وغیرہ۔

سخاوت علی، رجب علی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی وہ ویسا ہی تھا۔ اس کی اور رجب کی زمین اور جائیداد سب سانجھی تھی۔ حیدر علی کے خلاف وہ بھی بڑے بھائی کے خلاف صف آراء تھا۔

دن بیتتے چلے گئے۔ "نفرت کا بویا ہوا بیج بڑھ کر تناور درخت بن گیا۔ جب حیدر علی کو احساس ہوا کہ اب عبداللہ کی جان کو خطرہ کم ہو گیا ہے تو اُسے واپس بُلا لیا گیا۔ یوں بھی اب اُن کے گھر کو ایک نوجوان بیٹے کی ضرورت تھی۔

رجب علی کے چھ بیٹے تھے اور تقریباً سب ہی جوان تھے۔

"زہرا سینئر کیمبرج کر چکی تھی، جبکہ زینب کر رہی تھی۔ پہلے تو ماں باپ دونوں بیٹیوں سے ملنے خود ہی چلے جاتے تھے، پر اب بیٹیاں اپنے گھر بھی آنا چاہتی تھیں۔ معاملات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ عبداللہ کی پاکستان میں موجودگی ضروری ہو چکی تھی۔

☆======☆======☆

ماہ بانو کے جانے کے بعد ریشماں اُس کے متعلق سوچتی رہی تھی۔

اس کی دنیا اس قدر محدود تھی کہ وہ ایک ہی بات کے متعلق کئی دِنوں تک سوچتی رہتی تھی، اور اکتاتی نہیں تھی۔

"نہ جانے اس کی ان سے ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔" اُس نے سوچا۔ "پتا نہیں وہ کیسے ہوں گے۔ کریمن کہتی ہے بہت اچھے ہیں۔ جب وہ اپنی خالہ سے ملنے اُن کے گاؤں جاتی ہے تو انہیں دیکھ کے آتی ہے، اور میں اُس کی آنکھوں میں ان کی شبیہہ کھوجتی رہ جاتی ہوں۔"

اماں جان بھی تو بہت تعریف کرتی ہیں ان سب کی' اگر وہ سب اتنے اچھے ہیں تو پھر خدا جانے یہ دوری کیوں ہے۔ پتا نہیں نفرت کے بادل کب چھٹیں گے؟'' وہ تصور میں ماہ بانو کو اُن کپڑوں میں دیکھنے لگی جو ابھی کل ہی اُسے دیے تھے۔

''وہ اچھی لگ رہی ہوگی' بہت اچھی' پتا نہیں کیوں اسے کبھی یہ یقین نہیں آیا کہ وہ خوبصورت ہے' حالانکہ وہ تو بہت پیاری ہے۔''

وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ کریمن' دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ رجو سے مل کر آئی تھی۔ ''رجو سے مل کر آئی ہو؟'' اس نے کریمن سے پوچھا۔ کریمن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں حیرت کی چمک اُتر آئی۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا بی بی؟''

''یہ معلوم کرنا کیا مشکل ہے' تمہارا چہرہ بتا رہا ہے۔''

کریمن ہنس دی۔ ''پتا ہے بی بی' آج میری فرمائش پر رجو نے مجھے چاٹ کھلائی اور یہ پراندہ بھی وہی لایا تھا' میرے لئے۔'' اس نے اوڑھنی ایک طرف سرکا کر تیل سے بھیگے بالوں والی چوٹی آگے کر دی۔

''تو بہت خوش نصیب ہے کریمن' بغیر روک ٹوک کے جہاں جانا چاہتی ہے چلی جاتی ہے' لوگوں سے ملتی ہے' ہنستی ہے روتی ہے اور جسے پسند کرتی ہے اس سے مل بھی لیتی ہے۔'' ریشماں کے لہجے میں حیرت اُتر آئی۔

''نہ بی بی۔ یہ سب دور کی باتیں ہیں۔ ہر ایک کے اپنے دکھ ہوتے ہیں' جو دُکھ مجھے ہیں وہ آپ کو نہیں اور جن دُکھوں سے آپ تڑپتی ہیں وہ میرے نہیں۔''

''تجھے کیا دُکھ ہے؟''

''مجھے۔'' کریمن نے ریشماں کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔ ''رجو مجھے اچھے اچھے کپڑے اور خوبصورت گہنوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے شادی کے بعد تجھے سونے میں پیلا کر دوں گا۔ پگلا کہیں کا' کہاں سے لائے گا اتنے گہنے' ڈاکہ ڈالے گا کیا؟'' وہ خود ہی ہولے سے ہنس دی۔

''تیرے پاس دکھانے کو کچھ نہیں اور دیکھنے والا موجود ہے اور میرے پاس اتنے زیور' اتنا کپڑا لتا موجود ہے لیکن دیکھنے والا کوئی نہیں۔''

ریشماں نے ایک لمحے کے لئے اپنا اور کریمن کا موازنہ کیا۔

پیلاہٹ گھلے سانولے سے رنگ والی کریمن' تیل میں ڈوبے بالوں کی پتلی سی چٹیا' عام سے نقوش' ناک اور کانوں میں سفید اور سرخ نقلی موتیوں کے زیور۔ یہ تھی کریمن۔

دوسری جانب ریشماں تھی' شہد میں گھلی رنگت' گھنے سیاہ لمبے بال' بڑی بڑی خوابناک شربتی آنکھیں' بھرے بھرے رسیلے ہونٹ اور متناسب جسم۔

وہ قدرت کی ستم ظریفی پر ہنس پڑی۔

''کیا ہوا بی بی' اللہ خوش رکھے' آپ ہنسیں کیوں؟''

''کچھ نہیں' سوچ رہی تھی کہ جس پھول سے ہوا اٹھکیلیاں نہ کرے' جسے تتلی نہ چومے' جس کے اوپر بھنورہ نہ منڈلائے' اس پھول کا رنگ اور مہک کس کام کے۔''

پتا نہیں کریمن نے اس کی بات کس حد تک سمجھی تھی' لیکن وہ بولی کچھ نہیں' سر جھکائے اس کے پاؤں دباتی رہی۔

''میں تھوڑی دیر کے لئے اماں جان کے پاس جاؤں گی۔'' ریشماں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

خواب گاہ میں اماں جان کے علاوہ پیر صاحب رجب علی شاہ صاحب موجود تھے اور دونوں کے درمیان غالباً کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی۔ پیر صاحب کا انداز حتمی تھا' جبکہ اماں جان دبے دبے انداز میں انھیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مناسب تو یہی تھا کہ ایسے میں ریشماں واپس پلٹ جاتی' لیکن اُن کی گفتگو نے اس کے قدم روک دیے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''مانا کہ ہماری اُن لوگوں کے ساتھ دشمنی ہے' لیکن وہ معاملہ مختلف ہے۔'' اماں جان کہہ رہی تھیں۔

''آپ کو زہرا اور زینب کی تعلیم پر اعتراض تھا' لیکن میں تو بات ریشماں کی کر رہی ہوں۔ وہ ماشاءاللہ جوان ہو چکی ہے۔ وہ جن کی امانت ہے' ہمیں اُن کے سپرد کر دینی چاہیے۔''

''یہ بات بھول کر بھی مت سوچنا' یہ بات برسوں پہلے ختم ہو چکی ہے۔''

''لیکن پیر صاحب! ہم زبان دے کر اس سے کیسے پھر سکتے ہیں؟'' اماں جان نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔

''یہ برسوں پہلے اس وقت کی بات ہے' جب نہ علی کی شادی ہوئی تھی اور نہ ہماری' تب ہم نے کہا تھا کہ ہماری کوئی بیٹی ہوئی تو وہ کنواری نہیں رہے گی۔ ہم اپنے بھائی کے گھر سے رشتہ لیں گے' لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہمارے ایک نہیں دو بھائی ہیں۔''

''میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔''

''بہت آسان بات ہے۔ ہم ریشماں کی شادی اپنے بھائی کے گھر کریں گے حیدر علی کے گھر نہیں سخاوت کے گھر۔ ریشماں' سخاوت علی کی بہو بنے گی۔''

''کیا؟'' اماں کچھ نہ سمجھی تھیں۔

''یہ ہمارا فیصلہ ہے۔'' پیر رجب علی شاہ صاحب کا انداز حتمی تھا۔

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے' اُن کی تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔''

پیر صاحب نے اطمنان سے سگار کی راکھ جھاڑی۔ ''یہ قصور ہمارا تو نہیں' اگر تین شادیاں

کرنے کے باوجود بھی اس کی قسمت میں اولاد نہیں لکھی' تو یقیناً اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوگی' بندہ کیا کرسکتا ہے۔''

''یہ ظلم نہ کریں پیر صاحب۔''

''اس سے آگے ایک حرف نہیں یاسمین بیگم۔ ہمیں اپنے آگے چلنے والی زبان زیادہ پسند نہیں ہے۔'' پیر صاحب کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

اماں جان کے ہونٹ جیسے کسی نے سی دیے۔ ''یہ مسئلہ تو ختم ہوا۔''

''وہ دوسرا مسئلہ کیا تھا۔ جس کا تم نے کل رات ذکر کیا تھا؟''

''اماں جان نے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ پتھر سے سر ٹکرا رہی ہیں۔ اُن کی بات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا' لیکن ماں تھیں' جس چیز کو اولاد کے حق میں بہتر سمجھتی تھیں اُسے پورا کرنے کی اپنے تئیں کوشش کرتی رہتی تھیں۔

''خادم حسین اور امداد علی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔ دونوں ماشاءاللہ جوان ہو چکے ہیں' اُن کا گھر بس جاتا تو اچھا ہوتا۔ گدی کا وارث آجاتا تو سب مطمئن بھی ہو جاتے۔ یوں بھی دونوں کے رِشتے گھر کی بات ہے۔'' اماں جان نے پُر اُمید نگاہوں سے پیر صاحب کی طرف دیکھا۔

''اپنے دشمن کے گھر سے بیٹیاں لانا میری بھی دلی خواہش ہے' لیکن وہ دونوں لڑکیاں زہرا اور زینب' اس حویلی کی بہو بننے کے قابل نہیں ہیں' نہ جانے علی اُنھیں کہاں پڑھاتا رہا ہے۔ وہ یہیں پاکستان میں تھیں یا باہر تھیں اور پتا نہیں کتنے لوگ اُنھیں دیکھ چکے ہوں گے۔ کوئی عجب نہیں کہ اُن کی دوستی لڑکوں کے ساتھ بھی ہو۔''

اماں جان کو ایسے ہی اعتراضات کی توقع تھی۔ کہنے کو اُن کے پاس بہت کچھ تھا' لیکن وہ سب کچھ پیر صاحب سُننے پر آمادہ نہ ہوتے' اس لئے وہ چپ رہیں۔

''البتہ یہ مصدقہ اطلاعات ہیں کہ ان دِنوں زہرا حویلی میں ہی ہے اور وہ خادم حسین کی منگ ہے' وہ اس حویلی کی بہو بنے یا نہ بنے' اس کا نام ایک مرتبہ میرے بیٹے سے جُڑ چکا ہے اور اب کسی طور الگ نہیں ہوسکتا۔ وہ کسی اور کی بہو کسی اور کی بیوی نہیں بن سکتی۔''

''میری بالکل سمجھ میں نہیں آرہا پیر صاحب' نہ آپ اسے بہو بنانے پر تیار ہیں اور نہ ہی یہ چاہتے ہیں کہ اس کی کہیں اور شادی ہو' تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''حیدر علی یہ جانتا تھا کہ اُس کی بیٹیاں ہماری بہو بنیں گی۔ اس حویلی کی عزت بنیں گی' پھر بھی وہ انھیں اپنی ڈگر پر چلاتا رہا۔ اُس نے حویلی کی عزت تار تار کر دی' اگر ہم چاہنے کے باوجود اس وقت اپنی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے' تو اب اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اس عزت کو مٹی میں ملانے والے کو اسی طرح مٹی میں ملا دیں۔''

''یعنی؟''

یعنی یہ کہ اس جمعرات کو زہرا یہاں ہوگی اور وہاں حیدر علی ہاتھ مل رہا ہوگا۔''

اماں جان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''آپ......آپ ایسا نہیں کرسکتے' وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے' اس کی عزت ہے۔''

''وہ ہماری بھی عزت ہے' ہمارے ہاں بھی اسے پوری عزت ملے گی۔

''آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟'' اماں جان نے ملتجی انداز میں پوچھا۔

''اس کی جگہ اس حویلی میں تو رہی نہیں' ہاں قبر کی مٹی سب کے عیب ڈھانپ لیتی ہے۔''

☆======☆======☆

فنکشن بہت دلچسپ تھا۔ ماہ بانو کو درمیان میں ہی اٹھ جانا پڑا۔ اماں کہہ چکی تھیں کہ ابا کو بھیجیں گی اور وہ ابا جی کو انتظار کروانا نہیں چاہتی تھی۔ عبداللہ اس کے بالکل پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟ جانے لگی ہو' ابھی تو بہت فنکشن رہتا ہے۔''

''اماں نے دس بجے کی اجازت دی تھی۔''

سب کو بائے کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔

اکتوبر کا مہینہ تھا لیکن رات کے وقت موسم کافی خنک ہو جاتا تھا۔ تیز تیز چلتی وہ پارکنگ میں آگئی۔ ابھی وہ نیم تاریکی میں اچک اچک کر ابا جی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اپنے پیچھے ابھرنے والی قدموں کی چاپ سن کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کے پیچھے روش پر انگلی میں کی چین گھماتا عبداللہ آرہا تھا۔

''تمہاری وجہ سے مجھے بھی پروگرام ادھورا چھوڑنا پڑا۔''

''میری وجہ سے؟'' ماہ بانو نے کہا۔

''تو اور کیا۔ میں نے سوچا کہ پتا نہیں تم کیسے جاؤ گی۔ پتا نہیں تمہارے ساتھ کوئی ہوگا یا نہیں۔ یہی سوچ کر اٹھ آیا۔''

''یہ مہربانی صرف مجھ پر ہی ہے یا تم سب غریبوں پر اسی طرح ترس کھاتے ہو؟''

''تت تت۔ تم اپنی غریبی پر کس قدر شرمندہ رہتی ہو ہر وقت۔ ویسے میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر غریب کی مدد کروں۔ اور اگر وہ غریب کوئی خوبصورت لڑکی ہو تو کیا کہنے۔''

''اف عبداللہ۔'' ماہ بانو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی۔ ''میری کوئی کمزوری ہے تو پلیز اس پر مجھے شرمندہ مت کرو۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمی یا خامی تو ہوا ہی کرتی ہے۔ پتا ہے مجھے اچھا نہیں لگتا جب میں دیکھتی ہوں کہ میرے ابا جی اتنے ذہین اور پڑھے لکھے ہیں لیکن ایک ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں انہوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

اور رہ گئی یہ بات کہ غریب لڑکی خوبصورت بھی ہو تو یہ مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ یہاں تم غلط-

دروازے پر دستک دے رہے ہو کیونکہ میں غریب ہونا تو مانتی ہوں لیکن خوبصورتی ہرگز ہرگز نہیں۔"

"میں تمہیں یہ یقین دلانے کی کوشش نہیں کروں گا کہ تم خوبصورت ہو یا نہیں۔ یہ بتاؤ کہ گھر کیسے جاؤ گی؟"

"ابا جی لینے آجائیں گے۔ ان کے ساتھ ہی جاؤں گی۔"

"اب تک آئے نہیں؟"

"بس دس ساڑھے دس کا ٹائم دیا تھا ناں اماں جان نے۔ ویگن پر آتے آتے دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"اتنی دیر کے لئے اندر چلی چلو۔" عبداللہ نے کہا۔

"نہیں۔ اس طرح پتا نہیں کتنی دیر ابا کو انتظار کرنا پڑے۔ تم جاؤ پروگرام دیکھو۔"

"ہم مل کر انتظار کر لیتے ہیں۔"

وہ دونوں عبداللہ کی وائن کلرڈ ٹیوٹا کراؤن سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"اب گاؤں کب جاؤ گے؟"

"ابھی کل تو آیا ہوں۔ اب کچھ دن ٹھہر کر ہی جاؤں گا۔" اس نے کہا۔

"مجھے بہت نیند آرہی ہے۔ پتا نہیں ابا جی کب آئیں گے۔"

"کل سارے سفر میں تم سوتی رہی ہو۔ صبح کالج بھی دیر سے آئی ہو جس کا مطلب ہے کہ گھر میں بھی تم نے نیند پوری کر لی تھی پھر اب اتنی جلدی پھر نیند آرہی ہے۔"

"وہ کوئی نیند تو نہیں تھی نا۔ صبح بھی اماں جان نے اتنی جلدی جگا دیا۔ تمہیں نہیں آرہی نیند تو مجھے بہت حیرت ہو گی۔"

"تمہیں بھی سرامکس (Ceramics) سے کوئی دلچسپی ہے؟" عبداللہ نے گفتگو کا رخ تبدیل کیا۔

"بہت زیادہ۔ جو کچھ ابا جی بناتے ہیں وہ سب کچھ میں بنا لیتی ہوں۔ انھیں بہت سے مشورے بھی دیتی ہوں لیکن ابا جی کے بنائے ہوئے برتنوں کی کیا اہمیت۔

مارکیٹ میں اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ ان کا بنایا ہوا برتن کتنا خوبصورت اور معیاری ہے۔ مارکیٹ میں اصل اہمیت ہے قیمت کی۔ گھڑا ٹیڑھا بنا ہوا ہے یا نہیں' ہنڈیا اور گلدان کیسے ہیں' اس بات کی کسی کو پروا ہے۔ جو چیز سستی ہے وہ خریدی جاتی ہے۔"

"تو تم مارکیٹ تبدیل کر سکتی ہو۔ انہی برتنوں میں تھوڑی سی جدت پیدا کرو پھر دیکھو کہ اس کا ریٹرن کتنا ہے۔"

"وہ تو ہے۔ اپنے سبجیکٹ یعنی فائن آرٹس کے حوالے سے میں سرامکس میں بہت جدت

دے سکتی ہوں لیکن مارکیٹنگ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ پھر اس کے لئے سرمایہ بھی چاہیے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"مارکیٹنگ تو اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ میں آج صبح تمہارے گھر میں دیکھ رہا تھا۔ وہاں صحن میں کافی سارے برتن پڑے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ انہیں بنانے والے میں وہ حسِ جمال ہے جو کسی عام کمہار کے پاس نہیں ہوتی۔

تمہارے ابا جی سے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوئیں۔ وہ بھی مجھے بہت مختلف لگے۔ کمہار لفظ سن کر جو ایک تصور ذہن میں آتا ہے وہ ویسے نہیں تھے۔ مجھے بہت خوشگوار حیرت ہوئی ان سے مل کر۔ وہ تعلیم یافتہ ہی نہیں' بہت باشعور بھی لگ رہے تھے مجھے۔"

جب ابا جی کے متعلق کوئی ایسے بات کرتا تھا تو ماہ بانو کو بہت خوشی ہوتی تھی۔

"ہاں' وہ بہت باشعور ہیں۔ ان کے پاس صرف ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے ڈگری۔ انھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔"

"باقاعدہ تعلیم نہ لینے کے باوجود جو اتنا علم حاصل کرے' وہ شخص میرا آئیڈیل ہوتا ہے۔ میری اماں جان ہیں ناں' انہوں نے بھی کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بابا جان نے انہیں خود پڑھایا لکھایا۔ تم ان سے ملو تو تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ اماں جان نے کبھی کالج کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

اماں جان کی سنائی ہوئی کہانی سے ماہ بانو کے ذہن میں عبداللہ کی اماں جان کا ایک دھندلا سا خاکہ بن گیا تھا۔

"کیسی ہیں تمہاری اماں جان؟ میرا مطلب ہے ویسی ہی ہیں جیسی تمہارے خاندان کی دوسری عورتیں ہیں؟"

"تم میرے خاندان میں کس کس سے ملی ہو؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"میں؟ گاؤں میں میرا آنا جانا ہے' حویلی میں بھی ہے۔ وہاں جو عورتیں ہیں سب ہی سے واقفیت ہے۔" اس نے بھی گول مول سا جواب دیا۔

"میں نہیں جانتا کہ میرے خاندان کی عورتیں کیسی ہیں۔ صرف اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ کیسی ہوں گی۔ تم تو جانتی ہو کہ ہمارے یہاں پردہ کتنا سخت ہوتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ میری اماں اور دونوں بہنیں سب سے مختلف ہیں۔ بہنیں تو خیر کانونٹ میں پڑھی ہیں لیکن تم اماں جان سے بھی علاقائی' انگریزی یا اردو کسی بھی زبان میں بات کر سکتی ہو۔

ہمارا رہن سہن کا انداز بھی سب سے مختلف ہے۔ اماں جان اور دونوں بہنیں پردہ نہیں کرتیں البتہ گاؤں جاتے وقت چادریں لے لیتی ہیں اور گاڑی میں بھی پردے لگے ہوئے ہیں۔ ہم تبدیل ہو گئے ہیں لیکن گاؤں والے اب تک نہیں بدلے اس لئے وہاں تو اسی انداز میں

رہنا پڑتا ہے۔"

ماہ بانو اس کی باتیں سن رہی تھی لیکن اس کا ذہن ریشماں کی طرف تھا۔ وہ اس شش و پنج میں تھی کہ اسے ریشماں کے متعلق بتائے یا نہیں، لیکن ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ گیٹ سے ابا جی داخل ہوئے۔

"ابا جی آ گئے۔"

وہ دونوں آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر کی رسمی گفتگو کے بعد جب وہ جانے لگے تو عبداللہ بولا۔

"اس وقت اگر کوئی دقت ہو تو میں گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

"تھینک یو ویری مچ بیٹا...... ہم چلے جائیں گے۔" ابا جی نے کہا۔

"ابا جی کتنی ٹھنڈک ہو گئی ہے۔" گیٹ سے نکل کر ان کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے ماہ بانو نے کہا۔

"باہر ٹھنڈک ہے لیکن گھر کا موسم بہت گرم ہے۔"

"اماں جی کا موڈ بگڑا ہوا ہو گا لیکن کوئی بات نہیں میں ٹھیک کر لوں گی۔"

☆======☆======☆

اپنے کمرے میں بیٹھی ریشماں گہری سوچ میں گم تھی۔ اماں اور ابا جان کی گفتگو اس کے لئے ناقابلِ یقین تھی۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اسے اپنے بابا جان سے بے پناہ محبت تھی۔ اِدھر اُدھر سے ان کے متعلق بہت سی باتیں اس کے کان میں پڑتی رہتی تھیں لیکن اس کی محبت اسے مجبور کرتی تھی کہ وہ ان باتوں پر یقین نہ کرے۔

وہ جانتی تھی کہ برسوں پہلے بابا جان نے چچا جان اور ان کی بیٹیوں پر فائرنگ کروائی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ انہوں نے عبداللہ کو نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اس سے قبل ہی چچا جان نے اسے ملک سے باہر بھجوا دیا تھا۔ کہاں بھجوایا تھا۔ اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بابا جان نے جائیداد اور زمین کی تقسیم کے وقت بھی چچا جان کے حقوق غصب کئے تھے۔

لیکن وہ ان حقیقتوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتی تھی۔ ان کے متعلق سوچتی تک نہیں تھی، کیونکہ اپنے ابا جان کو ایک لمحے کے لئے بھی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور بابا جان سے اس کی یہ محبت یک طرفہ بھی نہیں تھی۔ وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ کم از کم ریشماں تو یہی سمجھتی تھی۔

مگر آج اپنے کانوں سے یہ سب سننے کے بعد جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہر دشمنی اپنی جگہ، لیکن عبداللہ سے منسلک ہر چیز سے بھی اسے بے پناہ محبت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی بھی حویلی میں رہے، اس کی محبت ہر جگہ ہر فرد سے ہے، آج نہیں تو کل آتش فشاں پھٹے گا ضرور

اور اس کی لپیٹ میں وہ سب لوگ آئیں گے جن سے وہ محبت کرتی ہے اور اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ اسے کسے بچانا یا کس کے ساتھ لاوے میں بہہ جانا ہے۔ پر یہ سب جاننے کے باوجود بھی وہ اسے سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

جاننے اور سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اب تک وہ آنکھیں بند کر کے مشکل کے گزر جانے کا انتظار کرتی رہی تھی لیکن آج اس پر انکشاف ہوا تھا کہ اب آنکھیں کھولنے کا وقت آ چکا تھا۔ اسے جاننے سے بڑھ کر یہ سب کچھ سمجھنا تھا۔

وہ بابا جان کی محبت کے حصار سے نہیں نکل سکتی تھی۔ اور عبداللہ سے محبت کرنا بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ دو کشتیوں میں سوار تھی۔ کسی ایک کا انتخاب کرنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔ اسے پتا تھا کہ کشتیاں ڈوبیں نہ ڈوبیں، دو کشتیوں کا سوار ہمیشہ ڈوب جاتا ہے لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وہ ان دونوں کشتیوں کو صحیح سالم منزلِ مقصود تک پہنچانا چاہتی تھی کسی بھی قیمت پر۔

"لیکن کیسے؟" یہ وہ سوال تھا جس کا جواب پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ سوچ رہی تھی۔

اپنے متعلق وہ اتنی پریشان نہیں تھی۔ سخاوت چچا کے گھر کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے اس کی طرف سے اسے فوری خطرہ نہیں تھا۔ جس مسئلے کو جلدی نمٹایا جانا ضروری تھا وہ زہرا کا مسئلہ تھا۔ آج ہفتہ تھا جو ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس کے پاس کچھ کرنے کے لئے صرف چار دن تھے لیکن وہ کیا کرے؟ سوچ سوچ کر اس کا ذہن شل ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

رات کو سونے کے لئے لیٹتے کے ساتھ ماہ بانو کے ذہن میں گزشتہ دو روز میں ہونے والے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی۔ وہ تھکی ہوئی تھی اور سب خیالات جھٹک کر جلد از جلد سونا چاہتی تھی لیکن خیالات کا ہجوم تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا۔

"مجھے کیوں لگتا ہے کہ میرے گرد کوئی کہانی بُنی جا رہی ہے۔" اس نے سوچا۔ "عبداللہ اچھا ہے، بہت اچھا دوست ثابت ہو گا لیکن پتا نہیں کیوں جیسے اندر کہیں سے وارننگ مل رہی ہے کہ مجھے اس سے دور ہٹ جانا چاہئے۔ ہٹ تو جاؤں لیکن کیا صرف چھٹی حس کی بنیاد پر؟ ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ اور دور ہٹ جاؤں تو ریشماں سے کیے ہوئے وعدے کا کیا ہو گا؟

آج اُماں نے عجیب سی توجیہہ پیش کی۔ میرے احساس کی، دوسرے جنم کی۔ وہ متذبذب تھی لیکن صرف زبانی طور پر، اس کی آنکھوں میں یقین تحریر تھا۔ کیا ایسا ممکن ہے۔ کیا میں زرینہ خالہ کا دوسرا جنم ہوں؟ پھر ریشماں کا مقام کون سا ہے؟ عبداللہ کہاں اسٹینڈ کرتا ہے؟"

اپنی اس سوچ پر اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔ "میں بھی کتنی احمق ہوں۔ وہ تو ہندو ہے۔ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہو سکتی ہے لیکن مجھے کیا ہوا ہے کہ میں بھی اسی سوچ کو اپنے ذہن میں جگہ دے بیٹھی۔ بات چھٹی حس تک رہے تو قابلِ قبول ہے لیکن دوسرا جنم۔" وہ پھر ہنس پڑی۔ "حد

ہوتی ہے ناں حماقت کی۔"

اُما کا خیال آیا تو اسے ایڈی کا خیال بھی آ گیا۔" اور ایڈی کیا حماقت کر رہا ہے۔ اگر وہ صرف وقت گزاری کے خیال سے ایسا کر رہا ہے تو برا کر رہا ہے اور اگر فلرٹ نہیں کر رہا تو مزید برا کر رہا ہے۔ مانا کہ انسان محبت میں اندھا ہو جاتا ہے لیکن اب ایسا بھی کیا اندھا ہونا۔ خیر یہ اچھا ہے کہ اُما اس حماقت کا جواب اثبات میں نہیں دے رہی۔

اور نیہاں نے اُما کی روم میٹ ہونے کے باوجود بھی اس نے بھنک تک نہیں پڑنے دی کہ اسے کون پسند ہے۔ کبھی ذکر تک نہیں کیا اُما سے' پتا نہیں آج کیسے کہہ دیا۔ شاید اتنی خوش تھی اس لئے' لیکن نام پھر بھی نہیں بتایا۔ مگر وہ ہوگا کون؟ یقیناً کوئی بہت توپ چیز ہوگا۔ وہ کسی عام سے شخص کو پسند نہیں کر سکتی۔ خیر اب کل سے کالج میں اس پر نگاہ رکھیں گے خود ہی پتا چل جائے گا۔"

یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اگلا دن گھر پر ہی گزرا۔ فنکشن کے بعد ایک دن کی چھٹی تو وہ شور شرابا کر کے ہی لے لیتے تھے۔ ماہ بانو اباجی کے پاس چلی آئی۔

"چلیں اباجی میں آپ کی مدد کر دوں۔" وہ پیڑھی کھینچ کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔ "مٹی کی ہانڈیاں بن رہی ہیں۔"

"ہوں۔" اباجی نے مٹی چاک پر رکھی اور چاک گھومنے لگا۔

"دیں' میں بنا دوں۔" ماہ بانو نے کہا۔

"تم یہ برتن بھٹی میں رکھ دو۔ یہ ہانڈیاں میں ہی بنالوں گا۔ تم ٹیڑھی میڑھی کر دیتی ہو' توجہ نہیں دیتیں۔"

"چھوڑیں اباجی۔" اس نے برتن اٹھا کر بھٹی میں رکھے۔ "جو لوگ آپ سے یہ ہانڈیاں خریدتے ہیں وہ بہت بدذوق ہوتے ہیں' اس لئے میں زیادہ توجہ کوالٹی کی بجائے تعداد پر دیتی ہوں۔ حسن جمال سے بالکل کورے ہیں یہ لوگ۔" اس نے بھٹی کا درجہ حرارت نو سو ڈگری (900 C) سینٹی گریڈ کر دیا اور واپس آ بیٹھی۔

"جو کام بھی کرو بانو اس میں پیسے کو ضرور اہمیت دو لیکن پیسے سے زیادہ اہمیت اس خوشی کی ہوتی ہے جو اپنی پسند کا کام کر کے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔"

وہ اباجی کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہی جو چاک پر بہت مہارت سے مٹی کے عام سے پیڑے کو شکل دے رہے تھے۔

"اباجی۔" بہت دیر بعد وہ بولی۔ "آپ نے اتنا کچھ پڑھا ہے۔ کیا بزنس اور مارکیٹنگ وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ پڑھا ہے۔"

"بیٹا میں بے استاد تھا۔ کوئی استاد نہیں ملا مجھے۔ اکنامکس کے متعلق عمومی باتیں تو سمجھ آ جاتی ہیں لیکن ہارڈ کور اکنامک ایشوز (Hard Core Economic Issues) وغیرہ

کے متعلق مجھے کچھ نہیں پتا۔ اسی طرح بزنس اور مارکیٹنگ کے متعلق بھی میری معلومات صفر نہیں تو اس سے صرف چند پوائنٹ اوپر ہوگی۔"

"کل میری اور عبداللہ کی ڈسکشن ہو رہی تھی۔ اگر ہمیں مارکیٹنگ کے متعلق پتا ہو اور سرمایہ مل جائے تو ہم اپنا بزنس کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس Skil ہے اور میرے پاس Creativity دیکھیں اباجی۔" اس نے پیڑھی مزید آگے سرکا لی۔ "سرامکس کی مارکیٹ میں دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ ایک تو جدی پشتی کمہار ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو کہیں سے سیکھ کر اس مارکیٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً جیسے ہمارے کالج سے۔

جن لوگوں کا یہ آبائی پیشہ ہے یعنی وہ کمہار ہیں ان کے پاس ہنر ہے۔ ان کا مقابلہ کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس نے کہیں سے یہ علم سیکھا ہو لیکن کمہاروں کے پاس جس چیز کی کمی ہے وہ ہے تخلیقی صلاحیت۔ وہ مارکیٹ کے نئے ٹرینڈز کو نہیں جانتے۔ انہیں نہیں پتا کہ Cramic Pieces کی کیا قدر و قیمت ہے۔ ان کی ساری زندگی اسی قسم کی ہانڈیاں' صراحیاں اور گھڑے وغیرہ بنانے میں گزر جاتی ہے۔ ان کے پاس جدت کی کمی ہے۔

اور اباجی جو لوگ ہیں سے سیکھ کر اس میدان میں اترتے ہیں ان میں تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے۔ جدت بھی ہوتی ہے اور مارکیٹ کے نئے ٹرینڈز کو بھی سمجھتے ہیں ان میں کمی ہوتی ہے Skill کی۔ ان کا ہاتھ اتنا پختہ نہیں ہوتا جتنا کہ کمہار کا ہوتا ہے۔"

اباجی مسکرا دیئے۔ "لیکن میری بیٹی میں دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ہنر بھی اور تخلیقی صلاحیت بھی۔"

"نہیں اباجی میرے پاس ہنر کہاں ہے۔ میں نے کوشش کی ہے لیکن مجھ میں وہ بات نہیں ہے جو آپ میں ہے۔ میرے پاس بس صرف تخلیقی صلاحیت ہے۔ اباجی اگر میں ڈیزائن کروں اور آپ بنائیں تو ہم مارکیٹ میں کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہیں۔"

اباجی کو سنجیدہ سنجیدہ سی پُرجوش ماہ بانو بہت اچھی لگی۔ وہ مسکرا کر پھر چاک پر رکھے مٹی کے پیڑے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"میرا خیال ہے اباجی کہ آپ نے میری باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میں کسی خواب و خیال کی دنیا کی باتیں نہیں کر رہی۔ یہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں ہم اگر جدوجہد کریں تو۔"

"نہیں بانو میں انہیں خواب و خیال کی باتیں نہیں سمجھ رہا لیکن تم نے خود کہا کہ اس کے لیے مارکیٹنگ کی سمجھ بوجھ ہونا ضروری ہے اور سب سے بڑھ کر سرمائے کی ضرورت ہے جو کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"اباجی انسان قدم بڑھانے کے متعلق سوچے تو راہیں خود بخود ملتی جاتی ہیں۔"

"اچھا سرمایہ مل جائے تو تم کیا کرو گی۔ کس قسم کی چیزیں بناؤ گی؟"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ ''میرے پاس بہت سے آئیڈیاز ہیں۔سب سے پہلے تو ہم نیا چاک لیں گے یہ چاک پرانا ہے اوراس پر کچھ بناتے ہوئے زیادہ وقت اور محنت خرچ ہوتی ہے اور میں بناؤں تو ہر چیز کا زاویہ الٹا ہو جاتا ہے۔اس کے بعد ہم بھٹی بھی تبدیل کریں گے۔ٹھیک ہے ہم گملے وغیرہ بھی بنائیں گے لیکن میں چاہتی ہوں کہ ہم زیادہ تر کام Stone Ware اور پورسیلین Porcelain میں کریں۔''

''یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے کیونکہ میں نے زیادہ تر کام عام چکنی مٹی سے ہی کیا ہے یا پھر Stone Ware میں۔''

''اورصرف یہی نہیں ہے ابا جی اگر ہم صرف ٹائلز Tiles بنانے لگیں تو بھی کاروبار کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔''

''اچھا اس پر سوچیں گے تم یہ ہانڈیاں بھٹی میں رکھ دو اور وہ دوسری نکال لو۔''

وہ ہانڈیاں بھٹی میں رکھنے لگی تو ابا جی مٹی کا ایک اور پیڑا چاک پر رکھ کر سوچنے لگے کہ ماہ بانو کو اتنی اونچی اڑان کا خیال کیسے آیا۔

''اسی لئے تو میں نے اسے آرٹ کالج میں داخل کروایا تھا۔'' انہوں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی سوچ لیا کہ اس کی اُڑان محدود نہ ہو اور اسے اُڑنے کے لیے وسیع وعریض آسمان ملے۔کمہار کتنا بھی آگے کے لئے کیوں نہ سوچ لے' وہ ایک کے بعد ایک نہایت احتیاط سے سیڑھیاں چڑھتا ہے اور بعض اوقات سیڑھیاں چڑھ بھی نہیں سکتا۔وہیں کھڑا رہتا ہے جہاں سے سفر شروع کرتا ہے۔

لیکن آرٹسٹ کی تخلیقی صلاحیتیں اسے چین نہیں لینے دیتیں۔وہ پیچھے کی نہیں آگے کی سوچتا ہے۔اس وقت کے بارے میں سوچتا ہے جسے برسوں بعد آنا ہوتا ہے۔اسی لئے وہ ایک ہی جست میں باقی سب سے آگے نکل جاتا ہے۔کسی عام شخص کی طرح پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر دوسری سیڑھی کے متعلق نہیں سوچتا بلکہ اس کی سوچ دسویں سیڑھی کے متعلق ہوتی ہے اور وہ دسویں اور وہاں سے بیسویں سیڑھی پر جست لگاتا ہے۔''

''اٹھیں ابا جی میں بناتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

ابا جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ذرا توجہ سے ٹیڑھی میڑھی نہ کر دینا۔''

اس دن ماہ بانو نے کتنے ہی برتن بنائے۔یہ کام کرتے ہوئے اسے ایک عجیب سی سرشاری کا احساس ہوتا تھا۔کبھی کبھار وہ سوچتی تھی کہ شاید یہ خون کا اثر تھا کہ اسے بھی اس کام میں اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی کہ ابا جی کو۔

لیکن اس کا کام کرنے کا انداز جدا تھا۔وہ ایپرن پہننا کبھی نہیں بھولتی تھی۔بال باندھ کر کام کرتی تھی اور عام برتن بناتے وقت یہ بات ہمیشہ یاد رکھتی تھی کہ خریدنے والوں کو ان کی

خوبصورتی سے کوئی غرض نہیں ہے۔وہ کم قیمت کے برتن خریدنا چاہتے ہیں اور بس۔

مگر گلدان اور سجاوٹ کی دوسری اشیا بناتے ہوئے وہ ان کی خوبصورتی کا پورا خیال رکھتی تھی۔

ابا جی اور اماں سارا دن اس کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔کبھی کبھی اس کی مدد بھی کر دیتے تھے۔اور وہ سارا دن مٹی اور چاک سے کھیلتی رہی۔

☆======☆======☆

ریشماں کا اگلا دن بھی اسی سوچ میں گزرتا جارہا تھا کہ وہ زہرا کے لئے کیا کرسکتی ہے۔

''بی بی میں دیکھ رہی ہوں آپ کل سے کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔خیریت تو ہے؟'' اس کے دوپٹے پر گوٹا لگاتی کریمن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''کچھ تو ہے بی بی۔پریشان تو آپ ہوتی ہیں لیکن اس قدر پریشان میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔کل سے آپ نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔''

''وہم ہے تمہارا اور کچھ بھی نہیں ہے۔'' ریشماں نے بات ٹالنے کی کوشش کی اور کاپی کھول کر اس سبق پر نظریں جما دیں جو کل ہی اس نے سبط حسن سے پڑھا تھا لیکن نظریں صفحے پر ہونے کے باوجود بھی اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک ترکیب آئی۔گو کہ اس پر عمل کرنا بہت مشکل تھا۔

''میرے پاس بانو کا لاہور کا پتا موجود ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''اگر میں اسے خط لکھ کر تمام صورتِ حال بتا دوں تو وہ یقیناً یہ سب کچھ انھیں بتا دے گی اور وہ یا تو خود کچھ کریں گے یا پھر چچا جان کو بتا دیں گے' لیکن خط جائے گا کیسے؟ اور مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ بانو ان سے ملی بھی یا نہیں؟ وہ کالج آئے یا نہیں؟''

اس نے کوئی اور زیادہ بہتر اور قابلِ عمل ترکیب سوچنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہ آسکا۔اس نے ہمیشہ یہ محسوس کیا تھا کہ حویلی میں کریمن پر خاص نظر رکھی جاتی تھی۔اسے ٹھیک طور سے معلوم نہیں تھا لیکن دبے دبے انداز میں کی گئی یہ بات بہت مرتبہ اس کے کانوں میں پڑی تھی کہ اس کی پھوپھی کی بغاوت میں ان کی ذاتی ملازمہ کا بھی ہاتھ تھا جس کی پاداش میں اسے قتل کر دیا گیا تھا۔اصل واقعہ کیا تھا۔اس کا اسے مکمل طور پر علم نہیں تھا۔البتہ اس بات کا اسے احساس تھا کہ کریمن پر نظر رکھے جانے کا ان واقعات سے گہرا تعلق تھا۔

مگر وہ اب بھی حرکت میں نہ آئی تو پھر شاید بہت دیر ہو جاتی اور اس کے لئے وہ خود کو معاف نہیں کرسکتی تھی۔بالآخر اس نے کریمن کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔

"کریمن میں واقعی پریشان ہوں۔" اس نے کہا۔ "اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں آپ پر صدقے بی بی!" وہ دوپٹا اور گوٹا چھوڑ کر اس کے قدموں میں آبیٹھی۔ "آپ حکم کریں۔"

"لیکن اس بات کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے ورنہ بہت برا ہوگا۔ میرے ساتھ تو شاید اتنا برا نہ ہو لیکن تمہاری خیر نہیں ہوگی۔"

"آپ حکم تو دیں' کریمن کی جان بھی حاضر ہے۔ آج تک یہاں کا نمک کھایا ہے۔ میں تو آپ کی خدمت پر مامور ہوں بی بی' لیکن آپ نے کبھی خدمت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھے میری اوقات سے بھی بڑھ کر رکھا' اپنے قدموں میں جگہ دی۔ آپ بس حکم کریں۔"

"میں نے بانو کو ایک خط لکھنا ہے' وہ مجھے بہت یاد آرہی ہے۔ جی چاہتا کہ خط لکھ کر کچھ باتیں کرلوں لیکن تم جانتی ہو' میں ایسا نہیں کرسکتی۔"

"پھر بی بی؟"

"نہ میرے پاس لفافہ ہے اور نہ میں خط ڈاک میں ڈال سکتی ہوں۔ اگر تم ساتھ دو تو میری مشکل حل ہوجائے۔"

"لیں بی بی' یہ کوئی کام ہوا۔ میں کل ہی آپ کو لفافہ لا دوں گی۔ آپ خط لکھ کر رکھیں باقی کام کریمن پر چھوڑ دیں۔"

"لیکن دھیان سے جانتی ہو ناں کہ کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو بہت برا ہوگا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں۔ کریمن اپنی جان دے دے گی لیکن آپ پر آنچ نہیں آنے دے گی۔"

رات کو کاغذ قلم پکڑے کتنی دیر وہ سوچتی رہی کہ کیا لکھے۔

"پیاری بانو۔" اس نے لکھنا شروع کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ریشماں کا دل زور سے دھڑکا۔ کاغذ اور قلم تکیے کے نیچے چھپا کر جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی۔ دروازہ کھول کر اندر آنے والا خادم حسین تھا۔

"بھائی آپ؟" اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔

"ہوں' کیسی ہو؟" وہ مسہری کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے نظریں چرا کر کہا۔ مبادا وہ اس کی آنکھوں میں وہ سب کچھ نہ پڑھ لے جو ریشماں چھپانا چاہتی تھی۔

"تم تو واقعی پریشان لگ رہی ہو۔" خادم حسین نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

"میں۔ نہیں تو۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"تو پھر کھانا کیوں نہیں کھایا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے کل سے ٹھیک سے کھایا پیا نہیں

ہے۔ کیا ہوگیا میری گڑیا سی بہن کو۔"

"نہیں بھائی' کچھ نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ ہولے سے بولی۔

"مجھ سے بھی چھپاؤ گی میں سچ مچ ناراض ہوجاؤں گا۔" اس نے بہت پیار سے کہا۔

ریشماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"کیا ہوا گڑیا رو کیوں رہی ہو۔" وہ بے چین ہو کر اس کے برابر آبیٹھا اور اس کا رخ اپنی طرف پھیر کر بولا۔ "کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟ مجھے بتاؤ۔"

وہ کچھ نہ بولی۔

"بھائیوں نے کچھ کہا ہے؟ سبط نے تو نہیں ڈانٹا سبق نہ یاد کرنے پر؟"

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"پھر؟ اماں یا بابا جان نے کچھ کہا؟"

اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں سر ہلایا۔ آنسو اب گالوں پر اتر آئے تھے۔

"کچھ تو بولو ہوا کیا؟ کسی نے کچھ نہیں کہا تو پھر کیا بات ہے؟ شہر سے کچھ منگوانا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے بمشکل کہا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو پڑی۔ "بھائی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر لگ رہا ہے لیکن کیوں کس سے؟ جس بہن کے چھ جوان بھائی ہوں' اسے کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے ریشماں کے ہاتھ ہٹا کر اس کے آنسو پونچھے۔

"مجھے آنے والے وقت سے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے ہولے سے کہا۔

خادم حسین کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ "دیکھو گڑیا تمہارا ایک ایک آنسو میرے دل پر گر رہا ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہے کہہ دو۔ ہم میں سے کوئی بھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ یہ وقت' آنے والا وقت' سب تمہارے ہیں۔ بولو کیا چاہیے تمہیں۔ کپڑا' زیور' کتابیں یا کچھ بھی اور۔ تم کہو تو سب کچھ تمہارے سامنے ڈھیر کردیں گے۔"

چند لمحے وہ بھائی کے چہرے کو تکتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ "مجھے تحفظ چاہیے' وہ دے دیں۔"

"تحفظ۔" خادم حسین ہنس پڑا۔ "چھ بھائیوں کی موجودگی میں تم خود کو محفوظ نہیں سمجھتیں؟"

"مجھے اپنے لئے نہیں' سب کے لئے تحفظ چاہئے۔ بھائی یہ دشمنیاں ہمیں لاشوں کے تحفوں کے علاوہ کیا دیں گی۔ ہم اس پر خوش ہوں گے کہ ہم نے ان کا خون بہایا' اور وہ جشن منائیں گے کہ انہوں نے ہمارا خون بہایا لیکن یہ کون سوچے گا کہ یہ سارا خون تو اپنا ہی ہے۔ کیا بات تھی کہ دادا جان کے ہوتے ہوئے ہمارا خون ایک تھا' ان کے آنکھیں بند کرتے ہی ہر رشتہ بدل گیا' کیا کبھی خون کا رشتہ بھی بدل سکتا ہے؟"

"یہ باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں ہیں۔ اس بات کا خیال تو ان لوگوں کو کرنا چاہئے تھا جنہوں نے جنگ شروع کی تھی اور جب جنگ شروع ہو جاتی ہے تو اس کی آگ آسانی سے نہیں بجھتی۔ ان لوگوں نے قدم قدم پر خاندان کی روایات کی دھجیاں بکھیریں۔ خود کو تو تماشا بنایا ہی تھا ہمیں بھی سارے گاؤں میں تماشا بنا دیا۔ اب ہم پیچھے ہٹنے کی ذلت برداشت نہیں کر سکتے۔"

"بھائی۔ زہرا کو قتل کرتے ہوئے کیا آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ وہ آپ کی منگیتر ہے۔ آپ کی عزت ہے؟"

خادم حسین کے چہرے پر سختی چھا گئی۔ "تمہیں یہ سب کس نے بتایا ہے کہ میں زہرا کو قتل کرنے لگا ہوں؟"

"میں اماں جان کے پاس جا رہی تھی۔ وہاں بابا جان کہہ رہے تھے۔ میں نے سن لیا۔" پھر بھائی کی طرف دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ "میں نے جان بوجھ کر نہیں سنا بھائی۔"

خادم حسین نے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکائی۔ "مجھے پتا ہے تم نے جان کر نہیں سنا لیکن گڑیا کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف ہمارے لئے ہیں۔ تمہارے نہیں۔ مجھے پتا ہے تمہارا نازک سا دل ہے۔ تمہیں دشمنوں کو بھی تکلیف میں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم نے تمہیں ان باتوں سے دور رکھا ہوا ہے۔ یہ مردوں کے معاملے ہوتے ہیں اور انہی کو طے کرنے ہوتے ہیں۔"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ لوگ دشمن نہیں ان کے اپنے ہیں۔ سب کا خون ایک ہی ہے۔ پھر جہاں اس کا عبداللہ ہے، وہ لوگ دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن اس نے سب کچھ اپنے اندر دفن کر دیا۔

"اچھا اب کوئی اچھی سی بات کرو۔ یہ بتاؤ کہ میں جو تمہارے لئے کپڑے لایا تھا، وہ سلوا لئے۔" خادم حسین نے پوچھا۔ بات کرتے کرتے اس نے مسہری پر پڑا تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

ریشماں نے بہت مشکل سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی نگاہ تکئے کے نیچے رکھے کاغذ اور قلم پر تھی۔

"یہ کیا ہے۔" خادم حسین نے کاغذ اٹھا لیا۔ "پیاری بانو" اس نے پڑھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ۔" ریشماں نے جلدی جلدی ذہن پر زور دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا کہے۔ پھر اچانک اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ "میں پڑھ تو سب کچھ لیتی ہوں اردو بھی انگریزی بھی لیکن سبط ہر وقت یہی زور دیتا رہتا ہے کہ مجھے لکھنے پر خاص توجہ دینی چاہئے۔ کہتا ہے فارغ وقت میں اردو، انگریزی دونوں میں مضمون لکھا کروں یا پھر خط۔ یہ میں خط لکھ رہی تھی

پریکٹس کے لئے۔"

"اور یہ بانو کون ہے؟"

"میری خالہ ہیں ناں، خالہ رضیہ، ان کی بیٹی ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "اور پتا ہے، میں نے دو خط آپ کو بھی لکھے ہیں۔"

"پھر وہ مجھ تک پہنچے کیوں نہیں؟" خادم حسین نے خوش دلی سے کہا۔

"مجھے پتا ہے ناں کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا جب سبط مجھے پڑھاتا ہے۔ بابا جان کو تو بہت برا لگتا ہے۔ ویسے انہوں نے کبھی ڈانٹا نہیں لیکن پھر بھی مجھے پتا ہے کہ انہیں یہ اچھا نہیں لگتا۔"

"تمہیں پڑھنا اچھا لگتا ہے ناں، تم پڑھو۔ ہمیں صرف تمہاری خوشی عزیز ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور اب کھانا کھا لو۔ ناراضگی بندوں سے ہوتی ہے کھانے سے نہیں۔"

☆======☆======☆

اس دن مجسمہ سازی (Sculpture) کی کلاس تھی۔ اُما اور ماہ بانو ساتھ ساتھ بیٹھی کام کر رہی تھیں۔ اُما بلی بنا رہی تھی اور ماہ بانو بطخ۔ ساتھ ساتھ دونوں کی باتیں بھی جاری تھیں۔

"میں نے خواہ مخواہ بطخ بنانا شروع کر دی۔ اس کے پاؤں بنانا کس قدر مشکل ہیں۔" ماہ بانو نے مٹی سے سنے ہاتھوں سے ماتھے پر آئے بال پیچھے کر کے پن لگالی۔

"میری بلی تو اتنی اچھی بن رہی ہے کہ جب پوری بن جائے گی تو دیکھنا میاؤں میاؤں کرنے لگے گی۔"

"اس لئے کہ تمہیں پتا ہے بلی میاؤں میاؤں کرتی ہے اگر مجھے پتا ہوتا کہ بطخ کیسے بولتی ہے تو تم دیکھتیں چونچ بننے کے ساتھ ہی یہ بھی بولنے لگتی۔"

"تو میں ابھی بتا دیتی ہوں بطخ بولتی ہے قیں قیں کر کے۔" اُما ہنسی۔ پھر اچانک اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا اور ارد گرد کا جائزہ لے کر بولی۔ "شی، سنو بانو یہ افشاں وغیرہ کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے۔"

ماہ بانو نے ناک سکیڑی۔ "مجھے تو نہیں آ رہی بو۔"

"سنو تو۔"

ماہ بانو نے بھی کان قریب کھڑی افشاں اور اس کی سہیلیوں کی باتوں پر لگا دئے۔

"ہاں سچ کہہ رہی ہوں، اس کا نام ہے عبداللہ۔" نوین کام کرنے کے ساتھ ساتھ کہہ رہی تھی۔

"بھئی میں اس کی بات کر رہی ہوں۔ وہ اسمارٹ سا لڑکا جو کل ایڈی کے ساتھ تھا۔" افشاں نے کہا۔

"تو میں کس کی بات کر رہی ہوں۔ اسی کی تو کر رہی ہوں۔ مجھے اچھی طرح سے پتا ہے

اس کا نام عبداللہ ہے۔'' نوین نے زور دے کر کہا۔

''حیرت ہے آج تک وہ کالج میں نظر کیوں نہیں آیا۔ میری نظریں اتنی خراب نہیں ہو سکتیں۔ اس کا تو مجھے سو فی صد یقین ہے۔'' افشاں بولی۔

''تمہارا یقین سو فی صد درست ہے کیوں کہ جب سے ہم کالج میں آئے ہیں۔ تب سے وہ کل پہلی مرتبہ کالج آیا ہے۔''

''عبداللہ۔'' افشاں نے دہرایا۔'' اولڈ فیشن نام ہے لیکن بندہ خود بہت ہینڈسم ہے۔''

ماہ بانو نے آنکھیں پٹپٹائیں اور ان سے مخاطب ہوئی۔'' تم آج کل کسی چیز کو اولڈ فیشنڈ نہیں کہہ سکتیں یہ سراسر غلط ٹرم ہے۔''

''کیا مطلب؟'' افشاں اس کی طرف مڑی۔

''بھئی یہ Post Modernism کا دور ہے اور اس دور میں کسی چیز کو Old Fashioned ہونے کا خطاب نہیں دیا جا سکتا۔''

اسے خبر نہیں تھی کہ عبداللہ کچھ ہی دیر پہلے Sulpture Studio میں داخل ہوا تھا اور اس نے افشاں کا اپنے بارے میں کمنٹ اور پھر اس پر ہونے والی بحث سن لی تھی۔

''جب مشق ستم میری ذات بن ہی رہی ہے تو کیا میں بھی کچھ عرض کر سکتا ہوں؟'' اس نے مداخلت کی۔

''اوہ تم۔ تم کب آئے؟'' اُما بولی۔

''زیادہ دیر نہیں ہوئی۔'' پھر وہ ماہ بانو کی طرف مڑا۔'' بات یہ ہے کہ میرا نام میری اماں جان نے رکھا تھا اور جب وہ یہ نام رکھ رہی تھیں تو انہیں خبر بھی نہیں تھی کہ یہ Post Modernism کس بلا کا نام ہے۔ یہ صرف پسند ناپسند کی بات تھی، آرٹ اور فلسفے کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''تو تمہارا نام تمہاری اماں جان نے رکھا تھا۔'' ماہ بانو نے مسکراہٹ دبانے کی کوشش کی۔

''تم اس بارے میں مشکوک کیوں ہو؟''

''کیوں کہ میری سی آئی ڈی کی اطلاعات مختلف ہیں۔''

''ذرا اپنی سی آئی ڈی کی وضاحت کرو کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ جب میں اس دنیا میں وارد ہوا تھا تو تم یہاں موجود نہیں تھیں۔'' وہ بولا۔

''تاریخ کے اوراق الٹنے سے پتا چلتا ہے ہمایوں بابر کا بیٹا تھا۔ سکندر نے پورس کو شکست دی تھی اور کنفیوشس، کنفیوژن کا بھائی نہیں تھا۔ ظاہر ہے جب یہ سب تاریخ ساز واقعات رونما ہو رہے تھے تو ہم وہاں نہیں تھے پھر ہمیں کیسے پتا چلا ان کے بارے میں؟''

''کم از کم اس میں تمہاری سی آئی ڈی کا ہاتھ نہیں تھا۔'' عبداللہ ہنسا۔

''میں اپنا سورس (ذریعہ) نہیں بتاؤں گی اور نہ تم اس تک پہنچ سکو گے لیکن ذرا سی تصحیح کر لو کہ تمہارا نام تمہاری اماں جان نے نہیں بابا جان نے رکھا تھا اور وہ بھی اپنی پسند سے نہیں کسی اور کی پسند سے۔''

''کسی اور کی فوراً وضاحت کرو۔'' پیچھے کھڑی نیہاں نے کہا۔

''یہ وضاحت بے فائدہ ہوگی اس لئے اسے رہنے دو۔'' ماہ بانو پھر بطخ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''بانو، تمہاری اس بطخ کا شجرہ ذرا مشکوک سا لگ رہا ہے۔'' اُما نے مٹی کی بطخ کا بغور جائزہ لیا۔'' کیوں عبداللہ ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟''

''ہوں، مجھے بھی لگ رہا ہے جیسے بطخوں کی نسل میں کوئی کبوتر گھس آیا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''مذاق مت اڑاؤ ورنہ میں زمین پر پھینک کر اسے توڑ دوں گی۔'' ماہ بانو نے دھمکی دی۔

''کسی اور کا کیا بگڑے گا۔'' نیہاں بولی۔

''اور یہ پر دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی اُڑنے لگے گی۔'' عبداللہ نے کہا۔

''سچی سے یہ بہت بری بنی ہے؟'' ماہ بانو پیچھے ہٹ کر اس کا جائزہ لینے لگی۔

عبداللہ گندھی ہوئی مٹی اٹھا کر بطخ کی شکل بہتر بنانے لگا۔

''تمہارے کپڑے خراب ہو جائیں گے، رہنے دو۔'' ماہ بانو نے کہا۔'' اور یہاں جاسوس بھی بہت ہیں، میڈم کو پتا چل جائے گا کہ یہ تم نے ٹھیک کی ہے۔''

''تم لوگ اتنے ڈرتے کیوں ہو؟'' وہ بدستور مٹی کی بطخ کو ٹھیک کر رہا تھا۔

وہ دونوں کام میں منہمک تھے کہ سعد اندر چلا آیا۔ تھوڑی دیر ان کے پاس کھڑا رہا پھر ماہ بانو سے مخاطب ہوا۔

''کب تک فارغ ہوگی؟''

''ابھی تو بہت کام پڑا ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ کچھ کھا پی لیا جائے۔'' وہ بولا۔

''نائس آئیڈیا۔ میرے پیٹ میں بھی چوہے دوڑ رہے ہیں۔'' پھر وہ عبداللہ کی طرف مڑی۔'' تھینکس عبداللہ تم نے بہت مدد کی، لیکن میرا خیال ہے کہ باقی کام کچھ کھانے پینے کے بعد ہی کریں گے۔''

''آل رائٹ۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''تم بھی میرے ساتھ چلتے۔'' اس نے بیگ اٹھاتے ہوئے رسماً کہا۔

''نو تھینکس (نہیں شکریہ) میں کچھ کام کروں گا ابھی۔''

سعد اور ماہ بانو میوزیم کی طرف چلے گئے۔سینڈوچز اور کولڈ ڈرنکس لے کر بیٹھے تو ماہ بانو نے محسوس کیا جیسے سعد کسی سوچ میں گم ہے۔

''تم کیوں اتنے چپ چپ سے ہو؟''

''مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کہو۔''ماہ بانو کا دل دھڑک اٹھا۔

''تم عبداللہ کو کب سے جانتی ہو؟''تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا؟

''تمہید باندھنے یا فالتو سوالات کرنے کی ضرورت نہیں ہے صاف صاف بات کرو کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''ماہ بانو اس کے انداز سے کسی حد تک سمجھ چکی تھی کہ وہ کیا سمجھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں خود بخود سختی آ گئی تھی۔

''دو ہی دن میں تم دونوں بہت فری ہو گئے ہو حیرت ہو رہی تھی۔''

ماہ بانو کو تاؤ آ گیا۔''حیرانگی کو چھوڑو اور وہ بات کرو جو تمہارے خیال میں ضروری تھی۔''

سعد کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ماہ بانو کو اس کا اندازِ گفتگو اچھا نہیں لگا تھا۔اس لئے اس نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ وہ تم سے اس قدر فرینک ہو رہا ہے۔''

''بات یہ ہے سعد کہ تمہارا دماغ بہت چھوٹا ہے۔مجھے بھی اچھا نہیں لگ رہا کہ تم مجھ سے اس طرح پوچھ گچھ کر رہے ہو اور پوچھ بھی اس بات کے متعلق رہے ہو جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔''

''وجود نہیں ہے۔''اس کا انداز تلخ ہو گیا تھا۔''تو پھر کل وہ کیا تھا کہ تم مجھے نظر انداز کر کے اس کے ساتھ ایک کونے میں جا بیٹھی تھیں۔اور کیا اس میں بھی کوئی شک ہے کہ کل فنکشن کے درمیان تم دونوں اٹھ کر باہر چلے گئے تھے۔اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا تم دونوں کو باتیں کرتے اور آج......''

''شٹ اپ۔''وہ چلائی۔''بہت کر لی تم نے بکواس۔ٹھیک ہے اگر ایسا ہے' تب بھی تم کون ہوتے ہو مجھ سے صفائی طلب کرنے والے؟ یہ میری زندگی ہے' اور میں اسے کیسے گزارتی ہوں' اس کا فیصلہ تمہیں نہیں مجھے کرنا ہے۔''

''گویا تمہاری زندگی میں میری کوئی وقعت' کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

''کیوں ہو؟ تم ہوتے کون ہو' کیا رشتہ ہے میرا تمہارا؟ کچھ نہیں۔میں تمہیں اس طرح رعب ڈالنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم جلد بازی کا مظاہرہ کر رہی ہو بانو۔''

ماہ بانو کا بس نہیں چلا کہ وہ اس کا گلا گھونٹ دے۔شدید غصے کے عالم میں کولڈ ڈرنک کی

بوتل پٹخ کر بغیر مزید کوئی بات کئے وہ وہاں سے چلی آئی۔

''اُما یہ مطلع ابر آلود لگ رہا ہے' ہے ناں۔''وہ Sculpture Studio میں داخل ہوئی تو عبداللہ بولا۔

وہ بغیر کچھ کہے مٹی کی بطخ کی طرف متوجہ ہو گئی۔غصے سے اب تک اس کا برا حال تھا۔کسی سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔اس کے ارد گرد سبھی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔اُما' عبداللہ اور رایڈی نان اسٹاپ بول رہے تھے' دوسری طرف نیہاں سر جھکائے مٹی کے چوہے کی دُم بنا رہی تھی۔اور ساتھ ساتھ ان تینوں کی گفتگو میں ٹکڑے بھی لگا رہی تھی۔دائیں طرف کچھ سینیئرز اپنے کام میں مصروف تھے۔مختلف کونوں میں کام کرتے مختلف گروپوں کے ساتھ موجود کیسٹ پلئیرز سے ابھرنے والے گانے اس تک پہنچتے پہنچتے گڈ مڈ ہوئے جا رہے تھے۔

''کب تک اس بطخ سے جھگڑتی رہو گی بانو۔''اُما اس کے پاس آئی۔''چلو مجھے بھوک لگی ہے کچھ کھا لیں۔''

ماہ بانو کی بھوک تو غصے سے ہی اُڑ چکی تھی لیکن اُما کے سامنے دل کا غبار نکالنے کی غرض سے وہ اس کے ساتھ ہو لی۔

''پہلے تو تم یہ پیپسی پیو تا کہ موڈ بہتر ہو سکے۔''اُما نے اس کے سامنے بوتل رکھی۔''اور اب بتاؤ کہ ہوا کیا ہے۔''

ماہ بانو نے سعد سے ہونے والی گفتگو اسے بتا دی۔

''تم نے اسے بتا دینا تھا کہ اصل بات کیا تھی۔اسے غلط فہمی ہوئی تھی' اور کوئی بات نہیں ہے۔''اُما نے کہا۔

''میں صفائیاں پیش کرنے کی عادی نہیں ہوں۔شکی طبیعت والے لوگ مجھے زہر لگتے ہیں۔اور پھر وہ مجھ پر کیسے حق جتا سکتا ہے۔اس نے مجھ سے یا میں نے اس سے کوئی کمٹمنٹ نہیں کی۔میں کسی کو اپنے ساتھ اس قسم کا رویہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''لیکن بانو تم اس سے محبت کرتی ہو' اور محبت میں تو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔''اُما نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

''محبت گئی بھاڑ میں۔کیا کبھی ایسا ہوا کہ محبت شکلوں سے کی جائے؟ نہیں محبت انسان کی ذات سے کی جاتی ہے' رویوں سے کی جاتی ہے۔اور سعد کی یہ حرکتیں' یہ رویے مجھے اس سے دور لے جا رہے ہیں۔میں اس سے دور نہیں جانا چاہتی' لیکن وہ مجھے مجبور کر رہا ہے اس بات کے لئے۔''

''اچھا ایسا کرو کہ آج تمام دن اس کے پاس مت جاؤ۔کسی بھی ایسی جگہ مت جاؤ۔جہاں اس کی موجودگی کا امکان ہو۔''اُما نے کہا۔

''اس سے کیا ہوگا؟''

''اس سے ہوگا یہ کہ تمہارا غصہ اتر جائے گا۔اور جب تمہارا غصہ اترے گا تو تم زیادہ بہتر طور پر سوچ سکو گی۔یہ ضروری ہے۔چاہے تب بھی تمہارا فیصلہ یہی رہے۔دراصل ہمیں کوئی بھی فیصلہ غصے یا جذبات میں آ کر نہیں کرنا چاہئے۔''

وہ ایک دن کیا' ماہ بانو نے تین دن گزر جانے کے باوجود بھی سعد سے بات نہیں کی۔تیسرے دن کالج سے گھر پہنچ کر ابھی اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیئے تھے کہ اماں جان ایک لفافہ اٹھائے اندر آئیں۔''

''بہت عجیب بات ہے بانو!''وہ بولیں۔

''کیا بات ہے؟''وہ بے زاری تھی۔آج ڈرائنگ کی کلاس میں سر چکرا کر رہ گیا تھا۔اس پر بری طرح سے تھکن سوار تھی۔

''یہ خط آیا ہے تمہارے نام۔''

''میرے نام؟ کس نے لکھا ہے؟''

''باہر نام ریشماں کا لکھا ہوا ہے۔''

''ریشماں کا؟''اس نے تعجب سے کہا اور لفافہ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔''لیکن ریشماں مجھے کیسے خط لکھ سکتی ہے۔آپ نے خط کھولا بھی نہیں۔''

''تمہارے نام تھا۔کیسے کھولتی۔اب جلدی سے دیکھو خیر کی ہی کوئی خبر ہے ناں؟''

اماں جان چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ماہ بانو نے جلدی جلدی لفافہ چاک کیا۔

پیاری بانو!

بہت پیار! یہ خط بہت مشکل سے لکھ رہی ہوں' اسے پڑھ کر جلا دینا۔کسی کے ہاتھ لگ گیا تو میری خیر نہیں۔اتنا بڑا رسک کبھی نہ لیتی' اگر مسئلہ بہت اہم نہ ہوتا۔کل اتفاق سے مجھے ایک بہت خطرناک منصوبے کا علم ہوا ہے۔خدا کے لئے کسی طور پر خبر ان تک پہنچا دو کہ ان کی بہن زہرا کی زندگی خطرے میں ہے۔جمعرات کو اسے اپنی گاڑی پر شہر جانا ہے۔

ان سے کہو کہ اسے کسی بھی صورت گھر سے نہ نکلنے دیں۔بانو! اگر تم نے میرا یہ کام کر دیا تو میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔میرا خط بہت بے ربط ہے لیکن اس وقت بہت افراتفری کے عالم میں لکھ رہی ہوں' ذہن بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔اب اجازت دو۔

خدا حافظ

بہت پیار کے ساتھ تمہاری بہن

ریشماں!

''کیا لکھا ہے' خیر تو ہے؟''اماں نے پوچھا۔

''جی اماں بالکل خیریت ہے۔یونہی اس کا دل چاہ رہا تھا خط لکھنے کو سو لکھ دیا۔''اس نے کاغذ واپس لفافے میں ڈالا' اور لفافہ بیگ میں ڈال دیا۔''میں ذرا کپڑے تبدیل کرلوں۔''

''جلدی کرو' میں کھانا نکالتی ہوں۔''اماں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ماہ بانو بستر پر بیٹھ گئی

''یہ اشارہ واضح طور پر عبداللہ کی طرف ہے۔کیا تکلیف ہوتی تھی اسے نام لکھتے ہوئے۔ان' ان سے بھلا کیا پتا چلتا ہے کہ کس کے متعلق بات کر رہی ہے۔''ماہ بانو نے سوچا۔

''مجھے تو اس کی بہنوں کے اصل نام بھی نہیں معلوم۔وہ زینی اور گڑیا کہہ کر بات کرتا ہے۔اوہ خدایا جمعرات تو کل ہے۔''اسے اچانک یاد آیا۔

اس نے گھڑی پر وقت دیکھا۔شام کے پانچ بج رہے تھے۔اسے یاد آیا کہ صبح کالج میں عبداللہ ذکر کر رہا تھا کہ رات کے وقت وہ گاؤں جانے کے لئے نکل جائے گا۔کس وقت؟ یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔

اس کے پاس وقت بہت کم تھا' اسے جو کچھ کرنا تھا۔فوری طور پر کرنا تھا۔

کھانے پر فاتحہ پڑھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی' دوپٹہ لے کر' بیگ کندھے پر ڈال کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

ماہ بانو کو بیگ کندھے پر ڈال کر کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر اماں جان ٹھٹک گئیں۔

''کہاں چل دی؟ میں کھانا نکال رہی تھی؟''

''اماں کو اصل بات بتا دی تو خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔کوئی عجب نہیں کہ اماں بھی عبداللہ کی طرف جانے کی ضد کرنے لگیں۔''اس نے سوچا۔

''یہ بیگ پھر کیوں کندھے پر لٹکا لیا؟''اماں نے پھر پوچھا۔

''مجھے اچانک یاد آیا ہے کہ میرا پورٹ فولیو' ثما کے پاس رہ گیا ہے' کھانا بھی وہیں کھا لوں گی۔''اس نے بہانا کیا۔

''ایک تو گھر واپس آنے میں اتنی دیر کر دیتی ہو اور پھر آتے ہی کبھی یہاں' کبھی وہاں۔شریف گھروں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کیا؟''اماں جان کو غصہ آ گیا۔

''میرا جانا بہت ضروری ہے۔پورٹ فولیو اِدھر اُدھر ہو گیا تو مصیبت آ جائے گی۔''

اماں کو اصل بات بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔انہیں اس کا لڑکوں سے میل جول پسند نہیں تھا اور لڑکا بھی ہو عبداللہ۔انہوں نے تو پہلے ہی دن اسے اس سلسلے میں وارننگ دے دی تھی۔

اسے یقین تھا کہ اس بات کا علم اگر اماں جان کو ہو گیا تو وہ اس کے ساتھ چلنے پر مُصر ہو جائیں گی۔اس کا جلد از جلد جانا بھی ضروری تھا۔پتا نہیں عبداللہ کو کس وقت گاؤں جانا تھا۔اس موقع پر

وہ اماں سے لمبی بحث نہیں کر سکتی تھی۔

''بی بی! میں باز آئی تمہاری ایسی پڑھائی سے۔'' اماں کا موڈ بگڑ گیا۔

''وہ ساتھ والوں کی بیٹی بھی تو کالج میں پڑھ رہی ہے۔ صبح سات ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتی ہے اور ساڑھے بارہ بجے یا ایک بجے تک لوٹ آتی ہے۔ تمہارا کالج نرالا ہے جس کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں ہے' نہ آنے کا نہ جانے کا۔''

''اماں یہ کالج مختلف ہے' میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟''

''اتنی کوڑھ مغز نہیں ہوں کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکوں۔ دنیا دیکھی ہے میں نے' جانتی ہوں کہ لڑکیاں کالج سے اتنی دیر لگا کر گھر واپس آئیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔''

''خدا کے واسطے اماں! مجھے پاگل مت بنائیں' میں اپنی کتنی ہی صفائیاں پیش کروں گی' تب بھی آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ جب آپ ایسی باتیں کرتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ دوں۔'' اس نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

''اور مجھے تمہارا اس ہندو لڑکی کے ساتھ ملنا جلنا بھی بالکل پسند نہیں ہے۔ غضب خدا کا' اب ایک مسلمان لڑکی ہندوؤں سے دوستی کرے گی۔''

''اماں پلیز! میں سب کے خلاف بات سن سکتی ہوں' اپنے خلاف بھی' لیکن اُما کے متعلق ایسی کوئی بات نہیں سن سکتی۔''

''اسی لڑکی نے تمہیں بگاڑا ہے۔'' اماں نے فتویٰ صادر کیا۔ ''اچھی بھلی تھی' جب دوسرے کالج میں پڑھ رہی تھی یہاں آتے ہی پر نکل آئے ہیں تمہارے' اور باپ کو بھی مجال ہے جو ذرا سی پروا ہو۔''

عبداللہ کو جلد از جلد خبردار کرنا ضروری تھا اور اماں بحث پر مُصر تھیں۔ اس وقت باہر نکلنے کا مطلب تھا اماں جان کی شدید ناراضگی' لیکن اس کے سوا چارہ کار بھی کوئی نہیں تھا' سو اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''خدا حافظ اماں جان!''

اماں تو غصے سے بے حال ہو گئیں۔

''تم ذرا گھر واپس آؤ' ٹانگیں توڑ دوں گی تمہاری۔ دیکھتی ہوں کل سے کالج کیسے جاتی ہو' آ جانے دو اپنے ابا کو۔''

دروازے سے باہر نکلنے تک ماہ بانو ایسی کتنی ہی باتیں سن چکی تھی۔

ویگن کے اسٹاپ تک پیدل جانا عذاب لگ رہا تھا۔ پہلے ہی گرافکس کی کلاس میں وہ حد سے زیادہ تھک چکی تھی۔ پرنٹس بھی کتنی مشکلوں سے اچھے نکلے تھے۔ صبح نو بجے سے لگاتار سہ پہر چار بجے تک کام کرنے کے بعد گھر میں اماں جان کا غصہ بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ اسے اپنے

اوپر ترس آنے لگا۔

''یہ بھی کوئی زندگی ہے۔'' ویگن میں بیٹھ کر اس نے سوچا۔ ''سارا دن گدھے کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ روز کی روز مارکنگ کی وجہ سے چھٹی بھی نہیں کی جا سکتی۔ کبھی دیر تک رکنا پڑے تو اماں شک و شبہے میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

آج صبح ناشتے کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا پیا۔ درمیان میں بھوک لگی تب بھی کام کی زیادتی کی وجہ سے کینٹین تک نہیں جا سکی۔ پریس سے پرنٹ نکالتے نکالتے کندھے جواب دے گئے۔ مسلسل سات گھنٹے کھڑے رہنے سے ٹانگوں میں الگ درد ہو رہا ہے' مگر اماں کو پروا ہی نہیں۔ انہیں صرف یہی خیال رہتا ہے کہ میں لڑکوں کے ساتھ کالج میں پڑھ رہی ہوں اور بس۔

یہاں یہ حال ہے کہ کام پر جُت جانے کے بعد سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی' عشق کرنے کی کیا ملے گی۔ تین دن ہو گئے ہیں سعد کی شکل بھی ٹھیک سے نہیں دیکھی۔ وہ کمبخت بھی نہیں آیا منانے کے لیے۔ ظاہر ہے وہ بھی فارغ نہیں ہے' جیوری چل رہی ہے اس کی' وقت کہاں ہے اس کے پاس' ہفتے تک فارغ ہوگا پھر ہی آ سکتا ہے اور اگر وہ نہ آیا تو میں بھی اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔ ایسی فالتو نہیں ہوں میں کہ جو وہ کہے میں سن لوں۔''

ویگن ایم۔اے۔او کالج کے اسٹاپ پر رکی تو وہ بھی خیالات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں پلٹ آئی۔ ہوسٹل میں وہ سیدھی اُما کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دستک کے جواب میں نیہاں کی بیزار سی آواز آئی۔

''یس!''

ماہ بانو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اُما دوپٹا آنکھوں پر رکھے سو رہی تھی۔ نیہاں وارڈ روب ٹھیک کر رہی تھی۔

''بانو تم ہو۔'' نیہاں جو دروازے کی طرف ہی متوجہ تھی' اسے اندر آتے دیکھ کر بولی۔

''تم گھر نہیں گئیں؟''

''گئی تھی' کام سے آئی ہوں۔'' وہ اُما کی طرف بڑھی۔ ''اُٹھو اما!''

''مت اٹھاؤ' بے چاری تھک کر ابھی ہی سوئی ہے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔'' نیہاں نے کہا۔

''اُما اُٹھو! کیا گھوڑے بیچ کر سوئی ہو؟'' ماہ بانو نے نیہاں کی بات نظر انداز کر کے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

نیہاں کچھ کہنے لگی تھی پھر ارادہ بدل دیا اور کندھے اُچکا کر دوبارہ کپڑوں کی الماری کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اُما پہلے تو کسمائی پھر دوپٹا ایک آنکھ سے سرکا کر اس کی طرف دیکھا۔

"بانو تم! خیریت تو ہے، تم تو گھر گئی تھیں"؟ ماہ بانو کو غیر متوقع طور پر وہاں دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی۔

"گئی تو تھی، لیکن ساتھ ہی پھر نکلنا پڑا" وہ وہیں بستر پر بیٹھ گئی۔

"خیریت ہے ناں؟" اُما کی مندی مندی آنکھیں اب کھلتی جا رہی تھیں۔

"پتا نہیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔" ماہ بانو نے کہا۔

"بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو، پہلے اپنا سانس تو ٹھیک کر لو۔ پھر بات کریں گے۔" اُما اب سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

"سوری تمہیں سوتے سے جگا دیا۔"

"فضول باتیں مت کرو، دوستوں میں اتنا تکلف اچھا نہیں لگتا۔"

"اما! کچھ منگوا دوں کھانے کے لیے؟" نیہاں کپڑے چھوڑ کر ان کی طرف پلٹی۔

"ہاں پلیز، بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"تو کھانا کیوں نہیں کھایا؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"کیا کھاتی بینگن بنے ہوئے تھے، مجھ سے تو کھائے نہیں جاتے، پھر تھکن بھی تھی۔ نیند اور بھوک اکٹھی محسوس ہوں تو میں سونے کو ترجیح دیتی ہوں، سوچا تھا اُٹھ کر کچھ کھا پی لوں گی۔" اُما بولی۔

"اور میرا خیال ہے بانو کہ تم نے بھی بس جانے آنے کی بات کی ہے، کھانا نہیں کھایا۔"

"اماں کی ڈانٹ کھائی ہے بس۔" وہ ہنسی۔ "اچانک بہت تیزی میں گھر سے نکلنا پڑا۔ اماں کو بہت غصہ آتا ہے، جب میں کھانا کھائے بغیر گھر سے نکلوں۔"

"میں کچھ کھانے کا انتظام کروں۔ اس بے ہودہ ہوسٹل میں تو ڈھنگ کا کھانا کھانے کو بھی ترس گئے ہیں۔" نیہاں کپڑوں کا ڈھیر ایک طرف رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ وہ کیا بات ہے، جس کی خیریت ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔" اُما نے آلتی پالتی مار کر تکیہ گود میں رکھ لیا اور مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"مجھے آج ریشماں کا یہ خط ملا ہے۔" نیہاں کے جانے کے بعد ماہ بانو نے بیگ سے خط نکال کر اُما کی طرف بڑھایا۔

"تمہیں پتا ہے ناں کہ میری اردو ریڈنگ بہت کمزور ہے۔" اُما بولی۔

"میں پڑھ کر سنا دیتی ہوں۔" بانو نے کہا اور کاغذ کی تہیں کھول کر با آواز بلند خط پڑھنے لگی۔

"ہوں۔" خط سن کر اُما سوچنے لگی۔

"ویسے تو اس نے نام نہیں لکھا، لیکن اس طرح وہ صرف عبداللہ کے متعلق لکھ سکتی ہے، لیکن کیا تمہیں اس کی بہنوں کا نام معلوم ہے؟"

"نہیں گاؤں میں تو کوئی ان کا نام نہیں لے سکتا، بس چھوٹی بی بی اور بڑی بی بی کہتے ہیں۔ کبھی ان کی حویلی جانے کا بھی اتفاق نہیں ہوا کہ اسی طرح معلوم ہو جائے۔ عبداللہ نے جب بھی ان کا ذکر کیا ہے تو گڑیا اور زینی کہہ کر ہی پکارا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بات عبداللہ کے علاوہ کسی اور کے گھر کے متعلق نہیں ہو سکتی۔"

"تم اتنی پُر یقین کیسے ہو؟"

"بہت سی وجوہات ہیں۔ ریشماں کی زندگی کا دائرہ بہت محدود ہے۔ زہرا یا وہ جو کوئی بھی لڑکی ہو، اسے جو بھی نقصان پہنچایا جائے گا اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح ریشماں کے گھر سے ہو گا، تب ہی یہ بات اس کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ کسی اور کے متعلق ایسی بات ہوتی تو وہ اتنا بڑا رسک کبھی نہ لیتی۔

ٹھیک ہے اس نے عبداللہ کا نام نہیں لیا، لیکن وہ اس کا نام لیتی بھی نہیں ہے اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ یہ مسئلہ عبداللہ کے علاوہ کسی کے ساتھ ہوتا تو میں بھلا اس کی مدد کیسے کر سکتی تھی؟ اسے معلوم ہے کہ عبداللہ میرے ساتھ پڑھ رہا ہے۔ میں اس سے مل سکتی ہوں، بات کر سکتی ہوں، اسی لیے تو اس نے مجھے خط لکھا ہے۔"

"آل رائٹ۔" اُما نے ہاتھ اُٹھائے۔ "میں نے مان لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عبداللہ کو کیسے بتایا جا سکتا ہے۔ وہ تو شاید آج گاؤں واپس جا رہا ہے۔"

"ایک تو میری عادت بری ہے، میں اول تو ٹیلی فون انڈکس رکھتی ہی نہیں ہوں اور رکھ لوں تو وہ دو ہی دن میں گم ہو جاتی ہے۔" ماہ بانو بولی۔

"تمہارے پاس عبداللہ کا نمبر ہے ناں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"عبداللہ کا نہیں البتہ ایڈی کا ہے۔"

"ایڈی سے عبداللہ کا نمبر معلوم ہو سکتا ہے۔" ماہ بانو نے پُر خیال انداز میں کہا۔

"بشرطیکہ وہ اس وقت گھر پر ہوا۔ ان لڑکوں کا یہ بھی تو پتا نہیں چلتا کہ کب گھر پر ہوتے ہیں اور کب گھر سے غائب۔"

"چلو ٹرائی تو کرتے ہیں۔"

وہ دونوں فون کرنے جا رہی تھیں کہ سامنے سے نیہاں آتی دکھائی دی۔

"تم دونوں کہاں چل دیں؟ میں نے برگرز منگوائے ہیں، آتے ہی ہوں گے۔"

"ایک فون کر آئیں پھر برگرز سے بھی انصاف کرتے ہیں۔" اُما نے کہا۔

اتفاق سے ایڈی گھر پر ہی تھا۔ ہاں یہ اتفاق ہی تھا' ورنہ وہ گھر پر کم ہی نکلتا تھا۔

''تمہارے پاس عبداللہ کا فون نمبر ہے؟'' اُما نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں ہے تو۔'' وہ بولا۔ ''لیکن یہ عجیب بے مروتی ہے' تم مجھ سے فون پر بات کر رہی ہو اور بجائے اس کے کہ پہلے میری حالتِ زار دریافت کرو۔ چھوٹتے ہی تم نے عبداللہ کے متعلق انکوائری شروع کر دی۔''

''بانو کو اس سے ضروری کام ہے' ورنہ جہاں تک تمہاری خیریت کا تعلق ہے تو وہ روز ہی پتا چلتی رہتی ہے۔ ہر روز تو کالج ٹپک پڑتے ہو بلا ناغہ۔''

''کبھی ہسٹری پڑھی ہے تم نے؟ نہیں پڑھی ہوگی۔ ایک بی بی تھی لیلیٰ اور ایک تھا اس کا مجنوں۔ جب مجنوں کو لوگوں نے پتھر مارے تو جانتی ہو لیلیٰ نے کیا کیا تھا؟ اس نے نہایت پُرسوز آواز میں گایا تھا کہ......

''کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔''

اور یہ آج کے زمانے کی لیلیٰ ہے'' اس نے ایک مصنوعی آہ بھری۔

''جس نے پہلی مرتبہ اپنے مجنوں کو فون کیا ہے اور فون پر ہی خود اپنے مجنوں کو پتھر مارنے لگی ہے واہ! بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔''

''تم کر چکے اپنی بکواس؟'' اُما جھلا گئی۔ ''تم سے عبداللہ کا فون نمبر مانگا ہے' دو گے یا نہیں؟''

''تم جان مانگو وہ بھی حاضر ہے۔'' وہ فدا ہونے والے انداز میں بولا۔

''ایڈی! اگر تم میرے دوست نہ ہوتے تو اب تک میں تمہارا سر پھاڑ چکی ہوتی۔ بکو عبداللہ کا نمبر کیا ہے؟''

''تم نے اسے کہنا کیا ہے؟''

''پلیز ایڈی' کچھ خدا کا خوف کرو۔ میں ہوسٹل سے فون کر رہی ہوں۔ تین لڑکیاں اب تک جھانک کر جا چکی ہیں کہ میں کب فون بند کروں گی۔''

''اچھا نمبر لکھو۔'' اس نے نمبر لکھوایا۔

''اور اب بتاؤ اسے کیا کہنا ہے؟''

''تم سے جو کام تھا' وہ ختم ہوا' بائے بائے۔'' اُما فون رکھنے لگی۔

''ٹھہرو تو' عبداللہ تمہیں اس نمبر پر نہیں ملے گا۔'' ایڈی کی آواز آئی۔

''کیوں' کیا وہ گاؤں جا چکا ہے؟''

''میں نے یہ کب کہا ہے؟''

''تو پھر وہ کس نمبر پر ہے؟'' اُما زچ ہوگئی۔

''وہ اس وقت قالین پر آلتی پالتی مارے' سگریٹ اور چائے سے شغل کرتے ہوئے فلم دیکھ رہا ہے' میرے کمرے میں' میرے بالکل پاس۔ ساتھ ہی مجھ پر چلا بھی رہا ہے کہ میں اپنے لیلیٰ مجنوں کے قصوں میں اسے فلم نہیں دیکھنے دے رہا۔''

''ایڈی! میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔ اتنی دیر سے میں کیا بک بک کر رہی تھی' فون دو عبداللہ کو۔'' وہ تنگ آ کر چلائی۔

'چلو تاریخ کا ریکارڈ تم نے خود ہی درست کر دیا' ورنہ اب سے پہلے تم یہ ڈس انفارمیشن پھیلا رہی تھیں۔ کہ بکواس تم نہیں بلکہ میں کر رہا تھا۔''

''تم عبداللہ کو دیتے ہو فون یا نہیں؟'' وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

''دے دیتا ہوں' اس میں اتنا چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ خواہ مخواہ کان کا پردہ پھاڑ دیا۔ یہ لو بات کرو اس سے۔''

تھوڑی دیر میں اس طرف سے ماہ بانو اور دوسری طرف سے عبداللہ لائن پر تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔'' ماہ بانو بولی۔ ''تم اتنا بتا دو کہ تمہاری کسی بہن کا نام زہرا ہے؟''

''ہاں میری چھوٹی بہن ہے۔ میں نے غالباً تمہارے سامنے اس کا ذکر گڑیا کہہ کر ہی کیا تھا' تب ہی تمہیں اس کا اصل نام معلوم نہیں تھا۔''

''اچھا عبداللہ! میری بات غور سے سنو' مجھے بہت باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جمعرات کو تمہاری بہن شہر جا رہی ہے یا ایسی ہی کوئی بات ہے۔ بہر حال اس کا گھر سے نکلنے کا پروگرام ہے۔'' ماہ بانو بولی۔ ''اور مجھے پتا چلا ہے کہ اس دوران پیر صاحب یعنی تمہارے بڑے بابا کے آدمی اسے اغوا یا قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

''ہیلو۔'' ماہ بانو نے کہا۔ ''عبداللہ تم نے میری بات سنی ہے۔''

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں اس بات کا کیسے پتا چلا؟''

''یہ نہ پوچھو' میرا نیاز پور سے کوئی کچا رشتہ نہیں ہے' میں وہاں جاؤں یا نہ جاؤں' وہاں کی خبریں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔''

''اگر یہ خبر تم تک پہنچی تو پھر بابا جان تک بھی پہنچی ہوگی۔ شاید انہوں نے مجھے فون بھی کیا ہو' لیکن میں صبح سے گھر پر نہیں تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ خبر تمہارے بابا جان تک نہیں پہنچی۔''

''تھینک یو بانو' میں ابھی بابا جان سے بات کرتا ہوں' یوں بھی میں گاؤں کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔'' عبداللہ نے کہا۔

"سنو عبداللہ۔" وہ بولی۔ "تمہیں مشورہ دینے کا مجھے کوئی حق تو نہیں ہے' لیکن دوست ہونے کے ناتے سے مشورہ دوں تو برا تو نہیں مانو گے؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم تو ہمارے گھرانے کو بچانے کے لیے ہمارا ساتھ دے رہی ہو' تمہیں پورا حق ہے کوئی بھی مشورہ دینے کا' برا ماننے کا سوال ہی نہیں ہے۔"

"ایک دوسرے کے مقابلے میں اتر آنے سے زیادہ بہتر ہوگا کہ کل تم لوگ اپنی حویلی سے نہ نکلو۔ میں جانتی ہوں کہ میری بات سن کر تمہارے دل میں کیا خیال آ رہا ہوگا۔ یہی ناں کہ اس طرح تمہارے دشمن تمہیں بزدل سمجھیں گے' لیکن عبداللہ کسی کے کچھ سوچ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے عزت اور غیرت کے معیار تو یوں بھی دنیا سے نرالے ہیں۔ بجائے اس کے کہ تم بھی اتنا پڑھ لکھ جانے کے باوجود انہی معیار کو اپناؤ' بہتر ہوگا کہ تم انہیں تبدیل کرو' ان کے ذہن کو بھی وسعت اور کشادگی دو' تم میری بات سن رہے ہو ناں؟"

"ہاں' میں تمہاری بات سن رہا ہوں۔ تمہارا مشورہ بھی بہت اچھا ہے۔" وہ بولا۔

"میرا خیال ہے کہ اب میں بابا جان سے بھی بات کر لوں اور جلد از جلد گاؤں کے لیے روانہ ہو جاؤں۔"

"اچھا عبداللہ خدا حافظ۔" اس نے فون رکھ دیا اور اُما کی طرف مڑی۔

"اُما! وہ میرے مشورے پر عمل کرے گا۔"

"جتنا تم کر سکتی تھیں بانو' وہ تم نے کر دیا۔ باقی اوپر والے پر چھوڑ دو۔" اُما نے اسے تسلی دی۔

"دعا کرو خیریت رہے۔ ان لوگوں کی دشمنیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔"

"اچھا چلو کھانا کھا لو' اب تک تو سب کچھ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔" اُما بولی۔

کمرے میں نیہاں دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔

"اتنی لمبی بات کر رہے تھے فون پر تم لوگ' آدھا ہوسٹل گالیاں دے رہا تھا۔"

"اس ایڈی کے بچے نے مصیبت ڈال دی تھی۔ جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔" اُما نے برگرز کو چیک کیا جواب ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

نیہاں اس کی بات سن کر ہنس پڑی۔ "ظاہر ہے ایڈی کے بچے تمہیں مصیبت نہیں ڈالیں گے تو اور کسے ڈالیں گے۔ یقین کرو' آخر دم تک تمہاری جان نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں تمہیں قتل کر دوں گی نیہاں۔" اُما نے اسے تکیہ مارنے کی کوشش کی۔

"تم بتاؤ بانو' میں غلط کہہ رہی ہوں کچھ؟ آخر ہم بھی منہ میں زبان اور کھوپڑی کے گرد دو کان رکھتے ہیں۔ ماتھے سے کچھ نیچے دو آنکھیں بھی ٹکا رکھی ہیں۔ کیا اب بھی پتا نہیں چلے گا کہ ایڈی کیا کھچڑی پکا رہا ہے......؟" نیہاں بولی۔

"تم کھانا شروع کرو بانو۔ یہ تو باتوں پر شروع ہوتی ہے تو نان اسٹاپ بولتی ہے۔" اُما نے ماہ بانو کو برگر اور کولڈ ڈرنک پکڑائی' اور خود بھی کھانے لگی۔

"اب کوئی اس سے پوچھے کہ ایڈی کھچڑی پکا رہا ہے میں تو نہیں پکا رہی' مجھے خواہ مخواہ گھسیٹ رہی ہے یہ۔"

"اس بات پر تو میں نیہاں سے اتفاق کرتی ہوں۔ مانا کہ کھچڑی ایڈی پکا رہا ہے' یہ بھی تو دیکھو پکا کس کے لیے رہا ہے۔"

"واہ بانو! دل خوش کر دیا۔" نیہاں خوش ہو گئی۔

"تم دونوں خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ ٹھیک ہے کہ وہ حماقت پر اتر آیا ہے' لیکن میں تو حماقت پر نہیں اُتری۔ اس کے اس فعل کی ذمہ داری میں تو نہیں لے سکتی۔"

"رہنے بھی دو اُما۔ شروع شروع میں سب لڑکیاں یونہی نخرے دکھاتی ہیں اور جب یہ دیکھتی ہیں کہ لڑکا مزید نخرے اُٹھانے کے لیے تیار نہیں ہے تو خود ہی سیدھی ہو جاتی ہیں۔ دیکھ لینا بانو' چند دنوں کے بعد یہ بھی آہیں بھرنے لگے گی۔"

"تمہارے منہ میں خاک' میں کیوں آہیں بھرنے لگی۔" اُما بولی۔ "بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اسی لیے عشق و عاشقی کے چکر میں نہیں پڑتی کہ مجھے آہیں نہ بھرنی پڑیں۔"

"چچ...... چچ...... افسوس ہوا یہ سن کر' بس اتنی سی بات سے ڈر گئیں۔" نیہاں بولی۔

"میری بات چھوڑو' تم جو اس دن اتنی ترنگ میں تھیں وہ کیا تھا؟" اُما نے بھی جوابی حملہ کیا۔

"وہ کیا ہونا ہے۔ نیہاں کے پیچھے آہیں بھرنے والے بہت ہیں۔" بانو نے بھی لقمہ دیا۔

"یہ تو مسئلہ ہے' میرے پیچھے وہ آہیں بھرتے ہیں جو مجھے پسند نہیں ہیں۔ جو پسند ہے' وہ سرسری سی ہیلو ہائے سے زیادہ بات ہی نہیں کرتا۔"

"وہ ہے کون؟" اُما کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"ہاں' ایسا کون ہو سکتا ہے' جو تمہیں صرف ہیلو ہائے پر ٹرخا دیتا ہے۔" ماہ بانو نے بھی دلچسپی سے کہا۔

"چھوڑو' اب تک کسی کو نہیں پتا اس بات کا' جب تم لوگوں کو پتا چلے گا تم میرا بہت مذاق اڑاؤ گے۔ ہر وقت تو وہ نو لفٹ کا بورڈ لٹکائے پھرتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے اس کا گلا دبا دوں۔"

"ایسا کون ہو سکتا ہے؟" ماہ بانو نے سوچتے ہوئے کہا۔

"مت دماغ کھپاؤ۔" نیہاں بولی۔ "تم لوگوں کو بالکل اندازہ نہیں ہوگا۔"

"تم کس پرانے زمانے کے انداز میں عشق کرنے لگیں۔ چھپ چھپا کر' زمانے کی نظر سے بچا کر۔ یار ذرا فاسٹ ہو۔ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی ہے۔" ماہ بانو نے ہنس کر کہا۔

''اگر وہ بھی مثبت جواب دیتا تو میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات نہ چھپاتی' مگر اب مجھے اپنا مذاق بنوانا گوارا نہیں ہے۔''

''اوہو بانو! مجھے تمہیں بتانا تھا۔'' اُما نے جلدی جلدی برگر کا آخری نوالہ منہ میں ٹھونسا۔

''کام اتنا زیادہ تھا کہ کالج میں بتا ہی نہیں سکی اور بعد میں تھکن اتنی تھی کہ سوچا کون زبان چلائے۔''

''تو اب چلا لوناں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''ایڈی چاہتا ہے میں اس کے مجسمہ سازی کے لیے ماڈلنگ کروں۔'' اُما نے بتایا۔

''پھر تم نے کیا کہا؟'' بانو نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میرے پاس وقت ہی کہاں ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''لعنت ہو۔ اس نے کہا اور تم نے انکار کر دیا۔'' نیہاں چلائی۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے اُما! وہ مجسمہ سازی کا کیٹس ثابت ہوگا اور یوں فینی یعنی تمہارا نام بھی امر ہو جائے گا۔''

''پرواز اتنی اُونچی لینی تھی تو کیٹس کے بجائے ڈونا ٹیلو یا مائیکل اینجلو کا نام لیتیں۔'' اُما ہنسی۔

''کیسے لیتی' مجھے ان کی فینیوں کے ناموں کا پتا ہے بھلا۔'' نیہاں بولی۔

''اس بات کو چھوڑو' یہ بتاؤ کہ ایڈی نے کیا کہا پھر؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''اس نے کیا کہنا تھا پھر وہی لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد والی داستان شروع کر دی۔ کہنے لگا کہ میرا مجسمہ کالج کی کسی اسائمنٹ کے لیے نہیں بلکہ پرسنل کولیکشن کے لیے بنانا چاہتا ہے۔''

''پھر بھی تمہیں رحم نہیں آیا بے چارے پر چچ...... چچ'' نیہاں نے سر ہلایا۔

''تمہیں کتنوں پر رحم آتا ہے جو تمہارے پیچھے چلے آتے ہیں؟'' اُما نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''بات یہ ہے اُما۔'' نیہاں بولی۔ ''کہ انسان کو اتنا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ کون اس کے ساتھ مخلص ہے۔ دیکھنے میں ایڈی بھی کتنا لاپروا نظر آتا ہے' لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی کمٹ منٹ کو وہ کتنی سنجیدگی اور ذمہ داری سے پورا کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا' جسے پورا نہ کر سکے۔ وہ تمہیں کبھی درمیان میں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔''

''اور جو تمہیں پسند کرتے ہیں نیہاں' ان میں سے بھی تو کوئی مخلص ہوگا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''نہیں کوئی ایک بھی نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''مجھ میں انسانوں کو پہچاننے کی صلاحیت ہے' تم دیکھنا میری طرف سے کوئی مثبت ردِعمل نہ پا کر یہ سب دوسری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ یہ دور اتنا فاسٹ ہے کہ سوائے چند ایک احمقوں کے کوئی بھی اپنا سر کسی پتھر سے پھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اتنا وقت کس کے پاس ہے آج

کل؟''

''اور جسے تم چاہتی ہو؟ خود ہی کہتی ہو کہ اس نے نو لفٹ کا بورڈ لٹکایا ہوا ہے۔'' ماہ بانو نے اعتراض کیا۔

''میں ان چند احمقوں میں سے ہی ایک ہوں' وہ جو مرضی ہو' میں تو مخلص ہوں ناں اس کے ساتھ لیکن یہ تم نہیں سمجھو گی۔'' نیہاں نے کہا۔

''نہ اُما سمجھے گی' ہاں ایڈی سمجھ جائے گا۔''

''چھوڑو نیہاں۔'' اُما کے انداز میں تلخی آ گئی۔ ''یہ سب باتیں ہوتی ہیں' نہ کوئی کسی کے لیے جیتا ہے نہ کسی کے ساتھ مر سکتا ہے۔ کم از کم آج کے دور میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا کر سکتا ہے ایڈی میرے لیے؟ کس کس سے لڑے گا وہ؟ اپنے ماں باپ سے' میرے ماں باپ سے' اس معاشرے سے' آخر کس کس سے؟ کیا میری خاطر اپنا مذہب تبدیل کر لے گا وہ؟ نہیں...... نہ وہ ایسا کر سکتا ہے اور نہ میں...... اور نیہاں مذہب کی دوری اتنی چھوٹی نہیں ہوتی جسے آسانی سے پاٹ لیا جائے۔

میں نے مان لیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے' یہ بھی مان لیا کہ اگر ہمارے درمیان مذہب کا یہ فرق نہ ہوتا تو وہ مجھے اپنا لیتا' مگر اب کیا ہے؟ اب وہ چاہے تب بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بہت بزدل ہوں معاشرے کے پتھر نہیں کھا سکتی۔ میرے ماں باپ' میرے لیے خود ہی فیصلہ کر لیں گے اور جو بھی فیصلہ کریں گے' وہ میرے لیے بہترین ہوگا۔''

''تمہاری سوچ عقل کی تلوار پر چل رہی ہے اُما! میں نہیں کہتی کہ تم غلط کہہ رہی ہو' اس لیے کہ تم غلط نہیں تمہاری بات بالکل درست ہے۔'' نیہاں بولی۔ ''لیکن تمہاری اس سوچ کی بنیاد تمہارا خوف ہے۔ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ تم بزدل ہو' معاشرے کے پتھر نہیں کھا سکتیں۔ اور یہی وجہ ہے اُما کہ تم محبت نہیں کر سکتیں۔

تم صرف اتنا چاہتی ہو کہ تمہارے ممی ڈیڈی تمہارے لیے راستہ بنا دیں تا کہ تم اطمینان سے اس راستے پر اپنا سفر مکمل کر سکو' اپنی زندگی کے اس سفر میں بھی تم محبت نہیں کرو گی' صرف وفاداری کرو گی اور رشتے نبھاؤ گی۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اُٹھاؤ گی تا کہ تمہاری وفاداری پر حرف نہ آئے' رشتوں پر آنچ نہ آئے' اور اس کے باوجود ساری زندگی اس خوش فہمی کا شکار ہو گی کہ تم محبت کر رہی ہو۔ حقیقت تو یہ ہے اُما کہ تم صرف زندگی کا سفر طے کر رہی ہو گی۔''

''مجھے بحث نہیں کرنی۔'' اُما نے فیصلہ انداز میں کہا۔

''تم کچھ نہیں بولو گی بانو؟'' نیہاں نے اس کی طرف دیکھا پھر ہولے سے ہنس دی۔

''لیکن تم بھی کیا بولو گی' تم بھی تو صرف زندگی کا راستہ طے کرنا چاہتی' ہو محبت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔''

ماہ بانو جیسے چونک گئی۔ ''اوہو میں تو باتوں میں بھول ہی گئی' گھر بھی جانا ہے ابھی۔''

''میں بھی بھول گئی' مجھے بھی اپنی وارڈ روب ٹھیک کرنی ہے۔'' نیہاں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو میں تمہیں گیٹ تک چھوڑ آؤں۔'' اُما نے کہا۔

گیٹ تک کا فاصلہ دونوں نے خاموشی سے طے کیا۔ ماہ بانو سڑک کی بھیڑ میں شامل ہوگئی۔ اُما تب تک وہیں کھڑی رہی۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

☆======☆======☆

حسب توقع گھر کی فضا خاصی کشیدہ تھی۔ آج کل اندھیرا بھی جلدی پھیل جاتا تھا۔ اس کے گھر میں داخل ہونے تک اندھیرا ہر طرف اپنے پر پھیلا چکا تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور بیرونی دروازے کی کنڈی لگا کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔

اماں اور ابا جی کمرے میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ آواز باہر صحن تک آ رہی تھی۔ وہ سیدھی ان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اماں نے تو ٹھیک سے اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ البتہ ابا جی کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہاں وہ اس کی اچانک گھر سے روانگی کا سبب ضرور پوچھتے اور پھر اگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پاتی تو پیار سے سمجھانے سے لے کر جھڑکنے تک وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

''ابا جی! مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

قبل اس کے کہ وہ کچھ پوچھتے اور وہ غلط بیانی سے کام لے کر سب کے درمیان غلط فہمیاں پھیلا دیتی' اس نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

''بتاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''پہلے تو آپ اس سے یہ پوچھیں کہ یہ کالج سے اتنی دیر سے گھر کیوں آئی اور پھر آتے ہی واپس چلی گئی اور اب یہ وقت ہوا ہے کہ محترمہ آئی ہیں' شریف گھرانے کی لڑکیوں کے یہ لچھن ہوتے ہیں۔''

''اماں جان! میں یہی تو بتانے لگی ہوں۔'' وہ بولی پھر ابا جی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ابا جی! آپ کو پتا ہے ناں کہ...... گرافکس کرتے ہوئے کتنا وقت لگتا ہے۔ پہلے تو میری پلیٹ اچھی بھلی بنی تھی' وہ خراب ہوگئی' اسے ٹھیک کیا پر پرنٹس ٹھیک نہیں آ رہے تھے۔ میری تو رونے والی حالت ہوگئی تھی۔ اتنی مشکلوں سے پرنٹس نکالے۔ میں اتنی پریشان تھی کہ بھوک کے باوجود کچھ کھانے تک نہیں جا سکی۔ یہ دیکھیں میرے ہاتھ کتنے کالے ہو رہے ہیں' پرنٹس نکال نکال کر۔'' اس نے اپنے ہاتھ ان کے سامنے پھیلا دیے۔

''اور ابا جی یہ دیکھیں میرے پرنٹس۔'' اس نے پورٹ فولیو سے پرنٹس نکال کر ان کی گود میں رکھ دیے۔ ''مر مر کر یہ کام مکمل ہوا اور گھر آئی تو اماں نے ریشماں کا خط تھما دیا۔'' اس نے

بیگ سے خط نکال کر ابا جی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اس میں کیا ہے؟'' انہوں نے کھولے بغیر پوچھا۔

''آپ پڑھ لیں بلکہ اماں کو بھی سنا دیں۔'' اس نے کہا اور پرنٹس دوبارہ پورٹ فولیو میں رکھنے لگی۔

ابا جی نے بآواز بلند خط پڑھنا شروع کیا۔ اماں کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔

''ان لوگوں پر اللہ کی مار ہو' کمبخت کب باز آئیں گے یہ ظلم کرنے سے کل تو جمعرات ہے' ہائے اب کیا ہوگا' بانو کے ابا کچھ کریں۔''

''جو کرنا تھا میں کر چکی ہوں۔''

''کر چکی ہو۔'' انہیں حیرت ہوئی۔

''اس خط کو پڑھ کر میں اطمینان سے تو نہیں بیٹھ سکتی تھی ناں۔'' ماہ بانو بولی۔

''عبداللہ کو اس سازش سے باخبر کرنا ضروری تھا' اس لیے میں فوراً ہوسٹل گئی۔ میرے پاس عبداللہ کا فون نمبر نہیں تھا' میرا خیال تھا شاید اُما کے پاس ہو۔''

''تو تم اسی وقت مجھے بتا دیتیں' میں بھی تمہارے ساتھ چلی چلتی۔'' اماں بولیں۔

''مجھے پتا تھا کہ آپ دہشت زدہ ہو جائیں گی اور اسی لیے میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا۔''

''پھر تمہاری بات ہوئی عبداللہ سے؟'' ابا جی نے دریافت کیا۔

''جی' بات ہوئی۔ نمبر تو خیر اُما کے پاس بھی نہیں تھا لیکن ہم نے ایڈی کو فون کیا۔ اتفاق سے عبداللہ وہیں تھا۔ اسے یوں بھی آج گاؤں جانا تھا۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی ہے۔ یہ کام نپٹا کر میں نے کھانا کھایا۔ اتنی سخت بھوک لگی ہوئی تھی کہ اگر کچھ کھائے پیئے بغیر باہر نکلتی تو کہیں سڑک کے درمیان بے ہوش پڑی ہوتی۔''

''ہائے اللہ نہ کرے۔'' اماں نے پیار سے اس کے بالوں کو سنوارا۔

''میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اور اماں پھر آپ سنتی بھی کب ہیں۔ بلاوجہ ڈانٹتی جاتی ہیں۔'' ماہ بانو کی آنکھوں میں بلاوجہ آنسو آگئے۔

''روتے نہیں ہیں چندا۔'' اماں نے اسے پیار کیا۔

''اب تو تسلی ہوگئی ناں رضیہ بیگم۔'' ابا جی نے اماں سے کہا۔

''روٹی پکا دوں بانو؟'' اماں نے ابا جی کی بات نظر انداز کر کے اس سے پوچھا۔

''نہیں اماں' اب تو کھا لیا۔ نیہاں نے برگر اور پیپسی منگوا دی تھی۔ اُما اور نیہاں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہاں ہوسٹل میں بینگن پکے تھے ناں۔''

''اب اپنی چیزیں سمیٹو اور وہاں تارپین کا تیل پڑا ہوا ہے اس سے ہاتھ دھولو۔ انہی سیاہ کالے ہاتھوں سے کھانا کھایا ہے تم نے۔ خدا جانے کیا کرتی ہو کالج میں' سارے ہاتھ سیاہ کالے

کر آتی ہو۔'' اماں نے کہا۔

''اچھا اماں! اب مجھے کوئی تنگ نہ کرے۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے پینٹنگ کرنی ہے' کھانا کھانا ہوا تو میں خود نکال لوں گی۔ درمیان میں مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔''

وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں چلی آئی۔ دوپٹا اور بیگ بستر پر پھینک کر اس نے ایزل بورڈ لگایا اور کام کرنے لگی۔ تھکے ہونے کے باوجود کام کے دوران اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ سر اُٹھایا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ تمام چیزیں سمیٹ کر وہ تھک کر بستر پر لیٹ گئی اور خالی الذہنی کی کیفیت میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

اس کا چھوٹا سا کمرا اس کے سامان سے بھرا ہوا تھا پھر بھی اس میں نفاست تھی۔ لکڑی کی الماری بیک وقت وارڈ روب اور ڈریسنگ ٹیبل کا کام دیتی تھی۔ آرٹ کا سامان رکھنے کے لیے ابا جی نے اس کی پرانی رائٹنگ ٹیبل کے نیچے ہی دو کیبنٹ بنوا دی تھیں۔ ایک طرف ایک بک شیلف تھا' جس کے ساتھ ہی ایزل بند کر کے رکھ دیا جاتا تھا۔ کمرے کی اکلوتی چھوٹی سی کھڑکی پر باریک تنکوں کی چق تھی۔ دروازے پر اس نے ریمبراں کی ایک پینٹنگ کی نقل پینٹ کر دی تھی۔ دیواروں پر اس کی بنائی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں۔ کچھ مٹی کے برتن بھی سجاوٹ کی غرض سے رکھے ہوئے تھے' جن پر اس نے مختلف چیزیں پینٹ کر رکھی تھیں۔

اس وقت وہ تھکن سے بے حال تھی اور جلد از جلد سو جانا چاہتی تھی' مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جسمانی تھکاوٹ تو جو تھی سو تھی' ذہنی تھکاوٹ اس سے بڑھ کر تھی۔ وہ سُستی کے ساتھ بستر سے اُٹھی اور بتی بند کر کے پھر آ لیٹی۔

بہت سے خیال' بہت سی باتیں ذہن میں گڈمڈ ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کی سوچ میں وہ سب لوگ تھے جو کسی نہ کسی طرح اس کی زندگی پر اثر انداز ہو رہے تھے' لیکن کوئی بھی خیال واضح نہیں تھا' اسے رہ رہ کے نیہاں پر غصہ آ رہا تھا۔ اس سے ملنے سے پہلے وہ ذہنی طور پر اس قدر منتشر نہیں تھی۔

عجیب لڑکی تھی نیہاں بھی۔ ماہ بانو کی اس سے کبھی زیادہ دوستی نہیں رہی تھی' لیکن چونکہ کالج بہت چھوٹا سا تھا اور ہر شخص دوسرے کو جانتا تھا' اسی طرح ماہ بانو بھی نیہاں کو جانتی تھی۔ وہ دونوں کلاس فیلو بھی تھیں' پھر بھی ماہ بانو اس سے زیادہ قریب نہیں ہو سکی تھی۔ بعد میں وہ اور اُما روم میٹ بن گئیں۔ اُما اس کی بہت تعریف کرتی تھی' لیکن ماہ بانو کی تب بھی اس سے زیادہ دوستی نہیں ہوئی۔

نیہاں کے پاپا سول سرونٹ تھے اور اس کی فیملی اسلام آباد میں تھی۔ نیہاں بہت خوبصورت تھی۔ اس کی خوبصورتی میں زیادہ حصہ اس کے گورے رنگ کا تھا۔ یہی نین نقش اگر کسی سانولے چہرے پر ہوتے تو بہت کم لوگ اس چہرے کی طرف متوجہ ہوتے' مگر اب اسے دیکھ کر مجموعی طور پر

خوبصورتی کا تاثر ہی اُبھرتا تھا۔ اس میں نزاکت بھی تھی۔ باقی سب کی طرح گرافکس کرتے ہوئے' اس کے ہاتھ سیاہ نہیں ہو جاتے تھے۔ غالباً کالج کی وہ واحد اسٹوڈنٹ تھی جو یہ کام دستانے پہن کر کیا کرتی تھی۔

اس کے کپڑے ہمیشہ بہت عمدہ ہوتے تھے' بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس میں اسٹائل بہت زیادہ تھا' اگر وہ عمدہ کپڑوں کے بجائے عام سے کپڑے بھی پہن لیتی تو باقی سب سے منفرد دکھائی دیتی۔ میک اپ کے نام پر وہ صرف کاجل لگایا کرتی تھی۔ اس کے پہننے' اوڑھنے' اُٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے' غرض یہ کہ ہر چیز میں عجیب سی بے نیازی جھلکتی تھی۔ اس بے نیازی اور لاپروائی نے اس میں کشش بھر دی تھی۔

اور یہی وہ چیزیں تھیں' جنہوں نے ماہ بانو کو اس سے دور کر رکھا تھا۔ وہ اس کے فیملی بیک گراؤنڈ...... بول چال اور اندازِ نشست و برخاست سے خائف رہا کرتی تھی' احساسِ کمتری اسے ایسے کسی بھی شخص سے قریب ہونے سے روکتا تھا۔

ہاں اُما تھی' جس سے وہ بہت قریب تھی۔ شاید وہ اُما سے بھی اس قدر قریب نہ ہو سکتی' اگر پہلے دن اُما بھی اس کی طرح متجسس اور اکیلی اکیلی نہ ہوتی تو' ان کا تجسس اور اکیلا پن انہیں ایک دوسرے کے نزدیک لایا تھا۔

نیہاں نے اپنے منہ سے اعتراف نہ کیا ہوتا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ لڑکی بھی کسی کے ساتھ اتنی سنجیدگی سے عشق کر سکتی ہے۔ وہ تو بہت خوش باش اور بے فکر دکھائی دیتی تھی اور اس کی یہی بے فکری اور بے نیازی ماہ بانو کو اس سے دور لے جاتی تھی۔ اُما اکثر نیہاں کے متعلق کہتی تھی۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے بانو کہ وہ کتنی اچھی اور ہمدرد لڑکی ہے۔ اتنی اچھی روم میٹ کسی کو نہیں مل سکتی۔''

''ہوا کرے' میں کیا کروں۔'' جواب میں ماہ بانو بے نیازی دکھا دیتی تھی۔

آج ماہ بانو کو اپنے اندر دور کہیں خوشی کا ہلکا سا احساس جاگتا ہوا لگ رہا تھا۔ ہاں نیہاں بھی عام سی انسان تھی۔ بے حد عام سی لڑکی۔ وہ اتنی بے نیاز نہیں تھی۔ جتنی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی شخصیت میں بھی چھوٹی سی دراڑ تھی جو آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔

نیہاں کی ذات کا جو پہلو ماہ بانو کو اس سے دور رکھتا تھا' وہ آج چٹخنے لگا تھا۔ نیہاں ہار بھی سکتی تھی۔ فکر مند بھی ہو سکتی تھی' کتنی دلچسپ بات تھی ناں۔

ماہ بانو کا احساسِ کمتری کبھی کبھار اسے بہت تکلیف میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اس نے پہلے دن نیہاں کو دیکھا تھا' وہ اسے اچھی لگی تھی۔ اس کا انداز بھی اسے اچھا لگا تھا' لیکن وہ اپنے دل میں یہ بات ماننے پر قطعاً تیار نہیں تھی۔ وہ نیہاں جیسی بن جانا چاہتی تھی' مگر بن نہیں سکتی تھی۔ نیہاں جس کے پیچھے آدھا کالج دیوانہ پھرا کرتا تھا' مگر اس نے ہمیشہ ہر ایک کے لیے نو لفٹ

رکھا۔ یوں اس کے پروانوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔

ماہ بانو' نیہاں جیسی بننا چاہتی تھی کیونکہ اس کے اندر بھی سراہے جانے کی خواہش تھی اسے محبت اور رومانس وغیرہ سے اتنی دلچسپی نہیں تھی' جتنی اس بات سے تھی کہ نیہاں کی طرح اس کے پیچھے بھی آدھا نہ سہی چوتھائی کالج تو دیوانہ ہو۔ وہ صرف اپنی اَنا کی تسکین چاہتی تھی' لیکن یہ بات بھی وہ اپنے دل تک میں ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

مگر آج وہ پورے انصاف کے ساتھ اپنا تجزیہ کرنا چاہتی تھی۔

ماہ بانو نے کالج میں ایسے انداز میں رہنا شروع کیا' جس سے سب خود ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اس کا تعلق کسی اعلیٰ خاندان سے ہے۔ اس نے بھی کبھی کسی کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اُما کی بھی نہیں۔

دراصل جس وقت اس کی اُما سے ملاقات ہوئی تھی تب اسے احساس نہیں تھا کہ یہ ملاقات گہری دوستی میں تبدیل ہو جائے گی۔ جب تک وہ دونوں گہری دوستی تک پہنچیں' تب تک یہ غلط فہمی پورے طور پر کالج میں پھیل چکی تھی اور اس وقت ماہ بانو میں ہمت نہیں تھی کہ اُما کو سب کچھ بتا دے۔

پھر ایسے میں ہی سعد اس کی طرف بڑھا۔ سعد بے حد عام سا لڑکا تھا۔ دیکھنے میں ویسا ہی تھا جیسے کالج کے بیشتر لڑکے تھے' لیکن وہ واحد لڑکا تھا جو اس کی طرف بڑھا تھا اور جب بات صرف ایک شخص کی ہو تو نولفٹ کا بورڈ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے ہاتھ میں انتخاب کا حق تھا ہی نہیں۔

نیہاں کے نولفٹ کے باوجود اسے سراہنے والے بے شمار تھے' لیکن وہ سعد کو لوٹا دیتی تو اس کے پاس ایک بھی سراہنے والا نہ بچتا۔ سو اس نے بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ انا کی تسکین چاہیے تھی۔ نیہاں کی طرح نہ سہی' اس طرح سہی۔ اور وہ خود کو مطمئن کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

سعد نے کبھی اس سے محبت کا دعویٰ نہیں کیا تھا' وفاداری کی قسمیں نہیں کھائی تھیں۔ ماہ بانو کو اس بات سے صرف اسی قدر دلچسپی تھی کہ اس طرح ان دونوں کی دوستی کو ایک رنگ مل جاتا۔ یوں وہ دعویٰ کر سکتی تھی کہ اس سے بھی کوئی محبت کرتا ہے' مگر سعد نے کبھی کوئی اظہار نہیں کیا تھا۔

اپنے اندر کے اس غبار میں گھر کر ماہ بانو کو نیہاں اپنے سے بہت دور بہت اونچی نظر آتی تھی۔ ایسی جگہ جہاں تک ماہ بانو کی رسائی ممکن ہی نہیں تھی' تب ہی تو وہ اس سے ہمیشہ خائف رہتی تھی۔ ہمیشہ نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ یوں جیسے نیہاں کا ہونا نہ ہونا اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

مگر آج نیہاں اس اونچائی پر نہیں تھی۔ وہ سیڑھیاں اُترتی آ رہی تھی اور ماہ بانو کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی وہ آخری سیڑھی اتر کر اس کے برابر آ کھڑی ہو گی' جیسے ابھی دونوں کا قد بالکل

برابر ہو جائے گا۔

اپنے اندر اُٹھتی خوشی کے اس احساس پر ماہ بانو کو شرم بھی آئی۔

''میں کتنی خود غرض ہوں۔ نیہاں کی ذات چٹخنے کا تماشا دیکھنا چاہتی ہوں میں خود کیا ہوں؟ احساسِ کمتری میں مبتلا بیمار سوچ رکھنے والی لڑکی۔''

لیکن اس کے اندر دور کہیں اُٹھنے والی ہلکی ہلکی سی خوشی اس پر بھی ماند نہیں پڑی۔ شاید ان دونوں احساسات کے خانے الگ الگ تھے۔ شرمندگی کا احساس اپنی جگہ تھا' لیکن خوشی بھی اس کے اندر دفن نہیں ہوئی تھی۔

اتنے سارے انسانوں میں میرا خانہ کون سا ہے؟ اس نے سوچا۔ نہ تو میں نیہاں' ریشماں اور زرینہ خالہ کی طرح ٹوٹ کر محبت کر سکتی ہوں اور نہ ہی اُما کی طرح اماں اور ابا جی یا تقدیر پر بھروسا کرنے کو تیار ہوں۔

میں اُما کی طرح نہیں کہہ سکتی کہ میرے ماں باپ میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے وہی بہترین ہو گا اور میں اسی پر عمل کروں گی اور نہ ہی نیہاں کی طرح کسی کے متعلق یہ کہہ سکتی ہوں کہ کم از کم میں تو مخلص ہوں ناں اس کے ساتھ لیکن یہ کوئی نہیں سمجھ سکے گا۔

میں کیا ہوں' میرے جیسے کیا کچھ اور لوگ بھی ہیں ہمارا خانہ کیا ہے؟

نہیں سعد' یہ طے ہے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی' صرف زندگی کا راستہ آرام سے طے کرنے کے لیے اپنے علاوہ تمہیں بھی اس خوش فہمی کا شکار رکھنا چاہتی ہوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ حالانکہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ تم صرف میری بیمار انا کی ضرورت ہو' اگر مجھے تمہارا بہتر متبادل مل جاتا تو میں آنکھ اُٹھا کر بھی تمہاری طرف نہ دیکھتی۔

ہاں سعد! یہ حقیقت ہے' بہت تلخ سہی' لیکن یہی سچ ہے۔ اس حقیقت کو میں نے اب تک خود سے بھی چھپا رکھا ہے۔ میں خود بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

آج میں نے اپنے دل کو بہت ٹٹولا ہے۔ تم اس میں کہیں بھی نہیں ہو' اس میں صرف اور صرف سود و زیاں ناپنے کا ایک ترازو ہے' جسے میری بیمار انا نے اُٹھا رکھا ہے۔ شاید ایسی رات پھر میری زندگی میں کبھی نہ آئے۔ میں خود سے یہ اعترافات پھر کبھی نہیں کر سکوں گی' اس لیے آج میں خود کو اور تمہیں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنے آپ سے محبت ہے اور بس۔

یہ رات بہت تاریک ہے میرے اعترافات کی گواہ صرف اس کی تاریکی ہے۔ میں اتنی بہادر نہیں کہ دن کی روشنی میں سب کو اپنے اندر کی سیاہی دکھا سکوں۔ یہ باب جو آج رات کھلا تھا' آج رات کو ہی بند ہو جائے گا۔ شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے' لیکن مجھے ایسی کوئی دوسری رات چاہیے بھی نہیں۔

اب میں محبت کروں گی یا نہیں، لیکن خود سے جھوٹ نہیں بولوں گی، خود کو دھوکا نہیں دوں گی۔''

ماہ بانو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنے اندر نہیں جھانکنا چاہتی تھی، مگر آج اس نے اپنے اندر جھانکا تھا تو اسے وہ سب نظر آ گیا تھا، جس سے وہ ہمیشہ نظریں چراتی رہی تھی۔ اپنی ذات کے اندر کے خوف کی وجہ سے وہ اس سیاہی کو باہر نہیں نکالنا چاہتی تھی، لیکن اس رات اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے سب سیاہی دھو ڈالی۔

ساری رات وہ پریشان خیالی کا شکار رہی۔ عجیب عجیب سے خواب دکھائی دے رہے تھے۔ نیہاں سیڑھیاں اُترتی آ رہی تھی۔ وہ جتنی سیڑھیاں اُترتی تھی، ماہ بانو اسی قدر زمین میں دھنستی جا رہی تھی۔ نیہاں اس پر بھی بے نیاز اور بے فکر دکھائی دے رہی تھی، لیکن ماہ بانو مسلسل چلا رہی تھی، بچاؤ کے لیے سب کو پکار رہی تھی۔ اور پھر اس کا یہ خواب ٹوٹ گیا۔

☆======☆======☆

عبداللہ کو ماہ بانو کی بات کا یقین نہیں آیا تھا، لیکن اس نے ایڈی کی طرف سے ہی بابا جان کو فون کیا۔

''کل گڑیا کا ارادہ تو ہے شاپنگ پر جانے کا۔'' بابا جان نے بتایا۔ ''لیکن ہمیں کسی حملے کی اطلاع نہیں ملی۔ ایسی کوئی سازش بنائی گئی ہوتی تو ہمیں ضرور علم ہو جاتا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ یہ بات بھائی جان کی حویلی سے نکل کر لاہور تک پہنچ چکی ہے۔''

''لیکن بابا جان! جس نے مجھے اطلاع دی ہے، اسے یہ علم تھا کہ گڑیا نے جمعرات کو گھر سے نکلنا ہے، اس لیے اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ جس سازش کے متعلق اس نے ہمیں خبر دی ہے، وہ واقعی بڑے بابا جان کی حویلی میں بن چکی ہو، یوں بھی وہ ایسی کوئی بھی گھٹیا حرکت کر سکتے ہیں۔''

''خیر ہم بھی یہاں چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھے ہوئے۔ تم ایسا کرو عبداللہ کہ فوراً گاؤں کے لیے روانہ ہو جاؤ، لیکن ذرا دھیان سے۔'' انہوں نے کہا۔

''اور یہ تمہاری اماں بھی کچھ کہنا چاہتی ہیں، ان سے بھی بات کر لو۔''

اماں بہت پریشان تھیں۔ پہلے تو وہ اس سے خیر خیریت پوچھتی رہیں۔

''عبداللہ! تم بے احتیاطی کرتے ہو بیٹا۔'' انہوں نے کہا۔ ''گاؤں آتے ہوئے ساتھ گن مین ضرور لانا، مجھے تو یہ بھی ڈر ہے کہ انہیں تمہارے آنے کی بھنک مل گئی تو وہ راستے میں ہی تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔''

''آپ بے فکر رہیں اماں جان! مجھے کچھ نہیں ہو گا۔'' اس نے انہیں تسلی دی۔

''کیسے بے فکر ہو جاؤں، جب تک تم گھر نہیں پہنچ جاؤ گے میری جان اسی طرح سُولی پر ٹنگی

رہے گی۔'' وہ بولیں۔

''اور میری ایک بات یاد رکھنا۔ ایک گاڑی اپنے آگے رکھنا اور ایک پیچھے، دیکھو بیٹا لاپروائی مت دکھانا۔''

''جیسے آپ کی مرضی، میں بس آدھے گھنٹے تک نکل رہا ہوں، خدا حافظ۔''

''انہیں علم نہیں ہے اس بات کا؟'' عبداللہ نے فون رکھا تو ایڈی نے اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بانو کی بات کا کچھ زیادہ یقین نہیں ہے، بہرحال کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔''

''انکل آنٹی تو پریشان ہو گئے ہوں گے؟''

''ہاں، انہیں میری بھی فکر ہے۔ اماں نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ مسلح محافظوں کی ایک گاڑی میرے آگے اور ایک پیچھے ہونی چاہیے۔'' وہ ہنس پڑا۔

''اب میں اماں کو کیا سمجھاؤں کہ جس گولی پر میرا نام لکھا ہو گا، وہ ہر حفاظتی حصار توڑ کر مجھ تک ضرور پہنچے گی۔ یہ گن مین یہ کے کیزوغیرہ صرف اپنی تسلی کی باتیں ہیں۔ اور پھر یہ گن مین بھی تو کسی کے بیٹے، کسی کے بھائی ہوں گے، جو صرف چند سو روپوں کے عوض اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ میری جان ان میں سے کسی سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے۔'' اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ ''یہ سب بیکار اور فضول باتیں ہیں۔''

''ہاں ہیں تو، لیکن انہی بیکار اور فضول باتوں کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ تم یہ معاشرہ اور اس کا نظام تبدیل نہیں کر سکتے۔'' ایڈی نے کہا۔

''اسی بات کا تو افسوس ہے کہ میں یہ نظام اور معاشرہ تبدیل نہیں کر سکتا اور اس سے بھی بڑھ کر افسوس اس بات کا ہے کہ میں آرٹ پڑھ رہا ہوں۔ میرا ذہن اور میری روح حسن اور خوبصورتی تلاش کرنا چاہتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہر تلاش کا اختتام بدصورتی پر ہوتا ہے۔ میرا ذہن کسی بدصورتی کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا، خواہ وہ خیالات میں ہو۔ یا رویوں میں اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے ہر بدصورتی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''جا رہے ہو؟''

''ہاں، وہاں اماں اور ابا جان پریشان ہوں گے۔ گڑیا کو خبر ہوئی تو وہ بھی پریشان ہو جائے گی۔'' عبداللہ نے کہا۔

اماں جان کی ہدایت کے برعکس وہ اکیلا ہی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اماں سے بحث نہیں کرتا تھا چاہے اسے ان سے کتنا بھی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن کرتا وہی تھا جسے وہ درست سمجھتا تھا۔

سارا راستہ آرام سے طے ہوگیا تھا' لیکن گاؤں کی طرف مڑنے والی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر جیسے ہی اس نے اپنی نسان پٹرول اُتاری تو اسے بریک لگانا پڑے۔ بالکل سامنے ہی چار گاڑیوں نے سڑک بند کر رکھی تھی وہ تیزی سے اپنی جیپ ریورس کر کے بڑی سڑک پر لے جانا چاہتا تھا کہ سب سے اگلی گاڑی سے بابا جان نیچے اُترے۔

''اوہ بابا جان!'' اس نے گہری سانس لی اور جیپ بند کر کے نیچے اُتر آیا۔

''بابا جان آپ نے کیوں زحمت کی؟'' وہ ان سے گلے ملتے ہوئے بولا۔

''مجھے گھر میں چین نہیں آ رہا تھا' تمہاری اماں بھی پریشان تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ تم بغیر کسی محافظ کے آؤ گے۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خود ہی تمہیں لینے یہاں تک چلا آؤں۔''

''چلیں باقی باتیں گھر چل کر کریں گے۔''

وہ دونوں ایک ہی جیپ میں بیٹھ گئے۔

''یہ نسان پٹرول شاید آپ نے نئی لی ہے۔ میں نے پہچانا نہیں تھا۔'' عبداللہ نے جیپ کا جائزہ لیا۔

''ہاں تمہارے جانے کے اگلے ہی دن پہنچی تھی۔''

''تو بس ٹھیک ہے' اب کی مرتبہ لاہور جاتے ہوئے میں یہی لے جاؤں گا۔''

''تم سے زیادہ پیاری تو نہیں ہے' جو چاہو وہی گاڑی لے جاؤ۔'' بابا جان مسکرائے۔

حویلی میں اماں جان اور زہرا بے چینی سے ان کا انتظام کر رہی تھیں۔

''تم اپنے ساتھ محافظ نہیں لائے ہو گے؟'' اماں جان نے کہا۔

''آپ یہی چاہتی تھیں ناں کہ میں آپ تک خیریت سے پہنچ جاؤں' سو وہ میں پہنچ گیا۔''

وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

''میں نے زینی کو مری فون کر کے کہہ دیا ہے کہ وہ بھی محتاط رہے۔'' اماں نے بتایا۔

''گڑیا! تم نے کس کس کو اپنے کل کے پروگرام کے متعلق بتایا تھا؟'' عبداللہ نے اس سے پوچھا۔

''''سب ہی کو علم تھا' آپ کو تو پتا ہے ناں کہ میں جو پروگرام بناتی ہوں' اس کا اچھا خاصا اعلان کرتی ہون۔ اس کا بھی سب کو پتا تھا۔ گھر کے اندر کام کرنے والی ملازمائیں' ڈرائیور' گن مین۔''

''پھر تو یہ بات کوئی بھی باہر نکال سکتا ہے' ہو سکتا ہے کسی نے محض باتوں باتوں میں تذکرہ کر دیا ہو اور نیاز پور والوں نے اسے ایک اچھا موقع سمجھتے ہوئے اس کی مناسبت سے اپنا پروگرام بنا لیا ہو۔'' عبداللہ نے خیال ظاہر کیا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر بابا جان اندر چلے آئے۔ عبداللہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''میں فون پر تم سے لمبی بات نہیں کرنا چاہتا تھا' اب بتاؤ تمہیں یہ خبر دی کس نے ہے؟'' وہ صوفے بیٹھ گئے۔

''میری کالج فیلو ہے ماہ بانو' بہت اچھی لڑکی ہے اس کا تعلق بھی نیاز پور سے ہے۔''

''ہوں۔'' بابا جان سوچ میں پڑ گئے۔

''کس قسم کی رشتہ داری ہے اس کی نیاز پور میں؟''

''اس کی اماں اور ابا جی دونوں نیاز پور کے ہیں' لیکن عرصہ ہوا' وہ لوگ لاہور میں سیٹل ہو گئے ہیں' پھر بھی گاؤں میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔'' عبداللہ نے بتایا۔

''کیا نام ہے اس کے والد کا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نام تو مجھے معلوم نہیں ہے' البتہ اتنا پتا ہے کہ وہ کمہار ہیں۔''

بابا جان سوچ میں پڑ گئے' لیکن چونکہ عبداللہ کو ماہ بانو کے ابا جی کا نام معلوم نہیں تھا' اس لیے وہ انہیں شناخت کرنے میں ناکام رہے۔

''اس کے والدین نے تو بہت عرصہ پہلے گاؤں چھوڑ دیا تھا' البتہ اس کے نانا اب بھی نیاز پور میں رہتے ہیں۔'' عبداللہ کو اچانک یاد آیا۔

''تمہیں اس کے والد کا تو پتا نہیں ہے' نانا کا کیا پتا ہو گا۔'' بابا جان نے کہا۔

''نہیں' ان کا پتا ہے' نام ذہن میں نہیں آ رہا' لیکن یہ یاد ہے کہ وہ نیاز پور کی مسجد کے امام ہیں۔''

بابا جان چونک گئے۔ ''مولوی نعمت اللہ؟''

''اوہ یس! یہی نام ہے' بانو نے بتایا تھا۔''

وہ کچھ دیر سوچ میں گم رہے پھر سر اُٹھایا۔

''تو مولوی صاحب کی ایک نواسی تمہارے ساتھ پڑھتی ہے؟''

''جی' لیکن مولوی صاحب کی غالباً ایک ہی نواسی ہے اس کا کوئی اور بہن بھائی نہیں ہے۔''

''سنیں علی!'' اماں جان نے بابا جان کو متوجہ کیا۔ ''یہ وہی مولوی صاحب ہیں ناں' جن کی چھوٹی بیٹی پیر صاحب سے بیاہی گئی تھیں؟''

''ہاں۔'' بابا جان نے مختصراً کہا۔

''پتا نہیں اماں آپ کو کیسے اتنے لمبے لمبے رشتے یاد رہتے ہیں؟'' زہرا بولی۔

''شادی ہوتی ہے تو خود ہی سب رشتے یاد ہو جاتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''ٹھہریں مجھے سمجھنے دیں۔ ایک ہوئے مولوی صاحب' ان کی ایک چھوٹی بیٹی ہے' اس کی شادی ہوئی کسی پیر صاحب سے' لیکن اماں یہ پیر صاحب کون ہیں؟'' زہرا نے دریافت کیا۔

''تمہارے بڑے ابا اور کون؟'' اماں نے کہا۔

''توبہ میرے کوئی نہیں ہیں بڑے ابا جان۔'' زہرا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''میرے تو بس ایک ہی بابا جان ہیں' میرے اپنے۔'' اس نے ان کی گردن میں بازو ڈال دیے۔

''تو یہ ماہ بانو اپنی ریشماں کی خالہ زاد ہوئی ناں۔'' اماں نے بابا جان سے کہا۔

''ہاں۔'' بابا جان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ کیا آپ لوگ رشتے ملانے بیٹھ گئے' کام کی بات کریں۔'' عبداللہ کو اُلجھن ہونے لگی تھی۔

''دیکھا بابا جان!'' زہرا نے ہولے سے ان کے کان میں کہا۔ ''ذرا نام لیا ریشماں کا اور یہ بیزار ہو گئے۔''

بابا جان نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ عبداللہ کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس کے چہرے پر کیا تلاش کرنا چاہتے ہیں' اس لیے اس نے جلدی سے موضوع تبدیل کر دیا۔

''کل پروگرام یہ ہو گا کہ گڑیا گھر پر ہو گی' گاڑی پر شہر میں جاؤں گا' پھر دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ کیا کریں گے۔''

''تم نہیں جاؤ گے عبداللہ۔'' اماں جان نے ایک لمحے میں اس کا پروگرام رد کر دیا۔

''گاڑی میں صرف مسلح محافظ ہوں گے' وہ نپٹ لیں گے خود ہی۔''

''اچھا کل کی کل دیکھی جائے گی۔'' اس نے بات ختم کرنا چاہی۔

''ہرگز نہیں۔'' ماں نے اسے ڈپٹ دیا پھر بابا جان کی طرف مڑیں۔

''آپ اسے سمجھائیں علی' یہ اس وقت بات ٹال رہا ہے' لیکن کل وہی کرے گا' اس کی جو مرضی ہو گی۔''

''تم خود کیوں جانا چاہتے ہو عبداللہ؟'' بابا جان نے پوچھا۔

حالانکہ وہ اس کا جواب جانتے تھے۔ اس قسم کے جواب وہ بارہا انہیں دے چکا تھا۔ وہ اس کی جگہ ہوتے تو اپنے بابا جان کو بھی یہی جواب دیتے' بلکہ وہ تو اس سے بھی سخت اور ترش باتیں اپنے بابا جان سے کہہ دیا کرتے تھے۔

مگر اب جگہیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ جب وہ بیٹے تھے تو اس قسم کی بات اپنے بابا جان سے دوٹوک انداز میں کہہ دیا کرتے تھے۔ اب وہ باپ تھے اور ان کے سامنے انہی کا بیٹا کھڑا تھا۔

وقت نے سوچ میں کتنا فرق پیدا کر دیا تھا۔ جوانی میں نتائج کی پروا نہیں ہوتی تھی' آگ کا سمندر راستے میں آ جاتا تو وہ یہ سوچے بغیر اس میں قدم رکھ دیتے کہ اس سے پاؤں جل بھی سکتے ہیں۔

اور اب جب زندگی کی ندی میں عمر کا پانی آہستہ روی سے بہنے لگا تھا تو سوچنے کا انداز

بالکل بدل گیا تھا۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینا بہادری نہیں حماقت لگتا تھا۔ اب زندگی حساب کتاب میں کٹنے لگی تھی۔ دشمن کے مقابلے میں ہمارا نقصان کتنا ہو گا اور فائدہ کتنا...... فلاں بات کا نتیجہ کیا نکلے گا' فلاں عمل کا ردعمل کیا ہو گا' بس اب یہی حساب کتاب رہ گیا تھا۔

''بابا جان آپ وہ گولی روک سکتے ہیں' جس پر قضا نے میرا نام لکھ رکھا ہے؟''

عبداللہ کی آواز انہیں اپنی سوچ سے باہر کھینچ لائی۔

''اور کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان اپنے وقت سے پہلے یا وقت کے بعد اس دنیا سے جائے۔ کل میں اس لیے جانا چاہتا ہوں بابا جان کہ میری زندگی آپ کے ان مسلح محافظوں یا مزارعوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔

وہ چند سو روپوں یا گندم چاول کی دو چار بوریوں کی خاطر ہمارے سامنے ڈھال بنتے ہیں تو مجھے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لفظ انسانیت سے گھن آنے لگتی ہے مجھے۔

میں کوئی نیک پارسا انسان نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس دنیا میں رہنا ہے اور میرا وجود میرا ضمیر اس کی غلاظتوں سے آلودہ ضرور ہو گا' بس میری خواہش صرف اتنی ہے کہ یہ آلودگی کم سے کم ہو۔''

''بھائی آپ کو تو موقع ملنا چاہیے فلسفی بننے کا۔'' زہرا نے ٹانگ اڑائی۔

''اتنے فلسفے میں پڑیں گے تو زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ مس فٹ ہو جائیں گے۔ اس معاشرے میں۔

سیدھی سی بات ہے' نیاز پور والوں کی طرح ہم نے اپنے مسلح محافظوں یا مزارعوں کو برسوں اپنا نمک کھانے کا طعنہ دے کر کسی ملازمت کے لیے مجبور نہیں کیا۔ وہ ہماری خدمت کرتے ہیں' تو ہم بھی انہیں حق خدمت دیتے ہیں' بات برابر ہو گئی۔

اگر ایک گن مین ہماری ڈھال بنتا ہے تو اس لیے کہ وہ اپنی مرضی سے یہ کام کرنے پر راضی ہوا ہے۔''

''جو گن مین ہماری ڈھال بن رہا ہے یا جو مزارعے برسوں سے یہاں آباد ہماری زمینوں پر کام کر رہے ہیں' ان کے پاس یہ کام کرنے کے علاوہ آپشن کون سی ہیں؟ صدیوں کی غلامی نے انہیں اس قابل چھوڑا ہی کب ہے کہ ان کاموں سے ہٹ کر وہ کچھ اور سوچ سکیں۔ رہٹ کے گرد گھومنے والا بیل ہر روز میلوں کے حساب سے سفر کرتا ہے' لیکن رہتا اسی دائرے میں ہے' جہاں اس سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

اور یہ مزارعے' یہ سسٹم سب کچھ رہٹ کے بیلوں کی طرح ہے جو ہمیشہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ صدیوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اگلا موڑ مڑتے ہی سب کچھ تبدیل ہو جائے گا' لیکن تبدیل کچھ بھی نہیں ہوتا' نہ ہو گا۔ ہاں صدیاں گزرتی جائیں گی۔'' عبداللہ اُٹھ کھڑا

ہوا۔

''میں سونے جا رہا ہوں' جو پروگرام میں نے بنایا ہے' وہ فائنل ہے۔ اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔''

عبداللہ سونے کے لیے کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا' لیکن اس کا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ اماں اور بابا جان کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا' اس لیے چلا آیا تھا۔ ابھی اسے کل صبح کے لیے منصوبہ بندی کرنی تھی اور وہ بھی پو پھٹنے سے پہلے پہلے۔

آدھ گھنٹے تک اس نے سب کے سونے کا انتظار کیا پھر اپنے دو قابلِ اعتماد محافظوں کے ساتھ باہر نکلا۔ اسے حویلی سے بڑی سڑک تک تمام راستے کا جائزہ لے کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنا تھی کہ اگر حملہ ہوا تو کس طرف سے ہوگا۔ یہ کام اکیلے ممکن نہیں تھا۔ تمام راستے کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد ایک جگہ وہ رُک گیا۔

''اگر کل کوئی حملہ ہوا تو وہ اسی جگہ پر ہوگا۔'' اس نے کہا۔

اس طرف سڑک بہت ٹوٹی پھوٹی ہوئی تھی۔ ویسے تو جیپ اس طرح کے راستوں پر رفتار کم کیے بغیر گزر سکتی تھی لیکن عام حالات میں تقریباً سبھی یہاں رفتار کم کر دیتے تھے۔ اردگرد دھان کے کھیت تھے' یوں تو دھان کی کٹائی شروع ہو چکی تھی' لیکن سڑک کے گرد واقع کھیت دور دور تک اسی طرح لہلہا رہے تھے۔

''مگر یہاں تو بہت مشکل ہے شاہ صاحب!'' فتح محمد نے کہا۔

''کھیتوں میں تو کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ہے' اس طرح کھیتوں میں گھسنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا اور پھر یہ تو کھیت بھی ہم ہی لوگوں کے ہیں۔''

''نیاز پور والوں کے نقطہ نظر سے حملے کے لیے یہی سب سے محفوظ اور مناسب مقام ہے۔ یہاں مسلح محافظوں کی دو تو کیا دس گاڑیاں ہوں تب بھی وہ بیک وقت سب کو ناکارہ بنا سکتے ہیں۔''

''آپ کی بات درست ہے۔'' فتح محمد نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

''لیکن شاہ صاحب! حملہ کرنے کے لیے سب سے پہلے انہیں خود کھڑا ہونے کی جگہ چاہیے۔''

''سوچو فتح محمد' ہم ان کی جگہ ہوتے تو سب سے پہلا کام کیا کرتے؟'' عبداللہ نے کہا۔

''سب سے پہلے تو ہم اس بات کا انتظام کرتے کہ دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے اور ہمیں کم سے کم......'' فتح محمد کے بھائی نور محمد نے کہا۔

''اور اس کام کے لیے یہ جگہ کامیاب ہے' اس کے بعد ہم کیا کرتے؟''

''میں سمجھ گیا شاہ صاحب۔'' فتح محمد کی آواز میں جوش تھا۔ ''سیدھی سی بات ہے کہ ہم ان

کھیتوں میں اپنے لیے جگہ بناتے۔''

''گڈ۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''میں تمہیں اسی پوائنٹ پر لانا چاہتا تھا۔ اب تم دونوں ٹارچوں کی روشنی میں دائیں ہاتھ کی طرف کے کھیتوں کا جائزہ لو اور میں بائیں سمت جاتا ہوں۔''

''شاہ صاحب! ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ ایک طرف کے کھیت میں دیکھ لیتا ہوں۔ دوسری طرف کے نور محمد دیکھ لے گا۔ آپ گاڑی میں بیٹھیں۔''

''جو میں کہتا ہوں' وہ کرو۔''

''میرا مطلب تھا شاہ صاحب کہ کھیتوں میں سانپ بچھو وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ آپ کو تکلیف نہ پہنچے۔'' فتح محمد نے صفائی پیش کی۔

''میں نے کہا ناں فتح محمد کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' عبداللہ نے قدرے سختی سے کہا اور بائیں طرف والے کھیتوں کی طرف بڑھ گیا۔

اس طرح ایک ٹارچ کی روشنی میں کھڑی فصل میں گھسنا خاصا مشکل اور خطرناک کام تھا' لیکن ان کے پاس وقت بہت کم تھا اور یہ جائزہ انہیں پو پھٹنے سے پہلے پہلے مکمل کر لینا تھا۔

راستہ تلاش کرتے کرتے عبداللہ کے بازوؤں پر خراشیں بھی آ گئی تھیں۔ بالآخر آدھ پون گھنٹے کی تگ و دو کے بعد وہ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا' جو اس مقصد کے لیے نیاز پور والوں نے بنایا تھا۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں یوں ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں بھی فصل کھڑی ہے' جب کہ درحقیقت وہاں سے فصل کاٹ کر باقی پودوں کے سہارے یوں ہی کھڑی کر دی گئی تھی۔

ایک مرتبہ راستہ ملا پھر باقی کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ کٹی ہوئی فصل کے درمیان راستہ بناتے ہوئے اس جگہ تک جا پہنچا جو حملہ کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ یہاں سے سڑک پر ہچکولے کھاتی گاڑی کو بہت آرام کے ساتھ نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ وہ اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد واپس پلٹ گیا۔

جیپ کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے سگریٹ سلگالی۔ اس لمحے اسے ماہ بانو کا خیال آیا اور اس کا دل ماہ بانو کے لیے شکر گزاری کے جذبات سے بھر گیا۔

''اگر اس نے اطلاع نہ دی ہوتی تو......'' اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

میں نے تو ٹھیک سے اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا تھا' مگر مجھے اس اطلاع کی صداقت پر یقین بھی تو نہیں تھا۔

اس نے سامنے پھیلے کھیتوں کی طرف دیکھا فتح محمد اپنے بھائی کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے تھے شاہ صاحب!'' اس نے جوش سے کہا۔ ''وہاں تو باقاعدہ جگہ بی

ہوئی ہے۔''

''واپس چلو۔''اس نے سگریٹ کا بقیہ حصہ فضا میں اچھال دیا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔

☆======☆======☆

صبح جب اماں نے ماہ بانو کو جگایا تو وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔

''یہ کیا؟''اماں گھبرا گئیں۔

''بانو کے ابا...... بانو کے ابا!''

ماہ بانو اُٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا اماں؟ خیر تو ہے؟''اس نے بکھرے بال سمیٹ کر ڈھیلا ڈھالا سا جوڑا بنایا۔

''لیٹی رہو، تمہیں تو اتنا سخت بخار ہے۔''اماں نے زبردستی اسے لٹانا چاہا۔

''ٹھیک ہو جائے گا خود ہی۔''اس نے لاپروائی سے کہا۔

''مجال ہے جو یہ میری سن جائیں۔''اماں بڑبڑائیں پھر آواز بلند بولیں۔

''اجی سنتے ہیں!''

اباجی مٹی سے بھرے ہاتھوں سمیت اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔

''کیا ہوا؟''

''ذرا دیکھیں تو بانو کو کس قدر تیز بخار ہے۔''

''اماں بخار ہی ہے ناں ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ایسے تو نہیں ٹھیک ہو جائے گا ناں۔''اباجی نے کندھے پر رکھے کپڑے سے ہاتھ صاف کیے اور پھر اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ کر حرارت کا جائزہ لینے لگے۔''یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

''تب ہی تو آپ کو آواز دی ہے۔''

''تم ایسا کرو بانو کی ماں، مجھے تھرمامیٹر لا دو اور اسے ناشتا بھی کروا دو تا کہ بعد میں دوا لے سکے، پھر میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔''

''اس نقار خانے میں میری بھی کوئی سنے گا؟''ماہ بانو نے بے چارگی سے کہا۔

''کیا ہے؟''

''آج میری ڈرائنگ کی کلاس ہے، میں کسی صورت چھٹی نہیں کر سکتی۔''

''بھاڑ میں گئی ایسی پڑھائی۔''اماں کو غصہ آ گیا۔''میری بچی بخار میں پھنک رہی ہے اور کالج والوں کو پرواہی نہیں۔''

''ایک دن نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا، آج چھٹی کر لو، کل تو پھر جمعہ ہی ہے۔''اباجی نے کہا۔

''ممکن ہی نہیں ہے اباجی! روز کی روز مارکنگ ہوتی ہے۔ میری ایوریج خراب ہو جائے

گی۔''

بڑی مشکلوں سے اماں اور اباجی کو قائل کر کے وہ کالج جانے کے لیے تیار ہوئی۔ اس کا سر بری طرح دُکھ رہا تھا۔ آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ عام طور پر کالج جانے سے پہلے وہ ناشتا نہیں کرتی تھی، لیکن اماں نے زبردستی ڈبل روٹی اور انڈہ ٹھنسوایا۔ اباجی نے دواؤں کے بکس سے دوا نکال کر دی تب اُسے گھر سے نکلنے کی اجازت ملی۔

''چلو میں تمہیں کالج چھوڑ آؤں۔''اباجی نے کہا۔

''میں چلی جاؤں گی۔''

''ضد نہیں کرتے۔''اباجی نے اسے پیار سے ڈپٹا۔

بخار کی وجہ سے بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی، لیکن وہ کام کرتی رہی۔ اُما اپنا کام چھوڑ کر بار بار اس کے پاس آ جاتی تھی۔

''اب طبیعت کیسی ہے؟''وہ تشویش سے پوچھتی۔

''اب کچھ بہتر ہے، صبح دوا کھائی تھی، اب تو سر میں درد بھی نہیں ہے اور بخار بھی محسوس نہیں ہو رہا۔''وہ کہتی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

نیہاں اس کے ساتھ ہی کام کر رہی تھی۔ جینز اور کھلی ٹی شرٹ میں ملبوس، سر پر نیلی کیپ رکھے جس سے اس کے سنہری بال باہر نکل رہے تھے۔ کان کے اوپر پنسل اٹکائے، واک مین سنتے ہوئے، وہ ہمیشہ کی طرح بے نیاز اور لاپرواہ دکھائی دے رہی تھی۔

''کتنی خوش قسمت ہے یہ۔''ماہ بانو نے سوچا۔''اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ میری طرح کسی احساسِ کمتری میں بھی مبتلا نہیں ہے۔''

''کس سوچ میں گم ہو؟''اُما کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''نہیں کسی میں بھی نہیں۔''اس نے جلدی سے کہا۔

''تو آؤ، کچھ کھا پی آئیں۔ قسم سے بہت بھوک لگ رہی ہے، تم دوا بھی کھا لینا۔''

سینڈوچز اور کولڈ ڈرنکس لے کر وہ باقی سب سے ہٹ کر بیٹھ گئیں۔

''پتا نہیں عبداللہ نے میری ہدایات پر عمل کیا ہے یا نہیں۔''ماہ بانو نے کہا۔

''بہت مشکل ہے، ہم اس کی خیریت کی دعا ہی کر سکتے ہیں۔''اُما بولی۔

''پیر صاحب اور ان کے بیٹے تو پڑھے لکھے جاہل ہیں ہی، لیکن عبداللہ کو ایسی جہالت کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر آج کے دن ان کی حویلی سے کوئی بھی باہر نہ نکلے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟ ان کے درمیان دشمنی تو ختم تو نہیں ہو جائے گی۔ آج تو کسی نہ کسی طرح انہیں اس سازش کی خبر ہوگئی، لیکن ہر مرتبہ تو ایسا نہیں ہوگا ناں۔ وہ کل پھر ایسا ہی کوئی اور منصوبہ بنائیں گے اور عبداللہ یا اس کے گھر والے بے خبری میں اس کا شکار ہو جائیں گے۔

میرے خیال میں پیر صاحب اور ان کے گھر والوں کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ عبداللہ وغیرہ بھی کوئی تر نوالہ نہیں ہیں۔''

''دہشت گردی اور تشدد کا جواب تشدد سے نہیں دیا جاتا۔ یہ زمینیں تو یوں بھی بڑا فساد ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ زمینیں' جائیداد اور بنک بیلنس وغیرہ...... اسی طرح پڑا رہ جائے گا' نہ یہ سب کچھ پیر صاحب جلال الدین شاہ اپنے ساتھ لے کر جا سکے ہیں' نہ ہی ان کے بیٹے لے جا سکیں گے۔''

''تم اپنا دل مت جلاؤ' جو تم کر سکتی تھیں تم نے کر لیا۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہے تمہارے ہاتھ میں۔'' اُما نے اسے تسلی دی۔

وہ خاموشی سے کولڈ ڈرنکس کے گھونٹ لینے لگیں۔ ماہ بانو انہی سوچوں میں گم تھی۔ جب اُما نے اسے ٹہوکا دیا۔

''بانو! سعد آ رہا ہے۔''

ماہ بانو نے سر اٹھا کر دیکھا' سعد انہی کی طرف آ رہا تھا۔

''ہیلو' کیسی ہو تم دونوں؟'' اس نے قریب پہنچ کر کہا۔

''بالکل ٹھیک' تم سناؤ۔ پچھلے چند دن سے نظر ہی نہیں آ رہے۔'' اُما بولی۔

''جیوری میں پھنسا ہوا تھا' آج بھی بہت مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔''

''ایکسکیوز می!'' اُما خالی بوتل زمین پر رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے لائبریری میں کچھ کام ہے میں چلوں اور بانو میں وہیں سے کلاس میں چلی جاؤں گی' تم آ جانا۔''

اُما بہانا بنا کر اُٹھ کھڑی ہوئی تو سعد اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''بہت ناراض ہو؟'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بول اُٹھا۔

''نہیں۔'' ماہ بانو نے عام سے لہجے میں کہا۔

''میں نے اس دن جو کچھ کہا تھا' وہ مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ دراصل فیئر ویل والے دن جب تم آڈیٹوریم سے باہر نکلیں تو یہ سوچ کر میں بھی تمہارے پیچھے گیا کہ تمہیں وہاں اتنی رات گئے اکیلے نہیں کھڑے ہونا چاہیے۔ شاید تمہیں' پریشانی ہو۔ پتا نہیں کوئی تمہیں پک کرنے بھی آیا ہو گا یا نہیں۔

میں نے عبداللہ کو بھی اُٹھتے دیکھا تھا' لیکن اس وقت میرے ذہن میں کوئی بات نہیں آئی تھی' مگر پھر باہر نکل کر میں نے دیکھا کہ تم دونوں اس کی کار سے ٹیک لگائے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ خیال گزرا کہ تم کسی کا انتظار کرنے نہیں بلکہ عبداللہ کے ساتھ پروگرام بنا کر باہر نکلی ہو۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا بانو' مجھے ایسے نہیں سوچنا

چاہیے تھا۔''

''اگر میں پروگرام بنا کر باہر نکلی تھی تب بھی تمہیں کیا پریشانی تھی؟'' ماہ بانو نے بالآخر بات کلیئر کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''ہاں میں نے تم سے کوئی کمٹمنٹ نہیں کی' نہ تم نے مجھ سے۔ مجھے تم پر حق جتانے کا کوئی اختیار نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے بانو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں یہ بات اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے بعد تم سے کہنا چاہتا تھا' مگر آج اس لیے کہہ رہا ہوں تاکہ ہمارے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے' وہ ختم ہو سکے اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے لیے وہی سب کچھ محسوس کرتی ہو' جو میں تمہارے لیے محسوس کرتا ہوں۔''

ماہ بانو چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

''مجھے افسوس ہے سعد تم نے کچھ دیر کر دی ہے۔''

''دیر کر دی ہے۔'' اس نے زیرِ لب دہرایا۔ ''تو کیا عبداللہ؟'' وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

''کل رات میں نے دیر تک اپنا تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ تم سمیت ابھی کسی سے بھی مجھے محبت نہیں ہوئی۔ اور عبداللہ سے متعلق جو وہم تم اپنے دل میں پال رہے ہو' اسے جھٹک دو۔''

وہ بھی کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل وہیں رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں چلتی ہوں اب' ابھی بہت کام رہتا ہے۔''

سعد خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

ابا جی نے کہا تھا کہ وہ واپسی پر بھی اسے لینے آئیں گے۔ ابھی ہوسٹل کے لیے بس چلنے میں بھی کچھ وقت رہتا تھا اور سب طلباء کی عادت تھی کہ جب تک بس کھڑی رہتی تھی' تب تک تقریباً خالی رہتی تھی۔ جب چلنا شروع ہوتی تھی تو سب اِدھر اُدھر سے بھاگ کر اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ سو اتنی جلدی کسی کے بس پر چڑھنے کا امکان بھی نہیں تھا۔

پارکنگ میں اُما اور ماہ بانو بیٹھی ہوئی تھیں۔

''لیکن تم نے سعد سے یہ کیوں کہا؟'' اُما حیرانی سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

''اس لیے کہ مجھے واقعی اس سے محبت نہیں ہے۔'' اس نے آرام سے کہا۔

''محبت نہیں ہے' لیکن کیوں؟ کیسے؟'' اُما کچھ نہیں سمجھی۔

''یہ حقیقت ہے اُما' مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ نیہاں نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم صرف زندگی کا سفر اپنی ضرورتوں کے مطابق طے کرنا چاہتے ہیں اور بس۔''

''تم نے نیہاں کی فضول باتوں کو سنجیدگی سے تو نہیں لے لیا؟''

''اس نے فضول باتیں نہیں کی تھیں۔ بات صرف اتنی ہے اُما کہ ہم اپنے اندر جھانکتے ہوئے ڈرتے ہیں یا پھر شاید صرف میں ہی اپنے اندر جھانکنے سے ڈرتی ہوں۔''

''دیکھو بانو! ہم میں سے ہر ایک کے پاس اپنی بات کے ثبوت کے طور پر ایک دلیل ہوتی ہے چاہے کوئی غلط ہی کیوں نہ ہو۔ نیہاں کے پاس بھی بے شمار دلیلیں ہوں گی۔ تم محض کسی کی باتوں سے امپریس ہو کر اپنی زندگی کو اپنے لیے تکلیف دہ مت بناؤ۔'' اُما نے اسے سمجھایا۔

''نہیں اُما ایسا نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں کسی خود فریبی میں مبتلا رہنا نہیں چاہتی۔ ہمیں حقیقت کو تو قبول کرنا چاہیے ناں۔''

بس اسٹارٹ ہو چکی تھی' لیکن حسب معمول طلباء اپنے آپ میں مگن تھے۔ نیہاں ان کے قریب آ گئی۔

''اُما اپنی چیزیں مجھے دے دو' میں بس میں رکھ آؤں۔''

اُما نے اپنی چیزیں اسے پکڑا دیں۔ وہ بس کی طرف بڑھ گئی۔ جاوید جو کالج میں جیمز کے نام سے پکارا جاتا تھا' اس سے دو چار باتیں کیں اور بس میں چیزیں رکھ کر اتر آئی۔

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے بانو؟'' اس نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔''

''چلو کل آرام کر لینا۔ میرا تو پورا ہفتہ اس امید پر گزرتا ہے کہ ابھی جمعہ کی چھٹی آئے گی اور کچھ آرام نصیب ہوگا۔'' نیہاں بولی۔

''میں جمعہ کا سارا دن اپنے باجی کے ساتھ گزارتی ہوں' مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

''کل کا دن تو میں بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاروں گی۔ آج شام میں اسلام آباد جا رہی ہوں۔'' نیہاں نے کہا۔

''اوہ میں کمرے میں اکیلی رہ جاؤں گی۔'' اُما بولی۔

جب بھی نیہاں اسلام آباد جاتی تھی تو ماہ بانو کا بہت دل چاہتا تھا کہ اُما کو اپنے گھر لے جائے۔ نیہاں کے جانے سے وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی۔

لیکن ماہ بانو اسے اپنے گھر لے جا نہیں سکتی تھی۔ ان کا چھوٹا سا گھر ان کے لیے بھی کم پڑتا تھا اور پھر اماں تھیں' وہ تو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھیں' کہ ان کے گھر کوئی ہندو لڑکی داخل ہو۔ انہیں تو ماہ بانو کی اُما سے دوستی بھی بالکل پسند نہیں تھی۔

کبھی کبھار اسے یوں محسوس ہوتا تھا' جیسے اُما اس کے گھر آنا چاہتی تھی' لیکن چونکہ کبھی ماہ بانو نے اسے نہیں بلایا تھا' اس لیے اس نے بھی اس بات کا اظہار مناسب نہیں سمجھا تھا۔

وہ تینوں خاموش تھیں۔ کچھ تھکاوٹ کا بھی اثر تھا۔ ماہ بانو نے نیہاں کی طرف دیکھا' اس کے خوبصورت چہرے پر سوچ کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں اور اس کی گہری نیلی آنکھیں کسی خاص

نقطے پر مرکوز تھیں۔ ماہ بانو نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا' بس میں کھڑکی کے قریب بیٹھا جیمز کوئی اخبار پڑھ رہا تھا۔

اس نے دوبارہ نیہاں کی طرف دیکھا۔ اس وقت نہ وہ بے نیاز تھی نہ لاپروا۔ جیمز کو دیکھتے ہوئے وہ یقینی طور پر اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بنیاد کوئی بھی نہیں تھی' لیکن اس کے ذہن میں بہت قوی احساس نے سر اٹھایا۔

''تو گویا وہ جیمز ہے۔'' ماہ بانو نے سوچا۔

اُما بیزاری سے اپنے لمبے بالوں کا جُوڑا بنا رہی تھی۔ اس کی توجہ نیہاں اور جیمز کی طرف نہیں تھی۔ اسی وقت بس رینگنے لگی۔ ڈرائیور نے ہارن دینے شروع کیے۔ نیہاں سوچ کے حصار سے نکل آئی۔ اُما بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم کب جاؤ گی بانو؟'' اس نے پوچھا۔

''بس ابا جی آتے ہی ہوں گے۔''

''دیکھو اب مکمل آرام کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ ہفتے کے روز آج سے زیادہ بیمار پڑی ہو۔''

''تم فکر نہ کرو' میں فائٹنگ فٹ ہو کر کالج آؤں گی۔''

بس گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور اب سب طلبہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''اچھا بانو! بائے۔''

اُما اور نیہاں بھی بس کی طرف بھاگیں۔

ان کے جانے کے بعد وہ جیمز اور نیہاں کے متعلق سوچنے لگی۔

جیمز جس کا اصل نام جاوید تھا' ایڈی اور عبداللہ کا ہی کلاس فیلو تھا۔ ایڈی اور عبداللہ نے کالج میں اکٹھے ہی داخلہ لیا تھا۔ جیمز ان سے ایک سال بعد کالج آیا تھا۔ پھر سیکنڈ ایئر کرنے کے بعد ایڈی نے کالج سے ایک سال کی چھٹی لے لی تھی۔ اسے امریکہ جانا تھا' سال بھر بعد اس نے کالج جوائن کر لیا تھا اور یوں وہ تھرڈ ایئر میں پڑھ رہا تھا۔

ایڈی کی غیر موجودگی میں عبداللہ نے تھرڈ ایئر مکمل کر لیا تھا اور فورتھ ایئر میں جانے سے قبل ایک سال کی چھٹی لے لی تھی۔ اسے ورلڈ ٹور پر جانا تھا۔ اب اس نے جنوری کے آغاز سے دوبارہ کالج جوائن کرنا تھا۔ فورتھ ایئر کے طالب علم کی حیثیت سے۔

ایڈی اور عبداللہ کے ایک ایک سال ضائع کرنے کی وجہ سے اب جیمز ان کا کلاس فیلو تھا۔

جیمز کی دوستی پورے کالج سے تھی۔ اس کا کوئی مخصوص دوست یا گروپ نہیں تھا۔ جب ماہ بانو وغیرہ فرسٹ ایئر میں آئے تھے تو کتنے عرصے تک وہ جیمز ہی اس کا حقیقی نام سمجھتے رہے تھے۔ یہ تو بہت بعد کی بات تھی کہ انہیں اس کے اصل نام کا علم ہوا۔

وہ لگتا بھی تو بالکل جیمز تھا۔ شکل صورت سے بھی وہ بالکل کوئی یورپی لگتا تھا۔ گوری رنگت جو

دھوپ سے جھلس کر سنہری ہو گئی تھی۔ سنہرے بال، گہری نیلی آنکھیں، اس کی فزیک بھی بہت اچھی تھی بلکہ بعض اوقات تو وہ آرٹسٹ سے زیادہ وباڈی بلڈر لگتا تھا۔

جب اُما اور ماہ بانو کو علم ہوا کہ وہ دراصل جیمز نہیں، جاوید ہے، تو انہوں نے اس پر بہت سے تبصرے بھی کیے تھے۔

''اسے دیکھ کر اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کوئی پاکستانی ہے۔'' ماہ بانو نے کہا تھا۔

''ویسے مجھے ایک دو مرتبہ شک گزرا تھا۔ ٹھیک ہے کہ اس کی انگریزی اچھی ہے، لہجہ بھی امریکی ہے، پھر بھی کہیں کہیں پاکستانی انداز جھلک ہی جاتا ہے۔'' اُما نے کہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس کی ممی فارنر ہوں گی۔'' ماہ بانو نے خیال ظاہر کیا تھا۔

سب کا دوست ہونے کے باوجود وہ کسی سے بھی بہت قریب نہیں تھا۔ وہ سب کی مدد کرتا تھا، لیکن اس نے کبھی کسی سے مدد طلب نہیں کی تھی۔ اس کی دوستی بے شمار لڑکیوں کے ساتھ تھی، لیکن اب تک اس کا کوئی اسکینڈل نہیں بنا تھا۔

وہ ہوسٹل میں نہیں رہتا تھا، کہاں رہتا تھا؟ یہ بات ماہ بانو کو معلوم نہیں تھی، نہ ہی کبھی اس نے جاننے کی کوشش کی تھی۔ ضرورت ہی کیا تھی اس کی۔ آج وہ ہوسٹل جانے والی بس میں بیٹھا ہوا تھا، جس کا مطلب تھا کہ اسے ہوسٹل میں کچھ کام تھا۔ نیہاں نے رُک کر غالباً اس سے یہی پوچھا تھا۔

اسے نیہاں کا خیال آیا، جو بس میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہوئے جیمز کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

ماہ بانو نے کبھی جیمز کو اس میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا تھا۔ خیر اس نے تو کبھی نیہاں کو بھی اس میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا تھا۔

دل ہی دل میں اس نے نیہاں اور جیمز کا موازنہ کیا۔ دونوں کی رنگت سپید تھی۔ آنکھیں نیلی اور بال سنہرے تھے اور دونوں ہی ساتھ کھڑے ہو کر بہت اچھے لگتے تھے۔

اپنے خیالات سے وہ اس وقت چونکی جب گیٹ پر کھڑے ہوئے ابا جی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ بیگ کندھے پر ڈال کر پورٹ فولیو سنبھالتے ہوئے تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' انہوں نے اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھا۔

''اب بالکل ٹھیک ہوں، کالج میں بھی دوا لی تھی۔''

''بخار تو نہیں ہے۔'' وہ بولے پھر اس کے ہاتھ سے پورٹ فولیو لے لیا۔

''یہ مجھے دے دو، تھک جاؤ گی۔''

دونوں ساتھ ساتھ سیکرٹریٹ کے اسٹاپ کی طرف چل دیے۔

''آج اکیلی بیٹھی تھیں؟'' انہوں نے کہا۔

''ہاں، اُما تو ہوسٹل چلی گئی تھی، باقی کچھ دوست چلے گئے تھے اور کچھ اندر کام کر رہے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''تمہاری اماں تمہارے لیے سخت پریشان تھیں۔''

''وہ تو یوں ہی پریشان ہوتی رہتی ہیں......'' اس نے جواباً کہا۔

ویگن پر بیٹھ کر گھر روانہ ہوتے وقت اس کے ذہن میں ایک مرتبہ پھر عبداللہ کا خیال آ گیا۔

☆=====☆=====☆

حویلی میں سب سے پہلے اس کا سامنا بابا جان سے ہوا۔

''تم آ گئے؟''

''آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟ میں تو سوچ رہا تھا کہ سو چکے ہوں گے۔'' عبداللہ نے کہا۔

وہ دونوں گول کمرے میں آ گئے۔ فتح محمد اور نور محمد بھی ان کے پیچھے چلے آئے۔

''اب بتاؤ تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟'' انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اطلاع درست تھی، ہم حملے کی جگہ دیکھ کر آ رہے ہیں۔'' وہ بھی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ہوں۔'' بابا جان نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

عبداللہ نے کاغذ پنسل لے کر اس جگہ کا خاکہ بنایا اور انہیں متوقع حملے سے متعلق اپنے لگائے ہوئے اندازے بتانے لگا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو؟ انہیں کہاں روکو گے؟''

''مجھے حیرت ہے بابا جان کہ انہوں نے ہمارے ہی کھیتوں میں اپنے لیے جگہ بنا لی اور یہاں کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ گڑیا کے گھر سے نکلنے کا ذکر کسی نے یوں ہی باتوں باتوں میں کر دیا ہو گا، مگر اب مجھے یقین ہے کہ ہمارے درمیان نیاز پور والوں کا کوئی مخبر موجود ہے۔ ذرا اس مسئلے سے نپٹ لوں تو پھر یہ دیکھتا ہوں کہ یہ حرکت کس کی ہے؟

ابھی فوری طور پر ہمارے پاس دو آپشن ہیں۔ ایک تو یہ کہ نیاز پور والوں کو ان کے اپنے علاقے میں روک دیا جائے۔ دوسری یہ کہ انہیں اس وقت پکڑا جائے جب وہ حملہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''دوسری آپشن زیادہ بہتر ہے اور ہمارے لیے محفوظ بھی۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ انہیں ان کے علاقے میں روک سکیں، کیونکہ اس کے لیے ہمیں ان کے علاقے کا بھی مکمل

جائزہ لے کر منصوبہ بندی کرنا پڑے گی۔ وہاں اپنے آدمی پہنچانے ہوں گے' جس کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ فائرنگ ہمارے علاقے میں کریں گے تو یہ بات عدالت اور پولیس میں ان کے خلاف جائے گی۔'' باباجان نے کہا۔

''میں بھی یہی سب سوچ رہا تھا۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''باباجان! آپ آرام کریں اور سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

پو پھٹنے لگی تھی' جب عبداللہ نے محافظوں کو اکٹھا کر کے انہیں تفصیل سے اپنا منصوبہ سمجھایا۔ اب جبکہ انہیں علم ہو چکا تھا کہ حملہ آور کس جگہ پر موجود ہوں گے' تو انہیں اپنے لیے ایسی جگہ ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ جہاں سے وہ ان کا نشانہ لے سکتے تھے۔

''لیکن شاہ صاحب!'' فتح محمد نے تذبذب سے کہا۔ ''اس منصوبے میں تھوڑی سی ترمیم ممکن نہیں کیا؟''

''کیسی ترمیم؟''

''آپ نے کہا ہے کہ ہم سب چند مخصوص جگہوں پر بالکل تیار کھڑے ہوں گے اور آپ جیپ پر سڑک سے گزریں گے۔ اس موقع پر شاہ صاحب ہمیں حقِ نمک ادا کرنے دیں۔ جیپ سڑک سے گزرے یا نہ گزرے وہ لوگ ہمارے نشانے پر ہوں گے۔ یوں بھی ہمارے کھیتوں میں ان کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟ شاہ صاحب اگر پھر بھی جیپ سڑک پر لانا ضروری ہے تو آپ اپنی جگہ یہ کام مجھے دے دیں۔''

''جی شاہ صاحب! یہ تو سراسر خودکشی ہوگی۔'' نور محمد نے بھی کہا۔

''میرے بس میں ہوتا نور محمد! تو تم لوگوں سے اس قدر کام بھی نہ لیتا۔ یہ ہماری جنگ ہے' ہماری آگ ہے مجھے پسند نہیں کہ تم لوگ اس آگ کا ایندھن بنو۔''

''تو ٹھیک ہے شاہ صاحب' جیپ سڑک پر لانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح تو آپ سیدھے ان کے نشانے کی زد پر ہوں گے۔''

''ویسے تو یہ حماقت ہے۔'' اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ ''لیکن میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔ ان لوگوں کی دشمنی اب سے پہلے باباجان سے تھی' اگر آج انہوں نے مجھ پر حملہ کیا تو یہ جنگ باباجان کی نہیں رہے گی' میری بن جائے گی اور پھر اس کا فیصلہ میں کروں گا۔''

''لیکن وہ آپ کو باآسانی نشانہ بنا سکتے ہیں وہاں سے۔'' نور محمد نے احتجاج کیا۔

''اتنی آسانی سے نہیں نور محمد۔'' اس کی آنکھوں میں چمک اُتر آئی۔

''اب تم لوگ بھی آرام کرو تاکہ فریش ہو جاؤ۔ میں بھی اب آرام کروں گا۔''

وہ حویلی میں آ کر آرام سے سو گیا۔

ساڑھے دس بجے ایک محافظ کے ہمراہ عبداللہ حویلی سے باہر نکلا اور اس سڑک کی طرف

بڑھ گیا۔

☆=====☆=====☆

ریشماں نے کریمن کے ہاتھ خط پوسٹ کروا دیا تھا اور کریمن کتنی مرتبہ یقین دلا چکی تھی کہ اس نے خط اپنے ہاتھ سے لیٹر بکس میں ڈالا تھا پھر بھی ریشماں بے چین تھی اور اتنی یقین دہانی کے باوجود بھی بار بار کریمن سے اس کا ایک ہی سوال تھا۔

''تو نے اپنے ہاتھ سے خط ڈالا تھا ناں؟''

''صحیح کہتی ہوں بی بی' میں نے اپنے ہاتھوں سے ڈالا تھا۔ اب تو کب کا لاہور بھی پہنچ چکا ہوگا۔''

ریشماں کے لیے ایک ایک لمحہ کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے اخبار اُٹھا لیا۔

اس معاملے میں بھی اس کے ساتھ عجیب سلوک ہوتا تھا۔ وہ جو کچھ پڑھنا چاہتی تھی پہلے وہ باباجان کے ہاتھ سے گزرتا تھا۔ اس تک کبھی پورا اخبار نہیں پہنچا تھا۔ کتابیں بھی گنی چنی آتی تھیں۔ بہت عام سطحی سی کہانیوں والی جو کسی اخلاقی مقولے کو بنیاد بنا کر لکھی جاتی تھیں۔ اسلامیات سے متعلق کتابیں اس کے پاس سب سے زیادہ تھیں۔ سبط حسن نے کتنی مشکلوں سے اسے اجازت دلوائی تھی۔ انگریزی شاعری پڑھنے کی۔ ان میں بھی نظمیں خوب دیکھ بھال کر منتخب کی جاتی تھیں۔ یہ اور بات کہ سبط ان نظموں کے ساتھ ساتھ اسے دوسرے شاعروں کی دوسری خوبصورت نظموں کا حوالہ بھی دیتا جاتا تھا۔ ویسے تو باباجان ہمیشہ ہی کہتے تھے۔

''بیٹا آپ کسی کتاب کا نام لیں' ہم آپ کو منگوا کر دیں گے۔''

لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہوگا اور باباجان کو جھوٹا پڑتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے اس نے کبھی ان سے ایسی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ ہاں اپنی مرضی سے وہ کتابیں لاتے رہتے تھے۔ کبھی اردو یا انگریزی میں قرآن پاک کی تفسیر لے آتے تھے' کبھی اسلام کے حوالے سے کسی لیکچر کی آڈیو کیسٹ اسے دے دیتے تھے۔

انہیں اس کی پڑھائی لکھائی بالکل پسند نہیں تھی۔ پتا نہیں سبط کو کیا ہوا تھا کہ اس نے ریشماں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ جونہی وہ چھٹیوں میں گھر آتا تھا دونوں بہن بھائیوں کا سارا دن پڑھائی لکھائی میں گزر جاتا تھا۔

وہ منع کرنا چاہتے تھے جب یاسمین بیگم کے منہ سے انہوں نے سنا کہ سبط حسن ریشماں کو پڑھا رہا ہے تو وہ اسے منع کرنے ریشماں کے کمرے میں گئے تھے۔

وہ دروازے میں کھڑے تھے۔ سبط غالباً اسے پڑھا کر جا چکا تھا اور اب وہ سبق دہرا رہی تھی۔ ہر طرف سے بے خبر ہو کر۔ اسے تو ان کی آمد کی خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔

ان کے دل میں ہلکی سی کسک جاگ اُٹھی۔اسی طرح زرینہ بھی ان کی آمد سے بے خبر رہتی تھی، اپنے آپ میں مگن۔

دروازے میں کھڑے ہو کر وہ ریشماں کو تکتے رہے۔اس کے چہرے پر خوشی اور جوش کے بہت سے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ایسی خوشی انہوں نے زرینہ کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی تھی۔یہ سب رنگ وہ اس کے چہرے پر بھی دیکھنا چاہتے تھے لیکن ان تک پہنچنے سے پہلے وہ خوشی اور مسرت کے یہ رنگ حیدر علی کو دے آئی تھی۔ان کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔

کتنی خواہش تھی کہ زرینہ خوش رہے، مسرت کی ایک کرن ہی سہی، خوشی اس کے چہرے کو منور تو کرے۔

مگر ان دونوں کے درمیان بہت فاصلے تھے۔انہوں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ محبت کی تھی۔صرف ایک لڑکی نے منتر پڑھ کر ان کے قدم جکڑے تھے۔

پر ان کی انا اور رتبے نے ان کی محبت کو ان سے دور کر دیا تھا۔اگر حیدر علی فوزیہ کے ساتھ خوش رہ سکتا تھا تو وہ بھی زرینہ کے ساتھ خوش رہ سکتے تھے لیکن یہ خیال اس وقت ذہن میں آیا تھا۔جب وہ نہیں رہی تھی۔ان سے بہت دور جا چکی تھی کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔تب انہیں احساس ہوا تھا کہ محبت حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔اور جو لوگ کچھ کھونے پر تیار نہیں ہوتے وہ بالآخر اپنی محبت ہی گنوا بیٹھتے ہیں۔تتلیوں سے لمحے اُڑ جاتے ہیں۔انگلیوں پر یادوں کے کچھ رنگ رہ جاتے ہیں۔

پتا نہیں یہ سب باتیں انسان اس وقت کیوں نہیں سمجھتا جب وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔جب وقت نکل جاتا ہے تو کفِ افسوس ملتا رہ جاتا ہے۔

ریشماں کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔دروازے میں بابا جان کھڑے اسی کو دیکھ رہے تھے۔اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔اور کچھ نہ سوجھا تو کتاب اپنے پیچھے چھپا کر نظریں جھکا دیں۔

ان کے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ریشماں ان کی زرینہ کی نشانی تھی۔وہ اس کے چہرے سے خوشی اور مسرت کی کرنیں نہیں چھیننا چاہتے تھے۔

انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا کر رہی تھی ہماری بیٹی؟''انہوں نے پیار سے کہا۔

وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

''پڑھائی ہو رہی تھی؟''

اس نے کتاب والا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔

''آپ کو اچھا نہیں لگا بابا جان؟''اس نے بمشکل تمام کہا۔

''ہمیں اچھا لگا، بہت اچھا لگا۔''انہوں نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

ریشماں نے بے یقینی سے پلکیں جھپکا کر ان کی طرف دیکھا۔

''سبط کو تو خود کچھ نہیں آتا۔وہ آپ کو کیا پڑھائے گا۔آپ بیٹھیں، ہم آپ کو پڑھاتے ہیں۔''انہوں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی بیٹھ گئے۔

ریشماں نے روبوٹ کی طرح ان کے کہنے پر عمل کیا۔اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔پھر تھوڑی دیر تک بابا جان اسے پڑھاتے رہے۔وہ بہت اچھا پڑھا رہے تھے لیکن وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔کچھ دیر بعد انہوں نے کتاب بند کر دی۔

''پڑھتے وقت ایک بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔''انہوں نے کہا۔''کہ کتاب انسان کو بنا بھی سکتی ہے اور تباہ بھی کر سکتی ہے۔اس لیے پڑھتے وقت ہمیشہ اچھی کتاب کا انتخاب کرنا چاہیے۔یہ بات آپ یاد رکھیں گی ناں؟''

ریشماں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

اور وہ اُٹھ کر چلے گئے تھے۔اس کے بعد اس کی پڑھائی جاری رہی۔بابا جان نے پھر کبھی اسے نہیں پڑھایا تھا۔انہیں جو بات کہنی تھی، وہ کہہ چکے تھے۔اور ریشماں نے اسے ہمیشہ یاد رکھا تھا۔اس کے لیے یہی بہت تھا کہ انہوں نے اپنے اصول توڑ کر اسے پڑھنے کی اجازت دی تھی۔یہ محدود سی اجازت اسے اپنے لیے نعمت لگتی تھی۔

اب وہ تاریخ پڑھ سکتی تھی۔جغرافیہ پڑھنے کی بھی اجازت تھی۔اسلامیات سے متعلق کتابیں تو بابا جان خود لا دیا کرتے تھے۔اسی میں اس کا وقت گزر جاتا تھا۔

مگر اس دن وقت بالکل نہیں گزر رہا تھا۔اخبار چھوڑ کر وہ اماں جان کے پاس چلی آئی۔ان کے گرد ہر وقت عورتوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔کوئی ان کی ٹانگیں دبا رہی ہوتی......کوئی حویلی سے متعلق معاملات میں ہدایات لے رہی ہوتی تھی۔کچھ اپنے مسائل کے حل کے لیے پیر صاحب سے سفارش کروانا چاہتی تھیں اور کچھ یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔

''کیا ہوا بیٹا! چپ چپ لگ رہی ہو۔''اماں جان نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں۔''

اماں جان پھر اپنے اردگرد موجود عورتوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ریشماں سے رہا نہ گیا۔

''اماں جان بھائی کہاں ہیں؟''اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''امداد تو ابھی اُٹھ کر گیا ہے۔سبط کو پتا نہیں کیا ہوا ہے۔جس دن سے آیا ہے گم صم سا ہے۔وہ بھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی گیا ہے۔باقی سب مردانے میں ہی ہوں گے۔''

وہ بے چین تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ انہیں حویلی سے کب نکلنا تھا۔ گو کہ اماں جان باتوں میں مصروف تھیں لیکن ان سے اس کی بے چینی چھپی نہ رہ سکی۔

''کیا ہوا ریشماں، پریشان لگ رہی ہو؟'' انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس نے ایک نظر اماں جن کے گرد موجود عورتوں کی بھیڑ کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔

''اچھا تم سب جاؤ میں بعد میں بلالوں گی تمہیں۔'' انہوں نے تمام عورتوں کو رخصت کر دیا۔

''ہاں اب بتاؤ کیا ہوا؟'' سب عورتوں کے جانے کے بعد انہوں نے اس سے پوچھا۔

''اماں، بھائی اب بھی جائیں گے وہاں؟'' اس نے پوچھا۔ ''وہیں حیدر بابا کی بیٹی......'' اس سے اپنی بات مکمل نہ کی جا سکی۔

اماں جان نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

''یہ مردوں کے معاملات ہوتے ہیں۔ وہ انہیں بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔'' انہوں نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

''اماں جان رشتے تو سب قابلِ احترام ہوتے ہیں۔ حیدر بابا اور ان کی اولاد کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ہمارے گھرانے کی رگوں میں ہے، کبھی کوئی اپنا خون بھی بہاتا ہے؟''

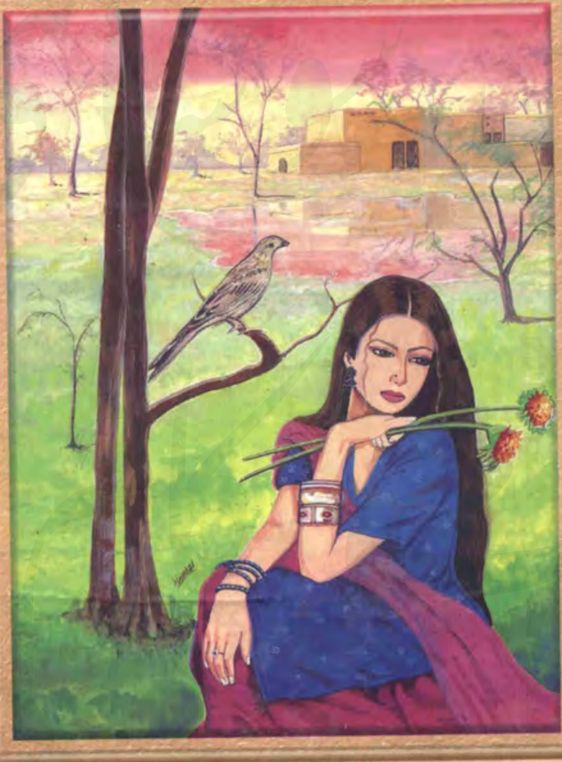
''یہ اس حویلی کی روایت ہے کہ جب اپنے خون اور غیرت کے درمیان انتخاب کا مرحلہ آتا ہے تو ترجیح غیرت کو ہی دی جاتی ہے۔ تم دعا کرو کہ تمہارے بھائی ہر آفت سے محفوظ رہیں۔'' اماں جان نے بہت پیار سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں کیسے کوئی دعا کروں۔'' اس کی آواز دکھ کے بوجھ سے چیخ رہی تھی۔ مزید کچھ کہے بغیر وہ ان کے کمرے سے نکل گئی۔

☆=====☆=====☆



ماہی ماہی کوکدی میں



2

ہُما کوکب بخاری

بار اول ——— ۲۰۰۷ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف کمپوزر۔ لاہور
قیمت ——— ۳۵۰ روپے

ISBN 978-969-517-254-4

اسٹاکسٹ
علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

یاسمین بیگم دم بخود بیٹھی رہ گئیں۔ ریشماں کے ایک فقرے' اس کے لہجے نے انہیں کتنا کچھ سمجھا دیا تھا۔

وہ بہت کم گو تھی۔ ضرورتاً بات کرنے والی لڑکی۔ ہاں سبطِ حسن کے ساتھ بہت باتیں کرتی تھی۔ ہنستی بھی تھی۔

برسوں پہلے اماں جان نے اس ننھی سی جان کو ان کی گود میں ڈال دیا تھا۔

یاسمین بیٹی تم میں بہت حوصلہ ہے۔'' انہوں نے کہا تھا۔ ''زرینہ تمہاری سوت ہے۔ میں تمہارا دکھ سمجھ سکتی ہوں لیکن یہ تو ہماری اپنی ہے' ہمارا خون ہے۔ اس بچی کی پرورش اب تمہارے ذمے ہے۔ دیکھنا بیٹی اسے سوتیلا مت سمجھنا۔ یہ بن ماں کی بچی اب تمہاری محبت اور شفقت کی محتاج ہے۔ اسے کبھی یہ احساس نہ ہونے دینا کہ اس کی سگی ماں ہوتی تو اسے تم سے زیادہ محبت دیتی۔''

اور یاسمین بیگم نے اسے کلیجے سے لگا کر رکھا تھا۔ اسے گود میں لینے کے بعد ان کے زرینہ سے بہت سے شکوے دُھل گئے تھے۔ زرینہ جس نے ان کے شوہر کو ان سے چھین لیا تھا۔ جس کی اس چھت تلے موجودگی کے دنوں میں ان کے شوہر ان کے نہیں رہے تھے۔ وہ تو اپنے آپ میں بھی نہیں رہے تھے۔

مگر ریشماں کو گود میں لینے کے بعد انہیں احساس ہوا تھا کہ زرینہ بھی انہی کی طرح مجبور اور محروم تھی۔

وہ ریشماں کو جتنی محبت دے سکتی تھیں' انہوں نے دی تھی۔ ریشماں نے بھی ان کی محبت کا جواب اپنی بھرپور محبت سے دیا تھا۔ اسے تو شاید کبھی اپنی ماں کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔

مگر اب انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ ریشماں کو صرف محبت دے سکتی ہیں ممتا نہیں۔ وہ اسے اس طرح نہیں سمجھ سکی تھیں جیسے ایک ماں اپنی بیٹی کو سمجھ جاتی ہے۔ حالانکہ انہیں اسے سمجھ لینا چاہیے تھا۔ وہ بیٹی کی ماں نہ ہی سہی لیکن عمر کے اس دور سے تو گزر چکی تھیں۔ اس عمر میں شاید ہر

کنواری لڑکی ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔

یاسمین بیگم کو یاد آیا' ان کی نسبت ان کی پیدائش کے ساتھ ہی طے کر دی گئی تھی۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے تھے' ان کے دل اور دماغ میں ان کے ہونے والے شوہر کا تصور پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں تو یہ بھی علم نہیں ہو سکا تھا کہ انہوں نے ان سے پہلی مرتبہ محبت کب محسوس کی تھی۔ وہ تو شاید اس محبت کے ساتھ ہی پیدا ہوئی تھیں۔ انہوں نے کبھی اپنے ہونے والے شوہر کو نہیں دیکھا تھا لیکن وہ ان کے ہر خواب میں موجود ہوتے تھے۔

دن گزر رہے تھے۔ والدین بیٹی کی وجہ سے پریشان تھے لیکن ان کے گھر میں کبھی کسی نے پیر صاحب سے شکوہ نہیں کیا تھا' کبھی جلدی اور اصرار نہیں کیا تھا۔

اور خود یاسمین بیگم کی کیا حالت تھی۔ نرم لوریوں جیسے سپنوں کی جگہ اندیشوں نے لے لی تھی۔ کتنی ہی پریشان کن سوچیں اور خیال ہر وقت دل کو ہولائے رکھتے تھے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جس کا انہیں شدت سے انتظار تھا۔ اور وہ جتنی خواہشیں' جتنے ارمان لے کر گئی تھیں' وہ سب چکنا چور ہوتے پتا بھی نہیں چلا۔ شاید ایک لمحہ تھا یا ایک دن لیکن ان کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔

مگر ان میں بہت حوصلہ' بہت قوتِ برداشت تھی' شوہر کی سب زیادتیاں چپ چاپ سہہ گئیں۔

وہ کل گزر گئی تھی۔ انہوں نے شعوری طور پر تکلیف دہ احساس کو بھلانے کی کوشش کی تھی اور اس دوران یہ بھول گئی تھیں کہ ان کی ایک بیٹی ہے جو اسی قسم کے احساسات سے دوچار ہو سکتی ہے۔

اس کی نسبت بچپن میں طے ہو گئی تھی۔ انہیں خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ بھی اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق سوچتی ہو گی۔ ہر گزرتا دن عبداللہ کا تصور اس کے ذہن میں گہرا کرتا جا رہا ہو گا۔ وہ خاموشی سے دونوں گھرانوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے دیکھ دیکھ کر کڑھتی ہو گی۔

انہیں نہ جانے کیوں یہ یقین ہو چلا تھا کہ آج کے جھگڑے میں ریشماں کو ہاتھ بلند کرنے پڑے تو یہ اس کے بھائیوں کے لیے نہیں بلکہ عبداللہ کے لیے بلند ہوں گے۔

☆=====☆=====☆

عبداللہ کا گن مین چوکس بیٹھا ہوا تھا۔ خود عبداللہ بھی پوری طرح تیار تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر اس کی رائفل ایسے پڑی ہوئی تھی کہ ضرورت پڑنے پر کم سے کم وقت میں اس سے کام لے سکتا تھا۔

گاڑی کے پچھلے حصے میں پردے لگے ہوئے تھے۔ دشمنوں کو یہ شک بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ گاڑی میں زہرا نہیں تھی۔ بظاہر صرف ایک چیز خلاف پروگرام تھی اور وہ تھی عبداللہ کی آمد۔ مگر

اسے یقین تھا کہ اس کی موجودگی نیاز پور والوں کے منصوبے پر اثر انداز نہیں ہو گی۔

ٹوٹی پھوٹی سڑک پر اس کی نسان پٹرول چلتی جا رہی تھی۔ آگے پیچھے دور تک سڑک سنسان تھی۔ اردگرد بھی دور دور تک سوائے سورج کی چمک اور پرندوں کی چہچہاہٹ کے اور کچھ نہیں تھا۔

گاڑی سڑک کے اس حصے تک پہنچ گئی تھی جہاں حملہ متوقع تھا۔

''فتح محمد تیار ہو؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''جی شاہ صاحب' بالکل تیار ہوں۔'' اس نے رائفل تھپتھپا کے کہا۔

☆=====☆=====☆

سڑک کے داہنے طرف والے کھیتوں میں امداد علی اور بائیں جانب والے کھیتوں میں خادم حسین اپنی پارٹی کے ساتھ موجود تھا۔ دونوں بے چینی سے زہرا کی گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر کام پروگرام کے مطابق ہوا تھا۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ کھیتوں میں کٹائی کا کام جاری تھا لیکن جو کھیت انہوں نے منتخب کیے تھے ان کی باری بہت دن بعد آنی تھی۔ دونوں بھائیوں نے موبائل فون پر ایک دوسرے سے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اب صرف زہرا کی گاڑی کی آمد باقی تھی۔

وقت گزاری کے لیے امداد علی نے سگریٹ سلگا لیا۔ ابھی دو تین کش ہی لیے تھے کہ اس کے کانوں میں گاڑی کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ موجود سب افراد بھی چوکنے ہو گئے تھے۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق سب سے پہلے گاڑی کے ٹائر ناکارہ کرنے تھے اور پھر ڈرائیور اور گن مین کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس طرح کہ گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھی زہرا کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

اس سے آگے امداد علی اور خادم حسین کا کام تھا۔ انہیں زہرا کو اس کی گاڑی سے نکال کر اپنی گاڑی میں ڈالنا تھا اور حویلی لے کر جانا تھا۔ قتل تو اسے کرنا ہی تھا بلکہ آبائی قبرستان میں اس کے لیے قبر بھی کھود دی گئی تھی لیکن وہ ان کے خاندان کی عزت تھی۔ اس کا یوں سڑک پر قتل کیا جانا اچھا نہیں تھا اس لیے اسے سزا حویلی میں دی جانی تھی۔

توقع تھی کہ زہرا کی گاڑی کے آگے پیچھے محافظوں کی بھی گاڑیاں ہوں گی۔ پروگرام کے مطابق ان میں بیٹھے افراد کو بے دریغ گولیاں مار دینی تھیں۔ یوں بھی وہ سب محافظ شطرنج کی بساط پر پڑے وہ پیادے تھے جن کا کام ہی اپنی جان داؤ پر لگا کر شاہ کو بچانا ہوتا ہے ان کی زندگی اور موت سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

آواز سنائی دینے کے بعد زہرا کی نسان پٹرول بھی نظر آ گئی۔ اس کے ساتھ حفاظت کے لیے کوئی گاڑی نہیں تھی لیکن گاڑی دیکھ کر امداد کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ان کی اطلاع کے مطابق

عبداللہ لاہور میں تھا۔

''خادم بھائی' گاڑی عبداللہ ڈرائیو کر رہا ہے۔ اب کیا کیا جائے۔'' اس نے فوراً موبائل فون کے ذریعے پوچھا۔

''یہ تم کن باتوں میں پڑ گئے۔ وقت بہت کم ہے۔'' خادم حسین کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی۔ ''گاڑی کے ٹائر برسٹ کرو۔ گن مین سے ہم نمٹ لیں گے۔ عبداللہ کو قتل مت کرو صرف اس حد تک ناکارہ بنا دو کہ وہ زہرا کی مدد نہ کر سکے۔''

تھوڑی ہی دیر میں فضا گولیوں کی آواز سے گونج اُٹھی۔ جواب میں دوسری طرف سے بھی فائرنگ کی گئی ایک سے ڈیڑھ منٹ کے اندر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

☆=====☆=====☆

خواب گاہ کا دروازہ کھول کر پیر صاحب اندر داخل ہوئے۔ ریشماں کے چلے جانے کے بعد سے اب تک یاسمین بیگم سوچوں میں گم اکیلی بیٹھی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا' آج یہاں رونق نظر نہیں آ رہی؟'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

یاسمین بیگم چونک گئیں۔ ''رونق؟'' انہوں نے جیسے خود سے کہا۔

''کچھ پریشان لگ رہی ہیں آپ۔''

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' وہ بولیں۔

پیر صاحب نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''آپ جو کچھ کر رہے ہیں' وہ بہت غلط ہے۔'' یاسمین بیگم نے دل مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

پیر صاحب چند لمحے پُرخیال نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔

''گویا ہمارا تختہ اُلٹنے کی کوشش ہمارے گھر میں ہو رہی ہے۔''

یاسمین بیگم گڑبڑا گئیں۔ ''آپ غلط سمجھے ہیں۔''

''ہم منتظر ہیں' آپ سمجھا دیں۔''

''حیدر علی آپ کا بھائی ہے۔ آپ ان کے گھرانے کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتے۔ آپ کے بیٹے بھی جوان ہیں' کل کو وہ آپ کی جگہ سنبھالیں گے۔ کیا آپ برداشت کر سکیں گے کہ وہ ایک دوسرے کا خون بہانے لگیں؟''

''یہ کس کی زبان میں بات کرنے لگیں یاسمین بیگم؟'' ان کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

''میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ کبھی آپ کے سامنے زبان نہیں کھولوں گی۔ آپ نے جو کچھ کیا میں نے چپ چاپ برداشت کر لیا۔ مجھ پر گزرے گی تو میں سب کچھ برداشت کر لوں گی لیکن آج معاملہ میری اولاد کا ہے اور میں خاموش نہیں رہ سکوں گی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آج مجھے بولنا پڑ رہا ہے۔'' انہوں نے قدرے توقف کیا پھر بولیں۔ ''پیر صاحب' ہمارے گھرانے کے رشتے

وہاں جڑے ہوئے ہیں' خدا کے لیے ان کے رشتوں کا خیال کر لیں۔''

''اب تو ایک ہی رشتہ قائم ہے یاسمین بیگم اور وہ ہے دشمنی کا رشتہ اور ہم رشتہ داری پوری دیانت سے نبھانے کے قائل ہیں۔''

''یہ میرے ہاتھ آپ کے سامنے جُڑے ہوئے ہیں پیر صاحب۔ جس گھر میں بیٹی بیاہی ہوتی ہے اس کے گھر والوں کے ساتھ محبت اور خلوص کے رشتے قائم کیے اور نبھائے جاتے ہیں۔''

''آپ اپنی حد سے بڑھ رہی ہیں یاسمین بیگم' ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ ہماری بیٹی کی شادی وہاں نہیں ہو گی۔ یہ ہمارا اٹل فیصلہ ہے۔''

''وہ نسبت جو آپ نے طے کی تھی' وہ بھی آپ کا اٹل فیصلہ تھا۔ آپ زبان دے کر آئے تھے اپنے بھائی کو۔''

''بس آگے ایک لفظ بھی نہیں۔ تمہیں جو کچھ کہنا تھا اس سے زیادہ کہہ چکی ہو اور ہم جتنا سنا کرتے ہیں ہم نے اس سے زیادہ سن لیا ہے۔''

''آپ نے کچھ نہیں سنا پیر صاحب۔ میں آپ کو سناتی ہوں۔ ریشماں کی عمر بیتتی جا رہی ہے اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ اس کی ماں ہونے کے ناتے میں آپ سے یہ سب کچھ کہنے کا حق رکھتی ہوں۔''

''ماں نہیں سوتیلی ماں۔'' پیر صاحب کے لہجے میں زہر اتر آیا۔ ''سوتیلی ماں ہو اس لیے اسے بوجھ سمجھنے لگی ہو۔ تمہاری سگی بیٹی ہوتی تو تمہارے لیے ایسا بوجھ نہ ہوتی جسے اتار پھینکنے کی تمہیں جلدی ہوتی اور وہ بھی دشمنوں کے گھر۔''

''نہیں پیر صاحب۔'' غم کے مارے یاسمین بیگم کا گلا رُندھ گیا۔ ''مجھے سوتیلی ماں ہونے کا طعنہ پھر کبھی مت دینا۔ آپ کی اس زرینہ نے تو اسے صرف پیدا کیا تھا۔ اسے پالا میں نے ہے۔ اس کی خاطر راتوں کو میں جاگی ہوں' وہ روئی ہے تو آنسو میرے کلیجے پر گرے ہیں۔ مجھے پھر بھی سوتیلی ماں نہ کہنا۔ میں نے تو زندگی تج دی آپ کے لیے آپ کی اولاد کے لیے اور آج انعام میں مجھے آپ یہ طعنہ دے رہے ہیں۔

جائیں پوچھیں اس سے جس کی میں سوتیلی ماں ہوں کہ یاسمین بیگم کون ہے' اس سے پوچھیں کہ زرینہ اس کی کیا لگتی ہے۔ وہ آپ کو بتائے گی کہ اس کی ماں کون ہے۔ وہ آپ کو بتائے گی کہ یاسمین اور زرینہ میں کیا فرق ہے۔

میں کم صورت تھی' اَن پڑھ تھی' آپ کے معیار پر پورا نہیں اترتی تھی' یہ میں جانتی تھی لیکن کیا یہ سب بدلنا میرے بس میں تھا؟ میں تو اتنا کر سکتی تھی کہ محبت سے سب کے دلوں میں گھر کروں۔ میں نے اپنی ایک ایک سانس کے ساتھ اس حویلی کی ایک ایک اینٹ سے محبت کی ہے

اور آپ نے مجھے ان سب محبتوں کے جواب میں کیا دیا؟ سوتیلی ماں ہونے کا طعنہ؟

میں تو سوتیلی ماں ہوں پھر بھی میں نے ریشماں کے دل میں اُٹھنے والی ٹیسوں کو محسوس کر لیا۔ آپ اس کے سگے باپ ہیں' کیا آپ جان سکے کہ وہ عبداللہ کو کس قدر چاہتی ہے؟''

پیر صاحب خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے لیکن ان کی آخری بات نے پیر صاحب کو سن کر کے رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے' خواب گاہ کا دروازہ بری طرح پیٹا جانے لگا۔

یاسمین بیگم نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

''کون ہے؟'' وہ غصے سے دہاڑے۔

جواب میں دروازہ کھول کر چند عورتیں پھولی سانسوں اور کانپتے جسموں کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔

''ہم برباد ہوگئے پیر صاحب۔'' وہ زمین پر بیٹھ کر بین کرنے لگیں۔ ''ان ظالم درندوں نے شاہ صاحب کو ختم کر دیا۔ ہائے' ان کی وہ خون سے بھری لاش دیکھنے سے پہلے ہم اندھے کیوں نہ ہوگئے۔''

''کیا؟ کیا بکواس کر رہی ہو۔'' پیر صاحب تیزی سے باہر نکلے۔

☆=====☆=====☆

حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ امداد علی کی گولیوں سے چھلنی لاش کے گرد عورتیں بین کر رہی تھیں۔ پیر صاحب شہر جا چکے تھے جہاں کے اسپتال میں خادم حسین شدید زخمی حالت میں بے ہوش پڑا تھا۔ گاؤں کے دو اور گھروں میں بھی ماتم ہو رہا تھا لیکن جو آہ و بکا حویلی سے اٹھ رہی تھی' ویسی بات اور کہیں نہیں تھی۔ پیر صاحب کے ایک صاحبزادے کو ان کے دشمنوں نے درندگی کا ثبوت دیتے ہوئے قتل کر دیا تھا اور دوسرے گدی کے وارث کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

یاسمین بیگم ایک ٹک سکتے کی سی کیفیت میں بیٹے کی خون آلود لاش دیکھ رہی تھیں۔ ریشماں پر غشی کی کیفیت طاری تھی۔ رہ رہ کے وہ بھائی کی میت کی طرف بھاگتی تھی۔ اسے ابدی نیند سے جگانے کی کوشش کرتی تھی اور اس کوشش میں ناکام ہو کر غش کھا کر گر پڑتی تھی۔

باہر مردانے میں بھی چیخ و پکار مچی ہوئی تھی لیکن بھائیوں کی آنکھیں خشک تھیں۔ خادم اور امداد سے چھوٹے بھائی سیّد مکرم علی شاہ کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ چھوٹے چچا سخاوت بابا بھی اندر سے اُبل رہے تھے۔

مکرم علی نے اپنے سے چھوٹے تینوں بھائیوں کو اندر گول کمرے میں بلوایا۔ سخاوت بابا بھی اس کے ساتھ تھے۔

''صاف ظاہر ہے کہ کسی نے یہاں سے مخبری کر دی تھی۔'' مکرم نے بغیر تمہید کے کہنا شروع کیا۔ ''اس مخبر کو تو میں کتے کی موت ماروں گا ہی لیکن جو کچھ حیدر علی کے کتوں نے ہمارے

بھائیوں کے ساتھ کیا ہے' اس کے لیے وہ لوگ کسی معافی کے مستحق نہیں ہیں۔''

سبط حسن' حضور علی اور نوازش علی سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''حیدر علی' عبداللہ شاہ' تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔'' اس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ''ہم تمہیں تہس نہس کر دیں گے۔ تمہیں اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔''

''علی بھائی' کاش آپ نے یہ نہ کیا ہوتا۔'' سخاوت بابا جیسے خود سے بولے۔

''میں نے تم تینوں کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ امداد بھائی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ خادم بھائی کی زندگی کا کچھ پتا نہیں۔ اب پیچھے ہم چار بھائی ہیں۔ اپنے بھائی کی موت اور اپنی ذلت کا بدلہ ہم نے لینا ہے۔ حیدر علی کا ایک جوان بیٹا ہے' وہ اتنا کچھ کر گیا اور ہم چھ جوان بھائی کچھ نہ کر سکے' لیکن اب ہم کریں گے۔ ہمیں امداد بھائی کی میت پر یہ قسم کھانی ہے کہ جب تک ہم ان کے قاتلوں سے بدلہ نہیں لیں گے تب تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اٹھو۔'' مکرم علی اٹھ کھڑا ہوا۔

سخاوت بابا' نوازش اور حضور علی اس کی تقلید میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیا بات ہے سبط۔ تم کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟'' مکرم علی نے اس کی طرف دیکھا۔

''ایک منٹ اگر آپ میری بات بھی سن لیں۔''

''جلدی کہو۔''

''آپ بیٹھیں تو۔''

''تم بات کرو' یہ وقت اطمینان سے بیٹھنے کا نہیں ہے۔'' مکرم کے لہجے میں تیزی تھی۔

''حملہ کرنے ہم لوگ گئے تھے ناں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' مکرم علی نے مختصراً جواب دیا۔

''یعنی غلطی کی پہل ہم نے کی۔ انہوں نے صرف اپنا دفاع کیا۔ وہ ہمیں نہ مارتے تو ہم ان کو مار دیتے۔ بات صرف یہ تھی کہ کس کا داؤ چلتا ہے۔ امداد بھائی کی وفات پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے لیکن بدلے وغیرہ کی قسمیں کھا کر ہم مزید حماقت کا ثبوت کیوں دیں؟ جو معاملہ ختم ہو گیا' اسے آپ بھی ختم کر دیں۔''

ان سب کی آنکھوں میں حیرت' غصے اور اشتعال کے سائے لہرانے لگے۔

''یہ تم کہہ رہے ہو سبط۔'' مکرم علی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''یہ مت بھولیں مکرم بھائی کہ صرف چند برس قبل تک بابا جان اور حیدر بابا اس حویلی میں اسی حیثیت کے ساتھ اکٹھے رہتے تھے جو آج میری اور آپ کی ہے۔ ہم جو آج ایک بھائی کے خون پر بدلہ لینے اور مر جانے کی قسمیں کھانے لگے ہیں' کیا یہ ممکن نہیں کہ کل ہم بھی اسی طرح ایک دوسرے کا خون بہانے لگیں' جیسے آج بابا جان اور حیدر علی کر رہے ہیں۔''

''تم ہمارے بھائی نہیں ہو سبط۔'' مکرم علی کی آنکھوں میں اشتعال کے ساتھ ساتھ دکھ بھی تھا۔ ''تم اس حویلی اس خاندان کے بیٹے نہیں ہو۔ تم کسی انتہائی گھٹیا خاندان کے ایک انتہائی گھٹیا اور بزدل مرد لگ رہے ہو۔ تم حیدر علی کی طرف داری کر رہے ہو کہ ہم اپنے بھائی کا خون بھول جائیں۔ اس بے حیائی کا مظاہرہ کرنے پر حیدر علی کو صرف اس لیے معاف کر دیں کہ وہ بابا جان کا بھائی ہے۔ وہ لوگ چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال کرتے رہیں۔ ان کی بیٹیاں جنہیں اس حویلی کی بہویں بننا تھا' وہ مردوں کے ساتھ آزادانہ اُٹھتی بیٹھتی رہیں اور ہم خاموش تماشائی بنے رہیں۔ ایسا صرف تم کر سکتے ہو سبط ہم میں سے کوئی بے غیرت نہیں ہے پھر تمہارے خون میں یہ بے غیرتی کہاں سے آ گئی۔''

''کاش آپ میرے بھائی نہ ہوتے۔ مجھے بے غیرت کہہ کر زمین پر کھڑا رہنے والا اب تک پیدا نہیں ہوا۔'' سبط نے غصے سے کہا۔

''میں تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتا۔ اتنے غیرت مند ہو تو ہمارے ساتھ قسم کھاؤ ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' اس نے مکرم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''ورنہ۔'' اس نے اپنا ماؤزر نکال لیا۔ ''کسی بے غیرت انسان کے لیے ہماری حویلی اور ہمارے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

☆=====☆=====☆

عبداللہ کو کندھے میں گرم سیسہ اترتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ فائرنگ ایک دم ہی شروع ہو گئی تھی۔ پہلے ٹائر پھٹے تھے۔ ایسے میں گاڑی کو کنٹرول کرنا بہت مشکل تھا لیکن اپنی تمام تر مہارت کو کام میں لاتے ہوئے عبداللہ نے گاڑی کو الٹنے سے بچا لیا تھا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان کے پاس سے گزری اور دوسری اس کے کندھے میں پیوست ہو گئی۔ اسے اپنا بازو بالکل ناکارہ محسوس ہو رہا تھا۔ درد ایک دم ہی سارے جسم میں سرایت کرتا چلا گیا۔

جیسے ہی گولیوں کا پہلا برسٹ آیا تھا کھیتوں میں امداد اور خادم حسین کی پارٹیوں کا نشانہ لیے عبداللہ کے محافظوں نے بھی فائر کھول دیا۔ اپنی تمام تر قوتِ ارادی کو کام میں لاتے ہوئے عبداللہ نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اسی دوران اسے احساس ہوا تھا کہ فتح محمد شدید زخمی ہو گیا تھا۔ گولیوں کے تبادلے کا سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ نیاز پور والے پہلے ہی اس کے آدمیوں کے نشانے کی زد میں تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی یوں خاموشی چھا گئی تھی جیسے یہاں کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

خون قمیص کو تر کرتا جا رہا تھا۔ ہنگامی امداد کے لیے اس نے جو تیسری پارٹی تشکیل دی تھی وہ فوراً آ پہنچی۔ دونوں طرف کے زخمیوں کو فوراً شہر کے اسپتال پہنچایا گیا اور لاشیں گھروں کو روانہ کر

دی گئیں۔

اسپتال میں ڈریسنگ کروا کے عبداللہ کمرے سے باہر نکلا تو نور محمد وہیں کھڑا تھا۔

''فتح محمد کو ہوش آ گیا؟''

''جی حضور' آپ کی دعاؤں سے وہ اب ہوش میں ہے خون بھی لگا دیا ہے اسے۔'' نور محمد نے کہا۔

''باقی کیا رپورٹ ہے؟''

''امداد شاہ صاحب کی میت ان کی حویلی میں پہنچا دی گئی ہے۔ سنا ہے پیر صاحب آنے والے ہیں یہاں۔''

''اور خادم حسین کی حالت کیسی ہے؟''

''ڈاکٹر زیادہ پُر امید نہیں ہیں۔ انہیں کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ اب تک بے ہوش ہیں وہ خون بہت زیادہ بہہ چکا ہے۔''

''خادم حسین کا کمرا کون سا ہے؟''

''انہیں انتہائی نگہداشت میں رکھا ہوا ہے۔'' نور محمد نے بتایا۔

''میں ایک نظر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''کیا کرتے ہیں شاہ صاحب' یہاں سے نکلنے کی کریں پیر صاحب آتے ہی ہوں گے۔'' نور محمد بوکھلا گیا۔

''مجھے یہ بحث و تکرار پسند نہیں ہے۔'' عبداللہ نے سختی سے کہا۔

خادم حسین کی حالت واقعی بہت خطرناک تھی۔ ڈاکٹروں کی بھاگ دوڑ جاری تھی۔

''خون بہت بہہ چکا ہے۔ زخم سب خطرناک ہیں پتا نہیں اب تک یہ زندہ کیسے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ضرورت ہو تو میں خون دے سکتا ہوں۔'' عبداللہ نے پیشکش کی۔

''آپ؟'' ڈاکٹر نے قدرے حیرت سے کہا۔

''ہاں' ہمارا ایک ہی خون ہے۔''

''شاہ صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں۔'' نور محمد کی سمجھ میں اس کی بات نہ آئی۔ ''دشمن کو زندگی دے رہے ہیں شاہ صاحب؟''

''دشمنی تب تک تھی نور محمد جب تک یہ دشمنی نبھانے کا اہل تھا۔ یہ اپنے پاؤں پر چلنے پھرنے لگا تو ہمارے درمیان یہ رشتہ پھر قائم ہو جائے گا۔ پر ابھی یہ صرف انسان ہے جو ہمدردی کا مستحق ہے۔ ہر رشتہ خوبصورتی سے نبھانا چاہیے۔''

عبداللہ اسپتال سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کی نگاہ سامنے سے آتے

ہوئے پیر صاحب پر پڑی اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے پیر صاحب ٹھٹکے۔ ان کی نگاہوں میں قہر وغضب کی پرچھائیاں تھیں۔ انہیں نظر انداز کر کے عبداللہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

اماں جان پریشان تھیں۔ ''آپ کو معلوم ہے اُن کا ردِعمل کیا ہوگا؟''

''معلوم ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''وہ عبداللہ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میرا بیٹا بہت غیر محفوظ ہوگیا ہے۔''

وہ بھی یہی سوچ رہے تھے۔ برسوں پہلے بابا جان نے لاہور میں گلبرگ میں تینوں بھائیوں کے لیے ایک ہی چار دیواری کے اندر الگ الگ تین وسیع وعریض کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ وقت تبدیل ہوا تو ایک ہی احاطے میں دیواریں کھڑی ہوگئیں۔ عبداللہ لاہور میں جس کوٹھی میں مقیم تھا' اس کے ایک طرف پیر صاحب اور دوسری جانب سخاوت علی کی کوٹھیاں تھیں۔

''اور معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوگا' گڑیا اور زینی بھی اس کی لپیٹ میں آئیں گی' وہ ہمیں ان کی شادی کہیں اور نہیں کرنے دیں گے' یہ لکھوالیں مجھ سے۔'' فوزیہ بیگم نے کہا۔

یہ بات تو وہ بھی جانتے تھے کہ انہوں نے خاندانی روایات سے بہت بڑی بغاوت کی تھی۔ انہیں تعلیم دلوا کر خاندان بھر میں معتوب کر دیا تھا اور اب جلد ہی ان کی شادی کا مرحلہ آنے والا تھا۔

اس کی تو انہیں پہلے ہی خبر تھی کہ رسمی بات چیت کے بغیر بھی خاندانی رُوایات کے مطابق زہرا کا رشتہ خادم حسین اور زینب کا امداد علی سے طے ہو چکا تھا لیکن وہ ایسی کسی روایت کو ماننے پر تیار نہیں تھے۔ اپنی بیٹیوں کو اس جہنم میں جھونکنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ اگر خاندان کی روایات کو ہی دیکھا جاتا تو امداد علی کی موت کی وجہ سے زینب کو شادی کے بغیر ہی بیوگی کی زندگی گزارنا تھی۔

خادم حسین کا بھی کچھ علم نہیں تھا۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔ اب اس دشمنی کو لگام ڈالنے کا صرف اور صرف ایک طریقہ تھا۔ عبداللہ اور ریشماں کی شادی۔

اگر ریشماں بہو بن کر ان کے گھر آ جاتی تو پیر صاحب کا گھرانہ اپنے اُٹھے قدم روک سکتا تھا۔ یوں بھی وہ ریشماں کو پیر صاحب کی حویلی سے نکالنا چاہتے تھے۔ یہ ان کی زندگی کی بڑی خواہشوں میں سے ایک خواہش تھی۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' فوزیہ بیگم نے پوچھا۔

''اس وقت اس کے علاوہ کیا سوچ سکتا ہوں کہ ان حالات کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔''

''میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہوگئی ہوں مگر کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔''

''ایک راستہ اب بھی باقی ہے لیکن بہت مشکل۔'' وہ بولے۔

''ہے کیا؟'' فوزیہ بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

''اگر بیٹیوں کے سلسلے میں ان کے کسی تقاضے سے پیشتر عبداللہ اور ریشماں کی شادی ہو جائے تو۔''

''آپ مشکل کی بات کرتے ہیں یہ تو بالکل ناممکن ہے۔'' فوزیہ بیگم نے نفی میں سر ہلایا۔

''اب وہ اس رشتے پر کسی طور راضی نہیں ہوں گے اور بالفرض وہ مان گئے تو ساتھ میں گڑیا اور زینی کے لیے ضرور بات کریں گے اور اپنی بیٹیاں ان کے حوالے کر دینے پر میں تیار نہیں۔ میں انہیں یرغمال نہیں بنا سکتی' انہیں چولہے میں جھونک سکتی ہوں لیکن وہاں قطعاً نہیں۔''

زہرا نے کمرے کے اندر جھانکا۔

''میں آ جاؤں؟''

''آ جاؤ بیٹا۔'' اماں جان نے کہا۔

''نئی خبر سنیں۔ ہمارے بہت پیارے اور اکلوتے بھائی دشمنوں کو اپنا خون دے آئے ہیں۔'' وہ قالین پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا' کیا کہہ رہی ہو؟'' اماں جان کچھ نہ سمجھتے ہوئے پریشان ہوگئیں۔

''ہونا کیا تھا۔ پیر صاحب کی گدی کے وارث کا بہت خون بہہ گیا تھا۔ بھائی کی انسانیت جاگی اور آدھ لیٹر خون ان کے حوالے کر آئے۔''

''پاگل ہوگیا ہے وہ' اتنا بھی خیال نہ آیا اسے کہ وہ خود بھی زخمی ہے' اور وہ ڈاکٹر احمق تھے کیا؟'' اماں جان کو غصہ آ گیا۔

''ڈاکٹر احمق نہیں اندھا تھا اور رہی بات بھائی کے زخمی ہونے کی تو یہ ضرور ان کی حماقت تھی۔ بیل کے سامنے یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے کہ آ مجھے مار۔ پھر بیل کیا کرتا۔ اس نے ٹکر مار دی۔''

''چھوڑو اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔'' بابا جان نے کہا۔

زہرا بے اختیار ہنس پڑی۔ ''مائنڈ نہ کریں لیکن اماں جان یہ بات حماقت کی نہیں وراثت کی ہے۔''

''زہرا۔'' اماں جان نے اسے تنبیہی انداز میں گھورا پھر بابا جان سے مخاطب ہوئیں۔ ''کیا ہمیں ان کے ہاں تعزیت کے لیے جانا چاہیے۔''

زہرا نے پلکیں جھپکا کر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ''سب سے عجیب وغریب ترکیب ہمیشہ اماں جان کی طرف سے آتی ہے۔''

''ایسے نہیں کہتے گڑیا۔'' بابا جان نے کہا پھر اماں کی طرف مڑے۔ ''چلیں گے لیکن امداد علی کے دفن ہو جانے کے بعد۔ تب تک وہ لوگ کچھ کھا پی بھی چکے ہوں گے۔''

"یہ کیا بات ہوئی بابا جان؟" زہرا ان کی بات سمجھ نہ سکی۔

"بیٹا غم کی پہلی قسم اس وقت ٹوٹتی ہے جب تمام تر غم کے باوجود پہلا نوالہ انسان کے حلق سے نیچے اُتر جاتا ہے۔ انسان نفس کی طرف بڑھ جاتا ہے اور نفس انسان میں حساب کتاب کرنے اور نفع نقصان جانچنے کی صلاحیت جگا دیتا ہے۔"

"لیکن بابا جان وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پہلے قتل کیا اور اب تعزیت کیوں؟"

"اسے کسی اور نے نہیں خود اس نے قتل کیا ہے۔ ہم تو صرف اپنا دفاع کر رہے تھے۔"

"یہ محض لفظوں کا ہیر پھیر ہے بابا جان۔ ٹھیک ہے وہ اس قابل تھا کہ اسے قتل کر دیا جاتا سو کر دیا۔ اب تعزیت وغیرہ کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ہمیں اس کے مرنے کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ بلکہ ہم نے تو اطمینان کا سانس لیا ہے۔"

"فضول باتیں مت کیا کرو گڑیا۔" اماں جان جھنجھلا گئیں۔ "جس بات کو سمجھ نہیں سکتیں اس پر بحث مت کیا کرو۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔"

وہ کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

"ایسے مت ڈانٹا کرو بچیوں کو۔ پتا نہیں آگے ان کی قسمت میں کیا لکھا ہوا ہے۔ کم از کم جب تک ہمارے پاس ہیں تب تک تو خوش رہیں۔" بابا جان نے کہا۔

"انہیں بھی تو خواہ مخواہ کی بحث نہیں کرنی چاہیے۔ کبھی ہم ایسے اپنے ماں باپ کے سامنے بولے تھے؟"

بابا جان ہنس پڑے۔ "اگر اس گھر میں بھی وہی گھٹا ہوا ماحول رکھنا تھا تو انہیں تعلیم دلوا کر ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں بھی جاہل رہنے دیتے اور خاندان کی روایات کے مطابق ان کی شادیاں کر دیتے۔ پھر مسئلہ کیا تھا؟"

"آپ بہت ٹھنڈے دل سے سوچتے ہیں لیکن میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا۔ میں اپنے بچوں کو محفوظ اور خوش دیکھنا چاہتی ہوں لیکن کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

☆======☆======☆

سخاوت بابا نے بہت مشکل سے دونوں بھائیوں کو الگ کیا تھا۔ قہر آلود نگاہوں سے ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے وہ دونوں الگ ہو گئے تھے۔

"یہ وقت آپس میں جھگڑنے کا نہیں ہے۔ حویلی کا جتنا سر جھک گیا ہے اسے اور مت جھکاؤ۔ لوگوں کو یہ مت بتاؤ کہ تم بھائیوں کے درمیان دوریاں اتنی بڑھ چکی ہیں۔" سخاوت بابا نے سختی سے کہا تھا۔

حویلی میں سخاوت بابا کی بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ سب بھائیوں کے لیے ان کی بات کی وہی اہمیت تھی جو پیر صاحب کے لفظوں کی تھی۔ اس وقت پیر صاحب کی غیر موجودگی میں وہی ان

کی جگہ سنبھالے ہوئے تھے۔

مکرم، حضور اور نوازش علی، سخاوت بابا کے ساتھ اندر چلے گئے۔ سبط حسن گہری سانس لے کر وہیں بیٹھ گیا۔

اندر اماں جان کی چپ برقرار تھی اور ریشماں کی تڑپ بھی ویسی ہی تھی۔ بھائیوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ریشماں ان کی جانب دوڑی۔

"مکرم بھائی کو جگاؤ۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے خدا کے لیے بھائی کو جگاؤ۔" اس نے مکرم کو کھینچتے ہوئے کہا۔

مکرم نے ریشماں کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"ادھر کسی سے کہو آپی کی چادر لائیں۔" اس نے ہولے سے حضور علی کو مخاطب کیا۔

وہ اس کے ساتھ لگی روتی جا رہی تھی۔

"مکرم بھائی کو جگاؤ نا۔ خدا کے لیے۔"

حضور علی نے ریشماں کے سر پر چادر ڈال دی۔ مکرم اسے لے کر امداد علی کی میت کے پاس آیا۔ نوازش اور حضور علی بھی ان کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ مکرم نے بہن کی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور جھک کر بھائی کے جسم پر لگے خون سے اپنا ہاتھ تر کر لیا۔

"ہم سب بھائی اپنے بھائی کے خون اور بہن کے آنسوؤں کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ حیدر علی کے خاندان کے ایک فرد کو بھی جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ یہاں موجود لوگوں میں سے بہت سے لوگ ان کی حویلی جاتے ہیں۔ تم سب جا کر انہیں بتا دو کہ بھاگ سکتے ہیں تو بھاگ جائیں۔ ہم انہیں پاتال کی گہرائیوں سے بھی نکال لائیں گے۔

ہم قسم کھاتے ہیں کہ جس نے ہماری مخبری کی تھی اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کریں گے۔ عبداللہ شاہ یہ ہماری قسم ہے کہ تجھے ہم قتل کریں گے۔ اسی طرح جیسے تُو نے ہمارے بھائی امداد علی شاہ کو قتل کیا ہے۔ ہم تیرے جسم میں اتنے ہی چھید کریں گے جتنے تُو نے ہمارے بھائی کے جسم میں کیے ہیں۔ ہم تیرا خون اسی مٹی پہ بہائیں گے جس مٹی پر تُو نے ہمارے بھائی کا خون بہایا ہے اور پھر تیری لاش کے ٹکڑے گلیوں میں پھرنے والے کتوں کو کھلائیں گے۔"

ریشماں جو ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ یہ سب کچھ سن رہی تھی ایک دم چلا اُٹھی۔

"نہیں نہیں۔" اور بے ہوش ہو کر مکرم علی کے بازوؤں میں جھول گئی۔

ریشماں کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر، ایک ملازمہ کو اس کا خیال رکھنے کی ہدایت دے کر تینوں بھائی باہر مردانے میں نکل آئے۔

☆======☆======☆

جنت بائی کی خواہش اچانک ہی پوری ہو گئی تھی۔ نوری کی بے وقت موت نے ان کے

برسوں پرانے خواب بکھیر دیے تھے۔ انہوں نے پَل پَل گن کر دن کاٹے تھے۔ نوری کے جوان ہونے کا انتظار کیا تھا۔ کیا کیا نہیں کیا تھا انہوں نے نوری کے لیے۔ اور پھر نوری بھی تو حسن و خوبصورتی کا ایسا شاہکار تھی جس پر نظریں نہیں ٹکتی تھیں۔ اس کی ناگہانی موت نے جنت بائی کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

دھندا سب چوپٹ ہوا جا رہا تھا جب اچانک انہیں شمیم مل گئی۔ شمیم فلموں میں کام کرنے کے شوق میں کسی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی تھی۔ لڑکا فلموں میں تو کیا کام دلواتا اپنا مطلب پورا کر کے اسے چھوڑ گیا اور وہ دربدر بھٹکتی ہوئی جنت بائی تک پہنچ گئی تھی۔

جنت بائی کو تو جیسے خزانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ بے شک گاؤں کی اُجڈ گنوار لڑکی تھی۔ اس پر محنت کی بھی بہت ضرورت تھی لیکن جنت بائی کی نگاہوں سے اس کا خیرہ کن حسن چھپا نہیں رہ سکا۔ اسے تھوڑا سا چمکانے کی ضرورت تھی پھر وہ ان کے لیے سونے کی کان ثابت ہو سکتی تھی' اور حقیقت تو یہ تھی کہ انہیں سونے کی اس کان سے سونا نکالنے کے علاوہ بھی بہت سا کام لینا تھا۔ ان کے وجود کی راکھ میں ایک چنگاری اب بھی سلگ رہی تھی اور اس چنگاری کو انہوں نے بہت محنت سے بجھنے سے بچا رکھا تھا۔ اس چنگاری کو آگ بنا دینے کے جو خواب وہ برسوں سے دیکھتی چلی آ رہی تھیں' شمیم ان خوابوں کو تعبیر دے سکتی تھی۔

انہوں نے اسے سنوارنا' چمکانا شروع کر دیا تھا۔ نوری بنا کر۔

☆======☆======☆

امداد علی کو دفنایا جا چکا تھا۔ پیر صاحب ابھی تک شہر سے واپس نہیں آئے تھے۔ خادم حسین کے لیے وہ اپنی دولت پانی کی طرح بہانے کے لیے تیار تھے۔ فی الحال انہیں صرف اس بات کا انتظار تھا کہ خادم حسین خطرے کی حالت سے باہر نکل آئے اور ڈاکٹر اسے سفر کی اجازت دے دیں۔ وہ اسے علاج کی غرض سے امریکہ لے جانا چاہتے تھے۔

ان کے حساب کتاب کرنے والے ذہن نے فوراً یہ حساب لگا لیا تھا کہ جو بیٹا جا چکا تھا اسے وہ اپنی جان دے کر بھی واپس نہیں لا سکتے تھے لہٰذا اس کی میت پر بیٹھ کر بین کرتے رہنا بالکل فضول سی بات تھی۔ اس وقت ضرورت تھی اس بیٹے کو بچانے کی جو زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا اور جو ان کی گدی کا وارث تھا۔ حویلی کے معاملات کے متعلق وہ زیادہ پریشان نہیں تھے۔ سخاوت بابا وہاں موجود تھے اور پھر مکرم پر بھی انہیں بہت اعتبار تھا۔

امداد علی کو دفنانے کے بعد بھی بھائیوں میں سے کسی نے سبط حسن سے بات نہیں کی۔ شام کو شہر جا کر وہ بڑے بھائی خادم حسین کو بھی دیکھ آیا تھا جو اب تک بے ہوش تھا۔ بابا جان وہیں تھے اور بے حد بے چین بھی۔ سبط کو دیکھ کر کتنی دیر تک گاؤں کے حالات پوچھتے رہے۔ اس نے جان بوجھ کر اپنی اور مکرم علی کی لڑائی کا تذکرہ نہیں کیا۔

''بابا جان آپی بہت اپ سیٹ ہیں۔ انہوں نے اب تک کچھ نہیں کھایا پیا۔ اماں جان کی حالت بھی بہت بری ہے۔''

''ماں اور بہن کے دل بہت نازک ہوتے ہیں۔ تم لوگوں کو ہم نے اسی لیے وہاں چھوڑا ہے تاکہ ان کا خیال رکھ سکو۔ ہم سے زیادہ وہ تم لوگوں کی بات سنیں گی بیٹا۔ ہم تب تک یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے جب تک ڈاکٹر ہمیں ہمارے بیٹے کی زندگی کی خوش خبری نہیں سنا دیتے۔''

''بابا جان رات یہاں گزارنے سے آپ کو زحمت ہو گی۔ آپ گھر چلے جائیں' میں یہاں رہ جاتا ہوں۔ ڈاکٹر جیسے ہی یہ خوش خبری دیں گے' میں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر آپ کو فون پر اطلاع دے دوں گا۔''

''ہمارا یہاں رہنا ضروری ہے۔'' پیر صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم جاؤ۔ اپنی اماں جان اور ریشماں کی دیکھ بھال کرو۔''

اس کے تمام تر اصرار کے باوجود وہ واپس گاؤں نہیں آئے۔

''اچھا بابا جان جیسا آپ کا حکم لیکن جیسے ہی بھائی کو ہوش آئے' پلیز آپ فون کر کے اطلاع ضرور بجھوا دینا۔'' اس نے کہا۔

''یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔'' وہ بولے۔ ''اب تم جاؤ۔ گاؤں میں تم بھائیوں کی زیادہ ضرورت ہے۔''

نیاز پور واپس آ کر وہ سیدھا اماں جان کی خواب گاہ میں گیا۔ ان کی حالت بہت خراب تھی۔ بڑی مشکلوں سے انہیں کھانا کھلا کر وہ ریشماں کے کمرے میں آیا۔

سبط حسن کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ دوڑ کر آگے بڑھی اور اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

''سبط وہ بھائی کو لے گئے' بھائی چلا گیا۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ ''میں نے روکا پھر بھی وہ اسے لے گئے۔ کسی نے میری پروا نہیں کی' کسی نے میری نہیں سنی' میں منتیں کرتی رہی' میری بات کسی نے نہیں مانی۔''

''میں جو ہوں آپی آپ کا بھائی۔'' اس نے ریشماں کو بستر پر لٹانا چاہا۔

''میں نہیں لیٹوں گی' نہیں سوؤں گی' مجھے بتاؤ میرے بھائی کو کہاں چھوڑ آئے ہو۔ تم بھی تو ساتھ تھے۔ تم بھی اسے لے جانے والوں میں شامل تھے۔ میں نے تم سے بھی کہا تھا۔ تم سے بھی منتیں کی تھیں لیکن تم نے بھی نہیں سنا۔ کسی نے نہیں سنا'' اس نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا۔

''آپی ابھی ہم دونوں مل کر کھانا کھائیں گے پھر میں آپ کو ساری بات بتا دوں گا۔ کریمن' آپی کے لیے کھانا لاؤ۔''

"میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔" وہ چلائی۔ "کل بھائی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائے گا' میں اس کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گی۔ میرے بھائی کو بلاؤ۔"

"بس ابھی بلاتا ہوں انہیں' لیکن ایک شرط پر کہ آپ رونا بند کردیں گی۔ آپ روتی رہیں تو میں نہیں بلاؤں گا۔"

"سب جھوٹ بول رہے تھے ناں؟ میرا بھائی زندہ ہے ناں؟" اس کے لہجے میں امید کی پرچھائیاں اتر آئیں۔

"کریمن جلدی کھانا لاؤ۔" اس نے جان بوجھ کر ریشماں کی بات نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے بہت بھوک لگی ہوئی ہے اور کھانا میں صرف اپنی آپی کے پیارے پیارے ہاتھوں سے کھاؤں گا۔"

"دیکھ سبط میں اپنے آنسو پونچھ رہی ہوں۔ تم اپنے وعدے سے پھرنا مت۔" ریشماں نے چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

سبط حسن نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی ذہنی حالت نارمل نہیں تھی۔

جو کچھ ہو چکا تھا۔ اس کا ذہن اسے رد کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کے محبت کرنے والے دل ودماغ کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ وہ اس حادثے کو سمجھ ہی نہیں سکی تھی قبول کیسے کرتی۔ اسے اس وقت صرف اس قدر یقین دہانی کی ضرورت تھی کہ اس کا بھائی امداد علی زندہ تھا۔ اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ جو کچھ اس نے دیکھا تھا' وہ صرف ایک خواب پریشاں تھا۔

رورو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چادر کا اسے کوئی ہوش نہیں تھا' پاؤں میں جوتا تک نہیں تھا۔

"پتا ہے سبط آج مکرم کیا کہہ رہا تھا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو پھر رواں ہو گئے۔ "کہہ رہا تھا کہ وہ انہیں مار دے گا۔ میرے عبداللہ کو مار دے گا۔ اسے روکو سبط عبداللہ کو کچھ ہو گیا تو میں مرجاؤں گی۔"

سبط حسن کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ریشماں اس سے بہت قریب ہے۔ وہ بہت کم گو تھی لیکن اس کے ساتھ دنیا جہان کی باتیں کیا کرتی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی بہن کو اچھی طرح جانتا تھا۔

مگر نہیں وہ تو کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

ریشماں رو رہی تھی اس مرتبہ عبداللہ کی خاطر اور وہ حیران تھا۔ ہاں ریشماں اور عبداللہ منگیتر تھے لیکن ہر کوئی جانتا تھا کہ اب یہ شادی ممکن نہیں۔ حویلی میں عرصہ ہوا اس نسبت کا ذکر تک ختم ہو چکا تھا لیکن ریشماں کے دل کی گہرائیوں میں اب تک یہ بات دفن تھی۔ اس کا اسے کیا کسی کو بھی شاید اندازہ نہیں تھا۔

اپنے اندر کا غبار شاید وہ آج بھی باہر نہ نکالتی مگر آج وہ اپنے آپ میں کب تھی۔ اسے تو علم بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ کس کے سامنے کہہ رہی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر کسی دیوار سے ٹکرا کر پھوڑ لے۔ ابھی تو وہ ایک معمے کے ٹکڑے جوڑنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ کہ ریشماں نے دوسرے معمے کے ٹکڑے اس کے سامنے ڈھیر کر دیے تھے۔

بڑی مشکلوں سے جھوٹ سچ بول کر اس نے ریشماں کو کھانا کھلایا اور نیند کی گولی کھلا کر سلا دیا۔ اس وقت اسے آرام کی سخت ضرورت تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ یہ اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ اس کے تھکے ہوئے ذہن کو بھی آرام کی ضرورت تھی لیکن وہاں آرام کہاں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فون اُٹھایا اور اسپتال کا نمبر ڈائل کیا مگر وہاں اب بھی صورتِ حال ویسی ہی تھی۔ نوازش اور حضور علی وہیں پیر صاحب کے پاس تھے۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

سگریٹ سلگا کر وہ بیتے دنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس دن کے بارے میں جب وہ فوٹو گرافی کے ارادے سے کیمرا کندھے پر لٹکائے' گھوڑا گلی میں واقع اپنے ہٹ سے نکلا تھا۔

اس روز جمعہ تھا۔ کالج کی چھٹی کو وہ اکیلے ہی انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے دوستوں کو لیے بغیر ہی وہ مری کی طرف چل دیا۔ موسم میں خنکی بڑھ چکی تھی اور دھوپ بھی پھیکی اور بے رنگ سی تھی۔

شام سے کچھ پہلے وہ واپسی کی نیت سے آہستہ آہستہ پہاڑ سے اترنے لگا' جب وہ اسے نظر آئی۔

اونچے نیچے راستوں پر خراماں خراماں چلتی کندھے پر بیگ لٹکائے' ہاتھ میں ایک لفافہ اور اسٹرابیری کا ڈبہ تھامے وہ پہاڑ کے اوپر چڑھ رہی تھی' اسے احساس نہیں تھا کہ اس وقت وہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ چلتے چلتے وہ ڈبے سے اسٹرابیری نکال کر کھاتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔

وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگا۔ لڑکی بہت خوبصورت یا حسین نہیں تھی لیکن بہت تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا اطمینان تھا۔ اتنے مطمئن اور خوش چہرے اس نے کم ہی دیکھے تھے۔

سبط دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گہری نیلی شلوار قمیص کے اوپر ڈینم کی نیلی جیکٹ میں ملبوس' سلک کے نیلے مفلر سے کانوں اور آدھے سر کو ڈھکے اس کے چہرے پر تردد اور فکر کی ایک بھی لکیر نہیں تھی۔

اچانک ہی اس کا پاؤں رپٹا' ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس نے درخت کا سہارا لیا اور خود تو

گرنے سے بچ گئی لیکن ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ نیچے گر گیا۔ لفافے میں مالٹے تھے۔ نیچے گرتے ہی سب مالٹے پھدک کر پہاڑ سے نیچے لڑھکنے لگے۔ پہلے تو اس نے ایک آدھ مالٹے کو قابو کرنے کی کوشش کی لیکن جب کوئی بھی اس کے ہاتھ نہ آیا تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور نیچے کی طرف لڑھکتے ہوئے مالٹوں کا نظارہ کرنے لگی۔ ویسے تو اچھلتے کودتے ان مالٹوں نے کوئی ایسی مزاحیہ حرکت نہیں کی تھی جس پر ہنسا جا سکتا بلکہ درجن بھر مالٹوں کے فرار ہو جانے پر اصولاً پہلا ردِعمل افسوس کرنے کا ہی ہونا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں وہ انہیں دیکھ کر ہنسنے لگی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی بلکہ ہنستی چلی جا رہی تھی۔ ایسے میں وہ سبط کو بہت اچھی لگی۔ نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے کیمرا سیدھا کیا اور اس کی تصویر کھینچ لی۔

لڑکی کی ہنسی کو بریک اس وقت لگے جب کلک کی آواز اُبھری اور اس کے چہرے سے فلیش کی روشنی ٹکرائی۔ ایک دم اس نے سبط کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو ٹھٹکی پھر اس کی طرف بڑھی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' ماتھے پر تیوریاں ڈال کر اس نے کہا۔

''کون سی بدتمیزی؟'' وہ ایک دم انجان بن گیا۔

''بغیر اجازت کسی کی تصویر کھینچ لینا بدتمیزی ہوتی ہے۔''

''میں بہت حسن پرست ہوں اس لیے آپ کی تصویر نہیں کھینچ سکتا' اطمینان رکھیے۔ ابھی تو یونہی فلیش چمک گئی تھی۔'' سبط نے آرام سے کہا۔

اس کی بات سن کر لڑکی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ چند لمحے وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورتی رہی۔

''تم بدتمیز ہی نہیں' بے ہودہ انسان بھی ہو۔'' بالآخر وہ بولی۔

''ثبوت پیش کرو ورنہ اپنے یہ غیر پارلیمانی الفاظ واپس لو۔'' سبط نے بھی فوراً کہا۔

''ثبوت اس کیمرے میں محفوظ ہے۔'' وہ بھی تیزی سے بولی۔

''کیمرے میں صرف بدتمیزی کا ثبوت ہے' بے ہودگی کا نہیں۔'' اس نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

چند لمحے وہ پُرخیال نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''وہ اوپر میرا گھر ہے' وہاں چل کر کافی پیتے ہیں۔''

سبط نے اس طرف دیکھا جہاں لڑکی نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں بہت خوبصورت ساہٹ تھا۔

''نہیں شکریہ' مجھے مار کھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

لڑکی کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی اتنی محنت سے

سوچی ہوئی اسکیم سبط نے اتنی آسانی سے سمجھ لی تھی۔

''اوہ یو۔'' اس نے آگے انگریزی میں یقیناً کوئی گالی دی تھی جو دانت پیسنے کے باعث اس تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے کیمرا جھپٹنا چاہا۔ کیمرا تو خیر وہ نہ چھین سکی البتہ اس کے لمبے اور تیز ناخن سبط کے بازو اور ہاتھ پر خراشیں چھوڑ گئے۔

''دیکھو' مجھے تصویر دے دو ورنہ بہت برا ہو گا۔'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''انسانوں کی طرح پہلے مانگ لی ہوتی تو مل جاتی مگر اب کچھ دن انتظار کرنا ہو گا۔''

وہ پہاڑ سے نیچے اتر گیا۔ لڑکی کافی دیر تک وہیں کھڑی اسے تکتی رہی۔

کیمرے میں وہ آخری تصویر بچی تھی۔ سبط گاڑی لے کر راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ وہ فوری طور پر ریل دھلوانا چاہتا تھا۔

اسے احساس تھا کہ اس نے لڑکی کے ساتھ واقعی بدتمیزی ہی نہیں بے ہودگی بھی کی تھی لیکن اسے لڑکی کے ردِعمل محظوظ کر رہے تھے۔ پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر سبط کو بہت خوشگوار احساس ہوا۔

فوٹو گرافی اس کا شوق نہیں جنون تھا۔ اس جنون کی تکمیل میں اس نے بہت سے چہرے دیکھے تھے۔ حسین اور خوبصورت لوگوں کی خوشی کے بہت سے لمحات اس نے قید کیے تھے لیکن آج تک اس نے کسی کے چہرے پر اتنی طمانیت...... اتنا خلوص اور سچی خوشی نہیں دیکھی تھی۔

دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی تھی لیکن نہ کسی کے پاس راستہ تھا' نہ منزل۔ خوشیاں ملتی نہیں تھیں۔ تخلیق کی جاتی تھیں۔ طمانیت سے بھرپور چہروں پر بھی کہیں نہ کہیں فکر اور پریشانی کی لکیر ضرور دکھائی دیتی تھی۔

مگر اس کے چہرے پر کہیں پریشانی کی ایک لکیر بھی نہیں تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ پرچھائیاں کبھی اس کے چہرے پر نہیں پڑ سکتیں لیکن وہ تو ایک لمحے میں مشتعل ہو گئی تھی۔

اس کا یہ روپ بھی دلکش تھا۔ اسے مشتعل ہونا ہی چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو محض تکنیکی اعتبار سے ایک اچھی تصویر ہی رہتی اور تصویر بہر حال تصویر ہی ہوتی ہے۔ زندگی کی حرارت سے خالی۔ سبط کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ اکیسویں صدی کی ہی ایک فرد تھی۔

اور پھر اگلے ہی روز شام کو وہ اس کی تصویر لے کر اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ جیسا کہ اسے توقع تھی' وہ تصویر بہترین تصویروں میں شمار کی جا سکتی تھی۔

گیٹ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ دائیں جانب چھوٹا سا خوبصورت لان تھا' سامنے گیراج میں چمکتی ہوئی پجیرو کھڑی ہوئی تھی۔ گھر میں چاروں طرف خاموشی تھی۔ وہ مخصوص آوازیں جو گھر میں کسی کی موجودگی کا پتا دیتی ہیں۔ بالکل نہیں تھیں' نہ جھاڑو کی آواز' نہ پریشر ککر کی شوں شوں نہ پانی گرنے کی ٹپ ٹپ اور نہ کسی کے باتیں کرنے کی آواز۔

اس نے آگے بڑھ کر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والی درمیانی عمر کی ایک خوش لباس خاتون تھیں۔

"جی فرمایئے؟" انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

سبط کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا کہ دروازہ کوئی اور بھی کھول سکتا ہے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ لڑکی کی والدہ ہو سکتی تھیں۔

وہ اب بھی سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"میں سبط حسن ہوں، آپ مجھے صرف سبط بھی کہہ سکتی ہیں کیونکہ سب قریبی لوگ مجھے یہی کہتے ہیں۔ اگر آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دیں تو میں کچھ وضاحت کر سکوں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ وضاحت لان میں بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہے مسٹر حسن۔" وہ بولیں۔ "آپ وہاں تشریف رکھیں میں ابھی آ رہی ہوں۔"

"جی ضرور۔" وہ لان کی طرف بڑھ آیا اور ایک لان چیئر پر بیٹھ گیا۔

"خاصی سخت گیر قسم کی والدہ پائی ہیں اس لڑکی نے۔" اس نے سوچا۔ "کتنے اطمینان سے مسٹر حسن کہہ کر انہوں نے یہ احساس بھی دلا دیا کہ نہ وہ قریبی لوگوں میں شمار ہوتی ہیں اور نہ ہونا چاہتی ہیں۔"

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے خاتون برآمد ہوئیں انہیں آتے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"تشریف رکھیں۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "اور کہیے آپ غالباً کسی وضاحت کی بات کر رہے تھے۔"

"جی ہاں۔ دراصل میں بدتمیز نہیں ہوں لیکن کل بلاوجہ، بالکل غیر ارادی طور پر مجھ سے ایک بدتمیزی سرزد ہو گئی تھی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ ان کی جانب بڑھایا۔ "مجھے...... فوٹوگرافی کا کریز ہے لیکن میں چہروں کی نہیں جذبوں کی تصویریں کھینچتا ہوں۔ کل آپ کی بیٹی کے چہرے پر مجھے اتنے شفاف جذبات نظر آئے کہ میں نے بے ساختہ اس کی تصویر کھینچ لی۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن فوٹوگرافر اپنی کھینچی ہوئی تصویر ضائع نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب اسے یقین ہو کہ وہ تصویر بہت اچھی آئے گی۔ اس لیے میں نے کیمرے کی ریل انہیں نہیں دی۔ اس ریل میں ان کی تصویر کے علاوہ بھی بہت سی تصویریں تھیں جو میں نے بہت محنت سے کھینچی تھیں۔"

خاتون نہ صرف اس کی بات سن رہی تھیں بلکہ اتنی دیر میں لفافے سے تصویر اور نیگٹو نکال کر بھی دیکھ چکی تھیں۔

"اب تو جو ہوا سو ہوا۔" بالآخر وہ بولیں۔ "لیکن آپ کو ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی [illegible]ن یہ آپ کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ کیا میں یقین کر لوں کہ اس تصویر کا کوئی

پرنٹ آپ کے پاس نہیں ہے؟"

"دیکھیں خاتون آپ مجھے جانتی نہیں تھیں، پہچانتی نہیں تھیں، میں یہ نیگٹو آپ کو نہ دیتا تب بھی آپ مجھے ڈھونڈ نہیں سکتی تھیں۔ ایسے میں جب میں خود آپ کے پاس یہ تصویر لے آیا ہوں تو مجھ پر شک کرنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔"

"اس خوش فہمی میں مت رہیں کہ آپ کو ڈھونڈا نہیں جا سکتا تھا۔ اینی وے میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ یہ چیزیں لے کر خود ہی آ گئے۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں چلتا ہوں۔"

خاتون اسے گیٹ تک چھوڑنے آئیں۔ گیٹ پر ہی اس کا سامنا ایک مرتبہ پھر اسی لڑکی سے ہوا۔ وہ گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے دو ملازمین بھی تھے۔ ایک مرد، ایک عورت۔ مرد پٹھان تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے ذمے محافظت کے فرائض تھے۔ ملازمہ مقامی تھی۔

لڑکی تقریباً اسی دن والے حلیے میں تھی۔ براؤن شلوار قمیص، چمڑے کی جیکٹ اور مفلر کے ساتھ کندھے پر بیگ لٹکائے ہاتھ میں اسٹرابیری کا ڈبہ لیے چہرے پر وہی طمانیت اور سکون۔

گیٹ کے دوسری جانب سبط کو کھڑے دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ تیزی سے گیٹ کھول کر وہ خاتون کی طرف بڑھی۔

"دیدی، یہ وہی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ آپ اندر جائیں زینی۔" وہ بولیں۔

"جی دیدی۔" ایک نظر اس پر ڈال کر وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

سبط کے گیٹ سے نکلنے تک وہ پٹھان محافظ اچھی طرح اس کا جائزہ لے چکا تھا۔

☆======☆======☆

اس کے بعد سبط حسن کا معمول ہو گیا۔ جمعہ کا دن وہ مری میں ہی گزارتا تھا، نہ صرف جمعہ بلکہ ہر ایسے دن جب وہ فارغ ہوتا، اس پہاڑی پر ضرور جاتا۔ زینی اسے اچھی لگی تھی۔ ویسے تو اس نے خاتون کو دیدی کہا تھا مگر وہ اسے کسی صورت اس کی بڑی بہن نہیں لگی تھیں۔

"کچھ گھروں میں ماؤں کو بھی آپی، باجی وغیرہ کہا جاتا ہے۔" اس نے سوچا۔ "ہو سکتا ہے زینی دیدی کہتی ہو۔"

اس دوران زینی اکثر اسے نظر آتی تھی لیکن اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا تھا۔ شاید اسے اکیلے باہر نکلنے کی اجازت نہیں رہی تھی۔ وہ اس کے قریب سے بھی ایسے گزرتی تھی جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔

موسم مزید ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا اور برفباری کسی بھی وقت متوقع تھی۔ وہ دن بھی سبط

مری ہی میں گزارا تھا اور حسبِ معمول زینی کے گھر کے قریب بھی گیا تھا۔ ابھی وہ واپسی کا پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ زینی کی ملازمہ گھر سے نکلی اور تیزی سے نیچے کی طرف چل دی۔

''شاید آج زینی کا باہر نکلنے کا پروگرام نہیں ہے موسم بھی تو بہت خراب ہے۔'' اس نے سوچا۔

وہ بھی نیچے اترنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دور چلا تھا کہ برف کے نرم نرم گالے نیچے گرنے لگے۔ ایک دن پہلے شاید بارش بھی ہو چکی تھی۔ اب جو برفباری شروع ہوئی تھی تو یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہنا تھا۔ تیزی سے چلتے ہوئے وہ سیسل ہوٹل کی طرف بڑھا جہاں اس کے لاہور کے دو دوست بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کی جیپ بھی انہی کے پاس تھی۔ ان سے ملنے کے بعد اس کا ارادہ فوری طور پر گاؤں نکل سے جانے کا تھا۔

دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگانے میں وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ جیپ پر وہاں سے واپسی کے لئے نکلا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ برفباری کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا اور سڑک پر آمدورفت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

''ذرا پہلے نکل گیا ہوتا تو موسم کی اس شدت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔'' اس نے سوچا۔ ''اب تک راولپنڈی میں ہوتا۔''

ابھی وہ بہت زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اس کی نگاہ سڑک کے کنارے بیٹھی ایک عورت پر پڑی۔ گاڑی بڑھتے دیکھ کر اس عورت نے ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہ عورت کسی پریشانی میں مبتلا لگ رہی تھی۔ سبط نے جیپ اس کے پاس روک دی اور نیچے اُتر آیا۔

''بھائی صاحب مجھے گھر تک پہنچا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔'' عورت خالص مقامی لہجے میں بولی۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی قسم کی تکلیف میں مبتلا تھی۔

سبط نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں پہچاننا مشکل تھا لیکن وہ اسے زینی کی ملازمہ لگ رہی تھی۔

''آؤ بیٹھو۔'' اس نے کہا۔

''صاحب چلتے چلتے گر گئی تھی اُٹھا نہیں جا رہا۔'' اس نے بہت بے چارگی سے کہا۔

''کہاں چوٹ لگی ہے۔''

''دائیں بازو اور ٹانگ پر۔'' اس نے سردی سے کانپتے ہوئے بتایا۔ ''لگتا ہے ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔''

سبط حسن نے اپنی چادر اس کے اوپر ڈالی اور سہارا دے کر اسے جیپ میں بٹھا دیا۔

''پہلے کسی ڈاکٹر کو دکھا دیتے ہیں۔'' اس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''بعد میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔''

''آپ مجھے گھر لے جائیں، دیدی خود ڈاکٹر بلوا لیں گی۔''

''پہلے ایکسرے کروانا پڑے گا۔ اور ایکسرے مشین ڈاکٹر گھر پر نہیں لایا کرتے۔ پہلے گھر جاؤ گی پھر واپس آنا پڑے گا۔ اس سے بہتر نہیں کہ پہلے ایکسرے کروالو۔''

ملازمہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ ایسے میں اسے کیا کرنا چاہیے مگر پھر وہ بولی کچھ نہیں۔

''ایسے موسم میں باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟'' سبط نے پوچھا۔

''چھوٹی بی بی کا پھل کا ڈبہ لانا تھا۔ پھر میں نے کہا یہاں تک آ گئی ہوں تو اپنے بھائی کو بھی دیکھتی جاؤں۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بس وہیں دیر ہو گئی۔'' وہ بولی۔

سبط نے ایمرجنسی میں اس کا ایکسرے کروایا۔ ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ پھر دوائیں لے کر وہ اسے گھر لے آیا۔ گھنٹی کے جواب میں دروازہ دیدی نے کھولا۔ زینی ان کے پیچھے ہی تھی۔ انہیں دیکھ کر زینی نے چیخ ماری۔

''سلیمہ کہاں چلی گئی تھیں تم، میرا دم نکلا جا رہا تھا۔'' اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے اٹکے ہوئے تھے۔

دیدی نے ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

''اندر آ جاؤ۔''

سبط اسے سہارا دے کر اندر لے آیا۔

''سلیمہ تمہیں ہوا کیا؟''

دیدی نے زینی کی طرف دیکھا۔

''زینی آپ مہمان کو ڈرائینگ روم میں بٹھائیں۔ میں سلیمہ کو اندر لے جاتی ہوں۔''

قدرے بھاری جسم والی سلیمہ کو سہارا دینا نرم و نازک سی زینی کے بس کی بات نہیں تھی ورنہ سبط کو یقین تھا کہ وہ اسے ڈرائینگ روم میں خود بٹھاتیں اور زینی کو سلیمہ کی تیمارداری کے فرائض سونپ دیتیں۔

جب دیدی سلیمہ کو لے کر اندر چلی گئیں تو زینی اس کی طرف مڑی۔

''آپ اندر آئیں ناں پلیز۔''

''نہیں شکریہ۔ میں چلتا ہوں مجھے برفباری مزید تیز ہونے سے پہلے راولپنڈی پہنچنا ہے۔''

''پلیز تھوڑی دیر تو رُک جائیں۔'' اس نے کہا۔

اب اتنے اصرار کے باوجود وہاں نہ رُک کر وہ کفرانِ نعمت تو نہیں کر سکتا تھا ناں، سو برف ماڑ کر اندر چلا آیا۔

''بیٹھیں۔'' زینی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

سبط بیٹھ گیا۔ ڈرائینگ روم چھوٹا لیکن بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ جس صوفے پر سبط بیٹھا تھا اس کے بالکل سامنے والی دیوار پر زینی کی اسی تصویر کی انلارجمنٹ لگی ہوئی تھی۔ جو اس نے کھینچی تھی۔

زینی فلور کشن پر بیٹھ گئی۔ آنسو اس نے ہتھیلی سے پونچھ لیے تھے۔ نیلی جینز اور کھلی لمبی سی سویٹر میں وہ بہت پُرکشش لگ رہی تھی۔ بالوں کی اونچی سی پونی بنا رکھی تھی اور ہمیشہ کی طرح آدھے سر اور کانوں کو مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔

''سلیمہ کو کیا ہوا ہے؟'' اس کے انداز میں بے چینی تھی۔

''راستے میں شاید پھسل گئی تھی۔ چوٹ بھی لگی لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ایکسرے کروالیا ہے میں نے' ہڈی ٹھیک ہے۔''

''ہم تو بہت پریشان تھے۔ شیر دل خان کو اچانک مردان جانا پڑ گیا تھا۔ وہی گھر کا چوکیدار بھی ہے اور ڈرائیور بھی' وہ نہیں ہوتا تو بہت دقت ہوتی ہے ہمیں۔ گھر میں صرف میں اور دیدی تھے۔ میں نے کہا بھی دیدی سے کہ میں جا کر اسے ڈھونڈتی ہوں لیکن دیدی نہیں مانیں۔ کہنے لگیں کہ وہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئی ہوگی' لیکن سلیمہ آپ کو ملی کہاں؟''

''اس بات کو چھوڑیں' یہ بتائیں کہ آپ کو اسٹرابیری کھانے کا اتنا ہی شوق ہے کہ ایسے خراب موسم میں آپ نے اسے بھجوا دیا۔ آپ کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ایسے موسم میں کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔''

''مگر میں نے اسے کب بھیجا تھا۔ پوچھ لیں بے شک اس سے۔'' زینی نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔ ''مجھے تو اس کے جانے کے بعد پتا چلا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا تو کیا میں اسے جانے دیتی؟''

''آپ لوگ یہاں اکیلے ہوتے ہیں۔ گھر میں کوئی مرد نہیں ہوتا؟'' سبط نے پوچھا۔

زینی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''اب تو بہت عرصہ ہو گیا آپ کو ادھر منڈلاتے ہوئے۔ آپ کو پتا نہیں چلا اب تک کہ یہاں کون کون رہتا ہے۔''

سبط حسن بے اختیار ہنس دیا۔ ''گویا آپ اتنی بے خبر نہیں ہیں جتنی نظر آتی ہیں۔''

زینی بھی ہنس پڑی۔ ''ایک بات بتاؤں بالکل سچ سچ۔''

''بتائیں۔''

''صحیح بات تو یہ ہے کہ پہلے دن آپ مجھے بہت برے لگے تھے پھر آپ نے تصویر لوٹا دی تو بہت نہیں صرف برے لگنے لگے۔ جب میں نے دیکھا کہ آپ نے میری اتنی اچھی تصویر کھینچی ہے تو میرے باقی سب شکوے بھی ڈھل گئے اور آج آپ سلیمہ کو لائے ہیں تو مجھے اچھا لگا ہے۔''

''اچھا لگا ہے یا میں اچھا لگا ہوں؟'' سبط نے شوخی سے پوچھا۔

زینی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''کچھ بھی سمجھ لیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں آپ کے لیے کافی لاتی ہوں۔''

''نہیں' نہیں' کافی کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کرتی رہیں۔ بس ایسی ہی جیسی ابھی کیں ہے۔''

''اگر میری عادات گڑیا جیسی ہوتیں تو ابھی آپ کو بہت سخت ڈانٹ پڑی ہوتی۔ شکر کریں' یہاں میں ہوں' گڑیا نہیں۔'' زینی واپس بیٹھ گئی۔

''اس بات پر میں بھی شکر ادا کر رہا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر یہ بات میں نے آپ کی دیدی کے سامنے کی ہوتی تو وہ بھی ضرور ڈانٹتیں۔''

''ارے نہیں' دیدی کو تو ڈانٹنا آتا ہی نہیں ہے۔ کم از کم پچھلے چار سال سے انہوں نے ہم بہنوں کو ایک مرتبہ بھی نہیں ڈانٹا۔''

''چار سال پہلے کس بات پر ڈانٹا تھا؟''

زینی پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''کسی بات پر بھی نہیں۔ وہ چار سال پہلے ہی یہاں آئی ہیں۔ ان سے پہلے ایک اور گورنس ہوتی تھی یہاں مس سارہ جارج۔ اُف یہ انگریز عورتیں ناقابلِ برداشت ہوتی ہیں' خاص کر پرانے مزاج کی انگریز عورتیں جو اللہ کے فضل سے مس بھی ہوں۔ مس جارج بہت سخت تھیں۔ گھر اور اسکول دونوں میں اتنی سختی ہوتی تھی کہ اسکول تو ہے ہی یہ گھر بھی ننری (Nunnery) لگتا تھا۔ پھر برسوں کی دعائیں اللہ میاں نے سنیں اور مس جارج واپس انگلینڈ سدھاریں اور دیدی یہاں آئیں۔ اب آرام سے سانس لے سکتے ہیں ہم ورنہ تو یہ کرو وہ نہ کرو کی گردان سننا پڑتی تھی سارا دن۔''

''دیدی آپ کی گورنس ہیں؟'' اسے قدرے حیرت ہوئی تھی۔

''جی۔ آپ کیا سمجھ رہے تھے؟''

''میں سمجھا آپ کی والدہ ہیں۔ آپ کے والدین کہاں ہوتے ہیں؟''

''اوہو ہم نے ایک دوسرے سے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔'' زینی نے جلدی سے کہا۔

سبط کو محسوس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر اس سوال کو نظر انداز کر رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ زینی ہیں۔'' اس نے بھی موضوع تبدیل کر دیا۔ ''میں سبط حسن ہوں۔ آپ کی دیدی سے میں نے کہا تھا کہ وہ مجھے سبط کہہ سکتی ہیں کیونکہ سب قریبی لوگ مجھے سبط ہی کہتے ہیں لیکن انہوں نے مسٹر حسن کہہ کر یہ باور کروا دیا کہ وہ میرے قریبی حلقے میں شامل ہونے کی کوئی خواہش نہیں رکھتیں۔ اب آپ بتا دیں کہ آپ مجھے کس نام سے پکاریں گی۔''

زینی ہنس پڑی۔ ''میں آپ کو سبط ہی کہوں گی کیونکہ اب مس جارج جا چکی ہیں۔''

سبط کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''تھینک یو۔''

''ویسے میں زینب ہوں اور سب قریبی لوگ مجھے زینی کہتے ہیں۔ آج کل سینئر کیمبرج کر رہی ہوں۔''

''ویری نائس' میں بھی سینئر کیمبرج ہی کر رہا ہوں۔''

''بورڈنگ میں رہتے ہیں؟'' زینی نے پوچھا۔

''نہیں۔ گھوڑا گلی میں چھوٹا سا ہٹ ہے۔ وہیں رہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اور آپ نے بتایا تھا کہ آپ دو بہنیں یہاں رہتی ہیں۔ آپ کی دوسری بہن نظر نہیں آ رہیں۔''

''گڑیا آج کل یہاں نہیں ہے۔ انگلینڈ گئی ہوئی ہے۔''

زینی بات کر رہی تھی کہ ڈیڈی ٹرالی لے کر اندر آ گئیں۔

''مجھے دیں ڈیڈی' میں کافی بنا دیتی ہوں۔'' زینی نے ٹرالی اپنے قریب گھسیٹ لی۔ ''میں تو بلیک کافی پیتی ہوں۔ آپ کے لیے کریم والی بنا دوں یا آپ بھی بلیک ہی پئیں گے؟''

''میں بلیک ہی پیوں گا۔''

''آپ نے سلیمہ کی بروقت مدد کی اس کا بہت شکریہ۔ ورنہ پتا نہیں بے چاری کو کتنی پریشانی اور تکلیف اٹھانا پڑتی۔'' ڈیڈی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں مدد نہ کرتا تو کوئی اور کر دیتا۔ شکریے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

''آپ چینی کتنی لیں گے؟'' زینی نے اس سے پوچھا۔

''ڈھائی چمچ۔''

''آپ نے ڈھائی چمچ کہا ہے؟'' زینی نے دوبارہ تصدیق چاہی۔

''جی۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''مردان شوگر مل آپ ہی کی تو نہیں ہے؟ اتنی چینی لیتے ہیں آپ؟''

''زینی۔'' ڈیڈی نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''ایسے بات نہیں کرتے بیٹا۔''

اس نے سبط کو کن اکھیوں سے دیکھا اور پھر ہنس پڑی۔ ہنسنا اس کی عادت تھی۔ وہ ہر وقت ہنستی تھی بات بے بات۔

''آپ یہ نہ سمجھیں کہ ڈیڈی نے مجھے ڈانٹا ہے۔'' اس نے کافی کا مگ اور چیز سینڈوچز سبط کو پکڑائے۔

کافی پیتے ہوئے بھی وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ موضوع سینڈوچز تھا۔ دونوں مختلف اداروں لیکن ایک ہی کلاس میں زیر تعلیم تھے۔ کتابیں بھی ایک سی تھیں۔ چنانچہ انہی کے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔ کافی ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''کافی اور گفتگو دونوں بہت اچھی تھیں۔ دونوں کا شکریہ۔''

''شکریہ تو میں نے قبول کر لیا لیکن آپ کہاں چل دیے۔ باہر دیکھا ہے برفباری کا

حال۔''

''ابھی حال ایسا برا نہیں ہے کہ نکلا نہ جا سکے۔ میرا گھر پہنچنا بہت ضروری ہے۔'' اس نے جیب کی چابی اٹھائی۔

''گھوڑا گلی جانا ہے ناں۔''

''نہیں مجھے لاہور سے بھی آگے جانا ہے۔''

''لاہور سے بھی آگے؟ لیکن موسم بہت خراب ہے۔''

''بس یہاں سے راولپنڈی تک ہی خراب ہے۔ آگے ٹھیک ہے۔''

زینی اس کے اس موسم میں...... سفر کرنے کے حق میں نہیں تھی لیکن بار بار اصرار کرنا اسے مناسب محسوس نہیں ہوا۔

''چلیں' میں آپ کو دروازے تک چھوڑ آؤں۔'' بالآخر اس نے کہا۔

ڈیڈی برتن سمیٹنے لگی تھیں' وہ اور زینی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

''اتنے برے موسم میں کہیں پہنچنے کی جلدی تب ہوتی ہے جب آگے کوئی انتظار کر رہا ہو۔'' زینی نے دروازہ کھولتے ہوئے اچانک کہا۔

سبط نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے کی ناب سے ہاتھ ہٹا کر بے نیازی سے اپنے لمبے ناخنوں سے نیل پالش کھرچنے لگی۔

اس نے بے اختیار ہونٹوں پر آ جانے والی مسکراہٹ کو چھپایا اور بولا۔ ''ہاں انتظار کرنے والے موجود ہیں تب ہی تو جانے کی جلدی ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولی صرف پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں جو شکوہ اور سوال تھے۔ انہیں دیکھ کر سبط کو اس پر ڈھیر سارا پیار آ گیا۔

''پوچھو گی نہیں کہ کون ہیں انتظار کرنے والے؟''

''بتانا ہوتا تو خود ہی بتا دیتے' پوچھنے پر بتایا تو کیا فائدہ۔''

وہ مسکرا دیا۔ ''میری اماں اور بہت پیاری سی بہن۔ بھائی بھی انتظار کرتے ہیں لیکن اتنا نہیں جتنا اماں جان اور آپی کرتی ہیں۔''

زینی بھی مسکرا دی۔ ''اچھا۔ پھر ٹھیک ہے۔''

''اب اجازت ہے جانے کی؟'' سبط نے پوچھا۔

''ہاں۔ اس لیے اجازت دے رہی ہوں کیونکہ اجازت نہ دینے سے آپ رکیں گے تو نہیں لیکن میں یہاں پریشان ہوں گی آپ کے لیے۔ سچ مچ موسم بہت خراب ہے۔''

''ایسے موسم میں بہت مرتبہ سفر کیا ہے میں نے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ پنڈی پہنچ کر فون کر دیں مجھے؟'' زینی نے کہا۔

''ہاں یہ ہوسکتا ہے اگر میرے پاس فون نمبر ہو تو۔''

''میں آپ کو فون نمبر لا دیتی ہوں۔ ایک منٹ ٹھہریں۔''

''یہ میرے پاس بال پین ہے۔'' سبط نے شیفر کا بال پوائنٹ نکال کر اسے دے دیا۔

''اور کاغذ؟''

''یہاں لکھ دو۔'' سبط نے ہتھیلی آگے کر دی۔

زینی نے نمبر لکھ کر بال پین اسے واپس کر دیا۔

''میں انتظار کروں گی فون کا۔''

وہ جیپ میں بیٹھنے لگا تو پیچھے سے زینی کی آواز آئی۔

جب تک وہ اس سے دور رہا روز فون پر بات کرتا رہا۔ زینی کی تصویر ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی۔ ہنستی مسکراتی زینی ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے اور زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔

گاؤں سے مری واپس آنے تک ان کی دوستی بہت گہری ہو چکی تھی۔

اور پھر ہر روز ملنا ان کا معمول ہو گیا۔ ان دونوں کو کبھی اظہار کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ نہ انہوں نے وعدے کیے تھے نہ قسمیں کھائی تھیں۔ اظہار کی ضرورت تھی بھی نہیں کیونکہ وہ دونوں جانتے تھے کہ انہیں ایک دوسرے سے محبت تھی' بہت شدید۔

سبط نے اس سے کبھی اس کے گھر والوں کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ زینی موضوع بدل دیتی تھی۔ اس نے خود ہی یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ زینی کا تعلق کسی بروکن فیملی سے تھا' تب ہی وہ اس موضوع پر بات نہیں کرتی تھی۔ خود زینی نے بھی اس کی اماں جان اور بہن کی خیریت دریافت کرنے سے زیادہ کچھ کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ جواب میں سبط بھی اس کے گھر والوں کے متعلق پوچھ سکتا تھا۔

مگر سبط کو ان باتوں کی پروا نہیں تھی۔ اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ زینی کا تعلق کس فیملی سے تھا۔ اسے زینی سے محبت تھی اور اس کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

اس کی ملاقات گڑیا سے بھی ہوئی تھی۔ وہ بھی اچھی لڑکی تھی۔ باقی کلاس فیلوز کے برعکس اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ کتابی کیڑا تھی۔ اس کا سر ہر وقت کسی کتاب میں ہوتا تھا۔ مزاجاً بھی وہ قدرے مختلف تھی۔ باقی لڑکیوں کی طرح اسے کپڑوں' جیولری اور لڑکوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ سبط سے وہ ملتی تھی لیکن اس کی ڈسکشن صرف پڑھائی تک تھی۔

''سارے عیش سینئر کیمبرج کے بعد۔'' وہ اکثر کہتی تھی۔ ''اس سے پہلے صرف اور صرف پڑھائی۔''

زینی سے ملنے کا اسے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ اب وہ پڑھائی پر توجہ دینے لگا تھا۔ وہ

دونوں ایک ہی کلاس میں تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ پڑھائی کے معاملے میں زینی سے کسی طور پیچھے رہے بلکہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ جو کچھ وہ اچھے طریقے سے نہیں سمجھ سکی وہ سب کچھ بھی اسے پڑھا دے۔

پڑھائی ختم کر کے وہ سیر کے لیے گھر سے نکل جاتے تھے اور اس سیر کے دوران وہ دنیا بھر کی باتیں کیا کرتے تھے۔

''تم نے سبط مجھے ایک مرتبہ بہت رُلایا تھا۔'' سیر کے دوران زینی نے کہا۔

''میں نے؟ تمہیں؟ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ایسا ہوا ہے۔'' زینی نے زور دیا۔

''کب؟''

''جس دن تم نے تصویر کھینچی تھی۔ میں نے ڈیڈی کو بتایا۔ وہ بھی پریشان ہو گئیں۔ میں ضد کر کے اکیلی گئی تھی اس دن ورنہ مجھے اکیلے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ رپورٹ گھر والوں تک پہنچتی تو بہت ڈانٹ پڑتی۔ اس بات پر نہیں کہ تم نے تصویر کھینچ لی۔ بلکہ اس بات پر کہ میں اکیلے گھر سے باہر گئی کیوں تھی۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ یہ بات گھر والوں کو بتائی نہ جاتی۔ بس پھر مجھے بہت رونا آیا تھا۔ اصل میں مجھے ڈانٹ کھانے سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

سبط ہنس دیا۔ ''چلو یہ تو پتا چلا کہ تمہیں رونا آتا ہے۔''

''تمہیں' مجھے رُلانے کا شوق ہے؟''

''تھوڑا سا رونا اچھا بھی ہوتا ہے' آنکھیں دُھل جاتی ہیں۔''

''مجھے حیرت ہے تم اور میں کتنے برسوں سے یہاں رہ رہے تھے پھر بھی کتنے عرصے بعد ملے۔'' زینی ٹوٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گئی۔

''اور مجھے بھی حیرت ہے میرے سب کلاس فیلو تمہارے اسکول کی تقریباً تمام لڑکیوں کو جانتے ہیں۔''

''میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''لیکن ہماری مس جارج بہت سخت تھیں۔ ہم بہنیں وہ سب کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں جو ہمارے ساتھ کی لڑکیاں کر رہی تھیں۔''

''اور میری دلچسپی کا محور صرف فوٹو گرافی تھا۔ پتا نہیں وہ لمحہ کیسا تھا کہ تمہیں دیکھ کر پھنس گیا۔''

زینی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''اور تم نے ڈیڈی سے بھی جھوٹ بولا تھا کہ تمہارے پاس تصویر کا ور کوئی پرنٹ نہیں ہے۔''

''یہ بات میں نے نہیں کہی تھی' پوچھ لو بے شک ان سے' میں نے تو جواب صاف گول کر دیا تھا۔'' وہ بھی ہنس پڑا۔

لیکن اس دن پڑھنے کے دوران بھی وہ ہمیشہ کی طرح بات بات پر ہنس نہیں رہی تھی' سیر کو نکلے تب بھی وہ چپ چپ تھی۔

''کیا ہوا آج بہت خاموش ہو۔ گڑیا سے جھگڑا تو نہیں ہوا؟'' سبط نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''ایک مسئلہ ہے بس وہی بعض اوقات پریشان کرنے لگتا ہے۔''

''مجھے بتاؤ' میں کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا۔''

''چلو چل کر بیٹھتے ہیں۔'' زینی نے کہا۔

وہ ہمیشہ کی طرح اس تنے پر جا کر بیٹھ گئے۔

''میرے بابا جان کا فون آیا تھا۔ وہ اور میری اماں جان شاید کل تک یہاں آئیں۔''

''ہوں۔'' سبط نے پُرخیال انداز میں کہا۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ زینی نے اس موضوع پر خود کوئی بات کی تھی۔

''اور تم چاہتی ہو کہ جب تک وہ یہاں ہیں' میں تمہاری طرف نہ آؤں۔''

''ڈونٹ بی ریڈی کولس...... نہ وہ اتنے تنگ نظر ہیں اور نہ ہی میں ان سے کچھ چھپانا چاہتی ہوں بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ تمہیں ان سے ملواؤں وہ یقیناً بہت خوش ہوں گے بلکہ مجھے یقین ہے کہ ڈرائینگ روم میں میری تصویر لگی دیکھ کر یہ ضرور پوچھیں گے کہ یہ میں نے کب اور کس سے کھنچوائی ہے۔''

''پھر؟''

''بات یہ ہے سبط کہ میرے بابا جان نے باقی سارے خاندان سے ناتا توڑ لیا ہے یا شاید یہ کہنا بہتر ہو کہ باقی سب خاندان نے ہم سے ناتا توڑ لیا ہے۔ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ایسا کیوں ہوا ہے لیکن بہرحال ایسا ہوا ہے تو اچھا ہی ہوا ہے۔

ہمارا سارا خاندان بہت تنگ نظر ہے۔ پتا نہیں صدیوں پرانی کون کون سی روایتوں کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں سب۔ میں اور گڑیا تو برسوں سے ادھر ہی ہیں۔ بس بابا اور اماں جان آتے رہتے ہیں ہم سے ملنے۔ گڑیا تو پھر بھی خاندان کے بکھیڑوں کے متعلق بہت کچھ جانتی ہے لیکن مجھے ان مسئلوں سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ الجھن سی ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے کبھی کچھ کریدنے کی کوشش نہیں کی لیکن کچھ نہ کچھ کان میں پڑتا ہی رہتا ہے۔

بابا جان نے ہمیں یہاں اس لیے بھجوایا ہوا ہے کہ ہمارے خاندان میں دشمنیاں چل رہی ہیں۔ ان کی سختی سے تاکید ہے کہ یہ باتیں ہم کسی کو نہ بتائیں تاکہ دشمن ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے گرد گاؤں کا کوئی ایک فرد بھی نہیں رکھا۔ ملازمین تک نہیں کہ کہیں ہم پہچان نہ لیے جائیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ دشمنیوں کی یہ آگ ہم تک بھی پہنچ جائے۔

میں ہنستی رہتی ہوں سبط۔ میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میرا دل کتنا دکھتا ہے جب میں یہ

سوچتی ہوں کہ ایک بے مقصد دشمنی کے پیچھے ہم اپنے ماں باپ سے الگ ہیں۔ بھائی برسوں بعد پاکستان آئے ہیں اور ہم بہنیں یہاں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہم اپنے گھر تک نہیں جا سکتے۔ اپنی زمین پر قدم نہیں رکھ سکتے۔ کچھ بچپن کے دھندلے خاکے ہیں۔ اپنی حویلی کے اور بس۔''

چند لمحے کے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ ''تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہم بہن بھائیوں نے زندگی میں کتنا کچھ مس کیا ہے۔ ماں باپ کے ہوتے ہوئے ہم ان کی محبت سے محروم رہے ہیں۔ وہ چند دنوں کے لیے یہاں آتے ہیں اور بہت پیار کرتے ہیں ہم سے لیکن چند دنوں کا پیار برسوں کے غبار کو کیسے ختم کر سکتا ہے۔ وہ نہیں ہوتے تو ہم کسی نہ کسی طرح دن گزار لیتے ہیں۔ مگر جب وہ یہاں آ کر' چند دن رہنے کے بعد واپس چلے جاتے ہیں تو ہر چیز سے دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔''

زینی بات کر رہی تھی اور سبط کے دل میں کانٹے چُبھ رہے تھے۔ زینی نے کوئی واضح بات نہیں کی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کے دل میں حیدر بابا اور ان کے گھرانے کا خیال بار بار سر اٹھا رہا تھا۔ زینب' زہرا۔ یہ نام بار بار اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگے تھے۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ اس کے بابا جان اور باقی گھر والوں کے متعلق مگر اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اندیشے ٹھیک نکلیں۔

پھر زینی کی اماں اور بابا جان آئے۔ اس نے سبط کو فون بھی کیا۔

''میں تمہیں ان سے ملوانا چاہتی ہوں۔''

''تم نے میرا ذکر ان سے کر دیا!'' سبط نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔ انہوں نے تصویر کے متعلق پوچھا تھا۔ میں نے کہا کہ جس نے تصویر کھینچی ہے اسے آپ سے ملوا دوں گی۔ بتاؤ کب آ رہے ہو؟''

''ایسا ہے زینی کہ آج کل ٹیسٹ ہو رہے ہیں' میں بزی ہوں۔''

''اب سے پہلے بھی تو ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ اتنے بزی تو تم کبھی نہیں ہوئے کہ مجھ سے ملنے بھی نہ آ سکو اور پھر میری پڑھائی کا کیا ہوگا۔ میں تو تمہارے بغیر پڑھنے کی عادی ہی نہیں رہی۔''

''گڑیا ہے ناں' اس سے سمجھ لو جو کچھ سمجھنا ہو۔''

''گڑیا سے؟ ہرگز نہیں۔ وہ بہت ڈانٹتی ہے پڑھاتے ہوئے۔ اور پھر وہ گڑیا ہے تم تو نہیں ہو۔''

''چند دن کی تو بات ہے۔''

زینی کے تمام تر اصرار کے باوجود بھی وہ تب تک وہاں نہیں گیا جب تک اس کے بابا اور اماں جان واپس نہیں چلے گئے۔

اور پھر یہ معمول ہو گیا۔ وہ جب بھی آتے سبط کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتا۔ زینی کا بھائی بھی آیا

تھا لیکن وہ اس سے ملنے بھی نہیں گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی زینی اس سے بچھڑ جائے۔ اس کی محبت میں ہلکی سی بھی دراڑ آئے۔

زینی کے گھر والے چلے جاتے تھے تو وہ کتنے دن تک اُداس رہتی تھی۔ گڑیا تو خود کو کتابوں میں گم کر لیتی تھی لیکن زینی ان کے چلے جانے کا بہت اثر لیتی تھی۔ ایسے میں سبط اس کی دلجوئی میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتا تھا۔ پھر گڑیا کے فائنل امتحان ہو گئے۔

''گڑیا گاؤں جا رہی ہے۔'' ایک دن زینی نے اسے پُر جوش انداز میں بتایا۔

''کب؟'' سبط نے پوچھا

''کل جا رہی ہے۔''

اس نے زینی کا پُر جوش چہرہ دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ اگر وہ حیدر بابا کی بیٹی تھی تو ان کے گاؤں جانے کے بعد جلد یا بدیر اسے علم ہو جانا تھا کہ سبط حسن' پیر صاحب کا بیٹا تھا۔ یہاں زینی اور گڑیا بے خبر تھیں لیکن وہاں تو ہر کوئی ان رشتوں کو جانتا تھا۔ جو دونوں گھرانوں میں موجود تھے۔ وہ حیدر بابا کو اور حیدر بابا اسے پہچانتے تھے۔ ان کے گاؤں یا حویلیوں میں فاصلہ ہی کتنا تھا اور پھر دونوں گاؤں کے لوگ آپس میں رشتہ داریاں اور قرابت داریاں رکھتے تھے۔ لوگوں کا آنا جانا دونوں طرف لگا ہی رہتا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے گڑیا کے لیے سبط کی حقیقت جان لینا کوئی حیران کن بات نہ تھی۔

''تم چپ چپ سے ہو' کیا بات ہے؟'' زینی نے تشویش سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''کچھ تو ہے' تھوڑی دیر پہلے تک تو ٹھیک تھے۔''

''میں سوچ رہا تھا کہ تم یہاں اکیلی ہو جاؤ گی۔''

''تم ہو گے ناں ساتھ' میں اکیلی کب ہوں گی۔'' وہ ہنسی۔ ''اور یہ بھی تو سوچو ناں کہ گڑیا گاؤں چلی گئی تو بابا جان شاید مجھے بھی چھٹیاں گزارنے کے لیے وہاں بلوا لیں۔''

لیکن گڑیا کے جانے کے بعد وہ واقعی بہت اُداس ہو گئی تھی۔ گھر میں وہ اور دیدی تھے۔ سبط کے لیے جو کچھ ممکن تھا' اس نے زینی کو خوش رکھنے کے لیے کیا۔ اسے پڑھائی میں مصروف کرتا۔ سیر کرتے ہوئے راستہ بھر اسے کالج کے دلچسپ قصے اور لطیفے سنا کر ہنساتا رہتا۔

نہ جانے کیسے اس کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ اس کی زینی اس سے چھن جائے گی اور یہ بات وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اور پھر ایک دن جب وہ اس کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا' اسے حیدر بابا کی نسان پٹرول نظر آئی۔ وہ ان کی سب گاڑیوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ہی کیا ان کی حویلی کے سب مرد جانتے تھے۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہیں ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ ان کی

جیپ کو دیکھنے لگا۔ جو زینی کی ہٹ کی طرف ہی بڑھ رہی تھی۔

جیپ ہٹ کے گیٹ پر پہنچی۔ پٹھان چوکیدار نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا اور جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ جیپ ڈرائیو وے میں جا کر رک گئی۔ دو گن مینوں کے ساتھ حیدر بابا اور چچی اماں باہر نکلے۔ ان کے ہاتھ میں زینی کے لیے بہت سے تحفے تھے۔ اتنے میں ہٹ کا دروازہ کھلا اور زینی بھاگتے ہوئے آ کر ان سے لپٹ گئی۔

سبط پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہو۔

اپنے ہٹ میں آ کر وہ کمرے میں بند ہو گیا۔ ملازم سے اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا فون آئے تو کہہ دیا جائے کہ وہ اسلام آباد گیا ہوا ہے۔

زینی کے بے شمار فون آئے تھے۔ وہ ایکسٹینشن پر اس کی آواز سنتا رہا۔

''وہ آئیں تو ان سے کہنا کہ مجھے فون کریں فوراً۔'' وہ کہتی رہی۔

لیکن جب بہت دیر گزرنے کے بعد بھی سبط نے فون نہ کیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ کب گئے تھے اسلام آباد کب واپس آئیں گے قسم کے سوالوں کے تسلی بخش جواب نہ ملنے پر اسے ملازم پر غصہ آ گیا۔

''تم ہوتے کہاں ہو۔ اتنا بھی نہیں پتا کہ وہ کب آئیں گے۔ مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔ ان کا اسلام آباد کا نمبر ہے تمہارے پاس؟''

اور نفی میں جواب سن کر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

سبط نے اپنے سرہانے کی دیوار پر لگی اس کی بڑی سی تصویر پر نگاہیں جما دیں۔ اسے معلوم تھا کہ زینی نے اس سے کیا ضروری بات کرنی تھی۔ وہ اپنے بابا جان کی آمد کے متعلق بتائے بغیر اسے ان سے ملوانا چاہتی تھی۔

مگر وہ ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی اس کے ذہن پر بہت بوجھ تھا۔ جب بات صرف اندیشوں تک تھی تب مسئلہ دوسرا تھا۔ وہ خود کو تسلی دیتا رہا تھا کہ جو کچھ وہ سوچ رہا تھا' وہ سب غلط تھا۔ مگر اب اندیشہ حقیقت بن گیا تھا تو بات مختلف ہو گئی تھی۔

بچپن کی منگنی وغیرہ پر وہ یقین نہیں رکھتا تھا لیکن اس کے گھر والے تو رکھتے تھے ناں۔ وہ کسی اور لڑکی کا ہاتھ تھامنے کے بعد اس سے زیادہ جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کر سکتا تھا جتنا حیدر بابا نے کیا تھا لیکن اپنے بھائی کی منگیتر کا ہاتھ تھام کر سب کے سامنے ڈٹ جانا اتنا مشکل نہیں تھا۔ جتنا تکلیف دہ تھا اور پھر حیدر بابا کب ماننے والے تھے۔

یہاں تو سارا معاملہ ہی اُلٹ ہو گیا تھا۔ وہ جس پہلو سے سوچتا تھا وہی الجھا ہوا تھا۔ خدا جانے زینی کو اس کی حقیقت کا علم ہو تو اس کا کیا ردِعمل ہو۔

دو دن تک وہ گھر پر رہا۔ ملازم سے کہہ دیا کہ فون پر زینی کو اس کے اچانک گاؤں چلے جانے کی اطلاع دے دے۔ دو دن بعد نہ جانے کیا سوچ کر وہ گاؤں چلا آیا تھا اور اس کے آنے کے ہفتہ بھر بعد ہی یہ سانحہ رونما ہو گیا تھا۔ اس کے بھائیوں نے کب منصوبہ بندی کی اور کب اس پر عمل کے ارادے سے نکلے۔ اس کا اسے کچھ علم نہیں تھا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا اپنے آپ میں گم تھا یا پھر ریشماں کے پاس بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔

اور اب اس سانحے کے بعد' خاندانی روایات کے مطابق زینی کو بقیہ زندگی بیوہ کی طرح گزارنی تھی۔ وہ زینی جو اب تک دلہن بھی نہیں بنی تھی۔

☆======☆======☆

اماں اور ابا جی کے اصرار کے باوجود بھی ماہ بانو نے جمعے کے روز آرام نہیں کیا۔ بخار اتر چکا تھا اور طبیعت میں بوجھل پن بھی نہیں رہا تھا۔ کالج کا کچھ کام کر کے وہ حسبِ معمول ابا جی کے پاس آ بیٹھی اور ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔

''میں آپ سے کچھ ڈسکس کرنا چاہتی ہوں ہوں ابا جی۔'' اس نے مٹی گوندھتے ہوئے کہا۔

''ضرور۔''

''میری سہیلی ہے ناں اُما۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''آپ کو پتا ہے وہ سکھر سے آئی ہے۔ روز روز اس کے لیے وہاں جانا اور واپس آنا ممکن نہیں ہے۔ خیر یہ ممکن ہو بھی سکتا ہے لیکن وہ اس لیے گھر کم جاتی ہے کہ اس کے جاتے ہی نئے سرے سے یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ اسے یہاں نہیں پڑھنا چاہیے۔ بہر حال یہ تو الگ بات ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب اس کی روم میٹ نیہاں اسلام آباد چلی جاتی ہے تو وہ بالکل اکیلی ہو جاتی ہے۔''

''پھر؟''

''ایسے میں اسے توقع ہوتی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی' میں اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دوں گی لیکن میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔''

''وہ کیوں؟ اسے بلا لو یہاں۔''

''اس کی دو وجوہات ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک تو یہ کہ اماں جان کو اس کا یہاں آنا اچھا نہیں لگے گا۔ اماں تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا بھی نہیں کھلائیں گی۔ آپ کو پتا ہے ناں' وہ مجھے بھی منع کرتی ہیں۔''

''تمہاری اماں والا فرنٹ تو میں بھی سنبھال سکتا ہوں۔''

''لیکن اور مسئلہ بھی تو ہے۔''

''وہ کیا؟'' ابا جی نے پوچھا۔

''وہ یہ کہ اسے یہ علم نہیں ہے کہ میں یہاں' اس دو کمرے کے چھوٹے سے مکان میں رہتی ہوں۔'' اس نے تامل کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس کے ڈیڈی بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ ان کا گھر نہیں پورا محل ہے۔ اسے یہاں رہنے میں تکلیف ہو گی۔''

ابا جی ہنس پڑے۔ ''یہ کیسی دوستی ہے۔ تمہاری سہیلی کو پتا ہی نہیں کہ تم چھوٹے سے گھر میں رہتی ہو۔ گھر تو وہی اچھا ہوتا ہے جہاں سکون ہو۔ بڑا چھوٹا ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھو کہ اگر وہ تمہاری بہت اچھی سہیلی ہے تو اسے اس چھوٹے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ دوستی کا رشتہ اتنا کچا نہیں ہوتا کہ چھوٹا گھر دیکھ کر ٹوٹ جائے۔ اور جو دوستیاں اس بات سے ٹوٹتی ہیں' ان کا ٹوٹ جانا ہی دراصل بہتر ہوتا ہے۔''

''اُما کی عادت ہے کہ وہ کسی بات کو کریدتی نہیں ہے۔ میں نے اسے اپنے گھر کے متعلق نہیں بتایا اور اس نے کبھی کریدا بھی نہیں۔''

''اب جب اُما کی روم میٹ اسلام آباد چلی جائے تو تم اسے اپنے ساتھ لے آنا۔'' ابا جی نے کہا۔

''یہی تو میں نے آپ کو بتانا ہے کہ وہ اسلام آباد چلی گئی ہے اور اب اُما خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی ہو گی۔''

''یعنی تم ابھی اسے گھر لانا چاہتی ہو۔''

ماہ بانو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میرا جانا تو بہت مشکل ہو گا ابھی کام کافی کرنا ہے۔ تم جا کر اسے لے آؤ۔'' ابا جی نے کہا۔

''لیکن اماں جان؟''

''انہیں میں سمجھا دوں گا۔''

''تھینک یو ابا جان!'' وہ خوش ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں کپڑے تبدیل کر لوں۔ اتنے میں آپ اماں جان کو منا لیں۔''

جب وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلی تو اماں جان کہہ رہی تھیں۔

''مگر ہندوؤں کے ساتھ کھانا شرعاً جائز نہیں ہے۔''

''تمہیں پتا ہے اسلام اتنی تیزی سے کیوں پھیلا تھا؟ اس لیے کہ مسلمان دشمنوں سے بھی اخلاق سے پیش آتے تھے۔ ملک اور علاقے بے شک تلواروں اور بندوق کی گولیوں سے فتح ہو سکتے ہیں لیکن دل صُرف اچھے اخلاق اور حسن سلوک سے ہی جیتے جا سکتے ہیں۔'' ابا جان نے کہا۔

ان دونوں کو بحث کرتے چھوڑ کر وہ باہر نکل آئی۔ اس وقت وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ احساسِ کمتری کی بھاری گٹھڑی اس نے اپنے سر سے اتار پھینکی تھی۔

☆======☆======☆

ہوسٹل کی بہت سی لڑکیاں ویک اینڈ پر اپنے اپنے گھر گئی ہوئی تھیں۔ اُما اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ نادیہ اور حرا کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

''ارے بانو تم؟'' ماہ بانو کو غیر متوقع طور پر وہاں دیکھ کر وہ ایک دم خوش ہوگئی۔

''چلو میں تمہیں لینے آئی ہوں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''کہاں؟ اپنے گھر؟''

''تو اور کہاں۔''

''تھوڑی دیر انتظار کرو' میں ابھی آئی۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

ماہ بانو' نادیہ اور حرا کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اُما تیار ہو کر آ گئی۔

''چلو' میں تیار ہوں۔''

ویگن اسٹاپ کی طرف بڑھتے ہوئے ماہ بانو اس سے مخاطب ہوئی۔

''آگے تنگ گلیاں آئیں گی' وہاں ہمیں پیدل ہی جانا ہوگا۔ چل لوگی اتنا؟''

''تم نے مجھے اتنا نازک مزاج کیسے سمجھ لیا۔ میل دو میل تو میں آرام سے چل سکتی ہوں۔''

راستہ بھر وہ دونوں باتیں کرتی آئیں۔ ماہ بانو بار بار اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

شاید ابھی اُما کے ماتھے پر ناگواری یا حیرت کے بل پڑیں۔

لیکن اس کے چھوٹے سے گھر میں داخل ہونے کے بعد بھی اُما کے چہرے پر کوئی تبدیل نہیں آئی۔

اماں جان نے بہت شفقت کے ساتھ اس سے بات چیت کی' لیکن اس کے سر پر ہاتھ نہیں پھیرا۔ ماہ بانو نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس وقت اتنا بھی بہت تھا کہ انہوں نے اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میرے ابا جی کمہار ہیں۔ جمعہ کو میں کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔''

''ریئلی۔'' وہ خوش ہوگئی۔ ''میں نے کبھی مٹی کے برتن بنتے نہیں دیکھے۔ کالج میں بھی کبھی سرامک اسٹوڈیو جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔''

''چلو پھر ابا جی کے پاس چلتے ہیں۔''

وہ مکان کے اس حصے میں آ گئے جہاں ابا جی کام کیا کرتے تھے۔

''یہ کتنا مشکل کام ہے' تم بھی کر لیتی ہو بانو؟'' اُما نے پوچھا۔ وہ وہیں ان دونوں کے

قریب پیڑھی پر بیٹھ گئی تھی۔

''یہ کام تو میرے خون میں رچا بسا ہوا ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''میں تو سارا ہفتہ اس ایک دن کا انتظار کرتی ہوں۔ تم اندازہ کر سکتی ہو ناں کہ مٹی کو اپنے ہاتھ پر محسوس کرنا کتنا خوشگوار عمل ہوتا ہے۔ اور جب ان ہاتھوں میں یہ صلاحیت بھی ہو کر وہ مٹی کے ایک عام سے پیڑے کو اپنی مرضی کے زاویوں پر موڑ سکیں' اسے شکل عطا کر سکیں۔ اس احساس میں بہت طمانیت ہوتی ہے کہ ہم کچھ بنا رہے ہیں۔''

''تم بھی تو کچھ بناؤ۔'' اُما نے کہا۔

ماہ بانو' ابا جی کی جگہ آ گئی۔ وہ تینوں باتیں بھی کرتے رہے اور کام بھی۔

اماں نے دوپہر کا کھانا بہت اچھا پکایا تھا۔ مہمان کا خیال کر کے اہتمام بھی کیا تھا۔ اُما کے لیے دال اور ساگ بھی تھا لیکن چونکہ اماں کے نزدیک کوئی بھی دعوت مرغ اور بریانی وغیرہ کے بغیر ادھوری ہوا کرتی تھی اس لیے یہ سب بھی دستر خوان پر موجود تھا۔

''ارے اماں جی آپ کو کس نے بتایا کہ مجھے بریانی پسند ہے۔ خوشبو سونگھ کر ہی میرے منہ میں پانی آ گیا ہے۔'' اُما نے کھانے کے لیے بیٹھتے ہوئے کہا۔

اماں کو حیرانی ہوئی۔ ''تم گوشت کھا لیتی ہو؟ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے دال اور ساگ پکائے ہیں۔''

ماہ بانو اور اُما بیک وقت ہنس پڑیں۔

''اسے گوشت اتنا پسند ہے کہ ہاتھی بھی کھا سکتی ہے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''ویسے آج تک کبھی ہاتھی کھانے کی نوبت نہیں آئی۔'' اُما ہنسی۔ ''ویسے بریانی تو مجھے بہت پسند ہے اور اماں جی آپ مائنڈ نہ کریں تو کہوں کہ یہ ساگ وغیرہ میں نہیں کھاتی۔ لگتا ہے گھاس پکا کر رکھ دی ہو۔''

اُما کے گوشت کھانے کے بعد اماں جان کے اس سے سفارتی تعلقات خود ہی اچھے ہو گئے۔

کھانے کے بعد وہ دونوں ماہ بانو کے کمرے میں چلی آئیں۔

''تمہارا کمرا کتنا اچھا ہے۔'' اُما نے چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا۔

''چھوٹا سا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ اس اکلوتی چارپائی پر کس کا قبضہ ہوگا۔'' ماہ بانو نے خوش دلی سے کہا۔

''میرا ہوگا اور کس کا ہوگا۔'' اُما ہنستے ہوئے جلدی سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ماہ بانو بھی ٹانگیں اوپر کر کے اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''سچ سچ بتانا اُما تم بور تو نہیں ہوئیں؟''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اپنے گھر سے باہر پہلی مرتبہ اتنا اچھا وقت گزارا ہے۔''

''تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟''

''کس بات پر؟'' اُما نے پوچھا۔

''یہی کہ میرا گھر اتنا چھوٹا سا ہے اور میں کسی بہت امیر کبیر خاندان سے تعلق نہیں رکھتی۔''

''اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔'' اُما بولی۔ ''اور پھر میری دوستی تمہارے گھر سے تو نہیں تم سے ہے۔ ویسے ایک حد تک میں جانتی تھی کہ تم کسی بہت دولت مند خاندان سے تعلق نہیں رکھتیں۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ میں تمہاری دوست ہوں۔ تمہیں سمجھتی ہوں۔ تم نے کبھی بتایا نہیں اور میں نے کبھی پوچھا نہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں تمہیں سمجھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس بارے میں تم سے کچھ پوچھتی تو تم مجھے بتا دیتیں لیکن میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ ایک دن تم خود ہی مجھے بتا دو گی۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ تم کب مجھ پر اعتماد کرنا شروع کرو گی۔''

''اُما مجھے تم سے اچھی دوست کبھی نہیں مل سکے گی۔'' ماہ بانو نے تشکر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو کوئی اور بات کرو۔''

''ارے یاد آیا۔ میں تم سے نیہاں کے متعلق بات کرنے کے لیے بے چین تھی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''کیا بات؟''

''میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ کس کے متعلق اتنی سیریس ہو رہی ہے۔''

''ریلی؟ کس کے متعلق؟'' اُما نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''قسم سے بہت گھنی ہے۔ میری روم میٹ ہونے کے باوجود اس نے مجھے بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔''

''ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میں نے نوٹ کیا ہے۔ یاد ہے وہ اپنی اور تمہاری چیزیں رکھنے بس پر گئی تھی اور پھر ہمارے پاس آ بیٹھی تھی۔''

''ہاں۔''

''اور اس وقت اس کی تمام تر توجہ کس پر تھی؟''

''میں تو اس وقت اتنی تھکی ہوئی اور بیزار تھی کہ اس کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔''

''جیمز پر۔'' ماہ بانو نے گویا انکشاف کیا۔

''ہائے جیمز پر؟ کتنا اچھا کپل بنے گا۔'' اُما نے جوش سے کہا۔ ''لیکن بانو کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ تمہارا وہم نہیں تھا' میرا مطلب ہے کہ متوجہ ہونے کا مطلب تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''نوے فیصد یقین ہے۔ میں کم ہی کسی کو غلط ریڈ کرتی ہوں۔''

''آنے دو نیہاں کو اس پر دونوں طرف سے اٹیک کریں گے۔''

''بڑی تیز ہے وہ' جواباً تم پر بھی فوراً اٹیک کرے گی۔''

اُما ہنس پڑی۔ پھر چادر کے ڈیزائن پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

''اچھا ہوتا اگر ایڈی ہندو ہوتا' یا پھر میں ہی مسلمان ہوتی۔''

''تم اس کے لیے سیریس ہو رہی ہو؟''

''ارے نہیں۔ یونہی ایک سوچ سی تھی۔'' اُما نے جلدی سے کہا۔

''یہ یقین دہانی تم مجھے کروا رہی ہو یا خود کو؟'' ماہ بانو نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''پاگل ہوئی ہو؟ میں نے یونہی بات کہہ دی تھی۔''

''میری مانو اُما! تو ایک مرتبہ اپنے اندر ضرور جھانکو' یہ مشکل کام ضرور ہے لیکن زندگی میں ایک آدھ مرتبہ کرنا چاہیے ورنہ انسان زندگی کے کسی لمحے کسی موڑ پر پچھتاتا ضرور ہے۔ اور انسان کو پچھتانا نہیں چاہیے۔''

اُما نے کمرے کی دیوار پر آویزاں سوزین کی The Repente کے Replica پر نگاہیں جما دیں۔

''تمہارا کیا خیال ہے' میں نے اپنے اندر کبھی نہیں جھانکا۔ میرا سودا نقصان کا ہی ہے۔ اب تو صرف یہ دیکھ رہی ہوں کہ کہاں کم نقصان ہے' پچھتاوا کہاں کم ہو گا اور بانو۔'' اُما نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''کیا ایسی لڑکیاں نہیں ہوتیں جو محبت کسی سے کرتی ہیں اور شادی کسی سے' پھر بھی خوش اور مطمئن رہتی ہیں۔''

ماہ بانو نے گہرا سانس لیا۔ اس کے ذہن میں زرینہ خالہ اور حیدر علی شاہ کے خاکے اُبھر آئے۔

''اُما مجھے یقین ہے کہ ہم ان لڑکیوں میں سے نہیں ہیں۔ جو یہ کر سکیں۔''

''سب بکواس ہے۔ یہ سسٹم' یہ سیٹ اپ' محبت' سب کچھ۔'' اُما نے آہستہ سے کہا۔

''اکیسویں صدی کمپیوٹر کا زمانہ Space Shuttle؟'' ماہ بانو ہنسی۔ ''اور اس سب کے بیچ میں محبت' وہی روایتی پرانا کھیل' انہی پرانے اصولوں اور قوانین کے ساتھ۔ ذرہ بھر بھی یہ قانون اور اصول ٹوٹیں تو ریفری فاؤل کی سیٹی بجا دیتا ہے اور بعض اوقات ریڈ کارڈ دکھا کر کھیل سے آؤٹ کر دیتا ہے۔''

''ہم انسان کیا جھک مار رہے ہیں یہاں زمین پر۔ یا تو یہاں رہنے کے قانون مختلف

ہونے چاہیے تھے یا پھر انسانی دماغ کی ساخت مختلف ہونی چاہیے تھی۔ اب تم اپنی زرینہ خالہ کو دیکھ لو، محبت کی تو کیا ملا انہیں؟ اور کیا مل جائے گا مجھے، اگر میں نے محبت کی؟ ایسا شعور نہیں ہونا چاہیے انسان کے پاس جو اسے صرف اور صرف دُکھ دے۔ یہ جنت جہنم، سورگ اور نرک کیا ہیں؟ ہمارے لیے تو یہ دنیا بھی جہنم ہے۔ جو اصول، جو قانون توڑیں گے، اس کو اِس زندگی میں بھی سزا بھگتنی ہوگی اور اس زندگی کے بعد بھی۔''

''کہتے ہیں محبت نہ کرنے سے محبت کرنا اور ناکام ہونا بہتر ہے۔'' اُما ہنس پڑی۔

''تم مجھے دنیا اور دنیا کے بعد یقینی جہنم میں دھکیلنا چاہتی ہو بانو تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ ہم ان لڑکیوں میں سے نہیں ہیں کہ محبت کسی سے کریں اور شادی کسی اور سے اگر ایسا نہ ہوتا تو یقین کرو میں اس فلرٹ پر تیار ہو چکی ہوتی۔''

کمرے کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

''آ جائیں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

اماں بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

''کیا ہوا اماں خیر تو ہے؟'' ماہ بانو ان کے ہوائیاں اُڑے چہرے کی طرف دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''غضب ہوگیا بانو۔'' وہ اس کی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

☆======☆======☆

وہ فوراً ہی گاؤں کے لیے نکل گئے تھے۔ اُما بھی ان کے ساتھ تھی۔ دوپہر کو کام سے فارغ ہو کر اباجی نے اخبار کھولا تو ان کی نظر گاؤں میں ہونے والے حادثے کی خبر پر پڑی۔ فون کر کے پتا کیا گیا تو اطلاع درست تھی۔ ماہ بانو اور اُما نے قریبی پی سی او سے ایڈی کو فون کیا۔ ساری رات کام کرنے کے بعد وہ سارا دن سونے کی نیت سے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ عبداللہ کے زخمی ہونے کا سن کر وہ بھی دوسرے کلاس فیلوز کے ساتھ اس کے گاؤں روانہ ہوگیا۔

☆======☆======☆

حیدر بابا اسی وقت پولیس کو فارغ کر کے آئے تھے۔ پولیس بھی وہاں محض رسمی کارروائی کی خاطر آئی تھی۔ دونوں فریقین اپنے معاملات اپنے طور پر حل کرنا چاہتے تھے۔ دونوں ہی اثر ورسوخ والے لوگ تھے تو پولیس کو کیا پڑی تھی درمیان میں آنے کی۔

حیدر بابا اس لڑائی کو طول نہیں دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے بیان دیا تھا کہ شہر جاتے ہوئے راستے میں ان کے بیٹے پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی تھی۔ دفاعی طور پر انہوں نے بھی جوابی فائرنگ کی۔ اس دوران ان کا بیٹا معمولی اور گن مین شدید زخمی ہوگیا۔ انہیں یہ علم نہیں کہ ان کے بیٹے پر فائرنگ کرنے والے کون تھے۔

جب کہ دوسری طرف پیر صاحب نے کہا تھا کہ ان کے بیٹوں کو اتفاقیہ گولیاں لگ گئی تھیں۔

بات جہاں تھی، وہیں دفن ہوگئی تھی۔

جمعہ کو امداد علی کے قُل تھے۔ حیدر بابا اور فوزیہ بیگم پیر صاحب کی حویلی جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

''بھائی!'' زہرا نے عبداللہ کے کمرے میں جھانکا۔

''ہوں، آ جاؤ۔'' وہ سگریٹ بجھا کر بستر پر اُٹھ بیٹھا۔

''یہ اماں اور باباجان کو سمجھائیں ناں بہت گڑبڑ کر رہے ہیں۔'' وہ اندر آ گئی۔

''کیا گڑبڑ کر رہے ہیں؟'' وہ کچھ نہ سمجھا۔

''بڑی حویلی جا رہے ہیں تعزیت کے لیے۔''

''مجھ سے تو کوئی بات نہیں کی انہوں نے اس سلسلے میں۔''

''پتا نہیں کیوں نہیں کی۔ کل بھی وہ یہ پروگرام بنا رہے تھے۔ میں نے منع کرنا چاہا تو اماں جان نے ڈانٹ دیا۔ اب پھر میں کوئی بات کروں گی تو ڈانٹ پڑ جائے گی۔ آپ انہیں منع کریں، آپ کو کچھ نہیں کہیں گی۔''

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔'' وہ پلنگ سے اتر آیا۔ اماں جان چادر اٹھا کر باہر نکل رہی تھیں جب وہ ان کے پاس آیا۔

''کہاں کی تیاری ہے اماں جان؟'' اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''تمہارے بڑے باباجان کی حویلی جا رہے ہیں تعزیت کے لیے۔''

باباجان بھی اپنی خواب گاہ سے نکل آئے۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے ناں بیٹا، تم نہیں سمجھو گے۔'' اماں جان نے پیار سے کہا۔

''آپ سمجھائیں گی تو سمجھ جاؤں گا؟''

''تم پھر بھی نہیں سمجھو گے۔'' باباجان نے کہا۔ ''کیونکہ جس عمر میں تم ہو اس میں سوچنے کا انداز وہ نہیں ہوتا، جو میری عمر تک پہنچ جانے والے کسی بھی شخص کا ہوا کرتا ہے۔''

وہ چند ثانیے خاموش رہا پھر بولا۔

''آل رائٹ! میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ وہاں جانے سے آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''

باباجان کے چہرے پر پُرشفقت مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مطمئن رہو، ایسا نہیں ہوگا۔''

"آپ اتنے پُریقین کیوں ہیں اس بارے میں؟" عبداللہ نے کہا۔

"وہ حویلی میرے لیے نئی نہیں ہے' نہ وہاں رہنے والوں کے رویے اور خیالات میرے لیے نئے ہیں۔ تم فکرمت کرو۔" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ مائنڈ نہ کریں' لیکن بابا جان! آپ کی باتوں نے مجھے مطمئن نہیں کیا۔ آپ جانا چاہتے ہیں' ضرور جائیں' لیکن ایسی صورت میں' مَیں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"نہیں' تم یہیں رہو گے عبداللہ!" اماں جان نے تیزی سے کہا۔

"تمہیں ساتھ نہ لے جانے میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ میں یہ آگ مزید نہیں پھیلانا چاہتا' بلکہ اسے بجھانا چاہتا ہوں۔ ابھی میرے سامنے تمہارا مستقبل ہے۔ تمہاری بہنوں کا مستقبل ہے اور مجھے تم لوگوں کے مستقبل کو محفوظ بنانا ہے۔

بڑی حویلی کی روایت ہے کہ گھر آئے مہمانوں کو پوری عزت دی جاتی ہے' چاہے آنے والا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ میں اور تمہاری اماں جائیں گے تو کچھ نہیں ہوگا لیکن تم بھی ہمارے ساتھ ہوگے تو وہ لوگ خواہ مخواہ آزمائش میں پڑ جائیں گے اور کسی کو آزمائش میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہر کوئی اس میں پورا نہیں اتر سکتا۔" بابا جان نے کہا۔

"مجھے آپ کی باتوں سے انکار نہیں ہے' لیکن وہ لوگ بہت گھٹیا ہیں اور کوئی بھی نیچ حرکت کر سکتے ہیں' میں مطمئن نہیں ہوں بابا جان!"

"کچھ نہیں ہوگا' میں اپنے بڑے بھائی کے گھر جا رہا ہوں بے فکر رہو۔" بابا جان نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

پھر وہ فوزیہ بیگم سے مخاطب ہوئے۔ "چلو! دیر ہو رہی ہے۔"

☆======☆======☆

بڑی حویلی میں اسی طرح صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ گٹھلیاں اور سپارے پڑھے جا رہے تھے۔ بَین بھی ہو رہے تھے اور لنگر بھی جاری تھا۔ ان کی گاڑی بغیر کسی محافظ کے وہاں پہنچی تو بہت سے لوگ چونک گئے۔

"حویلی والوں کا ردِعمل کیا ہوگا؟"

یہ وہ سوال تھا جو سب کے ذہنوں میں گردش کرنے لگا تھا۔

پیر صاحب شہر میں اسپتال میں تھے۔ مکرم اور صفدر علی بھی وہیں تھے اور اب کسی بھی لمحے ان کی واپسی متوقع تھی۔

مردانے میں اس وقت حویلی کے افراد میں صرف سخاوت بابا' سبط حسن اور نوازش تھے۔ ان کی گاڑی اندر داخل ہوتے دیکھ کر سبط حسن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

حیدر بابا سامنے ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ چچی اماں پیچھے پردے میں

تھیں۔

اس نے سخاوت بابا اور نوازش کی سمت دیکھا۔ ان دونوں کی تیز نگاہیں بھی اسی گاڑی پر مرکوز تھیں۔ اس سے قبل کہ ان میں سے کوئی کچھ کہتا یا کرتا' سبط اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

گاڑی رک چکی تھی اور حیدر بابا باہر نکل رہے تھے۔ وہاں بیٹھے لوگ کوئی ردِعمل ظاہر کرنے سے قاصر تھے۔ انہیں پہلے حویلی والوں کے ردِعمل کا انتظار تھا۔

سبط ان کی سمت بڑھا۔

"آیئے حیدر بابا!" اس نے کہا۔

انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ "جیتے رہو۔ تم سبط حسن ہو ناں؟"

"جی۔"

"اچھا بیٹا' اپنی چچی اماں کو اندر چھوڑ آؤ۔"

"جی بہتر' آپ وہاں تشریف رکھیں۔"

اس نے ایک نظر اس سمت میں دیکھا' جہاں سخاوت بابا اور نوازش تھے۔ ان کی آنکھوں میں تیرتے شعلے تھے جنہیں سرد رکھنے کی وہ حتی المقدور کوشش کر رہے تھے۔

وہاں موجود باقی لوگوں نے جب سبط کی مہمان نوازی دیکھی تو وہ بھی حیدر علی شاہ کی طرف بڑھے۔

ڈرائیور اتر چکا تھا۔ گو کہ وہ بظاہر غیر مسلح تھا' لیکن اس کے پاس کسی ریوالور یا پستول کی موجودگی بعید از قیاس نہیں تھی۔ اب بھی وہ ہر طرح سے چوکنا تھا۔

سبط حسن گاڑی کی چابی لے کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی اس سمت بڑھ گئی' جہاں باپردہ خواتین کے گاڑیوں سے اترنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ گاڑی روک کر اس نے چچی اماں کی سمت کا دروازہ کھولا۔

"آیئے چچی اماں؟"

"جیتے رہو۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ دونوں اندر پہنچے تو وہاں کی صورتِ حال بھی مختلف نہیں تھی۔

اماں جان عورتوں کے درمیان گھری ہوئی تھیں۔ وہ سب عورتیں رو رہی تھیں' لیکن اماں جان نے نہ جانے کیسے صبر کر رکھا تھا۔ شاید اس حویلی کی ماؤں کے مقدر میں یہی لکھا تھا کہ وہ چپ چاپ صبر کے ساتھ جیئے چلی جائیں۔

ریشماں وہاں نہیں تھی۔ شاید کوئی اسے کمرے میں لے گیا تھا۔ اس کی حالت اب بھی بہت بری تھی۔

"اماں جان! چچی اماں آئی ہیں۔" سبط نے آہستہ سے ان سے کہا۔

اماں جان نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔ چچی اماں ان کے قریب بیٹھ گئیں۔ اماں کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں لہرائیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

چچی اماں کے گلے سے لگ کر وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔ سبط کو محسوس ہوا کہ اس کا دل غم سے پھٹ جائے گا' وہ باہر کی طرف مڑ گیا۔

باہر ایک اور مسئلہ اس کا منتظر تھا۔ ابھی وہ دور ہی تھا کہ اس کی نگاہ جیپ سے اترتے مکرم علی پر پڑی۔ مکرم جیپ سے اترتے ہی ٹھٹک گیا تھا۔ حیدر علی شاہ کو وہاں دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا تھا اور وہاں ان کا نمک کھانے والے لوگ تھے' جو ان کے سامنے بچھے چلے جا رہے تھے۔

وہ لوگ جو پیر صاحب کے کھیتوں میں کام کرتے تھے جن کے گھروں کا چولہا پیر صاحب کی مہربانی سے جلتا تھا' جن کے دکھ بیماری میں پیر صاحب کی دعائیں اور پیسہ کام آتا تھا' وہ لوگ ان کے بیٹے کے قتل کے ذمہ دار شخص کے قدموں میں بیٹھے ہوئے تھے۔

اور وہاں سخاوت بابا اور نوازش بھی تھے جو حیدر علی شاہ کے بالکل برابر بیٹھے ہوئے تھے۔

مکرم علی نپے تلے قدموں سے ان کی طرف بڑھا۔ اس کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ اچھے موڈ میں نہیں تھا۔ سبط نے بھی اپنے قدم تیز کر دیے۔

"کیا لینے آئے ہو یہاں؟"

حیدر علی کے سامنے پہنچ کر مکرم تن کر کھڑا ہو گیا۔ سبط چند قدم آگے بڑھ کر ان دونوں کے بیچ آ کھڑا ہوا۔

"آپ حیدر بابا سے اس انداز میں بات نہیں کر سکتے۔" اس کے لہجے میں سختی تھی۔

"سبط میرے راستے سے ہٹ جاؤ' ورنہ تمہارا فیصلہ بھی یہیں ہو جائے گا۔"

"میں منتظر ہوں۔" سبط نے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

حیدر بابا اٹھ کھڑے ہوئے۔ "نہیں بیٹا یہ بھائی پر اٹھتا اچھا نہیں لگتا۔" انہوں نے سبط کے ریوالور والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولے۔

"مکرم کو امداد علی کا دکھ ہے' اسے کہہ لینے دو' جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آگ ہم بھائیوں کے درمیان بھڑک اٹھی ہے' وہ تم بھائیوں کے درمیان بھی بھڑکے۔"

"مکرم! یہ اس حویلی کی روایت ہے کہ یہاں دشمن آ جائے تو اسے بھی کچھ نہیں کہا جاتا۔" سخاوت بابا بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

مکرم علی چند لمحے قہر آلود نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا پھر بولا۔

"آج بچ کر جا رہے ہو حیدر علی' لیکن آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ تمہارے بیٹے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلاؤں گا اور تمہاری بیٹیوں کو......!"

"بس مکرم!" سبط اس کی بات کاٹ کر غصے سے دھاڑا۔ "بیٹیوں کا ذکر مت کرو' انہیں

درمیان میں لائے تو بہت برا ہو گا۔"

"برا تو تمہارے ساتھ بھی ہو گا' بس مجھے بابا جان کے آنے کا انتظار ہے۔"

وہ کہہ کر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف مڑ گیا۔

"آپ بیٹھیں حیدر بابا پلیز؟ اور اس کی باتوں کا برا مت ماننا' اس وقت غصے میں ہے۔" سبط نے کہا۔

☆======☆======☆

مکرم علی' خادم حسین کے ہوش میں آ جانے کی اطلاع لے کر آیا تھا۔ گو کہ وہ ابھی تک انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھا' لیکن ہوش میں آ جانے کے بعد یہ امید بندھ گئی تھی کہ وہ صحت یاب ہو جائے گا۔ مکرم یہ خبر لے کر فوراً گاؤں کی طرف روانہ ہوا تھا' لیکن حویلی میں پہنچتے ہی اس کی نگاہ حیدر علی شاہ پر پڑ گئی تھی۔ بہرحال اس نے یہ اطلاع اندر اماں جان تک بھجوا دی تھی اور اماں جان سجدہ شکر بجا لائی تھیں۔ کتنی دیر تک وہ فوزیہ بیگم کے کندھے سے لگی روتی رہیں۔

"یہ آپ کے قدموں کی برکت ہے بھابی! کہ خادم حسین ہوش میں آ گیا' ورنہ یہاں تو سب ناامید تھے۔"

"اللہ تعالیٰ سے خیر کی دعا کرنی چاہیے' وہ سب کی سنتا ہے۔" فوزیہ بیگم نے انہیں دلاسا دیا۔

"پر میرا جو بیٹا چلا گیا اسے کون لائے گا؟ کتنے خواب دیکھے تھے میں نے اپنی اولاد کے لیے' ابھی تو اس کے سہرے کے پھول کھلنے تھے' یہ عمر مرنے کی تو نہیں ہوتی۔ ہائے میری زینب اس کم عمری میں بیوہ ہو گئی۔"

فوزیہ بیگم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ زینی کا ہنستا مسکراتا چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں' مگر بہت مشکل سے انہوں نے خود کو روکا۔ وہ جانتی تھیں کہ یمین بیگم محبت اور خلوص کا پیکر تھیں' لیکن ان کی سوچ اسی حویلی کی چار دیواری میں بند تھی۔ اگر وہ اپنے بیٹے کے ساتھ زینی کے سہاگ کا ماتم کر رہی تھیں تو اس میں ان کا کچھ زیادہ قصور نہیں تھا' وہ گڑیا اور زینی کو بیاہ کر اس حویلی میں لاتیں تو انہیں اپنی پلکوں پر جگہ دیتیں' لیکن ان کی تمام تر محبت کے باوجود بھی فوزیہ بیگم اس ماحول میں اپنی بیٹیاں دینے پر کسی صورت تیار نہیں تھیں۔

اور اب تو یوں بھی پیر صاحب کے طرزِ عمل سے ثابت ہو چکا تھا کہ وہ گڑیا اور زینی کو نہ اپنی بہو اور نہ کسی اور کی بہو یا بیوی بننے دیں گے۔

فوزیہ بیگم انہیں دلاسا دیتی رہی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ دونوں خواب گاہ میں چلی گئیں۔

"ریشماں کہیں دکھائی نہیں دے رہی؟" فوزیہ بیگم نے پوچھا۔

"اس کی حالت بہت خراب تھی' بھائیوں نے منع کیا تھا اسے کمرے سے باہر نکلنے کے لیے۔ باہر آتی ہے' کسی سے ملتی ہے' روتا دیکھتی ہے تو پھر بلکنے لگتی ہے۔"

کھانا کس نے کھانا تھا۔ وہ ویسے ہی دھرا رہا۔

"بھابی مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا' ایک درخواست کرنی تھی۔" بہت ہمت کر کے یاسمین بیگم نے کہا۔

"آپ حکم کریں' درخواست کیسی؟" فوزیہ بیگم نے کہا۔

"یہ موقع تو نہیں ہے' لیکن میں کیا کروں پھر نہ جانے کب زندگی میں اکٹھا ہونے کا موقع ملے۔" وہ چند لمحے خاموش رہیں پھر کہنے لگیں۔

"کہنے کو تو میں ریشماں کی سوتیلی ماں ہوں' لیکن مجھے اب تک سمجھ میں نہیں آیا' کہ سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے۔ ماں تو صرف ماں ہوتی ہے اور میں نے اسے ماں بن کر پالا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس کی مرحومہ ماں زندہ ہوتی تو اسے کیسے پالتی' لیکن میں نے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر اسے محبت دی ہے۔

میں نے کبھی پیر صاحب کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی' لیکن ریشماں کے لیے ماتا سے مجبور ہو کر یہ بھی کیا۔ پیر صاحب نہیں مانتے' لیکن میں انہیں مجبور کروں گی کہ اب ریشماں جن کی امانت ہے' انہیں دے دی جائے۔

بھابی! وہ آپ کے گھر کی عزت ہے' اگر آپ باقاعدہ رشتہ لے آئیں تو میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گی۔" ان کی آنکھوں میں آس اور امید تھی۔

فوزیہ بیگم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس مسئلے کو کیسے حل کریں۔ یاسمین بیگم منتظر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اور ابھی بہت سی باتیں غور طلب تھیں۔ عبداللہ ابھی زیر تعلیم تھا لیکن اگر اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا' تب بھی یہ ہونا بہت مشکل تھا۔ عبداللہ بچپن میں طے کی گئی اس نسبت کو جانتا تھا۔ اس نے کبھی واضح طور پر ناپسندیدگی کا اظہار تو نہیں کیا تھا' لیکن یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ اس نے ذہنی طور پر اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ شاید اظہار نہ کرنے کی وجہ یہ ہو کہ اب مدتوں سے اس نسبت کی بات چیت قریباً بند ہی تھی۔ کبھی شاذ و نادر یہ ذکر چھڑ ہی جاتا تھا تب بھی عبداللہ موضوع گفتگو بدل دیتا تھا۔

اور پھر گڑیا اور زینی تھیں۔ فوزیہ بیگم کو یقین تھا کہ اگر کسی صورت پیر صاحب کو ریشماں اور عبداللہ کی شادی کرنے پر مجبور کر لیا گیا تو وہ بھی جواباً گڑیا اور زینی کے رشتے مانگیں گے۔ گڑیا کو خادم حسین کی بیوی بنا کر اپنی حویلی لے جائیں گے تو زینی کو امداد علی کی بیوہ۔ اور وہ دونوں وہاں یرغمال کی حیثیت سے رہیں گی۔

وہ ریشماں اور عبداللہ کی شادی چاہتی تھیں لیکن اپنی بیٹیوں کے تاریک مستقبل کی قیمت پر کسی صورت بھی نہیں۔

"چاہتی تو میں بھی ایسا ہی ہوں بلکہ یہ تو میری دلی خواہش ہے۔" انہوں نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن بھابی' پہلے تو پیر صاحب راضی نہیں ہوں گے۔ آپ جانتی ہیں ناں کہ دشمنی کی کیسی آگ بھڑک رہی ہے اور بالفرض محال ایسا ہو جائے تب بھی میری بیٹیاں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ تو انہیں بہت زیادہ پیار اور محبت دیں گی' لیکن انہیں اس حویلی کے دیگر افراد کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں ناں' اب بھی تو ایسا ہی ہونے لگا تھا۔" انہوں نے دبے دبے انداز میں' اپنی بات مکمل کی۔

یاسمین بیگم کی آنکھوں میں جلتے آس اور امید کے دیئے بجھ گئے۔

"ٹھیک کہتی ہیں فوزیہ بھابی! ایسے دشمنوں کے گھر سے آپ ڈولی کیسے لے جا سکتے ہیں' جس گھر کے مکین آپ کی بیٹیوں کی ڈولی کو آگ لگا رہے ہوں۔" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

فوزیہ بیگم نے خاموشی میں عافیت سمجھی۔

"میری بچی ریشماں بہت صابر ہے' وہ اب بھی صبر کر لے گی۔" یاسمین بیگم نے ہولے سے کہا۔

"بھابی! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ ریشماں کو عبداللہ کی دلہن بنانا میری کتنی بڑی خواہش ہے۔" فوزیہ بیگم نے کہا پھر قدرے دبے دبے انداز میں بولیں۔

"اگر آپ لوگ گڑیا اور زینی کے رشتے چھوڑ دیں تو......!" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

یاسمین بیگم کو دھچکا سا لگا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے' زہرا تو گدی کے وارث خادم حسین کی مانگ ہے اور زینی میرے امداد حسین کی نشانی۔"

ہر سمت عجیب مصیبت اور الجھن نظر آ رہی تھی دونوں کو۔

"اپنی مانگ چھوڑ دینا حویلی کی روایت نہیں ہے آپ لوگ اپنی مانگ چھوڑ رہے ہیں' لیکن میرے بیٹے اپنی مانگ نہیں چھوڑیں گے۔ یوں اپنی مانگ چھوڑ دینا اس حویلی میں بے غیرتی سمجھا جاتا ہے۔" یاسمین بیگم نے کہا۔

"آپ نہیں جانتیں کہ پیر صاحب نے ریشماں کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"کیا فیصلہ کیا ہے؟" فوزیہ بیگم نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"وہ اپنی زبان سے بھی نہیں پھرنا چاہتے تھے' جو انہوں نے شاہ صاحب کو دی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھائی کے گھر کریں گے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ اب ریشماں آپ کے گھر جائے' سگے بھائی سہی' لیکن اب تو دشمن ہیں اور وہاں بیٹی دینے کا مطلب ہوا کہ ان

کا سر جھک گیا۔ یہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں وہ۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ چھوٹے شاہ صاحب کے گھر اس کی شادی کریں۔''

''کیا؟ سخاوت بھائی کے گھر؟''

یاسمین بیگم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن بھابی! یہ تو سراسر ظلم ہے' ناانصافی ہے۔''

''اس حویلی میں اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے' ایک ہی امید تھی آپ کی طرف سے' آپ نے بھی ہاتھ اٹھا لیا' اس کے سر سے' اب تو کوئی امید ہی نہیں۔''

☆======☆======☆

جنت بائی' شمیم کو نوری بنا رہی تھیں' نشست و برخاست کے آداب' پہننے اوڑھنے کا سلیقہ' خاص خاص محفلوں میں انداز گفتگو' رقص کے زاویے' سُر اور تال کی سمجھ بوجھ۔

نوری کی تربیت تو وہ بچپن سے کرتی آ رہی تھیں اور تب وہ اکیلی نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ چندا بائی بھی تھیں اور چندا بائی کا ڈنکا ہر طرف بجتا تھا۔ نوری پر دونوں نے مل کر محنت کی تھی اور اسے ایسا ہیرا بنایا تھا' جس کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی' لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چندا بائی اور نوری کار ایکسیڈنٹ میں ان سے اتنی دور چلی گئی تھیں' جہاں سے واپس آنا ممکن نہیں تھا۔

شمیم کو دیکھ کر ان کے دل میں نوری کی یاد تازہ ہو گئی اور انہوں نے اسے شمیم کے نام سے پکارنا چھوڑ کر نوری کہنا شروع کر دیا تھا۔

اس نئی نوری پر انہوں نے بہت محنت کی تھی۔ وہ بہت بدسلیقہ اور گنوار لڑکی تھی۔ اس کے ہر انداز سے گنوار پن جھلکتا تھا اور اس گنوار پن کو ختم کرنا آسان نہیں تھا' لیکن انہوں نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔

جو عزم برسوں سے نوری کی پیدائش پر انہوں نے کیا تھا' وہ اسے ہر حال میں پورا کرنا چاہتی تھیں۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں انہوں نے بیٹی کی پیدائش کے لیے۔ کسی بھی قیمت پر۔

اور اب ان کی خواہش تھی کہ اس نئی نوری کی تربیت مکمل ہوتے ہی لاہور کا رخ کریں' جہاں روپیہ پیسہ تھا' فلم انڈسٹری تھی اور سب سے بڑھ کر وہاں رہتے ہوئے وہ خود سے کیا ہوا وعدہ پورا کر سکتی تھیں۔

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ اور فوزیہ بیگم اپنی حویلی واپس پہنچے تو دونوں ہی چپ چاپ اور افسردہ تھے' کسی سوچ میں گم تھے۔

''کیا ہوا اماں جان؟ میں اتنا انتظار کر رہی تھی آپ لوگوں کا؟'' زہرا بے تابی سے ان کی

طرف بڑھی۔

''انتظار؟'' حیدر بابا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے۔'' وہ بھی اماں جان کے قریب ہی فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

''آپ لوگ دشمنوں کی حویلی گئے تھے' میری تو جان اٹکی ہوئی تھی اور بھائی جان ابن بطوطہ بنے ہوئے تھے۔ یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں۔ غالباً بارہ سو چکر لگائے تھے' ہیں ناں بھائی؟''

''کسی نے آپ سے بدتمیزی تو نہیں کی بابا جان؟'' اس نے پوچھا۔

''بھائی جب بھائی کے گھر جاتے ہیں' تو محبت سے ملتے ہیں' بدتمیزی کا کیا مطلب؟''

''آپ کو بھی اچھی طرح اپنے بھائیوں کا پتا ہے خواہ مخواہ ہمارے سامنے ان کی سائیڈ لیتے رہتے ہیں۔ یہ آپ کے سگے بھائی اور پیر صاحب ہی ہیں ناں جن کے فرزند مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے۔'' زہرا نے تنک کر کہا۔

''گڑیا! تم بہت بولتی ہو۔ وہ زینی تمہارے ساتھ کی ہے' لیکن تمہاری طرح بدتمیز اور منہ پھٹ نہیں ہے۔'' اماں جان کے انداز میں ناگواری تھی۔

''میں نے کچھ غلط نہیں کہا' صرف حقیقت بتا رہی ہوں۔'' اس نے منہ پھلا لیا۔

''نہیں بیٹا! میں بھائیوں کی سائیڈ نہیں لیتا' کل جو کچھ ہوا' وہ صرف غلط فہمی کی وجہ سے ہوا' ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے' تم بڑے بابا کی طرف سے اپنا دل میلا مت کرو۔''

''چچ چچ۔ بابا جان! بھائیوں کے لیے آپ کی محبت۔ کیا وہ بھی غلط فہمی تھی۔ جس کی وجہ سے برسوں دور رہے؟ اسے آپ کیا کہیں گے کہ صرف آپ کے بھائیوں کی وجہ سے ہم بہن بھائی آپ کی اور اماں جان کی اس محبت سے محروم رہے' جس پر ہمارا حق تھا' اس گھر سے دور رہے' جس سے ہمارے بچپن کی کتنی یادیں وابستہ تھیں۔

زینی اس لیے نہیں بولتی کہ وہ جن سے محبت کرتی ہے ان کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی ہے' چاہے حقیقت جانتی بھی ہو۔ وہ حقیقت سے فرار کے راستے ڈھونڈتی ہے' لیکن میں اتنی احمق نہیں ہوں۔ میں حقیقت کا سامنا کرنا جانتی ہوں۔

لیکن آپ کو ان باتوں کی کیا خبر ہو گی۔ آپ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آپ لوگ اپنی اولاد کو جانتے ہیں ان کی سوچ کو پڑھ سکتے ہیں' اس لیے کہ آپ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ چار چھ مہینے بعد تحفوں سے لدے پھندے آنے اور ہفتہ بھر ساتھ رہنے سے آپ کو میرے اور زینی کے مزاج کا فرق یوں بھی پتا نہیں چل سکتا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ بابا جان' اپنے بھائیوں کی محبت کے قصیدے ان کے سامنے پڑھیں جو یہ باتیں نہ جانتے ہوں۔ کم از کم میرے سامنے ایسا مت کریں۔''

"گڑیا!" عبداللہ پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "اس طرح بات بات پر ناراض نہیں ہوتے' بیٹھو یہاں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ میں اور باباجان میں اتنا تحمل کیسے ہے۔ مجھے بہت غصہ آتا ہے ایسی باتوں پر' پتا نہیں آپ کو کیوں نہیں آتا۔" وہ منہ پھلا کر عبداللہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"غصہ آتا ہے' لیکن یوں بات بات پر نہیں اور ان لوگوں پر تو بالکل نہیں آتا جو میرے اپنے ہوں' میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیوں خفا ہو جاتی ہو۔ اس دنیا میں انسان کو بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ اچھا بھی اور برا بھی۔ ہم میں برداشت اور حوصلہ تو ہونا چاہیے ناں۔" عبداللہ نے اسے سمجھایا۔

"آپ میں اور باباجان میں ہی ہے۔ میں نے اتنا تحمل اور کسی میں نہیں دیکھا۔" وہ بولی۔

"گڑیا بیٹے! مجھ میں بہت سی کمزوریاں ہیں اور اپنے بھائیوں سے محبت کرنا' انہی میں سے ایک ہے۔ میری یہ کمزوری برداشت کرلیا کرو۔ وہ اچھے ہیں یا برے' میرے سگے بھائی ہیں۔" باباجان نے کہا۔

"اچھا چھوڑیں باباجان! یہ بتائیں کہ کس کس سے ملاقات ہوئی؟" عبداللہ نے موضوع بدل دیا۔

"پیر صاحب تو اسپتال میں تھے' اس لیے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ باقی تو تقریباً سب ہی سے ہوئی ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"تو کیا خادم حسین کی کوئی اطلاع آئی؟"

"ہاں' شکر ہے کہ اب وہ ہوش میں آگیا ہے۔"

"پھر وہی شکر ہے' باز نہیں آئیں گے؟" زہرا منہ پھیر کر بڑبڑائی۔

"اور تائی امی کیسی تھیں؟"

"وہ بے چاری کیسی ہوگی' اپنے بیٹے کو روتی ہے' لیکن ہم سے گلہ نہیں کرتی۔" اماں جان نے افسردگی سے کہا۔

"گلہ تو تب ہوتا جب اس کی کوئی وجہ ہوتی' ہم نے کوئی ظلم کیا ہوتا ان پر' ہم نے کیا کیا ہے' جس کا انہیں گلہ ہونے لگا۔" زہرا سے رہا نہ گیا۔

"غم کی شدت میں انسان یہ سب باتیں کب سوچتا ہے' لیکن یاسمین بھابی بہت اچھی ہیں۔" اماں جان نے کہا۔

"اچھا یہ بتائیں۔" زہرا نے کن اکھیوں سے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ "ریشماں سے بھی ملے؟"

"ہاں' ہم دونوں ہی ملے تھے' اس کے تو آنسو ہی نہیں تھم رہے تھے۔" اماں جان نے کہا۔

"یہ تو بتائیں کہ وہ دیکھنے میں کیسی ہے؟" زہرا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہُو بہو اپنی ماں جیسی' اتنی خوبصورت کہ ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد انسان نظریں اٹھانا ہی بھول جائے۔" اماں جان بولیں۔

حیدر علی شاہ کی نگاہوں میں کچھ دیر پہلے کا منظر گھوم گیا۔ جب ریشماں ان سے ملی تھی۔ ان کے سینے سے لگ کر روتی ہی رہی تھی۔ ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اس نے۔

فوزیہ بیگم نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ ہُو بہو زرینہ تھی وہی رنگت' وہی نین نقش' ویسے ہی لمبے بال اور وہی قد کاٹھ۔ برسوں گزر جانے کے باوجود بھی' وہ زرینہ کو بھولے نہیں تھے۔ اس کی شبیہہ اب بھی ان کی آنکھوں میں تھی۔ اسے دیکھ کر ان کے دل میں ٹیس سی اٹھی تھی۔ وہ زرینہ کی بیٹی تھی۔ اس کی نشانی۔

"کاش ریشماں کی عبداللہ سے شادی ہو جائے۔ میں سمجھوں گا کہ میں نے زرینہ کی محبت کا قرض چکا دیا۔" انہوں نے سوچا تھا۔

لیکن اب ان کی محبت کا دھارا ایک ہی سمت میں نہیں بہہ رہا تھا۔ اب وہ شوہر بھی تھے' باپ بھی۔ گو ریشماں انہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھی' لیکن اپنی اولاد تھی نہیں۔ اب جو قدم اٹھانا تھا بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا' تاکہ ان کی اولاد کا مستقبل محفوظ ہو سکے۔

"باباجان! آپ بتائیں' ریشماں دیکھنے میں کیسی ہے؟ اماں تو جب تعریف کرنے پر آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتی ہیں۔" زہرا نے کہا۔

"اس معاملے میں تم اپنی اماں جان پر ہی اعتبار کر سکتی ہو۔ مجھے تو وہ اس لیے بھی پیاری ہے کیونکہ میری بھتیجی ہے۔ مجھے تو تم' زینی اور ریشماں دنیا کی سب سے پیاری' سب سے خوبصورت بچیاں لگتی ہو۔"

"خیر رہنے دیں باباجان! میں اتنی خوبصورت نہیں ہوں یہ مجھے پتا ہے۔"

عبداللہ ہنس کر شرارت سے بولا۔ "مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم حقیقت کو فیس کر سکتی ہو۔"

"اونہوں!" اماں کو ان کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔ "کیا کمی ہے تم میں' بہت ناشکری ہو۔ ہر چیز دی ہوئی ہے اللہ نے۔ ہاتھ پاؤں' آنکھیں' ناک' کان اور کیا چاہیے؟"

"چھوڑیں اماں! خوبصورتی نہ دی تو کیا فائدہ ہوا؟"

"فضول باتیں کرتی ہو اب کیا جا کر اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کرو گی؟" اماں نے ڈپٹا۔

"اچھا چھوڑیں' یہ بتائیں کہ ان کے باقی بیٹوں کی بھی اپر سٹوری خالی ہے یا باقی کچھ بہتر ہیں؟" زہرا نے دریافت کیا۔

"سب ہی اچھے ہیں۔ چھوٹے دونوں جو جڑواں ہیں ان کا تو پتا ہی نہیں چلتا کہ کون صفدر علی ہے اور کون نوازش۔ امداد سے چھوٹا مکرم علی ذرا جوشیلا ہے' لیکن خیر یہ عمر کا تقاضا ہے' مگر جو

مجھے بہت اچھا لگا ہے بہت ہی پیارا بچہ ہے' وہ ہے سبط حسن۔"

"سبط حسن؟ اس نام کے لوگ ہوتے ہی اچھے ہیں۔" زہرا نے دلچسپی سے کہا۔

اس نام سے اسے سبط یاد آ گیا تھا' جس کے ساتھ گھنٹوں پڑھائی پر ڈسکشن ہوا کرتی تھی اور اس دوران کتنا ڈرائی فروٹ اور کتنی اسٹرابیریز کھائی جاتی تھیں' ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ اس کے گاؤں چلے آنے کے بعد بھی زینی کے خط سبط حسن کے ذکر سے ہی بھرے ہوتے تھے۔

"ہوں' وہ ہے تو بہت اچھا' لیکن ایک مسئلہ ہے۔" بابا جان نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"کیسا مسئلہ؟" عبداللہ نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"وہ بھی وہیں پڑھ رہا ہے گھوڑا گلی میں' کیمبرج کر رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ زینی کو کسی دوسرے اسکول میں ڈلوا دوں۔"

"کیا کہا بابا جان؟ وہ گھوڑا گلی میں پڑھ رہا ہے؟" زہرا نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"ہاں۔" انہوں نے زہرا کی طرف بغور دیکھا۔

انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا یوں چونکنا بے معنی نہیں تھا۔ وہ منتظر تھے کہ زہرا خود ہی ان سے کچھ کہے گی' مگر وہ کچھ نہیں بولی۔ ہاں اس کی آنکھوں میں الجھن بھی تھی اور پریشانی بھی۔

"چھوڑیں بابا جان! کب تک بھاگتے پھریں گے۔ جب تک ان مسئلوں کا ہم سامنا کرنا شروع نہیں کریں گے تب تک یہ حل بھی نہیں ہوں گے۔ یوں بھی اسے فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہاں اسے کوئی نہیں جانتا۔ گھر میں حویلی کا کوئی ملازم نہیں ہے' اس لیے بھی اسے شناخت نہیں کیا جا سکتا۔ جو گاڑی وہ استعمال کرتی ہے وہ بھی یہاں کبھی نہیں آئی۔

اور پھر وہ وہاں آرام سے پڑھ رہی ہے' آخری سال ہے اس کا' کہیں اور ایڈمیشن لینے سے اس کی پڑھائی بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ وہ بھی سینئر کیمبرج کر لے تو اسے اور گڑیا کو اسٹڈیز کے لیے باہر بھجوا دیں۔" عبداللہ نے کہا۔

"بابا جان۔ آپ کو اچھے طریقے سے پتا ہے کہ وہ گھوڑا گلی میں ہی پڑھ رہا ہے اور سینئر کیمبرج کر رہا ہے۔" زہرا نے بظاہر سرسری انداز سے پوچھا۔

"ہاں' کیوں کوئی خاص بات ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں سونے جا رہی ہوں' مجھے نیند آ رہی ہے۔"

☆======☆======☆

جب ماہ بانو' ابا جی اور اُما کے ساتھ گاؤں پہنچی تو رات گہری ہو چکی تھی۔ گھر پہنچ کر اماں اور بڑی اماں نے اپنی الگ نشست جما لی۔

مولوی صاحب مسجد میں عبادت میں مصروف تھے۔ ابا جی آتے ہی تھک کر سو گئے تھے۔ اُما اور ماہ بانو بستروں میں گھس گئی تھیں' لیکن تھکن کے باوجود بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

"اب کل کا کیا پروگرام ہے؟" اُما نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو ریشماں کی طرف جائیں گے تعزیت کرنے۔ وہ احمق لڑکی سب سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے اتنی محبتیں کرتے رہنا حماقت ہی تو ہے۔ عبداللہ کو بچانے کی کوشش میں وہ اپنا ایک بھائی گنوا بیٹھی اور ایک موت کی دہلیز سے واپس آیا ہے۔ یہ حادثہ اسے توڑ کر رکھ گیا ہوگا۔ ریشماں سے ملنے کے بعد عبداللہ کی طرف جائیں گے۔ وہاں دوسرے فرینڈز بھی ہوں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ ریشماں تمہاری کزن ہے اور اس کے بھائی کی ڈیتھ ہوئی ہے' لیکن میں شکر کر رہی ہوں کہ عبداللہ ٹھیک ہے۔ اخبار میں تو صرف اتنا لکھا تھا کہ زخمی ہوا ہے میں پریشان ہو گئی تھی۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ بہت زیادہ زخمی نہیں ہوا۔"

"اُما پلیز! مائنڈ نہ کرنا' ایک بات کہنی ہے تم سے۔"

"کہو!"

"کل حویلی جاتے ہوئے چادر لے لینا۔"

اُما ہنس پڑی۔ "اس میں مائنڈ کرنے والی کون سی بات ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس' کوئی اور حکم؟"

"حکم نہیں ہے پاگل' میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کیونکہ......"

"نو بانو پلیز۔" اُما اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میرے سامنے صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے' میں تمہاری فرینڈ ہوں۔"

ماہ بانو ہنس پڑی۔ "ٹھیک ہے اور میرا خیال ہے کہ اب سونا چاہیے۔ گاؤں میں پتا نہیں صبح اتنی جلدی کیوں ہو جاتی ہے۔ دیکھنا اماں جان مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ نہ صرف خود جاگ جائیں گی' بلکہ ہمیں بھی جھنجھوڑنے لگیں گی۔"

☆======☆======☆

زینی کا دل کسی چیز میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے اچانک بغیر اسے بتائے سبط اپنے گاؤں کیوں چلا گیا تھا اور چلا ہی گیا تھا' تو بھی اس نے فون کیوں نہیں کیا تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ جس دن وہ اس سے ملاقات نہ کر سکے' اس دن فون کر کے بات چیت بھی نہ کرے۔ وہ تو گاؤں سے بھی اتنی لمبی لمبی کالز کیا کرتا تھا۔

حساب کے سوال حل کرتے ہوئے بھی اس کا ذہن سبط میں اُلجھا ہوا تھا۔ کام خاک ہونا تھا۔ اس نے بال پوائنٹ رجسٹر پر پٹخا۔ اُونچی آواز میں لگا ہوا ڈیک بند کیا اور دیدی کے پاس کچن میں پہنچ گئی۔

"یہ کیسے ممکن ہے دیدی کہ وہ مجھے فون تک نہ کرے۔"

اُس نے اندر آتے ہی اُلجھن اور غصے کی ملی جُلی کیفیت میں کہا۔

دیدی نے جو رشین سلاد کے لیے سیب کاٹ رہی تھیں اُس کی طرف دیکھا۔

''ہوسکتا ہے' وہ مصروف ہو۔'' وہ دوبارہ سیبوں کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

''نہیں دیدی' بات مصروفیت کی نہیں' کچھ اور ہے۔ اُسے کتنی ہی مصروفیت کیوں نہ ہو' وہ میرے لیے وقت ضرور نکالے گا۔'' وہ وہیں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئی۔

''بھئی اب میں کیا بتا سکتی ہوں کہ اُسے کیا پرابلم ہے۔''

''ہائے دیدی You Are Right (آپ ٹھیک کہتی ہیں) اُسے یقیناً کوئی پرابلم ہوگی' ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مجھ سے ملے بغیر' بتائے بغیر گاؤں چلا جائے اور فون تک نہ کرے' لیکن اُسے اگر کوئی پرابلم تھی تب بھی اُسے مجھ سے شیئر تو کرنا چاہیے تھا۔''

''دیکھو زینی۔'' دیدی نے سیبوں کی ڈش پرے کھسکائی اور اُس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

''بظاہر سبط بہت اچھا لڑکا ہے' لیکن تم اُس کے متعلق کیا جانتی ہو؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ' اُس کے گھر والے' اُس کا گاؤں' تمہیں کچھ بھی تو معلوم نہیں ہے اُس کے بارے میں اور یہ دنیا بہت Painted ہے۔ لوگوں کے چہروں پر بہت سے نقاب ہوتے ہیں۔ تم خود اچھی ہو' اس لیے سمجھتی ہو کہ سب ہی اچھے ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ضروری نہیں سب اچھے ہوں۔''

''آپ یہ سبط کے لیے کہہ رہی ہیں دیدی؟ I Dont Believe It آپ جانتی بھی ہیں کہ وہ کتنا اچھا ہے پھر بھی ایسا کہہ رہی ہیں۔ کیا کسی شخص کو جاننے اور پرکھنے کے لیے ایک سال کم عرصہ ہوتا ہے؟

اور پھر دیدی' وہ بھی تو میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا تو کیا اس کا مطلب ہے کہ میں بھی Painted ہوں؟ وہ مجھے سب کچھ بتا دیتا اپنے بارے میں اگر میں نے پوچھا ہوتا لیکن میں اس سے اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں کیا پوچھ سکتی تھی۔ جبکہ میرے پاس اپنے بارے میں اُسے بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اماں اور بابا جان نے ہمارے ہونٹ سی رکھے ہیں۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ آپ سبط پر شک کریں گی۔''

''تم ابھی بچی ہو زینی' تم نے دنیا نہیں دیکھی۔ میں تو یہ بھی چاہتی تھی کہ تم اپنی اماں اور بابا جان کو سبط حسن کے متعلق بتا دو' لیکن تم نے نہیں بتایا۔''

''تو کیا میں اُن سے کچھ چھپا رہی تھی؟ نہیں بتایا تو اس کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ میں انہیں بتانا ہی نہیں چاہتی تھی یا اُن سے کچھ چھپا رہی تھی۔ آپ جانتی ہیں کہ ایسا نہیں تھا۔

میں تو یہ چاہتی تھی کہ غائبانہ تعارف کروانے کے بجائے انہیں سبط سے ملواؤں۔ جب انہوں نے پوچھا تھا کہ میری اتنی اچھی تصویر کس نے کھینچی ہے' تب بھی میں نے اُن سے کہا تھا کہ میں بتانے کے بجائے انہیں اُس شخص سے ملواؤں گی۔''

''اور وہ جو بلا ناغہ تم سے ملنے آیا کرتا تھا' جب بھی اُسے معلوم ہوا کہ تمہارے اماں' بابا یا بھائی آئے ہیں تو اُس دن وہ کبھی تم سے ملنے نہیں آیا' کوئی نہ کوئی بہانا بنا دیا۔''

''آپ تو دیدی مسلسل اُس پر شک کیے جا رہی ہیں۔ میں اُس کے لیے پریشان ہوں اور آپ کو اس کی کوئی پروا ہی نہیں۔'' زینی کی آواز بھرّا گئی۔

''اب پلیز زینی رونا مت۔ بات بات پر ہنستی ہو اور بات بات پر روتی ہو۔ ٹھیک ہے میں اس پر شک نہیں کر رہی۔ تم اُس کے گھر فون کر کے ملازم سے پتا کرو کہ وہ کب آئے گا۔''

''صبح سے سترہ مرتبہ فون کر چکی ہوں۔ اس کمبخت کو کچھ نہیں پتا کہ وہ کب آئے گا۔'' اُس نے دیدی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور امید بھرے لہجے میں بولی۔

''دیدی! میں اس کے گھر جا کر خود پتا کر آؤں پلیز!''

دیدی تذبذب میں پڑ گئیں۔

''پلیز دیدی!'' اُس کی آنکھوں میں پھر موٹے موٹے آنسو آ گئے۔

''پہلے تو تم یہ آنسو پونچھو' پھر بتاؤ کہ تم کبھی گئی نہیں کیسے ڈھونڈو گی اُس کا گھر؟''

اُس نے جلدی جلدی آنسو صاف کیے اور بولی۔ ''وہ مجھے پتا ہے۔ اُس نے دو مرتبہ دور سے اپنا گھر دکھایا تھا۔ اندر تو میں نہیں گئی اور اُس نے اندر چلنے کو کہا بھی نہیں اُسے پتا تھا کہ اندر میں نہیں جاؤں گی شاید اس لیے لیکن دیدی گھر کا مجھے اچھی طرح پتا ہے۔''

دیدی سوچ میں پڑ گئیں۔

''پلیز دیدی! اب کیا ہوگا' آپ مانتی کیوں نہیں ہیں؟''

''اچھا چلو۔'' انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''لیکن میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔''

''تھینک یو دیدی۔'' وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

گھر سے نکلنے سے قبل وہ ملازمہ کو بیسیوں مرتبہ یہ ہدایت جاری کر چکی تھی۔

''دیکھو اگر سبط حسن صاحب کا فون آئے تو کہنا کہ میں بہت پریشان تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد ضرور رِنگ کریں اور خود نہیں کر سکتے تو مجھے نمبر دے دیں۔ میں خود بات کر لوں گی۔ تم سمجھ رہی ہو ناں؟ میرا ان سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔''

''جی جی' میں سمجھ رہی ہوں۔''

گاڑی میں بیٹھ کر اس کے گھر جاتے ہوئے دیدی سوچ رہی تھیں کہ زینی کو ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے۔

زینی! میری ایک بات غور سے سنو؟''

''جی دیدی؟''

''میری بات سن کر رونے نہ لگنا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم ہرٹ ہو۔ دیکھو زینی! یہ بھی ممکن

ہے کہ سبط گھر پر ہو اور جان بوجھ کر تمہیں Avoid کر رہا ہو۔"

زینی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"دیدی آپ؟" کچھ کہتے کہتے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

سبط حسن کے گھر پہنچ کر اس نے بے تابی سے انگلی کال بیل پر رکھ دی۔ جواب میں ا کے نوکر کرم الٰہی نے دروازہ کھولا۔

"سبط حسن صاحب ہیں؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"نہیں بی بی! وہ تو گاؤں گئے ہوئے ہیں۔" کرم الٰہی نے بتایا۔

زینی نے بے بسی سے گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر قدرے سختی سے کرم الٰہی سے مخاطب ہوئی

"آگے سے ہٹو۔"

"کیا مطلب جی؟" وہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ آگے سے ہٹو سنتے نہیں ہو۔"

دیدی نے پیچھے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بس زینی واپس چلو وہ گھر پر نہیں ہے۔"

"میں ایسے واپس نہیں جاؤں گی دیدی۔"

اس نے ہاتھ چھڑایا اور کرم الٰہی کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

داہنی طرف ڈرائینگ روم تھا جو بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ زینی وہاں جھانک آگے بڑھ گئی۔

"کیا کر رہی ہو زینی۔" دیدی تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں اور مدھم آواز میں قدرے سخ سے کہا۔

"پلیز دیدی، مجھے روکیں مت، کیونکہ میں رکوں گی نہیں۔"

مجبوراً دیدی نے بھی اس کے ساتھ قدم بڑھا دیے۔

اسٹڈی بھی خالی تھی۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ سبط کی تمام کاپیاں اور کتابیں ترتیب سے پڑ تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک رجسٹر اٹھا لیا اور صفحے پلٹنے لگی۔ جگہ جگہ زینی کا نام لکھا ہوا تھا پلٹتے پلٹتے وہ اس صفحے پر پہنچی جس سے آگے سب صفحات خالی تھے۔ ورق کی پیشانی پر اس دن تاریخ تھی جس دن وہ آخری مرتبہ ملے تھے۔

رجسٹر چھوڑ کر اس نے باقی کتابوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہر کتاب پر بھی جگہ جگہ اس نام لکھا ہوا تھا۔ کتابیں واپس رکھ کر وہ اسٹڈی سے بھی نکل آئے۔ دیدی اور کرم الٰہی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ خوابگاہ صرف ایک تھی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رک

گئی۔

خوابگاہ انٹیریئر ڈیکوریشن کا شاہکار تھی۔ دبیز قالین، قیمتی فرنیچر اور سجاوٹ کا خوبصورت انداز، یہ سب کسی کو بھی مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھا، لیکن وہ جو رکی تھی تو اس لیے نہیں بلکہ بیڈ کے سرہانے والی دیوار پر اپنی لائف سائز تصویر دیکھ کر۔ وہی تصویر جوان دونوں کی ملاقات کا باعث بنی تھی۔

تصویر کے نیچے دائیں کونے میں سبط نے ہاتھ سے لکھ رکھا تھا۔

WITH LOVE

وہ دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"تمہیں یہ تو پتا ہوگا کہ وہ کیوں گئے ہیں؟" اس نے بے بسی کے ساتھ کرم الٰہی سے پوچھا۔

"بی بی! آپ فون بھی کرتی رہیں، لیکن مجھے کچھ پتا نہیں ہے تو کیا بتاؤں؟" وہ نظریں جھکا کر بولا۔

"جھوٹ مت بولو، تمہیں پتا ہے، ملازموں کو سب پتا ہوتا ہے۔" وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس سے سچ اگلوائے۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے امڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

ملازم نے ایک نظر اسے دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔

"قریباً ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے، وہ خلاف معمول جلدی گھر آ گئے تھے اور واپسی پر بہت بجھے بجھے سے تھے مجھے کہہ دیا کہ کوئی فون آئے تو یہ کہہ کر ٹال دوں کہ شاہ صاحب راولپنڈی گئے ہیں۔ پھر بعد میں وہ گاؤں چلے گئے اور اب تک نہیں آئے۔"

"لیکن کیوں؟" زینی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"یہ نہیں بتایا انہوں نے۔"

"اور یہ بتایا کہ کب واپس آئیں گے؟"

"اب تو شاید کچھ دن لگ جائیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ مغفرت کرے، ابھی جمعرات کو ان کے بڑے بھائی فوت ہو گئے ہیں۔"

"کیا؟ کیسے۔ اوہ گاڈ؟"

ملازم خاموش رہا۔

"تمہارے پاس ان کا فون نمبر تو ہوگا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ نہ ہو؟" زینی نے کہا۔

"وہ شاید پسند نہ کریں کہ ان کی اجازت کے بغیر میں نے ان کا نمبر دے دیا۔" اس کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"وہ کچھ نہیں کہیں گے تمہیں۔ یقین کرو' میں ذمہ لیتی ہوں۔" زینی نے جلدی سے کہا۔

"آپ ڈرائینگ روم میں بیٹھیں' میں لاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"نہیں' میں جلدی میں ہوں۔"

کرم الٰہی ٹیلی فون انڈکس اٹھالایا اور ایک صفحہ کھول کر سب سے اوپر لکھے نمبر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ نمبر ہے۔"

زینی نے جلدی جلدی نمبر ذہن نشین کر لیا۔

"تھینک یو۔" وہ واپسی کے لیے پلٹی۔

"بی بی! آپ چائے تو پیتی جائیں۔" کرم الٰہی بولا۔

"نہیں' بہت شکریہ' پھر کبھی سہی۔"

گاڑی میں بیٹھ کر وہ بہت حد تک مطمئن ہو گئی تھی لیکن سبط کے بھائی کی وفات کا دکھ اسے بھی بہت تھا۔

"دیکھ لیا دیدی! آپ خواہ مخواہ اس پر شک کر رہی تھیں۔ اس دن بھی یقیناً اسے کہیں سے اطلاع ملی ہو گی۔ شاید اس کے بھائی بیمار ہوں۔ اس لیے وہ یوں چلا گیا تھا اور فون بھی نہیں کیا اس نے۔ ایسی صورت حال میں کیسے فون کر سکتا تھا وہ۔ اُف دیدی! مجھے بہت ڈپریشن ہو رہا ہے اس کے بھائی کی ڈیتھ کا سن کر۔"

دیدی کے ذہن سے بھی بوجھ اتر گیا تھا۔

"پتا نہیں اس نے کیسے برداشت کیا ہو گا اپنے بھائی کی ڈیتھ کو' کتنا ڈپریس ہو گا وہ۔"

"ہاں' لیکن جو لوگ چلے جاتے ہیں' ان کے لیے صبر کرنے کے علاوہ کیا چارہ کار ہوتا ہے۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔

گھر آ کر وہ اس پریشانی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ سبط سے اظہار تعزیت کیسے کرے گی۔

"میں کیا کہوں اس سے دیدی؟ جب میں ڈپریس ہوتی تھی تو وہ اتنا سہارا دیا کرتا تھا مجھے حالانکہ میرے ڈپریشن کی وجہ صرف یہ ہوتی تھی کہ اماں اور باباجان وقتی طور پر مجھ سے دور ہو جاتے تھے۔ میں اسے کیسے اس بات پر تسلی دوں کہ اس کا بھائی اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا ہے۔"

"اب اس موقع پر اسے تسلی دینا تمہارا فرض ہے۔ دوستی صرف ہنسی مذاق اور ہلے گلے کا نام نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے زیادہ ضرورت تو غم کے وقت ہوتی ہے اور جو لفظ تمہارے دل سے نکلیں گے ناں زینی' وہی سب سے خوبصورت اور موزوں ہوں گے۔" دیدی نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"تھینک یو دیدی۔" اس نے ممنونیت سے کہا اور فون کی طرف بڑھی۔ دیدی اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔

ذہن ہی ذہن میں نمبر دہراتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کوڈ نمبر تو سبط کے گاؤں کا بھی وہی تھا' جوان کے گاؤں کا تھا' لیکن اس وقت اس بات پر زیادہ غور کرنے کی فرصت کب تھی۔ نمبر ڈائل کرنے کے بعد گھنٹی بجنے لگی۔ تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

دوسری طرف سے ریسیور اٹھا کر کسی نے بارعب آواز میں ہیلو کہا۔

زینی تذبذب میں پڑ گئی۔

"ہیلو!" ایک مرتبہ پھر کہا گیا۔

"ہیلو جی! مجھے سبط سے بات کرنی ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"سبط حسن سے بات کرنی ہے' آپ کون بول رہی ہیں؟" انداز حکمیہ تھا۔

"جی میں زینب بول رہی ہوں مری سے۔"

"زینب!" ایک مرتبہ پھر دہرایا گیا۔ "اچھا ہولڈ کریں۔ ہم پتا کرواتے ہیں۔"

ریسیور تھامے اسے خاصی دیر ہو چکی تھی۔

دوسری سمت سے آنے والی ملی جلی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ جس جگہ ٹیلی فون رکھا ہوا تھا وہاں خاصی رونق اور چہل پہل تھی۔ جس شخص نے فون ریسیو کیا تھا' وہ اب بھی وہاں کے لوگوں سے ویسے ہی حکمیہ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ لوگ کسی کا ذکر کر رہے تھے' جو زخمی تھا اور اسپتال میں ایڈمٹ تھا' لیکن بہت سی ملی جلی آوازوں کی وجہ سے کوئی واضح بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دوسری جانب زینی یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس سے مخاطب ہونے والے شخص کو اس نے سبط حسن کہہ کر غالباً اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اسے یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگی۔

"بہت سے گھر ایسے بھی تو ہوتے ہیں ناں جہاں یہ پسند نہیں کیا جاتا کہ لڑکیاں اور لڑکے آپس میں گھلیں ملیں۔ ہو سکتا ہے سبط کی فیملی اتنی لبرل نہ ہو۔" اس نے سوچا۔

فون کا ریسیور اٹھائے جانے کی آواز آئی تو وہ چونکی۔

"ہیلو!"

اس مرتبہ دوسری جانب سبط ہی تھا۔

"ہیلو سبط! میں زینی بول رہی ہوں۔" اس نے بے تابی سے کہا۔

"اس وقت میں مصروف ہوں' بعد میں خود فون کروں گا۔ خدا حافظ۔" اس نے کہا۔

زینی کے لیے اس کا یہ لہجہ بہت اجنبی اور انداز بہت غیر متوقع تھا۔

''سنو تو سبط۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''کب کرو گے فون؟ یہ تو بتا دو۔''
دوسری طرف خاموشی تھی۔
''تم سن رہے ہو ناں؟''

☆======☆======☆

سبط حسن نے بغیر کچھ کہے فون کریڈل پر رکھ دیا۔
پیر صاحب بغور اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔
''دوستوں کو ہمارا نہیں' اپنا ذاتی نمبر دیا کرو۔'' وہ بولے۔
''جی بہتر بابا جان!'' وہ مڑنے لگا۔
''ٹھہرو سبط! کہاں جا رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔
''باہر کچھ کام تھا۔''
''کام کرنے والے بہت لوگ ہیں۔ اندر گول کمرے میں چلو' ہمیں تم سے کوئی بات کرنی ہے۔''
وہ بغیر کچھ کہے گول کمرے میں چلا آیا۔ معلوم تو تھا ہی کہ پیر صاحب نے کیا کہنا تھا۔
کچھ دیر بعد پیر صاحب بھی اندر داخل ہوئے اور اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھ گئے۔
''بیٹھو!''
''ہمیں پتا چلا ہے کہ تم میں کچھ انقلابی قسم کے جراثیم آ رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ انہیں ادھر ہی ختم کر دو۔''
''میرا انقلاب سے کیا تعلق؟'' وہ بولا۔ ''جس نے بھی آپ کو یہ اطلاع فراہم کی ہے غلط کی ہے۔ میں جو گاڑیاں استعمال کرتا ہوں؟ جس قسم کے گھروں میں رہتا ہوں' وہاں رہنے والوں کا انقلاب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''
''اس کا مطلب ہے کہ تم اتنی دور نہیں گئے۔ تمہاری واپسی کی توقع کی جا سکتی ہے۔'' پھر قدرے توقف سے پائپ سلگانے کے بعد بولے۔
''حیدر علی شاہ کے نقشِ قدم پر مت چلنا' ٹھوکر لگے گی اور بہت بری طرح گرو گے۔''
''آپ کی نصیحت ہے' لیکن بابا جان! میں نے حیدر بابا کو ٹھوکر کھا کر گرتے نہیں دیکھا۔ میں تو جب بھی دیکھتا ہے۔ انہیں سر اٹھا کے ہی چلتے دیکھا ہے۔''
پیر صاحب نے پائپ کے تین چار کش لیے اور اسے پُرخیال انداز میں تکتے رہے پھر بولے۔
''بھائی مرا ہے تمہارا' بدلہ نہیں لینا چاہتے' نہ لو' لیکن درمیان میں بھی مت آنا۔'' پھر انہوں نے موضوع بدل دیا۔ ''پڑھائی کیسی جا رہی ہے تمہاری؟''

''ٹھیک جا رہی تھی۔''
''تھی؟ اب کیا مسئلہ آ گیا؟''
''میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ مجھے واپس جانا چاہیے یا نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔
''اس کی وجہ امداد علی یا خادم حسین تو نہیں ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔
''وہ بھی ہے' لیکن صرف وہی نہیں ہیں۔''
''پھر؟''
''نہ پوچھیں بابا جان! میں بتا نہیں سکوں گا۔'' اس نے پھر سچ سچ کہہ دیا۔
''ہوں۔'' انہوں نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔
''کسی لڑکی کا چکر ہے کیا؟''
سبط نے نظریں اٹھا کر حیرت سے انہیں دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ پیر صاحب سے بیٹوں میں لرکوئی فرینک تھا تو وہ بڑ۔ ۔ٔمن بیٹے تھے۔ خادم' امداد اور مکرم۔
''اتنی بڑی حماقت کا ثبوت مت دو۔ ابھی عمر پڑی ہے بے شمار لڑکیاں ملیں گی تمہیں۔ کسی یز کی کمی نہیں ہے تم میں۔ لکس (looks) روپیہ پیسہ' جائیداد سب کچھ ہے تمہارے پاس' کسی لڑکی کے پیچھے پڑھائی چھوڑ دینا۔ نان سینس۔''
اس کا دل چاہا کہ وہ ان سے کہہ دے کہ وہ کوئی لڑکی نہیں زینی تھی۔ اتنے دن بعد اس کی وازسن کر بے کلی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ جو اسے دیکھے بغیر' اس کی آواز سنے بغیر ایک دن بھی نہیں ہ سکتا تھا' اب کتنے دن سے خود پر پابندیاں لگائے بیٹھا تھا۔
پیر صاحب اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے تھے۔
''جسے جانا تھا' وہ چلا گیا ہے۔ خادم حسین کو ہوش آ گیا ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہے ں لیے اب تم کل ہی واپسی کی تیاری کرو۔ سنئیر کیمبرج مذاق نہیں ہے یوں بھی تم کافی دن سے اوجہ یہاں آئے بیٹھے تھے۔ ہم نہیں چاہتے کہ عام لینڈ لارڈز کی طرح ہمارے بیٹے اَن پڑھ اہل ہوں' لڑکیون کے چکر سے نکلو اور پڑھائی پر توجہ دو۔''
''میں جاؤں بابا جان؟''
''جاؤ۔'' انہوں نے کہا۔
وہ باہر نکل گیا۔
''بابا جان ٹھیک کہتے تھے۔'' اسے باہر نکلتے دیکھ کر انہوں نے سوچا۔ ''اولاد بہت بڑی کمزوری اور امتحان ہوتی ہے۔''

☆======☆======☆

جب ماہ بانو اور اُما' اماں جان کے ساتھ حویلی کے اندر داخل ہوئیں' تب بھی وہاں کی

کیفیت بدلی نہیں تھی۔

ریشماں نیند کی گولی لے کر سو رہی تھی' اس لیے تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر وہ اور اماں اٹھ آ

''تم دونوں بہت جلد اٹھ آئیں؟'' ابا جی نے انہیں دیکھ کر کہا۔ وہ وہیں مردانے تھے۔

''ریشماں سوئی ہوئی تھی۔ ایسے میں بیٹھ کر کیا کرتے۔ اب ابا جی ہمیں حضرت صا والی حویلی میں جانا ہے۔ ہم عبداللہ سے بھی مل لیں۔''

''چلو پھر۔''

ابا جی کے ساتھ وہ دونوں پیدل ہی چل پڑیں۔ موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ لہٰذا کھیتوں کے بیچ سے گزرنا اچھا لگ رہا تھا' اس لیے انہوں نے تانگہ لینے کی ضرورت نہیں سمجھ یوں بھی راستہ اتنا لمبا نہیں تھا۔

حیدر علی شاہ کی حویلی میں بھی بہت رونق تھی۔

''کہیں یہ بھی تمہاری کزن کی فیملی کی طرح تو نہیں ہیں؟ یہ نہ ہو ناں کہ ہم جائیں عبا سے ملنے اور گھر والے ہمیں باہر کا راستہ دکھا دیں۔'' اُما نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں یہ لوگ مختلف ہیں۔ گاؤں میں ویسے اس کی اماں اور بہنیں پردہ کرتی ہیں پھر بھ ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کریں گے۔''

وہاں واقعی ان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ ایک تو پہلے ہی عبداللہ کی مختصر ک وہاں موجود تھی۔ دوسرے ان کے گھر کا ماحول پیر صاحب کی حویلی کے ماحول کی طرح گھ نہیں تھا۔

عبداللہ کا نام لینے پر انہیں بہت آراستہ اور خوبصورت ڈرائینگ روم میں پہنچا دیا گ جہاں عبداللہ' ایڈی' جیمز کے علاوہ ظہیر بھی موجود تھا۔ بس ان کی Sculpture کی کلاس اتن مختصر سی تھی۔

''ارے تم لوگ؟'' انہیں آتے دیکھ کر وہ لوگ حیران ہو گئے۔

''ہاں' تم لوگوں کا کیا خیال تھا کہ یہ ڈرائی فروٹ تم لوگ اکیلے ہی ہضم کر جاؤ گے؟ بانو نے کہا۔

وہ دونوں بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

''میرا خیال تھا کہ تم لوگ ہمیں صرف انفارمیشن دے رہی ہو' یہ نہیں پتا تھا کہ تمہارا ی آنے کا ارادہ بھی ہے۔'' ایڈی نے کہا۔

''اُما ویک اینڈ پر میری طرف ہی آئی ہوئی تھی۔ ہم چلنے لگے تو یہ بھی تیار ہو گئی اور

آنا ہی تھا۔''

''تمہیں کیوں آنا تھا؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ ہمارا گاؤں نیاز پور ہے۔ بندہ مار دیا تم نے ہمارے گاؤں کا' تعزیت کرنے نہ آتے کیا؟ پھر آئے تو سوچا کہ کچھ ٹوٹ پھوٹ تمہاری بھی ہوئی ہے' ازراہِ مروت تمہیں بھی دیکھتے چلیں۔''

''اور جو ڈرائی فروٹ تم سب ٹھونس رہے ہو اس کے چند دانوں پر ہم بھی اپنی مہریں لگا دیں۔'' اُما نے کہا۔

☆======☆======☆

زینی کو اس کا رویہ عجیب سا لگا تھا۔ اس نے بغیر کوئی بات کیے فون رکھ دیا تھا۔ یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ کب رنگ کرے گا۔

''وہ یقیناً اَپ سیٹ ہوگا' لیکن اسے اتنی بے اعتنائی کا مظاہرہ تو نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے سوچا۔

''زینی! آؤ کھانا کھا لو۔'' دیدی نے کچن سے اسے آواز دی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے دیدی' میں پڑھنے جا رہی ہوں اپنے کمرے میں۔'' اس نے کہا۔

''کیا ہوا بیٹا؟ بجھی بجھی سی لگ رہی ہو۔ سبط سے بات نہیں ہوئی؟'' وہ کچن سے اس کے پاس چلی آئیں۔

''نہیں۔''

''نمبر تو ہے تمہارے پاس پھر ٹرائی کر لینا' ابھی کچھ کھا تو لو' دیکھو میں نے خاص طور پر تمہارے لیے رشین سلاد بنایا ہے۔''

''ایمان سے دیدی! ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا۔ آپ رکھ دیں' بھوک لگے گی تو کھا لوں گی۔'' پھر اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئی۔

''ہاں دیدی! فون آیا تو میں ریسیو کروں گی' پلیز کوئی اور مت اٹھائے۔''

☆======☆======☆

ظہیر اور جیمز باہر گھومنے نکل گئے تھے۔ کچھ فوٹو گرافی کرنے کا ارادہ تھا ان کا۔ ڈرائینگ روم میں وہی چاروں رہ گئے تھے۔

''اب ٹریٹ کب دے رہے ہو؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''کس بات کی؟''

''اسی بات کی کہ تمام تر کوشش کے باوجود بھی تم پر لوک سدھارنے سے بچ گئے اور کس چیز کی؟'' اُما نے ہنستے ہوئے کہا۔

''حالانکہ میں نے منع بھی کیا تھا' لیکن ان کے پورے خاندان کی منطقیں ہی نرالی ہیں۔ تو چھ بھائی ہیں' ایک آدھ لڑھک گیا تب بھی انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن تم اکیلے بیٹے ا بھائی ہو۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''چھ ہوں یا بارہ یا پھر ایک' ہر کوئی اپنے اندر ایک پوری کائنات ہوتا ہے اور اپنی جگہ ا ہوتا ہے۔ باقی رہ گیا خاندان کا سوال تو وہ میری مجبوری ہے' کیا کروں۔''

''فی الحال تو ایک اچھی سی ٹریٹ کا انتظام کرو۔'' ایڈی کشن نیچے رکھ کر قالین پر ہی در ہو گیا۔

''ایک نہیں دو ٹریٹ۔'' عبداللہ نے کہا۔

''تم دس ٹریٹیں دو گے تو ہم وہ بھی مر جی کے کھا ہی لیں گے' تمہارا دل تو نہیں توڑ سکے ناں۔'' ماہ بانو بولی۔

''یاد رکھنا اپنی بات' میرا دل نہ توڑنا۔'' عبداللہ نے ہنس کر کہا۔

''ٹریٹ کے معاملے میں۔'' ماہ بانو نے جلدی سے اضافہ کیا۔

''چلو ایسے ہی سہی؟''

''ویسے تو جب آم مل رہے ہوں تو پیڑ گننا حماقت ہوتی ہے' لیکن صرف تجسس کی وجہ سے پوچھ رہی ہوں کہ دوسری ٹریٹ کس لیے؟ کہیں چپکے چپکے منگنی تو نہیں کروالی؟'' اُما نے ہنسی دبا کی کوشش کی۔

''منگنی اپنی قسمت میں کہاں۔'' اس نے ماہ بانو کی طرف دیکھا۔ ''دوسری ٹریٹ صرف ما کے لیے ہو گی۔''

''وہ کیوں؟'' اُما نے جلدی سے کہا۔

''وہ اس لیے کہ اس نے بروقت اور بالکل ٹھیک خبر دی تھی۔''

''میرے سامنے تم نے پہلی مرتبہ اتنی اچھی بات کی ہے۔ اب یہ بھی کہہ دو کہ ریسٹورنٹ کی سلیکشن بھی بانو کرے گی اور مینیو بھی بانو سلیکٹ کرے گی۔'' ماہ بانو نے مزے سے کہا۔

''حاتم طائی کی قبر پر اتنی لاتیں لگیں تو مُردہ باہر آ جائے گا۔'' ایڈی بولا۔

''آج پھر آ ہی جانے دو مُردے کو باہر۔ تم بھی کیا یاد کرو گی۔ جہاں چاہو گی وہیں ڈنر ہو گا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''ڈنر نہیں' کیوں مجھے گھر سے نکلوانا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''رہنے دو عبداللہ۔ ان کی اوقات ہی یہی ہے کہ کالج والے پیپسی اور سینڈوچ پر خوش ہو جائیں گے۔ خواہ مخواہ حاتم طائی کو بھی اتنی تکلیف دی۔'' ایڈی بولا۔

ماہ بانو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''تم اپنی عقل کو اتنی تکلیف مت دیا کرو ایڈی۔ ماہ بانو کا مطلب تھا کہ ڈنر نہیں لنچ کیا جائے گا۔'' عبداللہ نے اس کی خفت محسوس کر کے کہا۔

''اچھا چھوڑو' بانو کی ٹریٹ سے ہمیں کیا لینا دینا۔ یہ بتاؤ کہ ہمیں کب مل رہی ہے ٹریٹ' ہمیں ڈنر ہی چاہیے؟'' ایڈی بولا۔

''یہ فیصلہ کر لو کہ ڈنر کہاں ہو گا؟'' عبداللہ نے کہا۔

''یہ فیصلہ کریں گی دیوی جی۔'' ایڈی نے اُما کی طرف دیکھا۔

''I Will Kill You ایڈی۔'' اس نے دانت کچکچائے۔ ''سیدھی طرح اُما نہیں کہہ سکتے تم اور پھر میں کیوں فیصلہ کروں بھلا؟''

''اس لیے کہ ڈنر میں یہ خاکسار بھی شرکت کرے گا' جو خاصا خوش خوراک ہے اور صرف آپ کی نظروں کے جام پر گزارا کرنا مشکل ہو گا۔ کچھ نہ کچھ کھانا ضروری ہے' بھوکے پیٹ سے عشق بھی نہیں ہو سکے گا۔ وہ جو میاں مجنوں تھے ناں' پتھر کھا کر نہ مرتے تو فاقہ کشی سے مر جاتے' سارا عشق مل جاتا وہیں مٹی میں' مجھے یہ گوارا نہیں ہے۔''

ماہ بانو اور عبداللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مینیو کا انتخاب مجھ پر چھوڑا تو غم کھانے کے علاوہ کچھ نہیں کھا سکو گے۔'' وہ تنک کر بولی۔

''وہی تو کھا رہا ہوں اور غصہ پی رہا ہوں۔''

''ایڈی! تم نے مجھے عاجز کر دیا ہے۔'' وہ زچ ہو گئی۔

''میں نے تو صرف عاجز کیا ہے ناں تمہیں' تمہارے اوپر اس سے کہیں زیادہ سیریس چارجز ہیں۔'' وہ بولا۔ ''صرف چند ایک گنوا رہا ہوں۔ تم نے مجھے پریمی' عاشق آوارہ بنا دیا ہے۔ ثبوت ہے یہ گانا جو میں آدھا دن سنتا رہتا ہوں اور اب جس طرف آنکھ اٹھاتا ہوں تمہاری ہی تصویراں ہے۔ ثبوت دیکھنا ہو تو میرے بیڈروم میں دیکھ لینا اور اسی پر بس نہیں کیا تم نے بلکہ کل ہی نہیں' ہر روز میرے سپنوں میں آ کر آنکھوں سے دل میں سماتی ہو۔''

اُما کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایڈی کے ساتھ کیا سلوک کرے' جب کہ اس کی زبان مسلسل ان ایکشن تھی۔

''اب تو آپ سے ایک ہی درخواست ہے دیوی جی کہ:

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شب
آ کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم

''سٹاپ اِٹ ایڈی۔'' اُما کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

"تمہیں ذرہ بھر بھی احساس نہیں ہوتا کہ تم کہاں بیٹھ کر کیا بولے جا رہے ہو۔ اٹھو بانو! اتنے غیر مہذب لوگوں میں بیٹھنا ہی حماقت ہے۔"

"پلیز اُما بیٹھو! اب یہ کوئی بے ہودگی نہیں کرے گا۔ یہاں تم میری مہمان ہو میرے گھر سے یوں ناراض ہو کر جاؤ تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" عبداللہ نے اسے روکا۔

"تو اپنے دوست کو سمجھاؤ' یہ تو انتہا کر دیتا ہے۔" اُما نے کہا۔

"راہِ محبت میں یہ مقام بھی آنے تھے کہ عشق کو بے ہودگی کہا جانے لگے۔ صد حیف ہے تم پر اکیسویں صدی کے انسانو! ہم دعا کرتے تھے:

خدا کرے کہ محبت میں وہ مقام آئے
کسی کا نام لوں لب پہ تمہارا نام آئے

لیکن تم لوگوں نے تو راستے میں ہی ایک پریمی عاشق' آوارہ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کا گھناؤنا منصوبہ بنالیا ہے۔" ایڈی نے مصنوعی آہ بھری۔

اُما سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

ماہ بانو ہنس پڑی۔ "تم کیوں اس کی حماقتوں پر اتنا سیریس ہوتی ہو۔ ایک کان سے سنو' دوسرے سے نکال دو۔"

"بانو! تم تو ظالم سماج میں شامل مت ہو' تم سے بہت امیدیں باندھ رکھی تھیں میں نے۔" ایڈی نے کہا۔

"بس عبداللہ! اب اگر کبھی تمہاری طرف آنا پڑا تو پہلے یہ یقین کر لوں گی کہ وہاں اس وقت ایڈی نہیں ہوگا۔ میں ناراض ہو کر نہیں جا رہی' لیکن اب مزید یہاں رک نہیں سکتی' چلو بانو۔" وہ بولی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس!" عبداللہ نے کہا پھر اُما کی طرف مڑا۔

"تم لوگ ابھی نہیں جاؤ گے' کھانا کھا کر جاؤ گے۔"

دروازہ کھول کر زہرا اندر داخل ہوئی۔ ایڈی اٹھ بیٹھا۔

"میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

"نہیں آؤ۔" عبداللہ نے کہا پھر ان کی طرف مڑا۔

"یہ میری بہن ہے زہرا جسے ہم گڑیا کہتے ہیں اور گڑیا' ایڈی کو تو تم جانتی ہی ہو' یہ اُما ہے اور یہ ہے ماہ بانو۔" اس نے تعارف کروایا۔

"اچھا آپ ہیں ماہ بانو' پلیز آپ بیٹھیں۔" وہ خود بھی بیٹھ گئی۔

"آپ سے تعارف ہے میرا؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

زہرا مسکرا دی۔ "بالکل ہے اور میں یہاں خاص طور پر آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں' اگر آپ نے اطلاع نہ دی ہوتی تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ میرے تو سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"شکریے کی تو بات ہی نہیں ہے۔ ہوتا وہی ہے جو ہونا ہے۔ باقی تو سبب بننے والی بات ہوتی ہے اور یہ سبب میں نہ بنتی تو کوئی اور بن جاتا۔"

"یہ تو آپ کہہ رہی ہیں ناں ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ہم جو اس وقت اتنے اطمینان سے یہاں بیٹھے ہیں تو صرف آپ کی وجہ سے' ویسے ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیں۔"

"آپ کو معلوم کیسے ہوا یہ سب؟" زہرا کے انداز میں تجسس تھا۔

ماہ بانو مسکرا دی۔ "بس یہ نہ پوچھیں۔ اتفاق سے معلوم ہو گیا تھا۔"

"یونہی سہی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آئیں آپ کو اپنی اماں جان سے ملواتی ہوں۔"

ماہ بانو اور اُما بھی اٹھ گئیں۔ ماہ بانو کو تو ویسے بھی فوزیہ بیگم کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے زہرا میں بھی فوزیہ بیگم کی شبیہہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ عبداللہ کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ اس نے شکل و صورت میں ایک نقش بھی ماں سے نہیں لیا کیونکہ وہ مجسم حیدر علی شاہ کی جوانی تھا۔

زہرا بہت حسین نہیں تھی' لیکن اسے خود کو رکھنے کا ڈھنگ آتا تھا' رہی سہی کسر اسٹائل پوری کر دیتا تھا اور یوں مجموعی تاثر خوبصورتی کا ہی آتا تھا۔

چلتے چلتے زہرا کوریڈور میں رک گئی۔

"بانو! مجھے آپ سے کوئی بات کرنی ہے۔"

"اوہ۔ شیور!" اس نے کہا۔

"ابھی نہیں' آپ اماں جان سے مل لیں پھر۔"

"آل رائٹ۔"

حویلی خاصی لمبی چوڑی تھی۔ کافی دیر چلنے کے بعد وہ آراستہ لیونگ روم میں پہنچے' جہاں فوزیہ بیگم اون سلائیاں پکڑے نٹنگ میں مصروف تھیں اور ساتھ ہی ٹی وی پر بی بی سی بھی دیکھ رہی تھیں۔ ٹی وی کی آواز بہت مدھم تھی۔

"اماں جان! یہ ہیں ماہ بانو اور یہ ہیں اُما۔" زہرا نے اندر داخل ہو کر تعارف کرایا۔

فوزیہ بیگم نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"آؤ بچو بیٹھو۔"

وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ زہرا' فوزیہ بیگم کے صوفے کی ہتھی پر ٹک گئی۔

"ماہ بانو میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ آپ کا ہم پر بہت احسان ہے بیٹا۔" انہوں نے اون سلائیاں ایک طرف رکھ دیں۔

"آنٹی پلیز! مجھے شرمندہ مت کریں۔ عبداللہ میرا فرینڈ ہے۔ اتفاق سے مجھے اس بات کا علم ہو گیا تو میں نے بتا دیا۔"

"نہیں بانو بیٹا۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ آپ نے کس مقام پر ہماری مدد کی ہے۔"

فوزیہ بیگم نے اتنی مرتبہ اور اتنے پیار کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا کہ وہ سچ مچ شرمندہ ہو گئی۔

فوزیہ بیگم واقعی خوبصورت نہیں تھیں اور اگر بانو' اماں کی یہ بات تسلیم کر لیتی کہ ریشماں' زرینہ خالہ کی ہو بہو تصویر ہے۔ تب تو واقعی وہ زرینہ خالہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں' لیکن ان کے چہرے پر ایک عجیب سی ملائمت تھی۔ انہیں دیکھ کر خوشگواریت کا احساس ہوتا تھا۔ ان کا بات چیت کرنے کا انداز بھی بہت خوبصورت تھا اور ان چیزوں نے ان کی شخصیت کو نکھار کر رکھ دیا تھا۔

"واقعی اماں ٹھیک کہا کرتی تھیں۔" ماہ بانو نے سوچا۔ "جو انسان اندر سے خوبصورت ہو' اس کا چہرہ اللہ تعالیٰ نور سے روشن کر دیتا ہے۔"

"آئیں ہم کمرے میں چلتے ہیں۔" کچھ دیر بعد زہرا نے کہا۔

"چلیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

زہرا انہیں اپنی خواب گاہ میں لے آئی اس کمرے کی سجاوٹ بھی گھر والوں کی خوش ذوقی کا پتا دیتی تھی۔

"اب آپ آرام سے بیٹھ جائیں بغیر کسی تکلف کے۔" زہرا نے کہا۔

"آپ نے کوئی بات کرنی تھی؟" ماہ بانو نے یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔

"ہاں' وہ تو کرنی ہے' لیکن کیا ہم بات چیت اتنے ہی تکلف زدہ ماحول میں کریں گے؟ میرا خیال ہے' ہم تینوں ہم عمر ہیں۔ یہ اچھا نہیں ہوگا کہ آپ جناب چھوڑ کر 'تم' پر چلے آئیں۔"

وہ تینوں ہی ہنس پڑیں۔

"مجھے کوئی اعتراض ہیں۔" ماہ بانو نے کہا۔

"شکر ہے ورنہ بات کرنا بہت مشکل ہو جاتی ہے۔" زہرا نے کشن گود میں رکھ لیا۔

"مجھے ذاتی سطح پر بات کرنی ہے' اس طرح کہ یہ بات بھائی تک نہ پہنچے۔ میں انہیں بتا دوں گی لیکن ابھی نہیں۔ اصل میں مجھے تمہاری مدد چاہیے۔"

ماہ بانو اور اُما نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ماہ بانو بولی۔

"مجھ سے جو مدد ہو سکے وہ میں کروں گی اور جہاں تک تمہارے بھائی کا تعلق ہے تو اس

کے ساتھ اگر تمہارا کوئی مسئلہ ہے تو وہ تم بہتر طور پر ہینڈل کر سکتی ہو۔" اس نے محتاط انداز اختیار کیا۔

"نہیں بھائی کے ساتھ میرا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے' صرف اتنا ہے کہ ابھی میں یہ طے نہیں کر سکی کہ انہیں کس انداز میں یہ بات بتاؤں۔" پھر قدرے توقف سے بولی۔ "تم ریشماں کی کزن ہو؟"

اس نے قدرے حیرت سے زہرا کو دیکھا پھر بولی۔ "یہ بات عبداللہ نے بتائی ہے تمہیں؟"

"نہیں' بھائی نے تمہارا ذکر کرتے ہوئے تمہارے نانا کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد یہ جاننا مشکل تو نہیں تھا۔" زہرا نے کہا۔

"اور یہ بات عبداللہ جانتا ہے؟"

"بات تو ان کے سامنے ہی ہوئی تھی' لیکن بھائی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ وہی بات سنتے ہیں' جو سننا چاہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ بات وہ سننا نہیں چاہتے تھے۔"

"تمہیں کس قسم کی مدد چاہیے؟"

"تم تو ریشماں کے بھائیوں کو بھی جانتی ہو گی۔ ہیں تو میرے کزن لیکن اول تو دشمنی ہی اتنی ہے تم جانتی ہو اور دوسرے ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یاد رکھنا مشکل ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

"ہیں تو بابا جان کے بھائی اس لیے کیا کہوں' لیکن انہوں نے فیملی پلاننگ کا بالکل خیال نہیں رکھا۔"

ماہ بانو خاموش رہی۔

"مجھے معلوم کرنا تھا ان کے بیٹے سبط حسن کے بارے میں وہ کیا کرتا ہے' کہاں ہوتا ہے؟"

ماہ بانو الجھن میں گرفتار ہو گئی۔ "کوئی وضاحت نہیں کرو گی زہرا؟ تم لوگوں کا ارادہ اسے کوئی......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں' یہاں کسی کا ارادہ اسے نقصان پہنچانے کا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ بابا جان اور بڑے بابا سگے بھائی ہیں لیکن بابا جان نے ان کی طرح کبھی اوچھے ہتھکنڈے اختیار نہیں کیے اور نہ ہی کبھی کریں گے۔" اس نے رک کر ماہ بانو کے چہرے کا جائزہ لیا پھر بولی۔ "تم مطمئن نہیں ہوئیں' اچھا ٹھہرو۔"

وہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

"یہ کیا ہے اُما' میں کیا کروں؟" ماہ بانو نے آہستہ سے کہا۔

"جب تک مطمئن نہ ہو جاؤ کوئی بات نہ بتاؤ۔" اُما نے بھی اسی طرح کہا۔

اسی وقت زہرا باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک البم تھی۔

''پلیز ماہ بانو! یہ تو بتا سکتی ہوناں کہ یہ وہ سبط حسن تو نہیں ہے جو ریشماں کا بھائی ہے؟
اس نے البم کھول کر ایک تصویر اس کے سامنے کر دی۔

تصویر میں زہرا' زینی اور سبط حسن تینوں قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پاس کتابیں' کاپیار بکھری ہوئی تھیں۔ تینوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ تصویر میں موجود سبط حسن۔ ریشماں کا بھائی ہی تھا۔ ماہ بانو تصویر دیکھ کر الجھ گئی۔

''یہ تمہارا دوست ہے زہرا؟''

''میرا صرف دوست ہے' لیکن زینی یہ میری چھوٹی بہن ہے۔'' اس نے زینی کی تصویر پر انگلی رکھ دی۔ ''زینی اور سبط حسن ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہوں؟''

''ہاں یہ ریشماں کا بھائی ہی ہے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

زہرا گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ البم بند کر کے اس نے اپنے پاس ہی قالین پر رکھ دی۔

''اس نے نہیں بتایا تھا تمہیں؟'' ماہ بانو کو زینی سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔

''نہیں' کبھی ایسا ذکر ہی نہیں ہوا تھا۔'' زہرا نے کہا۔ وہ واضح طور پر ڈپریس دکھائی دے رہی تھی۔

''اور کیا وہ جانتا تھا تم لوگوں کے بارے میں؟''

''مجھے یقین ہے کہ وہ بھی نہیں جانتا تھا' لیکن بانو یہ جو کچھ ہوا ہے' ایسا نہیں ہونا چاہتے تھا۔ پتا نہیں زینی کو معلوم ہو گا تو وہ اس صورتِ حال کو قبول بھی کر سکے گی یا نہیں۔'' پھر قدرے توقف سے بولی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے یہ بات زینی کو بتا دینی چاہیے یا نہیں۔''

''دیکھو زہرا! تم خود سمجھدار ہو اور یہ مسئلہ بہتر طور پر ہینڈل کر سکتی ہو' لیکن بہت خلوص سے مشورہ دے رہی ہوں تمہیں۔ آج یا کل جیسے تمہیں معلوم ہوا ہے' اسے بھی معلوم ہو جائے گا۔ اور اسے ہی نہیں سبط حسن کو بھی علم ہو جائے گا۔ یہ بات چھپی رہنے والی تو ہے نہیں۔ پتا نہیں ان دونوں کو کسی اور ذریعے سے معلوم ہو تو ان کا کیا ردِعمل ہو۔ سبط حسن کی بات مختلف ہے' لیکن زینی کا ری ایکشن زیادہ شدید ہو سکتا ہے۔ تم بتاؤ گی تو طریقے سے بتاؤ گی اور ردِعمل جو بھی ہو اسے سنبھال سکو گی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''یہی بات میں بھی سوچ رہی ہوں' لیکن میرا اسے بتا دینا بھی کوئی آسان تو نہیں ہے۔ یہ دیکھو اس کے خط۔'' اس نے تکیے کے نیچے سے وہ خطوط کا بنڈل نکال کر ان کے سامنے ڈھیر کر دیا۔

''ابھی تم لوگوں کے آنے سے پہلے میں اس کے یہ خط پڑھ رہی تھی۔ اتنے لمبے خطوں میں وہ کون سی سطر ہے جس میں سبط کا ذکر نہیں ہے۔

اور پھر چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ سب کی بہت لاڈلی ہے۔ ہر کوئی اس سے اب بھی ویسے ہی پیار کرتا ہے جیسے چھوٹے بچوں سے کیا جاتا ہے' اس لیے اس کی بچوں والی عادتیں بھی برقرار ہیں۔ جتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ بے اختیار ہنس پڑتی ہے' اس سے بھی چھوٹی باتوں پر اتنا زیادہ روتی ہے کہ چپ کرانا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔''

''تو کیا سبط حسن اس کے لیے اسٹینڈ نہیں لے گا؟'' اُما نے پوچھا۔

''اس کا حل اتنا آسان نہیں ہے۔ سبط اسٹینڈ لے لے تب بھی بہت مسئلے ہیں۔ ہم دونوں بہنوں کی منگنی بچپن میں بڑے بابا خود ہی اپنے بیٹوں سے طے کر چکے ہیں۔ میرے بابا جان نے خاندانی روایات سے بغاوت کر کے ہم دونوں کو پڑھانا شروع کیا۔ پہلے تو بڑے بابا نے زبانی منع کیا' لیکن جب بابا جان نہ مانے تو انہوں نے ہماری گاڑی پر فائرنگ کروا دی۔ اللہ نے کرم کیا اور ہم بچ گئے' لیکن پھر بابا جان نے ہمیں پڑھائی کے لیے مری بھجوا دیا۔ ہمیں یہاں آنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ بھائی کو بھی باہر بھجوا دیا۔ یہاں کسی کے بھی علم نہیں کہ ہم کہاں پڑھ رہے ہیں۔

اور اب جو بڑے بابا مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے تو اس لیے نہیں کہ مجھے بہو بنائیں' بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔

اب تو یوں بھی معاملہ بہت بگڑ گیا ہے۔ زینی کا وہ جو نام نہاد منگیتر تھا' وہ مر گیا ہے اور اب خاندانی روایات کے مطابق اسے بڑی حویلی میں امداد علی کی بیوہ کے طور پر باقی زندگی گزارنا ہو گی' لیکن حقیقت بتاؤں اُما تو وہ یہ بھی نہیں کریں گے' وہ اسے بھی قتل کر دیں گے۔''

''لیکن کیوں؟'' اُما کچھ نہ سمجھ سکی۔

''کیونکہ ہم ان کے بیٹوں کی عزت ہیں۔'' وہ تلخی سے ہنسی۔ ''ہمارے خاندان میں عزت اور غیرت کے فلسفے بھی تو بہت پرانے ہیں۔ صدیوں پرانے۔ بڑی حویلی کی عزت خاک میں مل چکی ہے' کیونکہ ہم بہنوں نے پڑھ لکھ لیا ہے۔ ہمیں نہ جانے کتنے لوگ دیکھ چکے ہیں اور نہ جانے کتنے لڑکوں سے ہماری دوستی رہی ہے۔

یہ بڑے بابا کا خیال ہے' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے پڑھنے سے اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ کسی لڑکے سے دوستی کرتی۔ کچھ شاید بچپن کی بے انتہا سختی کا اثر تھا کہ کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ بچپن میں ہماری گورنس بہت سخت تھیں۔

اور زینی کی سبط کے علاوہ کسی لڑکے سے دوستی نہیں ہے' وہ ہے بھی بہت اچھا۔ میں تو سوچ

بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا تعلق ایسے لوگوں سے ہوسکتا ہے۔

اب خود سوچو وہ اسٹینڈ لے بھی تو کتنا لے گا؟ اور پھر اماں جان ہم بہنوں کا رشتہ کبھی وہاں نہیں دیں گی' چاہے انہیں یہ یقین ہی کیوں نہ آجائے کہ وہاں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ چاہے وہ ہمیں پلکوں پر بٹھا کر رکھیں' تب بھی نہیں۔ ان کا سیٹ اپ اتنا مختلف ہے کہ وہاں تو ہمارا دم گھٹ جائے گا۔ زینی اور سبط کے معاملے میں تو فل اسٹاپ سمجھو۔"

"اور ریشماں اور عبداللہ کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"ناممکن۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔ "بابا جان تو چاہتے ہیں اماں جان کی بھی خواہش ہے' لیکن ان کی شادی ایک دوسرے سے ہوگی نہیں' ہو ہی نہیں سکتی۔"

"عبداللہ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"انہوں نے کبھی کھل کر مخالفت نہیں کی' لیکن شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا' اس لیے مخالفت کر کے خواہ مخواہ بدمزگی پیدا کرنے کا فائدہ۔ ویسے ان کا انداز صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ یہ ذکر بھی پسند نہیں کرتے۔ دراصل ان کے مزاج میں اتنا زیادہ تحمل اور برداشت ہے کہ وہ بہت ہی کم باتوں پر اپنے غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ ہاں اگر غصہ آجائے انہیں تو بس پھر یہ پوچھو کہ کیا ہوتا ہے' لیکن یہ غصہ آتا بہت ہی کم ہے۔"

اُما اور ماہ بانو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"تم اتنے یقین سے عبداللہ اور ریشماں کی شادی کے امکان کو کیسے رد کر سکتی ہو؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"ظاہر ہے جس گھر کی بیٹیوں کی وہ قبریں کھودنے پر آمادہ بیٹھے ہوئے ہیں اس گھر میں کبھی اپنی بیٹی دے سکتے ہیں؟ اور پتا ہے' ہمارے ہاں پیر گھرانے کی بیٹی کی شادی نہیں ہوتی۔ ان کا کہنا ہے کہ سسرال میں بیٹی کے ساتھ ہر قسم کا اچھا برا سلوک کیا جا سکتا ہے اور اگر سلوک برا ہو تو لڑکی والوں کا سر جھک جاتا ہے' اب اگر پیر صاحب کا سر جھک گیا تو قیامت نہیں آجائے گی کیا؟ ہے ناں پاگل پن۔

اب سوچو کہ وہ جو سر جھکنے کے ڈر سے دوستوں میں رشتہ نہیں دیتے' دشمنوں میں کیسے دے سکتے ہیں؟ میں تو کہتی ہوں کہ اچھا ہی ہے اگر بھائی' ریشماں میں دلچسپی نہیں رکھتے تو خواہ مخواہ خود کو مصیبت میں ڈالنے کا فائدہ؟"

ماہ بانو سوچ میں پڑ گئی۔

"ویسے تو مجھے تم لوگوں کے مسئلے میں نہیں آنا چاہیے لیکن زہرا! اچھا ہو کہ تم عبداللہ کو زینی اور سبط حسن کے بارے میں بتا دو۔ جتنا میں اسے جانتی ہوں' مجھے یقین ہے کہ وہ اس مسئلے کو سب سے اچھی طرح ہینڈل کرے گا۔" اُما نے کہا۔

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اگر درمیان میں سبط کے علاوہ کوئی اور ہوتا' تب تو کچھ مسئلہ ہی نہیں تھا' اب بات دوسری ہے۔ خیر چھوڑ دو اسے۔ میں نے تو خواہ مخواہ تم لوگوں کو پریشان کر دیا۔ یہ بتاؤ کہ کب تک ہو یہاں گاؤں میں؟"

"بس آج رات واپس جانا ہے۔"

"اتنی جلدی؟" زہرا نے کیا۔

"کالج چھوڑ کے آئے ہیں۔ ایک تو سب عتاب گرتا ہے فرسٹ ایئر والوں پر' روزانہ مارکنگ ہوتی ہے' آج بھی بہت حرج ہوا ہے۔ سیکنڈ ایئر میں جائیں گے تو اس روزانہ مارکنگ والی ٹینشن سے تو نجات ملے گی۔" اُما نے کہا۔

"میرا خیال ہے اُما کہ اب چلنا چاہیے۔"

"ایسے کیسے؟ کھانا لگ چکا ہے' کھانا کھائے بغیر جانے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔" زہرا بولی۔

کھانا بہت پُرتکلف تھا اور میز پر ان چاروں کے علاوہ جیمز اور ظہیر بھی موجود تھے۔

"گڑیا نے بتایا ہے کہ تم لوگ آج ہی واپس جا رہے ہو؟" عبداللہ نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"ہاں' ساری رات سفر کر کے صبح کالج بھی اٹینڈ کرنا ہوگا' مجھے تو سوچ کر ہی ہول اٹھ رہے ہیں۔" اُما نے کہا۔

"رہو گے تم لوگ فرسٹ ایئر فول ہی' ایک دن تم لوگوں کے کالج نہ جانے سے فطرت کے مقاصد تبدیل نہیں ہو جائیں گے۔" ایڈی نے کہا۔

"اتنی مشکل باتیں مت کیا کرو کہ اوپر سے گزر جائیں کل ڈیزائننگ کی کلاس ہے اور میرا نہیں خیال کہ قمر صاحب نے نمبر دینے کا اختیار تمہیں دے دیا ہے۔" اُما بولی۔

"مجھے دیا ہوتا تو تمہارے فل نمبر ہوتے۔ ابھی تو میں اتنا کہہ رہا ہوں کہ کبھی کبھار منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے نمبروں کے بغیر بھی گزارا کر لیا کرو۔"

"ذرا تمہارا تھیسز شروع ہو جائے ایڈی۔ یہی بددعا میں تمہیں اس وقت دوں گی۔"

"تم کچھ دو تو سہی' دعا نہ سہی' بددعا ہی سہی۔"

ایڈی نے کچھ اس انداز میں کہا کہ سب ہی ہنس پڑے۔

"ایڈی اگلے مائم کا موضوع ہونا چاہیے' ایک بددعا کا سوال ہے۔" ظہیر نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم لوگ کب آ رہے ہو۔" ماہ بانو نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

"ہم آ رہے ہیں سمیشن سے ایک آدھ دن پہلے۔" ایڈی نے کہا۔

"لیکن سب مٹ کیا کراؤ گے؟ کام تو تم نے کیا نہیں ہے۔" ماہ بانو ہنسی۔

''کام تو ہوتا ہے موڈ کے ساتھ' موڈ بن جائے تو آستینیں چڑھا کر دو دن' دو رات مسلسل بھی کام کیا جا سکتا ہے۔'' وہ بولا۔

''اور عبداللہ تم بھی ان کے ساتھ ہی آؤ گے؟''

''ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا' میرے پروگرام اچانک ہی بنتے ہیں۔''

کھانا کھا کر وہ چلنے کے لیے تیار ہوئیں۔

''چلو میں تم لوگوں کو چھوڑ آؤں۔'' عبداللہ نے جیپ کی چابی اٹھالی۔

''اتنے تکلفات میں مت پڑو' ہم چلے جائیں گے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''تکلفات میں تو تم پڑتی ہو بانو۔''

''میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ہمیں نیاز پور جانا ہے اور تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے ابھی یوں بھی حالات خراب ہیں۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔ تم لوگ تو چھوٹی چھوٹی باتوں کو سر پر سوار کر لیتے ہو۔''

''یہ چھوٹی بات نہیں ہے عبداللہ۔''

''اچھا چلو تو' ندی تک تو چھوڑ سکتا ہوں ناں تمہیں' آگے پھر تھوڑا ہی راستہ ہے۔''

وہ دونوں سب کو وِش کر کے اس کے ساتھ باہر نکل آئیں۔ جیپ ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ہو لی۔

''بانو! مجھے کام تھا تم سے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''کیسا کام؟''

''میں لاہور کے اپنے گھر کا لان ٹھیک کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں چاہتا ہوں کہ تم سرامکس سے متعلق چیزوں کی ڈیزائننگ کرو۔ صرف ڈیزائننگ نہیں انہیں تیار بھی تم ہی کو کرنا ہوگا' لیکن ایک تو یہ کام ذرا جلدی ہونا چاہیے۔ دوسرے چیز بہت آرٹسٹک ہونی چاہیے' کر سکو گی؟''

''ضرور' یہ تو بہت دلچسپ کام ہے۔''

''ٹرمز اور کنڈیشنز وہاں آنے پر طے ہو جائیں گی۔'' وہ بولا۔

''ٹرمز اینڈ کنڈیشنز؟ لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت کیوں نہیں ہے' تم اپنا ٹیلنٹ استعمال کرو گی' اپنا وقت دو گی اور ان دونوں چیزوں کی قیمت ہوتی ہے۔''

''قیمت تمہارے لیے نہیں ہے عبداللہ' وہ میں دوسرے لوگوں سے وصول کر لوں گی۔''

''لڑکی' آرٹ کو اتنا بے قیمت مت کرو۔ اسے سمجھاؤ اُما یہ اپنے کام کی ویلیو خود ہی کم کر رہی ہے' اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی۔''

''مجھے مت سمجھاؤ' میں خود بھی بہت پروفیشنل ہوں' اس معاملے میں' لیکن تم سے عبداللہ' میرا دل نہیں مانتا۔ چلو اس مرتبہ نہیں' پھر کوئی اور کام دیا تو خوب کھینچ تان کر پیسے وصول کروں گی۔''

''تم اب بھی ایسا ہی کرو گی اور یاد رکھو کہ یہ کام تم ہی کو کرنا ہے۔'' اس نے جیپ روک دی۔ ''باقی باتیں لاہور آ کر ہوں گی۔''

وہ دونوں اسے بائے کر کے اتر آئیں۔

''یہ کیا حماقت ہے بانو' وہ تم سے کام کروا رہا ہے اور تم پیسے لینے پر تیار نہیں ہو۔ پتا ہے کوئی آرٹسٹ سن لے تو تمہیں مینٹل اسپتال میں داخل کروا دے۔'' پگڈنڈی پر آگے بڑھتے ہوئے اُما نے کہا۔

''یہ بات نہیں ہے اُما۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ میری مدد کرنے کے خیال سے ایسا کر رہا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تمہیں بھیک تو نہیں پکڑا رہا۔ اسے تمہارے ابا جی کی بنائی ہوئی Pottery اچھی لگی۔ تمہاری ڈیزائننگ پر اسے بھروسا ہے' اس لیے وہ تمہیں یہ کام دے رہا ہے اور یہ بھی سن لو کہ کوئی کتنا بھی امیر کیوں نہ ہو۔ یونہی پیسے پھینک نہیں دیا کرتا۔''

''اُما! میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھ پر ترس کھائے اور مجھے پتا ہے کہ وہ مجھ پر ترس کھا رہا ہے۔''

''پاگل ہو' تم میں کسی بات کی کمی ہے کہ وہ تم پر ترس کھائے گا۔''

''اچھا چھوڑو۔''

چلتے چلتے ماہ بانو کی نگاہ چند قدم کے فاصلے پر کھڑے حیدر علی شاہ پر پڑی' جو بائیں سمت کھیت کے کنارے کھڑے تھے۔ کھیت میں کٹائی کا کام ہو رہا تھا اور وہ دور سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

''اُما!'' ماہ بانو نے اسے متوجہ کیا۔ ''وہ عبداللہ کے بابا جان ہیں۔''

ان کی طرف حیدر علی شاہ کی پشت تھی۔

''پیچھے سے تو صرف یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ ہائٹ اچھی ہے اور اسمارٹ بھی لگ رہے ہیں۔'' اُما نے تبصرہ کیا۔ ''ویسے بانو! اگر یہ واقعی جوانی میں عبداللہ جیسے تھے تو تمہاری خالہ زرینہ بلاوجہ ہی پہلی نظر کی محبت کا شکار نہیں ہوئی تھیں بھئی میں تو اب زرینہ خالہ کو الزام نہیں دیتی۔''

اسی وقت حیدر علی شاہ ان کی طرف مڑے۔

''اُف یہ تو اب بھی اتنے ہینڈسم ہیں' کتنے سوبر لگتے ہیں' کیا زبردست پرسنالٹی ہے۔'' اُما نے دبے دبے انداز میں ماہ بانو سے کہا۔

''شی' سن لیں گے جلدی چلو۔''

وہ دونوں آگے چل دیں۔

حیدر علی شاہ کی کبھی بھی یہ عادت نہیں تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر کسی کو دیکھیں لیکن اُما کے تبصرے میں زرینہ کا ایسے انداز میں ذکر سن کر وہ نہ جانے کیوں پیچھے مڑ گئے تھے۔ دور تک پھیلے کھیتوں میں کافی خاموشی تھی اور درمیان میں فاصلہ بھی کم تھا' اس لیے مدھم آواز میں کی گئی باتیں بھی ان تک پہنچ گئی تھیں۔ وہ چلی گئیں تو وہ بھی ان کھیتوں کی طرف متوجہ ہو گئے' جہاں کٹائی ہو رہی تھی۔

☆======☆======☆

زہرا اپنے کمرے میں بیٹھی زینی کے پرانے خطوط پڑھ رہی تھی۔ ابھی شام کو اس کا ایک اور خط آیا تھا۔ وہ بھی سبط کے ذکر سے بھرا ہوا تھا' لیکن اس مرتبہ خط میں پریشانی نظر آ رہی تھی۔ سبط بغیر بتائے گاؤں چلا گیا۔ کیوں گیا وہ اس طرح؟ کہیں بیمار نہ پڑ گیا ہو' فون نہیں کیا اس نے وغیرہ۔ یہی سب تھا اس کے خط میں۔ اندیشے' فکریں' پریشانیاں۔

اب تک کتنی ہی مرتبہ وہ اس کے مختلف خط پڑھ چکی تھی۔ جب دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس!'' اس نے کہا۔

اندر آنے والا عبداللہ تھا۔

''آئیں بھائی۔'' اس نے جلدی جلدی سب خط اکٹھے کر کے کشن کے نیچے سرکا دیے۔

وہ بیڈ سے ٹیک لگا کر قالین پر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

''کیا ہو رہا تھا؟''

''کچھ خاص نہیں۔ زینی یاد آ رہی تھی اس کے خط پڑھ رہی تھی۔'' زہرا نے کہا۔

عبداللہ نے سگریٹ سلگا لیا۔ ''سب سو گئے تھے' مجھے نیند نہیں آ رہی تھی' اس لیے تمہارے پاس چلا آیا۔''

''بہت اچھا کیا۔ بانو اور اُما کہہ رہی تھیں کہ وہ آج رات ہی لاہور چلی جائیں گی۔''

''ہاں بلکہ اب تک وہ لوگ جا بھی چکے ہوں گے۔ گیارہ تو بج رہے ہیں۔'' پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''یہ بتاؤ گڑیا کہ تم مجھ پر کتنا اعتماد کرتی ہو؟''

''یہ کیا بات ہوئی بھائی' آپ پر تو میں اپنے آپ سے بھی بڑھ کر اعتماد کرتی ہوں۔''

''اور اگر میں کچھ پوچھوں تو سچ سچ جواب دو گی؟''

''یہ آپ کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔ میرے اور آپ کے درمیان کوئی کمیونی کیشن گیپ تو نہیں ہے۔ آپ سے تو میں اس لیے بھی پورے اعتماد سے بات کر سکتی ہوں کیونکہ آپ کو غصہ نہیں آتا۔ آپ اور بابا جان پتا نہیں کیسے اتنی بڑی بڑی باتیں بھی آرام سے برداشت کر لیتے ہیں۔''

''اس بات کی مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے کہ دور دور رہنے کے باوجود بھی ہم بہن بھائی ایک دوسرے سے ذہنی اور قلبی طور پر دور نہیں ہوئے۔'' اس نے قدرے توقف کیا۔ سگریٹ کا ایک

طویل کش لیا پھر بولا۔

''تم سبط حسن کا نام سن کر چونکی تھیں مجھے محسوس ہوا تھا کہ تم اسے کسی کے ساتھ Identify کی کوشش کر رہی تھیں۔''

زہرا کو توقع نہیں تھی کہ وہ یہ موضوع چھیڑے گا وہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''آپ سے ماہ بانو یا اُما نے کچھ کہا؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

عبداللہ کی آنکھوں میں آنے والے تاثرات نے اسے ایک دم بتا دیا کہ ماہ بانو یا اُما نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ عبداللہ کی آنکھیں بہت جلد ہر بات ظاہر کر دیتی تھیں۔

''تم نے ان سے کوئی ذکر کیا تھا؟''

''ہوں' بانو سے کیا تھا۔ اینی وے' آپ نے جو کچھ محسوس کیا' وہ ٹھیک تھا۔''

''پھر کیا اندازہ لگایا تم نے؟ وہ وہی ہے جس کے ساتھ تم اسے Identify کر رہی تھیں؟''

''یہ نہیں ہے بھائی کہ میں آپ کو بتانا نہیں چاہتی تھی لیکن ابھی میں نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آپ کو یہ بات کب اور کیسے بتائی جائے۔''

عبداللہ نے سگریٹ' ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''مجھ پر اعتبار کرو گڑیا' میں نہیں چاہتا کہ میری بہنیں اس وجہ سے کسی پریشانی میں مبتلا ہوں کہ وہ مجھ سے اپنے مسئلے شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔''

''تھینک یو بھائی۔'' وہ مسکرائی پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''سبط ہمارا فرینڈ ہے' بہت اچھا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ بڑے بابا کے گھر میں سبط جیسا اچھا فرد بھی ہو سکتا ہے۔ آپ سب نے زینی کی تصویر کے متعلق پوچھا تھا اور اس نے کہا تھا کہ جس نے تصویر کھینچی ہے' وہ آپ کو اس سے ملوائے گی۔ بس اتفاق ہوا کہ سبط سے آپ کی ملاقات نہیں ہو سکی۔''

''ہوں۔'' وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''وہ صرف دوست ہے ناں۔''

گڑیا نے نفی میں سر ہلایا۔ عبداللہ نے گہرا سانس لیا۔

''زینی اور سبط ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔'' وہ بولی

''تمہیں یقین ہے اس بات کا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ محض گہری دوستی ہو۔''

''یہ محض گہری دوستی نہیں ہوتی۔'' اس نے کشن کے نیچے سے خطوط کا چھوٹا سا بنڈل نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''بھائی آپ کو اندازہ نہیں ہے' وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے کتنے پاگل ہیں۔''

عبداللہ نے دو تین خط نکال کر پڑھے۔ سب ہی بہت طویل اور سبط حسن کے ذکر سے بھرے ہوئے تھے۔ کیا باتیں ہوئیں' کتنی سیر کی' کس درخت کے تنے پر کتنی مرتبہ نام لکھا' کچن

میں گھس کر کون سی نئی ڈش بنانے کی کوشش میں سارا کچن تلپٹ کر دیا اور کون سے گانے سن ہوئے کتنا کچھ پڑھا' ہر خط میں اسی قسم کی باتیں تھیں۔ اس نے بنڈل دوسری جانب سرکا دیا۔

''یہ بات تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ یہ سبط بڑے بابا جان کا بیٹا ہی ہے؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

زہرا نے اثبات میں سر ہلایا اور البم اس کی طرف بڑھا دی۔

''میں نے ماہ بانو سے یہی پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ بڑے بابا جان کا ہی بیٹا ہے۔''

عبداللہ نے البم کھول لی۔ زیادہ تر تصویریں وہ تھیں جو سبط نے گڑیا اور زینی کی کھینچی تھیں لیکن چند تصویروں میں ان کے ساتھ وہ بھی موجود تھا۔ یہ تصویریں دیدی یا زہرا نے اتاری تھیں عبداللہ ایک تصویر پر رک گیا۔ اس میں زینی اور سبط پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پائن ایپل کولر کے گلاس تھے۔ دونوں ہنس رہے تھے' چہروں پر اطمینان کے رنگ تھے۔ اکٹھے بیٹھے و دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ کتنی دیر تک وہ ان کی تصویر تکتا رہا۔

''بھائی آپ یقین کریں' سبط بہت اچھا ہے' مجھے تو اب پتا چلا ہے کہ وہ بڑے بابا جان' بیٹا ہے' لیکن زینی کو اب بھی اس بات کا علم نہیں ہے۔''

''ہوں۔ سبط نے کبھی اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا؟ اور تم لوگوں نے بھی کبھی نہیں پوچھا؟''

''آپ کو پتا ہے ناں کہ ہماری فیملی کے بکھر جانے کا زینی نے کتنا اثر لیا تھا۔ وہ اب تک کمپلیکس محسوس کرتی ہے' پھر بابا جان نے بھی سختی سے منع کر رکھا تھا بتانے سے۔ زینی کا خیال تھا کہ وہ سبط سے پوچھے گی تو اپنے بارے میں بھی بتانا پڑے گا' اس لیے وہ یہ بات نہیں پوچھتی تھی۔ شاید سبط نے بھی یہ محسوس کیا تھا۔ وہ بھی کبھی یہ گفتگو نہیں کرتا تھا اور میرا اندازہ ہے کہ انہیں اس بات کی پروا بھی نہیں ہے۔ وہ ابھی اس عمر میں نہیں پہنچے' جہاں ان باتوں کی اہمیت کا انداز ہوتا ہے۔''

''یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ جب ان دونوں کا اتنا ملنا جلنا ہے تو اس کی کبھی اماں او بابا جان یا مجھ سے ملاقات کیوں نہیں ہوئی؟ کیا زینی ایسا نہیں چاہتی تھی؟''

''نہیں' وہ تو بہت زیادہ چاہتی تھی' لیکن یہ اتفاق ہے کہ ان دنوں سبط مصروف ہوتا تھا۔''

''ایسا اتفاق کتنی مرتبہ رونما ہو سکتا ہے؟'' عبداللہ نے کہا۔

''اس بارے میں' میں کیا کہہ سکتی ہوں' مجھے اس کی زبان کا اعتبار تھا' جو اس نے کہا' میں نے آپ کو بتا دیا۔''

''اس کا کوئی فون نمبر ہے تمہارے پاس؟''

زہرا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''زینی کو وہاں مری والا فون نمبر معلوم ہے' لیکن میں نے کبھی

ضرورت ہی نہیں سمجھی۔''

''خیر نمبر معلوم کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تھینک یو گڑیا! تم نے مجھ پر اعتبار کیا۔ اب تم اپنے ذہن سے یہ پریشانی جھٹک دو۔ میں یہ معاملہ ہینڈل کرلوں گا۔''

''اور بھائی جیسے آپ نے یہ محسوس کیا تھا کہ میں سبط کے ذکر سے چونکی تھی' ویسے ہی اگر اماں یا بابا جان نے محسوس کیا ہو اور ان میں سے کوئی مجھ سے پوچھے تو انہیں کیا بتاؤں؟''

''بابا جان نے تو یقیناً یہ بات محسوس کی تھی' اماں جان کے متعلق کہہ نہیں سکتا۔ بہرحال وہ پوچھیں تو ان سے کہہ دینا کہ تم مجھ سے بات کر چکی ہو اور میں نے ضرورت سمجھی تو انہیں بتا دوں گا۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' زہرا نے سر ہلایا۔

''تمہاری البم سے یہ تصویر لے سکتا ہوں؟'' عبداللہ نے اس تصویر کے متعلق کہا' جس میں زینی اور سبط حسن ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

''ضرور۔'' اس نے جلدی سے تصویر نکال کر عبداللہ کو تھما دی۔

''تھینک یو' اور اب سو جاؤ' بہت دیر ہو گئی ہے۔''

وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆======☆======☆

صبح حویلی سے متعلق ہنگاموں میں سبط نے خود کو مصروف کر رکھا تھا' لیکن رات کو اپنے کمرے میں آتے ہی اسے زینی بری طرح یاد آنے لگی۔ کتنے دنوں سے اس نے خود کو روک رکھا تھا زینی کو فون کرنے سے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کتنے دن اس کے بغیر رہ سکتا تھا اور ہر پل اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ زینی سے جدا نہیں ہو سکتا۔

درمیان میں امداد علی والا واقعہ ہو گیا۔ یہ غم اتنا اچانک اور اس قدر شدید تھا کہ زینی یاد تو آئی' لیکن ریشماں اور عبداللہ کے حوالے سے۔ غم کی شدت نے اس کی یاد کو دبائے رکھا تھا۔

لیکن دوپہر کو جو اس کا فون آیا تو اسی شدت سے پھر یاد آنے لگی تھی۔ کتنی بیتابی تھی اس کے لہجے میں' کتنی بے چینی سے اس نے پوچھا تھا کہ کب فون کرو گے اور اس نے تو بے اعتنائی کی انتہا کر دی تھی۔

''اسے میری اس رُکھائی سے کتنا صدمہ ہوگا۔'' اس نے سوچا۔ ''ذرا ذرا سی بات تو اسے دکھی کر دیتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو وہ رو پڑتی ہے۔ وہ بات کرتی رہی اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔''

اس نے فون اپنے قریب کھسکایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا' لیکن پھر درمیان میں رک گیا۔

''کیا بات کروں گا میں اس سے؟'' اس نے سوچا۔

"اب جب کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تو کیا اسے دھوکا دوں گا اور وہ تو ایسی ہے کہ محبت کے نام پر میں اسے کھائی میں بھی دھکا دے دوں تو بھی وہ شکوہ نہیں کرے گی' لیکن کیا اسے کھائی میں دھکا دینے کا مجھے کوئی حق ہے؟

کتنی بڑی آزمائش میں گرفتار ہو جائے گی وہ' جب اسے میری اصلیت کا علم ہوگا' پتا نہیں ایسے میں اس کا کیا ردِعمل ہو۔ نہیں مجھے اسے آزمائش میں مبتلا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اس نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ سونے کی کوشش میں ناکام ہو کر اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ پڑھنے کے لیے رسالہ بھی اٹھایا' ڈش انٹینا پر ایم ٹی وی لگا لیا' لیکن زینی کا فقرہ مسلسل اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا۔

"سنو تو سبط' کب کرو گے فون یہ تو بتا دو۔"

اور پھر تمام تر منطق پر جذبات حاوی ہو گئے۔ فون اٹھا کر اس نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف ابھی پوری رنگ بھی نہیں گیا تھا کہ فون اٹھا لیا گیا۔ حسبِ توقع دوسری طرف زینی تھی۔ ریسیور اٹھاتے ہی اس کی بیتاب آواز ابھری۔

"ہیلو!"

"کیسی ہو زینی؟" اس نے کہا۔

اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ رونے لگی۔

"رونا نہیں زینی پلیز۔"

"کیسے نہ روؤں' مجھے اتنا زیادہ رونا آ رہا ہے۔" وہ بولی۔

"میری خاطر پلیز اپنے آنسو پونچھ دو۔"

"مجھے تمہارے بھائی کی ڈیتھ کا پتا چلا' مجھے اتنا افسوس ہوا کہ کیا بتاؤں۔ پتا نہیں اللہ تعالیٰ ایسا کیوں کرتا ہے کہ اتنے قریبی رشتے ہم سے جدا کر دیتا ہے۔"

سبط نے ہونٹ کاٹے۔ وہ زینی کو کیا بتاتا کہ امداد علی کا زینی کے ساتھ کیا رشتہ تھا اور بتا دیتا تو پتا نہیں وہ اس کی موت پر روتی یا خوش ہوتی۔

"مجھے یہ سوچ کر رونا آ رہا تھا کہ جب اماں اور بابا جان یا بھائی چند دن میرے پاس رہ کے بعد واپس چلے جاتے ہیں تو میں ساری ساری رات روتے ہوئے گزارتی ہوں۔ حالانکہ پھر سے مجھے ملنے آ جاتے ہیں' لیکن تمہارا بھائی تو اتنی دور چلا گیا ہے کہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ سوچ کر میرا دل بہت دُکھتا ہے' انہیں ہوا کیا تھا؟"

"چھوڑو زینی' جسے جانا تھا' وہ تو چلا گیا۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

وہ کیا کہتا کہ امداد علی کیسے مرا تھا۔

"اچھا زینی! تم رونا تو بند کرو' میں تمہارا رونا برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اس وقت جب میں نے تمہیں فون کیا تھا تو کسی نے زخمی ہونے کا ذکر کیا تھا۔ مجھے بتاؤ سبط تم تو ٹھیک ہو ناں؟"

"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں' تم فکر مت کرو۔"

"تو وہ کون ہے جو زخمی ہوا ہے؟"

"میرا بھائی ہے' لیکن اب وہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے زینی کو تسلی دی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو ناں؟"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"میں بھی سوچ رہی تھی کہ تم بلاوجہ اس طرح نہیں جا سکتے۔ مجھے ڈر تھا کہ تم بیمار نہ ہو گئے ہو۔" اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

"تم بتاؤ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"تمہارے بغیر پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا' تم کب آؤ گے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ بولا۔

"تمہاری پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا ہے سبط۔ مجھے پتا ہے کہ تمہارا غم بہت بڑا ہے' لیکن جانے والے کے ساتھ بھی کوئی گیا ہے۔ وہاں رہو گے تو تمہارا ذہن اسی طرح منتشر رہے گا' یہاں آؤ گے تو دل بہل جائے گا' تم سن رہے ہو ناں سبط؟"

"ہاں اور زینی! میں جو کہنے لگا ہوں' وہ میں نے پہلے کبھی تم سے نہیں کہا۔ کبھی کہنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی اور شاید آج کے بعد پھر کبھی نہ کہوں۔

زینی! میں تم سے محبت کرتا ہوں' بہت زیادہ' اتنی زیادہ کہ کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ حالات خواہ کیسے ہوں' لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں تم سے اسی طرح محبت کرتا رہوں گا' ہمیشہ۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

☆======☆======☆

اگلے دن عبداللہ نے پہلا کام یہ کیا کہ بڑی حویلی کے تمام فون نمبر اکٹھے کیے۔

"یہ اوپر والا پیر صاحب کا نمبر ہے۔" نور محمد اسے بتا رہا تھا۔

"یہ بڑے شاہ صاحب کا ہے' یہ مکرم شاہ صاحب کے موبائل فون کا ہے' یہ سبط حسن شاہ صاحب کا ہے اور......!"

"اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔" عبداللہ نے کہا۔

نور محمد باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد عبداللہ نے سبط حسن کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل بج رہی تھی۔ تیسری بیل پر اس کے ملازم نے فون اٹھایا۔

''شاہ صاحب آرام کر رہے ہیں' جگانے سے منع کیا ہوا ہے۔''

''مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے' انہیں جگا دو۔''

''حکم نہیں ہے جناب۔''

''کچھ نہیں کہیں گے وہ تمہیں' ان سے کہو کہ زینب بی بی کے بھائی کا فون ہے۔''

''آپ ہولڈ کریں۔''

تھوڑی دیر بعد سبط حسن لائن پر تھا۔

''ہیلو۔''

''سبط حسن بول رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی۔''

''میں زینب کا بھائی بول رہا ہوں۔''

''عبداللہ بھائی!'' اس نے تامل کرتے ہوئے کہا۔

''گویا اسے معلوم ہے کہ زینی کا تعلق کس خاندان سے ہے۔'' عبداللہ نے سوچا۔

☆======☆======☆

پیر صاحب نے اپنے خاص ملازم کرم داد کو طلب کیا۔

''جی' آپ نے یاد فرمایا تھا؟''

''آج ہی مری روانہ ہو جاؤ' سبط حسن شاہ صاحب کے بنگلے پر جاؤ اور وہ ان کا نوکر کیا نام ہے اس کا؟''

''کرم الٰہی ہے جی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ہاں کرم الٰہی سے پتا کرو کہ شاہ صاحب کی کن کن لڑکیوں سے دوستی ہے۔ باہر کس ملتے ہیں اور گھر میں کون کون آتی ہے' سمجھ رہے ہو ناں ہماری بات؟''

''جی سرکار۔''

''اور خاص طور پر پتا کرو کہ یہ زینب بی بی کون ہے' ہمیں پوری تفصیل چاہیے۔''

''بہت بہتر حضور۔''

''بس اب جاؤ اور یہ کام جلدی ہونا چاہیے' شاہ صاحب بھی ایک آدھ دن میں واپس جائیں گے' ان کے جانے سے پہلے یہ کام ہو جانا چاہیے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں پیر صاحب۔''

''اور شاہ صاحب کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے۔''

''بہت بہتر۔''

کرم داد باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

''ہاں میں عبداللہ بول رہا ہوں۔'' بالآخر اس نے کہا۔

''آپ نے کیسے یاد کیا؟'' وہ اپنی حیرت پر قابو پا چکا تھا۔

''جو صورتِ حال ہے' اس میں ایک نہ ایک دن تمہیں یاد تو کرنا ہی تھا۔'' وہ بولا۔

''مجھے وضاحت کا موقع دیں گے آپ؟'' سبط حسن نے کہا۔

''ضرور' لیکن ٹیلی فون پر نہیں۔''

''آپ جہاں کہیں گے' میں ملنے کے لیے تیار ہوں۔''

''جگہ کا انتخاب تم کرو۔'' عبداللہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

سبط حسن سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ''میں آج لاہور جا رہا ہوں۔''

''لاہور ہی ٹھیک ہے' یہ جگہ یوں بھی اس ڈسکشن کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔'' عبداللہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

''پھر آپ ڈنر میرے ساتھ کریں۔''

''کہاں؟''

''آواری ٹھیک رہے گا۔''

''آل رائٹ' رات آٹھ بجے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں تمہاری یادداشت پر بھروسا کرلوں' کہ تمہیں بھی وقت اور جگہ یاد رہے گی۔''

عبداللہ کے لہجے میں چھپی وارننگ' سبط نے بھی محسوس کر لی تھی۔

''میں نے آپ کو بھائی کہا ہی نہیں سمجھا بھی ہے۔ مجھ پر اور میری یادداشت' دونوں پر بھروسا کریں۔''

''اور اس سے قبل تم زینی سے رابطہ نہیں کرو گے۔'' عبداللہ نے کہا۔

سبط تھوڑی دیر چپ رہا پھر بولا۔ ''جیسی آپ کی مرضی۔''

☆======☆======☆

ماہ بانو کو کالج میں جونہی تھوڑا سا فارغ وقت ملا وہ اُما کو لے کر لائبریری پہنچ گئی۔

''کون سی کتاب چاہیے تمہیں؟'' اُما نے اس سے دریافت کیا۔

''گارڈنز سے متعلق کتابیں دیکھوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ عبداللہ کے آنے سے پہلے ہوم ورک کرلوں۔ ظاہر ہے ہمارے گھر تو کبھی کوئی لان رہا نہیں' اس سلسلے میں کتابیں ہی کنسلٹ کرنی پڑیں گی' پھر جب وہ آ جائے گا تو اس کا لان بھی دیکھ آؤں گی۔''

''چلو اچھا ہوا تمہیں عقل تو آئی۔''

کافی دیر کتابیں کھنگالنے کے بعد ماہ بانو نے کچھ کتابوں کا انتخاب کیا۔

''اتنی ساری کتابیں ایشو کیسے کراؤ گی؟'' اُمانے پوچھا۔

''ہاں یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ تمہارا کارڈ کدھر ہے' ایک آدھ تو اس پر بھی ایشو ہو سکتی ہے۔''

''وہ ایڈی کے پاس ہے۔''

''ایڈی کے پاس؟ وہاں کیا کر رہا ہے وہ؟'' ماہ بانو بولی۔

''اسے کتابیں چاہیے تھیں۔ کہنے لگا مجھ سے کہ تم تو ہو جاہل مطلق۔ تمہیں لائبریری کتابوں سے کیا واسطہ۔ اپنا کارڈ مجھے دو' یہ کسی پڑھے لکھے بندے کے پاس ہونا چاہیے۔''

''بڑا آیا پڑھا لکھا اور تم واقعی جاہل مطلق ہو۔ تم نے بھی پکڑا دیا اسے اپنا کارڈ۔''

''تو کیا کرتی؟ مجھے تو اس سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ میں نے تو اس لیے اسے دے دیا تا کہ یہ بلا کسی صورت ٹلے سر سے۔''

''ویسے غلط تو وہ بھی نہیں تھا۔ ہم یوں بھی لائبریری کی شکل کب دیکھتے ہیں۔ وہ کم از کم پڑھتا تو ہے۔'' ماہ بانو بولی۔

''ایسا کرتے ہیں بانو کہ اپنے جیسے کسی جاہل مطلق سے مانگ لیتے ہیں۔'' اُما ہنسی۔

''ایسے جاہلوں کی فہرست تیار کرو۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''سب سے پہلے تو نیہاں اور نیہاں سے خیال آیا جیمز۔ ویسے بھی جیمز ہر وقت ہر ایک کی مدد کرنے پر تیار رہتا ہے۔''

''لیکن جیمز یہاں کب ہے' وہ گاؤں گیا ہوا ہے اور ابھی کچھ پتا نہیں کہ کب آئے گا۔''

''تو اتنی ساری کتابیں تم ایک دن میں پڑھ ڈالو گی کیا؟ کچھ انتظار کر لو' زیادہ دن تو وہ لوگ بھی وہاں نہیں رہیں گے۔''

''اچھا' ابھی تو چل کر کسی جاہل مطلق کو پکڑیں۔''

وہ دونوں باہر نکلیں۔ نیہاں سمیت چند اور کلاس فیلوز کے کارڈز لیے اور کتابیں ایشو کروا کے آ گئیں۔

''سنو! مجھے پتا چلا ہے کہ عبداللہ زخمی ہو گیا ہے۔'' نیہاں اس کے پاس آ گئی۔

''ہاں مگر اب وہ بہتر ہے۔''

''چلو شکر ہے' سنا ہے تم لوگ بھی گئے تھے وہاں؟''

''اصل میں اسی حادثے میں میری کزن کے بھائی کی بھی ڈیتھ ہوئی تھی' وہاں تعزیت کے لیے جانا تھا۔ اُما بھی میری طرف آئی ہوئی تھی۔ ہم اکٹھے ہی چلے گئے۔ اب ظاہر ہے' وہاں تک گئے تھے' تو عبداللہ سے ملے بغیر تو نہیں آ سکتے تھے۔''

''یہ کزن کا بھائی کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہ سمجھی۔

''نہیں سمجھو گی' جانے دو' ویسے وہاں عبداللہ کی طرف دوسرے فرینڈز سے بھی ملاقات ہوئی۔ جیمز سمیت۔'' آخری ٹکڑا لگاتے ہوئے اُمانے مسکراہٹ دبانے کی کوشش کی۔

نیہاں نے پہلے فقرے کی ساخت اور اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ بات اُمانے ویسے ہی بلا مقصد کہہ دی تھی یا بطور خاص جیمز کا ذکر کرنے کا کوئی مقصد ہے۔

''اس طرح مشکوک طریقے سے کیا دیکھ رہی ہو؟'' اُمانے کہا۔

''کچھ نہیں' ویسے لگتا ہے جیمز سے بہت خصوصی ملاقات ہوئی ہے۔'' وہ بولی۔

''بس خصوصی ہی سمجھو' ویسے بھی جیمز مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔'' اُمانے چہرے سے سنجیدگی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''کمال ہے۔ ایڈی تو اچھا لگتا نہیں ہے۔ جیمز اچھا لگنے لگا ہے۔'' نیہاں ہنس پڑی۔

''بہت بھوک لگ رہی ہے۔ کیا خیال ہے' کچھ کھانے پینے کا پروگرام ہو جائے؟'' ماہ بانو نے مداخلت کی۔

''ضرور' بھوک سے میرا بھی برا حال ہو رہا ہے۔'' نیہاں نے کہا۔

پیپسی اور چپس کے پیکٹ لے کر وہ وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

''جیمز کے ساتھ خصوصی ملاقات کا ایجنڈا کیا تھا؟'' نیہاں نے چپس کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے سرسری انداز میں دریافت کیا۔

اُمانے ماہ بانو کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ پوری طرح شرارت کے موڈ میں تھی۔ ماہ بانو نے بھی آنکھوں آنکھوں میں کیری آن کا سگنل دیا اور چپس کے پیکٹ میں جھانکنے لگی۔

''عبداللہ کا گاؤں بہت خوبصورت ہے۔ میں اور جیمز سیر کے لیے کھیتوں میں نکل گئے۔ اتنا انجوائے کیا کہ کیا بتاؤں۔''

ماہ بانو نے نیہاں کا جائزہ لیا۔ اس کی پیپسی کی بوتل میز پر پڑی تھی اور چپس کا پیکٹ کھولتے کھولتے وہ رک گئی تھی۔ نیلی آنکھیں اُما کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اس وقت وہ بالکل مومی مجسمہ لگ رہی تھی۔ نیلی جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس' سر پر پی کیپ اس طرح رکھے کہ جو سرا ماتھے پر آنا چاہیے' وہ سر کے پچھلے حصے کی طرف موڑ رکھا تھا۔ کٹے ہوئے سنہرے بال نرم ہوا کے ساتھ ہولے ہولے اُڑتے ہوئے۔ ماہ بانو کو یقین تھا کہ اگر ایسے میں جیمز اسے دیکھ لیتا تو کبھی آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

''کچھ موسم بھی اچھا تھا' کچھ ہم دونوں کے علاوہ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ واہ بہت لطف رہا۔'' اُما کہہ رہی تھی۔

''یوں دیکھنے میں لگتا ہے کہ وہ صرف باڈی بلڈنگ اور ویٹ لفٹنگ ہی کر سکتا ہے۔ عشق

وعاشقی اس کے بس کی بات نہیں، لیکن بھئی، مجھے تو جیمز نے حیران ہی کر دیا، پتا ہے کیا کہا اس نے؟"

نیہاں نے کچھ نہیں پوچھا۔ ویسے ہی بیٹھی اسے تکتی رہی۔

"کہنے لگا کہ اُما جس دن سے تم کالج آئی ہو تب سے میں تم سے یہ بات کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا، کوئی الفاظ ہی نہیں سوجھتے تھے کہ کس طرح تم تک اپنے دل کی بات پہنچاؤں تم اُما مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ تمہاری بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گھنی پلکیں...... مجھے لڑکیوں کی سیاہ آنکھیں ہی اچھی لگتی ہیں اور لمبے سیاہ بال تو مجھے بہت ہی زیادہ پسند ہیں، جیسے تمہارے بال ہیں اتنی مکمل مشرقی بیوٹی ہے تمہاری۔ تم نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔

میں نے ہنس کر کہا کہ تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ نیلی آنکھیں، سنہرے بال، کہنے لگا، کہ اسی لیے تو مجھے مشرقی بیوٹی پسند ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ لڑکیوں کو غرارے، لہنگے اور ساڑھیاں وغیرہ پہننی چاہئیں۔ حیدر آبادی ڈریس تو میرا فیورٹ ہے۔ ان کے ساتھ بڑے بڑے بالے، ڈھیر ساری چوڑیاں، بالوں میں پھول اور مدھم سُروں میں بجنے والی پائل، بس اُما اسی طرح رہا کرو۔"

ماہ بانو مزید اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تم کیوں ہنس رہی ہو؟" اُما نے اسے ڈپٹا۔

"کچھ نہیں، یہ سوچ کر ہنس رہی ہوں کہ کیا اسٹائل ہے اظہارِ محبت کا، بے چارے ایڈی کو آیا۔" ماہ بانو نے کہا۔

"اتنے خوبصورت موقع پر ایڈی کا ذکر کر کے ضرور بدمزگی پیدا کرنی ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر چپس کترتے ہوئے نیہاں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"میں نے اس سے کہا کہ میں اتنے بھاری بھاری قسم کے کپڑے کیسے پہن سکتی ہوں ٹھیک ہے میں کم پہنتی ہوں، لیکن مجھے ویسٹرن ڈریسز پسند ہیں۔ پتا ہے، کیا کہنے لگا؟ کہنے لگا ویسٹرن ڈریسز پہننے والی لڑکیاں تو مجھے بالکل زہر لگتی ہیں۔ بھئی لڑکیوں کو لڑکیوں کی طرح رہنا چاہیے۔

سچی نیہاں، اگر جیمز کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مجھے بالکل شاوینسٹ لگتا، لیکن پتا نہیں کیوں اس کے منہ سے مجھے یہ باتیں بری نہیں لگیں۔ اب میں سوچ رہی ہوں کہ سکھر سے اپنے ایسے کپڑے منگوالوں۔ ممی نے ساڑھیوں کا ڈھیر لگا رکھا ہے۔ کہتی رہتی ہیں مجھ سے پہننے کو، لیکن میں نہیں پہنتی۔ اب سوچ رہی ہوں کہ جب بھی جاؤں گی تو کچھ ساڑھیاں ضرور لاؤں گی اور دادی تو وہ جو ممی مشہور زمانہ پیٹی میں اتنے اچھے اچھے کپڑے بند کر چکی ہیں، ان میں سے بھی کچھ لاؤں گی۔ کیا خیال ہے تمہارا نیہاں؟"

نیہاں اس کی بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں بالکل بھی نہیں تھی۔ ماہ بانو کو اس پر بہت ترس آیا۔ وہ کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کا چہرا بجھ گیا تھا پتا نہیں اندر سے وہ کیا محسوس کر رہی ہوگی۔

"اچھا اُما! چھوڑو اس قصے کو۔" ماہ بانو نے کہا۔

"ابھی سے؟ ابھی تو میں نے اصل بات بتائی ہی نہیں، وہی جو اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گلاب کا پھول پکڑایا تھا اور کہا تھا کہ اُما مجھے لگتا ہے، میں تمہیں جنم جنم سے جانتا ہوں، جیسے ہم اب نہیں ملے، برسوں سے، جنموں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں جو کچھ میں نہیں کہہ سکا، وہ گلاب کا یہ سرخ پھول تم سے کہہ دے گا۔

اور تب مجھے تمہارا خیال آیا۔ تم نے کہا تھا ناں کہ اُما محبت ضرور کرو اور میں نے سوچا کہ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ It Is Better To Have Loved And Lost Than Not To Have At All Loved میرے پاس اس سے زیادہ موزوں جواب نہیں تھا کہ پھول اس کے ہاتھ میں تھما کر اس سے کہوں کہ وہ خود اسے میرے بالوں میں لگا دے۔"

"اوہو، مجھے یاد آیا، مجھے کام سے ہوسٹل جانا ہے۔" نیہاں چپس کا پیکٹ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اینڈ اُما آل دا بیسٹ۔"

"تھینک یو۔" اُما نے مسکرا کر نیہاں کا شکریہ ادا کیا۔

"اس وقت کیسے جاؤ گی ہوسٹل، بس چلنے میں تو ابھی بہت دیر ہے۔" ماہ بانو نے کہا۔

"چلی جاؤں گی، بائے۔"

"لیکن یہ چپس اور پیپسی؟ تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔" اُما نے کہا۔

"بھوک نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ بہت بھوک لگی ہے؟" ماہ بانو نے کہا۔

"یونہی بکواس کی تھی۔" وہ زچ ہوگئی تھی۔

"میرا تو خیال تھا نیہاں کہ تم میری اس کایا پلٹ پر بہت خوش ہوگی۔ ایک ایک بات کی تفصیل پوچھو گی، لیکن تم تو......" اُما نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"رات کو ڈسکس کریں گے ہر بات مکمل تفصیل کے ساتھ۔" نیہاں نے کہا۔

"لیکن یہ اچانک کیا ہوگیا تمہیں، ابھی تو تم بالکل ٹھیک تھیں اور ابھی منہ پر بارہ بجنے لگے۔" اُما بھی اس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

"نہیں یار، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو ایسی ہی بات لگ رہی ہے۔ ویسے تو تم محبت کے بہت فلسفے بگھارتی ہو، لیکن جب

مجھے محبت ہوئی ہے تو!'' اُما نے چند لمحے کے توقف سے ڈرامائی تاثر دینے کی کوشش کی۔

''تم مائنڈ نہ کرنا نیہاں' لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے جیلسی محسوس کر رہی ہو' جسے تم پسند کرتی ہو اگر وہ تم سے یا تم اس سے اظہار نہیں کر سکتیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تم نے تو یوں منہ بنایا ہوا ہے جیسے میں نے جیمز سے محبت نہ کی ہو' بلکہ تمہاری محبت تم سے چھین لی ہو۔''

نیہاں کے لیے یہ سب باتیں نا قابلِ برداشت تھیں۔

''اُما تم......''

لیکن کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ تھوڑی دیر ہونٹ کاٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے مڑ گئی۔

''اُما' حد کر دی تم نے۔'' ماہ بانو ایک دم چپس اور پیپسی میز پر پٹخ کر نیہاں کے پیچھے دوڑی۔

اُما کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ نیہاں اتنا ضبط کرے گی۔ اس کا خیال تھا کہ درمیان میں ہی کہیں وہ اس سے لڑ پڑے گی اور تب وہ ہنس کر اسے اصل بات بتا دے گی' لیکن یہاں تو معاملہ بالکل ہی گڑبڑ ہو گیا تھا' وہ بھی چپس اور پیپسی چھوڑ کر جلدی سے نیہاں کے پیچھے لپکی۔ ماہ بانو اور اُما نے دوڑ کر اس کا روا ستہ روک لیا۔

''پلیز نیہاں؟ میری بات سنو' وہ سب جھوٹ تھا' صرف مذاق تھا۔ ایسی کوئی بات سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ ہم تو صرف تمہیں تنگ کر رہے تھے۔'' اُما نے جلدی سے کہا۔

نیہاں رک گئی اور ان کے چہرے پر سچ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''قسم سے نیہاں؟ یہ کہانی ابھی ابھی اُما نے گھڑی تھی۔'' ماہ بانو نے بھی جلدی سے کہا۔

''نیہاں تم بھی تو سراسر احمق ہو۔ وہاں ہر طرف دھان کے کھیت تھے' دھان کے کھیت میں سرخ گلاب کہاں سے آ گیا؟'' اُما نے کہا۔

نیہاں پہلے چند لمحے پلکیں جھپکتے ہوئے انہیں دیکھتی رہی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ دونوں بھی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑیں۔

''اب تو پھر بھوک لگ گئی ہو گی' چلو وہ چپس کا پیکٹ اور پیپسی تمہارے منتظر ہیں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

تینوں واپس آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

''تم نے تو اُما میری جان نکال دی تھی۔ دیکھو میرے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔''

اُما ہنس پڑی۔ ''تمہیں اتنی ڈبا قسم کی اسٹوری سن کر بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ جو کچھ میں بول رہی تھی' یہ بالکل بکواس تھا۔''

''اتنا ہوش کہاں تھا۔'' نیہاں ہنسی۔

''ویسے اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ نیہاں کی تصویر لے لی جائے۔ قسم سے نیہاں لگتا تھا جیسے کوئی مومی مجسمہ بٹھا دیا ہو۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''لیکن تم لوگوں کو جیمز کا خیال آیا کیسے؟''

''یہ بانو کا کمال ہے' اس کا اندازہ کم ہی غلط ہوتا ہے۔''

''اُف! میری ہارٹ بیٹ! اب تک نارمل نہیں ہوئی۔ ویسے بانو! تمہیں پتا کیسے چلا؟ میری اسکیچ بک تو نہیں دیکھ لی تھی تم نے؟'' نیہاں نے چپس کا پیکٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو زیادہ آسان طریقہ تھا' لو مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''مجھے اس لیے بھی تمہارے جھوٹ کے اس پلندے کا یقین آ گیا تھا کیونکہ میں ہمیشہ یہ سوچتی ہوں کہ کسی دن میرے ساتھ ایسا ہی ہو گا۔ شاید کسی دن کوئی لڑکی مجھے ایسی ہی لیکن بالکل سچی بات بتائے یا پھر جیمز ہی کسی لڑکی کا اس طرح تعارف کروائے۔ پتا نہیں میں یہ سب کیسے برداشت کروں گی۔''

''قنوطیت چھوڑو اور چپس کھاؤ' وہ کم از کم خود کسی لڑکی کا تعارف نہیں کروائے گا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''اور اگر کروائے تو آل دا بیسٹ کہہ کر ہوسٹل کی جانب مت چل پڑنا۔ گلا دبا دینا دونوں کا'' اُما ہنسی۔

''وہ بے چارا بھی تو حالات کے ہاتھوں بہت کچھ برداشت کر چکا ہے۔'' نیہاں نے افسردگی سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''پھر بتاؤں گی' ابھی جلدی سے کلاس میں چلو ورنہ قمر صاحب کا تو تمہیں پتا ہے نا' آج ضرور فیل کر دیں گے۔''

☆======☆======☆

رات آٹھ بجے عبداللہ کی کار آواری کے پارکنگ مین رکی۔ اپنے پالتو کتے کلِر کو کار ہی میں چھوڑ کر وہ اندر چلا آیا۔ سبط حسن پہلے ہی انتظار کر رہا تھا۔ عبداللہ اس کی جانب بڑھ گیا۔

سبط نے شاید اچھا امپریشن دینے کے لیے قیمتی کپڑے کا سیاہ ڈنر سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سیاہ Tuxedo سے پتا چل رہا تھا کہ سوٹ کی سلائی بھی پاکستان میں نہیں ہوئی۔ اس سوٹ میں وہ واقعی بہت سمارٹ لگ رہا تھا۔

عبداللہ کو آتے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا' قریب پہنچنے پر اس نے سلام کی غرض سے ہاتھ بڑھایا۔

''سبط حسن!''

"عبداللہ!" اس نے بھی ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

"پلیز بیٹھیں۔" سبط نے کہا۔

عبداللہ نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ کسی بھی طرف سے کنفیوز یا پریشان نہیں لگ رہا تھا بلکہ اسے دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس ملاقات کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے اور اعتماد سے بات چیت کرے گا۔

دوسری طرف سبط حسن بھی یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی اصلیت معلوم ہو جانے کے بعد عبداللہ کس موڈ میں اس کے پاس آیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اسے کسی قسم کی وارننگ دینا چاہتا ہو یا زینی سے ملنے سے منع کرنا چاہتا ہو۔

لیکن عبداللہ کے متعلق ایسا کوئی بھی اندازہ لگانا اسے مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

"اتنا طے ہے۔" اس نے سوچا۔ "یہ بڑبولے قسم کے لوگوں کی طرح سطحی نہیں ہیں، بہت گہرے ہیں یہ، اور ریشماں آپی کے ساتھ کتنے اچھے لگیں گے۔"

"میری عادت ہے، ڈرائیونگ زیادہ تر میں خود ہی کرتا ہوں۔" عبداللہ نے ابتدا کی۔ "اور اب صبح سے ڈرائیونگ کر کر کے کافی تھکن محسوس ہو رہی ہے۔"

سبط نے اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہیں تھے، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا

"میرے ساتھ تو ایک پورا قافلہ تھا، ڈرائیور سمیت، دراصل خادم بھائی کو یہاں لاہور لا رہے ہیں ناں، اس لیے یہاں بہت سے لوگوں کی ضرورت پڑے گی۔" سبط نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے امداد علی اور خادم حسین کا۔" وہ بولا۔

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" سبط حسن نے افسردگی سے کہا۔ پھر قدرے توقف سے بولا۔

"لیکن ایک بات مسلسل میرے ذہن کو Punch (پنچ) کرتی رہی ہے۔"

"وہ کیا؟"

بیرا ان کے سامنے مینیو کارڈ چھوڑ گیا۔

"کہ امداد بھائی کو لگنے والی گولیاں کس نے چلائی تھیں؟"

"اتنی گولیوں کی بوچھاڑ میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے، ہاں اگر پوسٹ مارٹم ہوتا تو پتا چل سکتا تھا کہ کون سی گولی جان لیوا ثابت ہوئی اور جس گولی نے اس کی جان لی، وہ کس رائفل سے اور کتنی دور سے چلائی گئی تھی۔ یہ معلوم ہو جاتا تو میں یقینی طور پر تمہیں کوئی ایک نام بتا سکتا تھا۔"

"آپ آرڈر دیں۔" سبط نے کہا۔

بیرے کو آرڈر دے کر وہ سبط کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن وہ کچھ سوچ رہا تھا، چند لمحوں کے بعد

بولا۔

"کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ انہیں صرف زخمی کر دیتے۔ میری بڑی بہن ہیں ریشماں آپی، آپ تو جانتے ہی ہوں گے، وہ اب تک اس صدمے سے سنبھل نہیں سکیں۔"

"جیسے تمہیں اپنی بہن سے محبت ہے ناں سبط۔ ویسے ہی مجھے بھی اپنی بہنوں سے محبت ہے جانتے ہو اس دن میرے بجائے اس جیپ میں گڑیا ہوتی تو کیا ہوتا؟ جس رعایت کی توقع تم اپنے بھائی کے لیے مجھ سے کر رہے تھے، تمہاری حویلی میں اس سے آدھی رعایت بھی میری بہن کو نہیں مل سکتی تھی۔"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سبط بولا۔

"آپ یقین کریں گے کہ یہ جو کچھ ہوا، مجھے اس کا علم نہیں تھا، اگر مجھے خبر ہوتی، تو میں اپنی سی کوشش ضرور کرتا۔"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموشی سے سوپ پیتے رہے، پھر عبداللہ بولا۔

"تائی اماں کیسی ہیں؟"

"وہ اب تک سنبھل نہیں سکیں، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انہیں بھی صبر آ ہی جائے گا۔"

"خادم حسین کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"اب تو بہت ہوپ فل ہیں سب، ریکوری میں وقت تو لگے گا، لیکن خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔"

"اب مری جانے کا ارادہ کب ہے؟"

"ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" وہ چاول اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"ہوں۔" عبداللہ نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا اور پھر زینی اور اس کی تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

پل بھر کو سبط چونک گیا۔

"یہ اور ایسی باقی تصویریں بتاتی ہیں کہ تم اور زینی بہت اچھے دوست ہو۔ خیر دوست ہونے کے علاوہ کزن بھی ہو۔ اس لیے ان تصویروں کی اہمیت نہیں ہے، کزنز ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔"

"جی۔" وہ سمجھ نہیں سکا کہ عبداللہ اس سے کیا کہلوانا چاہتا ہے۔

"اب جب کہ امداد علی اس دنیا میں نہیں رہا۔ ہوتا تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ اس کے جیسے مزاج کے کسی شخص کے حوالے میں اپنی بہن نہیں کر سکتا۔ اور اب تو وہ جو تھوڑی سی جحت ہو سکتی تھی، وہ بھی باقی نہیں رہی۔

زینی اور گڑیا کی شادی کی ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ ابھی وہ جتنا چاہیں گی، پڑھیں گی،

لیکن بالآخر ہمیں ان کی شادی کرنی ہے۔ یوں تو ان کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے' لیکن ہم اتنے لبرل ضرور ہیں کہ اولیت ان کی پسند کو ہی دیں۔"

سبط کھانے سے ہاتھ روک کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"اور میں نہیں چاہتا کہ تب کوئی تحریر یا تصویر ان کی زندگی پر اثر انداز ہو۔" عبداللہ نے اپنی بات مکمل کی۔

سبط نے کانٹا پلیٹ میں رکھ دیا۔

"آپ نے ایک ساتھ بہت سی باتیں کہہ دیں۔ پہلے تو میں یہ پوائنٹ کلیئر کر دوں کہ ہم صرف بہت اچھے دوست اور کزن ہی نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر آپ زینی کی شادی کے وقت اس کی پسند کو اولیت نہیں دیں گے' تب زینی کا کیا ری ایکشن ہوگا۔ میں اس وقت اس کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا' لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ ایسی کسی صورتِ حال میں' میں کسی گھٹیا حرکت کا مظاہرہ کروں گا' تو آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ محبت اور عزت میرے نزدیک لازم وملزوم ہیں' جس سے محبت کی جاتی ہے' اسے دکھ نہیں دیا جاتا اس کی عزت تار تار نہیں کی جاتی۔"

چند ثانیے عبداللہ کسی سوچ میں گم رہا پھر بولا۔ "تم بہت کم عمر ہو سبط۔ اس عمر میں لڑکوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی مسئلے کی گہرائی میں نہیں اتر سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں بلکہ سمجھتے ہی نہیں اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ ایک ہی جست میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کر سکتے ہیں۔"

"سوری' آپ کی بات کاٹ رہا ہوں' مائنڈ نہ کریں لیکن آپ بھی ابھی اس عمر سے نکلے نہیں ہیں۔ کتنے بڑے ہوں گے آپ مجھ سے' چار سال' چھ سال' یہ کوئی زیادہ بڑا فرق نہیں ہوتا' لیکن آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ واقعی سطحی قسم کی ذہنیت رکھنے والے شخص نہیں ہیں' ورنہ اتنے تحمل کے ساتھ مجھ سے بات نہ کر رہے ہوتے' لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑ سکا' ورنہ آپ مجھے کراؤڈ میں شامل نہ کرتے۔"

عبداللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ تمہاری باتوں نے مجھ پر اچھا تاثر چھوڑا ہے' لیکن اس وقت میں بات کر رہا ہوں روایتوں کی۔ تم خود تو مشکل میں گرفتار ہو ہی رہے ہو' لیکن ساتھ میں زینی کو بھی اس مشکل میں ساتھ گھسیٹ رہے ہو۔ یار ہم لڑکے تو بہت کچھ کھونے کے بعد بھی اپنی زندگی متوازن رکھ سکتے ہیں' لیکن لڑکیوں کے لیے یہ آزمائش بہت بڑی ہوتی ہے۔

اور زینی کو تم جانتے ہو' وہ بہت مختلف ہے۔ وہ اب تک اس بات کو بھی ذہنی طور پر قبول نہیں کر سکی کہ وہ اماں اور بابا جان کے ساتھ نہیں رہتی حالانکہ اب اس بات کو اتنے برس گزر چکے ہیں کہ اس کی جگہ اور لڑکی ہوتی تو وہ کسی نہ کسی حد تک اس صورتِ حال کو قبول کر چکی ہوتی۔ گڑیا ہے اس نے بھی وہی ماحول' وہی حالات دیکھے ہیں' اس نے یہ سب قبول کر لیا تھا' لیکن زینی

مختلف ہے۔

اسے چھوڑ دو سبط' ابھی تو وہ سنبھل ہی جائے گی لیکن کچھ عرصہ بعد جب تم اس کے لیے ناگزیر ہو جاؤ گے تب اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ تمہاری جدائی برداشت کر سکے۔"

سبط نے گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"جس دن مجھے حتمی طور پر معلوم ہوا کہ زینی حیدر بابا کی بیٹی ہے' تب سے اب تک میں اس سے نہیں ملا۔ آپ کا خیال ہے کہ میں ان کم عمر لڑکوں میں سے ہوں جو سوچتے ہیں کہ وہ ایک جست میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کر لیں گے اور یہ ایک جست لگانے کی کوشش میں وہ اس طرح گرتے ہیں کہ پھر اٹھ نہیں سکتے۔

میں صرف اتنا کہوں گا کہ آپ نے مجھے غلط جج کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ راستہ کتنا مشکل ہے اور ان مشکلات کا احساس مجھے اسی وقت ہو گیا تھا' جب میں نے حیدر بابا کی جیپ زینی کے ہٹ میں جاتے دیکھی تھی۔ مجھے اتنا شدید ڈپریشن تھا کہ......" اس نے قدرے توقف کیا پھر بولا۔

"لیکن اسے جانے دیں' وہاں رہتے ہوئے میں اس معاملے کے بارے میں کچھ نہیں سوچ سکتا تھا' اس لیے گاؤں چلا آیا۔

گاؤں میں رہتے ہوئے بھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا پھر درمیان میں امداد بھائی والا حادثہ ہو گیا۔ وہ اچھے تھے یا برے یا جو کچھ وہ کرنے جا رہے تھے' اس سے قطع نظر وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ ان دنوں تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اس بارے میں کچھ سوچتا۔

لیکن کل زینی کا فون آیا تھا۔ اسے یہاں کا نمبر میں نے نہیں دیا تھا۔ وہ یقیناً میرے گھر گئی ہوگی۔ اینی وے' اس وقت بھی میں نے اس سے بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا کہ میں اسے رِنگ بیک کروں گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا تب تک اس سے رابطہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا' جب تک میں کوئی فیصلہ نہیں کر لیتا۔ اور پھر کل رات میں نے فیصلہ کر لیا' میں نے اسے فون کیا اور ابھی پہلا رِنگ بھی پورا نہیں گیا تھا کہ اس نے فون اٹھا لیا۔ یہ شاید رات ڈیڑھ پونے دو بجے کی بات تھی۔

میں شاید اتنی تفصیل کے ساتھ آپ کو یہ سب کچھ نہ بتاتا' اس سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے' جب ہم میں سے کوئی پیچھے ہٹ سکتا تھا۔"

کھانا یونہی درمیان میں رہ گیا تھا۔ دونوں میں سے کسی کا دل بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ عبداللہ نے سگریٹ کیس اور لائیٹر نکالا۔

"سموکنگ کرتے ہو؟"

"بہت کم' کیونکہ زینی دھوئیں سے الرجک ہے لیکن اس وقت ضرورت محسوس کر رہا تھا۔" وہ بولا۔

ان دونوں نے سگریٹ سلگا لیے۔

"تم نے مجھے بہت الجھن میں ڈال دیا ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

وہ خاموش رہا۔

"میں اتنا بے خبر نہیں ہوں کہ تمہاری حویلی میں جو کچھ ہوتا رہا ہے' اس کا مجھے علم نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ ایک مرتبہ مکرم نے تم پر اور ایک مرتبہ تم نے اس پر ریوالور تان لیا تھا' کیوں تانا تھا' یہ بھی میں جانتا ہوں' تم اپنے باقی بھائیوں سے مختلف ہو' یہ بھی میں جانتا ہوں۔

میں نہ تو کوئی افسانوی کردار ہوں اور نہ فرشتہ ہوں مجھ پر یا میرے گھر والوں پر کوئی رائفل اٹھائے گا' تو میں اسے ختم کرنے میں ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کا بھی مظاہرہ نہیں کروں گا' لیکن کوئی دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا تو آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لوں گا۔

ہمارا خاندان ایک ہے' خون ایک ہے۔ میرا کوئی سگا بھائی نہیں ہے' تم سب ہی میرے بھائی ہو لیکن یہ جو دشمنی ہمارے درمیان چل رہی ہے۔ یہ ہمیں ایک نہیں ہونے دے گی۔"

"میری خاطر نہ سہی' زینی کے لیے سہی۔ کیا آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے؟ کیا ادھر آنے کا آپ کا مقصد صرف یہ تھا' کہ مجھے پیچھے ہٹنے اور زینی کی زندگی سے نکل جانے کے لیے مجبور کریں؟"

"یہ بات نہیں' اس ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ میں اور تم ہم دونوں اس سچویشن کو سمجھ سکیں۔ تم جانتے ہو کہ یہ مسئلہ کس قدر الجھا ہوا ہے' یہ بھی ممکن ہے کہ تم دونوں کی دوستی کی مضبوطی کی وجہ یہ ہو کہ اب تک تم دونوں ہی ایک دوسرے کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر زینی کو علم ہو کہ تمہارے بھائیوں نے گڑیا کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں تمہارے بھائی کی ڈیتھ ہو گئی اور میں زخمی ہو گیا تھا' تو تم لوگوں کی دوستی میں دراڑ آ جائے گی۔

یا اگر آئندہ کبھی تمہارے گھر والوں کی طرف سے ہم میں سے کسی کو نقصان پہنچے تو تم دونوں کی پوزیشن کمپرومائز ہو گی' یہ صورت حال زینی کے لیے بہت تکلیف دہ ہو گی۔

اور پھر زینی تمہاری حویلی میں تمہاری بیوی بن کر داخل ہو بھی نہیں سکتی' یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔ چلو ایک لمحے کے لیے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ سب اس شادی پر ہنسی خوشی راضی ہو جاتے ہیں' لیکن کیا زینی اس ماحول میں رہ سکے گی۔ اگر ہماری غیر تعلیم یافتہ پھوپھیاں اتنے شدید ردعمل کا مظاہرہ کر سکتی ہیں' جنہوں نے باہر کی دنیا بھی نہیں دیکھی تھی تو آزاد فضاؤں میں پرورش پانے والی ایک باشعور لڑکی کے ردعمل کتنے شدید ہوں گے۔ کیا وہ اس ماحول کو قبول کر لے گی؟

تم جذباتی ہو رہے ہو سبط۔ تھوڑے سے منطقی ہو کر سوچو' سب پرابلم تم ہینڈل نہیں کر سکو گے اور یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ اس سے بڑے پرابلمز تمہیں فیس کرنے پڑیں گے۔ زینی کا ابھی میں نے ذکر بھی نہیں کیا۔

مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہے' لیکن یہ محبت تم دونوں کو بہت مہنگی پڑے گی۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ پیچھے ہٹ جاؤ' زینی کی زندگی سے نکل جاؤ۔"

سبط حسن نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"میں نے سوچا تھا کہ آپ مشورہ دیں گے مگر آپ تو فیصلہ کرنے اور حکم سنانے لگے۔"

"ایسی بات نہیں۔"

"ایسی ہی بات ہے۔" سبط نے اس کی بات کاٹی۔ "مجھے یہ حکم سنا دینا کہ میں زینی کی زندگی سے نکل جاؤں' لیکن میری اور زینی کی زندگی کا فیصلہ کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟

اس بات کا فیصلہ مجھے اور زینی کو ہی کرنے دیں۔ میں تو اس فیصلے میں اپنے گھر والوں کو بھی شریک نہیں کر سکتا۔ آپ نے خود ہی کہا ہے کہ زینی باشعور لڑکی ہے جو باتیں آپ مجھے سمجھا رہے ہیں' چاہیں تو اسے بھی سمجھا دیں' لیکن فیصلہ وہی ہو گا جو زینی کرے گی۔

میں کیا چاہتا ہوں' یہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے' اب دیکھنا یہ ہے کہ زینی کیا چاہتی ہے۔ ہم اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ یہاں ڈنر ٹیبل پر بیٹھ کر نہیں کر سکتے۔ اس فیصلے میں اسے بھی شامل ہونا ہو گا۔"

عبداللہ ہوٹل سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھا تو ایک طرف جہاں اس کی پریشانی میں اضافہ ہوا تھا' وہیں دوسری طرف اس کی پرانی پریشانی کا بوجھ آدھا رہ گیا تھا۔

سبط حسن سمجھ دار لڑکا تھا' زینی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ خاندان بھی ایک تھا۔ زہرا کے مطابق پڑھائی میں بھی بے حد اچھا تھا اور پُراعتماد بھی تھا۔

"وہ زینی کا مزاج شناس بھی ہے۔" عبداللہ گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ زینی دھوئیں سے الرجک ہے۔ شاید میں کم وقت کے لیے جاتا ہوں' اس لیے برداشت کر لیتی ہے۔

لیکن سبط کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ اسٹینڈ لے سکتا ہے' شاید اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنے مسائل دیکھ کر باعزت طور پر الگ ہو جانے میں ہی عافیت سمجھتا۔ الٹا یہ احسان بھی جتاتا کہ زینی کو پریشانیوں سے بچانے کے لیے اس سے یہ ناتا توڑ رہا ہے' ورنہ تو وہ اب بھی اس کے لیے ستارے توڑ کر لا سکتا ہے اور نہ جانے کیا کیا کر سکتا ہے۔

اس میں قوتِ فیصلہ ہے اور پریشرائز نہیں ہوا جو کہ اچھی بات ہے۔

بہتر تو یہی ہوگا کہ اب زینی انکار کردے' لیکن اگر وہ انکار نہیں کرتی' تب بھی سبط برا چوائس نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ہوگا یہ کہ سب مشکلات اور پریشانیاں مجھے اٹھانا پڑیں گی۔ بہنوں کے لیے تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

☆======☆======☆

جنت بائی اور شمیم عرف نوری اس شاپنگ کا جائزہ لے رہے تھے جو انہوں نے تھوڑی دیر پہلے کی تھی۔

"ممی! یہ ساڑھی خوب سجے گی۔" نوری نے ڈبے سے بنارسی ساڑھی نکالی۔

"اوپر کی ٹیپ ٹاپ تو اچھی ہے' لیکن منہ کھولتے پر وہی شمیم لگتی ہے۔ لہجہ بہت بہتر ہو جانے کے باوجود بھی اچھا نہیں ہے۔" جنت بائی نے سوچا۔

"ممی دیکھیں تو۔"

"ہاں اچھی لگے گی' لیکن ابھی یہ سیٹ پہن کر دکھاؤ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں اور کڑے بھی پہنو۔"

اس نے جلدی جلدی سیٹ نکالا اور پہننے لگی۔

"نوری! میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اپنے انداز میں ٹھہراؤ پیدا کرو۔ ٹھیک ہے تم نے پہلے کبھی اتنے زیور نہیں دیکھے تھے' ایسے کپڑے نہیں پہنے تھے' لیکن لوگوں پر یہ بات مت ظاہر ہونے دو' واپس رکھو ڈبے میں اور دوبارہ نکال کر پہنو' ذرا ناز کے ساتھ' نخرے کے ساتھ۔"

"مجھے خیال نہیں رہا تھا۔" وہ شرمندگی سے بولی۔

"کوئی بات نہیں' آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی۔" انہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔

ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے زیور دوبارہ ڈبے میں ڈال کر پھر نکالے اور اسی انداز میں پہننے لگی' جیسے جنت بائی نے کہا تھا۔ کڑے کلائیوں میں ڈال کر اس نے اٹھلا کر ایک ادا سے کہا۔

"ہم کیسے لگ رہے ہیں؟"

جنت بائی نے مسکرا کر اس کی بلائیں لے لیں۔

"یہ ہوئی ناں بات۔ اس بات کو عادت بنالو۔ سامنے کوئی بھی کیوں نہ ہو' ناز و ادا اور نخرے کے ساتھ ہی بات کرو۔"

"ہم لاہور کب جائیں گے؟"

"ابھی کوٹھی سیٹ ہو رہی ہے جب تیار ہو جائے گی' تب جائیں گے۔"

"بڑی سی کوٹھی میرا خواب ہوتا تھا۔" نوری نے کہا۔

"تو سمجھو یہ خواب پورا ہونے والا ہے۔ جس کوٹھی میں ہم جائیں گے' تم دیکھو گی تو حیران

ہو جاؤ گی۔ فیصل ٹاؤن میں پورے ایک کنال پر پھیلی ہوئی ہے۔ موٹر گاڑی ہے' نوکر چاکر ہیں اور ایک مرتبہ دھندا چل نکلا تو بس پھر وارے نیارے ہو جائیں گے۔ پھر کوٹھیاں' کاریں ہی کاریں' تجوری دوسروں کی' مال ہمارا اور تمہیں بتاؤں کہ اس غریب ملک کے امیروں کے پاس بہت پیسہ ہے۔ تجوریاں بھری ہوئی ہیں' بڑے بڑے زمیندار اور بزنس مین یوں بھی اپنے گھر والوں کے لیے کم اور ہمارے لیے زیادہ کماتے ہیں بس ان سے نکلوانے کا ڈھنگ آنا چاہیے۔"

"میں فلموں میں کام کرنے کے شوق میں گھر سے نکلی تھی۔" وہ بولی۔

"یہ شوق بھی پورا ہو جائے گا۔ چندا بائی مرنے سے پہلے کاروبار کی سب کنجیاں میرے حوالے کر گئی تھی۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ اب تک تالے بدل چکے ہوں۔" نوری نے ڈبے اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ تالے اب تک وہیں ہیں۔" جنت بائی نے پُرخیال انداز میں کہا۔

☆======☆======☆

کالج میں داخل ہوتے ہی اُما کی نگاہ سامنے باتیں کرتے ایڈی اور ماہ بانو پر پڑی۔ اُما کو آتے دیکھ کر ایڈی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''چلو بانو جلدی کرو' آج رافٹنگ کی کلاس ہے پہلے ہی اتنا مشکل سبجیکٹ ہے' دو بجے تک ہم کام مکمل نہیں کرسکیں گے۔'' اُما ایڈی کو نظرانداز کرکے ان کے پاس سے کہتے ہوئے گزرنے لگی۔

''وہ کیا ہے ہاں' بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے' بانو اپنی دوست کو سمجھاؤ' صبح صبح کسی سے سلام دعا کرلی جاتی ہے۔''

''دعا اور مجھ سے سنو گے تم؟ اس جنم میں تو ممکن نہیں ہے۔'' اُما نے مڑ کر کہا۔

''چلو میں اگلے جنم کا انتظار کرلیتا ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''پتا ہے' اگلے جنم میں کیا بن کر اٹھو گے؟''

''عاشق۔''

ماہ بانو اور اُما کی ہنسی نکل گئی۔

''دیکھو ایڈی! میں تمہاری باتوں پر ہنس پڑتی ہوں تو صرف ازراہِ ہمدردی۔ چلو بانو ہم لیٹ ہورہے ہیں۔''

''ہمدردی کی ضرورت تو اس وقت تمہیں ہے۔ آج تمہاری ڈرافٹنگ کی کلاس ہے۔ تم دعا نہیں دے سکتیں' لیکن میں کوشش کروں گا کہ دوا کا انتظام کردوں۔ اب جاؤ کلاس میں۔''

وہ دونوں تیزی سے آگے چل پڑیں۔

''یہ صبح صبح کیسے ٹپک پڑا؟''

''کل عبداللہ کو اچانک لاہور آنا پڑا' اس لیے یہ سب بھی آگئے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''کتنی دیر ہوئی ہے تمہیں آئے ہوئے؟'' اُما نے اس سے پوچھا۔

''بس پانچ منٹ اور ان پانچ منٹوں میں سے چار منٹ ساٹھ سیکنڈ تک ایڈی کی داستانِ الم

ہی سنتی رہی ہوں۔ پورا ریکارڈ اس کی فنگر ٹپس پر ہے۔ کتنی آہیں بھریں' کتنے دردناک گانے سنے' کتنی مرتبہ خواب میں تمہیں دیکھ کر تمہارے پیچھے لپکا اور صحرا میں پہنچ کر کتنی مرتبہ پکارا اُما۔ اُما۔ اور ایسے میں کتنی مرتبہ آنکھ کھلی۔ تمہیں سنانے کے لیے کتنے شعر یاد کیے' جو اتفاق سے سب مکس اَپ ہوگئے وغیرہ یارا اُما! یہ بندہ ناقابلِ علاج عاشق ہوچکا ہے۔''

''بہت ڈسٹرب کرتا ہے ایڈی۔ ہر مرتبہ سوچتی ہوں بلکہ تہیہ کرتی ہوں کہ اس کی باتوں پر دھیان نہیں دوں گی' لیکن اس کی باتیں بہت ڈسٹرب کرتی ہیں۔''

کلاس میں پہنچ کر وہ کام میں مشغول ہوگئیں۔ سر افتخار کلاس میں نہیں تھے۔ ماہ بانو اپنے بنائے Low Rise Building (لورائز بلڈنگ) کے ماڈل کے لیے کٹر کے ساتھ ربڑ کاٹ کر گاڑی کا ماڈل بنا رہی تھی۔ اُما بھی اپنے ماڈل کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف تھی۔ جب ایڈی فیصل کے ساتھ کلاس میں داخل ہوا' فیصل تھرڈ ایئر آرکیٹیکچر میں پڑھ رہا تھا۔

''کہاں تک پہنچا کام؟'' اس نے جائزہ لیا۔

''بس ہورہا ہے۔'' ماہ بانو نے مسلسل ربڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہ میں ڈرافٹنگ کے لیے ایڈ لایا ہوں۔'' ایڈی نے فیصل کی طرف اشارہ کیا۔

''بس اب تو سمجھو کام ہو ہی گیا ہے فور وہیل پروجیکٹ تھا۔ یہ اب آخری دن ایڈ لائے بھی تو کیا فائدہ۔''

فیصل ان کے بنائے ہوئے ماڈلز دیکھنے لگا۔ کچھ مشورے بھی دیے۔

''یہ تم اس ربڑ کی جان کی دشمن کیوں ہورہی ہو؟'' ایڈی' ماہ بانو کے قریب آگیا۔

''بلڈنگ میں گاڑی نہیں کھڑی کرنی کیا؟''

''کس کا گھر ہے یہ لگتا ہے فیملی پلاننگ کے قائل نہیں ہیں' یہ گاڑی نہیں بس لگ رہی ہے شیپ تو ٹھیک بناؤ۔''

''تم سر پر کھڑے ہوجاؤ تو اچھا بھلا کام الٹا ہوجاتا ہے اور ابھی میں نے شیپ دی کب ہے اب دیکھو۔''

''ہاں اب بہتر ہے' لگتا ہے مرسڈیز ہے؟'' ایڈی بولا۔

''تم درمیان میں ٹانگ نہ اڑاتے تو یہ رولز رائس ہوتی۔'' اس نے کار کا ماڈل ڈرائیو وے میں کھڑا کردیا۔

''یہ دیوی جی کیوں چپ چپ ہیں؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''خود پوچھ لو دیوی سے۔ آدم خور نہیں ہیں' بے فکر رہو۔''

''مجھے تو آدم خور ہی لگتی ہیں' بالکل کالی۔''

''کیا؟ تمہیں کالی لگتی ہے اُما؟ وہ کالی کب ہے؟'' ماہ بانو نے حیرت سے کہا۔

"شی؟" ایڈی نے کہا۔ "آہستہ بولو مجھے کچا چبا جائے گی یہ۔ اور تم بھی بالکل جاہل مطلق ہو۔ میں کالی دیوی کی بات کر رہا ہوں۔"

"تو یوں کہو ناں' تم اگر کہو بالکل کالی تو بندہ اور کیا سمجھ سکتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو اس بات کو' کیفے ٹیریا چلتی ہو؟"

"اُما سے پوچھ لوں۔"

پھر وہ اُما کی طرف مڑی۔ "رکمز چلتی ہو؟"

"بس دو منٹ۔"

"اچھا ہم چلتے ہیں' میں رکمز میں ہی ہوں گا' تم لوگ آ جانا۔"

تھوڑی دیر بعد دونوں کلاس سے باہر نکلیں۔

میوزیم کی طرف جاتے ہوئے نہ جانے کہاں پارکنگ سے نکل کر ایڈی بھی ان کے پاس آ گیا۔

"آج بہت فارغ نظر آ رہے ہو؟" اُما نے اسے دیکھ کر کہا۔

"موڈ نہیں بن رہا کام کرنے۔" وہ ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"فیل ہو جاؤ گے تھرڈ ایئر میں۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہو گا' تمہارے ساتھ گزارنے کو زیادہ وقت مل جائے گا۔"

"میں سیریس ہوں ایڈی۔" اُما نے کہا۔

"میں بھی سیریس ہوں۔ خیر جانے دو' یہ بتاؤ کہ کیا کھاؤ گی؟"

"چپس اور کولڈ ڈرنک۔"

ان کے لیے چپس اور کولڈ ڈرنکس اور اپنے لیے چائے منگوا کر اس نے سگریٹ سلگا لیا۔

"تم لوگ آرٹسٹ ہی نہیں لگتے' سگریٹ نہ سہی۔ کم از کم چائے تو پی لیا کرو۔"

"جتنی چائے تم پیتے ہو' اس حساب سے تو تمہارا چائے کا ایک آدھ باغ ہونا چاہیے تھا۔ تمہارے گھر میں چائے کے کتنے ڈبے آتے ہیں۔" ماہ بانو نے کہا۔

"یہ تو نہیں پتا' البتہ وہ ہماری نوکرانی ہے چراغ بی بی وہ بہت گالیاں دیتی ہے۔ چائے اسے ہی بنانی پڑتی ہے ناں۔"

"تم کسی سے بھی دعائیں نہ لینا۔" اُما نے کہا۔

"چلو شکر ہے مزاج بہتر ہے' میں تو سمجھا تھا کہ دیوی جی ناراض ہو گئی ہیں۔"

"تم مجھے اُما نہیں کہہ سکتے؟" وہ اس کے دیوی جی کہنے سے سخت چڑتی تھی۔

"نام کیا ہے تمہارا؟ اُما دیوی' کیا غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"میں نے تم سے کہا بھی ہے اُما کہ اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اُڑا دیا

کرو۔" ماہ بانو نے کہا۔

"تمہارا ابھی جواب نہیں بانو' زبانی کلامی ہی دوست کہتی ہو مجھے وقت آتا ہے تو فوراً دشمن کے کیمپ میں گھس کر گولہ باری شروع کر دیتی ہو۔"

"اُما کی بات اور ہے' اس کے سامنے کسی اور کی دوستی نہیں چل سکتی۔"

"تم نے اسے میری داستانِ آہ و فغاں سنائی؟" ایڈی نے ماہ بانو سے پوچھا۔

"یہ سننے میں انٹرسٹڈ ہی نہیں ہے' کہنے لگی ہٹاؤ کیا حماقت ہے؟"

"خیر' کہہ تو ٹھیک رہی تھی' نری حماقت ہے' لیکن اُما کیا یہ حماقت دوطرفہ نہیں ہو سکتی؟"

"میں نے پیپسی پی لی' چپس بھی کھا لیے اب تمہیں مزید برداشت کرنے کا میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔" اُما نے ہاتھ جھاڑے۔

"تم بھی جلدی کرو بانو' ابھی بہت کام کرنا ہے۔"

"تم تو سب کچھ بغیر چبائے معدے میں اتارتی ہو ابھی بیٹھو' مجھے آرام سے کھا لینے دو۔" ماہ بانو نے کہا۔

"تمہاری طرح چبانے کی سنچری کوئی نہیں کرتا۔ بہت آہستہ کھاتی ہو۔" وہ واپس بیٹھ گئی۔

"تمہارے آہستہ کھانے کا یہ غالباً پہلا اور آخری فائدہ ہوا ہے۔" ایڈی نے ماہ بانو سے کہا۔ پھر اُما کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے یہ بتا دو اُما کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں ہے اور ہو بھی کیوں؟ تم میرے کیا لگتے ہو کہ اعتبار کروں؟ ٹھیک ہے دوستی ہے' لیکن اب بہت بور کرتے ہو۔ یوں بھی دوستی ایسی چیز نہیں ہے کہ توڑی نہ جا سکے۔"

ایڈی چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر بولا۔ "آج کا مہینہ' دن' تاریخ اور وقت نوٹ کر لو کیونکہ میں اعلانِ لاہور کے نام سے ایک اعلان کرنے والا ہوں۔ بانو تمہاری آدھی گواہی کو وقتی طور پر پورا مان لیتے ہیں۔

اعلان یہ ہے کہ میں دیوی جی کے رویے کے خلاف احتجاج کے طور پر جوگ لے رہا ہوں اور اب یہ جوگی دوبارہ اسی وقت عدنان عرف ایڈی کی شکل میں واپس آئے گا' جب دیوی جی ہمارے حق میں فیصلہ دیں گی۔"

"منہ دھو رکھو۔" اُما نے کہا۔

"وہی تو نہیں دھوتا۔ بھئی میں جوگ لے رہا ہوں۔"

ماہ بانو خالی بوتل میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جتنے پیسے تم نے خرچ کیے ہیں ایڈی! ان میں تمہاری صرف اتنی ہی باتیں سنی جا سکتی ہیں' بائے۔"

وہ دونوں کلاس کی طرف چل دیں۔

☆======☆======☆

زینی، عبداللہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

''بھائی! آپ نے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے آپ کو دیکھ کر کہ کیا بتاؤں۔''

''اتنے دن سے تمہیں دیکھا نہیں تھا، بہت یاد آرہی تھی تمہاری سوچا کہ ایک آدھ دن کے لیے یہاں تمہارے پاس سے ہو آؤں۔''

''مجھے بھی سب بہت یاد آرہے تھے کہ کیا بتاؤں آپ آئیں ناں اندر۔''

دونوں ڈرائینگ روم میں آبیٹھے۔

''اچھا یہ بتائیں کہ سب کیسے ہیں۔ اماں، باباجان اور گڑیا۔ میرا اتنا دل چاہ رہا سب سے ملنے کو، اور یہ گڑیا تو اتنی بے وفا ہے کہ جب سے گاؤں گئی ہے یہاں مڑ کر بھی نہیں دیکھا اس نے۔''

''سب بالکل ٹھیک ہیں اور تمہارے لیے اتنے پیار بھیجے ہیں سب نے کہ انہیں لانے کے لیے دو پھیرے لگانے پڑیں گے اکٹھے لاتا تو اوورلوڈنگ ہو جاتی۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ویسے آپ نے آنے کی اطلاع تو دے دی ہوتی، میں کوئی اہتمام ہی کر لیتی۔''

''اہتمام تو لگتا ہے ہو رہا ہے۔ کچن سے بہت خوشبو آرہی ہے۔'' وہ بولا۔

''ہاں یہ خوشبوئیں، یہ تو بس یونہی ہے۔''

''دیدی کہاں ہیں؟''

''وہ اسلام آباد گئی ہیں کام سے، کہہ رہی تھیں کہ رات تک آجائیں گی۔'' اس نے بتایا۔

''اور تم پیچھے اکیلی ہو؟ انہیں اس طرح نہیں جانا چاہیے تھا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''میں اکیلی کب ہوں، اپنے گھر میں ہوں۔ سلیمہ ہے شیر دل خان ہے اور اب تو آپ بھی آگئے ہیں، ویسے وہ بھی جانا نہیں چاہتی تھیں، لیکن ان کا کام بہت ضروری تھا۔ اس لیے گئی ہیں۔''

ابھی اس کی بات بمشکل ختم ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ زینی نے تیزی سے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو!''

اس کی کوشش تھی کہ اس کے لہجے سے بیتابی ظاہر نہ ہو لیکن یہ وہ فون نہیں تھا۔ جس کا انتظار تھا۔ اسے بہت مایوسی ہوئی۔

''پلیز مائنڈ نہ کرنا نادرہ! اس وقت میں بزی ہوں، میں تمہیں خود فون کرلوں گی۔ ہاں بائے۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

''تم آرام سے بات کرلیتیں اپنی فرینڈ سے۔''

''نہیں کوئی بات نہیں پھر بات کرلوں گی۔'' اس نے مایوسی چھپانے کی کوشش کی۔

وہ فون بالکل بزی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ مبادا سبط حسن فون کرے اور اسے نمبر نہ ملے۔

''کیا بات ہے زینی، بہت تھکی تھکی لگ رہی ہو۔ آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں طبیعت تو ٹھیک ہے یا پھر نیند پوری نہیں ہوئی؟'' عبداللہ نے کہا۔

''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے زکام ہو گیا تھا مجھے، شاید اس کی وجہ سے محسوس ہو رہا ہو۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

کتنی دیر تک دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسی دوران گھر کی بیل بجی۔

''میں دیکھتی ہوں، دیدی آئی ہوں گی۔'' زینی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

عبداللہ نے رسٹ واچ پر وقت دیکھا، شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ طے شدہ پروگرام کے تحت اس وقت سبط حسن کو آنا تھا۔ وہ دونوں ہی نہیں چاہتے تھے کہ زینی کو اچانک شاک پہنچے۔ بجائے اس کے کہ ایک دم ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے، جس سے اس کے حواس ہی معطل ہو جائیں بہتر تھا کہ صورتِ حال کو آہستہ آہستہ اس پر واضح کیا جائے تاکہ وہ سوچ سمجھ کر کوئی بہتر فیصلہ کر سکے۔ یہی سوچ کر انہوں نے پہلے سے ایک پروگرام بنا لیا تھا۔

عبداللہ جان بوجھ کر دروازہ کھولنے باہر نہیں گیا تھا اور وہیں ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔

زینی نے دروازہ کھولا، سامنے سبط حسن کو دیکھ کر وہ چیخ پڑی۔

''سبط تم، مجھے صبح سے لگ رہا تھا جیسے تم آج آؤ گے، اندر آؤ ناں۔''

''تم کیسی ہو اور یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے۔ نیند پوری نہیں کی یا روتی رہی ہو۔'' وہ اندر آگیا۔

''دونوں ہی باتیں ہیں، مجھے تم اتنے یاد آرہے تھے اور پھر تم نے اس دن کے بعد رِنگ بھی تو نہیں کیا میں اسی لیے سوئی بھی نہیں تھی۔ سوجاتی اور تمہارا رِنگ آجاتا تو دیدی مجھے کبھی نہ جگاتیں۔

اور ہاں مجھے تمہارے بھائی کا بہت افسوس ہے، مجھے اندازہ ہے کہ تم کیا محسوس کر رہے ہو گے۔ پتا ہے میرے بھائی کو خراش بھی آجائے تو میری آدھی جان وہیں نکل جائے۔''

''مجھے بھی تم بہت یاد آئیں۔ اتنی زیادہ کہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتا۔''

زینی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''پتا ہے، مجھے یقین تھا کہ تم آج آؤ گے میں نے سلیمہ سے کہہ کر تمہاری پسند کا کھانا پکوایا ہے۔''

''اچھا یہیں کھڑا رکھو گی، باقی باتیں اندر چل کر ہو جائیں گی۔'' سبط نے کہا۔

"اوہو میں تو بھول ہی گئی تمہیں بتاتا۔ اندر میرے بھائی آئے ہوئے ہیں' ان سے ا
طریقے سے ملنا اور ہاں میں نے ابھی انہیں تمہارے متعلق بتایا نہیں ہے۔"

"جو حکم۔" سبط نے خوش دلی سے کہا۔

باہر وہ عبداللہ کی کار پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

عبداللہ بھی آنے والے لمحات کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے ا
سے پہلے کہ زینی ان کا تعارف کرواتی' وہ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

"سبط تم؟" عبداللہ نے ایسے کہا جیسے اسے وہاں دیکھ کر حیران ہوا ہو۔

"آپ زینی کے بھائی ہیں؟ اس نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ کدھر ہو زینی تم۔ تم نے مجھے کیوں نہیں کہ عبداللہ بھائی تمہارے بھائی ہیں؟"

وہ جو ایک طرف کھڑی حیرت سے پلکیں جھپکائے بغیر یہ منظر دیکھ رہی تھی آگے بڑھ آئی

"آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں' لیکن کیسے؟ ہائے مجھے تو پتا ہی نہیں تھا' میر
خیال تھا کہ......؟" وہ بات ادھوری چھوڑ کر ہنسنے لگی۔

"بیٹھو سبط۔" عبداللہ نے کہا پھر زینی کی طرف مڑا۔

"تم نے آج تک ذکر ہی نہیں کیا کبھی۔"

"میں' اماں' باباجان اور آپ کو بھی سبط سے ملوانا چاہتی تھی لیکن اتفاق ہے کہ یہ انہی دنو
بزی ہوتا تھا۔ میں نے بھی تہیہ کیا ہوا تھا کہ پہلے سے آپ لوگوں کو بتاؤں گی نہیں' سید
ملوادوں گی اور آپ لوگوں نے تو مجھے حیران ہی کر دیا۔"

وہ عبداللہ کے برابر صوفے پر ایک ٹانگ اوپر کر کے اور ایک نیچے لٹکا کر بیٹھ گئی۔ پا
پڑا کشن اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تم آج آرہے ہو؟" عبداللہ نے کہا۔

"ہاں بس میرا پروگرام بھی اچانک ہی بنا ہے۔"

"یہ آپ لوگ کیا پہیلیوں میں باتیں کرنے لگے۔ مجھے تو کوئی پوچھ ہی نہیں رہا۔ مجھے بھی اپنی باتوں میں شامل کریں۔" زینی نے کہا۔

"روک کون رہا ہے تم بھی شامل ہو جاؤ۔" عبداللہ نے کہا۔

"کیسے ہو جاؤں' یہ تو پتا چلے پہلے کہ آپ لوگ ایک دوسرے کو کیسے جانتے ہیں۔"

عبداللہ نے سگریٹ نکال کر ایک سگریٹ سبط کی طرف بڑھایا۔

"نو تھینکس۔ زینی مجھے کچا چبا جائے گی۔"

"کچا چبانے کی کیا بات' تمہیں خود نہیں پتا کہ سموکنگ صحت کے لیے نقصان دہ ہو
ہے۔" زینی اسے گھورا۔

"اپنے بھائی کو منع نہیں کرتیں۔" سبط نے بھی اسے گھورا۔

"انہیں کیسے منع کر سکتی ہوں' بڑے ہیں مجھ سے۔" وہ بولی۔

عبداللہ نے سگریٹ سلگا لیا۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ آپ لوگ کیسے ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"

یہی وہ سب سے مشکل سوال تھا' جس کا جواب انہیں احتیاط سے دینا تھا۔

"نہ جاننے کا کیا مطلب؟ بھئی کزن ہے ہمارا۔" عبداللہ نے کہا۔

"کزن؟ کیسا کزن؟ سب ماموؤں اور خالاؤں کے بچوں بلکہ ان کے بچوں کا بھی مجھے پتا ہے' ویسے اگر سبط کزن ہو تو قسم سے کتنا اچھا ہو' لیکن کیسا کزن؟"

"تمہارے صرف ماموں اور خالہ ہیں؟ کوئی تایا چچا نہیں ہیں؟" سبط نے بھی خوش دلی سے کہا۔

"ان کا تو نام نہ لو' میں نے دیکھا تو نہیں ہے' لیکن سنا ہے کہ وہ سب بہت ڈراؤنے ہیں' کیوں بھائی؟"

"شی' بری بات۔" عبداللہ نے کہا۔

"میں تمہیں ڈراؤنا لگتا ہوں کیا؟" سبط نے آنکھیں نکالیں۔

چند لمحے وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں میں بے یقینی پھیل گئی۔ اس نے عبداللہ کی طرف دیکھا جیسے اس سے تردید کی توقع کر رہی ہو۔

"سبط ٹھیک کہہ رہا ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

"لیکن......"

اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نے کبھی خاندان کے معاملات میں دلچسپی نہیں لی تھی اور اسے تمام معاملات کا علم نہیں تھا' لیکن اب وہ اس قدر بے خبر بھی نہیں تھی کہ آپس کی شدید دشمنی کا بھی اسے پتا نہ ہو' جب کہ دوسری طرف سبط اور عبداللہ اتنی گرمجوشی سے ملے تھے۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ اٹس سو سرپرائزنگ۔" اس نے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں۔

"بھائی اگر ایسا ہے تو وہ سب کیا تھا' جس کی وجہ سے ہم اپنے گھر سے اتنی دور رہے۔"

"گھر سے تو یوں بھی بہت سے لوگ دور رہتے ہیں۔ ظاہر ہے' تم گاؤں میں تو نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ اچھی اسکولنگ کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہم گھر سے دور رہتے۔"

"لیکن تب یہ تو نہ ہوتا' جو ہمارے ساتھ ہوتا رہا ہے' ہمیں اپنے گھر تک جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ میں اب تک حویلی واپس نہیں جا سکی۔ اپنے گاؤں' اپنے لوگوں میں نہیں

جاسکی۔ یہ۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا اب حالات بہتر ہو گئے ہیں؟ وہاں سب کی صلح ہو گئی ہے؟'' ا
نے پُر امید لہجے میں پوچھا۔

''نہیں‘ صلح تو نہیں ہوئی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خون کے رشتے تو نہیں تو
سکتے ناں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اوہ گاڈ! یا تو میں بہت کم عقل ہوں کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا‘ یا پھر آپ لوگ سید
طرح بات نہیں کر رہے۔ بڑے بابا تو ہم لوگوں کے خون کے پیاسے تھے۔ مجھے اب تک یاد
کہ انہوں نے ہم پر فائرنگ کروائی تھی۔ برسوں تک مجھے Night Mares (نائٹ میئر
آتے رہے تھے۔'' اس نے سبط کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر تناؤ کے آثار تھے۔

''سبط تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کچھ؟''

''مجھے خود ابھی تو پتا چلا ہے‘ لیکن کیا تمہارے نزدیک یہ سب باتیں اتنی زیادہ اہم ہیں؟''

''بھائی اب تک کچھ تو بدلا ہو گا؟'' وہ سبط کی بات نظر انداز کر کے عبداللہ کی طرف مڑی

''بدلا کچھ بھی نہیں ہے‘ سب کچھ بالکل ویسا ہی ہے بلکہ صورتِ حال زیادہ خراب ہو گ
ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے‘ کچھ تو بدلا ہو گا۔ آپ لوگ اتنی گرمجوشی سے ملے ہیں اور......!''

''بھئی ہم مہذب لوگ ہیں۔ کوئی وحشی جنگلی تو نہیں ہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر آ
خوری پر اتر آتے۔'' سبط حسن نے ماحول کا تناؤ کم کرنے کے لیے مسکرا کر کہا۔

''نہیں‘ اتنے مہذب نہیں ہیں آپ لوگ‘ کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے کہ جاہل ہوں‘ پاگل ہو
کچھ سمجھ نہیں سکتی۔ آپ لوگ پہلے مل چکے ہیں تو مجھ سے چھپا کیوں رہے ہیں؟ یہ جاننے کے
آئے ہیں ناں کہ میں کیسے ری ایکٹ کروں گی؟ اور میرے ری ایکشن دیکھ کر آپ لوگ نیا کو
آف ایکشن طے کریں گے۔ یہی ہے ناں بات؟ اب بولتے کیوں نہیں ہیں؟''

چند ثانیے وہ ان دونوں کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا پھر کش
پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر نکلنے لگی۔

''زینی!''

وہ پاس سے گزری تو عبداللہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''جا کہاں رہی ہو بیٹھو؟''

وہ عبداللہ کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کے کندھے کے ساتھ سر ٹکا کر رو پڑی۔

''رونے سے کون سا مسئلہ حل ہو جائے گا زینی۔'' تھوڑی دیر بعد سبط نے کہا۔

''دل کا غبار تو نکل جائے گا۔'' وہ بولی۔

''زینی! اتنا کم حوصلہ نہیں ہونا چاہیے تمہیں‘ ابھی تو پتا نہیں کیا کچھ فیس کرنا پڑے گا زند

میں Look, Life Is Not All Rosse'' عبداللہ نے اس کے آنسو پونچھے۔

''میں نے پھول دیکھے ہی کب ہیں؟ کیا ملا ہے مجھے اب تک زندگی سے؟ پہلے اپنا گھر چھوڑا‘ اپنے لوگ اور بچپن کی یادیں چھوڑیں‘ گھر والوں کا پیار ملا تو قسطوں میں‘ ساری زندگی گزری خوف کے عالم میں‘ مگر میں نے کبھی شکایت نہیں کی۔

لیکن اب میں کچھ برداشت نہیں کر سکتی‘ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ کیا میں ہی رہ گئی ہوں جس سے سب کچھ چھین لیا جائے؟ ایک ہی تو خوشی ملی تھی مجھے‘ وہ بھی نہ رہی تو میں جان دے دوں گی بھائی!'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔

اس لمحے سبط کو ریشماں کا خیال آیا۔ قدرت کی کیا ستم ظریفی تھی۔ وہ اور عبداللہ مل کر دونوں ہی زینی کے مستقبل کو تحفظ دینا چاہتے تھے‘ لیکن ریشماں؟ کیا عبداللہ اس کے مستقبل کو بھی تحفظ دینے کے لیے تیار ہو جاتا؟

لیکن اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ رہن سہن اور ماحول کا کتنا تضاد تھا دو بھائیوں کے گھروں میں۔ ریشماں ہوش و حواس میں اس سے یہ بات کبھی نہیں کہہ سکتی تھی‘ جو اس دن کہی تھی‘ اور یہاں عبداللہ اور زینی کے بیچ کوئی کمیونی کیشن گیپ تھا ہی نہیں۔

''تم سے تمہاری خوشیاں کوئی نہیں چھینے گا زینی‘ اس بات کا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

'لیکن یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ تمہاری خوشیاں ہیں کیا؟ کہیں ایسا نہ ہو زینی کہ تم جنہیں خوشیاں سمجھ رہی ہو‘ انہیں حاصل کرنے کے بعد تمہیں یہ احساس ہو کہ یہ تو صرف نظر کا دھوکا تھا۔''

آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے رگڑ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہی منحوس خبر سنانے آئے تھے‘ آپ دونوں مجھے؟ بہت شکریہ یہ انفارمیشن دینے کا۔ آپ نے اپنا فرض پورا کر لیا اور میں نے بھی سن لی یہ خبر۔ اب آپ لوگ چلے جائیں یہاں سے۔''

''زینی پاگل ہوئی ہو کیا؟'' عبداللہ نے پھر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

سبط اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا‘ لیکن عبداللہ کی موجودگی کی وجہ سے خاموش تھا۔

''ہم تم پر دباؤ ڈالنے نہیں آئے۔ فیصلہ جو بھی کرنا ہو وہ تم ہی کرو گی‘ ہم تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تم تسلی سے ٹھنڈے دل سے صورتِ حال کا جائزہ لو اور پھر کوئی فیصلہ کرو‘ جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹیک یور ٹائم۔ تم جو بھی فیصلہ کرو گی‘ میں تمہارے ساتھ ہوں گا‘ اب آنسو پونچھو‘ یہ کیا بچوں کی طرح رونا دھونا شروع کر دیتی ہو۔ یو آر گرون اَپ ناؤ۔''

وہ سر جھکائے‘ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے روتی رہی۔

''یار سبط! اس کا تو آج فل ٹائم رونے کا پروگرام بنا ہوا ہے‘ یہ ہمیں کھانے کو نہیں پوچھے

گی۔ میرا خیال ہے آج ڈنر باہر ہی کرنا پڑے گا۔'' عبداللہ نے کہا۔

سبط جو پہلے ہی بہت دل گرفتہ بیٹھا ہوا تھا' خاموش رہا۔ زینی آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی۔

''میں کھانا لگواتی ہوں۔''

وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے رہے۔

تھوڑی دیر بعد سلیمہ نے آ کر بتایا کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔ کھانے کو ان کا دل تو نہیں چا تھا' ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈائننگ ٹیبل پر پہنچے تو زینی میز پر گلاس رکھ رہی تھی۔ سلیمہ باہر نکل گئی تھی۔

کھانا شروع ہوا' لیکن ابھی زینی نے پہلا نوالہ بھی نہیں لیا تھا کہ اس کی آنکھوں سے برسات شروع ہو گئی۔ کانٹا پلیٹ میں اور نیپکن میز پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آئی ایم سوری سبط کہ تم ڈنر بھی نہیں کر سکے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''میرا دل بھی نہیں چاہ رہا۔'' وہ بولا۔

''میں زینی کو دیکھتا ہوں۔''

''میں بھی اب چلتا ہوں' شاید رات کو کسی وقت فون کروں۔''

سبط کے جانے کے فوراً بعد دیدی آ گئیں۔ عبداللہ ٹرالی میں زینی کے لیے کھانا رکھ رہا تھ

''شاہ صاحب آپ؟'' دیدی اس کے پاس آ گئیں۔

عبداللہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

''سوری! میں کچھ لیٹ ہو گئی۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو یوں زینی کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا اور پھر آپ اتنی سے آئی ہیں۔ آپ کو خود اس بات کا احساس ہونا چاہیے اور آپ کو یہ بھی پتا ہے کہ وہ کتنی ڈسٹر ہے۔''

''اس نے کھانا کھا لیا؟'' وہ قدرے شرمندہ ہو گئیں۔

''میں کھانا کھلا دیتا ہوں اسے' آپ آرام کریں اور بی کیئر فل ان فیوچر۔''

دیدی کچھ کہے بغیر کچن سے چلی گئیں۔ عبداللہ ٹرالی لے کر اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا' مگر اندر سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

عبداللہ نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا' اس نے نا گھمائی۔ دروازہ لاک نہیں تھا' وہ اندر چلا آیا۔ زینی بستر پر اوندھی پڑی رو رہی تھی۔

''کمال ہے زینی۔'' وہ ٹرالی بستر کے قریب لایا اور خود بھی بستر پر بیٹھ گیا۔

''مجھے بتاؤ کہ تم نے اتنا سمندر آنکھوں میں چھپا کیسے رکھا ہے۔ دیکھو' مجھے تمہارے رو

پر اعتراض نہیں ہے' دل بھر کر رو لینا' لیکن پہلے کھانا کھا لو' اٹھو۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''لڑنا ہو تو میرے اور سبط کے ساتھ لڑ لینا لیکن کھانے سے کیا لڑائی ہے تمہاری' اٹھو اچھے بچوں کی طرح۔''

''مجھے نہیں کھانا' کھانا۔'' اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''پتا نہیں یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے۔''

☆======☆======☆

سبط حسن گھر پہنچا تو بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ کمرے میں آیا تو اس کے پیچھے اس کا ملازم کرم الٰہی بھی چلا آیا۔

''شاہ صاحب! آپ کے لیے کھانا لاؤں؟''

''نہیں۔'' اس نے ٹائی بستر پر پھینک دی اور آستینوں کے بٹن کھولنے لگا۔

''دشمنوں کی طبیعت خراب لگ رہی ہے سرکار۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ' کھانا نہیں کھایا تو کھا لو اور آرام کرو' مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔''

''شاہ صاحب! کچھ عرض کرنا تھا۔'' وہ سبط حسن کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے جوتے اتارنے لگا۔

''جلدی کہو کیا ہے۔''

''شاہ صاحب! حوصلہ نہیں پڑ رہا کیسے کہوں۔''

''فضول تمہیدیں مت باندھا کرو کرم الٰہی جلدی کہو کیا کہنا ہے۔'' سبط نے بیزاری سے کہا۔

''سرکار ناراض مت ہوں' میں نے تو پہلے ہی بتا دیا ہوتا' لیکن زبان ساتھ نہیں دیتی۔ میں تو آپ کا نوکر ہوں شاہ صاحب' جب سے حویلی میں آیا ہوں' آپ کی خدمت پر تب ہی سے مامور ہوں۔ خدمت گار مالک کی عزت کرتے ہیں' لیکن میں آپ سے محبت کرتا ہوں' آپ جتنا خیال رکھتے ہیں مجھ غریب کا اس پر میرے دل سے آپ کے لیے اتنی دعائیں نکلتی ہیں' یہ میں اور میرا رب ہی جانتا ہے۔ آپ کو نقصان پہنچے' یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔''

''مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا' تم بے فکر رہو۔'' اس نے کرم الٰہی کو ٹالنا چاہا۔

''شاید ایسا ہی ہو' لیکن آپ کو آگاہ تو کرنا میرا فرض ہے ناں' مگر ڈرتا ہوں کہ پیر صاحب کو پتا چل گیا کہ جس بات کو انہوں نے چھپانے کا حکم دیا تھا' وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے' تو وہ میرے گھر کے ایک فرد کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

سبط نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو کرم الٰہی؟''

''سچ کہہ رہا ہوں شاہ صاحب۔'' اس نے نظریں جھکا لیں۔

''بابا جان تک کوئی بات نہیں پہنچے گی' یہ میرا ذمہ ہے۔''

''میں آپ پر قربان ہو جاؤں شاہ صاحب' اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔'' پھر وہ قدر آگے بڑھ کر رازداری سے بولا۔

''گاؤں سے کرم داد آیا ہے' آپ کی جاسوسی کے لیے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ پتا کرنے آیا ہے کہ آپ کی کن کن لڑکیوں سے دوستی ہے۔ پیر صاحب نے حکم دیا کہ یہ پتا کیا جائے کہ آپ کی کن کن اور کتنی لڑکیوں سے دوستی ہے' کن لڑکیوں سے آپ باہر ہیں اور کون گھر میں آتی ہیں اور خاص طور پر پتا کروایا ہے کہ زینب بی بی کون ہیں' تفصیل ما ہے انہوں نے ساری۔

کل جب آپ نہیں تھے تو کرم داد یہاں آپ کے کمرے میں آیا تھا۔ بی بی کی تصویر دیکھ پوچھنے لگا کہ یہ کون ہے؟ پیر صاحب کے حکم کی سرتابی کی مجال نہیں تھی۔ میں نے بتا دیا کہ زینہ بی بی ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگا کہ اس تصویر کی کوئی دوسری کاپی ہے' مگر میں نے انکار کر دیا۔

پتا ہے' کیا کیا اس نے؟ اس نے کھٹ سے کیمرے کے ساتھ اس تصویر کی تصویر کھینچ لی۔

آج میں جان بوجھ کر آپ کے ساتھ ساتھ رہا تا کہ کرم داد سے جان بچی رہے' لیکن مو ہی نہیں ملا کہ آپ کو کچھ بتاتا۔ وہ تو شکر ہوا کہ اس کی وہی گاؤں والی عادت ہے جلدی سو کی۔ آپ کے نکلنے سے پانچ منٹ پہلے چلا گیا تھا وہ سونے کے لیے' تب سے میں دعا کر رہا کہ آپ جلدی آئیں' کیونکہ کل صبح صبح وہ میرے سر پر سوار ہو جائے گا یہ سب باتیں پوچھنے لیے۔''

''اوہ گاڈ!'' اس نے گہرا سانس لیا۔

''اب آپ حکم کریں شاہ صاحب۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا ''تم اس سے کہنا کہ......''

☆======☆======☆

عبداللہ نے تمام تر صورتِ حال زینی کو بتا دی تھی۔ وہ سب پریشانیاں جن کا اسے سا ہو سکتا تھا' سب کچھ تفصیل کے ساتھ اسے بتا دیا تھا۔

''میں کسی جلد بازی کی بات نہیں کر رہا۔ میں نے ساری صورتِ حال تمہارے سامنے ر دی ہے' تم اطمینان سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔''

''حالات خواہ کیسے بھی کیوں نہ ہوں' خواہ اس سے بھی بدتر ہوں' لیکن میں سبط کو نہیں چھو

سکتی۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''زینی جلد بازی اور جذباتیت کا مظاہرہ مت کرو۔'' عبداللہ نے اسے سمجھایا۔

''آپ آج پوچھیں یا کل یا دس سال بعد' میرا فیصلہ یہی ہوگا۔''

''تم پڑھی لکھی' باشعور لڑکی ہو' ضد کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

''مجھے پتا ہے بھائی' آپ کیا چاہتے ہیں۔'' وہ چلائی۔ آنسو پھر اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

''آپ چاہتے ہیں کہ ہم دونوں دور ہو جائیں' لیکن اپنے منہ سے یہ بات کہنا نہیں چاہتے تا کہ کل کو یہ کہہ سکیں کہ یہ فیصلہ زینی کا تھا۔ مجھے پریشرائز کر کے یہ بات کہلوانے سے زیادہ بہتر ہوگا کہ آپ زبردستی مجھے سبط سے دور کر دیں' کیونکہ نہ تو میں پریشرائز ہوں گی اور نہ وہ سب کہوں گی' جو آپ مجھ سے کہلوانا چاہتے ہیں۔''

عبداللہ نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''زینی! تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو' میرا......!''

''مجھے کچھ نہیں سننا۔'' اس نے عبداللہ کی بات کاٹی۔ ''آپ نے میرا فیصلہ مانگا تھا' میں نے دے دیا۔ بس بہت ہو گئی' زندگی کی جن خوشیوں پر میرا حق تھا' انہیں اپنے گھر والوں کی مجبوری سمجھ کر میں ہمیشہ خاموشی سے اپنے اس حق سے دستبردار ہوتی رہی ہوں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''اچھا' اب تم آرام کرو۔'' عبداللہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں بھی تھکا ہوا ہوں' آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے کمرے سے نکلتے ہی زینی نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور سبط کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف پہلے ہی رنگ پر فون اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو سبط! میں بھی آج تم سے وہ بات کہنا چاہتی ہوں جو پہلے کبھی نہیں کہی۔'' وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔

''میں تم سے محبت کرتی ہوں بہت زیادہ۔ اتنی زیادہ کہ کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ حالات خواہ کیسے ہوں' لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں تم سے اسی طرح محبت کرتی رہوں گی ہمیشہ۔'' اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اور سبط حسن کے دل پر سے بھاری بوجھ اتر گیا۔

☆======☆======☆

لاہور جاتے ہوئے عبداللہ سوچ رہا تھا کہ زینی نے غلط اور جذباتی فیصلہ کیا تھا' لیکن اس کی موجودہ ذہنی حالت میں اس کا یہ فیصلہ تبدیل کرانا مشکل تھا۔

گو کہ عبداللہ نے سبطِ حسن کے ساتھ بہت تھوڑا وقت گزارا تھا' لیکن وہ اسے بھی اچھا لگا تھا اور زینی اور سبط کی دوستی تو تقریباً سال بھر پرانی تھی' دوستی بھی ایسی کہ ان کا اٹھنا' بیٹھنا' پڑھنا لکھنا اور کھانا پینا تک اکٹھے ہوتا تھا۔ ایسے میں زینی سے یہ توقع کرنا کہ وہ سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرے گی درست نہیں تھا۔ عبداللہ کا ارادہ تھا کہ وہ ہفتہ بھر بعد دوبارہ چکر لگائے گا' تب تک زینی کی ذہنی حالت بھی بہتر ہو چکی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا' تب تک وہ صورتِ حال کا منطقی جائزہ لے چکی ہو۔

☆======☆======☆

''جی میں نے بہت اچھی طرح سے معلوم کر لیا ہے' کہ شاہ صاحب کی دوستی صرف ایک لڑکی سے ہے۔'' کرم داد پیر صاحب کو رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ ''شاہ صاحب ان سے گھر سے باہر ہی ملتے ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے۔ یہ ملاقات بھی بعض اوقات ایک اور بعض اوقات دو دن چھوڑ کر ہوتی ہے۔''

''نام کیا ہے لڑکی کا؟''

''زینب بی بی ہیں جی۔''

اس نے ایک سفید لفافہ ان کی طرف بڑھایا جس میں زینی کی تصویر تھی۔

''یہ تصویر شاہ صاحب کے کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس تصویر کی تصویر کھینچ لی۔''

پیر صاحب لفافے سے تصویر نکال کر اس کا جائزہ لینے لگے۔

''لڑکی کے متعلق تفصیل بتاؤ۔''

''یہ بی بی اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہیں میں نے ان کا بنگلا دیکھا ہے' والدہ کو بھی دیکھا ہے۔''

حالانکہ یہ سراسر جھوٹ تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب سب کچھ کرم الٰہی اتنی تفصیل کے ساتھ بتا رہا تھا تو اسے زیادہ تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بقیہ دن یونہی مری اور اسلام آباد کی سیر کر کے واپس چلا گیا۔

''بنگلا ویسا ہی ہے جیسا کہ شاہ صاحب کا ہے۔'' اس کی بات جاری تھی۔

''گاڑی پجیرو رکھی ہوئی ہے' کھاتا پیتا گھرانہ لگتا ہے' لیکن بی بی کے والد وہاں نہیں رہتے' شاید ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''یہ اچھی طرح معلوم نہیں کیا کہ اس کا باپ کہاں ہے؟'' پیر صاحب نے سختی سے پوچھا۔

''جی پتا تو کیا تھا۔'' وہ ایک دم بھیگی بلی بن گیا۔ ''لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس ملک میں گئے ہوئے ہیں۔''

''اچھا جاؤ۔''

وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

پیر صاحب مطمئن ہو گئے تھے۔ یہ کوئی پریشان کن صورتِ حال نہیں تھی۔

''لڑکے اس عمر میں ایک آدھ محبت کرتے ہی ہیں پھر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اگر سبط لڑکی کے گھر نہیں جاتا تو اس کا مطلب ہے کہ لڑکی بھی اپنی ماں سے ڈرتی ہے۔ یہ ٹین ایج کی وہی محبت ہے جس میں جتنی تیزی سے ابال آتا ہے' اتنی ہی تیزی سے ختم بھی ہو جاتا ہے۔''

انہوں نے اس کے کالج فون کر کے اس کی اسٹڈیز کے بارے میں رپورٹ لی تھی۔ اب تک وہ بہترین گریڈز لیتا آ رہا تھا' جس سے پتا چلتا تھا کہ اس کے باقی مشاغل پڑھائی پر اثر انداز نہیں ہو رہے تھے۔ سبطِ حسن کی طرف سے انہیں اطمینان ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

''تم نے دیکھا ایڈی کو؟ اس نے تو واقعی تمہارے لیے جوگ لے لیا ہے۔''

ماہ بانو اور اُما گرافک اسٹوڈیوز کے باہر بیٹھی ہوئی تھیں۔ پلیٹ انہوں نے اینچ کرنے کے لیے رکھی ہوئی تھی اور اب وقتی طور پر فارغ ہی تھیں۔

''اس نے تو لگتا ہے واقعی منہ ہاتھ تک دھونا چھوڑ دیا ہے۔ اتنا میلا کچیلا ہو رہا ہے' شیو تک نہیں کر رہا۔'' اُما نے کہا۔

نیہاں بھی ان کے پاس ہی چلی آئی۔

''ایسے لڑکے کالج میں کم تو نہیں ہیں۔'' وہ بولی۔

''لیکن ان میں سے کسی نے اُما کے لیے جوگ نہیں لیا۔'' ماہ بانو ہنسی۔

''ہائے قسم سے اُما؟'' نیہاں کی نیلی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

''چھوڑو بھی۔'' اُما نے جھٹکا۔

''ویسے He Is Looking Very Handsome آنکھوں پر گول شیشوں والا چشمہ چڑھائے' میلی ٹی شرٹ اور اس سے بھی زیادہ میلی جینز کے ساتھ پھٹے ہوئے جوگرز پہنے ہوئے۔'' نیہاں ہنسی۔

''آج میں نے عبداللہ کو بھی دیکھا تھا کالج میں۔'' اُما نے موضوع بدلا۔

''اچھا؟ مجھے تو نظر نہیں آیا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''میں لاکر روم میں جا رہی تھی' وہیں راستے میں نظر آیا تھا۔ وہ اور ایڈی دونوں کھڑے تھے۔ مجھے ایڈی نظر آیا تو دور سے ہی واپس آ گئی۔''

''ہاں دیکھا تو اسے میں نے بھی تھا۔'' نیہاں نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

''اب تو میں نے بھی دیکھ لیا ہے' وہ آ رہے ہیں دونوں۔''

ماہ بانو نے سامنے سے آتے ایڈی اور عبداللہ کو دیکھا' وہ دونوں انہی کی طرف آ رہے

تھے۔

''وٹامن ڈی اُڑائی جارہی ہے اکیلے اکیلے۔'' ایڈی نے انہیں دھوپ میں بیٹھے دیکھا
بولا۔

''مفت کا مال ہے تم بھی شیئر کر سکتے ہو۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''میں دیکھ رہا تھا آج دیوی جی نے اس طرح راستہ بدلا تھا کہ کیا کوئی کالی بلی کو دیکھ
راستہ بدلتا ہوگا۔'' ایڈی نے کہا۔

''کوئی صفائی پسند انسان تمہارے قریب سے گزر سکتا ہے کیا؟'' اُس نے ناک سکیڑا۔

جس طرح آپ ہم سے ملتے ہیں
آدمی یوں نہ آدمی سے نہ ملے۔

ایڈی نے مصنوعی آہ بھری۔

''عبداللہ تم بہت Pulled Down لگ رہے ہو' تھکے تھکے سے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''ہاں ابھی رات کو دیر سے لاہور پہنچا تھا' نیند کچھ پوری نہیں ہوئی۔''

''تمہیں رات کو ضرور سفر پر نکلنا ہوتا ہے؟ رات آرام کرتے اور صبح سفر کے لیے نکلتے ا
پھر تمہیں چوٹ بھی لگی ہوئی ہے۔ ڈرائیونگ تو یوں بھی تمہیں نہیں کرنی چاہیے۔''

''اتنا نازک مزاج نہیں ہوں میں۔ ویسے بھی زخم زیادہ گہرا نہیں ہے بلکہ اب تو ٹھیک
ہو گیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اچھا چھوڑو' یہ بتاؤ میرا کام شروع کیا ہے؟''

''ہاں' لیکن ابھی میں نے ابا جی سے بات نہیں کی۔'' اس کے انداز میں تامل تھا۔

''تو کر لو' اس میں کون سا وقت لگتا ہے۔''

واقعی اس میں کون سا وقت لگتا تھا۔ وہ شام کو ہی ابا جی کے پاس بیٹھ گئی۔

''میں نے آپ سے ذکر کیا تھا ناں ابا جی' وہی عبداللہ والے پروجیکٹ کا۔''

''ہاں۔'' وہ بولے۔

''اب آپ بتائیں' میں وہ کر لوں یا نہیں؟''

''دیکھو تو تمہاری اسٹڈیز پر اثر انداز نہ ہو۔''

''نہیں ابا جی ایسا نہیں ہوگا' پھر اصل بات تو یہ ہے Creativity کی۔ کالج میں جس چ
کو اہمیت دی جاتی ہے' وہ یہی تو ہے کہ ہم اپنی پوری تخلیقی صلاحیتیں صرف کر کے آرٹ کو نئے
رجحانات دیں۔ یہ جتنا کچھ ہم پڑھ رہے ہیں' ان سب کا مقصد تو یہی ہے کہ ہم میں موجود تخلیق
صلاحیتوں کو نکھارا جائے۔''

''مجھے اعتراض نہیں ہے بانو' لیکن مسئلہ ہے' سرمائے کا۔ جو کچھ تم چاہتی ہو' اس کے لی
بہت سا پیسہ چاہیے۔''

''تو ابا جی! یہ پیہ ہے کہ میں اسے اس کے کامپلیکس سے نکالنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ پر اتنا بڑا
''لیکن وہ اس کہ میں چاہوں بھی تو تمام زندگی اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ ہاں اتنا کر سکتا ہوں
''آپ بھ یسی چیز' کوئی ایسا گفٹ دوں جو تمام عمر اس کے ساتھ رہے' اور میں اسے خوداعتمادی
فراہم کرے گ چاہتا ہوں۔ یہ وہ چیز ہے' جو ساری زندگی' ہر میدان میں اس کی مدد کرے گی اور وہ
اٹھا سکتے ہیں خود راستہ بنانے کے قابل ہو جائے گی۔''
''ا
عبداللہ تم اور تمہاری سوچ دونوں بہت اچھے ہیں' لیکن اسے یہ سب سمجھانا بہت مشکل
چاک
کھڑ

''تم بے فکر رہو' وہ خود ہی سب کچھ سمجھ جائے گی۔''

''ایک بات اور' وہ یہ کام کرنا چاہتی ہے' لیکن پے منٹ کی بات تم سے نہیں کر سکے گی۔
حالانکہ اس کے ابا جی کے پاس بالکل سرمایہ نہیں ہے۔''

''اس بارے میں بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تھینک یو عبداللہ' یو آر سو نائس۔''

☆======☆======☆

اگلے دن اسے عبداللہ کے ساتھ اس کے گھر جانا تھا' سوا دو بجے وہ گیٹ سے نکل کر
پارکنگ میں آئی تو عبداللہ سامنے ہی کھڑا تھا۔

''چلیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ بولی۔

دونوں کار کے پاس آئے۔

کار کی پچھلی نشستوں پر بیٹھا عبداللہ کا کتا کلر کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ عبداللہ نے ماہ
بانو کے لیے اگلا دروازہ کھولا۔

''میں اس گاڑی میں بیٹھوں گی جس میں اتنا بڑا سا کتا ہے؟'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''تم بیٹھو' کچھ نہیں کہے گا تمہیں۔''

''میں اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈر کر بے ہوش ہو جاؤں گی۔ یہ کتنا ڈراؤنا کتا ہے۔''

''میں اسے یہاں چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا۔'' وہ بولا۔

''تو مجھے یہاں چھوڑ جاؤ۔''

''بہت ڈرپوک ہو تم۔'' وہ بولا پھر کلر کے جسم پر ہاتھ پھیر کر اسے آرام سے بیٹھ جانے کو
کہا۔

''اب یہ نہیں ہلے گا اپنی جگہ سے اور تم بھی اب کار میں گھسو' مجھے ایسی ڈرپوک لڑکیاں
بالکل اچھی نہیں لگتیں۔''

ماہ بانو دل ہی دل میں صمّ بکمّ پڑھتی گاڑی میں بیٹھ گئی' عبداللہ سامنے سے گھوم کر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''تم نے کچھ کام شروع بھی کیا؟ میں نے کہا تھا مجھے جلدی ہے۔'' وہ کار مال روڈ پر لاتے ہوئے بولا۔

''شی۔''

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کرایا اور دوپٹا سر پر لے کر آنکھیں موندے وہ سب آیتیں اور سورتیں دہرانے لگی جو اسے حفظ تھیں۔ عبداللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

سارا راستہ وہ یونہی بیٹھی رہی۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر جب عبداللہ نے ہارن دیا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے گیٹ پر کتوں سے ہوشیار رہنے کی تختی لگی دیکھ کر اس کی آنکھیں خودبخود بند ہوگئیں اور وہ دوبارہ آیت الکرسی پڑھنے لگی۔

گیٹ کھلا۔ کار لمبی سی ڈرائیووے سے ہوتی ہوئی گیراج میں پہنچ کر رک گئی' عبداللہ نے خود اتر کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔

''اتر آؤ نیچے۔'' وہ بولا۔

''باہر کتے تو نہیں ہیں؟'' اس نے ویسے ہی آنکھیں موندے موندے پوچھا۔

''باہر تو نہیں' البتہ کار میں جو دو مسافر بچے ہیں' ان میں سے ایک تم ہو اور ایک کلر۔''

وہ جلدی سے باہر نکل آئی اور ارد گرد دیکھے بغیر اس کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اتنا خوبصورت اور آراستہ گھر اس نے صرف انٹیریئر ڈیکوریشن کی کتابوں میں دیکھا تھا۔

تین حصوں پر تقسیم ڈرائینگ روم' وال ٹو وال کارپٹنگ' ہاتھ سے بنے ہوئے قیمتی قالین' بھاری خوبصورت فانوس' انتہائی قیمتی فرنیچر' ڈیکوریشن کا سامان جو غالباً سارے کا سارا یورپ اور جاپان سے لایا گیا تھا۔ فرنچ کرسٹلز کا ذخیرہ' دیواروں پر خوبصورت بڑی بڑی پینٹنگز اور پرنٹس بہترین انداز سے رکھے گئے آرٹسٹک مجسمے' ہر چیز چمچماتی ہوئی' جیسے ابھی دکان سے خرید کر لائی گئی ہو۔

''آؤ ناں۔''

عبداللہ کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی۔

''بیٹھو' بھوک تو لگی ہوگی' بس پانچ منٹ میں کھانا لگ جاتا ہے۔''

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ عبداللہ نے بھی بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیا۔

''اتنی خاموشی ہے گھر میں۔''

''ہاں' میرے علاوہ یہاں صرف نوکر ہوتے ہیں کبھی گاؤں سے اماں اور باباجان آجاتے

ہیں' گڑیا صرف اس وقت آتی ہے' جب اسے شاپنگ کرنی ہو' ان کے آنے سے گھر میں کافی رونق ہوجاتی ہے۔''

''تمہارا دل نہیں گھبراتا اکیلے میں۔''

''میں خود گھر میں کم ہی ہوتا ہوں۔ زیادہ تر دوستوں کے ساتھ ہی وقت گزرتا ہے۔ کبھی میں ان کی طرف چلا جاتا ہوں۔ کبھی وہ یہاں جمع ہوجاتے ہیں۔''

''اماں جان ٹھیک ہی کہتی ہیں۔'' ماہ بانو نے دل میں سوچا۔ ''ہر اچھی چیز کے لیے یہ ضرور کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نصیب کرے۔ اب یہ اتنا بڑا مکان ہے لیکن جن کا ہے' ان کے نصیب میں یہ آسائشیں استعمال کرنا نہیں ہے۔ ہر چیز نوکر استعمال کرتے ہیں۔ کیا فائدہ اتنے بڑے اور ڈھیر سارے مکانوں کا۔ ایک اِس شہر میں کھڑا کر دیا اور دوسرا اُس شہر میں۔ پتا نہیں جن کے پاس ڈھیر سارا پیسہ ہوتا ہے' وہ اتنے مکان کھڑے کر کے کیا کرتے ہیں' رہنے کو تو بس ایک گھر ہونا چاہیے ایسا مکان نہیں۔''

''شاہ صاحب! کھانا لگا دیا ہے۔'' ایک ملازم نے اندر داخل ہو کر اطلاع دی۔

عبداللہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''آؤ بانو۔''

چوبیس کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل پر انواع واقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے' ڈنر سیٹ بھی نہایت نفیس اور قیمتی تھا۔

''لگتا تو نہیں ہے کہ تم اتنا کچھ کھاتے ہو۔ دیکھنے میں خاصے اسمارٹ ہو۔'' ماہ بانو نے مٹن پلاؤ اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

عبداللہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس کمپلیمنٹ کا شکریہ۔ ویسے کھانا میں اتنا زیادہ نہیں کھاتا' یہ تمہاری آمد کے سلسلے میں اہتمام ہے یوں بھی تمہیں لنچ دینے کا وعدہ کیا تھا میں نے۔''

''وہ گھر پر لنچ دینے کا کب تھا؟'' وہ بولی۔

''یعنی یہ لنچ کسی کھاتے میں ہی نہیں ہے۔'' وہ ہنس پڑا تھا۔

''بالکل نہیں' یہ تو مہمانداری کا تقاضا ہے اگر تم میرے گھر آؤ' کھانے کے وقت تو تمہیں بھوکا نہیں چلتا کروں گی' ظاہر ہے کھانا تو کھلاؤں گی ہی' خواہ کسی لنچ کا وعدہ ہو یا نہ ہو۔''

پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''ہاں یہ ہے کہ میری طرف لنچ اتنا شاندار نہیں ہوگا۔''

''وہ تو ظاہر ہے' میں امیر ہوں تم غریب تم ایسا لنچ کیسے دے سکتی ہو۔'' عبداللہ نے اطمینان سے کہا۔

ماہ بانو کھانے سے ہاتھ روک کر چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ہنس پڑی۔

''تم میری ہر ایسی بات کی ٹانگ ضرور پکڑتے ہو۔''

''پکڑتا رہا ہوں گا جب تک تم سدھر نہیں جاتیں ویسے یہ الگ بات ہے کہ تم مجھے لنچ دو گی' جب پہلی مرتبہ تمہارے گھر آیا تھا تو چائے تک نہیں پلوائی تھی تم نے۔''

''کب؟ اوہ یس' وہ اماں جان نے جو پلوا دی تھی۔''

''تم نے تو نہیں پلوائی تھی ناں؟ حالانکہ انہوں نے تم سے کہا تھا چائے بنانے کو اور تم غ میں پاؤں پٹختی سیدھی اپنے کمرے میں گھس گئی تھیں۔ دروازہ بھی اتنی زور سے بند کیا تھا کہ آ محلّہ ڈر کر جاگ گیا ہوگا۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔'' وہ ہنسی۔ ''اب کے تم آنا تو چائے بنا دوں گی۔ کیا یا کرو گے تم بھی۔ ویسے میں کچن میں جاتی نہیں ہوں۔''

''پھر تو بہت مہربانی ہوگی' اگر ایک کپ چائے اپنے ہاتھوں کی بنی ہوئی پلاؤ گی تو۔''

کھانے اور فروٹ کے بعد سبز چائے پی کر وہ فارغ ہوئے تو ماہ بانو بولی۔

''اب وہ کام جس کے لیے میں آئی تھی۔''

''چلو اٹھو پھر۔''

''لیکن پہلے اپنے کتے کو کہیں باندھ دو۔ اتنی بری سی شکل ہے اس کی' مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔''

''کیا؟ اس کی شکل بری ہے؟ اگر کتوں کا کوئی عالمی مقابلہ حسن ہوتا تو تاج کلر کے سر رکھا جاتا۔''

''کلر نام بھی ویسا ہی ڈراؤنا۔ رکھنے ہی ہیں کتے تو بندہ پوڈل رکھے یا سپینل' ننھے کیوٹ سے' دل چاہا تو ہاتھ میں اٹھا لیے' دل چاہا نیچے فرش پر رکھ دیے۔ اتنے کیوٹ لگتے ناں' جب بال آنکھوں پر آئے ہوتے ہیں اور وہ سر جھٹک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''تمہاری بات سن کر لاحول پڑھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ میرے پاس اعلیٰ ترین نسلوں کتے ہیں۔ وہ پطرس والے کتے جو ہلکی سی بخ کر کے خاموش ہو جاتے ہیں' وہ اولڈ انگلش لیڈ کے ساتھ ہی اچھے لگتے ہیں یہ کلر تو ڈوبر مین ہے۔''

''چلو بڑا کتا رکھنا تھا تو السیشین رکھ لیتے' کم از کم شکل وصورت تو اچھی ہوتی ہے اس کی۔''

''تمہیں پتا ہی کیا ہے کتوں کے بارے میں۔ ان کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ شکار لیے مختلف کتے ہیں' رکھوالی کے لیے دوسرے اور کچھ ہوتے ہیں جو محض سجاوٹ کے لیے ہو ہیں۔ اچھا اب اٹھو' کتے بندھے ہوئے ہیں۔''

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ گیراج میں چمکتی ہوئی چار بالکل نئی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں جنہیں اس وقت کتے کے خوف سے وہ دیکھ نہیں سکی تھی اور لان کیا تھا بے حد وسیع وعریض با

تھا' جو پہلے ہی بے حد خوبصورت تھا۔ سبز گھاس خوبصورت سی جو باہر سے منگوائی گئی تھی خوشنما اور خوش رنگ پھول۔

وہ اسے باغ کے مختلف گوشے دکھاتا رہا' پھر وہ دونوں برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔

''یہ ایریا کتنا ہوگا؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''پورا ملا کر بیس کنال ہے۔'' عبداللہ نے بتایا۔ ''دادا جان کی یہاں ساٹھ کنال زمین تھی جو تینوں بھائیوں میں برابر تقسیم ہوگئی تھی۔ اب دائیں طرف بڑے بابا جان اور بائیں طرف سخاوت بابا کے مکان ہیں۔''

''ہوں۔'' اس نے دور تک پھیلے باغ کی طرف دیکھا۔

''اب تم نے جگہ بھی دیکھ لی ہے' بتاؤ کام کرنے کا ارادہ ہے؟''

''دیکھو ایسا ہے عبداللہ۔'' وہ تامل سے بولی۔ ''کہ تمہارا یہ لان میری قابلیت کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔''

''اوہ اچھا! اب میں سمجھا۔'' وہ بولا۔ ''یہ تو مجھے پتا تھا کہ تم بہت غریب ہو' لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ تمہاری عقل بھی ذرا غربت کا شکار ہے۔''

''قسم سے عبداللہ! اگر تمہاری جگہ کوئی اور مجھے اتنا زچ کرتا تو میں یقیناً اس کا سر پھاڑ دیتی۔''

''تو مجھ پر رحم کرنے کی وجہ؟''

''تم سے کوئی سخت بات کہہ نہیں سکتی' تم کیوں میری کمزوری کا بار بار ذکر کرتے ہو۔''

''کیونکہ تم بار بار یہ ذکر خود شروع کرتی ہو' تمہیں حوصلہ دینے سے تو اب تک کام نہیں بنا' اس لیے اب میں سوچتا ہوں کہ ہمدردی کرنا زیادہ بہتر ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اچھا پلیز! اب ایسے مت کہو' میں کوشش تو کرتی ہوں کہ اب ایسی بات نہ کروں' لیکن کبھی کبھی زبان پھسل جاتی ہے۔''

''تمہاری زبان جتنی مرتبہ پھسلے گی' میں اتنی ہی مرتبہ تمہیں Realize کراؤں گا۔'' وہ بولا۔ ''اور اب ٹھیک طریقے سے بات کرو' میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ کام تمہیں ہی کرنا ہوگا' انکار نہیں سنوں گا میں۔''

''اب میں کیا بات کروں' تم نے انکار کی گنجائش چھوڑی ہی کب ہے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''تم نے کچھ آئیڈیا بنایا؟''

''ہاں۔'' اس نے بیگ سے لائبریری سے ایشو کرائی ہوئی دو کتابیں نکالیں اور اسکیچ بک بھی کھول لی۔ بہت سوچ سوچ کر اور بہت محنت سے اس نے اسکیچ تیار کیے تھے۔

''جو ڈیزائننگ تم چاہ رہے تھے' یعنی سرامکس سے متعلق چیزوں کی' تو اس کے لیے ضروری

ہے کہ لان میں تبدیلی لائی جائے' ورنہ تو اچھا نہیں لگے گا' اس لیے میں نے فلاور پاٹس وغیرہ کی ہی ڈیزائننگ نہیں کی بلکہ پورا پلان بنایا ہے۔"

وہ اسے بتاتی رہی کہ کون سا کیسا ہونا چاہیے' گملے کس انداز کے ہونے چاہئیں اور آج کل کیا نئے ٹرینڈز ہیں۔ بات ختم کر کے وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہوں تم نے یقیناً محنت کی ہوگی' لیکن مجھے کوئی نئی چیز چاہیے۔ مختلف انداز۔" عبداللہ نے کہا۔

اور پھر ہر چیز میں کوئی خامی نکال دی۔ فلاں چیز مکان کی Over All Look سے مطابقت نہیں رکھتی۔ فلاں چیز ہر گھر کے لان میں مل جائے گی' فلاں چیز آرٹسٹک نہیں ہے' ہر چیز میں اسے کوئی نہ کوئی نقص دکھائی دے رہا تھا۔

گھر آ کر بھی وہ پیچ و تاب کھاتی رہی۔

"پتا نہیں نواب صاحب کو کیا چیز اچھی لگے گی۔ اتنی تنقید' اتنے کیڑے' یہ کسی ادارے کا باس بن گیا تو بہت سنکی قسم کا باس بنے گا۔ ماتحتوں کی شامت آئی رہے گی ہمیشہ۔" اس نے سوچا۔

اور صبح جونہی اسے اُما نظر آئی' وہ اسے اپنا دکھڑا سنانے بیٹھ گئی۔

"یقیناً اس میں امپرومنٹ کی گنجائش ہوگی' تم زیادہ بہتر کر سکتی ہو۔" امانے اسے تسلی دی۔

"میں ذرا بھی بہتر نہیں کر سکتی' بس اتنا ہی کر سکتی تھی جتنا کر دیا۔ اف خدا! میرے اتنے دنوں کی محنت پر پانی نہیں پھیرا' چھری پھیری ہے اس نے' ذبح کر دیا ساری محنت کو۔"

"دیکھو بانو! ایسے پروجیکٹ میں اصل مرضی تو کلائنٹ کی ہی چلتی ہے ناں۔ ہمیں کلائنٹ کو وہی چیز دینی ہوتی ہے' جس سے وہ مطمئن ہو جائے۔"

"یہ تو ساری زندگی مطمئن نہیں ہوگا' تم دیکھ لینا۔" وہ غصے سے بولی۔

"چلو' اس سے ایک بات تو پتا چل گئی تمہیں کہ وہ تم پر ترس کھانے یا تم سے ہمدردی کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ کسی کے پاس کتنا بھی پیسہ کیوں نہ ہو' یوں نہیں پھینک دیتا۔"

"وہ میری شدید ترین غلط فہمی تھی۔ کاش اسے میرے اوپر تھوڑا سا ترس ہی آیا ہوتا۔ کمبخت کو وہ بھی تو نہیں آیا' اسے مجھ سے ایک فیصد ہمدردی بھی نہیں ہے' یہ تو خود ہی ثابت ہو گیا ہے۔"

کتنے دن تک وہ رات گئے تک اسی کام میں مصروف رہی۔ یہ سوچنا کہ کیا چیز زیادہ بہتر اور منفرد ہوگی' پھر اسکیچ کرنا' ڈیزائننگ' یہ سب بہت تھکا دینے والا کام تھا۔

اس دن وہ پھر عبداللہ کے گھر گئی۔

"نہ مجھے کھانا' کھانا ہے' نہ سبز چائے پینی ہے' بس تم میری بات سنو۔"

"سناؤ۔" وہ مسکرایا۔

"یہ میں نے نئے اسکیچ بنائے ہیں۔"

پھر وہ اسے سب کچھ بتانے لگی۔ باغ کے کس حصے میں کیا ہونا چاہیے' گملے کیسے ہونے چاہئیں' قد مچے کس ڈیزائن کے بنیں گے وغیرہ۔

"یہ لان ایسٹرن اور ویسٹرن کلچرز کا امتزاج ہوگا۔ میں نے بہت محنت سے' ڈھیر سارے مالیوں سے مل کر نرسریوں میں جا کر پودوں کا انتخاب کیا ہے اور ہاں' اگر یہ اچھا نہیں لگتا تو کسی اور سے کہو کہ وہ مغز ماری کرے' مجھ سے اور کچھ نہیں ہوگا' تمہیں اچھا لگ جاتا ہے' تو ٹھیک ہے' ورنہ اپنا راستہ ناپو۔ نہیں میرا مطلب ہے کہ راستہ تو مجھے ناپنا پڑے گا۔ میں تمہارے گھر میں کھڑی ہوں' لیکن یہ طے ہے کہ میری برداشت کی حد یہیں تک تھی۔ تمہیں یہ اچھا نہیں لگتا' تو نقص نکالے بغیر یہ سب کچھ مجھے واپس کر دو' میں اتنی فالتو نہیں ہوں کہ تم ہر مرتبہ میرے اتنی زیادہ محنت سے کیے کام میں کیڑے نکالتے رہو اور میں برداشت کرتی رہوں۔"

وہ مسکرا دیا۔ "اب بانو تم نے وہ سب دیا ہے' جو میں چاہتا تھا۔ یہ آئیڈیاز بہترین ہیں۔"

"تمہیں اچھا لگ گیا؟" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکتے ہوئے ماتھے پر آئے بال پیچھے کیے۔ "تمہیں سچ مچ اچھا لگا ہے عبداللہ۔"

"اوہ یس اٹس ایکسیلنٹ۔" وہ بولا۔

"اوہ؟" اس نے مطمئن ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس لمحے وہ عبداللہ کو بہت اچھی لگی۔ آج جس خود اعتمادی سے اس نے بات کی تھی عبداللہ اس میں یہی خود اعتمادی دیکھنا چاہتا تھا اور جس دھونس کا مظاہرہ اس نے کیا تھا' وہ اسے اچھا لگا تھا۔

آنکھیں کھول کر وہ مسکرا دی۔ "اب کھانا بھی نہیں کھلاؤ گے کیا' صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا اور کالج میں اتنا وقت نہیں ملا کہ کچھ کھا پی سکتی۔ بھوک سے میرا برا حال ہے۔"

"آتے ہی تو حکم نامہ جاری ہوا تھا کہ نہ کھانا کھانا ہے نہ سبز چائے پینی ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"اس وقت میں حالتِ جنگ میں تھی' اب صلح کر لی ہے۔" وہ بھی خوش دلی سے ہنس پڑی۔

☆======☆======☆

کھانے کی میز پر باغ کے سلسلے میں ہی ڈسکشن ہوتی رہی۔

"میں نے سارا پلان تو بنا دیا ہے' لیکن باقی کام میں نہیں کر سکوں گی۔ ہاں سرا کس سے متعلق سب کام میں کر لوں گی۔ باقی جتنا کام ہے وہ تم ہی کروانا۔ مجھ سے اناڑی پن میں کوئی غلطی ہو جائے گی اور تم کھڑے کھڑے نقص نکال دو گے۔"

"اب میں اتنی زیادہ تنقید بھی نہیں کرتا۔ بس جہاں غلطی محسوس ہوا سے ٹھیک تو کرنا ہی

چاہیے۔اینی وے' مجھے تم سے سرامکس سے متعلق ہی کام لینا ہے۔''

''تمہیں میرے ڈیزائن کیے ہوئے گملے پسند آئے؟''

''اوہ یس! بہت زیادہ اور اب تم یہ بتاؤ کہ تم نے خرچ کا اندازہ کتنا لگایا ہے؟'' وہ بولا۔

''یہیں کہیں رکھا ہوا تھا وہ لفافہ۔'' عبداللہ نے باقی کاغذوں میں وہ لفافہ تلاش کیا ا کھول کر پڑھنے لگا۔

''ہوں' تو فی الحال تمہیں کتنا ایڈوانس چاہیے؟''

اس نے کاغذ دوبارہ لفافے میں رکھ دیا۔

''تم خود اندازہ لگا لو' میں نے نہیں لگایا۔'' وہ سبز چائے کی پیالی سے کھیلنے لگی۔

عبداللہ نے ملازم کو طلب کیا۔

''میری دراز سے چیک بک لے آنا۔''

''جی شاہ صاحب۔'' وہ بولا اور مڑنے لگا۔

''نہیں عبداللہ۔'' ماہ بانو نے ایک دم کہا۔''ہم میں سے کسی کا اکاؤنٹ نہیں ہے۔اص میں کبھی اکاؤنٹ کھلوانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔''

''اوہ اچھا!'' پھر وہ ملازم سے مخاطب ہوا۔''اندر سے بیس ہزار روپے لے آنا۔''

جب تک ملازم نہیں آیا' وہ سبز چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی رہی۔

''مجھے اب چند دنوں کے لیے مری جانا ہے۔'' عبداللہ نے بتایا۔

''خیریت ہے ناں؟'' اس کے ذہن میں زہرا سے ہونے والی گفتگو تازہ ہوگئی۔

''ہاں! دعا کرو خیریت ہی رہے۔''

''ایسی کیا بات ہے کہ تم خیریت کے سلسلے میں مشکوک ہو؟'' اس نے سرسری سے اند میں پوچھا۔

''گڑیا بتا رہی تھی کہ اس نے تم سے بھی بات کی تھی۔'' وہ بولا۔

''ہاں' لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ تم سے بھی بات کر چکی ہے۔''

''کوئی ایک مسئلہ تو ہے نہیں' جسے سیٹل کرنا ہو۔''

''عبداللہ تمہارے مزاج میں اس قدر تحمل اور ٹھہراؤ ہے کہ بعض اوقات تو مجھے حیرت ہ ہے لیکن کبھی کبھار تم پتا نہیں کس جنون میں مبتلا ہو جاتے ہو۔کیوں کرتے ہو ایسا۔اب ضرورت تھی اپنی گاڑی دوطرفہ فائرنگ کے درمیان لے جانے کی؟ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ جاتا تو؟ تم نے پچھلی مرتبہ تو میری بات نہیں مانی تھی' لیکن پلیز اس مرتبہ مان لو' اگر زینی اور تم کزن ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں' تو یہ کوئی بڑی بات تو نہیں ہے۔پلیز انہیں کچھ مت کہنا

''نہیں' میں کسی جنون میں مبتلا نہیں ہوتا۔میرے ساتھ وہی صورت ہے کہ میں دھاوا

صورت میں بولتا ہوں جب مدافعت کی کوئی صورت نہیں رہتی۔'' پھر قدرے توقف سے بولا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اس مسئلے کو کیسے حل کروں۔زینی سوچ سمجھ نہیں رہی۔میں نے اسے ہر بات سمجھائی ہے اور بار بار سمجھائی ہے' سبط حسن کو بھی سمجھایا ہے لیکن ان دونوں کو معاملے کی نزاکت کا احساس نہیں ہے۔زینی تو خیر کچھ بھی سننے کی روادار ہی نہیں ہے۔سبط سمجھتا ہے لیکن ذہنی طور پر قبول نہیں کرتا اور میری مشکل یہ ہے کہ میں اپنی کسی بہن کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتا۔میں نے گھر سے دور رہ کر جتنا ان رشتوں کو سمجھا ہے اتنا قریب رہ کر نہیں سمجھ سکتا تھا۔میرے لیے سب سے اہم چیز رشتے ہیں۔اب اپنے سے وابستہ لوگوں کو میں دکھ' تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ زینی میرے لیے اس بیکار کی دشمنی سے زیادہ اہم ہے۔میں نے اس سے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے گی۔میں اس کا ساتھ دوں گا' مگر سبط مجھے یہ گارنٹی تو دے کہ اس کے ساتھ شادی کر کے زینی کی زندگی تباہ نہیں ہوگی۔''

ملازم آیا اور خاموشی سے ایک لفافہ عبداللہ کے سامنے رکھ کر واپس پلٹ گیا۔

عبداللہ نے سگریٹ نکالیا۔''یہی سب کچھ میں بھی سوچ رہا ہوں اور اسی لیے زینی کو سوچنے سمجھنے کے لیے چند دن کا وقفہ دے کر آیا ہوں۔شاید وہ جذباتیت سے ہٹ کر کوئی فیصلہ کر لے۔''

''تم نے اپنے بابا اور اماں جان کو بتایا؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''ابھی نہیں' انہیں بھی بتانا ہوگا۔اماں جان یوں بھی سخت ٹینشن میں مبتلا رہتی ہیں۔وہ بہت پریشان ہوں گی یہ سن کر۔''

''میں سمجھ رہی ہوں۔'' ماہ بانو نے کہا۔''لیکن عبداللہ! تم گھر والوں کو ایک بات کا فائدہ ہے کہ تم لوگوں میں کمیونی کیشن گیپ نہیں ہے۔تم سب کسی مسئلے کو دیکھ کر شور شرابا کرنے کے بجائے اسے مل جل کر حل کرتے ہو۔تم دیکھنا یہ مسئلہ بھی ان شاءاللہ حل ہو جائے گا۔

اور پھر یہ بھی ہے کہ جو دشمنی چل رہی ہے' اس کا اختتام کہیں تو ہونا چاہیے۔کسی کو تو کرنا چاہیے جس دشمنی کا بیج چوبیس سال قبل بویا گیا تھا اسے اب ختم ہونا چاہیے۔ایک عورت خواہ کتنی خوبصورت' کتنی اچھی کیوں نہ ہو' اس کی خاطر نسلوں کو دشمنی کی آگ میں نہیں جھونکنا چاہیے۔''

عبداللہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔''یہ کس عورت کی بات کر رہی ہو تم؟''

ماہ بانو کو ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا۔''کچھ نہیں یونہی منہ سے نکل گیا تھا۔''

''کچھ تو تھا۔'' وہ بولا۔''جب سے تم سے ملاقات ہوئی ہے۔تمہاری باتیں سنی ہیں۔تب سے مجھے مسلسل یہ احساس ہو رہا ہے کہ تم ہمارے خاندان کی کسی ایسی لڑکی سے واقف ہو جسے شاید صرف چند لوگ ہی جانتے ہیں۔تم نے میرے نام پر بھی ایسے انداز میں تبصرہ کیا تھا' جیسے یہ جانتی ہو کہ یہ نام رکھنے والا کون تھا۔''

''یہ سب بیکار کی باتیں ہیں عبداللہ' جو گزر گیا وہ اتنا اہم نہیں ہے جتنی اہم یہ بات ہے کہ جو ہونے والا ہے اسے بہتر بنایا جائے۔'' پھر اس نے موضوع تبدیل کر دیا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے' میں چلتی ہوں۔''

عبداللہ نے میز پر رکھی گاڑی کی چابی اور روپوں کا لفافہ اٹھا لیا۔

''چلو' لیکن پہلے یہ لے لو۔'' اُس نے لفافہ ماہ بانو کی طرف بڑھایا۔

''تھینک یو۔'' لفافہ لیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ پھیل گئی جو اپنی محنت کا سب سے پہلا معاوضہ لیتے ہوئے خود بخود چہرے کو منور کر دیتی ہے۔

☆======☆======☆

زینی اور سبط حسن دونوں قالین پر کشن رکھے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ آس پاس ہمیشہ کی طرح کتابوں اور کاغذوں کا ڈھیر تھا۔ انہی کتابوں اور کاغذوں کے درمیان کیسٹوں کا ریک بھی پڑا ہوا تھا۔ کیسٹیں ریک میں کم اور قالین پر زیادہ تھیں۔ ڈیک پر اونچی آواز میں گو ویسٹ لگا ہوا تھا۔

زینی سر جھکائے فزکس پڑھ رہی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ چہرے پر آئی ہوئی تھی جسے بار بار وہ ہاتھوں سے پیچھے کر رہی تھی۔

سبط حسن کے لیے ارتکاز مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن موجودہ مسئلوں میں الجھا ہوا تھا۔ زینی کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا لیکن اس نے زبردستی خود کو کام میں الجھا رکھا تھا۔

کچھ دیر کام کرتے رہنے کے بعد وہ پنسل کا پچھلا سرا منہ میں ڈال کر گانا سننے لگی۔

''کام ختم کر لیا؟'' سبط نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

''میوزک ڈسٹرب کر رہا ہے تو میں بند کر دیتا ہوں۔''

''یہ بند ہو گیا تو جو تھوڑا بہت موڈ بنایا ہے پڑھنے کا وہ بھی ختم ہو جائے گا۔'' اس نے کہا اور وہ کاغذ جس پر لکھ رہی تھی' باقی کاغذوں کی طرف اچھال دیا۔

''اِدھر دو' میں ہیلپ کر دیتا ہوں۔'' سبط نے اپنی کتاب بند کر دی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے' مجھے یہ آتا ہے۔ میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔''

''کیا سوچ رہی تھیں۔''

''کتنا اچھا گانا لگا ہوا ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے ہم دونوں بھی ویسٹ چلے جائیں۔''

''وہ کیوں؟''

''سن نہیں رہے؟ وہ اس لیے۔'' زینی بولی۔ ''کہ وہاں نیلا آسماں ہو گا' زندگی پُرسکون ہو گی' ہر طرف خوبصورتی ہو گی۔ یہاں بہت گھٹن ہے۔''

''یہ صرف Pet Shop Bags کا پروپیگنڈا ہے۔'' سبط ہنسا۔ ''چاہو تو کلنٹ ایسٹ وُڈ کی کوئی فلم دیکھ لو۔ گولیوں کی بارش میں زندہ رہنا پڑتا تھا وہاں۔''

''ایسا کیوں ہے؟ ہر طرف یہی سب کچھ ہے۔ آخر کیوں؟ کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں سکون ہو۔ یہ ڈر نہ ہو کہ ہماری خوشیوں کو کسی کی نظر لگ جائے گی۔'' زینی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

دروازے میں کھڑا عبداللہ یہ سارا منظر خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

''سکون اور بے سکونی انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ورنہ کیا یہاں آسمان نیلا نہیں ہے۔ ہر وہ جگہ خوبصورت ہوتی ہے۔ جہاں کے لوگ خوشیوں کے ساتھ زندہ رہنا جانتے ہیں۔''

زینی ایک بار پھر گانے کے سحر میں کھو گئی۔ پھر قدرے توقف سے بولی۔

''کاش! ویسٹ ایسا ہی ہوتا۔ پھر ہم دونوں وہیں چلے جاتے۔ کبھی واپس نہ آتے۔''

عبداللہ نے دروازے پر دستک دی۔ ان دونوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ زینی کی نظر جونہی اس پر پڑی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔

''بھائی آپ؟''

''ہوں' تم ٹھیک ہو۔''

''ہاں' آئیں بیٹھیں۔''

وہ وہیں ان کے ساتھ نیچے بیٹھ گیا۔ سبط اس سے ہاتھ ملانے کے بعد جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

''میں اب چلتا ہوں۔''

''تم کہاں چلتے ہو' بیٹھو یہاں۔'' عبداللہ نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

زینی کے ہونٹوں پر سکون بھری مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

''یہاں پڑھائی نہیں ہو رہی تھی۔ گانے سنے جا رہے تھے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''نہیں بھائی' تھوڑی تھوڑی سی پڑھائی بھی ہو رہی تھی۔ گانے سنے بغیر تو نہیں ہو سکتی ناں پڑھائی۔'' زینی نے جلدی سے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔''

اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ تینوں پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

''اب ذرا سیریس بات بھی ہو جائے۔'' عبداللہ نے کہا۔

زینی کے چہرے پر تناؤ کے آثار پیدا ہو گئے اور پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کھرچنے

لگی۔

"جو بات ہونی تھی بھائی! وہ تو ہو چکی، اب مزید کیا بات کریں گے۔" وہ بولی۔

"نہیں، ابھی بہت سی باتیں کرنا باقی ہیں۔" عبداللہ نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ منتخب کیا۔ "تم نے جذبات میں فیصلہ کر لیا اور اب اسی ضد پر قائم ہو، لیکن میں تمہیں محض ایک جذباتی فیصلے کی نذر نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ سبط تمہیں کس حد تک تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔"

"یہ غلط ہے بھائی! فیصلے کا اختیار مجھے دینے کے بعد آپ اپنا فیصلہ مجھ پر مسلط کرنا چاہتے ہیں اور......"

"ٹھہرو زینی! مجھے بات کرنے دو۔" سبط نے اس کی بات کاٹی اور عبداللہ سے مخاطب ہوا۔

"کس قسم کی Securities چاہئیں آپ کو؟ سیکیورٹیز تو نہ کسی کو آپ دے سکتے ہیں اور نہ میں۔ ہم تو یہ تک نہیں جانتے کہ اگلی سانس بھی لے سکیں گے یا نہیں، کسی اور کو کیا تحفظ فراہم کریں گے۔"

"ہم اس اُمید پر مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہیں کہ ہم اگلا سانس لے سکیں گے اور میں اسی امید کی بات کر رہا ہوں۔ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے یہ ہم سب کا ایمان ہے لیکن یہ بھی ہمارا ایمان ہے کہ قتل اور خودکشی بھی ناجائز ہیں۔"

"This is too much بھائی! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں کہ سبط مجھے قتل کرنے لگا ہے؟" زینی چلائی۔

"میں نے یہ نہیں کہا ہے، لیکن تمہیں سیکیورٹیز کے بغیر اس حویلی میں لے جانا قتل کرنے کے برابر ہی ہے۔ تم نے کان بند کر لیے ہیں، نہ کچھ سننا چاہتی ہو اور نہ سمجھنا چاہتی ہو مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔

سبط! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں تم جانتے ہو کہ حویلی میں اس کی موجودہ پوزیشن تبدیل نہیں ہو گی۔ اس سلسلے میں تم کچھ کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ یہ دوستی تم لوگوں کو یہیں ختم کرنا پڑے گی۔" عبداللہ کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"آپ یہ نہیں کر سکتے، بھائی۔" زینی کے لیے صورتِ حال پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ "آپ ہمیں پریشرائز کر رہے ہیں۔ ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم الگ ہو جائیں، لیکن میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ ہماری زندگی میں ایسا نہیں ہو گا۔"

"زینی پلیز! مجھے بات کرنے دو۔" سبط نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"وہ تمہاری بات سنیں گے کب؟ اور کسی بات کی گنجائش ہے بھی نہیں۔"

"زینی! خاموشی سے بیٹھو اور مجھے سبط سے بات کرنے دو۔" عبداللہ نے اسے سختی سے ڈپٹ دیا۔

"بھائی!" اس نے بے یقینی سے عبداللہ کی طرف دیکھا، آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔

"آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں بھائی! مجھے آج تک کسی نے نہیں ڈانٹا۔ اماں بابا نے بھی نہیں، آپ کو میں اتنی بری لگنے لگی ہوں کہ آپ نے مجھے اتنی سختی سے ڈانٹ دیا۔"

"اوہ گاڈ!" عبداللہ کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"انہوں نے تمہیں ڈانٹا نہیں ہے زینی، تمہیں کوئی بھی نہیں ڈانٹ سکتا، پلیز! اب مجھے اور بھائی کو بات کرنے دو۔"

وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی، لیکن آنکھوں سے نکلنے والے آنسو اسی تواتر سے بہتے چلے آ رہے تھے۔ عبداللہ نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تم نے دیکھا ہے ناں سبط۔ یہ تو اتنی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ وہاں سب کے رویے کیسے برداشت کرے گی۔" عبداللہ کے لہجے میں تھکن تھی۔

"میں اسے وہاں لے جاؤں گا ہی نہیں۔" سبط نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

زینی چونک کر ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"بھائی اب تو آپ کو اعتراض نہیں ہے ناں؟"

ہتھیلی سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"پھر کہاں لے جاؤ گے؟" اس نے زینی کی بات نظر انداز کر دی۔

"کہیں بھی، بس یہاں نہیں رہیں گے۔ ابھی ہم پڑھ رہے ہیں۔ بابا جان چاہتے ہیں کہ مجھے مزید تعلیم کے لیے باہر بھجوا دیں۔ جب تک میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا تب تک تو آپ انتظار کر سکتے ہیں ناں۔"

عبداللہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں بھائی! He is right ابھی مجھے بہت پڑھنا ہے۔ بھائی بتائیں ناں۔" اس نے بے تابی سے کہا۔

"تمہارے بابا جان باہر بھجوانے سے پہلے نکاح نہ سہی، تمہاری منگنی ضرور کر دیں گے۔ ٹھیک ہے کہ پہلے خادم اور امداد بھی باہر سے پڑھ کر آئے تھے لیکن وہ بھی تمہارے بابا کے نزدیک انگیجڈ تھے۔"

"اتنی آسانی سے تو میں بھی ہاتھ نہیں لگوں گا۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہاری منگنی کے وقت نہ تمہاری وہاں موجودگی کی ضرورت ہو گی اور نہ

مرضی کی۔''عبداللہ نے کہا۔

''ایسی منگنی کی ذمہ داری بھی نہیں ہوگی مجھ پر۔''وہ بولا۔

''ہوں۔''عبداللہ پھر سوچ میں گم ہوگیا۔

زینی امید وبیم کے درمیان معلق پلک جھپکائے بغیر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ بھی اتنا آسان نہیں ہے لیکن ممکن ہے۔''عبداللہ نے کہا۔

''آپ نے یہی کہا ہے ناں کہ یہ ممکن ہے؟''زینی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ دوبارہ تصدیق اس نے ضروری سمجھی۔

''ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔''

زینی خوشی سے چیخ کر عبداللہ سے لپٹ گئی۔

سبط حسن کے چہرے پر بھی خوشی کے کتنے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔

''اچھا اب اپنے ہاتھ سے ہمیں اچھی سی چائے تو پلواؤ۔''عبداللہ نے اس سے کہا۔

''او یس! ابھی بنا کرلاتی ہوں۔''وہ خوشی خوشی کچن کی طرف چلی گئی۔

عبداللہ نے سینے میں اٹکی سانس باہر نکالی۔

''آپ اب بھی زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔''سبط حسن نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔

''مطمئن تو میں کبھی نہیں ہوسکتا۔اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ بدترین حالات میں سب سے محفوظ راستہ کون سا ہوسکتا ہے۔''

''میں پڑھنے کے بعد باہر ہی سیٹل ہونا چاہتا ہوں۔دنیا میں کروڑوں نہیں' اربوں انسان بس رہے ہیں' ہمیں بھی کوئی نہ کوئی جگہ مل ہی جائے گی۔ مجھے روپے پیسے' جائیداد وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔بس میں یہ چاہتا ہوں کہ اتنا پڑھ لکھ جاؤں کہ زندگی میں آسانی سے اپنے اور زینی کے لیے راستہ بنا سکوں۔''

''یہ سب اتنا آسان نہیں ہے' جتنا تم سوچ رہے ہو' لیکن میں زینی سے وعدہ کر چکا ہوں کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے گی' میں اس کا ساتھ دوں گا۔اینی وے' تمہیں چند باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔کوشش کرنا کہ یہاں تمہاری منگنی نہ ہو۔کسی بھی لڑکی کو اس طرح انتظار میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔یہ بہت تکلیف دہ بات ہوگی اس کے لیے۔

دوسری بات یہ کہ برطانیہ میں پڑھنے کے بجائے بڑے بابا کو امریکہ کی چوائس دینا۔کسی صورت میں بھی برطانیہ کا انتخاب مت کرنا۔بڑے بابا جان' میرے بابا جان' تمہارے بھائی سب وہیں سے پڑھے ہوئے ہیں۔اور وہاں ہم سبھی کے بہت سے رابطے ہیں۔بڑے بابا جان یقیناً یہی چاہیں گے کہ تم برطانیہ میں جاؤ' لیکن یہ بات تمہارے لیے پریشان کن ثابت ہوسکتی ہے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ امتحانوں کے بعد زیادہ عرصہ گاؤں میں مت رہنا۔بہت سے مسئلوں سے بچ جاؤ گے۔''

''میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں سوچ رہا ہوں۔''وہ بولا۔

''یہ بتاؤ سبط کہ ایک لڑکی کے لیے سب کو چھوڑ سکو گے؟''عبداللہ نے پوچھا۔

''ایک لڑکی کے لیے نہیں زینی کے لیے۔''وہ بولا۔

''بہت مشکل دعویٰ کر رہے ہو۔''

''آپ نے پوچھا تھا اس لیے بتا دیا' ورنہ مجھے دعوے کرنے کی عادت نہیں ہے۔میں صرف فیصلے کرتا ہوں اور ان پر عمل کرتا ہوں۔''اس نے بہت اطمینان سے کہا۔

اس لمحے وہ عبداللہ کو بالکل پیر صاحب اور اپنے بابا جان کا پرتو لگا۔فیصلوں کی نوعیت مختلف سہی' لیکن ایک مرتبہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ خوبی یا خامی لیکن یہ ان کے پورے خاندان کے مزاج کا ایسا حصہ تھا جسے ان میں سے کوئی بھی اپنے سے الگ نہیں کرسکتا تھا۔

اس کے لہجے نے عبداللہ کو ایک دم مطمئن کر دیا تھا' لیکن وہ ہر طرح سے تسلی کرنا چاہتا تھا۔

''زندگی کے بہت سے رخ ہیں۔سبط کیا خبر آئندہ کیا ہو' لیکن پلیز اسے اکیلا کبھی مت چھوڑنا۔کبھی پچھتاوا محسوس ہو تو مجھے ضرور بتانا' کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی بھیڑ میں وہ بالکل تنہا ہو جائے۔''

یہ کہتے سے سبط کو وہ ایسا بھائی محسوس ہوا جو اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے کچھ بھی کرسکتا تھا۔اسے ریشماں کا خیال آیا۔

''عبداللہ کو کچھ ہوگیا تو میں مرجاؤں گی۔''اس نے کہا تھا۔

اور تب سبط حسن کا دل چاہا تھا کہ دنیا کی سب خوشیاں اپنی بہن کے آگے ڈھیر کردے۔

''آپ پھر مجھے دعوے پر مجبور کر رہے ہیں جو میں کرنا نہیں چاہتا۔میں اتنا کہوں گا کہ آپ مجھ پر اعتبار کریں پلیز۔''

''بس' چائے آگئی۔''زینی ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔

''واہ اس وقت یہ جنت کی نعمتوں سے کم نعمت نہیں لگ رہی۔''عبداللہ نے خوش دلی سے کہا۔

زینی نے دونوں کو کپ پکڑائے۔

''اماں' بابا سے بات کرنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔''وہ بولی۔

''تو کرلو بات۔''

"انہیں تو میرا خیال ہی نہیں آتا۔ آج تین دن ہو گئے ہیں ان کا فون آئے ہوئے۔"

زینی نے ٹیلی فون اپنے قریب کھسکا لیا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔

☆======☆======☆

گیٹ سے کار اندر داخل ہوئی تو نوری نے پلکیں جھپکا کر بڑے سے مکان کو دیکھا۔ پورے ایک کنال کی کوٹھی جس کے سامنے بڑی سی سڑک تھی۔ دائیں ہاتھ خوبصورت لان تھا، جس میں خوش رنگ پودے لگے ہوئے تھے۔ باہر سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ مکان کتنا خوبصورت ہو گا۔

گیراج میں کار رکتے ہی وہ جلدی سے اتر آئی۔

"ایسے نہیں بے بی!" جنت بائی نے کار سے اترتے ہوئے سرزنش کی۔ "شوخی دکھاؤ، جوش اور حیرانگی نہیں۔"

"ہم بھول گئے تھے۔" اس نے جلدی سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

"یہ بھول چوک اس دروازے سے باہر چھوڑ آؤ۔" انہوں نے کہا اور گھر کے اندر داخل ہو گئیں۔

نوری بھی ان کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ سحرزدہ سی وہ سارے بنگلے میں پھرتی رہی۔ ایسا شاندار بنگلہ اس سے پہلے اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ دبیز قالین، صوفے، پلنگوں پر فوم کے گدے، تینوں کمروں اور ڈرائنگ روم میں ایئر کنڈیشنڈ، تین ٹی وی، وی سی آر، صاف ستھرے باتھ روم، جدید ترین کچن۔

یہ سب اس کا خواب تھا اور وہ اسی کی تعبیر پانے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ سفر کچھ طویل ہو گیا تھا، پیچیدہ بھی اور تکلیف دہ بھی۔ اس سفر میں وہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی تھی۔ زندہ رہنے کی خواہش بھی دم توڑ گئی تھی۔ پھر جنت بائی نے اسے سہارا دیا تھا یا پھر اس نے جنت بائی کو سہارا دیا تھا، لیکن اب وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو گئی تھیں۔

اسے یاد تھا جنت بائی نے اس سے کہا تھا۔

"تم یہاں نہیں رہنا چاہتیں، نہ رہو اس کے لیے کوئی تمہیں مجبور نہیں کر سکتا، لیکن ماتم کس چیز کا کر رہی ہو، جب تم یہاں آئی تھیں تو تمہارے ساتھ صرف جسم تھا، عزت تو راستے میں اپنی نادانی کی وجہ سے کھو آئی تھیں۔ جو چیز تم یہاں لائیں ہی نہیں ہم اس کا سودا کیسے کر سکتے ہیں؟ یہاں تو صرف جسم کا سودا ہوتا ہے اور یہ سودا کرنے کے لیے بھی کوئی تمہیں مجبور نہیں کر رہا۔

گھر سے بھاگ کر آنے والی لڑکیوں کا مستقبل یہی ہوا کرتا ہے۔ آج نہیں تو کل یہاں نہ سہی تو کہیں اور، تم یہی کرو گی، پھر یہاں یہ دھندا کرنے میں کیا حرج ہے؟

گھر سے نکلتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں کچھ خواب تھے۔ بڑی اسکرین، چکا چوند کر دینے

والی روشنیاں، پرستاروں کی لمبی قطار، چمکتی گاڑی اور محل نما بنگلہ کے خواب۔ ان خوابوں کی تعبیر میں تمہیں دے سکتی ہوں، صرف میں۔ کہیں اور چلی گئیں تو گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گی۔ میرے پاس رہیں تو وہ سب کچھ حاصل کر لو گی جس کی خواہش میں گھر سے قدم باہر نکالا تھا۔

اور جب اپنے خوابوں کی اتنی بھاری قیمت چکا چکی ہو تو ان سے دستبردار مت ہو، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ پھر دیکھو کہ میں تمہیں کن آسمانوں کی سیر کراتی ہوں۔"

اور اس نے اپنا ہاتھ جنت بائی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

گھر کے ٹیرس کی ریلنگ پر بازو ٹکا کر سڑک پر تیزی سے گزرتی رنگ برنگی گاڑیاں دیکھ کر یہ سب سوچتے ہوئے اسے اپنا اور سڑک کا دکھ ایک سا لگا۔

سرمئی بجری والی وہ سڑک نئے پرانے ماڈلوں کی گاڑیوں، سائیکلوں اور پھٹے ہوئے جوتوں تلے پل پل روندی جاتی تھی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کے بعد نئے سرے سے اسے بنانے کا اہتمام ہوتا تھا، گڑھے پڑ جاتے تھے، بجری ڈالی جاتی تھی، تارکول بچھتی تھی، سفید لائنیں لگائی جاتی تھیں اور یوں ایک مرتبہ پھر وہ ٹوٹنے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔

"میرے خدا!" اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ "میں نے خواب دیکھے تھے اور ان خوابوں نے مجھ سے ایک غلطی سرزد کروائی تھی۔ عورت کی ایک غلطی کی سزا کتنی طویل، کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے اور مرد ہر مرتبہ بچ جاتا ہے۔

میرے مولا میں نے اپنی سزا قبول کر لی ہے، نہ تو میں اپنی غلطی پر پردہ ڈالوں گی اور نہ تاویلیں پیش کروں گی، جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے، میں اسی کی مستحق تھی، لیکن جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے وہ کس سزا کا مستحق تھا؟

اگر تیری اس دنیا میں انصاف ہے تو اسے نہ سہی کسی ایسے ہی مرد کو میری آنکھوں کے سامنے سزا ضرور دینا، اس کے علاوہ میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتی۔"

☆======☆======☆

زینی اور سبط حسن واک کے لیے باہر نکلے ہوئے تھے عبداللہ لاہور جا چکا تھا۔

"بھائی، جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا ہے، میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" اس نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔

"پاگل! بھائی بہنوں پر احسان نہیں کیا کرتے۔ میں نے کچھ سخت باتیں کہی تھیں تو اس لیے نہیں کہ میں تمہیں ہرٹ کرنا چاہتا تھا، بلکہ اس لیے کہ میں تمہیں ہر وقت خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے آپ سے بہت مس بی ہیو کیا تھا۔ آپ نے مائنڈ تو کیا ہو گا۔ آپ سے سوری کرنی تھی۔" اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔

''بھول جاؤ وہ سب' صرف ایک بات یاد رکھنا۔'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے بھائی طرف دیکھا تھا۔

''بعض اوقات زندگی کے کسی موڑ پر انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اس نے جو فیصلہ کیا تھا' غلط تھا' جو کچھ زندگی سے اس نے چاہا تھا' وہ اسے نہیں ملا۔ اگر کبھی تمہیں اس بات کا احساس ہو تمہارا بھائی ہر وقت تمہارے ساتھ ہوگا۔

یہ زندگی ایسی کتاب نہیں ہے' جس کا آخری صفحہ پہلے پڑھ لیا جائے' اس لیے بہت سے ذہین لوگ بھی بعض اوقات غلطی کر لیتے ہیں۔ اندازے کی' سمجھنے کی' رویوں کو پرکھنے کی۔

تم اتنا یاد رکھنا کہ ہمارے دل اور گھر کے دروازے ہر وقت تمہارے لیے کھلے رہیں گے' کبھی تھک جاؤ تو لوٹ آنا۔''

اور اس وقت سبط حسن کے ساتھ چلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ ہمسفر ایسا ہو تو تھکنے کا کیا سوال؟

''کہاں گم ہو؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''سوچ رہی تھی کہ آسمان یہاں بھی نیلا ہے۔ انسان خوش ہو تو ہر جگہ خود ہی خوبصورت لگنے لگتی ہے۔''

☆======☆======☆

ماہ بانو' عبداللہ کے لان کے لیے گملے تیار کرنے میں ابا جی کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ اماں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں' جہاں عنقریب ایک شادی تھی۔ برسوں کے مراسم تھے' اماں ہاتھ بٹانے چلی گئی تھیں۔

وہ اور ابا جی کام میں مصروف تھے کہ پڑوس سے چھوٹو ابا جی کو بلانے آ گیا۔

''چاچا جی! ابّے نے کہا ہے کہ آپ بھی آئیں۔''

''اپنے ابّے سے کہو کہ میرے ابا جی مصروف ہیں۔ پتا نہیں یہ کمبخت شادی کب ختم ہو گی' کب گلی میں سکون ہوگا۔ لگتا ہے ملکہ الزبتھ کی دوسری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں' ختم ہونے میں ہی نہیں آتیں۔'' ماہ بانو نے جھلا کر کہا۔

''ابّے نے کہا ہے کہ لڑکے والے آئے ہوئے ہیں۔ حق مہر طے کرنے کے لیے محلے کے چار معتبر بندے ہونے ضروری ہیں۔'' چھوٹو نے بقیہ پیغام بھی کہہ سنایا۔

''میں بس پانچ منٹ میں آتا ہوں' بانو!'' ابا جی نے ہاتھ دھوئے۔

''پانچ منٹ؟ لکھوا لیں مجھ سے کہ پانچ گھنٹے سے پہلے نہیں آ سکیں گے۔ عجیب حماقت ہے' جن کی بیٹی ہے' وہی حق مہر بھی طے کریں گے' سارا محلہ اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ایسے وقت میں انکار تو نہیں کیا جا سکتا ناں' برسوں سے رشتہ داروں کی طرح رہ رہے

ہیں' عین موقع پر کیسے منہ پھیر لیں؟'' ابا جی نے کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن پلیز جلدی آئیے گا' میں دروازہ بند نہیں کر رہی تاکہ آپ جلدی آئیں۔ دیکھیں کتنا کام بکھرا ہوا ہے' مجھ سے اکیلے نہیں ہوگا۔''

''اچھا بابا' تم یہ تو کر لوگی ناں'' انہوں نے گملوں کی طرف اشارہ کیا۔

''سب کام کر لوں گی بس آپ جلدی آ جایئے گا۔''

ان کے جانے کے بعد اس نے اپنا کیسٹ پلیئر لگایا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ یہ چھوٹا سا کیسٹ پلیئر اسے ابا جی نے کالج میں داخلے کے وقت انعام کے طور پر دیا تھا۔

گندھی ہوئی مٹی اٹھا کر اس نے چاک پر رکھی اور بڑی مہارت سے اسے گملے کی شکل میں ڈھالنے لگی تھی۔

اسی وقت عبداللہ دروازے پر آیا۔ پہلے دستک دے کر اسے متوجہ کرنے کا ارادہ کیا' لیکن پھر یہ سوچ کر دستک نہیں دی کہ وہ کام کے دوران ڈسٹرب ہوگی۔

سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس ایپرن پہنے آستینیں چڑھا کر وہ سر جھکائے پوری توجہ اور انہماک سے گملا بنانے میں مصروف تھی۔ لمبے بالوں کو پیچھے کر کے ڈھیلا سا جوڑا بنا رکھا تھا۔ اس لمحے وہ دل میں اتر جانے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔

کیسٹ پلیئر چل رہا تھا اور لتا کے ساتھ ساتھ وہ بھی گنگنا رہی تھی:

خود سے کہنا' میں جاتی ہوں
خود سے کہنا' میں آتی ہوں
ایسا بھی تو ہوتا ہے ناں ہلکی سی تنہائی میں
تنہائی میں تصویروں کے چہرے بھرتے رہنا
خود سے باتیں کرتے رہنا' باتیں کرتے رہنا
آنکھیں موندے دن میں میٹھی راتیں کرتے رہنا

گملا مکمل کر کے اس نے سر اٹھایا اور اسی وقت اس کی نگاہ دروازے پر پڑی' جہاں عبداللہ سفید کرتے شلوار پر کشمیری دُھسہ لیے کھڑا تھا۔

ماہ بانو نے اسے بے شمار مرتبہ دیکھا تھا اور وہ ہر مرتبہ اس کی مردانہ وجاہت کی معترف ہوئی تھی لیکن اس وقت......!

اس وقت اسے دیکھ کر دل میں عجیب سی ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں؟ وہ سمجھ نہیں سکی۔ شاید اس کی وجہ عبداللہ کی آنکھوں میں نظر آنے والے عکس تھے۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ وہ غیر متوقع طور پر نہ جانے کب وہاں آیا تھا۔ ماہ بانو مبہوت سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''ہاں' اگر زرینہ خالہ حیدر بابا کو دیکھ کر محبت کا شکار ہو گئی تھیں تو یہ غلط نہیں تھا۔'' اس کے

ذہن میں خیال آیا۔''کاش! عبداللہ' ریشماں کا نہ ہوتا۔''

''خیریت ہے؟''وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔

''آں......ہاں!''وہ واپس پلٹ کر آئی۔یوں لگا جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

''پوچھوگی نہیں کہ کب اور کیسے آیا؟''

''یہی پوچھنے لگی تھی۔''اس نے جلدی سے کہا۔

''کل رات مری سے واپس آیا تھا تمہاری ہدایت پر عمل کیا تھا اور رات دس بجے یہاں میں اپنے بستر پر تھا۔صبح سوچا کہ تم سے ملنا چاہیے' اس لیے یہاں چلا آیا۔دروازے پر ابا جی سے کچھ دیر رسمی باتیں ہوئیں لیکن وہ جلدی میں لگ رہے تھے۔تمہارے متعلق بتایا کہ اندر ہو۔یہاں سے تمہاری خوبصورت آواز ابھر رہی تھی' اس لیے پورے گھر میں جھانکنا نہیں پڑا۔سیدھا یہیں چلا آیا۔''

''میری نہیں لتا کی خوبصورت آواز۔''اب تک وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔

''مجھے تو کوئی کورس سنائی دے رہا تھا۔''وہ بولا۔

''میں ذرا یہ بھٹی میں رکھ دوں' تب تک تمہیں کھڑا رہنا پڑے گا۔یہاں کرسی رکھنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔''

''میں بھی اتنا نازک مزاج نہیں ہوں کہ اتنی دیر کھڑا نہ رہ سکوں۔''اس نے کہا۔

''بات نازک مزاجی کی نہیں' مہمانداری کی ہے۔''ماہ بانو نے بھٹی کھول کر گملے اندر رکھے۔

''میرا خیال تھا کہ تم خاصی نکمی ہو۔اتنے بڑے بڑے گملے ابا جی ہی بنائیں گے لیکن آج پتا چلا کہ تم اتنی نکمی بھی نہیں ہو۔''

''چلو تمہیں پتا تو چلا اور میری کوئی چیز اچھی لگی' ورنہ تم نے باغ کے متعلق بنایا ہوا میرا پلان اتنی بے دردی سے رد کیا تھا کہ میں اس پر تمہیں قتل بھی کر سکتی تھی......''

''مقتول ہونے میں' میں کوئی حرج نہیں سمجھتا' بشرطیکہ قتل کرنے والے ہاتھ خوبصورت ہوں۔''وہ ہنسا۔

ماہ بانو کی نگاہ بے اختیار اپنے ہاتھوں پر پڑی جو بری طرح مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔

''اچھا پلیز! اپنے لیے صحن سے کرسی لے آؤ' یہیں بیٹھ جاؤ۔میں ساتھ ساتھ کام بھی کرتی جاؤں گی۔''اس نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

''میں تمہاری مدد کر دیتا ہوں اگر کوئی ایسا کام ہو جو میں کر سکتا ہوں تو مجھے بتاؤ۔''

''یہاں تم صرف ایک کام کر سکتے ہو کہ بیٹھ کر میرے ساتھ باتیں کرو۔باقی کام مجھے ہی کرنے ہوں گے۔''وہ مسکرا دی۔

''چلو یونہی سہی۔''

وہ صحن سے کرسی لا کر وہیں بیٹھ گیا۔

''اماں اور ابا جی پڑوس میں گئے ہوئے ہیں' مجھ سے ابا جی کے بغیر کام نہیں ہوتا۔اتنے ڈھیر سارے کام کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے کیا کام کیا جائے۔مجھے تو گھبراہٹ ہوتی ہے ایسے میں۔ابا جی ہوتے تو بتاتے جاتے کہ کس ترتیب سے کام کرنا چاہیے۔چاہے وہ کام کریں نہ کریں' لیکن ان کی موجودگی سے مجھے تسلی رہتی ہے۔''ماہ بانو نے مٹی چاک پر رکھی۔

''آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی ذمہ داری اٹھانے کی۔''

''مجھے تو مشکل ہی لگتا ہے۔اکلوتی ہونے کے باوجود میں نے کبھی ذمہ داری نہیں اٹھائی۔''وہ ہنسی۔

''اس لیے کہ کبھی ذمہ داری پڑی نہیں ہے تم پر۔''

''اوہ یاد آیا تم مری گئے تھے' خیریت ہی رہی ناں؟''نظریں چاک پر جمائے ہوئے اور ہاتھوں سے گندھی مٹی کو گملے کی شکل میں لاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''زینی کسی صورت آمادہ نہیں تھی میری بات سننے کے لیے۔''

''پھر......؟''

''پھر مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔''

''ایک زینی ہی نہیں تمہارا سارا خاندان ہی بہت مشکل پسند ہے' لیکن عبداللہ یہ ہوگا کیسے؟''

''میرے خیال میں تم میرے خاندان کے بارے میں مجھ سے کچھ زیادہ ہی جانتی ہو۔''

لمحے بھر کے لیے ماہ بانو نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم یہ بتاؤ کہ پھر ہوا کیا؟''اس نے بات کو دوبارہ اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے پوچھا۔

''ان کا ارادہ ہے کہ وہ پاکستان سے باہر ہی کہیں سیٹل ہوں گے۔آخر ایسی جگہوں کی کمی تو نہیں ہے جہاں تک بڑے بابا یا دوسرے افراد نہ پہنچ سکیں۔''

''اور تمہاری اماں اور بابا جان مان جائیں گے؟''

''انہیں میں مناؤں گا۔یہ بھی تو دیکھو ناں کہ ہمیں گڑیا اور زینی کی شادیاں کرنی تو ہیں ہی' کسی کو اس بات پر بھی اعتراض نہیں ہے کہ شادیاں ان کی پسند سے ہوں۔

بڑے بابا جان اس وقت بھی بہت فساد کریں گے جب ان دونوں کی شادیاں ہوں گی اور تب بھی وہ اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔اب یہ تو ممکن نہیں ہے ناں پاکستان میں شادی ہونے کی صورت میں گڑیا اور زینی اسی طرح چھپ کر رہیں جیسے آج تک رہتی آئی ہیں۔

دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی شادیاں کسی بہت مضبوط خاندان میں ہو
سے ٹکر لیتے ہوئے بڑے بابا کو بہت کچھ سوچنا پڑے اور دوسری صورت یہ ہے کہ شادی کر
بہنیں کہیں باہر سیٹل ہو جائیں۔

اب چاہے سبط حسن ہو یا کوئی اور ہمارے پاس ان کے علاوہ کوئی Options نہیں
تو پھر زینی کے لیے سبط ہی کیوں نہ ہو؟"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ زینی اور سبط حسن تو خوش رہیں گے مگر یہاں بہت ط
آئے گا۔"

"جانتا ہوں لیکن یہ ذمہ داری تو اٹھانی ہی پڑے گی۔"

ماہ بانو نے گملا چاک سے اتار لیا اور وہیں ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"طوفان تو ہر حالت میں آئے گا ہی' چاہے ان کی شادیاں کہیں بھی طے ہو جائیں'
پیر صاحب کا اپنا بیٹا ایسا کرے' اس پر تو وہ ایسی آفت مچائیں گے کہ بس......!" وہ بولی۔

"تم خود بھی تو یہ چاہتی تھیں کہ زینی اور سبط ایک ساتھ زندگی گزاریں۔" عبداللہ نے

"یہ تو میں اب بھی چاہتی ہوں مگر یہ سب معاملے اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ کوئی سرا ہا
نہیں آتا اور یہ جو پیر صاحب ہیں ناں' خاندان کے معاملے میں یوں بھی سخت گیر ہیں۔ خ
تعالیٰ کرے کہ سب اچھا ہو۔"

"اپنے خاندان کے متعلق اتنی باتیں میں کسی سے نہیں کرتا جتنی تم سے کرتا ہوں۔ گھ
اماں جان ہر وقت ٹینشن میں مبتلا رہتی ہیں۔ بابا جان منع نہیں کرتے' لیکن ان کے سوچنے کا
بالکل مختلف ہے اور زہرا بات بات پر جھلا اٹھتی ہے' اس لیے گھر میں کسی سے اس موضوع پر
نہیں کرتا میں۔

تم سے کہہ دیتا ہوں کیونکہ اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس تب سے ہے ج
سے پہلی مرتبہ ملا تھا۔ اپنے گاؤں کی' اپنے لوگوں کی خوشبو آتی ہے تم سے' یوں جیسے پردیس'
کر اپنا وطن اور اس میں بسنے والے بہت عزیز ہو جاتے ہیں ناں' اسی طرح جب یہاں ہوتا
تو اپنا گاؤں سب سے اہم لگنے لگتا ہے۔"

ماہ بانو نے پلکیں جھکا لیں اور ہاتھ سے مٹی کھرچنے لگی۔ "مجھے اچھا لگتا ہے جب
باتیں مجھ سے شیئر کرتے ہو۔"

عبداللہ مسکرایا۔

"کام تو ہوتا رہے گا' چلو چائے پیتے ہیں۔ یوں بھی تمہیں شکوہ تھا کہ میں نے تمہیں
نہیں پلوائی تھی۔" ماہ بانو نے موضوع تبدیل کیا۔

وہ دونوں کچن میں چلے آئے۔ ماہ بانو نے پانی بھری کیتلی چولہے پر رکھ دی۔

"پکوڑے کھانے کو بہت دل چاہ رہا ہے' بناؤں؟" اس نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

وہ بیسن نکال کر گھولنے لگی۔ "امتحان بھی ہونے والے ہیں۔"

"ہاں' اور کچھ عرصہ بعد مجھے بھی دوبارہ کالج جوائن کر لینا ہے۔ آزادی کا ایک سال ختم
ہونے والا ہے۔" وہ ہنسا۔

"اب تیار ہو جاؤ' فائنل ایئر ویسے بھی ٹف ہوتا ہے' تھیسز کا تصور ہی دل دہلا دیتا ہے۔"

"چھوڑو بھی۔ تم لڑکیاں پڑھائی کو کچھ زیادہ ہی سر پر مسلط کر لیتی ہو۔"

"ابا جی کی اتنی زیادہ توقعات ہیں مجھ سے۔ کبھی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ نہ جانے میں انہیں پورا
کر سکوں گی یا نہیں۔" وہ پکوڑے تلتے ہوئے بولی۔

"آگے سرامکس لینے کا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں' ابا جی کو مجسمہ سازی پسند ہے۔"

"اور تمہیں کیا پسند ہے؟"

"مجھے...... مجھے بھی یہی پسند ہے۔"

"اپنی زندگی پر تھوڑا سا حق اپنا بھی رہنے دو بانو' دوسروں کے ماتھے پر ابھرنے والی لکیروں
ں اپنا مستقبل مت تلاش کیا کرو۔ خواہ وہ تمہیں کتنا بھی عزیز کیوں نہ ہو۔"

وہ مسکرا دی۔ "میں نے ان باتوں کے متعلق سوچا ہی نہیں ہے۔ میں بہت چھوٹی سی تھی
ب ابا جی نے مجھے یہ خواب دیا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب سب بچے ڈاکٹر اور پائلٹ بننے کی
ئیں کرتے ہیں۔

بس اس کے بعد میں نے کسی اور طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ شاید دھیان دیا ہوتا تو کوئی
فیلڈ بھی اچھی لگ جاتی۔ میں آٹھویں میں تھی جب ابا جی نے مجھے ایک کتاب لا کر دی تھی۔
ئیکل اینجلو اور ڈوناٹیلو کے متعلق اور میں بہت امپریس ہوئی تھی ان سے۔"

"تم نے انہیں اتنی آسانی سے آرٹسٹ مان لیا! آج کل تو بچے انہیں ننجا ٹرٹل ہی سمجھتے
ہیں۔"

وہ دونوں ہنس دیے۔

"جب میں آٹھویں میں تھی تو ڈوناٹیلو' مائیکل اینجلو' رافیل اور لیناڈو ڈاونچی بھی آرٹسٹ
سمجھے جاتے تھے' تب تک وہ ننجا ٹرٹل نہیں بنے تھے۔" وہ چائے کی پتی چینک میں ڈال کر کیتلی کا
اس میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"ویسے تم سرامکس میں کام کرو تو بہت کامیاب رہو۔" عبداللہ نے کہا۔

"ہاں' لیکن یہ کام تو مجھے آتا ہی ہے۔ ویسے میں چاہے کسی فیلڈ میں بھی چلی جاؤں' یہ کام

میں نہیں چھوڑ سکتی۔شاید یہ خون کا اثر ہے۔''
چائے کے کپ اور پکوڑے لے کر وہ دونوں پھر واپس آ گئے۔ گیلی مٹی' کچھ کچے اور تیار شدہ برتن ترتیب سے وہاں پڑے تھے۔
''مجھے معلوم تھا کہ ابا جی اتنی جلدی نہیں آئیں گے۔''
وہ چائے کی پیالی رکھ کر ایک مرتبہ پھر کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔عبداللہ کافی دیر اس پاس بیٹھا رہا۔انہوں نے اِدھر اُدھر کی بے شمار باتیں کیں۔کالج' گھر' آرٹ اور نہ جانے کن موضوعات پر۔
عبداللہ کے جانے کے بعد مٹی سے سنے ہاتھوں سمیت ماہ بانو نے وہیں پیڑھی پر پشت دیوار سے ٹکالی۔
''آج اچانک کیا ہو گیا۔''اس نے سوچا۔''دل میں ایسی ہلچل پہلے تو نہیں ہوئی تھی۔ اچھا تو وہ ہمیشہ سے لگتا آیا تھا۔پتا نہیں کب سے' لیکن یہ طے ہے کہ وہ تب سے اچھا لگتا آ جب ابھی میں اس سے ملی بھی نہیں تھی۔
اور جب ملی تو وہ زیادہ اچھا لگا۔شاید اس لیے کہ عام مردوں سے بہت مختلف ہے۔ متحمل اور Caring اور دوسری طرف عزم و حوصلے والا' مضبوط اور ضرورت پڑ...... جارحیت پسند۔
''لیکن ریشماں؟''وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔
''کیا ہوا بانو تھک گئی ہو؟''
ابا جی کی آواز اسے سوچ کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔
''جی!''اس نے اسی قدر کہا۔
''میں جلدی آ جاتا' لیکن انہوں نے روک لیا۔لڑکی والے بہت زیادہ حق مہر رکھوانا تھے اور لڑکے والے اتنے زیادہ پر راضی نہیں تھے۔بس اسی کھینچا تانی میں دیر ہو گئی۔''ابا گندھی ہوئی مٹی اٹھالی۔
''یہ سب فضول باتیں ہیں۔روپیہ پیسہ بھی کبھی سیکورٹی ہوا کرتا ہے۔حق مہر چا لاکھ روپے لکھوا لیں لیکن لڑکی خوش نہ ہو تو دس لاکھ بھی اسے کیا دیں گے؟ اصل بات رویوں کی' جن کی کوئی بھی گارنٹی نہیں دے سکتا۔یہ اچھے ہوں تو ہر مسئلہ خود ہی حل ہو جاتا یہ برے ہوں تو روپیہ پیسہ بھی کام نہیں آتا۔''وہ بولی۔
''لوگ ان باتوں کو نہیں سمجھتے' وہ ہر چیز کی فیس ویلیو دیکھتے ہیں۔''ابا جی نے کہا۔
''ہماری زرینہ خالہ کے پاس کس چیز کی کمی تھی؟ روپیہ پیسہ' کپڑا' زیور سب کچھ تو
ابا جی کو خیال آیا۔''ہاں' وہ عبداللہ آیا تھا ناں......؟''

''جی بیٹھا رہا۔''
''اسے گملے اچھے لگے؟''
''بہت اچھے۔''
''بس اس سے سرسری سی بات ہوئی تھی۔اس وقت میں جلدی میں تھا۔''
''ہوں' بتا رہا تھا مجھے۔''وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔''میں اب کالج کا تھوڑا سا کام کر لوں۔''
''تم نے تھیوریز بھی تیار کرنی شروع کی ہیں؟ میں نے تمہیں تھیوریز کو ہاتھ لگاتے کبھی نہیں دیکھا۔''ابا جی نے کہا۔
''ابا جی!وہ تو ہمارے کالج کی روایت ہے کہ پیپر دینے سے ایک دن پہلے ہی سب تھیوریز کو تیار کرتے ہیں۔ہسٹری آف کلچر میں کیا ہے۔اسٹون ایج' میسو پوٹیمیا مصری اور یونانی آرٹ وغیرہ ہیں۔اس میں ہے کیا ایسی چیز جو اتنے پہلے سے پڑھنا شروع کر دی جائے۔ Visual Arts بھی [illegible] خالص نہیں ہے اتنی بیسک سی چیزیں ہیں اس میں' ایڈورٹائزنگ' ٹیکسٹائل' منی ایچر' Sculpture (سرامکس) وغیرہ۔اس میں مشکل کیا ہے اور ہیومن انجینئرنگ ہے۔ابا جی یہ سب تو اتنا آسان ہے۔''
وہ صحن میں آ گئی اور پیڑھی پر بیٹھ کر حمام کے نیچے ہاتھ دھونے لگی۔
''عبداللہ کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ بھی............!''
ہاتھ دھوتے ہوئے اس کی ذہنی رو پھر اسی طرف چل پڑی' لیکن بروقت تمام اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا اور اپنے کمرے میں آ کر پلاسٹر آف پیرس کے بلاک کی چیزل اور ہتھوڑی کی مدد سے Non Objective Form بنانے لگی۔دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا' لیکن اس نے خود کو کام میں جوت رکھا تھا۔
''عبداللہ نے کہا تھا کہ وہ یہ سب باتیں مجھ سے شیئر کرتا ہے کیونکہ مجھ سے اسے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔''
اس نے چیزل پٹخ دیا۔
''کس قدر فضول باتیں سوچ رہی ہوں میں۔ریشماں کو پتا چل جائے کہ میں یہ باتیں سوچ رہی ہوں' تو اسے کتنا دکھ ہو۔اسے مجھ پر اتنا اعتبار ہے اور میں..........''اس نے سوچا۔
اپنا ذہن اس سمت سے ہٹانے کے لیے اس نے پھر کام کرنا شروع کر دیا' لیکن عبداللہ کی طرف سے ذہن ہٹانا اس کے بس میں نہیں تھا۔
''اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ عبداللہ تو بہت پہلے سے میرے دل میں تھا۔تب سے جب میں نے ابھی اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ہاں مجھے اس بات کا شعور نہیں تھا یا شعور تھا تو بھی میں اسے دبانے کی کوشش کرتی رہی۔''

اس نے چیزل اور ہتھوڑی رکھ دی اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ دن بہت خوبصورت تھے جب میٹرک کے امتحانوں کے بعد وہ چھٹیاں گزارنے گاؤں گئی تھی۔ ایف اے کے امتحان دینے کے بعد بھی وہ گاؤں چلی گئی تھی۔ وہ ہر روز ریشماں سے ملنے جاتی تھی اور پھر دونوں مل کر ڈھیر ساری باتیں کرتی تھیں۔ گھر، اسکول اور کالج کے قصوں کا ڈھیر تھا ماہ بانو کے پاس اور ریشماں کے پاس کچھ نہیں تھا سوائے ایک خواب کے۔

عبداللہ......!

وہ خواب بُنتی رہتی...... بُنتی رہتی حتیٰ کہ ماہ بانو تنگ آ جاتی۔

''تم کیا ہر وقت ایک ہی گردان کرتی رہتی ہو، تنگ بھی نہیں پڑتیں۔''

ریشماں ہنس پڑی۔ ''میں بھی تو تمہاری باتیں سنتی ہوں، تم سے میری ایک بات بھی نہیں سنی جاتی۔''

''میری باتیں اتنی بورنگ تو نہیں ہوتیں اور میں تمہاری طرح ایک ہی قصے کی ٹانگ نہیں پکڑے رہتی۔ اس بے چارے کی تو ہچکی ہی بندھ جاتی ہوگی۔''

''ہچکی بندھتی نہیں ہوگی، ہچکی آتی ہوگی۔'' ریشماں نے تصحیح کی۔

''جتنا ذکر تم کرو ہو، اس سے تو ہچکی بندھتی ہی ہوگی۔ یہ تک تو پتا نہیں کہ موصوف آج کل ہوتے کہاں ہیں؟''

''اس کا تو پتا ہے۔'' ریشماں نے شرارت سے کہا تھا۔

''کہاں؟''

''میرے دل میں۔'' وہ زور سے ہنستی۔

اور اس قہقہے میں ماہ بانو بھی شامل ہو جاتی۔

''سارا وقت کان میرے کھاتی رہتی ہو، اور دل میں رکھا ہوا ہے عبداللہ کو، میرے کان ا فالتو ہیں کیا؟''

''ارے نہیں، تم تو میری، بہت پیاری بہن ہو، تم بھی میرے دل میں ہی رہتی ہو۔''

''واہ.......... واہ کیا زبردست اکاموڈیشن ملی ہوئی ہے ہمیں۔ دل تمہارا ہے اور وہاں رہے ہیں میں اور عبداللہ۔ ذرا دھیان رکھنا، ایسا نہ ہو جائے کہ تمہارے پاس دل ہی رہ جائے مکین اکاموڈیشن تبدیل کر لیں۔'' ماہ بانو نے شرارت سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''کہیں بھی جانے کی کوشش کرو، میرے دل سے نہیں نکل سکو گے۔''

''اچھا چلو، اب ایک ہی جگہ رہنا ہوا تو کیا جھگڑتی پھروں عبداللہ سے۔ آج سے اس سے صلح۔ اب تم اس کے متعلق کتنی باتیں کرتی رہو گی، تب بھی میں بور نہیں ہوں گی۔''

رفتہ رفتہ عبداللہ اس کا بھی پسندیدہ موضوع بن گیا تھا۔ اس سے ملنے، دیکھنے اور با

کرنے کا شوق بڑھتا جا رہا تھا۔

ہاں اس سے ملنے سے پہلے یہ ڈر تھا کہ کہیں اس سے مل کر مایوسی نہ ہو وہ ویسا نہ ہو جیسا اس نے سوچا تھا۔

مگر وہ تو اس سے بھی زیادہ اچھا تھا، جتنا ماہ بانو نے سوچا تھا۔ اس کے مزاج کے کتنے ہی رنگ تھے اور سب کے سب خوبصورت۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے دل میں اترا تھا۔ بالکل دبے قدموں، اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ شخص دوست سے بہت اچھا دوست کب بنا تھا اور کب بہت اچھے دوست سے بھی بڑھ گیا تھا۔

''ہاں وہ سعد تھا۔ میرا پاگل پن، میری حماقت...... میری انا کی تسکین کا ایک ذریعہ۔ محبت کیا ہوتی ہے، یہ تو اب پتا چلا ہے۔

میں نے عبداللہ کے سراپے سے محبت نہیں کی، نہ ہی یہ پہلی نظر کی محبت تھی۔ یہ تو تب سے میرے اندر ہے جب میں نے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ ہاں تب سے میں نے اسے تراشنا شروع کیا تھا۔ آہستہ آہستہ سب خدوخال واضح ہو گئے۔ ہر رویہ، ہر سوچ اس پیکر کو نکھارتی گئی۔

اور جب وہ سامنے آیا تو مجھے اسے دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے بات کی تب بھی نہیں۔ اس نے اپنے رویے ظاہر کیے تب بھی نہیں۔

کیونکہ وہ اس پیکر سے مختلف نہیں تھا، جسے شعوری یا لاشعوری طور پر میں نے تراشا تھا مگر آہ......!''

اس نے بند آنکھیں کھول لیں۔ اس کا کمرا ویسا ہی تھا، اسی طرح پلاسٹر آف پیرس کے چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ چیزل اور ہتھوڑی پاس پڑے ہوئے تھے، سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسا آنکھیں موندنے سے پہلے تھا۔ صرف اندر کی دنیا تلپٹ ہو چکی تھی۔

''میں سوچتی تھی ناں، جیسے میرے گرد کوئی کہانی بُن رہا ہے۔ چھٹی حس کہتی رہی کہ مجھے عبداللہ سے دور ہٹ جانا چاہیے اور میں یہی سوچتی رہ گئی کہ کیا صرف چھٹی حس کی بنیاد پر؟

میں نے بے سوچے سمجھے خالہ کی صندوقچی کھول لی اور ساری بلائیں باہر نکل آئیں۔ پتا نہیں آگے کیا ہونے والا ہے۔ کالج کی سرخ اینٹوں سے بنی عمارت، مسجد کے سفید روشن مینار اور پیر صاحب کی حویلی، نہ جانے یہ مثلث سچ مچ مجھے گھیر رہی ہے یا میرا واہمہ ہے۔

سب کچھ ہو جائے، بس یہ محبت گہری نہ ہو، یہ مٹ جائے۔ ایسے کہ اس کا نشان بھی باقی نہ رہے۔ میں اپنی بہن، اپنی ریشماں کے خواب کیسے چھین لوں۔ عبداللہ پر صرف ریشماں کا حق ہے۔''

☆======☆======☆

پورا کالج امتحانوں میں مصروف ہو چکا تھا۔ ایگزام پرابلمز اور تھیوریز کے پرچوں۔ سب کچھ بھلا دیا تھا۔ پھر تھیسز ڈسپلے کی مصروفیت اور اس کے بعد نئے تعلیمی سال کا آغاز۔

ماہ بانو کی کوشش تھی کہ وہ عبداللہ سے دور دور ہی رہے اور عبداللہ کا خیال تھا کہ وہ مصروف تھی۔

نئے سال کے آغاز سے عبداللہ نے دوبارہ کالج جوائن کیا تھا۔ اس کے پاس Sculpture میجر اور پینٹنگ Minor تھا۔ یہی کمبی نیشن ایڈی کا بھی تھا۔

ڈرائنگ کی کلاس کا ایک ہفتہ گزارنے کے بعد اگلے ایک مہینے تک ماہ بانو کے سیکشن کی Sculpture کی کلاس شروع ہو گئی تھی۔ ایک ہی جگہ کام کرتے ہوئے یہ مشکل تھا کہ عبداللہ نظر انداز کیا جاتا۔

ماہ بانو کی کلاس کو سب سے پہلے کھوپڑی بنانے اور پھر اس پر چہرہ بنانے کی اسائنمنٹ ہوئی تھی۔ اس وقت وہ یہی کام کرنے میں مصروف تھی کہ عبداللہ اس کے پاس چلا آیا۔

''اس سے پوچھو بانو کہ اس نے جس لنچ کا وعدہ کیا تھا' وہ اس جنم میں مل جائے گا یا اس کے لیے اگلے جنم کا انتظار کرنا ہوگا؟'' اُما نے کہا۔

''بس لنچ کی آفر ختم۔ بانو نہیں جائے گی تو لنچ بھی نہیں ہوگا۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''بہت کنجوس مکھی چوس ہو اور بانو!'' وہ اس کی طرف مڑی۔ ''تم کیوں نہیں جاؤ گی؟''

''مجھے اجازت نہیں ہے۔'' اس نے کام کرتے ہوئے کہا۔

''اجازت میں لے دوں گا' تم چلنے کی بات کرو۔''

''تم لے دو گے؟'' اس نے سر اٹھایا۔ ''اور تمہارے جانے کے بعد اماں جی سارا حساب مجھ سے لیں گی۔ نہیں جی' بہت شکریہ آپ کا۔ آپ کی اس مہربانی سے مجھے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''اماں کی بات ہے ناں' وہ کچھ نہیں کہیں گی تمہیں۔''

''میری اماں کو تم زیادہ جانتے ہو یا میں؟''

''اچھا چھوڑو' یہ بتاؤ کہ میرے لان کا کیا بنے گا؟''

''بس اس جمعہ کو سب چیزیں تمہارے گھر پہنچ جائیں گی لیکن پلیز اپنے ان بدصورت کتوں کو باندھ کر رکھنا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''سنا اُما! یہ بہترین قسم کے ڈوبر مین کو بدصورت کتے کہہ رہی ہے۔'' وہ اُما سے مخاطب ہوا۔

اُما اور عبداللہ کھڑے باتیں کرتے رہے اور ماہ بانو کام کرنے میں مگن ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایڈی بھی ان کے پاس چلا آیا۔

''اُما! تمہارے لاکر میں کچھ گنجائش ہے۔''

''ہاں' کچھ رکھوانا ہے کیا؟''

''ہوں' کچھ چیزیں ہیں' چابی دے دو۔ میں خود رکھ آتا ہوں۔'' ایڈی بولا۔

''چابی تو لے لو لیکن کیا یہ مجھے واپس مل جائے گی یا پھر لائبریری کارڈ کی طرح یہ بھی داغِ مفارقت دے جائے گی۔''

''اردو اچھی ہوتی جا رہی ہے تمہاری۔'' وہ اس کے ہاتھ سے چابی لیتے ہوئے بولا۔ ''اور لائبریری کارڈ پر اب فاتحہ پڑھ لو۔ ویسے بھی تمہیں اس کا کیا کرنا ہے۔ کتابیں ہوتی ہیں پڑھے لکھے لوگوں کے لیے۔''

''دیکھا ہے مسٹر عالم فاضل کو بانو!'' اُما بولی۔

''اب دیکھا نہیں جاتا' دور سے سونگھا جاتا ہے اسے۔''

''میں نے تو پہلے ہی اپنا ارادہ بتا دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ مہینہ' دن' تاریخ اور وقت نوٹ کر لو۔'' وہ جاتے ہوئے بولا۔

''ویسے Sculpture (مجسمہ سازی) کے سب اسٹوڈنٹس کو مل کر میڈم کے سامنے ایک قرارداد پیش کرنی چاہیے کہ اگر ایڈی یہاں رہے گا تو اسے اپنے خرچ پر سٹوڈیو میں ایک ایگزاسٹ لگوانا ہوگا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''اُما! تمہیں بھوک نہیں لگ رہی؟'' نیہاں اس کے قریب چلی آئی۔

''اگر بانو کو لگ رہی ہے تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔'' وہ بولی۔

''ہاں مجھے تو بہت زور کی لگ رہی ہے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''تو پھر چلو۔''

وہ تینوں کولڈ ڈرنک اور چپس کے پیکٹ لے کر باہر ہی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

''میں نے محسوس کیا ہے بانو کہ تم عبداللہ سے کچھ دور دور رہنے لگی ہو۔ شاید اس نے بھی محسوس کیا ہو۔'' اُما نے کہا۔

ماہ بانو نے ایک نظر اسے دیکھا' پھر بولی۔ ''وہم ہے تمہارا۔''

''تمہاری اس بات سے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ میرا وہم نہیں ہے۔ اگر وہم ہوتا تو تم پہلے حیرت کا اظہار کرتیں' خوب زور شور سے 'نہیں تو' کہتیں' پھر مصروفیت یا ایسی ہی کسی اور وجہ کا ذکر کرتیں۔ اب یہ بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟''

''اُما! تم تو ایک منٹ میں سب کچھ ہی سمجھ جاتی ہو۔ وجہ کو جانے دو' بس یونہی۔''

''میری وجہ سے نہیں بتا رہی' میں اٹھ جاتی ہوں۔'' نیہاں نے کہا۔

''کمال کرتی ہو تم بھی۔'' اُما نے نیہاں کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا' پھر ماہ بانو سے بولی۔

''نیہاں کے سامنے کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم دونوں کا تو سارے وقت کا ساتھ ہے۔ نیہاں بہت مختلف ہے' اسے بات اِدھر اُدھر کرنے کی عادت نہیں ہے۔''

''وہ تو مجھے بھی پتا ہے' میں اس لیے نہیں کہہ رہی تھی' اصل میں......'' وہ قدرے توقف سے بولی۔ ''میں خود بھی بھولنا چاہتی ہوں۔''

وہ دونوں خاموشی کے ساتھ اسے دیکھتی رہیں۔

''میں اسے سب کچھ بتا دوں گی اُما۔ وہ سب کچھ جو ریشماں اس کے لیے محسوس کرتی ہے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماہ بانو نے مضطرب ہو کر انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں۔

''اوہ نو!'' اُما ایک دم سب بات سمجھ گئی۔

''کیا مصیبت ہے' ہر بات' ہر کام غلط ہو جاتا ہے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''میں نے محسوس کیا تھا کہ عبداللہ تم میں انٹرسٹ لے رہا ہے' لیکن کہا نہیں۔ یہ سوچ کر کہ تم ڈسٹرب ہو گی۔'' اُما بولی۔

''ڈسٹرب تو میں اب تک ہوں' پتا نہیں امتحانوں میں پاس کیسے ہو سکتی ہوں' نہ پڑھا جا رہا ہے' نہ کام کیا جا رہا تھا' بار بار ریشماں کا خیال آتا تھا۔ اُما! مجھے پتا ہے کہ یہ سب بہت غلط ہے' مجھے ایسے سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ میں نے کبھی ریشماں کو کزن نہیں سمجھا' ہمیشہ بہن سمجھا ہے' لیکن میں کیا کروں۔ بہت کوشش کرتی ہوں کہ یہ سب نہ سوچوں پھر بھی......'' ماہ بانو نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''عبداللہ نے کچھ کہا ہے تم سے؟'' نیہاں نے پوچھا۔

''نہیں' لیکن اس کی آنکھیں بہت ایکسپریسو ہیں' جو بات نہیں کہتا' وہ بھی اس کی آنکھیں کہہ دیتی ہیں۔''

''تو پرابلم کیا ہے؟ کیا وہ تمہیں پسند نہیں ہے یا پھر تمہاری کزن ریشماں کا کوئی افیئر ہے اس کے ساتھ؟'' نیہاں نے پوچھا۔

''بہت لمبی کہانی ہے۔ پرابلم یہ ہے کہ ریشماں اس کی منگیتر ہے۔''

''کیا؟ مجھے نہیں پتا تھا کہ عبداللہ انگیجڈ ہے۔'' وہ بولی۔

''تم یہ کسی سے مت کہنا۔ اس نے خود کسی کو نہیں بتایا تو ہم کیوں بتائیں۔'' اُما نے کہا۔

''آف کورس یار! مجھے اتنا احمق سمجھا ہوا ہے تم نے۔'' نیہاں چپس کترتے ہوئے بولی۔

''ویسے وہ فلرٹ قسم کا بندہ لگتا نہیں ہے' لیکن اب وہ تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔ آخر منگنی اس کی مرضی کے بغیر تو نہیں ہوئی ہو گی ناں۔''

''بچپن کی منگنی ہے۔''

''پپ...... پپ...... پتا نہیں ماں باپ یہ حماقت کیوں کرتے ہیں؟'' نیہاں نے تبصرہ کیا۔

''یہ منگنی کرتے ہوئے ان کی نیت بری نہیں تھی' اپنی طرف سے انہوں نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔'' ماہ بانو نے ان کا دفاع کیا۔

''The way to hell is often paved with the best of intentions''

نیہاں بولی۔

''یہ بتاؤ بانو کہ تم کس حد تک اس میں انٹرسٹڈ ہو؟'' اُما نے کہا۔

''میں...... میں اپنی بہن کا حق کیسے چھین سکتی ہوں۔''

''یہ الگ بحث ہے' میرا سوال دوسرا تھا' تم عبداللہ میں انٹرسٹڈ ہو یا نہیں؟'' اُما نے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے ناں کہ وہ میری بہن کا منگیتر ہے۔''

''اصل بات یہ ہے کہ وہ تمہاری بہن سے محبت نہیں کرتا اور اصل بات یہ ہے کہ ان دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ کوئی بھی اصل بات نہیں ہے' وہ جو بھی منگنی ہوئی تھی' اسے ماننے پر اب کون تیار ہے؟ زہرا نے کیا کہا تھا' بھول گئیں تم؟ اس نے بہت واضح انداز میں کہا تھا کہ عبداللہ کو یہ رشتہ قبول نہیں ہے۔''

''وہ ریشماں سے محبت کرتا ہے یا نہیں' اس کی شادی ریشماں سے ہو سکتی ہے یا نہیں' اس سے یہ حقیقت تو نہیں بدل سکتی ناں کہ ریشماں اس سے محبت کرتی ہے۔'' ماہ بانو جھلا اٹھی۔

''لیکن اس ایک بات کو سامنے رکھتے ہوئے عبداللہ سے یہ حق تو نہیں چھینا جا سکتا ناں کہ وہ ریشماں کے علاوہ کسی سے محبت یا شادی نہیں کر سکتا۔ چھوٹا سا پوائنٹ ہے اور تم سمجھ نہیں رہیں آخر وہ کہیں تو شادی کرے گا ناں؟ کسی سے تو محبت کرے گا ناں؟'' اُما نے کہا۔

''تو کرتا پھرے وہ محبت اور شادی' لیکن ایسا وہ میرے ساتھ نہیں کر سکتا۔'' ماہ بانو نے جھلا کر چپس کا پیکٹ میز پر پٹخا اور کرسی پیچھے کر کے کالج کی طرف مڑ گئی۔

''بانو پلیز! کیا کر رہی ہو؟ میری بات تو سنو۔'' اُما اس کے پیچھے لپکی۔

''مجھے کچھ نہیں سننا۔''

کلاس میں بھی وہ خاموشی سے کام کرتی رہی۔ اُما کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ایک دو مرتبہ بات کرنے کی کوشش بھی کی' لیکن ماہ بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چھٹی کے وقت ماہ بانو اپنا سامان سمیٹ کر اسٹوڈیو سے باہر نکلی تو اُما نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا۔

''آئی ایم سوری بانو' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''ہٹو مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے سائیڈ سے نکلنے کی کوشش کی۔

''مجھے اندازہ ہے کہ تم بہت خفا ہو' لیکن کیا دوستی ہی چھوڑ دو گی' بات بھی نہیں سنو گی

میری۔''

''ایسی بات نہیں ہے اُما' تم سے ناراض ہوسکتی ہوں میں کبھی؟ دوستی چھوڑنا تو بہت بڑی بات ہے۔''اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

''شکر ہے۔'' اُما کو اطمینان ہوگیا۔

''اب میں جاؤں؟''

''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''پہلے میری بات سنو' پھر بیشک چلی جانا۔''

''اس ایک موضوع کے علاوہ ہر موضوع پر بات کرلو۔''

''کیا مطلب؟ تم پریشان ہو اور میں اطمینان سے بیٹھی تمہیں دیکھتی رہوں' دوستی ایسی ہوتی ہے کیا؟''

''اُما! مجھے لگتا ہے میں پاگل ہوجاؤں گی۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔'' وہ بولی۔

''اور میں تمہیں اس پریشانی سے نکالنا چاہتی ہوں۔ اس وقت بھی جو کچھ میں نے کہا اس کا مطلب وہ نہیں تھا' جو تم نے سمجھا۔ میں نہیں چاہتی بانو کہ تم خواہ مخواہ کے کسی گلٹ میں مبتلا ہو۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم ایک پریشان کن اور تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہو' لیکن فرار اختیار کر لینا کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا' نہ ہی تم خود کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنے یا ریشماں کے ساتھ کوئی بھلائی کر رہی ہو۔''

''یہ فرار...... نہیں ہے اُما! میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ مجھے عبداللہ سے دور ہو جانا چاہیے۔ میں ریشماں کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی۔''

''ٹھیک ہے' اس سے دور ہو جاؤ' لیکن اس طرح نہیں' یوں چھپنے پھرنے' کنی کترانے یا کھنچے کھنچے رہنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔'' وہ بولی۔

''پھر میں کیا کروں اُما! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یوں لگتا ہے جیسے دماغ بالکل ماؤف ہوگیا ہو۔''

''وہ تم سے اظہار ضرور کرے گا' ہوسکتا ہے جلدی کر دے' ہوسکتا ہے دیر سے کرے' لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے اپنے سب محسوسات کہہ دے گا۔ اب دیکھو بانو! میری بات مائنڈ نہ کرنا' دو صورتیں ہیں۔''

''کون سی؟''

''مجھے اندازہ ہے کہ تم بھی اسے پسند کرتی ہو۔ ریشماں کی محبت یک طرفہ ہے' لیکن تمہاری اور عبداللہ کی نہیں۔ منطقی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ریشماں سے منگنی قریباً ٹوٹ ہی چکی ہے وہاں شادی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ عبداللہ' ریشماں کے لیے کوئی جذبات نہیں رکھتا۔ ان سب باتوں کو مدِنظر رکھا جائے تو تمہیں کوئی بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرا

سکتا۔ تم اس سے محبت کرو یا شادی' اس سے ریشماں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''پلیز اُما! یہ سب مت کہو۔ ریشماں تو جیتے جی مر جائے گی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''دوسری صورت یہ ہے کہ تم عبداللہ کو یہ باور کرا دو کہ تم اس سے محبت نہیں کرتیں بلکہ تمہاری کزن ریشماں اس کی منتظر ہے اور تمہاری اس سے دوستی کی وجہ' بھی صرف ریشماں تھی' لیکن یہ سب اسے جلد از جلد بتا دو' اس کے اظہار سے پہلے۔''

''مگر میں اسے یہ سب کب بتاؤں...... کیسے بتاؤں؟ کالج میں نہ تو وقت ملتا ہے اور نہ ہی یہ اس بات کے لیے مناسب جگہ ہے۔''

''کیسے بتاؤں کا جواب تو یہ ہے کہ ویسے ہی بتا دو جیسے مجھے بتا دیا کرتی ہو اور کب بتاؤ کا جواب یہ ہے کہ وہ تمہارے گھر آئے یا تم اس کے گھر جاؤ تو موقع مناسب دیکھ کر بتا دو۔ کالج تو واقعی اس قسم کی بات کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔'' اُما نے کہا۔

''میرے گھر میں تو ممکن نہیں ہے۔ وہاں اماں اور ابا جی ہوتے ہیں۔ ایک دن تو اتفاق تھا کہ وہ دونوں ہی گھر پر نہیں تھے' لیکن ہر مرتبہ تو یہ ممکن نہیں ہے اور اس کے گھر میں جانا نہیں چاہتی۔''

''تم الگ سے مت جاؤ بے شک' اس نے سب دوستوں کو لنچ پر بلایا ہوا ہے' تب چلی جاؤ۔ اس بات سے وہ کسی غلط فہمی کا شکار بھی نہیں ہوگا اور تم موقع دیکھ کر بات بھی کر لینا۔''

''تو اُما! کیا وہ یہ سب سن کر ریشماں سے محبت کرنے لگے گا؟'' ماہ بانو نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

''یہ تمہارا دردِ سر تو نہیں ہے۔ تم اسے سب کچھ بتا سکتی ہو' لیکن اسے کسی سے محبت کرنے پر مجبور تو نہیں کر سکتیں''۔

''شاید ریشماں کے متعلق سن کر وہ اس سے محبت کرنے لگے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

☆======☆======☆

ریشماں اپنے کمرے میں سوچوں میں گم بیٹھی ہوئی تھی کہ کریمن آ گئی۔

''بی بی آپ کی نانی اماں آئی ہیں۔'' اس نے آتے ہی اطلاع دی۔

''میری نانی اماں یا بڑی اماں؟'' اس نے پوچھا۔

اپنی سگی نانی کو وہ نانی اماں اور یاسمین بیگم کی والدہ کو بڑی اماں کہتی تھی۔

''آپ کی اپنی نانی اماں آئی ہیں۔'' کریمن نے اسے بتایا۔

''کہاں ہیں؟''

''بڑی بیگم سے مل کر یہیں آئیں گی۔''

ابھی کریمن کی بات منہ ہی میں تھی کہ نانی اماں اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئیں۔ وہ اٹھ

کران سے لپٹ گئی۔

''جیتی رہو' خوش رہو۔'' انہوں نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

''بیٹھیں نانی اماں!'' اس نے انہیں صوفے پر بٹھایا۔

''کتنی کمزور ہوگئی ہے میری بچی' دیکھ تو کریمن کیسی پیلی ہورہی ہے یہ؟'' انہوں نے کریمن کی طرف تصدیق طلب نظروں سے دیکھا۔

''آپ کو کیا بتاؤں جی' نہ کچھ کھاتی پیتی ہیں' نہ وقت پر سوتی ہیں۔ ہنسنا بولنا تو بالکل چھوڑ دیا ہے انہوں نے۔ ہر وقت سوچوں میں گم رہتی ہیں!'' کریمن نے جلدی جلدی بتایا۔

''بیٹا! جانے والے کے ساتھ جایا تو نہیں جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' انہوں نے آہ بھری۔

''تجھے کیا پتا کہ تیری ماں کتنی لاڈلی تھی ہم سب کی' وہ مری تو میرا دل چاہا کہ اس کے ساتھ ہی قبر میں جا سوؤں' لیکن ایسا کب ہوا ہے۔

اور پھر یہ بھی تو دیکھ کہ تیرے ایک بھائی کی جان اللہ تعالیٰ نے بچالی۔ وہ اب بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے' جو وہ دے دیتا ہے' اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔'' انہوں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''نانی اماں' میرے تو آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں' اب رونا بھی نہیں آتا مجھے۔''

''کتنا روئے گی؟'' انہوں نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ ''دریا تو بہا دیے میری بچی نے۔''

''چھوڑیں' نانی اماں! آپ نے ہمیشہ مجھے بابا جان کی بیٹی سمجھا ہے' کبھی اپنی بیٹی کی بیٹی سمجھا ہوتا تو غیروں کی طرح چار چھ مہینے بعد ملنے نہ آتیں اور نانا جی ہیں تو وہ عید کے علاوہ کبھی مجھ سے ملنے نہیں آتے۔ آپ کو یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ میں آپ لوگوں کو کتنا یاد کرتی ہوں۔''

''نہیں بیٹا' ایسا نہیں ہے۔'' انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''تجھے کیا پتا کہ میں کتنا یاد کرتی ہوں تجھے' اتنا تو میں نے کبھی ماہ بانو کو بھی یاد نہیں کیا۔ کتنا تڑپتی ہوں تجھ سے ملنے کو۔ بس مجبوریاں راستہ روک لیتی ہیں۔ تجھے نہیں پتا ناں کہ بیٹیوں کے سسرال جاتے ہوئے کیا کیا سوچنا پڑتا ہے۔ میں اور تیرے نانا جی تجھے اور ماہ بانو کو یاد کیے بغیر تو کھانا بھی نہیں کھاتے۔

میری دو بیٹیاں تھیں۔ میں نے کبھی اللہ تعالیٰ سے شکوہ نہیں کیا کہ اس نے مجھے بیٹا نہیں دیا۔ سوچا کہ جس طرح میرا مولا خوش ہے' میں بھی اسی طرح خوش ہوں۔ دونوں بچیاں بیاہی گئیں اور ہم بڈھا بڈھی اکیلے رہ گئے' پھر بھی شکوہ نہیں کیا اللہ تعالیٰ سے۔ مگر اب آخری عمر میں کبھی کبھی دل میں یہ خلش اٹھتی ہے' کہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ نے بیٹا نہیں دیا تو اس نعمت سے میری بیٹیوں کو ہی نواز دیتا۔''

ریشماں نے کریمن کی طرف دیکھا۔ ''کریمن تم باہر جاؤ۔''

''جی اچھا بی بی!'' وہ باہر نکل گئی۔

''نانی اماں! میرے دل پر بہت بوجھ ہے' میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ غبار کچھ دیر اور میرے اندر رہا تو شاید میں پاگل ہو کر ان دیواروں سے سر ٹکرانے لگوں گی۔ نانی اماں! مجھے بہت گھٹن محسوس ہورہی ہے' مجھے کہیں لے چلیں' یہاں سے بہت دور۔''

''ہوا کیا میری چندا! میں ہوں ناں تمہارے پاس' مجھ سے سب کچھ کہہ دو' دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں' آپ سمجھ نہیں سکتیں' بہت گھٹن ہے یہاں' مجھے لے چلیں اپنے ساتھ۔'' اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔

نانی اماں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ان شربتی آنکھوں میں بہت نیچے طوفان اٹھ رہے تھے۔

''گھٹن اس لیے ہے کہ تم نے سب کچھ اپنے دل میں بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ کسی سے کہہ دو گی تو سب گھٹن ختم ہو جائے گی۔''

''بانو آئی تھی نانی اماں' لیکن میں مل ہی نہیں سکی اس سے' وہ ہوتی تو سب کچھ اس سے کہہ دیتی۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید وہ پھر آئے لیکن وہ آئی ہی نہیں۔''

''اس کے امتحان تھے ناں' کالج سے چھٹی بھی نہیں کر سکتی وہ۔ مجبوری نہ ہوتی تو ضرور آتی وہ۔'' انہوں نے سمجھایا۔

''اسے بلوا دیں خدا کے لیے۔'' اس نے منت کرنے والے انداز میں کہا۔

''ہاں بلوا دوں گی' آج جاتے ہی خط لکھ لوں گی لیکن اسے آتے ہوئے کچھ وقت لگے گا' تب تک تم سب کچھ مجھ سے کہہ دو۔ یہ سمجھ لو کہ میں بانو ہوں۔''

''کیسے کہوں؟'' اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

''مجھے نہ بتایا تو میں سمجھوں گی کہ تم مجھے غیر سمجھتی ہو۔'' انہوں نے ریشماں کی جذباتی کمزوری پر ہاتھ رکھا۔

''پلیز ایسا مت کہیں۔'' چند لمحے وہ خاموش رہی پھر کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جما کر بولی۔

''آپ کو پتا ہے بھائی کو میں نے قتل کیا ہے؟''

''کیا؟ باؤلی تو نہیں ہوگئی؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں نانی اماں' امداد بھائی کو میں نے قتل کیا ہے۔''

انہوں نے دکھ سے ریشماں کی طرف دیکھا۔ ''کتنا زیادہ صدمہ ہوا ہے میری بچی کو۔ دیکھو

ریشماں بیٹا' اس کی زندگی کی سانسیں اتنی ہی تھیں۔ تم نے اسے کچھ نہیں کیا' اس کی موت آئی ہوئی تھی جسے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔'' انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''چھوڑیں نانی اماں' آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ بانو ہوتی تو سب سمجھ جاتی۔ وہ میری ہر بات سمجھ جاتی ہے۔ امداد بھائی کو میں نے گولیاں نہیں ماریں' لیکن وہ میری وجہ سے قتل ہوئے۔''

''ایسے نہیں کہتے بیٹا!''

''کیوں نہ کہوں؟ میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔'' اس نے ان کی بات کاٹی۔ ''میں نے بانو کو خط نہ لکھا ہوتا تو شاید وہ زندہ ہوتے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟ تم نے بانو کو کب خط لکھا؟'' نانی اماں کچھ نہ سمجھیں۔

''جب میں نے اماں اور بابا جان کی باتیں سنی تھیں وہ......!'' اس نے چند لمحے رک کر آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''وہاں بابا جان کہہ رہے تھے کہ وہ زہرا کو اغوا کرلیں گے۔ وہ مارنا چاہتے تھے' قتل کرنا چاہتے تھے زہرا کو' میں نے یہ سب کچھ بانو کو لکھ دیا۔''

''پھر؟ بانو کیا کرسکتی تھی؟'' وہ اب تک کچھ نہیں سمجھی تھیں۔

''میں نے کہا تھا بانو سے کہ وہ انہیں سب کچھ بتادے۔'' وہ بولی۔

''کسے بتادے سب کچھ؟''

''انہیں۔'' اس نے ہونٹ کاٹے۔ ''حیدر بابا کے بیٹے کو' وہ وہیں کالج میں پڑھتے ہیں بانو کے ساتھ۔''

''کیا؟'' نانی اماں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''میں کیا کرتی نانی اماں۔ ایک طرف بھائی تھے اور دوسری طرف ......!'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''تم جانتی ہو ریشماں بیٹا کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ مجھے لگتا ہے کہ صدمے سے تمہارا دماغ اُلٹ گیا ہے۔'' وہ اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

''میں جھوٹ نہیں کہہ رہی نانی اماں' ان کی حویلی بچاتے ہوئے میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی حویلی میں آگ لگادی۔ مجھے نہیں پتا نانی اماں کہ میں کس سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ میں چکی کے دونوں پاٹوں میں پس رہی ہوں نانی اماں۔ نہ بھائیوں کو کھونا چاہتی ہوں نہ انہیں۔

بھائیوں نے امداد بھائی کی میت پر کھڑے ہوکر ان کے زخموں سے رستے خون اور میری آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو گواہ بنا کر قسم کھائی تھی کہ وہ انہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ انہیں ویسے ہی قتل کریں گے' وہیں قتل کریں گے' جیسے اور جہاں امداد بھائی کو قتل کیا گیا تھا۔

نانی اماں میں اور کسی کو کھو نہیں سکتی۔ نہ بھائیوں کو' نہ عبداللہ کو' میں سب سے محبت کرتی ہوں

میں کیا کروں؟'' وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

نانی اماں چند لمحے بے یقینی کے سے عالم میں اسے دیکھتی رہیں' پھر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

اس عرصے میں پیر صاحب نے ہر ایسے شخص کو سخت سزا دی تھی' جس پر انہیں مخبری کا شک بھی گزرا تھا' لیکن پھر بھی انہیں یہ علم نہیں ہوسکا تھا کہ یہ سیندھ کہاں سے لگائی گئی تھی۔

''ریشماں' یہ بات کسی سے مت کہنا۔ ان دیواروں سے بھی نہیں۔'' وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔

ریشماں بدستور رو رہی تھی۔

''بھول جا اسے جو ہو چکا ہے' خواب میں بھی یہ سب یاد نہ کرنا' جیسے تُو اپنے بھائیوں اور عبداللہ کو نہیں کھونا چاہتی' ویسے ہی زرینہ کے بعد میں تجھے نہیں کھونا چاہتی۔ ریشماں سن رہی ہے ناں میری بات؟ مجھ سے کہہ دے جو کہنا ہے' لیکن اور کسی سے مت کہنا۔''

تھوڑی دیر بعد جب وہ وہاں سے اٹھیں تو ان کا دل بھی بہت بوجھل ہورہا تھا۔ یاسمین بیگم کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ سیدھی ہو بیٹھیں۔

''آیئے ملانی جی' مل آئیں ریشماں سے؟''

''جی مل آئی۔''

''ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے؟'' یاسمین بیگم نے کہا۔

''مجھے گناہ گار مت کریں' جو عزت آپ دیتی ہیں ہم اس کے قابل کہاں؟'' نانی اماں بولیں۔

''آپ ہماری ریشماں کی نانی ہیں اور ہمارے لیے بہت قابلِ عزت ہیں۔''

''آپ کی مہربانی ہے۔'' پھر قدرے توقف کے بعد بولیں۔ ''میں پیر صاحب سے مل سکتی ہوں؟''

''میں پتا کرواتی ہوں کہ وہ کہاں ہیں' یہاں ہوئے تو آپ سے ملنے ضرور آئیں گے۔'' یاسمین بیگم نے کہا اور ایک ملازمہ کو پیر صاحب کی تلاش میں بھجوا دیا۔

پانچ منٹ میں ہی پیر صاحب اپنی خواب گاہ میں ان کے روبرو تھے۔

''جی فرمایئے!'' ان کے الفاظ میں انکساری تھی' لیکن لہجے میں معمول کے مطابق حکم تھا۔

''ایک درخواست تھی اگر آپ قبول کرلیں تو آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔'' نانی اماں نے کہا۔

''کہیے' ہمارے بس میں جو کچھ ہوا ہم کریں گے۔''

''میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا پیر صاحب آج اس امید سے آپ کے پاس آئی

ہوں کہ خالی ہاتھ نہیں لوٹوں گی۔'' انہوں نے ملتجی انداز میں کہا۔

''زرینہ میری بہت پیاری بیٹی تھی' اسے بھول تو کبھی نہیں سکتی' لیکن آج وہ اس طرح رہی ہے کہ دل غم سے پھٹتا ہوا لگ رہا ہے۔

جی چاہتا ہے پیر صاحب کہ ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ ریشماں کو اپنے ساتھ اپنے گھر جاؤں' اسے وہاں چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے' ہنستے بولتے دیکھوں' اس کے بالوں میں تیل لگاؤں اس کے ساتھ بیٹھ کر اتنی باتیں کروں کہ برسوں کی تشنگی مٹ جائے۔ یوں لگے جیسے میری ز زندہ ہو گئی ہو۔ صرف ایک مرتبہ پیر صاحب!'' آنسو ان کے جھریوں بھرے چہرے کو بھگو لگے۔

پیر صاحب نے ان کی بات سنی اور ملائمت سے بولے۔'' ہم آپ کے جذبات سمجھتے لیکن جو آپ چاہتی ہیں' وہ ممکن نہیں ہے۔ آپ یہاں جب بھی آنا چاہیں' آئیں۔ ریشماں جب ملنا چاہیں' ہمیں آپ کے آنے سے خوشی ہو گی' لیکن ہماری بیٹی اس گھر میں نہیں جا سک اس کے علاوہ ہم آپ کے لیے کچھ اور کر سکیں تو ضرور بتائیں۔''

نانی اماں نے دھندلی آنکھوں سے انہیں دیکھا پھر اوڑھنی کے پلو سے آنکھیں صا کرتے ہوئے سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆======☆======☆

ماہ بانو نے جمعہ کو عبداللہ کے گھر لنچ پر جانے کی اجازت لے لی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ موقع ملتے ہی عبداللہ کے سامنے ریشماں کا ذکر چھیڑ دے گی۔

عبداللہ نے سب کو اپنے گھر پر ہی انوائیٹ کیا تھا۔ کل افراد ہی کتنے تھے۔ اس کے کلاس فیلو' جن میں ایڈی' جیمز اور ظہیر شامل تھے اور ان کے علاوہ ماہ بانو' اُما اور نیہاں تھیں۔ کو ان دونوں نے اس لنچ میں شامل کروایا تھا۔

''لنچ پر جیمز آ رہا ہے' اس لیے نیہاں کو بھی ضرور جانا چاہیے۔'' اُما نے کہا تھا۔

''لیکن نیہاں سے عبداللہ کی اتنی زیادہ دوستی نہیں ہے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ لنچ وہ دے ہے جسے انوائیٹ کرنا چاہے' یہ اس کی مرضی ہے۔'' ماہ بانو نے اعتراض کیا تھا۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو' بس دعا کرو کہ جیمز بھی نیہاں کو چاہنے لگے۔ نیہاں بہت اچھی ہے کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

اور اُما' عبداللہ کے پاس پہنچ گئی۔

''اگر میں تمہارے گھر لنچ پر چلی آئی تو میری روم میٹ اکیلی رہ جائے گی' اس لیے میں نہ آ سکوں۔''

''کیا مطلب؟ تمہیں ضرور آنا ہے' ہر حالت میں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''مشکل ہو جائے گی ناں' میری روم میٹ کا کیا بنے گا؟''

''مشکل کیا ہے' اسے بھی ساتھ لے آؤ۔ ہے کون تمہاری روم میٹ۔'' عبداللہ نے پوچھا۔

''نیہاں ہے۔''

''تو اسے لے آؤ' مسئلہ کیا ہے؟''

''لنچ تم دے رہے ہو' اس لیے انویٹیشن بھی تو تم ہی دو۔'' اُما نے فوراً کہا۔

اور جب عبداللہ نے نیہاں کو انوائیٹ کر لیا تھا تو اُما' ماہ بانو کے پاس آ کر بہت ہنسی تھی۔

''دیکھی میری ترکیب۔''

جب کہ نیہاں حیران تھی۔

''پتا نہیں' عبداللہ نے مجھے کیوں انوائیٹ کیا ہے میری تو اس سے کوئی خاص فرینڈ شپ بھی نہیں ہے۔''

''تمہیں کیا؟ یہ شکر نہیں ہے کہ ایک دن کے لیے ہی سہی ہوسٹل کے کھانے سے نجات ملے گی۔'' اُما نے بات ہنسی میں اڑا دی۔

''اس نے ہمیں انوائیٹ کیا ہے تو یہ سوچا ہو گا کہ تم ہماری دوست ہو۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''زیادہ سوچو مت' ایک تو اتنے مزیدار کھانے ہوں گے اور پھر وہاں جیمز بھی ہو گا۔'' اُما نے اسے وہاں جانے کے فوائد گنوا دیے۔

نیہاں ہنس پڑی۔'' وہ آرٹ اور ورلڈ پالیٹکس پر بولتا رہے گا اور اس وقت ان موضوعات میں میری دلچسپی صفر ہو گی' پھر بھی میں پورے ذوق شوق سے یوں اس کی باتیں سنتی رہوں گی جیسے اس سے زیادہ دلچسپ باتیں اور کوئی ہو ہی نہیں سکتیں۔''

وہ تینوں ایک ساتھ ہنس پڑیں۔

عبداللہ نے خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے کے بعد وہ سب مل کر بیٹھے تو مشترکہ موضوعات پر گفتگو کرنے کے باوجود تقریباً سبھی اپنے سے متعلق معاملات پر سوچ رہے تھے۔ ماہ بانو ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب عبداللہ سے ریشماں کا ذکر چھیڑ سکے۔ یوں تو عبداللہ کو دیکھ کر' اس سے مل کر باتیں کر کے اس کے ارادوں میں دراڑیں پڑنے لگتی تھیں' لیکن اس وقت وہ آنکھیں بند کر کے سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی' اسے یقین تھا کہ ایک مرتبہ عبداللہ کو ریشماں کے متعلق بتانے کے بعد وہ یقیناً اس سے دور ہونے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اور عبداللہ' ماہ بانو کی آنکھوں میں کسی مسئلے سے الجھنے کے واضح آثار دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ کس سوچ میں غرق تھی' کون سا مسئلہ اسے تنگ کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ مسئلہ خود اس کی ذات سے متعلق تھا۔

ایڈی تھا' جس نے سچ مچ اعلانِ لاہور کے بعد سے جوگ ہی لے لیا تھا۔ یہ الگ بات ہے

کہ اس کے جوگ میں صرف پرانے کپڑے اور پھٹے ہوئے جوگرز استعمال کرنا ہی شامل تھا۔ اس نے شیو بنانا بھی چھوڑ دی تھی اور اس دن کے بعد سے اب تک کسی حجام کی دکان کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ہر طرح سے پرانا والا ایڈی تھا۔ کام کے وقت بے حد سنجید فراغت میں اتنا ہی لاابالی۔ اس وقت اس کی سوچوں کا محور اُماہی تھی جو سادہ سی شلوار قمیص لمبے بال کھولے ہوئے دل میں اتر جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔

اور اُما تھی، جو ایڈی کی نظریں پڑھ رہی تھی، اور اس کے باوجود کچھ جاننا، کچھ سمجھنا نہیں چ تھی۔

نیہاں تھی جو جیمز کی ہر بات بڑے غور سے سنتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کی زندگ کون سی لڑکی آئے گی۔

اور جیمز تھا جس کا خیال تھا کہ کیا نیہاں جیسی بے نیاز لڑکی کبھی اس کی طرف متوجہ ہ اسے اس کی کلاس کا کوئی فرد' کوئی بیوروکریٹ' یا کوئی بزنس مین اپنے سنگ' اپنے محل میں جائے گا۔

اور ان سب سے الگ ظہیر تھا جو خود کو سب سے بڑا احمق سمجھتے ہوئے سوچ رہا تھا سب کے درمیان ہونے والی اتنی دلچسپ باتوں کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی ہو رہی تھیں جو نہیں پا رہا تھا اور یہ سب باتیں بغیر ایک لفظ ادا کیے پورے ڈرائینگ روم میں پھیلی ہوئی تھیں

وہ باتیں کر رہے تھے کہ ایڈی نے میز بجا کر گانا شروع کر دیا۔

"پلیز ایڈی! اتنی بھونڈی آواز میں گانا مت گاؤ میرے سر میں پہلے ہی درد ہے۔" نے کہا۔

"میں بھونڈی آواز میں گانا گا رہا ہوں؟ اُما تم فیصلہ کرو' کیا میری آواز ب ہے؟" ایڈی فوراً اُما کو درمیان میں لے آیا۔

"اتنی زیادہ نہیں' بس باغ میں بیٹھے کوے شکست مان کر اُڑ گئے ہیں۔" وہ بولی۔

"مجھے لگتا ہے اُما کہ عبداللہ تنگ آ کر ہمیں گھر سے نکالنا چاہتا ہے اور اسی لیے ا ایڈی کی خدمات لی ہیں۔" ماہ بانو نے کہا۔

"حد ہو گئی بھئی! میں تو سمجھتا تھا کہ میں لڑکیوں میں خاصا پاپولر ہوں۔" ایڈی نے سے سرہلایا۔

"لڑکیاں الگ محاذ بنا رہی ہیں ایڈی۔" ظہیر نے اسے خبردار کیا۔

"دیکھتا ہوں تم میں سے کون گا سکتا ہے' مجھ سے اچھا گانا کسی نے گا لیا تو سو روپے اور نہ گایا تو تین سو روپے وصول کروں گا۔"

"ہم تینوں کو میدانِ جنگ میں کودنے کی کیا ضرورت ہے' ہماری طرف سے اُما

ہے۔" نیہاں نے کہا۔

"اُما سے تو یوں بھی بہت سے بدلے لینے ہیں۔" ایڈی بولا۔

"مجھے تمہارے سو روپوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے رکھو اپنے پاس۔" اُما بے نیازی سے بولی۔

"میرے گانے سے تو کوے اُڑے ہیں' یہ گانے لگی...... تو مینڈک ہار مان لیں گے۔"

"تو پھر تم دونوں مل کر گا لو' میرا گھر بغیر تردد کے صاف ستھرا ہو جائے گا۔" عبداللہ ہنسا۔

"بھئی کوئی اور ہے جو ٹڈیوں اور کاکروچوں کو بھگا سکے۔"

"ایڈی کے کہنے سے نہیں تو ہمارے کہنے سے گاؤ۔" جیمز نے کہا۔

"ہاں پلیز اُما!" نیہاں نے کہا تو یہ تھا' لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اب تو گا لو' اب تو جیمز نے فرمائش کی ہے۔

اس کے تاثرات دیکھ کر اُما کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

"ٹھیک ہے میں ہمز اور نیہاں کے کہنے پر سنا رہی ہوں۔" اس نے کہا اور گانا شروع کیا۔

رادھا نے مالا جپی شام کی
میں نے اوڑھی چنریا تیرے نام کی
تیرے نام کی' ہاں پیا تیرے نام کی
کیا ترنگ ہے' کیا امنگ ہے
مورے انگ انگ لگا پی کا رنگ ہے
شرم آئے کیسے کہوں بات شام کی
رادھا نے مالا جپی شام کی
پالیا تجھے' پائی ہر خوشی!!
چاہوں بار بار چڑھوں تیری پالکی
صبح شام کی یہ پیاس بڑے کام کی
رادھا نے مالا جپی شام کی

سب مبہوت ہو کر سن رہے تھے۔ اس کی آواز بے حد خوبصورت تھی۔ جب گانا ختم ہوا تو سب نے تالیاں بجا کر اسے داد دی۔

"اس گانے پر تو میں سو کیا ہزار کی شرط ہارنے پر بھی تیار ہوں۔" ایڈی نے کہا۔

"تو نکالو ہزار روپے۔" نیہاں نے فوراً کہا۔

"ہم فقیروں کے پاس اتنے روپے کہاں' یہ پیروں سے لے لو۔" ایڈی نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔

سب ہنس پڑے۔
''ویسے اُما ذرا روشنی ڈالو یہ رادھا کیسی تھی؟'' ایڈی نے کہا۔
''رادھا!'' وہ جیسے کھو سی گئی۔ ''بے حد حسین اور اس سے بھی زیادہ باوفا۔''
''یعنی ہر حسین اور باوفا عورت کو رادھے کہا جا سکتا ہے۔'' ایڈی بولا۔
''رادھے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'' نیہاں نے دریافت کیا۔
''رادھا جیسی ......'' اُما بولی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''تم لوگ باتیں کرو' میں دیکھوں کہ عبداللہ کا باغ کیسا ہے؟''
وہ پھر سے باتوں میں مصروف ہو گئے اور اُما باہر نکل آئی۔ موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔ دھوپ تھی لیکن اس کی شدت نہیں تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی' جس سے موسم خوشگوار ہو رہا تھا۔
برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں ٹکائے وہ سامنے لان کی طرف دیکھ رہی تھی' جہاں پھول اور ہوا آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اس کا ذہن ایڈی کی طرف ہی تھا۔ اس طرح بیٹھے پتا نہیں کتنی دیر گزر چکی تھی کہ پیچھے سے ایڈی کی آواز آئی۔
''دیوی جی!''
وہ چونک گئی' لیکن یہ بات ایڈی پر ظاہر نہیں کی' سنی ان سنی کر کے ویسے ہی بیٹھی رہی۔
''دیوی جی!'' اس نے پھر پکارا۔
وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ اُما نے اس مرتبہ بھی اسے نظر انداز کر دیا۔
''رادھے!''
اُما کو جیسے کرنٹ لگا۔ وہ ایک دم پیچھے مڑی۔
''ایڈی! پھر مجھے کبھی رادھے مت کہنا۔''
وہ اس کے برابر آ بیٹھا۔ ''کیوں؟''
''کیونکہ میں رادھے نہیں بننا چاہتی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ جانتے ہو رادھا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''
ایڈی اس کے چہرے پر ابھرنے والے اضطراب کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رادھا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کرشن چندر نے لکھا تھا۔
''کرشن جی نے برندابن کی گوپیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک بار پھر برندابن آئیں گے اور ہر گوپی کے گھر کا دروازہ تین مرتبہ کھٹکھٹائیں گے' جس گھر میں روشنی ہوگی اور جو گوپی دروازہ کھٹکھٹانے پر ان کا خیر مقدم کرے گی' وہ اسی کے عشق کو سچا جانیں گے۔ اس بات کو کئی برس بیت

گئے۔
ایک اندھیاری طوفانی رات میں جب بجلی کڑک رہی تھی اور بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ کسی نے برندابن کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کیے۔ سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا اجنبی ہر ایک مکان پر تین بار دستک دیتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔
لیکن سب مکانوں میں اندھیرا تھا۔ سب لوگ سوئے پڑے تھے' کسی نے اٹھ کر دروازہ نہ کھولا۔
اجنبی ناامید ہو کر واپس جانے والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دور ایک جھونپڑے میں مٹی کا دیا جھلملا رہا ہے وہ اس جھونپڑے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھا' لیکن اسے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ جھونپڑے کے اندر دیئے کی روشنی کے سامنے رادھا بیٹھی تھی' اپنے محبوب کے انتظار میں رادھا کے سر کے بال سپید ہو چکے تھے' چہرے پر لاتعداد جھریاں۔
کرشن جی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''رادھا! میں آ گیا ہوں''
لیکن رادھا خاموش بیٹھی رہی۔ دیئے کی لو کی طرف تکتی ہوئی۔
''رادھا! میں آ گیا ہوں۔'' کرشن جی نے چلا کر کہا
لیکن رادھا نے کچھ نہ دیکھا نہ سنا۔ اپنے محبوب کی راہ تکتے تکتے اس کی آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں اور کان بہرے۔
زندگی سے پرے' موت سے پرے' انصاف سے پرے۔''
''اُما! تمہیں اتنا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔'' ایڈی نے کہا۔
اُما نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔
پوری کوشش کے باوجود ماہ بانو کو عبداللہ سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

☆======☆======☆

زینی اور سبط حسن کے فائنل ایگزام ختم ہو چکے تھے اور پڑھائی کی طرف سے بالکل فراغت تھی۔ تقریباً سارا دن ہی ان کا اکٹھے گزرتا تھا۔
''تم گاؤں کب جاؤ گے؟'' زینی نے سبط حسن سے پوچھا۔
''جب تم جاؤ گی۔''
''بابا جان نے بتایا ہی نہیں کہ وہ کب لینے آئیں گے مجھے اور لینے بھی آئیں گے یا نہیں' کیا پتا مجھے یہیں رہنا پڑے۔''
''عبداللہ بھائی سے کوئی بات ہوئی؟''
''نہیں' وہ بھی کالج میں مصروف ہو گئے ہیں' انہیں بھی نہیں پتا۔ کہہ رہے تھے کہ بابا جان کو

فون کریں گے۔" وہ بولی۔

"چھوڑو ان باتوں کو' بھوک لگ رہی ہے' کچھ کھانا چاہیے۔" سبط نے کہا۔

"ہاں' چلو انڈوں کا حلوہ بناتے ہیں۔" زینی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"انڈوں کا بھی ستیاناس ہوگا اور بھوک بھی ویسی ہی رہے گی۔ تمہیں انڈوں کا حلوہ بنانا کب آتا ہے۔"

"سیکھنے سے آئے گا ناں۔ تم بھی میری مدد کرو گے' چلو اٹھو۔" وہ بولی۔

دونوں کچن میں چلے آئے۔

"آج اس اصول پر حلوہ بنے گا کہ Try, try and try again and spoil as many eggs as you oan"

سبط حسن نے اونچے والیوم میں ڈیک لگا دیا۔ گھر میں بون ژوئی کی آواز پھیل گئی۔

:ause you were born to be my baby and baby i was nade to be young man.

گیٹ سے حیدر علی شاہ کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ گاڑی سے اترتے ہی انہیں احساس ہوا کہ گھر میں خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ گانوں کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ بیل دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ تھوڑا سا آگے بڑھے' کچن سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہیں دروازے سے کچھ پرے رہتے ہوئے اندر کا منظر با آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

زینی اور سبط حسن کچھ پکانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ گانے اونچی اونچی آواز میں لگے ہوئے تھے۔ زینی انڈا توڑ کر فرائی پین میں ڈالنے لگی تھی کہ سبط چلایا۔

"پیچھے ہٹو' دشمن کا اٹیک آ گیا۔"

گھبرا کر زینی کے ہاتھ سے انڈا فرش پر گر گیا۔

"کون سے دشمن کا اٹیک؟" اس نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

"بھئی گھی چھینٹے اُڑا رہا تھا۔" سبط حسن نے کہا۔

زینی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اور یہ جو فرش پر نقش و نگار بنے ہیں' اب انہیں صاف کو کرے گا؟"

"تم سے بنے ہیں' لہٰذا تم ہی صاف کرو گی' میں کیوں کروں؟" وہ صاف مکر گیا۔

"تمہاری غلطی سے انڈا گرا ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔

"میری غلطی سے نہیں' تمہاری حماقت سے گرا ہے۔" وہ اس سے بھی زیادہ زور سے بولا۔

"تو پتا ہے کیا سبط؟"

"کیا؟"

"ہم دونوں ہی صاف نہیں کریں گے' یہ سلیمہ صاف کرے گی۔"

وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑے۔

اسی وقت سبط حسن کی نگاہ دروازے سے کچھ دور کھڑے حیدر علی شاہ پر پڑی۔ اس کی ہنسی وہیں رک گئی۔ واضح طور پر انہیں دونوں کی بے تکلفی اچھی نہیں لگی تھی۔

"تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا؟" زینی نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

"بابا جان!" ایک لمحے کو وہ جھجکی پھر دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

"آپ نے آنے کا بتایا ہی نہیں۔"

سبط حسن بھی ان کے قریب آ گیا۔

"جیتے رہو۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ لیکن ان کے انداز میں سرد مہری تھی۔

"بابا جان' یہ سبط حسن ہے۔" زینی نے جھجک کر بتایا۔

ان کے تاثرات اس نے بھی بھانپ لیے تھے۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ بولے۔

"اور اب بیٹا' آپ جلدی سے تیار ہو جائیں' ہمیں آج ہی گاؤں جانا ہے۔"

دونوں نے کن اکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"جی بابا جان!" وہ اندر کی طرف مڑ گئی۔

"آپ کے پرچے کیسے ہوئے؟" حیدر بابا نے سبط سے پوچھا۔

"اچھے ہو گئے۔" پھر قدرے توقف سے بولا۔ "میں چلتا ہوں اب۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

"تم نے عبداللہ سے ذرا سا ذکر بھی نہیں کیا؟" اُما نے ماہ بانو سے پوچھا۔

"موقع ہی نہیں ملا۔ اتنے لوگوں کے درمیان کیسے کہہ دیتی۔ وہاں جیمز اور ظہیر بھی تھے۔ سے یقیناً ان کے سامنے ریشماں کا ذکر اچھا نہ لگتا۔"

"پھر؟" اُما نے کہا۔

"اس نے لنچ پر بلایا ہے۔ ذنہار میں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں جائزہ لے لوں وہاں کا اور ہیں کوئی سرامکس کی ایگزیبیشن کرواؤں۔"

"تم جا رہی ہو پھر؟"

"جانا ہی پڑے گا۔ ایک تو اس لیے کہ میں واقعی دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہاں ایگزیبیشن کس رنگ کامیاب رہے گی۔ آج کل وہاں کپڑوں کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں

صرف میں اور عبداللہ ہوں گے' اس لیے ریشماں کے متعلق بات کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے' لیکن اپنا ذہن پہلے ہی بنا کر جانا کہ کیا کہو گی اس سے۔''

''یہ تو ہے۔'' ماہ بانو بولی۔ ''ویسے اس نے کہا تو پہلے بھی تھا کہ وہ الگ سے مجھے لنچ دے گا لیکن بہت غور کرنے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ اس نے بلایا تب بھی میں نہیں جاؤں گی' پر اب تو جانا ہی ہوگا۔''

ذنہار میں داخل ہو کر ماہ بانو نے عبداللہ کی تلاش میں نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ میرون چنری کے کرتا شلوار پر بڑا سا گوٹے کا کام کا دوپٹا اوڑھے وہ بہت کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

''یہاں!''

اپنے کان کے قریب عبداللہ کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

''تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔''

''آؤ۔''

وہ دونوں ایک میز پر آ بیٹھے۔ بیرے کو آرڈر دے کر وہ اس سے متوجہ ہوئی۔

''مجھے تمہیں ایک بہت مزے دار بات بتانی تھی۔''

''اور مجھے تم سے ایک بہت دلچسپ بات کہنی تھی۔'' وہ بولا۔

''دلچسپ بات...... کیا بات ہے؟''

''تم مزے دار بات بتا دو پھر میں اپنی دلچسپ بات بتا دوں گا۔'' اس نے کہا۔

''میری بات تو بہت لمبی ہے۔''

''اور میری بہت مختصر ہے۔''

''تو پھر پہلے تم دلچسپ بات بتا دو۔'' ماہ بانو نے ماتھے پر آئے بال پیچھے کیے۔

''جو میں کہنے لگا ہوں وہ بات دن میں ہزاروں لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں' بہت عام سی بات ہے' لیکن ہر کہنے والے کے لیے یہ نئی اور خوبصورت ہوتی ہے۔''

ماہ بانو کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ وہ عبداللہ کو روکنا چاہتی تھی لیکن الفاظ کہیں گم ہو گئے تھے۔

''بانو! میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

☆=====☆=====☆

چند لمحے تو ماہ بانو بالکل گنگ سی اسے تکتی رہ گئی۔

''تمہیں معلوم ہے عبداللہ کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں مجھے معلوم ہے میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کہی ہے اور کہنے کا مرحلہ تو بہت بعد میں آیا ہے میں نے اچھی طرح اپنے محسوسات کو پڑھا ہے۔ پھر تم سے کہا ہے۔''

''پھر یقیناً تمہیں یہ علم نہیں ہوگا کہ ریشماں میری بہن ہے۔''

''میں اتنا بے خبر نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھتی ہو۔'' وہ بولا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو عبداللہ' تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اپنی بہن سے اس کی خوشیاں چھین سکتی ہوں۔ اسے دکھ دے سکتی ہوں۔''

''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ریشماں کے لیے میں نے کبھی کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ یہ میری زندگی ہے جس کے فیصلے میری مرضی کے بغیر کرنے کا کسی کو بھی اختیار نہیں ہے۔ ایک تو بچپن کی منگنی اور پھر ایسی منگنی جس کی اب کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ اگر میں اس سے محبت کرتا تو آگ کے سمندر میں کود کر بھی اسے نکال لاتا لیکن اب میں یہ حماقت کیوں کروں؟''

''پلیز عبداللہ! تم اس کے لیے سوچو تو۔ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔'' ماہ بانو کا انداز منت کرنے والا تھا۔

''محبت تو تم بھی کرتی ہو۔ کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں میں؟'' اس نے ماہ بانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ماہ بانو نے نظریں چرا لیں۔ ''میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ ریشماں میری بہن ہے اور وہ تم سے محبت کرتی ہے۔''

''اصل مسئلہ یہ ہوا ناں۔ تم ریشماں کی وجہ سے پیچھے ہٹنا چاہتی ہو۔''

''کیونکہ وہ میری بہن ہے۔''

''اس وقت سے بہن بہن کہہ رہی ہو اسے۔ وہ تمہاری بہن نہیں صرف کزن ہے۔ ہم دونوں سے اس کا ایک جیسا قریبی رشتہ ہے۔ اگر تمہاری خالہ کی بیٹی ہے تو میرے بھی تایا کی بیٹی ہے۔ نہ وہ میری بہن ہے اور نہ تمہاری۔'' عبداللہ نے کہا۔

وہ مضطرب تھی۔ انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے سوچ میں گم بیٹھی تھی۔

''میں تمہیں ایک بہت پرانی بات بتانا چاہتی ہوں۔'' بالآخر اس نے کہا۔

عبداللہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جہاں ماضی کی کچھ ایسی پرچھائیاں تیر رہی تھیں جنہیں نہ سننا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں کوئی پرانی بات نہیں سننا چاہتا۔ ماضی میں اگر کچھ ہوا تھا تو آج یقیناً اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ڈالی جا سکتی اور نہ ہی میں کسی اور کی غلطیوں یا گناہوں کے کفارے کے طور پر اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کو بھینٹ چڑھا سکتا ہوں۔ مجھے یہ زندگی ایک ہی مرتبہ ملی ہے اور میں اس ایک زندگی میں دوسروں کا اتنا ہی خیال رکھوں گا جتنے سے میری زندگی پر اثر نہ پڑے۔

ٹو بی فرینک۔ بانو میں ایک عام سا انسان ہوں۔ کوئی پیغمبر یا ولی نہیں ہوں۔ مجھے صرف

دوسروں کا نہیں اپنا بھی خیال رکھنا ہے۔ میں اپنے سے قریب لوگوں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں لیکن کسی کے ماضی کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہیں اٹھا سکتا۔''

''تم نے شروع سے ایک بالکل مختلف ماحول دیکھا ہے عبداللہ۔ اس لیے تم وہ سب محسوس نہیں کر سکتے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی ان حالات میں۔'' اس نے ہونٹ کاٹے۔

عبداللہ خاموشی سے اس کے چہرے پر پھیلے اضطراب کا جائزہ لیتا رہا۔

''میں ساری زندگی اس احساسِ جرم کے ساتھ نہیں گزار سکتی کہ ریشماں کی محبت کے متعلق جاننے کے باوجود بھی میں......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تم خواہ مخواہ کے احساسِ جرم میں مبتلا ہو رہی ہو' لیکن ظاہر ہے کوئی تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں' کرتا رہوں گا۔ تم اس احساسِ جرم سے پیچھا چھڑا سکو تو مجھے اپنا منتظر پاؤ گی۔''

ماہ بانو نے دھندلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور بیگ کندھے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

''بانو!'' عبداللہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں یہ یقین چاہتا ہوں کہ ہم اب بھی پہلے کی طرح دوست ہیں۔''

ماہ بانو نے ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کیں اور اثبات میں سر ہلا کر ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اندر بہت غبار جمع ہو رہا تھا۔ آنسو آنکھوں سے نکلنے کو بے چین ہو رہے تھے' لیکن وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ بڑے سے خوبصورت گوٹا لگے دوپٹے کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ یہ سوٹ بھی اسے ریشماں نے دیا تھا۔

''تاکہ عبداللہ کی نگاہ اس پر پڑے اور اس کی خوشبو اس میں رچ بس جائے۔'' ماہ بانو نے سوچا۔ ''ایسا کیوں ہو جاتا ہے۔ میں چاہوں تب بھی اس کی طرف کیسے بڑھ سکتی ہوں۔ میرا احساسِ جرم ایک دن مجھے پاگل کر ڈالے گا۔

ان اونچی بے حد مضبوط دیواروں کے بیچ ریشماں صرف اس امید پر زندگی کے دن کاٹ رہی ہے کہ ایک نہ ایک دن عبداللہ اسے وہاں سے نکال لے جائے گا۔ اس کی محبت اسے لے جائے گی۔ اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

کاش سب ٹھیک ہو سکتا لیکن زندگی اتنی آسان کب ہے اور کیا پتا زندگی کیا ہے؟ ٹریجڈی ہے یا یہ کامیڈی آف ایررز۔ ساری زندگی سرپٹ دوڑتے رہتے ہیں اور آخر میں حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کون سی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم۔ اور پھر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں یہ سوچتے ہوئے کہ

مچ آڈو اَباؤٹ تھنگ۔

اس دوڑ میں ہم میں سے کوئی ایک ہی جیت سکتا ہے۔ ریشماں یا میں۔ اور میں یہ دوڑ جیتنا نہیں چاہتی۔ میرے ہٹ جانے سے شاید عبداللہ ریشماں کی طرف بڑھ جائے۔ شاید کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ شاید۔''

☆=====☆=====☆

زینی نے گاؤں جانے کی تیاری کے دوران لاہور فون کیا۔

''شاہ صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''لیکن آج تو چھٹی ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

''انہوں نے باہر لنچ پر جانا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی نکلے ہیں۔''

اس نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ بابا جان کے انداز کی سرد مہری کی وجہ سے اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بابا جان کا رویہ پہلی مرتبہ دیکھا تھا اس نے۔ وہ تو سراپا شفقت اور محبت تھے۔ اب بھی انہوں نے اسے نہ ڈانٹا تھا اور نہ ہی ایسے انداز میں بات کی تھی جس سے ناگواری کا احساس ہو۔ بس ان کے رویے میں سرد مہری تھی۔

''میں کیسے سامنا کروں بابا جان کا۔ اگر ان کا انداز اب بھی ویسا ہی ہوا تو میرا دم ہی نکل جائے گا۔ پتا نہیں میرے چلے آنے کے بعد انہوں نے سبط کو کیا کہا ہوگا۔ شاید ڈانٹا ہو' شاید مجھ سے ملنے سے منع کیا ہو۔ ایسا ہوا پھر کیا ہوگا؟''

جب کچھ نہ سوجھا تو اس نے سبطِ حسن کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف فون اسی نے اٹھا لیا۔

''تمہیں بابا جان نے ڈانٹا تو نہیں؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''نہیں!''

''اُف اللہ۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ بھائی کو لاہور میں فون کیا ہے لیکن وہ گھر پر نہیں ہیں ورنہ وہ بابا جان سے بات کر لیتے۔''

''اب اس وقت کیا بات کرو گی ان سے۔ ابھی خاموشی سے ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ گاؤں جا کر بھائی سے فون پر بات کر لینا۔ وہ سنبھال لیں گے معاملہ۔'' وہ بولا۔

''لیکن اگر بابا جان نے راستے میں کچھ پوچھ لیا تو؟''

''نہیں پوچھیں گے بے فکر رہو۔'' سبطِ حسن نے کہا۔

''تمہیں کیسے پتا؟''

''میں اپنے خاندان کے لوگوں کا مزاج جانتا ہوں۔''

''پھر بھی اگر پوچھ لیا تو میں کیا کروں گی؟'' اس کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔

"میں جو کہہ رہا ہوں کہ نہیں پوچھیں گے اور اگر پوچھ لیا تو بتا دینا انہیں۔ آخر عبداللہ بھائی سے بھی تو بات کی تھی تم نے۔"

"وہ میرے بھائی ہیں۔ میرے دوست ہیں لیکن بابا جان تو میرے بابا ہیں ناں۔ ان سے اس انداز میں بات نہیں کر سکتی میں جیسے بھائی سے کی تھی۔ قسم سے سبط مجھے بہت رونا آ رہا ہے۔"

"تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو اور بات بے بات رونا تمہاری پرانی عادت ہے۔ میں کہہ رہا ہوں تمہیں کہ وہ براہِ راست تب تک تم سے بات نہیں کریں گے جب تک کہ یہ بہت ناگزیر نہ ہو جائے۔"

"اچھا!" اس نے کہا پھر قدرے توقف سے بولی۔ "تمہیں یقین ہے ناں کہ وہ نہیں پوچھیں گے؟"

"سو فیصد یقین ہے۔"

"تم آج گاؤں جاؤ گے ناں؟"

"شاید کل تک جاؤں۔" اس نے بتایا۔

"فون تو کرو گے ناں؟"

"ہاں۔ اور وہ واکی ٹاکی سنبھالی ہوئی ہے ناں تم نے؟"

"تمہارا دیا ہوا تحفہ ہے کیسے نہیں سنبھالوں گی بلکہ تم ایسا کرنا سبط کہ واکی ٹاکی پر ہی بات کرنا مجھ سے۔"

"اب تم تیار ہو جاؤ اور پلیز یہ رونے دھونے کا پروگرام شروع مت کرنا۔"

"وہ تو میں تیار ہو جاؤں گی لیکن پتا ہے کیا؟"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"نہ میرا یہاں رہنے کو دل چاہ رہا ہے اور نہ یہاں سے جانے کو۔ میری اتنی زیادہ خواہش تھی گاؤں جانے کی۔ اپنی حویلی میں، اپنے گھر میں، اپنے گھر میں اماں اور بابا جان کے ساتھ رہنے کی مگر جب سوچتی ہوں کہ تم اتنے دور ہو جاؤ گے تو میرا یہاں سے کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"یہی زندگی ہے۔ میرے لیے بھی کب آسان ہے کہ میں تم سے دور رہوں، لیکن یہ وقتی سی بات ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاءاللہ۔"

☆=====☆=====☆

حیدر علی شاہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہے تھے جب دیدی ان کے پاس آئیں۔

"آپ نے یاد کیا تھا؟"

انہوں نے رسالہ رکھ دیا۔ "تشریف رکھیں آپ۔"

وہ بیٹھ گئیں۔

حیدر علی شاہ نے زہرا یا زینب سے براہ راست کچھ نہیں پوچھا تھا۔ انہوں نے دیدی سے ساری تفصیل معلوم کر لی۔

"آپ کو دونوں بچیوں کی گورنس بنایا گیا تھا مگر آپ نے تب تک مجھے سبط حسن کے سلسلے میں انفارم نہیں کیا جب تک میں نے آپ سے خود نہیں پوچھا۔ آپ نے زینی کو روکنے یا سمجھانے کی بھی کوشش نہیں کی۔"

"پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دوں شاہ صاحب کہ میں بہرحال ایک ملازمہ ہوں۔ آپ لوگوں کی بھی اور بچیوں کی بھی۔ زینی نہیں چاہتی تھی کہ میں آپ کو سبط کے بارے میں بتاؤں۔ وہ یہ بات آپ کو خود بتانا چاہتی تھی، میں یہ سوچ کر خاموش رہی کہ ہم دونوں کے بتانے کا انداز مختلف ہوگا۔ میرے خیال میں بہتر یہی تھا کہ یہ بات آپ کو زینی یا گڑیا میں سے کوئی بتائے۔

مجھے نہیں معلوم کہ کیسے چھوٹے شاہ صاحب کو اس بات کا علم ہو گیا، وہ یہاں آتے رہتے تھے۔ سبط بھی آیا کرتا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ دونوں بہن بھائیوں اور سبط حسن کے درمیان کیا بات چیت ہوئی۔ انہوں نے مجھے شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا اور مجھے بھی یہ اچھا نہیں لگا کہ اس بات کو کرید دوں۔"

"آپ کو یاد ہے بی بی کہ آپ جب ملازمت لینے آئی تھیں تو میں نے آپ سے کہا تھا کہ میری صرف ایک ریکوائرمنٹ ہے کہ بچیوں کی دیکھ بھال اس طرح کی جائے جس طرح ایک ماں کرتی ہے۔" حیدر علی شاہ نے کہا۔

"پتا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، شاید یہ کہ میں نے بچیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کی حالانکہ خدا گواہ ہے کہ میں نے دانستہ کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ سبط کے سلسلے میں بھی میں نے زینی سے تفصیلی بات کی تھی اور زینی نے کہا تھا کہ دیدی ہم آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ معاف کیجیے شاہ صاحب، آپ بچیوں کو دنیا سے الگ تھلگ نہیں رکھ سکتے۔ نہ ہی میں سمجھتی ہوں کہ یہ بچیوں کے لیے کوئی اچھی بات ہو سکتی ہے۔ میں نے بچیوں کی دیکھ بھال ماں کی طرح ہی کی ہے لیکن شاید میں ایک مختلف ماں ہوں۔ قدرے لبرل اور قدرے آزاد خیال۔ اور آپ کے گھرانے کے متعلق بھی میں یہی سمجھتی رہی۔"

"میں بھی اتنا تنگ نظر نہیں ہوں بی بی لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اپنی اولاد، خاص طور پر بیٹیوں کے بارے میں باخبر رہوں۔"

"یہ میری غلطی ہے۔ شاید میں معاملات کو صحیح طور پر جج نہیں کر سکی۔"

"اینی وے، اب تو جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ آپ زینی سے کہیے کہ وہ بس ضروری سامان لے

کرا جائے باقی سب کچھ بعد میں آتا رہے گا۔''

''جی بہتر۔'' دیدی اٹھ کر ڈرائینگ روم سے باہر نکل گئیں۔

ان کی گفتگو کے دوران ڈرائینگ روم کی ایکس ٹینشن پر دو مرتبہ نمبر ڈائل کرنے کی آوازیں ابھری تھیں۔ انہوں نے ایک نظر فون کی طرف دیکھا پھر دوبارہ رسالہ اٹھا لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد فون رکھنے کی آواز ابھری۔

وہ چائے پی رہے تھے جب زینی سفری بیگ کندھے پر رکھے کمرے سے باہر نکلی۔

''بابا جان میں تیار ہوں۔'' اس نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

''تو پھر چلیں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

دونوں ساتھ ساتھ چلتے باہر نکل آئے۔ زینی نے ایک نظر ہٹ پر ڈالی۔ کتنی ہی یادیں تازہ ہوگئی تھیں۔

''بیٹھو بیٹا!''

وہ چونک گئی۔ ''جی'' پھر گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رک گئی۔ ''بابا جان ہم لاہور میں بھائی کے پاس رکیں گے ناں؟'' اس نے ملتجی انداز سے پوچھا۔

حیدر علی نے دیکھا' زینی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے رو کر آئی ہو یا رونے والی ہو۔

''بہت تھوڑی دیر کے لیے۔ گاؤں میں آپ کی اماں جان بہت بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بابا جان بھی اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور گاڑی سڑک پر لے آیا۔

ان کی گاڑی جانے پہچانے سب راستوں کو چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی اور زینی کا دل بھر آ رہا تھا۔ ہر پل کے ساتھ وہ آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ اونچے نیچے راستے جہاں وہ اور سبط واک کیا کرتے تھے۔ وہ جگہ جہاں سبط نے اس کی تصویر کھینچی تھی' وہ درخت جس کے تنے پر بیٹھ کر وہ دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے' مال روڈ کی وہ دکان جہاں سے وہ سٹرابیری کے ڈبے خرید کر اسے گفٹ کیا کرتا تھا۔ سب پیچھے رہ گیا تھا۔

اس نے بہت ضبط کرنا سیکھ لیا تھا لیکن بالکل اچانک سب کچھ چھوڑ جانے کے خیال سے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ سب سے زیادہ دکھ تو اس بات کا تھا کہ وہ ڈرائینگ روم میں لگی اپنی بڑی سی تصویر نہیں لا سکی تھی۔

''میری بیٹی رو رہی ہے۔'' حیدر علی نے اس کی طرف دیکھا اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''کچھ نہیں بابا جان' مجھے یونہی رونا آ گیا تھا'' اس نے سختی سے اپنی آنکھیں رگڑ دیں۔

''یہ کیا؟ میری بیٹی اپنی اتنی پیاری آنکھوں کے ساتھ یہ ظلم کرتی ہے۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔''

ان کی بات سن کر وہ اور زیادہ رو پڑی اور بالآخر ان کے کندھے سے سر ٹکا کر نہ جانے کب سو گئی۔

لاہور پہنچتے تک رات ہو چکی تھی۔ عبداللہ کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ اپنے بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ ابھی کچھ پہلے ہی اس کی آنکھ لگی تھی۔

''بھائی!'' اسے دیکھتے ہی زینی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

''کیسی ہو؟ لگتا ہے موڈ کچھ بگڑا ہوا ہے۔ کیا بات ہے؟''

''میں نے آپ کو فون کیا تھا۔ کہاں تھے آپ؟'' اس نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا۔

''میں باہر لنچ پر گیا ہوا تھا اور جیسے ہی مجھے تمہارے فون کا پتا چلا' میں نے تمہیں رنگ بیک کیا تھا لیکن وہاں سے معلوم ہوا کہ تم گاؤں کے لیے چل پڑی ہو۔''

''تم دونوں بہن بھائی یہیں ایک دوسرے کی ایکس پلینیشن کال کرتے رہو گے؟ کہیں بیٹھنے کا ارادہ نہیں ہے؟'' بابا جان نے کہا۔

''آئی ایم سوری' زینی کو یہاں دیکھ کر اتنا اچھا لگا کہ باقی سب کچھ بھول گیا۔ آئیں لاؤنج میں آجائیں۔''

وہ تینوں لاؤنج میں آ گئے۔

''آپ لوگوں نے کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟'' عبداللہ نے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' زینی بولی۔

''تم کھانے سے انکار کر دو میں مان ہی نہیں سکتا۔ ویسے سٹرابیری کے ڈبے بھی پڑے ہوئے ہیں۔''

''میں نے کچھ نہیں کھانا' مجھے رونا آ رہا ہے بہت زیادہ۔''

''یہ دیکھ بہن! میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' عبداللہ نے سچ مچ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''رونا مت پلیز۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ تمہیں چپ کروا سکوں اور یوں بھی زینی اگر کبھی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر روؤ تو تمہیں اندازہ ہو کہ کتنی بھیانک لگتی ہو روتے ہوئے۔ بلکہ ایک مرتبہ یہ تجربہ کر ہی لو' آئندہ کبھی نہیں روؤ گی۔''

''میں بھیانک لگتی ہوں بھائی؟ بابا جان' بھائی مجھے بدصورت کہہ رہے ہیں۔ میں کوئی بدصورت ہوں؟'' وہ ان کی طرف مڑی۔

''میری بیٹی کو کوئی بدصورت کہہ کر تو دیکھے۔ اتنی پیاری سی ہے میری زینب!'' بابا جان نے پیار سے کہا۔

"بس سن لیا؟ بدصورت ہوگی آپ کی ہونے والی بیوی۔ آپ کی منگیتر۔ میں کیوں ہو لگی بدصورت اور پتا ہے سبط بھی کہتا ہے۔" تیزی سے بولتے بولتے وہ اچانک رک گئی۔ کن اکھیوں سے بابا جان کی طرف دیکھا جو بظاہر سگار سلگانے میں مصروف تھے۔ وہ اندازہ نہیں سکی کہ انہوں نے اس کی بات سنی تھی یا نہیں۔ بات تو اس نے خاصی اونچی آواز میں کی تھی اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے کانوں تک نہ پہنچی ہو لیکن اگر انہوں نے سن لی تھی تب بھی ظاہر نہیں کیا تھا۔

"جسے تم بدصورت کہہ رہی ہو' اسے تم دیکھ لو تو دیکھتی رہ جاؤ۔" عبداللہ نے زینی کو پریشا سے نکالنے کے لیے بات مذاق میں اڑانا چاہی۔

"سچ بھائی' ریشماں بھابی بہت خوبصورت ہیں۔" اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "سبط حسن بھی کہتا ہے۔" اس نے پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کی بات سبط حسن کے ذکر کے بغیر پوری ہی نہیں ہوتی تھی۔ سب کے سامنے بات کرتے ہوئے اسے اس بات خیال ہی نہیں رہتا تھا۔

"ریشماں کہاں سے آ گئی درمیان میں۔" عبداللہ نے زیر لب کہتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے منع کیا۔ پھر بولا۔ "میں ملازم سے کھانے کے لیے کہتا ہوں بھوک ہے یا نہیں تمہیں کھانا تو کھانا پڑے گا۔"

وہ حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بہن کو کھانا کھلا دو تا کہ پھر ہم نکلیں۔"

اس نے ملتجی انداز میں بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ عبداللہ سے بات کرنا چاہتی تھی جو اس طرح کرنا ممکن نہیں تھا۔

"اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہے زینی' آپ لوگ رات کو آرام کریں' صبح نکل جائیں۔" عبداللہ نے کہا۔

"تمہاری اماں جان انتظار کر رہی ہیں ناں۔" وہ بولے۔

"انہیں فون کر کے بتا دیں کہ آپ لوگ صبح چلیں گے۔ زینی پہلی مرتبہ اس گھر میں آئی ہے' اسے گھر تو دیکھ لینے دیں۔ جلدی کیا ہے آپ کو جانے کی؟"

"پہلی مرتبہ نہیں' دوسری مرتبہ بھائی۔ پہلی مرتبہ جب آئی تھی تو بہت چھوٹی سی تھی پھر بھی مجھے بیڈ روم یاد ہے۔ یہ لاؤنج اور ڈرائینگ روم بھی یاد ہے اور پیچھے جھولے لگے ہوئے تھے' وہ بھی یاد ہیں۔"

"بڑی اچھی یادداشت ہے تمہاری۔" عبداللہ ہنسا۔

"آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں مذاق کر رہی ہوں؟ بے شک سبط سے پوچھ لیں۔ میں نے

اسے بھی پوری تفصیل سے بتایا تھا یہ والا گھر اور حویلی بھی مجھے یاد ہے۔ وہ بھی بتائی تھی میں نے اسے۔" وہ جوش سے بولتی گئی۔

اپنی رو میں بات کرتے ہوئے اس مرتبہ زینی کو احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے بہت آرام سے سبط حسن کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ عبداللہ نے بابا جان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں سوچ کی واضح پرچھائیاں تھیں۔

"میں اپنے بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔ بہن کو کھانا کھلانے کے بعد میرے پاس آنا۔" بابا جان نے اٹھتے ہوئے عبداللہ سے کہا۔

"آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟" زینی نے کہا۔

"نہیں!"

"میں لاؤں پھر بھی نہیں کھائیں گے؟" زینی بولی۔

"میں ضرور کھاتا لیکن بیٹا ابھی طبیعت نہیں چاہ رہی۔" وہ بولے۔

"میں اماں جان کو فون کر دوں آپ لوگوں کے رکنے کا؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"میں خود کر دوں گا۔ تم جیسے ہی فارغ ہوتے ہو میرے کمرے میں آؤ۔"

عبداللہ کو معلوم تھا کہ یہ طلبی کس سلسلے میں تھی مگر آج نہیں تو کل اس مسئلے کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔

بابا جان کے جاتے ہی زینی جلدی سے اس کے برابر آ بیٹھی۔

"بھائی! آپ سچ مچ ریشماں کی بات نہیں کر رہے تھے؟ سچی سے وہ بہت خوبصورت اور اچھی ہیں۔ مجھے خود سبط نے بتایا ہے۔" وہ صوفے پر آلتی پالتی مار کر کشن گود میں رکھتے ہوئے بولی۔

"تم نے اسے بھابی کہاں سے بنا لیا؟ وہ یقیناً اچھی اور خوبصورت ہوگی لیکن تمہاری بھابی نہیں ہو سکتی۔ بہت شوق ہے اسے بھابی بنانے کا تو بھائی تبدیل کر لو۔"

"اللہ نہ کرے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ دیکھیں سبط اچھا ہے ناں؟ اسی طرح ریشماں بھابی بھی بہت اچھی ہیں۔ پتا ہے سبط نے مجھے ان کی اتنی باتیں بتائی ہیں کہ مجھے لگتا ہے جیسے میں ان سے بہت مرتبہ مل چکی ہوں اور بھائی وہ آپ کی منگیتر بھی تو ہیں۔" اس نے عبداللہ کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

ملازم کھانے کی ٹرالی اندر لے آیا اور کھانا چن کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"یہ باتیں تمہاری چھوٹی سی عقل میں نہیں آئیں گی۔ اس لیے تم اپنا دماغ خرچ کرنے کے بجائے کھانا کھاؤ۔" عبداللہ بولا۔

"پتا ہے بھائی کیا ہوا؟ آج بابا جان اچانک آ گئے مجھے لینے کے لیے۔" اس نے چاول

پلیٹ میں ڈالے۔

''پھر؟''

''بہت مسئلہ ہوگیا ناں۔ وہاں سبط بھی تھا۔ ہم اس وقت انڈوں کا حلوہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اتنا ہنگامہ برپا تھا گھر میں جب بابا جان آئے۔ اُف اللہ کیا بتاؤں کہ اس وقت میرا کیا حال ہوا۔ بابا جان نے ہمیں کچھ نہیں کہا لیکن ان کا رویہ میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ مجھے تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ میرے بابا جان ہی ہیں۔ اتنی سرد مہری تھی ان کے رویے میں۔ اگر وہ مجھے ڈانٹ دیتے تب بھی مجھے اتنا محسوس نہ ہوتا جتنا ان کے سرد قسم کے رویے سے ہوا تھا۔''

''میں نے بتایا تھا تمہیں کہ یہ سب تو ہوگا۔ تم میں برداشت کا حوصلہ نہیں ہے' اسی لیے کہتا ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ سبط تمہارا کزن ہے' دوست ہے۔ بس دوستی رہنے دو اور باقی قصے کو ختم کرو۔ میں جانتا ہوں ناں تمہیں۔ جن رویوں کا تمہیں سامنا کرنا پڑے گا' وہ تم بالکل برداشت نہیں کر سکو گی۔'' عبداللہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

زینی نے کھانا ادھورا چھوڑ کر پلیٹ ٹرالی میں رکھ دی۔ ''آپ تو چاہتے ہی یہی ہیں۔ مجھ میں بہت حوصلہ ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر لوں گی۔ آپ سے اس لیے کہتی ہوں سب کچھ کہ آپ میرے بھائی ہیں لیکن آپ کو بھی میرا خیال نہیں ہے۔'' اس کی آواز بھرّا گئی۔

''میں کچھ اور کہتا ہوں' تم کچھ اور سمجھتی ہو۔ چلو جلدی سے کھانا کھاؤ۔ میں نہ دیکھوں کہ چاول کا ایک بھی دانا پلیٹ میں بچا ہوا ہو۔''

اس نے خاموشی سے پلیٹ اٹھائی اور چاول کھانے شروع کر دیے۔

''اور اب یہ اپنا موڈ بھی ٹھیک کرو' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا رو کیسے لیتی ہو تم۔ کتنا بڑا سمندر چھپایا ہوا ہے آنکھوں میں تم نے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''میرا موڈ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں؟ اب کیا ہوا؟''

''پتا ہے بھائی! کیا ہوا؟ وہاں ڈرائنگ روم میں بابا جان بیٹھے ہوئے تھے ناں۔ اس لیے میں اپنی تصویر تک نہیں لا سکی۔ دل بہت چاہ رہا تھا کہ اتار لاؤں لیکن بس سوچتی رہ گئی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بابا جان مائنڈ نہ کریں۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے ناراض ہو اور خاص کر آپ کو اور بابا جان کو تو میں بالکل ناراض نہیں دیکھ سکتی۔ ویسے ناراض تو میں اماں جان اور گڑیا کو ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی۔ سب سے اچھا سبط ہے' وہ ناراض ہوتا ہی نہیں ہے مجھ سے۔ آج تک ایک منٹ کو بھی ناراض نہیں ہوا۔''

''باقی سب کب ناراض ہوتے ہیں تم سے؟''

''اماں جان اور گڑیا ہی نہیں ہوتیں۔ بابا جان تو آج ہی ناراض ہو گئے تھے۔ میرا تو غم

سے دل ڈوبنے لگا تھا۔'' وہ بولی۔

''اور میں؟ میں تو کبھی تم سے ناراض نہیں ہوا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''واہ اتنی جلدی بھول بھی گئے۔ اتنا سخت ڈانٹا تھا آپ نے مجھے ایک دفعہ۔ وہاں سبط بھی تھا۔ یاد نہیں آیا آپ کو؟''

''اچھا بابا اگر کبھی ڈانٹا تھا تو اس کے لیے معافی دے دو اور اب کھانا ختم کر لیا ہے تو جا کر سو جاؤ۔ یہ ساتھ والا بیڈ روم تمہارا ہے۔''

''وہ تو میں چلی جاتی ہوں لیکن بابا جان نے آپ کو کیوں بلایا ہے؟''

''مجھے کیا پتا۔ یہ تو ان کے پاس جا کر ہی معلوم ہوگا ناں۔'' عبداللہ نے بات ٹالنا چاہی۔

''اگر انہوں نے سبط کے متعلق کچھ پوچھا پھر؟''

''جب یہ معاملہ تم نے میرے ہاتھ میں دے دیا ہے تو بے فکر ہو جاؤ اس کی طرف سے اور جا کر سو جاؤ۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن بابا جان کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟'' اسے دوسرا خیال آیا۔

''بتایا تو تھا انہوں نے۔ کہ ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

''لیکن مس جارج کہتی تھیں کہ رات کو کچھ نہ کچھ کھانا چاہیے۔ وہ زبردستی ہمیں کھانا کھلایا کرتی تھیں۔'' زینی نے کہا۔

''تو تم زبردستی بابا جان کو کچھ کھلا دو لیکن میرے سر سے ٹلو۔ مجھے بابا جان سے بات کر کے سونا بھی ہے۔ صبح کالج جانا بہت ضروری ہے میرا۔''

''اچھا تو پھر آپ جائیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

عبداللہ' بابا جان کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو وہ صوفے پر بیٹھے سگار پیتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھے

''آپ نے یاد کیا تھا؟'' اس نے کہا۔

''ہوں۔ بیٹھو۔'' انہوں نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا' پھر قدرے توقف سے بولے۔ ''جانتے ہو ناں کیوں بلایا ہے میں نے تمہیں؟''

''اندازہ ہے۔'' وہ بولا۔

''تم نے سبط حسن کا تذکرہ مجھ سے کیوں نہیں کیا؟''

''فی الحال میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ایک تو ابھی دونوں کم عمر ہیں اور پھر میں دونوں ہی کو کچھ وقت دینا چاہتا تھا۔ ضروری نہیں کہ جو محسوسات ان کے آج ہیں' کل یا سال بھر بعد بھی وہی ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ ابھی دونوں کو دنیا میں بہت کچھ دیکھنا ہے' بہت کم بھی لگا لیں تو کم از کم چھ سال تو لگیں گے ہی ان کی شادیاں

وغیرہ طے کرنے میں۔ تب تک نہ جانے حالات کیا ہوں' یہ بھی ممکن ہے کہ اتنے سال گزر کے بعد وہ اتنے قریب نہ رہیں جتنے آج کل ہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

'' یہ سب مفروضات ہیں۔ اور ہر بات کے برابر چانسز ہیں۔ تم جانتے ہو کہ زینی چاہتی ہے وہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی بیٹی کو کسی جہنم میں نہیں دھکیل سکتا۔ یہی سب کرنا ہو امداد میں کیا برائی تھی؟ مجھے اپنے بچوں کو اپنے اور ماں سے دور کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

'' آپ سبط سے مل لیں۔ وہ بہت مختلف لڑکا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ امداد سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

'' بھول جاؤ کہ وہ کتنا اچھا ہے۔ وہاں زینی کی شادی ممکن نہیں ہے۔ نو وے!'' انہوں سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔

'' میں آپ سے تفصیل سے بات کروں گا اس سلسلے میں لیکن میرا مشورہ ہے کہ ابھی آ اس مسئلے کو نہ چھیڑیں۔''

'' تفصیل سے بات کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' انہوں نے فیصلہ کن انداز کہا۔ '' آج کل گڑیا اور زینی کے لیے بہت اچھے پرپوزل آئے ہوئے ہیں اور میں سنجیدگی ان کے متعلق سوچ رہا ہوں۔''

'' لیکن دونوں ابھی بہت چھوٹی ہیں بابا جان اور ان کی تعلیم بھی نامکمل ہے۔'' عبداللہ کہا۔

'' میری اور تمہاری نظر میں تو وہ ہمیشہ چھوٹی رہیں گی۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری اماں جان پریشان رہتی ہیں۔ ہر وقت تم لوگوں کی طرف سے پریشان رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ بچیوں کے گھر بس جانے چاہئیں۔

اور پھر یہ کوئی انہونی بات تو ہے نہیں۔ خاندان کی بیشتر بچیوں کی شادیاں بہت کم عمری ہی ہوئی ہیں اور وہ بہت آرام سے گھر بار کی ذمہ داریاں اٹھا لیتی ہیں۔ تمہاری امی بہت کم عمر شادی کے وقت۔''

'' وقت بدل گیا ہے بابا جان۔ خاندان کی باقی عورتیں اس لیے خوش ہیں کہ انہوں ایک خاص قسم کی طرز زندگی کو اپنا مقصد سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ اور اماں جان اس لیے اپنے گھر خوش ہیں کیونکہ انہیں آپ جیسا لائف پارٹنر ملا ہے۔

مسئلہ یہ ہے بابا جان کہ آپ نے اپنی اولاد کی پرورش جدید دور کے مطابق کی ہے۔ کے ذہنوں کو پالش کیا ہے۔ آزادئ رائے کی اجازت دی ہے انہیں۔ ہم سب آپ سے ہر بات ڈسکس کر لیتے ہیں۔ ہم آپ کا احترام اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں آپ سے محبت ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ والدین کا احترام کرنا چاہیے۔

جب آپ نے یہ سب خود ہمیں سکھایا ہے تو آپ کا تمام تر احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے ذہنوں میں ابھرنے والے سوال آپ سے ضرور پوچھیں گے۔ آپ نے سکھایا ہے کہ سوال کرو۔ کسی بات کو محض اس لیے قبول مت کرلو کہ وہ کسی بزرگ نے کہی ہے۔ بلکہ اسے پرکھو۔ اب آپ بتائیں بابا جان کہ جب زینی آپ سے سوال کرے گی تو آپ کس طرح اسے مطمئن کریں گے۔''

'' یہ جو پرپوزل آئے ہیں ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔ تمہاری اماں جان کی پھوپھی زاد بہن کے بیٹے ہیں دونوں۔ ایک سول سرونٹ ہے ڈی ایم جی میں اور دوسرا ابھی باہر سے ایم بی اے کر کے آیا ہے۔ پڑھی لکھی فیملی ہے۔ گڑیا اور زینی ایڈجسٹ کر لیں گی۔ میں لڑکوں سے بھی ملا ہوں۔ بہت اچھے ہیں دونوں۔ آج کل کے لڑکوں کی طرف کھلنڈرے اور لاابالی نہیں ہیں۔ میں اس میں بھی حرج نہیں سمجھتا کہ زینی اور گڑیا ان سے مل لیں مجھے یقین ہے کہ وہ دونوں ہی بہت خوش رہیں گی۔'' بابا جان نے کہا۔

'' آپ کو اتنا یقین کیسے ہے؟ بابا جان خوش رہنے کے لیے صرف یہ ضروری نہیں ہوتا کہ لڑکا Well- Established ہو۔ گڑیا کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ زینی کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اپنی بہنوں کی طرف سے بے خبر ہوں۔ میری اس معاملے پر سبط اور زینی دونوں سے بہت تفصیل کے ساتھ بات ہوئی ہے اور ایک بار نہیں بار بار ہوئی ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ گھر میں دونوں کو ہلا گلا کرتے دیکھ لیا تو یہ سمجھے کہ سبط کھلنڈرا اور لاابالی ہے۔ عمر کی جس حد میں سبط ہے اصولاً اس عمر میں اسے لاابالی ہونا ہی چاہیے لیکن وہ نہیں ہے۔ وہ بہت میچورڈ اپ اور اسٹینڈ لینے والا لڑکا ہے۔ آپ اس سے ملنے سے پہلے اس کے بارے میں کوئی اندازہ مت قائم کریں کیونکہ آپ کا اندازہ ٹھیک نہیں ہوگا۔''

'' تم زینی کی کسی حماقت میں اس کا ساتھ دے سکتے ہو لیکن میں اس کی پوری زندگی تباہ نہیں کر سکتا۔ تم نے جو کچھ سبط کے لیے کہا' میں نے وہ سب مان لیا۔ ٹھیک ہے' وہ اچھا ہے' میچورڈ اپ ہے' اسٹینڈ لے سکتا ہے پھر بھی وہاں زینی کی شادی نہیں ہو سکتی۔ میں بڑی حویلی اور اس کے مکینوں کے مزاج کو جانتا ہوں۔ زینی کے لیے وہ لوگ' وہ ماحول مناسب نہیں ہے۔'' بابا جان کا انداز حتمی تھا۔

☆=====☆=====☆

صبح عبداللہ کالج آیا تو تھکا تھکا سا تھا۔ اُما' ماہ بانو کے قریب کھڑی اس سے پوچھ رہی تھی کہ کل لنچ پر عبداللہ سے ملاقات کیسی رہی۔

'' میں بہت ڈپریسڈ ہوں اُما!'' ماہ بانو نے کہا۔

'' کیوں؟ کیا پھر اس سے بات نہیں کر سکیں۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''اس کی نگاہ سامنے سے آتے ہوئے عبداللہ پر پڑی۔''بعد میں بتاؤں گی۔ وہ آ رہا ہے۔''

وہ پلاسٹر آف پیرس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''خیر تو ہے عبداللہ' تھکے تھکے سے لگ رہے ہو؟''اُمانے اس سے پوچھا۔

''کیا خیر ہونی ہے۔کل ساری رات بابا جان کو قائل کرنے کی کوشش میں لگا رہا لیکن وہ قائل ہونے پر بالکل تیار نہیں تھے۔''

''کس سلسلے میں قائل کرنا تھا انہیں؟''اس نے پوچھا۔

''پرسنل مسئلہ ہے۔میری چھوٹی بہن ہے زینب' اس کے متعلق۔''وہ بولا۔

ماہ بانو نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔''نہیں مانے تمہارے بابا؟''

''ابھی تو نہیں مانے لیکن میں منوالوں گا۔میں آخری لمحے تک جنگ لڑنے کا قائل ہوں۔ ہتھیار نہیں ڈالا کرتا۔''

''ہر چیز غلط ہوجاتی ہے۔جو نہیں ہونا چاہیے وہ ہو جاتا ہے۔جو ہونا چاہیے' وہ نہیں ہوتا۔''وہ بولی۔

''کیا ہونا چاہیے؟''

''کیا پتا؟''وہ دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''اب تمہارا گاؤں جانے کا ارادہ ہے؟''اُمانے اس سے پوچھا۔

''بہت مشکل ہے لیکن جانا پڑے گا۔آگے تھیسز بھی آ رہا ہے اور خاندان کے اتنے بکھیڑے ہیں۔سٹیج بھی مجھے ہی کرنا پڑتا ہے سب کچھ۔''

''واقعی تمہارے لیے مشکل ہوگا۔تھیسز تو بہت ٹف ہوتا ہے۔''اُمانے کہا پھر ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوئی۔''تمہارا ارادہ ہے گاؤں جانے کا؟''

''پتا نہیں۔ویسے اماں زبردستی ہر گرمیوں کی چھٹیوں میں لے جاتی ہیں اپنے ساتھ۔''وہ بولی۔

''تمہارا بھی تو ریشماں سے ملے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔''اُمانے چیزل اور ہتھوڑی ایک طرف رکھ دی۔

ماہ بانو نے کن اکھیوں سے عبداللہ کی طرف دیکھا۔وہ نظریں چرا کر پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''تمہارے بابا جان یہیں ہیں یا گاؤں چلے گئے؟''اُمانے پوچھا۔

''آج صبح ہی بابا جان اور زینی گاؤں کے لیے نکل گئے ہیں۔''

''تم نے انہیں بتایا نہیں کہ سبط حسن نے تمہیں مطمئن کر دیا ہے؟''ماہ بانو نے کہا۔

''ایک لیول پر وہ بھی زینی کی طرح ہی اپنی بات منوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''وہ بولا۔

''چلو کمز چلنا ہے۔''ایڈی ان کے قریب آ کر بولا۔

''تم دونوں چلو گی؟''عبداللہ نے پوچھا۔

''کیسے نہیں چلیں گی یہ دونوں۔ویسے بھی انہوں نے کون سا مائیکل اینجلو یا ڈونا ٹیلو بننا ہے۔''ایڈی نے کہا۔

وہ چاروں میوزیم کی طرف چل دیے۔

''لیکن عبداللہ انہوں نے کوئی دلیل تو دی ہوگی؟ کوئی ٹھوس بات تو کی ہوگی؟''ماہ بانو کا ذہن ابھی تک زینی کے مسئلے میں ہی الجھا ہوا تھا۔

''ان کا کہنا ہے کہ کوئی بھی اپنے خونی رشتوں کو مکمل طور پر نہیں چھوڑ سکتا۔سبط کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ یہ کہنے اور کرنے میں کیا فرق ہے اور بابا جان کا خیال ہے کہ ان کے درمیان یہ انڈرسٹینڈنگ صرف وقتی بات ہے۔تھوڑی دیر کا ابال ہے خود ہی ختم ہو جائے گا۔''عبداللہ نے کہا۔

وہ چاروں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ایڈی کولڈ ڈرنک لانے خود ہی چلا گیا۔

''تھوڑی دیر کا ابال؟''ماہ بانو کے انداز میں تلخی تھی۔''ہاں۔وہ یہ کہہ سکتے ہیں۔مردوں کی زندگی میں یقیناً یہ تھوڑی دیر کا ہی ابال ہوتا ہے۔اور تمہارے بابا جان بھی مرد بن کر سوچ رہے ہیں۔ضروری نہیں کہ عورت بھی ایسی سچویشن میں خود کو ایڈجسٹ کر سکے۔''

عبداللہ نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔وہ مضطرب تھی۔پریشان تھی لیکن خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم اپنے بابا جان سے کہنا عبداللہ۔''

''جو بھی کہنا ہو تم خود ان سے کہہ دینا۔''عبداللہ نے ماہ بانو کی بات کاٹی۔اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ جو بھی بات کہنے والی تھی' اس کا تعلق کسی ماضی کی کسی کڑی سے تھا۔

''میں؟ میری بات میں وہ وزن تو نہیں ہو سکتا جو تمہاری بات میں ہو سکتا ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہ بات سن کر وہ اپنی ضد چھوڑ دیں گے۔''ماہ بانو نے کہا۔

''نہیں بانو! جو بات بھی تم مجھے بتانا چاہتی ہو وہ انہی سے کرنا۔میں اپنے انداز سے فائٹ کروں گا۔دلیل سے' منطق سے' ماضی کے کسی حوالے سے نہیں۔میں اس بارے میں نہ سننا چاہتا ہوں اور نہ جاننا چاہتا ہوں۔''اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

''لیکن میں ان سے کیسے بات کر سکتی ہوں؟''اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا گاؤں میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔بابا جان بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔کسی بھی جگہ تم ان سے کوئی بھی بات کر سکتی ہو۔''

"میرے لیے مشکل ہوگا۔ ان سے کچھ کہنا اور پھر میں کس حیثیت میں ان سے با
کروں گی۔ تمہارے خاندانی معاملات میں' میں کیسے مداخلت کرسکتی ہوں' یہ حق میرے پاس نہ
ہے۔"

"تمہیں پورا حق ہے ہمارے خاندانی معاملات میں اپنی رائے دینے کا کیونکہ یہ
میں نے تمہیں دیا ہے اور یہ حق کسی اور لڑکی کے پاس نہیں ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

ماہ بانو پہلے ٹینشن میں مبتلا تھی۔ عبداللہ کی بات سن کر پہلے سے زیادہ ٹینس ہوگئی۔ اُما
بے یقینی سے پہلے عبداللہ اور پھر ماہ بانو کی طرف دیکھا۔ ایڈی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گ
عبداللہ نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے کسی کا ردعمل دیکھا ہی نہیں اور مالبرو کی ڈبیا سے سگر
نکال کر سلگانے لگا۔

"میں چلتی ہوں۔ میرا بہت کام پڑا ہوا ہے۔" ماہ بانو نے بیگ کندھے پر ڈال لیا۔

"تم کیوں چلتی ہو۔ میں چلا جاتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا۔

"میں نے اس لیے نہیں کہا' میرا واقعی بہت کام رہتا ہے۔" اس نے جلدی سے اپنی صفا
پیش کی۔

"جب تم یہاں آرہی تھیں' تب بھی تو تمہارا کام رہتا تھا ناں؟" ایڈی نے اسے دو
انداز میں ڈپٹا۔

ماہ بانو نے خاموشی سے بیگ واپس کرسی پر لٹکا دیا۔ باتوں کے دوران وہ دونوں
ڈرنکس پیتی رہیں اور عبداللہ اور ایڈی چائے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ماہ بانو خاصی غا
دماغی کے عالم میں وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا ذہن ریشماں' اپنی اور عبداللہ کی مثلث میں اٹکا
تھا۔ کبھی اس کی سوچ زینی اور سبط کی طرف مڑ جاتی تھی۔

"تم کہاں غائب ہو؟" ایڈی نے ماہ بانو کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"نہیں' نہیں' تم سب کی باتیں سن رہی تھی۔" وہ چونک گئی۔

"لگتا تو نہیں ہے لیکن چلو مان لیتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"اُما چلو ہاسٹل چلتے ہیں۔" ماہ بانو نے اچانک کہا۔

"چلو۔ نیہاں سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔" اُما اٹھ کھڑی ہوئی۔

نیہاں کو بھی ساتھ لے کر وہ ہوسٹل چلی آئیں۔

"تمہیں اچانک یہاں آنے کا خیال کیسے آیا؟" اُما نے بیگ بستر پر رکھ دیا اور خود بھی
آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہاں کالج میں موقع مل ہی نہیں رہا تھا۔ اسٹوڈیو
بھی عبداللہ قریب ہی ہوتا ہے۔ وہ قریب نہ ہو تو کوئی اور سر پر سوار ہو جاتا ہے۔" ماہ بانو نے

کھسے اتار کر پاؤں اوپر کر لیے۔

"ہوں۔ میں نے اس وقت اس لیے کچھ نہیں پوچھا تھا کیونکہ میرا خیال تھا تم نے یہ
فرمائش بلاوجہ تو نہیں کی ہوگی۔ ویسے مجھے حیرت ضرور ہوئی تھی کہ اچانک ہوسٹل کی یاد کیسے آئی
تمہیں؟" اُما بولی۔

"مجھے شدید ڈپریشن ہو رہا ہے۔ مجھے بتاؤ اُما کہ میں کیا کروں؟" اس نے بے چارگی سے
کہا۔

"آج عبداللہ کی بات سے اندازہ ہوا ہے مجھے کہ اس نے تم سے اظہار کر دیا ہے۔" اُما
نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"ہاں۔" اس نے گویا کسی جرم کا اعتراف کیا۔

"ریئلی؟" نیہاں کے انداز میں حیرت تھی۔ "پھر تم نے کیا کہا اس سے؟"

"میں نے اسے ریشماں کا حوالہ دیا لیکن وہ بہت مختلف انداز میں سوچ رہا ہے۔ مجھے بتاؤ
میں اب ریشماں کا سامنا کیسے کروں گی؟"

"تم پوری بات تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟"

ماہ بانو نے انہیں اول تا آخر ہر بات کہہ سنائی۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا بانو کہ تم عبداللہ سے یہ حق نہیں چھین سکتیں کہ وہ ریشماں کو
چھوڑ کر کسی اور سے محبت کرنے لگے۔" اُما بولی۔

"ہاں' یہ ممکن ہے کہ تم عبداللہ سے محبت نہ کرو۔" نیہاں نے کہا۔

"یہ بھی کب ممکن ہے۔" اس کی آواز مدھم تھی۔

"دیکھو بانو' یہ تکلیف دہ صورتِ حال ضرور ہے لیکن سوچو کہ تم تینوں میں سے کوئی ایک بھی
خوش نہ رہے' اس سے بہتر یہ نہیں کہ تین میں سے دو افراد تو خوش رہیں۔" اُما نے کہا۔

"تم میری فیلنگز نہیں سمجھ سکتیں اُما کیونکہ تم اتنی پریشان کن صورت میں مبتلا نہیں ہو۔"

"دیکھا جائے ناں بانو تو میں تم سے زیادہ پریشان کن صورتِ حال کا سامنا کر رہی ہوں۔
میں یہ بات خود سے بھی نہیں کہنا چاہتی لیکن آج کہہ رہی ہوں کہ مجھے ایڈی......" وہ چند لمحوں کو
رکی۔ "ہاں۔ مجھے وہ بہت پسند ہے۔"

ماہ بانو اور نیہاں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"میں جانتی ہوں کہ ایڈی سے محبت کرنا خود کو آگ میں جھونک دینے کے برابر ہے۔ تم
کہتی ہو ناں نیہاں کہ وہ میرے لیے اسٹینڈ لے سکتا ہے۔ میں بھی یہ بات جانتی ہوں' مجھے یہ بھی
پتا ہے کہ وہ مجھے ساری دنیا سے بچا لے گا لیکن اس دوران اسے معاشرے کے کتنے پتھر کھانے
پڑیں گے۔ مجھے نہ پا کر اسے جو تکلیف ہوگی' وہ اتنی زیادہ نہیں ہوگی' جتنی مجھے پانے کے بعد

اسے اٹھانا پڑے گی۔ اور میں اسے دکھ میں نہیں دیکھ سکتی۔ اب بھی تکلیف تو اسے ہوگی لیکن بڑ تکلیف کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔''

''اُما تم نے کبھی یہ سب مجھ سے شیئر بھی نہیں کیا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''کیا تو ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''خود سے بھی آج ہی کیا ہے۔ اس کا خیال آتا ہے تو میں خو ذہنی طور پر کسی دوسری طرف مصروف کر لیتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ان سب تکلیف دہ باتو کے متعلق بار بار سوچتی رہوں۔

اور بانو تم سے بھی میں یہی کہوں گی کہ اگر تم نے عبداللہ سے دور ہٹ جانے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے ذہنی طور پر اس سے دور ہٹو۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم احساسِ جرم میں بھی مبتلا اور اس سے محبت کرنا چھوڑ بھی نہیں سکتیں۔''

''تمہیں اندازہ نہیں ہے اُما مجھے اس سے اچانک محبت نہیں ہوئی۔ اب غور کرتی ہوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو برسوں پہلے سے میرے اندر موجود ہے اور اب اتنی توانا ہو چکی ہے کہ م اسے جڑ سے نکال کر نہیں پھینک سکتی۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' اُما نے کہا۔ ''کیونکہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ مجھے ایڈی سے اچانک محبت نہیں ہوئی۔ قطرہ قطرہ کر کے میرے اندر جمع ہوئی ہے اتنی آہستگی سے میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکی۔''

نیہاں خاموشی سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے اُما ہنس پڑی۔ ''ہم دونوں تو زیرو پوائنٹ پر کھڑ ہوئے ہیں۔ تم بتاؤ نیہاں کہ تمہاری کیا پروگریس ہے؟''

وہ مسکرا دی۔ ''ہم تینوں ہی زیرو پوائنٹ پر کھڑے ہوئے ہیں' لیکن اس دن عبداللہ گھر لنچ کرنا اچھا لگا۔ کبھی مجھے لگتا تھا کہ جیمز میری طرف زیادہ متوجہ ہے لیکن اگلے ہی لمحے خیال غلط ہو جاتا تھا۔ وہ باقی سب کی طرف بھی اتنا ہی متوجہ تھا جتنا میری طرف۔ پھر بھی انجوا کیا۔''

''ایک دن تم نے کہا تھا کہ جیمز نے بھی پریشانیاں اٹھائی ہیں' وہ کیا تھا؟'' ماہ بانو پوچھا۔

''جانے دو' اس کی پرسنل لائف ہے۔'' وہ بولی۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ ہم تمہارے سامنے ہر بات کہہ دیتے ہیں مگر تم بہت گھنی ہو۔ بھلا بھی نہیں نکالتیں۔'' اُما نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' ماہ بانو نے کہا۔ ''کہ ہم دونوں ہی جیمز کے متعلق زیادہ نہ جانتے۔''

''تم دونوں ہی کیا' اس کے متعلق بہت کم لوگ جانتے ہیں۔'' نیہاں بولی۔ ''اصل میں وہ کسی ایک کا دوست نہیں ہے۔ سب کا دوست ہے اور ایسے شخص کے متعلق جاننے کے بارے میں کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی' لیکن میری بات تو اور ہے ناں۔'' وہ پھر ہنسی۔

''اچھا بکو تو۔'' ماہ بانو نے دلچسپی سے کہا۔

''اس کی ممی پاکستانی نہیں ہیں' البتہ ڈیڈی پاکستانی ہیں۔ تمہیں پتا تو ہے پاکستانیوں کا حال۔ باہر جا کر نیشنلٹی کے چکر میں یا پھر وقت گزاری کے خیال سے شادی وغیرہ کر لیتے ہیں' بعد میں ان عورتوں سے جان بھی چھڑانا چاہتے ہیں لیکن طلاق نہیں دے سکتے۔ کیونکہ یہاں کی طرح یہ تو ہے نہیں کہ عورت کو تین لفظ کہہ کر گھر سے نکال دیا اور خود کمرے میں جا کر اطمینان سے اخبار پڑھنے لگے۔ وہ عورتیں تو طلاق کی صورت میں چمڑی تک کھینچ کر لے جاتی ہیں مرد کی۔

جیمز کے ڈیڈی نے بھی شادی تو کر لی تھی پتا نہیں کس چکر میں لیکن پانچ سال بعد وہ پاکستان واپس آ گئے اسے ساتھ لے کر۔ نہ تو انہوں نے جیمز کی ممی کو طلاق دی تھی اور نہ ہی انہیں بتا کر آئے تھے۔ پھر بھی اس کی ممی پاکستان آئیں اور تقریباً سال بھر بعد جیمز کو اپنے ساتھ واپس لے گئیں۔''

''اس کے ڈیڈی نے ان کے حوالے کر دیا جیمز کو؟'' اُما نے پوچھا۔

''نہیں عدالت کے ذریعے لے کر گئی تھیں۔'' نیہاں نے کہا۔ ''پھر وہاں وہ مختلف اسکولوں میں پڑھتا رہا۔ اس کی ممی نے دوسری شادی کر لی۔ انہوں نے جیمز کو بہت پیار اور محبت سے رکھا لیکن سوتیلے باپ نے روایتی سوتیلے پن کا......سلوک رکھا۔

تب یہ گیارہ سال کا تھا جب اس نے گھر چھوڑ کر پاکستان آنے کا فیصلہ کیا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اسے احساس تھا کہ اس کی ممی کی زندگی اس کی وجہ سے تلخ ہو رہی تھی۔ پہلے تو اس نے یہ کیا کہ بورڈنگ میں چلا آیا اور پھر اس نے اردو سیکھنی شروع کی۔ تین سال بعد پھر یہ پاکستان آ گیا اور تب سے اب تک یہاں ہے۔''

''اپنے ڈیڈی کے پاس؟''

''نہیں۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ وہ انہیں ڈھونڈ لے گا۔''

''تو اب انہیں ڈھونڈ کر بھی کیا کرے گا؟'' ماہ بانو نے تبصرہ کیا۔

''پتا نہیں کیوں ڈھونڈنا چاہتا ہے انہیں۔ میں بھی تو ابھی زیرو پوائنٹ پر کھڑی ہوں۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو کسی نہ کسی کی زبانی کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے سن کر میں نے ترتیب دی ہیں۔ اس کے اندر کیا ہے' وہ کیا سوچ کر یہاں آیا ہے اور اس قسم کی دوسری باتیں مجھے معلوم نہیں ہیں۔ ابھی میں اس کے اتنے قریب نہیں ہوں کہ یہ سب پتا چل سکے۔''

''تمہاری ممی بھی غالباً فارنرز ہیں؟'' ماہ بانو نے کہا۔

وہ ہنس پڑی۔ ''امریکن ہیں لیکن ڈیڈی نے نہ تو وقت گزاری کے لیے شادی کی تھی اور نہ نیشنلٹی لینے کے لیے اور میری مما کو بھی بہت کریڈٹ جاتا ہے۔ انہوں نے خود کو بہت بدلا ہے۔ شاید امریکہ میں رہتیں تو خود کو نہ بدل سکتیں۔ ماحول کی بھی بات ہوتی ہے ناں۔ اب یہاں ہیں تو بالکل پاکستانیوں کی طرح رہتی ہیں بلکہ مزے کی بات بتاؤں' مجھے بعض اوقات ڈانٹ بھی دیتی ہیں کہ میں سکرٹ نہ پہنوں۔ ٹراؤزر پہننے سے منع نہیں کرتیں لیکن سکرٹ پہننے کی ہم بہنوں کو بالکل بھی اجازت نہیں ہے۔''

''ایک پرسنل سا سوال ہے نیہاں۔ اگر مائنڈ نہ کرو تو پوچھوں؟'' اُما نے جھجک کر کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم مائنڈ کرنے والا کوئی سوال نہیں پوچھو گی' اس لیے پوچھ لو۔''

''تمہاری مما تو ایک بالکل مختلف ماحول سے آئی تھیں لیکن تمہارے ڈیڈی کے گھر والوں نے انہیں قبول کرلیا۔ میرا مطلب ہے مذہب وغیرہ پر اعتراض نہیں کیا؟'' اس نے تذبذب کے سے عالم میں پوچھا۔

نیہاں اور ماہ بانو کو اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی لیکن انہوں نے اظہار نہیں کیا۔

''تھوڑا بہت شاید کیا بھی ہو لیکن مما نے خود کو بالکل بدل دیا تھا اور مذہب بھی تبدیل کرلیا تھا' مما مسلمان ہیں۔ اب ان کا نام بھی فاطمہ ہے۔''

اُما چپ سی ہوگئی۔

''پتا ہے بانو! آج کل میں ہر دوسرے تیسرے روز اُما سے بالوں میں تیل لگواتی ہوں۔'' نیہاں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے موضوع تبدیل کردیا۔

''اچانک تیل لگوانے کا خیال کیسے آیا؟'' ماہ بانو نے کہا۔

''اسے بال لمبے کرنے کا شوق ہورہا ہے۔ چھ پراندے بھی لے آئی ہے۔'' اس کی جگہ اُما نے جواب دیا۔

''کیوں جیمز کو لمبے بال پسند ہیں؟'' ماہ بانو نے اسے چھیڑا۔

اس نے ہنس کر اثبات میں جواب دیا۔

''جیمز نے خود کہا ہے تم سے؟'' اُما نے دلچسپی سے دریافت کیا۔

''ہاں' لیکن جیسے تم سمجھ رہی ہو' ویسے نہیں۔ چند دن پہلے ہم کچھ فرینڈز اکٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں کیسے لمبے بالوں کا ذکر چلا تب اس نے کہا تھا کہ کٹے ہوئے بال اچھے لگتے ہیں' لیکن جو خوبصورتی لمبے بالوں میں ہوتی ہے' وہ چھوٹے بالوں میں نہیں ہوتی اور پتا ہے کیا؟ اس نے بطور خاص تم دونوں کا ذکر کیا تھا کہ کالج میں سب سے خوبصورت بال اُما اور بانو کے ہیں۔ سچ میں تو بہت جلی تھی۔'' نیہاں ہنسی۔

وہ دونوں بھی ہنس پڑیں۔

''دیکھو ناں کتنی ناانصافی کی بات ہے۔ اتنے تھوڑے سے دنوں میں ایڈی کے بال کتنے لمبے ہوگئے ہیں۔ میرے ذرا سے بھی نہیں ہورہے۔'' اس نے ایسے کہا جیسے شکایت کررہی ہو۔

''تم ایڈی کے ساتھ مقابلہ کررہی ہو؟'' اُما ہنسی۔

''ظاہر ہے تم دونوں کے ساتھ تو نہیں کرسکتی ناں' اتنے لمبے تو دس سالوں میں بھی نہیں ہوسکتے میرے بال جتنے تم دونوں کے ہیں۔''

''بھئی ہمت نہ ہارو۔'' ماہ بانو نے کہا پھر اُما سے مخاطب ہوئی۔ ''اس کے بالوں میں روز تیل لگایا کرو تاکہ جلدی جلدی لمبے ہوں۔''

''تم دونوں نے کیسے لمبے کیے ہیں بال؟ کوئی نسخہ تو ہوگا؟'' نیہاں نے کہا۔

وہ دونوں اسے بال لمبے کرنے کے نسخے بتانے لگیں۔ ارنڈی اور ناریل کے تیل میں مکھن ملا کر بالوں میں لگانا۔ بیری کے پتوں' یا آملوں' ریٹھوں کا استعمال وغیرہ۔ نیہاں نے بھی کاپی کھول کر سب نسخے نوٹ کرنے شروع کردیے۔

☆=====☆=====☆

پیر صاحب رجب علی شاہ کمرے میں داخل ہوئے تو ریشماں اخبار سامنے پھیلائے سوچوں میں گم تھی۔

''ریشماں گڑیا!'' انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

پیر صاحب پر نظر پڑتے ہی وہ یوں گڑبڑا کر رہ گئی' جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

''اخبار پڑھا جارہا تھا؟'' وہ چند قدم آگے بڑھ آئے۔

''جی!'' اس نے جلدی سے دوپٹا سر پر رکھا۔ ''آئیں بابا جان بیٹھیں۔''

وہ بیٹھ گئے۔ ریشماں ایک موڑھے پر ٹک گئی۔

''یہ آپ کا بھائی ہے ناں سبط۔ پتا نہیں یہ سارا دن کہاں غائب رہتا ہے؟'' پیر صاحب نے کہا۔

''میرے پاس بیٹھا ہوا تھا' ابھی پانچ دس منٹ پہلے اٹھا ہے۔''

''آپ کی نانی اماں آخری مرتبہ کب یہاں آئی تھیں؟'' انہوں نے پائپ جلا کر سرسری انداز میں پوچھا۔

''اب تو بہت دن ہوگئے ہیں۔'' اس نے دل گرفتگی سے کہا۔

''آپ کا دل چاہ رہا ہے ان سے ملنے کے لیے؟''

اس نے ایک نظر پیر صاحب کی طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

''انہیں بلا لیا ہوتا یہاں۔'' وہ بولے۔

''میں نہیں بلاؤں گی۔ انہیں خیال ہوتا تو میرا خود ہی آجاتیں۔''

''ایسے نہیں سمجھتے' انہیں آپ کا بہت خیال ہے۔''

وہ چپ رہی۔

''ہماری بیٹی اتنی چپ چپ اور اداس کیوں رہنے لگی ہے؟ کیا بات ہے بیٹا اپنے با بھی نہیں کہیں گی؟''

''بابا جان!'' اس نے ہونٹ کاٹے۔ ''مجھے' میرا دل بہت گھبرا رہا ہے' بہت گھٹن محسو رہی ہے۔ یوں لگتا ہے' جیسے یہ دیواریں......'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

پیر صاحب ایک پل کو بالکل سن ہو کر رہ گئے۔ بہت برسوں پہلے کی ایک رات کے منظر چند لمحوں میں ان کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔

زیب النساء کے سفید لباس پر لگے اچھو کے خون کے دھبے' اس کی وحشت' د آنکھوں میں شدید نفرت' سب کچھ۔

وہ بابا جان سے بات کر رہی تھی تو انجام سے بے پروا تھی۔ وہ الفاظ اب بھی رجب عل کو یاد تھے۔

''جس طرح یہ گڑیاں میری ملکیت تھیں' اسی طرح میں آپ کی ملکیت تھی۔'' زیب ا نے کہا تھا۔ ''جس طرح میں انہیں الماری میں بند کر کے بھول گئی تھی' اسی طرح آپ مجھے کمرے میں بند کر کے بھول گئے تھے۔

لیکن مجھ میں اور ان گڑیوں مین ایک بنیادی فرق تھا۔ ان میں روح نہیں تھی' مجھ میں ان میں دل نہیں تھا' مجھ میں تھا' یہ سوچ نہیں سکتی تھیں' میں سوچ سکتی تھی۔ میں بہت کچھ سوچتی ۔ بہت سے 'کیوں' میرے گرد چکراتے رہے' لیکن ادب آداب کی تہوں میں ملفوف ہو وجہ سے مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں اپنے 'کیوں' کا جواب آپ سے طلب کر سکتی' اس لیے میں نے نظریں چرانا شروع کر دیں۔ اپنی سوچوں سے بھی اور اپنے سوالوں سے بھی ان پر دھول بیٹھتی گئی۔ اتنی زیادہ کہ اس میں سب کچھ دفن ہو گیا۔

جب کبھی یہ سوچیں سر اٹھانے کی کوشش کرتی تھیں تو میں خوفزدہ ہو کر مذہب میں ڈھونڈنے لگتی تھی۔ جب دھند کی دبیز تہہ سے کوئی ہیولا میری طرف بڑھتا تھا تو میں سجدے میں جاتی تھی۔ آپ کو نہیں معلوم کہ اس آنکھ مچولی کے ساتھ دن کیسے گزرتے ہیں' لیکن مجھے معلوم ان اذیت ناک لمحوں کی چبھن میں اب بھی محسوس کر سکتی ہوں۔

میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس اپنی بیٹیوں کو زندگی اور موت دینے کے علاوہ کچھ نہیں' مجھے میرا تحفہ دے دیں۔''

اور جب بابا جان' پیر صاحب جلال الدین شاہ نے اسے زہر دینے کے بعد اس کی آ

خواہش پوچھی تھی تو اس نے بند ہوتی آنکھوں اور اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا تھا۔

''آئندہ جو شخص بھی آپ کی گدی پر بیٹھے گا' اگر اس کی کوئی بیٹی ہوئی تو اسے یہی والا کمرا دینا' اسی مسہری اور اسی آئینے کے ساتھ۔''

اور ریشماں اسی کمرے میں' اسی مسہری اور آئینے والی خواب گاہ میں رہتی تھی۔

پیر صاحب نے گہری سانس لے کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''کیا ہماری بیٹی بھی؟''

لیکن اپنے ذہن میں ابھرتی سوچوں کو انہوں نے سختی کے ساتھ دبا دیا۔

''ہماری ریشماں گڑیا کو جو کمرا اچھا لگے' وہ اس میں چلی جائے۔ اس خواب گاہ میں واقعی کچھ گھٹن ہے۔'' وہ بولے۔

''میں اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتی' اس میں رہنا بھی نہیں چاہتی۔ یہاں کی دیواریں میری باتیں سنتی ہیں اور میں ان کی۔ میں کیا کروں بابا جان' میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ میں......!'' وہ قدرے جھجک کر بولی۔ ''قبرستان جا سکتی ہوں بابا جان؟''

''کیا کریں گی وہاں جا کر؟'' انہوں نے نرم سے لہجے میں پوچھا۔

''اپنے بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھوں گی۔'' وہ بولی۔

''صرف بھائی کی؟''

''باقی سب پر بھی پڑھوں گی۔''

پیر صاحب کی آنکھوں کے سامنے زرینہ کا سراپا آ گیا۔ وہ بھی وہیں آبائی قبرستان میں دفن تھی' لیکن ریشماں نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا' اسے بھی سب میں شامل کر دیا تھا۔

''بات یہ ہے بیٹا کہ عورتوں کا قبرستان میں جانا غیر شرعی ہے۔ آپ جہاں بیٹھ کر اپنے بھائی کے لیے فاتحہ خوانی کریں گی' اسے ثواب پہنچتا رہے گا۔'' انہوں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

وہ بجھ کر رہ گئی۔ جانتی تھی کہ یہ صرف بہانا ہے۔ وہ اسے کسی نہ کسی دلیل سے مطمئن کرنا چاہتے تھے' ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ان دیواروں سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

''آپ کو اپنی ماں جی کا خیال آتا ہے کبھی؟'' انہوں نے اس سے پوچھا۔

اس نے سر اٹھا کر ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

''میری تو بس اماں جان ہیں' وہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔''

''آپ اپنی سہیلیوں کو بلا لیا کریں۔ دل لگا رہے گا۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بابا جان! آپ کو تو یہ بھی علم نہیں کہ میری کوئی سہیلیاں ہی نہیں ہیں۔'' اس نے انہیں خواب گاہ سے نکلتے دیکھ کر سوچا۔ ''دوستی برابری کا رشتہ ہوتی ہے اور یہاں ہمارا گھرانہ سب سے

اونچا ہے۔ کوئی عورت ہمارے برابر نہیں بیٹھ سکتی۔ ایسے میں بتائیں میری دوستی کس سے ہو؟ ہاں ماہ بانو ہے' صرف ایک دوست' اور وہ اتنی دور رہتی ہے کہ اس سے ملنا بھی خواب لگتا ہے۔''

اور پیر صاحب غلام گردش میں چلتے ہوئے یاسمین بیگم کے متعلق سوچ رہے تھے جنہوں نے کہا تھا۔

''میں نے اپنی ایک ایک سانس کے ساتھ اس حویلی کی ایک ایک اینٹ سے محبت کی اور آپ نے مجھے ان محبتوں کے جواب میں کیا دیا؟ سوتیلی ماں ہونے کا طعنہ۔ میں نے سوتیلی ماں ہونے کے باوجود ریشماں کے دل میں اٹھنے والی ٹیسیں محسوس کر لیں آپ تو سگے باپ ہیں' کیا آپ جان سکے کہ وہ عبداللہ کو کس قدر چاہتی ہے؟''

پیر صاحب نے اپنے اندر ابلنے والے لاوے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''اولاد واقعی بہت بڑا امتحان ہوتی ہے۔'' انہوں نے سوچا۔

☆=====☆=====☆

ان لوگوں کو اپنے نئے مکان میں آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے' لیکن اتنے تھوڑے دنوں میں ہی نوری نے محسوس کر لیا تھا کہ چندا بائی جنت بائی کو کاروبار کی جو کنجیاں سونپ کر گئی تھیں' وہ اب بھی کارآمد تھیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا' لیکن قفل تبدیل نہیں ہوئے تھے۔

اور نوری نے تو یوں بھی خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ جو کچھ جس انداز میں اس کے سامنے آ رہا تھا' وہ بغیر حجت کے قبول کرتی جا رہی تھی۔ شعوری طور پر وہ اس کوشش میں مصروف تھی کہ نئی زندگی کے مطابق خود کو ڈھال لے۔ جن باتوں پر اس سے ہنسنے کی توقع کی جاتی ہے' ان پر شوخی سے ہنسے اور جہاں لیے دیے رہنے کا وقت آئے تو ماتھے پر کم از کم دو تیوریاں ضرور ڈال لے' جس سے اس کے حسن میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔

اب تو جنت بائی نے اسے یہ خوشخبری بھی سنا دی تھی کہ جلد ہی اسے فلمیں ملنا شروع ہو جائیں گی۔ یوں بھی ان معاملات میں جنت بائی کے تعلقات بہت وسیع تھے۔

☆=====☆=====☆

ریشماں نے نانی اماں کو بلوایا تھا' لیکن اس وقت تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی' جب ان کے ساتھ لاٹھی ٹیکتے نانا جی بھی اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ بھی آئیں گے۔'' وہ انہیں بٹھا کر خود قالین پر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''نہ ریشماں بیٹا' ایسے نہ بیٹھو' اوپر بیٹھو۔'' انہوں نے کہا۔

''پلیز نانا جان' مجھے یہیں بیٹھا رہنے دیں۔'' وہ بولی۔

''یہ مناسب نہیں ہے' حویلی میں یہ بات کسی کو اچھی نہیں لگے گی۔''

''رہنے دیں نانا جی! اس حویلی میں تو سب کو پتا نہیں کیا اچھا لگتا ہے اور کیا نہیں۔ کیا کبھی میری اماں جی یوں آپ کے قدموں میں نہیں بیٹھی ہوں گی' لیکن آپ اور نانی اماں دونوں مجھے بابا جان کی بیٹی سمجھتے ہیں' کبھی یہ نہیں سمجھا کہ میرا آپ لوگوں سے بھی کوئی رشتہ ہے۔''

''ایسا سوچنا بھی مت کبھی' پہلے رضیہ اور زرینہ سب کچھ تھیں ہمارے لیے' اب تم اور بانو ہو۔ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو سلامت رکھے۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا پھر قدرے توقف سے نانی اماں سے مخاطب ہوئے۔

''ریشماں کو دیکھ کر یوں نہیں لگتا' جیسے ہماری زرینہ زمین پر اتر آئی ہو؟''

''ہاں۔'' نانی اماں کے لہجے میں آزردگی تھی۔

''مجھ سے بہت ظلم ہوا اس پر' لیکن میں کیا کرتا؟ تب مجھے عزت کا خوف تھا اپنی بھی اور اپنی بیٹی کی بھی۔ میری نیت بری نہیں تھی۔ اس وقت میں مرنے اور مار دینے پر بھی تیار تھا' کیونکہ مجھے سمجھ نہیں تھی کہ...... رشتے کھو جاتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔'' انہوں نے حسرت بھرے انداز میں کہا۔

''آپ کیا باتیں کر رہے ہیں نانا جی؟'' ریشماں کچھ نہ سمجھی تھی۔

وہ چونک گئے۔ ''کچھ نہیں' بس یونہی کبھی ذہن اِدھر اُدھر بھٹک جاتا ہے۔''

''پھر بھی کچھ تو تھا۔ آپ کو کس سے عزت کا خوف تھا' کس بیٹی پر ظلم کیا آپ نے' کیا ماں جی پر؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر نانی اماں کی طرف مڑے۔ ''چلو گھر چلیں' دیر ہو رہی ہے۔''

''نہیں نانا جی! پلیز اتنی جلدی نہیں' آپ نہیں چاہتے تو میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گی' لیکن اتنی جلدی مت جائیں۔'' اس نے منت کی۔

وہ پھر بیٹھ گئے۔

''نانی اماں! آپ نے کہا تھا کہ آپ بانو کو خط لکھ کر بلوا دیں گی' آپ نے خط لکھا اسے؟''

''ہاں لکھا تھا۔'' انہوں نے جھوٹ بولا۔ ''وہ کہہ رہی تھی کہ جلد ہی آئے گی۔''

''کب؟ یہ نہیں لکھا؟''

''لکھا تو ہے کہ جلدی آئے گی' اب دیکھو کب آتی ہے۔''

''اگر میں اسے خط لکھوں تو آپ اسے پوسٹ کروا دیں گے نانا جی؟'' اس نے تامل کرتے ہوئے' لیکن پُرامید لہجے میں پوچھا۔

''نہیں ریشماں' تم اسے خط مت لکھنا۔'' نانی اماں نے گھبرا کر کہا۔ ''میں خود لکھ دوں گی' تم

فکر مت کرنا۔''

''میں نے اگر اس سے دل کی بات نہ کہی تو میں پاگل ہو جاؤں گی، مجھے بہت گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔''

☆=====☆=====☆

ماہ بانو، اباجی کے ساتھ ڈسکشن کر رہی تھی۔ اس متوقع ایگزیبیشن کے بارے میں انہوں نے ذنہار میں کرنی تھی۔

''اباجی! آپ منی ایچر میں پاٹری کیوں نہیں ٹرائی کرتے؟''

''میں سمجھا نہیں کہ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ تمہارا مطلب ہے کہ چھوٹی چھوٹی ہانڈیاں اور گھڑے وغیرہ؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔ پاٹری کے سائز کو اگر ہم بہت زیادہ چھوٹا کر دیں اور شیشے کے کیس میں اس کی کمپوزیشن کریں تو بڑی زبردست چیز لگے گی۔ آپ کو پتا ہے ناں اباجی! سرامک پیسز (Pieces) کی ڈیکوریشن کی کتنی ڈیمانڈ ہے اور یہ کتنے قیمتی اور کس قدر خوبصورت ہوتے ہیں۔'' وہ بولے۔

''ہوں۔ یہ اچھی چیز بنے گی۔'' انہوں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''اور اباجی، اب جب کہ کپڑوں میں براؤن رنگ کا استعمال اتنا زیادہ ''اِن'' ہو چکا ہے، ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ مٹی کے بٹن بنائیں۔ آپ یقین کریں اباجی کہ یہ آئیڈیا بہت پسند کیا جائے گا۔''

''تم نے وہ پورسلین والا آئیڈیا چھوڑ دیا؟'' اباجی نے پوچھا۔

''بالکل نہیں، لیکن اس میں شاید ہمیں وقت لگ جائے، اس لیے کہہ رہی ہوں کہ پہلے چکنی مٹی میں ہی اس نئے انداز کو ٹرائی کرتے ہیں۔''

اماں جی ایک لفافہ اٹھائے اس کے پاس چلی آئیں۔

''بانو! یہ دیکھنا تمہارے نام کا خط آیا ہے، لکھائی تو اباجی کی لگتی ہے۔'' انہوں نے لفافہ اسے تھمایا۔

ماہ بانو نے لفافہ کھول کر تہہ شدہ کاغذ باہر نکالا۔

''جلدی دیکھنا کیا لکھا ہے؟'' اماں جی وہیں پر بیٹھ گئیں۔

اس نے تہہ شدہ کاغذ کھولا۔ خط ناناجی کا نہیں ریشماں کا تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ کے آثار ابھر آئے۔

''پیاری بہن بانو!

کیسی ہو؟ میں آج اس قدر اداس ہوں کہ کیا بتاؤں۔ تم سے ملنے اور ڈھیر

ساری باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ کاش تم اس وقت میرے ساتھ ہوتیں۔

اب جب تم اتنی دور ہو تو تم سے بات کرنے کی اس کے علاوہ کیا صورت ہو سکتی ہے۔ بڑی مشکلوں سے ناناجی اور نانی اماں کو راضی کیا ہے کہ وہ میرا خط پوسٹ کر دیں۔ اللہ کرے تمہیں یہ مل جائے۔ پلیز، مجھے جواب ضرور دینا۔ حویلی کے پتے پر تو یہ ممکن نہیں، تم ناناجی کے پتے پر خط بھیج دینا، مجھے مل جائے گا۔

بانو! مجھے حویلی میں اتنی گھٹن محسوس ہو رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ احساسِ جرم نے میری راتوں کی نیندیں چھین لی ہیں۔ یہ خیال جب آتا ہے کہ میرا بھائی میری وجہ سے قتل ہوا، مجھ سے اتنی دور چلا گیا کہ کبھی واپس نہیں آ سکتا، تو میرا دل چاہتا ہے کہ انہی دیواروں سے سر پھوڑ کر مر جاؤں۔

خادم بھائی اب تندرست ہو چکے ہیں، لیکن انہوں نے اس دوران کتنی تکلیف برداشت کی ہے۔ جب ان کی اس تکلیف کا خیال آتا ہے تو دل کٹنے لگتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورتِ حال میں کیا کروں؟ کس کو بچاؤں اور کس کو مر جانے دوں؟ لگتا ہے پاگل ہو جاؤں گی۔ تم آئی بھی تھیں، لیکن میں مل نہیں سکی۔ اس بات کا اب تک افسوس ہے۔ تم سے ملاقات ہو جاتی تو سب کچھ تم سے کہنے کے بعد شاید میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ اب یہ غبار اندر ہی اندر بڑھتا جا رہا ہے۔ جانتی ہوں کہ تمہارا آنا مشکل ہے، لیکن کیا کروں امیدوں کے سہارے ہی تو جی رہی ہوں۔

وہ کیسے ہیں؟ ضرور لکھنا۔

رات بہت ہو گئی ہے، بھائیوں نے دیکھا کہ میرے کمرے کی بتی جل رہی ہے تو انہیں تشویش ہو گی، اس لیے اجازت دو، خدا حافظ۔

تمہارے جواب کی شدت سے منتظر
تمہاری بہن ریشماں''

ماہ بانو نے کاغذ دوبارہ تہہ کر دیا۔

''خیر کی خبر ہے ناں؟'' اماں جی نے پوچھا۔

''جی!'' وہ وہاں سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ریشماں کا دل چاہ رہا ہے مجھ سے ملنے کے لیے، لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں ہے ناں۔'' پھر وہ اباجی سے مخاطب ہوئی۔

''باقی تفصیلات بعد میں ڈسکس کر لیں گے۔''

اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ ٹانگیں اوپر کر کے بستر پر بیٹھ گئی۔ ریشماں کے خط نے

اس کے اضطراب میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے ایک چھوٹے سے فقرے نے اس کے اندر ہل
مچا دی تھی۔

''وہ کیسے ہیں' ضرور لکھنا''

اس چھوٹی سی بات میں اس نے ماہ بانو سے سب کچھ پوچھ لیا تھا۔

☆=====☆=====☆

''میں نے ریشماں کو خط لکھنے کی کوشش بہت دیانتداری سے کی تھی۔ میں اسی وقت کمر
میں گئی تھی اور کاغذ قلم لے کر اسے خط لکھنے بیٹھ گئی تھی' لیکن ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکی۔'' ماہ بانو
سے کہا۔

وہ دونوں اس وقت کالج کے گرافکس اسٹوڈیو میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ رات تقریباً آٹھ بج چکے تھے اور اندھیرے کی چادر پھیل چکی تھی۔ ان دونوں کو ہی ابھی پرنٹس نکا
تھے' اور عین وقت پر لائٹ چلی گئی تھی۔ انہوں نے موم بتی روشن کر لی تھی' لیکن اتنے بڑ
اسٹوڈیوز میں اس کی روشنی ناکافی تھی۔ کچھ اور اسٹوڈنٹس بھی تھے' جو بجلی کے جاتے ہی باہر
گئے۔ اسٹوڈیوز میں وہ دونوں ہی تھیں۔

کالج کے دوسرے حصوں میں اسٹوڈنٹس کام میں مشغول تھے۔ خاص طور پر فائن آ
آرکیٹیکچر اور ڈیزائن کے فورتھ ایئر کے بہت سے طالب علم دیر تک رک کر کام کر رہے تھے۔
بھی فائنل ایئر نے تھیسز کی تیاری شروع کر دی تھی۔ گرافکس کے طالب علموں کو اکثر کافی د
جایا کرتی تھی۔

''کسی بھی طرح لیکن اسے تسلی کے دو حرف لکھ دو' مجھے تو اس بات کا خیال ہی نہیں آیا تھا
وہ کس قدر احساسِ جرم میں مبتلا ہو گی۔'' اُما نے ماہ بانو سے کہا۔

''یقین کرو اُما! بہت کوشش کر چکی ہوں' لیکن ذہن میں اتنی باتیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں کہ
سرا ہاتھ ہی نہیں آتا۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' اُما نے ہمدردی سے کہا۔

''اور اس نے بھی تو ایک ہی فقرے میں سب کچھ پوچھ لیا۔ چاہتی ہے کہ میں اسے عبد
کے متعلق بتاؤں کہ وہ کیسا ہے۔ یہ میرا پسندیدہ موضوع ہے' جس پر میں گھنٹوں بول سکتی ہو
صفحوں کے صفحے کالے کر سکتی ہوں اور یہی وہ موضوع ہے جسے میں سب سے زیادہ نظر اند
کرنا چاہتی ہوں۔ ریشماں نے کہا تھا کہ میں عبداللہ کو اس کی آنکھوں سے دیکھوں اور یہی
سب سے بڑی غلطی تھی۔''

اُما کھڑکیوں کے ساتھ رکھے ہوئے لاکرز کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر
میں لگے فوارے کے گرد بنی چھوٹی سی دیوار پر ایڈی گٹار لیے بیٹھا تھا۔ اس کے کلاس فیلوز اور

دوست وہیں کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسی وقت اس نے گٹار پر ہلکی ہلکی دھن بجانا شروع کی۔ اُما نے مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

''کتنا اچھا لگ رہا ہے' کون گٹار بجا رہا ہے؟'' ماہ بانو نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

اُما خاموشی سے باہر تکتی رہی۔ ایڈی نے دھن تبدیل کی۔ اس کے گرد کھڑے دوست بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے' پھر سب گٹار کے ساتھ ساتھ چٹکیاں بجا کر گانے لگے۔

''آئی ہوئی بہاروں میں' پھیلے ہوئے نظاروں میں
بھیگے ہوئے چناروں میں' یونہی کبھی اشاروں میں
نظریں جو ملیں اک بار صنم سے
جینا ہو جاتا آسان قسم سے
کتنی سنہری یادیں ہیں' کیسا نظر میں سپنا ہے
کیسے اسے میں پا لیتا' کہتا میں کیسے اپنا ہے
وہ جو نبھاتا ساتھ' اسی طرح میں بھی نبھاتا ساتھ
وہ جو بڑھاتا ہاتھ' اسی طرح میں بھی بڑھاتا ہاتھ
چاہا اسے میں نے' ڈھونڈا اسے میں نے
وہ نہ مجھے مل سکا
رنگوں بھرے جھمیلے میں' یا پھر کبھی اکیلے میں
نظریں جو ملتیں اک بار صنم سے
جینا ہو جاتا آسان قسم سے
سوچا نہیں تھا میں نے یہ ہاروں گا ایسی بازی میں
اس کو کبھی بھی چاہت سے کر نہ سکوں گا راضی میں
ہو کے رہے گی مات یونہی کبھی بگڑے گی میری بات
کتنی رُتیں بیتیں' کتنے سمے بیتے' کم نہ ہوئے فاصلے
یونہی سدا رہی دوری' خواہش کہاں ہوئی پوری
پلکیں ذرا اٹھانے سے' چاہے کسی بہانے سے
نظریں جو ملتیں اک بار صنم سے
جینا ہو جاتا آسان قسم سے''

سب نے تالیاں بجا کر داد دی۔ اسی وقت بجلی آ گئی۔ سب کام کرنے اپنے اپنے اسٹوڈیوز کی طرف بڑھ گئے۔ گرافکس اسٹوڈیوز میں بھی لڑکے لڑکیاں واپس آ گئے۔ اُما کھڑکی سے ہٹ کر

بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

''اُما کہاں......؟'' ماہ بانو نے آواز دی۔

''ابھی آئی۔'' وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

ایڈی ابھی تک وہیں فوارے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اُما اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''پلیز ایڈی' ایک بار پھر یہی دُھن بجانا۔'' اس نے کہا۔

ایڈی نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا' پھر مسکرا کر گٹار بجانے لگا

☆=====☆=====☆

''بھائی' میں صبح سے آپ کو ٹرائی کر رہی تھی' آپ کہاں تھے؟''

گھر پہنچتے ہی عبداللہ کو زینی کا فون آیا۔ اس کا انداز رونے والا ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا تمہیں؟ خیر تو ہے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''آپ تھے کہاں' میرا کوئی خیال نہیں ہے آپ کو۔'' وہ سخت ناراض لگ رہی تھی۔

''میں کالج میں تھا' لیٹ آورز میں رک گیا تھا' کام کرنے کے لیے۔''

''آپ نے بابا جان کو کچھ نہیں بتایا تھا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''میرے کانوں میں کچھ اُڑتی اُڑتی سی بات پڑی ہے کہ بابا جان ہم دونوں بہنوں کی شادی کر رہے ہیں کہیں' اب کیا ہو گا بھائی؟''

''کچھ نہیں ہو گا' میں بات کرتا ہوں بابا جان سے۔''

''آپ بس اتنا کہہ دیتے ہیں کہ کچھ نہیں ہو گا' کرتے کچھ بھی نہیں' آپ بس گاؤں آ جائیں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے زینی کہ بابا جان میری غیر موجودگی میں کوئی فیصلہ کریں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس سلسلے میں تمہاری رائے نہ لیں۔ ابھی سب کارڈز ہمارے ہاتھ میں ہیں۔'' عبداللہ نے اسے تسلی دی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے بھائی' آپ گاؤں آ جائیں ناں جلدی سے۔''

''ابھی تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں' جیسے ہی چھٹیاں ہوں گی' میں آ جاؤں گا۔''

''پرامس؟''

''پکا پرامس!'' وہ بولا۔

''ایک بات بہت تنگ کر رہی ہے مجھے بھائی!'' زینی نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''آپ سچ مچ ریشماں بھابی کے علاوہ کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں؟''

''ایک گھر میں ہم ایک ہی رشتہ جوڑیں گے اور بڑے بابا جان کی فیملی میں ہم تمہارا رشتہ جوڑ رہے ہیں۔'' اس نے بات ٹالی۔

''ہوں' میں سمجھ گئی۔'' اس نے پُر خیال انداز میں کہا۔

''اچھا اب اگر میری جان بخشو تو میں تھوڑا سا کام کر لوں۔''

''اب کیا کام کرنا ہے' کالج میں کام نہیں کیا؟'' وہ بولی۔

''میں فائنل ایئر میں ہوں' اور مجھے پاس بھی ہونا ہے۔ میرا تو گاؤں آنے کا بھی ارادہ نہیں تھا' ابھی تھیسز پر کام شروع کرنے لگا ہوں' صرف تمہاری خاطر وہاں آ رہا ہوں۔''

''آپ کا خیال ہے کہ میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی تو یہ بالکل غلط ہے' میرا ساتھ تو آپ کو دینا ہی ہے۔''

عبداللہ ہنس پڑا۔ ''وقت پڑنے پر تم بھی میرا ساتھ دینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ بھی خوش دلی سے ہنس پڑی۔

☆=====☆=====☆

کالج میں خبر گرم تھی' ہر کوئی ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

''آج ایڈی کو دیکھا ہے؟''

اور ایڈی یوں لگ رہا تھا جیسے نئی نئی پیکنگ سے ابھی ہی نکلا ہو۔ بال اب بھی لمبے تھے لیکن اتنے زیادہ نہیں۔ شیو بنی ہوئی تھی۔ پرانی میلی جینز کے بجائے لیوائس کی نیلی جینز اور مارکس اینڈ سپنسر کی قمیص میں ملبوس صاف ستھرا' نکھرا نکھرا۔

''اُما! تم نے ایڈی کو دیکھا؟'' ماہ بانو نے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اُما تم نے؟'' ماہ بانو نے بات ادھوری چھوڑ کر قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں بانو' پتا نہیں اچھا کیا یا برا' لیکن میں نے سوچا کہ:

It is better to have loved and lost than not to have loved at all.

''لیکن اُما! یہ سب جو تم کرنے جا رہی ہو' یہ ہو گا کیسے؟'' ماہ بانو کے انداز میں گھبراہٹ اور پریشانی تھی۔

''پتا نہیں بس ابھی تو میں ان سب باتوں کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی۔'' پھر اُما نے گفتگو کا رخ پلٹ دیا۔ ''تم گاؤں کب جا رہی ہو؟''

''میرا ارادہ نہیں تھا' لیکن ابھی عبداللہ سے میری بات ہوئی ہے۔ کل زینی کا فون آیا تھا

اسے اس کے بابا جان اس کی شادی پر مُصر ہیں۔''

''اور تم انہیں سمجھانا چاہ رہی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ تمہاری بات مان جائیں۔'' اُما بولی۔

''چند دن کے لیے ہی سہی' لیکن مجھے گاؤں جانا ہی تھا۔ اماں جی کب ٹلنے والی ہیں' جانتی ہو کہ میں وہاں کیوں نہیں جانا چاہتی۔ اب جب وہاں جاؤں گی تو اس کے بابا جان سے ملوں گی ضرور چاہے وہ مانیں یا نہ مانیں' لیکن خود سوچو اُما' وہ کس قدر زیادتی کر رہے ہیں اس کے ساتھ' میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔''

''لیکن تم کس حیثیت سے ان کے ساتھ بات کرو گی؟''

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ''یہ حق مجھے عبداللہ نے دیا ہے' وہ میرا دوست ہے۔ اسی رشتے کی وجہ سے میں ان سے بات کروں گی۔''

''اور یہاں تم لوگوں کی سرامکس کی ایگزیبیشن کب ہوگی؟'' اُما نے پوچھا۔

''اس میں ابھی مہینہ بھر رہتا ہے اور میں اور اباجی بہت محنت کر رہے ہیں' اس کے لیے یہ گاؤں سے جلدی آنے کا بہانا ہو جائے گا۔''

''مجھے بھی گھر بہت یاد آ رہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے جلدی سے چھٹیاں ہوں اور میں جاؤں۔'' اُما نے کہا۔

☆=====☆=====☆

سبطِ حسن کو پیر صاحب نے طلب کیا تھا۔ وہ اس وقت اماں جان کے پاس تھا۔

''اماں جان کچھ اندازہ ہے کہ بابا جان نے کیوں بلایا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بیٹا! مجھے کب پتا چلتا ہے کہ ان کے دل میں کیا ہے۔'' وہ بولیں۔

''ایسا کیوں ہے اماں جان' اس طرح ہونا تو نہیں چاہیے؟''

''جو کچھ بھی ہوتا ہے' وہ اس سے بہت مختلف ہوتا ہے' جو ہونا چاہیے۔'' انہوں نے کہا۔ ''اپنے بابا جان کے پاس جاؤ' انہوں نے تمہیں یاد کیا ہے۔''

گول کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اماں جان اور بابا جان کے درمیان کس طرح کا رشتہ قائم تھا۔ ایک چھت کے نیچے رہنے کے باوجود' ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی ہونے کے باوجود وہ دونوں بہت الگ دنیاؤں کے باسی تھے۔ اسے یہ رشتہ ساتھیوں اور دوستوں والا نہیں لگا تھا' اسے ہمیشہ یونہی محسوس ہوا تھا' جیسے یہ آقا اور غلام والا ہو اور یہ بات اسے کبھی پسند نہیں آئی تھی۔

گول کمرے میں بابا جان اس کے منتظر تھے۔

''ہوں!'' وہ بیٹھ گیا تو انہوں نے پُرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے

یہ کہ آگے کیا کرو گے؟ ایف ایس سی میں داخلہ لینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے تمہارا؟''

''ارادہ کیوں نہیں ہے' لیکن بابا جان میں یہاں پاکستان میں نہیں پڑھنا چاہتا۔''

''تو برطانیہ چلے جاؤ' لیکن یوں ہم تمہیں فارغ بیٹھے نہیں دیکھنا چاہتے۔'' انہوں نے کہا۔

''تھینک یو بابا جان! میں یہی چاہتا ہوں' لیکن اگر برطانیہ کے بجائے امریکہ میں ایڈمیشن لے لوں تو؟''

''اس میں حرج تو کوئی نہیں ہے' مگر برطانیہ میں ہمارے کنٹریکٹ ہیں' وہاں تمہیں زیادہ سہولت رہے گی' دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی۔''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے لیے امریکہ زیادہ بہتر ہے۔ برطانیہ کا ماحول مجھے کلف زدہ سا لگتا ہے۔''

پیر صاحب مسکرائے۔ ''یہی تو وہاں کی خوبی ہے اور وہاں پڑھنے کا جو لطف ہے' وہ دنیا میں اور کہیں بھی نہیں ہے۔ اینی وے ہم اس سلسلے میں تم پر کوئی پابندی نہیں لگا رہے۔ تم کسی تعلیمی ادارے کا انتخاب کر لو اور ہمیں بتا دو۔ ہمیں یقین ہے کہ تم کسی بہترین انسٹی ٹیوشن کا ہی انتخاب کرو گے۔ برطانیہ ہو تو اچھا ہے' لیکن ہمیں امریکہ پر بھی اعتراض نہیں ہے۔''

☆=====☆=====☆

"گڑیا مجھے لگتا ہے کہ بھائی کو ریشماں بھابی سے اس لیے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ انہیں جانتے ہی نہیں ہیں۔ سوچو کہ وہ انہیں جانتے ہوتے تو بھلا کیوں اعتراض کرتے۔ سبط نے مجھے خود بتایا ہے کہ وہ اتنی زیادہ خوبصورت ہیں کہ بس بندہ دیکھتا ہی رہ جائے' اور پتا ہے سبط نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بھائی سے بہت محبت کرتی ہیں۔" زینی نے زہرا سے کہا۔

وہ دونوں لیونگ روم میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

"یہ بات سبط کو کیسے پتا چلی کہ ریشماں بھابی بھی بھائی سے بہت محبت کرتی ہیں۔" زہرا نے پوچھا۔

"اس نے خود بتایا تھا مجھے' چاہے تو تم بھی پوچھ لینا۔ بھئی ہمیں بھی تو پتا ہے ناں کہ بھائی کو ان سے دلچسپی نہیں ہے' اسی طرح اسے بھی پتا ہے کہ اس کی بہن کو ان سے محبت ہے۔" زینی نے کہا۔

"بھائی جو انہیں ناپسند کرتے ہیں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ درمیان میں کسی اور لڑکی کا چکر ہو۔" زہرا نے خیال ظاہر کیا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسی بات نہیں ہے' ورنہ وہ مجھے ضرور بتاتے اور پھر گڑیا میں تو بہت جذباتی ہوں۔ اس معاملے میں۔ وہ سبط کی بہن ہیں' بھائی کو پسند کرتی ہیں تو بھلا وہ کیوں نہ ہماری بھابی بنیں۔ مجھے تو بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ کوئی اور لڑکی ان کی جگہ لے لے۔"

"تم جذباتی ہو رہی ہو اور یہ بھول گئی ہو کہ بھائی انہیں ناپسند کرتے ہیں۔" زہرا نے کہا۔

"وہ انہیں ناپسند نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے سلسلے میں Indifferent ہیں۔ نہ پسند کرتے ہیں اور نہ ہی ناپسند' لیکن سوچو گڑیا کہ اگر بھائی کو ان کے متعلق معلومات ملیں یا وہ ان کی تصویریں دیکھیں' ان سے ملیں یا ان کی باتیں سنیں تو بھائی کا یہ Indifferent رویہ ختم ہوسکتا ہے' ریشماں بھابی سے محبت کر سکتے ہیں۔" زینی کے انداز میں جوش تھا۔

"تم کن مفروضوں کی بات کر رہی ہو' نہ تو بھائی ان سے مل سکتے ہیں' نہ ان کی تصویریں

دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی باتیں سن سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ خواہ مخواہ سب کو مصیبت میں مت ڈالو۔ خود تو پھنسی ہوئی ہو' باقی سب کو بخشو۔"

"یہ مفروضے نہیں ہیں۔ میں ان باتوں کو حقیقت بناؤں گی۔" اس نے پُر خیال انداز میں کہا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہے۔" زہرا نے کہا اور اٹھ کر ٹی وی لگا لیا۔

زہرا ٹی وی دیکھتی رہی اور وہ نظریں اسکرین پر جمائے سوچنے لگی۔ جلد ہی ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ گئی تھی۔ زہرا کو وہیں چھوڑ کر وہ اٹھی اور اپنے کمرے سے بڑی سی چادر لے کر بابا جان کے ڈرائیور کے پاس آ گئی۔

"بشیر! گاڑی نکالو۔" اس نے کہا۔

"بی بی! کہاں جانا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جہاں میں کہوں وہاں لے چلو۔" وہ بولی۔

"گن مین ساتھ لے لیں بی بی؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے' تم گاڑی نکالو۔"

"لیکن بی بی' بڑی بیگم اور شاہ صاحب نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے کہ گن مین کے بغیر بیبیاں کہیں باہر نہیں نکلیں گی۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں گاڑی خود ڈرائیو نہیں کر سکتی؟ مجھے پتا ہوتا کہ تم اتنی بحث کرو گے تو کبھی نہ کہتی تم سے۔" اسے غصہ آ گیا۔

"بی بی! میں تو نوکر ہوں' شاہ صاحب کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔"

"گاڑی کی چابی مجھے دے دو۔" اس نے چڑچڑے انداز میں کہا۔ "اتنا بڑا قید خانہ ہے یہ جگہ' کوئی کام اپنی مرضی سے نہیں کیا جا سکتا۔"

"آپ بیٹھیں جہاں کہیں گی میں لے چلتا ہوں۔"

گاڑی لے کر وہ ندی تک آ گئی۔

"اب تم جاؤ بشیر' دو ڈھائی گھنٹے میں یہیں آ جانا۔" وہ اترتے ہوئے بولی۔

"لیکن بی بی! آپ کو یہاں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟" وہ متذبذب تھا۔

"تو مت جاؤ' میرا دماغ مت کھاؤ' مجال ہے کہ اس حویلی میں ہماری بات بھی کوئی سنے۔" وہ غصے سے بولی اور ندی کے اوپر بنے پُل کی طرف چل دی۔

"بی بی! یہ پیر صاحب کا علاقہ ہے' یہاں مت جائیں۔" وہ گھبرا کر اس کے پیچھے لپکا۔

مگر وہ سنی اَن سنی کر کے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

حویلی کچھ زیادہ دور نہیں تھی' لیکن اس کے لیے راستہ اجنبی تھا' پھر بھی وہ اطمینان سے چلتی

جا رہی تھی۔ چہرہ اس نے بڑی سی چادر میں چھپا رکھا تھا۔ بشیر نے دیکھا کہ وہ واپس پلٹنے کے موڈ میں نہیں تھی' تو وہ تیزی سے پیچھے مڑا اور گاڑی لے کر حویلی کی طرف چل دیا۔ اسے حیدر علی شاہ سے جھاڑ پڑنی یقینی تھی' لیکن فوری طور پر ان تک یہ خبر پہنچانی ضروری تھی۔

☆=====☆=====☆

زینی کو راستہ ڈھونڈنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور وہ جلد ہی پیر صاحب کی حویلی میں پہنچ گئی۔

متجسس آنکھوں کے ساتھ حویلی کی غلام گردشوں میں گھومتے ہوئے بالآخر وہ زنان خانے میں اماں جان کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اپنا چہرہ اب بھی اس نے چادر میں چھپا رکھا تھا۔ کمرے میں ڈھیر ساری عورتیں موجود تھیں۔ وہ بھی سلام کر کے اپنے بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب سی جگہ کی تلاش کرنے لگی۔

وہاں آنے والی عورتیں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ زینی ان سب کے لیے اجنبی تھی۔ یوں بھی وہاں آ کر پردہ کرنے والی عورتیں بھی نقاب اتار دیا کرتی تھیں۔

یاسمین بیگم بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اپنے لباس اور انداز سے وہ کسی تعلیم یافتہ گھرانے کی لڑکی لگتی تھی۔ چادر سے نظر آنے والی اس کی آنکھیں بھی اس کے ذہین ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ انہوں نے اب سے قبل اسے کبھی نہیں دیکھا تھا' وہ غیر محسوس انداز میں کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی قالین پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''بچی تم کون ہو؟ آج سے پہلے تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔'' یاسمین بیگم نے کہا۔

اس نے راستے میں سوچی ہوئی کہانی کے مطابق جواب دیا۔

''میرا نام ہاجرہ ہے۔ ملتان سے آئی ہوں۔''

''کوئی رشتے دار ہیں یہاں تمہارے؟''

''نہیں۔ کسی نے بتایا تھا کہ پیر صاحب کی دعا میں بہت اثر ہے۔ اس لیے ان سے دعا کروانے چلی آئی۔'' وہ بولی۔

یاسمین بیگم نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ ان کا اندازہ تھا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے لہجے میں گنوار پن پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''پیر صاحب اس وقت کچھ مصروف ہیں۔ میں ان سے تمہارے لیے دعا کرنے کا کہوں گی۔ وہ ضرور مدد کریں گے۔ اتنی دیر تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یہ چادر بھی اتار دو بے شک۔''

''نہیں جی' میں ٹھیک ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''ارے ایسا بھی کیا پردہ۔ یہ پیروں کی حویلی ہے۔ کوئی محلے کی گلی یا بازار کی سڑک نہیں ہے۔

جو کوئی یہاں کسی لڑکی کی طرف نظر بھر کر بھی دیکھے۔'' ایک عورت نے منہ بنایا۔

''گھبراؤ مت بچی۔ اطمینان سے بیٹھو۔ یہاں کوئی مرد بغیر اجازت اندر داخل نہیں ہوتا'' یاسمین بیگم نے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے جی۔ دراصل میرا چہرہ جلا ہوا ہے' اس لیے میں منہ چھپا کر رکھتی ہوں۔''

''چچ چچ' آئے ہائے بے چاری۔''

سب ہی اس کی طرف ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''شادی ہو گئی تمہاری یا نہیں؟'' دوسری عورت نے کہا۔

''شادی کے لیے ہی بے چاری دعا کروانے آئی ہو گی۔ اپنی ذات بتا دینا۔ پیر صاحب کہیں نہ کہیں تمہاری شادی طے کروا دیں گے۔'' دوسری عورت نے کہا۔

''اوہ گاڈ۔ یہ عورتیں۔'' زینی نے دل ہی دل میں سوچا۔

''لڑکی میں نے پوچھا تھا کہ شادی ہو گئی تمہاری یا نہیں؟'' پہلے والی عورت نے اپنا سوال دہرایا۔

''میری شادی کی تمہیں اتنی فکر کیوں ہے؟'' وہ تنک کر بولی۔

''بڑی تنک چڑھی ہے۔'' اس عورت نے ناک سکیڑ کر منہ پھیر لیا۔

عورتیں ایک مرتبہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ زینی دیوار سے ٹیک لگائے حویلی اور اس کے مکینوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس حویلی کے متعلق اس نے بہت کچھ سنا تھا۔ بچپن میں ان پر فائرنگ کی گئی۔ زہرا کو اغوا کرنے کی کوشش ہوئی۔ زبردستی رشتے طے ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سبط کے بھائیوں نے عبداللہ کو قتل کرنے کی قسم اٹھائی۔

وہ یاسمین بیگم کے چہرے پر نگاہ ڈالتی تھی تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کی اماں جان کی طرح ہوں۔ محبت کرنے والی' حساس دل رکھنے والی اور اولاد کے لیے ہر وقت فکر مند رہنے والی۔

''تو کیا جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری صرف بڑے بابا جان پر عائد ہوتی ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''اگر اس وقت کسی کو میری اصلیت معلوم ہو جائے تو کیا ہو؟ کیا یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے؟ یا پھر سبط مجھے بچا لے گا۔ اور سبط کی اماں جان کا کیا ردِ عمل ہو گا؟ بھائی نے بتایا تھا کہ یہ سب بھی مجھے امداد حسین کی منگیتر ہی سمجھتی ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ مرنے والے بیٹے کی محبت پر زندہ بیٹے کی محبت غالب آ جائے اور یہ سبط کا ساتھ دے دیں۔ منوا لیں بڑے بابا جان سے کہ میری اور سبط کی شادی ہو سکتی ہے؟''

وہ خود سے سوال پوچھ رہی تھی۔ اور اس کے پاس اپنے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ وہاں موجود عورتوں کی باتوں سے اکتا گئی۔ وہ گاؤں کے اور خاندانوں کے متعلق جانے کون کون سے بکھیڑے لے کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بالآخر تنگ آ کر وہ یاسمین بیگم سے مخاطب ہوئی۔

''میں جی چھوٹی بی بی سے مل سکتی ہوں؟''

''ہاں مل لو۔ اس کا بھی دل بہل جائے گا۔'' وہ بولیں۔

''لیکن مجھے پتا نہیں ہے جی کہ ان کا کمرا کہاں ہے؟''

یاسمین بیگم نے ایک عورت اس کے ساتھ کر دی جو اسے ریشماں کے کمرے میں چھوڑ گئی۔ کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر زینی نے اندر کا جائزہ لیا۔ اس بڑے سے کمرے کی آرائش بہت خوبصورتی سے کی گئی تھی لیکن آرائش کے انداز میں جدت نہیں تھی۔ سامنے صوفے پر ریشماں ٹانگیں اوپر کیے بیٹھی تھی۔ گود میں کوئی کتاب تھی لیکن اس کی نگاہیں دروازے میں کھڑی زینی پر ہی لگی ہوئی تھیں۔

زینی نے اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ شہد آگیں رنگت' خوبصورت نین نقش جیسے بہت فرصت کے عالم میں بنائے گئے ہوں۔ گھٹنوں تک لمبے گھنے بال جن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

''کون ہو؟ اندر آ جاؤ۔''

ریشماں نے کہا تو وہ چونکی اور اندر بڑھ گئی۔

''بیٹھو۔'' ریشماں نے کہا۔

''اے بی بی' یہ چادر ہٹا لو منہ سے اور آرام سے بیٹھو'' وہاں موجود کریمن نے اس سے کہا۔

''ہاں'' وہ بولی پھر گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کریمن سے مخاطب ہوئی۔ ''باہر بہت گرمی ہے مجھے سخت پیاس محسوس ہو رہی ہے۔ ایک گلاس پانی مل جائے گا۔''

''ارے کیوں نہیں۔ دنیا کی کون سی نعمت ہے جو اس بڑی حویلی میں نہ ہو۔ اللہ پیر صاحب کو سلامت رکھے۔'' کریمن اٹھی۔

زینی اسے باہر جاتے دیکھتی رہی۔ جب اس نے باہر نکل کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا تو زینی ریشماں کی طرف مڑی۔

''مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے لیکن صرف آپ سے کسی اور کی موجودگی میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکوں گی اور میرا آپ سے بات کرنا بھی بہت ضروری ہے۔''

ریشماں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''تم کون ہو؟ میں اس طرح کسی سے بھی نہیں ملا کرتی۔''

''پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں ابھی آپ کو تفصیل سے بتا دیتی ہوں کہ میں کون ہوں۔ ابھی صرف اتنا کہوں گی کہ میں آپ کی دوست اور ہمدرد ہوں۔ آپ سے محبت کرتی ہوں۔''

''دیکھو لڑکی تم جو بھی ہو' میں تمہیں نہیں جانتی۔ نہ ہی مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت ہے۔ یوں بھی میں ہر آئی گئی عورت سے نہیں ملتی۔ میری ایک بہت اچھی دوست بھی ہے اور میرے ہمدرد' مجھ سے محبت کرنے والے بھی بہت ہیں۔ مجھے تو تم کوئی مشکوک سی لڑکی لگ رہی ہو۔''

''اوہ گاڈ۔ ایک تو آپ کچھ سمجھتی ہی نہیں ہیں۔ میں آئی گئی عورتوں میں سے نہیں ہوں اور نہ ہی مشکوک ہوں۔ میں آپ کی کزن ہوں زینی یعنی زینب۔''

''زینب؟'' ریشماں نے بڑی سی چادر میں لپٹی زینی کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ ''تم حیدر بابا کی بیٹی ہو؟''

''ہاں' اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ میں آپ سے کسی کے سامنے بات چیت نہیں کر سکتی۔ یہاں کسی کو نہیں پتا کہ میں اصل میں کون ہوں۔ آپ......''

ابھی اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ کریمن دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

''یہ لو۔ ایسی لسی تو تم نے کبھی نہیں پی ہوگی۔'' وہ گلاس لے کر زینی کی طرف بڑھی جو ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔

ریشماں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گود میں رکھی ہوئی کتاب قالین پر گر گئی۔

''تم نے تو چادر بھی نہیں اتاری۔ بیٹھی بھی نہیں ہو۔''

''تمیز سے بات کرو کریمن!'' ریشماں نے اسے جھاڑا۔

کریمن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں نے کوئی غلطی کی بی بی؟''

''بحث کیوں کر رہی ہو اور یہاں کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ باہر جاؤ اور اسی وقت آنا جب میں تمہیں آواز دوں۔'' ریشماں واضح طور پر کنفیوز ہو چکی تھی۔

''جی اچھا بی بی۔''

کریمن کمرے سے باہر نکل گئی۔

''تم وہاں کیوں کھڑی ہو زینی!'' ریشماں لپک کر اس کی طرف بڑھی اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ صوفے تک لے گئی۔ ''بیٹھو نا' اور ہاں یہ چادر اتار دو۔ یہاں بغیر اطلاع دیے کمرے میں کوئی نہیں آتا۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ اطمینان سے بیٹھو۔''

زینب ہنس پڑی۔ ''اصولاً اتنا زیادہ کنفیوز مجھے ہونا چاہیے اور ہو آپ رہی ہیں۔ ویسے ایک بات ہے۔'' وہ چادر تہہ کرتے ہوئے بولی۔ ''کہ اس ایڈونچر کو میں نے بہت انجوائے کیا ہے۔ ہاں جب گھر واپس جاؤں گی تو میری خیر نہیں۔ بہت جھاڑ پڑے گی سب سے۔''

وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔

''وہاں کسی کو نہیں پتا تمہارے یہاں آنے کا؟'' ریشماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''وہاں کسی کو پتا چل جاتا تو میں یہاں آ سکتی تھی؟'' اس نے جوتے پاؤں سے اتار قالین پر اچھال دیے اور ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔

''تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم نے کتنا بڑا رسک لیا ہے۔ اس پاگل پن کی کیا ضرورت تھی؟''

''ضرورت تھی، تب ہی تو آئی ہوں۔ ویسے آپ بہت خوبصورت ہیں۔'' زینی نے کہا۔

ریشماں ہنس پڑی۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ کہاں کی بات تھی اور تم کہاں لے گئیں۔''

''میری اکثر باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ زیادہ تر لوگ میری بے ربط باتوں سے پریشان جاتے ہیں لیکن سبط نہیں ہوتا۔ اصل میں جو بات میرے ذہن میں آتی جاتی ہے، میں وہی با کہتی جاتی ہوں۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ میری زبان ذرا آہستہ چلتی ہے اور دماغ ذرا تیز۔ آپ سمجھنا کہ میرا دماغ چلنے سے دوسرا مطلب ہے۔ میرا مطلب سوچ کی رفتار سے ہے۔''

ریشماں ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''تمہاری زبان کی رفتار کا عالم تو میں نے دیکھ ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ دماغ چلنے کی رفتار کیا ہوگی؟''

زینی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

''اب یہ بتاؤ کہ وہ سبط کون ہے جو تمہاری باتوں سے پریشان نہیں ہوتا؟''

''اُف!'' زینی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر ہنستی گئی۔

''کیا ہوا؟'' ریشماں نے اس کے ہاتھ چہرے کے سامنے سے ہٹائے۔

''کچھ نہیں۔ یونہی ہنسی آ گئی تھی۔ مجھے ہنسی بہت آتی ہے۔'' اس نے بمشکل اپنی ٹرول کی۔

ریشماں کی آنکھوں کے سامنے امداد حسین کا چہرہ ابھرا۔

''کتنی اچھی لگتی زینب امداد بھائی کے ساتھ۔ یونہی ہنستی ہوئی۔'' ریشماں نے دکھ کے ساتھ سوچا۔ پھر قدرے الجھن سے پوچھا۔ ''مگر یہ سبط کون ہے؟''

''اس کا مطلب ہے کہ......'' زینی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کیا؟''

''کچھ نہیں۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ سبط میرے لیے سب کچھ ہے۔ مجھے سوچنے دیں کہ کے متعلق آپ کو بتاؤں یا نہ بتاؤں۔''

ریشماں ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔ دل میں جیسے کچھ چبھ سا گیا ہو۔

''کیا زینب کو مجھ سے بات کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میرے بھائی کی جگہ وہ کسی اور شخص کا نام اتنی آسانی سے میرے ہی سامنے لے رہی ہے۔ میرا وہ بھائی جس کے ساتھ اسے اپنی ساری زندگی گزارنی تھی، وہ بھائی جو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

''آپ افسردہ سی لگ رہی ہیں، کیا ہوا؟'' زینی نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' وہ سوچ کی دنیا سے پلٹ آئی۔

''ویسے قسم سے بھائی آپ کو ایک نظر دیکھ لیں بس ایک نظر تو آپ پر فدا ہی ہو جائیں۔'' زینی نے کہا۔

ریشماں کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

''ایک بات بتاؤں آپ کو بھابی!'' وہ اس کے قریب کھسک آئی۔ ''ہم سب چاہتے ہیں کہ آپ ہماری بھابی بنیں اور سب سے زیادہ یہ خواہش میری ہے۔ گڑیا ہے ناں، میری بہن زہرا۔ چاہتی تو وہ بھی یہی ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ اماں اور بابا جان بھی چاہتے ہیں لیکن ان کا بھی یہی خیال ہے۔ بس صرف میں ہوں جس نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا چاہے مجھے کچھ بھی کرنا ہو۔

اور آپ سوچ رہی ہوں گی کہ میں نے سب کی خواہش کا ذکر کر دیا، بھائی کے متعلق کچھ نہیں بتایا آپ کو۔ میں آپ کو ان کی ایک پرابلم بتاتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ دل دل میں وہ بھی آپ کو پسند کرتے ہیں لیکن اوپر اوپر سے کہتے نہیں ہیں۔ بس ایک مرتبہ آپ کو دیکھ لیں تو مجھے یقین ہے کہ سب کچھ بھول جائیں گے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ ابھی ان کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو مجھے ضرور پتا ہوتا۔''

ریشماں پلکیں جھپکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھے گئی۔ وہ بھی ماہ بانو کی طرح ہی اسے لگی تھی۔ ویسی ہی دلچسپ باتیں کرنے والی۔ عبداللہ کے متعلق باتیں وہ صرف ماہ بانو سے ہی کیا کرتی تھی لیکن زینی کو دیکھ کر اس سے مل کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس سے بھی سب کچھ کہہ سکتی ہو۔

''آپ نے بھی تو بھائی کو نہیں دیکھا ہوا لیکن خیر میں ان کی تصویر لائی ہوں۔ آپ کو بھی وہ بہت اچھے لگیں گے۔'' زینی نے اپنے بیگ کو صوفے پر الٹ دیا۔ اس کا ہیئر برش، بالوں میں لگانے والے مختلف رنگوں کے بہت سے بینڈز، ایک کی رِنگ جس میں چند چابیاں بھی لگی ہوئی تھیں، خوشبو میں بھیگے ٹشو پیپرز، چند پرانی بیکار رسیدیں، ایک بال پین، چند تصویریں اور نہ جانے کیا کیا بیگ سے نکل کر صوفے کے کشن پر پھیل گیا۔

اپنی اور سبط کی تصویریں اس نے ایک دم سے اٹھا کر واپس بیگ میں ڈال دیں اور عبداللہ کی دو تصویریں اس کے ہاتھ میں تھا دیں۔

"ویسے تو مجھے پتا ہے کہ آپ کو بھائی سے بہت محبت ہے لیکن اب انہیں دیکھیں گی تو محبت بہت اسپیس شٹل کی رفتار سے آگے بڑھے گی۔" زینی ہنسی۔

ریشماں کے ہاتھ میں تصویریں تھیں اور وہ اب تک یہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ کیا کرے۔ زینی ہر کام بہت تیزی سے کرنے کی عادی لگتی تھی۔ اس نے اچانک ہی عبداللہ کا ذکر شروع کیا تھا اب اسے تصویریں بھی تھما دی تھیں۔

اسی وقت دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ ریشماں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں سے جان نکال دی ہو۔

☆=====☆=====☆

بشیر گھبرایا ہوا حویلی پہنچا تو سب سے پہلے اس کا سامنا حیدر علی شاہ سے ہی ہوا۔

"کہاں غائب تھے تم؟ پچھلے دس منٹ سے تمہیں پوچھ رہا تھا۔"

"جی میں۔ وہ دراصل......" اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

"کیا ہوا تمہیں' لگتا ہے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔" زہرا بھی وہیں چلی آئی تھی۔

"خیریت تو ہے بشیر' مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی" حیدر بابا نے کہا۔

"جی وہ اصل میں چھوٹی بی بی۔" وہ ہکلا کر خاموش ہو گیا۔

"کیا ہوا چھوٹی بی بی کو؟" انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

"وہ پیر صاحب کے علاقے میں چلی گئی ہیں۔ میں نے بہت روکا لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو' گھاس تو نہیں کھالی۔" انہوں نے اسے گھورا پھر زہرا سے مخاطب ہوئے۔ "گڑیا بیٹے' زینی کہاں ہے؟"

"پتا نہیں بابا جان' میرا خیال تھا کہ اپنے کمرے میں گئی ہوگی۔" زہرا نے بوکھلا کر کہا۔

"اسے جا کر دیکھو کہ وہ کہاں ہے۔" وہ سگار ایش ٹرے میں مسل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"شاہ صاحب میری گردن حاضر ہے۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے پیر صاحب کے علاقے میں گئی ہیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں انہیں لے کر جاؤں۔" بشیر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

زہرا چیخ کر ان سے لپٹ گئی۔ "بابا جان وہ وہیں گئی ہوگی۔ اب کیا ہوگا' وہ اسے مار دیں گے۔ وہ سبط کی خاطر وہاں گئی ہوگی۔ بھابی کے لیے گئی ہوگی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ ایسا کرے گی ورنہ میں اسے روک ہی دیتی۔"

بابا جان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ غصہ قطرہ قطرہ ان کے پورے وجود میں جمع ہو رہا تھا۔

"بی بی کو تم لے کر گئے تھے؟" وہ دہاڑے۔

"میری غلطی شاہ صاحب لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ وہ وہاں جائیں گی۔ میں تو جی......" بشیر کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے کبھی انہیں اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

"تم سے تو میں آ کر ملتا ہوں۔ چابی دو گاڑی کی۔"

"آپ کا وہاں جانا مزید خطرناک ہوگا شاہ صاحب خدا کے واسطے آپ وہاں مت جائیں۔"

"بکواس بند کرو اور گاڑی کی چابی دو۔" وہ ایک بار پھر غصے میں دہاڑے۔

اماں جان ساتھ والے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ لاؤنج سے پریشان کن ملی جلی آوازیں سن کر وہ بھی وہیں چلی آئیں۔ انہوں نے کبھی بھی حیدر علی شاہ کو غصے میں اس طرح چلاتے نہیں سنا تھا۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے دروازے میں کھڑے ہو کر کمرے کے منظر کا جائزہ لیا۔

بشیر مجرموں کی طرح سر جھکائے ہانپ رہا تھا۔ زہرا بابا جان سے لپٹی رو رہی تھی اور وہ خود سخت غصے میں بھرے ہوئے تھے۔

زہرا نے ماں کو وہاں کھڑے دیکھا تو بابا جان کو چھوڑ کر ان کی طرف بڑھی اور ان سے لپٹ گئی۔

"اماں' بابا جان کو منع کریں وہاں مت جائیں۔ وہ انہیں بھی مار دیں گے۔"

"گڑیا اپنی ماں کو لے کر اندر جاؤ اور رونا دھونا بند کرو۔" وہ بولے۔

اماں جان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"عبداللہ تو خیریت سے ہے؟ ہوا کیا ہے؟ کچھ تو بولیں۔"

"اماں میں بھائی کو فون کرتی ہوں۔ آپ بابا جان کو وہاں جانے سے روکیں۔" زہرا کو عبداللہ کے نام سے اسے فون کرنے کا خیال آیا۔ وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھی۔

"گڑیا! حماقت کا ثبوت مت دو۔" بابا جان نے اسے ڈپٹا پھر بشیر کی طرف مڑے۔ "اور دفع ہو جاؤ میری نگاہوں کے سامنے سے۔ یہ خبر اگر باہر نکلی تو میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ نکالوں گا۔"

بشیر خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ زہرا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"گڑیا میں نے کیا کہا ہے تمہیں؟" وہ غصے سے بولے۔

"میں بھائی کو فون کر رہی ہوں۔" وہ مسلسل روتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا کرے گا یہاں آ کر؟ اور فوراً چل پڑا تب بھی گھنٹوں میں پہنچے گا۔ رکھو ریسیور نیچے خواہ مخواہ کی پریشانی میں مبتلا مت کرو۔"

"کچھ تو بولیں کہ ہوا کیا ہے؟" اماں جان پریشانی سے بولیں۔

"کچھ نہیں ہوا' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تھوڑی دیر میں آ گا۔" انہوں نے گاڑی کی چابی اٹھالی۔

"میں آپ کو وہاں نہیں جانے دوں گی بابا جان۔ اماں انہیں روکیں ناں۔ وہ زن ماردیں گے اور بابا جان کو بھی۔"

"زینی...... میری زینی کہاں ہے؟ علی' زینی کہاں ہے؟" اماں جان نے انہیں جھنجو

اماں جان کا بلڈ پریشر پہلے ہی ہائی رہتا تھا اب جو یہ افتاد ٹوٹی تو اور زیادہ ہائی ہو گیا جیسے ہی خبر ہوئی کہ زینی بڑی حویلی گئی ہے' ان کے ہوش وحواس جواب دے گئے۔

"بابا جان' اماں کو کیا ہو گیا ہے؟" زہرا کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔

"تم انہیں سنبھالو' پانی کے چھینٹے دو۔ کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا انہیں۔ میں ا ہوں۔"

"اللہ کے واسطے بابا جان' آپ مت جائیں۔ اماں کو کچھ ہو گیا ہے۔" وہ ہسٹریا میں چلائی۔

انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت بے ہوش ہو کر گر پڑ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"ریلیکس گڑیا کچھ نہیں ہوا بیٹا۔ ریلیکس!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"اگر تم اپنا یہ حال کر لو گی تو تمہاری اماں کو کون سنبھالے گا۔ جاؤ پانی لاؤ۔" انہوں زہرا قریب رکھے جگ سے پانی نکال لائی۔ وہ ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈا اور زہرا ان کی ہتھیلیاں سہلانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں اماں جان کو ہوش آ گیا۔ زہرا میں اچانک ایک خیال کوندا۔ وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھی۔

"کسے فون کر رہی ہو گڑیا؟" بابا جان نے پوچھا۔

"سبط کو۔" اس نے کہا اور دوبارہ فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ دوسری طرف بیل تھی۔

اماں جان بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ گو انہیں ہوش آ گیا تھا لیکن ان کی حالت بہت غیر تین چار گھنٹیوں کے بعد سبط نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!"

"ہیلو سبط۔ میں گڑیا بول رہی ہوں۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟ تم رو رہی ہو کیا؟ زینی تو ٹھیک ہے ناں؟" اس نے ایک

میں ڈھیر سارے سوال کر دیے۔

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے سبط۔ زینی سخت خطرے میں ہے۔"

"کیا ہوا اسے؟" وہ گڑیا کی بات کاٹ کر پریشانی سے بولا۔

"وہ احمق لڑکی تم لوگوں کی حویلی میں آئی ہوئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم سے مل چکی ہو گی لیکن تم سے نہیں ملی تو ریشماں بھابی سے ضرور ملی ہو گی۔ پلیز اسے دیکھو وہ کس حال میں ہے' کہاں ہے۔ اماں جان کا بہت برا حال ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم۔ وہ یہاں ہے؟ اوہ گاڈ۔"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اماں جان کی حالت بہت بری ہے اور بابا جان مُصر ہیں کہ وہ ابھی زینی کے پیچھے جائیں گے۔ پلیز کچھ کرو اس کے لیے۔" گڑیا رو پڑی۔

بابا جان نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"تم بالکل فکر مت کرو۔" دوسری طرف سے سبط کہہ رہا تھا۔ "میں ہوں ناں یہاں اس کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ میں خود چھوڑ کر جاؤں گا اسے تم لوگوں کے پاس۔ وہ بالکل محفوظ ہے' اسے کچھ نہیں ہو گا۔"

"اسے کچھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔" بابا جان نے سرد لہجے میں کہا۔ "اگر میری بیٹی کو کچھ ہو گیا تو میں وہاں کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس سے زیادہ شرافت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا میں جتنا اب تک کرتا آیا ہوں۔"

"حیدر بابا آپ؟" اس نے کہا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔ "اسے کچھ ہوا تو آپ بعد میں کچھ کریں گے' پہلے میں اس حویلی کو آگ لگاؤں گا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

☆=====☆=====☆

ریشماں کے ساتھ زینی بھی گڑبڑا گئی تھی۔ مگر یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آ گئی کہ آنے والا سبط حسن تھا۔ اتنے دن بعد اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔

"سبط!" وہ خوشی سے چلائی۔ اس لمحے وہ ریشماں کی وہاں موجودگی کو بھی فراموش کر چکی تھی۔

اسے خیریت سے دیکھ کر سبط نے سکون کا سانس لیا اور کمرے کے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔

"تمہیں حیرت ہوئی ہے ناں۔ میں بھی تمہیں حیران کرنا چاہتی تھی اور تم اتنے بے وفا ہو۔ جب سے یہاں آئے ہو کبھی خود سے مجھے فون نہیں کیا۔ میں ہی کروں تو کروں۔" زینی نے کہا۔

ریشماں نے حیرت سے دونوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں قبل زینی سے ہونے والی گفتگو اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔

"بس اتنا سمجھ لیں کہ سبط میرے لیے سب کچھ ہے۔" اس کے ذہن میں زینی کے کہے ہوئے الفاظ گونجے۔

"ویسے تو مجھے تم سے اسی قسم کی حماقت کی توقع ہونی چاہیے تھی لیکن ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید تم اس قدر احمق نہیں ہوگی۔ یا شاید یہاں آ کر تم میں کچھ بہتری پیدا ہوگئی ہو گی لیکن نہیں۔" سبط نے زینی سے کہا۔

"تم مجھے ڈانٹ رہے ہو؟ میں نے سب سے کہا تھا۔ بھائی سے بھی کہ تم مجھے کبھی نہیں ڈانٹ سکتے لیکن تم نے بالآخر مجھے ڈانٹ ہی دیا ناں۔"

"ابھی تم واپس اپنی حویلی میں پہنچو گی تو پتا چلے گا کہ ڈانٹ کیا چیز ہوتی ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟" اس نے گھبرا کر کہا۔

اسی وقت سبط کو اچانک ریشماں کا خیال آیا۔

"آئی ایم سوری آپی! مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ آپ بھی یہاں موجود ہیں۔" وہ قدرے شرمندہ ہوگیا۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی تصویریں غیر محسوس انداز میں کشن کے نیچے سرکا دیں۔

"بھابی میں نے کہا تھا کہ سوچوں گی آپ کو سبط کے بارے میں بتاؤں یا نہیں۔ اب مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ آپ کو پتا چل ہی گیا ہوگا۔ میرے لیے دنیا میں ہر چیز سبط کے بعد ہے۔" وہ ہنس پڑی پھر اچانک اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ "سبط تم کیوں کہہ رہے تھے کہ گھر واپسی پر مجھے ڈانٹ پڑے گی۔"

"میں یہاں محض اتفاقاً نہیں نازل ہوگیا۔ گڑیا کا فون آیا تھا۔ وہاں سب تمہارے لیے پریشان ہیں۔" اس نے دانستہ اس کی اماں جان کا ذکر نہیں کیا۔

"لیکن انہیں میری یہاں موجودگی کا پتا کیسے چلا؟" پھر وہ خود ہی بولی۔ "بشیر کے پیٹ میں بات نہیں رہی ہوگی۔ اسی نے بتایا ہوگا۔ اُف اب تو واقعی بہت ڈانٹ پڑے گی اور اس بات سے مجھے سخت ڈر لگتا ہے۔"

سبط وہیں بیٹھ کر اپنے موبائل فون پر ان کا نمبر ملانے لگا۔ سلسلہ ملنے پر اس نے فون زینی کو تھمانا چاہا۔

"میں بات نہیں کروں گی۔ تم کہو کہ میں بس تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔"

"تم بات کرو، تسلی دو اپنے بابا جان کو اور فوراً اٹھو واپسی کے لیے۔" سبط حسن نے کہا۔

"بابا جان سے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا قسم سے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

اسے انکار کرتے دیکھ کر سبط نے خود فون پر بات کرنا شروع کی۔

"حیدر بابا وہ آپی کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ بس میں ابھی اسے لے آتا ہوں اپنے ساتھ۔"

"میری بات کراؤ اس سے۔" انہوں نے اسی سرد مہر انداز میں کہا۔

"وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" سبط حسن نے زینی سے کہا۔

"میں بات نہیں کر سکوں گی۔ پلیز سبط میری جگہ تم تھوڑی سی ڈانٹ کھا لو۔ بس تب ہی میں مانوں گی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔"

اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر ریشماں ہنس پڑی اور سبط کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

"تم دونوں کی جگہ میں ڈانٹ کھانے لگی ہوں تاکہ تم دونوں کو پتا چل سکے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور پھر فون کان سے لگا لیا۔

"حیدر بابا میں ریشماں بول رہی ہوں۔ السلام علیکم!"

اس کی آواز بھی زرینہ جیسی ہی تھی۔ اور یہ آواز برسوں بعد بھی اب تک ان کی سماعت میں محفوظ تھی۔

"جیتی رہو بیٹا!" وہ بولے۔

"آج میں بہت خوش ہوں بلکہ امداد بھائی کی وفات کے بعد آج ہی صحیح معنوں میں خوش ہوئی ہوں۔ زینی کے آنے سے لگا ہے جیسے کوئی گمشدہ خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔"

انہوں نے گہری سانس لی۔ "مجھے خوشی ہے کہ آپ کی ملاقات زینی سے ہوگئی لیکن بیٹا اس کے لیے وہاں خطرہ ہے۔ آپ اس سے کہیں کہ وہ فوراً گھر آ جائے۔ اس کی اماں جان کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں بابا جان۔ یہاں وہ بالکل محفوظ ہے۔ وہ میرے کمرے میں ہے اور یہاں کوئی بغیر اجازت نہیں آ سکتا۔ آپ چچی اماں کو بھی تسلی دیں۔" وہ بولی۔

"اس کی اماں جب تک اسے دیکھ نہیں لیں گی تب تک انہیں تسلی نہیں ہوگی۔" انہوں نے کہا۔

"پلیز بابا جان، پھر پتا نہیں میں کبھی زندگی بھر زینی کو دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں۔ آج اسے تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس ہی رہنے دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ سبط خود اسے آپ کے پاس چھوڑ جائے گا۔ میں یہاں بہت اکیلی ہوتی ہوں بابا جان، بس چھٹیوں میں ماہ بانو آ جاتی ہے ورنہ تو دن کاٹنے بھی مشکل ہو جاتے ہیں۔ آج بہت اچھا لگ رہا ہے۔ گھٹن بھی محسوس نہیں ہو رہی۔ پلیز بابا جان!" اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔

ان کے ذہن میں ایک لمحے میں ہی کتنی باتیں کتنی یادیں تازہ ہو گئیں۔

"ہاں وہاں بہت گھٹن ہے۔" انہوں نے سوچا۔ "بڑی آپا' زیبی آپی اور گوری سب اس گھٹن کا شکار ہوگئیں۔ میں ان تینوں سے بے تحاشہ محبت کرتا تھا اور پھر بھی تینوں کے لیے نہ کرسکا۔

ریشماں اسی کمرے میں رہتی ہے جہاں زیبی آپی رہا کرتی تھیں۔ اسے بھی اتنی ہی گھ محسوس ہوتی ہوگی جتنی انہیں ہوتی تھی۔ وہ بھی شاید اسی طرح تڑپتی ہو جیسے زیبی آپی تڑپتی تھ لیکن اس کی تڑپ کی باہر کسی کو خبر نہیں ہوتی ہوگی۔

اور گوری کہتی تھی کہ وہ اس حویلی میں نہیں جانا چاہتی۔ اسے بھی وہاں گھٹن محسوس ہو تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس حویلی میں روحیں چلتی پھرتی ہوں۔ ایک ہی خواہش تھی اس کی کہ اسے کبھی حویلی آنے پر مجبور نہ کروں لیکن اس کی قسمت کہ اس کی زندگی اور موت دونوں کی ڈ بڑی حویلی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔

اور اب ریشماں ہے۔ گوری کی بیٹی۔ اسے تو شاید احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے کہہ دیا ہے۔ آج اسے گھٹن محسوس نہیں ہو رہی۔ کاش کوئی ایسا طریقہ ہو کہ ریشماں آبرو ساتھ اپنی حویلی کو چھوڑ کر یہاں عبداللہ کی دلہن بن کر داخل ہو۔ پھر اسے زندگی میں کبھی گھ محسوس نہیں ہوگی۔"

ریسیور ہاتھ میں تھامے وہ سوچ میں گم تھے۔ تھوڑی دیر تک ریشماں نے ان کے بولنے انتظار کیا پھر مایوس ہوگئی۔

"اچھا بابا جان! آپ نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ میں اسے ابھی بھیج دیتی ہوں۔"

اس کے لہجے کی مایوسی سے انہیں بہت دکھ ہوا۔ "نہیں ریشماں بیٹا' ایسی کوئی بات نہی ہے۔ آپ اس سے باتیں کریں لیکن کوشش کریں کہ اسے زیادہ دیر نہ ہو اور بیٹا محتاط رہیں۔"

"تھینک یو! تھینک یو ویری مچ!" ریشماں کھل اٹھی۔

"تھینک یو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بھی میرے لیے زہرا اور زینب کی طر ہی ہیں۔" انہوں نے شفقت سے کہا۔

"ایک بات اور بابا جان!" اس نے جلدی سے کہا۔

"کیا بات؟"

"آپ گھر آنے پر اسے ڈانٹیں گے تو نہیں؟ پلیز اسے کچھ مت کہیے گا۔"

"اچھا آپ کہتی ہیں تو میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"وعدہ؟" ریشماں نے کہا۔

"بالکل پکا وعدہ۔"

"تھینک یو بابا جان!" وہ ہنس پڑی۔ "اور خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"

اس نے فون بند کر دیا۔

"ہائے ریشماں بھابی! آپ نے تو کمال کر دیا۔" زینی نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اب یہ بتاؤ کہ تم دونوں ایک دوسرے سے کب ملے' کیسے ملے؟ اور سبط اب تک تم نے مجھے یہ سب کچھ بتایا کیوں نہیں؟" ریشماں نے کہا۔

زینی اور سبط نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر زینی کشن گود میں رکھتے ہوئے بولی۔ "میں بتاتی ہوں بھابی۔"

☆=====☆=====☆

عبداللہ اور ایڈی کالج کے گرافک اسٹوڈیوز میں داخل ہوئے تو وہاں ہمیشہ کی طرح خاصی گہما گہمی تھی۔ فائنل ایئر پبلسٹی ڈیزائننگ کے اسٹوڈنٹس میزوں اور اسٹول پر بیٹھے کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ باآواز بلند گپیں بھی لگا رہے تھے۔ فوٹو ایچنگ کے لیے انہوں نے اپنی پلیٹیں ایسڈ میں ایچ ہونے کے لیے رکھی ہوئی تھیں اور اب فارغ تھے۔ ایک طرف کچھ لڑکے لڑکیاں نیوز پرنٹ شیٹس کاٹ رہے تھے۔ انہی کے قریب ماہ بانو اور نیہاں اپنی زنک کی پلیٹوں سے نیوز پرنٹ شیٹ کی مدد سے سیاہی وائپ کر رہی تھیں۔ اُما لیتھو گرافک پریس کے پاس کھڑی چلا رہی تھی۔

"پلیز کوئی تو میری مدد کرے۔ میں اکیلی کیسے کروں یہ سب۔"

"بس ایک منٹ ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں ذرا کیسٹ پلیئر میں کوئی ڈھنگ کا گانا لگا دوں پھر تمہاری مدد کرتی ہوں۔" نیہاں اپنی پلیٹ وہیں رکھ کر کیسٹ پلیئر میں نئی کیسٹ لگانے لگی۔

Tears for Fear کے بریک اِٹ ڈاؤن اَگین کی آواز پورے اسٹوڈیو میں پھیل گئی۔

"کچھ خوف کرو نیہاں۔ بند کرو یہ گانا۔ ابھی تو میں نے اور ایڈی نے محبت کا بھی ٹھیک سے ذائقہ نہیں دیکھا اور تم نے بریک اِٹ ڈاؤن اَگین لگا دیا ہے۔ بہت برا شگون ہے یہ۔ کوئی اور گانا لگاؤ۔" اُما نے ہنستے ہوئے کہا۔

ماہ بانو اور نیہاں بھی ہنس پڑیں۔ ایڈی جو اُما کی بے خبری میں اس کے عین پیچھے پہنچ چکا تھا اس کے کان میں بولا۔

"یہ نہیں تو پھر آئی کینٹ ہیلپ' فالنگ ان لو وِد یو لگا دیتے ہیں۔"

اُما اچھل ہی پڑی۔ "تم؟ تم کب نازل ہوئے؟ میری جان نکال دی تھی ابھی تم نے۔"

اس نے اُما کی بات نظر انداز کر دی اور آگے بڑھ کر یو بی فورٹی کا can't help falling in love with you لگا دیا۔

"تم اپنا کام کرتی رہو نیہاں۔ اُما کی مدد میں کروا دیتا ہوں۔" ایڈی نے کہا اور اُما کے پاس چلا گیا۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے لیتھوگرافک پریس کے پاس کھڑے کام بھی کرتے جارہے تھے۔ ایڈی پلیٹ میں اسفنج سے پانی لگاتا جارہا تھا اور اُما رول سے انک رول کرتی جارہی تھی۔

عبداللہ' ماہ بانو کے برابر ہی ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ماہ بانو اسے نظرانداز کیے کام میں مصروف رہی۔

"ایگزیبیشن کی تیاری کہاں تک پہنچی؟" بالآخر عبداللہ نے اس سے پوچھا۔

"کررہے ہیں۔ زیادہ کام تو اباجی کو ہی کرنا پڑ رہا ہے۔" وہ بولی۔

"اب تو چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ تم ان کی مدد کرواسکتی ہو۔"

"چھٹیوں میں مجھے گاؤں جانا ہے۔" اس نے کہا۔

"نمائش سے پہلے ہی جاؤ گی یا بعد میں؟"

"پہلے۔ میں ساری چھٹیاں وہاں نہیں گزارنا چاہتی۔ گزار سکتی بھی نہیں ہوں۔"

"میں نے تمہارے لیے آواری اور پرل کانٹی نینٹل میں بھی بکنگ کروادی ہے۔ وہاں بھی نمائش کے لیے تیار رہنا۔" عبداللہ نے کہا۔

"کیا؟" ماہ بانو نے پلیٹ سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "لیکن کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب؟ بکنگ اس لیے کروائی ہے تاکہ وہاں سرامکس کی نمائش کی جاسکے۔" وہ بولا۔

"لیکن وہاں بکنگ بہت مہنگی ہے۔"

"تو؟"

"تو عبداللہ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میرا ہاتھ تمہارے سامنے پھیلا ہوا ہے۔" اس کے انداز میں تلخی تھی۔

"میرا دل چاہ رہا ہے بانو کہ اسی پلیٹ سے تمہارا سر پھاڑ دوں۔" وہ بولا۔

"نہ نہ۔ پلیز یہ غضب مت کرنا۔ بہت مشکل سے پلیٹ اینچ کی ہے۔" نیہاں نے جلدی سے کہا۔

"تم مجھے بکنگ کے پیسے واپس کر دینا۔ مجھے یقین ہے کہ سب سرامک پیسز (Pieces) بک جائیں گے۔" عبداللہ نے کہا۔

"اور انہیں خریدنے والے بھی تم ہی ہو گے۔ مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔" ماہ بانو کے انداز میں ابھی تک تلخی برقرار تھی۔

"تمہاری شکل ہی ایسی ہے کہ تم پر ترس کھانے کو دل چاہتا ہے۔"

ماہ بانو نے پلیٹ وہیں میز پر پٹخ دی۔ "پلیز عبداللہ میرا پیچھا چھوڑ سکتے ہو؟"

"نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "اور بانو مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ چلو کمرز چلتے ہیں۔"

"میرا کام بہت رہتا ہے۔" اس نے پلیٹ اٹھالی۔

"میں تمہیں ہاتھ سے پکڑ کر لے جاؤں گا۔"

"چلی جائے گی۔" نیہاں نے عبداللہ سے کہا پھر بانو سے مخاطب ہوئی۔ "تمہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر عبداللہ سے مخاطب ہوئی۔ "دیکھو عبداللہ! بانو تم سے بہت محبت کرتی ہے لیکن درمیان میں جو تمہاری کزن ہے ناں ریشماں اس کی وجہ سے تمہیں نظر انداز کرتی ہے۔ حالانکہ میں نے اور اُما نے اسے سمجھایا بھی ہے لیکن یہ سمجھ نہیں رہی۔"

ماہ بانو نے پہلے حیرت اور بے یقینی سے نیہاں کی طرف دیکھا پھر گھبرا کر گردوپیش کا جائزہ لیا کہ کسی نے ان کی گفتگو سنی تو نہیں ہے لیکن وہاں سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ کسی نے ان کی باتیں نہیں سنی تھیں۔

"اب چلو بھی۔ عبداللہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" نیہاں نے اسے گھورا۔

"میں یہاں کوئی سین نہیں تخلیق کرنا چاہتی لیکن تم سے میں بعد میں پوچھوں گی نیہاں!" ماہ بانو نے دانت پیسے۔

عبداللہ کے ساتھ میوزیم کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بہت الجھی ہوئی تھی۔

"میری دھونس کا غصہ ختم نہیں ہوا؟" عبداللہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے تم پر نہیں اپنے آپ پر غصہ ہے۔" وہ کرسی چھاؤں میں کھسکا کر بیٹھ گئی۔

"آئی ایم سوری۔ میں اس قسم کا رویہ اختیار نہیں کرتا۔ بس تمہیں تھوڑا سا تنگ کرنا تھا۔ کوئی تو ایسا شخص ہو جس پر دھونس جمائی جاسکتی ہو۔"

"اچھا تم نے بات کیا کرنی تھی؟" ماہ بانو نے کہا۔

"تم سے پوچھنا تھا کہ آج کل آلو اور پیاز کس طرح کلو مل رہے ہیں؟" اس نے جیب سے مالبرو کی ڈبیا نکال کر ایک سگریٹ سلگا لیا۔

ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ جاننے کے لیے تو تمہیں اماں جی سے رجوع کرنا پڑے گا۔"

"تمہارا موڈ ٹھیک کرتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ کیا لوگی۔ وہی چپس اور پیپسی؟"

"تمہارا کیا خیال ہے میرا موڈ چپس اور پیپسی سے ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ بولی۔

"تو پھر کس چیز سے ٹھیک ہوگا؟"

"میں تم سے تفصیل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ تم میری بات سن لو اور سمجھ لو تو میرا موڈ خود

بخود ٹھیک ہو جائے گا۔''

''یعنی تم چاہتی ہو کہ میں بھی تمہاری حماقت میں شریک ہو جاؤں؟''

''تم بھی تو یہی چاہتے ہو کہ میں تمہاری حماقت میں شریک ہو جاؤں۔''

''وہ تو تم ہو چکیں۔ جو بات تمہیں مجھ سے کہنی چاہیے وہ تم اُما اور نیہاں سے کہتی ہو۔'' عبداللہ نے کہا۔

''تم میری بات سنتے کب ہو؟''

''سنتا ہوں۔ وہ بات بھی سن لیتا ہوں جو تم نہیں کہتیں۔ لیکن باتیں بعد میں' پہلے تمہارا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک ٹھنڈی سی پیپسی منگوا لوں۔'' عبداللہ نے کہا اور اپنے لیے چائے اور ماہ بانو کے لیے پیپسی کا آرڈر دے کر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مجھے ریشماں نے خط لکھا تھا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''اچھا؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بڑی حویلی میں عورتوں کے خط لکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔'' اس نے سگریٹ کا بقیہ حصہ زمین پر پھینک کر جوتے تلے رگڑ دیا۔

''پابندی تو ہے۔ اس نے چھپ کر لکھا تھا اور نانا جی کے ہاتھ پوسٹ کرایا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے لیکن میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ اس نے نانا جی کی کتنی منتیں کی ہوں گی۔ وہ بہت سخت اپ سیٹ ہے۔'' ماہ بانو نے بیگ سے اس کا خط نکال کر عبداللہ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ پڑھ لو۔''

''ریشماں کا خط؟'' اس نے ہاتھ آگے بڑھائے بغیر پوچھا۔

''ہاں!''

''نہیں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔'' عبداللہ نے بانکے کے ہاتھ سے چائے کی پیالی اور پیپسی کی بوتل لے لی۔

''پلیز عبداللہ! پڑھ لو۔''

''کیوں پڑھوں؟ نہ میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں اور نہ ہی یہ خط میرے نام ہے۔ بانو! تم سے بھی کہہ رہا ہوں میں۔ اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں دوسروں کا اتنا ہی خیال رکھا کرو جس سے تمہیں تکلیف نہ پہنچے اور تم اپنی خوشیاں نہ کھو بیٹھو۔''

''اس نے تمہارے متعلق بھی پوچھا ہے۔ بتاؤ کیا جواب دوں اسے۔'' اس نے پیپسی کی بوتل سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کوئی بات تم سے چھپا کر نہیں رکھی۔ اس نے یقیناً کوئی ایسی بات نہیں پوچھی ہوگی جس کا جواب تمہارے پاس نہ ہو۔''

''جواب تو ہے میرے پاس۔ بہت کوشش بھی کی اسے لکھنے کی لیکن ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکی۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''تم خواہ مخواہ خود کو اذیت میں مبتلا کر رہی ہو۔ میری محبت منڈی میں پڑے آلو پیاز یا تمہارے بنائے ہوئے سرامک پیسز (Pieces) نہیں ہیں کہ تم کسی کو بھی اپنی مرضی سے پکڑا دو۔'' اس نے چائے کا چھوٹا سا گھونٹ لیا اور پھر بولا۔ ''اپنی احمقانہ باتوں میں تم نے میری چائے بھی ٹھنڈی کروا دی ہے۔''

''تمہیں پتا ہے عبداللہ کہ مجھے زہرا پر حملے کی خبر کیسے ہوئی تھی؟''

''یہ بات بھی تمہیں یقیناً ریشماں نے بتائی ہوگی اور تم چاہتی ہو کہ میں اس بات پر اس کا شکرگزار رہوں۔ ٹھیک ہے میرا شکریہ اس تک پہنچا دینا۔''

''تمہیں اندازہ ہے کہ ایسا کر کے' تمہیں بچا کر اس نے اپنا بھائی کھو دیا ہے۔''

''میں نے کہا تھا اسے ایسا کرنے کے لیے؟ اس کے کسی عمل کی ذمہ داری میرے اوپر عائد نہیں ہوتی۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ صورتِ حال پیدا ہو سکتی تھی۔'' عبداللہ نے ماتھے پر بل ڈال کر قدرے تیز لہجے میں کہا۔

''اسے تم نے نہیں کہا تھا یہ کرنے کے لیے' میں مانتی ہوں۔ یہ جو کچھ کیا' اس نے تمہاری محبت میں کیا۔''

''تو میں کیا کروں؟ کیا میں نے کبھی اسے یہ باور کروایا ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ کبھی اس سے کوئی کمٹمنٹ کی ہے؟ کوئی وعدہ؟ کبھی نہیں۔ اپنی یک طرفہ محبت میں وہ کیا کرتی ہے اور کیا نہیں' اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' عبداللہ کو غصہ آ گیا۔

''ٹھیک ہے سارا غصہ تم میرے اوپر ہی نکال دو۔ اور کوئی نہیں ملتا اس کام کے لیے نہیں!''

عبداللہ ہنس پڑا۔ ''غصہ تمہیں ہی برداشت کرنا پڑے گا۔ ایک تو چائے ٹھنڈی کروا دی اور پھر یہ فضول باتیں جو تم کر رہی ہو۔''

پیپسی پیتے ہوئے وہ کسی سوچ میں گم ہو گئی۔

''کہاں گم ہو؟''

عبداللہ کی آواز پر وہ چونک گئی۔

''سوچ رہی ہوں گاؤں جا کر ریشماں سے کیا کہوں گی۔''

''اوہ خدا۔ تم یہ ذکر ختم نہیں کر سکتیں؟'' اس نے تنگ آ کر کہا۔

''کیسے ختم کر دوں یہ ذکر۔ تمہیں تو یہ اندازہ بھی نہیں ہے کہ میں کتنی اَپ سیٹ ہوں۔''

''مجھے اندازہ ہے لیکن تم تو دونوں صورتوں میں اَپ سیٹ رہو گی۔ چاہے میں تمہاری طرف بڑھوں یا ریشماں کی طرف۔ ابھی جو صورت حال ہے' یہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی۔ لیکن جو تم اَپ سیٹ ہو' یہ وقتی سی بات ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاؤ گی۔ پر اگر اس وقت میں کسی

وجہ سے ریشماں کی طرف بڑھ گیا تو یہ صدمہ سہارنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ بتاؤ میں غلط
رہا ہوں کیا؟'' عبداللہ نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
''تم بہت خوش قسمت ہو عبداللہ۔ تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ میری تو یہ سمجھ
نہیں آ رہا کہ میں ریشماں کا کیسے سامنا کروں گی۔'' پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''یہ کہانی
پہلے شروع ہوئی تھی۔ میری اور تمہاری پیدائش سے بھی بہت پہلے۔ اور ہماری بدقسمتی کہ کی
خواہش کے بغیر ہم اس کہانی میں شامل ہو گئے ہیں۔ میرے ذہن پر بہت بوجھ ہے۔ عبداللہ
بوجھ بانٹو گے نہیں؟''

وہ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میں ہر وہ بوجھ بانٹ سکتا ہوں
جو آج ہماری زندگی میں ہماری وجہ سے موجود ہے لیکن وہ بوجھ میں نہیں اٹھا سکتا جو ہم دونوں
سے کسی کا نہیں ہے۔ پلیز بانو' میں بار بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ جو گزر چکا ہے' وہ ہماری زندگی
حصہ نہیں ہے۔ جو کہانی تم نے سنی' دیکھی یا جانی' وہ ہم دونوں کی نہیں ہے۔ بھول جاؤ اسے ا
اور میرے حوالے سے سوچو۔ تمہاری بیکار کی ضد کی وجہ سے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔''

ماہ بانو سر جھکائے سنتی رہی۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہارے انکار کے بعد میں ریشماں کو اپنا لوں گا؟ نہیں۔ اگر تم ضد
سکتی ہو تو میری بھی یہ ضد ہے کہ تمہارے بعد بھی ریشماں مجھے نہیں پا سکے گی۔ وہ میری زندگی
نہ آج آ سکتی ہے نہ کل۔ ہم تینوں کو بیک وقت خوشیاں نہیں مل سکتیں۔ خوشی یا تو ہم دونوں کو ملے
ہے یا پھر کسی کو بھی نہیں۔''

ماہ بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں چلتی ہوں۔ ابھی بہت کام رہتا ہے میرا۔''

☆=====☆=====☆

ریشماں کے پاس کافی دیر بیٹھنے کے بعد زینی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں چلتی ہوں اب۔ ا
دل مضبوط کر کے جانا ہوگا۔ پتا ہے کیا بھابی۔ آپ ایسا کریں کہ بابا جان کو ایک مرتبہ پھر فون
دیں۔ کہیں وہ بھول ہی نہ گئے ہوں کہ وہ مجھے نہیں ڈانٹیں گے۔''

''انہوں نے ایک مرتبہ مجھ سے وعدہ کر لیا ہے تو وہ تمہیں بالکل نہیں ڈانٹیں گے۔''

''آپ کو کیسے پتا؟''

''ایسے کہ میرے بابا جان بھی مجھ سے جو وعدہ کرتے ہیں' وہ ضرور پورا کرتے ہیں۔''
ریشماں بولی۔

''میں نے سنا ہے بھابی کہ آپ کے بابا جان کی دعاؤں میں بہت اثر ہے۔ کیا یہ
ہے؟'' زینی نے پوچھا۔

''تم کن باتوں میں پڑ گئی ہو۔ تمہارے بابا جان کی دعا میں بھی اتنا ہی اثر ہوگا۔ اب وا

کی فکر کرو۔'' سبط نے کہا۔

''تمہیں کیوں جلدی ہے سبط؟'' ریشماں نے اسے گھورا پھر زینی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہاں زینی! بابا جان کی دعاؤں میں بہت اثر ہے۔ تم نے کوئی دعا کروانی ہے؟''

''اوہ یس!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں نے ان سے یہ دعا کروانی ہے کہ جسے میں دنیا میں
سب سے زیادہ چاہتی ہوں وہ مجھے مل جائے۔''

''جسے تم چاہتی ہو اور جو تمہیں چاہتا ہے' وہ تمہیں ضرور مل جائے گا۔ میری طرف سے مکمل
گارنٹی ہے۔ کہو تو یہ دعا بابا جان کی جگہ' میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ لیکن پلیز اب واپس چلو۔'' سبط
نے اس کی چادر اس کی طرف پھینکی۔

''دیکھیں بھابی کس طرح مجھے حویلی سے نکال رہا ہے۔'' زینی نے چادر اوڑھی۔

''یہ تمہیں کیسے نکال سکتا ہے۔'' ریشماں ہنسی۔

''سبط میں تمہارے ساتھ باہر نکلوں گی تو لوگ مشکوک تو نہیں ہو جائیں گے؟''

''ہوتے رہیں۔ تمہیں لوگوں کی فکر کب سے ہو گئی ہے؟'' وہ بولا۔

''اچھا بھابی۔ میں جاؤں اب۔'' وہ ریشماں کے گلے لگ گئی۔ ''خدا حافظ۔ اور ہاں بابا
جان کو یاد دہانی کروانا مت بھولنا۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ڈانٹیں گے نہیں۔''

''اچھا۔'' ریشماں ہنسی۔

''تم اپنا فون تو یہاں چھوڑتے جاؤ۔'' اس نے سبط کے ہاتھ سے فون لے کر ریشماں کو
تھمایا۔ ''پلیز بھابی بھولنا مت۔''

سبط کے قدموں سے قدم ملا کر چلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ بہت سی نگاہیں ان کی
طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جونہی ایک دالان عبور کر کے وہ دوسرے دالان میں داخل ہوئے' سامنے
سے آتا ہوا اکرم یکدم چونک کر رک گیا۔

''سبط تمہارا بھائی ہے یہ؟'' زینی نے ساتھ چلتے سبط حسن سے سرگوشی میں پوچھا۔

''خاموشی سے چلتی جاؤ۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''ایک منٹ' مجھے اچھی طرح دیکھ تو لینے دو۔ ویسے ایک بات ہے۔ تم سے زیادہ ہینڈسم
ہے۔'' زینی نے تبصرہ کیا۔

وہ اس کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اکرم بول اٹھا۔ ''کہیں جا رہے ہو سبط؟''

بات اس نے سبط حسن سے کی تھی لیکن اس کی نگاہیں زینی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ بھی
تنقیدی نگاہوں سے اکرم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''جی۔'' سبط نے مختصراً کہا۔

''کب تک واپس آؤ گے؟'' اکرم نے پوچھا۔

''شاید گھنٹہ بھر لگ جائے۔ شاید اس سے پہلے ہی آ جاؤں۔''

''واپسی پر مجھ سے ملنا۔'' مکرم نے کہا۔

''جی بہتر۔''

وہ دونوں آگے چل پڑے۔

''ڈانٹ تو نہیں پڑے گی تمہیں؟ انہوں نے کیوں ملنے کے لیے کہا ہے؟'' زینی نے پوچھا۔

''تمہارے سر پر ڈانٹ کیوں اتنی سوار ہے؟''

''ڈانٹ سوار نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ اچھا چھوڑو اسے' یہ بتاؤ' یہ تمہارے بھائی ہیں؟''

''ہاں۔''

''تعارف ہی کروا دیا ہوتا۔ اُف بہت ہینڈسم ہیں۔ نام کیا ہے ان کا؟'' زینی نے تبصرہ اور سوال اکٹھے کیے۔

''تعارف کروا دیتا تو تم میرے ساتھ اتنی آسانی سے چلتی نہ جا رہی ہوتیں۔ یہاں دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کی لاش پڑی ہوتی۔''

''اللہ نہ کرے۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''اینی وے' ان کا نام مکرم ہے۔ امداد بھائی سے چھوٹے اور مجھ سے بڑے ہیں۔'' سبط نے اپنی جیپ کا دروازہ زینی کے لیے کھولا۔

اپنے گاؤں کی طرف واپس جاتے ہوئے زینی خاموش تھی۔

''کیا ہوا؟ زبان وہیں بھول آئی ہو؟'' سبط نے کہا۔

''نہیں۔ سوچ رہی ہوں کہ شاید اچھا ہی ہے کہ ہمارا صرف ایک بھائی ہے۔ دیکھو نا! میرے اور تمہارے بابا جان اور پھر سخاوت بابا تین بھائی ہیں اور ان کے درمیان آپس میں اختلاف ہی نہیں۔ خون کے جھگڑے اور دشمنیاں ہیں۔ پھر تم چھ' سوری پانچ بھائی ہو۔ میری ماں سے تم بھائیوں کے بیچ بھی دشمنیاں ہوگئی ہیں اور آگے نہ جانے یہ کیا صورت اختیار کریں۔ میرے زیادہ بھائی ہوتے تو شاید وہ بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔ کیا فائدہ ہوتا اس طرح کے رشتوں کا؟''

''اپنے چھوٹے سے دماغ کو اتنی مشکل باتوں میں مت الجھاؤ۔ اپنی سائیڈ میں نے سنبھالنی ہے اور تمہاری سائیڈ عبداللہ بھائی سنبھالیں گے۔ اس لیے تم دونوں طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ تم یہ بتاؤ کہ گاؤں آنا کیسا لگا؟'' سبط نے گاڑی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ڈال دی۔

''تھوڑا سا اچھا' تھوڑا سا برا۔ ایک تو یہاں تم سے ملنے کو ترس گئی ہوں۔ باتیں بھی احتیاط سے کرنی پڑتی ہیں کہ کہیں درمیان میں تمہارا نام نہ آ جائے۔ اب تو میں نے فالتو بات کرنی چھوڑ دی ہے۔ کیونکہ تمہارے ذکر کے بغیر میری کوئی بات مکمل ہی نہیں ہوتی۔''

''اس لیے گاؤں برا لگ رہا ہے؟'' وہ آہستہ سے ہنس پڑا۔

''صرف اس لیے بھی نہیں۔ یہاں تو سختی ہی اتنی زیادہ ہے کہ کبھی مس جارج نے بھی ہم پر نہیں کی ہوگی۔ یہ کرنا ہے اور وہ نہیں کرنا۔ سمجھتے ہی سارا دن گزر جاتا ہے۔ حویلی سے فالتو باہر نہیں نکلنا اور نکلنا ہو تو اماں اور بابا جان کی اجازت لے کر نکلنا ہے جو کبھی ملتی ہی نہیں۔ کسی چیز میں لطف نہیں آتا۔ شاپنگ تک ہم خود نہیں کرتے۔ لسٹ بنا کر اماں جان کو تھما دی اور تھوڑی دیر میں سب چیزیں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟ رنگینی ہی نہیں ہے کوئی؟''

''اچھا تو یہ شکوے ہیں تمہیں؟''

''صرف یہی کہاں ہیں۔ پتا ہے ہم بغیر گن مین کے باہر بھی نہیں نکل سکتے۔ یہ دیکھو کتنے اچھے لگ رہے ہیں کھیت۔ یہاں تک تو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ گاڑی میں باہر نکلتے ہیں تو اتنے بڑے بڑے پردے لٹکے ہوتے ہیں۔ ایک دن میں نے کونے سے پردہ ہٹا کر باہر دیکھنا چاہا تو اماں جان نے منع کر دیا۔ بالکل تھوڑا سا پردہ اٹھایا تھا کونے سے پھر بھی اماں نے فوراً ہی منع کر دیا۔''

''چچ چچ۔'' وہ ہنسا۔ ''یہ تو بہت بری صورتِ حال ہے۔ پھر آج اتنی بڑی سی چادر اوڑھ کر خاصی پریشانی ہوئی ہوگی تمہیں۔''

''اس میں اتنی پریشانی نہیں ہوئی۔ کم از کم ارد گرد نظارہ تو کیا جا سکتا ہے ناں۔ اور چادر نہیں لیکن دوپٹا لینے کی بچپن سے مس جارج نے عادت ڈلوائی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ اذان کے وقت اور اسلامیات پڑھتے وقت ہم دوپٹا ضرور سر پر رکھیں۔ اگر ہم بھول جاتے تو بہت ڈانٹ پڑتی تھی ان سے۔ مجھے تو ہمیشہ بھول جاتا تھا کہ میرا دوپٹا کہاں ہے۔ کبھی الماری میں ڈھونڈتی تھی اور کبھی تکیے کے نیچے۔'' اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

گاڑی اسی وقت حویلی میں داخل ہوئی۔ بابا جان باہر ہی منتظر تھے۔ انہیں دیکھ کر زینی کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز تم آگے چلنا۔'' اس نے سبط حسن کی طرف دیکھا۔

''تاکہ سارا نزلہ میرے اوپر گرے۔ بہت اچھے۔'' وہ ہنسا۔

وہ نیچے اتر کر بابا جان کی طرف بڑھے۔ سبط آگے تھا اور زینی اس کے پیچھے۔

''السلام علیکم۔'' اس نے کہا۔

''جیتے رہو۔'' وہ بولے۔

''میں زینی کو لایا تھا۔ اس سے جو کچھ ہوا اس کے نتائج کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اب یہ ایسا نہیں کرے گی۔'' سبط نے ان سے کہا پھر آہستگی سے زینی کو مخاطب ہوا۔ ''سوری کرو ناں۔''

''ہاں' سوری بابا جان۔'' وہ بوکھلا گئی۔

''زینی آپ اندر جائیں۔'' بابا جان نے اس سے کہا۔

اس نے ایک نظر سبط کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر اندر چلی گئی۔

''تھینک یو کہ آپ زینی کو حفاظت سے یہاں تک لائے۔'' اس کے جانے کے بعد بابا جان نے کہا۔ ''اسے واقعی نتائج کا اندازہ نہیں تھا لیکن آپ کو ضرور ہوگا۔ مری میں آپ دو دوست تھے اور آپ دونوں ہی کو معلوم نہیں تھا کہ دونوں کا تعلق کس خاندان سے ہے۔ ہمارے گھرانوں کے درمیان اب کوئی اور رشتہ باقی نہیں ہے سوائے دشمنی کے رشتے کے۔ میں اولاد کو کسی آگ میں نہیں جھونکنا چاہتا اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی نہیں چاہیں گے کہ زینی کو نقصان پہنچے۔ میرے تھوڑے کہے کو بہت سمجھیں۔ مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں آپ کو سمجھا رہا ہوں' وہ آپ سمجھ چکے ہیں۔''

''ہوں۔'' سبط نے کہا۔ ''جو آپ نے کہا ہے' وہ بھی میں نے جان اور سمجھ لیا ہے اور جو نہیں کہا وہ بھی۔ میں آپ کو بابا جان کہہ سکتا ہوں؟''

''ضرور۔'' وہ بولے۔

''بات یہ ہے بابا جان کہ کچھ نہ کہہ کر بہت کچھ کہہ جانے کا سلیقہ مجھے نہیں آتا۔ شاید آپ کی عمر تک پہنچ کر میں بھی سیکھ جاؤں۔ شاید تب بھی نہ سیکھ پاؤں۔ میں جب اپنے بابا جان سے بات کرتا ہوں تب بھی بعض اوقات ایسی باتیں کہہ دیتا ہوں یا شاید ایسے انداز میں کہہ دیتا ہوں جو انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ شاید آپ کو بھی میری باتیں اچھی نہ لگیں۔

کیا آپ کو یقین ہے بابا جان کہ جو آگ آپ بھائیوں کے درمیان بھڑک رہی ہے وہ صرف آپ بھائیوں تک ہی محدود رہے گی۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ آگ اولاد تک نہ پہنچے لیکن وہ ہم سب تک پہنچ بھی چکی ہے۔ آپ بھائیوں کی غلطیوں کا خمیازہ ہم سب بھگت رہے ہیں۔ آپ مانیں نہ کریں لیکن میں یہ کہوں گا کہ ان غلطیوں میں بابا جان کے ساتھ ساتھ آپ بھی برابر کے شریک ہیں۔ میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ صرف زینی اور گڑیا کی پڑھائی اس فساد کی وجہ بنی۔ اصل بات کچھ اور ہے جس کا ہمیں علم نہیں ہے۔

میں نہیں جانتا کہ وہ کون سے حالات تھے جن کے تحت آپ لوگوں نے بچپن میں اولاد کے رشتے طے کر دیئے۔ زینی اور گڑیا کا رشتہ خادم اور امداد بھائی سے طے ہوا اور اس میں آپ کی مرضی شامل نہیں تھی۔ تب بھی ریشماں آپی اور عبداللہ بھائی کا رشتہ آپ کی مرضی اور رضا سے طے ہوا تھا۔ آج جو آگ ہم تک پہنچی ہے اس کی وجہ انہی رشتوں کا طے ہو جانا ہے ورنہ بہت ممکن ہے کہ حالات اس حد تک نہ بگڑتے۔

بابا جان اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ آگ آپ کی اولاد تک نہ پہنچے تو اسے بجھانا ضروری ہے۔

لیکن آپ کا اور میرے بابا جان کا مسئلہ ہی یہی ہے کہ آپ دونوں اس آگ کو بجھانا نہیں چاہتے۔ صرف چند لوگوں کو اس سے بچا کر دور لے جانا چاہتے ہیں۔ باقی سب چاہے اس آگ میں جل جائیں۔ آپ دونوں کو اس کی پروا نہیں ہے۔''

''آپ اپنی بات کر چکے؟'' بابا جان نے پوچھا۔

''کہنے کو تو بہت کچھ ہے۔ کہنا چاہتا بھی ہوں لیکن آپ سننا پسند نہیں کریں گے۔''

''اب آپ جا سکتے ہیں۔ زینی کو بحفاظت واپس لانے کا شکریہ۔''

سبط نے گہرا سانس لیا اور واپس مڑ گیا۔

☆=====☆=====☆

حویلی پہنچ کر سبط کا سامنا ایک مرتبہ پھر مکرم سے ہو گیا۔

''کب آئے؟'' مکرم نے اس سے پوچھا۔

''ابھی ابھی آیا ہوں اور آپ کے پاس ہی آ رہا تھا۔'' سبط نے انگلی میں کی چین گھماتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' کہہ کر مکرم گول کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت کمرے میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''جی؟'' سبط نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پہلے تمہیں کسی اور وجہ سے بلایا تھا اب وجہ مختلف ہو گئی ہے۔'' مکرم نے کہا۔

''آپ کھل کر بات کریں۔ میں سن رہا ہوں۔''

''پہلے تمہارے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر تعجب ہوا تھا۔ وجہ تم جانتے ہو' یہ نہیں تھی کہ تمہارے ساتھ کوئی لڑکی کیوں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ تمہارے ساتھ کوئی لڑکی تھی بھی تو یہاں کیوں تھی۔ کسی بھی لڑکی کے ساتھ کے لیے یہ حویلی غیر مناسب جگہ ہے۔''

''وہ کوئی لڑکی نہیں تھی۔'' سبط نے مکرم کی بات کاٹی۔

''مجھے معلوم ہو گیا ہے۔'' مکرم نے کہا۔ ''اور ابھی یہ بات میں نے بابا جان کو نہیں بتائی۔ وہ گاؤں کی کوئی عام کمی کمین لڑکی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ تم اسے چھوڑنے حیدر علی شاہ کی حویلی گئے تھے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ وہ زہرا تھی یا زینب؟''

چند لمحے سبط اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میں آپ کے سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔''

''تم اپنے لیے مصیبت کو دعوت دے رہے ہو۔'' مکرم کے انداز میں دھمکی تھی۔

''میں آپ کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے والا نہیں ہوں اور آپ کے سوالوں کا جواب دینے کا پابند بھی نہیں ہوں۔''

"چاہوں تو تم سے اپنے ہر سوال کا جواب حاصل کر سکتا ہوں لیکن صرف اس وجہ سے نہیں کر رہا کہ بات بہت دور تک نکل جائے گی۔ ٹھیک ہے تم مجھے کسی بات کا جواب مت دو ایسی صورت میں مَیں مجبور ہوں گا کہ یہ بات بابا جان تک پہنچا دوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے کندھے اچکائے اور وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆=====☆=====☆

پہلی فلم سائن کرتے ہی نوری ہر اخبار، ہر رسالے کے ٹائٹل پر دکھائی دینے لگی۔ شوبز سے منسلک صحافی اس کے انٹرویو لینے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ جنت بائی نے اس سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دکھایا تھا۔ فیصل ٹاؤن میں واقع اس کی کوٹھی پر مہربانوں اور فن کے قدر دانوں کی بھیڑ جمع رہتی تھی، جن کے ساتھ نوری پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ملتی تھی۔

لیکن وہ شخص اب تک نہیں آیا تھا جس کا جنت بائی کو انتظار تھا۔ تاہم انہیں یقین تھا وہ آئے گا ضرور۔ یہ ساری محنت جو انہوں نے برسوں تک کی تھی۔ یونہی ضائع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ تحمل سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب وقت کے پہیے پر اپنی گرفت مضبوط کر کے وہ اپنی مرضی سے اپنے حق میں موڑ سکیں اور برسوں پہلے جس آگ نے ان کی روح کو جلایا تھا، اُسی سے اس شخص اور اس کے تمام تر خاندان کو جلا کر خاکستر کر دیں۔

☆=====☆=====☆

بہت دن ہو گئے تھے، ماہ بانو نے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ ریشماں ایک ایک دن گزار رہی تھی۔ جب مزید صبر نہ ہو سکا تو اس نے ایک مرتبہ پھر کاغذ قلم سنبھال لیا۔

پیاری بہن بانو

ڈھیروں پیار

تمہارے خط کا بہت انتظار کیا کیونکہ کرنے کے لیے میرے پاس انتظار کے سوا کچھ ہے بھی نہیں۔ اب اتنے دن گزر گئے لیکن تمہارا کوئی خط نہیں آیا تو سوچا کہ میں ہی تمہیں لکھ لوں۔ تمہاری طرف سے بہت سے عذر بھی خود ہی تراش لیے۔ شاید تمہارا خط ڈاک میں گم ہو گیا ہو۔ شاید تمہاری مصروفیت نے تمہیں مہلت نہ دی ہو۔ آخر تم میری طرح بیکار تو نہیں۔ اور بھی نہ جانے کیا کیا۔

خیر جانے دو۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔ تمہاری گرمیوں کی چھٹیوں کا تاکہ تم آؤ اور ہم ڈھیر ساری باتیں کریں۔ تم کہتی جاؤ اور میں سنتی جاؤں۔ میرے پاس بھی کچھ باتیں جمع ہو گئی ہیں تمہیں سنانے کے لیے۔ یوں تو اندر بہت غبار ہی جمع ہو گیا ہے لیکن تمہارے علاوہ کوئی ہے بھی نہیں جس سے کہہ سکوں۔

ایک دلچسپ بات بتاتی ہوں۔ ان کی بہن ہے ناں زینب۔ ایک دن بالکل

غیر متوقع طور پر ہماری حویلی میں چلی آئی۔ ہے ناں حیران کن بات۔ پہلے تو مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ وہ اصل میں کون ہے۔ جب اس نے بتایا تو میری تو جان ہی نکل گئی۔ تم اندازہ کر سکتی ہو کہ یہ اس کی حماقت کی انتہا تھی کہ وہ یہاں کس طرح چلی آئی۔ ویسے ایک بات ہے زینی ہے بہت اچھی۔ مجھے بالکل تمہاری طرح لگی۔ بہت فرینک بھی ہے۔ صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے اس نے جوتے ہوا میں اچھال دیئے۔ ایک اگر شمال میں گرا تو دوسرے نے جنوب کی راہ لی۔ میں تو اسے بس دیکھتی ہی رہ گئی۔

اور پتا ہے، اس نے ان کے متعلق بھی بہت سی باتیں بتائیں مجھے۔ ان کی دو تصویریں بھی دیں۔ یقین کرو کہ میں نے اپنے خوابوں کا ایسا ہی پیکر تراشا تھا۔ ان کی تصویریں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں کس قدر خوش قسمت ہوں جس کی زندگی کی ڈور ان کے ساتھ بندھی ہے۔

لیکن سب سے حیران کن بات تو میں نے ابھی تمہیں بتائی ہی نہیں ہے۔ زینی اور سبط حسن ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ جب مجھے اس بات کی خبر ہوئی تو میں اپنے محسوسات سمجھے، سے بھی قاصر تھی۔ میرے ذہن میں مسلسل امداد بھائی کا خیال آ رہا تھا۔ زینی چلی گئی تب بھی کتنی دیر تک میں یہ سوچتی رہی کہ یہ بات اچھی ہے یا بری؟ امداد بھائی یا سبط؟ یہ بات میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی کہ امداد بھائی کی منگیتر کسی اور کے ساتھ اظہارِ محبت کرے لیکن وہ کوئی اور بھی تو نہیں۔ میرا ہی دوسرا بھائی ہے جسے وہ پسند کرتی ہے۔ بہت سوچنے کے بعد میں بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ برا نہیں اچھا ہے۔ زینی ہمارے گھر کی عزت ہے، اسی گھر میں رہے گی لیکن کیا بابا جان اس بات پر راضی ہو جائیں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اور سب سے دلچسپ بات سنو۔ زینی مستقل مجھے بھابی کہتی رہی۔ مجھے اتنا اچھا لگا کہ کیا بتاؤں۔ کتنا خوبصورت رشتہ ہے یہ اور کتنا خوبصورت لفظ۔ مجھے اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا، جب زینی کے منہ سے اپنے لیے یہ لفظ سنا۔

اگر فرصت ہو تو مجھے خط ضرور لکھنا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کس شدت سے تمہارا اور تمہارے خط کا انتظار کرتی ہوں۔ اب باقی باتیں اگلی دفعہ۔

خدا حافظ!

تمہارے خط کی شدت سے منتظر

تمہاری بہن

ریشماں

ابھی اس نے بمشکل خط لکھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے گھبرا کر خط صوفہ کے کشن کے نیچے رکھ دیا۔

''ہاں آجاؤ۔'' وہ بوکھلا کر بولی۔

آنے والا سبط حسن تھا۔

''میں بہت بور ہو رہا تھا' اس لیے آپ کے پاس چلا آیا۔ آپ کو تنگ تو نہیں کیا؟''

''بالکل نہیں۔ تمہارے آنے سے میں بھلا تنگ ہو سکتی ہوں۔'' ریشماں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں' زینی نے فون کیوں نہیں کیا۔ میں نے ٹرائی کیا ہے لیکن وہاں سے حیدر بابا اٹھاتے ہیں اور مجھے فون بند کرنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی وہ مجھ سے خاصے ناراض ہیں۔'' سبط دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گیا۔

''وہ تم سے ناراض کیوں ہیں؟ تم تو زینی کو حفاظت کے ساتھ خود وہاں پہنچا کر آئے تھے۔''

''ہمارے خاندان کے بزرگ چاہتے ہیں کہ جو کچھ وہ سوچتے ہیں' کرتے ہیں۔ ہم بھی سر جھکا کر' آنکھیں بند کر کے اسی پر چلتے جائیں۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا ناں۔ کم از کم مجھ سے کوئی ایسی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ میرے پاس یوں بھی اپنا دماغ ہے سوچنے کے لیے۔''

''تم حیدر بابا سے لڑ کر آئے ہو؟ کیا کہا تم نے انہیں؟'' ریشماں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''میں لڑا نہیں ہوں لیکن میں انہیں بھی نہیں سمجھ سکا۔ ایک لیول پر وہ اتنے روشن خیال ہیں اور دوسری طرف اچانک اتنے تنگ نظر ہو جاتے ہیں کہ ناقابلِ برداشت لگنے لگتے ہیں۔ ان سے اچھے تو عبداللہ بھائی ہیں۔ کم از کم ان میں بات سننے اور حقیقت کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہے۔''

''سبط کسی بزرگ کے متعلق اس طرح تو بات نہیں کرنی چاہیے۔''

''میں نے کیا غلط کیا ہے؟ حیدر بابا ایسے ہی ہیں جیسا میں نے کہا ہے۔ بہت اچھا شخص بہرحال عام انسان ہی ہوتا ہے۔ اس میں بھی خوبیوں کے ساتھ خامیاں ہوتی ہیں۔ اچھے برے شخص میں فرق ہی کتنا ہوتا ہے۔ صرف اتنا کہ اچھے میں اچھائیاں زیادہ ہوتی ہیں اور برے میں برائیاں۔ نسبت تناسب کی بات ہے ورنہ اچھائیاں اور برائیاں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔'' سبط نے کہا۔

''پھر بھی اس طرح تو نہیں کہتے۔''

''اچھا بابا غلطی ہو گئی۔'' وہ بدمزگی سے بولا۔ ''لیکن یہ بتائیں کہ میں زینی سے کیسے بات

کروں۔ بہت دل چاہ رہا ہے اس سے بات کرنے کا اور ہر مرتبہ وہ حیدر بابا۔'' سبط بات کرتے کرتے ایک لمحے کو رک گیا۔ ''آئی ایم سوری۔ میں کچھ غلط بات کہنے لگا تھا کہہ دیتا تو بہت جھاڑ پڑتی آپ سے۔''

''نمبر ملا کر فون مجھے دے دو۔ میں بات کرنا چاہوں تو شاید حیدر بابا اسے بلوا دیں۔ پھر تم بات کر لینا اس سے۔'' ریشماں نے ترکیب بتائی۔

سبط نے نمبر ڈائل کرنے کے بعد فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف سے حسب توقع فون بابا حیدر نے ہی اٹھایا۔

''میں ریشماں بول رہی ہوں بابا جان۔'' سلام کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''کیسی ہیں بیٹا آپ؟''

''ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟ چچی اماں کیسی ہیں؟''

''بالکل ٹھیک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔''

''میں اکیلی تھی۔ بہت بور ہو رہی تھی۔ میرا بہت دل چاہا کہ زینی سے باتیں کروں۔ آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں تھوڑی دیر اس سے باتیں کرلوں۔'' ریشماں نے کہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''میں ابھی آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔ آپ ہولڈ کریں۔''

ریشماں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ سبط آ کر اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

''تھینک یو آپی۔''

''پہلے میں بات کروں گی۔'' ریشماں نے کہا۔

''جلدی کرنا۔ ورنہ درمیان میں کہیں وہ یو پائے داسیلر والا جن نہ آجائے۔'' وہ بولا۔

''یو پائے داسیلر والا جن؟ وہ کیا ہوتا ہے؟''

''ایک تو آپ کو یو پائے داسیلر کا بھی نہیں پتا لیکن جن تو جن ہوتا ہے ناں اور ہمارے معاملے میں حیدر بابا یہ رول کر رہے ہیں۔''

''تم بہت بدتمیز ہو۔'' ریشماں کی ہنسی نکل گئی۔

اسی وقت دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے کی آواز آئی۔

''ہیلو بھابی!'' زینی کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔

''شکر ہے تمہاری آواز سنائی دی ہے۔''

''میں کیا کروں۔ یہاں بہت گڑبڑ ہے۔'' اس نے آواز مدہم کر کے کہا۔ ''لیکن بھابی سب سے پہلے یہ بتائیں کہ سبط کہاں ہے؟ اس بے ہودہ جگہ آنے کے بعد تو میں اس سے باتیں کرنے کو بھی ترس گئی ہوں۔''

"اب مزید مت ترسو وہ بھی اتنی مسکین سی شکل بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔"

"پلیز بھابی میری بات کروا دیں۔"

اسی وقت سبط نے فون ریشماں کے ہاتھ سے لے لیا۔

"زینی کیسی ہو؟"

"شکر ہے تمہاری آواز تو سنی لیکن میں لمبی بات نہیں کر سکوں گی۔"

"کیوں؟"

"یہاں بہت گڑبڑ ہے ناں۔ فون پر بات کرنا بھی مشکل ہے۔" وہ مدہم آواز میں بولی۔

"کیوں؟ حیدر بابا نے منع کیا ہے؟"

"منہ سے تو منع نہیں کیا لیکن ہر بات کہنے سے تو سمجھ میں نہیں آتی۔ کچھ باتیں بغیر کہے بھی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس دن بابا جان نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں تھا؟"

"وہی بات کہ کچھ نہ کہہ کر بھی انہوں نے بہت کچھ کہہ دیا اور مجھ سے حماقت یہ ہوئی کہ میں نے بھی اسی موقع پر اظہارِ خیال شروع کر دیا۔"

"بابا جان نے مجھے ڈانٹا تو نہیں لیکن ان کا موڈ سخت آف تھا۔ اماں جان نے پہلے تو مجھے بہت پیار کیا اور پھر اتنا زیادہ ڈانٹا کہ کیا بتاؤں۔ گڑیا الگ ناراض تھی۔ میری بات کسی نے سننے یا سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔" زینی نے بے چارگی سے کہا۔

"میں نے فون کی طرف سے مایوس ہو کر واکی ٹاکی بھی استعمال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی رینج ہی اتنی زیادہ نہیں تھی۔"

"ایک بہت گڑبڑ ہے سبط۔ یہاں میرے اور گڑیا کے لیے پروپوزل آئے ہوئے ہیں اور بابا جان کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ ہماری شادیاں وہیں پر کر کے رہیں گے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میری تو آخری امید صرف بھائی ہیں۔ اتنا تو طے ہی ہے کہ بابا جان! ان کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔" پھر اسے اچانک خیال آیا۔ "ہاں، وہ تمہارے بہت ہینڈسم بھائی ہیں وہی مکرم بھائی۔ انہوں نے تو کچھ نہیں کہا تمہیں؟"

"تم انہیں بار بار ہینڈسم کہہ کر شدید قسم کی جلن میں مبتلا کر دیتی ہو مجھے۔"

زینی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ویسے ان کا جاسوسی کا نیٹ ورک بہت اچھا ہے۔ انہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ تم یا تو زینب ہو یا پھر زہرا۔ خاصی انکوائری کی انہوں نے لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ اب یہ مسئلہ بابا جان کی عدالت میں پہنچے گا۔"

"اُف۔ پھر کیا ہو گا؟" وہ گھبرا گئی۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اب تک ہر بات بابا جان تک پہنچ گئی ہو گی لیکن انہوں نے ابھی طلبی نہیں کی۔"

"بس چند دنوں میں بھائی آنے والے ہیں۔ تم اپنا اینڈ سنبھال کر رکھو۔ میرا اینڈ بھائی سنبھال لیں گے اور ہاں پتا ہے کیا کرو۔"

"کیا؟"

"تم ریشماں بھابی کی چند اچھی سی تصویریں کھینچ کر مجھے بھجوا دو۔ ڈاک سے ہی بھجوا دینا۔ میرا خط کوئی نہیں کھولتا۔"

سبط نے ایک نظر ساتھ بیٹھی ہوئی ریشماں پر ڈالی پھر اس سے ایکسکیوز کر کے ذرا دور جا بیٹھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا زینی کہ تم آپی کو بھابی مت کہا کرو۔"

"کیوں؟"

"ایک تو پہلے ہی حالات اتنے اچھے نہیں ہیں کہ انہیں خوبصورت خواب دکھائے جائیں اور پھر ضروری تو نہیں کہ عبداللہ بھائی بھی ایسا ہی چاہتے ہوں۔"

"اپنے فلسفے اپنے پاس رکھو۔ وہ میری بھابی ہیں تو میں انہیں بھابی کہوں کیوں نہ؟ بس تم ان کی تصویریں بھجوا دو۔ حالات خود بخود اچھے ہو جائیں گے۔"

"میں مناسب نہیں سمجھتا۔"

"کیا مطلب؟ ہو تو تم بھی اسی خاندان کے۔ سوچنے کا انداز تمہارا بھی ویسا ہی ہے۔ باہر تمہیں کوئی لڑکی دکھائی دے تو تم ایک سیکنڈ میں اس کی تصویر کھینچ لیتے ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ یہ بات مناسب ہے یا نہیں لیکن جب تمہاری بہن کی بات کی جائے تو تمہیں ان کی تصویر کھینچ کر مجھے بھجوانا مناسب نہیں لگتا۔ چچ چچ، بہت افسوس کی بات ہے۔ مجھے کم از کم تم سے اس بات کی امید نہیں تھی۔"

زینی کی بات درمیان میں ہی تھی کہ پیچھے سے اس کی اماں جان نے قدرے سختی سے اسے آواز دی۔

"زینی کب سے فون کے ساتھ چمٹی ہوئی ہو۔ بات ختم نہیں ہوئی کیا؟"

"بس ایک منٹ۔" اس نے ان سے کہا اور سبط کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اماں اور بابا جان دور بیٹھے ہیں لیکن انہیں شک نہیں پورا یقین ہے کہ میں اس وقت تم سے باتیں کر رہی ہوں۔ اب سوچتی ہوں تو وحشت ہوتی ہے مجھے کہ اس جگہ آنے کے لیے میں اتنی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ پلیز سبط کبھی کبھار ریشماں بھابی کے ذریعے فون پر بات کر لیا کرو۔"

"تم نے جو تھوڑی دیر پہلے باتیں کی ہیں ناں، ان پر تمہارے کان کھینچنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

مگر جانے دو۔ تمہاری عقل ابھی ذرا چھوٹی ہے۔''

''ہروقت میری عقل کے پیچھے مت پڑے رہا کرو۔ میری بات سنی ہے ناں۔ ایک ریشماں بھابی کی اچھی سی تصویریں بھجواؤ مجھے اور دوسرے پلیز فون اٹھا کرلیا کرو۔ سن رہے ناں۔''

''بالکل سن رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

پیچھے سے ایک مرتبہ پھر آواز آئی۔ ''زینی۔''

''ایک منٹ اماں جان پلیز۔'' وہ بولی پھر دوبارہ سبط کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''دیکھ نے۔ اگر اس وقت میں ریشماں بھابی کے ساتھ باتیں کررہی ہوتی تو یوں گھڑی گھڑی مجھے نہ پکارتا۔ اس لیے کہ بھابی کے لیے یہاں سب کے دل میں بہت جگہ ہے۔ اماں اور بابا جا دونوں چاہتے ہیں کہ وہ ان کی بہو بنیں لیکن دونوں میں سے کوئی یہ نہیں چاہتا کہ میں بڑے جان کی بہو بنوں۔ کتنی افسوس ناک صورتِ حال ہے۔''

سبط ہنس پڑا۔ ''افسوس ناک صورتِ حال نہیں' تشویش ناک صورتِ حال۔''

''زینی۔'' اماں جان نے ایک مرتبہ پھر اسے جھڑکا۔ ''میں کہہ رہی ہوں کہ اب فون بند کرو۔ بہت کرلیں باتیں' چلو اب کچن میں۔''

''دیکھا سبط تم نے کہ مجھ پر کتنا ظلم ہورہا ہے۔ یہ سب اہتمام ہورہا ہے مجھے اس ایم اے والے کے سپرد کرنے کا۔ خیر اب فون بند کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ ابھی اماں جان نے ہا سے چھین کر بند کردینا ہے۔'' وہ بولی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ اب فون بند کردو ورنہ مزید گڑبڑ بھی ہوسکتی ہے۔''

''بھولنا مت' تصویریں اور فون یاد ہے ناں۔''

''سوفیصد۔'' وہ بولا۔

''اچھا بائے ٹیک کیئر۔''

☆=====☆=====☆

اُما اور نیہاں تیار ہونے کے لیے ماہ بانو کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ کل سے کالج میں چھٹیاں شروع ہورہی تھیں اور چھٹیوں سے قبل عبداللہ نے ان سب کو اپنے گھر چائے پر بلا رکھا تھا۔

''میں تم لوگوں کو لینے آؤں گا۔'' اس نے کہا تھا۔

کالج سے وہ تینوں سیدھی یہیں چلی آئی تھیں اور اب اپنے اپنے کپڑے استری کررہی تھیں۔

''مجھے بتاؤ کہ میں کون سے کپڑے پہنوں؟'' ماہ بانو نے کہا۔

''مجھے دکھاؤ اپنے کپڑے' میں بتاتی ہوں۔'' نیہاں نے کہا۔

ماہ بانو نے الماری کھول دی۔ ریشماں نے اسے بہت سے سوٹ دیئے تھے اور وہ سب ہینگروں پر لٹک رہے تھے۔

''واہ تمہارے پاس تو ایک سے ایک اچھا سوٹ ہے۔ یہ چنزی والا پہن لو۔''

''پہن چکی ہوں۔''

''کب؟ میں تو نہیں دیکھا۔'' نیہاں نے کہا۔

''جسے دیکھنا چاہیے تھا اس نے دیکھ لیا تھا۔ عبداللہ نے جو اسے الگ سے لنچ دیا تھا اس میں اس نے یہی سوٹ پہنا تھا۔'' اُما اپنے کپڑے استری کرتے ہوئے بولی۔

''اُما بالکل پاکستان کا جھنڈا لگو گی۔ سبز کرتے اور سفید شلوار میں۔'' نیہاں نے کہا۔ پھر ماہ بانو سے مخاطب ہوئی۔ ''میں اس سے کہتی رہی کہ کوئی اور کپڑے پہن لو لیکن اس نے میری سنی ہی نہیں۔''

''اتنا تو سوٹ کرتا ہے اس پر سبز رنگ۔'' ماہ بانو نے اُما کی طرف داری کی۔

''اسے اور ایڈی کو بالکل اچھے طریقے سے ڈریس اپ ہونا نہیں آتا۔'' نیہاں نے ماہ بانو کے کپڑے الٹ پلٹ کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''خبردار جو تم نے ایڈی کے متعلق ایسا تبصرہ کیا۔ اس پر تو ہر کپڑا اچھا لگنے لگتا ہے۔ بالکل ماڈلز والی Looks ہیں اس کی۔'' اُما نے اسے گھورا۔

''چھوڑو بھی۔ ایک زمانہ ہوا فائیو اون جینز آؤٹ آف فیشن ہوئے۔ وہ اب تک وہی رگڑے جارہا ہے۔''

نیہاں اپنی بات پر مُصر تھی۔

''بھئی مجھے مردوں کے فیشن کا بالکل نہیں پتا ورنہ ابھی تمہیں جھٹلا دیتی۔'' اُما بولی۔

''پلیز نیہاں' تم اُما اور ایڈی کی فکر چھوڑ کر یہ بتاؤ کہ میں کیا پہنوں؟'' ماہ بانو نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''مجھے دیکھنے تو دو۔'' اس نے ایک ایک کپڑا الٹنا شروع کیا پھر ہلکے گلابی کرتے اور چوڑی دار پاجامے والا ہینگر نکال دیا۔ ''تم یہ پہنو۔''

''اونہوں۔ یہ رنگ مجھ پر سوٹ نہیں کرے گا۔'' ماہ بانو نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ اُما تم بتاؤ' یہ کتنا سجے گا اس پر۔''

''بانو! یہاں میں نیہاں سے پوری طرح متفق ہوں۔ تمہارا دماغ واقعی خراب ہے۔ اتنا زبردست سوٹ ہے۔ یہ تم نے اب تک کیوں نہیں پہنا؟''

''سن لی اُما کی بات؟ بس تم یہی پہنو گی۔ میں نے اور اُما نے کہہ دیا ہے۔''

''اس کا دوپٹا ساڑھے تین گز کا ہے۔ سنبھلے گا نہیں۔'' ماہ بانو نے احتجاج کیا۔

"میں پن اپ کروا دوں گی۔" نیہاں نے فوراً کہا۔

"اور اسے پریس کرنا بھی مشکل ہے۔ اس پر کلف لگی ہوئی ہے۔" اس نے دوسرا بہانہ بنایا۔

"تمہیں پریس نہیں کرنا پڑے گا۔ میں کر دوں گی۔" اُما نے کہا۔

"پتا ہے' یہ رنگ مجھ پر اچھا نہیں لگے گا۔ میں بہت کالی ہوں۔" بالآخر اس نے کہا۔

"میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔ پتا نہیں کس نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ تم کالی ہو۔" اُما نے غصے سے کہا۔

"کسی نے کیا کہنا ہے۔ مجھے خود پتا ہے۔"

"اُما اس لڑکی کو صرف تم ہی سنبھال سکتی ہو۔ میری سمجھ سے یہ بالکل بالاتر ہے۔" نیہاں نے کہا۔

"اچھا پہن لیتی ہوں یہی لیکن نیہاں مجھے تم سے پہلے کا بہت گلہ ہے۔" ماہ بانو نے باقی کپڑے الماری میں واپس رکھے۔

"مجھ سے؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"اس دن جو تم نے عبداللہ سے کہا تھا۔ وہ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔"

"کس دن؟ کیا کہا تھا؟" نیہاں نے ذہن پر زور دیا۔

"یہی کہ میں عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن ریشماں کی وجہ سے اسے Avoid کرتی ہوں۔"

"تو غلط کب کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے غلط نہیں تھا لیکن ہر بات کہہ دینے والی تو نہیں ہوتی۔" ماہ بانو واپس چارپائی پر آ بیٹھی۔

"کم آن یار۔ کس دور میں رہ رہی ہو؟ ساری زندگی رونے کا ارادہ ہے کیا؟ دیکھو بانو! محبت مل رہی ہو تو ناشکری نہیں کرتے۔ قسمت ہر کسی پر اتنی مہربان نہیں ہوتی کہ جسے ہم چاہیں وہ بھی ہمیں چاہنے لگے۔ تم تو بہت خوش قسمت ہو تمہیں ایک ایسا شخص مل رہا ہے جسے تم چاہتی ہو۔ جو تمہیں چاہتا ہے۔ میں تمہاری دوست ہوں۔ اس دن میں نے جو کچھ کہا وہ اس لیے کہا تھا کہ تم نے جو دیوار اپنے اور عبداللہ کے بیچ کھڑی کی ہے۔ وہ کسی صورت میں گر پڑے' نہیں گرتی تب بھی اس میں شگاف ہی پڑ جائے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم ساری زندگی اس دکھ کے ساتھ گزارو کہ جو تمہیں مل سکتا تھا۔ تم نے اسے اپنی حماقت سے کھو دیا۔"

"پتا ہے بانو' ہمدردی اور قربانی کا جذبہ ایک وقت میں بہت قوی ہوتا ہے لیکن یہ بہت وقتی جذبہ ہوتا ہے۔ جب انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے تو تنہائی میں ضرور پچھتاتا ہے۔ کڑھتا ہے۔ تم

کیوں نہیں سمجھتیں۔" نیہاں نے کہا۔

"اس پر میرا حق نہیں ہے۔" ماہ بانو کمزور سے لہجے میں بولی۔

"تو پھر کس کا حق ہے؟ حالات کیسے بھی ہوں نہ ہوں' کسی کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار ماں باپ تک کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ ایک جیتے جاگتے انسان کی قسمت کا فیصلہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ بچپن کی منگنی سے زیادہ فرسودہ بات اور کوئی نہیں ہوتی۔ آج صرف اس ایک فیصلے کی وجہ سے تم تین لوگ دکھ میں مبتلا ہو رہے ہو اور قصور تم تینوں میں سے کسی ایک کا بھی نہیں ہے۔"

"آئی ایم سوری لیکن بانو تم اپنے لیے بہت غلط فیصلہ کر رہی ہو۔ عبداللہ پر اگر کسی کا حق ہے تو وہ صرف تم ہو کیونکہ وہ تم سے اور تم اس سے محبت کرتی ہو۔ ریشماں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض اس کی بدقسمتی ہے۔ لیکن پلیز اپنے کسی غلط فیصلے کی وجہ سے ریشماں کی بدقسمتی کو اپنی اور عبداللہ کی زندگی پر بھی مت پھیلاؤ۔"

"نیہاں اسے سمجھانا پتھر سے سر پھوڑنے کے برابر ہے۔" اُما نے کہا اور ماہ بانو کے کپڑے اٹھا کر استری کرنے لگی۔

"کیا کروں۔ میری قسمت میں پتھروں سے سر پھوڑنا ہی لکھا ہوا ہے۔" نیہاں ہنسی۔

"لیکن ایک پتھر بہت خوبصورت اور دوسرا بہت ہینڈسم ہے۔" اُما بھی ہنسی۔

"جیمز والی بات تو ٹھیک ہے لیکن میں خوبصورت؟ مذاق مت کیا کرو۔"

نیہاں نے تکیہ اٹھا کر اسے مارا۔ "حد ہوتی ہے ناشکری کی۔ تم صرف یہ چاہتی ہو کہ ہم دونوں ہر وقت تمہارے حسن کے قصیدے پڑھتے رہیں۔"

"تمہاری آنکھوں پر دوستی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ تمہیں میں خوبصورت ہی دکھائی دوں گی۔" ماہ بانو ہنسی۔

اسی وقت باہر سے اماں جی کی آواز سنائی دی۔ "بانو۔"

"ابھی آئی۔" اس نے کرسی پر پڑا دوپٹا اٹھا لیا اور ان دونوں کی طرف مڑی۔ "جلدی تیار ہو جاؤ۔ عبداللہ آتا ہی ہوگا۔"

"یہ بھی خوب رہی۔ مجھے یقین ہے بانو کہ تم سب سے آخر میں تیار ہو گی۔" اُما نے کہا۔

ماہ بانو کمرے سے باہر نکل آئی۔ اماں صحن میں ہی تھیں۔

"جی اماں۔"

"بانو مجھے تمہاری حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"اب کیا ہوا اماں جی؟"

"ابھی تو تم جا رہی ہو عبداللہ کی طرف لیکن مجھے تمہارا اس سے زیادہ میل جول پسند نہیں ہے۔" وہ بولیں۔

وہ بجھ سی گئی۔ ''اماں! کالج میں اکٹھے پڑھتے ہیں میل جول تو ہو ہی جاتا ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''بہر حال میں اسے پسند نہیں کرتی۔'' اماں نے ماتھے پر بل ڈال دیئے۔ ''تم بندوبست میں کرتی ہوں۔ ان چھٹیوں میں ہی کہیں تمہارا رشتہ طے کرتی ہوں۔''

''جو دل چاہے وہ کریں لیکن پلیز میرے ساتھ ایسی باتیں مت کیا کریں۔ ایک تو عبدا ہمارے لیے اتنا کچھ کر رہا ہے۔ پہلے اس نے اپنے لان کی ڈیزائننگ کا پروجیکٹ دیا اور اماں یہ اسی پروجیکٹ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ اب ہم دنیا میں نمائش کر سکتے ہیں۔ اپنے بنائے ہوئے برتنوں کی اور اب اس نے آواری اور پرل کانٹی نینٹل میں بھی بکنگ کروا دی ہے۔ پلیز اماں میں کیسے اس سے میل جول چھوڑ دوں' آپ خود سوچیں ناں۔''

''یہی باتیں تو میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجاتی ہیں۔ وہ کیوں کر رہا ہے اتنا ہمارے لیے۔ دیکھنا بانو اس بن ماں کی بچی پر کوئی ظلم نہ کرنا۔''

ماہ بانو چند لمحے وہاں کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی پھر مڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''کیا ہوا؟ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' اُما نے کہا۔

''کچھ نہیں۔ میرا جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ تم دونوں جاؤ' میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''اچانک کیا ہوا تمہیں؟'' نیہاں نے تشویش سے پوچھا۔

''اماں جی نے کچھ کہا ہے؟'' اُما اس کے پاس آ بیٹھی۔

''میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ مجھے کوئی راستہ نہیں مل رہا۔'' اس نے آزردگی سے کہا۔

''اوہ گاڈ' میری اتنی لمبی تقریر کا یہ نتیجہ نکلا۔'' نیہاں بولی۔

''پتا ہے اماں جی نے کیا کہا ہے؟''

''کیا؟''

''کہنے لگیں کہ دیکھنا بانو' اس بن ماں کی بچی پر ظلم مت کرنا۔''

''وہ تمہیں اپنے جذبات کی نذر کر رہی ہیں۔'' نیہاں بولی۔

''ایسے مت کہو۔ وہ میری اماں جی ہیں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''ٹھیک ہے' میں کچھ نہیں کہتی۔ اس بن ماں کی بچی کو کچھ نہ ہو اور جن کے ماں باپ موجود ہیں وہ چاہے زندگی میں ہی جہنم کاٹتے رہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتے یہ لوگ۔'' نیہاں اس سے کچھ فاصلے پر پڑی کرسی پر ٹک گئی۔

''پلیز بانو' ابھی اس بات کو جانے دو۔ تمہارے پاس سوچنے کے لیے بہت وقت ہے فیصلے کے لیے کسی اور کی طرف مت دیکھو۔ یہ مت سوچو کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ بس یہ دیکھو

تمہاری خوشی کس بات میں ہے اور تم کس فیصلے پر بغیر کسی پچھتاوے کے قائم رہ سکتی ہو۔ جو فیصلہ تم کرو گی وہی سب سے اچھا ہوگا۔'' اُما نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''اُما اتنی تکلیف دہ صورتِ حال میں اگر تمہاری دوستی میرے ساتھ نہ ہوتی تو شاید میں پاگل ہو چکی ہوتی اب تک۔''

''چلو اب اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔ میں نے تمہارے کپڑے پریس کر دیئے ہیں۔ عبداللہ لینے کے لیے آتا ہی ہوگا۔''

وہ تینوں بمشکل تمام تیار ہوئی تھیں کہ عبداللہ انہیں لینے آ گیا۔ آخری چند ٹچز انہیں بھاگ دوڑ میں ہی دینے پڑے۔

اُما کو لپ اسٹک ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ نیہاں کو پرفیوم نہیں مل رہا تھا اور ماہ بانو بالوں کا برش ہاتھ میں لیے اپنے گلابی کڑھائی والے کھسے ڈھونڈ رہی تھی۔

''بچیو اور کتنی دیر ہے؟'' اماں جی نے اندر سے جھانکا۔

''میرے کھسے پتا نہیں کہاں گئے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''ٹھہرو' میں لاتی ہوں۔ یہاں جگہ نہیں ہے۔ وہ تو میں نے اپنے کمرے میں رکھ دیئے تھے۔'' اماں اس کے کھسے لینے چلی گئیں۔

''میں نے بال تک برش نہیں کیے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''کھلے چھوڑ نا۔'' نیہاں نے بالآخر چارپائی کے نیچے فرش پر پڑا اپنا پرفیوم ڈھونڈ نکالا۔

اماں جی اس کے کھسے لے کر آئیں تو بے اختیار اس کا ماتھا چوم لیا۔

''کتنی پیاری لگ رہی ہے میری بیٹی۔''

''مجھے اپنی ممی یاد آ گئیں۔ وہ بھی مجھے ایسے ہی پیار کر کے اسی طرح کہتی ہیں۔'' نیہاں نے کہا۔

''میری ممی نے مجھے اتنا سر نہیں چڑھایا ہوا۔'' اُما ہنسی۔

''تم دونوں بھی میری بیٹیاں ہی ہو۔'' اماں نے آگے بڑھ کر باری باری ان دونوں کا ماتھا چوما۔ ''نظر بد دور تم تینوں ہی بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

''جلدی کرو ورنہ عبداللہ یہی کہے گا کہ لڑکیاں تیار ہونے میں بہت دیر لگاتی ہیں۔'' نیہاں نے کہا۔

وہ کمرے سے باہر نکلیں تو عبداللہ صحن میں ابا جی کے ساتھ آئندہ ہونے والی نمائش کے متعلق بات چیت میں مصروف تھا۔

''ہم تیار ہو گئے۔'' اُما نے گویا اسے اطلاع دی۔

''بہت جلدی تیار ہو گئے ہو۔ میں پچھلے بیس منٹ سے یہاں کھڑا ہوں۔''

"اچھا اماں جی، ابا جی خدا حافظ۔ واپسی میں بھی عبداللہ چھوڑ جائے گا۔" ماہ بانو نے

وہ سب بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔

"بانو ایک منٹ رکنا۔ میں بھول گئی۔" اماں جی نے اسے پیچھے سے پکارا۔

"کیا چیز بھول گئیں؟"

وہ سب دروازے میں کھڑے ہو گئے۔ ماہ بانو وہیں سے پلٹ آئی۔

"یہ خط آیا ہے گاؤں سے۔ دیکھنا ریشماں کا تو نہیں ہے۔" اماں نے اسے خط تھمایا۔

ماہ بانو نے کن انکھیوں سے دروازے میں کھڑے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ پھر خط پلٹ کر دیکھنے لگی۔ "جی ریشماں کا ہی ہے۔"

"تم نے اسے پہلے بھی خط کا جواب نہیں دیا۔ خیر کل تو ہم گاؤں چلے جائیں گے لیکن کھول کر، خیریت لکھی ہے ناں؟" اماں جی نے کہا۔

"ابھی جلدی میں ہوں۔ بعد میں پڑھ لوں گی۔ یوں بھی مجھے پتا ہے کہ اس نے کیا ہے۔" اس نے خط مٹھی میں دباتے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف مڑ گئی۔

بے شمار تنگ گلیوں سے گزرنے کے بعد بالآخر وہ سڑک پر آ گئے۔ عبداللہ نے ڈرائی سیٹ سنبھال لی۔ ماہ بانو اس کے برابر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی جبکہ اُما اور نیہاں پیچھے بیٹھ گئیں۔

"تم لوگ کل گاؤں جا رہے ہو؟" عبداللہ نے گاڑی مال روڈ سے ظفر علی روڈ پر مو ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ شاید دو ہفتے رہیں۔ شاید اس سے بھی کم۔" ماہ بانو نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ میں بھی رات کو گاؤں کے لیے نکل جاؤں۔ زیادہ دن میں بھی رک نہیں سکتا۔ واپس آ کر تھیسز پر بھی کام شروع کرنا ہے۔"

وہ عبداللہ کی طرف پہنچے تو ایڈی، جیمز اور ظہیر پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ڈرائنگ رو سگریٹوں کا دھواں اور مختلف قسم کے پرفیوم کی ملی جلی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ قالین پر کشن رکھ تینوں آڑے ترچھے لیٹے ہوئے تھے۔ یہاں وہاں پھلوں کے بہت سے چھلکے بکھرے پڑے، چائے کے استعمال شدہ برتنوں کا بھی ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ماہ بانو، اُما اور نیہاں ڈرائنگ روم کے دروازے میں ہی رک گئیں۔

"یہ تمہارے دوستوں نے کیا مچھلی بازار بنایا ہوا ہے۔" ماہ بانو نے عبداللہ کی طرف اور آگے بڑھ کر ڈیک بند کر دیا۔

جیمز نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ "کون ہے؟ ڈیک کیوں بند کیا ہے؟"

"اف خدایا تم لوگوں نے ڈرائنگ روم کا کیا حشر کیا ہے۔ اٹھو فوراً۔" ماہ بانو نے ڈپٹا۔

"اس جگہ کا یہ حال تم تینوں نے کیا ہے؟" اُما نے حیرت سے کہا۔

"تمہیں کیوں شک ہے؟" ایڈی اٹھ بیٹھا۔

"اصولاً شک ہونا تو نہیں چاہیے تھا کیونکہ مجھے تمہاری صلاحیتوں کا علم ہے لیکن یونہی خیال سا آیا تھا کہ شاید یہ تین نہیں تیس افراد کا پھیلایا ہوا گند ہے۔" اُما صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کسی نوکر کو بلوا کر یہ چیزیں اٹھواؤ۔" ماہ بانو نے عبداللہ سے کہا۔

"جو حکم۔" وہ ہنس پڑا۔

"یار اس نے کچھ جلدی چارج نہیں سنبھال لیا۔ یہ تو ہمیں یہاں آنے سے صاف منع کر دیا کرے گی۔ برداشت نہیں کرے گی ہمیں۔" ایڈی نے عبداللہ سے کہا۔

"ایڈی تم قتل ہو جاؤ گے میرے ہاتھوں۔" ماہ بانو کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "میرا کیا جاتا ہے۔ بیٹھے رہو اسی گندی جگہ پر لیکن پھر ہم تینوں لڑکیاں یہاں نہیں بیٹھیں گی۔"

"اُما اس سازش میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہو گی۔ پوچھ لو بے شک اس سے۔" جیمز نے فوراً کہا۔

اُما بغیر کچھ کہے ہنس پڑی۔

عبداللہ کے نوکر نے آ کر کمرے کی بکھری چیزیں سمیٹیں اور چائے کے استعمال شدہ برتن اٹھا کر لے گیا۔

"یہ گرمیوں کی چھٹیاں کچھ زیادہ لمبی نہیں ہیں۔" جیمز نے کہا۔

"خدا کو مانو یار۔ یہ تمہیں لمبی لگ رہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہمیں تھیسز کے لیے بالآخر ایکسٹینشن لینی پڑے گی۔" ظہیر بولا۔

"گرمیوں کی چھٹیاں مجھے بھی کچھ لمبی لگ رہی ہیں کہیں ہم دونوں کا مسئلہ ایک ہی تو نہیں ہے؟" ایڈی ہنسا۔

نیہاں بظاہر بے نیازی سے جیمز کی طرف دیکھنے لگی لیکن درحقیقت اسے اس کے جواب کا انتظار تھا۔

"کالج کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔" بالآخر جیمز بولا۔

ایڈی، ظہیر اور عبداللہ نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

"کس رونق کی بات کر رہے ہو؟ تینوں فورتھ ایئرز تو کم از کم کالج میں ہی ہوں گی۔" بداللہ نے کہا۔

"میں ایک خاص رونق کی بات کر رہا ہوں۔ پھر کبھی بتاؤں گا۔"

"ہم باہر چلے جاتے ہیں۔ تم نے جو کچھ اپنے دوستوں کو بتانا ہے، بتا دو۔" نیہاں نے کہا۔

ماہ بانو اور اُما کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بھی میرے اچھے دوستوں میں سے ہو۔ با
کے ساتھ تمہیں بھی ضرور بتاؤں گا۔'' جیمز نے کہا۔

''باقی سب کے ساتھ۔'' نیہاں نے دل ہی دل میں دانت پیستے ہوئے دہرایا اور میز پر پڑا ہیرالڈ کا تازہ شمارہ اٹھا کر بلاوجہ ورق گردانی کرنے لگی۔

وہ سب اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے جب اچانک اُما کی نگاہ جیمز پر پڑی اور ہنس پڑی۔

''کیا ہوا؟ مجھے یقین ہے میں نے مسخروں والی کوئی حرکت نہیں کی۔'' جیمز نے کہا۔

''بانو فائیو او ون (5.0.1)۔'' اُما نے سرگوشی میں کہا۔

ماہ بانو نے جیمز کی طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''یہ لڑکیاں کوئی سازش کر رہی ہیں۔'' ظہیر بولا۔

''نہیں' سازش کوئی نہیں ہے۔ ہمیں آج ہی نیہاں نے بتایا ہے کہ فائیو او ون آؤٹ آف فیشن ہوگئی ہے۔ آج کل Guess P Jeans اِن ہیں۔ جیمز تم اب تک فائیو او ون کر رہے ہو۔'' اُما نے بہت مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔

نیہاں نے رسالے سے سر اٹھا کر جیمز کو دیکھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہونق بنا بیٹھا تھا۔

''شرم کرو تم دونوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے رسالہ اُما کو مارا۔

''میرے سامنے اُما سے یہ سلوک؟ یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی اور تمہیں
کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔'' ایڈی نے کہا۔

''کوئی نہ کوئی تو بچا ہی لے گا مجھے۔'' نیہاں نے کن اکھیوں سے جیمز کی طرف دیکھا

''ویسے تو بانو اور اُما کی اس سازش میں تم بھی برابر کی شریک لگ رہی ہو مجھے'
وقت تم پر بہت ترس آ رہا ہے۔ تمہیں میں بچالوں گا۔'' جیمز نے کہا۔

وہ تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''یہ تم نے مٹھی میں کیا بند کر رکھا ہے بانو۔ میرا مطلب ہے اپنی اور عبداللہ کی تقا
علاوہ۔'' ایڈی نے کہا۔

ماہ بانو کو ایک دم احساس ہوا کہ نہ جانے کب سے اس نے ریشماں کا خط مٹھی میں
تھا۔

''اوہ یہ کچھ نہیں۔'' وہ بولی۔

سب ایک مرتبہ پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔ عبداللہ اس سے تھوڑے فاصلے پر

کے چہرے پر بکھرے اضطراب کا جائزہ لیتا رہا۔

وہ پریشان تھی۔ کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی اور عبداللہ چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ ماہ بانو خود کرے۔

بالآخر ماہ بانو نے قالین پر سگریٹ کی ڈبیا کے ساتھ رکھا ہوا عبداللہ کا لائٹر جلایا اور ریشماں کے خط کو آگ لگا کر آتشدان کی طرف اچھال دیا۔

''تھینک یو بانو۔'' عبداللہ نے آہستگی سے کہا۔

☆=====☆=====☆

جی ٹی ایس کی ہچکولے کھاتی بس میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر پہلے کتنی دیر ماہ بانو تیزی سے پیچھے بھاگتے درخت گنتی رہی' پھر اس کے ذہن میں کل شام کے بہت سے مناظر تازہ ہوگئے۔ عبداللہ کے ہونٹوں اور آنکھوں میں ابھرنے والی مسکراہٹ۔ جب اس نے ریشماں کا خط جلا کر آتش دان میں اچھال دیا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل تھا مگر ایک دن کرنا تو تھا ہی۔ سو جتنا جلد کرلیا جاتا' بہتر تھا۔

''دیکھنا یہ تھا کہ عبداللہ کو پانا میرے لیے زیادہ تکلیف دہ تھا یا اسے کھو دینا۔'' اس نے دور تک پھیلے کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

جب معاملے کو اس زاویئے سے دیکھا تو احساس ہوا کہ اسے کھو دینا کتنا تکلیف دہ تھا۔ شاید میں بہت خودغرض ہوں۔ شاید یہ اخلاقی گراوٹ ہو۔ شاید ریشماں میری شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کرے' لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے پوری کوشش کی کہ عبداللہ اس کی طرف متوجہ ہو جائے' مجھے بھول کر اسے اپنا لے' مگر میں اس پر زور دے سکتی ہوں' اسے مجبور تو نہیں کر سکتی تھی۔

یا پھر یہ سب غلط ہے۔ جیسے انتخاب کا حق ہم تینوں میں سے کسی کے پاس تھا ہی نہیں' جیسے یہ سب تقدیر کا لکھا ہوا کوئی کھیل ہے' جسے کھیلنے پر ہم سب مجبور ہیں یا شاید یہ بھی غلط ہے۔ صرف خود کو بری الذمہ ثابت کرنے کا ایک بہانا۔ ایک بے حد کمزور سی دلیل محض اپنے اطمینان کے لیے۔

نہ جانے سچ کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ شاید سچ صرف ہماری اپنی زندگی ہے جو ہمارے لیے سب سے اہم ہے اور اس زندگی کو گزارتے ہوئے اس کے لیے فیصلے کرتے ہوئے شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ بالآخر ہمیں بھی تھک کر اپنے لیے ایک پناہ گاہ تلاش کرنی ہے۔ ہمیں بھی آج نہیں تو کل کسی کے سہارے' کسی کے کندھے کی ضرورت محسوس ہوگی' تب ایثار اور قربانی کا جذبہ ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ ہمارے پاس صرف پچھتاوا رہ جائے گا۔

زندگی کی راہیں کبھی کبھار بہت پُرپیچ اور پُرخار ہو جاتی ہیں۔ نہ جانے حقیقت کہاں' افسانے میں اور افسانہ کب حقیقت میں مدغم ہو جاتا ہے۔ جو کسی کو یہ کتھا سنانے بیٹھو تو شاید کوئی

یقین ہی نہ کرے، لیکن یہی حقیقت ہے، یہی سچ ہے کہ شاہراہِ حیات پر یوں بھی ہوتا ہے
چلتے چلتے تھک کر ہم کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نگاہ دوڑاتے ہیں تو دور کہیں ٹمٹماتی روشنی دکھائی
ہے لیکن اس تک بڑھتے بڑھتے پتا چلتا ہے کہ یہ تو ممنوعہ علاقہ ہے۔ یہ ہماری نہیں کسی اور کی
گاہ ہے۔ تب یہ احساس شدت اختیار کر جاتا ہے کہ ان راہوں پر چلنے والے کے لیے گناہ و ثو
محض ضمنی باتیں ہوتی ہیں اور اس گناہ و ثواب کے درمیان جو حدِ فاصل شیخ و برہمن نے کھینچ
ہے وہ کتنی بے معنی ہے۔

اس نے گہری سانس لے کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور کل ش
ایک اور منظر اس کے تصور میں تازہ ہو گیا۔

چائے پینے کے بعد جب وہ سب دوبارہ ڈرائینگ روم میں جمع ہوئے تو چاروں
پہلے فلور کشنز پر بیٹھے، پھر نیم دراز ہوئے اور بالآخر پہلے کی طرح آڑے ترچھے لیٹ گئے۔

"میں تو سخت تھکا ہوا ہوں، دو دن اور رات مسلسل کام کیا ہے۔" ایڈی نے سگریٹ سا
کہا۔

"اور مجھ پر ویسے ہی سُستی سوار ہے۔" ظہیر بھی اس کی تقلید میں نیم دراز ہو گیا۔

اور ان کے بعد سب ہی آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لگاتے، اپنے کام کی تھکن کا بہا
کے آرام کرنے لگے۔

"اٹھو اُما! یہ سب سُستی کے بورے ہیں۔ چلو باہر لان میں نکلتے ہیں۔" ماہ بانو نے کہا

"میزبان کو بھی خیال نہیں ہے ذرا سا، مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک، بہت بری بات ہے"
اُما نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میزبان بھی انسان ہے، کام کر کے تھک جاتا ہے دو دن اور دو راتیں صرف ایڈی
ہی نہیں، میں نے بھی کام کیا ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

"بلکہ ایڈی اور میزبان نے مل کر میزبان کے گھر میں ہی کام کیا ہے۔" ایڈی بولا۔

"تو پھر ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ میزبان اور ایڈی نے مل کر کیا کام کیا ہو گا۔" نیہاں نے کہ

"باہر کہیں میزبان کے کتے تو نہیں ہیں؟" ماہ بانو کو باہر جاتے ہوئے اچانک خیال آیا

"اتنے بہادر مہمانوں کی موجودگی میں میزبان انہیں کھلا چھوڑ دینے کا رسک نہیں لے
تھا۔" عبداللہ نے کہا۔

وہ تینوں باہر لان میں نکل آئیں۔

"ویسے بانو یہ مت سمجھنا کہ میں دوستی نبھانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ یہ حقیقت ہے
نے بہت خوبصورت گملے بنائے ہیں۔" نیہاں نے تعریفی نظروں سے باغ کا جائزہ لیا۔

"تھینک یو، لیکن اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ صرف ابا جی کی محنت ہے۔"

مسکرائی۔

"یہ Pavement بہت زبردست ہے۔" نیہاں جھک کر گھاس میں پھولوں کی طرز پر
بنائے گئے راستے کی طرف دیکھنے لگی۔

"Pavement کے بہت سے ڈیزائن میرے ذہن میں تھے۔ ایک یہ بات بھی ذہن
میں تھی کہ مسلسل Solid Surface کے بجائے بکھرا ہوا راستہ بنایا جائے لیکن پھر اس
آئیڈیے کو میں نے ڈراپ کر دیا۔ میں نے سوچا کہ باغ کی لکس کو زیادہ قدرتی بنانا چاہیے، اس
لیے سوچا کہ چھ پتیوں والا ایک مسلسل پھول بنایا جائے۔ ایک پھول اورنج رنگ کا ہو اور ایک
گلابی جبکہ درمیان میں جو دو مشترکہ پتیاں ہوں، وہ ان دونوں رنگوں کا امتزاج ہوں۔ بیچ کے خالی
حصے میں گھاس ہو۔" ماہ بانو نے کہا۔

"ہاں ایسی چیز تو نیچر سے جتنی قریب ہو گی، اتنی ہی اچھی لگے گی۔" اُما بولی۔

"لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے انہیں اتنے اچھے رنگوں میں کیسے بنا لیا؟ مجھے بہت حیرت ہے یہ تم
نے خود بنایا ہے بانو؟" نیہاں نے کہا۔

"یہ تو کہہ دے گی کہ اس کے ابا جی نے بنایا ہے حالانکہ اس میں آدھی چیزیں اس نے
اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں۔ تم کبھی اسے کام کرتے دیکھو چاک پر، بہت حیران ہو گی۔" اُما نے کہا۔

"بانو! ایک بات کہنی ہے۔" اُما نے کہا۔

"کیا؟"

"میں نے تمہیں پہلے اس لیے نہیں بتایا تھا کہ تم ڈسٹرب ہو گی لیکن اب بتا دینے میں کوئی
حرج نہیں سمجھتی۔"

"پہلے کیوں نہیں اور اب کیوں؟" ماہ بانو نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

"پہلے اس لیے نہیں کیونکہ تم نے اپنے لیے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، آج کر لیا ہے۔" وہ
بولی۔

ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "تم نے دیکھ لیا تھا؟"

"ٹھیک ہے ہم باتیں کر رہے تھے لیکن اس قدر بے خبر بھی نہیں تھے۔ اینی وے یہ اچھا ہوا
کہ تم نے فیصلہ تو کیا۔"

"پتا نہیں صحیح فیصلہ کیا یا غلط!" اس نے خود سے ہی کہا۔

"بانو! یہ تو کبھی کوئی نہیں جان سکتا کہ اس کا فیصلہ صحیح ہے یا غلط اور صحیح یا غلط ہوتا کیا ہے؟ صحیح
وہ چیز ہے جس سے مستقبل میں ہمیں فائدہ حاصل ہوتا ہو اور غلط وہ ہے جس سے آئندہ کبھی
نقصان اٹھانا پڑے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صحیح یا غلط دونوں Relative Terms ہیں اور
اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ صحیح درحقیقت صحیح ہے اور نہ غلط غلط۔" نیہاں نے کہا۔

''نہیں نیہاں' یہ فلسفے خود کو بری الذمہ ثابت کرنے کا ایک ذریعہ ہیں اور کچھ نہیں۔'' بولی۔

''چھوڑو یار' تم بتاؤ اُما کہ تم کیا کہہ رہی تھیں؟'' نیہاں نے کہا۔

''ہاں وہ بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔'' ماہ بانو کو خیال آیا۔

''وہ سعد ہے ناں' یاد ہے؟'' اُما نے کہا۔

''ہاں یاد ہے۔''

''وہ بہت مرتبہ کالج آیا ہے تھیسز ڈسپلے کے بعد پتا ہے ناں تمہیں اسے آنرز ملا تھا۔''

''ہاں پتا ہے' تم اصل بات کرو۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''آنرز کے بعد نوکری ملنا مشکل تو تھا نہیں' اس لیے نوکری مل گئی اور نوکری ملنے کے بظاہر وہ مجھے یہ خبر ہی سنانے آیا تھا' لیکن درحقیقت وہ تمہارے متعلق جاننا چاہتا تھا۔''

''پھر؟'' ماہ بانو نے سوالیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔

''پھر میں نے اُسے کوئی ایسی خاص بات نہیں بتائی۔ یہی سمجھ لو کہ گول مول جواب دے کر ٹال دیا۔ تین چار مرتبہ ملا ہے' وہ مجھ سے تاکہ میں تم سے اُس کی سفارش کر سکوں۔''

''تمہیں پتا تو ہے اُما کہ میرے دل یا میری زندگی میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تمہیں صاف صاف اس سے کہہ دینا چاہیے تھا' مجھے اس سے کبھی بھی محبت نہیں رہی تھی۔ مجھے ہلکا سا شبہ تھا کہ شاید ایسی کوئی بات میں اس کے لیے محسوس کرتی ہوں' لیکن ایک دن میں نے اس بات پر غور کیا تو یہ شبہ خود ہی رفع ہو گیا اور میں نے اُسے تب بھی بہت صاف الفاظ میں یہ بات بتا دی تھی۔''

''اُسے بھی یہ شبہ تھا کہ تم نے جو کچھ کہا' وہ کسی وقتی غصے کی وجہ سے کہا تھا۔'' اُما بولی۔

''لیکن تمہیں تو اس سلسلے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ تم یا اُسے میرے پاس بھیج دیتیں تاکہ میں اس کے بقیہ شکوک و شبہات رفع کر دیتی یا پھر تم خود ہی اُسے منع کر دیتیں۔''

''مائنڈ نہ کرنا بانو' میں نے جو اُسے صاف منع نہیں کیا تھا تو اُس کے پیچھے ایک وجہ تھی' تمہیں اچھی نہیں لگے گی۔''

''کیا وجہ تھی؟''

''جانے دو۔'' اُما نے کہا۔

''نہیں' تم مجھے بتاؤ گی' وجہ تو ہو گی' مجھے بھی پتا ہونی چاہیے۔'' ماہ بانو نے اصرار کیا۔

''وجہ یہ تھی کہ تم نے ابھی تک عبداللہ کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا' اگر تم ان کا انکار کر دیتیں تو بھی کہیں تو شادی کرتیں' چاہے وہ کمپرومائز ہی ہوتی۔ میں نے سوچا کہ پھر سعد میں کیا برائی ہے۔ کم از کم وہ تم سے محبت کرتا تو ہے۔'' اُما نے کہا۔

''اوہ گاڈ! اتنی دور کی کوڑی۔'' ماہ بانو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''یہ چاہ رہی تھی کہ تمہاری سب کشتیاں نہ جلیں۔'' نیہاں بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

''مذاق مت اُڑاؤ میرا' میں نے ذرا بزرگوں کی طرح سوچا تھا۔'' اُما نے کہا۔

''بس اب بزرگ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ سعد آئے تو اُسے بتا دینا کہ اس وقت اس کا شک بے معنی تھا' لیکن آج میں واقعی عبداللہ سے محبت کرتی ہوں۔ بہت شدید اور بہت مشکل سے اس فیصلے پر پہنچی ہوں لیکن بہرحال پہنچ گئی ہوں۔'' ماہ بانو بولی۔

بس کے ہچکولوں کے درمیان یہی سب سوچتے ہوئے وہ نہ جانے کب سو گئی۔ آنکھ اُس وقت کھلی جب اماں جی نے اُسے جھنجھوڑا۔

''اب اُٹھ بھی جاؤ بانو!''

''لیکن اماں گاڑی تو اب تک چل رہی ہے' ابھی بہت راستہ رہتا ہے۔'' اُس نے نیند بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''راستہ نہیں رہتا' ابھی ایک منٹ میں نیاز پور کا موڑ آجائے گا' اُٹھو سامان اکٹھا کرو۔''

''ایک تو آپ پتا نہیں کیا کیا پوٹلیاں باندھ لاتی ہیں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے سامان اکٹھا کرنے لگی۔

''سب کی فرمائشیں ہوتی ہیں۔ میں کہتی ہوں ہر ایک کا سامان الگ الگ ہی باندھوں۔ امانت ہوتی ہے لوگوں کی' بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

''فرمائشیں سب اس طرح کرتے ہیں' جیسے ہم لاہور سے نہیں نیویارک سے آرہے ہوں'' وہ بڑبڑاتی گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں گاڑی بڑی سڑک پر ہی رُک گئی۔ وہ دونوں سامان اُٹھا کر نیچے اُتر آئیں۔ ایک تانگہ پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔

''مولوی نعمت اللہ کے گھر چلنا ہے۔'' اماں جی نے کوچوان سے کہا۔

''جی بسم اللہ باجی! آؤ بیٹھو۔''

تانگے پر بیٹھ کر وہ اِردگرد دور تک پھیلے کھیتوں کا نظارہ کرتی گئی۔ عبداللہ کے گاؤں کی طرف اسی سڑک سے داہنے ہاتھ واقع ایک اور سڑک جاتی تھی۔ وہ اس امید پر اس طرف دیکھتی رہی کہ شاید اسے کہیں عبداللہ دکھائی دے جائے' لیکن اس کی یہ اُمید پوری نہیں ہوئی۔ دور کھیتوں میں کچھ مزارعے کام کر رہے تھے اور بس۔ یوں بھی شام ہونے والی تھی اور اکا دکا لوگ جو دکھائی دے رہے تھے' وہ بھی اپنے اپنے گھروں کی جانب لوٹ رہے تھے۔

وہ مسجد پہنچے تو نانا جی شام کی اذان دینے ہی والے تھے۔ بڑی اماں نے بہت خوشی سے ان کا استقبال کیا۔

"بانو کے ابا نہیں آئے ساتھ؟" بڑی اماں نے انہیں صحن میں بچھی چارپائیوں پر بٹھا کر پنکھا چلا دیا۔

"نہیں' انہیں کچھ کام تھا۔" اماں جی نے بتایا۔

"ایک آدھ دن کو ہی آجاتا۔"

"اماں جی' اللہ کا بڑا فضل ہو گیا ہے' اُن کا کام بہت چلنے لگا ہے' اب تو بانو بھی اُن کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ کالج میں پڑھ رہی ہے ناں' روز نت نئی چیزیں سیکھ کر آتی ہے اور انہیں بتاتی جاتی ہے۔ پھر دونوں باپ بیٹی مل کر نہ جانے کیسے کیسے برتن' گملے بناتے رہتے ہیں بس اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ ہمارے بھی دن پھر جائیں۔" اماں جی نے کہا۔

"اللہ کرے ہم بڈھا بڈھی تو بس یہی دعا کرتے ہیں۔" بڑی اماں نے کہا۔ پھر انہیں خیال آیا۔

"تم دونوں کو میں لسی لا دیتی ہوں' تم وہ پیو' تو اتنی دیر میں' میں روٹیاں پکا لوں۔"

"اتنی جلدی؟ اُف میں بھول جاتی ہوں کہ میں گاؤں آچکی ہوں' لیکن پلیز بڑی اماں' میں کھانا کچھ ٹھہر کر کھاؤں گی۔ پہلے ٹھنڈے پانی سے نہاؤں گی تاکہ فریش ہو جاؤں اور گرد و غبار سے نجات ملے۔ قسم سے سفر کے دوران کم از کم من بھر گرد پھانکی ہے۔"

"اُس بے چاری کا حال تو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اتنی کمزور ہو گئی ہے۔ جب سے بھائی مرا ہے تب سے تو بالکل سُوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔" بڑی اماں نے بتایا۔

"اُسے دیکھتی ہوں تو زرینہ یاد آجاتی ہے۔ دل کٹنے سا لگتا ہے۔" اماں جی نے کہا۔

"ایک غلطی کی میری بچی نے اور اس کی سزا اس کی بیٹی بھی بھگت رہی ہے۔ اللہ نے اُسے اولاد دینی ہی تھی تو بیٹا دے دیا ہوتا۔ کم از کم لڑ جھگڑ کر اپنا حق تو وصول کر لیتا۔ پر اللہ نے دی بھی تو بیٹی چلو اس کے کام نرالے ہیں' نہ جانے اس میں کیا مصلحت ہے۔" بڑی اماں نے آہ بھری۔

"آپ ملنے تو جاتی ہیں ناں اُس سے؟ دو خط بھی آئے تھے اس کے بانو کے نام۔ ایک تو کل ہی ملا تھا۔" اماں جی نے انہیں بتایا۔

"ہر دوسرے روز وہ بلوا بھیجتی ہے تو اپنے سب کام چھوڑ کر اُس کی خاطر دوڑی چلی جاتی ہوں۔ تمہارے ابا جی کو بھی ایک دو مرتبہ ساتھ لے کر گئی تھی' انہیں ہی منت کر کے اپنے خط دے دیتی ہے وہ۔ بتا رہی تھی کہ اُس کے پہلے خط کا بھی بانو کی طرف سے جواب نہیں آیا۔"

"اماں! بانو بے چاری کیا کرے' ان کا تو کالج بھی نرالا ہے۔ پڑھائی نہیں ہوتی ان کے یہاں' بس عملی کام ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تو صبح سے شام ہو جاتی ہے پھر گھر آ کر بھی یا کالج کے کام میں لگی رہتی ہے یا پھر اپنے ابا جی کے ساتھ مدد کرانے لگتی ہے۔ اس غریب کے پاس تو ایک لمحہ نہیں ہے فرصت کا' ورنہ دل اس کا بھی بہت بے چین رہتا ہے ریشماں کے لیے۔ آپ کو تو پتا

ہے کہ یہاں آتے ہی ریشماں سے ملنے کی ضد کرنے لگتی ہے۔" اماں جی نے فوراً ماہ بانو کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اب لگ رہا ہے کہ انسان کی جون میں واپس آئی ہوں۔" ماہ بانو تولیے سے بال سکھاتی غسل خانے سے باہر نکلی۔

"چلو اب کھانا کھا لو اور سو جاؤ' سویرے اٹھنا بھی ہو گا۔" بڑی اماں نے پیار سے کہا۔

"ابھی سو جاؤں اور سویرے اٹھوں' مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ' دونوں کام ناممکن ہیں۔ ہاں کھانا ابھی کھا سکتی ہوں' کوئی گھاس واس تو نہیں پکائی بڑی اماں؟" اس نے دیگچیوں میں جھانکنا شروع کیا۔

"حد ہوتی ہے ناشکری کی۔" اماں جی نے اسے گھورا۔ "مت اس طرح جھانکا کرو دیگچیوں میں' بے برکتی ہوتی ہے۔"

"نہ ڈانٹا کرو بچی کو رضیہ!" بڑی اماں نے ان سے کہا پھر ماہ بانو سے مخاطب ہوئیں۔

"مجھے پتا تھا کہ میری بانو کو سبزی اچھی نہیں لگتی' اس لیے مرغی پکائی ہے تمہارے لیے۔"

"تھینک یو بڑی اماں!" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"یہ لڑکی بہت سر پر چڑھ گئی ہے' اس کا کوئی علاج کرنا ہی پڑے گا۔" اماں جی بولیں۔

"نہ نہ رضیہ' اپنی اولاد سے بڑھ کر کوئی پیارا نہیں ہوتا' تمہیں تب احساس ہو گا اس بات کا جب یہ بیاہ کر اپنے گھر چلی جائے گی۔"

"اماں کا بس چلے تو یہ آج ہی مجھے کسی شیدے یا گلو کے حوالے کر دیں۔ انہیں بڑی اماں تب بھی احساس نہیں ہو گا' یہ لکھوا لیں مجھ سے۔"

"اس کی زبان کو بھی لگام نہیں ہے۔" اماں بڑبڑائیں۔

"اتنی باتیں کر لیں تم نے بانو آج ریشماں کا نہیں پوچھا۔" بڑی اماں نے چنگیر اور پلیٹیں ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

ماہ بانو کے چہرے پر تناؤ کے آثار پیدا ہو گئے۔

"تھکی ہوئی ہے ناں اس لیے خیال نہیں رہا۔" اماں جی نے ایک مرتبہ پھر اس کی صفائی پیش کی۔

"میں پوچھنے ہی لگی تھی۔ ابھی کل ہی اس کا خط ملا تھا' اس سے پہلے بھی ایک ملا تھا' لیکن میں جواب نہیں دے سکی تھی۔"

"اسے تو بہت انتظار تھا تمہارے آنے کا' دن گن رہی تھی۔ مجھ سے کہتی تھی کہ نانی اماں' آپ بانو کو لکھیں کہ وہ جلد سے جلد یہاں آجائے۔" انہوں نے بتایا۔

"آج اسے چھٹیاں شروع ہوئی ہیں اور آج ہی ہم آ گئے ہیں۔ اس سے زیادہ جلدی تو

نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ہمارا کام کتنا ٹف ہے۔ پہلے میں سوچتی تھی کہ فرسٹ ایئر بہت مصیبت ہے' ہرروز کے کام کی ہرروز مارکنگ۔ ایک دن بھی چھٹی نہیں کر سکتے تھے ہم۔ فرسٹ ایئر سے نکلے تو اندازہ ہوا کہ سیکنڈ ایئر بھی کم مصیبت نہیں ہے' روز مارکنگ نہیں ہوتی' لیکن ڈیڑھ مہینے کی کلاس میں ڈیڑھ سال کا کام نپٹانا پڑتا ہے اب' پاگل ہو جاتے ہیں کام کرتے ہوئے۔''

''وہ تو مجھے پتا ہے کہ تمہارا کام بہت ہوتا ہے لیکن میں بتا رہی تھی کہ ریشماں بے چاری کی تو کوئی سگی سہیلی بھی نہیں ہے' جو کچھ ہو وہ تم ہی ہو۔ بہن بھی اور سہیلی بھی۔ پتا نہیں کیسے زندگی کے دن کاٹ رہی ہے اس قید خانے میں۔'' بڑی اماں کی آواز بھر آ گئی۔

اس ذکر سے ماہ بانو کی بھوک مر گئی تھی۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ جتنا وہ موضوع بدلنے کی کوشش کر رہی تھی بڑی اماں رہ رہ کر وہی ذکر نکال رہی تھیں۔

''کیوں بانو' کھاؤ گی نہیں کیا؟''

''نہیں' مجھے نیند آ رہی ہے۔ سفر کی تھکن بھی ہے' میں سونے جا رہی ہوں۔''

وہ اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''اندر گرمی ہو گی بانو' میں نے تمہارے لیے باہر ہی چارپائی بچھائی ہے۔'' بڑی اماں نے کہا۔

''بڑی اماں مجھے عادت نہیں ہے باہر سونے کی۔'' وہ کمرے میں گھس گئی۔

بستر پر لیٹ کر کتنی دیر تک وہ اپنے' عبداللہ اور ریشماں کے متعلق سوچتی رہی۔ پھر نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

صبح بھی وہ دیر تک سوتی رہی۔ بڑی اماں نے جلدی جگانے سے منع کر دیا تھا۔

ناشتا کرتے ہوئے اماں نے ایک مرتبہ پھر ریشماں کا ذکر چھیڑ دیا۔

''میں تمہارے انتظار میں اب تک بیٹھی ہوں بانو' ورنہ مجھے حویلی جانا تھا ریشماں سے ملنے کے لیے۔'' انہوں نے کہا۔

''میرے انتظار کی کیا ضرورت تھی' آپ چلی جاتیں۔'' وہ ناشتا کرتے کرتے رک گئی۔

''کیا مطلب؟ یونہی چلی جاتی؟ تم نے نہیں جانا کیا؟''

''جانا ہے اور چلی جاؤں گی' لیکن اس کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کی کیا ضرورت ہے' آپ چلی جاتیں' میں نانا جی یا بڑی اماں کے ساتھ پیچھے پیچھے آ جاتی۔'' وہ چڑ سی گئی۔

''تم کیوں اتنی چڑچڑی ہو گئی ہو بانو' ذرا بات کرو تو لڑنے لگتی ہو۔'' اماں نے بیزاری سے کہا۔

''پلیز اماں میں لڑتی کب ہوں؟''

اسی وقت نانا جی مسجد سے صحن میں داخل ہوئے۔

''جلدی کرو ناشتہ اور تیار ہو جاؤ۔'' اماں نے کہا۔

ناشتا ختم کر کے بھی وہ وہیں چارپائی پر ہی بیٹھی رہی۔

''کس سوچ میں گم ہو؟'' بڑی اماں نے پوچھا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ اگر میں اور ریشماں بیک وقت ڈوب رہی ہوں تو آپ لوگ کسے بچائیں گے مجھے یا ریشماں کو؟''

''اللہ نہ کرے تم دونوں میں سے کوئی ڈوبے' کیسی بدشگونی کی باتیں کرتی ہو۔'' بڑی اماں نے کہا۔

''پھر بھی اگر ایسا ہو جائے تو' مجھے یقین ہے کہ اماں ریشماں کو بچائیں گی' بلکہ آپ سب ریشماں کو ہی بچائیں گے' مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔''

''کیا فضول باتیں شروع کر دی ہیں' اٹھو تیار ہو جاؤ' وہ بے چاری کتنا انتظار کر رہی ہو گی۔'' اماں بولیں۔

''آپ جائیں اماں' مجھے نہیں جانا۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''کیا؟ ہر وقت مزاج مت دکھایا کرو بانو' جلدی اٹھو۔''

''میں نے کہا ناں اماں کہ مجھے نہیں جانا' آپ جائیں' میں کہیں اور جاؤں گی۔'' اس نے جھلا کر انداز میں کہا۔

پہلے تو اماں اسے دیکھتی رہیں' جیسے ابھی کچا چبا جائیں گی پھر دانت پیس کر بولیں۔

''مجھے اتنا بچہ نہ سمجھو بانو۔ تمہاری سب حرکتیں جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں کیوں نہیں جا رہی اور تمہیں جانا کہاں ہے۔ ذرا مجھے یہاں سے واپس ہو لینے دو' پھر دیکھو۔''

''آپ صرف جانتی ہیں اماں' سمجھتی کچھ نہیں ہیں۔ آپ کو ہر وقت اپنی بہن کی اولاد کی فکر رہتی ہے' کبھی میرے متعلق بھی سوچا ہے آپ نے کہ میری خوشی کس میں ہے۔ مجھے پتا ہے کہ جب بھی وقت پڑا آپ ریشماں کا ہی ساتھ دیں گی۔ میں آپ کی کیا لگتی ہوں؟'' اسے خود بخود ہی رونا آ گیا۔

بڑی اماں اور نانا جی ان کی گفتگو سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکے۔ اماں پہلے تو خاموشی سے اسے روتے ہوئے دیکھتی رہیں پھر ان کا دل پگھل گیا۔ اس کے قریب بیٹھ کر انہوں نے اسے خود سے لگا لیا اور اسے چپ کرانے لگیں۔

''چھوڑیں اماں' آپ کو مجھ سے کوئی محبت نہیں ہے۔ آپ جائیں ریشماں کے پاس۔'' وہ ان کو چھڑا کر کمرے میں چلی آئی۔

اماں اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئیں۔

"بانو! تم کیا سمجھتی ہو' مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں تم پر سختی کرتی ہوں' اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ مجھے تم پیاری نہیں ہو۔ مائیں اگر اولاد پر سختی کرتی ہیں تو ا بہتری کے لیے ہی کرتی ہیں ناں۔" انہوں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار کہا۔

وہ کچھ نہیں بولی' خاموشی سے بیٹھی روتی رہی۔

"میری کون سی ڈھیر ساری اولادیں ہیں' ایک تم ہی تو ہو' تم سے پیار نہیں کروں گی ت کس سے کروں گی اور جو میں تمہیں منع کرتی ہوں تو اس لیے کہ مجھے خبر ہے' یہ آگ کیسی ہے سے تم کھیلنا چاہتی ہو۔ میری بہن اس آگ میں جل چکی ہے' میں تمہیں کیسے جلنے دوں گی آگ میں۔"

"اماں! وہ وقت اور حالات مختلف تھے۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے انہیں کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے ریشماں کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔ آپ جانتی ہیں کہ پیر صاحب' اس کی ش عبداللہ کے ساتھ کرنے پر راضی نہیں ہیں۔ خود عبداللہ نے بھی کبھی ریشماں کے متعلق نہیں سو ایسے میں یوں بھی اس کی اور عبداللہ کی شادی ممکن نہیں ہے۔ میں تو تب قصوروار ہوتی' ج دونوں ایک دوسرے کو پسند کر رہے ہوتے اور میں ان کے درمیان آجاتی۔"

"بات یہ نہیں ہے بانو' عبداللہ چاہے کسی اور سے شادی کرے' لیکن یہ رشتہ اس تمہارے ساتھ جوڑا تو ریشماں کو ہی نہیں' میری مرحومہ بہن کی روح کو بھی بہت صدمہ ہوگا۔"

"اماں جی! آپ مرے ہوؤں کو ہی خوش کرتی رہیں' میری فکر چھوڑ دیں' میں صرف آ کی بہن کی خاطر اپنی خوشیاں کیوں برباد کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو اعتراض بات پر ہے' وہ کسی سے بھی شادی کرے' آپ کو اعتراض نہیں' پھر اگر وہ مجھ سے شادی کرتا۔ اس میں کیا حرج ہے؟"

"تمہاری خوش فہمی ہے بانو کہ وہ ہمارے خاندان میں رشتہ طے کریں گے۔ وہ کسی چھو خاندان میں رشتہ طے نہیں کرتے۔" اماں جی نے ایک اور اعتراض کیا۔

"ہم اٹھارھویں صدی میں نہیں رہ رہے اماں جی' وقت بہت تبدیل ہوگیا ہے' میرا خاند چھوٹا نہیں ہے۔ میرے باپ نے مجھے کم دیا ہے' لیکن حلال رزق کھلایا ہے ہمیشہ' ہم چھوٹے ہو سکتے ہیں؟"

"میرا دل تم نے بہت دکھایا ہے بانو' مجھے یہی خدشہ تھا پہلے دن سے۔ میں ان پڑھ جا میرے پاس تمہاری دلیلوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں پرانے خیالات کی عورت ہوں ہمارے ہاں خاندان کی کسی ایک لڑکی کا رشتہ ٹوٹ جاتا تھا تو سارا خاندان لڑکے والوں کے خلا

ایکا کر لیتا تھا اور کوئی بھی اپنی بیٹی اس گھر میں نہیں دے سکتا تھا۔ آج وقت تبدیل ہوگیا ہے' لیکن میں وہی پرانی عورت ہوں' میں کیسے اس جگہ اپنی بیٹی کا رشتہ دوں گی جہاں میری بہن کی بیٹی کا رشتہ ٹوٹا ہے۔" اماں نے دکھ سے کہا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اماں اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☆=====☆=====☆

عبداللہ اپنے کمرے میں بیٹھا ایم ٹی وی دیکھ رہا تھا جب زہرا اس کے پاس چلی آئی۔

"آپ کے مہمان آئے ہیں۔" اس نے اندر آکر خبر دی۔

"میرے مہمان! اوہ بانو آئی ہوگی۔" اسے اچانک خیال آیا۔

"بہت اچھا اندازہ ہے آپ کا' میں نے اسے ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا ہے۔" وہ بولی۔

وہ ڈرائینگ روم میں آگیا۔ ماہ بانو بیٹھی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

"میں صبح جاگی ہی دیر سے تھی۔ پھر اماں جان سے بحث اور نہ جانے کیا کیا۔" اس نے رسالہ واپس رکھ دیا۔

"تم اماں جی سے بحث مت چھیڑا کرو' خواہ مخواہ ان سے الجھتی ہو۔"

"میں کیا کرتی' اماں مصر تھیں کہ میں فوراً ریشماں سے ملنے چلی جاؤں' میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ For obvious reasons ویسے ہی میری اماں کی ناک بہت تیز ہے' فوراً ہی خطرے کی بو سونگھ لیتی ہیں۔ پھر میں نے بھی کہا ہے کہ آج نہیں تو کل مجھے ان سے یہ ذکر تو کرنا ہی ہے تو آج ہی کیوں نہ کر لیا جائے۔" وہ بولی۔

"تم کیوں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتی ہو۔ جا کر اس سے مل آتیں۔ تمہیں کسی کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے ناں۔ میرے لیے ریشماں کا سامنا کرنا بہت مشکل ہے۔ حالانکہ میں نے خود کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ میں غلطی پر نہیں ہوں۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جو غلط ہو' لیکن عبداللہ پھر بھی ریشماں کو بہت دکھ ہوگا۔ میں سب کو Convince کر سکتی ہوں مگر اسے کیسے کروں۔"

"تمہیں کسی کو کنوینس کرنے کی ضرورت نہیں ہے ریشماں سمیت اور میرے سامنے اس کا نام پھر مت لینا۔ میں تمہاری بے تکی باتوں سے عاجز آچکا ہوں۔ اب جب فیصلہ کر لیا ہے تو پچھتاتی کیوں ہو؟" عبداللہ نے کہا۔

"نہیں' میں پچھتا نہیں رہی' تم بھی تو کچھ نہیں سمجھتے' کوئی بھی نہیں سمجھتا میری بات۔"

"آتے ہی فضول باتیں شروع کر دیں تم نے۔ میں نے تمہیں بتانا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اُما کا فون آیا تھا۔"

"اُما کا' کیا کہہ رہی تھی؟" ماہ بانو کھل اٹھی۔

"کہہ رہی تھی کہ سکھر پہنچنے پر اسے پتا چلا کہ اس کی ممی نے پہلے سے انڈیا جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا اور اب وہ ایک آدھ دن میں ان کے ساتھ انڈیا جا رہی ہے۔"

"کتنے دن کے لیے جا رہی ہے؟"

"شاید چھٹیاں وہیں گزارے۔ تم اس سے آج فون پر بات کر لینا۔" عبداللہ نے کہا۔

"اچھا۔" پھر اسے خیال آیا۔

"زینی سے تو ملواؤ۔"

"وہ گھر میں بہت بور ہو رہی تھی' بلکہ بوریت تو بہت چھوٹا لفظ ہے' یہاں اس پر پابندیاں بھی بہت ہیں' تنگ آ کر ماموں کی طرف گئی ہے۔" اس نے بتایا۔

"کب تک آئے گی وہاں سے؟"

"آج ہی کسی وقت آ جائے گی۔"

"تمہارے ماموں وغیرہ کیسے ہیں؟ تمہارے خاندان کی طرح ہی ہیں' یا وہ مختلف ہیں۔"

"نہ بہت قدامت پسند' نہ بہت روشن خیال۔ اصل میں ماموں جتنے بھی ہیں' ان سب کے بچے ہم سے کافی بڑے ہیں۔ شادی شدہ ہیں سب اور آگے سے ان کے بھی بچے ہیں' کچھ چھوٹے' کچھ بڑے ہر سائز کے' زینی بچوں کے ساتھ کھیلنے گئی ہے۔"

"اس کے سلسلے میں کچھ معاملات بہتر ہوئے؟"

"بہتر تو ہوئے یا نہیں' لیکن اس نے حالات بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" عبداللہ نے کہا اور اسے زینی کے بڑی حویلی چلے جانے کا قصہ سنانے لگا۔

"Very daring i must say" ماہ بانو نے تبصرہ کیا۔

"لیکن وہ وہاں گئی کیوں؟"

"پتا نہیں' آج آئے گی تو پوچھوں گا۔ گھر میں کسی نے اس سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ ہمارے گھر میں کچھ اسی طرح ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔"

"تمہاری اور بابا جان کی بات چیت ہوئی؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"نہیں' ابھی تک نہیں ہوئی۔ البتہ اماں جان اس کے سلسلے میں بہت پریشان ہیں۔ انہیں بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ سبط کو پسند کرتی ہے اور تب سے ہی وہ بہت فکر مند ہیں۔"

"میں بات کروں تمہارے بابا جان سے؟"

"Oh, sure, why not میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا' باقی سب کے لیے تم اس گھر کی فرد کل بنو گی۔ میرے لیے تو تم آج ہی اس کی ایک فرد بن چکی ہو۔"

وہ مسکرا دی۔

"اچھا یہ بتاؤ عبداللہ کہ تمہارے گھر میں کسی کو میرا اس طرح آنا برا تو نہیں لگے گا؟ پہلے میں آئی تھی تو بات دوسری تھی' تب باقی دوست بھی یہاں موجود تھے اور پھر تب تک میرے میں بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی یا تھی بھی تو میں اسے سمجھ نہیں سکی تھی مگر اب بہت فرق ہے۔"

"اول تو یہ کسی کو برا نہیں لگے گا۔ ہمارے گھر میں بہت کم باتوں پر برا منایا جاتا ہے۔ دوسرا اگر کسی کو برا لگا تب بھی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' جو میرے مسائل ہیں' میں سنبھال سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"زہرا اور اماں جان کہاں ہیں؟"

"اماں جان تو ماموں کی طرف گئی ہوئی ہیں زینی کو لینے کے لیے اور زہرا یہیں کہیں میں پتا کرواتا ہوں۔"

تھوڑی ہی دیر میں زہرا چائے کی ٹرالی کے ساتھ ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔

"میں نے سوچا کہ آج بانو کو اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں کھلاتی ہوں۔" زہرا نے کہا۔

"دھیان سے بانو! اس نے ذرا نیا ہی کچن میں جانا شروع کیا ہے۔" عبداللہ نے اسے خبردار کیا۔

"گویا تجربات کے لیے ہمیں گنی پگ بنایا جا رہا ہے۔" ماہ بانو ہنسی۔

"بھائی کی باتوں میں مت آنا' میں اتنی گئی گزری بھی نہیں ہوں۔ بہت اچھی چیزیں بناتی ہوں۔" اس نے ٹرالی ماہ بانو کے سامنے رکھ دی۔

"لیکن زہرا' میں اتنا کچھ نہیں کھایا کرتی' پوچھ لو بے شک عبداللہ سے۔" ماہ بانو نے بھری ہوئی ٹرالی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ ایک چپس کے پیکٹ اور ایک پیپسی کی بوتل پر گزارا کرتی ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

"مگر آج تمہیں سب کچھ کھانا پڑے گا۔ چاہے تھوڑا ہی سہی' لیکن ہر چیز ضرور چکھنی پڑے گی اور ہاں چائے بھی خود ہی بنانی پڑے گی' بلکہ مجھے اور بھائی کو بھی دینی ہوگی۔ قسم سے میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے بیکنگ کے لیے کھڑے رہ رہ کر۔ اب مزید کام نہیں ہوگا مجھ سے۔" زہرا بولی۔

"اس میں اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟" ماہ بانو نے ہاف پلیٹیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس ٹرالی میں موسم اور بے موسم کی ہر چیز مل جائے گی تمہیں۔ حیران مت ہونا' میں کوکنگ سیکھ رہی ہوں' اس لیے ہر قسم کی ڈش ٹرائی کرتی رہتی ہوں۔ پتا ہے کل میں نے اسنیکس بھی بنائے تھے۔" زہرا نے کہا۔

"اسنیکس! اتنی گرمی میں؟" ماہ بانو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی تو کہہ رہی تھی کہ حیران مت ہونا' سب کچھ سیکھ رہی ہوں آج کل۔"

"اور وہ کھائے کس نے؟ اس موسم میں تو وہ کوئی نہیں کھا سکتا۔" ماہ بانو بولی۔

"بھائی اور زینی زندہ باد۔ یہ دونوں ایسی ہر چیز کھا لیتے ہیں۔ بہت خوش خوراک دونوں۔ کل تو خیر زینی نہیں تھی' ہوتی تو بھائی سے بھی پہلے ہاتھ صاف کرتی ان پر۔"

"ویسے سب کچھ اچھا بنا ہوا ہے' لیکن ایپل پائی بہت زبردست ہے۔" ماہ بانو نے کہا۔

"تھینک یو۔" زہرا بولی۔

"تم سیکھ لو پھر بانو کو بھی سب ترکیبیں لکھ کر دے دینا۔ یہ بھی بہت نکمی ہے کچن معاملے میں۔" عبداللہ نے ہنس کر کہا۔

"مجھ سے نہیں گھسا جاتا کچن میں' وہ بھی اتنی گرمی میں۔ پھر کالج کا کام بھی اتنا ہوتا میرے لیے تو ممکن ہی نہیں ہے کہ اتنے کام کے ساتھ کچن میں جھانک بھی سکوں۔" ماہ بانو صاف انکار کر دیا۔

"تم کس ایئر میں ہو بانو؟" زہرا نے پوچھا۔

"میں سیکنڈ ایئر میں ہوں۔"

"اور تمہارا تھیسس ہوگا فورتھ ایئر میں۔" زہرا نے کہا۔

"ابھی دو سال رہتے ہیں تھیسس میں' ابھی سے مت ڈراؤ۔ میری جان نکل جاتی ہے یہ سن کر۔" ماہ بانو نے کہا۔

"اتنا بھیانک ہوتا ہے آپ کا تھیسس؟ ویسے بھائی کی بے فکری دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ یہ اتنی ڈراؤنی چیز ہوتی ہوگی۔"

"تمہارا بھائی اس لیے بے فکر ہے کیونکہ خاصا لائق اسٹوڈنٹ ہے۔ میں اتنی لائق نہیں ہوں' اور عبداللہ نے تو تھیسس کا موضوع بھی بہت ہی ٹف چنا ہے۔ میری تو اب تک سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ وقت پر کام کیسے ختم کرے گا۔" ماہ بانو نے کہا۔

"باقی سب کے موضوع آسان ہیں؟" زہرا نے دریافت کیا۔

"نہیں' سبھی کے مشکل ہیں۔ آخر تھیسس ہے' کوئی مذاق تو نہیں ہے۔"

"تو سب کیا کر رہے ہیں؟ کیا موضوع ہیں سب کے؟" زہرا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تم ہی بتاؤ بانو! کیونکہ یہ آرٹ کے معاملے میں بالکل ان پڑھ ہے' اسے سمجھانا میرے بس سے باہر ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' ٹھیک ہے کہ میں سائنس اسٹوڈنٹ ہوں' لیکن ایسا نہیں کہ آرٹ کو سمجھ ہی نہ سکوں۔" زہرا نے منہ بنایا۔

"ٹھہرو' میں تمہیں بتاتی ہوں۔ ان کی کلاس میں چار اسٹوڈنٹ ہیں' جیمز اپنا کام کر رہا ہے Tera Wta میں۔"

"اور وہ کیا ہوتا ہے؟" زہرا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دریافت کیا۔

"اس کا مطلب ہوتا ہے Baked Clay یعنی چکنی مٹی سے پہلے مجسمہ یا کوئی بھی چیز بنائی جاتی ہے۔ پھر اسے بیک کر لیتے ہیں اور جیمز نے اپنے کام کے لیے انسپائریشن لی ہے موہنجوداڑو سے اور وہ بہت چھوٹے سائز کے' تم منی ایچر بھی کہہ سکتی ہو' بہت چھوٹے فگرز بنا رہا ہے۔"

"تھوڑا تھوڑا سمجھ میں آیا ہے۔ خیر' جتنا سمجھ میں آیا ہے' میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" زہرا نے کہا۔

"پھر ظہیر ہے' وہ کاپر اور برونز میں زیورات ڈیزائن کر رہا ہے۔ یہ تو آسان سی بات ہے' تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی۔"

"ہاں' ایسی جیولری میں نے بہت دیکھی ہے' بلکہ پہنی بھی ہے۔"

"میں نے کہا بھی تھا ظہیر سے کہ سب یہی کہیں گے کہ یہ پرانا کام ہے' گھسا پٹا ہے' لیکن وہ مانا ہی نہیں۔" ماہ بانو نے عبداللہ سے کہا۔

"دیکھتے ہیں کہ اس کے ذہن میں کیا آئیڈیا ہے' ہو سکتا ہے' وہ کوئی نئی چیز دے۔"

"مشکل ہے' وہ کتنی ہی نئی چیز دے گا' لیکن سننے اور دیکھنے والے کے ذہن میں پہلے ہی یہ خیال بیٹھ چکا ہوگا کہ یہ پرانا موضوع ہے۔ خیر چھوڑو۔" پھر وہ زہرا سے مخاطب ہوئی۔

"پھر ایڈی ہے' وہ اپنا کام کر رہا ہے فائبر گلاس میں اور اس کا موضوع شاید Nude ہے' ہیں عبداللہ!"

"نہیں اس کا موضوع ہے Intricacies Of Female Figure دراصل نیوڈز کہنے سے بات کچھ Crude سی لگتی ہے۔" وہ بولا۔

"اور بھائی کیا کر رہے ہیں؟" زہرا نے پوچھا۔

"عبداللہ پتھروں پر کام کر رہا ہے۔ پہلے میں تمہیں تکنیک بتا دوں' پھر تمہاری سمجھ میں آئے گی کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ ہمارے پاس دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک کہلاتا ہے Additive Process اور دوسرا ہوتا ہے Subtractive جیسے نام سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ پہلی قسم میں ہم آہستہ آہستہ مٹی یا پلاسٹر آف پیرس یا کسی بھی چیز سے ایک شکل بناتے جاتے ہیں۔ مثلاً ہمیں کسی انسان کا مجسمہ بنانا ہے چکنی مٹی سے تو ہم تھوڑی تھوڑی مٹی لگا کر بالآخر شکل یا مجسمہ مکمل کر لیتے ہیں۔ لیکن جو دوسری صورت ہے Subtractive Process کی' اس میں ہم کسی چیز کو کاٹ کر اس کی شکل واضح کرتے ہیں۔ مثلاً ہمارے پاس ایک پتھر ہے اور ہمیں اس سے مجسمہ بنانا ہے تو اس پتھر کو کاٹ کر ہم مجسمے کی شکل میں لاتے ہیں اور یہ بہت مشکل کام ہے' لیکن کیونکہ تمہارا بھائی بہت مشکل پسند ہے' اس لیے اس نے اپنے تھیسس کے لیے یہی طریقہ اختیار

کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"
"یہ تو واقعی سوچنے میں ہی اتنا مشکل لگ رہا ہے' کرنے میں کتنا مشکل ہوگا۔" زہرا نے
تبصرہ کیا۔
"عبداللہ نے اپنے کام کے لیے انسپائریشن لی ہے زمانہ قبل از تاریخ سے' یعنی پتھر کے
زمانے سے۔ یہ بنائے گا ریلیف۔ پتا ہے ریلیف کیا ہوتا ہے؟"
"جو انگریزی میں ہوتا ہے وہ پتا ہے' جو آرٹ میں ہوتا ہے' اس کا نہیں پتا۔ پر
دیواروں پر کچھ بناتے ہیں۔" زہرا نے کہا۔
"کسی بھی سپاٹ سطح پر جب ہم کوئی نقش ابھار کر بناتے ہیں تو اسے ریلیف کہتے ہیں۔ یہاں
تو عبداللہ ریلیف بنائے گا اور مجسموں کو کمپوز کرے گا نئے طریقے سے۔ ویسے تکنیک تو بہت پرانی
ہے' ظاہر ہے قبل از تاریخ کی تکنیک ہے' لیکن اس کا موضوع اس صدی کا' آج کے دور کا۔
یعنی Contemporary Issue ہے' بلکہ ہمارے دور' ہمارے ملک کا اہم ترین اور نازک
ترین مسئلہ ہے۔ یوں تو اسے سوشل ٹیبو سمجھا جاتا ہے' لیکن جب تک ہم اسے فیس نہیں کریں گے
تب تک یہ حل بھی نہیں ہوگا۔"
"اور وہ موضوع کیا ہے؟"
"موضوع ہے ریپ...... زنا بالجبر اور اس موضوع کو ہینڈل کرنا اور اس تکنیک میں ہینڈل
کرنا اچھا خاصا پریشان کن کام ہے۔ پتا نہیں تمہارا بھائی کیوں اس قدر بے فکر بیٹھا ہوا ہے؟"
"فکر کرنے سے کیا ملے گا؟ میں خواہ مخواہ کی فکریں نہیں پالتا تمہاری طرح۔" عبداللہ نے
کہا اور پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔
"یہ اماں اور زینی کہاں رہ گئی ہیں؟"
"کہا تو تھا انہوں نے کہ کھانے سے پہلے ہی آئیں گی۔" زہرا بولی۔
"تم بابا جان سے ملنا چاہتی تھیں' چلو تمہیں ان سے ملوا دوں۔" عبداللہ اٹھ کھڑا ہوا۔
ماہ بانو بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ڈرائینگ روم سے نکل کر
راہداریوں سے ہوتے ہوئے اسٹڈی میں پہنچ گئے۔
"یہ بابا جان کی اسٹڈی ہے' تم یہاں بیٹھو' میں انہیں لاتا ہوں۔"
وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔
ماہ بانو شیلفوں میں رکھی مختلف کتابیں دیکھنے لگی۔ اسٹڈی میں اس کی دلچسپی کی بہت
چیزیں موجود تھیں۔ آرٹ سے متعلق کتابیں' ویڈیو کیسٹس اور نہ جانے کیا کیا۔ ایک کمپیوٹر
اور ایک ٹی وی جو بڑی سی ڈش کے ساتھ منسلک تھا۔
ابھی وہ اسٹڈی کا جائزہ لے رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور عبداللہ اپنے بابا جان کے ساتھ

داخل ہوا۔
"بابا جان! یہ بانو ہے' میرا مطلب ہے ماہ بانو اور بانو یہ میرے بابا جان ہیں۔" عبداللہ
نے تعارف کرایا۔
اس نے انہیں سلام کیا۔
"جیتی رہو۔" انہوں نے کہا اور بیٹھ گئے۔ وہ دونوں بھی بیٹھ گئے۔
"ویسے بانو! تمہارا غائبانہ تعارف ہے بابا جان سے۔" عبداللہ بولا۔
"بالکل' ہم تو بیٹا آپ کے جتنے شکرگزار ہوں' اتنا ہی کم ہے۔ آپ نے ہماری بہت مدد کی
تھی' اگر اس دن آپ نے عبداللہ کو نہ بتایا ہوتا تو بہت بڑا حادثہ رونما ہو سکتا تھا ہمارے
ساتھ۔" انہوں نے کہا۔
"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں' مجھے تو بس اتفاقاً علم ہوا تھا اور میں نے عبداللہ کو بتا دیا۔
اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا میں نے۔" اس نے کہا' پھر اسٹڈی کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔
"آپ کے پاس تو زبردست کولیکشن ہے ہر موضوع پر۔ ان کتابوں کو دیکھ کر اندازہ
نہیں ہوتا کہ آپ کا اصل سبجیکٹ کیا ہے۔"
"دراصل زندگی مسلسل سیکھنے کا عمل ہوتی ہے۔ تعلیم تو میری کچھ زیادہ نہیں ہے' لیکن کوشش
ہمیشہ یہی رہی ہے کہ نئی چیزیں' نئے علوم ضرور سیکھیں۔ ان بچوں سے بھی یہی کہتا ہوں' لیکن یہ
ذرا کم ہی سنتے ہیں۔ ویسے میرے سبجیکٹس تھے لٹریچر اور فلاسفی' اب ہر چیز پڑھتا ہوں۔"
"لگتا ہے آپ کو آرٹ سے بھی دلچسپی ہے۔" ماہ بانو نے کہا۔
"ہاں' لیکن اس دلچسپی سے مختلف جو عبداللہ کو ہے۔" وہ مسکرائے۔
"بابا جان آرٹ کی کتابی دنیا میں رہتے ہیں اور میں عملی دنیا میں ہوں۔ یہ فرق تو موجود
ہے اور رہے گا۔" عبداللہ نے کہا۔
ماہ بانو ہولے سے ہنس پڑی۔ "یہی فرق مجھ میں اور ابا جی میں بھی ہے۔ ویسے تو وہ ایک
حد تک آرٹ کی عملی دنیا سے بھی وابستہ ہیں' لیکن یہ ان کا خیال ہے' میں اس سے ذرا کم ہی متفق
ہوں۔"
عبداللہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
"بانو! تم بابا جان کے ساتھ باتیں کرو' مجھے تھوڑا سا کام ہے' ابھی آ جاؤں گا۔ ویسے تم بور
نہیں ہو گی...... بابا جان کی کمپنی میں۔ چاہو تو ان سے اختلاف بھی کر لو۔ ہاں کتابوں سے ہٹ کر
جب عملی زندگی میں داخل ہو جائیں تو بعض اوقات انہیں اختلاف رائے اچھا نہیں لگتا۔ بہرحال
یہ اسٹڈی ہم سب کے لیے ہائیڈ پارک ہے' کیونکہ یہاں بابا جان ہر چیز کو دلیل پر پرکھ کر دیکھ سکتے
ہیں۔ لاؤنج اور بیڈ رومز میں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

''عبداللہ!'' انہوں نے مسکراتے ہوئے سرزنش کے انداز میں کہا۔

وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔

''مجھے فلسفے سے بنیادی اختلاف ہی یہ ہے کہ فلسفی اتنے زیادہ Logical ہو جاتے ہیں کہ جذبات کا خون کر دیتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ دنیا کو جذبات سے محروم کر رہے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے' فلسفہ تو ہمیں زندگی کے اسرار و رموز سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''میرا ارادہ بحث کرنے کا نہیں تھا۔ میں صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ آپ کا اختلاف رائے کتنا زوردار ہوتا ہے تاکہ اسی حساب سے اپنا دفاع تیار کر سکوں' لیکن آپ نے تو بہت نرم و ملائم قسم کا اختلاف کیا ہے۔''

بابا جان بھی مسکرا دیے۔

''بانو بیٹا! جب زندگی کے اتنے برس اس انداز میں گزارے جائیں' جس طرح میں نے گزارے ہیں تو ندی کے پانی کا شور کم ہو جاتا ہے۔ وہ جا کر دریا میں اور دریا سمندر میں مل جاتا ہے' گہرائی بڑھ جاتی ہے' سکون بڑھ جاتا ہے' جوار بھاٹے اٹھتے ہیں' موجیں چڑھتی بھی ہیں اترتی بھی ہیں' لیکن ندی کے پانی اور سمندر کی موجوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

''ہوں۔'' وہ ان کی طرف دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

''میرا آپ سے ملنے کو دل چاہتا تھا' لیکن ایک انجانا سا خوف تھا کہ پتا نہیں آپ کیسے ہوں گے...... بزرگوں سے ملتے ہوئے انسان کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اصل میں' میں نصیحتوں سے سخت الرجک ہوں اور مجھے یہی ڈر لگتا ہے کہ اِدھر میں نے کوئی بات کہی اور اُدھر کوئی نصیحت سننے کو مل گئی' لیکن آپ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے یہ خوف ختم ہو گیا ہے۔''

''جب میں آپ کی عمر کا تھا تو مجھے بھی نصیحتیں پسند نہیں تھیں' میں بھی ان سے اسی طرح الرجک ہوتا تھا' یہ عمر کا تقاضا ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''پھر تو آپ اب کسی کو نصیحت نہیں کرتے ہوں گے۔ مجھے ایسے لوگ اچھے لگتے ہیں جو اپنا پرانا وقت بھولتے نہیں ہیں۔''

''نہیں نصیحت تو کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہر عمر کا اپنا تقاضا ہوتا ہے۔ آپ کی عمر کے لوگوں کو نصیحتیں سننا اچھا نہیں لگتا اور میری عمر کے لوگوں کو اپنے تجربات کے حوالے سے نصیحتیں کرتے رہنا اچھا لگتا ہے۔ یہ زندگی کا ایک سائیکل ہے' ایسے ہی چلتا رہے گا۔'' وہ مسکرا دیے۔

''یعنی آج سے تئیس چوبیس سال بعد میں بھی ایسی ہی ہو جاؤں گی؟ نہیں میں ایسی نہیں ہوؤں گی۔''

''اگر ہو گئیں تو اس وقت مجھے ضرور یاد کرنا' کیونکہ شاید اس وقت میں نہ ہوں۔''

''اللہ نہ کرے' آپ کیوں نہ ہوں؟''

''اچھا' وہ آپ اپنا دفاع کس غرض سے تیار کرنا چاہتی تھیں؟'' وہ بات کو اصل موضوع کی طرف لے آئے۔

''اگر یہ سچ مچ ہائیڈ پارک ہو تو بلا جھجک کہہ دوں گی' ورنہ پہلے جان کی امان طلب کرنی پڑے گی۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''یہ ہائیڈ پارک نہ ہو' تب بھی میں اتنا خونخوار نہیں ہوں' آپ بات کریں۔'' انہوں نے سگار سلگایا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

''مجھے یقین ہے کہ آپ اتنے Logical نہیں ہوں گے کہ منطق کی تلوار پر جذبات کا خون کر دیں۔''

''میں ان فلسفیوں میں سے نہیں ہوں۔'' انہوں نے دلچسپی سے کہا۔

وہ بھی ماہ بانو کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''آپ کو عبداللہ نے کچھ بتایا کہ میں کس موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں؟''

''نہیں۔''

''اچھا۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

''مجھے عبداللہ نے زینی اور سبط حسن کے متعلق بتایا تھا۔''

ان کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی' لیکن فوراً ہی انہوں نے اپنے تاثرات چھپا لیے۔

''پھر......؟''

''آپ کو اچھا نہیں لگا ہو گا کہ میں آپ کے خاندان کے معاملات میں مداخلت کر رہی ہوں۔''

''نہیں' میرے پاس کوئی تخت و تاج تو نہیں ہے جس کا عبداللہ وارث ہو' لیکن وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور اگر اسے معلوم ہے کہ آپ یہاں کیا بات کرنے آئی ہیں اور اسے اس پر اعتراض نہیں ہے' تو مجھے بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنے بیٹے پر بہت اعتماد ہے۔'' وہ سگار انگلیوں کے درمیان گھماتے ہوئے بولے۔

''مجھے سب حالات کا پتا ہے۔ تھوڑا سا اس لیے بھی کہ ریشماں میری خالہ زاد بہن ہے اور کچھ اس لیے کہ عبداللہ میرا دوست ہے۔ میں وہ تمام حالات دہرا کر وقت ضائع نہیں کروں گی۔ صرف اتنا کہوں گی کہ اس معاملے میں آپ بہت زیادہ لوجیکل ہو رہے ہیں اور زینی کے جذبات کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ اس قسم کا سلوک کر کے آپ زینی کے ساتھ

کوئی ہمدردی کر رہے ہیں۔''

''بانو بیٹا! زینی ابھی اپنا برا بھلا نہیں سوچ سکتی۔ میں جو کچھ اس کے لیے چاہتا ہوں' جہاں اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں' وہاں وہ زیادہ خوش' زیادہ محفوظ رہے گی۔ وہ لوگ بہت اچھے ہیں' تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے ہیں۔ ان کے گھر کا سیٹ اپ اور ماحول بھی ہم سے ملتا جلتا ہے۔ میں بھی تو اس کی بہتری کے لیے بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔''

''آپ نے پھر منطق کا سہارا لے لیا بابا جان' چونکہ وہ لوگ اچھے ہیں' اس لیے زینی خوش رہے گی۔ آپ بتائیں گے کہ یہ فارمولا آپ نے کیسے ایجاد کیا؟ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ خوش رہے گی؟'' ماہ بانو نے کہا۔

''زندگی میں ہر چیز کو جذباتی نقطہ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ جذبات بہت وقتی چیز ہوتے ہیں۔ شروع میں شاید زینی کو میرا فیصلہ اچھا نہ لگے' لیکن جب وہ غیر جانبداری سے جائزہ لے گی تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے اس کے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔''

''آپ نے تو فیصلہ کر بھی لیا' اب میں جتنا بھی آپ کو کیوں نہیں کنوینس کر لوں گی' آپ میری بات مانیں گے ہی نہیں۔ مجھے یہ بتائیں بابا جان کہ زینی کب غیر جانبداری سے جائزہ لے گی' کبھی نہیں وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی اور ابھی دو دن پہلے ہی ہم تین دوست باتیں کر رہے تھے میری دوست نیہاں نے بہت اچھی بات کہی تھی۔

ہم بھی غلط اور صحیح فیصلے کی بات کر رہے تھے تو اس نے کہا تھا کہ یہ تو کبھی کوئی نہیں جان سکتا کہ اس کا فیصلہ صحیح ہے یا غلط اور صحیح یا غلط ہوتا کیا ہے؟ صحیح وہ چیز ہے' جس سے مستقبل میں فائدہ ہوتا ہو اور غلط وہ ہے جس سے آئندہ کبھی نقصان اٹھانا پڑے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غلط صحیح...... دونوں Relative Terms ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ صحیح درحقیقت صحیح اور نہ غلط' غلط۔

بہت ممکن ہے بابا جان کہ آپ اپنے فیصلے کو ساری زندگی صحیح سمجھتے رہیں اور زینی محض آپ کی عزت کی خاطر آپ کے فیصلے کو غلط سمجھنے کے باوجود یہ سمجھوتا کر لے اور باقی تمام زندگی سمجھتی رہے کہ اس نے ایک غلط فیصلے کو مان کر نقصان اٹھایا ہے۔''

''آپ کی گفتگو بہت دلچسپ ہے۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ آپ سے زیادہ باتیں کی جائیں لیکن مجھے کچھ کام ہے' مجھے یقین ہے کہ آپ آئندہ جب بھی آئیں گی تو مجھ سے ضرور ملیں گی۔'' بابا جان نے واضح طور پر گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کا اشارہ دے دیا۔

''ایک منٹ بابا جان! آپ کا کوئی کام بھی زینی کے مستقبل سے زیادہ اہم نہیں ہوگا۔ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ آپ اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہیں؟''

''بانو بیٹا! میں نے اس سلسلے میں بہت سوچا ہے۔ حالات آپ بھی جانتی ہیں بیٹا!

موضوع پر کوئی بحث کرنا ہی نہیں چاہتا' ورنہ میں آپ کو مطمئن کر سکتا تھا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ آپ کو بھی زینی کی فکر ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''گویا آپ فیصلہ کر چکے ہیں۔'' وہ بولی پھر قدرے توقف سے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ میں آپ کو قائل کر لوں گی' لیکن افسوس کہ نہیں کر سکی۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلنے لگی پھر واپس پلٹی۔

''آپ ایک منٹ مجھے دے سکتے ہیں بابا جان؟ زینی کے لیے نہیں' میرے لیے۔''

''اوہ شیور......!'' انہوں نے کہا۔

''میں ایک معمہ حل کر رہی ہوں' حل نہیں ہو رہا۔'' وہ بولی۔

''کون سا معمہ؟ ویسے میں ہر روز اخباروں میں آنے والے پزلز ضرور حل کرتا ہوں' بڑھاپے میں یہ مشغلہ دلچسپ لگتا ہے۔''

''یہ ذرا مختلف ہے۔'' اس نے کہا۔

''دکھائیں کیسا معمہ ہے؟'' انہوں نے دلچسپی سے اس سے کہا۔

کام تو انہیں کوئی خاص تھا نہیں۔ اس وقت جو انہوں نے کام کا کہا تھا تو اس لیے کہ وہ گفتگو ختم کرنا چاہتے تھے۔

ماہ بانو نے بیگ کھول کر ایک خاکی پھولا ہوا لفافہ نکال لیا۔

''کسی کتاب میں ہے؟'' انہوں نے خاکی لفافے کی طرف دیکھ کر کہا۔

ان کا خیال تھا کہ لفافے میں کوئی کتاب ہے۔

''نہیں' یہ معمہ کسی کی زندگی کا ہے۔ بہت پہلے کی بات ہے' ایک لڑکی ہوا کرتی تھی' بہت خوبصورت عام فلمی سی لو اسٹوری تھی اس کی۔ گاؤں کی لڑکی' پڑھا لکھا لڑکا' ظالم سماج اور کچھ بدقسمتی۔ نہ تو اس میں کوئی نیا پن ہے' نہ ہی کوئی ایسا گوشہ جس کی کسی کو خبر ہی نہ ہو سکے' پھر بھی ایک گرہ ہے۔''

بابا جان الجھن سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''یہ دیکھیں!'' وہ صوفے کی ہتھی پر بیٹھ گئی اور لفافے سے باری باری چیزیں نکال کر صوفے پر ڈھیر کرتی گئی یہ...... ایک پرفیوم کی شیشی خالی ہے۔ یہ کچھ ٹوٹی ہوئی کانچ کی چوڑیاں ہیں' یہ کچھ سوکھے پھول ہیں۔ اس لفافے میں کچھ کاغذوں کی راکھ ہے' یہ سونے کی زنجیر ہے' ویسے ٹوٹی ہوئی ہے۔ یہ کسی کی قمیص کا نیلا بٹن ہے' اور یہ جو اوڑھنی ہے غالباً سرخ رنگ کی تھی' پرانی ہے اس لیے رنگ اڑ گیا ہے اور یہ وہ رومال ہے جو اس لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کو دینے کے لیے کاڑھا تھا۔ چچ...... چچ...... بے چاری کی بدقسمتی کہ دے نہیں سکی۔''

بابا جان کا چہرہ پرسکون تھا' لیکن آنکھوں میں جوار بھاٹا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں بانو بیٹا؟'' بالآخر انہوں نے کہا۔

''میں تو کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ میں صرف آپ کی مدد سے ایک معمہ حل کرنا چاہتی ہوں اور وہ معمہ یہ ہے کہ کیا جذبات واقعی وقتی چیز ہوتے ہیں؟ اگر جذبات وقتی چیز ہوتے ہیں تو کیا ک اور سے شادی کرنے کے بعد وہ عورت اپنے بوائے فرینڈ کو بھول گئی ہوگی؟ اس بات کا جواب م نہیں سکا مجھے۔ وہ عورت میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے مرگئی تھی یا شاید قتل کر دی گئی تھی یا پھ شاید اس نے خودکشی کر لی تھی۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے بابا جان اگر کسی کو خودکشی پر مجبور کر د جائے' میرا مطلب ہے کہ حالات ایسے بنا دیے جائیں کہ زندہ رہنا اس کے لیے محال ہو جا اور وہ خودکشی کر لے تو کیا یہ عمل خودکشی کہلایا جائے گا یا قتل؟ پتا نہیں تکنیکی سا سوال ہے۔''

بابا جان صوفے پر بکھری چیزوں پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔

''میرا خیال ہے بابا جان کہ مرد بہت لوجیکل اور عورتیں بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ شاید یہ خیال غلط ہو اور خیال تو کسی کا بھی غلط ہو سکتا ہے' لیکن میرا اندازہ ہے کہ مردوں کے لیے محب بالکل ایسی ہی چیز ہے جیسی ......'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''جیسے کسی Object یا کسی چیز کو پسند کر لیا جائے مثلاً ایک کار کے ہوتے ہوئے دوسر کار پسند آ سکتی ہے یا ایک حویلی کے ہوتے ہوئے ایک اور مکان بنایا جا سکتا ہے' مگر عورتوں ک لیے بات قدرے مختلف ہوتی ہے۔ کم از کم میرا یہی خیال ہے' جو بہت بہادر ہوتی ہیں' وہ نقا چڑھا کر خوشی کا اظہار کرتی رہتی ہیں' لیکن کچھ عورتیں اتنی بہادر نہیں ہوتیں' وہ مر جاتی ہیں' قتل دی جاتی ہیں یا پھر خودکشی کر لیتی ہیں۔''

بابا جان نے نگاہیں اٹھائیں۔

''بانو بیٹا! آپ جیتیں' میں ہارا۔''

اس نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

''میں یہ چیزیں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟''

''نہیں بابا جان! آپ کو دکھ ہی ہوگا۔ میں نہیں چاہتی تھی' لیکن میں نے آپ کے زخم کر دیے۔ جو زندگی جیسے چل رہی ہے اسے ویسے ہی چلنے دیں۔ ماضی میں رہنے سے حال تکلیف ہوتا ہے اور اپنی تکلیف میں ہم بہت سی وہ باتیں یاد رکھتے ہیں جو یاد نہیں رکھنی چاہئیں اور وہ بھ جاتے ہیں' جن کا یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے۔''

اس نے سب چیزیں واپس خاکی لفافے میں ڈال کر لفافہ بیگ میں رکھ لیا۔

''ان میں سے کسی بات کی عبداللہ کو خبر نہیں ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آئی۔ ایم سوری بابا جان!''

''اِٹس آل رائٹ بیٹا! آپ کی کمپنی بہت دلچسپ ہے۔ یہاں آتی رہنا اور جب بھی آ

ے ضرور ملنا۔'' وہ مسکرائے۔

''تھینک یو بابا جان!'' وہ بھی مسکرا کر باہر نکل آئی۔

عبداللہ اور زہرا باہر لاؤنج میں بیٹھے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اندر داخل ہوئی اور عبداللہ پر نظر پڑتے ہی ہنس پڑی۔

''کیا رہا؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

ماہ بانو وکٹری کا نشان بنا کر ہنستے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

''سچ مچ مجھے یقین نہیں آرہا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''بانو تم زینی اور سبط کے متعلق کہہ رہی ہو؟'' زہرا نے بے یقینی سے کہا۔

''بالکل میں اسی کے متعلق کہہ رہی ہوں۔''

زہرا اپنی جگہ سے اٹھ کر ماہ بانو کے پاس آ بیٹھی۔

''لیکن یہ ہوا کیسے؟ بابا جان تو ماننے کے لیے کسی طور پر تیار نہیں تھے اور پھر اماں جان ہیں' وہ تو کسی صورت نہیں مانیں گی۔'' وہ بولی۔

''جب تمہارے بابا جان مان گئے تو سب مان جائیں گے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''پھر بھی تمہارے پاس کون سی جادو کی چھڑی تھی۔ میں تو اس مرتبہ پوری طرح تیار تھا ایک جنگِ عظیم کے لیے' شکر ہے اس کی نوبت نہیں آئی۔'' عبداللہ بولا۔

''پہلے تو میں نے کوشش کی کہ بابا جان کو باتوں میں قائل کرلوں۔''

''اس طرح تو وہ قائل ہو ہی نہیں سکتے' ان کے پاس ہر بات کے سو جوابات تیار پڑے رہتے ہیں۔'' زہرا نے کہا۔

''خیر' میرے ساتھ انہوں نے کوئی بحث نہیں کی۔ شاید وہ خاندان کے معاملات پر میرے ساتھ زیادہ تفصیل کے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتے تھے یا شاید عبداللہ کی فرینڈ سمجھ کر میرا لحاظ کر رہے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ اس طرح تو وہ کسی صورت نہیں مانیں گے تو پھر میں نے دوسری طرف سے حملہ کیا۔''

''کیا مطلب؟ دوسری طرف سے کیسا حملہ؟''

''ہوا یہ کہ جب انہوں نے سمجھا کہ وہ تو میرا لحاظ کر رہے ہیں' لیکن میں بالکل لحاظ نہیں کر رہی تو انہوں نے بہت مہذب انداز میں مجھے گیٹ آؤٹ ...... کہہ دیا۔ اب اٹھ کر جانا تو تھا ہی مجھے اور میرے پاس ترپ کا ایک آخری پتا تھا جو میں کھیلنا نہیں چاہتی تھی' لیکن ہر طرح سے ناکامی کے بعد میں نے سوچا کہ اب یہ کارڈ بھی کھیل ہی لینا چاہیے۔

تب میں نے کچھ Theatrics والا کام لیا۔ ویسے بھی ایڈی کے ساتھ رہتے ہوئے اتنا ڈراما کرنا تو آ ہی گیا ہے۔ جب میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں پسپا ہو کر واپس پلٹ رہی ہوں

اور شکست مان چکی ہوں' اسی وقت میں دروازے سے پلٹ آئی اور میں نے بہت آرام سے آہستہ آہستہ پورے ڈرامائی تاثر اور ڈائیلاگز کے ساتھ اپنا آخری کارڈ کھیلا اور بس پھر جیت گئی۔ کم از کم بابا جان نے اپنے منہ سے یہ کہہ دیا ہے کہ بانو بیٹا آپ جیتیں' میں ہارا۔'' وہ ہنس پڑی۔

''اور وہ آخری کارڈ کون سا تھا؟'' زہرا نے بے تابی سے پوچھا۔

''یہ تمہیں نہیں بتاؤں گی' بلکہ تمہارے بھائی کو بھی نہیں بتاؤں گی۔ بلی کو ایک داؤ تو بچا کر رکھنا چاہیے ناں۔''

اسی وقت لاؤنج میں زینی داخل ہوئی۔ نیلی جینز اور ٹی شرٹ پہنے جسے آگے سے اس نے گرہ لگا رکھی تھی' اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔

''بھائی!'' وہ آتے ہی چلائی اور تقریباً اچھل کر اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بہت غضب ہوگیا ہے' مجھے اماں جان سے بچا لینا۔''

''زینی! آکر کسی سے سلام دعا کرتے ہیں' یہ کیا طریقہ ہے تمہارا؟'' زہرا نے اسے گھورا۔

''وہ تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے' لیکن اماں جان سیدھی گئی ہیں بابا جان سے شکایت کرنے۔'' وہ بولی۔

''بھائی اتنے دن کے بعد آئے ہیں' بھائی کی فرینڈ آئی ہوئی ہیں' کچھ تو شرم کرو۔'' زہرا نے اسے ڈپٹا۔

''اچھا ناں! السلام علیکم بھائی اور آپ کو بھی ہیلو۔'' اس نے بانو کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر دوبارہ عبداللہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''بابا جان تو پہلے ہی مجھ سے سخت خفا ہیں' میں کیا کروں۔''

''ہوا کیا ہے بتاؤ تو؟'' عبداللہ نے کہا۔

''وہ ہے ناں مسٹر ایم۔ بی۔ اے' وہ بھی ماموں جان کی طرف آیا ہوا تھا۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ بہت ذوق وشوق سے مجھ سے ملا اور پھر پتا ہے کیا ہوا؟''

''بک بھی چکو کیا ہوا؟'' زہرا نے کہا۔

''میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ مجھے اس سے کوئی شادی وادی نہیں کرنی' کیونکہ میں اپنے ایک اور کزن کو پسند کرتی ہوں۔''

''کیا؟'' زہرا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اماں جان کے سامنے کہا؟'' عبداللہ نے کہا۔

''پاگل ہوں میں' احمق نہیں ہوں۔ کہا تو میں نے اماں جان کے سامنے نہیں ہے' لیکن وہ

جو پہلے اس کا ذوق شوق تھا' وہ یہ بات سننے کے بعد نہیں رہا اس لیے اماں جان کو شک ہوگیا ہے۔ میں کیا کروں بھائی؟''

ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے زینی اچھی لگی تھی' گو کہ اس کے لہجے میں انگریزی پن نمایاں تھا' لیکن اس کا بات کرنے کا انداز ماہ بانو کو بہت اچھا لگا۔

''پہلے الٹی سیدھی حرکتیں خود کر آتی ہو پھر بھائی بھائی چلانے لگتی ہو کہ نتیجہ وہ بھگتے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''بھائی ڈانٹ رہے ہیں؟'' اس نے ڈانٹ کھا کر رونے سے پہلے تصدیق ضروری سمجھی۔

''نہیں' ڈانٹ نہیں رہا۔ میرے پاس اتنا بڑا رومال نہیں ہے' جو تمہارے آنسو پونچھ سکے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اب کیا ہوگا بھائی؟''

''کچھ بھی نہیں ہوگا کیونکہ یہاں تمہارا معاملہ سیٹ ہوگیا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''کیا؟ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' زینی نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''بالکل سچ۔''

''اوہ بھائی تھینک یو۔'' وہ عبداللہ کے ساتھ لپٹ گئی۔

''نہیں' اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ بولا۔

''پھر؟ بابا جان خود بخود ہی مان گئے کیا؟ واہ میری دعائیں تو اللہ میاں بہت قبول کرتا ہے۔ میں نے دعا کی تھی کہ بابا جان خود بخود ہی مان جائیں۔ انہیں خود سے ہی سمجھ آجائے کہ بس میرے لیے سبط ہی ٹھیک ہے۔''

''ابھی اللہ میاں تم پر اتنا مہربان نہیں ہوا کہ تمہاری ایسی احمقانہ دعائیں بھی قبول کرلے۔ یہ خود بخود نہیں ہوا۔ کسی نے بہت کوشش کی ہے اس کے لیے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''کوشش کی ہے' لیکن آپ نے نہیں کی تو کس نے کی ہے؟ زہرا نے تو کبھی نہیں کی ہوگی۔'' وہ بولی۔

''تمہیں بتا دیا تو تم اسی جوش وخروش سے اس کے ساتھ بھی لپٹو گی اور اس کی ہڈیاں اتنی مضبوط نہیں ہیں۔'' عبداللہ نے ماہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آئی ایم سوری! میں اتنی پریشان تھی کہ آپ سے ٹھیک طرح سے مل بھی نہیں سکی۔ میں زینی ہوں اور آپ؟'' اس نے ماہ بانو کی طرف دیکھا۔

''ٹھہرو بانو! میں تعارف کرواتا ہوں۔ زینی سے بھی اور گڑیا سے بھی۔'' وہ بولا۔

''گڑیا سے تو میرا تعارف ہے۔''

''نہیں یہ تعارف ذرا نیا اور دھماکہ خیز قسم کا ہوگا۔'' عبداللہ مسکرایا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اب اس خوشی کے موقع پر جب زینی کا مسئلہ بھی آدھا حل ہو چکا ہے۔ مجھے تمہارا صحیح قسم کا تعارف کروا ہی دینا چاہیے۔"

ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہائے جلدی کرائیں بھائی۔ آج تو میری خواہش ہے کہ ڈھیر سارے دھماکے ہوں۔" زینی نے بے تابی سے کہا۔

"زینی تمہیں اپنی ہونے والی بھابی کے متعلق جاننے کا بہت شوق تھا ناں' تو آج اس سے مل لو' یہ ہے تمہاری ہونے والی بھابی ماہ بانو۔" عبداللہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا؟" زینی نے بے یقینی سے پہلے ماہ بانو اور پھر عبداللہ کی طرف دیکھا۔

"آپ یہ نہیں کر سکتے بھائی!" اس نے حقارت سے ماہ بانو کی طرف دیکھا اور پاؤں پٹختی لاؤنج سے باہر نکل گئی۔

زہرا کو پہلے ہی اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ عبداللہ' ماہ بانو کو پسند کرتا ہے اور فی الحال وہ اس موضوع پر خاموش تھی' یوں بھی اسے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

ان تینوں کے لیے زینی کا ردِعمل غیر متوقع تھا۔

"اس کا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا۔" عبداللہ کو زینی کی اس حرکت پر بہت سخت غصہ آیا تھا۔

"ٹھیک کب ہے اس کا دماغ' بانو پلیز تم مائنڈ مت کرنا۔" زہرا کا موڈ بھی آف ہو گیا تھا۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔" اس نے بہت مشکل سے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکائی اور بیگ کندھے پر ڈال لیا۔

"اب میں چلتی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اماں جی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"تم اس طرح نہیں جاؤ گی بانو' پہلے وہ تم سے ایکسکیوز کرے گی۔ اسے اس بدتمیزی کی معافی مانگنی ہو گی۔" عبداللہ نے کہا۔

"چھوڑو بھی' یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے' جس پر وہ مجھ سے معافی مانگے۔"

"خیر' تم بیٹھو' اس طرح نہیں جاؤ گی تم' کھانا کھا کر جاؤ گی۔" عبداللہ نے کہا۔

"ایکسکیوز می!" زہرا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

"مجھے آج بہت غصہ آیا ہے زینی پر اس نے بہت بدتمیزی کی ہے۔"

"جانے بھی دو۔" ماہ بانو نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں بانو' یہ بات غلط ہے۔ ہم اس کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ

ں توجہ دیتے ہیں۔ اتنے لاڈ اٹھاتے ہیں اسے بھی سب کا خیال رکھنا چاہیے۔ زندگی صرف لینے کا نام نہیں ہے اسے کچھ نہ کچھ دینا بھی آنا چاہیے۔"

"عبداللہ! تم مائنڈ نہ کرنا لیکن اب میں چلتی ہوں۔ کھانے کا کیا ہے' وہ تو میں اکثر تمہاری ر کھا لیتی ہوں۔ لاہور کی بات فرق ہے اور یہاں کی بات فرق۔ ہو سکتا ہے' میرا یوں چلا آنا ہاری اماں جان کو بھی اچھا نہ لگے۔ چند دنوں کی تو بات ہے پھر ہم دونوں نے واپس لاہور چلے ا ہے۔" وہ بولی۔

"تم میری مہمان ہو' اگر کوئی اپنا مزاج دکھا سکتا ہے تو میں بھی مزاج دکھا سکتا ہوں اور تم ہاں آئی کس لیے تھیں؟ زینی کے لیے آئی تھیں ناں۔ یہ چھوٹی قسم کی ذہنیت ویسے ہی میری داشت سے باہر ہے۔ تم کیوں آئیں اور کیوں نہیں آئیں' قسم کی باتیں میں برداشت نہیں کیا رتا اور گھر میں یہ بات سب کو معلوم ہے۔"

"میں آئی تو زینی کے لیے ہی تھی' لیکن یہ بات نہ زینی جانتی ہے اور نہ اماں جان' یوں بھی ر اماں جان کو خبر ہوئی کہ میں زینی کی سفارش کرنے آئی تھی تو میرے نمبر انہوں نے ویسے ہی اٹ لینے ہیں۔" اس نے بات مذاق میں ٹالنی چاہی۔

"اچھا تم فون پر اُما سے بات کر لو' اتنی دیر میں میرا مزاج بھی کچھ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

عبداللہ اسے دوسرے کمرے میں لے آیا اور نمبر ملا کر خود باہر نکل گیا۔

"میں نے تو ایک دن ہی میں تمہیں اتنا مس کیا ہے بانو' باقی چھٹیاں کیسے گزاروں گی؟ یہ ٹیاں کچھ زیادہ لمبی نہیں ہیں؟" اُما نے چھوٹتے ہی کہا۔

"ہاں تمہیں تو لگیں گی ہی۔ سچ سچ بتاؤ مجھے مس کر رہی تھیں یا ایڈی کو؟" ماہ بانو ہنسی۔

"ہائے دونوں کو۔ ایڈی سے تو دو مرتبہ بات بھی ہو چکی ہے' کل بھی اس کا فون آیا تھا اور اج بھی۔" اُما نے بتایا۔

"میں یہاں عبداللہ کی طرف آئی تو اس نے بتایا کہ تمہارا فون آیا تھا۔"

"اسی امید پر کیا تھا کہ شاید تم اس وقت وہاں ہو۔ خیر عبداللہ سے بھی خاصی دیر گپ شپ ئی۔ اور تم سناؤ' کیسی جا رہی ہے عبداللہ کے ساتھ؟"

"بس یار! ٹھیک جا رہی ہے۔"

"ریشماں سے ملیں؟"

"نہیں۔"

اور پھر اس نے پوری تفصیل کے ساتھ صبح اماں جی کے ساتھ ہونے والا اپنا معرکہ بھی اسے بتا دیا۔

"میں تو کہتی ہوں بانو اچھا ہی ہوا' وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں گی۔" اُما نے کہا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے۔" وہ بولی۔

"کیوں کوئی اور گڑبڑ ہوگئی کیا؟" اُمانے تشویش سے پوچھا۔

جواب میں ماہ بانو نے اسے تفصیل سے اپنی اور حیدر بابا کی گفتگو کے علاوہ زینی ملاقات کے بارے میں بھی بتادیا۔

"بہت بدتمیز لڑکی ہے' اس کے پیٹ میں کیوں درد ہوگیا تمہارا نام سن کر؟"

"جانے دو' اس عمر کی لڑکیوں کو اپنے ردعمل پر قابو نہیں ہوتا۔" ماہ بانو نے کہا۔

"اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اتنی بدتمیزی کرے۔ ایک تو تم نے اس کی اتنی طرف داری کی ہے' جو کام اس کے بہن بھائی اس کے لیے نہیں کرسکے' وہ تم نے کیا' پھر بھی اس نے حرکت کی۔ مجھے تو بہت غصہ آرہا ہے۔"

"اچھا چھوڑو' یہ بتاؤ کہ تم نے گھر میں کوئی Feeler چھوڑا ایڈی کے بارے میں؟"

"میں ایسا کیسے کرسکتی ہوں۔ مجھے تو پتا ہے کہ میں نے خود کنوئیں میں چھلانگ لگادی ہے اب گرنے کے بعد کتنا نقصان پہنچتا ہے' وہ سب میری ہی ذمہ داری ہوگی۔" اُما بولی۔

"تم نے اور ایڈی نے کچھ طے بھی نہیں کیا؟"

"نہیں' ایک دو مرتبہ ایڈی نے اس سلسلے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی مجھ سے' آ سے پہلے بھی وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا' لیکن میں نے ٹال دیا۔ بلکہ ٹالا کیا' میں نے ا صاف منع کردیا کہ فی الحال میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے پتا ہے کہ میں غلط رہی ہوں' لیکن میں چاہتی ہوں کہ جتنے دن یوں ٹل جائیں' اتنا ہی اچھا ہے۔ رونا تو ہے ہی' کچھ دن اس کے ساتھ ہیں' وہ تو خوشی سے گزریں۔"

"اچھا چھوڑو اس موضوع کو' یہ بتاؤ کہ انڈیا کتنے دن رہنے کا ارادہ ہے؟" ماہ بانو نے اُ کے ڈپریشن کا اندازہ کرکے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"پتا نہیں ممی کے موڈ کا' مجھے تو خواہ مخواہ اپنے ساتھ گھسیٹ رہی ہیں۔ جانے کا موڈ تو بھی ہے' لیکن یہ سوچتی ہوں کہ ایڈی سے بات چیت بھی مشکل ہوجائے گی وہاں جاکر' بس' جانے کو دل نہیں چاہتا۔ تم بتاؤ تمہارے لیے وہاں سے کیا لاؤں؟"

"بس تم خیریت سے آجاؤ اور جلدی آجاؤ۔"

"اور آتے ہی تمہارے سر پر بھی سوار ہوجاؤں' ہیں ناں۔" وہ ہنسی۔

"اوہو! باتوں میں خیال ہی نہیں رہا' میں عبداللہ کے گھر سے فون کررہی ہوں اور خاصا بل آجائے گا اس کا۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا' بہت پیسہ ہے اس کے پاس۔" اُمانے ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر بھی' باقی باتیں تمہاری واپسی پر ہوں گی' بائے۔"

ماہ بانو نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور وہیں بیٹھ کر صبح سے پیش آنے والے واقعات کے سوچنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اسے محسوس ہوا' جیسے کوئی تیز تیز آواز میں بولتا ساتھ لے کمرے میں داخل ہوا ہے۔

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی اور میں اس سے ایکسکیوز نہیں کروں گی۔" زینی روتے ے کہہ رہی تھی۔

"تم حد سے بڑھ رہی ہو زینی۔" زہرا نے اسے ڈپٹا۔

"تم سب مجھے ہی ڈانٹ رہے ہو' یہ کوئی نہیں سوچتا کہ وہ ہماری بھابی کیسے بن سکتی ہے؟"

"وہ بھابی بنے یا نہ بنے' تمہیں اس سے معافی مانگنی ہوگی۔" زہرا نے زور دے کر کہا۔

"کہہ دیا ہے نہیں مانگوں گی معافی اور میں کیوں معافی مانگوں اس سے؟ میں نے اس سے بھی نہیں کہا۔ بھائی سے بات کی تھی میں نے۔" وہ مُصر تھی۔

"تمہیں یہ بھی احساس نہیں ہے زینی کہ بابا جان سے تمہارے اور سبط کے لیے بانو نے ہے۔"

"کوئی احسان نہیں کیا مجھ پر۔ میں نے نہیں درخواست دی تھی اسے کہ میری سفارش کرو۔ بھی میں اس مسٹر ایم۔ بی۔ اے سے کہہ آئی تھی کہ مجھے سبط اچھا لگتا ہے۔ غیرت والا ہوگا تو نزل لے کر اب وہ اس گھر میں خود ہی قدم نہیں رکھے گا۔" زینی نے تیزی سے کہا۔

"تمہیں تکلیف کیا ہے؟ برائی کیا ہے بانو میں؟" زہرا نے بھی تیز لہجے میں کہا۔

"کام کا سوال تم لوگ سب سے آخر میں پوچھتے ہو۔" زینی بولی۔

ماہ بانو ٹینشن کے عالم میں وہیں بیٹھی ان کی لڑائی سن رہی تھی۔

"یہ لڑکی بانو' ریشماں بھابی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ان سے مل کر آئی تم سے گڑیا تم دیکھو گی انہیں تو دیکھتی ہی رہ جاؤ گی اور پھر وہ نیچر کی اتنی اچھی ہیں...... کبھی ان سے تو یہ بانو ان کے سامنے کچھ نہیں لگے گی تمہیں۔ بھائی دیکھیں گے تو دیوانے ہو جائیں گے۔ سبط نے ان کی اتنی تعریفیں کی تھیں میرے سامنے اور جب میں ملی تو وہ ان تعریفوں ے کہیں زیادہ اچھی تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ وہ بھائی کی منگیتر ہیں اور یہ یک طرفہ نہیں تھی۔ بابا جان اور بڑے بابا جان دونوں کی پسند سے طے ہوا تھا یہ رشتہ۔ وہ تو پن ہی ہیں ریشماں بھابی' یہ کالی کلوٹی کچھ نہیں ہے ان کے سامنے۔"

"شٹ اپ زینی! بہت ہوگیا' اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی بابا جان کی پسند کی بجائے ہارے ہوتو بھائی کے اوپر اپنی پسند کیوں مسلط کرتی ہو۔ وہ چاہے کسی کالی کلوٹی سے کریں یا کسی حور سے تم کون ہوتی ہو ان کے معاملے میں بولنے والی؟ وہ کالی کلوٹی ہے اور تم بہت رت ہو؟ اور اگر کل تمہیں سبط سے زیادہ ہینڈسم لڑکا مل گیا تو تم اس کے پیچھے دیوانی ہوجاؤ

گی کیا؟'' زہرا نے غصے سے کہا۔

''میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ میں کسی پر اپنی پسند مسلط نہیں کر رہی۔ وہ میرا پہلا ری ا
تھا اور پہلا ری ایکشن چھپایا نہیں جاسکتا۔ میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ بھائی اور ریشماں کی باقاعدہ منگنی ہوئی تھی۔ جواب تک ٹوٹی نہیں ہے۔ جس دن میں بڑی حویلی گئی تھی اس ہی دن پہلے اماں جان اور بابا جان باتیں کر رہے تھے اور بابا جان یہی کہہ رہے تھے کہ ان ہوئے حالات کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے بھائی اور ریشماں کی شادی۔ بابا جان صرف بھا تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں' اس کے بعد وہ بڑے بابا جان کے پاس جائیں گے شادی کے سلسلے میں۔'' زینی نے کہا۔

''مجھے جھوٹ بول کر کیا کرنا ہے۔ کبھی آج سے پہلے جھوٹ بولا ہے میں نے؟ جاؤ چاہے اماں جان سے پوچھ لو۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا یہ سب کچھ' یوں بھی بھا اگر کسی کا حق ہے تو وہ صرف ریشماں بھابی ہیں۔ وہ اتنی محبت کرتی ہیں بھائی سے' یہ کیسے ہے کہ اچانک کوئی لڑکی کہیں سے اٹھ کر آجائے اور ان سے ان کی محبت چھین لے۔ یہ جائز بات نہیں ہے۔''

''بانو کہاں ہے گڑیا؟'' عبداللہ ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا۔

''پتا نہیں۔'' میں نے نہیں دیکھا۔

''ساتھ والے کمرے میں فون کر رہی تھی وہ۔'' عبداللہ اس کمرے کے دروازے کی
بڑھا۔

''اوہ گاڈ! وہ یہاں تھی؟'' زہرا کے انداز میں پریشانی تھی۔

عبداللہ کمرے میں داخل ہوا تو ماہ بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آئی ایم سوری! اُما سے بات کرتے ہوئے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ ابھی فون ہے میں نے۔'' وہ بولی۔

''کوئی بات نہیں' تم آؤ کھانا تیار ہے۔''

''نہیں عبداللہ' میں اب چلوں گی' اماں جی کا موڈ اب سخت آف ہو چکا ہوگا۔''

''چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔'' وہ بولا۔

وہ ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئے تو زہرا اور زینی شرمندہ شرمندہ سی لگ رہی تھیں

''اچھا زہرا' میں جا رہی ہوں' بائے۔ اور زینی کبھی لاہور آنا ہوا تو مجھ سے ضرور ملنا حافظ!'' اس نے ایسے انداز میں کہا' جیسے کچھ بھی نہ سنا ہو اور عبداللہ کے ساتھ باہر نکل گئی۔

''کیا ہوا بانو' اب تک زینی کی بات سے ڈسٹرب ہو؟'' عبداللہ گاڑی اسٹارٹ ہوئے بولا۔

''نہیں' یونہی سر میں درد ہو رہا ہے۔ شاید کل کے سفر کی تھکن ابھی باقی ہے۔'' اس نے گاڑی کے باہر دور تک پھیلے کھیتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ورنہ حقیقت یہ تھی کہ زینی کی باتوں نے اسے اندر تک کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اسے اتنی توہین محسوس ہوئی تھی کہ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔

''زینی نے پھر تو کچھ نہیں کہا؟'' عبداللہ کو شک سا گزرا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''میری طرف دیکھو بانو۔''

''میں کہہ رہی ہوں کچھ نہیں ہوا پھر تم کیوں کریدتے ہو؟'' اسے رونے کا بہانہ چاہیے تھا عبداللہ کی بات سن کر اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''بانو رو رہی ہو؟'' اس نے گاڑی کو بریک لگا دیے۔

''پلیز عبداللہ! مجھے کچھ نہیں ہوا' تم بار بار ایک ہی بات مت دہراؤ۔'' اس نے آنسو پونچھ لیے۔

''یہاں آکر تم خوامخواہ ڈسٹرب ہوگئی ہو' کوشش کرو کہ جلدی واپس چلی جاؤ۔'' وہ بولا۔

''ہاں' میں بھی زیادہ دن رکنا نہیں چاہتی' لیکن اماں جی...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا میں کیا کروں۔'' وہ ایک مرتبہ پھر رو دی۔

''بانو! تم اتنی کم حوصلہ تو نہیں ہو۔'' اس نے ماہ بانو کے ہاتھ تھام لیے۔

''نہیں' میں بہت کم حوصلہ ہوں' مجھے قدم قدم پر ضرورت ہے تمہارے سہارے کی۔''

''میں ہوں ناں تمہارے ساتھ' تم اکیلی تو نہیں ہو۔ اچھا برا وقت ہم مل کر کاٹیں گے۔'' اس نے رسان سے کہا اور ماہ بانو کے آنسو پونچھ دیے۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم تو ہر قدم پر میرا ساتھ دو گے' لیکن شاید میں ہی کہیں تھک کر بیٹھ جاؤں گی۔''

''تمہیں خود پر بھی بھروسا رکھنا چاہیے۔''

''بھروسا تم پر بھی ہے اور خود پر بھی ہے' تقدیر پر نہیں ہے۔ بعض اوقات تقدیر ایسے کھیل کھیلتی ہے کہ انسان دم بخود ہو کر دیکھتا رہ جاتا ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا۔'' اس نے آزردگی سے کہا۔

''تمہاری عادت ہے ان باتوں پر بھی پریشان ہونے کی جن پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' عبداللہ نے کہا۔

''مجھے گھر پہنچنا ہے عبداللہ' ابھی آگے پتا نہیں اماں کا موڈ کیا ہوگا۔ نہ جانے گھر پہنچ کر کیا کیا برداشت کرنا پڑے گا۔'' عبداللہ نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔

ماہ بانو نے ندی کے کنارے ہی گاڑی رکوا دی۔

"آگے میں چلی جاؤں گی۔" وہ بولی۔

"بیٹھی رہو۔ میں چھوڑ کر آتا ہوں۔"

"تمہیں میری قسم عبداللہ! تم آگے نہیں آؤ گے۔ میں پہلے ہی بہت سخت ٹینشن میں ہوں' اس میں اور اضافہ مت کرو۔" ماہ بانو نے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں ٹینشن کس بات کی ہے۔"

"تم نہیں جانتے کہ یہ پیر صاحب کا علاقہ ہے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو......!"

"کچھ نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔

"تم سمجھتے نہیں ہو میری بات۔ ٹھیک ہے تمہیں کچھ نہیں ہو گا' لیکن میں تمہاری خیر طرف سے کیسے مطمئن ہوں گی۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ کل کب آ رہی ہو؟"

"میں نہیں آؤں گی۔ اب لاہور میں ملاقات ہو گی۔" ماہ بانو نے کہا۔

"میرے گھر نہیں آنا چاہتیں؟"

"ابھی نہیں' پھر کبھی۔" وہ بولی۔

"تو ٹھیک ہے کل شام کو میں یہاں ندی پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

"چند دن کی تو بات ہے' شاید ہفتہ یا پھر دو ہفتے۔" وہ متذبذب تھی۔

"ہفتہ دو ہفتے بہت لمبا عرصہ ہے۔ پھر ہم چھپ کر بھی نہیں مل رہے ہیں۔ کسی کو ہوتی ہے' تو ہوا کرے۔ تمہیں پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا دیکھوں گی۔" وہ اترتے ہوئے بولی۔

"دیکھو گی نہیں' تمہیں آنا ہے۔ مجھے اپنا تھیسس بھی ڈسکس کرنا ہے تم سے۔" وہ بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے بائے...... ٹیک کیئر۔"

وہ چلی گئی اور عبداللہ اسے تب تک جاتے دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

گھر پہنچی تو اماں جی اس کی منتظر تھیں۔

"اپنی تو تم منوا لیتی ہو کبھی ماں کی بات بھی مان جایا کرو۔" وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

"جی اماں۔" وہ تھک کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"بیٹا! ریشماں تمہاری بہن ہے۔ بہت انتظار کر رہی ہے تمہارا' آج تو مجھ سے گلے اتنا روئی ہے کہ میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ تمہارے متعلق اتنا زیادہ پوچھا اس نے اور مجھے بہانا بنانا پڑا بیمار ہو۔ اس سے مل آؤ ناں میری جان۔"

"مل آتی ہوں۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"اس غریب کا ہے کون۔ ایک تم ہی تو ہو' جس سے وہ دل کی بات کہہ دیتی ہے۔ تم نے بھی منہ موڑ لیا اس سے' تو کیا سہارا رہ جائے گا اس کے پاس۔"

"اماں میں کہہ تو رہی ہوں کہ اس سے مل آتی ہوں ابھی۔" وہ بولی۔

"کھانا کھا لو پھر میں تمہیں لے چلتی ہوں۔" اماں نے اس سے کہا۔

"کھانا نہیں کھانا مجھے آپ کھا لیں۔"

"میں نے تو کھا لیا ہے' تمہارے لیے لاتی ہوں۔" اماں اٹھیں۔

"میں نے نہیں کھانا۔"

"کیوں نہیں کھانا' بھوکی رہو گی کیا؟"

"میں کھا آئی ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا۔

کھانا کھانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"تو پھر چلو اٹھو۔" اماں جی نے چادر سنبھالی۔

☆=====☆=====☆

جنت بائی کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ خادم حسین نے ان کی کوٹھی میں قدم رکھا تو انہیں یوں لگا گویا برسوں سے اندر جلتے انگاروں پر کسی نے پہلی مرتبہ پانی کے ٹھنڈے چھینٹے ڈالے ہوں۔

"بے بی! ان سے ملو۔" انہوں نے نوری سے کہا۔

"یہ بہت بڑے رئیس ہیں' بہت بڑے جاگیردار اور فن کے تو بہت قدردان ہیں۔ سمجھو آج تو اس گھر کے نصیب کھلے ہیں۔"

خادم حسین اس قسم کی عورتوں کی ایسی باتوں کا عادی تھا۔ جنت بائی اس کے سامنے نوری کے قصیدے پڑھ رہی تھیں اور وہ ان کی گفتگو سے بے نیاز نوری کی طرف متوجہ تھا۔

وہ بہت خوبصورت تھی' اس سے کہیں زیادہ حسین جتنی رسالوں کے ٹائٹل پر دکھائی دیتی تھی۔

"بے بی! شاہ صاحب کے لیے چائے تو بناؤ۔" جنت بائی نے کہا پھر خادم حسین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

"بے بی بہت مصروف رہتی ہے بے چاری تھک جاتی ہے اتنا کام کر کے۔"

خادم حسین کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔

"آپ باتیں کریں' مجھے ذرا شاپنگ کے لیے باہر نکلنا ہے۔" اس کی بیزاری بھانپ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کتنی چینی لیں گے آپ؟" نوری نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

خادم حسین کے چہرے پر بدمزگی پھیل گئی۔ وہ جتنی خوبصورت تھی' اس کا لہجہ اتنا ہی گنوار

تھا۔

''ڈیڑھ چمچ۔'' اس نے کہا۔

نوری نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

''خیر' مجھے کون سا اپنے گھر لے کر آنا ہے۔'' اس نے چائے کی پیالی تھامتے ہوئے کہا

''وقت گزاری کے لیے خوب ہے۔''

اسے ذہین اور خوبصورت لڑکیاں پسند تھیں۔ ایسی لڑکیاں جو جدید دور کے تقاضوں کو سمجھتی ہوں' لیکن اس کے بہاؤ میں نہ چلی جائیں۔ نوری کی قسم کی لڑکیاں محض وقت گزاری کا ذریعہ تھیں جنہیں روپے پیسے خرچ کر کے خریدا جا سکتا تھا اور روپیہ خرچ کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں

جنت بائی اپنے کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹی سوچ رہی تھیں کہ قدرت ان کا ساتھ دینے لگی تھی۔ کتنے برس پہلے کی بات تھی' وہ بہت تڑپی تھیں' بہت سسکی تھیں' سب نے انہیں دھتکارا تھا۔ یوں لگتا جیسے اپنے' اپنے نہ رہے ہوں۔ وہی سب جو محبت کرتے تھے' ان پر جان چھڑکتے تھے' ان سے دور ہو گئے تھے۔ وہ شخص جس نے بڑے بڑے دعوے کیے تھے ان کا ساتھ نبھانے کے وعدے کیے تھے' وہ بھی منہ پھیر گیا تھا۔

وہ رات بہت تاریک تھی' جب ان کی زندگی میں پیر صاحب کا بڑا بیٹا رجب علی شاہ داخل ہوا تھا۔ صرف ایک رات کے لیے۔ وہ تو کب کا اس بات کو بھول چکا ہوگا' لیکن جس کی روح پر زخم لگا تھا' اس نے نہ اس واقعہ کو بھلایا تھا اور نہ اس شخص کو۔

انہیں وہ وقت یاد تھا جب انہوں نے فریاد کی تھی' سارے گاؤں کے سامنے رجب علی شاہ کا نام لیا تھا لیکن ان کی فریاد کسی نے نہیں سنی تھی۔ معاملہ پیر صاحب تک بھی پہنچا تھا' انہوں نے بھی کچھ نہیں کیا تھا۔ بظاہر وہ غیر جانبدار تھے' لیکن ان کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے نرم گوشہ ضرور تھا' اسی لیے انہوں نے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی' جس پر یہ ظلم ہوا تھا۔

اچانک ہی وقت بہت ظالم ہو گیا تھا۔ گھر والے تک بیگانے ہو گئے تھے۔ ماں نے؟ انہوں نے اس شخص کی طرف دیکھا تھا' جس پر انہیں سب سے زیادہ بھروسا تھا' لیکن وہاں سے اپنی عزت عزیز تھی یا پھر رجب علی شاہ کا خوف۔

قصور ان کا نہیں تھا' لیکن ان سے ایسا سلوک ہو رہا تھا' جیسے وہ خود اپنے پاؤں پر چل کر رجب علی شاہ کے پاس گئی ہوں۔ وہ مرنا چاہتی تھیں' لیکن کوئی انہیں مرنے بھی نہیں دیتا تھا۔ زندہ رہنا چاہتی تھیں تو زندگی اجیرن بنا دی جاتی تھی۔ زندگی بہت بوجھل ہو گئی تھی اور ایسے میں ایک دن انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ کب اپنے گھر سے نکلیں اور کب چندا بائی تک جا پہنچیں' وہیں انہوں نے نوری کو جنم دیا۔

نوری کو دیکھ کر انہیں ایک لمحے کے لیے بھی خوشی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ان کی زندگی کی تاریک ترین رات کی نشانی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ رجب علی شاہ کی بیٹی تھی یا پھر شاید اس لیے کہ وہ بھی ایک عورت تھی۔ آج چھوٹی سی بچی تھی' کل اسے عورت ہی بننا تھا۔ انہی جیسی عورت' وہ جس نے ایک کوٹھے پر جنم لیا تھا اور بن بھی کیا سکتی تھی۔

چندا بائی نے انہیں تسلی دی تھی کہ ماں بنتے ہی عورت کے اندر کی ممتا خود ہی بیدار ہو جاتی ہے' لیکن وہ تو نوری کو جنم دے کر بھی ویسی ہی رہی تھیں' مگر نہیں وہ ویسی نہیں رہی تھیں۔ ان کے اندر روز بروز زہر بھرتا جا رہا تھا۔

اور پھر گرمیوں کی ایک رات بستر پر لیٹ کر ستارے تکتے ہوئے ان کے ذہن میں ایک انوکھا خیال ابھرا اور باقی تمام زندگی انہوں نے اس خیال کو پرورش دیتے ہوئے گزار دی تھی۔

لیکن پھر نوری مر گئی اور وہ خیال' وہ تمام منصوبے خود ہی ختم ہو گئے۔ انہوں نے ماتم کیا۔ نوری کے مرنے کا نہیں' اپنے منصوبوں اور خیال کے مرنے کا۔ اسی ماتم میں ایک عرصہ بیت گیا' مگر قدرت شاید ان پر مہربان تھی۔ انہیں نوری کا نعم البدل مل گیا' شمیم کی صورت میں۔

اور آج خادم حسین کی آمد کے ساتھ ہی ان کے منصوبوں اور ان کے خیال کا پہلا حصہ تکمیل کی طرف گامزن ہو گیا تھا۔

وہ ایک ڈراما کھیل رہی تھیں' اور اس ڈرامے میں موجود کرداروں کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ ان کی لکھی ہوئی کہانی میں اپنی مرضی کے بغیر' وہ کردار ادا کر رہے تھے جو جانتے بوجھتے ہوئے وہ کبھی ادا نہ کر سکتے۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو حویلی پہنچی تو اس کا ذہن بہت منتشر تھا۔

''ریشماں نے عبداللہ کے متعلق پوچھا تو میں کیا جواب دوں گی۔ کیا میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اسے سچ بتا سکوں گی؟ یہ کہہ سکوں گی کہ عبداللہ تمہارا نہیں میرا ہے؟ نہیں میں اس سے یہ سب نہیں کہہ سکوں گی۔''

اس کا دل چاہا کہ وہیں سے واپس بھاگ جائے لیکن اماں جی اس کے ساتھ تھیں اور وہ دونوں چلتے ہوئے ریشماں کے کمرے کے دروازے تک پہنچ چکی تھیں۔

اماں جی نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ کریمن نے دروازہ کھولا۔

ماہ بانو کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ یوں چلتے ہوئے کمرے میں پہنچی جیسے مقتل میں اپنے پاؤں پر چل کر جا رہی ہو۔

مگر اس کے سامنے عجیب منظر تھا۔ ریشماں اپنی مسہری پر گھٹنوں میں سر دیے بری طرح رو رہی تھی۔

''ریشماں کیا ہوا میری جان!'' اماں جی آگے بڑھ کر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

ماہ بانو کا دل ڈوبنے لگا۔

''کیا زینی نے فون کر کے ریشماں کو بتا دیا ہے۔''

ریشماں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو رہا تھا۔ ماہ بانو کو دیکھ کر پہلے تو چند لمحے وہ خاموش رہی' پھر چلاتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔

''بانو! مجھے بچا لو۔'' وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

''کیا ہوا ریشماں؟'' لفظ اٹک اٹک کر اس کے حلق سے نکلے۔

''چھوٹی چچی کے گھر اولاد ہونے والی ہے' اگر ان کا بیٹا ہو گیا تو......!'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر بری طرح سے رو دی۔

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہ سمجھی۔

''بابا جان نے کہا تھا کہ وہ میری شادی سخاوت بابا کے بیٹے سے کریں گے۔ اب اگر ان کے گھر بیٹا ہوا تو کیا ہو گا!'' ریشماں کی آواز میں اندیشے ہی اندیشے تھے۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو نے اسے واپس مسہری پر بٹھا دیا۔ تم نے تو مجھے خوفزدہ کر دیا ریشماں' تمہارے بابا جان ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ سخاوت بابا کے ہاں بیٹا ہی ہو' بیٹی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' اس نے ریشماں کو تسلی دی۔

''نہیں بانو اس حویلی میں کسی لڑکی کو جنم نہیں لینا چاہیے۔ جو دکھ میں کاٹ رہی ہوں جو اذیت میں سہہ رہی ہوں وہ کسی اور لڑکی کا مقدر نہیں بننا چاہیے تمہیں نہیں پتا میں روز گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں اور پھر زندہ ہوتی ہوں۔ دوبارہ اسی طرح تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے۔''

ماہ بانو کے دل میں بہت سی کرچیاں پیوست ہو گئیں۔ اماں جی کی شکی نگاہیں بھی اس کی برداشت سے باہر تھیں لیکن وہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔

''کچھ نہیں ہو گا ریشماں' سب تمہارے خدشے ہیں اور پھر یوں رونے سے کیا حاصل؟ اپنا دل جلا کر تمہیں کیا ملے گا؟'' اس نے آہستہ آہستہ ریشماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ سب قسمت کی بات ہے بانو۔ پتا نہیں میری قسمت میں کوئی خوشی بھی لکھی ہے یا یونہی خواب بنتے اور مستقبل کے خوف سے لرزتے ہوئے میں بھی اپنی ماں کے پہلو میں جا سوؤں گی۔''

''اللہ نہ کرے۔'' ماہ بانو کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر وہ کریمن سے مخاطب ہوئی۔

''تم باہر جاؤ۔''

''جی بہتر۔'' وہ باہر نکل گئی۔

''تم تو بہت حوصلے والی تھیں ریشماں پھر آج کیوں بے حوصلہ ہو رہی ہو۔ یہ تو کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ آنے والا وقت اس کی جھولی میں کیا ڈالے گا لیکن اچھے دنوں کی امید تو رکھنی چاہیے ہاں!'' ماہ بانو نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔

''کب تک صرف امید کے سہارے جیوں گی؟ کوئی حد بھی تو ہو کہیں' کوئی امید تو نظر آئے؟ مجھے ایسی زندگی بسر کرنی تھی تو میری تخلیق کا مقصد کیا تھا؟ میں کس بات کی سزا کاٹ رہی ہوں ان دیواروں کے بیچ؟''

''صرف اس بات کی کہ مجھے میری مرضی کے بغیر میرے ماں باپ نے اس دنیا میں لا پٹخا۔ میں ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ تم نہیں جانتیں کہ میں عذابوں کا سفر طے کر رہی ہوں۔ یہ صرف مجھے پتا ہے کہ ان دیواروں کی قید میں دن کیسے گزرتے ہیں راتیں کیسے کٹتی ہیں۔'' وہ پھر رو دی۔

''تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ ان دیواروں کے باہر بھی کوئی تمہارا اپنا موجود ہے۔'' ماہ بانو نے اپنے دل میں اٹھنے والی ٹیس پر قابو پانے کی کوشش کی۔

ریشماں نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ کب آئیں گے بانو؟ میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ تم تو ان کے ساتھ پڑھتی ہو ان سے بات کر سکتی ہو۔ تم نے انہیں کبھی نہیں بتایا کہ میں کس حال میں ہوں کس امید پر جی رہی ہوں۔''

ماہ بانو کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ اس نے سہارے کی خاطر دھندلی آنکھوں سے اماں جی کی طرف دیکھا لیکن وہ منہ پھیر کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں چلتی ہوں تم دونوں باتیں کرو۔''

''پلیز اماں جی' اس وقت مت جائیں۔'' اس نے ملتجی انداز میں کہا۔

''جو تم بو چکی ہو بانو اس کی فصل تمہیں تنہا کاٹنی ہو گی۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے باہر نکلتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بالکل تنہا رہ گئی ہو۔

''انہیں خبر نہیں ہو گی ورنہ وہ ضرور آتے۔'' ریشماں نے ہولے سے یوں اسے کہا جیسے خود سے باتیں کر رہی ہو۔

ماہ بانو سر جھکائے مجرم بنی بیٹھی تھی۔ اس کے تصور میں عبداللہ کا سراپا ابھر آیا۔ وہ دونوں Xinhua میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے اور عبداللہ کہہ رہا تھا۔

''جو میں کہنے لگا ہوں وہ بات دن میں ہزاروں لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ بہت عام کی بات ہے لیکن ہر کہنے والے کے لیے یہ نئی اور خوبصورت بات ہے بانو میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

ماہ بانو نے آنکھیں موند لیں۔

"یا پھر میری محبت میں کشش ہی نہیں ہے۔" ریشماں کہہ رہی تھی شکستہ تھکے ہوئے لہجے میں۔

"نہیں ریشماں محبت میں بہت کشش ہے۔" ماہ بانو نے پلکیں جھکائے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟ کیا انہوں نے تم سے میرے متعلق کچھ کہا؟" اس کے انداز میں بے تابی تھی۔

"ہاں اس نے کہا کہ جو بات میں کہنے لگا ہوں وہ بات دن میں ہزاروں لوگ کہتے ہیں۔ بہت عام سی بات ہے لیکن ہر کہنے والے کے لیے یہ نئی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ اس نے ریشماں سے کہنا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔" ماہ بانو نے اٹکتے ہوئے بمشکل کہا۔

"کیا؟" ریشماں کی شربتی آنکھوں میں بے یقینی نمایاں تھی۔ "تم سچ کہہ رہی ہو۔"

ریشماں نے اسے لپیٹ کر بے اختیار اس کا منہ چوم لیا۔

"پھر بتاؤ بانو تم سچ کہہ رہی ہو؟" ریشماں نے کہا۔

"ہاں۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا قدرت مجھ پر اتنی مہربان بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے بانو کہ یہ بات بتا کر تم نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں بانو کہ آج میں کتنی خوش ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں روؤں یا ہنسوں۔" وہ بیک وقت رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔

"اتنی بڑی خوشی میں سنبھالوں گی کیسے؟"

ماہ بانو سر جھکائے ہونٹ کاٹتی رہی۔

☆=====☆=====☆

عبداللہ ندی کے کنارے بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے کنکر پھینکتا ہوا ماہ بانو کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

"اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ماہ بانو اسی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"بہت دیر کر دی۔" اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھایا۔

ماہ بانو اس کا ہاتھ تھام کر اس کے برابر ہی آ بیٹھی اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور جسم بھی تپ رہا تھا۔

"کیا ہوا بانو؟ تمہیں تو بخار ہے؟" عبداللہ نے تشویش سے کہا۔

"کچھ نہیں یونہی تھکن سے ہو گیا ہے۔" اس نے بات ٹالی۔

"تھکن! کس بات کی تھکن ہے اب؟ سفر کی تھکن اتنے دن تک نہیں رہتی۔" وہ بولا۔

"میں ڈاکٹر تو ہوں نہیں، دوا لے لی تھی اب ٹھیک ہوں تم فکر مت کرو۔"

"تمہیں یہ جگہ سوٹ ہی نہیں کی زیادہ دن مت رکو بانو واپس چلو۔"

"ہاں چلی جاؤں گی۔" اس نے چھوٹا سا کنکر ندی میں پھینکا۔

"سچ سچ بتاؤ، تم نے زینی کی باتوں کا اثر لیا ہے ناں؟" عبداللہ نے کہا۔

"تم تو خواہ مخواہ اس بے چاری کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ میں تو بھول بھی گئی تھی اور پھر اس نے کچھ ایسی بات تو کہی نہیں تھی جسے ذہن پر سوار کر لیا جاتا۔ ٹھیک ہے وہ میرے علاوہ کسی کو بھابی بنانے کے متعلق سوچتی رہی ہو گی اس لیے اس نے ایسا کہہ دیا۔ ابھی تو وہ بالکل بچی ہے اسے خود بھی اندازہ نہیں ہو گا اپنی بات کا۔" ماہ بانو نے بات ٹالنا چاہی۔

"میری طرف دیکھو بانو!" اس نے ماہ بانو کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔

"تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ زینی نے صرف ایک بات پر بس نہیں کیا تھا۔ اس نے اس وقت بھی بہت کچھ کہا تھا جب تم اُما کو فون کر رہی تھیں۔"

"پلیز عبداللہ جانے دو۔ اس نے اگر کچھ کہا تھا تو اسے اپنے خیالات ظاہر کرنے کا حق ہے تم یا میں اسے روک نہیں سکتے۔" اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمہیں مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔" وہ بولا۔

"یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں کہ تمہیں ضرور بتائی جاتی اور پھر تمہیں بتانے کا فائدہ کیا ہوتا؟ تم بہن بھائی ایک دوسرے سے اس قدر محبت کرتے ہو اور میرے آتے ہی تم لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں میں ایسا نہیں چاہتی۔"

"یہ بات کر کے تم نے ثابت کر دیا ہے کہ میری چوائس غلط نہیں ہے۔" وہ مسکرایا۔

ماہ بانو کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ عبداللہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ڈسٹرب تھی اور اس کا خیال تھا کہ ایسا ڈرائنگز ینی کی باتوں کی وجہ سے ہوا تھا۔

ماہ بانو کا ذہن اس طرف سے ہٹانے کے لیے وہ اس کے ساتھ اپنا تھیسس ڈسکس کرنے لگا۔ اسٹون ایج کی ڈرائنگ اور مجسموں کے متعلق باتیں کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ماہ بانو اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ کہیں اور گم تھی۔ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے، گھاس کے تنکے سے مٹی پر عبداللہ کا نام لکھ رہی تھی۔

"بانو کیا ہوا ہے؟" اس نے الجھن سے کہا۔

وہ چونکی۔ "کچھ نہیں میں تمہاری باتیں سن رہی ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو" عبداللہ نے بانو کا چہرہ اوپر کیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔

"کچھ تو بتاؤ ہوا کیا ہے؟" وہ کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔

''کچھ ہو تو بتاؤں' بہت دیر ہوگئی ہے؟ میں چلتی ہوں اب' اماں جی کو اچھا نہیں لگے گا میرا اتنی دیر کے لیے باہر رہنا۔'' وہ اٹھنے لگی۔

''تم کہیں نہیں جاسکتیں سمجھیں؟ مجھے بتاؤ کیا بات ہے کیوں اتنی پریشان ہو؟''

وہ ہنس پڑی۔ ''میری پریشانیوں کا تو تمہیں پتا ہے۔ اس وقت تو یہی ایک پریشانی ہے کہ اماں جی سے ڈانٹ پڑے گی' لیکن چلو تمہارے لیے ڈانٹ بھی کھالوں گی۔ ویسے عبداللہ یہ کتنی خوبصوت اور کتنی پُرسکون جگہ ہے۔''

''مجھے اتنا ہی احمق سمجھتی ہو تم؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے اس فضول سے جواب سے مطمئن ہو جاؤں گا' مجھے بتاؤ کیا پرابلم ہے؟''

ماہ بانو پہلے تو چند لمحے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ ریشماں سے ملنے کے بعد سے اب تک اس کے اندر بہت سا غبار جمع ہو چکا تھا۔ اب عبداللہ کے محبت بھرے اصرار پر اس کے ضبط کے سب بندھن جواب دے گئے۔

عبداللہ نے بھی تھوڑی دیر تک اسے رونے دیا۔ اندر کا غبار نکل جانے کے بعد وہ ہلکی پھلکی ہو کر اس سے اپنا مسئلہ بیان کر سکتی تھی۔

رونے سے جب اس کا دل ہلکا ہوا تو اس نے نظریں اٹھا کر عبداللہ کی طرف دیکھا۔

''عبداللہ میں بہت اَپ سیٹ ہوں' مجھے کوئی راہ نہیں مل رہی میں کیا کروں۔''

وہ ماہ بانو کی پلکوں پر اٹکے آنسو دیکھتے ہوئے بولا۔

''اگر تمہیں اندازہ ہو جائے کہ تمہارے آنسو مجھے کتنی تکلیف پہنچاتے ہیں تو شاید تم کبھی نہ روؤ۔ ماہ بانو میں ہوں ناں تمہارے ساتھ تم اکیلی نہیں ہو تمہیں راہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے جب میں ہوں تمہیں راستہ دکھانے کے لیے۔''

ماہ بانو کو لگا جیسے عبداللہ کی باتیں اس کے دل پر ٹھنڈے پانی کی پھوار کی طرح برسی ہوں۔

''میں ریشماں سے ملی تھی اور میں نے اسے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی' سب سے خوبصورت چیز دے دی۔''

''کیا چیز؟'' عبداللہ کچھ نہ سمجھا۔

''وہ لمحہ جو صرف میرا تھا' میرے لیے تھا۔ وہ میں اسے دے آئی۔ وہ لمحہ جب تم نے کہا تھا کہ بانو میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' اس نے بمشکل کہا اور ایک مرتبہ پھر اس کا ضبط جواب دے گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو بانو' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔''

ماہ بانو نے روتے ہوئے اسے ریشماں سے اپنی ملاقات کی تفصیل بتا دی۔

''اوہ گاڈ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔'' عبداللہ نے اس کی بات سن کر کہا۔

''تم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اس وقت میری ذہنی حالت کیا تھی۔''

''وہ ہسٹیرک ہو رہی تھی' خود کو نقصان بھی پہنچا سکتی تھی اور پھر قصور بھی تو میرا ہی تھا' وہ تو زندہ ہی صرف ایک امید کے سہارے پر ہے۔ یہ امید بھی نہ رہتی تو اس کے پاس کیا بچتا' اس کے تو دن رات خواب دیکھتے' خواب بُنتے گزرتے ہیں۔ میں نے اس سے اس کے خواب بھی چھین لیے۔ مجھے بتاؤ عبداللہ تمہارے دل میں ریشماں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟ چاہے تھوڑی سی ہی پلیز عبداللہ۔''

''اس وقت تم بھی ہسٹیرک ہو رہی ہو بانو' تمہیں خود اندازہ نہیں ہے کہ تم ریشماں کے لیے مجھ سے کیا طلب کر رہی ہو؟''

''مجھے اندازہ ہے کہ میں تم سے کیا مانگ رہی ہوں میں اس وقت پورے ہوش و حواس میں ہوں۔'' وہ بولی

''تو سنو میں نے مانا کہ وہ بہت حسین ہے' بہت اچھی ہے' بہت تنہا ہے' مجھ سے بہت محبت کرتی ہے لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں' صرف تم سے' میں ریشماں سے ہمدردی کر سکتا ہوں' محبت نہیں اور تم بھی اسے یہ خواب دکھانے چھوڑ دو۔''

وہ خاموشی سے عبداللہ کی طرف دیکھے گئی۔

''اور یہ جو احمقانہ فرمائشیں تم مجھ سے کرتی ہو' یہ کرنا ختم کر دو۔ آج تم نے اسے اپنی طرف سے ایک کہانی گھڑ کر سنادی ہے' کل مجھ سے کہو گی کہ میں اس کے لیے ایک لَو لیٹر بھی لکھ کر تمہارے حوالے کروں اور پرسوں کہو گی کہ میں اس سے شادی کرنے چلا جاؤں سمجھا کیا ہوا ہے تم نے اپنی اور میری زندگی کو؟

میری بات غور سے سنو بانو۔'' اس سے اتنی ہی ہمدردی کرو' جس سے ہماری زندگی میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ آج تو تم نے اسے مطمئن کر دیا کل جب ہم ایک گھر کی بنیاد رکھیں گے تب اسے کیسے مطمئن کرو گی۔''

''میں بہت اکیلی تھی عبداللہ' اس احساسِ جرم سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی تھی کہ میں نے اس سے اس کے خواب بھی چھین لیے ہیں۔ میں تو بس اسے اس کے خواب لوٹا رہی تھی۔ اور میں نے تو صرف ایک بات کہی تھی' وہ خواب بنتی گئی' بُنتی گئی۔'' ماہ بانو نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔

عبداللہ کو محسوس ہوا کہ ماہ بانو کی ذہنی حالت اس وقت ایسی نہیں تھی کہ وہ اس کی بات سمجھ سکتی۔ اس سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ وہ شدید ذہنی دباؤ میں تھی۔

''اچھا کوئی بات نہیں۔'' اس نے اپنے رومال سے ماہ بانو کے آنسو پونچھے۔

''اب تم روؤ گی نہیں' مجھے روتی ہوئی بانو بالکل پسند نہیں۔''

''اب میں کیا کروں؟'' ماہ بانو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میری بات مانو تو میں پھر یہی کہوں گا کہ لاہور واپس چلو، یہاں جب تک رہو گی اسی طرح کسی نہ کسی بات پر ڈسٹرب ہوتی رہو گی۔" عبداللہ نے کہا۔

"میں اماں جی سے کہوں گی تو کیا وہ مان جائیں گی؟" وہ بولی

اس بات کا جواب عبداللہ کے پاس نہیں تھا لیکن وہ اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"مانیں گی کیوں نہیں، تم کہہ کر تو دیکھو۔"

تھوڑی دیر وہ خاموش سے بیٹھی رہی، پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں، بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جو ڈپریشن تمہیں ہو رہا ہے یہ عارضی ہے، بس زیادہ سوچو مت۔" واپس جانے سے پہلے عبداللہ نے اسے ہدایات دیں۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"سوچوں کیسے نہ عبداللہ۔" وہ واپس جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ "یہاں گزرنے والا ایک ایک لمحہ مجھے احساسِ جرم میں مبتلا کرتا جا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے کیسی کو قتل کرنے سے بھی زیادہ بھیانک جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ میں ریشماں کو اس سلسلے میں کیا مطمئن کروں گی، جب ابھی تک میں بھی مطمئن نہیں ہوں۔"

☆=====☆=====☆

اس کی پوری کوشش کے باوجود بھی اماں جی دو ہفتے سے پہلے جانے پر تیار نہیں تھیں۔

"لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع ملتا ہے۔ سال بھر میں ہمارے چکر ہی کتنے لگتے ہیں گاؤں کے...... اب جب تمہاری چھٹیاں ہیں تو ہم دو ہفتے بھی یہاں نہ رہے تو خود سوچو کہ لوگ کیا کہیں گے؟" وہ اماں سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ان کی بات سن کر بہت الجھن ہوئی تھی۔

"لوگوں کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔ اگر ہم زیادہ دن تک گاؤں میں رہیں یا کم دن تک، آخر لوگ اس قدر فالتو کیوں ہوتے ہیں کہ دوسروں کے معاملات کے متعلق سوچیں اور باتیں کریں۔ میرے پاس تو اتنا وقت نہیں ہوتا کہ کسی اور کے کام میں مداخلت کروں یا اس کے متعلق سوچوں۔" وہ عبداللہ سے کہتی تھی۔

گھر میں ایک عجیب سے کھنچاؤ کی کیفیت طاری تھی۔ اماں جی نے غالباً بڑی اماں کو بھی اپنے خدشات بتا دیے تھے۔ اسے ہر ایک کی نگاہوں میں اپنے لیے نفرت اور حقارت محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر شخص ہی اسے موردِ الزام ٹھہرا رہا ہو حالانکہ کسی نے کبھی زبان سے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔

وہ ریشماں سے ملنا نہیں چاہتی تھی لیکن ملتی تھی۔ کبھی اماں اور بڑی اماں کے اصرار پر کبھی ریشماں کے بلاوے پر اور کبھی اپنے احساسِ جرم سے مغلوب ہو۔ بڑی حویلی کی طرف قدم

بڑھاتے ہوئے ہر لمحہ ہر پل وہ واپس پلٹ جانے کی خواہش کرتی اور پھر بھی اس خواہش کا گلا گھونٹتی تھی ریشماں کے کمرے میں داخل ہو کر اس کے ساتھ بیٹھ کر بھی اس کا ذہن اس سے کوسوں دور ہوتا تھا۔

جس دن ماہ بانو نے ریشماں سے عبداللہ کے متعلق جھوٹ بولا تھا تب سے ہی وہ بہت خوش تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ بات بے بات کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی اس کی باتوں میں وہ شوخی اور آواز میں وہ کھنک لوٹ آئی تھی، جو چند سال پہلے تک اس کی ذات کا حصہ تھی اور پھر آہستہ آہستہ نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

"تمہیں یہ تو پتا ہو گا بانو کہ انہیں کیسی لڑکیاں پسند ہیں؟" وہ اس سے بے تابی سے پوچھتی۔

"اسے خوش رہنے والی لڑکیاں پسند ہیں۔" وہ کہتی۔

اور ریشماں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں کٹے ہوئے بالوں والی لڑکیاں پسند ہوں؟ اسے ایک اور خیال آتا۔

"نہیں وہ تو لمبے بال ہی پسند کرتا ہے بلکہ لمبے بالوں کا دیوانہ ہے۔" ماہ بانو کہتی۔

"پھر ٹھیک ہے مجھے بھی اپنے لمبے بال ہی پسند ہیں۔" وہ مطمئن ہو جاتی۔

"انہیں کھانے میں کیا پسند ہے؟" تھوڑی دیر بعد وہ ماہ بانو سے پوچھتی۔

"زیادہ تر چائنیز فرنچ ور اٹالین لیکن وہ بہت خوش خوراک ہے ہر اچھی بنی ہوئی چیز شوق سے کھاتا ہے۔"

"وہ کہیں مزاج کے تیز تو نہیں ہیں؟ کسی کو غصہ آ جائے تو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔" ریشماں کہتی۔

"نہیں وہ بہت نرم مزاج ہے لیکن جب اسے غصہ آتا ہے تو بہت زوردار آتا ہے۔"

"انہوں نے میرے متعلق کوئی اور بات نہیں کہی تھی؟" اس کے لہجے میں شوق سمٹ آتا۔

اور ماہ بانو الجھ جاتی احساسِ جرم بچھو کی طرح ڈنک مارنے لگتا اس کا دل چاہتا کہ وہاں سے بھاگ نکلے لیکن کہاں؟ ہر طرف ہر شخص کی آنکھوں میں نفرت تھی حقارت تھی یوں لگتا تھا جیسے ہر کوئی اسے یہ احساس دلا رہا ہو کہ اس نے ریشماں کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا زبان سے نہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں۔

اس کا دل شدت سے رونے کو چاہتا تھا وہ سب کو چیخ چیخ کر بتانا چاہتی تھی کہ اس نے ریشماں کو چاہا ہی نہیں تھا وہ تو اسے چاہتا ہے اس سے محبت کرتا ہے صرف اور صرف ماہ بانو سے۔

لیکن ایسے میں اسے ریشماں کی آواز چونکا دیتی تھی۔

''بانو کہاں گم ہو میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟''

اور جواب میں ماہ بانو اسے وہ سب کہہ سناتی جو عبداللہ نے کہا تو ہوتا تھا لیکن ریشماں لیے نہیں ماہ بانو کے لیے۔

پھر جب وہ عبداللہ سے ملتی تھی تو اس کا ضبط جواب دے جاتا تھا

''سب مجھے کیوں الزام دیتے ہیں عبداللہ' میرا کیا قصور ہے؟'' وہ اسے ریشماں ہوئی باتیں سناتے ہوئے رو دیتی۔

''تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہا تمہارا وہم ہے بانو پلیز باہر نکلو اس وہم سے۔'' وہ ا سمجھاتا۔

''ہر روز میں اس خوف کے ساتھ حویلی جاتی ہوں کہ ریشماں کو میرے اور تمہارے علم ہو گیا ہوگا۔ اگر اسے پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟'' وہ اس کی بات نظر انداز کر کے اپ خدشات میں گھر جاتی۔

''تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے بانو کہ تم اپنے ساتھ کتنا ظلم کر رہی ہو۔ ذرا شیشے میں دیکھا کو آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑتے جا رہے ہیں۔'' وہ اس کے ہاتھ تھام لیتا۔

''اگر اسے ہمارے متعلق معلوم ہو گیا تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا؟ کچھ نہیں ہوگا اسے معلوم ہو جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔''

''تم میری پریشانی سمجھ ہی نہیں سکتے شیئر کیا کرو گے۔'' وہ الٹا عبداللہ سے الجھ پڑتی۔

''تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ میں کس ذہنی اذیت سے گزر رہی ہوں تمہارے لیے آسان ہے کہہ دینا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ آسمان نہیں ٹوٹے گا لیکن میں جانتی ہوں کہ کیا ہوگا۔ سب کی نظروں سے تو گر ہی چکی ہوں اس کی نظروں سے بھی گر جاؤں گی اور ایسا ہوا نا عبدا میں اپنی نظروں سے بھی گر جاؤں گی۔''

جب اسے احساس ہوتا کہ عبداللہ کے ساتھ وہ خواہ مخواہ ہی لڑنے لگی ہے تو اسے ا آپ پر غصہ آ جاتا سخت شرمندگی ہوتی۔

''آئی ایم سوری پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے میں پاگل ہونے والی ہوں' بلاو سے الجھنے لگتی ہوں حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے لڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

اور عبداللہ ہنس پڑتا۔ ''مجھے پتا ہے کہ تم مجھ سے لڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں لیکن تم پرابلم یہ ہے بانو کہ تم ہر کام سوچے سمجھے بغیر کر دیتی ہو۔''

☆=====☆=====☆

زینی بہت الجھی ہوئی تھی جب سے اسے علم ہوا تھا کہ عبداللہ کی زندگی میں ریشماں کی ماہ بانو لے چکی ہے تب سے ہی وہ اس الجھن میں گرفتار تھی۔ اپنے پہلے رد عمل پر اسے کوئی پچھ

نہیں تھی لیکن بعد میں جو کچھ اس نے زہرا سے کہا تھا اور وہ سب باتیں اس کی لاعلمی میں ماہ بانو نے سن لی تھیں ان پر اسے یقیناً افسوس تھا۔ اگر اسے علم ہوتا کہ اس کی اور زہرا کی لڑائی ماہ بانو کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی تھی تو وہ کبھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اتنی شدت سے نہ کرتی۔ آپس کی بات اور تھی آپس میں تو بہن بھائی ایک دوسرے سے کچھ بھی کہہ سن سکتے تھے۔

''مگر مجھے بہت شاک لگا تھا بھائی کی یہ بات سن کر۔'' اس نے زہرا سے کہا تھا۔ ''قسم لے لو گڑیا جو مجھے خبر ہوتی کہ وہ لڑکی ساتھ والے کمرے میں ہے تو میں کبھی بھی ایسی بات نہ کرتی۔''

''تم ایسی حرکت کرتی تو نہیں ہو زینی اس دن تو میں اور بھائی دونوں حیران بھی ہوئے تھے اور ہمیں غصہ بھی بہت آیا تھا۔ یوں بھی اس میں بانو کا کیا قصور بھائی ہی ریشماں سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو ہم میں سے کوئی کیا کر سکتا ہے۔'' زہرا نے کہا تھا۔

''مجھے تو یقین ہے کہ وہ فوراً بھائی سے میری شکایت کرے گی ہر بات بتائے گی کہ میں اس کے متعلق کیا کیا کہہ رہی تھی مجھے ڈر لگتا ہے اگر بھائی کو غصہ آ گیا تو پھر کیا ہوگا؟'' زینی نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔

لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ماہ بانو نے عبداللہ کو زینی کے بعد کے رویے کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ عبداللہ نے زینی کو بلایا تھا اور اس کے سامنے پہنچنے تک وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ ماہ بانو نے اس کی شکایت لگا دی تھی مگر جب عبداللہ نے بہت نرمی سے اسے سمجھایا تو وہ بہت حیران ہوئی تھی۔

''بھائی آپ کو غصہ نہیں آیا؟''

''غصہ آیا تھا مگر تم پر اتارنے سے کیا فائدہ ہے' تم روتیں تو تمہیں چپ کیسے کراتا ویسے بھی جتنی لڑکیاں آج کل مجھے روتے ہوئے مل رہی ہیں اتنے رومال میرے پاس نہیں ہیں۔'' وہ مسکرا دیا۔

وہ ہنس پڑی۔ ''میرے علاوہ کتنی لڑکیاں رو رہی ہیں؟''

''ایک وہ ہے جس کے ساتھ تم نے انتہائی جنگلی پن کا مظاہرہ کیا تھا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''مجھے یقین تھا کہ وہ آپ کو میری شکایت ضرور لگائیں گی' لیکن آپ اتنے اچھے ہیں کہ غصہ ہوئے۔''

''اس نے کیوں شکایت لگانی تھی' تم نے میرے سامنے ہی تو اس سے بدتمیزی کی تھی۔''

زینی تھوڑی دیر چپ رہی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ ماہ بانو نے عبداللہ کو کچھ نہیں بتایا۔

''اب تم بھاگ جاؤ یہاں سے' مجھے ایک پینٹنگ بنانی ہے۔'' عبداللہ نے اس سے کہا۔

''میں ڈسٹرب نہیں کروں گی آپ بنائیں۔'' وہ وہیں بیٹھی رہی۔

عبداللہ کینوس ایزل پر رکھ کر کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد زینی نے اسے پکارا۔

''بھائی۔''

''کیا ہوا؟'' وہ رنگ نکالتے ہوئے بولا۔

''آئی ایم سوری بھائی، مجھ سے بہت بدتمیزی ہوگئی تھی۔'' وہ اس کے پاس آ کر بولی۔

''کوئی بات نہیں، آئندہ مت کرنا۔'' اس نے کینوس پر برش چلاتے ہوئے کہا۔

''سنیں تو، جس بات پر میں سوری کہہ رہی ہوں وہ تو آپ کو پتا ہی نہیں ہے۔'' اس نے عبداللہ کا بازو پکڑ کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

''زینی! تم نے کہا تھا کہ تم مجھے ڈسٹرب نہیں کرو گی۔''

''آپ بھی تو میری بات سنیں۔ اصل میں میں اور گڑیا لڑ رہے تھے اور ہمیں نہیں پتا تھا کہ ساتھ والے کمرے میں آپ کی فرینڈ ہیں۔ میں نے اس وقت بہت برے برے سے ریمارکس دیے تھے۔ آپ کی فرینڈ کے متعلق۔'' اس نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر کہا۔

''کیا کہا تھا تم نے؟'' عبداللہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

''کالی کلوٹی کہا تھا اور بھی پتا نہیں کیا کچھ کہا تھا۔ اصل میں، میں ریشماں بھابی کی تعریف کر رہی تھی ناں ساتھ ساتھ۔'' اس نے اٹکتے اٹکتے بتایا۔

اس لمحے عبداللہ کو زینی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

ماہ بانو تو یونہی قدم قدم پر خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ ریشماں کا ذکر آتے ہی شدید قسم کے احساسِ جرم میں مبتلا ہو جاتی تھی جب اس نے زینی کی باتیں سنی ہوں گی تو اس کا کیا حال ہوا ہو گا۔

''تب ہی وہ واپسی پر اس قدر ڈسٹرب تھی اور اس نے مجھے یہ بتایا بھی نہیں کہ زینی نے اس کے متعلق کیا کہا تھا۔'' عبداللہ نے سوچا۔

''تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے زینی کہ تم نے بانو کو کتنی تکلیف پہنچائی ہے اور تمہیں یہ بھی اندازہ نہیں ہے کہ بانو کو تکلیف میں دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے تم پر غصہ بھی ہے اور میں تم سے سخت ناراض بھی ہوں۔ ناؤ گیٹ لاسٹ اور مجھے اپنی شکل مت دکھاؤ۔'' اس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

زینی خاموشی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس کے بعد کتنے دن گزر چکے تھے لیکن عبداللہ نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ یہ اس کے غصے اور ناراضگی کا سب سے بڑا اظہار تھا۔ بہنوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا نہیں تھا اور ہاتھ اٹھانے کا تو سوال ہی نہیں تھا سو غصے کا اظہار خاموشی سے ہی کیا کرتا تھا۔

اس عرصے میں سبط حسن نے بہت مرتبہ اسے فون کیا تھا اور اس کا ہر فون ریشماں کے

توسط سے آیا کرتا تھا۔ کتنی مرتبہ اسے خیال آیا تھا کہ وہ سبط کو ماہ بانو کے متعلق بتا کر اس سے مشورہ لے پھر اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ سبط نے تو اسے ریشماں کو بھابی کہنے سے بھی منع کیا تھا مگر اس وقت اسے یقین تھا کہ وہ عبداللہ کو منا لے گی۔ اسی وجہ سے اس معاملے میں وہ خاموش ہی رہی۔

اس روز عبداللہ کھیتوں میں جانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ زینی اس کے کمرے میں چلی آئی۔

''بھائی!''

عبداللہ اسے نظر انداز کر کے کمرے سے نکلنے لگا۔

''بھائی!'' وہ آگے بڑھ کر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ''میں نے آپ سے سوری تو کیا تھا۔ آپ تو کبھی ناراض نہیں ہوتے مجھ سے پھر اب صرف اتنی سی بات پر اتنے زیادہ ناراض ہوئے کہ بات تک نہیں کر رہے مجھ سے۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے زینی' تم یہ چاہتی ہو کہ ہر کوئی تم سے محبت سے پیش آئے تمہارے جذبات کا احترام کرے تو ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے۔'' اس نے اسے سمجھایا۔

''مگر اب تو میں نے سوری کر دیا ہے ناں۔'' وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگی۔

''ٹھیک ہے لیکن تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ آئندہ تم اس قسم کی حماقت نہیں کرو گی۔''

''نہیں بھائی پھر نہیں کروں گی ایسے۔''

''تو بس میں بھی تم سے ناراض نہیں ہوں اب۔'' وہ بولا۔

''سچ مچ؟''

''بالکل سچ مچ۔'' عبداللہ نے پیار سے کہا۔

''تھینک یو بھائی۔ تھینک یو ویری مچ۔''

''اب تم جاؤ میں ذرا کھیتوں میں جا رہا ہوں۔''

''نہیں بھائی ایک منٹ یہاں بیٹھیں میں نے آپ کو کچھ بتانا ہے۔'' اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

''جلدی بتاؤ۔''

''پتا ہے جب میں نے گڑیا کو بتایا کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں تو وہ بھی مجھے ہی ڈانٹنے لگی۔ کہہ رہی تھی کہ زینی تمہارے پیٹ میں بھی بات نہیں رہتی کیا ضرورت تھی بھائی کو یہ بات بتانے کی لیکن مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اتنی زیادہ گلٹی فیلنگ ہو رہی تھی پہلے میں نے سوچا کہ نہ بتاؤں آپ کو کوشش بھی کی کہ نہ ہی بتاؤں مگر دل نہیں مانا۔''

''اب جانے دو تمہیں افسوس ہے یہی بہت ہے لیکن تم نے بانو کو بہت زیادہ ڈسٹرب کیا۔''

تمہیں معلوم ہے اسی نے بابا جان سے تمہاری سفارش کی تھی میں تو ان سے کسی بھی صورت یہ سب نہیں منوا سکتا تھا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''وہ تو اپنی جگہ لیکن میں بھی اس مسٹر ایم بی اے سے کہہ آئی تھی' سارے فساد کی جڑ وہی تو تھا جب میں نے اسے منع کر دیا تو خود ہی سارا مسئلہ ختم ہو گیا۔ وہ بابا جان سے نہ بھی سفارش کرتیں تو معاملہ حل ہو گیا تھا۔'' اس کے انداز میں بے رخی آ گئی پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا تو جوش سے بولی۔

''بھائی آپ کو بتاؤں بابا جان نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ایف اے کا امتحان پرائیویٹ دے لوں جیسے گڑیا نے دیا ہے۔''

''اور پھر اس کے بعد؟''

''اماں جان تو کہہ رہی تھیں کہ پھر میں اور گڑیا پرائیویٹ بی۔ اے کر لیں لیکن مجھ سے تو گھر میں بالکل نہیں پڑھا جاتا اور پھر میرے پاس سائنس ہے میں آرٹس نہیں پڑھ سکتی۔'' وہ بولی۔

''تو اب چاہتی کیا ہو تم؟'' عبداللہ نے کہا۔

''آپ کو پتا تو ہے بھائی' سبط کے بابا جان اسے ملک سے باہر بھجوا رہے ہیں اس نے امریکہ کے لیے کہا انہیں اور وہ مان گئے۔'' زینی نے اسے بتایا۔

''اسے جانے دو اور تم یہاں سے ہی کالج ایجوکیشن مکمل کر لو اور پھر ہائر اسٹڈیز کے لیے باہر چلی جاؤ۔''

''کالج ایجوکیشن ایسے نہیں کر سکتی ناں۔ اماں جان بالکل نہیں چاہتیں کہ ہم مزید یہاں کے کسی کالج یا اسکول وغیرہ میں پڑھیں۔ مری کی بات اور تھی وہاں کسی کا ذہن ہی نہیں گیا مگر اب یہاں سب کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم کہاں پڑھ رہے ہیں۔ یوں بھی تو پاکستان میں لڑکیوں کے چند گنے چنے اچھے کالج ہیں اب تو یوں بھی سب کو اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم کہیں ملک سے باہر نہیں تھے بلکہ یہیں پاکستان میں تھے۔ اماں کو ڈر ہے کہ اب حویلی سے باہر ہر جگہ ہمارے لیے غیر محفوظ ہے۔''

''یہ بات بھی بابا جان سے اگر کوئی منوا سکتا ہے تو صرف ماہ بانو۔'' عبداللہ نے کہا ویسے تو وہ خود بھی ان سے یہ بات منوا سکتا تھا لیکن اس وقت وہ زینی کی نظر میں ماہ بانو کی اہمیت ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

''میرے لیے تو صرف آپ ہی ہیں اور آپ کو ہی یہ کام کرنا ہے۔ کیسے کرتے ہیں یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے بہنوں والی دھونس دی۔

''بابا جان راضی ہو گئے تب بھی تم دونوں کو کسی ایسی جگہ بھجوائیں گے جہاں تم دونوں کی

بحال کرنے کے لیے مس جارج قسم کی کوئی چیز موجود ہو۔''

''اُف مس جارج قسم کی نہیں ڈیڈی جیسی کوئی ہوں تو ٹھیک مگر مس جارج جیسی عورت ناقابل برداشت ہو گی۔'' زینی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''باہر جا کر پڑھنا ہے تو یہ برداشت کرنا ہو گا ورنہ یہیں پڑھو۔'' عبداللہ نے کہا۔

''آپ بابا جان سے بات تو کریں ناں۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''اچھا کروں گا۔'' اس نے بات ختم کی۔

''کب کریں گے؟''

''آرام سے موقع دیکھ کر بات کروں گا تمہاری طرح وقت بے وقت کسی کے سر پر سوار ہونے کی عادت نہیں ہے میری۔''

☆=====☆=====☆

ماہ بانو کا گاؤں میں آخری دن تھا۔ اگلے روز صبح سویرے اسے اور اماں جی کو لاہور کے لیے نکل جانا تھا۔ اس وقت وہ ریشماں کے پاس اس کے کمرے میں بیٹھی تھی اور ریشماں بہت مطمئن، بہت خوش لگ رہی تھی۔

''اتنے دنوں میں مجھے خیال نہیں آیا۔ تمہارا اور سعد کا افیئر کیسا جا رہا ہے؟'' ریشماں نے اچانک پوچھا۔

''وہ ختم ہو گیا۔'' ماہ بانو نے مختصراً کہا۔

''کیوں؟'' ریشماں نے حیرت اور افسوس کے ملے جلے انداز میں پوچھا۔

''بس مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ مخلص نہیں تھی' اس لیے چھوڑ دیا اسے۔'' ماہ بانو نے اکتاہٹ سے کہا۔

''نہیں بانو ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اصل بات کوئی اور ہو گی۔ تم تو اتنی سویٹ ہو، ہر ایک کے ساتھ مخلص' ہر ایک سے پیار محبت سے پیش آنے والی۔'' ریشماں اس کی کسی بات کو ماننے پر تیار نہیں تھی۔

''ریشماں! کسی کے متعلق اتنے یقین سے کوئی بات مت کیا کرو۔ انسان کو اپنے آپ کو جاننے میں ہی ایک عرصہ لگ جاتا ہے۔ کسی اور کے متعلق وہ کیا جان سکتا ہے۔ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے' وہ بالکل صحیح ہے سو فیصد۔''

ریشماں کچھ نہ سمجھتے ہوئے چند لمحے تک اسے تکتی رہی پھر بولی۔ ''تمہیں دکھ تو ہو گا؟''

''دکھ کس بات کا؟ دکھ تو تب ہوتا جب مجھے اس سے محبت ہوتی اور کوئی تیسرا فرد ہمارے درمیان آ جاتا۔ اب کیسا دکھ؟ اسے میں نے خود چھوڑا ہے کیونکہ مجھے اس سے محبت ہی نہیں تھی مجھے کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی اپنے متعلق۔'' ماہ بانو نے اطمینان سے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' ریشماں اب بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔
''لیکن بانو! محبت کے بارے میں غلط فہمی کیسے ہو سکتی ہے؟ محبت یا تو ہوتی ہے یا نہیں
بس۔ مثلاً میں جانتی ہوں کہ مجھے محبت ہے تو اس معاملے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔''
''ریشماں! تم جس جگہ' جن حالات میں رہ رہی ہو' وہ اس جگہ اور حالات سے بہت مختلف
ہیں۔ جہاں میں رہ رہی ہوں۔ یہ کمرا اور اس حویلی کا ایک حصہ تمہاری مملکت ہے اور تم اس کمرے
میں All In All ہو۔ یہاں عورتیں آتی ہیں۔ تمہارے اور تمہاری اماں جان کے پاؤں
ہیں۔ تم لوگوں کا حکم سنتی اور مانتی ہیں۔ تم لوگوں کے سامنے سر جھکاتی ہیں' تم لوگوں کا
پیٹرن ایک مخصوص انداز میں صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔
مگر میں جس سوسائٹی میں رہ رہی ہوں' وہ بہت مختلف ہے۔ وہاں زندگی اتنی سادہ
آسان نہیں ہے۔ ہمارا سیٹ اَپ بہت کامپلیکس ہے۔ تم اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکو گی۔ کیونکہ
میرے سیٹ اَپ سے بالکل ناواقف ہو۔ اصل میں ریشماں ایک ہی ملک میں رہنے کے
ہم سب مختلف صدیوں میں رہ رہے ہیں۔ ہماری سوسائٹی بہت سے مختلف خانوں میں بٹی
ہے۔ جو بات تمہارے لیے ناقابلِ یقین یا ناقابلِ فہم ہے' یقین کرو وہ بھی وقوع پذیر ہو رہی
اسی سوسائٹی میں۔'' ماہ بانو نے کہا۔
''یہ تو ہے۔ میں بعض باتوں پر بہت حیران ہوتی ہوں۔ مثلاً تمہیں دیکھ کر حیران
ہوں۔ زینی کو دیکھا تب بھی مجھے بہت حیرت ہوئی۔ وہ اور سبط ایک دوسرے سے اس قدر
ہیں کہ یہ بات میری سوچ سے بھی باہر ہے اور پھر تم ہو۔ میں تمہارے کالج کے متعلق باتیں
ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ تم لڑکوں کے ساتھ نہ صرف باتیں کر لیتی ہو بلکہ دوستی بھی کر
ان کے ساتھ کینٹین تک چلی جاتی ہو اور سب سے بڑھ کر تم لوگ کلاس روم میں گانے بھی گا
ہو۔'' ریشماں بولی۔
''جیسا ہمارے کالج کا ماحول ہے ویسا تو خیر تمہیں یہاں شاید ہی کسی دوسرے
ماحول ملے گا۔ میں یہی فرق تو تمہیں بتا رہی ہوں۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ سب غلط
بعض کے نزدیک کچھ ٹھیک اور کچھ غلط ہے اور بعض ایسے ہیں جنہیں ان میں سے کوئی بات
نہیں لگتی۔ یہ اپنے اپنے ماحول اور اپنی اپنی صدی کی بات ہے۔''
''لڑکے تم لوگوں کو تنگ نہیں کرتے؟'' ریشماں نے دریافت کیا۔
''تنگ۔ کیوں؟ ہم کسی گلی محلے کی سڑک پر تو نہیں ہوتے' کالج میں ہوتے ہیں۔
کالج ہے اور سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ چاہے کوئی کسی بھی ڈیپارٹمنٹ کسی بھی
زیرِ تعلیم ہو۔ کوئی لڑکا بدتمیزی کرے تو سہی' اگلے لمحے مال روڈ پر پڑا ہوگا۔ بعض پسماندہ
سے آنے والے لڑکے اچھے خاصے کنفیوز ہوتے ہیں' لیکن بس شروع میں' بعد میں وہ بھی

سمجھ جاتے ہیں اور اس میں ایڈجسٹ کر جاتے ہیں۔
یوں بھی کام اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ کسی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ کالج میں
برے سے برے حلیے والا اسٹوڈنٹ بھی مل جائے گا اور اچھے سے اچھے حلیے والا بھی۔ پتلونیں
اور اسکرٹیں پہننے والی لڑکیاں بھی ملیں گی' لیکن کبھی کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ کون کیسے آ رہا ہے' کیا
پہن رہا ہے۔ جس چیز پر توجہ دی جاتی ہے' وہ یہ ہے۔'' ماہ بانو نے اپنے سر کو انگلی سے چھوا۔
''یہاں دماغ میں کچھ ہونا چاہیے' یہاں کچھ نہیں ہے تو آپ کچھ نہیں ہیں اور یہاں کچھ
موجود ہے تو آپ قابلِ توجہ ہیں۔''
''میرے حلق سے یہ بات نہیں اترتی۔'' ریشماں نے کہا۔
''اترے گی بھی نہیں' کم از کم اس چار دیواری میں رہتے ہوئے تو کبھی نہیں اترے گی۔
اس لیے تم اسے حلق سے اتارنے کی زحمت کرو بھی نہیں۔''
''خیر مجھے کیا' میرا تو فائدہ ہی ہے۔'' ریشماں ہنسی۔ ماہ بانو خاموش رہی' لیکن اس کا ذہن
تیزی سے یہ سوچ رہا تھا کہ ریشماں کو اس موضوع سے کیسے ہٹائے جس کی طرف وہ دونوں رفتہ
رفتہ بڑھ رہے تھے۔
''تم نے انہیں میرے متعلق کیا کچھ بتایا؟'' ریشماں نے پوچھا۔
اس کے لہجے میں شوق بھی تھا اور بے تابی بھی' جسے چھپانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی
تھی۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔
''سبھی کچھ۔ یہ کہ تم بہت خوبصورت ہو' اس سے بہت محبت کرتی ہو اور یہ بھی کہ زہرا کے
متعلق بھی تم نے مجھے بتایا تھا۔''
''پھر؟''
''پھر کیا؟'' ماہ بانو کو الجھن ہونے لگی تھی۔
''تفصیل سے بتاؤ ناں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ انہیں ویسے دیکھنا جیسے میں دیکھ رہی
ہوں اور تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں ہوتی تو ہر بات کا خاصی باریک بینی سے جائزہ لیتی۔'' ریشماں
ہنسی۔
''میرے سر میں درد ہو رہا ہے ریشماں۔'' اس نے بہانا بنایا۔
''یہ اچانک تمہارے سر کو کیا ہو گیا ہے۔ روز ہر دس منٹ کے بعد درد ہوتا ہے' کسی ڈاکٹر کو
نہیں دکھایا؟'' اس نے تشویش سے کہا۔
''اتنی سی بات کے لیے کیا ڈاکٹر کے پاس دوڑے جانا۔'' اس نے جان چھڑانے کے لیے
کہا۔
''یہ اتنی سی بات نہیں ہے' ہر وقت سر میں درد ہونا اچھا تو نہیں ہوتا' تم ضرور چیک اَپ

کراؤ۔''

''اچھا! اب کل تو واپس جا ہی رہے ہیں' وہیں جا کر ڈاکٹر کو دکھاؤں گی۔''

ماہ بانو نے گفتگو کا رخ پلٹ دیا تھا' لیکن تھوڑی دیر کے بعد گفتگو میں عبداللہ کا ذکر آ جاتا تھا۔ ماہ بانو اٹھنے کی کوشش کرتی رہی' لیکن ریشماں اسے جانے نہیں دے رہی تھی۔

''تھوڑی دیر تو میرے پاس بیٹھو' کل تو یوں بھی تمہیں چلے جانا ہے۔''

اور ماہ بانو کو پھر بیٹھنا پڑتا۔ دوپہر کا کھانا لگ رہا تھا' جب وہ بہت مشکل سے جان چھڑا کر وہاں سے نکلی۔

☆=====☆=====☆

''میرا ارادہ بھی آج رات کے وقت نکلنے کا ہے۔'' عبداللہ نے اسے بتایا۔

''میں نے منع بھی کیا ہے کہ رات کو مت سفر کیا کرو۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''رات کو بہتر رہتا ہے۔ نہ زیادہ ٹریفک ہوتی ہے نہ وہ دن والا ہنگامہ اور شور شرابا' اطمینان سے سفر طے ہوتا۔''

''تم نے بھی قسم اٹھائی ہوئی ہے کہ میری بات نہیں سنو گے۔'' ماہ بانو نے ندی میں کنکر پھینکا اور گھٹتی بڑھتی لہریں دیکھنے لگی۔

''نہیں تمہاری باتیں سننے میں' میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کیونکہ دوسرے کان کا مصرف ہی یہی ہے کہ اس سے تمہاری سنی ہوئی باتیں نکالتا جاؤں۔''

ماہ بانو نے اسے گھورا اور پھر ایک اور کنکر پھینک کر لہریں دیکھنے لگی۔

''ویسے عبداللہ! کتنا رومانٹک لگتا ہے۔ ہماری پہلی ملاقات بھی یہیں ہوئی تھی' اس ندی کے کنارے اور تم نے میری بنائی ڈرائنگ ٹھیک کی تھی' تب میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہم دونوں پھر کبھی یہاں اکٹھے بیٹھیں گے' اس طرح۔''

''اب تو بہت مرتبہ یہاں اس طرح بیٹھیں گے۔'' وہ مسکرایا۔

''مجھے تو شک ہی ہے۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں ندی میں دھکا دے دوں' سخت موڈ آف کرتی ہو۔'' اس نے بانو کو گھور کر دیکھا۔

''دے ہی دو دھکا' ایک ہی مرتبہ جان اس عذاب سے چھوٹے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

لیکن جیسے ہی اسے اندازہ ہوا کہ عبداللہ کو اس کی باتوں پر غصہ آنے لگا ہے' اس نے بات کو مزاح کا رنگ دے دیا۔

''یوں بھی تمہیں اتنی اچھی سوئمنگ آتی ہے کہ مجھے ڈوبنے کا خدشہ نہیں ہے۔ دھکا دینے کے بعد بچانے تو آؤ گے ناں۔''

"تمہاری یہ حرکتیں جاری رہیں تو ہرگز نہیں۔" اس نے سگریٹ سلگا لیا پھر بولا۔

"اُما کا خط آیا ہے۔"

"اُما کا خط' کہاں ہے؟" وہ کِھل اٹھی۔

"گھر پر پڑا ہوا ہے۔" اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

"ساتھ ہی لے آئے ہوتے۔"

"ساتھ اس لیے نہیں لایا کیونکہ ابھی تمہیں اپنے ساتھ ہی گھر لے جانے کا ارادہ ہے۔" بولا۔

"تم جانتے ہو عبداللہ' میں تمہاری حویلی میں نہیں جانا چاہتی۔"

"جانا تو ہوگا تمہیں۔ کل تم جارہی ہو' باباجان کو خدا حافظ تو کہہ دو اور ایک اور سفارش بھی کر دینا ساتھ میں۔"

"کیسی سفارش؟"

"زینی کے متعلق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ باباجان صرف تمہاری بات مانیں گے۔" اس نے سگریٹ کے دھوئیں کے رِنگز بناتے ہوئے کہا۔

بات تو وہ خود بھی کرسکتا تھا' لیکن اس وقت وہ چاہتا تھا کہ زینی اور ماہ بانو کے تعلقات بہتر ہوسکیں۔

وہ چند لمحے ندی کے شفاف پانی کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"ٹھیک ہے۔"

عبداللہ کو احساس تھا کہ وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی اور صرف اس کی خاطر وہاں جانے پر تیار ہوئی تھی۔

"چلو" اس نے سگریٹ کا بقیہ حصہ ندی کی طرف اچھال دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ تو بتادو کہ باباجان سے کیا کہنا ہے؟" اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"راستے میں بتادوں گا۔"

"اور اگر باباجان نے میری بات نہ مانی؟ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ میری ہر بات مان لیں۔"

"میں تمہارے ساتھ ہی ہوں گا اور کسی بھی صورت باباجان سے تمہیں منوانا ہی ہوگا۔" عبداللہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

حویلی میں داخل ہوتے ہوئے عبداللہ نے ماہ بانو کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن نظر آنے کی کوشش کررہی تھی' لیکن اندر سے یقیناً شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔

سب سے پہلے زہرا سے ان کی ملاقات ہوئی لیکن اس کی مسکراہٹ اور باتیں بھی ماہ بانو کو

ذہنی دباؤ سے نجات نہ دلاسکیں۔

"باباجان اپنی اسٹڈی میں ہیں' اماں جان آرام کررہی ہیں اور زینی فون پر سبط کے ساتھ باتیں کررہی ہے۔" زہرا نے انہیں بتایا۔

"پھر پہلے باباجان سے ہی مل لیتے ہیں۔" عبداللہ نے کہا اور اس کے ساتھ اسٹڈی کی طرف بڑھ گیا۔

باباجان راکنگ چیئر پر بیٹھے اخبار میں چھپا کوئی کراس ورڈ پزل حل کررہے تھے۔

"آؤ بیٹھو۔" انہیں اندر آتے دیکھ کر انہوں نے اخبار تہہ کرکے ساتھ میز پر رکھ دیا۔

"آپ کی چھٹیاں کیسی گزر رہی ہیں بانو؟"

"ٹھیک ہی گزر رہی ہیں۔ کل صبح میں اور اماں جان واپس لاہور جارہے ہیں۔"

"یہاں گاؤں میں دل نہیں لگ رہا۔" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں' ایسی بات نہیں ہے' اصل میں اباجی سرامکس کی نمائش کرنے والے ہیں' تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں اب تو' مجھے ان کی مدد کرنا ہے۔" وہ بولی۔

"اچھا! دراصل عبداللہ کو بھی جلدی ہے واپسی کی' میں چاہ رہا تھا کہ چند دن کے لیے رک جاتا۔"

"آپ کو پتا تو ہے کہ مجھے تھیسس شروع کرنا ہے۔ یہ مسئلہ نہ ہوتا تو میں ساری چھٹیاں یہیں گزارتا' لیکن ابھی تو ہمارے لیے چھٹیاں بھی بس نام کی ہیں۔ کالج تو روزانہ ہی جانا پڑے گا۔" عبداللہ نے کہا۔

ماہ بانو خاموشی سے بیٹھی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ زینی نے زہرا سے کہا تھا کہ باباجان' عبداللہ کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ریشماں کے لیے پروپوزل لے کر جائیں گے۔ کیا وہ سچ کہہ رہی تھی؟ کیا باباجان کا یہی ارادہ تھا؟ اور اگر ان کا ارادہ یہی تھا تو اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا تھا؟

"باباجان! آپ نے زینی کے متعلق کیا سوچا ہے؟" عبداللہ نے ان سے پوچھا۔

"ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان تو دے لے پہلے پھر دیکھیں گے۔" وہ بولے۔

"سمجھیں کہ اس نے امتحان دے دیا پھر؟"

"انجینئرنگ کی طرف وہ نہیں جانا چاہتی اور پڑھنا بھی سائنس ہی چاہتی ہے۔ میتھ اور فزکس' اس کے لیے کسی اچھے سے ٹیوٹر کا انتظام کردیں گے۔" باباجان نے اپنا پائپ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز باباجان' اسے اور گڑیا کو اس چار دیواری میں قید مت کریں وہ اسے قبول نہیں کرسکیں گی۔"

''مجبوری ہے ناں بیٹا۔ لاہور یا کسی بھی اور شہر میں اب وہ محفوظ نہیں رہیں گی۔ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے بعض اوقات چھوٹا نقصان برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''تو آپ انہیں باہر بھجوادیں' لیکن ان کے ساتھ یہ سلوک مت کریں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اگر بات چند دن کی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے' وہ کہیں بھی جانا چاہیں اور چند دن گزار کر واپس آجائیں' لیکن انہیں لمبے عرصے کے لیے کہیں بھیجنے کو دل نہیں چاہتا۔ ابھی دونوں بہت چھوٹی ہیں اور زینی تو بہت امیچور اور غیر ذمہ دار ہے' اسے ہر وقت راہنمائی کی ضرورت ہے۔ پھر دونوں بچیاں گھر سے اتنی دور جا کر گھبرا جائیں گی۔''

''آپ ان سے پوچھ کر تو دیکھیں' ممکن ہے وہ خود بھی یہی چاہتی ہوں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''لیکن بانو بیٹا! میرے مسائل بہت ہیں' ان کی اماں ہیں' وہ ہر وقت ان کے سلسلے میں پریشان رہتی ہیں بلکہ اب تو وہ بہت بیمار رہنے لگی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اب اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ ہماری اولاد ساری زندگی ہم سے دور رہی ہے اور یہ بات خاصی تکلیف دہ ہوتی ہے کہ اولاد کے ہوتے ہوئے صرف ان کے تحفظ کی خاطر انہیں اپنے سے دور کرلیا جائے۔''

''چھوڑیں باباجان!'' عبداللہ نے پیپرویٹ کو گھماتے ہوئے کہا۔ ''ابھی آپ ان کی شادیاں کرنا چاہتے تھے' تب بھی وہ آپ سے اور اماں جان سے دور ہوجاتیں۔''

''وہ بات اور ہے۔ شادیاں ہوجائیں تو ماں باپ مطمئن ہوجاتے ہیں' کتنی فکریں ختم ہوجاتی ہیں۔''

''میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ آپ لوگ صرف اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے انہیں اس حویلی میں بند کررہے ہیں۔ انہیں ایک اچھا اور بہتر ماحول دکھا دینے کے بعد اگر آپ ان سے امید رکھیں کہ وہ گاؤں کے اس ماحول کو قبول کرلیں گی تو یہ بہت ناانصافی ہوگی ان کے ساتھ۔ بہترین تعلیم حاصل کرنے کا انہیں بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مجھے یا اور کسی کو ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

باباجان مسکرادیے۔

''تمہارا کیا خیال ہے عبداللہ کہ مجھے یہ علم نہیں ہے کہ تم دونوں بہنوں بلکہ خاص طور پر زینی کو ملک سے باہر کیوں بھجوانا چاہتے ہو؟''

عبداللہ سر جھکا کر ہنس دیا۔

''جب آپ کو پتا ہے تو آپ انکار کیوں کررہے ہیں؟''

''تم صرف ایک مسئلے کو دیکھ رہے ہو' میرے سامنے بے شمار مسائل ہیں۔'' باباجان نے

کہا۔

''آپ گڑیا اور زینی کو ان مسائل سے دور رہی رکھیں یہاں کے مسائل یوں بھی ہمیں ہی سنبھالنے ہیں۔ بس باباجان آپ انہیں باہر بھجوادیں۔''

''ایسے کیسے بھجوادوں انہیں باہر ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اور ابھی تو پتا نہیں انہیں داخلہ بھی کہیں ملتا ہے یا نہیں' یہ سب کچھ سوچے سمجھے بغیر یونہی تو انہیں کہیں بھجوایا نہیں جاسکتا۔''

''اماں جان کو میں راضی کرلوں گا' داخلہ بھی دونوں کو مل جائے گا' ان کے گریڈ اتنے اچھے ہیں کہ کم از کم داخلہ مسئلہ نہیں ہوگا۔ دیکھ بھال کے لیے جہاں پہلے انتظام ہوتا رہا ہے' اب بھی ہوجائے گا۔ ظاہر ہے جب ہاتھ پاؤں ہلائیں گے تب ہی ہر انتظام ہوگا ناں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''مجھے پتا کرنے دو کہ مس جارج آج کل برطانیہ میں کہاں ہوتی ہیں۔''

''لیکن داخلہ تو انہیں امریکہ میں لینا ہے۔'' وہ بولا۔

''برطانیہ بہتر ہے' وہاں بہت سے جاننے والے ہیں۔ بچیوں کو پریشانی نہیں ہوگی۔'' باباجان نے کہا۔

''وہاں آپ کے ہی نہیں بڑے باباجان کے جاننے والے بھی ہیں' وہاں دونوں کو زیادہ پریشانی ہوگی۔''

اور پھر کتنی دیر کی بحث کے بعد عبداللہ نے باباجان کو اس بات پر راضی کرلیا کہ زہرا اور زینی امریکہ میں ہی تعلیم حاصل کریں گی۔ باباجان اس بات پر مشروط طور پر راضی ہوئے تھے۔

''اگر مس جارج ان کے ساتھ امریکہ گئیں تو' ورنہ کچھ اور سوچیں گے۔'' باباجان نے کہا۔

عبداللہ کو اندازہ تھا کہ مس جارج انکار نہیں کریں گی' وہ سخت تھیں لیکن انہیں زہرا اور زینی دونوں سے بہت پیار تھا۔

وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر لاؤنج میں آگئے جہاں زہرا اور زینی باتوں میں مصروف تھیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ آپ لوگ باباجان کے پاس کسی خاص مشن کے سلسلے میں گئے تھے۔'' زہرا نے کہا۔

''اوئیں۔'' عبداللہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بانو' زینی کی سفارش کرنے گئی تھی باباجان کے پاس!''

ماہ بانو خاموشی سے بیٹھی رہی۔ زینی کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''یہ بہت اچھا موقع تھا باباجان سے بات منوانے کا' لیکن افسوس میرا ایسا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے' جس کے منوانے کی ضرورت پیش آئے' ورنہ بانو میں فوراً تمہاری خدمات لے لیتی۔'' زہرا ہنسی۔

''بھائی! باباجان مانے؟'' زینی نے پُر امید لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ایک بہت کڑی شرط پر مانے ہیں۔"

"وہ کیا؟" زینی کے انداز میں بے چینی تھی۔

"وہ یہ کہ تم لوگوں کے ساتھ مس جارج جائیں گی اگر نہ گئیں تو پھر نہیں۔" عبداللہ نے کہا۔

"ہائے اللہ کرے وہ ساتھ چلنے پر راضی ہو جائیں۔" زینی بولی۔

"یہ دن بھی آنا تھا۔" زہرا نے افسوس سے سر ہلایا۔

"جب زینی یہ دعائیں مانگ رہی ہے کہ مس جارج ہمارے سر پر مسلط ہو جائیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ تو اسی انتظار میں بیٹھی ہوں گی کہ اِدھر بابا جان انہیں ہمارے ساتھ چلنے کے لیے کہیں اور اُدھر وہ ہمیں مصیبت میں مبتلا کرنے پر تیار ہو جائیں۔ اس طرح امریکہ جانے کا کیا فائدہ کہ ساتھ مس جارج دُم بنی چلی جا رہی ہوں۔"

"وہ سبط کو گھر میں داخل ہی نہیں ہونے دیں گی۔ بھائی آپ نے بابا جان سے کہنا تھا کہ ہم دیدی کے ساتھ چلے جائیں گے۔" زینی نے کہا۔

"میری بات تو وہ سن ہی نہیں رہے تھے، یہ جو تھوڑا بہت مان گئے ہیں، یہ بھی بانو کی وجہ سے مانے ہیں۔" وہ بولا۔

اس لمحے وہ ماہ بانو کو بہت اچھا لگا تھا۔ جتنی بحث کی تھی، وہ بابا جان سے عبداللہ نے کی تھی۔ اسی نے ان سے سب کچھ منوایا تھا، لیکن اس کا تمام تر کریڈٹ وہ بانو کے کھاتے میں ڈال رہا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس کی بہنوں کے دل میں اس کے لیے جگہ بن جائے۔

لیکن زینی اب بھی اسے نظر انداز کیے ہوئے تھی۔ اس نے ماہ بانو کا شکریہ تک ادا نہیں کیا تھا۔

"بانو تم بیٹھو میں اُما کا خط لاتا ہوں۔" عبداللہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے پیچھے زہرا بھی کچن کی طرف چل دی۔

اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد زینی، ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اس دن میں نے آپ سے بہت بدتمیزی کی تھی آپ کے متعلق پتا نہیں کیا کیا الٹے سیدھے ریمارکس دیے تھے۔ مجھے آپ سے سوری کرنا تھی۔"

"کس بات کی سوری؟ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ تم نے کیا کہا تھا۔" ماہ بانو نے کہا۔ حالانکہ اسے ایک ایک بات اچھی طرح یاد تھی۔

"نہیں، ڈائریکٹ تو میں نے آپ سے کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی، وہ گڑیا سے جھگڑتے ہوئے میں نے کچھ ریمارکس دیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ آپ نے سن لیے ہوں گے، لیکن اچھا ہوا کہ آپ نے نہیں سنے۔ میں خواہ مخواہ ہی گلٹی فیل کر رہی ہوں۔ اتنے دن تک بھائی نے بھی بول چال بند رکھی۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ نے نہیں سنے تو مجھے سوری بھی نہ کرنا پڑتا آپ سے۔" وہ

بولی۔

ماہ بانو خاموش رہی۔

"آپ ریشماں بھابی کی کزن ہیں ناں؟" زینی نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا۔

"انہوں نے آپ کا ذکر کیا تھا مجھ سے، وہ تو مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ آپ ان کی واحد سب سے اچھی اور راز دار دوست ہیں۔"

ماہ بانو نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔

"آپ کو پتا ہے ناں کہ وہ بھائی کے ساتھ انگیجڈ ہیں؟" زینی نے پوچھا۔

اسی وقت عبداللہ کمرے میں داخل ہوا۔ ماہ بانو نے سکون کا سانس لیا۔ زینی اسے الزام دینے والی نظروں سے دیکھتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"یہ لو خط۔" عبداللہ نے خط اس کی طرف بڑھایا۔

زینی کی نظروں نے ایک مرتبہ پھر اسے ڈپریشن میں مبتلا کر دیا۔

"زینی کیا کہہ رہی تھی۔" عبداللہ اس کے محسوسات بھانپ کر بولا۔

"کچھ نہیں سوری کر رہی تھی۔" اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا اور خط کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ڈیئر ماہ بانو اور عبداللہ!

آج تم سب اتنے زیادہ یاد آ رہے ہو کہ کیا بتاؤں۔ ابھی ابھی ایڈی کو خط لکھا ہے اور اب نیہاں کو بھی لکھنے کا ارادہ ہے۔ اتنے دن ہو گئے، تم سب سے ملے اور بات کیے ہوئے۔

ویسے میں یہاں بہت انجوائے کر رہی ہوں، لیکن ہر اچھی جگہ یہی خیال آتا ہے کہ اگر ہم سب یہاں ہوتے تو کتنا اچھا لگتا۔ آج کل سارا دن گھومنے پھرنے اور شاپنگ کرنے میں گزر جاتا ہے اور پتا ہے میں کس چیز کی شاپنگ کر رہی ہوں؟ کتابوں کی۔ (ظاہر ہے اپنے لیے نہیں، ایڈی کے لیے کیونکہ میں اس کے مطابق جاہل مطلق ہوں)

ان دنوں یہ حال ہے کہ کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ کبھی ایک شہر میں ہوتے ہیں اور کبھی دوسرے میں، اس لیے تم لوگوں کو نہ ایڈریس دے سکتی ہوں اور نہ فون نمبر۔ ویسے آج کل بمبئی میں ہوں۔

ایک بہت مزے کی بات بتاؤں تم لوگوں کو۔ میرا بھائی ہے ناں اجے، اس کا ایک دوست ہے آنند، بہت ہینڈسم ہے، وہی یہاں پر ہمارا گائیڈ بنا ہوا ہے، وہ مجھے

کسی چکر میں لگ رہا ہے‘ لیکن میں نے لفٹ نہیں کروائی اسے۔ ایڈی کو میں نے اپنی کچھ تصویریں بھجوائی ہیں ان میں وہ بھی موجود ہے۔ اس کا ذکر بھی کیا ہے میں نے ایڈی کے خط میں۔ بانو تم مجھے بتانا کہ ایڈی کا کیا ری ایکشن تھا اس بارے میں؟

ایک دن میں نے بہت مشکل سے فون کیا تھا ایڈی کے گھر۔ شاید اس کی بہن نے ریسیو کیا تھا فون۔ اس نے بتایا کہ وہ سارا دن اور پھر رات گئے کام میں مصروف رہا تھا‘ اس لیے اس وقت سو رہا ہے‘ میرا دل نہیں چاہا اسے جگانے کے لیے ویسے اس سے بات نہ کرنے کا اب تک افسوس ہے۔

ایڈی تو اتنا کام کر رہا ہے‘ تمہارا تھیسس کیسا جا رہا ہے عبداللہ؟ جب تک تم گاؤں میں ہو تب تک تو مشکل ہوگا۔ میرا خط ملنے تک تم دونوں ہی واپسی کے لیے تیار ہو گے یا شاید واپس بھی جا چکے ہو۔

اور بانو‘ نیہاں کا راؤنڈ اباؤٹ یعنی چکر کہاں تک پہنچا؟ ہمیں اتنے سبق پڑھائے اس نے اور خود ابھی تک وہیں پر کھڑی ہے۔

تمہاری ایگزیبیشن مس کرنے کا مجھے بہت افسوس ہے بانو‘ لیکن نیہاں کو میں لکھ رہی ہوں کہ وہ کسی بھی طرح اسلام آباد سے لاہور پہنچے۔ ایڈی کو بھی لکھا ہے میں نے کہ وہ سب ماسٹر پیس کی تصویریں ضرور کھینچے بلکہ سلائیڈ ہی بنا لے۔

اور عبداللہ پہلے تو یہ کام میں اور نیہاں کرتے تھے‘ اب ہماری غیر موجودگی میں تمہیں ہی کرنا پڑے گا‘ اگر بانو کسی قسم کی حماقت کا ثبوت دے تو بے دریغ اس کے کان کھینچ لینا۔ مجھے تو فکر ہے کہ پتا نہیں گاؤں جا کر اس نے صورتِ حال کو کیسے قابو کیا ہوگا۔ وہ بہت پریشان تھی چھٹیوں سے پہلے۔ ہم نے بہت سمجھایا بھی تھا اسے لیکن وہ سمجھتی کب ہے‘ پلیز اس کا خیال رکھنا۔

اب اجازت دو‘ نیہاں کو بھی چند لائنیں گھسیٹ دوں اوکے۔

تمہاری اُما۔

ماہ بانو نے خط بند کیا۔

”اب بتاؤ کہ تمہارے کان کھینچوں یا تمہارا خیال رکھوں۔ اُما نے بیک وقت دونوں کا آرڈر دیا ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔

وہ ہنس پڑی۔

”میں بہت خوش ہوں‘ اُما کا خط پڑھ کر مجھے یوں لگا ہے‘ جیسے وہ ہمارے پاس ہی ہو۔“

”سارا خط تو ایڈی کے ذکر سے بھرا ہوا ہے۔“ وہ بھی ہنس پڑا۔

”سارا کہاں‘ تھوڑا سا تو ذکر ہے اس کا‘ لیکن مجھے اس پر بہت غصہ ہے‘ وہ آئے گی تو اس کے کان تو میں کھینچوں گی‘ سب تصویریں اس نے ایڈی کو بھجوا دی ہیں‘ ایک آدھ ہمیں بھی بھجوا دیتی تو کیا فرق پڑتا۔“

”اس کی مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ مروت میں اس نے ہمیں خط لکھ دیا تو ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے‘ ورنہ حقیقت میں وہ صرف ایڈی کو مس کر رہی ہوگی۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے‘ تم سے نہ سہی‘ مجھ سے تو اس کی ایسی دوستی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو سچ مچ بہت مس کرتے ہیں۔“ ماہ بانو نے کہا۔

”اور یہ نیہاں کا کیا راؤنڈ اباؤٹ یعنی چکر ہے۔“ عبداللہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

ماہ بانو ہنس پڑی۔

”اس نے ہم سے وعدہ لیا تھا کہ ہم کسی کو نہیں بتائیں گے اور ہمیں مجبوراً وعدہ کرنا پڑا۔ اس بات کا صرف مجھے اور اُما کو پتا ہے۔ نیہاں کا خیال تھا کہ اور کسی کو ہم نے بتایا یا نہ بتایا‘ تم دونوں کو تو ضرور بتائیں گے۔“

”اور اب چونکہ تم نے وعدہ کر لیا ہے‘ اس لیے نہیں بتاؤ گی۔“

”نہیں۔ خیر‘ میں وعدے کی اتنی پکی نہیں ہوں‘ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جسے وہ پسند کرتی ہے‘ وہ تمہارا دوست ہے اور ابھی تک تمہارے اس دوست کی طرف سے پسندیدگی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔“

”ایسا کون سا دوست ہو سکتا ہے۔“ عبداللہ نے ذہن پر زور دیا۔

”میں نے بُوجھ لیا تھا‘ تم بھی خود ہی بُوجھو‘ نہ جان سکے تو پھر میں بتاؤں گی۔“ وہ ہنسی۔

”اچھی لڑکی ہے نیہاں بھی۔“ وہ بولا۔

”صرف اچھی نہیں ہے‘ بہت اچھی ہے۔“

وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ زینی ہاتھ میں ایک لفافہ لیے کمرے میں داخل ہوئی اور بانو کو وہاں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

”کیا بات ہے زینی! آ جاؤ ناں۔“ ماہ بانو نے اس سے کہا۔

”نہیں‘ میں پھر آ جاؤں گی۔“ اس کے انداز میں بے رخی تھی۔

”زینی۔“ عبداللہ کے انداز میں سختی اور سرزنش تھی۔

”اب میں نے کیا کر دیا بھائی۔“ اسے احساس ہوا کہ عبداللہ نے اسے ماہ بانو کے سامنے ڈانٹ دیا ہے تو خفت سے اس کا برا حال ہو گیا۔

”کیا بات ہے؟ کیوں آئی تھیں؟ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ عبداللہ نے کہا۔

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ”میں یونہی آ گئی تھی‘ کوئی بات نہیں تھی۔“

"جھوٹ مت بولو بتاؤ کیا بات ہے۔"

"میں نے گڑیا کو یہ دکھانا تھا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے لفافے کی طرف دیکھا۔

"ادھر دو میں دیکھوں کہ اس میں کیا ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

پھر لفافہ کھولتے ہوئے اسے خیال آیا۔

"کوئی پرسنل چیز تو نہیں ہے؟"

"نہیں، تصویریں ہیں۔" وہ بولی۔

"تصویریں! کس کی؟" عبداللہ نے کہتے ہوئے تصویریں لفافے سے نکال لیں اور د لگا۔

"واہ! یہ بیوٹی کون ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے زینی کی طرف دیکھا۔

"یہ ریشماں بھا......!" وہ بھابی کہتے کہتے رک گئی۔ اور پھر جلدی سے بولی۔

"ریشماں آپی ہیں۔ سبط سے میں نے کہا تھا کہ مجھے ان کی تصویریں بھجوائے۔"

ماہ بانو کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے ساتھ والی میز پر پڑا رسالہ اٹھایا اور یونہی اس کے و پلٹنے لگی۔

"اچھی تصویریں ہیں۔" عبداللہ نے انہیں لفافے میں واپس ڈال کر لفافہ زینی کو پکڑا د

"تصویریں نہیں۔ وہ خود اچھی ہیں۔ تصویر میں تو وہ ویسی ہی آئیں گی ناں جیسی وہ ہیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ضروری نہیں ہے، لیکن تم جاؤ، میں بحث نہیں کروں گا۔"

وہ کمرے سے نکل گئی تو ماہ بانو بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں اب چلتی ہوں۔"

"چائے پی کر چلی جانا۔" وہ بولا۔

"نہیں، دیر ہو رہی ہے۔"

"اچھا، اماں جان سے تو مل لینا۔ ان کی طبیعت آج ٹھیک نہیں تھی، اس لیے سوئی ہ تھیں۔"

"پھر سہی، تم مائنڈ مت کرنا پلیز۔" ماہ بانو نے کہا۔

☆=====☆=====☆

لاہور پہنچ کر ماہ بانو اس قدر مصروف ہوئی کہ ہفتہ بھر عبداللہ سے مل بھی نہ سکی۔ فون تو نہیں کہ اس سے بات کی جا سکتی اور کالج جانے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ ابا جی کے ساتھ مل کر مسلسل ایگزیبیشن کی تیاری میں مصروف تھی۔ گاؤں میں جو کچھ گزرا تھا، اس مصروفیت کے دوران اس نے ان سب باتوں کو بھی ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

انہوں نے تمام تر کام سرخ چکنی مٹی اور اسٹون ویئر میں ہی کیا تھا۔ سرخ چکنی مٹی تو خیر وہاں بھی دستیاب تھی، لیکن اسٹون ویئر (Stone Wear) لانے کے لیے ابا جی خود گجرات گئے تھے۔

اور اب سب کچھ تیار تھا۔ ماہ بانو اپنے اور ابا جی کے کام کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"میں نے جب دوستوں کو بتایا تھا ناں ابا جی، تو سب بہت حیران ہوئے تھے کہ ہم نے چاک پر اتنی چھوٹی چھوٹی چیزیں کیسے بنا لیں۔ سرامک میں منی ایچر کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں گئی تھی۔" اس نے ننھے منے سے گھڑے کو چھوتے ہوئے کہا۔

"تم نے شیشوں کے کیس میں کمپوزیشن بھی کر لی یا نہیں۔" ابا جی نے اس سے پوچھا۔

"کر تو لی ہے لیکن میں چاہ رہی تھی کہ اپنے دوستوں کو بھی دکھا دوں، وہ سب بہت اچھے مشورے دیں گے۔"

"تو انہیں گھر پر ہی بلوا لو۔ یہ اتنی چیزیں لے کر تم کالج تو نہیں جا سکتیں۔" ابا جی نے مشورہ دیا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" پاس بیٹھی اماں جی نے مداخلت کی۔ "آپ کو پتا بھی ہے کہ ہم محلے میں رہ رہے ہیں، اس کے تو آدھے دوست لڑکے ہیں، محلے والے کیا کہیں گے؟ پہلے بھی اتنی باتیں مجھے ہی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ ہر کوئی پوچھتا ہے کہ رات دس بجے تک آخر کون سا کالج لگا رہتا ہے؟ ذرا کسی کو اس کے کالج کا نام بتا دو، وہی کانوں کو ہاتھ لگانے لگتا ہے کہ کیا ضرورت تھی بانو کو وہاں بھیجنے کی۔"

"پتا ہے امی! رسل کہتا ہے کہ ہمارے ناخوش رہنے کے بہت سے اسباب ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں اور ان کی باتوں سے ڈرتے ہیں یعنی فیئر آف پبلک اوپینین۔ اگر ہم اپنے اندر سے مضبوط ہوں اور سارے زمانے کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کرنا چھوڑ دیں تو ہم بہت خوش رہ سکتے ہیں۔"

"مجھے نہیں پتا کون کیا کہتا ہے اور کیا نہیں، جس نے یہ سب کہا ہے، پتا نہیں وہ کس کونے کھدرے میں رہتا ہے۔ میں انسانوں کے درمیان رہ رہی ہوں مجھے سب کی پروا کرنی پڑتی ہے، لیے کیسے پردے ڈالنے پڑتے ہیں اس لڑکی پر مجھے۔ قیامت کے آثار ہیں۔ ہمارے زمانے میں تو کوئی لڑکی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ماں باپ کے سامنے کسی لڑکے کا نام بھی منہ سے نکالے، کجا یہ کہ لڑکوں سے اس کی دوستی ہو، لڑکوں کے ساتھ کالج میں پڑھے۔" اماں بولیں۔

"اماں ہر زمانے کے بزرگوں کو ہر وقت قیامت کے آثار ہی دکھائی دیتے ہیں حالانکہ ذرا مختلف انداز میں وہ بھی یہی سب کچھ کر چکے ہوتے ہیں، جو ہم آج کر رہے ہیں، مگر یقین کریں قیامت اتنی جلدی آئے گی نہیں۔ ہم تو مفت میں بدنام ہیں۔ میں جانتی نہیں کیا کہ گاؤں

میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ ایک طرف اور ہمارے گاؤں ایک طرف۔ بس
اسٹائل کی کمی ہے اور کچھ نہیں۔'' ماہ بانو چیزیں ترتیب سے لگاتے ہوئے بولی۔

''میری بات کان کھول کر سن لیں آپ دونوں' اس گھر میں اس کے کالج کا کوئی لڑکا
نہیں ہوگا۔ ہمیں محلے میں سب کے درمیان رہنا ہے' غمی خوشی اکٹھے کاٹنی ہے۔ یہاں یہ من
نہیں چلے گی ہاں۔''

''رہنے دیں ابا جی! میں خود ہی سب کچھ کرلوں گی۔'' وہ بولی۔

''بانو بیٹا! میں تمہارے بھلے کے لیے یہ سب کچھ کرتی ہوں' تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔'' ا
جی نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے اماں! میں آپ کی بات مان تو گئی ہوں۔ یوں بھی بدا اچھا ہوتا ہے' بد
برا' ورنہ ہر ایک کے کرتوت سے میں بھی واقف ہوں۔ سب پتا ہے مجھے کہ محلے میں کون کیا کر
ہے' مگر جانے دیں اس بات کو۔'' وہ ابا جی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''ابا جی! مجھے کپڑے بنانے ہیں۔''

''وزیر خزانہ سے پوچھو' اگر خزانے میں کچھ ہوا تو لے لو۔'' انہوں نے اماں جی کی طر
اشارہ کیا۔

''اماں جی' خزانے کی کیا صورت حال ہے؟''

''سب کچھ تو تم باپ بیٹی اس نمائش کے نام پر خرچ کر چکے ہو' میں کہاں سے لاؤں
وہ بولیں۔

''دیکھا ابا جی! ذرا پیسوں کی بات کرو تو اماں سے یہی جواب سننے کو ملتا ہے۔''

''کمی کون سی ہے تمہارے پاس کپڑوں کی' الماری بھری پڑی ہے۔''

''ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو میں پہن سکوں اور اماں جی اتنی محنت کرنے
بعد مجھے نمائش میں نئے کپڑے تو پہننے چاہئیں ناں۔''

''کتنے سے کام چل جائے گا؟'' انہوں نے پوچھا

''ذرا مہنگے سے ہی چلے گا۔'' اس نے دبے دبے سے انداز میں کہا۔

''پھر بھی؟''

''اماں ابھی کپڑا لے کر سلوانے کا وقت تو رہا نہیں ہے۔ کسی بوتیک سے ہی لینے
گے۔'' وہ بولی۔

''یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کتنے سے کام چل جائے گا۔''

''چار یا پانچ ہزار۔'' اس نے کہا۔

''کیا؟'' اماں کو جھٹکا لگا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

''ایک بھی تو ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے میرے پاس' میں کیا کروں؟''

''غضب خدا کا' پانچ سو تک تو میں دے دیتی' لیکن ایک نہ دو پورے پانچ ہزار۔ باپ نے
ٹال نہیں کھولی ہوئی یہاں۔ میں ایک ایک پیسہ جوڑ رہی ہوں' اس کی شادی کے لیے اور یہ
زادی ایک جوڑے پر پانچ ہزار پھونک رہی ہے۔'' اماں جی چلائیں۔

اس نے مدد طلب کرنے کے لیے ابا جی کی طرف دیکھا۔

''وزیر خزانہ میری سفارش پر دے دو' بعد میں اس کے اور میرے جیب خرچ سے کاٹ
رپورے کر لینا۔'' ابا جی نے کہا۔

''آپ کی شہ پر یہ ایسی حرکتیں کرتی ہے۔'' اماں بولیں۔

ابا جی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

''آپ دیکھ لیں ابا جی! میں نے قیمتوں کا تعین خود ہی کر کے کارڈز لگا دیے تھے۔'' وہ اندر
احتیاط کے ساتھ شیشے کے کیس باہر لے آئی۔ ان کیسوں میں سرامکس پیس کمپوز کر کے رکھے
تھے۔

''جو قیمتیں تم نے لگائی ہیں' ٹھیک ہوں گی' مجھے صرف کمپوزیشن دیکھنی ہے۔'' وہ بولے۔

اماں بھی شوق سے سب چیزیں دیکھنے لگیں۔

''بانو اس کی کیا قیمت رکھی ہے؟'' اماں نے ایک کیس کی طرف اشارہ کیا' ماہ بانو باری
ی سب کی قیمت بتانے لگی۔

''یہ ہے اماں جی دو ہزار کا' یہ والا ہے ڈیڑھ ہزار کا اور یہ ہے پانچ ہزار کا۔''

''کیا۔ کیا؟ تم ہوش میں تو ہو بانو؟ اتنی قیمتوں میں یہ کون خریدے گا؟ یہ ہانڈیاں اور
ڑے تو کسی کام کے بھی نہیں ہیں' نہ کھانا پکایا جاسکتا ہے ان میں اور نہ پانی رکھنے کے کام آسکتے
۔ کیا غضب کیا تم نے توبہ ایسی مہنگائی۔'' اماں جی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

''میرا دل چاہ رہا ہے اماں جی کہ خودکشی کرلوں' ابھی اور اسی وقت' او گاڈ! اماں یہ ہانڈیاں
نا پکانے کے لیے نہیں ڈرائنگ روم میں سجانے کے لیے ہیں۔ ٹھیک ہے ہمارے لیے بنانا
ئی مشکل نہیں ہے' لیکن یہ تو دیکھیں کہ ہم نے اتنی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی چاک پر بنائی ہیں۔
ل رنگ لگائے ہیں ان کے ساتھ ہر چیز گلیزڈ ہے اور پھر ان کی کمپوزیشن۔''

''بہت پاگل ہوں گے کہ اتنی زیادہ قیمتوں میں خریدیں گے۔'' اماں نے کہا۔

''آپ کو اس لیے پاگل لگ رہے ہیں وہ کہ گھر کی مرغی ہمیشہ دال برابر ہوتی ہے۔'' وہ
ا

ابا جی ایک بے حد خوبصورت کمپوزیشن کا جائزہ لے رہے تھے' جس پر این۔ ایف۔ ایس کا

کارڈ لگا ہوا تھا۔

''بانو اس پر ناٹ فار سیل کیوں لگا رکھا ہے' یہ بیچنے کا ارادہ نہیں ہے؟ میرے خیال میں
ان سب سے زیادہ خوبصورت کمپوزیشن ہے۔'' ابا جی نے کہا۔

''یہ سب سے خوبصورت ہے' اسی لیے نہیں بیچ رہی' پھر بتاؤں گی کہ کیوں نہیں بیچ رہی۔''
اس کے ذہن میں عبداللہ کا تصور ابھر آیا۔ اس کمپوزیشن پر اس نے سب سے زیادہ محنت کی تھی اور اسے وہ عبداللہ کو تحفے میں دینا چاہتی تھی۔

رات کو وہ سونے ہی لگی تھی۔ ابا جی اس کے کمرے میں آ گئے۔

''یہ لو بانو!'' انہوں نے اس کی طرف روپے بڑھائے۔

''یہ کیا ہے؟''

''پیسے ہیں' تمہارے کپڑوں کے لیے۔'' انہوں نے کہا۔

''سچ ابا جی!'' اسے یقین نہ آیا۔

''بالکل سچ۔ محسوس کر کے دیکھ لو۔'' انہوں نے روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

''تھینک یو ابا جی! یو آر گریٹ لیکن......'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر دبی آواز میں پوچھا۔
''وزیر خزانہ نے اتنی آسانی سے دے کیسے دیے؟''

''یہ کام مجھ پر چھوڑ دیا کرو' تمہاری اماں کو قائل کر ہی لیا بالآخر میں نے کہ ہر کوئی جیسا عقل مند نہیں ہے کہ مٹی کی ان بیکار ہانڈیوں پر روپے نہ پھونکے۔ ابھی کچھ بیوقوف م ہیں جو ان پر روپے پھونکیں گے اور بخوشی پھونکیں گے اور انہی بے وقوفوں کے دم سے ہا ہانڈی روٹی چلتی رہے گی۔''

وہ ہنس پڑی۔

☆=====☆=====☆

زینی کو حویلی میں آئے اتنے دن گزر چکے تھے کہ اب سبط حسن اس بارے میں مطمئ ہو چکا تھا کہ مکرم کی بات پر یا تو پیر صاحب نے ہی توجہ نہیں دی یا پھر مکرم نے ہی انہیں کچھ بتا کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

مگر ابھی اس کے اس اطمینان کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اسے پیر صاحب کا بلاوا آ گیا۔

''جی بابا جان؟'' وہ گول کمرے میں ان کے پاس پہنچ کر کہنے لگا۔

''ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم یونہی بیکار پھر رہے ہو' پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے تم نے؟''

''نہیں' میں نے امریکہ میں اپلائی کیا ہوا ہے۔'' وہ بولا۔

انہوں نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

''جن طریقوں میں تم پڑے ہو' ان میں صرف وقت ضائع ہوتا ہے' یہ لو اور امریکہ جا

ی تیاری شروع کر دو۔ میں تمہیں اس طرح بیکار پھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔''

''اس میں کیا ہے؟'' اس نے لفافہ لے کر پوچھا۔

''تمہارا ایڈمیشن ہو گیا ہے نیویارک میں۔'' انہوں نے کہا۔

سبط نے لفافہ کھول کر اندر سے تہہ شدہ کاغذ نکال لیا۔ اس پر کالج میں ایڈمیشن اور یگر تفصیلات درج تھیں۔

''تھینک یو بابا جان؟'' وہ کھل اٹھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد یہ خوش خبری زینی کو ا سنائے۔ یوں بھی وہ انتظار کر رہی تھی کہ سبط کا داخلہ جس کالج میں ہو' وہ بھی وہیں داخلہ لے۔

''میں جاؤں بابا جان!'' اس نے کاغذ دوبارہ لفافے میں ڈال دیے۔

''نہیں ابھی بیٹھو۔'' وہ پائپ سلگاتے ہوئے بولے۔

''جی بابا جان۔'' وہ منتظر تھا۔

''تم حیدر علی کی حویلی میں کیوں گئے تھے اس دن؟'' انہوں نے پائپ کا کش لے کر پوچھا۔

''بابا جان آپ نہ پوچھیں تو اچھا ہے۔ میں سچ بتانا نہیں چاہتا اور جھوٹ بول نہیں سکتا۔'' انے صاف گوئی سے کہا۔

''ہوں۔'' وہ چند لمحوں تک پُرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔

''تو گویا یہ زینب' حیدر علی شاہ کی بیٹی ہے کرم داد کی کارکردگی نے مجھے مایوس کیا ہے۔''

انہوں نے بآسانی زینب اور حیدر علی شاہ کا لنک ملا لیا تھا۔ پہلے وہ زینب سے متعلق کرم کی اطلاع پر مطمئن ہو گئے تھے' لیکن جب مکرم نے انہیں سبط کے کسی لڑکی کے ساتھ حیدر علی کی حویلی جانے کا واقعہ بتایا تھا اور ساتھ یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ لڑکی زہرا یا زینب ہو سکتی تو انہیں اصل بات سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

''جی بابا جان! وہ زینب تھی' حیدر بابا کی بیٹی۔'' اس نے کہا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ آج نہیں تو کل اسے یہ بات گھر والوں تک پہنچانی تو تھی ہی پھر آج میں مضائقہ تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب یہ بات اس کے بجائے خود بابا جان نے ع کی تھی۔

''کیوں؟'' پیر صاحب نے اسی قدر کہا۔

''اس لیے بابا جان کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ شروع میں ہمیں یہ علم تھا کہ ہمارا خاندان ایک ہی ہے لیکن اب کچھ عرصہ پہلے ہمیں اس بات کی خبر ہوئی تب بھی سے ہمارے تعلقات متاثر نہیں ہوئے۔

اس روز وہ یہاں ریشماں آپی سے ملنے آئی تھی بلکہ سبھی سے ملنا چاہتی تھی۔ آپ سے بھی لیکن ریشماں آپی کے علاوہ وہ کسی پر اپنا آپ' اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے بھی علم نہیں تھا کہ وہ اس طرح حویلی میں چلی آئی ہے۔ جب خبر ہوئی تو میں انسے واپس حضرت صاحب والی حویلی میں چھوڑ آیا۔''

کچھ دیر تک پیر صاحب سوچتے رہے پھر بولے۔

''اس کے گھر والوں کو اس بات کی خبر ہے؟''

''جی' اب تو ہے۔ ان کا ماحول خاصا مختلف ہے ہمارے گھر سے' خاص طور پر عبداللہ بھائی کی سوچ بہت مختلف ہے۔''

''تم غالباً اسی عبداللہ شاہ کی بات کر رہے ہو' جس نے تمہارے بھائی کو قتل کیا تھا۔''

''نہیں' میں اس عبداللہ شاہ کی بات کر رہا ہوں' جس پر بے مقصد گولیاں برسائی گئیں اور پھر بھی اس نے اپنے اوپر گولیاں برسانے والے کو خود بھی زخمی ہونے کے باوجود اپنا خون دیا۔'' سبط حسن نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''سبط حسن! اس حویلی میں کبھی کسی نے اپنے والد کے سامنے ایسے لہجے میں بات نہیں کی۔''

''آئی ایم سوری بابا جان! میرا مقصد آپ کے سامنے بدتمیزی کرنا نہیں تھا۔ میں تو صرف ریکارڈ درست کر رہا تھا۔'' وہ بولا۔

''تمہیں خبر ہے سبط کہ زینب کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟''

''جی بابا جان! ہم دونوں فرسٹ کزن ہیں۔''

''ایک اور رشتہ بھی ہے۔ وہ اس گھر کی بہو بھی ہے تمہارے مرنے والے بھائی کی بیوہ۔'' انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

''یہ کس الہامی کتاب میں درج ہے بابا جان کہ نکاح کے بغیر کوئی لڑکی بیوہ ہو سکتی ہے؟'' اس نے کہا۔

اسی وقت مکرم کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

''شریعت اپنی جگہ' لیکن اس حویلی کی روایات کسی صورت نہیں توڑی جا سکتیں۔'' پیر صاحب بولے۔

''For Heayen Sake بابا جان' اس دور میں یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ دنیا کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم اب تک لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ پلیز بابا جان! اس حصار سے باہر نکلیں۔ اول تو میں زینی اور گڑیا کی کسی بچپن کی منگنی کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا یک طرفہ فیصلہ تھا اور اگر یہ دو طرفہ فیصلہ ہوتا تب بھی یہ فیصلہ آپ کر سکتے تھے اور نہ

بابا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی کی زندگی کا فیصلہ' اس کی مرضی کے بغیر کرنے کا اختیار کسی کو ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں۔

لیکن ایک لمحے کو ہم یہ فرض بھی کر لیں تو بابا جان' اگر گڑیا کی منگنی خادم بھائی اور زینی کی امداد بھائی سے ہوئی تھی اور اس کی اب تک کوئی اہمیت ہے تو ریشماں آپی اور عبداللہ بھائی کی منگنی بھی اب تک برقرار ہے اور اس کی بھی وہی اہمیت ہے۔''

''یہ تو قوتِ بازو کی بات ہے۔ وہ ریشماں آپی کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے' لیکن ہم میں اتنا حوصلہ ہے کہ گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کر سکتے ہیں۔'' مکرم نے کہا۔

''تو جن میں انگلیاں ٹیڑھی کر کے گھی نکالنے کا حوصلہ ہے' وہ بھی اپنے ارمان پورے کر لیں۔'' سبط نے اسے گھورا۔

''سبط! میں صرف بابا جان کی وجہ سے لحاظ کر رہا ہوں' ورنہ اتنی بات کاش کسی اور نے کہی ہوتی۔'' مکرم نے دانت پیسے۔

''آپ بالکل کسی کی وجہ سے لحاظ نہ کریں۔ تعلیم نے مجھے مہذب بنا دیا ہے' لیکن خاندان کا اثر اتنی آسانی سے نہیں جاتا۔ اندر سے میں بھی اتنا ہی جنگلی ہوں جتنے آپ یا ہمارے پچھلے جنگلی تھے۔''

''کیا بکواس کی تم نے؟ کسے جنگلی کہا ہے؟ بابا جان کو' دادا جان کو۔'' مکرم غصے سے سرخ ہوتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''مکرم۔'' پیر صاحب نے اسے سرزنش کے انداز میں ڈپٹا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں بابا جان کہ یہ کیا بکواس کر رہا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں خاموش ہو جاؤں۔'' وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

''بیٹھ جاؤ مکرم۔'' بابا جان نے سختی سے کہا۔

وہ بیٹھ گیا' لیکن اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سبط کا حشر نشر کر دے۔

''سیدھی بات کرو سبط! تم زینب کے ساتھ صرف وقت گزار رہے ہو یا اس کے سلسلے میں سنجیدہ ہو۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''میں سو فیصد سنجیدہ ہوں۔'' وہ بولا۔

''شادی کرنا چاہتے ہو اس سے؟''

''جی بابا جان' لیکن ابھی نہیں تعلیم مکمل کر کے۔'' اس نے کہا۔

''آل رائٹ! ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ابھی تمہیں جلدی نہیں ہے' ہمیں بھی نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد ہم خود تمہارا پروپوزل لے کر جائیں گے اس کے لیے۔'' پیر صاحب نے

کہا۔

مکرم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور سبط نے الجھن سے۔ پیر صاحب کے منہ سے نکلنے والی بات بہت غیر متوقع تھی۔

''اب تم جاؤ سبط۔'' انہوں نے کہا۔

''یہ کیا بابا جان؟'' مکرم نے اس کے اٹھنے کے بعد کہا۔

پیر صاحب نے پائپ کا کش لیا اور سبط کے کمرے سے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

جب وہ جا چکا تو بولے۔

''وقت آنے پر تمہیں سب کچھ سمجھ میں آجائے گا سانپ کو ایسے مارنا چاہیے کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ہمارے بابا جان درست کہتے تھے کہ اولاد انسان کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑا امتحان ہوتی ہے۔ ہم ایک لڑکی کی خاطر اپنے بیٹے سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ ایک بیٹے کو کھو چکے ہیں اور کسی کو کھونا نہیں چاہتے۔ سانپ ہم ضرور ماریں گے لیکن ایسے کہ اس سے ہماری لاٹھی نہ ٹوٹے۔''

پھر وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔

''اور تم کچھ دنوں کے لیے لاہور چلے جاؤ۔''

''لیکن کیوں بابا جان؟'' مکرم نے پوچھا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تم میں اور سبط میں مزید کوئی لڑائی جھگڑا ہو۔ خادم حسین بھی آج کل وہیں ہے، تم بھی کچھ دن لاہور گزار آؤ۔''

''جی بہتر۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆=====☆=====☆

سبط حسن کمرے سے باہر نکلا تو بہت الجھا ہوا تھا۔ پیر صاحب کا یوں مان جانا اس کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا، لیکن خطرے کی نوعیت وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہاں سے وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا اور زینی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف فون زینی نے ہی ریسیو کیا۔

''سب سے پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ تمہارے ایڈمیشن کا کیا بنا؟'' سبط نے اس سے پوچھا۔

''ابھی کیا بننا ہے، میں انتظار کر رہی تھی کہ پہلے یہ تو پتا چلے تمہارا ایڈمیشن کہاں ہو رہا ہے؟ یہ تو نہ ہو کہ میں ہوں نیویارک میں اور تم کیلیفورنیا میں ہو، اس کا کیا فائدہ۔'' وہ بولی۔

''مجھے خبر بھی نہیں تھی اور بابا جان نے نیویارک میں میرا ایڈمیشن کروا دیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کہاں پر؟''

سبط اسے تفصیل بتانے لگا۔

''اور تمہیں بتاؤں سبط، بابا جان نے مس جارج سے بات کی اور وہ تو جیسے اس انتظار میں تھیں کہ تلوار بن کر ہمارے سروں پر لٹک جائیں۔ وہ فوراً راضی ہو گئیں۔ دیکھو تمہاری خاطر کیا کیا برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔''

''میں نے تم سے کہا تھا زینی کہ جب تک پاکستان میں ہو محتاط رہو، کوشش کرو کہ حویلی سے زیادہ باہر مت نکلو اور اگر نکلنا پڑے تو گن مین ضرور ساتھ رکھنا۔ جو میں کہہ رہا ہوں، اس پر سختی سے عمل کرنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''لیکن کیوں؟ ایک تو ویسے ہی یہاں اتنی پابندیاں ہیں کہ میرا دم گھٹنے لگتا ہے اور اب میں حویلی سے باہر بھی نہ نکلوں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ ذرا ایک آدھ دن کے لیے ماموں کی طرف چلی جاتی ہوں۔ وہاں بہت انجوائے کرتی ہوں۔ وہ بچے اتنے پیارے اور اتنے شرارتی ہیں کہ کیا بتاؤں۔'' وہ بولی۔

''کبھی کسی کی بات مان بھی لیا کرو زینی۔''

''میں نے کب تمہاری بات نہیں مانی ہے مگر وجہ تو بتاؤ۔ اچانک تمہیں یہ خیال آیا کیسے؟''

''یوں سمجھ لو کہ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی ہے اور زینی کم از کم اس معاملے میں، میں تمہیں من مانی نہیں کرنے دوں گا۔''

''تم مجھ سے کچھ کہو اور میں نہ مانوں، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تم چاہتے ہو کہ میں حویلی سے نہ نکلوں تو میں نہیں نکلوں گی، لیکن سبط میں بچوں کو اپنی حویلی میں بلوا لیا کروں؟''

''حویلی کے اندر جو مرضی کرو۔''

وہ سبط کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔

اماں جان اور زہرا لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے اور زہرا ان سے اپنے کپڑوں کے متعلق بات کر رہی تھی۔

''اماں جان! اتنی اچھی کڑھائی کرتی ہیں یہ عورتیں میں سوچ رہی ہوں کہ ان دو سوٹوں پر سادہ کڑھائی کروا لوں اور اس میرون سوٹ پر گوٹا لگوا لوں بہت اچھا لگے گا۔'' زہرا نے کہا۔

''زینی سے بھی پوچھ لو کہ وہ کیا چاہتی ہے تاکہ میں ایک ہی مرتبہ سب کپڑے دے دوں۔ یہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی کو بلانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' اماں جان بولیں۔

''میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ زینی صاف انکار کر دے گی، اسے کوئی شوق نہیں ہے ان چیزوں کا۔''

اسی وقت عبداللہ اندر داخل ہوا۔ اس کا ارادہ کافی دن پہلے لاہور چلے جانے کا تھا، لیکن اماں جان نے اسے روک لیا تھا۔ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی، اس لیے اس نے واپسی ملتوی

کردی تھی۔

''عبداللہ بیٹا! کہاں گم ہو جاتے ہو' تین مرتبہ تمہارے لیے کھانا گرم کروا چکی ہوں۔'' اماں جان نے اسے دیکھ کر کہا۔

''اور اماں نے بھی اب تک کھانا نہیں کھایا' نہ بابا جان تھے اور نہ آپ۔'' زہرا نے بتایا۔

''اماں! آپ تو کھانا کھالیا کریں وقت پر' میں اپنا کام کرنے میں مصروف تھا' تھیسس کے سلسلے میں۔'' وہ ان کے صوفے کی ہتھی پر بیٹھ گیا۔

''تمہارے بابا جان شہر گئے ہوئے ہیں' لیکن تم تو یہیں ہو' تمہارے بغیر کیسے کھانا کھا سکتی ہوں۔'' انہوں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

''گڑیا! تم نے اور زینی نے کھالیا؟''

''بھئی' مجھے بہت بھوک لگی تھی' اس لیے میں نے تو کھالیا۔ زینی کچن سے دو سینڈوچ اچک کر لے گئی تھی اور فون پر باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ سینڈوچ بھی کترتی جا رہی تھی۔ اب مجھے نہیں پتا کہ اس نے کھانا کھانا ہے یا نہیں۔'' زہرا نے کہا۔

''تو چلیں اماں جان' ہم کھانا کھا لیتے ہیں۔'' وہ بولا۔

لیکن اماں جان پھر پریشان نظر آنے لگی تھیں۔

''تم میں سے کوئی زینی کو منع کیوں نہیں کرتا۔ کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے اسے۔ گھنٹوں فون پر اس لڑکے کے ساتھ باتیں کرتی رہتی ہے۔ وہ تو ناسمجھ ہے' اسے نہیں پتا کہ یہ لوگ اس کی زندگی میں زہر گھول دیں گے۔''

''اچھا میں کہہ دوں گا اسے' آپ آئیں' کھانا کھالیں۔'' اس نے انہیں اٹھانے کی کوشش کی۔

''تم کیا کہو گے اسے' سب سے زیادہ شہ تو دی ہی اسے تم نے ہے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں' اسے کچھ نہیں ہوگا۔''

''کیسے نہ پریشان ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ گڑیا اور زینی کی شادی ہو جائے تو میرے ذہن سے ان کا بوجھ اتر جائے۔ اتنے اچھے رشتے تھے' لیکن زینی نے پتا نہیں کیا کہا اس سے۔ چلو وہاں شادی نہیں ہوئی' ان کے لیے رشتوں کی کون سی کمی ہے' لیکن رہیں تو یہ میری نظروں کے سامنے۔ ساری زندگی میں اولاد ہونے کے باوجود ترستی رہی۔ میرے اپنے بچے مجھ سے الگ تھے۔ سینے پر صبر کی سل رکھ لی میں نے' ایک بیٹا تھا' سو وہ کوسوں دور۔ یہ زندگی گزاری ہے میں نے۔ آخر کب تک میرے بچے مجھ سے دور رہیں گے۔ اب یہ پڑھنے امریکہ چلی جائیں گی' تم کبھی ساتھ رہے نہیں۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا یہ سب۔'' وہ رونے لگیں۔

''اماں پلیز۔'' عبداللہ نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں چپ کرانے کی کوشش کی۔

''رہنے دو تم بھی۔ تم لوگوں کو ماں باپ کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنی من مانی کرتے ہو تم لیکن میں کیا کروں' مجھے تو ضرورت ہے ناں تم بچوں کی۔''

''اماں جان! میں آپ سے کب دور ہو رہا ہوں اب تو چند مہینوں کی بات ہے' تھیسس مکمل ہو گیا تو میں یہیں پر آ جاؤں گا۔ جب تک تھیسس مکمل نہیں ہو جاتا آپ میرے پاس آ جائیں۔'' اس نے انہیں تسلی دینے کے لیے کہا۔

''اور اماں جان جہاں تک ان دو چڑیلوں کا تعلق ہے تو انہیں جانے دیں جہاں جاتی ہیں ہمارا کیا؟ شادی کرتی ہیں یا پڑھائی کرتی ہیں' ہم دونوں کو بھلا کیا؟ یہ بابا جان کی بیٹیاں ہیں' وہ جانیں میں آپ کا بیٹا ہوں۔

اور یوں بھی اماں جان یہ لڑکیاں بہت بے وفا ہوتی ہیں۔ ماں باپ کے گھر ہوتی ہیں تو ان سے محبت کے دعوے کرتی ہیں اور سسرال چلی جاتی ہیں تو اپنے پیچھے سب کو بھول جاتی ہیں۔ ایسی بے وفا مخلوق کے لیے آپ کیوں روتی ہیں۔ آپ تو شکر کریں کہ یہ ٹل رہی ہیں سر سے کسی طرح۔''

اماں جان نے اس کا ماتھا چوم لیا پھر زہرا کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''دعا کرو بیٹا کہ انہیں بھی ایسی سسرال ملے کہ یہ اپنی خوشیوں میں مگن ہو کر ہمیں بھول جائیں' بس یہ خوش رہیں۔''

''اچھا اماں! اب آپ بیٹھیں' میں خود کھانا لگاتا ہوں۔'' وہ اٹھا۔

''آپ کیا لگائیں گے بھائی' ہر چیز کی تباہی پھیر دیں گے۔'' زہرا بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''تم لوگ اماں کو مصروف رکھا کرو تا کہ وہ زیادہ نہ سوچیں۔'' عبداللہ نے ڈائننگ ٹیبل پر برتن لگاتی زہرا سے کہا۔

''میں کیا کروں بھائی' پتا ہی نہیں چلتا اماں جان کا' ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہیں۔ ابھی تو قسم سے میرے ہاتھ پاؤں سے جان نکل گئی تھی اماں کو روتے دیکھ کر۔ آپ نہ ہوتے تو شاید میں بھی ساتھ ہی رونا شروع کر دیتی۔'' اس نے سالن کے ڈونگے ٹیبل پر رکھے۔

''رونے کے علاوہ بھی کچھ کر لیا کرو۔ ہر بات کا اختتام رونے پر ہوتا ہے تم لوگوں کا اب جاؤ اماں جان کو لے کر آؤ۔''

☆=====☆=====☆

نوری کے ساتھ خادم حسین کا وقت بہت اچھا گزر رہا تھا' لیکن اس کی تمام تر خوبصورتی کے باوجود اس میں جو گنوار پن تھا' وہ اسے الجھن میں ڈال دیتا تھا۔ خادم حسین کو نفاست پسند لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔ ایسی لڑکیاں جن کے اندازِ نشست و برخاست میں تمکنت اور شاہانہ پن ہو۔ نوری

میں ان میں سے کوئی بات نہیں تھی' بس نخرہ ہی نخرہ تھا۔

نوری کی شوخی میں بازاری پن تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایسے خول میں بند کردی گئی ہو جو اس کے لیے بنا ہی نہیں تھا۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود خادم حسین اس کے ساتھ اچھا وقت گزار رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس قبیل کی عورتوں کے ساتھ یہ مسائل تو ہوتے ہی ہیں۔

☆=====☆=====☆

نی پُن ہال سے باہر نکلتے ہوئے ماہ بانو کی نگاہ نیہاں پر پڑی۔

''نیہاں۔'' اس نے آواز دی۔

''ارے بانو! تم کہاں؟'' وہ گرم جوشی سے اس کے گلے لگ گئی۔

''میرا تو شہر ہے یہ بتاؤ کہ تم اسلام آباد سے کب اور کیسے آئیں؟''

''اتنی سختی سے تاکید کی تھی اُماں نے کہ میں نے ہر حالت میں تمہاری ایگزیبیشن دیکھنی ہے اس کے لیے آئی ہوں۔'' وہ بولی۔

''اور یہاں اس لیے دکھائی دے رہی ہوں تمہیں کہ ابھی میں آف بیٹ پر کیسٹیں دیکھ رہی تھی۔ پھر Hentage پر کچھ سوٹ دیکھنے تھے۔''

''میں بھی سوٹوں کے لیے ہی آئی ہوں۔ اماں جی سے کچھ پیسے مارے تھے۔ سوچا تھا توپ کا لائسنس مانگوں گی پستول کا ملے گا' لیکن اباجی کی سفارش پر لائسنس کیا پوری توپ ہی مل گئی۔'' وہ ہنسی۔

''یعنی؟''

''یعنی میں نے کہا کہ چار پانچ ہزار روپے چاہئیں۔ سوچا تھا بہت بھی ہوا تو ہزار ڈیڑھ ہزار مل جائیں گے لیکن مجھے تو اباجی نے پورے پانچ ہزار دلوا دیے۔ میں نے سوچا کہ چلو دو زبردست قسم کے سوٹ لے لوں۔''

وہ دونوں Hentage میں داخل ہوگئے۔

''مجھے یہ تو بتاؤ کہ جیمز کیسا ہے' کیا کر رہا ہے؟'' نیہاں کپڑے دیکھتے ہوئے بولی۔

''پتا نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے کپڑوں کی طرف سے توجہ ماہ بانو کی طرف مبذول کردی۔

''مطلب یہ کہ مجھے تو عبداللہ کی خبر نہیں کہ وہ کیسا ہے' کیا کر رہا ہے جیمز کا کیا پتا ہوگا۔ آج اتنی مشکل سے گھر سے نکلی ہوں۔ میں تو بہت بزی تھی۔ ایک لمحے کی فرصت نہیں تھی۔''

''بہر حال میں نے فون پر عبداللہ سے بات کی تھی' وہ کل رات ہی گاؤں سے آیا تھا۔'' وہ پھر کپڑوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''کیا؟ لیکن اسے تو مجھ سے بھی ایک دن پہلے آنا تھا۔''

''اس کی ممی نے روک لیا تھا اسے۔ میں نے اس لیے فون کیا تھا اسے تاکہ کنفرم کرلوں ایگزیبیشن کے بارے میں۔ جس وقت میرا فون آیا اس سے بمشکل پانچ منٹ پہلے پہنچا تھا' اس نے بتایا۔''

''اور تم اس وقت کہاں رہ رہی ہو؟''

''ہوسٹل زندہ باد' مما چاہ رہی تھیں کہ یہاں آنٹی انکل کی طرف رہ جاؤں' لیکن بابا میں تو ان کے گھر نہیں رہ سکتی۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا انہیں۔ ہوسٹل لاکھ برا سہی' لیکن وہاں پھر بھی رہ لوں گی۔'' اس نے کہا۔

''اب واپس کیسے جاؤ گی؟'' ماہ بانو نے اس سے دریافت کیا۔

''کیب لے لوں گی۔'' وہ بولی۔

''اس طرح مت جاؤ۔ اگر مناسب سمجھو تو ہوسٹل کے بجائے میری طرف چلی چلو' اگر ہوسٹل میں ہی رہنا ہے تب بھی میں اور اباجی تمہیں وہاں چھوڑتے ہوئے گھر چلے جائیں گے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''تمہارے گھر رہ جانے میں کوئی حرج نہیں ہے' لیکن انکل ہیں کہاں؟ وہ بھی تمہارے ساتھ آئے ہیں؟''

''ہاں' وہ بک اسٹال گئے ہوئے ہیں' کچھ کتابیں دیکھ رہے ہیں۔''

''تو چلو وہیں چلتے ہیں۔''

☆=====☆=====☆

ایگزیبیشن والے دن ماہ بانو خاصے اہتمام کے ساتھ تیار ہوئی تھی۔ سیاہ اور سنہرے نیٹ کے کرتے اور سیاہ پاجامے پر نیٹ کا بڑا سا سنہرا دوپٹا لیے' جیل کے ساتھ بال پیچھے کرکے اس نے جوڑا باندھ لیا تھا۔ میک اپ کا بھی اس نے پورا خیال رکھا تھا اور سنہرے رنگ کی مناسبت سے ہی کر رکھا تھا۔

عبداللہ نے اسے دیکھا تو چند لمحے کے لیے پلکیں جھپکنا ہی بھول گیا۔ اسے اپنی طرف یوں دیکھتے پاکر وہ مسکرا دی تھی۔

''تم اسی طرح ڈھنگ سے تیار ہوکر نہیں رہ سکتیں؟'' وہ بولا۔

''اتنا وقت نہیں ہوتا میرے پاس' پورا ایک گھنٹہ لگ گیا اس تیاری میں' روزانہ اتنا وقت کہاں سے لاؤں۔'' وہ ہنسی۔

''پھر بھی جتنی جھلّی بن کر تم کالج میں آتی ہو' یہ میری ہی نظر کا کمال تھا کہ ایسے میں بھی تمہاری خوبصورتی ڈھونڈ لی۔''

''ڈھونڈ لی۔'' وہ پھر ہنسی۔ ''بہت دقت ہوئی ہوگی تمہیں میری خوبصورتی ڈھونڈنے میں' واقعی یہ تمہاری نظر کا ہی کمال تھا۔''

ایڈی ایگزیبیشن میں رکھے ہوئے سرامکس پیس دیکھتے ہوئے ان کی طرف چلا آیا۔

''بہت زبردست ہے' یہ سب کچھ' لیکن جو سب سے خوبصورت پیس ہے وہ تم نے این ایف ایس کرر کھا ہے' میں وہ خریدنا چاہتا ہوں۔''

''مائنڈ مت کرنا ایڈی' لیکن وہ میں نے صرف دیکھنے کے لیے رکھا ہے' بیچنے کے لیے نہیں۔''

''مگر مجھے وہی اچھا لگا ہے۔'' وہ مصر تھا۔

''کوئی اور دیکھ لو' اتنے زیادہ پیس ہیں' تم صرف ایک کی تعریف کر کے میرا دل توڑ رہے ہو۔ میں نے اور اباجی نے سب پر بہت محنت کی ہے۔''

''مجھے بھی وہی پیس اچھا لگا ہے جو ''ناٹ فار سیل'' ہے' لیکن ایڈی یہ آرٹسٹ کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ کیا پیس آف آرٹ بیچے اور کیا نہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

وہ سب دوست ماہ بانو کے اباجی سے سرامکس ڈسکس کرتے رہے' جو پیس ناٹ فار سیل تھا اس کے لیے بہت سے لوگ ماہ بانو کے پاس آئے تھے۔

''پلیز! یہ بیچ دیں۔''

لیکن اس نے سب سے نہایت شائستگی کے ساتھ معذرت کر لی اور انہیں نمائش کے لیے رکھی باقی چیزیں دکھانے لگی۔

اس وقت اباجی' ایڈی اور عبداللہ کو ساتھ لے کر لبرٹی گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ماہ بانو کو بتایا نہیں تھا لیکن وہ اس کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ لینا چاہتے تھے۔ اس نے ان کے ساتھ مل کر محنت بھی تو بہت کی تھی۔ وہاں پر ماہ بانو' نیہاں اور جیمز ہی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

''مبارک ہو نمائش بہت کامیاب جا رہی ہے۔'' نیہاں نے اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے ہم نے محنت کی اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیابی دی لیکن میں اصل کریڈٹ عبداللہ کو ہی دوں گی اس کے لیے۔'' وہ بولی۔

''وہ تم دوگی ہی' لیکن آخر کیوں؟'' نیہاں نے کہا۔

''اس لیے کہ یہ آئیڈیا اسی کا تھا' ابھی تو اس نے پرل کانٹی نینٹل اور آواری میں بھی بکنگ کروا دی ہے۔ دعا کرو کہ وہاں بھی ہمیں اسی طرح کامیابی ملے۔ میں شدید کامپلیکس کا شکار تھی' یہ عبداللہ ہی تھا' جس نے مجھے اس احساسِ کمتری سے نکالا۔ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ جو کچھ اس نے میرے لیے کیا ہے' میری پوری شخصیت ہی تبدیل کر دی ہے اس نے۔'' ماہ بانو نے اس سے کہا۔

''میری سمجھ نہیں آتا کہ آخر عبداللہ ہر جگہ کلف لگا کُرتا شلوار کیوں پہن آتا ہے۔ دور سے ایسا لگتا ہے' جیسے کوئی زمیندار' جاگیردار چلا آ رہا ہو۔'' نیہاں نے عبداللہ پر تبصرہ کیا۔

''اس لیے کہ وہ اس میں بہت ہینڈسم لگتا ہے۔ ویسے تو وہ ہر طرح ہینڈسم لگتا ہے' لیکن یہاں ہیں' کُرتا' شلوار تو پہنے گا ناں۔'' ماہ بانو نے فوراً اس کی سائیڈ لی۔

''کوئی تبدیلی تو ہونی چاہیے۔'' وہ مصر تھی۔

''تبدیلی ہی ہے' کالج میں وہ اس طرح ڈریس اَپ نہیں ہوتا۔'' اب کے جیمز بھی میدان میں کود پڑا تھا۔

''خیر جیمز تم تو چپ کر جاؤ' تمہیں تو مردوں کے فیشن کا کچھ بھی نہیں پتا۔'' نیہاں اس پر اُبل پڑی۔

''ہاں سخت شرمندہ کروایا تم نے جیمز۔'' ماہ بانو ہنس پڑی

''کیسے؟'' وہ کچھ نہ سمجھا۔

''آئی وِل کِل یو ماہ بانو۔'' نیہاں نے ہنستے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔

''تم فائیواو وَنز کب کوڑے کے ڈرم میں ڈال کر Guessp Jeans پہنو گے؟'' ماہ بانو مسلسل ہنس رہی تھی۔

''اس صدی میں تو یہ ممکن نہیں ہے' بہت مہنگی جینز ہیں میری۔'' وہ بولا۔

''فیشن کے ساتھ ساتھ چلا کرو۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا' تمہارے اتنے خوبصورت بال ہیں جیمز' لمبے بھی ہیں بلکہ افسوس ہے' بالوں سے بھی زیادہ لمبے ہیں۔ آخر تم اسی پرانے اسٹائل میں بال پیچھے کر کے پونی کیوں ... ہو' رومال کیوں نہیں باندھتے۔'' نیہاں نے کہا۔

''ہاں تمہیں تو بالکل Male Fashion کا نہیں پتا جیمز۔'' ماہ بانو نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

''یہ تم لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو' آج کل جسے دیکھو رومال باندھے پھر رہا ہے' اس لیے بھی میرا موڈ نہیں ہوا۔''

''ظاہر ہے فیشن میں ہے' فیشن تو کریں گے سب' ایک تم ہی پرانے ماڈل کے نظر آؤ گے۔'' نیہاں نے کہا۔

''ویسے جیمز! تم یہ کرلو تو بالکل اسکاٹ کیمپل لگو گے۔'' ماہ بانو نے بھی کہا۔

''چلو اسکاٹ کیمپل والا کام مت کرو لیکن پلیز! Guessp Jeans پہننا شروع کر دو' نیہاں بے چاری اسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

جیمز کو ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔

☆=====☆=====☆

خادم حسین اور مکرم علی ڈنر کرنے کے لیے Xinhua آئے ہوئے تھے۔ وہیں ان کا ا ایگزیبیشن دیکھنے کا بھی بن گیا۔ جب وہ دونوں اس کمرے میں پہنچے تو کھنکھناتی ہنسی نے ا استقبال کیا۔ خادم حسین نے ہنستی ہوئی لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ ایک لڑکی بالکل امریکن رہی۔ اور دوسری خالص مشرقی حسن کا شاہکار تھی۔ ایک لڑکا بھی تھا' وہ بھی غیر ملکی لگ رہا تھا۔

خادم حسین کی نگاہیں سانولی لڑکی پر ٹک گئیں۔ وہ خوبصورت تھی' اس کی ہنسی بھی کھنک تھی لیکن جو چیز خادم حسین کو اس میں سب سے خوبصورت لگی تھی' وہ اس کے انداز کی تمکنت شاہانہ پن تھا۔

جب ماہ بانو کو احساس ہوا کہ کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو اس نے بھی اس سمت نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ایک لمحے میں ہی اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا' وہ ریٹا کے بھائیوں کو پہچانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ وہ کیسے عبداللہ کے خون کے پیاسے ہو رہے اور عبداللہ کسی بھی وقت لبرٹی سے واپس آ سکتا تھا۔

ماہ بانو کو احساس ہوا کہ اسے فوری طور پر کچھ کرنا تھا' ورنہ عبداللہ کے آنے پر صورت بگڑ بھی سکتی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر خادم حسین نے اپنے اوپر بے نیازی کا خول چڑ تھا اور نمائش میں رکھے سرامکس پیسز (Pieces) کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مکرم بھی اس ساتھ ساتھ ہی تھا۔

ماہ بانو' جیمز کو بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے گئی۔ نیہاں بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان پیچھے ہی باہر نکل آئی۔

''کیا ہوا بانو' تم پریشان لگ رہی ہو۔'' جیمز نے کہا۔

''میری بات سنو جیمز! پلیز کسی بھی صورت عبداللہ کو یہاں مت آنے دینا' یہاں اس لیے خطرہ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہ سمجھا۔

''یہ جو دو لڑکے ہیں' یہ دونوں اس کے وہی کزن ہیں جو اس کی جان کے دشمن ہو رہے یہاں پر بہت مشکل پیش آ جائے گی اگر ان کا سامنا ہو گیا تو۔''

''اچھا! میں اسے باہر ہی روک کر بتا دوں گا' تم بالکل فکر مت کرو۔'' جیمز نے ا دی۔

''نہیں' اسے بتانا مت' تمہیں پتا ہے ناں کہ اس کے دماغ کی ایک چول ڈھیلی ہے؟ نے کہنا ہے کہ ان کی ایسی کی تیسی' میں دیکھتا ہوں کہ کیا کر سکتے ہیں یہ۔ اور میں نہیں چاہتی کہ کوئی نقصان پہنچے۔ تم اسے بتانا بالکل مت اور باہر بھی مت روکنا۔ کسی بہانے سے دوبارہ

میں کوشش کرتی ہوں کہ یہ ٹل جائیں' بس تم ان کے جانے کے بعد ہی اس کے ساتھ

''آل رائٹ' تم فکر مت کرو۔''

''بانو! تمہیں تو کوئی خطرہ نہیں ہے ناں؟ ان میں سے ایک تو مجھے لگ رہا ہے جیسے پ آنکھیں دیکھی ہیں اس کی۔'' نیہاں نے کہا۔

''مجھے بالکل کوئی خطرہ نہیں ہے' میرا ان سے کیا لینا دینا۔ میرے متعلق فکر مت کرو۔'' اس انہیں تسلی دی۔

''تم سچ کہہ رہی ہو ناں؟'' نیہاں نے دوبارہ تصدیق ضروری سمجھی۔

''بالکل سچ کہہ رہی ہوں' مجھے کیوں کچھ کہیں گے۔ مجھ سے بھلا کیا دشمنی ہے ان کی۔''

''پھر ٹھیک ہے' اگر تم مائنڈ نہ کرو تو میں بھی جیمز کے ساتھ باہر چلی جاؤں۔'' اس نے کہا اور جھک کر اس کے کان میں بولی۔

''مجھے اس کے اکیلے پن پر ترس آ رہا ہے۔''

ماہ بانو ہنس پڑی۔

''کیوں نہیں اور ہاں اسے Male Fashion سے ذرا اچھی طرح آگاہ بھی کر دینا۔''

نیہاں مسکراتے ہوئے جیمز کے ساتھ باہر نکل گئی۔ ماہ بانو واپس اس کمرے میں چلی آئی۔ جہاں ایگزیبیشن لگی ہوئی تھی۔

''یہ سرامکس پیس آپ نے بنائے ہیں؟'' خادم حسین اس کی طرف بڑھ آیا۔

''جی میں نے اور میرے فادر نے بنائے ہیں۔''

''مجھے ایک پیس خریدنا ہے لیکن اس پر 'ناٹ فار سیل' کا کارڈ لگا ہوا ہے۔'' وہ بولا۔

''پھر تو ظاہر ہے آپ وہ نہیں خرید سکتے۔ وہ پیس 'ناٹ فار سیل' ہے' یہاں اور بہت سے موجود ہیں' آپ کو ضرور کوئی نہ کوئی اچھا لگ جائے گا۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

''لیکن میں وہ خریدنا چاہتا ہوں' آپ اس کی قیمت کا تعین کر کے مجھے بتا دیں۔''

''یہ آرٹسٹ کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز بیچ دے اور کیا نہیں۔ میں اسے نہیں بیچنا ۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں سب سے مہنگا پیس پانچ ہزار تک کا ہے' میں آپ کو اس پیس لیے دس ہزار بھی دے سکتا ہوں۔''

''دیکھیں مسٹر! آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

''پچیس ہزار۔''

''پچیس لاکھ میں بھی نہیں۔'' اس نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

وہ پیس اس نے عبداللہ کو تحفے میں دینے کے لیے رکھا ہوا تھا اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا عبداللہ کو دینے والا تحفہ کسی اور کے ہاتھ بیچ دیتی۔

''یہ پیس دیکھ لیں' یہ بھی بہت خوبصورت ہے۔'' اسے اپنے لہجے میں موجود سختی کا انداز تو اس نے قدرے توقف سے شائستگی کے ساتھ کہا۔

''اور کوئی نہیں' مجھے صرف یہی پیس چاہیے' اور آپ کو بھی یہ بیچنا ہوگا۔''

''مسٹر خادم حسین؟'' ماہ بانو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''نہ تو یہ نیاز پور ہے اور نہ ہی میں وہاں رہنے والے آپ کے کسی مزارعے کی بیٹی ہوں رعب مجھ پر جمانے کی ضرورت نہیں ہے' نہ ہی میں آپ جیسوں کا رعب برداشت کرتی ہوں میری مرضی ہے کہ میں کیا بیچنا چاہتی ہوں اور کیا نہیں' جو چیزیں فار سیل ہیں آپ ان میں چیزیں چاہیں خرید سکتے ہیں۔''

خادم حسین نے پُرخیال نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ مکرم بھی اسی کی طرف د تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں' جنہیں وہ کم ہی پورا کھول کر رکھتا تھا۔ نیہاں نے اس متعلق تبصرہ کیا تھا۔

''بی بی! اگر تم انہیں جانتی ہو تو یہ بھی جانتی ہوگی کہ 'فار سیل' چیزیں تو ہر کوئی خرید سکتا لیکن ہم وہی چیزیں حاصل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں' جو 'ناٹ فار سیل' ہوتی ہیں۔'' مکرم نے کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ماہ بانو کے لیے اس کے لہجے میں چھپی دھمکی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔

پھر مکرم' خادم حسین کی طرف مڑا۔ ''یہاں دو خوبصورت چیزیں ''ناٹ فار سیل'' ہیں' ہمارے بنگلے میں اچھی لگیں گی' کیا خیال ہے؟''

ماہ بانو کا دل چاہا کہ وہ چیخ کر عبداللہ کو مدد کے لیے پکارے' لیکن بہت مشکلوں سے نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔

''نہیں بانو! تم نے گھبرانا نہیں ہے' یہاں یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے' صرف تمہیں ڈرا رہے ہیں۔ ڈرو مت اور نہ انہیں محسوس ہونے دو کہ تم ان سے خوفزدہ ہو۔'' اس نے دل ہی دل سوچا اور خود کو تسلی دی اور پھر چہرہ سپاٹ رکھتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئی۔

''دنیا بدل گئی لیکن تم لوگ وہی رہے۔ اس قسم کی دھمکیاں اپنے مزارعوں کو دو' مجھے نہیں اینڈ ناؤ گیٹ لاسٹ۔''

وہ کہہ کر ان کی طرف پشت کر کے شیشوں کے ترتیب سے رکھے کیسوں کو بغیر وجہ ترتیب دینے لگی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے الفاظ کا نتیجہ کیا نکلے گا اور اس کے لیے اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ خادم حسین کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''نہیں مکرم' نہیں' جو چیزیں بیک وقت خوبصورت اور ناٹ فار سیل ہوں' انہیں خوبصورتی سے ہی حاصل کرنا چاہیے' واپس چلو۔''

قدموں کی آوازوں نے اسے بتایا کہ وہ دونوں کمرے سے نکل چکے تھے۔ ماہ بانو گہری سانس لے کر وہیں دیوار سے ٹک گئی اور اپنے ہاتھ سے کنپٹیاں دبانے لگی۔ اسے احساس تھا کہ اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے' اور چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ ان دونوں کی وہاں موجودگی میں نہ جانے کس طرح اس نے خود پر قابو پائے رکھا تھا' لیکن ان کے جاتے ہی اسے اپنے اعصاب جواب دیتے لگ رہے تھے۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے اسی طرح کھڑے ہوئے چند لمحے گزرے تھے یا چند منٹ عبداللہ سب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا' اسے اس طرح کھڑے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''کیا ہوا بانو؟ آر یو آل رائٹ؟''

''تم عبداللہ؟'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ڈونٹ وری' ایوری تھنگ ہیز بین ٹیکن کیئر آف۔'' جیمز نے جلدی سے کہا۔

نیہاں نے بھی ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا کہ وہ دونوں جا چکے ہیں۔

ماہ بانو نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ابا جی جو سب سے آخر میں کمرے میں داخل ہوئے تھے' وہ بھی گھبرا کر اس کے پاس آ گئے۔

''بانو بیٹا! کیا ہوا' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''جی ابا جی' بس سر میں درد ہو گیا تھا۔'' اب تک اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ خود کو اپنے پیاروں میں گھرے دیکھ کر وہ خاصا بہتر محسوس کر رہی تھی۔

''بیٹھ جاؤ بیٹا!'' انہوں نے پیار سے کہا۔ وہ پریشان ہو چکے تھے۔

''ابا جی! آپ فکر مت کریں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تھوڑے سے سر درد سے کیا ہوتا ہے۔'' وہ ان کی تسلی کے لیے ہنس پڑی۔

عبداللہ اور ایڈی بغور اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی' لیکن اس وقت اسے کریدنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔

''دیکھو بانو! میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔'' ابا جی نے خوبصورت کاغذ میں لپٹا ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''کیا ہے؟'' اس نے شوق سے کہتے ہوئے پیکٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا' لیکن اس

کے لینے سے پہلے ہی پیکٹ ایڈی نے اچک لیا۔

"گیس کرو۔" وہ بولا۔

"اتنی دور سے کیا اندازہ لگا سکتی ہوں۔" اس نے چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جب تک بوجھو گی نہیں، تب تک نہیں ملے گا" ایڈی اسے بالکل مت دینا۔" نیہاں نے جلدی سے اسے ہدایت دی۔

"کیا ہو سکتا ہے؟" اس نے ذہن پر زور دیا۔

"اتنی مصیبت کی کیا ضرورت ہے۔" عبداللہ نے اسے کہا اور پیکٹ ایڈی کے ہاتھ سے کھینچ کر ماہ بانو کو پکڑا دیا۔

"یہ سراسر فاؤل ہے۔" ایڈی بولا۔

ماہ بانو نے ہنستے ہوئے پیکٹ کھولا۔ اندر حسب توقع World Mythology رکھی ہوئی تھی۔ اس کتاب کے خریدنے کا اسے بہت شوق تھا۔ وہ خوشی سے چیخ پڑی۔

"تھینک یو ابا جی!"

بظاہر ہر چیز ٹھیک ہو چکی تھی۔ وہ سب کے ساتھ ہنس بول رہی تھی، لیکن اس کا ذہن ابھی تک تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے واقعے میں اٹکا ہوا تھا۔ مکرم کی دھمکی تو بہت واضح تھی لیکن جو کچھ خادم حسین نے کہا تھا، اس کا مطلب کیا تھا؟ وہ ان الفاظ کو بھول نہیں سکتی تھی۔

"نہیں مکرم نہیں، جو چیزیں بیک وقت خوبصورت اور ناٹ فار سیل ہوں، انہیں خوبصورتی سے ہی حاصل کرنا چاہیے۔"

وہ کیا کہنا چاہتا تھا، کیا کرنا چاہتا تھا؟ اس کے انداز میں دھمکی نہیں تھی۔ انا کا غرور تھا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ جو چیز جیسے چاہے حاصل کر سکتا تھا۔ حاصل کرنے سے اس کا مطلب کیا تھا؟ اور اس نے مکرم کو کس بات سے منع کیا تھا؟ کیا مکرم، ماہ بانو کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہتا تھا؟

وہ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔ کیا کروں عبداللہ کو بتا دوں یا ریشماں سے مدد طلب کروں؟

بہت دیر تک سوچنے کے بعد اسے یہ دونوں خیال ہی غلط محسوس ہوئے۔

نہیں عبداللہ کو خبر ہوئی تو وہ پتا نہیں کیا ردعمل ظاہر کرے۔ وہ تو اب بھی پانچ بھائی ہیں، ان کے بے شمار وفادار ملازم ہیں اور وہ سب ہی عبداللہ کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں، اگر انہوں نے عبداللہ کو نقصان پہنچا دیا تو؟ یوں بھی عبداللہ کو غصہ آ جائے تو پھر وہ اپنے آپ کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اسے اندازہ ہوا کہ انہوں نے مجھے کوئی دھمکی دی ہے تو وہ برداشت نہیں کر سکے گا اور بات بہت زیادہ بگڑ جائے گی۔

پھر کیا ریشماں سے کہہ دوں؟ لیکن اس سے کیسے کہوں؟ پہلے اس سے عبداللہ کو چھین لیا

اب کیا اسے اس کے بھائیوں سے بھی دور کر دوں؟ وہ جیسے بھی ہیں، اس کے تو بھائی ہیں اور اس سے بے تحاشا محبت بھی کرتے ہیں۔ میں اس کی زندگی میں مسلسل زہر نہیں گھول سکتی۔ اسے ساری زندگی شاید ان ہی در و دیوار کے درمیان رہنا پڑے۔ ابھی تو وہ سب کی محبتوں کے درمیان وہ عذاب ناک دن اور رات بسر کر ہی لیتی ہے، لیکن اگر اسے ان سے نفرت ہو گئی، اگر چاہنے کے باوجود وہ ان سے محبت نہ کر سکی تو ذہنی طور پر وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔

"اوہ گاڈ! یہ بھی نہیں تو پھر کیا کروں؟" آرڈرز کے فارمز دیکھتی وہ یہی سب سوچے جا رہی تھی۔

"کہاں گم ہو؟"

عبداللہ کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

"کہیں نہیں، یہ دیکھ رہی تھی کہ کتنے آرڈرز ملے ہیں اور کس کس پیس کے۔"

"اونہوں! کم از کم مجھ سے تو مت چھپاؤ۔"

"مگر میں کیا چھپا رہی ہوں اور میرے پاس چھپانے کے لیے ہے کیا۔"

"مجھے افسوس ہوتا ہے، اس وقت جب تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتیں۔" اس نے کہا۔

"پلیز عبداللہ، نتیجے اخذ کرنے میں اتنی جلد بازی سے کام مت لیا کرو۔" وہ مضطرب نظر آنے لگی تھی پھر قدرے توقف سے بولی۔

"میں اکیلی ہوتی ہوں تو وہ سب سوچنے لگتی ہوں جس کے متعلق سوچنا بے کار ہے، جس کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتی، سوائے اچھے وقت کا انتظار کرنے کے۔ میں ہر وقت تمہیں انہی باتوں میں الجھائے نہیں رکھنا چاہتی۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"جو کچھ تم نے کہا وہ بالکل درست کہا۔ تم وقت بے وقت یہی بے کار کی باتیں سوچتی لیکن اس وقت یہ سب سوچنے کی وجہ ہے، کیا وجہ ہے یہ میں نہیں جانتا اور تم بتانا نہیں چاہتیں۔ میں تمہاری آزادی کا قائل ہوں۔ نہیں بتانا چاہتیں تو یہ تمہاری مرضی ہے لیکن اگر مجھ پر اعتبار کرتی ہو تو مجھ سے کوئی ایسی بات نہ چھپانا، جس کے چھپانے سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہو۔"

ماہ بانو کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ "عبداللہ میری سوچوں کو کیسے پڑھ لیتا ہے۔" اس نے سوچا، پھر جلدی سے منہ پھیر لیا۔

"پتا نہیں ابا جی کہاں چلے گئے۔" وہ بولی۔

"کچھ امریکی ٹورسٹ آئے ہوئے ہیں، ان ہی سے باتیں کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔

"اگر تم لوگ ڈسٹرب نہ ہو تو میں آ جاؤں؟" نیہاں نے کہا۔

"اوہ شیور! کیوں نہیں۔" ماہ بانو نے کہا۔

"میرے پاس ایک بہت دھماکا خیز خبر ہے۔" اس کے انداز میں جوش وخروش نمایاں تھا۔

"کیا خبر؟" ماہ بانو نے زبردستی دلچسپی کا اظہار کیا' ورنہ اس وقت اسے کسی خبر سے دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ جو امریکی ٹورسٹ ہیں ناں' ان میں سے دو Polters ہیں۔ امریکی ہیں اس لیے Polter کہہ رہی ہوں' ورنہ ہیں کمہار ہی۔" وہ ہنسی۔

"اور ابھی وہ اباجی سے یہی بات ڈسکس کر رہے ہیں؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"ہاں' اور پتا ہے کیا؟ وہ تو بس پاگل ہو گئے ہیں یہ Poltery دیکھ کر۔ ویسے بھی وہا اوکسی ڈیٹیل کی جگہ اورنٹیل اِن ہو رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ وہ کوئی بزنس ڈیل کر رہے ہیں۔"

"لیکن وہ ہیں کہاں؟ میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔" ماہ بانو نے حیرت سے کہا۔

"وہ خاصی دیر یہاں رہے تھے۔ چیزیں بھی دیکھی تھیں انہوں نے لیکن تم اس وقت آرڈر فارمز دیکھنے میں مصروف تھیں۔" عبداللہ نے سگریٹ کیس سے مالبرو کا ایک سگریٹ منتخب کرتے ہوئے کہا۔

ماہ بانو کو احساس تھا کہ اس بات سے عبداللہ کا مطلب اسے یہ باور کروانا تھا کہ وہ اپنی پریشانی میں بری طرح گم ہونے کے باوجود اس پر اعتبار نہیں کر رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وہ عبداللہ کو سب کچھ بتا دے اور اسے یہ یقین دلا دے کہ اس پر تو وہ اپنی ذات سے بڑھ کر اعتماد کرتی تھی۔ وہ اگر اس سے کچھ چھپا رہی تھی تو اس لیے نہیں کہ وہ اس پر اعتبار نہیں کرتی تھی' وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ عبداللہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور بس۔

"ایڈی اور جیمز بھی انکل کے ساتھ ہی ہیں۔ ویسے ہی انکل کی نالج اتنی زیادہ ہے اور یہ دونوں بھی آرٹ کے حوالے سے لیکچر دیتے جا رہے ہیں۔ وہ دونوں امریکی تو بہت زیادہ امپریس ہو رہے ہیں۔" نیہاں نے مزید اطلاع دی۔

ماہ بانو کو ایک دم ڈھیروں خوشی کا احساس ہوا۔

"جب کوئی اباجی سے ایسے امپریس ہوتا ہے انہیں اور ان کے کام کو سراہتا ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے مجھے ایک نئی دنیا مل گئی ہو۔ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے خود کیا ہے۔ ان کی Achievement ان کی اپنی ہے۔ وہ مکمل طور پر سیلف میڈ انسان ہیں۔ میرے اباجی جیسا اور کوئی بھی نہیں ہوگا۔"

"پتا ہے بانو' وہ امریکی بھی یہی ناٹ فار سیل والا پیس خریدنا چاہتے تھے۔ وہ اس کا آرڈر دینا چاہتے ہیں شاید۔" نیہاں نے اسے بتایا۔

"نہیں یہ ایک ہی پیس ہے اور اس جیسا کوئی دوسرا پیس کبھی نہیں بنے گا۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کیوں؟ کوئی وجہ تو ہو؟ اس کا تو میں بھی آرڈر دینا چاہتی تھی۔" نیہاں بولی۔

"اس لیے کہ اس میں میری محنت سے زیادہ میری محبت شامل ہے۔" ماہ بانو نے کہا۔

"اوہ اب سمجھی' تو یہ عبداللہ کے لیے ہے۔ تم نے پہلے بتا دینا تھا' پھر ہم تم سے کبھی یہ تقاضا نہ کرتے۔" نیہاں ہنسی۔

ماہ بانو اور عبداللہ نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"محبت اور شکریے کے اظہار کے لیے مجھے ہمیشہ لفظ بہت چھوٹے' بہت تھوڑے لگتے ہیں۔" وہ بولا۔

ماہ بانو ہنس پڑی۔ سکون اور طمانیت بھری ہنسی تھی۔

اسی وقت اباجی' ایڈی اور جیمز کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ وہ تینوں بھی کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

"یہ بتاؤ بانو کہ ڈنر کہاں دو گی؟ بہت شاندار سا۔" ایڈی نے آتے ہی کہا۔

"وہ کس خوشی میں؟" وہ کچھ نہ سمجھی۔

"ابھی کچھ طے کہاں ہوا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ سوچ کر جواب دوں گا۔" اباجی نے کہا۔

"کیا باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ' میرے تو سر پر سے گزر رہی ہیں۔" ماہ بانو بولی۔

"چار انچ ہیل پہن کر بھی سر پر سے گزر رہی ہیں۔ فوراً کرسی پر کھڑی ہو جاؤ۔" ایڈی نے کہا۔

"کچھ بکو گے بھی کہ بات کیا ہے۔ بغیر کچھ جانے بوجھے ڈنر نہیں مل سکتا۔ یہ میں پہلے کلیئر کر رہی ہوں۔"

"یعنی جو کچھ میں فرما رہا ہوں' وہ تمہاری نظر میں بکواس ہے۔ ٹھہرو' میں نوٹ کر لوں۔" ایڈی نے جیب سے نوٹ پیڈ اور بال پوائنٹ نکال لیا۔

وہ ہر اہم بات نوٹ کرنے کا عادی تھا' اور ایک نوٹ پیڈ اور بال پوائنٹ ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

"یہ تو کچھ نہیں بتائے گا اباجی پلیز آپ بتا دیں۔" وہ ان کی طرف مڑی۔

"ابھی ہماری بات ہو رہی تھی یہاں دو امریکی Polters سے۔ انہیں ہمارا کام اچھا لگا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ امریکہ جاؤں اور بس۔ اتنی سی بات ہے۔" اباجی نے بتایا۔

"کیا؟ یہ اتنی سی بات ہے۔ یہ آپ کو اتنی سی بات لگتی ہے اباجی؟" اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"بس انکل آپ یہ آفر فوراً قبول کر لیں۔" نیہاں نے جلدی سے انہیں مشورہ دیا۔

"دیکھیں گے بیٹا! کوئی فیصلہ اتنی جلدی تو نہیں کیا جاسکتا۔ بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔" انہوں نے شفقت سے کہا۔

☆=====☆=====☆

خادم حسین اور مکرم ریسٹورنٹ سے باہر آکر کار میں بیٹھے تو مکرم کا موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔

"بہت غصے میں ہو؟" خادم حسین نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہونا نہیں چاہیے؟ اس دو ٹکے کی لڑکی نے ہماری بے عزتی کر دی اور ہم خاموشی سے واپس پلٹ آئے۔"

"نہیں مکرم! تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔" وہ سڑک پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"کیوں؟ اس وقت بھی آپ نے مجھے منع کر دیا تھا' کوئی خاص وجہ ہے کیا؟"

"ہاں وجہ تو خاص ہے' بلکہ بہت خاص ہے۔ تم نے دیکھا تھا مکرم کہ اس لڑکی میں کتنی شان کتنی تمکنت تھی۔ مجھے ایسی ہی کسی لڑکی کی تلاش تھی۔ میرا آئیڈیل ایسی ہی لڑکی ہے۔"

"کیا؟" مکرم علی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

"ہاں اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ اسے کوئی نقصان پہنچے یا اس کی چھوٹی سی اَنا پر کوئی ضرب لگے۔" خادم حسین نے کہا۔

"آپ سنجیدہ ہیں؟" مکرم نے تصدیق چاہی۔

"یہ کوئی فیصلہ نہیں ہے' میں اس کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔ اس کا پہلا امپریشن تو اچھا ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ویسی نہ ہو جیسا کہ میں نے اسے سمجھا ہے۔ جلد بازی مجھے پسند نہیں ہے' ہاں اگر وہ میرے معیار پر پوری اتری تو پھر میں دیر نہیں کروں گا۔"

کچھ دیر تک کار میں خاموشی رہی۔ مکرم چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

"گویا آپ ایک حد تک سنجیدہ ہی ہیں۔"

"ہاں' تم کہہ سکتے ہو۔" خادم حسین نے کہا۔

"مگر کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟"

"ممکن کیوں نہیں؟ ہمارے گھرانے کے رشتے کو کون ٹھکرا سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ وہ تو کسی کی جرأت نہیں ہے کہ نیاز پور کی گدی کے وارث کا رشتہ رد کر سکے' میرا خیال دوسری طرف تھا۔ اپنے گھر' اپنی حویلی کی طرف۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ بابا جان اس بات کی اجازت دے دیں گے؟"

گھر کا گیٹ آ گیا تھا۔ خادم حسین کے ہارن دیتے ہی گھر کا دروازہ کھلا اور وہ اپنی کار ڈرائیو وے میں لے آیا۔

"میرا خیال ہے' باہر ہی بیٹھتے ہیں۔" خادم حسین نے کہا اور لان کی طرف بڑھ گیا۔

مکرم بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

"میں نے بابا جان کے متعلق پوچھا تھا۔ کیا وہ اجازت دے دیں گے؟" مکرم نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال دہرایا۔

"یقیناً دیں گے۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے مشکل دکھائی دے رہا ہے اور پھر میرے خیال میں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آپ کو لڑکی پسند آ گئی ہے تو یہاں بھی اسے اٹھوا لینا کوئی مسئلہ نہیں ہے' آپ ایک مرتبہ اشارہ کر دیں اور بس۔"

"نہیں مکرم! میں ہر اس عورت کو عزت ضرور دیتا ہوں' جو قابلِ عزت ہو' جو بکنے پر تیار ہو' اس کی قیمت لگانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا' لیکن جو بکاؤ نہیں ہے' اسے کسی نچلی سطح پر گرانا مجھے منظور نہیں ہے۔" خادم حسین نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن اسے بطور بہو کون قبول کرے گا؟"

"میں یہ سمجھتا ہوں کہ مرد کو بہت مضبوط ہونا چاہیے اتنا مضبوط کہ اس سے غیر ضروری سوالات کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہو' کوئی بھی اس پر دباؤ ڈال کر اس کا فیصلہ تبدیل نہ کر سکے اور مجھے معلوم ہے کہ مجھ میں یہ مضبوطی ہے۔

میں کوئی عورت نہیں ہوں' جس کے لیے معاشرے نے اور ہماری حویلی نے کچھ روایتیں بنا ڈالی ہیں اور اس کے لیے ان روایتوں کی پابندی ضروری ہے۔ مردوں کے لیے کسی اور کے وضع کیے ہوئے قوانین اور روایتیں نہیں ہوا کرتیں۔ وہ اپنی روایتیں خود بناتے ہیں' انہیں کسی کے پہلے سے تیار کردہ راستوں پر نہیں چلنا ہوتا' اپنے لیے خود راستہ بنانا ہوتا ہے۔

وہ یہاں آئے گی تو اسے ویسے ہی رہنا ہوگا جیسے حویلی میں عورتیں رہا کرتی ہیں' لیکن اسے اپنی حویلی میں لانے سے مجھے روکنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ دادا ابا تھے جو حویلی کے مردوں کو بھی باندھ کر رکھنا چاہتے تھے۔ اب وقت تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ وقت ہمارا ہے۔ بابا جان تنگ نظر نہیں ہیں۔ وہ بدلتے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں' انہیں یقیناً کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ بابا جان سے کچھ زیادہ کی توقع کر رہے ہیں۔ ایسا ممکن ہوتا تو زہرا اور زینب میں کیا برائی تھی؟" مکرم بولا۔

"میں بابا جان کے اس سے کہیں زیادہ قریب ہوں جتنا تم سمجھتے ہو۔ زہرا اور زینب اسی حویلی کی لڑکیاں تھیں اور کوئی بھی لڑکی حویلی کی روایات سے انحراف نہیں کر سکتی اور پھر یہاں معاملہ تعلیم کا ہی کب تھا؟ یہاں تو مسئلہ جائیداد اور زمینوں کا بھی تھا اور سب سے بڑھ کر ایک عورت کا تھا' لیکن ان سب باتوں کو جانے دو' اب تو دونوں گھرانوں کے درمیان صرف ایک تعلق اور ایک رشتہ ہے اور وہ ہے دشمنی کا' نفرت کا۔"

''عورت کا' کون عورت؟'' مکرم نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اس بات کو رہنے دو' یہ بات میرے لیے بھی تکلیف دہ تھی' تمہارے لیے بھی تکلیف دہ ہوگی' یوں بھی اسے دہرا کر کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ بات مجھے بھی بابا جان نے نہیں بتائی۔''

''پھر کس نے بتائی ہے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے خادم حسین کی طرف دیکھا۔

''میں اس گدی کا وارث ہوں مکرم' جس پر آج بابا جان بیٹھے ہوئے ہیں' مجھ سے کیا چھپا رہ سکتا ہے۔''

''آپ کہہ رہے تھے کہ زہرا اور زینب اس حویلی کی لڑکیاں ہیں اور کوئی بھی لڑکی حویلی کی روایات سے انحراف نہیں کر سکتی' لیکن انحراف انہوں نے کب کیا تھا؟ وہ بہت چھوٹی تھیں جب ان کے متعلق یہ فیصلہ ان کے باپ نے کیا تھا۔ سو یہ فیصلہ ان کا نہیں' ان کے باپ کا تھا۔ جو اسی حویلی کا ایک مرد تھا اور مرد اپنی روایتیں خود بناتے ہیں' اپنے لیے راستہ خود چنتے ہیں' پھر اگر حیدر علی شاہ نے ایک نئی روایت کی بنیاد رکھ دی تو اس سے دشمنی کا سبب؟ آپ یہ مت سوچنا کہ مجھے حیدر علی شاہ سے ہمدردی ہے' قطعاً نہیں۔ وہ شخص ناقابلِ معافی ہے' میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایسا ہی ایک محاذ آپ کے خلاف بھی کھل سکتا ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

خادم حسین مسکرایا۔ ''میرے خلاف محاذ کون کھول سکتا ہے؟ رہ گئی حیدر علی شاہ کی بات تو اسے اپنے لیے روایتیں بدلنے اور راستے بنانے کا اختیار تھا لیکن حویلی کی کسی بھی لڑکی کو اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلانے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔''

''مجھے الجھن محسوس ہو رہی ہے۔ وہ لڑکی آپ کا نام جانتی تھی۔ جس انداز سے اس نے بات کی تھی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ صرف نام ہی نہیں اور بھی بہت کچھ جانتی ہے' کیسے؟'' مکرم علی نے کہا۔

''کل تک اس کے متعلق تمام تفصیلات مل جائیں گی۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ یا تو اس کا اپنا تعلق نیاز پور سے ہے یا پھر وہاں اس کی کسی طور کوئی واقفیت یا رشتہ داری ہے۔'' خادم حسین نے کہا۔

وہ باتیں کر رہے تھے کہ ساتھ والے گھر کے گیٹ کے سامنے سے ہارن بجنے کی مدھم سی آواز آئی۔ رات گہری ہو چکی تھی اور ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے دور ہونے کے باوجود آواز صاف سنائی دی تھی۔

''یہ ضرور عبداللہ ہوگا۔'' مکرم نے کہا۔

''ہاں۔''

''یہ سوچ کر کہ یہ شخص اب تک زندہ و سلامت پھر رہا ہے' میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میں امداد بھائی کی خون میں بھیگی لاش اور ریشماں آپی کے آنسو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اسے بھائی کے

خون کے ایک ایک قطرے اور آپی کی آنکھوں سے بہنے والے ایک ایک آنسو کا حساب دینا ہوگا۔''

''ہاں' لیکن ذرا انتظار' اسے وہیں مرنا ہوگا جہاں امداد کو گولیاں لگی تھیں' اسے امداد کی طرح ہی تڑپنا اور سسکنا ہوگا۔ اس روز میرا بچ جانا مشکل نہیں ناممکن تھا' لیکن میں بچ گیا۔ شاید اس لیے کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے۔ اپنے بھائی کا بدلہ لینا ہے' اس کے سینے میں اتنی ہی گولیاں اتارنی ہیں' جتنی امداد کے جسم میں پیوست تھیں۔'' خادم کے لہجے میں نفرت اتر آئی۔

☆=====☆=====☆

''تم نے تو ٹھیک کہا تھا بانو' اتنے سارے لوگوں نے وہ بیکار برتن خریدے' مجھے حیرت ہے۔'' اماں جی نے کہا۔

وہ تینوں صحن میں چارپائیوں پر پیڈسٹل فین کے سامنے بیٹھے ہوئے سبز چائے پی رہے تھے۔

ماہ بانو ان کی بات سن کر مسکرا دی۔ ''تب ہی تو آپ سے کپڑوں کے لیے اتنے پیسے مانگے تھے اور اب تو اماں گھر میں ڈالر آئیں گے۔''

''ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ یہ تو نہیں کہ منہ اٹھا کر نیویارک چل دیے۔'' انہوں نے کہا۔

''چھوڑیں ابا جی۔ دیکھنا کیا ہے۔ اتنی زبردست آفر ہے۔ آپ نے خود ہی تو مجھ سے کہا تھا کہ اپنی سوچ کو کبھی محدود نہ ہونے دینا۔ آپ ہی کہتے تھے کہ کوشش کرنے سے انسان سب کچھ پالیتا ہے اور ابا جی وہ جو شخص آپ کو برسوں پہلے ہمارے کالج میں ملا تھا اس نے سب سے اچھی بات کہی تھی۔ آپ کو یاد ہے اس نے کیا کہا تھا؟''

''وہ تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ اس بابو کی باتوں نے میری زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دیا تھا۔'' ابا جی نے کہا۔

''اور صرف ایک مرتبہ سننے کے باوجود مجھے وہ سب باتیں یاد ہیں ابا جی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر تمہارا کام اچھا ہے تو تمہارے لیے ترقی کے دروازے ضرور کھلیں گے' آج نہ سہی کل سہی۔ نہ تو آج تک خوشبو کے راستے میں کوئی دیوار کھڑی کر سکا اور نہ ہی روشنی کو بیڑیاں پہنائی جا سکتی ہیں۔ اچھا کام کسی کالج کی سند کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ تو دیکھنے میں ہی اچھا نظر آتا ہے۔

اس نے کہا تھا' ابا جی کہ کوشش سے تو انسان خدا کو بھی پالیتا ہے' اپنے لیے اپنے قوت بازو سے جگہ بناؤ۔ یاد رکھو یہاں ہر کوئی آگے بڑھنے کی دھن میں سرپٹ دوڑ رہا ہے اور کوئی بھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ پیچھے رہ جانے والے لوگوں پر رحم اور ہمدردی کی ایک نظر ہی ڈال لے کیونکہ ذرا دیر میں کارواں آگے نکل جائے گا۔

ابا جی یہ موقع قدرت کی طرف سے انعام ہے آپ کی محنت اور جدوجہد کا۔ ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے کہا تھا اور آج میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ پلیز ابا جی اپنی سوچ کو محدود نہ ہونے دیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا لیکن خوش قسمتی بھی بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ پلیز ابا جی' اس آفر کے متعلق سنجیدگی سے سوچیں۔''

ابا جی اس کی باتیں سن کر مسکرا دیے۔ ''ہماری بیٹی خاصی سمجھ دار ہوگئی ہے' کیوں بانو کی ماں؟''

''سمجھداری ہی تو نہیں ہے اس میں۔'' اماں نے کہا۔

ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ اماں جان کا اشارہ کس طرف تھا۔ اس کے دل میں ایک مرتبہ پھر کانٹا سا چبھ گیا' لیکن اس نے یوں ظاہر کیا' جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''نہیں ہماری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔'' ابا جی نے اس کا دفاع کیا۔ پھر اس سے مخاطب ہوئے۔ ''بانو! میں جو فیصلہ کرنے سے کتراتا رہا تھا تو صرف اس لیے کہ میرے جانے کے بعد تمہاری اور تمہاری ماں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔''

''ابا جی ہم دونوں اتنے بڑے ہو چکے ہیں کہ اپنی دیکھ بھال خود کرسکیں۔'' اس نے کہا۔

''مجھے تو تم چھوٹی سی لگتی ہو۔'' ابا جی نے پیار سے اس سے کہا۔

''آپ کو تو چھوٹی سی ہی لگوں گی لیکن میں چھوٹی ہوں یا بڑی' اپنی دیکھ بھال کرسکتی ہوں اور پھر ابا جی ہم لوگ اپنوں کے درمیان رہ رہے ہیں اپنے دیس میں اپنی مٹی پر۔ اتنے لوگ باہر جاتے ہیں۔ اپنی فیملی چھوڑ کر' یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے اور پھر آپ نے کون سا ساری زندگی باہر گزار دینی ہے' بس دو چار سال پھر یہاں اپنا کاروبار سیٹ کرنا۔'' ماہ بانو نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

''یہی سب میرے خواب تھے کبھی' لیکن اب نہیں رہے۔ اب تم اور تمہاری اماں میرے لیے سب سے پہلے ہیں' باقی سب کچھ بعد میں' اور سچ تو یہ ہے کہ تمہاری اماں کے بغیر تو میں کہیں رہ ہی نہیں سکتا۔'' ابا جی نے مسکرا کر اماں کی طرف دیکھا۔

''چھوڑیں ابا جی' وہاں ایک سے ایک میم ہوگی۔ آپ کو اپنے فیصلے پر افسوس نہیں ہوگا۔'' اس نے اپنی ہنسی دبا کر شرارت سے کہا۔

''بے حیائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اپنے باپ کے سامنے ایسی بکواس۔'' اماں کا پارا چڑھ گیا تھا۔

''کوئی میم تمہاری اماں کا کب مقابلہ کرسکتی ہے اگر میں نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا تو تمہاری اماں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''کیا مطلب؟ اور میں کہاں جاؤں گی؟ میری کوئی جگہ ہی نہیں ابا جی۔''

''تمہاری جگہ جس گھر میں ہوگی' تمہیں وہاں بھجوا دیں گے اور ہم دونوں اپنی مزے کی زندگی گزاریں گے۔''

اماں جان خوش ہوگئیں۔ ''شکر ہے آپ کو بھی بانو کی شادی کا خیال آیا۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔''

''ابھی اس سال تو بیس سال کی ہوگی ہماری ماہ بانو۔'' ابا جی نے کہا۔

''اس کے ساتھ کی لڑکیوں کی پندرہ سولہ سال کی عمر میں شادی ہو چکی ہے۔ دیکھ لیں خاندان بھر میں اس کی عمر کی کوئی کنواری لڑکی نہیں ملے گی آپ کو۔ میری سنی ہوتی آپ نے تو اب تک یہ بھی اپنے گھر میں میاں اور بچوں کے درمیان ہوتی۔''

''پلیز اماں! اسٹاپ اِٹ' اس موضوع کو یہیں ختم کردیں۔'' اس نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''دیکھا آپ نے؟ دیکھ لیا؟ پڑھ لکھ گئی ہے تو اماں باوا کی عزت دو کوڑی کی ہوگئی ہے اس کی نظر میں۔'' اماں نے کہا۔

''بچی ہے' میں نے تو مذاق میں کہہ دیا تھا' جانے دو اس بات کو۔'' ابا جی چارپائی پر لیٹ گئے۔

''بس بہت ہوگئی بانو کے ابا' اٹھیں اور میری بات سنیں۔ میرا تو آدھا خون جل گیا ہے سوچتے سوچتے اور آپ کو پروا ہی نہیں۔''

''ہوا کیا ہے؟ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے' کون سا اس کی عمر نکل گئی ہے۔ ان شاء اللہ' اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ ابھی اسے ماں باپ کے گھر کے سکھ اٹھانے دو۔'' ابا جی اٹھ بیٹھے۔

''آپ نے تو آنکھیں بند کر رکھی ہیں' کھلی رکھیں تو آپ کو پتا چلے کہ قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ میں ہر ایک کے سامنے اس پر پردے ڈالتی ہوں' لیکن اس سے حقیقت تو نہیں بدلے گی' اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے' آپ کو اس کی شادی کرنا ہوگی۔''

''کیا کہہ رہی ہو بانو کی ماں؟ کون سی قیامت؟ ارے بھئی کہاں پانی سر سے گزرنے والا ہے' سیدھی بات تو تم کبھی کرتی ہی نہیں۔''

''میں کیا بات کروں جب آنکھیں رکھتے ہوئے آپ انجان بنے ہوئے ہیں۔ پہلے اس کے خاندان کے ہاتھوں میری بہن برباد ہوئی ہے' اب میں اپنی بیٹی کو اسی کنویں میں چھلانگ نہیں لگانے دوں گی' یہ بھی اسی طرح سیدھی سادی اور معصوم ہے' اسے نہیں خبر کہ یہ کیا کر رہی ہے' لیکن ہم تو اسے بچا سکتے ہیں ناں؟ اس سے پہلے بانو کے ابا کہ یہ اس اندھے کنویں میں گر جائے' آپ کو اللہ کا واسطہ دیتی ہوں کہ اس کی شادی کردیں۔'' اماں جان کی آواز بھر آگئی۔

"کچھ نہیں ہوتا بانو کی ماں، تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو، وہم ہے تمہارا۔" ابا جی نے انہیں تسلی دی۔

"وہم ہے، یہ وہم ہے میرا؟ اس کمبخت لڑکے نے پتا نہیں کیا پڑھ کر پھونک دیا ہے میری بچی پر کہ اسے ایک عبداللہ کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اس روز گاؤں میں اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اعتراض کرنے والی کون ہوتی ہوں، اگر وہ عبداللہ سے شادی کرتی ہے۔" اماں باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ رونے لگیں۔

"بانو کی ماں یہ ایک دم جل تھل نہ کر دیا کرو، ٹھنڈے دل سے سوچو۔" ابا جی نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"میں نے بہت سوچا ہے جی، اور بانو صرف آپ کی نہیں میری بھی بیٹی ہے۔ ایک ہی ایک تو اولاد ہے میری۔ میں اسے ایسی شہ نہیں دے سکتی کہ اس کی زندگی تباہ ہو جائے۔ اپنی بہن کو رو چکی ہوں میں، اپنی بیٹی پر نہیں رونا چاہتی۔" اماں ان کی بات کاٹ کر تیزی سے بولیں۔

"جذباتی باتیں مت کرو، ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو، ابھی یہ سب باتیں قبل از وقت ہیں، اور پھر عبداللہ میں برائی کیا ہے، تعلیم یافتہ ہے، روزگار کی اسے فکر نہیں، ان کی حویلی بھی اپنے ہی گاؤں میں سمجھو، ملنے جلنے میں بھی مجھے اس سے اچھا لڑکا اور کوئی نہیں لگا۔ پھر یہ ہے کہ ان کی حویلی کا ماحول بھی مختلف ہے سب پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ بڑی حویلی والی پابندیاں بھی نہیں ہیں وہاں، اس سے بہتر گھر کہاں ملے گا بانو کو۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں اور میں اس میں کوئی برائی بھی نہیں سمجھتا۔ یوں بھی ہم بانو کی مرضی کے بغیر اس کا رشتہ کہیں بھی طے نہیں کر سکتے۔" ابا جی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"آپ نے بھی حد کر دی بانو کے ابا! یہ لوگ ناقابلِ اعتبار ہیں اور پھر ریشماں اس لڑکے کی منگیتر ہے۔ کیا اپنی منگیتر کو چھوڑ کر وہ اس سے شادی کر لے گا؟ اپنی مانگ چھوڑ سکتا ہے اس حویلی کا کوئی فرد؟ اور پھر پتا نہیں دونوں بھائیوں کی آپس کی دشمنی کیا رنگ لائے، نہ جانے کب آگ بھڑکے، میری بیٹی کیوں اس آگ کا شکار ہو۔ ایک مرتبہ بچ گیا عبداللہ لیکن ہر مرتبہ بچ جائے گا؟ نہ بابا نہ، میں باز آئی وہاں اپنی بیٹی دینے سے، اور آپ بھی سن لیں کہ وہاں بانو کی شادی نہیں ہو سکتی۔

اور بانو کی مرضی کی کیا اہمیت؟ ہماری شادی کے وقت ماں باپ نے ہم سے پوچھا تھا؟ جہاں انہوں نے کہا، ہم نے گردن جھکا دی اور پھر اچھی بھلی پُرسکون زندگی گزاری۔ اچھے برے دن مل کر گزارے کبھی لڑائی جھگڑا نہیں کیا۔ دو وقت کی روٹی چاہے روکھی سوکھی کھائی لیکن عزت کے ساتھ وقت گزارا۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہیے۔"

"اچھا پھر بات کریں گے اس مسئلے پر۔ ابھی میں تھکا ہوا ہوں۔ کل سے کام بھی بہت ہے"

ابا جی لیٹ گئے۔

"ٹھیک ہے آپ آرام کریں، یوں بھی اب مزید کیا بات رہ گئی ہے کرنے والی۔" اماں جی

بانو اپنے کمرے میں بیٹھی اماں اور ابا جی کی گفتگو سن رہی تھی۔

"یا اللہ کیا کروں۔" اس نے سوچا۔ "لگتا ہے پاگل ہو جاؤں گی۔ اماں جی نے ابا کو کتنے دنوں میں گاؤں والے واقعے کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ جو کچھ ہوا اس میں حیدر بابا کا قصور کب اب عبداللہ مجھ سے فلرٹ تو نہیں کر رہا۔ وہ جو چاہتا ہے، اسے منوانے کی صلاحیت بھی ہے میں وہ اسٹینڈ لے سکتا ہے میرے لیے۔

مجھے تو اب خبر ہوئی ہے کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک شخص کی مجھے اس قدر بدل دے گی۔ وہ کون سا لمحہ ہے جب عبداللہ میرے ساتھ نہیں ہوتا۔ ہر وقت اس کا تصور میرے ساتھ رہتا ہے۔

پتا نہیں کس کی نظر لگ رہی ہے ہماری محبت کو، ایک مسئلہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا گھر میں اماں جان، گاؤں میں ریشماں اور زینی اور اب خادم حسین شاہ، کچھ سمجھ میں نہیں کہ کیا کروں؟"

☆=====☆=====☆

سبط حسن، نوازش اور حضور علی رات کا کھانا کھا کر ریشماں کے کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ سبط کالج کے قصے سنا رہا تھا اور وہ دونوں یہ بتا رہے تھے کہ وہ اپنے ٹیوٹروں کا کیسے ناک میں دم کیے تھے۔

"تم اچھے رہے سبط۔" نوازش بولا۔ "کسی انسٹی ٹیوشن میں پڑھنے کی بات ہی اور ہوتی ہم نہیں حویلی میں ٹیوٹروں کے حوالے کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح نہ تو پڑھنے میں مزا ہے الٹی سیدھی حرکتیں کرنے میں۔"

"اور یہاں ہر وقت بابا جان سر پر رہتے ہیں۔ ذرا سی غفلت ہو پڑھائی میں تو شامت ہے، کبھی تو بالکل اچانک رات کو اس وقت طلبی ہوتی ہے، جب ہم سونے کے لیے ابھی لیٹے تے ہیں۔ بھاگ دوڑ کر بابا جان کے پاس پہنچتے ہیں تو حکم جاری ہوتا ہے کہ اپنی فلاں ہلاؤ اور وہیں پہ جان نکل جاتی ہے۔" حضور علی نے ہنستے ہوئے نوازش کی تائید کی۔

"اتنے ناشکرے ہو تم دونوں، یہاں سب کے درمیان رہ رہے ہو، وہ بے چارا سبط گھر سے ہے، پتا نہیں کتنی مصیبت ہوتی ہوگی اسے۔ یہاں تو بابا جان ہوتے ہیں اور وہ تو اتنا اچھا تے ہیں۔ کاش مجھے پڑھایا کریں۔" ریشماں نے کہا۔

وہ تینوں اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔

"ہاں یہ سبط بے چارا گھر سے دور بہت مصیبتیں بھگت رہا تھا۔ ایسی مصیبتیں تو رب
بھگتیں۔" نوازش نے کہا۔

"دیکھیں آپی! میں آپ کا معصوم سا بھائی' یہ مجھ پر کیسے کیسے الزام لگا رہے ہیں' بھلا
ایسی حرکتیں کر سکتا ہوں۔" سبط نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سبط تو واقعی بہت پیارا ہے۔" ریشماں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپی یہ!" نوازش' سبط کو تکیہ مار کر بولا۔ "اس کی شکل پر نہ جائیں آپ' یہ اتنا پیارا
نہیں' جتنا نظر آتا ہے۔"

"تمہارا پروپیگنڈا اسپیل بہت اچھا ہے سبط' آپی تو کبھی مانیں گی ہی نہیں کہ تم وہاں
مس نہیں کرتے تھے۔" حضور علی نے کہا۔

"ان کی باتوں میں مت آنا آپی' میں کیا کرتا تھا سارا دن۔ صبح کالج' واپسی پر کھانا
کر کچھ دیر آرام اور پھر ساری شام اس کے ساتھ' جس کے بغیر میں رہ ہی نہیں سکتا۔ اتنے
سے طریقے سے سارا دن گزارتا تھا۔" وہ بولا

"یہ تفصیل بتاؤ کہ تم کس کے بغیر نہیں رہ سکتے؟" نوازش نے شرارت سے کہا۔

"تمہیں بتانے کی کیا ضرورت ہے' آپی کو بتا چکا ہوں میں۔" وہ مزے سے بولا۔

"آپی! اس نے آپ کو کیا بتایا ہے' جلدی بتائیں۔"

ریشماں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ایسے تو نہیں بتا سکتی ناں۔ سبط سے پوچھو' وہ اجازت د
دے تو بتا دوں گی۔"

"سبط! تم نے کتنی رشوت دی ہے آپی کو؟" حضور علی نے کہا۔

"یہ رشوت کی وجہ سے نہیں ہے' تم سب بھی اپنے سیکریٹ مجھے بتاؤ گے تو میں وہ بھی
کو نہیں بتاؤں گی۔" ریشماں ہنسنے لگی۔

"شکر ہے آپی آپ بھی خوش رہنے لگی ہیں۔" نوازش بولا۔

"میں ہوں ہی بہت خوش' اس لیے خوش دکھائی بھی دیتی ہوں۔"

"ویسے تو اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے لیکن خصوصاً آج کل کیوں؟ لگتا ہے کوئی
خاص بات ہے اور آپ اپنا یہ سیکریٹ ہم سے شیئر نہیں کر رہیں کیوں سبط یہ غلط بات ہے نا؟"
نوازش نے کہا۔

"وہم ہے تمہارا' کوئی خاص بات نہیں ہے۔" وہ پلکیں جھکا کر پھر ہنس دی۔

اسی وقت دروازے پر دستک دے کر کریمن اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ
کے پاس حویلی کے متعلق کوئی خاص خبر تھی۔

"کیا ہوا کریمن؟ کوئی خاص بات ہے؟" ریشماں نے پوچھا۔

"ہاں بی بی! بڑی بیگم نے کلام پاک کے ختم کا ارادہ کیا ہے۔ پرسوں حویلی میں ہی انتظام
ہے کہ چھوٹی مالکن کے گھر بیٹا پیدا ہو۔"

ریشماں کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

"اوہ گاڈ! ابھی اماں کا دل نہیں بھرا بیٹوں سے۔" حضور علی بولا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ اب کے بیٹی ہو' مجھے چھوٹی چھوٹی پونی ٹیل والی بچیاں بہت اچھی لگتی
ہیں۔" سبط نے کہا۔

"خدا کو مانو یار! وہ کوئی سگی بہن نہیں ہو گی' کزن ہو گی اور بابا جان اسے ہم میں سے ہی کسی
کے پلے لگا دیں گے۔" نوازش ہنستے ہوئے بولا۔

"ہاں اور سخاوت بابا کا بھی دل چاہ رہا ہو گا کہ بیٹا ہو۔" حضور علی نے کہا۔

"بی بی خیر تو ہے' کہیں دشمنوں کی طبیعت خراب تو نہیں ہو گئی۔" کریمن نے ریشماں کو
با تشویش سے بولی۔

"نہیں' میں ٹھیک ہوں۔" اس نے بمشکل کہا۔

وہ تینوں بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"آپ کو کیا ہوا آپی؟"

انہیں مطمئن کرنے کے لیے وہ ہنس پڑی۔

"مجھے کیا ہونا ہے' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم لوگ تو میرے لیے ایک لمحے میں ہی پریشان
تے ہو اور تم لوگوں کو پریشان دیکھ کر میں پریشان ہو جاتی ہوں۔"

انہیں کمرے سے رخصت کر کے وہ اماں جان کی خواب گاہ میں چلی آئی۔ وہ ابھی سوئی
نہیں' البتہ قرآن پاک پڑھ کر لیٹ چکی تھیں۔ دو ملازمائیں ان کی ٹانگیں دبا رہی تھیں اور
ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔

"ریشماں بیٹے! نیند نہیں آ رہی کیا؟" یاسمین بیگم نے اسے اپنے قریب ہی مسہری پر بٹھا

"نہیں۔"

"تھکی تھکی لگ رہی ہو' کیا ہوا؟" انہوں نے پوچھا۔

"اماں جان! بہت بے چینی محسوس ہو رہی ہے' گھبراہٹ ہو رہی ہے بہت۔" وہ بولی۔

"کیوں چندا؟ بھائیوں نے تو کچھ نہیں کہہ دیا؟"

"نہیں بھائی تو کبھی کچھ نہیں کہتے مگر......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

انہوں نے ریشماں کی طرف بغور دیکھا۔ وہ مضطرب تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی' لیکن کہہ نہیں

"تم دونوں جاؤ اب۔" انہوں نے ملازماؤں سے کہا اور ان کے جانے کے بعد ریشماں سے مخاطب ہوئیں۔

"اپنی اماں کو بھی نہیں بتاؤ گی چندا کہ کیا ہوا' کیوں پریشان ہو؟"

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ یاسمین بیگم تڑپ اٹھیں۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"کیا ہوا میری جان کچھ تو بولو روتے نہیں ہیں بیٹا! میں ہوں ناں۔ تمہارے سب دکھ جھولی میں ڈال لوں گی' لیکن تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی' مگر منہ سے تو بولو ایسے کیسے پتا چلے مجھے؟"

"اماں جان! آپ سچ مچ چاہتی ہیں کہ چھوٹی چچی کے گھر بیٹا پیدا ہوا؟" اس نے کہا۔

یاسمین کے دل میں جیسے کسی نے برچھے پیوست کر دیے۔ وہ جانتی تھیں کہ ریشماں نے یہ سوال کیوں پوچھا تھا؟

"بیٹا! میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے یہ تو قدرت کے کھیل ہیں' اللہ تعالیٰ کچھ اپنے بندوں کے لیے بہتر سمجھتا ہے' وہی کرتا ہے' اس کی خدائی میں کون دخل دے سکتا ہے' میرے لیے ممکن ہوتا تو میں دعا کرتی کہ تمہاری چھوٹی چچی بے اولاد رہتیں' لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ بھی دکھی عورت ہے' کتنی منتوں مرادوں کے بعد اس کے گھر خوشی آئی ہے۔

ہاں خدا کی خدائی میں تو میں دخل نہیں دے سکتی۔ البتہ جو خدشے تمہارے ذہن میں ہیں انہیں جھٹک دو' مجھے مرنا پڑا تو یہ بھی کر گزروں گی' لیکن وہ سب نہیں ہونے دوں گی' جس کے لیے تم پریشان ہو رہی ہو۔"

"اماں جان!" وہ ان سے لپٹ کر رو پڑی۔

پیر صاحب خواب گاہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ سامنے ریشماں کو روتے اور یاسمین بیگم کو اسے چپ کراتے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھے۔

"کیا ہوا ریشماں کو؟"

ان کی آواز سن کر ریشماں' یاسمین بیگم سے الگ ہو گئی اور بھیگی آنکھوں سے پیر صاحب کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! کیوں رو رہی ہیں آپ؟" انہوں نے مسہری پر بیٹھ کر اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"نہیں بابا جان کچھ نہیں۔" اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

"اپنے بابا جان کو بھی نہیں بتائیں گی؟"

آنسو ایک مرتبہ پھر بہنے لگے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کتنے برس بہت گئے تھے' جب بابا جان نے یوں اس کا سر اپنے سینے سے لگایا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ساری زندگی یوں ہی ان کی آغوش میں بسر کر دے۔ یوں لگا جیسے ساری دنیا میں بس یہی چھاؤں اور یہی پناہ گاہ تھی۔

وہ جانتی تھی کہ بابا جان کو اس سے بہت محبت تھی اور یہ بھی کہ خود وہ ان سے بے تحاشا محبت کرتی تھی' مگر پھر بھی بہت سی باتیں تھیں جو وہ ان سے نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ان سے اس قدر قریب نہیں تھی بلکہ وہ تو کسی سے بھی اس قدر قریب نہیں تھی سوائے ماہ بانو کے۔ اماں جان تھیں جن سے کبھی کبھار وہ اپنے دل کی کوئی بات کہہ دیتی تھی۔ وہ خود البتہ سب کچھ سمجھ جاتی تھیں۔

"یاسمین بیگم! ہماری بیٹی کیوں رو رہی ہے؟ آپ نے اسے کچھ کہا ہے؟" پیر صاحب کے لہجے میں سختی تھی۔

"پیر صاحب! آپ کی سگی اولاد ہے پھر بھی آپ کو پتا کیوں نہیں چلتا کہ کیوں رو رہی ہے؟" انہوں نے دکھ کے ساتھ کہا۔

یاسمین کی بات سے پیر صاحب کا مزاج برہم تو کیا' لیکن ریشماں کی موجودگی میں انہوں نے اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا اور اسے چپ کراتے رہے۔

"بابا جان! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔" بالآخر اس نے کہا۔

"کیوں بیٹا؟ ہم ہیں ناں آپ کے ساتھ' آپ کے بھائی ہیں' آپ کی اماں جان ہیں پھر بھی ڈر لگتا ہے آپ کو؟"

"یہ کچھ نہیں بتا پائے گی پیر صاحب کیونکہ اس کی زبان پر حویلی کی روایتوں نے تالے رکھے ہیں' اور اس سے پوچھتے بھی کیوں ہیں؟ میں اس کی سوتیلی ماں ہوں' مگر آپ کی یہ سگی ہے' اس کے آنسو اپنی داستان خود سنا رہے ہیں؟ آپ سن نہیں سکتے یا سننا نہیں چاہتے؟" یاسمین بیگم نے تلخی سے کہا۔

ریشماں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی بھیگی ہوئی شربتی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں واضح تھیں' چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بننے لگے تھے۔

پیر صاحب جو یاسمین بیگم کو کچھ کہنے لگے تھے ریشماں کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گئے۔ وہ خوفزدہ تھی' کمزور ہو گئی تھی اور کچھ نہ کہہ سکنے کے باعث اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔

اس لمحے انہیں شدت کے ساتھ اپنی شکست کا احساس ہوا۔ انہیں لگا جیسے وہ سب کچھ ہار چکے ہوں۔ انہوں نے ہر موقع پر حیدر علی شاہ کو زک پہنچانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب رہے تھے۔ اپنا بہت پیارا بیٹا گنوا دینے کے باوجود بھی انہیں شکست کا ایسا احساس نہیں ہوا تھا' جیسا کہ ریشماں کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر ہوا تھا۔

وہ رو رہی تھی۔ حیدر علی شاہ کے بیٹے کے لیے اور انہوں نے زرینہ سے اپنی روح
گہرائیوں کے ساتھ محبت کی تھی، مگر اس کے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ محبت،
ہنسی، نہ آنکھوں کی چمک۔ ہاں جاتے جاتے وہ اپنی سب سے خوبصورت، سب سے قیمتی نشا
چھوڑ گئی تھی۔

وہ اذیت ناک دن وہ کبھی نہیں بھول سکتے تھے، جب زرینہ سے دور ہو کر انہیں ایک
خیال ستاتا تھا۔

"جب وہ میرے پاس ہوتی ہے تو کس کے متعلق سوچتی ہے، جب اس کا جسم میرے پا
ہوتا ہے تو اس کا دل اور اس کی روح کس کے پاس ہوتی ہے کسے ڈھونڈتی ہے؟"

تب انہیں لگتا کہ قدرت ان کو کسی بات کی سزا دے رہی تھی۔ یہ تازیانے جوان
جسم پر نہیں روح پر گھاؤ لگا رہے تھے، اس سے کہیں زیادہ سخت تھے جو انہوں نے اچھو کے جسم
لگائے تھے۔

اور ان باتوں کے سوچتے ہی وہ قدرت سے انتقام لینے پر تُل جاتے تھے۔ وہ ساری دنیا
نیچا دکھا دینا چاہتے تھے۔ زرینہ کی خون میں بھیگی لاش دیکھنا چاہتے تھے اور جب اس کے کمر
میں پہنچتے تھے، اسے دیکھتے تھے تو ہر ارادہ خود بخود پانی کے بلبلے کی طرح لمحوں میں ختم ہو جاتا تھا۔
پھر ایک دن انہیں خبر ہوئی کہ محبت کی منزل تو انہیں مل گئی تھی، مگر حیدر علی شاہ نے اس
باوجود انہیں شکست دے دی تھی۔ اس لمحے حیدر علی شاہ کے لیے، اپنے چھوٹے بہت پیار
بھائی کے لیے نفرت کا جو احساس ان کے دل میں جاگا تھا، برسوں بیت جانے کے باوجود کم
نہ ہو سکا تھا۔

زرینہ ان کی زندگی میں داخل ہوئی تو اس کے پاس صرف سانس کی ایک چلتی ڈور تھی،
سب کچھ حیدر علی کا تھا۔ پھر وہ ڈور بھی نہ رہی اور وہ منوں مٹی تلے سکون کی نیند جا سوئی، مگر
کے دل میں ایسی خلش چھوڑ گئی جو پھانس بن کر آج تک چبھ رہی تھی۔ کبھی وہ حساب لگانے
تھے کہ کہاں کہاں انہوں نے حیدر علی کو شکست دی اور کس جگہ وہ ہارے، یہ حساب بہت سادہ تھا
حیدر علی نے محبت کی اور اس کی محبت کو حاصل کیا انہوں نے۔ یہ واضح فتح تھی حیدر علی
پر، لیکن جب انہیں یہ احساس ہوتا کہ پا لینے کے بعد بھی ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تو ان کی فتح
بخود شکست میں بدل جاتی تھی، مگر وہ اسے ماننے پر تیار نہیں تھے پھر انہوں نے ریشماں کا
عبداللہ کو دینے کے باوجود دل میں یہ ٹھان لی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کسی صورت وہاں نہیں کر
گے۔ انہیں اندازہ تھا کہ خود حیدر علی کو بھی اس شادی کی کتنی شدت سے آرزو ہو گی اور کم از کم
مقام پر وہ اسے فتح سے ہمکنار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پیر صاحب جلال الدین
وفات کے بعد حیدر علی کو بہت کم اور سب سے بری زمینیں دی تھیں، جن کا مقدمہ آج تک

کی عدالتوں میں زیرِ سماعت تھا۔ انہوں نے خود سے خادم حسین اور امداد علی کے رشتے زہرا اور
زینب سے طے کر دیے تھے۔ جب حیدر علی نے دونوں بچیوں کو پڑھانا چاہا تھا تو ان پر فائرنگ
کروادی تھی، اس کی اولاد کو اس سے دور کر دیا تھا، کھڑی فصلوں میں آگ لگوا دی تھی اور بھی ہر حربہ
آزمایا تھا اسے تنگ کرنے کا، اشتعال دلانے کا، اس سے انتقام لینے کا۔

مگر ہوا کیا تھا؟ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی بہنوں کی آنکھوں میں خوف دیکھا تھا۔ اپنے
بھائی کے لیے اور آج وہ ریشماں کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھ رہے تھے، اس کے اپنے
باپ کے لیے، اور زرینہ تھی جو غم اور خوشی، خوف اور بے خوفی کے تمام حصار توڑ چکی تھی۔

زرینہ کو کھو کر احساس ہوا تھا کہ وہ اس سے کتنی شدید محبت کرتے تھے اور انہوں نے سوچا
تھا کہ کیا کسی چیز، کسی شخص کی قدر و قیمت جاننے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ کھو جائے؟
انہوں نے اس کی نشانی کو بہت محبت، بہت پیار سے پالا تھا، اس کی خاطر اپنے کئی اصول توڑے
تھے، اس نے پڑھنا چاہا تھا اور انہوں نے انکار نہیں کیا تھا کیونکہ زرینہ نے مر کر انہیں بہت بڑا
سبق دیا تھا کہ محبت میں اَنا نہیں ہوتی، محبت تو بس صرف محبت ہوتی ہے۔

یہ سبق ان کے مزاج کے خلاف تھا اسے جان لینے اور سمجھ لینے کے باوجود بھی وہ اس پر عمل
نہیں کر سکے تھے، مگر ریشماں کی آنکھوں کے خوف اور زرد پڑتی رنگت نے انہیں وہ بھولا بسرا سبق
یاد کروا دیا تھا۔

"لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔" انہوں نے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر سوچا۔
"ہم سب اپنی انا اور اپنی دشمنی میں اتنے آگے بڑھ آئے ہیں کہ واپسی کا کوئی راستہ ہی
نہیں رہا۔"

☆=====☆=====☆

خادم حسین اور مکرم اپنے گھر کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خادم حسین کے ہاتھ میں
کاغذ تھا جس پر لکھی تفصیلات وہ مکرم کو سنا رہا تھا۔

نام:۔ ماہ بانو
عمر:۔ تقریباً بیس سال
باپ کا نام:۔ منظور حسین۔ (نیاز پور شریف کے مولوی نعمت اللہ صاحب کا داماد)
پیشہ:۔ کمہار
ماہ بانو کی تعلیم:۔ زیرِ تعلیم سال دوم، آرٹس کالج
شعبہ:۔ فائن آرٹس
دوستوں کے نام:۔ تعداد بہت زیادہ ہے چند گنے چنے نام یہ ہیں۔ اُما دیوی (جو کہ ایک
ہندو لڑکی ہے) والد بزنس مین۔

نیہاں:۔اسلام آباد میں مقیم ایک بڑے بیوروکریٹ کی بیٹی۔
عبداللہ:۔حیدر علی شاہ کا بیٹا۔
عدنان:۔(جسے عموماً ایڈی کہا جاتا ہے) والد ریٹائرڈ آرمی آفیسر۔
ظہیر:۔والد ریٹائرڈ پروفیسر۔
جاوید:۔(جسے عموماً جیمز کہا جاتا ہے) اکیلا رہتا ہے' والد یا والدہ کا پتا نہیں مل سکا۔
فہرست طویل تھی اور ان ناموں کے بعد بھی بیس پچیس نام موجود تھے۔خادم حسین' مکرم کو بتاتا جا رہا تھا۔

''عبداللہ اور یہ لڑکی ایک ہی کالج میں پڑھ رہے ہیں اور اتفاق سے ایک دوسرے کے دوست بھی ہیں' مگر کیا یہ محض اتفاق ہے۔'' مکرم نے خادم حسین کی بات سننے کے بعد کہا۔

''اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے کہ کیا یہ محض اتفاق ہے؟ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ تفصیل کے مطابق یہ ریشماں کی کزن ہے اور اکثر ریشماں اس کا ذکر کرتی رہا کرتی تھی اور مجھے خبر بھی نہیں ہو سکی کہ جیسی لڑکی میں چاہتا تھا' وہ مجھ سے اتنے قریب تھی۔'' وہ بولا۔

''اپنے گاؤں کی لڑکی ہے' مولوی صاحب کی نواسی ہے' اس کا تو مسئلہ ہی نہیں ہے' بس ایک چٹکی بجانے کی دیر ہے۔''

''نہیں مکرم' میں اس کے لیے ایسا نہیں چاہتا۔ یہ بھی مت بھولو کہ وہ ریشماں کی کزن ہے' اس کی دوست ہے اور مولوی صاحب کی نواسی ہے' ویسے بھی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ابھی بہت سے اور کام بھی ہیں کرنے کے لیے' وہ نپٹا کر پھر اس طرف توجہ دیں گے۔'' خادم حسین نے کہا۔

''ایک اور مسئلہ بھی ہے سبط کا۔'' مکرم بولا۔

''ہاں' میری بابا جان سے بات ہوئی تھی اس بارے میں۔ابھی بچہ ہے وہ امریکہ جائے گا تو اس کے رنگوں میں سب کچھ بھول جائے گا۔میں نے بابا جان سے بھی کہا ہے کہ اس سلسلے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ابھی بہت وقت پڑا ہے سبط کے کچھ بننے میں۔ برسوں بعد اسے یاد بھی نہیں ہوگا کہ اس کی زندگی میں زینب نام کی کوئی لڑکی بھی آئی تھی' یہ اسے بھول جائے گا' وہ بھی اسے بھول جائے گی' یونہی یہ زندگی چلتی ہے' آج کل کس کے پاس وقت اتنا ہے کہ بچپن کی محبت کو یاد رکھے۔''

''میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے۔آپ سب ایک سنجیدہ بات کو بہت لائٹلی لے رہے ہیں۔''

''تم ضرورت سے زیادہ سیریس ہو رہے ہو اور کچھ نہیں۔ جب عبداللہ شاہ کی خون میں لت پت لاش اس کی حویلی پہنچی تھی تو کیا اس کی بہن اسے قتل کرنے والوں کی حویلی میں بہو بن کر داخل ہونا پسند کرے گی؟ نہیں۔'' خادم حسین نے کہا۔

''میں اس لڑکی کی دیدہ دلیری پر حیران ہوں۔ وہ ہماری حویلی میں داخل ہوئی' اماں اور ریشماں آپی سے ملی اور پھر سبط کے ساتھ مزے سے چلتی ہوئی واپس چلی گئی' بلکہ جب میں نے سبط کو روکا تو وہ تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیتی رہی۔''

خادم حسین ہنس پڑا۔''یقین کرو اسے تم پر تنقید کرنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔تم اتنے ہینڈ سم ہو کہ کوئی بھی لڑکی بآسانی تم پر پھسل سکتی ہے۔''

☆=====☆=====☆

...ل اور آواری میں ہونے والی نمائش بھی بے حد کامیاب رہی تھی۔انہیں ان کی توقعات سے بڑھ کر ریسپانس ملا تھا۔ ماہ بانو تو خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔بس اسے ایک بات کا ...وس تھا کہ تھیسس کی مصروفیت کے باعث عبداللہ دونوں جگہوں پر بمشکل تمام آدھا گھنٹہ رک سکا ...ا۔

وہ اس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی تھی' اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس دوران کیا کیا ...ات پیش آئے تھے۔لوگوں نے کس کس انداز میں ان کے بنائے ہوئے سرامکس پیس کی ...ریف کی تھی اور یہ بھی کہ اماں جی اس پر کس قدر مہربان ہو رہی تھیں۔انہیں فکر تھی کہ اگر بانو نے ...ا زیادہ محنت کی تو وہ کمزور رہ جائے گی اور بھی نہ جانے کیا کیا۔ایک مرتبہ باتیں شروع ہو ...تیں تو شاید ختم ہی نہ ہوتیں۔

اس روز بھی عبداللہ اور اپنے باقی دوستوں سے ملنے کے لیے اس کا دل شدت کے ساتھ ...ل رہا تھا۔

''ابا جی! یہ بات ہوئی بھلا۔ ہمارے گھر فون بھی نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''کسے کرنا ہے فون؟ ساتھ والوں کے گھر سے کرلو۔'' ابا جی نے کہا۔

''سب دوستوں کو کرنا ہے' اماں جی نے انہیں گھر آنے سے منع کر دیا ہے' کالج میں نہیں ...ئی اب میرا بہت دل چاہ رہا ہے سب سے ملنے کے لیے' ہائے قسم سے اُماہی ہوتی یہاں۔''

''ٹک کر بیٹھو گھر میں' زیادہ دھوپ میں نکلو گی' تو کالی ہو جاؤ گی۔'' اماں نے کہا۔

''اس سے زیادہ کالی نہیں ہو سکتی' اب تو اتنی کالی ہو چکی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو ترس کھا کر مجھے ...ورا کر دینا چاہیے۔''

''حد ہوتی ہے ناشکری کی بھی۔'' اماں نے بگڑ کر کہا۔

''میں نے تمہیں شکل وصورت کے معاملے میں کبھی خوش نہیں دیکھا بانو' کیا کمی ہے بیٹا تم ...ا؟ ایسے نہیں کہا کرتے۔'' ابا جی بولے۔

''چھوڑیں ابا جی! خوش تو میں تب ہوتی' اگر میں بھی ریشماں جیسی خوبصورت ہوتی' ...صورتی تو اسے کہتے ہیں۔''

"تمہارے بس میں ہوتا تو تم اس کی صورت شکل بھی چھین لیتیں۔" اماں کے انداز
میں تلخی آ گئی۔

ماہ بانو کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔ احساسِ توہین اور ذلت سے اس کی آنکھیں
ہو گئیں۔ ابا جی کو ایک لمحے میں ہی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ ماہ بانو ان کی اکلوتی
اولاد تھی اور بے حد لاڈلی بھی جب وہ بہت چھوٹی سی تھی تب سے ان کے دل میں یہ حسرت
تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے سامنے دنیا بھر کی ہر نعمت ڈھیر کر دیں' مگر یہ ان کے بس میں نہیں تھا
جب بھی وہ اس کی کوئی خواہش پوری نہیں کر سکتے تھے۔ دکھ کے احساس کی وجہ سے کتنے
تک ٹھیک سے سو بھی نہیں سکتے تھے' انہیں تب تک چین نہیں آتا تھا جب تک وہ اس کی مطلو
چیز اس کے سامنے لا کر رکھ نہیں دیتے تھے' وہ تو ایک لمحے کے لیے بھی اس کی آنکھوں
آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے اور اب وہ بار بار پلکیں جھپکا کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جنگل میں مور ناچا' کس نے دیکھا' ہو گی ریشماں خوبصورت' ہمیں کیا پتا' ہم تو
بیٹی کو دیکھتے ہیں اور جیتے ہیں۔ کیوں بانو! سچ بتاؤ کہ ایسی شکل وصورت کا کیا فائدہ' جسے
دیکھتا ہی نہ ہو' ایسی زندگی کا کیا فائدہ جو ایک کونے میں پڑے پڑے گزاری جائے جس
دنیا کے دروازے بند ہوں' نہیں بھئی نہیں' ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے ہماری دعاؤں کے صلے
ویسی ہی پیاری بیٹی دی ہے' جیسی ہم چاہتے تھے۔ یہی ہماری آنکھوں کی روشنی اور نور
یہی ٹھنڈک ہے۔" ابا جی نے کہا۔

ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆=====☆=====☆

کالج میں چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ نیہاں بھی لاہور آئی ہوئی تھی۔ اس کا اور ماہ
عبداللہ کی طرف جانے کا پروگرام بن گیا۔

ملازم نے دونوں کو ڈرائینگ روم میں بٹھایا اور خود عبداللہ کو اطلاع دینے چلا گیا۔

"شاہ صاحب سوئے ہوئے ہیں۔ میں ابھی انہیں جگا کر اطلاع کرتا ہوں۔" اس
کہا تھا۔

اور وہ اس کے جانے کے بعد وہیں بیٹھی اس کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔

"مجھے عجیب سا لگ رہا ہے نیہاں' دیکھو اتنے خوبصورت کرسٹلز کے درمیان میرا
سرامکس پیس کچھ غلط نہیں لگ رہا۔ یوں جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔" ماہ بانو نے کہا۔

"تم خواہ مخواہ کیوں کامپلیکس میں مبتلا ہو جاتی ہو۔ اتنا اچھا تو لگ رہا ہے۔ میں تو عبد
کے گھر کے انٹیریئر پر عاشق ہوں۔ ہر چیز اتنی خوبصورت ہے اور اتنے مناسب انداز میں
ہوئی ہے' کبھی کسی بڑے گھر میں داخل ہو جاؤ تو لگتا ہے کہ کسی دکان میں داخل ہو گئے ہوں

امپورٹڈ چیزوں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے' لیکن یہاں آ کر ایسا محسوس نہیں ہوتا۔"

"سنو نیہاں' یہ پیانو کہاں بج رہا ہے؟" ماہ بانو نے کان لگائے۔

"ہاں' کافی دیر سے بج رہا ہے اور بہت اچھا' لگتا نہیں ہے کہ ریکارڈنگ ہو' ایسا محسوس ہو
جیسے کوئی یہیں کسی کمرے میں بجا رہا ہو' ہیں نا؟"

ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ پیانو کی آواز آنا بند ہو گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد زینی
ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ کیولاٹس اور ٹی شرٹ میں ملبوس کندھوں تک کٹے بال کھلے
ہوئے۔ وہ یوں اندر داخل ہوئی جیسے وہاں آنا نہ چاہتی ہو اور مجبوری میں آنا پڑا ہے۔

"بھائی تھکے ہوئے آئے تھے۔ دیر تک کام کرتے رہے تھے' اس لیے سو گئے تھے۔ انہوں
کہا ہے کہ آپ لوگ انتظار کریں' وہ آ رہے ہیں اور مجھے کہا ہے کہ آپ کو کمپنی دوں۔" وہ کہتے
صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تم دونوں تو آپس میں پہلے نہیں ملے' اس لیے تم لوگوں کا تعارف کروا دوں۔" ماہ بانو
زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اسے امید نہیں تھی کہ یہاں اس کی ملاقات زینی سے ہو گی۔

"یہ ہے نیہاں' ہماری کالج فیلو اور میری اور عبداللہ کی مشترکہ دوست...... اور نیہاں یہ
ہے عبداللہ کی بہن۔ سب پیار سے اسے زینی کہتے ہیں۔"

نیہاں کو ماہ بانو' زینی سے اپنی ملاقات کا قصہ سنا چکی تھی اور اُما کی طرح اسے بھی زینی کی
بات پر بہت غصہ آیا تھا۔

"اور زینی آج کل تم کیا کر رہی ہو؟" ماہ بانو نے اس سے پوچھا۔

"امریکہ جانے کی تیاری کر رہی ہوں۔" اس نے مختصراً کہا۔

"کب ارادہ ہے جانے کا؟"

"اس منگل کو فلائٹ ہے۔"

"زہرا نہیں آئی تمہارے ساتھ؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہے۔"

زینی کے مختصر سے جوابات اور اس کا شکوے گلے سے بھرپور انداز ماہ بانو کو ٹینشن میں مبتلا
کر رہا تھا۔ پہلے تو اس نے کوشش کی تھی کہ بات سے بات نکال کر اپنے اور زینی کے تعلقات کو
بہتر بنائے' مگر زینی کے انداز نے اسے خاموش کر دیا۔ نیہاں نے زینی پر توجہ دینے کی ضرورت
نہیں سمجھی تھی اور ایک رسالہ اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی تھی۔ ماہ بانو چپ چاپ بیٹھی اپنے
ناخنوں سے نیل پالش کھرچتی رہی۔ اسے زینی کی تیز نگاہوں کا اندازہ اس کی طرف دیکھے بغیر
بھی ہو رہا تھا۔

"ذرا ایک بات تو بتائیں۔" زینی کی آواز نے ماہ بانو کو چونکا دیا۔

"آپ بھائی سے ملنے یہاں بھی آتی ہیں؟" اس نے تیکھے انداز میں کہا۔

زینی نے کہا اور ماہ بانو شرم سے سرخ ہوگئی۔ اسے اس قسم کی بات کی توقع نہیں تھی۔ بات ت[ھی] خیر اپنی جگہ تھی مگر جس لہجے میں زینی نے کہا تھا' وہ بالکل یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کہنا چاہتی ہو کہ یہاں تو بھائی کا پیچھا چھوڑ دو۔ ماہ بانو نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر زینی اس کے بولنے کا انتظار...... کرتی رہی۔ مگر پھر اسے خاموش دیکھ کر بولی۔

"میرا خیال تھا کہ گاؤں میں ملاقات محض اتفاق تھا۔"

انداز میں گلے شکوے تھے تمسخر تھا' حقارت تھی اور نہ جانے کیا کیا۔

نیہاں نے رسالہ واپس میز پر رکھ دیا اور ماہ بانو کی طرف دیکھا' جو ہونٹ کاٹ رہی تھی پھر زینی کی طرف دیکھا جو ماہ بانو کی طرف ہی متوجہ تھی اور شاید اسے کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی۔

"تم سبط سے ملنے کہاں کہاں جاتی ہو؟" نیہاں نے جوابی کارروائی شروع کی۔

"میں نہیں جاتی' سبط آتا تھا۔" وہ بولی۔

"اور وہ تم سے ملنے تمہاری حویلی بھی آیا تھا ناں' یا تم گئی تھیں اس کی حویلی اس سے ملاقات کرنے؟" نیہاں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"میں حویلی میں اس سے ملنے نہیں گئی تھی۔ اپنی ریشماں بھابی سے ملنے گئی تھی۔"

"چھوڑو بھی نیہاں۔" ماہ بانو نے گھبرا کر کہا۔

"ایسے نہیں چھوڑوں گی' جس شخص کو دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا نہ آتا ہو' اس [کے] جذبات کا احترام کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔" نیہاں نے ماہ بانو سے کہا۔

"میں سب کے جذبات کا احترام کرتی ہوں' یہ سبق میرے بجائے اپنی سہیلی کو پڑھائیے یہ آپ کی سہیلی ہے جس نے جس لڑکی سے بہن ہونے کا' دوست ہونے کا دعویٰ کیا' سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ اس سے اس کی محبت چھین رہی ہے۔ ٹھیک ہے ریشماں آپی بے شک میری بھابی نہ بنیں' بے شک یہ ان کی جگہ لے لے' لیکن مجھ سے تو میرے بھائی کا رشتہ ختم نہیں ہو سکتا ناں۔ میں نے بھی تمہاری زندگی اجیرن نہ کردی تو میرا نام بھی زینب علی نہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر پاؤں پٹختی واپس چلی گئی۔

"کس قدر اِل مینرڈ' بدتمیز اور جنگلی لڑکی ہے۔" نیہاں نے کہا۔

"خواہ مخواہ اس سے ٹاکرا لگانے کی کیا ضرورت تھی نیہاں' وہ بہت چھوٹی ہے ابھی۔" بانو کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے' کیا عمر ہوگی اس کی' پندرہ یا سولہ سال' کتنی چھوٹی ہوگی ہم سے چار پانچ سال اور تم سے بھی کہہ رہی ہوں بانو کہ خاموش رہ کر اسے زیادہ سر چڑھانے کی ضرورت

نہیں۔"

"وہ کیا کر سکتی ہے سوائے اس کے کہ کچھ بول کر دل کا غبار نکال لے۔ نکال لینے دو اسے غبار...... سبط کی وجہ سے وہ ریشماں کے قریب آ گئی ہے' اسے دکھ ہو رہا ہے یہ دیکھ کر کہ عبداللہ' ریشماں کے بجائے میری طرف متوجہ ہے' اور میں اسے کیا کہوں' ایک وہی کیا' میرے ارد گرد موجود سب ہی لوگ ایسی باتیں کر رہے ہیں اور اگر منہ سے نہیں کہہ سکتے تو آنکھوں سے کہہ دیتے ہیں۔"

اسی وقت عبداللہ اندر داخل ہوا۔

"آئی ایم سوری' مجھے آنے میں تھوڑی سی دیر ہوگئی اور زینی کہاں ہے۔ میں نے اسے تم لوگوں کے پاس بھیجا تھا۔"

"یہیں بیٹھی ہوئی تھی' ابھی شاید کسی کام سے اُٹھ کر گئی ہے۔" ماہ بانو نے جلدی سے کہا۔

"اتنا کام سر پر آ پڑا ہے کہ کسی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں مل رہی۔ پھر تمہاری طرف فون بھی نہیں ہے۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اور چاہے کسی طرف دیکھو یا نہ دیکھو' لیکن پلیز بانو کی طرف دیکھ لیا کرو۔ حد کرتے ہو تم لڑکے بھی' جب تک لڑکی ملتی نہیں ہے تب تک سو جتن ہوتے ہیں اسے دیکھنے اور اس سے بات کرنے کے لیے اور جب مل جاتی ہے تو اسے ایک کونے میں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔" نیہاں نے کہا۔

ماہ بانو اور عبداللہ ہنس پڑے۔

"یہ تم غلط بات کر رہی ہو نیہاں' عبداللہ تو واقعی بہت مصروف ہے۔"

"مجھے یقین تھا کہ ابھی تم ہی اس کی صفائی پیش کرنے لگو گی۔ حقوقِ نسواں کی گاڑی چلتی نہیں ہے کہ تم جیسی لڑکیاں اسے جھٹکے دے کر روک دیتی ہیں...... سخت افسوس ہے۔" نیہاں نے کہا۔

"اچھا عبداللہ یہ بتاؤ کہ اُما کی کوئی خیر خبر؟ وہ کب آ رہی ہے واپس؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"وہ تو کالج کھلنے کے شاید دو دن بعد آ رہی ہے ہوسٹل میں ابھی اس کا لیٹر آیا تھا ڈیڈی کی طرف' وہ سب کو بہت مس کر رہی ہے اور سب سے ملنے کے لیے سخت بے چین ہے۔" اس نے بتایا۔

"ہم نے تو وہ تصویریں بھی نہیں دیکھیں جو اس نے بھجوائی ہیں۔" نیہاں کو خیال آیا۔

"وہ تو ڈیڈی کے پاس ہیں' چلو ایسا کرتے ہیں کہ اس کی طرف چلتے ہیں' وہ ابھی سویا ہوگا' اسے جھنجھوڑیں۔" عبداللہ نے کہا۔

"مگر میں نے اباجی سے وہاں جانے کی اجازت نہیں لی۔" ماہ بانو نے کہا۔

"چلو تو اسے یہاں بلوا لیتے ہیں۔" عبداللہ نے ٹیلی فون قریب کھسکایا۔

ایڈی کا گھر کینٹ میں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی آ گیا۔ نیہاں اور ماہ بانو تصویریں لے کر بیٹھ گئیں۔ سب تصویریں بہت اچھی تھیں۔ ہر ایک کے پیچھے تفصیل بھی درج تھی۔

"یہ کون ہے جو اُما کے ساتھ ہر تصویر میں موجود ہے؟" نیہاں نے کہا۔

"یہی تو وہ رقیب رُوسیاہ ہے میرا۔ آنند...... پتا نہیں اُما کو کہاں سے یہ ہینڈسم نظر آتا ہے۔ شکل دیکھی ہے اس کی۔" ایڈی بولا۔

نیہاں نے ماہ بانو کو آنکھ ماری' پھر ایڈی سے مخاطب ہوئی۔

"ویسے تم سے تو زیادہ اسمارٹ ہے۔"

"کیا؟" ایڈی چلایا۔

"اگر تمہاری چوائس کی یہی حالت ہے' نیہاں تو مجھے تمہاری دماغی کیفیت پر شک ہونے لگا ہے۔"

"خدا نہ کرے کہ میں اسے چوز کروں۔" نیہاں نے تیزی سے کہا۔

وہ سب ہنس پڑے۔

"اور خط میں تمہیں کیا لکھا ہے اس نے؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"کمال کرتی ہو تم بھی۔ یہ سیکرٹ کیسے آؤٹ کر دوں۔ ویسے ایک خط میرے پاس ہے' اس کی چند ایک سطریں تمہیں سنا سکتا ہوں۔" ایڈی نے کہا اور اپنا والٹ کھول کر اس میں سے چار پانچ تہہ شدہ کاغذ نکال لیے۔

"یہ پورا خط ہے یا اس میں دوسرے کاغذ بھی شامل ہیں؟" نیہاں نے تنقیدی نگاہوں سے خط کی طرف دیکھا۔

"یہ خط ہے بلکہ اس کا ایک مختصر سا حصہ ہے۔" ایڈی نے تہہ شدہ کاغذ کھولے۔

"ایک مرتبہ اُما آئے تو میں اس سے پوچھوں گی' ہمیں اتنے چھوٹے چھوٹے خط لکھتی ہے اور دیکھو بانو اسے کتنا لمبا خط لکھا ہے' ذرا واپس آنے دو اسے۔"

"اچھا بتاؤ ناں ایڈی کہ اس نے کیا لکھا ہے؟" ماہ بانو نے بے چینی سے پوچھا۔

"ٹھہرو دیکھنے دو کہ کہاں سے سناؤں۔" اس نے کاغذوں پر نظر ڈالی پھر بولا۔

"ہاں لکھتی ہے کہ پورے قیام کے دوران مجھے جے پور سب سے زیادہ پسند آیا۔ فلم "لمحے" کی شوٹنگ جس محل میں ہوئی تھی' وہ بھی دیکھا اور وہ جو "ہوا محل" کی ہم نے تصویریں دیکھی تھیں کتاب میں اور ہم سب کو بہت پسند آیا تھا۔ وہ بھی دیکھا۔ کیا بتاؤں کہ اصل میں وہ کتنا خوبصورت ہے۔

جب ہم جے پور پہنچے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ وہاں اتنے خوبصورت مور تھے۔

بہت اچھا لگا۔ آنند نے میری پسندیدگی دیکھی تو کہنے لگا کہ بتاؤ پاکستان میں ایک بھی اتنی خوبصورت جگہ ہے' مجھے اس پر غصہ آیا پھر اپنے آپ پر غصہ آیا کہ بیس برس پاکستان میں گزارنے کے بعد بھی میں کبھی کلر کہار نہیں گئی۔ خیر اس لڑائی میں یہ بات ثانوی حیثیت رکھتی تھی کہ میں نے کلر کہار نہیں دیکھا۔ آنند سے میں اس قدر لڑی کہ وہ گھبرا ہی گیا۔ وہاں کے اُن دیکھے موروں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے اور یہ بھی بتایا کہ کلر کہار کے قریب ہی کھیوڑہ میں نمک کی کانیں ہیں جہاں سے نہ صرف پاکستان کی مارکیٹ میں نمک پہنچتا ہے بلکہ انڈیا بھی ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ پھر میں نے اس نمک کے طعنے دیے سب کو۔

ویسے آپس کی بات ہے ایڈی' یہ سب باتیں میری سنی سنائی تھیں۔ کتنی بری بات ہے کہ ہم دوسرے ملکوں کی سیاحت کرنے چلے جاتے ہیں' مگر اپنے ملک کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

جے پور حقیقتاً بہت خوبصورت جگہ ہے اور وہاں کے کپڑے اور جیولری بھی بہت خوبصورت ہے۔ میں نے ماہ بانو اور نیہاں کے لیے بھی سوٹ خریدے ہیں۔"

ایڈی خاموش ہو گیا۔

"اور...... اور کیا لکھا ہے؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"اور باقی سب میرے لیے ہے۔ تم لوگوں کا اتنا ہی ذکر ہے۔" وہ بولا۔

ماہ بانو نے ذرا سا آگے ہو کر خط اس کے ہاتھ سے اُچکنے کی کوشش کی لیکن اس نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا۔ ابھی اس نے خط بہ مشکل ماہ بانو کے ہاتھ سے بچایا تھا کہ دوسری طرف سے عبداللہ نے کھینچ لیا۔

"تمہیں یہی چاہیے تھا ناں' یہ لو۔" عبداللہ نے خط ماہ بانو کی طرف بڑھا دیا۔

ایڈی نے کشن عبداللہ کو کھینچ مارا۔

"تم کہیں نہ کہیں روایتی وڈیرا پن ضرور دکھا دیتے ہو۔" وہ سب ہنس پڑے۔

ماہ بانو نے خط کھول لیا۔ ایڈی نے خط اس سے چھیننے کی کوشش کی' لیکن عبداللہ نے اسے پکڑ لیا۔

"تم اطمینان سے خط پڑھو۔" وہ بولا۔

ماہ بانو اور نیہاں ہنستے ہوئے خط پر جھک گئیں۔

"بانو تم صریحاً بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کر رہی ہو' یہ سراسر غلط ہے۔" ایڈی ہڑبڑاتے ہوئے چلایا۔

ابھی یہ ہلا گلا جاری تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ عبداللہ' ایڈی کو چھوڑ کر فون کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے ایڈی نے ماہ بانو کے ہاتھ سے خط چھین لیا۔

"اُما تم کب آئیں؟"

عبداللہ نے کہا تو وہ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ہاں' ایڈی یہیں ہے۔ اس کے علاوہ ماہ بانو اور نیہاں بھی ادھر ہی ہیں۔'' عبداللہ نے پھر ایڈی کی طرف بڑھا۔

''اُما کا فون ہے' تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔''

''واہ دعائیں اتنی بروقت بھی قبول ہوتی ہیں۔'' ایڈی نے کہا اور فون اُٹھا کر دوسرے کونے میں لے گیا۔

''کب آئی اُما واپس؟'' ماہ بانو نے عبداللہ سے دریافت کیا۔

''آج صبح آئی ہے' پہلے اس نے ایڈی کی طرف رِنگ کیا تھا لیکن وہاں سے جب پتا چلا کہ وہ یہاں آیا ہوا ہے تو ادھر رِنگ کر لیا۔''

''کچھ جلدی آ گئی ہے' ہیں ناں؟'' نیہاں نے کہا۔

''ہاں جلدی آ گئی ہے اور اس نے کہا تو نہیں لیکن مجھے پریشان لگ رہی تھی۔'' عبداللہ نے کہا۔

''کیوں؟ تم نے پوچھا نہیں؟'' ماہ بانو بے چین ہو گئی۔

''نہیں' مناسب سمجھے گی تو خود بتا دے گی' تم بھی اس سے کریدنا مت۔''

کافی دیر اس سے باتیں کرتے رہنے کے بعد ایڈی ان کی طرف مڑا۔

''بانو' اُما تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔''

ماہ بانو نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ ایک دوسرے سے احوال دریافت کرتی رہیں' پھر اُما نے اس سے نمائش کے بارے میں پوچھا۔ ماہ بانو کو احساس ہو رہا تھا کہ عبداللہ کا اندازہ ٹھیک تھا' وہ واقعی کسی بات پر پریشان تھی۔

''خیریت تو ہے اُما؟ تم مجھے پریشان لگ رہی ہو؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے' تب ہی تو انڈیا سے جلدی بھاگ آئی ہوں۔ اس وقت تو دل چاہ رہا ہے کہ سکھر سے بھی بھاگ کر سیدھی لاہور پہنچ جاؤں۔'' وہ بولی۔

''ہوا کیا؟''

''ہونا کیا تھا یار' وہی جس کا خدشہ تھا' بس یہ ہے کہ سمندر کے کنارے بیٹھ کر کوئی لہروں کی تباہی کے بارے میں کوئی نہیں جان سکتا' اس کے لیے سمندر میں اترنا ضروری ہے۔ اب جب میں سمندر میں اتر گئی ہوں تو یہ سب تو برداشت کرنا پڑے گا ناں۔''

''او گاڈ! مجھے تفصیل سے کچھ بتاؤ۔ تم نے ایڈی سے بھی اس سلسلے میں ذکر کیا؟''

''نہیں' جان بُوجھ کر نہیں کیا۔ وہ تھیسس دے رہا ہے' پریشان ہو گیا تو کچھ نہیں کر سکے گا۔ تم بھی اس سے کچھ مت کہنا۔ میری کوشش ہے کہ یہ بلا ایڈی کے تھیسس ڈسپلے تک کسی صورت

جائے۔ میں بہت سخت پریشان ہوں بانو۔'' اُما نے کہا۔

''میں اندازہ لگا سکتی ہوں' مگر کیا آنٹی' انکل نے تم سے کچھ کہا ہے یا تم نے خود کوئی اندازہ لگایا ہے؟''

''گھر میں یہ ذکر صبح شام ہو رہا ہے' مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا' لیکن شاید ممی اور ڈیڈی نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ ان کے خیال میں جہاں وہ چاہیں گے' وہیں کے لیے میں ایک پل میں راضی ہو جاؤں گی اور وہ سب سیریس ہیں آنند کے لیے...... مجھے کیا پتا تھا کہ ایسا ہوگا' میں کبھی انڈیا جاتی ہی نہ۔ تم میری ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتیں بانو۔ یہاں کوئی بھی نہیں ہے' جس سے میں اپنے دل کی بات کر سکوں' اگر میں نے گھر میں ایڈی کے متعلق ذرا سا اشارہ بھی دے دیا تو سمجھو قیامت آ جائے گی۔''

''تم فوراً لاہور آ جاؤ اُما' ہم مل کر بیٹھیں گے تو کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔'' ماہ بانو نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔

''یہاں آ کر بھی کیا ہوگا' بنیادی مسئلہ تو وہیں کا وہیں ہے ناں اور یہ مسئلہ ایسا ہے جو کبھی حل نہیں ہوگا۔'' وہ آزردگی سے بولی۔

''پھر بھی' بس تم آ جاؤ' یہاں کسی سے بات تو کر سکتی ہو' وہاں رہ کر ڈسٹرب ہو گی۔''

''ممی نہیں چاہتیں' وہ کہہ رہی ہیں کہ چند چھٹیاں تو رہ گئی ہیں' آرام سے سکھر میں گزارو۔''

''تمہاری بہن بھی تو ہے ہیما' تم اسے راز دار نہیں بنا سکتیں کیا؟'' ماہ بانو نے سوچتے ہوئے کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔ اس نے میری ہمدردی میں الٹا زیادہ نقصان پہنچا دینا ہے۔ پہلے تو وہ ہفتہ بھر روتی رہے گی۔ میری متوقع ٹریجڈی کے متعلق سوچ کر' پھر چاہے گی کہ کسی ترکیب سے ایڈی مذہب تبدیل کر لے' وہ چاہے گی کہ اس سے ملے اور اسے کنوینس کر لے' پھر ممی اور ڈیڈی کو کنوینس کرنے کی کوشش کرے گی اور مجھے مصیبت میں مبتلا کر دے گی۔''

''پھر بھی کچھ تو کرنا ہوگا اُما' اس معاملے کو یوں تو نہیں چھوڑا جا سکتا ناں۔''

''کیا کیا جا سکتا ہے' کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بات میں بھی جانتی ہوں' غلطی میری ہی تھی۔ ایڈی سے محبت تھی تو اپنے دل میں رکھ لی ہوتی' ضروری تھا کہ اسے بھی بتا دیتی۔''

''نہ بھی بتاتیں تب بھی یہ حقیقت تو تبدیل نہیں ہو سکتی تھی کہ تمہیں اس سے محبت تھی اور ہے......'' بانو نے کہا۔

''اس سے حقیقت تو یقیناً تبدیل نہ ہوتی' لیکن نہ کہنے سے صبر آ جاتا ہے۔ سب یہی سمجھتے کہ میں اس کے بارے میں نہیں سوچتی اور رفتہ رفتہ میں خود کو بھی اسی طرح نارمل کر لیتی۔

اس سے کہہ دیا' اس نے مجھ سے کہہ دیا' اور ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوا کہ اتنے مختصر سے عرصے میں ہم دونوں کتنا آگے بڑھ گئے ہیں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی' بانو اسے چھوڑ دینا میرے لیے موت سے زیادہ بدتر ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں گی' میں بہت اپ سیٹ ہوں' بہت ڈپریس ہوں۔'' پھر قدرے توقف سے بولی۔

''جانے دو اسے' یہ بتاؤ کہ عبداللہ کیسا ہے؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

''اس نے اپنے گھر والوں سے کوئی بات کی؟'' اُما نے پوچھا۔

''بس' وہی جو اس کی بہنوں کو پتا ہے۔ یہاں بھی مسئلے کم نہیں ہیں' مگر تم آؤ گی تو بتاؤں گی۔''

وہ دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں' پھر ماہ بانو نے اسے گڈ بائی کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

''یہ کونے میں گھس کر کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی؟'' ایڈی نے کہا۔

''میں کونے میں لے کر گئی تھی فون؟ تم خود تو لے کر گئے تھے۔'' وہ واپس آ گئی۔

''میری تو جینوئن پرابلم ہے ناں' تمہارے ساتھ کیا تھا؟''

''میں فون کی تاریں اُلجھ کر گرنا نہیں چاہتی تھی۔'' وہ بولی۔

''مجھ سے تو ٹھیک سے بات بھی نہیں کر رہی تھی اُما بار بار اسے تمہاری یاد آ رہی تھی کہ بانو کو بلاؤ' اس سے بات کرنی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اسے تم سے کون سا سیکرٹ شیئر کرنا تھا' جو وہ مجھ سے نہیں کر سکتی تھی۔''

''وہ آئے تو اس سے خود ہی پوچھ لینا۔''

''یار مجھے اُما نے پریشان کر دیا ہے۔ وہ خوش نہیں لگ رہی تھی مجھے اور کچھ بتا بھی نہیں رہی تھی۔ تم سے کچھ نہیں کہا اس نے؟''

''نہیں' مجھے تو محسوس نہیں ہوا۔'' ماہ بانو نے حیرت کا اظہار کیا۔ پھر بولی۔ ''اچھا چھوڑو اس بات کو' مجھے یہ کہنا تھا کہ ابا جی کو کسی ترکیب سے قائل کرو۔''

''کس بات کے لیے؟ عبداللہ کے سلسلے میں......؟'' ایڈی نے شرارت سے کہا۔

''تم پٹو گے میرے ہاتھوں۔'' ماہ بانو ہنس پڑی۔

''تم پٹنے کی بات کرتی ہو' ہم مرنے پر تیار ہیں کہ بقول شاعر:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

''لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔'' ایڈی نے کہا۔

''یہ اُما پر مرتے مرتے تم نے اچانک ڈائریکشن کیوں تبدیل کر لی؟'' نیہاں نے کہا۔

''ذرا تبدیلی ہوتے رہنا چاہیے' اُما آئے گی تو اس پر بھی مر جائیں گے۔ ہم کون سا

سچ......وفات پا رہے ہیں۔ وہ کیا کہا ہے داغ نے کہ......

اے داغ نہ دے جان محبت میں کہ ناداں
پھر زندہ جہاں میں کوئی مر کر نہیں ہوتا

تو سچ مچ کون مرتا ہے کسی کے لیے' لیکن لفظوں لفظوں میں مر جانے سے ذرا سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''تم بکواس بند نہیں کرو گے تو میں عبداللہ سے کہوں گی' وہ تمہارے منہ پر ہاتھ رکھ دے گا۔'' ماہ بانو نے دھمکی دی۔

''کب تک بند رکھے گا عبداللہ میرا منہ جونہی ہاتھ ہٹائے گا میں پہلا نعرہ یہی لگاؤں گا کہ اس ملک کو وڈیروں اور جاگیرداروں سے نجات ملنی چاہیے۔''

''یہ تو کچھ نہ کچھ کہتا رہے گا' تم بتاؤ بانو کہ کس مسئلے پر ابا جی کو قائل کرنا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ ابا جی امریکہ جائیں' اتنی اچھی آفر ہے' انہیں یہ ضرور قبول کرنی چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر ابا جی پوری دنیا کو یہ بتائیں کہ ان کے پاس کتنا خوبصورت ہنر ہے۔''

''تو انکل جانا کیوں نہیں چاہتے؟'' نیہاں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ مجھے اور اماں جی کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے۔ بس میری سمجھ میں تو یہ ایک وجہ ہی آتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی وجہ ہے تو وہ انہوں نے مجھے نہیں بتائی۔''

''تم بے فکر ہو جاؤ بانو' میں انکل کو قائل کروں گا۔'' ایڈی نے کہا۔

''کیسے؟''

''اگر میں اُما کو قائل کر سکتا ہوں تو کسی کو بھی کر سکتا ہوں۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''اسے تم نے نہیں تمہارے گٹار نے قائل کیا تھا مگر انکل کو قائل کرنے کے لیے گٹار سے کام نہیں چلے گا۔ انکل کو یہ والی موسیقی پسند نہیں ہے۔'' نیہاں ہنس پڑی۔

''انہیں قائل کرنے کے لیے ستار اُٹھا لیں گے' بس یا کچھ اور؟'' ایڈی نے کہا۔

☆=====☆=====☆

سبط نیویارک کی فلائیٹ لینے کے لیے لاہور پہنچ چکا تھا۔ خادم حسین اور مکرم بھی وہیں تھے۔ مکرم کو پیر صاحب نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ وہ سبط کے کسی معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے فون پر زینی سے بات کرتے دیکھنے کے باوجود بھی وہ خاموش رہا تھا۔

اس روز جانے سے پہلے زینی نے سبط سے فرمائش کی تھی۔

''میرا بہت موڈ ہو رہا ہے آئس کریم کھانے کا لیکن تمہارے ساتھ۔''
''تو چلو چلتے ہیں۔'' اس نے فوراً ہامی بھر لی۔
''سچ مچ؟''
''تو اور کیا؟'' وہ بولا۔
''ہائے قسم سے سبط تم کتنے اچھے ہو' بس تم فوراً آ جاؤ مجھے لینے کے لیے۔''
پھر اسے اچانک خیال آیا۔
''مگر نہیں' تم نہ آؤ۔ تم یوں کرو کہ یمی 36 آ جاؤ۔ میں اور گڑیا بھی آ جائیں گے۔''
''نہیں' تم ایسے نہیں نکلو گی' میں تمہیں لینے آتا ہوں۔'' سبط نے کہا۔
''نہیں ناں سبط' کوئی گڑبڑ ہو گئی تو؟''
''کیا گڑبڑ ہو گی' کچھ نہیں ہو گا' یہ بتاؤ عبداللہ بھائی ہیں وہاں؟''
''ہاں بھائی گھر پر ہیں' لیکن ان کے فرینڈز آئے ہوئے ہیں۔''
''بس ٹھیک ہے میں تمہیں لینے آ رہا ہوں......'' سبط نے کہا۔
''سنو تو۔''
''کیا ہوا؟''
''میں نے سنا ہے کہ تمہارے بھائی بھی لاہور میں ہی ہیں۔ وہ ہینڈسم سے جو ہیں اور وہ بھی جو سب سے بڑے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ جو ہینڈسم والے ہیں ناں' وہ بہت خونخوار ہیں۔ انہیں پتا چلا کہ تم ہمیں لینے آ رہے ہو تو وہ تمہیں کچھ کہیں گے تو نہیں؟''
''اول تو وہ گھر پر نہیں ہیں اور اگر ہوتے...... اور انہیں پتا چل جاتا' تب بھی اس سے کیا فرق پڑتا۔ میں ڈر ڈر کر زندگی گزارنے کا قائل نہیں ہوں۔'' سبط نے کہا۔
''تم فوراً تیار ہو جاؤ اور گڑیا سے بھی کہو۔''
''آل رائٹ' بائے۔'' اس نے ریسیور رکھ دیا۔ سبط ان کی طرف پہنچا تو وہ دونوں تیار تھیں۔
''عبداللہ بھائی کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''وہ فرینڈز کے ساتھ ہیں۔ میں نے ان سے پوچھ لیا ہے' واپسی پر ان سے مل لینا۔'' زینی نے کہا۔
وہ تینوں باہر نکل آئے۔ زینی' سبط کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور زہرا پچھلی نشست پر۔ سبط کار اسٹارٹ کر کے مین بلیوارڈ پر لے آیا۔
''قسم سے سبط لگتا ہے صدیوں بعد انسانی تہذیب و تمدن کی دنیا میں واپس آئی ہوں' میں تو تنگ آ گئی تھی اس جگہ سے۔''

''خیر' اب اتنا برا بھی نہیں ہے گاؤں اور تم ہی دعائیں مانگا کرتی تھیں' وہاں واپس جانے کی۔'' زہرا نے کہا۔
''میں احمق تھی اور پاگل بھی' لیکن یہ سب ماضی کے فیصلے ہیں۔ اب میں اتنی عقلمند ہو گئی ہوں کہ ایسی کوئی دعا نہیں مانگا کروں گی' اچھی دعائیں قبول نہیں ہوتیں اور گاؤں جانے والی دعائیں سب قبول ہو جاتی ہیں۔''
''تم اپنے لیے وہاں بھی کوئی دلچسپی ڈھونڈ سکتی تھیں۔ یہ تو تم پر منحصر تھا۔'' سبط نے کہا۔
''وہاں دلچسپی؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں تو یہی ہو سکتا تھا کہ میں گاؤں بھر کے بچے اکٹھے کر کے ان کے ساتھ کھیلوں یا پھر پیانو بجاؤں' لیکن پتا ہے کیا سبط' وہاں پیانو بھی عجیب مری مری سی آواز نکالتا تھا۔''
سبط حسن اور زہرا اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔
اسی وقت خادم حسین' اور مکرم' نوری کو فیصل ٹاؤن چھوڑ کر واپسی پر وہاں سے گزر رہے تھے۔ خادم حسین کی نگاہ سبط کی کار پر پڑی۔
''یار مکرم یہ سبط بہت تیز نہیں ہو گیا۔ دیکھو ایک نہیں دو لڑکیاں بٹھائی ہوئی ہیں اس نے۔''
مکرم نے بھی اسی سمت دیکھا۔
''سبط ایسا کرتا تو نہیں ہے۔'' اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔
خادم حسین اپنی کار آگے لے گیا۔ سبط کی کار لبرٹی کی طرف مڑ گئی۔
''کون ہو سکتی ہیں یہ لڑکیاں۔'' مکرم نے خود سے کہا۔
''سبط اس ٹائپ کا تو نہیں ہے۔''
''ٹائپ وائپ خود ہی بنتی جاتی ہے۔'' خادم حسین ہنس پڑا۔
''اچھا ہے اس کی عمر ہے' عیش کرے۔''
وہ گھر کے گیٹ کے پاس پہنچ چکے تھے جب مکرم بولا۔
''خادم بھائی' واپس چلیں۔''
''کیوں؟ خیریت؟''
''ہاں بالکل خیریت ہے۔ ایک خیال آیا ہے لبرٹی چلیں۔''
خادم حسین کار موڑ کر دوبارہ سڑک پر لے آیا۔
''سبط کہاں جا سکتا ہے؟'' مکرم نے سوچتے ہوئے کہا۔
''ایک سو ایک جگہیں ہیں جانے کے لیے۔ ہو سکتا ہے شاپنگ کے لیے نکل گیا ہو' ہو سکتا ہے ہوٹل میں چلا گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دوست کے گھر گیا ہو۔''
''ہوں۔'' مکرم سوچ رہا تھا۔

"تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟" خادم حسین نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ زہرا اور زینب ہیں' میں چیک کرنا چاہتا ہوں' ان کی صورتیں ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں۔"

"زینب کی تصویر تو غالباً بابا جان کے پاس ہے۔" خادم حسین نے کہا۔

"ہاں' اور میں نے دیکھی ہوئی ہے' یہی میں چیک کرنا چاہتا ہوں اور زہرا کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

خادم حسین نے کار لبرٹی کی سڑک کی طرف موڑ لی۔

"تم دائیں بائیں نگاہ رکھو' اپنی کار ہے' جہاں ہوگی' دور سے پہچانی جائے گی۔" خادم حسین نے کہا۔

"پہلے ایچ کریم بخش والی سائیڈ پر چلیں۔ وہاں نہ ہوئے تو دوسری طرف چلیں گے اور وہاں بھی نہ ہوئے تو پھر آگے کے ریسٹورنٹ میں دیکھیں گے۔" مکرم نے کہا۔

خادم حسین پٹرول پمپ کے ساتھ سے ہوتا ہوا کار ایچ کریم بخش کی طرف لے آیا۔

"یہ کسی ریسٹورنٹ میں جانے کا وقت نہیں ہے' اگر وہ یہاں نہیں آئے تو کسی دوست کی طرف نہ چلے گئے ہوں۔ ایسا ہوا تو انہیں تلاش کرنا مشکل ہوگا۔"

اسی وقت مکرم اور خادم حسین کی نگاہ بیک وقت سبط کی کار پر پڑی۔

☆=====☆=====☆

سبط نے کار یمی 36 کے سامنے روک دی تھی۔

"اندر چلیں یا کار میں ہی آئس کریم منگوا لیں؟" سبط نے پوچھا۔

"یہیں ٹھیک ہے' میں تو اس بے ہودہ گاؤں جانے کے بعد یہ رنگین قسم کی رونق دیکھنے کو ترس ہی گئی تھی۔"

"کیوں گڑیا پھر یہیں منگوا لیں؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔

سبط کے آرڈر دینے کے تھوڑی ہی دیر بعد آئس کریم ان کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ باتیں کرتے رہے ساتھ ساتھ آئس کریم سے بھی انصاف کرتے رہے۔

اچانک نئے ماڈل کی سیاہ شیشوں والی سفید مرسڈیز بینز زینی کی نشست کی سمت' ان کی کار کے بالکل قریب آ کر رک گئی۔

"سبط تم کیوں نہیں ایسی کار لے لیتے۔ بھائی کے پاس بھی بالکل ایسی ہی کار ہے۔ مجھے اتنی پسند ہے کہ کیا بتاؤں۔" زینی نے کہا۔

"مجھے چاہیے تھا کہ تمہیں اندر لے جاتا۔ یہاں باہر بیٹھ کر تمہاری توجہ سوائے میرے اور

...رہی ہے۔" سبط نے اسے گھورا۔

"ہائے سبط۔" اچانک زینی تقریباً چلا اٹھی۔

"یہ تمہارے بھائی کی کار ہے' وہی ہیں ناں یہ؟ دیکھو تو کہاں دیکھ رہے ہو تم' یہ تمہارے ...نی پنڈ تم سے بھائی ہیں ناں؟"

سبط نے اس سمت میں دیکھا۔ مکرم کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ جبکہ خادم حسین ...ہر نکل رہا تھا۔

"سبط تم ان سے کہہ کر یہ کار انہیں دے دو اور ان کی والی مرسڈیز بینز لے لو' بعد میں واپس ...ر دینا' ٹھیک ہے۔" زینی حالات سے بے خبر کہہ رہی تھی۔

"تم تھوڑی دیر خاموش نہیں رہ سکتیں زینی۔" زہرا جسے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہو ...تھا۔ چلا اٹھی۔

زینی نے پہلے سبط اور پھر زہرا کی طرف دیکھا۔ زہرا پریشان تھی اور سبط کار سے باہر نکل ...تھا۔ پھر اس نے مکرم اور خادم حسین کی طرف دیکھا۔ خادم حسین کار کا دروازہ کھول کر کھڑا تھا ...مکرم خونخوار سی نگاہوں سے انہیں گھورتا ہوا انہی کی کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"زینی اور گڑیا' میری بات دھیان سے سنو۔ زینی میرے اترتے ہی تم ڈرائیونگ سیٹ پر ...ؤ۔ دروازے لاک کر لو اور کسی بھی صورت میں لاک مت کھولنا اور باہر مت نکلنا۔ یاد رکھنا کسی صورت میں نہیں' اگر میرے اور بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو کار نکال کر سیدھے ...گھر لے جاؤ۔ میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ مکرم اور خادم بھائی کے لیے تم نے کسی بھی صورت ...نہیں کھولنا۔ یہاں تک کہ میں زخمی ہو جاؤں یا مر جاؤں تب بھی نہیں۔" سبط نے تحمل کے ...ا ایک ایک بات واضح انداز میں کہی تھی۔

زینی کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے سبط کا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں سبط' اللہ کے واسطے تم باہر مت نکلو' پلیز سبط!" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

اسی وقت مکرم نے زینی کی سمت کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی' لیکن دروازہ لاک تھا سبط بازو چھڑا کر باہر نکلا۔

"زینی دروازہ لاک کر لو اور جیسے میں نے کہا ہے ویسے کرو۔ کار نکال کر لے جاؤ۔" سبط ...ہر نکلتے ہوئے کہا۔

زینی اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔ سبط قدم آگے بڑھا رہا تھا۔

"میرے اللہ میاں جی' میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتی سوائے سبط کی زندگی کے۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ بھی دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

☆=====☆=====☆

خادم حسین کونظر انداز کر کے سبط' مکرم کی طرف بڑھا۔

''کیابات ہے؟'' اس نے مکرم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کرکہا۔

''میں دیکھ رہا تھا ان دو ہیروں کو' سوچا بھائی ہیں شیئر کر لیتے ہیں۔'' مکرم نے اطمینان سے کہا۔

سبط کا دل چاہا کہ اس کے پاس ریوالور ہو جس کی تمام گولیاں وہ سامنے کھڑے مکرم کے سینے میں پیوست کر دے' لیکن وہ جانتا تھا کہ مکرم کا مقصد ہی اسے مشتعل کرنا تھا۔ اگر زینی کار نکال کر لے گئی ہوتی تو شاید وہ مکرم پر ہاتھ اُٹھانے سے دریغ نہ کرتا مگر اس وقت اسے زہرا اور زینی کی بھی فکر تھی۔

''جوش میں ہوش مت کھونا سبط تمہیں کچھ ہو گیا تو زینی اور گڑیا بھی نہیں بچیں گی۔'' اس نے دل ہی دل میں خود کو وارننگ دی۔

دوسری طرف اسے زینی پر بھی غصہ آ رہا تھا جو اب تک کار لے کر وہاں سے نکلی نہیں تھی۔ وہ مکرم اور خادم حسین کو مصروف رکھ کر اسے نکلنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس کا ذہن پوری طرح چوکس تھا اور وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

''مکرم! مجھے مجبور مت کرو کہ میں بھول جاؤں کہ تم میرے بھائی ہو۔'' سبط نے اس سے کہا۔

''میں نے کیا غلط بات کہی ہے۔ وہ نوری ہے فلم ایکٹریس' اسے میں اور خادم بھائی......!''

''بس مکرم!'' سبط نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''شاید تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے میرے ساتھ کوئی غلط قسم کی لڑکیاں نہیں ہیں۔ میری فرینڈز ہیں۔ تم نے خواہ مخواہ انہیں پریشان کر دیا ہے۔''

مکرم اس کے صبر وتحمل پر حیران ہو رہا تھا لیکن یہ بات اس نے ظاہر نہیں ہونے دی۔

''فرینڈز ہیں یا کچھ اور بھی ہیں؟'' اس نے زہرا اور زینب کی طرف دیکھا۔

''یہ میں گھر چل کر بتاؤں گا۔ اس وقت میں یہاں کوئی سین کریئیٹ نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ واپس مڑنے لگا۔

''رکو سبط!'' مکرم نے سختی سے اس کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا اور اس کا رُخ اپنی سمت موڑا۔

''میں تمہیں نہیں روکوں گا' لیکن تم زہرا کو ہمارے حوالے کر دو۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے۔ زینب سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے' اسے تم لے جا سکتے ہو۔''

''تم جانتے ہو مکرم کہ میں ایسی گری ہوئی اور گھٹیا باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں

بڑے صبر وتحمل کا ناجائز فائدہ مت اُٹھاؤ۔''

''یہ اس طرح نہیں جا سکتی۔ ہمارا بھائی اس لڑکی کی وجہ سے ہم سے جدا ہوا ہے' تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بہتر ہے کہ زہرا کو ہمارے حوالے کر دو اور زینب کو لے جاؤ۔ یہ سودا پسند نہیں ہے تو زینب کو ہمیں دے دو اور زہرا کو لے جاؤ اور اگر یہ بھی پسند نہیں تو پھر ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔''

مکرم نے شولڈر ہولسٹر سے اعشاریہ اڑتیس بور کا ریوالور نکال لیا۔

زہرا جو کار کے اندر ساکت بیٹھی باہر کا منظر دیکھ رہی تھی' چیخ اُٹھی۔ شیشے چڑھے ہونے کی وجہ سے وہ آواز نہیں سن سکی تھی' مگر جو کچھ دکھائی دے رہا تھا اس کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔ زہرا کی چیخ سے زینی نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ باہر کا منظر اسے دہلانے کے لیے کافی تھا۔ اس لمحے وہ سبط کی دی ہوئی تمام ہدایات بھول گئی اور کار کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آئی۔

''پلیز آپ سبط کو مت ماریں پلیز۔'' وہ سبط کے سامنے آ گئی۔

مکرم اور خادم حسین نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔ سبط نے اسے بازو سے پکڑ کر کار کے اندر دھکیلنا چاہا' لیکن وہ بمشکل خود کو چھڑا کر پھر اس کے سامنے آ گئی۔

''پلیز' میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتی ہوں' آپ مجھے مار دیں' لیکن سبط کو کچھ نہ کہیں۔''

مکرم نے کلائی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک جھٹکے سے سبط سے دور کر لیا۔

زینی بھی سب کچھ بھول کر کار سے تر آئی۔

سبط وہیں ٹھٹک کر رُک گیا۔ ریوالور کا رُخ زینی کی طرف تھا اور مکرم کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

''سبط کی جگہ مرنا چاہتی ہو؟'' مکرم نے کہا۔

زینی نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

''بہت محبت ہے اس سے؟''

''ہاں۔'' اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''اس کی زندگی اسی صورت میں بچ سکتی ہے اگر تم ہمارے ساتھ چلو۔'' مکرم نے کہا۔

''پلیز بھائی' آپ اسے کچھ مت کہیں' میں آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ مجھے کوئی ڈر نہیں لگتا آپ سے' جیسے اپنے بھائی سے نہیں لگتا اور آپ لے جائیں گے بھی کہاں؟ حویلی میں ناں' وہاں بڑی اماں' بڑے بابا جان اور ریشماں آپی ہوں گی۔ پھر مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

مکرم نے اس کی طرف بغور دیکھا۔ وہ بمشکل پندرہ سولہ سال کی معصوم سی لڑکی تھی

جسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ جانے کا کیا مطلب تھا۔ اس نے جس لہجے
''پلیز بھائی'' کہا تھا اس سے اس کے ذہن میں ریشماں کی شبیہہ اتر آئی تھی اور وہ کہتے کہ
یقین سے کہہ رہی تھی کہ جس جگہ بڑی اماں بڑے بابا جان اور ریشماں آپی ہوں
ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔

مکرم نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔

''جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گیا۔

خادم حسین اور مکرم دونوں کار میں بیٹھ گئے اور کار تیزی سے بیک ہو کر سڑک پر رواں دوسری ٹریفک میں شامل ہو گئی۔

''چلو، کار میں بیٹھو۔'' سبط نے ان سے کہا۔

وہ دونوں خاموشی سے کار میں بیٹھ گئیں۔ زہرا نے اندر بیٹھتے ہی رونا شروع کر دیا۔ زینی نے آنسو پونچھ کر سبط کی طرف دیکھا۔ وہ شدید ٹینشن کا شکار تھا اور خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے تکتی رہی اور سوچتی رہی۔

''اگر آج سبط کو کچھ ہو جاتا تو میں اسی لمحے اسی جگہ اپنی زندگی ختم کر دیتی۔ اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور ہی کتنا بے معنی ہے۔''

گھر کے ڈرائیو وے میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ عبداللہ اور اس کے دوستوں پر پڑی۔ وہ شاید واپس جانے کے لیے باہر نکلے تھے۔

کار کے رکتے ہی زینی دروازہ کھول کر باہر نکلی اور بھاگ کر عبداللہ سے لپٹ گئی۔

''آ گئے تم لوگ۔'' عبداللہ نے زہرا اور سبط کو اترتے دیکھ کر کہا۔

''پھر اسے احساس ہوا کہ زہرا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، سبط بھی پریشان تھا اور زینی اس سے لپٹی رو رہی تھی۔

''کیا ہوا زینی؟'' اس نے پریشان ہو کر کہا، پھر سبط سے مخاطب ہوا۔

''کیا ہوا ہے؟''

سبط نے اس کے دوستوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب بھی رک گئے تھے۔

''میں چلتا ہوں عبداللہ۔'' ایڈی موقع کی نزاکت دیکھ کر بولا۔

''او کے یار۔'' عبداللہ نے کہا۔

''ہم بھی چلتے ہیں عبداللہ۔'' ماہ بانو نے کہا۔

حالانکہ اسے اور نیہاں کو خود عبداللہ نے چھوڑ کر آنا تھا۔

''نہیں تم دونوں ایسے نہیں جاؤ گی، میں چھوڑ کر آؤں گا۔'' وہ بولا۔ پھر سبط سے مخاطب ہوا۔

''اندر آ جاؤ، اندر چل کر ہی بات کرتے ہیں۔''

پھر وہ زینی سے مخاطب ہوا۔

''چلو تم بھی، ہر وقت روتی کیوں رہتی ہو، آنسو پونچھو فوراً۔''

''آپ کو کیا پتا بھائی یہ رونے والی ہی بات ہے۔'' وہ بولی۔

''اچھا! اس کا فیصلہ تو بات سننے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، تب تک آنسو پونچھ لو۔''

ڈرائینگ روم میں وہ عبداللہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

''میں آپ کو بتاتی ہوں بھائی۔ ہم آئس کریم کھانے گئے تھے ناں، تو ابھی کھا ہی رہے تھے کہ سبط کے بڑے بھائی آ گئے۔''

عبداللہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''دو بھائی۔ ایک سب سے بڑے والے اور ایک وہ جو بہت ہینڈسم ہیں مکرم بھائی۔ پتا نہیں کیا ہوا، لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ انہوں نے ویسا ریوالور نکال لیا جیسا آپ کے کار میں ہوتا ہے ناں۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ سبط نے مجھے کہا تھا کہ کار کے لاک کھولنا، لیکن میں کیا کرتی، یہ دیکھ کر اندر تو بیٹھی نہیں رہ سکتی تھی ناں، اس لیے باہر نکل

وہ جو مکرم بھائی ہیں ناں، انہوں نے کہا کہ سبط کو ہم اس وقت چھوڑیں گے جب تم ہمارے ساتھ چلو گی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، میں چلی جاتی ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ مجھے بڑی حویلی ہی لے کر جائیں گے ناں تو میں چلی جاتی ہوں، مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہاں بڑے بابا جان، بڑی اماں اور ریشماں آپی ہیں، ظاہر ہے، وہاں تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پھر انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ کہنے لگے تم لوگ جاؤ اور خود بھی وہاں سے چلے گئے۔ وہ جو بڑے بھائی ہیں ناں، خادم بھائی، وہ خاموش کھڑے رہے تھے۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ یہ باتیں مکرم بھائی کے ساتھ ہوئی تھیں۔

''بھائی! مجھے یہ سوچ کر رونا آ رہا ہے کہ اگر خدانخواستہ سبط کو کچھ ہو جاتا تو پھر کیا
وہ پھر رونے لگی۔

عبداللہ نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور خاموش کروانے لگا۔ پھر سبط سے مخاطب ہوا۔

''میرے ساتھ آنا۔''

وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔

زہرا نے خود پر قابو پا لیا تھا، لیکن زینی اب بھی رو رہی تھی۔

ماہ بانو اور نیہاں خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر تو ماہ بانو وہیں بیٹھی رہی پھر اُٹھ کر زینی کے پاس آ گئی۔

"تمہاری جگہ میں ہوتی زینی تو میں بھی یونہی رو رہی ہوتی' لیکن اس سے بہتر ہے
اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ سبط اور تم دونوں خیریت سے ہو محفوظ ہو اور اپنے گھر میں ہو۔"

"اگر سبط کو کچھ ہو جاتا تو میں خودکشی کر لیتی۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"
روتے ہوئے بولی۔

"اب روؤ مت' ایک دو دن کی بات ہے پھر تم لوگ نیویارک چلے جاؤ گے۔ سبط
تم دونوں محفوظ ہو جاؤ گے۔ یہاں کے بکھیڑے یہیں رہ جائیں گے۔" ماہ بانو نے اسے
دینے کے لیے کہا لیکن یہ وہی جانتی تھی کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ یہاں کے بکھیڑ
سنبھالنے کے لیے عبداللہ تنہا تھا۔ ہر وقت خطرے کی زد میں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مکرم
خادم حسین نے زینی کو چھوڑ کیوں دیا تھا' لیکن اتنا اسے یقین تھا کہ وہ عبداللہ کو اس طرح
لیتے تو کبھی زندہ نہ چھوڑتے اور یہ تصور آتے ہی اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔

"بانو! یہ وہی دونوں تو نہیں ہیں' جو اس دن نمائش پر بھی آئے تھے؟" نیہاں
پوچھا۔

زہرا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں وہی ہیں' لیکن پلیز عبداللہ سے ذکر مت کرنا۔ وہ مزید پریشان ہوگا اور پھ
نہیں کیا کر بیٹھے۔ ابھی اس کا تھیسس شروع ہوا ہے اور میں اسے ایک لمحے کے لیے
پریشان نہیں دیکھ سکتی۔" ماہ بانو نے کہا۔

"مجھے اس روز بھی تم پریشان لگ رہی تھیں۔ مجھے کیا سب کو اندازہ تھا کہ پریشان
مگر تم نے بتایا نہیں تھا۔" نیہاں بولی۔

"جانے دو نیہاں' میں دہرانا نہیں چاہتی' مجھے اور کچھ نہیں ہے' بس عبداللہ کی فکر۔
خواہ مخواہ میں شروع ہونے والی ایک لڑائی میں وہ اس لیے ملوث ہو رہا ہے کیونکہ یہ اس
مجبوری ہے۔ وہ حیدر علی شاہ کا بیٹا ہے اور حیدر علی اور رجب علی......" اس نے بات ادھو
چھوڑ دی اور کنپٹیاں سہلانے لگی۔

"مجھے لگتا ہے نیہاں کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

زینی اپنے متعلق بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا تمہیں بھی مکرم اور خادم حسین نے کچھ کہا تھا؟" زہرا نے اس کی طرف
دیکھا۔

وہ مضطرب ہو گئی۔ "کچھ نہیں کہا انہوں نے' یوں بھی انہیں میرے اور عبداللہ
متعلق علم نہیں ہے جو ہوا وہ محض اتفاق تھا۔ مگر پلیز تم عبداللہ سے کچھ مت کہنا۔ وہ
ڈسٹرب ہوگا۔ تھیسس پر کام بھی نہیں کر سکے گا۔ پہلے ہی وہ بہت غیر محفوظ ہے' اس کی جان

ہے۔ اگر آج تم لوگوں کی جگہ وہ ہوتا تو دونوں بھائی اسے زندہ نہ چھوڑتے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ دشمنی کی یہ آگ کہاں تک جائے گی۔" زہرا نے کہا۔

☆=====☆=====☆

خادم حسین اور مکرم گھر پہنچے تو مکرم ملازم سے چائے کے لیے کہہ کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔

"تم مجھ سے صرف چیک کرنے کا کہہ کر گئے تھے۔" خادم حسین نے اسے مخاطب کیا۔

"ارادہ تو یہی تھا مگر پھر بدل گیا۔ رش بھی نہیں تھا اور ان کی کار باقی کاروں سے ہٹ
کھڑی ہوئی تھی تو سوچا کہ اس موقع کا فائدہ اُٹھا لیا جائے بس یہی سوچ کر اتر آیا۔"

"اول تو تمہیں اس جگہ سبط سے پنگا نہیں لینا چاہیے تھا لیکن لے ہی لیا تھا تو پھر اپنا کہا
کرتے۔"

"کر لیتا' لیکن وہ زینب ہے ناں' وہ اتنی معصوم سی ہے کہ میرا دل نہیں مانا۔" اس کی
ہوں میں وہی منظر اتر آیا جب اس نے زینب کی کلائی پکڑی ہوئی تھی اور وہ بھیگی آنکھوں
ساتھ سبط کی جگہ مرنے پر تیار تھی۔ مکرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس نے اماں جان' بابا جان اور ریشماں آپی پر جس یقین کا اظہار کیا تھا۔ میں اسے
نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس نے مجھے بھائی کہا تو مجھے لگا جیسے وہ سچ مچ میری چھوٹی بہن
ہی از ریئلی کیوٹ۔"

خادم حسین ہنس پڑا۔

"سبط بہت خوش قسمت ہے کہ اس سے ایسی لڑکی محبت کرتی ہے جو اس کی جگہ مرنے
تیار تھی۔"

"ہاں' میرا ارادہ صرف ڈرا دھمکا کر ان میں سے کسی ایک کو لے آنے کا تھا۔ ریوالور
بھی انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے نکالا تھا۔ زہرا کو بھی زینب کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ ویسے
آپ کو کیسی لگی زہرا؟"

"اچھی ہے لیکن اس میں ماہ بانو والی بات نہیں ہے۔" وہ بولا۔

وہ باتیں کر رہے تھے کہ ملازم چائے لے آیا۔

"پیر صاحب کا گاؤں سے فون آیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "وہ کہہ رہے تھے کہ بڑے شاہ
صاحب کو بھی امریکہ جانا ہوگا۔"

"سبط کے ساتھ؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" وہ بولا۔ "اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ تشریف لائیں تو پیر صاحب
فون پر بات کر لیں۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ' ہم بات کر لیں گے۔" اس نے کہا۔

چائے پیتے ہوئے مکرم کو خیال آیا۔
"سبط اب تک نہیں آیا' کافی دیر ہو گئی ہے۔"
"وہ زہرا اور زینب کو چھوڑنے چلا گیا ہوگا۔ وہیں دیر ہو گئی ہوگی۔ میں نے بیک ویو میں اس کی کار دیکھی تھی۔ وہ عبداللہ کے مکان کی طرف مڑ گیا تھا۔"
"اسی لیے میں پریشان ہوں۔ عبداللہ نے اسے کوئی نقصان نہ پہنچایا ہو۔"
"ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری اطلاعات کے مطابق عبداللہ اس سے اچھے طریقے سے ملا ہے۔ وہ اسے کچھ نہیں کہے گا۔"
"آپس میں ہم بھائیوں کی بات اور ہے لیکن اگر عبداللہ نے اسے خراش بھی پہنچائی تو وہ اپنے لیے بہت برا کرے گا۔" مکرم نے کہا پھر قدرے توقف سے بولا۔
"ویسے آپ کا کیا خیال ہے۔ سبط کا کیا ردِعمل ہوگا یہاں آ کر۔"
"اگر آج میں نے اسے اتنے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے نہ دیکھا ہوتا تو یہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس کا ردِعمل شدید ہوگا مگر اب کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال اگر وہ شور کرے تو تم خاموش رہنا۔ میں سنبھال لوں گا وہ کچھ بھی کہے تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔"
"مجھے تو زینب نہیں بھول رہی۔ میرا سبط کو کچھ کہنے کا ارادہ نہیں تھا' ریوالور تو بس یونہی نکال لیا تھا شغل میں اور وہ اس کی جگہ مرنے پر بھی تیار ہو گئی۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہے کہ زندگی کتنی خوبصورت اور قیمتی چیز ہوتی ہے۔ بس اس میں ایک ہی خامی ہے کہ وہ حیدر علی کی بیٹی اور عبداللہ کی بہن ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ کبھی اس سے پھر سامنا ہوا تو میرا ردِعمل کیا ہوگا۔ شاید اگلی مرتبہ اس کے بھائی کہنے پر بھی میں اسے نہ چھوڑ سکوں' اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ اتنی سویٹ ہو گی تو میں کبھی ان کے پیچھے نہ جاتا۔ حیدر علی کے خاندان کے کسی فرد کے لیے بھی میں اپنے دل میں نرم گوشہ پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ جس پل میرے ذہن میں امداد بھائی کی شکل آتی ہے۔ میرے دل میں ان کے خاندان کے ایک ایک فرد سے نفرت اور شدید ہوتی جاتی ہے۔ میں امداد بھائی کا خون اور ریشماں آپی کے آنسو کبھی نہیں بھول سکتا۔" مکرم جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔
خادم حسین نے فون اپنے قریب کھسکایا اور نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولا۔
"بھول جاؤ اس بات کو' اگلی مرتبہ کی اگلی مرتبہ دیکھی جائے گی۔ ابھی ان لوگوں سے ہمیں بہت سے حساب بھی بے باق کرنے ہیں' لیکن یہ بات یاد رکھو مکرم کہ ان سے دشمنی نبھاتے ہوئے ہمیں آپس کے رشتے ختم نہیں کرنے' میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ اس دوران سبط یا تمہیں یا کسی بھی بھائی کو نقصان پہنچے۔"
رابطہ ملنے پر وہ پیر صاحب سے بات کرنے لگا۔

"تم سبط کے ساتھ نیویارک جاؤ گے اور کم از کم تین مہینے اس کے پاس رہو گے تاکہ وہاں بغیر کسی دقت کے سیٹ ہو جائے۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہاں وہ خود کو اکیلا محسوس کرے پریشان ہو۔ تم زیادہ بہتر طور پر اس کا خیال رکھ سکتے ہو اور مکرم سے کہو کہ آج یا کل تک وہ واپس آ جائے۔" انہوں نے کہا۔
"بہت بہتر بابا جان۔"
اس نے فون رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بج اٹھی۔
"ہیلو۔" اس نے کہا۔
"ہیلو' سیں آپ کون بول رہے ہیں؟" گھبرائی ہوئی نسوانی آواز آئی۔
"بی بی! آپ بتائیں کہ آپ کون بول رہی ہیں۔ فون آپ نے کیا ہے۔"
"میں زینی بول رہی ہوں۔ پلیز آپ سبط کے بھائی یا بابا جان سے میری بات کروا دیں۔"
"میں اس کا بھائی بول رہا ہوں۔" اس نے کہا۔
"میں نے کہنا تھا کہ سبط ابھی یہاں سے نکلا ہے۔ وہ ظاہر تو نہیں کر رہا تھا لیکن غصے میں تھا بہت پریشان بھی تھا۔ پلیز بھائی! آپ اسے کچھ مت کہنا۔ پلیز۔" اس کی آواز بھرا گئی۔
"بھائی نے اسے بھی سمجھایا ہے کہ وہ گھر جا کر کوئی جھگڑا نہ کرے لیکن پلیز آپ بھی کچھ مت کہیں۔"
"بی بی! بہتر ہوگا کہ آپ اس سے زیادہ تعلق نہ رکھیں۔"
"کیا مطلب؟ کیوں نہ رکھوں؟" وہ اس کی بات کاٹ کر درمیان میں بولی۔ "اس ے میں تو میں نے بھائی اور بابا جان کی بات نہیں مانی تو آپ کی مانوں گی؟ میں نے کبھی ا اور بابا جان کی کسی بات سے انکار نہیں کیا' لیکن سبط کے معاملے میں' میں کسی سے بھی کمپرومائز نہیں کر سکتی۔ آپ لوگ یہ کبھی نہیں کہتے کہ ہم آپس کی دشمنی ختم کرتے ہیں' ہی کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کو چھوڑ دو۔"
اسی وقت سبط لاؤنج میں داخل ہوا اور خادم حسین کو نظرانداز کر کے مکرم کی جانب خادم حسین نے ریسیور کریڈل پر واپس رکھ دیا اور اُٹھ کر دونوں کے درمیان آ گیا۔
"بھائی! آپ درمیان میں مت آئیں۔" سبط نے کہا۔
"مکرم تم جاؤ۔" خادم حسین نے کہا اور پھر سبط سے مخاطب ہوا۔
"تم یہاں بیٹھ کر میری بات سنو۔"
"میں آج آپ کی یا کسی کی بھی کوئی بات نہیں سن سکتا۔ مکرم نے صرف میری انسلٹ

کی ہوتی تو میں خاموش بھی ہو جاتا' لیکن زینی کی اتنی توہین' میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

''مکرم میں کہہ رہا ہوں کہ تم جاؤ۔'' خادم حسین نے درشت لہجے میں کہا۔

''بھائی میں کہہ رہا ہوں' آپ ہٹ جائیں۔''

مکرم اُٹھا اور خاموشی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ سبط اس کے پیچھے لپکا لیکن خادم حسین نے اسے روک لیا۔

''سبط میری بات سنو۔'' اس نے اسے زبردستی صوفے پر بٹھا دیا۔

''میں نے اتنے صبر اور ضبط کا مظاہرہ پہلے کبھی نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کر سکتا ہوں۔ اس وقت میں زینی اور زہرا کے تحفظ کی وجہ سے خاموش تھا' لیکن اب وہ محفوظ ہیں اور میں وہ سب کر سکتا ہوں جو اس وقت نہیں کر سکتا تھا۔''

''اس وقت جو کچھ ہوا' وہ صرف غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ ایسا نہ ہوتا تو ابھی مکرم خاموشی سے باہر نہ نکل گیا ہوتا۔ تم اس کی عادات جانتے ہو۔''

''افسوس تو مجھے اس بات کا ہے بھائی کہ آپ چپ چاپ تماشا دیکھتے رہے۔ اس کے منہ میں جو آیا اس نے بکا۔ مجھ پر ریوالور نکال لینا تو اس کے لیے عام سی بات بن گئی ہے لیکن زینی پر' میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا اور پھر اس نے یہیں پر بس نہیں کیا' اسے کلائی سے پکڑ کر کھینچا۔

وہ کوئی عام بازاری لڑکی نہیں ہے' جن کے آپ لوگ عادی ہیں۔ آپ لوگوں کی نظر میں گھر سے باہر نکلنے والی ہر لڑکی نیچ ہوتی ہے۔ یہی سوچ لیا ہوتا کہ وہ میرے ساتھ تھی۔ ٹھیک ہے' وہ آپ کے دشمن کی بیٹی ہے مگر آپ کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ آپ کے بھائی کی محبت اور عزت ہے۔''

''یہی خیال آیا تھا اس لیے اسے چھوڑ دیا' ورنہ ہر خیال سے پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ لڑکیاں اس گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جہاں امداد کے قاتل رہتے ہیں۔ میں نے اس جسم پر کتنی گولیاں کھائیں' مجھے کتنے زخم لگے یا میں موت کی دہلیز سے پلٹ کر آیا۔ یہ سب میں نے فراموش کر دیا ہے' لیکن یہ بات نہیں بھول سکتا کہ عبداللہ نے امداد کو قتل کیا۔ گولیاں اس کی رائفل سے نکلی تھیں یا کسی اور کی رائفل سے' یہ ایک ثانوی بات ہے۔ میرے نزدیک میرے بھائی کا قاتل عبداللہ ہی ہے۔

اور تم نے ہمیں دہری مشکل میں گرفتار کر دیا ہے۔ تم سے بھی ہمارا وہی رشتہ ہے جو امداد سے تھا۔ ہم میں سے کوئی تمہیں بھی کسی ذہنی اور جسمانی تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا' مگر یہ بھی مت بھولو کہ جہاں بات چوائسز کی آ جاتی ہے' وہاں دل پر جبر کر کے ہم کو کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

کبھی میں سوچتا ہوں کہ قدرت اس سے بڑا مذاق ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا میں ہزاروں نہیں لاکھوں لڑکیاں ہیں' پھر بھی تمہیں پسند آئی تو حیدر علی شاہ کی بیٹی۔''

''میں نے کسی حیدر علی کی بیٹی کو پسند نہیں کیا تھا' میں نے زینب علی کو پسند کیا تھا اور مجھے اس بات سے نہ کوئی سروکار تھا اور نہ ہے کہ اس کے باپ' دادا کون ہیں اور ان کا سوشل اسٹیٹس کیا ہے۔''

''پھر بھی تم نے ہر معاملے میں ان کی طرف داری کی' یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ امداد کے قاتل ہیں۔ تم عبداللہ سے ملتے رہے' صرف ایک لڑکی کی خاطر۔'' خادم حسین نے تلخی سے کہا۔

''میں ایک لڑکی یا کسی لڑکی کی خاطر نہیں' زینی کی خاطر ان سے ملا اور اس لیے ملا کہ میں نے انہیں کبھی امداد بھائی کے قاتل کی حیثیت سے نہیں دیکھا۔ حیدر بابا اور ان کے گھرانے کے ساتھ ہمیشہ ہماری طرف سے زیادتی ہوئی ہے۔''

''میں اس معاملے پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں آنے والے وقت کے لیے تیار رکھوں اور اگر سب کچھ تمہارے حسب منشا نہ ہو تو تم ذہنی طور پر اس بات کے لیے بھی تیار رہو۔''

پھر فون کی گھنٹی بجی۔ خادم حسین نے ریسیور اُٹھا لیا۔

''ہیلو۔''

''سنیں! سبط پہنچ گیا؟'' زینی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''پہنچ گیا ہے۔''

''آپ نے اسے کچھ کہا تو نہیں؟''

''نہیں۔'' خادم حسین نے مختصراً کہا۔

''تو پھر اس نے مجھے رنگ کیوں نہیں کیا؟ میں نے اسے اتنی سختی کے ساتھ تاکید کی تھی کہ وہ مجھے خیریت کا فون کرے۔'' وہ بولی۔

''آپ خود اس سے بات کر لیں۔'' خادم حسین نے ریسیور سبط کی طرف بڑھا دیا۔

☆=====☆=====☆

زینی اور زہرا کی فلائیٹ میں کچھ ہی دیر رہتی تھی۔ وہ ائیر پورٹ کی حدود میں داخل ہوئے ہی تھے کہ عبداللہ نے زینی کی طرف دیکھا۔

''اتنی ڈپریس کیوں ہو؟ میں مانتا ہوں کہ تم ایک مرتبہ پھر گھر سے دور جا رہی ہو' لیکن اس کے بجائے زیادہ اچھی اچھی باتیں سوچو۔ وہاں مس جارج تو ہوں گی' مگر پھر بھی تمہارا

دل لگ جائے گا۔"

"ہاں۔"

"اور اب اماں جان کو ایسی پریشان کن شکل مت دکھانا' وہ پہلے ہی تم لوگوں کے جانے کے خیال سے افسردہ ہیں' انہیں مزید افسردہ مت کرنا۔" وہ کار پارک کرتے ہوئے بولا۔

"بھائی میری بات سنیں۔" اس نے عبداللہ کا بازو پکڑ لیا۔

"کیا بات ہے؟"

"کیا آپ سچ مچ ماہ بانو کے لیے سیریس ہیں؟ ریشماں آپی کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کرتے؟"

"کیا حماقت ہے زینی۔" عبداللہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی زہرا نے اسے ڈپٹ دیا۔

"اچھا اب اترو' بابا جان کی کار بھی رُک گئی ہے۔" عبداللہ نے کہا۔

وہ زینی کو اس وقت کوئی سخت بات نہیں کہنا چاہتا تھا۔

"میری بات سنیں بھائی۔" وہ پھر بولی۔

"زینی حد ہوتی ہے کسی بات کی۔" زہرا کو غصہ آ گیا۔ "میں کیا کہہ رہی ہوں' سنا بھی ہے تم نے؟" وہ بگڑ گئی۔

"میرے خیال میں زینی جو کچھ تم کہہ رہی ہو' وہ تمہاری فلائیٹ سے زیادہ اہم نہیں ہے' چلو اترو اب۔" عبداللہ نے کہا۔

"جو میں کہہ رہی ہوں' وہ بہت اہم ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔

"آپ کی وہ ماہ بانو ہے ناں' وہ آج کل بہت پریشان ہے۔ اس نے آپ کو نہیں بتایا لیکن شاید سبط کے بڑے بھائیوں نے اس سے کچھ کہا ہے۔"

"اسٹاپ اِٹ زینی' کوئی بات تو اپنے پیٹ میں رکھ لیا کرو' جو تمہارے معاملات نہیں ہیں' ان میں ٹانگ مت اڑاؤ اور اب اترو جلدی سے۔" زہرا نے تیز لہجے میں کہا۔

"ٹھہرو زہرا۔" عبداللہ نے کہا پھر زینی سے مخاطب ہوا۔

"تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے اور تم نے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے۔"

"ماہ بانو نے منع کیا تھا۔ اس خیال سے کہ آپ پریشان ہوں گے۔ اس کا خیال ہے کہ آپ تنہا ہیں اور خطرے میں ہیں' مگر میں اس بارے میں مسلسل سوچتی رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو نہ پتا چلا تو وہ خود خطرے میں گھر جائے گی' کس قسم کے خطرے میں' یہ میں نہیں جانتی' لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ اسے کوئی خطرہ ہے۔"

"تمہیں کیا بتایا ماہ بانو نے؟ وہ اسے کہاں ملے اور اس سے کیا کہا؟"

"ماہ بانو نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہتی۔ خادم اور مکرم بھائی شاید کس

نائٹ میں ملے تھے اسے۔"

حیدر بابا نے انہیں کار سے نہ اترتے دیکھا تو خود ان کی طرف بڑھ آئے۔

"کیا ہوا بیٹا! آپ لوگ جلدی کریں' ابھی اندر جا کر بھی بہت سے مرحلے ہیں۔"

انہوں نے کار کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔

"جی بابا جان!" عبداللہ نے کہا اور اتر آیا۔

☆=====☆=====☆

کالج کھل گیا تھا اور ایک مرتبہ پھر سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ فائنل ایئر پوری طرح تھیس میں مصروف تھی اور ان کے پاس سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اُما بھی واپس آ گئی تھی اور بہت بجھی بجھی سی تھی۔

"میں نے ممی سے دسمبر تک کا وقت لیا ہے۔ بس ایڈی کا تھیسس ڈسپلے ہو جائے۔ وہ بہت جینئس ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بہت آگے تک جائے گا' لیکن اس وقت اسے کوئی شاک پہنچا تو وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ یہیں پر زندگی کی جدوجہد ختم کر دے گا۔"

"کیا کوئی صورت نہیں ہو سکتی اُما؟" ماہ بانو کے لہجے میں امید تھی۔ "کوئی تو ہو گی' کوئی حل تو ہو گا اس مسئلے کا سوچو۔"

"کوئی حل نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک مذہب تبدیل کر لے۔ میں مسلمان ہو جاؤں یا ایڈی ہندو اور یہ دونوں باتیں ہی ممکن نہیں ہیں۔"

"میری ممی بھی مسلمان ہو گئی تھیں' تم بھی اسلام کو اسٹڈی کرو۔ ایڈی کی خاطر نہیں' صرف اس لیے کہ سچائی اور حقیقت تلاش کر سکو۔" نیہاں کہتی۔

"سچائی اور حقیقت خواہ کچھ بھی ہو' لیکن میرے لیے اپنا مذہب تبدیل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ جس حد تک یہ بات تمہارے لیے ناممکن ہے' اس حد تک میرے لیے بھی ناممکن ہے۔ تمہارے خیال میں مذہب تبدیل کر لینا اسی قدر آسان بات ہے۔"

"تم ایڈی سے بات تو کرو' دیکھو کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔" ماہ بانو اسے مشورہ دیتی۔

"پلیز! اس وقت ایڈی سے کچھ مت کہو۔ اس کے تو کان میں بھنک بھی نہ پڑے اس بات کی۔"

اس روز ان کی پینٹنگ کی کلاس ہو رہی تھی۔ ماہ بانو اور نیہاں ریمبراں کی بنائی ہوئی تصویریں کاپی کر رہی تھیں جبکہ اُما سیزین کی پینٹنگ بنا رہی تھی۔ عبداللہ اور ایڈی اسٹوڈیو میں داخل ہوئے۔

"شکر ہے تم لوگوں کی شکل بھی نظر آئی۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ تھیسس ڈسپلے تک

غائب ہو گئے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''کام ہی اتنا ہے کہ کسی اور بات کے سوچنے کی بھی مہلت نہیں مل رہی۔'' عبداللہ نے کہا۔

''مگر آج ہم نے سوچا کہ تھوڑی سی بریک لی جائے۔'' ایڈی نے کہا۔

''بہت اچھا کیا۔'' نیہاں بولی۔

''اب چلو ہمارا پروگرام ہے ٹولنٹن سے حلیم کھانے کا اور تم تینوں کو دعوت ہے کہ آؤ ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔''

''کیا؟ ہم ٹولنٹن جائیں؟ بہت اچھی جگہ چنی ہے ہماری دعوت کرنے کے لیے۔'' اُما نے ایڈی کو گھورا۔

''جب باہر کسی کو بتاؤ گی کہ یہاں دو سال پڑھنے کے باوجود بھی تم لوگوں نے ٹولنٹن کی شکل نہیں دیکھی اور وہاں سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے تو کوئی یقین نہیں کرے گا' چلو ابھی اور اسی وقت۔'' ایڈی نے زور دیا۔

''پھر بھی ہم لوگ وہاں کیسے جا سکتے ہیں' جیسی جگہ وہ ہے۔'' نیہاں نے تذبذب سے کہا۔

''وہاں بھی انسان رہتے ہیں۔ تم لوگ کیسا آرٹ پڑھ رہے ہو۔ جب تک سوسائٹی کو اسٹڈی نہیں کرو گے' کیا تخلیق کر سکو گے؟''

''مسٹر عدنان عرف ایڈی' کہنا میں نے یہ ہے کہ آپ رہے ہیں ہمیشہ کنٹونمنٹ میں۔ چار چھ سال سے اگر آپ نے سوسائٹی اور سوشل سیٹ اَپ کو اسٹڈی کرنا شروع کیا ہے تو کوئی کمال نہیں کیا۔ مجھے دیکھو جس سیٹ اَپ کو تم نے دور رہ کر اسٹڈی کیا ہے میں اس کا ایک حصہ ہوں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''یار یہ بحث بند کرو' چلنا ہے یا نہیں؟'' عبداللہ نے بدمزگی سے کہا۔

''یہ لڑکیاں تیار نہیں ہوں گی' کہیں اور چلتے ہیں۔'' ایڈی نے کہا۔

''پھر میری طرف آ جاؤ۔'' عبداللہ نے تجویز دی۔

وہ سب اس کی طرف جانے پر راضی ہو گئے۔

عبداللہ کی گاڑی میں ہی بیٹھ کر وہ اس کے گھر پہنچے۔ اتنے دن بعد مل کر بیٹھے تھے' اس لیے باتیں شروع ہوئیں تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ باتیں کرتے ہوئے عبداللہ اور ماہ بانو اُٹھ کر باہر لان میں نکل آئے۔

''زہرا اور زینی وہاں ایڈجسٹ ہو گئیں؟'' ماہ بانو نے لان اور برآمدے کی درمیانی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ کچھ' زینی کا ہر روز فون آ جاتا ہے کہ سب یاد آ رہے ہیں۔ زہرا کو مس جارج سے ڈھیروں شکایتیں ہیں' بس یونہی چل رہا ہے۔''

''زینی اور سبط ایک ہی جگہ پڑھ رہے ہیں ناں۔''

''ہاں' اور جو وہ دونوں تھوڑی بہت ایڈجسٹ ہوئی ہیں تو صرف سبط کی وجہ سے۔ حالانکہ ابھی وہ شروع سے گھر سے دور رہی ہیں بلکہ زینی تو گاؤں جا کر بھی بہت Crib کرتی تھی کہ کس جگہ آ گئی ہے' مگر اب یہی سب یاد آتا ہے اسے۔ ہر روز اماں اور بابا جان سے گھنٹہ بھر ضرور بات کرتی ہے فون پر' خود تو ڈسٹرب ہوتی ہے' اماں جان کو بھی ڈسٹرب کرتی ہے۔''

''ابھی تو زیادہ دن نہیں ہوئے انہیں گئے ہوئے' آہستہ آہستہ عادی ہو جائیں گے۔ شروع میں مشکل ہوتی ہی ہے۔''

''مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں مکرم اور خادم نے کیا کہا تھا؟'' عبداللہ نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے پوچھا۔

ماہ بانو چونک گئی۔

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''اس بات کو چھوڑو کہ کس نے بتایا' مجھے افسوس ہے کہ تم نے نہیں بتایا۔''

''پلیز عبداللہ! تم ایسے تو مت سوچو۔ اس روز بھی میں نے تم سے کہا تھا کہ نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی سے کبھی کام نہ لینا۔''

''اس روز جائیز میں تم اسی لیے پریشان تھیں۔ تم نے مجھے اپنی پریشانی میں شریک نہیں کیا' اس سے میں کیا نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ تم مجھ پر بھروسا نہیں کر رہیں۔ تم کیوں سمجھتی ہو کہ میں تمہیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتا؟ اتنا دم ہے ابھی میرے بازوؤں میں۔''

''تم کیوں نہیں سمجھتے عبداللہ! تمہارے ذہن پر پہلے کم بوجھ ہیں کیا؟ تم اکیلے ہو اور وہ آٹھ بھائی ہیں سب تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ آگ بجھے اور تم پیر صاحب کا خاندان چاہتے ہو کہ یہ آگ مزید پھیلے' مجھے بتاؤ کہ تمہیں کچھ ہو جائے تو......!'' اس نے بات مکمل کرنے کی کوشش کی' لیکن درمیان میں ہی رک گئی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''جہاں موت آنی ہوئی وہاں تم یا کوئی اور اس کا راستہ نہیں روک سکے گا۔'' عبداللہ کا مزاج بگڑ گیا۔

''مجھے پاگل مت کرو پلیز کیا ثابت کرنا چاہتے ہو یہ بات کر کے تم؟ یہ کہ بہت دلیر

بہت بہادر ہو، موت سے نہیں ڈرتے۔ میں نے مان لیا مگر تم نے کبھی اپنے علاوہ بھی کسی کے بارے میں سوچا ہے کہ تمہاری یہ باتیں ان لوگوں کے لیے کتنی تکلیف دہ ہوں گی جو تم سے محبت کرتے ہیں، تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں، محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں۔'' وہ رو پڑی۔

''مائی گاڈ! میں تم لوگوں کے آنسوؤں سے عاجز آ گیا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ خادم اور مکرم نے تم سے کیا کہا تھا؟''

''کچھ نہیں کہا تھا انہوں نے، صرف نمائش دیکھی تھی اور چلے گئے تھے۔''

''تو پھر تم پریشان کیوں تھیں؟'' اس نے جرح کی۔

''میں اس لیے پریشان تھی کہ ان کی نگاہ تم پر پڑی تو کیا ہوگا؟ تم تو بہت بہادر ہو نا، مگر میں بہت بزدل ہوں۔ تم خوفزدہ نہیں ہوتے مگر میں ہوتی ہوں تمہیں اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے مگر مجھے تمہاری زندگی کی پروا ہے۔''

''میں نے ایسی بھی کوئی بات نہیں کہی، جس پر اتنے آنسو بہا رہی ہو۔ او کے! مان لیا میری غلطی ہے، مجھے تم سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ پلیز اب یہ رونا بند کرو۔'' اس نے اپنا رومال ماہ بانو کی طرف بڑھایا۔

☆=====☆=====☆

''مجھے آج کل تم پریشان لگ رہی ہو، کیا بات ہے؟'' ایڈی نے اُما سے کہا۔

''وہم ہے تمہارا، ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس گھر یاد آ رہا ہے۔'' وہ بولی۔

''گھر یاد آ رہا ہے یا انڈیا؟ بہت اچھے میزبان چھوڑ کر آئی ہو وہاں۔'' ایڈی نے شرارت سے کہا۔

اُما کے ہونٹ بھنچ گئے پھر وہ بے نیازی سے بولی۔

''انڈیا تو یاد نہیں آ رہا البتہ میزبان یاد آ رہے ہیں واقعی بہت اچھے تھے۔''

''اوئے، کہیں یہ گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میرا تختہ تو نہیں اُلٹ گیا۔''

''کیا فضول باتیں کر رہے ہو، تمہارے پاس کرنے کو کوئی اچھی بات نہیں ہے کیا؟'' اُما زچ ہو گئی۔

''اچھی باتیں اس وقت کر رہے ہوں گے عبداللہ اور بانو۔ میرے پاس تو یہی باتیں ہیں، انہی پر تمہیں گزارا کرنا پڑے گا ساری زندگی۔''

''کتنے لکی ہو تم لوگ، جسے چاہا وہ مل گئی، میرا کیا بنے گا۔'' جیمز ہنسا۔

''نظر نہ لگاؤ ہمیں۔'' اُما نے کہا۔

''یار مر مر کر ملی ہیں۔ اتنی آسانی سے تو نہیں ملیں۔ بس تیشے سے سر پھوڑنے کی کسر رہتی تھی، ورنہ دودھ کی نہر ہم کھود چکے تھے۔'' ایڈی بولا۔

نیہاں نے جیمز کی طرف دیکھا۔ ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس، سر پر سیاہ رومال باندھے جس سے اس کے سنہرے بال چھپ گئے تھے۔ وہ کام کرتے کرتے اُٹھ کر آیا تھا، اس لیے کپڑوں پر جا بجا دھبے لگے ہوئے تھے۔

''کتنی لکی ہو گی وہ لڑکی، جسے جیمز پسند کرتا ہوگا۔'' اس نے سوچا۔

''اب بتا ہی دو جیمز کہ وہ ہے کون؟ ہم اس سے تمہاری سفارش کریں گے۔'' ظہیر نے کہا۔

''ابھی سوچ ہی رہا ہوں۔ کہوں گا اس سے مگر کچھ بننے کے بعد۔ میں اسے رائل پارک کے اس تنگ و تاریک کمرے میں لا کر اس کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا۔'' جیمز بولا۔

''مگر وہ ہے کون؟ ہمیں تو بتا دو۔'' نیہاں نے کہا۔ جیمز کی بات سن کر اس کے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

''وہ Living Aphrodite ہے۔ اس کی اس سے زیادہ مکمل اور جامع تعریف کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔'' جیمز نے کہا۔

اُما نے نیہاں کی طرف دیکھا۔ جیمز کی باتوں نے اسے ڈسٹرب کیا تھا مگر وہ بظاہر اسی طرح بے نیاز بیٹھی ہوئی تھی۔

☆=====☆=====☆

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، ریشماں کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ چچی اماں کی اولاد ہونے والی تھی۔ برسوں کی دعاؤں کے بعد ان کے گھر بہار آ رہی تھی۔ بس اب ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک ہی دعا رہتی تھی۔

''یا مولا بیٹا دینا۔''

یہ الفاظ جیسے ہی اس کی سماعت سے ٹکراتے تھے وہ اندر تک کانپ کر رہ جاتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے میں وہ کیا دعا مانگے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ چچی اماں کے گھر بیٹا پیدا ہو اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس حویلی کی چار دیواری میں سسکنے کے لیے ایک اور لڑکی آ جائے۔ گھبراہٹ بڑھ جاتی تھی تو وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے عبداللہ کی تصویریں نکال لیتی تھی اس سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ایسے میں کتنا وقت گزر جاتا تھا۔

اماں جان نے اس کا بہت خیال رکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک اسے اپنے ساتھ رکھیں۔ یہ تو انہیں معلوم تھا کہ وہ انہیں اپنی سکھی سہیلی سمجھ کر ان سے اپنے دل کی بات نہیں کر سکتی تھی، مگر اس سے زیادہ ان کے بس میں اور کچھ تھا بھی نہیں۔ پیر صاحب سے البتہ اس کا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ان سے کتراتی تھی۔

اسے اب تک یاد تھا جب اماں جان نے ان سے کہا تھا۔

''یہ کچھ نہیں بتا پائے گی پیر صاحب کیونکہ اس کی زبان پر آپ کی حویلی کی روایتوں کے تالے لگا رکھے ہیں اور اس سے پوچھتے بھی کیوں ہیں؟ میں اس کی سوتیلی ماں ہوں' مگر آپ کی یہ سگی اولاد ہے' اس کے آنسو اپنی داستان خود نہیں سنا رہے' آپ سن نہیں سکتے یا سننا چاہتے نہیں ہیں۔''

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کہ پیر صاحب سے اس لہجے میں کوئی اتنی بڑی بات کہہ سکتا ہے خواہ وہ اماں جان ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے سانس رک گیا ہو۔ پیر صاحب کا چہرہ اماں جان کی بات سن کر متغیر ہو گیا تھا۔ پہلے انہیں غصہ آیا تھا' پھر آنکھوں میں بیتے دنوں کے عکس لہرانے لگے تھے اور پھر انہوں نے صرف اسی قدر کہا تھا۔

''بیٹا! آپ اب اپنی خواب گاہ میں جائیں' بہت رات ہو گئی ہے' آرام کریں۔''

اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی' اسے یقین تھا کہ اماں جان کی بات سن کر پیر صاحب ضرور طوفان اُٹھائیں گے' لیکن نہ جانے کیسے وہ طوفان ٹل گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ اماں جان کے کمرے میں رات کا کھانا کھا رہی تھی۔ پیر صاحب کے علاوہ سب ہی وہاں تھے۔ کھانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر اماں جان اور بھائیوں کے اصرار پر وہ خاموشی سے تھوڑا بہت کھا رہی تھی۔

''آپی کیا ہوا ہے۔ دوپہر میں بھی آپ نے بمشکل چند لقمے لیے تھے۔ کھانا اچھا نہیں لگ رہا؟'' مکرم نے کہا۔

''نہیں' میں کھا تو رہی ہوں' تمہیں خواہ مخواہ وہم ستاتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''اماں! آپ آپی کے لیے' ان کی پسند کا کھانا پکوایا کریں۔'' مکرم نے انہیں مخاطب کیا۔

''میں تو تم سب کے لیے تم لوگوں کی پسند کا کھانا ہی پکواتی ہوں۔'' پھر وہ قدرے توقف سے آہ بھر کر بولیں۔ ''اس حویلی کی عورتوں کی قسمت میں ہی یوں گھل گھل کر مرنا لکھا ہے۔''

ریشماں یک دم مضطرب ہو گئی۔ اس نے اس طرح اماں کی طرف دیکھا' جیسے انہیں روکنا چاہ رہی ہو' جیسے کوئی بات ہو' جسے وہ سب سے چھپا کر رکھنا چاہتی ہو' مکرم نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیا بات ہے اماں جان؟'' اس نے ان کی طرف دیکھا پھر ریشماں سے مخاطب ہوا۔

''آپی' آپ بتائیں' آپ لوگ کچھ چھپا رہے ہیں' کیوں' ایسی کیا بات ہے؟''

''جو بھی بات ہے وہ جا کر اپنے بابا جان سے پوچھ لو۔'' اماں جان نے تلخی سے کہا۔

نوازش اور حضور علی نے بھی کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

''کچھ نہیں ہے مکرم تمہیں وہم ہو رہا ہے۔ پلیز تم کھانا کھاؤ۔'' ریشماں نے جلدی سے

کہا۔ وہ مضطرب اور پریشان تھی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

ریشماں اسے کمرے سے نکلتے دیکھتی رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ ایک بار کھانے سے ہاتھ کھینچ لینے کا مطلب تھا کہ وہ تب تک اپنے منہ میں گندم کا ایک دانہ بھی نہیں ڈالے گا جب تک یہ جان لے کہ اماں جان کی بات کا مفہوم کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس وقت بابا جان کے پاس گیا ہو گا۔ وہ ان سے ہر بات جاننے کی کوشش کرے گا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ بچپن سے ایسا ہی تھا۔ جس چیز کی دھن سوار ہو جاتی تھی اسے پورا کر کے چھوڑتا تھا۔ اسے غصہ جلدی آتا تھا۔ وہ ضدی تھا اور ضد پوری کرنا بھی جانتا تھا اور جس بات کا ایک مرتبہ ارادہ کر لیتا تھا اسے پورا کر کے ہی چھوڑتا تھا۔

نوازش اور حضور علی ابھی تک اس تمام واقعے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ریشماں نے اماں جان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ان کے لیے شکوے ہی شکوے تھے۔

''اماں! آپ کیوں چاہتی ہیں کہ ان کی زندگی مختصر ہو جائے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح خاموش رہنا چاہتی تھی' مگر اس وقت نہ رہ سکی۔

اماں جان کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی' مگر اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتیں' ریشماں اُٹھ کر ان کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

مکرم وہاں سے نکل کر سیدھا پیر صاحب کے پاس پہنچا' جو منشی کے ساتھ زمینوں کے حساب کتاب میں مصروف تھے۔ اماں جان کے چہرے پر پھیلا دُکھ اور ریشماں کی آنکھوں کا اضطراب اسے بھول نہیں رہا تھا۔ اسے ریشماں سے بے تحاشا محبت تھی' مگر کسی سے بھی محبت کا اظہار کرنا اس کی فطرت میں ہی نہیں تھا۔ وہ کہیں بھی جاتا تھا تو ریشماں کے لیے ڈھیروں چیزیں لاتا تھا لیکن سبط اور باقی بھائیوں کی طرح اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی اپنی سوچ تھی اور وہ اس سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ ریشماں کے حوالے سے بس وہ اس قدر چاہتا تھا کہ وہ خوش رہے۔ وہ اس کی آنکھوں میں دُکھوں کی پرچھائیاں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''منشی! کتنا کام باقی ہے۔'' اس نے حسبِ عادات تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

پیر صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ اندازہ لگانے میں انہیں دیر نہیں لگی کہ وہ ان سے کوئی خاص بات کرنے آیا تھا۔ اس کی ضدی طبیعت سے بھی وہ واقف تھے۔ کہنے کو تو اس نے منشی سے یہ پوچھا تھا کہ کتنا کام باقی رہ گیا تھا' مگر اس کا لہجہ کہہ رہا تھا کہ منشی اُٹھو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ کام ضروری تھا لیکن وہ اپنے بیٹوں کو ہر چیز کے مقابلے میں اولیت دینے کے قائل تھے' اس لیے منشی سے مخاطب ہوئے۔

"منشی جی! آپ جائیں' باقی حساب بعد میں دیکھ لیں گے۔"

پھر وہ مکرم سے بولے۔ "بیٹھو۔"

وہ بیٹھ گیا۔

"اب کہو کیا کہنا ہے۔" منشی کے جانے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ریشماں آپی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟ کیا ہوا اسے؟ وہ خیریت سے تو ہے؟" انہوں نے فکر مند ہو کر کہا۔

"بظاہر تو وہ ٹھیک ہیں' لیکن ان کے ساتھ کوئی پرابلم ضرور ہے۔ ان کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی ہے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا ہے۔ بہت ہوا تو دو چار لقمے ہمیں مطمئن کرنے کی خاطر لے لیتی ہیں۔ انہیں کوئی مسئلہ درپیش ضرور ہے' جس کی اماں جان اور آپ کو بھی خبر ہے۔ میں اس کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

پیر صاحب نے پائپ سلگایا اور کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔

"اگر تمہاری اماں جان کو خبر ہے تو ان سے پوچھ لو۔ یوں بھی مائیں بیٹیوں کے مسائل زیادہ اچھے طریقے سے سمجھتی ہیں۔"

"نہیں بابا جان! وہ جو بھی مسئلہ ہے' اسے آپ شاید اماں جان سے بھی زیادہ بہتر طور پر جانتے اور سمجھتے ہیں مجھے ٹالیں مت۔"

وہ پائپ کے کش لیتے ہوئے سوچتے رہے کہ صورتِ حال کو قابو میں رکھتے ہوئے مکرم کو کس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ وہ منتظر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالآخر وہ بولے۔

"وقت اور زمانہ تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ حویلی کی روایات اور نئے آنے والے رجحانات کو بیلنس کر سکیں۔"

"بابا جان! مجھے ان مسائل اور باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں اتنا چاہتا ہوں کہ آپی خوش رہیں جبکہ وہ خوش نہیں ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیوں ناخوش ہیں اور کیسے خوش ہوں گی۔"

"وہ شاید زندگی میں کچھ مس کر رہی ہے۔" پیر صاحب نے کہا۔

"کیا؟ ہم سب ان سے محبت کرتے ہیں' ان کا خیال رکھتے ہیں' ان کے سامنے ان کی پسند کی چیزوں کا ڈھیر لگا دیا ہے ہم نے' پھر وہ کیوں خوش نہیں ہے؟ کیا مس کر رہی ہیں وہ؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ وہ بہت کم گو ہے' شاید اس کی کوئی بہن ہوتی تو وہ اس سے اپنے دل کی بات کہہ دیتی' لیکن اب وہ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔"

مکرم کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

"میرے خیال میں بابا جان وہ زندگی کے تجربات مس کر رہی ہیں۔ ان کی زندگی محدود ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہی کمرا' وہی در و دیوار' وہی مخصوص چہرے' وہی روزمرہ کی باتیں' انہیں تبدیلی چاہیے۔

ایک تو امداد بھائی کی وفات نے ان کے ذہن پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ وہ اس صدمے سے ہی نہیں سنبھلیں۔ اس کے بعد سے اب تک میں انہیں دیکھ رہا ہوں کہ جیسے وہ اندر ہی اندر ختم ہو رہی ہیں۔ اب خادم بھائی اور سبط بھی امریکہ چلے گئے ہیں۔ وہ اپنے ذہن کا بوجھ کسی سے شیئر بھی نہیں کرتیں' اس طرح تو وہ گھٹ کر رہ جائیں گی۔ ہمیں ان کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔" پھر اسے جیسے اچانک خیال آیا۔

"بابا جان! میں چاہتا ہوں کہ وہ حویلی سے باہر نکلیں۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی' چاہے لاہور' چاہے کہیں بھی مگر اس حویلی میں نہ رہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا مکرم! اس حویلی کی کوئی بیٹی آج سے قبل حویلی سے باہر نہیں نکلی' نکلتی رہی ہیں' مگر جب بھی نکلی ہیں' حویلی میں طوفان ضرور اُٹھے ہیں' بہت تباہیاں آئی ہیں۔" ان کی نگاہوں میں برسوں کی دُھند میں لپٹے زیب النساء اور مہر النساء کے چہرے ابھر آئے۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔"

"اور ہم تکلیف دہ ماضی کو دہرانا نہیں چاہتے۔" پیر صاحب نے کہا۔

"بابا جان! میں نے آج تک آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کیا اور...... میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا لیکن آپی کی خوشیوں کی خاطر میں کسی سے بھی کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتا۔ میری ایک ہی بہن ہے اور میں اسے یوں گھٹ گھٹ کر مرتے نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے "ایک بہن" کہا تو ساتھ ہی اس کے ذہن میں بھیگی آنکھوں والی زینی کا تصور اُبھر آیا۔

"اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے سوچو' ہمیں اس حویلی کی عزت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہے۔"

"آئی ایم سوری بابا جان! لیکن میرے لیے یہ حویلی' اس کی عزت اور روایات ریشماں آپی کی خوشیوں سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔ میرے لیے اس دنیا میں دو رشتے سب سے زیادہ اہم ہیں' اماں جان اور ریشماں آپی کا۔ میں آپ کی طرح جذبات کو الگ رکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہ شاید اچھا ہی ہے کہ میں خادم بھائی کی جگہ نہیں ہوں۔ آپ کی گدی کی وراثت میرے لیے نہیں آئی۔ میں ریشماں آپی کو کہیں باہر لے جانا چاہتا ہوں۔ جگہ کا انتخاب آپ کر لیں۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

پیر صاحب چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔ ان کے ذہن میں یاسمین بیگم کی آواز گونج رہی تھی۔

"میں اس کی سوتیلی ماں ہوں مگر آپ کی یہ سگی اولاد ہے۔ اس کے آنسو اپنی داستان خود نہیں سنا رہے؟ آپ سن نہیں سکتے یا سننا نہیں چاہتے۔"

ان کی نگاہوں کے سامنے ریشماں کا ستا ہوا چہرہ آ گیا۔ آنکھوں میں ڈر' زرد چہرہ' خوفزدہ کمزور سی:......ریشماں۔

پل کے پل انہوں نے ماضی کا طویل سفر طے کر لیا وہ دن جب انہیں ان کی زندگی کا پہلا اور زبردست دھچکہ لگا تھا۔ جس روز لاہور سے واپسی پر راستے میں اچانک ان کی نگاہ اچھو اور زیبی پر پڑی تھی...... زیبی جس نے ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑتے ہی چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا اور جیسے ہی اسے اندازہ ہوا کہ آنے والا رجب علی تھا تو اس نے یوں اچھو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی تھی' جیسے وہ اسے سب سے بچا لے گا۔ وہ اس وقت کو کبھی بھلا نہیں سکے تھے۔ جب زیبی' اچھو کو جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی' اسے ابدی نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور جب وہ اسے بالوں سے گھسیٹ کر کار کی طرف لے جا رہے تھے' تو وہ چلا رہی تھی۔

"چھوڑو مجھے ظالم انسان' نفرت ہے مجھے تم سے' تم نے میرے اچھو کو مار دیا' میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

اور جب وہ اور بابا جان' زیب النساء کی خواب گاہ میں داخل ہوئے تھے' حویلی کے ماتھے پر لگ جانے والے داغ کو دھونے کے لیے اس وقت زیب النساء کی آنکھوں میں صرف اور صرف ایک جذبہ تھا' شدید نفرت کا جذبہ۔

پھر اس نے بولنا شروع کیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہر خوف سے آزاد ہو گئی ہو' انجام سے بے پروا ہو گئی ہو۔

"جس طرح یہ گڑیاں میری ملکیت تھیں' اسی طرح میں آپ کی ملکیت تھی' جس طرح میں انہیں الماری میں بند کر کے بھول گئی تھی' اسی طرح آپ مجھے اس کمرے میں بند کر کے بھول گئے تھے۔

لیکن مجھ میں اور ان گڑیوں میں ایک بنیادی فرق تھا۔ ان میں روح نہیں تھی' مجھ میں تھی۔ ان میں دل نہیں تھا۔ مجھ میں تھا۔ یہ سوچ نہیں سکتی تھیں' میں سوچ سکتی تھی۔ سو میں بہت کچھ سوچتی رہی۔ بہت سے "کیوں" میرے گرد چکراتے رہے' لیکن ادب آداب کی تہوں میں ملفوف ہونے کی وجہ سے مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں اپنے "کیوں" کا جواب آپ سے طلب کر سکتی' بس اس لیے میں نے نظریں چرانا شروع کر دیں۔ اپنی سوچوں سے بھی اور اپنے سوالوں سے بھی۔"

اور وہ وقت جب بابا جان نے یہ سب باتیں سن کر زیب النساء کے گال پر طمانچہ مارا تھا اور وہ چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں ان کی جانب دیکھتی رہ گئی تھی۔

انہیں وہ سب یاد تھا۔ اس لمحے انہیں زیب النساء سے رتی بھر بھی ہمدردی محسوس نہیں ہوئی اس نے ان کے سامنے جان دی تھی۔ پھر بھی انہیں کوئی دکھ' کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ ہاں سکون ہوئے تھے' یہ سوچ کر ابھی ان کی ایک اور بہن بھی تھی اور جو کچھ زیب النساء نے کیا کچھ آئندہ بھی پیش آ سکتا تھا۔ اور وہ بے سکون تھے' یہ دیکھ کر کہ حیدر علی ان سے دور ہو گیا خلیج پاٹنا چاہتے تھے' لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

لیکن پھر یوں ہوا کہ وہ مسلسل بے سکون رہنے لگے۔ یوں لگتا تھا' جیسے زیب النساء کی کے بعد پنڈورا کا پٹارہ کھل گیا ہو۔ اس روز سے لے کر اب تک انہیں سکون میسر نہیں آیا

زیب النساء کے بعد مہر النساء کو قتل کرتے ہوئے انہیں صدمہ ہوا تھا۔ اس روز بھی وہ شدید کے عالم میں تھے۔ جو کچھ مہر النساء نے کیا تھا۔ اس کے بارے میں تو وہ کبھی سوچ بھی نہیں تھے۔ مگر اسے مارتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ان کے ذہن میں ریشماں کی شبیہہ اتر آئی اسے ذہن سے جھٹک کر انہوں نے مہر النساء کو بھی قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد برسوں یوں کہ ریشماں پر نگاہ پڑتے ہی یہ خیال ان کے دل میں اُتر آتا تھا۔

"کیا ایک دن ریشماں بھی میرے یا اپنے بھائیوں کے ہاتھوں اسی طرح' اسی نفرت کے قتل ہو جائے گی۔"

اور ان کا دل دہل کر رہ جاتا تھا۔

"نہیں یہ تو اتنی معصوم' اتنی پیاری ہے' ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

پھر انہیں خیال آیا تھا کہ ان کی بہنیں بھی اس عمر میں اتنی ہی پیاری اور اتنی ہی معصوم تھیں' ان کتنے ہی کھلونے لا کر دیا کرتے تھے۔ کتنی ڈھیر ساری گڑیاں لا کر دی تھیں۔ انہوں نے کو۔ ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد انہوں نے وہ گڑیاں اسی الماری میں مقفل کر کے رکھ جس میں سے ایک دن انہوں نے سیاہ شیشی نکالی تھی۔

یہ سب خیال آتے ہی وہ دل میں تہیہ کر لیتے تھے کہ ریشماں سے کبھی بھی زیادہ محبت نہیں گے' مگر اس کی حرکتیں اتنی پیاری اور باتیں اتنی میٹھی ہوتی تھیں کہ وہ خود سے کیے تمام بھلا دیتے تھے۔ اس پر پہلی مرتبہ نظر پڑتے ہی ان کے دل میں کچھ پگھلنے سا لگا تھا۔ اس محبت ایک بالکل نئے انداز میں ابھری تھی۔ وہ پہلے بھی باپ بن چکے تھے' گدی کا وارث تھا تو انہیں خوشی ہوئی تھی' مگر ایسی نہیں۔ پھر ریشماں کی پیدائش سے چند دن قبل امداد پیدا ان کا دوسرا بازو' تب بھی انہیں ویسی خوشی نہیں ہوئی تھی۔

ہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ کیا اس لیے کہ وہ زرینہ کی بیٹی تھی؟ زرینہ' جس پڑھ کر ان کے قدم جکڑ لیے تھے۔ یا پھر اس لیے کہ وہ بیٹی تھی اور بیٹیاں جتنی نرم و نازک

خود ہوتی ہیں، ویسے ہی نرم ونازک جذبات والدین میں بھی پیدا کر دیتی ہیں۔

ریشماں نے سب سے پہلے ''بابا'' کہنا سیکھا تھا۔ اس کے منہ سے ''بابا'' سن کر ان کی روح تک سرشار ہو جاتی تھی۔ جب چھوٹی سی ریشماں بھائیوں کو تنگ کر کے انہیں چھیڑ کر یا ان سے شرارت کر کے ان کے پاس بھاگی آتی تھی اور ان کی گود میں چڑھ کر کہتی تھی۔

''بابا جان بچائیں۔''

تو ایک لمحے کے لیے ان کا دل بیٹھ جاتا تھا۔ ان کے تصور میں پل کے پل میں وہ بڑی ہو جاتی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی تھی۔

''بابا جان بچائیں۔''

اس تصور سے انہیں اس کی خوبصورت ہنسی باہر کھینچ نکالتی تھی۔ اسے بابا جان کی گود میں چڑھے دیکھ کر اس کے پیچھے آتے بھائی رُک جاتے تھے اور وہ انہیں منہ چڑا کر ہنس دیتی تھی۔ ایسے میں وہ انہیں اتنی پیاری لگتی تھی کہ وہ کتنی دیر تک اسے گود میں بٹھائے رکھتے تھے۔ ڈھیر سارا پیار کرتے تھے۔ وہ بھی ان سے باتیں کرتے نہیں تھکتی تھی۔ مزے لے لے کر انہیں اپنی شرارتوں کے قصے سناتی تھی۔

اس کی باتیں سنتے ہوئے ان کے ذہن میں مسلسل یہ سوال ہتھوڑے برساتا رہتا تھا۔

''کیا ایک دن ریشماں بھی میرے یا اپنے بھائیوں کے ہاتھوں اسی طرح، اسی نفرت کے ساتھ قتل ہو جائے گی۔''

یہ تصور ہی ان کے لیے سوہانِ روح تھا۔ وہ حیران ہو جاتے تھے اپنے بابا جان کی ہمت پر جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی سب سے پیاری بیٹی کو زہر دیا تھا۔

ایسے میں انہیں حیدر علی کا خیال آتا تھا۔ حیدر علی جسے اپنی بہنوں سے شدت کے ساتھ محبت تھی، جس نے یہ جاننے کے باوجود بھی کہ زیب النساء اچھو کے ساتھ بھاگ رہی تھی، اس کا ساتھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ان کے ساتھ لڑ بھی پڑا تھا، ہاتھا پائی پر اتر آیا تھا۔

ان کا دل چاہتا کہ اور سب باتوں کو چھوڑ کر...... حیدر علی کی ذات کا یہ وصف ان کے بیٹوں میں بھی آ جائے۔ ریشماں ان کی سوتیلی بہن تھی، مگر وہ چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے اسے سگے بھائیوں سے بھی بڑھ کر محبت دیں۔ یہ خوف ان کے اندر بیٹھ چکا تھا کہ ایک دن ان کے بیٹے ریشماں کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انہوں نے زیب النساء اور مہر النساء کے ساتھ کیا تھا۔

انہوں نے لاشعوری طور پر یہ کوشش شروع کر دی کہ ان کے سب بیٹے ریشماں سے اتنی محبت کریں کہ اسے کبھی سوتیلے پن کا احساس نہ ہو اور اگر کبھی ریشماں کے بھائیوں کو اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا پڑے جو انہوں نے مہر النساء اور زیب النساء کے ساتھ کیا تھا، تو ان کے ہاتھ اس پر نہ اُٹھ سکیں، ان کی بہن سے محبت، ان کا راستہ روک لے۔

اس سلسلے میں انہوں نے صرف ایک مرتبہ یاسمین بیگم سے کہا تھا۔

''ہم نہیں چاہتے کہ ہماری بیٹی کو اس حویلی میں کسی سوتیلے پن کا احساس ہو۔ اس حویلی پر سب سے پہلا حق ہماری بیٹی کا ہے، بعد میں کسی اور کا۔ یہ بات آپ اپنے بیٹوں کو بچپن سے ہی ذہن نشین کروا دیں۔''

یاسمین بیگم جھکے سر کے ساتھ سب کچھ سنتی رہیں۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس بات پر یاسمین بیگم نے دل میں کیا سوچا تھا۔ البتہ آنے والے دنوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ انہوں نے ان کے حکم سے سرتابی نہیں کی تھی۔ انہوں نے بیٹوں کی پرورش اس طرح کی تھی کہ وہ بہن کی محبت میں شاید حیدر علی کو بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے۔

بچپن میں وہ بے حد شرارتی تھی۔ مگر شرارتوں کی عمر سے نکل کر جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو انہیں احساس ہوا کہ وہ بھی بھائیوں پر جان چھڑکتی تھی۔ انہیں خراش آ جاتی تھی تو رو رو کر ہلکان ہو جاتی تھی۔ کھانا تک نہیں کھا سکتی تھی۔ بہن بھائیوں کی اس محبت نے ان کے دل سے بہت سے خدشات مٹا دیے تھے، مگر پھر بھی اس پر نگاہ پڑتے ہی انہیں زیب النساء اور مہر النساء کا خیال آ گھیرتا تھا اور کہیں سے حیدر علی کی آواز ابھرتی تھی۔

''بابا جان! آپ جیتی جاگتی، سانس لیتی ہوئی لڑکیوں اور زمین کو ایک ہی مقام دے رہے ہیں۔ وہ زمین، جائیداد اور بینک بیلنس کی طرح نہیں ہیں۔ وہ محسوس کر سکتی ہیں، ہر دکھ ہر تنہائی کو۔ بابا جان! آپ ان کے لیے صدر دروازہ نہیں کھولیں گے، تو چور راستے اپنے لیے کھل جائیں گے۔ کٹورے میں گنجائش سے زیادہ پانی ڈالا جائے تو وہ بھی چھلک جاتا ہے۔ ان کے صبر اور ضبط کو ان کے لیے آزمائش مت بنائیں۔ اس دن کو آنے سے روکیں۔ بابا جان جس دن چور دروازے کھل جائیں گے اور کٹورے سے پانی چھلک جائے ...

انہیں خبر نہیں تھی کہ ریشماں کے صبر و ضبط کے کٹورے میں وہ کس قدر پانی بھر چکے ہیں اور اسے چھلکنے میں کتنا وقت درکار تھا۔ اس روز بھی وہ رو رہی تھی اور بہت اصرار کے بعد بھی اس نے صرف اسی قدر کہا تھا۔

''بابا جان مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''تو کیا ریشماں بھی اپنے انجام کے قریب پہنچنے والی ہے؟'' ان کے اندر کسی نے لیا۔

اور ان کا دل بیٹھنے لگا۔ لمحوں میں انہوں نے برسوں کا سفر طے کر لیا تھا۔ مکرم اب بھی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ریشماں کے ما کا حق لے کر ہی جائے گا۔

"ٹھیک ہے۔" بالآخر انہوں نے مکرم سے کہا۔ "ہماری طرف سے اجازت ہے' اسے اس کے نانا' نانی کے گھر لے جاؤ' یوں بھی اس کی نانی نے ہم سے اس بارے میں بہت اصرار کیا تھا۔"

"تھینک یو بابا جان۔" وہ مسکرایا۔

"مگر اس کے لیے چند شرائط ہیں۔" وہ بولے۔

"کیسی شرائط؟"

"وہ آج رات جا کر پرسوں رات واپس آ جائے گی۔ دن کی روشنی میں باہر نکلنے کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔ جب تک وہ مولوی صاحب کے گھر رہے گی' تب تک اس کی ملازمہ کے علاوہ کوئی بھی اور شخص' خواہ وہ ان کا کتنا ہی قریبی عزیز' رشتہ دار کیوں نہ ہو' خواہ کوئی عورت ہی ان کے گھر میں داخل نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" مکرم نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

"اس کے علاوہ تم اس تمام عرصے میں وہیں رہو گے' اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں کرو گے۔"

"بہتر بابا جان۔" اس نے اس بات پر بھی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ دو دن تک وہ کہیں بھی یوں بندھ کر نہیں رہ سکتا تھا مگر ریشماں کی خوشی کی خاطر اسے اس بات کی پروا نہیں تھی۔

"جاؤ' ریشماں کو بھی بتا دو اور مولوی صاحب کو بھی اطلاع کر دو۔" انہوں نے کہا۔

مکرم وہاں سے نکل کر سیدھا ریشماں کی خواب گاہ میں پہنچا۔ اسے دیکھ کر ریشماں نے ہشاش بشاش دکھائی دینے کی کوشش کی۔

"آؤ مکرم بیٹھو۔" وہ مسہری سے اتر آئی۔

"آپی! میں آپ سے کچھ کہنے آیا تھا۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

ریشماں کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"کیا کہنا چاہتا ہے مکرم؟ کیا اماں جان نے بابا جان...... کو کچھ بتا دیا تھا یا وہ خود ہی سب کچھ سمجھ گئے تھے اور کیا انہوں نے وہی سب کچھ مکرم کو بھی بتا دیا؟ مکرم کیا کہے گا کیا کرے گا؟ وہ تو ان کے خون کا پیاسا ہے کہیں......" اس سے آگے وہ سوچ بھی نہ سکی۔

مکرم جو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا' بولا۔

"آپی! میں نے آپ کو ایک بہت دلچسپ بات بتانی ہے۔"

اس کے الفاظ نے بھی ریشماں کو کوئی تسلی نہیں دی۔ اس کا چہرہ اب تک ویسا ہی تھا۔

"آپ کا دل چاہتا ہے آپی یہاں سے کہیں باہر جانے کا؟ مثلاً اپنے نانا جی اور نانی اماں کے گھر؟"

ریشماں کی کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ وہاں سے باہر نکل سکتی۔

"بابا جان چاہ رہے ہیں کہ آپ ایک آدھ دن ان کی طرف رہ آئیں' آپ کی طبیعت بہل جائے گی۔" مکرم نے اپنی بات مکمل کی۔

"کیا؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"ہاں' لیکن یہاں بھی تو کوئی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا' اس لیے بابا جان چاہتے ہیں کہ زیادہ دن نہ رکیں۔" وہ بولا۔

"پلیز مکرم! مجھ سے مذاق مت کرو۔" اس نے آزردگی سے کہا۔

"آپی! میں مذاق نہیں کر رہا' میں سو فیصد سیریس ہوں۔" وہ بولا۔

☆=====☆=====☆

ثریا بیگم کا دل بچوں کے بغیر بہت اداس ہو رہا تھا۔ جب زہرا اور زینب حویلی میں تھیں' تو رونق رہا کرتی تھی۔ اب بھی ہر روز بچیوں کا فون آ جاتا تھا۔ زینی جو گاؤں میں خوش نہیں تھی' سب بہت مس کر رہی تھی۔

"اماں! میں بہت اداس ہوں' مجھے سب بہت یاد آتے ہیں۔ میرا دل نہیں لگ رہا۔" وہ رو پڑتی تھی۔

"میری جان! میری چندا چھوڑو سب کچھ اور واپس آ جاؤ۔" وہ بھی رو دیتی تھیں۔

"میں کیا کروں اماں! یہ بھی تو نہیں ہو سکتا ناں اماں پلیز! آپ اور بابا جان آ جائیں' پلیز

وہ بھی تو نہیں آ سکتے' یہاں زمینوں کے مسئلے ہیں' عبداللہ بھی کالج میں مصروف ہے۔ سب کچھ چھوڑو اور پاکستان واپس آ جاؤ۔"

روز ماں بیٹیوں کے درمیان اسی قسم کی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد بھی وہ روتی رہتی تھیں۔ حیدر علی کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

"ہم کب تک اس طرح رہیں گے علی' اپنے بچوں کے بغیر' مجھ سے اب ایسے نہیں رہا جاتا۔ اپنے بچوں کی زندگی کے کتنے خوبصورت فیز مس کیے ہیں۔ وہ ہماری نگاہوں کے بڑھتے اور جوان ہوتے مگر ہم کچھ نہیں دیکھ سکے۔ ہم نے اولاد ہوتے ہوئے بے کے دکھ سہے ہیں۔"

علی انہیں چپ کراتے رہ جاتے۔ خود بھی وہ کب خوش رہے تھے بچوں کے بغیر اور اب کے امریکہ چلے جانے کے بعد سے تو وہ خود بھی بہت اداس تھے۔ زہرا تو سمجھ دار تھی مگر زینی کا خیال آتا تھا۔ اس کی شرارتیں' اس کی حماقتیں' وہ بات بے بات اس کا رونا۔ سبط کا ذکر کرتے ہوئے زبان دانتوں تلے دبا لینا۔

سبط حسن انہیں اچھا لگا تھا لیکن زینی کی وہاں شادی کے سلسلے میں وہ مطمئن نہیں تھے۔ انہیں احساس تھا کہ ماہ بانو نے انہیں جذباتی طور پر بلیک میل کر کے شکست دی تھی۔ بعد میں بھی انہوں نے اس بارے میں بہت سوچا تھا۔ زینی اور زرینہ میں انہیں ایک قدر مشترک نظر آئی تھی۔ ان دونوں نے شدت سے محبت کی تھی۔ زرینہ کا انجام ان کے سامنے تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ زینی بھی ایسے ہی کسی انجام سے دوچار ہو۔ بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ وقت اور تقدیر پر چھوڑ دیا۔ اپنے آپ کو یہ کہہ کر دلاسا دیا تھا کہ ابھی سبط کے کچھ بننے میں بہت وقت پڑا ہے تب تک نہ جانے کیا صورتِ حال ہو۔ شاید دونوں ایک دوسرے سے اُکتا کر راستے بدل لیں۔ شاید حالات اس حد تک بہتر ہو جائیں کہ وہ اور پیر صاحب اپنے ہاتھوں سے ان کا گھر آباد کر سکیں۔

اس روز زہرا اور زینی سے بات کرنے کے بعد فوزیہ بیگم کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔

''میری بچیوں کو بلوا دیں۔ پلیز علی! میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' وہ رو پڑیں۔

''چند دن کی بات ہے' وہ سیٹ ہو جائیں گی۔ اتنے لوگ جاتے ہیں' سب سیٹ ہو جاتے ہیں۔ شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے سب کے ساتھ تم کیوں فکر مند ہوتی ہو۔''

''کیا ملا مجھے زندگی میں؟ کتنی خواہش تھی بیٹے کی۔ وہ پوری تو ہوئی' لیکن ایسے کہ میں اپنے بیٹے کو اپنے سامنے جوان ہوتا بھی نہ دیکھ سکی' اسی طرح رہے گا سب ساری عمر؟ اولاد کی کوئی خوشی نہیں دیکھیں گے ہم؟''

''تم تو خواہ مخواہ اداس ہو رہی ہو۔ بیٹیاں امریکہ میں ہیں' لیکن بیٹا تو یہیں ہے' تم جا کر اس سے مل آتے ہیں۔'' وہ بولے۔

فوزیہ بیگم کا چہرہ کھل اُٹھا۔ ''ابھی چلیں۔''

اور حیدر علی اسی وقت چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

لاہور میں گھر تک پہنچتے ہوئے صبح کے چار بج چکے تھے۔

''شاہ صاحب تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے کام سے فارغ ہو کر سوئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ انہیں صبح دس بجے سے پہلے مت جگائیں۔'' ملازم نے بتایا۔

''ہم اسے جگائیں گے نہیں' لیکن میں اسے دیکھ تو لوں۔'' فوزیہ بیگم نے حیدر علی سے کہا۔

وہ دونوں اس کے کمرے میں چلے آئے۔ کمرے میں لائٹ جلی ہوئی تھی اور وہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس بستر پر آڑا ترچھا پڑا بے خبر سو رہا تھا...... فوزیہ بیگم بے اختیار ہو کر آگے بڑھیں اور وہیں بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔

''دیکھیں کیسا کمزور ہو رہا ہے۔ اتنی رات گئے تک کام کرے گا تو یہی حالت ہو گی نا۔

حیدر علی ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور سگار سلگا لیا۔ ''دیکھنا تھک کر سویا ہے' جاگ نہ جائے۔'' وہ بولے۔

''نہیں' میں بات نہیں کروں گی۔'' انہوں نے کہا اور اسے تکتے ہوئے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔

حیدر علی نے سگار کے کش لیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا' جہاں ہر طرف بے ترتیبی تھی۔ کمرے میں فلور کشن' سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ایش ٹرے' چائے کی خالی پیالیاں' کاغذوں کا ڈھیر' دیوار کے ساتھ ٹکائی چند پینٹنگز' ایک ادھورا اور تین پورے مجسمے' قالین میں پھنسے پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے' اور نہ جانے کیا کیا۔

ان سب میں سے ان کی توجہ دو چیزوں پر مبذول ہوئی تھی۔ ایک ماہ بانو کا خوبصورت قدِ آدم مجسمہ اور دوسرے قالین پر بکھرے کاغذوں پر اسی کے پنسل اسکیچ۔ انہوں نے ایک نظر عبداللہ کی طرف دیکھا جو ماں کی گود میں سر رکھے گہری نیند سو رہا تھا۔ پھر وہ فوزیہ بیگم سے مخاطب ہوئے۔

''فوزیہ! تم تھک گئی ہو گی' اتنا لمبا سفر کیا ہے' آؤ اب آرام کر لو۔''

''اس کی صورت دیکھتے ہی ساری تھکن دور ہو گئی ہے۔'' انہوں نے پیار سے عبداللہ کی ...ل دیکھا۔

''بہت تھکا ہوا لگ رہا ہے عبداللہ' کہیں ڈسٹرب ہو کر جاگ نہ جائے' اسے بھی آرام کرنے دو۔''

فوزیہ بیگم اس کے پاس سے بادلِ نخواستہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆=====☆=====☆

مکرم نے پیر صاحب کو ریشماں کے حوالے سے بہت ڈسٹرب کیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ خوش رہیں جبکہ وہ خوش نہیں ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیوں ناخوش ہیں اور کیسے خوش ہوں گی۔''

وہ اسے کیا بتاتے کہ وہ کیوں ناخوش تھی اور کیسے خوش ہو گی۔ یہ حیدر علی کے سامنے ان کی شکست ہوتی' جس کے بعد شاید وہ سر اُٹھا کر چلنے کے قابل بھی نہ رہتے۔ وہ رات ان پر بھاری ثابت ہو رہی تھی۔ انہیں اپنی اَنا بہت پیاری تھی مگر وہ ریشماں کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت کی چنگاریاں بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہی نفرت جو انہوں نے مہر النساء اور زیب کی آنکھوں میں اپنے لیے دیکھی تھی اور وہ نفرت جو زرینہ کے دروازے کی چوکھٹ پر رکھے پھولوں میں تھی۔ انہیں بیٹی کی محبت اور اپنی اَنا میں سے کوئی ایک چیز چننا تھی' لیکن وہ اس

فیصلے کو مؤخر کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت تک جب تک کہ کوئی فیصلہ کرنا ناگزیر نہ ہو جاتا۔ کہیں اندر بہت دور کسی گوشے میں یہ گمان جڑ پکڑ گیا تھا کہ وہ فیصلہ ان کے بجائے وقت نے کرنا تھا اور وہ اس وقت کے انتظار میں تھے۔

مگر انتظار کے یہ لمحات بہت کٹھن تھے۔ ذہن اور دل میں کشمکش جاری تھی۔ پہلے انہوں نے ڈرنک لے کر اپنا ذہن اس طرف سے ہٹانا چاہا' لیکن جو باتیں ان کے ذہن سے چپک گئی تھیں' وہ نہ نکل سکیں۔ انہوں نے بدمزگی کے عالم میں ڈرائیور کو طلب کیا۔

''جی پیر صاحب!'' وہ دست بستہ آ کر کھڑا ہو گیا۔

''گاڑی تیار کرو' ہمیں لاہور جانا ہے۔''

وہ اُلٹے قدموں پلٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں پیر صاحب لاہور کی طرف رواں دواں تھے۔ شہر میں داخل ہو کر گھر چلنے کے بجائے انہوں نے ڈرائیور سے فیصل ٹاؤن چلنے کے لیے کہا۔

ابھی انہیں ڈرائینگ روم میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ جنت بائی اندر داخل ہوئی۔

''زہے نصیب پیر صاحب رجب علی شاہ تشریف لائے ہیں' آج تو اس گھر کے نصیب کھل گئے۔''

جنت بائی کے چہرے پر طمانیت بھرا سکون چھایا ہوا تھا اور آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے جس گوہر مراد کی تلاش تھی۔ وہ خود بخود ان کی مٹھی میں چلا آیا تھا۔

نوری کو پیر صاحب کے ساتھ بھیجتے ہوئے جنت بائی نے چند باتوں کی اسے بطور خاص تاکید کی تھی۔

''نوری' میں نے تمہارے لیے بہت کچھ کیا ہے' تمہیں گندی نالی سے نکال کر آسمان ستارے کی طرح روشن کر کے ٹکا دیا ہے' آج میں تم سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔''

''ممی! میرے لیے سبھی کچھ آپ ہی ہیں۔ میں زندگی کو بہت مختلف انداز سے دیکھتی ہوں۔ زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں ہوں' لیکن میرے تجربات نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ پہلے مجھے آپ کی ضرورت تھی' اب آپ سے محبت ہے' آپ جو کچھ مانگیں گی' میں وہ دینے سے انکار نہیں کروں گی' چاہے وہ میرے بس میں ہو یا نہیں۔'' وہ بولی۔

''پہلے ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھے تم میری اور میں تمہاری' مگر آج میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں نوری۔'' جنت بائی نے کہا۔

''آپ کہیں ممی جو کچھ آپ کو کہنا ہے۔''

''ایک بہت تاریک رات کو ایک درندے نے میری زندگی تباہ کی تھی۔ اس بات کو کئی برسوں ہو چکے مگر مجھے اب بھی وہ واقعہ تمام تر جزئیات سمیت یاد ہے۔'' وہ بولیں۔ ''اس شام ماسی بیداں کا بیٹا گلا مجھے بلانے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ماسی نے مجھے بلایا ہے۔ میں اس کے ساتھ

چل پڑی اور پھر اچانک کسی نے پیچھے سے میرے اوپر کھیس ڈال دیا۔ میں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں چلائے مگر بے سود۔

جنہوں نے مجھے یوں اُٹھایا تھا وہ سب حکم کے غلام تھے۔ حکم کے وہ غلام مجھے ایک بہت آراستہ کمرے میں چھوڑ گئے۔ کتنی دیر تک میں وہاں بند رہی' کتنی کوشش کی کہ کسی طرح وہاں سے نکل سکوں' مگر قسمت میں بربادی لکھی تھی' سو قسمت کا لکھا پورا ہوا۔

صبح گھر پہنچی تو میں نے رو رو کر سب گاؤں والوں سے فریاد کی۔ انہیں بتایا کہ مجھ پر یہ ظلم کس نے کیا تھا' مگر کسی میں بھی ہمت نہیں تھی' اس درندے کا گریبان پکڑنے کی کیونکہ وہ دولت مند تھا' اور طاقت ور تھا' زمین کا ناخدا تھا۔

وہ جو میری بربادی کا ذمہ دار تھا' بچ گیا اور میں گاؤں بھر کے لیے اچھوت بن گئی۔ کچھ ہی دنوں میں میری شادی ہونے والی تھی' اسی سے جسے میں اپنی روح کے بہت قریب سمجھتی تھی۔ جس نے مجھ سے بے شمار وعدے کیے تھے' جو مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا اور ہم دونوں خوش تھے کہ بن کہے ہم ایک دوسرے کے ہو رہے تھے۔ ہمیں لگتا تھا کہ قدرت ہمیں کوئی انعام دے رہی ہے۔ جبھی تو ہمارے ماں باپ نے ہمارے دلوں کا حال جانے بغیر ہی پیر صاحب سے کہہ کر ہمارا رشتہ طے کروا دیا تھا۔

مگر وہ بھی دغا باز نکلا۔ میں اسے گندگی کا ڈھیر لگنے لگی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا تھا۔ ایک روز میں نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ پوچھا کہ اس سب میں میرا کیا قصور تھا؟ کس بات کی سزا دے رہا ہے وہ مجھے؟

وہ کہنے لگا کہ میرا قصور یہی تھا کہ اتنا کچھ بیت جانے کے بعد بھی میں زندہ تھی۔ میں غیرت مند ہوتی تو کب کی کچھ کھا کے مر گئی ہوتی۔

میں نے مر جانا چاہا' لیکن کسی نے مرنے نہیں دیا' زندہ رہنا چاہا تو زندگی اجیرن بنا دی' پھر میں وہاں سے چلی آئی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ کہاں جاؤں گی' کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں تھا۔ نہ جانے کیسے میں چندا بائی تک پہنچ گئی۔ ہاں یاد آیا۔ میں بیچ سڑک پہ چلتی جا رہی تھی۔ مجھے نہیں پروا تھی کہ کوئی گاڑی مجھے کچل جائے گی۔ بس میں چلتی چلی جا رہی تھی پھر نہ جانے کہاں گر گئی۔ ایسے میں چندا بائی کی گاڑی رکی تھی اور اس نے مجھے بٹھا لیا تھا۔ اس نے میری کہانی سنی تو مجھے اپنے پاس رکھ لیا' علاج معالجہ کرایا۔

اسی دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں ماں بننے والی تھی۔ مجھے قدم قدم پر' لمحے لمحے کی اذیت دینے کے لیے وہ تاریک رات میری کوکھ میں پلنے لگی اور میں نے بیٹی کو جنم دیا۔ اپنی بیٹی کا نام میں نے سیّدہ نورالنساء علی رکھا' اس کے حوالے سے میں نے بہت سے خواب دیکھے۔ میرا ہر خواب اس تاریک رات کے انتقام کے متعلق ہوا کرتا تھا' مگر پھر نوری مر گئی' میرے خواب

بکھر گئے۔ یہ خواب مجھے بہت پیارے تھے' میرا سرمایہ تھے۔

ہر روز میں ان خوابوں کے مرنے کا' راکھ ہو جانے کا ماتم کرتی تھی' ایسے ہی ایک دن مجھے ت ملیں۔ میری آنکھوں میں ایک بار پھر پرانے خواب روشن ہو گئے میں نے تمہیں نکھارا' سجا سنوارا' کتنے جتن کیے۔

نوری! آج وہ خواب پورے ہونے کا وقت قریب آیا ہے' میرا ساتھ دو گی؟''

''ہاں ممی!'' اس نے بلا تامل کہا۔

''آج وہ درندہ ہمارے گھر کے ڈرائینگ روم میں ہے۔ پیر صاحب رجب علی شاہ۔'' جنت بائی کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔

''میں اس سے اپنی کانٹوں بھری زندگی کے ایک ایک پل کا حساب لینا چاہتی ہوں۔ اذیت میں اسے دینا چاہتی ہوں' وہ اسے توڑ پھوڑ کر' مسل کر رکھ دے گی۔''

''مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی پہلے مرحلے میں صرف اتنا کہ اسے مکمل طور پر اپنا اسیر بنا لو اسے سوچنے سمجھنے کا مو نہ دو' اس کے حواس پر چھا جاؤ' اسے باندھ دو' جکڑ دو' یہاں تک کہ وہ تمہارے علاوہ کچھ بھی سو نہ پائے۔'' جنت بائی کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو بہت خوش تھی۔ عبداللہ کا تھیسس بہت اچھا جا رہا تھا اور اس نے خادم حسین اور کر والے معاملے کو بھی زیادہ طول نہیں دیا تھا۔ آج کل وہ بے حد مصروف تھا۔ کبھی کبھار تو یوں ہ تا کہ دو تین دن تک اس سے مل بھی نہیں سکتی تھی۔ کام کے دوران یوں بھی وہ ڈسٹرب کیے ج پسند نہیں کرتا تھا۔ فارغ ہو کر وہ خود ہی ماہ بانو کے پاس چلا آتا تھا اور پھر دونوں مل کر ڈھیر سار باتیں کرتے تھے۔

مگر سب سے زیادہ خوشی اسے اس بات کی تھی کہ ابا جی امریکہ جانے پر راضی ہو گئے تھے اس کے دوستوں نے مسلسل بحث کر کر کے انہیں قائل کر ہی لیا تھا۔ اور ان کے سب سے بڑ مسئلے کا حل بھی ایڈی نے پیش کر دیا تھا۔

''آپ اس بات کی فکر مت کریں انکل' ہمارا گھر ڈپلکس ہے۔ گھر کے دونوں حصے سا ساتھ ہونے کے باوجود دونوں علیحدہ ہیں۔ کینٹ کا علاقہ ہے اس لیے یوں بھی محفوظ ہے۔ آ اور بانو وہاں شفٹ کر جائیں۔ میری بہن شادی شدہ ہے اور لاہور سے باہر رہتی ہے۔ امی ا ہوتی ہیں۔ ان کا بھی دل لگ جائے گا۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس حصے میں بہن رہ رہی تھی۔ اب چلی گئی ہے تو گھر بالکل خالی خالی لگتا ہے۔''

ابا جی پھر بھی تذبذب میں تھے۔

''سوچ کیا رہے ہیں انکل' اتنا اچھا موقع ہے پلیز' آپ اس آفر سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ مجھے تو یہی سوچ سوچ کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کی پالٹری دیکھ کر ان امریکیوں کے بھی ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔'' نیہاں نے کہا۔

''انکل! اب مسئلہ کیا ہے۔ ماہ بانو اور آنٹی ادھر اچھے طریقے سے رہیں گی۔ پرانا گھر چھوڑنا پڑے گا لیکن اتنی قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے' کچھ بھی حاصل کرنے کے لیے۔'' جیمز نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

اور بالآخر وہ جانے پر راضی ہو ہی گئے تھے۔ چند دن میں انہیں امریکہ فلائی کر جانا تھا اور ماہ بانو اور اماں انہی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ابا جی چاہتے تھے کہ وہ ان کے سامنے ہی ایڈی کے گھر کے خالی حصے میں منتقل ہو جائیں۔ انہیں وہ مکان بہت پسند آیا تھا۔ صاف' شفاف اور وسیع' جگہ بھی بہت اچھی تھی اور کرایہ مناسب تھا۔ ایڈی کرائے وغیرہ پر راضی نہیں تھا' لیکن ابا جی کو اس طرح ان لوگوں کا وہاں رہنا گوارا نہیں تھا۔

اماں کا خیال تھا کہ ابا جی کا ہر فیصلہ ٹھیک ہوتا تھا۔ ماہ بانو کی شادی کے علاوہ انہوں نے کبھی کسی معاملے پر ابا جی سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ وہ اب بھی یہی سمجھتی تھیں کہ ان کا امریکہ جانے کا فیصلہ درست تھا' لیکن پھر بھی بعض اوقات وہ رو پڑتی تھیں۔ ماہ بانو اور ابا جی انہیں سمجھانے لگتے تھے اور وہ پھر ان کے ساتھ مل کر تیاریاں شروع کر دیتی تھیں۔

☆=====☆=====☆

ریشماں نانی ماں کے گھر پہنچی تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ کبھی اس کے گال چومتیں' کبھی ماتھا۔ ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ ریشماں پہلے تو ان کے گلے لگ کر روتی رہی پھر انہیں چپ بھی کرانے لگی۔

''پلیز نانی ماں آپ روئیں مت۔ میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔'' وہ بولی۔

''اب اسے بیٹھنے تو دو رضیہ کی ماں' یونہی ساری رات کھڑا رکھو گی کیا؟'' نانا جی نے ان سے کہا۔

''ہاں بیٹا بیٹھو۔ شاہ صاحب آپ بھی تشریف رکھیں۔'' انہوں نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہاں آپ کے شایانِ شان چیزیں نہیں ہیں۔ بس چھوٹا سا غریب خانہ ہے۔ ہم سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو ہمیں معاف کر دینا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔

اس نے چھوٹے سے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا' جو دو کمروں' ایک باورچی خانہ' ایک غسل خانہ اور صحن پر مشتمل تھا۔ اینٹوں کے بنے اونچے نیچے صحن میں ایک ترتیب کے ساتھ ڈھیروں گملے

پڑے ہوئے تھے، جن میں موسم کے مطابق بہت سے خوبصورت پھول کھلے ہوئے تھے۔ صحن کی دیوار کے ساتھ دو چار پائیاں کھڑی کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں تخت اور چند پرانی کرسیاں تھیں، جن پر کڑھائی والے کور چڑھا کر رکھے تھے۔ گھر صاف ستھرا تھا لیکن آرام دہ نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسی جگہ پر ریشماں دو دن کیسے گزار سکے گی۔

''نانی ماں! آپ کا گھر کتنا پیارا ہے۔'' ریشماں نے ان سے کہا۔ ''میں دیکھ لوں؟''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں، تمہارا اپنا گھر ہے، جہاں دل چاہے گھومو پھرو۔'' وہ جلدی سے بولیں۔

ریشماں اُٹھ کر کمروں اور گھر کے دوسرے حصوں میں جھانکنے لگی۔

''نانی ماں! یہ کس کا کمرا ہے؟'' اس نے اندر جھانکا۔

''یہاں ہم بڈھا بڈھی رہتے ہیں۔'' وہ بولیں۔

''اور یہ دوسرا والا؟ اچھا یہ بیٹھک ہے۔'' وہ اندر داخل ہوگئی۔

''یہ کسی زمانے میں تمہاری ماں اور خالہ کا کمرا ہوتا تھا۔ وہ دونوں چلی گئیں تو خالی ہوگیا۔ ان کی چیزیں اسی طرح یہاں پڑی رہتی تھیں، پھر تمہاری ماں کو اللہ تعالیٰ کا بلاوا آ گیا۔ میں اس کی ایک ایک چیز دیکھ کر گھنٹوں رویا کرتی تھی۔ اس وجہ سے تمہارے نانا نے اس کمرے کی ترتیب بدل دی۔'' انہوں نے بتایا۔

''اور اب بانو آتی ہے تو وہ کہاں رہتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اسے بھی یہی کمرا پسند ہے، یہیں رہتی ہے وہ۔''

''اکیلے میں دل نہیں گھبراتا نانی ماں آپ کا اور نانا جی کا؟''

''گھبراتا تو ہے، لیکن اس کا کیا علاج؟'' انہوں نے آہ بھری۔

وہ ان کے ساتھ باہر نکل آئی جہاں برآمدے میں مکرم بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

''تمہیں اچھا لگا ناں مکرم؟ یہ کتنا پیارا گھر ہے ناں؟''

مکرم نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں خوشیوں کے ہزار رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اس کا دل رکھنے کے لیے بولا۔

''ہاں بہت اچھا ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اتنے خوبصورت پھول، اتنا نکھرا نکھرا آسمان، یہ سب بہت خوبصورت ہے۔''

''رضیہ کے ابا! یوں نہیں لگتا جیسے زرینہ واپس آ گئی ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے ہماری سن لی ہو۔ وہ ہو بہو ایسی ہی تھی ناں۔'' نانی ماں اسے تک رہی تھیں۔

''ہاں۔'' انہوں نے آزردگی سے کہا پھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں مسجد جا رہا ہوں۔ رضیہ

...ں، تم ریشماں کو سلا دینا۔ یہ نہ ہو کہ اپنی خوشی میں بچی کی نیند خراب کرو۔''

ریشماں انہیں لاٹھی ٹیک کر آہستہ آہستہ چل کر جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر نانی ماں کی ...واز پر چونکی۔

''زرینہ نیند کی بہت شوقین تھی۔ تمہیں بھی نیند تو آئی ہوگی؟''

''میرا تو آپ سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔'' وہ بولی۔

''اچھا تو تم لیٹ جاؤ میں تمہارے پاس بیٹھ کر تم سے باتیں کرتی جاؤں گی۔ یہیں زرینہ ...لے کمرے میں آ جاؤ۔'' پھر وہ مکرم سے مخاطب ہوئیں۔

''شاہ صاحب! آپ اس کمرے میں آرام کریں، میں بہت شرمندہ ہوں۔ یہ جگہ آپ ...شایانِ شان نہیں ہے۔''

مکرم سگریٹ فرش پر جوتے کے ساتھ مسل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''مگر آپ اور نانا جی کہاں سوئیں گے؟'' ریشماں نے پوچھا۔

''تمہارے نانا تو مسجد سے دیر سے آئیں گے۔ ہم باہر سو جائیں گے۔'' وہ بولیں۔

''لیکن یہ تو اچھی بات نہیں ہے، آپ لوگ بھی اندر سو جائیں، ہم بھی اندر سو جائیں گے۔ ...نے میں کون سی بڑی جگہ چاہیے ہوتی ہے۔''

''اچھا تو ہم بھی تمہارے والے کمرے میں سو جائیں گے، خوش؟''

''ریشماں آپی اکیلے کمرے کی عادی ہیں، لیکن اگر جگہ کم ہے تو وہ میرے والے کمرے ...آ جائیں گی لیکن اس کے علاوہ کہیں نہیں۔'' مکرم نے اپنے مخصوص حکمیہ لہجے میں کہا۔

ریشماں اسے دیکھے گئی۔ نانی ماں شرمندہ ہوگئیں۔

''جگہ بہت ہے شاہ صاحب! جیسا آپ مناسب سمجھیں گے، ویسا ہوگا۔''

وہ مکرم والے کمرے میں آ گئی۔ یہاں دو چار پائیاں تھیں، مکرم کے بیٹھتے ہی چار پائی سے ...ں'' کی آواز آئی۔ اس نے اس گھر کو زیر لب گالی دی اور جوتے اتارنے لگا۔

''بابا جان کو نانا، نانی کے گھر ہی بھجوانا تھا تو ہمارے نانا، نانی بھی تو تھے۔ وہاں حویلی میں نہ ...ے کا مسئلہ تھا اور نہ ہی جگہ کی کمی۔ کیا واہیات مکان ہے۔ ایک بھی ڈھنگ کی چیز نہیں ہے ...۔'' اس نے سوچا۔

''مکرم!'' ریشماں نے اسے پکارا۔ وہ چار پائی کے اوپر ٹانگیں کر کے بیٹھا تھا۔

''ہوں۔''

''ایک بات کہوں، برا مت ماننا۔''

''آپ سو باتیں کہیں آپی، آپ کی بات کا برا کون مان سکتا ہے؟''

''پلیز نانا جی یا نانی جی سے سختی سے بات مت کرنا یہی سوچ کر کہ وہ بزرگ ہیں، ہم سے عمر

میں بہت بڑے ہیں، قابلِ عزت ہیں۔''
''مگر میں نے تو ان سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔'' وہ بولا۔
ریشماں خاموش ہوگئی۔ اسے اندازہ تھا کہ مکرم کا یہ لہجہ اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ اسے خو
بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اس نے کسی سے سخت لہجے میں بات کی تھی۔
وہ دو دن ریشماں کی زندگی کے خوبصورت ترین دن تھے۔ مکرم سخت بور ہو چکا تھا، لیکن
ریشماں کی خوشی کی خاطر دو دن کی یہ سزا بھگت رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہاں آ کر
ریشماں اتنی خوش کیسے ہوگئی تھی۔ اس کے نزدیک تو وہ دنیا کی واہیات ترین جگہ تھی۔
پہلے روز اس نے صبح ہی صبح نانی ماں کو گھر میں جھاڑو لگاتے دیکھا تو ان کے پاس چل
آئی۔
''آپ رہنے دیں، میں لگاؤں گی جھاڑو۔''
نانی ماں کو یہ گوارا نہیں تھا، لیکن اس نے زبردستی جھاڑو ان کے ہاتھ سے چھین لی۔
مکرم یہ تمام منظر کمرے سے دیکھ رہا تھا۔ پہلے ہی اس کا موڈ سخت آف تھا۔ صبح صبح جھاڑ
کی جھر جھر سن کر اس کی نیند اُچاٹ ہوگئی تھی۔ پہلے ہی ساری رات بے آرامی میں گزری تھی۔
بمشکل تمام آنکھ لگی تھی کہ صبح کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ انتہائی بدمزگی کے عالم میں وہ باہر نکل آیا۔
ریشماں جھاڑو لگانے کے لیے جھکی ہی تھی کہ وہ اس کے سر پہنچ گیا اور نانی ماں سے مخاطب
ہوا۔
''کیا ریشماں آپی یہ گھٹیا کام کریں گی؟''
ریشماں ٹھٹک کر رک گئی۔ نانی ماں مکرم کے انداز و اطوار سے واقف تھیں، گڑبڑا گئیں۔
''شاہ صاحب! اس نے زبردستی لی ہے۔ میں نے منع بھی کیا تھا۔''
''کریمن۔'' وہ کڑک کر بولا۔ ''اندھی ہوگئی ہو، دکھائی نہیں دیتا تمہیں، تم نے بی بی کے
ہاتھ سے جھاڑو کیوں نہیں لی؟''
کریمن گڑبڑا کر آگے بڑھی اور جلدی سے جھاڑو ریشماں کے ہاتھ سے لے لی۔
ریشماں کے لیے مارے شرمندگی کے نانی ماں سے آنکھ ملانا مشکل ہو رہا تھا۔ مکرم واپس
کمرے کی طرف پلٹا تو وہ بھی اندر چلی آئی۔
''مکرم! تم نے ایسے کیوں کیا؟'' وہ رو دینے کو تھی۔
''کیا مطلب؟ میں نے کیا کیا ہے؟''
''نانی ماں سے جھاڑو میں نے خود لی تھی اور تم نے انہیں اتنے زور سے جھڑک دیا۔ مجھے تم
نے کہا تھا کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔''
اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ایسا کیا کہہ دیا ہے، جس کی وجہ سے ریشماں رونے

ہو رہی تھی۔
''آپی! میں نے تو بس اتنا کہا تھا کہ جھاڑو کریمن لگا دے، آپ بھلا کیوں یہ گھٹیا کام
یں۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
''یہی کام مکرم! میری ماں نے بھی کیے تھے اور میری نانی بھی کر رہی تھیں۔ اسے گھٹیا
رے اپنے ذہن نے بنایا ہے۔ گھر گندا پڑا رہے تو اچھی بات ہے اور جھاڑو پکڑ کر صاف کر لیا
ے تو گھٹیا کام ہو جاتا ہے، کیوں؟''
''اوہو آپی! آپ تو ناراض ہوگئیں، میں نے تو آپ کے آرام کے خیال سے کہا تھا۔'' وہ

''تم میرے آرام کی فکر مت کرو۔ میں اسی طرح خوش ہوں۔''
مکرم خاموش ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ وہ خود تو آپی کو زندگی کے تجربات حاصل کرنے کی
ں سے لایا تھا اور خود ہی انہیں اس سے دور کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ریشماں کو کسی کام
بھی نہیں روکا۔ اس نے کھانا پکانے کی کوشش کی۔ بدشکل روٹیاں پکائیں، صحن میں پانی کا
کاؤ کیا۔ موتیے کے پھولوں کے گجرے بنائے اور نہ جانے کیا کیا۔ شروع میں تو نانی ماں گھبرا
اسے منع کرتی تھیں یہ سوچ کر کہ کہیں مکرم خفا نہ ہو جائے مگر بعد میں اسے خاموش دیکھ کر
ں نے ریشماں کو اس کی مرضی سے ہر کام کی اجازت دے دی۔
مکرم سوچ رہا تھا کہ اس گھر کے مکینوں کی زندگی کتنی محدود تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ
ی زندگی کے نئے تجربات حاصل کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے بہت کچھ دیکھا اور محسوس کیا

ریشماں کی نانی ماں تھیں جو اس پر واری صدقے ہوئے جا رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں
ا تھا کہ دنیا کی کون کون سی نعمتیں اس کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ کبھی ان کی آنکھوں میں نمی اتر
تی، مگر وہ اسے ریشماں کے سامنے ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ ہاں جب اس کے نانا جی آ جاتے
اور ریشماں سامنے نہیں ہوتی تھی تو رو پڑتی تھیں۔
''ریشماں کو دیکھ کر مجھے زرینہ یاد آنے لگتی ہے، کبھی کبھار یوں لگتا ہے، جیسے قدرت کو ہم پر
ا آ گیا ہو، مگر پھر جب یہ سوچتی ہوں کہ ریشماں یہاں سے چلی جائے گی تو دل ڈوبنے لگتا
۔ زرینہ بھولی تو کبھی نہیں تھی مگر اس کی بیٹی پر نگاہ پڑتے ہی پچھلے زخم پھر کھل جاتے ہیں۔ وہ
ب میں آ کر مجھ سے روتے ہوئے کہتی ہے۔ اماں میں نے آپ سے اپنے لیے کوئی شکوہ نہیں
لیکن میری بیٹی کو کوئی دکھ نہ ہونے دینا۔ ہم تو کچھ نہ کر سکے مولوی صاحب نہ اپنی بیٹی کے
اور نہ ریشماں کے لیے۔ اس سے اتنا بڑا قصور بھی سرزد نہ ہوا تھا۔ چھوٹی سی بچی تو تھی اس
نادان تھی، ہم نے اپنی ضد میں اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔''

ان کی باتیں سن کر مکرم خاموش ہو گیا تھا۔

''چھوٹی اماں کا ذکر اس انداز میں کیوں؟ ان سے کیا خطا سرزد ہوئی تھی' جس کا ریشماں آپی کی نانی ماں حوالہ دے رہی ہیں۔''

مگر انہوں نے کبھی واضح انداز میں کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

ریشماں کو خوش دیکھ کر البتہ وہ بھی خوش تھا۔ حیران تو تھا ہی کہ اسے اس چھوٹے سے بے آرام گھر میں اتنے فضول سے کام کرنے میں کیا مزہ مل رہا ہے' لیکن اس سے بڑھ کر وہ خوش تھا کتنے دن بعد اس نے ریشماں کو کھلکھلا کر ہنستے دیکھا تھا۔

جب وہ کپڑے دھونے کی کوشش میں پوری بھیگ جاتی' جب روٹیاں پکاتے ہوئے ان کی عجیب وغریب شکل دیکھ کر خود ہی ہنسنے لگتی' جب مکرم کو سگریٹ فرش پر پھینکتے دیکھ کر اسے گھورتے ہوئے ایش ٹرے کے طور پر چھوٹی سی کٹوری لا کر دیتی' جب نانی ماں سے اپنے لمبے بالوں میں ڈھیر سارا تیل لگواتی اس نے ایک ایک لمحہ خوشی کے عالم میں گزارا تھا۔

''مکرم! تم میرے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹی کھاؤ گے یا نانی ماں کے ہاتھ کی؟ نانی ماں نے تمہارے لیے بطور خاص پکائی ہے' کہہ رہی تھیں کہ تم میری والی روٹیاں نہیں کھا سکو گے۔'' وہ آ کر کہتی۔

''آپی! آپ کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیاں ہی کھاؤں گا۔'' وہ اس کا دل رکھنے کو کہتا۔

وہ کچی پکی روٹیاں اس کے سامنے رکھ دیتی اور پھر خود بھی ان کی شکل وصورت دیکھ کر ہنسے چلی جاتی۔

''دیکھو مکرم! یہ والی روٹی کچھ کچھ اٹلی کے نقشے سے نہیں ملتی؟ اور یہ جرمنی جیسی روٹی دیکھو اس میں برلن وال بھی ہے۔''

رات کا کھانا کھاتے ہوئے اسے اچانک ہی خیال آیا۔

''مکرم! بابا جان سے میری ایک سفارش کر دو گے؟''

''ارے آپی! سفارش کی کیا بات ہے' آپ کی تو کوئی بات بابا جان خود بھی نہیں ٹالتے۔''

''نہیں' مگر میں ان سے کہہ نہیں سکتی۔ پلیز تم ان سے کہہ دو کہ وہ مجھے کچن میں جانے کی اجازت دے دیں۔''

''آپ کا دل نہیں بھرا ان کاموں سے؟''

''مجھے تو بہت مزے کے لگے ہیں یہ کام۔'' وہ بولی۔

''بس تم بابا جان سے مجھے اجازت دلوا دو۔ میں چائنیز' فرنچ اور اٹالین کھانے پکانے سیکھوں گی۔''

وہ مسکرا دیا۔ ''ٹھیک ہے۔''

ریشماں کے ذہن میں عبداللہ کا خیال آ رہا تھا...... ماہ بانو نے بتایا تھا کہ اسے چائنیز' فرنچ اور اٹالین کھانے پسند تھے۔ وہ خود کو مکمل طور پر عبداللہ کی پسند میں ڈھال دینا چاہتی تھی۔

☆=====☆=====☆

عبداللہ کے لیے اماں اور بابا جان کا وہاں آنا بہت خوشگوار سرپرائز تھا۔

''آپ نے مجھے جگا دیا ہوتا۔ کمال ہے میں اتنی گہری نیند میں تھا کہ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔'' اس نے ناشتا کرتے ہوئے کہا۔

''تھک کر سوئے تھے ناں' اس لیے نیند گہری تھی۔ ایسے میں کیسے جگا دیتی تمہیں۔'' اماں جان نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ لوگوں نے اطلاع بھی کوئی نہیں دی۔''

''بس اچانک ہی پروگرام بنا' تمہاری اماں تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔'' بابا جان نے کہا۔

''اماں! آپ ہی یاد کرتی رہیں یا بابا جان نے بھی یاد کیا؟'' اس نے اماں جان کے ہاتھ سے مکھن لگا توس لیا۔

''تمہارے بابا جان کی تو تم میں جان ہے' یہ کہتے نہیں ہیں تو یہ نہ سمجھا کرو کہ تمہیں یاد نہیں کرتے۔''

''اچھا اماں جان ایسا ہے کہ مجھے کچھ ضروری کام ہے' میں واپس آ کر آپ کے ساتھ تفصیلی ملاقات کروں گا۔'' وہ بولا۔

''کیوں ایسا کیا کام ہے؟''

''میری فرینڈ ہے ماہ بانو' اس کے ابا جی امریکہ جا رہے ہیں۔ ان کی فلائیٹ ہے۔ آج مجھے انہیں ایئر پورٹ لے کر جانا ہے۔'' اس نے جلدی جلدی چائے حلق میں اتاری۔

''بہت ضروری ہے کہ تم ہی انہیں ایئر پورٹ چھوڑنے جاؤ؟ وہ خود نہیں جا سکتے؟'' بابا جان نے سگار سلگاتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا۔

''ان کے پاس کار نہیں ہے' مجھے بھی منع کر رہے تھے کہ ٹیکسی میں چلے جائیں گے' لیکن میں نے خود اصرار کیا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا اور اماں اور بابا جان کو پیار کر کے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

شک تو بابا جان کو کافی عرصے سے تھا کہ ماہ بانو اور عبداللہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت عام دوستی سے کچھ بڑھ کر رہی تھی' مگر کل رات اس کے کمرے میں ماہ بانو کے ڈھیر سارے اسکیچ اور اس کا مجسمہ دیکھ کر ان کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ انہیں احساس ہوا کہ وقت کا پہیہ ایک مرتبہ پھر پچیس سال پیچھے کی طرف گھوم گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

زہرا اور زینب اب تک امریکہ میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکی تھیں۔ فرق اتنا تھا کہ زہرا پڑھائی پر زیادہ توجہ دے کر اپنا ذہن دوسری باتوں کی طرف سے بٹا لیا کرتی تھی۔ زینی کے ساتھ مسئلہ دوسرا تھا۔ اس نے کبھی بھی ذہنی طور پر اپنے خاندان کے بکھر جانے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ بالآخر وہ گاؤں واپس گئی تھی، تب بھی وہ وہاں کی پابندیوں سے گھبرا گئی تھی، مگر اب وہ محسوس کرتی تھی کہ وہ سب کچھ امریکہ چلے آنے سے بہر حال بہتر تھا اور کچھ نہیں تو وہاں سب اپنے تو تھے۔ اپنی مٹی سے اپنائیت کی خوشبو تو آتی تھی۔

سبط اب بھی قدم قدم پر اس کا حوصلہ بڑھاتا تھا اسے گھمانے پھرانے لے جاتا تھا، مگر وہ کسی طور بہل نہیں رہی تھی۔

عموماً سبط ہی اس کے اپارٹمنٹ میں چلا آتا تھا۔ زینی کو وہ اپنے اپارٹمنٹ میں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ وہاں خادم حسین کی موجودگی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ پہلے سے ذہنی طور پر پریشان زینی اسے دیکھ کر یا اس کی کسی حرکت سے مزید پریشان ہو، مگر اس روز خادم حسین کا تفریح کی غرض سے باہر نکلنے کا ارادہ تھا اور سبط کا خیال تھا کہ وہ اتنی جلدی واپس نہیں آئے گا، اس لیے وہ زینی کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔

پہلے دونوں کچھ دیر پڑھائی میں مصروف رہے لیکن زینی کا پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

''بس کرو سبط! میں نے نہیں پڑھنا۔'' اس نے اکتا کر کتاب کچھ فاصلے پر پٹخ دی۔

''پڑھنا کیوں نہیں ہے؟''

''میرا دل نہیں چاہ رہا، کسی کام کو بھی دل نہیں چاہ رہا، نہ پڑھنے کو نہ کسی سے بات کرنے کو۔''

''مجھ سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا؟'' اس نے رسان سے کہا۔

''تمہیں بھی تو بور کرتی رہتی ہوں ناں ایک ہی بات دہرا کر، تم بھی ایک دن تنگ آ جاؤ گے۔''

''اب تک تنگ نہیں آیا تو یقین کرو آئندہ بھی نہیں آؤں گا۔'' سبط نے شرارت سے کہا۔

زینی نے پہلے اسے گھورا پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''میرا مذاق اُڑا رہے ہو ناں، دیکھنا مجھے موقع ملا تو میں بھی نہیں بخشوں گی تمہیں۔''

غمِ جہاں ہو رُخِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

سبط نے کہا۔

''ہائے سبط! تمہیں کتنی اچھی اردو پوئٹری آتی ہے تمہیں مشکل نہیں لگتی؟'' زینی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کہیں باہر چلیں گھومنے کے لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔ پہلے ہی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اس مرتبہ تو میں فیل ہو جاؤں مجھے اچھے طریقے سے پتا ہے۔''

''زہرا بھی تمہارے ساتھ ہے...... تم نے تو پڑھنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اس سے کیا فائدہ نہیں؟'' سبط نے کہا۔

''مجھے نہیں پتا، میرا دل ہی نہیں لگتا کام میں، مجھے اماں، بابا جان اور بھائی بہت یاد آتے مری میں گزرنے والے دن یاد آتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ وہ وقت پلٹ آئے۔ ین نہیں یاد آتے وہ دن؟''

''ان دنوں کو یاد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن انہیں اپنے ذہن پر سوار کر لینا ہے۔ اُس وقت تم گوویسٹ سن کر یہاں آنے کی دعائیں مانگتی تھیں۔ نہ تم اُس وقت خوش ں اور نہ آج ہو۔''

''پہلے تو خوش رہتی تھی ناں جب تک تم میرے لیے صرف میرے اپنے سبط تھے، اب تم ے بابا جان کے بیٹے بھی ہو، بڑی حویلی کے مکین بھی ہو۔ تمہارے بھائی، میرے بھائی کو قاتل ے ہیں، انہیں قتل کرنا چاہتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ وہ خود کیا کرنے نکلے تھے۔ اس روز عبداللہ ی کو خبر نہ ہوتی تو وہ تو گڑیا کو اغوا کر چکے تھے ناں۔ پھر پہل بھی تمہارے بھائیوں نے کی۔ اس سیلف ڈیفنس کے لیے بھائی نے گولیاں چلائیں تو کیا برا کیا، لیکن تمہارے بھائیوں کے سر خون سوار ہے، وہ ہمیں بھی کبھی خوش نہیں رہنے دیں گے۔'' اس نے ہونٹ کاٹے۔

''پرانی باتیں دہرانے کا کیا فائدہ ہے۔ تم یہ سب بہت پہلے سے جانتی تھیں، یہ تمہارے ی کوئی نئی بات نہیں ہے۔''

''ہاں بہت پہلے سے جانتی تھی، لیکن تمہیں چھوڑ تو نہیں سکتی ناں۔ کس سے شیئر کروں میں ب کچھ؟ گڑیا یا بھائی سے کہوں گی تو وہ بہت اطمینان سے کہہ دیں گے کہ ہم نے یہ سب تمہیں ی سمجھایا تھا لیکن تم نہیں سمجھیں۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ مجھے ان کی باتیں سن کر اور غصہ آئے پہلے سے زیادہ دُکھ ہوگا۔

مشکل تو یہ ہو گئی ہے کہ اب تم سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم یہ سمجھو کہ میں رہی ہوں کیونکہ ایسا نہیں ہے، مگر میں پریشان تو ہوں ناں، پہلے بھائی کی طرف سے پریشان ب تمہاری طرف سے بھی ہوں۔ اس روز اگر تمہارے مکرم بھائی تمہیں کچھ کر دیتے تو کیا م سے میں وہیں پر خودکشی کر لیتی۔ اس دن کے بعد کتنے دن تک مجھے نائٹ میئرز آتے بھی خواب میں دیکھتی تھی کہ وہ تمہیں مار رہے ہیں، کبھی دیکھتی تھی کہ بھائی پر گولیاں چلا یں اور اب میں اماں، بابا اور بھائی سے دور ہوں تو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت میں

خوفزدہ رہتی ہوں۔ میرا بھائی بہت غیر محفوظ ہے۔ مجھے پتا ہے کہ میں وہاں رہ کر بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی مگر یہ تسلی تو رہتی ہے ناں کہ وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔'' وہ رو پڑی۔

خادم حسین اپنے کمرے کی روشنی گل کر کے وہیں لیٹا ہوا تھا۔ زینی اور سبط کی تمام تر گفتگو اس تک پہنچ رہی تھی۔ اس کے سر میں صبح سے ہلکا ہلکا درد تھا' مگر شام تک اس کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ باہر نکلنے کا پروگرام ملتوی کر کے اپنے کمرے میں ہی لیٹ گیا تھا۔ پھر اسے خبر نہیں ہوئی' کہ کب اسے نیند نے آ لیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب سبط اور زینی پڑھ رہے تھے۔

اسے سبط کا زینی کو اپنے اپارٹمنٹ میں لانا اچھا نہیں لگا تھا' لیکن وہ مکرم کی طرح اس بات پر اس سے جھگڑنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ اس بات پر سبط کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس پر اپنی یہ کمزوری بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا وہ زینی کے حوالے سے اس کے سامنے سبط کو کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا' اس لیے خاموشی سے اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔

زینی رو رہی تھی اور سبط اسے چپ کرا رہا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر ہم نے ایسا کیا کیا ہے' جس کی وجہ سے سب ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔ میں نے بابا جان سے پوچھا تو انہوں نے بھی ٹال دیا۔ کہنے لگے کہ بس زمینوں کے جھگڑے ہیں' اور کچھ نہیں۔ میں نے ان سے اتنا کہا' بابا جان! آپ چھوڑ دیں زمینیں' نہیں چاہئیں ہمیں ایسی زمینیں جن سے ہمارے بھائی کی جان چلی جائے۔ مجھے بتاؤ سبط کہ ان زمینوں میں کیا ہے۔ ان سے اٹھنے والے طوفان کو جانتے ہوئے بھی کوئی ان سے دستبردار ہونے پر راضی نہیں ہے۔''

سبط جانتا تھا کہ وہ زمینوں کے اس مفہوم سے واقف ہی نہیں تھی جسے کوئی زمیندار ہی سمجھ سکتا تھا۔ اس کے نزدیک اس سارے مسئلے کا حل بہت آسان تھا' بس زمینیں چھوڑ دیں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم نے تو سارا پیسی فک اوشن آج ہی آنکھوں کے راستے بہانا ہے' مگر مائنڈ نہ کرنا مجھے بہت سخت بھوک لگ رہی ہے۔ تم اپنا یہ شوق پورا کرو' میں اتنی دیر میں کچن میں جھانک آؤں۔''

سبط نے زینی کا دھیان بٹانے کے لیے نئی ترکیب سے کام لیا۔

''میں اتنی سیریس گفتگو کر رہی ہوں اور تمہیں کھانے پینے کی فکر ہے۔ جاؤ میں نہیں بولتی تم سے۔''

''اس سمندری طوفان کا مقابلہ اسی وقت کر سکتا ہوں ناں' جب کھا پی کر کچھ جان میں جان آئے۔'' وہ اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

زینی منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ جب سبط کچن تک پہنچ گیا تو وہ بھی گود میں رکھا ہوا کشن قالین

پھینک کر' آنکھیں پونچھ کر اور ناک رگڑ کر جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''سبط پلیز! مجھے بھی کچھ دو کھانے کے لیے' مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔''

خادم حسین کتنی دیر تک کچن میں ابھرنے والے ان کے قہقہے سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد دونوں لِونگ روم میں واپس آ گئے۔

''سنو سبط! اگر اس وقت تمہارے بھائی اپارٹمنٹ میں واپس آ گئے تو کیا ہو گا؟ تمہیں ڈانٹیں گے تو نہیں' یا پھر مجھے ہی کچھ کہیں گے؟'' اس نے صوفے پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میرے بھائی بہت مہذب ہیں' افریقہ کے جنگلی نہیں ہیں کہ گھر آئے مہمان کے ساتھ بدسلوک کریں۔''

''خیر جانے دو' جیسے میں نہیں جانتی۔ اس روز تم نے ہی حویلی میں کہا تھا کہ اگر تمہارے بھائی کو میری اصلیت کا علم ہو جاتا تو وہاں خدانخواستہ کسی ایک کی لاش پڑی ہوتی۔ اور جو اس روز انہوں نے ریوالور نکال لیا تھا۔ وہ بھول گئے تم؟ میں تو کبھی نہیں بھول سکتی۔''

''میں بڑے بھائی کی بات کر رہا ہوں مکرم کی نہیں۔''

''ویسے سچ کہوں سبط! مکرم بھائی اتنے ہینڈسم ہیں کہ میرا تو ان کے آدھے گناہ معاف کر دینے کو دل چاہتا ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''تم مجھے جلایا مت کرو۔'' اس نے گھورا۔

زینی پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''چلو اب تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو۔'' وہ بھی کتابیں سمیٹ کر تیار ہو گئی۔

دو گھنٹے بعد جب سبط اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو خادم حسین ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

''آپ کب آئے بھائی؟'' اس نے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

''اس بات کو جانے دو' صرف اتنا یاد رکھو کہ آئندہ کبھی بھی' کسی بھی صورت میں زینی کو اس اپارٹمنٹ میں نہیں آنا چاہیے۔ میں اتنا مہذب بھی نہیں ہوں کہ گھر آئے دشمن کو بار بار معاف کر دوں۔''

☆=====☆=====☆

وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ عبداللہ وغیرہ تھیسس میں مصروف تھے اور ماہ بانو وغیرہ کی کلاسیں جاری تھیں۔ ان دنوں ڈرائنگ کی ایک ہفتے کی کلاس کے بعد منی ایچر کی پانچ سالہ کلاس بھی ختم ہونے والی تھی۔ فائنل امتحانوں میں کچھ زیادہ دن نہیں رہ گئے تھے۔ ان امتحانوں کے فوراً بعد فائنل ایئر کا تھیسس ڈسپلے تھا اور پھر انہیں کالج سے فارغ ہو جانا تھا۔

"اوہ گاڈ! یہ منی ایچر کی مصیبت کب ختم ہوگی۔" نیہاں نے فگرو دلینڈ اسکیپ اینڈ آرکیٹکچر کی اسائنمنٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ہے تو مشکل کام منی ایچر' لیکن اب اتنا مشکل بھی نہیں ہے اور تم تو اچھا بھلا کام کر لیتی ہو......" ماہ بانو بولی۔

"میں ان گانوں سے تنگ آ گئی ہوں' جو سر لگا کر رکھتے ہیں۔ شمشاد بیگم سے کم کی تو بات ہی نہیں کرتے کبھی۔ ایک دو تین' آیا موسم ہے رنگین۔ اور کبھی برسات میں پتا نہیں کس کس سے کون کون ملا۔ یہ پانچ ہفتے تو لگتا ہے' پل صراط پر چلتے ہوئے گزارے ہیں ہم نے۔" نیہاں نے کہا۔

"ہاں بقول سر کے یہ ایسٹرن آرٹ ہے اور پھر ان کا بھی کیا قصور' انگریزی انہیں آتی نہیں ہے۔ ترس آتا ہے مجھے ان کی صورت دیکھ کر۔" اُما ہنسی۔

"میرا تو دماغ پلپلا ہو گیا ہے۔ میں کب کہتی ہوں کہ انگریزی کے گانے لگائیں۔ اُردو کے ہی لگائیں لیکن کسی انسانی دور کے تو لگائیں۔" نیہاں بولی۔

"بانو' انکل کا کوئی خط یا فون آیا؟" اُما نے اس سے پوچھا۔

"ہاں' پرسوں ہی فون آیا تھا۔ مجھے بتانے کا خیال نہیں رہا۔ کہہ رہے تھے کہ میرے لیے انہوں نے کچھ بھیجا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بھیجا ہے تو انہوں نے بتایا نہیں۔ کہنے لگے کہ خود پتا چل جائے گا۔

میں کہتی تھی ناں اُما کہ موقع ملنے کی بات ہے صرف میرے ابا جی کو موقع ملا تو انہوں نے خود کو منوا کر دکھایا...... وہاں سب ابا جی سے اتنے امپریس ہیں۔ ابا جی کو اپارٹمنٹ ملا ہوا ہے' کار ہے سب کچھ ہے ان کے پاس۔ پتا ہے ابا جی چاہتے ہیں کہ فائنل امتحانوں کے بعد ہونے والی چھٹیاں ہم ان کے پاس امریکہ میں ہی گزاریں' میرے اور اماں جی کے لیے بہت اداس ہوتے ہیں' وہ ہمیں بھی اتنا یاد آتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔"

"میرے ڈیڈی بھی ہفتہ بھر کے لیے لاہور آ رہے ہیں کام کے سلسلے میں۔" نیہاں نے اس سے کہا۔ "میں ملواؤں گی تمہیں ان سے۔"

"ہاں ضرور۔" پھر وہ اُما سے مخاطب ہوئی۔ "تمہاری ممی کی طرف سے پھر تو خط یا فون نہیں آیا آنند کے سلسلے میں؟"

"ہر روز خط بھی پہنچ جاتا ہے اور فون بھی۔ خط ہیما کا' فون ممی کا۔ بڑی مشکل ہے بانو' سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔" اُما نے کہا۔

"میری مانو اُما تو تم اس سلسلے میں ایڈی سے ضرور بات کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ کل تم اس بات پر پچھتاؤ کہ اگر تم نے ایڈی سے ذکر کر لیا ہوتا تو شاید کوئی راہ نکل آتی۔ اپنے لیے کوئی بھی

دروازہ بند مت کرو' اچھے طریقے سے سوچو اس مسئلے پر۔" ماہ بانو نے کہا۔

"اس کا تھیسس ڈسپلے ہو جائے ناں۔"

"بھاڑ میں گیا اس کا تھیسس۔" نیہاں کو غصہ آ گیا۔

"تھیسس ڈسپلے کے بعد تم سدھار جاؤ گی سکھر اور وہاں سے ایک دن ہمیں اور ایڈی کو تمہاری شادی کا کارڈ موصول ہو جائے گا۔ حد کرتی ہو تم بھی' ساری زندگی تباہ کرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"وہ تو ہو ہی گئی ہے' مزید کیا تباہ ہو گی۔"

"میری بات سنو اُما! ایڈی کے ساتھ اتنا برا سلوک مت کرو' ٹھیک ہے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا لیکن تم ایڈی کو اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تو کر لو۔" نیہاں نے کہا۔

"وہ بچہ نہیں ہے' میں نتائج سے بے پروا نہیں تھی تو کیا وہ بے خبر تھا؟ اسے بھی اچھے طریقے سے پتا تھا کہ بالآخر یہی ہوگا۔ اب تک وہ ذہنی طور پر تیار بھی نہیں ہوا ہوگا کیا؟ نہیں وہ ذہنی طور پر تیار ہوگا یوں بھی یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے منہ سے' اپنی زبان سے اسے کچھ بتاؤں۔" اُما کا موڈ آف ہو گیا۔

"جانے دو تم' میں اس سے بات کروں گی۔ کم از کم اسے اچانک اتنا بڑا شاک تو نہ پہنچے گا۔" نیہاں نے کہا۔

"تم سب کو اس کی فکر ہے اور جو میری جان پر بنی ہوئی ہے' اس کی پروا کسی کو نہیں۔"

"ہم سب کو تمہاری پروا ہے' لیکن بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں' جب تک تم خود کچھ نہیں کرنا چاہو گی......" ماہ بانو نے کہا۔

"میرا تو سر درد سے پھٹ جائے گا۔ اُٹھو چلو کیمز چلتے ہیں۔" اُما نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا اتنا ڈھیر سارا کام رہتا ہے ابھی۔" نیہاں بولی۔

"اُٹھو تم' میں کچھ نہیں سنوں گی۔" اُما نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

وہ تینوں کیمز میں چلی آئیں اور کرسیاں دھوپ میں رکھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے قریب ہی کرسی میز پر فائنل ایئر کی چند طالبات بیٹھی ہوئی تھیں۔

"بانو' تم ایڈی سے بات کر سکتی ہو اُما کے بارے میں؟" نیہاں نے پیپسی پیتے ہوئے کہا۔

"وہ کام میں مصروف ہے۔ اس کی امی کو بھی اس سے بہت شکایت ہے کہ دو دو دن اس کی شکل نظر نہیں آتی' ہاں اگر مل گیا تو ضرور بات کروں گی۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ یہ اپنی حماقت میں سب کچھ گنوا بیٹھے جو اسے مل سکتا تھا۔"

"ویسے اُماتم اپنے گھر والوں سے اس بارے میں بالکل بات نہیں کر سکتیں کیا؟" نیہاں نے کہا۔

"ایک لمحے کو فرض کر لو کہ میں کر سکتی ہوں ان سے بات پھر کیا ہوگا؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے ایڈی کے ساتھ رخصت کر دیں گے کہ جاؤ بیٹا اس مسلمان سے شادی کر لو اور پھر بہت سی باتیں ہیں جو میں تم لوگوں کو بھی نہیں بتا سکتی۔ میرا بھائی اسے تو وہ طوفان اُٹھائے گا کہ نہ پوچھو۔ اسے یوں بھی پاکستان سے، اس مٹی اور یہاں کے رہنے والوں سے کوئی محبت تو کیا انسیت بھی نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ میری اور ہیما کی پاکستان میں کہیں شادی ہو۔"

وہ خاموشی سے پیپسی پینے لگیں۔

ساتھ کی میز پر بیٹھی باتیں کرتی افشین، ربیعہ اور نازنین کی آوازیں واضح ہو گئیں۔ وہ بھی فائنل ایئر کے تھیسس کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی باتوں میں جیمز کا ذکر آیا تو نیہاں کے کان کھڑے ہو گئے۔

"ہائے افشین! تمہیں پتا ہے جیمز رائل پارک میں رہتا ہے اور وہیں سینما کے بورڈز بھی پینٹ کرتا ہے۔" نازنین نے کہا۔

"ریئلی؟" افشین نے آنکھوں میں حیرت بھر کر پوچھا۔

"اوہ یس! اور کیا۔" نازنین بولی۔

"تب ہی، تم نے کبھی نوٹ کیا کہ اس کی ڈرائنگ کتنی اچھی ہے؟" ربیعہ نے کہا۔

"ہاں ظاہر ہے، چالیس فٹ کی انجمن بنائے گا تو ڈرائنگ تو خود ہی اچھی ہو جائے گی۔" افشین نے ہنس کر کہا تو ان دونوں نے بھی قہقہہ لگایا۔

نیہاں کو ان کا جیمز کے متعلق اس انداز میں باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"ویسے تمہیں کس نے بتایا نازنین؟" اس نے پوچھا۔

"لگتا تو بالکل نہیں ہے، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی یار۔ He is so handSome"

"سر قمر نے بتایا تھا، میں بھی بہت حیران ہوئی تھی۔ وہ اتنے عرصے سے یہاں پڑھ رہا ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں تھی۔"

"میں نے ہمیشہ محسوس کیا تھا کہ اس کی پینٹنگز بہت ڈائریکٹ ہوتی تھیں رائل پارک برانڈ کی، جاتا تو بےچارہ سرریئل ازم کی طرف تھا اور بن کچھ کا کچھ جاتا تھا۔ اس نے اچھا ہی کیا کہ Sculpture کی طرف چلا گیا۔"

فائن آرٹس میں ڈائریکٹ کام کا طعنہ برداشت کرنا شاید خود جیمز کے لیے اتنا مشکل نہ ہوتا جس قدر یہ نیہاں کے لیے مشکل تھا۔ وہ اُما اور ماہ بانو سے ایکسکیوز کر کے ان کی میز کی طرف بڑھی۔

"تم جیمز کی کسی ایک ایسی پینٹنگ کا حوالہ دے سکتی ہو جو ڈائریکٹ ہو؟" اس نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

افشین کو یہ مداخلت کچھ پسند نہیں آئی تھی، لیکن اس نے اس پر تبصرہ نہیں کیا۔

"کوئی ایک؟ اس کی سب پینٹنگز ایسی ہی ہیں۔"

"نہیں تم کسی ایک پینٹنگ کا حوالہ دو پھر میں تمہیں تمہاری پینٹنگز کا حوالہ دے کر بتاؤں گی کہ تم کہاں کھڑی ہو۔" نیہاں کا مزاج مزید بگڑ گیا۔

"اس میں لڑنے کی کیا بات ہے؟ میں نے محسوس کیا اور کہہ دیا۔ تم ایسا محسوس نہیں کرتیں تو تمہیں اپنے خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے، لیکن میں نے جیمز کو کسی کے ساتھ کمپیئر نہیں کیا۔ جو میں پینٹ کرتی ہوں اسے سمجھنے کے لیے تمہیں دو نہیں مزید بیس سال لگیں گے۔" افشین نے کہا۔

اسی وقت کالج کی طرف سے جیمز آتا دکھائی دیا۔ ماہ بانو اُٹھ کر نیہاں کے پاس چلی آئی۔

"فارگیٹ اِٹ نیہاں، چلو کلاس میں۔" اس نے نیہاں کا بازو پکڑ کر کہا۔

"آئی کین ناٹ۔" اس نے ماہ بانو کو گھورا اور پھر افشین کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"دوسروں پر بات کرنے سے پہلے انسان کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ خود کتنے پانی میں ہے۔ تم نے ایبسٹریکٹ پکڑا اس لیے کہ تمہیں ڈرائنگ نہیں آتی تھی۔ جیوری کے وقت اِدھر اُدھر سے کبھار کر تم پاس ہوتی رہی ہو۔ ایبسٹریکٹ کو تم جیسے آرٹسٹوں نے ہی سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، جنہیں ڈرائنگ کی الف ب سے بھی واقفیت نہیں ہے۔

پھر تم نے سرریئل ازم...... کی ٹانگ توڑنی شروع کی۔ سارا کالج جانتا ہے کہ تم نے ان اے آردی اور سلواڈور ڈالی کی نقل کی میٹنگ کلاس بنانے کے بعد کہا۔ ریئلی؟ ایسی کوئی چیز میں نے بھی بنائی ہے۔ کمال ہے مجھے تو پتا ہی نہیں۔

سرریئل ازم سے پھر تم نے ایبسٹریکٹ پر چھلانگ لگائی کیونکہ جس ڈرائنگ کی ضرورت سرریئل ازم میں تھی، وہ تو تمہیں آتی نہیں تھی۔ ایبسٹریکٹ میں البتہ فلسفے کی کلیاں ٹانک کر تم اسے کچھ ثابت کر سکتی تھی۔"

جیمز، اُما اور بانو کے ساتھ کھڑا نیہاں کی گفتگو سن رہا تھا، مگر نیہاں کو اس بات کا اندازہ ہی نہ تھا۔

"دیکھو نیہاں! میں نے تم سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہوں۔" افشین بیگ کندھے پر ڈال کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تھوڑی سی پریشانی اسے یہ بھی ہوئی کہ جیمز آ گیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کالج میں کسی کو ڈائریکٹ کام کا طعنہ دینے کا نتیجہ ویسا ہی ہوا تھا جیسا کہ ابھی ہو رہا تھا۔ دوستوں کے درمیان بات کرنا اور چیز تھی، لیکن یوں کسی کو کہہ دینا

بالکل مختلف بات۔ آرٹ کے حوالے سے اس سے زیادہ برا لیبل اور کوئی نہیں تھا۔

نازنین اور ربیعہ بھی موقع کی نزاکت دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تم ایسے نہیں جاؤ گی افشین' مجھے بتاؤ کہ تمہیں جیمز کے کام میں کیا چیز ڈائریکٹ نظر آئی تھی۔ تم نے اس کے کام کے لیے رائل پارک کا حوالہ کیوں دیا؟ تم یہ کہو کہ تم میں آرٹ کو سمجھنے کی حِس نہیں ہے۔ تم نے کہا کیوں کہ وہ رائل پارک برانڈ کا کام کرتا ہے؟ اس کی ہر پینٹنگ میں ایک واضح سوچ ہوتی ہے۔ یونہی تمہاری طرح رنگ نہیں پھینک دیتا' کینوس یا بورڈ پر۔''

''شٹ اپ' میں تم سے بات نہیں کر رہی' چلو ربیعہ' نازنین' ہم کیا بات کر رہے تھے اور اس نے کیا بات پکڑ لی۔''

وہ تیزی سے کالج کی طرف چلی گئیں۔

''یہ لڑکیاں' میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں ان کی ایسی کی تیسی کر دوں۔'' نیہاں نے دانت پیس کر کہا۔

''جانے دو نیہاں' اتنا غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

جیمز کی آواز سن کر وہ پلٹی' اسے حیرت ہوئی تھی جیمز کو وہاں دیکھ کر۔

''تم کیوں جھگڑا کر رہی ہو' میرے متعلق کہہ رہی تھی تو کہنے دیا ہوتا' تمہیں کیا؟'' وہ بولا۔

''مجھے کیا؟'' وہ اسی تیزی کے ساتھ بولی جس تیزی کے ساتھ افشین سے مخاطب تھی۔

''ہاں مجھے کیا؟ میں کون ہوتی ہوں ان سے یہ کہنے والی' کیونکہ بات تو وہ تمہارے متعلق کر رہی تھیں ناں۔ میں ہوں ہی اسٹوپڈ فول جو تم جیسے کے ساتھ محبت کیے جا رہی ہوں' جسے اس بات کی خبر ہی نہیں ہے اور جو کسی Living Aphrodite کی محبت میں گرفتار ہے۔

میں نے جو کچھ آج کیا' میری حماقت تھی اور وہ سب بھی جو میں پچھلے دو سالوں سے تمہارے لیے محسوس کر رہی ہوں۔ سب حماقت ہے۔'' اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور کالج کی طرف چلی گئی۔ اُما اور ماہ بانو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیمز کی نگاہیں نیہاں پر ہی لگی ہوئی تھیں یہاں تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''چلو بانو۔'' اُما نے کہا۔

''پلیز اُما' بانو' ایک منٹ میری بات سن سکتی ہو؟'' جیمز نے کہا۔

''کیا بات؟''

''میں آیا تو تھا بانو کو ایڈی کا کوئی پیغام دینے' لیکن اب بالکل یاد نہیں رہا کہ اس نے کیا کہہ کر بھجوایا تھا۔'' وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔

''پھر اب کیا بات ہے؟'' ماہ بانو نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

نیہاں جس نے بظاہر خود کو بے نیازی کے خول میں لپیٹ رکھا تھا' اس کا یہ خول چٹخنے

دونوں افسردہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت نیہاں کو ان کی تسلی کی ضرورت تھی اور وہ جلد از جلد اس کے پاس جانا چاہتی تھیں۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم لوگ نیہاں کی فرینڈز ہو' پلیز مجھے بتاؤ کہ جو کچھ اس نے ابھی کہا ہے' وہ سب کیا تھا؟''

''تمہیں نہیں پتا کیا تھا؟ اس بات پر تمہیں زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاؤ اپنی Living Aphrodite کے پاس' چلو اُما۔'' ماہ بانو نے تیز لہجے میں کہا۔

''پلیز بانو میری بات تو سنو۔''

''ہمیں کام ہے۔'' اس نے بے رُخی سے کہا۔

''پلیز اُما! تم ہی رُک جاؤ۔'' وہ اُٹھ کر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اُما کا دل پسیج گیا۔ ''اچھا بولو جلدی سے کیا کہنا ہے۔''

''تم میں سے بھی کوئی نہیں جانتا کہ میری Living Aphrodite تو نیہاں ہی ہے۔''

وہ بولا۔

''کیا؟ جیمز تم کتنے گھنے' کتنے میسنے ہو' تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ وہ دو سال سے تمہارے لیے سیریس ہے' مگر تم نے ہمیشہ ایسا رویہ رکھا' جیسے وہ تمہاری عام دوستوں کی طرح ہو۔'' ماہ بانو بولی۔

''میں اس طرح نہیں کہنا چاہتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ فی الحال میں نیہاں کے لیے موزوں ہوں۔ میں کچھ بن کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا اور اس سے قبل اس کی زندگی کو محدود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے اور یہاں میں نے دیکھا ہے کہ اس بات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ نہ میں خود کسی اعلیٰ مقام پر ہوں اور نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ میرا پاکستانی باپ مجھے کہاں ملے گا۔ میرے متعلق بھلا وہ یا اس کے گھر والے کیوں سوچتے۔ میرے سامنے ایک نہیں بے شمار ایسی باتیں تھیں' جنہوں نے مجھے روک رکھا تھا۔''

''تم نے ہر بات خود سے سوچ لی اور اس پر فیصلہ بھی خود ہی صادر کر دیا۔ تم ابھی چلو اور اس سے جا کر اپنی اس حماقت کی سوری کر دو اور اسے بتاؤ کہ تم اس کے لیے کیا محسوس کرتے ہو۔'' اُما نے دوستانہ حکیمہ لہجے میں کہا۔

''تم لوگ جانتے تھے تو مجھے کوئی کلیو ہی دے دیتے۔ نیہاں نے مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ اس کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ عام دوستوں والا ہی رہا ہے' پھر میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ وہ بھی سیریس ہے میرے لیے۔''

''سارا الزام اس بے چاری کے سر پر نہ رکھو' تم نے کب اسے احساس ہونے دیا' کبھی اسے کوئی کلیو دیا؟ تم نے بھی اس کے ساتھ ہمیشہ عام دوستوں والا رویہ روا رکھا۔''

''اچھا بابا میری غلطی' لیکن اب میری Living Aphrodite مجھے ملے گی کہاں؟'' جیمز نے کہا۔

''کلاس میں گئی ہوگی' وہیں چلتے ہیں۔''

چلتے چلتے اُما کو خیال آیا۔

''وہ ایڈی کا پیغام بھی یاد آیا یا نہیں؟''

''اتنا تو یاد ہے کہ پیغام تمہارے نہیں بانو کے لیے تھا' لیکن یہ یاد نہیں آ رہا کہ کیا تھا' میرے لیے نیہاں کی باتیں ایٹمی دھماکے سے زیادہ بڑا دھماکا تھیں اور اس کے بعد اگر مجھے کچھ یاد نہیں رہا تو کوئی عجیب بات نہیں ہے۔''

''مجھے پتا ہے' اس نے کہا ہوگا کہ اس کے پاس ٹیلی کارڈ نہیں ہے' ورنہ وہ گھر فون کر کے اپنی امی کو بتا دیتا کہ آج وہ رات کو دیر تک کالج میں رہے گا' اب میں یہ پیغام اس کی امی تک پہنچا دوں......'' ماہ بانو نے کہا۔

''اوہ یس! بالکل یہی پیغام تھا' یاد آ گیا۔'' جیمز نے کہا۔

نیہاں کلاس میں نہیں آئی تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔

''کہاں گئی ہوگی؟'' اُما نے کہا۔

کالج کے چند ممکنہ گوشوں میں دیکھنے کے بعد وہ پریشان ہو گئے۔

''کہاں جا سکتی ہے' گئی تو کالج کے اندر ہی تھی۔''

بڑی مشکلوں سے اتنا پتا چلا کہ وہ آرکیٹیکچر ڈیپارٹمنٹ کی طرف گئی تھی۔

''وہاں کیا کرنے گئی ہے وہ۔'' جیمز بولا۔

''وہاں شور شرابا نہیں ہوتا۔ شاید وہ تنہائی چاہتی ہو۔'' اُما نے خیال ظاہر کیا۔

گراؤنڈ فلور پر وہ کہیں نہیں تھی' فرسٹ فلور پر بھی نہیں تھی۔

''دعا کرو سیکنڈ فلور پر ضرور مل جائے' پانچویں فلور پر ہوئی تو میں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہی اللہ کو پیاری ہو جاؤں گی۔'' ماہ بانو بولی۔

سیکنڈ فلور کے لیکچر روم میں اُما نے جھانک کر دیکھا۔ نیہاں درمیانے بینچ پر بیٹھی رو رہی تھی' وہ پیچھے ہٹ گئی۔

''یہاں بھی نہیں ہے اُما۔'' جیمز اور ماہ بانو اس کے پاس چلے آئے۔

''شی!'' اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔

''اندر ہے اور رو رہی ہے۔ جیمز پلیز تم مائنڈ مت کرنا' پہلے میں اور بانو جا کر اسے تسلی دے لیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' جیمز نے سر ہلایا۔

وہ دونوں اندر داخل ہوئیں اور اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ نیہاں نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں صاف کیں' جن میں لگا کاجل پھیل رہا تھا۔

''رو کیوں رہی ہو نیہاں؟''

''نہیں' رو نہیں رہی' تم لوگ جاؤ' میں اس وقت اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ماتھے پر آئے اپنے سنہرے بال پیچھے کیے۔

''تمہیں اتنا سمجھایا' اتنی پٹیاں پڑھائیں کہ محبت کر کے ناکام ہو جانا' محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔ اور خود یہ حال ہے کہ ایک جھٹکا نہیں سہار سکیں' جانے دو یار میں تمہیں اتنا کم ہمت نہیں سمجھتی تھی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''پتا نہیں کیوں میں نے اسے یہ سب کہہ دیا۔'' اس کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔

''مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اب میں اتنی سخت شرمندگی محسوس کر رہی ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں پہل کروں گی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ کسی اور کو چاہتا ہے۔ اس کی زندگی میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دو سال سے اُسے نہیں بتایا تھا تب بھی کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹی تھی ناں۔ چند دن کے بعد اس کا تھیسس ہو جاتا اور وہ کالج سے چلا جاتا۔ صرف چند دن کی بات تھی میں چپ رہ جاتی۔ کیوں کہا میں نے اسے یہ سب؟'' وہ پھر رونے لگی۔

''اچھا کیا ناں کہہ دیا۔'' اُما بولی۔

''اچھا کیا؟ تمہیں بھی پسند تھا ایڈی' لیکن تم پہل کر سکتی تھیں۔ نہیں ناں' میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس کا سامنا کیسے کروں گی۔'' اس نے ٹشو پیپر سے آنکھیں رگڑیں۔

''اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ تمہارا سامنا کیسے کرے کیونکہ اسے افسوس ہے کہ اس نے پہل کیوں نہیں کی۔ پاگل لڑکی اس کی Living Aphrodite تم ہو۔'' اُما نے کہا۔

''کیا بولیں تم؟'' نیہاں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''جو تم نے سنا۔'' اُما نے کہا۔

''اور اب باقی کے شکوے شکایتیں تم دونوں ایک دوسرے سے خود کرو۔ راستے میں ہم تمہاری وکالت تو کرتے آئے ہیں' لیکن میرا خیال ہے کہ وہ یہ سب تمہارے اور تم اس کے منہ سے سننا زیادہ پسند کرو گی۔''

ماہ بانو اور اُما اُٹھ کھڑی ہو گئیں۔

''کہاں چلے تم لوگ؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''ابھی سمجھ میں آ جائے گا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''بس تم گھڑی بھر انتظار کرو' یہیں بیٹھ کر۔''

نیہاں انہیں لیکچر تھیٹر سے نکلتے دیکھتی رہی۔ ابھی تک وہ صورتِ حال کو پورے طریقے سے سمجھ نہیں سکی تھی۔

''اب تم جا کر اسے بتا دو اور چاہو تو لڑ بھی لو کہ اس نے یہ بات دو سال بعد کیوں بتائی، پہلے کیوں نہیں بتا دی۔'' ماہ بانو نے جیمز سے کہا۔

''ہم اب کلاس میں جا رہے ہیں۔''

☆=====☆=====☆

ریشماں حویلی واپس آ جانے کے باوجود بھی نانی ماں کے گھر گزارے دو دن نہیں بھول سکی تھی۔ مکرم نے اسے کچن میں جانے کی اجازت دلوا دی تھی...... وہاں اماں جان اس کے ساتھ ساتھ ہوتی تھیں۔ اتنی ملازماؤں کی موجودگی میں ریشماں کا کام کرنا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا، لیکن اس کی خوشی دیکھ کر چپ تھیں۔

اس کے کچن میں داخل ہوتے ہی ملازمائیں الرٹ ہو جاتی تھیں۔ بڑھ کر اس کے ہاتھ سے چھری اور سبزی لے لینا چاہتی تھیں، لیکن وہ ہر کام خود کرتی تھی۔ اماں جان کو ہر وقت یہ فکر رہتی تھی کہ کہیں سبزی بناتے ہوئے اس کی انگلی پر زخم نہ آ جائے یا کھانا پکاتے ہوئے وہ جل نہ جائے۔ اس فکر کی کچھ وجہ تو یہ تھی کہ انہیں ریشماں سے سگی ماں کی طرح محبت تھی اور کچھ یہ بھی کہ اسے چوٹ لگنے یا جل جانے کی صورت میں پیر صاحب حویلی میں طوفان کھڑا کر دیتے۔

پیر صاحب بھی اسے دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے۔ پہلے روز وہ جھجکتے ہوئے ان کے پاس آئی تھی۔

''بابا جان۔''

''آئیں بیٹا بیٹھیں۔'' انہوں نے اسے دیکھ کر شفقت سے کہا تھا۔

''میں بیٹھنے نہیں آئی، میں پوچھنے آئی تھی کہ آپ میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھائیں گے؟'' اس کے انداز میں جھجک تھی۔

اور انہیں اس پر بے طرح پیار آیا تھا۔

''آپ لائیں گی تو کیوں نہیں کھائیں گے۔''

''لیکن وہ اتنا اچھا نہیں پکا، ابھی نیا نیا سیکھ رہی ہوں ناں؟'' اس نے کہا۔

''ہمیں یقین ہے کہ ہماری بیٹی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے سے زیادہ لذیذ کھانا دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

ان کی بات سے وہ کھل اٹھی۔

اور اب تو وہ بہت اچھے کھانے پکانے لگی تھی۔ چائنیز، فرنچ اور اٹالین کھانے بھی۔

خادم حسین اور سبط کو اس کے نئے شوق کا علم ہوا تو انہوں نے اس کے لیے ڈھیر ساری

کتابیں بھجوا دیں جن میں کھانوں کی ترکیبیں درج تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کھانا پکانے سے متعلق کتنی ویڈیو بھی اس کے لیے بھجوائیں۔

نوازش اور حضور علی البتہ اسے بہت تنگ کرتے تھے۔ شروع میں تو خیر واقعی اس کے پکے کھانے بہت اچھے نہیں ہوتے تھے اور وہ ان کا درست مذاق اڑاتے تھے، لیکن جب وہ بہت اچھے کھانے پکانے لگی تب بھی وہ اسے تنگ ضرور کرتے تھے۔

ایسے میں بعض اوقات وہ اماں کو مدد کے لیے پکارتی۔

''اماں جان! دیکھیں یہ مجھے کتنا تنگ کر رہے ہیں۔''

اور اس سے قبل کہ اماں جان کچھ کہتیں مکرم انہیں گھور کر دیکھتا۔

''خاموشی سے کھانا کھاؤ۔''

اور وہ دونوں بھیگی بلی بن کر رہ جاتے۔ ریشماں ہنس پڑتی تھی۔

''آئندہ میں اماں جان کے بجائے مکرم کو کہا کروں گی۔ اس کے سامنے تم سب کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔''

یاسمین بیگم، ریشماں کی طرف سے کافی حد تک مطمئن ہو گئی تھیں۔ وہ خوش رہنے لگی تھی اور پیر صاحب نے بھی اس کے لیے ایک نہیں حویلی کی کئی روایتیں توڑی تھیں۔ وہ نہ صرف اپنی مرضی سے فون پر خادم حسین اور سبط سے باتیں کر سکتی تھی، بلکہ انہیں خط بھی لکھا کرتی تھی۔ اب انہیں حالات کی بہتری کی امید ہو چلی تھی۔

مگر ان کے دل میں ایک کانٹا چبھ رہا تھا۔

پیر صاحب کے لاہور کے چکر بڑھ گئے تھے اور یاسمین بیگم جانتی تھیں کہ ایسا کب ہوا کرتا تھا۔ اپنی پوری ازدواجی زندگی میں انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ ان کا شوہر مکمل طور پر ان کا تھا۔ پھر بھی جب وہ راتیں ڈیرے پر گزارا کرتے تھے یا ان کے لاہور کے چکر بڑھ جاتے تھے تو ان کے اندر خلش پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ اکثر سوچتیں۔

''پچیس سال پیر صاحب کے ساتھ گزارنے کے باوجود بھی میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ انہیں کیا چاہیے۔''

☆=====☆=====☆

نیہاں بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی ممی کو جیمز کے متعلق بتایا تھا اور انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بس وہ اتنا چاہتی تھیں کہ اس کے ڈیڈی کی لاہور آمد کے موقع پر وہ جیمز کو ان سے ملوا دے۔

''ڈیڈی ویسے تو بہت اسٹرکٹ مارکنگ کرتے ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ جیمز پاس ہو جائے گا۔ اصل میں ممی کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور جس بات پر ممی کو اعتراض نہیں ہوتا، ڈیڈی وہ

بات ضرور مان لیتے ہیں۔" اس نے انہیں بتایا۔

"تمہاری ممی نے جرح نہیں کی جیمز کے متعلق؟ کہ کون ہے' کہاں سے آیا ہے وغیرہ۔" اُما نے پوچھا۔

"کی تو تھی اور میں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ ممی کی وہی امریکی سوچ ہے کہ ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتی ہیں کہ جیمز کسی اچھی جگہ جاب کر لے۔ پھر میں بھی ابھی پڑھ رہی ہوں۔ دو سال بہت ہوتے ہیں' وہ کہیں نہ کہیں قدم جمانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مجھے یوں بھی زیادہ کی خواہش نہیں ہے۔ ہم دونوں مل کر اپنی زندگی کے لیے جدوجہد اور محنت کریں گے۔"

اور جیمز کو بھی فکر تھی۔

"تمہارے ڈیڈی کیا کچھ پوچھیں گے؟ خالص بیوروکریٹس کی طرح افسری تو نہیں جھاڑیں گے؟ میں سخت الرجک ہوں اس قسم کے لوگوں اور رویوں سے۔"

"اب ایسے بھی نہیں ہیں ڈیڈی' ہاں افسر ہیں تو افسری کی عادت بھی ہے' لیکن تم انسانوں کی طرح ڈھنگ سے بات کرو گے تو تمہیں کاٹ نہیں کھائیں گے۔ آج شام کو تمہیں پرل میں آنا ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ ہوسکتا ہے ممی بھی اسلام آباد سے آ جائیں۔"

"تمہارے ڈیڈی وہی ہیں جن کے ساتھ تم صبح کالج آئی تھیں؟" جیمز نے تصدیق چاہی۔

"اولیس وہی ہیں' واپسی پر بھی لینے آئیں گے۔ آج میرا ہوسٹل جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

اُما اور بانو چھٹی کے وقت اپنا سامان سمیٹ رہی تھیں۔ نیہاں ڈیڈی کے آنے کی خوشی میں کچھ دیر پہلے ہی چلی گئی تھی۔ اُبھی وہ دونوں منی ایچر روم سے نکل ہی رہی تھیں کہ نیہاں دانت پیستی پہنچ گئی۔

"کیا ہوا؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"یہ پوچھو' کیا نہیں ہوا۔ سارا ستیاناس ہوگیا۔ گڑبڑ ہوگئی اتنی۔"

"کچھ تو کہو کہ کیا ہوا؟ اللہ خیر کرے۔" ماہ بانو گھبرا گئی۔

"میں ڈیڈی کے ساتھ کار میں بیٹھی اور اوپر سے جیمز صاحب باہر پارکنگ میں تشریف لے آئے۔ اس نے بلیک جینز اور بلیک بغیر آستینوں کے ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور سر پر رومال باندھا ہوا تھا۔ پتا ہے ڈیڈی نے کیا کہا اسے دیکھ کر؟"

اُما نے نفی میں سر ہلایا۔

"کہنے لگے یہ کیا چیز ہے۔ آج غلطی سے اسے دوسری بار دیکھ لیا ہے۔" نیہاں بولی۔

اُما اور ماہ بانو نے قہقہہ لگایا۔ "تم نے کہنا تھا کہ کام کرتے ہوئے اُٹھ کر آیا ہے۔"

"مجھے کچھ سوجھا ہی نہیں۔ میں ڈیڈی سے ایکسکیوز کر کے اتری اور اب یہاں تم لوگوں کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ پلیز اسے پارکنگ سے یہاں لے کر آؤ۔ میں اسے یہ تو کہہ دوں کہ آج شام ڈھنگ سے ڈریس اپ ہو کر آئے۔ پلیز جاؤ اور ابھی اسے لے کر آؤ۔"

وہ دونوں اسے پارکنگ سے پکڑ کر لے آئیں۔

"انتہا کر دی تم نے جیمز۔" اس کا موڈ آف تھا۔

"تمہارے ڈیڈی جانتے بھی ہیں کہ آرٹ کیا ہے؟ ان کے لیے صرف فیشن ہے آرٹ۔ انہیں کیا پتا کہ کوٹ ٹائی لگا کر Sculpture نہیں کیا جا سکتا۔"

"اچھا اچھا۔" اس نے تیزی سے کہا۔ "اب انسانوں کی طرح آنا۔ میں جلدی میں ہوں۔ ڈیڈی باہر انتظار کر رہے ہیں۔ تم Dress Clothes پہن کر آؤ گے۔ اس کے بغیر اچھا امپریشن نہیں پڑے گا تمہارا۔" وہ کہتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

"مگر میرے پاس ایک بھی فارمل ڈریس نہیں ہے۔" وہ چڑ ہی گیا۔

"اب اپنی محبت کو فارمل ڈریس کی بھینٹ مت چڑھاؤ۔ کوئی نہ کوئی انتظام کر لو۔" اُما نے کہا۔

"آل دا بیسٹ جیمز۔" ماہ بانو نے کہا۔

جیمز ایڈی کے گھر آ کر ہی تیار ہوا تھا۔ اس کے اپنے پاس تو کوئی فارمل کپڑے تھے نہیں۔ مارکس اینڈ سپنسرز کی آف وائٹ قمیص اس نے ایڈی سے لی اور نیوی بلیو کوٹ اور پتلون عبداللہ سے ادھار لی۔ جوتے اسے دونوں میں سے کسی کے پورے نہیں آئے۔ تیاری کے دوران وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ ماہ بانو اور عبداللہ بھی وہیں تھے اور جیمز کی مسلسل بڑبڑاہٹ سے محظوظ ہو رہے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ ویسے ہی بڑبڑاتا ہوا واپس آیا۔

"کیا رہا جیمز؟" ماہ بانو نے بے تابی سے پوچھا۔

اس نے میرون ٹائی اُتار کر پھینکی۔ "اس کے ڈیڈی کا خیال تھا کہ میں بھی ان کے آفس کا کوئی کلرک قسم کی چیز ہوں۔ پہلے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔ پھر بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر اس طرح انٹرویو شروع کیا جیسے کسی ملزم سے جرح شروع کر رہے ہوں۔ جرح ختم ہوئی تو انہوں نے ایسے جھاڑنا شروع کیا جیسے اپنے کلرک کو جھاڑتے ہوں گے۔"

"لیکن جھاڑ کس بات پر رہے تھے؟"

"جانے دو۔ موڈ آف ہو گیا ہے سخت۔" وہ دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اس کی ممی نہیں تھیں؟ ان کا ووٹ تو یقیناً تمہاری طرف ہوگا۔" ماہ بانو نے کہا۔

جیمز نے بڑبڑاتے ہوئے سگریٹ سلگا لیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ایڈی نے ریسیور

اٹھایا۔

''ایڈی، جیمز تمہاری طرف ہے؟'' نیہاں نے پوچھا۔

''ہاں میری طرف ہی ہے۔ ہولڈ کرو۔ میں بات کراتا ہوں۔''

اس نے جیمز کی طرف ریسیور بڑھایا۔

''مجھے اس وقت بات نہیں کرنی۔ میرا موڈ سخت بگڑا ہوا ہے۔''

''حد کرتے ہو جیمز تم بھی۔'' ایڈی کے ہاتھ سے ریسیور ماہ بانو نے لے لیا۔ ''نیہاں یہ جیمز کا موڈ کیوں بگڑا ہوا ہے؟''

''اسے یہ تو سمجھنا چاہیے کہ ڈیڈی کا اپنا سوچنے کا انداز ہے۔ بات کرنے کا انداز ہے۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ڈیڈی اس کی انسلٹ کر رہے ہیں۔ ہے ناں حماقت۔ سوچو وہ ڈان جانسن کی طرح ڈریس Clothes کے ساتھ جرابوں کے بغیر کینوس شوز پہن آیا۔ ڈیڈی نے اس بات کو مینشن کر دیا۔ اب یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ یہ ڈان جانسن اسٹائل ڈیڈی کے سامنے تو نہیں چل سکتا ناں۔

پہلے تو وہ سنتا رہا پھر کہنے لگا کہ یہ قمیص میں نے اپنے دوست ایڈی سے ادھار لی ہے۔ کوٹ اور پتلون عبداللہ کی ہے۔ جرابیں میلی تھیں اس لیے میں نے پہننا مناسب نہیں سمجھیں اور یہ کینوس شوز میرے اپنے ہیں۔ اس قدر بھی جو میں فارملی (Formaly) ڈریس اپ ہوا ہوں تو صرف نیہاں کی وجہ سے کہ اس نے مجھ سے ایسا کرنے کو کہا تھا۔''

''یہ سب کہہ دیا اس نے؟'' ماہ بانو نے حیرت سے کہا۔

''ہاں اور پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ اسے تھیسز کا کام کرنا ہے۔ قسم سے بانو میری تو رونے والی حالت ہو رہی تھی۔ یہ تو شکر ہوا کہ ڈیڈی نے اس کی اس حرکت کو مائنڈ نہیں کیا ورنہ میرا کیا بنتا۔ تب تک تو میری جان سولی پر ہی اٹکی رہی۔ جب تک ممی اور ڈیڈی کی میٹنگ جاری رہی۔ بہرحال انہیں اس کی صاف گوئی پسند آئی۔ نہ صرف یہ بلکہ مجھے بھی لیکچر ملا کہ انسان کپڑوں کی کوالٹی وغیرہ سے نہیں پہچانا جاتا اور نہ جانے کیا کیا۔''

''یعنی آنٹی انکل مان گئے؟'' ماہ بانو نے خوشی سے پوچھا۔

''اویس۔''

☆=====☆=====☆

تھیسز ڈسپلے سے ایک روز پہلے کالج میں کافی گہما گہمی تھی۔ فائنل ایئر کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ ہر کوئی اپنی گیلری ڈیکوریٹ کر رہا تھا۔ جونیئر کلاسز کے اسٹوڈنٹس اپنے سینئر دوستوں کی مدد کر رہے تھے۔ بلب ڈھونڈے جا رہے تھے۔ جھگڑے جاری تھے۔ ہر طرف شور مچا ہوا تھا۔ کہیں فش واٹر کی تلاش جاری تھی اور کہیں کورو گیٹڈ شیٹس کی۔

''اپنے سب چہیتوں کو اچھی جگہ دے دی۔ ہمیں سب سے سڑی ہوئی جگہیں مل رہی ہیں۔ ڈسپلے کے لیے۔'' یہ شکوہ تقریباً ہر ایک کا ہی تھا۔

''مجھے باکس پینلز چاہیے تھے اور سمپل پینلز مل گئے۔ اس کی کیا تک ہے۔''

''سب اچھے پینلز ڈیزائن والے لے گئے ہیں۔ ان کے ٹیچرز بھی تو ان کی مدد کر رہے ہیں۔ ہم فائن آرٹس والے یونہی بے یارو مددگار ہیں۔''

''میرا کیا بنے گا۔ مجھے منی ایچر روم کے ساتھ جگہ ملی ہے اور واش رومز اس کے پاس ہی ہیں۔''

''خیر اب اتنے بھی پاس نہیں ہیں۔ مصیبت تو میری ہے۔ مجھے وہاں جگہ ملی ہے جہاں پہلے لاکرز پڑے تھے۔ وہ جگہ بالکل اوپن ہے۔ اگر صبح تک کوئی میری پینٹنگز چرا لے گیا تو؟''

''خیر تمہاری پینٹنگز چرانے کے لیے کوئی پاگل ہی آ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں تم احتیاطاً پاگل خانے والوں سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

Sculpture کے چاروں اسٹوڈنٹس اپنی مصیبت میں گرفتار تھے۔

''تم لڑکیاں یہاں کھڑی گپ بازی کر رہی ہو۔ دیکھو پیڈسٹلز ملیں تو لے آؤ۔ جلدی کرو۔'' ایڈی انہیں دیکھ کر چلایا۔

''کان کے پردے مت پھاڑو۔ لا رہے ہیں۔'' اُما نے کہا۔

دوسری طرف سے جیمز آ گیا۔ ''بلب ڈیزائن والے اُڑا لے گئے ہیں۔ جلدی سے کہیں سے انتظام کرو۔''

ابھی انہیں پیڈسٹلز اور بلب لا کر دیے تھے کہ عبداللہ بھی پہنچ گیا۔

''This is too much ہم کیا برآمدوں میں ڈسپلے کریں گے۔ حد ہوتی ہے۔ ابھی چل کر بات کرو کہ ہمیں گیلری ملنی چاہیے۔''

رات کے آٹھ تو انہی لڑائی جھگڑوں میں بج گئے۔ اس کے بعد گیلری ڈیکوریٹ کرنے سے پہلے انہیں کچھ سانس لینے کا موقع ملا۔ لان میں فوارے کے قریب گھاس پر بیٹھ کر وہ کولڈ ڈرنکس اور چپس کھانے لگے۔

''یہ تم دونوں کی شکلوں پر کیوں بارہ بج رہے ہیں؟'' ایڈی نے اُما اور ماہ بانو کی طرف دیکھا۔

''تم لوگوں کو کیا غرض۔ ہم مریں یا جئیں۔ صبح سے ہماری خیریت بھی دریافت نہیں کی۔ کولہو کا بیل سمجھ کر کبھی یہاں، کبھی وہاں دوڑاتے رہے۔'' ماہ بانو نے منہ پھلا لیا۔

''صبح سے ابھی تو سانس لینے کا موقع ملا ہے اور ابھی پتا نہیں اسی کام میں صبح کے چار بجتے ہیں یا پانچ۔ اس کے بعد گھر جا کر نہانا دھونا۔ تیار ہونا اور پھر کالج کے لیے دوڑ کیونکہ صبح نو بجے

جیوری ہوگی۔'' عبداللہ نے کہا۔

''تم سے تو اتنا بھی نہیں ہوا عبداللہ کہ مجھ سے پوچھ لیتے کہ میں جو کل ویزا لگوانے گئی تھی اس کا کیا بنا؟'' ماہ بانو ابھی تک اس سے خفا تھی۔

''ارے یاد آیا۔ کل تم امریکہ کا ویزا لگوانے گئی تھیں واقعی اس کا کیا بنا؟'' اسے یاد دلانے پر خیال آیا۔

''اماں جی کا لگ گیا اور میرا نہیں لگا۔ ساری رات روتے ہوئے گزاری ہے میں نے۔ ا... جی اتنے یاد آ رہے تھے۔ اتنا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی ایک مہینے کی چھٹیوں میں ان سے مل آؤں۔''

''وجہ کیا ہوئی؟'' ظہیر نے پوچھا۔

''وجہ کیا ہونی تھی بس نخرے ہیں ان کے' اتنا موڈ بگڑا ہوا ہے میرا۔ ان کا خیال ہے کہ ہم بقیہ دو افراد بھی امریکہ چلے گئے تو واپس نہیں آئیں گے۔ یہاں کوئی زمین جائیداد بھی نہیں ہے۔ کچھ تھوڑا بہت بینک بیلنس ہے تو اس کا کیا ہے۔''

''تو اب کیا ہوگا؟'' جیمز نے کہا۔

''ہونا کیا ہے۔ اماں جی تو جائیں گی۔ کل ہم نے ابا جی کو فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ چلو اماں تو آ جائیں۔ رہ گئی میں تو اماں مجھے گاؤں میں نانا جی اور نانی اماں کے حوالے کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ جانا تھا امریکہ اور حالات نیاز پور لے جا رہے ہیں۔ مجھے نہیں جانا گاؤں۔ یہیں لاہور میں رہوں گی میں میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا وہاں جانے کو۔'' اس نے بگڑے موڈ کے ساتھ کہا۔

''میں بھی گاؤں جا رہا ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔ کیا فرق پڑتا ہے۔'' عبداللہ بولا۔

''مجھے نہیں جانا۔ میں گاؤں نہیں جانا چاہتی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''تم نے اماں جی سے کہا۔ وہ مان گئیں؟''

''نہیں ناں۔ ابھی نہ تو ان سے کہا ہے اور نہ وہ ماننے والی ہیں۔ وہ تو ابا جی کے پاس جائیں گی اس شرط پر کہ میں گاؤں جاؤں گی۔ بلکہ مجھے کان سے پکڑ کر نانا جی کے پاس چھوڑیں گی اور پھر جائیں گی۔ میں کیا کروں؟''

''فی الحال تم صرف پیپسی پیو اور چپس کھاؤ۔'' جیمز نے اسے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

''نیہاں اور جیمز ہم سب سے زیادہ اچھے رہے۔'' ایڈی نے مصنوعی آہ بھر کر کہا۔ ''سب سے آخر میں اظہار عشق کیا اور سب سے پہلے منگنی ہوگی۔ ہماری قسمت میں تو ابھی دودھ کی د... مزید نہریں کھودنا لکھا ہوا ہے۔''

''اتنا بھی افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اُما۔ راحت... نے کہا۔

اسے یہ بات اچھی تو نہیں لگی لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

''ہوا کیا ہے اُما؟ تم مجھے بہت پریشان لگ رہی ہو۔'' ایڈی نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

''نہیں تو۔ تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں۔ تم بتاؤ کہ تھیسز کے بعد کیا ارادہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''برطانیہ کے اسکالرشپ نکل رہے ہیں کچھ دنوں میں۔ میرا ارادہ ہے مووی میکنگ میں ...کرنے کا۔''

''رائل کالج آف آرٹس میں؟'' نیہاں نے پوچھا۔

''ہاں آر سی اے میں ہی ہے۔ دو سال وہاں گزار کر آؤں گا تب تک اُما بھی فارغ ہو چکی ...''

''میں شاید ابھی ہی کالج چھوڑ دوں۔'' اس نے بظاہر ایسے کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

''میرے جانے سے اس قدر بھی اداس مت ہو۔ میں واپس آ جاؤں گا۔'' ایڈی نے ...ت سے کہا۔

وہ خاموش رہی۔

''کیا ہوا اُما؟ کیا بات ہے؟ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو کیا؟'' ایڈی کو پہلی مرتبہ اس بات کا ...گی سے احساس ہوا۔

''تم سے کیا چھپانا ہے۔ صرف تھک گئی ہوں۔ دل نہیں چاہ رہا باتیں کرنے کا۔ تم سب ...کرو۔ میں سن رہی ہوں۔'' وہ بولی۔

''یہ بمبئی چلی جائے شاید۔'' نیہاں نے موقع دیکھ کر ذکر چھیڑا۔

''کیوں؟''

''اس کا بھائی نہیں چاہ رہا کہ یہ یہاں مزید پڑھے۔'' نیہاں نے ہی جواب دیا۔

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اُما تم اپنے بھائی کو راضی کر لو کہ تم پونا میں ایڈمشن لینا چاہتی ...بھی آر سی اے کی قربانی دے کر وہیں چلا جاؤں گا۔ کیسا ہے؟'' ایڈی کو خیال آیا۔

''اور پھر ت Bolly Wood کی فلمیں بناؤ گے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس سے زیادہ سڑا ...ڈیا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' نیہاں نے کہا۔

''تم کیوں ہم دونوں کے بیچ دیواریں کھڑی کرنے پر تُل گئی ہو۔ میں ہالی وڈ جاؤں۔ بالی ...یا لولی وڈ رہوں۔ میں اچھی فلمیں ہی بناؤں گا اور میری ہر فلم کی ہیروئن ہوگی اُما دیوی۔'' ...نے مزے سے کہا۔

اُما اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس کی گود میں رکھی ایڈی کی کتاب نیچے گر گئی۔

''تم کہاں چلیں اور میری کتاب سے یہ ظالمانہ سلوک۔''

"اپنی کتاب اپنے پاس رکھو اور میرا مزید بور ہونے کا ارادہ نہیں ہے' اس لیے میں جا رہی ہوں۔" وہ آرٹ گیلری کی طرف چل دی۔

"بانو اسے کیا ہوا ہے؟ یہ تو اس طرح بی ہیو نہیں کرتی۔ اور میں جانتا ہوں کہ یہ اسٹینڈ لے سکتی ہے۔ اپنے بھائی کو قائل کر سکتی ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔ تم تو جانتی ہوگی۔" ایڈی پریشان ہو گیا۔

ماہ بانو اپنے منہ سے اسے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایڈی کو کس قدر دکھ ہوگا۔

"نہیں' اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ تم خود پوچھ لو۔"

"جھوٹ بولنا نہ آتا ہو تو نہیں بولنا چاہیے۔" ایڈی نے اُما کی گود سے گرنے والی کتاب ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

ماہ بانو شرمندہ ہو گئی۔ "ٹھیک ہے' میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ مجھے اصل بات معلوم ہے مگر میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی۔ اُما چاہے گی تو تمہیں خود بتا دے گی۔"

ورق پلٹتے پلٹتے ایڈی رُک کر کتاب میں کچھ دیکھنے لگا۔ پھر کتاب بند کر کے وہیں گھاس پر رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ اسے آرٹ گیلری کی طرف بڑھتے دیکھتے رہے۔ ماہ بانو نے گھاس پر پڑی دی رومانس آف تاج محل...... اٹھالی اور اس کے صفحات الٹنے لگی۔ ایک صفحے پر اُما کی تحریر دیکھ کر وہ رک گئی۔

"جو سکھی میں جانتی پیت کرے دکھ ہوئے
نگر نگر ڈھنڈورا پیٹتی پیت کرے نہ کوئے

(سہیلی اگر میں جانتی کہ محبت کرنے سے انسان دکھی ہو جاتا ہے تو میں سب کو بتاتی پھرتی کہ کوئی محبت نہ کرے)

ایڈی اُما کو لے کر آرکیٹیکچر ڈیپارٹمنٹ کی طرف آ گیا۔ یہاں رش کم تھا اور باقی کالج کی نسبت یہ پُرسکون جگہ تھی۔

"کالج چھوڑنا بہت ضروری ہے اُما؟" اس نے بلاتمہید سوال پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"بتایا تو تھا' اجے نہیں چاہتا کہ میں مزید یہاں تعلیم حاصل کروں۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"میں نے بانو سے بھی کہا تھا اور تم سے بھی کہہ رہا ہوں کہ جھوٹ بولنا نہ آتا ہو تو مت بولا کرو۔"

"تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا؟ میں بالکل جھوٹ نہیں بول رہی۔" اس نے کہا۔

"میں اتنے عرصے تک تم سے دور نہیں رہ سکتا۔ شادی کرو اور میرے ساتھ برطانیہ چلو۔" ...نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

چند لمحے تو اُما اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"شاید تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو ایڈی۔" بالآخر اس نے کہا۔

"میں مکمل طور پر اپنے حواسوں میں ہوں۔ اس میں بدحواسی والی کون سی بات ہے۔ میں ...ی کرنے کو کہہ رہا ہوں تم سے اور دنیا میں سب ہی شادی کرتے ہیں۔"

"تمہارا ذہن اس وقت تھیسز میں اٹکا ہوا ہے اس لیے تم شاید خود بھی نہیں سمجھ رہے کہ تم کیا ...ہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب گیلری ڈیکوریٹ کرنا شروع کر دینی چاہیے۔ میں نے ہوسٹل ...ات دیر تک باہر رہنے کا بتایا بھی نہیں ہوا۔ نو بجے تک نہ پہنچی تو فائن ہو جائے گا۔" وہ مڑ گئی۔

ایڈی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔ "مجھے اصل بات بتاؤ اُما۔"

"اصل بات؟ تم نہیں جانتے کہ اصل بات کیا ہے۔ کیا یہ بات بھی مجھے تمہیں بتانی پڑے ...ماری شادی نہیں ہو سکتی۔" اس نے ہونٹ کاٹ کر آنکھوں میں آئے آنسو پیچھے کیے۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیوں نہیں ہو سکتی؟ جب ہم دونوں کے درمیان محبت ہو سکتی ہے تو ...کیوں نہیں ہو سکتی؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس لیے کہ نہ میں تمہارے لیے اپنا مذہب تبدیل کر سکتی ہوں اور نہ تم میرے لیے۔ کر ...اپنا مذہب تبدیل؟ کبھی نہیں۔ نہ میرے گھر والے تمہیں قبول کریں گے اور نہ تمہارے گھر ...مجھے۔ اس حقیقت کو ہم دونوں جس قدر جلد سمجھ لیں' اتنا ہی اچھا ہے۔" اس نے ہتھیلی کی ...ے آنکھیں رگڑیں۔

"تم سے اتنی کم ہمتی کی توقع نہیں تھی مجھے۔ تم صرف اتنا بتا دو کہ انڈیا قیام کے دوران تمہارا ...ہیں طے نہیں ہو گیا؟"

"باقاعدہ رشتہ کہیں طے نہیں ہوا لیکن زبانی بات چیت ہو رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ...طے بھی ہو جائے گا۔"

"وہی آنند؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنسو پھر گالوں پر بہنے لگے۔

"تم نے گھر والوں کو رضامندی دے دی؟" ایڈی نے پوچھا۔

"نہیں' لیکن میں جانتی ہوں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہوگا وہی کچھ جو میرے ...لے چاہیں گے۔ اور پھر میرے پاس انکار کرنے کی وجہ بھی کیا ہو گی؟ ممی ڈیڈی کوئی ٹھوس ...نگے تو میں کیا کہوں گی؟"

"یہی کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔اس کے سوا کیا؟" ایڈی نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ وجہ سننے کے بعد وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے تمہارے ساتھ رخصت کردیں گے۔"

"میں نے اس معاملے پر بہت سوچا ہے اُما۔ہم دونوں کا تعلق جن گھرانوں سے ہے وہاں مذہب کی اہمیت تو تسلیم کی جاتی ہے لیکن اس پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔تم لوگ مسلمانوں کے درمیان اُٹھتے بیٹھتے ہو'ان کے ساتھ کھاتے پیتے ہو۔عام ہندوؤں کے برعکس گوشت کھانے میں بھی حرج نہیں سمجھتے۔

میرا تعلق مسلمان گھرانے سے ہے۔میرے گھر میں صرف امی نماز پڑھتی ہیں۔وہ بھی ایسے کہ کبھی پڑھ لی اور نہ پڑھ سکیں تو غم نہیں۔روزہ رکھا یا نہیں افطاری کا اہتمام ضروری ہوتا ہے۔مجلس یا میلاد میں جانا گیٹ ٹوگیدر کا بہانا ہوتا ہے۔

اس کے باوجود میں یہ جانتا ہوں کہ میری امی کسی ایسی مسلمان لڑکی کو بہو بنانے پر راضی ہو جائیں گی جسے نماز اور کلمہ تک نہ آتا ہو مگر کسی غیر مذہب کی لڑکی کو بہو نہیں بنائیں گی۔میرا ذہن بہرحال ان باتوں کو قبول نہیں کرتا۔میں کوئی اچھا مسلمان نہیں ہوں۔عید کے علاوہ شاید ہی کوئی نماز پڑھی ہو اور وہ بھی ایسے پڑھتا ہوں کہ ساتھ پاپا یا کسی اور کی طرف دیکھتا جاتا ہوں کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔

تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم اس بات پر راضی ہو جاؤ گی کہ ہم دونوں اپنے اپنے مذہب پر رہتے ہوئے ایک دوسرے سے شادی کرلیں؟"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسی کوئی شادی ہم میں تو درست نہیں سمجھی جاتی اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم لوگوں میں بھی اسے غلط ہی سمجھا جاتا ہے۔"

"تم غلط صحیح کے چکر میں مت پڑو۔نہ تم کوئی سیدھی سچی ہندو ہو اور نہ میں سیدھا سچا مسلمان۔جب ہم عام روزمرہ کاموں میں اپنے مذہب کو چھوڑ چکے ہیں تو شادی کے معاملے میں ایسا کیوں نہیں کرسکتے؟"

اُما خاموش کھڑی چاند کی مدھم روشنی میں ایڈی کو دیکھتی رہی۔

"چپ کیوں ہو؟"

"مگر ہمارے گھر والے کیسے راضی ہوں گے؟"

"ہم نے محبت گھر والوں سے لائسنس لے کر شروع کی تھی؟ جب اس وقت ہم نے گھر والوں کے متعلق نہیں سوچا تھا۔انہیں اہمیت نہیں دی تھی تو آج ان کے بغیر فیصلہ کر لینے میں حرج ہے۔"

جو کچھ ایڈی کہہ رہا تھا' وہ اُما کے قیاس سے بھی باہر کی باتیں تھیں۔

"تم سوچ لو اُما۔میں تمہارے فیصلے کے بعد اپنے گھر والوں کو آگاہ کردوں گا۔اگر انہوں نے اعتراض نہ کیا تو ٹھیک ہے۔اور اگر وہ معترض ہوئے تو مجھے پروا نہیں ہے۔مگر ہر چیز سے پہلے مجھے تمہارے فیصلے کی ضرورت ہے۔ہاں کہو یا نہیں' مجھے بتا ضرور دینا۔"

وہ دونوں گیلری میں آئے تو اُما گم صم سی تھی۔ایڈی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔کافی لمبے جھگڑے کے بعد انہیں گیلری میں ڈسپلے کی اجازت مل گئی تھی اور اب وہ چاروں گیلری میں اپنے اپنے حصے کو ڈیکوریٹ کر رہے تھے۔

ماہ بانو اور نیہاں نے اُما کی کیفیت میں تبدیلی محسوس کی تھی لیکن اسے کچھ کہا نہیں تھا۔وہ بھی ان کے ساتھ مدد کرانے میں مصروف تھیں۔اچانک نیہاں کو خیال آیا۔

"اُما! ہم نے رات دیر تک باہر رہنے کی اجازت نہیں لی تھی۔"

"ہاں۔" اس نے غیر حاضر دماغی سے کہا۔

"خیر فائن ہی ہوگا نا' دے دینا۔سب کو پتا ہے تم لوگ کالج میں ہو۔" ماہ بانو نے کہا۔

"بانو اگر ممکن ہو تو آج کالج کے بجائے تمہاری طرف رات گزار لوں؟" اُما نے اچانک پوچھا۔

"او شیور۔یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔تم ایسا کرو کہ فون کر کے ہوسٹل میں اطلاع کردو۔یہاں سے فارغ ہو کر گھر چلے جائیں گے۔بلکہ نیہاں تم بھی آج ہمارے ساتھ ہی چلو۔" ماہ بانو نے کہا۔

"میرا ٹیلی کارڈ ختم ہو گیا ہے۔" نیہاں بولی۔

"یہ مجھ سے لے لو۔" جیمز نے اپنا ٹیلی کارڈ اسے تھمایا۔

وہ سب پھر کام میں مصروف ہو گئے۔بارہ بجے کے قریب عبداللہ ماہ بانو کے پاس آیا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے بانو۔تم لوگ اب گھر جاؤ۔"

"لیکن ابھی تو اتنا کام رہتا ہے۔ایسے کیسے چلی جاؤں۔" ماہ بانو نے کہا۔

"کام ہوتا رہے گا۔بس تم جاؤ۔" وہ مُصر رہا۔

"میری تسلی کیسے ہوگی؟ میری جان سُولی پر ٹنگی رہے گی۔" وہ متذبذب تھی۔

"صبح آؤ گی تو تسلی ہو جائے گی۔تم اس وقت گھر نہ پہنچیں تو میری تسلی نہیں ہوگی۔"

وہ خاموش ہو گئی۔اسے علم تھا کہ اب عبداللہ اسے گھر بھجوا کر ہی دم لے گا۔

"میرا ڈرائیور تم لوگوں کو چھوڑ آئے گا۔پھر بھی میں فون کر کے بھی پتا کرلوں گا۔میرا بہت ... ہے ورنہ میں ہی تمہیں ڈراپ کر دیتا۔"

"ایک شرط پر جاؤں گی۔" ماہ بانو نے کہا۔

"بولو۔"

"فارغ ہو کر تم مجھے رِنگ کر دو گے' چاہے کتنا ہی وقت ہو جائے۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی اور میں فون سرہانے رکھ کر سوؤں گی۔"

"وہ مسکرا دیا۔ جو حکم۔"

جب سے وہ لوگ پرانے گھر سے یہاں شفٹ ہوئے تھے اماں نے ماہ بانو پر پابندیاں بھی کچھ کم کر دی تھیں۔ ایک تو ماحول بدل گیا تھا اور وہاں کے برعکس یہاں کسی کو ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہنے کی عادت نہیں تھی۔ بلکہ یہاں پر تو ہمسائے بھی برسوں گزر جانے کے باوجود اکثر ایک دوسرے سے ناواقف ہی رہتے تھے۔ پھر کچھ یہ بھی تھا کہ ابا جی چلے گئے تھے اور وہ ان کی بہت لاڈلی تھی۔ ابا جی کے جانے کے بعد اماں جی کی توجہ کا سارا مرکز وہی تھی۔ کبھی امریکہ سے ابا جی کا فون آتا تو وہ انہیں بطور خاص تاکید کرتے تھے کہ ماہ بانو ایک لمحے کے لیے بھی دکھی اور افسردہ نہ ہو۔ اسے جس چیز کی خواہش ہو وہ اسی وقت پوری کی جائے۔

اماں خود بھی اس کی دشمن تو نہیں تھیں۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی اور انہیں اس سے کوئی کم محبت تو تھی نہیں۔ اب ماحول بدلا تو اماں کو احساس ہوا کہ ماہ بانو کا ذہن اس کے ابا جی نے اس نئے ماحول کے مطابق ڈھالا تھا۔ وہ یہاں آ کر خوش تھی۔ اس کی سوچیں' اس کا اندازِ نشست و برخاست یہاں کے ماحول سے مطابقت رکھتے تھے۔

اماں اسے خوش دیکھ کر خوش تھیں۔ وہ سارا دن اپنے کام میں مصروف رہتی تھی۔ صبح کالج' واپسی پر کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتی تھی۔ پھر گھر کے پچھلے حصے میں کچن کے باہر جو شہتوت کا درخت لگا ہوا تھا اس کے نیچے رکھے چاک پر کچھ نہ کچھ بناتی رہتی تھی۔ اسے یہ کام کرتے دیکھ کر اماں جی کا دل بھر آتا تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اسے کام کرتے دیکھتی تھیں۔ اس سے باتیں کرتی تھیں۔ شام گہری ہونے لگتی تو دونوں اندر آ جاتیں اپنی خواب گاہ کے ساتھ والا کمرا اس نے اسٹوڈیو بنا رکھا تھا۔ اور رات گئے تک وہاں کام کرتی رہتی تھی۔

بس اماں ڈسٹرب ہوتی تھیں تو اس وقت جب وہ عبداللہ کو فون کرتی تھی یا...... عبداللہ کا فون آتا تھا مگر وہ خاموش رہتی تھیں۔ جب تک ابا جی یہیں تھے تب تک وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ لیا کرتی تھیں لیکن اب اسے کچھ کہنے کو ان کا دل نہیں چاہتا تھا۔

وہ تینوں گھر پہنچیں تو اماں جاگ رہی تھیں۔

"کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ بھوکی ہی اُٹھ آئی ہو۔"

"اماں کام ہی اتنا زیادہ تھا۔ شام کو چپس کھا لیے تھے اور بس' اس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔" وہ بولی۔

"قسم سے آنٹی! اس وقت سخت بھوک لگ رہی ہے۔" نیہاں نے کہا۔

"میں ابھی کھانا گرم کرتی ہوں۔ روٹیاں میں نے نہیں پکائی تھیں۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ تم

کب آؤ گے۔ روٹیاں پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جائیں۔ تم لوگ بیٹھو' میں تھوڑی دیر میں کھانا لاتی ہوں۔"

"میں آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔" اُما اُٹھی۔

ماہ بانو اور نیہاں ڈھیٹوں کی طرح لاؤنج میں بیٹھی رہیں...... اُما کھانا چن رہی تھی۔ جب عبداللہ کا فون آیا۔ تھوڑی دیر اس سے بات کر کے اور اسے یہ تسلی دے کر کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ گئی ہیں۔ وہ کھانے کے لیے آ گئیں۔ اُما نے دو چار نوالے کھا کر چھوڑ دیا۔ اماں اس پر کھانے کے لیے زور دیتی رہیں۔ ماہ بانو اور نیہاں نے البتہ اس سے اصرار نہیں کیا۔

خواب گاہ میں پہنچ کر وہ تینوں بستر اور قالین پر بیٹھ گئیں۔

"تم لوگوں کا سونے کا ارادہ نہیں ہے؟" نیہاں نے کہا۔

"مجھے تو نیند نہیں آ رہی...... ویسے بھی عبداللہ نے کہا تھا کہ وہ کام ختم کر کے فون کرے گا۔" ماہ بانو نے کہا۔

"اور تمہیں کیوں نیند نہیں آ رہی؟" اس نے اُما کی طرف دیکھا۔

وہ خاموشی سے قالین کے ڈیزائن پر انگلی پھیرتی رہی۔

"ہوا کیا ہے اُما۔ اب تو بتا دو پلیز۔ تم ہم سے تو کچھ نہیں چھپاتیں۔" ماہ بانو نے کہا۔

"ایڈی نے شادی کا پروپوزل دیا ہے۔" وہ بولی۔

"سچ؟"

"ہاں۔" وہ بولی۔

"پھر؟ تم نے کیا کہا؟" نیہاں نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں نے کیا کہنا تھا سوائے اپنے خدشات اور چند حقیقتوں کے' لیکن اس نے ایک عجیب غریب تجویز رکھ دی۔ کہنے لگا کہ ہم اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے شادی کر لیتے ہیں۔" اُما نے بتایا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسا تو ممکن نہیں ہے۔" ماہ بانو کچھ نہ سمجھی۔

"میں نے بھی یہی کہا تھا مگر وہ مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔" اُما نے انہیں تفصیل سے اپنی اور ایڈی کی گفتگو سنا دی۔

"عام حالت میں مذہب پر عمل کرنا یا نہ کرنا اور بات ہے۔ میں مانتی ہوں کہ ہم میں سے کوئی بھی اچھا مسلمان نہیں ہے لیکن شادی بیاہ......" ماہ بانو کہتے کہتے رُک گئی۔

"تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتیں اُما۔" نیہاں نے بے چارگی سے کہا۔

"مجھے نہیں پتا کہ ایڈی کو مذہب سے کتنی واقفیت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بالکل ہی نہیں ہے۔ قرآن پاک میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر مرد یا عورت اپنا

مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کر لیں تو شادی ممکن ہے۔ میری معلومات تو یہ کہتی ہیں کہ ایسا کرنے والا دائرہ اسلام سے ہی خارج ہو جائے گا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ خود کو مسلمان کہلوانے پر مُصر ہے اور غیر مذہب میں شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

اُما نے مجروح نظروں سے ان کی طرف دیکھا پھر بولی۔

''بتی بجھا دو۔ عبداللہ کا فون آیا تو تم جاگ جاؤ گی۔''

''میری باتوں کو تم نے مائنڈ کیا ہے اُما؟'' ماہ بانو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''نہیں۔ مائنڈ کیا کرنا۔ تم نے وہی کہا جو حقیقت ہے اور جو میں بھی جانتی ہوں۔''

''نہیں' تم نے مائنڈ کیا ہے۔ میرا مطلب تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔''

''بانو میں کبھی نہیں چاہتی تھی کہ ہماری دوستی کے بیچ مذہب حائل ہو مگر میرے یا تمہارے نہ چاہنے کے باوجود بھی آج ایسا ہو گیا ہے۔ تم نہ مجھے منع کر سکتی ہو اور نہ ایڈی کو۔ اس بات پر تمہارا زور نہیں ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ اگر ہماری شادی اسی صورت میں ہوئی تو تم دل سے خوش نہیں ہو گی۔ شاید تم کوئی بہانا بنا کر اس میں شرکت بھی نہ کرو۔

تم سب دل سے چاہتے تھے کہ میری اور ایڈی کی شادی ہو لیکن اس صورت میں نہیں جو آج ایڈی نے پیش کی ہے بلکہ اس صورت میں کہ میں مسلمان ہو جاؤں گی اپنی محبت اور ایڈی کی خاطر۔ اور یوں کسی کو بھی کوئی مسئلہ درپیش نہیں آئے گا۔ اور کچھ نہیں تب بھی یہ تم سب کی خواہش ضرور تھی۔

اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ہمارے بچھڑ جانے کا تم سب کو دکھ ہوتا بہت شدید۔

مگر اب میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس طرح ہمارے ملنے کی نسبت تم سب ہمارا بچھڑنا زیادہ پسند کرو گے۔ دکھ تو ہو گا تم سب کو لیکن اس دکھ کو اپنی ذہنی کشمکش پر ترجیح دو گے۔

مجھے بتاؤ کہ جب تم لوگ مذہب کے معاملے میں اتنی سی بات پر ری کنسائل نہیں کر سکتے تو مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں پورا مذہب ہی تبدیل کر لوں۔ مجھ سے وہ کچھ کیوں مانگتے ہو جو میں کبھی نہیں دے سکتی۔ کیا اس وقت تم دونوں میں سے کوئی مذہب تبدیل کر سکتا ہے؟ چاہے اپنی محبت ہی کی خاطر؟ پھر میں کیسے ایسا کر سکتی ہوں۔ یہ سب تو سات جنموں میں بھی ممکن نہیں ہے۔

''میں بھی تم دونوں جیسی عام لڑکی ہوں۔ میرا ذہن میری تعلیم' میرا سوچنے کا انداز' سب کچھ تم دونوں جیسا ہے پھر تم لوگ مجھ سے اتنی بڑی توقعات کیوں وابستہ کر رہے ہو۔ ہم لڑکیاں تو یوں بھی نفسیاتی طور پر مذہب کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ ایڈی جس نے اس حد تک تجویز دی ہے۔ وہ بھی مذہب تبدیل کرنے کے متعلق نہیں سوچ سکتا' پھر میں ہی کیوں؟'' وہ خاموش بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد نیہاں بولی۔

''پلیز اُما تم اسلام کا مطالعہ کر کے تو دیکھو؟''

''تم نے کتنا مطالعہ کیا ہے نیہاں کیا کچھ پڑھا ہے تم نے اسلام کے بارے میں؟ تم تو پیدائشی طور پر مسلمان ہو پھر بھی کتنا کچھ جانتی ہو؟''

وہ خاموش ہو گئی۔

''تم نے اس تجویز کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''میں جانتی ہوں کہ میرے گھر والے تو دور کی بات تم جیسے دوستوں کی دعائیں بھی ہمیں نہیں ملیں گی پھر بھی میں کوشش ضرور کروں گی۔ میں پچھتانا نہیں چاہتی اور نہ ہی Failure یا Loser کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا تھا ناں کہ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو محبت کسی اور سے کرتی ہیں اور شادی کسی اور سے کرتی ہیں۔ میں کوشش ضرور کروں گی I do not want up as a loser۔'' اس نے قطعی انداز میں کہا۔

وہ بتی بجھا کر لیٹ گئیں۔ نیند ماہ بانو کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

''یہ حقیقت ہے کہ میں اُما اور ایڈی کی اس انداز میں ہونے والی شادی میں شرکت نہیں کر سکتی حالانکہ وہ دونوں میرے بہت پیارے دوست ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے دل کے بہت اندر یہ خواہش موجود تھی کہ اُما' ایڈی کی خاطر مسلمان ہو جائے لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اُما کی پرواز کتنی ہے۔''

اس کے ذہن میں بار بار اُما کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''میں پچھتانا نہیں چاہتی۔''

I don't want up as a loser

☆=====☆=====☆

ظہیر کے علاوہ سب کی جیوری اچھی ہو گئی تھی۔ حالانکہ سب رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ مگر ابھی تک بالکل چاق و چوبند تھے۔ صبح پونے پانچ بجے ماہ بانو کو عبداللہ کا فون آیا تھا۔ پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اُٹھا لیا تھا۔

''میں ابھی گھر پہنچا ہوں اور پہلا کام یہ کیا ہے کہ تمہیں فون کروں۔'' اس نے کہا۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ کام تو ٹھیک طریقے سے ختم ہو گیا ناں؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''ہاں ہو گیا۔ میرا اور ایڈی کا تو ہو ہی گیا تھا۔ ہم باقی سب کی ہیلپ کراتے رہے۔ خیر اب تم سو جاؤ۔ میں نے خواہ مخواہ تمہیں ڈسٹرب کیا۔''

''بالکل نہیں بلکہ میں تو انتظار میں کب سے جاگ رہی تھی۔'' وہ بولی۔

''اماں اور بابا جان بھی شام کو پہنچے ہیں۔ میرا انتظار کر کے سو گئے ہیں۔''

''تم بھی سو جاؤ تاکہ صبح فریش ہو۔'' ماہ بانو نے مشورہ دیا۔

''ابھی سوگیا تو پھر شام سے پہلے نہیں جاگ سکوں گا۔ ابھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''اچھا پھر میری بات سنو۔'' وہ فون اُٹھا کر گیلری میں نکل آئی۔

''سناؤ۔'' وہ بولا۔

''تمہیں پتا ہے کہ ایڈی نے اُما کو پرپوز کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اور یہ بھی پتا ہے کہ اس نے اُما کو کیا تجویز دی ہے؟''

''ہاں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''لیکن سوچو عبداللہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ایڈی پاگل تو نہیں ہوگیا۔''

''تمہیں کیا ضرورت ہے تبصرہ کرنے کی۔ وہ دونوں بالغ ہیں اور اپنے سلسلے میں خود فیصلہ کرسکتے ہیں۔ اچھا یا برا تمہیں درمیان میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟ میں کب درمیان میں آرہی ہوں۔ میں تو اتنا کہہ رہی ہوں کہ اس سے بہتر ہے وہ ہندو ہو جائے کیونکہ مسلمان تو وہ نہیں رہے گا ایسا کر کے مسلمان کہلوانے اور مسلمان ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور جب وہ مسلمان نہ رہا تو پھر جو مرضی ہو۔ ہندو، سکھ، عیسائی اتنی سی عقل نہیں ہے اس میں کہ یہ بات سمجھ لے۔ اچانک کیا کیڑا گھس گیا ہے اس کے دماغ میں۔ مائی گاڈ! میری تو سمجھ میں نہیں آرہا۔'' ماہ بانو نے جھرجھری لی۔

''سنو بانو، ہم سب کو دوسروں کے بجائے اپنے اعمال پر توجہ دینی چاہیے۔ ہم دونوں بھی اتنے اچھے مسلمان نہیں ہیں کہ کسی پر کفر کا فتویٰ لگائیں۔ تم نے ٹھیک کہا کہ مسلمان کہلوانے اور مسلمان ہونے میں فرق ہوتا ہے۔ مگر میرا اور اپنا غیر جانبداری سے تجزیہ کر کے بتاؤ کہ ہم کیا ہیں؟ ہم میں سے آدھے لوگ تو یہ بھی نہیں غور کرتے کہ وہ مسلمان کیوں ہیں۔ بس وہ اس لیے مسلمان ہیں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوگئے ہیں۔

صرف اپنے اوپر توجہ رکھو کہ تمہارے اعمال کیسے ہیں اور میں اپنے اوپر توجہ رکھوں گا۔ اگر ہم سب اپنے اپنے اوپر توجہ دیں تو ہمارے آدھے مسائل حل ہو جائیں گے۔ معاشرہ فرد سے قائم ہوتا ہے اور ہر فرد غیر جانبداری سے اپنا تجزیہ کرتا رہے اور اپنی غلطیاں درست کرتا رہے تو معاشرہ سدھرے گا۔ یہ نہیں کہ ہم خود تو کچھ بھی کرتے رہیں اور دوسروں کی فردِ جرم تیار کرنے میں مصروف رہیں۔''

عبداللہ کے کہنے پر اس نے اس موضوع پر دوبارہ کسی سے بات نہیں کی تھی۔

عبداللہ کی اماں اور بابا جان آئے تھے۔ وہ ان سے ملی تھی۔ انہوں نے بھی اس سے بہت شفقت اور محبت سے بات چیت کی تھی۔ یوں بھی وہ سارا وقت وہیں رہی تھی۔ جہاں عبداللہ نے ڈسپلے کر رکھا تھا اور سب آنے والوں کو پوچھنے پر اس کا کام اس طرح Explain کر رہی تھی

جیسے یہ سب کچھ خود اس نے تخلیق کیا ہو۔

مگر ایک بات کا احساس اسے بہت شدت سے ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے عبداللہ کے بابا جان اس کی محبت کا راز جانتے ہوں۔ یہ صرف اس کے محسوسات تھے۔ کوئی اس بارے میں پوچھتا تو شاید وہ کوئی ٹھوس وجہ بیان بھی نہ کرسکتی۔ بس ایک احساس تھا۔ انہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ رویے سے کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔ بظاہر کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جسے وہ اپنے احساسات کی بنیاد بنا سکتی۔

جیسے ہی اسے احساس ہوا تھا اس نے غیر محسوس انداز میں انہیں کھوجنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ان کا ردِعمل جاننا چاہتی تھی۔ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے خوش آمدید کی چمک تھی۔ یا وہیں رُک جانے کی تنبیہ۔ مگر وہ کچھ جان نہیں سکی تھی۔

ہاں ایک موہوم سا خیال تھا کہ ان کی نگاہوں میں ریشماں کی جو جگہ تھی، وہ شاید اسے نہ مل سکتی۔ وہ ایک طرف زرینہ خالہ کی بیٹی تھی تو دوسری طرف رجب علی کی بیٹی۔ بابا جان کے دل میں ایک طرف گزشتہ محبت کا نرم گوشہ تھا اور دوسری طرف خون کا رشتہ جبکہ ماہ بانو صرف عبداللہ کی پسند تھی اور بس۔

''جو حق حیدر بابا اپنے بابا جان سے اپنے لیے طلب کر رہے تھے۔ کیا وہ یہی حق عبداللہ کو بھی دیں گے؟'' یہ سوال مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا لیکن اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

رزلٹ آؤٹ ہوا تو ایڈی کی Distinction تھی۔ عبداللہ کو آنرز ملا تھا اور جیمز بھی پاس ہوگیا تھا۔ ہاں ظہیر کو فیل کر دیا گیا تھا وہ سخت اَپ سیٹ تھا۔ جسے پتا چلتا تھا وہی کوئی نہ کوئی تبصرہ شروع کر دیتا تھا۔

''او گاڈ! تھیسز میں فیل کر دیا؟ اوہ نو۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ اب اس کا کام فیل ہونے والا بھی نہیں تھا۔ ضرور اسے Victimise کیا گیا ہے۔''

''تھیسز میں فیل کرنے سے بہتر تھا کہ اسے پہلے ہی تھیسز دینے سے روک دیا جاتا۔ یہ تو بے چارے کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی ہے۔''

''ویسے اس نے کوئی نئی چیز دی بھی نہیں تھی۔ چلو پرانی ہی دے دیتا لیکن کچھ تو تبدیل کرتا۔''

''خیر جیوررز کو بھی کچھ نہیں آتا تھا۔ سب نکمے بطور جیوررز بلوا لیے جاتے ہیں۔''

''میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہی ہوگا۔ اس کا کام بس ایویں تو تھا۔''

غرض جتنے منہ تھے، اتنی باتیں۔

☆=====☆=====☆

چھٹیوں سے پہلے وہ سب ایک مرتبہ پھر عبداللہ کے گھر جمع تھے۔ فائنل ائر تو تھیسز کے ب
کالج کو الوداع کہہ چکی تھی لیکن ماہ بانو اُما اور نیہاں کی کل سے چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں۔

''اب تم سب نے ہماری منگنی پر ضرور آنا ہے میں کوئی بہانا نہیں سنوں گی کسی کا۔'' نیہا
نے کہا۔

''گروپ میں ہونے والی پہلی منگنی ہے۔ آئیں گے۔ کیوں نہیں۔'' ایڈی بولا۔

''اُما اور بانو تم لوگوں نے بھی آنا ہے۔'' وہ ان سے مخاطب ہوئی۔

''مجھے تو اماں گاؤں ضرور پٹخیں گی اور نانا جی کو تاکید کر کے جائیں گی کہ وہ مجھے ب
مرغیوں کے ڈربے میں بند کر دیں تاکہ میں کہیں نکل نہ سکوں۔ اسلام آباد بہت دور کی با
ہے۔'' ماہ بانو نے منہ بنایا۔

''یہ نہیں چلے گا۔ عبداللہ یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ بانو کو لاؤ۔'' وہ بولی۔

''میں کان سے پکڑ کر لاؤں گا تم فکر مت کرو۔'' اس نے کہا۔

''اور اُما تم نے بھی آنا ہے۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔'' نیہاں اس سے مخاطب ہوئی۔

''میں کل سکھر جا رہی ہوں اور پتا نہیں وہاں حالات کیا صورت اختیار کریں۔ میں فرینکل
کہہ رہی ہوں تم سے کہ میں وعدہ نہیں کر سکتی۔ البتہ کوشش کروں گی۔''

''میں نے کوئی بات نہیں سنی، بس تمہیں آنا ہے۔'' وہ مُصر تھی۔

''میرا مسئلہ حل کرو۔ کوئی ترکیب بتاؤ کہ میں گاؤں نہ جا سکوں۔ میں بالکل نہیں جا
چاہتی۔'' ماہ بانو نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

''ایسی عاجز اور مسکین صورت بنائی ہے تم نے کہ بندے کو خواہ مخواہ ترس آ جائے۔'' جیم
نے کہا۔

''میرے پاس ایک ترکیب ہے۔ تمہاری اماں جان کو سی آف کرنے تمہارے رشتے دا
گاؤں سے آئیں گے اور واپسی پر تمہیں ساتھ لے کر جائیں گے۔ تم ان کی واپسی کے وقت
بیماری کی ایکٹنگ کر لینا۔ میں امی سے کہوں گا کہ وہ رشتے داروں کو یقین دلا دیں کہ تم شہر میں ر
کر ہی ٹھیک ہو سکتی ہو اور یہ بھی کہ وہ دن رات تمہاری تیمار داری کریں گی۔ آخر رشتے دار اپنے
اپنے کام چھوڑ کر آئے ہوں گے۔ کتنے دن یہاں ٹکیں گے۔ بالآخر تو انہیں جانا ہی ہو گا ناں۔''
ایڈی نے ترکیب بتائی۔

''میرے رشتے دار اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت فالتو قسم کے لوگ ہیں، لیکن خیر یہ ترکیب
آزما لینے میں ہرج بھی کوئی نہیں ہے۔ جس نے نکلنے کی کوشش کی، اس سے ایسی تیمار داری
کراؤں گی کہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بھاگ کھڑا ہو گا۔''

☆=====☆=====☆

خادم حسین امریکہ سے واپس آ گیا تھا۔ ابھی اسے آئے بمشکل دو ہی دن ہوئے ہوں گے
کہ زمینوں کے مقدمات میں ان کی پیروی کرنے والا وکیل آ گیا۔

''پیر صاحب، اگلی پیشی پر فیصلہ ہے اور میں نے پہلے پتا کروا لیا ہے۔ میری تمام تر کوشش
کے باوجود ہم یہ کیس نہیں جیت سکتے۔ اس کے بارے میں، میں نے پہلے بھی آپ کو عرض کر دیا تھا
کہ کیس بہت واضح اور ہمارے خلاف ہے۔ زمینیں حیدر علی شاہ صاحب کا حق ہیں اور اس سلسلے
میں ہم سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکیں گے کہ مقدمے کو طول دیتے جائیں۔''

گو کہ پیر صاحب ذہنی طور پر اس فیصلے کے لیے تیار تھے لیکن ایسا ہو جانا انہیں بالکل پسند
نہیں تھا۔ اس سارے علاقے میں ان کا جو رعب اور دبدبہ تھا، جو وقار تھا، وہ پل بھر میں خاک میں
مل جاتا۔ زمین ان کی عزت اور غیرت تھی۔ اپنی عزت اور غیرت وہ حیدر علی شاہ کے حوالے کیسے
کر سکتے تھے۔

''وہ یہاں بھی جیت گیا لیکن ہم اسے جیتنے نہیں دیں گے۔ اس مرتبہ اسے ہارنا ہو گا۔''
انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور خادم حسین کو طلب کیا۔

''جی بابا جان۔'' وہ ان کے پاس چلا آیا۔

''زمینوں کے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ فیصلہ حیدر علی شاہ
کے حق میں ہو رہا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''اس کا اندازہ تھا مجھے۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''لیکن اسے جیتنا نہیں چاہیے۔ کسی بھی صورت نہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''پیسہ خرچ کریں بابا جان۔ پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے۔''

''یہاں پیسہ خرچ کر کے بھی ہم نہیں جیت سکتے۔ اور ہار ہم کسی صورت برداشت نہیں
کریں گے۔'' وہ بولے۔

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟ حیدر علی کا سر؟ آپ صرف حکم کریں۔''

''نہیں۔ حیدر علی بیتا ہوا کل ہے۔ ہمیں اس کا کٹا ہوا سر نہیں، اس کی ٹوٹی، جھکی ہوئی کمر
چاہیے۔''

''عبداللہ۔''

''ہاں۔ وہ گاؤں واپس آ رہا ہے۔ ہمیں اس کا سر چاہیے۔ بہت ہو گیا۔ اس سے زیادہ
نہیں۔ زمین اس کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے تھک گئی ہے۔ اس کے بوجھ سے زمین کو آزاد کراؤ۔
جاؤ، مکرم کو اس کی قسم یاد دلاؤ۔ وہ عبداللہ کے گاؤں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے بتاؤ کہ وہ آ رہا
ہے۔''

''بہت بہتر بابا جان۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے جانے کے بعد پیر صاحب کمرے میں تنہا رہ گئے۔ اور تنہا ہوتے ہی ان کے ذہن میں ریشماں کی تصویر اُبھر آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''پیر صاحب' ریشماں آپ کی سگی اولاد ہے۔ پھر بھی آپ کو پتا کیوں نہیں چلتا کہ کیوں رو رہی ہے؟ اس کے آنسو اپنی داستان خود نہیں سنا رہے؟ آپ سن نہیں سکتے یا سننا چاہتے نہیں ہیں۔'' یاسمین بیگم کی آواز گونجی۔

اور ان کے تصور میں ریشماں کی جگہ زرینہ نے لے لی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''مجھ سے محبت کا دعویٰ ہے پیر صاحب؟ کیسی محبت ہے آپ کی؟ میری نشانی' میری اکلوتی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک؟ نہیں آپ کسی سے محبت نہیں کر سکتے۔ جھوٹ بولتے ہیں آپ کہ آپ نے مجھ سے محبت کی تھی۔ پوری شدت کے ساتھ۔

مجھے کھو کر آپ کو میری محبت کا احساس ہوا۔ کیا ریشماں کو بھی کھو کر ہی اس کی قدر و قیمت پہچانیں گے آپ؟''

انہوں نے انگلیوں میں پکڑا اسگار ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''اب بہت دیر ہو چکی ہے زرینہ۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہا۔ وہ یہ مقدمہ ہار جاتا تو شاید ہم عبداللہ کے بارے میں اپنا فیصلہ تبدیل کر دیتے مگر اب نہیں۔ بہت دن پہلے ہمارے بابا جان نے ہمیں بہت قیمتی سبق دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ حویلی کی عزت اور وقار کے سامنے ہر رشتہ ہیچ ہے۔

اور پھر ہماری ریشماں کو بھائیوں سے اتنی محبت ہے کہ وہ ان کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت' ہر رشتہ ٹھکرا سکتی ہے۔'' انہوں نے سوچا۔

☆=====☆=====☆

چھٹیاں ہوتے ہی سب اپنے اپنے گھروں کو سدھار رہے تھے۔ نیہاں اسلام آباد روانہ ہو گئی تھی اور اُما کو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ سکھر کی فلائیٹ کے لیے ایئر پورٹ چھوڑ کر آئے تھے۔ جاتے ہوئے وہ بہت خاموش تھی۔ لاؤنج میں جانے سے پہلے اس نے ماہ بانو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

''دعا کرنا بانو کہ ہم پھر مل سکیں۔''

پھر سب کو بائے کر کے لاؤنج میں چلی گئی تھی۔ اس سمے ماہ بانو کو لگا تھا جیسے اب وہ کبھی اُما کو نہیں دیکھ سکے گی۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اب ان کا سارا گروپ پھر کبھی اکٹھا نہیں ہوگا۔ یوں جیسے ان کا ساتھ یہیں تک تھا۔ سب سے پہلے اُما اُن سے جدا ہوئی تھی اور شاید اب ایک ایک کر کے سبھی نے جدا ہو جانا تھا۔

اس کی اداسی محسوس کر کے عبداللہ اسے فورٹریس اسٹیڈیم لے آیا۔ یہ کہہ کر کہ تھوڑی دیر باتیں کریں گے۔ کولڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہوں گے اور پھر گھر جائیں گے۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ کار ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''تم بھی آج گاؤں چلے جاؤ گے''؟ ماہ بانو نے اداسی سے کہا۔

''ہاں' تمہیں گھر ڈراپ کر کے ساتھ ہی نکل جاؤں گا۔ اماں اور بابا جان بھی ساتھ ہوں گے۔''

''پتا نہیں اُما کا کیا بنے گا؟'' اس کا ذہن وہیں اٹکا ہوا تھا۔

''یہ سوچو کہ ہمارا کیا بنے گا؟'' عبداللہ ہنس پڑا۔

''اور چاہے سب مان جائیں۔ میری اماں جی بالکل نہیں مانیں گی۔'' اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

''وہ بھی مان جائیں گی' بس تم ان سے الجھنا چھوڑ دو۔''

''میں کب الجھتی ہوں۔'' پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''پتا ہے عبداللہ' مجھے لگتا ہے کہ

تمہارے بابا جان کو بھی ہمارے متعلق اندازہ ہو گیا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن تم نے کیسے محسوس کیا۔''

''پتا نہیں' بس میری Feeling ہے۔ یہ اندازہ نہیں ہے مجھے کہ انہیں یہ بات اچھی لگ ہے یا بری۔''

''بری لگنے کا کیا سوال؟''

''تم نہیں جانتے ناں۔'' ماہ بانو کے انداز میں افسردگی اتر آئی۔

''کیا نہیں جانتا؟''

''اب کیا فائدہ بتانے کا۔ جب میں بتانا چاہتی تھی تب تم سننا نہیں چاہتے تھے اور اب میں بتانا نہیں چاہتی۔ اب کچھ بتایا تو ہر بات الجھ جائے گی۔ اتنا البتہ' سمجھ لو کہ تمہارے بابا جان ریشماں کو مجھ پر یا کسی بھی اور لڑکی پر ترجیح دیں گے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''شادی مجھے کرنی ہے' پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کسے ترجیح دیتے ہیں۔''

''یہ کہہ دینا آسان ہے' تم چاہے ان کی بات نہ مانو' اپنی منوا لو' لیکن ساری عمر کے لیے بدمزگی تو پیدا ہو جاتی ہے ناں۔''

''پتا نہیں تم نے کیا کیا وہم پالے ہوئے ہیں' ان کا علاج نہیں ہے میرے پاس۔'' عبداللہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''بہر حال تم ابھی گھر میں کوئی بات مت کرنا۔ کم از کم دو سال تک بالکل نہیں۔ ابھی میں پورے ذہنی سکون کے ساتھ پڑھنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے کون سی جلدی ہے۔ تم آرام سے اسٹڈیز مکمل کرو' اس کے بعد دیکھ لیں گے۔'' بولا۔

''زہرا اور زینی کیسی ہیں؟'' ماہ بانو نے موضوع بدل کر کہا۔

''زہرا تو ایڈجسٹ کر گئی ہے' لیکن زینی ابھی تک ایڈجسٹ نہیں ہوئی۔'' اس نے کہا۔

''اب تو انہیں اتنا وقت ہو گیا ہے کہ زینی بھی ایڈجسٹ کر سکتی تھی۔''

''بہت پریشان کیا ہوا ہے اس نے سب کو' اس کے رزلٹس بھی بہت برے آرہے ہیں۔ گر کے مطابق وہ پڑھتی ہی نہیں ہے۔ آدھا دن روتے ہوئے گزارتی ہے' مگر واپس بھی نہیں چاہتی۔'' اس نے بتایا۔

''پھر؟''

''میں نے اماں اور بابا جان سے کہا ہے کہ وہ نیو یارک کا ایک چکر لگا آئیں۔ اب تو بھی فارغ ہوں۔ زمینوں کی دیکھ بھال کا بھی مسئلہ نہیں ہوگا' مگر بابا جان کا خیال ہے کہ ان بجائے مجھے اور اماں جان کو جانا چاہیے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں ناں وہ' تم اور اماں جان ہی چلے جاؤ۔ تمہارا تو گرین کارڈ بھی بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ تم مزید تعلیم کے لیے امریکہ چلے جاؤ۔ زینی بھی تمہاری موجودگی سے ہو جائے گی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''نہیں' اب میں چاہتا ہوں کہ بابا جان کو بھی تھوڑی سی چھٹی ملے۔ انہوں نے بہت سی ذمہ اں اٹھائی ہوئی تھیں۔ اب میں فارغ ہوا ہوں تو میرا فرض ہے کہ انہیں آرام کرنے دوں اور جگہ کام سنبھالوں۔''

''میری بات سنو عبداللہ! تم بابا جان کی غیر موجودگی میں گاؤں میں نہیں رہو گے۔'' ماہ بانو نجیدگی سے کہا۔

''کیوں؟''

''کیا ہر مرتبہ یہ بتانا ضروری ہے؟ تم نہیں جانتے کہ پیر صاحب کے بیٹوں نے کیا قسم اٹھا ہے' میں تو اس حق میں بھی نہیں ہوں کہ تم گاؤں جاؤ۔''

''میں گاؤں نہ جاؤں اور اپنی موت کے ڈر سے ساری زندگی کبھی یہاں اور کبھی وہاں چھپتا ں؟ کیا اس طرح کبھی موت نہیں آئے گی؟ اور تمہارا خیال ہے کہ بابا جان مجھے موت سے گے۔ یاد رکھو جہاں اور جب تک میری موت نہیں لکھی وہاں اور تب تک مجھے موت نہیں گی اور جب اسے آنا ہوا تو ساری دنیا مل کر بھی مجھے نہیں بچا سکے گی۔ پھر ڈرنے اور گھبرانے دہ؟''

ماہ بانو منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ عبداللہ کا جواب اسی قسم کا ہوگا۔ کے پاس الفاظ نہیں تھے عبداللہ کو قائل کرنے کے لیے۔

''ناراض ہو گئی ہو؟'' اس نے ماہ بانو کا رخ اپنی طرف پھیرا۔

''کیا ناراض ہونا' تم کون سا پھر بھی میری بات مان جاؤ گے۔ مجھے لگتا ہے عبداللہ جیسے تم قدم چل کر اپنی موت کی طرف بڑھ رہے ہو' جانتے بوجھتے ہوئے۔ تمہیں اپنے سمیت بھی پروا نہیں ہے۔'' اس کی آواز بھر آ گئی۔

''مجھے سب کی پروا ہے' تمہاری بھی اور اپنی بھی۔ میں نے اپنے بابا جان کو ہمیشہ سر اونچا چلتے دیکھا ہے۔ انہوں نے ہر قسم کی تکلیف اٹھائی پھر بھی کوئی ان کا سر نہیں جھکا سکا اور ہے اس بات پر۔ تم کیا چاہتی ہو کہ اب صرف اپنی موت کے خوف سے میں اپنا سر جھکا مجھے سب کی پروا ہے بانو' اسی لیے میں اپنا سر نہیں جھکانا چاہتا کہ کہیں آنے والے کل میں مجھ سے وابستہ تمام افراد کو یہ ذلت برداشت نہ کرنی پڑے۔''

خاموش بیٹھی آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

''میں تمہیں بہت مضبوط اعصاب کی مالک سمجھتا تھا۔'' عبداللہ بولا۔

”غلط سمجھتے تھے‘ میں بہت عام سی لڑکی ہوں جب دل دُکھتا ہے تو مجھے بہت رونا آتا ہے
کاش! یہ آگ کسی صورت بجھ جائے‘ کسی بھی صورت‘ صرف تمہاری زندگی‘ تمہارے تحفظ کی
خاطر۔“

عبداللہ نے موضوع تبدیل کر دیا۔ ”اب تم کب گاؤں جا رہی ہو؟“

”میرا دل نہیں چاہ رہا ہے جانے کو۔“

”دل کیوں نہیں چاہ رہا‘ وہاں میں بھی ہوں گا‘ یہی خیال کر کے آجاؤ۔“ عبداللہ نے کہا۔

”کیا فائدہ؟ تم میرے گھر نہیں آسکتے اور مجھے بار بار تمہاری حویلی میں آنا اچھا نہیں لگتا۔“

”آل رائٹ‘ زور نہیں دے رہا میں‘ لیکن کوشش کرنا کہ آجاؤ اور آنے سے پہلے مجھے فون
دینا۔“

”اچھا!“ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

”تم بھی وہاں پہنچ کر بھول مت جانا‘ مجھے فون ضرور کرنا ہے تم نے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ وہاں پہنچ کر بھول جاؤں گا تمہیں۔“

ماہ بانو نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں‘ لیکن کہنا میری عادت ہے۔“

”اب گھر چلیں؟“

”ہاں اماں جی میرا انتظار کر رہی ہوں گی‘ لیکن ایک منٹ ٹھہرو۔“

ماہ بانو نے اپنے شولڈر بیگ سے دو پیکٹ نکالے۔

”ٹھہرو‘ پہلے میں گفٹ دوں گا۔“

عبداللہ کو اچانک یاد آیا۔ اس نے کار کا ڈیش بورڈ کھول کر ایک پیکٹ ماہ بانو کی طرف
بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کھول کر دیکھ لو۔“

ماہ بانو احتیاط سے ریپر کھولنے لگی۔

”اس طرح پیکٹ کھولو گی تو کھولنے میں سال بھر لگ جائے گا۔“ عبداللہ نے کہا۔

”میری عادت ہے یہ کہ ریپر بھی تو سنبھال کر رکھنا ہوتا ہے ناں!“

اس نے اندر رکھی ہوئی پرفیوم کی شیشی نکال لی۔

”آہا...... بیجن......!“ وہ خوش ہو گئی۔ ”تھینک یو عبداللہ۔“

”اور یہ تمہارے۔“ ماہ بانو نے بیگ سے نکالے ہوئے دونوں پیکٹ عبداللہ کی طرف بڑھا
دیے۔

اس نے پہلا پیکٹ کھولا۔ اندر سوکھے پھولوں کا گلدستہ تھا۔

”واہ! par pourri (پوری) زبردست۔“

”اس کی ارینجمنٹ میں نے خود کی ہے۔“ ماہ بانو نے کہا۔

”بہت اچھی ہے۔“

پھر عبداللہ نے دوسرا پیکٹ کھولا۔ اس میں دو دیے تھے۔ اس نے مسکرا کر ماہ بانو کی طرف
یا۔

وہ بھی ہنس پڑی۔

”یہ میں نے خود بنائے ہیں‘ اچھے ہیں ناں؟“

اس نے بچوں کے سے جوش سے پوچھا۔

”ہاں‘ بہت ہی اچھے‘ بہت ہی خوبصورت۔“

”جب بھی تمہیں میری یاد آئے تو ان دئیوں کو روشن کر دینا‘ اور......!“ پھر رک گئی۔

”اور پتا نہیں کیا‘ کافی دن سے کوئی افسانہ نہیں پڑھا ہے۔“

”میں نے البتہ چند دن پہلے الہ دین کی کہانی پڑھی ہے۔ مزہ تو تب ہو کہ میں دیئے کو
ں اور تم حاضر ہو جاؤ۔“

ماہ بانو ہنس پڑی۔

☆=====☆=====☆

ری تھوڑی دیر قبل ہی شوٹنگ سے واپس آئی تھی۔ میک اپ اتار کر‘ نہا دھو کر ابھی وہ بستر
لیٹی ہی تھی کہ جنت بائی آ گئیں۔

”تھک گئی ہو؟“ انہوں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں‘ بہت زیادہ۔“

”میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گی‘ تم آرام کرو۔ میں صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ کافی دن
رجب علی شاہ نہیں آیا۔ کچھ پتا ہے کیوں نہیں آ رہا؟“ جنت بائی نے کہا۔

”زیادہ دن تو نہیں ہوئے‘ ہفتہ بھر ہوا ہے شاید آ جائے گا۔“ وہ بولی۔

”اور نہ آیا تو؟“ جنت بائی کے لہجے میں خدشات تھے۔

ری ہنس پڑی۔

”کہاں نہیں آئے گا تو کہاں جائے گا؟ آپ ایسی وہمی تو نہیں ہیں ممی۔ پتا نہیں رجب علی
معاملے میں آپ کو کیا ہو جاتا ہے۔“

”اب تک سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اچانک کہیں
جائے۔ وہ زیادہ دن ایک عورت کے ساتھ نہیں رہتا۔“

"وہ دن گئے ممی! اب بڈھا ہو گیا ہے وہ، اور پھر مجھ سے بڑھ کر کون ہو گی، جس کے پاس جائے گا، اس کی تو سُدھ بُدھ ہی ماردی ہے میں نے۔" نوری نے کہا۔

"پیسے سے سب کچھ خرید سکتا ہے وہ۔"

"ممی! وقت بہت کچھ تبدیل کر دیتا ہے، بے شک اس کے ہاتھ میں پیسہ ہے، لیکن یہ وقت اس کا نہیں، اس کے بیٹوں کا ہے، جوانی ڈھل جائے تو...... اکڑ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ احساس ہی بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کہ جوانی ختم ہو گئی اور بڑھاپا شروع ہو چکا ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ اب اس کھیل کا اگلا راؤنڈ شروع کیا جائے۔" جنت مائی نے کہا۔

"کون سا راؤنڈ؟"

"اسے چاروں شانے چت گرا دو، اسے کچھ دکھائی نہ دے سوائے ایک لفظ کے۔ نوری میں چاہتی ہوں کہ اب وہ سر کے بل چل کر یہاں آئے، تمہارا طلب گار بن کر۔"

"بس ممی، اتنی سی بات ہے؟ جو آپ چاہتی ہیں وہی ہو گا۔"

☆=====☆=====☆

کریمن پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان ریشماں کے کمرے میں پہنچی۔

"بی بی بڑا غضب ہونے والا ہے حویلی میں، بہت آگ لگے گی، بڑا خون بہے گا۔"

ریشماں کو لگا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو۔

"اللہ خیر، کیا ہوا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں ہوا، پر ہونے والا ہے۔ ہائے بی بی! میری تو روح کانپ رہی ہے، سوچ سوچ کر کہ کیا ہو گا گاؤں میں۔"

"کچھ بتاؤ گی بھی کہ نہیں، میرا دل دہلا دیا ہے تم نے۔" ریشماں نے کہا۔

"رجو ہے ناں بی بی! وہی اپنا رمضان۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "اس نے بتایا ہے مجھے۔"

"بتایا کیا ہے؟" ریشماں کی الجھن بڑھ گئی۔

"کہہ رہا تھا کہ کسی کو نہ بتانا، پر بی بی مجھ سے تو ایسی بات چھپائی نہیں جاتی آپ سے۔" وہ ریشماں کے قریب کھسک آئی اور رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"پیر صاحب نے بڑے شاہ صاحب کو طلب کیا تھا۔ زمینوں کے مقدمے کا فیصلہ بڑی حویلی کے خلاف ہو رہا ہے۔ پیر صاحب چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہی عبداللہ شاہ صاحب کو قتل کر دیا جائے۔"

ریشماں کا دل ڈوبنے لگا۔

"کیا...... کیا کہہ رہی ہے تُو، پاگل تو نہیں ہو گئی؟"

"لیں بی بی! اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے، قسم لے لیں، مجھے خود رجو نے بتایا ہے، اب اللہ شاہ صاحب واپس آ رہے ہیں گاؤں، ان کی پڑھائی ختم ہو گئی ہے، آپ کے سامنے ہی تو کھائی تھی آپ کے بھائیوں نے، بہت انتظار کیا ہے انہوں نے شاہ صاحب کے قتل کا بدلہ لینے "

ریشماں کے اندر قطرہ قطرہ بہت سے آنسو جمع ہو رہے تھے۔ ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔

"بابا جان کو ایک لمحے کے لیے یہ احساس بھی نہیں ہو گا کہ میرے دل پر کیا گزرے گی؟ ان کو تو بہت محبت ہے مجھ سے، پھر میرا خیال کیوں نہیں آیا۔" اس نے دُکھے دل کے ساتھ سوچا۔

"خود سوچیں بی بی!" ن، ریشماں کی حالت سے بے خبر کہتی جا رہی تھی۔ "جس کا ایک ایک بیٹا ہو اور وہ بھی قتل ہو جائے، وہ کیا نہیں کرے گا اپنے دشمنوں کے ساتھ، انصاف کی بات جائے تو ابھی تک حیدر علی شاہ صاحب نے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی، مگر ان کے بیٹے کو ہو گیا تو وہ خاموش نہیں بیٹھیں گے، آگ لگا دیں گے بڑی حویلی میں۔"

"ہاں، یہاں سب رف آگ لگانا جانتے ہیں۔ یا اللہ! وہ کون ہو گا جو آ کر اس آگ کو ئے گا؟"

ریشماں نے آنکھیں موند کر آنسو پیچھے دھکیلے۔

"بی بی، طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"سن کریمن! ذرا اپنی آنکھیں اور کان کھول کر رکھنا اور جو کچھ بھی اس بارے میں سنو، مجھے ر بتانا۔"

"جی بی بی!"

اس کے جانے کے بعد ریشماں کمرے میں تنہا رہ گئی۔

اس بات کا تو اسے یقین تھا کہ کریمن نے جو کچھ کہا، وہ درست تھا۔ اس کے بھائی، عبداللہ خون کے پیاسے تھے، بس موقع ملنے کی دیر تھی۔ یہ بھی غلط نہیں تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ان پہنچنے کی صورت میں حیدر بابا بھی چین سے نہ بیٹھتے۔ پھر ایسی آگ بھڑکتی جو دونوں انوں کو تباہ کر دیتی۔

"یا اللہ! کیا کروں؟" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"کیا ایسا ہی رہے گا ہمیشہ؟ دشمنی کی یہ آگ کبھی ختم نہیں ہو گی؟ کیا کسی صورت میں حیدر بابا نادوں۔"

اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے امداد علی کی خون میں لت پت لاش آ گئی۔

"نہیں۔" وہ رو پڑی۔

"میں یہ بھی نہیں کر سکتی، انہیں بھی نہیں کھو سکتی اپنے بھائیوں کی لاشیں بھی نہیں دیکھ سکتی...... میں کیا کروں؟"

اسے اندازہ نہیں ہوا کہ کتنی دیر گزر گئی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ انداز خادم حسین کا تھا۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے۔

دروازہ کھلا اور خادم حسین کے ساتھ مکرم بھی اندر آ گیا۔

"آپی! آپ اکیلی کیوں بیٹھی ہیں، الجھن نہیں ہوتی؟" مکرم نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، مجھے الجھن نہیں ہوتی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ریشماں روئی ہو؟" خادم حسین نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

اس کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔ اس نے سر جھکا لیا۔ "نہیں تو۔"

مکرم کے لیے ریشماں کے آنسو برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔

"کیا ہوا آپی؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟"

اس نے آنسو ہتھیلی کی پشت سے پونچھ لیے۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہے؟" اس نے اصرار کیا۔

"امداد بھائی کا خیال آ گیا تھا۔" اس کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو آ گئے۔

مکرم اور خادم حسین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے ریشماں کہ امداد چلا گیا، لیکن ہم بھی تو ہیں تمہارے بھائی۔ امداد کے خیال سے اداس ہو جاتی ہو تو ہم میں سے کسی کو بلوا لیا کرو، مجھے تمہارا رونا اچھا نہیں لگتا۔" خادم حسین نے کہا۔

"آپی! آپ کے آنسوؤں کا بدلہ تو میں خود لوں گا اپنے ہاتھ سے۔" مکرم کے لہجے میں عبداللہ کے لیے نفرت تھی۔

"نہیں، نہیں۔" وہ چلائی اور چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر رو پڑی۔

"آپی!" مکرم نے اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔

ریشماں کو روتے دیکھ کر وہ بے چین ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟"

ریشماں نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

"کتنی آگ لگاؤ گے تم سب؟ سب کچھ جلا کر راکھ کر دو گے، کتنا خون بہاؤ گے؟ نہ تم میں سے کسی کے لیے اپنی زندگی کی کوئی اہمیت ہے اور نہ کسی دوسرے کی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خون خرابا کیا معنی؟ یہ بھی احساس نہیں کہ سارا خون اپنا ہی ہے، یہاں بہے یا حیدر بابا کی حویلی میں، مجھ

میں ہمت نہیں ہے کسی اور کے لیے رونے کی، کیوں حویلیاں بے آباد کر کے قبرستان آباد کرنا چاہتے ہو۔"

خادم حسین اٹھ کر ریشماں کے پاس آ گیا۔ "پتا ہے ریشماں، جہاں ہم رہ رہے ہیں اور جس پوزیشن میں ہیں، وہاں یہی سب ہوا کرتا ہے، مجھے معلوم ہے کہ تمہارا دل بہت نازک ہے، تمہارے لیے نہ وہ، نہ کوئی اور کہیں بھی کوئی دشمن نہیں ہے، کیونکہ تم ایک محفوظ چار دیواری میں زندگی بسر کر رہی ہو مگر ہمیں موسموں کے سارے سرد گرم برداشت کرنے ہوتے ہیں، ہماری زندگی میں یہ سب چلتا ہے۔"

"ہاں، مردوں کی زندگی میں یہی ہے کہ گولیاں برسائیں، کسی کو مار دیں یا خود مر جائیں اور ہم عورتوں کی زندگی میں صرف یہی لکھ دیا گیا ہے کہ اپنے پیاروں کی لاشیں دیکھیں اور ساری زندگی روتے ہوئے گزار دیں۔"

مکرم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے چپ کرائے، اس کا رونا اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

"آپی پلیز! روئیں مت، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"خود آنسو دیتے ہو اور کہتے ہو کہ روؤں مت۔ کاش! تم سمجھ سکتے، جان سکتے یا پھر یہاں ماہ بانو ہی ہوتی۔"

مکرم نے خادم حسین کی طرف دیکھا۔

"اسے بلوا لو ریشماں۔" خادم حسین نے کہا۔ "چاہو تو فون کر لو، چاہے خط لکھ لو۔"

"بھائی! اس سے بہتر یہ نہیں ہے کہ آپ لوگ یہ دشمنی ختم کر دیں، پلیز بھائی، یہ زمینیں، جائیداد، رشتوں کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتیں۔ امداد بھائی چلے گئے، ان کا کمرا اب تک ویسا ہی ہے، ان کی چیزیں اسی طرح ہیں، ان کے کپڑے، ان کا بستر، وہاں رکھا ٹی وی، ٹیلی فون ان کے میگزین، سب کچھ، مگر وہ نہیں ہیں۔ آپ زمینیں اور جائیداد چھین سکتے ہیں، کسی کی جان لے سکتے ہیں، لیکن جو چلا گیا، اسے اس کے پیاروں کے درمیان کون واپس لائے گا؟" وہ بری طرح سے رو دی۔

مکرم خاموش کھڑا تھا۔ خادم حسین، ریشماں کو خاموش کرانے لگا۔

"میں مولوی صاحب کے گھر پیغام بھجواتا ہوں کہ وہ ماہ بانو کو بلوائیں۔ آپی اس کے بغیر ...ما ہو رہی ہیں۔" بالآخر مکرم نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اس بلاوے پر دوڑی آئے گی؟ اس کی اپنی بھی کوئی کمٹ منٹس ہوں گی۔" خادم حسین نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم، اسے آنا ہوگا۔ جب آپی ایسا چاہتی ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔" مکرم نے زور

دے کر کہا۔

''میں کچھ نہیں چاہتی' صرف تنہائی چاہتی ہوں' جاؤ تم لوگ یہاں سے۔'' ریشماں نے کہا۔

☆=====☆=====☆

اماں جی نیویارک جانے کی تیاری کر رہی تھیں' پہلے تو انہیں یہ آسرا تھا کہ ماہ بانو بھی ساتھ ہوگی مگر جب اس کا ویزا نہیں لگ سکا تو وہ پریشان ہوگئیں۔ کچھ تو اس بات کی پریشانی تھی کہ پیچھے ماہ بانو اکیلی ہوگی اور کچھ اس بات کی کہ وہ تنہا کیسے اتنا لمبا سفر طے کریں گی' جبکہ اس سے قبل وہ کبھی جہاز میں بیٹھیں بھی نہیں۔

''اماں جی! کوئی مسئلہ نہیں ہوگا' یہاں سے ہم آپ کو سوار کروا دیں گے' وہاں ابا جی ائیر پورٹ پر آپ کو لینے کے لیے آ جائیں گے۔'' ماہ بانو انہیں تسلی دے رہی تھی۔

''پھر بھی بیٹا' وہاں ہزاروں لوگوں میں' میں بدحواس ہو جاؤں گی' نہ مجھے ان کی زبان سمجھ میں آئے گی اور نہ انہیں میری' مجھے تو لگتا ہے کہ میں گم ہو جاؤں گی' اتنی مخلوق کے درمیان۔''

''ارے نہیں اماں' کوئی گم نہیں ہوتا۔ ایڈی کے چچا ہیں ایئر پورٹ سیکیورٹی میں' انہوں نے ایک ائیر ہوسٹس کو بطور خاص تاکید کر دی ہے کہ آپ کا خیال رکھے۔ یوں سمجھیں کہ جیسے میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''یہ کیسے سمجھ سکتی ہوں' تمہاری بات تو اور ہے ناں' تمہیں انگریزی بھی تو آتی ہے۔''

''اماں جی! اسے بھی آتی ہے' وہ آپ کا بہت خیال رکھے گی۔ بس صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ کوئی لمحہ بھر کو بھی کچھ پکڑانا چاہے مثلاً ایسا کوئی بیگ' وینٹی باکس' کوٹ' کچھ بھی نہیں لینا' نہ پکڑنا' نہ ہی اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سامان کسی کو تھمانا۔'' ماہ بانو انہیں بار بار یہ تاکید کر رہی تھیں۔

''ہاں ہاں تمہارے ابا جی نے بھی فون پر مجھے کہا تھا' میں کسی سے نہ کچھ لوں گی اور نہ کسی کو کچھ دوں گی۔'' وہ بولیں۔

''اب آپ کی تیاری مکمل ہے' اپنا پاسپورٹ سنبھال کر رکھنا اور جو میں نے چیزوں کی لسٹ دی ہے امریکہ سے لانے کے لیے' وہ نہ گم کر دینا۔''

''تم بہت زیادہ خرچ کرنے لگی ہو بانو۔''

''اماں! میں کہاں زیادہ خرچ کرتی ہوں' صرف چند سویٹرز منگوائے ہیں اور کچھ کتابیں' جو یہاں نہیں مل رہیں' اس کے علاوہ دو تین پرفیومز اور تھوڑا سا کاسمیٹکس کا سامان ہے' اور بس۔'' اس نے کہا۔

''میں جمع کر رہی ہوں تمہارے جہیز کے لیے اور تم پیسے اُڑاؤ۔''

''اُف اماں! پلیز مجھے کوئی جہیز وغیرہ نہیں چاہیے۔'' ماہ بانو بولی۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ماہ بانو نے ریسیور اٹھا لیا۔

''بانو' میں ایڈی کی امی بول رہی ہوں۔'' ان کے انداز میں پریشانی تھی۔

''جی آنٹی۔''

''یہاں آ سکتی ہو بانو۔ میں بہت پریشان ہوں بیٹا۔''

''میں ابھی آتی ہوں آنٹی۔'' اس نے ریسیور واپس رکھا اور اماں جی کو بتا کر وہاں چلی گئی۔

وہ لاؤنج میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ پریشانی ان کے چہرے پر تحریر تھی۔

''کیا ہوا آنٹی! بہت پریشان لگ رہی ہیں؟'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

''بانو! یہ اُما کون ہے؟'' انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''فرینڈ ہے ہماری۔'' اس نے کہا۔

یہ تو اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہاں بھی ایک پنڈورا باکس کھل چکا تھا' عافیت اسی میں تھی کہ ڈی کی امی کے سوالوں کا مختصر سا جواب دے۔

''ہاں نام تو میں نے بھی سنا تھا بلکہ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا جب انڈیا سے ہر دوسرے دن اور تصویریں چلی آ رہی ہوتی تھیں' مگر میں نے سوچا تھا کہ ایڈی ایسا نہیں کرے گا۔ میں نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا کہ کالج میں اس کی لڑکیوں سے دوستی کیوں ہے۔ ظاہر ہے ایک جگہ ھنا ہو تو دوستی تو ہو گی ہی' مگر اس حد تک؟'' وہ بولتی جا رہی تھیں۔

ماہ بانو خاموش رہی۔

''بانو بیٹا! تم نے ہی کبھی مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایڈی ایسی فرمائش رے گا۔''

''آنٹی! میں آپ کے فیملی افیئرز میں کیسے مداخلت کر سکتی تھی۔'' اس نے اپنا دامن بچانے کی کوشش کی۔

''آج مجھ سے لڑ کر ابھی باہر نکلا ہے وہ' خود سوچو کیسے شادی کر دوں میں اس کی ہندو لڑکی کے ساتھ؟ دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ کہتا ہے شادی کرے گا تو صرف اسی کے ساتھ۔ انے کہا کہ مت کرو شادی میری طرف سے' ویسے بھی ابھی شادی کی کوئی عمر نہیں ہے۔'' امی نے کہا۔

''ابھی کہاں گیا ہے وہ؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''پتا نہیں' غصے میں نکلا ہے کہیں' گاڑی بھی لے گیا ہے۔''

''ویسے آنٹی وہ بہت سیریس ہے اُما کے لیے۔'' ماہ بانو نے دبے دبے انداز میں کہا۔

''وقتی ابال ہوگا' خود ہی اتر جائے گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہندو لڑکی اس گھر کی بہو ے۔ کالج میں پڑھنے نہیں آتیں یہ لڑکیاں' یہی سب تماشے کرنے آتی ہیں۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔

ماہ بانو کو ان کی بات بہت بری لگی۔ وہ بولی تو بھی اس کے انداز میں ناگواری تھی۔

"آنٹی! اُما کا قصور نہیں ہے' وہ کالج میں پڑھنے ہی آئی تھی' ایڈی ہی اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ جب ایک شخص اتنا پاگل ہو رہا ہو تو لڑکی بے چاری کیا کرے۔ ٹھیک ہے کہ اب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے بہت سیریس ہیں' لیکن پہل اُما نے نہیں ایڈی نے کی تھی۔"

"ایڈی کا دماغ تو میں اس کے ڈیڈی سے کہہ کر ٹھیک کرواتی ہوں...... دنیا جہان کی مسلمان لڑکیاں ابھی مری نہیں ہیں۔ یوں بھی اتنی جلدی شادی کی میں قائل نہیں ہوں۔ ابھی یہ لڑکے کچھ بنے نہیں ہوتے' سر اٹھاتے ہی شادی کی فکر سوار ہو جاتی ہے۔"

"ایک بات ہے آنٹی کہ اسے ڈانٹنے ڈپٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ اس وقت اپنی ڈگری لے کر باہر نکلے گا تو اسے چھ سات ہزار روپے ماہوار کی جاب کہیں بھی بآسانی مل جائے گی۔ کچھ لوگ صرف ٹیلنٹڈ ہوتے ہیں' ایڈی جینئس ہے۔ اس کے ساتھ آپ لوگ سختی کریں گے تو جو تھوڑا بہت اس گھر میں رہنے کا جواز ہے وہ بھی وہ ختم کر دے گا۔

آپ مائنڈ نہ کریں آنٹی! لیکن ہم فرینڈز اس کے متعلق شاید آپ سے اور انکل سے بھی بہتر جانتے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں' جو ہم دوستوں سے تو شیئر کر لیتے ہیں' لیکن والدین اور بہن بھائیوں سے نہیں کر سکتے' اسی لیے میں کہہ رہی ہوں کہ اُما کے لیے اس کا کوئی وقتی ابال نہیں ہے۔ میں نے کالج میں رہتے ہوئے بہت سے وقتی ابال بھی دیکھے ہیں' لیکن ایڈی سچ مچ سیریس ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اُما کے لیے۔ اپنا گھر بھی چھوڑ سکتا ہے۔"

ایڈی کی امی مزید پریشان ہو گئیں۔ پھر پُرامید لہجے میں بولیں۔

"اس لڑکی کے گھر والے بھی تو راضی نہیں ہوں گے۔"

"جی' بہت مشکل ہے کہ وہ مانیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے' ایڈی کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"ایسا ہونا بھی بہت مشکل ہے' لیکن میرے خیال میں ناممکن نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے خلوص اور ہماری محبت کے بعد وہ اس بارے میں سوچے۔ یقین کریں آنٹی! وہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ اتنی اچھی کہ میں بتا بھی نہیں سکتی۔"

"اس کے گھر والے نہیں مانیں گے تو اس کا ممکنہ ردِعمل کیا ہوگا؟" اس کی امی نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"ردِعمل تو وہی ہوگا جو ایڈی کا تھا' لیکن لڑکوں اور لڑکیوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایڈی لڑ کر گھر سے باہر نکل گیا ہے۔ شاید رات کو دیر سے گھر آئے' لیکن لڑکیاں شاید ہی ایسا کر سکیں۔"

"فی الحال میں ایڈی سے کہہ دیتی ہوں کہ اس بارے میں سوچوں گی۔ ابھی میں نے اس کے ڈیڈی سے بھی بات نہیں کی۔ اتنے میں وہ آر سی۔ اے میں داخلے کے لیے اپلائی کر دے۔

داخلہ مل گیا تو باہر چلا جائے گا۔ کچھ عرصے کے لیے بات ٹل جائے گی۔"

"جی آنٹی!" ماہ بانو نے کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"اگر کوئی لڑکی گھر میں اپنی پسند بتائے اور گھر والے اس پر راضی نہ ہوں تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ جلد ہی اس لڑکی کی کہیں شادی کر دیں۔ اُما کی بھی شادی ہو جائے تو مسئلہ ختم ہو جائے گا۔" ایڈی کی امی کہہ رہی تھیں۔

"ہوں!" ماہ بانو نے اب بھی کچھ نہ کہا۔

"تم ذکر مت کرنا ایڈی سے کہ اس معاملے میں میری کیا رائے ہے۔ میں کہہ دوں گی کہ سوچ رہی ہوں اور ممکن ہو تو ذرا پتا رکھنا کہ اس لڑکی کا کیا بنا۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے' میں اسے ایک لڑکی کی خاطر کھونا نہیں چاہتی۔ میں تو کہتی ہوں کہ ایڈی کو اسکالرشپ ملتا ہے یا نہیں' اس کا داخلہ ہو جائے تو چاہے مجھے مکان بیچ کر اس کی پڑھائی کا خرچ اٹھانا پڑے میں اٹھاؤں گی۔ یہاں سے دور جائے گا تو بہت کچھ بھول جائے گا۔"

"میں اب جاؤں آنٹی؟" ماہ بانو نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا!"

وہ وہاں سے اٹھ آئی۔ دل بہت بوجھل سا ہو رہا تھا۔ اپنے پورشن میں داخل ہوئی تو اماں منتظر تھیں۔

"اتنی دیر لگا دی بانو! ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے نانا جان کا فون آیا تھا' حویلی سے کر رہے تھے۔"

"خیریت تھی ناں؟"

"ہاں خیریت ہی تھی۔ اپنی ریشماں ہے ناں' وہ بہت اداس ہو رہی ہے تمہارے بغیر' میں نے تمہارے نانا جی کو بتایا کہ بانو کی بھی چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ اب مجھے امریکہ جانا ہوا تو پیچھے اسے گھر میں اکیلا تو نہیں چھوڑوں گی ناں۔ ظاہر ہے گاؤں ہی آئے گی وہ۔" اماں نے بتایا۔

"آپ نے کہہ دیا کہ میں گاؤں آؤں گی؟" اس کا دل چاہا تھا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"تو اور کیا تم نہیں جاؤ گی گاؤں؟" انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

"وہ بہت نواب زادی ہے ناں ریشماں' جب اداس ہوتی ہے' آ جانے کو کہہ دیتی ہے اور جو میں گاؤں جا کر اداس ہوتی ہوں' اس کی کبھی کسی نے پروا بھی نہیں کی۔" وہ دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو ناں بیٹا! وہ تو ایک چار دیواری میں قید ہے بے چاری اور تم اپنی مرضی کی مالک ہو کالج بھی جاتی ہو' گھوم پھر لیتی ہو' کبھی مارکیٹ چلی جاتی ہو' اپنی پسند کی چیزیں لے آتی ہو۔ تمہاری اداسی دور کرنے کے لیے تو بہت کچھ ہے' وہ غریب کہاں جائے' لے دے کے ایک تم

ہی ہو' جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ دیتی ہے۔ مہینوں انتظار کرتی ہے تمہارا تب ملاقات ہوتی ہے۔'' اماں جی نے پیار سے اسے سمجھایا۔

''اماں! وہ تو اپنے دل کی بات کہہ دیتی ہے میں کس سے کہوں۔ میری بات نہ کوئی سنتا ہے' نہ سمجھتا ہے' آپ بھی نہیں' عبداللہ بھی نہیں۔'' اس نے آزردگی سے کہا۔

اماں کچھ دیر کے لیے گم صم ہوگئیں۔ اس نے پہلے کبھی بھی اس طرح عبداللہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔

''میں ریشماں کے پاس جاتی ہوں ناں تو وہ مجھ سے سب کچھ چھین لیتی ہے۔ میری یادیں بھی' پھر بھی اسے کوئی کچھ نہیں کہتا' پھر بھی میں ہی قصوروار گردانی جاتی ہوں۔'' اس نے مجروح انداز میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جارہی ہو بانو! میں تمہاری بات سنوں گی بھی اور سمجھوں گی بھی۔ میں ماں ہوں تمہاری' سب کچھ کہہ دو مجھ سے۔''

ماہ بانو چند لمحے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھتی رہی پھر ان کی گود میں سر رکھ کر بے تحاشہ رو دی۔

''اماں! میں نے ریشماں سے کچھ نہیں چھینا' اس کے پاس تھا ہی کیا' جسے میں چھینتی۔ ہاں میرے پاس جتنی یادیں تھیں' وہ سب اس نے چھین لیں۔ مگر میں اپنی محبت اسے نہیں چھیننے دے سکتی۔'' وہ روتے ہوئے کہتی جارہی تھی۔ ''میں اسی لیے گاؤں نہیں جانا چاہتی۔''

اماں جی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے خاموش کرانے کی کوشش کرنے لگیں۔

''اماں! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے' میرا ایک ایک لمحہ جیسے سُولی پر گزر رہا ہے۔ وہاں پتا نہیں کب وہ عبداللہ سے بدلہ لینے پر اتر آئیں۔ اسے کچھ ہوگیا ناں تو میرے لیے دنیا وہیں ختم ہو جائے گی' میں بھی نہیں رہوں گی اماں۔''

''اللہ نہ کرے۔'' اماں دہل گئیں۔

''اماں آپ کو ریشماں سے بہت محبت ہے نا!''

''مجھے صرف اپنی بیٹی سے محبت ہے' اپنی بانو سے۔ میں صرف تمہارے چہرے پر خوشی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا اور پھر ان سے لپٹ گئی۔

☆=====☆=====☆

گاؤں آتے ہی عبداللہ نے تمام تر ذمہ داریاں اٹھالی تھیں۔ اس کے آجانے سے فوزیہ بیگم اگر ایک طرف مطمئن ہوگئی تھیں تو دوسری طرف انہیں یہ پریشانی بھی لاحق تھی کہ کہیں بڑی حویلی سے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے' جس سے عبداللہ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔

حیدر علی شاہ اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے تاکہ اسے کسی معاملے میں دقت پیش نہ آئے۔

اس وقت بھی حیدر علی اور فوزیہ بیگم لیونگ روم میں بیٹھے ہوئے اسی مسئلے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

''عبداللہ کے گاؤں آجانے سے میں خوش تو بہت ہوں' لیکن ساتھ ہی یہ تشویش بھی ہے کہ پیر صاحب اور ان کے بیٹوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ جب تک عبداللہ باہر رہتا ہے تب تک بے چینی اور گھبراہٹ ہی رہتی ہے۔ وہ گھر آتا ہے تو سکون کا سانس لیتی ہوں۔''

''پریشان تو میں بھی بہت ہوں' مگر میری اطلاعات کے مطابق بڑی حویلی میں ابھی اس بات پر خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ میں بھی اس طرف سے بے خبر نہیں ہوں۔'' حیدر علی نے کہا۔

''آپ کو تو تب بھی اطلاع نہیں ملی تھی' جب وہ زہرا کو اغوا کرنا چاہتے تھے' اس بات کی بھی خبر ماہ بانو نے دی تھی۔''

''ماہ بانو نے نہیں ریشماں نے۔'' انہوں نے تصحیح کی۔

''ہمیں تو ماہ بانو نے ہی بتایا تھا ناں' مگر ہر مرتبہ اس طرح غیبی امداد نہیں پہنچا کرتی۔''

''میں اس آگ کو ہوا نہیں دینا چاہتا' میں چاہتا ہوں کہ ہماری اولاد کو تحفظ حاصل ہو۔'' حیدر علی نے کہا۔

''آپ کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے علی۔ پیر صاحب نہیں چاہیں گے تو کچھ نہیں ہوگا۔ پتا نہیں کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک بیٹے کی لاش دیکھی' ایک کو موت کے منہ سے پلٹتے دیکھا پھر بھی ان کے دل میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔''

''میں چاہتا ہوں کہ ٹوٹے رشتے جڑ جائیں۔ اس سے شاید مزید خون خرابا رک جائے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ پیر صاحب راضی ہوجائیں گے؟ کبھی نہیں اور اگر وہ راضی ہو بھی گئے تو یہ شرط ضرور رکھیں گے کہ ہم زہرا اور زینی کے رشتے وہاں کردیں۔ میں کیسے اپنی بیٹیوں کو تباہی کے اس گڑھے میں دھکیل دوں۔''

''زینی کے لیے میں انکار نہیں کروں گا۔'' وہ بولے۔

''کیا؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میری بیٹی تو اتنی معصوم سی ہے' اس کا یہاں حویلی میں دم گھٹتا تھا۔ وہاں تو وہ ختم ہوجائے گی اور پھر وہ اسے سبط حسن کے لیے نہیں مانگیں گے' وہ چاہیں گے کہ زینی وہاں امداد کی بیوہ بن کر رہے۔''

''اب ایسے بھی نہیں ہیں بھائی جان۔''

''ایسے ہی ہیں وہ۔'' فوزیہ بیگم نے کہا۔ ''آپ کو اب تک ان سے بھلائی کی امید ہے۔ اچھے بھلے رشتے آئے تھے دونوں کے لیے۔ زینی نے پتا نہیں کیا کہہ دیا۔ میں بتا رہی ہوں علی کہ میری بیٹیاں اس گھٹے ہوئے ماحول میں نہیں جائیں گی۔''

اسی وقت عبداللہ اندر داخل ہوا۔ فوزیہ بیگم اسے آتے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

"کمرے کی فضا کافی گرم لگ رہی ہے‘ مگر اس میں آتش دان کی گرمی کم اور باتوں کی گرمی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری اماں جان سے کہہ رہا تھا کہ تم دونوں کچھ دن کے لیے نیویارک چلے جاؤ۔" حیدرعلی نے موضوع تبدیل کر دیا۔

"آپ پتا نہیں اماں جان سے یہ کہہ رہے تھے یا نہیں‘ لیکن جس وجہ سے مجھ سے کہہ رہے ہیں‘ وہ میں جانتا ہوں۔ بابا جان! میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھانا مجھے گوارا نہیں ہے۔ آپ اور اماں جان چلے جائیں۔" عبداللہ نے کہا۔

"پتا نہیں سب کے سر پر خون خرابا کیوں سوار ہے۔ میں نے پہلے ہی بہت دکھ اٹھائے ہیں‘ مجھ میں حوصلہ نہیں ہے مزید دکھ اٹھانے کا۔" فوزیہ بیگم روہانسی ہو گئیں۔

"اماں جان! اس بات پر تو بابا جان یا آپ بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ سب کے سر پر خون کیوں سوار ہے۔ ہمیں تو یہ تحفہ ہماری پیدائش کے ساتھ ہی بزرگوں نے دیا تھا جسے ہمیں بہ حالتِ مجبوری قبول کرنا پڑا ہے۔"

پائپ صاف کرتے حیدرعلی کے ہاتھ رک گئے۔

"تم جانتے ہو کہ وجہ کیا ہے؟" بالآخر انہوں نے کہا۔

"میرا نہیں خیال کہ میں اصل وجہ سے آگاہ ہوں‘ مگر خیر‘ میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ اب تک بڑی حویلی والے وار کرتے آئے ہیں‘ اگر میرے سر پر خون خرابا سوار ہوتا تو ان کے اتنے بے شمار واروں کے جواب میں اب میرا بھی حق تھا کہ اس مرتبہ طبلِ جنگ میں بجاتا‘ لیکن میں اب بھی یہ سب نہیں چاہتا۔ اپنی خاطر نہیں‘ اپنی بہنوں کے تحفظ کی خاطر۔" عبداللہ بولا۔

حیدرعلی نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ سب روکنا چاہتے ہو عبداللہ؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ کو شک کیوں ہے بابا جان؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم ایسا دل سے چاہتے ہو یا محض زبانی کلامی دعوے ہیں؟"

"میں دل سے چاہتا ہوں بابا جان۔ زینی اور سبط کے لیے میں نے اتنا اسٹینڈ لیا ہے تو آخر کس وجہ سے؟"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا‘ اسی لیے میں اور تمہاری اماں جان بڑی حویلی جا رہے ہیں۔"

"بڑی حویلی جا رہے ہیں‘ پوچھ سکتا ہوں کیوں؟"

عبداللہ نے ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تمہاری تعلیم مکمل ہو چکی ہے‘ تم سب ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل ہو۔ منگنی تو بچپن میں ہو چکی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب شادی کی تاریخ بھی طے کر دی جائے اور ریشماں بہو بن کر اس حویلی میں آ جائے۔" حیدرعلی نے کہا۔

عبداللہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ گاؤں پہنچنے کے صرف چند دن بعد اسے اس موضوع پر بات کرنی پڑے گی‘ اسی لیے اس نے فوری طور پر ماہ بانو کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا‘ لیکن اب جب یہ موضوع چھڑ گیا تھا‘ تو پھر اس پر کھل کر بات کر لینا مناسب تھا۔

"میں نہیں سمجھتا بابا جان کہ یہ اس مسئلے کا کوئی حل ہے۔" بالآخر اس نے کہا۔

"وجہ؟"

"وجوہات بہت سی ہیں‘ اگر صرف خاندان کے حوالے سے دیکھا جائے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ بڑے بابا جان ہی اب اس بات پر راضی نہیں ہوں گے‘ اگر ہو گئے تو مشروط طور پر ہوں گے۔ وہ ان رشتوں کا بھی تقاضا کریں گے جو انہوں نے زہرا اور زینی کے یک طرفہ طور پر کر لیے تھے۔

اس کے علاوہ بابا جان! میں بچپن کے طے کیے رشتوں کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ آج سے چوبیس‘ پچیس سال قبل حالات کا فرق تھا‘ آج اور ہیں۔ آپ نے ہمیں اپنے طور پر سوچنے کا موقع دیا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ ہم نے اس موضوع پر کبھی نہ سوچا ہو۔"

حیدرعلی اور فوزیہ بیگم خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"میں نہیں سمجھتا کہ ریشماں اور میں ایک دوسرے کے لیے مناسب ہیں‘ نہ ہی کبھی میں نے اس کے متعلق اس انداز میں سوچا ہے۔ میری کالج فیلو ہے ماہ بانو‘ آپ اور اماں جان دونوں ہی اس سے مل چکے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور میرا ارادہ اسی سے شادی کرنے کا ہے۔"

حیدرعلی کچھ دیر تک خاموشی سے پائپ کے کش لیتے رہے پھر بولے۔

"تم ریشماں کو جانتے نہیں ہو‘ ورنہ شاید یہ نہ کہتے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے مناسب نہیں ہو۔"

"ممکن ہے۔" وہ بولا۔ "اگر میں ماہ بانو سے نہ ملا ہوتا تو شاید بات اور ہوتی‘ پر اب میں ریشماں سے ملنے یا اس کے متعلق کچھ بھی جاننے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔"

"میرا خیال تھا کہ اور کچھ نہیں تو تم میری عزت کی خاطر میرے الفاظ کا پاس ضرور کرو گے۔"

"بابا جان! آپ کی عزت کی خاطر تو میں جان بھی قربان کر سکتا ہوں‘ لیکن وقت بہت تبدیل ہو گیا ہے اور اس گزرتے وقت کے ساتھ عزت کا مفہوم بھی بدلتا جا رہا ہے۔ آپ کے

الفاظ عزت سے زیادہ ذمہ داری ہیں، جن کا بوجھ آپ میرے کندھوں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس سے...... آپ نے اسی گھرانے سے دشمنی کا بوجھ بھی میرے کندھوں پر ڈالا ہے۔ آپ نے بہت سے فرائض تو میرے سپرد کر دیے ہیں، لیکن اپنی زندگی کے لیے مجھے ایک بھی حق دینا گوارا نہیں کیا۔" عبداللہ نے کہا۔

فوزیہ بیگم گومگو کے عالم میں بیٹھی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ اس بحث میں کس کا ساتھ دیں۔ پیر صاحب کے گھرانے سے ان کی دشمنی ختم ہو جائے، یہ ان کی شدید خواہش تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنی اولاد کو محفوظ دیکھنا چاہتی تھیں۔ دوسری طرف انہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ ریشماں کے رشتے کی خاطر بڑی حویلی جانے سے کہیں کوئی اور مصیبت گلے نہ پڑ جائے، کہیں وہ زینی اور زہرا کا رشتہ نہ طلب کر لیں۔ جبکہ پیر صاحب سے یہ بھی بعید نہیں تھا کہ عبداللہ کی شادی کہیں اور طے کر دینے کی صورت میں وہ اس بات کو جواز بنا کر نیا محاذ قائم کر لیں۔ دونوں صورتوں میں مشکل تھی۔

"میں نے تمہارے لیے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا عبداللہ، بہت مان کے ساتھ، اس یقین کے ساتھ کہ حالات خواہ کیسے بھی کیوں نہ ہوں، وقت چاہے کتنا بھی بدل جائے، میرا بیٹا، میرے الفاظ کا پاس ضرور کرے گا۔" حیدر علی کہہ رہے تھے۔

"بابا جان شاید آپ نے کبھی محبت نہیں کی، ورنہ آپ میرا مسئلہ سمجھ سکتے تھے۔ میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا، جس سے میرے گھر کے افراد خوش نہ ہوں اور یہی توقع مجھے اپنے گھر والوں سے بھی ہے کہ وہ میرے لیے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کریں گے جس سے میں خوش نہ ہوں۔

ہر فرد کی زندگی کے دو حصے ہوتے ہیں بابا جان ایک اس کا اپنا، ایک اس سے وابستہ افراد کا اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر وہ شخص جو کسی بھی صورت میں کچھ بہتر پوزیشن پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد بسنے والے تمام افراد کی زندگی بھی سمیٹ کر اپنے نام کرنا چاہتا ہے، ان کی زندگی بھی خود بسر کرنا چاہتا ہے۔

پتا نہیں آپ نے کن حالات میں بچپن میں ہی میرا رشتہ طے کر دیا تھا مجھے یقین ہے کہ وہ بھی عام حالات نہیں ہو سکتے، شاید آپ نے ایسا کسی دباؤ کے تحت کیا ہو، ورنہ ممکن نہیں کہ آپ میری پسند اور مرضی کے متعلق سوچتے ہی نہیں۔ ظاہر ہے، میں چابی سے چلنے والا کھلونا تو ہوں نہیں جسے جب دل چاہا اپنی مرضی سے چلا لیا جائے، جہاں چاہے اس کا رخ موڑ دیا جائے۔

پلیز بابا جان، مجھ سے اتنی توقعات وابستہ مت کریں، جنہیں پورا کرنا میرے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ میں بہت عام سا انسان ہوں، مجھ میں اتنی خوبیاں نہیں ہیں، جتنی آپ لوگ مجھ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کی شادی کا فیصلہ بھی آپ کے بزرگوں نے طے کیا تھا۔ آپ

لوگ اچھے تھے، جنہوں نے اپنے بزرگوں کے فیصلے کا احترام کیا اور ایک خوشگوار زندگی بھی گزاری۔ میں شاید اتنا اچھا نہیں ہوں۔"

حیدر علی گم صم بیٹھے اسے دیکھے گئے۔ اس نے بے خبری میں بہت سے پرانے زخم کرید ڈالے تھے۔

"بابا جان! شاید آپ نے کبھی محبت نہیں کی، ورنہ آپ میرا مسئلہ سمجھ سکتے تھے۔"

عبداللہ کے ان الفاظ نے یادوں کے کتنے در وا کر دیے تھے۔ تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں پرانے دن لوٹ آئے ہوں، جیسے آج عبداللہ اپنا حق طلب کر رہا تھا، ویسے ہی برسوں پہلے انہوں نے اپنے بابا جان سے اپنے لیے یہی حق طلب کیا تھا۔ عبداللہ کے الفاظ بھی تقریباً وہی تھے، جو کبھی انہوں نے بولے تھے، ہاں لہجے میں فرق تھا۔ انہوں نے تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ مگر عبداللہ کے انداز میں نرمی تھی۔

وہ بھی تقریباً عبداللہ جتنے ہی تھے، ان کی منگنی بھی اسی کی طرح ان کی مرضی کے بغیر کر دی گئی تھی، وہ بھی اس کی طرح ایک اور لڑکی کو چاہنے لگے تھے۔ انہوں نے بھی اسی کی طرح اپنا حق طلب کیا تھا سب کچھ ویسا ہی تھا۔

ہاں، ایک فرق پڑا تھا۔ آج وہ عبداللہ والے نہیں، اپنے بابا جان والے مقام پر تھے، ان کے بابا جان کو تو اپنے الفاظ کا ہی پاس تھا، جبکہ یہاں بات صرف اتنی سی نہیں تھی۔

وہ وقت خواب وخیال سا لگتا تھا، جب انہوں نے گوری سے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور گوری نے صرف ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔ انہیں وہ دن اب تک یاد تھا، جب حمیدہ روتے ہوئے ان کے پاس آئی تھی۔

"زرینہ مر گئی شاہ صاحب!"

اور انہیں لگا تھا جیسے کسی نے ان پر بجلی سی گرا دی ہو اور پھر ان کی خواہش پر حمیدہ نے اپنی اور گوری کی آخری گفتگو انہیں سنا دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"شاہ صاحب! ہم تو آرام سے باتیں کر رہے تھے، ہمیں خبر نہیں تھی کہ کھلے دروازے میں بڑے شاہ صاحب کھڑے ہیں۔ میں نے زرینہ بی بی سے کہا۔

"سنا ہے بڑے شاہ صاحب، ریشماں کی نسبت چھوٹے شاہ صاحب کے صاحبزادے سے طے کر رہے ہیں؟"

"ایسا ہو جائے حمیدہ تو میں سکون سے مر سکوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے لیے بھی یہ حویلی مقبرہ بن جائے۔ مجھ پر تو جو گزرنی تھی گزر گئی، لیکن میری بیٹی پھولوں کی طرح نازک ہے اس پر یہ سب نہیں گزرنا چاہیے۔" زرینہ بی بی نے کہا۔

میں بولی۔ "یہ تو اپنی قسمت کی بات ہے۔"

''اس اوپر والے نے میری بیٹی کو سب کچھ میرے جیسا دیا ہے' وہی رنگ و روپ' وہی چہرہ۔ میری دعا ہے کہ اسے میری قسمت نہ ملے۔ شاہ جی میرے لیے کچھ نہیں کر سکے' مجھے اس کا شکوہ نہیں ہے' لیکن انہوں نے میری بیٹی کو اس در و دیوار سے نہ بچایا تو میں سمجھوں گی کہ انہوں نے کبھی مجھ سے محبت ہی نہیں کی تھی' وہ سب جھوٹ تھا' فریب تھا۔''

ریشماں اور عبداللہ کی منگنی تو اس سے پہلے ہی طے ہو چکی تھی' لیکن ان کی دشمنی کی تجدید در حقیقت اس روز سے ہوئی تھی۔ اسی روز انہوں نے سوچا تھا کہ گوری کی ان باتوں کو وہ اس کی آخری خواہش سمجھیں گے۔ اس سے بے تحاشا محبت تو اپنی جگہ تھی ہی مگر یہ ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش بھی تھی اور آخری خواہش کا احترام دنیا کے ہر مذہب میں کیا جاتا ہے۔ نہ صرف مذہب بلکہ انسانیت کے حوالے سے بھی اسے پورا کرنا فرض سمجھا جاتا ہے۔

انہوں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اسے جو کچھ کہنا تھا' وہ کہہ چکا تھا۔

''انسانیت پر کتنا ایمان ہے تمہارا؟'' حیدر علی نے اس سے پوچھا۔

''آپ جانتے ہیں بابا جان' بات کیجئے۔''

''ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش کو کیا درجہ دیتے ہو تم؟''

وہ الجھن سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ فوزیہ بیگم ان کے چہرے پر نظریں گاڑے بیٹھی تھیں۔

''یوں سمجھو عبداللہ کہ یہ ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش ہے۔''

فوزیہ بیگم اٹھ کر لیونگ روم سے باہر نکل گئیں۔ حیدر علی انہیں جاتے دیکھتے رہے۔

''کیا مطلب بابا جان؟ میں سمجھ نہیں سکا' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' عبداللہ نے الجھن کے ساتھ پوچھا۔

''صرف اتنا کہ تمہیں ریشماں سے ہی شادی کرنا ہوگی۔'' وہ کہہ کر باہر چلے گئے۔

☆=====☆=====☆

اماں جی تذبذب کے عالم میں تھیں کہ کیا کریں ماہ بانو گاؤں نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتیں تو اس کے ساتھ زبردستی بھی کر سکتی تھیں' لیکن اس روز وہ روئی تھی تو انہیں لگا تھا جیسے اس کے آنسو ان کے دل پر گر رہے ہوں۔ ریشماں کی محبت اپنی جگہ' ٹھیک ہے' وہ ان کی مرحومہ بہن کی نشانی تھی اور اپنی زندگی کے دن صرف ایک امید پر گزار رہی تھی' مگر ماہ بانو ان کی سگی اولاد تھی' اکلوتی بیٹی' جسے بہت دکھ اٹھا کر پالا تھا انہوں نے۔

جب وہ پیدا ہوئی تھی تو وہ خود اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں' اتنی پیاری بیٹی انہی کی تھی' کبھی اس کا ماتھا چومتیں' کبھی ہاتھ' کبھی اس کے ننھے ننھے پاؤں دیکھتیں۔ جب وہ ہنستی تھی تو انہیں لگتا

ا کہ کائنات روشن ہوگئی اور وہ روتی تو انہیں محسوس ہوتا جیسے کسی نے ان کا کلیجہ چیر ڈالا ہو۔ تب گاؤں میں رہتی تھیں' چھوٹے سے گھر میں ساس' سسر' جیٹھ' جٹھانی' نندیں' دیور سبھی تھے۔

ماہ بانو کی پیدائش پر صرف وہ اور ماہ بانو کے ابا جی خوش ہوئے تھے۔ ہاں جٹھانی بھی خوش ھی کیونکہ اس کے دو بیٹے تھے اور ان کے گھر بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ خود کو اس گھر میں اور مستحکم بھنے لگی تھی' اسے فخر تھا کہ وہ بیٹوں کی ماں تھی۔ خاندان والے مبارکباد دینے کے بجائے ماہ بانو کو یسے ماتمی انداز میں دیکھتے کہ ان کا خون کھول اٹھتا اور یہ فقرہ تو انہیں کاٹ کر رکھ دیتا تھا۔

''چچ...... چچ' خیر اللہ بیٹا بھی دے گا۔''

وہ سوچتیں کہ جب بیٹی کی پیدائش پر وہ ناخوش نہیں تھیں' تو پھر باقی سب کو فکر کی کیا ضرورت ھی؟

جب ساس' نندیں انہیں کام پر لگا دیتی تھیں اور ماہ بانو بھوک سے روتی تھی تو ان سے رہا ہیں جاتا تھا' جہاں تہاں کام چھوڑ کر وہ اس کی طرف بھاگتی تھیں اور اس بات پر روز فساد ہوتا ا۔

پھر وہ بڑی ہوئی' اس نے چلنا پھرنا شروع کیا' باتیں کرنا سیکھیں تو وہ خوشی سے دیوانی ہو ئیں۔

اب بھی انہیں ماہ بانو کے سامنے دنیا میں کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا' لیکن انہوں نے اپنا دل ضبوط کر لیا تھا۔ اسے ڈانٹتی ڈپٹتی تھیں جو وہ اس کی بہتری کے لیے ضروری سمجھتی تھیں' کیونکہ بانو کے ابا جی اسے کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کے لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتے تھے' جو خواہش کرتی تھی' ان مار کر پورا کرتے تھے۔ ایسے میں انہیں ڈر لگتا تھا کہ کہیں ماہ بانو اتنے پیار سے بگڑ نہ جائے۔

''کیا فائدہ ہوگا اس کا' ساری زندگی تباہ ہوگی۔''

یہی سوچ کر وہ اس پر سختی کرتی تھیں۔

عبداللہ کے معاملے پر بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ماہ بانو کو روکنا چاہتی تھیں تو صرف اس کی بھلائی کے لیے' اب وہ سوچتی تھیں کہ شاید ان کا روکنے کا انداز ٹھیک نہیں تھا لیکن ان کا مقصد ماہ بانو کی بھلائی ہی تھا۔

پر اس مرتبہ وہ روئی تو ان کا دل پگھل گیا۔ ماہ بانو ان کے سامنے قالین پر بیٹھی وودیئوں میں ل ڈال رہی تھی۔ ہر روز شام ہوتے ہی وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں وہ دیئے جلا کر رکھ دیتی ی۔

''یہ ہر روز کیا کرتی ہو بانو؟'' انہوں نے پوچھا۔

اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا' اس کے چہرے پر ہزار رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے کہا اور بلا وجہ ہنس پڑی۔

''بس یونہی دل چاہتا ہے۔''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ماہ بانو نے اس طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں ایڈی کھڑا تھا۔ چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔

''خیریت تو ہے ایڈی؟'' وہ دیئے چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''ہاں۔''

''آؤ بیٹھو بیٹا! امی ٹھیک ہیں؟'' اماں جی نے کہا۔

''جی آنٹی! امی ٹھیک ہیں۔''

پھر وہ ماہ بانو سے مخاطب ہوا۔

''بانو! تم سے کام تھا۔''

اسے احساس ہوگیا کہ ایڈی کو اُما کے متعلق کام تھا۔

''چلو! باہر لان میں ہی چلتے ہیں۔'' ماہ بانو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بانو! جلدی آنا' مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' اماں نے کہا۔

''اچھا!'' کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

بالکل ساتھ ساتھ گھر ہونے کی وجہ سے ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایڈی کی امی اور ماہ بانو کی امی کے درمیان بھی میل جول تھا۔

''ہاں؟'' ماہ بانو لان میں آ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''میں بہت پریشان ہوں' اُما سے رابطہ کرنے کی پوری کوشش کر لی ہے' لیکن ہو نہیں سکا۔ وہاں سے بہت درشت قسم کا جواب ملتا ہے کہ اُما گھر پر نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ کبھی سوچتا ہوں کہ سکھر چلا جاؤں۔''

''نہیں' سکھر جانے کی حماقت مت کرنا' پہلے یہ تو پتا چلے کہ وہاں حالات کس قسم کے ہیں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''مگر یہ کیسے پتا چلے گا؟ اور پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ اُما کس حال میں ہے' تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ میری پریشانی کا۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''اب تک تم فون پر رابطے کی کوشش کرتے رہے ہو' اب میں کوشش کرتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے گھر والے میری بات کروا دیں گے اس سے۔''

''مشکل ہے' جیمز یہی کوشش کر چکا ہے۔'' ایڈی نے کہا۔

''تم دونوں لڑکے ہو' میری بات دوسری ہے اور ایڈی پلیز! تم ہم سب دوستوں کے بتائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے اس سلسلے میں۔ یوں بھی فی الحال سکھر جانا بے کار ہے۔''

''میرا تو دماغ بالکل کام نہیں کر رہا۔''

''تمہارے اسکالرشپ اور ایڈمیشن کا کیا ہوا؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''وہ تو ہوا ہی سمجھو' بلکہ میں سوچ رہا تھا کہ جب تک لندن نہیں جاتا تب تک کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں جاب کرلوں' مگر اس وقت سخت ذہنی انتشار کا شکار ہوں۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمہیں' صرف ذہنی انتشار کا شکار ہونے سے تمہیں اُما تو نہیں مل جائے گی۔''

''مجھے بہت شکوہ ہے تم لوگوں سے بھی' تمہیں اور نیہاں کو معلوم تھا' اُما کی پرابلم کے متعلق اس وقت تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

''تم کیا کر لیتے اس سلسلے میں؟ کچھ بھی نہیں' جیسے اب کچھ نہیں کر سکتے' اس وقت تمہیں بتا دیتے تو تمہارا تھیسس بھی رہ جاتا۔'' ماہ بانو بولی۔

''تھیسس گیا بھاڑ میں۔'' اس کے انداز میں غصہ تھا' جھنجلاہٹ تھی۔

''پلیز ایڈی! خود پہ قابو رکھو۔ میں ابھی اُما کو رِنگ کرتی ہوں اور پھر تمہیں بتاتی ہوں۔'' ماہ بانو اسے پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا اس سے بھی۔''

''لیٹ می ٹرائے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''آل رائیٹ!''

''تم جاؤ میں کوشش کرتی ہوں' جیسے ہی میرا اس سے رابطہ ہوا میں آ کر تمہیں بتا دوں گی۔''

وہ اندر چلی آئی۔ اماں جی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ وہ گیلری کی طرف بڑھ گئی۔

''بانو! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' انہوں نے اسے گیلری کی طرف جاتے دیکھ کر

''بس اماں! ابھی آئی' ذرا اُما سے بات کرلوں۔'' وہ فون اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔

''میں ماہ بانو بول رہی ہوں' اُما کی دوست' اُما سے بات کروا دیں پلیز۔'' اس نے کہا۔

نرم لہجہ یک دم سخت ہوگیا۔

''اُما گھر پر نہیں ہے۔''

''اچھا تو پھر آپ اسے میرا میسج دے دیں۔''

لیکن دوسری جانب فون بند کر دیا گیا۔ ماہ بانو نے حیرت سے ریسیور کی طرف دیکھا۔ اسے اس قسم کے ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔

''دوبارہ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے' پھر بھی انہوں نے یہی حرکت دہرائی تو میں بھی اس مرتبہ پھر فون کروں گی۔ آخر کب تک ایسے کریں گے۔''

اس نے سوچا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔

دوسری طرف سے فون اٹھایا گیا تو وہ بولی۔

''شاید لائن کٹ گئی تھی۔ میں آپ سے اُما کے بارے میں بات کر رہی تھی' وہ کہاں گئی ہے اور کب تک واپس آئے گی؟''

فون ایک مرتبہ پھر بند کر دیا گیا۔

''کتنے بدتمیز لوگ ہیں' یہ بھی نہیں سوچ رہے کہ فون کا بل آنے پر مجھے اماں کے سامنے پیشی بھگتنی ہوگی۔''

پانچ چھ مرتبہ کی کوششوں کے بعد بھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا تو وہ تھک گئی۔

''اب کیا کروں؟''

سوچ سوچ کر اس نے نیہاں کا نمبر ڈائل کیا۔

''اس مرتبہ فون کا بل دیکھ کر اماں جی نے مجھے الٹا ٹانگ دینا ہے۔'' وہ بولی۔

''کیوں؟ عبداللہ فون نہیں کرتا جو تمہیں اسے کرنا پڑتا ہے؟'' نیہاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں' وہ تو خود ہی فون کرتا ہے یہاں مسئلہ دوسرا ہے۔'' یہ کہہ کر ماہ بانو نے اسے ایڈی کے متعلق تفصیل سے بتا دیا۔

''یہ تو بہت گڑبڑ بات بتائی تم نے۔ میرا خیال ہے کہ کچھ کوشش مجھے بھی کرنی چاہیے' میں اسے رنگ کرتی ہوں' شاید بات بن جائے۔''

''میں انتظار کروں گی تمہارے فون کا۔'' کہہ کر ماہ بانو نے فون رکھ دیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی' فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''نیہاں نے اتنی جلدی ہتھیار ڈال دیئے۔'' اس نے سوچا اور ریسیور اٹھایا۔

''مجھے ماہ بانو سے بات کرنی ہے' پلیز وہ ہیں تو انہیں بلوا دیں۔''

ماہ بانو نے ذہن پر زور دیا' لیکن اس نسوانی آواز کو وہ پہچانتی نہیں تھی۔

''آپ کون بول رہی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اُما کی بہن ہوں ہیما۔''

''میں ماہ بانو بول رہی ہوں۔'' اس نے سکون کا سانس لے کر کہا۔ اُما سے رابطے کی کوئی تو صورت پیدا ہوئی تھی۔

''میں زیادہ تفصیل سے بات نہیں کر سکتی۔ ممی چند دنوں میں اُما کو انڈیا بھیج رہی ہیں' جہاں اس کی شادی ہوگی۔''

''لیکن ایڈی! میرا مطلب ہے اُما مان گئی؟'' ماہ بانو نے پریشانی سے پوچھا۔

''اس بے چاری کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ اسے کمرے میں بند کیا ہوا ہے؟''

اجے نے۔ وہ آپ کو فون کرنا چاہتی تھی' لیکن اس کی اجازت بھی نہیں ملی۔'' ہیما رونے لگی۔

''یہ سب کتنا برا ہوا ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''ہاں۔'' ماہ بانو نے دھیمے سے کہا۔

''اس نے مجھے آپ کا نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں۔'' اس نے آنسو پونچھ کر کہا۔

''ہیما! کیا کوئی صورت بھی نہیں ہے؟ صرف ایک فیصد امکان بھی نہیں؟''

''اُما کہہ رہی تھی کہ آپ یہ ضرور پوچھیں گی' لیکن میں آپ کو سچ سچ بتا دوں تو ایک فیصد بھی امکان نہیں ہے۔ اس بات کے مانے جانے کے تو پہلے بھی چانسز نہیں تھے' لیکن اجے کی موجودگی میں تو ایک فیصد بھی نہیں۔ وہ اُما کو قتل کر سکتا ہے' لیکن یہ کبھی نہیں ہونے دے گا کہ اس کی شادی کسی مسلمان سے ہو۔

اجے نے اُما سے کہا ہے کہ اگر اس نے کسی صورت یہ شادی کر لی' تب بھی وہ اسے سیاسی اور مذہبی ایشو بنا دے گا۔ یہاں کے رہنے والے ہندو بھی بھڑکیں گے اور مسلمان بھی۔

میں کہنا نہیں چاہتی' اجے میرا بھائی ہے' لیکن یہاں حالات جتنے خراب ہوں' وہ اتنا ہی خوش ہوتا ہے۔ ڈیڈی ایسے نہیں ہیں' مگر وہ ایسا ہی ہے یہاں جتنے فساد ہوں گے' جتنا خون بہے گا' اجے اتنا ہی خوش ہوگا۔ اس نے کہا ہے کہ وہ اس بات کو سیاسی اور مذہبی ایشو بنائے گا تو میں جانتی ہوں کہ وہ ایسا کر گزرے گا۔ مذہب اور سیاست کے لحاظ سے لوگ بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ انہیں کسی راہ پر لگایا جائے' لگ جاتے ہیں۔ ایسے معاملوں میں انہیں سڑکوں پر لے آنا' ان سے توڑ پھوڑ کروانا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ آپ سن رہی ہیں ناں میری بات؟''

''ہاں۔''

''وہ ایڈی کو نہیں بھول سکتی' اب بھی وہ اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ اس کی خواہش پوری ہو' لیکن ماہ بانو میں اپنے بھائی کو بھی جانتی ہوں۔ وہ چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنانا چاہتا ہے۔ اسے آگ لگانے کے لیے صرف ایک چنگاری ڈالنی ہوتی ہے اور بس۔ مجھے اپنی دھرتی سے بہت محبت ہے اور اپنی بہن سے بھی۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ مٹی خون آلود ہو اور اس پر گرنے والا خون کا پہلا قطرہ میری اپنی بہن کا ہو۔'' وہ پھر رونے لگی۔

ماہ بانو خاموشی سے اس کی سسکیاں سنتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد پھر ہیما کی آواز ابھری۔

''میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے' یہ بھی کہ اس کی اور ایڈی کی شادی کا پوائنٹ زیرو زیرو ون پرسنٹ بھی امکان نہیں ہے۔ بہت سی باتیں جو میں نے نہیں کیں' وہ آپ خود ہی سمجھ گئی ہوں گی۔ اب آپ جیسے چاہیں' یہ سب باتیں ایڈی تک پہنچا دیں۔'' ہیما نے کہا۔

ماہ بانو نے فون بند کیا تو اداسی بڑھ گئی۔ اُما کے کہے ہوئے الفاظ بار بار اسے یاد آ رہے

تھے۔

''میں جانتی ہوں کہ میرے گھر والے تو دور کی بات' تم جیسے دوستوں کی دعائیں بھی نہیں ملیں گی۔ پھر بھی میں کوشش ضرور کروں گی۔ میں پچھتانا نہیں چاہتی اور نہ ہی فیلیئر یا لوز حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا تھا ناں کہ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں جو محبت کسی اور سے کرتی ہیں اور شادی کسی اور سے۔ میں کوشش ضرور کروں گی۔''

"I Dont want to End up as a Loser"

وہ وہیں بیٹھی نیہاں کے فون کا انتظار کرتی رہی۔ اس کا انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہو جلد ہی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھالیا اور نیہاں کو ہر بات بتا دی۔

''میں نے بھی بہت کوشش کی تھی لیکن بات نہیں بنی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تمہیں ہیما کا فو گیا۔ کچھ تو صورتِ حال کا اندازہ ہوا۔'' نیہاں نے کہا۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ ایڈی کو کیا بتاؤں؟''

''اور میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا کہ آخر اجے کیا ایشو بنائے گا؟'' نیہاں بولی۔

''ایسے لوگوں کو کسی ٹھوس بنیاد کی ضرورت نہیں ہوتی کسی ایشو کے لیے۔ دیکھو نہ ایڈ مذہب تبدیل کرنا چاہتا ہے اور نہ اُما۔ جبکہ ایسی شادی کی دونوں مذہبوں میں اجازت نہیں ہے اس بات کو اگر اُما کے گھر والے زور و شور سے نشر کرنے لگیں تو کیا ہوگا؟''

''دنگا فساد۔''

''اسی لیے میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایڈی کو کیا بتاؤں۔ وہ بہت پریشان ہے اور ایسا ہی تو کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ ہمارا دوست ہے۔ اُما کی زندگی تو تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے اور ا کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے' مگر میں نہیں چاہتی کہ ایڈی کا مستقبل اور اس کی زندگی بھی تباہ ہو یا ساری زندگی کسی احساسِ جرم میں مبتلا رہے۔''

''پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی ہے دونوں کو۔'' نیہاں نے افسوس سے کہا۔

☆=====☆=====☆

بابا جان کی باتوں نے عبداللہ کو الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہوں نے اس سے کسی ٹھوس بنیا پر بات نہیں کی تھی۔ ان کی ہر بات جذباتی تھی۔ اس نے بہت مہذب انداز میں ان کے سامنے انکار کیا تھا اور یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے انکار کے بعد بھی ان کا اصرار جاری رہے گا بلکہ اصرار بھی نہیں ایک قطعی حکم۔

''تمہیں ریشماں سے ہی شادی کرنا ہوگی۔''

''اور وہ کیا کہہ رہے تھے۔ ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش۔ کیا یہ کوئی دھمکی تھی یا پھر کوئی یاد؟'' وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

لیونگ روم سے اٹھ کر وہ اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔ آتے ہی اس کی نگاہ ماہ بانو کے مجسمے پر جو اس نے خود بنایا تھا۔ اس کے نزدیک ہی دونوں دیئے اور سوکھے پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا

ماہ بانو اسے شدت سے یاد آ رہی تھی۔ ویسے تو صبح ہی اس سے بات ہوئی تھی اور وہ بہت لگ رہی تھی۔ ہاں اس نے ہمیشہ کی طرح بہت سی ہدایات دی تھیں اور وہ دل میں ہنس پڑا

''سب میری طرف سے فکر مند ہیں۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جہاں موت لکھی ہے' اسے ٹال سکا ہے۔''

لیکن یہ بات اس نے ماہ بانو سے نہیں کہی تھی۔ اس سے اتنی دور رہ کر وہ آپس میں کوئی لڑائی چاہتا تھا۔ وہ خوش تھی کیونکہ اس کی اماں جی اس سے خوش تھیں۔ اس نے عبداللہ کو بہت آمیز لہجے میں بتایا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اماں جی مان گئی ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''پتا ہے عبداللہ میری اور ابا جی کی تو ہمیشہ سے انڈراسٹینڈنگ رہی ہے' مگر اماں جی سے کبھی رہی مگر اب پہلی مرتبہ وہ میری بات سمجھی ہیں۔ مجھے ویسے پیار کیا ہے' جیسے کبھی میرے بچپن تی تھیں' مجھے اچھا لگا۔''

وہ اس طرح بتا رہی تھی' جیسے یہ کوئی بہت بڑا انکشاف ہو۔

اس نے ماہ بانو کے مجسمے سے نگاہیں ہٹائیں اور سگریٹ سلگانے لگا۔

اسی وقت انٹر کام کی بزر بجی۔ دوسری طرف اماں جان تھیں۔

''عبداللہ میرے پاس آؤ۔'' انہوں نے کہا۔

وہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اماں جان خواب گاہ میں تھیں۔ بابا جان یں تھے۔

''جی اماں جان!'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تم نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا کہ تمہیں ماہ بانو پسند ہے۔'' انہوں نے بلا تمہید کہا۔

''میرے خیال میں یہ وقت مناسب نہیں تھا۔ بابا جان نے ذکر شروع کیا تو میں نے بھی ا۔'' وہ بولا۔

''تم نے اپنے بابا جان کو ناراض تو نہیں کیا؟''

''پتا نہیں' ویسے اس وقت نہ جانے کیوں وہ میری بات سمجھنے پر تیار نہیں ہیں۔ بہر حال جیسا کے لیے اپنے الفاظ سے پھرنا ممکن نہیں' ویسے ہی میرے لیے بھی وعدے کر کے اپنے

القاظ توڑ دینا ناممکن ہے۔ مجھے بھی وعدے کا پاس رکھنا ہے۔ آپ پلیز بابا جان کو راضی کر لیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارے اور اس حویلی کے مستقبل کے لیے کیا چیز بہتر ہے۔ اگر ہم ریشماں کے لیے رشتہ لے کر جائیں تو ممکن ہے وہ انکار کر دیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے اپنی توہین سمجھتے ہوئے اور پرانی دشمنی کے حوالے سے وہ پھر سرگرم ہو جائیں اور اگر ہم تمہاری شادی کہیں اور کر دیں تو بھی یہ ممکن ہے کہ وہ اس بات کو اپنی توہین سمجھیں اور کہیں کہ رشتہ تو ریشماں کے ساتھ بچپن میں طے ہو گیا تھا پھر ہم نے اسے نظر انداز کر کے کسی دوسری لڑکی کو بہو کیوں بنایا۔ اس طرح بھی ان کے ہاتھ ایک جواز آ جائے گا۔ تمہیں خدانخواستہ تکلیف پہنچانے کا۔"

"اماں، وہ ہر صورت میں مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں اور میری شادی کے سلسلے میں آپ لوگ جو بھی قدم اٹھائیں گے، وہ اسے نئے سرے سے جواز بنا کر اس دشمنی میں اضافہ ہی کریں گے۔ آپ رشتہ وہاں لے جائیں گی تب بھی، نہیں لے جائیں گی تب بھی۔"

"اللہ نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو۔" اماں جان سخت پریشان ہو گئیں۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ بابا جان جب کسی مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش کا ذکر کر رہے تھے تو اس کا مطلب کیا تھا؟ وہ کیا کہنا چاہتے تھے؟ یہ کوئی دھمکی تھی یا ماضی کی کوئی گمشدہ کڑی؟" اس نے پوچھا۔

اماں جان نے آنکھیں بند کر لیں۔ "جاؤ عبداللہ میں آرام کروں گی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

وہ چند لمحے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ جب وہ اور بابا جان گفتگو کر رہے تھے، تب بھی اس بات پر اماں جان ان کے درمیان سے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ ڈسٹرب تو وہ پہلے سے تھیں۔ اب زیادہ لگ رہی تھیں۔ واضح طور پر وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ وہاں سے اٹھ آیا۔

کمرے میں آ کر اس نے فون اپنے قریب کھسکایا اور ماہ بانو کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف فون اسی نے اٹھایا۔ عبداللہ کی آواز سن کر وہ کھل اٹھی۔

"میرا کتنا دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت تم سے بات کروں۔ تم ٹھیک ہو ناں؟"

"ہاں۔" وہ بولا، پھر پوچھا۔ "کیا کر رہی تھیں؟"

"میں دیئے جلا رہی تھی۔ تم بہت یاد آ رہے تھے۔ تم نے بھی دیئے جلائے؟"

اس نے ماہ بانو کے دیے تحفوں کی طرف دیکھا۔ وہ دیئے اب تک ویسے ہی پڑے تھے۔

"میں نے اس وقت تم سے ضروری بات کرنی ہے بانو۔" اس نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

"کہو؟ خیریت تو ہے ناں؟" وہ فکرمند ہو گئی۔

"ہاں۔" اس نے کہا پھر قدرے توقف سے بولا۔ "تم ہمارے خاندان کے ماضی کی کسی

کڑی سے واقف ہو جسے میں نہیں جانتا۔ اب میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔

"میری بات سن رہی ہو بانو؟"

"ہاں۔"

"تو جواب کیوں نہیں دے رہیں۔"

"آج میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے عبداللہ۔ نہ ہی اس سے تمہیں کوئی ... ہو گا۔ میں نے تمہارے بابا جان سے بھی کہا تھا کہ تمہیں کسی بات کی خبر نہیں۔ انہیں بھی یہ اچھی نہیں لگے گی کہ تم ماضی کو کریدو۔" ماہ بانو نے کہا۔

"مگر کسی کے ماضی کا سایہ ہماری زندگی پر پڑ رہا ہے اور یہ بات میرے لیے ناقابلِ ...شت اور ناقابلِ فہم ہے۔"

"مجھے بتاؤ عبداللہ کہ تم پریشرائز ہو رہے ہو اس بات سے؟"

"نہیں، لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔" وہ بولا۔

"مجھ سے کچھ پوچھنے کے بجائے تم بابا جان سے کیوں نہیں پوچھ لیتے۔ وہ مجھ سے زیادہ ...یل کے ساتھ تمہیں ہر بات بتا سکتے ہیں؟"

"اس کہانی سے سبھی واقف ہیں سوائے میرے۔" عبداللہ نے کہا۔

"نہیں۔ اسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔"

"اور تم کیسے جانتی ہو؟"

"اسے میں اپنی بدقسمتی کے علاوہ کچھ اور نہیں کہہ سکتی۔" ماہ بانو نے کہا۔

وہ اس موضوع سے ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ عبداللہ نے اسے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

"ایڈی ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بہت مشکل ہے یہاں عبداللہ۔ اُما اور ایڈی کا معاملہ بہت بگڑ گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

ماہ بانو نے اسے کچھ تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔

"وہ بہت پریشان ہے۔ میں نے اب تک اسے کچھ نہیں بتایا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ...ے کیسے یہ سب کچھ بتاؤں اور یہ سب جان لینے کے بعد اس کا ردِعمل کیا ہو گا۔"

"فی الحال میں اسے گاؤں میں بلوا لیتا ہوں۔ جیمز اور ظہیر کو بھی ساتھ بلوا لیتا ہوں۔ ظہیر بھی ...ڑ کے بعد سے پریشان ہے۔ ہم سب کو اب ذہنی طور پر تھوڑے آرام کی ضرورت ہے۔ ...لا شکار کا پروگرام بنائیں گے۔ تفریح رہے گی۔ سب فریش ہو جائیں گے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔" ماہ بانو نے کہا پھر قدرے توقف سے بولی۔ "میں بھی گاؤں آ رہی

ہوں۔''

''یہ پروگرام کیسے بنا؟''

''اماں جی میری وجہ سے اپنا ٹرپ کینسل کر رہی تھیں۔ مجھے یوں گھر میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے ان کا پروگرام خراب ہو۔ ابا جی کو گئے اتنے مہینے ہو گئے۔ میری تو مجبوری ہے کہ نہیں جا سکتی مگر اماں جی کو ضرور جانا چاہیے۔ ابا جی ہمیں' اور ہم انہیں بہت مِس کر رہے ہیں۔''

''نیہاں سے کوئی اور بات ہوئی؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''ہاں۔ جیمز نے شاید تمہیں بتایا ہوا سے جاب مل گئی ہے ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں۔ دونوں کی منگنی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے اور نیہاں نے بہت زور دیا ہے آنے کے لیے۔ وہ تمہیں انوائٹ کرنے کے لیے فون کرے گی۔''

''ہم سب ہوں گے' بس اُماں نہیں ہو گی۔'' وہ بولا۔

''مت یاد دلاؤ مجھے۔ اس کی طرف سے میرا دل بہت دُکھ رہا ہے۔''

☆=====☆=====☆

مکرم نے مولوی صاحب سے کہہ کر ماہ بانو کو گاؤں آنے کے لیے فون کروا دیا تھا۔

''ریشماں آپی اداس ہو رہی ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ ماہ بانو گاؤں آ جائے۔ آپ فون کر کے اسے یہاں آنے کے لیے کہہ دیں۔'' اس نے اپنے مخصوص حکمیہ لہجے میں ان سے کہا تھا۔ اور انہوں نے فون کر دیا تھا۔ پھر چند دن بعد معلوم ہوا تھا کہ وہ گاؤں آنے والی تھی۔

ریشماں کے دن بہت بے چینی سے گزر رہے تھے۔ ہر لمحہ اسے ماہ بانو کی آمد کا انتظار تھا اور ہر پل یہ دھڑکا کہ ابھی عبداللہ کے متعلق کوئی بری خبر سننے کو ملے گی۔

اس نے کوشش کی تھی کہ عبداللہ کو خبردار کر دے لیکن ایک ڈر' خوف اس کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔

''اگر میرے بھائیوں کو کچھ ہو گیا تو؟''

وہ بری طرح سے شش و پنج کا شکار تھی۔ امداد علی کی موت کا ذمہ دار وہ اب تک خود کو ہی سمجھتی تھی۔ یہ احساسِ جرم بہت شدید تھا۔ اور اب ایک مرتبہ پھر وہ نئے امتحان میں ڈال دی گئی تھی۔

اس نے چاہا کہ سبط سے مدد طلب کرے۔ شاید وہی بھائیوں کو اس بات سے باز رکھ سکے مگر یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ اماں جان کے کمرے میں اس کا فون اٹینڈ کرتی تھی جہاں پر گفتگو کے دوران بہت سے لوگ موجود ہوتے تھے۔ بھائیوں کی طرح اس کے پاس اپنا ذاتی فون نہیں تھا۔ لے دے کے ایک ماہ بانو ہی تھی جسے سب کچھ بتا کر وہ اس سے کوئی مشورہ لے سکتی تھی۔

''ضروری تو نہیں کہ کریمن کو ہر بات معلوم ہو جائے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے خبر نہ ہو اور بھائی اپنے منصوبے پر عمل کر ڈالیں۔ ایسا ہوا تو کیا ہو گا؟'' وہ سوچتی تو اس کا دم گھٹنے لگتا۔

پہروں بیٹھ کر وہ عبداللہ کی تصویروں کو تکا کرتی تھی۔ یہ سوچ کر ہی اس کا دل غم سے پھٹنے لگتا تا کہ اس دشمنی میں دونوں طرف ایسے لوگ تھے جن سے وہ بے حد محبت کرتی تھی۔ ان میں سے کسی کو بھی کھونا اسے گوارا نہ تھا۔

دوسری طرف بیٹھک میں سب بھائی اکٹھے ہو چکے تھے۔

''منصوبہ فول پروف ہونا چاہیے۔ ایسا جس میں ہمارا کوئی جانی نقصان نہ ہو اور عبداللہ کے بچنے کا ایک فیصد بھی امکان نہ ہو۔'' مکرم نے کہا۔

''منصوبہ تو پہلے بھی فول پروف ہی تھا۔ امداد کا قتل مخبری کا نتیجہ تھا اور افسوس' ہمیں آج تک پتا نہیں چل سکا کہ یہ مخبری کس نے کی۔'' خادم حسین بولا۔

''اس منصوبے کو محدود رکھیں۔ تو یہ خدشہ کم ہو گا۔'' مکرم نے کہا۔

''کتنا محدود رکھیں؟ ظاہر ہے یہ صرف ہم چاروں تک تو محدود نہیں ہو گا ناں۔ کچھ اور افراد بھی شامل کرنے پڑیں گے۔'' نوازش بولا۔

''وہ سب میرے اور مکرم کے پرسنل باڈی گارڈ ہوں گے۔ اس میں مخبری کا رسک کم سے کم ہو گا۔'' خادم حسین نے کہا۔

''عبداللہ کے معمولات لگے بندھے ہیں۔ سب سے اچھا موقع اس وقت ہے جب وہ رائیڈنگ کے لیے صبح سویرے نکلتا ہے۔ اس کا روٹ مخصوص ہے۔ ہاں گھوڑے کی رفتار کے حساب سے بعض اوقات اس کے وقت میں تبدیلی آ جاتی ہے لیکن یہ تبدیلی بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ صرف پانچ سے پندرہ منٹ کا فرق پڑتا ہے۔'' مکرم نے بتایا۔

''میں نے اور مکرم نے اچھی طرح ہر پہلو کا جائزہ لے لیا ہے۔ حملے کے لیے بھائیوں میں سے ہم دونوں ہی جائیں گے۔ نوازش تم پیچھے رہ کر حالات کا جائزہ لو گے۔ کچھ افراد تمہارے ساتھ بھی ہوں گے۔ اول تو ہمیں تمہاری ضرورت نہیں پڑے گی۔ اگر پڑ گئی تو تمہیں فوراً ایکشن میں آنا ہو گا۔ اور حضور تم حویلی میں رہو گے۔'' خادم حسین نے کہا۔

''میرے ساتھ یہ سلوک کیوں؟ آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟'' اس کے انداز میں شکوہ تھا۔

''ہم سب کو تم پر بھروسا ہے لیکن حویلی کو بھی خالی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ہم میں سے کسی ایک کا یہاں رہنا بھی بہت ضروری ہے۔''

''میں صرف ایک بات سے ڈسٹرب ہوں۔ ریشماں آپی نے ابھی امداد بھائی کا غم ہی نہیں بھلایا۔ ہم میں سے کسی کو خراش بھی آئی تو وہ اس کا بہت برا اثر لیں گی۔'' مکرم نے کہا۔

''عورتیں جذباتی طور پر کمزور ہوتی ہیں اور آپی تو بہت جلد پریشان ہو جاتی ہیں لیکن اب ہم صرف اس وجہ سے پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے۔'' حضور علی بولا۔

''میں پیچھے ہٹنے کی نہیں محتاط رہنے کی بات کر رہا ہوں۔ میں آپی کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکتا۔ اماں جان کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ اسے میری کمزوری کہہ لو یا کچھ بھی۔ میرے لیے ر سے پیارے سب سے محترم رشتے یہی ہیں۔

امداد بھائی کی وفات پر میں نے ان کی آنکھوں میں جو آنسو دیکھے تھے' میں انہیں فراموش نہیں کر سکتا۔ میرے لیے ممکن ہے کہ میں امداد بھائی کے جسم سے بہنے والا خون بھو جاؤں مگر اس روز جو آنسو آپی کی آنکھوں سے نکلے تھے' انہیں نہیں بھلا سکتا اور اسی سبب سے ا شخص کو بھی کبھی معاف نہیں کر سکتا جو ان آنسوؤں کی وجہ بنا تھا۔

میں آپی کو خوش کرنا چاہتا ہوں یہ بتا کر کہ جس نے ان کے بھائی کو قتل کیا۔ ان کی آنکھو میں آنسو بھرے۔ میں نے اسے اسی جگہ کتے کی موت مارا ہے لیکن آپی کی خوشی تب ہی مکمل ہو جب ہم میں سے کسی کو کچھ نہ ہو۔''

''ہم میں سے کسی کو کچھ نہیں ہوگا۔'' خادم حسین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

☆=====☆=====☆

اماں جان بہت بے دلی سے نیویارک روانہ ہوئی تھیں۔ انہیں ماہ بانو کی سخت فکر تھی۔ گاؤ میں مولوی صاحب کے گھر ٹیلی فون بھی نہیں تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر اس سے بات کر سکتیں۔ کم ایمر جنسی کی صورت میں ماہ بانو نے انہیں عبداللہ کا نمبر دے دیا تھا۔

گاؤں آنے کے لیے اس کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ جس شام وہ گاؤں پہنچ تو تھکن کے باوجود بھی آدھی رات تک بڑی اماں سے باتیں کرتی رہی۔ وہ اسے ریشماں کی وہاں آمد کا احوال بہت جوش وخروش سے سنا رہی تھیں۔

''پیر صاحب نے اجازت دے دی؟'' ماہ بانو کو حیرت تھی۔

''ہاں۔ پتا نہیں کیسے اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رحم ڈال دیا تھا۔'' بڑی اماں نے کہا۔

''وہ بہت اداس تھی تمہارے بغیر؟'' نانا جی بولے۔

''ہر وقت یاد کرتی رہتی ہے تمہیں۔'' بڑی اماں نے اضافہ کیا۔

''اچھا اب مجھے نیند آ رہی ہے۔ بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ حالانکہ آنکھوں میں نیند کا نشان بھی نہیں تھا۔ وہ صرف ریشماں کے مسلسل تذکرے سے بچنا چاہتی تھی۔

صبح بھی وہ دیر سے اٹھی۔ بڑی اماں نے اس کی تھکن کے خیال سے اسے سونے دیا تھا۔ ناشتا کر کے وہ چارپائی دھوپ میں ڈال کر بیٹھ گئی۔ یہاں آتے ہی عبداللہ سے ملنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ لاہور میں تھی تو یہ احساس تھا کہ وہ مکانی اعتبار سے بہت دور دور ہیں۔ اور ملنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں آتے ہی یہ احساس ختم ہو گیا تھا۔ بس تھوڑی دور ندی تھی اور اس سے پرے عبداللہ کا گاؤں تھا۔

''مگر مجھے وہاں نہیں جانا۔'' اس نے یہاں آتے وقت جو ارادہ کیا تھا۔ اس پر قائم رہنے کی کوشش کی۔

''یہاں کوئی بھی میرا نہیں ہے۔ زینی تو ہے ہی اگر عبداللہ کے باقی گھر والوں نے بھی مجھے الزام دینے والی نظروں سے دیکھا تو کیا ہوگا؟ اس نے کہا تھا کہ کسی کے ماضی کا سایہ ہماری زندگی پر پڑ رہا ہے۔ اور یہ سایہ کوئی اور نہیں یقیناً عبداللہ کے بابا جان ڈال رہے ہوں گے۔ ایسا کیوں ہے کہ زرینہ خالہ کا دکھ ہم سب کی زندگی پر پھیل رہا ہے۔'' وہ سوچ رہی تھی۔

بڑی اماں اس کے پاس چلی آئیں۔ ''کچھ تھکن دور ہوئی ؟''

''ہو گئی۔''

''تمہارا دل چاہے تو ریشماں سے بھی مل کر آؤ۔'' انہوں نے دبے دبے انداز میں یوں کہا جیسے منت کر رہی ہوں۔

ان کے اس انداز پر اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

''جی بڑی اماں میں یہی سوچ رہی تھی۔ بس اس دھوپ نے تھوڑا سا سست کر دیا ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

تھوڑی دیر میں تیار ہو کر وہ نانا جی کے پاس آ گئی۔

''اسے ریشماں کی طرف چھوڑ آئیں۔'' بڑی اماں نے دور سے ہی انہیں آواز دی۔

ماہ بانو کو آتے دیکھ کر ریشماں کھل اٹھی۔

''بانو'' اس نے چیخ کر کہا اور اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ ''کتنی یاد آ رہی تھیں تم۔ میں نے تو سوچا کہ تم مجھے بھول ہی گئی ہو۔''

''تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔'' ماہ بانو نے چادر اتار کر تہہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے دن رات تمہارے آنے کی دعائیں کرتے ہوئے ہی گزر رہے تھے۔''

وہ دونوں بیٹھ کر ایک دوسرے اور باقی گھر والوں کی خیریت دریافت کرتی رہی۔ ماہ بانو نے اماں جی کے نیویارک جانے کے بارے میں بتاتی رہی۔ یہ کہ وہ خود ان کے ساتھ کیوں نہیں گئی۔ اور یہ کہ اس نے ان سے کیا کچھ منگوایا تھا۔

''تم ان سے ملیں؟'' اس کی باتیں ختم ہونے پر ریشماں نے پوچھا۔

''عبداللہ یہیں ہوتا ہے آج کل۔'' ماہ بانو نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں اب چلتی ہوں۔ بڑی اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''ابھی سے؟ تھوڑی دیر پہلے تو آئی ہو۔''

''صبح آئی تھی میں' اب سہ پہر ہو رہی ہے۔'' ماہ بانو بولی۔

''سردیوں کے دن ہیں' اتنے چھوٹے سے تو ہوتے ہیں۔ ورنہ اتنا زیادہ وقت تو نہیں گزرا۔

اور ابھی تو نانا جی بھی نہیں آئے تمہیں لینے کے لئے۔''

''مجھے تھکن محسوس ہو رہی ہے سفر کی۔ گھر جا کر سونے کا ارادہ ہے۔'' اس نے بہانا بنایا۔

''یہاں سو جاؤ۔ اتنی جلدی مت جاؤ پلیز۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

ریشماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکنا چاہا۔

''عبداللہ کے متعلق؟'' ماہ بانو نے کوشش کی کہ اس کے لہجے کی تلخی ظاہر نہ ہو۔

''ہاں۔ انہی کے متعلق۔''

''یہی کہ اس نے تمہارے متعلق کیا کچھ کہا اور اسے کیا پسند اور کیا ناپسند ہے۔'' اب کے وہ اپنی تلخی نہ چھپا سکی۔

''نہیں' یہ سب اس وقت ثانوی باتیں ہیں۔ مجھے کچھ اور کہنا ہے۔'' ریشماں نے اس کے لہجے پر غور کیے بغیر کہا اور اٹھ کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔

ماہ بانو کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کی چھٹی حس ایک دم بیدار ہو گئی۔ بہت پرانے محسوسات ایک مرتبہ پھر جاگ گئے۔ ویسے ہی جیسے زرینہ خالہ کی چھوٹی سی صندوقچی کھولتے وقت اسے محسوس ہوئے تھے۔

یوں جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ جیسے کوئی کہانی چپکے چپکے اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی اور اس میں ماہ بانو کو مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔ کالج کی سرخ اینٹوں کی عمارت اور مسجد کے سفید روشن مینار اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پیر صاحب رجب علی شاہ کی حویلی اسے آواز دے کر بلا رہی تھی۔

اس روز کی طرح آج بھی وہ سوچ رہی تھی کہ اس کہانی میں اس کا کردار کہاں فٹ آتا تھا؟ کیا یہ کہانی شروع ہو رہی تھی یا اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تب بھی اس نے زرینہ خالہ کی کہانی سنانے کے لیے اماں سے کہا تھا۔

''مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کہانی کو سننے کی میری آرزو کہیں بہت اندر سے پھوٹ رہی ہو۔ جیسے یہ کہانی آپ کی نہیں میری زندگی کا حصہ ہو اور اسے جاننے کا مجھے پورا پورا حق حاصل ہو۔''

اور اماں نے کتنا درست کہا تھا اس سے۔

''کسی انسان کا ماضی کھنگالنے سے صرف دکھ اور غم ملتا ہے۔ خاص کر ایسے شخص کا جسے مرے ہوئے بھی کئی سال بیت گئے ہوں۔''

مگر وہ باز نہیں آئی تھی اور اس نے زرینہ خالہ کی کہانی جان کر ہی دم لیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے پتا چلا تھا کہ اماں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ زرینہ خالہ کا ماضی جان کر کیا ملا تھا اسے؟ صرف غم۔ یہ سب نہ جانتی تو شاید احساسِ جرم بھی اتنا شدید نہ ہوتا۔

اور اب عبداللہ بھی یہ سب جاننا چاہتا تھا۔

''وہ شدید خطرے میں ہیں بانو۔''

ریشماں کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی۔ لمحوں میں کتنا کچھ سوچ لیا تھا اس نے۔

میں نے سنا نہیں ریشماں۔ کیا کہہ رہی تھیں تم؟''

''وہ شدید خطرے میں ہیں بانو اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔''

''کیا؟ عبداللہ خطرے میں ہے؟'' ماہ بانو کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

''ہاں' مجھے پتا چلا ہے کہ......'' وہ رک کر مناسب الفاظ تلاش کرنے لگی۔

''کہ تمہارے بھائی اسے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟'' ماہ بانو نے تیزی سے کہا۔

ریشماں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

''مجھے بتاؤ بانو کہ میں کیا کروں؟ اپنے بھائیوں کو بچاؤں تو انہیں کھونا پڑتا ہے اور انہیں بچاؤں تو بھائیوں کو کھو دوں گی۔ سوچ سوچ کر میں پاگل ہو رہی ہوں۔'' وہ رو پڑی۔

''یہی محبت ہے تمہاری۔ جھوٹ کہتی ہو کہ تمہیں عبداللہ سے محبت ہے۔ سراسر جھوٹ۔ تمہیں اس سے محبت ہوتی تو یہ سب نہ سوچتیں۔'' ماہ بانو نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسے مت دیکھو میری طرف بانو۔ تمہارے بھائی نہیں ہیں ناں ورنہ تم اس کشمکش کو سمجھ جاتیں۔ میں نے اپنے بہت پیارے اور جوان بھائی کی لاش دیکھی ہے' اپنی آنکھوں کے سامنے۔ تمہیں کیا پتا کہ میں نے وہ دن کیسے گزارے تھے۔ کتنی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ کتنا غبار جمع ہو گیا تھا میرے اندر۔ آج کے دن تک مجھے یہی لگتا ہے کہ امداد بھائی کے قتل کی ذمہ دار میں ہوں۔ انہیں گولیاں کسی اور نے ماری ہیں لیکن ان کی قاتل میں ہوں۔ آج بھی میرے بھائی کی ہر چیز ویسی ہی رکھی پڑی ہے۔ میں اس کے کمرے میں کتنی دیر تک بیٹھ کر اس کی چیزیں تکتی رہتی ہوں۔ انہیں چھو کر دیکھتی ہوں لیکن اب وہاں کچھ نہیں ہے۔ میرا بھائی دور جا چکا ہے مجھ سے بہت دور۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اس کی باتیں سن کر بھی ماہ بانو کو پہلی مرتبہ اس سے محبت یا ہمدردی کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''میں اور کسی کو بھی رونا نہیں چاہتی بانو۔ کیا یہ آگ کبھی نہیں بجھے گی؟ میں نہ اپنے بھائیوں کو کھو سکتی ہوں نہ انہیں۔ کاش ہمارے درمیان یہ دشمنی نہ ہوتی۔ نہ جانے یہ سب کس نے شروع کیا' کس وجہ سے؟ میں نے کبھی کسی شخص کو بددعا نہیں دی لیکن اس شخص کو بددعا دینے کے لیے بڑا شدت سے دل چاہتا ہے جو اس دشمنی کا باعث بنا۔ پھر بھی میں ایسا نہیں کر سکتی۔ کیسے بددعا دوں۔ سبھی میرے اپنے ہیں۔'' وہ ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

''اپنی سگی ماں کو بددعا دو جو اس دشمنی کی وجہ بنی اور اپنے باپ کو بددعا دو جس نے دشمنی کا یہ

پودا لگایا۔ اسے سینچا' بڑا کیا۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹے کے خون سے اس کی آبیاری کی۔ پھر بھی اس کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا۔'' ماہ بانو نے نفرت سے کہا۔

ریشماں پلکیں جھپکائے بغیر ایک ٹک اس کی طرف دیکھے گئی۔

''میری سگی ماں؟'' بالآخر اس کے ہونٹ ہلے۔

''ہاں تمہاری ماں۔ تمہاری سگی ماں۔ میری زرینہ خالہ۔ اور تمہارے باپ کے منہ کو تو ویسے بھی خون لگا ہوا ہے۔ قتل کرنا' قتل کروا دینا۔ دونوں اس کے لیے صرف مشغلے ہیں۔ عبداللہ کو ختم کر کے وہ اپنے سگے بھائی سے بہت پرانا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو بھی گلے لگا لے لیکن اس وقت جب وہ اس کی نسل ختم کر چکے۔'' ماہ بانو غصے کے مارے مٹھیاں بھینچ کر کہہ رہی تھی۔

ریشماں ساکت بیٹھی اسے تکے جا رہی تھی۔

''مجھے بتاؤ' کیا کرنے والے ہیں تمہارے بھائی عبداللہ کے ساتھ؟ کب اور کہاں جان لینا چاہتے ہیں وہ اس کی۔'' ماہ بانو نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

''تمہیں کس نے بتایا بانو کہ اس دشمنی کی وجہ میری ماں جی ہیں؟''

''میں تم سے کچھ اور پوچھ رہی ہوں۔'' ماہ بانو نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں بھی تم سے...... پوچھ رہی ہوں کہ تم نے میری ماں جی کا ذکر کیوں کیا؟ مجھے بتاؤ کہ وہ کس طرح اس دشمنی کی وجہ بنیں؟''

''او گاڈ! یہ وقت ان بیکار باتوں کا نہیں ہے۔''

''یہ بیکار باتیں نہیں ہیں۔'' ریشماں نے بھی تیز لہجے میں کہا۔

''کچھ ہاتھ نہیں آئے گا تمہارے' یہ سب جان کر' سوائے دکھ کے۔ اور اگر تم یہ جاننے پر مصر رہیں تو تمہیں وہ سب بھی جاننا ہوگا جو آج ہو رہا ہے۔ ماضی کریدو گی تو حال بھی سامنے آئے گا اور تم بیتے کل کا تو شاید سامنا کر لو لیکن آج کا سامنا نہیں کر سکو گی۔''

اسی وقت کریمن اندر داخل ہوئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر تھی۔ اندر کی صورتِ حال اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ ریشماں کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ ماہ بانو کا چہرہ غصے سے تپ رہا تھا۔ وہ ٹھٹک گئی۔

''خیر تو ہے بی بی؟'' کریمن نے پوچھا۔

ریشماں نے منہ پھیر کر آنسو پونچھے۔ ''ہاں خیر ہے تم جاؤ۔''

''بی بی! جاتی تو ہوں لیکن جو بات ہے وہ آپ کو بتانا ضروری ہے۔ خود آپ نے تو کہا تھا۔'' اس نے ماہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ ریشماں ماہ بانو سے کچھ نہیں چھپاتی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ عبداللہ کے قتل کا منصوبہ بھی وہ ماہ بانو پر ظاہر کرنا چاہے گی یا نہیں۔

ریشماں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''بھائیوں نے ارادہ بدل دیا ہے ناں؟''

''نہیں بی بی۔ مجھے رجو نے ابھی بتایا ہے کہ اب کی مرتبہ تو ایسا منصوبہ ہے کہ عبداللہ شاہ صاحب بچیں گے نہیں۔'' وہ چند قدم آگے بڑھ کر قالین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

ریشماں اور ماہ بانو نے ایک دوسری کی طرف دیکھا پھر ماہ بانو اس سے مخاطب ہوئی۔

''کیا منصوبہ بنایا ہے انہوں نے؟''

''نہیں کریمن۔ تم بانو کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔'' ریشماں نے تیز لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں؟'' ماہ بانو ریشماں کی طرف مڑی۔

''کیونکہ تم بغیر سوچے سمجھے سب کچھ حیدر بابا کی حویلی میں بتا دو گی۔''

''تو؟''

''اس بات کا فیصلہ تمہیں نہیں مجھے کرنا ہے کہ یہ بات بتائی جائے یا نہیں۔'' ریشماں نے کہا۔

''تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی؟'' ماہ بانو نے غصے سے کہا۔

''میں ہی ہوں وہ جسے یہ فیصلہ کرنا ہے۔ تم شاید بھول رہی ہو کہ اس آگ میں دونوں طرف میرے اپنے لوگ ہیں۔ ایک طرف میرے بھائی ہیں اور دوسری طرف وہ جس کے علاوہ میں نے کبھی کسی کے متعلق سوچا بھی نہیں ہے۔ تمہیں درمیان میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ تمہارا ان میں سے کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' ریشماں نے سختی سے کہا۔

ماہ بانو چند لمحے اسے گھورتی رہی پھر بولی۔ ''کس نے کہا تم سے کہ میرا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے؟''

''دوستی خون اور محبت کے رشتوں سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔'' ریشماں بولی۔

''میرے نزدیک خون کے رشتے بھی محبت کے رشتوں سے بڑھ کر نہیں ہوتے مگر تم کچھ نہیں سمجھو گی۔ تمہارا ذہن اور تمہاری صلاحیتیں اسی چار دیواری کی طرح محدود ہیں۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں نے محبت اور دوستی کی خاطر کیا کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ اپنی یادیں بہت قیمتی یادیں کھو دی ہیں اس سفر میں۔

مگر تمہیں اپنے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اور تم کچھ دیکھ بھی نہیں سکتیں۔ اس لیے کہ تمہاری اڑان بہت محدود ہے۔'' پھر وہ کریمن کی طرف مڑی۔ ''تمہیں بتانا ہوگا کہ عبداللہ کے خلاف کیا منصوبہ بنایا گیا ہے؟''

کریمن نے ریشماں کی طرف دیکھا۔ اس کی اجازت کے بغیر ماہ بانو کو کچھ بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''میں اپنی ماں جی کے متعلق جاننا چاہتی ہوں۔'' ریشماں نے یوں کہا جیسے کچھ اور سنا ہی نہ

ہو۔

"کس نے منع کیا ہے تمہیں ان کے متعلق جاننے سے؟ جاؤ جا کر پوچھ لو اپنے باپ سے یا حیدر علی شاہ سے۔ اور یہ دونوں جواب نہ دے سکیں تو اپنی ماں کی قبر سے سوال کرو۔ مجھ سے کیوں پوچھتی ہو۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں عبداللہ کو مرنے نہیں دوں گی۔ تم مجھے چاہے کچھ نہ بتاؤ لیکن اپنی جان دے کر بھی مجھے اس کی جان بچانی پڑی تو میں یہ بھی کر گزروں گی۔"

وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ ریشماں گنگ رہ گئی تھی۔ ٹھیک ہے' اس نے دنیا صرف اپنی حویلی کی چار دیواری تک دیکھی تھی لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ماہ بانو کی بات اور اس کے لہجے میں چھپی کہانی کو جان ہی نہ سکتی۔ ماہ بانو دروازہ کھول کر باہر نکل چکی تھی۔ وہ صدمے کی سی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے وجود میں آندھیاں چل رہی ہوں۔ لگتا تھا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا تھا؟

"نہیں' وہ تو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ بانو ان کے متعلق سوچتی ہے۔ یہ حقیقت تو کبھی نہیں بدل سکتی ناں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہاں زینی نے بھی تو کہا تھا۔ وہ مجھے بھابی کہتی تھی۔ خود بانو نے بھی بتایا تھا کہ انہیں مجھ سے محبت ہے۔ ہاں اسی نے بتایا تھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ جو بات میں کہنے لگا ہوں وہ بات دن میں ہزاروں لوگ کہتے ہیں۔ بہت عام سی بات ہے لیکن ہر کہنے والے کے لیے یہ نئی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ بانو تم ریشماں سے کہنا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔

نہیں ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ بانو میرے ساتھ یہ کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ مجھے بہن کہتی ہے' دوست کہتی ہے۔ کبھی کوئی اپنی بہن کے ساتھ بھی ایسا کرتا ہے؟ نہیں۔ میں ہی غلط سوچ رہی ہوں۔ ہاں ایسا ہی ہے۔ بانو کبھی یہ حرکت نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے دوست ہیں اس لیے جذباتی ہو کر یہ بات کہی اس نے۔

میں بھی پاگل ہوں' کیا سمجھ بیٹھی۔ بانو تو ایسی لڑکی ہے جو ہر کسی سے محبت کرتی ہے۔ وہ عبداللہ کے لیے اتنی جذباتی ہو رہی ہے تو صرف اس لیے کہ وہ دونوں دوست ہیں اور میں اس کی بہن۔ وہ ہم دونوں سے انہیں حوالوں سے محبت کرتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی ہو گی کہ بعد میں میں پچھتاتی رہ جاؤں۔"

ریشماں نے خود کو تسلی دی لیکن جو کانٹا اس کے دل میں پیوست ہو چکا تھا اس کی کسک ختم نہ ہو سکی۔

"بی بی اب کیا کروں؟" کریمن بوکھلائی ہوئی تھی۔ ریشماں چونک گئی۔

"تم ایسا کرو کریمن کہ بانو بی بی کے پیچھے جاؤ جلدی سے۔ اور ان سے وہ سب کہہ دو جو تم مجھے بتانے آئی تھیں۔ جلدی کرنا' وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوں گی۔" اس نے کہا۔

"انہیں یہاں اندر لے آؤں بی بی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں' یہاں اندر لانے کی ضرورت نہیں ہے۔" ریشماں نے کہا۔

کریمن کمرے سے نکل گئی۔ ریشماں کو خود بھی احساس نہیں تھا کہ اس نے اتنی جلدی یہ فیصلہ کس بنیاد پر کیا تھا۔

☆=====☆=====☆

زینی نے کچھ دنوں کے لیے پاکستان جانے کا فیصلہ بہت اچانک کیا تھا۔

"یہاں مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا' ادھر آ کر میں ایک لمحے کے لیے بھی خوش نہیں ہوئی۔" اس نے سبط اور زہرا سے کہا۔

"تمہارا اپنا فیصلہ تھا یہ۔" زہرا نے کہا۔

"فیصلے غلط ہو جائیں تو اپنی غلطی مان لینی چاہیے' اس پر اڑے نہیں رہنا چاہیے۔" وہ بولی۔

"کس فیصلے کی بات کر رہی ہو؟" سبط نے اس کی طرف دیکھا۔

"اپنے گھر سے اتنی دور چلے آنے کی بات کر رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں سب کچھ کھو ئی ہوں۔"

"اگر تمہارا یہ فیصلہ غلط ہے تو پچھلے کیے تمام فیصلے بھی غلط ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی وقت پچھتاؤ۔"

"میں کوئی پچھتا نہیں رہی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "نہ ہی میرے باقی فیصلے غلط نا۔ مگر تم میری بات سمجھتے نہیں ہو۔ مجھے اماں اور بابا جان بہت یاد آتے ہیں۔ جب اماں فون پر تے ہوئے مجھ سے کہتی ہیں کہ سب کچھ چھوڑ کر گھر واپس آ جاؤ تو میرا دل چاہتا ہے کہ ابھی اسی ت اڑ کر اماں جان کے پاس پہنچ جاؤں۔"

"تم ہوم سک فیل کر رہی ہو اور کوئی بات نہیں ہے۔" زہرا نے کہا۔

"کیسا ہوم سک فیل کرنا گڑیا۔ اب چھ سات مہینے ہونے لگے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے پھر تم دونوں پہلے کس گھر میں رہ رہی تھیں۔ مری میں کیا تمہارے اماں اور بابا ہوتے تھے؟ ں گئے تو زینی گاؤں سے بیزار تھی۔ یہاں آئی تو گاؤں یاد آنے لگا۔" سبط نے کہا۔

"مجھے گاؤں یاد نہیں آتا' اماں بابا یاد آتے ہیں۔" وہ رو پڑی۔

"دیکھو تو زینی! ہم بہت بڑا فیصلہ کر کے گھر سے نکلے ہیں۔ پاکستان میں رہ کر یہ ممکن نہیں لہ ہم اور ہمارے گھر ایک ہو سکیں۔ ایسا صرف یہیں ممکن ہے۔" سبط بولا۔

"مجھے پتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں تمہارے بغیر بھی نہیں رہ سکتی لیکن مجھے اماں اور بابا عائی بہت یاد آتے ہیں تو کیا میں انہیں یاد بھی نہ کروں؟ اگر انہیں یاد کرتے ہوئے مجھے رونا آ ے تو کیا میں روؤں بھی نہیں؟ کتنا کہا ہے میں نے کہ انہیں کہ کچھ دن کے لیے ہی سہی' یہاں آ

جائیں لیکن وہ نہیں آتے۔ ہمیں ایسا تو نہیں کرنا چاہیے ناں۔''

''فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے لیکن ایگزامز کے بعد تم ہی پاکستان چلی جانا۔'' سبط نے اسے مشورہ دیا۔

''نہیں، میں ابھی گھر جاؤں گی۔''

اور پھر وہ اپنی بات پر اڑ گئی۔ زہرا اور سبط حسن تو یوں بھی اس کے آنسو دیکھ کر پگھل جاتے تھے۔ اس مرتبہ تو وہ اتنا روئی کہ مسز جارج کو بھی اجازت دینی ہی پڑی۔ پاکستان میں بھی اس نے اپنی آمد کی اطلاع تب تک نہیں بھجوائی جب تک اس کی فلائٹ میں محض چند گھنٹے نہیں رہ گئے۔ اسے ڈر تھا کہ بابا جان اسے آنے سے منع کر دیں گے۔ پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سخت تھے۔

''سبط! یہ سب کتنا برا ہے کہ ہمارے خاندان کے افراد آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ اگر وہ صلح صفائی سے رہتے تو ہم بھی وہیں پاکستان میں خوش خوش رہ رہے ہوتے۔'' ائر پورٹ جاتے ہوئے اس نے سبط سے کہا۔

''ہاں، مگر یہ ممکن نہیں ہے اور میرا مشورہ یہ ہے کہ تم گھر پہنچ کر اطمینان سے میرے اور اپنے تعلق کے بارے میں سوچو۔ یہ بات بھلا دو کہ حالات کبھی بہتر ہوں گے۔ یہ کبھی بہتر نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد سوچو کہ میرے اور تمہارے ...... ساتھ رہنے کی کیا کیا آپشنز ہیں۔ اور کیا تمہارے لیے ممکن ہے کہ سب کچھ چھوڑ دو۔ صرف ایک شخص کے لیے۔''

''تم یہ کیوں سوچ رہے ہو کہ میں باقی سب کچھ نہ چھوڑ سکی تو تمہیں چھوڑ دوں گی یا میں پچھتا رہی ہوں۔ نہیں سبط۔ میں تو صرف اپنے گھر والوں کو یاد کرتی ہوں۔ اب کیا یہ بھی نہ کروں؟'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

وہ خاموش رہا۔

''کسی فیصلے پر پچھتانا اور کسی کو یاد کرنا دو بہت مختلف باتیں ہیں۔ تمہارے بغیر زندگی کا تو کوئی تصور ہی نہیں ہے میرے نزدیک۔ اب کیا یہ دعا بھی نہ کروں کہ حالات ٹھیک ہو جائیں۔ کبھی دونوں گھرانوں کے افراد ایک جگہ مل کر ہنسی خوشی کھانا کھائیں؟ دعا کی قبولیت پر بے شک اختیار نہیں ہے لیکن دعا مانگنے پر تو اختیار ہے ناں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

سبط نے مسکرا کر رسان سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں دعا مانگنے پر اختیار ہے۔''

''کبھی یہ مت سوچنا کہ میں تمہیں چھوڑ سکتی ہوں۔ ایسا تو مر کر بھی نہیں کر سکتی۔''

☆=====☆=====☆

مکرم اور نوازش کو رات ہی کے وقت ملتان کے لیے کام سے نکلنا تھا۔ مسئلہ وہی زمینوں کا تھا۔ پیر صاحب گزشتہ رات کو لاہور کے لیے نکلے تھے اور تاکید کر گئے تھے کہ ملتان میں اسے کچھ

...ادے ملنا تھا۔ نوازش بھی اس کے ساتھ ہی جا رہا تھا۔

مکرم ماں جان کو خدا حافظ کہنے ان کی خواب گاہ میں پہنچا تو وہ قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تم سوئے نہیں بیٹا؟'' انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔ ابھی مجھے اور نوازش کو ملتان کے لیے نکلنا ہے۔ میں آپ کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔''

انہوں نے قرآن پاک بند کر دیا۔ ''ابھی رات کے وقت جاؤ گے؟ صبح چلے جانا۔''

''کچھ افسروں سے ملنا ہے زمینوں کے سلسلے میں۔ ابھی اس لیے ضروری ہے تاکہ صبح دفتری ...ات میں کام مکمل ہو سکے۔ بابا جان بھی تاکید کر گئے تھے۔''

''اچھا بیٹا اللہ کے حوالے!'' انہوں نے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے اماں جان، ریشماں آپی سے نہیں مل سکوں گا۔ انہیں میری طرف سے ...پ ہی خدا حافظ کہہ دیں۔''

وہ باہر نکلا تو تھوڑی ہی دور نوازش مل گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' مکرم نے اس سے کہا۔

''آپ نکلیں۔ میں اماں جان کو خدا حافظ کہہ کر ابھی آیا۔''

بیرونی دالان میں حویلی کے بڑے پھاٹک سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس نے سگریٹ ...لیا۔ باہر خاصی خنکی تھی۔ اندھیرا ابھی بہت گہرا تھا۔ آسمان پر چھائے بادلوں کی وجہ سے چاند کی ...بھی نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس دالان میں اس پہر عموماً اندھیرا ہی چھایا رہتا تھا۔ خاص طور پر ...یوں میں، جب اس وقت تک لوگ اپنے لحافوں میں دبک چکے ہوتے تھے۔ ہاں زنان خانے ...بڑے دروازے کے نیچے سے روشنی کی پتلی سی لکیر باہر تک دکھائی دے رہی تھی۔

مکرم نے سگریٹ کا آخری ٹکڑا زمین پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا اور گھڑی کے چمکتے ...کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں نوازش کہاں رہ گیا۔'' اس نے سوچا۔

...اسی وقت زنان خانے کا بڑا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی برآمد ہوئی۔ چادر کو اپنے گرد اچھی ...لپیٹا اور دروازہ بند کر کے قدم بڑھا دیے۔ تھوڑی ہی دور چلی تھی کہ اسے ایک پتھر سے ٹھوکر ...ور بمشکل گرتے گرتے بچی تھی۔

عین اسی وقت کریمن دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ زنان خانے کے بڑے دروازے کی بجائے اس ...سے آئی تھی جو حویلی کے ملازموں کے لیے مخصوص تھا۔ اپنے پیچھے دوڑتے ہوئے قدموں ...ازسن کر وہ لڑکی رک گئی۔

''کون ہے؟''

"میں ہوں جی کریمن۔"

"کیا بات ہے؟"

"بی بی جی نے بھیجا ہے آپ کے پاس۔" وہ سانس درست کرتے ہوئے بولی۔

"کہہ رہی ہیں کہ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں۔"

"کیوں! ترس آ گیا تمہاری بی بی کو عبداللہ پر یا پھر بھائیوں سے اس کی محبت کم ہو گئی یک دم۔"

لڑکی کے انداز میں تلخی تھی۔

"پتا نہیں بی بی! میں تو حکم کی غلام ہوں۔ انہوں نے آپ کے پاس بھیج دیا۔ میں چلی آئی۔"

مکرم اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ اس کے دماغ میں ہتھوڑے برس رہے تھے۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کی حویلی میں یہ کیسی گفتگو ہو رہی تھی؟ یوں لگ رہا تھا جیسے اس اجنبی لڑکی کی آواز وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ مگر کہاں؟ یہ بالکل یاد نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس سے بھی اہم چیز وہ گفتگو تھی جو کریمن اور اس اجنبی لڑکی کے درمیان ہو رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

پیر صاحب' رجب علی شاہ اس مرتبہ کافی دن کے بعد لاہور گئے تھے۔ پہنچ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد انہوں نے نوری کے گھر رابطہ کیا۔ دوسری طرف جنت بائی تھیں۔

"جی' بسم اللہ' بسم اللہ۔ اس مرتبہ بہت دن بعد لاہور تشریف لائے۔ خیر تو تھی ناں!"

"ہاں۔" انہوں نے کہا۔ "نوری کے لیے ہم ڈرائیور بھجوا رہے ہیں۔ اسے کہیں کہ جلد از جلد آ جائے۔"

"کیوں نہیں پیر صاحب لیکن ایسا ہے کہ بے بی شوٹنگ پر گئی ہوئی ہے۔ آئے گی تو ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں۔"

شام تک بھی نوری کی طرف سے کوئی پیغام نہ آیا تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر رنگ کیا۔

"وہ ایسا ہے پیر صاحب کہ بے بی آتے ہی سو گئی تھی۔ بہت تھکی ہوئی تھی بے چاری۔" جنت مائی نے کہا۔

پیر صاحب فون بند کرنے لگے تھے کہ لائن کے دوسری طرف پس منظر میں نوری کی کھنک دار ہنسی کی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی ایک مردانہ قہقہہ بھی ان کی سماعت سے ٹکرایا اور پھر فوراً بعد دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

"تو نوری نہ سوئی ہوئی ہے اور نہ تنہا ہے۔" انہوں نے سوچا۔

غصے سے ان کا برا حال ہو گیا۔ انہیں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے منہ پر طمانچہ دے مارا

ذلت اور توہین کے باعث ان کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ان کے ساتھ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ جہاں جاتے تھے سب دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ملتے تھے۔ پیسہ بے حساب تھا۔ مردانہ وجاہت اور جوانی کا غرور تھا۔ یہ سب باتیں کسی کو بھی مقناطیس کی طرح کھینچنے کے لیے کافی تھیں۔

ٹھیک ہے' وقت نے اپنا سفر آگے کی طرف جاری رکھا تھا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ جوانی ہی ہاتھ سے گئی تھی ناں۔ اس کے علاوہ تو اب تک سبھی کچھ تھا ان کے پاس۔ بے تحاشہ دولت کے ساتھ۔

اور اب جنت بائی کے ایک جھوٹ سے انہیں اپنا سارا غرور مٹی میں ملتا نظر آ رہا تھا۔ ایسا ہتک آمیز سلوک ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

بہت زمانے کے بعد انہیں نوری کی شکل میں کوئی ایسی لڑکی ملی تھی جس نے سچ مچ ان پر جادو کر دیا تھا۔ اس کی ایک ایک ادا میں نزاکت تھی۔ حسن تھا۔ ہاں اس کا بات کرنے کا انداز خوبصورت نہیں تھا لیکن باتیں خوبصورت ہوتی تھیں۔ یوں تو انہیں لاہور میں بہت سے کام انجام دینے ہوتے تھے' لیکن نیاز پور سے روانہ ہوتے وقت ان کے ذہن میں پہلا خیال نوری سے ملنے کا ہی آتا تھا۔

وہ نوری کے ہاں پہنچے تو وہ حسبِ توقع جاگ رہی تھی اور تنہا بھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی موجود تھا۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو ریشماں سے لڑ کر باہر نکلی تو غصے اور دکھ سے اس کا برا حال تھا۔ اسے بالکل امید نہیں تھی کہ ریشماں اسے عبداللہ کے قتل جیسے منصوبے کو بتانے کے لیے منع کر دے گی۔

"کیسی محبت ہے اس کی؟ اسے محبت کہتے ہیں؟ اپنے بھائیوں کا خیال تو ہے اسے لیکن جس سے محبت کے اتنے دعوے کیے اس کا کچھ خیال نہیں؟ کہتی ہے دونوں کو بچائے گی۔ اپنے بھائیوں کو بھی اور عبداللہ کو بھی۔ احمق لڑکی یہ نہیں جانتی کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اوہ میرے خدا اگر عبداللہ کو کچھ ہو گیا تو۔" اس سے آگے سوچنے کی اس میں ہمت بھی نہیں تھی۔

زنان خانے سے نکل کر وہ بیرونی دالان میں پہنچی تو اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ حالانکہ ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ جلدی سو جانے کے عادی تھے۔ اس لیے تاریکی کے علاوہ ویرانی بھی تھی۔ اسے پتا تھا کہ بڑی اماں اسے اکیلے گھر آتے دیکھ کر دہل جائیں گی لیکن وہ نانا جی کی آمد تک حویلی میں رکنے پر تیار نہیں تھی۔ یہاں سے اسے عبداللہ کے خون کی بو آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر طرف بھیڑیے دانت تیز کیے بیٹھے ہوں اور نانا جی کے متعلق اسے یقین تھا کہ وہ عشاء کی نماز پڑھا کر ہی اسے لینے آئیں گے۔

انہی سوچوں میں گم وہ چلتی جا رہی تھی کہ کریمن بھاگتی ہوئی آئی۔ اسے ریشماں نے بھیجا

تھا۔ وہ سب کچھ ماہ بانو کو بتانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

''پرسوں صبح کے وقت سویرے سویرے عبداللہ شاہ صاحب کا کام تمام کرنا ہے انہوں نے۔ اس وقت وہ اکیلے ہی ریڈنگ پر جاتے ہیں' تب۔''

''کس پر؟'' ماہ بانو کچھ نہ سمجھی۔

''ریڈنگ پر۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''پتا نہیں جی' رجو نے مجھے یہی بتایا تھا۔ بڑے شاہ صاحب اور مکرم شاہ صاحب' رجو اور کچھ دوسرے لوگوں کو وہ جگہ دکھانے کے لیے لے کر گئے تھے۔ ان سے روز بندوقیں بھی چلواتے ہیں تاکہ نشانہ پکا ہو جائے۔''

اس کی باتیں سن کر ماہ بانو کا دل بیٹھ رہا تھا۔ کتنے اطمینان سے منصوبہ بنایا ہے عبداللہ کو قتل کرنے کا۔ یوں جیسے وہ انسان نہ ہو' کوئی کیڑا مکوڑا ہو۔ اس نے سوچا۔

''میں اب جاؤں بی بی؟'' کریمن نے اس سے پوچھا۔

''نہیں ٹھہرو۔ پرسوں صبح کتنے بجے؟''

''یہ مجھے نہیں پتا۔ بس جب شاہ صاحب ریڈنگ کے لیے جائیں گے تب۔ رجو نے بتایا تھا کہ اس وقت وہ اکیلے ہوتے ہیں۔'' کریمن نے کہا۔

''مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ رجو نے کیا کچھ بتایا تھا۔''

کریمن نے اپنی عقل کے مطابق اسے کچھ باتیں بتا دیں۔ ماہ بانو اسے اپنے اندازے کے مطابق جوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ باتیں عبداللہ سے ملنے کے بعد خود ہی کلیئر ہو جائیں گی مثلاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ صبح صبح وہ کس کام کے لیے نکلتا تھا' جسے کریمن ریڈنگ کہہ کر پکار رہی تھی۔

یہ سب باتیں سن کر ماہ بانو کو اپنا سر گھومتا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ شکر ادا کر رہی تھی کہ اس کا گاؤں آنے کا پروگرام بن گیا تھا۔ بمشکل تمام وہ کریمن سے مخاطب ہوئی۔

''تھینک یو کریمن۔ میرا مطلب ہے تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''شکریہ تو بی بی کا ادا کریں جی۔ انہوں نے حکم دیا تھا تو میں آ گئی۔''

''ہاں۔'' ماہ بانو سخت سردی میں ماتھے پر آیا پسینہ چادر سے پونچھنے لگی۔ ''تم میرا پیغام دے دینا بی بی کو۔''

''بولو بی بی! کیا کہنا ہے انہیں؟'' اس نے پوچھا۔

ماہ بانو چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ''میں لکھ کر دے دیتی ہوں۔ روشنی کی طرف چلو۔''

کریمن نے زنان خانے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر سے آتی روشنی میں ماہ بانو نے اپنے بیگ

سے بال پین نکالا اور کسی اچھے کاغذ کے نہ ہونے کے باعث ایک پرانی رسید کی پچھلی طرف ریشماں کے لیے رقعہ لکھنے لگی۔

پیاری ریشماں۔

آج ہمارے بیچ جو لڑائی جھگڑا ہوا اس پر مجھے بہت افسوس ہے۔ بہرحال تم نے تلافی کر دی ہے۔ میں یہ سب باتیں عبداللہ کو بتا دوں گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب جاننے کے بعد عبداللہ کا ردِعمل کیا ہوگا۔ میری دعا ہے کہ تمہارے بھائی محفوظ رہیں۔ بلکہ میری دعا ہے کہ ہر کوئی محفوظ رہے لیکن عبداللہ کیا فیصلہ کرتا ہے یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔

تمہاری بہن

ماہ بانو!

اس نے کاغذ تہہ کر کے کریمن کو پکڑا دیا۔

''یہ اپنی بی بی کو دے دینا۔'' اس نے کہا اور واپس مڑ گئی۔

☆=====☆=====☆

ان دونوں کی باتوں نے مکرم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ جیسے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اتر رہا تھا۔

''ریشماں آپی؟ وہ ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟ اور کیوں؟ نہیں' وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتیں۔ کریمن جھوٹ بول رہی ہے۔ یونہی ریشماں آپی کا نام استعمال کر رہی ہے۔ اس سے تو میں بعد میں نمٹوں گا پہلے اس لڑکی کی خبر لوں۔''

☆=====☆=====☆

ماہ بانو سن ہوئے دماغ کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ ایک تو اندھیرا تھا' پھر راستہ بھی ناہموار تھا۔ اس کے پاس کوئی ٹارچ بھی نہیں تھی لیکن یہ سب ہوتا تب بھی وہ اپنے حواسوں میں کب تھی۔ قدم قدم پر اسے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ عبداللہ کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا ہنسنا' باتیں کرنا یاد آ رہا تھا۔ اس کے وہ الفاظ جو ماہ بانو کی زندگی کا سرمایہ تھے۔

''جو میں کہنے لگا ہوں' وہ بات دن میں ہزاروں لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ بہت عام سی بات ہے لیکن ہر کہنے والے کے لیے یہ نئی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ بانو' میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

ماہ بانو چلتے چلتے رک گئی۔ آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا تھا۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کی۔ اسی وقت اسے اپنے بالکل پیچھے قدموں کی چاپ محسوس

ہوئی۔

''کک......کون ہے؟''اس نے قدرے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

''اگر خاموشی سے میری بات نہیں مانو گی تو تمہاری موت۔'' سفاک لہجے میں کہا گیا۔

ماہ بانو کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر اترتی محسوس ہوئی۔ اس نے بھاگنا چاہا لیکن قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ چیخنا چاہا لیکن حلق بالکل بند ہوتا لگ رہا تھا۔ اردگرد دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

''خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔''

وہی سفاک لہجہ۔ اندھیرے کی چادر میں لپٹے اس شخص نے ماہ بانو کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لی۔

''چھوڑو مجھے' کون ہو تم۔''اس نے بمشکل تمام کہا اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

''میں نے کہا ہے خاموشی سے میرے ساتھ چلو ورنہ یہیں ذبح کر دوں گا۔''اس نے ماہ بانو کو اپنے ساتھ گھسیٹا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔ کون ہو تم۔ مجھے چھوڑو۔''اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی۔

☆=====☆=====☆

اسے ڈیرے پر لانا کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اس نے مزاحمت کی تھی لیکن مکرم کے سامنے اس کے دھان پان سے وجود کی کیا حیثیت تھی۔ جب تک وہ اسے ڈیرے پر لایا' وہ خوف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

خود کو مکرم کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش میں اس کی چادر وہیں کہیں گر گئی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا ڈھالا سا جوڑا کھل گیا تھا اور بال بکھر گئے تھے۔ اسے بستر پر لٹاتے ہوئے پہلی مرتبہ مکرم نے اس کی شکل دیکھی۔ چند مہینے پہلے کا ایک منظر اس کی نگاہ میں تازہ ہو گیا۔

''مسٹر خادم حسین۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''نہ تو یہ نیاز پور ہے اور نہ ہی میں وہاں رہنے والے آپ کے کسی مزارعے کی بیٹی ہوں۔ یہ رعب مجھ پر جمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی میں آپ جیسوں کا رعب برداشت کرتی ہوں۔''

اور اس کے متعلق خادم حسین نے کہا تھا۔ ''تم نے دیکھا تھا مکرم کہ اس لڑکی میں کتنی شان' کتنی تمکنت تھی۔ مجھے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی۔ میرا آئیڈیل ایسی ہی لڑکی ہے۔''

مکرم نے آگے بڑھ کر لحاف اس کے اوپر ڈال دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ دوسرے کمرے میں آ کر اس نے خادم حسین کا نمبر ڈائل کیا۔

''کہاں غائب ہو گئے ہو مکرم۔ نوازش کب سے پریشان ہو رہا ہے۔''

''میں ڈیرے پر ہوں۔ نوازش کو یہاں بھیج دیں۔''

''مگر وہاں کیا کر رہے ہو۔ ملتان کے لیے کس وقت نکلو گے؟''اس نے پوچھا۔

''ملتان کا پروگرام کینسل سمجھیں۔ نوازش کو یہاں بھجوا دیں۔ مجھے اس سے کچھ کام ہے۔''

تھوڑی ہی دیر میں نوازش وہاں پہنچ گیا۔

''میں حویلی جا رہا ہوں۔ تمہیں یہیں ٹھہرنا ہے۔ یہاں کمرے میں ایک لڑکی ہے' اس کی حفاظت کرنا ہے۔''

''کیسی لڑکی؟''نوازش کچھ نہ سمجھا۔

''کیسی ہوتی ہے لڑکی؟''مکرم نے اسے گھورا۔ ''تم سے جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ لڑکی ابھی بے ہوش ہے لیکن جلد ہی ہوش میں آ جائے گی۔ اور اس کے بعد شاید شور مچائے' چیزیں توڑے پھوڑے' ہسٹیرک ہو جائے لیکن......اسے کسی بھی صورت یہاں سے نکلنے نہیں دینا۔

تم یہاں کیوں ہو یا یہاں کوئی لڑکی ہے' وقتی طور پر اس بات کا علم کسی کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ خادم بھائی اور حضور کو بھی نہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس لڑکی کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگانا' اس کی عزت ہر حال میں محفوظ رہنی چاہیے۔''

نوازش کچھ سوال کرنا چاہتا تھا لیکن بولا تو اسی قدر۔

''جی بہت اچھا۔''

حضور جلدی سو جانے کا عادی تھا اور خادم حسین کو فوری طور پر مکرم ماہ بانو کے متعلق بتانا نہیں چاہتا تھا جبکہ اس کے پاس کسی قابلِ اعتماد شخص کی بھی ضرورت تھی سو اس نے نوازش کو بلوا لیا تھا۔

حویلی کی طرف واپس جاتے ہوئے اس کی سوچیں بہت منتشر تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ کریمن نے ریشماں کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا' اس میں ریشماں کا حوالہ جھوٹ ہو لیکن ماہ بانو کو دیکھ کر اس کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہونے والے ہوں۔

ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ معاملہ جہاں ہے اسے وہیں ختم کر دیا جائے۔ ماہ بانو کو اس وقت تک قید میں رکھا جا سکتا تھا۔ جب تک کہ وہ عبداللہ کے سلسلے میں اپنے منصوبے پر عمل پیرا نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد اسے چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ گاؤں میں کسی کی اتنی جرأت نہیں تھی کہ ان کے خلاف تھانے کچہری میں جا کر گواہی دیتا۔

مگر پھر اسے یہ بھی ممکن محسوس نہیں ہوا' اس معلوم کرنا تھا کہ حویلی کے اندر کہاں اور کیوں یہ سازش ہو رہی تھی اور اس کی جڑیں کتنی گہری تھیں۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو سے رقعہ لے کر کریمن زنان خانے میں داخل ہوئی۔ ریشماں کے کمرے میں جھانکا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر اس کی تلاش میں اماں جان کے کمرے میں گئی لیکن انہوں نے بھ

لاعلمی کا اظہار کیا۔ جب وہ ان دونوں جگہوں پر نہیں ہوتی تھی تو عموماً امداد علی کے کمرے میں مل جاتی تھی۔ حسب توقع وہ وہیں تھی۔ بہت چپ چاپ اور اداس۔

''بی بی یہ بانو بی بی نے دیا ہے۔'' کریمن نے رقعہ ریشماں کی طرف بڑھایا۔

ریشماں نے رقعہ اس کے ہاتھ سے لے کر کھول لیا۔ پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''بی بی! اپنے کمرے میں آجائیں۔ یہاں بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ؟'' کریمن نے ہمدردی سے کہا۔

''تم جاؤ۔ سو جاؤ۔''

''بی بی کھانا نہیں کھائیں گی؟''

''نہیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ تم جاؤ۔ میں اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔''

کریمن چلی گئی۔ ریشماں کو کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ وہاں کتنی دیر تک بیٹھی رہی۔ اسے اپنے گرد بہت دھند محسوس ہو رہی تھی۔ اندر خالی پن کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ کیا غلط تھا اور کیا صحیح۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ امداد علی کی البم نکال لائی۔ کتنا پیارا بھائی تھا وہ اس کا۔ سب بھائیوں میں وہ سبط حسن اور امداد کے ہی سب سے زیادہ قریب تھی۔ اور اب وہ اس سے بہت دور جا چکا تھا۔ صرف اور صرف اس کی وجہ سے اگر وہ اس روز اطلاع نہ دیتی تو شاید وہ زندہ ہوتا' لیکن اسے کیا پتا تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ اس روز حیدر بابا زہرا کو حویلی سے نکلنے کے لیے منع کر دیں گے۔ یہ خبر کب تھی کہ امداد بھائی ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے۔

اس نے البم کے ورق الٹنے شروع کیے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کی تصویریں تھیں اس میں۔ ریشماں کی نظر اس تصویر پر ٹک گئی جو امداد کو سب سے زیادہ پسند تھی۔ اس میں وہ Breeches اور لانگ بوٹس Long Boots پہنے رائیڈنگ پر جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ قدرے لمبے بال ہوا کی وجہ سے بکھر رہے تھے اور چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایسی خوبصورت اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹ رکھنے والا شخص کبھی مر بھی سکتا تھا۔ وہ تصویر بے جان تھی لیکن اس میں دکھائی دینے والا امداد علی کا وجود زندگی سے بھرپور تھا۔

ریشماں کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ نہ ہی یہ پتا چلا کہ اسے اس طرح کتنی دیر گزر گئی تھی۔ جب کمرے کا دروازہ کھلا اور مکرم اندر داخل ہوا۔ وہ ویسے ہی گھٹنوں پر سر رکھے روتی رہی۔

چند لمحے مکرم اسے دیکھتا رہا' پھر آگے بڑھ کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

''ریشماں آپی!''

ریشماں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ والا مکرم نہیں تھا۔ اس وقت وہ بہت اجنبی لگ رہا تھا۔

''وہ رقعہ دے دیں جو ماہ بانو نے کریمن کے ہاتھ آپ کو بھجوایا ہے۔''

ریشماں کو اپنا خون رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ اس کی طرف دیکھے گئی۔

''آپی وہ رقعہ دے دیں۔''

ریشماں کی نگاہیں اپنے قریب ہی قالین پر پڑے رقعے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں مکرم نے بھی وہیں دیکھا اور پھر جھک کر تہہ شدہ رقعہ اٹھا لیا۔

اسی وقت دروازے پر ایک ملازمہ نمودار ہوئی۔

''بی بی! مولوی صاحب آئے ہیں۔'' وہ اندر کی صورتِ حال سے بے خبر بولے گئی۔ ''بانو بی بی کا پوچھ رہے ہیں۔''

''ان سے کہو وہ گھر جا چکی ہے۔'' مکرم نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ پھر وہ ریشماں سے مخاطب ہوا۔

''آپی آپ اپنے کمرے میں جائیں۔''

☆=====☆=====☆

پیر صاحب سے فون پر گفتگو کرنے کے بعد جنت بائی چہرے پر مسکراہٹ سجائے نوری اور اس کے ساتھ بیٹھے نوجوان کی طرف پلٹی۔

''مجھے پوری امید ہے کہ جو ڈراما میں کھیل رہی ہوں' آج اس کا ڈراپ سین ہونے والا ہے۔ تم دونوں کا قہقہہ بہت بروقت تھا۔''

''تو پھر مجھے اگلی فلم میں ہیرو کا رول مل جائے گا ناں؟'' نوجوان نے امید سے پوچھا۔

نوری نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں یقین کیوں نہیں ہے؟ انڈسٹری میں کیا کوئی میری بات ٹال سکتا ہے؟ جب میں کہوں گی کہ میں تمہارے علاوہ کسی کے مقابل ہیروئین کا کردار ادا نہیں کروں گی تو کیا ہوگا؟ سب تمہیں لینے پر مجبور ہوں گے۔ میرے بغیر کوئی فلم کامیاب کیسے ہو سکتی ہے؟''

نوجوان مطمئن ہو گیا۔

''تمہیں اپنا رول یاد ہے ناں؟'' جنت بائی نے تصدیق چاہی۔

''سو فیصد۔'' نوجوان نے کہا۔

حسب توقع پیر صاحب کو وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ جنت بائی اون سلائیاں لے کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ نوری اور وہ نوجوان تاش کھیل رہے تھے۔ ساتھ ہی کافی کے استعمال شدہ برتن بھی

پڑے ہوئے تھے۔

''آیئے پیر صاحب۔ آپ نے کیسے زحمت کی؟'' جنت بائی مستعدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

رجب علی نے سرد مہری سے ان کی طرف دیکھا۔

''ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہم سے جھوٹ کیوں بولا گیا؟''

''ہمیں جھوٹ بول کر کیا کرنا ہے پیر صاحب! بے بی سوئی ہوئی تھی اب جاگ گئی ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ دھاڑے۔

''چلایئے مت۔ یہاں ہماری عزت ہے۔ ہمارے گھر کی آوازیں باہر نہیں جاتیں۔''

''عزت؟ کیا عزت ہے تمہاری؟ بیٹی کو بازار میں کھڑا کر دینے والی عورت کی کیا عزت ہوتی ہے؟''

''جب آپ جیسے شریف زادے کسی عورت کی کوکھ میں اپنے گناہ کا بیج ڈال دیتے ہیں تو اسے اپنی عزت سمیت کسی بازار کا رخ ہی کرنا پڑتا ہے۔'' پھر وہ نوری سے مخاطب ہوئی۔ ''تم اپنے کمرے میں جاؤ بے بی۔''

''نوری کہیں نہیں جائے گی۔'' پیر صاحب نے غصے سے کہا۔

''تم جاؤ۔ میں خود آ جاؤں گی تمہارے پاس۔'' نوری نے پاس کھڑے نوجوان سے دبے دبے انداز میں کہا۔

وہ سر ہلا کر باہر چلا گیا۔

''نوری! میرے ساتھ چلو۔''

''سوری پیر صاحب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے یہ سب کچھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں گندگی کی اس دلدل میں سے نکلنا چاہتی ہوں۔ ممی سے میں نے کہا تھا کہ آپ کو منع کر دیں۔ میں اپنے ماضی کو بھول کر ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتی ہوں۔

ہر لڑکی کی طرح میرا بھی ایک خواب ہے۔ ایک گھر، شوہر اور بچے۔ ایک ایسی محفوظ چار دیواری جس میں رہتے ہوئے میں لوگوں کی گندی نظروں سے بچ سکوں۔

آپ دیکھ رہے تھے ناں اس نوجوان کو۔ یہ سلیم ہے، آپ کی طرح زیادہ امیر نہیں ہے لیکن اس میں بہت حوصلہ ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے مجھ سے کہ اس گندگی سے مجھے نکال لے گا۔ میری کچھ ہی فلمیں مکمل ہونی رہتی ہیں۔ جیسے ہی وہ مکمل ہوئیں ہم شادی کر لیں گے۔

چھوٹا سا گھر ہے اس کا۔ دو کمروں کا۔ ایک ماں ہے اور بس۔ کہتا ہے کہ اس کے پاس میرے شایانِ شان کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ بنگلہ، نہ گاڑی، یہ دھن دولت لیکن میں جانتی ہوں کہ اس کے پاس سب کچھ ہے۔ جس کا ظرف اتنا بڑا ہے اس کے پاس کس چیز کی کمی؟ روپیہ پیسہ بہت دیکھا ہے میں نے۔ اسکرین پر اس اسکرین سے باہر لوگوں کے منہ سے بہت جھوٹ سنا۔ بہت

لفت برداشت کی۔ پہلی مرتبہ میرا ایک سچا رشتہ قائم ہو رہا ہے۔ اسے چھوڑ کر ساری زندگی پچھتاتے ہوئے کیسے گزاروں؟'' نوری نے جذباتی ہو کر کہا۔ دو آنسو لڑھک کر اس کے گالوں پر آ آئے۔

''دیکھ لیا پیر صاحب کہ عزت کیا ہوتی ہے؟ وہ آپ کو نوری کی آنکھوں میں ہی دکھائی دے ں۔ بہت دن بازار میں بیٹھ کر دکان چلا لی۔ اب تھک گئے ہیں، پہلے کوئی سہارا نہیں تھا۔ یہ کم ت پیٹ کھانے کو مانگتا ہے۔ جو عورت در بدر ہو جائے، وہ کہاں سے یہ سب پورا کرے۔ یہ ں جانتی ہوں کہ اپنی اکلوتی بیٹی، اپنے جگر کے ٹکڑے کے ساتھ معاشرے کے اس سلوک سے ے دل پر کیا بیتتی تھی لیکن یہاں آ کر جذبات کو مارنا پڑتا ہے۔ یہ سوداگری ہے، کیا کریں۔ پر ب سہارا ملا ہے تو میں نے اپنی بیٹی کو اجازت دے دی ہے کہ جائے اور اپنی دنیا بسائے۔ کیا ہوا سلیم غریب ہے۔ کیا ہوا جو اسے روکھی سوکھی کھلائے گا۔ کیا ہوا جو کپڑے گہنے کی کمی ہوگی۔ ت تو ہوگی۔'' جنت بائی نے رقت آمیز انداز میں کہا۔

پیر صاحب نوری کے وجود کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ اس کی شادی کی خبر ان سے اشت نہیں ہو رہی تھی۔ جوانی جانے اور بڑھاپے کے آنے کا غم کم نہیں ہوا کرتا۔ اس عمر ا جب ایسی خوبصورت اور کم عمر لڑکی انہیں مائل بہ کرم نظر آتی تھی تو بہت سے غم خود ہی دور ہو تے تھے۔

اور اب اس کی شادی اس بدشکل چھوکرے کے ساتھ ہو رہی تھی۔ ایسا ہونا تو ممکن ہی ں تھا۔

''یہ شادی نہیں ہوگی۔'' انہوں نے اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں کہا۔

''اس بات کا فیصلہ آپ کو نہیں مجھے کرنا ہے اور میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں۔'' نوری کے انداز عزم تھا۔

''تمہیں عزت کی زندگی اور ایک چار دیواری چاہیے ناں؟ ہم سے کہا ہوتا۔ ہم تمہاری یہ ش بھی کی پوری کر دیتے۔ ہم تم سے شادی کے لیے تیار ہیں۔ وہ چھوکرا تمہیں کچھ نہیں دے ا۔ ہم تمہیں عزت دیں گے، چار دیواری دیں گے، سونے میں پیلا کر دیں گے تمہیں۔ جس چیز تھ رکھو گی تمہیں مل جائے گی۔''

''بس پیر صاحب بس۔ ہم پہلے ہی جو کچھ کرتے رہے ہیں، اس کے لیے گناہ کا لفظ بھی ٹا ہے۔ پروردگار ہمیں معاف فرمائے۔ بس آپ یہاں سے چلے جائیں۔ نوری کی شادی سلیم ہی ہوگی۔ آپ جائیں یہاں سے۔'' جنت بائی نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

''کیوں؟ جب ہم سب کچھ دے سکتے ہیں نوری کو تو پھر کیوں؟ نوری بنے گی تو صرف ی دلہن اور کسی کی بھی نہیں۔''

"خدا کے لیے پیر صاحب منہ نہ کھلوائیں۔ ورنہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔" جنت بائی بولیں۔

"تباہ تو ہم کریں گے تم دونوں کو۔" پیر صاحب نے کہا اور نوری کو کلائی سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔

"ممی بچائیں۔" وہ چلائی۔

"بہت ہو گیا رجب علی شاہ‘ اب خدا کے قہر کو اور آواز مت دو۔" جنت بائی دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"ہٹ جاؤ ہمارے راستے سے۔"

"تمہیں میری لاش پر سے ہی گزر کر جانا ہوگا۔ جو خواہش تم کر رہے ہو‘ اس کا پورا ہونا بھی ممکن ہی نہیں۔ اس کا اظہار تو تمہارے بیٹوں خادم حسین اور مکرم علی نے بھی نہیں کیا تھا۔ بھول جاؤ وہ سب جو ہو چکا۔ یہ نوری نہیں سیّدہ نور النساء علی ہے۔ تمہاری سگی بیٹی۔"

پیر صاحب کو کچھ دیر تک تو جنت بائی کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئی جب سمجھ میں آئی تو وہ غصے سے ابل پڑے۔

"بکواس بند کرو ذلیل گھٹیا عورت۔ ہمیں بلیک میل کر رہی ہو؟ ہمارے گھرانوں کی عورتوں کو تو ہوا بھی نہیں چھو سکتی۔"

"میں ذلیل اور گھٹیا ہوں اور تم کیا ہو؟ میں تو گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی تھی جنت بی بی۔ مجھے جنت بائی تم نے بنایا ہے۔ یاد ہے تمہیں وہ لڑکی؟ تمہارے مزارعے الٰہی بخش عرف بخشو کی چھوٹی بیٹی جس کی شادی میں بمشکل دو ہفتے رہ گئے تھے جب تم نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔

مگر تمہیں کہاں یاد ہوگی وہ لڑکی‘ تمہاری زندگی میں تو جنت بی بی سے لے کر نور النساء تک نہ جانے کتنی عورتیں اور لڑکیاں آئی ہوں گی۔ تمہیں کہاں یاد ہوگا کہ اس لڑکی نے کتنی منتیں کی تھیں‘ کیسے فریاد کی تھی‘ کتنا گڑگڑائی تھی۔ تم یہ سب بھول سکتے ہو کہ یہ تم امیرزادوں کی عادت ہوتی ہے مگر میں کیسے بھولوں وہ تاریک رات۔

بہت چرچا سنا تھا تمہارے باپ کے انصاف کا۔ سارے گاؤں کو اکٹھا کر کے میں نے انصاف طلب کیا تھا۔ کتنی دہائی دی تھی میں نے‘ لیکن میرا سچ تمہارے جاہ و حشم‘ تمہاری دولت اور تمہارے رعب و دبدبے میں دفن ہو گیا۔ سارا گاؤں مجھے کوڑے کا ڈھیر سمجھنے لگا۔ یوں جیسے میں خود چل کر تمہارے پاس گئی تھی۔

میرے خواب‘ میری مسرتیں سب کچھ تم نے چھین لیا رجب علی! مجھے دربدر کر کے بازار میں لا بٹھایا۔ مگر خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ دیکھو اسے۔" جنت بائی نے نوری کی طرف اشارہ

کیا جو بت بنی آنکھیں پھیلائے سب کچھ سن رہی تھی۔ "تم کہتے ہو ناں کہ تمہارے گھرانے کی ورتوں کو ہوا بھی نہیں چھو سکتی۔ یہ بھی تمہاری بیٹی ہے‘ تمہارا خون ہے۔ دیکھو اس کے جسم پر کتنے ان ہیں۔ دیکھو اسے کس کس نے چھوا ہے؟"

جنت بائی کی آواز پیر صاحب کو کہیں دور سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ برسوں پہلے کا ایک ظر دھند میں لپٹا ہوا ان کے تصور کے پردے پر جلوہ گر ہو گیا تھا۔

بڑی بیٹھک میں گاؤں کے بہت سے افراد جمع تھے اور پیر صاحب رجب علی شاہ نے انہیں ہوں کی طرح طلب کیا تھا۔ یہی نہیں انہوں نے یاسمین کو بھی گواہی کے لیے طلب کرنے کا حکم تھا‘ جسے بہت سی دلیلیں دے کر حیدر علی نے رکوایا تھا۔ اس وقت وہاں موجود افراد میں سے ید کوئی ایک آدھ فرد بول اٹھتا لیکن انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں بہت واضح تنبیہہ کر دی تھی ب کو اور پھر کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ ہر ایک کو اپنے گھر کی عزت پیاری ، اپنی جان عزیز تھی۔ یوں معاملہ دب گیا تھا۔

یہ سب یاد آ گیا تھا انہیں لیکن لڑکی کے خدوخال یاد نہیں تھے۔ برسوں کی دھول بیٹھ چکی تھی ۔ اس عرصے میں آنکھوں نے کتنے نظارے کر لیے تھے لیکن جنت بائی کی آنکھوں میں وہ اب تک منجمد تھا۔ وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہیں۔

"یہ بھی تمہاری بیٹی ہے۔ تمہارا خون ہے۔ دیکھو اس کے جسم پر کتنے نشان ہیں‘ اسے کس انے چھوا ہے۔"

جنت بائی کے فقرے ہتھوڑے کی طرح رجب علی شاہ کے سر پر برس رہے تھے۔ سیسہ تھا جو ل کے راستے اندر تک اترتا چلا جا رہا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کے وجود میں زلزلہ سا آ ہو جیسے سب کچھ ٹوٹ رہا ہو۔ ہر چیز دھند میں لپٹی جا رہی تھی۔ سامنے صرف دو سائے تھے کی کوئی صورت تھی‘ نہ چہرے کے خدوخال۔

پیر صاحب کو اپنے سینے کے بائیں حصے میں درد کی شدید لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔

☆=====☆=====☆

مکرم اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ریشماں کے پاس سے اس کاغذ اٹھایا تھا‘ وہ بظاہر بالکل ردی تھا۔ الفتح کی ایک پرانی رسید جس کے مطابق وہاں سے لونے خریدے گئے تھے۔ مکرم نے کاغذ پلٹ کر دیکھا۔ اصل تحریر وہیں تھی۔ وہ تحریر اس نے تبہ پڑھی تھی کہ اسے زبانی یاد ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ریشماں نے ایسا کیوں کیا سے تو اپنے بھائیوں سے بہت محبت تھی۔ پھر......؟

مداد کے کمرے سے نکل کر اس نے سیدھا کریمن کو پکڑا تھا اور اسے حویلی کے ایک کمرے کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا بند کر دیا تھا۔ پھر اس نے رمضان عرف رجو کو اس کے گھر سے

بلوایا تھا' لیکن اب تک اس سے پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ بظاہر یہی چار افراد تھے جو یہ خبر باہر نکال سکتے تھے' لیکن اس نے اس امکان کو رد نہیں کیا تھا کہ اس سازش میں ان کے علاوہ بھی کوئی شریک ہوسکتا تھا۔

رات بھیگتی جا رہی تھی اور وہ اب تک جاگا ہوا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اس معاملے کو کیسے ہینڈل کیا جائے۔ ریشماں کو کس طرح بری الذمہ ثابت کیا جائے۔ اس کا دل یہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اس کی اپنی اور بے حد پیاری بہن اپنے بھائیوں کے لیے اپنے ہاتھ سے قبر کھود سکتی تھی۔ حویلی کی عزت مٹی میں ملا سکتی تھی' اپنے باپ کی پگڑی پر داغ لگا سکتی تھی۔ اس نے ایسا کرنا چاہا تھا تو آخر کیوں؟ وہ مسلسل سوچ رہا تھا لیکن کسی سوال کا کوئی جواب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اس کا ذہنی انتشار حد سے بڑھا تو وہ اٹھ کر اماں جان کی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ اس وقت ماں کے علاوہ کوئی اور ہستی نہیں تھی جو اس کے دکھوں پر اپنے پیار کا مرہم رکھ سکتی۔

احتیاط سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ اماں جان بے شک لیٹی ہوئی تھیں' لیکن نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ بھی جاگ رہی ہیں۔

مکرم کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھیں۔

''کیا ہوا مکرم! خیریت ہے ناں بیٹا!'' انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

اتنی رات گئے ان کے کمرے میں کوئی بھی نہیں آیا کرتا تھا۔

''جی اماں' بالکل خیریت ہے' آپ جاگی ہوئی ہیں؟''

''صحیح بتاؤ بیٹا! میرا دل ہول رہا ہے۔'' وہ اس وقت وہاں دیکھ کر سخت پریشان تھیں۔

''اماں جان بالکل خیریت ہے' بس میرا دل چاہ رہا تھا کہ آپ کے پاس آؤں۔ آپ کو دیکھوں' اس لیے یہاں چلا آیا' میرا مقصد آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں تھا۔'' وہ ان کے پاس بستر پر ہی آ بیٹھا۔

''تم لوگوں کے آنے سے تو میرا سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ مجھے پریشانی نہیں ہوتی۔'' وہ پیار سے بولیں۔

مکرم کا ذہن سخت منتشر تھا۔ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''ملتان جانے کا ارادہ بدل دیا تھا تو اب تک سو جاتے' زیادہ رات تک جاگنے سے صحت خراب ہوتی ہے۔'' اماں جان نے کہا۔

''آپ بھی تو جاگ رہی ہیں۔'' وہ بولا۔

وہ بس آہ بھر کر رہ گئیں۔ کیا بتاتیں اسے کہ رت جگا تو شادی کے ساتھ ہی جیسے ان کے نصیب میں لکھا گیا تھا۔ جب پیر صاحب پاس نہیں ہوتے تھے تو ان کی ساری رات انگاروں پر ہوتی تھی' یہ سوچتے ہوئے کہ وہ کس کے پاس ہوں گے اور جب وہ پاس ہوتے تھے تو بھی ان کے نہیں ہوتے تھے' تب وہ سوچتی رہ جاتی تھیں۔ اب وہ کس کے پاس تھے۔

''تمہیں اپنے کمرے میں نیند نہیں آرہی بیٹا تو یہاں سو جاؤ۔ ماں کے پاس' نیند آجائے گی۔''

اماں جان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسے لگا جیسے وہ کسی پناہ گاہ میں پہنچ گیا ہو' جیسے صحرا میں چلتے چلتے اچانک نخلستان آ گیا ہو۔ ان کا بوڑھا وجود کسی گھنے' سایہ دار درخت کی طرح تھا۔ وہ وہیں بستر پر لیٹ گیا۔

اماں جان بیٹھے بیٹھے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ سکون کی ٹھنڈی لہریں اس کے وجود میں اترتی جا رہی تھیں۔

''ماں سے زیادہ خوبصورت رشتہ کون سا ہوگا؟'' مکرم نے سوچا۔ ''ہم ساری دنیا کی عورتوں کے چہرے اور جسم میں حسن تلاش کرتے رہتے ہیں' لیکن ماں اپنے حسن سے نہیں اپنی محبت اور ممتا سے پہچانی جاتی ہے۔'' ان کا بوڑھا' جھریوں بھرا چہرہ بھی کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ وہ سکون کے اس سمندر سے باہر نہیں آنا چاہتا تھا کیونکہ باہر کی دنیا بہت تلخ تھی۔ بہت آزمائشیں تھیں وہاں' جن پر پورا اترنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔

''مکرم!'' ماں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''بیٹا! میں نہیں جانتی کہ اس حویلی سے باہر کیا کیا بکھیڑے ہیں۔ میری دنیا یہی چار دیواری ہے' لیکن ماں اپنی اولاد کے چہرے پر فکر اور پریشانی کی ہر لکیر دیکھ لیتی ہے۔ کیا ہوا ہے بیٹا کہ سو نہیں پا رہے؟'' انہوں نے پیار سے پوچھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اماں جان! میں بہت پریشان ہوں' کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔''

''میرے پاس شاید تمہاری پریشانی کا حل تو نہ ہو لیکن کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔''

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''اماں جان' آپ ریشماں آپی کو مجھ سے بہتر جانتی ہیں' ظاہر ہے کہ جو باتیں وہ آپ سے کرسکتی ہیں' مجھ سے نہیں کرسکتیں میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حیدر علی شاہ کے ساتھ ہماری دشمنی کی کیا نوعیت ہے' وہ ان سے ہمدردی کا اظہار کیوں کرتی ہیں؟'' اس نے اپنی طرف سے الفاظ کا چناؤ نہایت احتیاط سے کیا تھا۔

اماں جان کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔
''وہ بہت نرم دل ہے ناں۔ خون دیکھنا تو دور کی بات' وہ تو کسی کا آنسو بھی نہیں دیکھ سکتی۔''
''اماں! مجھے لگتا ہے کہ اس ہمدردی میں آپی بہت آگے تک جا سکتی ہیں۔ یہ پروا کیے بغیر کہ اس سے ہماری حویلی پر کیا اثر پڑے گا۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر کھلے الفاظ میں سوال پوچھنے سے گریز کیا۔
''رات سونے سے پہلے سب خیالات ذہن سے جھٹک دینے چاہئیں' دیکھو اسی لیے تمہیں نیند نہیں آ رہی۔'' انہوں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔
''اماں جان پلیز بات نہ بدلیں جو میں جاننا چاہتا ہوں' وہ جان کر رہوں گا۔''
اماں جان اس کی ضدی طبیعت سے واقف تھیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ مکرم کو کچھ بتا دینے سے معاملہ بالکل ہی بگڑ جائے۔
''دیکھو ناں بیٹا! اس گھر سے ہمارے رشتے جڑے ہوئے ہیں' ایک ہی خون ہے۔ کسی کا بھی ہے' تکلیف تو ہوتی ہے ناں۔''
''رشتے؟ اماں' رشتے تو صرف دشمنی کے باقی ہیں۔ اور پھر بات اسی قدر بھی نہیں ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے آپی کو ہم بھائیوں سے اتنی محبت نہ ہو جتنی ہم ان سے کرتے ہیں۔ وہ حیدر علی کے گھرانے کو ہم پر فوقیت دے رہی ہیں۔''
''نہ بیٹا نہ' یہ الزام نہ لگاؤ اس بے چاری پر۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ اس حویلی میں اس کے دکھ کم نہیں ہو سکتے' مگر ان میں اضافہ بھی مت کرو۔'' وہ بولیں۔
''کیا دکھ ہے انہیں یہاں؟ سب کچھ دے رکھا ہے انہیں۔ ہم میں سے جو بھی باہر جاتا ہے' واپسی پر ان کے پاس خالی ہاتھ نہیں آتا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ جائے تو ہمارا کھانا پینا تک چھوٹ جاتا ہے' پھر بھی اماں......؟
میں نے اس چھت کے نیچے رہتے ہوئے کبھی نہیں سوچا کہ کون سا رشتہ سگا ہے اور کون سا سوتیلا' مگر اماں آج دل بہت دکھا ہے میرا۔ آپی نے ہمیں بھائی سمجھنے کے بجائے سوتیلا بھائی ہی سمجھا ہے۔ سگی بہن ہوتی تو کبھی یہ سب نہ کرتی۔''
''کیا کر دیا اس نے؟ ریشماں کے ذہن میں تو مر کر بھی یہ خیال نہیں آ سکتا۔ وہ صرف بہن ہے تم لوگوں کی اور بہن تو بہن ہوتی ہے۔ سگی' سوتیلی کچھ نہیں۔''
''جانے دیں اماں' دل بہلانے کے لیے میں بھی ایسے ہی لفظوں سے خود کو تسلی دے رہا ہوں۔''
''مگر ہوا کیا؟ کیا کر دیا ہے اس نے؟''
''میں نے ایک عہد کیا تھا خود سے' ایک وعدہ تھا اپنے بھائی کے خون اور بہن کے آنسوؤں

ے جب اسے پورا کرنے کا وقت آیا تو راستے میں آپی اس طرح آ گئیں کہ......!'' وہ رک گیا پھر
رے توقف سے بولا۔
''اپنے بھائیوں کے لیے اپنے ہاتھ سے قبریں کھودتے ہوئے کیا ایک لمحے کے لیے بھی
ن کے دل میں اس محبت کا احساس نہیں جاگا ہو گا' جو ہم نے ان سے کی؟''
اماں جان نے اپنا سر پکڑ لیا۔
''پچھلی مرتبہ بھی وہ پہلے سے جانتی تھیں کہ آئندہ چند دنوں میں کیا ہونے والا ہے۔ مجھے
یں معلوم کہ تب بھی یہ بات انہوں نے ہی کسی ذریعے سے خانقاہ حضرت صاحب والی حویلی
ں بھجوائی تھی' مگر اب یہ بات پھانس بن کر چبھ رہی ہے۔ ممکن ہے وہی ہوں' جیسے اب وہی ہیں'
ن ہے نہ ہوں......امداد بھائی چلے گئے' خادم بھائی موت کی دہلیز سے پلٹے اور اب میں' خادم
ائی اور نوازش ہیں۔ ہماری محبت میں کہاں کمی تھی اماں جان؟'' مکرم نے آزردگی سے کہا۔
اماں جان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ امداد کے ذکر نے ان کے زخم پھر سے ہرے کر دیے
ے۔
وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ کافی دیر بعد اماں بولیں۔
''مکرم بیٹا! محبت بہت عجیب جذبہ ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں کس سے سب سے زیادہ محبت
ہے؟''
''آپ سے اور آپی سے۔'' اس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بعد کہا۔
''اور مجھے اپنے بچوں اور تمہارے بابا جان سے۔'' وہ بولیں۔
وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔
''شکر ہے مکرم کہ ہمیں اپنی محبتوں میں کبھی آزمائش کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کبھی یہ انتخاب
ں کرنا پڑا کہ کس کو کس پر فوقیت دیں۔ جن کے ساتھ ایسا ہوتا ہے وہ بہت بے بس ہو جاتے
' سمجھ نہیں پاتے کہ کیا کریں۔ کبھی دو کشتیوں کے سوار کو دیکھا ہے؟ کشتیاں شاید بچ جائیں'
ن دو کشتیوں کا سوار کبھی نہیں بچتا۔ کبھی یہ مت سوچنا کہ ریشماں کو تم بھائیوں سے محبت نہیں ہے'
بے بس ہے۔''
چند لمحے وہ منتظر رہا کہ اماں جان کچھ اور کہیں' پھر بولا۔
''حیدر علی کے گھرانے سے اتنی محبت کہ وہ بھائیوں کی محبت کے مقابل آ جائے۔''
''مجھے بتاؤ مکرم کہ تمہاری اپنی بہن سے محبت زیادہ ہے یا اپنے حیدر بابا کے گھرانے سے
ت؟''
کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر بولا۔
''آپی سے محبت۔''

''بہت پہلے کی بات ہے' میں اس حویلی میں ہونے والے قتل کی دو وارداتوں کی گواہ بنی تھی۔ اس روز میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ میں کبھی کسی کو یہ تاریخ دہرانے نہیں دوں گی۔ میں کمزور ناتواں عورت' میرے بس میں نہ تو پستول اٹھانا تھا اور نہ ہی کسی کے راستے میں کھڑے ہو جانا' مگر میرے پاس اس سے زیادہ بڑی طاقت تھی۔ اسی روز سے میں نے محنت شروع کر دی۔ اپنی اولاد کو محبت کے ایسے رشتوں میں باندھنے کی کہ کبھی بھی ان کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف جذبات نہ جاگ سکیں۔ پتا نہیں میں کامیاب ہوئی یا نہیں' مگر بیٹا آج تم سب کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ بڑھاپے میں مجھے کسی اور عذاب سے مت گزارنا۔'' وہ رو پڑیں۔

مکرم نے ان کے جڑے ہاتھ تھام لیے۔

''یہ کیا کر رہی ہیں اماں جان!''

''بیٹا! میں نے دکھ ہی نہیں اٹھائے' ظلم سہے ہیں۔ تم تو مرد ہو' تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس حویلی کی عورتیں اپنے دل میں کتنے زخم چھپا کر جیتی ہیں۔ میرا بہت مرتبہ دل چاہا کہ اس زندگی سے چھٹکارا حاصل کر لوں مگر پھر تم بچوں کی صورتیں دیکھ کر اپنے غم چھپا لیتی تھی۔ میں نے اپنے اوپر سب کچھ برداشت کر لیا مگر اب اپنی اولاد کے اوپر بیتنے والے غم برداشت نہیں ہوتے۔ میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔'' آنسو ان کے گالوں پر ابھر آنے والی جھریوں میں اپنا راستہ بنا رہے تھے۔

اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر وہ دوبارہ مکرم کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''آج تم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے آئے ہو۔ کبھی کبھار ریشماں بھی چلی آتی ہے۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولتی' لیکن اس کا زرد چہرہ اور آنسو بھری آنکھیں اس کی محرومیوں کی داستان خود ہی سنا دیتے ہیں۔

تم بھولے تو نہیں ہو گے مکرم' بہت عرصے تک اس حویلی کی دیواروں میں ایک بازگشت سنائی دیتی رہی تھی۔ ریشماں اور عبداللہ کی نسبت طے ہو جانے کی بازگشت۔ بعد میں تمہارے بابا جان کے حکم پر سب نے اپنی زبانیں سی لی تھیں تب تک یہ...... بازگشت ریشماں کے کانوں میں بھی پہنچ چکی تھی۔

ایک لڑکی جس کی زندگی گنی چنی اینٹوں کی ایک چار دیواری کے اندر ہی بسر ہو رہی ہو۔ اس سے کیا ردعمل ہوگا۔ دبے دبے لفظوں میں ہونے والا یہ تذکرہ اگر اس کے دل میں اتر گیا تو کیا عجب؟ اتنی محدود سی دنیا میں اس کے پاس سوچنے کے لیے اور تھا ہی کیا؟

خواب ہر لڑکی دیکھتی ہے' ایک خوبصورت دنیا کے حسین اور انوکھے بندھن کے' خوابوں کی عمر میں پہنچ کر اگر اس نے اپنے گرد تخیلاتی دنیا قائم کر لی اور اپنی اس دنیا میں مگن رہنے لگی تو یہ حیرت

کی بات تو نہیں ہے۔

مگر حقیقت کی دنیا بہت تلخ ہوتی ہے۔ تم لوگوں نے اس کے سامنے سبھی کچھ ڈھیر کر دیا' مگر کبھی کسی کو خیال نہیں آیا کہ اسے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے تو بس اپنے خواب کی تعبیر چاہیے' جو ملنا ناممکن ہے۔

بہت بڑی آزمائش میں مبتلا ہے وہ' بہت اذیت سہہ رہی ہے۔ دیکھو کب تک اور یہ سب سہنا پڑتا ہے۔ شاید زیادہ عرصہ نہ لگے۔ اس حویلی کی بیٹیوں کی عمریں مختصر ہی ہوتی ہیں۔''

انہوں نے آہ بھری۔

مکرم کے لیے گویا کسی نئی دنیا کا دروازہ کھل گیا تھا' جسے نہ تو پہلے اس نے دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے متعلق کچھ سنا تھا۔ ایسا بھی کہیں ہوتا تھا؟ اس کی دنیا بہت مختلف تھی۔ زمینیں' دوست' شکار کا پروگرام' تفریح' جدید اسلحہ' نئے ماڈل کی گاڑیاں اور بس۔ حویلی کے اندر کی دنیا سے اس کا بس اسی قدر واسطہ تھا کہ روز اماں جان اور آپی کو سلام کرنا اور ان کا حال چال دریافت کرنا ہے اور گاؤں میں ہونے کی صورت میں دن میں کسی ایک وقت کا کھانا ان کے ساتھ کھانا ہے۔

کمرے کا دروازہ احتیاط کے ساتھ کھلا اور خادم حسین اندر داخل ہوا۔ ان دونوں کو جاگتے ہوئے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آیا۔

''آپ دونوں جاگ رہے ہیں؟''

''ہاں بیٹا! خیریت تو ہے' پریشان لگ رہے ہو؟'' اماں جان کا دل ہول اٹھا۔

''جی اماں جان! میں مکرم کو ڈھونڈتا ہوا یہاں آیا تھا۔'' وہ ان کے قریب چلا آیا۔

''کیا ہوا؟'' مکرم نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''مولوی صاحب آئے ہیں' بہت پریشان ہیں' ماہ بانو ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔''

''گھر نہیں پہنچی؟ صبح یہاں آئی تھی وہ؟'' اماں جان نے گھبرا کر کہا۔

''انہیں بتا دیں کہ وہ جا چکی ہے' اس کے بعد وہ کہاں گئی' یہ ہمارا درد سر تو نہیں ہے۔'' مکرم نے بے رخی سے کہا۔

خادم حسین نے اسے گھورا۔

''یہ ہمارا ہی درد سر ہے' رات بہت ہوگئی ہے' ریشماں سو چکی ہوگی' لیکن میرے خیال میں اسے جگا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''ہاں بیٹا! اسے جگا کر پوچھ لو۔ کسی کی بچی ہے' یہاں آئی تھی تو ہماری ہی ذمہ داری تھی نا؟'' اماں جان نے جلدی سے کہا۔

''میرے سامنے گئی تھی وہ۔ اس کے بعد میں اور ریشماں آپی باتیں کرتے رہے ہیں' پہلے بھی شاید آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب مولوی صاحب نے پتا کروایا تھا' اس وقت بھی انہیں

بتا دیا تھا کہ وہ جا چکی ہے۔ حویلی سے نکل کر وہ کہاں جاتی ہے' یہ اس کی اپنی ذمہ داری ہے۔ وہ ٹھہر کر مولوی صاحب کا انتظار بھی کر سکتی تھی۔'' مکرم نے کہا۔

''پھر تو ریشماں کو بھی علم نہیں ہوگا۔'' اماں جان پریشانی سے بولیں۔

''ظاہر ہے' انہیں کیا خبر ہو سکتی ہے۔''

''جاؤ بیٹا کہیں جا کر اسے ڈھونڈو۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔ اکیلی بچی پتا نہیں کہاں ہوگی۔ خدانخواستہ کچھ ہو نہ گیا ہو اسے۔ کہیں گر کر چوٹ نہ لگ گئی ہو۔'' اماں جان نے کہا۔

''آپ آرام کریں' میں اور خادم بھائی دیکھ لیتے ہیں۔'' مکرم بستر سے اترتے ہوئے بولا۔

وہ دونوں باہر نکل آئے۔

خادم حسین' ماہ بانو کی اس طرح گمشدگی پر پریشان تھا۔ مکرم اب تک اس معاملے میں کسی فیصلے تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ یہ طے کرنا بہت مشکل تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے وہ اس پر اچھی طرح سوچ لینا چاہتا تھا اور اسی لیے فوری طور پر وہ ماہ بانو کے بارے میں کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔

''کہاں جا سکتی ہے وہ؟ ایسی لڑکی نہیں ہے ماہ بانو جو کسی غیر ذمہ داری کا ثبوت دے۔'' خادم حسین نے جیسے خود سے کہا۔

مکرم خاموشی سے اس کے ساتھ چلا گیا۔ بیٹھک میں مولوی صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ بے چینی اور پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

''آپ کھڑے کیوں ہیں مولوی صاحب' تشریف رکھیں۔'' خادم حسین نے اندر داخل ہو کر کہا۔

''میں ٹھیک ہوں شاہ صاحب' بانو بیٹا کی کچھ خبر ملی؟''

''ہم نے پتا کروایا ہے' مگر وہ حویلی میں نہیں ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد...... کچھ دیر بعد ہی وہ چلی گئی تھی۔'' خادم حسین نے بتایا۔

''مگر وہ گھر تو نہیں پہنچی۔''

''گھر نہیں پہنچی تو کہیں اور چلی گئی ہوگی۔ اس حویلی کی چار دیواری کے باہر وہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔'' مکرم نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''گستاخی معاف شاہ صاحب لیکن اس گاؤں کا ہر فرد آپ کی ہی ذمہ داری ہے۔ ہم غریب یہاں نہیں آئیں گے تو کہاں جائیں گے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مولوی صاحب' ہم ابھی اسے تلاش کرنے کو کہتے ہیں۔'' خادم بولا۔

''آپ نے کہیں اور بھی پتا کیا یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کسی اور کے ہاں چلی گئی ہو' کسی دوست

رشتہ دار کے ہاں۔ شام کو بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔ پتا نہیں بارش ہوئی یا نہیں۔ اگر بارش ہوئی ہے تو ممکن ہے' وہ کہیں ٹھہر گئی ہو۔'' اب کے مکرم نے قدرے نرمی سے کہا۔

''بارش نہیں ہوئی اور بانو کی دوستی یہاں صرف ریشماں کے ساتھ ہے۔ وہ کسی رشتہ دار کے گھر بھی نہیں جاتی۔'' مولوی صاحب بولے۔

''آپ فکر مت کریں' ہم ابھی پتا کرواتے ہیں' بلکہ آپ گھر جا کر آرام کریں۔ وہ اس گاؤں میں یا آس پاس ہوئی تو ہم دو گھنٹے کے اندر اندر اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔'' خادم حسین نے کہا۔

''فکر کیسے نہ کروں شاہ صاحب!'' مولوی صاحب کی آواز بھرا گئی۔

خادم حسین مکرم کی طرف مڑا۔

''تم بندے تیار کراؤ۔ ہم خود بھی جائیں گے۔''

''شاہ صاحب! ہمارے پاس ایک عزت ہی ہے نہ اونچی۔ پکی حویلیاں ہیں اور نہ دھن دولت۔ اس عزت پر حرف آ گیا تو ہم جیتے جی ختم ہو جائیں گے۔ یوں تو یہ بات سارے گاؤں میں پھیل جائے گی۔ میری نواسی بہت معصوم ہے۔ اس طرح سے تو اس کے دامن پر داغ لگ جائے گا۔''

آنسو مولوی صاحب کی سفید داڑھی میں جذب ہونے لگے۔

''پھر کیا کریں ہم؟ ہاں ڈھونڈا تو اسی طرح جاتا ہے۔ یہاں بیٹھ کر الہام نازل نہیں ہوگا۔'' مکرم بگڑ کر بولا۔

خادم حسین نے مکرم کو بری طرح سے گھورا۔

مولوی صاحب سر جھکا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

لمحوں میں ہی وہ پہلے سے بھی زیادہ بوڑھے لگنے لگے تھے۔

''میں کیا جواب دوں گا اپنی بیٹی کو؟ اس نے تو بانو کو اس لیے یہاں بھجوایا تھا کہ وہ محفوظ رہے گی۔ یہاں اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ ڈھے سے گئے۔

''آپ خاطر جمع رکھیے مولوی صاحب۔ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں ابھی۔'' خادم حسین بولا۔

وہ بھی ماہ بانو کی گمشدگی سے کم پریشان نہیں تھا۔

☆=====☆=====☆

نوری اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ جنت بائی کے الفاظ نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا' وہ سب غلط تھا' جھوٹ تھا۔ اس میں ایک فیصد بھی سچائی نہیں تھی' لیکن وہ الفاظ نوری کو بھی اندر سے توڑ پھوڑ دینے کے لیے کافی تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ماں باپ کون تھے' وہ کتنے بہن بھائی تھے۔ اس کا گھر کہاں تھا اور اس نے گھر کو چھوڑا تھا تو کیوں چھوڑا

تھا۔

ایک مرتبہ اپنے گھر اور گھر والوں کو خیر باد کہہ دینے کے بعد اس نے شعوری کوشش سے انہیں بھلانے کی کوشش کی تھی اور جنت بائی کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ اپنی ماں' بہن' سہیلی' استاد سبھی کچھ۔ انہوں نے بھی اس سے جو وعدہ کیا تھا' اسے پورا کر دکھایا تھا۔ نوری کے لیے جنت بائی کا وجود ضروری تھا' اسے اپنی بقاء کے لیے جنت بائی کی ضرورت تھی۔ پھر وہ فلموں میں آ گئی۔

یہ وقت تھا جب وہ ان سے بآسانی نظریں چرا سکتی تھی' مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں میں اتنی شرم باقی تھی کہ اپنی محسنہ کو اچھے وقت میں فراموش نہ کرتی اور پھر یہ محض احسان مندی بھی نہیں تھی۔ اب اسے ان سے محبت ہو چکی تھی' اس کا مختصر سا خاندان اس پر اور جنت بائی پر ہی مشتمل تھا۔

گھر چھوڑنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ نوجوانوں کے سر پر بزرگوں کا سایہ کتنا ضروری ہوا کرتا ہے۔ یہی احساس تھا جس کی وجہ سے وہ جنت بائی سے بے حد قریب ہو گئی تھی۔ وہ انہیں وہی درجہ دیتی تھی' جو اپنی سگی ماں کو دے سکتی تھی۔

یہ تو نوری کو معلوم تھا کہ جنت بائی پیر صاحب رجب علی شاہ سے اپنا بہت پرانا بدلہ لینا چاہتی تھیں لیکن وہ بدلہ اس قدر سنگین ہوگا' اس کا اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے اسے ایک کہانی سمجھائی بلکہ رٹائی تھی۔ کاغذ قلم لے کر انہوں نے ایک ایک فقرہ جوڑا تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ کہانی کا اختتام کیا ہوگا۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ اسے بس اتنا کہنا تھا۔ نوری نے بھی اپنے کردار سے آگے کچھ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

اس کے بعد سب کچھ جنت بائی کی خواہش کے مطابق ہوا تھا۔ کہانی کے جو مناظر' جو الفاظ کاغذ پر بے جان نظر آتے تھے' انہوں نے حقیقت کا روپ لیا تھا تو وہ کتنے بدلے بدلے لگ رہے تھے۔

جنت بائی کی لکھی ہوئی اس کہانی کا اختتام ہوا تو نوری نے انہیں صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ ایک نفرت بھری نظر اور اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔

☆=====☆=====☆

ریشماں کو محسوس ہو رہا تھا' جیسے وہ رات کبھی ختم نہیں ہوگی۔ ایک ایک لمحہ جیسے ایک ایک صدی تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا وہ اس کا سجا سجایا کمرا نہ ہو' بلکہ پھانسی پانے والے کسی مجرم کی تاریک کوٹھڑی ہو اور وہ پل پل گن کر اس وقت کا انتظار کر رہا ہو' جب چرچراہٹ کی مدھم سی آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر کوئی صدا لگائے۔

''پھانسی کا وقت ہو گیا ہے' تیار ہو جاؤ۔''

اس کی کیفیت بھی عجیب تھی۔ ایک طرف اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس رات کی کبھی صبح نہ ہو

دوسری طرف اسے ان دیواروں سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ ا تھا' لیکن ان میں سے کوئی بھی واضح نہیں تھی۔ بس کچھ چہرے تھے' کچھ بے ربط سے فقرے ں اماں جان تھیں اور کہیں اس کی اماں جی' کہیں بھائی تھے اور کہیں عبداللہ اور ان سب کے بیچ و تھی۔

مسہری سے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئی تھی مگر اسے اس بات کا احساس نہیں ہاں جب اسے لگا کہ اب سوچوں سے پاگل ہو جائے گی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے کا ازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اسے خود بھی علم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی' کہاں جا رہی تھی۔ ہوش تو وہ اماں جان کے کمرے میں تھی۔

''میں بہت بری ہوں اماں جان' بہت بری۔''

اماں جان نے بلکتی ہوئی ریشماں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''کس نے کہا کہ تم بری ہو' تم تو بہت اچھی ہو' بہت پیاری بیٹی ہو میری۔'' وہ بولیں۔

''نہیں' میں اچھی نہیں ہوں' وہ سارا خون پھیلا ہوا ہے ناں امداد بھائی کا' میری وجہ سے نے قتل کیا ہے ناں انہیں' اب سب آئیں گے مجھے پھانسی لگانے کے لیے' عبداللہ کا خون بھی ہی پھیلے گا' اسے بھی لے جائیں گے دفن کر دیں گے۔''

وہ ہچکیوں کے درمیان ہذیانی انداز میں کہہ رہی تھی۔ فقرے بے ربط اور بے ترتیب تھے۔

اماں جان اس کا سر گود میں رکھ کر تھپکنے لگیں۔ اسی طرح بولتے اور روتے ہوئے وہ سوگئی۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو کے لیے وہ اس کی زندگی کے سب سے اذیت ناک لمحے تھے۔ ہوش میں آنے پر وہ ایک اجنبی کمرے میں تھی۔ سجی سجائی وہ خواب گاہ اس نے کبھی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ چند لمحوں میں ہی اسے اپنے اوپر بیتنے والا واقعہ یاد آ گیا تھا۔

متوحش سی نگاہوں سے اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ کمرا خالی تھا' وہ صاف ستھرے ڈبل بیڈ پر نرم لحاف کے اندر تھی۔ بجلی کا ہیٹر بھی جل رہا تھا۔ باہر کی خنکی کا اندر احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی نگاہ دروازے کی طرف اٹھی' جو بند تھا۔ اپنی چادر کی تلاش میں اس نے اِدھر اُدھر دیکھا' لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ بستر سے اتر کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی' اسے کھولنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ باہر سے لاک تھا۔

''بانو! یہ وقت اپنے حواس کھونے کا نہیں ہے۔ اب تک محفوظ ہو' ابھی یہاں سے نکل گئی تو نکل گئی ورنہ......!'' اس سے آگے سوچنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ کمرے میں دروازے کے علاوہ کھڑکیاں بھی تھیں' لیکن وہ بھی بند تھیں۔ ڈرائینگ روم کے سامنے پردہ گرا ہوا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پردہ اٹھایا اور اندر جھانکا' مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ داہنی دیوار کے ساتھ الماریاں تھیں اور بائیں دیوار کے ساتھ باتھ روم کا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ وہاں کافی اوپر کی جانب ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی' جس میں جالی اور لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ وہ مڑ کر ڈریسنگ روم میں آ گئی اور الماری کھولنے لگی۔ چند ہینگروں پر مردانہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دوسری الماری میں ترتیب وار بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ماہ بانو نے گھبرا کر الماری بند کر دی اور کمرے میں آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

خوف آہستہ آہستہ اس کے اندر سرائیت کرتا جا رہا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہاں سے نکلنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ بھی وہ جانتی تھی کہ اسے یہاں لانے والا اتنا احمق تو نہیں ہوگا کہ اسے ایسی جگہ بند کرے' جہاں سے اس کی آواز باہر نکل سکتی ہو' اسے اس شخص کا لہجہ یاد آ گیا۔

''میں نے کہا ہے کہ خاموشی کے ساتھ چلو' ورنہ یہیں ذبح کر دوں گا۔''

کتنا سرد' کتنا سفاک لہجہ تھا اس کا۔ وہ کوئی دھمکی نہیں تھی۔ ماہ بانو کو یقین تھا کہ وہ یہ سب کر بھی سکتا تھا۔ اب تک اس کی کلائی بھی بہت دُکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا تھا' یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

''مگر وہ کون ہو سکتا ہے' جس نے اس قدر گھٹیا اور کمینی حرکت کی ہے؟'' اس نے سوچا۔

جواب کے لیے اسے زیادہ تردد کی ضرورت نہیں تھی۔

''ظاہر ہے پیر صاحب کے گھرانے کا ہی کوئی فرد ہوگا۔ ان کا کوئی بیٹا۔ یہاں کسی اور میں نہ اتنی ہمت ہے اور نہ ہی کسی کے پاس اتنے ذرائع ہیں کہ وہ اغوا ہونے والی لڑکی کو ایسی جگہ رکھے' مگر کیا یہ حویلی ہے؟ نہیں' وہ جو بھی تھا مجھے حویلی میں نہیں لایا ہوگا پھر میں کہاں ہوں؟''

اسے اتنی بے بسی محسوس ہو رہی تھی اور وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ گھٹنوں میں سر دے کر کتنی دیر تک روتی رہی۔

اس وقت اسے ابا اور اماں جی یاد آ رہے تھے۔ عبداللہ یاد آ رہا تھا۔

''ان میں سے کسی کو خبر ہوتی تو مجھے اب تک ڈھونڈ نکالتے۔ میرے سب اپنے کہاں ہیں۔ انہیں کیا پتا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔''

☆=====☆=====☆

پیر صاحب کو ایک پرائیویٹ کلینک میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ ان کی حالت سخت خراب تھی۔ ان کا خاص ملازم کرم داد انہیں وہاں لے کر آیا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ مکان کے اندر کیا ہوا تھا۔ وہ باہر گاڑی میں ان کا انتظار کر رہا تھا جب ایک ملازم نے آ کر اسے ان کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع دی تھی۔ وہ اسی وقت انہیں کلینک لے آیا تھا۔ ابھی اس کا ارادہ حویلی میں اطلاع دینے کا تھا' جب پیر صاحب نے اسے اس بات سے سختی سے منع کر دیا۔

''اب حویلی میں ہمارے مرنے کی اطلاع ہی جائے گی۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''اللہ آپ کو لمبی زندگی دے پیر صاحب!'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی لمحے ہمیں موت دے دے۔ ہمارے مرنے سے پہلے تم حویلی میں کوئی اطلاع نہیں پہنچاؤ گے۔''

کرم داد تذبذب میں تھا کہ کیا کرے۔ حکم عدولی کی جرأت نہ تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی خدشہ تھا کہ بعد میں پیر صاحب کے صاحبزادوں سے اس بات پر کھینچائی نہ ہو جائے۔

☆=====☆=====☆

مکرم نے رجو اور کریمن سے اگلوا لیا تھا۔ رجو نے کریمن پر رعب ڈالنے کے لیے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اسے باور کرانا چاہتا تھا کہ حویلی میں شاہوں کے درمیان اس کی کیا اہمیت

تھی۔ بعد میں کچھ باتیں کریمن نے اس سے خود معلوم کی تھیں۔ کریمن نے پوچھ گچھ کے دوران بتایا تھا کہ اسے ریشماں کی محبت کے متعلق معلوم تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ کبھی ریشماں نے اسے اپنا رازداں بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہی سب ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے اس منصوبے کے متعلق اسے خبر دی تھی اور یہ بھی کہ مکرم اور خادم حسین کے منتخب کردہ افراد کے علاوہ صرف کریمن، ریشماں اور ماہ بانو ہی اس راز سے واقف تھے۔

یہ سب جاننے کے بعد بھی مکرم ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔ اس کی سوچیں بھٹک رہی تھیں۔ یہ سمجھ میں آنا مشکل تھا کہ اب اسے کیا فیصلہ کرنا تھا۔ ایک روز بعد صبح سویرے سویرے انہیں عبداللہ کو قتل کرنا تھا۔ سوچنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

وہ اٹھا اور ڈیرے کی طرف چل دیا۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو نے اپنے حواس قائم رکھنے کی بہت کوشش کی تھی، خود کو سمجھایا تھا کہ اس وقت گھبرانے اور حواس کھو دینے کا نتیجہ اس کے حق میں برا ہوگا، مگر کب تک، وہ خوفزدہ تھی، بے بس تھی، بے خبر تھی کہ آنے والے وقت میں اس پر کیا بیتنے والا تھا۔ یہ سب کچھ اس کی ذہنی حالت تباہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ خاموشی سے آنسو بہاتے بہاتے وہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ اس نے بری طرح سے دروازہ پیٹ ڈالا تھا، پاگلوں کی طرح ایک ایک کھڑکی کھولنے کی کوشش کی تھی، مدد کے لیے چلائی تھی، مگر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی ویرانے میں ہو، جہاں اس کی بات سننے والا کوئی بھی نہ ہو۔

اس کا حلق خشک ہو گیا تھا، آنکھیں سوج چکی تھیں، ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے لگی تھیں، سر چکرا رہا تھا۔ ہر کوشش بے سود ثابت ہوتے دیکھ کر وہ نڈھال ہو کر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی تھی۔

رات بیت چکی تھی۔ صبح کی سپیدی پھیلے بھی کتنی دیر ہو چکی تھی۔ اسے وقت کا بالکل اندازہ نہیں تھا، یہاں لانے والے نے اس کی کلائی پر بندھی گھڑی اتار لی تھی اس کے علاوہ اس نے کسی چیز کو بھی نہیں چھوا نہیں تھا۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں، انگوٹھی اور بریسلٹ سبھی کچھ اسی طرح تھا۔ ہاں گھڑی موجود نہیں تھی، وہ جو کوئی تھا، شاید یہ نہیں چاہتا تھا کہ ماہ بانو کو وقت کا اندازہ ہو سکے۔ یہی کلائی اس نے پکڑی تھی اور گھڑی کی چین کی رگڑ سے اس پر چھوٹے چھوٹے زخم بن گئے تھے۔

''پتا نہیں نانا جی اور بڑی اماں کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ بڑی اماں تو پاگل ہو رہی ہوں گی۔ ہائے کاش! میں نے نانا جی کا انتظار کر لیا ہوتا، مگر مجھے کیا پتا تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔''

ساری رات گزر گئی۔ بڑی اماں کی طرف تو میلہ سا لگا رہتا ہے۔ عورتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ سارا وقت ان عورتوں نے میرے بارے میں پوچھا ہوگا تو بڑی اماں نے انہیں کیسے مطمئن

گا کیسی کہانیاں بن جائیں گی میرے خدا۔

اور وہ کون ہے جو مجھے یہاں بند کر گیا؟ اور کیوں؟

مجھے اس طرح بند کر دینے کا مطلب!

سوچیں بے شمار تھیں، جو ذہن میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی، مگر یہ ے اختیار میں نہیں تھا۔ ہر واقعہ، ہر سوال اپنے آپ ابھر رہا تھا۔

اچانک ڈور لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ ماہ بانو خوف کے مارے وہاں سے ہل بھی نہ سکی۔ ہینڈل گھوما اور دروازہ کھول کر مکرم اندر داخل ہو گیا۔

ماہ بانو کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ اس نے پیچھے دروازہ بند کر کے ماہ بانو کا جائزہ لیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی تھی کہ اس کی ں میں سرخی اور سوجن اتر آئی تھی، چہرہ ستا ہوا تھا، بال الجھ رہے تھے، آنکھوں میں خوف کی ائیاں لیے، متوحش سی نگاہوں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم نے کچھ کھایا پیا؟'' مکرم نے اس کے پپڑی زدہ ہونٹ دیکھ کر پوچھا۔

اس کے الفاظ میں شاید ہمدردی ہو، لیکن لہجہ کسی بھی قسم کی ہمدردی کے جذبے سے عاری

ماہ بانو اسی طرح اسے تکتی رہی، کچھ بولے بغیر۔

مکرم ایک گلاس اٹھا کر روم ریفریجریٹر کی طرف بڑھا اور پانی کی بوتل نکال لی۔

''یہ پی لو۔'' وہ پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر اس کی طرف بڑھا۔

ماہ بانو تیزی سے اٹھ کر صوفے کے پیچھے چلی گئی۔

''میرے قریب مت آنا۔''

''پانی پیو۔'' مکرم نے سختی کے ساتھ حکمیہ لہجے میں کہا اور پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

ماہ بانو نے ہاتھ مار کر گلاس پرے پھینک دیا۔

''میرے اوپر اس پانی کا ایک قطرہ بھی حرام ہے، مجھے گھر جانا ہے اور کچھ نہیں چاہیے مجھے۔''

مکرم چند لمحے ہونٹ بھینچے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی اس ت پر جواباً اس کے منہ پر کس کے طمانچہ مارے۔

''تم نے دیکھا تھا مکرم!'' اس کے کانوں میں خادم حسین کے الفاظ گونجے۔

''اس لڑکی میں کتنی شان ہے، کتنی تمکنت تھی، مجھے ایسی ہی کسی لڑکی کی تلاش تھی۔ میرا ل ایسی ہی لڑکی ہے اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ اسے کوئی نقصان پہنچے یا اس کی چھوٹی سی انا ضرب لگے۔''

اس نے بہت مشکل سے خود پر قابو پایا اور بولا۔

''یہاں تم محفوظ ہو، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بس مجھے تم سے چند ایک سوال کرنے

ہیں۔ ان کا ٹھیک ٹھاک جواب دے دو' اس کے بعد تمہیں جانے کی اجازت ہوگی۔''

جس وقت سے ماہ بانو خوفزدہ تھی' جب وہ وقت آیا تو اسے لگا' جیسے خوف کی ہر دیوار گر
ہو۔

''ان دیواروں میں' میں محفوظ ہوں؟ جھوٹ کہتے ہو۔ اغوا کر کے لائی جانے والی
عورت' کوئی لڑکی کبھی بھی محفوظ نہیں ہوا کرتی۔'' اسے خود بھی خبر نہیں تھی کہ وہ روتے ہوئے
کچھ کہہ رہی تھی۔

''میں جو پوچھ رہا ہوں' اس کا جواب سچ سچ دو۔'' مکرم نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا
''تمہیں عبداللہ کے قتل کے منصوبے کے متعلق کس نے بتایا؟''

ماہ بانو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''تو یہ بات تھی۔'' اس نے سوچا۔ ''مگر اس کے متعلق اسے اتنی جلدی کیسے خبر ہوگئی؟''

مکرم بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ دوبارہ بولا۔

''اس منصوبے کے متعلق اور کس کس کو معلوم ہے؟''

وہ پھر کچھ نہ بولی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ پوچھا۔

''کیا اس سے پہلے تمہیں اس منصوبے کے متعلق بھی معلوم تھا' جس میں امداد بھائی
ہوئے تھے؟''

ماہ بانو کے ہونٹ اب بھی سلے ہوئے تھے۔

''تم ریشماں آپی کی واحد راز دار دوست ہو۔ عبداللہ شاہ کے متعلق ان کے کیا محسوسا
ہیں؟''

ماہ بانو کے ذہن میں اماں جان کی حویلی کے متعلق سنائی ہوئی کہانی کا ایک کردار تاز
گیا۔ زیب النساء......

''کیا یہ ریشماں کو قتل کر دے گا؟'' اس نے خوف سے سوچا۔

''میں منتظر ہوں' تم مجھے ان سوالوں کے جواب دے دو۔ جب تک نہیں دو گی' تب تک
یہیں رہوں گا۔'' مکرم دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

ماہ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ یوں ہی اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا' جیسے فی الحال ا
وہاں سے اٹھنے کی کوئی جلدی نہ ہو۔ اس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ ماہ با
دل چاہ رہا تھا کہ اسے شوٹ کر دے۔ نفرت کا لاوا تھا' جو اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔ خوف کی
آہستہ آہستہ غصے نے لے لی تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس کی بوٹی بوٹی الگ کر لیتی
نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھ لیے۔

''سنو مکرم علی شاہ!'' وہ بولی تو اس کا لہجہ نفرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''میرے پاس تمہار

سوال کا جواب ہے۔ یوں بھی یہ سوالنامہ اتنا مشکل نہیں ہے' جسے آسانی سے حل نہ کیا جا سکے'
ی ایسا ہے' جس کا جواب میں دینا نہ چاہوں۔ پھر بھی میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں

میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں صرف اتنی سی باتیں معلوم کرنے کے لیے اتنا تردد کرنے کی
ضرورت تھی؟ مجھے اغوا کیا' یہاں لا کر رکھا' یقیناً باہر پہرے دار بھی بٹھائے ہوں گے' آخر
ں؟ ان میں سے ہر سوال کا جواب تو تمہاری اپنی حویلی میں ہے۔ پھر تم سب مجھ ہی سے یہ
ی باتیں کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو۔

عبداللہ جاننا چاہتا ہے' اپنے خاندان کے ماضی کی اس کڑی کے بارے میں جو اس دشمنی کی
ا ٹھہری تھی۔ ریشماں اس شخص کو بددعا دینا چاہتی ہے' جو اس دشمنی کی وجہ بنا اور مجھ سے
تی ہے اپنی ماں جی کے متعلق اور اب تم آئے ہو ایک نیا سوالنامہ لے کر۔

کیوں؟ میں کہاں ہوں اس سارے کے بیچ؟ رجب علی شاہ اور حیدر علی شاہ اپنے اپنے کیے
فصلیں کاٹ رہے ہیں اور تم لوگ ان کی اولادیں ہو۔ میرا اس خاندان سے کیا تعلق؟ جاؤ ہر
ت تمہاری اپنی حویلی میں ہے' وہاں جا کر ڈھونڈو' میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ نہیں
''

مکرم خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کیا باتیں کر رہی تھی اسے کچھ علم نہیں تھا۔ اس
شارہ کس طرف تھا' وہ کچھ نہ جان سکا۔ اس کے ذہن میں بہت سی باتیں الجھنے لگی تھیں۔ اس
ماہ بانو سے چند بہت معمولی سے سوال پوچھے تھے۔ جن میں سے بیشتر کے جواب بھی اسے
م تھے۔ اصل سوال تو صرف ایک ہی تھا۔ ریشماں اور عبداللہ کے متعلق۔ باقی سوال صرف
ی کی سچائی جاننے کے لیے پوچھے تھے اس نے۔

''یہ میرے سوالوں کے جواب نہیں ہیں۔''

''تمہیں ان سوالوں کے جواب ملیں گے بھی نہیں۔ جاؤ ریشماں سے پوچھو کہ وہ عبداللہ کے
ے میں کیا محسوس کرتی ہے۔ میری نسبت اس کا تم سے زیادہ گہرا رشتہ ہے۔ سوتیلے سہی' لیکن
ہو۔''

''میری بات سے انکار کر کے اچھا نہیں کر رہی ہو شاید تمہیں نتائج کا اندازہ نہیں ہے۔''
نے کہا۔

اس کا خیال تھا کہ دھمکی کام کر جائے گی اور وہ اس سے یہی نہیں اور بھی بہت کچھ اگلوا لے گا'
اس نے اپنی گفتگو میں اشارہ کیا تھا۔

''مجھے نتائج کا اندازہ ہے۔'' وہ چلائی۔ ''کیا کر لو گے؟ عزت لے لو گے' جان لے لو گے؟
نامردانگی سے یہی توقع ہے مجھے۔''

"شٹ اپ۔" مکرم دھاڑا۔

"آواز کا والیوم بڑھا کر کیا ثابت کر رہے ہو تم؟ تمہاری ذہنیت بھی تمہارے باپ کی طرح گھٹیا ہے۔ سچ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ تم نے بھی اپنی بہن کو دیواروں اور پردوں میں چھپا کر یہ سوچ لیا ہے کہ جس عورت پر قدرت کی نعمتیں حرام ہیں' جسے ہوا نہیں چھو سکتی جس تک دھوپ اور چاندنی نہیں پہنچ سکتی' صرف وہی عورت قابلِ عزت ہے اور ہر اس عورت کو اپنے عشرت کدے کی زینت بنایا جا سکتا ہے جو کھلی ہوا میں نکلتی ہے۔ ہر اس عورت کی تذلیل کی جا سکتی ہے جو گھر سے باہر دکھائی دیتی ہے۔

مگر معلوم ہے کیا ہوتا ہے ان عورتوں کے ساتھ جنہیں تم زندہ ہی اپنی حویلیوں کے اندر دفن کر دیتے ہو؟ تمہاری پھوپھو زیب النساء کی طرح وہ چور دروازے تلاش کر کے نکل بھاگتی ہیں۔ حویلی کے اندر چور دروازے کھولنے مشکل ہوں تو اپنی ذات کے اندر چور دروازے کھول لیتی ہیں جیسا کہ تمہاری بہن ریشماں نے کیا۔

یاد رکھو' مکرم علی شاہ کہ یہ سب کرنا تمہاری حویلی کی روائتیں ہیں۔ میں تمہاری حویلی کی عورتوں سے زیادہ قابلِ عزت ہوں جسے کسی چور دروازے کی تلاش نہیں ہے۔ نہ میں نے حالات سے فرار اختیار کیا ہے اور نہ میں گھر سے بھاگی ہوں۔ میرا گھر تمہاری حویلی کی طرح شاندار نہیں ہے' چھوٹا ہے۔ آسائشوں میں کم ہے لیکن اس کی دیواریں تمہاری حویلی کی دیواروں کی طرح داغدار نہیں ہیں۔

تمہارے بس میں جو کچھ ہے کر گزرو۔ میں تمہیں خدا رسول ﷺ...... کے واسطے نہیں دوں گی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم پر ان میں سے کسی کا اثر نہیں ہوگا۔ تم جو چاہو کرو۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ آج میں بھی دیکھوں گی کہ میرا خدا زیادہ بڑا ہے یا تمہارا ظلم۔"

مکرم علی شاہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کس دنیا کی باتیں کر رہی تھی؟ حویلی کی عورتیں زیب النساء پھوپھو اور ریشماں یہ وہ دنیا تو نہیں تھی جس میں وہ رہ رہا تھا۔

اور پھر اللہ تعالیٰ پر اتنا کامل یقین۔ اس نے تو کبھی اس بارے میں سوچنے کی زیادہ زحمت بھی نہیں کی تھی۔ بس وہ مسلمان تھا۔ کلمے آتے تھے۔ بچپن میں آیت الکرسی حفظ کی تھی' تیسویں سپارے کی چند چھوٹی سورتیں بھی ذہن میں محفوظ تھیں۔ ایک مرتبہ بچپن میں ہی قرآن پاک بھی ختم کر لیا تھا۔ اس سے بڑھ کر خدا کہاں تھا؟

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ مکرم نے راہ چلتی کسی عورت کو بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی اس بارے میں سوچنے کا تردد اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کا ذہن کہتا تھا کہ یہ غلط تھا۔ عورت کو تو ویسے مقدس ہونا چاہیے تھا جیسے اس کی اماں جان یا ریشماں آپی تھیں۔ انہیں ویسے ہی رہنا چاہیے تھا جیسے وہ دونوں رہتی تھیں۔

ان کے بعد اسے ایک ہی لڑکی اچھی لگی تھی۔ بہنوں جیسی اور وہ تھی زینی۔ حیدر علی شاہ کی بیٹی۔ اس روز اسے حیرت ہوئی تھی کہ گھر کی چار دیواری سے نکلنے والی کوئی لڑکی اتنی معصوم بھی ہو سکتی تھی۔ بعد میں اس نے زینی کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ دشمن کی بیٹی تھی۔ ایسے دشمن کی جس نے خاندان کی روایات کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

مگر آج اسے لگا تھا کہ جو زندگی وہ گزارتا رہا تھا اس میں بہت سے جھول تھے۔ عورت کا تقدس کہاں تھا؟ اس کی حویلی کی اونچی مضبوط دیواروں میں یا اس لڑکی کے لہجے میں جو کہہ رہی تھی کہ "میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ آج میں بھی دیکھوں گی کہ میرا خدا زیادہ بڑا ہے یا تمہارا ظلم۔"

وہ الجھتا جا رہا تھا۔ ایک گتھی سلجھانے کی کوشش کرتا تھا تو کہیں اور سے کچھ الجھ جاتا تھا۔

وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆=====☆=====☆

بابا اور اماں لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے کہ عبداللہ اندر داخل ہوا۔

"گڑیا کا فون آیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟ خیریت سے ہے ناں؟ زینی کیسی ہے؟" اماں جان نے بے تابی سے پوچھا۔

"سب بالکل ٹھیک ہیں۔"

"تم نے فون کیوں بند کر دیا۔ میں بھی بات کر لیتی۔"

"گڑیا جلدی میں تھی۔ اسے لائبریری جانا تھا۔ فون اس نے صرف یہ بتانے کے لیے کیا تھا کہ زینی پاکستان آرہی ہے۔"

"کب؟" بابا جان نے پوچھا۔

"آج رات کو پہنچ رہی ہے۔" عبداللہ نے بتایا۔

"آج رات؟ یعنی وہاں سے چل پڑی ہے۔"

"جی بابا جان۔"

"اتنے اچانک کیوں؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟" وہ پریشان ہو گئے۔

"نہیں۔ پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔ آپ کو اس کی عادت کا تو پتا ہے ناں۔ اچانک اس کے دل میں سمائی کہ پاکستان جانا ہے تو پھر اسے روک کون سکتا تھا۔ اس کے رونے پر یوں بھی آپ ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔"

"کوئی فوری طور پر نکلے اسے ریسیو کرنے کے لیے ایئر پورٹ پہنچ کر کہیں بچی پریشان نہ ہو۔" اماں جان فکر مند ہو گئیں۔

"بہت غلط حرکت کی ہے زینی نے۔ یوں پڑھائی چھوڑ کر چلے آنا۔ اب وہ آ تو رہی ہے

لیکن میں چاہوں گا کہ اس کی اس حرکت کو گھر میں کوئی بھی Encourage نہ کرے۔'' بابا جان نے کہا۔

''رہنے دیں علی! بچی ہے۔ دل گھبرا رہا تھا' آ گئی۔ میری تو آنکھیں ترس گئی ہیں اسے اور گڑیا کو دیکھنے کے لیے۔ پڑھنے کو ساری عمر پڑی ہے۔ آپ نے اسے کچھ کہا تو خواہ مخواہ اس کا دل برا ہو جائے گا۔'' اماں جان بولیں۔

''یہی وقت ہوتا ہے بننے اور بگڑنے کا۔ اس وقت اسے نہ سمجھایا گیا تو وہ کبھی نہیں سمجھے گی۔''

''جانے بھی دیں۔ اتنی سی بات پر اتنا غصہ۔ اتنی چھوٹی سی تو ہے وہ۔ ساری زندگی ہم سے دور رہی ہے۔ کہتی رہی ہم سے آنے کو۔ ہم نہ گئے تو کیا اب خود بھی نہ آتی۔ میں بتا رہی ہوں کہ اسے ملتے ہوئے کسی کے ماتھے پر بل نہ ہو۔'' پھر عبداللہ سے مخاطب ہوئیں۔ ''بیٹا تم ہی نکل جاؤ لاہور کے لیے۔ تمہارے بابا جان تو میری بات نہیں مانیں گے۔ وہ اتنی دور سے آ رہی ہے۔ اس کے پہنچنے کے ساتھ اسے کچھ کہہ دیا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''میرا فوری طور پر نکلنا تو بہت مشکل ہے۔ میں نے اکٹھے کتنے سارے کام شروع کیے ہوئے ہیں۔ آپ اور بابا جان دونوں چلے جائیں۔ وہ بھی خوش ہو جائے گی۔''

بابا جان اسے اکیلے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے مگر اب مجبوری تھی۔ اماں جان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے وہ گاؤں میں ہی رک گئیں۔ وہ انہیں ان کی جیپ تک چھوڑنے آیا۔

''محتاط رہنا بیٹا۔'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''میری فکر مت کریں بابا جان!''

''کیسے نہ کروں فکر؟'' وہ تھوڑی دیر چپ رہے پھر بولے۔ ''زینی تھکی ہوئی ہوگی مگر ہم لاہور میں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے۔ صبح نو یا دس بجے تک گاؤں آ جائیں گے۔ اپنی اماں سے کہنا کہ پھر وہ تیار رہیں' ہم دونوں نکلیں گے۔''

''کہاں کے لیے؟''

''ہمیں اس دشمنی کو جڑ سے اکھاڑنا ہے۔ میں تم .... تینوں بچوں کو محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''بڑی حویلی؟''

''ہاں' ہم بڑی حویلی جائیں گے۔ بھائی کبھی بھی اتنے دور نہیں ہوتے کہ ٹوٹے رشتے جڑ نہ سکیں۔'' انہوں نے کہا۔

''اس معاملے پر آپ کی واپسی پر بات کریں گے بابا جان!'' عبداللہ بولا۔

لاہور کی طرف جاتے ہوئے حیدر علی شاہ کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ ان کے واضح حکم کے

باوجود عبداللہ نے یہ کہہ کر کہ اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اب بھی مختلف انداز میں سوچ رہا تھا اور ان کے حکم کو آسانی کے ساتھ ماننے پر تیار نہیں تھا۔

انہیں اس کی خوشیاں عزیز تھیں مگر ان کا خیال تھا کہ وہ ایک غلط فیصلے پر مُصر تھا۔ اس کے لیے بہترین بیوی صرف ریشماں ہی ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ اس کی منگیتر بھی تھی۔ دشمنی کی اس آگ کو وہی بجھا سکتی تھی۔ ماہ بانو سے شادی کی صورت میں بڑی حویلی والوں کو یہ رنج ہونا لازمی تھا کہ بچپن کی منگنی ہونے کے باوجود ریشماں کو نظر انداز کر کے خاندان کے باہر کی اور ایک معمولی گھرانے کی لڑکی کو بہو بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور دشمنی کی ابتدا ہوتی جس کی آگ عبداللہ کی اولاد تک پہنچتی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اولاد ہوتے ہوئے اولاد کو خود سے دور رکھنے کا جو دکھ زبیدہ بیگم اور انہوں نے اٹھایا تھا' وہی اب ان کے بیٹے کا بھی مقدر بنے۔

یہ سب تو تھا ہی مگر اس کے ساتھ ہی کہیں بہت اندر رہ کر ایک یاد کی کسک جاگ اٹھتی تھی۔ وہ چند الفاظ ان کے ذہن سے کبھی بھی محو نہیں ہو سکتے تھے۔

''سنا ہے بڑے شاہ صاحب ریشماں کی نسبت چھوٹے شاہ صاحب کے صاحبزادے سے طے کر رہے ہیں۔''

''ایسا ہو جائے حمیدہ تو میں سکون سے مر سکوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے لیے بھی حویلی مقبرہ بن جائے۔ مجھ پر تو جو گزرنی تھی' گزر گئی لیکن میری بیٹی پھولوں کی طرح نازک ہے۔ اس پر یہ سب نہیں گزرنا چاہیے۔''

''یہ تو قسمت قسمت کی بات ہے۔''

''اس اوپر والے نے میری بیٹی کو سب کچھ میرے جیسا دیا ہے۔ وہی رنگ و روپ' وہی ...رہ۔ میری دعا ہے کہ اسے میری قسمت نہ ملے۔ شاہ جی میرے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ مجھے اس کا گلہ نہیں ہے لیکن انہوں نے میری بیٹی کو اس در و دیوار سے نہ بچایا تو میں سمجھوں گی کہ انہوں نے کبھی مجھ سے محبت ہی نہیں کی تھی۔ وہ سب جھوٹ تھا' فریب تھا۔''

وقت کا پنچھی دھیرے دھیرے اُڑتا ہوا برسوں کا سفر طے کر چکا تھا۔ اتنے سالوں کی دھول میں بہت کچھ چھپ جاتا ہے۔ مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ سدا ایک ہی شخص سے محبت نہیں کی جا سکتی۔

یہ سب ٹھیک' لیکن وہ کسک اب تک اندر تھی۔ انہوں نے شعوری کوشش کی تھی۔ گوری کو اپنے ذہن سے کھرچنے کی۔ وہ الفاظ کتنے اذیت ناک تھے جو بڑی آپا نے ان سے کہے تھے۔

''مان لو کہ اب اس کی شادی ہو گئی ہے۔ مان لو کہ تم دونوں کے بیچ جو بھی تعلق تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ مان لو کہ اب وہ تمہارے بھائی کی عزت ہے۔ اور تم اپنے بھائی کی عزت سے نہیں کھیل

سکتے۔ تمہیں اتنا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اسے بار بار گوری کہہ کر' اس انداز سے اسے یاد کر کے تم اپنے بھائی کی عزت تار تار کر رہے ہو۔

اس کی یاد اتنا ستاتی ہے تو جاؤ اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لاؤ۔ مگر تم یہ نہیں کر سکتے۔ کر سکتے ہو؟

وہ تمہاری بھابی بن چکی ہے اور بھابی دیور کا رشتہ وہ نہیں ہوتا جس کے لیے تم اتنے افسردہ ہو۔ اپنے دیور کے لیے وہ ماں اور بہن کی جگہ لے لیتی ہے۔ سمجھے تم؟ اپنی ماں یا سمین کے لیے اس انداز میں سوچ سکتے ہو تم؟''

کتنا وقت بیتا تھا خود کو اس نئے رشتے کے بارے میں سمجھاتے اور یادوں کے درمیان بھٹکتے ہوئے کتنی مرتبہ وہ اس کمرے کے دروازے تک جا کر پلٹ آئے تھے۔ وہ کتنے کرب انگیز لمحے تھے جب انہوں نے رجب علی شاہ کو زرینہ کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اور تب وہ بابا جان کے پاس چلے آئے تھے۔

''میں یہ کہنے آیا ہوں بابا جان کہ آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے۔ آپ اس حویلی کو بچانا چاہتے ہیں ناں تو فوری طور پر میرا نکاح کر دیں۔ میں اور اذیت برداشت نہیں کر سکتا۔''

حیدر علی نے اپنے پاؤں کی بیڑیاں مضبوط کر لی تھیں۔ انہیں خوف تھا کہ کسی دن دیوانگی کے عالم میں کہیں وہ منقش دروازہ کھول نہ بیٹھیں' جس کے قریب جانے کا انہیں کوئی حق نہیں تھا۔

انہوں نے جو کچھ کھو دیا تھا' اسے اپنی زندگی کا ایک ایسا حصہ سمجھ کر سمجھوتا کر لیا تھا جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔ فوزیہ کو ہر خوشی دینے کی کوشش کی تھی۔ ہر طرح خیال رکھا تھا ان کا۔ انہیں گھر پر ہی خود پڑھایا لکھایا تھا' ان کے ذہن کو وسعت دی تھی اور ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ وہ فوزیہ بیگم سے محبت کرنے لگے تھے۔ وہ تھیں ہی ایسی کہ ان سے محبت کی جاتی۔ انہوں نے اپنا تن من ان کے گھر کو دے دیا تھا۔ انہیں دے دیا تھا۔ بہت دکھ سہے تھے ان کی رفاقت میں۔ اولاد سے دوری برداشت کی تھی۔ رات کی تاریکی میں جب وہ اپنے بچوں کے لیے خاموشی کے ساتھ آنسو بہاتی تھیں تو حیدر علی کا دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایسی عورت سے کون محبت نہیں کرے گا۔

مگر یہ محبت ان کے دل سے پرانے نقش دھو نہیں سکی تھی۔ گوری کی محبت کسک بن گئی تھی۔ احساسِ جرم کہیں اندر تک ان کے دل میں چبھتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی وجہ وہی تو تھے۔

وہ دن جب انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔

''گوری! کیا پھر ملو گی؟''

اور اس ایک سوال نے گوری کو ہمیشہ کے لیے باندھ کر رکھ دیا تھا۔ اور یہ بات انہیں اگلی ہی ملاقات میں گوری کی زبان سے ادا ہونے والے صرف دو الفاظ نے بتا دی تھی۔ اس نے فقط اس

قدر کہا تھا۔

''شاہ جی۔''

کہنے کو یہ صرف دو الفاظ تھے لیکن گوری کے لہجے میں چھپی مسرت آمیز حیرت نے وہ سب جذبے عیاں کر دیے تھے' جو صرف محسوس کیے جاتے ہیں۔ جنہیں کہا نہیں جاتا۔

اور پھر اسی روز انہوں نے رضیہ سے وعدہ کر لیا تھا' اسے یقین دلایا تھا کہ اس کی بہن کو' گوری کو وہ اپنی بیوی بنائیں گے۔ اسے وہ مقام دلوائیں گے جو ان کی بیوی کو ان کے گھرانے میں ملنا چاہیے۔ اسے راستے میں تنہا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔

اس نے پوچھا تھا۔ ''شاہ جی' آپ کی زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی اور لڑکی بھی آئی تھی؟''

''تم سے پہلے؟ یہ کیوں پوچھا تم نے؟''

''ولایت میں تو بہت خوبصورت لڑکیاں ہیں مجھ سے زیادہ گوری ہیں۔ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں۔ میں سوچتی ہوں کہ میں تو ان لڑکیوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں۔ پھر آپ کی نگاہِ انتخاب مجھ پر کیسے ٹھہری؟''

اور انہوں نے جواب میں کہا تھا۔ ''شاعر کہتا ہے کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ وہاں واقعی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں لیکن ان میں سے کسی سے بھی ملتے ہوئے میرے دل سے یہ صدا نہیں آئی تھی کہ وہ لڑکی میری ہے۔ تمہیں دیکھا تو میرے دل نے صدا دی کہ میں تمہاری ہی تلاش میں تھا۔ میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ لندن کے کلبوں میں' سڑکوں پر' لائبریری میں' کتابوں کے ریک کے پیچھے' خاموش ندیوں کے ویران اور بے آباد کناروں پر' کینوس لگے ایزل کے گرد اور پیانو بجاتی لڑکیوں کے درمیان' میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم مجھے یہاں ملو گی۔''

گوری بہت معصوم اور بھولی لڑکی تھی۔ ان کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینے والی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے محبت کی گلیوں میں گھماتے رہے اور وہ آنکھیں بند کیے ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔

پھر جب اسے علم ہوا کہ ان دونوں کے بیچ فوزیہ بھی تھی تو وہ گم صم سی رہ گئی۔ اس نے کہا تھا۔

''اب میں اس دن آپ سے ملوں گی' جس دن آپ میرے حق میں فیصلہ کریں گے۔ میں خود کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ کسی کے ہاتھ میرے حق میں دعا کے لیے اٹھنے کے بجائے مجھے بددعا دینے کے لیے اٹھیں۔ مجھے بددعا سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ کے کسی پچھتاوے کا سبب بنوں اور آپ کو پا لینے کے بعد بھی ساری زندگی آپ کو کھوجتی رہوں۔''

بہت ضبط کے باوجود بھی آنسو کا ایک قطرہ اس کے گال پر پھسل آیا تھا۔

"ایک چیز مانگوں گوری۔ دو گی؟"

"آپ جان مانگیں شاہ جی، وہ بھی دوں گی۔" اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

"اپنا یہ آنسو مجھے دے دو۔"

"مانگی بھی تو اتنی بے قیمت چیز۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ ان کی قدر و قیمت کیا ہے۔"

اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر آنکھیں موند لیں۔

انہوں نے انگلی کی پور سے اس کا آنسو اٹھا لیا۔ "تھینک یو۔ تم نے مجھے زادِ راہ دے دیا ہے۔ اب ساری زندگی کانٹوں پر چلنا پڑے تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔"

ہاں، وہی اس کی موت کے ذمہ دار تھے۔ مانا کہ انہیں جدا کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تقدیر کا تھا، مگر وہی تھے جنہوں نے اسے ایک نئی اور انجانی راہ کا مسافر بنایا تھا۔ خود تو سب کچھ پالیا تھا لیکن اس بھولی بھالی لڑکی کے مقدر میں زہر بھر دیا تھا۔

ان کی بہت پیاری اور محبت کرنے والی بیوی تھی۔ اولاد تھی، غم تھے تو زندگی میں خوشیاں بھی بہت تھیں۔ مگر گوری کو ان کی محبت میں کیا ملا تھا؟ نہ وہ شوہر کو محبت دے سکی۔ نہ اس کے گھر کو اپنا گھر سمجھ سکی۔ بیٹی ہوئی تو ابھی اسے جی بھر کر دیکھ بھی نہیں پائی تھی۔ اسے لوریاں سنانے، سجانے، سنوارنے اور دلہن بنے دیکھنے کے ارمان پورے بھی نہیں کر پائی تھی کہ تھک کر زندگی سے منہ ہی موڑ لیا۔

"نہیں۔ جو دکھ گوری نے اٹھائے ہیں، وہ دکھ ریشماں نہیں اٹھائے گی۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" انہوں نے سوچا۔

☆=====☆=====☆

وقت دھیرے دھیرے سے گزر رہا تھا۔ ماہ بانو کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسے وہاں آئے کتنی دیر ہو چکی تھی اور مزید کتنی دیر تک اسے وہاں بند رہنا تھا۔ وہ صوفے پر سکڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ مکرم کے جانے کے بعد کتنی دیر تک وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ بار بار اس نے سوچا تھا کہ اپنی عزت دے دینے کے مقابلے میں جان دے دینا اس کے لیے زیادہ آسان تھا۔ خودکشی کرنے کے کتنے طریقے سوچے تھے اس نے۔ مکرم سے اسے رحم دلی کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔ وہ اب تک اس کے نمائش والے دن کے الفاظ نہیں بھولی تھی۔ جب اس نے کہا تھا۔

"فارسیل چیزیں تو ہر کوئی خرید سکتا ہے لیکن ہم وہی چیزیں حاصل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو ناٹ فارسیل ہوتی ہیں۔ یہاں دو خوبصورت چیزیں ناٹ فارسیل ہیں۔ دونوں ہمارے بنگلے میں اچھی لگیں گی۔"

ایسی ذہنیت رکھنے والے شخص سے اچھائی کی توقع رکھنا حماقت ہی ہوتی۔ اس نے بانو کی

اتنی باتیں سن لی تھیں اور پھر بھی اسے کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا تھا تو اسے وہ صرف معجزہ ہی کہہ سکتی تھی۔

مگر ماہ بانو کے ذہنی انتشار کا سبب صرف ایک مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اس وقت کے متعلق بھی نہ چاہتے ہوئے ہی سہی، سوچ رہی تھی جب عبداللہ کی بے خبری میں یہ بھائی اس پر حملہ آور ہو جاتے۔

"آخر کس چیز کو کریمن ریڈنگ کہہ رہی تھی، جس کے لیے وہ صبح صبح گھر سے نکلتا ہے۔"

سوچ سوچ کر اس کا دماغ جیسے پھٹتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔

"وہ یقیناً رائیڈنگ کے لیے نکلتا ہوگا۔ کریمن اسی کو اپنے لہجے میں ریڈنگ کہہ رہی ہوگی۔ کاش کوئی صورت ہو یہاں سے نکلنے کی اور میں عبداللہ کو خبر کر سکوں۔ یا اللہ اسے اپنی امان میں رکھنا۔"

وہ بلک بلک کر رو دی۔

"چاہے عبداللہ اور میں ایک دوسرے سے دور ہو جائیں مگر وہ زندہ سلامت رہے، خوش رہے۔ چاہے میں پھر اسے نہ دیکھ سکوں مگر وہ ٹھیک رہے اسے کچھ نہ ہو۔"

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی ذہنی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ مگر وہ شعوری کوشش کر کے خود کو نارمل رکھ رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ تالے میں ایک مرتبہ پھر چابی گھومی اب کی دفعہ اندر آنے والا نوازش تھا۔ اس کے ساتھ کھانے کے سامان سے لدی ہوئی ٹرالی بھی تھی۔ ویسے تو یہ کام ملازموں کا تھا لیکن مکرم نے اسے سخت تاکید کی تھی کہ ماہ بانو پر کسی اور کی نگاہ نہ پڑنے پائے۔

"یہ کھانا کھالو۔" نوازش نے ٹرالی اس کی طرف بڑھائی۔

ماہ بانو نے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سختی اور درشتی کے وہ تاثرات نہیں تھے جو مکرم کے چہرے پر تھے۔

"فریج میں پانی اور کولڈ ڈرنکس دونوں ہیں۔ ٹینڈ فروٹ بھی ہیں، جس چیز کے لیے دل چاہے لے لینا۔"

گرم گرم کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو سے ماہ نور بانو کو خیال آیا کہ اسے سخت بھوک لگی ہوئی تھی اور پیاس سے اس کا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ ہی بیٹھی رہی۔ نوازش واپس جانے کے لیے مڑ چکا تھا۔ دروازے تک پہنچ کر وہ رکا اور اس کی طرف مڑا۔

"زیادہ شور شرابا مت کرنا۔ مجھے الجھن ہوتی ہے یوں بھی یہاں تمہاری آواز میرے علاوہ کوئی بھی نہیں سن سکتا اور میں تمہاری مدد نہیں کروں گا۔ اس لیے چیخنا چلانا تو بیکار ہے۔ یہ ٹرالی میں گھنٹی رکھی ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دینا۔ میں آجاؤں گا اور جو کچھ تمہیں چاہیے

ہوگا مل جائے گا۔

اور ہاں۔ تمہیں پتا نہیں کب تک یہاں رہنا پڑے اس طرح رونے سے بہتر ہے کہ تم ٹی وی لگا کر دیکھ لو۔ ڈش انٹینا لگا ہوا ہے۔ اپنی پسند کا چینل لگا لو۔ اس کا دل نہیں چاہتا تو بہت سی موویز رکھی ہوئی ہیں وی سی آر دیکھ لو۔''

ماہ بانو کا دل چاہا کہ کسی چیز سے اس کا سر پھاڑ دے۔ کس قدر ہمدردانہ مشورہ دیا جا رہا تھا۔ بہت مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا۔ نوازش بھی مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

بھوک اتنی شدید تھی کہ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑنا چاہتی تھی۔ کھانا بھی خوشبو سے ہی اتنا لذیذ لگ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ بے اختیار ٹرالی کی طرف بڑھا تھا۔ مگر اس نے خود کو روک دیا۔

''جنہوں نے مجھے اغوا کیا اور جو عبداللہ کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ کیا میں ان کے گھر کا ان کا دیا ہوا کھانا کھاؤں گی؟ مجھ پر اس کا ایک بھی لقمہ حرام ہے۔''

سب کچھ ویسے ہی پڑا ٹھنڈا ہوتا رہا۔ اس کی سوچیں پھر بھٹکنے لگیں۔ بڑی حویلی اور حویلی خانقاہ حضرت صاحب کے درمیان۔

☆=====☆=====☆

خادم حسین، ماہ بانو کی گمشدگی سے سخت اَپ سیٹ تھا۔ رات کو کسی کو کچھ بتائے بغیر اس نے گاؤں کے ایک ایک گھر کی تلاشی لی تھی۔ اس اچانک افتاد پر گھروں کے مکین خوفزدہ ہو گئے تھے۔ مگر اس تمام کارروائی سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ماہ بانو کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ وہ حویلی سے نکلی تھی تو آخر کہاں چلی گئی تھی؟

گاؤں میں اس کے رشتے دار تو تھے مگر وہ وہاں جانا پسند نہیں کرتی تھی۔ یہاں آکر وہ صرف مولوی صاحب کے گھر پر ہی ٹھہرتی تھی اور رشتے داروں میں صرف ریشماں سے ملنے حویلی آیا کرتی تھی۔

پھر خانقاہ حضرت صاحب سے ان کا مخبر آیا تھا جس نے بتایا تھا کہ زینب بی بی اچانک پاکستان آ رہی تھیں اور حیدر علی شاہ صاحب انہیں لینے لاہور چلے گئے تھے۔

خادم حسین کے ذہن میں اگلی صبح کے لیے بنایا گیا پروگرام تازہ ہو گیا۔

''کیا باقی سب کام معمول کے مطابق ہو رہے ہیں یا نہیں؟''

''باقی سب کچھ معمول کے مطابق ہی ہے۔'' مخبر نے بتایا۔

''عبداللہ کے روزمرہ کے کام اسی طرح جاری ہیں؟''

''جی شاہ صاحب۔ ہر کام ہر روز کی طرح لگے بندھے وقت اور طریقہ کار کے مطابق ہو رہا ہے۔''

خادم حسین کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''وہاں حویلی میں کوئی ایسی لڑکی تو نہیں آئی جس کا وہاں عام طور پر آنا جانا ہو۔ میں خاص طور پر عبداللہ کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں ذہن پر زور دو۔ اس سے ملنے کوئی لڑکی تو نہیں آئی۔ کل مغرب کے بعد سے تمہارے یہاں آنے تک؟''

یونہی اسے خیال سا آیا تھا کہ ماہ بانو، عبداللہ کی کالج فیلو تھی۔ عبداللہ کا شمار اس کے دوستوں میں بھی ہوتا تھا۔ کہیں وہ وہاں نہ چلی گئی ہو۔

''نہیں شاہ صاحب۔''

''ہو سکتا ہے زنان خانے میں ہو۔''

''تقریباً ناممکن ہے۔ پچھلے دنوں لاہور سے ان کے کچھ دوست شکار کے لیے آئے تھے۔ تو شاہ صاحب کے معمولات یکسر تبدیل ہو گئے تھے۔ ان سے ملنے ان کے دوست احباب آتے رہتے ہیں اور اس کے متعلق ان کے معمولات کی تبدیلی سے فوراً پتا چل جاتا ہے۔

کل رات کافی دیر تک مصروف رہے تھے شاہ صاحب۔ پہلے سائیس سے اصطبل کے متعلق بات چیت کرتے رہے پھر منشی اور وکیل کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ رات کا کھانا بھی انہوں نے کافی دیر سے کھایا تھا۔ صبح حسبِ معمول گھڑسواری کے لیے نکل گئے۔ ناشتے کے بعد بڑے شاہ صاحب، بی بی کو لینے نکل گئے۔ اس کے بعد میرے آنے تک عبداللہ شاہ صاحب روزمرہ کے کاموں میں ہی مشغول تھے۔''

''ہوں۔ تم جاؤ۔'' خادم حسین نے کہا۔

''کہاں گئی ماہ بانو۔ زمین کھا گئی۔ آسمان نگل گیا۔''

اس نے سوچا۔ ابھی تو اس کا پورا ارادہ تھا کہ پیر صاحب کی گاؤں واپسی پر وہ ان سے ماہ بانو کے متعلق بات کرے گا۔ جھنجلاہٹ بری طرح سے اس پر سوار تھی۔ پریشانی الگ تھی۔ یہ اور بات کہ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ جہاں بھی تھی، ٹھیک تھی۔ مگر اس سے اس کی پریشانی میں کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

ڈیرے سے نکل کر مکرم سیدھا حویلی میں اپنی خواب گاہ میں چلا آیا۔ اس کا ذہن منتشر تھا اور وہ یکسوئی سے سوچنا چاہتا تھا۔ کل رات سے اس وقت تک دنیا بہت تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے دو دروازے کھلے تھے جن کی طرف اس نے کبھی دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ پر اب ہر منظر بدل گیا تھا۔ ہر چیز دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ اور وہ دھند میں لپٹے ان ادھورے منظروں کو دیکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے کھوج تھی ہر حقیقت کی۔

اماں جان اور ماہ بانو کے الفاظ رہ رہ کر اس کی سماعت میں ابھر رہے تھے۔ اماں جان نے کہا تھا کہ انہوں نے دکھ ہی نہیں اٹھائے، ظلم سہے ہیں۔ کیسے ظلم؟ یہ انہوں نے نہیں بتایا تھا۔

انہوں نے کہا تھا کہ اس حویلی کی عورتیں اپنے دل میں کتنے زخم بسا کر جیتی ہیں۔ کس کے دیے ہوئے زخم؟ یہ بھی انہوں نے نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ بہت پہلے وہ اس حویلی میں ہونے والے قتل کی دو وارداتوں کی گواہ بنی تھیں۔ کس نے کسے قتل کیا تھا؟ مگر یہ بھی انہوں نے نہیں بتایا تھا۔

اور ماہ بانو نے کہا تھا کہ زیب النساء پھوپھو حویلی سے بھاگ گئی تھیں۔ مگر ایسا کب تھا؟ ان کی نہایت شاندار پختہ قبر تو ان کے آبائی قبرستان میں موجود تھی۔ تو کیا ماہ بانو نے جھوٹ کہا تھا یا پھر وہ قبر جھوٹی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی کہ عبداللہ جاننا چاہتا ہے اپنے خاندان کے ماضی کی اس لڑکی کے بارے میں جو اس دشمنی کی ابتدا ٹھہری تھی۔ ریشماں اس شخص کو بددعا دینا چاہتی ہے، جو اس دشمنی کی وجہ بنا اور مجھ سے پوچھتی ہے اپنی ماں جی کے متعلق۔

مکرم کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ تو صرف ماہ بانو کو عبداللہ تک پہنچنے سے روکنے کے لیے نکلا تھا مگر نہ جانے کن بھول بھلیوں میں گم ہو گیا تھا۔

اور پھر بہت دن پہلے خادم حسین نے اس سے دونوں گھرانوں کی دشمنی کے متعلق کہا تھا۔

''یہاں معاملہ تعلیم کا ہی کب تھا؟ یہاں تو مسئلہ جائیداد اور زمینوں کا بھی تھا اور سب سے بڑھ کر ایک عورت کا۔''

''عورت کا؟ کون عورت؟'' اس نے پوچھا تھا۔ مگر خادم حسین نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

اسے محسوس ہوا جیسے اس کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی کی گئی ہو۔ جیسے وہ سب جو جاننے کا اسے حق حاصل تھا' اس سے چھپایا گیا ہو۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر اسے ہر حقیقت کا علم ہوتا تو اس کی زندگی بہت مختلف ہوتی۔

ابھی کیا تھا اس کی زندگی میں؟ کسی چیز کی کوئی واضح صورت نہیں تھی۔ وہ کھاؤ پیو' عیش کرو اور مر جاؤ کو ہی زندگی سمجھتا آیا تھا۔ جو کچھ تھوڑی دیر قبل ماہ بانو نے کہا تھا اور اس نے خاموشی سے سن لیا تھا۔ اگر مکرم کی ذہنی کیفیت ایسی نہ ہوتی جو اماں جان کے پاس سے اٹھ آنے کے بعد تھی تو وہ اس کا آدھا بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ اس کا منہ بند کر دیتا۔

ایک بات کا البتہ وہ معترف ہو چکا تھا کہ خادم حسین کا انتخاب برا نہیں تھا۔ ماہ بانو میں واقعی شان اور تمکنت تھی۔ اس وقت بھی جب وہ اسیر تھی۔ اس کی ذات کا غرور اس کی اسیری بھی ختم نہیں کر سکی تھی۔ وہ اس کے سامنے گڑگڑائی نہیں تھی۔ اس نے رو رو کر التجائیں نہیں کی تھیں۔ ہر سوال کا جواب معلوم ہونے کے باوجود بھی جب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی بات کا جواب نہیں دے گی تو اس نے واقعی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

اسے ماہ بانو بہت اچھی لگی تھی۔ شکل و صورت اچانک ہی اس کے لیے ثانوی چیز بن گئی

تھی۔ ماہ بانو میں اسے اس کی ذات کا غرور اور اس کی ضد پسند آئی تھی۔

''خادم بھائی اور سبط دونوں کے انتخاب بہت اچھے ہیں۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے زندگی کو میری نسبت مختلف روایتوں سے دیکھا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ زندگی اصل میں کیا ہے؟''

وہ سوچتا رہا' پھر اٹھ کر اماں جان کے کمرے کی طرف چل دیا۔ خواب گاہ میں ہمیشہ کی طرح بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ صرف اماں جان تھیں' اور ریشماں۔ وہ اندر آیا تو ریشماں بے اختیار اماں جان سے لپٹ گئی۔ اماں جان نے بھی اپنی اوڑھنی اس پر یوں پھیلا دی جیسے مرغی چوزوں کے اوپر پھیلا دیتی ہے۔ ریشماں کی سسکیوں کی آوازیں مکرم کو اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

اماں جان نے اس کی طرف بغور دیکھا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ وہ کس نیت سے وہاں آیا تھا۔ وہ ضدی تھا' اکھڑ تھا' غصہ ور تھا۔ اپنے سامنے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ بس ان کے سامنے امید کی صرف ایک کرن تھی کہ وہ ریشماں کو بہت پیار کرتا تھا۔

ریشماں کو اماں جان سے لپٹتے دیکھ کر وہ وہیں رک گیا۔ اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی بہت واضح طور پر تحریر تھی۔

''کیا بات ہے مکرم؟'' اماں جان نے پوچھا۔

''آپ کے پاس میرے لیے بھی کچھ ہے اماں جان؟''

''میرے پاس تم سب کے لیے مامتا اور محبت کا سمندر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔''

''میں یہاں بیٹھ جاؤں؟''

''بیٹھ جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ تم میرا اور اپنی بہن کا دل دکھانے والی کوئی بات نہیں کرو گے۔'' انہوں نے کہا۔

وہ اماں جان کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک کمرے میں سکوت طاری تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اماں جان سے کیسے بات کرے۔

''آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟'' بالآخر اس نے کہنا شروع کیا۔ ''اس حویلی کا ایک فرد ہونے کے باوجود بھی آپ لوگوں نے مجھ سے اتنا کچھ چھپایا۔ کیا میری کوئی اہمیت نہیں ہے یہاں؟''

''کیا چھپایا تم سے بیٹا؟''

''سبھی کچھ اماں جان۔ ہر چیز' اور یہ باتیں جو کسی ایسے شخص کے منہ سے سننی پڑیں جو اس حویلی کا فرد نہ ہو تو آپ سوچ سکتی ہیں کہ کتنی تکلیف ہو سکتی ہے۔ مجھے بھی کسی نے یہ نہیں بتایا کہ زیب النساء پھوپھو گھر سے بھاگ گئی تھیں۔ کیوں اماں؟'' وہ بولا۔

''کچھ گزری باتیں بہت تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ ان کا نہ جاننا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مجھے نہیں

معلوم کہ تم سے کس نے اس بات کا ذکر کیا مگر جس نے بھی کیا' اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں کیا حق ہے کہ جس بات کا اللہ تعالیٰ نے پردہ رکھا ہے' اس کا پردہ اٹھا دیں۔''

''نہیں اماں جان! یہ سب جاننا میرے لیے بہت ضروری ہے۔ میری زندگی کا توازن بگڑ رہا ہے۔ میں کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ پلیز اماں جان میری مدد کریں۔ مجھے بتائیں کہ آخر ہمارے درمیان دشمنی کی کیا وجہ ہے؟''

اماں جان نے ایک نظر ریشماں پر ڈالی پھر اس سے مخاطب ہوئیں۔

''زیب النساء بھی بہت پیاری تھی' بہت خوبصورت۔ بالکل ریشماں جیسی۔ تمہارے دادا جان اپنی اولاد میں اسی کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اسے بھی ریشماں کی طرح سب کچھ میسر تھا۔ کپڑا' زیور' باپ کی محبت' ماں کی ممتا' سبھی کچھ۔ مگر اس کی زندگی میں جو خلاء تھا وہ ان چیزوں سے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

ہاں صرف تمہارے حیدر بابا تھے جو اپنی بہنوں کی ذہنی اور جسمانی ضرورتوں کو سمجھتے تھے اور ان کے لیے لڑتے جھگڑتے تھے۔ اسی لیے تمہارے دادا جان کی نگاہوں میں معتوب ہو چکے تھے۔ پیر صاحب اور تمہارے حیدر بابا کے درمیان بہت سے اختلافات تھے پھر بھی وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ سب سے زیادہ اختلاف اسی بات پر تھا۔ تمہارے حیدر بابا چاہتے تھے کہ بہنوں کی شادیاں کی جائیں مگر اس بات پر کوئی بھی راضی نہیں تھا۔ پیر صاحب اور تمہارے دادا جان کو بہت سے خوف لاحق تھے۔ جائیداد کے بٹ جانے کا خوف' سر جھک جانے کا خوف اور نہ جانے کیا کیا۔

افسوس کہ تمہارے دادا جان نے مہر النساء اور زیب النساء کو صرف اپنی بیٹیاں اور خاندان کی عزت سمجھا۔ یہ کبھی سوچا ہی نہیں کہ وہ انسان بھی ہیں۔ ان کی کوئی اپنی پسند' کوئی خواہش' کوئی آرزو بھی ہو سکتی ہے۔

زیب النساء نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے لیے ایک چور دروازہ کھول لیا اور باہر نکل کر دیکھا تو اسے اچھو ملا۔ اچھو کچھ عرصہ ہمارے اصطبل میں کام کرتا رہا تھا۔ پھر پیر صاحب کے خاص ملازموں میں شامل ہو گیا تھا۔ زیب النساء اس کے ساتھ ایک نئی دنیا بسانے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ مگر راستے میں تمہارے بابا جان مل گئے۔ اچھو کو انہوں نے وہیں مار ڈالا اور زیبی کو بالوں سے گھسیٹ کر حویلی لے آئے۔''

اماں جان خاموش ہو گئیں۔

''پھر اماں؟'' مکرم نے پوچھا۔

''پھر کیا۔ وہی ہوا جو ہونا تھا اور جس کے لیے شاید زیبی ذہنی طور پر تیار بھی تھی۔ وہ آزادی چاہتی تھی سو اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا گیا۔''

ریشماں جو حیرت سے اپنی شربتی آنکھیں پھیلائے ایک ٹک اماں جان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان سے لپٹ کر زیادہ شدت سے رونے لگی۔

''اب زیبی کا دہی کمرا ریشماں کے پاس ہے۔ مرتے ہوئے اس نے یہی خواہش کی تھی کہ پیر صاحب کی کوئی بیٹی ہوئی تو وہیں رہے۔''

کمرے میں ایک مرتبہ پھر سکوتِ طاری ہو گیا۔ جسے بالآخر مکرم نے ہی توڑا۔

''کیا اسی لیے بابا جان اور حیدر علی شاہ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے؟''

''یہ دشمنی کی نہیں شدت کی ناراضگی کی ابتدا تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے مگر ایک دوسرے پر ہتھیار اٹھانے کا تب بھی شاید کسی نے نہیں سوچا تھا۔''

''پھر؟ پھر نوبت یہاں تک کیسے آ پہنچی؟''

''جانے دو مکرم۔ گزری ہوئی باتوں میں کیا رکھا ہے؟'' اماں جان ریشماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''یہی تو باتیں ہیں اماں جان جنہیں بہت پہلے جان لینا چاہیے تھا ہمیں۔ میں اتنا تو جانتا ہوں کہ اس کی وجہ بھی کوئی عورت تھی مگر وہ کون تھی؟ کیا تھی؟ کیسے اس دشمنی کی وجہ تھی؟'' وہ جاننے پر مُصر تھا۔

''پرانے زخم کیوں ادھیڑتے ہو مکرم۔ جو باتیں بیتے وقت میں دفن ہیں' انہیں وہیں دفن رہنے دو۔''

ریشماں سر اٹھا کر دھندلی آنکھوں سے اماں جان کو دیکھنے لگی تھی۔ مکرم کے سوال نے اس کے ذہن میں ماہ بانو سے ہونے والی اپنی آخری گفتگو تازہ کر دی تھی۔ جس میں اس نے اس دشمنی کا ذمہ دار صرف اور صرف اس کی ماں جی اور بابا جان کو ٹھہرایا تھا۔

''وہ عورت کون تھی اماں جان۔ پلیز اس وقت کچھ مت چھپائیں۔'' مکرم کہہ رہا تھا۔

اماں جان نے منہ پھیر لیا۔

''میری وجہ سے نہیں بتانا چاہتیں ناں۔'' ریشماں نے ان کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔ ''میں جانتی ہوں کہ اس دشمنی کی وجہ میری ماں جی تھیں۔ یہ احساس کتنا تکلیف دہ ہے کہ وہی اس کی وجہ تھیں۔ اس دشمنی کی جس میں سب کچھ جل رہا ہے۔ جس کی وجہ سے میرے بھائی کا خون اور اب۔ اب......'' وہ بری طرح سے رو دی۔ ''میری ماں جی بہت بری تھیں۔ میں انہیں ماں نہیں کہنا چاہتی۔''

''نہ نہ ریشماں' ایسے نہیں کہتے۔ تم سے کس نے یہ سب کہہ دیا۔ تمہاری ماں تو بہت اچھی تھی۔ اتنی پیاری اتنی خوبصورت۔ ہو بہو ویسی' جیسی تم ہو کہ کوئی نظر ڈالے تو پلک جھپکنا ہی بھول جائے۔''

"اماں، بانو کہہ رہی تھی کہ......" اس نے کہنا چاہا لیکن ہچکیوں کے درمیان کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

"بانو جھوٹ کہہ رہی تھی۔ جس کی اتنی پیاری بیٹی ہو، وہ عورت بری کیسے ہوسکتی ہے۔" انہوں نے اسے چمکارا۔

"میں کسی اور کی بیٹی نہیں ہوں۔ مین صرف آپ کی بیٹی ہوں۔"

مکرم خاموشی سے سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا۔

اماں جان ریشماں کو چپ کراتی رہیں۔

"گویا یہ بھی ماہ بانو کو معلوم تھا۔" اس نے سوچا۔

"وہ کیسے یہ باتیں جانتی ہے جو اس حویلی کے بیشتر مکین بھی نہیں جانتے؟"

ریشماں بدقت تمام چپ ہوئی۔ اب بھی وہ سکڑی سمٹی اماں جان کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔

"ریشماں آپی! میں صرف ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔ اس کا جواب مجھے اماں جان نے بھی دیا تھا۔ مگر میں آپ کے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" مکرم نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اس سے عبداللہ کے متعلق براہِ راست سوال کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ریشماں نے اماں جان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"کیا آپ عبداللہ شاہ سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

ریشماں کو اپنا سانس حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو مکرم؟" اماں جان نے گھبرا کر کہا۔

"اماں جان میں نہیں چاہتا کہ زیب النساء پھوپھو کی طرح ریشماں آپی بھی کوئی چور درواز ڈھونڈیں۔ ریشماں آپی بھی صرف حویلی کی بیٹی اور عزت ہی نہیں ہیں، ایک انسان بھی ہیں۔ ان کی بھی خواہشات اور آرزوئیں ہوسکتی ہیں۔ یہ بھی کسی کو پسند کرنے کا حق رکھتی ہیں اور انہیں اپ پسند کے اظہار کا پورا پورا حق ہے۔

میں نے آپ سے کہا تھا ناں اماں جان کہ حیدر علی شاہ کے لیے میرے دل میں بہت نفرت ہے لیکن ریشماں آپی کے لیے جو محبت ہے وہ اس نفرت سے کہیں زیادہ ہے۔ پلیز ریشماں آپی بتائیں کیا آپ عبداللہ شاہ سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

مکرم سوالیہ نگاہوں سے ریشماں کی طرف دیکھ رہا تھا، مگر اس میں ہمت نہیں تھی مکرم کی طرف دیکھنے کی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ کسی نئے فساد کی ابتداء تھی یا پھر پرانی دشمنی کی انتہاء۔

اچانک سب کچھ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوگیا۔ ہر چیز گھومنے لگی۔ چہرے دھندلا گئے، بس ہیولے باقی تھے۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ رو رہی تھی یا ہنس رہی تھی، سسک رہی تھی یا چلا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔

☆=====☆=====☆

نوازش کمرے میں داخل ہوا تو ماہ بانو گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ ہولے ہولے ہلتا ہوا ں کا جسم اس بات کا پتا دے رہا تھا کہ وہ سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ اس نے ٹرالی کی طرف کھا، سب کچھ ویسے ہی پڑا پڑا ٹھنڈا ہوگیا تھا۔

"بی بی! میں نے تم سے کہا تھا کہ پتا نہیں تمہیں کب تک یہاں رہنا پڑے، بہتر ہوگا کہ تم انا کھالو۔"

ماہ بانو نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ کھانا کھالو، کب تک بھوکی رہوگی؟" وہ بولا۔

"نہیں۔"

کہنے کو یہ صرف ایک لفظ تھا مگر اس میں ماہ بانو کے اندر اُبلنے والا تمام تر لاوا دکھائی دے رہا ۔ اس لفظ میں نفرت تھی، غصہ تھا، حقارت تھی، ضد تھی۔

نوازش اس کے لہجے پر تپ کر رہ گیا۔ مکرم نے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کیا ہوا تھا، مگر اس کا مزہ چکھانا بھی ضروری تھا۔

"مرتی رہو میری بلا سے، اب تمہیں کھانا اسی وقت ملے گا جب تم اس کے لیے ہاتھ پھیلا کر مانگوگی۔"

ماہ بانو نے نفرت بھری ایک نظر اس پر ڈالی اور سر دوبارہ گھٹنوں میں دے دیا۔

نوازش ٹرالی گھسیٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"عبداللہ! تمہیں میں نے اللہ تعالیٰ کی امان میں دیا۔ تم ٹھیک کہتے تھے، اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو وت کا فرشتہ کب کسی کی جان لے سکتا ہے اور اس کا حکم نہ ہو تو کب کسی کو زندگی عطا ہوتی ۔ تمہاری زندگی ہوئی تو میرے بجائے کوئی اور اس کا سبب بن جائے گا اور نہ ہوئی تو ساری بھی مل کر تمہیں کب بچاسکتی ہے۔ ہاں، مگر میری دعا پر اختیار ہے اور میرے جسم کا رواں رواں ری سلامتی کے لیے دعا گو ہے۔" ماہ بانو سوچ رہی تھی۔

"کہاں ہیں وہ سب، جو میرے اپنے ہیں۔ کیا خبر میں ان میں سے کسی کو پھر دیکھ بھی پاؤں نہیں۔ ابا جی، اماں...... آپ دونوں کتنے دور ہیں مجھ سے، آپ کو تو خبر بھی نہیں ہوگی کہ آپ اڈلی بیٹی کس طوفان میں گھری ہوئی ہے۔ آپ دونوں مطمئن ہوں گے کہ بانو گاؤں میں نانا ر بڑی اماں کے پاس محفوظ ہوگی۔ یہی سوچ کر مجھے چھوڑا تھا ناں یہاں کہ لاہور میں، میں تنہا گی، غیر محفوظ ہوں گی، مگر دیکھ لیں میری قسمت کی یہ سیاہی میری اپنی مٹی میں لکھی تھی۔

اور اگر عبداللہ کو معلوم ہوجاتا تو وہ شاید حویلی کے کسی مکین کو زندہ نہ چھوڑتا، خود بھی جان سے یکن ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑتا۔ یا اللہ کسی بھی طرح سے بچالے، اسے محفوظ کردے۔

زندگی کتنی مختلف لگنے لگی ہے۔ آج شاید میری زندگی میں یہ تجربہ نہ آتا تو میرے لیے زندگی کا مفہوم اس قدر تبدیل نہ ہوتا۔ وہ سب باتیں جو کل تک بہت اہم لگتی تھیں' آج کتنی غیر اہم اور بے معنی لگ رہی ہیں۔''

اس نے سر اٹھا کر کمرے کے درودیوار کی طرف دیکھا۔

''شاید یہی وہ جگہ ہو جہاں برسوں پہلے' زرینہ خالہ کی قسمت کا فیصلہ ہوا تھا' جیسے یہ درودیوار میری تقدیر کی سیاہی کے گواہ ہیں' شاید ویسے ہی یہ زرینہ خالہ کی تقدیر کی سیاہی کے بھی گواہ بنے ہوں۔

میری اور زرینہ خالہ کی کہانی میں کتنی مماثلت ہے۔ یوں لگتا ہے' جیسے نئے ناموں کے ساتھ پرانی کہانی پھر دہرائی جا رہی ہو۔ کاش! میں اماں جی سے اصرار نہ کرتی' یہ سب جاننے کے لیے' مگر تب بھی میری چھٹی حس کہہ رہی تھی جیسے کوئی کہانی چپکے چپکے میرے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہو' جیسے کچھ ہونے والا ہو اور جو کچھ ہونے والا ہو' اس میں میرا کردار ہی مرکزی ہو۔ اپنے کالج کی سرخ اینٹوں کی عمارت مجھے خبردار کرتی تھی۔ مسجد کے سفید روشن مینار اشارے سے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے' پیر صاحب کی حویلی آواز دیتی تھی اور میں سوچتی رہ گئی تھی کہ زرینہ خالہ کی کہانی میں میرا کردار کہاں فٹ ہو سکتا تھا؟

میرے اندر کوئی چلاتا تھا کہ میں اسی کہانی کا کردار ہوں' مجھے زرینہ خالہ کی کہانی جاننے کا حق حاصل ہے۔ یہ میری زندگی کا حصہ ہے۔

میں بھی ویسی ہی مثلث کا ایک زاویہ ہوں۔ پہلے زرینہ خالہ' حیدر بابا اور فوزیہ اماں تھیں' آج میں' عبداللہ اور ریشماں ہیں۔ میں نہیں جانتی' لیکن مجھے یقین ہے کہ عبداللہ کی اماں جان بھی منگنی طے ہو جانے کے بعد حیدر بابا سے اسی طرح محبت کرنے لگی ہوں گی' جیسے زرینہ خالہ کیا کرتی تھیں یا جیسے آج ریشماں' عبداللہ سے کرتی ہے۔ حیدر بابا اپنی منگنی سے اسی طرح نالاں تھے جیسے عبداللہ ہے۔ برسوں پہلے پیر صاحب جلال الدین شاہ اپنے کیے ہوئے فیصلے پر مُصر تھے' آج اسی طرح حیدر بابا مُصر ہیں' جس طرح زرینہ خالہ بے یقینی اور احساسِ جرم کا شکار تھیں' ویسے ہی آج میرے ساتھ ہے اور شاید یہ وہی کمرا ہے' جہاں کل قسمت نے زرینہ خالہ سے ان کی زندگی کی تمام خوشیاں چھین لی تھیں۔ پتا نہیں آج میرے ساتھ یہاں کیا سلوک ہو۔

نہ جانے اس اتفاق پر آسمان سے جھانکتی زرینہ خالہ کی روح کیا سوچ رہی ہوگی؟ کیا اب بھی ان کے لیے ان کی اپنی ہی بیٹی اہم ہوگی یا پھر وہ میرا غم بھی سمجھتی ہوں گی' وہی سب جو مجھ سے پہلے وہ جھیل چکی ہیں۔

اُما میرے پاس ہوتی تو میں اس سے پوچھتی شاید وہ بتا سکتی۔''

اُما کا خیال آتے ہی ماہ بانو کا ذہن اس کی طرف چلا گیا۔

''پتا نہیں وہ کیسی ہوگی؟ کیا بیتی ہوگی اس پر۔'' ماہ بانو نے سوچا۔

اس کے ذہن میں بار بار اُما کے کہے ہوئے فقرے گونج رہے تھے۔

''میں پچھتانا نہیں چاہتی' میں کوشش ضرور کروں گی I don't want to end up as a loser۔''

اس نے کوشش کی تھی' جس کے نتیجے میں اس کے مہربان گھر والے یک دم ہی اس سے خائف ہو گئے تھے۔ ہیما کی وضاحتوں کے بعد بھی اس نے اُما سے رابطہ قائم کرنے کی پوری کوشش کی تھی' مگر بے سود۔ کچھ عرصہ تو اس کے گھر والے برداشت کرتے رہے تھے۔ پھر شاید انہوں نے نمبر ہی تبدیل کروا لیا تھا کیونکہ بے شمار گھنٹیوں کے باوجود بھی وہاں سے کوئی فون نہیں اٹھاتا تھا۔

ماہ بانو ان دنوں بہت پریشان تھی۔ ایڈی کو عبداللہ نے بہت اصرار سے گاؤں بلوا لیا تھا۔ ثمیز اور ظہیر بھی اس کے ساتھ ہی گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں جا کر ایڈی بہل جائے گا' مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی خیال کروٹیں لیتا رہتا تھا۔ اُما پر نہ جانے کیا گزر رہی ہوگی۔ گاؤں سے واپسی پر وہ سیدھا ماہ بانو کے پاس آیا تھا۔

''میں نے ارادہ کر لیا ہے سکھر جانے کا۔'' اس نے بتایا تھا۔

''پاگل پن کی باتیں مت کرو ایڈی۔''

''میں پاگل ہو چکا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ تم اس سے رابطہ کرو گی۔ رابطہ نہیں ہو سکتا تو اب اس کے علاوہ کیا صورت باقی ہے؟ اس پر خدا جانے کیا بیت رہی ہوگی اور کس وجہ سے؟ صرف اس لیے کہ ہم دونوں محبت کرتے ہیں۔ مائی گاڈ' وہ پتا نہیں کس حال میں ہوگی۔''

ماہ بانو ہونٹ کاٹنے لگی۔ ہیما سے ہونے والی تمام گفتگو اس کے ذہن میں تازہ ہو چکی تھی۔ اس نے واضح طور پر کہا تھا کہ اس کا ایک فیصد بھی امکان نہیں۔ ایڈی اُما کے لیے جتنا پریشان تھا' اس کی ایک ایک لکیر اس کی پیشانی پر واضح تھی۔

''کیا کر لیں گے وہ؟ میں سب کچھ برداشت کرنے اور بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ ہر چیز جانتے ہوئے بھی میں اس آگ میں اترا تھا اور اب ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کو بھی تیار ہوں' مگر اُما کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔''

''کیا کروں؟ ایڈی کو ہیما سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دوں؟ مگر ایسا ہوا تو یہ بھی اڑ جائے گا' بات لمبی ہو کر نہ جانے کہاں تک پہنچ جائے گی۔ اسے معلوم ہوا تو وہ کل کا ٹھہر جاتا' آج وہاں چلا جائے گا اور اُما سے ملنے کی کوشش کرے گا اور پھر اس کا اور اجے کا سامنا ہو گیا تو؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے' لیکن اگر یہ ٹھیک نہیں ہے تو پھر کیا ٹھیک ہے؟ اسے کیسے مطمئن کیا جائے؟ اُما کی زندگی تو تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی ہے اور ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے' مگر

کیا ایڈی جیسے جینئس شخص کو ہم دوست خاموشی سے تباہی کی طرف بڑھتے دیکھ سکتے ہیں؟ نہیں یہ بھی ممکن نہیں ہے۔'' ماہ بانو نے سوچا۔

''میں ذہنی طور پر تباہ ہوگیا ہوں۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ اس کے گھر والے اس شادی پر تیار نہیں ہوں گے لیکن وہ اسے کسی سے بات چیت بھی نہیں کرنے دیں گے' فون تک اٹینڈ نہیں کرنے دیں گے' یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔'' وہ جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔

''ایڈی! مجھے دوست سمجھتے ہوناں؟'' ماہ بانو نے کہا۔

''میں نے زندگی میں بہت کم لوگوں سے دوستی کی ہے مگر جن سے کی ہے' ان سے آخری سانس تک دوستی نبھاؤں گا اور بانو تم ان میں سے ایک ہو۔''

''تھینک یو ایڈی!'' وہ بولی۔ پھر قدرے توقف سے کہا۔ ''اُما میری بہترین دوست ہے' اس کی ہر خوشی مجھے بہت عزیز ہے' مگر ایڈی میں تمہیں بھی اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ پلیز اسے بھول جاؤ۔ یوں سمجھو جیسے وہ تمہاری زندگی میں آئی ہی نہیں تھی۔''

ایڈی نے شاک کی سی کیفیت میں اسے دیکھا۔

''یہ تم کہہ رہی ہو بانو؟''

''ہاں میں کہہ رہی ہوں۔ ہم سب سے لڑ سکتے ہیں مگر قدرت کی طرف سے کیے گئے فیصلوں سے کبھی نہیں لڑ سکتے' وہ اپنا آپ خود ہی منوا لیتے ہیں۔''

''قدرت کے فیصلے؟ مجھے اور اُما کو دور کرنے کا فیصلہ قدرت کا نہیں' انسانوں کا کیا ہوا فیصلہ ہے۔ قدرت کا فیصلہ یہ ہوتا کہ میں مرجاتا یا وہ مرجاتی۔ میں انسانوں کے کیے ہوئے کسی فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا۔ اُما انکار کردے' میں آج بھی پیچھے ہٹ جاؤں گا مگر ہمارے بارے میں کوئی تھرڈ پرسن کیوں فیصلہ کرے؟ میں ماردوں گا یا مرجاؤں گا اور یہ قدرت کا نہیں میرا فیصلہ ہے۔''

ماہ بانو چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

''میں نے اُما سے بھی کہا تھا کہ مجھے کسی کے فیصلے سے پہلے اس کے فیصلے کی ضرورت ہے۔ وہ ہاں کہے یا نہیں' مگر مجھے بتا ضرور دے۔ افسوس کہ وہ اپنے ہونٹوں سے نہ ہاں کہہ سکی' نہ نہیں۔ مگر حالات نے مجھے خود ہی اس کے فیصلے سے آگاہ کردیا ہے۔ اسے انکار ہوتا تو یوں اس کے گھر والے اس سے ہر قسم کا رابطہ ختم نہ کروادیتے۔

اور میں اسی لیے سکھر جانا چاہتا ہوں۔ وہ آج بھی اپنی زبان سے انکار کرسکتی ہے' مگر یہ انکار اس کا نہیں ہے تو کوئی بھی زبردستی اسے اس بات کا پابند نہیں کرسکتا۔'' ایڈی نے اٹل لہجے میں کہا۔

''نہیں ایڈی! تم سکھر نہیں جاؤ گے۔'' ماہ بانو نے بھی فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ ان سب باتوں کو وقوع پذیر ہونے سے روکنا چاہتی تھی' جو ایڈی کی پیش قدمی کے باعث بہت کچھ تباہ کر

سکتی تھیں' خود ایڈی کو بھی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی' لیکن اب مجبوری کی وجہ سے تمہیں سب کچھ بتانا پڑ رہا ہے۔''

''کھل کر بات کرو' میں کسی بات سے ہرٹ نہیں ہوسکتا۔'' وہ بولا۔

''میرا اُما سے رابطہ ہوگیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''وہ ٹھیک تو تھی' اس نے کیا کہا تم سے؟''

''ہاں وہ ٹھیک تھی۔'' ماہ بانو نے اپنی گھڑی ہوئی کہانی کا آغاز کیا۔

''اس کی اپنی خواہش پر اس کے گھر والے تم سے اس کی بات نہیں کروا رہے تھے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے' تم جھوٹ بول رہی ہو۔ کیا میں اُما کو نہیں جانتا' وہ ایسا کبھی نہیں کرسکتی۔''

''ہر شخص کچھ بھی کرسکتا ہے' میں اسی لیے تمہیں بتانا نہیں چاہتی تھی حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ پہلے تم یقین نہیں کرو گے اور اگر یقین کرلیا تو بہت ہرٹ ہوگے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

''مجھ سے بھی بہت مشکل سے بات کرنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ وہ ہم میں سے کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی مگر میں اسے قصوروار نہیں سمجھتی۔ اسے یقیناً تم سے محبت تھی اور شاید اب بھی ہو' لیکن جب انسان سب...... Pros And Cons Weigh کرتا ہے تو محبت کے علاوہ بھی بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے' تمہاری اور اس کی محبت میں شاید تم دونوں کے لیے نفع کم تھا اور نقصان زیادہ۔ اس نے بہت دنوں تک ٹھنڈے دل سے اس بارے میں سوچا تھا اور پھر اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس تعلق کو یہیں ختم کردینا زیادہ بہتر ہے۔''

ایڈی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میری بات کا یقین کرو ایڈی۔ وہ ذہنی طور پر ایسی کسی شادی کو قبول نہیں کرسکتی جسے اس کا مذہب درست تسلیم نہیں کرتا کیونکہ شادی سوسائٹی سے لیا سرٹیفکیٹ ہی نہیں ہوتی' بلکہ یہ سند مذہب سے بھی لینی پڑتی ہے۔ جب مذہب اجازت نہ دے تو پھر شادی.........شادی تو نہیں رہتی ناں' یہ تو بغیر شادی کے رہنے والی بات ہوگئی۔

مگر وہ ہم سب سے شرمندہ تھی۔ ہم میں سے کسی کو فیس (سامنا) نہیں کرسکتی تھی۔ اس کا فیصلہ تمہارے حق میں نہیں تھا' مگر یہ بات وہ اپنے منہ سے بھی نہیں کہنا چاہتی تھی۔ میرے بار بار رابطہ کرنے پر بالآخر اس نے مجھ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور مجھے کہا میں تمہیں یہ سب بتا دوں۔ اس کے ممی' ڈیڈی نے اسے آنند کے لیے کہا اور وہ اب اس پر راضی ہے۔ اب تک تو وہ شاید انڈیا جا بھی چکی ہو اور اگر نہیں گئی تو جانے ہی والی ہوگی۔''

ایڈی کچھ دیر تک گھاس پر نظر جمائے رہا پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کر اپنے پورشن کی طرف چلا گیا۔

ماہ بانو اس کے بعد مسلسل ڈپریشن کا شکار رہی تھی۔ یہ احساس بہت تکلیف دہ تھا کہ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ جھوٹ بولا تھا اور انہیں الگ کر دیا تھا۔

''مگر یہی بہتر تھا بانو!'' نیہاں نے افسردگی سے کہا تھا۔

''میں کیا کرتی نیہاں' مجھے اپنے دوست اور اپنا ملک بہت پیارا ہے۔ اسی میں دونوں کی بہتری تھی۔ ہم سب کی بہتری تھی مگر یہ احساس مجھے بار بار کچوکے لگا رہا ہے کہ انہیں میں نے جدا کیا ہے۔'' ماہ بانو بھی آزردہ تھی۔

''نہیں تم نے نہیں تقدیر نے جدا کیا ہے۔ تم نے تو صرف ایڈی کو یہ فیصلہ تسلیم کرنے پر آمادہ کیا ہے۔''

''کل رات میں بہت روئی دونوں کے لیے' مگر میں سچ بتاتی تو کیا ہوتا نیہاں؟''

''وہی سب جس کی اجے نے دھمکی دی تھی۔ تم نے جو کیا وہ بہت اچھا تھا۔'' نیہاں نے کہا۔

''میرے ذہن پر اپنے اس جھوٹ کا بہت بوجھ ہے۔ میں یہ سب کسی سے شیئر کرنا چاہتی تھی' مگر تمہارے علاوہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ لڑکوں کو بتاتی تو وہ فوراً ایڈی کے پاس پہنچ جاتے کہ اصل بات تو یہ تھی۔''

''تم نے اچھا کیا کہ کسی لڑکے کو نہیں بتایا۔ ان کے دماغ کی چولیں ویسے بھی کچھ ڈھیلی ہوتی ہیں۔ انہوں نے کہنا تھا کہ اُما کے گھر والوں کی ایسی کی تیسی' ہم دیکھتے ہیں کہ کیا کر لیں گے یہ ایڈی کا' کیا بگاڑ لیں گے ہمارا۔ ان سے ذکر نہ کرنا ہی اچھا ہے۔''

''اگر زندگی میں کبھی اُما یا ایڈی کو خبر ہوئی کہ میں نے جھوٹ بولا تھا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟'' ماہ بانو نے آہستہ سے پوچھا۔

''وہ یہی سوچیں گے کہ تم دونوں کی دوست ہو۔ اس لیے اگر تم نے ایسا جھوٹ بولا ہے تو اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔ پتا ہے بانو' ہم ایسے دوست نہیں ہیں کہ ایک دوسرے کی دوستی پر شک کریں۔ ہماری دوستی عام دوستی نہیں ہے۔ ہم سب ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہی محبت ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا' کیئر کرنا سکھاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی فیلنگز سمجھتے ہیں' تم یقین کرو کہ انہیں خبر ہوئی تب بھی وہ تم سے گلہ نہیں کریں گے۔ ان کے دل میں تمہارے لیے کبھی بال نہیں آئے گا۔'' نیہاں نے اسے سمجھایا۔

ابھی وہ نیہاں کو فون کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ جیمز آ گیا تھا۔

''یہ منگنی کا انویٹیشن کارڈ ہے۔ فنکشن اسلام آباد میں ہی ہوگا اور تمہارے بغیر بالکل ادھورا ہوگا۔''

''پتا نہیں آ سکوں یا نہیں' میں گاؤں جا رہی ہوں۔ تمہیں تو پتا ہے کہ اماں جان امریکہ جا رہی ہیں اور وہ مجھے یہاں چھوڑنے پر بالکل راضی نہیں ہیں۔ وہاں سے اسلام آباد آنا مشکل ہوگا۔ سفر بھی بہت طویل ہے۔''

''یہ نہیں چلے گا بانو' سفر کی طوالت کے لیے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ملتان سے بائی ایئر آ جانا پھر میں عبداللہ کو فون کر دوں گا کہ آتے ہوئے تمہیں بھی گھسیٹ لائے۔ نہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''میں کوشش کروں گی' وعدہ نہیں کرتی۔''

''کوشش؟ ہرگز نہیں' تم ہر حال میں آؤ گی ہم دوست ہی کتنے ہیں۔ تم بھی نہ آئیں تو میں ساری زندگی تم سے بات نہیں کروں گا۔''

''پلیز جیمز! اتنی بڑی دھمکی مت دو' پہلے ہی ہمارا گروپ ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔'' اس نے آزردگی کے ساتھ کہا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''اُما کا کوئی قصور نہیں ہے' مگر ایڈی بھی بہت اپ سیٹ ہے۔''

''مجھے پتا ہے' لیکن جو ہوا وہ ہونا ہی تھا۔ معلوم نہیں کہ ہم کیوں اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ بالآخر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''تمہاری اماں کب جا رہی ہیں نیویارک؟'' جیمز نے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔

''پرسوں فلائیٹ ہے ان کی۔''

''اور تم اس سے پہلے گاؤں جاؤ گی یا بعد میں؟''

''انہیں سی۔ آف کرنے کے بعد ہی جاؤں گی۔ گاؤں سے رشتہ دار بھی آ رہے ہیں' ان کے ساتھ ہی جاؤں گی۔'' اس نے بتایا۔

''اگر ممکن ہو سکے تو نیویارک میں میرا ایک کام ہے' انکل سے کہنا کہ کر دیں۔''

''اوہ شیور کیوں نہیں' تم بتاؤ۔''

''کسی زمانے میں میری مام وہیں رہتی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد ان سے کوئی رابطہ ہی نہیں رہا۔ اب تو بہت مشکل ہے کہ وہ کہاں ہوں' مگر وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میں خط و کتابت اور فون کے ذریعے انہیں اپنی زندگی میں شامل کر لوں۔'' جیمز نے کہا۔

''ہاں جیمز ضرور' میں ابا جی کو بطورِ خاص تاکید کروں گی۔ اللہ کرے کہ تمہیں تمہاری مام مل جائیں۔'' ماہ بانو نے صدقِ دل سے کہا۔

''جب سے میں نے نیہاں کے متعلق سوچنا شروع کیا تھا' تب سے زندگی کا مفہوم میرے

لیے بہت بدل گیا تھا۔ مجھے محبتوں کی قدر آنی شروع ہوئی تھی۔ یوں بھی بانو میں نے بہت کم محبتیں دیکھی ہیں زندگی میں۔ نیہاں سے پہلے شاید صرف میری ماں کو مجھ سے محبت تھی، مگر میں نے انہیں اس لیے چھوڑ دیا کیونکہ میری وجہ سے وہ مسلسل تکلیفیں بھگت رہی تھیں۔ میں ان کی زندگی سے نکل گیا۔ ان سے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا۔

اب جب میں نے اور نیہاں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو مجھے وہ بہت یاد آتی ہیں۔ انہیں خبر ہوتی تو وہ بہت خوش ہوتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں اپنی شادی پر انوائیٹ کروں۔"

"ہاں، ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اللہ کرے وہ اب تک وہیں ہوں۔"

"یہ ان کا ایڈریس ہے، اگر وہ مل جائیں تو انہیں نیہاں کا اسلام آباد کا ایڈریس دے دینا۔ میں آج کل رائل پارک سے نکلنے کی تگ و دو کر رہا ہوں۔ پتا نہیں کس وقت نئی جگہ منتقل ہو جاؤں۔"

"ٹھیک ہے۔" ماہ بانو نے ایڈریس کی پرچی تھامتے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔ "ایک بات تو بتاؤ جیمز۔"

"پوچھو!"

"ویسے کافی پرسنل سوال ہے، نہ چاہو تو جواب نہ دینا۔"

"اتنا پرسنل نہیں ہوگا کہ تمہیں بھی جواب نہ دے سکوں۔" وہ بولا۔

"تم پاکستان کیوں آئے تھے، وہاں امریکہ میں بہت سی جگہیں تھیں، جہاں تم جا سکتے تھے، پھر تم نے پاکستان ہی کیوں چنا؟"

"نیہاں نے بھی مجھ سے پوچھا تھا۔ اس نے تمہیں بتایا نہیں؟"

"جب میں نے اس سے پوچھا تھا، تب اسے علم نہیں تھا، بعد میں نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔"

"میرا پاکستانی باپ میری ماں کو چھوڑ کر پاکستان آ گیا تھا۔ مجھے البتہ وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے شادی شاید گرین کارڈ کے چکر میں کی تھی۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، اس نے وہاں شادی کر تو لی تھی، مگر نبھا نہیں سکا۔ میری مام اس کے پیچھے پاکستان آئیں اور عدالت کے ذریعے مجھے واپس امریکہ لے گئیں، انہیں مجھ سے بہت محبت تھی۔

پھر انہوں نے شادی کر لی۔ سوتیلا باپ، سوتیلا ہی بن کر رہا۔ مام نے مجھے بورڈنگ ہاؤس میں بھجوا دیا، مگر تب تک میں فیصلہ کر چکا تھا یہاں پاکستان آنے کا۔ اس کے تین سال بعد میں یہاں چلا آیا۔ یہ تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے۔"

"تمہیں امید تھی کہ تمہیں اپنے ڈیڈی مل جائیں گے؟"

"میں انہیں ڈھونڈنا چاہتا تھا اور امید ہی نہیں مجھے یقین تھا کہ وہ شخص مجھے مل جائے گا۔

بچپن کے خواب اور سپنے اور قسم کے ہوتے ہیں، اپنے خوابوں میں ہر بچہ سپر مین ہوتا ہے۔ وہ ہر کام کر سکتا ہے۔ میں بھی اپنے خوابوں میں سپر مین تھا۔"

"تمہاری باتوں سے لگتا تو نہیں ہے کہ تمہیں اپنے ڈیڈی سے محبت ہے، پھر بھی تم ان کی تلاش میں یہاں تک آ گئے۔"

وہ ہولے سے ہنس پڑا۔

"میں اس شخص کی محبت کے مارے تو یہاں نہیں آیا تھا۔ میں اسے قتل کرنے آیا تھا یہاں۔ میں اس سے اپنی اور اپنی ماں کی محرومیوں کا حساب لینا چاہتا تھا۔ برسوں تک یہ کیڑا میرے ذہن میں رہا۔ میں نے ایک ریوالور بھی خرید لیا تھا، جو آج تک میرے پاس ہے۔ میں نشانہ بازی کی پریکٹس بھی کرتا رہتا تھا۔

پھر بعد میں، میں نے سوچا کہ کیا حماقت ہے یہ۔ اس روز میں ایک فلم کا بورڈ پینٹ کر کے آرام کر رہا تھا، جب قریبی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ابھرنے والے...... الفاظ میرے کانوں تک پہنچے۔ مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ ہر برے عمل کا اسی قدر بدلہ لینا جائز ہے، مگر معاف کر دینا اس سے بہتر ہے۔

اس دن میں نے دیر تک اس بارے میں سوچا۔ میں اپنے باپ کو نہیں جانتا تھا اور بچپن کے خوابوں کے سحر سے بھی آزاد ہو چکا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ بھوسے کے ڈھیر سے سُوئی تلاش کرنا قریباً ناممکن ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ خدا اتنا بے خبر تو نہیں ہے کہ ظالم کو مستقلاً ڈھیل دیے رکھے، جو شخص برا ہوتا ہے، وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی تباہی کا سامان کرتا ہے اور تباہ ہو جاتا ہے۔ تب میں نے اپنا انصاف اپنے خدا کے سپرد کر دیا اور آج تک مطمئن ہوں۔ اس نے مجھے بہت کچھ دیا ہے، اس سے کہیں زیادہ کمی مجھے فیملی لائف کی ہی محسوس ہوتی تھی۔ میں محسوس کرتا تھا کہ سب کے کام آنے کے باوجود سب کے ساتھ دوستی رکھنے کے باوجود کسی کو بھی مجھ سے دلچسپی نہیں تھی۔ یہ بات مجھے ہرٹ کرتی تھی۔

"اب یہ کمی پوری ہو گئی ہے۔ میں نیہاں سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے۔ ہم کچھ ہی سالوں میں ایک نئے سفر کا آغاز کریں گے۔ تب تک مجھے بھی قدم جمانے کا موقع مل جائے گا۔ وہ بھی بہت اچھی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اسے بہت زیادہ تو نہیں دے سکتا، مگر اسے اس بات کی پروا نہیں ہے۔ وہ جدوجہد کرنے پر یقین رکھتی ہے، کہتی ہے کہ ہم مل کر محنت کریں گے تو سب کچھ حاصل کر لیں گے۔ بانو I really love her۔"

سوچتے سوچتے ماہ بانو کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"چلو کوئی تو خوش ہوا۔ اُما اور ایڈی بچھڑ گئے۔ میں یہاں قید ہوں اور موت عبداللہ کے تعاقب میں ہے۔" اس نے سوچا۔

"اُما مجھے معاف کر دینا۔ میں نے ایڈی سے بہت بڑا جھوٹ بولا' مگر صرف اس لیے کہ میں اسے ساری زندگی تباہ کرتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ سب نہیں ہونے دینا چاہتی تھی' جس کی دھمکی تمہارے بھائی نے دی تھی۔

"تم کہاں ہو اُما' پتا نہیں میں تمہیں کبھی دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں۔"

"میں کوشش ضرور کروں گی۔"

I Don't want to end up as a loser

اُما کی آواز اس کی یادوں میں تازہ ہوگئی۔

"اُما! قدرت نے ہار تمہارا مقدر کر دی تو کس سے لڑو گی۔" ماہ بانو نے سوچا۔

"میں کوشش ضرور کروں گی۔ I Don't want to end up as a loser

اُما کی آواز شدت سے اُبھری۔

☆=====☆=====☆

یہ خیال خادم حسین کو بہت بعد میں آیا تھا' کہ مولوی صاحب کے گھر میں بھی حویلی کی طرح آنے جانے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ ایسے میں ماہ بانو کی گمشدگی کی خبر کو چھپائے رکھنا ان کے لیے بہت مشکل ہوتا۔ جیسے ہی اسے یہ خیال آیا' وہ تیزی سے ان کے گھر کی طرف چل دیا۔

مسجد خالی تھی۔ یوں تو یہ نماز پڑھنے کا وقت نہیں تھا' مگر بچے قرآن پاک پڑھنے کے لیے وہیں ہوتے تھے۔ خود مولوی صاحب کا زیادہ وقت بھی مسجد میں ہی گزرتا تھا۔

گاؤں میں مسجد کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ہر قسم کے دینی اجتماعات یہیں ہوا کرتے تھے۔ لوگ دینی مسائل پوچھنے کے لیے بھی ادھر کا رخ ہی کرتے تھے۔ گاؤں کے بوڑھے اور بچے مولوی صاحب کی محبت سے فیض اٹھاتے تھے۔ کبھی وہ خود درس کا انتظام کرتے تھے۔

عورتیں بھی ملانی جی کے پاس آتی رہتی تھیں۔ مولوی صاحب نے دینی لحاظ سے گاؤں کی جتنی خدمت کی تھی' اس کا حق تو وہاں رہنے والے کبھی نہیں چکا سکتے تھے مگر جتنا ان کے بس میں تھا' اتنا کرنے میں انہوں نے بھی کبھی کوتاہی نہیں برتی تھی۔ خاص کر زرینہ اور رضیہ کی شادی کے بعد تو گاؤں کی عورتیں اپنی بچیاں ان کی طرف بھیج کر ان کے گھر کے کام کروا دیا کرتی تھیں۔ یوں مل جل کر ان کے گھر کا گزارہ ہو جایا کرتا تھا۔

اس قسم کے حالات میں ماہ بانو کی غیر موجودگی کو کب تک چھپایا جا سکتا تھا۔

باہر سے گزرتے چند بچوں کو خادم حسین نے اپنے پاس بلایا۔

"مولوی صاحب کہاں ہیں؟"

"آج ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اس لیے انہوں نے ہمیں چھٹی دے دی ہے۔"

"مولوی صاحب کو ہمارے آنے کی اطلاع دو۔"

"جی شاہ صاحب!" دو بچے تیزی سے اندر کی طرف بھاگے۔

خادم حسین کی آمد کی اطلاع ملتے ہی مولوی صاحب ننگے سر باہر آگئے۔

"کوئی اطلاع شاہ صاحب؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہمیں افسوس ہے مولوی صاحب کہ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔" وہ بولا۔

مولوی صاحب کے بوڑھے چہرے کی جھریاں کچھ اور گہری ہو گئیں۔

"شاہ صاحب! میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں' میری نواسی کو ڈھونڈ لائیں۔ وہ بہت بھولی بہت معصوم ہے۔ اس پر نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی۔ میری بیٹی کو پتا چلے گا تو وہ جیتے جی مر جائے گی۔ خدا کے لیے شاہ صاحب!"

وہ گڑگڑاتے ہوئے خادم حسین کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

"نہیں مولوی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"آپ کو کیا خبر شاہ صاحب کہ مجھ پر اور میری گھر والی پر کیا بیت رہی تھی۔ ہم نے ہمیشہ بہت صبر کیا ہے مگر کب تک؟ اس بڑھاپے میں امتحان نہیں دے سکتے۔" وہ بچوں کی طرح شدت سے رونے لگے۔

خادم حسین چند لمحے تک انہیں دیکھتا رہا' پھر بولا۔

"ہم نے خود گاؤں کے ایک ایک گھر کی تلاشی لی ہے۔ نیاز پور کی ہی نہیں' ساتھ والے گاؤں کی بھی لی ہے۔ آپ ہماری کچھ تو مدد کر سکتے ہیں۔ کسی پر شک تو ہوگا آپ کو' کہیں تو وہ جاتی ہوگی۔ کوئی راستہ تو دیں ہمیں تلاش کرنے کا۔ ابھی تو ہم مکمل طور پر اندھیرے میں کھڑے ہیں۔"

"وہ کہیں نہیں جاتی تھی سوائے حویلی کے۔ وہ تو اپنے چاچے' تائے اور پھوپھی کے گھر بھی کبھی نہیں گئی۔ صبح سے جو بھی آرہا ہے' وہ اس کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ میرے پاس کسی کو دینے کے لیے کوئی جواب نہیں ہے۔ صبح اس کا چاچا آیا تھا' وہ چاہتا تھا کہ بانو کو اپنے گھر لے جائے۔ میں اسے کیا بتاتا کہ بانو کہاں ہے۔ اسے شک ہو گیا کہ بانو گاؤں میں نہیں ہے۔ ہمیں دھمکیاں دے کر چلا گیا۔ کہہ رہا تھا کہ اس کے تائے کو بھی لائے گا۔ گاؤں کی دوسری عورتیں بھی پوچھ رہی تھیں۔ میری گھر والی کی حالت بھی بہت خراب ہے۔ صبح سے غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ بار بار بانو کو آوازیں دیتی ہے۔ ابھی سرگوشیاں ہیں' کل تک سب کھلم کھلا اس پر کیچڑ اچھالنے لگیں گے۔ اس کا صاف دامن داغدار ہو جائے گا۔" مولوی صاحب کا گلا رندھ گیا۔

"آپ نے کہہ دیا ہوتا کہ وہ شہر چلی گئی ہے۔" خادم حسین ان کی بات سن کر کسی قدر جھلا گیا تھا۔

"مجھ سے جھوٹ بولا نہیں جاتا۔ وہ پوچھ لیتے کہ کس کے ساتھ گئی ہے' تو کیا جواب دیتا؟"

"آپ یہاں رہے تو مسلسل اس قسم کے سوال پوچھے جاتے رہیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اور ملانی جی فوراً شہر چلے جائیں۔ اپنے رشتہ داروں کو بتا دیں کہ بانو حویلی میں ریشماں کے پاس ہے۔ اتنی دیر میں ہم آپ کے شہر جانے کا انتظام کرتے ہیں۔"

"مگر پیچھے سے بانو آ گئی تو کیا ہوگا' ہمیں کہاں ڈھونڈے گی وہ؟"

"وہ ہم سنبھال لیں گے۔ شہر میں آپ ہمارے بنگلے پر رہیں' بانو کا پتا چلا تو ہم خود اسے آپ کے پاس لے کر آئیں گے۔ آپ یہاں رہے تو بات زیادہ پھیلے گی اور بدنامی ہوگی۔"

مولوی صاحب شش و پنج میں تھے۔

"سوچئے مت مولوی صاحب' جو ہم کہہ رہے ہیں' وہ آپ کو کرنا ہے۔"

مولوی صاحب سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ایسا کرنا ماہ بانو کے حق میں اچھا ہوگا یا برا۔ یہاں سے جانے کو بھی ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا' انہیں لگتا تھا کہ وہ کہیں چلے گئے تو پیچھے سے ماہ بانو آ جائے گی اور انہیں نہ پا کر کہاں جائے گی؟ اس معاملے میں انہیں کسی پر اعتبار نہیں تھا' مگر خادم حسین نے بھی جو کچھ کہا تھا' ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ تذبذب میں تھے۔

"اور یہاں مسجد کا انتظام کون سنبھالے گا؟" انہوں نے نہ جانے کے لیے بہانا بنایا۔

"وہ سب آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ مسجد کا انتظام چلتا رہے گا۔"

"مگر میں لوگوں کو شہر جانے کی وجہ کیا بتاؤں گا میں تو بہت کم گاؤں سے نکلتا ہوں اور اس طرح اچانک تو پہلے کبھی نہیں نکلا۔"

"مولوی صاحب! یہ سب باتیں کیا ماہ بانو کی عزت سے زیادہ اہم ہیں؟" خادم حسین نے جھنجلاہٹ کے عالم میں کہا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بولے۔

"ٹھیک ہے شاہ صاحب۔"

انہیں تیاری کیا کرنا تھی' ہاں بڑی اماں کو بتانا مشکل مرحلہ تھا جو خادم حسین کی آمد کی خبر سن کر ہی سجدے میں گر گئی تھیں۔

"یا اللہ .... ! میری بچی کو محفوظ رکھنا۔ یا اللہ پاک میری بانو کی حفاظت فرمانا۔" وہ سجدے میں گری بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

مولوی صاحب اندر داخل ہوئے تو انہوں نے پُر امید نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا' مگر وہاں مایوسی' پریشانی اور دکھ کے سائے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

"اب بھی نہیں ملی میری بانو' کہاں گئی وہ؟ جب رضیہ اپنی امانت مانگے گی تو کہاں سے لا کر دوں گی اسے؟" صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا تھا۔

مولوی صاحب چارپائی پر تقریباً ڈھے ہی گئے۔

"آپ نے بھی کچھ نہیں کیا۔ کہیں نہیں ڈھونڈا اسے۔ یا اللہ ان کے گھروں پر بجلی کیوں نہیں گرتی' جو میری معصوم بانو کو لے گئے۔ ہائے میں کہاں سے لاؤں اسے' کہاں ڈھونڈوں۔"

"بڑے شاہ صاحب نے ہمیں شہر چلنے کے لیے کہا ہے۔" مولوی صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"کیا؟ میں کہیں نہیں جاؤں گی' وہ شہر جانے کو کیوں کہہ رہے ہیں؟ ہمیں بھی راستے سے ہٹا رہے ہیں۔ یہاں کون ہے' جس میں اتنی ہمت ہو کہ بانو کو اغوا کرے؟ انہوں نے ہی میری بچی کو اغوا کیا ہے۔"

مولوی صاحب کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"آہستہ بولو نیک بخت!"

"آہستہ! میں کیوں آہستہ بولوں؟ ظلم بھی ہم پر ہوا اور اپنی زبانیں بھی ہم ہی سی لیں۔ اب یہ نہیں ہوگا مولوی صاحب' میں چلا چلا کر سب کو بتاؤں گی کہ پہلے زرینہ اور اب بانو کے ساتھ کیا ہوا ہے' کیا ہر مرتبہ ہمارے ساتھ ہی ایسا ہوگا۔"

"آہستہ بولو' ایک عزت ہی ہے ہمارے پاس وہ بھی نہ رہی تو جیتے جی کسے منہ دکھائیں گے......؟" مولوی صاحب تھکن زدہ لہجے میں بولے۔

"ہماری تو جتنی عزت اترنی تھی اتر گئی' اب عزت اترے گی حویلی والوں کی۔ میں ایک ایک کو ان کے کرتوت بتاؤں گی۔"

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔ بلا تحقیق کسی پر الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ بڑے شاہ صاحب تو خود پریشان ہیں۔ وہ اور مکرم شاہ صاحب ساری رات اسے ڈھونڈتے رہے ہیں۔ اغوا کرنے والے یہ زحمتیں نہیں اٹھاتے۔ ان کا ہاتھ پکڑنے والا یہاں کون ہے؟ یہ سب انہوں نے کیا ہوتا تو وہ اس بات کو چھپاتے کبھی نہ۔ وہ سینہ اکڑا کر اقرار کر لیں تو میں اپنے رب کے حضور جھک کر انہیں بددعا دینے کے علاوہ کیا کر لوں گا؟ مجھے یقین ہے کہ یہ کام انہوں نے نہیں کیا۔" مولوی صاحب نے کہا۔

بڑی مشکل سے انہوں نے بڑی اماں کو لاہور چلنے کے لیے راضی کیا۔

☆=====☆=====☆

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے' اور مکرم کے پاس فیصلہ کرنے کا وقت بہت کم تھا۔ صبح سویرے یا تو اسے عبداللہ کو قتل کرنے کے لیے بھائیوں کے ساتھ نکل جانا تھا یا پھر سب کو اس کام سے روک دینا تھا۔ پہلی بات آسان تھی۔ اس کام پر وہ سب راضی تھے' مگر اس قتل سے انہیں روک دینا آسان نہیں تھا۔

اماں جان کے کمرے سے نکل کر وہ اپنے آبائی قبرستان میں چلا آیا تھا۔ اپنے بزرگوں کی

آخری آرام گاہیں دیکھتے ہوئے وہ امداد علی کی قبر تک جا پہنچا تھا۔ سنگِ مرمر سے پختہ کی گئی یہ قبر دوسری قبروں سے زیادہ خوبصورت اور شاندار تھی۔ وہ وہیں ایک ٹھنڈی سِل پر بیٹھ گیا۔ اردگرد دور دور تک خاموشی تھی۔ صرف کچھ پرندے تھے جو چہچہا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر قبرستان کا گورکن بھی ہاتھ باندھے چلا آیا تھا۔

"تم جاؤ ہم تنہائی چاہتے ہیں۔" مکرم نے کہا۔

گورکن الٹے قدموں پلٹ گیا۔

تنہائی میں اس نے دور تک پھیلے شہرِ خموشاں کا جائزہ لیا' جس کا ایک حصہ قبروں سے بھر چکا تھا۔ کچھ قبریں پرانی تھیں اور کچھ نئی۔ آخر میں امداد علی کو لایا گیا تھا۔ پیر صاحب نے اس کے لیے بہترین سنگِ مرمر منگوایا تھا۔

وہ بیٹھا کتنی دیر تک اسے تکتا رہا

ایک طرف بھائی کا خون تھا اور دوسری طرف بہن کے آنسو تھے۔ کچھ دیر پہلے کا واقعہ اس وقت بھی اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا جب اس نے ریشماں سے پوچھا تھا۔

"پلیز ریشماں آپی! بتائیں کیا آپ عبداللہ سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

ریشماں پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ تو جیسے سانس لینا بھی بھول گئی تھی اور جب دوبارہ اس نے یہی سوال پوچھا تھا تو ریشماں کے حواس جواب دے گئے تھے۔

"عبداللہ......عبداللہ......عبداللہ!" وہ ہذیانی انداز میں چلائی تھی اور پھر ہوش وخرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

وہیں بیٹھے ہوئے شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ سورج چھپ گیا تھا۔ وہاں سے اسے زیب النساء پھوپھو کی قبر بھی دکھائی دے رہی تھی' اور ان کے ساتھ بی بی مہر النساء پھوپھو کی قبر تھی۔

"کیا ہماری حویلی کی گھٹن ایک دن ریشماں آپی کو بھی اتنی کم عمری میں یہاں لا سلائے گی؟" اس نے سوچا تھا۔

یہ سوچ اس کے لیے سخت تکلیف دہ تھی۔ مسجد سے اذان کی آواز سنائی دینے پر اسے احساس ہوا کہ عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"امداد بھائی! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے خون سے کیا ہوا وعدہ نہیں نبھا پاؤں گا۔ اس وعدہ خلافی کے لیے میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں' مگر اسے نبھا کر میں ریشماں آپی کو جیتے جی مرتے نہیں دیکھ سکوں گا۔" اس نے قبر کے پاؤں والی طرف سنگِ مرمر کی ٹھنڈی سِل پر ہاتھ رکھ کر کہا

اور مڑ آیا۔

قبرستان اور حویلی کے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ تھا۔ وہ احاطے سے باہر نکلا ہی تھا کہ اس کی نگاہ قبرستان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے سفید داڑھی والے بوڑھے پر پڑی۔ وہ وہاں اجنبی تھا۔

"شاید کوئی مسافر ہو۔" مکرم نے سوچ کر آگے بڑھنا چاہا۔

"سنو!" بوڑھے نے پکارا۔

مکرم رک گیا۔

"آگ بجھانا چاہتے ہوناں؟ ہاں یہ آگ یا تم بجھا سکتے ہو یا پھر تمہاری قیدی۔"

مکرم نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"کون ہو تم؟"

"اسے جانے دو' یہ بتاؤ کہ میں تمہیں خوش خبری سناؤں تو میری گمشدہ چیز مجھے دے دو گے؟"

مکرم نے سوچا کہ بڑھاپے نے بوڑھے کا دماغ الٹا دیا ہے۔ نہ جانے کہاں کا سفر کر کے وہاں پہنچا تھا وہ۔ باہر سردی بھی بہت تھی اور اتنی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے پاس چیتھڑا ہوئی ایک قمیص اور تہہ بند تھی۔ وہ کمزور بھی تھا۔ شاید بھوکا بھی۔ اسے رات وہاں گزارنی پڑتی تو صبح تک اس کی اکڑی ہوئی لاش ہی ملتی' مگر وہ جیسے سب باتوں سے بے نیاز تھا۔

"تم مسجد یا مہمان خانے چلے جاؤ' کھانا ہماری سرکار سے پہنچ جائے گا۔" مکرم نے کہا۔

"مانا کہ تم اس جگہ کے بادشاہ ہو اور میں اس اوپر والے کی ایک ادنیٰ مخلوق' مگر میں فقیر ہوں بھک منگا نہیں۔ میں تو تمہیں خوش خبری سنانے آیا تھا کہ جو آگ برسوں سے جل رہی ہے' اسے تم بجھا دو گے' تم بھی اور تمہاری قیدی بھی۔"

مکرم نے الجھن سے اس کی طرف دیکھا۔ بظاہر تو وہ بوڑھا اجنبی تھا' مگر یہ ممکن تھا کہ اسے دونوں بھائیوں کے درمیان چلی آ رہی دشمنی کی خبر ہوتی' لیکن دوسری مرتبہ بھی جب اس نے "قیدی" کا ذکر کیا تو مکرم کا چونکنا یقینی تھا۔

"تم کون ہو؟"

"کہا ناں کہ اللہ تعالیٰ کی ادنیٰ سی مخلوق ہوں۔ اپنی چیز ڈھونڈتے ڈھونڈتے فقیر بن گیا ہوں۔"

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

"میری سب سے قیمتی چیز' میری محبت کھو گئی ہے۔"

"محبت؟"

"ہاں نگری نگری گھوم چکا' یہاں بھی بہت تلاش کیا' اب پھر تلاش کرنے آیا ہوں۔ دیکھو میں نے تمہیں خوش خبری سنائی ہے' کیا تم فقیر پر اس قدر احسان بھی نہیں کرو گے کہ میری محبت کی تلاش میں میری مدد کرو۔"

مکرم اس شخص کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یا تو وہ بہت پہنچا ہوا شخص تھا یا پھر بہت بڑا فراڈ۔ مکرم کا ذہن ایسا تھا کہ وہ دوسرے امکان کے بارے میں زیادہ غور کر رہا تھا۔

"اپنی محبت کی تلاش میں' میں نے کونا کونا چھان مارا۔" اس نے آہ بھری۔

"بس اس چاردیواری کے اندر نہیں جھانکا۔ تم اجازت دو تو ایک نظر دیکھ لوں؟ شاید یہیں مل جائے؟"

"یہ قبرستان ہے' یہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔" مکرم بولا۔

"یہاں سب کھویا نہیں جاتا' پایا بھی جاتا ہے۔ آج تم خالی ہاتھ اندر گئے تھے' مگر خالی ہاتھ لوٹے نہیں۔ تمہارا دل اور تمہارا دامن محبتوں سے بھرا ہوا ہے۔ شاید میری محبت بھی یہاں مل جائے۔"

مکرم اسے دیکھتا رہ گیا۔ کیا وہ بوڑھا دل کے بھید جان لیتا تھا؟

"کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟" وہ جھلا اٹھا۔

"میں ایک بہت ادنیٰ سا بندہ ہوں۔ لوگوں کی محبت کھو جائے تو وہ در در بھٹکنے کے بعد ادنیٰ محبت سے اعلیٰ محبت کی طرف بڑھ جاتے ہیں' مگر میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں آج تک اسی محبت کی تلاش میں ہوں' اس کے علاوہ کوئی آرزو ہی نہیں۔"

مکرم سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بوڑھا عجیب سا تھا۔ اس کے دل کے بھید جان لیتا تھا مگر اپنی محبت کی تلاش کے لیے اس سے مدد کا طالب تھا۔

"آؤ' اور آ کر اس چاردیواری میں جھانک لو۔" بالآخر اس نے کہا۔

"تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا اور لنگڑاتے ہوئے قبرستان کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ مکرم اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ اچانک بوڑھا رکا اور چیخ کر ایک قبر کے قریب بیٹھ گیا۔ مکرم بھی ٹھہر گیا۔

"تمہاری تلاش میں مَیں کہاں کہاں نہیں بھٹکا۔ کس کس جگہ تمہیں تلاش کیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم اتنی گہری' اتنی میٹھی نیند میں ہو۔"

مکرم کی نگاہ بے اختیار کتبے کی طرف اٹھ گئی۔

"سیّدہ سکینہ بتول بنت جہانیاں شاہ۔"

وہ اس کے بابا جان کی پھوپھو کی قبر تھی۔ بوڑھا آنسو بہا رہا تھا' مکرم سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ

خوشی کے آنسو تھے یا غم کے۔ اسے اپنی تلاش کی تکمیل کی خوشی تھی یا پا کر کھو دینے کا غم۔

"مجھے یہاں کھڑے رہنے کا کوئی حق نہیں ہے' اس بوڑھے کو اپنی خوشیوں اور غموں کے ساتھ تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔" اس نے سوچا اور واپسی کے لیے پلٹنے لگا۔

"جیسے تم نے بچھڑے ہوؤں کو ملایا ہے' اس طرح مولا تم بچھڑے ہوؤں کو ملائے۔" بوڑھے نے اس سے کہا۔

مکرم حویلی میں واپس چلا آیا۔ اس کا دل بہت اداس تھا۔ اسے لگ رہا تھا' جیسے اچانک ہی وہ ونڈر لینڈ میں داخل ہو گیا ہو۔ اس جگہ اور اس میں بسنے والوں کو اس نے کبھی اس رخ سے تو دیکھا ہی نہیں تھا۔

"یہ تو طے ہے کہ عبداللہ کو قتل نہیں کرنا' مگر یہ قتل روکا کیسے جائے؟" اپنے کمرے میں آ کر اس نے سوچا۔

"کیا ماہ بانو کو آزاد کر دوں تاکہ وہ جا کر عبداللہ کو اس منصوبے کے متعلق خبر دے دے؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ پچھلی مرتبہ اسے معلوم ہوا تو نقصان ہم نے ہی اٹھایا تھا۔ یوں دشمنی ختم ہونے کے بجائے بڑھے گی' پھر کیا کیا جائے؟ جو کچھ بھی کرنا ہوا وہ ہماری طرف ہی کرنا ہوگا۔ بھائیوں کو کسی بات یا دلیل سے قائل کرنا' وہ بھی اس قدر مختصر مدت میں ممکن ہی نہیں۔"

سوچ سوچ کر اسے خیال آیا۔

"اگر اپنی حویلی میں پریشانی پیدا کر دی جائے تو سب اسی میں الجھ جائیں گے اور قتل کا منصوبہ التوا میں پڑ جائے گا۔ تب تک اتنا موقع تو ہوگا کہ بھائیوں کو قائل کیا جا سکے۔"

یہ خیال آتے ہی وہ اپنا ریوالور لے آیا۔

☆=====☆=====☆

خادم حسین ماہ بانو کی طرف سے سخت پریشان تھا۔ مولوی صاحب کو تو اس نے بہت سی تسلیاں اور دلاسے دے کر لاہور بھجوا دیا تھا مگر خود اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ تو اس طرح غائب ہوئی تھی کہ اپنے پیچھے کوئی سراغ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کبھی وہ سوچتا تھا کہ کسی نے اسے اغوا کر لیا اور کبھی یہ خیال آتا کہ شاید وہ لاہور چلی گئی ہو۔

مگر اسے اغوا کون کر سکتا تھا؟ اس نے اردگرد کے پانچ گاؤں کی تلاشی لے لی تھی۔ گاؤں میں ہونے والی اغوا کی وارداتوں کا کچھ نہ کچھ پس منظر ایسا ضرور ہوتا ہے' جس کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچتی ہے' پر یہاں ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔

اور وہ اتنی غیر ذمہ دار بھی نہیں تھی کہ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر مغرب کے وقت لاہور کے لیے ایسے نکل پڑے کہ اس کے پاس پیسے بھی نہ ہوں۔ اس کا تمام تر سامان بھی یہیں پڑا ہو۔ سارا وقت ریشماں کے ساتھ گزارنے کے باوجود اس نے اس سلسلے میں اسے کچھ نہ بتایا ہو۔

یہ معاملہ بے حد الجھا ہوا تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیسے سلجھائے۔ ایک مرتبہ پھر ریشماں سے بات کرنے کی غرض سے وہ اماں جان کے کمرے کی طرف چل دیا۔

اماں جان اس وقت عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں۔ ریشماں انہی کے بستر پر سو رہی تھی۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' میں نے دوا دے کر سلا دیا ہے۔ اسے تنگ مت کرنا۔'' اماں جان نے کہا۔

''مگر اماں جان یہ معاملہ بہت ضروری ہے۔ ماہ بانو کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بارے میں ریشماں سے پوچھوں۔ شاید اپنی گفتگو کے درمیان اس نے کسی ایسی بات کا ذکر کیا ہو جس سے کچھ اندازہ ہو سکے۔''

''صبح دیکھی جائے گی۔ اس وقت اسے تنگ مت کرو۔''

''اماں! یہ آپ کہہ رہی ہیں؟ یہاں ایک لڑکی کی زندگی اور عزت کا معاملہ ہے۔ آپ تو ایسے کبھی نہیں کرتی تھیں۔'' اسے ان کی بے نیازی سے تعجب ہوا۔

''میرے لیے میری اولاد سب سے زیادہ اہم ہے اور بس۔'' انہوں نے قطعی انداز میں کہا۔

''پتا نہیں بابا جان کب آئیں گے؟'' وہ جھنجلا گیا۔ ''کتنی پریشانیاں اکٹھی نازل ہو گئی ہیں۔ بابا جان ہر معاملہ سنبھال لیتے ہیں اور مجھ سے ایک مسئلہ حل نہیں ہو رہا۔ ابھی صبح کا بھی پروگرام ہے اور مکرم اور نوازش دونوں سارا دن سے غائب ہیں۔ اماں' ریشماں ہی نہیں' میں بھی آپ کی اولاد ہوں۔ اگر میں ماہ بانو والا مسئلہ حل نہ کر سکا تو سوچوں گا کہ بابا جان کی گدی پر بیٹھنے کا میرا کوئی حق نہیں ہے' اور میں خود اس گدی سے دستبردار ہو جاؤں گا۔''

''اللہ نہ کرے۔ کیسی باتیں کر رہے ہو خادم!'' اماں جان نے دل تھام لیا۔

''سچ کہہ رہا ہوں۔''

اماں جان نے لاچاری سے پہلے اس کی طرف دیکھا پھر ریشماں کی طرف۔ ابھی ریشماں کی طرف ان کا ہاتھ بڑھا بھی نہیں تھا کہ فائر کی آواز گونجی۔

''یا اللہ خیر!'' اماں جان نے ہول کر کہا۔

''گولی یہیں کسی کمرے میں چلی ہے۔'' خادم حسین نے کہا اور تیزی سے ان کی خواب گاہ سے نکل گیا۔

باہر نکل کر یہ پتا چلانا مشکل نہیں تھا کہ گولی مکرم کی خواب گاہ میں چلی تھی۔ وہ وہاں پہنچا تو پہلے ہی بہت سے ملازمین وہاں موجود تھے۔ مکرم کا بایاں بازو خون میں لت پت تھا اور وہ ہونٹ بھینچ کر اپنی کراہیں ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا ریوالور بھی پڑا ہوا تھا۔

''فوراً گاڑی نکالو۔'' خادم حسین نے چلا کر ملازمین سے کہا اور خود مکرم کو اٹھا کر باہر لے گیا۔

''میں چل سکتا ہوں۔'' مکرم نے نقاہت سے کہا۔

''نہیں' تمہارا بہت خون بہہ رہا ہے۔'' وہ بولا۔

آگے پیچھے گن مینوں کی گاڑیوں کے درمیان ان کی جیپ تیزی سے ملتان کی طرف جا رہی تھی۔

''یہ ہوا کیسے مکرم؟'' خادم حسین نے پوچھا۔

''میں ریوالور صاف کر رہا تھا' گولی چل گئی۔''

''کیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہارے لیے ریوالور کوئی نئی اور انوکھی چیز تو نہیں ہے کہ صفائی کرتے ہوئے چل جائے۔''

''مجھے پتا نہیں چلا۔'' مکرم نے کہہ کر آنکھیں موند لیں۔

اس کے بازو میں گزرتے پل کے ساتھ درد شدید ہوتا جا رہا تھا۔ خون سے اس کی قمیص سرخ ہو چکی تھی۔ بری طرح سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

اسپتال میں مرہم پٹی کر کے اور دوائیں دے کر اسے فارغ کر دیا گیا۔ زخم گہرا تھا مگر تشویشناک بات نہیں تھی۔ واپس آتے ہوئے خادم حسین خاموش تھا۔

''کیا ہوا؟ آپ خاموش کیوں ہیں بھائی؟'' مکرم نے کہا۔

''ہر کام غلط ہو رہا ہے۔ بابا جان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو وہ بھی نہیں ہو رہا۔ پہلے ہی کم پریشانیاں تھیں کہ اب تم بھی زخمی ہو گئے ہو۔ ریشماں الگ بخار میں پھنک رہی ہے۔ ماہ بانو ایسے غائب ہے' جیسے وہ کبھی یہاں آئی نہیں ہو۔ میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں' پھر عبداللہ کے قتل کا منصوبہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ بابا جان آ کر پوچھیں گے تو ان کے سامنے اپنی پریشانیوں کی ایک لمبی لسٹ رکھنی پڑ جائے گی۔ شاید چار دن رہ گئے ہیں۔ زمینوں کے مقدمے کا فیصلہ ہونے میں۔ یہ فیصلہ بھی ہمارے خلاف ہے۔ کھڑی فصلوں والی زمینیں حیدر علی کو دینے کے خیال سے ہی میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ عبداللہ کو عدالت کے فیصلے سے قبل ٹھکانے لگانا بہت ضروری ہے۔''

مکرم خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

''افسوس تو مجھے یہ ہے مکرم کہ تم نے بجائے مجھے سپورٹ کرنے اور میرا ساتھ دینے کے' مجھ سے جھوٹ بولا۔ تم ریوالور صاف کرتے ہوئے زخمی نہیں ہو سکتے۔ وجہ کچھ اور ہے' جو تم نے مجھے نہیں بتائی۔ تم جانتے ہو کہ اس وقت تمہارے زخمی ہو جانے کا کیا مطلب ہے؟''

مکرم کھڑکی سے اندھیرے میں پیچھے بھاگتے ہوئے درخت دیکھنے لگا۔

''میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے؟''

''جواب تو مجھے دینا ہی ہے' مگر میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی صحیح لفظوں کے انتخاب پر توجہ نہیں دی۔''

''تمہیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے تم سے ادبی شہ پارہ تخلیق نہیں کروانا۔ سیدھے سیدھے لفظوں میں میرے سوال کا جواب دے دو۔'' خادم حسین نے کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ عبداللہ شاہ کو قتل کیا جائے اور نہ ہی میں اسے قتل ہونے دوں گا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری جواب طلبی اتنی جلدی ہو جائے گی۔ خیر اچھا ہی ہے۔''

خادم حسین نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم اپنے حواسوں میں تو ہو؟''

''اب ہی حواسوں میں آیا ہوں۔ میں بہت سی حقیقتوں سے بے خبر تھا' مگر جب ان کا علم ہوا تو میں نے سوچا کہ یہ سب کیا ہے' کیوں ہے؟ میری نفرت' میری محبتوں کے مقابلے میں بہت ادنیٰ ہے' اسی لیے میری محبتیں نفرتوں پر غالب آ گئی ہیں۔

آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ ریشماں آپی حویلی میں کس گھٹن کا شکار ہیں۔ بابا جان نے خود ان کی منگنی کی تھی عبداللہ کے ساتھ اور یہ کوئی یک طرفہ فیصلہ نہیں تھا۔ اس میں حیدر علی کی مرضی بھی شامل تھی پھر اب ریشماں آپی کو ان کے حق سے محروم کر دینا کوئی انصاف کی بات نہیں ہے۔ کس قدر ظلم ہو گا ان کے ساتھ اگر سخاوت بابا کے گھر بیٹے کی ولادت ہوئی اور ان کی شادی ان سے برسوں چھوٹے بچے کے ساتھ کر دی گئی۔ کیا خوشیوں کے لیے ان کا دل نہیں چاہتا ہو گا؟ کیا ہماری طرح ان کی خواہشیں نہیں ہوں گی کہ ایک گھر کی بھرپور خوشیاں دیکھیں؟

آپ کو ماہ بانو پسند آ گئی' سبط نے زینی کو منتخب کر لیا۔ سب نے اپنی مرضی چلائی' مگر ہم میں سے کسی نے یہ جاننے کی زحمت بھی نہیں کی کہ کیا انہیں بھی کوئی پسند ہے یا نہیں؟ ہم اپنی زندگی کے متعلق دوسروں کے کیے ہوئے فیصلے پسند نہیں کرتے' مگر ان کے لیے اس بارے میں کسی نے نہیں سوچا' ان کی زندگی کی لگامیں آج بابا جان کے ہاتھ میں ہیں' کل آپ کے ہاتھ میں ہوں گی۔ کیا کبھی ایسا وقت آئے گا کہ وہ اپنی خوشیوں کے لیے خود کوئی فیصلہ کر سکیں گی؟

کوئی اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہو یا نہیں' کسی کی سوچ پر تو پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ وہ بھی اپنے بارے میں سوچتی ہیں۔ انہیں بھی ایک گھر کی آرزو ہے اور ان کے خوابوں کے اس گھر کی تکمیل عبداللہ شاہ کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔''

خادم حسین نے گاڑی سڑک کے کنارے کچے پر روک دی۔

''یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟''

''جانا جا سکتا ہے' اگر ہم اپنی دنیا سے ہٹ کر کبھی کسی اور کی طرف بھی دیکھیں' میں ذرا

موٹے دماغ کا آدمی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی اور باریک باتیں سمجھ میں نہیں آتیں' ورنہ یہ سب بہت پہلے ریشماں آپی کی آنکھوں اور ان کے چہرے سے بھی پڑھ سکتا تھا۔ مگر مجھے ضرورت پڑی کہ وہ اپنی زبان سے بھی اس بات کا اقرار کریں اور انہوں نے کیا۔'' مکرم نے کہا۔

''اس نے اپنے منہ سے کہا یہ؟'' خادم حسین نے ہولے سے پوچھا۔

خادم حسین کے ہاتھ سٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموشی کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا' پھر سگریٹ سلگا لیا۔ مکرم چپ چاپ اسے سگریٹ کے کش لیتے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے سگریٹ کا بقیہ حصہ باہر کی طرف اچھال دیا۔ اندھیری ٹھنڈی سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ ان کے باڈی گارڈز کی گاڑیاں ان سے کچھ فاصلے پر رکی ہوئی تھیں۔

''ریشماں کی زندگی کی لگامیں بابا جان کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ درست ہے مگر یہ درست نہیں کہ کل میرے ہاتھ میں ہوں گی۔'' خادم حسین نے کہنا شروع کیا۔

''میں اس بات کا قائل ہی نہیں ہوں' لیکن میں بابا جان کے اختیارات کو بھی چیلنج نہیں کرنا چاہتا۔ حویلی کی بعض روایتوں سے مجھے شدید اختلاف ہے اور بعض کو میں بہت پسند کرتا ہوں۔ بہر حال پرسنل لیول پر میری پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے اس سیٹ اَپ پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا' جو روایتیں قائم ہیں' وہ ویسے ہی قائم رہیں گی۔''

''مطلب آپ اس کے لیے تیار نہیں ہیں؟'' مکرم نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کیا نہیں' فی الحال اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے' اگر بابا جان راضی ہو جاتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے' اگر نہیں تو سب کو ان کی یہ بات بھی تسلیم کرنی ہو گی۔''

''مجھ سے یہ امید مت رکھیں کہ میں ان کے ایسے کسی حکم کی پابندی کروں گا۔''

''ہم میں سے کوئی بھی اس سیٹ اَپ کو بدل نہیں سکتا مکرم!'' خادم حسین نے کہا۔

''مجھے نہ تو اس سیٹ اَپ سے دلچسپی ہے اور نہ اس بات سے کہ اس میں کون کیسے کیسے کچلا جا رہا ہے' میری دلچسپی صرف اماں جان اور ریشماں آپی سے ہے۔ مجھے کوئی انقلابی بننے کا شوق نہیں ہے۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ ان کی آنکھوں میں' چہرے پر کبھی دکھ کی پرچھائیاں نہ دیکھوں۔'' اس نے قطعی انداز میں کہا۔

خادم حسین سٹیئرنگ کو انگلیوں سے بجاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے سبط اور اب ریشماں۔ قدرت بھی بعض اوقات عجیب و غریب کھیل کھیلتی ہے۔''

مکرم خاموش رہا۔

''وراثت میں جو گدی میرے حصے میں آئی ہے' وہ پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ تم اس سیٹ اَپ میں صرف مخصوص افراد کو بچانا چاہتے ہو۔ جبکہ میری نگاہ پورے سسٹم پر ہے۔ حاکم' محکوم' آقا

اور غلام کا یہ سیٹ اَپ ہماری اور ہماری حویلی کی بقا کے لیے ضروری ہے اور جب بات بقا کی آ جاتی ہے تو کچھ کڑوے گھونٹ بھی پینے پڑتے ہیں۔ حویلی کے اندر کا سیٹ اَپ یہی کڑوے گھونٹ ہیں۔ اگر انہیں بدل دیا نا مکرم! تو ساری عمارت ڈھے جائے گی۔''

''بہنوں کی شادیاں نہ کر کے' ان پر سورج کی روشنی اور ہوا تک بند کر کے ہم کس سیٹ اَپ' کس سسٹم کو بچا رہے ہیں؟ کیا یہ سسٹم انہی باتوں پر کھڑا ہے؟ آپ کو جو کڑوے گھونٹ پلوانے ہوں' اپنی بیٹی کو پلوا دینا۔ میری بہن کے ساتھ مزید یہ سلوک نہیں ہو سکتا۔'' مکرم کا انداز فیصلہ کن تھا۔

خادم حسین نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ وہی ضدی اور اپنی بات منوانے کا عادی مکرم تھا جو عبداللہ کو قتل کرنے کے بجائے صرف ریشماں کی خواہش پوری کرنے کی خاطر خود کو گولی مار بیٹھا تھا۔ اسے کچھ کہنا یا سمجھانا فضول تھا۔ اس معاملے میں تو خود خادم حسین نے بھی اپنی رائے محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ اسے بابا جان کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ جو بھی فیصلہ کرتے' اس میں اتنی صلاحیت تھی کہ اس فیصلے کو سب سے منوالیتا۔ ابھی مکرم سے خواہ مخواہ الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا' اس لیے اس نے چاہا کہ اس بات کو فی الحال ہنسی مذاق میں اڑا دے۔

''مجھے یقین ہے کہ اگر کبھی میری کوئی بیٹی ہوئی تو تم اس کی خاطر بھی یہی سب کر گزرو گے جو آج ریشماں کے لیے کر رہے ہو' مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے میری شادی ہو اور یہ تب تک تقریباً ناممکن ہے' جب تک ماہ بانو کا پتا نہیں چل جاتا۔'' اس نے شگفتگی سے کہا۔

''ماہ بانو؟'' مکرم کو اچانک اس کا خیال آیا۔ ''ہاں وہ بہت اچھی لڑکی ہے بالکل ویسی جیسی آپ چاہتے ہیں۔ اس میں واقعی بہت شان اور تمکنت ہے۔ برے سے برے حالات میں بھی وہ جھکی نہیں ہے' آپ کو پتا نہیں کیسا لگے گا' مگر مجھے اس کا یہ ضدی پن اچھا لگا ہے۔ اس میں ہر وہ خوبی ہے' جو حویلی کی بہو بننے کے لیے ضروری ہو سکتی ہے۔

پتا ہے جب میں نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا تو شدید پیاس کے باوجود اس نے وہ پانی پھینک دیا' ایک قطرہ نہیں پیا اور آپ کو نہیں معلوم کہ اس کا لہجہ کتنا سچا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اس کا ایمان کتنا کامل ہے۔ مجھے ریشماں آپی کے بعد دو ہی لڑکیاں اچھی لگی ہیں' ایک زینی اور دوسری ماہ بانو۔ مجھے نہیں معلوم کہ زہرا کیسی ہے' مگر میری زندگی کی بڑی خواہشوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کی شادی ماہ بانو سے ہی ہو۔''

خادم حسین بے یقینی اور تعجب کے عالم میں اسے دیکھے جا رہا تھا' اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔

''اسے تم نے؟ مکرم تم نے؟'' وہ بات پوری نہ کر سکا تھا۔

''ہاں!'' اس نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا دیا۔

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس کے بارے میں کیا سوچتا ہوں؟ اس کے بارے میں کتنا پریشان تھا میں؟ یہ کیسے کر سکتے ہو تم؟'' وہ مجروح لہجے میں بولا۔

''جو آپ سوچ رہے ہیں' ویسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے آپ سے حقیقت چھپائے رکھی' مگر اس کے اغوا کا مقصد وہ نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''پھر کیا تھا؟'' خادم حسین نے اپنے اندر اٹھتے ہوئے غصے کو بہت مشکل سے قابو کیا۔

''وہ عبداللہ کے قتل کے منصوبے کی خبر دینے جا رہی تھی۔ اندھیرے میں مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ وہ کون ہے۔ ڈیرے پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ ماہ بانو تھی۔ وہاں وہ بالکل محفوظ ہے۔ میں نے نوازش کو سختی سے اس بات کی تاکید کی تھی۔ اس کی وہاں پر موجودگی کے متعلق میرے اور نوازش کے علاوہ کوئی بھی واقف نہیں ہے۔''

وہ کچھ بھی نہ سمجھ پایا۔

''مگر اسے اس بات کی خبر کیسے ہوئی؟''

''اسے یہ بات ریشماں آپی نے کریمن کے ذریعے بتائی تھی۔ ریشماں آپی کو کریمن نے اور کریمن کو رمضان نے بتایا تھا۔'' مکرم نے کہا۔

''تم نے اس بارے میں مجھے کیوں نہیں بتایا؟ تمہیں معلوم تھا میری پریشانی کے متعلق اب کہاں ہے وہ؟''

''وہ وہیں ہے' آپ کو کچھ نہ بتانے کی وجہ یہ تھی کہ میں اس بارے میں کسی فیصلے تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ ریشماں آپی' عبداللہ کو بچانا چاہتی تھیں اور غالباً انہی کی خواہش پر وہ اسے یہ خبر دینے جا رہی تھی۔ میرے لیے یہ انکشاف خاصا تکلیف دہ تھا۔ جو کچھ اب جانتا ہوں' وہ پہلے جانتا تو شاید مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔''

''تم نے بہت برا کیا مکرم۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا' اترو نیچے۔'' خادم حسین کے لہجے میں غصے سے زیادہ دکھ تھا۔

''آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا؟ میں سچ کہہ رہا ہوں' میں تو صرف......!''

I Don't want explanations

''تم بھی صفائیاں مت پیش کرو۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

مکرم اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور باڈی گارڈز کی پجیرو کی طرف بڑھ گیا۔

خادم حسین اپنی نسان پٹرول اسٹارٹ کر کے سڑک پر لے آیا۔

نیاز پور پہنچ کر خادم حسین حویلی کی طرف جانے کے بجائے ڈیرے کی طرف گاڑی لے گیا۔ مکرم بھی باقی باڈی گارڈز کو اتار کر صرف ڈرائیور کے ساتھ ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ دونوں جیپیں تقریباً ساتھ ساتھ ہی وہاں پہنچی تھیں۔ خادم اسے نظر انداز کر کے اندر بڑھ گیا۔

"تم جاؤ۔" مکرم نے ڈرائیور سے کہا اور خود بھی اندر چلا آیا۔

نوازش کمرے میں صوفے پر لیٹا پرائم اسپورٹس سوئمنگ کے مقابلے دیکھ رہا تھا۔ خادم حسین اور اس کے پیچھے مکرم کو آتے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"آئیں بھائی' یہ کس بور کام پر لگا دیا ہے آپ نے؟"

"کہاں ہے بانو؟" خادم حسین کے تیور کچھ اچھے نہیں تھے۔

نوازش نے الجھن زدہ نگاہوں سے مکرم کی طرف دیکھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ بانو کہاں ہے؟" لہجہ بہت سخت تھا۔

"خادم بھائی! کو چابی دے دو نوازش!" مکرم نے کہا۔ پھر خادم حسین سے مخاطب ہوا۔

"وہ ماسٹر بیڈ روم میں ہے۔"

نوازش نے چابی اس کی طرف بڑھا دی اور بولا۔

"میں نے اسے کھانا پہنچا دیا تھا' مگر اس نے نہیں کھایا۔"

خادم حسین تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور لاک میں چابی گھما دی۔ دروازہ کھلا تو ماہ بانو نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ خادم حسین اسے دیکھ کر وہیں رک گیا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ وہ صوفے پر دونوں ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ چہرے پر نقاہت اور تھکاوٹ کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ گالوں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ بال الجھے ہوئے' بکھرے ہوئے تھے۔ پہلے چند لمحے وہ اسے' مکرم اور نوازش کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس نے سر جھٹک کر ذہن پر چھائی دھند کو دور کرنا چاہا۔ جونہی اسے احساس ہوا کہ وہ تینوں وہاں موجود تھے' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفے کے پیچھے چلی گئی۔ خادم حسین اس کی طرف بڑھا۔

"میرے نزدیک مت آنا۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ سر جھٹک کر دوبارہ آنکھوں کے آگے آتے اندھیرے کو دور کرنا چاہا' کنپٹیاں سہلائیں' مگر نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور وہیں قالین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

زینی کلیرنس کروا کے باہر نکلی تو سامنے ہی بابا جان کھڑے ہوئے تھے' وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

"بابا جان' میں آپ سے بات نہیں کرتی۔ آپ سب مجھے بھول گئے تھے' کسی کو یاد نہیں آئی میری۔" وہ رو پڑی۔

"تمہیں بھول سکتا ہے ہم میں سے کوئی؟" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میں کہتی رہی کہ وہاں آ جائیں' مگر میری بات مانی کسی نے؟ آپ کو پتا ہے کہ میں سب کو

کتنا مِس کر رہی تھی؟ مگر آپ سب کو بھلا کیا پروا؟ میری تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے ناں۔" وہ مسلسل شکوہ کر رہی تھی۔

"ہم سب نے بھی تمہیں بہت مِس کیا ہے بیٹا۔ گڑیا اور تمہیں' دونوں کو...... مگر کیا سارا سمندر یہیں بہانے کا ارادہ ہے' گھر نہیں چلنا؟"

اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کیں ان کی طرف دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بابا جان! میں اتنی خوش ہوں یہاں آ کر' میرا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ پلک جھپکتے میں یہاں آ جاتی۔ راستہ کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ اٹلانٹک اوشن تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں رہا تھا۔ میں تو تھک گئی اتنا سمندر دیکھ کر۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اچھا لگتا' مگر اب نہیں' ابھی تو غصہ آ رہا تھا کہ راستہ ختم کیوں نہیں ہو رہا۔" وہ حسبِ عادت تیز تیز بول رہی تھی۔

کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"اماں جان اور بھائی کہاں ہیں؟"

"وہ وہیں گاؤں میں ہیں۔" بابا جان نے جواب میں کہا۔

"پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ مجھے بھولے نہیں ہیں۔ یہ پروا ہے آپ لوگوں کو میری۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ آتے ہی آپ سب کو دیکھوں گی۔" اس نے منہ پھلا لیا تھا۔

"بیٹا' ایسی بات نہیں ہے' سب ہی تمہیں لینے آنا چاہتے تھے' مگر تمہاری اماں جان کا بلڈ پریشر ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے انہیں منع کر دیا تھا۔ آنے سے اور پھر ظاہر ہے کہ کسی کو تو ان کے پاس رہنا تھا ناں!" انہوں نے پیار سے کہا۔

وہ جو کل تک کہہ رہے تھے کہ کسی نے زینی کے اس طرح چلے آنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی ہے' اسے دیکھ کر وہ خود ہی اپنی یہ بات بھول گئے تھے۔ تقریباً چھ سات ماہ ہو گئے تھے اسے دیکھے ہوئے۔

"ابھی ہم گاؤں جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں' ابھی یہاں ہی گھر چلیں گے۔ میں سفر سے کچھ تھک گیا ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد واپس جائیں گے۔ تم فون پر اپنی اماں اور بھائی سے بات کر لینا۔"

"ہاں' مجھے سبط کو بھی فون کرنا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ پہنچتے ہی......" وہ پُرجوش انداز میں کہتے کہتے رک گئی۔ یہ سوچ کر کہ شاید بابا جان کو اس کی بات اچھی نہ لگے۔

"ایک تو یہ بہت مشکل ہے' یہاں ہر بات اتنا سوچ سوچ کر کرنا پڑتی ہے۔ بابا جان' جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں' مگر اماں جان کا تو بلڈ پریشر سبط کا نام سنتے ہی ہائی ہونے لگتا ہے۔" زینی نے سوچا۔

"گڑیا ٹھیک ہے؟" بابا جان نے پوچھا۔

"جی وہ بالکل ٹھیک ہے۔ پتا نہیں کیا بات ہے بابا جان! وہ اتنا محسوس نہیں کرتی' سب کی غیر موجودگی کو' کرتی ہے مگر کم' مجھ سے تو وہاں کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ سب اتنے یاد آتے تھے' اتنا ڈر بھی لگتا تھا کہ کہیں یہاں بھائی کو خدانخواستہ کچھ ہو نہ جائے۔ ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔ یہ سب سوچتی تھی تو پڑھا بھی نہیں جاتا تھا۔ کبھی میں چاہتی ہوں کہ گڑیا جیسی ہو جاؤں وہ ہر جگہ ایڈجسٹ کر جاتی ہے۔"

کار گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ زینی نے گھر میں گھستے ہی پہلا کام یہ کیا کہ فون اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ بابا جان اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اس نے سبط' زہرا' اماں جان اور عبداللہ سے بھی بات کی' پھر اٹھ کر بابا جان کے کمرے میں چلی آئی' جو چائے پی رہے تھے۔

"میں نے بات کر لی بابا جان' اماں جان کہہ رہی تھیں کہ اُڑ کر گاؤں پہنچ جاؤ۔" اس نے بہت خوشی اور شوق سے بتایا۔

"بس بیٹا! ابھی تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔" وہ بولے۔

"میں نے اماں جان کو بتایا ہے کہ آپ تھکے ہوئے ہیں۔ اماں کہنے لگیں کہ پھر آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔"

زینی کی بات منہ ہی میں تھی کہ ملازم دروازے پر نمودار ہوا۔

"ہاں نور محمد! کیا بات ہے؟" بابا جان نے پوچھا۔

"شاہ صاحب! ایک خبر ہے۔"

"کیا خبر ہے؟"

"پیر صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ کلینک میں داخل ہیں۔"

"کیا؟" بابا جان اٹھ کھڑے ہوئے۔

زینی کا رنگ فق ہو گیا۔

"بڑے بابا جان کو...... اوہ گاڈ! کیسی حالت ہے ان کی۔"

"ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے جی اور انہوں نے کسی کو بھی یہ بات بتانے کے لیے منع کیا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بڑے شاہ صاحب خادم حسین شاہ کو بھی علم نہیں ہے۔" نور محمد نے بتایا۔

"اب کیا ہوگا بابا جان! سبط سنے گا تو بہت پریشان ہوگا۔ وہ تو ہے بھی اتنی دور۔"

"زینی بیٹا! تم آرام کرو' میں ابھی آتا ہوں۔" بابا جان نے کہا۔

"آپ بڑے بابا جان کے پاس جا رہے ہیں ناں!"

"ہاں' میں جلدی آ جاؤں گا۔" وہ بولے۔

"میں بھی کے ساتھ چلوں گی بابا جان!" وہ فوراً تیار ہو گئی۔

"پتا نہیں وہاں کیسے حالات ہوں گے اور پھر تم تھکی ہوئی ہو' اتنا لمبا سفر کیا ہے' اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں تمہیں لے جاؤں گا۔"

"میں بالکل تھکی ہوئی نہیں ہوں اور بابا جان! حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں' ہمارا فرض ہے کہ ایسے وقت میں ان کے پاس جائیں اور ان کی خدمت کریں۔ اگر یہاں ریشماں آپی ہوتیں تو کیا وہ نہ جاتیں؟ اور پھر سبط سنے گا تو کیا اسے اچھا لگے گا کہ میں یہاں ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس نہیں گئی۔"

اس نے انہیں قائل کرنے کے لیے پورے جوش سے کہا۔

بابا جان نے ایک نظر اسے دیکھا پھر ہتھیار ڈال دیے۔ "چلو۔"

"تھینک یو۔" وہ خوش ہو گئی۔

ان کے ذہن میں کہیں یہ خیال بھی ابھر رہا تھا کہ شاید اسی طرح حالات بہتر ہو جائیں۔ شاید ان سب کو ان کی کھوئی ہوئی خوشیاں مل جائیں۔ شاید زینی کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ شاید یہ آگ بجھ جائے' جو عبداللہ کے دامن تک پہنچ چکی ہے۔

"مریض کے پاس آپ جا تو سکتے ہیں' مگر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان سے زیادہ باتیں مت کیجیے اور خاص کر ایسی کوئی بات مت کیجیے' جو ان کے لیے اچانک بہت بڑی خوشی یا شاک ثابت ہو۔" ڈاکٹر نے ہدایت کی۔

وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ زینی نے بابا جان کی آستین پکڑ رکھی تھی اور ان کے پیچھے قدرے چھپی ہوئی تھی۔ پیر صاحب کی آنکھیں بند تھیں۔ اندر ان کے دو خاص ملازمین بھی موجود تھے۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ ایک دم مستعد ہو گئے تھے۔ وہ دونوں ہی مسلح تھے۔ بابا جان انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھے اور کتنی دیر تک خاموشی کے ساتھ پیر صاحب کو تکتے رہے۔

انہوں نے کبھی بھی اپنے بھائی کے ساتھ جان بوجھ کر برائی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی' مگر حالات نے ان کے درمیان اتنی گہری خلیج حائل کر دی تھی کہ ملنا تو دور کی بات' وہ ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

لیکن آج ان کے دل میں کچھ پگھل سا رہا تھا۔ دوریاں کتنی گہری سہی' پر وہ دونوں سگے بھائی تھے۔ ان کا خون ایک تھا' وہ وقت بھی تھا جب وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے جان تک قربان کر سکتے تھے۔

اب تک وہ اپنے بچوں کے سامنے اپنے بھائیوں کا پردہ رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ان کی غلط سے غلط بات کی تشریح اس طرح کرتے تھے کہ بظاہر وہ بالکل بے قصور دکھائی دینے لگتے تھے' محبت تو اب بھی ان کے دل میں بہت تھی' مگر حالات ایسے تھے کہ انہیں یہ محبت اپنے دل میں دفن کر دینی پڑی تھی۔ ان کے سامنے اپنی اولاد اور اس کی سلامتی بھی تو تھی۔

ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب بھی وہ ملنے تو آ گئے تھے' مگر کیا ضروری تھا کہ ملنے کے لیے کسی حادثے' کسی دکھ' کسی تکلیف کا انتظار کیا جائے۔

وہ چند قدم آگے بڑھے اور جھک کر پیر صاحب کے پیروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ انہیں احساس بھی نہیں تھا کہ آنسو قطرہ قطرہ ان کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو کا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا مگر اس سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب اس کی نقاہت اور کمزوری بہت حد تک ختم ہو چکی تھی۔ اپنے اردگرد اسے کبھی کبھار ہلچل کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی گلاس زور سے میز پر رکھا جاتا اور آواز آتی۔

''چپ' آہستہ اسے ڈسٹرب مت کرو۔''

کبھی کمرے کا دروازہ کھلنے' بند ہونے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس وقت کہاں تھی۔

کمرے کا دروازہ ایک مرتبہ پھر کھلنے کی آواز آئی تھی۔

''آہستہ بند کرنا دروازہ۔'' دبی دبی سی مردانہ آواز آئی۔

یہ آواز پہلے بھی وہ سن چکی تھی۔ ہر آنے جانے والے کو خاموشی کی ہدایت دینے والا یہی شخص تھا' جس کی آواز وہ پہچان نہیں پائی تھی۔

''اماں جان کو بتا آئے ہو کہ تمہیں زیادہ چوٹ نہیں لگی؟''

اسی آواز نے غالباً آنے والے سے پوچھا تھا۔

''جی۔'' دوسری آواز آئی۔ ''انہیں تسلی دینے میں ہی دیر ہوگئی۔''

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی پھر آنے والے نے پوچھا۔

''اب طبیعت کیسی ہے اس کی؟''

''ہوش نہیں آیا اب تک۔''

''ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ کچھ دیر تک آ جائے گا۔''

دوبارہ خاموشی کا ایک وقفہ آیا پھر آنے والے نے کہا۔

''میں آپ سے سوری کرنے آیا ہوں' مگر اب تو آپ کو میری سچائی پر یقین آ جانا چاہیے۔ دیکھیں بھائی یہ بالکل محفوظ ہے۔''

''اس بات پر تو میں یقین کر لوں گا' مگر اور کون کرے گا؟ آج اسے یہاں آئے ہوئے ایک دن اور دو راتیں ہو چکی ہیں۔ میں نے اس کے نانا اور نانی کو تو شہر بھجوا دیا ہے' مگر کیا اس سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ آپ کو تو یقین ہے ناں اور یہی بات اہمیت رکھتی ہے۔ دنیا تو اچھے اچھوں کو نہیں چھوڑتی۔'' آنے والے نے کہا۔

''یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہم دنیا کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

''بس خادم بھائی یہی تھا آپ کا جذبہ؟ قصور میرا ہے اس کا نہیں اور آپ تو اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر پا رہے' جس میں یہ بے قصور ہے۔''

''میں نے یہ نہیں کہا' میں اب بھی اس کے لیے ایسے ہی سوچتا ہوں' جیسے اس سے پہلی مرتبہ ملنے کے بعد سوچا تھا۔ میں اب بھی اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور اسی لیے یہ بات میرے لیے بہت تکلیف دہ ہوگی کہ کوئی اس پر انگلی اٹھائے جو بالکل بے گناہ ہے۔''

''اس نے کھانا بھی نہیں کھایا' پانی تک نہیں پیا۔ نوازش اپنی جگہ شرمندہ ہے کہ اس نے دوسری مرتبہ اس سے کھانے کا پوچھا بھی نہیں۔'' آنے والے نے کہا۔

''کوئی فرق نہ پڑتا اس سے بھی۔ کمرے میں ریفریجریٹر موجود تھا اور اس میں بہت کچھ تھا کھانے کے لیے۔''

اس گفتگو کے بعد کمرے میں ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی۔

ان کی بات چیت سے ماہ بانو کو یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ کمرے میں اس کے ...اوہ مکرم اور خادم حسین تھے۔ ہر گزرتے پل کے ساتھ وہ خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ...ا کے ذہن پر چھائی دھند بھی ختم ہوتی جا رہی تھی اور وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتی جا رہی تھی

''تو نمائش والے روز خادم حسین کی بات کا مطلب یہ تھا!'' اس نے سوچا۔

''کیا کہہ رہا تھا مکرم اس سے' بس خادم بھائی یہی تھا آپ کا جذبہ؟ اور خود خادم حسین کیا ...ہہ رہا تھا کہ میں اب بھی اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یا خدا! یہ کیا ہو رہا ہے' میری قسمت ...ا ذہنی سکون ہے بھی یا نہیں؟ کتنے امتحانوں سے اور گزرنا ہوگا؟ عبداللہ! تم کہاں ہو؟ پلیز آ ...' کہیں سے آ جاؤ۔'' اس نے سوچا۔

وہ آنکھیں کھولنے کے قابل ہوگئی تھی' مگر کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ بند آنکھیں بھی پناہ کا بہت ...ذریعہ تھیں۔ وہاں کون تھا اور کون نہیں' وہ کہاں تھی' کس حال میں تھی' وہ کچھ بھی دیکھنا' کچھ بھی ...نہیں چاہتی تھی۔

''کاش! یہ صرف ایک بھیانک خواب ہو اور آنکھیں کھلتے ہی ہر منظر بدل جائے۔ میں ...ا اپنی دنیا میں لوٹ سکوں' جہاں یہ تاریک دن رات نہ ہوں' جہاں سب میرے اپنے ہوں' ...ب جو مجھ سے محبت کرتے ہیں' جو میرا خیال رکھتے ہیں' جنہیں میری پروا ہے۔ اماں' ابا جی' ...للہ' میرے سارے دوست۔'' اس نے سسکیاں اپنے اندر دفن کرتے ہوئے سوچا۔

☆=====☆=====☆

نرس دوا لے کر آئی تھی مگر پیر صاحب لینا نہیں چاہتے تھے۔

''بھائی جان دوا لے لیں پلیز!'' بابا جان نے کہا۔

مگر پیر صاحب نے آنکھیں موند لیں۔

''یہ دوا بالکل نہیں لے رہے' اس طرح تو یہ ٹھیک نہیں ہو سکیں گے۔''

زینی جو اب تک بابا جان کی آستین پکڑے بیٹھی تھی' اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لائیں میں دیتی ہوں' میرے ہاتھ سے لے لیں گے۔''

اس نے دوا لے لی اور پیر صاحب کے قریب آ گئی۔ ''پلیز بابا جان! میرے ہاتھ سے تو دوا لے لیں۔ یہی سوچ لیں کہ میری جگہ ریشماں آپی ہیں' کیا وہ برداشت کر سکتی ہیں کہ آپ بیمار رہیں؟ نہیں ناں؟ تو پھر بھلا میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔''

پیر صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ دو آنسو آنکھوں کے گوشوں سے نکلے اور بالوں میں جذب ہو گئے۔ اس نے انہیں بہت احتیاط سے دوا کھلا دی۔ پیر صاحب نے اپنے بستر پر اپنے قریب اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی اور اسے اشارے سے وہاں بیٹھنے کو کہا۔ وہ وہیں ٹک گئی۔ انہوں نے بہت مشکلوں سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ آنسو متواتر بہنے لگے۔

''سب نے بڑے بابا جان کو اتنا خونخوار بنا کر پیش کیا تھا' یہ تو بہت محبت کرنے والے ہیں۔ ان کے وجود سے بھی ویسی ہی خوشبو آتی ہے' جیسی بابا جان سے' ان کے لمس میں بھی وہی شفقت ہے' جیسی بابا جان کے لمس میں ہے۔ ان کی آنکھوں میں بھی ویسی ہی محبت ہے' جیسی بابا جان کی آنکھوں میں ہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ برے ہوں۔'' اس نے سوچا۔

تھوڑی دیر پہلے اس نے دیکھا تھا جب بابا جان نے ان کے پاؤں پکڑ کر پیار کیا تھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے تو پیر صاحب نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ انہیں شاید توقع تھی کہ انہیں وہاں اپنا چھوٹا بھائی دکھائی دے گا۔ پھر اس نے دیکھا تھا کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز روتے رہے تھے۔ انہوں نے نہ کوئی گلہ کیا تھا نہ شکوہ' جیسے ساری کثافت' سب دشمنی آنسوؤں کے رستے بہہ گئی تھی۔ وہ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

کیا یہ وہی بھائی تھے جن کے درمیان دشمنی کی شدید آگ بھڑک رہی تھی؟ اسے لگا جیسے ہر پچھلی بات جھوٹ ہو۔ دشمن یوں تو نہیں ملا کرتے۔ اتنی محبت سے تو صرف بچھڑے ہوئے بھائی ملتے ہیں' ایسے بھائی جو برسوں ایک دوسرے کو تلاش کرتے کھوجتے رہے ہوں۔

''یہ زینب ہے۔'' بابا جان نے بتایا۔

پیر صاحب کی نگاہوں کے سامنے سبط حسن کا چہرہ آ گیا۔ وہ جو زینب کو اس قدر چاہتا تھا' کتنی پیاری تھی وہ' بالکل ریشماں جیسی۔

''زینی بیٹا! اب تم ڈرائیور کے ساتھ گھر جاؤ اور آرام کر لو' بعد میں آ جانا۔'' بابا جان نے کہا۔

''میں نہیں جاؤں گی ابھی۔''

''تھکی ہوئی ہو ناں بیٹا' اس طرح بیمار پڑ جاؤ گی ابھی میں ہوں بھائی جان کے پاس۔''

''آپ سے تو دوا نہیں لی تھی ناں بڑے بابا جان نے' مجھ سے ہی لی تھی ناں؟ میں چلی گئی تو پھر کون دوا کھلائے گا انہیں؟ اب میں یہیں رہوں گی۔''

پھر وہ پیر صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''میں اس لیے یہاں ہوں تاکہ آپ کو ریشماں آپی کی کمی کم سے کم محسوس ہو۔ ظاہر ہے میں ان کی جگہ تو نہیں لے سکتی' مگر پھر بھی آپ کا خیال تو رکھ سکتی ہوں ناں' آپ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔''

پھر اس نے بابا جان کو زبردستی بھجوا دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ انہیں آرام کرنا چاہیے' وہ تھکے ہوئے تھے۔ بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر صدمے سے بھی دوچار ہوئے تھے۔ ان کے اعصاب شل ہوتے جا رہے تھے۔ اب انہیں یہ اطمینان تو تھا ہی کہ زینی وہاں محفوظ تھی اس لیے نیم دلی سے چلے گئے۔

زینی نے بھی پیر صاحب کا پورا خیال کیا تھا۔ ڈھیر ساری باتیں کی تھیں ان کے ساتھ۔ بس اتنا خیال رکھا تھا کہ درمیان میں سبط کا ذکر نہ آئے۔

''پتا نہیں کیا سوچیں بڑے بابا جان۔ انہیں شاید بہت برا لگے۔'' اس نے سوچا تھا۔

پھر وہ انہیں اخبار پڑھ کر سنانے لگی تھی۔ اخبار سنانے کے درمیان ہی اسے خیال آیا۔

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی بابا جان! یہ بندے یہاں کلینک میں بھی رائفلیں لے کر کیوں پہرا دے رہے ہیں؟ مجھے تو ان کی شکلیں دیکھ کر ہی خوف آ رہا ہے۔'' اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

پیر صاحب کو اس وقت ان کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں باہر چلے جانے کو کہا۔

اس نے اخبار رکھ دیا۔

''ایک تو ان میں خوشی کی کوئی خبر ہوتی ہی نہیں ہے' ہر طرف لڑائی جھگڑے ہو رہے ہیں' ہر ایک دوسرے کا گریبان کھینچنے کی فکر میں ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا یہ۔''

اس کی بات منہ میں ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''شاید ڈاکٹر ہو۔'' وہ بولی پھر اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک لڑکی سیاہ چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ زینی کو اس کی شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی' مگر اسے یاد نہ آ سکا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا تھا۔

''جی۔'' زینی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے پیر صاحب سے ملنا ہے۔" وہ اندر چلی آئی۔

دروازہ بند کر کے زینی مڑی تو اس نے محسوس کیا' جیسے وہ دونوں اس کی وہاں موجودگی سے قطعاً بے خبر ہوں' جیسے بھول چکے ہوں کہ وہ بھی وہیں تھی۔ پیر صاحب کی آنکھوں میں دھند سی اتر آئی تھی۔ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی' مگر اٹھ نہ سکے۔

"لیٹے رہیں پیر صاحب۔" وہ لپک کر ان کے قریب آ گئی مگر پھر رک گئی۔

"آج آپ کے پاس آتے ہوئے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں کہ میں اپنی کیفیت بتا سکوں۔ میں صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ اس روز جو کچھ ہوا' وہ سب جھوٹ تھا' وہ کہانی جھوٹ تھی۔ سچ صرف ایک تھا کہ جنت بائی برسوں سے انتقام کی آگ میں جل رہی تھی' جو کچھ آپ بھول چکے ہیں' وہ اسے نہیں بھول سکی تھی کیونکہ اس کی زندگی تباہ ہو چکی تھی اور اسے تباہ کرنے والے آپ تھے۔

میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں' جو آپ کی بیٹی تھی' وہ ایکسیڈنٹ میں مر گئی تھی۔ شاید خدا کو آپ کو اتنی بڑی سزا دینی منظور نہیں تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ جنت بائی یہ سب کر گزرے گی۔ اس نے اپنی لکھی ہوئی کہانی میں' ہمیں اس طرح استعمال کیا کہ خود ہمیں بھی اس بات کی خبر نہ ہوئی۔ میں اپنے ماں باپ کو اچھی طرح جانتی ہوں' ان کے لیے میں مر چکی ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

چند لمحوں بعد وہ دوبارہ بولی۔

"کبھی میں نے اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا تھا کہ یا اللہ میں ہی کیوں؟ کیا یوں در بدر ہونا میرے مقدر میں ہی تھا؟ اسے کچھ کیوں نہیں ہوا' جو میری بربادی کا باعث بنا تھا؟ میں نے دعا کی تھی کہ وہ نہیں تو میں کسی اور مرد کو اس کے گناہوں کی سزا بھگتتے ضرور دیکھوں۔

اور آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں' لیکن مجھے خوشی نہیں ہے' یہ جو کچھ ہوا اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ آپ کی ہی نہیں' میری بھی تذلیل تھی۔ خیر میں تو اتنی نیچے گر چکی ہوں کہ مجھے مزید پستی میں گرتے دیکھ کر کسی کے دل کو چوٹ نہیں لگے گی' مگر آپ کو یوں دیکھ کر مجھے چوٹ لگی ہے۔

پیر صاحب! میرا سفر تو جاری ہے اور موت تک جاری رہے گا۔ جنت بائی جس مقصد کے لیے زندہ تھی' وہ پورا ہوا تو اس نے آنکھیں موند لیں' میں اکیلی رہ گئی۔"

اس نے ہونٹ کاٹ کاٹ کر سسکیاں روکنے کی کوشش کی پھر خود پر قابو پا کر بولی۔

"مگر آپ اکیلے نہیں' بھرا پُرا گھر ہے آپ کا اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ میرے پاس حق تو نہیں ہے کہنے کا' پھر بھی کہہ رہی ہوں تو اس لیے کہ ہم نے ایک خوبصورت وقت اکٹھے گزارا تھا۔

آپ کی ایک بیٹی مر گئی پیر صاحب' مگر شاید کہیں نوری جیسی بدنصیب بیٹی اور جنت بی بی کی طرح انتقام کی آگ میں جلتی اور عورت بھی ہو خود کو اور اپنے بیٹوں کو پچھتاوے اور اذیت کی اس

آگ سے دور کر دیں۔ پیر صاحب جو شاید جہنم کی آگ سے بھی زیادہ شدید ہو۔"

وہ سر جھکا کر آنکھیں صاف کرتے ہوئے مڑی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ زینی نے یہ سب بہت حیرت سے دیکھا تھا۔ اسے "نوری" لفظ سے ایک دم یاد آ گیا کہ یہ فلم ایکٹریس نوری تھی۔ وہ اردو فلمیں تو نہیں دیکھتی تھی مگر کبھی ٹی وی اور کبھی کسی رسالے کے سرورق پر اس نے نوری کی تصاویر بے شمار دیکھی تھیں۔

مگر جو کچھ وہ کہہ رہی تھی' وہ اس کے حواس معطل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ نوری کے کہے ہوئے الفاظ اب تک اس کی سماعت پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

"جنت بائی کی زندگی تباہ ہو چکی تھی اور اسے تباہ کرنے والے آپ تھے۔"

"اس نے اپنی لکھی ہوئی کہانی میں' ہمیں اس طرح استعمال کیا کہ خود ہمیں بھی اس بات کی خبر نہ ہوئی۔"

"ہم نے ایک خوبصورت وقت اکٹھے گزارا۔"

"آپ کی ایک بیٹی مر گئی پیر صاحب مگر شاید نوری جیسی بدنصیب بیٹی اور جنت بائی کی طرح انتقام کی آگ میں جلتی اور عورت بھی ہو۔ خود کو اور اپنے بیٹوں کو پچھتاوے اور اذیت کی اس آگ سے دور کر دیں پیر صاحب جو شاید جہنم کی آگ سے بھی زیادہ شدید ہو۔"

وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر دیوار سے ٹیک لگا کے ایک ٹک پیر صاحب کی طرف دیکھے گئی' جن کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا اور جس پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہے تھے' ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

زینی تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

"بابا جان!" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں پکارا۔

مگر ان کی کیفیت میں تبدیلی نہ آئی۔

"بابا جان!" وہ بوکھلا کر چلائی اور اپنا کان ان کے ہونٹوں کے قریب لے گئی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے' مگر کہہ نہیں پا رہے تھے۔ ان کی آواز بہت ہی مدھم تھی۔ اتنی مدھم کہ پوری کوشش کے باوجود بھی وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں جان سکی کہ وہ عربی میں کچھ پڑھ رہے تھے' پھر ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار بڑھنے لگے۔ زینی نے بے اختیار ان کے سرہانے کے قریب لگی گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا اور تب تک بجاتی رہی تھی' جب تک ڈاکٹر اور نرسیں تیزی سے اندر داخل نہیں ہو گئے۔

"دیکھیں' بابا جان کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ روتے ہوئے بولی۔

"انہیں باہر لے جاؤ" ڈاکٹر نے ایک نرس سے کہا۔

وہ زینی کو باہر لے آئی۔

☆=====☆=====☆

کافی دیر گزر چکی تھی۔ ڈاکٹر کے مطابق اس وقت تک ماہ بانو کو ہوش آ جانا چاہیے تھا۔ خادم حسین نے اسے بے ہوش ہوتے دیکھ کر نوازش کے ہاتھ فوراً ڈاکٹر کو بلایا تھا' جس نے بتایا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ کھانا نہ کھانے اور بے آرامی کے باعث نقاہت اور تھکن تھی۔ اس نے گلوکوز کی بوتل لگا دی تھی' اور کہا تھا کہ تھوڑی دیر میں اسے ہوش آ جائے گا مگر اس کی آنکھیں اب تک بند تھیں۔

خادم حسین صوفہ گھسیٹ کر بستر کے قریب لے آیا تھا اور اب ٹیک لگائے سگریٹ پیتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ لمبے الجھے بال بستر پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ ناخن لمبے اور قدرتی گلابی تھے۔ انگلیوں میں ایک ہیرے اور تین سونے کی خوبصورت انگوٹھیاں تھیں۔ داہنی کلائی میں بہت نازک اور نفیس طلائی بریسلٹ تھا۔

خادم حسین کی نگاہ اس کی بائیں کلائی کی طرف اٹھی' مگر وہ خالی تھا اور اس پر جا بجا چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔

''یہ کیا ہوا؟ اس کی کلائی زخمی کیوں ہے؟'' اس نے لحاف کے اوپر رکھے ماہ بانو کے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اس کی کلائی سہلانے لگا۔

''یہ میری غلطی ہے' شاید گھڑی کی چین کی وجہ سے زخم بن گئے ہیں۔'' مکرم بولا۔

مگر ابھی اس کی بات منہ ہی میں تھی' انہوں نے دیکھا' ماہ بانو کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ بائیں ہاتھ میں اس نے لحاف کا ایک حصہ اس طرح دبا لیا' جیسے بہت مشکل سے ضبط کر رہی ہو۔

خادم حسین اور مکرم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی' مگر آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ وہ اب بھی ایسے ہی رہتی اگر خادم حسین نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو' اس کی یہ حرکت بالکل بے اختیار تھی۔ خادم نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا' مگر اس کی کیفیت اب بھی نہیں بدلی تھی۔

☆=====☆=====☆

پیر صاحب کے خیالوں پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ بہت سے چہرے تھے' بہت سی آوازیں تھیں' جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئی جا رہی تھیں مگر کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ پھر انہیں اپنے پاؤں پر کسی کے ہاتھوں کے محبت بھرے لمس کا احساس ہوا۔ وہ لمس اتنا اپنا اپنا تھا کہ ایک لمحے کو وہ ساکت رہ گئے' پھر آنسوؤں کے دو گرم گرم قطرے ان کے پاؤں پر گرے۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ان کا سگا بھائی' ان کا ماں جایا جھکا کھڑا تھا اور ان کے پاؤں کو چوم رہا تھا۔ دھند چھٹنے لگی تھی' انہیں لگا تھا کہ دکھ' اذیت اور کرب کے لمحات میں انہیں اسی سہارے کی

ضرورت تھی۔ یہی محبت بھرا لمس درکار تھا...... وہ دونوں کتنی دیر تک ہاتھ میں ہاتھ دیے آنسوؤں کی زبان میں وہ سب کہتے رہے تھے' جو اپنی انا کے حصار میں قید رہتے ہوئے کبھی نہیں کہہ سکے تھے۔

انہیں اپنا آپ بہت حقیر' بہت پستی میں گرا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ بھائی' جسے انہوں نے ہمیشہ دکھ دیے تھے' جسے ہر مقام پر اذیت سے دوچار کیا تھا' جس کی بیٹیوں کی عزت کا پاس نہیں کیا تھا' جس کے اکلوتے بیٹے کی جان لینے پر آمادہ تھے' وہی بھائی ان کے پاؤں چوم کر ان کے لیے رو رہا تھا۔ اسے شکوہ کرنے' گلہ کرنے کا پورا حق تھا' لیکن اس نے اب بھی ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ وہاں آیا تھا' اپنے ساتھ صرف اور صرف محبت لے کر' اس کی جگہ وہ ہوتے تو شاید کبھی اتنے اعلیٰ ظرف کا مظاہرہ نہ کر سکتے۔

یہ تو قدرت نے انہیں بہت بڑا سبق دیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اب بھی فرعون بنے ہوتے۔

اور وہ زینب تھی' باپ کی آستین پکڑ کر اس کے پیچھے تقریباً چھپی ہوئی مگر پھر وہی آئی تھی' انہیں دوا دینے کے لیے۔ زندگی سے ان کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ اب صرف ایک خواہش باقی تھی' کہ ان کے بیٹے ان کے انجام سے عبرت پکڑیں' بچھڑے ہوئے مل جائیں اور پھر وہ اطمینان سے مر جائیں۔

کچھ دیر پہلے تک یہ سب باتیں انہیں بہت مشکل لگ رہی تھیں' جو کچھ انہوں نے حیدر علی کے ساتھ کیا تھا' اس کے بعد وہ ان کے ساتھ جو کچھ کرتا کم تھا' وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ انہیں دیکھنے کے لیے نہ صرف خود آئے گا' بلکہ اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لائے گا۔

اب وہ مطمئن تھے' زینی ان کے ساتھ مسلسل باتیں کر رہی تھی' وہ دوا نہیں لینا چاہتے تھے' مگر اس نے اتنا محبت بھرا اصرار کیا تھا کہ ان کے پاس انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی' اس کی ہنسی بہت خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر وہ سوچ رہے تھے کہ اتنی پیاری بچی کے ساتھ وہ کیا ظلم کرنا چاہتے تھے۔ اسے امداد علی کی بیوہ بنا کر اس کی زندگی ویران کرنا چاہتے تھے۔ وہ جو کسی باغ میں کھلی تازہ' شگفتہ کلی جیسی تھی۔

ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ نوری چلی آئی تھی۔ ہر زخم پھر ہرا ہو گیا تھا۔ جنت بائی کے الفاظ تازیانے کی طرح ان کی روح کو گھائل کر رہے تھے۔ وہ ان کی بیٹی تھی اور جنت بائی نے انہی کا نہیں' خادم اور مکرم کا نام بھی لیا تھا۔ یہ تو وہ احساس تھا جسے وہ زبان بھی نہیں دے سکتے تھے۔

مگر پھر قدرت کو شاید ان پر رحم آ گیا تھا۔ نوری نے واضح الفاظ میں اس کہانی سے انکار کر دیا تھا' جو جنت بائی نے انہیں سنائی تھی۔ نہ جانے یہ احساسِ گناہ کا بھاری پتھر سرک جانے کا نتیجہ تھا یا کچھ اور' وہ ایک مرتبہ پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے تھے' ان کے پاس الفاظ نہیں تھے اپنے

گناہوں کی معافی مانگنے اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا شکر ادا کرنے کے لیے۔

آنکھوں کے سامنے سے دھند چھٹی تو زینی ان کا ہاتھ تھامے رو رہی تھی اور نرس سے جھگڑ رہی بھی رہی تھی۔

"آپ مریض کو ڈسٹرب کر رہی ہیں' ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ کمرے میں نہیں رہیں گی۔" نرس اصرار کر رہی تھی۔

"مجھے کون نکال سکتا ہے یہاں سے؟ میں بابا جان کے پاس سے نہیں جاؤں گی۔ کبھی کوئی اپنی بیٹی کی وجہ سے ڈسٹرب ہوتا ہے؟"

پیر صاحب نے نرس کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

"آپ ٹھیک ہیں ناں بابا جان؟" زینی نے انہیں آنکھیں کھولتے دیکھا تھا تو بے تابی سے پوچھا۔

انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"آپ سو جائیں' میں آپ کا سر دباتی ہوں۔" وہ بولی اور نرمی سے ان کا سر دبانے لگی۔

انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

دھند میں لپٹے ہوئے ہیولے واضح ہو گئے تھے' انہیں لگ رہا تھا کہ ان کا آخری وقت قریب آتا جا رہا ہے۔ انہیں موت کا خوف نہیں تھا بلکہ وہ تو زندہ رہنے سے خوفزدہ تھے۔ ہاں یہ احساس ضرور تھا کہ ان کا رحیم و کریم اللہ شاید اپنے حقوق معاف فرما دے مگر جو کچھ انہوں نے اس کی مخلوق کے ساتھ کیا تھا' وہ کیسے معاف ہوگا؟ جب کہ ان کے ظلم کے ستائے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے ان کے گریبان تک ہاتھ پہنچائیں گے تو وہ ان مظلوموں کا سامنا کیسے کر سکیں گے۔

اور ان مظلوموں کی فہرست بہت طویل تھی' کچھ تو ایسے تھے' جن کی صورتیں اور نام تک ان کے ذہن سے محو ہو چکے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جنہیں وہ کبھی بھلا نہیں سکتے تھے۔ ان میں سرفہرست ان کی بہنیں' زیب النساء اور مہر النساء اور اچھو تھا جس کے ساتھ اس کی زندگی اور پھر موت تک بہت بے رحمانہ سلوک کیا تھا انہوں نے۔

محض ایک گھوڑے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا انہوں نے' انہیں وہ وقت یاد آیا جب وہ اپنے بابا جان پیر صاحب جلال الدین شاہ کو بحث سے قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"یہ تو ایک چھوٹا سا امتحان تھا جس میں اچھو ناکام رہا' وہ سر کیا کٹواتا' اس کے لیے تو ایک گھوڑا واپس کرنا مشکل تھا۔"

"تم اس سے سر طلب کرتے' وہ دے دیتا' لیکن تم نے اس سے اس کے خواب طلب کیے تھے' جن پر ہمارا کوئی حق نہیں تھا۔ انسانوں کی نفسیات سمجھو رجب علی۔" ان کے بابا جان نے کہا

تھا۔

مگر وہ کسی کی نفسیات نہیں سمجھ سکتے تھے' بلکہ وہ ہی کیا ان کے بابا جان بھی تھے' جو سب کے لیے سراپا شفقت تھے' سب کی نفسیات سمجھتے تھے سوائے اپنی حقیقی اولاد کے۔

کتنی محبت تھی انہیں زیب النساء سے۔ اپنی اولادوں میں وہ اسی کو سب سے زیادہ چاہتے تھے' مگر اسے زہر پلاتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں ایک لمحے کے لیے بھی لرزش نہیں آئی۔ کتنی دکھی تھی ان کی بہن مگر انہوں نے' بابا جان نے کسی نے بھی اس کے دکھوں کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ہاں صرف حیدر علی تھا' جو ان کی خاطر لڑ رہا تھا۔ اسے اپنی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ دکھوں کی اتنی بھاری گٹھڑی اٹھانے والا کبھی تو یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوتا ہوگا کہ یہ سب بوجھ اس کی کمر سے اتر جائے' پھر زیب النساء نے ایسا سوچا تو کیا برا کیا؟ انہوں نے اس کی جائز ضرورتوں کا احساس نہیں کیا تو پھر وہ کیا کرتی؟ اس کے سامنے اور کیا راہ تھی جسے اختیار کر کے وہ اپنی منزل بھی پا لیتی اور اس کے بابا جان اور بھائی بھی خوش رہتے؟ انہیں وہ الفاظ اب تک یاد تھے۔ زیبی کہہ رہی تھی۔

"میرے لیے بڑا پھاٹک کھولنا ممکن نہیں تھا' اس لیے میں نے عقبی پھاٹک استعمال کیا۔ آپ اسے چور دروازہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہاں دنیا کا سب سے اچھا انسان میرا منتظر تھا اور جب میں حقیقی خوشیوں کی تلاش میں اس کے ساتھ نکلی تو ایک درندے نے ہمارا راستہ روک لیا۔ وہ جو مجھے جان سے بھی عزیز تھا۔ اس کا خون اس درندے کی گردن پر ہے۔" اس نے ان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اس کی بات کے جواب میں پیر صاحب جلال الدین شاہ کا بھرپور طمانچہ اس کے گال پر پڑا تھا۔

یہ سب سوچ کر ان کے لبوں سے بے اختیار آہ نکل گئی۔

وہ اچھو تھا۔ اونچا لمبا' بھرپور نوجوان' کس بے رحمی سے انہوں نے اس کے کسرتی جسم پر کوڑے برسائے تھے۔ وہ کوڑے' جو اس کے جسم سے زیادہ اس کی روح کو گھائل کر گئے تھے۔ پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا تھا کہ جسمانی تکلیف معمولی بات ہوتی ہے' زخم لگتے ہیں اور بھر جاتے ہیں' مگر جب روح زخمی ہوتی ہے تو پھر کبھی ٹھیک نہیں ہوتی۔

ایک مرتبہ انہوں نے اپنا چابک اٹھا کر اچھو کو اس قدر مارا تھا کہ وہ لہولہان ہو گیا تھا' اسے اپنے جسم پر لگنے والے گھاؤ کی پروا نہیں تھی' وہ اپنی روح کے زخمی ہونے پر تڑپ اٹھا تھا' پھر وہ تو ان سے بدلہ نہیں لے سکا تھا' مگر قدرت نے یہ بدلہ خود ہی لے لیا تھا۔ ان پر جنت بائی کے الفاظ کی صورت میں کوڑے برسائے تھے۔ جسم صحیح سلامت تھا' نہ درد ہوا تھا نہ خون بہا تھا' مگر جو ٹیسیں اٹھی تھیں' وہ وہی جانتے تھے۔

وہ اللہ اوپر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا‘ ان کے ہر ظلم کو‘اس کی خاموشی بھی بہت جامد تھی۔ وہ سوچنے لگے تھے کہ اگر کوئی خدا تھا تو وہ بھی انہی کا تھا‘ ان روتے‘ تڑپتے لوگوں کا خدا نہیں تھا‘ ان کا کوئی خدا تھا تو وہی تھے‘ انہی کے دم سے ان لوگوں کے گھروں کا چولہا جلتا تھا انہی کی سخاوت کی وجہ سے وہ لوگ زندہ تھے۔ انہی کی فیاضی کے باعث ان کے چہروں پر رونق تھی۔ وہ اپنی زمین سے ملنے والا ان کا رزق بند کردیتے تو وہ لوگ کہاں جاتے۔ کیا ان کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑ کر اسے گھسا نہ دیتے۔

مگر آج وہ سب سے بڑی ہستی‘ وہ اللہ‘ وہ خدا ان کا نہیں تھا‘ آج وہ ان مظلوم لوگوں کا خدا تھا‘ جو ان کے‘ پیر صاحب کے قدموں میں سر رکھ کر کبھی کسی کی زندگی اور کبھی اپنے رزق کی بھیک مانگتے تھے۔ نہ جانے اس نے کسی مظلوم کی دعا سنی تھی یا بددعا؟ وہ اب بھی اسی طرح خاموش تھا‘ مگر اسے اپنی قدرت کا مظاہرہ کرنے کے لیے الفاظ کی کیا ضرورت تھی؟

پھر مہر النساء تھی‘ اس کی نفرت بھری نگاہیں آج بھی ان کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ اس وقت وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ مردوں سے اتنی نفرت کیوں کرتی تھی‘ مگر آج قدرت اپنے سب اسرار خود ہی کھول رہی تھی۔ اپنے حالات سے فرار کے لیے دونوں بہنوں نے دو بالکل جدا راستے ڈھونڈے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ رہتی آئی تھیں‘ ان دونوں سے ایک سا برتاؤ ہوتا رہا تھا‘ ان کے گرد ایک سی دیواریں تھیں‘ پھر بھی ان کے ردِ عمل مختلف تھے۔

زیبی نے اپنے لیے ایک مضبوط سہارا ڈھونڈا تھا مگر مہر النساء نے کسی مرد کو سہارا بنانا گوارا نہیں کیا تھا۔

اس روز انہوں نے انتہائی خوف اور افراتفری کے عالم میں حمیدہ کو حویلی سے نکلتے دیکھا تھا‘ وہ تقریباً بھاگ رہی تھی۔ بہت سے لوگ رک کر اس سے استفسار کررہے تھے‘ مگر اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے کوئی بھوت پریت دیکھ لیا ہو۔

انہوں نے اسے نظر انداز کردیا تھا۔

”ہوسکتا ہے‘ باپ مر گیا ہو یا ماں کنویں میں گر گئی ہو۔“ انہوں نے سوچ کر اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد وہ اماں جان کی خواب گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ انہیں مہر النساء کے کمرے میں افراتفری کا احساس ہوا۔ دروازہ یوں تو بند تھا مگر وہاں کوئی کنڈی لگا کر نہیں رکھتا تھا۔ یوں بھی سب آنے والے خواتین کے کمروں میں دستک دے کر ہی داخل ہوتے تھے۔

انہوں نے بھی دستک دی‘ مگر اندر کی افراتفری ویسی ہی رہی۔ شاید کوئی کچھ توڑ رہا تھا۔ چیزیں گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔

مہر النساء سجاوٹ کی چیزیں اٹھا کر اِدھر اُدھر پھینک رہی تھی۔ اس کا دوپٹا بے ترتیبی سے بستر پر بکھرا ہوا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے‘ چہرے پر وحشت کے آثار تھے۔

وہ دروازہ بند کرکے تیزی سے اس کے پاس پہنچے۔

”کیا ہوا مہرو؟“ انہوں نے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر تشویش سے پوچھا۔

وہ رک گئی اور ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔

”کون ہو تم‘ چھوڑو مجھے‘ چھوڑ دو۔“

”مہرو! میں ہوں تمہارا بھائی‘ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاتھ مت لگاؤ مجھے‘ نفرت ہے مجھے تمام مردوں سے‘ چھوڑ دو مجھے۔“ وہ چلائی۔

”ادھر آؤ بستر پر لیٹو‘ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ انہوں نے اسے مسہری تک لانے کی کوشش کی۔

”نہیں‘ ہاتھ مت لگاؤ مجھے‘ تم وہی ہو ناں‘ جس نے میری بہن کو قتل کیا تھا‘ جس نے زرینہ کو قتل کیا تھا‘ تم میرے بھائی نہیں‘ صرف ایک مرد ہو‘ اس دنیا کے حکمران‘ جنہوں نے اس دنیا پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے‘ مجھے نفرت ہے تم سب سے۔“ وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔

”مہرو!“ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا

”میں آزادی چاہتی ہوں اس حویلی سے‘ اس دنیا سے تمہارے اور اس شخص کے قبضے سے جو بدقسمتی سے میرا باپ ہے‘ مگر جسے میں اپنا باپ کہنا نہیں چاہتی‘ مجھے بھی مار دو زیبی اور زرینہ کی طرح‘ مجھے اس طرح نہیں جینا۔“ وہ خود کو چھڑاتے ہوئے چلائی۔

اس کی ذہنی حالت اعتدال پر لانے کے لیے انہوں نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا۔

وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر چند لمحوں کے لیے بالکل گنگ رہ گئی‘ پھر بستر پر گر کر رونے لگی۔

”ہوش و حواس میں آؤ مہرو!“ انہوں نے سختی کے ساتھ کہا۔

”ہوش و حواس کیا ہوتے ہیں؟“ وہ سیدھی ہوتے ہوئے پھر چیخی۔ ”ہوش میں رہو تو وہ کچھ دکھائی اور سنائی دینے لگتا ہے جو کلیجہ چیر کر رکھ دیتا ہے۔ میری بات سنو رجب علی شاہ! میں اپنی حالت دیکھتی ہوں تو خدا پر میرا ایمان متزلزل ہونے لگتا ہے‘ مگر وہ کہیں ہے تو میری بددعا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی کو ایسے دکھ دے جو تم اپنے دل پر محسوس کرسکو۔ وہ ان دیواروں میں رہ کر تڑپے تو اس کی تڑپ تمہیں محسوس ہو‘ وہ جس اذیت سے گزرے اس کی کسک تم تک بھی پہنچ سکے اور میری بددعا ہے کہ تمہاری بیٹی ہمیشہ تڑپتی رہے‘ ہمیشہ اذیت میں دن گزارے اور اس کی وجہ سے تم بھی تڑپتے رہو۔“

رجب علی کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ غصے کا آتش فشاں ابل رہا تھا۔ وہ مہر النساء‘ ان کی چھوٹی بہن ان سے کس لہجے میں بات کررہی تھی‘ اور ریشماں کے متعلق کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ ننھی منی ریشماں جس نے ابھی ہی انہیں بابا کہنا شروع کیا تھا‘ جو چھوٹے چھوٹے

قدم اٹھاتی ان کی طرف بڑھتی تھی اور کبھی درمیان میں ہی گر جاتی تھی' وہ اسے زندگی بھر کی اذیت کی بددعا دے رہی تھی۔

''کاش تم میری بہن نہ ہوتیں اور میں تم پر ہاتھ اٹھا سکتا تو تمہاری زبان گدی سے باہر کھینچ نکالتا۔ یہ توڑ پھوڑ اور ڈرامے بازی بند کرو۔ آج کے بعد میں تمہیں ایسی گری ہوئی حرکت کرتے نہ دیکھوں۔''

وہ باہر نکل آئے۔ پھر اگلے روز دبے دبے لفظوں میں ایک عجیب سی کہانی گردش کرنے لگی۔

اس روز وہ کھیتوں سے حویلی واپس آئے تو انہیں ریشماں کو دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ صبح جب وہ نکلے تھے تب وہ سوئی ہوئی تھی اور انہیں معلوم تھا کہ جاگتے ہی سب سے پہلے وہ انہی کو دیکھنا چاہتی تھی۔ جب انہیں دیکھ پاتی تھی تو کتنی دیر تک روتی رہتی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اب بھی اس نے یاسمین بیگم اور سب ملازماؤں کو تنگ کر کے رکھا ہوگا۔

اپنی خواب گاہ کے دروازے میں کھڑے ہو کر انہوں نے ریشماں کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس خیال سے کہ وہ جاگ نہ جائے' وہ دبے قدموں سے آگے بڑھے۔ دبیز قالین پر یوں بھی قدموں کی چاپ نہیں ابھرتی تھی۔ یاسمین بیگم وہاں اکیلی تھیں اور مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر نیم دراز تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں' مگر گالوں پر آنسوؤں کی لکیر تھی۔ وہ رک گئے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے کھنکار کر............ اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کی آواز سن کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھی ہو بیٹھیں۔

''آپ؟'' اس وقت ان کا وہاں آنا غیر متوقع تھا۔

انہوں نے جلدی سے آنسو صاف کیے اور دوپٹا ٹھیک کرنے لگیں۔

''کیا بات ہے؟ کون مر گیا ہے جو یوں آنسو بہا رہی ہیں؟'' انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔

''نن...... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ گڑبڑا گئیں۔

''یہاں ظلم ہوتا لگ رہا ہے تو باپ کے گھر چلی جائیں۔ اس حویلی میں یہ رونا دھونا نہیں چلے گا۔''

''مجھے تو سب کچھ سہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ یہ میرا گھر ہے' اس کے لیے ہر کڑوا گھونٹ پی لوں گی۔ نہ پی سکی تو بھی میرے پاس ایک اور پناہ گاہ تو ہے۔ میرے بابا جان اب بھی مجھے پلکوں پر بٹھا سکتے ہیں۔ مگر وہ کہاں جائیں جن کے پاس یہ بھی نہیں ہے؟ جن کے پاس گھر تو دور ایک پناہ گاہ بھی نہیں ہے۔ وہ بددعا جو بڑی آپا نے آپ کو دی۔ اسے سن کر آپ کا دل نہیں لرزا؟''

''بکواس بند کرو۔''

''میری زبان روک سکتے ہیں آپ' مگر کس کس کی زبان پکڑیں گے؟ جو ظلم ان پر ہوا اور جو ردِعمل انہوں نے ظاہر کیا' اس کے بعد انہیں کہاں پناہ ملے گی؟ سرگوشیوں میں ابھرنے والی یہ

کہانی شاید کبھی آپ کے کانوں تک نہ پہنچ پائے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ وقوع پذیر ہی نہیں ہوئی۔ خدا کے لیے شاہ صاحب اپنی بہن کو سانس تو لینے دیں۔

کتنی محبت ہے آپ کو ریشماں سے۔ اور یہ بھی آپ کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ کل کو یہ بڑی ہو گی تو کیا اسے بھی یہی سب برداشت کرنا ہوگا؟'' وہ رو پڑیں

''کیا ہوا ہے مہرو کو؟''

مگر وہ روتی رہیں۔

''میں پوچھ رہا ہوں کیا ہوا مہرو کو؟'' انہوں نے سختی سے کہا۔

''میں نہیں بتا سکتی' میری زبان ساتھ نہیں دیتی۔''

وہ غصے اور الجھن میں کمرے سے باہر نکل گئے۔

اماں جان کے پاس گئے مگر انہیں کچھ خبر نہیں تھی۔ حویلی میں چلتے پھرتے انہیں مسلسل احساس ہو رہا تھا کہ عورتوں کے درمیان کوئی خاص موضوع زیرِ بحث تھا جس پر پورے زور و شور سے تبادلۂ خیال جاری تھا لیکن انہیں آتے دیکھ کر آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھار کسی فقرے کا ایک آدھ لفظ ان کے کان میں بھی پڑ جاتا تھا۔ وہاں حمیدہ اور مہر النساء کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ عورتیں توبہ استغفار پڑھ رہی تھیں۔ ان باتوں سے ان کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے انہوں نے سوچا کہ مہر النساء کے کمرے میں جا کر اس سے براہِ راست بات کریں مگر پھر اس خیال کو رد کر دیا۔ کل جو کچھ ہوا تھا اور اس نے ریشماں کو جس انداز میں بددعا دی تھی' اس نے انہیں مہر النساء سے خائف کر دیا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں چلے آئے۔ یاسمین بیگم سے کچھ بھی اگلوانا مشکل نہیں تھا' جانتے تو اور بھی بہت لوگ تھے مگر وہ اپنے خاندان کے معاملات میں کسی غیر کی مداخلت بالکل برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

ان کی خواب گاہ کی صورتِ حال اب بھی ویسی ہی تھی۔ ریشماں سو رہی تھی۔ یاسمین بیگم گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھیں۔

''یاسمین!'' انہوں نے سخت لہجے میں انہیں پکارا۔

یاسمین بیگم نے سر اٹھایا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ مہرو کے متعلق کیا باتیں گردش کر رہی ہیں؟''

یاسمین بیگم بتانا نہیں چاہتی تھیں۔ الفاظ ان کا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بار بار انکار کیا مگر پھر اپنے شوہر کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔

''وہ۔'' انہوں نے لڑکھڑاتے انداز میں کہا۔ ''شاہ صاحب! وہ بہت دکھی ہیں' ان کی دل کی بات سننے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ کہنا چاہتی ہیں مگر سننے والا کوئی نہیں ہے۔''

''شٹ اپ!'' وہ دھاڑے۔ ''تمہید باندھنے اور اس کا دفاع کرنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ مجھے بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں۔''

ان کی اونچی آواز سن کر ریشماں کسمسائی اور رونے لگی۔ یاسمین بیگم نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ انہیں اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

''شاہ صاحب ان کی کچھ ذہنی اور جسمانی ضروریات بھی ہیں اور یہ ضروریات پوری کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔'' ان کی پلکیں پھر بھیگ گئیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئیں۔ ''مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی ان ضروریات کو بھول سکتی ہیں۔ یا ان کی تکمیل نہ ہونے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔

جب قدرت کے وضع کیے ہوئے اصولوں سے منہ موڑ لیا جائے تو زندگی میں تباہی کے سوا کچھ باقی نہیں بچتا۔ ان کے پاس اپنی ضرورتوں کی تکمیل کا کوئی فطری ذریعہ نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے فطرت سے بغاوت کر دی۔ وہ حمیدہ کے ساتھ......'' وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

انہیں یوں محسوس ہوا جیسے یاسمین بیگم نے پگھلا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔

''تم الزام لگا رہی ہو میری بہن پر۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔'' وہ شدید غصے کے عالم میں ان پر جھپٹے تھے۔

اپنے اردگرد نامانوس سی افراتفری دیکھ کر ریشماں کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''آپ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکتے ہیں شاہ صاحب مگر اس سے کون سی حقیقت تبدیل ہو گی۔'' وہ بھی دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ چلا پڑی تھیں۔

غصے سے ان کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ تو یہ بات ساری حویلی کیا' سارے گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ وہیں سے پلٹے اور مہر النساء کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ یاسمین بیگم بھی تیزی سے ان کے پیچھے لپکیں۔ اس وقت انہیں اپنے دوپٹے تک کا ہوش نہیں تھا۔

مہر النساء اپنے بستر پر آنکھیں موندے پڑی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''آ گئے؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کے انداز میں تمسخر اور حقارت تھی۔

''کہہ دو مہر کہ میں نے جو کچھ سنا ہے اس میں ایک فیصد بھی سچ نہیں ہے۔''

''جو کچھ تم نے سنا ہوگا' اس میں سو فیصد سچائی ہو گی رجب علی۔ بلکہ تم نے تو بہت کم سنا ہو گا' میرے منہ سے تفصیل سننا پسند کرو گے؟'' وہ شدید نفرت کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

وہ چند لمحوں کے لیے ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ انہیں مہر النساء سے اس اعتراف کی توقع نہیں تھی۔ اسی وقت یاسمین بیگم آگے بڑھیں اور مہر النساء کے پاؤں پکڑ لیے۔

''اللہ کے واسطے بڑی آپا چپ ہو جائیے۔ کچھ نہ کہیے۔''

''اسی طرح مردوں کے سامنے گڑگڑا کر تم جیسی عورتیں ساری زندگی کیڑے مکوڑوں کی طرح گزار دیتی ہیں مگر پھر بھی کیا ملتا ہے؟ کیا مل گیا میری ماں کو؟ اور کیا مل جائے گا تمہیں۔ کیا

ہم عورتیں ہی رہ گئی ہیں مر مر کر جینے کے لیے؟'' پھر وہ ان سے مخاطب ہوئی۔ ''سنو رجب علی شاہ' میں انسان ہوں اور مجھے ساتھی کی' سہارے کی ضرورت بھی ہے۔ مگر مجھے یہ سہارے تم جیسے مردوں سے نہیں چاہئیں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی' وہ آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے دونوں مضبوط ہاتھ اس کی نازک سی گردن پر جما دیے۔ یاسمین بیگم ایک لمحے کو تو کچھ سمجھ ہی نہ سکیں۔ پھر ہوش آیا تو مہر النساء کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگیں۔ جس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل رہی تھیں۔

''شاہ صاحب' یہ غضب مت کریں۔ اللہ کے واسطے انہیں چھوڑ دیں۔ ایسا مت کریں۔''

مگر ان پر تو جنون سوار تھا۔ یاسمین بیگم' مہر النساء کی گردن پر جمے ان کے ہاتھ پوری کوشش کے باوجود بھی نہ ہٹا سکیں۔ جب مہر النساء بھی ہاتھ پاؤں چلانے لگی اور وہ بھی مزاحم ہوتے لگیں تو انہوں نے ایک جھٹکے سے یاسمین کو پرے پھینک دیا اور پھر سے اپنے ہاتھ گردن پر جما دیے۔

یاسمین بیگم کا سر مسہری کی پائنتی کی نوک سے ٹکرایا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ماتھے پر چپچپاہٹ محسوس ہونے لگی اور ان کے ہوش و حواس ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔

جب مہر النساء کے جسم کی مزاحمت ختم ہو گئی تو انہوں نے اس کے بے جان وجود کو مسہری پر پٹخ دیا اور باہر نکل گئے۔ اب ان کا رخ حمیدہ کے کچے مکان کی طرف تھا۔ ہاتھ میں ریوالور لیے جب وہ وہاں پہنچے تو گھر کے مکینوں کی گھگی بندھ گئی۔

''کہاں ہے حمیدہ؟'' وہ دھاڑے۔

''حضور' میری بچی بے قصور ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو کل کی بخار میں پھنک رہی ہے۔'' حمیدہ کی ماں ان کے قدموں میں گر گئی۔

انہوں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے دور کیا اور کچے مکان کے اکلوتے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ حمیدہ کی ماں ایک مرتبہ پھر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

''اللہ کے واسطے شاہ صاحب' اسے کچھ مت کہیں۔ اللہ آپ کے رتبے بلند کرے گا۔ اسے معاف کر دیں۔''

انہوں نے ممتا کی ماری کو لات رسید کی اور خود آگے بڑھ گئے۔ حمیدہ بستر پر پڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی چلانے لگی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا شاہ صاحب۔ مجھ سے قسم لے لیں بے شک۔ میں تو' میں تو وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ میں اب کبھی وہاں نہیں جاؤں گی۔ میں بے قصور ہوں شاہ صاحب۔''

مگر ان پر جنون سوار تھا۔ بغیر کچھ کہے انہوں نے ریوالور سیدھا کیا اور تین فائر کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔

وہ حویلی واپس آئے تو کہرام مچا ہوا تھا۔ مہر النساء کو تو انہوں نے اپنے ہاتھوں ختم کیا تھا مگر

اس کی موت کی خبر سن کر اماں جان نے بھی آنکھیں موند لی تھیں۔ ان کے دل پر بہت گھاؤ لگ چکے تھے۔ اب کچھ اور جھیلنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔

آج کلینک کے بستر پر لیٹے وہ اپنی گناہوں کی فہرست پر نگاہ ڈال رہے تھے تو بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ اپنے اللہ سے شرمسار تھے کہ ان کے اتنے گناہوں کے بعد بھی وہ اتنا مہربان تھا کہ ان کے ماتھے پر اب بھی محبت بھرا لمس موجود تھا۔ زینی بہت نرمی سے ان کا سر دبا رہی تھی۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

''بیٹا!'' انہوں نے ہولے سے کہا۔

''جی بابا جان!'' وہ جلدی سے بولی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے آثار بھی تھے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اسے مخاطب کیا تھا۔

''یہاں سے ہمیں چھوڑ کر مت جانا۔ ہم تنہا رہ گئے ہیں۔'' ان کے لہجے میں کرب تھا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ کے پاس ہی رہوں گی اور بابا جان آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ تنہا ہیں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔''

☆=====☆=====☆

ماہ بانو رو رہی تھی۔ مکرم کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

''مجھے گھر جانا ہے۔''

''میں خود تمہیں گھر چھوڑ کر آؤں گا۔ مگر یہ گلوکوز کی بوتل ختم ہو جائے تو پھر۔'' خادم حسین نے اسے تسلی دی۔

اس نے داہنی ہتھیلی کی پشت پر لگی سرنج کو بائیں ہاتھ سے باہر کھینچ نکالنے کی کوشش کی۔ سوئی کے ساتھ لگی ٹیپ کی وجہ سے وہ پوری طرح باہر نہ نکل سکی۔ تکلیف کی وجہ سے ماہ بانو کی چیخ نکل گئی۔

''حماقت کا ثبوت مت دو۔'' خادم حسین نے تیزی سے اٹھ کر سرنج ٹھیک کرنا چاہی۔ مگر وہ سے نوچ کر باہر نکالنے کے درپے تھی۔ سوجن کے خوف سے خادم نے احتیاط سے سرنج باہر نکال دی۔

''مجھے گھر جانا ہے۔'' اس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ دائیں ہاتھ سے جہاں کچھ دیر پہلے سرنج لگی ہوئی تھی، خون بہنے لگا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔

خادم حسین نے روئی اس کے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر اسے سختی سے دبا دیا۔ وہ اپنی سسکیاں بانے کی کوشش کرتی رہی۔

''اب تھوڑی دیر تک مٹھی بند نہیں کرنی۔ خون پھر سے بہنے لگے گا۔'' اس نے سختی کے ساتھ کہا۔

ماہ بانو بے اختیار اپنا ہاتھ سہلانے لگی۔

''اب تم آزاد ہو۔ مکرم نے جو کچھ کیا، وہ صرف غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ میں اس کی طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ اٹھو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔''

ماہ بانو کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ آزاد تھی۔ اپنے گھر، اپنے پیاروں کے درمیان لوٹ سکتی تھی۔ وہ تیزی سے بستر سے نیچے اتری۔

''میں خود چلی جاؤں گی۔''

''تمہیں لاہور جانا ہوگا کیونکہ تمہارے نانا، نانی وہیں ہیں۔ باقی رشتے دار البتہ یہیں ہیں۔ چاہو تو ان کے پاس چلی جاؤ۔''

ماہ بانو کے ذہن میں دونوں بھائیوں کے درمیان کچھ دیر پہلے ہونے والی گفتگو تازہ ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس وقت بھی اس بات کا ذکر کیا تھا کہ بڑی اماں اور نانا جی شہر چلے گئے تھے۔ مگر انہوں نے کچھ اور بھی تو کہا تھا۔

''بھائی، یہ بالکل محفوظ ہے۔'' مکرم نے کہا تھا۔

''اس بات پر تو میں یقین کر لوں گا مگر اور کون کرے گا۔ آج اسے یہاں آئے ایک دن اور دو راتیں ہو چکی ہیں۔ میں نے اس کے نانا اور نانی کو شہر تو بھجوا دیا ہے مگر کیا اس سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی؟'' خادم حسین نے کہا تھا۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ماہ بانو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نے ایک ایک لمحہ ذیت کے ساتھ گزارا تھا مگر وہ محفوظ تھی۔ لیکن یہ بات کون مان سکتا تھا؟ وہ کہاں جاتی؟ کون اس کی بے گناہی پر یقین کرتا۔

دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور رونے لگی۔

''رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم جہاں کہو گی میں تمہیں پہنچا دوں گا۔'' خادم نے رسان سے کہا۔

''کہاں جاؤں گی میں؟ مجھے نہیں پتا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ میں کیسے جواب دوں گی لوگوں کے سوالوں کے؟ کون یقین کرے گا میری بات پر؟'' اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو یا۔

''تمہیں کسی کو یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں ہے ماہ بانو۔ جسے یہ یقین ہونا چاہیے، اسے بن ہے۔'' وہ بولا۔

اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کا دل بہت رت سے فریاد کر رہا تھا۔

''عبداللہ کہاں ہو؟ آئے کیوں نہیں؟ تم ہی ہو جو مجھے ساری دنیا سے بچا سکتے ہو۔''

مگر عبداللہ تک اس کی فریاد نہیں پہنچ پائی تھی۔

''چلو میں تمہیں لاہور لے چلوں۔ اپنے نانا' نانی کے پاس نہ جانا چاہو تو بھی وہاں بہت جگہیں ہیں۔ تم محفوظ رہو گی اور کسی کی جرأت بھی نہیں ہو گی کہ تم پر انگلی اٹھا سکے۔''

اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ گاؤں میں کسی کا سامنا کرنے اور سب کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ خادم حسین کی بات مان لے۔ یوں بھی اتنے پُراذیت لمحات گزارنے کے بعد اس کا ذہن کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔

وہ کمرے سے باہر نکلی تو مکرم اور نوازش سامنے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

''آئی ایم سوری ماہ بانو۔ میں شرمندہ ہوں۔ تمہارا خدا واقعی میرے اور ہم سب کے ظلم سے بڑا ہے۔'' مکرم اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ ''تمہاری باتوں نے مجھے ایک بہت مختلف دنیا دکھائی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم میں سے کوئی عبداللہ کو کچھ نہیں کہے گا۔ وہ محفوظ ہے۔''

ماہ بانو نے آنکھیں بند کر کے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔ ''یا اللہ' میں تو تیری بہت حقیری مخلوق ہوں۔ پھر بھی تُو نے اپنی رحمتوں کے خزانے میں کمی نہیں ہونے دی۔ آج تُو نے مجھے وہ کچھ دے دیا ہے کہ آئندہ مجھے کچھ مانگنے کی شاید ضرورت ہی نہ پڑے۔ تیری اس بے پایاں رحمت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس نہ الفاظ ہیں نہ آنسو'' اس نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔

''میں نے جب اپنے سوالوں کے جواب حاصل کرنا چاہے تو نئے نئے سوال سر اٹھانے لگے۔ پھر میں نے سوچا کہ ماضی کو کریدنا بے کار کی بات ہے۔ جب میں اپنی بہن سے اتنی محبت کرتا ہوں تو کیا اس کی ایک جائز خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ آپی نے تو کبھی اپنے منہ سے کچھ مانگا ہی نہیں مگر کوئی منہ سے نہ مانگے تو اندھا اور بہرا تو نہیں بن جانا چاہیے۔ تم ان کی دوست ہو' بہن ہو۔ عبداللہ کی بھی کالج فیلو اور دوست ہو اس لیے مجھے یقین ہے کہ اس تبدیلی پر تم سے زیادہ خوش اور کوئی نہیں ہو گا۔ میں ہر ایک سے منوا کر رہوں گا اس حق کو جو میری بہن کو بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا۔ ہمیں اپنی نفرتوں میں اتنا آگے نہیں نکلنا چاہیے کہ ہم اپنی محبتیں ہی بھول جائیں اور یہ سبق مجھے تم نے دیا ہے۔'' مکرم کہہ رہا تھا۔

ماہ بانو کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنی زندگی کے اس مختصر سے وقت میں اس نے بہت کچھ کھویا بہت کچھ پایا ہو۔ عبداللہ شاید کھو رہا تھا اور نئے تجربات کے حوالے سے زندگی بہت کچھ سکھا رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی بہن کی خواہش پوری کر کے رہے گا۔

''کاش میرا کوئی بھائی ہوتا اور وہ جب میرے بارے میں بات کرتا تو اتنے ہی محبت بھرے لہجے میں' میری ایک خواہش کے لیے وہ کچھ بھی کر لیتا مگر میرا کون ہے؟'' اس نے دکھے دل کے

ساتھ سوچا۔

مکرم نے ہاتھ میں پکڑی چادر ماہ بانو کو اوڑھا دی۔

''آج سے تم میرے لیے ریشماں آپی جیسی ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ میری بڑی بہن ہیں اور تم چھوٹی بہن ہو۔''

ماہ بانو کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

''مجھے اچھا لگا تمہارا بہن کہنا مگر میں تمہاری بہن بننا نہیں چاہتی۔ تم بہت بڑی آزمائش میں پڑ جاؤ گے جس سے نکلنے کا راستہ نہیں ملے گا تمہیں۔ تم صرف اپنی بہن ریشماں کے لیے خوشیاں تلاش کرو۔'' اس نے آنسو پیتے ہوئے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔

☆=====☆=====☆

زینی نے انہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ پیر صاحب سے روزمرہ کی باتیں بہت دلچسپ انداز میں کر رہی تھی مگر ان کی توجہ اس کی باتوں پر کم تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے زندگی کی کتنی ساری خوشیاں اپنے ہاتھ سے ختم کر دی تھیں۔ وہ ان کی بھتیجی تھی۔ ان کے لیے بیٹی جیسی اور وہ کتنی پیاری' کتنی اچھی تھی۔ کتنا خیال رکھ رہی تھی اور انہوں نے کیا دیا تھا اسے؟ صرف مصائب اور تکالیف۔ کبھی وہ سب اکٹھے ہوتے تو کتنے خوش رہتے۔ سب ایک دوسرے سے کتنی محبتیں سمیٹتے۔

''آپ پڑھ رہی ہیں بیٹا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی!''

''وہیں امریکہ میں سبط کے ساتھ؟''

وہ قدرے مضطرب ہو گئی۔ نہ جانے بڑے بابا جان یہ بات پسند کریں یا نہیں۔ مگر جواب دینا بھی ضروری تھا' اس لیے مرے مرے سے انداز میں بولی۔

''جی۔''

''وہ تو پڑھائی میں بہت نکما ہو گا؟''

''نہیں۔'' وہ ہمیشہ کی طرح پُرجوش انداز میں بولی اور سبط حسن کی طرف سے صفائی پیش کرنے لگی۔ ''وہ تو بہت لائق ہے بابا جان۔ وہ بھی اور گڑیا بھی' گڑیا کا تو آپ کو پتا ہے ناں۔ میں زہرا کی بات کر رہی ہوں۔ میں جب یہاں مری میں ہوتی تھی ناں۔ تب میں بھی بہت لائق تھی۔ میں اور سبط اکٹھے ہی پڑھتے تھے شام کے وقت۔ مگر اب وہاں امریکہ میں میرا دل ہی نہیں لگتا۔ کیا کروں۔

پتا ہے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اماں بابا اور بھائی سے دور رہوں۔ پہلے بھی ہم اتنے برسوں تک دور رہے ہیں۔ امریکہ میں تو میں سب کو بہت مِس کرتی تھی۔ ابھی رات کو ہی یہاں پہنچی ہوں

میں۔مگر شاید میں ہی اتنی پاگل ہوں۔میری پڑھائی پر بھی بہت اثر پڑ رہا ہے۔جبکہ گڑیا اور سبط بالکل مطمئن ہیں۔اسی طرح پڑھتے ہیں جیسے یہاں پڑھتے تھے۔''

''آپ ہماری حویلی آئی تھیں تو ہم سے کیوں نہیں ملی تھیں؟''

''میں نے تو سبط سے کہا تھا مگر وہ مانا ہی نہیں۔اصل میں میرا دل چاہ رہا تھا ریشماں آپی سے ملنے کے لیے۔اسی لیے آئی تھی میں۔کبھی میں سوچتی تھی بابا جان کہ کیا وہ دن آئے گا جب ہم سب اکٹھے ہوں گے؟ میں نے اتنی زیادہ دعائیں مانگی تھیں۔سبط کہتا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔پھر بھی میں دعائیں مانگتی رہی۔اور دیکھیں میری دعائیں قبول ہو گئیں۔ابھی ہم سب تو اکٹھے نہیں ہوئے مگر اب مجھے یقین ہے کہ ہم اکٹھے ہو جائیں گے۔''

''ہاں بیٹا ہم سب ضرور اکٹھے ہوں گے۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''تو آپ نے اپنی حویلی اطلاع کیوں نہیں بھجوائی؟'' انہوں نے آنکھیں موند لیں۔کیا بتاتے اسے کہ وہ کسی کا سامنا کر ہی نہیں سکتے تھے۔

اس وقت وہ پیر صاحب کو اپنے اسکول اور کالج کے قصے اور لطیفے سنا رہی تھی۔وہ اس کی باتیں سن کر مسکرا رہے تھے۔ابھی اس کی سنائی ہوئی بات کا مزاحیہ حصہ آیا بھی نہیں ہوتا تھا کہ خود ہی اتنا ہنستی تھی کہ اس کی آنکھوں میں پانی آ جاتا تھا۔تب ہی دروازہ کھول کر حیدر علی شاہ داخل ہوئے۔زینی کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔

''بیٹا! تم نے تو اپنے بڑے بابا جان کو بہت ڈسٹرب کیا۔اتنی ہنسی؟'' وہ پیر صاحب کا ماتھا چھوتے ہوئے بولے۔

''اپنی بیٹی کی باتوں اور ہنسی سے بھی کوئی ڈسٹرب ہوتا ہے؟'' انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔

''دیکھا بابا جان آپ نے؟'' زینی فاتحانہ لہجے میں بولی۔

''علی! ہمارے پاس شاید بہت کم وقت بچا ہے۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''نہیں بھائی جان، ابھی تو ہمیں آپ کے سائے کی بہت ضرورت ہے۔مجھے بھی اور میری اور آپ کی اولاد کو بھی۔اور پھر اب تو آپ کی طبیعت بھی کافی بہتر ہے۔'' ان کے انداز میں محبت اور پیار کی چاشنی تھی۔

''چراغ بھی بجھنے سے پہلے ذرا دیر کے لیے بھڑکتا ہے مگر اسے بجھنا ہی ہوتا ہے۔ہماری بات سنو علی۔وہاں آگے بہت سے مظلوم ہمارا گریبان پکڑنے کو کھڑے ہوں گے۔ہم وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔تم سے ساری زندگی ہم نے بہت زیادتی کی۔یہاں تک کہ ہماری وجہ سے تمہیں اپنی اولاد سے دور ہونا پڑا۔اب وہ وقت کون لوٹا سکتا ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ اپنے گناہوں اور ظلم کی تلافی کریں مگر کیسے؟ ہم تو تم سے معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔'' پیر صاحب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''پلیز بھائی جان مجھے شرمندہ مت کریں۔میرے لیے آج بھی آپ کا مقام بہت بلند ہے۔''

''نہیں علی۔تم ایک مرتبہ ہمیں معاف کر دو۔ہم یہ بوجھ لے کر مرنا نہیں چاہتے۔''

''آپ یہی چاہتے ہیں تو میں نے آپ کو معاف کیا۔آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔''

''تمہیں معافی کی کیا ضرورت ہے علی؟ آج ہم تم سے کچھ مانگنا چاہتے ہیں۔حکم کے ساتھ نہیں، محبت اور عاجزی کے ساتھ۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''بھائی جان آپ حکم کریں۔میرا سر بھی آپ کے لیے حاضر ہے۔''

''ہمیں زینی دے دو۔ہمارا بیٹا سبط حسن بہت اچھا ہے۔اسے بہت چاہتا ہے۔زینی چاہے تو بے شک حویلی میں نہ رہے۔یہ جتنا پڑھنا چاہے پڑھے۔جس انداز میں رہنا چاہے رہے، اس پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔'' وہ بولے۔

زینی ان کے سرہانے کھڑی تھی۔اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ پیر صاحب اچانک اس کا رشتہ طلب کر لیں گے سبط کے لیے۔

بابا جان نے اس کی طرف دیکھا۔وہ حیرت اور بے یقینی کی تصویر بنی کھڑی تھی، بالکل گم صم۔

''خاموش ہو علی!'' پیر صاحب کے انداز میں مایوسی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے۔آپ کا کہا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

زینی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ سب اچانک ہو جائے گا۔

''زینی بیٹا!'' پیر صاحب نے اسے پکارا۔

''جج جی بابا جان!'' وہ چونکی۔

''ادھر ہمارے پاس آئیں۔'' ان کی آواز حسب معمول مدھم تھی۔

وہ قریب آ گئی۔

پیر صاحب نے اپنے ہاتھ سے ایک انگشتری اتار کر اسے تھمائی۔

''یہ ہماری نشانی رکھ لیں۔ہمارے پاس اس وقت دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

''بابا جان!'' وہ رو پڑی۔

پیر صاحب نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

☆=====☆=====☆

تاریکی کی چادر کو چیرتی ہوئی کار تیزی سے چلی جا رہی تھی۔خادم حسین خود ڈرائیو کر رہا تھا۔اس نے باڈی گارڈ تک ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ماہ بانو اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اپنے خیالوں میں گم تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں صبح کی سپیدی پھیلنے لگی۔

"تو مکرم مان گیا" وہ سوچ رہی تھی۔" خادم نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ سبط تو پہلے ہی راضی ہوگا۔ باقی دو بھائیوں کو بھی کیا اعتراض ہوگا۔ جب سب مان گئے۔ مگر کیا پیر صاحب بھی ایسا ہی چاہیں گے؟ اور سب سے بڑھ کر عبداللہ! وہ کبھی راضی نہیں ہوگا۔ اسے تو اس سب کی خبر بھی نہیں ہوگی۔ وہ اپنی حویلی میں ہر طرف سے مطمئن بیٹھا ہوا ہوگا۔

اب اگر پیر صاحب بھی مان جائیں اور عبداللہ انکار کر دے تو کیا ہوگا؟ وہ یقیناً اس بات پر اسے معاف نہیں کریں گے۔ اپنی بیٹی اور بہن کے رد کیے جانے کا رنج بہت زیادہ ہوتا ہے اور یہ سب تو یوں بھی ہتھیاروں کی زبان میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ گویا ابھی اس آگ کے بجھنے کی کوئی امید نہیں ہے۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟" خادم حسین نے پوچھا۔

"میں بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"میں تمہارے محسوسات سمجھ سکتا ہوں ماہ بانو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم کتنی اذیت سے گزری ہو۔"

"تمہیں کچھ نہیں معلوم۔" وہ اس کی بات کاٹ کر پھٹ پڑی۔" کچھ نہیں جانتے تم۔ وہ لمحے میں نے گزارے ہیں۔ انہیں میں نے محسوس کیا ہے۔ ان کی اذیت میں نے برداشت کی ہے۔ اور کون تھا جو میری سسکیوں پر تڑپتا۔ جس کے دل میں میرے رونے سے ٹیسیں اٹھتیں؟ جو میری آہ وزاری اور میری چیخ و پکار سن سکتا؟ کوئی بھی نہیں۔ میں نے اپنے پیاروں کو آوازیں دیں۔ انہیں بلایا پکارا' مگر کوئی نہیں آیا۔ تمہیں اس کرب کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جس سے میں گزری ہوں۔" وہ رو پڑی۔

کچھ دیر تک خادم حسین خاموشی کے ساتھ ڈرائیو کرتا رہا' پھر بولا۔

"جو لوگ دل میں رہتے ہیں' ان کا دکھ بھی اپنے دل پر محسوس کیا جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم یہاں ڈیرے پر تھیں۔ تمہیں کیا پتا کہ میں نے تمہیں کیسے پاگلوں کی طرح تلاش کیا ہے۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تھا تمہیں۔ میں یہ کب جانتا تھا کہ تم میرے ہی گھر میں تھیں۔"

"جو لوگ دل میں رہتے ہیں۔" ماہ بانو نے دل ہی دل میں دہرایا اور خوفزدہ ہوگئی۔

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔" وہ چلائی۔

"میں بھی کچھ کہنا نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جب پہلی مرتبہ میں نے تمہیں دیکھا تھا۔"

وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ مگر ماہ بانو کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وہ اسے حقیقت بتا

دے۔ یہ کہہ دے کہ وہ صرف اور صرف عبداللہ کو چاہتی تھی اور عبداللہ بھی صرف اسے چاہتا تھا۔ صرف اور صرف اسے۔

مگر اس نے بہت مشکل سے خود پر قابو پایا۔

"میں نے یہ بتا دیا تو شاید اب کی مرتبہ عبداللہ نہ بچ سکے۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے دوبارہ اس قید خانے میں جانا پڑے۔ کیا پتا پھر میرے ساتھ کیا سلوک ہو۔" اس نے سوچا۔

"مجھے تمہارے جواب کا انتظار ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔" اس نے روتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

اس کی ذہنی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے منتشر دماغ کو یکسو کرنا بھی اسے ناممکن لگ رہا تھا۔ اس کا ذہن اور جسم اتنا تھک چکا تھا کہ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

خادم حسین نے اس کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہاں وہ وقتاً فوقتاً اس سے کھانے پینے کے لیے پوچھتا رہا تھا اور اسے آرام سے سو جانے کے لیے کہتا رہا تھا۔ ماہ بانو نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ نقاہت تو بہت تھی مگر بھوک کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ تھکن کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"کبھی اماں جان میری سونے کی عادت سے پریشان ہو کر مجھے ٹوکتی رہتی تھیں اور اب یہ حال ہے کہ میں سونا چاہ رہی ہوں مگر نیند نہیں آ رہی۔" اس نے سوچا اور اماں جی کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس وقت وہ لاہور کے قریب تھے جب خادم حسین کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ ماہ بانو اس وقت بھی دوسری طرف متوجہ تھی۔ اماں' ابا جی اور عبداللہ اس کی سوچوں کا محور یہی لوگ تھے۔ مگر سوچیں بکھری ہوئی تھیں۔ اسے صرف اتنا محسوس ہوا تھا کہ خادم حسین پریشان ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ماہ بانو کو مخاطب کیا۔

"بابا جان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ ایڈمٹ ہیں۔"

اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس وقت اسے کسی بھی بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"میں سمجھ نہیں پا رہا کہ حالات کیا رخ اختیار کر رہے ہیں۔"

ماہ بانو کو یہ جاننے میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔

"مجھے فون پر یہ اطلاع حیدر علی شاہ نے دی ہے۔"

کوئی دھماکہ سا دھماکہ تھا۔ ماہ بانو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "حیدر بابا؟"

''ہاں مجھے یہ بھی یقین نہیں ہے کہ یہ حقیقت ہے یا سازش کا کوئی جال؟'' خادم حسین نے کہا۔

''آج تک سازش کے جال کہاں بچھائے جاتے رہے ہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''دشمنی بہرحال دشمنی ہی ہوتی ہے۔ اور دشمن پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔''

''اتنی دشمنیاں کرلیں تم لوگوں نے کہ محبتوں کی پہچان ہی باقی نہیں رہی۔'' اس نے ہولے سے کہا اور شیشے سے باہر پیچھے کی طرف بھاگتے درختوں کو دیکھنے لگی۔

کار میں ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ لاہور میں داخل ہو چکے تھے۔

''پلیز ماہ بانو ایک نمبر ملا دینا۔'' اس نے فون اس کی طرف بڑھایا اور نمبر بتانے لگا۔

ماہ بانو نے خاموشی سے نمبر ملا کر فون اسے پکڑا دیا۔ یہ فون اس نے پیر صاحب کے متعلق خبر کی تصدیق کرنے کے لیے کیا تھا۔

''حیدر علی نے ٹھیک کہا تھا۔ بابا جان کی کنڈیشن بہت سیریس ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولا۔

ماہ بانو خاموش رہی۔

''تمہیں تکلیف تو ہوگی مگر میں چاہوں گا کہ پہلے بابا جان کو ایک نظر دیکھ لوں۔''

وہ اتنی تکلیفیں اٹھا چکی تھی کہ اب یہ تکلیفیں بے معنی ہو گئی تھیں۔ اس نے اعتراض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یوں بھی وہ اب تک سوچ نہیں پائی تھی کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اپنے لاہور کے گھر کی چابیاں گاؤں میں اس کے سامان میں پڑی ہوئی تھیں۔ اسے سکون کی ضرورت تھی اور وہ تالے توڑنے اور دھول میں اٹے فرنیچر کو صاف کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ایڈی کی طرف بھی وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ فوراً عبداللہ کو اطلاع کر دیتا اور۔

اس ''اور'' سے آگے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہر وہ بات جسے وہ اپنی سوچ میں بھی جگہ نہیں دینا چاہتی تھی۔

گاڑی تیزی سے جیل روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ حیدر بابا کی وہاں موجودگی کو کیا معنی پہنائے۔ وہ وہاں کیوں تھے؟ اور خادم حسین کو جس بات کی خبر نہیں تھی، وہ انہیں پہلے کس طرح معلوم ہو گئی؟ وہ انہیں وہاں دیکھ کر کس قسم کے ردِعمل کا اظہار کرے گا؟ ایسی بے شمار سوچیں آکٹوپس کی طرح اسے جکڑے ہوئے تھیں۔

بالآخر ان کی کار کلینک کی پارکنگ میں داخل ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

پیر صاحب کے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھر رہی تھی کہ جیسے انہوں نے زینی اور سبط حسن کی خوشی کا خیال رکھا تھا، ویسے ہی حیدر بابا بھی ان کی بیٹی کی خوشیوں کا خیال رکھتے ہوئے

پرانے تعلق کو جوڑنے کی بات کریں مگر انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ کتنی دیر گزر گئی تھی، زینی بہت خوش تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح یہ خوش خبری سبط اور اماں جان کو جا سنائے۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''بھائی جان میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ بیٹوں کو اطلاع کیوں نہیں دینا چاہتے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر آپ کی آدھی بیماری رفع ہو جائے گی۔ اور پھر یہ ان کا حق ہے کہ انہیں اس بات کا علم ہو۔ بعد میں جب انہیں معلوم ہوگا کہ آپ بیمار تھے اور آپ نے انہیں خبر نہیں کی تو انہیں صدمہ ہوگا۔'' حیدر بابا انہیں سمجھا رہے تھے۔

''بس خادم حسین کو اطلاع دے دو۔ مگر اسے کہنا کہ اور کسی کو خبر نہ ہونے دے۔'' انہوں نے آہستہ آواز میں کہا۔

''باقی سب کو کیوں نہیں؟'' زینی بولی۔

''ہم اسے کچھ باتیں بتانا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ وہی ہماری گدی کا وارث ہے۔ سبط اور زینی کی منگنی اس کے علم میں آنا بہت ضروری ہے۔''

حیدر بابا نے پیر صاحب کے بتائے ہوئے نمبر پر رِنگ کر دیا تھا۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پیر صاحب کو خیال آتا تھا کہ شاید ابھی حیدر بابا ان سے ریشماں کے سلسلے میں بات کریں مگر ہر لمحہ مایوس کن ثابت ہوتا تھا۔ اگلا لمحہ پھر سے نئی امید لے کر آتا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگے کہ وہ خود ہی بات کر لیتے ہیں مگر کیسے بات کرتے۔ ایک تو بیٹی تھی۔ اگر حیدر بابا اس رشتے کو رد کر دیتے، یا وقتی مصلحت سے کام لے کر رد کرنے کے بجائے عقل سے کام لیتے تو اپنی بیٹی کے اس دکھ پر وہ شاید زندہ ہی نہ رہتے۔ ایسے میں وہ آنے والے لمحے سے نئے سرے سے امید وابستہ کر لیتے مگر وہ امید ریت کا گھروندہ ثابت ہوتی۔

ایک ایک کر کے کتنے پل دبے پاؤں سرکتے گئے۔ ان کے سینے میں کانٹا سا چبھ گیا تھا۔

''میں مانگ تو لوں مگر میں نے اپنے بھائی کو دیا کیا ہے؟ کس برتے پر اس سے تقاضا کروں؟ وہ کیا سوچے گا کہ میں ہمیشہ مانگتا یا چھینتا آیا ہوں، کبھی کوئی ایک خوشی بھی اس کی جھولی میں نہیں ڈالی۔''

بہت انتظار کے بعد وہ تھک گئے۔ زندگی کا سفر تمام ہوتا لگ رہا تھا اور وہ اپنی آنکھوں سے اپنی بیٹی کا گھر آباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے، تو بھی اسے ایک محفوظ مستقبل ضرور دینا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ریشماں ان دیواروں کے بیچ میں پھوپھو سکینہ کی طرح گھٹ گھٹ کر مر جائے یا پھر مہر النساء اور زیب النساء کی طرح چور دروازے تلاش کرے۔ آج جو بھائی اس سے محبت کرتے تھے، کیا معلوم شادی کے بعد بدل جاتے۔ ان کی زندگی تک تو کسی کی جرأت بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اسے دانستہ دکھ پہنچاتا مگر ان کے مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ کس کو خبر تھی؟

"بابا جان باتیں کریں ناں!" زینی کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

انہوں نے اس کی آنکھوں کی خوشی دیکھی۔ ان کا دل حسرت میں ڈوب گیا۔

"کیا کبھی ریشماں کی آنکھوں میں بھی ایسی خوشی اترے گی۔ وہ جو بہت پیاری اور بہت معصوم ہے مگر بہت دکھی بھی ہے۔ یہ احساس پہلے بھی تھا مگر انا کا خول بہت سخت تھا۔ یاسمین کہتی تھی کہ وہ سوتیلی ماں ہو کر بھی ریشماں کو سمجھتی ہے اور میں سگا باپ ہو کر بھی اس کے دکھ محسوس نہیں کرتا۔

ٹھیک کہتی تھی وہ۔ میں سمجھتا آیا تھا کہ میں اس کے دکھوں کو سمجھتا تھا۔ مگر ایسا کب تھا؟ میں تو رشتوں کے مفہوم کو اب سمجھا ہوں۔ اس بستر پر پہنچ کر، جنت بائی تم نے بہت سخت انتقام لیا ہے۔"

"بابا جان!" زینی نے پھر پکارا۔ "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"اپنی بیٹی کے بارے میں سوچ رہے ہیں ہم جو بہت ہی پیاری ہے مگر بہت دکھی بھی ہے۔ اس نے بہت کم خوشیاں دیکھی ہیں۔ کاش اس کی آنکھوں میں بھی ویسی ہی چمک دیکھ سکیں جیسی آپ کی آنکھوں میں ہے۔" ان کا لہجہ حسرت و یاس سے چیخ رہا تھا۔

حیدر بابا کے دل پر برچھی سی لگی۔ صاف واضح تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہیں پا رہے تھے۔ وہ بھی کیا کرتے۔ یہاں تو وعدہ کر لیتے اور عبداللہ راضی نہ ہوتا تو ریشماں کی ساری زندگی خوار ہو جاتی، شادی خوشی کے لیے کی جاتی ہے، ایک دوسرے کو بھگتنے یا بوجھ اٹھانے کے لیے نہیں کی جاتی۔ اور ریشماں دکھی ہوتی تو اس رشتے کا قائم رکھنا بھی بیکار ہوتا۔

زینی نے امید بھری نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ یہ خوشی ضرور پیر صاحب کی جھولی میں ڈال دیں۔ انہوں نے منہ پھیر لیا۔

زینی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پیر صاحب کی آنکھوں میں لکھی حسرت کی تحریر کو مٹا دے۔ ان سے کہہ دے کہ ریشماں اس کے بھائی کی دلہن بن کر آئے گی لیکن یہ بات وہ کیسے کہہ سکتی تھی۔ ایک امید اپنے بابا جان سے تھی، سو انہوں نے بھی منہ موڑ لیا تھا۔

"ہمیں تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے علی۔ ہمارا حق بھی نہیں ہے تم سے کچھ مانگنے کا۔ تمہیں دیا بھی کیا ہے ہم نے سوائے دکھوں اور تکلیفوں کے۔ اتنا ہی بہت ہے کہ تم نے ہمیں سبط کے لیے مایوس نہیں کیا۔ بلکہ اپنی بیٹی دے کر اب بھی ہم پر احسان کیا ہے۔" بہت دیر بعد انہوں نے مایوسی سے کہا۔

"بھائی جان!" حیدر بابا تڑپ اٹھے۔

زینی بے آواز رونے لگی تھی۔

"علی، ہماری زندگی بس چند سانسوں تک باقی ہے، اور کچھ نہ سہی تب بھی ریشماں تمہاری بھتیجی تو ہے۔ ہم پر ایک احسان اور کرنا کہ ہماری بیٹی کا بہت خیال رکھنا۔ ہم اس کی آنکھوں کے

آنسو برداشت نہیں کر سکتے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔ "نہ جانے اس کے بھائی کب اس سے منہ موڑ لیں۔ وہ تو اتنی معصوم اور کم گو ہے کہ اپنے دل کی بات زبان تک بھی نہیں لا سکتی۔ بس اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہے۔" ان کے آنسو بہنے لگے۔

☆=====☆=====☆

خادم حسین منتظر تھا کہ ماہ بانو اس کے ساتھ اتر کر اندر جانا پسند کرے گی یا باہر کار میں ہی بیٹھی رہے گی۔ ایک لمحے کو ماہ بانو نے بھی سوچا۔

"اتروں یا نہیں؟ شاید وہاں حیدر بابا کے ساتھ عبداللہ بھی ہو؟ ہوا تو؟ میں اندر نہیں جاؤں گی، دور سے ہی اسے دیکھ لوں گی۔ جب ذہنی کیفیت بہتر ہوگی تو فیصلہ کروں گی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ عبداللہ کو بتانا چاہیے یا نہیں، مگر اس وقت عبداللہ نظر آ جائے تو میں اپنی اذیت اور تکلیف کے شاید سبھی لمحات بھلا دوں۔"

یہی سوچ کر وہ اتر آئی۔ ریسیپشن سے پیر صاحب کے کمرے کا پتا کر کے وہ کاریڈور میں چلے آئے۔ ایک ایک کمرے کا نمبر دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ بائیں طرف کا آخری کمرا انہی کا تھا۔ یہ شاید اس لیے انہیں دیا گیا تھا کیونکہ یہ جگہ نسبتاً پُرسکون تھی۔ اکا دکا ملازمین کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔

خادم حسین نے دروازے پر دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر ناب گھمانے لگا۔

"چلو۔" اس نے ماہ بانو سے کہا۔

"نہیں، میں اندر نہیں جاؤں گی۔" وہ بولی۔

"باہر کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے۔"

"میں تمہاری حویلی کی پردہ نشین عورت نہیں ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ یہیں رہوں۔ میں نہیں جاؤں گی۔" اس کے لہجے میں ضدی پن تھا۔

وہ کچھ نہ بولا اور اندر چلا گیا۔ ماہ بانو کوریڈور کے اختتام پر بنی کھڑکی سے باہر سڑک پر رواں دواں ٹریفک دیکھنے لگی۔

خادم حسین اندر حیدر بابا اور زینی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر آگے بڑھ آیا۔ پیر صاحب رو رہے تھے۔ حیدر بابا مضطرب تھے اور زینی رو رہی تھی۔ اسے اندر آتے دیکھ کر زینی نے آنسو پونچھ لیے اور پیر صاحب کے دوسری جانب جا کھڑی ہوئی۔

"بابا جان کیا ہوا؟ آپ نے خبر کیوں نہیں دی اور اب بھی منع کر دیا کسی کو بتانے سے؟ یہ سب ہوا کب اور کیسے؟" اس نے کمرے میں موجود حیدر بابا اور زینی کو قطعی نظر انداز کر کے پوچھا۔

"اپنے حیدر بابا کو سلام اور چھوٹی بھابی کو دعا نہیں دو گے؟" پیر صاحب بولے۔

اس نے گہری نظر سے دونوں کو دیکھا۔ زینی بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پاکر وہ پیر صاحب کے کچھ اور قریب ہو گئی۔ حیدر بابا اب تک مضطرب اور پریشان تھے۔

''چلو زینی بیٹا' باہر چلو۔'' حیدر بابا اٹھ کھڑے ہوئے۔

زینی نے متذبذب ہو کر پیر صاحب کو دیکھا۔

''جائیں بیٹا' مگر تھوڑی دیر میں آجانا۔ ہم آپ کے بغیر اداس ہو جائیں گے۔''

وہ چپ چاپ حیدر بابا کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ باہر نکلتے ہی ان کی نگاہ کھڑکی سے ٹیک لگا کر کھڑی ماہ بانو پر پڑی۔ اسے اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ خاموش تھی' تھکی ہوئی' اداس اور پریشان تھی۔ چادر کو اس نے دوپٹے کی طرح لیا ہوا تھا۔ لمبے بال جوڑے کی شکل میں تھے مگر یوں جیسے دو تین دن سے کنگھی بھی نہ کی ہو۔ اس کے کپڑے بھی شکن آلود تھے۔

''تم یہاں نہیں ہو عبداللہ۔ یہاں تمہاری خوشبو نہیں ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہو بہت دور۔ کیا میرے دل کی فریاد تم تک نہیں پہنچ رہی۔ تمہیں کیوں خبر نہیں کہ تمہاری بانو کتنی اداس' کتنی تھکی ہوئی ہے۔'' وہ سوچتے سوچتے رو پڑی۔

زینی نے پہلے حیرت سے اسے دیکھا۔ اسے نفرت ہو رہی تھی اس لڑکی سے جو پیر صاحب کی خواہش کی تکمیل کے سامنے دیوار بنی کھڑی تھی۔ جو اس کے بھائی اور ریشماں کے درمیان موجود تھی۔ وہ نہ ہوتی تو بابا جان اس کی پُرامید اور بڑے بابا جان کی حسرت بھری نگاہوں کے جواب میں منہ نہ پھیرتے۔ وہ اسی طرح بخوشی یہ رشتہ منظور کرتے جیسے اس کا اور سبط کا کیا تھا۔ بلکہ تب تو بڑے بابا جان کو اپنے منہ سے کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ان سے پہلے ہی بابا جان یہ بات کہہ دیتے۔ مگر درمیان میں ماہ بانو کا نفرت انگیز وجود موجود تھا۔ وہ یہاں بھی تھی' اس وقت جب زینی اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

مگر یہ ایک لمحے کی سوچ تھی۔ اگلے لمحے بظاہر اچانک اور بلاوجہ وہ رو پڑی تو زینی پریشان ہو گئی۔

''بابا جان' ماہ بانو کو کیا ہوا؟'' پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس کی طرف لپکی۔ ''بانو تم ٹھیک ہو؟''

ماہ بانو چونک گئی۔ زینی اس کے بہت قریب کھڑی تھی۔ حیدر بابا بھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے اور ان کی طرف بڑھی۔

''السلام علیکم' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

''وعلیکم السلام جیتی رہیں۔'' حیدر بابا نے کہا۔ ان کے لہجے میں ہمیشہ والی گرم جوشی نہیں تھی۔

''تم یہاں کیسے بانو؟ اور تم رو کیوں رہی ہو؟'' زینی نے پریشانی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ ''اب پیر صاحب کیسے ہیں؟''

''ان کی حالت بہت خراب ہے۔ دوا بھی تو نہیں لیتے۔ میں آئی ہوں تو کچھ دوا لینی شروع کی ہے۔ تمہارے گھر کا کوئی فرد یہاں ایڈمٹ ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تم نے ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔''

حیدر بابا اسے دیکھ رہے تھے اور ان کے ذہن میں زرینہ اور پیر صاحب کے الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

''ایسا ہو جائے حمیدہ تو میں سکون سے مر سکوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے لیے بھی یہ حویلی مقبرہ بن جائے۔ مجھ پر تو جو گزرنی تھی' گزر گئی لیکن میری بیٹی پھولوں کی طرح نازک ہے۔ اس پر یہ سب نہیں گزرنا چاہیے۔

اس اوپر والے نے میری بیٹی کو سب کچھ میرے جیسا دیا ہے۔ وہی رنگ و روپ' وہی چہرہ' میری دعا ہے کہ اسے میری قسمت نہ ملے۔ شاہ جی میرے لیے کچھ نہیں کر سکے' مجھے اس کا شکوہ نہیں ہے لیکن انہوں نے میری بیٹی کو اس در و دیوار سے نہ بچایا تو میں سمجھوں گی کہ انہوں نے کبھی مجھ سے محبت ہی نہیں کی تھی۔ وہ سب جھوٹ تھا' فریب تھا۔'' زرینہ سرگوشی کر رہی تھی۔

''اپنی بیٹی کے بارے میں سوچ رہے ہیں جو بہت ہی پیاری مگر بہت دکھی بھی ہے۔ اس نے بہت کم خوشیاں دیکھی ہیں۔ کاش ہم اس کی آنکھوں میں بھی وہی چمک دیکھ سکیں' جیسی آپ کی آنکھوں میں ہے۔''

''علی ہماری زندگی بس چند سانسوں تک باقی ہے' اور کچھ نہ سہی تب بھی ریشماں تمہاری بھتیجی تو ہے۔ ہم پر ایک احسان اور کرنا کہ ہماری بیٹی کا بہت خیال رکھنا۔ ہم اس کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتے۔ نہ جانے اس کے بھائی کب اس سے منہ موڑ لیں۔ وہ تو اتنی معصوم اور کم گو ہے کہ اپنے دل کی بات زبان تک بھی نہیں لا سکتی۔ بس اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہے۔'' پیر صاحب آنسو بہاتے ہوئے منت کر رہے تھے۔

''میں اپنے مرتے ہوئے بھائی اور گوری کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔ منت سے' فریاد سے' کیسے بھی۔'' انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا۔ پھر وہ زینی سے مخاطب ہوئے۔ ''زینی بیٹا تم ریسپشن میں جا کر بیٹھو' میں ماہ بانو سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

ماہ بانو کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ وہ اس سے کیا کہنا چاہتے تھے۔ سر پہلے ہی دکھ رہا تھا۔ اب تو لگا کہ درد سے پھٹ جائے گا۔ دل ڈوبنے لگا۔

''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے بانو بیٹا!'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''میرا بھائی مر رہا

ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ہزار برس جیے مگر ہر دعا کب پوری ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان کیسے بھی تعلقات تھے مگر خون کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔

آج وہ میرے سامنے رو رہے تھے۔ منت اور فریاد کر رہے تھے اور میرے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ صرف آپ ہیں بانو بیٹا جو ہم سب کو خوشیاں بھی دے سکتی ہیں اور اس آگ کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کرسکتی ہیں۔

اب میں آپ کے سامنے منت کر رہا ہوں۔ ہمیں خوشیاں دے دیں۔ زندگی گزرتی ہے' وقت آگے بڑھتا ہے تو بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔ جو آج آپ کے لیے اہم ہے' وہ کل آپ کو بہت غیر اہم لگے گا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک طرف صرف آپ اور آپ کی خوشیاں ہیں اور دوسری طرف ہم سب ہیں۔ ہم سب کی زندگیاں ہیں۔"

ماہ بانو کو اپنا آپ کسی طوفان کی زد میں نظر آنے لگا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے گرد جھکڑ چل رہے ہوں۔ اس کی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے خود کو گرنے سے بچایا اور چند گہرے سانس لیے۔ دل میں ٹیس سی اٹھ رہی تھی۔

"آپ مجھے بیٹا کہتے ہیں مگر حقیقت میں' میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں ہوں۔ جس طرح آپ مجھے میری محبت اور خوشیوں سے دستبردار ہونے کے لیے کہہ رہے ہیں کیا ویسے ہی اپنی کسی بیٹی سے کہہ سکتے ہیں؟ اس سے اس کی خوشیاں چھین سکتے ہیں؟"

"میں آپ پر زور نہیں دے رہا۔ آپ سے کچھ چھین بھی نہیں رہا۔ صرف التجا کر رہا ہوں۔ منت کر رہا ہوں۔ میرے بھائی نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ آج پہلی مرتبہ رو کر منت کی ہے' وہ مر رہے ہیں۔ ان کے پاس زندگی کی بس چند سانسیں باقی ہیں۔ وہاں ریشماں ہے جو گھٹ گھٹ کر حویلی کی ہر بدقسمت بیٹی کی طرح جان دے رہی ہے۔ میرا بیٹا ہے جو غیر محفوظ ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں مگر وہ آگ کے اس کھیل میں شریک ہونے پر مجبور ہے۔ پلیز بانو بیٹا' کیا ہماری خوشیاں بھیک سمجھ کر بھی ہمیں خیرات نہیں کریں گی۔"

اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور بری طرح سے رو دی۔ وہ آزردگی سے اس کے کانپتے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہے۔ "I Don't want to end up a loser"
کہیں سے اُما کی فیصلہ کن آواز آئی۔

جو سکھی میں جانتی' پیت کر کے دکھ ہوئے
نگر نگر ڈھنڈورا پیٹتی' پیت کرے نہ کوئے

ایک اور یاد اُبھری۔

"It's better to have loved and lost than not to have loved at all"

نیہاں کہہ رہی تھیں۔

"یہ بات دن میں ہزاروں لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں مگر ہر کہنے والے کے لیے یہ نئی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ بانو میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔" عبداللہ کہہ رہا تھا۔

"پلیز بیٹا' کیا ہماری خوشیاں بھیک سمجھ کر بھی خیرات نہیں کریں گی؟" حیدر علی شاہ پوچھ رہے تھے۔

"میں نے سب کچھ آپ کے حوالے کر دیا۔ اپنی خوشیاں' اپنی محبت' سب کچھ۔" بالآخر اس نے کہا۔

"تھینک یو بیٹا۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ کبھی بھی نہیں۔"

ماہ بانو نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر سسکیاں اپنے اندر دفن کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے اس کی محبت اور اس کی خوشیاں اہم تھیں مگر ایک مرتے ہوئے شخص کی خواہش اور عبداللہ کی زندگی سے زیادہ نہیں۔

"ہم پر ایک احسان اور کر دینا بیٹا۔ ہمارے بیٹے کی زندگی سے مکمل طور پر نکل جائیں۔ اس طرح کہ وہ آپ کے متعلق سوچ بھی نہ سکے۔ وہ مڑ کر آپ کے پاس آیا تو آپ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکیں گی۔"

وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ دکھ اس کی رگ رگ میں گردش کرنے لگا تھا۔ وہ اس سے نئے رشتے استوار کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ ایسے رشتے جو اسے اور عبداللہ دونوں کو مذہب' قانون اور معاشرے کے اصولوں کی زنجیروں میں جکڑ دیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھنا چاہیں تو بھی نہ بڑھ پائیں۔

"یارب! میرے گناہ اتنے بڑے تھے جن کی سزا اتنی کڑی مل رہی ہے؟ کیا میں کبھی کوئی نیا رشتہ جوڑ پاؤں گی۔ اور جوڑ پاؤں گی تو اتنی بڑی بددیانتی کا ارتکاب کروں گی۔" اس نے آنسوؤں کی زبان میں فریاد کی۔

حیدر علی شاہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ نہ پائی تھی کہ پیر صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا اور خادم حسین باہر نکلا۔ اس کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر بہت طوفان اٹھ رہے ہوں۔ مگر وہ خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

ریشماں کو بہت تیز بخار تھا۔ نہ وہ کھا پی رہی تھی نہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ بس کبھی اچانک ساتھ بیٹھی اماں جان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگتی تھی' اماں جان اس کے لیے بہت فکرمند تھیں۔ انہوں نے مکرم کو بلوایا۔

"بیٹا' اس وقت نہ تو تمہارے بابا جان یہاں ہیں اور نہ خادم۔ ریشماں کا بخار ختم ہونے کا

نام نہیں لے رہا۔ نہ کچھ کھاتی پیتی ہے' نہ دوا لے رہی ہے۔ تم اپنے سخاوت بابا سے اجازت لے کر کوئی ڈاکٹرنی بلوالو۔''

''سخاوت بابا سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے مجھے پہلے بتایا ہوتا۔ میں خود آپی کو شہر لے جاتا ہوں۔''

''نہ بیٹا!'' اماں جان گھبرا گئیں۔ ''تمہارے سخاوت بابا کو اچھا نہیں لگے گا اور پھر تمہارے بابا جان کی بھی اجازت نہیں ہے۔ بس تم ڈاکٹرنی یہاں بلوالو۔''

''سخاوت بابا کا کیا تعلق اس بات سے؟ میری بہن ہیں ریشماں آپی۔ جواب طلبی کا اگر کسی کو حق ہے تو صرف بابا جان اور خادم حسین کو۔ ان کے سوا یہ حق نہیں کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ اور میں ہر بات منوا سکتا ہوں ان سے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو مکرم۔ یہ بات کبھی اپنے بابا جان یا سخاوت بابا کے سامنے مت کہنا۔''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ حضور علی گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔

''مکرم بھائی! میری بات سنیئے۔''

''کیا ہو گیا ہے؟'' مکرم جھلا اٹھا۔

''آپ آئیں تو سہی۔''

وہ باہر نکل گیا۔

''اب کیا مصیبت ہے؟''

''لاہور سے خادم بھائی کا فون آیا ہے۔ میں اماں جان اور ریشماں آپی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ بات کافی پریشان کن ہے۔ بابا جان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ ایڈمٹ ہیں۔ ڈاکٹرز کے مطابق ابھی وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ خادم بھائی سخت پریشان تھے۔''

مکرم اس کی بات سن کر گم صم ہو گیا۔

''اور یہی نہیں' وہاں حیدر بابا اور ان کی بیٹی زینب بھی ہے۔ بابا جان نے سبط اور زینب کی منگنی کر دی ہے۔ بابا جان یہ چاہ رہے تھے کہ ہم عبداللہ کو کچھ نہ کہیں بلکہ اگر ان میں سے کوئی حویلی آئے تو اس سے پیار اور محبت سے ملیں۔ اس طرح سے کہ ہمارے درمیان کوئی دشمنی نہ ہو۔ خادم بھائی یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ہم اماں جان اور ریشماں آپی کو لے کر فوراً بائی ایئر لاہور آئیں۔''

☆=====☆=====☆

خادم حسین' ماہ بانو کو اپنے ساتھ کار تک لے آیا تھا۔ اس کی حالت بہت بری تھی اور وہ کسی بھی لمحے گر سکتی تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم ڈاکٹر کو دکھا لو۔'' خادم حسین نے کہا تھا۔

''میں صرف سکون چاہتی ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں میں۔'' وہ بولی۔

خادم حسین نے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر بیٹھ گئی۔

''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ میرے گھر چلی چلو۔ وہاں تم بالکل محفوظ ہو گی۔ تمہارے نانا اور نانی بھی وہیں ہیں۔ میں انہیں تمہارے مل جانے کی اطلاع فون پر دے چکا ہوں۔ وہاں کچھ دیر آرام کر لو۔ پھر چاہو تو وہیں رہو اور نہ چاہو تو جہاں کہو گی' میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔'' وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

ماہ بانو میں یہ فیصلہ کرنے یا ایک لفظ بولنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھ کر وہ اسے اپنے بنگلے پر لے آیا۔ عبداللہ کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں کتنی ٹیسیں اٹھیں۔ وہ دن یاد آئے جب وہ سب وہاں اکٹھے ہوتے تھے۔ گھر کا وہ باغ یاد آیا جو اس نے ڈیزائن کیا تھا اور جہاں چہل قدمی کرتے ہوئے وہ کتنی ڈھیروں باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی محبت کے ساتھ' کبھی لڑائی جھگڑے کے ساتھ اور کبھی روٹھ کر۔ کتنے خوبصورت دن تھے وہ' مگر وقت کب کسی کے لیے رکتا ہے۔ کہنے کو صرف چند گز کا فاصلہ تھا' مگر دوری اتنی تھی کہ پھر کبھی شاید وہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکتے۔

اس کی آنکھوں میں ڈھیروں پانی اتر آیا۔ پوری کوشش کے باوجود بھی وہ اپنی سسکیاں نہ روک سکی۔

لمبی سی ڈرائیو وے طے کر کے جب کار رکی تو خادم حسین نے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا اور اسے اندر لے آیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر نہ وہ کچھ دیکھ پا رہی تھی' نہ سمجھ رہی تھی۔

''مولوی صاحب اور ملانی جی پچھلی طرف کے کمروں میں ہیں۔''

خادم حسین کے استفسار پر ایک ملازم نے بتایا۔

وہ ماہ بانو کو اپنے کمرے میں لے آیا اور اسے بستر پر لٹا دیا۔ پھر بیڈ سائیڈ ٹیبل سے ویلیم کی شیشی نکال کر اسے ایک گولی کھلا دی۔ اس نے بغیر کسی مزاحمت یا تذبذب کے گولی نگل لی۔

''آرام سے سو جاؤ اب۔ جاگو گی تو خود کو بہت بہتر محسوس کرو گی۔'' اس نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

ماہ بانو نے آنکھیں موند لیں۔

خادم فوری طور پر اسے اس کے نانا اور نانی سے ملوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ذہنی حالت پہلے ہی تباہ ہو چکی تھی۔ اتنے قریبی لوگوں کو دیکھ کر اس کا کچھ بھی ردِعمل ہو سکتا تھا۔

☆=====☆=====☆

پیر صاحب کے آبائی قبرستان کا گورکن دن میں ایک مرتبہ تمام قبروں کو صاف کرتا اور پانی دیتا تھا۔ گھر میں اور افراد بھی تھے جو یہ کام کر سکتے تھے مگر اس کام کو وہ اپنے ہاتھوں سے کرنا ہی پسند کرتا تھا۔ اس روز اس کی طبیعت صبح سے کچھ خراب تھی۔ اٹھ کر کام شروع کرتے کرتے اسے دوپہر ہوگئی۔

وہ کوئی عام قبرستان نہیں تھا جو ٹوٹا پھوٹا ویران اور اجاڑ ہوتا۔ پیر صاحب کا آبائی قبرستان تھا۔ وہاں بے شمار سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے' پھولوں کے تختے تھے' خوبصورت سنگ مرمر کی ترتیب وار قبریں تھیں۔

گورکن نے پانی کا پائپ اٹھا کر نلکے کے ساتھ لگایا اور باری باری سب قبریں دھونے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ چیتھڑوں میں ملبوس ایک شخص پر پڑی جو سکینہ بی بی کی آرام گاہ پر پاؤں کی طرف اوندھا گرا ہوا تھا۔ گورکن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے جلدی سے اپنے بیٹوں کو آواز دی۔

''دیکھو' یہ کون ہے جو یہاں گرا پڑا ہے؟'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''ابا مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی رات کو بھٹکتا ہوا یہاں آ نکلا ہے۔'' ایک بیٹے نے اظہارِ خیال کیا۔

''رات سردی بھی بہت تھی۔ دیکھیں ابا کہیں کھسک تو نہیں گیا۔'' دوسرا بولا۔

''تم لوگ جا کر دیکھو۔'' گورکن نے انہیں کہا۔

دونوں بیٹوں نے آگے بڑھ کر اس شخص کو سیدھا کیا۔ ایک نے دل کی دھڑکن دیکھی۔

''ابا یہ تو مر گیا ہے۔''

''مر گیا ہے؟'' اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔

''ہاں ابا۔ لگتا ہے سردی سے ہی مرا ہے بے چارا۔ ساری رات آسمان تلے پڑا رہا۔''

اب کے گورکن تہہ بند سنبھالتا اس کے قریب آ گیا۔

''اپنے گاؤں کا نہیں لگتا۔'' اس کے بیٹے نے بوڑھے کا جائزہ لیا۔

''شکل تو کچھ دیکھی بھالی لگ رہی ہے۔'' گورکن نے ذہن پر زور دیا۔

سفید داڑھی اور شکن آلود چہرے والا وہ بوڑھا بار بار اس کی یادوں پہ دستک دے رہا تھا۔

''ہاں بے چارا لنگڑا بھی ہے۔'' دوسرے بیٹے نے کہا۔

''ابا اسے لے کر کہاں جائیں؟''

''ارے! یہ تو سائیں بابا ہے۔'' گورکن چلایا۔ اس نے انہیں پہچان لیا تھا۔

''سائیں بابا؟ وہ کون ہے؟''

''بہت پہلے یہاں رہتا تھا۔ پتا نہیں کہاں سے آیا تھا اور پھر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اللہ

لوک تھا۔ جلدی سے اسے چارپائی پر ڈالو اور گاؤں والوں سے بولو کہ سائیں بابا گزر گیا۔''

دونوں بیٹوں نے مل کر اسے چارپائی پر ڈالا اور مسجد میں اعلان کروانے چلے گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہاں لوگ اکٹھے ہونے لگے۔

سخاوت بابا اور نوازش کو حویلی اور گاؤں کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ کر وہ سب ملتان جا رہے تھے' جہاں سے انہیں خصوصی ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور جانا تھا۔ گاڑی ابھی کچھ ہی دور چلی تھی کہ قبرستان کے پاس لوگوں کو جمع دیکھ کر مکرم نے رکوادی۔

''کیا بات ہے' سب یہاں کیوں جمع ہیں؟'' اس نے گورکن سے دریافت کیا۔

''سرکار' سائیں بابا وفات پا گئے ہیں۔ اسی لیے سب جمع ہیں۔'' اس نے جلدی سے بتایا۔

''کون سائیں بابا؟''

''حضور برسوں پہلے یہاں رہتے تھے۔ بہت پہنچے ہوئے تھے۔ اول تو بات نہیں کرتے تھے' مگر جب کرتے تھے تو ضرور پوری ہوتی تھی۔ شاید رات میں کسی پہر بھٹکتے ہوئے یہاں آئے اور سردی کی وجہ سے مر گئے۔''

مکرم نے گہرا سانس لیا اور گاڑی آگے بڑھوادی۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک سوئی رہی تھی۔ جب وہ جاگی تو اس کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ سر اب بھی بھاری تھا اور ہلکا ہلکا درد تھا' لیکن وہ پہلے والی حالت نہیں تھی۔ نانا جی اور بڑی اماں وہیں اس کے پاس بیٹھے اس کے جاگنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ جاگی تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ بڑی اماں اسے سینے سے لگائے کتنی دیر تک روتی رہی تھیں۔ نانا جی سجدے میں گر کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔

وہ کچھ سنبھلی تو منہ ہاتھ دھونے باتھ روم میں چلی آئی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اس کی نگاہ سامنے لگے آئینے پر پڑی۔ وہ خود کو تکتی چلی گئی۔

ان دو دنوں نے اسے کتنا بدل کر رکھ دیا تھا۔ اندر اور باہر دونوں طرح سے۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ بال تک برش نہیں ہوئے تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

وہ باہر نکلی تو ایک ملازمہ کھانے کی ٹرالی اور کپڑوں کا جوڑا لیے موجود تھی۔

''بڑے شاہ صاحب کہہ کر گئے ہیں کہ آپ یہ کھانا کھا لیں اور کپڑے تبدیل کر لیں۔'' وہ بولی۔

''اور وہ خود کہاں ہیں؟''

''وہ پیر صاحب کے پاس گئے ہوئے ہیں۔''

''میں فون کرنا چاہتی ہوں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

"یہ بستر کے ساتھ پڑا ہے بی بی!" ملازمہ نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے فون اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

"بیٹا پہلے کچھ کھالو۔ دیکھو تو کیا حالت ہو رہی ہے۔" بڑی اماں نے پیار سے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ نمبر ملاتے ہوئے بولی۔

"کیوں نہیں بھوک۔ تھوڑا سا میری چندا۔"

اسی وقت نمبر مل گیا اور ماہ بانو کی توجہ اماں سے ہٹ گئی۔

"ہیلو! ایڈی؟"

"ہاں، بانو کیسی ہو؟ کہاں غائب ہو؟ ٹیلی فون نہ سہی، خط ہی لکھ دیا ہوتا۔" ایڈی بولا۔

"ابھی اتنے دن تو نہیں ہوئے مجھے گئے ہوئے۔"

"یہاں میں اکیلا ہوں۔ جیمز بھی اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ حسب دور ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ صدیاں گزر گئیں تم سب کو دیکھے اور تمہاری آواز سنے ہوئے۔"

"لگتا تو مجھے بھی یہی ہے ایڈی!" وہ آزردگی سے بولی۔

"اس وقت عبداللہ کی طرف سے فون کر رہی ہو؟"

"نہیں، میں لاہور میں ہوں۔"

"لاہور میں کہاں؟ گھر تو بند ہے۔ تم کہاں ہو؟" اس نے ایک ساتھ سوال کیے۔

"میں پیر صاحب رجب علی شاہ کے مکان میں ہوں۔"

"کیا؟ پیر صاحب رجب علی شاہ کے مکان میں؟ کیوں مذاق کرتی ہو؟"

"میں مذاق نہیں کر رہی مگر پہلے تم اپنی سناؤ۔ تم ٹھیک ہو؟"

"اب کیا ٹھیک ہونا۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "میری آج رات فلائٹ ہے لندن کے لیے۔ جیمز ناراض ہو رہا تھا کہ میں اس کی منگنی کی تقریب میں شامل نہیں ہو رہا مگر اب یہاں ایک لمحہ گزارنا بھی دوبھر ہے۔ تمہیں معلوم ہے بانو! اُما انڈیا چلی گئی ہے۔"

"اُما انڈیا چلی گئی؟ تمہیں کس نے بتایا؟" وہ جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوگا مگر پھر بھی اسے دکھ ہوا تھا۔

"میں سکھر گیا تھا، وہیں پتا چلا تھا۔ مجھے دکھ ہے کہ اس نے اپنے منہ سے انکار نہیں کیا۔ وہ مجھے خود کہہ دیتی، میں سب سمجھ جاتا، وہ انکار خوشی سے نہیں کر سکتی تھی۔ مگر مجھ سے خود تو کہتی۔ میں اس کے ہونٹوں سے انکار سننا چاہتا تھا۔ مگر وہ جا چکی تھی۔"

"تمہیں کیا خبر ایڈی کہ اپنے منہ سے انکار کرنا کتنا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ اچھا ہوا وہ تمہیں نہیں ملی، ورنہ وہ ساری عمر سلگتی ہی رہتی۔" پھر قدرے توقف سے بولی۔ "میری بات سنو ایڈی۔ میرے دوست ہو تو میرا ایک کام کرنا۔ عبداللہ سے کہہ دو کہ......" اس کے حلق میں آنسوؤں کا

گولہ سا پھنس گیا۔ "اس سے کہہ دو کہ مجھے بھول جائے۔"

"کیا؟ تم اپنے حواسوں میں تو ہو بانو؟ کیا کہہ رہی ہو بانو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" اس نے بمشکل آنسو پیے۔ "ہم دونوں نے جو کچھ مل کر سوچا تھا۔ جو خواب اکٹھے دیکھے تھے، وہ سب بھول جائے۔ وقت گزرتا ہے ناں ایڈی تو بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک لمحے میں دنیا بدل جاتی ہے۔ بس سمجھو میری دنیا بدل گئی ہے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا بانو۔ میں نے اُما کو کھویا ہے اور میں جانتا ہوں کہ کھو دینے کی تکلیف کتنی زیادہ ہوتی ہے۔ جو مجھ پر گزر رہا ہے، وہ تم دونوں پر گزرے، میں ایسا نہیں چاہتا۔"

ماہ بانو نے چند لمحے کانپتے ہاتھوں میں ریسیور تھامے رکھا اور پھر کریڈل پر واپس رکھ دیا۔ نانا جی اور بڑی اماں خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بڑی اماں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

☆=====☆=====☆

ایڈی کے پاس وقت کم تھا۔ اسے ایئر پورٹ بھی پہنچنا تھا، مگر ماہ بانو کے فون نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے اسی وقت عبداللہ کا نمبر ڈائل کیا۔

"عبداللہ فوراً لاہور پہنچو۔" ایڈی نے اسے کہا۔

"میں لاہور میں ہی ہوں۔ بڑے بابا جان ہارٹ اٹیک کے بعد کلینک میں ایڈمٹ ہیں۔ انہیں دیکھنے جا رہا ہوں، بلکہ میں اور اماں جان ابھی پارکنگ میں ہی کھڑے ہیں۔"

"بانو سے تمہارا کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"ارے نہیں، اس سے کیا جھگڑا ہوگا۔ وہ تو اتنی سویٹ ہے۔"

"ابھی ابھی اس کا فون آیا تھا مجھے۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ پیر صاحب کے مکان میں ہے۔" اس نے بتانا شروع کیا۔

☆=====☆=====☆

جو کچھ ایڈی نے بتایا تھا وہ عبداللہ کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ ابھی گاؤں آنے سے پہلے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ اس کے جانے کے خیال سے افسردہ ضرور تھی۔ اس بات سے پریشان بھی تھی کہ اس کے بابا جان اس کے اور ماہ بانو کے متعلق جان کر کیا کہیں گے، وہ اس بات سے اپ سیٹ بھی تھی کہ وہ اس سے اپنے خاندان کے ماضی کے بارے میں کرید رہا تھا۔ فکر مند بھی تھی کہ وہ گاؤں میں محفوظ نہیں تھا۔ مگر وہ اسے چھوڑ دینے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"شاید وہ مذاق کر رہی ہو۔" عبداللہ نے خود کو تسلی دینا چاہی تھی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ماہ بانو اس قسم کا مذاق نہیں کر سکتی تھی۔

"اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی۔"

پیر صاحب کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے وہ اس بات کا کتنے زاویوں سے جائزہ لے چکا تھا۔ سب سے زیادہ جو چیز دماغ میں اسے چبھ رہی تھی' وہ ماہ بانو کی پیر صاحب کے مکان میں موجودگی تھی۔

کمرے میں سبھی موجود تھے' اس کے بابا جان' زینی' مکرم' حضور' بڑی اماں اور ریشماں۔ اسے ریشماں کو پہچاننے میں ذرا سی بھی دشواری نہیں ہوئی۔ زینی اس کی تصویریں دکھا ہی چکی تھی۔

وہ اماں جان کے ساتھ اندر داخل ہوا تو سبھی کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ زینی دوڑ کر ان دونوں سے لپٹ گئی۔

"میں کب سے انتظار کر رہی ہوں آپ لوگوں کا۔ آپ بھی بائی ایئر آجاتے تو کیا ہو جاتا۔"

"ایک منٹ بیٹا۔ اپنے بڑے بابا جان کو تو دیکھ لینے دو۔" اماں جان نے اسے پیار کے ساتھ اپنے سے الگ کیا۔

عبداللہ نے ریشماں کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے اپنی خوابیدہ آنکھوں سے ایک ٹک اسی کو تک رہی تھی۔ وہ واقعی بہت حسین تھی۔ لمبے بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا سامنے پڑی ہوئی تھی اور ململ کا دوپٹا سر سے سرک کر کندھوں پر آ رہا تھا۔

لیکن اس کا ذہن ماہ بانو میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے فارغ ہو کر اس کے پاس جانا چاہتا تھا۔ سب آپس میں مل رہے تھے۔ بڑی اماں اور اماں جان گلے لگ کر رو رہی تھیں۔ وہ ریشماں کو نظر انداز کر کے مکرم اور حضور سے ملا پھر پیر صاحب کی طرف بڑھ گیا۔

"جیتے رہو بیٹا!" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اسے دیکھ کر' محسوس کر کے' ان کے اندر پھر مسرتوں نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

"کتنا خوبصورت ہے عبداللہ۔ بالکل حیدر علی کی جوانی کی تصویر۔ اونچا' لمبا' کڑیل۔ ریشماں اس کے ساتھ کتنی اچھی لگے گی۔ ایسا ہی کوئی جوان اسے دنیا سے بچا کر رکھ سکتا ہے۔"

مگر اگلے ہی لمحے وہ مایوس ہو گئے۔ "حیدر علی نے انکار نہیں کیا مگر اقرار بھی تو نہیں کیا۔ شاید عبداللہ ایسا نہ چاہتا ہو۔ شاید خود علی ایسا نہ چاہتا ہو۔"

ریشماں اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ اپنی تصویروں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ وہ سب سے مل رہا تھا اور ریشماں اسے تکے جا رہی تھی۔ دل ہی نہیں بھر رہا تھا اسے دیکھنے سے۔ یہ تو اسے توقع ہی نہیں تھی کہ وقت تبدیل ہو جائے گا۔ اس نے اس کے خواب ضرور دیکھے تھے' دعائیں بھی بہت مانگی تھیں۔ مگر پھر بھی یہ سب بہت غیر متوقع تھا۔

اس کی خوشی اب بھی ادھوری تھی۔ پیر صاحب بیمار تھے۔

"اگر بابا جان تندرست ہوتے اور پھر ہم سب ملتے تو کتنا اچھا ہوتا۔" اس نے سوچا تھا۔

پیر صاحب نے عبداللہ کو اپنے قریب بٹھا لیا اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"بیٹا! ہم نے تم سب سے بہت زیادتی کی ہے۔ ہماری بہت کم سانسیں باقی ہیں۔ جو گناہ ہم نے کیے' ان کا بوجھ کسی معافی سے کم نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی تم معاف کر دو گے تو ہمیں تسلی ہو گی۔"

"بابا جان' آپ بزرگ ہیں۔ یوں بھی میں تو بہت عام سا شخص ہوں۔ میں کسی کو کیا معاف کر سکتا ہوں۔"

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

ریشماں کے دل میں کانٹا سا چبھ رہا تھا۔ عبداللہ نے اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا اور بس۔ وہ منتظر تھی کہ وہ اسے پھر دیکھے گا' مگر وہ بابا جان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی طرف پشت کیے۔

"خادم بھائی کہاں گئے ہیں؟"

زینی نے اس سے پوچھا تو وہ چونکی۔

"وہ گھر گئے ہیں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

☆=====☆=====☆

ماہ بانو سرخ کرتے اور سفید شلوار پر سفید دوپٹا لیے نہا کر باہر نکلی تو خادم حسین اس کا منتظر تھا۔ نہانے سے اس کی تھکن زائل ہو گئی تھی اور وہ خود کو کافی فریش محسوس کر رہی تھی۔ لمبے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

خادم حسین کو خواب گاہ میں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹک گئی پھر متوازن قدموں سے چلتی ہوئی صوفے پر آ بیٹھی۔

"خود کو بہتر محسوس کر رہی ہو؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہوں!"

"اب بتاؤ یہیں رہنا پسند کرو گی یا اپنے گھر جاؤ گی۔"

"وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے' نہ اماں نہ ابا۔" وہ خود سے بولی۔

"تو پھر ٹھیک ہے' یہیں رہ جاؤ۔"

"نہیں' میں گھر ہی جاؤں گی۔" اس نے کہا۔

"اکیلے گھر میں جا کر کیا کرو گی۔ اماں ابا کہاں ہیں؟" خادم نے پوچھا۔

"وہ امریکہ میں ہیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ میرا گھر ہے اور وہاں میں اکیلے بھی رہ سکتی ہوں۔ وہاں تنہا بھی میں محفوظ رہوں گی۔" وہ بولی۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم وہاں تنہا مت رہو۔ یہ اتنا بڑا گھر ہے۔ ہماری ضروریات کے لحاظ

سے کہیں زیادہ ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی' اور پھر اب تو اماں جان اور ریشماں بھی آ گئی ہیں۔ تمہاری کمپنی بھی رہے گی۔ یوں بھی ریشماں تو تمہاری بہت اچھی دوست بھی ہے ناں۔''

''ریشماں یہاں آئی ہوئی ہے؟'' اس کے اعصاب پھر کشیدہ ہونے لگے۔

''ہاں۔ مگر اس وقت وہ بابا جان کے پاس کلینک میں ہے۔ سب ہی آئے ہیں۔ سخاوت بابا اور ان کی فیملی البتہ گاؤں میں ہی ہے۔ وہاں کے معاملات کی دیکھ بھال بھی تو ضروری ہے۔ نوازش بھی وہیں ہے۔ زینی اور حیدر بابا سے تو تمہاری ملاقات ہوگئی تھی۔ چچی اماں اور عبداللہ بھی چل پڑے تھے اب تک شاید پہنچ بھی گئے ہوں۔''

ماہ بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تھینک یو۔ تم نے میری وجہ سے بہت پریشانی اٹھائی۔ میرا خیال بھی رکھا۔ مجھے اس قید خانے سے نکال کر میرے اپنوں کے درمیان پہنچایا۔ اس وقت تو میں نے تمہیں نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا ہوگا۔ تب میں اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہو جس نے تمہیں ہرٹ کیا ہو تو میں سوری کرتی ہوں۔''

''سوری تو ہمیں تم سے کرنا ہے۔''

''اب میں چلتی ہوں۔ بڑی اماں اور نانا جی کو بھی میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔''

''کہاں؟ تمہیں جہاں جانا ہوگا' میں خود چھوڑ دوں گا۔ اور ابھی تو مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

''بات تو ٹھیک ہے مگر چلی میں خود جاؤں گی۔ تمہیں پیر صاحب کے پاس بھی جانا ہوگا۔'' وہ بولی۔

''لاہور آتے ہوئے میں نے تم سے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔ بابا جان سے میں نے تمہارے متعلق بات کی ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم بہت خوش رہو گی۔ جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تب ہی میں نے سوچا تھا کہ شادی کروں گا تو تم سے۔ پھر میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے واپس آئے ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں۔ بابا جان سے آتے ہی بات کرنا چاہتا تھا مگر کچھ اور پریشانیوں میں الجھ گیا۔

اب جب یہ Mishap ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ تم میرے لیے کس قدر اہم ہو۔ میں لمبے چوڑے افیئرز وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا۔ میں نے تمہیں پسند کیا' چاہا کہ تم سے شادی کروں اور اس خواہش کا اظہار کر دیا۔ اب یہ تم تک ہے کہ تم کیا چاہتی ہو۔''

ماہ بانو نے ہونٹ کاٹ کر آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا۔

''مجھے جلدی نہیں ہے' سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلو۔ تمہیں اعتراض نہ ہوا تو پھر تمہارے اماں اور ابا جی سے بات کریں گے۔''

ماہ بانو کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنس گیا۔

''ہم پر ایک احسان اور کر دینا بیٹا۔ ہمارے بیٹے کی زندگی سے مکمل طور پر نکل جائیں۔ اس طرح کہ وہ آپ کے متعلق سوچ بھی نہ سکے۔ وہ مڑ کر آپ کے پاس آیا تو آپ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکیں گی۔ کیا ہماری خوشیاں بھیک سمجھ کر بھی ہمیں خیرات نہیں کریں گی۔'' حیدر بابا کی آواز اس کے ذہن میں ابھری۔

''شاید انہوں نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ آیا تو نہ جانے میں فیصلے پر قائم رہ سکوں گی یا نہیں۔ ہمارا ساتھ اب ممکن نہیں' تو مجھے کیا حق ہے کہ میں باقی سب کی زندگیوں میں زہر گھول دوں۔

وہ چاہتے تھے کہ میں اپنے پاؤں میں مذہب' قانون' معاشرے اور اخلاق کی ایسی بیڑیاں ڈال لوں کہ پھر چاہوں بھی تو اس کی جانب پلٹ نہ سکوں۔

میں کسی کو بھیک یا خیرات نہیں دے سکتی۔ میں تو خود تہی دامن ہوں۔ میرے پاس میری خوشیاں اور میری محبت ہی تو تھی۔ دل بے شک دُکھا' سارا وجود لہولہان ہو گیا مگر احساسِ گناہ تو ختم ہو گیا۔ اب سب کی آنکھیں' سب کی زبانیں مجھے خود غرض تو نہیں کہیں گی۔

ہاں' میری زندگی زرینہ خالہ جیسی ہی ہے۔ صرف نام بدلا ہے۔ انداز بدلا ہے لیکن باقی سب ویسا ہی ہے۔ ایک روز انہوں نے سوچا تھا کہ وہ اپنی خوشیوں کے لیے آخر کس قدر خود غرض ہو سکتی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ اپنی خوشیوں کے لیے وہ کبھی خود غرض نہیں ہو سکتیں۔ آج یہی سوال میرے سامنے ہے۔

اسے دیکھ لیا تو شاید میں وہ وعدہ نہ نبھا سکوں جو میں نے ایک مرتے ہوئے شخص کی خواہش کے احترام میں اور عبداللہ کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کیا تھا۔

یا اللہ مجھے ثابت قدم رکھنا۔ ہم آزاد رہے تو وہ مجھے پھر قائل کرنے آئے گا۔ سمجھائے گا اور بس پھر ہار جاؤں گی۔ میں بہت عام انسان ہوں۔ مجھ میں اتنی اچھائی نہیں کہ اپنے اٹھتے قدم دوبارہ روک سکوں۔ اس لیے میں اپنے پاؤں کاٹ دینا چاہتی ہوں۔''

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے خادم حسین کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماہ نو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یوں لگا جیسے دل کسی نے مسل دیا ہو۔ سب آہیں' سب سسکیاں اس نے اپنے اندر دفن کر دیں۔

''یہ کراہیں' آہیں اور سسکیاں ہمیشہ میرے اندر رہیں گی۔ میں انہیں اپنی یا ریشماں اور بداللہ کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہونے دوں گی۔'' اس نے دل میں تہیہ کیا۔

''تھینک یو بانو۔ تھینک یو ویری مچ!'' خادم حسین نے مسکرا کر رسان سے کہا۔

وہ تھوڑی دیر خاموشی سے آنسو پیتی رہی پھر بولی۔

''بس مجھے ایک یقین دلا دو۔''

"کہو بانو!"

"کہ تمہاری زندگی میں آئندہ میرے علاوہ کوئی عورت نہیں آئے گی۔"

"میں کوئی اتنا اچھا شخص نہیں ہوں بانو‘ مگر آج بابا جان نے مجھے بہت کچھ بتایا ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس نے میری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ میری زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی ہیں مگر ان میں سے کسی کو اپنی بیوی بنانے کا میں نے نہیں سوچا تھا۔ تم وہ واحد لڑکی ہو جس کے متعلق میں نے ایسا سوچا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میری زندگی میں کوئی اور عورت کبھی نہیں آئے گی۔"

"اور میری کوئی بیٹی ہو تو اس کے لیے حویلی کی چار دیواری مقبرہ نہیں بنے گی۔" ماہ بانو نے کہا۔

"نہیں۔ اس کا بھی ہر انسان کی طرح خوشیوں پر حق ہوگا اور اسے اس کا ہر جائز حق ضرور ملے گا۔"

"ایک اور بات۔ میرے ابا جی کمہار ہیں۔ مٹی کو شکل دینا میرے خون میں رچا بسا ہوا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ کام کبھی نہ چھوڑوں۔ مجھے اس کام سے محبت ہے۔"

"جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔ مگر یاد رہے کہ اس مرتبہ تمہیں خصوصی طور پر مجھے ایک اچھا سا سرامک پیس بنا کر دینا ہوگا۔ اس روز کی طرح اس مرتبہ میں خالی ہاتھ نہیں رہنا چاہتا۔" وہ شگفتگی سے بولا۔

"وہ بھی‘ اور بھی بہت سے دوسرے۔" اس نے دل میں اٹھتی ہوئی ٹیس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ شعوری کوشش سے عبداللہ کو اپنے دل و دماغ سے نکال کر خادم حسین کو وہاں بٹھانا چاہتی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے۔" وہ مسکرایا۔

"اور......" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی۔

"اور کیا؟ جو کہنا چاہو کھل کر کہہ دو۔ میرے بس میں تمہاری خواہش پوری کرنا ہوا تو ضرور کروں گا۔"

"اور زہرا؟" بالآخر اس نے کہا۔

"بابا جان سے میری بات ہوئی تھی اس بارے میں۔ وہ چاہ رہے تھے کہ حیدر بابا سے اس سلسلے مین بات کریں مگر میں نے منع کر دیا اور ان سے تمہارے متعلق کہا۔ وہ بغیر کسی تامل کے مان گئے۔ زہرا سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔" اس نے تسلی دی۔

وہ خاموش رہی۔

"اب بیٹھ جاؤ۔ اتنا حق تو مل گیا ہے ناں مجھے کہ تمہیں اکیلے گھر میں جانے سے روک

دوں۔ تم چاہو تو فون پر اپنے اماں اور ابا جی سے بات کر لو۔"

وہ بیٹھ گئی۔

"میں چلتا ہوں۔ بابا جان کو بھی دیکھنا ہے۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ اس کے سیاہ و سفید کی تم ہی مالک ہو‘ جس چیز کے لیے دل چاہے‘ جس چیز کی ضرورت ہو‘ بلا جھجک کہہ دینا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گڈ بائے!"

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ماہ بانو نے صوفے کے ساتھ پشت ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆=====☆=====☆

حیدر بابا سے نہ تو ریشماں کا عبداللہ کو ایک ٹک دیکھنا چھپا تھا اور نہ ہی پیر صاحب کی آنکھوں کی حسرت۔ سب باتیں کر رہے تھے اور وہ مناسب وقت کے انتظار میں تھے جب وہ ریشماں کو عبداللہ کے لیے مانگ سکیں۔ فوزیہ بیگم زینی کی منگنی پر خوش تھیں۔ اب حالات ایسے تھے کہ وہ ریشماں کو ماہ بانو پر ترجیح دے رہی تھیں مگر حیدر بابا کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ حیدر بابا سے فوزیہ بیگم کی رضامندی بھی پوشیدہ نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس بارے میں مطمئن تھے۔ بس ایک فکر تھی کہ کہیں ریشماں کی موجودگی میں عبداللہ کسی ایسے ردِعمل کا مظاہرہ نہ کردے جو اس کے لیے باعثِ تکلیف ہو۔

پیر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور حیدر بابا کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ بیماری ان کے بھائی کو دیمک کی طرح چاٹ جائے گی۔ ان کے پاس اپنے بھائی کی آخری خواہش پوری کرنے کا زیادہ وقت نہیں تھا۔

"ریشماں بیٹے‘ ادھر آنا۔" بالآخر انہوں نے کہا۔

وہ سر جھکا کر ان کے قریب آ گئی۔ عبداللہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی‘ گو کہ بات عام سی تھی۔ حیدر بابا اسے اپنے پاس بلا سکتے تھے۔ مگر ان کا انداز یہ بتا دینے کے لیے کافی تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہے تھے۔ وہ بے شک زیادہ عرصے ان کے ساتھ نہیں رہا تھا مگر ان کا بیٹا تھا اور ان کے مزاج‘ ان کے لہجے اور ماتھے کے ایک ایک بل کو سمجھتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے‘ عبداللہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں چلتا ہوں‘ مجھے کچھ کام ہے۔"

"کہاں جا رہے ہیں بھائی‘ بیٹھیں ناں۔" زینی نے بابا جان کا مدعا بھانپ کر اسے روکنا چاہا۔

"ہاں بیٹا‘ اس وقت کہاں جا رہے ہو؟" اماں جان نے کہا۔

اس نے سرد سی نگاہ سے بابا جان کو دیکھا اور کار کی چابی اٹھا لی۔

''ضروری کام ہے' ایک فرینڈ کی طرف جانا ہے۔''

بابا جان بھی اس کے لہجے کو پہچانتے تھے۔ اس کے ایک ایک تیور کو پہچانتے تھے۔ اس کی سرد نگاہیں یہ بتا دینے کے لیے کافی تھیں کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہے تھے' وہ ویسا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی آنکھوں سے اس نے بہت واضح پیغام دے دیا تھا۔

''اس بات کو یہیں ختم کر دیں بابا جان۔''

اور انہیں اس پیغام کو سمجھنے میں صرف ایک لمحہ لگا تھا۔

وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

پیر صاحب کے سامنے امید کا جو دیا جلا تھا وہ ایک لمحے میں بجھ گیا۔

عبداللہ کو نکلے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا جب خادم حسین کمرے میں داخل ہوا۔ سب سے ملنے کے بعد وہ پیر صاحب کے قریب بیٹھ گیا۔

''عبداللہ کہاں ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''اسے کچھ کام تھا' باہر گیا ہے۔''

اس نے پیر صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس امید پر کہ شاید وہاں ریشماں کی خوشیوں کے سبب کوئی چمک ہو۔ مگر وہاں وہی مایوسی تھی۔ اس نے ریشماں کی طرف دیکھا۔ اسے پہلے ہی تیز بخار تھا۔ پیر صاحب کی بیماری کی اطلاع سنتے ہی اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے ابھی تک بخار تھا۔ وہ پیر صاحب کے لیے فکر مند تھی اور اس کی اعصابی کشیدگی بھی واضح تھی۔

پیر صاحب ریشماں کے بعد خادم حسین کو بھی اس کی خوشی دینا چاہتے تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ کب ان کی آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ اس سے پہلے وہ اتنا ضرور کر دینا چاہتے تھے کہ اپنے سب سے بڑے بیٹے' اپنی گدی کے وارث کے گھر کی بنیاد رکھ جائیں۔ وہ اپنی حویلی کو آباد دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سکون کے ساتھ مرنا چاہتے تھے کہ ان کے پیچھے ان کی نسل قائم و دائم تھی۔

''علی! خادم ہمارا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کا گھر بھی آباد ہو جائے۔''

فوزیہ بیگم پریشان ہو گئیں۔ اس سلسلے میں بارہا زہرا نے قطعی انکار کیا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ حالات بدل چکے تھے' مگر زہرا کی مرضی جانے بغیر وہ کچھ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ یوں بھی وہ سب گھر والے ایک دوسرے سے دور رہ کر ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے تھے۔ ان کے بچوں نے اکٹھے رہ کر گھریلو زندگی کا لطف کبھی نہیں اٹھایا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ساری زندگی اس لطف سے محروم رہیں۔

حیدر بابا' بھائی کی محبت میں سرشار تھے اور اگر پیر صاحب تقاضا کرتے تو وہ انکار نہیں کر سکتے تھے مگر دل کے ایک گوشے میں وہ بھی انہی خطوط پر سوچ رہے تھے جن پر فوزیہ بیگم سوچ رہی

تھیں۔

پیر صاحب نے بات اس انداز میں شروع کی تھی کہ اگر حیدر بابا زہرا کے لیے سوچ رہے ہوتے تو انہیں اپنا مدعا زبان پر لانے کے لیے مشکل نہ ہوتی۔ خادم حسین کی پسند پر انہیں اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ محبت کھو کر انسان کیا محسوس کرتا ہے مگر اپنی دی ہوئی زبان کا بھی انہیں پاس تھا۔ حیدر بابا کو منظور نہ ہوتا تو خادم حسین اور ماہ بانو کا رشتہ طے کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کا تامل بھی نہ کرتے۔

اس سے قبل کہ ان کی بات کے جواب میں حیدر بابا کچھ کہتے' فوزیہ بیگم بول اٹھیں۔

''جی بسم اللہ۔ کوئی اچھی سی لڑکی ہو آپ کی نگاہ میں تو یہ نیک کام بھی کر دیں۔''

ان کا پیغام واضح تھا۔ انہیں زہرا اور خادم حسین کے بارے میں تامل تھا۔ پیر صاحب نے بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔

یاسمین بیگم کہنا چاہتی تھیں کہ کوئی اچھی سی لڑکی؟ کیا مطلب؟ زہرا یقیناً سب سے اچھی تھی' مگر اس معاملے میں وہ پیر صاحب سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں۔ فیصلے کا اختیار تو بہرحال انہی کے پاس تھا۔

''خادم کو ایک لڑکی پسند ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو علی' اور بھابی آپ بھی معترض نہ ہوں تو ہم یہ رشتہ طے کر دیں۔ بچی کے والدین امریکہ میں ہیں۔ آپ سب بھی جانتے ہوں گے اسے۔ عبداللہ بیٹے کے ساتھ پڑھتی رہی ہے اور اپنی ریشماں بیٹی کی خالہ زاد بہن بھی ہے۔ اس کا نام ماہ بانو ہے۔''

وہ سب چونک گئے۔ فوزیہ بیگم نے حیدر بابا کی طرف دیکھا جو خود بھی حیران تھے اور اپنی حیرت کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''کیا ماہ بانو راضی ہے؟'' زینی نے اپنے لہجے کی بے یقینی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

پیر صاحب نے خادم حسین کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔ اس کے تیار نہ ہونے کی صورت میں یہ رشتہ کیسے طے ہو سکتا تھا۔'' وہ بولا۔

خادم حسین تو ماہ بانو کو پا کر خوش تھا ہی لیکن مکرم بھی کم خوش نہیں تھا۔ ریشماں حیران بھی تھی اور بہت خوش بھی۔

اور حیدر بابا سوچ رہے تھے کہ اس نے بہت بڑی قربانی دی تھی۔ اس وقت انہیں ریشماں کے بجائے ماہ بانو میں گوری کا پرتو دکھائی دے رہا تھا۔ کتنی ملتی جلتی کہانی تھی یہ' فرق صرف اتنا تھا کہ گوری سے حالات نے اس کی محبت چھینی تھی اور ماہ بانو نے ایک مرتے ہوئے شخص کی خواہش پوری کرنے کے لیے اور اپنی محبت کی سلامتی کی خاطر خود یہ فیصلہ کیا تھا۔ ایک کی محبت نے آگ بھڑکائی تھی اور دوسری کی قربانی نے اس آگ کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

وہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ فیصلہ اس نے کتنی اذیت سے گزر کر کیا ہوگا۔ وہ اس کا دکھ اپنے دل پر محسوس کر سکتے تھے۔

☆=====☆=====☆

''بی بی جی' عبداللہ شاہ صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

ماہ بانو کو ملازمہ نے پیغام دیا تھا۔ وہ کچھ پریشان سی ہو کر آئی تھی۔ وہاں حویلی کی بیبیوں سے ملنے کے لیے مرد کبھی نہیں آیا کرتے تھے۔

ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ عبداللہ اس کے پاس ضرور آئے گا اور ذہنی طور پر اس کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

''انہیں بٹھاؤ' میں آتی ہوں۔''

ملازمہ چلی گئی۔

عبداللہ سے مل لینا بہتر تھا' ورنہ ماہ بانو کے انکار کے بعد وہ ضد کے ساتھ بھی ریشماں کے لیے راضی نہ ہوتا۔ کچھ عرصے بعد جب وہ ایک گھر کی' بیوی کی' غمگسار کی ضرورت محسوس کرتا تو وہ شادی ضرور کرتا مگر ریشماں کے ساتھ نہیں۔ اور ماہ بانو نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو۔ ایسا ہوتا تو ان تینوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ آتا۔ وہ چاہتی تھی کہ ان میں سے کوئی تو خوش ہو۔ اس کی قربانی یوں رائیگاں نہ جائے۔

اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اب وہ کافی بہتر لگ رہی تھی۔ نہانے' سو جانے اور کھانا کھا لینے کے بعد اب وہ بہتر انداز میں سوچ بھی سکتی تھی۔

مکان کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھا عبداللہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم ٹھیک ہو بانو؟ یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے اپنی؟''

ماہ بانو کا دل دکھ سے بھر گیا۔ آئینہ دھوکا کھا سکتا تھا' مگر عبداللہ اسے دیکھ کر دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور میری حالت کو کیا ہوا؟'' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم نے فون پر ایڈی سے کیا حماقت انگیز باتیں کی تھیں؟ اور یہاں کیا کر رہی ہو تم؟ لاہور میں اپنے گھر کے علاوہ کہیں رہنا تھا تو کیا میرا گھر نہیں تھا؟ یہاں آ کر رہنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ایک ایک کر کے سوال پوچھو گے تو سب کے جواب دے دوں گی۔ اتنا لمبا سوالنامہ' وہ بھی زبانی۔ میری یادداشت اچھی نہیں ہے۔''

عبداللہ بیٹھ گیا۔ ''وہ تو نظر آ رہا ہے کہ تمہاری یادداشت اچھی نہیں ہے' ورنہ تمہیں یاد ہوتا کہ کوئی شخص عبداللہ بھی ہے جس کی تمہاری زندگی میں کوئی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ تمہیں یاد ہوتا کہ

یہاں سے صرف چند گز کے فاصلے پر چہل قدمی کرتے ہوئے کبھی تم اور وہ شخص اکٹھے خواب دیکھا کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہوتا کہ وہ باغ جسے تم نے سجایا تھا' اس کی گھاس کی ایک ایک پتی تمہاری اور اس کی محبت کی گواہ تھی۔ تمہیں یاد ہوتا کہ......''

وہ اس کا ایک ایک زخم کرید رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی دیوار سے سر ٹکرا دے' چیخ چیخ کر رو پڑے۔ اپنے اوپر قابو رکھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

''نہیں بانو' جو وعدہ تم نے کیا ہے' اسے مت توڑنا۔ اپنے اوپر قابو رکھنا ورنہ سب تباہ ہو جائے گا۔'' اس نے اپنے اندر اٹھتی چیخوں کو اندر ہی دفن کرنے کی کوشش کی۔

''جو کچھ تم کہہ رہے ہو' وہ مجھے یاد نہیں ہے۔'' اس نے کوشش کی کہ اس کے لہجے سے اس کے جذبات کا اندازہ نہ ہو سکے۔

عبداللہ نے آنکھیں قدرے میچ کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تمہاری زبان اور تمہارے الفاظ نہیں ہیں بانو۔ یہ لہجہ تمہارا اپنا نہیں ہے۔ میں نے بارہا تم سے کہا کہ کبھی مجھ سے کوئی ایسی بات نہ چھپانا جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔ اور ہمیشہ کی طرح آج بھی تم مجھ پر اعتبار نہیں کر رہی ہو۔ مجھے بتاؤ کہ کس نے تمہیں یہ سب کہنے پر مجبور کیا ہے۔ کس نے پریشرائز کیا ہے تمہیں؟''

''یہ فیصلہ خالصتاً میرا اپنا ہے۔ بغیر کسی دباؤ کے کیا ہوا۔''

''یہ صرف تمہاری زندگی کا فیصلہ نہیں ہے میری زندگی کا فیصلہ بھی ہے اور اسے کرنے کا اختیار تنہا تمہارے پاس نہیں ہو سکتا۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''تم مجھ پر زبردستی نہیں کر سکتے۔''

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں کس نے مجبور کیا مجھے چھوڑنے کے لیے؟ ریشماں؟ خادم حسین؟ مکرم؟ کس نے؟'' اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''میں نے بتایا ہے کہ یہ فیصلہ ذاتی تھا۔''

''میں اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گا جس نے تمہیں پریشرائز کیا ہے۔ مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟'' عبداللہ نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

''صرف اپنی کہو گے یا میری بھی سنو گے۔'' وہ بولی۔

''مجھے صرف اپنے سوالوں کا جواب چاہیے۔'' وہ مُصر تھا۔

''یہی سہی۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہ کر پھر بولی۔ ''دو دن پہلے میں نے زندگی کو ایک بالکل مختلف انداز میں دیکھا۔ میں تنہا تھی اور میرے پاس سوچنے کے لیے ان باتوں کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں۔ میں نے اپنے اور تمہارے تعلق کے بارے میں بہت غیر جانبداری سے سوچا۔

یہ دو دن میری زندگی کے تجربے کے اعتبار سے بہت قیمتی تھے۔ انہوں نے مجھے بہت کچھ

سکھایا ہے۔ بہت سی چیزیں جو کبھی میرے لیے' بہت اہم تھیں' اب وہ بہت غیر اہم ہو گئی ہیں اور جو باتیں غیر اہم تھیں' وہ اہم ہو گئی ہیں۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ زندگی میں محبت سے زیادہ اہم چیزیں بھی ہیں۔ آج تک محبت کھو دینے سے کوئی نہیں مرا۔ میں اور تم زندہ رہیں گے اور اپنے آپ میں گم ہو جائیں گے۔ جب سے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے' میں مطمئن ہوں۔ میرے دل سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ وہ بوجھ جو تمہاری طرف پسندیدگی کی پہلی نگاہ ڈالتے ہوئے ہی میرے دل پر آ پڑا تھا۔''

''جھوٹ مت بولو بانو۔ کیا میں تمہیں نہیں جانتا؟ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کبھی غیر اہم نہیں ہو سکتے۔''

''پلیز عبداللہ۔ پھر کبھی یہ بات مت دہرانا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری آئندہ زندگی میں کبھی میرے ماضی کا زہر گھلے۔ یاد ہے ایک مرتبہ یہ درخواست تم نے زینی کے لیے سبط سے کی تھی۔ تم واقعی میرے لیے غیر اہم ہو گئے ہو۔ میری آئندہ زندگی میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے اور خادم نے منگنی کر لی ہے۔ شادی بھی جلد ہی ہو جائے گی۔ وہ میرے اور تمہارے تعلق کے بارے میں بے خبر ہے۔ پلیز اسے کچھ مت بتانا۔''

''کیا؟'' اس نے بے یقینی سے ماہ بانو کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔ وہ بہت اچھا ہے۔ میں اس کے ساتھ خوش رہوں گی۔ سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ مجھے کسی کے دکھے دل کی آہ' کسی کی بددعا لگنے کا خوف نہیں ہے۔ وہ میرا ہے پورے کا پورا۔ میں ساری زندگی کسی احساسِ گناہ کے ساتھ نہیں گزارنا چاہتی۔

شادی کے بعد محبت کا وہ روپ نہیں رہتا جو شادی سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ایک ایسے ماحول میں نہیں رہ سکوں گی جہاں کسی کی نگاہ میں میرے لیے عزت اور محبت نہ ہو۔ جہاں ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد بھی میرے ہاتھ کچھ نہ آئے۔ میں توقعات کے سہارے نہیں جینا چاہتی' نہ کسی کو دھکا دے کر اس کی جگہ پر قبضہ کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر سچائی کھوجنے کی کوشش کرتا رہا۔

''پلیز عبداللہ! پھر میری راہ میں مت آنا۔ خادم حسین تمہارا بھائی ہے۔ میرا اور تمہارا رشتہ بالکل بدل گیا ہے۔ اپنے بھائی کی عزت کو رسوا مت کرنا۔'' عبداللہ کے دل کو دھکا سا لگا۔

''اور اگر میرے اور تمہارے تعلق کے بیچ کوئی سچائی تھی تو تمہیں اس سچائی کی قسم' جو جگہ ریشماں کی ہے وہ اسے دے دو۔ پلیز۔'' وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔

وہ چلا گیا اور ماہ بانو اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

☆=====☆=====☆

حیدر بابا سے عبداللہ کے قدموں کی شکستگی چھپی ہوئی نہیں تھی۔ ایسے ہی ایک روز وہ اپنے بابا

جان کے پاس گئے تھے۔ یونہی شکستہ' بجھے ہوئے۔

خادم حسین نے گرم جوشی سے اسے گلے لگایا اور اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ ریشماں قدرے اوٹ میں ہو گئی۔

''بھائی جان آج میں آپ سے آپ کی سب سے قیمتی اور پیاری چیز مانگنے لگا ہوں۔'' اب وہ انکار کے خوف کے بغیر ان سے ریشماں کا ہاتھ عبداللہ کے لیے مانگ سکتے تھے۔

☆=====☆=====☆

نیو یارک سے جتنی افراتفری کے عالم میں سبط حسن اور زہرا آئے تھے' اتنی ہی افراتفری کے عالم میں ماہ بانو کے ابا اور اماں جی بھی آئے تھے۔

ریشماں کی طرف سے مطمئن ہو کر پیر صاحب نے ان سے کہا تھا۔

''اب تم سب گھر جاؤ۔ اب ہم صرف یاسمین بیگم سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

وہ سب گھر چلے آئے تھے۔ ریشماں کمرے سے نکل کر بند دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔

''چلیں آپی!'' مکرم نے قریب آ کر کہا تھا۔

''میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے مکرم۔ مجھے لگتا ہے کچھ ہونے والا ہے جسے ہم سہار نہیں پائیں گے۔'' اس نے ہونٹ کاٹ کر اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ سب خیر ہو گی۔ آپ خواہ مخواہ گھبرا رہی ہیں' آئیں گھر چلیں۔''

خادم حسین بھی قریب آ گیا۔

''کیا ہوا ریشماں؟''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے بھائی۔ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔''

''ڈرنے کی اور خواہ مخواہ ڈرنے کی تمہاری عادت ہے۔ چلو میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے پیار سے کہا۔

لیکن وہ بلاوجہ نہیں ڈر رہی تھی۔ جن خدشات کو وہ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی' وہ حقیقت میں بدل گئے تھے۔

جب ڈاکٹر اور نرس عمومی چیک اپ کے لیے پیر صاحب کے کمرے میں گئے تو وہ ہر علاج سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اور وہ جو ان کی زندگی کی ہمسفر تھیں مگر جسے انہوں نے کبھی اپنا ساتھی نہیں بنایا تھا' موت کے اس سفر میں ان کی ہمسفر بھی تھیں اور ساتھی بھی۔

☆=====☆=====☆

ابا جی' ماہ بانو کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ گھر آ کر وہ ان سے اور اماں جی سے لپٹ کر بہت

روئی تھی۔

''میں نہ کہتی تھی کہ اس آگ میں مت کودنا۔ کیا آیا تمہارے ہاتھ؟ ساری زندگی کے لیے قید!'' اماں جی کہہ رہی تھیں۔

''اماں! میں اس آگ میں نہ کودتی تو یہ بجھتی کیسے؟ اپنا آپ لہولہان کر کے' خود کو بھسم کر کے ہی تو یہ آگ بجھا پائی ہوں۔ آپ کی ریشماں کو خوشیاں مل گئیں۔ وہ اتنی اچھی ہے کہ جلد ہی عبداللہ اسے قبول کر لے گا۔ وہ دونوں بہت خوش رہیں گے۔''

''وہ تو خوش رہیں گے' سبھی خوش رہیں گے مگر تم؟ مجھے کسی سے غرض نہیں ہے' نہ ریشماں اور نہ عبداللہ سے' نہ ان کے ماں باپ سے' میرے لیے تو تم ہی ہو بانو۔ میری کل کائنات تو میری بیٹی ہے۔'' اماں کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔

''اماں! میں بہت عام سی انسان ہوں۔ میں کسی کو اس سے بڑھ کر کیا دے سکتی ہوں جو میرے پاس ہے۔ مکرم اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے اس قدر بے چین تھا کہ حیدر بابا اور ان کے گھرانے کے لیے اس کے دل میں کوئی میل نہیں رہا تھا۔ مگر وہ بہت انتہا پسند ہے۔ عبداللہ انکار کر دیتا تو یہ آگ پھر بھڑکتی اور اس مرتبہ اسے مکرم اور عبداللہ دونوں بھڑکاتے۔ ایک مرتبہ پھر وہی دوریاں' وہی آگ اور خون نسلوں کا مقدر بنتی۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتی اماں۔ اور مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ میں ایک مرتے ہوئے شخص کو کوئی خوشی کوئی سکون دے سکی۔''

''اس ظالم جہنمی کو!'' اماں کے لہجے میں زہر اتر آیا۔

''نہیں اماں' ایسے نہ کہیں۔ ہم کیا جانیں کسی کا اعمال نامہ؟ کیا خبر وہ خدا کے حضور کیسے گڑگڑائے ہوں۔ ان کی آنکھوں سے ندامت کا کیسا آنسو ٹپکا ہو جس نے ان کے اعمال نامے کی ساری سیاہی دھو ڈالی ہو۔ یہ تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔''

ابا جی بہت آزردہ تھے' مگر انہوں نے اسی قدر پوچھا۔

''بانو اپنے فیصلے سے خوش ہو؟''

''خوش؟'' وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ''میں مطمئن ہوں۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ کسی جرم کا احساس نہیں ہے۔ ابا جی' میں جانتی ہوں کہ زندگی اتنی ہموار تو نہیں ہوگی مگر پھر کس کی زندگی ہموار ہے؟ اتنا بہت نہیں ہے کہ میرے قدم اس جگہ ہیں جو صرف میری ہے' بلا شرکت غیرے۔

پیر صاحب کی وفات کے بعد بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ سب لوگ بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان کے رویے اور زندگی کے بارے میں ان کے نظریے بدل گئے ہیں۔ شاید ٹھوکر بھی بہت بڑی تھی یہ۔ وہاں میری اتنی حیثیت ضرور ہوگی کہ سب میری بات پر توجہ دیں۔ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ اپنی اس تعلیم کو کام میں لا کر میں بھی انہیں بدلوں گی۔ سفر تھکا دینے والا ہوگا مگر منزل

خوبصورت ہوگی۔ یہ سفر بھی ابا جی صرف میں ہی کر سکتی ہوں۔ یاسمین بیگم یا نذری بیگم جیسی کوئی عورت نہیں۔ اتنا حوصلہ مجھ میں ہی ہے۔''

ابا جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اللہ تمہیں اس سفر میں کامیاب کرے۔'' پھر قدرے توقف سے بولے۔ ''میری صرف ایک خواہش ہے کہ تم اس حویلی میں اس وقت داخل ہو جب ریشماں وہاں سے جا چکی ہو۔''

اس نے پلکیں جھکا لیں۔

☆=====☆=====☆

زندگی آہستہ آہستہ اپنی ڈگر پر واپس آ رہی تھی۔ ریشماں' عبداللہ کے ساتھ بڑی حویلی سے نکلی تھی تو ماہ بانو' خادم حسین کے سنگ وہاں داخل ہوئی تھی۔

ریشماں کو لگا تھا جیسے اس کے ہاتھ خوشیوں کا خزانہ لگ گیا ہو۔ اس نے جو مانگا تھا' اسے مل گیا تھا۔ عبداللہ' جسے وہ چاہتی تھی' اس کا بنا دیا گیا تھا۔ اور ماہ بانو' اس کی دوست' اس کی بہن' اس کی راز دار اس کی بھابی بن گئی تھی۔

لیکن کبھی کبھی اسے یہ خوشی بہت ادھوری لگتی تھی۔ اس روز لاہور کے مکان کے لان پر گھاس پر بیٹھے وہ یہی سب سوچ رہی تھی کہ فوزیہ بیگم چلی آئیں۔

''کیا سوچ رہی ہو ریشماں؟'' انہوں نے کرسی اس کے قریب کرتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' پھر ہولے سے بولی۔ ''کس سے کچھ کہوں اللہ تعالیٰ نے میری دونوں مائیں مجھ سے لے لیں۔''

''میں ماں نہیں ہوں تمہاری؟''

وہ آبدیدہ ہو گئی۔ ''جی اماں جان' اب تو آپ' آپ ہی میرے لیے ماں ہیں۔''

''تو پھر بتاؤ' اداس کیوں ہو؟''

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ''اماں جان' وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مجھے کہنا بھی نہیں پڑتا اور وہ سب کچھ میرے سامنے ڈھیر کر دیتے ہیں مگر مجھے لگتا ہے کہ پھر بھی وہ مجھ سے بہت دور ہیں۔ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی میرے پاس نہیں ہوتے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح میرا خیال تو ضرور رکھیں گے' مگر میرے کبھی نہیں ہوں گے۔''

فوزیہ بیگم کے دل میں تیر سا پیوست ہو گیا۔

''ریشماں بیٹا' محبت بہت قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسے خوش قسمت بہت کم ہوتے ہیں جنہیں یہ قدرت انعام میں دیتی ہے۔ بغیر کسی جدوجہد کے۔ تم اپنا تن من دھن اس بھٹی میں جھونکو گی تو پاؤ گی۔ اور میرا ایمان ہے کہ پاؤ گی ضرور۔ بہت قربانی دے کر' بہت جدوجہد

کر کے۔"

اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"اماں اپنے گھر کے لیے تو عورتیں ہمیشہ ہی بہت قربانی دیتی آئی ہیں۔ میری اماں جان نے کتنی دیں۔ کوئی عورت شاید کبھی اپنی سوتیلی اولاد کو اتنی محبت نہیں دے سکتی' جتنی انہوں نے مجھے دی۔"

فوزیہ بیگم نے اسے حوصلہ افزا مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ "جاؤ دیکھو' وہ اندر کیا کر رہا ہے۔ اس سے کہو کہ تمہارا دل چاہ رہا ہے یہاں اس کے ساتھ بیٹھنے کے لیے' اس سے باتیں کرنے کے لیے"

اسے آہستہ آہستہ چل کر اندر جاتے دیکھتے ہوئے فوزیہ بیگم ماضی میں گم ہو گئیں۔ کچھ ایسے ہی الفاظ انہوں نے اپنی ساس سے کہے تھے۔

"پھوپھو جان! مجھے لگتا ہے کہ وہ کبھی میرے نہیں ہوں گے۔ حالانکہ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میری ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ پھر بھی یوں لگتا ہے کہ وہ میرے نہیں ہیں' کسی اور کے ہیں۔"

اور ان کی ساس کے الفاظ وہی تھے جو انہوں نے آج ریشماں کے سامنے دہرائے تھے۔

پھر ایک دن یونہی اتفاق سے انہوں نے حمیدہ اور حیدر علی شاہ کی گفتگو سن لی تھی' جب وہ انہیں اپنی اور زرینہ کی گفتگو سنا رہی تھی۔

"شاہ جی میرے لیے کچھ نہیں کر سکے' مجھے اس کا شکوہ نہیں ہے لیکن انہوں نے میری بیٹی کو اس در و دیوار سے نہ بچایا تو میں سمجھوں گی کہ انہوں نے کبھی مجھ سے محبت ہی نہیں کی تھی۔ وہ سب جھوٹ تھا' فریب تھا۔"

انہیں لگا تھا کہ کسی نے ان کے دل پر آرے چلا دیے ہوں۔ تب انہیں معلوم ہوا تھا کہ ان کے مقدر میں اپنے شوہر تک پہنچنے کے لیے ہی کتنا طویل سفر لکھا ہوا تھا اور پھر کتنی جدوجہد' کتنی قربانیوں کے بعد وہ ان تک پہنچ پاتی تھیں۔

عبداللہ اور ریشماں باہر باغ میں آ رہے تھے۔ ریشماں کے چہرے پر امید اور محبت کے ہزار رنگ تھے۔ اس کے ریشمی لمبے بالوں کے ساتھ ہوا اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔

فوزیہ بیگم دیکھ رہی تھیں' وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے باتیں کرتے ہوئے گھاس پر ننگے پاؤں چہل قدمی کر رہے تھے۔

"ریشماں! یہ مسافت بہت طویل اور راہیں بہت پُر خار ہیں۔ تمہاری محبت کی شدت ایک روز اپنے آپ ضرور منوا لے گی۔ مگر اس منزل تک پہنچتے پہنچتے تمہارے پاؤں میں آبلے بھی پڑیں گے اور تمہارا وجود بھی لہولہان ہو گا۔ کبھی یوں لگے گا کہ تم ساری عمر جیت نہیں پاؤ گی۔ وہ جو

سامنے ہوتے ہوئے بھی تم سے کھو گیا ہے' اسے ڈھونڈ نہیں سکو گی۔ لیکن تھک کر بیٹھنا مت۔ ایک دن وہ ضرور تمہارا ہو گا۔ صرف اور صرف تمہارا' پورے کا پورا۔"

فوزیہ بیگم نے سوچا اور اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

اور عبداللہ کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے ریشماں سوچ رہی تھی۔

"تم مجھ سے اتنے دور بھی نہیں ہو عبداللہ کہ میری محبت کی حرارت تم تک نہ پہنچ سکے۔ تمہیں اپنا اسیر نہ بنا سکے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے پاس ہوتے ہوئے تم کہاں ہوتے ہو' مگر میری محبت کی کشش ایک روز تمہیں میرے پاس ضرور کھینچ کر لائے گی اور پھر تم کہیں نہیں جا سکو گے۔ مجھ میں بہت حوصلہ ہے اور تم بھی بنیادی طور پر محبت کرنے والے انسان ہو۔ تمہیں جیت لینا' اپنا بنا لینا اتنا مشکل نہیں کہ اس کے لیے یہ زندگی کم پڑ جائے۔"

اس نے اپنے ہاتھ پر عبداللہ کے مضبوط ہاتھ کی گرفت محسوس کی اور اس کے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔ مسافت طویل اور پُر خار تھی مگر اس کا حوصلہ بہت بلند تھا۔

☆=====ختم شد=====☆